# DUE DATE



| | | | |
|---|---|---|---|
| | | | |

# بیسویں صدی

فروری



DELHI

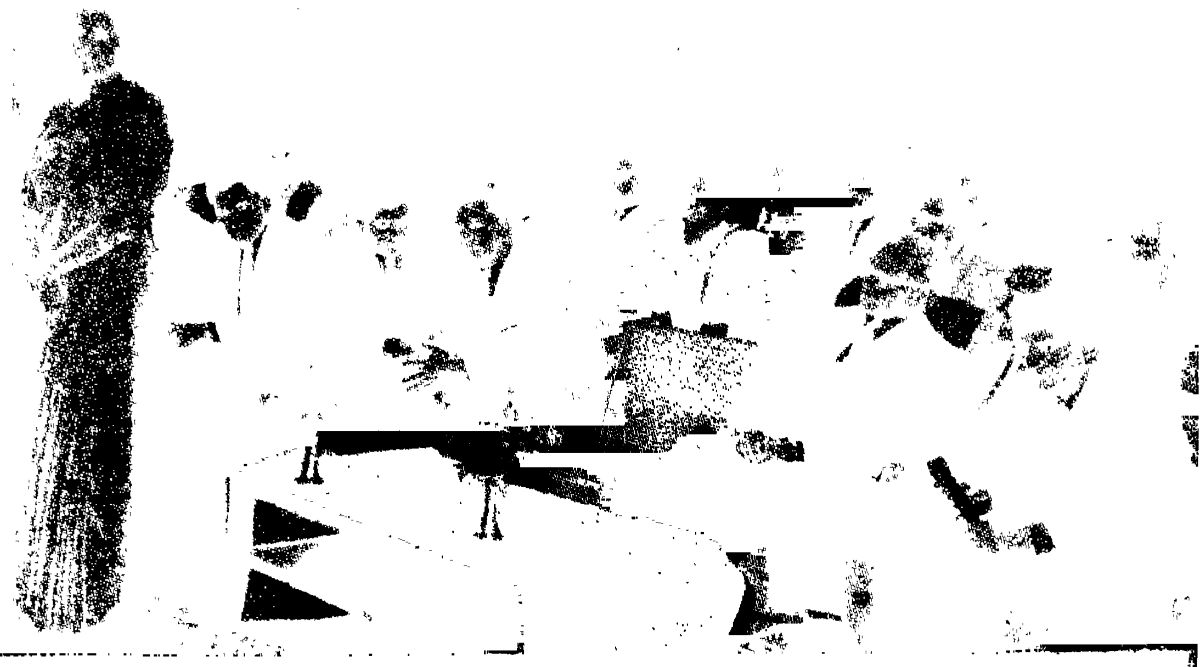
25



وہ چہرہ کہ سورج کو دکھائے درپن        وہ زلفیں کہ جھوم جھوم اٹھے ساون

شرمائیں جو بجلیوں کو ایسی آنکھیں        ہو جائے جو چاندنی سے میلا وہ بدن

نزایش کارشاد



پچھلے دنوں نئی دہلی میں سوویت لینڈ نہرو کمیٹی کی طرف سے ادبی انعامات تقسیم کیے گئے۔ اِس تقریب کی صدارت ہندوستان کی وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں اُنھوں نے فرمایا کہ "مجھے اس تقریب میں شامل ہو کر بے اندازہ خوشی محسوس ہو رہی ہے جو میرے پتا شری جواہر لال نہرو کے نام گرامی سے متعلق ہے۔ والدِ محترم یقیناً عالمی امن کے پیغمبر تھے اور رُوس کی انسان دوستی اور امن پسندی کا اُنھیں خلوصِ دل سے اعتراف تھا"۔۔۔۔۔ تصویر میں حاضرین کی صف میں سب سے پہلے شخص ہندوستان کے بہت بڑے صحافی اور اسم با مسمیٰ رانا جنگ بہادر ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں متعدد کامیاب لڑائیاں لڑیں ۔



اُردو کی نامور ترقی پسند افسانہ نگار خاتون محترمہ رضیہ سجاد ظہیر کو کرُپ کایا (Kaupa Kaya) کی ایک تاریخی تصنیف کے اُردو ترجمہ "لینن کی یاد میں" کے سلسلے میں ایک ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔
اندرا گاندھی کے دستِ مبارک سے یہ انعام حاصل کرتے ہوئے دونوں خواتین کی پُروقار مُسکراہٹ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ سیاست اور ادب کے میدان میں بھی عورت آج مرد سے پیچھے نہیں ہے



اُردو کے پُرانے صحافی اور پختہ مشق مترجم جناب مخمور جالندھری کو رُوس کے عظیمُ المرتبت صاحبِ قلم میکسم گورکی کے شاہکار (Foma Gordeev) کے اُردو ترجمہ "دیوانہ ہے دیوانہ" کے لئے ایک ہزار روپے کا انعام عطا کیا گیا جسے وہ خندہ پیشانی سے اندرا جی سے حاصل کر رہے ہیں ۔

# بیسویں صدی

ایڈیٹر: خوشتر گرامی

فروری ۱۹۶۶

جلد ۳۱ — شمارہ ۲

ٹیلیفون دفتر ——

ٹیلیفون رہائش ——



| | | |
|---|---|---|
| ۱. تیر و نشتر | خوشتر گرامی | [illegible] |
| ۲. ایس۔ کے۔ پامی | خوشتر گرامی | ۱۴ |
| ۳. دو کنواریاں | کشمیری لال ذاکر۔ ایم۔ اے | ۱۵ |
| ۴. غزل | سید حباب ترمذی | ۲۰ |
| ۵. سجا اگھر | اقبال صدیقی۔ ایم۔ اے | [illegible] |
| ۶. غزل | نافع رضوی۔ ایم۔ اے | ۲۶ |
| ۷. غزل | قمر عثمانی | ۲۹ |
| ۸. پھول کا دل | عفت موہانی۔ ایم۔ اے | [illegible] |
| ۹. غزل | ناز قادری۔ بی۔ اے (آنرز) | [illegible] |
| ۱۰. غزل | کرشن موہن۔ ایم۔ اے | [illegible] |
| ۱۱. غزل | سعادت نظیر۔ ایم۔ اے | [illegible] |
| ۱۲. زرد گلاب | رضیہ سجاد ظہیر۔ ایم۔ اے | ۳۳ |
| ۱۳. غزل | شہر یار پرواز۔ ایم۔ اے | ۳۵ |
| ۱۴. فضاؤں کی گود میں | م۔ م۔ راجندر۔ ایم۔ اے | [illegible] |
| ۱۵. جوانی | مختلف شعراء | [illegible] |
| ۱۶. محفل | مختلف شعراء | ۳۹ |
| ۱۷. غزل | اختر واصفی | [illegible] |
| ۱۸. نئی زبان | رضا نقوی واہی | [illegible] |
| ۱۹. کہنے کو بہت کچھ تھا | وسیم بانو قدوائی۔ بی۔ اے | [illegible] |



قیمت فی پرچہ

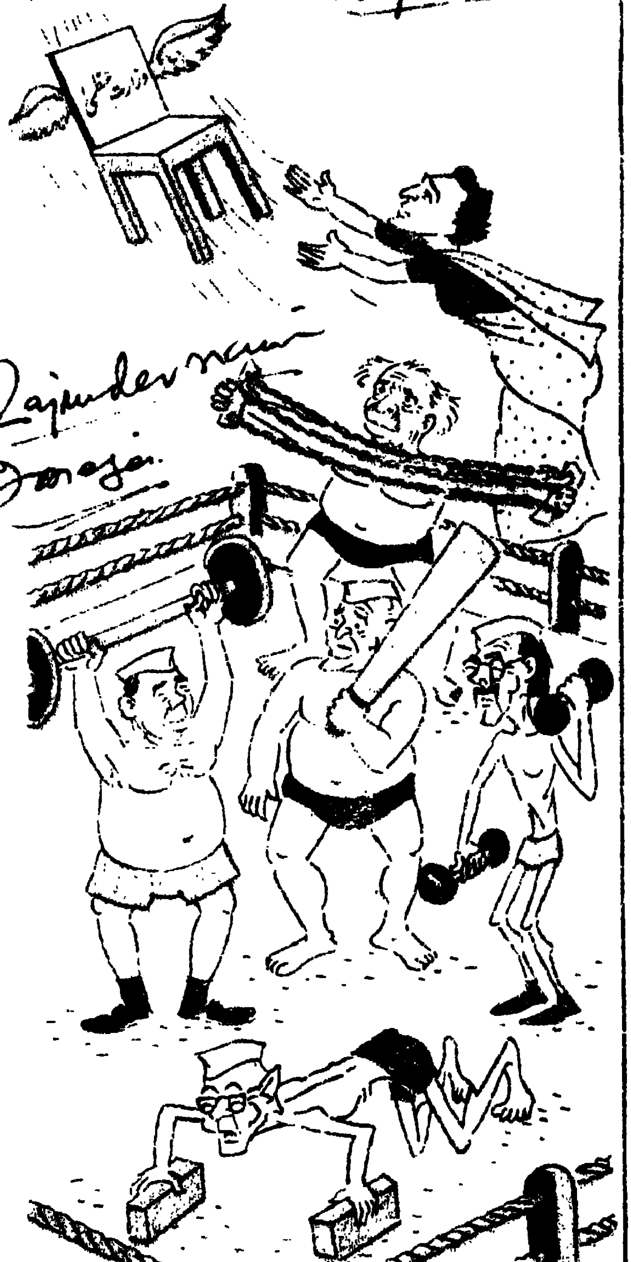
رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

سالانہ قیمت عام نمبر ہندوستان و پاکستان میں —— چودہ روپے

دیگر ممالک سے —— ساٹھ شلنگ

مستقل خریداروں کو چودہ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو عظیم الشان خاص نمبر بھی دیے جاتے ہیں جن کی قیمت [illegible]

| | | |
|---|---|---|
| ۲۰ - غزل | پروفیسر آزاد گلاٹی - ایم - اے | ۴۶ |
| ۲۱ - دل کا درد | رئیس نعیمی امروہوی | ۴۷ |
| ۲۲ - غزل | غلام محمد زائر گنگوہی | ۵۵ |
| ۲۳ - غزل | نفیس سندیلوی | ۵۵ |
| ۲۴ - غزل | افگر مشتاق رحیم آبادی | ۵۵ |
| ۲۵ - غزل | ڈاکٹر کیول دھیر | ۵۷ |
| ۲۶ - غزل | مسرت خانم - ایم - اے | ۶۳ |
| ۲۷ - غزل | پروفیسر اختر نظمی - بی - اے - بی - ٹی | ۶۳ |
| ۲۸ - غزل | حقی حزیں - ایم - اے | ۶۳ |
| ۲۹ - مہمانِ نزول | نریش کمار شاد | ۶۵ |
| ۳۰ - دولت کا بوجھ | عظیم واسطی | ۶۹ |
| ۳۱ - قندیلِ تبسم | پرکاش ناتھ پرویز - ایم - اے | ۷۵ |
| ۳۲ - جنازہ | راجہ مہدی علی خاں مرحوم | ۷۹ |
| ۳۳ - فرشتہ | شاہد فریدی | ۸۱ |
| ۳۴ - نوٹ پنانگ | فکر تونسوی | ۸۷ |
| ۳۵ - نیلگوں شعلے | بال کرشن دوگل | ۹۰ |
| ۳۶ - سالنامہ دیکھا | اہلِ قلم حضرات | ۹۴ |
| ۳۷ - صحت و زندگی | نفرت کی آگ — تفکرات اور پریشانیوں سے بچئے | |
| کیا آپ خوش رہنا چاہتے ہیں | یقین کی شمع — طویل عمر کا راز | |
| اگر آپ کامیاب بننا چاہتے ہیں | | ۹۵ |
| ۳۸ - سرگوشیاں | سوال و جواب | ۹۹ |




مسز اندرا گاندھی نے انتخابات کے بعد وزیر اعظم کے عہدے کے لئے مقابلہ کرنے کا اعلان کیا ہے اور کہا ہے کہ اور بھی امیدوار ہو سکتے ہیں۔

"بہار میں غذائی حالت بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے" ایک خبر —— زوردار تقریریں ہو رہی ہیں۔ اس پر بھی بہتر نہ ہو تو سرکار کا قصور۔

"کینسر کے ریسرچ سینٹر" ایک عنوان —— کاش ہندوستان کے سیاسی کینسر کا علاج تلاش کر سکیں۔

"غلے کی گرانی پر عنقریب قابو پا لیا جائے گا" سرکاری اعلان —— جب عنقریب کھانے والوں کی بہت بڑی تعداد راہیٔ ملکِ عدم ہو چکی ہو گی۔

"دفتر روزگار کی کارکردگی مشکوک" ایک عنوان —— بالکل مشکوک۔ وزارت سے الگ ہونے والوں کی بحالی کا انتظام نہیں کرتا۔

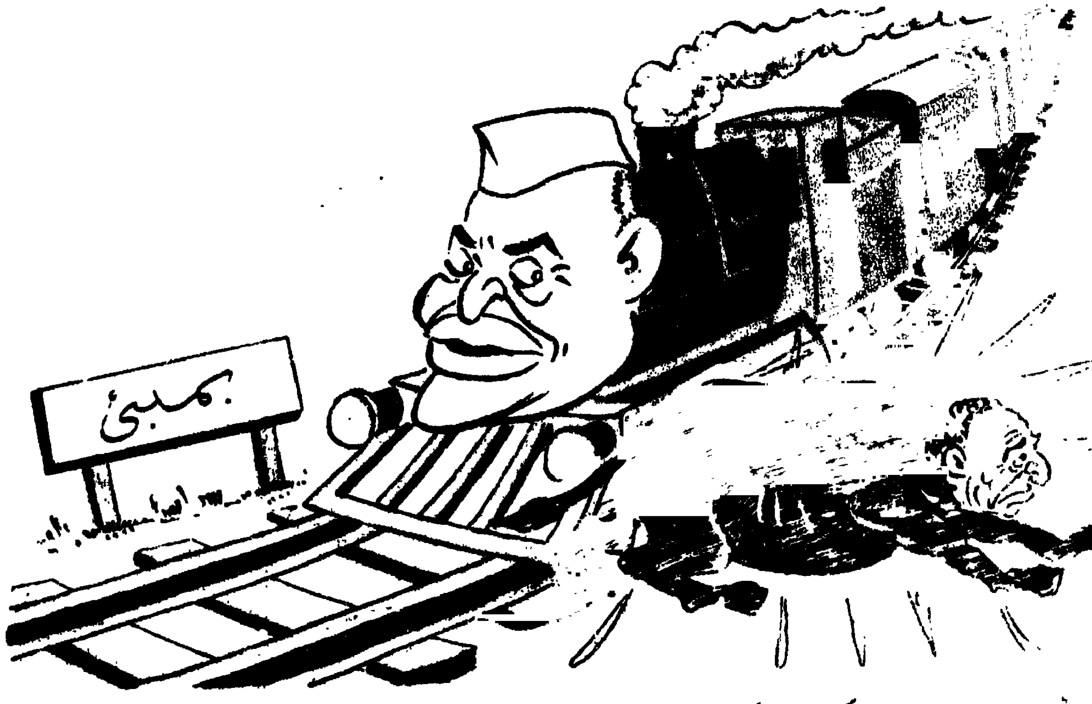
"شملہ میں برف باری" ایک خبر —— اسی کے بعد پنجاب میں اکالی تحریک ٹھنڈی ہوئی۔

"چین کا انکار" ایک خبر —— اقرار اس کی ڈکشنری ہی میں نہیں لکھا۔

"چنڈی گڑھ کا پنجاب میں جانا برداشت نہیں کریں گے" ہریانہ جن سنگھ کا اعلان —— اس کے خلاف پہلے برت رکھیں گے۔ پھر کھول دیں گے۔

"جن سنگھ سیاسی جماعت نہیں ہے" گول والکر —— مذہبیانہ ہونے سے جو ہوتی تو کیا ہوتا۔

"دیش میں گرانی" ایک عنوان —— دیش کے گراں قدر لیڈروں کے لئے باعثِ عزت۔




"پاٹل" اور مینن کی لڑائی" ——— مینن کو ٹکٹ کیا، کانگریس سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

"سینٹ مانک کے ویٹنام پر سنہ کا فیصلہ شرمناک" بمبئی کی طلبا یونین کا اعلان
اس سے زیادہ شرمناک فیصلہ مشرقی روایات کے خلاف مقابلۂ حسن منعقد کرنے کا مظاہرہ تھا۔

"پنجاب میں گرفتار شدگان کی تعداد دو ہزار سے اوپر پہنچ گئی تھی" ایک خبر
——— آہ۔ بیچارے قربانی کے بکرے۔ کام پہ آئے نام کسی کا ہوا۔

"اکالی دل جھوٹ کہتا ہے" باؤنڈری کمیشن کی رپورٹ کے متعلق گلزاری لال نندہ کا بیان ——— کیا سیاست میں سچ بھی بولا جاتا ہے۔

"ہوش ربا گرانی کے باعث عوام کو سخت مشکلات درپیش ہیں" ایک عنوان
——— بلکہ ہوش غائب ہیں۔

"بہار کے قحط زدہ لوگوں کی مدد کیجیے" ایک اپیل ——— جنھیں روٹی چاہیے، روٹی دیجیے۔ جن کے پاس کپڑا نہیں انھیں کپڑا دیجیے اور جن بچاروں کو الیکشن ٹکٹ نہیں ملا انھیں راہِ خدا ٹکٹ دلا دیجیے۔

"اُمید ہے کہ مجھے بچا لیا جائے گا" سنت فتح سنگھ کی پریس کانفرنس" ایک خبر
——— اور سنت جی کی توقع پوری ہوئی۔

"یو۔پی میں تیرہ شکر ملیں" ایک خبر ——— لیڈروں کے دلوں میں پھر بھی مٹھاس پیدا نہ ہوگا۔

"عوام کو اچھی قسم کا آٹا کم قیمت پر مہیا کیا جائے" ایک عنوان ——— یعنی دو دو اور چپڑی۔ اچھی قسم بھی اور کم قیمت بھی۔

"ہندو تہذیب اور کلچر کی حفاظت کا نعرہ" ایک عنوان ——— کھوکھلا نعرہ ہے۔ ہندو تہذیب اور کلچر کی حفاظت نعروں سے نہیں اس پر عمل سے ہوگی۔




"ہمیں بہت سے سنگین مسائل کا سامنا ہے" اندرا گاندھی

"دھوبیوں نے مقدمہ جیت لیا" ایک خبر ـــــــ تمام الزامات دھل گئے۔

"بچوں کے لوگ کس طرح ووٹ دے سکتے ہیں" ایک عنوان ـــــــ پیٹ پر پتھر باندھ کر۔

"کانگریس کا جسم تو ہے مگر اس میں روح نہیں" ایک عنوان ـــــــ وہ حقیقت نہرو کی روح کے ساتھ پرواز کر گئی تھی۔

"ہم اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں" اندرا گاندھی ـــــــ کہاں وہ سر کے بل کھڑے ہوئے ہیں۔

"ہند کو قرضہ دینے والے ممالک کا رویہ انتہائی غیر ہمدردانہ" ایک عنوان ...... بلکہ غیر شریفانہ بھی۔ شرطیں عائد کی جاتی ہیں۔

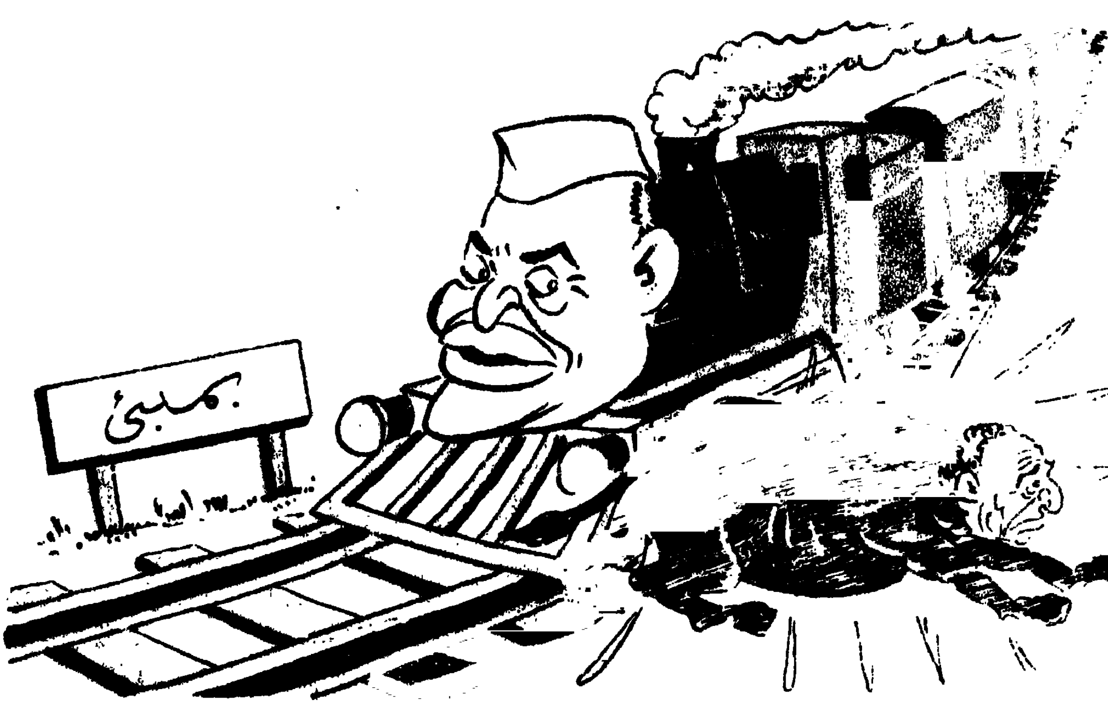
"تشدد اور دباؤ کے آگے جھکنے والی حکومت بزدل ہوتی ہے" مرارجی ڈیسائی کی تقریر ـــــــ حق۔ حق۔ حق۔

"پولیس تعلیمی اداروں میں مداخلت نہ کرے" ایک عنوان ـــــــ مگر تعلیم حاصل کرنے والوں کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ پولیس کے کاموں میں مداخلت کریں، اُن پر پتھراؤ کریں۔

"پانی پت میں بدمعاش گرفتار" ایک خبر ـــــــ انھیں تو پانی میں بہا دینا تھا۔ گرفتاری کی کیا ضرورت تھی۔

"بہار کے سوکھا پیڑتوں کی امداد کیجیے" یہ ایک عنوان ـــــــ مگر امداد تر ہو۔ سوکھی نہ ہو۔

"جن سنگھ دھڑا دھڑ اُردو میں پوسٹر چھاپ رہا ہے" ایک خبر ـــــــ یعنی اُردو پوسٹر کی زبان ہے کہیں کی علاقائی اور سرکاری زبان نہیں۔




پاٹل اور مینن کی لڑائی ــــــــ مینن کو ٹکٹ گیا، کانگریس سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

---

"... ویتنام جنگ کا فیصلہ شرمناک ہے" بمبئی کی طلبا یونین کا

مسلمان ... اس سے زیادہ شرمناک فیصلہ مشرقی روایات کے خلاف مقابلہ

حسن بیناحسن کا انعقاد تھا۔

"پنجاب میں گرفتار شدگان کی تعداد دو ہزار سے اوپر پہنچ گئی تھی" ایک خبر

ــــــــ آہ۔ پنجاب کہ بانی کے بکرے۔ کام یہ آئے نام کسی کا ہوا۔

"آکاش وانی جھوٹ کہتا ہے" بھونڈری کمیشن کی رپورٹ کے متعلق گلزاری لال

نندہ کا بیان ــــــــ کیا سیاست میں سچ بھی بولا جاتا ہے۔

"ہوش ربا گرانی کے باعث عوام کو سخت مشکلات درپیش ہیں" ایک عنوان

ــــــــ بلکہ ہوش غائب ہیں۔

"بہار کے قحط زدہ لوگوں کی مدد کیجیے" ایک اپیل ...... جنھیں روٹی

چاہیے روٹی دیجیے۔ جن کے پاس کپڑا نہیں انھیں کپڑا دیجیے اور جن بچاروں کو الیکشن

ٹکٹ نہیں ملا انھیں راہ خدا ٹکٹ دلا دیجیے۔

"امید ہے کہ مجھے بچا لیا جائے گا" سنت فتح سنگھ کی پریس کانفرنس" ایک خبر

ــــــــ اور سنت جی کی توقع پوری ہوئی۔

"یو۔پی میں تیرہ شکر ملیں" ایک خبر ــــــــ لیڈروں کے دلوں میں

پھر بھی مٹھاس پیدا نہ ہوگا۔

"عوام کو اچھی قسم کا آٹا کم قیمت پر مہیا کیا جائے" ایک عنوان ــــــــ

یعنی دو دو اور چپڑی۔ اچھی قسم بھی اور کم قیمت بھی۔

"ہندو تہذیب اور کلچر کی حفاظت کا نعرہ" ایک عنوان ــــــــ

کھوکھلا نعرہ ہے۔ ہندو تہذیب اور کلچر کی حفاظت نعروں سے نہیں اس پر عمل

سے ہوگی۔




"ہمیں بہت سے سنگین مسائل کا سامنا ہے" اندرا گاندھی

"دھوبیوں نے مقدمہ جیت لیا" ایک خبر ——— تمام الزامات دھل گئے۔

"بمبئی کے لوگ کس طرح ووٹ دے سکتے ہیں" ایک عنوان ——— پیٹ پر
...باندھ کر۔

"کانگریس کا جسم تو ہے مگر اس میں روح نہیں" ایک عنوان ——— وہ
...ت نہرو کی روح کے ساتھ پرواز کر گئی تھی۔

"عوام اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں" اندرا گاندھی ——— کہاں وہ
...سے بن کھڑے ہوتے ہیں۔

"ہند کو قرضہ دینے والے ممالک کا رویہ انتہائی غیر ہمدردانہ" ایک عنوان
——— بلکہ غیر شریفانہ بھی۔ شرطیں عائد کی جاتی ہیں۔

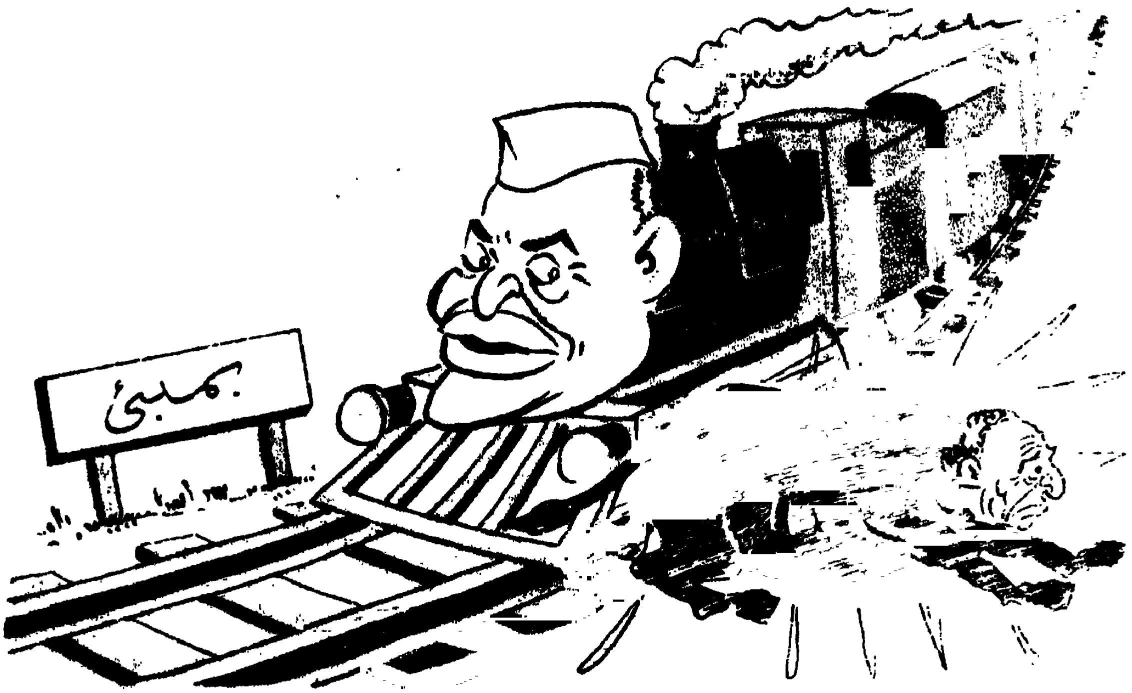
"تشدد اور دباؤ کے آگے جھکنے والی حکومت بزدل ہوتی ہے" مرارجی ڈیسائی
...ی تقریر ——— حق۔ حق۔ حق۔

"پولیس تعلیمی اداروں میں مداخلت نہ کرے" ایک عنوان ——— مگر
تعلیم حاصل کرنے والوں کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ پولیس کے کاموں میں مداخلت کریں،
...ن پر پتھراؤ کریں۔

"پانی پت میں بدمعاش گرفتار" ایک خبر ——— انھیں تو پانی میں بہادینا
تھا۔ گرفتاری کی کیا ضرورت تھی۔

"بہار کے سوکھا پیڑتوں کی امداد کیجیے" ایک عنوان ——— مگر امداد
...ہ تر ہو۔ سوکھی نہ ہو۔

"جن سنگھ دھڑا دھڑ اردو میں پوسٹر چھاپ رہا ہے" ایک
خبر ——— یعنی اردو پوسٹر کی زبان ہے کہیں کی علاقائی اور سرکاری
زبان نہیں۔




"پٹیل اور میمن کی لڑائی" ——— میمن کو ٹکٹ گیا، کانگریس سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

"[…] عالمی مقابلۂ حسن کا فیصلہ شرمناک: بمبئی کی طلبا یونین کا اعلان

اس سے زیادہ شرمناک فیصلہ مشرقی روایات کے خلاف مقابلۂ حسن میں حسن کا مظاہرہ تھا۔

"پنجاب میں گرفتار شدگان کی تعداد دو ہزار سے اوپر پہنچ گئی تھی" ایک خبر

—— آہ۔ بیچارے قربانی کے بکرے۔ کام پہ آنے نام کسی کا ہوا۔

"اکالی دل جھوٹ کہتا ہے: بھنڈاری کمیشن کی رپورٹ کے متعلق گلزاری لال نندہ کا بیان ——— کیا سیاست میں سچ بھی بولا جاتا ہے۔

"ہوش ربا گرانی کے باعث عوام کو سخت مشکلات درپیش ہیں" ایک عنوان

.......... بلکہ ہوش غائب ہیں۔

"بہار کے قحط زدہ لوگوں کی مدد کیجیے" ایک اپیل ...... جنھیں روٹی چاہیے، روٹی دیجیے۔ جن کے پاس کپڑا نہیں انھیں کپڑا دیجیے اور جن بچاروں کو الیکشن ٹکٹ نہیں ملا انھیں راہ خدا ٹکٹ دلا دیجیے۔

"اُمید ہے کہ مجھے بچا لیا جائے گا" سنت فتح سنگھ کی پریس کانفرنس" ایک خبر

———اور سنت جی کی توقع پوری ہوئی۔

"یو۔ پی میں تیرہ شگر ملیں" ایک خبر ——— لیڈروں کے دلوں میں پھر بھی مٹھاس پیدا نہ ہوگا۔

"عوام کو اچھی قسم کا آٹا کم قیمت پر مہیا کیا جاتا ہے" ایک عنوان ———

یعنی دو دو اور چپڑی۔ اچھی قسم بھی اور کم قیمت بھی۔

"ہندو تہذیب اور کلچر کی حفاظت کا نعرہ" ایک عنوان ———

کھوکھلا نعرہ ہے۔ ہندو تہذیب اور کلچر کی حفاظت نعروں سے نہیں اس پر عمل سے ہوگی۔

"دھوبیوں نے مقدمہ جیت لیا" ایک خبر —— تمام الزامات دُھل گئے۔

"بھوکے لوگ کس طرح ووٹ دے سکتے ہیں" ایک عنوان —— پیٹ پر باندھ کر۔

"کانگریس کا جسم تو ہے مگر اس میں روح نہیں" ایک عنوان —— وہ ت نہرو کی روح کے ساتھ پرواز کر گئی تھی۔

"عوام اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں" اندرا گاندھی —— کہاں وہ بل کھڑے ہوتے ہیں۔

"ہند کو قرضہ دینے والے ممالک کا رویہ انتہائی غیر ہمدردانہ" ایک عنوان —— بلکہ غیر شریفانہ بھی۔ شرطیں عائد کی جاتی ہیں۔

"تشدد اور دباؤ کے آگے جھکنے والی حکومت بزدل ہوتی ہے" مرارجی ڈیسائی کی تقریر —— حق۔ حق۔ حق۔

"پولیس تعلیمی اداروں میں مداخلت نہ کرے" ایک عنوان —— مگر تعلیم حاصل کرنے والوں کو یہ حق ہونا چاہئے کہ وہ پولیس کے کاموں میں مداخلت کریں، ن پر پتھراؤ کریں۔

"پانی پت میں بدمعاش گرفتار" ایک خبر —— انھیں تو پانی میں بہا دینا تھا۔ گرفتاری کی کیا ضرورت تھی۔

"بہار کے سوکھا پیڑتوں کی امداد کیجیے" ایک عنوان —— مگر امداد بہتر ہو۔ سوکھی نہ ہو۔

"جن سنگھ دھڑا دھڑ اردو میں پوسٹر چھاپ رہا ہے" ایک خبر —— یعنی اردو پوسٹر کی زبان ہے۔ کہیں کی علاقائی اور سرکاری زبان نہیں۔




"ہمیں بہت سے سنگین مسائل کا سامنا ہے" اندرا گاندھی




"بدیشی امداد بہت ضروری ہے" وزیر خزانہ کا بیان

"مہاراجہ بڑودہ کانگریس کو چھوڑ رہے ہیں" ایک خبر ——— سوتنتر پارٹی خیر مقدم کی تیاریاں کرے۔

"تیس لاکھ ٹن کھاد درکار ہے" ایک خبر ——— ساٹھ لاکھ من اناج کھلایئے اور کھاد لیجئے۔

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

"تارا سنگھ ورکر سنگر لنگوٹے کس لیں" پروفیسر بدھوک ——— ایسی گئی گزری تو نہیں ہے آپ کی پارٹی۔ سرمایہ داروں کے چندوں کا کچھ حصہ بچارے ورکروں کو بھی دیجئے۔ انہیں لنگر لنگوٹوں پر نہ ٹالئے۔ ایک ایک پتلون سلوا دیجئے۔

"گوا کے دارالحکومت پنجم کے نام کی تبدیلی" ایک خبر ——— جی نہیں، گوا کے دارالحکومت کی شدھی۔

"اعلیٰ سطح پر کانفرنس ناکام" ایک عنوان ——— اعلیٰ قسم کی ناکامی۔

"اکالی دل کی ورکنگ کمیٹی نے مصالحتی فارمولا منظور کر لیا" ایک خبر ——— مصلحت بھی اسی میں تھی۔

"بزرگوں کے لئے سیوا آشرم" ایک عنوان ——— کیا یہ لوک سبھا اور راجیہ سبھا کا دوسرا نام ہے۔

"قیمتوں میں ۱۱۲ فیصدی اضافہ۔ پٹیالہ شہر اول نمبر پر ہے" ایک خبر ——— اس لئے پٹیالہ کو راشٹرپتی کا گرانی ایوارڈ دیجئے۔

"اچاریہ کرپلانی الیکشن نہیں لڑیں گے" ایک خبر ——— وہ شرنوں پر بڑا کرم کریں گے۔

" جانوروں کے بنیادی حقوق۔ اتحادی سبھا سے چارٹر تیار کرنے کی اپیل" ایک عنوان ——— سب حق دئے جائیں، مگر الیکشن لڑنے کا حق نہ دیا جائے۔

" روس کے موجودہ حکمراں شنٹ ہو جائیں گے" بیجین کا دعویٰ ——— تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔

" ایڈیٹر کی ڈاک" ایک عنوان ——— جس میں ۹۰ فیصدی خط شعرائے کرام کے ہوتے ہیں جو اپنی ناقابلِ اشاعت غزلیں بھیجتے ہیں۔

" اودھم پور کی خبریں" ایک عنوان ——— اودھم مچانے کے متعلق ہوں گی۔

" برطانیہ میں دفتروں میں کام کرنے کے لئے لڑکیوں کی ضرورت" ایک اشتہار ——— بھارت سے درآمد کی جا سکتی ہیں۔ ایک سے ایک فیشن ایبل لیڈی ملے گی۔

" مشرقی پاکستان میں زبردست طوفان" ایک خبر ——— اُن سیاستدانوں نے برپا کیا ہوگا جن پر سے پابندی ہٹی ہے۔

" پنجاب میں مکمل امن رہا" ایک خبر ——— گیانی گورمکھ سنگھ مسافر کا حسنِ انتظام۔

" ناگالینڈ ——— جہاں نہ سڑکیں ہیں نہ ڈاکخانے" ایک عنوان ——— البتہ لوٹ مار، قتل و غارتگری کی فراوانی ہے۔

" جہالت اور علم" ایک عنوان ——— دونوں کے درمیان ٹھنی گئی تصادم ہے۔ پولیس اور طالبِ علم کی صورت میں۔

" ایک عورت کی چودہ مردوں سے شادی" ایک خبر ——— نرخ بالائے کن کہ ارزانی ہنوز۔



" روس نے ہندوستان کو دو لاکھ ٹن گندم بطور تحفہ دینے کا اعلان کیا ہے اور اُس کا کرایہ بھی وہ خود ادا کرے گا۔

لمبا قد، لمبا چہرہ، لمبے کان اور لمبی ناک۔ موٹے ہونٹ، بند گلے کا کوٹ اور پتلون۔ یہ ہے حلیہ ہمارے وزیرِ ریلویز کا۔ جن کا نام ہے ——— ———

کانگریس الیکشن کمیٹی کی تائید سے ناک اور لمبی ہو گئی ہے۔

سیاست کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ ۱۹۵۷ء کے الیکشن میں جن کو جتوانے پر خوش ہو کر پنڈت جواہر لال نہرو نے اگلی پچھلی خطائیں معاف کر کے آپ کو وزارت میں شامل کیا تھا۔ دس برس بعد ۱۹۶۷ء کے الیکشن سے اُسی کا نام خارج از فہرست کرانے میں شری پاٹل نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور جب اِن کی لاش گرنے لگی تو مرکزی کانگریس الیکشن کمیٹی نے مسٹر مینن کا نام فہرست سے کاٹ دیا۔ آپ نے فرمایا تھا میری لاش پر مینن کو ٹکٹ مل سکتا ہے۔ اِس طرح ایک بہت بڑا حادثہ ٹل گیا ——— اِن کے محکمے میں ریلوں کے حادثے آئے دن ہوتے ہیں اور وہ انھیں روک نہیں پاتے۔ سردار پٹیل کے ضدی مزاج، مُنہ پھٹ چیلے اور مردِ آہن کہلانے کے متمنی ہیں۔ اخلاقی جرأت اِتنی زبردست کہ پچھلے دنوں ریلوے حادثات پہ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر استعفےٰ کا مطالبہ ہوتا رہا۔ مگر صاف کہہ دیا وہ اور وزیر ہوتے ہیں جو استعفےٰ دیا کرتے ہیں ——— امریکن نواز، امریکی قانون کے پابند، امریکہ کی کٹ پتلی اور اُسی کے اشارے پر ناچنے والے مردِ آہن ——— وزیرِ اعظم بننے کی خواہش دل میں چھپی رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں وزیرِ داخلہ بننے کی تمنا میں نندہ جی کو تو نکلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر اس کے بعد؟



# دو کنواریاں

کشمیری لال ذاکر۔ ایم، اے

معرفت نیو مدرن پبلیکیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۳۰۱۷۲ نئی دہلی

۲۶ اکتوبر ۱۹۹۶ء مدیر محترم تسلیم

۔ ۔ دو تین روز سے ایک تعلیمی کانفرنس کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا تھا لیکن یہاں بھی اتنا مصروف رہا کہ مجبور رہا کہ آپ سے بھی ملاقات نہ ہو سکی ۔۔۔۔ نے ذاکر کی تین کہانیوں کا انتساب آپ کے نام کر کے مجھے بے حد مسرت بخشی ہے۔ اور اب یہ حضرت اس طرح پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ۔ ۔ لکھی ہوئی کہانی آپ کے لئے لئے جا رہے ہیں۔ خدا کرے آپ کو پسند آئے ۔ ۔ ۔ نیاز کیش ۔۔۔۔ کشمیری لال ذاکر

---

اُن دو عورتوں کو میں نے ہر گھڑی اور ہر موقع پر موجود پایا۔ ہلکے رنگوں کے دو پیچیدہ رنگوں کے کناری سے چمکتے ہوئے سرخ دوپٹوں کو جان بوجھ کر اپنے سروں سے کھسکاتے ہوئے میں نے انھیں اِدھر اُدھر پھرتی سے لپکتے ہوئے بار ہا دیکھا۔ دونوں کا اُونچا سا قد، تیکھے نقش، گورا رنگ، سڈول جسم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں جڑواں بہنیں ہوں۔ شاید آپ اِسے عجیب بات سمجھیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری دلچسپی اپنی شادی کی رسومات سے کہیں زیادہ اُن دو لڑکیوں میں زیادہ تھی۔ اُس وقت تو میرے لئے اپنی دُلھن کی شخصیت بھی ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ کچھ لوگ کتنے جاذب نظر ہوتے ہیں! یہ بات مجھے اُس روز بہت شدت سے محسوس ہوئی۔ ایسی ہی ایک لڑکی مجھے اپنے پرائمری ہیلتھ سینٹر میں ملی تھی۔ اپنی بیمار ماں کے ساتھ۔ پہاڑوں کی گود میں پروان چڑھی وہ دوشیزہ مجھے ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے برف سے ڈھکی چوٹیوں کے پیچھے سے اُبھرتا ہوا سورج! ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے چڑھتے ہوئے سورج کی گرم گرم کرنیں میرے رگ و پے میں تحلیل ہو رہی تھیں! اور آج پھر اُسی طرح کا احساس ہو رہا تھا مجھے اُن دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر۔ پھر وہی مدھم سی آنچ میرے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔

پہلی بار روشنی کے یہ ستون مجھے اُس وقت نظر آئے تھے جب برات دُلھن کے گھر پہنچی تھی اور میں گھوڑی سے اُتر کر جے مالا ڈلوانے کے لئے آگے بڑھا تھا۔ رشمی ایک کڑھی ہوئی ریشمی، ایک ہاتھ کا لمبا گھونگھٹ نکالے عورتوں کے درمیان گھری کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں موتیے کے پھولوں کا ہار تھا اور اُس کے دائیں اور بائیں پہلو میں دو عورتیں کھڑی تھیں۔ جن کے وجود سے حُسن کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے رشمی کو روشنی کے دو ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ میں نے اپنے سہرے کی جھمجھماتی ہوئی لڑیوں سے انھیں دیکھا اور دونوں کا ملا جُلا قہقہہ گونج اُٹھا۔

"رشمی یہ کھڑی ہے۔ اِدھر!" اُن میں سے ایک بولی۔

"پہاڑیا ہے بیچارہ کیا جانے!" دوسری نے کہا۔

جیسے دونوں روشنی کے ستون اپنا اُجالا لٹا رہے تھے۔

"پہاڑی کوّا ہے یہ تو سونے کی چڑیا ہے" پہلی عورت نے زور کا قہقہہ لگایا اور قہقہے کی اُس گونج میں بہت سے اور قہقہے بھی شامل ہو گئے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بہت سے پہاڑی کوّے میرے ننگے سر پر ٹھونگیں مار رہے ہوں۔ میں بلبلا اٹھا۔

سونے کی چڑیا اپنے ہاتھوں میں موتیے کی کلیاں لئے پہاڑی کوّے کا انتظار کر رہی تھی اور پھر اُس نے پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا اور موتیے کی بھینی بھینی خوشبو میرے دماغ میں لہرا گئی۔ رام شہر کے میرے سرکاری کوارٹر کے صحن میں رات کو ایسی ہی خوشبو لہرایا کرتی ہے۔ جیسے رام شہر کی چھوٹی سی بستی، اُس کے نشیب میں بہتا ہوا پہاڑی نالہ۔ اُس کی گلیوں میں چمکتے ہوئے صاف شفاف پتھر۔ اُن کے معصوم صحت مند مرد اور عورتیں بھی ایک بار میرے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے اور میری شادی پر خوش ہو رہے تھے اور جب میں نے اپنا ہار رشمی کے گلے میں ڈالنا چاہا تو وہ اُس کی ساڑی کے تاروں میں

آکر رہ گیا اور روشنی کے دونوں ستون اُس پر جھک گئے اور ریشمی روشنی کے سیلاب میں ڈوب گئی۔

اور پھر پاٹ دار آوازوں میں سرگوشیاں گونجنے لگیں جن میں میری ماں، میری بہن، میرے باپ، میری دادی سب پھبتیاں کستی جا رہی تھیں۔ اُن دونوں عورتوں کی آواز کے انار چھوٹ رہے تھے اور اُن میں دوسری آوازوں کی پھلجھڑیاں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔

جب ہم کھانے کی میز پر بیٹھے، وہ دونوں جڑواں بہنوں کی طرح مہمانوں میں گھومنے لگیں۔ بہت آزادی اور بے باکی سے، جیسے انھیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ وہ خوبصورت عورتیں ہیں اور غیر لوگوں کے درمیان گھوم رہی ہیں۔ میں نے دیکھا وہ دونوں برات کے ساتھ آئی ہوئی عورتوں پر فقرے بازی کر رہی تھیں۔ کسی کے لباس پر، کسی کے رنگ پر، کسی کے میک اپ پر، کسی کے بالوں پر۔

"اس گھونسلے میں کون رہتا ہے؟" وہ کملا کے پاس پہنچ کر اس کے پفڈ ہیئر کو چھو کر کہہ رہی تھی۔

"تمھاری جان!" کملا نے ہنس کر کہا۔

"ارے میری جان تو وہ بیٹھی ہے!" دوسری عورت نے نانی شاماں کی طرف اشارہ کیا جس کے جھریوں سے بھرے چہرے پر [illegible] لال انگارہ والی بات بنا [illegible] تھی۔ ایک زوردار قہقہہ گونجا اور نانی شاماں کی مردہ جھریوں میں زندگی کا خون دوڑ گیا۔

وہ دونوں اسی طرح گھومتی ہوئی میرے قریب آگئیں۔ سچ جانتے ہیں تو بس [illegible] بھی اس بات کو جان گئی تھیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"تو لو تم جا کہو! یہ تو سب کے سب بھگو کے ہیں۔"

"کسی نے قید ہو جانے والے آدمی کی گھر والی کو یہ خبر دے دی۔ وہ بے چاری بہت پریشان ہوئی۔ سوچنے لگی اپنے گھر والے کو کیسے چھڑائے۔ راجہ بڑا انصاف پسند تھا۔ وہ اُسے ضرور چھوڑ دے گا بشرطیکہ وہ اُس کے پاس جا کر فریاد کرے۔"

"وہ پہاڑن دیکھنے میں کیسی تھی؟"

"بالکل اس مانی کی طرح لاجو!" کمو نے میری ممانی کی طرف اشارہ کیا جو کٹوری سے رائتا سڑکے جا رہی تھی۔ ایک زوردار قہقہہ گونجا۔

میں نے جان لیا کہ اُن میں سے ایک کا نام کمو تھا اور دوسری کا لاجو۔

"تب تو اُس کا گھر والا ضرور آزاد ہو گیا ہوگا۔"

"سُن تو سہی۔ تیری زبان بڑی بے قابو ہے۔" کمو نے لاجو کو جھاڑ دیا۔

"پہاڑن نے سوچا راجہ کے لئے کوئی سوغات لے جانی چاہئے۔ اُس نے بہت سوچا لیکن اُسے کوئی چیز نہ ملی۔ آخر اُس نے چھ مہینے پہلے کے بنائے ہوئے گلگلے نکالے اور ٹوکری میں رکھ لئے۔"

"وہ گلگلے کیا ہوتے ہیں کمو؟"

"یہ تو اِن پہاڑنوں سے پوچھو جو کھلنے پر ٹوٹ رہی ہیں۔"

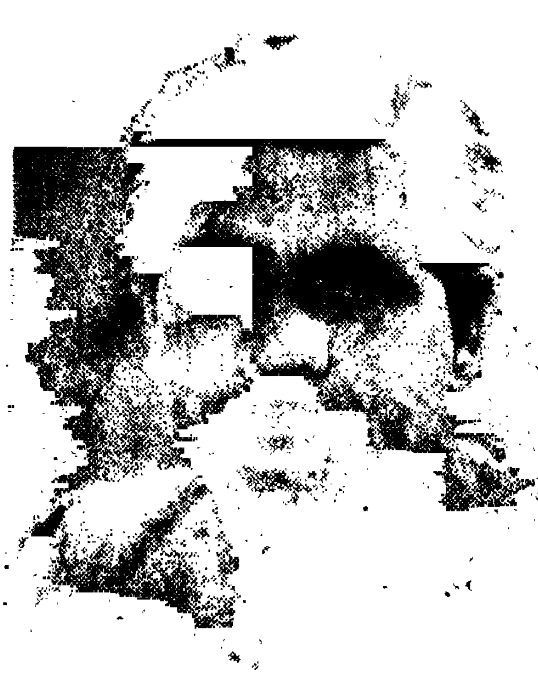
ایک اور قہقہہ گونجا۔

"پہاڑن نے گلگلوں والی ٹوکری کو کپڑے سے ڈھک کر سر پر رکھا اور اپنے گاؤں سے راجہ کے محل کی طرف چل پڑی جو کوئی دس بارہ میل نیچے تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اُس نے ٹوکری میں ہاتھ ڈال کر ایک گلگلا نکالا اور منہ میں ڈال لیا۔ وہ چھ مہینوں پرانا گلگلا پہاڑن کے منہ میں تھا اور گھلنے میں نہ آرہا تھا۔ چلتے چلتے وہ راجہ کے محل تک پہنچ گئی۔ باہر سنتری کھڑا تھا۔ اُس سے بات کرنے سے پہلے اُسے منہ میں ڈالے ہوئے گلگلے کا خیال آگیا۔ اُسے پھینک بھی نہ سکتی تھی۔ جھٹ سے منہ سے نکال کر ٹوکری میں ڈال دیا۔"

برات کھانے سے دھیان ہٹا کر کمو کی بات سن رہے تھے جو میرے پیچھے کھڑی تھی۔ دوراتوں کا دوپٹہ میری گردن کو چھو رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کمو کا دوپٹہ نہیں اُس کا [illegible] ہاتھ ہو۔ لیکن کمو بے نیاز تھی۔ اپنی کہانی میں محو تھی۔ میں نے سر نیچا کر لیا تھا اور اُدھر میری بائیں طرف لاجو کھڑی تھی جس کے بازو کا دباؤ کبھی کبھی مجھے محسوس ہو جاتا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" لاجو نے پوچھا اور اُس کے جسم کا بھر پور دباؤ میرے بائیں پہلو میں جذب ہو کر رہ گیا۔

"پھر وہ پہاڑن راجہ کے حضور میں پیش ہو گئی اور اپنے پتی کو آزاد کرانے کے لئے پرارتھنا کی اور ساتھ ہی سوغات والی ٹوکری راجہ کو پیش کر دی۔ راجہ نے ٹوکری سے کپڑا اُٹھا کر دیکھا تو مسکرا دیا۔ سارے گلگلے بدرنگ ہوئے تھے۔ بس وہی ایک ٹھیک تھا جو پہاڑن نے کچھ دیر پہلے منہ سے نکال کر ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔ راجہ نے وہی گلگلا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور فوراً ہی راجہ کے دانتوں کے دباؤ سے ٹوٹ گیا۔ پہاڑن بول اُٹھی۔



"یہ سب عمر کی بات ہے راجہ جی! میں نے اِس ٹکڑے کو دس میل تک منہ میں ڈالے رکھا پر پگھلنے میں نہ آیا۔ آپ کے منہ میں ڈالتے ہی ٹوٹ گیا۔"

یہ سنتے ہی تمام براتی لوٹ پوٹ ہوگئے۔

انصاف پسند راجہ نے بتاشے کو تو آزاد کر ہی دیا ہوگا لیکن وہ دونوں ستون بعد میں اِس طرح گُزرے کہ میرا سارا وجود اُن کے درمیان قید ہو کر رہ گیا۔

اور جب رات کو پھیرے ہونے لگے تو وہ دونوں عورتیں رشمی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ مجھے چوکی پر بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ لاجو نے میرا جسم چٹکیاں لے لے کر نڈھال کر دیا تھا اور پھر میرے ایک ڈاکٹر دوست نے اُس کے بھی ایسی چٹکی لی کہ وہ چیخ ہی تو اُٹھی۔

"بے شرم! بدتمیز! پہاڑی!" اس طرح چیختے ہوئے وہ ایک طرف سرک گئی۔ لیکن سبھی ہنستے رہے کسی نے بُرا نہ مانا۔ پھر تو ہم پر اُس کے بعد کسی نے چٹکی نہ لی۔

ہاں جب پھیرے ختم ہوئے تو میرے جوتے غائب تھے اور یہ کمو کی شرارت تھی۔ میں نے جوتے مانگے تو کہنے لگی۔

"میرے پاؤں کو ہاتھ لگاؤ پھر دوں گی!"

"پاؤں میں کیا ہے" میرا ڈاکٹر دوست بولا۔

"پاؤں میں چپل ہے، اس لئے!" اُس نے جواب دیا۔

اور جب پھیروں کے بعد ہم برات لے کر گھر کو لوٹے تو کمو اور لاجو دونوں مجھے کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑنے آئیں۔

صبح جب ناشتہ سے پہلے مجھے دلہن کے گھر بلایا گیا تو میری نگاہیں انھیں دونوں کو ڈھونڈتی رہیں اور جب وہ سامنے آئیں تو میں نے دیکھا، رت جگے کے خمار نے انھیں اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ وہ جیسے لڑکھڑا رہی تھیں۔

جب برات رخصت ہونے لگی تو وہ دونوں موجود تھیں۔ رشمی کو سنبھالے ہوئے کار کی طرف لا رہی تھیں۔ رشمی کی جھکی ہوئی نظریں اپنے ہی قدموں پر جمی تھیں لیکن کمو اور لاجو کی نگاہیں سارے ماحول کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں محبت کی نمی تھی اور پیار کی چمک تھی! اور جب انھوں نے رشمی کو کار میں بٹھایا اور رشمی کی ماں اور اُس کے پتا اور اُس کی بہنوں نے اُسے گھیر لیا تو وہ دونوں ایک طرف اُداس کھڑی ہو گئیں اور اُن کی آنکھوں کا خمار اُن کے آنچلوں میں جذب ہونے لگا۔ میں اُسی گھڑی بس انھیں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھیں، کہاں رہتی تھیں اور کیا کرتی تھیں۔ کسی نے بس اتنا کہا تھا کہ وہ دو کنواریوں کے نام سے مشہور ہیں اور وہ دونوں کنواریاں اپنے حُسن کے کنوارے پن کی رعنائیاں لُٹاتے جا رہی تھیں۔ اور پھر نہ جانے کیوں وہ میرے قریب آگئیں۔

"ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دینا۔" کمو نے کہا تھا۔

"ہمارے دل شیشے کی طرح صاف ہیں۔" لاجو بولی تھی۔

میں خاموش تھا اور ان کی آنکھوں سے رستے ہوئے اُس خمار کو دیکھ رہا تھا جس نے مجھے پچھاڑ ڈالا تھا

"ہماری رشمی کا خیال رکھنا!"

"بڑے نازوں میں پلی ہے۔"

میں پھر بھی خاموش تھا۔

"رشمی بہت نازک دل کی لڑکی ہے۔"

"اس کا دل توڑ نہ دینا کہیں۔"

میں اب بھی خاموش تھا۔ صرف انھیں دیکھے جا رہا تھا۔

"پہاڑی کوتے! بولتے کیوں نہیں۔ بس ٹکر ٹکر دیکھے جا رہے ہو" لاجو چیخ اُٹھی تھی۔

مجھے ہنسی آگئی تھی۔

"تمہاری سونے کی چڑیا کو سونے کے پنجرے میں رکھوں گا۔ اسے سونے کے

دانے کھلاؤں گا اور سونے ہی کا پانی پلاؤں گا۔"

"ایسا نہ کرنا ٹو اکٹر!" لاجو نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور پھر وہ رونے لگی تھی۔ میں نے اسٹارٹ ہوتی ہوئی کار میں سے ایک بار آخری نظر ان دونوں پر ڈالی۔ دونوں کنواریاں ورشت کے ستے کے ساتھ لگی خوشی سے سلگ رہی تھیں۔ اپنے آنسوؤں کی آگ میں!!

ایک ہفتے کے بعد رشمی کو لے کر اس سنیگ آیا ہوں۔

یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے ایک چھوٹی سی پہاڑی جاگیر کے ایک قصبہ نما گاؤں رام شہر میں گزرا ہے۔ میں وہاں پیدا ہوا، پرائمری ہیلتھ سنٹر کا میڈیکل آفیسر ہوں۔ رشمی نے اب تک جس طرح کے پہاڑ دیکھے ہیں اُن میں شملہ، نینی تال، ڈلہوزی، مسوری جیسی جگہیں ہیں جہاں سردی اور بارش کے سوا پہاڑوں والی کوئی بات نہیں۔ وہاں کے میدانی شہروں اور ان پہاڑی مقاموں میں کوئی فرق نہیں۔ وہی مال، وہی شور، وہی بازار، وہی ہوٹل، ویسے ہی لوگ۔ صرف اتنی بات ہے کہ یہاں سب کچھ ایک اونچی سطح پر ہے۔ جیسے سیلانوں کی تہذیب، اُن کا مصنوعی پن، اُن کی نظارہ داری کسی نے ایک بڑی سی طشتری میں اٹھا کر ایک اونچی، وسیع چوٹی پر رکھ دی ہو۔ رشمی کی توقعات سے رام شہر کی زندگی کے کسی شعبے نے بھی میل نہیں کھایا بلکہ اُسے مایوسی ہوئی۔

وہ یہاں ٹرانسسٹر پر ریڈیو سیلون سے فلمی گانے تو سُن سکتی ہے، لیکن کسی خوبصورت ریستوران میں بیٹھ کر چائے نہیں پی سکتی۔ چاہے تو اُسے اپنے کوارٹر کے ایک کمرے ہی میں بیٹھی ہوتی ہے جس کی کھڑکی سے سامنے پھیلی ہوئی پہاڑیوں کی چوٹیاں نظر آتی ہیں اور اُن پر لہراتے ہوئے بادل دکھائی دیتے ہیں اور چھت پر گرتی ہوئی بارش کی آواز سُنائی دیتی ہے اور نیچے بہتے ہوئے نالے کا شور کانوں میں گونجتا ہے۔

"تمھیں یہ جگہ پسند نہیں آئی کیا؟"

"بہت اچھی ہے۔ فار اے چینج اٹ از ویری گڈ!"

"اور اگر یہاں مستقل طور پر رہنا ہو؟"

"آئی وَنڈر اِف آئی وُڈ لائک اِٹ!"

"لیکن دو سال تو یہاں رہنا ہی ہوگا۔"

"کیوں؟" رشمی نے جیسے چونک کر پوچھا۔

"اس لیے کہ مجھے امریکہ بھیجنے سے پہلے سرکار نے مجھ سے اس شرط پر دستخط کرائے تھے۔"

"آپ کو سوچ سمجھ کر یہ شرط ماننی چاہیے تھی۔ یو شُڈ ہیو یُوزڈ یُور امیجی نیشن۔"

"آئی نیک دیٹ۔"

لیکن یہ کچھ ضروری نہیں کہ مجھے دو سال یہاں رہنا ہی پڑے۔ اگرچہ مجھے یہاں رہنا پسند ہے لیکن رشمی کا خیال ہے کہ ری آرگنائزیشن میں میرا ٹرانسفر کسی اچھی جگہ ہو جائے گا۔ اس لیے اُس نے یہ پانچ چھ دن بہت سکون سے گزارے ہیں۔

رشمی کے میکے واپس آیا ہوں تو اب کمو اور لاجو کے بارے میں وہ پہلے جیسا اشتیاق نہیں رہا۔ وہ تجسس ختم ہو چکا ہے۔ رشمی سے مجھے اُن دو کنواریوں کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اُس نے مجھے بتایا ——————

پہلی کنواری —— کمو کی عمر تیس سال سے اوپر ہے۔ اُس کا پورا نام کملا دیوی ہے۔ وہ ذات کی براہمن ہے۔

باپ کی موت کے چار ماہ بعد پیدا ہوئی۔ جب وہ پانچ سال کی تھی تو اُس کی ماں بھی مر گئی۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا۔ دُور کے ایک رشتہ دار نے جسے وہ چاچا کہتی تھی، اُسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ جب وہ دس برس کی ہوئی تو اُن کی چاچی کا بھی انتقال ہو گیا۔ گھر میں صرف کملا اور اُس کا چاچا ہی رہ گئے۔ کملا جوان ہو گئی۔ چاچا بوڑھا ہوتا گیا۔ کملا کے بال کالے سیاہ اور چاچا کے بال برف جیسے سفید ہونے لگے اور جب چاچا کے سر میں ایک بھی کالا بال نہ رہا اور کملا کے جسم سے جوانی پھوٹنے لگی تو ایک دن سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ چاچا نے اپنی زمین بیچ دی اور اُس سے حاصل کئے ہوئے روپے سے کملا کی جوانی خرید کر گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

تب سے دونوں اس شہر میں رہتے ہیں اور کملا فخر سے کہتی ہے: اُس نے اپنی مرضی کا شوہر چُنا ہے۔ اُس کا خیال ہے اُس کے یتیم کنوارے پن کی جو قیمت اُس کے شوہر نے دی ہے دُنیا میں اور کوئی وہ قیمت ادا نہ کر سکتا تھا۔

دوسری کنواری لاجو کا پورا نام لاجونتی ہے۔ اُس کی عمر بھی لگ بھگ تیس سال ہے۔ پہلے کھتری تھی، پھر ویشن ہوئی اور اب راجپوت ہے۔

ماں باپ غریب تھے اس لئے لاجو آٹھویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکی۔ اُسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا لیکن ماں باپ اس قابل نہ تھے۔ اس لئے اُسے مجبوراً گھر بیٹھنا پڑا۔ لیکن وہ دن رات روتی رہتی تھی اور اُسے بے حد دُکھ ہوتا تھا جب اُس کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں جو اُس سے کہیں کم سمجھ تھیں اگلی جماعت میں داخل ہو کر فیل ہو رہی تھیں۔ لاجو بے حد حسین تھی۔ اس لئے اُس کے ماں باپ نے کچھ روپیہ لے کر اُسے ایک بڑی عمر کے دُکان دار سے بیاہ دیا۔ وہ اس لئے راضی ہو گئی کہ اُسے یقین دلایا گیا کہ اب وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہے اور دُکان دار لالہ اُسے کالج تک پڑھانے پر رضامند تھا۔ خوبصورت لاجو نے اپنا حُسن اور اپنی جوانی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گروی رکھ دی۔ لیکن شادی کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ لالہ نے یہ سب جھوٹ کہا تھا۔ کچھ عرصہ وہ صبر کر کے پڑی رہی۔ اس دوران میں اُس کے ہاں ایک لڑکا بھی ہو گیا لیکن لالہ کو دمہ کی شکایت تھی اور شک کا مرض تھا۔ لاجو اُس کے کمزور ہاتھوں سے پٹتی لیکن اپنی آبرو کی حفاظت کرتی۔

اور پھر ایک دن وہ اپنے لڑکے کو لے کر لالہ کا گھر چھوڑ گئی اور اپنے ماں باپ کے گھر آ گئی۔ ماں باپ کا سلوک اُس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ اُدھر لالہ انھیں اُسی طرح تنگ کئے جا رہا تھا۔

ایک دن وہ ایک نوجوان کے ساتھ اپنا شہر چھوڑ گئی۔ اُس نوجوان نے اُسے لڑکیوں کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا لیکن اب وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ اب اُس کی توجہ کسی طرف بٹ گئی تھی۔ وہ وہاں تو کوشش کرتی رہی کہ پڑھنے لکھنے کی طرف دھیان دے۔ لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ... اسکول جانا چھوڑ دیا۔ وہ نوجوان لاجو سے بے حد محبت کرتا تھا اور ہر ممکن کوشش ... رکھتا تھا۔ وہ دن میں ایک بنک میں چپراسی کا کام کرتا اور صبح اور شام اخبار ... تھا ... وہ نوجوان رشمی کے پتا کے ایک دوست کے ہاں کلرک تھا اور راجو کا لڑکا اسکول ... نالائق تھا۔ اُس کی ماں بے حد دکھی تھی۔

رشمی نے مجھے نہایت مختصر انداز میں ان دونوں کنواریوں کی داستان سنا دی ... وہ دونوں اپنی آزادہ روی اور رنگین مزاج ہونے ... تھیں۔ اُن دونوں میں بہنوں جیسا پیار تھا۔ اُن کی ایک ہی جیسی مجبوریوں نے ... ایسے مقام پر ملا دیا تھا کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو گئی تھیں ... رشمی ... سے مدعا ... بچپن کا افسانہ کیا۔ تو یہ جاننے کی کوشش کی کہ اُس کے گھر ... کنواریوں کا کیا تعلق تھا اور وہ انھیں کب سے جانتی تھی۔

... رشمی کے میکے آیا تو میرا خیال تھا کہ کمو اور لاجو وہاں پہلے ہی سے موجود ... ہم سے ویسی ہی بے باکی سے بات کریں گی اور مجھے پہاڑی کوا کہہ کر پکاریں گی۔ ... نہیں ہوئی۔ میں سوچتا تھا کہ ان سے کہوں گا کہ میں نے اُن کی سونے کی چڑیا ... پنجرے میں قید کر دیا تھا اور اُسے سونے کے دانے کھلا رہا تھا اور سونے ہی کا پانی پلا رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں انھیں خوب چڑاؤں گا اور اُن سے پوچھوں گا ... تم دو کنواریاں کیوں رہتی ہیں؟ اور وہ شادی کیوں نہیں کرتی ہیں۔ میں تو ... رام شہر کے دو ایک اچھے پہاڑئے بھی تجویز کرنے والا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ... بار حسرت اُن کی آواز کا کوندا لہراتا ہوا محسوس کیا جب شام کو ڈھولک پر ... یہ گیت گایا ——

کوٹھے کوٹھے آ گوریے
تینوں ہنتو دا یار دکھاواں

اور پھر اُن کے قہقہوں کا آبشار بھی گرا تھا اور پھر ایک بار اُن دونوں کے آنچلوں ... بھی کھلی تھی اور پھر اچانک وہ پچھلے دروازے سے اُٹھ کر چلی گئی تھیں۔

رشمی بھاگ کر آئی تھی میرے کمرے میں۔

"کمو اور لاجو ناراض ہو کر چلی گئیں!"

"کیوں؟" مجھے دھچکا سا لگا۔

"میں نے اُن سے کہہ دیا کہ میں نے اُن کی کہانی آپ سے کہہ ڈالی ہے۔"

"بڑا ظلم کیا تم نے رشمی!"

رشمی ایکدم خاموش ہو گئی۔ خاموش اور افسردہ!"

اتنے میں ایک بزرگ جس کی عمر ساٹھ سے اُوپر ہوگی اور ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا گیٹ کے اندر داخل ہوئے اور رشمی کی کمو اور لاجو گیٹ کی طرف بڑھیں۔

"یہاں کیا کہنے آئے ہو کم بختو!" دونوں کی آواز کڑکی۔

اور وہ بزرگ اور وہ لڑکا دونوں سہمے ہوئے گیٹ سے باہر نکل آئے۔

"یہ کمو کا خاوند اور لاجو کا لڑکا ہے" رشمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے کھڑکی کے قریب ہو جانے کو دھکیلا۔ میں انھیں ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔

میں تو غلط مذاق کرتا رہا تھا۔ بڑا نقصان ہوتا اگر میں کمو اور لاجو کے لئے رام شہر کے اچھے پہاڑئے تجویز کر دیتا۔ کمو اور لاجو کا بے باک کنوارا پن اور بے باک جوانی تو اپنی مجبوریوں، اپنے حالات اور سماج کے گھناؤنے پن سے تنگ آ کر شادی کر چکی تھی اور یہ ساٹھ برس کا بوڑھا اور تیرہ برس کا لڑکا دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ اُن میں ایک گہرا رشتہ تھا۔ یہ دونوں اُن کنواریوں اور اُن حالات کی اولاد تھے جن سے کمو اور لاجو کا بیاہ ہوا تھا۔ یہ دونوں سماج کی کوکھ ... سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ ایک پچاس برس بڑا، ایک چالیس برس چھوٹا۔

لیکن اِن دونوں کا کمو اور لاجو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کمو اور لاجو اب بھی غیر شادی شدہ تھیں۔ کیونکہ اُن کی محبت کا بیاہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُن کی محبت کو کوئی منڈپ نہیں ملا تھا، اُس کی کبھی ڈولی نہیں اُٹھی تھی۔ اُس کی مانگ میں کسی نے سیندور نہیں ڈالا تھا۔ اُن کی محبت اب تک کنواری تھی۔

میں دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا اور رشمی دیر تک اپنا گال میرے کندھے پر ٹکائے میرے ساتھ لگی پرائشچت کرتی رہی اور پھر میں نے رشمی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

گیٹ کے دونوں حصے اپنے بے جان بازو پھیلائے جانے کس صبح کا انتظار کر رہے تھے!!

واپس گاؤں کو لوٹ جائے گا اور [illegible]

"ایسا مت کرنا ڈاکٹر [illegible] اور پھر وہ رونے لگی [illegible] دونوں کنواریاں [illegible] اپنے آنسوؤں کو [illegible]

ایک [illegible] رشمی [illegible]

یہ ایک [illegible] بہاڑ [illegible] ایک [illegible] شہر میں [illegible] نہیں [illegible] ہیں [illegible] شہروں [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] ایک [illegible]

[illegible] اپنے لو [illegible] ایک [illegible] سامنے پھیلی ہوئی پہاڑیوں کی چوٹیاں نظر آتی ہیں [illegible] ہیں اور چھت پر گرتی ہوئی بارش کی آواز [illegible] کانوں میں گونجتا ہے۔

"تمہیں یہ جگہ پسند [illegible] آئی کیا؟"

"بہت اچھی ہے فار [illegible]"

"اور اگر یہاں مستقل طور پر رہنا ہو؟"

"آئی وِنڈر [illegible] آئی وُڈ لائک اِٹ!"

"لیکن دو سال تو یہاں رہنا ہی ہوگا۔"

"کیوں؟" رشمی نے جیسے چونک کر پوچھا۔

"اس لئے کہ مجھے امریکہ بھیجنے سے پہلے سرکار نے مجھ سے اس شرط پر دستخط کرائے تھے۔"

"آپ کو سوچ سمجھ کر یہ شرط ماننی چاہئے تھی۔ یُو شُڈ ہیو یُوزڈ یُور ایمبی نیشن۔"

"آئی لیک [illegible]"

لیکن یہ کچھ ضروری نہیں کہ مجھے دو سال یہاں رہنا ہی پڑے۔ اگرچہ مجھے یہاں رہنا پسند ہے۔ لیکن رشمی کا خیال ہے کہ ری آرگنائزیشن میں میرا ٹرانسفر کسی اچھی جگہ ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے یہ پانچ چہرے بہت سکون سے گزارے ہیں۔

شہر کے میکے واپس آیا ہوں تو اب کمو اور لاجو کے بارے میں وہ پہلے جیسا اشتیاق نہیں رہا۔ وہ تجسس ختم ہو چکا ہے۔ رشمی سے مجھے ان دو کنواریوں کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ——

پہلی کنواری —— کمو کی عمر تیس سال سے اوپر ہے۔ اس کا پورا نام کملا دیوی ہے۔ [illegible] ہے۔

[illegible] جب وہ پانچ سال کی تھی تو اس کی [illegible] دور کے ایک رشتہ دار نے جسے وہ چاچا [illegible] جب وہ [illegible] برس کی ہوئی تو اس کی چاچی کا بھی انتقال ہو گیا۔ [illegible] اس کا چاچا ہی رہ گئے۔ کملا جوان ہو گئی۔ چاچا بوڑھا ہونے لگا۔ کملا [illegible] چاچا کے [illegible] سفید ہونے لگے اور جب چاچا کے [illegible] کملا کے جسم سے جوانی پھوٹنے لگی تو ایک دن [illegible] گاؤں [illegible] اپنی زمین [illegible] اس سے حاصل کئے ہوئے روپے سے کملا کی جوانی خرید [illegible] گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

تب سے دونوں اس شہر میں رہتے ہیں اور کملا فخر سے کہتی ہے اس نے اپنی [illegible] کا شوہر چنا ہے۔ اس کا خیال ہے اس کے [illegible] کی جو قیمت اس کے شوہر نے دی ہے دنیا میں اور کوئی وہ قیمت ادا نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری کنواری لاجو کا پورا نام لاجونتی ہے۔ اس کی عمر کبھی اٹھائیس سال سے پہلے [illegible] تھی۔ پھر ودیشن ہوئی اور اب راجپوت ہے۔

ماں باپ غریب تھے اس لئے لاجو آٹھویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکی۔ اُسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا لیکن ماں باپ اس قابل نہ تھے۔ اس لئے اُسے مجبوراً گھر بیٹھنا پڑا۔ لیکن وہ دن رات روتی رہتی تھی اور اُسے بے حد دکھ ہوتا تھا جب اُس کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں جو اُس سے کہیں کم سمجھ تھیں اگلی جماعت میں داخل ہو کر فیل ہو رہی تھیں۔ لاجو بے حد حسین تھی۔ اس لئے اُس کے ماں باپ نے کچھ روپیہ لے کر اُسے ایک بڑی عمر کے دکان دار سے بیاہ دیا۔ وہ اس لئے راضی ہو گئی کہ اُسے یقین دلایا گیا کہ اب وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہے اور دکان دار لالہ اُسے کالج تک پڑھانے پر رضامند تھا۔ خوبصورت لاجو نے اپنا حسن اور اپنی جوانی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گروی رکھ دی۔ لیکن شادی کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ لالہ نے یہ سب جھوٹ کہا تھا۔ کچھ عرصہ وہ صبر کر کے پڑی رہی۔ اس دوران میں اُس کے ہاں ایک لڑکا بھی ہو گیا لیکن لالہ کو دمہ کی شکایت تھی اور شک کا مرض تھا۔ لاجو اُس کے کمزور ہاتھوں سے پٹتی لیکن اپنی آبرو کی حفاظت کرتی۔

اور پھر ایک دن وہ اپنے لڑکے کو لے کر لالہ کا گھر چھوڑ گئی اور اپنے ماں باپ کے گھر آ گئی۔ ماں باپ کا سلوک اُس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ اُدھر لالہ اُنھیں اُسی طرح تنگ کئے جا رہا تھا۔

دن وہ ایک نوجوان کے ساتھ اپنا شہر چھوڑ گئی۔ اُس نوجوان نے اُسے لڑکیوں کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا لیکن اب وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ اب اُس کی توجہ کسی طرف بٹ گئی تھی۔ وہ کوشش کرتی رہی کہ پڑھنے لکھنے کی طرف دھیان دے۔ لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ ... مکان پڑھنا چھوڑ دیا۔ وہ نوجوان لاجو سے بے حد محبت کرتا تھا اور ہر ممکن کوشش ... خوش رکھتا تھا۔ وہ دن میں ایک بنک میں چپراسی کا کام کرتا اور صبح اور شام اخبار ... وہ نوجوان رشمی کے پتا کے ایک دوست کے ہاں ملازم تھا اور لاجو کا لڑکا اسکول ... نہیں جاتا تھا۔ اُس کی ماں بے حد دکھی تھی۔

... نے مجھے نہایت مختصر انداز میں ان دونوں کنواریوں کی داستان سنا دی ... اپنے رو مردوں سے ... تھی۔ وہ دونوں اپنی آزادہ روی اور رنگین مزاج ہونے ... تھیں۔ اُن دونوں میں بہنوں جیسا پیار تھا۔ اُن کی ایک ہی جیسی مجبوریوں نے ... ملا دیا تھا کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو گئی تھیں۔ میں نے رشمی ... سے مدعا دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ اُس کے گھر ... کا کیا تعلق تھا اور وہ انھیں کب سے جانتی تھی۔

... جب رشمی کے میکے گیا تو میرا خیال تھا کہ کمو اور لاجو وہاں پہلے سے موجود ... ہمیشہ کی طرح بے باکی سے بات کریں گی اور مجھے پہاڑی کوا کہہ کر پکاریں گی۔ ... بات نہیں ہوئی۔ میں سوچتا تھا کہ اُن سے کہوں گا کہ میں نے اُن کی سونے کی چڑیا ... میں قید کر دیا تھا اور اُسے سونے کے دانے کھلا رہا تھا اور سونے ہی ... پلا رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں انھیں خوب چڑاؤں گا اور اُن سے پوچھوں گا ... انھیں روکنواریاں کیوں کہتے ہیں؟ اور وہ شادی کیوں نہیں کرتی ہیں۔ میں تو ... شہر کے دو ایک اچھی پہاڑنے بھی تجویز کرنے والا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ... صرف اُن کی آواز کا کوندا لہراتا ہوا محسوس کیا جب شام کو ڈھولک پر ... گایا ——

کوٹھے کوٹھے آ گوریئے

تینوں بنتو دا یار دکھاواں

اور پھر اُن کے قہقہوں کا آبشار بھی گرا تھا اور پھر ایک بار اُن دونوں کے آنچلوں ... دھنک بھی کھلی تھی اور پھر اچانک وہ پچھلے دروازے سے اُٹھ کر چلی گئی تھیں۔

رشمی بھاگ کر آئی تھی میرے کمرے میں۔

"کمو اور لاجو ناراض ہو کر چلی گئیں!"

"کیوں؟" مجھے دھچکا سا لگا۔

"میں نے اُن سے کہہ دیا کہ میں نے اُن کی کہانی آپ سے کہہ ڈالی ہے۔"

"بڑا ظلم کیا تم نے رشمی!"

رشمی ایکدم خاموش ہو گئی۔ خاموش اور افسردہ!"

اتنے میں ایک بزرگ جن کی عمر ساٹھ سے اُوپر ہوگی اور ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا گیٹ کے اندر داخل ہوئے اور اُسی لمحہ کمو اور لاجو گیٹ کی طرف بڑھیں۔

"یہاں کیا کرنے آئے ہو کم بختو!" دونوں کی آواز کڑکی۔

اور وہ بزرگ اور وہ لڑکا دونوں سہمے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

"یہ کمو کا خاوند اور لاجو کا لڑکا ہے" رشمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے کھڑکی سے قریب ہو جانے کو دھکیلا۔ میں انھیں ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔

میں تو غلط مذاق کر ڈالنے والا تھا۔ بڑا ہی غضب ہوتا اگر میں کمو اور لاجو کے لئے رام شہر کے اچھے پہاڑنے تجویز کر دیتا۔ کمو اور لاجو کا سہاگ کنوارا پن اور بے باک بوالہوسی تو اپنی مجبوریوں، اپنے دکھوں اور سماج کے گناہوں کے پردے تھے! شادی کر چکی تھی اور یہ جو ساٹھ برس کا بوڑھا اور تیرہ برس کا لڑکا دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ اُن میں ایک گہرا رشتہ تھا۔ یہ دونوں اُن مجبوریوں اور ... حالات کی اولاد تھے جن سے کمو اور لاجو کا بیاہ ہوا تھا۔ یہ دونوں ... کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ ایک پچاس برس بڑا ایک چالیس برس چھوٹا۔

لیکن ان دونوں کا کمو اور لاجو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کمو اور لاجو اب بھی غیر شادی شدہ تھیں۔ کیونکہ اُن کی محبت کا بیاہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُن کی محبت کو کوئی منڈپ نہیں ملا تھا۔ اُس کی کبھی ڈولی نہیں اٹھی تھی۔ اُس کی مانگ میں کسی نے سیندور نہیں ڈالا تھا۔ اُن کی محبت اب تک کنواری تھی۔

میں دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا اور رشمی دیر تک اپنا گال میرے کندھے پر ٹکائے میرے ساتھ لگی پرارتھنا کرتی رہی اور پھر میں نے رشمی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

گیٹ کے دونوں تختے اپنے بے جان بازو پھیلائے جانے کس صبح کا انتظار کر رہے تھے!!

---

[illegible] کانوں کو اور سونے ہی کا پانی پلاؤں گا۔"

"ایسا نہ کرنا ڈاکٹر!" لاجونتی نے مجھے جھنجھوڑ کر کہہ دیا تھا اور پھر وہ رونے لگی تھی۔ میں نے اسٹارٹ ہوتی ہوئی کار میں سے ایک بار آخری نظر ان دونوں پر ڈالی۔ دونوں کنواریاں، رخصت کے نیزے کے ساتھ لگی خاموشی سے سسک رہی تھیں۔ اپنے آنسوؤں کی آگ میں!!

ایک ہفتے کے بعد رشمی کو لے کر اس کے میکے آیا ہوں۔

یہ ایک ہفتہ اس نے میرے ساتھ ایک چھوٹی سی پہاڑی جاگیر کے ایک قصبہ نما گاؤں رام شہر میں گزارا ہے۔ میں وہاں پرائمری ہیلتھ سینٹر کا میڈیکل آفیسر ہوں۔ رشمی نے اب تک جس طرح کے پہاڑ دیکھے ہیں ان میں شملہ، نینی تال، ڈلہوزی، مسوری جیسی جگہیں ہیں جہاں سردی اور بارش کے سوا پہاڑوں والی کوئی بات نہیں۔ وہاں کے میدانی شہروں اور ان پہاڑی مقاموں میں کوئی فرق نہیں۔ وہی مال، وہی رنج، وہی بازار، وہی ہوٹل، ویسے ہی لوگ۔ صرف اتنی بات ہے کہ یہاں سب کچھ ایک اونچی سطح پر ہے۔ جیسے میدانوں کی تہذیب، ان کا مصنوعی پن، ان کی ظاہرداری کسی نے ایک بڑی سی طشتری میں اٹھا کر ایک اونچی، وسیع چوٹی پر رکھ دی ہو۔ رشمی کی توقعات سے رام شہر کی زندگی کے کسی شعبے نے بھی میل نہیں کھایا بلکہ اسے مایوسی ہوئی۔

وہ یہاں ٹرانسسٹر پر ریڈیو سیلون سے فلمی گانے تو سن سکتی ہے لیکن کسی خوبصورت ریستوران میں بیٹھ کر چائے نہیں پی سکتی۔ چاہے تو اسے اپنے کوارٹر کے ایک کمرے ہی میں پینی ہوتی ہے جس کی کھڑکی سے سامنے پھیلی ہوئی پہاڑیوں کی چوٹیاں نظر آتی ہیں اور ان پر لہراتے ہوئے بادل دکھائی دیتے ہیں اور چھت پر گرتی ہوئی بارش کی آواز سنائی دیتی ہے اور نیچے بہتے ہوئے نالے کا شور کانوں میں گونجتا ہے۔

"تمہیں یہ جگہ پسند نہیں آئی کیا؟"

"بہت اچھی ہے۔ فار اے چینج اٹ از ویری گڈ!"

"اور اگر یہاں مستقل طور پر رہنا ہو؟"

"آئی ونڈر اف آئی وُڈ لائک اٹ!"

"لیکن دو سال تو یہاں رہنا ہی ہوگا۔"

"کیوں؟" رشمی نے جیسے چونک کر پوچھا۔

"اس لئے کہ مجھے امریکہ بھیجنے سے پہلے سرکار نے مجھ سے اس شرط پر دستخط کرائے تھے۔"

"آپ کو سوچ سمجھ کر یہ شرط ماننی چاہئے تھی۔ یو شُڈ ہیو یوزڈ یور ڈسکریشن۔"

"او آئی [illegible] دیٹ۔"

لیکن یہ کچھ ضروری نہیں کہ مجھے دو سال یہاں رہنا ہی پڑے۔ اگرچہ مجھے یہاں رہنا پسند ہے لیکن رشمی کا خیال ہے کہ ری آرگنائزیشن میں میرا اثر افسر کسی اچھی جگہ

ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے یہ پانچ چھ دن [illegible]

رشمی کے میکے واپس آیا ہوں تو اب گاؤں اور [illegible] کے [illegible] اشتیاق نہیں رہا۔ وہ تجسس ختم ہو چکا ہے۔ رشمی سے مجھے ان دو کنواریوں کے [illegible] معلوم ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ——

پہلی کنواری —— کملا کی عمر تیس سال سے اوپر ہے۔ اس کا پورا نام [illegible] ہے۔ وہ ذات کی براہمن ہے۔

باپ کی موت کے چار ماہ بعد پیدا ہوئی۔ جب وہ پانچ سال کی تھی تو اس کی ماں بھی مر گئی۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا۔ دور کے ایک رشتہ والے [illegible] کہتی تھی، اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ جب وہ دس برس کی ہوئی تو اس کی چاچی کا انتقال ہو گیا۔ گھر میں صرف کملا اور اس کا چاچا ہی رہ گئے۔ کملا جوان ہو گئی۔ چاچا بوڑھا ہو گیا۔ کملا کے بال کالے سیاہ اور چاچا کے بال برف جیسے سفید ہونے لگے اور جب چاچا کے سر میں ایک بھی کالا بال نہ رہا اور کملا کے جسم سے جوانی پھوٹنے لگی تو ایک دن سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ چاچا نے اپنی زمین بیچ دی اور اس سے حاصل کئے ہوئے روپے سے کملا کی جوانی خرید کر گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

تب سے دونوں اس شہر میں رہتے ہیں اور کملا فخر سے کہتی ہے اس نے مرضی کا شوہر چُنا ہے۔ اس کا خیال ہے اس کے یتیم کنوارے پن کی جو قیمت اس کے شوہر نے دی ہے دُنیا میں اور کوئی وہ قیمت ادا نہ کر سکتا تھا۔

دوسری کنواری لاجو کا پورا نام لاجونتی ہے۔ اس کی عمر بھی لگ بھگ تیس سال [illegible] پہلے کھتری تھی، پھر ویش ہوئی اور اب راجپوت ہے۔

ماں باپ غریب تھے اس لئے لاجو آٹھویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکی۔ [illegible] پڑھنے کا بے حد شوق تھا لیکن ماں باپ اس قابل نہ تھے۔ اس لئے اسے مجبوراً گھر بیٹھنا پڑا۔ وہ دن رات روتی رہتی تھی اور اسے بے حد دکھ ہوتا تھا جب اس کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں جو اس سے کہیں کم سمجھ تھیں اگلی جماعت میں داخل ہو کر فیل ہو رہی تھیں۔ لاجو بے حد حسین تھی اس لئے اس کے ماں باپ نے کچھ روپیہ لے کر اسے ایک بڑی عمر کے دکان دار سے بیاہ دیا۔ [illegible] راضی ہو گئی کہ اسے یقین دلایا گیا کہ اب وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہے اور دکان دار لالہ اسے کالج تک پڑھانے پر رضامند تھا۔ خوبصورت لاجو نے اپنا حسن اور اپنی جوانی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گروی رکھ دی لیکن شادی کے بعد اسے معلوم ہوا کہ لالہ نے سب جھوٹ کہا تھا۔ [illegible] وہ صبر کر کے پڑی رہی۔ اس دوران میں اس کے ہاں ایک لڑکا بھی ہو گیا لیکن لالہ کو دمہ کی شکایت تھی اور شک کا مرض تھا۔ لاجو اس کے کمزور ہاتھوں سے پٹتی لیکن [illegible]

اور پھر ایک دن وہ اپنے لڑکے کو لے کر لالہ کا گھر چھوڑ گئی اور اپنے ماں باپ کے پاس آ گئی۔ ماں باپ کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ اُدھر لالہ انہیں بھی طرح طرح تنگ کرنے [illegible]

آخر ایک دن وہ ایک نوجوان کے ساتھ اپنا شہر چھوڑ گئی۔ اس نوجوان نے لڑکیوں کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ اب وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ اب اس کی توجہ کسی طرف بٹ گئی تھی۔ وہ کچھ دن تو کوشش کرتی رہی کہ پڑھنے لکھنے کی طرف دھیان دے لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر اس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ وہ نوجوان لاجو سے بے حد محبت کرتا تھا اور ہر ممکن کوشش سے اُسے خوش رکھتا تھا۔ وہ دن میں ایک بنک میں چپڑاسی کا کام کرتا اور صبح اور شام اخبار بیچتا تھا۔ اب وہ نوجوان رشمی کے پتا کے ایک دوست کے ہاں کلرک تھا اور لاجو کا لڑکا اسکول جاتا تھا لیکن نالائق تھا۔ اس کی ماں بے حد دُکھی تھی۔

رشمی نے مجھے نہایت مختصر انداز میں اِن دونوں کنواریوں کی داستان سُنا دی تھی جو اس نے دوسروں سے سُنی تھی۔ وہ دونوں اپنی آزادہ روی اور رنگین مزاج ہونے کے لئے مشہور تھیں۔ اُن دونوں میں بہنوں جیسا پیار تھا۔ اُن کی ایک ہی جیسی مجبوریوں نے اُنہیں ایک ایسے مقام پر ملا دیا تھا کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو گئی تھیں۔ میں نے رشمی سے کُرید کرکے اپنی بے مدعا دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ اُس کے گھر سے اُن دو کنواریوں کا کیا تعلق تھا اور وہ اُنھیں کب سے جانتی تھی۔

میں جب رشمی کے میکے آیا تو میرا خیال تھا کہ کمو اور لاجو وہاں پہلے ہی سے موجود ہوں گی اور مجھ سے ویسی ہی بے باکی سے بات کریں گی اور مجھے پہاڑی کتا کہہ کر پکاریں گی۔ لیکن ایسی بات نہیں ہوئی۔ میں سوچتا تھا کہ اُن سے کہوں گا کہ میں نے اُن کی سونے کی چڑیا کو سونے کے پنجرے میں قید کر دیا تھا اور اُسے سونے کے دانے کھلا رہا تھا اور سونے ہی کا پانی پلا رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں انھیں خوب چڑاؤں گا اور اُن سے پوچھوں گا کہ لوگ اُنھیں دو کنواریاں کیوں کہتے ہیں؟ اور وہ شادی کیوں نہیں کرتی ہیں۔ میں تو اُن کے لئے رام شہر کے دو ایک اچھے پہاڑئے بھی تجویز کرنے والا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے ایک بار صرف اُن کی آواز کا کوندا لہراتا ہوا محسوس کیا جب شام کو ڈھولک پر انھوں نے یہ ٹپّہ گایا۔——

کوٹھے کوٹھے آ گوریئے

تینوں ہنتو دا یار دکھاواں

اور پھر اُن کے قہقہوں کا آبشار بھی گرا تھا اور پھر ایک بار اُن دونوں کے آنچلوں کا دھنک بھی کھلی تھی اور پھر اچانک وہ پچھلے دروازے سے اُٹھ کر چلی گئی تھیں۔

رشمی بھاگ کر آئی تھی میرے کمرے میں۔

"کمو اور لاجو ناراض ہو کر چلی گئیں!"

"کیوں؟" میں چونکا سا لگا۔

"میں نے اُن سے کہہ دیا کہ میں نے اُن کی کہانی آپ سے کہہ ڈالی ہے۔"

"بڑا ظلم کیا تم نے رشمی!"

رشمی یکدم خاموش ہو گئی۔ خاموش اور افسردہ۔

اتنے میں ایک بزرگ جن کی عمر ساٹھ سے اُوپر ہو گی اور ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا گیٹ کے اندر داخل ہوئے اور اُسی لمحہ کمو اور لاجو گیٹ کی طرف بڑھیں۔

"یہاں کیا کرنے آئے ہو کم بختو!" دو توں کی آواز کڑکی۔

اور وہ بزرگ اور وہ لڑکا دونوں سہمے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

"یہ کمو کا خاوند اور لاجو کا لڑکا ہے" رشمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے کھڑکی کے قریب ہو جانے کو دھکیلا۔ میں انھیں ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔

میں تو غلط مذاق کر ڈالنے والا تھا۔ بڑا ہی ظلم ہوتا اگر میں کمو اور لاجو کے لئے رام شہر کے اچھے پہاڑئے تجویز کر دیتا۔ کمو اور لاجو کا بے باک کنوارا پن اور بے باک اپنی مجبوریوں، اپنے حالات اور سماج کے گھناؤنے پن سے کئی بار شادی کر چکی تھی اور جو ساٹھ برس کا بوڑھا اور تیرہ برس کا لڑکا دونوں ساتھ ساتھ تھے، اُن میں ایک گہرا رشتہ تھا۔ یہ دونوں اُن مجبوریوں اور اُن حالات کی اولاد تھے جن سے کمو اور لاجو کا بیاہ ہوا۔ یہ دونوں سماج کی گندگی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ ایک پچاس برس بڑا ایک چالیس برس چھوٹا۔

لیکن اِن دونوں کا کمو اور لاجو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کمو اور لاجو اب غیر شادی شدہ تھیں۔ کیونکہ اُن کی محبت کا بیاہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُن کی محبت کو منڈپ نہیں ملا تھا، اُس کی کبھی ڈولی نہیں اُٹھی تھی۔ اُس کی مانگ میں کسی نے سیندور نہ ڈالا تھا۔ اُن کی محبت اب تک کنواری تھی۔

میں دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا اور رشمی دیر تک اپنا گال میرے کندھے ٹکائے میرے ساتھ لگی پرستش کرتی رہی اور پھر میں نے رشمی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

گیٹ کے دونوں حصے اپنے بے جان بازو پھیلائے جانے کس کا انتظار کر رہے تھے!!

---

بیٹی بنا لاؤں گا اور سونے ہی کا پانی پلاؤں گا۔"

"ایسا نہ کرنا ڈاکٹر!" لاجو نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور پھر وہ رونے لگی تھی۔ میں نے اسٹارٹ ہوتی ہوئی کار میں سے ایک بار آخری نظر اُن دونوں پر ڈالی۔ دونوں کنواریاں دہشت کے سنّاٹے کے ساتھ لگی خاموشی سے سُلگ رہی تھیں۔ اپنے آنسوؤں کی آگ میں!!

ایک ہفتے کے بعد رشمی کو لے کر اُس کے میکے آیا ہوں۔

یہ ایک ہفتہ اس نے میرے ساتھ ایک چھوٹی سی پہاڑی جاگیر کے، ایک قصبہ نما گاؤں رام شہر میں گزارا ہے۔ میں وہاں پرائمری ہیلتھ سینٹر کا میڈیکل آفیسر ہوں۔ رشمی نے اب تک جس طرح کے پہاڑ دیکھے ہیں اُن میں شملہ، نینی تال، ڈلہوزی، مسوری جیسی جگہیں ہیں جہاں سردی اور بارش کے سوا پہاڑوں والی کوئی بات نہیں۔ وہاں کے میدانی شہروں اور ان پہاڑی مقاموں میں کوئی فرق نہیں۔ وہی مال، وہی رنج، وہی بازار، وہی ہوٹل، ویسے ہی لوگ۔ صرف اتنی بات ہے کہ یہاں سب کچھ ایک اونچی سطح پر ہے۔ جیسے میدانوں کی تہذیب، اُن کا مصنوعی پن، اُن کی ظاہرداری کسی نے ایک بڑی سی طشتری میں اُٹھا کر ایک اونچی، وسیع چوٹی پر رکھ دی ہو۔ رشمی کی توقعات سے رام شہر کی زندگی کے کسی شعبے نے بھی میل نہیں کھایا بلکہ اُسے مایوسی ہوئی۔

وہ یہاں ٹرانسسٹر پر ریڈیو سیلون سے فلمی گانے نہیں سکتی ہے لیکن کسی خوبصورت ریستوران میں بیٹھ کر چائے نہیں پی سکتی۔ چائے تو اُسے اپنے کوارٹر کے ایک کمرے ہی میں پینی ہوتی ہے جس کی کھڑکی سے سامنے پھیلی ہوئی پہاڑیوں کی چوٹیاں نظر آتی ہیں اور اُن پر لہراتے ہوئے بادل دکھائی دیتے ہیں اور چھت پر گرتی ہوئی بارش کی آواز سُنائی دیتی ہے اور نیچے بہتے ہوئے نالے کا شور کانوں میں گونجتا ہے۔

"تمہیں یہ جگہ پسند نہیں آئی کیا؟"

"بہت اچھی ہے۔ فار اے چینج اٹ از ویری گڈ!"

"اور اگر یہاں مستقل طور پر رہنا ہو؟"

"آئی ونڈر اف آئی وُڈ لائک اِٹ!"

"لیکن دو سال تو یہاں رہنا ہی ہوگا۔"

"کیوں؟" رشمی نے جیسے چونک کر پوچھا۔

"اس لئے کہ مجھے امریکہ بھیجنے سے پہلے سرکار نے مجھ سے اس شرط پر دستخط کرائے تھے۔"

"آپ کو سوچ سمجھ کر یہ شرط ماننی چاہئے تھی۔ یُو شُڈ ہیو یُوزڈ یُور امیجی نیشن۔"

"آئی لیک دیٹ۔"

لیکن یہ کچھ ضروری نہیں کہ مجھے دو سال یہاں رہنا ہی پڑے۔ اگرچہ مجھے یہاں رہنا پسند ہے لیکن رشمی کا خیال ہے کہ ری آرگینائی زیشن میں میرا ٹرانسفر کسی اچھی جگہ ہو جائے گا۔ اِس لئے اُس سے یہ بات چھپانی بہت مشکل ہے کہ ...

رشمی کے میکے واپس آیا ہوں تو اب کو اور لاجو کے بارے میں کچھ پوچھنے کا اشتیاق نہیں رہا۔ وہ تجسّس ختم ہو چکا ہے۔ رشمی سے مجھے اُن دو کنواریوں کے متعلق سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اُس نے مجھے بتایا ——

پہلی کنواری —— کمو کی عمر تیس سال ہے اور پورا نام کملا ہے۔ وہ ذات کی براہمن ہے۔

باپ کی موت کے چار ماہ بعد پیدا ہوئی۔ جب وہ پانچ سال کی تھی تو اُس کی ماں بھی مر گئی۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا۔ دُور کے ایک رشتہ دار نے جسے وہ چاچا کہتی تھی، اُسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ جب وہ دس برس کی ہوئی تو اُس کی چاچی کا بھی انتقال ہو گیا۔ گھر میں صرف کملا اور اُس کا چاچا ہی رہ گئے۔ کملا جوان ہو گئی۔ چاچا بوڑھا ہونے لگا۔ کملا کے بال کالے سیاہ اور چاچا کے بال برف جیسے سفید ہونے لگے اور جب چاچا کے سر میں ایک بھی کالا بال نہ رہا اور کملا کے جسم سے جوانی پھوٹنے لگی تو ایک دن سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ چاچا نے اپنی زمین بیچ دی اور اس سے حاصل کئے ہوئے روپے سے کملا کی جوانی خرید کر گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

تب سے دونوں اِس شہر میں رہتے ہیں اور کملا فخر سے کہتی ہے، اُس نے اپنی مرضی کا شوہر چُنا ہے۔ اُس کا خیال ہے اُس کے یتیم کنوارے پن کی جو قیمت اُس کے شوہر نے دی ہے دُنیا میں اور کوئی وہ قیمت ادا نہ کر سکتا تھا۔

دوسری کنواری لاجو کا پُورا نام لاجونتی ہے۔ اُس کی عمر بھی لگ بھگ تیس سال ہے پہلے کھتری تھی، پھر ویش ہوئی اور اب راجپوت ہے۔

ماں باپ غریب تھے اِس لئے لاجو آٹھویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکی۔ اُسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا لیکن ماں باپ اِس قابل نہ تھے۔ اِس لئے اُسے مجبوراً گھر بیٹھنا پڑا۔ لیکن وہ دن رات روتی رہتی تھی اور اُسے بے حد دُکھ ہوتا تھا جب اُس کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں جو اُس سے کہیں کم سمجھ تھیں اگلی جماعت میں داخل ہو کر فیل ہو رہی تھیں۔ لاجو بے حد حسین تھی۔ اِس لئے اُس کے ماں باپ نے کچھ روپیہ لے کر اُسے ایک بڑی عمر کے دُکان دار سے بیاہ دیا۔ وہ راضی ہو گئی کہ اُسے یقین دلایا گیا کہ اب وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہے اور دُکان دار لالہ اُسے کالج تک پڑھانے پر رضامند تھا۔ خوبصورت لاجو نے اپنا حُسن اور اپنی جوانی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گروی رکھ دی۔ لیکن شادی کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ لالہ نے یہ سب جھوٹ کہا تھا۔ پھر بھی وہ صبر کر کے پڑی رہی۔ اِس دوران میں اُس کے ہاں ایک لڑکا بھی ہو گیا لیکن لالہ کو دمے کی شکایت تھی اور شک کا مرض تھا۔ لاجو اُس کے کمزور ہاتھوں سے پٹتی رہی لیکن اپنی آبرو کی حفاظت کرتی رہی۔

اور پھر ایک دن وہ اپنے لڑکے کو لے کر لالہ کا گھر چھوڑ گئی اور اپنے ماں باپ کے گھر آگئی۔ ماں باپ کا سلوک اُس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ اُدھر لالہ اُنہیں کسی طرح تنگ کرتا رہا تھا۔

آخر ایک دن وہ ایک نوجوان کے ساتھ اپنا شہر چھوڑ گئی۔ اس نوجوان نے اُسے لڑکیوں کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ اب وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ اب اُس کی توجہ کسی اور طرف بٹ گئی تھی۔ وہ کچھ دن تو کوشش کرتی رہی کہ پڑھنے لکھنے کی طرف دھیان دے لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر اُس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ وہ نوجوان لاجو سے بے حد محبت کرتا تھا اور ہر طرح کی کوشش سے اُسے خوش رکھتا تھا۔ وہ دن میں ایک بنک میں چپراسی کا کام کرتا اور صبح اور شام اخبار بیچتا تھا۔ اب وہ نوجوان رشمی کے پتا کے ایک دوست کے ہاں کلرک تھا اور لاجو کا لڑکا اسکول جاتا تھا لیکن نالائق تھا۔ اُس کی ماں بے حد دُکھی تھی۔

رشمی نے مجھے نہایت مختصر انداز میں اِن دونوں کنواریوں کی داستان سُنادی تھی، جو اُس نے دوسروں سے سُنی تھی۔ وہ دونوں اپنی آزادہ روی اور رنگین مزاجی کے لئے مشہور تھیں۔ اُن دونوں میں بہنوں جیسا پیار تھا۔ اُن کی ایک ہی جیسی مجبوریوں نے انہیں ایک ایسے مقام پر ملا دیا تھا کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو گئی تھیں میں نے رشمی سے گرید کر کے اپنی بے مدعا دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ مزید جاننے کی کوشش کی کہ اُس کے گھر سے اُن دو کنواریوں کا کیا تعلق تھا اور وہ اُنھیں کب سے جانتی تھی۔

میں جب رشمی کے میکے آیا تو میرا خیال تھا کہ کمو اور لاجو وہاں پہلے ہی سے موجود ہوں گی اور مجھ سے ویسی ہی بے باکی سے بات کریں گی اور مجھے پہاڑی کوا کہہ کر پکاریں گی۔ لیکن ایسی بات نہیں ہوئی۔ میں سوچتا تھا کہ اُن سے کہوں گا کہ میں نے اُن کی سونے کی چڑیا کو سونے کے پنجرے میں قید کر دیا تھا اور اُسے سونے کے دانے کھلا رہا تھا اور سونے ہی کا پانی پلا رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اُنھیں خوب چڑاؤں گا اور اُن سے پوچھوں گا کہ لوگ اُنھیں دو کنواریاں کیوں کہتے ہیں؟ اور وہ شادی کیوں نہیں کرتی ہیں۔ میں تو اُن کے لئے رام شہر کے دو ایک اُنچی پہاڑئے بھی تجویز کرنے والا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے ایک بار صرف اُن کی آواز کا کوندا لہراتا ہوا محسوس کیا جب شام کو ڈھولک پر اُنھوں نے یہ ٹپہ گایا ———

کوٹھے کوٹھے آ گوریئے

تینوں بھتورا یار دکھاواں

اور پھر اُن کے قہقہوں کا آبشار بھی گرا تھا اور پھر ایک بار اُن دونوں کے آنچلوں کی دھنک بھی کھلی تھی اور پھر اچانک وہ پچھلے دروازے سے اُٹھ کر چلی گئی تھیں۔

رشمی بھاگ کر آئی تھی میرے کمرے میں۔

"کمو اور لاجو ناراض ہو کر چلی گئیں!"

"کیوں؟" مجھے دھچکا سا لگا۔

"میں نے اُن سے کہہ دیا کہ میں نے اُن کی کہانی آپ سے کہہ ڈالی ہے۔"

"بڑا ظلم کیا تم نے رشمی؟"

رشمی یکدم خاموش ہو گئی۔ خاموش اور افسردہ؟

اتنے میں ایک بزرگ جن کی عمر ساٹھ سے اُوپر ہو گی اور ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا گیٹ کے اندر داخل ہوئے اور اُسی لمحہ کمو اور لاجو گیٹ کی طرف بڑھیں۔

"یہاں کیا کرنے آئے ہو کم بختو؟" دونوں کی آواز کڑکی۔

اور وہ بزرگ اور وہ لڑکا دونوں سہمے ہوئے سے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

"یہ کمو کا خاوند اور لاجو کا لڑکا ہے۔" رشمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے کھڑکی کے قریب ہو جانے کو دھکیلا۔ میں اُنھیں ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔

میں تو غلط مذاق کر ڈالنے والا تھا۔ بڑا ہی ظلم ہوتا اگر میں کمو اور لاجو کے لئے رام شہر کے اُنچی پہاڑئے تجویز کر دیتا۔ کمو اور لاجو کا بے باک کنوارا پن اور بے باک جوانی تو اپنی مجبوریوں، اپنے حالات اور سماج کے گھناؤنے پن سے کبھی بار شادی کر چکی تھی اور یہ جو ساٹھ برس کا بوڑھا اور تیرہ برس کا لڑکا دونوں ساتھ ساتھ تھے، اُن میں ایک گہرا رشتہ تھا۔ یہ دونوں اُن مجبوریوں اور اُن حالات کی اولاد تھے جن سے کمو اور لاجو کا بیاہ ہوا تھا۔ یہ دونوں سماج کی گندگی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ ایک پچاس برس بڑا ایک چالیس برس چھوٹا۔

لیکن اِن دونوں کا کمو اور لاجو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کمو اور لاجو اب بھی غیر شادی شُدہ تھیں۔ کیونکہ اُن کی محبت کا بیاہ کہیں نہیں ہوا تھا۔ اُن کی محبت کو کوئی منڈپ نہیں ملا تھا، اُس کی کبھی ڈولی نہیں اُٹھی تھی۔ اُس کی مانگ میں کسی نے سیندور نہیں ڈالا تھا۔ اُن کی محبت اب تک کنواری تھی۔

میں دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا اور رشمی دیر تک اپنا گال میرے کندھے پر ٹکائے میرے ساتھ لگی پراسرار سی کرتی رہی اور پھر میں نے رشمی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

گیٹ کے دونوں حصے اپنے بے جان بازو پھیلائے جانے کس کس کا انتظار کر رہے تھے!!

# غزل

**سید حجاب ترمذی**

اے مژہ پر ستارۂ شبِ غم — تجھ سے روشن ہے عشق کا عالم

حسنِ نازک مزاج کا عالم — کبھی شعلہ ہے تو کبھی شبنم

صفحۂ دہر سے مٹا دو گے — میں بھی ہوں کیا کسی کا نقشِ قدم

آپ کیا جانیں مرتبہ غم کا — آپ ہیں ناشناسِ لذتِ غم

لوگ ایسے بھی ہیں زمانے میں — جن کا کوئی وجود ہے نہ عدم

بڑھ کے دار و رسن کو چوم لیا — عشق نے رکھ لیا جنوں کا بھرم

ہر نفس ہے پیامِ مجبوری — مجھ سے پوچھے کوئی نوازشِ غم

دل پہ جو حادثہ نہیں گزرا — کر رہا ہوں اسے سپردِ قلم

سویت بنا محبت کی — ان کا ادنیٰ اشارۂ مبہم

عشق کو چارہ سازِ عشق نہ چھیڑ — عشق ہے بے نیازِ راحت و غم

لاکھ دستِ جنوں نے سلجھایا — پھر بھی نکلے نہ اُن کی زلف کے خم

فتنۂ حسن، محشرِ خاموش — التجا پر سکوت کا عالم

عشق کے مرحلوں میں آخرِ کار — ڈگمگانے لگے خرد کے قدم

ہر نفس کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہے گویا چراغِ یاس و الم

میرے دل میں بڑی جگہ ہے حجاب
ناخدا کے لئے خدا کی قسم

افسانہ

# بھاڑاگھر

اقبال صدیقی۔ ایم، اے

آل انڈیا ریڈیو۔ الٰہ آباد

۱۳ر اکتوبر ۹۶ء                بندہ پرور! تسلیم ونیاز

لیجئے حاضر ہے "بھاڑاگھر" دیکھئے اور پرکھئے۔ چاہتا ہوں سالنامے میں شامل ہو سکے تو بہتر۔ قدرے طویل ضرور ہو گیا لیکن مجھے یقین ہے آپ اس کی طوالت کو نظر انداز فرما دیں گے۔ آپ کی اور قارئینِ "بیسویں صدی" کی رائے کا منتظر رہوں گا . . .

اقبال صدیقی

---

ٹرام ابھی پوری طرح رکی بھی نہ تھی کہ نیتائی دا "ہاں ہاں ہاں" کہتے ہوئے دھڑام سے کود پڑے۔ زور قدرے بے احتیاطی کے باعث جوانی کا بھاری بھرکم جسم غیر متوازن ہوا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھی نمیتا کو لئے دئے وہ چاروں شانے چت ہو بیٹھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ... ہوتی وہ تیزی سے اُٹھ کھڑے ہوتے اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اپنی دھوتی جھاڑنے لگے۔ نمیتا کی پھٹی ہوئی ساری کا پلّو جو گرا تو اُس کے شانے نیم عریاں ہو گئے۔ نیتائی دا تو تیزی سے اُٹھ چکے تھے اور کسی نے شاید دیکھا بھی نہیں کہ وہ ایک ثانیہ پہلے چت بہ چارگی سے گرے بھی تھے۔ لیکن نمیتا اب تک اُسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ دھوتی جھاڑتے جھاڑتے نیتائی دا کی آنکھیں بھی نمیتا کے نیم عریاں شانوں سے پھسل گئیں۔ مثاً نیتائی دا کو خیال ہوا کہ کہیں اُسے چوٹ تو نہیں آئی۔ اور وہ جھٹ اُس کے قریب ... جیسے سرگوشیوں میں بولے۔

"او گو، تو ماتے کچھو کشٹ ہولو نا کی؟" تمہیں کوئی تکلیف ہوئی کیا؟

نمیتا ایک لفظ بولے بغیر اُٹھ بیٹھی اور نہایت اطمینان سے اپنے شانوں پر پلّو ... ہوئی اپنے بچّے کی طرف متوجّہ ہوئی۔ تین چار سال کا بچّہ جو فٹ پاتھ پر ہی لیٹا ہوا ... مریل سا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہو۔ پاس ہی نمیتا کی بچّی ... ایک سڑا آم چوس رہی تھی، جو اُس نے ابھی ابھی گندگیوں کے ڈھیر سے اُٹھا کر منہ لگا لیا تھا۔ بچّی کی عمر کوئی چھ سات سال ہوگی۔ وہ ایک پھٹا ہوا گندا فراک پہنے ہوئے ... اُس کے سر کے بال بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے اور ناک سے رطوبت بہہ رہی تھی جسے ... آم کے ساتھ بار بار سی سی کرتی ہوئی چوستی اور رطوبت پھر باہر نکل آتی۔ نمیتا نے سوتے ہوئے بچّے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور جیسے اُس کا ہاتھ گرم توے پر پڑ گیا ہو۔

"او ماں!"

ہلکی سی کرب ناک آواز اُس کے منہ سے نکلی اور پھر بے بسی کا سہارا لے کر وہ اُسی طرح گوشت پوست کی ایک مُبت بن گئی۔

"کی ہوئے چھے کی؟ چھیلیر جُر ہوئے چھے نا کی؟" (کیا ہوا ہے؟ کیا بچّے کو بخار ہے کیا؟)

نیتائی دا نے نمیتا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ نمیتا نے پہلی بار نیتائی دا کی طرف آنکھیں اُٹھائیں۔ غریبی اور بے بسی میں ڈوبی ہوئی نمیتا کی خاموش آنکھیں ساری داستان کہہ گئیں۔ نیتائی دا کا ہاتھ بچّے کی پیشانی پر گیا اور وہ چیخ اُٹھے۔

"او رے بابا!"

اور تبھی نمیتا کی آنکھوں سے آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے پگھلے ہوئے موم کی طرح گر کر خشک ہو گئے۔

"کو تھائے تھا کو تُمی؟" (کہاں رہتی ہو تم؟)

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"چھیلےکے آشپتال لئے جاؤ" (لڑکے کو ہسپتال لے جاؤ)

کون ہے یہ وہ رہا تھا جس کے دل میں نمیتا جیسی ابھاگن کے لئے اتنی ہمدردی تھی۔

لیکن کون جواب دیگا۔

نیتائی دا کو اور کچھ سمجھنا باقی نہ رہا۔ انھوں نے بچے کو اپنی گود میں اٹھایا اور بولے۔

"آمار ٹھاکر چوٹے ایشو بھگوان شب ٹھیک کرے دیبین" (میرے ساتھ چلو تو بھگوان سب ٹھیک کر دیں گے)

نمیتا مینا کی طرح پرانٹھ کھڑی ہوئی اور بچی کو سنبھالتی ہوئی نیتائی دا کے پیچھے ہولی۔ بچی آم کی ٹھوکی گٹھلی کو اسی طرح چوسے جا رہی تھی۔ وہ پوری گٹھلی منہ میں ڈالتی، پھر نکالتی اور پھر چوس کر منہ میں ڈال دیتی

پانچ نمبر بس میں وہ سب بیٹھ گئے اور جب بس ہوڑہ پل پر دوڑنے لگی تو نمیتا کو پہلی بار کلکتہ شہر کی زندگی کا اندازہ ہوا۔ ادھر ٹرام، ادھر بسیں، ادھر رکشہ۔ شور، گڑگڑاہٹ، بھاگ دوڑ۔ کلکتہ شہر کی زندگی میں یہ تین ہی عمل تو ہیں۔ رفتار، تیز رفتار، اور تیز رفتار!! یہ سب کے سب کہاں بھاگے جا رہے ہیں کیوں بھاگے جا رہے ہیں؟

اور وہ خود کہاں جا رہی ہے؟

اور تبھی نمیتا چونک اٹھی۔ ایک عجیب خوف، ایک گھبراہٹ نے اسے ڈس لیا اور اس کی نظریں نیتائی دا کو ڈھونڈنے لگیں۔ وہ ادھر بائیں ہاتھ کی نشست پر اس کے بیمار بچے کو سنبھالے بیٹھے تھے۔ نمیتا نے پہلی بار ان کا جائزہ لیا۔ کوئی پچاس کا سن ہوگا نیتائی دا کا۔ وہ دوہرے جسم کے درمیانے قد کے انسان تھے جن کے سر کے بال قریب قریب صاف ہو چکے تھے اور بڑی گھنی مونچھوں میں ان کا منہ نظر ہی نہ آتا تھا۔ ان کے کان بڑے بڑے تھے اور گال ڈبل روٹی کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ ان کا پیٹ اوندھے مٹکے کی طرح نکلا ہوا تھا۔ کھادی کا ڈھیلا کرتا اور کھادی کی دھوتی پہن رکھی تھی انھوں نے۔ وہ بار بار اپنے نتھنے پھیلا کر نسوار لیتے اور بکرے کی طرح چھینکتے "آچھیں"۔

ہوڑہ پل سے گزرتی ہوئی نمیتا سوچ رہی تھی ——

"یہ دھرماتما کون ہے؟"

اسے یقین نہ آتا تھا کہ کلکتہ جیسے شہر میں جہاں لوگوں کو سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ہوتی کوئی اس سے پوچھ بھی سکتا ہے ——

"تم کہاں رہتی ہو؟ تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں؟ لڑکے کو ہسپتال کیوں نہیں لے جاتیں؟"

نمیتا کی آنکھیں گہری عقیدت میں ڈوب گئیں اور نیتائی دا کی طرف دیکھ کر اس نے زیرِ لب کہا۔

"دھرماتما!"

آج سات دنوں سے وہ ہوڑہ اسٹیشن کے باہر بھٹک رہی تھی لیکن کسی نے اس کی طرف نگاہیں بھی نہ اٹھائیں۔ کتنوں کے آگے ہاتھ پھیلائے تھے اس نے!

"بابا ایکٹی پیشہ بابا گو"

لیکن پیسوں کی ریل پیل میں اس کے لئے صرف ایک پیسہ کسی کے پاس نہ تھا اور سات دنوں کے اندر ہی اس کی کیا حالت ہو گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ گال پچک گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ برسوں سے کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو۔ پانی پی پی کر اور جھوٹے کھا کھا کر اس نے کسی طرح اپنے آپ کو زندہ رکھا تھا۔ جب گاؤں سے چلی تھی تو اس نے ایک پوٹلی موڑھی (بھنا ہوا چاول) ساتھ لی تھی اور تھوڑا گڑ۔ انھیں سے وہ اپنے بچوں کو سنبھالتی رہی تھی۔ اس امید میں کہ جب اسے کہیں چاکری مل جائے گی تو پھر اسے بھات بھی مل جائے گا لیکن اس بھرے ہنگامے اجنبی شہر میں قدم رکھتے ہی اس کے حواس جاتے رہے۔ وہ کہاں جائے؟ کس سے نوکری مانگے؟ یہاں تو کسی کو کسی کی باتیں سننے کی فرصت ہی نہیں۔ جسے دیکھئے اپنی ہی فکر میں غلطاں ہے۔ ہوڑہ سٹیشن پر نمیتا دیکھتی ایک ریل آتی اور مسافروں کا ایک پورا جلوس کود کر نکلتا۔ پھر دھکے اور ریل پیل شروع ہو جاتی۔ لوگ بھاگتے، پھلتے، دوڑتے نظر آتے۔ ٹیکسی، بس اور ٹرام کے لئے لمبی لمبی قطاروں میں جگہ لینے کے لئے بے تحاشہ بھاگتے ہوئے لوگوں سے وہ کیسے کہتی۔

"دادا! آمی چاکری چائی" (دادا مجھے نوکری چاہئے)

وہ تو تیر کی طرح ٹھیک اپنے اپنے نشانوں کی طرف بھاگتے تھے۔ بھول سے بھی کسی کی نظر نمیتا کی طرف نہ پڑتی۔ شاید سب کے سب ٹیکسیوں، بسوں اور ٹراموں میں لد لدا کر اپنی اپنی چاکریوں میں پہنچ جانے کو بے قرار ہوتے۔ کئی بار نمیتا سوچتی کہ کیا وہ بھی لپک کر ٹرام میں بیٹھ جائے۔ لیکن نہ بابا! کیا پتہ ٹرام اسے کہاں لے جائے؟ سٹیشن سے باہر اخبار والے، بوٹ پالش والے، ٹھیلے والے اور بھیک مانگنے والے بھی اپنے اپنے گاہکوں پر ہی نظر ڈالتے۔ نمیتا کا تو جیسے کوئی وجود ہی نہ تھا۔ بغیر مرد کی عورت شاید ایسی ہی ہوتی ہے۔ جب ہی تو بھگوان کی آنکھیں بھی اسے دیکھنے سے قاصر تھیں۔ ورنہ وہ جس نے اتنا بڑا سنسار بنایا ہے نمیتا کے لئے کہیں سے کوئی چھوٹی سی چاکری کا انتظام نہ کر دیتا اب تک جب کہ وہ بھوکی تھی، بے سہارا تھی اور اس کے دو بچے تھے جو بھوک سے بے تاب ہو کر ملبے کے ڈھیروں سے اناج چننے کی کوشش کرتے تھے۔

"کیا پتہ بھگوان ہے بھی یا نہیں؟"

نمیتا کے دل میں پہلی بار بھگوان سے انکار کا خیال پیدا ہوا تھا۔ لیکن پھر وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔

"چھی، تو ناستک ہو گئی کیا؟"

اور پھر اُس کے ذہن میں جو صدیوں کا اعتقاد تھا بھگوان کے لئے وہ ایک دن اُس کی زبان سے پھوٹ پڑا۔

"بھگوان کے لئے بابا، ایکو پیسہ بابا گو!"

سویرے سے شام تک وہ رٹ لگاتی اور رات کو اپنی ہی طرح کتنوں کے ساتھ اپنے بچوں کو سمیٹے فٹ پاتھ پر لیٹ جاتی۔ صبح اُٹھتی تو پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اِس طرح سات دن گزر گئے۔

آج سویرے ہی سے کھوکا بخار میں جھلس رہا تھا۔ نمیتا سر پیٹ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے پاس پیسے تھے اور نہ اُسے یہی معلوم تھا کہ ہسپتال کدھر ہے۔ پھر کیا ہوگا؟

"کھوکا مر جائے گا!"

نمیتا نے موت کی سرگوشیاں سُنیں اور وہ بلبلا اُٹھی۔

"نہیں نہیں!" اُس نے احتجاج کیا۔ کھوکا کو اپنے سینے سے لگا لیا، اُسے پیار کیا۔ لیکن کھوکا اِتنا بے حس کیوں ہو گیا تھا؟ اُس کی آنکھیں کیوں نہیں کُھلتی تھیں؟

"کھوکا!"

نمیتا چلّا اُٹھی۔ وہ دھاڑیں مار کر رونا چاہتی تھی۔ فریادیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن نہ تو اُس کی زبان ہی کُھلی اور نہ اُس کی آنکھوں میں سیلاب ہی اُمڈا۔

نمیتا بُجھ چکی تھی، خشک ہو چکی تھی۔ چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا۔

جبھی جانے کہاں سے یہ دھرماتما آ گیا۔

"بھگوان سے بھی بھی اگر تو ناستک ہو گئی تھی۔ ناتا۔ اُس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔"

جگہ جگہ رُکتی ہوئی بس چلی جا رہی تھی۔

"اومان گو، کو تو بوڑو بوڑو بازی!" (او ماں! کتنے بڑے بڑے مکان ہیں)

نمیتا دونوں طرف دیکھتی جا رہی تھی اور اُس کی آنکھوں میں اُمیدیں جل اُٹھی تھیں۔ اُن عظیم الشان عمارتوں میں ایک چھوٹی سی نوکری تو مل ہی سکتی ہے اُسے۔ وہ کہیں جھوٹے برتن ہی صاف کرے گی۔ کسی کے بچے ہی کھلایا کرے گی۔ کوئی نہ کوئی تو اِسے رکھ ہی لے گا۔ ایک بار پھر اُس نے نیتائی دا کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھا اور اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"یہ دھرماتما مجھے چاکری ضرور دلوائے گا!"

بس ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہوئی اور نیتائی دا نے نمیتا کو جگایا۔

"چولے ایشو" (چلی آؤ)

نمیتا بچی کو سنبھالتی ہوئی بس سے اُتری۔ بچی اب تک خشک گٹھلی چاٹ رہی تھی۔

"پھیلے دائو" (پھینک دو!)

نمیتا نے اُسے ڈانٹ بتائی اور اُس کے ہاتھ سے گٹھلی چھین کر پھینک دی۔ بچی نے ایک قہر آلود نگاہ اپنی ماں پر ڈالی اور پھر زبان نکال کر اپنی ہتھیلی چاٹنے لگی۔ نیتائی دا نے کھوکا کو اپنی گود میں اُٹھا لیا اور پھر کہا۔

"چولے ایشو۔ ایئی ہے ایئی دیکھے" (چلی آؤ اِدھر اِس طرف)

راستے سے ہٹ کر ایک گلی۔ گلی کے اندر کچھ دُور جا کر دونوں طرف بانس اور مٹی کے سہارے کھڑے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے اور پھر ایک دو منزلہ پختہ مکان جو کافی پُرانا ہونے کے باوجود کافی صاف سُتھرا تھا۔ وہی نیتائی دا کا مکان تھا۔

اندر جا کر نیتائی دا نے کھوکا کو بستر پر لٹا دیا اور اُس پر ایک چادر ڈال دی۔ پھر نمیتا کو اُسی پلنگ پر بٹھا کر وہ یہ کہتے ہوئے اندر چلے گئے۔

"تُمی بوشو۔ آمی ایکھنی آشچھی" (تم بیٹھو، میں ابھی آیا!)

اور تھوڑی ہی دیر میں نیتائی دا ایک لوٹے میں پانی لے آئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک صاف، باریک کپڑا بھی تھا۔ اُنھوں نے ایک ٹکڑا پھاڑ کر لوٹے میں ڈبویا اور نچوڑ کر کھوکا کی پیشانی پر چپکا دیا۔ اتنے میں ایک معمر سی بیوہ عورت نکلی۔ اُس کا سر گُھٹا ہوا تھا اور اُس نے ایک پتلی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ نمیتا نے دیکھا اُس کے چہرے پر زندگی کے تجربات کی گہری چھاپیں تھیں۔

"کاکی ماں!"

نیتائی دا بیوہ عورت سے مخاطب ہوئے۔

"تُمی اُو کے دیکھو۔ آمی ڈاکٹر کے نے ایکھنی آشچھی" (تم اِسے سنبھالو۔ میں ڈاکٹر کو لے کر ابھی آیا)

بغیر کوئی ردِ عمل ظاہر کئے کاکی ماں کھوکا کے سرہانے بیٹھ گئیں اور اُس کی نبض ٹٹولنے لگیں۔ پھر نہایت متانت سے بولیں۔

"چِنتا کُرو نا۔ ٹھیک ہوئے جابے" (فکر نہ کرو ٹھیک ہو جائے گا)

اور اپنی آنکھوں میں کتنا تشکر، کتنی التجائیں بھر کر نمیتا نے کاکی ماں کو دیکھا۔ کاکی ماں اُس سے باتیں کر رہی تھیں۔

"تومار نام کی؟" (تمھارا نام کیا ہے؟)

"نمیتا"

"اے تومار چھیلے؟" (یہ تمھارا لڑکا ہے)

"اگیں ہیں" (جی ہاں)

"باڑی کو تھائے؟" (گھر کہاں ہے؟)

"آگے تو پوڑولیائے تھاکتم" (پہلے تو پورولیا میں رہتی تھی)

"آر ایکھن ؟" (اور اب ؟)

"ایکھن آر کی ؟ (اب اور کیا ؟)

"چھیلر باپ نیئی ؟" (لڑکے کا باپ نہیں ہے ؟)

اور نمیتا کی آنکھوں میں جیسے بند ہمیشہ اُمڈ آیا ہو۔ اُمڈ اُمڈ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ کاکی ماں نے اُس کی دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھ دی تھی اور وہ درد سے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

"اِسے اِسے کی ہو لو ؟ کاند چھو کینو ؟" (اے اے کیا ہوا ؟ رو تی کیوں ہو؟)

نمیتا کاکی ماں کو کیا بتاتی کہ اُس کا پتی اُسے چھوڑ کر ایک رات نہ جانے کہاں چلا گیا۔ وہ دو سال سے بیکار تھا۔ آخر بیکاری سے تنگ آکر اُس نے اپنے کھیت بیچ دیئے اور کچھ دنوں تک اُسی رقم سے اپنے کُنبے کو پالتا رہا۔ اِس درمیان وہ کئی بار چاکری کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکا کیا۔ کلکتہ، جمشید پور، رانچی۔ لیکن چاکری اُسے کہیں نہ ملی۔ آخر ایک رات صرف بیس روپے نمیتا کے تکیے کے نیچے رکھ کر نہ جانے وہ کہاں چلا گیا ؟ اور پھر کبھی نہ لوٹا۔ وہ زندہ بھی ہے یا مر کھپ گیا۔ نمیتا نے اُس کا انتظار کیا۔ لیکن جب گاؤں میں بغیر قحط کے چاول کی قلت ہو گئی اور موٹا چاول بھی کہیں نظر نہ آنے لگا تو نمیتا نے ایک دن گٹھری باندھی اور اپنے بچوں سمیت ریل میں بیٹھ کر ہوڑہ پہنچ گئی۔ گاؤں چھوڑتے وقت اُس نے سوچا تھا شاید کلکتے کے کسی گوشے میں کھوکا کا باپ اُسے مل جائے لیکن . . .

غریب رو کر ہی جی ہلکا کر لیتی ہے۔ نمیتا نے اپنے آنسو خشک کئے۔ کاکی ماں نے اُسے ڈھارس دی۔

"چِنتا کُرو نا۔ ایکھن شب ٹھیک ہوئے جابے" (فکر نہ کرو اب سب ٹھیک ہو جائے گا)

اور جب نیتائی دا کے ساتھ ڈاکٹر مُوشا آئے تو نمیتا کو واقعی بہت تقویت ہوئی۔ کیونکہ ڈاکٹر مُوشا نے بھی تو انہیں الفاظ کے خوشگوار مینہہ برسائے تھے جلتی تپتی نمیتا پر۔

"چِنتا کُرو نا۔ آمی اوشدھ دیئے جاچھی" (فکر نہ کرو میں دوا دیئے جاتا ہوں)

ساری رات کاکی ماں کھوکا کی تیمار داری کرتی رہی۔ دو ہی خوراک کے بعد کھوکا کا بخار کچھ کم ہو گیا تھا۔ پہلی خوراک خود نیتائی دا نے اپنے ہاتھ سے پلائی تھی اور پھر اُس کے بعد ضروری ہدایات دے کر وہ پُوجا کے لئے رخصت ہو گئے تھے۔ وہ روزانہ بلا ناغہ ڈیڑھ گھنٹے صبح اور ڈیڑھ گھنٹے شام پُوجا کیا کرتے تھے۔

کھوکا کا بخار جب ذرا ہلکا ہوا تو نمیتا فرش پر ہی بیٹھی بیٹھی اُونگھنے لگی۔ اُس کی بچی پہلے ہی سو چکی تھی۔ ایک زمانے کے بعد بھات اور مچھلی کھا کر وہ کس قدر مطمئن ہو گئی تھی۔ نمیتا کچھ کھانا نہیں چاہتی تھی لیکن کاکی ماں کی ضد پر اُس نے کچھ نوالے زہر مار کر لئے اور جب کھوکا کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو نمیتا بھی نیند میں ڈوبنے لگی۔ [illegible] تو تھی ہی بچاری۔ رفتہ رفتہ وہ فرش ہی پر پھیلنے لگی اور [illegible] سو رہی۔

آنکھیں کھلیں تو اُس کے کانوں میں نیتائی دا کے منتر پڑے۔

"گنو رنگو گنو رنگو گنو رنگو بولو گو"

اور نمیتا نے زیرِ لب دُہرایا۔

"گنو رنگو گنو رنگو گنو رنگو بولو گو"

---

تین دنوں کے بعد کھوکا بھلا چنگا ہو گیا اور چوتھے دن نمیتا کو نیتائی دا کے بھاڑا گھر میں منتقل کر دیا گیا۔ اُس گلی میں جو جھونپڑے تھے وہ سب نیتائی دا کے تھے جو اُنھوں نے نمیتا جیسی حاجت مند عورتوں کے لئے ہی بنوا رکھے تھے۔ کوئی ایک درجن کے قریب ہوں گے۔ ہر ایک میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اور آنگن کے ایک کنارے معمولی سا چھپر کا تھا۔ نیتائی دا کے حکم کے مطابق کاکی ماں نے نمیتا کے گھر چاول کی ایک بوری، دال، نمک وغیرہ پہنچا دئے اور نمیتا کا چولھا ایک بار پھر جلا۔ خود اُس کے لئے اور اُس کے دو بچوں کے لئے۔

جس دن نمیتا نے چولھا جلایا اُس دن بیلا اور منجو جو اُس کے پاس کے بھاڑا گھروں میں رہتی تھیں، اُسے مبارکباد پیش کرنے آئیں۔ نمیتا اُن سب کے بار احسان سے دب گئی۔ اُسے اِس پردیس میں، اِس بڑے شہر میں کتنے غمگسار، کتنے ہمدرد مل گئے تھے۔ وہ ٹھاکر دا کی مرہونِ منت تھی۔ گنو رنگ مہا پربھو کے بھگت ٹھاکر دا جو اِن دنوں موَن ورت میں مشغول تھے۔ اِس لئے اُس رات کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ نمیتا درشن کے لئے تڑپ رہی تھی۔

وہ بڑا دھرماتما تھا۔ وہ تو بھگوان ہی کا ساکشات روپ تھا۔ نیتائی دا اُن کے درشن کب ہوں گے ؟

کون کہتا ہے بھگوان نہیں ہے ؟

کون کہتا ہے انسان مر گیا ؟

چھی تو تو ناستک ہو گئی تھی !

کاکی ماں نے نمیتا سے بیلا اور منجو کا تعارف کرایا۔ بے چاری شوہر کھو چکی تھیں۔ ایسے ہی ایک دن نیتائی دا نے اُنھیں سیالدہ سٹیشن پر بھٹکتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیسی نظر تھی نیتائی دا کی جو ہر دُکھ درد کو تاڑ لیتی تھیں اور کیسا دل تھا اُن کا جو ہر دُکھ کے

تھی جب کہ نیتا تھا۔ بیلا اور منجو کی آنکھیں بھی کھٹک گئیں نیتائی دا نے اندر ہی اندر کے جاڑا کمیونسٹی منتقل ہو کر تعلیمی مقبول ہو گئی تھیں کہ وہ نٹ کھٹ کر اُجڑ کر آئی تھیں کہیں سے۔ ایک نئی زندگی شروع کر دی تھی انھوں نے جہاں تعیش و عشرت اور تن آسانی کے سارے لوازمات تھے۔ وہ سب آئی تھیں تو پکی ہوئی تھیں۔ مرقوق سی بجھی بجھی سی۔ لیکن آج وہ کتنی چکنی، کتنی بشاش اور کتنی جاذب نظر معلوم ہوتی تھیں جیسے رخصتی کے بعد اپنے سسرال پہنچ کر ہر لڑکی ہو جاتی ہے۔

بیلا اور منجو سے مل کر نمیتا بہت خوش ہوئی تھی۔ اُسے یہ دیکھتے دیر نہ لگی کہ دونوں نے چلپیے کی نفیس ساریاں باندھ رکھی تھیں اور اُن کے گلے اور کان میں سونے کے زیورات بھی تھے۔

"اِس کا مطلب یہ کہ نیتائی دا نے انھیں یقینا بہت ہی اچھی چاکری دلا دی ہے،"
نمیتا کو اس خیال سے بہت ہی ڈھارس ہوئی۔

رات کو جب کاکی ماں اُسے شب بخیر کہہ رہی تھیں تو نمیتا نے دھیرے سے کہا۔
"کاکی ماں! آمار چاکر کی ہولو؟" (کاکی ماں! میری نوکری کا کیا ہوا؟)
"چاکری؟" کاکی ماں نے قدرے تمسخر سے کہا۔
"توئی کی چاکری کری گو راجکماری؟" (تو کیا نوکری کرے گی راجکماری؟)
نمیتا کچھ نہیں بولی۔
"شب کچھو کرتے پاری" (سب کچھ کر سکتی ہوں)
"جا جا" کاکی ماں نے اسی طرح کہا "راجکماری کی چاکری کرے؟" (راجکماری کہیں نوکری کرتی ہے؟)
"راجکماری؟"

نمیتا حیرت میں ڈوب گئی۔ وہ کرم جلی راجکماری کیسے ہو سکتی ہے؟ جبھی کاکی ماں نے پیچھے باقی سب کچھ کہہ دیا۔

"جانو تمی کو تو سُندر؟ اُپورب! پھر شاہرون، رکالو چول۔ آر بویش تو بیشی ہوئے نی۔ ماتر دوئی چھیلیہ ماں؟" (جانتی ہو تم کتنی حسین ہو؟ صاف رنگ، سیاہ زلفیں اور سن بھی تو زیادہ نہیں ہوا۔ صرف دو بچوں کی ہی تو ماں ہو)
"کنتو آمی گھر بھاڑا کی کورے دیتے پار بو؟" (لیکن میں مکان کا کرایہ کیسے دوں گی؟)

نمیتا نے اپنی حقیقی فکر ظاہر کر دی۔
"او شب تھاک۔ گھر بھاڑا کی چنتا؟" (وہ سب کچھ نہیں۔ کرائے کی کیا فکر)
کاکی ماں نے پُر زور لہجے میں نمیتا کی فکر کو جھٹک دیا اور پھر رخصت ہو گئیں۔

دوسرے دن بیلا اور منجو نے نمیتا کو کلکتے کی سیر کرائی۔ یہ چورنگی ہے۔ کلکتے کا دھڑکتا ہوا دل! وہ سامنے میٹرو سنیما ہے۔ وہاں انگریزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ جن میں مرد عورت کھل کر پیار کرتے ہیں۔ وہ گرینڈ ہوٹل ہے۔ جہاں مرد خوبصورت عورتوں کے ساتھ ناچتے ہیں۔ وہاں قیمتی شراب پانی کی طرح بہتی ہے۔ یہ مہاتما گاندھی روڈ ہے۔ یہاں بڑے بڑے سیٹھوں کی دکانیں ہیں جہاں لاکھوں کروڑوں کا بیوپار ہوتا ہے۔ یہ ریس کا میدان ہے جہاں گھوڑوں کے دوڑ کے ساتھ سیکڑوں بازیاں کھیلنے والوں کی تقدیریں دوڑتی ہیں۔ کسی کی قسمت لاکھ ہو جاتی ہے اور کسی کی خاک!

لاکھ اور خاک!

زندگی ایک پانسہ ہے نمیتا۔ کوئی لاکھ لے جاتا ہے اور کسی کے لئے صرف خاک ہی رہ جاتی ہے!

نمیتا سوچ رہی تھی یہ منجو بہت ہوشیار معلوم ہوتی ہے!
"کو تو پوڑے چھو؟" (کتنا پڑھی ہو؟) اُس نے پوچھا۔
"بی۔ اے"

منجو نے بڑی ادا سے کہا۔ جب ہی تو اتنی صاف باتیں کرتی ہے یہ لڑکی!

بیلا، منجو اور نمیتا تھک تھکا کر ایک ریستوران میں بیٹھ گئیں۔ منجو نے گرم گرم سموسوں کا آرڈر دیا۔ پھر فش فرائی، مٹن چاپ، رس ملائی اور آخر میں چائے آئی خوب سیر کی تھی تینوں نے اور اب خوب سیر ہو کر کھانے کے بعد گرم گرم چائے پی رہی تھیں وہ۔ اُسی وقت ایک پتلا دبلا ہنس مکھ سا نوجوان سگریٹ کے کش لیتا ہوا اندر داخل ہوا اور جب منجو پر اُس کی نظر پڑی تو اپنے دانت نکال کر اُس نے مختصر سا "ہیلو" کہا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ایک پیالی چائے اور آئی۔ نوجوان بھک بھک دھواں اُگل رہا تھا اور سُڑ سُڑ کر کے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ نمیتا اُس غیر مرد کی موجودگی میں جھینپ رہی تھی۔ منجو نے تاڑ لیا۔ جھٹ اُس نے نمیتا سے اُس کا تعارف کرایا۔

"امینی آمار بندھو مسٹر سانیال!" (یہ میرے دوست مسٹر سانیال ہیں)

نمیتا نے دونوں ہاتھ جوڑ دئے۔ سانیال صرف مسکرا کر رہ گیا۔ پھر خاموشی طاری ہو گئی اور سب چائے پیتے رہے۔ نمیتا دل ہی دل میں سوچ رہی تھی سانیال منجو کا کیسا دوست ہے؟ جہاں تک اُسے معلوم تھا مرد عورت کا باپ، بھائی اور شوہر ہوتا ہے۔ مرد عورت کا دوست بھی ہو سکتا ہے یہ بات اُسے آج ہی معلوم ہوئی تھی۔ ہوگا، شہر کی بات گاؤں سے بہت الگ ہوتی ہے۔

رات کے نو بجے جب نمیتا گھر لوٹی تو کاکی ماں اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ بچوں کو کھلا پلا کر انھوں نے سُلا دیا تھا۔ نمیتا نے اپنے سوئے ہوئے بچوں کو پیار کیا اور جب کاکی ماں کی طرف پلٹی تو کاکی ماں نے پہلے تو اُسے سینے سے لگا کر پیار کیا پھر نیتائی دا کی

طرف سے مبارکباد پیش کی کہ اُس کے بچوں کے لئے ایک ٹیچر کا انتظام ہو چکا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اسکول میں اُن کا داخلہ کرا دیا جائے گا۔ پھر وہ اسکول سے فارغ ہو کر کالج اور پھر یونیورسٹی میں داخل ہو جائیں گے۔ اور اس طرح تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو کر وہ ایک دن جنٹل مین بن جائیں گے۔ [illegible] ایک اعلیٰ انجینئر ہوگا یا ڈاکٹر۔ اُس کی اپنی عالی شان کوٹھی ہوگی۔ کاریں ہوں گی اور اُس کی لڑکی کسی بڑے گھر میں بیاہ دی جائے گی۔

اپنے بچوں کے روشن مستقبل کی باتیں سُن کر نمیتا کی آنکھوں کے سامنے روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے چورنگی کی ساری روشنیاں اُس کی آنکھوں میں بھر گئی ہوں۔ اُس کے بچوں کا مستقبل اس قدر روشن ہو گیا؟ روشنی کی اُس چکا چوند سے وہ تلملا اٹھی اور اُس کی آنکھوں سے روشنی کی دو لکیریں چاندی کے تاروں کی طرح جھولنے لگیں۔ اُس کے اندر اور باہر ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی! معاً اُس کی آنکھوں نے روشنی کے اُس منبع کو دیکھ لیا۔ اُس کا سر جھک گیا اور اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکل پڑا۔

"دھرما تما!"

اُس کا جی چاہا وہ اُس دیوتا کے قدموں پر گر کر عقیدت کے آنسو روئے۔

لیکن دیوتا تو مون ورت کئے ہوئے تھے!

اُن کے درشن کب ہوں گے؟

آہستہ آہستہ جیسے سرگوشیوں میں کاکی ماں نے اُسے بتایا اب وہ اِس بھاڑا گھر کی مالکن ہے۔ جیسے منو، بیلا اور دوسری عورتیں تھیں۔ اُسی وقت دروازے پر ہلکی دستک ہوئی اور کوئی بہت احتیاط سے اندر داخل ہوا۔ نمیتا نے اُسے پہچان لیا۔ وہ تو سمیر کا دوست تھا سانیال۔ اور سانیال کے اندر آتے ہی کاکی ماں نے یہ کہنے میں دیر نہیں کی۔

"بھدر لوک کوڑی ٹاکا دیے چھین۔ آج راتری [illegible]"

(شریف آدمی نے بیس روپے دئے ہیں۔ آج رات یہیں سوئیں گے)

"نا نا!"

نمیتا نے پوری طاقت سے چیخ کر کہا اور اُس کا دم گھٹنے لگا۔ کاکی ماں نے غصّہ کھا کر گرتی ہوئی نمیتا کو تسلی دی۔

"جنھیں کلکتے میں رہنے کو مکان نہیں ملتے وہ رات انھیں بھاڑا گھروں میں گزارتے ہیں۔ اور صرف ایک رات گزارنے کی خاطر بیس روپے دیتے ہیں اور مہینے کے آخر میں نیتا جی وا ان بھاڑا گھروں کی مالکنوں کا حساب صاف کر دیتے ہیں۔ حساب پائی پائی ہو جاتا ہے۔"

"تمی کچھو بھئے کورو نا" (تم ذرا خوف نہ کھاؤ)

نمیتا کے دونوں بچے جاگ گئے تھے۔ وہ دونوں روتے ہوئے اپنی ماں پر گر پڑے۔ اور نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی نمیتا سوچ رہی تھی وہ انھیں لے کر کہاں جائے؟؟

---

# غزلیں

## نافع رضوی، ایم۔ اے

گو آپ کے خلوص میں کوئی کمی نہیں — لیکن دیارِ ناز میں اپنا کوئی نہیں
مہر و وفا کے سارے چراغ آج سرد ہیں — اب دل کی بستیوں میں کہیں روشنی نہیں
جینے کو جی رہے ہیں کسی طرح آج بھی — ہاں زندگی میں آج مگر زندگی نہیں
اہلِ نظر کے دل ہوں کہ وہ کوہِ طور ہو — کس پر ترے جمال کی بجلی گری نہیں
اپنوں کے طنز غیر کے طعنے ترے ستم — وہ کون سی چھری ہے جو دل پر چلی نہیں
ہر ایک اُس کے راز سے واقف ہے آج کل
نافع تمہارے شہر میں اب اجنبی نہیں

## قمر عثمانی

ہر ستم اُن کی ادا ہو جیسے — یہ بھی اک طرزِ عطا ہو جیسے
ایسے چپ ہو مری بربادی پر — تم نے کچھ بھی نہ کیا ہو جیسے
بارہا دل کو ہوا یوں محسوس — آپ نے یاد کیا ہو جیسے
دل کی ویرانیوں کا حال یہ ہے — سازِ محرومِ صدا ہو جیسے
چارہ سازی سے، میرے چارہ گرو! — اور بھی درد سوا ہو جیسے
عہدِ اُلفت جو قمر یاد آیا
دل میں نشتر سا چبھا ہو جیسے

# پھول کا دل

عفت موہانی۔ ایم۔ اے

۱۱۲۳-۳-۲۱۹ غیرت خان پیٹھ۔ حیدرآباد (اے۔ پی)

۳۰ ستمبر ۹۶ء

محترم و مشفقی! تسلیم و تکریم

. . . معاف فرمائیے گا۔ اس عرصے میں بہت مصروف رہی۔ یونیورسٹی کا کام بڑھ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ کو بھی خط نہ لکھ سکی اور آپ کے شفقت بھرے خط پڑھنے سے بھی محروم رہی۔ جس سے نصف ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تھا! ——— "بیسویں صدی" کے لئے ایک نفسیاتی کہانی "پھول کا دل" بھیج رہی ہوں . . .

آپ کی بہن ——— عفت موہانی

---

پھر ساز بج اٹھے اور ہلکا سا ترنم ہال میں نغمے بکھیرنے لگا۔ وہاں سب ہی خوش تھے۔ آنکھوں میں سحر انگیز چمک اور لبوں پر پُر سکون مسکراہٹ۔ صرف ایک وہی ایسا تھا جس کا تبسم سوگوار تھا اور دل نامعلوم اندیشوں سے لبریز۔ وہ اپنی زندگی سے اکتا چکا تھا۔ زندگی۔ جیسے مسلسل چلتے چلتے لڑکھڑانے لگی ہو۔

ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ یہ روشنی اور نغمہ۔ سب کچھ بناوٹ! پھر وہ یکایک چونک پڑا۔ بینا کو تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ جو یہ سوچ کر اسے اپنے ساتھ لائی تھی کہ میوزک کالج پہنچ کر اس کی اداسی دور کر سکے گی۔

"آپ پھر کچھ سوچنے لگے؟" بینا نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ چلو چلیں۔ یہاں جی نہیں لگتا۔"

اندھیرے اجالے میں مدھم کار سڑک پر تیرنے لگی۔

"آپ نے بتایا نہیں۔ کون سی ایسی بات ہے جو آپ کہنا نہیں چاہتے۔ کیا میں آپ کا دکھ بٹا نہیں سکتی؟"

"دکھ بانٹنے والا بوجھ نہیں ہے بینا!"

"پھر آپ خاموش کیوں ہیں؟ ہنسئے بولئے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"

"قہقہے اور چہچہے جن کے ہنگاموں سے نکل کر تم آرہی ہو، سب تصنع ہے۔ کتنے لوگ ایسے ہیں، جن کے دلوں میں غم کی بھٹی سلگ رہی ہے لیکن انھیں مسکرانا پڑ رہا ہے۔ خود کو دھوکا دینے کے لئے انسان کو اپنی روح پر کتنے غلاف چڑھانے پڑتے ہیں۔ غم سے کسی کو نجات نہیں بینا! قہقہے لگانا فرار ہے۔ نجات نہیں ہے!"

"پھر وہی فلسفہ" بینا جھنجلا گئی "غم کو سہارنا بزدلی کا کام ہے شرجیل صاحب!"

"میرے سینے میں لاوا سا پک رہا ہے بینا! جب میں نہیں تمہارے کالج میں موسیقی کا پروفیسر تھا۔ سوچتا تھا۔ زندگی ایک نغمہ ہے۔ لیکن جب میرے ماں باپ مر گئے۔ بھیا اور بھابی ایکسیڈنٹ کا شکار ہوئے اور میں نے فوج میں کمیشن لیا تو اس طرح ہزاروں انسانوں کو کٹتے دیکھا، جیسے وہ انسان نہ ہوں، گھاس پھوس ہوں! تب میں نے سوچا۔ زندگی نغمہ نہیں، زندگی نوحہ ہے!"

کار بینا کی کوٹھی پر پہنچ کر رک گئی۔ وہ اتر پڑی اور شرجیل کار کو بیک کرنے لگا۔

"خدا حافظ بھی نہ کہئے گا!" وہ مسکرائی۔

"خدا حافظ!" بڑی سنجیدگی سے اس نے کہا اور کار نکال لے گیا۔

---

پہلی بار بینا نے اسے میوزک کالج میں دیکھا تھا۔ وہ وہاں پروفیسر تھی۔ شرجیل کے آنے پر اسے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی شرجیل کے پرانے دوست تھے۔ یہ جان کر اسے خوشی ہوئی لیکن اس کے تعارف پر سادگی سے اظہارِ مسرت کیا اور ہال کی طرف مڑ گئی۔

نور و نکہت کی یہ دنیا اسے بے حد پسند تھی۔ وہ موسیقی کی دیوانی تھی۔ ایک معزز اور دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اتنی سادگی پسند اور معصوم جیسے

دیکھ کر یقین نہ آتا تھا، وہ فنکار ہے! موسیقی اُس کی روح کی تسکین تھی۔ یہ جنون اب ترقی پر تھا۔ لیکن اُسے یہ محسوس ہوتا، ابھی اُس کا فن اور وہ خود بھی پیاسی ہے۔ ایک بے تابی، ایک اضطراب سا اُس کی باتوں سے چھلکا کرتا۔

شرجیل بھی اسی راہ کا راہی تھا! اُس نے اپنے فن کا مظاہرہ کبھی کیا تھا۔ اور پھر بینا کو معلوم ہوا وہ اُداسی جو شرجیل کی دُنیا پر چھائی ہوئی تھی، دُنیا کی نہ تھی۔ اُس کے اپنے دل کی تھی۔ ورنہ اس رنگ و نُور، کیف و سرور کی دُنیا میں کوئی اُداس کیوں ہو؟

شرجیل ——— وہ اُداس اور اکیلا سا انسان جس کا دُنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ ہنس کا راہی ہے۔ وہ نو لسے پہلے بور فلاسفر سمجھتی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اُسے محسوس ہوا، وہ کسی کی رفاقت کا متلاشی ہے۔ اپنے دوستوں سے ملنے وہ ہر روز کالج آتا تھا۔ نئے اور پُرانے چہروں سے الگ تھلگ۔ ایک چہرہ موسمِ بہار کے پہلے پھول کی طرح نظر آرہا تھا۔

وہ حُسن کی سادگی سے متاثر ہوگیا۔

سفید ریشم میں لپٹی، سر پہ آنچل ڈالے، وہ کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق معلوم ہورہی تھی۔ جسے خود نمائی کا ذرا بھی شوق نہ تھا! آخری پیریڈ میں اُس نے اُس کا نغمہ بھی سُنا اور مبہوت رہ گیا! آواز میں بھی جادو ہوتا ہے!

"یہ اپنی بینا ہے!" محسن نے تعارف کرایا۔ "ہماری کولیگ ——— اور آپ ہیں احمد شرجیل۔ یا میرا شرجیل!"

"[illegible]!" وہ اپنی موٹی اور بھاری آواز میں بولا۔

بینا نے اپنا خوبصورت ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔

"کتنی اچھی ہیں آپ! دُکھی دلوں کو اپنے نغموں سے نئی زندگی عطا کرتی ہیں۔ کاش، میں آپ کا دوست بن سکتا!"

"بن تو گئے!" شاہد ہنس پڑا۔

پھر جب وہ اپنی گونج دار آوازوں میں قہقہے لگانے اور سگریٹ کا دُھواں چھوڑنے لگے تو وہ گھبرا کر برآمدے میں نکل آئی اور ایک ستون سے سر ٹیک کر کسی اور ہی جہان کی سیر کرنے لگی۔

آخر وہ دفعتہً اتنی پُرسکون کیوں ہوگئی ہے۔ کسی بڑے طوفان سے پہلے سمندر ہمیشہ ساکن ہو جاتا ہے لیکن جب سمندر کے سینے سے طوفان اُبلتا ہے تب ———!

راہداری کے سرے پر اُسے شرجیل دکھائی دیا۔ جیسے ہی اُس نے بینا کو دیکھا، اُدھر ہی چلا آیا۔

"آپ یہاں آگئیں؟" وہ پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

"جی!"

"شاید آپ تنہائی پسند ہیں۔ میری رفاقت ناگوار تو نہیں ہوئی؟"

"بعض رفاقتیں مستقل کہاں ہوتی ہیں؟" بینا [illegible] ہوگئی۔

"آپ وہاں سے چلی آئیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا [illegible] مکمل ہوگیا ہو!"

"آپ شاعر بھی ہیں!" وہ مسکرا پڑی۔

"جی نہیں۔ شاعر تو نہیں۔ البتہ صاف گو ضرور ہوں۔ جو دل میں آتا ہے کہہ دیتا ہوں۔ آپ کو بُرا معلوم ہو تو ٹوک دیجئے گا!"

وہ خاموش رہی۔

"اگر آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار گزرا ہو تو میں تشریف لے جاؤں؟"

"جی نہیں۔ آپ بیٹھئے!" بینا کو ہنسی آگئی۔

"مجھے سیدھے سادے لوگ بہت پسند ہیں۔" اُس نے کہا۔ "جیسی آپ ہیں اچھی ہیں آپ... اگر مجھے آپ کا ساتھ نصیب ہوسکے۔ اے کاش... آپ نہیں جانتیں اکیلا ہوں اور اُداس۔ اُف! اگر آپ میری زندگی کے ہولناک ویرانے میں جھانک!"

وہ جُھرجُھری لے کر خاموش ہوگیا۔

"ویرانہ آباد نہیں کیا آپ نے؟" بینا نے پوچھا۔

"یہ ویرانے خود بخود تو آباد نہیں ہوجاتے۔" اُس کا لہجہ معنی خیز تھا "آباد کرتا ہے!"

اور بینا نے یوں ویرانہ آباد کیا کہ شرجیل کی زندگی میں چراغاں ہوگیا۔ اُس کی ما[یوسیاں] شوخیوں میں بدل گئیں۔ اُداسی اور سنجیدگی، قہقہوں میں کھو گئی۔ ناکام زندگی سارے فلسفے بینا کے حسین نغموں میں تحلیل ہوگئے۔ اُسے یقین تھا، بینا نے اُسے لیا ہے۔

اور پھر سیزن ختم ہونے پر دونوں کی منگنی ہوگئی۔

دوسرے ساتھی بھی بے حد خوش تھے۔ منگنی کے لباس میں بینا گلاب معلوم ہورہی تھی! بہانے بہانے شرجیل اُس کے پاس آیا اور وہ شرما گئی۔

"جانتے یہاں سے سب دیکھ رہے ہیں!"

"بینا!" وہ یکایک سنجیدہ ہوگیا۔ "تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے غلط تو نہیں ہے؟"

"ہاں!" وہ حوصلے سے بولی۔ "میں نے خوب سوچ لیا ہے۔ [illegible] خیالوں میں تمہیں اپنا مان لیا۔ اُسی کی ہوگئی!"

"اوہ!" وہ بے حد متاثر نظر آنے لگا۔

"لیکن آپ... یہ کیا سوچنے لگے؟" بینا [illegible]

...کرتی ہیں۔ محبت کی توہین نہیں کرتی؟" پھر وہ اُس کی ناخوشی پر مسکرائی: "آپ ایسا نہ کہئے۔
...نہیں سکتا۔ آپ کی یادگار زندہ درگور کر دے گا۔ یہ پگھل کا دل ہے۔ خزاں کی ہوا چلی
...جاتا گیا؟"

بینا کی آنکھوں میں موتی سے چمکے۔ دیکھ کر شرجیل نے اُس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے
...سینے پر دبا لیا۔

---

دن یوں گزر رہے تھے جیسے ہوا کے دوش پر سوار ہوں! دونوں ایک انجانے
...راستے پر اتنی دور چلے آئے تھے کہ وہاں سے لوٹ جانا ناممکن تھا اور عین منزل کے سامنے
...صباحت رول گئی!۔۔۔ وہ بینا کی بھی نئی نئی دوست بنی تھی۔ شرجیل کو دیکھ کر
...دیکھتی ہی رہ گئی۔

تعارف کے بعد شرجیل نے ایک اُچٹتی سی نظر اُس کے سراپا پر ڈالی۔ دونوں
...کتنا تضاد تھا۔۔۔ ایک سراپا جمال تو دوسری سراپا جلال۔ وہ یوں ہشاش بشاش
...نظر آنے لگا جیسے اچانک تیز سرد ہوا سے اُسے کسی نے اُٹھا کر آتشدان کے پاس لا بٹھایا ہو!

"مبارکباد دینا بھول گئی!" صباحت مسکرائی۔

"شکریہ!" وہ جلدی سے بول پڑا۔

"اب ملی ہو۔ اتنے دنوں تک کہاں تھیں؟" بینا نے شکوہ کیا۔

"یہیں کہاں تھی۔ ڈیڈی کے ساتھ چوبیس پرگنہ چلی گئی تھی۔ کل ہی تو آئی ہوں۔
...محسن صاحب نے بتایا؟" وہ ہنس کر بھرپور نگاہ شرجیل پر ڈالتی ہوئی بولی۔

"گڈ لک۔۔۔ بے حد شاندار سلکشن ہے تمہارا!"

یکایک جیسے بینا کے دل میں جلنے والا چراغ گل ہو گیا اور صباحت کے رخسار تو
...اٹھے۔ یہ ہینڈسم آدمی بھلا بینا جیسی دقیانوسی لڑکی کے ساتھ کیا نباہ کر سکے گا! اس کے
...تو۔۔۔ وہ کچھ سوچ کر خوش ہونے لگی۔

اور پھر جس نے دیکھا، انگشت بدنداں رہ گیا۔۔۔ شرجیل صباحت کے ساتھ
...دیکھا جانے لگا۔ انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟ وہ تو بینا کا منگیتر تھا۔ کیا وہ اپنی وفائیں،
...عہد و پیماں سب بھول گیا!؟ بینا کو اُن کا اِس طرح رہنا، اتنا میل جول اچھا نہ معلوم
...ہوتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتی؟ شرجیل حیرت انگیز طور پر صباحت کی طرف جھک گیا تھا۔

اور اُس کی شوخی گہری اُداسی میں بدل گئی۔ انسان، انسان کو کبھی نہیں پہچان
...سکتا! وہ اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کر لے، سمندروں کی تہہ تک پہنچ جائے لیکن
...کسی کو نہیں سمجھ سکتا! بینا کو محسوس ہوا، شرجیل ایک چاند ہے جس کا ایک رُخ جس قدر
...تابناک ہے، دُوسرا رُخ اتنا ہی تاریک!

اُس نے تو سوچا بھی نہ تھا اُسے یوں رونا پڑے گا۔ وہ ستارا جو اُسے کسی طوفان کا
پیشین خیمہ معلوم ہوا تھا اُس پورے جوش و خروش سے اُس کی ہستی کو اپنے اندر سمیٹ لے گیا تھا۔

وہ پہروں بیٹھی چپ چاپ سوچا کرتی۔ وہ ایسا تو نہ تھا۔ پھر یہ سب کیا ہے اور
وہ اپنی ہی آگ میں جلنے لگی۔

"بینا بہن! یہ کیا ہوا؟" ایک دن شاہد نے پوچھا۔

"کوئی کسی کے دل پر پہرے تو نہیں بٹھا سکتا، شاہد بھیا!" وہ بولی۔

"تم اُس بے وفا کے لئے اُداس رہتی ہو؟" محسن کو غصہ آنے لگا۔

"محسن بھائی! کیا میں اتنا نہیں جانتی۔ جو اپنا نہ ہو سکے اُس کے لئے غم کرنے سے کیا حاصل؟"

لیکن اُسے بے حد صدمہ ہوا۔ ایک وقت آتا ہے جب دوسروں کا رحم و کرم اپنے اوپر ظلم اور تمسخر معلوم ہوتا ہے۔

کرسمس نائٹ اٹینڈ کرنے شرجیل اور صباحت بھی پہنچے تھے۔ وہی ماحول تھا۔ شرجیل نے کنکھیوں سے بینا کو دیکھا۔ وہ پیانو کے قریب اسٹول پر پتھر کی مورتی کے مانند خاموش بیٹھی تھی۔ دریچے کے باہر آسمان سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دور پہاڑوں پہ دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔

صباحت کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ بینا بھی مسکرا رہی تھی لیکن یہ تو اُس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ مسکراہٹ کتنے آنسوؤں میں ڈوب کر لبوں تک آئی تھی۔

کسی نے نوٹس ہی نہ لیا۔ محسن اور شاہد رمی کھیل رہے تھے اور اختر کسی لڑکے کو کوئی ساز بجانا سکھا رہا تھا۔

"ہم بہت جلد شادی کر رہے ہیں!" صباحت بینا کے پاس جھکی۔

"اچھا!؟" بینا نے کہا۔ "تمہاری مبارکباد واپس کر دوں!"

"اپنی تقدیر کا وہ چکر ضرور واپس لے لو جو تم نے شرجیل کی انگلی میں ڈالا تھا!" صباحت نے کہا۔

شرجیل سب کچھ سن رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں خاموش بیٹھا سگریٹ کا دھواں اُگل رہا تھا۔

"ہار گئے!" اچانک محسن کا قہقہہ گونجا۔

"ہار جیت قسمت سے ہوتی ہے یار۔ ختم کرو!" شاہد نے اکتا کر کارڈز رکھ دیے۔

"ہار گئے تو رونے لگے!" محسن نے کہا۔

"زندگی کی کسی بازی میں ہار جیت نہیں ہے لیکن بعض اوقات سوال حق کا بھی ہوتا ہے!" اختر ادھر متوجہ ہو گیا۔

"کوئی نہ مانے تب؟"

دیکھ کر یقین نہ آتا تھا، وہ فنکار ہے! موسیقی اُس کی روح کی تسکین تھی یہ جنون اب ترقی پر تھا لیکن اُسے یہ محسوس ہوتا، ابھی اُس کا فن اور وہ خود بھی پیاسی ہے۔ ایک بے تابی، ایک اضطراب سا اُس کی باتوں سے چھلکا کرتا۔

شرجیل بھی اسی راہ کا راہی تھا! اُس نے اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ اور پھر بینا کو معلوم ہوا وہ اُداسی جو شرجیل کی دُنیا پر چھائی ہوئی تھی، دُنیا کی نہ تھی۔ اُس کے اپنے دل کی تھی۔ ورنہ اس رنگ و نُور، کیف و سرور کی دُنیا میں کوئی اُداس کیوں ہو؟

شرجیل ــــــ وہ اُداس اور اکیلا سا انسان جس کا دُنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ اُس کا بن گیا۔ وہ تو اُسے پہلے بور فلاسفر سمجھتی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اُسے محسوس ہوا، وہ کسی کی رفاقت کا متلاشی ہے۔ اپنے دوستوں سے ملنے وہ ہر روز کالج آتا تھا۔ نئے اور پرانے چہروں سے الگ تھلگ ایک چہرہ موسمِ بہار کے پہلے پھول کی طرح نظر آرہا تھا۔

وہ حُسن کی سادگی سے متاثر ہوگیا۔

سفید ریشم میں لپٹی، سر پہ آنچل ڈالے، وہ کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق معلوم ہورہی تھی۔ جیسے خود نمائی کا ذرا بھی شوق نہ تھا! آخری پیریڈ میں اُس نے اُس کا نغمہ بھی سُنا اور مبہوت رہ گیا! آواز میں بھی جادُو ہوتا ہے!

"یہ اپنی بینا ہے!" محسن نے تعارف کرایا۔ "ہماری کولیگ ــــــ اور آپ ہیں احمد شرجیل۔ بلکہ سیمبر شرجیل!"

"سو لکّی ٹو!" وہ اپنی موٹی اور بھاری آواز میں بولا۔

بینا نے اپنا خوبصورت ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔

"کتنی اچھی ہیں آپ! دُکھی دلوں کو اپنے نغموں سے نئی زندگی عطا کرتی ہیں۔ کاش! میں آپ کا دوست بن سکتا!"

"بن تو گئے!" شاہد ہنس پڑا۔

پھر جب وہ اپنی گُونج دار آوازوں میں قہقہے لگانے اور سگریٹ کا دُھواں چھوڑنے لگے تو وہ گھبرا کر برآمدے میں نکل آئی اور ایک ستون سے سر ٹیک کر کسی اور ہی جہان کی سیر کرنے لگی۔

آخر وہ دفعتہً اتنی پُرسکون کیوں ہوگئی ہے۔ کسی بڑے طوفان سے پہلے سمندر ہمیشہ ساکن ہوجاتا ہے لیکن جب سمندر کے سینے سے طوفان اُبلتا ہے تب ــــــ!

راہداری کے سرے پر اُسے شرجیل دکھائی دیا۔ جیسے ہی اُس نے بینا کو دیکھا، اُدھر ہی چلا آیا۔

"آپ یہاں آگئیں؟" وہ پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

"جی!"

"شاید آپ تنہائی پسند ہیں۔ میری رفاقت ناگوار تو نہیں ہوئی؟"

"بعض رفاقتیں مستقل کہاں ہوتی ہیں؟" بینا کا [illegible] ہوگئی۔

"آپ وہاں سے چلی آئیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا [illegible] گُل ہوگیا ہو!"

"آپ شاعر بھی ہیں؟" وہ مسکرا پڑی۔

"جی نہیں۔ شاعر تو نہیں۔ البتہ مات گو ضرور ہوں۔ جو دل میں [illegible] ہوں۔ آپ کو بُرا معلوم ہو تو ٹوک دیجئے گا!"

وہ خاموش رہی۔

"اگر آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار گُزرا ہو تو میں تشریف لے جاؤں!"

"جی نہیں، آپ بیٹھئے!" بینا کو ہنسی آگئی۔

"مجھے سیدھے سادے لوگ بہت پسند ہیں۔" اُس نے کہا۔ "جیسی آپ ہیں! کتنی اچھی ہیں آپ . . . اگر مجھے آپ کا ساتھ نصیب ہوسکے۔ اے کاش . . . آپ نہیں جانتیں، میں اکیلا ہوں اور اُداس۔ اُف! اگر آپ میری زندگی کے ہولناک ویرانے میں جھانک لیں"

وہ جُھرجُھری لے کر خاموش ہوگیا۔

"ویرانہ آباد نہیں کیا آپ نے؟" بینا نے پوچھا۔

"یہ ویرانے خود بخود تو آباد نہیں ہوجاتے۔" اُس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "کوئی آباد کرتا ہے!"

اور بینا نے یوں ویرانہ آباد کیا کہ شرجیل کی زندگی میں چراغاں ہوگیا۔ اُس کی مایوسیاں شوخیوں میں بدل گئیں۔ اُداسی اور سنجیدگی، قہقہوں میں کھو گئی۔ ناکام زندگی کے سارے فلسفے بینا کے حسین نغموں میں تحلیل ہوگئے۔ اُسے یقین تھا، بینا نے اُسے جیت لیا ہے۔

اور پھر سیزن ختم ہونے پر دونوں کی منگنی ہوگئی۔

دوسرے ساتھی بھی بے حد خوش تھے۔ منگنی کے لباس میں بینا گلاب کا پھول معلوم ہورہی تھی! بہانے بہانے شرجیل اُس کے پاس آیا اور وہ شرما گئی۔

"جائیے یہاں سے سب دیکھ رہے ہیں!"

"بینا!" وہ یکایک سنجیدہ ہوگیا۔ "تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ تمہارا فیصلہ غلط تو نہیں ہے؟"

"ہاں!" وہ ہولے سے بولی۔ "میں نے خوب سمجھ لیا ہے۔ میں مشرقی لڑکی ہوں خیالوں میں جسے اپنا مان لیا۔ اُسی کی ہوگئی!"

"اوہ!" وہ بے حد متاثر نظر آنے لگا۔

"لیکن آپ . . . یہ کیا سوچنے لگے؟" بینا بولی۔ "آپ نے مجھے ابھی تک نہیں"

...سکتی وہ محبت کی ترجمانی نہیں کر سکتی۔ پھر وہ اس کی نازک سی گردن تک آپ اپنے کہے۔
...آپ کی بینا کو زندہ درگور کر دے گا۔ یہ پگھلا ہوا دل ہے۔ خزاں کی ہوا چلی
...جائے گی!

بینا کی آنکھوں میں موتی سے چمکتے دیکھ کر شرجیل نے اُس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے
...پر دبا لیا۔

---

دونوں گویا یوں تھے جیسے ہوا کے دوش پر سوار ہوں! دونوں ایک انجانے
...پر اتنی دُور چلے آئے تھے کہ وہاں سے لوٹ جانا ناممکن تھا اور جب منزل کے سامنے
...صباحت بن گئی!۔۔۔۔۔ وہ بینا کی بھی نئی نئی دوست بنی تھی، شرجیل کو دیکھ کر
...دیکھتی ہی رہ گئی۔

تعارف کے بعد شرجیل نے ایک اُچٹتی سی نظر اُس کے سراپا پر ڈالی۔ دونوں
...کتنا تضاد تھا۔۔۔۔۔ ایک سراپا جمال تو دوسری سراپا جلال۔ وہ یوں ہشاش بشاش
...رہنے لگا جیسے اچانک تیز سرد ہوا سے اُسے کسی نے اُٹھا کر آتشدان کے پاس لا بٹھایا ہو!

"مبارکباد دینا بھول گئی!" صباحت مُسکرائی

"شکریہ!" وہ جلدی سے بول پڑا۔

"اب ملی ہو۔ اتنے دنوں تک کہاں تھیں؟" بینا نے شکوہ کیا۔

"یہاں کہاں تھی۔ ڈیڈی کے ساتھ چوبیس پرگنہ چلی گئی تھی۔ کل ہی تو آئی ہوں۔

...یہ محسن صاحب نے بتایا" وہ ہنس کر بھرپور نگاہ شرجیل پر ڈالتی ہوئی بولی۔

"گُڈ لک۔۔۔۔۔ بے حد شاندار سلکشن ہے تمہارا"

یکایک جیسے بینا کے دل میں جلنے والا چراغ گُل ہو گیا اور صباحت کے رخسار تو
...اُٹھے۔ یہ ہینڈسم آدمی بھلا بینا جیسی دقیانوسی لڑکی کے ساتھ کیا نباہ کر سکے گا! اس کے
...تو۔۔۔۔۔ وہ کچھ سوچ کر خوش ہونے لگی۔

اور پھر جس نے دیکھا، انگشت بدنداں رہ گیا۔۔۔۔۔ شرجیل صباحت کے ساتھ
...جانے لگا۔ انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟ وہ تو بینا کا منگیتر تھا کیا وہ اپنی وفائیں،
...عہد و پیمان سب بھول گیا!؟ بینا کو اُن کا اِس طرح رہنا، اِتنا میل جول اچھا نہ معلوم
...ہوتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتی؟ شرجیل حیرت انگیز طور پر صباحت کی طرف جھک گیا تھا۔

...اور اُس کی شوخی گہری اداسی میں بدل گئی۔ انسان، انسان کو کبھی نہیں پہچان
...سکتا! وہ اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کر لے۔ سمندروں کی تہہ تک پہنچ جائے لیکن
...انسان کو نہیں سمجھ سکتا! بینا کو محسوس ہوا، شرجیل ایک چاند ہے جس کا ایک رُخ جس قدر
...تابناک ہے، دوسرا رُخ اُتنا ہی تاریک!

اُس نے تو سوچا بھی نہ تھا اُسے یوں رونا پڑے گا۔ وہ ستارا، جو اُسے کسی طوفان کا
...پیش خیمہ معلوم ہوا تھا، پورے جوش و خروش سے اُس کی ہستی کو اپنے اندر سمیٹ لے گیا تھا۔

وہ پہروں بیٹھی چپ چاپ سوچا کرتی۔ وہ ایسا تو نہ تھا۔ پھر یہ سب کیا ہے اور
وہ اپنی ہی آگ میں جلنے لگی۔

"بینا بہن! یہ کیا ہوا؟" ایک دن شاہد نے پوچھا۔

"کوئی کسی کے دل پر پہرے تو نہیں بٹھا سکتا، شاہد بھیا!" وہ بولی۔

"تم اُس بے وفا کے لئے اُداس رہتی ہو؟" محسن کو غصہ آنے لگا۔

"محسن بھائی! کیا میں اتنا نہیں جانتی۔ جو اپنا نہ ہو سکے اُس کے لئے غم کرنے سے
کیا حاصل؟"

لیکن اُسے یہ محسوس ہوا۔ ایک وقت آتا ہے جب دوسروں کا رحم و کرم اپنے
اوپر ظلم اور تمسخر معلوم ہوتا ہے۔

کرسمس نائٹ اٹینڈ کرنے شرجیل اور صباحت بھی پہنچے تھے۔ وہی ماحول تھا۔
شرجیل نے کنکھیوں سے بینا کو دیکھا۔ وہ پیانو کے قریب اسٹول پر پتھر کی مورتی کے مانند
خاموش بیٹھی تھی۔ دریچے کے باہر آسمان سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دُور پہاڑوں پر
دُھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔

صباحت کے ہونٹوں پر فاتحانہ مُسکراہٹ تھی۔ بینا بھی مُسکرا رہی تھی لیکن
یہ تو اُس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ مُسکراہٹ کتنے آنسوؤں میں ڈوب کر لبوں تک آئی تھی۔

کسی نے نوٹس ہی نہ لیا۔ محسن اور شاہد رمی کھیل رہے تھے اور اختر کسی لڑکے کو
کوئی ساز بجانا سکھا رہا تھا۔

"ہم بہت جلد شادی کر رہے ہیں!" صباحت بینا کے پاس جھکی۔

"اچھا!؟" بینا نے کہا "تمہاری مبارکباد واپس کر دوں!"

"اپنی تقدیر کا وہ چکر ضرور واپس لے لو جو تم نے شرجیل کی اُنگلی میں ڈالا تھا!"
صباحت نے کہا۔

شرجیل سب کچھ سُن رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں خاموش بیٹھا سگریٹ کا دُھواں
اُگل رہا تھا۔

"ہار گئے!" اچانک محسن کا قہقہہ گونجا۔

"ہار جیت قسمت سے ہوتی ہے یار۔ ختم کرو" شاہد نے تاش کا رقعہ رکھ دیئے۔

"ہار گئے تو رونے لگے" محسن نے کہا۔

"زندگی کی کس بازی میں ہار جیت نہیں ہے لیکن بعض اوقات سوال حق کا بھی ہوتا
ہے!" اختر ادھر متوجہ ہو گیا۔

"کوئی نہ مانے تب؟"

دیکھ کر یقین نہ آتا تھا، وہ فنکار ہے! موسیقی اُس کی روح کی تسکین تھی۔ یہ جنون اب ترقی پر تھا۔ لیکن اُسے یہ محسوس ہوتا، ابھی اُس کا فن ادھورا ہے اور وہ خود بھی پیاسی ہے۔ ایک بے تابی، ایک اضطراب سا اُس کی باتوں سے چھلکا کرتا۔

شرجیل بھی اسی راہ کا راہی تھا! اُس نے اپنے فن کا مظاہرہ کبھی کیا تھا۔ اور پھر بینا کو معلوم ہوا وہ اُداسی جو شرجیل کی دُنیا پر چھائی ہوئی تھی، دُنیا کی نہ تھی۔ اُس کے اپنے دل کی تھی۔ ورنہ اس رنگ و نور رنگینی و سرور کی دُنیا میں کوئی اُداس کیوں ہو؟

شرجیل ——— وہ اُداس اور اکیلا سا انسان جس کا دُنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ اُس کا بن گیا۔ وہ تو اُسے پہلے بور ملاحظہ جیسی رہی لیکن رفتہ رفتہ اُسے محسوس ہوا، وہ کسی کی رفاقت کا متلاشی ہے۔ اپنے دوستوں سے ملنے وہ ہر روز کالج آتا تھا۔ نئے اور پُرانے چہروں سے الگ تھلگ ایک چہرہ موسم بہار کے پہلے پھول کی طرح نظر آرہا تھا۔

وہ حُسن کی سادگی سے متاثر ہوگیا۔

سفید ریشم میں لپٹی، سر پہ آنچل ڈالے، وہ کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق معلوم ہورہی تھی۔ پہلے تو دلچسپی کا، یا ابھی شوق نہ تھا! آخری پیریڈ میں اُس نے اُس کا نغمہ بھی سُنا اور مبہوت رہ گیا! آواز میں بھی جادو ہوتا ہے!

"یہ ابن بینا ہے!" محسن نے تعارف کرایا۔ "ہماری کوئین ——— اور آپ ہیں احمد شرجیل۔ بلکہ سیمر شرجیل!"

"ہیلو!" وہ اپنی موٹی اور بھاری آواز میں بولا۔

بینا نے اپنا خوبصورت ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔

"کتنی اچھی ہیں آپ! دُکھی دلوں کو اپنے نغموں سے نئی زندگی عطا کرتی ہیں۔ کاش! میں آپ کا دوست بن سکتا!"

"بن تو گئے"، شاہد ہنس پڑا۔

پھر جب وہ اپنی گونج دار آوازوں میں قہقہے لگانے اور سگریٹ کا دُھواں چھوڑنے لگے تو وہ گھبرا کر برآمدے میں نکل آئی اور ایک ستون سے سر ٹیک کر کسی اور ہی جہان کی سیر کرنے لگی۔

آخر وہ دفعتاً اتنی پُرسکون کیوں ہوگئی ہے۔ کسی بڑے طوفان سے پہلے سمندر ہمیشہ ساکن ہو جاتا ہے لیکن جب سمندر کے سینے سے طوفان اُبلتا ہے تب ———!

راہداری کے سرے پر اُسے شرجیل دکھائی دیا۔ جیسے ہی اُس نے بینا کو دیکھا، اُدھر ہی چلا آیا۔

"آپ یہاں آگئیں؟" وہ پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

"جی!"

"شاید آپ تنہائی پسند ہیں۔ میری رفاقت ناگوار تو نہیں ہوئی؟"

"بعض رفاقتیں مستقل کہاں ہوتی ہیں" بینا کا دل [illegible] ہوگئی۔

"آپ وہاں سے چلی آئیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا [illegible] گُم ہوگیا ہو!"

"آپ شاعر بھی ہیں!" وہ مُسکرا پڑی۔

"جی نہیں۔ شاعر تو نہیں۔ البتہ جذبات کو ضرور ہوں۔ جو دل میں [illegible] ہوں۔ آپ کو بُرا معلوم ہو تو ٹوک دیجئے گا!"

وہ خاموش رہی۔

"اگر آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار گزرا ہو تو میں تشریف لے جاؤں!"

"جی نہیں۔ آپ بیٹھئے!" بینا کو ہنسی آگئی۔

"مجھے سیدھے سادے لوگ بہت پسند ہیں" اُس نے کہا۔ "جیسی آپ ہیں! کتنی اچھی ہیں آپ ... اگر مجھے آپ کا ساتھ نصیب ہو سکے۔ اے کاش ... آپ نہیں جانتیں۔ میں اکیلا ہوں اور اُداس۔ اُف! اگر آپ میری زندگی کے ہولناک ویرانے میں جھانک [illegible]"

وہ جھُرجھُری لے کر خاموش ہوگیا۔

"ویرانہ آباد نہیں کیا آپ نے؟" بینا نے پوچھا۔

"یہ ویرانے خود بخود تو آباد نہیں ہوجاتے" یہ اُس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "کوئی آباد کرتا ہے!"

اور بینا نے یوں ویرانہ آباد کیا کہ شرجیل کی زندگی میں چراغاں ہوگیا۔ اُس کی مایوسیاں شوخیوں میں بدل گئیں۔ اُداسی اور سنجیدگی، قہقہوں میں کھو گئی۔ ناکام زندگی کے سارے فلسفے بینا کے حسین نغموں میں تحلیل ہوگئے۔ اُسے یقین تھا، بینا نے اُسے جیت لیا ہے۔

اور پھر سیزن ختم ہونے پر دونوں کی منگنی ہوگئی۔

دوسرے ساتھی بھی بے حد خوش تھے۔ منگنی کے لباس میں بینا گلاب کا پھول معلوم ہورہی تھی! بہانے بہانے شرجیل اُس کے پاس آیا اور وہ شرما گئی۔

"جائیے یہاں سے۔ سب دیکھ رہے ہیں!"

"بینا!" وہ یکایک سنجیدہ ہوگیا۔ "تم نے اچھی طرح سوچ لیا، تمہارا انتخاب غلط تو نہیں ہے؟"

"ہاں" وہ ہولے سے بولی "میں نے خوب سمجھ لیا ہے۔ میں مشرقی لڑکی ہوں۔ اپنے خیالوں میں جسے اپنا مان لیا۔ اُسی کی ہوگئی"

"اوہ!" وہ بے حد متاثر نظر آنے لگا۔

"لیکن آپ ... یہ کیا سوچنے لگے؟" بینا بولی "آپ نے مجھے ابھی تک نہیں سمجھا"

...ہوں۔ مجھے تو عورت نہیں ملے گی۔" پھر وہ اُس کی خاطر مسکرائی: "آپ ابھی کہتے ...لوگ آپ کی بینا کو زندہ درگور کر دیں گے۔" یہ شرجیل کا دل ہے۔ خزاں کی ہوا چلی ...یا!"

...بینا کی آنکھوں میں موتی سے چمکے۔ دیکھ کر شرجیل نے اُس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے ...دبا لیا۔

---

...دونوں اُڑ رہے تھے جیسے ہوا کے دوش پر سوار ہوں! دونوں ایک انجانے ...سی دُور نکل آئے تھے کہ وہاں سے لوٹ جانا ناممکن تھا اور عین منزل کے سامنے ...آ گئی! ـــــ وہ بینا کی بھی نئی نئی دوست بنی تھی۔ شرجیل کو دیکھ کر ...وہ رہی رہ گئی۔

...تعارف کے بعد شرجیل نے ایک اچٹتی سی نظر اُس کے سراپا پر ڈالی۔ دونوں ...تضاد تھا ـــــ ایک سراپا جمال تو دوسری سراپا جلال۔ وہ یوں ہشاش بشاش ...جیسے اچانک تیز سرد ہوا نے اُسے کسی نے اُٹھا کر آتشدان کے پاس لا بٹھایا ہو!

"مبارکباد دینا بھول گئی!" صباحت مسکرائی۔

"شکریہ!" وہ جلدی سے بول پڑا۔

"اب ملی ہو۔ اتنے دنوں تک کہاں تھیں؟" بینا نے شکوہ کیا۔

"یہاں کہاں تھی۔ ڈیڈی کے ساتھ چوبیس پرگنہ چلی گئی تھی۔ کل ہی تو آئی ہوں۔ ...صاحب نے بتایا۔" وہ ہنس کر بھرپور نگاہ شرجیل پر ڈالتی ہوئی بولی۔

"گُڈ لک ـــــ بے حد شاندار سلکشن ہے تمہارا۔"

یکایک جیسے بینا کے دل میں جلنے والا چراغ گُل ہو گیا اور صباحت کے رخسار تو ...۔ یہ ہینڈسم آدمی بھلا بینا جیسی دقیانوسی لڑکی کے ساتھ کیا نباہ کر سکے گا! اس کے ... ـــــ وہ کچھ سوچ کر خوش ہونے لگی۔

اور پھر جس نے دیکھا، انگشت بدنداں رہ گیا ـــــ شرجیل صباحت کے ساتھ ...نے لگا۔ انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟ وہ تو بینا کا منگیتر تھا کیا وہ اپنی وفائیں، ...وعدے پیمان سب بھول گیا!؟ بینا کو اُن کا اس طرح رہنا، اتنا میل جول اچھا نہ معلوم ...تا۔ لیکن وہ کیا کرتی؟ شرجیل حیرت انگیز طور پر صباحت کی طرف جھک گیا تھا۔

...اور اُس کی شوخی آہستہ آہستہ اُداسی میں بدل گئی۔ انسان زمانے کو کبھی نہیں سمجھ پاتا ...اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کر لے، سمندروں کی تہہ تک پہنچ جائے لیکن ...نہیں سمجھ سکتا! بینا کو محسوس ہوا، شرجیل ایک چاند ہے جس کا ایک رُخ جس قدر ...ہے، دوسرا رُخ اُتنا ہی تاریک!

اُس نے تو سوچا بھی نہ تھا اُسے یوں رونا پڑے گا۔ وہ سناٹا، جو اُسے کسی طوفان کا

...پیش خیمہ معلوم ہوا تھا، پہلے جوش و خروش سے اُس کی ہستی کو اپنے اندر سمیٹ لے گیا تھا۔

وہ بھولی بیٹھی چپ چاپ سوچا کرتی۔ وہ ایسا تو نہ تھا۔ پھر یہ سب کیا ہے اور وہ اپنی ہی آگ میں جلنے لگی۔

"بینا بہن! یہ کیا ہوا؟" ایک دن شاہد نے پوچھا۔

"کوئی کسی کے دل پر پہرہ تو نہیں بٹھا سکتا، شاہد بھیّا!" وہ بولی۔

"تم اُس بے وفا کے لئے اُداس رہتی ہو؟" محسن کو غصہ آنے لگا۔

"محسن بھائی! کیا میں اتنا نہیں جانتی۔ جو اپنا نہ ہو سکے اُس کے لئے غم کرنے سے کیا حاصل؟"

لیکن اُسے بے حد صدمہ ہوا۔ ایک وقت آتا ہے جب دوسروں کا رحم و کرم اپنے اوپر ظلم اور تمسخر معلوم ہوتا ہے۔

کرسمس نائٹ اٹینڈ کرنے شرجیل اور صباحت بھی پہنچے تھے۔ وہی ماحول تھا۔ شرجیل نے کنکھیوں سے بینا کو دیکھا۔ وہ پیانو کے قریب اسٹول پر پتھر کی مورتی کے مانند خاموش بیٹھی تھی۔ دریچے کے باہر آسمان سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دُور پہاڑوں پر دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔

صباحت کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ بینا بھی مسکرا رہی تھی لیکن یہ تو اُس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ مسکراہٹ کتنے آنسوؤں میں ڈوب کر لبوں تک آئی تھی۔

کسی نے نوٹس ہی نہ لیا۔ محسن اور شاہد رمی کھیل رہے تھے اور اختر کسی لڑکے کو کوئی ساز بجانا سکھا رہا تھا۔

"ہم بہت جلد شادی کر رہے ہیں!" صباحت بینا کے پاس جھکی۔

"اچھا!؟" بینا نے کہا: "تمہاری مبارکباد واپس کر دوں!"

"اپنی تقدیر کا وہ چکر ضرور واپس لے لو جو تم نے شرجیل کی انگلی میں ڈالا تھا!" صباحت نے کہا۔

شرجیل سب کچھ سُن رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں خاموش بیٹھا سگریٹ کا دھواں اُگل رہا تھا۔

"ہار گئے!" اچانک محسن کا قہقہہ گونجا۔

"ہار جیت قسمت سے ہوتی ہے یار۔ ختم کرو۔" شاہد نے تاش کا رفنہ رکھ دیئے۔

"ہار گئے تو رونے لگے۔" محسن نے کہا۔

"زندگی کی کس بازی میں ہار جیت نہیں ہے لیکن بعض اوقات سوال حق کا بھی ہوتا ہے!" اختر ادھر متوجہ ہو گیا۔

"کوئی نہ مانے تب؟"

دیکھ کر یقین نہ آتا تھا، وہ فنکار ہے! موسیقی اُس کی روح کی تسکین تھی۔ یہ جنون اب ترقی پر تھا۔ لیکن اُسے یہ محسوس ہوتا، ابھی اُس کا فن اور وہ خود بھی پیاسی ہے۔ ایک بے تابی، ایک اضطراب سا اُس کی باتوں سے چھلکا کرتا۔

شرجیل بھی اسی راہ کا راہی تھا! اُس نے اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ اور پھر بینا کو معلوم ہوا وہ اُداسی جو شرجیل کی دُنیا پر چھائی ہوئی تھی، دُنیا کی نہ تھی۔ اُس کے اپنے دل کی تھی۔ رو مان، رنگ و نور، کیف و سرور کی دُنیا میں کوئی اُداس کیوں ہو!

شرجیل ——— وہ اُداس اور اکیلا سا انسان جس کا دُنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ اُس کا بن گیا۔ وہ اُسے پہلے بور فلاسفر سمجھتی رہی لیکن رفتہ رفتہ اُسے محسوس ہوا، وہ کسی کی رفاقت کا متلاشی ہے۔ اپنے دوستوں سے ملنے وہ ہر روز کالج آتا تھا۔ نئے اور پرانے چہروں سے الگ تھلگ ایک چہرہ موسم بہار کے پہلے پھول کی طرح نظر آ رہا تھا۔

وہ حُسن کی سادگی سے متاثر ہو گیا۔

سفید ریشم میں لپٹی، سر پہ آنچل ڈالے، وہ کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔ جسے خود نمائی کا ذرا بھی شوق نہ تھا! آخری پیریڈ میں اُس نے اُس کا نغمہ بھی سُنا اور مبہوت رہ گیا! آوازیں بھی جادو ہوتا ہے!

"یہ اپنی بینا ہے!" محسن نے تعارف کرایا۔ "ہماری کولیگ ——— اور آپ ہیں احمد شرجیل۔ بلکہ صرف شرجیل!"

"سلامت!" وہ اپنی موٹی اور بھاری آواز میں بولا۔

بینا نے اپنا خوبصورت ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔

"کتنی اچھی ہیں آپ! دُکھی دلوں کو اپنے نغموں سے نئی زندگی عطا کرتی ہیں۔ کاش! میں آپ کا دوست بن سکتا!"

"بن تو گئے۔" شاہد ہنس پڑا۔

پھر جب وہ اپنی گونج دار آوازوں میں قہقہے لگانے اور سگریٹ کا دُھواں چھوڑنے لگے تو وہ گھبرا کر برآمدے میں نکل آئی اور ایک ستون سے سر ٹیک کر کسی اور ہی جہان کی سیر کرنے لگی۔

آخر وہ رفعتہً اتنی پُرسکون کیوں ہو گئی ہے۔ کسی بڑے طوفان سے پہلے سمندر ہمیشہ ساکن ہو جاتا ہے لیکن جب سمندر کے سینے سے طوفان اُبلتا ہے تب ———!

راہداری کے سرے پر اُسے شرجیل دکھائی دیا۔ جیسے ہی اُس نے بینا کو دیکھا، اُدھر ہی چلا آیا۔

"آپ یہاں آ گئیں؟" وہ پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"جی!"

"شاید آپ تنہائی پسند ہیں۔ میری رفاقت ناگوار تو نہیں ہوئی؟"

"بعض رفاقتیں مستقل کہاں ہوتی ہیں؟" بینا [illegible] ہو گئی۔

"آپ وہاں سے چلی آئیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا [illegible] شامل ہو گیا ہو!"

"آپ شاعر بھی ہیں!" وہ مسکرا پڑی۔

"جی نہیں۔ شاعر تو نہیں۔ البتہ جذبات کو محسوس ضرور کرتا ہوں۔ جو [illegible] گزرتا ہوں۔ آپ کو بُرا معلوم ہو تو ٹوک دیجئے گا!"

وہ خاموش رہی۔

"اگر آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار گزرا ہو تو میں تشریف لے جاؤں!"

"جی نہیں۔ آپ بیٹھئے!" بینا کو ہنسی آ گئی۔

"مجھے سیدھے سادے لوگ بہت پسند ہیں۔" اُس نے کہا۔ "جیسی آپ ہیں! کتنی اچھی ہیں آپ . . . اگر مجھے آپ کا ساتھ نصیب ہو سکے۔ اے کاش . . . آپ نہیں جانتیں۔ میں اکیلا ہوں اور اُداس۔ اُف! اگر آپ میری زندگی کے ہولناک ویرانے میں جھانک لیں!"

وہ جُھرجُھری لے کر خاموش ہو گیا۔

"ویرانہ آباد نہیں کیا آپ نے؟" بینا نے پوچھا۔

"یہ ویرانے خود بخود تو آباد نہیں ہو جاتے۔" اُس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "کوئی آباد کرتا ہے!"

اور بینا نے یوں ویرانہ آباد کیا کہ شرجیل کی زندگی میں چراغاں ہو گیا۔ اُس کی مایوسیاں شوخیوں میں بدل گئیں۔ اُداسی اور سنجیدگی، قہقہوں میں کھو گئی۔ ناکام زندگی کے سارے فلسفے بینا کے حسین نغموں میں تحلیل ہو گئے۔ اُسے یقین تھا، بینا نے اُسے جیت لیا ہے۔

اور پھر سیزن ختم ہونے پر دونوں کی منگنی ہو گئی۔

دوسرے ساتھی بھی۔ بے حد خوش تھے۔ منگنی کے لباس میں بینا گلاب کا پھول معلوم ہو رہی تھی! بہانے بہانے شرجیل اُس کے پاس آیا اور وہ شرما گئی۔

"جائیے یہاں سے۔ سب دیکھ رہے ہیں!"

"بینا!" وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ "تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے [illegible] غلط تو نہیں رہے؟"

"ہاں۔" وہ ہولے سے بولی۔ "میں نے خوب سوچ لیا ہے۔ میں مشرقی لڑکی ہوں [illegible] خیالوں میں جسے اپنا مان لیا۔ اُسی کی ہو گئی۔"

"اوہ!" وہ بے حد متاثر نظر آنے لگا۔

"لیکن آپ . . . یہ کیا سوچنے لگے؟" بینا بولی۔ "آپ نے مجھے ابھی تک نہیں سمجھا۔"

محبت کرتی ہوں۔ محبت کی قدر وہ نہیں کرتی؟ پھر وہ کسی کی خاطر مسکرائی؟ آپ ایسا کیجئے۔ وعدہ کیجئے آپ کو بیچا کر زندہ درگور کر دیں گے۔ شرجیل کا دل ہے۔ خزاں کی ہوا چلی جائے گی؟"

بینا کی آنکھوں میں موتی سے چمکتے دیکھ کر شرجیل نے اُس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے سینے پر دبا لیا۔

---

دونوں گم تھے جیسے ہوا کے دوش پر سوار ہوں! دونوں ایک انجانے راستے پر اتنی دور چلے آئے تھے کہ وہاں سے لوٹ جانا ناممکن تھا اور عین منزل کے سامنے اچانک صباحت مل گئی! ـــــ وہ بینا کی بھی نئی نئی دوست بنی تھی۔ شرجیل کو دیکھ کر جیسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

تعارف کے بعد شرجیل نے ایک اچٹتی سی نظر اُس کے سراپا پر ڈالی۔ دونوں میں کتنا تضاد تھا ـــــ ایک سراپا جمال تو دوسری سراپا جلال۔ وہ یوں ہشاش بشاش نظر آنے لگا جیسے اچانک تیز سرد ہوا سے اُسے کسی نے اُٹھا کر آتشدان کے پاس لا بٹھایا ہو!

"مبارکباد دینا بھول گئی!" صباحت مسکرائی۔

"شکریہ!" وہ جلدی سے بول پڑا۔

"اب ملی ہو۔ اتنے دنوں تک کہاں تھیں؟" بینا نے شکوہ کیا۔

"یہاں کہاں تھی۔ ڈیڈی کے ساتھ چوبیس پرگنہ چلی گئی تھی۔ کل ہی تو آئی ہوں۔ کل ہی محسن صاحب نے بتایا!" وہ ہنس کر بھرپور نگاہ شرجیل پر ڈالتی ہوئی بولی۔

"گڈ لک ـــــ بے حد شاندار سلکشن ہے تمہارا!"

یکایک جیسے بینا کے دل میں جلنے والا چراغ گل ہو گیا اور صباحت کے رخسار لَو دے اُٹھے۔ یہ ہینڈسم آدمی بھلا بینا جیسی دقیانوسی لڑکی کے ساتھ کیا نباہ کر سکے گا! اس کے لئے تو ـــــ وہ کچھ سوچ کر خوش ہونے لگی۔

اور پھر جس نے دیکھا۔ انگشت بدنداں رہ گیا ـــــ شرجیل صباحت کے ساتھ دیکھا جانے لگا۔ انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟ وہ تو بینا کا منگیتر تھا۔ کیا وہ اپنی وفائیں، اپنے عہد و پیمان سب بھول گیا!؟ بینا کو اُن کا اِس طرح رہنا، اتنا میل جول اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتی؟ شرجیل حیرت انگیز طور پر صباحت کی طرف جھک گیا تھا۔

اور اُس کی شوخی گہری اُداسی میں بدل گئی۔ انسان، انسان کو کبھی نہیں پہچان سکتا! وہ اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کر لے۔ سمندروں کی تہہ تک پہنچ جائے لیکن آدمی کو نہیں سمجھ سکتا! بینا کو محسوس ہوا، شرجیل ایک چاند ہے جس کا ایک رُخ جس قدر تابناک ہے، دوسرا رُخ اتنا ہی تاریک!

اُس نے تو سوچا بھی نہ تھا اُسے یوں رونا پڑے گا۔ وہ سناٹا، جو اُسے کسی طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوا تھا جو سارے جوش و خروش سے اُس کی ہستی کو اپنے اندر سمیٹ لے گیا تھا۔

وہ پہروں بیٹھی چپ چاپ سوچا کرتی۔ وہ ایسا تو نہ تھا۔ پھر یہ سب کیا ہے اور وہ اپنی ہی آگ میں جلنے لگی۔

"بینا بہن! یہ کیا ہوا؟" ایک دن شاہد نے پوچھا۔

"کوئی کسی کے دل پر پہرے تو نہیں بٹھا سکتا، شاہد بھیا!" وہ بولی۔

"تم اُس بے وفا کے لئے آنسو بہاتی ہو؟" محسن کو غصہ آنے لگا۔

"محسن بھائی! کیا میں اتنا نہیں جانتی۔ جو اپنا نہ ہو سکے اُس کے لئے غم کرنے سے کیا حاصل؟"

لیکن اُسے بے حد صدمہ ہوا۔ ایک وقت آتا ہے جب دوسروں کا رحم و کرم اپنے اوپر ظلم اور تمسخر معلوم ہوتا ہے۔

کرسمس نائٹ اٹینڈ کرنے شرجیل اور صباحت بھی پہنچے تھے۔ وہی ماحول تھا۔ شرجیل نے کنکھیوں سے بینا کو دیکھا۔ وہ پیانو کے قریب اسٹول پر پتھر کی مورتی کے مانند خاموش بیٹھی تھی۔ دریچے کے باہر آسمان سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دور پہاڑوں پر دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔

صباحت کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ بینا بھی مسکرا رہی تھی لیکن یہ تو اُس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ مسکراہٹ کتنے آنسوؤں میں ڈوب کر لبوں تک آئی تھی۔

کسی نے نوٹس ہی نہ لیا۔ محسن اور شاہد رمی کھیل رہے تھے اور آنند کسی لڑکے کو کوئی ساز بجانا سکھا رہا تھا۔

"ہم بہت جلد شادی کر رہے ہیں!" صباحت بینا کے پاس جھکی۔

"اچھا!؟" بینا نے کہا "تمہاری مبارکباد واپس کر دوں!"

"اپنی تقدیر کا وہ چکر ضرور واپس لے لو جو تم نے شرجیل کی اُنگلی میں ڈالا تھا!" صباحت نے کہا۔

شرجیل سب کچھ سن رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں خاموش بیٹھا سگریٹ کا دھواں اُگل رہا تھا۔

"ہار گئے!" اچانک محسن کا قہقہہ گونجا۔

"ہار جیت قسمت سے ہوتی ہے یار۔ ختم کرو۔" شاہد نے اکتا کر تاش رکھ دئے۔

"ہار گئے تو رونے لگے؟" محسن نے کہا۔

"زندگی کی کس بازی میں ہار جیت نہیں ہے لیکن بعض اوقات سوال حق کا بھی ہوتا ہے!" آخر اِدھر متوجہ ہو گیا۔

"کوئی نہ مانے تب؟"

"لاکھ زمانہ حق حقدار کو مل کر رہتا ہے!" شاہد نے یقین کے ساتھ کہا۔

اسی وقت پروگرام شروع ہو گیا لیکن صباحت اٹھ کھڑی ہوئی۔ شرجیل بھی سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالتا ہوا اٹھ گیا۔ پل بھر کے لئے وہ ٹھٹکا اور پھر بینا کی طرف مڑا۔

"مجھے معاف کر دینا، میں نے کہا تھا تمہارا انتخاب صحیح نہیں ہے۔ میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ مجھے بھلا دینا" اور اس کی انگشتری پیانو پر ڈالتا ہوا مڑ گیا۔

ننھی سی ہیرے کی انگوٹھی بینا کے لئے ناگن بن گئی جس نے اس کی محبت کو ڈس لیا تھا لیکن خودداری پھر بھی زندہ تھی۔ کیا وہ ایک بے وفا مرد کے لئے بچھے گی، روئے گی؟

"میری دعا ہے آپ ہمیشہ خوش رہیں!" اس نے معصومیت سے کہا اور انگوٹھی اٹھا کر ہال سے نکل گئی۔

شرجیل مبہوت رہ گیا۔

صباحت زور سے ہنس پڑی "بینا سمجھ رہی تھی، تم نے اپنے سارے حقوق اس کے نام محفوظ کر دیئے ہیں!"

"بڑی احمق تھی" محسن بول پڑا "وہ یہ نہ سمجھ سکی، آپ کے نام محفوظ کرتے ہیں"

"شٹ اپ" صباحت چیخ پڑی۔

"ایڈیٹ!"

"ہائیں ہائیں" دوسرے دوڑ پڑے اور شرجیل صباحت کو باہر نکال لے گیا۔ کار سمندر کے راستے پر ہو لی۔ صباحت ہانپ رہی تھی اور بے حد تلخ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"دنیا تو سی سیوکر ہے۔ صورت پر معصومیت کا نقاب ڈالے دوسروں کو دھوکا دیتی پھرتی ہے۔ آخر وہ سب اس کی طرف سے کیوں بولتے ہیں؟ شرجیل! میں اس سے انتقام لوں گی"

"کس بات کا بھئی؟" شرجیل مسکرایا۔

"اپنی انسلٹ کا!" وہ بولی "ہم جلد از جلد شادی کر لیں گے"

پھر وہ ساحل کے کنارے جا بیٹھے۔ نکھری ہوئی چاندنی مسکرا رہی تھی۔ لہروں کا ارغنون نغمہ ریز تھا۔ دور دور تک کسی کا پتہ نہ تھا۔ شرجیل سوچ رہا تھا۔ اس نے کیا کھویا کیا پایا؟

"صباحت! تمہیں بینا سے نفرت ہے؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

"نفرت؟ میرا بس چلے تو اس کا منہ جھلس دوں" وہ بولی۔ پھر اس کی آواز میں شیرینی گھل گئی۔

"شرجیل! مجھے تو اس ہوا سے بھی جلن ہے جو تمہارے جسم کو چھو کر گزرتی ہے"

"اوہ!" وہ طویل سانس لے کر ہنس پڑا۔

"شرجیل! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی" وہ اس پر امڈ پڑی اور وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

---

آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا سب کو انتظار تھا۔ شرجیل واپس جا رہا تھا۔

دوست احباب اداس تھے لیکن جب انہیں اس کا ویڈنگ کارڈ ملا تو اور اداس ہو گئے۔

اور سوچ لیا اس کی شادی میں ہرگز نہ جائیں گے۔

بینا شدتِ احساس سے دیوانی سی ہو گئی لیکن اس نے خود کو سنبھالا —— وہ خودداری اور شرافت کا دامن نہ چھوڑے گی۔ وہ روئی بھی [illegible] ہنسی بھی آئی تھی۔ پاگل! کہہ رہا تھا وہ اسے بھلانے کی کوشش کرے [illegible] محبت جلنے سے بڑھتی ہے، نہ ملنے سے بھڑکتی ہے۔

پھر وہ اس کے لئے تحفے خریدنے لگی۔ اور اسی کے اہتمام سے ایک شاندار پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔

شادی کا دن آ پہنچا۔ بینا اور اس کے احباب ہال میں ڈولہا دلہن کا انتظار کر رہے تھے لیکن شرجیل تنہا آتا دکھائی دیا۔

"مسز شرجیل ——؟" محسن نے آہستہ سے پوچھا۔

"ختم کرو" اس نے کہا "میں غلطی پر تھا۔"

"کیا مطلب؟" اختر نے حیرت سے پوچھا۔

اتنے میں صباحت بھی آ گئی۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔

"شیطان کی بچی . . . !" وہ بینا پر جھپٹی۔

شرجیل نے اسے اپنے بازو پر روک کر پیچھے دھکیل دیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" شاہد چیخا۔

"میں نے بڑی بھول کی۔ سمندر کے دھوکے میں سراب کے پیچھے دوڑا تھا۔ صباحت! تم نہیں جانتیں محبت کسے کہتے ہیں۔ تم اب تک محبت کی توہین کرتی رہی ہو" شرجیل بولا۔

بینا کو صباحت کی بات سے بہت ٹھیس لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"دھوکا!!" صباحت آنکھیں نکال کر بولی "ذلیل! دیکھنا!! میں تم پر مقدمہ چلا دوں گی!"

اور دھڑ دھڑ پاؤں پٹختی ہال سے نکل گئی۔

"محبت کوئی ایسا جرم نہیں جس کا فیصلہ عدالت کرے" شرجیل مسکرایا۔ پھر وہ بینا کے پاس جا کر رک گیا۔

"بینا! میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ تم بہت پیاری ہو، مجھے معاف کر دو" اس نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

شاید اسے احساس ہو گیا تھا: پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کٹ سکتا ہے!

احباب بے حد خوش تھے۔ انہوں نے دیکھا بینا کی انگلی میں وہی انگشتری جگمگا رہی تھی جو شرجیل نے بہت پہلے اسے پہنائی تھی!!

یاسمین مہدی، دہلی

# غزلیں

### ناز قادری بی۔اے (آنرز)

کسی کی زُلفِ سیہ کو سحاب کہتے ہیں
رُخِ صبیح کو ہم ماہتاب کہتے ہیں

نگاہِ ناز کو کیفِ شراب کہتے ہیں
فروغِ حُسن کو جوشِ شباب کہتے ہیں

یہ تیرے حُسنِ فسوں ساز کا کرشمہ ہے
کہ ذرّے ذرّے کو ہم آفتاب کہتے ہیں

کرم پہ آئے تو کیف و سرُور سے بھر دے
وہی نگاہ جسے ہم عذاب کہتے ہیں

پیامِ عشرتِ فردا سے کیا سکوں ہو نصیب
جو تشنہ لب ہیں اسے وہ سراب کہتے ہیں

حضورِ جب سے مری زندگی میں آئے ہیں
جہاں میں سب مجھے خانہ خراب کہتے ہیں

جھول میں ناز! محبت کی مستیاں بھر دے
اسی کو شمن (؟) اسی کو شباب کہتے ہیں

### کرشن موہن ایم۔اے

رُخسار و گیسُو سے صبح و شام کا رشتہ
چشم و لب سے کیف و رنگِ جام کا رشتہ

ہر موسم کا اپنا سوز و درد الگ ہے
حُسن و عشق سے ہے دَورِ ایّام کا رشتہ

اب اُن کو ہم سے پہلا سا پیار کہاں ہے
نام کو لیکن باقی ہے پیغام کا رشتہ

کام نہ ہو تو کتنے ہی دن مل نہ سکیں ہم
سب سے راسخ، سب سے بڑا ہے کام کا رشتہ

زیست کے ہنگاموں کی کچھ پہچان تو ہوتی
عیش ہی تک محدُود ہے دَورِ جام کا رشتہ

سوزِ غم سے لاکھ جنوں ہوں کیسا غضب ہے
پھر بھی عزیزِ دل ہے ننگ و نام کا رشتہ

شوخ نگاہوں سے پاتا ہے تسکینِ دل
میری آنکھوں سے ہے حُسنِ بام کا رشتہ

### سعادت نظیر۔ایم۔اے

بے قراری ہے، اشک باری ہے
کیا یہی زندگی ہماری ہے!

کیا خبر اُس کو، ہم نے فرقت میں
کس طرح زندگی گزاری ہے؟

تم کہو دل کا حال، یا نہ کہو
اہلِ دل کو خبر تمہاری ہے

چاند ڈوبا، چراغِ راہ بجھے
اب مسافر پہ رات بھاری ہے

اور کچھ شے ہے زندگی اے دوست
نہ سکوں ہے، نہ بے قراری ہے

تم نہ سمجھو گے دل کی بے تابی!
تم نے کب شامِ غم گزاری ہے؟

مجھ سے کیوں حالِ دل چھپاتے ہو!
پردہ در خود یہ پردہ داری ہے

بات کر لیتے ہیں وہ مجھ سے، نظیر
یہ بھی اک اُن کی وضع داری ہے



۲۵ برس سے زائد مشہرت یافتہ
سول ڈسٹری بیوٹرز۔
جے۔ ایل۔ موریسن
سن اینڈ جونز
(انڈیا) پرائیویٹ لمیٹڈ
بمبئی، دہلی،
مدراس، کانپور،
کلکتہ
Asha
آشا سنو، فیس پاؤڈر، کم کم، کاجل اور دوسری خوبصورتی بڑھانیوالی چیزیں

# زرد گلاب

رضیہ سجاد ظہیر۔ ایم۔ اے

وائی ۳۴۲۔ حوضِ خاص نئی دہلی ۱۶

۱۴ر اکتوبر ۶۶ء

خوشتر بھائی! تسلیم

آپ نے اتنی محبت سے فرمائش کی کہ انکار کرنا ناممکن تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میرے تین بھائی ہیں مگر تینوں پاکستان میں ہیں۔ پھر یہاں جس کو بھائی کہوں اُس کا تو یہ کہا پُورا کروں گی ہی! مشکل یہی ہے کہ میں بہت کم لکھتی ہوں اور جو کچھ لکھتی ہوں اُسے بھی چھپکانے ٹھکانے میں اتنا وقت لگاتی ہوں کہ "بیسویں صدی" میں جتنا لکھنا چاہئے وہ نہیں ہو پاتا ــــ یہ کہانی میں نے راجہ مہدی علی خاں کی موت سے متاثر ہو کر ایک یاد اُبھر آنے پر لکھی تھی۔ موت کے سامنے انسان کی بے بسی ایک تلخ حقیقت ہے۔ اگرچہ یہ اُس سے بڑی حقیقت ہے کہ زندگی موت سے زیادہ طاقتور ہے! بہرحال۔ کبھی کبھی یوں بھی محسوس ہوتا ہے، نہ جانے کہانی کیسی بنی ــــ یہ تو آپ اور پڑھنے والے ہی بتائیں ــــ بھابی کو تسلیمات کہئے گا اور میرے بھتیجے بھتیجیوں کو دعائیں اور پیار!

آپ کی بہن ــــ رضیہ سجاد ظہیر

---

ہاں یہ وہی تصویر ہے!

وہی تصویر جو نہ جانے کب سے ہمارے کھانے والے کمرے میں لگی تھی ــــ یہ وہی ہے ــــ بڑی سی بھاری سی تصویر! جو تقریباً آدھی دیوار کو گھیرے تھی۔ یہی فریم اُس وقت بھی تھا۔ یہی بھاری، چوڑا سنہرا فریم جس میں کٹاؤ کی جالی تھی۔ ویسے اُس کی پالش جا بجا سے گھس گئی تھی لیکن تصویر کی رونق میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ پس منظر میں سیاہی اور سُرخی کا میل جیسے رات کا بڑھتا ہوا اندھیرا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی لال اور نارنجی روشنی کو اپنے اندر سموتے لے رہا ہو۔ سامنے رکھی ہوئی میز پر گہرے سبز رنگ کا میز پوش جس کی چمک سے ظاہر ہوتا تھا کہ پلش یا مخمل کا ہے۔ اُس پر رکھا ہوا بڑا سا کٹ گلاس کا گول پھول دان، جس کے ایک حصے پر کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی کی ٹوک پڑ رہی تھی۔ اس پھولدان میں لگا ہوا بڑے بڑے رنگ برنگے گلابوں کا ایک گچھا ــــ اور پھولدان کے قریب میز پوش پر پڑا ہوا ایک زرد گلاب!

شاید مصوّر نے اِسی لئے اُس کا رنگ زرد بنایا تھا کہ سب سے پہلے مرجھانا اُس کی قسمت تھی۔ اپنے ساتھیوں سے چھُوٹ کر وہ کیسے گر پڑا ہو وہ ہنستا مسکراتا گلاب کتنا مجبُور اور بے بس معلوم ہوتا تھا اور کچھ ایسا بھی محسوس ہوتا تھا جیسے باقی سارے گلاب اُسے حسرت سے دیکھ رہے ہیں۔ اُس کی جُدائی پر سرنگوں ہیں۔ پر کچھ نہیں کر سکتے ــــ وہ بھی بے بس ہیں، مجبور ہیں۔ اُن کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اُسے اُٹھالیں۔ اُسے پھر سے اپنے ساتھ گچھے میں لگالیں۔

اِس تصویر کو میں بہت چھوٹی عمر سے دیکھتی آئی تھی۔ اُسی کے نیچے آتش دان تھا۔ جس میں جاڑوں میں لکڑیوں کی آگ سُلگتی تھی اور ابّا مرحوم کبھی کبھی وہاں بیٹھ کر ہم لوگوں کو میر انیس کا کلام سُنایا کرتے تھے۔ جب آگ کے شعلے لپکتے تو اُن کی لپک اُس زرد گلاب پر پڑتی تھی۔ جب روشنیاں گُل ہو جاتیں تو اندھیرے میں بھی وہ زرد گلاب دکھائی دیا کرتا تھا اور صبح تڑکے جب سُورج کی پہلی کرن روشن دان سے جھانکتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا ذرا سی دیر کے لئے اُس گلاب میں جان پڑ گئی ہے۔

گھر میں سب سے زیادہ چہل پہل اِسی کمرے میں ہوتی تھی۔ کسی نہ کسی موقع پر سارا خاندان اکٹھا ہوتا رہتا تھا۔ پارٹیاں ہوتیں، شعر سُنائے جاتے۔ ریڈیو یا گراموفون بجتا، کھیل ہوتے۔ کبھی کبھی بڑوں کی غیر موجودگی میں ہم بچے دروازے اور روشنیاں بند کر کے ڈارک روم یا تکیہ فاختہ کھیلتے۔ ایسے میں کبھی کبھار میری نظر اُس گلاب پر جا پڑتی اور میں

ایکدم مُضحک سے رہ جاتی ــــــ کیسے یہ سب سے الگ ہوگیا؟ کیا اچھا ہوتا جو یہ بھی گلدان میں لگا ہوتا! اُس میں سب رنگوں کے گلاب تھے۔ زرد نہیں تھا تو یہی کیوں نہیں لگا دیا؟ شاید لگا تو رہا ہوگا مگر ٹوٹ کے گر گیا۔ کیسے ٹوٹ گیا؟

مجھے یاد ہے، ایک دن میں نے چپکے سے اِس زرد گلاب کو چھونے کی کوشش کی تھی۔ ایک چھوٹی سی میز کھسکا کے اُس پر کرسی رکھ کے میں چڑھی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے اُسے چھوا بھی تھا لیکن ایسا محسوس ہوا کہ وہ ٹھنڈا ٹھنڈا ہے اور نرم۔ قریب سے دیکھنے میں وہ کچھ ایسا لگتا تھا کہ نہ پھول اور نہ پھول بھی ہے۔ بس ایک مبہم سا زرد رنگ کا دھبہ سا معلوم ہوتا تھا!

پھر ایک دن صبح ناشتہ کرتے میں میں نے اپنی امّی سے پوچھا تھا: "امّی! یہ تصویر کس نے بنائی ہے؟"

میری امّی بہت کم سخن تھیں ــــــ چپ رہیں۔

ابّا نے ایک بار اُن کی طرف دیکھا، پھر میری طرف، اور بولے: "بیٹی! یہ تمھارے ماموں نے بنائی تھی"

"کون باقر ماموں؟" میں نے پوچھا تھا۔

"نہیں بیٹی تم نے اپنے اُن ماموں کو نہیں دیکھا۔ وہ تصویریں بناتے تھے اور بیمار رہتے تھے" پھر وہ ذرا سا رُک کے بولے: "وہ بہت خوبصورت تھے اور بڑے ہنس مکھ ــــ روتوں کو ہنساتے تھے ــــــ وہ تمھاری امّی کے چچازاد بھائی تھے اور یہ تصویر انھوں نے ہی تمھاری امّی کو تحفے میں دی تھی"

"مگر ابّا یہ تصویر مجھے اچھی نہیں لگتی" میں نے کہا۔

امّی نے جو اب تک خاموش تھیں، چونک کر میری طرف دیکھا "کیوں بیٹی، تجھے کیوں نہیں اچھی لگتی؟"

"امّی! یہ ماموں نے اِس زرد گلاب کو نیچے کیوں پھینک دیا؟ وہاں کیوں نہیں لگایا گچھے میں ــــــ ابّا! یہ کیسے سب گلابوں سے الگ ہوگیا؟"

ابّا کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے ایک بار مڑ کر تصویر کو دیکھا، پھر امّی کو، پھر مجھے پیار کیا اور کالج چلے گئے۔

میں آہستہ آہستہ دلیا کھاتی رہی پر اُسے برابر دیکھتی رہی۔ شفق کا پس منظر ہرے پلش کا میز پوش جیسے قبر پہ اُگی ہوئی تازی گھاس۔ اُس پر دکھتے ہوئے کٹ گلاس کا گلدان، رنگ برنگے گلابوں کا وہ گچھا اور سب سے الگ، سب سے دُور، سب سے بچھڑا ہوا ــــ وہ ایک زرد گلاب!

پھر وقت قطرہ قطرہ کر کے ٹپکتا رہا اور وہاں آکر تھم گیا جہاں مجھے یہ تار ملا کہ امّی کا انتقال ہوگیا!

وہ صرف چند دن بیمار رہی تھیں۔ مجھے انھوں نے اپنی بیماری کی بھی اطلاع نہیں دینے دی کہ وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر کہاں اتنی دور آئے گی۔ [illegible] ٹھیک ہی ہو جائے گی۔ اِس لئے میں اُس وقت پہنچی جب [illegible] کمنذر ہو چکی تھی۔ خاندان میں صرف ایک [illegible] ساتھ لے گیا تھا۔ جیسے سب چہل پہل اُنھی ایک دم سے [illegible]

ابّا نے اُن کے کمرے کی کنجی مجھے دیتے ہوئے کہا: [illegible] اُسے کیا کرنا ہے۔ اِس لئے تمھیں کوئی زحمت نہ ہوگی۔ یہ سب انتظام اُنھوں نے پہلے ہی [illegible] پہلے کیا تھا۔ شاید اُنھیں پتا چل گیا تھا کہ اب وہ بچیں گی نہیں۔ ورنہ مرنے سے چند منٹ پہلے تک۔ تو وہ تمھاری بچی کو یاد کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں اب کے میں اسے اپنے ساتھ لے آؤں گی اور اپنے ہی پاس رکھوں گی ــــــ خیر!"

جب میں کنجی لئے کھانے والے کمرے سے ہو کر امّی کے کمرے میں جانے لگی تو میں نے دیکھا، وہ تصویر آتشدان پر نہیں ہے۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ کبھی وہ تصویر وہاں نہ رہی ہو ایسا کوئی وقت یاد نہ تھا۔ دیوار پر اُس کی خالی جگہ میں اُس کی ناپ [illegible] لگی تھی کچھ جالے بھی اِدھر اُدھر لگے تھے جیسے کوئی ابھی سوتے سے اُٹھ کر گیا ہو اور [illegible] بستر اُسی طرح پڑا ہو!

میں اُلٹے پاؤں ابّا کے پاس برآمدے میں آئی: "ابّا! وہ گلابوں والی تصویر آپ نے کیوں اُترواری؟"

"بیٹی! وہ تمھاری امّی نے خود ہی اُتروائی تھی۔ اپنے کمرے ہی میں اُسے بھی رکھوا گئی ہیں"

میں نے کمرہ کھولا ــــــ اپنے کسی مرے ہوئے عزیز کی چیزیں سنبھالنے سے زیادہ سوہانِ روح کوئی دوسرا فرض نہیں۔ کبھی اُن چیزوں پر پیار آتا ہے کہ اُس کی تھیں، کبھی اُن سے نفرت ہوتی ہے کہ اُس سے وفا نہ کی تو کس سے کریں گی؟ یہ سب کچھ موجود ہے اور وہ چلا گیا جو انھیں اپنا کہتا تھا، اپنا سمجھتا تھا اور اب کبھی نہ آئے گا کہ انھیں برتے، انھیں بیٹھے سجائے، انھیں دیکھ کر خوش ہو! ایک ایک چیز کے ساتھ یادوں کا ایک طوفان سا اُمڈتا چلا آتا تھا۔ کب خریدی تھی، کہاں سے لی تھی، کتنے شوق سے گھر لا کر کس چاؤ سے سب کو دکھائی تھی ــــــ یہ فلاں نے امّی کو دی تھی، شادی کی سالگرہ پر، نئے سال پہ، عید پہ ــــ ہر ایک پر چِٹ لگی تھی کہ کس کو دی جائے، کیوں دی جائے اور کب دی جائے ــــــ پلنگ پہ جو بستر اور ریشمی لحاف تھا اُس تک کے متعلق ہدایت تھی۔ پورے کمرے میں اگر اور لوبان کی خوشبو بسی تھی جس سے کچھ روحانی سا بھی ماحول تھا۔ کچھ گھٹن سی بھی تھی جس سے جی گھبراتا تھا۔ جیسے کچھ سمجھ میں نہ آرہا ہو!

سب سامان دیکھ کر میں کمرہ بند کرنے کے لئے [illegible] تو میری کُہنی اُس تصویر سے ٹکرائی۔ وہ کواڑ کے پاس والی دیوار سے [illegible] تھی۔ دیکھا تو وہ

دیوار پر لگی چھوٹی سی کافی بڑی لگتی تھی لیکن اس وقت بے رنگی ہوتی وہ اور بھی زیادہ بڑی لگ رہی تھی۔ اس پر بادامی کاغذ لپٹا ہوا تھا جو ستلی سے بندھا تھا۔

ایک دم میرا دل چاہا کہ اسے دیکھوں —— برسوں امی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے وہ چیز سامنے لگی نظر آیا کرتی تھی۔ جب کبھی میں میکے آتی تو وہ آتشدان پر دکھائی دیتی تھی۔ اس کے نیچے کھڑے ہو کر امی نے اکثر مجھے اپنے گلے لگایا تھا۔ جاتے وقت خدا حافظ کہتے ہوئے امام ضامن باندھا تھا —— وہ تصویر جیسے ان کے وجود کا ایک حصہ تھی۔ میں اسے دیکھے بغیر سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ امی کے گھر آئی ہوں۔

میں نے اس پر بندھی ہوئی ستلی آہستہ آہستہ کھولی۔ پھر کانپتے ہاتھوں سے کاغذ ہٹایا۔ سنہرے فریم کے ایک کونے میں جہاں پالش کافی گھسی ہوئی تھی، ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ تہہ کیا ہوا اٹکا تھا۔ لیکن امی نے یہ تصویر بھی تو کسی کو دینے کے لئے نہیں رکھ دی ہے؟ اُن کی دریا دلی سے کیا فائدہ، کسی کو بخش گئی ہوں؟ نہیں، نہیں، یہ تو میرے سوا کوئی نہیں لے سکتا! یہ میں کسی کو نہیں دینے دوں گی! دھڑکتے دل سے میں نے پرچہ کھولا۔ لکھا تھا ——

"بیٹی زرینہ! تم نے ایک بار مجھ سے پوچھا تھا یہ زرد گلاب گچھے سے الگ کیسے ہو گیا۔ اس وقت تم ننھی سی تھیں۔ میں تمہیں کیا بتاتی۔ پر آج وقت تمہیں بتائے گا کہ گچھے سے کوئی پھول کس طرح الگ ہوتا ہے۔

بیٹی، کوئی پھول گچھے کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ کوئی انسان اپنے پیاروں سے جدا نہیں ہونا چاہتا —— پر وہ مجبور ہوتا ہے۔ اگر ایک پھول نہ چھٹے تو دوسرا کیسے پیدا ہو۔ اگر ایک انسان نہ جائے تو دوسرا کیونکر اس کی جگہ لے۔ یہ تصویر مجھے اپنی تمام چیزوں سے زیادہ پیاری ہے —— کیوں؟ یہ نہ پوچھنا۔ کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کے ساتھ قبر میں جاتی ہیں۔ وہ انھیں کسی سے نہیں دہرا سکتا۔ اپنی اولاد سے بھی نہیں —— میں یہ تصویر تمہیں دے رہی ہوں۔ میرا تو اب کوئی گھر نہیں پر تمہارا ہے۔ خدا اس گھر کو بسائے رکھے —— اس تصویر کو اپنے کھانے کے کمرے میں آتشدان پر لگانا۔

تمہاری امی

ہاں، تو یہ وہی تصویر ہے۔ شفق کا پس منظر، ہرے پلش کا میز پوش جیسے کسی قبر پر تازی اُگی ہوئی گھاس —— کٹ گلاس کا دمکتا ہوا پھولدان، کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی کی ڈلک اور اس پھولدان میں رنگ برنگے گلابوں کا گچھا اور سب سے الگ سب سے دُور، سب سے بچھڑا ہوا —— وہ ایک زرد گلاب!!

---

# غزل

شہریار پرواز ایم اے

حسرت نہیں کہ فطرتِ بے مُدعا نہیں ۔۔۔ تیرے کرم سے دامنِ خالی میں کیا نہیں
ہر موجِ تند جانتی ہے ناخدائیاں ۔۔۔ طُوفاں تو میرے ساتھ ہے گر ناخدا نہیں
جب تک تھا اپنا ہوش وہ رہتے تھے دُور دُور ۔۔۔ اب آ گئے قریب تو اپنا پتا نہیں
طوفاں سے کھیلتا ہوا دریا کو پار کر ۔۔۔ مقصود ہے عبُور ترا ڈوبنا نہیں
وہ آہ کیا جو بابِ اثر تک پہنچ گئی ۔۔۔ وہ نالہ کیا جو بے اثر و نارسا نہیں
کیا طاعتِ مُدام کا انعام ہے یہی ۔۔۔ یُوں جی رہے ہیں جیسے ہمارا خدا نہیں
اِک خواہشِ مُدام پہ ہے عشق کا مدار ۔۔۔ یہ بھی ہے مُدعا کہ کوئی مُدعا نہیں

اپنی نگاہِ شوق کی بے چارگی سے پُوچھ
آوازِ بازگشت ہے یہ التجا نہیں

افسانہ

# فضاؤں کی گود میں

——— م۔م۔ راجندر۔ ایم۔ اے

بی۔ ۱۹ (ای ٹائپ) موتی باغ ساؤتھ۔ نئی دہلی ۲

۱۶ ستمبر ۶۹ء                برادرِ مکرم! تسلیم

خیال تھا کہ ۲۲ ستمبر کو نرملا دیوی (پریم ناتھ در صاحب کی لڑکی) کی شادی کے موقعے پر آپ سے ملاقات ہوگی اور میں "بیسویں صدی" کی بزم سے اپنی طویل غیر حاضری کی وجہ خود بیان کر کے سالنامے میں شرکت کے لئے میدان ہموار کر لوں گا لیکن آنکھوں نے کافی ڈھونڈا، آپ اُس بھیڑ میں نظر نہ آئے۔ شاید آپ کسی وجہ سے شادی میں شامل نہ ہو سکے یا پھر بہت بعد میں آئے ہوں گے ——— دیکھئے ملاقات کی کوئی راہ نکل آئی تو سب باتیں ہو جائیں گی۔ فی الحال سالنامے کے لئے یہ افسانہ بھیج رہا ہوں۔ یہ ذریعہ پوری نہیں تو نصف ملاقات کا سبب تو بن ہی جائے گا۔ یہ افسانہ زندگی کے ایک حقیقی واقعے پر مبنی ہے۔ اگرچہ میں نے اِس میں فسانہ طرازی سے بھی کام لیا ہے۔ افسانہ کئی نفسیاتی دلچسپیوں کا حامل ہے۔ وِشْ اندر اور سیما کے کردار آج کل کے نوجوان طبقے کی بہت سی اُمنگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وِشْ اندر کی ماں کا کردار (اگر تمثیلی طور پر اُس کردار کی موجودگی تسلیم کر لی جائے) بظاہر کہانی میں محض ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے لیکن اِس تثلیث میں ماں کی کیا اہمیت ہے اور ماں پر کیا بیتی ہوگی یہ آپ جیسے اہلِ نظر نبض شناس فوراً محسوس کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ اسے محض ایک نفسیاتی افسانہ کہیں لیکن آپ یہ تسلیم کریں گے کہ بعض مرتبہ قدرت بھی ایسا حادثہ مہیا کر دیتی ہے جو کسی کی اُمنگوں اور چھپی ہوئی خواہشات کے مطابق ہو لیکن اُس وقت پیش آئے جب اُس کا وہم و گمان بھی نہ ہو اور نہ اُس کی ضرورت ہو۔ یہی بات افسانے میں المیے کی ذمہ دار ہوتی ہے ...

مخلص ——— م۔م۔ راجندر

---

وِشْ اندر اور میں لاہور میں دیال سنگھ ہائی سکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے لیکن میری اُس سے کوئی خاص دوستی نہ تھی۔ میں اُس سکول میں اُس کے ساتھ شاید ایک سال پڑھا ہوں گا اور پھر ہم نے لاہور چھوڑ دیا تھا۔

اس کے کوئی اٹھارہ برس بعد دہلی میں وِشْ اندر سے ایک میوزک سکول میں ملاقات ہوئی۔ مجھے گانے کا شوق تھا اور میں ایک شام کو اُس میوزک سکول میں داخل ہونے کے لئے گیا تھا۔ اُس سکول میں گانا سکھانے والے ماسٹر اندھے تھے۔ جس وقت میں پہنچا کلاس لگی ہوئی تھی اور ایک لڑکی اور تین لڑکے گانا سیکھ رہے تھے۔ ماسٹر جی نے میری آواز سُن کر مجھے بیٹھنے اور انتظار کرنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ اُن تین لڑکوں میں ایک دراز قد خوبرو نوجوان تھا جو دیکھنے میں چوبیس پچیس سال کا معلوم ہوتا تھا اور ایک خوبصورت نیوی وول کا سُوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اُس نوجوان میں ناپختگی اور غیر سنجیدہ پن بہت نمایاں تھا کیونکہ وہ گانا گاتے گاتے مُسکرا بھی رہا تھا اور ماسٹر جی کے اندھے پن کا فائدہ اُٹھا کر ہاتھوں سے کچھ ایسے اشارے کر رہا تھا کہ سب ہی زیرِ لب مُسکرا رہے تھے۔ یہ وِشْ اندر تھا لیکن اُس وقت ہم ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے۔ کلاس ختم ہوئی اور ماسٹر جی سے میں نے داخلے کا فارم لے کر میں باہر آیا تو وِشْ اندر نے مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔ [illegible] سال کے طویل وقفے کے باوجود ایک دوسرے کے بچپن کے نقوش ہمارے ذہنوں میں ابھر آئے اور اِس اچانک ملاقات سے ہم بے حد خوش ہوئے۔

وِشْ اندر اب کوئی اٹھائیس سال کا اور میں اُنتیس سال کا تھا۔ میری شادی ہو گئی تھی اور دو بچے تھے لیکن وِشْ اندر ابھی تک کنوارا تھا۔ وہ بچپن میں بھی امیر تھا اور اب بھی۔ وہ لاہور کے مشہور سول سرجن رائے بہادر کرپا رام کا اکلوتا بیٹا تھا۔ رائے بہادر

# جوانی

کیا جوانی پھرتی ہے جوبن پہ اترائی ہوئی
ٹھوکریں کھلوائے گی یہ چال اِٹھلائی ہوئی ——— امیر مینائی

[illegible] چھڑ گیا قیامت کا
ذکر جب [illegible] یک
بات پہنچی تری جوانی تک
منہ چھپا کے یوں گئی جوانی
کبھی [illegible] ہی جگمگا [illegible]
یاد آگیا رُوٹھنا [illegible] جو گیا
[illegible] ——— فانی

جھلکے ڈال دیتی ہے [illegible] فضائے آسمانی میں
محبت جب خدا کا نام لیتی ہے جوانی میں ——— سیماب اکبرآبادی

ہر گام دلِ عرش دہلتا ہے دھمک سے
جب فرشِ نزاکت پہ بھی چلتی ہے جوانی ——— بسمل سعیدی

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ ہتکاری، ایم۔ اے۔ کلکتہ

مر چکے تھے اور وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک بڑی کوٹھی میں رہتا۔ روڈ پر رہتا تھا۔ اُس کے پاس ایک مورس کار تھی اور اُس کی ہر حرکت اور بات چیت سے ایک بے پروائی، لاابالی پن اور ایک بے فکر امیر نوجوان کے اطوار جھلکتے تھے۔ دنیش اندر نے مجھے بتایا کہ وہ ایک بڑی انگریزی فرم میں ڈپٹی منیجر تھا اور اُسے ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ ساتھ ہی اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اس نوکری کو جلد ہی چھوڑ دے گا کیونکہ اُسے فلائینگ کا شوق تھا۔ وہ ایک ایکسپرٹ اے کلاس پائلٹ تھا لیکن ماں کے کہنے پر اُس نے فلائینگ چھوڑ کر یہ نوکری کر لی تھی۔

وہ مجھے اپنی کار میں میرے گھر تک چھوڑنے آیا اور چند منٹ میرے یہاں بیٹھا رہا۔ اُس کی باتیں اتنی غیر سنجیدہ تھیں کہ مجھے شک ہوا کہ وہ کسی غیر ملکی فرم میں اتنا بڑا ایگزیکیٹو ہوسکتا ہے اور یہ شک جبھی مٹا جب میں اگلے دن اُس کے دفتر ہو آیا۔ باہر اتنا غیر سنجیدہ اور لڑکپن کی سی عادتوں کا مالک دنیش اندر ایک فرم کے ایگزیکیٹو کی حیثیت سے بے حد سنجیدہ تھا۔ اُس کی سٹینو ایک نوجوان خوبصورت لڑکی تھی لیکن دنیش اندر کا اُس کے اور دوسرے ماتحتوں کے ساتھ سلوک پُر متانت، سنجیدہ اور بارعب تھا۔ دنیش اندر وہاں بے حد مصروف معلوم ہوتا تھا اور میں زیادہ دیر نہ بیٹھا۔ دوسرے یہاں آکر مجھ میں اور دنیش اندر میں جو فرق تھا وہ زیادہ نمایاں ہوگیا اور میں احساسِ کمتری کا شکار ہوکر جلد ہی وہاں سے چلا آیا۔

لیکن دنیش اندر ایک مخلص دوست تھا اور وہ ہر روز شام کو میرے پاس آجاتا

ہم دونوں کار میں اِدھر اُدھر گھومنے نکل جاتے۔ اُس کی عادت [illegible] کی ستی اور کناٹ پلیس میں دس پندرہ روپے خرچ [illegible] تھی۔ ایک دن میں نے اُس کی بینک کی کتاب دیکھی تو اُس میں [illegible] دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ اُس کا اپنا روپیہ [illegible] پائلٹ کے طور پر کام کر کے پانچ چھ برس میں کمایا تھا۔ وہ ایک [illegible] نوجوان تھا پھر بھی اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ دوسرے کبھی کبھی اُس کی باتوں سے مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ اپنے لاابالی پن اور کھلنڈرے پن کے باوجود وہ شاید ایک تنہا اور بہت بھٹکا ہوا انسان تھا۔ وہ اکثر مجھے کسی سنسان سڑک پر لے جاتا اور کار کے بونیٹ پر بیٹھ کر بے معنی سی فلسفیانہ باتیں کرتا رہتا۔ کافی فرق کے باوجود کئی باتوں میں میرا اور اُس کا زاویۂ نظر مل جاتا اور وہ زیادہ سے زیادہ مجھ سے وابستہ ہوتا چلا گیا۔ میں نے ایک دن اُس کی شادی کے بارے میں بھی ذکر کیا تو وہ ایک بے جان سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کوئی خاص بات تو نہیں لیکن کالج میں ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اُنیس بیس سال کی ہوگی اور میں ایک آدھ سال بڑا ہوں گا۔ نوجوانی کی یہ عمر [illegible] اور نادانی کی عمر بھی ہوتی ہے۔ خیر کچھ ایسا ہوا کہ ہماری شادی نہ ہو سکی اور میں نے اُسے بھول جانے کے لئے بی۔ اے کے بعد فلائینگ سیکھ لی تاکہ فضاؤں میں پرواز کر سکوں اور ہو سکے تو کبھی اُن فضاؤں میں ہی ہمیشہ کے لئے سو جاؤں۔ لیکن وہ بات تو اب آئی گئی ہو گئی۔ اُس لڑکی کو بھی اب میں تقریباً بھول ہی چکا ہوں۔ ماں بہت زور دے رہی ہے اِس لئے کوئی اچھی سی لڑکی مل گئی تو شادی بھی کر لوں گا۔"

"لڑکیوں کی تمہارے لئے کیا کمی ہے" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں یہ نوکری چھوڑ کر پھر پائلٹ بننا چاہتا ہوں۔ فضاؤں میں مجھے عجیب سکون ملتا ہے۔ اب جس کی زندگی فضاؤں کی ہو تو وہ دھرتی پر اپنی [illegible] کیا سجائے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ لڑکیاں پائلٹ سے شادی کرتے گھبراتی ہیں اور میں تو پائلٹ ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

"آج کل کی لڑکیاں تو" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بڑی دلیر ہیں۔ فضاؤں میں پرواز کرنے والی لڑکیوں کی بھی کمی نہیں۔ کتنے ہی اچھے گھرانوں کی [illegible] ہیں۔"

"ہاں لیکن ——— " تم چھوڑو اِس بات کو" یہ [illegible] اور بات چھیڑ دی۔

کچھ ہی دنوں کے بعد اچانک دنیش اندر نے یہ خبر سنائی کہ اُس نے [illegible] فرم کی نوکری چھوڑ دی ہے اور برما جا رہا ہے۔ وہ ایک ایئر ویز میں [illegible] پائلٹ کے طور پر تین ہزار روپے ماہوار پہ [illegible] وغیرہ کا

...کی شام کو جہاز کی چھٹی سے جا رہا تھا۔ میں اس خبر کو سن کر قدرتی طور پر اداس ... دینش اندر سے اب اتنا لگاؤ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ہی گھر کا ایک فرد معلوم ہوتا تھا ... اب پتہ نہیں وہ کب لوٹے گا اور اس کی ہنستی بولتی زندگی کبھی سنائی دے گی ... اپنی ماں کو بھی ساتھ نہیں لے جا رہا تھا۔

دینش اندر برما چلا گیا۔ کوئی سال بھر ہو گیا۔ نہ اس نے مجھے کوئی چٹھی بھیجی نہ خود ... لئے ایک خط لکھا بھی لیکن جواب نہ آیا۔ یوں بھی خط و کتابت کے معاملے میں ہم دونوں ... سست تھے۔ اگرچہ جب وہ یہاں تھا تو تقریباً ہر شام کو میرے گھر آ جاتا تھا لیکن میرا ... یہاں جانے کا اتفاق ایک ہی آدھ بار ہوا تھا۔ جب گیا بھی تو اس کی ماں سے جو ... الگ تھلگ رہا کرتی تھی کبھی بات چیت کا موقع نہ ملا۔ ... دینش اندر کے بارے ... لگانے کے لئے میں اس کے گھر بھی نہ گیا۔ ان حالات میں اس سے وہ ... جو ملاقاتیں ... تھیں اور جو خوشگوار شامیں اس کے ساتھ گزری تھیں وہ بس ایک ... ہو ... ... تھیں

اور ایک دن شام کو جب دینش اندر سے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، وہ ... پھر سے ... کچھ ہی فاصلے پر مجھے مل گیا۔ اچانک سے نہری میں ایک کار بہت تیزی سے میرے پیچھے آئی اور ... نے ہی والی تھی کہ میں تقریباً چیخ مار کر پٹری پر چڑھ گیا ... دیکھتا ہوں دینش اندر ... اور وہ اس میں بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اس کمبخت کا لڑکپن اور چھیڑ کی عادت ... نہیں گئی تھی۔ اس کی کار تقریباً میری ایڑیوں کو چھوتی ہوئی رکی تھی ورنہ میری تو جان ہی ... گئی تھی۔ میں کار میں بیٹھا اور ہم دونوں گھر چلے آئے۔ برما میں ایرویز کی نوکری وہ چھوڑ آیا ... اور اس کی وجہ اس کی ماں تھی جس نے برما جانے سے انکار کر دیا تھا اور ملازمت چھوڑے ... دلی نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بولا۔

"دوست! لیکن میں فلائینگ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فضا میں اڑ جانا اور پھر ان میں ... جانا یہ تو میرا عہد ہے۔ میں نے یہاں ایک اور ایرویز جائن کر لی ہے۔ یہ دلی سے کٹھمنڈو ... پرواز ہے۔ ہر تیسرے دن جاتا اور لوٹ آتا۔"

دینش اندر کا یہ عقیدہ تھا کہ کسی جہاز کا گر جانا اتنا ہی ناممکن یا غیر اغلب ہے جتنا ... ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آدمیوں کی ایک ساتھ ہی حرکت قلب کا بند ہو جانا۔ کوئی ایک ... کی بات ہے، ایک دن دینش اندر مجھ سے بولا۔

"دینش! میں تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ تم ایم۔اے ہو۔ اتنے قابل ہو ... کلرکی کرتے ہو۔ لوگ یہاں پرائیویٹ کالج کھول کر ہزاروں روپے کماتے ہیں۔ تم میرا ... اور ایک کالج کھول لو۔ بولو ہاں کرتے ہو تو میں پیسہ لگانے کو تیار ہوں۔"

دینش اندر نے مجھے بہت زور دیا۔ اس کے پاس پیسے کی کمی تو تھی ہی نہیں۔ اسے کسی ... سوچنے کی دیر ہوتی تھی اور روپے بے تحاشا خرچ کرنے لگتا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھے بغیر

# محفل

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا ——— جگر مراد آبادی

اٹھیے تو کہاں جایئے جو کچھ ہے یہیں ہے
باہر تری محفل سے تو دنیا ہے نہ دیں ہے ——— تنہا مجددی

رقیبوں کا تری محفل میں کیا کام
جہنم ان سے بھجوائے تو اچھا ——— داغ

نہ وہ منکر خدا کے ہیں نہ جنت کے نہ دوزخ کے
یہ کیا کچھ دیکھ آئے تیری محفل دیکھنے والے ——— بسمل سعیدی

گرچہ ہے کس کس برائی سے، ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے ——— غالب

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ ہتکاری، ایم۔اے، کلکتہ

ایک بڑی عمارت بیس ہزار روپے پگڑی دے کر چار سو روپے ماہوار کرایہ پر لے لی۔ فوراً فرنیچر بننے کے لئے دے دیا۔ ایک ریٹائرڈ پرنسپل اور دو تین پروفیسروں کو رکھ لیا۔ روزانہ اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات دے اور کوئی بیس پچیس ہی دن میں ہمارا "ماڈرن کالج" کوئی پچیس ہزار روپے خرچ کرنے کے بعد شروع ہو گیا۔ میرا نوکری چھوڑنے کا ابھی سوال ہی نہ تھا لیکن میں نے اس میں پڑھانا شروع کر دیا۔ ویسے ہم دونوں کالج کے مالک تھے۔

اس کالج کا کیا بنا اور اس میں دینش اندر کا کتنا روپیہ اور لگا، یہ بات میری اور دینش اندر کی زندگی میں یا ہمارے آپس کے رشتے میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ تیس چالیس ہزار روپے کا نقصان اس کے لئے کوئی بڑی بات بھی نہیں تھی کیونکہ اتنا روپیہ تو وہ دو تین ہی سال میں کما لیتا تھا لیکن اس کالج کی زندگی میں جو خاص بات تھی وہ سیما کا آنا تھا۔ ایک دن میں اور دینش اندر کالج کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خوبصورت لڑکی آئی۔ اس لڑکی نے ہسٹری میں ایم۔اے کیا تھا اور وہ ہمارے کالج میں لیکچرر ہونا چاہتی تھی۔ یہ لڑکی سیما بہت خوبصورت تھی۔ بالکل دھنک کے رنگوں کی طرح اور کسی کمان ہی کی طرح اس کا لچکیلا جسم تھا چہرے پر اتنی کشش تھی کہ میں اور دینش اندر دیکھتے رہ گئے۔ وہ ذہین معلوم ہوتی تھی اور اس کی انگریزی بولنے کی روانی اور لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کانونٹ کی پڑھی ہوئی ہے۔ ویسے بھی وہ کسی امیر گھرانے کی فیشن ایبل لڑکی معلوم ہوتی تھی اور اس نے ہمیں بتایا کہ وہ صرف کچھ تجربہ حاصل کرنے اور وقت گزارنے کے لئے ہمارے کالج میں پڑھانا چاہتی تھی۔ ہم نے سیما کو رکھ لیا۔

# جوانی

کیا جوانی پھرتی ہے جوبن پہ اِترائی ہوئی
ٹھوکریں کھلوائے گی یہ چال اِٹھلائی ہوئی ——— امیر مینائی

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک ——— فانی

منھ پھیر کے یوں گئی جوانی
یاد آگیا رُوٹھنا کسی کا ——— فانی

تہلکے ڈال دیتی ہے فضائے آسمانی میں
محبت جب خدا کا نام لیتی ہے جوانی میں ——— سیاب اکبرآبادی

ہر گام دلِ عرش دہلتا ہے دَھمک سے
جب فرشِ نزاکت پہ بھی چلتی ہے جوانی ——— بسمل سعیدی

مرسلہ:- ایس۔ ایس۔ ہتکاری، ایم۔ اے۔ کلکتہ

بچے تھے اور وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک بڑی کوٹھی میں رہتک روڈ پر رہتا تھا۔ اُس کے پاس ب موریس کار تھی اور اُس کی ہر حرکت اور بات چیت سے ایک بے پروائی، لاابالی پن اور بے فکر امیر نوجوان کے اطوار جھلکتے تھے۔ وِیش اندر نے مجھے بتایا کہ وہ ایک بڑی انگریزی م میں ڈپٹی مینیجر تھا اور اُسے ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ ساتھ ہی اُس نے یہ ی بتایا کہ وہ اِس نوکری کو جلد ہی چھوڑ دے گا کیونکہ اُسے فلائینگ کا شوق تھا۔ وہ ایک پہرٹ لے کلاس پائلٹ تھا لیکن ماں کے کہنے پر اُس نے فلائینگ چھوڑ کر یہ نوکری کر لی تھی۔

وہ مجھے اپنی کار میں میرے گھر تک چھوڑنے آیا اور چند منٹ میرے یہاں بیٹھا ۔ اُس کی باتیں اِتنی غیر سنجیدہ تھیں کہ مجھے شک ہوا کہ وہ کسی غیر ملکی فرم میں اِتنا بڑا ؍یکیٹو ہو سکتا ہے اور یہ شک جبھی مٹا جب میں اگلے دن اُس کے دفتر جا آیا۔ باہر اِتنا ؍نجیدہ اور لڑکپن کی سی عادتوں کا مالک وِیش اندر ایک فرم کے ایگزیکیٹو کی حیثیت ؍ بے حد سنجیدہ تھا۔ اُس کی سٹینو ایک نوجوان خوبصورت لڑکی تھی لیکن وِیش اندر کا ؍ کے اور دوسرے ماتحتوں کے ساتھ سلوک پُر متانت سنجیدہ اور بارعب تھا۔ وِیش اندر ؍ بے حد مصروف معلوم ہوتا تھا اور میں زیادہ دیر نہ بیٹھا۔ دوسرے یہاں آکر مجھ میں اور ؍ اندر میں جو فرق تھا وہ زیادہ نمایاں ہو گیا اور میں احساسِ کمتری کا شکار ہو کر جلد وہاں سے چلا آیا۔

لیکن وِیش اندر ایک خلو ... [illegible]

اور ہم دونوں کار میں اِدھر اُدھر گھومنے نکل جاتے۔ اُس کی عادت کھانے پینے اور خرچ کرنے کی سخی اور کناٹ پلیس میں دس پندرہ روپے ہر روز خرچ کر دینا اُس کے لئے معمولی بات تھی۔ ایک دن میں نے اُس کی بینک کی کتاب دیکھی تو اُس میں پچھتر ہزار روپے بیلنس دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ اُس کا اپنا روپیہ تھا جو اُس نے ایک غیر ملکی ایرویز میں پائلٹ کے طور پر کام کر کے پانچ چھ برس میں کمایا تھا۔ وہ ایک حسین اور دولتمند نوجوان تھا پھر بھی اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ دوسرے کبھی کبھی اُس کی باتوں سے مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ اپنے لاابالی پن اور کھلنڈرے پن کے باوجود وہ شاید ایک تنہا اور بہت بھٹکا ہوا انسان تھا۔ وہ اکثر مجھے کسی سنسان سڑک پر لے جاتا اور کار کے بونیٹ پر بیٹھ کر بے معنی سی فلسفیانہ باتیں کرتا رہتا۔ کافی فرق کے باوجود کئی باتوں میں میرا اور اُس کا زاویہ نظر مل جاتا اور وہ زیادہ سے زیادہ مجھ سے وابستہ ہوتا چلا گیا۔ میں نے ایک روز اُس سے اُس کی شادی کے بارے میں بھی ذکر کیا تو وہ ایک بے جان سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کوئی خاص بات تو نہیں لیکن کالج میں ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اُنیس بیس سال کی ہوگی اور میں ایک آدھ سال بڑا ہوں گا۔ نوجوانی کی یہ عمر غیر ذمّےداری اور نادانی کی عمر بھی ہوتی ہے۔ خیر کچھ ایسا ہوا کہ ہماری شادی نہ ہو سکی اور میں نے اُسے بھول لینے کے لئے بی۔ اے کے بعد فلائینگ سیکھ لی تاکہ فضاؤں میں پرواز کر سکوں اور ہو سکے تو کبھی اُن فضاؤں میں ہی ہمیشہ کے لئے سو جاؤں۔ لیکن وہ بات تو اب آئی گئی ہو گئی۔ اُس لڑکی کو بھی اب میں تقریباً بھول ہی چکا ہوں۔ ماں بہت زور دے رہی ہے اِس لئے کوئی اچھی سی لڑکی مل گئی تو شادی بھی کر لوں گا۔"

"لڑکیوں کی تمہارے لئے کیا کمی ہے"، میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں یہ نوکری چھوڑ کر پھر پائلٹ بننا چاہتا ہوں۔ فضاؤں میں مجھے عجیب سکون ملتا ہے۔ اب جس کی زندگی فضاؤں کی ہو تو وہ دھرتی پر اپنی گھر داری کیا سجائے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ لڑکیاں پائلٹ سے شادی کرتے گھبراتی ہیں اور میں تو پائلٹ ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

"آج کل کی لڑکیاں تو"، میں نے مسکراتے ہوئے کہا، "بڑی دلیر ہیں۔ فضاؤں میں پرواز کرنے والی لڑکیوں کی بھی کمی نہیں۔ کتنے ہی اچھے گھرانوں کی حسین لڑکیاں ایئر ہوسٹس ہیں۔"

"ہاں، لیکن ——— خیر چھوڑو اِس بات کو"، اُس نے ٹالتے ہوئے کہا اور کوئی اور بات چھیڑ دی۔

کچھ ہی دنوں کے بعد اچانک وِیش اندر نے یہ خبر سنائی کہ اُس نے فرم کی نوکری چھوڑ دی ہے اور برما جا رہا ہے۔ وہ ایک ایرویز میں جس کا ہیڈ کوارٹر رنگون میں تھا، کیپٹن

کر دیا تھا اور بدھ وار کی شام کو ہوائی جہاز سے جا رہا تھا۔ میں اِس خبر کو سُن کر قدرتی طور پر اداس ہوگیا کیونکہ دلیش اندر سے اب اِتنا لگاؤ ہوگیا تھا کہ وہ اپنے ہی گھر کا ایک فرد معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے اب پتہ نہیں وہ کب لوٹے گا اور اُس کی بھٹکی ہوئی زندگی کہیں سکون پا سکے گی یا نہیں۔ وہ ابھی اپنی ماں کو بھی ساتھ نہیں لے جا رہا تھا۔

دلیش اندر بمبئی چلا گیا۔ کوئی سال بھر ہوگیا۔ نہ اُس نے مجھے کوئی چٹھی بھیجی نہ خود آیا۔ میں نے اُسے ایک خط لکھا بھی لیکن جواب نہ آیا۔ یوں بھی خط و کتابت کے معاملے میں ہم دونوں ہی سُست تھے۔ اگرچہ جب وہ یہاں تھا تو تقریباً ہر شام کو میرے گھر آیا کرتا تھا لیکن میرا اُس کے یہاں جانے کا اتفاق ایک ہی آدھ بار ہوا تھا۔ جب گیا بھی تو اُس کی ماں سے، جو ایک کمرے میں الگ تھلگ رہا کرتی تھی کبھی بات چیت کا موقع نہ ملا۔ اِس لئے دلیش اندر کے بارے میں پتہ لگانے کے لئے میں اُس کے گھر کبھی نہ گیا۔ اِن حالات میں اُس سے دلّی میں جو ملاقات ہوگئی تھی اور جو خوشگوار شامیں اُس کے ساتھ گزر گئی تھیں وہ بس ایک حادثہ ہی معلوم ہوتی تھیں۔

اور ایک دن شام کو جب دلیش اندر میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، وہ پھر میرے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر مجھے مل گیا! اچانک بے خبری میں ایک کار بہت تیزی سے میرے پیچھے آئی اور مجھے کچلنے ہی والی تھی کہ میں تقریباً چیخ مار کر پٹری پر چڑھ گیا۔ مڑ کر کیا دیکھتا ہوں کہ دلیش اندر کی کار ہے! اور وہ اُس میں بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اُس کمبخت کا لڑکپن اور چھیڑ کی عادت ابھی تک نہیں گئی تھی۔ اُس کی کار تقریباً میری ایڑیوں کو چھوتی ہوئی رُکی تھی اور میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ میں کار میں بیٹھا اور ہم دونوں گھر چلے آئے۔ بمبئی میں ایروینز کی نوکری وہ چھوڑ آیا تھا اور اِس کی وجہ اُس کی ماں تھی جس نے بمبئی جانے سے انکار کر دیا تھا اور ملازمت چھوڑے بغیر وہ دلّی نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بولا۔

"دوست! لیکن میں فلائینگ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فضاؤں میں اُڑ جانا اور پھر اُن میں لوٹ جانا یہ تو میرا عہد ہے۔ میں نے یہاں ایک اور ایروینز جائن کر لی ہے۔ بس دلّی سے کھٹمنڈو تک کی پرواز ہے۔ ہر تیسرے دن جاتا اور لوٹ آتا ہوں۔"

دلیش اندر کا یہ عقیدہ تھا کہ کسی جہاز کا گر جانا اُتنا ہی ناممکن یا غیر اغلب ہے جتنا کہ دو ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آدمیوں کی ایک ساتھ ہی حرکت قلب بند ہو جانا! کوئی ایک مہینے بعد کی بات ہے، ایک دن دلیش اندر مجھ سے بولا۔

"رمیش! میں تمہارے بارے میں سوچا رہتا ہوں۔ تم ایم۔ اے ہو۔ اِتنے قابل ہو اور بے کار کلرکی کرتے ہو۔ لوگ یہاں پرائیویٹ کالج کھول کر ہزاروں روپے کما رہے ہیں۔ تم میرا کہنا مانو اور ایک کالج کھول لو۔ بولو ہاں کرتے ہو تو میں پیسہ لگانے کو تیار ہوں۔"

دلیش اندر نے مجھے بہت زور دیا۔ اُس کے پاس پیسے کی کمی تو تھی ہی نہیں۔ اُسے کسی خیال کے سوجھنے کی دیر ہوتی تھی اور وہ بے تحاشا خرچ کرنے لگتا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھے بغیر ایک بڑی عمارت بیس ہزار روپے پگڑی دے کر چار سو روپے ماہوار کرایہ پر لے لی۔ فوراً فرنیچر بننے کے لئے دے دیا۔ ایک ریٹائرڈ پرنسپل اور دو تین پروفیسروں کو رکھ لیا۔ روزانہ اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات دیئے اور کوئی بیس پچیس ہی دن میں ہمارا "ماڈرن کالج" کوئی پچیس ہزار روپے خرچ کرنے کے بعد شروع ہوگیا۔ میرا نوکری چھوڑنے کا ابھی سوال ہی نہ تھا لیکن میں نے انگریزی پڑھانا شروع کر دیا۔ ویسے ہم دونوں کالج کے مالک تھے۔

اُس کالج کا کیا بنا اور اُس میں دلیش اندر کا کتنا روپیہ اور لگا، یہ بات میری اور دلیش اندر کی زندگی میں یا ہمارے آپس کے رشتے میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ تیس چالیس ہزار روپے کا نقصان اُس کے لئے کوئی بڑی بات بھی نہیں تھی کیونکہ اِتنا روپیہ تو وہ دو تین ہی سال میں کما لیتا تھا لیکن اُس کالج کی زندگی میں جو خاص بات تھی وہ سیما کا آنا تھا۔ ایک دن میں اور دلیش اندر کالج کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خوبصورت لڑکی آئی۔ اُس لڑکی نے ہسٹری میں ایم۔ اے کیا تھا اور وہ ہمارے کالج میں لیکچرر ہونا چاہتی تھی۔ یہ لڑکی سیما بہت خوبصورت تھی۔ بالکل دھنک کے رنگوں کی طرح اور کسی کمان ہی کی طرح اُس کا لچکیلا جسم تھا۔ چہرے پر اِتنی کشش کہ میں اور دلیش اندر دیکھتے رہ گئے۔ وہ ذہین معلوم ہوتی تھی اور اُس کی انگریزی بولنے کی روانی اور لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کانونٹ کی پڑھی ہوئی ہے۔ ویسے بھی وہ کسی امیر گھرانے کی فیشن ایبل لڑکی معلوم ہوتی تھی اور اُس نے ہمیں بتایا کہ وہ صرف کچھ تجربہ حاصل کرنے اور وقت گزارنے کے لئے ہمارے کالج میں پڑھانا چاہتی تھی۔ ہم نے سیما کو رکھ لیا۔

# محفل

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا ——— جگر مرادآبادی

اٹھیے تو کہاں جایئے جو کچھ ہے یہیں ہے
باہر تری محفل سے تو دُنیا ہے نہ دیں ہے ——— تنہا مجددی

رقیبوں کا تری محفل میں کیا کام
جہنم اِن سے بھر جائے تو اچھا ——— داغ

نہ دو منکرِ خدا کے ہیں نہ جنت کے نہ دوزخ کے
یہ کیا کچھ دیکھ آئے تیری محفل دیکھنے والے ——— بسمل سعیدی

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے، ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے ——— غالب

مرسلہ:۔ ایس۔ ایس۔ ہتکاری، ایم۔ اے، کلکتہ

# جوانی

کیا جوانی پھرتی ہے جوبن پہ اِترائی ہوئی
ٹھوکریں کھلوائے گی یہ چال اِٹھلائی ہوئی ——— امیر مینائی

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک ——— فانی

مُنھ پھیر کے یوں گئی جوانی
یاد آگیا رُوٹھنا کسی کا ——— فانی

تھکے ڈال دیتی ہے فضائے آسمانی میں
محبت جب خدا کا نام لیتی ہے جوانی میں ——— سیماب اکبرآبادی

ہر گام دلِ عرش دہلتا ہے دھمک سے
جب فرشِ نزاکت پہ بھی چلتی ہے جوانی ——— بسمل سعیدی

مرسلہ:- ایس۔ زیس۔ ہتکاری، ایم۔ اے۔ کلکتہ

ے تھے اور وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک بڑی کوٹھی میں رہتک روڈ پر رہتا تھا۔ اُس کے پاس
موریس کار تھی اور اُس کی ہر حرکت اور بات چیت سے ایک بے پروائی، لاأبالی پن اور
بے فکر امیر نوجوان کے اطوار جھلکتے تھے۔ ویش اندر نے مجھے بتایا کہ وہ ایک بڑی انگریزی
میں ڈپٹی منیجر تھا اور اُسے ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ ساتھ ہی اُس نے یہ
بتایا کہ وہ اِس نوکری کو جلد ہی چھوڑ دے گا کیونکہ اُسے فلائنگ کا شوق تھا۔ وہ ایک
پرسٹ کلاس پائلٹ تھا لیکن ماں کے کہنے پر اُس نے فلائنگ چھوڑ کر یہ نوکری کر لی تھی۔

وہ مجھے اپنی کار میں میرے گھر تک چھوڑنے آیا اور چند منٹ میرے یہاں بیٹھا
۔ اُس کی باتیں اِتنی غیر سنجیدہ تھیں کہ مجھے شک ہوا کہ وہ کسی غیر ملکی فرم میں اِتنا بڑا
زیکیٹو ہو سکتا ہے اور یہ شک تبھی مٹا جب میں اگلے دن اُس کے دفتر ہو آیا۔ باہر اِتنا
سنجیدہ اور لڑکپن کی سی عادتوں کا مالک ویش اندر ایک فرم کے ایگزیکیٹو کی حیثیت
بے حد سنجیدہ تھا۔ اُس کی سٹینو ایک نوجوان خوبصورت لڑکی تھی لیکن ویش اندر کا
کے اور دوسرے ماتحتوں کے ساتھ سلوک پُر متانت، سنجیدہ اور بارعب تھا۔ ویش اندر
اِن بے حد مصروف معلوم ہوتا تھا اور میں زیادہ دیر نہ بیٹھا۔ دوسرے یہاں آکر مجھ میں اور
یش اندر میں جو فرق تھا وہ زیادہ نمایاں ہوگیا اور میں احساسِ کمتری کا شکار ہو کر جلد
وہاں سے چلا آیا۔

لیکن ویش اندر ایک مخلص دوست تھا اور وہ ہر روز شام کو میرے پاس آجاتا
اور ہم دونوں کار میں اِدھر اُدھر گھومنے نکل جاتے۔ اُس کی عادت کھلنے پینے اور خرچ
کرنے کی تھی اور کناٹ پلیس میں دس پندرہ روپے ہر روز خرچ کر دینا اُس کے لئے معمولی
بات تھی۔ ایک دن میں نے اُس کی بینک کی کتاب دیکھی تو اُس میں پچھتر ہزار کا بیلنس دیکھ کر
بہت حیران ہوا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ اُس کا اپنا روپیہ تھا جو اُس نے ایک غیر ملکی ایرویز میں
پائلٹ کے طور پر کام کر کے پانچ چھ برس میں کمایا تھا۔ وہ ایک حسین اور دولتمند نوجوان
تھا پھر بھی اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ دوسرے کبھی کبھی اُس کی باتوں سے مجھے
یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ اپنے لاأبالی پن اور کھلنڈرے پن کے باوجود وہ شاید ایک تنہا اور
بہت بھٹکا ہوا انسان تھا۔ وہ اکثر مجھے کسی سنسان سڑک پر لے جاتا اور کار کے بونیٹ پر
بیٹھ کر بے معنی سی فلسفیانہ باتیں کرتا رہتا۔ کافی فرق کے باوجود کئی باتوں میں میرا اور اُس کا
زاویۂ نظر مل جاتا اور وہ زیادہ سے زیادہ مجھ سے وابستہ ہوتا چلا گیا۔ میں نے ایک روز اُس سے
اُس کی شادی کے بارے میں بھی ذکر کیا تو وہ ایک بے جان سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کوئی خاص بات تو نہیں لیکن کالج میں ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ
اُنیس بیس سال کی ہوگی اور میں ایک آدھ سال بڑا ہوں گا۔ نوجوانی کی یہ عمر غیر ذمے داری
اور نادانی کی عمر بھی ہوتی ہے۔ خیر کچھ ایسا ہوا کہ ہماری شادی نہ ہو سکی اور میں نے اُسے
بھول لینے کے لئے بی۔ اے کے بعد فلائنگ سیکھ لی تاکہ فضاؤں میں پرواز کر سکوں اور ہو سکے
تو کبھی اُن فضاؤں میں ہی ہمیشہ کے لئے سو جاؤں۔ لیکن وہ بات تو اب آئی گئی ہو گئی۔ اُس
لڑکی کو بھی اب میں تقریباً بھول ہی چکا ہوں۔ ماں بہت زور دے رہی ہے اِس لئے کوئی
اچھی سی لڑکی مل گئی تو شادی بھی کر لوں گا۔"

"لڑکیوں کی تمہارے لئے کیا کمی ہے؟" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں یہ نوکری چھوڑ کر پھر پائلٹ بننا چاہتا ہوں۔ فضاؤں میں
مجھے عجیب سا سکون ملتا ہے۔ اب جس کی زندگی فضاؤں کی ہو تو وہ دھرتی پر اپنی گھر داری
کیا سجائے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ لڑکیاں پائلٹ سے شادی کرتے کچھ گھبراتی ہیں اور میں
تو پائلٹ ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

"آج کل کی لڑکیاں تو،" میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "بڑی دلیر ہیں۔ فضاؤں میں
پرواز کرنے والی لڑکیوں کی بھی کمی نہیں۔ کتنے ہی اچھے گھرانوں کی حسین لڑکیاں ایئر ہوسٹس
ہیں۔"

"ہاں، لیکن ——— خیر چھوڑو اِس بات کو۔" اُس نے ٹالتے ہوئے کہا اور کوئی
اور بات چھیڑ دی۔

کچھ ہی دنوں کے بعد اچانک ویش اندر نے یہ خبر سنائی کہ اُس نے فرم کی نوکری
چھوڑ دی ہے اور برما جا رہا ہے۔ وہ ایک ایرویز میں جس کا ہیڈ کوارٹر رنگون میں تھا ٹیسٹ
پائلٹ کے طور پر تین ہزار روپے ماہوار پر نوکر ہو گیا تھا۔ اُس نے پاسپورٹ وغیرہ کا انتظام

کر لیا تھا اور بدھ وار کی شام کو ہوائی جہاز سے جا رہا تھا۔ میں اِس خبر کو سُن کر قدرتی طور پر اُداس ہو گیا کیونکہ دلیش اندر سے اب اِتنا لگاؤ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ہی گھر کا ایک فرد معلوم ہوتا تھا۔ وہ برما سے اب پتہ نہیں وہ کب لوٹے گا اور اُس کی سنگتی جیسی زندگی کبھی مل سکے گی یا نہیں۔ وہ ابھی اپنی ماں کو بھی ساتھ نہیں لے جا رہا تھا۔

دلیش اندر برما چلا گیا۔ کوئی سال بھر ہو گیا۔ نہ اُس نے مجھے کوئی چٹھی بھیجی نہ خود آیا۔ میں نے اُسے ایک خط لکھا بھی لیکن جواب نہ آیا۔ یوں بھی خط و کتابت کے معاملے میں ہم دونوں زیادہ سست تھے۔ اگرچہ جب وہ یہاں تھا تو تقریباً ہر شام کو میرے گھر آ جاتا تھا لیکن میرا اُس کے یہاں جانے کا اتفاق ایک ہی آدھ بار ہوا تھا۔ جب گیا بھی تو اُس کی ماں سے، جو ایک کمرے میں الگ تھلگ رہا کرتی تھی کبھی بات چیت کا موقع نہ ملا۔ اِس لئے دلیش اندر کے بارے میں پتہ لگانے کے لئے میں اُس کے گھر بھی نہ گیا۔ اِن حالات میں اُس سے دوری بھی جو طبعی بات ہو گئی تھی اور جو خوشگوار شامیں اتنے ساتھ گزر گئی تھیں وہ بس ایک حادثہ ہی معلوم ہوتی تھیں۔

اور ایک دن شام کو جب دلیش اندر میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، وہ پھر میرے گھر پہنچ ہی گیا۔ وہ پر مجھے مل گیا! چانک بے خبری میں ایک کار بہت تیزی سے میرے پیچھے آئی اور مجھے چھونے ہی والی تھی کہ میں تقریباً چیخ مار کر پٹری پر چڑھ گیا۔ مڑ کر کیا دیکھتا ہوں دلیش اندر ہے! اور وہ اُس میں بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اُس کمبخت کا لڑکپن اور چھیڑ کی عادت ابھی تک نہیں گئی تھی۔ اُس کی کار تقریباً میری ایڑیوں کو چھوتی ہوئی رکی تھی اور میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ میں کار میں بیٹھا اور ہم دونوں گھر چلے آئے۔ برما میں اُس کا دل نہ لگا، وہ چھوڑ آیا تھا۔ اِس کی وجہ اُس کی ماں تھی جس نے برما جانے سے انکار کر دیا تھا۔ ملازمت چھوڑے بغیر وہ دلّی نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بولا۔

" دوست! میں فلائینگ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فضا میں اُڑ جانا اور پھر اُن میں لوٹ جانا یہ تو میرا عہد ہے۔ میں نے یہاں ایک اور ایروپلین کمپنی جوائن کر لی ہے۔ بس دلّی سے کٹھمنڈو تک کی پرواز ہے۔ ہر تیسرے دن جاتا اور لوٹ آتا ہوں۔"

دلیش اندر کا یہ عقیدہ تھا کہ کسی جہاز کا گر جانا اُتنا ہی ناممکن یا غیر اغلب ہے جتنا کہ روڈ پر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آدمیوں کی ایک ساتھ ہی حرکتِ قلب کا بند ہو جانا! کوئی ایک مہینے بعد کی بات ہے، ایک دن دلیش اندر مجھ سے بولا۔

" رمیش! میں تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ تم ایم۔ اے ہو۔ اِتنے قابل ہو۔ اور بے کار کلرکی کرتے ہو۔ لوگ یہاں پرائیویٹ کالج کھول کر ہزاروں روپے کما لیتے ہیں۔ تم میرا کہنا مانو اور ایک کالج کھول لو۔ بولو ہاں کرتے ہو تو میں پیسہ لگانے کو تیار ہوں۔"

دلیش اندر نے مجھے بہت زور دیا۔ اُس کے پاس پیسے کی کمی تو تھی ہی نہیں۔ کسی خیال کے سوجھنے کی دیر ہوتی تھی اور وہ بے تحاشا خرچ کرنے لگتا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھے بغیر

# محفل

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا ــــ جگر مرادآبادی

اُٹھئیے تو کہاں جائیے جو کچھ ہے یہیں ہے
باہر تری محفل سے تو دُنیا ہے نہ دیں ہے ــــ شہا مجددی

رقیبوں کا تری محفل میں کیا کام
جہنم اِن سے بھر جائے تو اچھا ــــ داغ

نہ دوزخ کے [illegible] نہ جنت کے نہ دوزخ کے
یہ کیا کچھ دیکھ آئے تیری محفل دیکھنے والے ــــ بسمل سعیدی

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے ــــ غالب

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ ہتکاری، ایم۔ اے، کلکتہ

ایک بڑی عمارت بیس ہزار روپے پگڑی دے کر چار سو روپے ماہوار کرایہ پر لے لی۔ فوراً فرنیچر بننے کے لئے دے دیا۔ ایک ریٹائرڈ پرنسپل اور دو تین پروفیسروں کو رکھ لیا۔ روزانہ اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات دئے اور کوئی تیس پچیس ہی دن میں ہمارا " ماڈرن کالج " کوئی پچیس ہزار روپے خرچ کرنے کے بعد شروع ہو گیا۔ میرا نوکری چھوڑنے کا ابھی سوال ہی نہ تھا لیکن میں نے اُس میں پڑھانا شروع کر دیا۔ ویسے ہم دونوں کالج کے مالک تھے۔

اِس کالج کو کھولا گیا اور اُس میں دلیش اندر کا کتنا روپیہ اور لگا، یہ بات میری اور دلیش اندر کی زندگی میں یا ہمارے آپس کے رشتے میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تیس چالیس ہزار روپے کا نقصان اُس کے لئے کوئی بڑی بات بھی نہیں تھی کیونکہ اتنا روپیہ تو وہ دو تین ہی سال میں کما لیتا تھا لیکن اُس کالج کی زندگی میں جو خاص بات تھی وہ سیما کا آنا تھا۔ ایک دن میں اور دلیش اندر کالج کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خوبصورت لڑکی آئی۔ اُس لڑکی نے ہسٹری میں ایم۔ اے کیا تھا اور وہ ہمارے کالج میں لیکچرر ہونا چاہتی تھی۔ یہ لڑکی سیما بہت خوبصورت تھی۔ بالکل دھنک کے رنگوں کی طرح اور کسی کمان ہی کی طرح اُس کا لچکیلا جسم تھا۔ چہرے پر اتنی نشش کہ میں اور دلیش اندر دیکھتے رہ گئے۔ وہ ذہین معلوم ہوتی تھی اور اُس کی انگریزی بولنے کی روانی اور لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کانونٹ کی پڑھی ہوئی ہے۔ ویسے بھی وہ کسی امیر گھرانے کی فیشن ایبل لڑکی معلوم ہوتی تھی اور اُس نے ہمیں بتایا کہ وہ صرف کچھ تجربہ حاصل کرنے اور وقت گزارنے کے لئے ہمارے کالج میں پڑھانا چاہتی تھی۔ ہم نے سیما کو رکھ لیا۔

... اس وقت دو شخصوں میں چل رہا تھا اور سیما کو دونوں شخصوں میں کچھ پیر پڑے ملے ہوئے تھے۔ مجھے یہ محسوس کرنے میں دیر نہ لگی کہ سیما اور دلیش اندر ایک دوسرے کی طرف کھنچ رہے ہیں۔ دلیش اندر ویسے تو ایک خوبرو نوجوان تھا ہی مگر اب اُس کے چہرے پر ایک نئی ہی رونق تھی اور وہ ہر روز قیمتی سے قیمتی فیشن ایبل کپڑے پہن کر آتا یہی حال سیما کا تھا۔ وہ ایک لمبے قد، متناسب جسم اور ایک پُرکشش چہرے والی لڑکی تو تھی ہی مگر اس رومان نے اس کے چہرے کے گلابوں کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے چراغ زیادہ حسین ہوگئے تھے اور اس کا سارا جسم ایک خمار اور مستی میں ڈھل گیا تھا!

ایک روز دلیش اندر نے مجھ سے کالج کے دفتر میں کہا۔

"تم تو جانتے ہی ہو سیما مجھ سے محبت کرتی ہے۔ مجھے بھی وہ پسند ہے۔"

"میں جانتا ہوں" میں نے کہا "میرا خیال ہے تم سیما سے شادی کر لو۔"

"ہاں لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔ میرے فلائینگ کی وجہ سے ماں بڑی پریشان رہتی ہے۔ اگر سیما سے میں نے شادی کی تو میں ایرویز کی نوکری چھوڑ دوں گا اور پھر اُسی فرم میں چلا جاؤں گا۔ دوسرے مجھے یہ کالج کا کام کبھی بُرا نہیں لگا۔ سیما کو اس میں دلچسپی ہے۔ اس میں اور روپیہ لگا کر اور ایک نئی بلڈنگ لے کر اسے بڑھا لیں گے۔ میں فلائینگ صرف اس لئے چھوڑنا چاہتا ہوں کہ ماں کے دل کو سکون مل جائے۔ اُن کا بڑھاپا ہے اور میں اُن کا اکلوتا بیٹا ہوں۔"

میں نے یونہی مذاق سے کہا "اور وہ تمہارے عہد کا کیا ہوگا، فضاؤں سے اُتر کر پھر فضاؤں میں لوٹ جانے کا؟"

وہ ہنس پڑا اور اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس سے کوئی ایک ہفتہ بعد کی بات ہے۔ صبح ہی اخبار کے پہلے صفحے پر یہ خبر پڑھی کہ کل نیپال کی ترائی میں ہندوستان سے شام کو اُڑنے والے طیارے کے انجن میں اچانک کوئی شدید گڑبڑ ہوگئی مگر جہاز کے کپتان دلیش اندر نے بڑی ہوشیاری اور حوصلے سے کام لے کر جہاز کو ایک محفوظ جگہ پر اتار لیا اور سارے مسافر محفوظ ہیں۔ شام کو دلیش اندر کے آنے کا انتظار رہا۔ وہ کوئی سات بجے آگیا۔ وہ حسب معمول خوش و خرم تھا اور اُس کے چہرے پر اس واقعے کی ذرا سی بھی پریشانی نہیں تھی۔ وہ، سیما اور میں کناٹ پلیس گئے۔ گھومتے پھرے اور دلیش اندر سے اس حادثے کی تفصیل سُنتے رہے۔ سیما کو آج اپنے دلیش اندر پر بڑا فخر تھا اور وہ اُس کی طرف بار بار ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جن میں توصیف اور عقیدت کے چراغ جل رہے تھے۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور فضاؤں کے شہزادے کو فضاؤں کی ہی گود میں ... نیپال کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا اور سارے مسافر اور جہاز کا عملہ ہلاک ہوگیا۔ جن کی جانیں گئی تھیں اُن میں سرِفہرست جہاز کے کپتان دلیش اندر کا نام تھا۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میرے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی!

میں اُس روز دفتر نہیں گیا۔ دن بھر دلیش اندر کے بارے میں سوچتا رہا اور کئی دفعہ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ شام کو صرف اس لئے کالج گیا کہ پرنسپل سے کہہ کر کالج بند کرا دوں اور سیما سے مل لوں۔ کالج میں طلباء کو دلیش اندر کے بارے میں یہ نہیں پتہ تھا کہ وہ پائلٹ تھا۔ یہ حقیقت سیما اور میرے علاوہ صرف پرنسپل کو معلوم تھی۔ اُن دونوں نے یہ خبر پڑھ لی تھی۔ سیما کی تو جیسے دنیا ہی کسی نے لُوٹ لی تھی۔

کالج میں طلباء کی رونق کے باوجود مجھے اُس کی ایک ایک اینٹ گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کالج کی رونق اور اس کے قیام میں ایک مخلص انسان کی دوستی اور بے غرضی گھلی ملی تھی۔ سیما ایک ... ہوا گلشن لگ رہی تھی۔ وہ کالج کے دفتر میں اپنا سر ... ہوئے بیٹھی تھی اور آنسو ... سب ہو رہے تھے۔ مجھے اچانک دلیش اندر کی بوڑھی ماں کا خیال آیا ... سی اٹھی۔ اُس کے غم اور دُکھ کو کون محسوس کر سکتا تھا ... تکمیل میں فضاؤں میں لوٹ کر فضاؤں کی گود میں ...



# غزل

اختر واصفی

آجا کہ یہ جہان ہے سُونا ترے بغیر — کم بخت دل کہیں نہیں لگتا ترے بغیر

اے رشکِ مہ خدا کے لئے اِک جھلک دِکھا — اندھیر ہو چلی ہے یہ دُنیا ترے بغیر

صورت دکھا کہ ہجر کی شب ختم ہو کہیں — ممکن نہیں ہے اِس کا سویرا ترے بغیر

[illegible] تو لطفِ مسرت حرام ہے — ہنسنا بھی ہے جہان میں رونا ترے بغیر

[illegible] تو نہ ہو — گلشن بھی ہے نگاہوں میں صحرا ترے بغیر

[illegible] اگر تو کیا — جینا نہیں ہے اب کوئی جینا ترے بغیر

[illegible] — بے سُود ہے جہان میں رہنا ترے بغیر

[illegible] — [illegible] ترے بغیر

[illegible] — دشوار ہو گیا ہے مرنا ترے بغیر

[illegible] — کوئی نہیں اب اِس کا مداوا ترے بغیر

[illegible] — دنیا ترے بغیر نہ عقبیٰ ترے بغیر

[illegible] — دیر و حرم میں رہتا ہے جھگڑا ترے بغیر

اختر ہوں گرچہ روشنی میری سرشت ہے — چاروں طرف ہے پھر بھی اندھیرا ترے بغیر

# نئی زبان

رضا نقوی واہی

کل اتفاق سے جانا پڑا اسمبلی میں — تھی ابتدا ابھی کاموں کی ہو رہے تھے سوال

کوئی سوال کسی ایک رکن نے جو کیا — جواب دینے کو اُٹھے وزیرِ نیک خصال

پڑھی انھوں نے کوئی چیز ایک پرچے سے — سُنا ہر اک نے مگر وائے شامتِ اعمال

جواب خاک کسی کی سمجھ میں آ نہ سکا — کئے گئے تھے کچھ ایسے ہی لفظ استعمال

نہ سادگیٔ عبارت نہ چاشنیٔ ادب — نہ دل فریبیٔ کاشی نہ جادوئے بنگال

خدا گواہ کہ چکرا گیا دماغ مرا — جواب سُن کے میں سمجھا کہ آ گیا بھونچال

زباں تھی کہ [illegible] — عُدوئے فہم رقیبِ خرد، جنوں تمثال

[illegible] — اندھیری رات [illegible]

بھرے ہوئے تھے [illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

بہت قریب سے [illegible] — اور اُس کے شور سے [illegible]

[illegible] — ہر ایک لفظ پہ یوں تھا کہ دماغ کا حال

تعصبات کے میدان میں بزعمِ خرد — کھلاڑیوں نے زباں کو بنا دیا فٹ بال

کچھ تو ہمارے کالج کی پڑھائی ہی اچھی تھی اور کچھ سیما کی وجہ سے کالج میں طلباء کا ایسا تانتا لگا کہ ایک دفعہ تو ہمیں محسوس ہوا کہ شاید ہمیں دوسری بلڈنگ بھی لینی پڑے۔ بہرحال سیما کی وجہ سے دلیش اندر جو شام کی فلائیٹ پر جاتا تھا اپنا زیادہ وقت کالج میں ہی گزارنے لگا اور شوقیہ اُس نے بھی ایک کلاس کو پڑھانا شروع کر دیا۔ کالج اِس وقت دو شفٹوں میں چل رہا تھا اور سیما کو دونوں شفٹوں میں کچھ پیریڈ ملے ہوئے تھے۔ مجھے یہ محسوس کرنے میں دیر نہ لگی کہ سیما اور دلیش اندر ایک۔ دوسرے کی طرف کھنچ رہے ہیں۔ دلیش اندر ویسے تو ایک خوبرو نوجوان تھا ہی مگر اب اُس کے چہرے پر ایک نئی ہی رونق تھی اور وہ ہر روز قیمتی سے قیمتی فیشن ایبل کپڑے پہن کر آتا۔ یہی حال سیما کا تھا۔ وہ ایک لمبے قد، متناسب جسم اور ایک پُرکشش چہرے والی لڑکی تو تھی ہی مگر اِس رومان نے اِس کے چہرے کے گلابوں کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے چراغ زیادہ حسین ہوگئے تھے اور اِس کا سارا جسم ایک خمار اور مستی میں ڈھل گیا تھا!

ایک روز دلیش اندر نے مجھ سے کالج کے دفتر میں کہا۔

"تم تو جانتے ہی ہو سیما مجھ سے محبت کرتی ہے۔ مجھے بھی وہ پسند ہے"

"میں جانتا ہوں" میں نے کہا "میرا خیال ہے تم سیما سے شادی کر لو"

"ہاں لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔ میرے فلائینگ کیریر کی وجہ سے ماں بڑی پریشان رہتی ہے اگر سیما سے میں نے شادی کی تو میں ایرویز کی نوکری چھوڑ دوں گا اور پھر اُسی فرم میں چلا جاؤں گا۔ دوسرے مجھے یہ کالج کا کام بھی بُرا نہیں لگا۔ سیما کو اِس میں دلچسپی ہے ہی۔ اِس میں اور روپیہ لگا کر اور ایک نئی بلڈنگ لے کر اِسے بڑھا لیں گے۔ میں فلائینگ صرف اِس لئے چھوڑنا چاہتا ہوں کہ ماں کے دل کو سکون مل جائے۔ اُن کا بڑھاپا ہے اور میں اُن کا اکلوتا بیٹا ہوں"

میں نے ایسے ہی مذاق سے کہا "اور وہ تمہارے عہد کا کیا ہوگا، فضاؤں سے اُتر کر پھر فضاؤں میں لوٹ جانے کا"

دلیش اندر ہنس پڑا اور اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اِس کے کوئی ایک ہفتے بعد کی بات ہے کہ صبح ہی اخبار کے پہلے صفحے پر یہ خبر پڑھی کہ کل نیپال کی ترائی میں ہندوستان سے شام کو اُڑنے والے طیارے کے انجن میں اچانک کوئی شدید گڑبڑ ہوگئی مگر جہاز کے کپتان دلیش اندر نے بڑی ہوشیاری اور حوصلے سے کام لے کر جہاز کو ایک محفوظ جگہ پر اُتار لیا اور سارے مسافر محفوظ ہیں۔ شام کو دلیش اندر کے آنے کا انتظار رہا۔ وہ کوئی سات بجے آگیا۔ وہ حسب معمول خوش و خرم تھا اور اُس کے چہرے پر اِس واقعے کی ذرا سی بھی پریشانی نہیں تھی۔ وہ، سیما اور میں کناٹ پلیس گئے۔ گھومے پھرے اور دلیش اندر سے اِس حادثے کی تفصیل سُنتے رہے۔ سیما کو آج اپنے دلیش اندر پر بڑا فخر تھا اور وہ اُس کی طرف بار بار ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جن میں توصیف اور عقیدت کے چراغ جل رہے تھے۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور فضاؤں کے شہزادے کو فضاؤں کی ہی گود میں لوٹ جانا اور سو جانا تھا۔ اِس واقعے کو گزرے مشکل سے پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ صبح سویرے اخبار کی پیشانی پر یہ منحوس خبر پڑھی کہ ہندوستان سے نیپال جانے والا کل شام کا طیارہ سخت طوفانی حالات میں گھِر کر نیپال کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا اور سارے مسافر اور جہاز کا عملہ ہلاک ہوگیا۔ جن کی جانیں گئی تھیں اُن میں سرِفہرست جہاز کے کپتان دلیش اندر کا نام تھا۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میرے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی!

میں اُس روز دفتر نہیں گیا۔ دن بھر میں دلیش اندر کے بارے میں سوچتا رہا اور کئی دفعہ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ شام کو صرف اِس لئے کالج گیا تاکہ پرنسپل سے کہہ کر کالج بند کرا دوں اور سیما سے مل لوں۔ کالج میں طلباء کو دلیش اندر کے بارے میں یہ نہیں پتہ تھا کہ وہ پائلٹ تھا۔ یہ حقیقت سیما اور میرے علاوہ صرف پرنسپل کو معلوم تھی۔ اُن دونوں نے یہ خبر پڑھ لی تھی۔ سیما کی تو جیسے دُنیا ہی کسی نے لوٹ لی تھی۔

کالج میں طلباء کی رونق کے باوجود مجھے اُس کی ایک ایک اینٹ گرتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اِس کالج کی رونق اور اِس کے قیام میں ایک مخلص انسان کی دوستی اور بے غرضی گھُلی ملی تھی۔ سیما ایک اُجڑا ہوا گلشن لگ رہی تھی۔ وہ کالج کے دفتر میں اپنا سر میز پر رکھے ہوئے بیٹھی تھی اور آنسو اُس کی بانہوں میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے اچانک دلیش اندر کی بوڑھی ماں کا خیال آیا اور میرے سینے میں ایک ہُوک سی اُٹھی۔ اُس کے غم اور دُکھ کو کون محسوس کر سکتا تھا مگر فضاؤں کے پجاری کو نہ جانے کس عہد کی تکمیل میں فضاؤں میں لوٹ کر، فضاؤں کی گود میں ہی ہمیشہ کے لئے سو جانا تھا!!

---



# غزل

اختر واصفی

آجا کہ یہ جہان ہے سُونا ترے بغیر
کم بخت دل کہیں نہیں لگتا ترے بغیر

اے رشکِ مہ خدا کے لئے اِک جھلک دکھا
اندھیر ہو چلی ہے یہ دنیا ترے بغیر

صُورت دکھا کہ ہجر کی شب ختم ہو کہیں
ممکن نہیں ہے اِس کا سویرا ترے بغیر

جب تو نہیں تو لُطفِ مسرت حرام ہے
ہنسنا بھی ہے جہان میں رونا ترے بغیر

لُطفِ بہار کیا ہے جو پہلو میں تو نہ ہو
گُلشن بھی ہے نگاہوں میں صحرا ترے بغیر

اُمیدِ زندگی نہیں، ہو بھی اگر تو کیا
جینا نہیں ہے اب کوئی جینا ترے بغیر

کچھ کھا کے مر نہ جاؤں تو آخر میں کیا کروں
بے سُود ہے جہان میں رہنا ترے بغیر

کیا تُو نے کر دیا ہے مجھے، سُوجھتا نہیں
کھانا ترے بغیر، نہ پینا ترے بغیر

اٹکا ہے دم لبوں پہ ترے انتظار میں
دُشوار ہو گیا مجھے مرنا ترے بغیر

اے مرگ کس سے جا کے کہوں حالِ دردِ زیست
کوئی نہیں اب اِس کا مداوا ترے بغیر

دے جنتوں سے کوئی تو پھر بھی نہ لوں کبھی
دنیا ترے بغیر، نہ عقبیٰ ترے بغیر

پردہ اُٹھا کہ شیخ و برہمن گلے ملیں
دیر و حرم میں رہتا ہے جھگڑا ترے بغیر

اختر ہوں گرچہ روشنی میری سرشت ہے
چاروں طرف ہے پھر بھی اندھیرا ترے بغیر

# نئی زبان

رضا نقوی واہی

کل اتفاق سے جانا پڑا اسمبلی میں
تھی ابتدا ابھی کاموں کی ہو رہے تھے سوال

کوئی سوال کسی ایک رُکن نے جو کیا
جواب دینے کو اُٹھے وزیرِ نیک خصال

پڑھی انھوں نے کوئی چیز ایک پرچے سے
سُنا ہر اک نے مگر وائے شامتِ اعمال

جواب خاک کسی کی سمجھ میں آ نہ سکا
کئے گئے تھے کچھ ایسے ہی لفظ استعمال

نہ سادگیِ عبارت، نہ چاشنیِ ادب
نہ دل فریبیِ کاشی نہ جادوئے بنگال

خدا گواہ کہ چکرا گیا دماغ مرا
جواب سُن کے میں سمجھا کہ آگیا بھونچال

زبان تھی کہ پراچین کال کا جادو
عدوئے فہم رقیبِ خرد، جنوں تمثال

کرختگیِ تلفظ ارے معاذ اللہ
اندھری رات میں جیسے صدائے بوم و شغال

بکھر رہے تھے فضا میں کچھ اِس طرح الفاظ
کہ جیسے ڈھول پہ پڑنے لگی ہو زور سے تال

کوئی چٹان لُڑھکتی ہوئی گرے جیسے
کسی پہاڑی ندی کی ہو جیسے باڑھ میں چال

بہت قریب سے گزرے کوئی ہوائی جہاز
اور اُس کے شور سے ہو جیسے سامعہ پامال

ہیروشیما پر ایٹم بم کی جس طرح گونجیں
ہر ایک لفظ پہ یوں تھا مرے دماغ کا حال

تعصبات کے میدان میں بزعمِ خرد
کھلاڑیوں نے زباں کو بنا دیا فٹ بال

افسانہ

# کہنے کو بہت کچھ تھا...

وسیم بانو قدوائی۔ بی۔ اے

عالی منزل۔ تاج محل۔ بھوپال

۲۵ ستمبر ۹۶۶ء

مکرمی خوشتر بھائی! تسلیم

"بیسویں صدی" کی بزم میں پہلی بار اپنی ایک تخلیق "کہنے کو بہت کچھ تھا..." لے کر حاضر ہو رہی ہوں۔ برسوں یہ تمنا رہی کہ اِس بزم میں شرکت کروں لیکن ہچکچاہٹ مانع ہوئی۔ اِس کا فیصلہ تو آپ کریں گے کہ میری یہ تخلیق "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق ہے بھی یا نہیں۔

ناچیز ——— وسیم قدوائی

صبا تیزی سے کار دوڑاتی جب ہوائی اڈّے پر پہنچی تو معلوم ہوا پلین دو منٹ پہلے آچکا۔ جاوید کو دُکھ تو ہوا لیکن صبا وہیں بیٹھی خیالات کے تانے بانے بُنتی رہی۔ الجھی سہیل کس قماش کے انسان ہیں۔ آج دیکھ کر معلوم ہوگا۔ گُل رُخ اِن کی منگیتر ہیں۔ دونوں ساتھ ہی چار سال انگلینڈ میں رہ کر آئے ہیں۔ لیکن عجیب ہیں یہ حضرت! آئے بڑے بے موقع... جبکہ نواب صاحب اور اُن کی بیگم دونوں گھر پر موجود نہیں۔ سہیل صاحب کی تحریر سے تو نواب صاحب نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ ہفتے میں پہنچیں گے یہاں۔ جبھی تو نواب صاحب نے جانے کا پروگرام بنالیا۔ بے چاری بیگم دُرّانی! وہ بھی علالت کے باعث اپنی بیٹی اور ہونے والے داماد کو لینے نہ جاسکیں۔ رہ گئے میاں جاوید اور ہم جو انھیں لینے آگئے۔ گُل رُخ تو اپنے بھائی کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوگی۔ لیکن میں بھلا کس خوشی میں یہاں آگئی، ایک لاوارث اجنبی! جسے حالات نے نواب صاحب کے در پہ لا ڈالا ہے۔ سہیل صاحب کی نظروں میں بھلا میری کیا وقعت ہوگی؟ گُل رُخ بھی مجھے ذلیل نظروں سے دیکھے گی۔ دیکھنا بھی چاہئے۔ بیگم دُرّانی نے مجھے کس لہجہ میں فون کیا۔ جیسے میں اُن کی زرخرید لونڈی ہوں۔ کیا وہ ٹیکسی میں جاوید کو اپنے کسی نوکر کے ساتھ ہوائی اڈّے نہیں بھیج سکتی تھیں جو انھوں نے مجھے یہ حکم دیا لیکن انھیں تو صرف اپنی بڑائی جتانا تھی اور یہ بھی کہ وہ مجھے ایک نوکر سے زیادہ نہیں سمجھتی ہیں۔ ہنہہ! اُس نے غصّے سے سر جھٹک دیا اور خشک بال چہرے پر بکھر گئے۔ اُس نے بال پیچھے کرکے اپنا سر ڈھانک لیا۔ اُسی وقت اُس کی نظر سامنے جاوید کے ساتھ آتی ہوئی صاحبزادی پر پڑی۔ ایک بے حد فیشن زدہ ترشے ہوئے بالوں اور بغیر آستین کی اسکرٹ پہنے پرس جھلاتی ہوئی وہ صبا کو مضحکہ خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور مُسکرا بھی رہی تھیں۔ صبا کو اُن کی یہ مُسکراہٹ ذرا بھی اچھی نہ لگی۔ اُسی وقت ایک تندرست اور خوبصورت نوجوان سیاہ چشمہ لگائے اور سفید پینٹ اور شرٹ پہنے قُلی کے ساتھ تیز قدم رکھتا اُن کی طرف بڑھ آیا۔ گُل رُخ اُس کی جانب دیکھ کر بڑی ادا سے مُسکرا دی لیکن صبا کو اُس کی یہ مُسکراہٹ بالکل بناوٹی معلوم ہوئی۔ چند لمحے بعد سامان ڈکّے میں رکھوا کر وہ گاڑی میں آبیٹھے۔ جاوید سامنے کی سیٹ پر بیٹھا تھا اور سہیل اور گُل رُخ پچھلی سیٹ پر۔ صبا نے بغیر کسی کو دیکھے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ سہیل جاوید سے مخاطب تھا۔ وہ اُس سے برابر سوالات کرتا جا رہا تھا۔ گُل رُخ بھی حالات جاننے کے لئے سوالات کرنے میں سہیل سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہی تھی۔ صبا اُکتائی سی بیٹھی کار کو آگے بڑھاتی جا رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں سامنے سڑک پر تھیں لیکن خیالات کہیں دُور پرواز کر رہے تھے۔ ایک بار اپنی سرکش لٹوں کو ہٹاتے ہوئے اُس کی نگاہ اچانک سامنے لگے ہوئے شیشے پر پڑ گئی۔ اُس کا دل دھڑک اُٹھا اور چہرہ شرم سے سُرخ ہوگیا۔ اُس کا ہاتھ اسٹیرنگ پر کانپ سا گیا کیونکہ شیشے میں دو بڑی بڑی پُرکشش آنکھیں اُسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ صبا نے جلد ہی اپنے پر قابو پالیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ سہیل اب بھی جاوید سے بات کر رہا تھا۔ گُل رُخ کے گھر پر صبا نے گاڑی روک دی۔ وہ تینوں اُتر گئے۔ جاوید نے بھی شاید صبا کو اندر بُلانا مناسب نہ سمجھا۔ صبا اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہ گئی۔ اُسے غصّہ آرہا تھا اِن لوگوں پر ——— اِن لوگوں نے مجھے ڈرائیور سمجھ لیا ہے۔ اِنھیں جاوید سے میرے بارے میں پوچھنا تو تھا۔ یہ ہے اِن کی مغربی تہذیب۔ لیکن اچھا ہی ہوا کہ انھوں نے نہ پوچھا۔ نہ جانے جاوید کیا اُوٹ پٹانگ بتاتا اور مجھے شرمندگی ہوتی۔ رنج و غم اور احساسِ کمتری کی ایک لہر صبا کے دل میں کوند سی گئی۔ اُسے

بے چارگی پر رونا آرہا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور اسٹیرنگ پر جھک گئی۔ اور کچھ دیر کے لئے بالکل بے سُدھ ہوگئی۔ ایک دھڑاکے کی آواز سے وہ اُچھل پڑی۔ چند لمحے تک گرد وپیش سے بے خبر ہوکر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے بیٹھے سہیل کو دیکھتی رہ گئی جو اُس کے برابر بیٹھا تھا۔ صبا کی نگاہوں میں غصّہ، رنج وغم اور ندامت کے مِلے جُلے احساسات تھے۔ پھر جیسے وہ ہوش میں آگئی۔ اُس نے دیکھا گُل رُخ سامنے کھڑی اُسے خشمگیں نظروں سے گھور رہی تھی۔ سوری کا لفظ بے خیالی میں صبا کے ہونٹوں سے نکلا۔ اُس نے کار اسٹارٹ کردی اور تیز رفتاری سے اُسے سڑک پر لے آئی۔ ایکسیلیٹر پر اُس کے پیر کا دباؤ بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ ہوا کی تیزی سے صبا کے لمبے لمبے بال کھُل کر اُس کے چہرے کے گرد ہالہ کئے ہوئے تھے اور اُن سیاہ چمکدار بالوں کے بیچ صبا کا معصوم سوگوار چہرہ چمک رہا تھا۔

سہیل کبھی کبھی اُسے نگاہ اُٹھا کر دیکھ لیتا۔ گھر پہنچ کر صبا نے زور سے ہارن

---

- اشخاص کو حق سے پہچانو، حق کو اشخاص سے نہیں (یعنی کسی شخص کی بُرائی بھلائی کا معیار حق وصداقت ہے۔ حق وصداقت کا معیار اشخاص نہیں)
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)
- جب کسی بات کا اقرار کر چکو تو اُسے پُورا کرو۔ (قرآن پاک)
- عاقل اپنے کو پست کر کے بلندی حاصل کرتا ہے، نادان اپنے کو بڑھا کر ذلّت اُٹھاتا ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- خدائے عزّ وجل سے ڈرتے رہو۔ جو خدا سے ڈرتا ہے خدا اُس کا محافظ ہوجاتا ہے۔ (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ)
- عفو و درگزر بہت اچھا انتقام ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

---

دیا۔ پھر اپنی ساری کا پلّو سر پر ڈالتے ہوئے اُس نے اُتر کر سہیل کی جانب کا دروازہ کھول دیا۔ سہیل مسحور سا ہوکر چند لمحے تک بیٹھا اُس کے سرو جیسے قد، متناسب اعضاء اور معصوم چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر وہ گاڑی سے باہر آگیا اور اپنے قدیم مالی چمن سے مخاطب ہوگیا۔ صبا گاڑی آگے بڑھا لے گئی۔ سہیل نے مُڑ کر جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھا۔ پھر چمن دادا اور رشید خانساماں سے بات کرتا ہوا اندر چلا گیا۔ گھر کا رنگ اُسے ایک دم بدلا سا معلوم ہوا۔ پُرانے دقیانوسی فرنیچر کے بجائے ڈرائنگ روم بے حد نفیس اور جدید سامان سے آراستہ تھا۔ دروازوں میں قیمتی پردے لٹک رہے تھے اور دیواروں پر بے حد خوبصورت سینریاں! وہ آگے بڑھا۔ گھر میں سنّاٹا ضرور تھا لیکن صفائی اور نفاست ہر چیز پر رنگ جمائے تھی۔ سہیل حیران سا سوچ رہا تھا۔ ممی نے یہ نیا پن...؟ وہ بے چاری پُرانے زمانے کی سیدھی سادی عورت ہیں۔ پھر یہ ردّ وبدل کیسے ہوگیا؟ وہ ڈرائنگ روم کے ایک آرام دہ صوفے میں دھنس گیا۔ رشید نے چائے لگا دی اور سہیل کے کپ میں اُنڈیلنے لگا۔ سہیل نے بے پروائی سے پُوچھا۔

"اسمٰعیل کہاں ہے جو ڈیڈی نے یہ نئی ڈرائیور رکھ لی...؟"

چمن نے چونک کر کہا "نئی ڈرائیور...؟ اوہ! اچھا! بٹیا کو کہہ رہے ہو تم؟ وہ ڈرائیور نہیں۔ اُسے نواب صاحب نے اپنے مہمان خانے کے دو کمرے رہنے کو دے رکھے ہیں۔ وہ یہاں کالج میں لیکچرار ہے انگلش کی۔ بہت لائق لڑکی ہے۔ ایک سال سے زیادہ ہوگیا اُسے یہاں رہتے ہوئے۔ کیا مجال جو کالج کے علاوہ کوٹھی سے باہر تو نکلے۔ کوٹھی کی صفائی سجاوٹ سب اپنے ذمّے لے رکھی ہے۔ گھر میں یہ رونق اُسی کے دم سے نظر آرہی ہے بھیا!"

سہیل سب خاموشی سے سُنتا رہا۔ پھر اُٹھ گیا۔

صبا نے بیگم دُرّانی کا فون سُنتے ہی نواب صاحب کو ٹرنک کال کر دیا تھا اور وہ لوگ اُسی شام کو آپہنچے۔ اپنے لائق بیٹے کو دیکھ کر وہ پھُولوں نہ سمارہے تھے۔ صبا نے اب کوٹھی میں جانا بالکل کم کر دیا۔ وہ اِس بات کا موقع ہی نہ آنے دیتی کہ سہیل کا سامنا ہو۔ حالانکہ سہیل روز اُسے کالج جاتے ہوئے دیکھتا۔ وہ اُس کی سادگی اور معصومیت سے متاثر ہوتا جا رہا تھا لیکن صبا کو اِس کی خبر بھی نہ تھی۔ وہ بے حد خود دار لڑکی تھی اور اِس بات کو قطعی پسند نہ کرتی تھی کہ کوئی اُسے حقیر سمجھے۔ نواب صاحب اور اُن کی بیگم کے اصرار کے باوجود اُس کے کھانے کا انتظام سامنے کے ہوٹل میں تھا۔ وقتِ مقرّرہ پر وہاں کا نوکر اُس کے لئے کھانا لے آتا۔ اُسے نواب صاحب کے گھر ایک پیالی چائے پینا بھی گوارا نہ تھی۔ وہ اپنے گزر اوقات کے لئے کما لیتی۔ شام کو اُس کے پاس کچھ لڑکیاں پڑھنے آجاتیں۔ وہ اپنا زیادہ وقت کمرے میں گزارتی۔ کوٹھی میں وہ اُسی وقت جاتی جب اُسے معلوم ہو جاتا کہ سہیل موجود نہیں۔ ایک صبح سہیل معمول سے پہلے جاگ گیا۔ اخبار لانے کے خیال سے وہ ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم کی جانب جا نکلا۔ اُس کی نظر سامنے کھڑی صبا پر پڑی —— جو پھُولوں کو گلدانوں میں سجا رہی تھی۔ اُس کا آنچل زمین کو چھُو رہا تھا۔ اُس کے گھنے اور لمبے بال اُس کے سراپا کو آدھے سے زیادہ ڈھکے ہوئے تھے۔ جن سے پانی کے ننھے ننھے قطرے ٹپک رہے تھے۔ بالوں کی اُلجھی اُلجھی لٹیں اُس کے چہرے پر بکھری ہوئی اُس کی معصومیت کو چار چاند لگا رہی تھیں اور اُس کا چہرہ نکھرا ہوا تھا۔ سہیل چند لمحے تک اُسے دیکھتا رہا، پھر صبا کے چونکنے سے پہلے ہی لَوٹ گیا۔ وہ عرصے سے کشمکش میں وقت کاٹ رہا تھا۔ اُس کے دل میں عجیب خلش اور بے چینی سی رہتی جیسے اُس کا کچھ کھو گیا ہو۔ وہ ہنسنا بولنا بھُول گیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ گُل رُخ رات دن اُس کے گرد منڈلاتی رہتی اور طرح طرح کے پروگرام بناتی جن پر وہ کم ہی عمل کرتا اور اگر کرتا بھی تو بہت بے دلی سے۔ وہ گُل رُخ کو بہت مشکل سے برداشت کرتا۔ اُسے اُس کی آزادی، تصنّع اور بناوٹ سے نفرت تھی لیکن مروّت میں وہ کچھ کہہ نہ سکتا۔ سہیل کو پُوری طرح علم تھا کہ گُل رُخ صرف

دولت کی پجارن ہے۔ وہ اُس سے نہیں اُس کی دولت سے پیار کرتی ہے۔ وہ اُسے بدتر سمجھتی ہے۔ سہیل خود سیدھا سادہ انسان تھا۔ وہ سادگی اور سچائی کو پسند کرتا تھا۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد سے گل رخ کی دوستی کا دائرہ دیکھتے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ رات کو بارہ ایک بجے کلب سے لوٹتی اور ہر روز ایک نیا نوجوان اُسے پہنچانے آتا۔ سہیل کو اُس کی ساری باتوں کی خبر رہتی لیکن وہ پرواہ بھی نہ کرتا۔ سہیل کی ممی کو بھی گل رخ کی یہ آزادی پسند نہ تھی۔ اور وہ اُس سے متنفر سی ہو گئی تھیں۔ کرنل درانی کو بھی گل رخ کے بدلے ہوئے رویّے سے پریشانی تھی۔ انھوں نے نواب صاحب سے شادی کا ذکر چھیڑا لیکن سہیل نے یہ رشتہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ گل رخ کے لئے یہ خبر ایٹم بم سے کم نہ تھی۔ وہ غصّے سے سُرخ ہو گئی۔ وہ بھاگی ہوئی سہیل کے گھر پہنچی اور نواب صاحب اور بیگم صاحب کی موجودگی ہی میں اُس نے سہیل کی بُری طرح خبر لے ڈالی۔ بیگم صاحب اُسے جواب دینا چاہتی تھیں لیکن سہیل نے آنکھ کے اشارے سے اپنی ممی کو منع کر دیا اور مُسکرا مُسکرا کر گل رخ کی بکواس کو سُنتا رہا لیکن جواب کچھ بھی نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گل رخ جھنّاتی اور پیر پٹختی وہاں سے چل دی۔ اُس نے سہیل کی صورت ساری زندگی نہ دیکھنے کی قسم کھا لی۔ اُس کے جانے کے بعد سہیل نے اطمینان کی سانس لی۔

---

صہبا اِن سب باتوں سے بے نیاز اپنے کاموں میں مگن رہتی۔ ایک شام کو وہ آرام کرسی پر نیم دراز ایک انگریزی ناول پڑھ رہی تھی کہ آہٹ ہوئی۔ اُس نے اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دی اور بے خیالی میں دروازہ کھولا۔ وہ چونک گئی۔ اُس نے آنچل سر پہ لے لیا۔ اُس کا دل دھڑک اُٹھا۔ سہیل دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ چند لمحے تک اُسے دیکھتا رہا پھر ایسے بولا جیسے اُس کا خیال کہیں اور ہو۔ "معاف کیجئے گا۔ میں آپ کی تنہائی میں مُخل ہوا۔ ممی آپ کا انتظار کر رہی ہیں" کہہ کر وہ واپس ہو گیا اور صہبا خیالات میں کھوئی ہوئی اُسی طرف دیکھتی رہ گئی جدھر وہ گیا تھا۔ پھر کوٹھی کی طرف چل پڑی۔ جب وہ وہاں پہنچی تو اُس نے دیکھا ممی اخبار کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ صہبا کو دیکھتے ہی وہ اُٹھتے ہوئے بول پڑیں۔ "بیٹی! تم سے ایک ضروری کام ہے" صہبا نے استفسار میں آنکھیں اُٹھائیں۔ وہ پھر بولیں۔ "سہیل کو مے فیر تک جانا ہے اور مجھے بھی ابھی گاڑی چاہئے۔ اِس لئے تم سہیل کے ساتھ جا کر گاڑی واپس لیتی آؤ" اور وہ جواب کا انتظار کئے بغیر باتھ روم میں چلی گئیں۔ صہبا چند لمحے کھڑی سوچتی رہی۔ سہیل کے ساتھ مے فیر تک جا کر گاڑی لانا.. یہ تو بہت بڑا مرحلہ ہے۔ لیکن ممی کا حکم ٹالا بھی تو نہیں جا سکتا۔ محسن جو ہیں میری۔ وہ دھیمے قدموں سے پورچ میں آ گئی۔ گاڑی میں سہیل اسٹیرنگ سنبھالے سامنے دیکھ رہا تھا۔ صہبا پیچھے بیٹھ گئی۔ اور سہیل نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے وہ صہبا کی طرف دیکھے بغیر بولا "بہت تنہائی پسند ہیں آپ۔ اِس تنہائی میں دل نہیں گھبراتا؟"

"یہی تنہائی تو میری مونس و غمخوار ہے" بے ساختہ صبا کے مُنہ سے نکل گیا۔ پھر اپنی اِس بے تکلفی کے انداز پر جھینپ گئی۔

سامنے لگے شیشے میں صہبا کو غور سے دیکھتے ہوئے سہیل بولا "مجھے آئے تین ماہ ہو چکے لیکن آپ نے متعارف ہونے کا موقع بھی نہ دیا.."

صہبا نے خشک لہجے میں کہا "میرا تعارف تو پہلے ہی دن ایک ڈرائیور کی حیثیت سے ہو چکا۔ اِس سے زیادہ کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

سہیل نے کہا "میں نے تہیّہ کر لیا ہے کہ آپ کو مستقل طور سے اپنا ڈرائیور بنا لوں۔ آپ کو اعتراض تو نہیں ہے کچھ؟"

صہبا بولی "خوب... تو گویا اِس طرح کی ذمّہ داریاں عائد کرنے کا ٹھیکہ لے

---

- خدا ایک ہے نام بے شمار۔
- صرف ایک خدا کی پرستش کرو اور اپنے بچوں (اولاد) کو بھی پرستش کرنا سکھاؤ۔
- بُرائی سے ہمیشہ لڑو۔
- تلوار بہادروں کا گہنا ہے۔
- جب کوئی اور راستہ نہ رہ جائے تو تلوار کا استعمال بالکل جائز ہے۔
- سچائی کی خاطر میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے مارے جانا سب سے بڑھیا موت ہے۔

(گورو گوبند سنگھ جی)

---

رکھا ہے آپ نے... لیکن اِس قسم کی ذمّے داریاں آپ صرف مِس درّانی ہی پہ عائد کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ دوسروں پر نہیں"

"مِس درّانی..." سہیل نے کہا "وہ بے چاری ایسی ذمّے داریاں نبھانے کی اہل کہاں...؟ اِس کے لئے تو آپ جیسے لوگ مناسب ہوا کرتے ہیں۔ میں نے اِن تین مہینوں میں کافی سوچ بچار کے بعد آپ کو اِس ذمّے داری کے لئے چُنا ہے صہبا صاحبہ... اور میرا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ اُس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہوتی"

صہبا نے طنز سے مُسکرا کر کہا "اوہ! بھلا کیا سوچ کر آپ نے ایسا فیصلہ کر ڈالا۔ میں آپ کے اِس فیصلے سے متفق ہونا مناسب نہیں سمجھتی"

سہیل نے مُڑ کر صہبا کو دیکھتے ہوئے کہا "لیکن آپ کو میرے فیصلے سے اتفاق کرنا پڑے گا محترمہ! ورنہ بصورتِ دیگر میں گاڑی کسی کھمبے یا پیڑ سے ابھی ٹکرا کر اپنا اور آپ کا

نیا تم کئے دیتا ہوں۔ آپ انکار کر کے تو دیکھئے . . . ؟"

صہبا نے مسکراتے ہوئے کہا "ہائے ہائے۔ آپ تو بالکل خدائی فوجدار ہی بنتے جا رہے ہیں!
خیر بیٹھے بٹھائے سوجھی کیا ہے آپ کو . . . ؟"

سہیل نرم سے لہجہ میں بولا "مذاق نہیں کر رہا ہوں میں آپ سے محترمہ! آپ کو ابھی اِس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ آپ کو میری زندگی کا ساتھی یا بہ الفاظِ دیگر ڈرائیور بننا قبول ہے یا نہیں؟ اتنا بے نیاز رہئے نہ ہو جو میں گہری نظروں سے آپ کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ مجھے آپ کے حالات سے پوری واقفیت ہے۔ سب معلوم کر لینے کے بعد ہی میں نے آپ کی اور اپنی بہتری اسی میں دیکھی کہ آپ کو اپنا لوں۔"

صہبا گھبرا کر بولی "میرے حالات سے کیا مراد ہے آپ کی؟ یہ جاسوسی کس سلسلے میں شروع کر دی آپ نے؟"

سہیل نے کہا "آپ کو اپنانے کی خاطر پڑے پاپڑ بیلے ہیں میں نے صہبا صاحبہ! مجھے پورا علم ہے کہ آپ فیروز آباد کے سیٹھ خورشید کی اکلوتی صاحبزادی ہیں جن کا شیشے کا کارخانہ بڑی آب و تاب سے چل رہا ہے۔ جن کی اچانک موت پر اُن کے بے ایمان منیجر حامد نے اُن کی بیوی کو زہر دلوا کر ختم کرایا۔ پھر آپ کی مدد کا ڈھونگ رچا کر ساری دولت پر قابض ہو گیا۔ یہاں تک کہ آپ کو اپنی عزت بچانے کے لئے بھاگ کر یوں روپوش ہونا پڑا۔ ہوں غلط کہہ رہا ہوں میں؟ ان سب حالات کے پیشِ نظر آپ کے لئے یہی مناسب ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ پھر آپ نے جو جادو مجھ پر کر دیا ہے اُس کی وجہ سے میں آپ کے بغیر زندہ بھی نہ رہ سکوں گا . . . بولئے نا کچھ . . . آپ کو میرے فیصلے سے اتفاق ہے نا؟"

"یہ کیا بچپنا ہے مسٹر سہیل!" صہبا نے گھبراتے ہوئے کہا "آپ جا کہاں رہے ہیں۔ فیروز آباد کب کا پیچھے رہ گیا۔ ممی کو گاڑی کا انتظار ہو گا۔"

سہیل نے مسکراتے ہوئے کہا "بے فکر رہئے وقت کو جانا ہے۔ یہ تو میری سب ترکیب تھی آپ سے ملنے اور بات کرنے کی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آپ ملنے کا موقع کبھی دیں گی۔ میں نے کل اپنی خواہش کا اظہار ممی سے کر دیا۔ وہ اور ڈیڈی دونوں ہی میرے بہترین انتخاب پر مسرور ہیں۔ آپ کی مرضی معلوم کرنے کو میں نے ممی سے جھوٹ بلوایا۔ بڑی مشکل سے راضی ہوئیں وہ جھوٹ بولنے پر۔"

صہبا بناوٹی خفگی سے بولی "جی! بڑی تعریف کا کام کیا ہے آپ نے کہ ممی سے جھوٹ بلوایا اور پھر میرے سامنے بم کی طرح پھٹ پڑے۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ ثریا رخ مزیب پر آپ کے رویے سے کیا بیتے گی؟ جبکہ وہ آپ کی منگیتر ہے؟"

سہیل نے کہا "منگیتر؟ کس نے کہہ دیا آپ سے۔ ممی کا پہلے کچھ ایسا ارادہ ضرور تھا لیکن میں نے اسے ہمیشہ ناپسند کیا . . . پھر انگلینڈ میں اُس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر مجھے نفرت ہو گئی ہے۔ اب تو ممی نے بھی اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ رہا بم کی طرح پھٹنے کا سوال۔ تو آپ نے پہلے کبھی بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا اور اپنی ہمیشہ سے یہ عادت رہی کہ جو بات دل میں ٹھانی اُسے عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ اُسے مُنہ سے کبھی نہیں کہتے ــــ ہاں تو بولئے نا . . . کیا کہہ رہی ہیں آپ . . . ؟ لڑا دوں گاڑی کسی پیڑ یا کھمبے سے . . . ؟"

"خدا نہ کرے!" صہبا کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ شرم و حیا کی سُرخی اُس کے چہرے پر پھیل گئی اور نظریں جھک گئیں۔ سہیل نے شیشے میں صہبا کے معصوم شرمیلے چہرے کو دیکھ کر اپنے سوال کا جواب پا لیا۔ گاڑی کا رُخ اُس نے گھر کی جانب موڑ دیا اور مسکراتے ہوئے دلکش سی دھن میں گنگنا اُٹھا "کہنے کو بہت کچھ تھا اگر کہنے پہ آتے . . ."

---

## غزل

پروفیسر آزاد گلاٹی، ایم۔اے

ساتھ یادوں کا نہ سایا ہوتا
کاش! اک پل تو میں تنہا ہوتا

تجھے مایوس نہ ہونے دیتیں
میری آنکھوں میں تو جھانکا ہوتا

حالِ دل اُن کو سُنا تو دیتے
فیصلہ اُن کا جو ہوتا، ہوتا

دل میں ہوتا جو کبھی میرا خیال
تو ہر اک سانس پہ چونکا ہوتا

جو پہن سکتا حقیقت کا لباس
کاش! ایسا کوئی سپنا ہوتا

ہم تغافل کی سزا بھی دیتے
تجھ سے ناراض جو ہونا ہوتا

دل کو ملتا نہ اگر ہجر کا داغ
میری راہوں میں اندھیرا ہوتا

اور ہوتی نہ جو اُلجھن کوئی
میں ترے غم سے بھی سُلجھا ہوتا

دل کو آزادؔ! نہ تھا پھر کوئی غم
غم کا احساس جو گہرا ہوتا

# دل کا وَرَق

رئیس نجمی امروہوی

• ۔کشیانہ ۔ سرائے کہنہ۔ امروہہ (یوپی)

یکم نومبر ۱۹۹۶ء        مکرم و محترم حضرت خوشتر واجبات

میری طویل خاموشی سے آپ کو جو شکایتیں اور شکوے ہو گئے تھے وہ شاید اب دُور ہو گئے ہوں گے ——— پہلی کہانی کی رسید مجھے مل گئی تھی۔ اب ایک اور تازہ کہانی آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں جس کے بارے میں بتنا ہی عرض کروں گا کہ یہ کہانی کم اور حقیقت زیادہ ہے اور اس حقیقت کے بیشتر پہلو آپ کے سامنے بھی ہیں۔ کسی حقیقت کو کہانی کا رُوپ دینے کے لئے جتنے دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ آپ بخوبی جانتے ہوں گے۔ یہ اُس انسان کی کہانی ہے جسے اگر میں اپنی رُوح سمجھتا ہوں تو آپ اُسے اپنے جسم کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ یہ وہی انسان ہے جس کے بارے میں آپ نے ایک بار برادرم اکرم فاروقی سے فرمایا تھا "نجمی نے میرا تعارف ایک آدمی سے نہیں ایک فرشتہ سے کرایا ہے"! آپ کا یہ فرمانا کسی حد تک درست ہی تھا کیونکہ فرشتے صرف آسمان ہی پر نہیں زمین پر بھی ہوتے ہیں۔ ضرورت صرف نگاہ اور جستجو کی ہے جو خدا نے سب کو نہیں بخشی ——— یہ کہانی لکھتے وقت مجھے جن نازک مراحل سے گزرنا پڑا ہے وہ کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔ میں اس کے ہر جملے پر ٹھٹکا ہوں، ہر لفظ پر رُکا ہوں کہ کہیں میرے قلم سے انجانے میں کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو میرے پاکیزہ جذبات کو خاک میں ملا دے اور پروفیسر نازش سے میری ساری عقیدت ایک طنز کا رُوپ لے لے۔ آپ مدت سے اس کہانی کے منتظر تھے اور میں برسوں سے یہ کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کوئی تعمیری بات ہی سامنے نہ آتی تھی۔ اتفاق سے آج اس کہانی نے میری پسند کا اختتام پا لیا ہے اور اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں نے اپنی آواز میں آپ کی آواز ملا کر پروفیسر کو جو پیغام دینے کی کوشش کی ہے خدا کرے وہ کوشش اُن کی زندگی میں ایک بار پھر بہارے آنے اور اُس بہار کا کوئی خوبصورت پھول مجھے اور آپ کو دیکھنا نصیب ہو۔ تب میں سمجھوں گا کہ میرے مقصد نے اپنی معراج پالی اور میں ناکام نہیں رہا ——— خدا کرے آپ کی صحت اچھی ہو۔ اپنی صحت کا خیال رکھا کیجئے۔ صرف آپ ہی کو آپ کی صحت کی ضرورت نہیں ہے۔ دُنیا کے ہر گوشے میں جہاں اُردو پڑھنے لکھنے والے موجود ہیں، آپ کی ضرورت واہمیت محسوس کرتے ہیں . . .

عنایات کا متمنی ——— رئیس نجمی

---

کالج کے نوٹس بورڈ پر پروفیسر نازش کی ایک ماہ کی طویل چھٹی کا نوٹس دیکھ کر میری حیرت اور تشویش کی انتہا نہ رہی۔ وہ پچھلے دس دن سے چھٹی ہی پر تھے اور کالج نہیں آ رہے تھے۔ ایکونامکس کا پورا کلاس کل سے اُن کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ گیٹ سے کچھ آگے بڑھ کر جب میں لائبریری کی طرف جانے لگا تو نہ جانے کیوں میرے ذہن میں پروفیسر کی اس طویل غیر حاضری نے ایک غیر معمولی ہلچل پیدا کر دی اور اچانک اُن کی سوچوں نے میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ اُن سے مجھے دلی عقیدت تھی اور میری عقیدت کا یہ جذبہ اُس دن سے میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا جب میں نے کے۔ جی۔ کے کالج میں داخلہ لیا تھا اور وہاں پہلی بار انھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ سب سے جد

خاموش اور خود میں کھوئے رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔ ان کے خاموش اور پُر وقار چہرے میں بے حد پُر اسراریت ہی نہ تھی، ایک کشش بھی تھی جو ہر نئے دیکھنے والے کو بے اختیار اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی اور چند لمحوں کے لئے کچھ نہ کچھ سوچنے کی دعوت دیتی تھی۔

ان کی شخصیت کی یہ پُر اسراریت صرف میرے ہی لئے نہیں، ڈگری کالج کے بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بہت دنوں سے ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ یوں تو سب جانتے تھے کہ وہ شہر کے "سول لائنز" کے ایک لاج میں پچھلے کئی برسوں سے تنہا رہ رہے ہیں۔ ان کی عمر چالیس سال سے کسی طرح کم نہ تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اب تک تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ وہ کہاں کے رہنے والے تھے؟ یہ جاننے کی نہ کسی کو ضرورت پڑی اور نہ کوئی جاننا چاہتا تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ میں نے پروفیسر کو نہ کبھی کوئی خط لکھتے دیکھا تھا اور نہ کوئی خط ان کے نام آتے ہی دیکھا تھا۔ کبھی کبھی ان کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ان کی اس پُر اسرار زندگی اور تنہائی کا شدید احساس ہونے لگتا تھا اور اسی وجہ سے جب میں نے ان کی اتنی طویل چھٹی کا نوٹس پڑھا تو میرا دل چاہا کہ میں ان کے گھر جاؤں اور وجہ دریافت کروں۔ مجھے علم تھا کہ وہ اپنے گھر پر کسی اسٹوڈنٹ سے ملنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ پھر بھی میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا اور میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے گھر پر جیسا بھی برتاؤ کریں گے میں بخوشی قبول کروں گا اور ان سے ضرور ملوں گا۔ اتنے زیادہ دنوں کی چھٹی انھوں نے اب تک برسوں میں کبھی نہیں لی تھی۔ وہ موسم گرما کی تعطیل میں بھی کہیں باہر نہ جاتے تھے۔ ان سب باتوں کو سوچتے ہوئے مجھے یقین سا ہو رہا تھا کہ اچانک وہ زیادہ بیمار ہو گئے ہوں گے ورنہ وہ کسی حالت میں بھی گھر بیٹھنے کے عادی نہ تھے۔

جب چوتھا پیریڈ ختم ہو گیا اور میرے کلاس کی چھٹی ہو گئی تو میں نے پروفیسر کے گھر کا رخ کیا۔

جب میں "روزی مینشن" کے گیٹ پر پہنچا تو میں نے دیکھا وہ بند تھا۔ میں نے کال بیل کے سوئچ پر انگلی رکھ دی۔ بیل کی آواز کے جواب میں کچھ دیر بعد پروفیسر کی بھاری آواز سنائی دی۔ وہ اندر بلا رہے تھے۔ گیٹ کھول کر میں آگے بڑھا اور لان عبور کر کے سامنے کے کمرے میں پہنچ گیا۔ میرے خیال کے مطابق پروفیسر وہیں موجود تھے۔ وہ اس وقت سنگل صوفہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے کوئی کاغذ پڑھ رہے تھے اور سگار ان کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ پہلی ہی نظر میں ان کے چہرے کو دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان کی حالت بہت بدلی ہوئی سی تھی۔ آنکھیں کسی قدر سوجی ہوئی تھیں۔ شیو بڑھا ہوا تھا اور وحشت کے تمام آثار ان کے سارے وجود کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ ان دنوں میں یا تو بے حد مصروف رہے ہیں یا پھر کئی راتیں انھوں نے اپنی ذہنی الجھنوں میں کھوئے ہوئے آنکھوں میں گزار دی ہیں۔ میرے سلام کا رسمی سا جواب دینے کے بعد اپنی حیرت کو سمیٹتے ہوئے انھوں نے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس سے پہلا کہ میں کچھ عرض کروں انھوں نے خود ہی میرے آنے کا مقصد دریافت کیا۔

میں نے ڈر اور خوف کے ملے جلے جذبات میں اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے وابستہ اپنی دلی ہمدردیوں کا اظہار مختصر الفاظ میں کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ پہلے تو وہ مجھے بہت غور سے دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ کچھ سنجیدہ ہو گئے تو مجھے حیرت ہوئی۔

جب میں سب کچھ کہہ کر خاموش ہو گیا تو انھوں نے میری باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا، "مسٹر آذر! تم وہ پہلے طالب علم ہو جو میرے گھر آئے ہو۔ میری زندگی کا یہ اصول رہا ہے کہ میں کالج کی حدود سے باہر کسی کالج کا پروفیسر نہیں رہتا۔ جبکہ کالج ٹائم کے لئے میری ہمیشہ سے یہ چاہت رہی ہے کہ اس کا ہر لمحہ میرے طلباء کے کام آئے۔ یہ کتنی عجیب بات ہوگی اگر ہم اپنے گھروں پر بھی وہی ماحول پیدا کر لیں جو کالج میں ہمارے ارد گرد رہتا ہے تو ہماری زندگی اور مشین میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ اس طرح ہم ہر وقت اور ہر لمحہ اپنی ملازمت کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ میرے اصول بہت سخت اور زندگی کی ٹھوکروں سے تراشے ہوئے ہیں ــــــ بہرحال تم مزاج پرسی کرنے آئے ہو اور مجھ سے تم نے ہمدردی کی ہے۔ اس لئے میں تمہیں دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنی بات پوری کر دی اور خاموش ہو گئے۔

ان کی گفتگو میں اپنے لئے ہمدردی کا ایک مجلا شکریہ پا کر میں نے بہت چند الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا۔

لیکن شکریہ کے جواب میں وہ بالکل خاموش رہے اور نہ جانے کن خیالوں کے گہرے سمندروں میں غوطے لگاتے ہوئے سگار کے کش لیتے رہے اور میں کچھ خاموشی کے ساتھ ان کے چہرے کو تکتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی کسی بات کو موضوع بنا کر گفتگو شروع کریں تو میں بھی ماحول کی بے تکلفی کا سہارا پا کر ان سے کچھ باتیں کر لوں۔ میرے دل میں شدت سے ایک خواہش دبی ہوئی تھی کہ کسی طرح ان کی زندگی اور ان کے حالات کے بارے میں کچھ معلوم ہو تاکہ ان کا کردار مکمل کر سامنے آ جاتے۔ اسی وجہ سے کچھ ہی دیر بعد میرے ذہن میں سوالات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا لیکن پھر بھی میں خاموش بیٹھا ان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اچانک ایک بار پھر ان کی نگاہیں اس کاغذ پر جھک گئیں جسے وہ میرے آنے سے پہلے پڑھ رہے تھے۔ نہ جانے وہ کیا تحریر تھی جس میں وہ اس قدر کھوئے ہوئے تھے۔ میں نے کئی بار چاہا کہ ان کے انہماک کو توڑ دوں لیکن اس وقت نہ جانے کیوں میرا دل میری زبان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اور میں یہ نہیں کہہ پا رہا تھا کہ کس طرح گفتگو کا آغاز کروں اور ان کی اس بدلی ہوئی حالت کی تفصیلات معلوم کروں۔ جب اسی کشمکش میں کتنے ہی لمحوں کی موت ہو گئی تو میں اپنے زندہ جذبات کا گلا گھونٹ کر اجازت کا طالب ہوا۔

"پروفیسر! کافی دیر سے آپ کچھ نہیں کہہ سکے۔ آپ کا چہرہ آپ کی حالت کا ترجمان ہے، آپ کی اندرونی پریشانیوں کا آئینہ ہے۔ مجھے خود نہیں معلوم میرا یہ کون سا جذبہ ہے کہ ایک مدت سے میرے دل میں یہ آرزو ہے کہ آپ سے کبھی طویل گفتگو کا موقع ملے۔ اِس کالج کی مختصر سی زندگی میں، میں نے آپ کے بارے میں بہت سی روایات سنی ہیں لیکن آپ سے آپ کے بارے میں کبھی کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ میں آج آپ سے آپ کے بارے میں اور آپ کی خاموش پسندی کے بارے میں معلوم کرنا چاہوں گا۔ اگر یہ گستاخی ہو تو معاف کیجئے گا۔ اپنی دلی چاہت کا اظہار کرنے کے بعد میں خاموش ہو گیا۔

اپنے بارے میں کچھ بتانے کے لئے پروفیسر نے انتہائی درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا: "روایات روایتی انسان بنا لیا کرتے ہیں جو اپنے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔ وہ دوسروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہہ دینا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ میں نے اپنے بارے میں ہمیشہ سوچا ہے۔ وہ دوسروں کے بارے میں کبھی سوچتے ہی نہیں۔ یہی میری خاموشی کا سبب ہے۔ میری زندگی تو خود میرے لئے اتنا بڑا سبق بن کر رہ گئی ہے جسے شاید زندگی کی آخری دھڑکنوں تک پڑھتے رہنے کے بعد بھی ختم نہ کر سکوں گا۔ تمہیں میرے بارے میں جاننے کی شدید خواہش ہے، یہ جان کر حیرت ہوئی۔ اگر واقعی جاننا چاہتے ہو تو یہ وعدہ کرو کہ میں جو کچھ کہوں گا وہ تم اپنے دل ہی میں رکھو گے۔"

"آپ کی بات میری بات ہے!" میں نے انہیں یقین دلایا۔

یہ سن کر وہ کہنے لگے۔

"میں سوچ رہا ہوں تمہیں کیا بتاؤں؟ اور کس طرح بتاؤں کہ میں ایک طویل مدت سے اپنے ایک ذہنی بوجھ کی وجہ سے بے حد پریشان ہوں۔ یوں تو چند سال پہلے میرا ماضی کسی قدر پُرسکون گزر گیا اور میری غمناک زندگی کے کچھ دن آرام کی گود میں چلتے گاتے گزر گئے۔ لیکن اب پھر کچھ دنوں سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں بے حد الجھنوں میں اُلجھ کر رہ گیا ہوں۔ یہ اُلجھنیں اور یہ ذہنی اذیتیں میرے ماضی کی دین ہیں۔ کتنی عجیب دُنیا ہے کہ کہیں بھی سکون کا سانس نہیں لینے دیتی۔ انہیں بے پایاں دُکھوں اور ذہن کی کربناک سوچوں سے گھبرا کر میں نے راہِ فرار اختیار کی تھی۔ اپنے بنگال سب کو چھوڑ کر یہ بھی سوچا تھا کہ گمنامی کے اندھیروں میں اپنی باقی ماندہ زندگی کے دنوں کو غرق کر دوں گا لیکن اب یہاں بھی وہی بے چینی ہے، وہی کرب کے نوکیلے نشتر اور وہی تکلیف کے کانٹوں کی چبھن ہے۔ شاید یہ دُنیا تو مجھے سکون سے مرنے بھی نہ دے گی۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں، یوں مر مر کر جینے سے مجھے کیا حاصل ہوگا؟ لیکن گنہگار صفت جو ہوتے ہیں انہیں موت بھی جلد نہیں آتی۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اب جیتے رہنے کی کوئی خواہش بھی میرے دل کے کسی گوشے میں پوشیدہ نہیں رہی۔ زندگی گردشِ ایام کے ہاتھوں کچھ اس طرح اور اس طور شکستہ ہو گئی ہے کہ گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں میں کیا تھا اور کیا ہو گیا؟ وہ بہت ہی خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں زندگی میں صرف ایک بار موت نصیب ہوتی ہے۔ میں تو اُن بدنصیبوں میں سے ہوں جو مر مر کے جیتے جاتے ہیں۔ جی رہا ہوں اس لئے کہ موت نہیں آتی اور خود سے موت کو بلانا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ خدا اگر مہربان نہ ہوگا تو شاید میری زندگی میں وہ وقت بھی آجائے گا کہ اِس گناہ کو عبادت کا درجہ دے دوں۔ تم یقین کرو کہ میں حالات سے کچھ اِس طرح مایوس ہو گیا ہوں کہ ہر لمحہ موت کا متمنی ہوں" یہ کہہ کر وہ گہری خاموشیوں میں ڈوب گئے اور بجھتے ہوئے سگار کے کچھ کش ایک ساتھ لگا کر اُسے انہوں نے ایش ٹرے میں مسل دیا۔

اُن کی درد بھری باتیں سن کر مجھے گہرے دُکھ کا احساس ہوا اور میں نے اندازہ لگایا کہ وہ زندگی کی دوڑ میں ہارے ہوئے انسان ہیں۔ نہ جانے کیوں وہ خاموش ہو گئے تھے۔ لیکن یہ خاموشی میری آتشِ شوق کو اب اور بھڑکا رہی تھی۔ میں نے اُس کربناک خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"آپ کی گفتگو سے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آپ اپنے حالات کو اپنے سامنے جھکانے کے خواہش مند کبھی نہیں رہے۔ بلکہ حالات کے سامنے خود جھکنے کے عادی ہو چکے ہیں پروفیسر! انسان کی زندگی تو کاغذ کے ایک سادے صفحے کی طرح ہوتی ہے وہ اُس پر جیسے نقش چاہے بنا سکتا ہے۔ جو لوگ غم پسند ہوتے ہیں وہ اپنے آنسوؤں سے اُن صفحات پر غم انگیز نقش بنا دیتے ہیں اور جو لوگ مسرت کے پرستار ہوتے ہیں، اُن نقشوں میں اپنے قہقہوں سے اپنے تبسم کا رنگ بھر لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں چُپ ہوا تو انہوں نے کہا۔

"لیکن جس کے حالات ہی نے اُس سے اُس کی زندگی کے نقش چھین لئے ہوں وہ کیا کرے؟" وہ سراپا سوالیہ نشان بن گئے تھے۔

"ایسا کبھی نہیں ہوتا پروفیسر! ہمارے حالات ہماری ہمت چھین لیتے ہیں ہماری زندگی کے نقش نہیں!" میں نے جواب دیا۔

میرے جواب سے شاید وہ مطمئن نہ ہوئے تھے۔ وہ پھر اُسی مرکز پر لوٹ آئے جہاں انہوں نے اپنی بات ادھوری چھوڑی تھی۔ وہ پھر کہنے لگے۔

"مسٹر آذر! شاید تمہیں کبھی زیادہ عرصے گھر سے باہر رہنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا۔ اور میں ہوں کہ مجھے گھر رہنا نصیب نہ ہوا۔ ترس گئی ہے زندگی اب تو گھریلو ماحول کو۔ کہنے کو تو میرا بچپن اور چند طویل برس گھر میں گزرے ہیں۔ لیکن جب شعور سنبھالا تو ایک بھیانک طوفان کے بعد میرے حالات کی تلخی میرے ماحول کے لئے زہر بن گئی اور میں گھر میں رہ کر بھی اُداس اُداس بے گھر سا رہا۔ تم اپنے گھر ہو۔ جہاں انسان کو جینے کے لئے کتنے سہارے مل جاتے ہیں یا خود کسی کا سہارا بنا جی لیتا ہے لیکن بے گھر کس سہارے جئیں؟ کس کے لئے جئیں؟ دیکھو نا انسان کی زندگی سدا ہی سے کسی نہ کسی سہارے کی محتاج رہی ہے ورنہ کبھی زندگی بذاتِ خود ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہوتی ہے۔ مجھے بہت مضبوط سہاروں کی

ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میں اس بوجھ کو بغیر کسی سہارے کے برسوں سے اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے اُٹھائے دلیس بدلیس پھر رہا ہوں۔ مجھے سکون کی تلاش ہے جو شاید میرے نصیب میں اب نہیں رہا ہے۔ میں نے آج تک اپنی اُن پریشانیوں کے بارے میں کسی سے نہیں کہا وہ سب میرے سینے کی قبروں میں ایک لاش کی طرح دفن ہیں۔ شاید تم نہ سمجھ سکو کہ میری جیسی بے مقصد زندگی کا ایک ایک لمحہ گزارنا کتنا دشوار اور کتنا کٹھن ہوتا ہے۔ ایسے حوصلہ شکن مراحل میں جب دل سکڑ کر گوشوں میں کچھ دبکی چھپی تمنائیں اور آرزوئیں بھی سسکنے لگتی ہیں تو روح کانپ کانپ جاتی ہے۔ دم ہونٹوں پر آکر رک جاتا ہے لیکن موت نہیں آتی" یہ کہتے کہتے اُن کی آواز رندھ گئی۔ وہ شاید رونے لگتے اگر اور کچھ بولتے۔ اِس لئے اُنھوں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا اور خاموش ہوگئے۔

کمرے میں گہرا سکوت چھاگیا تھا۔ دیر تک جب وہ کچھ بھی نہ بولے تو میں نے ہی انھیں مخاطب کیا اور کہا۔

"آپ کی اِتنی باتوں سے میں اب تک آپ کی زندگی کی اُس بُنیاد تک نہ پہنچ سکا جس کی وجہ سے آپ اِتنے دُکھی ہیں۔ ویسے میں اِتنا ضرور جان گیا ہوں کہ آپ نے اپنے حالات سے بھرپور شکست کھائی ہے اور آپ یاس پسند بن گئے ہیں اور اِس یاس پسندی ہی نے آپ کے دل میں موت کی چاہت بھر دی ہے جس کے لئے اِس وقت میرے ذہن میں ایک یہی بات ہے کہ ہم نے اپنی خواہشات اور ضرورتوں کو اِتنا بڑھا لیا ہے کہ ہمیں سکون کبھی مل ہی نہیں سکتا۔ ہم کبھی اپنی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ ہماری ہَوس نے ہماری منزلوں کو آگ لگا دی ہے۔ ہمیں بصارت سے محروم کر دیا ہے۔ ہمیں ایک ستون سے باندھ دیا ہے تاکہ ہم اُس کے چاروں طرف زندگی بھر چکّر کاٹتے رہیں۔ افسوس کہ ہماری آنکھیں یہ بتانے سے مجبور ہیں کہ ہم سیدھے چل رہے ہیں یا چکّر کاٹ رہے ہیں۔ ہم نے حرکت کو زندگی سمجھ لیا ہے جبکہ حرکت زندگی کا ایک جزو ہو سکتی ہے مکمل زندگی نہیں۔ زندگی کا حاصل تو خاموشی اور سکون ہیں" موت نہیں!!" اِس بار میری باتیں سُن کر وہ مُسکرائے اور پھر اچانک ہی اُس مُسکراہٹ کو سمیٹتے ہوئے کہنے لگے۔

"مسٹر آذر! تم نے خواہشات اور سکون کے لئے جو کچھ کہا ہے وہ صرف سُننے کی حد تک خوبصورت ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق جب سامنے آتے ہیں تو ایسی دلیلیں بے معنی بن جاتی ہیں۔ میری ساری زندگی جد و جہد اور کوشش کی آماجگاہ رہی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میری ہر کوشش کا نتیجہ شکست بن کر میرے سامنے آیا۔ ہر دُکھ کے بعد جب دُکھ نصیب ہو تو خوشی کی چاہت خود بخود ختم ہو جاتی ہے" اِتنا کہنے کے بعد وہ میرے چہرے کو تکنے لگے۔

میں نے اُن کی نگاہوں کے انداز کو بھانپتے ہوئے کہا: "ایسی بات نہیں جناب! [illegible]

بعد میں ضرور آتا ہے۔ جہاں تاریکی ہے وہاں [illegible] نہیں جاتی۔ اِس سلسلے میں مجھے ایک بات یاد آرہی ہے جو شاید آپ کی [illegible] ہوگی۔ میں نے اکثر بچّوں کو دیکھا ہے جو اپنی [illegible] کو سمجھاتے ہیں کہ [illegible] رہو ایک بار۔ دو بار۔ تین بار۔ ایک دن کامیابی [illegible] اپنی جگہ بالکل صحیح ہو لیکن میرے ذہن میں یہ فکر بار بار [illegible] کامیاب کیوں نہ ہوتی؟ ہماری دوسری کوشش کا نتیجہ کیوں خراب ہوا؟

اور ہمیں کیوں تیسری بار کا انتظار کرنا پڑا ۔۔۔۔؟ اور [illegible]!!

یا پھر اِس بات کو دوسری طرح یوں سمجھ لیجئے کہ لوگ سمندر کے کنارے [illegible] تڑپتی ہوئی لہروں کو دکھا کر کبھی کبھی اپنے بچّوں کو سمجھاتے ہیں کہ [illegible] کس قدر ناکام ہے لیکن ایک عرصے کے بعد پھر وہ لوگ سمندر کے کٹے ہوئے ساحل کو دکھا کر لہروں کی کامیابی کا راز سمجھاتے ہیں جو مستقل جد و جہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں گے تو اُس وقت وہ اُس بچّے سے بھی زیادہ کم عقل ہوتے ہیں جو اُن کی انگلی پکڑے ہوتا ہے کیونکہ وہ اُس بچّے کو بُنیادی جوہروں کو جلا دینے کے بجائے اُنھیں [illegible] ہیں اور اِس لئے وہ میری نظر میں سزا کے مستحق ہیں۔ غور کیجئے کہ ساحل کا کٹنا لہروں کی پیہم کوشش" اور "عرصہ" دونوں کا مشترکہ نتیجہ ہے۔ لہروں کو "عرصے" کی مدد [illegible] اور آپ بھی یہ جانتے ہوں گے کہ مدد کمزور لیا کرتے ہیں۔

میری اِن باتوں کو شاید آپ الفاظ کا گورکھ دھندا سمجھیں لیکن ایسی بات نہیں ہے کیونکہ ہمارا مشاہدہ بھی تو یہی ثابت کرتا ہے کہ جوار بھاٹا کتنے قلیل وقفے میں کروڑوں زمین کو ڈبو دیتا ہے۔ سیلاب کچھ ہی لمحوں میں ایکڑوں رقبہ کاٹ کر رکھ دیتا ہے کیونکہ یہ جوار بھاٹے سے بھی طاقت ور ہے۔ لیکن انسان کی بارہا کوششیں اور ایک کامیابی!! اب آپ یقینی طور پر سمجھ گئے ہوں گے کہ ہماری کوشش ہی میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے جو ہمیں ناکام بنا دیتی ہے ورنہ بھرپور کوشش ہمارے دامن میں کبھی ناکامی کی آگ نہیں ڈالتی"

میری باتیں سُننے کے بعد پروفیسر نے سگار جلاتے ہوئے سرد آہ بھری اور پھر مجھے مخاطب کیا۔

"تم تو فلسفے کی دلدل میں پھنس گئے مسٹر! تمہیں عملی زندگی کی جد و جہد سے ابھی واسطہ نہیں پڑا ہے، ورنہ یہ سب کچھ بھول جاتے۔ مجھے یقین ہے کہ تمھاری زندگی اور تمھارے حالات مستقبل میں جو کچھ سکھا دیں گے، میری طرح تمھاری زندگی کا بھی وہی فلسفہ بن جائے گا ۔۔۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟ میں اپنے بارے میں تمھیں بتانا چاہتا تھا!!"

اِتنا کہہ کر وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے اور نہ جانے کیا سوچ کے بعد [illegible] آواز میں بولے: "دیکھو میری کوئی بہن نہیں ہے [illegible] اُس کے پیار [illegible] نہیں ہوں [illegible] کو چھوڑ کر مجھے دُنیا کی ہر عورت سے نفرت ہے [illegible] مگر عورت کا وجود [illegible] دُنیا میں کوئی

[illegible] ۔ میرا خیال ہے [illegible]
[illegible] ایک طرح کا [illegible]
[illegible] دل کا بوجھ ہلکا
ہو جائے اور [illegible] روشنی کی [illegible] کر
سکو۔ یہ ایک دوسری وجہ ہے کہ [illegible] تعلق رکھتا ہوں۔ سماج اور مذہب کے
اصولوں کا تقاضا [illegible] کی بات ہے [illegible] محسوس کر سکتا۔ ورنہ
بہت سے لوگوں کی طرح اپنی ایک شادی کے بعد [illegible] شادیاں کر چکا ہوتا
اور میری زندگی تنہائی کی بے رحم آغوش میں یوں پڑی [illegible] سسکتی اور ...“

”تو آپ کی شادی ہو چکی ہے؟“ وہ آگے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میرے منہ سے غیر اختیاری طور پر ایکدم نکل گیا۔

”جی ہاں بہت پہلے! میں سب کچھ بتاتا ہوں۔“ میرے اشتیاق کو بھانپتے ہوئے وہ کہنے لگے: ”وہ حقیقت جس سے میں دوچار ہو چکا ہوں کاش میرے لئے ایک خواب ہو جاتی یا صرف ایک خیال ہو جاتی —— جو میں آج یوں لکھی نہ ہوتا۔ میں برسوں بعد تمہیں اپنے دل کے وہ زخم دکھانا چاہتا ہوں جن کی جلن اور سوزش میں مدتوں سے میرا وجود سُلگ رہا ہے۔

یہ اب سے کئی سال پہلے کی بات ہے، جب میں نے پہلی بار زینت کو دیکھا تھا۔ وہ میری ایک دُور کے رشتے کی خالہ کی لڑکی تھی۔ اُس دن میرے کسی رشتے دار کے یہاں شادی کی کوئی تقریب تھی جہاں وہ آئی تھی۔ اُسے پہلی ہی نظر میں دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے بہت اپنائیت کا احساس ہوا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی صورت میری جانی پہچانی ہے۔ میں اُسی اپنائیت کے جذبے کے تحت اُس کے قریب گیا اور اُس سے بات چیت کی۔ وہ بات کیا تھی؟ یہ مجھے یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اُس پہلی ہی بات چیت نے میرے احساس میں بہت سی نئی باتوں کو جنم دے دیا تھا۔ میں اُن دنوں محبت کے احساس یا شعور سے بالکل ناآشنا تھا لیکن میں آج تک اِس بات کو نہیں سمجھ سکا ہوں کہ اُس دن مجھے اُس کی قربت سے کیوں ایک گہرے سکون کا احساس ہوا تھا؟ دن جیسے جیسے گزرتے رہے میرے اُس سکون کی چاہت میں شدت آتی گئی اور میری یہ آرزو رہنے لگی کہ میں تنہائیوں میں اُس کے ساتھ مٹی کے گھروندے بناتا رہوں اور توڑتا رہوں۔ اپنی اِس آرزو کی تکمیل کے لئے اُن دنوں میں ایسے ہی مواقع فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہتا اور پھر اُس سے گھنٹوں باتیں کرتا رہتا —— دن گزرے تو اُس کا میرا شعور بڑھا اور اُس شعور کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ دل نے بھی کچھ نئی چاہتوں کو اُبھارا جن کا ذکر اُس نے مجھ سے کیا اور میں نے اُس سے کیا اور پھر ہم دونوں نے کچھ عہد و پیمان کر لئے [illegible] ملاقات کے تقاضے ہمیں ایک دوسرے سے جُدا کر دیں۔

[illegible] اس طرح دو سال بیت گئے [illegible]

[illegible] سب کچھ [illegible]
[illegible]
[illegible]
اور اُس [illegible] کی وجہ سے میں [illegible] میری
[illegible] گھر والوں نے میری [illegible] کا علاج
جان کر میری [illegible] کی لڑکی کے ساتھ میری شادی کا رشتہ طے کر دیا۔ میں نے پہلا ماحول سے بغاوت کر دی لیکن میری ماں نے [illegible] کا واسطہ میرے ارادوں کی راہ میں ڈال دیا اور پھر باپ نے اپنی ساری زندگی کی شفقت کا صلہ میری سعادت مندی سے طلب کر کے میرے حوصلے پست کر دیئے۔ پھر —— پھر تو میرے راستوں کے سب پھول مُرجھا گئے اور اُن کی جگہ آگ کے شعلوں نے لے لی اور میرا ہر راستہ آگ کا دریا بن گیا۔

مجھے آگ پر تڑپتا چھوڑ دیا گیا۔ میرے وہ دن اور اُن کا ہر لمحہ عجیب عالم میں گزرا۔ کبھی تو میں سوچتا تھا، عورت جو میری بیوی بن کر آئی ہے مجھے اِس سے نفرت کرنی چاہئے اور کبھی مجھے یہ خیال آتا کہ یہ بے قصور ہے اور دوسروں کی خطاؤں کا انتقام اِس بے گناہ سے لینا بہت بڑا گناہ ہوگا —— انہیں سوچوں میں بسر کرتے کرتے جب کچھ دن بیت گئے تو میں ایک خوبصورت سے بچے کا باپ بن گیا۔ اُس کے وجود سے میرے آنگن میں بے شمار خوشیوں کے جھرمٹ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ پورے ماحول پر مسرت کی چاندنی اور مسکراہٹوں کی نورانی کرنیں چھا گئیں۔ گھر والوں کو مرادوں کی اَن گنت خوشیاں ملیں لیکن نہ جانے کیوں میرے دل پر اُداسیاں چھائی رہیں۔ میرے نام کی کوئی ایک خوشی میرے ہونٹوں پر نہ آسکی۔ ایک عجیب بے نام سی خاموشی اور یاسیت میرے سارے وجود پر چھائی رہی۔ بیوی کو میں اُس حقیقی پیار کا ایک لمحہ بھی نہ دے سکا جس کی وہ مستحق تھی۔ میرے ذہن کا ایک ہی مرکز تھا جسے میں ہر گھڑی اور ہر وقت سوچنا چاہتا تھا۔ اِسی لئے بیوی سے میری بے رُخی اور اُس کے جواب میں اُس کی مسلسل شکایتیں گھر والوں کی خوشیوں میں آگ لگاتی رہیں اور اِسی وجہ سے میرا ذہن ایک آتش کدہ بن کر رہ گیا۔ لیکن پھر بھی اُس آتشکدہ کی آگ میں زینت کا پاکیزہ وجود مجھے بہت آسودگی بخشتا اور میں اپنے حال کی جلن اور سوزش سے فرار پانے کے لئے اُس کے خیالوں میں کھویا رہتا۔

زینت جب بی۔ اے کر کے گھر آئی تو کسی نہ کسی طرح میں نے اُس سے ملاقات کی۔ اُس مختصر لیکن یادگار ملاقات میں اُس نے اتنا کچھ کہا کہ اُسے بتانے کے لئے بہت وقت چاہئے۔ میں اُن کی تفصیلات میں نہ جاؤں گا لیکن وہ باتیں ضرور بتاؤں گا جو [illegible] ضروری رہے گی۔

[illegible]

فرصت ہوتی ہے۔ لیکن میں اُس بوجھ کو بغیر کسی سہارے کے برسوں سے اپنے ہی کمزور کندھوں پر لئے کے آخری دنوں میں بھی لئے پھر رہا ہوں۔ مجھے سکون کی تلاش ہے جو شاید میرے نصیب میں میسر نہیں رہا ہے۔ میں نے آج تک اپنی اُن پریشانیوں کے بارے میں کسی سے نہیں کہا، وہ سب میرے سینے کی قبر میں ایک لاش کی طرح دفن ہیں۔ شاید تم نہ سمجھ سکو کہ میری جیسی بے مقصد زندگی کا ایک ایک لمحہ گزارنا کتنا دشوار اور کتنا کٹھن ہوتا ہے۔ ایسے حوصلہ شکن مراحل میں جب دل کے گوشوں میں کچھ دبی چھپی تمنائیں اور آرزوئیں سسکنے لگتی ہیں تو روح کانپ کانپ جاتی ہے۔ دم ہونٹوں پر آکر رُک جاتا ہے لیکن موت نہیں آتی ہے" یہ کہتے کہتے اُن کی آواز بھر آگئی۔ وہ شاید رونے لگتے اگر اور کچھ بولتے۔ اس لئے انھوں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا اور خاموش ہو گئے۔

کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ دیر تک جب وہ کچھ بھی نہ بولے تو میں نے ہی انھیں مخاطب کیا اور کہا۔

"آپ کی اتنی باتوں سے میں اب تک آپ کی زندگی کی اُس بُنیاد تک نہ پہنچ سکا جس کی وجہ سے آپ اتنے دُکھی ہیں۔ ویسے میں اتنا ضرور جان گیا ہوں کہ آپ نے اپنے حالات سے بھرپور شکست کھائی ہے اور آپ یاس پسند بن گئے ہیں اور اس یاس پسندی ہی نے آپ کے دل میں موت کی چاہت دے دی ہے جس کے لئے اس وقت میرے ذہن میں ایک یہی بات ہے کہ ہم نے اپنی خواہشات اور ضرورتوں کو اتنا بڑھا لیا ہے کہ ہمیں سکون کبھی مل ہی نہیں سکتا۔ ہم کبھی اپنی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ ہماری ہوس نے ہماری منزلوں کو آگ لگا دی ہے۔ ہمیں بصارت سے محروم کر دیا ہے۔ ہمیں ایک ستون سے باندھ دیا ہے تاکہ ہم اُس کے چاروں طرف زندگی بھر چکر کاٹتے رہیں۔ افسوس کہ ہماری آنکھیں یہ بتانے سے مجبور ہیں کہ ہم سیدھے چل رہے ہیں یا چکر کاٹ رہے ہیں۔ ہم نے حرکت کو زندگی سمجھ لیا ہے جبکہ حرکت زندگی کا ایک جزو ہو سکتی ہے مکمل زندگی نہیں۔ زندگی کا حاصل تو خاموشی اور سکون ہے" موت نہیں!!" اس بار میری باتیں سُن کر وہ مُسکرائے اور پھر اچانک ہی اُس مُسکراہٹ کو سمیٹتے ہوئے کہنے لگے۔

"مسٹر آذر! تم نے خواہشات اور سکون کے لئے جو کچھ کہا ہے وہ صرف سُننے کی حد تک خوبصورت ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق جب سامنے آتے ہیں تو ایسی دلیلیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ میری ساری زندگی جد و جہد اور کوشش کی آماجگاہ رہی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میری ہر کوشش کا نتیجہ شکست بن کر میرے سامنے آیا۔ ہر دُکھ کے بعد جب دُکھ نصیب ہو تو خوشی کی چاہت خود بخود ختم ہو جاتی ہے" اتنا کہنے کے بعد وہ میرے چہرے کو تکنے لگے۔

میں نے اُن کی نگاہوں کے انداز کو بھانپتے ہوئے کہا "ایسی بات نہیں جناب! ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ دُکھ کے بعد انسان کو دُکھ ہی ملے۔ ہر شام کے بعد صبح اور ہر رات کے بعد دن ضرور آتا ہے۔ جہاں تاریکی ہے وہاں روشنی کا وجود [illegible] نہیں جاتی۔ اس سلسلے میں مجھے ایک بات یاد آرہی ہے [illegible] ہوگی۔ میں نے اکثر بچوں کو دیکھا ہے جو اپنی نسل کو سمجھایا کرتے [illegible] رہو ایک بار۔ دو بار۔ تین بار۔ ایک دن کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ [illegible] بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہو لیکن میرے ذہن میں یہ فکر ہر وقت رہتی ہے کہ [illegible] کامیاب کیوں نہ ہوئی؟ ہماری دوسری کوشش کا نتیجہ کیوں خراب رہا؟

اور ہمیں کیوں تیسری بار کا انتظار کرنا پڑا ۔۔۔؟ [illegible] !!

یا پھر اس بات کو دوسری طرح یوں سمجھ لیجئے کہ لوگ سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر تڑپتی ہوئی لہروں کو دکھا کر کبھی کبھی اپنے بچوں کو سمجھاتے ہیں کہ [illegible] کس قدر ناکام ہے لیکن ایک عرصے کے بعد پھر وہ لوگ سمندر کے کٹے ہوئے ساحل کو دکھا کر لہروں کی کامیابی کا راز سمجھاتے ہیں جو مستقل جد و جہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں گے تو اُس وقت وہ اُس بچے سے بھی زیادہ کم عقل ہوتے ہیں جو اُن کی اُنگلی پکڑے ہوتا ہے کیونکہ وہ اُس بچے کو بنیادی جوہروں کو جلا دینے کے بجائے انھیں جلا ڈالتے ہیں اور اس لئے وہ میری نظر میں سزا کے مستحق ہیں۔ غور کیجئے کہ ساحل کا کٹنا "لہروں کی پیہم کوشش" اور "عرصہ" دونوں کا مشترکہ نتیجہ ہے۔ لہروں کو "عرصہ" کی مدد کا رہی ہے اور آپ بھی یہ جانتے ہوں گے کہ مدد کمزور لیا کرتے ہیں۔

میری اِن باتوں کو شاید آپ الفاظ کا گورکھ دھندا سمجھ لیں لیکن ایسی بات نہیں ہے کیونکہ ہمارا مشاہدہ بھی تو یہی ثابت کرتا ہے کہ جوار بھاٹا کتنے قلیل وقفے میں گزوں زمین کو ڈبو دیتا ہے۔ سیلاب کچھ ہی لمحوں میں ایکڑوں رقبہ کاٹ کر رکھ دیتا ہے کیونکہ یہ جوار بھاٹے سے بھی طاقت ور ہے۔ لیکن انسان کی بارہا کوششیں اور ایک کامیابی!! اب آپ یقینی طور پر سمجھ گئے ہوں گے کہ ہماری کوشش ہی میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے جو ہمیں ناکام بنا دیتی ہے ورنہ بھرپور کوشش ہمارے دامن میں کبھی ناکامی کی آگ نہیں ڈالتی"

میری باتیں سُننے کے بعد پروفیسر نے سگار جلاتے ہوئے سرد آہ بھری اور پھر مجھے مخاطب کیا۔

"تم تو فلسفے کی دلائل میں پھنس گئے مسٹر! تمھیں عملی زندگی کی جد و جہد سے ابھی واسطہ نہیں پڑا ہے، ورنہ یہ سب کچھ بھول جاتے۔ مجھے یقین ہے کہ تمھاری زندگی اور تمھارے حالات مستقبل میں جو کچھ سکھا دیں گے، میری طرح تمھاری زندگی کا بھی وہی فلسفہ بن جائے گا۔۔۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں اپنے بارے میں تمھیں بتانا چاہتا تھا!!" اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے اور نہ جانے کیا سوچنے کے بعد وہ دھیمی آواز میں بولے۔ "دیکھو میری کوئی بہن نہیں ہے اس لئے میں اُس کے پیار سے آشنا نہیں ہوں۔ ماں کو چھوڑ کر مجھے دنیا کی ہر عورت سے نفرت ہے۔ میرے خیال میں کائنات میں اگر عورت کا وجود نہ ہوتا تو شاید خدا کو جنت کے ساتھ جہنم بنانے کی فرصت نہ تھی۔ [illegible]

نے ایک مضبوط ساتھی کے [illegible] جس کی [illegible] میں [illegible] سب کچھ [illegible] چھپا [illegible] گئی [illegible] میری [illegible] اُس کی [illegible] کر [illegible] ہوتی۔ [illegible] انکار کر دینا چاہیے تھا [illegible] اور اُس انکار کی وجہ سے میں اداس اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ جب کافی وقت تک میری یہی حالت رہی اور میں نے کسی سے دل کی بات نہ کہی تو گھر والوں نے میری اُداسی کا علاج جان کر میری سگی خالہ کی لڑکی کے ساتھ میری شادی کا رشتہ طے کر دیا۔ میں نے چاہا ماحول سے بغاوت کر دوں لیکن میری ماں نے اپنی بے لوث ممتا کا واسطہ دے کر میرے ارادوں کی راہ میں ڈال دیا اور پھر باپ نے اپنی ساری زندگی کی شفقت کا صلہ میری سعادت مندی سے طلب کر کے میرے حوصلے پست کر دئیے۔ پھر ـــــ پھر تو میرے راستوں کے سب پھول مرجھا گئے اور اُن کی جگہ آگ کے شعلوں نے لے لی اور میرا ہر راستہ آگ کا دریا بن گیا۔

مجھے آگ پر تڑپتا چھوڑ دیا گیا۔ میرے وہ دن اور اُن کا ہر لمحہ عجیب عالم میں گزرا۔ کبھی تو میں سوچتا تھا یہ عورت جو میری بیوی بن کر آئی ہے مجھے اِس سے نفرت کرنی چاہیئے اور کبھی مجھے یہ خیال آتا کہ یہ بے قصور ہے اور دوسروں کی خطاؤں کا انتقام اِس بے گناہ سے لینا بہت بڑا گناہ ہوگا ـــــ اِنہیں سوچوں میں بسر کرتے کرتے جب کچھ دن بیت گئے تو میں ایک خوبصورت سے بچے کا باپ بن گیا۔ اُس کے وجود سے میرے آنگن میں بے شمار خوشیوں کے جھرمٹ قہقہے مار کر ہنس پڑے۔ پورے ماحول پر مسرت کی چاندنی اور مسکراہٹوں کی نورانی کرنیں چھا گئیں۔ گھر والوں کو مرادوں کی اَن گنت خوشیاں ملیں۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے دل پر اُداسیاں چھائی رہیں۔ میرے نام کی کوئی ایک خوشی میرے ہونٹوں پر نہ آسکی۔ ایک عجیب بے نام سی خاموشی اور یاسیت میرے سارے وجود پر چھائی رہی۔ بیوی کو میں اُس حقیقی پیار کا ایک لمحہ بھی نہ دے سکا جس کی وہ مستحق تھی۔ میرے ذہن کا ایک ہی مرکز تھا جسے میں ہر گھڑی اور ہر وقت سوچنا چاہتا تھا۔ اِسی لئے بیوی سے میری بے رُخی اور اُس کے جواب میں اُس کی مسلسل شکایتیں گھر والوں کی خوشیوں میں آگ لگاتی رہیں اور اِسی وجہ سے میرا ذہن ایک آتش کدہ بن کر رہ گیا۔ لیکن پھر بھی اُس آتشکدہ کی آگ میں زینت کا پاکیزہ وجود مجھے بہت آسودگی بخشتا اور میں اپنے حال کی جلن اور سوزش سے فرار پانے کے لئے اُس کے خیالوں میں کھویا رہتا۔

زینت جب بی۔ اے کر کے گھر آئی تو کسی نہ کسی طرح میں نے اُس سے ملاقات کی۔ اُس مختصر لیکن یادگار ملاقات میں اُس نے اِتنا کچھ کہا کہ اُسے بتانے کے لئے بہت وقت چاہیئے۔ میں اُن کی تفصیلات میں نہ جاؤں گا لیکن خاص باتیں ضرور بتاؤں گا ورنہ بات ادھوری رہے گی۔

اُسے شکایت تھی کہ میں کیوں حالات سے شکست کھا گیا۔ میں نے کیوں زمانے سے ہار مان کر شادی کر لی۔ مجھے زندگی کی آخری سانسوں تک اُس کا انتظار کرنا چاہیئے تھا۔

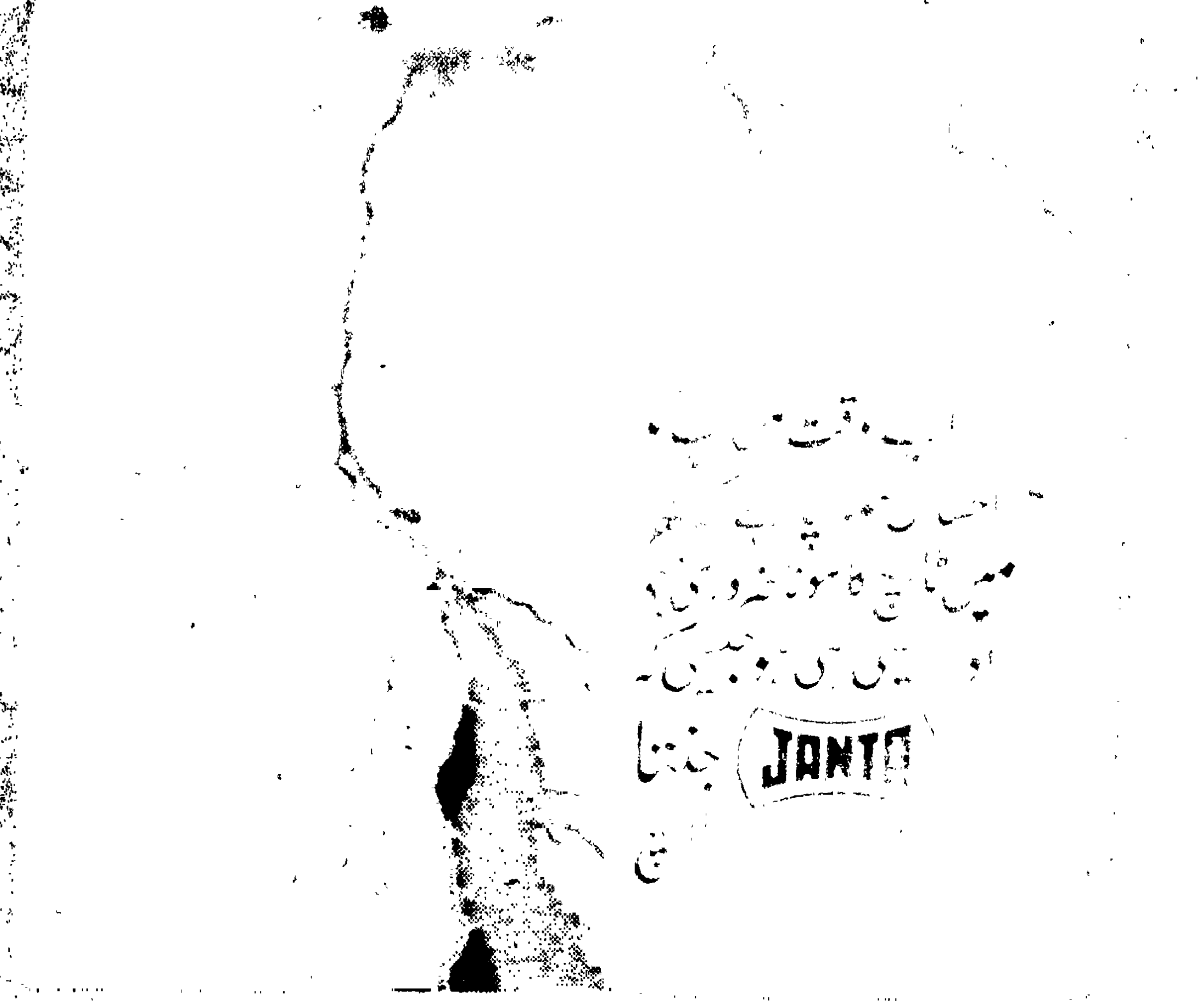
[illegible] ہے۔ میرا خیال ہے وہ ابھی تک [illegible] ہو سکتی [illegible] نہیں ہو سکتا [illegible] زندگی [illegible] جیسی [illegible] چاہتا ہوں [illegible] دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور تم [illegible] سے [illegible] کوئی [illegible] میں ایک مذہبی [illegible] گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ سماج اور مذہب کے اُصولوں کو توڑنا [illegible] کی بات ہے میں اپنا احترام [illegible] نہیں کر سکتا۔ ورنہ بہت سے لوگوں کی طرح اپنی ایک شادی کے بعد بھی [illegible] کئی شادیاں کر چکا ہوتا اور میری زندگی تنہائی کی بے رحم آغوش میں یوں پڑی نہ سسکتی ہوتی۔"

"تو آپ کی شادی ہو چکی ہے؟" وہ آگے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میرے مُنہ سے غیر اختیاری طور پر ایکدم نکل گیا۔

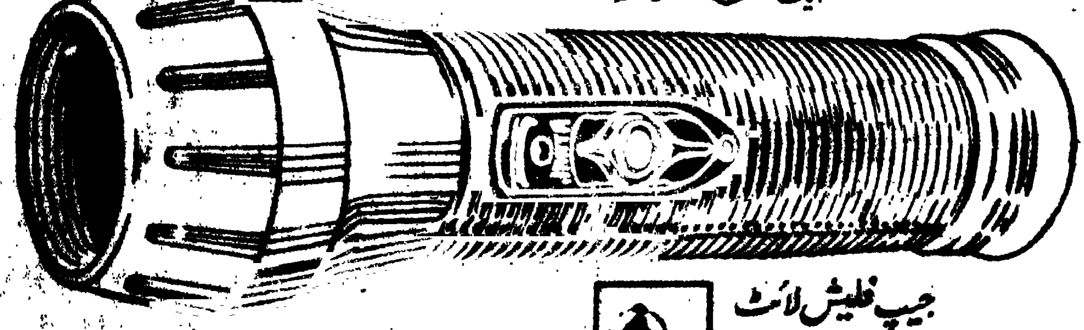
"جی ہاں بہت پہلے! میں سب کچھ بتا رہا ہوں۔" میرے اشتیاق کو سمجھتے ہوئے وہ کہنے لگے: "وہ حقیقت جس سے میں دوچار ہو چکا ہوں کاش میرے لئے ایک خواب ہو جاتی یا صرف ایک خیال بن جاتی ـــــ جو میں آج یوں دُکھی نہ ہوتا۔ میں برسوں بعد تمہیں اپنے دل کے وہ زخم دکھانا چاہتا ہوں جن کی جلن اور سوزش میں مُدتوں سے میرا وجود سُلگ رہا ہے۔

یہ اب سے کئی سال پہلے کی بات ہے، جب میں نے پہلی بار زینت کو دیکھا تھا۔ وہ میری ایک دُور کے رشتے کی خالہ کی لڑکی تھی۔ اُس دن میرے کسی رشتے دار کے یہاں شادی کی کوئی تقریب تھی جہاں وہ آئی تھی۔ اُسے پہلی ہی نظر میں دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے بہت اپنائیت کا احساس ہوا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی صورت میری جانی پہچانی ہے۔ میں اُسی اپنائیت کے جذبے کے تحت اُس کے قریب گیا اور اُس سے بات چیت کی۔ وہ بات کیا تھی؟ یہ مجھے یاد نہیں لیکن اِتنا ضرور یاد ہے کہ اُس پہلی ہی بات چیت نے میرے احساس میں بہت سی نئی باتوں کو جنم دے دیا تھا۔ میں اُن دنوں محبت کے احساس یا شعور سے بالکل ناآشنا تھا لیکن میں آج تک اِس بات کو نہیں سمجھ سکا ہوں کہ اُس دن مجھے اُس کی قربت سے کیوں ایک گہرے سکون کا احساس ہوا تھا؟ دن جیسے جیسے گزرتے رہے میرے اُس سکون کی چاہت میں شدت آتی گئی اور میری یہ آرزو رہنے لگی کہ میں تنہائیوں میں اُس کے ساتھ مٹی کے گھروندے بناتا رہوں اور توڑتا رہوں۔ اپنی اِس آرزو کی تکمیل کے لئے اُن دنوں میں ایسے ہی مواقع فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہتا اور پھر اُس سے گھنٹوں باتیں کرتا رہتا ـــــ دن گزرے تو اُس کا میرا شعور بڑھا اور اُس شعور کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ دل نے بھی کچھ نئی چاہتوں کو اُبھارا جن کا ذکر اُس نے مجھ سے کیا اور میں نے اُس سے کیا اور پھر ہم دونوں نے کچھ عہد و پیمان کر لئے تاکہ حالات کے تقاضے ہمیں ایک دوسرے سے جُدا نہ کر دیں۔

اور اِس طرح دو سال بیت گئے۔ زینت گھر سے کالج چلی گئی جہاں اُسے تعلیم حاصل کرنا تھا۔



JANTA
جنتا

قابلِ اعتماد، کارآمد اور پائیدار
ایک EEE ساختہ
جیپ فلیش لائٹ
انڈسٹریز لمیٹڈ
۲۸ ساروکٹہ روڈ الہ آباد
ENTERPRISE

سب کیا کر سکتی ہو۔ لیکن میں کہاں ہوں یہ اُس کو کیا معلوم تھا جب تم میرے پیدا ہونے سے پہلے
خوشیاں تھیں جو میری آنکھوں نے دیکھی تھیں۔ اس کا بھی میں اُن لمحوں کو
[illegible] سب سے زیادہ ذہن پر ہے [illegible] احساس [illegible]
[illegible] کے بعد [illegible] پھر [illegible] ایک مرکز پر
[illegible] میری اُداسیاں پھر لوٹ آئیں۔ میری شادی کے احساس نے پھر میرے ذہن پر
قبضہ جما لیا۔

وقت گزرا ——— دن گزرے ——— وہ گزرے تو حالات بدلے اور اُن حالات کے
ساتھ ساتھ اُن کا انداز بھی بدلا ——— پھر بہت کچھ بدل گیا۔

اُنھیں دنوں گھر والوں نے میرے چھوٹے بھائی کی شادی میری بیوی کی چھوٹی بہن
سے کر کے میری مشکل کو اور مشکل کر دیا اور تب تو میں بے حد ڈر گیا۔ گھر والے میری پریشانیوں
اور تمام خوشیوں سے پریشان تھے۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میں بیوی سے علیحدگی چاہتا
تھا لیکن بیوی سے برداشت [illegible] تو تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا۔ میرے ذہن پر ہر
ساعت یہ ڈر سوار رہنے لگا کہ میں اپنی خوشی کے لیے کہیں چھوٹے بھائی کے گھر کو آگ
نہ لگا دوں جو مجھے میری زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اُن حالات میں بالکل پاگل جیسا ہو گیا۔
میرے ذہن کی عجیب کیفیت ہو گئی اور اُس کیفیت میں کئی دن [illegible] گزر گیا اور
زینت سے ملا شاید میری مایوسیاں اور اُداسیاں [illegible] کو قسمت نے ایک بار
پھر میری آرزوؤں کے دروازے میرے لیے وا کر دئیے اور وہ ایک بار پھر میرے قریب آ گئی۔
ماضی کی داستان کا ہر ورق پھر سے دہرایا گیا۔ نئے عہد و پیمان ہوئے۔ کبھی ایک دوسرے
سے جدا نہ ہونے کی قسمیں کھائی گئیں۔ ایک دوسرے کے لیے مرنے اور جینے کے پھر عہد و پیمان
ہوئے اور گزرے ہوئے دنوں کی تمام شکایتوں اور شکووں کو دُہرا کر اُنھیں ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے ماضی کے مزاروں میں دفن کر دیا گیا۔ آخرکار اُن تمام خوش فہمیوں کے بعد جب
وہ مجھ سے جدا ہونے لگی تو اُس نے مجھ سے میری بیوی کی قربانی مانگی جسے میں نے سُنتے ہی
بخوشی قبول کر لیا۔ اس لیے کہ ایک مرد جسے دل و جان سے چاہتا ہے اُس کے لیے ہر قربانی
دے سکتا ہے۔ میں پہلے ہی بیوی سے علیحدگی چاہتا تھا اور اسے وہ پیار بھی نہ دے سکا تھا
جس کی وہ طلب گار تھی۔ اس لیے میں نے اُس کی راہ کا پتھر ہٹانے کا وعدہ کر لیا اور گھر
واپس آ گیا۔ اُس کے بعد میں پھر کبھی اُس کے ہوسٹل نہیں گیا۔ کیونکہ میری چاہت کی منزل
اب خود میرے قریب آ رہی تھی۔

یہ اُس کے ایم۔ اے کے آخری سال کی بات ہے، جب وہ کچھ دنوں بعد اپنے گھر
واپس آنے والی تھی۔ مجھے اپنا وعدہ یاد آیا اور ایک رات میں نے اپنی تمام قوتوں کو یکجا کر کے اپنی
تنہائی کے پاؤں پر سر رکھ کر اپنی جوانی کی بھیک مانگی۔ میری قسمت یا میرے حالات کہ تھوڑی
سی جد و جہد کے بعد وہ بھیک مجھے مل گئی۔ میرے چھوٹے بھائی کا گھر بھی سلامت رہا اور
میں بھی آزاد ہو گیا۔ لیکن گھر میں کمرے [illegible] جیسا تھا ویسا ہی [illegible] خوشی [illegible]
اور پھر سب کچھ بدل گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ لیکن جب حالات کی قدر [illegible] تو [illegible] ایک
طوفان آیا جو میرا سب کچھ بہا کر لے گیا۔ سب سے بڑی بدقسمتی میری کہ تھوڑے عرصے بعد
تھوڑی سی علالت کی وجہ سے میرا چار سالہ بچہ موت کی ظالم آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے
لیے سو گیا۔ جس کے غم میں کچھ عرصہ تک میں بالکل پاگل سا رہا۔ وقت تیزی سے گزرتا ہے تو
حالات کے زخم بھی آہستہ آہستہ ہی بھر جاتے ہیں یا مندمل ہو جاتے ہیں لیکن اُن دنوں جب جب وقت گزرتا
بچے کی موت کے صدمے اُس کے ساتھ ساتھ میرے ذہن پر اور زیادہ سوار رہنے لگے۔ اِس لیے
اُن سے چھٹکارا پانے کے لیے میں نے ایک جگہ ملازمت کر لی جس کی مصروفیات میں آ کر میں
اپنے غموں کو کسی حد تک بھول گیا۔ میں نے سوچا میں جلد ہی زینت کا سہارا پا کر اپنے غم کو کسی
قدر ہلکا کر سکوں گا۔ امتحانات کے بعد وہ اپنے گھر آ گئی۔ یہ خبر سُنتے ہی میرے ہونٹوں سے
سکوت کی مہریں ٹوٹ گئیں۔ میری تقدیر کی طرح مجھ سے روٹھا ہوا تبسم میرے لبوں پر پھر
واپس آ گیا اور مجھے تصورات میں شہنائیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہونے لگیں لیکن ایک
رات پھر عجیب سی بات ہوئی کہ سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی اور یکایک مجھے اپنے ابّو اور امّی کی
کچھ ایسی سرگوشیاں سنائی دیں جنھیں سُن کر میں حیران رہ گیا۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔
اِس سے پہلے کہ اُن کی سرگوشیاں [illegible] اور وہ کچھ کہتے پا سکتے۔ میں نے
چاہا کہ زینت سے مل کر اپنے والدین کے ارادوں کے بارے میں سب کچھ کہہ دوں کہ وہ کبھی بھی وہ
اُن کے ارادوں کو [illegible] اپنا [illegible] لیکن اِس سے پہلے کہ میں اُس سے
کچھ کہتا مجھے اُس کی طرف سے یہ خط ملا تھا ——— انھوں نے میز پر رکھے ہوئے اُس کاغذ
کی طرف اشارہ کیا جسے وہ کچھ دیر پہلے پڑھ رہے تھے۔

"یہ اُس کا خط نہیں تھا میری چاہت اور میرے خلوص کے ماتھے پر ایک
ٹھوکر تھی جس میں اُس نے لکھا تھا: میری منگنی کے دن قریب ہیں۔ میں اپنے والدین کو اپنی
رضامندی دے چکی ہوں۔ میرا شریکِ زندگی معمولی پڑھا لکھا انسان ہے۔ پھر بھی اُس کے گھر مجھے
بہت سکھ ملے گا۔ میری خاطر جب آپ اپنی پرستش کے [illegible] بیوی کو چھوڑ سکتے ہیں تو پھر
یقین کیسے ہو کہ کسی اور کی خاطر مجھے نہ چھوڑ دیں گے۔" انھوں نے وہ خط پڑھ کر میز پر رکھ دیا
اور اُس کے بعد پھر مخاطب ہوئے: "اُس کی شادی کو کئی برس ہو گئے اور آج وہی زینت
ہیڈ مسٹریس زینت ریاض ہے کہ ایک عام سے آدمی کی بیوی بن چکی ہے لیکن میری زندگی اُس دن
سے آج تک موت کے دامن میں سسک رہی ہے۔ اُسی دن سے میں گھر سے بے گھر ہوا پھر رہا
ہوں۔ میں نے جب سے گھر کی شکل نہیں دیکھی ہے اور اب جانے کیا کیا حاصل ہوگا؟
زندگی اگر ایسی ہی خوشیوں کا نام ہے تو موت کا ابدی سکون میرے خیال میں اُس سے کہیں
زیادہ پیارا ہوگا۔ اب تم ہی [illegible] کہ میری کس کوشش میں کمی رہی؟ میں نے کہاں جنت
ہاری ہے؟ اِس حقیقت کو میں کیسے سپنا کہوں؟ کیسے ایک خواب سمجھ لوں؟ بتاؤ میں تم سے

پُوچھتا ہوں کہ اُس لڑکی نے محبت کی رسوائی سے خفا ہو کر مجھ سے کیا انتقام لیا ہے کہ میری زندگی جہنم ہو کر رہ گئی ہے۔ میرا گناہ یہی تھا کہ میں نے اُس کے لئے گھر اور گھر والوں کا سکون غارت کر دیا۔ [illegible] بیوی کو چھوڑ دیا۔ اپنا بچہ موت کی ظالم آغوش میں دے دیا۔ لیکن اِس گناہ کی اتنی بڑی سزا کیوں؟ کہ جب دُنیا سوتی ہے تو میں روتا ہوں۔ یہی میرے حالات کی وہ کشمکش ہے جس نے میری روح کو اِس طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اب یہ سدا کے لئے میری زندگی کے ساتھ رہے گی۔ اِسے کوئی مجھ سے جُدا نہ کر سکے گا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اچھے دنوں کو یاد کر کے ہر شخص خوشی محسوس کرتا ہے لیکن میں اپنے ماضی کو یاد کر کے کیسے خوشی محسوس کروں؟ کہ ماضی ہی کو بھلانے کی غرض سے میں نے اپنوں کا پیار چھوڑا۔ گھر سے بے گھر ہوا۔ بیگانے دیسوں کی انجانی گلیوں میں پھر کر میں نے اپنی جوانی کے دن حقیقت کی سنگلاخ وادیوں میں کھو دئے!" یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئے۔ اِس بار پھر اُن کی آواز بھاری ہو گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

اُن کی اِتنی دردناک کہانی سُن کر میرا دل بھی بھر آیا۔ کمرے میں ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ صرف میری سانسوں کی سنسناہٹ تھی یا پھر اُن کی سسکیاں کمرے کی سکوت میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ اُس ماحول میں جب کافی دیر گزر گئی اور وہ کچھ نہ بولے تو اُنھیں دلاسہ دیتے ہوئے میں نے اپنی بات شروع کر دی۔

"آپ کی زندگی بے حد درد انگیز ہے۔ میں نے تصوّر میں بھی نہ سوچا تھا کہ آپ جیسے انسانوں کے سینوں میں بھی ایسے آتش فشاں چھپے ہوتے ہیں جن کی آگ اُن کے وجود کو اندر ہی اندر جلا کر راکھ کر دیتی ہے لیکن پروفیسر! آپ کی زندگی کے اِس پورے المیے میں میں نے ایک بات کا خاص طور پر اندازہ کیا اور وہ یہ کہ آپ نے مرد ہونے کے ناطے اپنے کردار کو بہت ہمدردی کے لائق بنا لیا اور عورت کے کردار کا ایک ہی رُخ پیش کیا۔ ہر مرد کی ایسی ہی فطرت ہے کہ ایسے واقعات میں اپنے آپ کو قابلِ رحم بنا لیتا ہے تاکہ اُس کے کردار پر کوئی آنچ نہ آئے۔ میری اپنی نظر میں زینت نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک ہی تھا اور اِسی لئے اُس کا آخری قدم بہت سی بھولی بھالی لڑکیوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گا۔" میرا آخری جملہ سُن کر وہ ایک دم چونک گئے۔ اُن کی آنکھیں ایک دم سُرخ ہو گئیں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "پہلے آپ ہی نے عورت کی ذات کو دھوکا دیا۔ اُس کے بعد دوسری عورت نے آپ کو سبق دے دیا۔ بات برابر ہو گئی۔ پھر یہ ضروری بھی تو نہیں کہ آپ جس سے محبت کرنے لگے ہوں وہ بھی آپ [illegible] لگے۔ اگر ایسا کوئی چاہتا ہے تو یہ محبت نہیں تجارت ہے۔ آپ کی بیوی آپ [illegible] کرتی تھی۔ آپ نے اُسے کیوں نظر انداز کر دیا۔ اُس سے محبت کیوں نہیں کی؟ رہی بات زینت کی بے وفائی کی تو دُنیا کی کوئی عورت یا مرد بے وفا نہیں ہے۔ وہ کسی نہ کسی کے ساتھ وفادار ضرور ہوتا ہے۔ اُس نے آپ کے ساتھ بے وفائی کی تو [illegible] اِس لئے آپ اُسے بے وفا کہنے کے حقدار ہرگز نہیں ہیں۔"

پھر نظر [illegible] اُن کے دماغ میں [illegible] بالکل [illegible] اپنے نظریے کے خلاف باتیں سُنتے سُنتے یا پھر کسی اور بات کے [illegible] اب آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا جس کی دھار میں [illegible] جو زینت کا شاید آخری خط تھا اور کچھ دیر پہلے اُنھوں نے پھینک دیا تھا۔ [illegible] جب زیادہ غور کیا تو مجھے دکھائی دیا کہ اُس کے سارے حروف اُن کے آنسوؤں سے [illegible] پھیل گئے تھے اور وہ ایک بھیگے ہوئے سادے کاغذ کی طرح میز پر پڑا ہوا تھا۔ [illegible] ایک ساعت کے لئے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اُن کی زندگی بھی اب ایک سادہ کاغذ کی طرح ہو گئی ہو۔

بہت دیر کے بعد جب اُن کے آنسو تھم گئے تو رُندھی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے ————

اُنھوں نے کہا: "میں اب اندھیروں سے نکل آیا ہوں اور اُجالے میرے منتظر ہیں۔ میں کل گھر جا رہا ہوں۔"

"کیوں ——؟" اُن کے منہ سے ایسی غیر متوقع باتیں سُن کر میں [illegible] نہ رہ سکا۔

"اِس کیوں کا جواب اِس وقت میرے پاس صرف میرا یقین ہے کہ میری بیوی آج بھی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ دُنیا کی سب عورتیں بے وفا نہیں، وفادار بھی ہیں۔" اِتنا کہنے کے بعد اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں نے دیکھا اُن کے چہرے پر اب مایوسی کے اندھیرے نہ تھے، ہمت کی سُرخیاں تھیں۔

اُن کا سگار جو اُن کے زمانۂ حال کی نشاندہی کر رہا تھا، اُنگلیوں کے بیچ جلتے جلتے ختم ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے اُسے ایش ٹرے کی راکھ میں اِس طرح رکھ دیا جیسے یہ راکھ وہ ہو، اُن کا ماضی ہو! اور ایسا کرنے کے تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے نہ جانے کیا سوچا کہ وہ اپنی جگہ سے ایک دم اُٹھے اور ایش ٹرے میں جمی ہوئی راکھ اور سگار کے ٹکڑوں کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

# غزلیں

## غلام محی الدین زارؔ گنگوہی

میں حرم کی شکستگی کروں کیوں تلاش راہیں
مرے دل کے متصل ہی ہیں تمہاری جلوہ گاہیں

کوئی حرف آ نہ جائے مرے عشق کی خودی پر
ترے بام تک نہ پہنچیں مری مضطرب کراہیں

یہ مذاق اُڑ رہا ہے مری عاشقی کا شاید
کبھی ملتفت تبسم، کبھی مجتنب نگاہیں

اُسے ہر ستم سکوں ہے، اُسے ہر الم مسرت
تری زُلفِ عنبریں میں جسے مل گئیں پناہیں

مرا مسلکِ جنوں تو ہے خلوص و دردمندی
تجھے اے خرد مبارک تری پُر فریب راہیں

کہیں فاش کر نہ جائیں مرے دل کا حال زارؔ
مرے گرم گرم آنسو، مری سرد سرد آہیں

## نفیسؔ سندیلوی

سحر کیا یار کردیا تُونے
سب سے بیزار کردیا تُونے

دل کو بیمار کردیا تُونے
جینا دُشوار کردیا تُونے

ابھی اقرار تھا ترے لب پر
ابھی انکار کردیا تُونے

بے پیئے اے نگاہِ مست ہمیں
مست و سرشار کردیا تُونے

اب کسی سے نہ دل لگائیں گے
ہم کو ہُشیار کردیا تُونے

ہم کو رُسوائے کوچہ و بازار
ذوقِ دیدار کردیا تُونے

حیرتِ حُسن سے نفیسؔ کو آج
نقشِ دیوار کردیا تُونے

## اخگرؔ مشتاق رحیم آبادی

حقیقت کُھل گئی آخر تمہارے عہدِ پیماں کی
بس اب فکرِ مداوائے دلِ بیتاب رہنے دو

عبث کیوں تم بھی میرے ساتھ رُسوائے زمانہ ہو
تم آنکھوں ہی میں اپنے گوہرِ نایاب رہنے دو

مری بیتابیٔ دل ہی اگر تم کو پسند آئی!
چلو پھر تم دلِ بیتاب کو بیتاب رہنے دو

کوئی بھی قصۂ شب شوق سے چھیڑو مگر یارو!
خدا کے واسطے ذکرِ شبِ مہتاب رہنے دو

کسی صورت سحر تک تو نہ جاگے دردِ تنہائی
شبِ غم مجھکو بربادِ شرابِ ناب رہنے دو

عبث اخگرؔ اب اُن کی آرزو کو کیوں جگاتے ہو
اسے آغوشِ محرومی میں محوِ خواب رہنے دو



سرگرم لوگوں کے لیے۔ بہت تسلی بخش!
انتخابی
آپ انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں؟ یہاں تو دھوپ میں پھرتے پھرتے بخار آگیا ہے۔ اخبار کے رپورٹر جو ٹھہرے۔
تم پر ترس آتا ہے ... آؤ چائے پلائیں۔ یہ لو سیزرز لو، میں بھی یہی پیتا ہوں۔ اس کے بغیر میرا کام نہیں چلتا۔
SCISSORS
آہا! سیزرز۔ میں بھی تو یہی پیتا ہوں۔ لاجواب سگریٹ ہے۔
بالکل! اور کسی دوسری سگریٹ میں یہ خوبی کہاں؟ سیزرز ہمیشہ مزیدار۔
سیزرز

# داغ

ڈاکٹر کیول دھیر

میڈیکل آفیسر، جیتو منڈی (پنجاب)

۲۹ ستمبر ۱۹۹۶ء

بھائی جان!

"داغ" نیا افسانہ ہے جسے میں نے جولائی کے آخر میں قلمبند کیا تھا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ آپ کو بھیج دوں کہ راجہ مہدی علی خاں کے انتقال پُرملال کی خبر مل گئی۔ اُن کا غم اِس قدر شدید تھا کہ کچھ یاد نہ رہا۔ میری حالت آپ بخوبی سمجھتے ہیں بھائی جان! کیا لکھوں!........ افسانہ اب ارسالِ خدمت ہے۔ اِس کا عنوان "داغ" مرکزی خیال کے نہایت قریب ہے لیکن افسانہ جتنا خوبصورت ہے اِس کا عنوان ویسا نہیں ہے۔ آپ بدل دیں تو مناسب ہوگا۔ کہانی آج کے ہمارے معاشرے کی ہے جو ہماری سماجی، قومی اور سب سے بڑھ کر اخلاقی ترقی پر طنز ہے۔ مجھے یقین ہے آپ پسند فرمائیں گے۔ اگر مناسب سمجھیں تو "بیسویں صدی" میں یہ اطلاع شائع فرما دیں کہ راجہ صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور اُن کی انسانی و ادبی عظمتوں کو اُجاگر کرنے کے جذبے کے تحت میں اُردو اور ہندی میں ایک کتاب ترتیب دے رہا ہوں۔ ادیب دوست اِس سلسلے میں مجھے قلمی تعاون دیں تاکہ اُس عظیم انسان کی مقدس یاد میں کتاب کو بھی اُتنا ہی عظیم بنایا جاسکے۔ آپ بھی کچھ لکھیں بھائی جان۔ ورنہ کتاب ادھوری رہے گی۔ طاہرہ وحیدی اپنے جذبات ارسال کر چکی ہیں۔ کچھ دوسرے ادیب دوستوں نے بھی لکھا ہے . . .

آپ کا چھوٹا بھائی ——— کیول دھیر

---

پرمود چونک گیا۔ سوچ میں ڈوبی اُداس نظروں سے اُس نے دیکھا۔ سامنے ایک اجنبی لڑکی کھڑی اُس کی طرف متوجہ تھی۔ اُسی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اپنی تمام تر توجہ اُس نے ذہن کی طرف منتقل کر دی اور سوچ کی عمیق گہرائی میں اُتر کر سوچنے لگا۔ شاید یہ لڑکی اجنبی نہ ہو لیکن اُس کی یادداشت ذہن کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی اور دوسرے ہی لمحے وہ آخری نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ شکل و صورت اُس کے لئے قطعی اجنبی ہی ہے۔ شاید پہلے کبھی اُس نے اِس لڑکی کو نہیں دیکھا۔ پرمود نے سر سے پاؤں تک نہایت غور سے اُسے دیکھا۔ چند لمحوں تک ... گھورتا ... نظروں سے دیکھتا رہا لیکن اُس کے ذہن کی اجنبیت کم نہ ہو سکی۔

لڑکی کے ... پرمود ... مرکوز کئے ہوئے تھی۔ اُس کے ہونٹ ... کچھ اِس طرح جھک گئے تھے کہ اُس کی دلآویز مسکراہٹ قلب کی نزاکتوں کو چھیڑتی ہوئی جذبات کو مچلتے ہوئے طوفان کی زد میں پھینک دینے کے لئے کافی تھی۔

لیکن پرمود نے اِس طرف جیسے کوئی خاص توجہ نہ کی تھی۔ وہ تو اُلجھے ذہن کو سلجھانے کی کوشش میں غرق تھا۔ ایک طائرانہ نگاہ اُس نے اپنے اِردگرد بھی ڈالی تھی۔ لیکن کوئی دوسری لڑکی اُس کی نگاہ کے دائرے میں نہ آسکی تھی اور اُسے اِس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ کچھ دیر پہلے اُس کے سامنے کھڑی لڑکی ہی نے اُسے مخاطب کیا تھا — شاید کچھ کہا بھی تھا اُس نے، لیکن وہ اپنے آپ ہی میں اِتنا اُلجھ گیا تھا کہ سُن نہیں پایا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صرف چونک اُٹھا تھا۔

"شاید آپ کو بُرا محسوس ہوا ہے۔ آئی ایم ... سوری ...

"I Very sorry

لڑکی کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پرمود نے محسوس کیا جیسے واقعی اُسے افسوس ہوا ہے۔ وہ اب مسکرا نہیں رہی تھی، سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"معاف کیجئے گا میڈم! میں خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ آپ نے کیا کہا تھا!" جس انداز سے پرمود نے کہا، اُس سے صاف ظاہر تھا کہ ذہنی اُلجھن کے باعث وہ اپنے الفاظ کو ڈھنگ سے ترتیب نہیں دے سکا تھا۔

"اوہ!" لڑکی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "میں بھی کہہ رہی تھی کہ آپ پر گراں گزری ہے لیکن ایسی بات نہیں ہے شاید؟"

"قطعی نہیں، تشریف رکھئے" پرمود نے اپنے ہونٹوں کو جیسے زبردستی مسکرا دینے کو مجبور کیا تھا۔

لڑکی نے پرمود کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی: "میری بے تکلفی سے کوئی غلط اندازہ قائم کیجئے گا" اور اُس نے اپنا تعارفی کارڈ پرمود کی طرف بڑھا دیا۔ اس ننھے سے خوبصورت کارڈ پر نہایت سلیقے سے چھپا ہوا تھا "مس نینا (ایم۔ اے۔ سائیکالوجی) سوسائٹی آف ماڈرن یوتھ"! ایک کونے میں پتہ درج تھا۔

پرمود اب تک اپنے اُلجھے ذہن کے منتشر خیالات پر اس حد تک ضرور قابو پا چکا تھا کہ اس اجنبی لڑکی سے ڈھنگ سے بات کر سکے۔ تعارف پا لینے کے بعد کسی قدر اُس سے مانوس بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ اُس کے کچھ کہنے ... [illegible] ... بول پڑی!

"آپ کے چہرے پر اُمڈتے ہوئے جذبات میرے احساس کو کرید رہے ہیں اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ یقیناً آپ پریشان ہیں۔ ــــــ ضرور کوئی غمناک داستان ہے جو آپ کے وجود کو غم زدہ بنائے ہوئے ہے ... اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دیر آپ سے باتیں کر لوں!"

پرمود بھول گیا کہ اُس کے سامنے ایک اجنبی لڑکی بیٹھی ہے۔ نینا کے محض چند الفاظ ہی نے اُسے جیسے جھنجھوڑ دیا تھا اور دل کا درد ٹیس جیسی چبھن بن کر اُس کے بے حد حساس وجود کو تڑپا گیا تھا۔ دل ہی دل میں وہ سوچنے لگا تھا، واقعی پریشان ہے وہ! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کی زندگی اندھیرے ویرانوں میں بھٹک رہی ہے۔ جیسے اُس کی زندگی کے شگفتہ پھول مُرجھا گئے ہیں۔ جیسے مایوسی کے گہرے اندھیرے نے اُس کی تمام آرزوؤں، مسرتوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ کسی کام میں بھی اُس کی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ہر خواہش دم توڑ چکی تھی، ہر جذبہ مر گیا تھا، ہر خوشی غم بن کر رہ گئی تھی اور ... اور ...

چند ہی لمحوں میں پرمود نے بہت کچھ سوچ لیا۔ ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا کہ وہ ترقی پا کر راجدھانی میں آیا تھا۔ ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر تھا وہ۔ اپنے طور پر اُس نے [illegible] اہم کام سرانجام دئے تھے کہ اتنی کم عمری ہی میں وہ اعلیٰ عہدے پر پہنچ گیا تھا لیکن ...

پرمود کی خوشی بھی اُسی کی طرح غم زدہ بن کے رہ گئی تھی اور [illegible] اُس کی یہ حالت بیوی لارینا!

لارینا سے چند ہی ماہ پہلے پرمود نے لو میرج کی تھی [illegible] خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ جس محبت کو اُس نے اپنے دل کے [illegible] اور جس کی لاج رکھنے کے لئے اُس نے اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں سے بغاوت کی تھی وہی محبت ایک روز ایسی حسرت ناک داستان بن جائے گی! ــــــ [illegible] اُس کی زندگی کے حُسن پر ایک بدنما داغ ثابت ہوگی!

شادی کے بعد ہی پرمود کو احساس ہوا کہ اُس سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ لارینا کے رویئے میں اچانک ہونے والی تبدیلی ہی اُس کے حساس جذبات کو مجروح کرنے کا باعث بنی تھی لیکن پرمود نے ضبط کا دامن نہیں چھوڑا۔ اُس نے ہر ممکن کوشش کی کہ لارینا اُسے سمجھنے کی کوشش کرے اور زندگی میں بیوی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے رویئے میں تبدیلی پیدا کر سکے۔ اِس لئے اُس نے ہر وہ بات کی جو ایک سنجیدہ شوہر کو کرنی چاہئے لیکن لارینا اُس کے محبت سے معمور دل کے مقدس جذبات کو کبھی سمجھ نہیں سکی اور اُن دونوں کے درمیان خلیج بڑھتی ہی گئی ــــ بڑھتی ہی گئی!

جب پرمود کا تبادلہ دہلی ہو گیا تو لارینا اُس کے لئے ایک مسئلہ بن گئی۔ پہلی بار اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی ذاتی زندگی کی راہ میں ــــــ اُس کے فرائض اور حقوق کی راہ میں سدِ راہ ثابت ہو رہی ہے۔ یہاں پرمود کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں اور خاص طور سے اس لئے سرکار نے اُس کی خدمات راجدھانی کے لئے حاصل کی تھیں کہ بڑھتے ہوئے سماجی جرائم کو روکا جا سکے ــــ لیکن پرمود دیکھ رہا تھا کہ لارینا کے اِس رویئے سے وہ اپنی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ پوری محنت، لگن اور ایمانداری کے ساتھ نباہ نہ کر پائے گا۔ آج خصوصی طور پر اُسے ہوم سکریٹری نے مدعو کیا تھا اور راجدھانی میں بڑھتے ہوئے سماجی جرائم کی تیز رفتار پر قابو پانے کے لئے اُسے چند اہم ذمہ داریاں سونپی تھیں۔ پرمود نے دل ہی دل میں فیصلہ لیا تھا کہ آج ہی وہ لارینا سے بات کرے گا۔ نئے حقائق کے بارے میں احساس دلانے کی کوشش کرے گا کہ بیوی شوہر کی معاون بھی ہوتی ہے۔ شوہر کی ذمہ داریوں کو کم کرنا بھی اُس کا فرض ہوتا ہے لیکن اِس سے پہلے کہ پرمود لارینا سے بات کرتا، لارینا نے چند الفاظ کی آڑ میں محبت کے مقدس جذبات ہی کو روند ڈالا۔ پرمود کے لئے [illegible] اپنا یہ آخری فیصلہ سنا دیا کہ وہ اُس سے طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے۔

لارینا اپنے اس فیصلے پر بضد تھی اور آخر پرمود کو شکست تسلیم کرنی ہی پڑی۔ اور شکست خوردہ پرمود جیسے کسی بھیانک طوفان کی زد میں آ گیا [illegible] آنکھوں کے سامنے اُس نے اپنی محبت، اپنی زندگی اور اپنی [illegible] دیکھا تھا۔

لیکن اس چوٹ کو برداشت کر گیا۔

اپنے ہر شام کا معمول بن گیا تھا کہ باہر کی شورش سے اکتا کر سکون کی تلاش میں یہاں آ بیٹھتا۔ اس کے زخمی دل کے چیخنے تڑپنے کی آوازیں وہ بھی نہیں سن سکتے تھے اور کونے کی ایک میز پر بیٹھا کافی دیر تک سگریٹ کے دھوئیں سے گہرے زخموں کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نہ جانے کب تک اپنے دل کے زخموں سے پیدا ہونے والے شدید درد کے احساس سے تڑپتا رہتا لیکن نینا نے اچانک ہی جب اس کے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش کی تو اسے بجلی کی سی تیزی کا احساس ہوا۔ پرمود محکمۂ خفیہ کا ایک اعلیٰ افسر تھا پھر بھی ایک انسان تھا اور کسی مجروح انسان کی طرح ہمدردی کے چند الفاظ اس پر بھی اثر انداز ہوتے تھے اور اکیلے ہوتے ہوئے بھی اس کو تنہائی میں نینا کی قربت کا احساس پا کر بے حد سکون محسوس کرنے لگا تھا۔

پرمود نے بھری بھری نظروں سے نینا کی طرف دیکھا۔ نینا کی مسکراہٹ بھی اس کی آواز کی طرح اسے شیریں محسوس ہوئی اور یہی احساس اس بار مسکان بن کر اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوا۔ اس نے کہا ——— "آپ کی باتیں میرے مجروح احساس کی تپش کو یقیناً کم کر دیں گی۔"

نینا کی مسکراہٹ اور بھی دلکش ہو گئی۔ میز پر جھکتے ہوئے اس نے کہا: "پچھلے کئی دنوں سے میں ہر شام آپ کو غم کا مجسمہ بنے ہوئے یہیں اور اسی میز پر دیکھتی رہی ہوں۔ ہماری سوسائٹی کا عقیدہ یہ ہے کہ دوسروں کے غم کو بانٹو، درد کی شدت کو کم کرو اور پریشان زندگیوں کو پُرمسرت و پُرسکون لمحات کا احساس دو۔ اس لئے جب میرے دل نے آپ کے چہرے پر سسکتی سی زندگی کی سیاہ پرچھائیاں محسوس کیں تو ذہن نے فرض کا احساس دلایا اور آخر آج اپنے فرض کی تکمیل کی جانب میں قدم بڑھانے میں کامیاب ہو سکی ہوں۔"

پرمود نہ صرف نینا کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا بلکہ اس کا ہر لفظ اسے متاثر کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ موجودہ دور میں کتنی الجھ گئی ہے زندگی! سماج کے سینے پر کہیں لا رینا جیسی عورت پیار، محبت اور خلوص سے بھڑکتی ہوئی اس آگ کے شعلوں پر قابو پانا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ یقیناً نینا جیسی عورت عظیم ہے۔ عظیم تر ہے! وہ زندگی کی ویرانی کے نقش مٹا کر اسے بہاروں سے ہمکنار کرنا چاہتی ہے۔ وہ اندھیروں کا طلسم توڑ کر نور کی شعاعیں بکھیرنا چاہتی ہے ... ایسے ہی خیالات میں غرق پرمود نینا کی عظیم شخصیت کے احساس کو گہرا بناتا جا رہا تھا۔ نینا کی باتوں نے، اس کی شخصیت نے، اس کے پُرخلوص لہجے نے پرمود کے تشنہ جذبات اور غیر مطمئن زندگی کے احساس کو سہارا دیا تھا۔

نینا موجودہ دور کی الجھی زندگی کے فلسفے پر باتیں کرتی رہی اور پرمود خاموشی



سے سنتا رہا ——— اپنے دل کی گہرائیوں میں نینا کے الفاظ کو محفوظ کرتا رہا۔ نینا کی قربت نے اور اس کی باتوں نے اسے تسکین عطا کی تھی۔ اس کے غم کا بوجھ ہلکا کیا تھا اور اس کے شکست خوردہ احساس کو دھڑکتی زندگی کی نمو بخشی تھی۔ اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ مسلسل کئی گھنٹے وہ نینا کے ساتھ گزار چکا ہے۔

اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ نینا نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا: "دیکھئے! میں نے آپ کا کتنا وقت ضائع کر دیا۔ اب چلنا چاہئے۔"

"نہیں نینا دیوی! یہ بات تو مجھے کہنی چاہئے تھی۔ میں ممنون ہوں کہ آپ نے میرے تڑپتے احساس کو تسکین عطا کی ہے۔"

جواب میں نینا صرف مسکرا دی ——— تبھی چونکتی ہوئی بولی وہ "ارے! آپ کا تعارف تو ابھی تک میں حاصل نہ کر سکی۔ حالانکہ ایک دوسرے کے لئے اب ہم اجنبی نہیں رہے ہیں۔"

"اوہ!" پرمود بھی چونکا۔ "مجھے [illegible] خیال ہی نہ رہا کہ اپنا تعارف

اُس نے نینا سے نہیں کہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اُسے یہ خیال آیا کہ [illegible] ایک [illegible] کی بجائے اِس حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہئے کہ وہ ذہنی طور پر اِس کے لئے تیار ہو تو [illegible] طالب ہو سکتے ہیں اُس نے کہہ دیا ۔۔۔۔۔ "ابھی صرف اتنا ہی کہ میرا نام پرمود ہے"

"اِس سے زیادہ جاننے کی مجھے خواہش بھی نہیں ہے۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے" نینا مسکرائی تو پرمود کو محسوس ہوا جیسے اُس کی خوابیدہ نگاہیں پلکوں کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر پا رہی ہیں۔ پرمود کے جذبات نینا کی نگاہوں کی گہرائی میں جھانک کر ان خوابوں کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے مچل اُٹھے لیکن اپنے جذبات کو اُس نے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ اُسے پہلی ملاقات کا احساس ہو اٹھا تھا اور اُس نے سب سوچا کہ کہیں کوئی ایسی بات ہو جائے جو نینا کو گراں گزرے۔ اِس لئے سمجھا کہ وہ مستقبل میں جھانک کر نینا کا تصور کسی دوسرے ہی انداز سے کرنے لگا تھا۔ اِس لئے ضروری تھا کہ پہلے باہمی تعلقات استوار ہوں۔

---

پرمود اور نینا تین روز پہلے پہلی بار ملے تھے اور آج اُن کی یہ پانچویں ملاقات تھی۔ پرمود اور نینا الگ ہو چکے تھے لیکن نینا کی قربت نے پرمود کو خلا کا احساس ہونے دیا تھا۔ پرمود اپنے دل میں نینا کے لئے چاہت محسوس کرنے لگا تھا جبکہ نینا خود الفاظ میں اپنی چاہت کا اظہار بھی کر چکی تھی۔ اُسے یقین سا ہو گیا تھا کہ نینا کے دل میں ضرور اُس کے لئے محبت کا جذبہ ہے۔ اگرچہ نینا نے ابھی تک کبھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن پرمود بارہا اُس کی پُرخمار آنکھوں میں، اُس کی ترنم ریز باتوں میں پیدا کی لگن کا احساس پا چکا تھا۔

نینا کی دعوت پر آج پرمود پہلی بار سوسائٹی آف ماڈرن یوتھ کے دفتر میں آیا تھا اور پہلی ہی بار نینا کے ذریعے اُس نے اُن چار نوجوان لڑکیوں کا تعارف حاصل کیا تھا جو ایک ادارے میں موجودہ سماج کے نفسیاتی پہلو کی صحت مندی کے لئے ایک ساتھ مل کر کام کر رہی تھیں۔ مس مالتی، کوشل، نیلما اور کلپنا چاروں ہی نینا کی طرح خوبصورت بے حد حسین و ذہین تعلیم یافتہ تھیں بلکہ سبھی کے خیالات میں ہم آہنگی تھی ۔۔۔ اُن کے چہرے ناقابلِ شکست ارادوں کی تکمیل کے لئے پُر اُمید تھے اور سبھی کا ایک عقیدہ تھا۔ ایک عزم تھا۔ پرمود نے اپنی آنکھوں سے دیواروں پر آویزاں کئی تصویریں دیکھی تھیں جن میں یہ پانچوں لڑکیاں ملک کے سیاسی، سماجی سربراہوں اور شہرت یافتہ شخصیتوں کے ساتھ دکھائی دے رہی تھیں۔ جب وہ ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا تو کلپنا نے اُسے بتایا کہ جس عقیدے کو لے کر وہ آگے بڑھ رہی ہیں ملک کے تہذیب یافتہ بڑے بڑے آدمی [illegible]

پرمود شاید [illegible]

[illegible] سوچتا۔ اُس کے دل و دماغ

پر اِن سب کا گہرا اثر ہوا تھا۔ اِس وقت وہ اِن سے متعلق کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ نینا کی آواز نے اُسے چونکا دیا "آیئے پرمود جی! کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"ارے واہ! اِس تکلف کی بھلا کیا ضرورت تھی؟" پرمود نزدیک آگیا اور نینا کے ہاتھوں سے کافی کا پیالہ لیتے ہوئے بولا "آپ کے یہاں کا ماحول، آپ لوگوں کی باتیں اور آپ سب کا خلوص بے حد پیارا ہے۔"

"ایسے میں تو کافی کا ذائقہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ پیار بھرے ماحول میں پیاری پیاری باتیں کرنے کے لئے کافی کی خاص اہمیت ہے" نینا نے اپنی آنکھوں میں سرمستیوں کے مچلتے طوفان بھر کر پرمود کی طرف دیکھا اور کچھ اِس انداز سے مسکرائی کہ پرمود کو اپنے بہکتے ہوئے جذبات کی بے قراری پر قابو پانے کے لئے سگریٹ سلگانا پڑا کہ اُس کی توجہ دوسری طرف منتقل ہو سکے۔ اب وہ کافی بھی سِپ کر رہا تھا... اور جیسے ہی کافی کا آخری گھونٹ اُس نے حلق سے نیچے اُتارا۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ ایک عجیب سا خمار اُس پر طاری ہو گیا ہے۔ چند ہی لمحے بعد پرمود کے مچلتے بہکتے ہوئے جذبات قابو سے باہر ہو گئے اور احساس کی صلاحیت پر قابو رکھتے ہوئے بھی اُس کی باتوں میں بے باکی پیدا ہو گئی۔

"زندگی ایک پھول ہے پرمود بابو! اور ہمیشہ زندگی کا چہرہ پھول جیسی شگفتگی و تازگی لئے رہنا چاہئے" نینا نے جان بوجھ کر پرمود کا ہاتھ اپنے نازک ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"واقعی زندگی ایک خوبصورت پھول ہے۔ بالکل تمہاری ہی طرح خوبصورت!" پرمود کہتے ہوئے نینا کی طرف جھک گیا اور اپنے بائیں ہاتھ سے اُس نے نینا کی پیشانی پر آئی ہوئی بالوں کی ایک خوبصورت لٹ کو اُچھال دیا۔ نینا اُس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی مسکرا دی۔ پرمود شاید اُسے اپنی باہوں کے گھیرے میں جکڑ لیتا لیکن نینا اُس کے قریب سے اُٹھ گئی اور اپنا ہاتھ اُس کی جانب بڑھاتے ہوئے مسکراتی ہوئی بولی "کم۔ میرے ساتھ آؤ" اور پرمود اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اُس کے جذبات پاگل ہوئے جا رہے تھے اور ایک عجیب سی بیقراری کے شوخ احساس نے اُس کے دل کی دھڑکنوں میں طوفان جیسی تیزی پیدا کر دی تھی۔

---

پرمود نیند سے بیدار ہوا تو حیران سا اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی ہی رہائش گاہ میں ہے۔۔۔ نینا... اُس کے ذہن میں نینا کی تصویر کے نقش اُبھر رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا... سوچتا رہا... سوچتا رہا...

کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی [illegible]

دیکھے والے تھے اور تاریخ تھی سات نومبر ــــــ کیا . . . ؟ " اِس یاد اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی ۔ چونک گیا وہ ۔ یقین نہ آیا تو قریب ہی پڑے اخباروں کو اُلٹنے پلٹنے لگا جو ہاکر ہر صبح کمرے کی کھڑکی سے اندر پھینک جاتا تھا ۔ اب وہ یہ یقین کر لینے کے لئے مجبور ہو گیا تھا کہ آج سات نومبر ہی ہے کیونکہ اسی تاریخ کا اخبار اُس کے سامنے تھا ۔ اُسے بخوبی یاد تھا کہ پانچ نومبر کی شام کو وہ نینا کے ساتھ تھا اور اس کے بعد آج وہ اپنی رہائش گاہ میں موجود ہے لیکن درمیان کے دو دن . . . ؟ اُس کا ذہن بے شمار خدشات سے بھر اُٹھا ۔ وہ آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا . . . اور ایک کے بعد ایک سارے واقعات سامنے آنے لگے . . . شاید کافی میں کوئی ایسا محلول ملا دیا گیا تھا جو اُس پر تیز نشہ بن کر چھا گیا تھا اور ذہنی طور پر مکمل ہوش میں رہتے ہوئے بھی اپنے جذبات پر اُسے قابو نہ رہا تھا . . . نینا اُسے الگ کمرے میں لے گئی تھی . . . ہپناٹائز کرنے کے عمل سے اُس نے شاید کئی ایک راز بھی اُس سے اُگلوائے تھے ۔ ایسی ہی کچھ اور باتوں کے علاوہ پرمود کو اور کچھ یاد نہیں تھا ۔ آخری بات اور یاد تھی کہ نیند کا غلبہ اُس پر طاری ہونے لگا تھا اور سو گیا تھا وہ . . . اور شاید لگاتار دو دن وہ سوتا ہی رہا تھا ۔ یقیناً جان بوجھ کر ایسا کیا گیا ہوگا اور اسی حالت میں اُسے یہاں پہنچا دیا گیا ہوگا ۔ ظاہر تھا کہ کسی مقصد کے لئے اُسے بلیک میل کیا گیا تھا لیکن کیوں ؟ پرمود کا ذہن تلخ ہوا تھا اور اُس کا جسمانی تناؤ شدت اختیار کرنے لگا تھا ۔ کچھ سوچ کر وہ یک بیک اُٹھ بیٹھا لیکن . . . تائی کے ساتھ بندھی کسی چیز کا لمس پا کر چونک گیا وہ ۔ یہ ایک پیکٹ تھا ۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اُس نے جب اسے کھولا تو حواس باختہ ہو گیا ۔ کانپتے ہاتھوں میں چند تصویریں تھامے اُنھیں دیکھ رہا تھا وہ ۔ کئی زاویوں سے اُتاری گئی تھیں ۔ ان تصویروں میں وہ کسی لڑکی کے ساتھ غیر مہذب انداز میں دکھائی دے رہا تھا اور یہ لڑکی اُن پانچوں میں سے کوئی بھی نہ تھی ۔ دوسرے ہی لمحے فون کی گھنٹی چیخ اُٹھی ۔

"کہیئے مسٹر چیف آف اِنٹیلی جینس ! مزاج تو بخیر ہیں نا !" آواز نینا کی تھی ۔ پرمود کے ذہن کی ساری تلخی جیسے اُس کی آواز میں بھر گئی ۔

"مس نینا ! میں جانتا ہوں تم نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یاد رکھو تمہارے ارادے کبھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکیں گے !"

دوسری طرف سے نینا کا بلند قہقہہ سنائی دیا اور اس کے بعد چبھتی ہوئی آواز ۔

"شوقین تمہارا و ہم ہے مسٹر پرمود ! تمہاری تصویریں ، ٹیپ ریکارڈر پر تمہاری باتیں اور چند ! ہم رکھ رہی کیا اس بات کے لئے کافی نہیں ہیں کہ تم اپنی زبان بند رکھ سکو اور سوسائٹی کے بارے میں سوچنے کی بجائے اپنے ذہن پر تالے لگا لو ؟"

"مجھے سب علم ہے کہ بیشک تم ہی تم ماہر ہو لیکن مت سمجھو کہ میرا تعلق اِنٹیلی جینس سے ہے اور پہلے سے علم ہونے پر ہی میں تمہاری طرف بڑھا تھا ۔ اور یہ اطلاع

بھی [illegible] کہ انجانے میں تم نے ایک ایسی [illegible] ساتھی لڑکیوں کو اِس نام نہاد سوسائٹی کے ساتھ [illegible] پرمود کے ذہن نے ایک فرضی کہانی کو ختم دیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے کانوں سے زور زور سے ہنسنے کی آواز ٹکرائی ۔ نینا کہہ رہی تھی ۔

"یہ سب بکواس ہے ۔ جھوٹ بول کر تم دھوکا نہیں دے سکتے [illegible] بیان کر رہی ہوں کہ تمہارے متعلق جو مواد میرے پاس محفوظ ہے وہ صرف تمہاری ذاتی زندگی تک ہی محدود ہے ۔ تمہاری آفیشیل زندگی میں دخل اندازی کر کے میں نے خطرہ مول لینا بہتر نہیں سمجھا اور میرا مقصد صرف یہ ہے کہ تم اور تمہارا محکمہ ہمارے طرف سے آنکھیں بند کر لے . . . اور ہاں مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے ۔ واقعی تم وائیٹ کی وجہ سے بے حد پریشان ہو ۔ کاکسٹن کی شام میں تمہاری دلجوئی کے لئے وقت کر سکتی ہوں ۔"

پرمود تلملا اُٹھا ۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے نینا نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا ۔

---

بہت سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد پرمود آخر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اُسے تمام حالات سے ہوم سکریٹری کو مطلع کر دینا چاہیئے اور ساتھ ہی اِس سوسائٹی کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے اُن سے خاص اختیارات حاصل کر لینے چاہئیں ۔ اُنھیں حالات کی اطلاع دینا وہ اس لئے بھی ضروری سمجھتا تھا کہ اُس کی ذاتی پوزیشن خطرے میں نہ پڑ جائے ۔ نینا اور اُس کی ہمراز لڑکیوں کی سماج دشمن سرگرمیوں کو بے نقاب کرنے کا اُس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا ۔ بیشک اِس کے لئے اُسے اپنی ذاتی شخصیت ہی کو کیوں نہ خطرے میں ڈالنا پڑے ۔ اُس کا حساس ذہن یہ سوچ کر نشتر جیسی چبھن محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستانی عورت کی عظمت آج کے ترقی پسند دور کی راہوں میں کیسے کچلی جا رہی ہے ؟ نینا کو اُس نے زندگی کا نور سمجھا تھا لیکن اُس کی شکل اتنی بھیانک ہوگی ۔ یہ سوچا بھی نہ تھا اُس نے ۔

اُس روز البم دیکھتے ہوئے غیر شعوری ہی طور پر پرمود نے ایک تصویر حاصل کر لی تھی ــــــ جس میں وہ پانچوں لڑکیاں کسی سے محو گفتگو تھیں ۔ اِس وقت وہ ہوم سکریٹری کے خاص کمرے میں بیٹھا اپنی داستان اُنھیں سنا رہا تھا ۔ آخر میں تصویر اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا " یہ ہیں وہ پانچوں لڑکیاں جناب ! جو سماج کے ماتھے پر بدنما داغ ہیں ! اور یہ مس نینا ان کی سربراہ ہے ۔ آپ . . . " لیکن پرمود ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کر سکا تھا کہ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے ہوم سکریٹری صاحب چیخ پڑے ــــــ "بکواس بند کرو مسٹر پرمود ! نینا میری لڑکی ہے !!"

---

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے ۔ بہتر ہے کہ اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے ۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

# غزلیں

**مسرت خالد، ایم اے**

سامنے منزل ہے لیکن جا نہیں سکتی
بھلا نہ پوچھے مجھ سے کہہ جا نہیں سکتی

کیسے باہر آ جاؤں اب نکل کے چلمن سے
اور دے چلمن بھی میں ہٹا نہیں سکتی

پا نہ جاؤں گی جب تک اک نگاہ ساقی کی
جامِ مے کو لب تک میں اپنے لا نہیں سکتی

کیوں دیا مجھے یا رب یہ نصیب شبنم کا
باغ میں بھی رہ کر میں مسکرا نہیں سکتی

لوگ پیار کرتے ہیں فصلِ گل میں کلیوں کو
اور مجھے یہ فصلِ گل راس آ نہیں سکتی

ہے عبث مسرت کو انتظار اُس کا
جو گھڑی گزر جائے واپس آ نہیں سکتی

**بشیر اختر تقی، بی اے، بی ٹی**

ہر خوشی ہر غم سے بیگانے رہے
ہم تو دیوانے تھے دیوانے رہے

گردشِ دوراں رہی تھمی ہوئی
جب تلک گردش میں پیمانے رہے

ہم تو بس اک بات کہہ کر اُٹھ گئے
دیر تک محفل میں افسانے رہے

ہوش میں کم ہی رہے وہ بھی اِدھر
اِن دنوں کچھ ہم بھی دیوانے رہے

زندگی کے رازداروں میں تھے ہم
زندگی سے ہم ہی بیگانے رہے

ہم تھے تقیؔ میکدے سے دُور دُور
جن دنوں گردش میں پیمانے رہے

**حقی حزیں، ایم اے**

آزردگیٔ دل بھی ہے وابستگی کے بعد
غم کے بھی ناز اُٹھانے پڑے ہیں خوشی کے بعد

غم دے رہے ہیں اب وہ مجھے ہر خوشی کے بعد
لازم ہو جیسے دل شکنی دل دہی کے بعد

اب جس کو دیکھیے وہی اک اجنبی سا ہے
دنیا بدل گئی تری بیگانگی کے بعد

عقل و خرد پہ اپنی بہت جن کو ناز تھا
ہوش آ گیا اُنھیں مری دیوانگی کے بعد

کس کو خبر کہ ختم ہو یہ سلسلہ کہاں
کیا جانے کتنے غم ہیں غمِ زندگی کے بعد

یہ رونقِ حیات یہ حسنِ جہاں حزیںؔ!
سب کچھ نظر میں ہیچ ہے خودآگہی کے بعد

# شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۵۳۷ نائک پورہ۔ نئی دہلی

۲۶ر نومبر ۱۹۶۶ء

مجتبی و محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات

"شانِ نزول" کی نئی قسط بھیج رہا ہوں۔ پچھلے دنوں آپ کے ایما پر جے پور کے مشاعرے میں شریک ہوا تھا۔ وہاں کے اکثر ادب دوست "بیسویں صدی" کے ساتھ ساتھ آپ کے اخلاقِ حسنہ کے بھی بے حد گرویدہ ہیں۔ خاص طور پر مشاعرے کے مہتمم جناب کمل کشور جین ایم۔ اے تو آپ کے "عاشق زار" ہیں۔ جب تک مشاعرہ ہوتا رہا وہ آپ کی عدم موجودگی کو شدت سے محسوس کرتے رہے ——— بعد از خرابیِ بسیار مجھے اب اولڈ سیکریٹریٹ میں دلی ایڈمنسٹریشن کی لائبریری سے وابستہ کیا گیا ہے۔ ادھر آنا ہو تو ضرور ملئے....

آپ کا اپنا ——— نریش کمار شاد

---

میر انیس جب قریبِ مرگ تھے تو اُن کے ایک دوست میر آغا حسین عیادت کے لئے آئے۔ انھوں نے جب انیس سے یہ پوچھا کہ مزاج کیسا ہے۔ تو انیس نے لیٹے لیٹے ہی کہا ؎

ضعف و ناطاقتی و سستی و اعضا شکنی
ایک گھٹنے سے جوانی کے بڑھا کیا کیا کچھ

آغا حسین نے شعر سُن کر کہا کہ یہ تو آپ میر تقی میر کی زبانی اپنا حال فرمارہے ہیں۔ اس وقت ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے انیس نے فی البدیہہ یہ مطلع کہا ؎

اک جوانی کیا گئی سَو درد پیدا ہوگئے
تُو ہی اے پیری! بتا ہم کیا تھے اور کیا ہوگئے

---

اپنے لڑکپن کے زمانے میں ایک بار جب برق دہلوی کی آنکھیں دُکھنے آئیں اور اُن کے کسی دوست نے حال دریافت کیا تو برق صاحب نے فی الفور جواب میں یہ شعر کہہ کر سُنا دیا ؎

دل تو آتا تھا مگر اب آنکھ بھی آنے لگی
پختہ کاریِ عشق کی یہ رنگ دکھلانے لگی

---

جگر مرادآبادی جب رند بلانوش تھے تو عموماً آخرِ شب تک پیتے پیتے بدمست ہوکر سو جایا کرتے تھے اور دن چڑھے اُٹھنا اُن کا معمول ہوگیا تھا۔ ترکِ مے کے بعد جب صبح سویرے جاگنے لگے اور اُنھوں نے صبحِ صادق کے نشہ پاش منظر سے لطف اندوز ہونا شروع کیا تو یہ شعر کہا ؎

ترکِ مے سے اور بھی میں تو شرابی بن گیا
روز آجاتا ہے مینائے سحر میرے لئے

---

"یاد" کی جمع "یادیں" اور "ہولی" کی جمع "ہولیاں" جوش ملیسانی کے ذوقِ سلیم پر بے حد گراں ہیں۔ وہ انھیں قطعی بے ضرورت اور لغو خیال کرتے ہیں۔ ذیل کے اپنے دونوں شعروں میں انھوں نے ان دونوں سے اپنی بیزاری کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

یاد آئی کی جگہ کہتے ہو یادیں آئیں
داد پاکر بھی یہ کہیئے گا کہ دادیں آئیں

اور سے

بد ذوقیوں نے تیری کی مٹی خراب کی
ہولی کو دنگ بھی لگے اب تو ہولیاں

---

ایک بار داغؔ دہلوی اجمیر گئے۔ جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ان کے شاگرد نواب عبداللہ خاں مطلب نے کہا کہ استاد! آپ جا رہے ہیں۔ جاتے ہوئے اپنی کوئی نشانی تو دیتے جائیے۔ یہ سُن کر داغؔ نے برجستہ کہا۔

داغؔ کیا کم ہے نشانی کا یہی یاد رہے "

---

ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بدترین دشمن لارڈ کرزن نے جب ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہندوستانی پرلے درجے کا بے ایمان اور دروغ گو ہوتا ہے تو کرزن کی اس دریدہ دہنی کے خلاف ہندوستان بھر میں صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ اکبر الٰہ آبادی نے بھی اپنے مخصوص طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں کرزن سے خطاب کرتے ہوئے اپنے ردِّ عمل کا اظہار یوں کیا۔

بے ڈھب ہے جھوٹ سچ کی چھڑی بحث ہند میں
سچ کہتے ہیں جو جھوٹ ہو، کہتے تھے رُو سیاہ
کیسے ہی ہم ہوں، آپ تو ہیں ہم پہ حکمراں
جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ

---

۱۹۰۸ء کے بعد جب علامہ اقبالؔ یورپ سے ہندوستان واپس آگئے تھے انجمن حمایت الاسلام لاہور کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا حالیؔ بھی شریک تھے۔ اس وقت مولانا حالیؔ کی عمر ۷۰ سال کے لگ بھگ تھی اور وہ خود اسٹیج پر اپنا کلام سُنانے کے ناقابل تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا کلام علامہ اقبالؔ سے پڑھوایا۔ اور حالیؔ کے اشعار سُنانے سے پہلے علامہ اقبالؔ نے فی البدیہہ یہ رُباعی کہہ کر سُنائی ؎

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالیؔ
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالیؔ
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالیؔ

---

گوالیار کے ایک طرحی مشاعرے کا مصرعِ طرح تھا ؎

مری فریاد کا اے سنگ دل تو نے اثر دیکھا

'اثر' قافیہ اور 'دیکھا' ردیف۔ 'دیکھ کر' کا قافیہ التزامی تھا۔ اکثر شعرا نے اس التزام کو

[illegible]
[illegible]
یہاں [illegible]
اسے بھی [illegible]

لیکن بے خود دہلوی نے اس خیال کو [illegible] مشاعرہ ثابت ہوا ہے

تم ہو عید سے بڑھ کے نہیں کوئی خوشی ہم کو
ہلالِ عید بھی ہم نے ترا منہ دیکھ کر دیکھا

---

راجہ مہدی علی خاں نے بمبئی میں اپنے یہاں خوکشر گرامی کے اعزاز میں ایک پُر تکلف دعوت دی جس میں فلم ڈائرکٹر موہن سہگل، میوزک ڈائرکٹر مدن موہن اور اختر مرزا کے علاوہ متعدد نامور فلمی شخصیتوں کو مدعو کیا۔ راجہ صاحب نے اپنے انتہائی بے تکلف دوست فلم پروڈیوسر تیغ ناصر نثار کو بھی دعوت نامہ بھیجا۔ لیکن نثار صاحب وعدہ کرنے کے باوجود جب اس دعوت میں شریک نہ ہو سکے تو راجہ صاحب دوسرے روز نثار صاحب کے یہاں پہنچے۔ اتفاق سے نثار صاحب گھر پر بھی نہ مل سکے۔ راجہ صاحب نے جل بھن کر وہیں بیٹھے بیٹھے یہ نظم کہی اور نثار صاحب کی میز پر چھوڑ کر واپس آگئے ؎

آیا تھا راجہ مہدی علی مردِ نیک نام
وہ کہہ گیا ہے غصّے بھرا تجھ کو اک سلام

میں زار زار روتا ہوں اے تیغ نا تو نثار
کرتا ہے بے وفائی گر کیوں میرے ساتھ یار
مجھ کو بلا بھی تو تو کروں گا نہ میں کلام
آیا تھا راجہ مہدی علی مردِ نیک نام

وعدے ترے بھی جھوٹے ہیں معشوق کی طرح
غصّے میں بھر گیا ہوں میں بندوق کی طرح
نادر کی طرح میں کہیں کر دوں نہ قتلِ عام
آیا تھا راجہ مہدی علی مردِ نیک نام

تو وہ ہے جس نے راجہ کی دعوت نہ کی قبول
مُرغے پکے، پلاؤ پکے اور گئے فضول
پر ساجد کھا نا کھا گیا سب آ کے بد سرام
آیا تھا راجہ مہدی علی مردِ نیک نام

اتنی بکی تمیں چیزیں دیا لا [illegible]

سے بھٹکے تو دوبارہ آ رہی ہوا بھی
کہے ہر کسی کو یہ ہمت ہوا تمام
آیا تھا جو بہت ہی مرد نیک نام

---

میر تقی میر کے مکان کے قریب ایک عطار کی دکان تھی جہاں میر صاحب فرصت کے اوقات میں بیٹھا کرتے تھے۔ عطار بھی میر صاحب کا بڑا معتقد تھا لیکن عطار کا لڑکا نہایت بنا ٹھنا کے دکان پر آیا کرتا تھا اور یہ بات میر صاحب کی طبیعت کو بڑی ناگوار گزرتی تھی۔ ایک روز یہ ناگواری طبع اُن کے اس برجستہ شعر کی صورت میں نمودار ہوئی ؎

کیفیتیں عطار کے لونڈے کی بہت ہیں
اس نسخے کی کوئی نہ رہی ہم کو دوا یاد

---

جب نواب سعادت علی خاں کے عہد میں کسی مولوی صاحب نے فردِ حساب میں اجناس کو اجنا لکھ دیا اور اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے قاموس اور لغات کے حوالوں سے اجنا کے معنی بتانے کی کوشش کرنے لگے تو نواب صاحب کے ایما پر سید انشا نے اسی وقت مولوی صاحب کی شان میں یہ دو رباعیاں موزوں کر دیں ؎

اجناس کے بدلے لکھے اجنا کیا خوب
قاموس کے رعد کا گرجنا کیا خوب
انسدے لغت نئی اُپک لی ہے
اس تان کے بیچ کا اُپجنا کیا خوب

---

اجناس کی جا گیا جو اجنا لہرا
گھر آیا لغت کا ایک بادل گہرا
تصویر ملہار کی دکھائی پھر تو
تفضیل: ٹھمری تال بالا ٹھہرا

---

ایک دن صبح ہی صبح حکیم مومن خاں مومن کے ایک شاگرد میاں خیرالدین یاس اُن کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اُستاد! ایک مصرع کہا ہے ؏

کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

رات بھر پہلا مصرع لگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ مومن نے اسی وقت شعر اس طرح مکمل کر دیا ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

---

بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ذوق دہلوی بھی حاضر تھے کہ ایک مُرشد زادے تشریف لائے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہو گئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ صاحب عالم! اس قدر جلدی یہ آنا کیا تھا اور یہ تشریف لے جانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ ظفر نے یہ سن کر ذوق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اُستاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے۔ ذوق نے بے توقف مطلع عرض کر دیا ؎

لائی حیات، آئی قضا، لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

---

قاضی فضل حسین کو جب انگریزی حکومت نے "خان صاحب" کے خطاب سے سرفراز کیا صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اُن کے ماتحت ایک لکچرار تھے چنانچہ صوفی صاحب نے قاضی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے اُن کے اعزاز میں شعر و سخن کی ایک مخصوص اور مختصر سی نشست کا اہتمام کیا جس میں صوفی صاحب نے اپنی ایک فارسی غزل پڑھی جس کی زمین تھی "نظر گرداں، اثر گرداں"۔

غزل سننے کے بعد ہری چند اختر نے اسی وقت اس زمین میں یہ دعائیہ شعر کہہ کر سنا دیا ؎

قاضیٔ ما را خان بہادر کن
صوفی را لکچرار تر گرداں

---

جوش ملیح آبادی کی تحریک پر دہلی ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے ۶۵ برس سے اوپر کی عمر کے شعرا کا ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں تلوک چند محروم بھی شامل تھے۔ جوش صاحب خود کو "بابا" کہلانے سے چونکہ بہت ڈرتے ہیں اس لئے اُن کی اس کمزوری کے پیشِ نظر محروم صاحب نے یہ قطعہ کہا ؎

ہم کو بڑھے شاعروں میں جس نے شامل کر دیا
اے خدا! اُس پر بڑھاپا کل کا آتا آج آئے
دیکھتے ہی وہ اُسے تعظیم سے بابا کہے
جب کسی ناظورۂ ناز آفریں کے پاس جائے

---

۱۹۴۳ء میں جب تاجور سامری کی عمر بیس اکیس سال کے قریب تھی انھوں

نے متعدد لکھنوی سے تدوانی شاعری بند کرنے کی شکایت کی اور انھیں شعوری طور پر شعانی شعر کہنے کا مشورہ دیا۔ متعدد صاحب یہ مشورہ سُن کر مسکرا دیئے اور چند لمحوں کے بعد یہ شامی کہہ کر تاجر کو مشادی ہے

طوفان کی شاعری کہاں سے لاؤں
ہیجان کی شاعری کہاں سے لاؤں
اب سینگ کٹا کے کیا ہوں بچھڑوں میں شریک
رُومان کی شاعری کہاں سے لاؤں

---

جن دنوں میں شاہدرہ (دہلی) میں مقیم تھا، میرے ہم تخلص منشی بشن دیال شاؔد ابھی بقیدِ حیات تھے اور وہ بھی وہیں قیام پذیر تھے۔ وہاں ایک مختصر سی ادبی دعوت میں شاد صاحب نے دنیا کی بے ثباتی کا رونا روتے ہوئے جب تین چار بار حالیؔ کا یہ شعر پڑھا

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بُلبلہ ہے پانی کا

تو بے اختیار مجھ سے یہ قطعہ موزوں ہوگیا جسے میں نے شاد صاحب ہی کی نذر کرتے ہوئے اس دعوت میں پڑھ بھی دیا ہے

زندگانی کا پاسدار ہے آج
شہرِ غفلت کا شہریار ہے آج
کل تلک اک بلبلہ تھا پانی کا
آدمی بحرِ بے کنار ہے آج

---

کلکتہ کے مشاعرے میں وؔلا دھولپوری جو ذ ت سے کلکتہ میں مقیم تھے کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ ڈاکٹر شفا گوالیاری کے بے تکلف دوست تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ دوپہر کو شربت کی تواضع میں وؔلا صاحب نے جو خود مشرب بھی تھے شفا گوالیاری کو شربت میں ذرا سی "لال پری" بھی ملا کر دے دی۔ شفا کسی طرح بھانپ گئے اور فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر سُنا دیا۔ سننے والے "ولا" کی رعایت سے خاص طور پر بہت مسرور ہوئے ہے

حسّاس ہیں دانا ہیں خبیر ہے مجھ کو
نادان کو دم بھر میں سمجھ لیتے ہیں
ہم دھوکے میں کیا آئیں گے لاحول "ولا"
شیطان کو دم بھر میں سمجھ لیتے ہیں

---

افسانہ

# دکھ کا بوجھ

عظیم واسطی

۸۲/۸۳۵ بزاز محلہ، صدر بازار۔ لاہور چھاؤنی (مغربی پاکستان)

۱۸، اکتوبر ۱۹۶۶ء

محبی خوشتر گرامی صاحب! سلام پہنچے

میں بیڈمنٹن کی تھامس کپ ٹائی کھیلنے لنکا گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو گرامی نامہ ملا۔ حسبِ حکم سالنامے کے لئے ایک کہانی "دُکھ کا بوجھ" بھیج رہا ہوں ــــ اس کا عنوان "پاگل لڑکی عاقل لڑکا" بھی ہو سکتا ہے۔ جو آپ مناسب سمجھیں۔ یہ کہانی کیا ہے ــــ کیسی ہے ــــ؟ یہ آپ دیکھیں۔ میں کیا لکھوں؟ آپ کی دُور رس نگاہیں یقیناً اِس میں کچھ تلاش کر لیں گی ــــ اکتوبر کا "بیسویں صدی" نہیں ملا۔ کراچی سے ایک مہربان نے اطلاع دی ہے کہ اس میں میری کہانی "اینٹ" شائع ہوئی ہے...

آپ کا ــــ عظیم واسطی

---

لاہور

ڈیر انوار!

ڈیڑھ مہینہ ہو چلا ہے اور تمھاری طرف سے خیریت کا کوئی خط نہ آیا۔ تمھارا جلد خط لکھو، بڑی تشویش ہو رہی ہے۔ نصیبِ دشمناں تمھاری طبیعت تو ناساز نہیں؟

جب میں سوچتی ہوں، تم ہزاروں کوس دُور پڑے ہم لوگوں سے ملنے کو کس طرح تڑپتے ہوگے تو میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میرے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر تمھارے پاس پہنچ جاؤں اور تمھاری خدمت کروں۔

کہتے ہیں انگلینڈ میں مزدوری بہت مہنگی ہے۔ تو تم صبح اُٹھ کر ناشتہ خود ہی تیار کرتے ہوگے اور پھر شیو اور نہانے کے لئے پانی بھی خود گرم کرتے ہوگے۔ جوتوں کو پالش، کپڑوں کو استری سب کچھ تمھیں خود ہی کرنا پڑتا ہوگا۔ تمھاری کتابیں کمرے میں بکھری پڑی رہتی ہوں گی۔ مجھے پتہ ہے ان سب باتوں میں تم بہت ہی بے پروا ہو۔ سدا کے۔ کاش! میں تمھارے کمرے کی چیزوں کو ترتیب دے سکتی۔ اے کاش!

اور پھر تم دل کے بھی تو بہت چھوٹے ہو۔ مجھے یاد ہے، تم چھوٹے تھے تو ذرا ذرا سی بات پر منہ بسور دیا کرتے تھے۔ عید پر بڑی آپا نے عیدی تقسیم کی سب کو پانچ پانچ روپے دئے اور پھر تمھارے روپے شاہد بھائی نے چرا لئے کیونکہ تم نے وہ اپنی کتابوں کے صفحوں میں رکھ لئے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ شاہد بھائی نے تمھارے روپے نکال کر تنویر بھائی اور بڑی آپا کو رس گلے کھلائے تھے اور پھر جب تم نے روپوں کو غائب پایا، تو تمھاری آنکھوں میں کتنے آنسو بھر گئے تھے لیکن تم نے روپوں کے کھو جانے کا کسی سے ذکر نہیں کیا تھا کسی سے بھی نہیں ــــ اور جب خلافِ توقع تم خاموش رہے، تو شاہد بھائی، تنویر بھائی اور بڑی آپا نے کس طرح کرید کرید کر پوچھا تھا۔

"انوار! تو نے روپوں کا کیا کیا ــــ کونسا سنیما دیکھا ــــ؟"

اور تم ڈبڈبائی آنکھوں کو چھپانے کے لئے کتاب میں خواہ مخواہ کچھ پڑھنے لگے تھے۔ اور پھر ایک دن تمھیں ایک کتاب میں سے پانچ روپے کا نوٹ مل گیا تھا اور تم سوچنے لگے تھے ــــ شاید تم اس کتاب میں نوٹ رکھ کر بھول گئے تھے۔ حالانکہ یہ نوٹ تمھاری کتاب میں میں نے رکھا تھا۔ اپنے حصے کا پانچ روپے کا نوٹ ــــ! اب وہاں تمھارا دل بھر آتا ہوگا۔ تو کس کو تم پر ترس آتا ہوگا۔ کون تمھاری کتاب میں پانچ روپے کا نوٹ رکھتا ہوگا۔

تم تو دو سال کے لئے بی۔ اے (آنرز) کرنے گئے تھے۔ یہ مزید تین سال کے لئے کیوں رُک گئے ہو ــــ؟ پی ایچ ڈی کرنا اتنا ہی ضروری تھا کیا؟ ابھی تمھارے آنے میں ایک سال باقی ہے انوار ــــ ایک سال ــــ!! ہائے! یہ عرصہ جلدی بیت جائے اور تم واپس آجاؤ۔ تمھیں پتہ نہیں کہ میں کس طرح تمھاری آمد کی گھڑیاں گن گن کر بتا رہی ہوں ــــ میرا شباب تمھارے سہرے کا منتظر ہے۔ روز روز میرے لئے رشتے

ٹھہر گئیں۔ پرسوں کسی ڈپٹی صاحب کے لڑکے کا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا سی ایس پی کر کے ہو [illegible] ابھی کہیں تعینات نہیں ہوا۔ ابا جی کا ارادہ ڈانواڈول ہو رہا ہے۔ وہ تو سوچ رہے تھے، انور تو پتہ نہیں پی ایچ ڈی کر کے کب آئے گا۔ دونوں چھوٹیوں کا بیاہ کر دیا جائے۔ اس کا کہیں ہو جائے تو اطمینان سے دونوں حج کر کے چلیں۔

اور پرسوں کسی نے ابا جی کو یہ خبر سنا دی کہ انور نے تو وہاں ایک میم سے شادی کر لی ہے۔ اس وقت سے گھر میں طوفان مچا ہوا ہے۔ امی نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ میری تو یہی خواہش تھی کہ بہن مرحومہ کے اکلوتے لڑکے سے اپنی بیٹی بیاہ دوں۔ میں نے اسے بچوں کی طرح پالا پوسا، لکھایا پڑھایا، بڑا کیا۔ اب اس نے جا کر انگلینڈ میں میم کر لی ہے۔ خاندان کی عزت کو بٹہ لگا دیا ہے۔ میں اب کسے منہ دکھاؤں گی۔

تم جلدی سے ابا جی کو تردید کا خط لکھ دو۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تم جیسا سمجھدار کبھی ایسا غلط قدم نہیں اٹھا سکتا۔ تمہارا یہ خط جلد سے جلد مل جانا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا خط اس وقت ملے جب تیر کمان سے نکل چکا ہو۔ میرا خط تم پڑھ رہے ہو تو اسے بند کر دو اور فوراً ابا جی کو خط لکھو۔

محبت بھرے سلام

تمہاری منتظر
شمسہ

---

ڈمبر ہوسٹل۔ لندن ایس ڈبلیو

ڈیر جینی فر!

تمہیں سکاٹ لینڈ گئے دو ہفتے ہو گئے ہیں اور تم ابھی تک نہیں لوٹیں۔ تم تو کہتی تھیں تم ماں کے پاس صرف چند دن ٹھہرو گی اور فوراً واپس آجاؤ گی۔ تمہاری یہ کوتاہی قابلِ معافی نہیں ہے۔ محبت کے قانون میں یہ بڑا سنگین جرم ہے اور اس کی پاداش میں تمہیں میری تھیسس کے فل سکیپ کے چالیس صفحے پہلے ہی دن ٹائپ کرنے ہوں گے۔

میرا کام رکا پڑا ہے جلدی سے آجاؤ!

کل ہی گھر خالو جان کو خط لکھ رہا ہوں۔ اس پاگل لڑکی کا خط آیا ہے۔ جانے خط میں کیا الا بلا لکھتی رہتی ہے۔ میں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس طرح کی باتیں قطعی پسند نہیں۔ لیکن وہ بیچاری معصوم لڑکی ان باتوں کو کہاں سمجھتی ہے۔ بس دل کے مندر میں ایک دیا جلائے [illegible] جا رہی ہے۔ اسے کیا پتہ کہ یہ دیا کسی طوفان کے ایک ہی جھونکے سے بجھ سکتا ہے!

میکڈانلڈ سٹورز میں بہترین نئے ڈیزائن کے کپڑے آئے ہوئے ہیں۔ جلدی آجاؤ کہیں ختم نہ ہو جائیں ۔۔۔ بائی بائی!

تمہارا ۔۔۔ انور

---

ڈمبر ہوسٹل۔ لندن ایس ڈبلیو

خالو جان السلام علیکم

یہاں پہنچ کر [illegible]
سردی بہت بڑھ گئی ہے۔ سورج کی شکل کو ترس گئی ہیں [illegible]
دھند اور کہرا چھایا رہتا ہے۔ پرسوں آج کل [illegible]
اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا وہ مجھے سے معذرت چاہ چکے [illegible]
شرم محسوس ہوئی اور میں زبان سے کوئی بات نہیں کہہ سکا۔ [illegible]
شعر ہمارے ملک میں حال پر اگر کوئی غریب کسی امیر سے ٹکرا جاتا تو [illegible]
کی بھیڑ تو معمولی سی بات ہوتی۔ کتنے مہذب ہیں یہ لوگ۔ کوئی [illegible]
طالب علم انور، انگلینڈ کے بازاروں میں سب ہم قدم ہیں!

خالو جان! آپ بے فکر رہیں۔ میں وقت بالکل ضائع نہیں کر رہا۔ تھیسس مکمل کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ صبح یونیورسٹی میں اور پھر رات گئے تک لائبریری میں ۔۔۔ بس میری زندگی یہیں وقف ہو کر رہ گئی ہے۔ لائبریری میں موٹی موٹی کتابیں [illegible]! حیرت ہے کہ یہ انگریز ہمارا سرمایہ کس طرح لوٹ کر لے گئے ہیں۔ اردو اور فارسی کی کتابوں کے وہ نادر نسخے موجود ہیں جن کی کاپیاں میرا خیال ہے ہندوستان اور پاکستان میں تو اب کسی کے پاس نہ ہوں گی۔ لائبریری کا ایک پرانا کارکن [illegible] ہوں، ایک بڑا نشان پڑا ہوا ہے جو اس پر متواتر بیٹھنے سے پیدا ہو گیا ہے۔ لائبریرین ایک لسٹ دکھا رہا تھا کہ اس پر فلاں فلاں بڑے لوگ کسی نہ کسی وقت میں بیٹھے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر اقبال کا نام بھی تھا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ لوگ کس طرح ذرا ذرا سی بات کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ مجھے بہت پسند ہیں یہاں کے لوگ۔

اور ہاں خالو جان! کل شمسہ کا خط آیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ کسی نے یہ افواہ اڑا دی ہے کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ مجھے اپنے ملک کے لوگوں کی عادتیں اسی لئے پسند نہیں کہ وہ ہمیشہ بے پر کی اڑاتے ہیں۔ یقین کیجئے کہ آپ کے مجھ پر [illegible] جنہیں میں دوسرا جنم لے کر بھی نہیں اتار سکتا۔ مجھے [illegible] ہوگا وہ اور کہاں مل سکتا ہے۔

میں نے آپ کے لئے ایک بہت [illegible] والا پیالہ تو اس کے ساتھ بھیج دوں گا۔ [illegible] کہیں کہ جب میں آؤں تو [illegible] آگیا! اگلے خط میں [illegible]

آپ کا [illegible] ۔۔۔ انور

پیاری شمسہ!

دل میں ایک شمع سی روشن ہے ہوئے

جس کی صورت کچھ آپ کی سی ہے

تمھارے خطوط سے مجھے ایک نئی زندگی، ایک نیا عزم ملتا ہے۔ اُن کا نکھرا زندگی کا خواب دیکھ دیکھ کر میرا دل کھل اُٹھتا ہے۔ جس میں تم ملکہ بن کر میرے دل اور میرے گھر پر حکمرانی کروگی۔ لوگوں کی اُڑائی ہوئی افواہوں پر کان نہ دھرو۔ یہ تو یونہی دوسروں پر کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں۔ یہاں کی لڑکیاں تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں سُرخ سُرخ خدا کی قسم اِنھیں دیکھ کر چقندروں کا خیال آتا ہے۔ اُبکائی سی آجاتی ہے۔ تم بھی تھوکنے باہر چلی گئیں۔ تمھارا بھی جی متلا گیا ہوگا۔ سالے بدن پر پسینے پھنسیاں سی نکلی ہوتی ہیں۔ کہاں ہماری لڑکیوں کے وہ صندلیں شفاف جسم، کہاں ان کی یہ سطح مُرتفع۔ ہماری لڑکیوں کی پلکوں کی نوکیں دلوں کو چھیدے ڈالتی ہیں اور ان کی پلکیں بھوری بھوری، سفید سفید، چھوٹی چھوٹی جیسے ماچس کی تیلی سے بال جھلس کر بھوٹے بھاتے ہیں ——— بس صرف اِنھیں رہنے سہنے اور بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے لیکن جو مزہ ہماری لڑکیوں کی بے سلیقہ اور اُکھڑی اُکھڑی باتوں میں ہوتا ہے۔ وہ ان کی سپاٹ باتوں میں کہاں۔ تہذیب ایسی کہ زینہ اُترنا ہو تو آدمی کا ہاتھ پکڑ کر، زینہ چڑھنا ہو تو ہاتھ پکڑ کر۔ میرا خیال ایک دم اُدھر چلا جاتا ہے، جہاں ایک لجائی ہوئی شمسہ فراک کو دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں میں تھامے زینے سے اُتر رہی ہو ——— قدم قدم پر ——— واری صدقے!! اللہ بیلی ———!!!

تم مجھے ایک اور نئی تصویر اُترواکر بھیجو، جس میں تم نے کلیوں کا گجرا بالوں میں سجایا ہوا ہو۔ اُسے دیکھ کر مجھے کلیوں کی پیاری پیاری خوشبو یہیں آجائے گی ———

اچھا اب بہت سا کام کرنا ہے ——— اجازت ہے؟ تمھارے امتحان میں کچھ تو تھوڑے سے دن رہ گئے ہوں گے۔ اِس دفعہ گریجویٹ ہونے کی خوشی میں گلاب جامنوں اور اِمرتیوں کا پارسل بھیجنا!

تمھارا اور صرف تمھارا ——— انوار

---

لاہور

برخوردار انوار، طول عمرہٗ

تمھارے خالو کے نام کل تمھارا خط آیا ہے، تو کہیں جاکر میری جان میں جان آئی۔ اللہ تیرا بیلی ہو ——— یہاں کے لوگ جانے ایسی ایسی خبریں کیسے گھڑ لیتے ہیں۔ سُن کر میرا تو کلیجہ مُنہ کو آگیا تھا۔ کئی دن اچھی طرح روٹی بھی نہیں کھائی گئی ——— میں سوچتی تھی، اتنا سمجھ دار اور ہوش مند بچہ کیسے ایسا غلط قدم اُٹھا سکتا ہے۔ تم ماشاءاللہ بڑے ہوشیار اور دُور اندیش ہو۔ اپنے بُرے بھلے کو خوب سمجھتے ہو۔ ولایت کی پریوں کے جال میں نہ پھنس جانا۔ کہتے ہیں یہ بہت بڑی جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔ اچھے بھلے آدمی کو اُلّو بنا دیتی ہیں۔ سمجھ دار سے سمجھ دار آدمی کو بھی ایسا تگنی کا ناچ نچاتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی! اِن بدذاتوں کا سایہ بھی اپنے اوپر نہ پڑنے دینا۔ میں اگلی گلی والے پیر صاحب کا ایک تعویذ اِس لفافے میں بھجوا رہی ہوں۔ اِسے اپنے گلے میں ڈال لینا۔ اِس سے تم سب بَلاؤں سے محفوظ رہوگے۔ میں جمعرات کو نیاز بھی دلواؤں گی اور مہترانی کو گڑ آٹے کا صدقہ بھی دے دوں گی۔ خدا تمھیں نظرِ بد سے بچائے رکھے!

پرسوں انیسہ کی بڑی لڑکی کی شادی ہے۔ لڑکا تھانیدار ہے اور گوجرانوالہ کے تھانوں میں ہے۔ تم اُنھیں مبارکباد کا خط لکھ دینا۔

شمسہ ماشاءاللہ بڑی ہوگئی ہے۔ اِس سال بی۔ اے کا امتحان دے رہی ہے۔ خیال ہے بی۔ اے کروا کے اُٹھاؤں گی۔ تمھیں بہت یاد کرتی ہے۔ اُس نے تمھارا فوٹو جو بڑے کمرے میں لگا ہوا تھا، اپنے کمرے میں لگا لیا ہے۔ بس تم خیر خیریت سے جلدی سے پڑھ کر آجاؤ۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اب یوں ہی سی جان باقی رہ گئی ہے۔ چاہتی ہوں تمھارا سہرا ابھی دیکھ لوں۔ تمھارے خالو ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں نے اُنھیں تمھیں خط لکھنے کو کہا تھا تو کہنے لگے، تم خود ہی لکھ دو۔ اُنھیں شطرنج سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ قریشی صاحب کے ساتھ بیٹھے شطرنج کھیلتے رہتے ہیں۔

تم آنے والے ہو۔ اچار، مربّہ، چٹنی سب تیار کر کے رکھوں گی۔ چار سوکھے ہوئے پان بھیج رہی ہوں۔ سوکھ جائیں تو بھگو کر کھا لینا۔

ماسی خیراں پاس بیٹھی ہے۔ تمھیں دعائیں دے رہی ہے۔ اگلے خط میں اُسے سلام لکھ دینا۔ خوش ہو جائے گی ——— خدا تمھیں خوش و خرم رکھے۔

تمھاری خالہ

---

ڈیر بیبی!

جب میں گھر آیا تو تم گھر پر نہیں تھیں۔ میں چار روز کے لئے ایک کام کے سلسلے میں نواحی علاقے میں جا رہا ہوں۔ اپنی تھیسس کے سلسلے میں دو چار لائبریریوں سے استفادہ کرنا ہے۔ تم ایسا کرنا، میرے ریک پر کتابوں کے نیچے جو کاغذات پڑے ہوئے ہیں اُنھیں ٹائپ کر رکھنا۔ بہت ضروری ہیں۔ احتیاط سے ٹائپ کرنا۔ غلطی کوئی نہ ہونی چاہئے۔ اِسی مہینے میں تھیسس داخل کرنی ہے۔ کام زیادہ ہے۔ تمھیں دن رات جاگ کر کام کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے میری محبت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تم بہ حُسن و خوبی اِس کام کو انجام دے دوگی۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ تم نے جو رقم پس انداز کی ہوئی تھی وہ میں لے کر جا رہا ہوں۔ شاید سفر میں ضرورت پڑ جائے۔ ویسے میں کوشش کروں گا کہ یہ رقم جوں کی توں واپس لے آؤں !

ڈیر، اور خرچ سے کچھ تنگی نہ لینا ورنہ تم کام ختم نہ کر سکو گی۔ تمہیں اگر پیسوں کی ضرورت پیش آئے تو بینک سے نکلوا لینا۔ ڈھیروں پیار !

تمہارا ——— فواد

---

ہری کین ایکسپریس

عمر بھر کا وہی سرمایہ ہے اے جانِ جہاں
زندگی جتنی ترے ہجر میں گزری میری

پیاری شمسہ !

میری منتظر، تمہاری ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کی فروزاں شمعیں، میرے لئے راہیں استوار کرتی ہیں۔ تمہارے خطوں کے اُلجھے اُلجھے فقرے میرے لئے تمہارے پھول سے ہاتھوں کے بہکے بہکے اشاروں سے کم نہیں تم اِن ہی آنکھوں سے مجھے راستے سجھاتی ہو اِنہی آنکھوں سے مجھ میں زندگی کی مشکلات سے لڑنے کی جرأت و حرارت پیدا کرتی ہو اور اِنہی آنکھوں سے میرے دل میں محبت کی جھلملاتی شمعیں روشن کرتی ہو ——— تمہاری اِنہی آنکھوں کی لگن مجھے آگے بڑھنے میں مدد دے رہی ہے !

تم نے لکھا ہے کسی نے خالو جان کو ایک فوٹو بھیجا ہے، جس میں میں ایک لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے پارک کی سیر کر رہا ہوں۔ اُس وقت سے گھر میں ایک بھونچال آیا ہوا ہے اور تم نے رو رو کر آنکھیں سُجا لی ہیں۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ اور اِن متوالے نینوں میں کاجل کی تحریریں ڈالو پھر میں بتاؤں گا کہ وہ کون ہے ؟ (لیکن یہ راز صرف تم تک محدود رہنا چاہیئے)

وہ جینی ہے ——— !

جینی ——— میری بیوی ——— لرزو نہیں، دل رکھو۔ میں تمہیں سب کچھ بتانے لگا ہوں ——— یہاں اگر میں کوئی ہاؤس میڈ رکھتا تو میرا اِتنا خرچہ بڑھتا کہ میں پھر ٹھیک سے روٹی بھی نہ کھا سکتا تھا اور اگر خود سب کام کرتا تو پڑھنے کے لئے وقت نہ ملتا۔ سو اِن سب باتوں پر غور کر کے میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ شادی کر لوں ——— جینی سے شادی کر کے جہاں مجھے یہ سہولت ملی کہ کھانا پکا پکایا ملنے لگا، کپڑے دُھلے دُھلائے ملنے لگے، کمرہ صاف ستھرا اور کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی ملیں، وہاں اُس نے پی ایچ ڈی کرنے میں میرا ہاتھ بھی بٹایا ہے۔ میری تھیسس کے سارے صفحے بھی اُسی نے ٹائپ کئے ہیں۔ دوسرے وہ خود ایک دفتر میں کام کرتی ہے۔ اِس وجہ سے وہ مجھ پر بار بھی نہیں بنی۔ اب تو تم سمجھیں کہ مجھے یہ

قدم کہیں [illegible] خط میں [illegible] تمہیں سب باتیں [illegible] ہیں۔ مگر میں نے خط میں سب باتیں لکھ دی ہیں تو [illegible] تم سے یہی کہنا ہے۔ میں نے [illegible] تمہیں [illegible] جا رہا ہوں اور یہ خط تمہیں گاڑی میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ [illegible] خالو جان کو تسلی دو اور سنبھالو اور [illegible] میں ایک مہینے کے بعد تم تک پہنچ جاؤں گا۔ میرا انتظار کرنا !

تمہارا ——— فواد

---

ہری کین ایکسپریس

خالہ جان ! تسلیمات

آپ کا خط ملا لیکن اِس میں تعویذ نہیں تھا۔ سفر میں رستے میں کہیں گر گیا ہو گا۔ پان مل گئے ہیں لیکن اُن کا ابھی لیبارٹری میں تجزیہ کیا گیا ہو گا۔ کیونکہ صرف تمہی پان کھاتی ہو شمسہ نے بی۔ اے پاس کر لیا ہے۔ اُسے ایم۔ اے میں داخلہ دلوا دو۔

خالو جان کو آداب کہنا اور کہنا کہ جو منگوانا ہو لکھیں۔ میں ایک مہینے تک واپس پہنچ رہا ہوں۔ پھر آپ کی دعاؤں سے میں پی ایچ ڈی بھی کر چکا ہوں۔ اب واپسی کے لئے سامان کی خرید و فروخت کر رہا ہوں۔ سارا سامان پیک کر کے بک کرا دیا ہے۔ اُس کے لئے بڑی دَوڑ دھوپ کرنی پڑ رہی ہے۔ آپ کے لئے مُرغیوں کے بچے نکالنے والی مشین بھی لا رہا ہوں ——— ماسی خیراں کو سلام کہہ دینا۔ باقی پھر ! گاڑی سٹیشن کے قریب ہو رہی ہے۔ میں یہ خط یہیں سٹیشن کے لیٹر بکس میں ڈال دوں گا۔ سب کو سلام

آپ کا فرمانبردار ——— فواد

---

ڈیبر ہوسٹل۔ لندن ایس ڈبلیو

ڈیر ساجد !

تمہارے اس ایثار کا بدلہ میں تازندگی نہ چکا سکوں گا کہ تم نے صرف میری خاطر جینی کے ساتھ تعلقات بڑھا کر دھوکے سے ایک فوٹو ایسی حالت میں کھینچ لیا جو میرے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ میں اُسے آج ہی اپنے وکیل کو دے [illegible] مقدمہ میں نے دائر کر دیا ہے۔ اگر شہادت دینے کے لئے تمہاری ضرورت پڑی تو میں پھر تمہیں تکلیف دوں گا شاید تمہیں ایک آدھ بار کورٹ میں پیش ہونا پڑے۔ اِس زحمت کے لئے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ [illegible] خوش قسمتی سے تعبیر کروں گا۔ اگر مجھے بھی تمہارے کام کرنے کی سعادت نصیب ہو سکے۔

تمہارا ——— فواد

---

پلورٹ سعید

جینی ——— !

اب جب کہ میں تم سے بہت دور ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھاری رفاقت میں بسر کئے ہوئے ان لمحوں کا شکریہ ادا کروں جو میری زندگی کے اہم ترین لمحے تھے۔ میں زندگی بھر کبھی بہترین ایکٹر نہیں رہا۔ لیکن یہ بات تم تو جانتی ہو گی کہ میں نے تمھارے ساتھ بہت اچھی اداکاری کی ہے۔

تم نے مجھے کامیاب ہونے میں بے حد مدد دی ہے۔ میں اس کے لئے تمھارا ممنون ہوں۔

تم شاید یہ گمان کرو کہ میں تمھارے ساتھ مخلص نہ تھا لیکن تم کون سی مخلص تھیں؟ تم پہلے سے طلاق یافتہ تھیں اور یہ بات تم نے مجھ سے چھپائی تھی لیکن اگر میں یہ بتا دوں کہ تمھارے پہلے شوہر ہی نے مجھے تم سے شادی کرنے کا مشورہ دیا تھا تو تم پر کیا بیتے گی۔

بھلا ہو ساجد کا جس نے مجھے تم سے جدا ہونے میں بڑی مدد دی ہے۔ تمھارا اور ساجد کا جو فوٹو عدالت میں پیش کیا گیا اور جس پر مقدمہ کا انحصار تھا وہ نقلی تو نہیں اصلی فوٹو تھا تمھارا اور ساجد کا۔ مجھے افسوس ہے کہ تم پر بد چلنی کا الزام لگا کر میں طلاق حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن سوچو تو اس کے سوا اور چارہ کار بھی کیا تھا۔ تم یوں آسانی سے مجھے چھوڑنے والی تو نہ تھیں۔

بہرحال جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے احساس ہے کہ زندگی کی اس دوڑ میں تم نے کچھ دن میری رفاقت میں بسر کئے اور مجھے کبھی تنہائی اور محرومی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اس کے لئے شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ کیونکہ ہم لوگ لاکھ بیوقوف سہی بد اخلاق نہیں ہوتے۔

جب تم تک یہ خط پہنچے گا تو یہ سمندری جہاز جس میں میں سفر کر رہا ہوں ہندوستان روانہ ہو چکا ہوگا اور ہو سکتا ہے کراچی کے ساحل پر لنگر بھی ڈال چکا ہو۔ جہاں میری ہونے والی بیوی جس کے اکثر خطوط آتے تھے۔ دل میں ہزاروں دھڑکنیں اور ارمان لئے میری منتظر ہو گی۔ یہ وہی لڑکی ہے جسے میں پاگل کہا کرتا تھا لیکن اس سے کا یہی تقاضا تھا کہ میں اُسے پاگل کہوں ورنہ وہ تو ایسی شکل و صورت کی ہے کہ لاکھوں کو پاگل کر دے!

تمھیں دُکھ تو نہ ہوگا اگر میں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے اس دن کا پہلے سے انتظار تھا اور غالباً اب تم سمجھ چکی ہو گی کہ میں بچے ہونے سے اتنا ڈرتا کیوں تھا۔ ہمارے اگر بچے ہو جاتے تو شاید وہ میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیتے اور ان کی محبت مجھے مجبور کرتی کہ یا تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لندن میں رہ جاؤں اور یا تمھیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں اور اس کھوئی کھوئی شمسہ کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے کانٹے بو دوں۔

تم کہہ رہی ہو گی کہ میں نے تمھاری زندگی میں کانٹے بوئے ہیں ـــــــ کہاں؟ تم تو بہت چالاک ہو۔ تم تو لاکھوں کو بدھو بنا سکتی ہو تمھیں اور بہتر سے بر ـــــــ

ان حسین رفاقت کا ایک بار پھر شکریہ! کبھی تمھارا ـــــــ انوار

---

ہوٹل جبیں۔ کراچی

ساجد!

میں لٹ گیا! میں تباہ ہو گیا!! میرا سب کچھ جاتا رہا! میرا ذہن ماؤف ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں ـــــــ تو قسمت کو یہ دن بھی دکھانا تھا! میری زندگی کا تاریک ترین دن!!

جب کیماڑی کے ساحل پر جہاز لگا تو خالو جان اور شمسہ مجھے لینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ شمسہ چپ چاپ سی تھی۔ خالو جان نے بھی کوئی خاص گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔ میں جب ان کے گلے سے لپٹ گیا تو بھیگی آنکھوں سے انھوں نے مجھے اپنے سے جدا کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خاموش کھڑے رہے۔ شمسہ کی طرف مڑا تو وہ صرف اتنا بولی۔

”سلام انوار بھائی!“

میں حیران ہو رہا تھا کہ خالو جان بولے۔

”انوار! تمھاری بیوی نہیں آئی؟“

”بیوی ـــــــ!؟“ میری زبان رک گئی اور میں سوچنے لگا کیا کہوں۔

”ہاں بیوی ـــــــ!“ خالو جان ٹھہر ٹھہر کر بولے ”جس شخص نے تمھارا بیوی کے ساتھ کھنچا ہوا فوٹو بھیجا تھا، اس نے چرچ سے تمھارے نکاح نامہ کی تصدیق شدہ کاپی بھی بھیج دی تھی!“

”جی ـــــــ!؟“ آسمان میرے سر پر گر پڑا! میں نے شمسہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ میں بمشکل بولا۔

”لیکن شمسہ میں نے تمھیں لکھا تھا ـــــــ“

شمسہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”آپ نے شادی کی بات ہی تو لکھی تھی اور کیا لکھا تھا ـــــــ اور پھر انھوں نے میری بات سنی ہی کب ہے ـــــــ“

خالو جان چلتے ہوئے بولے۔

”کوئی بات نہیں، اچھا کیا ـــــــ ایسا بھی ہو جاتا ہے ـــــــ ہم تمھارے ہی منتظر تھے۔ شمسہ کا نکاح کر دیا ہے۔ وہ لوگ جلدی کر رہے تھے۔ رخصتی کی بات تمھاری آمد تک کے لئے ملتوی کر دی تھی۔ اب تم آگئے ہو تو ان سے تاریخ طے کر لیں گے۔“

میرے دل پر دوسرا ہتھوڑا پڑا۔

اور مجھے محسوس ہوا میں ایک طوفان میں گھر گیا ہوں۔ میری دنیا لٹ رہی ہے اور میں اس بھری دنیا میں یکہ و تنہا کھڑا ـــــــ بے بسی سے شمسہ کی طرف دیکھ رہا ہوں جو لمحہ بہ لمحہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے چاہا قدم اٹھاؤں لیکن میرے قدم بوجھل ہو چکے تھے۔

اب تم ہی کہو میرے لئے اس دنیا میں کیا رہ گیا ہے۔ اس دکھ کے بوجھ کے سوا جو میں اب تنہا اٹھاؤں گا۔

سوگوار ـــــــ انوار

---

”بیسویں صدی“ میں وہی مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں، جن کے آخر میں لفظ ”غیر مطبوعہ“ لکھا ہو۔



# کاش یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا!

بیوہ بَین کرتی ہے۔ بچے اپنے باپ کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں۔ کتنا بھیانک حادثہ ہے!... کاش یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا...
لیکھ رام خاصا معقول آدمی تھا۔ گھر گرہستی اور بچے اُسے بہت پیارے تھے لیکن اُس میں ایک کمزوری تھی، شراب نوشی کی۔ وہ اپنی اِس کمزوری کو دُور نہ کر پایا۔ وہ شراب کا عادی ہوتا گیا۔ اور اپنے خون پسینے کی کمائی کو شراب میں غرق کرنے لگا۔ ایک رات، وہ اپنے ایک دوست کے گھر سے شراب کے نشے میں دھت ہو کر، لڑکھڑاتا ہوا گھر کو لوٹ رہا تھا۔ اُس نے سڑک کو پار کرنا چاہا۔ اُدھر سے ایک ٹرک تیزی سے آ رہا تھا۔ ٹرک کی طرف اُس کا دھیان نہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ٹرک کی زد میں تھا۔ نتیجہ، بے وقت موت اور گھر بھر کی بے کسی و بے حالی!

## شراب

## آپ کی اور قوم کی دشمن ہے

# قندیلِ تبسم

پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

۱۱۵۱، سیکٹر ۲۳ سی۔ چنڈی گڑھ

۱۹ر ستمبر ۱۹۹۶ء

محترمی و مکرمی خوشتر صاحب! آداب و تسلیمات

... اُردو زبان و ادب کے لئے آپ جو کام کر رہے ہیں، وہ تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ "بیسویں صدی" کا ہر شمارہ آپ کی شائستہ محنت و کاوش کا آئینہ دار ہے۔ آپ حسبِ دستور ابھی سے حسین و جمیل اور بے مثال سالنامے کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہوں گے ——— "قندیلِ تبسم" کے عنوان سے چند ادبی لطائف حاضرِ خدمت کر رہا ہوں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ زندگی کے چہرے سے کچھ غم کی گرد اُتر جائے۔ اس سے کسی کی تضحیک یا دل آزاری ہرگز مقصود نہیں ...

خلوص کار ——— پرکاش ناتھ پرویز

---

## وقع شناسی ———

کسی مشاعرے میں سامعین میں سے چند اصحاب نے جگر مرادآبادی سے ان کی وہ مشہور غزل سُنانے کی فرمائش کی جس کا مطلع ہے ؎

اگر نہ "زہرہ جبینوں" کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے

مشاعرے میں نامور شاعرہ زہرہ نگاہ بھی تشریف رکھتی تھیں۔ جگر صاحب جن کے دل میں خواتین کا نہایت احترام تھا، اس فرمائش کی تہہ میں کار فرما شرارت کو بھانپ گئے۔ انھوں نے غزل سُنائی لیکن مطلع یوں تبدیل کر دیا ؎

اگر نہ "ماہ جبینوں" کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے

## جواب ———

اسرار الحق مجاز بلا نوشی کے لئے مشہور تھے۔ شکیل بدایونی نے فرمایا ؎
... اتنی پی ہے کہ پی نہیں جاتی

مجاز صاحب کب چوکنے والے تھے۔ اُنھوں نے فی الفور کہا ؎

ظرف لازم ہے میکشی کے لئے
ہر کسی سے تو پی نہیں جاتی

## اعتراف ———

کسی مشاعرے میں ایک حسین و جمیل شاعرہ اپنا کلام سُنا رہی تھیں جب اُنھوں نے یہ مصرع پڑھا ع

شبِ وصال مرا ظرف آزما کے تو دیکھو

تو پنڈت ہری چند اختر نے بے ساختہ فرمایا ع

یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

## فی البدیہہ ———

چند بے تکلف شاعر دوست سیر کر رہے تھے۔ فی البدیہہ اشعار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مصرعِ طرح تھا ع اپنا اپنا مزاج ہے پیارے
کندن سنگھ بیدی تحسین نے یوں گرہ لگائی ؎

شمع گریاں ہے اور ہم خنداں
اپنا اپنا مزاج ہے پیارے

سامنے سے ایک پردہ پوش خاتون کو آتے دیکھ کر ایک شاعر نے بے ساختہ یہ شعر کہہ دیا ؎

اُن کو بے پردہ کس طرح دیکھیں
قیدِ رسم و رواج ہے پیارے

## حُسنِ کاوش ——

چندی گڑھ کی ایک ادبی مجلس میں ڈاکٹر ست پرکاش سنگر کے یہاں پرنسپل کنہیا لال کپور نے کئی اشعار سنائے جن میں کمالِ فنکاری یہ ہے کہ مصرعِ اولیٰ مرزا غالب کی ایک غزل کا ہے اور مصرعِ ثانی کسی دوسری غزل کا لیکن کوئی شعر بے ربط نہیں ہوتا۔ چند اشعار آپ بھی سماعت فرمائیں اور محظوظ ہوں ؎

جان تم پر نثار کرتا ہوں
شرم تم کو مگر نہیں آتی

---

میں ہوں مشتاق اور وہ بیزار
کس کی حاجت روا کرے کوئی

---

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

---

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

## پیش گوئی ——

فراقؔ گورکھپوری کے پاس ایک نوخیز شاعر تشریف لائے اور کہا۔
"فراقؔ صاحب! کل شب دو نظمیں کہی ہیں آپ کو سناتا ہوں۔ آپ فرمائیں ان دونوں میں سے کون سی نظم اچھی ہے" اور فراقؔ صاحب کے جواب کا انتظار کئے بغیر نظم سنانے لگا۔ نظم یوں ہی سی تھی۔ فراقؔ صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ نظم ختم ہوئی تو اُس صاحبزادے نے کہا۔
"اب دوسری نظم سناتا ہوں"

فرقت صاحب سے دریافت کیا تو اُنھوں نے فرمایا۔
"آپ سُنانے کی تکلیف نہ فرمائیں۔ دوسری نظم پہلی نظم سے یقیناً بہتر
ہوگی!"

## ...لی

دہلی کے ایک مشاعرے میں فنا نظامی کانپوری اپنی غزل سُنا رہے تھے۔ جب
اُنھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

میکش وہی میکش ہے جو عالمِ مستی میں
بہکے تو سنبھل جائے، سنبھلے تو بہک جائے

تو نریش کمار شاد نے فرمایا ——— "یہ شعر غلط ہے!"
فنا صاحب کچھ پریشان ہوئے اور بولے "کیسے غلط ہے؟"
"ابھی بتاتا ہوں ———" شاد صاحب نے اپنی جگہ سے اُٹھتے
ہوئے کہا۔
چند حضرات نے شاد صاحب کو روک دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔
مشاعرے کے بعد شاد صاحب سے اُن کے احباب نے پوچھا ———
"فنا صاحب کے شعر میں کیا غلطی تھی؟"
"بس یہی غلطی تھی کہ کہاں صاحبِ ریش فنا صاحب اور کہاں عالمِ مستی کی
باتیں!" شاد صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

## کمالِ سخن ———

پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی کے سامنے اُن کے کسی ہم عصر نے یہ مصرع
پڑھا ؎

شیخ نے مسجد بنا مسمار بُت خانہ کیا

نسیم صاحب نے بغیر کسی توقف کے مصرع لگا کر شعر یوں مکمل کر دیا ؎

شیخ نے مسجد بنا مسمار بُت خانہ کیا
جب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

## وِنندہ یا بندہ ———

کسی ادبی محفل میں ایک فن کار سے کچھ سُنانے کی فرمائش کی گئی تو اُنھوں
نے کہا ——— "میں تو صرف سُننے کے لئے حاضر ہوا ہوں"
مزید فرمائش پر جب اُنھوں نے جواب دیا کہ میں صرف سُننا چاہوں گا تو دلیپ سندر

جتیا رتھی نے اُن سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا ——— "بھئی آپ اتنے دنوں کہاں
چھپے رہے۔ میں تو اب تک لوگوں کو اپنی جیب سے پیسے دے دے کر اپنے
افسانے سُناتا رہا ہوں!"

## ردِ عمل ———

بمبئی کے ایک مشاعرے میں کسی شاعر نے ماہر القادری کو مخاطب کر
کے چند رندانہ اشعار پڑھے۔ جب ماہر صاحب کی باری آئی تو اُنھوں نے یہ کہہ
کر ——— "ہم بھی مُنہ میں زبان رکھتے ہیں" یہ شعر پڑھ دیا ؎

غمِ حیات سے گھبرا کے بندگانِ خُدا
چلے ہیں جانبِ میخانہ خودکشی کے لئے

شیخ گریاں ہے اور ہم خنداں
اپنا اپنا مزاج ہے پیارے

ــــے ایک پردہ پوش خاتون کو آتے دیکھ کر ایک شاعر نے بے ساختہ یہ شعر
ا ـــ

اُن کو بے پردہ کس طرح دیکھیں
قیدِ رسم و رواج ہے پیارے

## ـکاوش ـــــ

چندی گڑھ کی ایک ادبی مجلس میں ڈاکٹر ست پرکاش سنگر کے یہاں
نہیا لال کپور نے کئی اشعار سنائے جن میں کمالِ فنکاری یہ ہے کہ مصرعِ اولیٰ
ـب کی ایک غزل کا ہے اور مصرعِ ثانی کسی دوسری غزل کا لیکن کوئی شعر
نہیں ہوتا۔ چند اشعار آپ بھی سماعت فرمائیں اور محظوظ ہوں ـــ

جان تم پر نثار کرتا ہوں
شرم تم کو مگر نہیں آتی

---

میں ہوں مشتاق اور وہ بے ـــ
کس کی حاجت روا کرے کوئی

---

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

---

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

## پیش گوئی ـــــ

فراق گورکھپوری کے پاس ایک نوخیز شاعر تشریف لائے اور کہا۔
"فراق صاحب! کل شب دو نظمیں کہی ہیں آپ کو سناتا ہوں۔ آپ فرمائیں اِن دونوں میں سے کون سی نظم اچھی ہے" اور فراق صاحب کے جواب کا انتظار کئے بغیر نظم سنانے لگا۔ نظم یوں ہی سی تھی۔ فراق صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ نظم ختم ہوئی تو اُس صاحبزادے نے کہا۔
"اب دوسری نظم سناتا ہوں"

[illegible] صاحب سے دریافت [illegible] فرمایا۔
"آپ [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible]"

## غلطی

[illegible] ایک مشاعرے میں قنا [illegible] اپنی غزل سنا رہے تھے جب انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

میکش وہی میکش ہے جو عالمِ مستی میں
بہکے تو سنبھل جائے، سنبھلے تو بہک جائے

تو ویش کمار شاد نے فرمایا ——— "یہ شعر غلط ہے!"

قنا صاحب کچھ پریشان ہوئے اور بولے "کیسے غلط ہے؟"

"مانگ پہ بتاتا ہوں ——— شاد صاحب نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

چند حضرات نے شاد صاحب کو روک دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

مشاعرے کے بعد شاد صاحب سے اُن کے احباب نے پوچھا ———

"قنا صاحب کے شعر میں کیا غلطی تھی؟"

"بس یہی غلطی تھی کہ کہاں صاحبِ دیش قنا صاحب اور کہاں عالمِ مستی کی باتیں!" شاد صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

## کمالِ سخن

پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی کے سامنے اُن کے کسی ہم عصر نے یہ مصرع پڑھا ؎

شیخ نے مسجد بنا مسمار بُت خانہ کیا

نسیم صاحب نے بغیر کسی توقف کے مصرع لگا کر شعر یوں مکمل کر دیا ؎

شیخ نے مسجد بنا مسمار بُت خانہ کیا
جب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

## جو شعر یا بندہ

کسی ادبی محفل میں ایک فن کار سے کچھ سُنانے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے کہا ——— "میں تو صرف سُننے کے لئے حاضر ہوا ہوں"

کثیرِ فرمائش پر جب انھوں نے جواب دیا کہ "میں صرف سُنتا چاہوں گا تو دو بیت [illegible] [illegible]

شیا رحمٰن سلطان سے بل گیر ہوتے ہوئے کہا ——— "بھئی آپ اتنے دنوں کہاں چھپے رہے۔ میں تو اب تک لوگوں کو اپنی جیب سے پیسے دے دے کر اپنے افسانے سُنا تا رہا ہوں!"

## ردِ عمل

بمبئی کے ایک مشاعرے میں کسی شاعر نے ماہر القادری کو مخاطب کر کے چند پند آمیز اشعار پڑھے۔ جب ماہر صاحب کی باری آئی تو انھوں نے یہ کہہ کر ——— "ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں" یہ شعر پڑھ دیا ؎

غمِ حیات سے گھبرا کے بندگانِ خدا
چلے ہیں جانبِ میخانہ خودکشی کے لئے

---

# قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

| | | |
|---|---|---|
| آتشِ گل | جگر مراد آبادی | پانچ روپے |
| کلیاتِ اقبال | علامہ اقبال | چھ روپے |
| جنون و ہوش | جوش ملسیانی | چار روپے |
| ہفت رنگ | عرش ملسیانی | تین روپے |
| جنگ و محاذ | ″ | ایک روپیہ |
| موجِ غزل | ساحر ہوشیار پوری | تین روپے |
| دستک | نریش کمار شاد | دو روپے ۲۵ پیسے |
| پھوار | ″ | دو روپے ۵۰ پیسے |
| نکھار | ″ | دو روپے ۲۵ پیسے |
| آہٹیں | ″ | تین روپے |
| آیات و نغمات | ″ | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| سنگم | ″ | تین روپے |
| رباعیاتِ محروم | تلوک چند محروم | تین روپے ۷۵ پیسے |
| گنجِ معانی | ″ | سات روپے ۵۰ پیسے |
| روپ | فراق گورکھپوری | تین روپے ۵۰ پیسے |
| رمز و کنایات | ″ | تین روپے ۵۰ پیسے |
| مشعل | ″ | دو روپے ۷۵ پیسے |
| بیکراں | جگن ناتھ آزاد | چار روپے ۵۰ پیسے |
| ستاروں سے ذروں تک | ″ | دو روپے ۷۵ پیسے |
| کلیاتِ اکبر الہ آبادی (اول) | اکبر الہ آبادی | پانچ روپے |
| ″ حصہ دوم | ″ | چھ روپے |
| کلیاتِ اختر شیرانی | اختر شیرانی | آٹھ روپے |
| رعنائیاں | شکیل بدایونی | تین روپے |
| صنم و حرم | ″ | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گلِ رعنا | جگی رعنا | تین روپے ۵۰ پیسے |
| شبنم شبنم | کرشن موہن | پانچ روپے |
| دلِ ناداں | | چھ روپے |

| | | |
|---|---|---|
| خرابات | عبدالحمید عدم | چار روپے |
| رمِ آہو | ″ | چار روپے |
| گلنار | ″ | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قول و قرار | ″ | تین روپے ۵۰ پیسے |
| گردشِ جام | ″ | دو روپے ۲۵ پیسے |
| بطِ مے | ″ | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گجر | قتیل شفائی | تین روپے |
| رسالت مآب | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| اسلام اور عورت | مولانا مظہر الدین | تین روپے |
| نماز کیا ہے | مولانا محمد علی | دو روپے ۲۵ پیسے |
| نیا نو دن | راشد سہوانی | پانچ روپے ۷۵ پیسے |
| غم دے مستقل | انیس مرزا | چار روپے ۵۰ پیسے |
| شرارت | جمیل انجم | تین روپے |
| عشق اور خون | رائیڈر ہگرڈ | سات روپے |
| سوکھا ساون | انیس مرزا | دو روپے ۵۰ پیسے |
| محبت اور جرم | انور کمال حسینی | دو روپے ۷۵ پیسے |
| فن اور تنقید | ″ | چار روپے ۵۰ پیسے |

**آئینۂ اصلاح** ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

**جوش ملسیانی** کے مکمل حالاتِ زندگی، انتخابِ کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۴۸ صفحے۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

**مضراب** شبابِ ملت کے ایک ایک شعر میں اس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اس نے سارے

جہاں کے ڈنکے دور دور بجے ہیں۔ قیمت [illegible]

**گلستانِ ہزار رنگ** جس میں تقریباً ہزار [illegible] عنوانات [illegible]

ایک کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے [illegible] کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے [illegible] مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام ثانی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ مجلد ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۷۵ پیسے۔

**شاہنامۂ اسلام** جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں [illegible] اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے ہر حصہ تقریباً تین سو صفحات [illegible] کے ہر حصے کی قیمت [illegible] جلد [illegible] ایک روپیہ [illegible] لگے گا۔

**تلامذۂ غالب** غالبیات کے مشہور محقق مالک رام صاحب کی مرتب کردہ تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ [illegible] تقریباً تین تصاویر [illegible] شامل کی گئی ہیں۔ ہندوستان [illegible] کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین [illegible] ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

**کفر و ایمان** [illegible] اس کتاب کی اہمیت [illegible] فرشتوں کے ساتھ [illegible] قیمت چار روپے۔

**کلامِ بے لگام** [illegible] دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا۔ قیمت [illegible]

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

# میرا جنازہ

راجہ مہدی علی خاں مرحوم

[illegible] راجہ مہدی علی خاں بیمار ہو کر [illegible] ہسپتال میں گئے کہ وہاں سے ان کا جنازہ ہی نکلا۔ انتقال سے کچھ دن پہلے میرے عزیز بیٹا [illegible] اشعار کہے۔ جنہیں میں [illegible] کے ساتھ [illegible] کر رہا ہوں۔ ان اشعار سے [illegible] کے اپنے مخصوص انداز [illegible] کے لحاظ سے [illegible] مرحوم [illegible] شخصیت تھے ——— راجہ [illegible] عزیز و اقارب سے اپنی دائمی مفارقت [illegible] کر [illegible] نظم کب [illegible] ان کی [illegible] اپنا مخصوص [illegible] انداز برقرار رکھا ——— [illegible] کہا تھا [illegible] نظم [illegible] زندگی میں شائع کر رہا ہوں۔ [illegible]

خورشید گرامی

**کنہیا لال کپور:-**

سکت باقی نہیں چلنے کی ماتم کرنے والے میں
کہ افسوس آ رہی ہے دم بدم پگ دھرنے والے میں
کنہیا لال کی پتلی کمر کا اب خدا حافظ
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
مرا ہے یہ کہ گردن آ گیا مجھ پر قیامت کا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**مجنوں گورکھپوری:-**

مرے کندھوں پہ اللہ وقت آیا ہے قیامت کا
سرک کر اک طرف ہو جائے ہر اک سنگ راہوں کا
نکلنے کو ہے دیوالہ مری کمزور باہوں کا
کنہیا لال جی اپنا نہیں تھا بوجھ ظالم کا
یہ ہوگا بوجھ شاید اس کے ناکردہ گناہوں کا
جنازہ مت نکالو اس بیچارے کی شرافت کا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**ڈاکٹر وزیر آغا:-**

ابھی میں قسم [illegible] گر کہوں تو جاگ اٹھے گا
جو ہنس کر جھانک لیتا ہے، وہ بن کر آگ اٹھے گا
مگر پھر سوچتا ہوں کیوں جگاؤں اس بیچارے کو
یہ صدمے کے واپس اپنے گھر کو بھاگ اٹھے گا
[illegible] کی حالت کا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا

**احمد ندیم قاسمی:-**

چلو اچھا ہوا یہ مر گیا، یہ سب سے لڑتا تھا
رسائل کے مدیران گرامی سے جھگڑتا تھا
غلط نظموں کو کہتا، اوّلیں صفحات میں چھاپو
ہم اس سے جتنا دبتے تھے یہ اتنا ہی اکڑتا تھا
بہت اچھا ہوا جو سو گیا فتنہ قیامت کا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**ابوالاعلیٰ مودودی:-**

نہ تھا حاجی بتاتا تھا پرانا آپ کو حاجی
کہا کرتا تھا ہر اک پارسا عورت کو یہ باجی
ذرا مرنے سے پہلے نقلی داڑھی بھی لگا لی تھی
مجھے ڈر ہے کہ جنت میں چلا جائے نہ یہ پاجی
اگر آدم کو دی آواز اس نے کہہ کے ابا جی
تو شاید ہوگا عزرائیل خود اس کی شرارت کا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**محمد طفیل:-**

ڈھنڈورا اس کا پیٹوں گا میں گیت اس کے گاؤں گا
میں گھر جا کر ادیب [illegible] بلندی اس کی ناپوں گا
کہ شاید [illegible] اک دن ہی دنیا میں
[illegible] کتابیں [illegible] چھاپوں گا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

# قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

| | | |
|---|---|---|
| آتشِ گل | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| کلیاتِ اقبال | ذاکرِ اقبال | چھ روپے |
| جنون و ہوش | جوش ملسیانی | چار روپے |
| ہفت رنگ | عرش ملسیانی | تین روپے |
| آہنگِ حجاز | 〃 | ایک روپیہ |
| سحرِ غزل | ساحر ہوشیارپوری | تین روپے |
| دستک | [illegible] | دو روپے ۲۵ پیسے |
| پھوار | 〃 | دو روپے ۵۰ پیسے |
| للکار | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قاشِ نہیں | 〃 | تین روپے |
| آیاتِ جنوں | 〃 | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| سنگم | 〃 | تین روپے |
| رباعیاتِ محروم | تلوک چند محروم | تین روپے ۷۵ پیسے |
| گنجِ معانی | 〃 | سات روپے ۵۰ پیسے |
| روپ | فراق گورکھپوری | آٹھ روپے ۵۰ پیسے |
| رمز و کنایات | 〃 | تین روپے ۵۰ پیسے |
| مشعل | 〃 | دو روپے ۷۵ پیسے |
| بیکراں | جگن ناتھ آزاد | چار روپے ۵۰ پیسے |
| ستاروں سے ذروں تک | 〃 | دو روپے ۷۵ پیسے |
| کلیاتِ اکبر الہ آبادی (اول) | اکبر الہ آبادی | پانچ روپے |
| حصہ دوم | 〃 | چھ روپے |
| کلیاتِ اختر شیرانی | اختر شیرانی | آٹھ روپے |
| رعنائیاں | شکیل بدایونی | تین روپے |
| صنم و حرم | 〃 | دو روپے ۷۵ پیسے |
| عکسِ رعنا | جگی رعنا | تین روپے ۵۰ پیسے |
| شبنم شبنم | کرشن موہن | پانچ روپے |
| دلِ ناداں | | چھ روپے |

| | | |
|---|---|---|
| خرابات | عبدالحمید عدم | چار روپے |
| رمِ آہو | 〃 | چار روپے |
| گلنار | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قول و قرار | 〃 | تین روپے ۵۰ پیسے |
| گردشِ جام | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| بطِ مے | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گجر | قتیل شفائی | تین روپے |
| رسالت مآب | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| اسلام اور عورت | مولانا مظہر الدین | تین روپے |
| نماز کیا ہے | مولانا محمد علی | دو روپے ۲۵ پیسے |
| نیا نو دن | راشد سہسوانی | پانچ روپے ۵۰ پیسے |
| نرودے مستقل | انیس مرزا | چار روپے ۵۰ پیسے |
| شرارت | جمیل انجم | تین روپے |
| عشق اور خون | رائیڈر ہگرڈ | سات روپے |
| سوکھا ساون | انیس مرزا | دو روپے ۵۰ پیسے |
| محبت اور جرم | انور کمال حسینی | دو روپے ۷۵ پیسے |
| فن اور تنقید | 〃 | چار روپے ۵۰ پیسے |

**آئینۂ اصلاح** ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

**جوش ملسیانی** کے مکمل حالات زندگی، انتخاب کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۴۸ صفحے۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

**مضراب** شباب للت کے ایک ایک شعر میں اُس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اُس نے سارے

جہان کے [illegible]

**گلستانِ بہار رنگ** [illegible]

یادگار کتاب کا مقدمہ [illegible] کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے [illegible] راجندر پرشاد کا نام [illegible] بات کی [illegible] کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین [illegible] رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے [illegible] کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے [illegible] دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۵۰ پیسے۔

**شاہنامۂ اسلام** جناب حفیظ جالندھری کا [illegible] چار حصوں [illegible] کو منظوم کیا ہے [illegible] ہے [illegible] سب چھاپا ہے۔ قیمت [illegible] جلد کی ہے [illegible]

**تلامذۂ غالب** [illegible] غالب کے شاگردوں [illegible] مستند تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے [illegible]

قیمت [illegible] سات روپے۔

**گفتار** [illegible] اس کتاب کی اہمیت [illegible] کلام [illegible]

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

# میرا جنازہ

## راجہ مہدی علی خاں مرحوم

راجہ مہدی علی خاں جانے کو ... ہسپتال بمبئی میں کیا گئے کہ وہاں سے ان کا جنازہ ہی نکلا۔ انتقال سے کچھ دن پہلے میرے (رضیہ؟)
... صاحب نے اشعار کے جنہیں وہ ... بہت تعلق کے ساتھ پیش و قارئین کر رہا ہوں۔ ان اشعار سے بھی ظاہر ہے کہ اپنے مخصوص انداز
نگارش کے لحاظ سے ... شعر و ادب میں مرحوم منفرد شخصیت تھے ـــــ راجہ جی نے اپنے فرزند احباب سے اپنی دائمی مفارقت کو محسوس
کر لیا تھا۔ اس عالم کرب و اندوہ میں بھی ان کی شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی نے اپنا مخصوص مزاحیہ انداز برقرار رکھا ـــــ محمد نصیب ... بھی
... نظم جنازہ ... زندگی میں شائع کرا رہا ہوں۔ ... خوشتر گرامی

**کنہیالال کپور:-**

سکت باقی نہیں چلنے کی ماتم کرنے والے ہیں
کہ افسوس آہ بھی ہے دم بدم پگ دھرنے والے ہیں
کنہیالال کی پتلی کمر کا اب خدا حافظ
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
مرا ہے یہ مگر ون آ گیا مجھ پر قیامت کا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**بھوت گورکھپوری:-**

مرے کندھوں پہ اللہ وقت آیا ہے قیامت کا
شرک کر اک طرف ہو جائے ہر اک سنگ راہوں کا
نکلنے کو ہے دیوالہ مری کمزور باہوں کا
کنہیالال جی اپنا نہیں تھا بوجھ ظالم کا
یہ ہوگا بوجھ شاید اس کے ناکردہ گناہوں کا
جنازہ مت نکالو اس بچارے کی شرافت کا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**ڈاکٹر وزیر آغا:-**

ابھی میں قبر پر اپنی گر کہوں تو جاگ اٹھے گا
جو بن کر جاگ لیتا ہے، وہ بن کر آگ اٹھے گا
مگر پھر سوچتا ہوں کیوں جگا دوں اس بچارے کو
... واپس اپنے گھر کو بھاگ اٹھے گا
... کی ... کا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا

**احمد ندیم قاسمی:-**

چلو اچھا ہوا یہ مر گیا، یہ سب سے لڑتا تھا
رسائل کے مدیران گرامی سے جھگڑتا تھا
غلط نظموں کو کہتا، اولیں صفحات میں چھاپو
ہم اس سے جتنا دبتے تھے، یہ اُتنا ہی اکڑتا تھا
بہت اچھا ہوا جو سو گیا فتنہ قیامت کا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہا

**ابوالاعلیٰ مودودی:-**

نہ تھا حاجی بتاتا تھا پرانا آپ کو حاجی
کہا کرتا تھا ہر اک پارسا عورت کو یہ باجی
خدا مرنے سے پہلے نقلی داڑھی بھی لگا لی تھی
مجھے ڈر ہے کہ جنت میں چلا جائے نہ یہ پاجی
اگر آدم کو دی آواز اس نے کہہ کے ابا جی
تو شاہد ہوگا عزرائیل خود اس کی شرارت کا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہ

**محمد طفیل:-**

ڈھنڈورہ اس کا پیٹوں گا میں گیت اس کے الاپوں گا
میں گھر جا کر ادیبا و بلندی اس کی ناپوں گا
کہ تنہا دوست ... کا ... میں ... دنیا میں
کوئی چاہے نہ چاہے ... کتابیں اس کی چھاپوں گا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہا

فرحت

**خوشتر گرامی:۔**

کتابیں اس کی تم پڑھ پاؤ گے، گویا مر گئے ہیں ہم
غمِ شاعر بہت کم ہے، کتابوں کا بہت ہے غم
جنازہ چھوڑ کر تم کو میاں دوں گا میں اک گھونسہ
غمِ زر جھول جاؤ، مرنے والے کا کرو ماتم
بڑی بات مومنو سوچو کہ کندھوں پر جنازہ ہے
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**ڈاکٹر وزیر آغا:۔**

ابھی مرحوم کی رحلت کا دل پہ زخم تازہ ہے
ہویدا ہے جو چہرے سے شانِ اکبری اس کی
نہ یہ سمجھو کہ ان کندھوں پہ یہ مُلّا دو پیازہ ہے
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**کرشن چندر:۔**

پرندے اس کی ہیبت دیکھ کر شاخوں سے اُڑ جاتے
اسے شیرِ ببر گر دیکھتے، پیچھے کو مُڑ جاتے
اگر غصے سے گھر میں توڑتا چینی کے یہ برتن
تو برتن خود بخود آپس میں مارے ڈر کے جُڑ جاتے
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**راجندر سنگھ بیدی:۔**

سنا ہے چوری چوری عشق کا فکر کھا گیا اس کو
خدا ہی جانے کس کے غم میں چکر آ گیا اس کو
ادب کا قصرِ عالی شان تھا یہ بزمِ دنیا میں
نہ جانے کون ظالم مسکرا کر ڈھا گیا اس کو
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**رام لعل:۔**

کبھی افسر کو رشوت میں کبھی اس نے نہ ڈالی دی
کبھی مانگا انھوں نے کچھ تو اس نے ماں کی گالی دی
مٹھائی جب بھی بھجوائی لیے چاندی کی تھالی میں
مٹھائی کھا گیا یہ اور کبھی واپس نہ تھالی دی
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**ظ انصاری:۔**

اگرچہ دوست تھا اس کا پرانا ظ پنجابی
مگر آج اس کو کندھا دے رہا ہے ظ انصاری
نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا اس کو ہونے نے: نہ ہوتا یہ تو کیا ہوتا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا

**عابد علی عابد:۔**

ادب کی کان میں اس نے کئے لعل و گہر پیدا
کئے اس نے غموں میں مسکراہٹ کے ثمر پیدا
ہزاروں سال تک دنیا میں ایسے پیدا ہوتے ہیں
بڑی مشکل سے ہوتے ہیں جہاں میں دیدہ ور پیدا
میں کندھا دے چکا، لیکن یہ سنّی تھا کہ شیعہ تھا
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!
میاں آغا نہ اتراؤ نہیں تم شمس تبریزی
نہ اب جاگے گی اس ظالم ہلاکو خاں کی چنگیزی
ادب آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکل ہائے
نہاں رہتا تھا جو اس میں وہ انساں کس نے دیکھا ہے
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

**خوشتر گرامی:۔**

جنازہ یار کا ہے اسے کیسی دھوم سے نکلے
کچھ اس انداز سے جیسے شرابی جھوم کے نکلے
عقابی شان سے اس کو اٹھا کر لے چلو یارو!
اگر ممکن ہو سارے شہر میں یہ گھوم کے نکلے
حسینانِ جہاں قرباں ہوں آ کر بے نقاب اس پر
ہر اک کھڑکی سے چھڑکیں اپنے عارض کے گلاب اس پر
گلی کے سب حسیں ڈالیں نگاہیں بے حجاب اس پر
اٹھائیں گورے گورے ہاتھ اپنے اور دعا مانگیں
نہ آنچ آئے جہنم کی، نہ ہو کوئی عذاب اس پر
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!
بڑھو اے مومنو آگے، پڑھو کلمہ شہادت کا!

# فرشتہ

——— شاہد فریدی

کالج آف ایگریکلچرل انجینئرنگ ۔ ۵ (میسور اسٹیٹ)

۵ ستمبر ۶۹ء

محترم و معظم خوشتر صاحب! آداب

۲۹ جولائی کی صبح کتنی منحوس تھی، جب میں پیتھالوجی لیباریٹری میں کام کر رہا تھا میرے ایک دوست جعفر نے حقانی کر ۱۱ اخبار کی خبر سنائی کہ "مہدی علی خاں اس جہانِ فانی سے چل بسے!" ——— میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے ——— آہ! راجہ مہدی علی خاں! بقول آپ کے "انھیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔" انھیں مرحوم کون کہہ سکتا ہے۔ وہ زندہ ہیں۔ جب تک اُردو زبان بولی جائے گی وہ زندہ رہیں گے! اور رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے!! ——— آسمانِ ادب کا ایک اور ستارہ غروب ہو گیا اور یہ احساس بھی آپ کو یقیناً ہوگا کہ آپ کے کندھوں پر بار اور بڑھ گیا ہے ادب کے ستونوں کو گرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو بہت ڈر لگتا ہے۔ اُردو کے مستقبل کی طرف سے دعا گو ہوں کہ آپ جیسے سرفروش سرپرست اُردو کے لئے صدیوں زندہ رہیں! ——— ایک اور کوشش "فرشتہ" ارسالِ خدمت ہے۔ میں نے اسے صرف "بیسویں صدی" کے لئے لکھا ہے۔ پسند آئی تو سمجھوں گا کہ کوشش کا توقع سے زیادہ پھل ملا ——— میری پچھلی کہانی "تم کو خبر ہونے تک" کے سلسلے میں پسندیدگی کے بہت سے خط آئے ہیں۔ میری یہ بڑی خوش قسمتی ہے جو آپ کی مرہونِ عنایت ہے . . .

خلوص کیش ——— شاہد فریدی

---

رات کے بارہ بجے ایمرجنسی وارڈ کے راہداری پر آتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر وہ مریض جو ابھی تک اپنے اپنے بستر پر جاگ رہے تھے، سمجھ گئے کہ اب ڈاکٹر ناصر مسکراتے ہوئے وارڈ میں داخل ہوں گے۔ اور جب ڈاکٹر ناصر نرس کے ساتھ مسکراتا ہوا وارڈ میں داخل ہوا کئی ہاتھ سلام کے لئے اُٹھ گئے۔ ہر مریض کی آنکھوں میں اس کے لئے بے پناہ عقیدت تھی۔

کتنا دردمند دل دیا تھا خدا نے ناصر کو! جب وہ مریضوں کی نبض پر ہاتھ رکھتا تو آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں ایک حرارت سی ابھرنے لگتی اور آنکھوں میں حیات افروز چمک پیدا ہو جاتی۔ مرجھاتے ہوئے گالوں پر گلابی لہر دوڑ جاتی۔ مریضوں کے چہروں پر زندگی کے آثار دیکھ کر ناصر کی آنکھوں میں بھی ایک نئی روشنی چمکتی۔

اور جب وہ مریضوں کو دیکھ کر اور نرس کو دواؤں کے متعلق ہدا[یات دے کر] وارڈ سے نکلا، اس کے چہرے پر نور ہی نور تھا۔ جیسے ایک پجاری عبادت کے بعد مسجد [سے نکلتا ہے۔]

ناصر نے اپنے کمرے میں آکر خود ہی کافی تیار کی۔ پھر کافی کا ایک [کپ لے کر آرام] کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں د[بایا۔] کا ایک کش لینے کے بعد اس کے لب آپ ہی آپ گنگنا اٹھے ؎

اُف یہ غم کی دھوپ سے تپتی ہوئی راہِ طلب
سر پہ تیرے ریشمی آنچل کا سایہ بھی نہیں
اُف یہ پُراسرار سناٹا یہ گہری تیرگی
اور کوئی ساتھ میں اپنا پرایا بھی نہیں

آہستہ آہستہ اُس کے چہرے پر بیتے ہوئے دنوں کے سائے جھلملانے لگے۔ ناصر اپنے ماضی کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو گیا۔ اُس کا ذہن ماضی کے اُن کھنڈروں میں بھٹک رہا تھا جہاں آج سے بیس سال پہلے یاسمین نے زندگی کی کچی ڈگر پہ اُسے آواز دی تھی۔ ماضی کے دھندلکوں میں سے چند پیاری پیاری سی صورتیں اُبھرنے لگیں۔

اُسے اپنا بچپن یاد آیا جب اُسے گولیاں کھیلنا تو الگ رہا سیدھی طرح گولی پکڑنا بھی نہ آتا تھا۔ گلی کے موڑ پر جہاں پیپل کا گھنا درخت تھا اُسی درخت کی چھاؤں میں ناصر اکیلا ہی گولیاں کھیل رہا تھا۔ اُس نے چند گولیاں چھوٹے سے گڑھے میں ڈالیں۔ گولیاں ڈالتے وقت اُسے سامنے کے بڑے گڑھے کا بھی کچھ خیال نہ رہا۔ جہاں ساری نالیوں کا گندا پانی جمع ہوتا تھا اور محلے کے اکثر لڑکے جو سکول سے بھاگتے تھے، اِسی پیپل کے درخت کے نیچے جمع ہو کر کھیلتے اور اِسی گڑھے میں گرتے رہتے۔

---

- بھوکے کو روٹی، گرتے کو سہارا دو۔
- سچے انسان ذات پات، اونچ نیچ، امیر غریب کے فرق کو نہیں مانتے۔ اُن کے لئے سب بھائی ہیں۔
- کوشش کرو کہ قرضہ نہ لینا پڑے۔ اگر مجبوراً قرضہ لینا پڑے تو ایمانداری کے ساتھ پیسہ پیسہ چکاؤ۔
- صرف اچھے اعمال ہی انسان کو خدا سے ملاتے ہیں۔
- اے خدا مجھے طاقت (بر) دے کہ میں بھلے کام کرنے، غریبوں کی مدد کرنے اور ظالموں کو ختم کرنے میں کبھی پیچھے نہ ہٹوں۔

گورو گوبند سنگھ جی

---

ناصر اپنے ہاتھ کی گولی سے زمین پر پڑی ہوئی گولی کا نشانہ لے کر آگے کی طرف جھکا لیکن جھکتے وقت وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ وہ سامنے سے گزرتی ہوئی اپنی ہم عمر دو لڑکیوں سے ٹکرا گیا۔ ایک لڑکی تو اُسے ڈانٹتی ہوئی ایک طرف ہٹ گئی لیکن دوسری لڑکی نے ناصر کو تھام لیا ورنہ اُس کا اُس گندے گڑھے میں گر جانا یقینی تھا۔

"بدتمیز! آنکھیں نہیں ہیں، اندھے ہو!!" لڑکی اُسے ڈانٹتی رہی اور وہ سر جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا۔

دوسری لڑکی نے جس نے اُسے گرنے سے بچایا تھا اُس کے سراپا پر ایک نظر ڈالی اور اُس سے پوچھا۔

"یہ کھیلنے کا وقت ہے! کیا تم سکول نہیں جاتے؟" پھر وہ دونوں لڑکیاں آگے بڑھ گئیں اور ناصر چپ چاپ کھڑا اُس گڑھے کی طرف [illegible] اُس نے جھک کر ساری گولیاں اُٹھالیں اور اُنہیں [illegible] وقت اُس کے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال گونجتا رہا۔

"کیا تم سکول نہیں جاتے؟ کیا تم سکول نہیں جاتے؟"

گھر آکر وہ چپ چاپ اپنی امّی کے پاس بیٹھ گیا۔

"امّی جی"

"کیا ہے؟ کہنا چاہتے کیا ہو؟" اُس کی امّی نے [illegible]

"کیا تم لوگوں نے مجھے نوکرانی سمجھ رکھا ہے؟ ایک تمہارے [illegible] سہیلیوں ہی سے فرصت نہیں۔ پھر یہ لکڑیاں اتنی گیلی ہیں کہ پھونکتے پھونکتے [illegible] درد ہونے لگتا ہے اور نواب زادے کو بھوک لگی!"

ناصر تھوڑی دیر تک اپنی امّی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے [illegible] ڈرتے کہا۔

"امّی میں سکول جانا چاہتا ہوں۔"

اُس کی امّی چولہے پر چڑھے ہوئے برتن میں کچھ [illegible] ماں آخر ماں ہوتی ہے۔

"اِدھر آ ناصر!"

وہ ڈرتے ڈرتے امّی کے قریب گیا اور امّی جی نے اُسے [illegible] گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگیں۔ اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو ہی تو سارا دن آوارہ لڑکوں میں کھیلتا رہتا ہے۔ تیرے ابّا کو تو جیسے گھر کی فکر ہی نہیں! تجھے کس نے سکول جانے سے منع کیا ہے میرے لال!"

ناصر آج بھی سکول سے واپس آکر کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مسلسل پانچ دن سے اِسی طرح کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر اُس لڑکی سے ملنے کے بارے میں سوچتا لیکن جوں ہی اُس کی نظر کھڑکی سے باہر اُس لڑکی کے عالیشان بنگلے اور اُس کے خوبصورت باغیچے پر پڑتی وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ دو ایک بار اُس کے قدم اُس مکان کے پھاٹک تک بھی پہنچ گئے لیکن نہ جانے کیوں جب وہ پھاٹک تک جاتا اُس کی نظر اپنے کپڑوں اور پیروں پر پڑتی، وہ اپنے گھر چلا جاتا اور کھڑکی سے اُس کو دیکھنے کی کوشش کرتا لیکن آج اُس نے اپنے دل میں یہ ارادہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ اُس سے ضرور ملے گا! پھر وہ پھاٹک کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی کی نظر [illegible] اور وہ خود پھاٹک تک آئی۔

"اندر آؤ، باہر کیوں کھڑے ہو؟" لڑکی نے اُسے پہچانتے ہوئے کہا۔

ناصر ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ پھر اُس نے کہا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے؟

[illegible] ہے؟

اس کے بعد [illegible] سکول سے [illegible] یاسمین کے ساتھ [illegible] ہے۔

[illegible] یاسمین کے ساتھ [illegible] اس سے کہا۔

"یاسمین! [illegible] ماسٹر صاحب [illegible] کلاس میں لڑکوں سے کہا پوچھ [illegible] لڑکوں سے [illegible] لڑکوں نے [illegible] اپنا ہاتھ اٹھا سکا۔

"تم نے [illegible]؟ [illegible] ڈاکٹر ہوگے؟"

یاسمین اور ناصر نے ساتھ ساتھ [illegible] پاس کیا پھر ایک ساتھ کالج میں داخل ہوئے۔ یاسمین کے [illegible] سال ناصر نے فرسٹ ڈویژن میں پاس کرکے میڈیکل میں داخلہ لیا۔ پھر اس کے تین سال بعد [illegible] میں گھر آیا۔

"ناصر! ایک [illegible] تو [illegible] ہوگا" امی کمرے میں داخل ہوئیں۔

اس کی نظر [illegible] کے پاس [illegible] جس پر [illegible] سے گر کر چکنا چور ہو چکا تھا۔

"امی یہ ماڈل کس نے توڑ دیا؟"

"کل شاہین اور اس کے بچے آئے تھے۔ یہ اس کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔"

پھر اس کے کانوں سے ڈھولک کی آواز ٹکرائی جس پر شہنائی کے گیت گائے جا رہے تھے۔ اس نے امی کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں ایک سوال تھا اور اس کی امی سمجھ گئیں کہ وہ ان سے کیا پوچھنا چاہتا ہے۔

"ناصر بیٹے! شاہین تیرا انتظار کرکے چلی گئی اور جاتے وقت تجھے وہ چار دن کے لئے اپنے پاس بلایا ہے۔ تو وہ ایک دن کے لئے شاہین کے ہاں چلا جا!"

پھر اسے شاہین سے معلوم ہوا کہ جب سے وہ اپنے سسرال چلی گئی تھی، امی کو گھر ہمیشہ سونا سونا لگتا۔ گھر میں سارا دن وہ اکیلی رہتیں اور گھر انہیں کاٹنے کو دوڑتا۔ گھر میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ ہر وقت کسی چیز کی کمی محسوس کرتیں۔ انہیں ہر وقت ناصر کے بیاہ کا غم ستاتا۔ اس لئے کہ گھر کے سونے پن کو ہر وقت کسی کا انتظار تھا۔ اس کی امی کو بیٹے کے سر پر سہرے کے پھول دیکھنے کا بڑا ارمان تھا۔ اور ایک دن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یاسمین کے گھر گئیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ امیر باپ کی بیٹی ہے۔

یاسمین کے والد جانتے تھے کہ ناصر اور یاسمین دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں انہیں [illegible] دور نہ کر سکے۔

"آپ [illegible] کہ [illegible] رشتہ طے کر لیا ہے؟"

اور اس کے دو [illegible] دن [illegible] یاسمین کا رشتہ ایک امیر گھرانے [illegible] خوبصورت کوٹھی تھی۔ چار [illegible] کاریں تھیں اور دولت کے انبار تھے۔ وہ ایسا [illegible] جس سے کوئی ڈاکٹر خرید سکتے ہیں۔

ناصر اپنی امی کے پاس سے چلا گیا اور خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا۔ [illegible] کوئی تین بجے اس کے کمرے کا پردہ ہٹا اور یاسمین شادی کا سرخ جوڑا پہنے پاؤں میں پائل اور رنگ [illegible] ہاتھوں میں مہندی [illegible] جھکی جھکی پلکیں [illegible] ناصر کی نظر یاسمین کے پیروں پر گئی جن میں مہندی لگی ہوئی تھی [illegible] کانچ کے ٹکڑوں پر چل کر اس سے ملنے آئی ہے۔ [illegible] اس کے سامنے کھڑی [illegible]

---

- ہر ایک کو اپنے سے بہتر جانتا ہے ایک دن وہ سب سے بہتر بن جاتا ہے۔ (سوامی سارشدانند جی)
- کسی کو دلیل [illegible] دکھ پہنچانے کا کوئی کفارہ نہیں۔ (سوامی سارشدانند جی)
- اس عارضی زندگی کو جھوٹی اور وقتی خوشیوں کے جھگڑے میں نہ الجھاؤ۔ (گرو نانک جی)
- وقت کی قدر کرو اور باقاعدگی کو اپنا اصول بناؤ۔ اس طرح تمہیں کام کرنے کے لئے زیادہ وقت ملے گا۔ (پنڈت جواہر لال نہرو)
- بندہ وہی جو ایشور کی رضا میں راضی ہے۔ ([illegible])

---

دلہن بجے فرش پر چلنے نہیں دیا جاتا۔ جیسے کہ تابھی سہیلیاں اپنے ہاتھوں سے کھلا [illegible] تاکہ دلہن کے ہاتھوں کی مہندی ماند نہ پڑ جائے! اور آج اسی ہی ایک دلہن اپنے [illegible] پر چل کر مہندی کی رسم زمانے کی ساری زنجیروں کو توڑ کر اس سے ملنے چلی آئی؟

"میں بھی کتنا عجیب ہوں یاسمین!" ناصر نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "جب تمہارے گھر ڈھولک بج رہی تھی اور شہنائی کے گیت گائے جا رہے تھے، اس سے اب تک بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ کیا میں اپنے بچپن کی شہزادی سے کبھی مل سکوں گا ——؟ تمہیں یاد ہے یاسمین! جب تم اپنی گڑیا کا بیاہ میری بہن کے گڈے سے کرنا چاہ رہی تھیں، اس وقت تمہاری باجی نے تم سے کہا تھا بیاہ اپنے برابر میں کیا جاتا ہے۔ پھر تم روتی ہوئی میرے پاس چلی آئی تھیں اور مجھ سے کہا تھا تمہاری [illegible] نے تمہاری گڑیا کا بیاہ اپنی کسی سہیلی کے گڈے سے کر دیا ہے۔

وہ چپ چاپ نیچی نظریں کئے بیٹھی رہی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
اُس نے یاس بھری نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا۔ گلابی ہونٹوں کے گوشے آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے، لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

"اور اب جب کہ تم مجھ سے ملنے آئی ہو، میں سوچ رہا ہوں یاسمین کہ تمھیں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"کبھی میں نے سوچا تھا، سہرا باندھے تمھارے گھر آؤں گا اور اپنے بچپن کی ساتھی، اپنے سپنوں کی شہزادی کو ڈولی میں بٹھا کر اپنے گھر لاؤں گا۔ امی تمھیں دیکھ کر پھولی نہ سمائیں گی۔"

یاسمین کی نرگسی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی یاسمین کہ مجھے اس سال گولڈ میڈل ملا ہے! لیکن میں سمجھتا ہوں اس کی حقدار تم ہو!" ناصر کا گلا رندھ گیا۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک چھوٹا سا مخملی ڈبہ یاسمین کی طرف بڑھایا۔

اُس نے دیکھا دو آنسو میڈل پر ٹپک پڑے۔ پھر دونوں کی نظریں ملیں۔

کتنی یاس اور تڑپ تھی یاسمین کی آنکھوں میں! آج وہ ناصر کو آخری بار دیکھنے چلی آئی تھی۔ نہ جانے پھر کب دیکھنے کا موقع ملے۔ وہ ناصر کی طرف آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُسے اپنی آنکھوں میں چھپا لینا چاہتی ہو۔

کتنا درد تھا اُس کی آنکھوں میں! ناصر نے چاہا آگے بڑھ کر اپنے ہونٹ اُس کی آنکھوں پر رکھ دے اور اُس کی آنکھوں کا سارا درد اپنی روح کی گہرائیوں میں اُتار لے۔

یاسمین کا مہندی میں رنگا ہوا نازک سا ہاتھ اُس کے ماتھے کی طرف اُٹھا اور وہ روتی ہوئی ناصر کے کمرے سے چلی گئی۔

---

اور اب ناصر [illegible] سڑک [illegible]
ہیں۔ کتنی ویرانی اور تنہائی ہے ان میں۔ ڈاکٹری [illegible] کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہوا کا ایک شوخ جھونکا [illegible] رولر زتے ہوئے آنسو گود میں گر کر جذب ہو گئے۔ [illegible] کی گہری تاریکی کی طرف اُتر گئیں جہاں [illegible] سوچا جب کبھی وہ گھبرا جاتا ہے تو زندگی کی [illegible] جو کبھی اس نے یاسمین کے ساتھ گزارے تھے تو جواب [illegible] سوا کچھ نہ ملتا۔

نہ کسی کے نقش پا، نہ کوئی نشان، وہ گزر [illegible] میں ایک طویل اور بے کراں سناٹے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ [illegible] کرتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے اُداس [illegible] کس کے در پر دستک [illegible] ہی تھک کر افسردہ سی مایوس لوٹ کر [illegible] کے وقت اس کی آنکھوں میں [illegible] ناصر کو ایسا محسوس ہوتا جیسے ان اندھیروں میں کوئی پیار کی قندیل [illegible] ہے جس سے پھوٹتی ہوئی شعاعیں اُسے جینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

"ڈاکٹر! ڈاکٹر!!" نرس کی گھبرائی ہوئی آواز نے اُس [illegible] توڑ دیے۔

"کیا بات ہے نرس؟"

"ایمرجنسی وارڈ میں ایک سیریس کیس آیا ہے۔"

کیس واقعی سیریس تھا۔ کوئی سات برس کے ایک معصوم [illegible] بچے کا Spleen Rupture ہونے کی وجہ سے خون بہت زیادہ نکل گیا تھا۔ [illegible] زندگی کی کوئی اُمید نہیں تھی اور اگر جلدی سے خون نہ پہنچایا گیا تو بچہ نہیں بچ سکتا تھا۔

"ڈاکٹر! میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ زندگی صرف خدا کے ہاتھ ہے! پھر بھی اگر یہ بچہ نہ بچ سکا تو میری ہونے والی زندہ نہ رہ سکے گی!" بچے کے باپ نے [illegible] کی طرف اشارہ کیا۔

ناصر کی نظریں اُٹھیں۔ اُس کے سامنے یاسمین بیٹھی تھی اور اپنی خالی خالی نظروں سے خلاؤں میں [illegible] دیکھ رہی تھی۔

ناصر نے بچے کی ڈوبتی سانسوں کو [illegible] جھک کر نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر [illegible]
"نرس! [illegible]"

[illegible] شکل ہو گئی [illegible] ساتھ اچھا ہوا تھا اور
[illegible] کے [illegible]

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"سسٹر [illegible] اس وقت کسی گروپ کا بھی کوئی بوتل جاسے یہاں نہیں ہے۔"

"آپ ہی خون دے دیجئے۔"

[illegible] یاسمین اور اُن کے شوہر کا خون ٹسٹ کیا۔ پھر اُس نے انگریز سے کہا پہلے
[illegible]

"مجھے افسوس ہے آپ دونوں کا خون بچے کے خون سے نہیں ملتا!"

"نرس! تم میرا خون لے سکتی ہو! میں Universal Donor ہوں!"

"مگر سر....؟"

"چلو جلدی کرو! وقت بہت کم ہے!"

"سر! آپ نے کل بھی ایک مریض کو اپنا کافی خون دیا ہے!"

"یہ باتوں کا وقت نہیں ہے نرس!"

اور خون دیتے وقت ناصر سوچتا رہا ————

شاید یہ وہی جذبہ ہے جس سے ایلورا اور اجنتا کی لافانی مورتیاں تراشی گئیں
اور اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو تاج محل ادھورا رہتا۔ Paradise Lost اور ہیملٹ
نہ لکھی گئی ہوتیں، اور کالیداس سے شکنتلا کے دو لفظ بھی نہ لکھے جاتے۔ اور آج وہی جذبہ
اُسے خون دینے پر مجبور کر رہا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ بچے کی حالت درست ہوتی گئی۔ ناصر نے مسکرا کر اطمینان کی
سانس لی اور کمرے کے باہر آ کر کہا۔

"اب آپ کا بچہ خطرے سے باہر ہے! میں نے نرس کو دوا اور انجکشن کے لئے
کہہ دیا ہے۔"

صبح کوئی چار بجے کے قریب بچے نے آنکھیں کھولیں سرہانے بیٹھی ہوئی یاسمین کی
آنکھیں خوشی سے چھلک پڑیں۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس گئی اور اُس سے
لپٹ گئی۔

"وسیم! تم نے دیکھا، ناصر کو ہوش آ گیا ہے۔ جانتے ناصر نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی
ہیں" وہ ایسا خوش تھی جیسے ساری کائنات اُس کے ہاتھ آ گئی ہو!

"جانتے ہو وسیم! ابھی ابھی اُس نے مجھے ممی کہہ کر پکارا ہے؟"

"میرا ناصر! خدا نے میرے بچے کو دوسری زندگی عطا کی ہے۔ پروردگار نے
پھر وہ قبول کر لی؟"

"پہلے تمہیں ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرنا چاہئے یاسمین! جس نے اپنا خون دے کر
ہمارے ناصر کو بچایا ہے!"

"اوہ! کہاں ہے وہ دیوتا؟"

"نرس! نرس!! وہ بھاگتی ہوئی نرس کے پاس گئی۔

"سسٹر! مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو!"

یاسمین اپنے شوہر اور نرس کے ساتھ ڈاکٹر ناصر کے کمرے میں داخل ہوئی جہاں وہ
آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔

"ڈاکٹر! آپ انسان کی شکل میں فرشتہ ہیں! آدمی کے روپ میں دیوتا ہیں" یاسمین
ناصر کی کرسی کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

"دیکھئے ڈاکٹر! ابھی ابھی میرے ناصر کو ہوش آیا ہے اور اب اُس کے ہونٹوں پر
مسکراہٹ کھیل رہی ہے!"

"کیا آپ سن رہے ڈاکٹر! آپ بولتے کیوں نہیں؟" یاسمین نے ناصر کو کندھوں سے پکڑ کر ہلایا۔

اور ——— اور ———

ناصر کا ہاتھ اور سر کرسی کے ایک طرف ڈھلک گئے۔
لیکن ہونٹوں پر فرشتوں کی سی ابدی مسکراہٹ کھیل رہی تھی!!

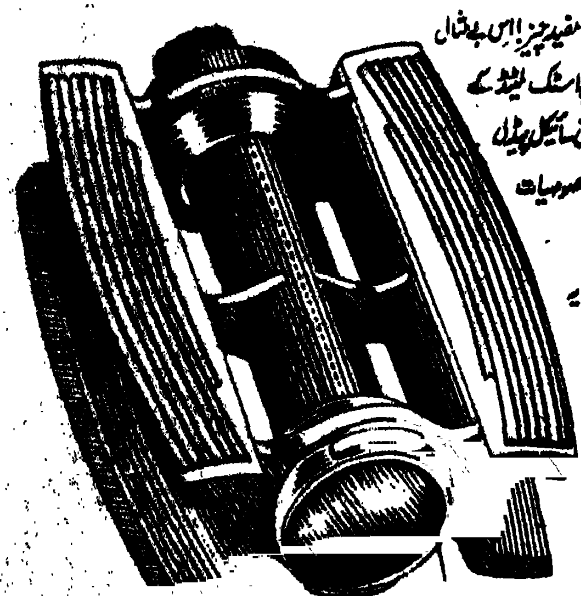


کپور تھا...

:: نئے استعمال :: نئے فوائد

# پرایپلان پیڈل

☆ Speed Bird ☆



پلاسٹک : ایک گھریلو نام! انسانی زندگی کے ہر پہلو میں ایک نہایت مفید چیز! اس بے مثال چیز کو آپ کی زندگی کا نزدیکی جزو بنانے کے ٹھوس نیصلے پر انڈین پلاسٹک لمیٹڈ کے تجربہ کار تکنیکی ماہرین کی نئی نرالی کھوج ہے۔ پلاسٹک کا پیڈل! روایتی سائیکل پیڈل سے بالکل مختلف لیکن دیکھنے میں دلکش اور کارکردگی میں بے نظیر۔ ان خصوصیات کے باعث :

* رکھ رکھاؤ میں کم خرچ : از خود مکمل چھوٹے پرزوں کے بغیر بنا ہوا۔ یہ پیڈل نہ زیادہ گھستا ہے۔ اور نہ ہی پرزے بدلنے پڑتے ہیں۔
* ٹھوس کاریگری کا عظیم نمونہ ہونے کے باعث نہ زنگ لگنے کا ڈر اور نہ رگڑ کھانے کا اندیشہ۔
* اعلیٰ قسم کے پلاسٹک سے تیار شدہ اس پیڈل میں سائیکل چلانے کے لطف کو بغیر آواز اور مختصر بنانے کے لئے تیل ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں۔
* ہلکا پھلکا : وزن میں آج تک کے تیار شدہ پیڈلوں سے نصف سے بھی کم۔

کسی بھی مشہور سائیکل ڈیلر کے ہاں سے تجربہ کر کے دیکھئے

کاروباری معلومات کے لئے : جواہر کانتا۔ لکھنؤ یا

**I انڈین P پلاسٹک L لمیٹڈ بمبئی 67**

**IPL** کی ٹھوس کاوشیں زندگی کو پُر لطف بنانے کے لئے

# اُوٹ پٹانگ

فکر تونسوی

چند دن ہوئے مجھے ایک لڑکی ملی مگر وہ شادی شدہ تھی۔ پندرہ برس پہلے میں نے اس کی جو تصویر ذہن میں بنا رکھی تھی وہ بدستور خوبصورت رہی۔ بدستور جھیل کی جھیل بنی رہی تھی۔ جھیل کی نیلگوں لہروں میں ڈھول سا مچلتی ہوئی اُس کی تصویر میں کتنی حرکت، تمازت تھی۔ وہ پچھلے پندرہ سال تک ان لہروں کی شہزادی بنی رہی۔ لیکن جونہی چند دن پہلے وہ مجھے ملی، لہریں ایک دم گم ہو گئیں، مرگئیں۔ تصویر بھی مرگئی۔ جھیل بھی مرگیا۔ شہزادی بھی مرگئی۔ ہر چیز مرگئی۔ صرف میں رہ گیا۔ تحیر اور تاسف کے دوراہے پر گھبرائے جانا۔ نڈھال صرف وہ لڑکی رہ گئی۔ خزاں سے زرد خشک پتے کی طرح کھڑکھڑا کرتی۔ افسردہ، غیر ضروری لڑکی ———— تخیل کی دنیا کی ہر لڑکی سے خوبصورت ہوتا ہے، حقیقت کتنی لغو ہوتی ہے۔ بالکل اس لڑکی کی طرح جیسے تو ہو مگر بے حال ہو۔

میں نے کہا: اوشا! (اصل نام کچھ اور تھا، یہ تو ہمارے عشق کا نام تھا) تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

وہ کاونٹنگ مشین کی طرح بولی: تین لڑکے، ایک لڑکی، ڈھائی کمروں والا مکان، چھ چارپائیاں، کچھ بینک بیلنس اور کچھ بال کالا کرنے والی شیشیاں۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی، مسکرا نہیں سکا۔ کیونکہ وہ بھی بالکل نہیں مسکرائی تھی۔ کاش! وہ شادی نہ کرتی۔ عشق کرتی رہتی۔ کاش! میں بھی شادی نہ کرتا، عشق ہی کرتا رہتا۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا کہ اشیا کی بالکل اسی سے ملتی جلتی فہرست میرے ذہن میں بھی لکھی ہوئی ہے۔ میری فہرست میں صرف ایک چیز زائد تھی۔ اس کے کچھ بوسیدہ، زرد اور میلے لو لیٹرز۔ اوشا اُنہی دنوں کی ایک سن کی بوری بن کے بھول گئی کہ وہ کتنے خوبصورت لو لیٹر لکھا کرتی تھی اور میں اُسے کہا کرتا تھا۔ اوشا! تمہارے لو لیٹر تم سے زیادہ جاذب اور دلآویز ہوتے ہیں اور وہ بہ باطن خوش ہو کر اور بظاہر میرے بازو میں چٹکی بھر کر کہا کرتی تھی مسلمان! (یہ اصل نام نہیں تھا، یہ تو ہمارے عشق کا نام تھا) ہوش میں آؤ اور اُٹھو انقلاب کرو۔ جو لیٹر پہلے کبھی کا کرتا زیادہ جاذب اور دلآویز ہوتا ہے؟"

بے اختیار میرا جی چاہا بھاگ کر وہ لو لیٹر لے آؤں اور اس کے منہ پر دے ماروں۔ اور اس سے کہوں یہ لے اپنی لاشوں کو سنبھال لے اور اپنے انقلاب کے قبرستان میں گاڑ دے اور ان پر یہ کتبہ لکھ دے۔

"یہاں وہ شہید ابدی نیند سو رہے ہیں جو بن آئی موت مر گئے۔"

"چلو اوشا! کسی ریسٹورانٹ میں بیٹھ کر ایک ایک کپ چائے پئیں اور عشق، انقلاب کے عظیم و جمیل ماضی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیں۔"

"نہیں، میری بس نکل جائے گی۔"

"نکل جانے دو۔ غلط بس پر چڑھنے سے بہتر ہے کہ بس نکل جائے۔ ذرا سوچو! شاید کہ ایک بار تم پہلے بھی غلط بس پر چڑھ گئی تھیں تو پندرہ سال تک منزل تک نہ پہنچیں اور اب اتفاقاً منزل کے پاس آ پہنچی ہو تو چند منٹ ہی دم لے لو۔"

"ہی ہی ہی! پہلی سی آسودہ مسکراہٹ۔" ہی ہی ہی! تم تو ابھی تک شاعر ہو۔ تم شاعری کی بجائے فلسفی ہوتے تو اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر ہنسی خوشی گھر ونشا پر آتے۔ ذرا بیان کرو تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

کتنی لغو حسینہ ہے۔ شاعری کا جواب ماں کی گالی میں نہیں دیتی۔ جھنکی ہو نہیں دیتی۔ اُس کی نگاہیں عینک سیٹ کسی گرے ہوئے مکان کا مرثیہ لکھ رہی تھیں چور چور ہے۔ کاش! یہ نگاہیں ایک بار پھر غزل کے دو مصرعے بن جائیں تو میں اپنا نیلام کر کے اُس کے ساتھ ایک بنچ پر اور بیٹھ جاؤں۔ "میں جا بیٹھوں۔ لیکن یہ تو اب اُس جہاں وہ گھنٹوں بیٹھی رہتی تھی، بیٹھنا ہی نہیں چاہتی۔ اُٹھ کر بھاگ جانا چاہتی۔ میں نے اُس کی کلائی پکڑ لی تاکہ اُسے بنچ پر زبردستی بٹھا دوں۔ مگر کلائی ٹھنڈی، اُس میں ہلکی سی لرزش بھی نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہی وہ کلائی تھی جو ہاتھ کے چھونے سے پورے جسم میں سنسنا جاتی تھی۔ ٹھنڈے لہو اور ٹھنڈے لمس کے ساتھ میں نے

"اوشا! میرے بچوں کی تعداد تو تم یوں پوچھ رہی ہو جیسے کوئی دکاندار بکری گن رہا ہو۔ کاش! تم اس کی بجائے یہ پوچھتیں کہ ان سردیوں میں تم نے کتنے گولے خریدے، کس بھاؤ آئے اور اس بھاؤ سے تمہاری کرکتے! اچھے اور مہنگا گھی؟ سابقہ گلابی ہونٹوں کے پیچھے چھپا ہوا منہ تو کھول کر دکھاؤ کہ تمہارے دانتوں کی آب و تاب کیسی ہے؟"

[illegible] ہونٹ کرنے نہیں، مزید کچھ نہ کہے۔ میں پھر نہ آؤں گا۔ زخمی پرندے کی طرح [illegible] مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ یہ بھی ہونٹوں کی ایک ادا ہے۔ میں چاہتے ہوئے بھی یہ سوال اوشا سے کیوں نہ کیا۔ دوستی کے ذکر سے کیوں نہ پوچھا جس کی رپورٹ زیادہ واضح اور زیادہ [illegible] ہوتی کہ اوشا کے کتنے موتیوں کو پاتے رہا [illegible] جہاں سے آئی تھیں واپس چلی گئیں اور پھر اوشا اگر یہی سوال مجھ سے کرتی تو کیا میں کہہ [illegible] کر اپنی رہی سہی عزت کو محفوظ کر لیتا۔

میری مسکراہٹ ختم ہو گئی۔ کتنی جلدی ختم ہو جاتی ہے مسکراہٹ۔ کتنا آسان ہو گیا ہے اپنے جذبے کو مارنا۔ شاید میں اب سیانا ہو گیا ہوں۔ کیا فائدہ زیادہ دیر تک مشتعل رہنے کا۔ اوشا کو دیکھو۔ کتنی ساکت و صامت کھڑی ہے جیسے لاش۔ جیسے میرے اور اس کے دونوں کے جذبے کی لاش۔ اسے تو علم ہی نہیں ہوا کہ میں پھر مسکرایا ہوں گا۔

مزید ایک منٹ تک خاموشی طاری رہی۔

لیکن اب ہم دونوں کیوں کھڑے ہیں۔ ہمارے پاس تو کوئی موضوع ہی نہیں رہا۔ کیا ہم ایک دوسرے سے کہہ دیں کہ آؤ اپنا اپنا راستہ ناپیں۔

"اوشا!" میرے منہ سے نکلا۔ آواز میں تھرتھری تو اب بھی موجود ہے۔ یہ کیسی تھرتھری ہے۔

"کہو" یہ تھرتھری ادھر بھی موجود تھی۔

"آؤ، ایک بار پھر ایک دوسرے سے پیار کریں"

اوشا کا چہرہ ایک دم لال ہو جانا چاہئے تھا۔ نہیں ہوا۔ جھریوں میں لال ہو جانے کی خو نہیں ہوتی۔ وہ بولی "مذاق کی عادت ابھی تک نہیں گئی۔ تم نے یہ کہتے ہوئے کچھ نہیں سوچا کہ مہنگائی کتنی بڑھ رہی ہے اور میرا بڑا لڑکا ٹیوشن رکھوانے کے باوجود سالانہ امتحان میں فیل ہو گیا ہے اور میں مندر کی طرف جا رہی ہوں تاکہ بھگوان سے اس کی کامیابی کی پرارتھنا کر سکوں"

یہ بھگوان بیچ میں کہاں آ ٹپکا۔ کیا محبت کا انجام مندر ہے۔ کیا یہ بھگوان کی مرضی تھی کہ ٹیکسٹائل ملیں کپڑے کے ریٹ بڑھا دیں اور اوشا کا لڑکا امتحان میں فیل ہو جائے۔ میں نے سوچا جب تک بھگوان موجود ہے، اوشا میرے ساتھ بیٹھ کر چائے کا کپ نہیں پی سکتی۔ کاش! بھگوان اتنا فراخ دل ہو جائے کہ اوشا کو مندر جانے کی بجائے ریستوران میں جانے کی اجازت دے دے۔ مگر ہائے! بھگوان نے تو ہمارے پیار کو مذاق کی دردناک منزل تک پہنچا دیا ہے۔ اس سے کسی معقول بات کی توقع فضول ہے۔ وہ تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ اوشا کے لڑکے کو امتحان میں کبھی [illegible] کرے کبھی پاس کرے اور اوشا کے دل میں [illegible] کہ سیمنٹ اگر بلیک میں ملتی ہے تو فوراً خرید لو۔ شاید [illegible]

بتا بند ہو جائے۔ پیار کا جذبہ سیمنٹ کی [illegible] دو بولوں سے زیادہ اہم ہے۔

میرے خیال میں اب [illegible]

"اوشا!" (تم بھی جاؤ، بھاگ جاؤ۔ [illegible]) کہہ سکا۔ اوشا (زمانہ گزرا) [illegible] جذباتی لڑکی تھی [illegible]

"کہو" ([illegible])

"[illegible] میں چاہتا ہوں [illegible] کہوں [illegible] چھپی ہوئی تھی۔ کیا یہ ابھی مری نہیں تھی۔ "کیوں اوشا! ہماری عینک کے [illegible] ہیں، میری عینک کی [illegible] والی آنکھوں کو دیکھ سکتی ہو؟"

جواب میں پھر [illegible] کورا پن "تم نے عینک کب لگوائی تھی؟ کیا نرگس کے شیشے تھے، کتنے میں آئے تھے؟"

ساڑی کا بارڈر، نرگس کے شیشے، باوائی کرائری یہ سب کیا ہے [illegible] اوشا جان بوجھ کر میرے دل پر ان اشیا کا بوجھ پھینکے جا رہی ہے۔ کیا میں [illegible] کے مطلع مقطع، صوفہ، کرایہ مکان اور اسٹیشنری کا انبار ڈال دوں؟ تو پھر کس [illegible] جو کالی کالی راتوں میں شاعر کی غزل کے مصرعے بن کر چمکے ہیں۔ اوشا [illegible] کوئی حق نہیں کہ ہم اپنے دلنواز ماضی کے رومانس کو گدلا کریں۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم خاموش رہیں۔ خاموشی کے وسیع و عریض جنگل میں کھو جائیں [illegible] جنگل میں بھٹکتے پھرنے کے ایک دوسرے کے قریب نہ آسکیں۔

میں نے دل کڑا کر لیا اور منہ پھیر کر ایک طرف چل پڑا۔

اوشا کھڑی رہی۔ سوچتی رہی۔ [illegible] منہ پھیر کر ایک طرف [illegible] تھا۔ کیا اس کے دل میں میری اس سنگدلانہ حرکت پر کوئی آنسو تڑپا ہوگا؟

میرے قدم رک گئے کیونکہ آنسو کی آواز [illegible] اوشا [illegible] کیوں نہیں جاتی۔ چلی جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ یہ خشک [illegible] جان لے لے گی۔ مگر نہیں۔ اگر یہی کشمکش اوشا کے دل میں بھی [illegible] تو پھر ۔۔۔!

میرے قدموں کے رکتے ہی اوشا نے شاید منہ پھیر لیا [illegible] اور آنکھ [illegible] ادا تھی (اوشا ایسی اداؤں کی پرانی عادی تھی) [illegible] لیکن اس کے ہاتھ میں تو سبزی سے بھری ہوئی ٹوکری تھی ——— [illegible] بچوں کے لئے کھانا پکانے جا رہی ہے۔ سبزی کی ٹوکری کے ساتھ حسین ادائیں نہیں کی جا سکتیں۔

واپس [illegible] کیا کروں؟

اوشا نے شاید منہ پھیر کر ایک منٹ انتظار کیا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"...شاہ"

"...ممتاز"

"میری محبوبہ تصویر:"

لیکن وہ تو دور رہ چکی تھی! وہ بکلی کی کاغذ سی میری طرف بڑھی اور بے حد تیزی سے پھر میرے چہرے پر چھا گئی۔ زلفوں کی بھاری بھاری خوشبو۔ بیس سال پہلے والی خوشبو، آنسوؤں سے بھیگی ہوئی خوشبو۔ جیسے کروڑوں آنسو آدھے منٹ میں بہہ گئے اور پھر ایک دم جانے کیا ہوا۔ اس نے جلدی سے اپنا سر ہٹا لیا۔ بھرے بازار کا تقدس ایسی باتوں کا روادار نہیں ہوتا۔ اس تقدس کے ہاتھوں سے ہم نے صرف ایک چھوٹا سا لمحہ چھین لیا تھا۔ لو پھر مڑ گیا بازار پھر سے اٹھا اور وہ اپنے منی بیگ میں سے ایک وزٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولی: "یہ ہمارا ایڈریس ہے۔"

اور پھر وہ تنہا، تیز تیز قدموں سے چلی گئی اور بازار کے ہجوم میں کھو گئی۔

کیا مجھے بھی بازار کی بھیڑ میں کھو جانا چاہئے؟ مگر ابھی ابھی جو لمحہ مجھ پر گزرا ہے، بازار کا ہجوم کچھ کم نہ ہوا ہے تو وہ کھو جائے گا۔

میں نے بازار کی بھیڑ میں کھو جانے سے پہلے دونوں کاغذ اور وزٹنگ کارڈ پرزے پرزے کر کے پھینک دیا۔

خورروزی نوٹ:- دراصل مجھ کو کوئی لڑکی بازار میں نہیں ملی تھی۔ بیس سال پہلے میں نے کسی لڑکی سے عشق نہیں کیا تھا۔ کسی لڑکی نے مجھے لو لیٹرز نہیں لکھے تھے۔ کسی نے مجھے وزٹنگ کارڈ نہیں دیا تھا۔ میں نے تو یہ سب کچھ صرف اس لئے لکھ دیا کہ مجھے الٹی پلٹی باتیں کرنے کا چسکا ہے، تخیل کا چسکہ!!

# نیلگوں شعلے

بال کرشن ودگل

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اکسائز کسٹم اینڈ سنٹرل اکسائز۔ روہتک (پنجاب)

۱۱ر اگست ۶۶ء

محترم خوشتر صاحب! آداب

. . . دہلی کی خاک کے نیچے بہت سے افسانے دفن ہیں۔ اُن میں سے ایک "نیلگوں شعلے" ہے ــــــ امید ہے آپ اسے "بیسویں صدی" میں ضرور جگہ دیں گے . . .

ــــــ بال کرشن ودگل

ماسٹر جی کو محسوس ہوا جیسے اِس سرد اور بے جان نیلی گوند میں زندگی عود کر آئی ہے اور اس میں یکایک حرارت پیدا ہو گئی ہے جو ہر لحظہ بڑھتی چلی جا رہی ہے جیسے یہ نرم نرم، ملائم نیلی گوند نہ ہو، دہکتا ہوا انگارہ ہو!

انھوں نے ہاتھ جھٹک کر اُس انگارے کو پرے پھینک دیا۔

یہ قصہ ماسٹر امرناتھ جی کی زندگی کے گرد گھومتا ہے جو پچیس تیس برس پہلے دہلی میں مقیم تھے اور ایک پرائمری سکول میں ماسٹر تھے۔ ایک ہر دلعزیز معلّم۔ وہ اپنے کام میں یکتا تھے اور اپنے مضامین کو اتنا دلنشین بنا دیتے تھے کہ طالب علم بڑے اشتیاق سے کلاس میں بیٹھتے۔ ماسٹر جی اپنے طالب علموں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے اور مار پیٹ سے گریز کرتے تھے اور ایک حسّاس دل رکھتے تھے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب بھی اُن سے مرعوب تھے اور انسپکٹر سکول بھی۔

لیکن، ان کی اقتصادی حالت نہایت غیر اطمینان بخش تھی، کیونکہ وہ ٹیچر تھے اور وہ بھی پرائمری سکول کے!

ایک روز وہ گھر لوٹ رہے تھے۔ اُنھوں نے دیکھا دریا گنج میں بہت بھیڑ ہے۔ ایک جلوس نعرے بلند کرتا ہوا بازار سے گزر رہا ہے۔ ماسٹر جی کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا اور وہ بھی جلوس کے ساتھ پکار اُٹھے: "زندہ باد!"

تانگے پر سوار ایک لیڈر بازو ہلا ہلا کر چلّا رہا تھا

"انقلاب!"

اور جواب میں مجمع پکار اُٹھتا: "زندہ باد!"

"مہاتما گاندھی!"

"زندہ باد!"

اور ہجوم فلک شگاف نعرے بلند کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

ماسٹر جی کا جی چاہا وہ بھی اچھل کر تانگے پر چڑھ جائیں [illegible] تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیں جسے سن کر اہلِ وطن جوش میں آجائیں اور [illegible] دُم دبا کر انگلستان کو بھاگ جائیں۔ حب الوطنی کے جذبے نے جوش مارا اور وہ [illegible] سے تانگے کی جانب لپکے لیکن دفعتاً جیسے کسی غیبی طاقت نے ان کے پاؤں جکڑ لیے۔ انھیں اِس حقیقت کا شدت سے احساس ہونے لگا کہ وہ ایک [illegible] کے مانند آزاد نہیں ہیں۔ ان کے نحیف کاندھوں پر کئی انسانی زندگیوں کا بوجھ ہے جن میں ان کی بوڑھی ماں، بیوی اور دو بچے شامل ہیں۔ اِس بوجھ سے اُن کے کاندھے دُکھنے لگے اور وہ سوچنے لگے ــــــ کاش! میں ایسا کر سکتا!

اور اپنے دیش کی غلامی کا خیال کانٹا بن کر اُن کے دل میں چبھنے لگا [illegible] اور اُداس ہو گئے۔ مگر ایک دوسرے خیال نے اُن کی ہمت بندھائی۔

الحمد! میں تو ہر لحظہ ملک اور قوم کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ [illegible] سے جاہل لوگ بیرسٹر اور انجینئر اور نہ جانے کیا کیا بن جاتے ہیں اور تعلیم کی ترویج کا کام سارے کاموں سے زیادہ نیک اور پاکیزہ ہے۔ ہم لوگ نہ ہوتے تو ملک [illegible] مذاق اور یہ لیڈر اِس مقام تک نہ پہنچ سکتے۔ ہم لوگ نہ ہوتے تو [illegible] ہم ہی لوگوں نے تو اِن لیڈروں کو لیڈر بننے کے قابل بنایا ہے۔ ہم [illegible] کی وجہ سے وطن ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔

اِس خیال نے انھیں ذہنی تقویت دی اور [illegible]

[illegible]

گرے ہوئے اوراق کا ڈھیر تھا جیسے [illegible] کتابوں کی تصویر بنا بیٹھا

[illegible] جیسے [illegible] کر دیا گیا ہو۔

انھوں نے جھک کر [illegible] اٹھا لیا۔ [illegible] اور اندر سے گئے اور دل

[illegible] ——— چار دو جلدوں کے درمیان [illegible] گرفتاری

[illegible] بچے کے سر پر ہاتھ پھیر سکتا ہوں۔ مشتاق [illegible] کیوں بیٹے؟ انھوں نے

پچکار کر پوچھا۔

لیکن یہ صرف پچکار کر یہ مسئلہ حل نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے وہ شدت سے اس پر غور کرنے لگے ——— دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ مہنگائی روز بروز [illegible] تھی۔ اخراجات بڑھ رہے تھے اور آمدنی گھٹ کر [illegible] کی مانند کمزور تھی!

وہ سوچ میں مستغرق تھے۔ کچھ کئے بغیر چارہ نہیں تھا لیکن کیا کیا جائے؟ انھوں نے بچپن میں شغل کے طور پر جلد سازی کا کام سیکھا تھا۔ اب انھوں نے فیصلہ کیا کہ فاضل وقت میں جلد سازی کی جائے جس میں گھر کے دو بچے بھی مدد دے سکتے ہیں۔

اور جلد سازی کا کام ماسٹر جی کے گھر میں شروع ہو گیا۔

ایک روز ماسٹر جی کتاب میں آنکھیں گڑوتے ہوئے زور زور سے ہنسنے لگے۔ وہ برابر ہنستے چلے جاتے تھے اور ہنستے ہنستے خود ہی پکار اٹھے۔

"واہ بھئی لطف آگیا! زندگی بھی کیا عجیب شے ہے۔"

تب ان کی پلکوں پر آنسو لرزنے لگے۔

جن کتابوں پر ماسٹر جی کو عبور حاصل تھا اور جن کے کئی صفحات انھیں ازبر تھے ان کتابوں پر زمانے کی گردش اب ان سے جلدیں بندھواتی تھی!

لیکن جلد سازی سے کچھ آمدنی بڑھی۔ ان کی زندگی کسی قدر آسودہ ہو گئی۔

مگر تمام اشیا کا بھاؤ دن بدن چڑھ رہا تھا اور گوند کی ایک مد کافی مہنگی ہو گئی، جس نے ان کا منافع کم کر دیا۔

---

ایک روز وہ سکول سے لوٹ رہے تھے۔ راستے میں ان کی نظر ایک رنگ ساز کے ساز و سامان پر پڑی۔ رنگ ساز پگڑیاں اور دوپٹے رنگ چکا تھا۔ رنگے ہوئے کپڑے اوپر بجلی کے تاروں پر سوکھ چکے تھے اور اب ایک لمبے بانس کی مدد سے وہ انھیں اتار رہا تھا۔

ماسٹر جی یہاں رک گئے۔

رنگ ساز ان سے شناسا تھا۔ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا: "فرمایئے صاحب"

کرتی کیا ہو ... [illegible] کیا؟"

"نہیں بھئی۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ... کیا تم ... کیا تم ..." ماسٹر جی رک گئے جیسے کسی حسینہ سے اظہارِ محبت کی کوشش کر رہے ہوں۔

"ہاں ہاں، کہئے۔ ماسٹر جی رک کیوں گئے؟"

ماسٹر جی کی زبان جو کلاس میں روانی سے چلتی تھی اب رک رک کر چل رہی تھی۔

"کیا تم مجھے اس مٹی کے پیالے سے لسی دے سکتے ہو؟"

رنگ ساز اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اور اس کی ہنسی جیسے کہہ رہی ہو۔

"ارے صاحب، اتنی سی بات کے لئے اس قدر حجاب!"

اور اس نے کہا: "آپ لے جایئے جس قدر ضرورت ہو!"

"اس کے کتنے دام ہوں گے؟"

"آپ سے پیسے نہ لوں گا۔ ویسے بھی مجھے اس کی چنداں ضرورت نہیں لیکن آپ کریں گے کیا؟"

"کچھ بھی کروں۔ مجھے ضرورت ہے۔"

رنگ ساز نے لسی کا پیالہ ماسٹر جی کی طرف بڑھا دیا۔

ماسٹر جی نے جیب سے اخبار کا ایک ورق نکالا اور اس میں لسی نکال لی اور گھر کی راہ لی۔ آج وہ بے حد خوش تھے جیسے خزانہ پا لیا ہو۔

اب ان کے گھر میں یہ نیلی گوند مفت پہنچ جاتی تھی۔ بچے رنگ ساز سے لے آتے تھے۔ منافع معقول ہو جاتا تھا۔

---

اُدھر کانگریس نے "انگریزو! ہندوستان سے نکل جاؤ!" کا نیا نعرہ ۱۹۴۲ء میں بلند کیا جس سے ملک بھر میں گرفتاریوں کا دَور دَورہ شروع ہو گیا۔ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، سردار پٹیل اور دوسرے بڑے اور چھوٹے رہنماؤں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ اس سلسلے کا آغاز تو نظر آ رہا تھا، انجام دکھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ ہر روز نت نئے رہنما نمودار ہو جاتے۔ اشتعال انگیز تقریریں ہوتیں اور ملک بھر کے جیل خانے آزادی کے پروانوں سے بھر گئے۔

دہلی کے دریا گنج بازار سے ایک جلوس گزر رہا تھا۔ پولیس کے افسر اور سپاہی کافی تعداد میں موجود تھے۔ لیڈر بے خوفی سے اپنی مکمل آزادی کے حق میں جوشیلی تقریریں اُگل رہے تھے۔ بازار کے دونوں طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ بازار کے اوپر دکانوں اور دفاتر اور ہوٹلوں کی کھڑکیوں سے لوگ اپنے ہم وطنوں کی گرفتاری کا منظر دیکھ رہے تھے۔

ماسٹر جی اور ان کا بڑا لڑکا بھی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

بڑے لڑکے نے پوچھا: "پتا جی! پولیس انھیں گرفتار کیوں کرتی ہے؟"

ماسٹر جی نے سمجھایا: "یہ آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں جو انگریز [illegible]

نہیں [illegible] لیتے ہوئے۔"

"مگر پتا جی، یہاں تو اس وقت ایک بھی انگریز [illegible]"

"یہی تو دکھ کی بات ہے کہ اس کی نمبر [illegible]

تاثر پایا جاتا ہے بیٹا۔ بجھت نظر تو نہیں آیا کرتے [illegible]"

"پتا جی! میرے دل میں بھی ایک [illegible] اُٹھی ہے [illegible] حکومت کے خلاف لڑنا چاہتا ہوں۔" لڑکے نے جوشیلے لہجے سے کہا۔

"بیٹا، تمہارا ابھی وقت نہیں آیا ... انگریزوں کی [illegible] خون کھول اُٹھتا ہے۔ جی چاہتا ہے، دو چار فرنگیوں کو قتل کر دوں۔ کئی مرتبہ میں [illegible] آگ میں کود جانا چاہا لیکن فرض کی زنجیروں نے ہر بار میرے قدم تھام لئے۔ اس آگ میں کود جانا کٹھن نہیں تھا مگر تب تمھیں زندہ رکھنا دشوار ہو جاتا۔ تمھاری دیکھ بھال [illegible] لازم تھی اور یہ بھی تو دیش کی خدمت ہے۔ یہ بڑے لیڈر بہت خوشحال اور [illegible] گھر کی فکر سے آزاد ہیں۔ اور اگر میں جیل چلا گیا تو نوکری تو چھوٹ ہی جائے گی [illegible] دیکھ بھال کون کرے گا۔ حکومت اگر ہنگامی حالات کی آڑ میں کانگریس کو [illegible] گرفتاریاں عمل میں لاتی ہے تو فی الحال دیکھتے جاؤ۔ مجبوری ہے۔ جذبات [illegible] بہتری اسی میں ہے کہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاؤ۔ اِدھر [illegible] جلدیں باندھتے جاؤ۔ اگر زندہ رہنا ہے تو یہ"

---

راجدھانی میں ایک دن پھر کانی گہما گہمی تھی۔ خبریں بھی ایسی ہی آ رہی تھیں۔ بمبئی کی ایک خبر کا بہت چرچا تھا۔ وہاں انگریزی سوٹ جلا دئے گئے تھے۔ بازار سے گزرتے ہوئے ایک انگریز کی ٹوپی، کوٹ اور پینٹ چھین کر نذرِ آتش کر دئے گئے اور اسے دھوتی پہنا دی گئی۔ وہ دھوتی لپیٹ کر رخصت ہونے کو غنیمت جان رہا تھا لیکن [illegible] نے اسے روک لیا اور حکم دیا: "بولو مہاتما گاندھی کی جے!"

انگریز خاموش رہا۔ تب اس نے ایک لڑکے کے [illegible] کا ہاتھ لیا۔ [illegible] سے کام لیا اور مہاتما گاندھی کی جے پکارتا ہوا اور ٹانگوں سے لپٹی دھوتی کو سنبھالتا ہوا بھاگ نکلا۔

دہلی کی دیواروں پر جا بجا اشتہار لگے ہوئے تھے: "انگریزو! ہندوستان سے نکل جاؤ!"

انگریز کپتان پولیس نے حکم دیا کہ پوسٹر [illegible] اور پوسٹر دیواروں سے پھاڑ کر پھینک دو۔ [illegible] تو انگریزوں کو ملک سے جانا ہی پڑے گا۔ دیواروں سے پوسٹر ہٹا [illegible]

پھر پوسٹر لگانے والا شخص دوسری جگہ پر چسپاں کرنے لگا۔
[illegible] سپاہیوں [illegible] لگے۔
سپاہی [illegible] پوسٹر [illegible]
[illegible] انجام
[illegible]

کیونکہ [illegible] ایک شخص [illegible] پوسٹر [illegible] دوسری [illegible] لگاتا
[illegible] پوسٹر [illegible]
[illegible] سپاہیوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔

ایک گیلا پوسٹر ابھی ابھی دیوار سے چپکا ہوا تھا۔
نیچے سڑک پر ایک شخص رومال میں کچھ چھپائے تیزی سے چلا جا رہا تھا۔
"ٹھہرو!" انہیں سپاہیوں نے روک لیا اور پوچھا۔
"کون ہو تم؟"
"میرا نام امرناتھ ہے۔"
"کون امرناتھ؟"
"پرائمری سکول کا ایک ماسٹر۔"
"یہ رومال میں کیا لئے جا رہے ہو؟"
"یہ لئی ہے۔"
"مگر تم لئے کیوں جا رہے ہو؟"
"آج گھر جانے میں دیر ہو گئی ہے اس لئے قدم تیزی سے بڑھا رہا ہوں۔"
"یہ لئی کیوں لئے جا رہے ہو؟"
"اس سے میں گھر میں جلدیں باندھنے کا کام کرتا ہوں کیونکہ میری قلیل تنخواہ میں گذران نہیں ہوتی۔ لئی سامنے رنگ ساز کی دوکان سے مفت لے جاتا ہوں اس سے کچھ بچت ہو جاتی ہے۔"
"اچھا! انصاف گھر آؤ... تم کانگریس کے رکن ہو؟"
"نہیں۔"
"یہ دیوار پر پوسٹر تم نے لگایا ہے؟"
"نہیں۔"
"کسی کو پوسٹر لگانے میں مدد دی ہے؟"
"نہیں۔"
اتنے میں کپتان پولیس بھی موقع پر پہنچ گئے۔ انہیں یہ داستان سنائی گئی۔
[illegible]

"یہ پوسٹر تم نے لگایا ہے؟"
"نہیں۔"
"تم جھوٹ بولتے ہو؟"
"میں نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"
ماسٹر جی نے کپتان کو حقیقت بتا دی۔ کپتان کچھ سوچنے لگا اور کہا: اچھا اس کا فیصلہ ہم ابھی کئے دیتے ہیں... پوسٹر لاؤ؟

دیوار سے اترا ہوا پوسٹر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ پوسٹر کی جانچ پڑتال کے بعد افسر نے حکم دیا: اس پوسٹر کی لئی ابھی نم دار ہے اور ویسی ہی لئی ماسٹر جی کے پاس رومال میں ہے اور ماسٹر جی پوسٹر کے نزدیک ہی پکڑے گئے ہیں۔ اس لئے پوسٹر لگانے میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔ سپاہیو! انہیں گرفتار کر لو اور حوالات میں رکھو۔ جن سپاہیوں نے انہیں پکڑا تھا انہیں ہم انعام دیں گے؟

ماسٹر جی رومال میں لپٹی ہوئی نیلی لئی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لئی نے کس قدر بھیانک فتنہ برپا کر دیا تھا!

ماسٹر جی نے کہا: صاحب! یہ لئی جلدیں باندھنے کے عمل میں صرف گھر کے اخراجات کو کم کرنے ہی میں معاون ثابت نہ ہوتی تھی بلکہ یہ لئی میری مفلسی سے تار تار زندگی کو بھی یکجان بناتی تھی۔

مگر کپتان صاحب نے توجہ نہ کی اور آگے بڑھ گئے۔

ماسٹر جی کو محسوس ہوا جیسے اس خشک بے جان لئی میں زندگی عود کر آئی ہے۔ اس لئی میں یکایک حرارت پیدا ہو گئی ہے جو ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے۔ جیسے یہ نرم نرم ملائم نیلی لئی نہ ہو، دہکتا ہوا انگارہ ہو! ان کے ہاتھ نیلے شعلوں کی آنچ سے جلنے لگے اور انہوں نے ہاتھ جھٹک کر رومال میں لپٹے ہوئے انگارے کو پرے پھینک دیا۔ ایسا نہ ہو ان کے ہاتھ جل جائیں۔

ایک سپاہی نے لپک کر رومال میں لپٹی لئی کو اٹھا لیا اور بڑے صاحب سے جا کر رپورٹ کی: "حضور! ملزم ثبوت کو تلف کرنے کی کوشش کر رہا تھا!"

---

# سالنامہ دیکھا

## اہلِ قلم حضرات کی رائیں

... سالنامہ بہت خوب ہے۔ ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔ نظرِ بد دُور . . .

کرشن چندر (بمبئی)

---

... آپ جاذبِ نظر اور دلکش سالنامے شائع کرنے کے فن میں کمال رکھتے ہیں۔
موجودہ سالنامہ اپنی جمالیاتی کشش کے لحاظ سے "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" کا مصداق ہے . . .

(ڈاکٹر) منوہر سہائے انور (نئی دہلی)

---

... اس بار آپ نے بےحد خوبصورت، حسین اور جاذبِ نظر سالنامہ نکالا ہے۔
چوٹی کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کی تخلیقات کو بڑے دلفریب انداز میں پیش کیا ہے۔
ادیبوں کی تصویروں سے رسالے میں سنجیدگی کا اضافہ ہوتا ہے۔ میری رائے میں
"بیسویں صدی" ہندوستان اور پاکستان کا پہلا رسالہ ہے جو ادبی ہستیوں کو باتصویر
پیش کرنے میں سب سے آگے ہے . . .

مہندر ناتھ (بمبئی)

---

... سالنامہ کیا ہے رنگ و نور، کیف و سرور کی دنیا ہے۔ "بیسویں صدی" کا
یہ سالنامہ دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے۔ اُردو ختم ہو رہی ہے۔ اُردو ختم ہو سکتی ہے!! ——
یوں تو سالنامہ کی ہر تخلیق تحسین طلب ہے لیکن حسن اجمل مسرت کی تحریر "سب کا محسن
سب کا دوست" سب سے زیادہ تاثر انگیز ہے . . .

آسی رام نگری (مغل سرائے)

---

... اس مرتبہ سالنامہ اپنی گزشتہ روایات سے کئی لحاظ سے آگے ہے ——
کرشن چندر نے بہت مدت کے بعد اب کے ایک بہت ہی اچھی کہانی دی ہے۔ ایک ہی نام
کے دو کرداروں کو مختلف سماجی خانوں میں پیش کر کے طبقاتی تضاد کے المیے کو اور بھی
گہرا کر دیا ہے۔ یہ کہانی کرشن چندر ہی لکھ سکتے تھے۔ گزشتہ تیس برس سے ظلم، ناانصافی،
نابرابری اور بربریت کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ جوگندر پال، مہندر ناتھ اور کوثر چاندپوری
کی کہانیاں بھی بہت پسند آئیں۔ علم و ادب کے میدان میں کوثر صاحب اس عمر میں بھی جوانوں
کی طرح ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر سچ خوشی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ادب میں طبابت اور
جراحت کا حق بھی بڑی خوبی سے ادا کر جاتے ہیں۔

رام لعل (لکھنؤ)

---

... حسنِ ترتیب اور رنگ تخلیق کا [illegible]
آدمی دنیا سے "رنگ و بُو" میں کھو جاتا ہے۔ میں [illegible]
—— کرشن چندر کا افسانہ سالنامے کی جان ہے۔ [illegible]
کی کہانیاں بھی خوب ہیں —— سالنامے میں چند [illegible]
"چھوٹے ناموں" کی بڑی کہانیاں بھی شامل ہیں اور آپ کی ترتیب نے [illegible] کر دیا
ہے کہ آپ کو بڑی اور چھوٹی کہانی کی کتنی شدید پہچان ہے۔ اُردو کو آپ کی [illegible] اور
واجب طور پر ہے . . .

[illegible] ناتھ ([illegible])

---

... سالنامہ ہمیشہ کی طرح آپ کے ذوقِ انتخاب کا [illegible]
ہے۔ مجھے سلمیٰ صدیقی، حامدی کشمیری اور رضا الجبار کے افسانے [illegible] پسند آئے۔
تینوں افسانے تاثر، روانی اور شگفتگی کے مظہر ہیں! —— خدا آپ کا شفیق و
مہربان سایہ ہم پر تادیر قائم رکھے۔ آپ سے ہمارے [illegible] اور اُردو کی
آن باقی ہے! . . .

عشرت [illegible] (حیدرآباد)

---

... سالنامہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ کس کس تخلیق کی تعریف کروں۔
سالنامہ خوب سے خوب تر ہے . . .

[illegible]

---

... سالنامہ رنگ و نور، کیف و سرور کی ایک [illegible]
آپ بھارت میں اُردو کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ میں [illegible]
کر رہا ہوں۔ مجھے سفر کا بہت اچھا ساتھی مل گیا . . .

نازش [illegible] ([illegible])

---

... بلند پایہ شعری و نثری تخلیقات سے مزین۔ بعض [illegible] خوب
ہیں اور سخت سے سخت انتخاب میں شریک ہونے کے لائق ہیں۔ آپ کے [illegible]
کا کیا کہنا۔ فکر تونسوی کی "[illegible]" [illegible]
ہوتے ہے . . .

[illegible]




زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

## ۱ ● امرود ـــــ مفید نمکیات کا خزانہ!

امرود ایک سستا پھل ہے۔ لیکن فوائد کے اعتبار سے خاصا قیمتی ہے۔ اس کا مزاج سرد تر ہے۔ کھانے سے پہلے کھائیں تو قبض پیدا کرتا ہے۔ کھانے کے فوراً بعد کھائیں تو قبض کشا ہے۔ معدہ کو طاقت دیتا ہے۔ کھانے سے بھوک بڑھتی ہے۔ کھانے کے ساتھ یا فوراً بعد کھانے سے ہاضمہ میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کھانے سے پہلے استعمال کریں تو بھوک مر جاتی ہے۔ امرود اور اس کے بیج پیٹ اور آنتوں کی صفائی کے لئے بہت مفید ہیں جنھیں قبض کی شکایت رہتی ہو، وہ امرود کا استعمال کریں۔ آپ جانتے ہیں قبض تمام بیماریوں کی جڑ ہے اور پیٹ کی خرابی ہی سے بے شمار امراض لاحق ہوتے ہیں۔

امرود بدن کی پرورش کرنے اور اسے طاقت دینے والے پھلوں میں سے ہے۔ اس میں فولاد، پروٹین، اجزائے شکریہ، وٹامنیہ اور جسم کے لئے مفید نمکیات پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مفرح اور مقوی قلب بھی ہے۔

امرود اپنی سرد تاثیر کی وجہ سے پیاس اور صفرا کو زائل کرتا ہے۔ دل و دماغ اور معدے کو طاقت بخشتا ہے۔ پھیپھڑے کو طاقت ور بنانے کی بڑی قوت رکھتا ہے۔ امرود کھانے سے بھوک بڑھتی ہے۔

دماغ کے اعصاب کو قوت بہم پہنچاتا ہے۔ ذہنی پریشانیوں سے نجات پانے کے لئے امرود بے حد مفید پھل ہے۔ چنانچہ امرود پاگل پن کی اچھی خاصی دوا ہے۔ پاگل خانوں میں مریضوں کو کھلائے جاتے ہیں ـــــ امرود خونی بواسیر میں بہت مفید اور نافع ہے۔ البتہ ریاح پیدا کرتا ہے۔ نمک اور سیاہ مرچ کے ساتھ کھائیں تو مضرت کم ہو جاتی ہے۔

یہ ہندوستان ہی میں نہیں، یورپ میں بھی شوق سے کھایا جاتا ہے۔ یورپ والے اس کی جیلی بنا کر کھاتے ہیں۔ جو بہت خوش ذائقہ ہوتی ہے۔

## ۲ ● نفرت کی آگ

ایک مفکر نے کہا ہے ـــــ تم اپنا دامن مسرت کے پھولوں سے بھرنا چاہتے ہو تو کسی سے نفرت نہ کرو۔ ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ـــــ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا ـــــ اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرو ـــــ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا تھا تو وہ صرف اخلاقیات ہی کا درس نہیں دے رہے تھے۔ انھوں نے بیسویں صدی کی طب کی بھی تشریح فرما دی تھی۔ جب آپ نے فرمایا کہ دشمن سے بھی درگزر سے کام لو تو ہمیں بتا رہے تھے کہ خون کے دباؤ، امراض قلب، معدے کے زخم اور بہت سی بیماریوں سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔

جب حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرو۔ وہ یہ بھی بتا رہے تھے، ہم اپنی صورتوں کو کس طرح دلکش بنا سکتے ہیں۔ آپ ایسی عورتوں کو جانتے ہوں گے جن کے چہروں پر نفرت کی وجہ سے جھریاں پڑ گئی ہیں۔ غصے نے ان کی صورتیں بگاڑ دی ہیں۔ دنیا کا کوئی علاج ان کے حسن میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ درگزر کرنے والے، محبت سے معمور اور نیکی سے لبریز قلب سے ممکن ہے۔

نفرت کی وجہ سے ہم کھانے سے بھی پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

اگر ہمارے دشمنوں کو یہ معلوم ہو کہ ان سے ہماری نفرت خود ہمیں چوس رہی ہے، ہماری قوتیں سلب کر رہی ہے، ہمیں اعصاب زدہ بنا رہی ہے، ہماری صورت بگاڑ رہی ہے، ہمیں اختلاج قلب میں مبتلا کر رہی ہے اور شاید ہماری زندگی

بھی گنہگار رہی ہے، تو کیا وہ خوش نہ ہوں گے؟ ——— اگر ہم اپنے دشمنوں سے محبت نہیں کر سکتے، تو ہمیں خود اپنے سے تو محبت کرنی چاہئے تاکہ نفرت کی آگ جلا کر ہمیں خاکستر نہ بنا ڈالے!!

## ۳ • تفکرات اور پریشانیوں سے بچئے

آج جبکہ انسان کی زندگی تفکرات اور پریشانیوں کی آماجگاہ بن گئی ہے، یہ کہنا کہ تفکرات اور پریشانیوں سے بچئے کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تفکرات اور پریشانیوں سے کوئی اُلجھا ہوا مسئلہ حل نہیں ہوتا، بلکہ اور اُلجھ جاتا ہے۔ کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی، مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ تفکرات اور پریشانیاں بڑھ کر ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث بن جاتی ہیں۔

ڈاکٹر کارل مننگر نے تفکرات اور پریشانیوں کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے۔ "انسان اپنا دشمن آپ"۔ ڈاکٹر موصوف کی یہ کتاب ان حیرت انگیز حقائق کا انکشاف کرتی ہے، جب آپ مہلک جذبات کو اپنی زندگی پر غالب آنے دیتے ہیں۔ اُس وقت آپ اپنے ساتھ کیا دشمنی برت رہے ہوتے ہیں۔

ایک دوسرے ڈاکٹر نے لکھا ہے ——— علمِ طب نے جسمانی جراثیم سے پیدا ہونے والی خوفناک بیماریوں ——— چیچک، ہیضہ، زرد بخار اور ہزاروں دوسرے امراض کا جو ہر سال لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے تھے، کافی حد تک قلع قمع کر دیا ہے لیکن علمِ طب اُن جسمانی اور دماغی امراض کا علاج کرنے سے قاصر ہے جو جراثیم سے نہیں، ڈر، خوف، نفرت، شکست، مایوسی، فکر اور پریشانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان جذباتی بیماریوں کے سانحات میں نہایت خوفناک رفتار سے روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

تفکرات سے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ تفکرات گٹھیے کی علّت بنا سکتے ہیں۔ تفکرات کا معدے پر سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔

پریشانیاں اور تفکرات قطرہ قطرہ پانی ٹپکنے کے مانند ہیں۔ پریشانیوں کی مسلسل ٹپ ٹپ ٹپ انسانوں کو جنون اور خودکشی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

## ۴ • کیا آپ خوش رہنا چاہتے ہیں؟

ماہرِ عمرانیات جسٹس ٹی۔ لینڈ کے تجربات سے واضح ہوتا ہے کہ لوگ ایسے وقت میں سب سے زیادہ مائل بہ مسرت ہوتے ہیں، جو ان کا مصروف ترین وقت ہوتا ہے۔ دوسرے مشاہدات سے یہ بات بار بار پایۂ تحقیق کو پہنچتی ہے کہ لوگ بڑے ارمان سے ایسے وقت کا انتظار کرتے ہیں، جب وہ موجودہ کام سے سبکدوش ہو سکیں گے یا اُن کی زندگی میں زیادہ سہولتیں پیدا ہو جائیں گی یا جب وہ اپنی زندگی کے [illegible] ہو سکیں گے۔ لیکن اُن کی مُراد پوری ہو جانے کے بعد [illegible] ہوتے ہیں اور اکثر آدمیوں کے لئے فراغت انبساط کا سبب [illegible] اور بے اطمینانی کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ اُن کا سینہ اُن [illegible] جاتا ہے جو اُن کی زندگی کی روح تھیں۔ مشاہدات [illegible] لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے پاس کم سے کم فاضل وقت ہوتا [illegible] میں برابر اُلجھے رہتے ہیں اور مصروف زندگی بسر کرتے ہیں۔

بیسویں صدی دہلی

## ۵ • پرول ——— ایک مفید سبزی

کبھی یہ غیر معروف ترکاری تھی۔ اب مشہور ترکاری ہے۔ کچھ اطباء کے نزدیک اس کا مزاج گرم و تر ہے۔ بعض کے نزدیک معتدل ہے۔

یہ ترکاری زود ہضم بلکہ کسی قدر ملیّن تاثیر رکھتی ہے۔ مقوی دل و دماغ اور اشتہا آور ہے۔ پرول صحت مند لوگوں کے لئے لذیذ سبزی اور بیماروں کے لئے زود ہضم اور صحت بخش ہیں۔ ضعفِ معدہ، جنون و مالیخولیا۔ کئی خون میں خصوصیت سے مفید ہیں۔ پیٹ کے کیڑوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ خون اور ہضم کی شکایات میں فائدہ مند ہیں۔ ڈاکٹر کمزور مریضوں کو ان کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔ دل اور معدہ کو طاقت بخشتے ہیں۔ مقوّیِ باہ ہیں۔ مادّہ تولید پیدا کرتے ہیں۔ صفرا کی گرمی کو دُور کرتے ہیں۔

دوسری ترکاریوں کی طرح سُرخ مرچ اور تیز مسالے پرول کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے سرخ مرچ کے بجائے سیاہ مرچ استعمال کرنی چاہئے۔

## ۶ • یقین کی شمع

مشہور مفکر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے ...... "دُنیا کی عظیم ترین شے یقین ہے۔ آپ اسے محسوس کریں یا نہ کریں، لیکن آپ کی روزمرہ کی زندگی اور عمل کا بنیادی محرک یقین ہی ہے۔ اس بات میں یقین کہ آپ کے موٹر کا اسٹارٹر کام کرے گا۔ اس بات میں یقین کہ گاڑی وقت پر پہنچے گی۔ ...... آپ کے یقین کا یہ دائرہ بہت وسیع ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ آپ احباب و اعزّہ کے ساتھ مخلص ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھوں سے یقین کا دامن چھوٹ جائے تو زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

کوئی ہمالیہ اور آپ کے اندر سے یقین اور اعتماد کی قوّت [illegible] سکتا۔ یقین ہمیشہ آپ کے انتظار میں ہے کہ آپ اسے اپنا لیں۔ [illegible] خواہش کی معجز نما قوتیں آج ہی سے آپ کو اپنا کرشمہ دکھانے لگیں گی [illegible]

[illegible] مشکلات کو حل کر سکتی ہے۔
[illegible] اگر آپ اسی طرح [illegible] ہو ——— آپ کے ذہن [illegible] زندگی [illegible] کا باعث بن سکتی ہے۔
[illegible] تو آپ [illegible] جب آپ اپنے اندر [illegible] کو [illegible] گے۔

وہ [illegible] ہمیشہ اپنے اندر یقین کی شمع روشن رکھتے۔ یقین کی شمع بجھنے نہ دیجئے، ورنہ اندھیرا اور گہرا ہو جائے گا۔

## ۷• طویل عمر کا راز

ایسا کون انسان ہوگا جو زیادہ سے زیادہ دنوں تک جینا نہ چاہتا ہو۔ آپ بھی یقیناً زیادہ سے زیادہ دنوں تک جینا چاہتے ہوں گے۔ آیئے آپ کو طویل عمر کا راز بتائیں ———

آپ زیادہ سے زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہتے ہیں تو خوش طبعی کو اپنا شعار بنایئے۔ اور ہمیشہ رنج و غم سے اپنی زندگی کا دامن بچایئے۔ فکرِ فردا میں نہ گھلئے۔ فیاضی، دوستی، محبت و انسانیت، خوش طبعی و شگفتہ مزاجی، قناعت و استغنا کو اپنا دستور العمل بنایئے۔ چڑچڑی اور مغموم طبیعتیں زندگی کے بوجھ سے دب جاتی ہیں۔ انھیں درازیٔ عمر نصیب نہیں ہوتی۔ جو لوگ اپنی توانائی کو کثرتِ مطالعہ میں صرف کرتے ہیں یا زیادہ دماغی محنت کے کام میں لگے رہتے ہیں، وہ بالعموم طویل عمر سے محروم رہتے ہیں۔ مشہور معمّرین میں سے گنتی کے جن لوگوں نے طویل عمریں پائی ہیں، اُن کی درازیٔ عمر کی وجہ آسودہ طبعی اور خوش مزاجی تھی۔

اپنا دل تنگ نہ کیجئے۔ کبھی رنج کو پاس نہ پھٹکنے دیجئے۔ رنج سے بڑھ کر انسانی زندگی کا دشمن کوئی اور دشمن نہیں۔ غصے سے پرہیز کیجئے۔ غصے کا ہر حملہ زندگی کو کچھ نہ کچھ کوتاہ کر دیتا ہے۔

## ۸• اگر آپ کامیاب بننا چاہتے ہیں

ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے ——— اگر آپ اپنی زندگی کا دامن کامیابی کے پھولوں سے بھر لینا چاہتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ دوست بنایئے ——— ناموری کا تحفہ مانگنے سے نہیں ملتا۔ اس کے لئے عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ بڑے بڑے لوگوں کی زندگیوں کو دیکھئے، آپ کو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ لوگ آگے بڑھ کر دوستی کے طلب گار ہوتے تھے۔ جو شخص بھی دوستی کے خزانے سے مالا مال ہونا چاہتا ہے اُسے عملی طور پر آگے بڑھ کر طلب کرنا پڑے گا۔

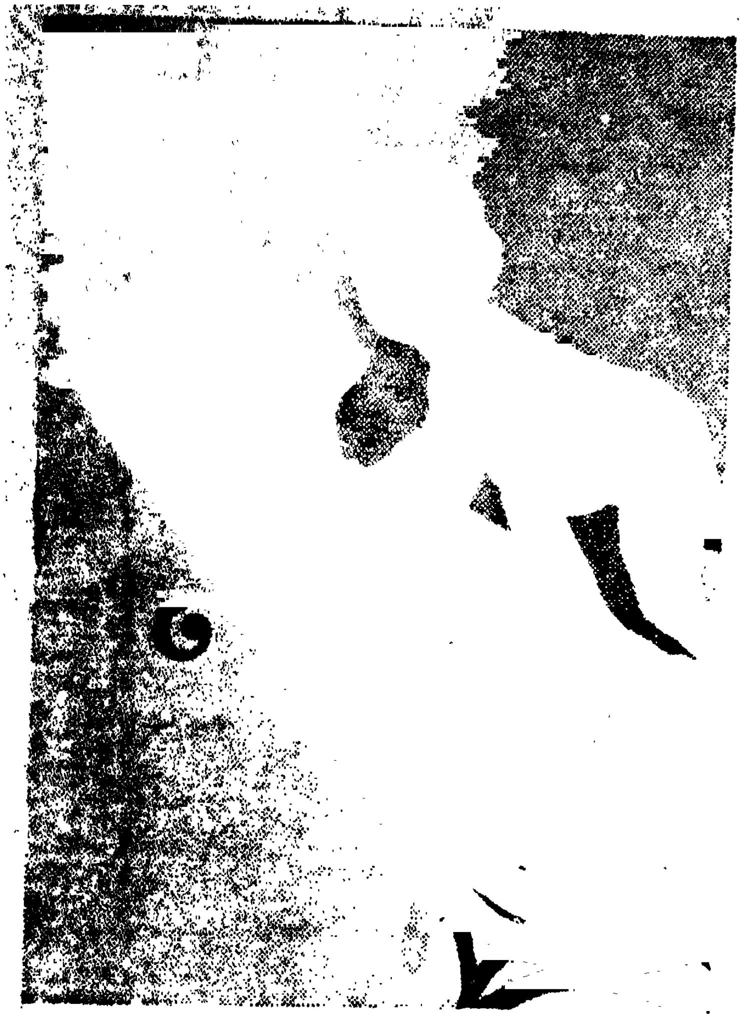
کسی بھی قوم میں ممتاز شخصیتیں وہی ہوتی ہیں جو سماج میں دوستانہ عمل کا ثبوت دیتی ہیں۔ ایسے لوگ صرف تنہا بیٹھ کر خواہش نہیں کرتے رہتے۔ وہ دانت کی کاٹی روٹی کھاتے ہیں۔ وہ دوستوں کی تعریف میں مضامین لکھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے مفاد میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ وہ اپنے حُسنِ سلوک کے اظہار کے لئے سیکڑوں مواقع پیدا کرتے ہیں۔ وہ لوگوں سے ملتے ہیں تو اس طرح مُسکراتے ہیں جیسے دل سے مُسکرا رہے ہوں۔ وہ دوسروں میں دلچسپی لیتے ہیں کہ دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں۔ وہ اس دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کسی کو پسند کرنے پر ہی انسان پسند کیا جاتا ہے۔

زندگی میں کامیابی حاصل کرنے، مقبول و ہر دلعزیز بننے کے لئے یہ اسرار و رموز کیا بہت مشکل ہیں؟

## ۹• تجربات کا نچوڑ

مشہور مفکر نپولین ہل نے لکھا ہے ——— میری زندگی کے تجربات کا نچوڑ یہ ہے کہ آپ کسی دوسرے آدمی کو اپنے اعمال، افعال اور الفاظ کے ذریعے وہ کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے جس میں آپ کو خود اعتماد اور بھروسہ نہ ہو اور اس کا سبب یہ ہے کہ اگر آپ اپنے ضمیر کو دھوکا دیتے رہیں گے تو وہ رفتہ رفتہ بے حس ہوتا چلا جائے گا اور پھر بہت جلد آپ کو یہ معلوم ہوگا جیسے آپ کے ضمیر کی آواز کہیں کھو گئی ہے۔ جس طرح وہ گھڑی جس میں آپ الارم لگانا بھول جاتے ہیں، آپ کو سوتے سے اٹھانے میں ناکام رہتی ہے اُسی طرح آپ کا ضمیر ہے۔ اگر اُس کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے تو وہ آپ کی رہنمائی کے قابل نہیں رہتا۔

یہ میرا خیال نہیں ہے، یہ میری زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ اگر آپ بھی تجربہ کریں تو آپ کی زندگی کے تجربات کا بھی یہی نچوڑ ہوگا۔



# سرگوشیاں

## سوال و جواب

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ نیز اخلاق تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش دیوانہ سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ــــــ (ایڈیٹر بیسویں صدی، دہلی)

**محمد سلیم شبلی۔ دہلی**

س۔ اگر عورت نہ ہوتی؟

ج۔ دنیا ایک ویران وادی ہوتی
وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ!

س۔ کشتی حیات اگر گرداب حوادث کی آغوش میں پڑی ہچکولے کھا رہی ہو؟

ج۔ جب بھی حوصلہ نہ کھونا چاہئے۔ مایوس نہ ہونا چاہئے ـــ کشتی حیات اکثر ڈوب کر ابھرتی ہے۔

**عبدالعزیز۔ بنگلور**

س۔ ازدواجی زندگی کو کامیاب و خوشگوار بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اپنے رفیق حیات سے پرخلوص محبت کرنی چاہئے۔ زندگی کے کسی موڑ پر اپنی ازدواجی زندگی کے دامن پر بدگمانی کا سایہ بھی نہ پڑنے دیں۔

س۔ دشمن نما دوست کی پہچان؟

ج۔ دشمن نما دوست نہیں، دوست نما دشمن کہئے ـــ دوست نما دشمن چین کے چاؤ کی طرح دوستی کے پردے میں دشمنی کرتے ہیں۔

س۔ دنیا کیا ہے؟

ج۔ دنیا تم چاہو تو حقیقت تم چاہو تو خواب!

**مرزا محمد علی بیگ۔ لکشمی پیٹھ۔ عادل آباد**

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ کوشش کرنے پر خدا بھی مل جاتا ہے؟

ج۔ جی ہاں!

س۔ زندگی کا مقصد؟

ج۔ انسانیت کی خدمت!

س۔ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرکے جینا ممکن ہے؟

ج۔ زندگی جیسی بھی ہے بہت حسین ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے ـــ

قدم قدم پہ مصیبت نفس نفس زحمت
مگر بشر ہے کہ مرتا ہے زندگی کے لئے

**محمد اسحاق پینچولی ضلع گلبرگہ شریف**

س۔ خوشتر بھیا! کوئی شخص اجنبی لڑکی سے بہن جیسا برتاؤ کرے اور لوگ اس پر طعنہ کسیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ج۔ یہ صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ آپ اس غریب لڑکی پر کرم فرمائیں۔ اس سے بہن جیسا برتاؤ کرکے اسے بدنام نہ کریں۔ اس سے دور رہیں۔ اس پر اپنا سایہ بھی نہ پڑنے دیں۔

س۔ خوشتر بھیا! عورتوں میں جو روز بروز فیشن پرستی بڑھ رہی ہے۔ کیا اس کا سہرا مردوں کے سر ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟

ج۔ جی ہاں! عورتوں کی فیشن پرستی کا سہرا مردوں کے سر ہے۔ عورتیں جو کچھ بھی کرتی ہیں مردوں کے لئے کرتی ہیں۔ مردوں کی خوشنودی کے لئے کرتی ہیں۔

**سید زاہد علی نظر علی بھساول**

س۔ چراغ بجھ جاتے تو پھر سے روشن کیا جاتا ہے لیکن دل بجھ جائے تو؟

ج۔ دل بھی بجھ جانے کے بعد روشن ہوسکتا ہے۔ کسی نے کہا ہے ـــ

دل کی بستی عجیب بستی ہے
روز اجڑتی ہے روز بستی ہے

**عبدالسبحان راہی ۔ گوکک**

س۔ کیا وجہ ہے کہ انسان یہ جاننے کے باوجود کہ برائی ضرر رساں ہے، پھر بھی وہ برے کاموں کی طرف مائل ہوتا ہے؟

ج۔ برائی میں بظاہر بہت کشش ہوتی ہے۔

س۔ وہ طلباء جن سے وطن کا مستقبل وابستہ ہے، آج انھیں میں انسانیت، اخلاق، فرض شناسی کا فقدان کیوں ہے؟

ج۔ اس کی وجہ کچھ تعلیم کی خرابی کچھ تربیت کی کمی ہے۔

س۔ فرقہ وارانہ فسادات کے اہم اسباب کیا ہیں؟

ج۔ فرقہ وارانہ فسادات کا ایک ہی سبب ہے — تعصب اور تنگ نظری کا وہ زہر — جس کا تریاق جاننے والے جان کر بھی استعمال نہیں کرتے۔

---

**سید اسدالرحمٰن ظفر، نرمل۔ عادل آباد**

س۔ بہادری کی تعریف عورت زیادہ کرتی ہے یا مرد؟

ج۔ اپنی بہادری کی تعریف مرد زیادہ کرتا ہے۔ دوسروں کی بہادری کی تعریف عورت زیادہ کرتی ہے۔

س۔ آج کل کی لڑکیاں اتنا چست لباس پہننا کیوں پسند کرتی ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ یہی بیشتر مردوں کی پسند بن گئی ہے۔

س۔ اگر انسان کا دل کمزور ہوتا جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ اس کی اصل وجہ دور کرنی چاہیے۔

---

**قاسم انعامی ندوی۔ اورا میرلو پوراٹ**

س۔ کچھ فرقہ پرست اور متعصب لوگ اُردو زبان کو مٹانا چاہتے ہیں۔ پھر اُردو کے پرستاروں کا کیا حال ہوگا؟

ج۔ اُردو زبان کبھی نہیں مٹ سکتی — پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا! اُردو کی خوبیاں اُردو کی بقا کی ضامن ہیں۔

س۔ ڈاکٹر اقبال نے خودی کے فلسفے کو کس انداز سے سمجھایا ہے۔ مذہبی یا قومی انداز سے؟

ج۔ اُن کے سامنے مذہب بھی تھا، ملت بھی تھی۔

---

**واجد علی انصاری۔ بمبئی**

س۔ سنتا ہوں اُردو رسائل ادیبوں کو ہندی رسائل سے کم معاوضہ دیتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ اس لئے کہ انھیں زندہ رکھنے کے لئے اُردو کے بیشتر حامی رسائل مانگ کر پڑھتے ہیں جبکہ ہندی رسائل کے ایک ایک گھر میں کئی خریدار ہوتے ہیں۔ سب کی الگ الگ کاپیاں آتی ہیں۔

---

**ریاض احمد بوریولی۔ بمبئی**

س۔ شادی۔ سادی۔ دھوم!

ج۔ سستی کھادی۔ ہینڈ لوم! — فرمائیے آیا کچھ سمجھ میں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو ہم بھی عرض کردیں۔ آپ کا سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا۔

س۔ آج کے دوست آپ کی نظر میں؟

ج۔ چین کے چاؤ کی قسم! آج کے بیشتر دوست دوست کے روپ میں دشمن ہوتے ہیں۔

---

**ڈاکٹر خورشید علی۔ امدادی کیمپ**

س۔ کیا زندگی پھولوں کی سیج ہے؟

ج۔ جی نہیں، زندگی کانٹوں بھری راہ ہے۔ بلند حوصلہ انسان اس سے گزر کر پھولوں کی سیج تک پہنچتے ہیں۔

محمد ایوب، کلکتہ

س۔ معلم کو علم دینا چاہئے یا نہیں اور اگر دینا چاہئے تو کس قدر؟

ج۔ معلم کو اپنی ساری کوشش تعلیم پر مرکوز کر دینی چاہئے۔ علم جتنی طلباء کے زیادہ ہو اتنا ہی اچھا ہے۔

س۔ دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ عزت انسان کون ہے؟

ج۔ جو اپنے قابلِ عزت ہونے کا خود دعویٰ نہ کرے۔ جو دوسروں کی عزت کرے۔

س۔ ڈاکٹر اقبال کے اس شعر کو پورا کیجئے ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

ج۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

---

پروین اختر۔ سہرسہ

س۔ کیا حقیقت میں ادب سماج کا آئینہ ہے۔

ج۔ ہاں، ادب کو سماج کا آئینہ ہونا چاہئے۔

س۔ اگر دل جلے تو؟

ج۔ ضبط کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ضبط سے کام لینا چاہئے۔

س۔ ایک جاہل کی وجہ سے پورا گھر تباہ ہو جائے تو کیا کیا جائے؟

ج۔ گھر کو تباہ ہونے سے بچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

---

ریاض احمد۔ دہلی

س۔ جس طرح ہماری ادب کو سستا ادب ملتا چاہتے ہے

اسی طرح خطرناک انسانوں کو بھی سستا ...

س۔ سب شاعر فلم انڈسٹری سے کوئی رشتہ قائم کرنا نہیں چاہتے پھر کرشن چندر، عصمت، قرۃ العین حیدر وغیرہ کیوں فلم انڈسٹری سے رابطہ قائم کر چکے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں؟

ج۔ اگر اس اقدام سے ان کا مقصد فلم انڈسٹری کا معیار بلند کرنا ہے تو اس اقدام کو قابلِ اعتراض نہ کہنا چاہئے۔

---

مس سلطانہ بیدل۔ ہزاری باغ

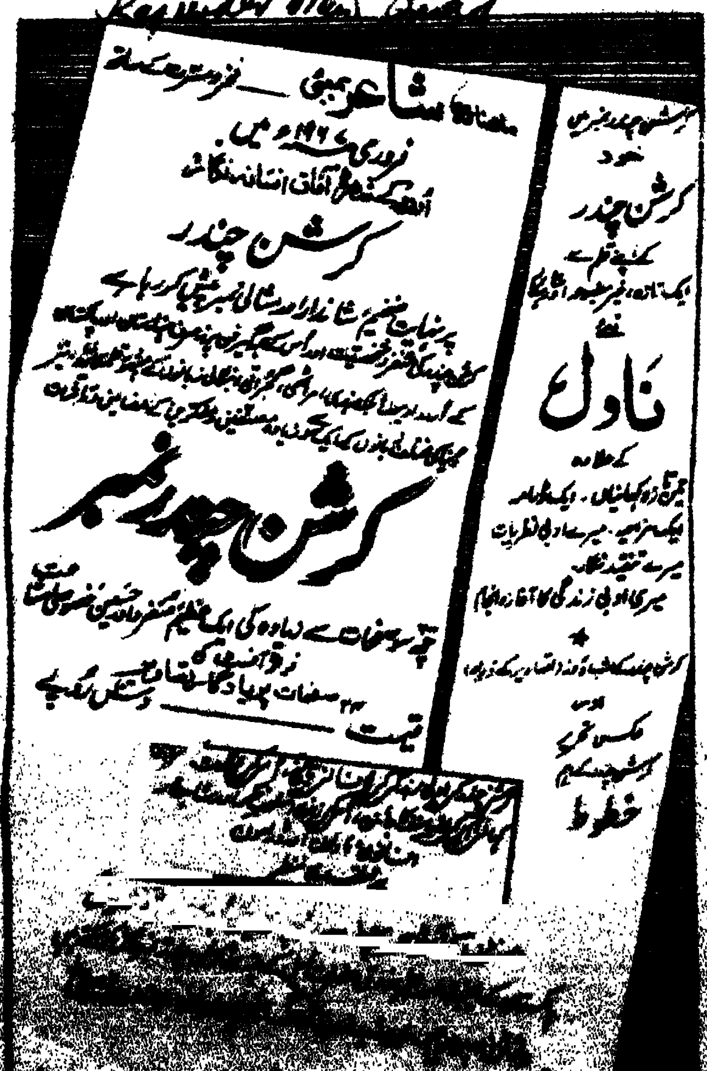
س۔ دوست مصیبت میں ساتھ کیوں چھوڑ دیتا ہے؟

ج۔ دوست مصیبت میں ساتھ نہیں چھوڑتے جو مصیبت میں ساتھ چھوڑ دیتا ہے وہ دوست نہیں!

س۔ اگر پڑھنے میں دل نہ لگے تو؟

ج۔ دل لگانے کی کوشش کرنی چاہئے۔





عبدالسلام کوہ پشت ۔ دہلی

س۔ ترقی کا راز؟

ج۔ ایمان داری ۔۔۔ اَن تھک محنت۔

س۔ علامہ اقبال کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ خدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے

س۔ زندگی اور موت کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟

ج۔ حضرت جگر مرادآبادی نے فرمایا ہے ؎
موت و حیات میں ہے صرف ایک قدم کا فاصلہ
یہ کوزندگی بنا جلوۂ زندگی نہ دیکھ

---

س۔ سراج شاد ۔ راجم پیٹ

س۔ میں ایک لڑکی کو چاہتا ہوں۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی ہے۔ ہم دونوں اظہارِ وفا بھی کرچکے ہیں۔ لیکن لڑکی کا باپ دولت مند ہے اور وہ اپنی بیٹی کو ایسے نوجوان سے بیاہنا چاہتا ہے جو ڈبل گریجویٹ ہو یا پانچ سو روپے ماہوار مشاہرہ [illegible] [illegible] اور سوا دو سو روپے ماہوار کماتا ہوں۔ بتائیے میں کیا کروں؟

ج۔ آپ کو واقعی اُس لڑکی سے محبت ہے تو اُس کی زندگی کا دامن خوشحالی کے پھولوں سے بھرنے دیجئے۔ اس کی راہ سے ہٹ جائیے۔

س۔ کوئی ایسا شعر سنائیے جو میرے غم کو کم کرسکے۔

ج۔ ہے بڑی چیز انبساط مگر
غم نہ ہو تو حیات کچھ بھی نہیں

---

عبدالحمید، عبدالقادر، دھولیہ

س۔ خوشتر بھیا! انسان کو وطن پرست ہونا چاہئے یا قوم پرست؟

ج۔ انسان کو وطن اور قوم دونوں سے محبت کرنی چاہئے۔

س۔ علامہ اقبال نے قوم کو خصوصاً نوجوانوں کو کون سا درس دیا؟

ج۔ بیداری کا۔ خودداری کا۔ ایک جہتی کا۔

---

توفیق احمد ساجد۔ آندھرا پردیش

س۔ خوشتر بھیا! بتائیے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو کی موت سے ہمیں کیا سبق ملا؟

ج۔ زندگی کی طرح موت بھی ایک اٹل حقیقت ہے۔ موت بڑے سے بڑے انسان سے زندگی چھین لیتی ہے۔ اس لئے زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ کرنا چاہئے۔ پنڈت جی کہتے تھے ۔۔۔ آرام حرام ہے!

س۔ کوئی اپنا پسندیدہ سبق آموز شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎
الم ہی الم ہیں، غم ہیں خوشی کی بات کرو
خیالِ مرگ میں تم زندگی [illegible]
[illegible]

---

اشفاق احمد ۔ ہوڑہ

س۔ خوشتر بھیا! سنا ہے آپ اُردو کے لئے بھوک ہڑتال کرنے کو تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟

ج۔ آپ نے صحیح سنا۔ وقت آنے پر اُردو کی بقا کے لئے، اُردو کا حق منوانے کے لئے ہم اپنی جان کی بھی بازی لگانے سے دریغ نہ کریں گے۔

س۔ آپ کس طرح کے سوال چاہتے ہیں؟

ج۔ جیسے سوالات آپ بیسویں صدی میں دیکھتے ہیں۔ سنجیدہ، مفید اور معلوماتی۔

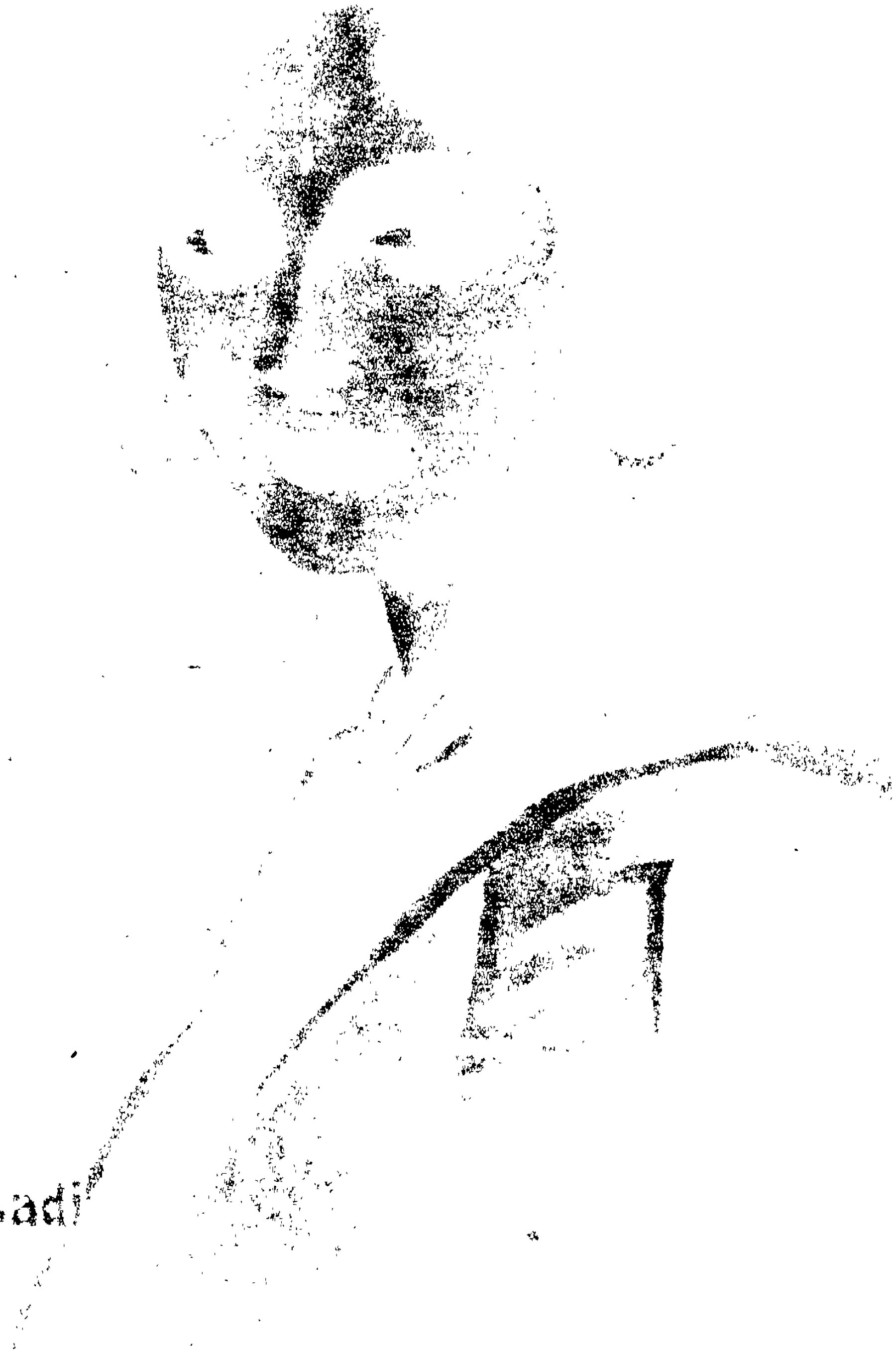
---

عبدالرحمٰن۔ اے ملّا دکمازنگر، دھولیہ

س۔ خوشتر بھیا! جو آدمی اپنے آپ کو [illegible] عقلمند سمجھتا ہے اُسے کیا کہیں [illegible]

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی ۔۔۔۔۔۔ مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ [illegible]





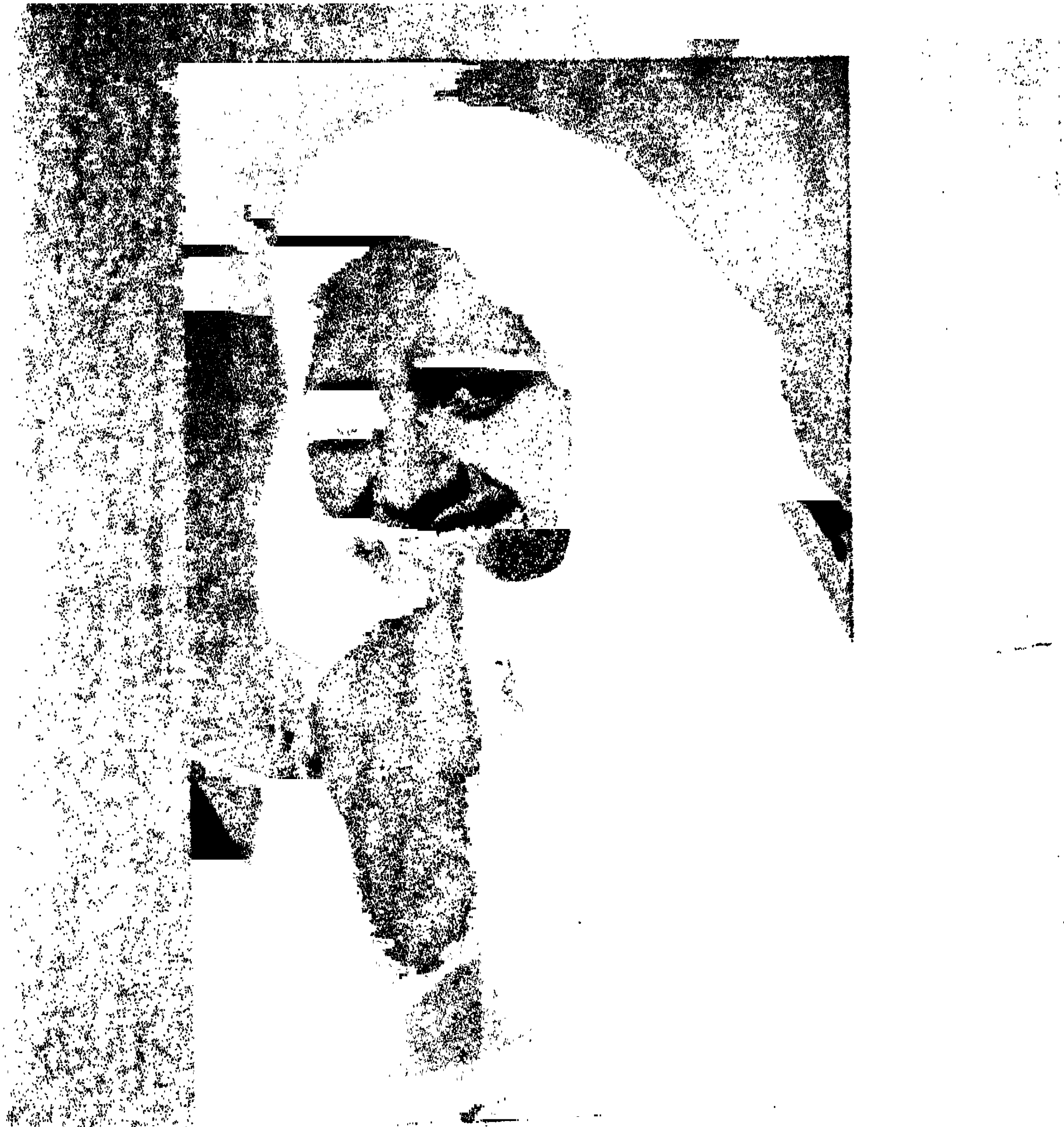
Shair Sadi



تابش ہے مہر میں نہ تجلّی ہے ماہ میں
تیری نگاہ جب سے ہے میری نگاہ میں

فوٹو : سورج، این، شرما سے پلد


کیا کہہ گئی کسی کی نظر کچھ نہ پوچھیے
کیا کچھ ہوا ہے دل پہ اثر کچھ نہ پوچھیے ——— اختر شیرانی

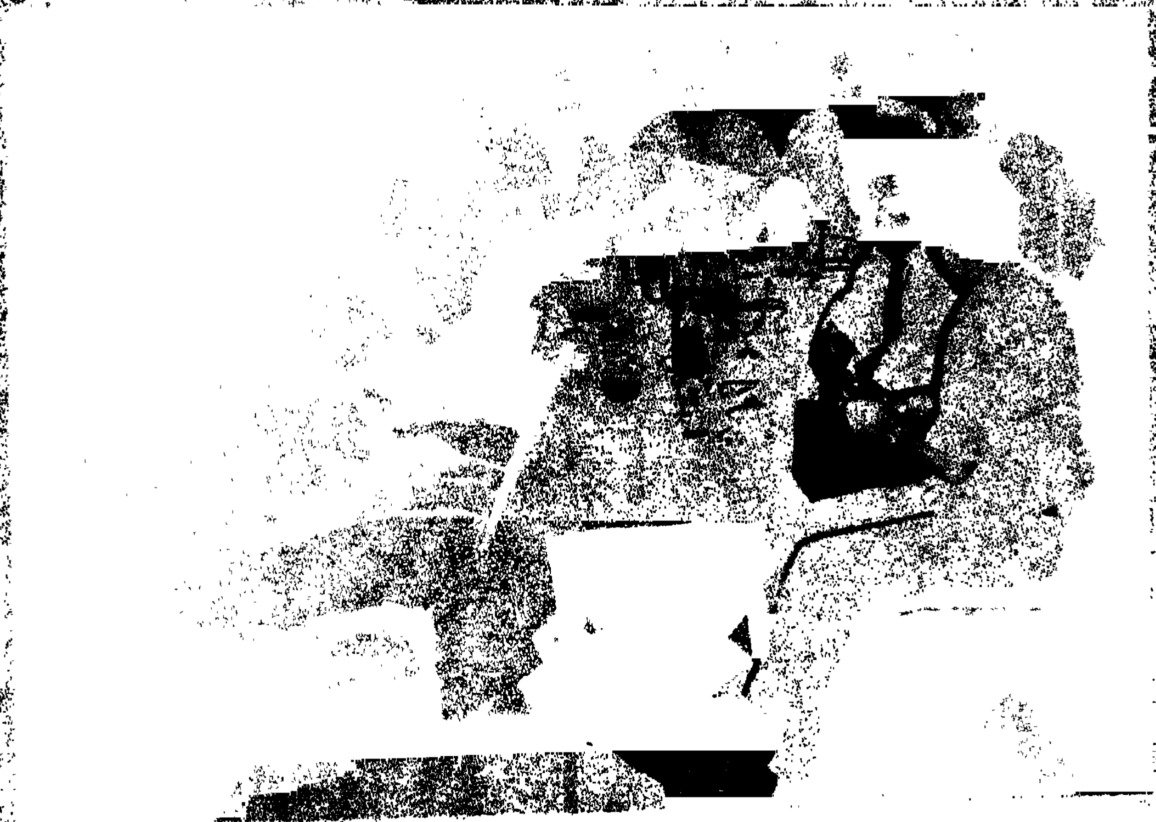


خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری مسکراتے ہیں کیا کیا ——— یاس یگانہ

فوٹو:۔ روشن لال [illegible]



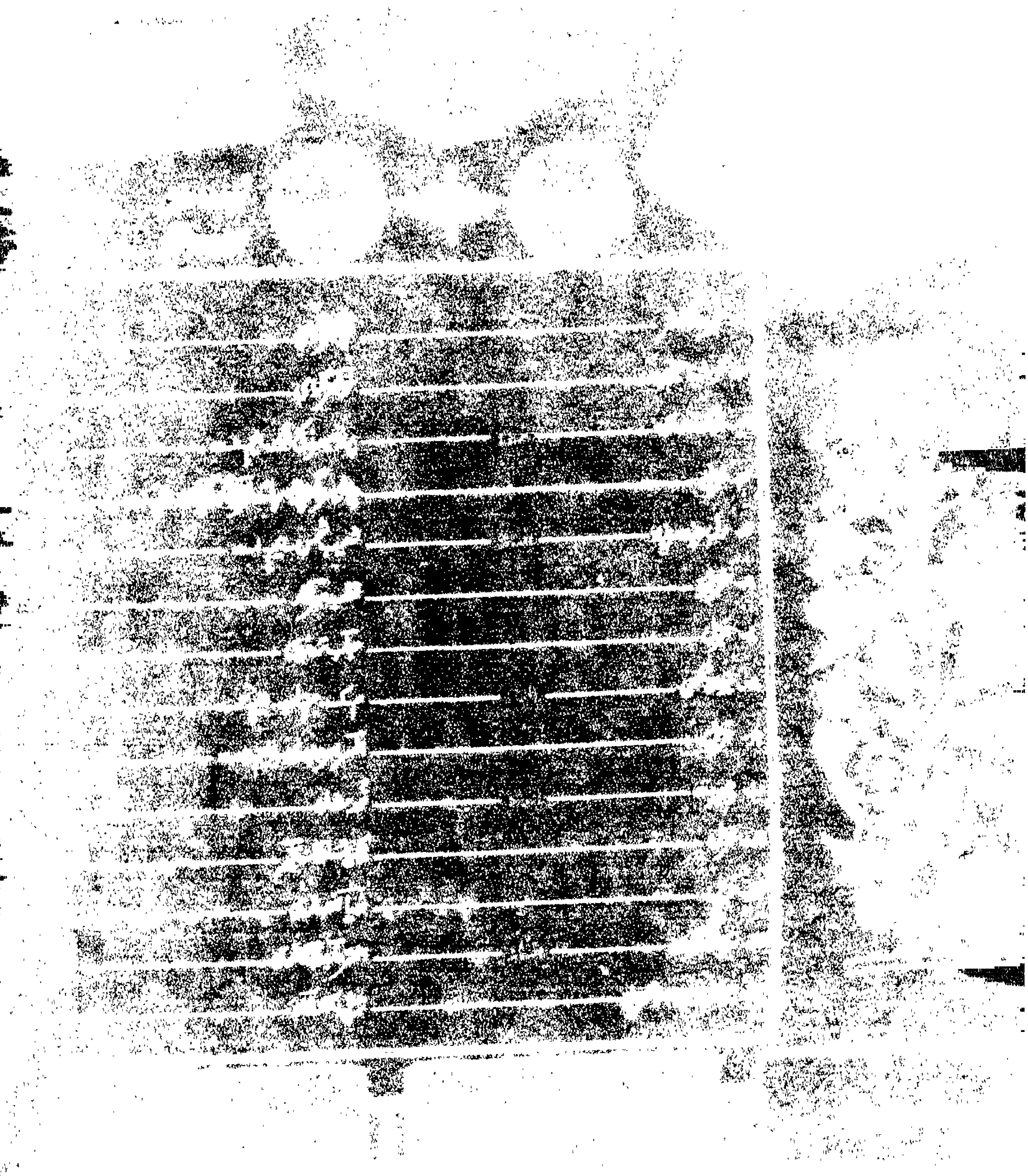
علامہ آرزو صہبری نو سال کی عمر ہی میں حافظِ قرآن ہو چکے تھے۔ سولہ سترہ برس کے تھے کہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے چند سال بعد ان کا فطری شوق
سیاحت و مطالعہ انھیں مشرق سے مغربی دُنیا میں لے گیا جہاں گیارہ سال تک انھوں نے گلاسگو، لندن، سکاٹ لینڈ، فرانس اور یو۔کے کے بہت سے حسین اور دل فریب
مقامات دیکھے۔ وہاں کی زبان، لٹریچر، کلچر اور تہذیب و تمدن کا مطالعہ کیا اور اپنے شوقِ سیاحت کو بھی پورا کیا اور بالآخر گیارہ سال کی طویل مدت کے بعد جب خاکِ وطن کی
کشش انھیں اپنی جنم بھومی ملکوال (پاکستان) تک لے آئی تو [illegible] "بیسویں صدی" اور رئیس مجتبیٰ امروہوی کی محبت نے انھیں ہندوستان آنے پر بھی مجبور کر دیا
جہاں پہنچ کر وہ خواجہ غریب نواز کی درگاہ اجمیر شریف کی زیارت کے بعد ہندوستان کے متعدد تاریخی مقامات جے پور، دہلی، مراد آباد، امروہہ، بمبئی اور نینی تال
کے [illegible] دیکھنے گئے ——— دہلی میں ناز صاحب مدیر "بیسویں صدی"، مشہور شاعر ضیا فتح آبادی اور نامور افسانہ نگار مہندر ناتھ کے ساتھ۔



دہلی میں مدیر "بیسویں صدی" نے تابش صاحب کے اعزاز میں ایک پُرتکلف عصرانہ دیا۔ جس میں [illegible]
نے شمولیت فرمائی۔ ہندوستان میں آپ جہاں بھی گئے علم دوست طبقے نے آنکھیں فرشِ راہ کر دیں اور [illegible]



ممبر پارلیمنٹ چودھری محمد شفیع، روزنامہ "سویرا" کے مدیر اعلیٰ جناب [illegible] [illegible]
جوگندر پال اور کرشن موہن نے دلی خلوص سے تابش صاحب کا خیرمقدم کیا۔



۱۶ - غزل ——— [illegible]
۱۷ - رابعہ صاحب ——— دور آفریدی
۱۸ - معان اور زعفران ——— شمیم احمد
۱۹ - غزل ——— [illegible] ایم اے
۲۰ - غزل ——— [illegible]
۲۱ - غزل ——— کیف احمد صدیقی
۲۲ - یہ درد اس رات کا غم ہے ——— حبیب اعظمی
۲۳ - خط لکھیں گے ——— فکر تونسوی ۷۵
۲۴ - قلمی چہرہ نویس ——— راز یوسفی
۲۵ - غزل ——— پروفیسر اختر نظمی۔ ایم اے۔ بی ٹی ۸۳
۲۶ - غزل ——— تیر قریشی لکھنوی ۸۴
۲۷ - غزل ——— آزاد گورداسپوری۔ بی اے ۸۴
۲۸ - بہار آتے آتے ——— خورشید اقبر سوانی ۸۵
۲۹ صحت و زندگی ——— صحت مند رہنے کے لئے خوراک کی اہمیت ——— [illegible]
مسرت کا راز ——— احساس کمتری ——— کیا آپ پریشان رہتے ہیں؟
اگر آپ ہر دلعزیز بننا چاہتے ہیں ——— ۸۹
۳۰ - سرگوشیاں ——— سوال و جواب ۹۳

خوشتر گرامی



"میں پبلک زندگی سے علیحدہ نہیں ہوں گا" کرشنا مینن

• "... ہوں گے" ڈاکٹر لوہیا ——— بس جلدی ...

• "فریدآباد میں اسپورٹ اسٹیڈیم" ایک خبر ——— تاکہ ہریانہ ... اور سیاستدانوں کو کرتب دکھانے کا موقع مل سکے۔

• "کالا بیوپار کرنے والوں کی جھٹ گرفتاری پٹ سزا یو پی کے ... چاہیے" ایک عنوان ——— اور کالے بیوپاریوں کے سرپرست وزیروں کا کیا ہوگا؟

• "ہندوستان کی معیشت پر ناتجربہ کار لوگوں کا قبضہ ہے" ٹاٹا ——— ایک ٹاٹا اسکول آف تجربہ کاری کھولنے کی ضرورت ہے۔

• "مرکز میں متبادل حکومت بنانے کا پروگرام تیار ہوگیا" کیمونسٹ پارٹی کی میٹنگ میں اعلان ——— وزارتوں کا فیصلہ پہلے ہی کر لیجئے اور کرسیوں کا ٹاپ بجا دیجئے۔

• "کرشنا مینن کو بمبئی میں عبرت ناک شکست" ایک عنوان ——— جی ہاں۔ حیرت ناک کی بات یہ ہے کہ مسٹر مینن نے کہا ہے کہ موقع ہوا تو پھر الیکشن لڑوں گا۔ لوگوں کو مجھ پر بھروسہ ہے۔

• "شری بلراج مدھوک کا سیکولرزم پر حملہ" ایک عنوان ——— دکان سیاست چمکانے کے لئے۔

• "شری چھاگلہ کا کویت اور ایران کا دورہ" ایک خبر ——— شیخوں اور شاہ کا کلچرل پروگرام خوب رہا ہوگا۔

۱۵ - تارِ رشتہ — [illegible] — [illegible]
۱۶ - غزل — گلشن موہن ایم اے — ۵۴
۱۷ - راجہ صاحب — دورؔ آفریدی — ۵۵
۱۸ - دھان اور زعفران — شمیم احمد — ۵۹
۱۹ - غزل — زرینؔ کلیم - ایم اے — ۶۳
۲۰ - غزل — حامد مینائی شاہجہاں پوری — ۶۳
۲۱ - غزل — کیف احمد صدیقی — ۶۴
۲۲ - یہ درد اس رات کا شعر ہے — شعیب اعظمی — ۶۵
۲۳ - خط لکھیں گے — فکر تونسوی — ۷۵
۲۴ - قلمی چہرہ نویس — رازؔ یوسفی — ۷۹
۲۵ - غزل — پروفیسر اخترؔ نظمی - ایم اے - بی ٹی — ۸۳
۲۶ - غزل — تیرؔ قریشی گنگوہی — ۸۳
۲۷ - غزل — آزادؔ گورداسپوری - بی اے — ۸۴
۲۸ - بہار آتے آتے — خورشید افسرؔ بسوانی — ۸۵
۲۹ صحت و زندگی — صحت مند رہنے کے لئے خوراک کی اہمیت — ککڑی اور کھیرا
مسرت کا راز — احساس کمتری — کیا آپ پریشان رہتے ہیں!
اگر آپ ہر دلعزیز بننا چاہتے ہیں — ۸۹
۳۰ - سرگوشیاں — سوال و جواب — ۹۳

# تیر و نشتر

• مرکزی سرکار ٹوٹنے ہی والی ہے : ڈاکٹر لوہیا ——— بس جلدی سے اپنا ٹینڈر داخل کر دیجئے۔

• فریدآباد میں اسپورٹ اسٹیڈیم : ایک خبر ——— تاکہ ہریانہ کے وزیروں اور سیاستدانوں کو کرتب دکھانے کا موقع مل سکے۔

• کالا بیوپار کرنے والوں کی جھٹ گرفتاری پٹ سزا یو۔پی کے مجسٹریٹوں کو ہدایت : ایک عنوان ——— اور کالے بیوپاریوں کے سرپرست وزیروں کا کیا ہوگا؟

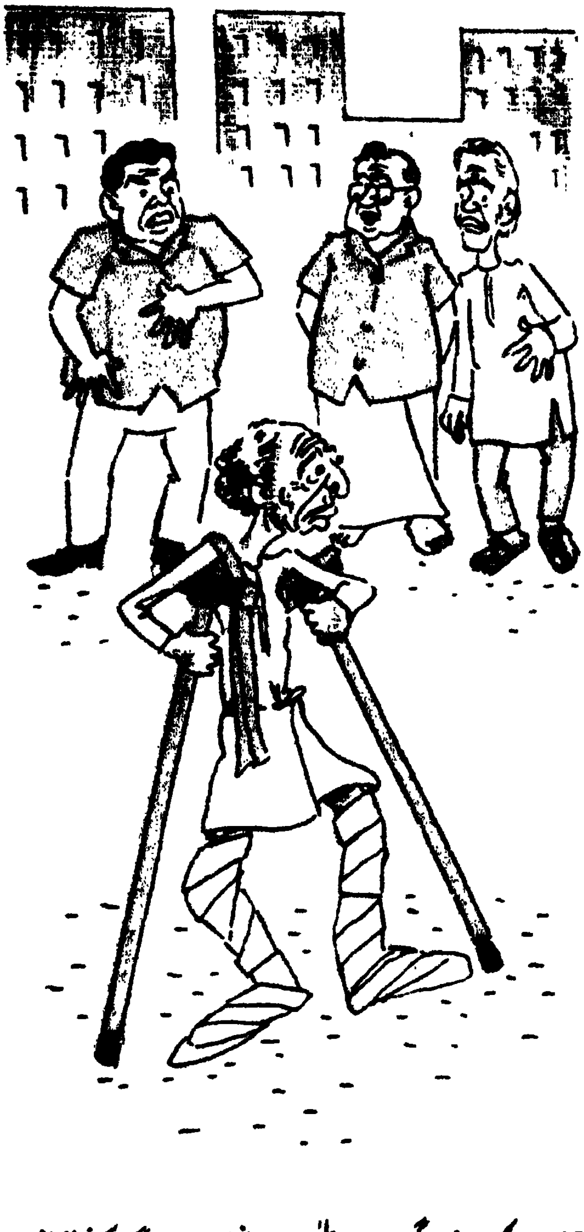
• ہندوستان کی معیشت پر ناتجربہ کار لوگوں کا قبضہ ہے : ٹاٹا ——— ایک ٹاٹا اسکول آف تجربہ کاری کھولنے کی ضرورت ہے۔

• مرکز میں متبادل حکومت بنانے کا پروگرام تیار ہو گیا : کیمونسٹ پارٹی کی میٹنگ میں اعلان ——— وزارتوں کا فیصلہ پہلے ہی کر لیجئے اور کرسیوں کا ناپ بھجوا دیجئے۔

• کرشنا مینن کو بمبئی میں عبرت ناک شکست : ایک عنوان ———
جی ہاں۔ عبرت ناک کی بات یہ ہے کہ مسٹر مینن نے کہا ہے کہ 'موقع ہوا تو پھر الیکشن لڑوں گا۔ لوگوں کو مجھ پر بھروسا ہے۔

• شری بلراج مدھوک کا سیکولرزم پر حملہ : ایک عنوان ———
دوکان سیاست چمکانے کے لئے۔

• شری چھاگلہ کا کویت اور ایران کا دورہ : ایک خبر ———
مرغ و ماہی کا کلچرل پروگرام خوب رہا ہوگا۔



"میں پبلک زندگی سے علیحدہ نہیں ہوں گا" : کرشنا مینن



"دیش میں موجودہ خرابیوں کی ذمّے دار حکومت ہے" گلزاری لال نندہ

---

"بادشاہ خاں (سرحدی گاندھی) کیا چاہتے ہیں" ایک عنوان ——— ہندوستان میں اُن کے نام پر چلنے والی دوکانیں فی الفور بند کردی جائیں۔

"میں نے ایک خواب کی بنا پر مرکزی وزیر بننے کی پیشکش منظور کرلی" ڈاکٹر کرن سنگھ کا بیان ——— یہ راجہ کے بیٹے کا خواب تھا جو سچا ہوا ورنہ ہم تو کتنے خواب دیکھتے ہیں اور یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

"میرٹھ میں جرائم بڑھ گئے" ایک خبر ——— مسٹر چرن سنگھ کا دیس ہے۔ لوگوں نے کہا ؎

سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا

"جن سنگھ کا اصلی رُوپ" ایک عنوان ——— جو بصیرت و بصارت سے محروم لوگوں کو نظر نہیں آتا۔

"چوتھے منصوبے میں جنگلات کی ترقّی" ایک عنوان ——— جنگلی پیدا کرنے کے لئے، انسانوں سے تو جھر پائے۔

"ہاپوڑ میں اناج برابر گر رہا ہے" ایک خبر ——— گرنے دو۔ بارش نہیں تو اناج ہی گرے۔

"ریواڑی میں بکنگ آفس کی ضرورت" ایک خبر ——— جہاں سے وزارت کا ٹکٹ مل سکے۔

"ہند میں چھوٹی کار کا کارخانہ" ایک عنوان ——— قائم ہوگیا تو کوئی بے کار نہ رہے گا۔

"آٹے میں ملاوٹ" ایک عنوان ——— پھر بھی سب کا پیٹ نہیں بھرتا۔

"کانگریس کا سیکولرزم بوگس ہے" بلراج مدھوک ــــــ درست ہوگا
س را بوگس می شناسد۔

• "راشن میں تخفیف" ایک عنوان ــــــ پیٹ پر پتھر
ندھ کر۔

• "ہریانہ والے جَو اور چنا کھائیں" ایک عنوان ــــــ اور راؤ بیریندر سنگھ
کے گُن گائیں۔

• "مدراس میں کانگریس کو دوبارہ متحرک بنانے کی تجویز"
یک خبر ــــــ بمبئی کے بھابا ایٹمی انسٹی ٹیوٹ سے توانائی حاصل
کیجیے۔

• "پارٹی بازی چھوڑ کر شہر کی سیوا کرو" دلّی کے نئے میئر کی
پیل ــــــ اس میں پہل آپ کی طرف سے ہونی چاہیے۔

• "راؤ بیریندر سنگھ چنڈی گڑھ کو پنجاب کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں"
ھدر پردیش کانگریس کا بیان ــــــ اور بہت سستا فروخت کر رہے ہیں۔
یعنی صرف وزارت کے لئے۔

• "یو۔ پی کے گورنر بسوا ناتھ داس سبکدوش ہونے پر گیتا پڑھا
کریں گے" ایک خبر ــــــ ہار کر سبکدوش ہونے والے وزیروں کے لئے
قابلِ تقلید مثال۔

• "جھانسی میں سرکاری غلّے کی تیرہ دوکانوں کے لائسنس منسوخ"
ایک خبر ــــــ تیرہ دوکانداروں کے جھانسہ کرنے کا نتیجہ۔

• "نیویارک کے ایک کالج میں اُردو پڑھنا لازمی" ایک خبر ــــــ
اور اُردو کے وطن ہندوستان میں؟ ہندی رکھشا سمتی مورچہ لگائے،
حکومت امریکہ سے احتجاج کرے۔




شری مرارجی ڈیسائی نے بمبئی کے پریس کلب میں قیمتیں کم کرنے کا وعدہ کیا۔




ڈاکٹر لوہیا کا نیا کھیل ۔ سوتیلانہ کو ہندوستان میں ٹھہرنے کی اجازت دلانا ۔

"یو۔پی میں نظم ونسق کی نئی تنظیم" ایک عنوان ——— ایسی ہو کہ پہلے سے کچھ زیادہ وزارتیں بن سکیں ۔

"ڈاکوؤں نے عورتوں کے زیورات اُتار لئے" ایک خبر ——— غنیمت ہے لوٹے نہیں ۔

"پریم نگر کو ٹیوب ویل چاہئے" ایک خبر ——— تاکہ پریم کو دھو کر پاک کیا جاسکے ۔

"آبادی میں اضافہ کا سبب اموات میں کمی" ایک مقالہ ——— پھانسی کا ایک ایک لوپ فراہم کیجئے ۔ راشن کارڈ سب واپس مل جائیں گے ۔

"ہندوستان کی برآمد میں کمی" ایک خبر ——— مراد شاید کلچرل ڈیلی گیشنوں سے ہے جو بہت دنوں سے کم ہی بھیجے جارہے ہیں ۔

"شری چرن سنگھ اور اُن کے ساتھی کانگرس سے نکال دیئے گئے" ایک خبر ——— کیبنٹ میں گھس جانے کے بعد ۔

"سوتیلانہ کی کتاب کی آمدنی" ایک خبر ——— ہم سے پوچھیے تو ڈاکٹر لوہیا کو ملنی چاہئے ۔ بطور فیس وکالت ۔

"امریکہ ویت نام سے ہر وقت بات چیت کے لئے تیار ہے" یہ ایک خبر ——— حتیٰ کہ بمباری کے وقت بھی ۔

"پندرہ قومی زبانیں انگریزی کی جگہ لیں" یہ سیٹھ گوبند داس کا مطالبہ ——— کیا سچ مچ اُردو کو بھی آپ نے شامل کیا ہے ؟

"کانگرس ختم ہوگئی تو ملک میں ابتری پھیل جائے گی" یہ بھگوت دیال شرما ——— اور اس کی بہت بڑی ذمّے داری آپ پر ہوگی ۔

• جس دیش میں گنگا بہتی ہے" ایک عنوان ـــــــ اس میں جن سنگھ سے مل کر چرن سنگھ نے وزارت بنائی ہے۔

• ایکسپریس ڈلیوری کی برق رفتاری تیس کلومیٹر کا سفر ۲۸۲ دن میں" ایک خبر ـــــــ وزیر ڈاک و تار کو میڈل عطا کیجئے۔

• تپ اور تیاگ کے جذبے کی ضرورت" ایک مقالہ ـــــــ سُپر بازار میں ملتا ہو تو منگا لیجئے۔

• انسان اور انسانیت" ایک عنوان ـــــــ اب وہ ہیں جیسے خواب کی باتیں۔

• مغلیہ دور کے سونے کے سکے برآمد" ایک خبر ـــــــ ہمارے جمہوری دور کے کاغذ اور ایلومنیم کے سکوں سے بہتر نہ ہوں گے۔

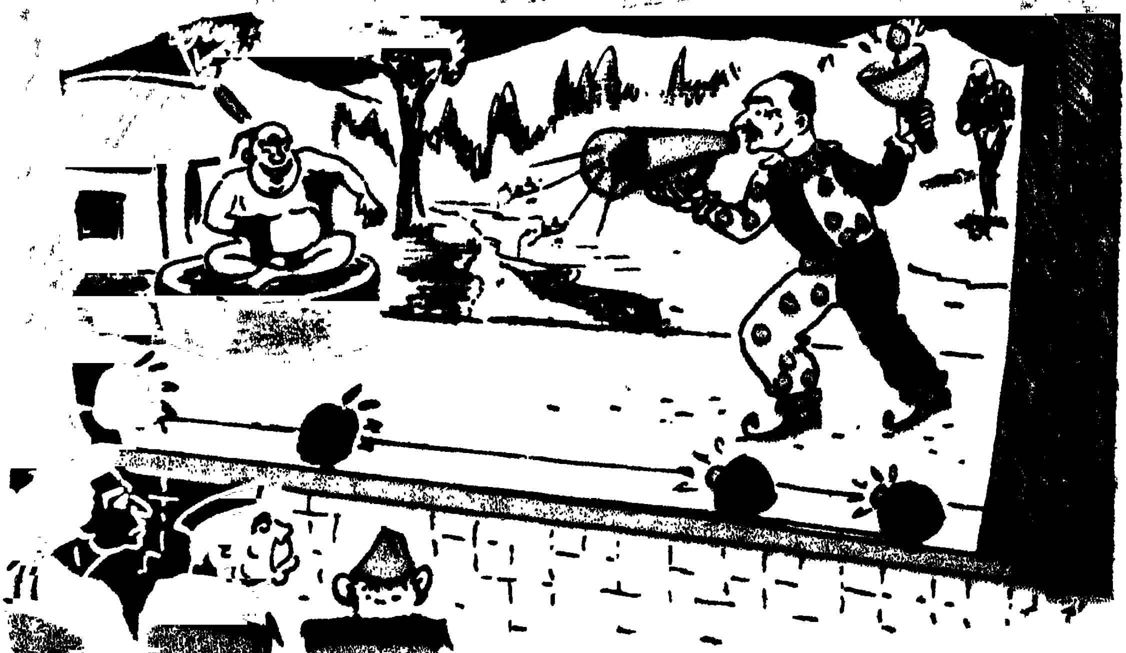
• اُردو اور حکومت" ایک عنوان ـــــــ بہت بے جوڑ عنوان ہے۔

• ہندوستان کے دو بڑے سرمایہ دار۔ ایک نے وزیر کو چائے پر بلایا دوسرا وزیر سے ملنے اس کے دفتر گیا" ایک خبر ـــــــ مقصد ملاقات تھا۔ ۔ چاہے ناک سیدھی پکڑ لی یا گھما کر۔

• دلی میں ڈی۔ ٹی۔ یو کی بس غائب" ایک خبر ـــــــ اغوا کی ایک اور واردات۔

• ہماچل وزارت میں توسیع" ایک خبر ـــــــ اچھا ہوا ورنہ یو۔ پی یا ہریانہ بن جاتا

• ضابطۂ اخلاق" ایک عنوان ـــــــ جن سنگھ کو سکھانے کی ضرورت ہے۔ ان میں سے بعض نوجوان بڑے بے لگام ہیں۔



"ہمارے سارے مسائل کا حل سیکولرزم کے مقابلے میں نیشنلزم کو اپنانا ہے" بلراج مدھوک

لمبا قد، کتابی چہرہ، آنکھیں بڑی اور اندر کو دھنسی ہوئی۔ طوطا چشم بھی۔ طوطے کی سی ناک بھی۔ رنگ کالا جو سفید کھدر کے لباس پر اور بھی کھل جاتا ہے۔ یہ ہیں ہمارے سابق وزیرِ دفاع اور اب تو سابق ممبر پارلیمنٹ بھی جناب ——————



لباس کے معاملے میں گنگا گئے تو گنگا رام، جمنا گئے تو جمنا داس۔ ہندوستان میں ہوں تو بگلا بھگت۔ سفید کھدر کا کرتا، دھوتی اور پٹو۔ ہندوستان سے باہر ہوں تو رنگ سے میچ کرتا ہوا سوٹ —— پنڈت نہرو کی دوستی نے وزیر بنایا، چو۔این۔لائی کی دوستی نے وزارت سے نکلوایا۔ ہندوستان کا ہر مقدمہ تقریروں سے خراب کیا اور اب تقریروں ہی کے دوران میں سیاسی خودکشی کر بیٹھے —— پنڈت نہرو کے بعد پہلا تو الیکشن ہوا اور چاروں شانے چت ہوئے اور اب یک نہ شد دو شد۔ تیسرا الیکشن لڑنے کے لئے بھی غالب کا مصرع بگاڑ کر اپنے حسبِ حال کر لیا ہے —— ۔

لڑیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ہرائے کیوں

تقریروں کی دھوم یو۔این۔او تک ہے۔ بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم ؎

# انوکھا رُومان

پروفیسر زکی انور، ایم۔ اے

جمشید پور۔ ۱

۱۰ مارچ ۱۹۶۶ء

بھائی جان تسلیم

بہت دنوں کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ کالج بند تھا اور میں زیادہ دنوں تک جمشید پور سے باہر رہا۔ جمشید پور سے باہر جہاں میں تھا وہاں بھی ڈاک خانے تھے، اس لئے خط نہ لکھنے کی وجہ جمشید پور سے باہر ہونا نہیں ظاہر ہے خط نہ لکھنے کی وجہ کاہلی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس لئے معذرت خواہ ہوں۔ کچھ میں بیمار بھی رہا۔

آپ نے رضا راہنجار صاحب کو کوئی جواب دیا نہیں اور دوسری طرف ہم لوگ "بیسویں صدی برادری کانفرنس" کے معاملے میں کافی سیریس ہو گئے ہیں۔ آپ کا مشورہ ہمیں مل جائے تو پھر "برادری" کے دوسرے افراد سے خط و کتابت کی جائے۔ گرمی کی تعطیل میں دلی آنے کا پختہ ارادہ تھا لیکن بہار کے طلباء کی عنایت سے اس سال یہاں گرمی نہ پڑے گی۔ یعنی مارچ ہی میں ہڑتالیں کر کر کے انھوں نے کالج اتنے دنوں تک بند رکھے کہ اب گرمی کی تعطیل کی گنجائش نہیں، اس لئے اب دلی پہنچ کر تو باتیں نہ کر سکوں گا۔ کانفرنس کے سلسلے میں آپ کے خط کا انتظار کروں گا.....

آپ کا ——— زکی انور

---

کلکتہ: ۷ مئی ۶۶ء

محترم مسٹر اے۔ تسلیم

آپ کے دونوں کارڈ مل گئے تھے۔ ایک تو جو آپ نے پرنسپل صاحب کی معرفت لکھا تھا اور دوسرا جو مس لے ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کے پتے پر منگوایا تھا۔ شکریہ، بہت بہت شکریہ!

قبلہ! یہ تو آپ ہر کارڈ میں لکھتے ہیں کہ طویل اور تفصیلی خط لکھوں گا، لیکن لکھتے کبھی نہیں۔ کیوں جھوٹ لکھتے ہیں، کیوں جھوٹ بولتے ہیں؟ جب کہ آج کل گلی گلی آپ مائیک پر یا بھرے بازار کے لونڈوں اور رکشا والوں کے منہ سے فلمی گیت کے یہ بول سنتے ہوں گے کہ جھوٹ نہ بولنا چاہئے اس لئے کہ پیل خدا کے گھر جانا ہے!!

حضرت! میں کسی حد تک منہ پھٹ واقع ہوئی ہوں جو صحیح بات ہے کہہ دیتی ہوں۔ برا نہ مانئے! آپ یقیناً یہ سوچتے ہیں کہ کیوں خواہ مخواہ دس یا پندرہ پیسے ضائع کئے جائیں، یا پھر یہ بھی کہ جوابِ جاہلاں باشد خموشی کے مصداق آپ میری جاہلانہ بکواس کا جواب خموشی سے دیتے ہیں .... حضور! آپ بھی میرا خیال ہے، انسان ہیں اور یقیناً کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی بات پر آپ کو بھی جھنجھلاہٹ ہوتی ہی ہوگی، یہ جھنجھلاہٹ انسان کا پیدائشی حق ہے جس سے کوئی بھی حکومت کسی کو باز نہیں رکھ سکتی۔ میں بھی اس نعمتِ عظمیٰ سے بھری پڑی ہوں اور جب کوئی مجھ سے جھوٹ بولتا ہے تو جیسے میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ لیکن آپ کو ان باتوں سے کیا مطلب؟ میں آپ کی ہوتی ہی کون ہوں۔ کوئی بھی تو نہیں؟ ہے نا!

آپ کے تشریف لانے کی خبر سے اتنی خوشی ہوئی جتنی شاید زندگی میں کبھی نہ ہوئی۔ اب میں نے تعطیل میں بنارس یا چنڈی گڑھ جانے کا پروگرام ختم کر دیا ہے۔ بس آپ کا انتظار کرتی رہوں گی اور اب اگر آپ نہ آئے تو آپ کو میری

ہائے لگے گی!

ہماری چھٹیاں شاید ہر اکتوبر سے شروع ہوں گی اور خدا غارت کرے صرف بارہ چودہ دنوں کی ہوتی ہیں۔ لیکن آپ کے آنے کے لئے تو یہ بھی بہت کافی ہیں!

مجھ سے ملنے میں آپ کو دشواری نہ ہوگی۔ آپ نے اپنی جن عزیزہ کا تذکرہ کیا ہے یہ جن سے ملنے میں آپ کو بہت دشواری پیش آئی تھی وہ یقیناً ہوسٹل میں رہتی ہوں گی۔ ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیوں سے ملنے میں بے شک دقت ہو سکتی ہے لیکن میں تو ایک الگ مکان میں رہتی ہوں۔ شہر کے ایک مشہور بیرسٹر ہیں شری بھگوان داس، انھیں کی کوٹھی کے ایک کمرے میں مقیم ہوں......

آپ یقیناً میرے بدلتے ہوئے پتوں سے تنگ آگئے ہوں گے لیکن شاید یہ آخری پتہ ہو ---

مس "کے"

معرفت شری بھگوان داس، ایم۔ اے۔ ال ال بی،
۲۔ ہری سن روڈ۔ کلکتہ

اور اب اس کمرے میں آکر مطمئن ہوں اور کہتی ہوں ---

اب قفس میں تڑپ نہ اے بلبل
تو ہے اور تیرا آشیانہ ہے!

میں نے اپنے ناگپور والے مکان کا نام "آشیانہ" رکھا تھا۔ اور اس کمرے کا نام میں نے قفس رکھا ہے! مجھے تو ہول ہوتا رہتا ہے یہاں۔ بہرحال مسز داس بہت ہی نیک، ہمدرد اور رحم دل خاتون ہیں۔ بہت ہی غمزدہ ہیں اور ہمیشہ رویا کرتی ہیں۔ اُن کی بارہ سال کی ایک بچی ہے اور بس!

وہ دیکھئے ایک شاگرد صاحبہ تشریف لے آئیں، ... جی ہاں میں نے یہاں آکر تھوڑا سا آپ کا پیشہ بھی اختیار کر لیا ہے۔ بی۔ اے فائنل کی دو لڑکیاں ہیں جو مجھے بور کرنے میں بڑی مستعد ہیں!

تو بتائیے کب تشریف لا رہے ہیں آپ؟ اور ہاں، اب آپ کی صحت کیسی ہے؟

"کے"

جالندھر: ۱۸ مئی ۶۶ء

"کے" خوش رہو!

تمہارا کرم نامہ، نیا پتہ اور "ہائے" ملے --- شکریہ!

تم نے تو یہ لکھا تھا کہ تم نے اپنا مضمون انگریزی ادب [illegible] اور ایم۔ اے کر رہی ہو، لیکن تمہارے اس خط سے پتہ چلا کہ تم [illegible] بے شک اس تحقیق کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم نے [illegible] پتہ نہیں کس کونے سے یہ راز ڈھونڈ نکالا ہے کہ میں طویل اور [illegible] اس لئے نہیں لکھتا کہ دس یا پندرہ پیسے خرچ کرنا پڑیں گے جب کہ [illegible] لکھا جا سکتا ہے ---- اب ایک کام کرو، ابھی سے [illegible] شروع کر دو اور ایم۔ اے کرتے ہی یہ مضمون ریسرچ کے لئے رجسٹر کرا لو ...... "خطوط کتابت میں معاشی پہلو" اس سلسلے میں غالب مرحوم بھی تمہاری [illegible] جواہر لال نہرو نے اپنی دختر کو جو طویل ترین خطوط لکھے تھے ان سے بھی تمہیں مدد ملے گی۔ انگریزی کا ایک ناول صرف خطوں پر ہی لکھا گیا ہے۔ میں نام بھول رہا ہوں اس کا بھی پتہ لگا کر مطالعہ کر لینا اور یہ خاکسار بھی اس حد تک ضرور مدد کرے گا کہ اپنے ایک دوست سے ملا دے گا، جسے خط لکھنے کا خبط ہے۔ وہ افسانے تو خیر خطوں میں لکھتا ہی ہے۔ سُنا ہے کہ وہ چاتا پھرتا، کھاتا پیتا اور [illegible] بھی سے خطوں میں پتہ نہیں لیے؟

مس "کے" سچی بات سننا چاہتی ہو تو وہ یہ ہے کہ خط و کتابت میں میں اے۔ بی۔ سی۔ ڈی کا قائل نہیں۔ تمہیں تمہارے [illegible] اور پورے نام سے [illegible] مخاطب نہ کر کے یہ "کے" لکھنا مجھے کتنا برداشت کرنا پڑتا ہے میں کہہ نہیں سکتا۔ ذہن پر تمہارا ایک عجیب سا نقشہ ابھر آتا ہے...... جیسے چوڑے سیاہ برقعے میں لپٹی، منہ تک چھپائے کوئی احمق سی لڑکی! نفسیاتی طور پر سوچی ہوئی طویل باتیں لکھتے وقت سمٹ کر مختصر ہو جاتی ہیں۔ اور پھر میں ایک پوسٹ کارڈ پر ہی اکتفا کر لیتا ہوں۔

اب تک تو یہی ارادہ ہے کہ کلکتہ پہنچوں گا اور تم سے ملوں گا [illegible]
خدا مالک!

"اے"

۱۸ مئی ۶۶ء

کامنی، میری آرزو --- پیار!

ابھی ابھی تمہیں ایک کارڈ لکھ چکا ہوں جو میز پر پڑا ہے اور اب پوسٹ کرنے کو بھیج دوں گا، اور اب یہ دوسرا خط لکھ رہا ہوں جو تمہارے نام لکھے گئے [illegible] خطوں کی طرح، کچھ دنوں تک میری جیب میں پڑا میرے دل کی [illegible] گا اور پھر میں اُسے اپنی جیب سے نکال کر نذرِ آتش کر دوں گا [illegible]!



بیسویں صدی دہلی

میں تمہیں چاہتا ہوں کہ تمہیں نہیں خط لکھوں، تمہیں تفصیلی خط لکھوں اور تمہیں وہ سب کچھ لکھ ڈالوں جو سب کچھ تمہیں نہ کہہ سکنے کی وجہ سے دل پر بوجھ بنتا جا رہا ہے لیکن میں تمہیں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا جب تم اپنا پیارا نام ظاہر کرتے ہوئے گھبراتی ہو یا شاید ڈرتی ہو کہ میرا یہ خط پا کر کس قدر بوکھلا اٹھو گی جو یقیناً ایک بے پیغام تیر ہوگا۔ اور جس خط میں مجھے کہتے ہوئے ہرگز ہچکچاہٹ نہ ہوگی کہ مجھے تم سے پیار ہے، تم میری آنند ہو، تم میری تمنا ہو، تم میری زندگی ہو اور تم .... اور تم میری کائنات ہو!

اپنے ہر اُس خط میں جو میں پوسٹ کرنے کے لئے نہیں لکھتا ہیں تمہیں نئے نئے اُن ناموں سے مخاطب کر لیتا ہوں جو "ک" سے شروع ہوتے ہوں، کبھی تو میں تمہیں کرونا لکھتا ہوں، کبھی پکار اٹھتا ہوں "کوشلیا"، کبھی کدم کے نام سے مخاطب کر لیتا ہوں، کبھی کمل کے نام سے اور آج کامنی کہہ رہا ہوں، کوئی تو تمہارا پیارا نام ہوگا۔ اور تب یقیناً میرے دل کی دھڑکنوں کی حد سے زیادہ بے بسی کچھ ضرور کم ہو جائے گی لیکن میں سمجھتا ہوں تم کرونا، کوشلیا، کدم، کمل یا کامنی وغیرہ ہرگز نہیں، تم کرانتی ہو۔ ہاں تم کرانتی ہو، تم ایک مجسم انقلاب ہو۔ پتہ ہے تمہیں کہ تم نے میری زندگی میں کیسے کیسے انقلاب برپا کر رکھے ہیں؟

میرا ایک شاعر دوست چودھویں کی رات کی چاندنی کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ نغمہ و نور کی بارش ہو رہی ہے اور میں اُس پر ہنس پڑتا تھا لیکن آج! --- آج میں خود اپنے آپ پر ہنس پڑتا ہوں جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر تم پاس ہوتیں تو یقیناً یہ چاندنی ایسی ہوتی جیسے شراب کا ایک دریا ہو اور ہم مخمور و مدہوش جانے کس سمت کو بہے چلے جا رہے ہیں.... مجھے کبھی کسی لڑکی کی گھنیری زلفیں ساون کی گھٹا نظر نہ آئیں لیکن آج تمہاری زلفیں جنہیں میں نے دیکھا تک نہیں میرے ذہن پر چھا گئی ہیں، اور کبھی کبھی کامنی یقین کرو، سچ مچ یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے اس پاگل پریم کا انجام سوچ کر میری آنکھیں برس پڑتی ہیں... اور کامنی! میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی کہ کوئی لڑکی اگر کسی کو نظر بھر کے دیکھ لے تو اُسے نشہ کیوں ہو جاتا ہے، لیکن تمہاری اُن آنکھوں نے مجھے پاگل بنا دیا ہے جن آنکھوں کو دیکھنے سے میں اب تک محروم ہوں۔ جانے کیا ہو جائے گا جب میں ان آنکھوں کو چوم لوں گا!.... اور سب سے بڑا حادثہ جو میرے ساتھ ہوا ہے کامنی! وہ یہ ہے کہ کل مجھے اپنے آپ پر فخر تھا کہ میں پتھر کا بنا ہوا ہوں، میرا دل پتھر کا بنا ہوا ہے۔ لیکن آج! --- آج تمہارے اُس حسن کے شعلے نے جسے میں کبھی نہ دیکھ سکا اس پتھر کو پگھلا دیا ہے۔

میں آؤں گا کامنی ضرور آؤں گا، کچے دھاگے میں بندھا چلا آؤں گا، لیکن کیا تم سوچ بھی سکتی ہو کہ وہ منظر کتنا کرب ناک ہوگا جب مجھے تمہارے رشتے کے کسی بھائی کا [illegible] کھانا پڑے گا --- پھر ہمت کرو کامنی اور سینہ تان کر لوگوں سے کہو کہ وہ جو آنے والا ہے میرا محبوب ہے! --- آپ کی اذیت تک احتیاط --- خط بھی لکھا جائے تو "ک" کو اپنا نام بھی لکھا جائے "اسے"... اور پھر شروع میں بہن "ک" اور آخر میں تمہارا بھائی "اسے"... تم سمجھو اس پابندی پہ تمہارا احتجاج چاہے خفا ہو لو لیکن آج کے خط میں میں نے یہ بھائی بہن کا تعلق ختم کر دیا ہے۔ اب اس "اسے" اور "ک" کی لعنت سے بھی نجات بخش دو کامنی --- کامنی پیار گناہ نہیں ہے، دھوکا گناہ ہے، فریب گناہ ہے اور گناہ ہے کسی کے جذبات سے کھیل جانا، ہماری نیت میں جب کوئی کھوٹ نہیں تو پھر یہ پردہ کیسا؟ یہ نقاب کیسا؟

بہرحال میں آؤں گا کامنی! اور ضرور آؤں گا۔ آج ہی سے میں تم سے ملنے کی تیاری شروع کر رہا ہوں۔ آج ہی سے میں اپنی دیوی کے چرنوں میں جھک جانے کو بے قرار ہوں

کاش.... میں یہ خط پوسٹ کر سکتا۔

بے بس

"اسے"

جالندھر - ۱۲ جون ۶۶ء

ڈیئر رشدی!

پچھلے سال میں محض یونیورسٹی کی فیس کی رقم نہ ہونے کی وجہ سے امتحان میں شریک نہ ہو سکا تھا تو تم نے مجھے بہت ڈانٹا تھا کہ مجھے تم سے فیس کی رقم لے لینی تھی۔ تمہاری اُس ڈانٹ کے خلوص کی چاشنی اب تک میرے ذہن میں موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اور نادم بھی میں ہمیشہ رہوں گا کہ تم جیسے دوست کی محبت مجھے کیوں نہ یاد آئی تھی۔ بہرحال یہ سب کچھ تو ایک حقیقت تھی جس کا دہرانا تم جیسے عدیم الفرصت بزنس مین کے لئے بوریت کا باعث ہو سکتی ہے اور میرے لئے فضول کیونکہ میں اپنوں کا احسان یاد کرنے کا قائل نہیں، یاد تو رکھنا پڑتا ہے غیروں کا احسان جس کا کبھی نہ کبھی بدلا چکا دیا جائے تو اچھا ہے۔

کہنے کی بات صرف اتنی سی ہے کہ جلد ہی میں ایک بہت بڑے امتحان سے گزرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ یہ امتحان نہ تو ایم اے کا ہے اور نہ کسی یونیورسٹی کا ہے۔ یہ امتحان اُس مکتب کا ہے جہاں بے بی لیلیٰ اور ماسٹر قیس پڑھا کرتے تھے۔ لو پیارے اب خوش ہو جاؤ! تمہارے بقول تمہارا یہ "کھوسٹ" بھی عشق کرنے لگا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے یار کہ یہ عشق میں نے کیا نہیں، بس بائی دی وے ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ محبت سچ مچ ہو ہی جاتی ہے، کی نہیں جاتی۔ میری "اُن" کا نام، پتہ، ذات

اور نسل و رنگ پیشہ وغیرہ تم اپنی عادت کے مطابق ضرور پوچھوگے، وہ درج ذیل ہے ——

نام : کے  پتہ : ہری من روڈ ۲۲ کلکتہ
ذات : علم نہیں  نسل : یقیناً آرین
رنگ : دیکھا نہیں  پیشہ : پڑھنا
وغیرہ : کہا نہیں جا سکتا۔

اور اب عرض ہے میری جان کہ دسہرے کی تعطیل میں اُن سے ملنا ہے، دسہرے میں بہت کم دن باقی رہ گئے ہیں۔ جلدی سے دو سو روپے کا ایک چیک عنایت کریں۔

بھائی کس حادثے کی خوش خبری سنادو کہ اب میں۔ قول اُن کے الو بیچارا نہیں رہا!

تمھارا اپنا
انیل کمار

کلکتہ۔ ۱۷ اگست ۶۶ء

"ے" صاحب!

میں سمجھتی ہوں آپ کو خواہ مخواہ رونے بسورنے کی عادت ہے۔ اب آپ یہ کہنے لگے ہیں کہ اے بی سی ڈی کے آپ خط میں قائل نہیں! پہلے آپ اس بات کے لئے پریشان تھے کہ آپ خط میں مجھے بہن اور اپنے آپ کو بھائی لکھنا نہیں پسند کرتے تھے۔ چلئے وہ بات تو خود بخود ہی ختم ہوگئی۔ عرصے سے آپ تو اپنے خط میں مجھے بہن اور اپنے آپ کو بھائی نہیں لکھتے۔ رہی اے بی سی ڈی کی بات، تو آپ اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کرسکتے کہ اس میں بہرحال ایک لطافت ہے۔ اگر آپ میں اتنی جمالیاتی حس نہیں کہ اس لطافت سے لطف اندوز ہوسکیں تو میرا کچھ نام رکھ دیجئے!

آپ نے حد کردی، اس بار خط کسی قدر تفصیلی تو ضرور ہے لیکن ہے بہر حال کارڈ پر ہی! شاید آپ نے میرے لئے ریسرچ کے بتلائے ہوئے مضمون —— "خط و کتابت میں معاشی پہلو" پر پہلے خود بھی کافی غور و خوض فرمالیا ہے۔ اتنی باریک تحریر میں کارڈ رنگنے اور آنکھیں پھوڑنے سے تو بہتر تھا کہ چار پیسے زیادہ خرچ کردیتے اور ان لینڈ لکھتے۔

میری کچھ اور سہیلیاں ہیں اور اُن کے بھی کئی قلمی دوست ہیں۔ میں کیا عرض کروں کہ اُن کے قلمی دوستوں کے پاس سے کتنے حسین خط آتے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت کاغذ پر لکھے ہوئے۔ کبھی کبھی سینٹ کی بہت ہی لطیف خوشبو میں بسے ہوئے اور کبھی کبھی لفافے کے اندر سے گلاب کی کئی پنکھڑیاں بھی برآمد ہوجاتی ہیں۔

اور کبھی الگ سے ایک پرزے پر کوئی رنگین شعر، ان لفافوں البتہ ٹکٹ غائب رہتا ہے، ایسا نہ ہو غائب ہوجائے کیونکہ رنگین لفافے زیادہ تر غائب ہی ہوجاتے ہیں۔

کلکتہ آنے کے بارے میں آپ کا ارادہ پختہ ہوا یا نہیں؟ میں نے صرف آپ کو جلانے کے لئے لکھ دیا تھا کہ صرف بارہ چودہ دنوں کی چھٹی ہوتی ہے۔ دسہرہ کا بہت ہی اہم تہوار ہے۔ کافی دنوں تک کالج بند رہے گا لیکن مجھے کچھ دنوں کے لئے ناگپور بھی جانا ہوگا۔ کالج ۶ اکتوبر سے بند ہو رہا ہے۔ اب فرمائیے آپ کب تشریف لا رہے ہیں! مہربانی کرکے پروگرام جلد لکھئے۔

لیجئے اب کے میں اپنا پورا نام لکھ رہی ہوں۔ آپ بھی اسی نام سے خط لکھ سکتے ہیں۔

کمود

جالندھر: ۲۸ اگست ۶۶ء

کمود!

تمھارا خط ملا، تم مجھے ایک نئی دنیا میں کھینچ لائی ہو، یہ رنگ و نور کی دنیا ہے، نغمہ و سرور کی دنیا ہے۔ میری نظروں کے سامنے یہاں سے وہاں تک جہاں تک نظر جاتی ہے رنگ برنگ کے رنگ پھیلے ہوئے ہیں۔ سارا عالم جگ مگ کر رہا ہے ایک ملکوتی نغمہ پھوٹنے لگا ہے اور میں مدہوش ہوگیا ہوں۔ یہ سب کچھ تم نے کیا کر دیا کمود! جانتی ہو! تم نے پتھر کے ایک بہت بڑے بُت کو پگھلا کر پانی کر دیا ہے۔ ایک غرور کا سر کچل ڈالا ہے اور تم نے ایک طلسم توڑ دیا ہے! شکریہ کمود شکریہ!

ایسی بات ہرگز نہیں تھی کمود کہ میں چار پیسے بچانے کے لئے تمھیں پوسٹ کارڈ پر خط لکھا کرتا تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھے وہ سب کچھ لکھنے کی اجازت نہیں جو میں لکھنا چاہتا ہوں اور میں جو کچھ لکھا کرتا تھا اُن کے لئے ہرگز ضروری نہیں تھا کہ انھیں پردے میں لکھا جائے —— ایک بات بتاؤں گا تو تم یقیناً میرے پاگل پن پر ہنسو گی کہ تمھیں کارڈ پر خط لکھنے کے بعد میں ایک بہت ہی طویل خط تمھارے نام لکھا کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اُن درجنوں خطوں کے ساتھ ہمیشہ انتہائی ظالمانہ برتاؤ کیا! بے چارے سب کے سب تباہ کئے جاتے رہے کوئی بھی تمھاری خوبصورت انگلیوں کا لمس نہ پاسکا بکتنے بدنصیب تھے وہ خطوط کتنا خوش قسمت ہے یہ خط!

کمود! میں نے تمھارے پاس آنے کی ساری تیاریاں مکمل کرلی ہیں، میں ضرور آؤں گا۔ البتہ یہ بات سوچ کر آج ہی کانپ اُٹھتا ہوں کہ آج تک میری دنیا جس اُمید پہ قائم ہے، اگر تم نے میری اُس اُمید کا طلسم توڑ ڈالا تو پھر کیا ہوگا!.....

کیا میں نعوذ بھی برداشت کر سکوں گا کمود! ...کمود! مجھے میرا پاگل پن شدید بہت شدید...... بہت شدید بنتا چلا گیا ہے۔ اور اب اگر میں دوبارہ تم سے جدا ہو گیا تو میں ٹوٹ کر ابھی نہ سکوں گا۔

کمود!..... کمود!..... ایک بات..... ایک بات کہوں! لیکن آج نہیں، پھر کبھی، لیکن اس خط کے جواب میں یہ ضرور لکھو کہ میں وہ 'ایک بات' لکھوں یا نہیں! الوداع

انیل کمار

کلکتہ: ۱۰ ستمبر ۶۶ء

مسٹر انیل!

تو آپ لفظوں کے بھی کنجوس ہیں، یہ شاندار کاغذ، یہ شاندار سینٹ، یہ بھینی بھینی خوشبو، لیکن خط! ... خط تو بس وہی ڈھاک کے تین پات! میرا خیال ہے آپ حد سے زیادہ احتیاط پسند واقع ہوئے ہیں۔ اتنی احتیاط کی کیا ضرورت، لکھئے وہ سب کچھ جو آپ لکھنا چاہتے ہیں، بھلا آپ اور مجھ سے اجازت لیں؟ کیوں گنا ہگار بناتے ہیں؟

گھبرائیے نہیں مسٹر انیل! میں آکاش کی کوئی اپسرا تو ہرگز نہیں لیکن کچھ اس حد تک بدصورت بھی نہیں ہوں کہ آپ کی وہ اُمید ٹوٹ جائے جس پر آپ کی دنیا قائم ہے!

یہ خط بس یہیں ختم کرنا ہوگا کارن یہ ہے کہ میں نے مسز بھگوان کے ساتھ شاپنگ کو جانے کا وعدہ کیا تھا اور اب وہ تقاضا کر رہی ہیں۔ — الوداع

کمود

جالندھر: ۱۹ ستمبر ۶۶ء

ڈیر کمود!

تمہارا خط ملا۔ خط تو خیر وہ نہیں تھا، لیکن کہنا تو پڑے گا خط ہی! اری کمود تم تو میری بات کو ایک اور ہی بات سمجھ بیٹھیں۔ کمود! میری دنیا تو صرف اس اُمید پر قائم ہے کہ مجھے ——— کہ مجھے میرے پاگل پن کے جواب میں تمہاری طرف سے جو کچھ ملے گا وہ میرے پاگل پن کو اور بڑھا دے گا نہ یہ کہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شانت کر دے گا۔ میرا خیال ہے اب تم ضرور سمجھ چکی ہوگی کہ میری دنیا پیار کی ایک اُمید پر قائم ہے، پیار کی ایک نظر پیار اور بس! کیا تم مجھے مایوس کر دوگی؟..... نہیں تم ایسا ہرگز نہ کروگی..... تم اتنی ظالم تو ہرگز نہیں ہو سکتیں۔

یہ خط مجھے بس یہیں ختم کرنا ہوگا، لیکن مجھے کسی کے ساتھ شاپنگ کے لئے نہیں جانا ہے، ہاں، کسی سے بدلا ضرور لینا ہے اور کسی کو بتا دینا ہے کہ تشنگی میں کتنا کرب ہوتا ہے، کیسی اذیت ہوتی ہے۔

تمہارا: انیل کمار

رشدی کے نام انیل کے ۷ اکتوبر کے خط کا ایک حصہ:۔

(مورخہ ۲۹ اکتوبر ۶۶ء)

.... اور پھر میرے پیارے رشدی! تیسرے دن میری دنیا یکلخت الٹ کر رہ گئی۔ چاند سے زہر برسنے لگا ساری کائنات میں گونجتی ہوئی شہنائیاں شانت ہو گئیں اور میری محبت کا تاج محل گر کر چکنا چور ہو گیا۔ ڈرائنگ روم میں کمود اپنی کسی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی اور میں اُس کے کمرے میں بیٹھا اُس کی سہیلی کو کوس رہا تھا کہ دن رات مسز بھگوان کی نگہبانی کی وجہ سے ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع ہی کب ملتا ہے۔ ایک موقع ملا بھی تھا تو کمود کی اُس باتونی سہیلی نے اُس کا ستیاناس کر دیا تھا: میں بُری طرح بور ہو رہا تھا اور اس بوریت کو ختم کرنے کے لئے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا کہ شاید کوئی نیا پرچہ ہی کہیں نظر آ جائے لیکن جن پرچوں کا وہاں انبار لگا ہوا تھا وہ پرانے نہ تھے تو میرے پڑھے ہوئے ضرور تھے۔ میں اٹھا اور کتابوں کی الماری سے میں نے ایک خوبصورت سی چھوٹی سی کتاب نکال لی۔ لیکن وہ کتاب، کتاب نہیں تھی ڈائری تھی اور ڈائری بھی تھی تو کمود کی تھی! یقین کرو رشدی نہ صرف یہ کہ یکلخت میری ساری بوریت ختم ہو گئی۔ وہ ڈائری پاکر میں کچھ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے مجھے سارے جہان کی دولت مل گئی ہو۔ بھلا کمود کے دل کے اندر جھانک کر دیکھنے کا اس سے بہتر اور کونسا ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اب میں بڑے اطمینان سے بیٹھ گیا اور ڈائری پڑھنے لگا۔

لیکن میرے پیارے رشدی .... پیارے رشدی! میں کس طرح تمہیں بتاؤں کہ اس ڈائری نے مجھے کتنی بلندی سے کیسے گہرے اور اندھیرے غار میں دھکیل دیا ——— ڈائری کے کچھ جملے جو میرے سینے میں تیر کی طرح اُتر گئے ہیں اور جن کی تکلیف میں کبھی نہ بھول سکوں گا یہ ہیں ——— پڑھو اور فیصلہ کرو رشدی کہ میں کیا کروں؟

ا۔ فیشن کی بہت ساری چیزوں کی طرح پیار بھی ایک چیز ہے جو ضروری ہے اس لئے میں نے بھی اب ایک حد پیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کسی پرچے میں میں نے کسی انیل کمار کی ایک کہانی پڑھی تھی، اُس کی کہانی کی تعریف کرتے ہوئے اسی کو ایک خط لکھوں گی۔

۲۔ انیل کمار تو میرے اندازے سے بھی بڑا احمق نکلا۔ لیکن مصیبت یہ:

کنندہ رنگین معطر اور طویل خط نہیں لکھتا۔ اسی لیے سہیلیوں پر کچھ خاص دھونس نہیں جمتی۔

۳۔ رجنی اور سلمہ انیل کمار کا معطر اور رنگین اور لمبا چوڑا خط دیکھ کر جل ہی تو گئیں اور میرا سر فخر سے اونچا ہوگیا۔ بے شک پیار کا یہ پہلو حد سے زیادہ مفید ہے کہ اچھے قسم کا پیار ہو تو سہیلیوں پر خاصی دھونس جمتی ہے۔ انیل کمار سے پیار قائم رکھنا ہی ہوگا۔

۴۔ لو وہ [illegible] آگئے! ہائے رام اب کیا کروں؟ خیر دیکھا جائے گا۔

۵۔ بے وقوف سمجھتی تھی کہ میں ایک سیدھی سادی لڑکی ہوں اور انیل کمار کے پیار کا جواب پیار سے نہ دے سکوں گی، لیکن میں نے انیل کمار پر بہر حال ظاہر کر دیا کہ میں اُس کے پیار میں مر رہی ہوں)۔

۶۔ آج مسٹر انیل نہیں گئے ۔ ۔ ہے بھگوان اب تو اس بلا کو دور کر!

پیارے رشدی! میں نے نمونے کے طور پر صرف آدھ درجن ٹکڑے پیش کئے ہیں۔ ویسے مجھے کئی گروس ٹکڑے زبانی یاد ہیں۔ اُف! وہ ٹکڑے جو مجھے کبھی چین سے جینے نہ دیں گے!

لیکن پیارے رشدی! اب تک تو جو کچھ میں نے لکھا وہ اُس انیل کمار کی حیثیت سے لکھا تھا جو انیل کمار فرہاد اور قیس کے گروہ میں شامل ہوگیا ہے۔ اور اب اُس انیل کمار کی بات سنو جو انسان کی برادری کا ایک فرد ہے —— میری جان! میں وہ ڈائری کمود کے ہاں سے اُڑا لایا ہوں اور اب اُس ڈائری سے ایک طویل ناول لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی ڈائری پتہ نہیں کہاں رکھ دی ہے اُسے تلاش کر لوں، پھر ناول لکھنا شروع کر دوں گا، واضح ہو پیارے کہ اُسی ناول کے معاوضے سے تمہارا قرض چکاؤں گا اس لئے تمہیں زلف کے سر ہونے تک جینا ہی پڑے گا۔ گھبراؤ نہیں بہت زیادہ دیر نہ ہوگی کیونکہ وہ لمبے لمبے خط جو میں پہلے ہی کمود کے نام لکھ لکھ کر صرف اپنے پاس رکھتا رہا ہوں، صرف اسی لئے لکھے گئے تھے کہ ایک طرف عشق آگے کی طرف بڑھتا رہے اور دوسری طرف ناول!

بھابی کو سلام کہو، پیارے پیارے بچوں کو پیار!

تمہارا

انیل کمار

کلکتہ: ۵ نومبر ۶۶ء

مسٹر انیل کمار! بہت سا پیار!

حضرت! آپ میرا دل لے گئے، خیر کوئی بات نہیں بے کار سی چیز تھی لیکن میری ڈائری بڑی قیمتی ہے .... ویسے وہ بھی کچھ زیادہ قیمتی نہیں، اس کے سوا کہ آپ اس کے ذریعے مجھے پہچان سکیں گے کہ میں ایک انسان ہوں، ایک عورت ہوں، شیریں یا لیلیٰ نہیں! لیکن ڈائری کے پلاسٹک کور کے نیچے ایک لفافہ سا بنا ہوا ہے جو خاص [illegible] کے لئے بنایا گیا ہے۔ لیکن میں اس میں اپنی سہیلیوں سے چھپا کر روپے رکھتی رہی ہوں۔ اب بھی اُس میں سو روپے کا ایک نوٹ موجود ہے ..... پلیز انیل کمار! مہربانی کر کے وہ روپے ٹی۔ ایم او سے بھیج دیجئے۔ بہت شکر گزار رہوں گی۔

آپ کی ڈائری جو میں نے آپ کے ٹرنک سے اُڑا لی ہے، بھیج دوں گی، ابھی تو مزے لے لے کر پڑھ رہی ہوں اور بہت خوش ہو رہی ہوں کہ میرا دوست آدمی ہے عاشق نہیں!

آپ نے بہت سی رومانی کہانیاں لکھی ہوں گی۔ اور میں نے بہت سی رومانی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ہمارا رومان اُن سب سے انوکھا ہے!

نوٹ:۔ ٹی۔ ایم او خرچ کاٹ کر روپیہ آج ہی بھیج دیجئے۔ بڑا کرم ہوگا۔

آپ کی

کمود

---

# غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے

شام تھی، تم تھے، میں نے چھیڑی غزل
جل اُٹھے مسکراہٹوں کے کنول

عالمِ نرمیِ نگاہ نہ پوچھ
جیسے پہلی شعاعِ صبحِ ازل

نگہِ شوخ، کوندتی بجلی
گیسوئے خم بہ خم سیہ بادل

ڈھلک آئے ہیں کس کے کاندھوں سے
یہ طلوع و غروب کے آنچل

زندگی سلسلہ سوالوں کا
نگہِ لطف ہر سوال کا حل

اے ہواؤ کھلائے ہیں کس نے
آسمانوں پہ مہر و مہ کے کنول

رہ نما اور کون ہے ایسا
اے دل اُس آنکھ کے اشاروں پہ چل

پیکرِ ناز اِک کرشمہ ہے
سر سے پا تک وہ رُوپ چھل بل کل

دیکھ اتنا نہ لڑکھڑا سرِ بزم
نگہِ مستِ یار کچھ تو سنبھل

وہ تری آرزو کی ٹھنڈی ہوائیں
وہ ترے غم کے صف بہ صف بادل

بیکراں زندگی کے لُوٹ مزے
سرحدِ سرخوشی و غم سے نکل

فاصلے درمیان ہیں کیا کیا
آنکھ اوجھل بھی ہے پہاڑ اوجھل

سر بسر عشق بارِ غم سے گراں
حُسن کیفِ نشاط سے بوجھل

اِس کو دار و رسن کی کیا حاجت
زندگی اپنا آپ ہے مقتل

سینۂ زخم زخم سے پھوٹی
کِشتِ غم کی ہری ہری کونپل

کہہ گئی گُل سے تیغِ موجِ نسیم
خون اپنا ہی اپنے مُنھ پر مَل

اِس کی اُفتادگی پہ تو مت جا
تیرا سایہ ہی تجھ کو دے نہ کُچل

دردِ منزل جو دل میں اُٹھتا ہے
بس اِسی درد کے سہارے چل

اُف کِس آتش کدے سے اُٹھتے ہیں
شامِ غم یہ دُھواں دُھواں بادل

جو اُفق سے اُمنڈتے آتے ہیں
غمِ جاناں کے ہیں وہ دَل بادَل

لاگ ہے درمیانِ عشق و جمال
کہہ سکے کون کِس نے کی ہے پہل

دل میں کیوں جوش زن ہے بادۂ عشق
آبگینہ کہیں نہ جائے پگھل

چھیڑ تو دوں میں کوئی نغمۂ درد
سب کے آرام میں پڑے نہ خلل

شعر تک سلسلے ہیں فردا کے
ہے ہر امروز کا اشارہ کہ "کل"

زندہ ہے ذرّہ ذرّۂ منزل
کاروانِ حیات دیکھ کے چل

اب سہارا نہیں رہا کوئی
زندگی سے کہو کہ اب تو سنبھل

سب کے بس کی نہیں سیاستِ عشق
دیوتا بھی تو جھانکتے ہیں بغل

نکلی اِک عُمر کی شناسائی
سامنا جب ہوا ہے پہلے پہل

جو نہ مانے فراق کو، اُس سے
کہہ دو کہہ لائے ایک ایسی غزل

افسانہ

# دلِ ریزہ ریزہ

شعیب شمس۔ ایم۔ اے

صفدر منزل، کریم چک، چھپرہ (بہار)

۱۰ مارچ ۶۷ء

محترمی! تسلیم و نیاز

اس سے پہلے تیسے بھیج چکا ہوں۔ اب اُس کے ریزے ارسالِ خدمت ہیں۔ ان ریزوں میں اگر زندگی کی شبیہ آپ کو نظر آجائے اور اُس کی بے بسی و بے چارگی آپ کو متاثر کرے تو میں سمجھوں گا میری کاوش رائگاں نہیں گئی ——— اپنی گرانقدر رائے سے نواز کر ممنون فرمائیں ...

آپ کا اپنا ——— شعیب شمس

"یہاں اندھیرے میں بیٹھی کیا کر رہی ہو زیبی ڈارلنگ؟"
"خاکوں میں رنگ بھرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"
"لیکن مجھے تو کینواس کہیں بھی نظر نہیں آتا۔"
"زندگی کا کینواس ایسا نہیں کہ اِس چھوٹے سے نہاں خانے میں سما سکے۔"
"لیکن روشنی تو کر لی ہوتی۔ جو خاکے اندھیروں میں ترتیب دئے جاتے ہیں وہ بھی دھندلے ہی دھندلے ہوتے ہیں ——— " اور تم نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کر دیا تھا ——— تم نے ٹھیک ہی کہا تھا سیما کہ تاریکی سے زیادہ اُنسیت نہیں ہونی چاہئے، ورنہ زندگی کے ہر موڑ پر سیاہ بُت ہی نظر آتے ہیں۔ عجیب عجیب سی شکل و صورت والے بُت! اُن کی بڑی بڑی خوفناک آنکھیں ——— تو بہ جیسے کھا ہی تو جائیں گی ——— میں نے تمہاری باتوں کو مذاق میں اُڑا دیا تھا! اِس لئے کہ مجھے اپنی وفاؤں پر بہت اعتماد تھا۔ میں یہ سمجھتی تھی جیسے میں اپنی وفاؤں کے سہارے ساری کہانیوں کو پلٹ دوں گی۔ لیکن وہ میری بھول تھی سیما! زبردست بھول ——— جس سے کہانی تو کیا پلٹتی خود ہی لمبی لمبی لپٹ گئی اور اُس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر راتوں کی تنہائی میں سسکیاں بھرتی رہتی ہوں۔ گھنٹوں خدا کے حضور میں گڑ گڑا گڑ گڑا کر موت کی دعائیں مانگتی ہوں۔ لیکن شاید موت کو بھی مجھ پر رحم نہ آیا یا بابِ قبول تک میری دعائیں ہی نہیں پہنچ پاتیں۔ میرا مرض بھی مجھ سے دُور بھاگتا جا رہا ہے اور میں صحت یاب ہو رہی ہوں۔ جتنی زیادہ موت کی خواہش ہوتی ہے اُتنی ہی تیزی سے زندگی کے آثار نظر آتے جا رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے سیما تم ہی بتاؤ نا؟ ——— لیکن تم مجھے اب کیوں مشورے دینے لگیں تم تو مجھ سے ناراض ہو نا۔ بہت زیادہ خفا ہو اور محض ذرا سی بات پر محض اس لئے کہ میں نے تمہیں اُس دن بُری طرح جھڑک دیا تھا جب تمہیں یہ خبر ملی تھی کہ برسوں کی لگی لگائی نسبت کو شاہد نے چشم زدن میں ختم کر دیا۔ تمہیں شاہد کی اس حرکت سے بہت صدمہ ہوا تھا۔ تمہیں کیا سب ہی پریشان اور متفکر تھے۔ امی جان نے تو بلک بلک کر روتے بُرا حال کر لیا تھا اور مجھے گلے سے لگا کر گھنٹوں روتی رہی تھیں۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس دن میری آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے تھے، میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی تو نہ ٹپکا تھا اور اچھا ہی ہوا ورنہ میں کہیں کی نہ رہتی۔ دیکھنے والے یہ سمجھتے شاہد سے بچھڑ جانے کا مجھے بہت زیادہ صدمہ ہو۔ صدمہ تو ضرور تھا لیکن یہ بھی کیا ضروری ہے کہ ہر صدمہ کا اظہار انسان آنسوؤں ہی سے کرے۔ ابو جان بھی برسوں کے مریض نظر آ رہے تھے ——— لیکن تم؟ ——— میں تو تمہیں ہی دیکھ کر کانپ گئی تھی ——— اُف ——— غصہ کی شدت اور صدمے کے ملے جُلے جذبات نے تمہیں بالکل سُرخ انگارہ بنا دیا تھا۔ میں وہاں سے کھسک آئی پھر اُسی تاریک کاریڈور میں جہاں میں برابر بیٹھا کرتی تھی۔ تم نے آکر آہستہ سے میرے بالوں میں اپنی اُنگلیاں پھنسا دیں۔ اگر میں تمہارے قدموں کی چاپ سے تمہیں پہچان نہ جاتی تو اِس طرح بالوں میں اُنگلیاں پھنسانے سے شاید میں کسی اور ہی غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ——— ہاں بشاہد اُسی کاریڈور میں ایسا کئی بار کر چکے تھے اور میں شرما جاتی تھی۔ بیر بہوٹی کی طرح ——— بالکل چھوئی مُوئی سی ہو جاتی تھی۔

"جانتی ہو بے خیالی میں میں ایسی بات کیوں کر جاتا ہوں؟" وہ پوچھتے۔

"بھلا کیوں؟" میں مجسم سوال بن جاتی تھی۔ اس لئے کہ ایسے موقعوں پر حلق سے کم ہی آواز بھی تو نکلتی تھی۔ نہ جانے کس ویرانے میں کھو جاتی تھی۔

"تمھاری ان جھکی جھکی حیا آلود پلکوں پر کانپتا شرمیلا رقص دیکھنے کے لئے" یہ میری پلکیں کچھ اور جھک جاتی تھیں ——— ایسا خود بخود ہو جاتا تھا سیما نہ جانے کیوں؟ حالانکہ شاہد سے میں نے کبھی پردہ نہیں کیا اور نہ ان کے سامنے خود کو سنبھالے رہی۔ بلکہ ہم تو کئی بار ایک دوسرے سے جھگڑ بھی چکے تھے۔ بس ذرا ذرا سی باتوں کے لئے۔ وہ کہتے۔ گوری رنگت والوں پر فالسئی رنگ خوب جچتا ہے، اور میں سیاہ رنگ پر زور دیتی۔ بس اتنی سی بات پر نوک جھونک شروع ہو جاتی اور تمھیں یا تہمینہ کو بیچ بچاؤ کرانا پڑتا۔ اس قدر بے تکلف ہونے کے باوجود انھوں نے جب بھی میرے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں میں بالکل گاؤدی سی ہو جاتی تھی۔ تُم یہ خود ہی کہہ سکتی ہو۔

اس کاریڈور میں بالکل اسی انداز سے تم نے بھی میرے بالوں میں انگلیاں پھنسا رکھی تھیں۔ اس لئے کہ تم میرے ہر راز سے واقف تھیں۔

"سیما! بالوں میں اس طرح انگلیاں نہ پھنسایا کرو۔ میں ان حالات کو بھی بھول جانا چاہتی ہوں جن سے ذرا بھی لگاوٹ کی بو آتی ہے۔"

"شاہد نے تمھیں بہت دُکھ دیا ہے نا نجی؟"

"نہیں سیما! شاہد نے نہیں یہ دُکھ میں نے خود ہی مول لیا ہے۔ سارا قصور میرا ہے۔"

اور میری اتنی سی بات پر تم بُری طرح بپھر اُٹھی تھیں۔ تم شاہد کی ہمدردی میں ایک لفظ بھی سُننا نہیں چاہتی تھیں اور اسی لئے تمھارے منہ میں جو آیا تم بکتی چلی گئیں۔ میں نے تمھیں بالکل نہ ٹوکا تھا۔ تمھیں شاہد کی حرکت پر غصہ ہی اس قدر آ گیا تھا۔ لیکن جب تم نے شاہد کو ان پڑھ، جاہل اور گنوار عورتوں کی طرح کوسنے دئے تو مجھے بہت بُرا لگا تھا اور میں نے تمھیں بُری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ تمھیں میری بات بہت بُری معلوم ہوئی۔ اتنی بُری کہ تم فوراً چلی گئیں۔ ایک منٹ بھی نہ رکیں اور اس کے بعد تم نے آج تک مجھے اپنی صورت بھی نہ دکھائی۔ تمھارے جانے کے بعد میں بہت روئی تھی سیما بہت روئی تھی۔ اتنا روئی اتنا روئی کہ کئی دنوں تک میری آنکھوں میں تکلیف رہی ——— لیکن میں آج بھی مُصر ہوں کہ میں حق بجانب تھی اور تمھاری بری باتوں کی ضد سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ——— میں نے شاہد کو دل و جان سے چاہا تھا۔ دل کی انتھاہ گہرائیوں سے، جذبات کی بے پناہ شدت سے۔ بھلا میں یہ کیسے برداشت کرتی کہ کوئی انھیں بُرا کہے۔ ان کے بُرے دنوں کی تمنا کرے۔ میں آج بھی شاہد سے

اُتنا ہی پیار کرتی ہوں جتنا اُس وقت کرتی تھی۔ آج بھی وہ مجھے مل جائیں تو انھیں دیکھ کر مُسکرا دوں۔ میرا غم دور ہو جائے اور شاید یہ تھوڑی طرح کا بکھا بکھا سا ہے۔ تم ہی سوچو سیما! جس شخص نے مجھے کانٹوں کا بستر دیا اس سے میں آج بھی اسی شدت سے پیار کرتی ہوں لیکن تم نے میرے ناکردہ گناہوں کی ایسی سخت سزا دی کہ آج تک مجھ سے ناراض ہو ——— ابو جان کے انتقال پر بھی تم نہ آئیں حالانکہ ہم دونوں کے گھروں میں چند فرلانگ ہی کا تو فاصلہ ہے ——— دلوں کی قربت تو طویل فاصلوں کو بھی ختم کر دیتی ہے لیکن تم سے یہ معمولی سا فاصلہ بھی نہ ختم کیا جا سکا ——— میری علالت کی خبر سُن کر خاندان کے سارے افراد آئے، ساری کی ساری سہیلیوں نے ایک جمگھٹا لگا دیا۔ سب کے چہروں سے وحشت برس رہی تھی۔ لیکن نہ آئیں تو تم ——— حالانکہ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ لیکن تم نے میرے یقین کو بڑا زبردست صدمہ پہنچایا، بڑی کاری ضرب لگی تھی مجھے اس دن ——— میرا یقین اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور میں بلک پڑی ——— ہاں سیما! مجھے زندگی میں پہلی بار اپنی بے بسی اور کم نصیبی پر رونا آیا تھا۔ شاید تم شاہد سے زیادہ بے وفا ہو۔ شاید کیا یقیناً تم نے شاہد سے زیادہ بے وفائی کا ثبوت دیا تھا ——— میری بیماری کی خبر سُن کر تو شاہد نے بھی لندن سے ہمدردی کے چند الفاظ لکھ بھیجے تھے۔ لیکن تم سے وہ بھی نہ ہو سکا ——— کیا میں اتنی بُری ہوں میری جان؟

تمھیں یاد ہے ایک مرتبہ جب میں اس سے بھی پہلے بہت بُری طرح بیمار پڑی تھی تو کئی راتیں تم نے میرے سرہانے بیٹھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی تھیں اور پھر جب میں خطرے سے بالکل باہر آ چکی تھی اور ڈاکٹروں نے میری زندگی کی ضمانت دے دی تھی تو شاہد بھی چھٹیوں میں کالج سے آ گئے تھے۔ تم ویسے ہی میرے سرہانے بیٹھی تھیں اور شاہد نزدیک ہی کرسی پر بیٹھے تھے۔ تم نے کہا تھا۔

"شاہد بھائی! نجی کا علاج آپ ہی کیوں نہیں کرتے۔ آخر آپ بھی تو ڈاکٹر ہی ہیں؟"

"ابھی کچا ہوں۔ ہاں! کالج سے نکلنے کے بعد یہ اگر بیمار پڑیں تو شاید میں ہی علاج کر دوں۔"

"تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ اسی طرح بیمار پڑتی رہیں؟"

"کم از کم آپ کی طرح تیمارداری کرنے کا موقع تو ملے گا۔"

شاہد بھی تمھاری تیمارداری سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور برابر تمھاری تعریفیں ہی کیا کرتے تھے۔

"تم بہت ہی خوش نصیب ہو نجی!"

"وہ کیسے؟"

"تمھیں سیما جیسی وفادار اور خوش اخلاق بیوی جو مل گئی ہے۔"

شاہد کی یہ عادت تھی کہ وہ بات کرتے کرتے میرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھنسا دیتے تھے۔ مجھے بھی بہت سرور ملتا تھا۔ میں خوابوں کی حسین دنیا میں کھو جاتی تھی۔

"زیبی! میں تمھاری ان حیا آلود پلکوں کو چومنا چاہتا ہوں۔"

اور شاہد کی اس عجیب سی خواہش پر میں لرز جاتی تھی میرے انگ انگ میں درد سا ہونے لگتا ——— اور ایک دن تو شاہد نے حد ہی کر دی۔ اس نے اپنے گرم گرم جلتے ہوئے ہونٹ میری پلکوں پر رکھ دئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے آنکھوں میں جلتی ہوئی سلائیاں پھیر دی ہوں۔ لیکن اس وقت میں بھی بے خودی ہو گئی تھی اور شاہد کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھے ہوئے بہت دیر تک کوٹ کے کالر میں لگے ہوئے گل مہر کی خوشبو سونگھتی رہی۔

شاہد جانتے تھے کہ گل مہر میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اسی لئے وہ جب بھی میرے سامنے آتے تو کوٹ کے کالر میں گل مہر لگا ہوتا اور جانے کے وقت وہ پھول شاہد کے کالر سے نکل کر میرے جوڑے میں آ جاتا اور پھر میں انھیں بہت حفاظت سے رکھ دیتی۔ میرے پاس ابھی تک بیسوں پھول جمع ہو چکے ہیں سیما! سوکھے ہوئے پھولوں میں نہ جانے کیوں اب بھی بہت خوشبو ہے۔ اس سینی ٹوریم میں بھی شاید گل مہر کے پودے ہیں۔ نرس ہر شام گل مہر کا ایک گلدستہ میرے سرہانے رکھ جاتی ہے۔ پتہ نہیں اسے میری پسند کیسے معلوم ہو گئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھنے کی بارہا کوشش کی۔ لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ ہو سکتا ہے گل مہر اس کی بھی کمزوری ہو اور اگر کہیں کچھ یادیں اس سے وابستہ ہوئیں تو ماضی کے دھندلکے نرس کے لئے بہت ہی اذیت ناک ثابت ہوں گے۔

لیکن اگر تم ایک دن کے لئے بھی آ جاؤ تو میں تمھیں گل مہر کا ایک حسین گلدستہ تحفہ میں پیش کروں گی۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔ وہ میری آخری یادگار ہوگی اور آخری ملاقات بھی۔ اس لئے کہ میں اب اس دنیا میں زیادہ دنوں کی مہمان نہیں ہوں۔ بس اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ اپنی بربادی وقدر کر کے اگر مل جاؤ تو شاید میں سکون سے موت کی آغوش میں چلی جاؤں ورنہ مجھے اس نامراد موت کا بھی بہت صدمہ ہوگا اور میں ایسی موت نہیں مرنا چاہتی سیما ——— مرنے سے پہلے تم سے ملنا چاہتی ہوں، کچھ کہنا چاہتی ہوں، کچھ سننا چاہتی ہوں ——— بیتے دنوں کی باتیں۔ شادی کی باتیں۔ سہاگ رات کی اٹکھیلیاں۔ ننھے منے بچوں کی ہڑبونگ ——— ان کی شرارتیں۔ تمھارے سرتاج صاحب کی مسکراہٹیں۔ ان کی پیار بھری باتیں۔ یہ سب کچھ تمھاری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔ میری یہ آخری خواہش پوری کر دو سیما ڈارلنگ ——— اور اگر پوری نہ کرنا چاہو تو الوداع ——— الوداع میری سیما! میری جان!!

——— زیبی

---

"زیبی! میں آ گئی ہوں۔ میری خطائیں معاف کر دو اور یہ دیکھو تم سے ملنے کون آئے ہیں۔ غور سے پہچان لو زیبی! تمھارا مجرم تمھارے سامنے ہے۔"

زیبی نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ گلے میں ہار ڈالے شاہد کھڑے تھے۔ کوٹ کے کالر میں اب بھی گل مہر مسکرا رہا تھا ——— اور جب وہ جانے لگے تو اس نے کالر سے پھول نکال کر زیبی کی زلفوں میں لگا دیا۔

"آخری تحفہ؟"

"نہیں زیبی! آخری تحفہ تو میں تمھیں اس دن دوں گا جب تم اس سینی ٹوریم سے صحت یاب ہو کر نکلو گی۔"

"کیا میرے اچھے ہونے کی بھی امید باقی ہے؟"

"میری دو سال کی محنت رائیگاں تھوڑے ہی جائے گی۔"

"تو کیا؟ ... آپ؟ ..."

"ہاں زیبی! اس سینی ٹوریم کا انچارج میں ہی ہوں۔ محض تمھاری وجہ سے اس وارڈ میں نہ آتا تھا۔ غصہ میں کہیں دوا کی شیشیاں نہ پھینک دو۔"

"یہ گل مہر؟ ... یہ گلدستہ؟ ..."

"میں ہی بھجوا دیتا تھا۔"

"آپ کی بیوی۔ آپ کے بچے؟"

"جب شادی ہوگی تو انھیں بھی دیکھ لینا۔ اب تک صرف اپنا مستقبل سنوارنے کی امید میں تنہا ہوں۔ شادی سے انکار کی بھی خاص وجہ یہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ تم زندگی کی آخری سانسوں تک ایک موہوم امید کے سہارے میرا انتظار ضرور کرو گی ——— اور اب؟ ——— اب تو مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو تم جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔"

اور جب زیبی صحت یاب ہو کر سینی ٹوریم سے جانے لگی تو اس نے سینی ٹوریم کے لان میں گل مہر کا ایک اور پودا لگا دیا۔

"نرس! اس پودے کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا تمھارا فرض ہوگا۔" زیبی نے کہا۔

"یس میڈم! یہ پودا مجھے آپ کی یاد دلاتا رہے گا۔"

سیڑھیوں پر شاہد سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں میں گل مہر کا گلدستہ تھا۔

"نئی زندگی مبارک ہو زیبی!"

"کسے؟"

"تمھیں۔"

"نہیں شاہد۔"

"کیوں؟"

"ہم دونوں کو!"

"سچ؟"

"ہاں۔"

"تم نے مجھے معاف کر دیا؟"

"میں خفا ہی کب تھی؟"

اور زیبی شاہد کی بانہوں میں اس طرح جھول گئی جیسے پانی کے بوجھ سے کیلے کا پتہ!!

# غزلیں

## قطبؔ سرشار

عرضِ غم کا صلہ نہیں، نہ سہی — کوئی درد آشنا نہیں، نہ سہی

اپنی فطرت ہے بندگی اے دل! — اپنا کوئی خدا نہیں، نہ سہی

کچھ جفائیں بھی کم نہیں قاتل! — تم میں خُوئے وفا نہیں، نہ سہی

برق گرتی ہے، دل دھڑکتا ہے — یہ تمھاری ادا نہیں، نہ سہی

کیا ہی شیریں چٹک ہے غُنچوں کی — کیا یہ تیری صدا نہیں، نہ سہی

ہیں ستارے ہماری خاکِ پا — ہم تری خاکِ پا نہیں، نہ سہی

کتنی دلکش ہے تیری گُلبدنی — ہاں یہ گُل کی قبا نہیں، نہ سہی

عشق تو حُسن کا ہے شیدائی — آپ گر آشنا نہیں، نہ سہی

ٹھوکریں ہی بنیں گی راہ نُما! — اب کوئی رہ نُما نہیں، نہ سہی

رُوئے تاباں کا نُور پھیلا ہے — چاندنی کی رِدا نہیں، نہ سہی

اُن کی خفگی حسین ہے سرشار — درحقیقت خفا نہیں، نہ سہی

## حجابؔ ترمذی

پھر ستایا ہے تشنہ لبی نے — جا رہا ہوں اُن آنکھوں سے پینے

میرے ہی دل کی گہرائیوں سے — مجھ کو آواز دی ہے کسی نے

مے کے بدلے کبھی میکدے میں — خُون کے گھونٹ پڑتے ہیں پینے

پھُول چُنتے نہ کانٹوں میں پھنستے — درد بخشا ہے دل بستگی نے

ٹُوٹ جاتے ہیں دل ٹھیس کھا کر — کِتنے نازک ہیں یہ آبگینے

کر دیا آج اپنوں سے بدظن — پُوچھ کر حال اِک اجنبی نے

اُن کو جی بھر کے ہم دیکھ لیتے — اِتنی فُرصت نہ دی زندگی نے

دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا — آج انساں کو بے رہ روی نے

دیدہ و دل کا عالم نہ پُوچھو — عین طُوفاں میں ہیں یہ سفینے

بحرِ غم میں حجاب اِک قدم بھی — ساتھ چھوڑا نہ بے چارگی نے

# جوالا مکھی

————— م۔ک۔ مہتاب۔ ایم۔ اے

ای۔جی۔۹۸۴۔ پریم نگر۔ جالندھر

۲۸ر فروری ۶۷ء                    مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

آپ کا دلی بھی عجیب شہر ہے کہ جتنے قریب ہوتے جائیں اتنا ہی فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ ملنے کی خواہش کے باوجود نہ مل سکا۔ ——— آپ سے معلوم کرنا تھا کہ پاکستان میں آپ خریدار کس طرح بناتے ہیں۔ میرے ایک دو کرم فرماؤں نے پوچھ بھیجا ہے۔ کیا آپ تحریر کریں گے کہ وہ کس طرح "بیسویں صدی" کے سالانہ خریدار بن سکتے ہیں ——— ایک افسانہ "جوالا مکھی" بیسویں صدی کے لئے بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ ملک اور بیرون ممالک میں "بیسویں صدی" کے پرستار شرف قبولیت عطا کریں گے ... خیر اندیش ——— م۔ک۔ مہتاب

"سردیوں کی اس رات جب برفیلی ہوائیں چلتی تھی جیسے فضا میں برچھیاں چل رہی ہوں۔ پورنماشی کا چاند سیاہ بادلوں کی اوٹ میں بھاگا جا رہا تھا۔ سریتا! میں اس کوٹھی سے بھاگ نکلا۔ راستے میں جنگلی جانوروں کی خوفناک آوازیں سنائی دیتی تھیں، درخت جھول جھول کر ٹکراتے تھے۔ ندی کا پانی اچھل اچھل کر بہتا تھا۔ جب بادلوں کی گرج اور ہوا کی آواز رکتی تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے موہنی اس کوٹھی کے بیرونی دروازے کی سلاخوں کو پکڑ کے زور زور سے چیخ رہی ہو۔ آوازیں دے رہی ہو۔ اس کی سسکیاں زنجیر کے حلقوں کی طرح پھیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہوں اور آ کر میرے پاؤں کو جکڑ لیں گی۔ پھر میں کبھی شہر میں نئی ملازمت کے لئے نہ جا سکوں گا۔ میں پوری قوت سے پھر بھاگنے لگا تاکہ کسی طرح پل پار کر جاؤں اور جب میں ندی سے پار ہوا تو طوفان کے ایک زوردار تھپیڑے نے لکڑی کے اس پل کو اکھاڑ کر ندی میں پھینک دیا۔

"ہوں۔ یہ کیا ہے؟" سریتا نے آنکھیں ملتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔ شاید کوئی بھیانک خواب تھا۔ اس نے بیڈ لائٹ روشن کی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ راجندر اس کے قریب ہی پلنگ پر سویا خراٹے لے رہا تھا۔ اس کے پریشان بال اس کی سرخ پیشانی کو اور بھی روشن کر رہے تھے۔ کیسا خوبصورت جوان ہے راجندر۔ کتنی خوش نصیب ہے وہ۔ جہاں بھی وہ جاتی ہے سب لوگ اس کے شوہر کی تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ کتنی ہی لڑکیاں دل مسوس کر رہ جاتی ہیں" سریتا باؤلی ہو اٹھی۔ اور وہ فخر سے پھولی نہیں سماتی۔ کیسا جوان، محنتی، وجیہہ اور شریف ہے وہ۔ جب صبح اٹھ کر انگڑائی لیتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے ہاتھ پاؤں سیدھے کر رہا ہو۔

سریتا کا جی چاہا کہ جھک کر راجندر کی پیشانی چوم لے لیکن اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ کہیں ایسا نہ ہو راجندر کی نیند میں خلل پڑے اور پھر وہ سو بھی نہ سکے۔ وہ پہلے ہی رات گئے تک اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ سریتا نے بتی گل کر دی اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔

پھر وہ آنکھیں موند کر ہاتھ باندھ کر اپنے والد کا شکریہ ادا کرنے لگی جن کی مہربانی سے اس کی دلی تمنا پوری ہو گئی تھی ورنہ وہ راجندر کے قابل کہاں تھی۔ پیسہ کتنی بڑی چیز ہے۔ اگر پیسے سے راجندر حاصل ہو سکتا ہے تو پھر دنیا میں اور کیا نہیں ہو سکتا؟

پھر اسے وہ دن یاد آیا جب اس نے نوٹ بک آگے بڑھا کر راجندر سے آٹوگراف مانگا تھا۔ وہ یونیورسٹی چیمپین شپ جیت کے آیا تھا۔ کالج میں اس کے نام کی دھوم مچ گئی تھی۔ تقریب میں تو اور اتنے زیادہ لڑکے لڑکیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ اس لئے بس تنہائی میں ہی جب وہ برآمدے میں سے گزر رہا تھا یہ درخواست کی تھی۔ راجندر نے ہنستے ہوئے اس کے بالوں کو ہاتھ میں دبا کر کہا تھا "یوں لوگوں کا دماغ

خواب نہیں دیکھتے۔ میں کوئی فلمسٹار ہوں۔ میرے آٹوگراف سے کیا مطلب؟"

"یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ ہر آدمی کا اپنا آسمان ہوتا ہے اور اپنے ستارے!"

وہ اِس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ راجندر مُسکرانے لگا اور سگریٹ لان میں پھینک کر اُس کی نوٹ بُک پر دستخط کر دیئے۔

اُس دن وہ ایک نشے میں مدہوش رہی۔ کتنی مضبوطی اور کتنا خلوص تھا راجندر کی گرفت میں جیسے ایک ہی جھٹکے میں اُس نے اُسے بے حس کرکے مکھی کی طرح مکڑی کے جالے میں لٹکا دیا ہو۔ پھر وہ چاہنے کے باوجود کبھی راجندر سے بات نہ کر سکی۔ وہ راجندر کو دوسری لڑکیوں سے کھیلتے باتیں کرتے دیکھتی۔ اُس سے بدرجہا اچھی اور حسین لڑکیاں شوخ و شنگ تتلیاں کالج میں تھیں جو راجندر کو گھیرے میں لئے رہتی تھیں لیکن کسی کو کھونا یا پانا تو اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔

اور مقدر نے اُس کا ساتھ دیا تھا۔ اُس نے تو ایک دن اپنی ماں سے سرسری طور پر راجندر کا ذکر کیا تھا لیکن سیٹھ آنند سروپ نے دُنیا دیکھی تھی۔ انھیں اپنی دولت اور عزت کی صلاحیتوں کا علم تھا۔ ان کے کارخانے میں ایک نیا ڈیپارٹمنٹ کھل رہا تھا۔ جس کے لئے ایک بزنس ایگزیکٹو کی ضرورت تھی۔ تنخواہ نہایت معقول اور مستقبل بہت روشن تھا۔ انھوں نے یہ پیش کش راجندر تک پہنچائی۔ سریتا کو یقین نہ تھا کہ راجندر یہ پیش کش قبول کرے گا کیونکہ اُس کے علم کے مطابق تو وہ کسی غیر مُلک میں جانے کے لئے وظیفے کی تلاش میں تھا۔ لیکن اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا جب اُس نے دیکھا کہ راجندر اُس کے والد سے ملنے ان کی کوٹھی پر آیا ہوا ہے۔

سیٹھ جی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ ملازمت کے ساتھ ہی انھوں نے راجندر کے والد سے بات کی اور سریتا سے شادی کا سُنہری جال بچھا دیا۔ پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی، مال دولت، کوٹھی کار، شادی کے بعد مزید تربیت کے لئے غیر مُلکی دورہ۔ جال پھینکنے والے نے فرار کے تمام راستے بند کر دیئے تھے اور سریتا نے دیکھا کہ وہ چنچل پرندہ جو قریب آتے ہی پھدک کر کسی اور شاخ پر جا بیٹھتا تھا۔ ملازم ہونے کے تین ماہ بعد ہی سونے کی تیلیوں والے اِس پنجرے میں بڑے آرام سے بیٹھا چہک رہا تھا!

پھر اُن دونوں نے مل کر کیسا خوبصورت گھر بنایا۔ راجندر کو گھر کی آرائش کا اُس سے بھی زیادہ شوق تھا۔ راجندر کو مزید تربیت کے لئے باہر بھیجا گیا وہ بھی اُس کے ساتھ تھی۔ سائے کی طرح چپکی ہوئی جیسے کسی گراں قدر ہیرے کی حفاظت کر رہی ہو۔ راجندر اُسے کتنا چاہتا تھا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ راجندر جس کی نگاہ کبھی اچھی لڑکیوں پر نہیں ٹھہرتی تھی اُسے اتنا پیار کرنے لگے گا۔ لیکن یہ تو اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ ہیرے کو خریدار کی انگوٹھی میں قیام کرنا ہی پڑتا ہے۔

راجندر کی طبیعت کی سادگی، خلوص اور پیار کی گرمی نے سریتا کو دُنیا کی باقی ہر چیز بھول جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ایک کامیاب کھلاڑی اور بہترین [illegible] ایک نہایت کامیاب شوہر بھی ثابت ہو رہا تھا جیسے سریتا نے دُنیا اور جنت دونوں حاصل کر لی ہوں۔

اُن کی یہ دو ڈھائی برس کی ازدواجی زندگی کتنی مسرتوں سے معمور تھی جیسے پھولوں سے لدی شاخ! ایک عورت اور ایک بیوی بھلا اِس سے زیادہ کیا مانگ سکتی ہے۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی سوچتی، دولت کتنی بڑی چیز ہے جس کے لئے راجندر اپنی دُنیا سے ایک دم الگ تھلگ ہو گیا۔ کیا یہ اُس کی کمزوری تھی لیکن اُسے اپنی بات ہی غلط معلوم ہونے لگتی کہ شادی کے بعد اُس نے کبھی کسی کا اظہار نہیں کیا، اُس کے پیار کو کہیں بلند مقام حاصل تھا۔

پھر وہ سوچتی کیا راجندر کو کہیں کالج ہی میں تو اُس سے محبت نہیں تھی جسے وہ چھپائے ہوئے تھا۔ صرف دلی جذبات کے اظہار کا موقع چاہتا تھا۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو وہ کیسی خوش نصیب ہے کہ راجندر جیسا لڑکا اُسے چاہتا تھا۔ اگر یہ درست تھا تو اسے حاصل کرنے کے لئے اِتنے تردد کی کیا ضرورت تھی اور اگر یہ درست ہے تو وہ اب اُس سے سہمی سہمی کیوں رہتی ہے، کیوں ایسے مواقع نہیں آنے دیتی کہ راجندر اُس کے ناز اُٹھائے۔ وہ رُوٹھے تو راجندر اُسے منائے۔ اُس سے اپنی من مانی کرائے۔ ہر وقت اُس کے قدموں پر نہ بچھی رہے۔ لیکن اُس کا دل دھک دھک کرنے لگتا اگر یہ قیاسات غلط ہوئے تو قفس کی کھڑکی تو نہیں کھل جائے گی۔

اُن کی زندگی چین اور سکون محبت اور مسرتوں سے معمور تھی لیکن اُسے پھر بھی درمیان میں اجنبیت کا ایک پردہ تنا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ کیا یہ سنگی دیوار تھی؟ وہ یہ دیوار گرا کر راجندر کے وجود میں گم ہو جانا چاہتی تھی۔ راجندر اُسے ایک باس معلوم ہوتا تھا اور وہ اُس سے بات کرتے کرتے جھجک جاتی تھی۔ کیا یہ جھجک عمر بھر رہے گی۔ اِس شخص نے زندگی میں سب کچھ چھپتے چھپتے کر لئے سے بچپن رکھا تھا۔ وہ راجندر کی طرف سے والہانہ عشق چاہتی تھی سنجیدگی اور عقلمندی نہیں، بیوقوفی اور پاگل پن چاہتی تھی۔ اِسی لئے وہ کبھی کبھی راجندر کو شبہ کرتی تھی کہ کہیں اور تو دلچسپی نہیں؟ لیکن راجندر کی دُنیا میں تو سریتا اور صرف سریتا دکھائی دیتی تھی۔ وہ سریتا کی تصویروں سے کمروں کو سجاتا۔ سریتا کی سہیلیوں میں اُس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتا لیکن تنہائی میں عشق کی یہ گرمی ختم ہو جاتی۔ صرف شناسائی سی باقی رہ جاتی۔

شام کو جب وہ چائے کے لئے بیٹھے [illegible]

وہ سونے کے لئے بستر پر جاتے تو سریتا اکثر [illegible]

لڑکی کے رومانس کی باتیں کسی [illegible]

راجندر یو سامالت پر بہت سرگرمی سے اظہارِ خیال کرتا لیکن سریتا کی تسلّی نہ ہوتی۔ وہ چاہتی راجندر اُسے اپنے کسی رومانس کی بات سُنائے تاکہ جو کچھ اُس کے ذہن میں ہے وہ دُھل دُھلا جائے۔ مطلع صاف ہو، پیاسے تانے تپھری تابانی سے چمکیں، اُس کے سینے میں جو لاوا سا کلبلا رہا ہے وہ جوش مار کر بہہ جائے۔

---

کئی مہینے پہلے اُس نے راجندر کے موہنی سے تعلقات کی بات چھیڑ دی تھی۔ موہنی جو ایک ریٹائرڈ جج کی لڑکی تھی جس کی آنکھوں میں بے پناہ کشش بلکہ جادُو تھا۔ کالج کے لڑکے اُس کی شیریں گفتار پر جان دیا کرتے تھے اور سریتا نے راجندر کو کئی بار موہنی کے ساتھ تنہا گھومتے دیکھا تھا۔

راجندر موہنی کا ذکر سُن کر بہت ہنسا۔ پھر کہنے لگا "چھوڑو سریتا! کیا رکھا ہے اِن باتوں میں۔ گڑے مُردے دفن ہی رہنے چاہئیں پھر ہم ناکام لوگوں کے قصّے چھیڑ کر اپنی کامیاب زندگی میں تلخیاں کیوں شامل کریں" لیکن سریتا تو اُس حسین گڑیا کی کہانی سُننا چاہتی تھی جس کی حسین زُلفوں کے خطرناک جال اُس کے گالوں کے گرد گھیرے رہتے تھے جو اور لڑکیوں سے کتنی مختلف تھی۔

"بڑی بے وقوف لڑکی تھی وہ" راجندر اچانک ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے سریتا کے ہاتھ کا بوسہ لیا اور بولا "نہ جانے اُسے اپنے آپ سے کیا دشمنی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کیوں تباہ کرنا چاہتی تھی۔ اگر ہیرا کسی جوہری کے ہاں جانے کی بجائے کیچڑ میں گرنا پسند کرے تو اُسے تم بے وقوف نہ کہو گی کیا؟ بھلا کالج میں پروفیسروں یا طلبا میں سے کون ہوگا جو اُس کے نینوں کے جادُو اور عارضوں کی مہک سے متاثر نہ ہوا۔ اور ایک دن میں نے بھی محسوس کیا کہ میں بھی اُس شمع کی طرف کھچا چلا جا رہا ہوں۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ میرے من کی اُمنگ کا موہنی پر کوئی اثر ہوا ہوگا لیکن جب مجھے اُس سے تنہائیوں میں ملنے کا موقع مِلا تو میں اعتبار نہ کر سکا کہ وہ سراپا عشق اور انتظار ہو چکی ہے! وہ زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کرتی تھی۔ کبھی کسی نہالی کمرے میں، باغیچے کے کسی تنہا کونے میں سڑک کے کسی ویران حصّے پر مل جاتی تھی۔ اپنے نرم و گداز ہاتھوں میں میرا ہاتھ لے لیتی اور آنکھیں بند کر کے اپنے کپکپاتے گرم گرم ہونٹ میری انگلیوں پر رکھ دیتی۔ اُس کے سینے کے سمندر میں طوفان جوش مار رہا ہوتا۔ چہرہ جذبات کی گرمی سے سُرخ ہو جاتا۔ لہروں کی پھوار قطروں کی صورت میں پیشانی پر نمودار ہو جاتی جسے میں اُس کے آنچل سے صاف کر دیتا۔ پھر اُس کے بالوں میں اُنگلیاں ڈال کر کہتا "موہنی! ہوش میں آؤ تم کہاں ہو؟" وہ آنکھیں کھول دیتی لیکن کچھ کہتی نہ تھی۔ صرف ایک بار اُس نے کہا تھا "راجندر! مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لو۔ مجھے اپنے سینے سے اِس زور سے بھینچ لو کہ میرا دم نکل جائے اور مجھے اِس دیوانگی سے نجات مِل جائے"

سریتا! تم بُرا نہ ماننا۔ ہر انسان کے راستے میں نازک دَور آتے ہیں۔ اُس کی خاموشی میں نہ جانے کون سا جادُو تھا کہ میری زبان بھی گُنگ ہو گئی۔ میں محسوس کرنے لگا کہ اُس کی زُلفوں کی گھنگھور گھٹا میں میں گُم ہو گیا ہوں۔ وہ چاہتی تھی کہ جہاں وہ جاتے میں بھی وہاں موجود ہوں۔ آخری برس میں تو میں بھی یہ محسوس کرنے لگا کہ میری کیفیت بھی وہی ہوتی جا رہی ہے۔ میری توجہ تعلیم سے ہٹنے لگی اُس نے فسٹ کوارٹرلی امتحان بھی نہ دیا اور میں بمشکل پاس ہو سکا۔

شہر سے نَدور ندی کے دوسری طرف موہنی کے دادا کی ایک غیر آباد کوٹھی تھی۔ وہ لوگ وہاں دوپہر کی پکنکوں اور برسات کے نظاروں کے لئے جایا کرتے تھے۔ صرف ایک دو ملازم وہاں رہا کرتے تھے۔ وہ مجھے وہاں لے جاتی۔ ننگے پیر جنگل میں گھومتی رہتی۔ اِدھر اُدھر کے پیلے کھنڈروں سے جنگلی پھول توڑتی، حسین تتلیاں پکڑتی۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے۔ وہ کسی کھنڈر میں چھپ جاتی۔ چاہتی کہ میں زور زور سے اُسے پکاروں تاکہ سارا جنگل اُس کے نام سے گُونج اُٹھے۔ جب میں اُسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا تھک جاتا تو وہ قریب ہی کسی درخت کی اوٹ سے نکل کر جنگلی بیل کی طرح میرے جسم کے ساتھ لپٹ جاتی۔ مسرت و مدہوشی کی یہ گھڑیاں کتنی طویل ہوتیں یہ احساس ہی نہ رہتا۔

کئی بار ہم رات کا کھانا وہیں موم بتیوں کی روشنی میں بیٹھ کر کھاتے۔ دیر ہو جاتی تو ملازم کہتا "مالک! اندھیرا ہے رات یہیں رُک جاؤ" لیکن اُسے اندھیرے ہی تو پسند تھے۔ اندھیرے میں لکڑی کا پُل پار کرتے اُسے بہت لطف آتا۔ وہ ڈرتے ڈرتے میرے ساتھ جھکتی چلی جاتی۔ جب ہوا تیز ہوتی تو کہتی "راجندر ہوا میں کیسی اچھی خوشبو ہے آؤ پُل سے چھلانگ لگا دیں اور ہوا میں اُڑتے ہوئے ندی کے پانی میں کہیں گُم ہو جائیں۔" میں اُس کے پریشان بالوں کو جھنجھوڑ کر کہتا ——— "ہوش میں آؤ موہنی! کیا کہہ رہی ہو؟"

اُس نے فسٹ کوارٹرلی کے بعد ہی کالج چھوڑ دیا تھا لیکن میرا تو زندگی کا سوال تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں اِس طرح پاس نہ ہو سکوں گا۔ کہنے لگی، وہ اب مجھے پریشان نہ کرے گی۔ اِسی دَوران وہ اپنے والد کے ساتھ کلکتے چلی گئی لیکن سریتا! میں جھوٹ نہیں کہتا کہ وہ میرے ذہن کے کونے کونے میں سما گئی تھی میرا قلم سوالوں کے جواب دینے کی بجائے اُس کے خطوط کے جواب دیتا معلوم ہوتا تھا۔

کلکتے سے اُس کا باپ اُسے ہوا بدلنے کسی مرض کے علاج کے لئے سنگاپور اپنے ایک واقف ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ وہ لوگ اُسی ڈاکٹر کے ہاں ٹھہرے تھے۔ موہنی نے مجھے سنگاپور سے لکھا "راجندر یہ ڈاکٹر بھی عجیب شخصیت ہے۔ ہزاروں روپیہ

کماتا ہے، اکیلا رہتا ہے۔ ایک روز پتا جی نے پوچھا، تم شادی کیوں نہیں کرتے تو کہنے لگا کوئی اچھی لڑکی ہی نہیں ملتی۔ خواب نظر آتے ہیں کہ کسی دوسرے ملک سے کوئی لڑکی آئے گی اور میرے وجود پر چھا جائے گی۔ عجیب انسان ہے۔ کوٹھی میں رنگ برنگی سنہری مچھلیوں سے بھرے شیشے کے برتن سجا رکھے ہیں۔ اُن کے پاس کھڑا کھیلتا رہتا ہے۔ اُن سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ ایک روز بڑے مزے کی بات ہوئی۔ دوپہر کے وقت وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا "موہنی! سنو!! کہیں وہ لڑکی تم ہی تو نہیں ہو کیونکہ اب مجھے خواب نظر نہیں آتے" میں نے ہنستے ہوئے کہا ڈاکٹر! میں تو ایک مچھلی ہوں جو پہلے ہی کسی کے کانٹے میں گرفتار ہو کر تڑپ رہی ہوں" اور بھاگ کر پتا جی کے کمرے میں چلی گئی۔ شام کو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر اپنے ہسپتال نہیں گیا بلکہ رنگ برنگی مچھلیوں والے وہ شیشے کے برتن اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینک رہا ہے۔ بیوقوف!!

موہنی! سنگاپور سے کب لوٹی مجھے کچھ علم نہیں۔ میں نے غیر ملک میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ مجھے کارخانے میں ملازمت مل چکی تھی۔ سردیوں کی ایک شام مجھے اُسی کوٹھی کے مالی نے موہنی کا خط لا کر دیا۔ سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ بادل بھی گھرتے آ رہے تھے۔ موہنی جاپانی لباس اور ریشمی شال میں ایک مختصر قیامت معلوم ہو رہی تھی۔ میں اِس حسین گڑیا کو پہچان نہ سکا لیکن وہ وارفتگی کی حالت میں مجھ سے آکر لپٹ گئی اور کہنے لگی "بس پہچان تک نہ سکے؟ تم اگر یہاں ایک پرندہ بن کر بھی آجاتے تو میں تمھیں پہچان لیتی!"

وہ رات مجھے وہیں رکھنا چاہتی تھی لیکن میرے ارادوں کی دیواروں میں دراڑیں آ گئی تھیں میں اُسے سمجھا رہا تھا "دیوانی نہ بنو۔ تمھارے ملازم کیا کہیں گے کیا تمھیں گھر کی بدنامی اور شہر میں رُسوائی کا بھی ڈر نہیں لیکن وہ مجھے اپنے جذبات کے ساتھ بہلے جانا چاہتی تھی۔ میں ابھی ہوش میں تھا مجھے پتہ تھا اُس کا باپ مجھے کیوں وہاں لے گیا تھا۔ اُس نے میرا گریبان پکڑ لیا وہ زور زور سے رونے لگی۔ بادل زور سے گرجا تو میرا پھٹا ہوا گریبان اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ چکا تھا اور میں جنگل کے اونچے نیچے راستوں پر بھاگا جا رہا تھا۔ موہنی کی چیخیں مجھے سُنائی دے رہی تھیں۔ مقناطیس کی لہروں کے مانند مجھے کھینچ رہی تھیں۔ طوفان اُمڈ آیا تھا بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج پورے زور پر تھی"

سریتا اِس داستان کے خیال سے پھر کانپنے لگی۔ جیسے موہنی کی دلدوز چیخیں اُسے سُنائی دینے لگی ہوں۔ اُس نے گھبرا کر کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اُس نے دیکھا راجندر پرسکون حالت میں گہری نیند سو رہا تھا جیسے طوفان تھم گیا ہو۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج تھک گئی ہو اور تھکے ہارے مسافر کو کسی بڑے درخت کا آرام دہ سایہ مل گیا ہو۔ اُس نے زیادہ سوچنے کی بجائے سو جانا ہی بہتر سمجھا۔

تھوڑی دیر بعد پھر اُس کی آنکھ کھل گئی۔ باہر زور کی بارش ہو رہی تھی۔ بجلی کی چمک کھڑکیوں سے لہرا لہرا کر اندر آ رہی تھی شیشے بادل کی گرج سے جھنجھنا رہے تھے۔ باہر درختوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ اُس کا جی چاہا راجندر سے کہے "طوفان شروع ہو رہا ہے۔ وہ اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لے!"

اُس نے ہاتھ سے راجندر کو ٹٹولا۔ ایک بھیگی ہوئی تکیہ پھاڑ کر رضائی میں ڈھک گئی تھی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ سرہانے کی بتی جلا کر روشنی کر دی ... جیسے دریا ہوا جوالا مکھی پھٹ گیا ہو، جیسے ندی کا پُل اُڑ گیا ہو۔

---

# غزل

**اخترؔ امروہوی۔ ایم۔ اے**

سب سے خفا ہو تم مگر اُس سے خفا نہ ہو  
جس کا جہاں میں کوئی تمھارے سوا نہ ہو

اُٹھے اگر نگاہ تو دل میں اُتر ہی جائے  
ہم آپ چاہتے ہیں نشانہ خطا نہ ہو

میری ہی طرح چاند بھی زخمی بلا سے ہے  
وہ بھی تری نگاہ کا مارا ہوا نہ ہو

ایسا تو کوئی پھول چمن میں نہیں ملا  
اب تک جو اُن حسین لبوں پر کھلا نہ ہو

منزل سمجھ کے جس کی طرف بڑھ رہا ہوں میں  
اے جذبِ عشق وہ بھی کوئی نقشِ پا نہ ہو

حالات کے دباؤ سے اُٹھے گا ایک بار  
وہ حشرِ انقلاب جو اب تک اُٹھا نہ ہو

اِس التفاتِ خاص کو ہم جانتے ہیں خوب  
اُس کو فریب دو جو تمھیں جانتا نہ ہو

مدت ہوئی تم اُس کی نگاہوں سے دور ہو

اخترؔ نہیں حیات سے تنگ آ گیا نہ ہو

## افسانہ

# چہرے

نور شاہ

ایڈیٹر ماہنامہ دیہات سدھار، کمیونٹی ڈیولپمنٹ اینڈ این۔ اے۔ ایس۔ جموں (توی)

۱۵ مارچ ۱۹۹۷ء — محترم و مکرم گرامی صاحب! تسلیم

"چہرے" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ یہ چہرے جانے پہچانے ہیں۔ آپ بھی انھیں جانتے ہیں۔ یہ ہر دور میں، ہر جگہ، ہر ماحول اور ہر سوسائٹی میں نظر آتے ہیں۔ صرف انھیں ایک نئے ہوئے روپ میں پیش کرنے کے لئے میری ایک نئی روش، نیا پن ہے۔ یہ روش آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ آپ کے ساتھ ساتھ قارئین "بیسویں صدی" کی رائے جاننے کے لئے حسبِ معمول انتظار رہے گا ——— دلی آنے کا پروگرام بنتے بنتے پھر رہ گیا . . .

آپ کا ——— نور شاہ

---

شام!

شام پھیل گئی!!

رنگ بکھر گئے!!!

بکھر کر کینوس پر پھیل گئے۔ پھیل کر سنور گئے۔ سنور کر ایک صورت میں ڈھل گئے۔

جسم قریب آئے!

قریب آکر ——— ایک ہوگئے!

پھر ایسا ہوا ———!

شعلوں کو ہوا مل گئی۔ شعلے بھڑک اٹھے۔ بھڑک کر پرسکون ہوگئے ——— اور ایک تصویر بن گئی۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ شاستروں میں لکھا ہے من بھٹکنے لگے تو اپنی آنکھیں بند کرلو تمھیں سکون ملے گا ——— من کا شک مل جانے سے تن کے سارے دکھ ڈھل جاتے ہیں۔

میں نے دیکھا آنکھیں بند کرنے سے من کا شک نہیں ملتا۔ بس اندھیرا سا چھا جاتا ہے اور اس اندھیرے میں ڈوب کر اپنے جیون کی کہانیاں یاد آتی ہیں ——— نہ جانے آپ نے بھی کتنی کہانیاں سنی ہوں گی۔ اپنے لڑکپن اور بچپن کے دنوں میں اور شاید جوانی کے کسی لمحے میں ——— ایک بار پھر سن لیجئے۔ میں سناتا ہوں یہ میری اپنی کہانی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ آپ کی بھی کہانی ہو۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا یہ میرے بچپن یا لڑکپن کی کہانی ہے یا جوانی کے کسی لمحے کی داستان۔ جب ارشد کی بات آتی ہے تو میرا بچپن سارا بچپن میری نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ میرا لڑکپن اسی پرانے رنگ میں ایک نیا روپ اپنا کر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور جب یہی رنگ روپ بچپن کی حدوں سے نکل کر جوانی کے کسی اجنبی لمحے سے جا ملتے ہیں تو بیک وقت کئی آنکھیں کئی مسکراہٹیں اور کئی چہرے ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں اور جوانی کے یہ لمحے بھٹکے ماندے لمحے فرار کی راہ تلاش کرتے ہیں تو ایک سراپا سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

ایک بے حد بدصورت سراپا؟!

یہ تہمینہ ہے:

تہمینہ کو میں نے چالیس برس پہلے دیکھا تھا۔ جانا اور پہچانا تھا۔ چالیس برس پہلے جب میں صرف دس برس کا تھا اور تہمینہ چودہ برس کی ——— مجھ سے چار سال بڑی۔ جان پہچان کی بات تو دوسری ہے۔ اس کا سراپا میرے ساتھ رہا ہے کبھی میری پرچھائیں بن کر، کبھی میرا روپ بن کر کبھی دکھ اور کبھی میرا شک بن کر!

بات جسموں کے ٹکرانے کی تھی۔ رنگوں کے بکھرنے کی تھی اور ایک تصویر بن جانے کی تھی۔

اور پھر ایسا ہوا۔
میرے بچپن کا ایک لمحہ لوٹ آیا!!
ممی بھی نہیں۔
ابا بھی نہیں ——— اور ہما بھی نہیں۔
ہاں انکل آگئے ہیں۔

"کیا بات ہے ارشد، آج تم خاموش کیوں ہو۔ ہنستے کیوں نہیں؟"

"سوچ رہا ہوں انکل سعید کی بات کا کیا جواب دوں۔ میں آج خاموش کیوں ہوں، ہنستا کیوں نہیں ——— سعید انکل اکثر ہمارے گھر آتے ہیں۔ آج کئی دنوں بعد آئے ہیں اور جب بھی آتے ہیں میں انھیں دیکھ کر مسکراتا ہوں۔ خوب مسکراتا ہوں۔ انھیں دیکھ کر ممی بھی تو مسکراتی ہیں لیکن آج مجھے خاموش پاکر کچھ سوچ میں پڑ گئے ہیں شاید میں اسی لئے مسکرا نہیں رہا ہوں اور شاید اس لئے کہ ممی گھر میں نہیں ہیں ——— کاش میں انکل سے کہہ سکتا اپنی اداسی اور خاموشی کا سبب۔ ابا بھی نہیں، ہما بھی نہیں۔ ممی اور ابا لڑ پڑے تھے۔ ہاں انکل سعید ہی کی بات پر لڑ پڑے تھے۔ ابا نے غصے میں آکر انکل ہی کی بات چھیڑی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ کون سی بات چھیڑی تھی۔

ابا نے کہا تھا

"تم سعید سے پیار کرتی ہو؟"

امی نے کہا تھا

"اور تم کالی کلوٹی ہما کو چاہتے ہو؟"

"یہ جھوٹ ہے!"

"یہ سچ ہے۔ میں نے نئی آیا بھی رکھ لی اور تم اب بھی ہما کو رکھنے کے لئے بضد ہو؟"

"صرف اس لئے کہ ارشد ہما کے بغیر نہیں رہ سکتا!"

"یہ ایک بہانہ ہے ——— اور تم ایسے بول رہے ہو جیسے ارشد ——— ارشد تمہارا بیٹا ہے؟"

"شریفہ!"

یہ لڑنے کی بات تو روز ہی ہوتی تھی لیکن آج کچھ شدت اختیار کر گئی۔ اسی لئے مجھے اکیلا چھوڑ گئے اور ہما بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ مجھ سے روٹھ کر ——— وہ مجھے مارتی تھی، پیٹتی تھی لیکن پیار بھی تو کرتی تھی ——— پیار ——— ہاں پیار۔ اس کے پیار کرنے کا انداز کچھ انوکھا سا تھا۔ نرالا تھا۔ مجھے پیار کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ ایک ایسی کیفیت، ایک ایسا انداز۔ میں کیسے بیان کروں۔ لیکن یہ سب کچھ تنہائی کے کسی لمحے میں ہوتا تھا۔ ایک ایسے لمحے میں جب ہما اور میرے سوا گھر میں کوئی نہ ہوتا تھا یا ابا گھر میں نہ ہوتے۔ صرف ممی اور انکل سعید ہوتے ——— ایسی ہی تنہائی میں ممی بھی انکل سعید کے سینے پر سر رکھ کر کچھ عجیب سی باتیں کرتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آنے والی باتیں۔ لیکن جب میں انھیں ایسے دیکھتا تو مجھے بے ساختہ اپنی ہما یاد آتی اور میں رونے لگتا۔

ہما کے لئے:
ابا کی بے بسی کے لئے!!
انکل سامنے کھڑے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں ان کی بات کا کیا جواب دوں۔

"ارشد، یہ نئی عورت کون ہے؟"

"آیا ہے انکل سعید!"

"کب آئی یہاں میں نے پہلے نہیں دیکھا"

"آپ بھی تو کتنے دنوں بعد آئے"

"تم اسی لئے مجھ سے ناراض ہو؟"

"میں کیوں ناراض ہونے لگا۔"

"تمہاری ممی کہاں ہیں؟"

(خاموشی)

——— سنو تو خاموشی بھی داستان ہے!

"ہما کہاں ہے ارشد؟"
"وہ چلی گئی انکل!"
"چلی کہاں گئی؟"
"میں کیا جانوں"

انکل سعید کچھ سوچ رہے ہیں ——— جانے کیا سوچ کر چلے گئے اور میں نئی آیا کا ہاتھ پکڑے آنگن میں گھوم رہا ہوں۔ ہمارے گھر کا آنگن، یہاں اس آنگن میں رنگ برنگے پھول کھلے ہیں۔

سرخ و سپید پھول!
زرد پیلے پھول!!
کالے پھول ——— پھول کالے نہیں ہوتے بس ایک ہما کالی ہے۔
اور وہ کالی کلوٹی ہما بھی چلی گئی!

میں اپنی نئی آیا کا ہاتھ پکڑے گھوم پھر کر پھر اسی کمرے میں لوٹ آیا ہوں اور اس کمرے میں سب کچھ ویسے ہی پڑا ہے۔ سامنے شیلف میں کتابیں ہیں اور پلنگ کے سرہانے دیوار پر ابا اور ممی کی ایک تصویر آویزاں ہے اور اس کے ساتھ ہی میری ایک تصویر ہے، ہما کے ساتھ۔ ادھر ایک کونے میں ریڈیو پڑا ہے خاموش بے صبر و بے آواز!

میری طرح! اور آتش دان کے ساتھ ہی دیوار پر ایک بڑی تصویر ٹنگ رہی ہے۔ یہ تصویر انکل سعید ایک شام لے آئے تھے۔ اس تصویر میں رنگ رنگ کی عجیب عجیب سی لکیریں ہیں۔ سُرخ و سپید، زرد، نیلی اور کالی لکیریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان رنگ برنگی لکیروں میں کچھ صورتیں اُبھر رہی ہوں۔ ایک بچے کی، ایک عورت کی اور ایک مرد کی۔ یہ بچہ شاید میں ہوں۔ یہ عورت ممی ہیں اور یہ مرد پاپا ہیں۔ نہیں کچھ اور بھی لکیریں نظر آتی ہیں۔ بچہ میں ہی ہوں۔ عورت ممی ہیں اور مرد انکل سعید ——— یہ ٹیڑھی سیدھی لکیریں ایک دوسرے میں مدغم ہوگئی ہیں۔ ایک دوسرے میں تحلیل ہوگئی ہیں ———

انکل سعید اس تصویر کے بارے میں ممی سے کچھ کہتے ہیں

میں سمجھانے کچھ کہہ رہا ہوں۔

اور پاپا ——— آپ خاموش کچھ سوچ رہے ہیں۔

شاید ممی کے بارے میں۔

شاید انکل کے بارے میں۔

شاید اس تصویر کے بارے میں ——— یہ تصویر دیکھ کر میں اکثر سوچتا ہوں

میری ماں کون ہے ممی یا ——— ...

اور پاپا؟

وہ بھی جا چکے ہیں

(جانے والے لوٹ کر نہیں آتے)

اور یہ ممی آیا ہے پہروں اِدھر اُدھر لئے پھرتی ہے اور اس گھوم پھر کے چکر میں

اب میں رکھی یہ کتابیں بھی عجیب سی معلوم ہو رہی ہیں۔ میری طرح اُداس اور کھوئی کھوئی سی! مجھے اِس وقت بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ جب کبھی پاپا مسہری پر لیٹے انھیں پڑھنے لگتے تو میں ابا کے ہاتھوں سے چھین کر دوڑتا دوڑتا ممی کے پاس آتا اور کہتا۔

"ممی!"

"ممی۔ پڑھو الف۔ ب۔ تم تو انکل کے ساتھ انگریزی میں باتیں کرتی ہو۔ میں بھی انگریزی بول سکتا ہوں ———

*Mummy_ my darling mummy I Love you*

"خاموش ہو جا ارشد، میرے سر میں درد ہے۔"

اور جب دن میں ——— انکل سعید اکثر دن کے وقت آتے ہیں نا، اُن کے ہاتھوں سے کوئی کتاب چھین کر ممی کے پاس آتا۔

"ممی!"

"ممی! پڑھو الف۔ ب۔"

"ارشد! اب تم بڑے ہوگئے ہو۔ یہ الف۔ ب پڑھنا چھوڑ دو۔ انگریزی پڑھا کرو۔"

• "ممی میں انگریزی پڑھ سکتا ہوں، بول سکتا ہوں!"

"ارشد۔ و آؤ میں تمھیں پڑھاتی ہوں ———

*My darling. you are my sweety.*
*I love you. I very much Love you.*

یہ کہتے ہوئے ممی انکل کی طرف دیکھنے لگتیں اور دفعتہً انکل سعید کی انگلیاں کالوں پر چلی جاتیں۔ سمجھا آتی۔

"کیا ہے صاحب؟"

"ارشد۔ تو بڑے ہو گئے"

میں سمجھانے سو پیچھے ... کرے میں چلا آتا۔

"ارشد۔ تم بڑے ہوکر کیا بنوگے؟"

"... ——— میں آرٹسٹ بنوں گا۔ تصویریں بناؤں گا۔ تمھاری بھی ایک تصویر بناؤں گا۔ بڑی ——— بہت بڑی تصویر۔"

انکل چلے گئے ہیں!

ممی بھی نہیں۔

پاپا بھی نہیں ——— اور سمجھا بھی نہیں۔ میں اکیلا ہوں۔ اکیلا تنہا! ... کا ہاتھ پکڑے ہوئے۔

میرا بچپن میرا لڑکپن!!

---

صبح!

صبح پھیل رہی ہے!!

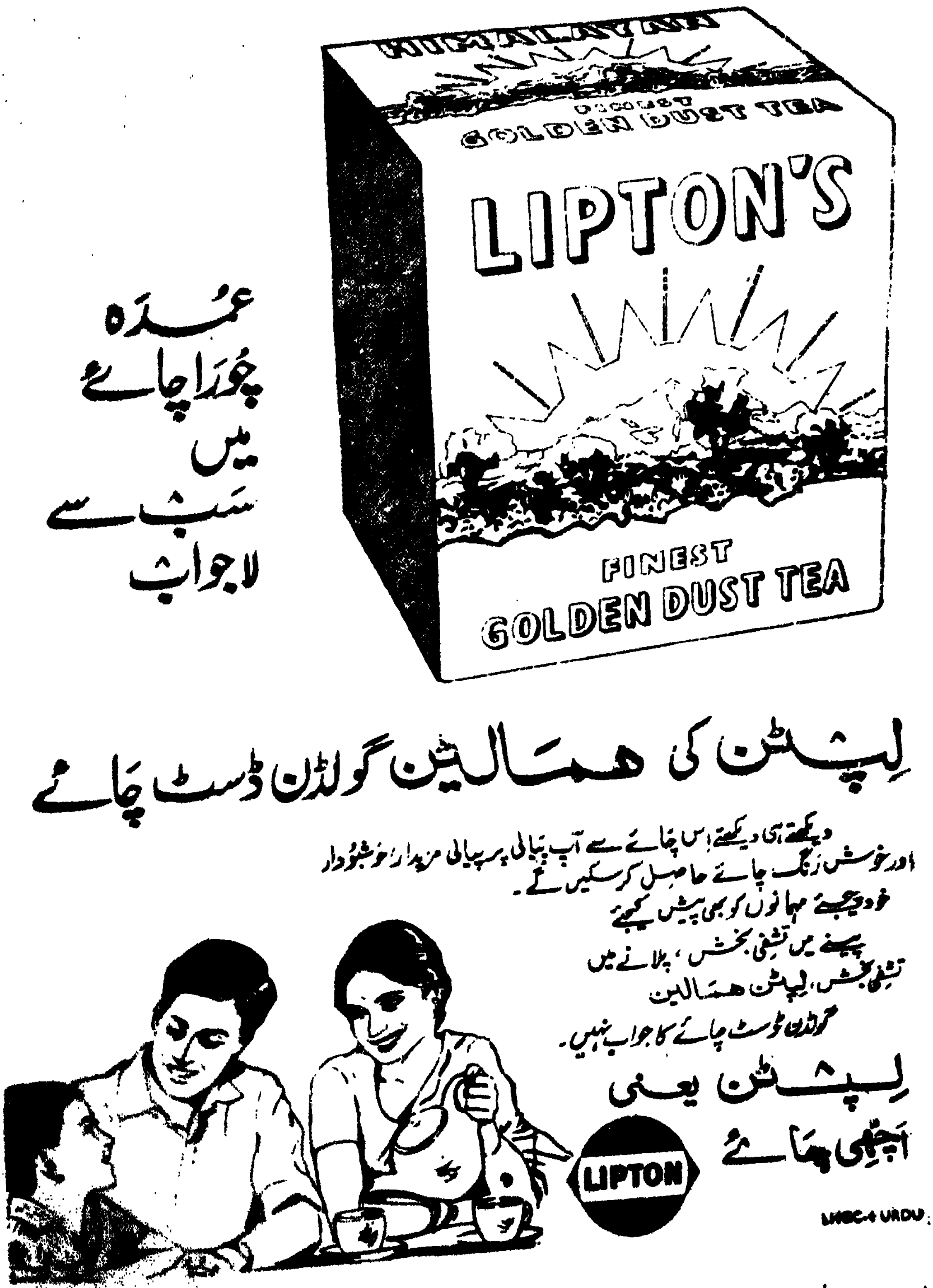
وقت قریب سرک آیا ہے!!!

ممی انکل سعید کے ساتھ کہیں دُور چلی گئی ہیں۔ سمجھانے کسی اور کو اپنا لیا ہے ——— پاپا نے خودکشی کر لی ہے۔ سب نے اپنی اپنی راہیں اپنا لیں۔

میں انھیں پا نہ سکا جو میرے تھے اور جو بیگانے تھے۔ انھیں بھی جنھوں نے میری ذات کو اُچھالا اور وہ بھی جنھوں نے مجھے تحریک بخشی۔ شاید ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے سے صبح کے اُجالے نظر نہیں آتے۔ ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے کے لئے آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں۔ لیکن آنکھیں بند کرنے سے ہر سمت اندھیرا بکھر جاتا ہے اور اُس اندھیرے میں ڈوب کر جیون کی کہانیاں یاد آتی ہیں۔

اور ———!!

اور میرا بچپن بیت گیا لیکن میں نے وہ رنگ روپ نہیں دیکھے جن کے سہارے



HIMALAYAN
FINEST
GOLDEN DUST TEA
LIPTON'S
FINEST
GOLDEN DUST TEA
عمدہ
چورا چائے
میں
سب سے
لاجواب
لپٹن کی ہمالین گولڈن ڈسٹ چائے
دیکھتے ہی دیکھتے اس چائے سے آپ پیالی پر پیالی مزیدار خوشبودار
اور خوش رنگ چائے حاصل کرسکیں گے۔
خود پیجئے مہمانوں کو بھی پیش کیجئے
پینے میں تشفی بخش، پلانے میں
تشفی بخش، لپٹن ہمالین
گولڈن ڈسٹ چائے کا جواب نہیں۔
لپٹن یعنی
اچھی چائے
LIPTON
LHGC-4 URDU

انسان کا مستقبل بنتا یا بگڑتا ہے۔ وہ نشیب و فراز نہیں دیکھے جن کی بدولت منزل ملتی ہے ——— میں نے کبھی کسی کے ساتھ مل کر بچپن میں گھروندے نہیں بنائے، کسی گھر کے خواب نہیں دیکھے جس گھر کے آنگن میں میری اَن دیکھی محبوبہ کے قدموں کے نشان ہوں مجھے صرف اتنا یاد ہے جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرا بچپن بیت چکا تھا، بچپن کی باتیں بیت چکی تھیں۔ وہ گھروندے ڈھ چکے تھے، وہ خواب ٹوٹ گئے تھے اور جب میں نے ہوش سنبھالا میری نئی آپا بھی جا چکی تھی۔ میں اپنے ہی گھر میں اکیلا تنہا بھٹک رہا تھا اور کمرے کی دیوار پر وہ تصویر اب بھی لٹک رہی تھی۔ ایک بچہ، ایک عورت اور ایک مرد ———

ان ہونٹوں پر اب کوئی گیت نہیں اُبھرتا۔

کوئی گیت، آگے بڑھنے کا، کسی جدوجہد کا۔

کوئی گیت، پیار کی مسرت کا یا پیار کی کسک کا۔

ان نیلے بے جان ہونٹوں پر خاموشی کا تالا پڑا ہے!

اور ایک دن ان نیلے بے جان ہونٹوں نے حرکت پائی اور رقص کرنے لگے!!

لمحے بدلتے رہے۔ لمحے طے ہوتے رہے تصویر میں رنگ بھرے جاتے تھے اور ایک صورت اُبھر رہی تھی۔

آہستہ آہستہ ———

میں خود تصویر بنا رہا تھا۔

"کتنے دن اور؟"

"سائرہ بس دو دن اور!"

"آج کیا بنا رہے ہو؟"

"تمھارے کانوں کی بالیاں!"

"کانوں کی بالیاں؟"

"ہاں سونے کی رنگ کی بالیاں جو ملتی جھولتی ہوئی نظر آئیں گی جیسے روشنی بکھیر رہی ہوں!"

"ہوں"

"کیا ہوں ہوں کر رہی ہو؟"

(خاموشی)

"تم کچھ کہہ رہی تھیں؟"

"کہوں؟"

"ہاں کہو!"

"ذرا قریب آؤ ارشد تو میں چپکے سے تمھارے کانوں میں اپنی خاموشی کا راز بکھیر دوں؟"

شرزید برگو تو رویۂ واکاکسن
آدو نسند رودُم نہ پاسں تام!

جسم قریب آئے۔
رنگ بکھر گئے۔
شعلوں کو ہوا مل گئی۔

اور میں نے دوسرے دن اپنے آپ کو آرٹ سکول کے گیٹ سے باہر پایا ——— سائرہ آرٹ سکول کے پرنسپل کی بیٹی تھی۔

میں خاموش رہا۔

اپنی زندگی کی پہلی محبت پر روتا رہا۔

"تم ——— تم کہاں ہو؟"

میں نے کچھ کاغذ سنبھالے۔ بے رنگ کاغذ۔ کچھ رنگ سنبھالے۔ قدم قدم سے رنگ اور کئی تصویریں بنا ڈالیں۔

کسی بچے کی
کسی عورت کی
کسی مرد کی ——— بس تصویریں بناتا رہا!

میرا ایک دوست ڈاکٹر بن گیا۔ میرا دوسرا دوست انجینئر بن گیا میرا تیسرا دوست سات سمندر پار چلا گیا۔ میرا . . . اور دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ سب کو اپنی اپنی منزل مل گئی۔ صرف میں اپنے ہاتھ میں کاغذ اور رنگ تھامے اپنے ہی شہر کی گلیوں میں اکیلا تنہا اپنی منزل کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ فاصلے ہمیشہ اپنی جگہ کھڑے رہتے ہیں۔ صرف راہی کے چلنے کی سکت پر منحصر ہے۔ اُس کی سکت قائم رہی تو فاصلے اپنا وجود خود بخود کھو بیٹھتے ہیں۔ جب فاصلے طے ہوئے تو منزل خود ہی میرے گلے ملنے آئی۔

اور میں نے اپنے آپ کو ارشد مختار کے رُوپ میں پایا۔
ارشد مختار ——— ایک بڑا مصوّر!!

دوپہر!
دن کافی چڑھ آیا ہے۔

میں نے اپنے ذہن کی خواب گاہ کے دریچوں کو ہمیشہ کے لئے بند کیا تاکہ سائرہ کی چھوڑی ہوئی خوشبو اُڑ کر نہ چلی جائے ——— دن چڑھ آیا اور دریچے کھل گئے۔ رنگ بکھر کر کینواس پر پھیل گئے۔ پھیل کر ایک صورت میں اُبھر گئے اور آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ ڈاکٹر تاج کی صورت کے خدوخال ظاہر ہوئے۔

میری تصویروں کی پہلی نمائش تھی کئی تصویریں تھیں اُس نمائش میں۔

ہر تصویر کا رنگ الگ تھا، موضوع الگ تھا، اسلوب الگ تھا۔ ایک تصویر تھی اُن تصویروں میں اور میں نے نام رکھا تھا۔۔۔۔ دو جسموں کا ملاپ ـــــ اُس تصویر میں ایک افریقی لڑکا بے پناہ کالا، ایک لڑکی بے پناہ سپید سے اپنی غلامی کا انتقام لیتے نظر آرہا تھا۔ کچھ ایسے کہ وہ اپنی غلامی کا سیاہ کالا رنگ سپید فام لڑکی کے اندر پن کے کینواس پر بکھیر رہا تھا۔ اور وہ لڑکی ـــــ کچھ بے دل ہوکر، کچھ پُرسکون ہوکر اپنے نرم و نازک سپید سپید ہاتھوں سے اپنے [illegible] کی سِسکنیں دُور کر رہی تھیں۔

بے حد دلچسپ تصویر تھی!

ڈاکٹر [illegible] یہ تصویر دیکھ کر مجھ سے کچھ پوچھتی اور بھری محفل میں اُس تصویر کے نام ـــ ایک لیکچر جھاڑ گئی ـ ماڈرن آرٹ پر اُس نے کیا کہا [illegible] اِن لطیفوں پر قہقہوں کا ایک طوفان اُمڈ پڑا۔

[illegible] خاموش رہا۔

[illegible] ہوگئی ـ میں نے کئی بار ڈاکٹر تاج کو اُس کی کار میں آتے جاتے دیکھا۔

اور اُس شام ـــــ کشمیر میں [illegible] کی پہلی برف باری ہو رہی تھی۔ میں اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے ہاں مدعو تھا۔ ڈاکٹر تکو کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے [illegible] دیکھا۔ کچھ اور بھی لوگ تھے۔ تقریباً سب ہی پہلے سے پہچانے تھے ـ کچھ [illegible] ماحول تھا۔ گرم گرم ـــــ جیسے سر سر کرتی ہوئی برف کے سینے سے گرم گرم [illegible] کھا کے اُٹھ رہا ہو۔ ڈاکٹر تکو نے حسبِ معمول کچھ زیادہ ہی پی رکھی تھی۔

ڈاکٹر تکو نے کہا۔

"آرٹسٹ ہونا ـ سنا ہے آرٹسٹ پارٹیوں میں ہمیشہ دیر سے آتے ہیں"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"[illegible] دوسرے لوگ اُن کا انتظار کریں اور اُن کی اہمیت کا احساس ہو"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

تاج نے کوئی اہمیت نہ دی۔ بس ایک پھیکی پھیکی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیلی اور پھیل کر ختم ہوگئی۔

"ڈاکٹر ـــــ میٹ مائی فرینڈ۔ ارشد مختار اور ارشد آپ ڈاکٹر تاج ہیں"

"ہم پہلے بھی مل چکے ہیں"

"ہاں ڈاکٹر ـــــ" کسی نے کہا "آپ ابھی کچھ کہہ رہی تھیں"

میں نے اپنا گلاس سنبھالا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔

"اختر صاحب، بس کیا کہوں، سُرمئی آنکھوں، لمبے سُرخ بالوں اور مرمریں جسم [illegible] ورلڈ کتنی خوبصورت ہے! اُسے دیکھ کر تو خوبصورتی کا معیار۔۔۔ [illegible]"

خاموش ہوگئی۔

مجھے محسوس ہوا جیسے سب کو اُس کے ہونٹوں کی جنبش کا انتظار تھا۔ سارے کمرے میں ایک پُراسرار سی خاموشی چھا گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کمرے کی چھت ابھی ابھی اُڑ گئی ہو اور سارا کمرہ، کمرے کے سارے لوگ برف کے نیچے آگئے ہوں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ بے بس نظروں سے، بے خواب نگاہوں سے!

میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر تاج آپ کی خوبصورتی کا معیار [illegible] ورلڈ کے جسم پر ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن خوبصورتی کا معیار ـ پرکھا اور نہ تولا ہی جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا ـ"

"وہ کیسے؟" تکو نے چھیڑتے ہوئے [illegible]

ڈاکٹر تاج نے کہا [illegible] دیکھا ہوگا کہ کوشے کی کان میں کام کرنے والے [illegible]

[illegible]

[illegible]

بھی وہ [illegible] حسن [illegible] چاندنی سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] میں بھی ایک انوکھی خوبصورتی ہے [illegible]

"ڈاکٹر تکو نے کچھ [illegible] آپ تاج [illegible]"

"ڈاکٹر آپ کیا کچھ [illegible]"

ڈاکٹر تاج خاموش [illegible]

[illegible]

بدصورت الیہ ـ ارشد کی [illegible] کا بدصورت الیہ [illegible]

کی زندگی کا خوبصورت [illegible] ـــــ لیکن [illegible]

میں نہیں آئے ہیں۔ [illegible] جاتے ہوئے [illegible]

سب کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے [illegible]

دھکیلا گیا ہوں۔۔۔۔ [illegible]

[illegible]

سمجھنے کی باتیں نہیں

[illegible]

[illegible] میری [illegible]



بھدن دی

بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کی ڈیل بھی آپ کی تصویروں جیسی ہے۔ آپ نے مرمریں جسم کو بھی اپنی ٹیڑھی میڑھی لکیروں میں گم کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کسی مرمریں جسم والی لڑکی کو اُس کے اصلی رنگ روپ میں کبھی کینوس پر بکھیر دیجئے تب آپ کو احساس ہوگا کہ خوبصورتی کا معیار کیسے تولا اور پرکھا جاتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے۔ کسی کے تن میں چھپی ہوئی تمناؤں میں یا کسی کی نیلگوں آنکھوں کی گہرائیوں میں۔"

دفعتہً میں نے تاج کی آنکھوں میں جھانکا۔ اُن پر کالا چشمہ چڑھا تھا۔ وہ میری اس حرکت پر بے ساختہ مسکرا دی۔

کئی دن گزر گئے۔

میں نے ڈاکٹر تاج کو اس کی کار میں آتے جاتے دیکھا۔ اس کی جب بھی مجھ پر نظر پڑی، وہ مسکرا دی۔ وہ مسکراہٹ میں جیسے طنز بھی تھا۔ ۔۔۔ ایک شام میں اپنے سامان سمیت ہی پھر کر اس کے کلینک جا پہنچا۔

"آپ یہاں، یہ رنگ، یہ کینوس ۔۔۔۔ شاید آپ نے [illegible] میں صرف عورتوں کا علاج کرتی ہوں۔"

"جی ہاں میں جانتا ہوں۔"

"پھر بھی آپ یہاں چلے آئے۔"

"کئی دنوں تک آپ کی باتیں سوچتا رہا اور اب مرمریں جسم والی لڑکی کو اُس کے اصلی روپ میں کینوس پر بکھیرنے آیا ہوں۔"

اُس نے معصومیت سے کہا۔

"تو مس ورلڈ کو تلاش کیجئے نا!"

"جی نہیں فی الحال تو میں مس کشمیر ہی پر اپنا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ہنس دی۔

"ابھی آپ کسے مس کشمیر کے روپ میں پیش کرنا چاہتے ہیں مجھے یا . . . ؟"

"یا؟" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یا مچھلیاں فروخت کرنے والی کم سن لڑکی کو؟"

میں خاموش ہوگیا۔ یہ خاموشی مجھے کبھی کبھی دریائے جہلم کے کنارے کئی کوٹھیوں کی بھولی بھلیوں میں لے جاتی ہے۔ جہلم کے کنارے ایک کوٹھی ڈاکٹر تاج کی بھی ہے اور [illegible] جہلم کے اس کنارے ہر صبح ایک کم سن لڑکی مچھلیاں فروخت کرنے آتی ہے۔

"مچھلیاں لے لو ۔۔۔۔ ڈل اور تیل بل کی مچھلیاں [illegible] سرخ [illegible] تازہ سیر ۔۔۔۔"

یہی لڑکی کبھی کبھی دریائے جہلم کے اس طرف آتی ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ ایک کرائے کے مکان میں۔

اکیلا تنہا ۔۔۔۔ کوئی نہیں بس میں ہوں۔ دل کی گہرائیوں میں کھویا ہوا۔ دل کی گہرائیاں سمندر کی پتیاں ہیں اور ان پتیوں میں کئی روگ ہیں، کئی داغ ہیں، کئی آنسو ہیں۔ ۔۔۔ اور جب مالا اپنے سر پر مچھلیوں سے بھری ایک بڑی ٹوکری لئے میرے کرائے کے مکان کے آنگن میں داخل ہوتی ہے تو میری نظروں کے سامنے وہ چھوٹا سا ڈونگا بھی آ جاتا ہے جو اُس کا گھر ہے۔ ساری کائنات، ساری جائداد ۔۔۔۔ دن بھر ڈل اور تیل بل کے سینے پر ناؤ کھیتے کھیتے وہ مچھلیاں پکڑتی ہے، چند سیر مچھلیاں، چند ٹکے، کھوٹے سکّے اور جب کبھی کبھی میں اُس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں، کچھ تمنائیں نظر آتی ہیں۔ کچھ ارمان مچلتے نظر آتے ہیں ۔۔۔۔ ہاں بس ایک دن میں ڈھیر ساری مچھلیاں پکڑوں گی، ڈھیر سارے پیسے کماؤں گی، ڈونگا سجا کر دوں گی اور پھر ۔۔۔ پھر ایک دن میری شادی ہوگی میں دلہن بنوں گی اور ۔۔۔۔

آنسو، بے پناہ آنسو!

روتے روتے وہ ہنسنے لگتی ہے۔

روتے ہونٹوں کی مسکان بھی ایک انمول شے ہے۔ رونے والے ہی مسکراہٹ کی قیمت جانتے ہیں۔

مالا ۔۔۔ اپنے آنسو روک لو۔ اپنے آنسو پونچھ لو۔ تمہارا دولہا ایک بڑے ہاؤس بوٹ میں رہتا ہے۔ اُس کا ایک بڑا گھر ہے، ایک بڑی دنیا ہے۔ پُرکیف دلہن حسین دنیا! ایک دن تمہیں لینے کے لئے آئے گا، پیار کی وادی میں لینے کے لئے۔ پھر کوئی دُکھ نہ ہوگا، کوئی روگ نہ ہوگا!

میرا من پھر بھٹکنے لگا ہے۔

شاستروں میں لکھا ہے من بھٹکنے لگے تو اپنی آنکھوں کو بند کر لو ۔۔۔۔

میں نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن جوانی کا ایک لمحہ، ایک تھکا ماندہ لمحہ پھر ڈاکٹر تاج کے روپ میں میرے سامنے کھڑا ہے اور مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

"اب کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"ابھی تو آپ ہی کی تصویر بنے گی۔"

اور پھر ایسا ہوا۔

تم قریب آکر مسکرائے۔ رنگ کینوس پر بکھر کر پھیل گئے۔

"کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"کہو۔"

"کتنے دنوں سے آگ کے شعلے کو اپنے سینے میں دبائے بیٹھی ہوں۔ اندر ہی اندر

جُھلس دینے کے لئے !"

"کہنا کیا چاہتی ہو ؟"

"میں تم سے پیار کرتی ہوں لیکن . . ."

"لیکن کیا ــــــ ؟"

"تم جانتے ہو ارشد پیار صرف دو جسموں کا ملاپ نہیں۔ پیار کچھ اور بھی مانگتا ہے۔ پیار کے کچھ اور بھی لوازم ہیں، کچھ اور بھی ضرورتیں ہیں ــــــ جہلم کے کنارے ایک بڑی کوٹھی کی، گھومنے پھرنے کے لئے ایک کار کی۔ میں جانتی ہوں ارشد تمھارے پاس نام ہے، فن ہے۔ کیا تمھارا نام، تمھارا فن میری ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ میرے جیون . . . تم تو جانتے ہو کہ . . ."

"میں سب جانتا ہوں۔ تم کچھ اور کہنا چاہتی ہو"

"چاہتی ہوں کہ تم یہ تصویر مکمل کر لو"

"نہیں تاج! اس تصویر کو ادھوری ہی رہنے دو۔ میں اس تصویر کو اپنے پاس رکھوں گا۔ بغیر آنکھوں کے یہ تصویر زندگی کے تھکے ماندے لمحوں میں مجھے سہارا دے گی"

"نہیں میں اندھی بن کر نہیں رہنا چاہتی۔ میری طرف دیکھو۔ دیکھو کیا نظر آتا ہے تمھیں ؟"

"گہری نیلگوں آنکھیں"

"تو بناتے کیوں نہیں ایسی ہی آنکھیں ؟"

"تمھاری ان آنکھوں کو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ ہر بار کچھ نیا ہی انداز ملا ہے مجھے ــــــ آج ایک بار پھر دیکھوں گا۔ آخری بار جھانکوں گا ان آنکھوں میں ــــــ"

میں نے اور قریب ہو کر جھانکا۔ یہ وہ آنکھیں نہ تھیں جو میرے من کی گہرائیوں میں بس گئی تھیں۔ آج ان آنکھوں، ان گہری نیلگوں آنکھوں میں ایک بازار تھا۔ ایک نیا مصور تھا۔ پیار محبت کے اس الف لیلوی بازار میں جادوئی اشارے تھے، رنگین ادائیں تھیں، من موہنی مسکانیں تھیں ــــــ اشارے وہ کہ دل کا ہر ہر تار جھنجھنا اٹھے۔ ادائیں وہ کہ روح رقص کرنے لگے اور مسکراہٹیں وہ کہ . . .

"نہیں ڈاکٹر تاج! اب یہ تصویر کبھی مکمل نہ ہو گی"

ڈاکٹر تاج مسز ڈاکٹر تاج بیگ بن گئی۔

ممی نہیں۔

ابا نہیں۔

ہما نہیں۔

وہ نئی آیا بھی نہیں ــــــ کوئی نہیں۔

مما اور تاج!

ایثار کے آنسو اور جوانی کا خون ــــــ دونوں میں کتنا فرق ہے، کتنا طویل فاصلہ ہے!

---

"نئی کوٹھی مبارک ہو ارشد!"

"ہاں گھر ضرور نیا ہے لیکن میں وہی ہوں روپ!"

"اس گھر میں اکیلے رہ کر تمھیں ڈر تو نہ لگے گا ؟"

"پہلے کچھ ایسا ہی سوچا تھا لیکن اب . . ."

"اب کیا ہے ؟"

"اب جو تم آگئی ہو!"

روپ کے ہونٹ کھلے اور وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کنول کے پتوں پر شبنم کے قطرے کھل اٹھے ہوں۔

روپ کا پورا نام روپ متی ہے!

میری نئی کوٹھی کا نام روپ بھون ہے!!

جب میں اپنے روپ بھون کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے رانی روپ متی سنگ مرمر سے ترشی ہوئی وینس کی مورتی بن کر گلاب کی بیلوں کا سہارا لئے میری طرف دیکھ رہی ہے ــــــ روپ بھون اور روپ متی ایک ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں!

تاج نے کہا تھا۔

"پیار صرف دو جسموں کے ملاپ کا نام نہیں۔ پیار کی تکمیل کے لئے ایک گھر . . . ایک کوٹھی . . . !"

"روپ کب آؤ گی ؟"

"آ تو گئی ہوں!"

"میرا مطلب ہے میرے دل کے روپ بھون کو ہمیشہ کے لئے اپنانے!"

---

شام پھیل گئی ہے۔

"روپ!"

"کیا ہے ؟"

"تمھارا یہ بھیگا بھیگا سمٹا سمٹا سا بدن دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے شفق جیسے زعفران میں نہا کر آئی ہو!"

(ایک لمبی سانس)

"تمہاری اِن سانسوں سے کیک کے پھولوں کی سرور انگیز مہک آتی ہے؟"

"ارشد!"

"رُکیے!"

---

"سُنو!"

"کہیے؟"

"تم نے ڈیڈی سے بات کی؟"

"ہاں۔"

"کیا کہتے ہیں وہ؟"

"وہی جو سب کہتے ہیں۔"

"کیا کہتے ہیں سب؟"

"تمہارے پاس نام ہے، فن ہے، کار ہے، کوٹھی ہے لیکن . . ."

"لیکن کیا؟"

"تمہارا کوئی خاندان نہیں۔"

"میرا خاندان ــــــ پیار اور خاندان کا کیا تعلق؟"

"ہے ــــ بہت بڑا تعلق ہے۔ تمہاری عزت، شرافت، ڈیڈی کہتے ہیں تمہارے ڈیڈی نے خودکشی کر لی تھی، تمہاری ممی نے . . ."

"رُکیے!"

---

رات!

رات جھک آئی!!

اور میری جوانی بیت گئی!!!

میں نے گھر بنایا، جہلم کے کنارے۔ جہلم بہتا ہے اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتا ہوں۔ سوچتا ہوں آج میرے پاس فن ہے، نام ہے، گھر ہے، سب کچھ ہے لیکن میں پھر بھی اکیلا ہوں!

ممی نہیں!

ابا نہیں!!

ہما نہیں!!!

سائرہ اور تاج نہیں۔ رانی روپ متی نہیں۔

چند تصویریں ہیں۔ ایک بچے کی، ایک عورت کی، ایک مرد کی ــــــ ایک اور تصویر ہے بغیر آنکھوں کے ایک لڑکی کی۔ یہ سب اُلجھے ہوئے لمحوں کے چہرے ہیں۔ اِن چہروں میں میرا بھی ایک چہرہ ہے۔ میری بھی ایک کہانی ہے ــــــ میرے جیون کے تھکے ماندے لمحے کی کہانی!!!

---

## غزلیں

### ذکیہ سلطانہ نیّر

حُسن کے ذوقِ تبسم کو خود جگا دیتی ہوں میں ــــ چوٹ جب پڑتی ہے دل پہ مُسکرا دیتی ہوں میں

آستاں کی قید سے آزاد ہے ذوقِ سجود ــــ جب خیال آتا ہے دل میں سر جھکا دیتی ہوں میں

مجھ کو تو کم ہائے غم کا رہتا ہے ملال ــــ مُسکراتا دیکھتی ہوں مُسکرا دیتی ہوں میں

برق شرمائی ہوئی ہے ذوقِ تسکیں طلب ــــ جمع کر کے چند تنکے خود جلا دیتی ہوں میں

ایک ہی قصہ ہے نیّر زندگی عشق کا!
مختلف عنوان سے اُس کو سُنا دیتی ہوں میں

### ضیا انصاری

شور ہوتا ہے نہ گلشن میں خلل ہوتا ہے ــــ اپنا کچھ اور ہی اندازِ فغاں ہوتا ہے

میرا احساسِ لطیف آج [illegible] ــــ دل پہ پھولوں کا تبسم بھی گراں ہوتا ہے

اب مری محویتِ شوق کا عالم [illegible] ــــ دل کی دھڑکن پہ بھی آمد کا گماں ہوتا ہے

قصۂ دل کو نہیں لفظ و بیاں کی حاجت ــــ یہ فسانہ تو نگاہوں سے بیاں ہوتا ہے

ایک ہے عشق کے ماروں کا عدم اور وجود
اے ضیاؔ ان کا کہاں کوئی نشاں ہوتا ہے

افسانہ

# بے نور کرن

اختر عابد نوگانوی

گھیر مناف۔ امروہہ (یو۔پی)

۵ مارچ ۶۷ء

محبی! آداب

اِن دِنوں غمِ روزگار کے ہنگاموں میں ہر شخص گھِرا ہوا ہے۔ میں بھی اُسی غم کا شکار ہوں ـــــ قلم اُٹھانے سے پہلے ذہن پر یہی غم مسلط ہو جاتا ہے اور ذہن بھٹک جاتا ہے۔ ایک مدت کے بعد یہ کہانی لکھنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ کہہ نہیں سکتا کہ "بیسویں صدی" کے بلند معیار پر پُوری اُترے گی یا نہیں . . .

آپ کا نیاز مند ـــــ عابد

---

تقریباً ایک سال سے میرے قدم ایک ہی راہ پر چل رہے ہیں۔ یہ راہ مجھے روز گھر سے کالج تک لے جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس راہ میں اتنے پیچ و خم پیدا ہو جاتے ہیں کہ میرے قدم بہک جاتے ہیں۔ ذہن بھٹک جاتا ہے اور پھر کتنے ہی موڑ سامنے آ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی اِک نقطے میں سمٹ گئی ہے جو ایک دن وقت کی سیاہی میں گُم ہو کر رہ جائے گا اور کوئی موہوم سی اُمید بھی دل میں نہ جاگ سکے گی۔

دن کالج کے خشک ماحول میں دَم توڑ دیتا ہے کیونکہ میں کامرس کا ٹیچر ہوں۔ راتوں کی سوگوار تنہائیوں میں کتابوں کے اوراق اُلٹتا رہتا ہوں یا اُس ماضی کی یاد میں کھو جاتا ہوں جو حسین تھا جس میں رعنائیاں تھیں، شگفتہ زندگی تھی، آزادی اور بے فکری تھی، محبت و خلوص کی مہک تھی، دلوں کے اُجالے تھے ـــــ لیکن اب ماضی کا خیال ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ ایک دولت مند باپ کی بیٹی کے لئے بِک چکا ہوں۔ میری تعلیم پر ہزاروں روپے خرچ ہوئے تھے جو معہ سُود کے بل چُکے ہیں۔ اب میں اِس اندھیرے میں تنہا اپنی زندگی کا جنازہ اُٹھائے بھٹک رہا ہوں جسے دولت کے وحشت ناک فسوں نے پھیلا دیا ہے۔ سب مجھ سے قریب ہونے کے باوجود دُور ہیں۔ کوئی میرے دل کی آواز نہیں سُن سکا ہے۔ اُس زنجیر کی جھنکار کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی ہے جس میں مجھے اسیر کر دیا گیا ہے اور جس کا بوجھ صرف میرے ہی قدم اُٹھاتے اُٹھاتے تھک چکے ہیں۔ میں اپنے حسین خوابوں کی بھونڈی تعبیر دیکھ رہا ہوں ـــــ پدما میری شریکِ حیات ہے، میری منزل ہے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، میری حسرتوں کا کارواں اِس منزل پر آکر لُٹ گیا ہے میری زندگی جس پر میرا حق تھا مجھ سے چھین لی گئی ہے۔ میں پھر بھی خاموش ہوں۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ پدما سے مجھے نفرت ہے۔ اِس کا نام بھی مجھے پسند نہیں۔ اِس کا کریہہ چیچک زدہ چہرہ، بھونڈا، بھاری جسم دیکھ کر مجھے محسوس ہوا میرے ساتھ بہت بڑا مذاق کیا گیا ہے۔ میں اِسے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ مجھ سے کوئی بات کرتی ہے تو میرے ذہن پر چوٹ سی لگتی ہے اور درد کی شدت سے میں کراہنے لگتا ہوں۔ وہ مُسکراتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے مجھ پر طنز کر رہی ہو۔ وہ سنگھار کرتی ہے تو میرے جسم میں شعلہ سا بھڑکنے لگتا ہے اور میں اُس سے کہیں دُور بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ اِتنی دُور کہ اُس کا تصوّر بھی میری آنکھوں میں نہ رہے۔

لیکن آج اچانک ہی راہ میں ایک حسین حادثہ پیش آیا ہے جس نے مجھے سوچوں کی عمیق پنہائیوں میں اُتار دیا ہے۔ میں تھکے تھکے قدموں اور ماؤف ذہن کے ساتھ کالج سے لَوٹ رہا تھا۔ میری راہ میں کتنے ہی جھونپڑے آتے ہیں جن میں ننگے بھوکے افلاس زدہ انسان سانسیں لیتے ہیں۔ کتنی ہی اونچی اونچی بلڈنگیں نظر آتی ہیں جن سے نکلتی ہوئی مرمریں جسموں کی خوشبو مجھے اکثر روک لیتی ہے ـــــ آج بھی میں اُنھیں بلڈنگوں کے سائے میں گزر رہا تھا۔ معاً ایک السیشن نسل کا کُتا بلڈنگ سے نکل کر میرے پیچھے دوڑنے لگا۔ شاید مجھے کاٹ کھانے کے لئے پیچھے دوڑا ہو۔ میں نے سوچا،

# حدیثِ دل

وسعتیں دل کی سی ہر گز دشت و صحرا میں نہیں
اپنی وحشت کے لئے ویرانہ ایسا چاہیے — ظہیر دہلوی

سُننے دیتا ہی نہیں دل اُنھیں فریاد مری
اس نے اپنا ہی الگ شور مچا رکھا ہے — عرش ملسیانی

دَیر و حرم میں بحث رہی دل کہاں رہے
آخر یہ طے ہوا کہ یہ بے خانماں رہے — ناطق لکھنوی

ایثار و وفا، سوز و جنوں، درد و تمنّا
اُس دل کا لہو کتنے چراغوں میں جلا ہے — خمار انصاری

کوسوں دیارِ عشق میں آبادیاں نہیں
یادش بخیر جب سے مرا دل نہیں رہا — عزیز

مرسلہ: سید قدیر۔ گولکنڈہ۔ حیدرآباد

مگر اُس کے مُنہ میں کچھ دبا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے روٹی کا ٹکڑا اُچک کر بھاگا ہو۔ اس لئے اُس کے کاٹنے کا خوف میرے دل سے نکل گیا۔ لیکن احتیاطاً سیدھا چلتے چلتے بائیں جانب بچ گیا۔ مگر اُس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ میرے قریب آکر ٹھہر گیا اور اِس طرح دُم ہلانے لگا جیسے مجھے پہلے سے ہی جانتا ہو۔ میں بھی ٹھہر گیا تھا۔ پھر اُس نے اپنے مُنہ میں دبی شئے کو میرے قدموں میں ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر میں سراپا حیرت بن گیا کہ وہ روٹی کا ٹکڑا نہ تھا ایک لفافہ تھا۔ میں نے لفافہ اُٹھالیا اور کُتّا میرے وجود کا اِس طرح جائزہ لینے لگا جیسے کوئی انسان کسی اجنبی کا جائزہ لیتا ہے ——— اور پھر دُم ہلاتا ہوا بے حد مسرت کا اظہار کرتے ہوئے جدھر سے آیا تھا اُسی طرف دَوڑ گیا۔ میں نے رُخ پھیر کر دیکھا۔ ایک بلڈنگ کی کھڑکی کے پردے کی آڑ میں آنکھوں کی شمعیں شام ہی سے جھلملا رہی تھیں۔

وہی خوشبو میں ڈُوبا ہوا لفافہ اب بھی میری استعجاب بھری آنکھوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جس میں رکھے ہوئے معطّر کاغذ پر صرف اِتنا لکھا ہے۔

"حیرت سے نہ سوچئے گا۔ آپ میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔
کل رات کو آپ ہمارے یہاں آنے کا کشٹ کریں۔ بھیا تو سمجھا گیہ ہوگا۔ میرا برتھ ڈے ہے۔

شیلا"

یہ چند جملے پڑھ کر میں اسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہوں کہ میں نے تو کبھی شیلا کو نہیں دیکھا ہے۔ اگر دیکھا ہے تو مجھے یاد نہیں آرہا ہے مگر اُس حسن کی آنکھوں کی شمعیں اب بھی میرے سامنے میری تنہائی میں روشن ہیں۔

---

گزشتہ رات حسین خوابوں اور تصوّرات کی رعنائیوں کے ساتھ گزر گئی ہے۔ شیلا کو قریب سے دیکھنے کے لئے دل بے قرار ہے۔ میں اُس کی برتھ ڈے میں شریک ہونے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ ایک تحفہ بھی اُسے پیش کرنے کے لئے لیا ہے جسے میں نے پہلے سے چھپا کر رکھا ہے۔

اِسی عالمِ بیقراری میں میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی ہے۔ ساڑھے سات بج چکے ہیں: مجھے کس وقت شیلا کے یہاں پہنچ جانا چاہئے؟

میں نے سوچا ہے ——— اُس نے کوئی وقت تو مجھے دیا ہی نہ تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے۔ اپنے آپ کو سنوارا۔ اپنے سراپا کا کئی بار جائزہ لیا۔ پھر بھگوان کا نام لے کر جانے کے لئے قدم اُٹھاتے ہی تھے کہ پتا کی چبھتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر میرے قدم ٹھہر گئے۔ پھر وہ مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے بولے

"آج کہاں کا پروگرام ہے آپ کا؟"

اِس جملے سے میرے ذہن پر چوٹ سی لگی۔ میں نے نفرت بھرے لہجے میں جواب دیا: "ایک دوست کے یہاں جا رہا ہوں"

"آج آپ کو میرے ساتھ پکچر چلنا ہے۔ دوست کے یہاں کل جایئے گا"

"تم پکچر کیا نرک میں بھی جا سکتی ہو مگر میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا" میں نے قدم اُٹھا دئے اور پتا میرے پیروں کے نشان دیکھتی رہ گئی۔

---

یہ شیلا کا گھر ہے۔ اُس کا محل، اُس کی بلڈنگ ہے، اُس کی جنّت ہے ہر طرف حُسن کی برق کوند رہی ہے۔ مُسکراہٹوں کی کرنیں بکھر رہی ہیں۔ رعنائیاں سمٹ آئی ہیں ——— مگر میں اِس رنگین ماحول میں آکر پتھر کا بُت بن گیا ہوں اور میری آنکھوں کے سامنے وہ جھونپڑے آگئے ہیں جن میں دِیے ٹمٹماتے ہیں پھیکی مُسکراہٹیں ہوتی ہیں۔ اُداسی اور ویرانی کی پرچھائیاں ہوتی ہیں۔

اِس تصوّر کو نگاہوں سے دُور کر کے میں اِس ماحول میں کھو جانا چاہتا ہوں لیکن ایک خیال نے پھر سر اُبھارا ہے کہ شیلا نے مجھے کیوں بُلایا ہے؟ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے جبکہ سب کچھ اُسے نصیب ہے۔ مجھ سے تحفہ لینے کے بعد اُسے اتنی فرصت بھی نہیں مل سکی ہے کہ مجھ سے کچھ اور بات کر سکے۔ اِن رعنائیوں میں کہیں کھو گئی ہے اور میری آنکھیں اُسے تلاش کرتے کرتے تھک گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں اِس مہکتے ماحول سے

[illegible] کی شکل ہے۔ اپنی جانب کھینچ رہے
ہوا میں اسیر ہو کر رہ گیا ہوں [illegible] نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ وہ مجھے کیسے اور کب سے جانتی ہے۔ میں اُس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں ایسی باتیں جو [illegible] جذبات کی ترجمانی کر جائیں۔ جو اُس کے دل کی آواز ہوں۔ وہ آواز جس نے مجھے [illegible] پکار لیا ہو۔

میں نے پھر سے شیلا پر نظر ڈالی ہے۔ نو بج چکے ہیں اور مجھے اُس وقت کا شدت سے انتظار ہے جب یہ محفل یہ ہنگامہ ختم ہو جائے۔ معاً ایک بجلی سی کوندی —— پھر [illegible] کا ایک شور اُٹھا ہے۔ قہقہوں اور تالیوں کی آوازیں ہم آہنگ ہونے لگی ہیں۔ میں نے بھی شیلا کو دیکھ کر تالیاں بجائیں۔ مُسکرانے کی کوشش کی لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے جو کچھ کیا وہ اپنی فطرت کے خلاف کیا۔

کچھ دیر بعد میں نے اطمینان کی سانس لی اور جاتے ہوئے مہمانوں کو دیکھتا رہا۔ پھر خود بھی جانے کے لئے قدم اُٹھائے ہی تھے کہ بجلی پھر کوندی اور اس بار صرف مجھ پر آ گری۔ شیلا شیشے کی دیوار کی طرح میرے سامنے آ کھڑی ہو گئی ہے اور میں اُسے کسی پاگل کی طرح گھور رہا ہوں — — ۔

"مہمانوں میں اتنی گھر گئی کہ پھر آپ سے مل بھی نہ سکی" شیلا نے میری محویت کو توڑا۔

"اب اجازت چاہوں گا" میں نے رسماً کہا۔

"ابھی نہیں۔ آپ ڈیڈی سے تو ملے ہی نہیں۔ وہ بھی آپ سے ملنے کے متمنی ہیں۔ اُس نے بڑے تپاک سے" میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ شیلا کی اس نکھری اور میٹھی زبان نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور اُس کے ہاتھ کے لمس سے میرے جسم میں برقی رو سی دوڑ گئی ہے اور میں حسین خیالات کے سیلاب میں لامحدود حد تک بہتا چلا گیا ہوں۔

کچھ دیر بعد شیلا نے اپنے ڈیڈی سے مخاطب ہو کر کہا ہے "ڈیڈی آپ سے ملئے آپ ہی ہیں مسٹر شیل کمار"

"او مسٹر شیل کمار! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے اشوک رائے کہتے ہیں شیلا کو تو آپ جانتے ہی ہیں"

میں چونکا لیکن شیلا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ڈیڈی۔ لیکن صرف میں ہی مسٹر شیل کو جانتی ہوں"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اشوک رائے صاحب نے حیرت کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی میں بھی استعجاب سے سوچ رہا ہوں کہ شیلا نے کیا کہہ دیا ہے۔

"ڈیڈی جس کالج میں میں پڑھتی ہوں اُسی کالج میں آپ پڑھاتے ہیں۔ لیکن

## انتظار

فانیؔ یقینِ وعدۂ فردا کو کیا کروں
اب زندگی ہے نام فقط انتظار کا — فانیؔ

مجھ کو یہ آرزو وہ اٹھائیں نقاب خود
اُن کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی — مجاز لکھنوی

لُوٹے مزے اُسی نے ترے انتظار کے
جو حدِ انتظار سے آگے نکل گیا — آرزو لکھنوی

نگاہِ شوق سرِ رہ گزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے — نامعلوم

کہتے ہیں لوگ موت سے بدتر ہے انتظار
میری تمام عُمر کٹی انتظار میں — مجاز لکھنوی

مرسلہ: ایس. عتیق السلام۔ بھوپال

میں سائنس کی اسٹوڈنٹ ہوں اور آپ کامرس کے ٹیچر ہیں... دوسرے یہ کہ ٹیچرس بہت کم اسٹوڈنٹس کو جانتے ہیں لیکن اسٹوڈنٹس تقریباً ہر ٹیچر کو جانتے ہیں"

"او یہ بات ہے؟" اشوک رائے صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے —— "مسٹر شیل! یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہماری ایک فرم ہے"

"جی نہیں ——!" میں درمیان ہی میں بولا۔

"خیر کوئی بات نہیں —— " اشوک رائے صاحب نے بے وجہ مُسکرانے کی کوشش کی۔

پھر شیلا مجھ سے مخاطب ہوئی —— "مسٹر شیل! ہماری فرم کے لئے ایک اچھے کامرس جاننے والے کی ضرورت ہے۔ کئی انٹرویو دینے آئے لیکن ناکام ثابت ہوئے۔ پھر آپ پر نظر گئی تھی"

"لیکن میں تو..." میں نے جملہ پورا بھی نہیں کیا کہ اشوک رائے صاحب نے کہنا شروع کیا ہے۔

"مسٹر شیل! جو آپ کہنا چاہتے ہیں وہ میں سمجھ گیا ہوں۔ اگر ہماری فرم آپ کو کالج سے زیادہ تنخواہ دے تو آپ..."

"کیا میں کالج چھوڑ سکتا ہوں —— " میں شیلا اور اُس کے ڈیڈی کا مطلب

سمجھ گیا ہوں۔ مگر میری زبان خاموش ہے۔ وہ دونوں جواب کے منتظر ہیں اور میری آنکھیں اُن در و دیوار کو گھور رہی ہیں جن سے حُسن کی، دولت کی چمک پھوٹ رہی ہے۔

"آپ کچھ سوچ رہے ہیں؟" شیلا نے مُسکراہٹوں کی بجلی گراتے ہوئے پُوچھا ہے۔

پھر میں نے بھی مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ہے۔ "اِس وقت جواب دینے سے معذور ہوں۔ اجازت دیجئے گا۔"

یہ کہہ کر میں چلا آیا ہوں۔ پھر وہی اُداسی وہی تنہائی ہے اور میں ہوں —— اور سوچوں کا سیلاب ہے جس کے ساتھ بہہ رہا ہوں —— کبھی پدما کی صورت سامنے آجاتی ہے —— کبھی شیلا کا پیکر سامنے اُبھر آتا ہے —— پدما کی صورت بھونڈی، اُس کا چہرہ چیچک زدہ ہے، لیکن اُس کا دل حسین ہے —— شیلا خوبصورت ہے، اُس کی ادائیں دلفریب ہیں، لیکن اُس کی آنکھوں میں وہ خلوص نہیں جو پدما کی آنکھوں میں ہے۔

دوسرے دن کالج جاتے ہوئے میرے قدم پھر شیلا کی بلڈنگ کے قریب رُک گئے ہیں۔ اُس کا السیشن کتا میرے قریب کھڑا دُم ہلا رہا ہے اور اوپر کھڑکی سے شیلا مجھے کچھ اس انداز سے گھور رہی ہے، جیسے مجھے کسی قیمتی شے کی چوری کرتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ کیونکہ میں نے آج بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب مُسکرا کر نہیں دیا ہے۔ ایک بار دیکھ کر نظریں ہٹالی ہیں اور وہ لفافہ جیب سے نکال کر [illegible] جس میں میں نے لکھا ہے ——

مس شیلا! پرنام

آپ کی محبت و خلوص کا شکریہ کہ آپ نے [illegible] برتہ دے میں بلانے کا کشٹ کیا۔ آپ اِس بات پر حیرت نہ سوچئے کہ میں ایک بار بک چکا ہوں [illegible] میرے سینے میں انسان کا دل ہے جسے دولت نہیں محبت خرید سکتی ہے۔ یقیناً اب آپ محسوس کریں گی۔

سنیل

اِس کے بعد... میرے قدم مجھے اُس گلی کی طرف [illegible] جہاں کوئی حسینہ نظر نہیں آتا لیکن اِس احساس، اُس غم کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے جسے میں ایک سال سے دل کے کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے تھا ——!!

---

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین، نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔

---

## ناموَر افسانہ نگار خاتون

# جیلانی بانو سے انٹرویو

نریش کمار شاد

۱۵۳۷ - نانک پورہ نئی دہلی ۳

۲۰ مارچ ۱۹۶۷ء

مُحبِ گرامی خوشتر صاحب : خلوص

آئندہ شمارے کے لئے جیلانی بانو سے انٹرویو بھیج رہا ہوں۔ "بیسویں صدی" کے اَن گنت قارئین اسے پڑھ کر اس ذہین و طباع افسانہ نگار خاتون کی نکھری ہوئی شخصیت اور سلجھے ہوئے خیالات سے بخوبی واقف ہو سکیں گے ——— میری رُسوائیاں آپ کے لئے باعثِ اذیت ہیں لیکن اُن کے پیشِ نظر مجھے اپنے دوست احمد فراز کا یہ شعر بار بار یاد آتا ہے ؎

ہر جسم داغ داغ تھا لیکن فراز ہم　　بدنام یوں ہوئے کہ بدن پر قبا نہ تھی

اس دنیا اور خصوصاً اپنے "یارانِ پُرخلوص" کی اس سلسلے میں آخر کوئی شکایت کروں بھی تو کس مُنھ سے۔ اس ضمن میں میری بھی ایک نئی رُباعی ملاحظہ فرمایئے ؎

اب اتنے بھی اے شاد پریشاں کیوں ہو　　تبدیلیٔ حالات پہ حیراں کیوں ہو
انصاف کیا ہے زندگی سے تم نے ؟　　انصاف کے زندگی سے خواں کیوں ہو

آپ کا ——— نریش کمار شاد

---

**شاد :۔** "سب سے پہلے تو محترمہ ! یہ فرمایئے کہ اپنی ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں میں کون کون سی افسانہ نگار خواتین آپ کو خاص طور پر پسند ہیں ؟"

**بانو :۔** "کیوں شاد صاحب افسانہ نگار خواتین ہی کیوں ؟ میں ادب کو صنف کے اعتبار سے خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ عورتوں کے بعض ہمدرد نقادوں کا وطیرہ ہے۔ وہ اپنے مقالات میں افسانوں پر لکھتے ہوئے خواتین افسانہ نگاروں کے لئے علیحدہ گیلری کا اُسی اہتمام سے انتظام کرتے ہیں جو میلاد شریف کے جلسوں میں ہوا کرتا ہے۔ مجھے اپنی ہم عصر سبھی افسانہ نگار خواتین پسند ہیں۔ کچھ زیادہ اور کچھ کم ۔"

**شاد :۔** "اور اپنے معاشرے کے کس پہلو نے آپ کو غیر معمولی اعتبار سے متاثر کیا ہے ؟

**بانو :۔** "عورت کی بے بسی اور مجبوری نے۔ چند ایسی خواتین تھیں جو محض خاندان کی ناک اونچی رکھنے کے لئے اپنی زندگی تباہ کر رہی تھیں۔ اس بات نے میرے لکھنے کے شوق کو اُکسایا اور شاید اسی لئے میری کہانیوں کا موضوع عموماً عورت ہی کا کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔"

**شاد :۔** "اور اسی لئے تو بانو صاحبہ مجھے انٹرویو کا آغاز اس طرح کے سوال سے کرنے کی جُرأت بھی ہوئی۔ بہرکیف اب یہ بتایئے کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئیں ؟"

**بانو :۔** "۱۹۳۳ء میں یو۔پی (بدایوں) میں پیدا ہوئی جو میرے والدین کا وطن ہے لیکن بچپن ہی سے حیدرآباد دکن میں رہتی ہوں جو اب میرا وطن بن چکا ہے۔"

شاد :- "حیدرآباد کے ادبی ماحول نے آپ کی تخلیقی کاوشوں پر کیا اثر ڈالا ؟"

بانو :- "حیدرآباد ہی نے مجھے افسانہ نگار بنایا۔ کسی اور جگہ رہتی تو شاید کہانیاں نہ لکھتی۔ یہاں کی دلکش تہذیب، نمایاں طبقاتی تضاد اور بے حد خوبصورت شہر نے مجھے افسانہ نگار بنا دیا۔ جب عصمت آپا نے مجھ سے کہا کہ تم صرف حیدرآباد پہ کہانیاں لکھا کرو کیونکہ ہمیں تمہارے یہاں کی ہی چیز نئی لگتی ہے اور اچھی لگتی ہے تو میں اُن سے بالکل متفق تھی، کیونکہ میری جن کہانیوں کا ماحول حیدرآباد ہے وہ نہ صرف سب کو پسند ہیں بلکہ وہ میں نے جی جان سے لکھی ہیں۔"

شاد :- "غالباً آپ کے والدِ محترم یعنی میرے کرم فرما علامہ حیرت بدایونی ہی نے ابتدائی ادبی زندگی میں آپ کی سب سے زیادہ رہنمائی کی ہوگی ؟"

بانو :- "جی ہاں میرے لکھنے کا ابتدائی رجحان اُنھیں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے اس ضمن میں ایک چھوٹا سا واقعہ بھی سن لیجئے۔ جب میں بہت چھوٹی تھی اور بہت چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھا کرتی تھی تو ایک بار میں نے خواب میں دیکھا کہ میری کہانی عصمت چغتائی کی کہانی کے ساتھ شائع ہوئی ہے اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عصمت کے فن کی عظمت اُس وقت بھی میرے دل میں کتنی تھی اور میں کچھ لکھنے کو کتنی بے تاب تھی۔"

شاد :- "اِس کا مطلب ہے، شروع میں آپ نے عصمت ہی کی تقلید میں کہانیاں لکھی ہوں گی۔"

بانو :- "جی نہیں عصمت چغتائی کی اِس پسندیدگی نے مجھے اُن کی راہ پر چلنے پر مجبور نہیں کیا۔"

شاد :- "لیکن ابھی ایک انٹرویو میں سردار جعفری صاحب نے تو اِس خیال کا اظہار کیا ہے کہ واجدہ تبسم کے ساتھ ساتھ آپ بھی عصمت چغتائی کی پیروی کرتی ہیں اور جنس کے سوا آپ کا کوئی دوسرا موضوع نہیں ہے۔"

بانو :- "حالانکہ شاد صاحب! میں نے بہت کم بلکہ شاید ہی کبھی اِس موضوع پر لکھا ہو۔ خیر اس کا فیصلہ تو مجھے پڑھنے والا کوئی بھی قاری کر سکتا ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ کسی مشہور ادیب کی پیروی کرنے سے بہتر ہے کہ کچھ بھی نہ لکھا جائے۔"

شاد :- "شعوری طور پر نہیں تو نیم شعوری یا غیر شعوری طور پر تو ہر نیا ادیب اپنے کسی نہ کسی پیش رو ادیب سے متاثر ہونے کے لئے مجبور ہے محترمہ! میرے خیال میں تو آپ بھی اگر ذرا گہرائی سے اپنا جائزہ لیں تو آپ کو بھی احساس ہو جائے گا کہ آپ نے بھی ابتدا میں کسی نہ کسی مُلکی یا غیر مُلکی ادیب کا اثر ضرور قبول کیا ہے۔"

بانو :- "یقین مانئے شاد صاحب! میں نے ابتدا میں کسی [illegible] ہو کر نہیں لکھا۔ کیونکہ جب میں نے لکھنا شروع کیا [illegible] کسی ادیب کو سنجیدگی سے پڑھا تھا۔ البتہ لکھنا شروع کرنے کے بعد جب میں نے پڑھنے پر بھی توجہ کی تو بہت سے ادیب پسند آئے۔"

شاد :- "مثلاً ؟"

بانو :- "مثلاً چیخوف، گورکی، موپساں، او ہنری، [illegible] عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر [illegible]۔"

شاد :- "حیرت صاحب کی بیٹی ہونے کی وجہ سے آپ کو شاعری سے بھی دلچسپی تو ضرور ہوگی۔ کیا آپ نے خود بھی کبھی شعر موزوں کئے ؟"

بانو :- "واقعی مجھے شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ میں [illegible] شاعر کی بھی اِس لئے عزت کرتی ہوں کہ اُسے کسی بات کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا آتا ہے جو مجھے نہیں آتا۔ اگر میں شعر کہہ سکتی تو افسانے لکھنے کی زحمت نہ کرتی۔"

شاد :- "اچھا تو اب اِس کا جواب دیجئے کہ آپ افسانے کیوں لکھتی ہیں ؟"

بانو :- "جی چاہتا ہے اِس لئے لکھتی ہوں۔"

شاد :- "اور کیوں کر لکھتی ہیں ؟"

بانو :- "نہایت رف قسم کے کاغذ کی کاپی اور پنسل لے کر بیٹھ جاتی ہوں اور سوچتی ہوں فلاں فلاں خیال ذہن میں آیا تھا، اُسے لکھا جائے۔ اب اِس ساری تفصیل کے اجمال کے لئے مجھے ایک ابتدائی، خوبصورت اور موزوں جملے کی تلاش ہوتی ہے۔ کہانی کا [illegible] سطر میں کہانی سے بھاری کرتی ہوں۔"

شاد :- "وہ کس لئے ؟"

بانو :- "کیونکہ میرا خیال ہے، یہی وہ جادو ہے جو کسی کہانی کو پڑھنے کے لئے قاری کو آمادہ کرتا ہے۔"

شاد :- "اور لکھنے کے لئے بالعموم آپ کو کیسا ماحول درکار ہوتا ہے ؟"

بانو :- "لکھنے کے لئے مجھے کسی خاص ماحول کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ صرف اتنی فرصت چاہئے کہ کوئی بے معنی کام میرے ذہن پر سوار نہ ہو، البتہ میں رات میں کبھی نہیں لکھتی۔ میری ہر کہانی کا نزول دن کے اُجالے ہی میں ہوتا ہے۔"

شاد :- "کیا افسانہ لکھنے سے پہلے اُس کا خاکہ آپ کے ذہن میں موجود ہوتا

ہے ؟"

بانو:۔ "یہ ضروری نہیں۔ کبھی تو ذہن میں کچھ بھی نہیں ہوتا اور میں کاپی کھول کر بیٹھ جاتی ہوں۔ کبھی مختلف واقعات و حادثات ذہن میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کبھی بنی بنائی کہانی بھی میرے سامنے آجاتی ہے اور مجھ سے کہتی ہے' مجھے فوراً لکھو ورنہ میں غائب ہو جاؤں گی! اس لئے سب کام چھوڑ چھاڑ کر اُس کا تعاقب کرنا پڑتا ہے۔"

شاد:۔ "آپ کے نزدیک مختصر افسانے کی مختصر ترین تعریف کیا ہے ؟"

بانو:۔ "یہ بہت مشکل سوال ہے شاد صاحب! افسانے کی تکنیک نے اتنی کروٹیں بدلی ہیں کہ مختصر افسانے کی مختصر ترین تعریف ممکن ہی نہیں ہے۔ آج تو ہر وہ چیز افسانہ ہے جسے افسانہ کہہ کر پیش کیا جائے۔ میرے خیال میں افسانے کی مختصر ترین تعریف یہ ہے کہ اُس میں کہانی پن ہو اور یہ کیفیت افسانے کے روایتی عناصر پلاٹ، کردار اور تسلسل وغیرہ ہی سے عبارت نہیں ہے۔ ان کے بغیر بھی افسانہ لکھا جاسکتا ہے۔"

شاد:۔ "پریم چند کے بعد آپ اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کسے اور کیوں سمجھتی ہیں ؟"

بانو:۔ "آپ کا یہ سوال بھی کافی ٹیڑھا ہے۔ میں سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے افسانہ نگار کا پیمانہ لے کر کبھی نہیں نکلی، البتہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ پریم چند سے اُردو افسانے کی جو روایت شروع ہوتی ہے اُسے آگے بڑھانے میں کرشن، بیدی، منٹو، عصمت، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر وغیرہ نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ یہ سب مختلف وجوہ اور اسالیب کی وجہ سے نہ صرف بڑے افسانہ نگار ہیں بلکہ ان کی اہمیت پریم چند سے بھی زیادہ ہے۔ پریم چند آج اُردو کے بڑے افسانہ نگار ان معنوں میں ہیں کہ اُنھوں نے جدید افسانے کی تکنیک کو پہلی بار برتا تھا۔"

شاد:۔ "کیا آپ اپنی کسی ادبی تخلیق پر نادم بھی ہیں ؟"

بانو:۔ "جی ہاں اپنی اُن ساری تحریروں پر، جنھوں نے مجھے افسانہ نگار مشہور کر رکھا ہے کیونکہ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں نے ابھی تک کوئی ایسا افسانہ نہیں لکھا کہ اپنے آپ کو بڑے افسانہ نگاروں میں شامل کر سکوں۔"

شاد:۔ "یہ تو کسر نفسی فرما رہی ہیں آپ! خیر یہ تو فرمائیے کہ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب اور کن حالات میں ہوا؟ پہلی تخلیق کیا تھی اور وہ کہاں شائع ہوئی ؟"

بانو:۔ "میری ادبی زندگی کا آغاز تو غالباً اُسی وقت ہوا ہوگا جب میں نے اُردو لکھنا پڑھنا سیکھی، کیونکہ کرشن چندر کی "شکست" اور عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" پڑھی تھی تو بعض الفاظ کا صحیح تلفظ پوچھنے کے لئے اماں کے پاس جانا پڑتا تھا۔ اُسی وقت سے مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہوا۔ لیکن یہ شوق صرف اُن قلمی رسالوں تک محدود تھا جو ہم بہن بھائی ایڈیٹر بننے کے شوق میں نکالا کرتے تھے۔ ویسے میری پہلی باقاعدہ کہانی کا عنوان تھا "ایک نظر اِدھر بھی" یہ ۱۹۵۸ء کے "ادبِ لطیف" لاہور میں شائع ہوئی تھی۔"

شاد:۔ "یہ بتایئے کہ آپ کے سیاسی اور مذہبی نظریات کیا ہیں ؟"

بانو:۔ "میں سمجھتی ہوں اعلیٰ انسانی تہذیب مکمل طور پر ابھی اتنی آگے نہیں بڑھی کہ وہ روحانیت کا سہارا لئے بغیر اپنی صالح قدروں کے نظام کو برقرار رکھ سکے۔ انہی معنی میں مذہب کو ضروری سمجھتی ہوں۔ میں کسی خاص سیاسی نظریئے سے متاثر نہیں ہوں، صرف اُن قدروں کی تائید کرتی ہوں جو انسانی مساوات پر مبنی معاشرے کی تعمیر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اِس طرح آپ چاہیں تو مجھے ترقی پسند مکتبِ خیال کا حامی قرار دے سکتے ہیں۔"

شاد:۔ "اور ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا یہ تحریک اب ختم ہو چکی ہے اور کیا موجودہ حالات میں اِس کی ضرورت نہیں ہے ؟"

بانو:۔ "ترقی پسند تحریک نے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے لیکن اب اُس کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ اِس لئے وہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ اب حالات اتنے بدل چکے ہیں کہ اُسی شکل میں اس تحریک کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

شاد:۔ "ویسے آپ ذاتی طور پر ادب میں افادیت اور مقصدیت کی کس حد تک قائل ہیں ؟"

بانو:۔ "میں ادب میں افادیت اور مقصدیت کی اس حد تک قائل ہوں کہ چاہے کسی خاص سیاسی نظریئے یا فارمولے کو سامنے رکھ کر لکھا جائے لیکن ادیب کی وہ تخلیق ادب پارہ کہلائے اخبار کی خبر یا صرف پروپیگنڈہ نہ بن جائے۔ میرے خیال میں تو ہر ادیب اپنے سامنے ایک مقصد رکھ کر ہی لکھتا ہے خواہ اُس کا اظہار شعوری طور پر نہ کرے۔ ویسے ترقی پسند تحریک کے دَور میں مقصدیت اور افادیت کو کچھ ایسے معنی پہنائے


اب... سنڈک کیمیلون کی نویلیوں کے لئے
اپنی شان کو آپ ہی ٹھیک رکھنے والا جوتا آدھمکا...
نئی نویلیوں کے لئے باٹا کا سنڈک پامیلا اپنی نوعیت کا سب سے پہلا ہے جو کیمیلون سے بنا ہے۔ کمسن لڑکیوں کے رجحانات کا خیال رکھتے ہوئے بنایا گیا تاکہ جس طرح بھی پہنا جائے زیادہ سے زیادہ دنوں تک ساتھ دے سکے۔
یہ ایک خوبصورت جوتا ہے۔ دیکھنے میں بہترین ایڑی سے نوک تک یکساں بناوٹ اور پاؤں میں بالکل فٹ۔ مختلف رنگوں میں ملتا ہے۔ نیلا، زردی مائل اور سیاہ رنگ میں۔ سرخ، نیلو اور بھورے رنگوں میں عنقریب دستیاب ہوگا
بلا مبالغہ یہ انتہائی پائیدار جوتا ہے جس کی تیاری میں باٹا کی مہارت اور جوتے سازی کے ساز و سامان لگے ہیں۔ کیمیلون کے جوتے یوں بھی دیکھنے میں خوبصورت ہوتے ہیں۔ آپ ان پر بھروسہ رکھ سکتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ دنوں تک اپنی شکل برقرار رکھتے ہیں اور چمکدار رہتے ہیں
کیمیلون کے جوتے آپ کسی موسم میں پہن سکتے ہیں۔ گرد و غبار، داغ دھبے کا کوئی اثر نہیں۔ پانی میں ڈبو دیجئے اور پہن کر چلئے یا کپڑے سے رگڑ ڈالئے۔ برش، پالش یا اسی قسم کی دوسری چیزوں سے بے نیاز آپ جہاں بھی جائیں سنڈک آپ کا ساتھ دیگے۔ یہ زیادہ دنوں تک نئے جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ آج ہی سنڈک پامیلا خرید لیجئے۔
□ ہر موسم میں شاندار
□ پونچھئے اور پہنئے
□ بناوٹ ہمیشہ قائم
□ رنگ برابر چمکدار
پامیلا
سنڈک
کیمیلون
پامیلا
Bata
جوتوں میں ایک نیا سنسنی خیز اضافہ
* رجسٹرڈ ٹریڈ مارک

[illegible] ایک خاص تحریک سے مل جانے لگی ہے۔
[illegible] کے بغیر کوئی ادیب اچھا اور صحت مند
ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔"

بانو:- "ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ اگر سماجی شعور کا مطلب محض سیاسی شعور ہے
[illegible] تہذیب، تاریخ اور معاشرے کے تمام بنیادی
حقائق اور [illegible] سے آگہی بھی ہو۔ کیونکہ ذہنی اور جذباتی طور پر کوئی
بھی [illegible] ادیب اپنے معاشرے سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔"

شاد:- "ادب ادیب کی شخصیت کا یا شخصیت سے اُس کے فرار کا ترجمان
ہوتا ہے؟"

بانو:- "دونوں باتیں ممکن ہیں۔ ادیب کسی تخلیق میں تو اپنی شخصیت سے فرار
اختیار کرتا ہے اور کہیں وہ اپنی ہی شخصیت کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ لیکن
[illegible] شخصیت سے فرار کا رجحان بھی ایک طرح سے ادیب کی شخصیت
ہی کا ایک حصہ ہے۔"

شاد:- "اور کیا اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟"

بانو:- "اچھے انسان سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اچھائی اور برائی کے کوئی بندھے
ٹکے معیار تو ہیں نہیں۔ مختلف تہذیبوں اور مذہبوں کی اخلاقی قدروں
میں بہت کچھ فرق موجود ہے۔ اس لئے میں اچھے انسان کو کون سی کسوٹی
پر پرکھوں؟ میں تو اچھا ادب تخلیق کرنے کو بھی انسان کی ایک اچھائی
تصور کرتی ہوں۔ ویسے عام طور پر یہی دیکھتی ہوں کہ ادیب حضرات کی
نجی زندگی کے بارے میں رائے عامہ ہمیشہ ہی اچھی نہیں رہی ہے۔"

شاد:- "کیا ہمارا موجودہ ادب جمود کا شکار ہے؟ اگر ہے تو آپ کے خیال میں
اس کی وجہ؟ اور اگر نہیں تو یہ مسئلہ پیدا ہی کیوں ہوا؟"

بانو:- "۵۲-۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ ادب میں ہر طرف جمود کا شور مچ رہا تھا۔
بس اُسی وقت میں نے قلم اٹھایا تاکہ اُن نعروں کی شدت کو کم کر سکوں۔
میرا خیال ہے کہ یہ نعرہ اُس وقت بلند کیا گیا جب ترقی پسند گروپ کے
نمایاں لکھنے والے تھک چکے تھے۔ اُن کی حد تک تو جمود کی بات واقعی
درست تھی۔ نئے لکھنے والوں کو نہ تو کوئی اہمیت دی جا رہی تھی اور نہ کوئی
ایسا نمایاں گروپ اُبھر سکا تھا۔ اس لئے جمود کے نعرے کو فروغ حاصل
ہوا اور کمال یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ نعرہ بلند کیا تھا اب وہ خود ہی
شرمندگی کے ساتھ اُس کی تردید کرتے ہیں۔ ویسے بھی اُن دنوں ہمارا معاشرہ
ایک ایسے شدید بحران سے دوچار تھا کہ صرف ادب ہی کیا ہر طرف غیر یقینی،
اُداسی اور انتشار کا عالم چھایا ہوا تھا لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد بہت سے
ایسے ادیب اور فنکار سامنے آئے جنھوں نے جمود کا یا نہیں تو اپنی جانب
متوجہ ضرور کیا ہے۔ مختصر یہ کہ میرے خیال میں ادب میں جمود کا نہ تو کوئی
مسئلہ ہے اور نہ اب اس پر مزید بحث کی ضرورت ہے۔ اب تو اس
بات کی ضرورت ہے کہ پچھلے دس پندرہ برس میں نئے گروہ نے جو کچھ
لکھا ہے اُس کا تجزیہ کیا جائے۔"

شاد:- "آپ کے خیال میں ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟"

بانو:- "موجودہ دور میں اُردو سخت کشمکش سے گزر رہی ہے اور اس کی
بقا کے لئے جو کچھ کرنا ہے وہ ہمارا ہی کام ہے۔ کیونکہ آج نئی نسل کا مستقبل
ہندی اور انگلش سے وابستہ ہے۔ اس لئے ہمارے بچے اُردو سیکھنے میں
دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ اُردو کو صرف اِسی رجحان سے خطرہ لاحق
ہو سکتا ہے۔"

شاد:- "کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتی ہیں کہ ہندوستان میں اُردو کی بقا
کی اب صرف یہی صورت ہے کہ دیوناگری رسم الخط کو اپنا لیا جائے؟"

بانو:- "نہیں صاحب! اس بات سے مجھے شدید اختلاف ہے کہ اُردو کے
رسم الخط کو بدلنے پر غور کیا جائے۔ کسی زبان کو زندہ رکھنے کے لئے اُسے
دوسری زبانوں میں ضم کر لینے کی میں مخالف ہوں۔ ہندوستان میں اور
بھی تو زبانیں ہیں۔ آخر اُن کی ترقی اور بقا کے لئے رسم الخط بدلنے کے
بارے میں کیوں نہیں سوچا جاتا۔ جو لوگ اُردو کا رسم الخط دیوناگری
کرنے کا مشورہ دیتے ہیں وہ اُردو دشمن ہیں اُردو دوست نہیں۔"

شاد:- "بے شک! بے شک! آخر میں اگر آپ چاہیں تو رسماً آپ کا شکریہ
بھی ادا کر دوں۔ آپ کو زحمت تو واقعی بہت دی میں نے۔"

بانو:- "زحمت کاہے کی شاد صاحب۔ ہاں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ آپ
نے سوال کچھ اتنے سنجیدہ انداز کے کئے ہیں کہ اپنے آپ کو ادیب تصور
کرنے اور سنجیدہ بننے کا موڈ زبردستی سوار کرنا پڑا!"

(مشترکہ قہقہہ)

---



# ہم نے اس کی شادی دھوم دھام سے کی

ہماری خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم جیسے کم آمدنی والے سیتا کی شادی ایسی دھوم دھام سے کر سکتے ہیں۔ اب تو ہمیں یہ بھی یاد نہیں (کیونکہ برسہا برس گزر چکے ہیں) کہ ہمیں نیشنل اینڈ گرنڈلیز بینک میں ہر مہینے بچت کچھ جمع کراتے رہنے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔ اور ہمیں یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ہمیں اس کے اندر قدم رکھنے کے لیے بڑی ہمت سے کام لینے کی ضرورت پڑی تھی کیونکہ ہم یہ خیال رکھتے تھے کہ نیشنل اینڈ گرنڈلیز بڑا اور بڑے لوگوں کا بینک ہے۔ وہ ہم پر ہنسیں گے تو نہیں؟ وہ بچت کی اتنی حقیر سی رقم قبول کر لیں گے۔ مگر آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ انہوں نے ہم سے کہا یہ کہ اگر آپ پانچ روپیہ سے بھی کھاتہ کھولیں تو ہم [illegible] اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہاں سیونگ بینک اکاؤنٹ کھولنے کے لیے صرف ۵ روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی کیا وہ تو ہم فیصدی سود دے کر رقم کو بڑھاتے بھی ہیں۔ بس اندر قدم رکھ دیجیے اس کے بعد بڑی دوستانہ فضا میں خود دیکھ لیجیے [illegible] بینک میں ہی خوبیاں ہوتی ہیں [illegible] نیشنل اینڈ گرنڈلیز [illegible]

## آپ اور نیشنل اینڈ گرنڈلیز بہترین دوست ثابت ہوں

## نیشنل اینڈ گرنڈلیز بینک لمیٹڈ

یونائیٹڈ کنگڈم میں قائم شدہ ۔ ممبروں کی ذمہ داری محدود ہے
ایسوسی ایٹڈ بینکس ۔ لائڈس بینک لمیٹڈ ۔ نیشنل پراونشیل بینک [illegible]

دہلی میں واقع شاخیں:۔ چاندنی چوک۔ چاندنی چوک (لائڈز برانچ) بھاگ مل بلڈنگ گراؤنڈ فلور، روڈ کملا نگر دہلی [illegible]
نئی دہلی:۔ ۱۰ پارلیامنٹ اسٹریٹ (لائڈز برانچ)۔ ایچ بلاک کناٹ سرکس (سیف ڈپازٹ لاکرس) [illegible]
۵/۷۵۔ دیسٹرن اکسٹینشن ایریا، اجمل خاں روڈ، قرول باغ۔ جیون وکاس بلڈنگ [illegible] آصف علی [illegible]
کمرہ ۱ ہلو والیہ (لائڈز برانچ)

BENSONS/NGB-10 C LPU

# نازک رشتہ

مس طلعت آمبوری

۱۲۔ محمد پورہ، گلی نمبر ۲۔ آمبور (این۔ اے) ضلع مدراس

۲۷ر فروری ۶۷ء

اچھے چچا جان! آداب

کئی پہلی بار "نازک رشتہ" کے ساتھ "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کی جسارت کر رہی ہوں لیکن آپ تو ہمارے محترم بزرگ ہیں ـــــ اس لحاظ سے آپ کا اور ہمارا رشتہ قطعی نازک نہیں اور نہ "بیسویں صدی" ہی سے ہمارا تعلق کوئی نیا اور کمزور ہے، جو نازک کہلائے ـــــ اسی مضبوط اور پُرلطف رشتے نے تو آج اتنی جرأت بخش دی کہ اپنی ایک تخلیق حاضرِ خدمت کر سکوں . . .

آپ کی ایک زود رفتار و بھتیجی

مہر طلعت آمبوری

"تم پوچھ رہی ہو... نادر تمھارا کون ہے؟ وہ میرا کون ہے۔ بتا دوں تو کہہ اٹھو گی، اتنا تو وہ میرا بھی ہے . . . سنو گی ـــــ؟" روبی نے خلا میں تکتے ہوئے پوچھا۔

"سُننے ہی کے لئے تو میں نے یہ ذکر چھیڑا ہے۔" رینو ہنس پڑی لیکن روبی کی اداسی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"تم جانتی ہو۔ میری ازدواجی زندگی بہت کامیاب رہی ہے۔ تمھارے بھائی جان بہت معقول آدمی ہیں۔ نادر انہی کا دوست تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ مجھ سے ملا تو میں اس کی ذہانت سے متاثر ہو گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ بات مجھ پر کھل گئی کہ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی سادہ لوح اور معصوم انسان ہے۔ اتنا معصوم اور سادہ تھا کہ لوگ اسے بدھو کہتے تھے۔ انھیں نادر بہت عزیز تھا۔ ان کا اس دنیا میں کوئی اپنا نہ تھا۔ جو چند احباب تھے اس سے نالاں تھے، اور وہ بھی ان سے بیزار تھا۔ نادر کا بے انتہا خلوص احباب کے لئے "مصیبت" بن جاتا تھا۔ اس لئے نادر ان سب سے الگ تھلگ زندگی گزار رہا تھا۔ باتیں بہت اچھی کرتا تھا۔ وہ رنگ سازی کرتا تھا۔ یہ دروازوں اور کھڑکیوں پر رنگ دیکھ رہی ہو؟ یہ سب اسی کی محنت کا نتیجہ ہے۔ وہ بڑی لگن سے ان کے کمرے کی چیزوں پر رنگ کرتا تھا۔ نادر کی یہ جی بھر کے تعریف کرتے تھے۔ میں ذرا سی تعریف کر لوں تو جل جاتے تھے۔ یہ اندازہ ہوتے ہی میں محتاط ہو گئی تھی لیکن نادر ـــــ وہ اتنا معصوم تھا کہ نگاہوں کی تبدیلی محسوس نہ کر سکا اور اسی طرح آتا رہا۔ جہاں کمرے کی کسی چیز کی چمک کم ہوئی کہ آیا اور لگا ہر ہر چیز کو چمکانے۔ یہی نہیں، مجھے آوازیں دے کر کہتا۔

"بھابی! . . . دیکھو۔ یہ رنگ تمھیں پسند آیا ـــــ؟"

"بھئی! میں کیا جانوں۔ ان سے پوچھ لو" میں مسکرا دیتی۔

"ان سے؟ . . . ان سے تو میں پہلے پوچھ چکا۔ بھابی، یہ رنگ تمھاری پسند کا ہے" تو وہ ہنستے ہوئے انھیں سے کہتا ـــــ میں کہتا تھا کہ اس بھابی کو آنے دو۔ کمرے کو دلہن کی طرح سجا دوں گا۔ دیکھو اچھا ہوا [illegible]

[illegible] میں مسکرا کر رہ گئی۔

"نادر! تمھارے دوست شاید ٹھیک ہی کہتے تھے کہ تم بس چلے تو ان پر بھی رنگ چڑھا دو!"

"ہا ہا . . ." نادر بڑے زور سے ہنس کر برش چلاتے ہوئے کہتا "واہ . . . بھابی! کمال کر دیا تم نے بھی۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کہیں بتائی جاتی ہیں ـــــ؟ ویسے ہاں بھابی! یہی تو ستم ظریفی ہے کہ میرا بس نہیں چلتا ورنہ آپ پر بھی رنگ چڑھا دیتا۔"

اُس کی باتوں میں کچھ ایسی بے ساختگی ہوتی تھی کہ میرے ساتھ وہ بھی ہنس دیتے۔ پھر مصنوعی غصّے سے کہتے تھے —— "کیوں بے! میرے سامنے میری بیوی پر رنگ جمانے کی تمنّا کر رہا ہے؟"

"کیوں نہ کرتا جناب! آپ میری بھابی تو اتنی پیاری ہیں کہ بس! . . . کیا بتاؤں۔ ذرا سی رنگین ہو جائیں تو تم بھی غش کھا جاؤ!" پھر نادر میری تعریف پر اُتر آتا کہتا۔ "وہ یوں مُسکراتی ہیں، یوں باتیں کرتی ہیں کہ . . . بس . . . دل پہ چھُری سی چلتی ہے۔ آدمی پر وہ بیتتی ہے —— ایسی ہی بہت سی باتیں —— جمیل مُسکرا مُسکرا کر مجھے دیکھتے رہتے اور پھر مذاق کرتے ہوئے کہتے۔

"ابے! بس کر . . . یہ کیوں بھُول رہا ہے کہ جس کی اتنی تعریفیں کر رہا ہے اُس کا شوہرِ نامدار تیرے ہی سامنے بیٹھا ہے!"

---

- کِسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو۔ (قرآنِ پاک)
- اللہ سے ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ (قرآنِ پاک)
- اپنے اُستادوں کی توقیر کرو۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جس نے غور و فکر کی عادت ڈالی اور اپنے نفس کو نصیحت کرتا رہا وہ سمجھ لے کہ اُس پر خدا نے بہت رحم کیا۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ)
- اللہ اُس پر رحم نہیں کرتا جو دوسروں پر رحم نہ کرے۔ اللہ اُس کی خطا معاف نہیں کرتا جو دوسروں کی خطا معاف نہ کرے۔ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ)
- معاف کرنے میں جلدی کرنا، انتہائے شرافت ہے۔

(حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)

---

"تو کیا ہوا؟ میں نے تعریف ہی تو کی ہے۔ بُرائی تو نہیں کی؟ کیوں بھابی؟"

وہ حسبِ عادت مجھ سے تائید چاہتا اور میں گھبرا کر وہاں سے چلی آتی۔ یہ کیسا آدمی ہے جو ایک شوہر کے آگے اُس کی بیوی کی جی کھول کر تعریفیں کر رہا ہے۔ اِسے کون سمجھائے کہ ایک شوہر، دوسرے مرد کی زبان سے اپنی بیوی کی شاید بُرائیاں تو برداشت کر جائے لیکن خوبیاں —— خاص کر حُسن کے معاملے میں تو اُس کے آگ ہی لگ جاتی ہے —— جبکہ شوہر تنگ نظر بھی ہو۔ لیکن یہ باریکیاں وہ کیوں سمجھنے لگا۔ میں اُس سے کترانے لگی۔

لیکن وہ کچھ بھی نہ سمجھا۔ ہر روز آتا رہا۔ میرے اور اُن کے لئے تحفوں کے ڈھیر لگاتا رہا اور اُن کے تیور بدلتے رہے۔ میں عجیب مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی۔ نادر کو ٹوک دوں تو اُس کے خلوص کو ٹھیس پہنچنے کا ڈر تھا۔ نہ ٹوکتی تو زندگی میں تلخی گھُلنے کا اندیشہ تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ کیا کروں۔ کبھی اشارتاً اُسے سمجھانے کی کوشش بھی کرتی تو وہ اِس خوبصورتی سے بات اُڑا دیتا تھا کہ میری بات دھری کی دھری رہ جاتی۔ [illegible] یاد ہوں۔ نادر ہر شام ایک کپ چائے کی خاطر ہمارے ہاں ضرور آتا تھا۔ دروازے سے گزرتے ہو کر گھر کے بیچ کھڑکی سے آواز دیتا۔

"بھئی! چائے تیار ہو تو اللہ کے نام پہ۔ اللہ کے بندے کے لئے بھابی سے بھیجو۔ ورنہ . . . ؟"

چائے پی کر وہ پیالی پٹخ کر چلا جاتا۔ ہاں وہ ہوں تو دندناتا گھر میں گھس آتا۔ اور میں یہی محسوس کرتی کہ دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ نادر میرا دیور ہے۔ بہت کم اچھا دیور! وہ بھی اکثر کہتا تھا۔

"میں گھریلو زندگی کو ترس گیا ہوں بھابی! یہاں تمہارے ہاں آ کر مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔"

ایک شام میں نے اُن کی موجودگی ہی میں اُس سے کہا تھا۔

"آخر کب تک یوں رہو گے؟ شادی کیوں نہیں کر ڈالتے؟"

"کر لوں گا۔ کوئی لڑکی پسند بھی آئے جب نا؟" وہ بڑے مزے سے ہنستا ہنستا کہتا —— "کوئی اپنی جیسی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ دو بھابی! مجھے تو آج کی عورتوں سے بہت کوفت ہوتی ہے!"

"آخر میں بھی تو آج کی عورت ہوں!" میں یونہی پوچھ بیٹھی تھی۔

"او ہو۔ تم عورت کب ہو؟ تم تو بھابی ہو!" نادر ہنسنے لگا تھا۔

"اچھا۔ تو کیا بھابی عورت نہیں ہوتی؟" جمیل صاحب نے مُسکرا کر پوچھا۔

"اوں ہوں! بھابی تو بس بھابی ہی ہوتی ہے۔ عورت سے کہیں بلند! اور صرف بھابی پر ہی کیا منحصر ہے؟ یہ تو ہر پاک رشتے کے لئے ہے۔ بہن، بہن ہی ہوتی ہے بھابی، بھابی ہی۔ دیور، دیور ہی اور بھابی، بھابی ہی۔ یہاں مرد اور عورت کا کوئی سوال نہیں اُٹھتا۔ ہاں جب کوئی دیور سے ہٹ کر مرد بن جاتا ہے اور کوئی عورت بھابی کے بجائے عورت بن جاتی ہے۔ جب مرد اور عورت کا سوال جاگ اُٹھتا ہے۔ بس! تب ہی بات بگڑ جاتی ہے۔ ساری پاکیزگی دم توڑ دیتی ہے اور تمام رشتوں پر . . . گھڑے پانی —— یا پھر نادر کا رنگ پھر جاتا ہے —— کہے؟"

میں بھونچکی سی رہ گئی تھی۔ نادر کتنا بامذاق انسان ہے۔ کتنا بلند خیال ہے؟ رشتہ میں آتے ہی عورت کو اُس کی سطح سے کس بلندی پر لا کھڑا کیا؟ . . . اور اپنی صفائی کس دلکش انداز سے پیش کر دی —— ؟ میں اُسے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھے بغیر نہ رہ سکی۔ اُس کے جانے کے بعد جب میں نے جمیل سے اُس کی اس بلند خیالی کا ذکر چھیڑا تو اُنھوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"باتوں سے شخصیت کا صحیح اندازہ لگا لینا آسان نہیں۔ بڑی بڑی باتیں کر کے کیا

مشکل ہے ہ اس سے بلند باتیں تو میں بھی کر سکتا ہوں!"

"تو کیا آپ فرشتہ ہیں؟" نہ جانے کیوں میں چڑ سی گئی تھی۔

"جی نہیں۔ لیکن آدھا انسان بھی تو نہیں ہوں۔ بس!۔۔۔ نادر بھی ایسا ہی ایک عام مرد ہے۔ ہاں باتیں ضرور کر لیتا ہے۔ اُس کی اونچی باتوں سے مرعوب ہو کر اُسے دیوتا سمجھ لینا مجھے پسند نہیں۔ بدصورت ہی کر دوسروں کو بدصورت بناتا ہے!"

مجھے اتنی شدید غصہ آ چلا تھا کہ میں کچھ نہ کہہ سکی۔ لیکن اتنا صاف صاف کہہ دینے کے بعد بھی میرا رویہ ویسا ہی رہے، یہ ناممکن تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ موقع ملتے ہی نادر سے سب کچھ کہہ دوں گی۔ اُسے بتا دوں گی کہ جمیل تم پر شک کرتے ہیں اور یہ شک میری زندگی کو جہنم بنا سکتا ہے۔ اس لئے بہتر ہے تم ہم سے دُور ہو جاؤ۔ میں مناسب موقع اور الفاظ کی تلاش ہی میں رہی تاکہ نادر کا دل نیک۔ مگر ٹھیس بھی نہ لگ جائے۔ ہاں اُس سے بولنا تو میں نے اُسی دن بند کر دیا تھا جسے اُس نے بہت دیر میں محسوس کیا۔۔۔ کوئی ایک ہفتے بعد۔۔۔ جب جمیل گھر پر نہ تھے تو وہ حسب معمول کیا۔ کچن میں باورچی خانے ہی میں رہ گئی۔ اُس نے پوچھا۔۔۔ "بھابی! تم مجھ سے ناراض ہو کیا؟"

"نہیں تو۔۔۔!" میں بمشکل کہہ سکی اور تیزی سے کمرے میں چلی آئی تاکہ نادر مجھ سے چلا جائے۔ اُس کی معصوم صورت دیکھ کر میرا دل بھر آ رہا تھا۔ میں محسوس کر چکی تھی کہ میں استقلال سے نادر سے باتیں نہ کر سکوں گی۔ ضرور رو دوں گی لیکن!۔۔۔ لیکن میری بے رُخی محسوس کر لیتا تو وہ نادر ہی کیا ہوتا۔ وہ میرے پیچھے ہی آ گیا۔

"بھابی! تمہارا رویہ میرے لئے سخت تکلیف دہ ہے۔ مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی جو تم سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتیں؟"

"دُنیا چاہتی ہے میں اِس سے بھی بُرا برتاؤ رکھوں!" میں نے جی کڑا کر کے کہہ دیا۔

"کیا۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ بوکھلا گیا۔ میں چند لمحے خود کو سنبھالتی رہی۔ پھر ہمت کر کے بولی۔

"میرے بھیا!۔۔۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ غلط نہ سوچو۔ کہو، بُرا تو نہ مانو گے؟"

"کہو۔۔۔!" اُس نے بجھے دل سے کہا۔ میں نے اُس سے نظریں ملائے بغیر رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔ مگر وہ پوری بات سنے بغیر ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا چہرہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ جیسے ابھی رو دے گا۔۔۔ جیسے ابھی ساری دُنیا کو کچا چبا جائے گا۔۔۔ جیسے اپنا گلا گھونٹ لے گا۔۔۔ جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔ عجیب تاثر تھے۔ اُس نے میرے شانوں کو سختی سے پکڑ لیا اور اپنا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب لا کر سرد لہجے میں کہا۔

"دیکھو!۔۔۔ اِن آنکھوں میں جھانک کر دیکھو۔ ان کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھو۔ کوئی غلط ارادہ نظر آتا ہے؟ مجھے، میرے ماضی، میری زندگی، میرے خیالات کو کھنگال ڈالو۔ کہیں کوئی غلط بات نظر آئے تو۔۔۔ میری گردن تمہارے کتنے نزدیک ہے۔ اسے دبا دو! بولو۔۔۔ میں بُرا ہوں؟" وہ پاگلوں کی طرح مجھے جھنجھوڑے جا رہا تھا۔ میں سہم گئی تھی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ۔۔۔ تم۔۔۔ میں تو نہیں کہتی۔ یہ تو جمیل کے خیالات ہیں۔ ورنہ تم تو۔۔۔ میرے بھائی ہو۔ میرے بھیا!"

میں جذباتی ہو گئی تھی۔ اُس وقت مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ نادر میرا چھوٹا بھائی ہے جو زندگی کے کسی امتحان میں ناکام ہو کر اپنی بڑی بہن کے گلے لگ کر رونا چاہتا ہے لیکن اُس کی خودداری اجازت نہیں دیتی۔ سچ رینو! مجھے اُس پر بے حد پیار آ رہا تھا۔ میں نے اُس کے گال پیار سے تھپتھپا کر بزرگانہ شفقت سے کہا۔

- ہر آدمی نے جو کچھ کیا اُس کے آگے آ جائے گا۔ (مہابھارت)
- جس نے اپنے کو پہچانا اُس نے سب کو پہچان لیا۔ (ہندی ادب)
- خدا کی زمین پر کوئی کمتر ہے نہ کوئی برتر۔ (مہاتما گاندھی)
- درویش کی صحبت میں خدا یاد آتا ہے، یہی لمحے کام کے ہیں۔ باقی سب بیکار۔ (کبیر داس)
- جس طرح لہریں ہوا کا ساتھ دیتی ہیں اُسی طرح ایشور کی رحمت محنتی اور صابر لوگوں کا ساتھ دیتی ہے۔ (سوامی سارشبدانند جی)
- جو انسان ایشور سے اپنا تعلق مضبوط بنا لیتا ہے اُس کا دل ہمیشہ مسرور رہتا ہے۔ (سوامی آتم آنند جی)

"سمجھ دار بنو نادر!۔۔۔ یہ دُنیا ہے دُنیا! کمبخت! بڑی ظالم ہے میرے معصوم فرشتے! اِس دُنیا میں فرشتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ان پر بھی تہمت آ ہی جاتی ہے۔ میں نے کئی بار تمہیں اشاروں میں سمجھایا بھی تھا۔ لیکن تمہارے پاس تو وہ آنکھیں ہی نہیں جو ایسی نگاہیں پہچان سکیں۔ اُف! تم کتنے بھولے ہو۔۔۔ کتنے بھولے۔۔۔!"

لیکن نادر کی وحشت بڑھ گئی۔ اُس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے میرے کندھے جکڑ رکھے تھے۔ اُس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔

"دُنیا بُری ہے۔ ظالم!۔۔۔ لیکن کیا تم بھی بُری ہو؟ میں ہمیشہ اپنا سب کچھ لُٹا کر بدلے میں بس ایک خلوص۔۔۔ کسی کا پاکیزہ سچا پیار چاہتا تھا۔۔۔ میرے اکیلے پن نے مجھے پاگل بنا رکھا ہے۔ میں نے عورت کی کبھی چاہ نہیں کی۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ تو۔۔۔ بہن۔۔۔ بھابی، ایک ہمدرد کی تمنا کرتا تھا۔ تمہیں پا کر اِس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ

میری تلاش پوری ہوگئی۔ کیا تم بھی مجھے ٹھکرا دو گی؟ ... بولو... بولو... جواب دو...!"

میں بُری طرح ڈر گئی۔ نادر پاگل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ میرے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"جواب میں دیتا ہوں پہلے! ٹھہرو" دفعتہً یہ کہتے ہوئے جمیل ڈرامائی انداز میں داخل ہوئے۔ میرا خون خشک ہوگیا۔ نادر کے ہاتھ میرے شانے پر دھرے رہے۔ وہ پریشان نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ جمیل کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بے ہودہ سفاک مسکراہٹ۔ انھوں نے نادر کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا اور میرے حلق میں کتنی چیخیں، کتنی سسکیاں گھٹ کر رہ گئیں۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا جیسے کوئی یتیم بچہ ظالم سوتیلی ماں کے ڈر سے پناہ کی تلاش میں ہو۔ میرا دل چاہا نادر کو کلیجے میں چھپا کر جمیل کی زہر آلود نگاہوں سے بچالوں۔ جیسے اس نے میری کوکھ سے جنم لیا تھا لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔

جمیل نے نادر کو دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

"نادر! تم میرے لئے اچھے دوست تھے! لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ تم میری بیوی کے لئے بھی اچھے دوست ثابت ہوگے۔ جاؤ۔ باعزت بری کرتا ہوں۔ اُمید ہے تم پھر اِدھر کا رُخ نہ کروگے!"

نادر نے جاتے جاتے مُڑ کر... ایک بار... صرف ایک بار اپنی نمناک آنکھوں سے مجھے دیکھا اور خاموشی سے ہونٹ بھینچے... سر جھکائے تیزی سے چلا گیا اور... میں... رو بھی نہ سکی تھی۔ ہائے ریتو! یہ کیسی مجبوری تھی؟ پھر میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ اور اب... اب سُنا ہے، وہ بیمار ہے۔ اپنے کسی دوست کے گھر بستر مرگ پر پڑا مجھے یاد کر رہا ہے۔ میں اُس سے ملنا چاہتی ہوں۔ مگر... میں کیا کروں؟ نادر کا نام سُنتے ہی یہ آگ بگولہ ہو جاتے ہیں۔ اُف! میں اُداس ہوں۔ میں مغموم ہوں۔ اپنے اُس نادر کے لئے۔ جو میرا کوئی نہ تھا۔ تم پوچھتی ہو۔ نادر میرا کون ہے؟ اب تم خود بتاؤ... وہ میرا کون ہے؟ کون نہیں ہے وہ...!؟ میرا سب کچھ ہے۔ پھر بھی... میرا کوئی نہیں—غیر تھا غیر—! اُف——!!"

---



# غزل

کرشن موہن۔ ایم۔ اے

موسمِ گُل میں بھی اُداس ہے دل　　کیف گلشن میں بھی ہے سوزِ قفس

تھا جنھیں ناز اپنی قوت پر　　ہوگئے تیرے عشق میں بے بس

کیا ستم ہے کہ راہِ اُلفت میں　　اہلِ دل کر رہے ہیں پیش و پس

چھائی ہے تیری یاد کی خوشبو　　جس سے مسرور ہے مری نس نس

ہر کوئی اپنا دل لُٹا بیٹھا　　عشق میں کون رہ سکا چوکس

لالہ و گُل ہیں آج وقفِ ہراس　　اور باحوصلہ ہیں خار و خس

لذتِ قُرب ہے اساسِ نشاط　　آرزوئے حیات کیفِ مَس

کیا ہوا مدتوں کے رونے سے　　چشمِ خوں بار لب نہ اور برس

رنگ بدلے بہت زمانے نے　　اہلِ مذہب ہوئے نہ ٹس سے مَس

کرلے کچھ کارِ نیک دُنیا میں　　جانے کب ٹوٹ جائے تارِ نفس

ہجر میں گھٹ رہا ہے دم میرا　　گھر تمہارے بغیر ہے محبس

وقت بیکار کھو دیا ہم نے

اَن سُنی ہی رہی صدائے جرس

# راجہ صاحب

دور آفریدی

نودہ فلور، تاج بلڈنگ، ۱۴۴ - بارہ امام روڈ، بمبئی نمبر ۳

۲۷ فروری ۱۹۹۷ء — محترم خوشتر گرامی صاحب، تسلیم

"راجہ صاحب" راجہ مہدی علی خاں کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے۔ لیکن "بیسویں صدی" کے افسانے پڑھنے والے اس میں ایک افسانے جیسا لطف پائیں گے، بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ!...

آپ کا ــــــــ دور آفریدی

یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ میں نے راجہ صاحب کے دروازے پر، اُن کے مکان واقع پالی ہل روڈ بمبئی کی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کچھ دیر میں ایک محترمہ سامنے کھڑی تھیں۔ میں نے کہا: "راجہ صاحب سے کہیے، دور آفریدی آیا ہے۔" اُس وقت قرآن شریف کی کسی سورت کی قرآت میں ہوا کرنے کی ایک زوردار آواز اندر سے آ رہی تھی۔ یہ قرآت میری آواز سُننے کے لئے رُک گئی۔ پھر اندر سے آواز آئی: "آجایئے!" اور پھر قرآت کی آواز آنے لگی۔ میں اندر داخل ہوا۔ دیکھا، اوسط درجے کے قد کا، ایک تندرست و توانا شخص بغیر تکیے کے صوفے پر چت پڑا ہے۔ بالکل ننگا تو نہیں، لیکن سراپا ننگا بھی بہت آسانی سے کہا جا سکتا ہے۔ راجہ صاحب، اس وقت صرف ایک کچھا پہنے ہوئے تھے اور کمر بند میں ایک گرہ یا کوئی پھندہ تک نہ تھا۔ میری موجودگی پر ٹھٹکے، مجھ پر ایک تیز نظر ڈالی، پھر آنکھیں بند کر لیں اور کمر بند باندھ لیا۔ اس اثنا میں قرآت کی آواز ایک منٹ کے لئے ٹھہر گئی! فرمایا: "کیوں آئے ہو؟" اور پھر قرآت شروع ہو گئی۔

میں تو یہ سُنتے ہی حیران سا ہو گیا، گم سُم سا کھڑا رہ گیا! پھر آواز آئی: "بیٹھ جایئے! اور فرمایئے کیسے آنا ہوا؟" ــــ اور پھر آنکھیں بند ہو گئیں اور پھر قرآت شروع ہو گئی۔

میں راجہ صاحب کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ لیکن ذہنی طور پر خاصہ پریشان ہو چکا تھا۔ سوچتا تھا، عجیب آدمی ہے۔ یہ آدمی بھی ہے یا کوئی داداہے، غنڈہ ہے یا چیز ہے۔ کیا ایسے بھی آدمی ہوتے ہیں! کیا ایسے بھی شاعر ہوتے ہیں!

میری خاموشی کو راجہ صاحب نے بھانپ لیا، قرآت بند کر دی۔ لیکن اندازِ گفتگو وہی رہا! ــــ "اے صاحب! دور آفریدی فرمایئے نا! کیسے آنا ہوا؟"

میں نے بہ مجبوری کہا: "میرے ایک دوست ہیں، پروفیسر سید عبدالحی رضا صاحب۔ وہ ان دنوں قائم چاند پوری پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ "ادبی دنیا" میں قائم کی ایک مثنوی پر مضمون شائع ہوا ہے۔ سُنا ہے "ادبی دنیا" آپ کے پاس آتا ہے۔ آپ رسالہ عنایت کر دیں تو مہربانی ہوگی۔ دس گیارہ روز میں واپس کر دیا جائے گا۔" راجہ صاحب فوراً گرج پڑے: "اپنی غرض سے سب آتے ہیں، پہلے کہاں مر گئے تھے؟ مجھے معلوم ہے تم چھ سات سال سے بمبئی میں ہو، لیکن آج سے پہلے کبھی نہیں آئے۔ نہیں نہیں، یہ رسالہ ہرگز نہ ملے گا! میرے چھ ہزار پانچ سو پچیس رسالے نو سات ہزار چھ سو پچاس کتابیں اسی طرح ضائع ہو چکی ہیں۔ وہ صلاح الدین احمد اور وزیر آغا مجھے مار ڈالے گا اگر تم نے میرا رسالہ کسی کو کیوں دیا! ــــ دیکھو دور آفریدی! تم نے جتنی غیریت مجھ سے برتی ہے، راجہ مہدی علی خاں کو بھی اُتنی ہی غیریت برتنے کا حق ہے۔ اس وجہ سے میں تمھیں بالکل بیکار آدمی سمجھتا ہوں۔ کار آمد ہوتے تو جس دن بمبئی آئے تھے، اُسی دن میرے یہاں آتے۔ اُسی دن نہیں تو اُس ہفتے میں آتے۔ اُس ہفتے میں نہیں تو اُس مہینے یا اُس سال ہی میں آجاتے۔ مگر آتے ضرور۔ تم تو نرے پٹھان نکلے۔ میں بھی ہند و پٹھان ہوں۔ راجپوت نسل کا ہوں۔ راجہ میرا نام ہے۔ تمھیں خبر ہے کہ تم اس وقت کس کے حضور میں ہو!" میں چُپ رہا، کچھ وہ بھی چُپ رہے، پھر بولے: "کیا کھاؤ پیوگے؟" میں نے کہا: "ناشتہ گھر سے کر کے چلا ہوں!" فوراً کہنے لگے: "تم اس وقت کیا کھا پی سکتے ہو! اس وقت تو میری کڑوی باتیں ہی ہضم نہیں ہوئی ہوں گی۔"

قدرے توقف سے چلّائے "طاہرہ لے طاہرہ یار ادھر آ ــــــ دیکھو یہ دَور آفریدی ہے، میرا صدیوں کا دوست! اور یہ میری پیاری راج دُلاری بیوی ہے، طاہرہ سلطانہ مخفی! لیکن اسے میری طرح زور دار شاعری کرنا نہیں آتی، ورنہ یہ بھی راجہ مہدی علی خاں دوم ہوتی! دیکھو طاہرہ مہمان آیا ہے۔ کچھ چائے وائے لاؤ اور "ادبی دُنیا" کے سارے فائل اس کے سامنے لاکر رکھ دو۔ یہ اپنے کام کا رسالہ نکال لے گا۔ آدمی شریف معلوم ہوتا ہے ورنہ میں اسے رسالہ ہرگز نہ دیتا!"

اس کے آٹھ دن بعد میں "ادبی دُنیا" واپس کرنے گیا تو کہنے لگے "صحابی دَور آفریدی! تم اتنے دنوں سے یہاں ہو، تم نے یہ نہیں بتایا کہ کیا کرتے ہو؟" میں نے کہا "کچھ نہیں کرتا" کہنے لگے "تو زندہ کیسے رہتے ہو؟" میں نے کہا "گھر سے پیسے آتے ہیں! اور کیسے زندہ رہنا؟" دُلار سے بولے "پھر بھی کچھ اپنی سناؤ یار!" میں نے کہا۔ "بہت عرصہ ہوا فلموں میں گیت لکھنے آیا تھا۔ اے، بی کلاس کی فلموں میں گیت لکھنے کو نہیں ملے۔ سی کلاس میں خود کوشش نہیں کی۔ زندہ رہنے کے لئے فلموں میں ایکٹنگ کرتا ہوں۔ اس وقت کئی فلموں میں چھوٹے چھوٹے کیریکٹر کر رہا ہوں۔ جب گانے لکھنے کو ملے، ایکٹنگ چھوڑ دی جائے گی"

پھر چند ماہ بعد، میں ایک دن صبح ہی راجہ صاحب کے ہاں پہنچ گیا! اُس دن طبلہ کھڑک رہا تھا، ہارمونیم گنگنا رہا تھا۔ راجہ صاحب قدرے سنجیدہ نظر آتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے "دَور صاحب! ابھی ابھی ہم نے گیت لکھا ہے۔ دھن تیار ہو جائے تو پھر باتیں ہوں گی" ہارمونیم گنگناتا رہا، طبلہ کھڑکتا رہا اور دھن اپنے پیکر میں ڈھلتی رہی۔ کچھ دیر بعد یہ مرحلہ طے ہوا اور گیت دھن پر گایا جانے لگا! اچانک راجہ صاحب کڑک کر نغمہ نوازوں کو مخاطب کیا "اے ناچنے گانے والو! اب تم سب بھاگ جاؤ۔ اب میں دَور آفریدی سے باتیں کروں گا، رام جلد پہنچا ورنہ مقدمہ کر دیا جائے گا؟"

راجہ صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "اے دَور آفریدی پٹھان بچے! تو رام پوری کیوں ہے، تو تو افغانی یا پشاوری ہوتا!" میں نے کہا "مہاراج! آپ بجنے کیوں ہیں، آپ تو وزیر آبادی یا پاکستانی ہوتے!" کہنے لگے "یہ ہونے ہوانے کی باتیں چھوڑو ــــــ میں نے سُنا ہے تم مضمون بھی خوب لکھتے ہو! کیا تمھیں راجہ مہدی علی خاں کا کلام پسند نہیں ہے! مگر ٹھہرو! تم نے اگر مجھ پر مضمون لکھا تو لوگ کہیں گے، ایک پٹھان نے دوسرے پٹھان کا پروپیگنڈہ کیا ہے تم مجھ پر ہرگز مضمون نہ لکھنا۔ ورنہ سارا ادب مر جائے گا اور تم اور میں ہی اِس دُنیا میں باقی رہ جائیں گے!" پھر ایک زور دار آواز نکلی "اے طاہرہ یار! اے میری بچی کے چھ بچوں کی اماں! دوڑ کر آجا، ورنہ یہ دَور آفریدی ہاتھوں سے گیا" بھاگی گھبرائی ہوئی

دوڑی آئیں اور کچھ نہ دیکھ کر کہا: "کیوں فضول چیخیں مارتے ہو؟" راجہ صاحب بولے: "ارے میری پیاری جان! یہ چیخیں ہیں! بھلا کون چیخیں کہے گا! یہ پیار کی پکار ہے، جو میرے دل سے تیرے لئے نکلی تھی۔" پھر بولے: "دیکھو یہ دور آفریدی مجھ پر مضمون لکھ رہا ہے اور میرا دوست وزیر آغا پاکستان سے بمبئی آنے والا ہے تو کبھی نہیں، تیرا راجہ اِن دنوں کتنا خوش ہے!"

پھر ایک بار بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی۔ چھوٹتے ہی بولے "تجھے معلوم ہے میرے پیارے دوست اِس دُنیا میں کتنے ہیں؟" میں نے کہا: "فرمایئے!" کہنے لگے۔ "میرے پیارے دوست صرف دو ہیں۔ ایک ڈاکٹر وزیر آغا اور دوسرا محافظ حیدر۔ مگر یہ دونوں بڑے ظالم ہیں! کیا کروں!" پھر زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر کچھ سانس میں سانس آئی، کچھ خاموش ہوئے، پھر کہا: "وزیر آغا کو دُنیا جانتی ہے۔ محافظ حیدر کو بھی ایک دن دُنیا جان جائے گی۔ ارے یہ وہی محافظ حیدر ہے جس نے مرحوم بالا کی فلم "مجنوں کے خواب" ڈائرکٹ کی تھی۔ اب یہ "خوابوں کے محل" ڈائرکٹ کرے گا اور پھر کہیں محلوں میں جگ دیاں مناتا ہوگا۔ تو جانتا ہے: دور آفریدی: یہ دُنیا دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔" میں نے کہا: "جی ہاں! یا تو لوگ اپنی سطح سے بلند ہو جاتے ہیں یا اپنی سطح سے نچلی زندگی میں آجاتے ہیں، یہ تو دُنیا کا کاروبار ہے۔ ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا!"

پھر میں نے کہا: "یہ دونوں تو آپ کے دوست ہوئے۔ یہ ایڈیٹر "بیسویں صدی" خوشتر گرامی آپ کے کیا لگتے ہیں؟ اُن کے بھی تو آپ بہت گُن گاتے ہیں!" راجہ صاحب نے کہا: "وہ میرا دوست نہیں ہے، میرا بھائی ہے، بھائی! مگر کبھی کبھی میرا باپ بننے لگتا ہے۔ مجھے روپے بھیجتا ہے، جیسے میں اُس کے روپوں کا بھوکا ہوں! یا وہ اپنے امیر ہونے کا ثبوت دیتا ہے، جیسے میں اُس کی امیری سے مرعوب ہو جاؤں گا! کبھی میرا سرپرست ہونے کا ثبوت دینے لگتا ہے، جیسے میں اپنوں کو بھول جاؤں گا: ویسے یہ بے چارہ بھی تو اپنا ہی ہے، اگر نالائق حرکتیں کرتا ہے تو کرنے دو ـــ میں تو اُس کے بھیجے ہوئے منی آرڈر واپس کر دیتا ہوں، پھر یہ شعر و شاعری یا "مشہور ادیبوں کے محبوب مشغلے" چھپنے سے کوئی میرا پیٹ بھر سکتا ہے! میرا موٹا پیٹ تو میرا اللہ بھرتا ہے!"

راجہ صاحب بمبئی کے ادبی ہنگاموں سے بہت دُور رہتے تھے۔ اِس کی ایک وجہ یہاں کی "ادبی گروہ بندی" بھی تھی۔ اِس لئے کسی ادبی تقریب کے سلسلے میں، کبھی بھولے بسرے بھی اُن کا نام منظرِ عام پر نہ آتا۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کی بات ہے ڈاکٹر وزیر آغا اپنے دوست راجہ مہدی کے پاس ملنے کے لئے آئے۔ اُن کی آمد پر یکدم ادبی جلسوں کا طوفان بپا ہو گیا۔ اُن میں راجہ صاحب بھی شریک ہوتے۔ یہ طوفان ذرا کم ہوا تو ایک دن کہنے لگے: "راجہ آج کل بہت تھک گیا ہے۔ کتنے جلسے، کتنے مشاعرے اٹینڈ کرنے پڑے ہیں۔ اگر راجہ اِس وقت چاہتا تو اِن سب لوگوں سے، جنھوں نے مجھے نظر انداز کر رکھا ہے، بدلہ لے سکتا تھا! مگر یہ راجہ کیا کرے۔ یہ راجہ جنگجو نہیں ہے!" اِتنے میں وزیر آغا اپنے کمرے سے ہماری طرف آ گئے اور پوچھا: "کیا ہوا؟" راجہ صاحب فوراً بولے: "کسی وزیر آغا کی وزارت کا ذکر نہیں ہے۔ اِس وقت راجہ اپنی پرجا کے مظالم کا ذکر کر رہا ہے، جو بے وقوف پرجا اکثر کرتی رہتی ہے۔ مگر راجہ اپنی جگہ راجہ ہے، کوئی اُس کا کیا بگاڑ سکتا ہے! کیوں وزیر آغا! کیوں دور آفریدی؟" میں نے کہا: "بجا فرماتے ہیں مہاراج!"

پھر راجہ صاحب اُٹھے اور جزدان میں لپٹا ہوا ایک قرآن شریف اُٹھا لائے۔ اور وزیر آغا کی طرف بڑھایا۔ وزیر آغا نے کہا: "یہ کیا ہے؟" راجہ صاحب نے فوراً جواب دیا: "وہ میری بہن ظہورہ بدر، مدیرہ "ترم" لاہور ہے نا! یہ اُسے دے دینا۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی تو تم میرے مہمان ہو، جب کبھی جاؤ، تب! اور اُس سے کہنا: تیرا بھائی، تیرے لئے اِس سے بڑا کوئی اور تحفہ کیا بھیج سکتا تھا؟"

وقت گردش کرتا رہا۔ دن رات گزرتے رہے۔ ایک دن معلوم ہوا۔ راجہ صاحب بہت دنوں سے سخت بیمار ہیں۔ استسقا ہے، حبس ریاح کا زور ہے۔ دل پر بھی بہت تکلیف ہے۔ نیشنل ہاسپٹل ماہم بمبئی میں داخل ہیں۔ ایک ماہ سے علاج ہو رہا ہے۔ پھر اچانک ۲۸ جولائی ۱۹۶۶ء کی شام کو معلوم ہوا۔ راجہ صاحب گزشتہ رات اِس دُنیا سے رخصت ہو گئے اور ابھی ابھی دفن ہوئے ہیں۔ میں پھر بھی اُن کے گھر نہ پہنچ سکا۔ اِس خبر کے دوسرے دن بھی نہیں۔ سوم کے روز صبح پہنچا۔ ان گنت لوگ اُس وقت اُن کے مکان پر آچکے تھے۔ ختم قرآن کے بعد مرحوم کے کچھ دوست اُن کی قبر پر فاتحہ کو چلے، میں بھی ساتھ تھا۔

فاتحہ کے بعد جب ہم لوگ قبرستان سے واپس ہونے لگے تو اچانک میری آنکھوں کے آگے راجہ کی تصویر آ گئی اور پھر بے اختیار آنسوؤں کا سمندر بہہ نکلا میرے آنسو بہتے ہی جا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا۔

"ظالم راجہ! اگر اپنی پرجا کو ایک دن رُلانا ہی تھا تو ساری عمر اُسے کیوں ہنساتے رہے!!"

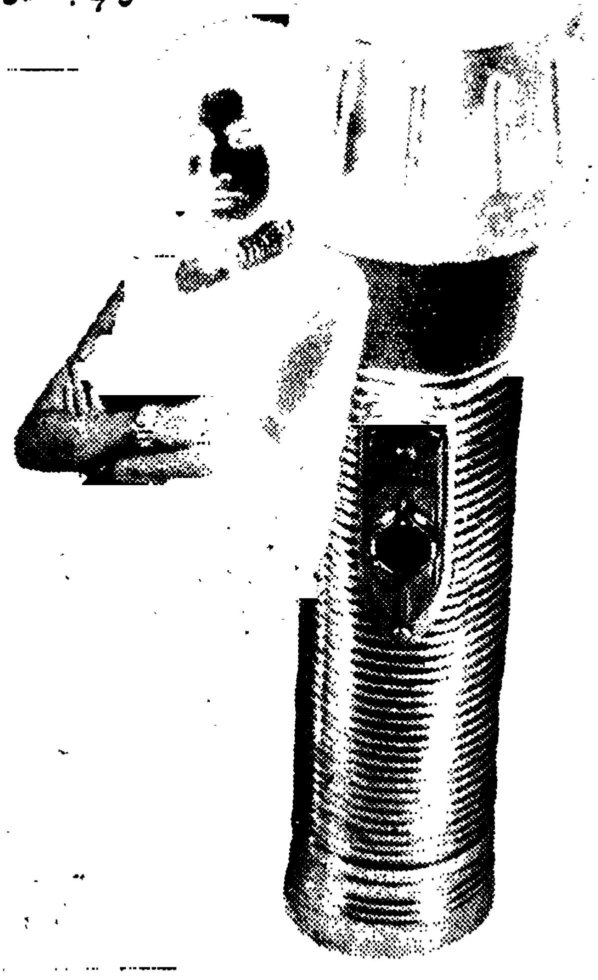
---

# بھروسہ کے لائق
# فلیش لائٹ

لیجیے ایک ایسی فلیش لائٹ جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ہمیشہ کارآمد ہونے نے اسے ہر جگہ ایک مثالی ساتھی بنا دیا ہے۔ [illegible] باقاعدہ ہے۔ اور آپ کے [illegible] بیگ میں بہ آسانی آسکتی ہے۔ جنتا فلیش لائٹ کو ہمیشہ اپنے پاس رکھیں۔

JANTA

ایک جیپ پروڈکٹ



جیپ فلیش لائٹ
انڈسٹریز لمیٹیڈ
۲۸۔ساؤتھ روڈ۔الہ آباد۔ ۱

STERLING-GF-492

افسانہ

# دھان اور زعفران

شمیم احمد

۲۰۲ بی، نیو ہوسٹل، ریجنل انجینیرنگ کالج نسیم باغ، سرینگر۔ ۹

۲۰ فروری ۱۹۷۰ء محترم خوشتر صاحب! تسلیم

ذرّوں کو آفتاب بنانا، محاورے کے طور پر سنتا آیا تھا، لیکن راتوں رات فنکار بنا دینا بس آپ کے حصّے کی بات ہے۔ ستمبر ۶۹ء کے شمارے میں میری کہانی "زخم کی کہانی، کہانی کا زخم" شائع کر کے آپ نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر میں کوشش کروں تو عوام کے پسند کی کہانی لکھ سکتا ہوں۔ شمارہ بازار میں آتے ہی، مجھے ہند کے علاوہ غیر ملکوں سے بہت سے خطوط ملے۔ میں اُن سب بھائی بہنوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری پہلی کوشش کو سراہا، میری حوصلہ افزائی کی۔ میں خاص طور سے قرۃ العین حیدر صاحبہ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے خصوصی خط کے ذریعے میری حوصلہ افزائی کی ہے ——— میں خشک سالی کے ہاتھوں تباہ صوبہ بہار کا رہنے والا ہوں۔ اپنی سردی کی چھٹیوں میں گھر آیا تو یہاں کے ماحول نے اس کہانی "دھان اور زعفران" کو جنم دیا ہے۔ اُمید ہے آپ اور بیسویں صدی کے باذوق قارئین اسے پسند کریں گے۔ آپ سب کی گرانقدر رائے کا منتظر رہوں گا۔ ——— کشمیر واپس جانے والا ہوں . . .

مخلص ——— شمیم احمد

---

ہزاروں کروٹیں بدل چکا ہوں، لاکھوں طرح سے دل کو سمجھا چکا ہوں، مگر دل اور دماغ کی یہ بھیانک جنگ ہر لمحہ زور پکڑتی جا رہی ہے۔ دل اور میں، یہ دو ایسی چیزیں ہیں جن میں چوبیس گھنٹے جنگ چلتی رہتی ہے۔ لیکن آج تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا ہے ——— کبھی دل میرے سامنے جھک جاتا ہے تو کبھی میں دل کے سامنے۔ نہ جانے یہ جنگ کب تک چلتی رہے گی۔ شاید اُس وقت تک جب تک اس دل کو دھڑکنے کا فن آتا ہے یا میں دل کی مخالفت کرنے کا حوصلہ نہ پیدا کر لوں اور تمہیں بھی تو مجھ سے یہی شکایت رہا کرتی ہے کہ میں تم سے زیادہ اپنے جذبات و احساسات سے پیار کرتا ہوں۔ اُس وقت میں تمہیں سمجھاتا "تم بھی میری اپنی ہو اور یہ دل بھی اپنا۔ لیکن تم ہی بتاؤ، کیا دل کا مجھ پر تم سے زیادہ حق نہیں؟" اور تم مسکرا کر کہتیں ——— "آپ بالکل پاگل ہیں" ہاں شمشی! میں بالکل پاگل ہوں۔ یہ پاگل پن آج پھر مجھ پر طاری ہے۔ آج جنوں کا بہاؤ پھر تیز ہے۔ آج پھر میں اس سیلاب میں ایک تنکے کی طرح بہتا چلا جا رہا ہوں۔ دُور ——— بہت دُور، پر کہاں ———؟ یہ میں کچھ نہیں جانتا ———!!

رات کے تین بج رہے ہیں۔ طرح طرح کے خیالات سے دماغ بوجھل ہو چکا ہے، لیکن نیند جیسے مجھ سے رُوٹھ گئی ہے۔ اُلٹے سیدھے خیالات نے دماغ میں ہلچل سی مچا دی ہے۔ مگر یہ دل ہے کہ دھڑکتا ہی چلا جا رہا ہے۔ میرا سارا گاؤں سو رہا ہے۔ پر میں جاگ رہا ہوں۔ نہیں نہیں میں تو سو رہا ہوں، صرف جنگ جاگ رہی ہے۔ دل اور دماغ میں جنگ، فرض اور جذبات میں جنگ، حق پرستی اور خود پرستی میں جنگ ——— دھان اور زعفران میں جنگ ——— سچ کہتا ہوں شمشی! اگر اس جنگ کے دھماکے کو میں روک نہ سکا تو میں حقیقت میں پاگل ہو جاؤں گا۔ پاگل ——— بالکل پاگل!!

جب میں فکر مند ہوتا ہوں تو اپنے گاؤں کے قریب سے گزرتی ہوئی

پھلگو ندی کے کنارے جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اس کی مچلتی لہریں مجھے مرنے جینے کا سبق دیتی ہیں۔ صاف اور شفاف رواں دواں پانی زندگی کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ اُچھلتے کودتے پانی سے پھوٹتے ہوئے نغمے میرے روز و شب کو ترنم بخشتے ہیں۔ آج بھی جب میں نے اُلجھنوں سے اپنا سر پھٹتا ہوا محسوس کیا تو اس ندی کی یاد آگئی اور اپنے غم و الم سے نجات پانے کے لئے میں اس ندی کے قریب آگیا۔ میری پھلگو ندی جو پانی کا ترانہ ہوتی ہے، کھیت اور فصلوں کے لئے آبِ حیات ہوتی ہے۔ جو آج تک میری اور میرے گاؤں والوں کی زندگی کا ایک حصہ بنی ہوئی ہے۔ سچ پوچھو تو اس ندی کے قریب جا کر میں اور زیادہ پاگل ہو گیا ہوں۔۔۔۔ کوثر و تسنیم کی طرح میری پھلگو بھی دودھ سے بھری رہتی تھی لیکن آج وہ بیوہ کی مانگ کی طرح سونی اور سوکھی ہے ۔۔۔ خشک سالی کی کالی ناگن اسے پی گئی ہے ۔۔۔ آج میں اپنا دکھ درد کسے دکھاؤں، کن آنکھوں سے بھری کہانی کسے سناؤں؟ مرنے جینے کا سلیقہ کس سے سیکھوں؟ آج پھلگو کی مچلتی ہوئی لہروں کی جگہ اُڑتے ہوئے ریت کے ذرّے ہیں ۔۔۔ آج میرا سب سے بڑا ساتھی مجھ سے رُوٹھ گیا ہے۔ میری ندی کی تجارت رُک گئی ہے ۔۔۔ بے اختیار آنکھوں سے جھرنے پھوٹ پڑے۔ لیکن آنسو سے بھی کبھی ریگستان سیراب ہوا ہے؟

یکایک خیالوں کی دیوی نے میرے سامنے سوکھی ہوئی ندی کو پانی سے بھر دیا ۔۔۔ کشتی اور شکارے چلنے لگے۔ آس پاس کے سبھی سوکھے درخت ہرے ہو گئے ۔۔۔ اور پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ پھلگو نہیں جہلم ہے۔ رات کی دوشیزگی اپنی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے، دودھیا چاندنی نے ماحول کو کسی نوخیز کلی کا نکھرا ہوا حسن بخش دیا ہے۔ جہلم کی چنچل لہریں اٹکھیلیاں کرتے کرتے نڈھال ہو کر سو گئی ہیں، جس طرح محبوب کے فراق میں مچلتی ہوئی آرزوئیں دل کے کسی گوشۂ تنہائی میں دبک کر سو جایا کرتی ہیں۔ اونچے اونچے چنار بھی چاندنی کے سائے میں سو چکے ہیں۔ جھینگروں کی ترنم ریزی نے ماحول کے سکوت کو نغمگیں بنا دیا ہے۔ خنک ہواؤں کے لطیف جھونکے خوابیدہ پھولوں کا چہرہ بوسے لے کر گزر رہے ہیں اور میں تمہارے ہاتھ میں ہاتھ دیئے چپ چاپ بند پر ٹہل رہا ہوں۔

وہی بند جہاں آج سے تین سال پہلے میں تم سے پہلی بار ملا تھا۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"میں صوبہ بہار کا رہنے والا ہوں"

"یعنی آپ ٹورسٹ ہیں؟"

"جی نہیں، میں مقامی انجینئرنگ کالج کا طالب علم ہوں"

"اور آپ کی تعریف؟"

"مجھے شمشی کہتے ہیں۔ میں یہاں ویمنس کالج میں پڑھتی ہوں"

"آپ کشمیری ہیں؟"

"آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا"

لیکن جلد ہی 'آپ'، 'تم' میں بدل گیا۔ اجنبیت نے دوستی کا رنگ لے لیا۔ پھر آہستہ آہستہ دوستی نے اُنسیت کا جامہ زیب تن کر لیا اور یہ اُنس جلد ہی پیار بن بیٹھا ۔۔۔ تم اور میں ۔۔۔ زندگی کی شاہراہ سے دور ۔۔۔ کالج کے علاوہ ہر جگہ دیکھے جانے لگے۔ کشمیر کے آغوش میں میں فطرت کے بکھرے بکھرے حسین مناظر کی سیر کو نکلتا اور تم کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتیں ۔۔۔ نظریں ملتے ہی میں بے تابی سے تمہاری جانب کھنچتا اور تم شرما کر میرے سامنے آ جانے کا انتظار کرتیں۔ پھر کبھی گیسوؤں کے کیبن میں، تو کبھی پری محل کے آرکسٹا کی دھن میں، کبھی نشاط کے شاداب غنچوں کو ہمراز بناتے، تو کبھی شالیمار کے فواروں کے بیچ ۔۔۔ کبھی چنار کی ٹھنڈی چھاؤں تو کبھی سفیدے کے فلک بوس درخت کے نیچے ۔۔۔ کبھی گلمرگ کے Swimming Pool پر تو کبھی ڈل کی خاموش سطح پر شکارے کے آغوش میں ۔۔۔ ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے ۔۔۔ ایک روز تم مجھے اپنے گھر بھی لے گئیں۔ تمہارے گھر والے بہت پیارے اور بھولے معلوم ہوئے۔ فیرن پہنے، سینے سے کانگڑی کو یوں چپکائے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو دودھ دے رہی ہو۔ ایک ہاتھ میں حقّے لئے اور دوسرے میں قہوہ کا سماوار سنبھالے ۔۔۔ وادی میں رہنے والے بھولے بھالے کشمیریوں کی زندگی کی اسی سادگی نے مجھے متاثر کیا ۔۔۔ تمہارے گھر والے مجھ سے بہت پیار سے ملتے رہے۔ میں تمہارے گھر کا ایک فرد بن گیا۔

ہر سال جب برف اپنی سفید چادر تم پر ڈالتی ہے تو تمہاری وادی مفلوج ہو جاتی ہے۔ برف کی ٹھنڈک میں سب کچھ شل ہو جاتا ہے لیکن مجھے اس سردی سے نفرت ہے۔ یہ تین مہینے کے لئے مجھے تم سے جدا کر دیتی ہے۔ اس سال بھی ہر سال کی طرح مجھے سردی کی چھٹیاں ہوئیں اور جب میں گھر کے لئے روانہ ہونے لگا تو تمہارے بابا نے مجھ سے پوچھا ۔۔۔ "ارشد بیٹا! ابھی تک آپ نے صاف لفظوں میں نہیں کہا کہ شمشی سے شادی کریں گے یا نہ کریں گے؟ محلے والے جملے بھی کستے ہیں۔ اگر شادی کرنا ہے تو بولو، نہ کرنا ہے تو صاف بولو ۔۔۔ اس کے لئے ایک بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا پامپور کا رہنے والا ہے۔ باپ دادا کے زعفران کے باغات ہیں۔ ہمیں رشتہ پسند ہے۔ مگر شادی اسی سردی میں ہو جانی چاہئے جناب! اگر آپ راضی نہیں ہیں تو ہم پامپور والوں سے بات کریں"

میں نے مسکرا کر بابا کو جواب دیا ۔۔۔ "آپ شادی کی تیاریاں کریں، شادی اسی سال سردی میں ہوگی ۔۔۔"

اور جب چلتے وقت ... پر مجھے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا تو میں نے تمہارے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا ـــــ "مقابلہ دھان اور زعفران میں ہے پگلی! گھبراتی کیوں ہے۔ دھان کی بالیاں تو زندگی کا پرچم ہوتی ہیں، میں وہ پرچم لہراتا ہوا آؤں گا!"

میرے نوکر نے مجھے بہت دُور سے آواز دی اور یکایک میرے سامنے خیالوں کی دیوی اپنا سارا طلسمی حُسن لے کر غائب ہو گئی، جیسے بجلی سی کوند جائے ـــــ خیالوں کی حسین وادی ـــــ خیالوں کی حسین جنّت پھلگو کی ریت اور سُوکھے ہوئے کھیت میں بدل گئی۔ وہ تم تھیں، نہ سر بلند و شاداب ماحول۔ میرے سامنے صرف ریت کا ڈھیر تھا جس کے اوپر میں جلے ہوئے سگریٹ کا ڈھیر لگا رہا تھا۔

"کیا ہے رامو ـــــ؟" میں نے نوکر سے مخاطب ہوتے ہوئے پُوچھا ـــــ

"بابو، یہاں کیا کرتے ہو۔ اِس بالو میں کیا دھرا ہے۔ چلو گھر چلیں۔ سب گھر میں تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔"

رامو بچپن سے میری پھلگو کے کنارے بیٹھنے کی عادت سے واقف تھا۔ اُس نے مجھے اُداس دیکھ کر ہمدردی سے کہا "ابکی بار پھلگو ماتا ہم سب سے رُوٹھ گئی ہیں بھیا۔ ایسا سُوکھا، ایسی بھوکمری ـــــ؟" رامو نے ٹھنڈی آہ بھری۔

میں نے رامو کی طرف دیکھا جو سُوکھے ہوئے کھیت میں پھٹی ہوئی زمین اور مٹی کے ڈھیر کی طرف تک رہا تھا جہاں کئی مویشی دُور دُور تک ہری گھاس کے ایک پتّے کے لئے مارے مارے پھر رہے تھے۔ رامو کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"پنڈت جی کہتے ہیں، یہ سب پاپ کے کارن ہوا ہے بابو ـــــ یہ کھیت کھلیان جہاں اناج کا ڈھیر رہتا تھا وہاں ایک بھی ہری پتّی نہیں ہے۔" رامو نے جھنجلاتے ہوئے لہجے میں کہا "کس کے پاپ کے کارن یہ ظلم ہے بابو ـــــ ہم سب تو جاہل ہیں۔ آپ پڑھے لکھے ہیں۔ بتائیں، یہ کس کا پاپ ہے؟ ـــــ اسّی، نوّے روپے من چاول کہاں سے خریدا جائے۔ ساری زمین تو مہاجن کو گروی دے دی ہے۔" رامو بولتا رہا، سسکتا رہا، مجھ سے پُوچھتا رہا لیکن اِس سوال کا جواب وہ مجھ سے زیادہ خود جانتا تھا۔ اِس قحط کا ذمّے دار صرف بے رحم آسمان اور سخت دل زمین ہی نہیں، اِس کا سہرا اُن مہربانوں کے سر بھی ہے جو دھرتی کے دانے کو اپنی تجوری کا سکّہ سمجھ کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ میں خاموش رہا۔ چُپ چاپ اُس کے ساتھ چلتا رہا۔

شام کسی طرح بیت گئی ـــــ رات کھانے کے بعد آگ کے پاس بیٹھے ابّا نے امّی سے جو کہا وہ جُملے اب بھی میرے سارے جسم میں نشتر چبھو رہے ہیں۔ میں وہاں سے کافی دُور بستر پر لیٹا اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔

امّی ابّا سے کہنے لگیں "ارشد کی شادی کب کرو گے جی۔ . . ؟"

ابھی امّی نے جُملہ پُورا بھی نہ کیا تھا کہ ابّا چیخ پڑے "شادی کی بات، تم بالکل پاگل ہو گئی ہو۔ کھیت میں دھان کا ایک دانہ نہیں۔ دھان سُوکھ گیا۔ بعد وادھو کاٹے گی۔ ربیع سے اُمیدیں لگائیں لیکن وہ بھی کالا منہ کھا رہی ہے ـــــ اور تمہیں شادی کی پڑی ہے ـــــ خشک سالی کا یہ حال رہا تو اِس سال شاید ہی ارشد میاں کشمیر جا سکیں۔ جب کھلیان میں دھان نہیں تو کالج کی فیس کہاں سے آئے گی . . . ؟" ابّا نہ جانے کیا کیا کہتے رہے مگر مجھ میں جیسے سُننے کی طاقت ہی نہ رہی۔

ہزاروں کروٹیں بدل چکا ہوں، لاکھوں طرح سے دل کو سمجھا چکا ہوں لیکن دل و دماغ کی بھیانک جنگ ہر لمحہ زور پکڑتی جا رہی ہے۔ میں کیا کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا کشمیر کے بابا کو خط لکھ دوں کہ دھان نے زعفران کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے ہیں ـــــ نہیں نہیں ـــــ تو پھر کیا کروں، کسے آواز دوں ـــــ کسے پکاروں ـــــ میری ندی مجھ سے رُوٹھ گئی ہے ـــــ میرا ساتھی مجھ سے چھوٹ گیا ہے ـــــ میں کیا کروں؟"

زعفران کے لپکتے شعلوں میں دھان کے سُوکھے ڈھیر بھی جلتے جا رہے ہیں۔

کہاں ہو ـــــ

کہاں ہو! پھلگو کی مچلتی لہرو! ـــــ دھان کی جھلملاتی بالیو!!

بچاؤ! ـــــ بچاؤ ـــــ!!

بچاؤ اِس شعلے سے ـــــ زعفران کے لپکتے شعلے سے!!

---




LIFEBUOY
for health

# غزلیں

## نقش ایم اے

سرِ انجمن غمِ دہر کا انھیں حال سارا سنا دیا
جو زباں سے کام نہ بن سکا اُسے آنسوؤں نے بنا دیا

تری چشمِ فتنہ طراز نے یہ کرم بھی کر کے دکھا دیا
مجھے وحشتوں سے نواز کر غمِ دو جہاں سے بچا دیا

مجھے جس جبیں پہ غرور تھا مجھے جس جبیں پہ گھمنڈ تھا
جو کسی کے در پہ نہ جھک سکی اُسے تیرے در پہ جھکا دیا

جسے آندھیاں اُڑا سکیں جسے بجلیاں جلا سکیں
مرا وہ نشیمنِ زندگی مرے سوزِ دل نے جلا دیا

تنِ ناتواں کے سوا تو اب مرے خاکدان میں کیا رہا
کہ سکون و صبر و قرار تک رہِ عاشقی میں لٹا دیا

نہ تمیزِ دیر و حرم رہی، نہ جبیں کی خلش رہی
ترے عشقِ درد نواز نے من و تو کا فرق مٹا دیا

یہ حسیں اداؤں کی دلکشی یہ غضب نظر کی فسوں گری
کبھی مسکرا کے ہنسا دیا کبھی درد دے کے رُلا دیا

## حامد مینائی شاہجہانپوری

نہ بہلے گا دلِ وحشی بہاروں سے گلستاں میں
مناسب ہو تو لے چل اے جنوں مجھ کو بیاباں میں

انھیں کے آشیاں اے باغباں تو نے جلائے ہیں
کہ جن کا خون شامل ہے تعمیرِ گلستاں میں

اثر کیا ہو دلِ خود دار پہ موجِ تلاطم کا
ہماری زندگی اے ناخدا گزری ہے طوفاں میں

مقدر اپنا اپنا ہے یہ قسمت اپنی اپنی ہے
کہ گل بھی خار ہو جاتے ہیں آ کر میرے داماں میں

فقط اک داستاں سن کر ہی تم اتنے پریشاں ہو
بہت سی داستانیں ہیں ابھی قلبِ پریشاں میں

پھر اس کے نام سے موجِ تلاطم کانپ اٹھتی ہے
ڈبو دیتا ہے جو اپنا سفینہ خود ہی طوفاں میں

گلوں میں تازگی کیا ہو، فضاؤں میں دلکشی کیا ہو
خزاں بن کر بہار آئی ہے اے حامد گلستاں میں

## کیف احمد صدیقی

یوں سُلگتا ہے دل آتشِ صبر میں
جیسے برقِ تپاں دامنِ ابر میں

آنسوؤ! صبح تک یوں ہی روشن رہو
چاند کا کیا بھروسہ شبِ ابر میں

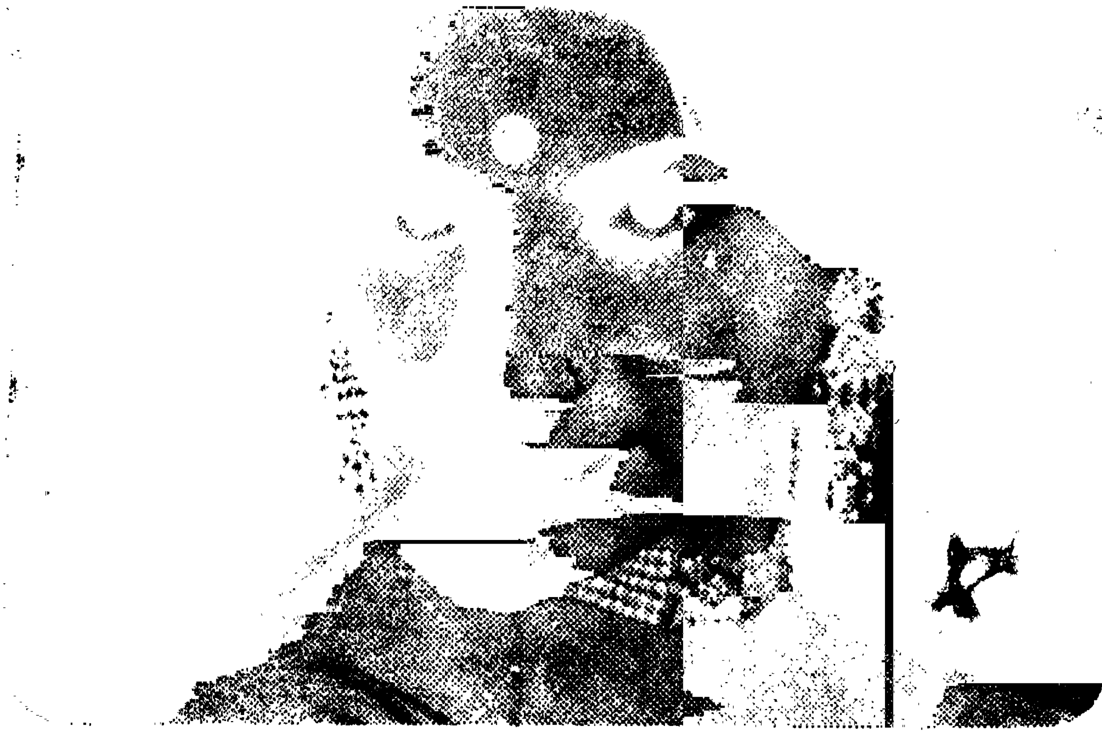
ہر طرف ہے تری یاد کی روشنی
کتنی تابندگی ہے مری قبر میں

گو مجھے اختیارِ محبت نہیں
پھر بھی دل قیمتِ پیار کے جبر میں

اہلِ عیش و طرب کو بھی حاصل نہیں
جو سکوں ہے میسر مجھے صبر میں

یوں مجھے شعلۂ عشق سے پیار ہے
جیسے آتش کی عظمت دلِ گبر میں

چند زندہ خیالات بھی دفن ہیں
کیف دیکھو ذرا ذہن کی قبر میں



افسانہ

# یہ درد اُس رات کا شجر ہے

## شعیب اعظمی

بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۲۷ فروری ۹۷ء

مکرمی خوشتر صاحب، مزاج گرامی!

میں افسانے کم لکھتا ہوں اور "بیسویں صدی" کی بزم میں باریاب ہونے کی جرأت پہلی بار کر رہا ہوں۔ ایک افسانہ "یہ درد اُس رات کا شجر ہے" ارسالِ خدمت ہے۔ یہ افسانہ کم حقیقت زیادہ ہے ـــــ حقیقت کو افسانے کا روپ دینے میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں یہ آپ کی بلند نگاہ بتا سکتی ہے . . . آپ کا

نیازکیش ـــــ شعیب اعظمی

---

پریاگ اسٹیشن پر ریلوے کی خاتون اناؤنسر آلوکر جی کی سادہ و نوخیز آواز مسافروں کے شور میں آہستہ آہستہ سنائی دے رہی تھی " یہ پریاگ اسٹیشن ہے۔ پلیٹ فارم نمبر ۴ سے ۲۸ اَپ وارانسی ایکسپریس بمبئی کو جانے والی گاڑی ٹھیک چار بج کر ۳۵ منٹ پر روانہ ہوگی۔" میں مسافروں کے ہجوم سے ہوتا ہوا تیسرے درجے کے سلیپنگ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور سائڈ کی برتھ پر اپنے نام کی چٹ دیکھ کر جذباتی موڈ میں اپنا پسندیدہ مصرع گنگنانے لگا ـــــ "تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار"!

غمزہ و ادا اور ست تو ہی یہ بھی سوچا جاتا تھا یہ قرۃ العین حیدر کہاں سے اتنے حسین اشعار تلاش کرتی ہیں۔ غمزہ و ادا کا شکار "سیتا ہرن" کی جان ہے میں ذہن اور زبان کی لذت کے درمیان اپنا بستر درست کر رہا تھا کہ ہنسی اور مسرت سے بھری ہوئی ایک چیخ سنائی دی۔

"کمال آج ہے! ہم لوگوں کا پہلا کیبن ہے۔ سارا سفر مزیدار رہے گا۔"

میں نے بے اختیار اپنی نگاہیں مسرت سے بھرپور آواز والی شخصیت کی طرف اٹھائیں۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر قلی سے اپنے چھوٹے بڑے سامان کو ادھر اُدھر رکھوا رہی تھی۔ شعر میرے ذہن سے غائب ہو گیا اور میرے حافظے میں کسی زمانے کے پڑھے ہوئے چند جملے آ گئے ـــــ "عورت جب بے پردہ ہو، مصروف ہو اُس وقت وہ بہت عظیم معلوم ہوتی ہے۔ اُس کا جائزہ ایسے عالم میں بہت شاندار ہوا کرتا ہے۔" اور میں بڑے غور سے اُسے دیکھتا رہا۔

وہ ساری اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ بلاؤز اور ساری کے درمیانی فاصلے کی چمپئی اور پیازی رنگ کی امتزاجی پٹی، پُرکشش چہرہ اور جادو جگانے والی شربتی آنکھیں میرے لئے پریشانی کا باعث بنتی رہیں اور اپنی بے پروائی میں اُس کے لباس اور جسم کا جائزہ میں باقاعدہ طور پر لیتا رہا۔ یہ مہاراشٹری حُسن ہے، سمندری جسم ہے۔ مہاراشٹری لڑکیاں، مہاراشٹری ساریاں دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ چولی دامن کا ساتھ ہیں۔ اتنی نفاست و نزاکت سے ساریاں باندھیں گی جیسے پھول کی پنکھڑیاں۔ ایک ذرا ہوا چلی۔ یہ سرسرائیں اور رنگوں اور نکہتوں کے سیکڑوں کارواں بکھیر گئیں۔

اور اب وہ میرے سامنے تھی۔ میں حُسن کے اِس کارواں کو دیکھتا رہا۔ جوڑے میں لگے ہوئے روایتی بیلے کے پھول، گلے میں لٹکتا ہوا سنہری منگل سوتر اور ترشے ہوئے بُتے جیسی ابروؤں کا معصوم مگر شوخی سے بھرا ہوا چہرہ۔ وہ اب اپنا سامان درست کر کے چہرے پر لٹکی ہوئی بالوں کی ایک آوارہ لٹ سے کھیلتی ہوئی اپنے ساتھیوں کو آواز دے رہی تھی جو پلیٹ فارم پر گاڑی روانہ ہونے کے انتظار میں کھڑے تھے۔

گاڑی آہستہ آہستہ چل پڑی۔ فضا میں برسات کی آمد آمد کے نئے نویلے بادل شام کی شفق کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے اور کبھی کبھی موتی لٹانے لگتے۔ اس ترشح نے سفر کی ابتدا کا اچھا شگون کیا تھا۔ اب اُس کے سارے ساتھی آ چکے تھے۔ اُن میں چند لڑکیاں اور بہت سے لڑکے تھے۔ ہنسی، شور اور ہنگامے کا خاتمہ گاڑی

کی تیز رفتاری کے ساتھ ہوتا گیا اور نیند آتے آتے اُن سب نے تاش کی گڈیاں نکال لیں۔ اُن میں وہ بھی شامل تھی۔ مجھے حیرت ہوئی عورت تاش کھیلتی ہے، عورت شراب پیتی ہے، گالیاں بکتی ہے تو اُس کی تقدیس اور عظمت مشتبہ ہو جاتی ہے اور وہ بہت انہماک سے تاش کے پتّوں پر نگاہیں جمائے تاش کھیلنے میں مصروف تھی۔ عورت کا تصوّرِ حُسن سے شروع ہوتا ہے۔ وہ مخلص ہوتی ہے۔ سنجیدہ اور پُر وقار ہوتی ہے لیکن اُس وقت اُسے تاش کھیلتے دیکھ کر اُس کی شوخی اور حسین معصومیت کے باوجود میں اُس کے بارے میں بہت کچھ سوچتا رہا۔ میں نے سفری بیگ سے "سویرا" نکالا اور بلونت سنگھ کا افسانہ "کمال جھالا" پڑھنے لگا۔

"کمال جھالا" عجیب و غریب کردار ہے۔ میں اپنی ہنسی کو روک نہ سکتا تھا اور ضبط کے باوجود میری زبان پر "کمال جھالا" کا نام آگیا۔ اُن سب کی نگاہیں میری اُس بے ہنگم ہنسی پر مجھے کبھی کبھی گھور لیا کرتی تھیں اور وہ اُن سب کے درمیان غیر ارادی طور پر کنکھیوں سے میرے رسالے کو بغور دیکھ لیتی اور میں بھی افسانے کے کردار کمال جھالا سے محظوظ ہوتا ہوا اُسے کبھی کبھی ارادتاً دیکھنے کی کوشش کرتا۔

رات کی تاریکی میں گاڑی اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ کمپارٹمنٹ کے دوسرے مسافر سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ میرے اوپر والی برتھ پر ایک مارواڑی ڈبّے کی خاموشی سے فائدہ اُٹھا کر آب ناؤ و نوش میں مصروف تھے۔ گاڈ از گریٹ ہر گھونٹ کے بعد اُن کا یہ مخصوص جملہ اُن کے مُنہ سے بھلا معلوم ہوتا۔ اُنھوں نے گارڈ کنڈکٹر کو بھی دعوت دی "آؤ جی۔ یہ چیز بمبئی میں کہاں ملے گی۔ گاڈ از گریٹ! آپ بھی ایک گلاس لو" اور گارڈ کنڈکٹر اِس نعمتِ غیر مترقبہ کو ٹھکرا نہ سکا اور اُن کے ساتھ شریک ہو کر بقیہ مسافروں کی چیکنگ کے ساتھ ساتھ صبح کے ناشتے کا آرڈر بھی لینے لگا۔

اُس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ بمبئی کے کئی کالجوں کے لڑکے لڑکیوں کا ایک گروپ ہے جو ہندو یونیورسٹی کی کسی تقریب میں کلاسیکل ڈرامے کے مقابلے میں شرکت کر کے لوٹ رہا تھا۔ وہ گروپ انچارج تھی اور اب اُس کے ساتھی تاش کی طویل بازی سے اُکتا کر جماہیاں لیتے ہوئے اپنی اپنی برتھ پر نیند کا لطف لے رہے تھے۔ میں نے افسانہ ختم کیا۔ کمال جھالا کا تصوّر نیند میں مُخل تھا اور میں پھر اپنا محبوب مصرع "تمام عمر رہا غمزہ و ادا کا شکار" گنگناتا ہوا سونے کی ناکام کوشش میں تھا کہ اُس نے کروٹ لی اور اُٹھ کر تھوڑے توقف کے بعد مجھ سے بولی۔

"آپ کچھ پڑھ رہے تھے۔ آپ شاید اُردو کا کوئی شعر گنگنا رہے تھے۔ مجھے اُردو کے اشعار بہت بھلے لگتے ہیں۔ مجھے اُن کے سُننے اور لکھنے کا بہت شوق رہا ہے۔ کاش میں اُردو پڑھ سکتی!" وہ خود اپنا تعارف کراتی رہی "میں میرا تو ہیا کانونٹ کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ میری ساتھی زرینہ ساجدہ، وہ [illegible] پاپا نانا ماؤنٹن میں بڑے انجینئر ہیں۔ وہ آتری جماعت کی [illegible] اُردو جانتی ہے۔ اُردو کے اشعار اُسے اِتنے یاد ہیں کہ کوئی بات ہو کوئی [illegible] سُنانے جاتی ہے۔ اسکول کے سالانہ جلسے میں اُس نے ایک گزل [illegible] آپ کو؟"

"گزل نہیں غزل کہتے!" اِتنی دیر بعد اُس نے [illegible] میں نے اُسے ٹوکا۔

"ارے آپ اُردو والے اِن سب باتوں کا بہت دھیان رکھتے ہیں" وہ [illegible] بے تکلفی سے ہنستی ہوئی بولی "ہمارے ہندی کے اُستاد بی پی [illegible] اِتھوں لیا کرتی ہے۔ اُن کا پرونسیشن بہت خراب ہے۔ ہاں تو کیسی لگی آپ غزل۔ اب تو میں نے صحیح کہا نا؟"

اور میں اُس درمیان اُسے اپنے اِتنے قریب دیکھ کر متعجب تھا۔ اُس کی ہنسی، اُس کا اشتیاق اور اُس کی اِس بے تکلفی میں اُس کے ہنستے ہوئے خوبصورت دہانوں کی چمپئی وادی کی رنگت کا شوخ نظارہ میرے لئے باعثِ مسرت ہی تھا۔

"ضرور سُنائیے" میں خواب سے چونکتا ہوا بولا اور وہ سُنانے لگی ——

سبق ایسا پڑھا دیا تُو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تُو نے

داغ کی غزل ختم کرتے ہوئے وہ مجھ سے پوچھ بیٹھی —— "کیا پڑھ لیتی ہوں میں؟"

"بہت اچھا! آپ کی آواز، آپ کا تلفّظ بہت خوب ہے۔ آپ نے داغ کی غزل پڑھی ہے۔ وہی جو کہہ گئے ہیں تخلّص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں۔"

"آپ کو بھی بہت اشعار یاد معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا ٹھہریئے میں اپنی کاپی پر نوٹ کروں گی۔ ساجدہ بی بی کو اچھے اشعار یاد کرنے پر بہت ناز ہے۔ اِتنے اشعار سُناؤں گی کہ وہ بھی کیا یاد کریں گی!" وہ قلم اور کاپی اُٹھا لائی اور بولی۔

"ہاں لکھائیے!" وہ ایک شاگرد کی طرح میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کے اشتیاق، معصومیت، سنجیدگی کے حسین انداز پر میں غمزہ و ادا کا شکار ہوتا ہوا بولا۔ لکھئے ایک شعر ——

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں سجا رکھے ہیں
شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

اُس کا ہاتھ خود بخود اپنے جوڑوں پر چلا گیا "میں نے اپنے بال؟" وہ [illegible]

سونیا

"تحسین صاحب یہ تو شاعر اپنے دوست سے کہہ رہا ہے جس نے یہ کہتے ہوئے پیالہ کھڑکی کی طرف کر لیا اور دوسرا شعر پڑھا

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں"

"یہ کون کس سے کہہ رہا ہے؟" وہ عجیب معصومیت سے گویا ہوئی۔

"اچھا دوسرا لکھئے" یہ میں جان بوجھ کر ٹال گیا۔

"آپ شرمائیں نہیں جو سے تو بہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے"

"یہ جو کیا ہوتا ہے؟" قلم کو دانتوں میں پھنساتے ہوئے وہ سراپا مجسم تصویر تھی۔

"یہی جو آپ کر رہی ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا کر رہی ہوں میں؟" قلم ابھی تک دانتوں میں اسیر تھا۔ "اے مہربان آپ مراٹھی والیاں وہ ماترا اس پائی پر لگائیے۔ شعر بھی لکھئے اور اصلاح بھی کیجئے" یہ میں نے کہہ کر ہندی کے جو پر ایک اور ماترا بڑھائی۔

اور اشعار لکھانے کا سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب تُت جمائیاں آنے لگیں اور نیند کی ماتی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے اس سے صبح کی چائے پینے کی درخواست کی اور اس نے بھی مجھ سے وعدہ لیا کہ چائے وہ خود بنائے گی اور صبح اندری پر ہم دونوں چائے پیتے وقت ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے محظوظ ہوتے رہے۔

"آپ کو معلوم ہے میں بہت اچھی چائے پیتا ہوں۔"

"اور آپ کو معلوم ہے میں بہت اچھی چائے بناتی ہوں۔"

"اسی لئے تو آج کی چائے اور اچھی ہے" میں نے کہا۔

"آپ بہت دلچسپ ہیں" وہ تکلف کے لہجے میں بول کر شرما گئی۔

"اور آپ کافی سے زیادہ دلچسپ ہیں!" میں نے بے خود ہوتے ہوئے کہا اور پیالی اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی۔ ہنسی، شرم، حیا اور مسرت کی ملی جلی کیفیتیں اس کی دلچسپی میں چار چاند لگاتی گئیں اور میرے رگ و پے میں سماتی گئیں۔ پلیٹ فارم پر بھاگتے ہوئے مسافروں کی چیخ پکار سن کر اوپر کی برتھ سے سردار جی ہڑبڑا کر اپنے سامان سمیت بھاگ رہے تھے۔ انھیں راونکیلا کے لئے گاڑی بدلنی تھی۔ میں نے ان کے تعاقب میں آواز لگائی "گاڈ از گریٹ سردار جی!" وہ ہنسے بغیر نہ رہ سکے اور میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے۔ "ری آئی گاڈ از گریٹ۔ آپ کا شکریہ!" کہتے ہوئے وہ رخصت ہو گئے اور اسی ہنگامے میں اب وہ اپنے ہم سفروں کے درمیان تھی جیسے مجھ سے کوئی مطلب ہی نہیں اور کبھی کبھی نادانستہ طور پر ہماری نگاہیں مل کر ایک لطیف سی مسکان میں تبدیل ہو جاتیں۔

اور پھر اب بمبئی اسٹیشن پر اناؤنسر کی آواز تھی۔ "بمبئی اسٹیشن آ رہا ہے۔ وارانسی جیسے گاڑی ٹھیک سے پر پلیٹ فارم نمبر ۱ پر آئی" مہاراشٹری زبان نے ہماری گاڑی کا سواگت کیا۔ میں ٹیکسی اسٹینڈ پر اپنے کیو میں تھا اور وہ اپنی کانونٹ کی گاڑی میں سامان رکھوا کر میرے قریب آگئی اور اپنا کارڈ دیتے ہوئے بولی: "اس پتہ پر ضرور آئیے!" کارڈ میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے وہ رخصت ہوا چاہتی تھی کہ میں نے ازراہِ مذاق پوچھ لیا۔

"اپنے منگیتر کا نام تو بتاتی جائیے" وہ حیرت میں تھی: "یہ جو آپ نے سہاگ نشانی منگل سوتر پہن رکھا ہے!"

"ارے یہ تو مجھے مہاراشٹر کنیا کا پارٹ ادا کرنا تھا۔ آپ بھی کیا سمجھ بیٹھے۔ ابھی تو ہمیں بہت سارا پڑھنا ہے" وہ مسکراتی ہوئی اپنے دونوں ہاتھ اٹھا بیٹھی اور ہاتھوں کے کنول کے درمیان دو روشن آنکھیں چمکتی رہیں اور ہونٹوں کے گلاب مسکراتے رہے۔

اور میں بھری برسات میں اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ بمبئی اور بارش، سونا اور اس پہ سہاگہ! ایسی حسین بارش صرف شہرِ خوباں یعنی عروس البلاد بمبئی کا حصہ ہے۔ سارا شہر بادلوں کی جھڑی کے سمندر میں ڈوبا رہتا ہے۔ عمارتیں دھل جاتی ہیں۔ سڑکیں نکھر جاتی ہیں۔ موٹریں پانی کے کٹاروں میں بہا لگتی ہیں۔ لوگ برساتیوں اور لانگ بوٹوں میں ہولق بن جاتے ہیں لیکن مہاراشٹر کنیائیں رنگین برساتیوں میں آسمان سے اتری ہوئی صاف شفاف شیشے جیسی اپسرائیں معلوم ہوتی ہیں۔ ساریاں، اسکرٹ اور شلواریں سایے کے ساتھ اس برساتی میں چھپ کر یک رنگ بن جاتے ہیں۔ چہرہ، زلفیں اور پیر انجانے، جانے پہچانے، سانولے سلونے، گندمی، چمپئی نہ جانے کتنے رنگ مگر سب اپنی بہاریں لئے ہوئے ——— میں ان تمام مناظر کو دماغ میں سموتے اپنی چارپائی پر دراز لیمپ کی روشنی میں جیب سے کارڈ نکال کر اس کا پتہ پڑھتا رہا ———

مونیکا، ساگر درشن ۲۲ وارڈن نمبر بمبئی ۲۶۔ سونیکا آسمانی اپسرا! میرے جسم میں جھرجھری سی آگئی۔ کالیداس کی شکنتلا میں سونیکا کا کردار میرے ذہن میں غیر شعوری طور پر ابھرتا رہا اور میں اپنی ذاتی ڈائری کے صفحات بھرتا رہا۔ یہ مردوں کا دل، ہر رنگ، ہر ادا اپنا شیدائی بناتی ہے۔ کسی کے موتی جیسے دانت کی آب، کسی کے دہانوں کی وادی، کسی کی جھیل جیسی گہری شفاف آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو جانے کی تمنا اور کسی کے سراپا میں ہمیشہ کے لئے کھو جانے کی دعا کیجئے۔ یہ دل بہانے



کی ادائیں اگر کوئی کشش رکھتی ہیں، اور میں اپنے دلِ گم گشتہ کو تلاش کرتا رہا جو پہلو سے نکل کر ساگر درشن وارڈن روڈ کی اجنبی اور خیالی دنیا میں آسمانی اپسرا کا خواب دیکھ رہا تھا۔

بمبئی کے شب و روز تھے اور میں تھا ——— دی ہمفری ینینشن، وہ ڈرامے، وہاں کی ادبی مجلس، ریہرسل کے ہنگامے۔ ہر چند تم نے جانے میں دل میں ایک نامعلوم سی خلش اور آنکھوں کو عجیب سی تلاش تھی۔ جیب میں پتہ کا کارڈ دل کی دھڑکنوں کو تیز کرنے کے لئے کافی تھا لیکن میں اُدھر کا رُخ نہ کرتا مبادا میری زندگی پھیکی تھی۔ زندگی نے اب تک کیا دیا تھا کہ اب رہا سہا بھی رومان کی نذر کر دیجئے۔

ثریا سنگار سمد کی سالانہ تقریب کے سلسلے میں تیج پال ہال میں ڈراموں کا ریہرسل ہو رہا تھا۔ دوستوں کا اصرار وہاں کھینچ لے گیا۔ وہاں موسیو احمد، بی۔ پی۔ سنگھ اور کیپٹن مرزا اپنی ہدایت کاری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بی۔ پی۔ سنگھ صدر کی اجازت کے بغیر کانونٹ کی منتخب لڑکیوں کا پورا گروپ اونچی پاسکل کے لباس تنگ بلاؤزوں اور اونچے لہنگوں سمیت مرتے اور بجاری کرتوں اور چھاگلوں کی آواز میں اپنی پاٹ دار آواز پر رقص کرا رہے تھے۔

"چھیتے ہو پیر تری چرتی تو کے سد کے!"

اور میں اگلی صف میں بیٹھا کسی خیال میں غرق تھا کہ رقص کرتی ہوئی پارٹی میں وہ بھی نظر آگئی۔ ایک لمحے کے لئے جب تک میرا اشتیاق دور ہو وہ پائلوں کی جھنکار کے ساتھ میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ٹخنوں سے ذرا اوپر تک کا دھانی لہنگا دونوں کا فوری تھمیں روشن کئے ہوئے چولی اور لہنگے کے درمیان کی پتلی اور چاندنی جسم کی امتزاجی خوبصورت پٹی ذرا زیادہ فاصلے کے ساتھ آنکھوں کے طویل اور حسین دنبالے اور پھر اس لباس میں لپٹا ہوا اس کا جوان جسم مجھے بے اختیار حسرت موہانی کے شعر پڑھنے پر مجبور کر رہا تھا لیکن اس نے بہت لجاجت سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"یہاں نہیں چلئے کینٹین میں!" اور جب میں اس کے پیچھے وہاں پہنچا تو کہنے لگی: "وعدہ کیجئے کسی اور کے سامنے میرے لئے کوئی شعر نہ پڑھیں گے۔ ہاں اب یہاں سنائیے کیا تھا وہ شعر؟"

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

میرے شعر دہرانے پر آنکھوں کے دنبالے بھیگ کر پُرکشش بنتے رہے۔ انگلیاں مروڑی جاتی رہیں اور نگاہیں کبھی میرے چہرے پر کبھی زمین پر۔ میں نے کہا: بس ایک شعر اور پڑھنے کی اجازت دیجئے!"

بسی ہوئی ہے جن آنکھوں میں شوخیوں کی بہار
ہوائے شرم انھیں کیوں لگائی جاتی ہے

اٹھنے لگا . . . میرے سامنے گردن کے خم ہونے اور آنچل کا جب اُڑ جانا جاگتا رہا۔

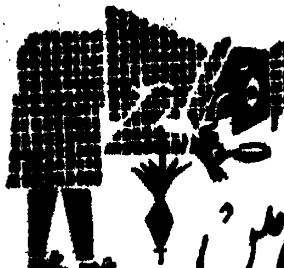
حیا سے سر جھکا لینا ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

"آپ کے یہ شعر میری جان لے لیں گے۔ نہ جانے کیوں آپ اتنے اچھے انداز میں اتنے اچھے شعر پڑھتے ہیں" وہ شرماتے ہوئے بولی۔

"مجھے معاف کیجئے جب آپ سامنے آجاتی ہیں تو نہ جانے کتنے شاعر میرے سامنے اپنا دیوان لئے آموجود ہوتے ہیں۔ میں کیا کروں شعر خود میری زبان پر آجاتے ہیں۔ ورنہ میں اتنے دنوں بعد آپ کو دیکھ کر دیکھ بھی نہ سکتا۔ ورنہ بات ہی ہو سکتی کہ یہ شاعر لوگ . . ." اتنے میں موسیو احمد، بی۔ پی۔ سنگھ اور کیپٹن مرزا پورے گروپ کے ساتھ داخل ہوئے۔ مونیکا کو معلوم نہ تھا کہ وہ سب میرے شناسا تھے۔ وہ میرا تعارف کرانا چاہتی تھی کہ موسیو حسبِ عادت رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بول اٹھے: "جناب صاحب وہ شعر ذرا پھر پڑھئے گا۔ آپ لوگوں کی جان پہچان پرانی معلوم ہوتی ہے۔" اور وہ انجان بن کر میرا تعارف کرانے لگی: "نسرین، ساجدہ، روزا، نرملا، کنیز۔ کوئی اچھا گاتی ہے، کوئی رقص کی دلدادہ ہے، کوئی کچھ ہے اور نسرین ادب و سیاست کی شیدائی ہے۔ آپ سے خوب نبھے گی ان کی۔ لیکن آپ کا تعارف کس طرح کراؤں — سوائے اس کے کہ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں کہ آپ بہت دلچسپ ہیں۔ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں اور بڑے حسین شعر پڑھتے ہیں۔" لیکن اسی درمیان بی۔ پی۔ سنگھ بھی اپنی مخصوص اردو میں بول اٹھے: "جناب آپ ان کا تعارف ہم لوگوں سے کرانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔" اور نسرین حسبِ معمول ان کی شکل اردو کی غلطیوں کی درستی کرتی لیکن چڑاتی ہوئی بولی: "ہاں تو پھر جناب ہی ہم لوگوں کا تعارف کرانے کی زحمت فرمائیں!" اور زوردار قہقہوں کے درمیان یہ کارواں ایشیاٹک میں داخل ہو گیا۔

---

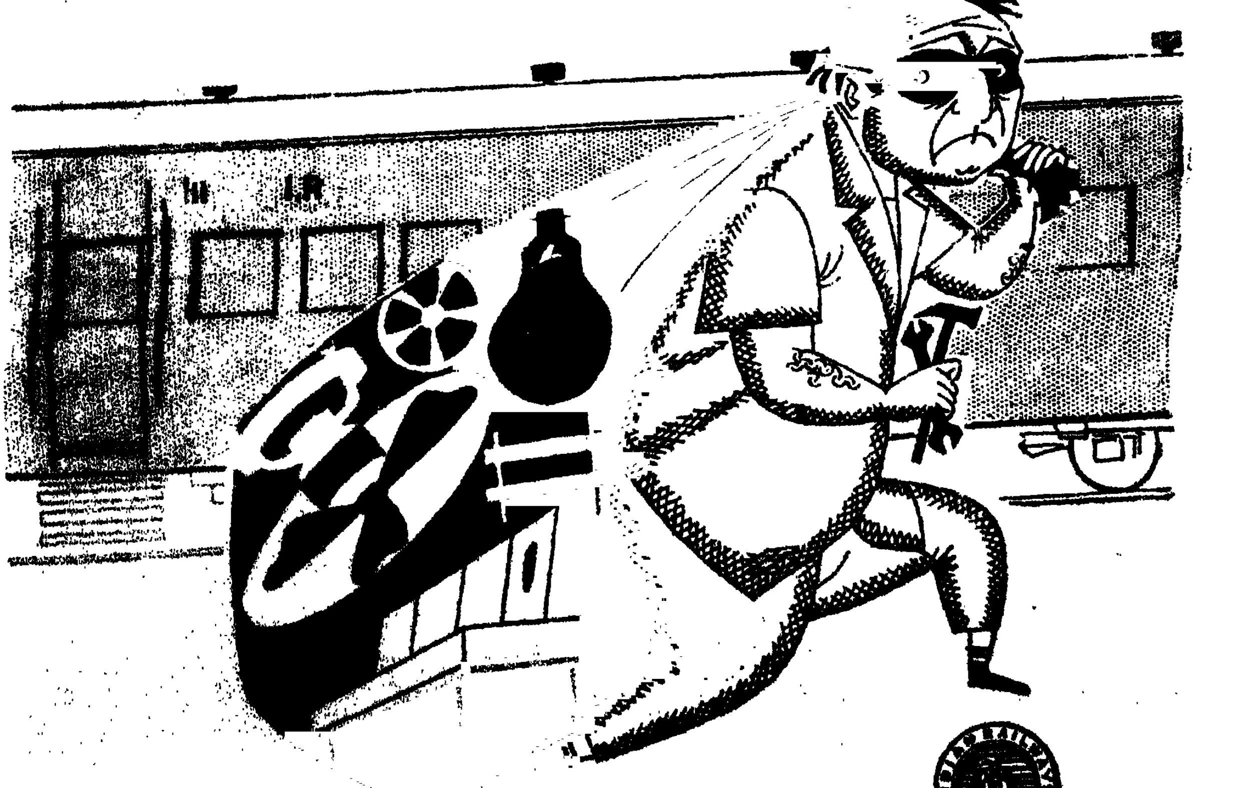
یہ برسات کی بہت شبنمی رات تھی۔ منی بھون کی وسیع عمارت میں ہم سب مغرب سے لوٹ کر آئے ہوئے رامانند ساگر کے تاثرات سننے کے لئے اکٹھے ہو گئے تھے۔ منی بھون جہاں ہندوستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگ ٹھہرے رہتے۔ سوشل ورکر اپنے جلسے کیا کرتے۔ ایشیائی ممالک کے وفود کے ممبر بھون کی خوش وضع اور مقدس گیلریوں اور زینوں پر آویزاں تصویریں دیکھتے کسی وقت بھی نظر آجایا کرتے۔ اور اسی منی بھون میں مختلف کمروں اور گوشوں میں نظریات اور ازم پر بحث کرتے کرتے دن کے ہاتھوں مجبور ہو کر خاموش عشق کیا کرتے۔ مذہب بدل کر شادیاں رچتے۔ بڑے بڑے مشنوں کی تبلیغ کے لئے ایشیائی ممالک اور یورپ کی سیر کرنے کے لئے سادگی،



# آپ کی سہولتوں میں کمی کا معاملہ

پنکھے۔ بلب۔ سوئچ۔ نشستوں کی گدیاں۔ پانی کی ٹونٹیاں۔ ڈائنمو کے بیلٹ — یہ سب قومی املاک ہیں اور ان کا مقصد ہے سفر کے وقت آپ کے لئے سہولتوں کی فراہمی۔

**کیا آپ ان کی چوری کو روکنے میں ریلوں کا ہاتھ نہیں بٹائیں گے؟**



**ہندوستانی ریلیں**

[illegible] اور زندگی کے جشنوں کی کمی بھی نہ تھی۔ اِس جشن کے ایک رنگ میں ہم لوگ بھی [illegible] گئے تھے۔ جانے پہچانے چہرے، آداب، نمسکار، نمستے اور بعض اوقات السلام علیکم کی آوازیں کمرے میں سُنائی دے جاتیں۔ پرنس کرم، فاروقی، چندر کمار دیپک، اُس علی، اینڈورز، بی پی سنگھ، موسیو اور احمد اور بہت ساری لڑکیاں رومانس کے کلچر، مغربی تھیٹر اور ڈرامے میں جدید تکنیک کُھلنے میں محو تھے اور میں دلِ خانہ خراب کے ہاتھوں اپنی آسمانی اپسرا کی روح تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ طویل گفتگو سے اُکتا کر میں لائبریری میں چلا آیا جہاں لائبریرین سمرتی بسواس نے مجھے ایک پرچہ دیا جس کی عبارت یہ تھی: "بیچ روڈ پر سنگی براونس کے سامنے مجھ سے ملئے۔ م"

وہ مجھے دُور سے نظر آگئی۔ نیلے رنگ کی ہلکی زعفران کی ساڑی، سفید چپل اور اُودے رنگ کی برساتی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی "آیئے! کتنا اچھا موسم ہے! بارش جانے والی ہے۔ یہ اچھی شام ہم آپ کہیں بہت اچھی سی جانے پہچانی جگہ گزاریں گے۔" ہم باتیں کرتے کرتے وارڈن روڈ کے ڈھلوانوں سے اُترتے ہوئے سکینڈل پوائنٹ کے پاس سمندر سے لگی ہوئی چٹانوں پر چلے گئے۔ ڈوبتا ہوا سورج اور اُس کی ڈھلی ہوئی خوشگوار دھوپ اُس کی دلکشی میں رنگ بھر رہا تھا اور میں کسی شعر کی تلاش میں ڈوبا تھا کہ وہ بول اُٹھی۔

"کیوں چُپ چُپ کیوں ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ آپ کو اتنے نزدیک پاکر ایک اچھا سا شعر یاد آرہا ہے۔ سنادوں؟"

اور اُس کا سر اثبات کا اشارہ دے گیا۔

شفق، دھنک، مہتاب، گھٹائیں، خوشبو، تارے، شبنم، پھول
اُن کے دامن میں کیا کچھ ہے دامن ہاتھ میں آئے تو

"آپ مجھے پاگل بنادیں گے! میرے پاس اتنی ساری چیزیں ہیں؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"کہاں سے گِنانا شروع کروں؟" میں اُس کی معصوم آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھانکتے ہوئے بولا۔

"آپ سے کون جیتے گا؟ آیئے چلئے چائے انتظار میں ٹھنڈی ہوجائے گی۔" اور ہم بامبے لیبرنکے کوریڈور میں ایک میز پر بیٹھے ہوئے راجندر سنگھ بیدی کی مخصوص نشست پہ سردار جعفری اور انھیں باتیں کرتے ہوئے بہت عقیدت سے دیکھتے رہے اُن کی فلموں اور بیدی کے جنتی، بھولا اور ایک چادر میلی سی کے کرداروں کا تجزیہ کرتے رہے۔

شہر کے دانشور، ادیب، شاعر، انجمنیں، سنستھائیں، شلپی کلا کیندر، پیامبر سنگھ سمیت جلسے، تقریبات، اُن میں شریک ہونے والے اگرچہ پریشان تھے مگر سب ایک صاف ستھرے ادب اور معاشرے کے لئے کوشاں۔ اِن سب کا جذبہ قابلِ صد ستائش تھا کہ نئی آنے والی نسلیں ادب، فن اور آرٹ سے بے بہرہ نہ تھیں۔

اور انھیں دانشوروں کے جلسوں میں کسی نہ کسی بہانے ہماری جان پہچان بڑھتی گئی۔ وہ کانونٹ سے صوفیا کالج میں آگئی۔ ادب، سیاست اور فلموں پر گفتگو کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرنے لگی کہ مجھے کیا چیزیں پسند ہیں۔ کپڑے کس رنگ کے اچھے لگتے ہیں، کن فلموں کے ریکارڈ پسند ہیں؟ وہ میری پسند کے لباسوں میں آنے لگی۔ شہر کی خاموش تفریح گاہوں میں بہت کے تانے بانے اپنے آپ بُنتے رہے۔ اُس کے پیغامات مجھے کبھی امپائر میں، کبھی فیلٹیئر میں اور کبھی سنگم میں ملتے رہتے۔ آج یہاں آجایئے، کل میں وہاں ملوں گی اور میں اِس قربت کا انجام جاننے کے باوجود اُس کی طرف نہ جھکنے سے اپنے آپ کو بے بس پاتا رہا۔ اپنے حلقے میں نہ جانے کیا فیشن تھا کہ جاننے والی زبان ایک دوسرے کو پڑھانے میں مدد دیتے رہو اور وہ جادا جاجا آیا کاکا لاتا پالا، رانی کا بانو لا پڑھنے والی لڑکی روانی سے اُردو پڑھتی گئی۔ اُس کے حُسن، نفاست اور اس ذہانت نے مجھے اُس کا اور گرویدہ بنا دیا ـــــ ہمارے اِس تعلق کا چرچا اپنے حلقے میں بحث و گفتگو کا موضوع ہوگیا۔

اِس کے باوجود میں اپنی مقررہ حد سے آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ ریشم بھون کی ایک شام کو چندر کمار دیپک کی ایک پارٹی میں ہم سب مدعو ہوگئے۔ موسیو احمد کی فرمائش پر مجھے ترنم سے غزل پڑھنے پر مجبور ہوجانا پڑا۔ میں جب آخری مصرعہ "تمنا آرزو میری سلامت زندگی تیری" دُہرا رہا تھا تو اپنا منہ دوسری طرف کرلیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے۔ وہ اُٹھ کر باہر چلی گئی اور زرینہ اُس کے پیچھے دوڑ گئی۔ سب دم بخود تھے۔

اُس رات میں بہت پریشان تھا۔ میرا کام ختم ہوچکا تھا اور مسودہ کی رپورٹ پر دوسرے ساتھیوں کے دستخط بھی ہوچکے تھے اور میں اپنی ذاتی ڈائری کے صفحات پُر کر رہا تھا ـــــ مجھے اب لگتا جاتا ہے ـــــ کلکتہ، شرت چندر کے ناولوں کا دیس، ٹیگور کے خوابوں اور نظموں کا مسکن، ستیہ جیت کی چارولتا کا ماحول اور پھر اُسی میں موہنیا کا آنا [illegible] اپنے بارے میں کبھی نہیں بتایا۔ اُس نے مجھے [illegible] باتونی بھی ہوتی ہیں لیکن وہ بہت دلچسپ باتیں کرتی ہے۔ اپنے دورانِ قیام میں مجھے اُس کی ہر ادا یاد آئی۔ اُس کی شانِ بے نیازی سے چہرے پر لٹکی ہوئی بالوں کی ایک لٹ جو بار بار میرے ذہن میں لہرا جاتی تھی۔ رات کی تاریکی میں بھی روشنی بن کر

---

میری سرکاری ڈائری کے اوراق رپورٹ کی شکل میں تیار ہوتے رہے۔ بمبئی

میری آنکھوں کے سامنے مچلتی رہی۔

دوسری صبح مجھے اُس کا ننھا سا پیغام ملا جو ایک شعر پر مشتمل تھا

اگر باور نہ ہو تجھ کو تو آ کر میری خلوت میں
مرا حال پریشاں دیکھ آ کر اپنی فرقت میں

میں پہلی بار اُس کے گھر کے دروازے پر تھا۔ دستک کے جواب میں زرینہ نے پذیرائی کی "آئیے"۔ وہ مجھے ایک کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی "یہ جناب اتنے درد انگیز اور رومانی ترنم میں پڑھنے کا انداز آپ نے کہاں سے سیکھا اور یہ کہ ذرا دوسروں کا خیال بھی کیجئے!" میں مونیکا کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا کہ زرینہ نے ہنستے ہنستے ایک پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ دیا "مژدہ اے دردِ مسیحا نفسے می آید!"

وہ نیلی ساری اور سفید بلاؤز میں ملبوس اپنے بستر سے اُٹھتی ہوئی بولی۔

"زار رانی۔ یہ کون سی زبان ہے۔ ذرا میں بھی تو سمجھوں؟"

"مونا بیگم۔ آپ بس اپنی کوشش اُردو تک ہی محدود رکھئے ورنہ پھر مسز مہدی کی کلاس میں آنا پڑے گا۔ یہ ہماری اور شوبی صاحب کی زبان ہے" دونوں کی نوک جھونک میں میں بول اُٹھا۔

"آپ نے مجھے بُلایا ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ آپ نے میری زندگی میں کیا کر دیا ہے؟" وہ یکایک روتی اور سسکیاں لیتی ہوئی میرے قریب آ گئی اور کہتی گئی "میں آپ کو کیسے بتاؤں میرے اِس دل میں ایک مہمان آ بسا ہے، ایک مرد آ گیا ہے۔ آپ کو آج جواب دینا ہوگا، اپنے بارے میں سب کچھ بتانا ہوگا" اُس کی باتوں پر مجھے حیرت تھی لیکن میں اُسے اپنے بارے میں کیا بتاتا۔ وہ جو میرے سامنے سب کچھ بن کر آ گئی تھی میری زندگی سے ناواقف تھی۔ وہی چہرہ لیکن مجسم سوال: وہی آنکھیں مگر افسردہ اور بالوں کی آوارہ لٹ میری آرزو کا مرکز! "میں بھی آپ سے ایک مشکل حل کرنا چاہتا ہوں ... آسمانی اپسرا کی روح آ بسی ہے۔ ایک لڑکی ... جواب دینا ہوگا۔ یہ شفق، یہ مہتاب، یہ تاروں، یہ شبنم، یہ پھول ... لٹ میری زندگی کا سوال بن گئی ہے مونی!!" میں ایک ثانیہ میں ... تھا اور میرے ہاتھوں میں نادانستہ طور پر اُس کی زلفوں کی لٹ آ گئی ... سے بھری ہوئی! میں نے کہا کاش یہ سب کچھ میرا ہو سکتا لیکن ... درمیان ایک حدِ فاصل ہے!" میں نے پہلی بار اُس کے ہاتھ تھام ... آسمان کا فرق ہے۔ سماج کے بندھنوں کو ہم آپ نہ توڑ سکیں گے ... ایک اجنبی، بے مقصد زندگی گزارنے والا انسان آپ کو کچھ نہ دے سکے گا!" میری توقع کے برعکس اُس کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوئی گئی۔ وہ کہہ اٹھی "میں سب کچھ جانتی ہوں۔ میں سب کچھ سہہ لوں گی۔ آپ ریکارڈ سنیں گے میرا اور اپنا پسندیدہ!" اُس نے گراموفون پر ریکارڈ رکھ دیا اور سارا کمرہ گونجتا رہا: "موہے گورا رنگ ... موہے شام رنگ دے دیو، چھپ جاؤں گی رات ہی میں!" اور میں ... اپنے کانوں میں کچھ کھو کے پا لیا ہے۔ پائے کے گنوا دیا ہے۔ موہے ... کہاں باوری بنائے کے" آواز کے رس کے ساتھ ساتھ اُس کے ... وجود میں سماتا، اپنے وجود پر چھاتا ہوا محسوس کرتا رہا۔

جب میں اُس کے گھر سے لوٹ رہا تھا تو تقریباً اِس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ میں یہاں سے نہ جاؤں گا اور زندگی گزارنے کا ایک بہترین سہارا بن بھی سکتا تھا میں واپس آ کر اپنی ذاتی ڈائری میں رہا تھا ——— بمبئی ہندوستان کا دل ہے۔ مغرب اور مشرق کا حسین امتزاج ایک نیا کیف بخشتا ہے۔ سارا ہندوستان اُمنڈ آیا ہے اور پھر یہاں مونیکا ہے، مونی ہے، مو ... کچھ رک کر میرا قلم چل پڑا ———

بمبئی بقول گجیندر گڈکر (چیف جسٹس ہندوستان) ایک کلچرل شہر ہے۔ زندگی کا ہر رخ ... ہے۔ میں یہ شہر نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں بہت حسین خواب دیکھے جا سکتے ہیں"

رات کا خوشگوار خواب جب صبح ٹوٹا تو میرے ہاتھوں میں صدر دفتر کا ٹیلیگرام تھا۔ رپورٹ کا مسودہ صدر دفتر بھیج کر مجھے پہلی گاڑی سے کلکتہ روانہ ہونے کا حکم تھا۔ میں کچھ دیر تک فرض اور محبت کی کشمکش میں اُلجھا رہا اور کل کی ڈائری کے ورق پر ... دن کی تاریخ ڈال کر میں ... میں

وہاں جاکر واپس بھی آسکتا ہوں۔ مونیکا کو ابھی پڑھنا ہے۔ ابھی اُسے بہت کچھ کرنا ہے اور ہوسکتا ہے میں بھی اُس وقت تک کسی بامقصد زندگی گزارنے کے قابل ہوجاؤں۔ میں کل امرتاؤں سے روانہ ہو رہا ہوں ؟ــــ آخری جملہ ختم کرکے میں نے ڈائری سے وہی ورق الگ کرکے لفافہ میں رکھا اور کسی پیغام بھیج دیا۔

اور وہ آخری شام جو زندگی کے آخری لمحے تک نہ بھول سکوں گا۔ مجھے زندگی کی شامیں بہت عزیز رہی ہیں اور یہ شام اُن میں یادگار شام تھی۔ میں دوستوں کے ہجوم میں وی ٹی اسٹیشن پر اُن سب سے غیر معینہ مدت کے لئے رخصت ہو رہا تھا۔ مسز خان کی خواہش پر ہم آخری چائے ساتھ پیتے ان پورنا کے کیفے میں تھے۔ رخصت کرنے والوں میں مونیکا بھی تھی۔ میں اوروں سے معذرت کرکے اُسے برآمدے میں بلا لیا۔ اُس کی صورت اُس کے اندرونی کرب کی غمازی کر رہی تھی ؟ آپ نے مجھے پہلے کچھ نہ بتایا۔ آپ یکایک جا رہے ہیں ـــــ ؟ اُس کی خاموشی رو پڑی تھی۔ میں اُس کے کہنے پر تھپتھپاتے ہوئے بولا ـــــ

” وعدہ کیجئے میرا انتظار کریں گی۔ میں . . ؟ ہچکیوں میں اُس کی آواز کھو تی گئی۔

” یاد آئیں گی . . . بہت . . ؟ وہ کچھ سنبھلتی ہوئی بولی۔

اور تڑپائیں گی . . . اِتنا کہ آپ کو چین نہ لینے دوں گی ؟ یہ بہت دیر کے بعد اُس کا پورا جملہ مکمل ہوا تھا۔

اور آج اناؤنسر کی آواز میرے دل کی دھڑکنوں میں کھو گئی تھی۔ گاڑی کی وِسل کے ساتھ اُس کا ایک چھوٹا پیکٹ میرے ہاتھ میں تھا اور اُس کے دونوں ہاتھ میرے سینے کو اُٹھے تھے۔ وہی روشن چہرہ، وہی آنکھیں لیکن پیشانی پر بالوں کی آوارہ لٹ نہ تھی۔ میں سوچ بھی نہ پایا تھا کہ گاڑی حرکت میں آگئی اور میں جب اُس خواب سے چونکا تو کھلا پیکٹ میرے ہاتھ میں تھا اور کاغذ کی تحریر آنکھوں کے سامنے تھی۔

” آپ کا پسندیدہ نیلا رنگ، آپ کی زندگی کا سوال اور آپ کی فرمائش سب آپ کے ساتھ ہیں ـــــ ماں نے نام مونیکا، اُس کی تصویر، نیلا رومال اور بالوں کے چند اُلجھے تار ـــــ میرا جی چاہا کاش! گاڑی رُک جاتی اور میں اُتر جاتا۔ یہاں سے نہ جاتا۔ لیکن اب یہ ممکن نہ تھا۔

آج بھی مونیکا کی دی ہوئی وہ ساری چیزیں میرے پاس محفوظ ہیں لیکن اُنہیں دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ میرے سینے میں درد کی ایک سِل جم کر رہ گئی ہے اور درد کا ایک تناور درخت میرے سینے میں اُگ آیا ہے۔ میرے خدا میں کیا کروں ؟!

---

[illegible]

# نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| شکست کے بعد | کرشن چندر | چار روپیہ پچاس پیسے |
| طوفان کی کلیاں | " | چار روپے |
| گدھے کی واپسی | " | تین روپے |
| الٹا درخت | " | دو روپے پچھتر پیسے |
| دروازہ | " | دو روپے پچیس پیسے |
| سسرال | شوکت تھانوی | دو روپے |
| سٹہ ۵۸ | " | تین روپے پچاس پیسے |
| بقراط | " | دو روپے پچاس پیسے |
| جی ہاں پٹے ہیں | " | تین روپے پچیس پیسے |
| جوڑ توڑ | " | پانچ روپے |
| داماد | " | دو روپیہ پچیس پیسے |
| گوشۂ عافیت | پریم چند | پانچ روپے |
| چوگان ہستی مکمل | " | گیارہ روپے |
| دودھ کی قیمت | " | تین روپے |
| خاک پروانہ | " | تین روپے |
| صبح زندگی | راشد الخیری | دو روپے |
| شب زندگی | " | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| شام زندگی | " | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| سیدہ کی بیٹی | رازق الخیری | تین روپے |
| حسن پوش | مجنوں گورکھپوری | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| اقبال | " | چار روپے |
| گرد کارواں | کنھیا لال کپور | تین روپے |
| سنگ و خشت | " | دو روپیہ پچاس پیسے |
| سونا گاچھی | جمنا داس اختر | چار روپے پچاس پیسے |
| شعلۂ سنگ | کوثر چاندپوری | تین روپے پچاس پیسے |
| شمع | اے آر خاتون | پانچ روپے |
| چشمہ | " | دس روپے پچھتر پیسے |
| شکیلہ | مسعود ہمایوں | چار روپے پچیس پیسے |
| شکست ظلمت | مخمور جالندھری | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| آرزو کی کلیاں | " | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| پہلی محبت | " | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| خواب گاہ میں | " | تین روپے پچاس پیسے |
| دنیا کے مشہور سائنسداں | " | دو روپے پچیس پیسے |
| شائستہ | نادرہ خاتون | چار روپے پچاس پیسے |
| ظالم | سید امرت | دو روپے پچاس پیسے |
| فتح خیبر | صادق حسین | چار روپے |
| مقابلہ | خان محبوب طرزی | تین روپے |
| نیلوفر | " | تین روپے |
| اکبری دروازہ | " | چار روپے |
| دوشیزۂ روم | " | تین روپے |
| دیوانہ | " | تین روپے |
| دو دیوانے | " | دو روپے پچاس پیسے |
| سیلاب | " | تین روپے |
| گناہ | دت بھارتی | دو روپے پچاس پیسے |
| اندھیرے اجالے | عادل رشید | تین روپے |
| بہار آنے تک | " | تین روپے پچاس پیسے |
| دو پھول | " | تین روپے پچانوے پیسے |
| مغرور | رئیس احمد جعفری | چار روپے پچاس پیسے |
| قیامت | ذکی انور | دو روپے پچاس پیسے |
| سازش | " | دو روپے پچاس پیسے |
| گورا | ٹیگور | چار روپے پچاس پیسے |
| لٹ گئی بہار | ضیا عظیم آبادی | تین روپے پچاس پیسے |
| دل ہی تو ہے | " | چار روپے پچیس پیسے |
| ممتاز | ایم اسلم | آٹھ روپے |
| آخری رات | " | پانچ روپے |
| ریحانہ | " | سات روپے |
| دمہ | مہندر ناتھ | [illegible] |
| گلی گلی | رام لعل | چار روپے |
| فردوس گوش | [illegible] | چار روپے |
| کفر و ایمان | [illegible] | چار روپے |
| وسکی کی بوتل | [illegible] | دو روپے |
| لندن سے کلب | مقبول مکنوری | تین روپے |
| موٹر میکینک گائڈ | خیبر ناتھ سکین | چار روپے |
| موٹر ڈرائیونگ | کرشنانند شاد | چار روپے پچاس پیسے |
| کیا خوب آدمی تھا | | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| عجیب لڑکی | اوم پرکاش نائل | تین روپے |
| ہمارا نیپال (بچوں کیلئے) | خورشید [illegible] | پچاس پیسے |
| ہمارا سبھاش | " ہندی " | [illegible] پیسے |
| اجالے سے پہلے | ابراہیم جلیس | دو روپے پچاس پیسے |
| ابھرتے جوبن | اظہر اثر | دو روپے |
| آندھی میں چراغ | غلام الثقلین | سات روپے پچاس پیسے |
| اقوال زریں | مصطفیٰ احسن [illegible] | پچاس پیسے |
| انارکلی | امتیاز علی تاج | دو روپے پچاس پیسے |
| آشا دیپ بجھ نا | ستیہ پرکاش سنگر | دو روپیہ |
| ابراہیم لنکن | چندر موہن لانبہ | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| انسانیت موت کے دروازے پر | مولانا ابو الکلام آزاد | تین روپیہ پچاس پیسے |
| اصلی مکمل باورچی خانہ | جے سی داس صاحب | تین روپے پچاس پیسے |
| جینے کے لئے | ستیہ پال آنند | دو روپیہ پچاس پیسے |
| چھبیس سال بعد | امرتا پریتم | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| حادثہ | قیصی رامپوری | پانچ روپے پچاس پیسے |
| خون | شہزادہ تبسم | چار روپے |
| رضیہ کا شاہی دسترخوان | رضیہ سلطانہ | دو روپے پچاس پیسے |
| رسیلی | شہزادہ تبسم | [illegible] |
| زمین کے چھالے | آزاد [illegible] | [illegible] |

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۲۴، دہلی

بیسویں صدی دہلی

طنزیہ

# خط لکھیں گے...

فکر تونسوی کے طنزیہ خطوط کا سلسلہ (۴)

## ڈاکٹر گنڈیری سنگھ کے نام —— •

اے میڈیکل سائنس کی ناجائز اولاد!

کل شہر کی مضافاتی بستی سے گزر رہا تھا کہ تمھارے نام کا سائن بورڈ دیکھ کر ٹھٹک گیا: "ڈاکٹر گنڈیری سنگھ۔ اے۔ وی۔ پی ماہرِ امراضِ پیچیدہ" تعجب ہوا، مسرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ چوروں کی طرح جھانک کر دیکھا تو واقعی تم تھے —— وہی گنڈیری لال جو چوک بھوڑے خاں میں گنڈیریوں کی ریڑھی لگایا کرتا تھا۔ اے گنڈیری! تم ڈاکٹر کیسے بن گئے؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم دسویں جماعت میں بھی مشکل سے پاس ہوتے ہوتے بچے تھے۔ تمھارے ماموں (نہ جانے اصلی ماموں تھے یا نقلی) البتہ حکیم ضرور تھے لیکن ان کی معلومات بھی عرق گاؤزبان سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ تمھارے والدِ محترم (جو شاید اصلی تھے) سیمنٹ میں اینٹ کی ملاوٹ کا شوق فرماتے تھے اور تمھیں رام لیلا میں ایکٹنگ کرنے کا چسکہ تھا۔ کیکئی اور منگرو کا پارٹ کرتے کرتے اچانک تم گنڈیریاں بیچنے لگے۔ اس کے چند سال بعد تم سے ملاقات ہوئی تو تم نے ایک چٹ فنڈ کمپنی چلا رکھی تھی جو اس لئے زیادہ دیر نہیں چل سکی کہ تم لوگوں کو اور لوگ تمھیں دھوکا دینا چاہتے تھے۔ اس کے بعد تم کہیں غائب ہو گئے۔ سننے میں آیا تھا کہ تم نے کہیں چھوٹی موٹی نوکری کر لی ہے۔ نہ جانے کہاں؟ کسی سبزی منڈی میں یا بنا سپتی گھی کمپنی میں یا کسی بزاز کی دوکان پر۔ میں نے سوچا، چلو تمھاری بیوی کو شوہر اور یا شو مل گیا۔

لیکن شوہر پیارے! چند سال بعد جو تم نمودار ہوئے تو ایک ڈاکٹر کی شکل میں۔ گنڈیریاں بیچتے بیچتے تم پنسلین بیچنے لگے۔ اس پر مجھے تعجب ہوا کہ گنڈیری اور کیکئی اور بزازی کی روح میڈیکل سائنس میں کیسے داخل ہو سکتی ہے؟ مجھے مسرت بھی ہوئی کہ ایک گنڈیری فروش بھی ترقی کر کے سوسائٹی کا معزز ترین انسان بن سکتا ہے اور افسوس ان مریضوں پر ہوا جو تم سے دوائیں لے کر بھی شمشان کی طرف نہیں جاتے۔

میری دلی تمنا ہے گنڈیری سنگھ! کہ تم جب بطور ڈاکٹر ناکام ہو جاؤ (اور ضرور ناکام ہو جاؤ گے) تو تم کسی پولیٹکل پارٹی میں لیڈر بن جاؤ۔ کیونکہ اس ملک میں جو انسان کسی کام کا اہل نہیں ہوتا وہ لیڈر بن جاتا ہے۔ جاہل بننا مشکل ہے، لیڈر بننا آسان۔

## سکول مسٹریس مس پربھا کے نام —— •

نہ جانے کس کی پیاری پربھا جی!

میں ہر روز تمھیں بس سٹاپ پر کھڑے دُور اُفق پر نگاہیں جمائے دیکھتا ہوں۔ نہ جانے تمھیں کس کا انتظار رہتا ہے۔ کس کو اپنا دل دے بیٹھی ہو جس کے لئے تمھاری ٹانگیں تھک جاتی ہیں، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ مگر اُفق پار کا وہ شہزادہ کبھی آتا ہی نہیں۔ کئی بار تمھاری حالتِ زار دیکھ کر میرا دل پگھل گیا اور میرا جی چاہا کہ تم سے پوچھوں، پربھا! تم نے ایسے آدمی کو دل ہی کیوں دے دیا جو آتا ہی نہیں۔ جو تمھارے دل کی دھڑکن سنتا ہی نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اُفق پار رہتا ہی نہ ہو۔ اس نے کسی اور جگہ مکان کرائے پر لے لیا ہو؟ اور تم غلط بس شاپ پر کھڑی انتظار کرتی رہتی ہو۔

لیکن تم سے میں کبھی یہ پوچھ نہیں سکا۔ حوصلہ ہی نہیں پڑا۔ اس لئے نہیں کہ تم حیکا چوند حد تک حسین ہو۔ کیونکہ تمھیں حسین کہنا تو تمھاری سخت توہین ہے۔ بلکہ اس لئے کہ تم ایک عام عورت نہیں ہو، ایک محبوبہ ہو اور انتظار کی لذت اٹھا رہی ہو (تاکنے میں بھی ایک لذت ہوتی ہے پربھا!) تو میں کیوں اس لذت میں رخنہ ڈالوں اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمھارا شہزادہ صرف تمھارے تخیل کی پیداوار ہو۔ اس کائنات میں اس کا کہیں وجود نہ ہو بلکہ وہ صرف تمھاری پلکوں پر لرزتا ہوا تابناک آنسو ہو جسے صرف تم نے ہی تخلیق کیا ہو اور صرف تمھاری پلکوں پر ہی زیب دیتا ہو اور میرے استفسار پر تمھارے حُسن تخیل کا نازک پر دہ تھر تھرا جائے، اُڑ جائے، تتر بتر ہو جائے اور تم نے اپنے بھونڈے بدن اور حسین تخیل کے امتزاج سے اپنے عشق کی جو بستی آباد کر رکھی ہے وہ اُجڑ جائے۔

اس لئے میں نے یہ تخریبی کارروائی کبھی نہیں کی۔ لیکن میرے دل میں برابر یہ خلجان ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ کیا سچ مچ تم سے کوئی عشق نہیں کرتا یا کسی نے

ایک بار تم سے عشق کر کے اپنی غلطی محسوس کر لی اور تمہارے دل کے نازک تار چھیڑ کر کہیں بھاگ گیا اور تمہیں عمر بھر کے انتظار کے لئے اِس بس سٹاپ پر چھوڑ گیا۔

میرے اِس سوال کا جواب نہ دینا چاہو تو بھی دے دو۔ تمہارے من میں ہیجان مچا ہوا ہے تو مچا رہنے دو۔ لیکن کم از کم میرا ہیجان تو ختم کر دو۔

## جیب کترے کے نام ———●

ڈیر جیب کترے!

گزشتہ تین دن سے تم میری جیب کاٹنے کی برابر کوشش کر رہے تھے۔ آج آخر کامیاب ہو گئے۔ لیکن پیارے! اِس کامیابی اور ناکامی میں بھی صرف ایک نازک سا حجاب حائل ہے۔ کیونکہ دونوں کی سرحدیں ایک دوسرے سے یوں مل گئی ہیں کہ امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا کہ تم ناکام ہوئے یا کامیاب۔ تم نے جیب کاٹی یا جھک مارا۔

بات یہ ہے مسٹر جیب کترے! کہ دو دن پہلے تک جب تم جیب کاٹنے میں ناکام رہتے تب اُس وقت تک میرے بٹوے میں روپے موجود رہتے تھے (کافی روپے تھے۔ اب رال ٹپکاتے پھرو) لیکن بدنصیبی (میری نہیں تمہاری) سے آج جب تم نے میرا بٹوا اُڑایا تو خالی تھا۔ میرا مطلب ہے، کم از کم اُس میں روپے بالکل نہیں تھے۔ اُمید ہے تم اِس خط کے پہنچنے سے پہلے ہی خالی بٹوا دیکھ چکے ہو گے اور سر پیٹ چکے ہو گے۔

پیارے جیب کترے! کم از کم جیب کاٹنے سے پہلے یہ تو پوچھ لینا چاہئے کہ صاحب! آپ کی جیب میں روپے بھی ہیں یا نہیں۔ میری اِس بات کا برا مت ماننا۔ پوچھ لینے میں کیا حرج ہوتا ہے۔

بہرکیف اب جبکہ تم میرا بٹوا اُڑا کر لے گئے ہو اُس کے سلسلے میں تمہیں کچھ ہدایات دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُس بٹوے میں روپے تو نہیں تھے مگر کچھ اور ضروری اور غیر ضروری چیزیں بھی تھیں۔ مثلاً بنک کا ایک ردی چیک تھا۔ اُسے بھنانے کیلئے بنک میں نہ جانا۔ کیونکہ وہاں میرا کھاتہ ہی بند ہو چکا ہے۔ بنک والوں کے سامنے خواہ مخواہ تم بھی شرمندہ ہو گے اور میں بھی۔ اُس بٹوے میں ایک شوز کمپنی کی رسید تھی جس میں میرے بوٹ کی مرمت کی گارنٹی دی گئی ہے۔ چونکہ بوٹ میرے پاس ہے اور گارنٹی تمہارے پاس۔ اِس لئے بہتر یہ ہے کہ میرا بوٹ بھی چرا کر لے جاؤ۔ اِس کے علاوہ اُس بٹوے میں کچھ "اَن پیڈ" بل تھے۔ اُن کے متعلق پوزیشن بڑی ڈانواڈول ہے۔ کہ وہ مجھے ادا کرنے چاہئیں یا تمہیں۔ اِس لئے اِس سوال کو میں تمہارے ذوقِ نظر پر چھوڑتا ہوں۔

میرے بٹوے میں میری ایک محبوبہ کا فوٹو بھی تھا جس کا اب بیاہ ہو چکا ہے۔ اور اب میں تو اُسے صرف یادِ محبوب کے طور پر سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ لیکن تم اُسے سینے سے لگا کر کیا کرو گے؟ کیونکہ سینے سے لگائے رکھنے کا فائدہ تب ہے جب سینے میں احساسِ محبت بھی ہو۔ میری محبوبہ نے تمہارے تو بے وفائی کی ہی نہیں [illegible] اِس لئے تمہارا دل اُس کے لئے کبھی نہیں دھڑکے گا۔ لہٰذا وہ فوٹو تمہارے [illegible] بیکار ٹکڑا ہے۔ آہ! میری محبوبہ اُس کے سسرال نے چھین لی اور اُس کا فوٹو تم چھین کر لے گئے۔ مسٹر جیب کترے! سچ مچ دو دلوں کو یہ دُنیا ملنے ہی نہیں دیتی۔

اور کیا حال چال ہے؟ اب دوبارہ میری جیب کاٹنے کا پروگرام کب بنا رہے ہو؟

## سیٹھ منی رام کے نام ———●

اے جن کے ناگ دیوتا!

کل شام کو میں نے آپ کو بھگوان کی مورتی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھے دیکھا۔ کیا تمہارے گھٹنوں کے جوڑوں میں درد ہوتا ہے۔ کیونکہ بار بار تمہیں اُٹھنی تھی جسے تم دانت پیس کر روکتے تھے۔ گٹھیا کی حالت میں بھگوان کے سامنے جانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔ بہرکیف اپنا اپنا خیال ہے۔ اپنا اپنا گٹھیا ہے اور اپنا اپنا بھگوان۔

مگر سیٹھ جی! تم بھگوان سے اُن چیزوں کا کیوں مطالبہ کر رہے تھے جو بھگوان کے اپنے بس میں بھی نہیں۔ کیونکہ بھگوان نے اِس نظامِ کائنات کو چلانے کے لئے کچھ اصول بنا رکھے ہیں اور وہ اپنے ہی اِن اصولوں کا پابند (غلام ہی کہہ سکتے ہو) ہے۔ تمہارے مطالبوں سے اُس کے اصول ٹوٹ جائیں گے۔ نجانے تمہیں کس نے بہکا دیا کہ بھگوان اپنے اصول توڑ دیتا ہے۔ صرف چند سنگتروں اور کیلوں کی خاطر چند پھولوں، کافور کی خوشبو اور اگر بتی کے دھوئیں کی خاطر یا اُن اینٹوں کی خاطر جو تم نے مندر کی ایک دیوار کے لئے دان دی تھیں ——— معاف کرنا سیٹھ جی! بھگوان کوئی انکم ٹیکس آفیسر نہیں ہے کہ وہسکی کی دو بوتلیں اور ایک مرغِ مسلّم کی خاطر قواعد و ضوابط توڑ دے گا۔ یقیناً تمہیں کسی نے بہکا دیا ہے کہ بھگوان اُن بھگتوں کے بس میں ہے جو اُس کی حمد و ثنا کے گیت گاتے ہیں اور مندر میں ڈھول تاشے بجاتے ہیں۔ اُوں ہوں ——— اِس وہم میں نہ رہنا۔ بھگوان کو ذرا مزید گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کرو۔

سیٹھ منی رام! میں یہ تو نہیں کہتا کہ آپ بھگوان کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلیں۔ کیونکہ وہ تو آپ کے خمیر میں نہیں ہے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ بھگوان کو اصول شکنی پر آمادہ کر کے اُس بیچارے کی پوزیشن اور اپنا وقت خراب کریں۔ اِس لئے یہ خط لکھ دیا ہے کہ آپ بھگوان کے سامنے اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنے گٹھیا کا علاج کریں تو زیادہ سُکھی رہیں گے۔ آپ میرا اعتراض کر سکتے ہیں

...ہوتا ہو تو آپ کے روزی مسائل میں دخل دینے والا لیکن سیٹھ جی گزارش یہ ہے کہ دراصل ہمیں نوعِ انسان کی خدمت کرنے کا شوق ہے۔ اگر آپ کو یہ شوق نہیں ہے تو کم از کم دوسروں کو ہی یہ شوق پورا کرنے دیجئے۔

## قرض خواہ کے نام ●———

پیارے قرض خواہ عرف بھگت رام جی!

مجھے معتبر ذرائع یعنی میرے دشمنوں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ مجھے رُسوا کرتے پھرتے ہیں کہ میں نے آپ کا قرضہ نہیں چکایا۔ دیکھئے بھگت رام جی! مجھے اپنی رُسوائی کا اتنا غم نہیں جتنا افسوس آپ کی ناسمجھ بوجھ کا ہے۔ اوّل تو آپ کو یہ سوچنا چاہئے کہ آپ نے مجھے قرضہ دیا ہی کیوں تھا۔ دینے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچا تھا کہ میں نادہندہ بھی ہوں اور پھر آپ یہ بھی بھول گئے کہ آپ نے مجھے جو کرنسی نوٹ دئے تھے ان میں سے ایک نوٹ بالکل گلا سڑا ہوا تھا۔ جسے میں نے ادھے پونے دام پر بھنایا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نیت شروع سے ہی خراب تھی۔ لہٰذا آپ جیسے بدنیت آدمی کو قرضہ واپس کرنا انسانیت کی توہین ہے۔ آخر سماج میں کچھ نہ کچھ اخلاق تو باقی رہنا ہی چاہئے۔

مگر اس سے آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ میں آپ کے روپے زندگی بھر نہیں لوٹاؤں گا۔ جونہی میرے پاس روپیہ آیا میں لوٹا دوں گا۔ لیکن روپیہ (کم بخت) جب بھی آتا ہے تمہارے پاس ہی آتا ہے، میری طرف رُخ ہی نہیں کرتا۔ میں نے معتبر ذرائع یعنی دشمنوں سے سُنا ہے کہ ملک میں کچھ لوگ سوشلزم لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لہٰذا جونہی سوشلزم آگیا (جس کی امید کم کم ہے) میں آپ کے روپے لوٹا دوں گا۔ لیکن پیارے بھگت رام، جب تک سوشلزم نہیں آتا، تمہیں قرض مانگتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ روپیہ تو ہاتھ کا میل ہے اور آپ نے مجھے اپنا میل ہی اتار کر بطور قرض دیا تھا۔ مگر میرے ہاتھ پر تمہارا میل جمتا ہی نہیں۔ ہاتھ اکثر صاف رہتے ہیں۔ لہٰذا میرے ہاتھ پر میل آنے تک انتظار کیجئے اور اس دوران میں عاشقوں کی طرح انتظار کی لذت اٹھاتے رہئے۔ آمین!!

---

## رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ چیکنگ کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶)

# مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| افسانہ لکھ رہی ہوں | خورشید پاش ایم اے | دو روپے |
| اندھیرے | اختر عادل روپ | دو روپے |
| آگ اور دھواں | ہم راجندر ایم۔ اے | دو روپے ۷۵ نئے پیسے |
| اندھیرے اجالے | عادل رشید | تین روپے |
| اندھیری راتیں | ریوتی سرن شرما | تین روپے ۹۵ نئے پیسے |
| ایک پیار ایک دھوکا | رام سرن شرما | تین روپے ۲۵ نئے پیسے |
| بیگم صاحبہ | شوکت تھانوی | تین روپے ۷۵ نئے پیسے |
| داماد | ″ | دو روپے ۷۵ نئے پیسے |
| پگلی | ″ | تین روپے ۷۵ نئے پیسے |
| بےغیرت | مضطر ہاشمی | چار روپے ۲۵ ″ |
| باون پتے | کرشن چندر ایم اے | پانچ روپے ۹۵ ″ |
| پہلی لڑکی | رازداں ایم اے | دو روپے ۹۵ نئے پیسے |
| انور | فیاض علی | آٹھ روپے ۵۰ ″ |
| برہمن | کرشن گوپال عابد | چار روپے ۵۰ ″ |
| ستم | ″ | چار روپے ۷۵ ″ |
| گھائل | ″ | تین روپے ۹۵ ″ |
| ظالم | سعید امرت | دو روپے ۵۰ ″ |
| جانے والے | اختر عادل روپ | تین روپے ۵۰ ″ |
| جاتی ہوئی بہار | وحشی محمود آبادی | چار روپے |
| چوٹ | دت بھارتی | تین روپے ۷۵ نئے پیسے |
| گناہ | ″ | دو روپے ۹۵ نئے پیسے |
| حالِ دل | بیگم نذیر ولایت حسین | تین روپے ۵۰ ″ |
| خاتون | انتصار حسین | تین روپے |
| حاجی مراد | قیسی رامپوری | چار روپے |
| پاگل | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| خم ابرو (نظم) | عبدالحمید عدم | دو روپے ۵۰ نئے پیسے |

| | | |
|---|---|---|
| دو پھول | عادل رشید | تین روپے ۹۵ ″ |
| دو سال پہلے دو سال بعد | زبیدہ خاتون | چھ روپے |
| فریبِ مسلسل | شفیق بانو | دو روپے |
| زہر | ذکی انور | چھ روپے |
| برجیس | قیسی رامپوری | چار روپے |
| اچھی صورت بری نگاہ | ریاض ارشد | تین روپے |
| سناٹے | رضیہ سجاد ظہیر | تین روپے ۹۵ نئے پیسے |
| مجھے تم سے محبت ہے | نقی نور | تین روپے ۵۰ ″ |
| نئے قدم | ہاجرہ نازلی | چار روپے ۵۰ ″ |
| ننگی جوانی | سعید امرت | دو روپے |
| رہ گذر | انیس مرزا | چار روپے ۷۵ نئے پیسے |
| خوفناک محبت | عبدالحلیم شرر | تین روپے |
| شاہدہ | انتصار حسین | تین روپے |
| کرنیں | شفیق الرحمٰن | تین روپے |
| ناظم کی آپ بیتی | ایم اسلم | تین روپے |
| ایک دل ہزار غم | عزیز بدایونی | دو روپے ۷۵ نئے پیسے |
| زرینہ | رئیس احمد جعفری | چھ روپے ۵۰ نئے پیسے |
| ننگا شہر | احمد شجاع | پانچ روپے |
| دردانہ | نادرہ خاتون | پانچ روپے |
| چندر کلا | جمنا داس اختر | دو روپے ۵۰ نئے پیسے |
| جلن | ″ | دو روپے ۵۰ ″ |
| رادھا الزبتھ | ″ | دو روپے ۵۰ ″ |
| پاپی | ″ | چار روپے |
| سونا گاچی | ″ | چار روپے ۵۰ ″ |
| طوفانوں کی کہانی | ″ | چار روپے ۵۰ ″ |
| جوار بھاٹا | ″ | چار روپے ۵۰ ″ |

| | | |
|---|---|---|
| قیامت | نگار | [illegible] |
| سازِ دل | ″ | [illegible] ۵۰ ″ |
| کھنڈروں کے بیچ | [illegible] | پانچ روپے |
| گمراہ | قیسی رامپوری | [illegible] |
| ناگ دیوتا | [illegible] | دو روپے ۵۰ ″ |
| خون کے چھینٹے | ″ | دو روپے ۵۰ ″ |
| خوابگاہ میں | ″ | تین روپے ۵۰ ″ |
| فراق | [illegible] | تین روپے ۵۰ ″ |
| پیاسا | ″ | تین روپے ۵۰ ″ |
| پُراسرار رقاصہ | ″ | دو روپے |
| پُراسرار قاتلہ | ″ | دو روپے |
| پیاس | کے۔ ایل نارنگ ایم اے | تین روپے ۵۰ ″ |
| محبت روتی ہے | غلام عباس | دو روپے |
| مالوا | میکسم گورکی ترجمہ نرلیش کمار شاد | ایک روپیہ ۵۰ ″ |
| کھیت میں لہو | تاجور سامری | ایک روپیہ ۷۵ ″ |
| جی ہاں بیچتے ہیں | شوکت تھانوی | تین روپے ۷۵ ″ |
| پردے کے پیچھے | منٹو | دو روپے ۵۰ ″ |
| ملکۂ صحرا | اوم پرکاش ناگی | دو روپے ۵۰ ″ |
| خاموش نغمہ | ″ | چار روپے |
| آتشِ گل (مجموعہ کلام) | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| باقیاتِ اقبال ″ | ڈاکٹر اقبال | تین روپے |
| تلخیاں (کلاں) ″ | ساحر | چھ روپے |
| تلخیاں (خورد) ″ | ساحر | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| پرچھائیاں ″ | ساحر | ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے |
| انسانیت موت کے دروازے پر | (مولانا آزاد) | تین روپے ۵۰ ″ |
| کیٹلاگ سازی | حاجی محمد زبیر | تین روپے ۵۰ پیسے |

پتہ:— رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

افسانہ

# قلمی چہرہ نویس

راز یوسفی

۴۴/۱، دھرم پورہ، لاہور نمبر ۱۵

۳۰ مارچ ۱۹۶۷ء

مکرم خوشتر صاحب۔ سلام عقیدت

"انسانیت کا خلوص" کے بعد "انسانیت کا جلوس" ملاحظہ کیجئے جو اکثر و بیشتر ایسے کوتاہ اندیش اور طمع پرست انسانوں کے ہاتھوں نکلتا رہتا ہے۔ جو اپنے چھوٹے چھوٹے فائدوں کے لئے دوسروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جا رہا ہے۔ جعلسازی اور دھوکہ دہی کے طریقوں میں بھی نت نئی جدتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ پیش نظر کہانی کا "قلمی چہرہ نویس" ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ جو اپنے مذموم طرز عمل سے کئی بے گناہوں کی جیبیں کاٹ چکا ہے۔ ایسے مسخ شدہ چہرے کو بے نقاب کرنا میرے نزدیک انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ شاید آپ اور "بیسویں صدی" کے بالغ نظر قارئین مجھ سے متفق ہوں . . .

خلوص کار ——— راز یوسفی

---

افسانہ نویس، ناول نویس اور ڈرامہ نویس جیسے فنکاروں سے تو بارہا میری ملاقات ہو چکی تھی مگر قلمی چہرہ نویس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی عجیب سے ماحول و پس منظر کے ساتھ:

میں اُن دنوں ہفت روزہ "بُت کدہ" کو ایڈٹ کر رہا تھا۔ جو اپنے مخصوص سیاسی شذرات اور مستقل ادبی عنوانات کے باعث بڑی تیزی سے عوام میں مقبول ہو رہا تھا۔ اُن مستقل عنوانات میں "قلمی چہرہ" خاصے کی چیز تھا۔ جو نہ صرف دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ بلکہ اُس سے رسالے کی اشاعت میں بھی خوشگوار اضافہ ہوا تھا۔ یہ مستقل صفحہ ادارے کی طرف سے نہیں لکھا جاتا تھا۔ اُسے لکھنے والا ایک غیر معروف سا ادیب تھا۔ جو کسی دوسرے شہر سے ہر ہفتے یہ صفحہ لکھ کر بھیج دیتا تھا۔ (شہر کا نام مصلحتاً نہیں لکھا گیا) اور میں بڑی پابندی سے اُسے اپنے پرچے میں جگہ دیا کرتا تھا۔ ادیب کا نام تھا ساجد فارانی۔

شروع شروع میں یہ قلمی چہرے اُس شہر کے مقامی ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور اسی قبیل کے دوسرے فنکاروں سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور اُن میں شہر کے وکلا، پروفیسر، اسکولوں کے مدرّس، کنٹریکٹر اور تاجر بھی شامل ہوتے چلے گئے۔

ساجد فارانی مسلسل قلمی چہرے لکھتے لکھتے خاصی مہارت بہم پہنچا چکا تھا اور جوں جوں وقت گزر رہا تھا اُس کی تحریریں جاندار ہوتی جا رہی تھیں۔ اُن میں غضب کی شگفتگی اور بلا کا بانکپن ہوتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ خاصا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد قارئین "بُت کدہ" اِس مستقل صفحے سے بور نہیں ہوئے تھے جس کا بیّن ثبوت وہ تعریفی خطوط تھے۔ جو کثیر تعداد میں قارئین کی طرف سے موصول ہوتے رہتے تھے اور جن میں شدید اصرار کیا جاتا تھا کہ یہ صفحہ کبھی بند نہ کیا جائے کیونکہ ساجد فارانی کے لکھے ہوئے قلمی چہرے کسی عظیم شخصیت کا اتنی خوبصورتی اور چابکدستی سے جائزہ لیتے تھے کہ قاری سینکڑوں میل کے فاصلے پر بیٹھا ہوا متعلقہ شخصیت کو اپنے صحیح خط و خال میں دیکھ لیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تحریر کا کمال تھا اور فنکارانہ مہارت کا جیتا جاگتا ثبوت!

ایسے حوصلہ افزا خطوط کی موجودگی میں قلمی چہروں کے صفحے کو ختم کر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پھر ایک عجیب حادثہ گزرا۔ ایک دن مجھے ڈاک میں ایک خاتون کا شکایت نامہ ملا۔ اُس نے لکھا تھا ———

- اپنے تمام معاملات خدا کو سونپ دو۔ عیش و مسرت کی سعادتوں پر نازاں نہ ہو۔ مصائب و شدائد سے نہ گھبراؤ۔ زمانے میں انقلاب آتے ہی رہتے ہیں۔ (عربی ادب)
- زندگی کیا ہے؟ مقصد اور اُسے حاصل کرنے کی اُمنگ! (عربی ادب)
- جو اپنی زبان اور اپنے کردار پر نگاہ رکھتا ہے اُس کی رُوح ہر طرح کے عذاب سے بچی رہتی ہے۔ (عربی ادب)
- انسانیت نُور کا دریا ہے، جو ازل کی وادیوں سے نکل کر ابد کی راہوں میں بہتا ہے۔ (خلیل جبران)
- جس نے کبھی دُکھ کا سامنا نہیں کیا، وہ سب سے زیادہ دُکھی ہے۔ (ایک مشرقی مفکر)

محترم آذر صاحب!

تسلیمات۔ بہت عرصہ ہوا جب آپ کے نامہ نگار خصوصی ساجد فارانی صاحب میرے پاس آئے تھے اور میرا "قلمی چہرہ" لکھ کر لے گئے تھے۔ لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود وہ "چہرہ" ابھی تک پرچے میں نہ آیا۔ حالانکہ آپ کی جانب سے مقرر کردہ فیس کی رقم مبلغ پچاس روپے میں اُن کی نذر کر چکی ہوں۔ براہِ کرم بواپسی ڈاک جواب دیں۔ میں بے چینی سے منتظر ہوں۔

والسلام

راحت سیمیں

میں یہ خط پڑھ کر چونک اُٹھا۔ عجیب بات تھی۔ قلمی چہرے لکھنے کی آڑ میں ساجد فارانی نے بلیک میلنگ کا ناپاک کاروبار شروع کر رکھا تھا اور اُس میں وہ تنہا شریک نہ تھا۔ اُس نے "بُت کدہ" کے ادارے کو بھی اِس ناپاک کاروبار میں زبردستی ملوث کر لیا تھا۔ مجھے اُس پر سخت غصہ آیا اور جی چاہا، اُسی وقت ایک خط کے ذریعے اُسے آئندہ قلمی چہرے لکھ کر بھیجنے سے روک دوں۔ لیکن پھر سوچا ہو سکتا ہے اُس کے کسی دشمن نے اُسے بدنام کرنے کے لئے یہ ذلیل حرکت کی ہو۔ اِس لئے چُپ ہو رہا۔

لیکن پھر یہ سلسلہ یہیں ختم نہ ہوا۔ اِسی طرح کے تین چار اور خطوط آئے۔ تب میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ پھر بھی بعض کاروباری مصلحتوں کی بنا پر میں فوراً ہی اِس سلسلے کو ختم کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ کیونکہ اِس سے پرچے کی ساکھ پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔ اِس لئے میں ذاتی طور پر اُن شکایتوں کی چھان بین کرنے کے لئے اُس شہر میں پہنچا۔

میرا قیام گرینڈ ہوٹل کے کمرہ نمبر ۵ میں تھا۔ جو اُس شہر کے بہت اچھے ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔ میں چاہتا تھا اِن شکایتوں کی چھان بین خفیہ طریقے سے کروں۔ کیونکہ براہِ راست ساجد فارانی سے پُوچھ گچھ سے تو دشواری ہوتی۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے ہوٹل کے منیجر سے ساجد فارانی کا مکان اور محلہ معلوم کیا۔ وہ اُس سے ذاتی طور پر واقف تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ گھر پر کسی کو نہیں ملتا۔ دن رات آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ وہ تقریباً شہر کے ہر ہوٹل میں دوسرے تیسرے دن چکر لگاتا ہے اور نئے نئے لوگوں سے مِل کر اُن کے قلمی چہرے لکھتا ہے اور انھیں ہفت روزہ "بُت کدہ" میں چھپوا کر اُن سے موٹی موٹی رقمیں وصول کرتا ہے۔

میں یہ ساری باتیں سُن کر سکتے میں آگیا۔ میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ میں بے خبری کے عالم میں اعانتِ مجرمانہ کے جُرم کا مرتکب ہو رہا تھا؟ یہ قیمتی معلومات فراہم ہو جانے کے بعد مزید پُوچھ گچھ کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اِس لئے میں نے اُسی روز پہلی گاڑی سے واپسی کا فیصلہ کر لیا۔

کمرے میں واپس آ کر ابھی میں اپنا سامان درست ہی کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بہت بے پروائی سے کہا: "اندر آجائیے"

دوسرے لمحے ایک دُبلا پتلا اور لمبا سے تیکھے ناک نقشے والا جوان کمرے میں داخل ہوا۔ سلام کرنے کے بعد اُس نے بڑے سلیقے سے مجھ سے مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا: "خاکسار کو ساجد فارانی کہتے ہیں"

"ساجد فارانی؟" میں یوں چونک اُٹھا جیسے کسی بچھو نے بہت بڑے زور کا ڈنک مارا ہو۔ مگر میں نے فوراً ہی اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے بڑے تپاک سے کہا: "تشریف رکھئے"

وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے پاس "بُت کدہ" کے بہت سے پچھلے شمارے تھے۔ جو اُس نے کرسی پر بیٹھتے وقت میز پر رکھ دیے تھے۔

"کہئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"میں قلمی چہرہ نویس ہوں اور ہفت روزہ "بُت کدہ" میں قلمی چہرے لکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ بھی اُس رسالے میں اپنا "قلمی چہرہ" شائع کرانا پسند فرمائیں گے۔ "بُت کدہ" ہزاروں کی تعداد میں چھپتا ہے۔ اگر آپ کا قلمی چہرہ چھپ گیا تو ایک ہی بار میں آپ کی شہرت مُلک کے کونے کونے میں پھیل جائے گی۔ بلکہ یُوں کہنا چاہئے ـــــ کہ ساری دُنیا میں آپ مشہور ہو جائیں گے۔ "بُت کدہ" پاکستان کے علاوہ دُنیا کے ہر حصّے میں بہت باقاعدگی سے پہنچتا ہے۔" وہ ایک اچھے سیلزمین اور بیمہ ایجنٹ کی طرح بے تکان بول رہا تھا۔

"مگر ساجد صاحب! میں تو ایک بہت معمولی سا کاروباری آدمی ہوں۔ میری

لات کو اس کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اور عوام کو مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، کیونکہ میں نہ تو کوئی سیاسی لیڈر ہوں اور نہ کوئی ادیب و شاعر اور نہ کوئی ایسا فرد جس کی کوئی پبلک لائف ہوتی ہے۔" میں نے ذرا ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ بالکل غلط سمجھے ہیں۔ قبلہ! کہ ایک عام کاروباری آدمی کی کوئی پبلک لائف نہیں ہوتی۔ دیکھئے آپ جیسا بھی کاروبار کرتے ہیں اس کا تعلق براہِ راست عوام سے ہے۔ اگر عوام کو آپ کی شخصی عظمت اور آپ کے کردار کی بلندی سے آگاہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ آپ کون سا کاروبار کرتے ہیں تو یقیناً اس سے آپ کے کاروبار پر خوشگوار اثر پڑے گا۔"

وہ بحث پر اُتر آیا تھا۔

"اس کام کے لئے مجھے کچھ حقِ محنت بھی ادا کرنا ہوگا؟"

"صرف ایک سو روپے کی حقیر سی رقم۔ جو رسالہ "بُت کدہ" کے مالکان وصول کرتے ہیں۔ میں تو اُن کا تنخواہ دار ملازم ہوں۔"

"یہ رقم تو بہت زیادہ ہے۔" میں بڑبڑانے لگا۔

"دیکھئے۔ اگر "بُت کدہ" میں آپ کوئی کاروباری اشتہار چھپوائیں گے تو اس کی اُجرت تین سو روپے فی صفحہ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اس صورت میں پورا صفحہ آپ کے لئے مخصوص ہوگا اور اُجرت صرف ایک سو روپے ہوگی۔ کہئے آپ کو دو سو روپے کا فائدہ ہوا یا نہیں؟"

اُس نے اتنی محکم دلیل دی تھی کہ میرے بجائے کوئی بھی ہوتا فوراً ہی گھٹنے ٹیک دیتا۔

"مجھے منظور ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

اُس کی باچھیں کھل گئیں اور وہ فوراً ہی اپنی نوٹ بک سنبھالتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔ تو اپنے بارے میں کچھ موٹی موٹی باتیں لکھوا دیجئے۔ نام، عادات، مشاغل اور کاروبار کی نوعیت وغیرہ۔ باقی تمام مضمون زیبِ داستان کے ساتھ میں خود لکھ لوں گا۔"

"پہلے نام لکھئے۔" میں تبسمِ زیرِ لب کے ساتھ بولا: "ابراہیم آذر ایڈیٹر ہفت روزہ بُت کدہ۔۔۔"

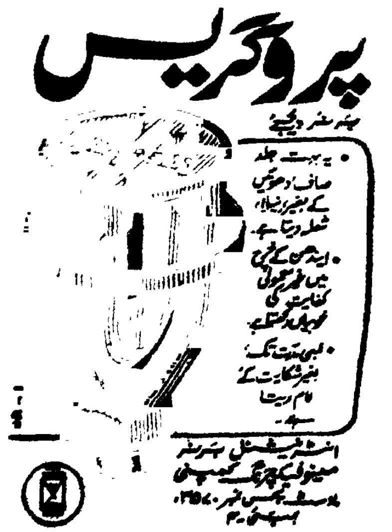
یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا ملاقاتی کارڈ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کارڈ لیا۔ بُجھی بُجھی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ پھر اُس کی پیشانی پر عرقِ ندامت سمٹتا چلا گیا اور میں نے دیکھا، قلمی چہرہ نویس کا اپنا چہرہ ذرا سی دیر میں کتنا مسخ ہو گیا تھا؟ پھر وہ اسی وقت اُٹھ کر کچھ کہے سُنے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

---

- زندگی کا مُدعا غم یا خوشی نہیں بلکہ زندگی کا مقصد یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سرگرمِ عمل رہیں تاکہ ہمارا مستقبل بہتر سے بہتر بنتا چلا جائے۔ (لانگ فیلو)
- کامیابی کے بعد اُس پر اِترانا کامیابی کا بدترین مصرف ہے۔ (آرتھر ہلپس)
- تقریباً اسی فیصد بیماریاں ہمارے جسم کے بجائے ہمارے دماغ سے پیدا ہوتی ہیں۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- بہت سے لوگ محض اس وجہ سے ترقی نہیں کرتے کہ وہ مشکل کاموں اور ناموافق حالات سے گھبرایا کرتے ہیں۔ (ڈاکٹر ماڈون)
- زندگی کے ہر شعبے میں ناشاد اور نامراد لوگ ہیں جو کوئی فیصلہ کرنے میں تاخیر اور پس و پیش سے کام لیتے ہیں۔ (ڈوگلس لرٹن)

"بُت کدہ" کے اگلے شمارے میں جو آخری قلمی چہرہ قارئین نے دیکھا وہ ساجد فارانی کا تھا۔ جسے میں نے اپنے قلم سے لکھا تھا اور پھر یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ کیونکہ اگر اُسے جاری رکھا جاتا تو آگے چل کر نہ جانے کتنی الجھنیں پیدا ہوتیں اور کتنے بھولے بھالے شہرت کے بھوکے مریض ساجد فارانی کی مشقِ ستم کا نشانہ بنتے!!

---



# قابلِ مطالعہ مُنتخب شعری مجموعے

| | | |
|---|---|---|
| آتش گُل | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| کلیاتِ اقبال | ڈاکٹر اقبال | چھ روپے |
| جنون و ہوش | جوش ملسیانی | چار روپے |
| ہفت رنگ | عرش ملسیانی | تین روپے |
| آہنگِ حجاز | 〃 | ایک روپیہ |
| سحرِ غزل | ساحر ہوشیارپوری | تین روپے |
| دستک | زبیر کمار شاد | دو روپے ۲۵ پیسے |
| پُھوار | 〃 | دو روپے ۵۰ پیسے |
| للکار | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قاشیں | 〃 | تین روپے |
| آیاتِ جنوں | 〃 | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| سنگم | 〃 | تین روپے |
| رباعیاتِ محروم | تلوک چند محروم | تین روپے ۷۵ پیسے |
| گنجِ معانی | 〃 | سات روپے ۵۰ پیسے |
| رُوپ | فراق گورکھپوری | تین روپے ۵۰ پیسے |
| رمز و کنایات | 〃 | تین روپے ۵۰ پیسے |
| مشعل | 〃 | دو روپے ۷۵ پیسے |
| بیکراں | جگن ناتھ آزاد | چار روپے ۵۰ پیسے |
| ستاروں سے ذروں تک | 〃 | دو روپے ۷۵ پیسے |
| کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی (اوّل) | اکبر الٰہ آبادی | پانچ روپے |
| 〃 حصہ دوم | 〃 | چھ روپے |
| کلیاتِ اختر شیرانی | اختر شیرانی | آٹھ روپے |
| رعنائیاں | شکیل بدایونی | تین روپے |
| صنم و حرم | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گُلِ رعنا | جگی رعنا | تین روپے ۵۰ پیسے |
| شبنم شبنم | کرشن موہن | پانچ روپے |
| دلِ ناداں | | چھ روپے |

| | | |
|---|---|---|
| خرابات | عبدالحمید عدم | چار روپے |
| رمِ آہو | 〃 | چار روپے |
| گلنار | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قول و قرار | 〃 | تین روپے ۵۰ پیسے |
| گردشِ جام | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| بطِ مے | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گجر | قتیل شفائی | تین روپے |
| رسالت مآب | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| اسلام اور عورت | مولانا مظہر الدین | تین روپے |
| نماز کیا ہے | مولانا محمد علی | دو روپے ۲۵ پیسے |
| نیا نو دن | راشد سہسوانی | پانچ روپے ۷۵ پیسے |
| غم ہائے متفرق | انیس مرزا | چار روپے ۵۰ پیسے |
| شرارت | جمیل انجم | تین روپے |
| عشق اور خون | رائیڈر ہگرڈ | سات روپے |
| سوکھا ساون | انیس مرزا | دو روپے ۵۰ پیسے |
| محبت اور جُرم | انور کمال حسینی | دو روپے ۷۵ پیسے |
| فن اور تنقید | 〃 | چار روپے ۵۰ پیسے |

**آئینۂ اصلاح** ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

**جوش ملسیانی** کے مکمل حالات زندگی، انتخاب کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۳۸ صفحے ضخامت، ۵ سو صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

**مضراب** شاب للت کے ایک ایک شعر میں اُس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور اِن دھڑکنوں میں اُس نے سارے جہان کے دُکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

**گلستانِ ہزار رنگ** جس میں تقریباً چار ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دئے گئے ہیں۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اِس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اِس کتاب کو اِس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اُردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۷۵ پیسے۔

**شاہنامۂ اسلام** جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام۔ چار حصوں میں ہے جن میں تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتی سولہ روپے اب صرف نو روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

**تلامذۂ غالب** غالبیات کے مشہور ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے ۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پورے صفحہ کی تقریباً تیس تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

**کفر و ایمان** پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت اختر کا نام نامی ہی اِس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے۔ کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ دردمند دل کی گرمی بھی ہے۔ قیمت چار روپے۔

**گردِ راہ** ضیا فتح آبادی کا چوتھا مجموعۂ کلام ... ضیا ایک صاحب طرز شاعر ہیں۔ اُن کے اندازِ بیان اور لب و لہجہ میں انفرادیت و ندرت ہے۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

# غزلیں

## پروفیسر اختر نظمی، ایم۔اے۔بی ٹی

لو نہ دیتے جو خیالات تو نیند آجاتی
جل نہ اُٹھتے مرے جذبات تو نیند آجاتی

رات بھر اُن کے خیالات نے سونے نہ دیا
سوچتے اور کوئی بات تو نیند آجاتی

آگیا یاد تمھیں دیکھ کے جانے کیا کیا
تم سے ہوتی نہ ملاقات تو نیند آجاتی

دل سے سرگوشیاں کرتی ہی رہی تنہائی
ختم ہوتیں یہ حکایات تو نیند آجاتی

جن کو نسبت ہے تمناؤں کی بے خوابی سے
یاد آتے نہ وہ لمحات تو نیند آجاتی

صبح تک خوابِ تمنا کا بھرم کھل جاتا
ہاں مگر چین سے اک رات تو نیند آجاتی

## نیّر قریشی گنگوہی

ہوئی تیرگی مختصر دھیرے دھیرے
ہوئی شمع روشن، مگر دھیرے دھیرے

چلا چاند تاروں کی دُنیا سجانے
زمیں سے فلک پر بشر دھیرے دھیرے

بالآخر ڈھلے گی شبِ غم بھی اِک دن
نمودار ہوگی، سحر دھیرے دھیرے

دلِ مضطرب، صبر سے کام لے تو
وفاؤں کا ہوگا اثر دھیرے دھیرے

وہ آخر چلے آئے مجبور ہو کر
محبت ہوئی کارگر دھیرے دھیرے

ضروری ہے نیّر، گُلوں کی حفاظت
یہ کانٹے، اُٹھائیں نہ سر دھیرے دھیرے

## آزاد گوردا سپوری، بی۔اے

تھے دو پردوں میں تو دل پردوں سے بہلانا پڑا
چشمِ بینا کو فریبِ رنگ و بو کھانا پڑا

دوست کی مرضی میں ہم کو جذب ہو جانا پڑا
گیت غم کا زندگی کے ساز پر گانا پڑا

اللہ اللہ داستانِ عشق کی دلچسپیاں
ایک افسانے کو سو سو بار دُہرانا پڑا

ایک نامعلوم شے کو ڈھونڈنے کے واسطے
وُسعتِ کون و مکاں سے بھی گزر جانا پڑا

عزمِ کامل کو رکاوٹ سے نہیں کوئی غرض
آگیا جو بھی مقابل اُس سے ٹکرانا پڑا

دوستی کی لاج رکھنے کے لئے آزاد کو
اِک فریبِ دوستی ہر گام پر کھانا پڑا

# ملک کے مایۂ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے دلچسپ شاہکار

**آج کی بات** آپ کے محبوب افسانہ نگار جناب جگدیش بمل کے دلچسپ بلند پایہ افسانوں کا حسین مجموعہ جن کے دلدوز قہقہوں اور آنسوؤں کو آپ اپنے قہقہے اور اپنے آنسو سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

**جو عورت ننگی ہے** نامور فنکار رام لعل کی رومان پرور اور تلخ کہانیوں کا حسین مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

**میرے سپنے** نامور افسانہ نگار خاتون پروفیسر کرشنا کماری ایم۔اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

**سنگھار کمرے میں** پروفیسر کرشنا کماری ایم۔اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں کے اس مجموعے کے ہر صفحے پر جذبات کا ایک محشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ قیمت دو روپے

**دُکھتی رگیں** ہر افسانے میں جوانی کا اضطراب ہے حسن کی بیکلی ہے عشق کی بیقراری ہے مصنفہ جناب شمس مظفر پوری۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

**ایک حمام میں تین ننگے** زندگی کی عریاں تصویریں۔ وقت کی دُکھتی ہوئی رگ پر سعید امرت کی فنکارانہ ضرب۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

**کالی راتیں** سعید امرت کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ۔ تشنہ جوانیوں کے اندھے جذبات کی ترجمان۔ بہکے ہوتے بڑھاپے کی ہوسناکیوں پر طنز ہیں اور کالی راتوں میں رینگنے والے گناہوں پر ضرب کاری ہیں۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

**یہ لڑکیاں** رنگ رنگ کی شوخ و شنگ لڑکیوں کے جذبات و احساسات کی تصویریں۔ اختر ملیح آبادی کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

**عورت ایک پہیلی** کیا عورت واقعی ایک پہیلی ہے؟ سمجھ میں نہ آنے والی پہیلی؟ اس کا جواب آپ راج کنول کے سولہ دلکش رومانی افسانوں میں پائیں گے قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

**پوسٹ مارٹم** عرش ملسیانی کے مزاحیہ افسانوں اور مضامین کا حسین و جمیل مجموعہ جس میں مسکراہٹوں اور قہقہوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ قیمت سوا دو روپے۔

**سیاہ تاج محل** موہن یاور کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔

**فردوس** اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک قابل قدر اضافہ مصنفہ شکیل بالی اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب دوسرا ایڈیشن قارئین کے اصرار پر نہایت آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

**۱۸۵۷ء کی دلّی** جناب مہیشور دیال نے اس میں تاریخی خاکوں کے عام منظوں کو ایک پُر کیف، داستان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس میں آپ محض دستانوں کی رنگینیوں ہی سے نہیں، جذبۂ حب الوطنی، ایثار، اخوت و محبت اور وفاداری کے چشموں سے بھی سیراب ہوں گے۔ دلّی کی ٹکسالی زبان، قلعۂ معلّےٰ کی رسیلی دل موہ لینے والی زبان کی حلاوت آپ کچھ جناب مہیشور دیال ہی کے زورِ قلم میں پائیں گے کیونکہ یہ اُن کی اپنی مادری زبان ہے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

**ڈارلنگ** جناب نریش کمار شاد کے منتخب طبع زاد افسانوں کا بے مثل اور حسین و جمیل مجموعہ۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

**سُرخ حاشیے** اُردو کے مشاہیر ادیبوں کے دلچسپ لطیفے۔ قیمت دو روپے پچھتر نئے پیسے۔

**راکھ تلے** غیر ملکی افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانے ہندوستانی لباس میں۔ قیمت دو روپے۔

**مالوا** میکسم گورکی کے شہرۂ آفاق ناولٹ کا ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

**نورا** ایک رقاصہ کو اپنے اندر نئی جاذبیت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا لا مثال قربانیاں دینی پڑیں۔ قیمت صرف دو روپے پچاس پیسے۔

**شہرِ دل** جناب محسن زیدی کی غزلوں کا حسین انتخاب۔ محسن زیدی نے شہرِ دل کو آرزوؤں کی نوخیز کلیوں سے سجایا ہے۔ قیمت صرف دو روپے۔

**سفینہ و ساحل** جناب عزیز وارثی کا مجموعۂ کلام، اِن کی شاعری میں اتنی توانائی، قوت اور دلآویزی ہے کہ نسلوں تک فراموش نہ کیجا سکے گی۔ قیمت صرف چار روپے

**گُلِ رعنا** جناب برج لال جگی رعنا کا تازہ مجموعۂ کلام جو موجودہ دور کی بہترین شعری خوبیوں سے مزین ہے جس کے مطالعہ کے بعد آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ گُلِ رعنا واقعی بہترین شعری مجموعہ ہے۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

افسانہ

# بہار آتے آتے

خورشید افسر بسوانی

"دارالسیدہ" بسواں، سیتاپور

۱۱، اپریل ۹۷ء                عالی مقام محترم خوشتر گرامی! آداب و تسلیم

... مجھے امید ہے کہ قارئین "بیسویں صدی" پسند فرمائیں گے۔ لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب آپ کی بلند نگاہ بھی افسانے کو قابلِ التفات سمجھے۔ زیرِ نظر افسانے میں گھریلو فرائض کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، یہ آپ فیصلہ کریں گے...                خادمِ دیرینہ ——— خورشید افسر بسوانی

"فوزیہ دیکھو لکھنؤ کا چار باغ اسٹیشن کتنی دلکشی رکھتا ہے۔" ابھی میں نے گفتگو کی ابتدا ہی کی تھی کہ بمبئی جانے والی ٹرین نے وِسل دے دی۔ انجن کا وِسل دینا تھا کہ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل سے دھڑکنے والی طاقت ہی چھین لی ہو۔ مجھ پر سکوت اور جمود کا عالم طاری ہو گیا۔ فوزیہ ناہید آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھتی رہی۔ اُسے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے اعزّہ اقربا کا بھی دھیان نہ رہا۔ شیفو جو اُس کی بہت چہیتی بہن تھی ہنگامِ رخصت اُس کے آداب کا بھی جواب نہ دے سکی۔ شیفو آپا کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھتی رہ گئی۔ ٹرین دھیمے دھیمے رینگنے لگی۔ ہر کمپارٹمنٹ کے قریب سے سلام علیک، نمستے، آداب، الوداع اور ٹاٹا! بائی بائی! کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لیکن سیکنڈ کلاس میں بیٹھی ہوئی فوزیہ کے تھرتھراتے ہونٹ نطق سے عاری تھے۔ رفتہ رفتہ ٹرین کی رفتار میں تیزی آ گئی۔ ہم دونوں حدِ نگاہ تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اچانک آنسوؤں کی یورش نے آنکھوں کی روشنی دھندلا دی۔ آستین میں آنسو جذب کرنے کے بعد جب سر اُٹھایا تو صرف پٹری چمکتی ہوئی نظر آئی۔ پلیٹ فارم پر ویرانی برس رہی تھی اور ساری چہل پہل ختم ہو چکی تھی۔ اِکا دُکا مسافر یا ریلوے ملازمین کہیں کہیں ضرور نظر آتے تھے۔

میرا سر چکرانے لگا اور پیروں میں لرزش سی ہونے لگی میں کچھ دیر کے لئے آہستہ سے قریب کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ مجھے فیکٹری منیجر پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ اُس نے آخر کیوں چھٹی نہ دی۔ لاکھ دفتری کام پچھڑا ہوا تھا پھر بھی ایک دو دن کی غیر حاضری میں کیا بنتا بگڑتا۔ کم از کم میں اُسے لندن کے لئے بامبے ایر پورٹ تک تو چھوڑ ہی آتا۔ لیکن فوزیہ میری ساری مجبوری جانتی ہے۔ میں نے چند دن پہلے ہی تمام حالات بتا دئے تھے۔ پھر فوزیہ کے ماموں بمبئی تک پہنچانے بھی تو گئے ہیں۔ اگر میں جاتا بھی تو سارے سفر میں بُت بنا بیٹھا رہتا اور کوئی بات نہ ہو پاتی ——— میں دل ہی دل میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ میری آنکھیں اور میرے خشک لب میرے دُکھ بھرے دل کی غمازی کر رہے تھے۔ تھوڑے ہی وقفے میں ہمدردانہ طور پر کئی لوگ مجھ سے مخاطب ہو چکے تھے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اب یہاں سے اُٹھ جاؤں اور میں پلیٹ فارم سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر جاتے ہی ایک صوفے پر دراز ہو گیا۔ میری خاموشی گھر والوں کی اُلجھن کا سبب بن گئی۔ گھر میں طرح طرح کے سوالات کئے گئے لیکن میں نے کسی کی بات کا جواب نہ دیا۔ دوسرے دن حسبِ معمول غسل کیا اور خلافِ معمول کئی کپ اسٹرانگ چائے پی اور سُرخ آنکھوں کو ملتا ہوا دفتر روانہ ہو گیا۔ اُن دنوں دفتر میرے لئے قید خانہ سے کم نہ تھا۔ کام سے دل اُچٹا ہوا تھا لیکن مجبوراً فائلیں اُلٹنا پڑتیں...

کاش کسٹوڈین نے میری جائداد نہ ضبط کی ہوتی اور والد ماجد کا سایہ سر پر برقرار رہتا تو حسبِ وعدہ میں بھی ایم۔ اے کرنے کے بعد اپنی کلاس فیلو فوزیہ ناہید کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن جاتا۔ وہاں کے علمی اور رومان پرور ماحول میں ہم دونوں حسین اور دلکش تعلیمی زندگی گزارتے لیکن قدرت کی ستم ظریفی کہ معاشی حالات نے سلسلۂ تعلیم ختم کرنے پر مجبور کر دیا اور دفتر کی فائلیں میری اپنی ساری صلاحیتوں کو جذب کرنے لگیں۔ وقت جاتے دیر نہیں لگتی۔ آج فوزیہ کو گئے پورے پندرہ دن ہو گئے۔ فوزیہ نے وعدہ کیا تھا کہ میں لندن پہنچتے ہی خط لکھوں گی۔ بمبئی

سے بذریعہ جہاز جانے کا پروگرام تھا۔ وہ اُسی دن پہنچ گئی ہوگی۔ میں آج خلافِ معمول دفتر میں تھوڑی فرصت ملنے پر یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ چپراسی نے آکر میری میز پر ڈاک کا انبار لگا دیا۔ اُن خطوط میں ایک غیر مُلکی لفافہ بھی تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی بیتاب انگلیوں سے جلدی جلدی اسی لفافے کو چاک کیا اور پڑھنے لگا۔

ڈیر ۔۔۔۔ آج صبح سات بجے میں لندن ہوائی اڈے پر پہنچ گئی۔ اِس وقت ہندوستان میں دس بج چکا ہوگا اور تم دفتر پہنچنے والے ہوگے۔ یہاں دوشنبہ اور اتوار ہفتہ میں دو روز چھٹیاں رہتی ہیں۔ آج دوشنبہ ہے۔ سارے کام بند ہوں گے۔ مل کے مزدور سے لے کر بڑے سے بڑا آفیسر تک چھٹی منا رہے ہوں گے۔ ابھی میں نے شہر کا کوئی حصہ نہیں دیکھا۔ پھر بھی جہاں تک نگاہ جا سکتی ہے بڑی دلکشی اور دیدہ زیبی نظر آرہی ہے۔ لیکن تمہاری دُوری کی وجہ سے وطن کا احساس اور بڑھنے لگا ہے۔ بننا سنورنا تو درکنار کپڑے تک بدلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اِس وقت میں ایرپورٹ کے گیسٹ ہاؤس میں ہوں۔ دیکھئے خطوط کے جوابات اپنی پہلی فرصت میں دیتے رہئے گا۔ آپ کی تحریر سے یقیناً مجھے بے حد سہارا ملتا رہے گا۔

اچھا اب اجازت دیجئے آئندہ تفصیلی خط لکھوں گی۔

آپ کی ہمیشہ اپنی ۔۔۔۔ فوزیہ ناہید

فوزیہ نے خط بھی لکھا تو اِتنا مختصر کہ اُلجھنوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ نہ تو حالاتِ سفر، نہ اپنی پُوری کیفیات! خیر آئندہ تفصیلی خط کا انتظار کروں گا لیکن جواب تو اِسی وقت دینا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے فوراً میز کی دراز سے لیٹر پیڈ نکالا اور جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ اِس وقت دل کی عجیب کیفیت ہے۔ لکھنا کچھ چاہتا ہوں لکھ کچھ اور رہا ہوں۔ اِس اضطراب نے کئی صفحے بیکار کر ڈالے ہیں۔

جان و دل سے عزیز! خوش رہو

آج دفتر کی ڈاک دیکھتے وقت اچانک تمہارے خط پر نظر پڑ گئی۔ میں نے فرطِ مسرت میں خط چُوم لیا! لفافے کے قالب میں تمہاری شفق رنگ نرم و نازک اُنگلیوں سے لکھی ہوئی مختصر تحریر تھی۔ تم نے اپنے کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی پھر بھی میری دُوری کا احساس تمہیں تڑپا ہی گیا! دیکھو تم نے میری ہر بات ماننے کا وعدہ کیا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ تھوڑے دنوں کے لئے تم مجھے بھی فراموش کر دو اور اپنے ذہن کو تمام اُلجھنوں سے آزاد کر کے اکتسابِ علم کی کوشش کرنا۔ میں تمہاری جُدائی ایک دن بھی نہیں برداشت کر سکتا تھا کسی نہ کسی بہانے روز ہی ملاقات کر لیا کرتا تھا۔ صبح سے شام تک کسی وقت ضرور ہم کہیں مل جایا کرتے تھے۔ تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔ پھر بھی مسیرے دفتری کام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ میں صحیح وقت سے دفتر پہنچ جاتا ہوں اور پُوری توجہ سے سارا کام انجام دیتا ہوں۔ . . ویسے تو مجھے پُورا یقین ہے کہ وہاں کے پارک اور کلب تمہارے کردار پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں گے۔ لیکن احتیاطاً ایک بات تحریر کر دوں۔ لندن کی آب و ہوا سے دامن بچائے رکھنا۔ میرا ایک دیرینہ دوست اپنے خطوط میں لکھا کرتا تھا کہ لندن انتہائی خوبصورت ہے۔ یہاں مکان، پارک اور دُکانوں کی تزئین بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اِتنی صفائی اور سُتھرا پن یہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ لوگ ماڈرن اور دیدہ زیب لباس اختیار کرتے ہیں۔ سائل اور مساکین نظر نہیں آتے۔ قدم قدم پر دلکشی دامنِ رنگ رنگ پھیلئے ہے۔ خصوصاً آکسفورڈ کا راستہ تو جادۂ فردوس سے کم کشش نہیں رکھتا۔ اِن تمام خوبیوں کے ساتھ ہی لندن کی بڑھتی ہوئی آزادی انتہائی خطرناک ہے۔ یہاں عورت میں نسائیت اور مرد میں مشرقیت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ تم خود بھی مغربیت کو ہمیشہ بُرا کہتی رہی ہو۔ اب تو میں اُس دن کا منتظر ہوں جب میرے مکان "سلیم منشن" کا نام "فوزیہ ہاؤس" ہوگا۔ خدا تمہیں نگہِ بد سے بچائے۔ اچھا اب اجازت . . .

تمہارا دُور افتادہ ۔۔۔۔ ایم سلیم شاہد

آج کی ڈاک میں پھر ایک بدیسی لفافے پر نظر پڑ گئی۔ میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ معاً یہ خیال ہوا، آج مجھے خط لکھے پُورے بیس دن ہو چکے ہیں۔ یقیناً فوزیہ ہی کا خط ہوگا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ دو برس کی طویل خاموشی کے بعد پھر اسلم مجھے یاد کرے گا۔ لفافہ کھولا اور خط پڑھنے لگا ۔۔۔۔

پیارے دوست!

میں اپنی طویل خاموشی کے لئے معذرت چاہتا ہوں. اُمید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔ اِن دنوں مجھے تعلیمی اور معاشی حالات نے عدیم الفرصت بنا رکھا تھا ورنہ یاد میں اور تمہیں خط

دیکھتا۔ بہرحال تمھیں یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ میں نے گزشتہ سال آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کر لیا ہے اور آکسفورڈ سے ملحق ایک کالج میں لکچرر بھی ہوگیا ہوں۔ سچ پوچھو تو اگر تم ناراض نہ ہو تو ایک بات کہوں، میں نے فی الحال ہندوستان کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ یہاں کی سہولتیں، زندگی اور دلکش ماحول چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن پیارے! تم بہت یاد آتے ہو۔ جب میں سیر و تفریح کے لئے نکلتا ہوں، کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے، کسی طرف سے تم بھی آنے والے ہو! چند منٹ کے لئے میرے قدم رُک جاتے ہیں۔ پھر آگے بڑھ جاتا ہوں کئی دنوں کے بعد کل شام کو میں مشہور باغ ہائیڈ پارک جا رہا تھا (یہ انگلینڈ کا سرسبز و شاداب اور اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری باغ ہے جہاں ہر شام ہزاروں افراد کا اجتماع ہوتا ہے۔ ہائیڈ پارک میں الگ الگ مختلف نظریات کے واعظین اور مقررین آزادانہ طور پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اِس طرح کے پروگرام ہر روز ہوتے ہیں) ایک شخص نظر سے گزرا جو تم سے بہت مشابہ تھا۔ دیکھتے ہی تم یاد آ گئے۔ تمھاری یاد کے ساتھ ہی سارا ہندوستان نظر کے سامنے رقص کرنے لگا۔ دل درد سے بھر آیا اور آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ میں نے سوچا گھر واپس چلا جاؤں۔ پھر خیال آیا، آج مجھے بھی تقریر کرنی ہے۔ آخر جب میری باری آئی تو میں نے "انسان اور مجبوری" کے عنوان سے ایک طویل تقریر کی۔ دورانِ تقریر میں کئی بار پُرزور کلیپنگ ہوئی۔ میری تقریر بہت پسند کی گئی۔ شہر میں خاصہ چرچا رہا۔ آج صبح چھ بجے ہوں گے کہ باہر کسی نے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ میں بستر پر دراز تھا۔ گھبرا کر اُٹھا اور آنکھیں مَلتا ہوا دروازے کی طرف چل پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں ایک گندمی رنگ اور چھریرے بدن کی سیاہ بالوں اور نرگسی آنکھوں والی لڑکی مغربی لباس میں مشرقی جسم کو چھپانے کی ناکام کوششوں میں مصروف ہے۔ میری صورت دیکھتے ہی پہلے تو کچھ سہمی سہمی سی نظر آئی۔ پھر دُزدیدہ نگاہی کے ساتھ مجھے آداب کیا۔ دل پر ایک برق سی کوند گئی۔ پھر بھی میں اپنے جذبات کو دباتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائنگ روم میں دونوں چائے پیتے جاتے تھے اور اپنی زبان میں گفتگو کرتے جاتے تھے۔ اُس نے میری تقریر کے سلسلے میں اپنے تاثرات کا اظہار ہی نہیں کیا۔ کچھ دیر تک اچھوتے انداز سے تعریف کرتی رہی۔ اُسی دوران میں نے نام دریافت کیا۔ اُس نے لجاتے ہوتے لہجے میں کہا مجھے فوزیہ ناہید کہتے ہیں۔ فوزیہ میری تقریر سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ وہ ہائیڈ پارک ہی میں مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ لیکن میرے گرد دوستوں کی بھیڑ تھی۔ وہ بیچاری ایک تو عورت دوسرے ہندوستانی! ملاقات کی جسارت نہ کر سکی۔ میرے گھر کا پتہ لگانے میں اُسے کتنی دشواری ہوئی ہوگی، میں نہیں کہہ سکتا اور نہ اُس نے اپنی دشواریوں کا اظہار ہی کیا۔ فوزیہ ہندوستانی ہے۔ دوسرے سیاہ زُلفیں گندمی رنگ کو ندتوں بعد قریب سے دیکھا۔ نہ پوچھو کہ دل پر کیا گزر گئی۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی طالبہ بھی ہے اور پھر میرا کالج آکسفورڈ جاتے ہوئے اُس کے راستے ہی میں ہے۔ اب تو آتے جاتے ملاقات ہوتی رہے گی۔ فوزیہ لکھنؤ یونیورسٹی کی فارغ التحصیل ہے اور تم نے بھی اُسی یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا ہے۔ اماں یار پتہ لگاؤ ممکن ہے تم نے بھی اُس پری زاد کو دیکھا ہو۔ میں پھر بھی خود کو بہت سنبھالے رہا۔ اگر تمھیں اُس فتنۂ محشر کی قربت راس آجاتی تو شاید

گریباں چاک کر کے جانبِ صحرا نکل جاتے!

تمھارا ساتھی ـــــ مرزا حیدر اسلم

سلیم شاہد خط پڑھتا جاتا تھا اور پھیکی پھیکی مسکراہٹوں کے ساتھ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتا جاتا تھا۔ اُس کی نگاہ میں مرزا حیدر بالکل بے قصور تھا اور پھر فوزیہ کی محبت پر بھی پورا بھروسہ تھا۔ لیکن حیدر اسلم کی تحریر سے معمولی بدگمانی کا ایک دُھندلا سا عکس ضرور دل کے آئینے پر نظر آنے لگا۔ لیکن اُس نے تھوڑی ہی دیر میں خود پر قابو پا لیا اور ایک طویل خط لکھنے بیٹھ گیا کہ تمھارے خط سے اندازہ ہوتا ہے فوزیہ یقیناً حسین و جمیل لڑکی ہوگی۔ کاش! میں بھی لندن میں ہوتا اور تمھارے توسُّل سے فوزیہ ناہید کو دیکھتا۔ اگر مناسب سمجھو تو اُس کی تصویر ہی بھیج دو۔ اِن دنوں بہت بے کیف زندگی گزار رہا ہوں۔ لیکن یہ تو بتاؤ، سُنا ہے ہندوستان کی لڑکی لندن جا کر انگلینڈ کی دوشیزاؤں سے زیادہ ماڈرن ہو جاتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں فوزیہ بھی رومان کو آرٹ سمجھنے لگی ہو اور الگ الگ پیکروں میں مختلف رنگ بھرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

فوزیہ کو اِن دونوں کی مراسلت کا قطعی علم نہ تھا اور نہ وہ یہ سوچ سکتی تھی کہ مرزا حیدر اُس کے خلوص اور بے تکلفی کو رومان کی تمہید سمجھ بیٹھے گا۔ وہ فنِ خطابت اور مضمون نگاری

سے بے پناہ محبت کرتی تھی، یہ ایک ایسا جذبہ تھا جس نے فوزیہ کو حیدر سے قریب کر دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں لوگ عورت کے معمولی التفات کو بھی محبت سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔

---

آخر وہ دن بھی آ گیا جب فوزیہ نے کئی ڈگریاں حاصل کر لیں اور ہندوستان آنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ لیکن اُسے مرزا حیدر کا بھی انتظار تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں حیدر اسلم بھی آ گیا۔ فوزیہ نے کہا "آیئے حیدر صاحب! میں آپ کا انتظار ہی کر رہی تھی!" وہ حیدر کو لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔ حیدر نے آج چائے کی بھی فرمائش نہیں کی۔ اُس کے چہرے سے انتہائی رنج و غم کا اظہار ہو رہا تھا۔ فوزیہ نے حیدر اسلم کے مایوس چہرے کی طرف نہایت معصومانہ انداز سے دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا ــــــ "مرزا صاحب! آپ نے فنِ خطابت اور مضمون نگاری کے سلسلے میں مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھول سکوں گی اور ہمیشہ احترام سے نام لوں گی۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ جہاز چھوٹنے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا ہے!" حیدر اسلم نے کہا "میں تمہارے کردار کی بلندی کی قدر کرتا ہوں لیکن تمہارے خلوص اور التفات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ تم ہمیشہ کے لئے میری ہو جاؤ گی۔ ہم تم ایک ساتھ زندگی کا سفر طے کریں گے لیکن میرے دیرینہ ہندوستانی دوست شاہد سلیم نے ٹھیک لکھا تھا کہ "ہندوستان کی لڑکی انگلینڈ جا کر لندن کی دوشیزاؤں سے زیادہ ماڈرن ہو جاتی ہے"۔" یہ سُن کر فوزیہ ناہید کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ پھر اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "حیدر! میں تمھیں ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے تم سے نہیں تمہارے فن سے محبت تھی۔ حیرت ہے کہ تمہارے جیسے ذہین آدمی نے مجھے سمجھنے میں بڑی کم فہمی کا ثبوت دیا ہے" فوزیہ خلافِ توقع حیدر اسلم پر برس پڑی لیکن اُسے اپنی تلخ نوائی کا بے حد احساس رہا۔ پھر مرزا حیدر اور سلیم شاہد کی مراسلت کے بارے میں سُن کر وہ اور پریشان ہو گئی۔ مرزا اسلم کی گفتگو اور سلیم شاہد کا حوالہ اُس کی اُلجھنوں میں اضافہ کرتا ہی رہا۔ وہ پورے سفر میں یہی سوچتی رہی کہ سلیم شاہد میرے بارے میں خدا جانے کیا کیا سوچ رہا ہو۔

چند ہی گھنٹوں میں فوزیہ بمبئی پہنچ گئی۔ بابے ایرپورٹ پر سارا گھر آ گیا تھا۔ ابھی فوزیہ جہاز کی سیڑھی پر ہی تھی کہ اُس کی چھیتی بہن سیفو دیوانہ وار دوڑ کے لپٹ گئی۔ فوزیہ کو یقین تھا کہ "میرا سلیم" چار باغ اسٹیشن پر ضرور آئے گا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ آج سے صرف ایک ہفتہ پہلے فیکٹری منیجر نے سلیم شاہد کو اپنے بنگلے میں صبح کی چائے پر بلایا تھا اور چائے نوشی کے درمیان اُس نے سلیم سے کہا تھا کہ دیکھو سلیم میں بہت جلد اس فیکٹری کا مالک بننے والا ہوں۔ مجھ پر اور بھی ذمّے داریوں کا بار پڑ جائے گا۔ پھر فارم وغیرہ کا کام بھی تو دیکھنا پڑتا ہے۔ واقعی میں بہت بدنصیب ہوں۔ قدرت نے کاش ایک بیٹا دیا ہوتا جو اس بڑھاپے میں ہاتھ بٹایا کرتا۔ لیکن مشیتِ ایزدی میں چارہ ہی کیا ہے۔ خیر دیکھو میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوں۔ مجھے پُورا اطمینان ہے کہ تم فیکٹری کا سارا کام بخوبی انجام دے لوگے۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنی لاڈوں کی پالی اکلوتی بیٹی پروین کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے کر تمہیں پرچیز آفیسر کے بجائے فیکٹری منیجر بنا کر دوسرے کام دیکھوں۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں میرے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جہاں تک ہو سکے آرام کروں۔ تمہاری نیک نیتی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ رشتہ دونوں کے لئے انتہائی مناسب ہے۔ یہ سُن کر سلیم پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ لیکن اُس میں انکار کی تاب نہ تھی۔ وہ جانتا تھا اگر میں نے انکار کر دیا تو میرے ساتھ سارے گھر کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ خود کو کتنی ہی بڑی مصیبت میں مبتلا کر سکتا تھا لیکن اپنی بیوہ ماں اور چھوٹے بھائیوں کو دوسرے کا دست نگر نہیں بنا سکتا تھا۔ اُس کی نظر میں بھائیوں کی تعلیم و تربیت اور بہنوں کی شادی کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ گیارہ افراد پر مشتمل گھر کی معاشی ذمہ داریاں بھی تنہا اُنہی کے سر تھیں۔ اِن تمام کمزوریوں نے اُسے اقرار کرنے پر مجبور کر دیا۔ کبھی وہ اقدامِ خودکشی پر بھی آمادہ ہوتا تو گھر کے تباہ ہونے کا اندیشہ اُسے روک دیتا۔ اُس نے کئی بار مرنا چاہا لیکن اُس کے فرائض نے ہاتھ تھام لئے۔

منیجر کو سلیم شاہد اور فوزیہ کی محبت کا بھی کسی حد تک علم ہو چکا تھا۔ اس لئے اُس نے ایک ہی ہفتہ میں شادی کا سارا انتظام کر لیا۔

فوزیہ ناہید چار باغ اسٹیشن پر اُتر کر اعزہ اقرباء کی بھیڑ میں گم ہو گئی لیکن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتی رہی اور سلیم شاہد کہیں نزدیک و دور نظر نہ آیا۔ ناچار کار پر بیٹھ کر گھر کے لئے روانہ ہو گئی۔

فوزیہ کی آمد کی خوشی میں سارا گھر بقعۂ نور ہو رہا تھا۔ دیوار و در رنگ برنگ برقی قمقموں سے جگمگا رہے تھے۔ فوزیہ سلیم کو نہ پا کر ماہیٔ بے آب کی طرح مضطرب تھی۔ کچھ دیر آئی ہوئی سہیلیوں اور گھر کے افراد سے باتیں کرنے کے بعد ایک خوبصورت بہانے کا سہارا لے کر گھر سے نکل پڑی۔

آج "سلیم منشن" کی سجاوٹ بھی فوزیہ کے گھر سے کم نہ تھی۔ وہ دیکھتے ہی فرطِ مسرت میں جھومنے لگی۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ ساری تزئین میری ہی آمد کے سلسلے میں کی گئی ہے۔ اُسے کیا خبر تھی کہ آج اُس کا سلیم پروین کا ہو جائے گا!

وہ اپنے دل میں آرزوؤں اور ارمانوں کی ایک دُنیا بسائے ہوئے لندن سے آئی تھی ــــ لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ اُس کی زندگی کے چمن میں بہار آتے آتے رُک جائے گی ــــ سلیم اپنی محبت کو فرض پر قربان کر دے گا!!

---

"بیسویں صدی" کے غیر ملکی خریدار سالانہ قیمت بائیس شلنگ بذریعہ ڈرافٹ یا برٹش پوسٹل آرڈر بذریعہ رجسٹری بھیج سکتے ہیں۔ رجسٹری ملتے ہی رسالہ جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس قلیل رقم میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو قیمتی خاص نمبر بھی بھیجے جاتے ہیں۔

منیجر رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶



# صحت و زندگی

**زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات**

## ۱ • شہتوت ـــــ موسمِ گرما کا مفید پھل

شہتوت سفید، سیاہ، سبز اور کئی قسم کا ہوتا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے گرم و تر ہے۔ بعض اطبا کی رائے میں اس کا مزاج ٹھنڈا ہے۔ اس لئے گرم مزاج والوں کے لئے مفید ہے۔ پیاس اور گرمی کو دُور کرتا ہے۔ اس کا شربت بخار میں ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ شہتوت بلغم خارج کرتا ہے، قبض کشا ہے، اجابت بافراغت لاتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد کھانے سے ہضم غذا میں مدد دیتا ہے، ہاضمے کو قوت پہنچاتا ہے، گردوں کو قوت دیتا ہے، جگر اور تِلّی کی اصلاح کرتا ہے، نیا خون پیدا کرتا ہے، خشک کھانسی اور گلے دُکھنے میں بے حد نفع بخش ہے۔

شہتوت مفرح ہے، دماغ کی خشکی دُور کرتا ہے۔ مرض سکروی (گوشت خورہ) میں بہت مفید ہے۔

شہتوت نزلہ زکام میں بھی مفید ہے۔ کئی صفراوی امراض میں فائدہ بخش ہے۔ صفرا کی تیزی کو دُور کرتا ہے۔

سفید شہتوت کا مزاج گرم و تر ہے۔ اس میں غذائی اجزاء شکر اور نمکیات ہوتے ہیں۔ بدن کو غذائیت دیتا ہے، بدن کی پرورش کرتا اور اس میں قوت و حرارت پیدا کرتا ہے۔ حلق اور سینے کے لئے مفید ہے۔

سیاہ شہتوت کی طبیعت سرد و تر ہے۔ یہ قابض ہے، پیاس بجھاتا ہے۔ ورمِ حلق کے لئے مجرب دوا ہے۔ صفرا کا غلبہ دُور کرتا ہے۔ مرض خناق (جس میں مریض کا گلا بند ہو جاتا ہے اور سانس تک لینا دشوار ہو جاتا ہے) میں سیاہ شہتوت کا شربت مفید ہے۔ پیٹ کے کیڑے ہلاک کرتا ہے۔

## ۲ • صحت مند رہنے کے لئے خوراک کی اہمیت

صحت مند رہنے اور جسم کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ہی اچھی خوراک بھی ضروری ہے۔ صحت کے حصول میں غذا کو بڑی قدرت و اہمیت حاصل ہے۔ اکثر امراض کے دفعیہ میں دوا کا صرف بیس فیصدی حصہ ہوتا ہے۔ دوا ہزار مفید ہو کارگر نہیں ہو سکتی۔ اگر مریض کو مرض کے حالات کے مطابق غذا نہ دی جائے۔

طبی تجربات سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ہندوستان میں نوے فیصدی بیماریاں غذا کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر سر رابرٹ میکسرسن نے لکھا ہے "جسمانی تندرستی مناسب غذا کی فراہمی پر اور امراض کی نشو ونما اور ترقی ناقص غذا پر منحصر ہے۔ غذا اور صحت کا نہایت قریبی تعلق ہے۔ اس لئے ہر روز کافی مقدار میں ایسی خوراک کھانی چاہئے جو محافظِ صحت ہو تاکہ جسمانی قوت قائم رہے اور جسم بیماریوں کا بخوبی مقابلہ کر سکے۔ اس طرح کی غذا میں ہرے پتّوں والی اور زرد رنگ کی تازہ سبزیاں، بھنے ہوئے چنے، چنے کا بیسن، لوبیا، مٹر کی پھلیاں، موسمی پھل، دودھ، دہی، انڈا، گوشت، جو کا دلیہ، بے چھنے آٹے کی روٹی، سویابین، آلو، مٹر، مختلف دالیں، چھاچھ اور مچھلی شامل ہیں۔

خیال رکھنا چاہئے کہ روزانہ خوراک میں ایسی غذائیں ہوں جن میں قوت بخش اجزاء کافی مقدار میں ہوں تاکہ آپ بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں اور جسم میں امراض کے مدافعت کی قوت پیدا ہو سکے۔ غذائیت کے بغیر خوراک صرف پیٹ بھرنے کا سامان ہے۔ صحت و زندگی کے ساتھ غذا کے عناصرِ حیات کا گہرا تعلق ہے۔ ان کی کمی یا غیر موجودگی میں انسان طرح طرح کے امراض کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ امراض کے

علاج سے یہ زیادہ آسان ہے کہ غذا میں ایسے اجزا کا التزام رکھا جائے جو صحت کی بقا کے لئے ضروری ہیں۔

## ۳ • آپ کی جلد

ہر انسان اپنے جسم اور جسم کے سارے اعضا کو خوبصورت و پُرکشش بنانے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کرتا ہے لیکن شاید انسانی جسم کے کسی اور حصے کی طرف اتنی توجہ نہیں کی جاتی جتنی جلد کی طرف کی جاتی ہے اور شاید اتنی ہی ناواقفیت اور غفلت کا شکار بھی جسم کا اور کوئی حصہ نہیں ہوتا جتنی جلد ہوتی ہے۔

روزانہ پندرہ بیس منٹ تک روشنی اور ہوا کا غسل جلد میں نئی جان ڈال دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد جسم کو ہاتھوں سے خوب ملنا چاہئے۔ پھر ایک تولیے کو ٹھنڈے پانی میں بھگو کر نچوڑ لیا جائے اور اس سے سارے جسم کو ملا جائے تو جلد قوی اور مضبوط ہو جائے گی اور اس کے عمل میں نئی جان پڑ جائے گی۔ اس عمل کا جلد کی نسوں پر بھی بہت اچھا اثر ہوتا ہے اور دل اور دورانِ خون میں بھی اس سے تحریک پیدا ہوتی ہے۔

ٹھنڈا پانی جلد کی بعض بیماریوں کا سب سے بہتر علاج ہے۔ ٹھنڈا پانی سب سے بڑا، سب سے بہتر حسن افزا ہے۔ اس کا روزانہ استعمال دورانِ خون میں اضافہ کرتا ہے اور جلد کو قوت بخشتا ہے۔ گردوں کے عمل کو تیز تر کر دیتا ہے جس سے فضلات کے اخراج میں بہت مدد ملتی۔ پانی کا کثرت سے اور متواتر استعمال جلد کو تندرست رکھتا ہے۔ روز صبح اٹھ کر منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنا دورانِ خون کو بیدار کر دیتا ہے، جس سے چہرہ نکھر جاتا ہے اور جلد نرم اور لچک دار رہتی ہے۔ اس کے صحت بخش اثرات جلد کو خشک اور بے رونق نہیں ہونے دیتے۔ ٹھنڈے پانی کی کثیر مقدار کا استعمال خلیوں کو جس طرح مضبوط کرتا ہے اور بافتوں کو چکنا کرتا ہے۔ اس طرح قیمتی سے قیمتی حسن افزا مصنوعی چیزیں نہیں کر سکتیں۔ اندرونی جلد کو سنوارنے اور خوبصورت بنانے کے لئے تازہ پھل اور تازہ ہری ترکاریوں کا استعمال بے حد فائدہ بخش ہے۔ ان کا روزمرہ استعمال جلد کو صاف، بے داغ اور نرم بنا دیتا ہے اور وہ دلکشی، دمک اور سُرخی پیدا کر دیتا ہے جو صحت بخش زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ مناسب اور متوازن غذا، پانی کا اندرونی اور بیرونی طور پر حسبِ ضرورت استعمال، روشنی اور ہوا کا بلا ناغہ غسل، یہ سب چیزیں جلد پر زندگی کی سختیوں کا اثر نہیں ہونے دیتیں اور جلد کو وہ حسن و دلکشی بخشتی ہیں جو قیمتی سے قیمتی مصنوعی چیزیں نہیں دے سکتیں۔

---

## ۴ • کامیابی

انسانی زندگی کا سب سے اہم موضوع کامیابی و ناکامی ہے۔ انسان کی سب سے بڑی آرزو، سب سے بڑی تمنا کامیابی ہے۔ کامیابی کسی کی میراث کسی کی ملک نہیں۔ دُنیا کے بڑے بڑے کامیاب انسانوں کی زندگیاں اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ کامیابی حالات کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے ——— دنیا کی بزم میں کامیابی ایسا جام ہے جس پر کسی کا نام نہیں لکھا ہوتا ——— ایک مشرقی شاعر نے لکھا ہے ——— جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے ———

مشہور مفکر نپولین ہل نے لکھا ہے ——— ہر ناکام انسان کہتا ہے۔ حالات نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ ظالم زندگی نے ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ ہمیں وہ مواقع حاصل نہ ہو سکے جو دوسروں کو حاصل ہیں۔

لیکن آپ اُن کے حالات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا مواقع اُن کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں اور ناکام انسانوں میں سے ہر شخص اُن مواقع کو اپنے سے دُور ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے! ——— مواقع آپ کی زندگی میں بے شمار ہیں۔ شاید وہ آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ لیکن آپ ان سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ اگر آپ میں سوچنے کی قوت ہے، اگر آپ میں مواقع سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت ہے، اگر آپ کے اندر خود اعتمادی ہے۔ اگر آپ عمل کی قوت سے واقف ہو گئے ہیں تو آپ کو کامیاب و کامراں ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

## ۵ • ککڑی اور کھیرا

ککڑی کو تر بھی کہتے ہیں۔ اِس کا مزاج سرد و تر ہے۔ بعض اطبا کے نزدیک اِس کا مزاج ٹھنڈا ہے۔ قدرے دیر ہضم اور اپھارا پیدا کرتی ہے۔ یہ کچی کھائی جاتی ہے اور تنہا یا گوشت کے ساتھ پکا کر بھی کھائی جاتی ہے۔ کھیرا سے زیادہ ٹھنڈی سمجھی جاتی ہے۔ پیاس، گرمی، پیشاب کی جلن اور خون کے جوش کو مٹاتی ہے۔ گُردے اور مثانے کی گرمی کو دُور کرنے کے لئے مفید ہے۔ اِس کے کھانے سے خون کی حدت، جگر اور معدے کی گرمی دُور ہوتی ہے۔ پیشاب بہت لاتی ہے۔ گُردہ اور مثانہ کی پتھری کو نکالتی ہے۔ اِس کے کثرتِ استعمال سے قولنج کا خطرہ رہتا ہے۔ سرد مزاج والوں کو بھی موافق نہیں۔ گرم بخاروں، جنون و مالیخولیا جیسی گرم بیماریوں میں خاص طور پر نفع بخش ہے۔

قدرے دیر ہضم ہے۔ سیاہ مرچ اور نمک لگا کر کھانے سے اِس کی مضرت دُور ہو جاتی ہے۔ ککڑی کھا کر پانی نہ پینا چاہئے۔ ورنہ ہیضے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

…دانتوں کے ملنے سے مسوڑھوں میں درد ہو جاتا ہے۔
کچی ککڑی کے چھلکے پیشانی پر رکھنے سے گرمی کا درد برطرف ہو جاتا ہے۔
کھیرا ککڑی سے زیادہ دیر ہضم ہے۔ اس میں کیلشیم، فولاد، پوٹاشیم اور دوسرے معدنیات موجود ہیں۔ وٹامن بی اور سی کی بھی اس میں کمی نہیں۔ پیشاب آور، پیاس بجھاتا اور گرمی کے تمام امراض میں مفید ہے۔ موسم گرما میں گرم مزاجوں کے لئے خصوصیت سے بہت مفید ہے۔ پیاس بجھاتا ہے۔ پیشاب بہت لاتا ہے اور پیشاب زیادہ لانے کی وجہ سے پیشاب کی سوزش کو دور کرتا ہے۔ یرقان کے لئے نافع ہے۔ دل و جگر کی گرمی دور کرتا ہے۔ صفرا اور خون کی تیزی اور گرمی کو کم کرتا ہے جبکہ معدہ کمزور کرتا ہے۔ ریاح پیدا کرتا ہے۔ نمک اور سیاہ مرچ اس کا مصلح ہے۔

## ۶• مسرت کا راز

ہر انسان مسرت کا متلاشی ہے۔ انسان کی ساری تگ و دو مسرت ہی کے حصول کے لئے ہے۔ لیکن بہت کم لوگ مسرت کے راز سے آشنا ہیں وہ اپنے گرد و پیش بکھری ہوئی خوشی کی طرف سے آنکھیں بند کرکے بہت حسرت سے کہتے ہیں۔

غم حیات کی تلخی سے کام رہتا ہے
خوشی کے لمحے نہیں ہیں مرے مقدر میں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود اس زندگی میں مسرتیں نایاب و کمیاب نہیں۔ مسرتوں کی ارزانی ہے اور اس میں آپ کا بھی حصہ ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ایک یونانی مفکر و فلسفی نے کہا ہے ——— "یہی حقیقت نہیں ہے کہ خدا نے سارے انسانوں کو مسرت سے لطف اندوز ہونے کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے اگر کوئی خوش نہیں ہے تو اُسے جاننا چاہئے کہ اپنی ناخوشی کا سبب وہ خود ہے"

یہ بات کچھ عجیب سی ہے لیکن روشن حقیقت ہے مشہور مفکر سر ولیم اوسلر نے ایک موقع پر ییل یونیورسٹی کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ——— "یہ زندگی محدود ہے لیکن اس میں قدرت کی فیاضیاں لامحدود ہیں۔ اُن سے آپ خوشی کے خزانے انڈیل سکتے ہیں۔ سورج کی روشنی ہر شے کو منور کرکے یہ بتاتی ہے کہ آپ کے گرد و پیش کتنا حسن بکھرا پڑا ہے۔ اُسے حاصل کرکے مستفید اندوز ہونا آپ کا کام ہے۔"

جو لوگ اس حقیقت کو جان لیتے ہیں زندگی کے متعلق اُن کا رویہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ غم کو بھی خوشی بنا لیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اِس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے اُن کے لب پر یہ شکایت ہوتی ہے ——— تلاش کرتے ہیں لیکن خوشی نہیں ملتی!

## ۷• خزانہ کی تلاش!

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے ———
"بعض مردہ دل اور کم ہمت لوگوں کا خیال ہے، اب دنیا میں دولت کمانے کے اتنے مواقع نہیں جتنے پہلے موجود تھے ——— یہ کاہل، شکست اور پست حوصلہ لوگوں کے ذہن کی اختراع ہے اور اس میں حقیقت کا ذرا بھی شائبہ نہیں۔ آج بھی ان لوگوں کے لئے دنیا میں بے شمار مواقع موجود ہیں جو اپنے اوپر بھروسہ اور اپنے اندر سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور آگے بڑھنے سے نہیں گھبراتے۔

ہر شخص دولت کے خواب دیکھتا ہے لیکن وہی چند لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کا عزم مصمم ——— جن کا ارادہ مستقل ہوتا ہے اور جو ایک مجوزہ لائحہ عمل پر استقلال سے کاربند رہتے ہیں۔

اگر آپ خزانہ کی تلاش میں ہیں تو اپنی زندگی کا ایک مقصد تلاش کیجئے۔ کیونکہ اس سے بہتر آپ کو کوئی خزانہ نہ مل سکے گا۔ یہ خزانہ گھر کے باہر مت ڈھونڈئیے۔ یہ تو آپ کے دل کے ویرانے میں چھپا ہوا ہے۔

## ۸• احساسِ کمتری

ننانوے فیصدی انسان یہ سمجھتے ہیں کہ احساس کمتری انسان کو پست ہمت اور پست حوصلہ بنا دیتا ہے۔ احساسِ کمتری میں مبتلا انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ احساسِ کمتری انسان پر کامیابی کے دروازے کھول دیتا ہے۔

ایک مفکر نے لکھا ہے ——— احساسِ کمتری ایک پوشیدہ قوت ہے جو انسان کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے بیدار کرتی ہے۔ اُس میں کامیابی حاصل کرنے کی لگن پیدا کر دیتی ہے اور آخر کامیاب بنا دیتی ہے۔

اُس مفکر نے لکھا ہے ——— کمتری کے شدید احساس نے بہت سے انسانوں کو ترقی کی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ اُس مفکر کا خیال ہی نہیں، یقین ہے کہ کوئی انسان احساسِ کمتری کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جو انسان کامیابی حاصل کرتا ہے احساسِ کمتری ہی کی وجہ سے حاصل کرتا ہے۔

سکندرِ اعظم، نپولین، نلسن کو فوجی برتری حاصل کرنے کا احساس اِس لئے پیدا ہوا کہ وہ پست قد تھے۔ سقراط، مرابو، والٹیر بدرو اور بدصورت تھے۔ اِس لئے اُنھوں نے غیر معمولی قابلیت پیدا کرکے اُس کی تلافی کی۔

اگر تم خلوص کے ساتھ اپنی طرزِ زندگی میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہتے ہو تو

احساسِ کمتری اس کی کلید ہے۔ اب تک تم احساسِ کمتری کو ایک عیب، ایک خامی سمجھتے رہے ہو، تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ وہ خامی نہیں ہے، قابلِ قدر چیز ہے۔ اگر تم اس کے متعلق اپنے دل سے غلط فہمی دُور کر دو اور مستعدی سے کام لو تو احساسِ کمتری تمہیں کہیں سے کہیں پہنچا سکتی ہے۔"

آپ کی احساسِ کمتری آپ کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ آپ کو جدوجہد کی دعوت دیتا ہے۔

## ۹۔ کیا آپ پریشان رہتے ہیں؟

اگر آپ پریشان رہتے ہیں تو اس تکلیف دہ اور میں تو کہوں گا تباہ کُن عادت کا سایہ بھی اپنے دل کے دامن پر نہ پڑنے دیجئے۔ پریشان رہنے سے زیادہ تباہ کُن اور لاحاصل کوئی اور عادت نہیں۔

مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ـــــ اگر پریشانی سے بچنا چاہتے ہیں تو مصروف رہیئے۔ پریشان آدمی کو کام میں مستغرق ہوجانا چاہیئے۔

جب ہمیں کوئی کام نہیں ہوتا تو اس وقت ہم تقریباً خالی الذہن ہوجاتے ہیں اور فطرت خلا سے نفرت کرتی ہے۔ فطرت خالی دماغ کو پُر کرنے میں عجلت کرتی ہے ـــــ جذبات، خوف، ڈر، پریشانی، نفرت، حسد اور رشک اپنے ریلے میں بہا لاتے ہیں۔ یہ جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں سے اطمینان و سکون کے تمام خیالات و جذبات کو نکال باہر کرنے کے درپے ہوجاتے ہیں۔

مشغول رہیئے، مصروف رہیئے ـــ پریشانی سے بچنے کی یہ ارزاں ترین دوا اور آسان تدبیر ہے اور مفید ترین بھی!

## ۱۰۔ اگر آپ ہر دلعزیز بننا چاہتے ہیں

دُنیا میں سبھی ہر دلعزیز بننا چاہتے ہیں لیکن بہت کم لوگ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر دلعزیزی کا راز کیا ہے؟ ہر دلعزیز بننے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

مشہور مفکر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے ـــــ اگر آپ ہر دلعزیز ہونا چاہتے ہیں، دوست پیدا کرنا چاہتے ہیں، خوش رہنا چاہتے ہیں، مطمئن، آسودہ خاطر اور اثر انگیز انسان بننا چاہتے ہیں تو آپ کو کچھ کر کے دکھانا پڑے گا، کچھ بن کر دکھانا پڑے گا۔

اگر آپ سماج میں دلچسپی نہ لیں گے تو سماج بھی آپ میں کوئی دلچسپی نہ لے گا۔ چاہے آپ کتنے ہی ملنسار اور دوست دار کیوں نہ ہوں۔ لوگوں کی نظروں میں آپ کی کوئی وقعت، کوئی قدر و منزلت نہ ہوگی۔ اگر آپ کا کوئی دشمن نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ سب لوگ آپ کے دوست ہیں۔ آپ کو ایسے بہت سے [illegible] قسم کے لوگ ملیں گے جن کا نہ کوئی دشمن ہے اور نہ کوئی دوست ہے۔

## ۱۱۔ زندگی کی دوڑ میں

زندگی کی دوڑ میں بہت سے لوگ ناکام رہ جاتے ہیں لیکن بہت کم لوگ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ بہت سے لوگ اس وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ترقی نہیں کرتے کہ وہ مشکلات سے ناموافق حالات سے گھبراتے ہیں۔ آسان کام تو وہ چُن چُن کر پہلے کر لیتے ہیں۔ اس طرح سے مشکل کام آخر وقت تک پڑے رہتے ہیں۔ پھر کبھی انہیں پیش آنے والی مشکلات، پیش آنے والے ناموافق حالات کی فکر لگی رہتی ہے۔

یہ احساس کر کے انسان کی خود اعتمادی اور خود داری میں اضافہ ہوتا ہے کہ کوئی مہم پیش آئے، کوئی مشکل آپڑے۔ ہمتِ مردانہ سب کو سر کر لیتی ہے۔ سب پر غالب آجاتی ہے۔ یہ محسوس کر کے اپنی ذات پر انسان کا اعتماد بڑھ جاتا ہے کہ میں ناموافق اور ناخوشگوار مہمات کو سر کر سکتا ہوں۔ فضول اور غیر ضروری تفکرات سے مجھے نجات مل چکی ہے۔

# سرگوشیاں

## سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر بیسویں صدی، دہلی)

---

### انیس شبانہ۔ حیدر آباد

س۔ طالب علم، علم و ادب کی دُنیا میں ستارہ بن کر کب چمک سکتا ہے؟

ج۔ جب تعلیم کی تکمیل سے پہلے اپنا ہر لمحہ تعلیم کی تکمیل کے لئے وقف کر دیتا ہے۔

س۔ دولتمند غریب کی زندگی کے خاموش تاروں کو چھیڑ کر کیوں لطف اندوز ہوتے ہیں؟

ج۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ دولت چار دن کی چاندنی ہوتی ہے۔

س۔ دولتمند اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے غریب کو رُسوا کیوں کر دیتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ وہ غریب کو انسان ہی نہیں سمجھتے

---

### عبدالحنان گکلی ثانی کوٹلوی

س۔ سماج میں عورت کا کیا درجہ ہے؟

ج۔ اگر آپ پوچھتے، سماج میں عورت کا کیا درجہ ہونا چاہئے؟ تو ہم بتاتے۔ آپ نے پوچھا ہے، سماج میں عورت کا کیا درجہ ہے؟ سماج آپ کے سامنے ہے!

س۔ آج کل کے زمانہ میں انسان کی کیا قیمت ہے؟

ج۔ اِتنی کم کہ غیور و خوددار انسان زبان پر بھی نہیں لا سکتا۔

س۔ وہ کون سی چیز ہے جو دُنیا میں دوبارہ نہیں ملتی؟

ج۔ عزّت!

---

### مبارک۔ فیض آباد

س۔ خوشتر بھیّا! کیا موت سے بھی زیادہ بھیانک کوئی اور چیز ہے؟

ج۔ پیٹ کی آگ!

س۔ ہماری سرکار اُردو سے اِتنی بیزار کیوں ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ وہ سرکار ہے اور سرکار کو ہر بات کا حق ہے۔

س۔ بُرے وقت میں اپنے بیگانے کیوں ہو جاتے ہیں؟

ج۔ آپ جہاں ہیں، وہاں ہمارے ماحول سے زیادہ حیثیت نظیاں ہوگی۔

---

### اصغر شاکر۔ رائے پور

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ زندگی ایک حادثہ ہے؟

ج۔ زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔

س۔ کس چیز سے دل تاریک ہوتا ہے؟

ج۔ گناہوں سے۔

س۔ جس کی زندگی میں صرف پریشانی اور مصیبت ہو وہ اپنے دامن میں خوشیاں سمیٹنا چاہے تو اُسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اپنے سے زیادہ پریشان اور مصیبت زدہ لوگوں کو دیکھنا چاہئے۔ اُس کے غم خوشی بن جائیں گے۔

---

### ایم عثمان بیگ بسوانی کلیانی (کرناٹک)

س۔ خوشتر بھیّا! ایک اچھے شاعر کی پہچان؟

ج۔ بہت آسان ہے ——— ایک اچھا شاعر پاندُستلی قوال کو بھی مات کر دیتا ہے!

س۔ خوشتر بھائی! موجودہ زمانے کا سب سے بڑا ناول نگار کون ہے؟

ج۔ جو کئی ناولوں کے پلاٹ جوڑ کر ایک ناول تیار کر لینے کا فن جانتا ہے!

### انور بیگ (بی سی) گرگاؤں (میسور)

س۔ مجھے ہر وقت کامیابی کی طرف بڑھتا ہوں لیکن ہر بار ناامید ہوتا ہوں۔ کامیابی حاصل کرنے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے۔

ج۔ کامیابی کی طرف برابر بڑھتے رہنا چاہئے۔ کسی نے کہا ہے اور بالکل سچ کہا ہے ؎

عزم کامل کو ہے ہر گام پر منزل ملی

س۔ مرد کی کمزوری عورت ہے اور عورت کی کمزوری؟

ج۔ احساس کمتری!

س۔ جد و جہد کرنے کے باوجود منزلِ مقصود نہ ملے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اے شکوہ سنج شوئی تدبیر دیکھنا
ذوق عمل ہی تیرا کہیں خام تو نہیں

---

### عبداللہ ہنگولی (پربھنی)

س۔ زمانہ ظالم ہے، زندگی کیسے بسر ہوگی؟

ج۔ ظلم سے شکست نہ کھانے کا عزم و عہد کر کے!

س۔ آج کل کے دوست دل سے زیادہ جیب پر کیوں نظر رکھتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ ان کی بصارت سے محروم آنکھیں دل تک نہیں پہنچ سکتیں۔

س۔ اگر صبح سورج لے کر نکلے، شام اندھیرا لے کر نکلے، تو آپ کیا لے کر نکلیں گے؟

ج۔ اپنے خونِ جگر سے روشن کر کے ایسی شمع لے کر آگے بڑھیں گے، جو سورج کی طرح غروب ہوگی نہ حالات اور حوادث کے طوفان میں بجھے گی!

---

### م۔م۔ سیع، حیدر آباد دکن

س۔ بھیا آپ کی تعلیمی قابلیت کیا ہے؟

ج۔ [illegible] کی ضرورت نہیں۔

---

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ کوئی انسان اُس وقت تک مکمل اور بڑا انسان نہیں بنتا جب تک اُس سے بہت سی چھوٹی بڑی غلطیاں نہ کی ہوں۔

ج۔ کئی مفکرین کا یہی خیال ہے۔

س۔ بھیا! لیڈر اور گیدڑ میں کیا فرق ہے؟

ج۔ گیدڑ خود فریب کھائے تو کھائے لیکن کسی کو فریب نہیں دیتا۔ لیڈر سراپا فریب ہوتا ہے۔

---

### اے۔ رشید، بشری پور

س۔ اردو میں سب سے پہلے کس نے غزل کہی؟

ج۔ گلستان ہزار رنگ کے مؤلف کے بیان کے مطابق اردو میں اس صنف (غزل) کا سنگِ بنیاد امیر خسرو نے رکھا۔

س۔ احساس کمتری؟

ج۔ اپنے دل کے دامن پر احساسِ کمتری کا سایہ کبھی نہ پڑنے دینا چاہئے۔

س۔ کوئی مزاحیہ شعر سنائیے۔

ج۔ کیا پوچھتے ہو اکبرِ شوریدہ سر کا حال
خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

---

### ستارہ تبسم۔ کلکتہ

س۔ دُنیا کی بہترین چیز کیا ہے؟

ج۔ یہ اپنی اپنی نظر اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ کسی کے لئے بدترین چیز بہترین، کسی کے لئے بہترین چیز بدترین!

س۔ کیا ہر زندگی ایک کہانی ہے؟

ج۔ جی ہاں ؎
زندگی ہے غم و مسرت کا
مختصر اور طویل افسانہ

س۔ ماں کی آرزو؟

ج۔ اس کی اولاد ــ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک

---

خوشی ہے، شادماں رہیے۔

---

### محمد خلیل خاں، جیلانیکٹری۔ بہار

س۔ کسی قوم کی بلندی اور پستی کی نشانیاں کیا ہیں؟

ج۔ اخلاق و کردار کی بلندی و پستی قوموں کی بلندی اور پستی کی نشانیاں ہیں۔

س۔ میری نظر اتنی بلند ہے کہ میری نظر کسی لڑکی پر نہیں جچتی کہ اس سے شادی کروں ـــ کیا اس مشکل کا کوئی حل ہے؟

ج۔ اپنی اس مشکل کا حل پوچھنے سے پہلے یہ سوچئے۔ یہ دیکھئے۔ کوئی لڑکی آپ کو کیا سمجھتی ہوگی؟ انسان کو، خاص کر مرد کو، دوسروں کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے۔ اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

---

### انوار حسین انصاری، برہت پور۔ بردوان

س۔ عورت کی عظمت؟

ج۔ بے برڈ نے لکھا ہے ـــ عورت تقدیس و تعظیم کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ہوگو نے کہا ہے ـــ عورت عقل کی طرح گہری، انصاف کی طرح عزیز ہے۔ ہیگل نے کہا ہے ـــ عورت زندگی کی کٹھن منزل کے لئے رہبر کامل ہے۔ ٹالسٹائی نے کہا ہے ـــ عورت تاریک دلوں کو مشعلِ ہدایت دیتی ہے۔

---

### احمد مناف انصاری، درگاپور

س۔ آج کل آنکھوں کا مرض اتنا عام کیوں ہے؟ اس کا باعث کیا ہے یا ناقص غذا؟

ج۔ [illegible] سب ہے۔

## عبدالملک۔ قلابہ۔ بمبئی

س۔ میرؔ کے کلام میں اتنا سوز و گداز کیوں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ اُن کے دل میں سوز و گداز تھا۔ اُن کے سینے میں درد مند دل تھا۔

س۔ براہِ کرم میرؔ کے اِس شعر کا ثانی مصرعہ لکھئے ؎
سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو

ج۔ ؎ ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

---

## ایس۔ این۔ اختر۔ مدراس

س۔ خوشتر بھائی! میں ہمیشہ سفر میں رہتا ہوں۔ اِس لئے "بیسویں صدی" وقت پر نہیں ملتا۔ بتایئے کیا کیا جائے؟

ج۔ "بیسویں صدی" جب بھی ملے، سمجھئے وقت پر ملا۔ اِس لئے کہ "بیسویں صدی" کوئی اخبار تو نہیں کہ خبریں پُرانی ہوجائیں گی۔

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ حیات دُور ہے راحت کشانِ گیتی سے
گلوں کی سیج پہ سونا نہیں ہے اِس کا شعار
یہ وہ عروسِ شہیداں ہے جس کا حجلۂ سرخ
کبھی ہے معرکۂ مقتل، کبھی ہے تختۂ دار

---

## ہدایت علی ساحل خمری تلیا

س۔ انسان کو ہر دلعزیز بننے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ ہر دلعزیز لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔

س۔ زندگی شادی سے پہلے سکون سے گزرتی ہے یا شادی کے بعد؟

ج۔ شادی کی قدروں کا احترام کیا جائے تو شادی کے بعد سکون سے گزرتی ہے۔

س۔ شوہر اور بیوی میں دائمی محبت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟

ج۔ جب دونوں ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے ہیں۔

---

## رضوان الحق۔ رانچی

س۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ انسان غیر شادی شدہ رہ کر اپنی زندگی کو صحیح طور سے گزار سکے۔

ج۔ جی نہیں۔ زندگی کو صحیح طور سے گزارنے کے لئے شادی کرنا ضروری ہے۔ آپ اپنے گرد و پیش کی زندگیوں کو دیکھتے نہیں۔

س۔ انسان کی پہچان اُس کے فن سے ہوتی ہے یا اُس کے کردار سے؟

ج۔ فن سے کم کردار سے زیادہ!

---

## معیزالدّین زیدی۔ گیا

س۔ کبھی کبھی گھڑی چلتے چلتے رُک جاتی ہے لیکن وقت نہیں رُکتا۔ کیوں؟

ج۔ اِس لئے کہ وقت گھڑی نہیں ہے۔

س۔ عورتوں کا دل؟

ج۔ مردوں کے دل سے خوبصورت ہوتا ہے۔

---

## سہیل احمد سہیل سہسرامی۔ مرزاپور

س۔ اچھائی اور بُرائی کی تمیز ہوتے ہوئے بھی انسان کے قدم گناہ کی طرف کیوں بڑھتے ہیں۔

ج۔ گناہ میں بہت کشش ہوتی ہے۔

س۔ خوشتر بھائی! ہم نے اب تک آپ کی جتنی تصویریں دیکھی ہیں، سبھی میں آپ کو ہنستے ہوتے پایا ہے۔ آپ ہر وقت ہنستے رہتے ہیں۔

ج۔ ہاں! ہم نے ہر مشکل کو ہنس ہنس کر شکست دینا سیکھا ہے۔

---

## ایس۔ ایس۔ علی۔ نظام آباد (آندھرا)

س۔ موجودہ دَور میں سب سے بڑا انسانیت دشمن کون ہے؟

ج۔ انسان!

س۔ دھوکے اور فریب پر جس کام کی بنیاد رکھی جائے اُس کا انجام کیا ہوتا ہے؟

ج۔ ناکامی!! ہر کام میں کامیابی کا راز ایمانداری ہے۔

---

## م۔ ف۔ شیریں۔ سلیم پور۔ [illegible]

س۔ ہندوستان میں پردے کا مستقبل؟

ج۔ اِس نئی روشنی کے دَور میں تاریک ہے!

س۔ نیک سیرت خواتین کے اوصاف؟

ج۔ بدسیرت مرد کی بھی کسی بُرائی کو بُرائی نہیں سمجھتیں۔

---

## احمد حسین فضلی۔ گریڈیہہ

س۔ اِس بڑھتی ہوئی مہنگائی میں اُن معصوم بچوں کا کیا ہوگا جو ابھی بے زبان ہیں۔

ج۔ وہ زبانِ بے زبانی سے ذخیرہ اندوزوں کو چھوٹ دے دینے والے اربابِ حکومت کو دعائیں دیں گے!

س۔ کیا برتھ کنٹرول اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے؟

ج۔ کسی عالمِ دین سے پوچھا جائے۔ ہم تو دُنیا کے عالم ہیں نہ دین کے۔

---

## محمد شمس الرحمٰن پرواز۔ بھاگل پور

س۔ آپ کی نظر میں موجودہ [illegible] کی [illegible] اسباب کا نتیجہ ہے؟

ج۔ صرف ایک سبب۔ [illegible] کی [illegible] کا نتیجہ ہے۔

---

### آئی۔ ایچ فرہاد۔ بہار شریف

س۔ چند ایسی کتابوں کے نام تحریر کریں جن میں شیریں فرہاد، وامق عذرا، نل دمینتی، لیلیٰ مجنوں اور جولیس سیزر کے حالات پڑھ سکوں۔

ج۔ آپ فرہاد ہیں اور ہم سے ایسی کتابوں کے نام پوچھ رہے ہیں جن میں آپ کے ہم مشرب ہم پیشہ لوگوں شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور جولیس سیزر وغیرہ کے حالاتِ زندگی ہوں؟

س۔ آزاد ہندوستان میں ٹاپ لیس فیشن کا مستقبل؟

ج۔ آزاد فضا میں نکھر رہا ہے!

---

### عبدالمجید خاں۔ برہان پور

س۔ زبانوں کے نام پر جھگڑوں کی وجہ؟

ج۔ کمال ناسمجھی!

س۔ "زندگی" پر کوئی بہترین شعر سنائیے۔

ج۔ ہر نفس اِک زندگی ہے، ہر نفس اِک موت ہے
زندگی اے دوست ہے آساں بہت مشکل بہت

---

### شمیم الدین۔ صفی پور (اُناؤ)

س۔ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہے۔ لیکن وہ مجھے خاطر میں نہیں لاتی، بتائیے کیا کروں؟

ج۔ خدا کا شکر ادا کیجئے۔ وہ آپ کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ورنہ کون جانے کس طرح آپ کی مدارات کرتی۔

س۔ انسان جب اپنے آپ سے بیزار ہو جائے؟

ج۔ تو اُسے اپنے حالات سے زیادہ اپنے ذوق پر شاکی ہونا چاہئے۔

---

### ایم۔ ایم بیگ۔ بسوا کلیانی

س۔ انسان کو سدا خوش رہنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ غم کو خوشی بنا لینا چاہئے! کسی نے کہا ہے ؎
مسرت کی تمنا ہے تو غم کی انتہا کر لے

س۔ انسان دوسروں کی برائی پر ہنستا ہے اور اپنے میں جو برائیاں ہوتی ہیں اُنھیں ظاہر نہیں کرتا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔

---

### شاہدہ شیریں۔ حیدر آباد

س۔ بھائی جان! آپ اردو کے سب سے پہلے اخبار کا نام بتا سکتے ہیں؟ اور یہ بھی بتا سکتے ہیں اُسے کس نے جاری کیا تھا؟

ج۔ اردو کا سب سے پہلا اخبار مولانا محمد حسین آزاد نے جاری کیا تھا۔ اس کا نام "اردو اخبار" تھا۔

---

### غلام سرور۔ شاہدرہ

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎
حیات بیداریٔ مسلسل حیات اِک خواب جو نہ ٹوٹے
نشاط کی غفلتوں سے بہتر وہ غم جو انسان کو جگا دے

ج۔ یہ شعر حضرتِ فراق گورکھپوری کا ہے۔

---

### رضیہ سلطانہ۔ بدایوں

س۔ بھائی جان! روشن صدیقی کا پورا نام کیا ہے؟

ج۔ شاہد عزیز۔

س۔ مشہور نقاد و ادیب نیاز فتحپوری کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

ج۔ ۲۴ مئی ۶۶ء کو کراچی میں۔

---

### فضل الرحمٰن۔ راور کیلا

س۔ کیا ہر فنکار کے لئے شراب [illegible]

ج۔ ہرگز نہیں! ہم ایسے کئی فنکاروں کو جانتے ہیں جنھوں نے کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اور کئی تو ایسے ہیں جو سگریٹ بھی نہیں پیتے جو سگریٹ کے ذائقے سے بھی ناآشنا ہیں۔

---

### ایم۔ رہبر نیپالی

س۔ آپ کی نظر میں ہند و پاک میں رومانی شاعر کون کون سے ہیں؟

ج۔ ہند و پاک کی تین چوتھائی آبادی شاعر ہے۔ کتنے لوگوں کے نام بتائے جائیں۔

س۔ جابر اور ظالم بادشاہ اِس جمہوری دور میں بھی ظلم و بربریت سے اپنی رعایا کی نظر میں صرف ذلیل و رسوا ہیں۔ کیا خدا کے سوا دنیا میں کوئی اُن کی سرکوبی نہیں کر سکتا؟

ج۔ کیوں نہیں۔ وقت اور زمانہ ایسے لوگوں کے کس بل نکال دیتا ہے۔

---

### شانتی سکینہ۔ سرینگر

س۔ بھیا! آپ بتا سکتے ہیں، زمین کی عمر کتنی ہے؟

ج۔ پروفیسر ایرچ جرلنگ سربراہ سوویت سائنس اکادمی کے طبقات الارض کے تجربہ خانہ کا بیان ہے ــــــ دنیا کی عمر کا اندازہ پانچ ارب سال ہے۔

---

### اکبر حسین [illegible]

س۔ ادب [illegible] شاعر؟

ج۔ شاعر [illegible] ہوتا ہے۔

س۔ دنیا میں کتنی [illegible] بولی جاتی ہیں؟

ج۔ [illegible]

س۔ زندگی کے سفر میں ہم سفر کا ہونا ضروری ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟

ج۔ [illegible] کہ ساتھی کے بغیر سفر طے ہونا مشکل ہوتا ہے اور زندگی کا سفر تو بہت طویل ہے۔

---

## قاسم عبّاس رضوی۔ لکھنؤ

س۔ مجھے ایک نایاب کتاب مل گئی ہے جس کی مجھے عرصے سے تلاش تھی۔ لیکن وہ لائبریری کی ملکیت ہے۔ سنا ہے خوشبو، پھول اور کتاب کی چوری گناہ نہیں اور اس نایاب کتاب کے حصول کی یہی صورت ہے۔ آپ سے رائے لیتے ہوئے ڈرتا ہوں، کہیں صرف پہلے ہی مصرعے سے مرعوب نہ کر دیں کہ

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل

ج۔ آپ خود صاحبِ عقل ہیں۔ دماغ دل سے بہتر رہنمائی کرتا ہے۔

---

## سلطان سلیم شاد۔ سکھر

س۔ کیا ثقافت روحانیت اور مادیت کا حسین امتزاج ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ انسان حقیقی مسرتوں سے کب آشنا ہوتا ہے؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دے کر۔

---

## اظہر نیّر برہولوی۔ دھنباد

س۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "عورت کے دل کا فیصلہ ایک عظیم الشان طاقت ہے، جسے سمندر کی قہار موجیں، پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانیں، زمین کے زبردست زلزلے اور جلیل القدر بہادر فوجوں کے حملے بھی نہیں [illegible] میں ایسا دل کہاں پایا جاتا ہے۔" کیا آپ مولانا کے خیالات سے متفق ہیں؟

ج۔ مولانا نے بالکل بجا ارشاد فرمایا ہے۔

---

## حمید ادیب۔ ہلدوانی۔ نینی تال

س۔ اگر کوئی اپنی بیوی کو صرف اس وجہ سے طلاق دے کہ وہ ناخواندہ اور دیہات کی پروردہ ہے، ایسے آدمی کو کیا کہیں گے؟

ج۔ جاہل!

س۔ تکبّر اور جھوٹی شان کا انجام؟

ج۔ عبرت ناک ہوتا ہے ——— تکبّر عزازیل را خوار کرد!

س۔ معراجِ انسانیت؟ اور معراجِ شیطنت؟

ج۔ اُڑے تو شہپرِ یزداں گرے تو شیطاں ہے
بشر کے حوصلۂ خیر و شر کو کیا کہیے

---

## شکیل اختر شوخ۔ سیوان

س۔ زندگی اور موت میں اہم کون ہے؟

ج۔ یہ وقت وقت کی بات ہے۔ کبھی زندگی اہم ہوتی ہے کبھی موت!

س۔ حُسن کی تعریف آپ سے پُوچھوں یا حضرتِ جگر مرحوم کی روح سے؟

ج۔ حضرتِ جگر کی رُوح سے! جنھوں نے فرمایا ہے ؎

ہمہ نغمہ، ہمہ خوشبو، ہمہ رنگ
دوسرا تجھ سا کہاں ہے کوئی!

---

## ایم۔ آئی۔ کے۔ ناز حیدر آبادی

س۔ ڈاکٹر مریضوں کی خدمت کے بجائے سیاست میں کیوں حصّہ لیتے ہیں؟

س۔ [illegible] مہنگی ہوئی گرانی کا کون ذمے دار ہے؟

ج۔ ذخیرہ اندوزوں کو چھوٹ دینے [illegible] حکومت!

---

## شاہ عبدالرحمن لکھینوی۔ مونگیر

س۔ دُنیا میں کون مذہب سب سے بہتر اور سچا ہے۔ اگر سارے مذاہب سچے ہیں تو ایک مذہب نے دوسرے مذہب کو اپنے سے کمتر کیوں بتایا ہے؟

ج۔ کسی مذہب نے دوسرے مذہب کو جھوٹا یا کمتر نہیں کہا ہے۔ اُن کے ماننے والے اپنے مذہب کی تعلیمات کو بھول کر ایک دوسرے کو بُرا کہتے ہیں۔

س۔ جو حکومت عوام سے بے پروائی کر رہی ہو اُس حکومت کا وفادار رہنا کہاں تک درست ہے؟

ج۔ واہ! آپ نے بھی کیا بات کہہ دی۔ عوام کو کیا حق ہے کہ وہ حکومت کی بے وفائی، بے اعتنائی کا گلہ کریں۔ وفاداری تو عوام پر فرض ہے۔ عوام کا فرض ہے۔

س۔ لوگ جسے بُرا انسان سمجھتے ہیں، اُن سے عام طور پر نفرت کی جاتی ہے لیکن میرے خیال میں ایسے لوگ پیار اور ہمدردی کے مستحق ہیں۔ اُن سے لوگ نفرت کرتے رہے تو بُرے اچھے کیسے بنیں گے؟

ج۔ آپ کا خیال بہت حد تک بجا ہے۔ آپ کو اپنے خیال پر عمل کر کے دوسروں کے لئے نمونہ بننا چاہئے۔

---

## محمد ظہیر چکر دھر پور

س۔ پاکستان کا نام کس نے رکھا ہے؟

ج۔ بانیٔ پاکستان جناح صاحب نے۔

سوہن صدیقی دہلی

**ایس۔ ڈبلیو چودھری۔ سندیلہ**

س۔ جب انسان اپنی منزلِ مقصود سے بھٹک گیا ہو؟

ج۔ منزل آشنا لوگوں کے نقشِ قدم کی روشنی میں آگے منزل کی طرف بڑھنا چاہئے۔

س۔ کیا شراب ایک غم زدہ انسان کا آخری سہارا ہو سکتی ہے؟

ج۔ ہرگز نہیں۔ ایسا سمجھنا خود فریبی ہے۔

س۔ کیا آجکل محبت کرنا بھی ایک فیشن ہے؟

ج۔ جی ہاں!

---

**ثمینہ خاتون۔ باڑھ۔ پٹنہ**

س۔ ہر ماہ "بیسویں صدی" کو پابندی سے مطالعہ کرتی ہوں۔ لیکن "تیر و نشتر" سے لے کر سرگوشیاں تک پڑھ لینے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کچھ پڑھنے کو باقی رہ گیا ہے۔ بتائیے، یہ "بیسویں صدی" کی سحر آفرینی ہے یا آج سے دس سال پہلے اور حال کا اختلاف معیار؟

ج۔ دونوں!

س۔ "بیسویں صدی" کا وصف؟

ج۔ خود ستائی ہمارا شیوہ نہیں۔ "بیسویں صدی" آپ کے سامنے ہے۔

---

**سمیع عالم۔ پیپرول**

س۔ عشق اور محبت؟

ج۔ ایک ہی مرض کے دو نام ہیں —— کہتے ہیں
جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!

س۔ حالی کا کوئی شعر سنائیں۔

ج۔ یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

---

**سبکی عباسی۔ برہانپور**

س۔ خوشتر بھائی! رفیقِ حیات معیار کے مطابق نہ ملے تو؟

ج۔ اُسے اپنے معیار کے مطابق بنا لینا چاہئے۔

س۔ جو دولت زندگی میں انسان کے کام نہ آسکے وہ دولت آپ کی نظر میں؟

ج۔ کسی اچھے کام میں آئے تو بہت اچھی —— کسی بُرے کے ہاتھ لگ جائے تو بہت بُری۔

س۔ مالی حالت اچھی نہ ہو اور شادی ضروری ہو تو؟

ج۔ اپنی مالی حالت کے مطابق رشتہ تلاش کرنا چاہئے۔

---

**سید اعجاز حیدر زیدی۔ رامپور**

س۔ انسان اپنی زندگی کو کب خوشگوار بنا سکتا ہے؟

ج۔ زندگی کی صحیح قدروں کا احترام کرکے۔ زندگی کی صحیح راہوں پر چل کر۔

س۔ عورت اور شراب میں کیا فرق ہے؟

ج۔ شراب انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے، عورت انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

---

**شجاع الدین۔ اندور**

س۔ جواہر لال نہرو؟

ج۔ متاعِ مشرق نادار تھے جواہر لال!

س۔ ہندوستان کا مستقبل؟

ج۔ ہندوستان کے اربابِ سیاست کے ہاتھ میں ہے۔

---

**حبیب حسین۔ حیدرآباد دکن**

س۔ حضرت فراق گورکھپوری کا پورا نام بتلائیے۔

ج۔ رگھوپتی سہائے۔

---

**محمد یوسف راجگانپوری۔ سُندرگڑھ**

س۔ اس دور میں انسان کے خون کی قیمت کی بنیادی اہمیت کیا ہے؟

ج۔ اس دور میں انسانی خون پانی سے بھی ارزاں ہے!

---

**سی۔ رحمت النساء بیگم۔ آمبور**

س۔ مرد بیوی کی نظروں سے کب گر جاتا ہے؟

ج۔ جب اپنی بیوی سے کسی دوسرے کی بیوی کی تعریف کرتا ہے۔

س۔ زندگی کو کن چیزوں سے سنوارنا چاہئے؟

ج۔ اچھے اعمال۔ بلند کردار سے۔

س۔ عورت رونے پر کب مجبور ہوتی ہے؟

ج۔ جب اُس کے دل کو ٹھیس لگتی ہے۔

---

**ایم۔ اے۔ رشید نرمل۔ عادل آباد**

س۔ وہ کون سی چیز ہے جو میاں بیوی کے درمیان حائل ہو کر دونوں کے لئے مصیبت بن جاتی ہے؟

ج۔ بدگمانی!

س۔ میرا ایک دوست ہے جو روز بروز موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج۔ وہ ذخیرہ اندوز ہوگا یا غلہ کا بڑا بیوپاری۔ اگر یہ نہیں تو پھر ملک و قوم کے لئے غم کھانے اور خون جگر پینے والا لیڈر ہوگا۔ منسٹر ہوگا۔

س۔ "بیسویں صدی" کا آغاز کب سے ہوا؟

ج۔ آج سے ۳۰ سال پہلے۔

سرت جہاں، پھلواری شریف، پٹنہ

س۔ زندگی کے سفر میں ہم سفر کا ہونا ضروری ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟

ج۔ اس لئے کہ ساتھی کے بغیر سفر طے ہونا مشکل ہوتا ہے اور زندگی کا سفر تو بہت طویل ہے۔

---

## قاسم عباس رضوی، لکھنؤ

س۔ مجھے ایک نایاب کتاب مل گئی ہے جس کی مجھے عرصے سے تلاش تھی، لیکن وہ لائبریری کی ملکیت ہے۔ سنا ہے خوشبو، پھول اور کتاب کی چوری گناہ نہیں اور اس نایاب کتاب کے حصول کی یہی صورت ہے۔ آپ سے رائے لیتے ہوئے ڈرتا ہوں، کہیں مدرسہ پہنچتے ہی مصرع سے معیوب نہ کر دیں کہ

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل

ج۔ آپ خود صاحبِ عقل ہیں۔ دماغ دل سے بہتر رہنمائی کرتا ہے۔

---

## سلطان سلیم شاد، سکھر

س۔ کیا ثقافت، روحانیت اور ادبیت کا آئین امتزاج ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ انسان حقیقی مسرتوں سے کب آشنا ہوتا ہے؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دے کر۔

---

## اظہر نیر، برمولوی، دھنباد

س۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "عورت کے دل کا فیصلہ ایک عظیم الشان طاقت ہے، جسے سمندر کی قہار موجیں، پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانیں، زمین کے زبردست زلزلے اور جلیل القدر بہادر فوجوں کے حملے بھی نہیں توڑ سکتے۔ اس کا دل ایسا طلسم مخفی ہے جس کے بھید آج تک نامعلوم ہیں۔ مگر آج کل کی عورتوں میں ایسا دل کہاں پایا جاتا ہے ---؟ کیا آپ مولانا کے خیالات سے متفق ہیں؟

ج۔ مولانا نے بالکل بجا ارشاد فرمایا ہے۔

---

## حمید ادیب، ہلدوانی، نینی تال

س۔ اگر کوئی اپنی بیوی کو صرف اس وجہ سے طلاق دے کہ وہ ناخواندہ اور دیہات کی پروردہ ہے، ایسے آدمی کو کیا کہیں گے؟

ج۔ جاہل!

س۔ تکبر اور جھوٹی شان کا انجام؟

ج۔ عبرت ناک ہوتا ہے ---- تکبر عزازیل را خوار کرد!

س۔ معراجِ انسانیت؟ اور معراجِ شیطنت؟

ج۔ اُڑے تو شہپرِ یزداں گرے تو شیطاں ہے
بشر کے حوصلۂ خیر و شر کو کیا کہئے

---

## شکیل اختر شوخ، سیوان

س۔ زندگی اور موت میں اہم کون ہے؟

ج۔ یہ وقت وقت کی بات ہے۔ کبھی زندگی اہم ہوتی ہے کبھی موت!

س۔ حُسن کی تعریف آپ سے پوچھوں یا حضرتِ جگر مرحوم کی روح سے؟

ج۔ حضرتِ جگر کی روح سے! جنھوں نے فرمایا ہے ؎
ہمہ نغمہ، ہمہ خوشبو، ہمہ رنگ
دوسرا تجھ سا کہاں ہے کوئی!

---

## ایم۔ آئی۔ کے۔ ناز حیدر آبادی

س۔ ڈاکٹر مریضوں کی خدمت کے بجائے سیاست میں کیوں حصہ لیتے ہیں؟

ج۔ تاکہ سیاست دانوں کی مریضانہ ذہنیت کو صحت مند بنا سکیں۔

س۔ بڑھتی ہوئی گرانی کا کوئی علاج ہے؟

ج۔ ذخیرہ اندوزوں کو ختم کر دیا جائے تو ممکن ہے۔

---

## شاہ عبدالرحمٰن کیفی، مونگیر

س۔ دنیا میں کوئی مذہب برا نہیں ہے تو پھر اگر سارے مذاہب اچھے ہیں تو کیوں ایک مذہب نے دوسرے مذہب کو اپنے سے کمتر کیوں بتایا ہے؟

ج۔ کسی مذہب نے دوسرے مذہب کو "گھٹیا" یا کمتر نہیں کہا ہے۔ ان کے ماننے والے اپنے مذہب کی تعلیمات کو بھول کر ایک دوسرے کو برا کہتے ہیں۔

س۔ جو حکومت عوام سے ووٹ لے کر بنتی ہے اس حکومت کا وفادار رہنا کہاں تک درست ہے؟

ج۔ واہ! آپ نے بھی کیا بات کہی۔ عوام کو یہ حق ہے کہ وہ حکومت کی بدعنوانی و بے انصافی کا گلہ کریں۔ وفاداری تو عوام پر فرض ہے۔ عوام کا فرض ہے۔

س۔ لوگ جسے برا انسان سمجھتے ہیں، ان سے عام طور پر نفرت کی جاتی ہے، لیکن میرے خیال میں ایسے لوگ پیار اور ہمدردی کے مستحق ہیں۔ ان سے لوگ نفرت کرتے ہیں تو برے اچھے کیسے بنیں گے؟

ج۔ آپ کا خیال بہت حد تک بجا ہے۔ آپ کو اپنے خیال پر عمل کر کے دوسروں کے لئے نمونہ بننا چاہئے۔

---

## محمد ظہیر، چکردھر پور

س۔ پاکستان کا نام کس نے رکھا ہے؟

ج۔ بانیٔ پاکستان جناح صاحب نے۔

**این۔ ڈبلو۔ چودھری۔ سندیلہ**

س۔ جب انسان اپنی منزلِ مقصود سے بھٹک گیا ہو؟

ج۔ منزل آشنا لوگوں کے نقشِ قدم کی روشنی میں آگے منزل کی طرف بڑھنا چاہئے۔

س۔ کیا شراب ایک غمزدہ انسان کا آخری سہارا ہو سکتی ہے؟

ج۔ ہرگز نہیں۔ ایسا سمجھنا خود فریبی ہے۔

س۔ کیا آجکل محبت کرنا بھی ایک فیشن ہے؟

ج۔ جی ہاں!

---

**ثمینہ خاتون۔ باڑھ۔ پٹنہ**

س۔ ہر ماہ "بیسویں صدی" کا پابندی سے مطالعہ کرتی ہوں۔ لیکن "نیرو نشتر" سے لے کر سرگوشیاں تک پڑھ لینے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کچھ پڑھنے کو باقی رہ گیا ہے۔ بتائیے "یہ "بیسویں صدی" کی سحر آفرینی ہے یا آج سے دس سال پہلے اور حال کا اختلاف معیار؟

ج۔ دونوں!

س۔ "بیسویں صدی" کا وصف؟

ج۔ خود ستائی ہمارا شیوہ نہیں۔ "بیسویں صدی" آپ کے سامنے ہے۔

---

**سمیع عالم۔ بیپرول**

س۔ عشق اور محبت؟

ج۔ ایک ہی مرض کے دو نام ہیں ——— کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!

س۔ حالی کا کوئی شعر سنائیں۔

ج۔ یاران تیز گام نے منزل کو جالیا
ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے

---

**سیفی عباسی۔ برہانپور**

س۔ خوشتر بھائی! رفیقِ حیات معیار کے مطابق نہ ملے تو؟

ج۔ اُسے اپنے معیار کے مطابق بنا لینا چاہئے۔

س۔ جو دولت زندگی میں انسان کے کام نہ آسکے وہ دولت آپ کی نظر میں؟

ج۔ کسی اچھے کام پر آئے تو بہت اچھی ——— کسی بُرے کے ہاتھ لگ جائے تو بہت بُری۔

س۔ مالی حالت اچھی نہ ہو اور شادی ضروری ہو تو؟

ج۔ اپنی مالی حالت کے مطابق رشتہ تلاش کرنا چاہیئے۔

---

**سید اعجاز حیدر زیدی۔ رامپور**

س۔ انسان اپنی زندگی کو کب خوشگوار بنا سکتا ہے؟

ج۔ زندگی کی صحیح قدروں کا احترام کرکے۔ زندگی کی صحیح راہوں پر چل کر۔

س۔ عورت اور شراب میں کیا فرق ہے؟

ج۔ شراب انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے عورت انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

---

**شجاع الدین۔ اندور**

س۔ جواہر لال نہرو؟

ج۔ متاعِ مشرق نادار تھے جواہر لال!

س۔ ہندوستان کا مستقبل؟

ج۔ ہندوستان کے اربابِ سیاست کے ہاتھ میں ہے۔

---

**حبیب حسین۔ حیدرآباد دکن**

س۔ حضرت فراق گورکھپوری کا پورا نام بتائیے۔

ج۔ رگھوپتی سہائے۔

---

**محمد یوسف راجگانپوری۔ سُندرگڑھ**

س۔ اس دور میں انسان کے خون کی قیمت کی بنیادی اہمیت کیا ہے؟

ج۔ اس دور میں انسانی خون پانی سے بھی ارزاں ہے!

---

**سی۔ رحمت النساء بیگم۔ آمبور**

س۔ مرد بیوی کی نظروں سے کب گر جاتا ہے؟

ج۔ جب اپنی بیوی سے کسی دوسرے کی بیوی کی تعریف کرتا ہے۔

س۔ زندگی کو کن چیزوں سے سنوارنا چاہئے؟

ج۔ اچھے اعمال۔ بلند کردار سے۔

س۔ عورت رونے پر کب مجبور ہوتی ہے؟

ج۔ جب اس کے دل کو ٹھیس لگتی ہے۔

---

**ایم۔ اے۔ رشید نہال۔ عادل آباد**

س۔ وہ کون سی چیز ہے جو میاں بیوی کے درمیان حائل ہوکر دونوں کے لئے مصیبت بن جاتی ہے؟

ج۔ بدگمانی!

س۔ میرا ایک دوست ہے جو روز بروز موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج۔ وہ ذخیرہ اندوز ہوگا یا غلّہ کا بڑا بیوپاری! اگر یہ نہیں تو پھر ملک و قوم کے لئے غم کھانے اور خون جگر پینے والا لیڈر ہوگا۔ منسٹر ہوگا۔

س۔ "بیسویں صدی" کا آغاز کب سے ہوا؟

ج۔ آج سے ۳۰ سال پہلے۔

## محمد محب الحق۔ آکیٹر

س۔ گلستاں کا صحیح تلفظ کیا ہے۔ گُلِستاں یا گُلَستاں؟

ج۔ گُلِستاں!

س۔ راجہ مہدی علی خاں آپ سے اتنی بے تکلفی سے کیوں پیش آتے تھے؟

ج۔ اس لئے کہ وہ رگِ جاں سے زیادہ قریب تھے۔

س۔ افسانہ نمبر ۱۹۶۴ء کے سرورق پر راجہ مہدی علی خاں، کنہیالال کپور، ڈاکٹر عندلیب شادانی، فراق گورکھپوری کے علاوہ کن کن حضرات کی تصویریں ہیں؟

ج۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور فکر تونسوی کی تصویریں ہیں۔

---

## شیدا ردولوی

س۔ کسی ایسے مورخ کی کتاب کا نام بتائیے جس میں انارکلی اور شہزادہ سلیم کی محبت کے بارے میں صحیح معلومات ہوں۔

ج۔ بھائی جان! ع

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

---

## احمد ظفر۔ دربھنگہ

س۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر
اس کے متعلق ہم کو معلوم تھا کہ یہ علامہ اقبال کا ارشاد ہے۔ لیکن ایک جگہ ہم نے اس کے نیچے "بھرتری ہری" لکھا ہوا پایا۔ اس کا مطلب؟

ج۔ یہ قول، یہ خیال "بھرتری ہری" ہی کا ہے۔ جسے علامہ اقبال نے اپنے الفاظ اور اپنے اندازِ خاص میں پیش فرمایا ہے۔

---

س۔ [illegible] حیرت ہو، پھر بھی شوہر [illegible] اُس کی موت کا مستحق ہو تو؟

ج۔ ایسا شوہر احمق اور اندھا کہا جائے گا۔

س۔ ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ انسان کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے لیکن ہر خواہش اور تمنا نہیں۔ اور میں کہتا ہوں ہر خواہش و ہر تمنا پوری ہو سکتی ہے، البتہ شیخ چلی کا خواب نہیں۔ فیصلہ آپ پر ہے۔

ج۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔ جد و جہد کی جائے تو ہر خواہش، ہر تمنا پوری ہو سکتی ہے۔ انسان نے پتھر سے جوئے شیر نکال لی۔ انسان دھرتی سے چاند تاروں پر کمند ڈال رہا ہے۔

---

## سید صولت شیر۔ کراچی

س۔ ذرا بتائیے! پنڈت نہرو کی وفات پر کراچی اتنا سوگوار تھا جتنا قائد ملت لیاقت علی خاں کی موت پر! حالانکہ کچھ ہی عرصہ پہلے پنڈت جی پاکستان کو ہندوستان کا دشمن قرار دے چکے تھے۔

ج۔ پنڈت جی ایسا کہنے کے بعد بھی دل سے پاکستانی عوام کو ہندوستانی عوام کا دشمن نہیں سمجھتے تھے اور دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔

---

## قیس انصاری شب پور۔ ہوڑہ

س۔ علامہ اقبال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ علامہ اقبال عظیم شاعر، عظیم مفکر، عظیم انسان تھے۔

س۔ علامہ اقبال کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

---

[illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

---

## [illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ مرد!

س۔ بیسویں صدی [illegible]

ج۔ اگر آپ کا [illegible] ہر ماہ بیسویں صدی [illegible] کا نام خوشخطی [illegible]

---

## سید حامد حسین۔ مرشد آباد

س۔ اگر ایک لڑکی [illegible] کسی کو بھائی بنالے تو ایسی لڑکی کو آپ کیا کہیں گے؟

ج۔ ایک ایسی معصوم لڑکی [illegible] سے الگ کر [illegible]

س۔ میری دوست [illegible] میں کیا کہوں؟

ج۔ [illegible]

---

## عبدالحمید خاں۔ [illegible]

س۔ شاعر کہتے ہیں [illegible]

ج۔ [illegible]

[illegible]

ج۔ ... [illegible] ... کو نہیں۔

### [illegible] بھاگلپور

س۔ مفلسی اور قسمت کا رشتہ؟

ج۔ مفلسی اور قسمت کا کوئی رشتہ نہیں۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ

ہاں! اپنے کار و فرو دستِ تو تقدیر تست!

س۔ رسم و رواج کی پابندی ترقی کے راستے کا کانٹا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ساری رسموں اور سارے رواجوں کو ترقی کے راستے کا کانٹا کہنا صحیح نہیں۔ کچھ رسمیں، کچھ رواج مفید بھی ہیں۔

س۔ خوشتر بھیا! کیا ایسا بھی کوئی کام ہے جسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ناممکن ہو؟

ج۔ ناقابلِ شکست عزم و عمل کے آگے کوئی کام ناممکن نہیں۔ اب تو انسان چاند تاروں تک پہنچ گیا۔

---

### شکیل الرحمن پرواز، بھاگلپور

س۔ [illegible] کی دوستی ایک [illegible] فریب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن کہاں تک درست ہے؟

ج۔ [illegible] کی دوستی [illegible] ہوتی ہیں کہ جہاں کو [illegible]

س۔ [illegible] سائنس کی کیا ضرورت

---

ج۔ شاید اسی لئے [illegible] جن سے دنیا میں اندھیرا چھا جائے۔ اندھیرا اور گہرا ہو جائے۔ دنیا کی [illegible] حالت دیکھ کر انسان [illegible] پہلے ہی مر جائے۔

---

### عبدالشکور رضا غوری، سنبھل، مرادآباد

س۔ پروفیسر نثار احمد کہاں؟ بیسویں صدی میں نظر نہیں آتے۔ ایک عرصہ ہوا ان کا افسانہ پڑھے ہوئے۔

ج۔ موصوف بیسویں صدی کے کاروان سے الگ نہیں ہیں۔ بیسویں صدی سے دور نہیں ہیں۔ کبھی کبھی حالات سے مجبور ہو کر کہانی کار خود کہانی بن جاتا ہے۔

---

### ذکریا ناز، کلکتہ

س۔ انسان عظیم کیسے بن سکتا ہے؟

ج۔ عظیم انسانوں کے نقشِ قدم پر چل کر!

س۔ مجھے رونا اچھا لگتا ہے۔ کوئی ایسا دردناک شعر سنائیے جسے سن کر دل میں ایک درد اٹھے اور آنکھوں میں آنسو بھر آئیں۔

ج۔ بالو! آپ کو رونا کیوں اچھا لگتا ہے؟

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

---

### محسن بن سعید، عادل آباد

س۔ یہ دنیا پھولوں کی سیج ہے یا کانٹوں کی؟

ج۔ بلند حوصلہ لوگوں کے لئے پھولوں کی سیج ہے۔ پست حوصلہ انسانوں کے لئے کانٹوں بھری راہ!

س۔ سائیکل کا پہیہ پنکچر ہوتا ہے، موٹر کا پہیہ پنکچر ہوتا ہے۔ لیکن ریل کا پہیہ کیوں نہیں پنکچر ہوتا؟

---

ج۔ داتاؤں کے شہنشاہ، بیانوں کے بادشاہ! شاید آپ نے کبھی ریل نہیں دیکھی۔ ورنہ یہ سوال نہ کرتے۔

---

### سید مظاہر حسن کوسوی، جمشید پور

س۔ زندگی کے ساتھ الجھنیں ہیں پھر زندہ رہنے کی تمنا کیوں ہوتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ ہزاروں الجھنوں کے باوجود زندگی بہت پیاری ہے۔ ہزاروں تلخیوں کے باوجود زندگی بہت میٹھی ہے۔

س۔ زندگی جب بوجھ بن جائے تو؟

ج۔ زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جد و جہد کرنی چاہئے۔

س۔ دنیا کیا چاہتی ہے۔ دولت یا محبت یا عزت؟

ج۔ سب کچھ!

---

### ذکیہ جمال، لال پور

س۔ بھیا! موت کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟

ج۔ موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے

زندگی ہے پے بہ پے طوفان سے ٹکرانے کا نام
ڈوب کر بحرِ حوادث میں ابھر آنے کا نام

---

### عبدالحمید آزاد، بنگلور

س۔ بکواس — خاموشی — مطالعہ؟

ج۔ بکواس سے خاموشی، خاموشی سے مطالعہ بہتر ہے۔

---

### عبدالمجید بٹ فاضل، سری نگر

س۔ ساری دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ ۷۵ کروڑ۔

## ضیاء الدین قریشی۔ بجنور

س۔ حضرت جگر مراد آبادی رومانی ہی شاعر تھے یا انھوں نے زندگی آموز شاعری بھی کی ہے؟

ج۔ اُن کی شاعری زندگی آموز بھی تھی اور حیات افروز بھی۔ اُن کے دو حیات افروز شعر سُنئے ؎

جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے
قدم قدم پہ وہ اک شمع راہ پیدا کر
یہی زمیں ترا مسکن یہی ترا مدفن
اسی زمین سے تو مہر و ماہ پیدا کر

---

## شوکت خاں عشرت۔ تالڈانگہ

س۔ کیا مفلسی کی آگ تہذیب اور اخلاق کے ہر نقش کو مٹا دیتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ خلوص و محبت سے بھرا ایک شعر سُنایئے۔

ج۔ وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی، وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

---

## افشاں حنا مظفر پور

س۔ کیا بیوی کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے؟

ج۔ بیوی کا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں۔ ہاں، پڑھی لکھی ہو تو اچھا ہے، بہت اچھا! لیکن پڑھی لکھی سے زیادہ ہم خیال ہونا ضروری ہے!

س۔ ماں کا پیار بھی کسی سے مل سکتا ہے؟

ج۔ ماں کا پیار اپنا جواب آپ ہے!

س۔ ہر انسان کی زندگی میں اندھیرے کے بعد اُجالا اور اُجالے کے بعد اندھیرا آتا

لازمی ہے۔

ج۔ یہ کچھ ضروری نہیں۔ یہ اپنے اپنے عمل پر موقوف ہے۔

---

## محمد الیاس خاں۔ بارہمولا کشمیر

س۔ دُنیا میں مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ تقریباً پچپن کروڑ۔

س۔ پھول شاخ پر اچھا لگتا ہے یا گلدان میں؟

ج۔ شاخ پر نہ گلدان میں۔ خوبصورت عورت کے جوڑے میں اچھا لگتا ہے۔

س۔ کامیابی کیسے حاصل ہوتی ہے؟

ج۔ کامیابی کے لئے جدوجہد کرنے سے!

---

## سلمیٰ زیدی۔ علیگڑھ

س۔ بھائی جان! یہ شعر کس کا ہے؟

کیسی پھوٹ کہاں نفرت، انساں کی فطرت ہے محبت
آؤ سایۂ گل میں رکھ دیں، یہ خنجر بھی وہ خنجر بھی

ج۔ زیب غوری کا۔

---

## ذکیہ زیدی۔ بجنور

س۔ کوئی خوبصورت قطعہ سُنائیں۔

ج۔ سُنئے ؎

چاندنی رات کی خموشی میں
یوں کوئی مہ جمال آتا ہے
ایک شاعر کے ذہن میں جیسے
خوبصورت خیال آتا ہے

---

## ایم۔ قاسم انعامی۔ میرہاٹ پوسٹ پونپریہ

س۔ ایک دہریئے کی قیامت قبول کرنے والے حاجی، صوفی، مولوی، زاہد اور عابد کو کس نام

[illegible]

ج۔ ایسے [illegible] جہاں تک [illegible] [illegible] ہے۔

س۔ [illegible] کا اصل نام اور مذہب کیا ہے؟

ج۔ اصل نام [illegible] ہے۔ ایسے لوگوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ اپنے وجود [illegible] کی وجہ سے [illegible] کا نام کرتے ہیں۔

س۔ مجاز کی شاعری میں عورت کا درجہ؟ عورت کا تصور؟

ج۔ بہت بلند ہے۔ [illegible] ہے۔

---

## ایم علیم الدین ہاشمی۔ اسلام نگر جھاجھا

س۔ "نرگس" "نورجہاں" اور "اشتیاق" نام کے پرچے کہاں سے نکلتے ہیں اور ان کی سالانہ قیمت کیا ہے؟

ج۔ یہ پرچے کبھی نکلتے تھے اب نہیں نکلتے۔ "نرگس" غالباً بمبئی سے نکلتا تھا۔ "نورجہاں" دہلی سے اور "اشتیاق" پشاور سے نکلتا تھا۔

## الیاس احمد۔ برہان پور

س۔ بھارت کے سابق وزیر تعلیم اور حال وزیر داخلہ کا نام عبد الکریم چھاگلہ ہے یا محمد کریم؟

ج۔ محمد کریم۔ وہ سابق وزیر داخلہ نہیں [illegible] وزیر خارجہ ہیں۔




ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی — مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائیٹل و تصاویر: براڈشٹ پریس صدر بازار دہلی — [illegible]

# ڈکشنریاں، صنعت و حرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

## کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

| | | |
|---|---|---|
| بیسویں صدی کی کشیدہ کاری | کرشنا کماری ایم اے | چار روپے |
| کشیدہ کاری | زینت کوثر | پانچ روپے ۵۰ پیسے |
| . | . | چار روپے ۵۰ پیسے |
| . | رشیدہ خاتون | تین روپے ۵۰ پیسے |
| . | زینب انور | دو روپے ۵۰ پیسے |
| . | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| . | قدسیہ انور | ایک روپیہ |
| . | . | ایک روپیہ |
| کتاب درزی خانہ | زینب نور | دو روپے |
| اشعار | اشرف بازغلہ | دو روپے |
| رشیدہ کی کتاب | زینت کوثر | پانچ روپے |

### انگریزی اردو میں اپنی قابلیت بڑھائیے

اردو انگریزی کی سب سے بہترین ڈکشنریاں

| | | |
|---|---|---|
| پاکٹ ڈکشنری انگریزی سے اردو ہندی | | چار روپے |
| انگریزی اردو ڈکشنری کلاں (رسالہ سائز) قیمت مجلد | | دس روپے |
| اردو انگریزی ڈکشنری کلاں رسالہ سائز قیمت مجلد | | بارہ روپے |
| سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری | عبدالحق | تیس روپے |
| سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری | " | بیس روپے |
| سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری | . | بارہ روپے |
| اردو انگریزی ڈکشنری | | گیارہ روپے |
| انگریزی اردو ڈکشنری | | دس روپے |
| آکسفورڈ ڈکشنری انگریزی سے اردو ہندی | | تین روپے |
| اردو ادبی لغت | | آٹھ روپے |
| نور اللغات جدید کلاں | | بارہ روپے |
| فرہنگ عامرہ | | سات روپے ۵۰ پیسے |
| نور اللغات عکسی خورد | | چھ روپے ۵۰ پیسے |

## صنعت و حرفت

| | | |
|---|---|---|
| الیکٹریکل انجینئرنگ بک | نرنجن ناتھ | بارہ روپے |
| الیکٹرک گائڈ (نیا ایڈیشن) | | آٹھ روپے |
| الیکٹرک وائرنگ | . | چار روپے ۵۰ پیسے |
| موٹر کار وائرنگ | . | چار روپے ۵۰ پیسے |
| الیکٹرک بیٹری | | تین روپے ۵۰ پیسے |
| الیکٹرک لائٹنگ | . | چھ روپے |
| الیکٹرک سپروائزر امتحان کے پیپرز (معہ جواب) | . | چھ روپے ۵۰ پیسے |
| آئل و گیس انجن گائڈ | . | دس روپے |
| آئل انجن گائڈ | . | چھ روپے |
| کروڈ آئل انجن گائڈ | . | چار روپے ۵۰ پیسے |
| وائرلیس ریڈیو گائڈ | " | چھ روپے |
| ریڈیو سروسنگ (ریڈیو مکینک) | . | آٹھ روپے ۲۵ پیسے |
| ٹانکا لگانے کا ہنر | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| چھوٹے ڈائنمو و الیکٹرک موٹر بنانا | | تین روپے ۵۰ پیسے |
| پریکٹیکل آرمیچر وائنڈنگ (اے سی ڈی سی) | . | ستارہ روپے ۵۰ پیسے |
| ریفریجریٹر گائڈ | نرنجن ناتھ | آٹھ روپے ۲۵ پیسے |
| ہر ہمسر ریڈیو گیان | . | پندرہ روپے |
| ٹرانسفارمر گائڈ | . | چار روپے ۵۰ پیسے |
| الیکٹرک موٹرز | . | آٹھ روپے |
| خراد شکشا یعنی ٹرنر گائڈ | . | تین روپے |
| ورکشاپ گائڈ (فیٹر ٹریننگ) | . | تین روپے |
| خراد اور ورکشاپ گیان | . | چھ روپے |
| پریکٹیکل گھڑی سازی | رام اوتار ورما | چار روپے ۵۰ پیسے |
| سائیکل ریپیرنگ | . | دو روپے ۵۰ پیسے |

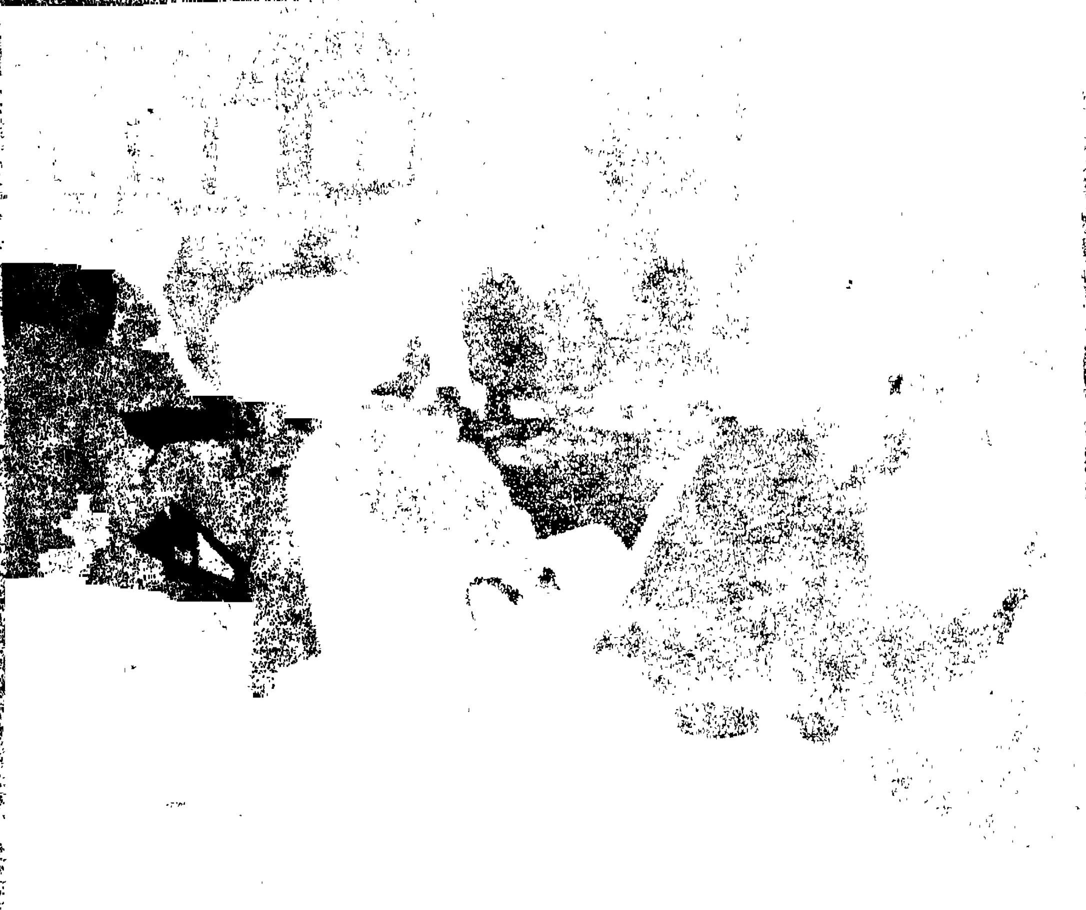
## خانہ داری

| | | |
|---|---|---|
| عصمتی دسترخوان | آمنہ نازلی | تین روپے |
| رضیہ کا دسترخوان | رضیہ سلطانہ | دو روپے ۵۰ پیسے |
| رنگ سازی | پروفیسر نرنجن ناتھ | دو روپے ۵۰ پیسے |
| پرنٹنگ گائڈ | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| اپٹوڈیٹ بوٹ پالش سازی | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| اپٹوڈیٹ انک ماسٹر (روشنائیاں بنانا) | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| کنفیکشنری (انگریزی مٹھائیاں بنانا) | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| ہیئر آئل (خوشبودار تیل) | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| بیکری بہار (بسکٹ ڈبل روٹی کیک) | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| پینٹری کا کام | . | چار روپے ۵۰ پیسے |
| فن مصوری (چیز کاری) | . | چار روپے ۵۰ پیسے |
| پرفیومری ماسٹر | . | دو روپے [illegible] |
| وارنش ماسٹر (وارنش سازی) | . | [illegible] |
| آتش بازی کا کاروبار | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| اچار، مربہ، چٹنی | بی بی رانی بیگم | دو روپے ۵۰ پیسے |
| حلوائی ماسٹر | جندر بھان سنگھل | دو روپے ۵۰ پیسے |
| تمباکو کا کاروبار (تمباکو کی دوکان) | | دو روپے ۵۰ پیسے |
| پان کی دوکان | " | دو روپے ۵۰ پیسے |
| چھپائی پارچہ جات کیلیکو پرنٹنگ | . | تین روپے ۵۰ پیسے |
| انڈو یوروپین ککری بک / دیسی انگریزی کھانے | سوامی جین | چار روپے |
| کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| موم بتی کا کاروبار | . | دو روپے ۵۰ پیسے |
| ڈیری فارمنگ | . | چار روپے |

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج، دھلی نمبر ۶

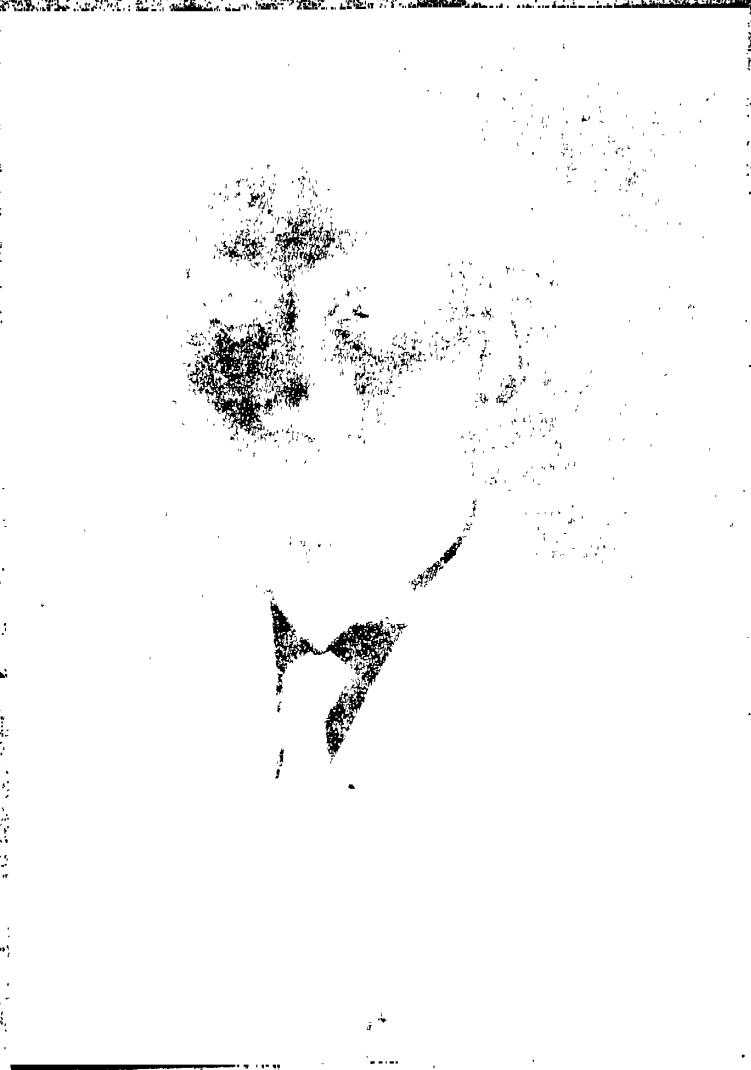
BISWIN SADI
31 ST YEAR OF PUBLICATION
Office 271637





خورد و نوشش بھی ہوئی جس میں جناب گوپی ناتھ امن
یں اور خالص گڑ کی چائے کچھ اس طمطراق سے پی ہے

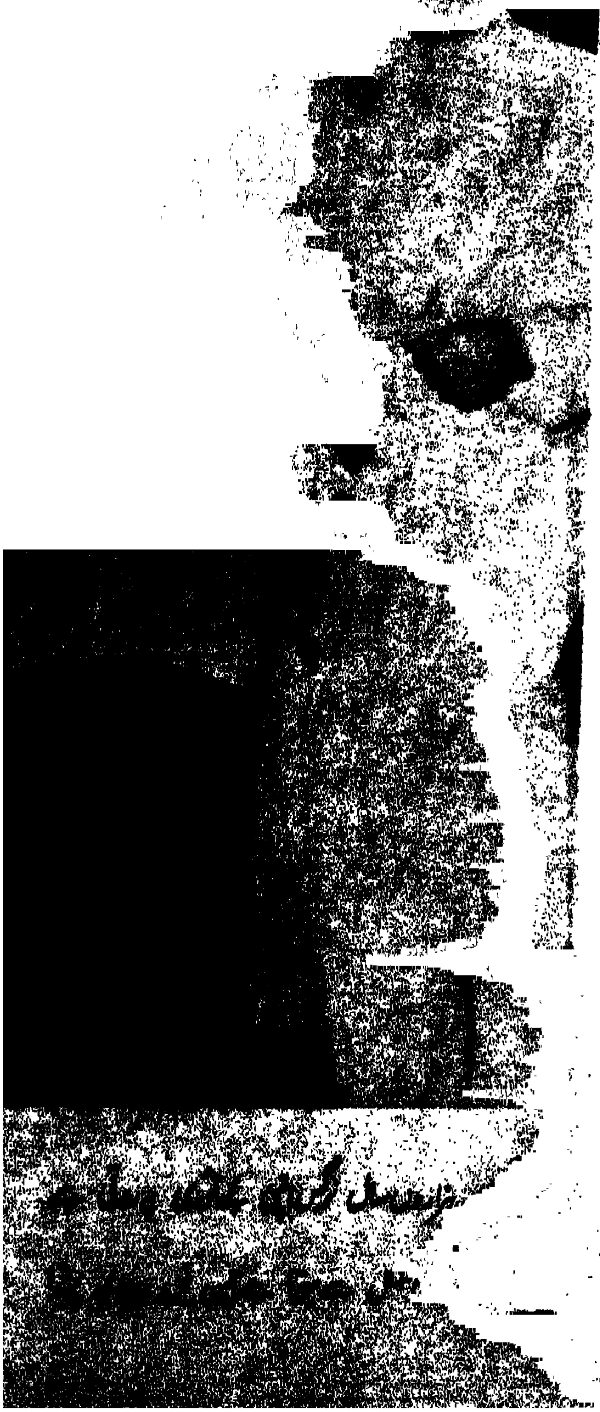
ماں رہا یہ حقارت منگر
ورین گرپ ... باشد
... چائے کے ... ستار گڑ کی چائے پینے
... کچھ ...



ماں کی مامتا کے بارے میں اُس کہانی سے تو آ [illegible] واقف ہوں گے کہ کسی عاشق سے اُس کی محبوبہ نے ماں کے کلیجے کا مطالبہ کیا [illegible] عاشق اپنی ماں کو قتل کرنے کے بعد جب اُس کا کلیجہ لے کر اپنی محبوبہ کے یہاں رو [illegible] ہوا تو راستے میں اُسے ٹھوکر لگ گئی اور مُردہ ماں کا کلیجہ تڑپ اُٹھا کہ میرے لال! [illegible] تو نہیں آئی ـــــ جن کی تصویر آپ دیکھ رہے ہیں "بیسویں صدی" کے پُرانے قلم [illegible] رازیوسفی ہیں اور اپنے افسانے "گھر ہونے تک" میں انھوں نے بڑی فنی چابک [illegible] سے ایک اور پہلو سے جو ہماری روزمرّہ زندگی کے بہت قریب ہے، [illegible] انسانی تصویر کشی کی ہے۔



پروفیسر عاصی کرنالی ایم۔اے جن کے پچھلے افسانے اُن کی انسان دوستی کا نہایت واضح
اور روشن ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ افسانہ میں اُن کا تازہ بتازہ افسانوی شاہکار "قاتل"
اِس خوبصورت حقیقت کی نہایت کامیاب عکاسی کرتا ہے کہ بڑے سے بڑے سیاہ کار
انسان کے دل میں بھی نیکی کی کوئی کرن ضرور پوشیدہ ہوتی ہے اور زندگی کے
کسی نہ کسی لمحے میں یہ کرن لر انسانی عظمت پر مہرِ تصدیق ثبت کر سکتی ہے۔



[illegible] یقیناً اُن اصولوں کی جیت

[illegible] گاندھی اور پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنائے

[illegible] کے لئے سارا دیش قابلِ مبارکباد ہے ——

اس انتخاب سے دیش کے ہر اُس شخص کو خوشی ہوئی

ہے جسے اپنے دیش سے پیار ہے۔ جسے شرافت، تجربے

قابلیت اور دیش بھگتی کی قدر ہے —— ڈاکٹر صاحب

کے انتخاب نے بلاشبہ دنیا میں ہندوستان کو سربلند

کیا ہے اور یہ اُن کی بلند اور جامع شخصیت، شرافت

اخلاق اور سیکولرازم کے حق میں اور رجعت پسندی

کے خلاف دیش کا واضح فتویٰ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے انتخاب کی جانفزا خبر جب مدیر

" بیسویں صدی " نے ریڈیو پر سُنی تو اُن کی آنکھوں میں

بے اختیار خوشی کے آنسو آگئے اور بارگاہِ الٰہی میں ڈاکٹر صاحب

کی درازیٔ عمر کے لئے سر جھک گیا اور فوراً ڈاکٹر صاحب کی

خدمت میں حاضر ہوکر اُن پر خلوص و محبت کے پھول نچھاور

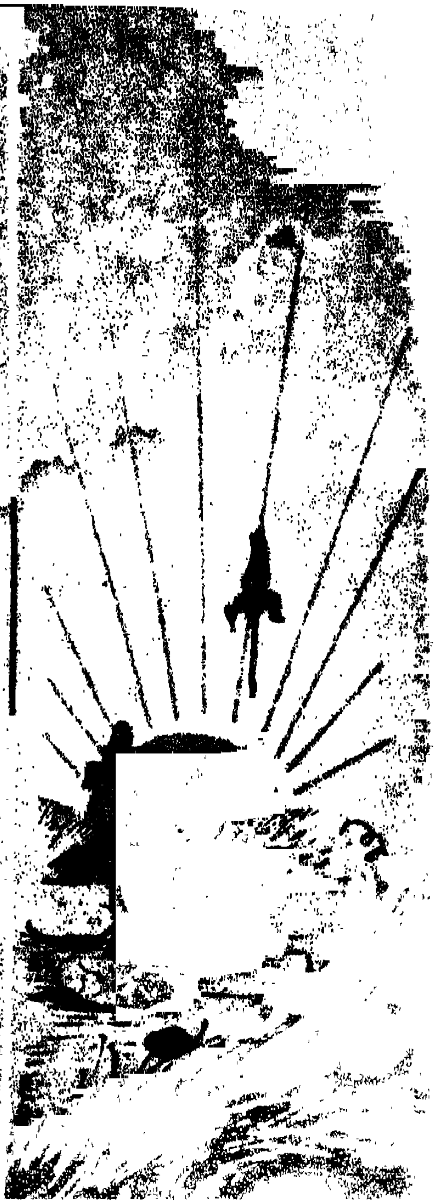
کئے —— ہمارا ایمان ہے کہ ڈاکٹر صاحب بلاشبہ ایک ایسے

دیدہ ور انسان ہیں جن کی ذاتِ گرامی پر علامہ ڈاکٹر اقبال کا

یہ شعر حرف بہ حرف صادق آتا ہے ؎




۱- [illegible] ——— [illegible]
۲- [illegible] ——— [illegible]
۳- [illegible] ——— [illegible]
۴- غزل ——— [illegible]
۵- [illegible] ——— [illegible]
۶- غزل ——— [illegible]
۷- غزل ——— [illegible]
۸- غزل ——— [illegible]
۹- [illegible] ——— [illegible]
۱۰- غزل ——— [illegible]
۱۱- [illegible] ——— [illegible]
۱۲- [illegible] ——— [illegible]
۱۳- [illegible] ——— [illegible]
۱۴- غزل ——— [illegible]
۱۵- [illegible] ——— [illegible]
۱۶- غزل ——— [illegible]
۱۷- [illegible] ——— [illegible]
۱۸- غزل ——— [illegible]
۱۹- مزاح ——— [illegible]

۲۰۔ خد وخال ——— محمود سعیدی ——— [illegible]
۲۱۔ بجھتے دیئے کی لَو ——— بشیشر دیپ۔ ایم۔ ایس۔ سی ——— ۶۹
۲۲۔ غزل ——— ابراحسن گنوری ——— ۷۲
۲۳۔ گنگا سے نیل تک ——— ظفر پیامی۔ ایم۔ اے ——— ۷۳
۲۴۔ غزل ——— پروفیسر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا۔ ایم۔ اے ——— ۸۰
۲۵۔ غزل ——— بیکس رامپوری ——— ۸۰
۲۶۔ ٹھا۔ ٹھا ——— پروفیسر جوگندر پال۔ ایم۔ اے ——— ۸۱
۲۷۔ تحفہ ——— قتیل شفائی ——— ۸۳
۲۸۔ چمکتے سِکّے ——— م۔ ک۔ مہتاب۔ ایم۔ اے ——— ۸۵
۲۹۔ غزل ——— اسما سعیدی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ ——— ۸۷
۳۰۔ طلسم عشق رُبا ——— پروفیسر ظ۔ انور۔ ایم۔ اے ——— ۸۹
۳۱۔ غزل ——— رعنا بیگم۔ بی۔ اے ——— ۹۳
۳۲۔ غزل ——— عائشہ انصاری دلکش بھوپالی ——— ۹۳
۳۳۔ گیلے پتھروں کی مہک ——— نُورشاہ ——— ۹۵
۳۴۔ غزل ——— محسن زیدی۔ ایم۔ اے ——— ۱۰۱
۳۵۔ غزل ——— سیّد یزدانی جالندھری ——— ۱۰۱
۳۶۔ روشنی کا مینار ——— عفت موہانی۔ ایم۔ اے ——— ۱۰۳
۳۷۔ غزل ——— ضیا فتح آبادی۔ ایم۔ اے ——— ۱۰۸
۳۸۔ غزل ——— اخلاق سہسوانی ——— ۱۰۸
۳۹۔ غزل ——— سراج ادیبی۔ ایم۔ اے ——— ۱۰۸
۴۰۔ تصویرِ فریب ——— ظفر عالمگیر۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ سی ——— ۱۰۹




۴۱۔ جگر مرادآبادی سے انٹرویو ــــــــ نریش کمار شاد ــــــــ ۱۱۹
۴۲۔ اُجلی مٹی، نیلا ساحل ــــــــ حسنی رباب ــــــــ ۱۲۲
۴۳۔ خط لکھیں گے ــــــــ فکر تونسوی ــــــــ ۱۲۹
۴۴۔ ایک تارہ بجھا بجھا سا ــــــــ شعیب شمس۔ ایم۔ اے ــــــــ ۱۳۳
۴۵۔ غزل ــــــــ پروفیسر عنوان چشتی۔ ایم۔ اے ــــــــ ۱۳۶
۴۶۔ غزل ــــــــ پریم وار برٹنی ــــــــ ۱۳۷
۴۷۔ غزل ــــــــ شہریار پرواز۔ ایم۔ اے ــــــــ ۱۳۷
۴۸۔ کھنڈر ــــــــ ش۔ نذیر الدین ــــــــ ۱۳۹
۴۹۔ غزل ــــــــ حقی تزئین۔ ایم۔ اے ــــــــ ۱۴۲
۵۰۔ غزل ــــــــ پروفیسر عبدالرب عرفان۔ ایم۔ اے ــــــــ ۱۴۲
۵۱۔ غزل ــــــــ اخگر مشتاق رحیم آبادی ــــــــ ۱۴۲
۵۲۔ قاتل ــــــــ پروفیسر عاصی کرنالی۔ ایم۔ اے ــــــــ ۱۴۳
۵۳۔ غزل ــــــــ پروفیسر بیتاب پیلی بھیتی۔ ایم۔ اے ــــــــ ۱۴۷
۵۴۔ غزل ــــــــ امینہ خاتون عشرت۔ بی۔ اے ــــــــ ۱۴۷
۵۵۔ غزل ــــــــ آزاد گورداسپوری۔ بی۔ اے ــــــــ ۱۴۷
۵۶۔ گھر ہونے تک ــــــــ راز یوسفی ــــــــ ۱۴۹
۵۷۔ غزل ــــــــ کرشن موہن ایم۔ اے ــــــــ ۱۵۱
۵۸۔ صحت و زندگی ــــ کیا نمک مضرِ صحت ہے؟ ــــ خوبصورتی کا راز ــــ اپنے آپ پر مہربان بنئے ــــ
سونگھنے کی پھلیاں، ایک مفید سبزی ــــ کامیابی کا راز ــــ انسان کی سب سے بڑی دولت ــــ
اِملی، ایک مفید چیز ــــ کامیابی کا زینہ، ناکامی ــــ ایک عجیب بات ــــ ۱۵۵
۵۹۔ سرگوشیاں ــــــــ سوال و جواب ــــــــ ۱۵۶

# تیر و نشتر

خوشتر گرامی

"وزیر تعلیم ہریانہ توجہ دیں" ایک عنوان ——— ہریانہ کے وزیروں اور ممبرانِ اسمبلی کو نائٹ اسکولوں میں داخل کرائیے۔

"مرار جی ڈیسائی کا بجٹ شرمناک" ایک عنوان ——— ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔

"اکالیوں میں زبردست پھوٹ" ایک خبر ——— بے موسم نہیں۔ آج کل یہی کا تو میوہ ہے۔

"کئی وزیر اور کانگرسی لیڈر برلا کے ہاتھ کی کٹھ پتلیاں ہیں" ایک عنوان ——— اور ہم اُن کا تماشا دیکھتے ہیں۔

"کانگرسی اور غیر کانگرسی ریاستوں کے درمیان خوراک کے معاملے میں کوئی امتیاز نہیں" ایک عنوان ——— سب غلّے سے پیٹ بھرتے ہیں اور ہاتھ منہ سے کھاتے ہیں۔ کوئی منہ کی بجائے ناک میں لقمہ نہیں دیتا۔

"دکھی دُنیا کی خدمت کا بہترین طریقہ بُدھ کی تعلیمات پر عمل ہے" مرار جی ڈیسائی کی تقریر ——— اور مہاتما بُدھ نے راج گدی کو ٹھکرا دیا تھا۔ وزارت کے پیچھے بھاگنا تو کیا معنی۔

"پاکستان کے لئے چینی ٹینک" ایک عنوان ——— ہم گڑ کے ٹینک تیار کرلیں گے۔

"پنجاب میں شراب کی قیمت کم اور دوکانوں کی تعداد زیادہ کردی جائے گی" ایک خبر ——— گورنام سنگھ وزارت زندہ باد۔ لوگ نہ صرف پئیں پلائیں بلکہ نہائیں دھوئیں اور خوب لنڈھائیں۔



"آئندہ چند برسوں میں ہندستان کی انتہا پسند پارٹیاں ختم ہو جائیں گی" مسز اندرا گاندھی



"ہندوستان میرا وطن ہے اور یہاں کے رہنے والے میرا کنبہ": ڈاکٹر ذاکر حسین

"کسی مسلمان یا عیسائی کا ہندوستان میں اونچے عہدوں پر تقرر خطرناک ہوگا" جن سنگھی اخبارات —— جن سنگھی مسلمان آنکھیں کھولیں۔ جن سنگھ اپنے اصلی روپ میں نظر آرہا ہے۔

"شملہ میں ڈبل روٹی غائب" ایک خبر —— سنگل روٹی کھائیں شملے والے۔

"بوئے کوئی اور کھائے کوئی" ایک عنوان —— آزادی حاصل کی کانگرس نے اور اسے ہڑپ کرنا چاہتا ہے جن سنگھ۔

"تیمور کے خزانے کی تلاش" ایک خبر —— مل جائے تو مسٹر مرار جی ڈیسائی کو لادو تاکہ ہمیں ٹیکسوں سے نجات ملے۔

"راؤ وزارت (ہریانہ) ایک ماہ تک ٹوٹ جائے گی" پنڈت بھگوت دیال کی پیش گوئی —— اچھا تو وزارت سے فراغت پاکر "جیوتش ودیا" کا کام شروع کر دیا ہے۔

"دلّی کے لئے مزید پرائیویٹ بسیں۔ معاملہ طے ہوگیا" ایک عنوان —— پرائیویٹ طور پر طے ہوا ہوگا۔

"پانی پت میں پانی کا کرائسس" ایک خبر —— اسے کہتے ہیں راجہ کے گھر میں موتیوں کا کال۔

"اسکول کی لڑکیوں نے ہیڈ مسٹریس کو گھیر لیا" ایک خبر —— استانی جی سے پیار محبت اور اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار۔

"پنجاب میں غلے کی چور بازاری۔ پڑوسی ریاستوں کو سمگلنگ جاری" ایک خبر —— جس طرح سیاسی لیڈروں کی چور بازاری اور اپوزیشن بینچوں سے سرکاری بینچوں کی طرف سمگلنگ کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔

"مدھیہ پردیش کے بوگس وزیر خوراک کی گرفتاری" ایک خبر ——— بوگس وزارت کے دور میں وزیر بھی بوگس ہی ہوں گے۔

"جموں کے لئے خود مختاری کا مطالبہ" ایک عنوان ——— پنجاب کی تقسیم کا نتیجہ۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔

"امریکہ آگ سے کھیل رہا ہے" ایک عنوان ——— فائر بریگیڈ سروس میں شامل ہوگیا ہوگا۔

"مرادنگر نوٹیفائڈ ایریا کمیٹی پر جن سنگھ قابض" ایک خبر ——— مرادنگر میں جن سنگھ کی مراد بر آئی۔

"بھارت میں اوسط عمر پچاس برس" ایک خبر ——— اس سے سیاستداں مستثنیٰ ہیں۔

"ہریانہ کے لئے الگ گورنر رکھنا عیاشی" ایک عنوان ——— اور جب مقصد زندگی ہی یہ ہو تو

"عیش کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں"

"جن سنگھ بدنام ہو جائے گا" ایک عنوان ——— کوئی ہرج نہیں ہے

بدنام اگر ہوگا تو کیا نام نہ ہوگا

"ڈاک بابو شکنجے میں" ایک خبر ——— کیا کرے بیچارہ جب سے اس کو مکان نہ ملے۔

"اردو سرکاری زبان نہیں بن سکتی" یو۔ پی کے جن سنگھی وزیر کا مرادآباد میں بیان ——— جی نہیں سنسکرت کو بنایئے جسے دیوتا ہی سمجھتے ہیں۔



یو۔پی میں بھی گھیراؤ۔ وزیر اعلیٰ یو۔پی مسٹر چرن سنگھ کو زنانہ ملازمین نے گھیر



بجٹ میں نئے ٹیکس

" دلی میں بھوک اور لو سے ایک موت " ایک خبر ——— بھوک میں لو کھانے کا نتیجہ۔

" سالانہ بجٹ " ایک عنوان ——— عوام کی جیب کاٹنے کا مہذب طریقہ۔

" شراب پینے والوں کے لئے خوشخبری " ایک عنوان ——— کرمہاتما گاندھی کے نام لیواؤں۔ نے کئی جگہ نشہ بندی ختم کر دینے کا اعلان کر دیا ہے۔

" اقتدار چھن جانے کا ملال نہیں " گیانی ذیل سنگھ ——— اس لئے کہ وہ ذرا سی قلابازی کھانے پر مل جاتا ہے

" بھارت نے ساڑھے تین کروڑ کے غیر ملکی قرضے استعمال ہی نہیں کئے " ایک عنوان ——— اور سود ادا ہوتا رہا۔ دیکھئے ہماری فراخ دلی۔

" چرن سنگھ کے انتخابی نعروں کی حقیقت " ایک عنوان ——— پنجاب، یو۔پی اور بہار میں کھل گئی۔ جہاں اپنے دشمن نمبر ۱ کمیونسٹوں سے مل کر وزارتیں بنائیں اور کابینہ میں ان کے دوش بدوش بیٹھے ہیں۔

" ماسٹر تارا سنگھ کا نیا سنت " ایک عنوان ——— پہلے والوں سے زیادہ پھسپھسا نکلے گا۔

" ہریانہ میں انسپکٹری راج کے کرشمے " ایک عنوان ——— بنتے عزت کا دعویٰ کراؤگے میاں۔ وہاں راؤ راج ہے۔

" فلم ایکٹرس گرفتار " ایک خبر ——— فلم کا شوٹنگ ہو رہا ہوگا۔

" لکھنؤ کی سترہ سالہ لڑکی نیتر مرزا مقابلۂ حسن میں مس انڈیا منتخب ہوئی " ایک خبر ——— یہ خبر سننے سے پہلے زمین پھٹ گئی ہوتی اور آسمان ٹوٹ پڑا ہوتا۔

# ڈاکٹر ذاکر حسین

خوشتر گرامی

گاندھی جی کی اصول پسندی، جواہر لال کی انسان دوستی،
ابوالکلام آزاد کی استقامت، شیخ الہند کی ایمان پروری، ڈاکٹر انصاری
کی حب الوطنی، محمد علی جوہر کا عزم، حکیم اجمل خاں کی بلند نگاہی
ـــــــــ اِن سب سے مِل کر بنے ہیں ہمارے

[illegible]



ایک معمولی اُستاد سے صدرِ جمہوریہ ہند کی منزل تک ـــ
مسلسل جہد و عمل کا ایک شاندار پیکر۔ یو۔پی اور حیدرآباد کی
تہذیب و ثقافت کا نمونہ اور جیسے خدا عزت دے کی عالمگیر
سچائی کا مظہر ہیں ـــــــ ۴۰ سال قبل گاندھی جی کی آواز پر
جوانی کو تپ اور تیاگ کی قربان گاہ پر نچھاور کرنے والا نوجوان
ذاکر حسین جب ترکِ موالات کی تحریک میں کالج سے نکلا
تو کون جانتا تھا کہ وہ امیرِ جامعہ ملیہ، وائس چانسلر مسلم
یونیورسٹی، گورنر بہار، نائب صدر جمہوریہ ہند بنے گا
اور پھر بے لوث خدمت کا صلہ ہندوستان کے سب سے
اونچے عہدے پر سرفراز ہونے کی صورت میں پائے گا ـــــــ
محبت، اخلاق، انسانیت، شرافت، رواداری اور وضعداری،
عزم و ہمت، انسان دوستی، وطن پروری کتنے اوصاف اِس
ایک شخص میں جمع ہو گئے ہیں اور وہ آج بھی سراپا عجز و نیاز
اپنے آپ کو ایک معمولی اُستاد ہی کہتا اور سمجھتا ہے ؎

[illegible]

افسانہ

# گوری چِٹّی دھوپ

کشمیری لال ذاکر۔ ایم۔ اے

۲۲۔سیکٹر ۱۰، چنڈی گڑھ

۲۴ر اپریل ۱۹۶۷ء          برادرِ محترم! تسلیم

. . . یہ تو آپ کی فراخ دلی ہے کہ آپ نے اپنے خط میں یوں لکھ دیا کہ اس مرتبہ "بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر میرے افسانے کے بغیر ہرگز ہرگز شائع نہ ہوگا! ورنہ ——

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ سے مجھے اِتنا احترام اور خلوص ملتا ہے۔ بھائی جان اِس دور میں خلوص کے بندے ہیں ہی کتنے؟ —— لیجئے ارشاد کی تعمیل میں افسانہ نمبر کے لئے ایک بہت پیاری سی کہانی بھیج رہا ہوں۔ کردار بھی اتنا ہی نازک ہے جتنا کہانی کا عنوان۔ خدا کرے آپ کو پسند آئے —— "ذاکر کی تین کہانیاں" پر مجھے یونین ٹیری ٹری چنڈی گڑھ نے ایوارڈ دیا ہے۔ کتاب کا انتساب آپ ہی کے نام ہے اِس لئے آپ کو یقیناً مجھ سے زیادہ خوشی ہوگی . . .

نیاز کیش —— ——

میں نے پہلی بار اُسے مقامی کالج کے ڈیکلیمیشن کونٹیسٹ میں دیکھا۔ وہ اپنے کالج کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اُس کا ساتھی، اُسی کالج کا ایک لڑکا اُس سے پہلے تقریر کر چکا تھا۔ پھر اُس کا نام پکارا گیا، گیتا کوشک! اور ایک بہت نازک سی، دُبلی پتلی گوری سی لڑکی، سفید ساڑی پہنے، بے حد متوازن چال سے ہال کے ایک کونے سے اُٹھ کر ڈائس پر آگئی۔ جب اُس نے ابتدائی فقروں کے بعد پریذیڈنٹ سر! کہنے کے ساتھ اپنا چہرہ صدر کی طرف گھمایا تو اُس کی پتلی سی ناک میں پڑے لونگ کی سفید کنی جگمگا اُٹھی جیسے نُور کی ایک شعاع اچانک پھوٹ نکلی ہو۔ کالج کے اُس نیم اندھیرے ہال میں کہیں سے سورج کی ایک کرن آگئی تھی۔ دبے پاؤں، خاموشی سے! اور پھر وہ ایک کرن گیتا کی شخصیت میں رچنے لگی اور جب گیتا بولتے بولتے اپنے آپ میں گم ہو گئی اور جوش و حوصلہ سے اُس کا چہرہ سُرخ ہونے لگا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہال کی اُس کچھ کچھ اندھیری فضا میں کھلی سی روشن اور بہت کی سی شفاف دھوپ پھیل گئی تھی اور ہال میں بیٹھا ہر شخص اس کی حرارت سے راحت محسوس کرنے لگا تھا۔

میں کونے میں لگی اُن تین کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا جو ججوں کے لئے مخصوص تھیں۔ میرے دائیں پہلو میں مِس اوبرائے تھیں اور بائیں پہلو میں ڈاکٹر مدھوسودن۔ مِس اوبرائے اُس کالج کی اولڈ سٹوڈنٹ تھیں، ورالہ آباد سے صرف اِس سالانہ تقریب میں شرکت کرنے کے لئے مدعو کی گئی تھیں۔ ڈاکٹر مدھوسودن یہاں کے سول سرجن تھے اور ادب میں دلچسپی رکھتے تھے۔ میں یہاں کا ایک ایڈووکیٹ ہوں اور بہت سی سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہوں۔ کسی زمانے میں دس بیس غزلیں بھی کہی تھیں، جن کی کمائی اب تک کھا رہا ہوں۔ لیکن میرے پروفیشن نے مجھے ادب سے بالکل الگ نہیں کر دیا۔ لکھنے کا تو نہیں لیکن پڑھنے کا شوق اب بھی ہے۔ مِس اوبرائے بہت سنکوچ سے بیٹھی تھیں اِس لئے بات چیت صرف ڈاکٹر مدھوسودن ہی سے ہوتی تھی۔ لیکن جب گیتا اپنی تقریر ختم کر کے ڈائس سے اُتری تو تالیوں کی گونج میں مِس اوبرائے کی آواز اُبھری ——

"یو آر ایکسی لینٹ سپیچ" وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔

"ویری نائس!" میں نے جواب دیا۔

مس اوبرائے پھر اپنے خول میں ڈبک گئیں اور میری نگاہیں دھوپ کے اس ٹکڑے کا تعاقب کرتی رہیں جو ایکدم ٹوٹ کر گر گیا تھا اور کالج کا عالی شان ہال نیم اندھیرا ہال بن گیا تھا۔ ججوں کا فیصلہ سنانے کے لئے مجھے ہی ڈائس پر جانا پڑا۔ مقامی کالج کی مس گیتا کوشک اوّل تھی لیکن اسے انعام نہیں ملنا تھا کیونکہ مقامی کالج کی ٹیم انعامی شیلڈ حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ شیلڈ باہر سے آئی ہوئی ایک ٹیم کو ملی اور جب میں فیصلے کا اعلان کر کے ڈائس سے نیچے اترا تو تالیوں کا نغمہ ایک خاص لے سے گونجے جا رہا تھا اور گیتا سامنے بیٹھی اپنی معصوم اور کھلی مسکراہٹ کی دھوپ پھیلا رہی تھی اور سارا ماحول اس گوری چٹی دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔

اور پھر گروپ فوٹو ہوا۔

مس اوبرائے، ڈاکٹر مدھوسودن اور میں پرنسپل کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے اور ہمارے پیچھے کونٹیسٹ میں حصہ لینے والے لڑکے اور لڑکیاں! اور محض اتفاق کی بات تھی کہ گیتا کوشک میری کرسی کی بیک پر کھڑی تھی اور میں نے جب پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی اور اس کے ناک کے لونگ کی سفید کنی دھوپ کے کسی ٹکڑے سے ٹکرا کر آفتاب بن گئی! تصویر اتر گئی اور ہم سب چائے کی میزوں کے گرد کھڑے ہو گئے۔ گیتا نے چائے کی تین پیالیاں بنائیں۔ ایک مس اوبرائے کو دوسری ڈاکٹر مدھوسودن کو اور تیسری مجھے اونر کی۔

"شکریہ!" میں نے پیالی لیتے ہوئے کہا۔

"دیٹ از آل رائٹ سر!" گیتا نے جواب دیا۔

"یہ سر کیوں؟ اب تو میں جج نہیں ہوں"

وہ مسکرائی اور اس کے جسم کی پتلی سی چمک دوہری ہو گئی۔

"کوئی غزل سنائیے!" اس نے فرمائش کی۔

"اب تو گواہوں پر جرح کیا کرتا ہوں۔ غزلیں تو بھول بھال گئیں۔"

"میرے ڈیڈی تو آپ کی بہت تعریف کیا کرتے ہیں۔"

"کیا نام ہے تمھارے ڈیڈی کا؟"

"مسٹر ہری پرشاد کوشک، ایس۔ ڈی۔ او۔"

"آئی سی! تم ان کی لڑکی ہو؟"

"جی!"

میں نے قریب ہو کر اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور دل ہی دل میں دعا دی، اے خدا اس اُجلی دھوپ کو کبھی کوئی سایہ اپنے کرخت ہاتھوں سے مسلنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ دھوپ دوپہر میں بدلے اور زندگی کی تمام تر رعنائیاں اس میں سما جائیں!"

"جیتی رہو!"

"تھینک یو انکل!"

اس کا انکل کہہ کر مخاطب کرنا مجھے اچھا معلوم ہوا۔ میری اپنی کوئی بیٹی نہیں۔ سنجیدہ اور خوبصورت لڑکیاں بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں اور میں ہر ایسی لڑکی کو دیکھ کر محسوس کرتا ہوں کہ کہیں کسی شہر یا گاؤں میں ایک چھوٹا سا گھر زندگی میں خوبصورتی لائے گا۔ ایک چھوٹا سا کنبہ ہندوستان کی آبادی میں خوبصورت اضافہ بنے گا۔ ایک آنگن میں خوبصورت مہذب بچے کھیلیں گے۔ ایک مرد خوشحال اور مطمئن زندگی بسر کرے گا۔ کہیں کسی چھت پر چاند اپنی چاندنی بکھیرے گا اور ستارے اپنی روشنی لٹائیں گے اور دیواروں کے اندر قہقہے گونجیں گے اور مسرت کے پھول مسکرائیں گے۔ میں کسی بھی جگہ کسی پیاری سی لڑکی کو دیکھتا ہوں تو مجھے نہ جانے کیسے سکون اور اطمینان کی بے پناہ دولت مل جاتی ہے۔ میں ذہنی طور پر ایکدم بہت متاثر ہو جاتا ہوں۔

"میری آٹوگراف بک پر کچھ لکھ دیجئے نا!" گیتا نے اپنی آٹوگراف بک میرے سامنے کر دی۔

مجھے محسوس ہوا جیسے اس نے اپنی معصوم زندگی کا سفید شفاف بے داغ ورق میرے سامنے رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا اس ورق پر کیا لکھوں؟ اس ان کہی کہانی پر کون سا عنوان درج کروں؟ ایک لمحہ میں بجلی کی تیزی کے ساتھ کئی خیالات آئے، کئی جملے سوجھے۔ ایک آدھ شعر بھی یاد آ گیا لیکن جب میں اس کھلی کتاب پر لکھنے لگا تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس پر اس طرح مرکوز ہو گئیں کہ میں جو کچھ لکھنا چاہتا تھا سب بھول گیا۔ میں نے قلم روک لیا۔

"آپ نے قلم روک کیوں دیا؟"

اس کی ہمت اور حوصلہ بھری آنکھیں میرے سامنے کھلی تھیں اور اس کے صحت مند چہرے کی دھوپ میرے سامنے پھیل گئی تھی۔

"سوچ رہا ہوں کیا لکھوں؟"

"میرے لئے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا آپ کو؟"

اس نے انجانے ہی میں میرے دل کی کیفیت بیان کر دی تھی۔ میں خاموش رہا اور کھلے صفحے پر آپ سے آپ ایک شعر کی پرچھائیں پھیل گئی ہے۔

گوری چٹی دھوپ نہ جو بن پہ اترائے

دن کے پیچھے کالی کالی رات لگی ہے

پیا گھر ڈالا میں نے۔ گیتا اُردو نہیں جانتی تھی۔ وہ اُسے پڑھ نہ سکی۔ لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے اُس نے بہت بڑا جرم کیا ہو! میری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے میرا سنگی پن ایک بار پھر اپنی گرفت میں لے کر مجھے پکڑے دے رہا تھا۔ میں نے قلم جیب میں رکھ لیا اور آٹوگراف بک گیتا کو لوٹا دی۔

"ویری ویری تھینکس انکل!" جوش سے آٹوگراف بک لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور اُسی لمحہ بالوں کی ایک لٹ جیسے کچھ تنگ ہو کر اُس کے ماتھے پر جھول گئی۔ اور نہ جانے کیوں میں نے جیب سے قلم نکال کر آٹوگراف بک پہ لکھے ہوئے شعر کو کاٹ دیا۔ وہ بہت جھنجھلائی ہوئی اور حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف تک رہی تھی۔ اور میں قلم کی نب پر توڑ دینے کی حد تک زور ڈالتے ہوئے شعر کے ایک ایک لفظ کو کاٹ رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں۔"

"کیا آپ ناراض ہو گئے ہیں مجھ سے؟"

"تم سے تو خدا بھی ناراض نہیں ہو سکتا گیتا! میری کیا مجال ہے!"

میں نے جواب دیا۔

گیتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے اپنی آٹوگراف بک واپس لے لی اور مجھے محسوس ہوا اُس کے چہرے پر پھیلی دھوپ ایکدم مدھم ہو گئی تھی۔ اُس کی ناک میں پڑی لونگ کا آفتاب گہنا گیا تھا۔ اُس کے ماتھے پر جھولتی ہوئی لٹ کی پرچھائیں گہری ہو گئی تھی اور پھر فوراً ہی وہ چلی گئی اور آنگن میں پھیلی ہوئی دھوپ دیواروں پر سے سرکتی ہوئی غائب ہو گئی۔

---

دوسری بار میں نے گیتا کو سنیما ہال کی باہر والی گیلری میں دیکھا۔ میں انگریزی فلم کا میٹنی دیکھنے گیا تھا اور دیواروں پر شیشوں کے اندر جڑے ہوئے سٹیلز دیکھ رہا تھا۔ اُس طرف سے لڑکیوں کا ایک مختصر سا گروپ آ رہا تھا۔ میری نظریں شیشوں کے اندر چمکتی تصویروں سے ہٹ کر اُس گروپ پر جم گئیں۔ کسی بڑی عمر کے آدمی کا جوان لڑکیوں کو اِس طرح گھورنا معیوب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر ایک تسکین سی ہوتی ہے۔ اِس کا باعث شاید وہی ہو جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں یا شاید اِس میں رنگین مزاجی کو دخل ہو یا شاید یہ میری ہوس کوشی ہی کا کوئی روپ ہو۔ اِس کا تجزیہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن خوبصورتی کا میری داخلی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یہی چیز ہے کہ ابھی میں دور کی چیزوں کو دیکھنے کے لئے عینک استعمال نہیں کرتا۔ صرف رات کو اخبار یا باریک چھاپے کی کتاب پڑھتے وقت عینک کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ورنہ عینک لگا کر خوبصورت لڑکیوں کو دیکھنا تو ایسے ہے جیسے بائی ناکولرز لگا کر ریس کورس میں گھوڑوں کو دوڑتے ہوئے دیکھا جائے۔ ویسے اب ہم میں اور ریس کورس میں دوڑتے ہوئے گھوڑوں میں فرق ہی کیا رہ گیا ہے۔ زندگی کے اِتنے بڑے ریس کورس میں لوگ بائی ناکولرز لگائے کھڑے ہیں۔ چیخ رہے ہیں۔ پورے گلے سے شور مچا رہے ہیں، ذہنی تناؤ سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن پھر بھی داؤ لگائے جا رہے ہیں!

ایک پُر زور قہقہہ گونجا تو محسوس ہوا ماحول میں کچھ لہریں سی بکھر گئی ہیں۔ اِدھر اُدھر کچھ چھینٹے سے اُڑے ہیں۔ میرے اپنے کپڑے بھی تو بھیگ گئے تھے قہقہوں کی اُس بوچھاڑ میں گیتا کے چہرے کی دھوپ اور بھی نکھر گئی اور سنیما ہال کی گیلری جیسے دھوپ اور برکھا کے امتزاج سے گنگا جمنی ہو گئی۔

"نمستے انکل!"

میں بھونچکا سا اُسے دیکھنے لگا۔

"جیتی رہو!"

اُس کے ساتھ کی لڑکیاں ہنس پڑیں۔ وہ آدمی جو ابھی کچھ لمحے پہلے انہیں بدی نظروں سے گھور رہا تھا اب دعائیں دے رہا تھا۔ پاکھنڈی کہیں کا! مجھے محسوس ہوا جیسے وہ میری دوغلی پر ہنس رہی تھیں۔

"آپ اچھے تو ہیں انکل؟"

"شکریہ!"

ایک لڑکی گیتا کو کہنی سے پکڑ کر آگے دھکیل رہی تھی۔

"پکچر دیکھیں گے یا صرف سٹلز ہی؟"

سب ہنس پڑیں۔

"میں تو ویسے ہی اِدھر آ گیا تھا۔" میں نے ایکدم جھوٹ بولا تھا۔ ٹکٹ میرے پاس تھا جو میں نے کل ہی اپنے منشی کو بھیج کر منگوا لیا تھا۔ میری بیوی دو ایک دنوں کے لئے باہر چلی گئی تھی اور میں گھر میں اکیلا تھا۔ اِس لئے پکچر کا پروگرام بنا لیا تھا۔ سوچا تھا دوپہر کٹ جائے گی اور پھر شام کو اپنے کیسز دیکھ لوں گا۔

"انکل بہت اچھی پکچر ہے یہ! فیلڈنگ کا ناول ٹام جونز تو بہت ہی مشہور ناول ہے!"

"ہاں۔ لیکن آج موڈ نہیں۔"

"اچھا بائی بائی کبھی گھر آیئے نا انکل۔" اُس نے ہال کے انٹرنس کی طرف بڑھتے ہوئے فقرے کا آخری حصہ ادا کیا۔

آوں گا کبھی! اب حسن و شباب کا وہ ریلہ آگے نکل گیا اور کناروں پر کھڑے لوگ چھینٹوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

میں پکچر ہال میں جانے کے بجائے گھر واپس آ گیا۔ کتابوں کی الماری سے تمام چیزیں نکال کر پڑھتا رہا اور سنیما کا سبز رنگ کا ٹکٹ اسی میں رکھ کر سو گیا۔ طبیعت میں بے حد اضمحلال اور تھکن تھی۔ اس رات میں اپنے کیسز بھی اچھی طرح سے تیار نہ کر سکا۔ گیتا کے شگفتہ، معصوم اور پاکیزہ چہرے کی دھوپ بار بار میرے سامنے بکھیں جاتی۔ سونے سے پہلے میں نے ایک ایسی لڑکی کے لئے جس سے میرا کوئی رشتہ نہ تھا۔ جو عمر میں بیٹی کے برابر تھی جس کے ساتھ میں کوئی بھی رشتہ قائم نہ کر سکتا تھا۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے دعا کی، اس کی عمر کے لئے۔ اس کے سُکھ کے لئے اور اس کی خوشی کے لئے !!

اگلی صبح میں بے حد خوش تھا۔

پھر کئی مہینوں تک گیتا نظر نہ آئی۔

آخری بار اس سے اس شام ملاقات ہوئی جب اس کے پتا ہر پرشاد کوشک کا ٹرانسفر ہوا تھا اور کلب میں پارٹی تھی۔ کلب میں جب کبھی کوئی پارٹی ہو خاصہ ہنگامہ ہوتا ہے اور دیر تک رونق رہتی ہے۔ جب پارٹی ختم ہو جاتی ہے تو برج اور رمی کے رسیا گئی رات تک بیٹھے رہتے ہیں۔ اپنے اپنے گلاسوں سے ہلکے ہلکے سپ لیتے ہوئے سگریٹ پھونکتے رہتے ہیں اور ہار جیت کا حساب کتاب کرتے رہتے ہیں۔ اس پارٹی میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

اس دن گیتا نے سیفؔ کی ایک بہت پیاری سی غزل گائی تھی ؎

ابھی نہ جاؤ کہ تاروں کا دل دھڑکتا ہے
تمام رات پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
پھر اس کے بعد کبھی ہم نہ تم کو روکیں گے
یہ فیصلے کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

محسوس ہوا تھا جیسے اُسے اپنی دوست لڑکیوں کو، شہر کی گلیوں اور سڑکوں کو چھوڑتے ہوئے بہت دُکھ ہو رہا تھا۔ وہ بے حد اُداس تھی اور اس کی آواز میں جیسے اس کا غم سُلگ رہا تھا۔ میں نے اس تپش کو محسوس کیا اور سوچا انسان کو اپنے سمبندھ، اپنے لگاؤ، اپنے تعلقات توڑتے ہوئے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

تعلقات جب بنتے ہیں تو خبر بھی نہیں ہوتی بس آپ ہی آپ بن جاتے ہیں اور ان میں ایک مضبوطی اور گہرائی آ جاتی ہے لیکن جب ٹوٹتے ہیں تو آنکھیں ویران ہو جاتی ہیں اور دل کے آنگن سُونے ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں جیسے سمبندھوں کی ایک ایک کرچی اِدھر اُدھر بکھر گئی ہو اور جہاں پاؤں پڑے وہیں تیز سی کرچیں چُبھ کر لہولہان کر ڈالے۔ بس ایسی ہی کیفیت گیتا کی تھی۔ اس کی سہیلیاں ایک طرف کھڑی سُبک رہی تھیں اور پھر ان سسکیوں میں گیتا کا اپنا غم بھی شامل ہو گیا تھا۔

"آپ کی بیٹی بہت بڑی آرٹسٹ بنے گی کوشک صاحب"

میری یہ بات سُن کر کوشک صاحب بولے۔

"میں نے بڑی لگن سے پرورش کی ہے گیتا کی۔ مجھے اس پر فخر ہے"

"بھگوان کرے آپ کا یہ فخر قائم دائم رہے"

اور اسی لمحہ گیتا اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہمارے پاس آ گئی۔

"انکل! آپ نے آج بھی غزل نہیں سُنائی!"

"میرے پاس تمہاری جیسی آواز نہیں بیٹے! ہم تو بس [illegible] ہی گا سکتے ہیں، یہاں نہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے وہ آٹوگراف والا صفحہ اب تک سنبھال کر رکھا ہے"

اس نے جس شکایت بھرے لہجے میں یہ بات کہی اس سے ظاہر تھا کہ گیتا نے اب تک مجھے معاف نہیں کیا تھا۔ کاش وہ جانتی کہ میں نے اس کی خوشی ہی کے لئے اُسے ناراض کیا تھا۔

"تمہارا انکل ایسا ہی ہے۔ چلو کسی بہانے یاد تو کرو گی"

"یاد تو کروں گی ہی"

"اب ہم تمہاری شادی میں غزل سُنائیں گے"

"پھر تو آپ سُنا چکے غزل۔ ابھی دس بیس برس تک اس کی اُمید نہیں اور جب تک ——"

"اور جب تک شاید یہ محفل ہی اُٹھ جائے!"

"انکل تو اونٹ ہی ہیں۔ ارے یہ کیا کہہ دیا میں نے" اس نے [illegible] ڈرتے ہوئے کہا۔

"گیتا! تم جو منہ میں آئے کہہ ڈالتی ہو" کوشک صاحب نے ڈانٹ سا دیا۔

"آئی ایم سو سوری انکل!" گیتا میرے قریب آ گئی اور میں نے نہ جانے کیوں اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

"تم ہمیشہ سُکھی رہو۔ زندگی کا کوئی بھی [illegible]"

گیتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے [illegible] لگا لیا۔

اس رات میں نے پہلی بار اس تصویر کو غور سے دیکھا جو [illegible] ڈیکلیمیشن کونٹیسٹ میں کھینچی گئی تھی اور جس میں گیتا میری کرسی کی پشت پر

کھڑی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے گیتا اپنی معصومیت کی ساری پاکیزگی مجھ پر انڈیل رہی ہو۔ میں نے تصویر پر جمی گرد کو اپنے رومال سے پونچھ ڈالا۔

اور آج جب میں نے گیتا کو دیکھا ہے تو ہمارے درمیان لمحات کی گردنے ایک بہت اونچی دیوار کھڑی کر ڈالی ہے۔

میں ہائی کورٹ میں ایک کیس کے سلسلے میں چنڈی گڑھ آیا تھا۔ دو دن بے حد مصروف رہا۔ آج شام تھوڑی دیر کے لئے اِس چھوٹے سے ریستوران میں آگیا ہوں۔ یہ ریستوران نہ جانے مجھے کیوں اچھا لگتا ہے۔ میں جب بھی آتا ہوں کونے میں لگی آخری ہی میز پر بیٹھتا ہوں۔ آج بھی وہیں بیٹھا ہوں۔ یہ گوشہ اندھیرا سا ہے۔ یہاں بہت کم لوگ بیٹھتے ہیں۔ وہ جو دوسروں کی نظروں سے دور بیٹھنا چاہیں یا وہ جو ہنگامے سے یکدم کٹ کر اپنی ہی دُنیا میں سمٹ کر غافل ہونے کی کوشش کریں۔ میں کافی کی پیالی سامنے رکھے سگریٹ پی رہا ہوں۔ تنہا رہنے کی خواہش کے باوجود جب بھی ریستوران کا دروازہ کھلتا ہے نظریں ضرور اُدھر اُٹھ جاتی ہیں۔ کبھی جی خوش ہو جاتا ہے، کبھی جذبات سپاٹ رہتے ہیں اور کبھی طبیعت جھنجھلا اُٹھتی ہے۔ یہ اندر آنے والوں کی شخصیت کے مختلف ردِعمل ہیں

ریستوران میں بیٹھے کچھ لوگوں کا جائزہ لے رہا ہوں۔

درمیان کی بڑی سی میز کے گرد کچھ الٹرا ماڈرن قسم کی لڑکیاں بیٹھی ہیں غالباً یونیورسٹی سٹوڈینٹس ہیں۔ بفرڈ ہیرز، سیلولیس بلاوز، ٹائٹ جینز۔ ہر بات میں بناوٹ، ہر انداز میں تصنع۔ اتنے زور سے قہقہے لگاتی ہیں کہ سب اُن کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

اور اِس میز کے بالکل سامنے والی میز پر کچھ لڑکے بیٹھے ہیں۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہے ہیں۔ حرکات اِتنی غیر متوازن ہیں جیسے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بھی ٹوسٹ کر رہے ہوں۔ اُن کی خواہش ہے کہ وہ سب کی نظروں کا مرکز بنے رہیں۔

یہ دونوں میزیں ہمارے نظام کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ نئی نسل کی قدروں کی، نظریات کی، رجحانات اور آدرشوں کی۔ یہ دونوں میزیں گویا دو الگ الگ جزیرے ہیں، دو الگ الگ دُنیائیں ہیں، دو الگ الگ آسمان ہیں، دو الگ الگ زمینیں ہیں۔

اور ان سے پرے آج کے سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ سیاسی پارٹیوں کے نمائندے بیٹھے ہیں۔ جنھیں جنتا کی دگرگوں حالت کا بے حد افسوس ہے۔ جنھیں مہنگائی سے پریشانی ہے۔ جنھیں چھوٹے موٹے بہت سے غم ہیں۔ لیکن اِن سب غموں پر اُن کا اپنا غم محیط ہے۔ اور یہ چند اشخاص ہزاروں انسانوں کے ترجمان ہیں۔ جو بالکل بے غرض ہو کر سب کچھ دیکھ رہے ہیں جیسے وہ مصنوعی سیارے ہوں جنھیں امریکہ اور روس نے آسمانی خلاؤں میں گردش کرنے کو چھوڑ دیا ہو لیکن جنھیں دھرتی کی مخلوق سے کوئی لگاؤ نہیں۔

کچھ لوگ اُٹھ کر جا رہے ہیں۔ کچھ آ رہے ہیں۔ میں اِس اندھیرے کونے میں بیٹھا اپنی ٹھنڈی ہوتی ہوئی کافی کو دیکھے جا رہا ہوں۔ میری قنوطیت کچھ دنوں سے پھر مجھے اپنی گرفت میں لئے جا رہی ہے۔ میں نہ جانے کیوں قنوطی ہوتا جا رہا ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے، اِس ریس کورس میں سبھی گھوڑے دوڑ چکے ہیں۔ اب یہ گھوڑے پھر نہ دوڑیں گے۔ جب تک نئے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سُنائی نہیں دیتی۔ اِس ریس کورس میں پُرانے گھوڑوں کی لید پڑی سڑتی رہے گی اور فضا میں تعفن پھیلاتی رہے گی۔

میں نے یخ ہو چکی کافی کی ساری پیالی ایک ہی گھونٹ میں ختم کر ڈالی ہے۔ میری میز کا ویٹر بھی میری طرف توجہ نہیں دے رہا ہے۔ اُس کا دھیان دوسری دو میزوں پر ہے، جہاں ابھی ابھی ایک لڑکا اور لڑکی آکر بیٹھے ہیں اور جہاں ایک فوجی افسر اپنے ایک دوست کے ساتھ خوش گپیاں کر رہا ہے۔ میں اپنی کم مائیگی پر جھنجھلا رہا ہوں۔ حالانکہ میری جیب میں اِس وقت بھی ہزار سے زیادہ روپوں کے نوٹ پڑے ہیں۔ لیکن اِس سے کیا ہوتا ہے۔ اِس کا احساس تو کسی جیب کترے ہی کو ہو سکتا ہے۔ ویٹر کو تو شاید مجھ سے کسی خاص ٹپ کی بھی اُمید نہیں۔ میں نے ایک اور سگریٹ سُلگا لیا ہے اور ویٹر کا انتظار کر رہا ہوں جو بڑی نخوت سے بل کو اپنی رنگ دار پیٹی کے اندر اُڑسے ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے کی بھی فراخ دلی نہیں کرتا۔

عجیب بیزاری سی محسوس ہو رہی ہے۔

ریستوران کا دروازہ پھر کھلا ہے۔ پھر کوئی اندر آ رہا ہے۔

ایک بہت ہی بے ہنگم سا آدمی ہے۔ توند نکلی ہوئی۔ گہرا گندمی رنگ، کھچڑی ہوتے ہوئے بال۔ لیکن بے حد نفیس سُوٹ اور اُس کے پیچھے ایک خوبصورت سرو قامت لڑکی جو رشتے میں اُس کی بیٹی ہونی چاہئے۔ لیکن ہوٹلوں اور ریستورانوں میں بھلا کون کسی کا رشتہ جان سکتا ہے۔ وہ ایک خالی میز چُن کر بیٹھ گئے ہیں۔ اُن کی کرسیاں اِس طرح کا زاویہ بناتی ہیں، جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں سے دونوں کو اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ اُس آدمی کو تو میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن جس طبقے سے اُس کا تعلق ہے اُسے میں پہچانتا ہوں۔ اُس طبقے کے سبھی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سب کا نقشہ ایک سا ہوتا ہے۔ کہیں ایک آدھ میں رنگ کا فرق پڑ جائے تو دوسری بات ہے۔ وہی توند، وہی سیاہ رنگ، وہی پیلے دانت، وہی

اُٹھے ہوئے بال۔ ایکسپرٹ فورسے سالے طبقے کے خدوخال معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس لڑکی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے اور یہ لڑکی جو اُس کی بیٹی بھی ہو سکتی ہے، بہن بھی، بیوی بھی، ماں بھی۔ کیونکہ اِن سب کی حیثیت ایک عورت کی ہے۔ عورت جو ایک ہی وقت میں کئی فرائض سرانجام دے سکتی ہے۔ اِس لڑکی کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ لیکن یاد نہیں آرہا ہے کہاں دیکھا ہے۔ ویٹر بل کی رقم لے کر کاؤنٹر تک گیا ہے۔ میں اِس لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں جب کسی بھولے ہوئے نام یا بھولی ہوئی صورت کو اپنے ذہن میں اُبھارنے کی کوشش کرتا ہوں تو آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اِس کا سوچنے سے کیا تعلق ہے یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے آنکھیں بند کرکے سوچنے میں آسانی رہتی ہے۔ اِس سے سوچ کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ جب ویٹر نے کاؤنٹر سے واپس آکر چینی کی پلیٹ، جس میں کچھ ریزگاری اور باقی رقم پڑی تھی، میز پر رکھی تو میں نے آنکھیں کھولیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں چنڈی گڑھ کے ایک چھوٹے سے خوبصورت ریستوران میں نہیں، اپنے شہر کے گرلز کالج کے ہال میں بیٹھا ہوں اور میرے سامنے ایک گوری سی، دُبلی پتلی لڑکی تقریر کر رہی ہے اور اُس کی ناک میں پڑی لونگ کی کنی آفتاب بن کر چمک اُٹھی ہے۔

"گیتا کوشک!" میں زیرِ لب بڑبڑایا۔

"کیا سر؟" ویٹر پوچھ رہا ہے۔

"اوہ، کچھ نہیں۔" میں نے پلیٹ سے نوٹ اُٹھا لئے ہیں اور ریزگاری پلیٹ ہی میں چھوڑ دی ہے۔ ویٹر نے جھک کر سلام کیا ہے اور مُسکرایا ہے اور ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا ہے۔

اور اب میں اُس خوبصورت لڑکی کی نظروں سے بچ کر ریستوران سے باہر نکل جانا چاہتا ہوں لیکن جاتے ہوئے مجھے اُس میز کے پاس سے ہو کر گزرنا پڑے گا جہاں ایک خاص طبقے کا نمائندہ، دھوپ کے ایک ٹکڑے کو مُٹھی میں دبوچ کر بیٹھا مُسکرا رہا ہے۔ لیکن جانا تو ہوگا ہی۔ میز کے پاس سے بھی گزرنا ہی پڑے گا۔ یہ آگ کا دریا تو پار کرنا ہی ہوگا چاہے میرا ذہن اِس سے جُھلس جائے۔

"انکل!"

شاید اُس خوبصورت لڑکی نے مجھے پکارا ہے۔ لیکن میں نے جیسے کچھ نہیں سُنا اور اِدھر توجہ دئے بغیر تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل آیا ہوں۔ گیٹ بوائے نے سلام کیا ہے لیکن میں نے شاید جواب نہیں دیا۔

اور مجھے محسوس ہو رہا ہے، چنڈی گڑھ جو ہندوستان کا ایک خوبصورت ترین شہر ہے گیتا کوشک کی آٹوگراف بُک کا ایک اُجلا صفحہ بن کر میرے سامنے پھیل گیا ہے، جس پر ایک دن میں نے ایک شعر لکھا تھا اور پھر اُسے چھپانے کے لئے اپنے قلم کی ساری سیاہی اُنڈیل دی تھی اور جب ریستوران سے باہر ہوا کا ایک تُند و تیز جھونکا میرے جسم سے ٹکرایا تو مجھے محسوس ہوا اُس خوبصورت لڑکی کے ماتھے پہ جھولتی ہوئی خوبصورت لٹ نے ایک گھنگھور گھٹا بن [illegible] دودھ جیسی اُجلی دھوپ کو دبوچ لیا۔

میرے سامنے گورنرز ڈرائیو پہ چمکتی ہوئی [illegible] کی قطاریں ہیں اور میرے ذہن میں مجروح نظریات کا [illegible] کے جھروکے سے ایک آواز آرہی ہے۔

"انکل ڈاؤنٹ بی سلی!!"

# غزل

جگن ناتھ آزاد، ایم اے

اِک نظر ہی دیکھا تھا شوق نے شباب اُن کا
دن کو یاد ہے اُن کی رات کو ہے خواب اُن کا

گِر گئے نگاہوں سے پھول بھی ستارے بھی
میں نے جب سے دیکھا ہے عالمِ شباب اُن کا

ناصحوں نے شاید یہ بات ہی نہیں سوچی
اِک طرف ہے دل میرا اِک طرف شباب اُن کا

اے دل! اُن کے چہرے تک کس طرح نظر جاتی
نور اُن کے چہرے کا بن گیا حجاب اُن کا

اب کہوں تو میں کس سے میرے دل پہ کیا گُزری
دیکھ کر اُن آنکھوں میں دردِ اضطراب اُن کا

حشر کے مقابل میں حشر ہی صف آرا ہے
اِس طرف جنوں میرا اُس طرف شباب اُن کا

جگن ناتھ آزاد

افسانہ

# پھانس

واجدہ تبسم۔ ایم۔ اے

فلیٹ نمبر ۱۰۔ ریلوے بلاک ۱۲۱۔ شانتا کروز (ویسٹ) بمبئی نمبر ۵۴

۲۰ر اپریل ۱۹۶۷ء عزیز بھیا!

میرا خط آپ کو مل چکا ہوگا۔ اب تک تو جواب آ جانا چاہئے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اُس خط کو آپ نے گول کیا ہے۔ حالانکہ آپ سوچیں تو اُس میں ایسی کوئی بات ہی نہیں جسے آپ محسوس کر سکیں۔ بہرکیف آپ کے حکم کی تعمیل میں، ایک کہانی "پھانس" بھیج رہی ہوں۔ خیال رکھئے گا کہ کاتب صاحب اسے چانس یا پھانسی نہ کر دیں۔ ورنہ سارا مزا جاتا رہے گا۔ یہ ممکن ہے کہ کہانی آپ کو پسند نہ آئے —— ہاں بھیا پڑھنے والوں سے میری معذرت! اِتنے خطوط آتے ہیں کہ جواب دینا تو ایک طرف پڑھنے تک کو بڑی مشکل سے وقت نکال پاتی ہوں۔ ظاہر ہے ہر کوئی خلوص ہی سے خط لکھتا ہے، لیکن بھیا آپ خود انصاف کریں کہ چار بچوں کی ماں (وہ بھی بے حد شریر بچے) میں خط و کتابت کی ذمہ داریاں نباہ سکتی ہوں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ لکھنے والے میری مجبوری کو غرور پر محمول نہ کریں؟ میں اُن سب بھائیوں اور بہنوں کے لئے اپنا بے پناہ خلوص اور محبتیں بھیج رہی ہوں جنھوں نے مجھے خطوط لکھے ہیں اور "بیسویں صدی" میں نہ چھپنے پر گلہ کیا ہے۔ اِس طرح میں آپ سے اور سبھی سے آج سُرخرو ہو رہی ہوں۔ کوشش کروں گی کہ زیادہ نہیں تو سال میں دو کہانیاں تو آپ کے لئے لکھ ہی لیا کروں! —— اشفاق بے حد خوش اور اللہ کے فضل سے صحت مند ہیں۔ آپ کے پاؤں کے بارے میں انھیں بے حد فکر رہتی ہے۔ انھوں نے کل مجھے بتایا کہ وہ آپ سے اِس لئے بھی شاکی ہیں کہ آپ نے انھیں اپنی صحت کے بارے میں الگ کوئی خط نہیں لکھا۔ آپ کو پتہ ہے یہ اشفاق کا ویک پوائنٹ ہے وہ کسی کو بیمار نہیں دیکھ سکتے —— اب خدا کے لئے اپنا غصہ دُور کیجئے اور ہم سب کو محبت بھرا خط لکھئے —— آپ میری بیٹی کو دیکھ کر بے حد خوش ہوں گے۔ بالکل گڑیا سی لگتی ہے۔ اکلوتی ہے اِس لئے ماں باپ کے لاڈ میں بگڑی جا رہی ہے —— اچھا تو میں چلوں —— بہت سی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ . . .

آپ کی بہن —— واجدہ

---

"کسی بھی حالت میں فوراً پہنچ جاؤ ——!"

تار ملتے ہی شاذی کی حالت غیر ہوگئی —— تار بھیجنے والے کا نام انور تھا، یقیناً یہ تار اُن کی پیاری باجی نکہت کے میاں کی طرف سے تھا —— انھوں نے کبھی کسی بات کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ فوراً پہنچ جانے کے لئے کہا گیا ہے، لیکن اُس کا دل رہ رہ کر گواہی دے رہا تھا کہ یقیناً باجی کی حالت نازک ہے —— میرے مُنہ میں خاک —— وہ بسترِ مرگ پر ہیں۔ ورنہ —— ورنہ کبھی انور بھائی ایسا تار نہ دیتے —— اِس صورت میں کہ شادی کے بعد کئی سال گزر لینے کے باوجود آج تک دونوں بہنوں میں کسی قسم کی خط و کتابت نہ تھی اور نہ کبھی ملی تھیں۔

عورت سائے راستے بھول جاتی ہے، لیکن زندگی بھر ایک راستہ کبھی نہیں بھولتی ـــــــ میکے کو جانے والا راستہ! پھلواری چاہے کتنی ہی گندی ہو اُس کے پاس سے سدا پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔ یہی حال میکے کا ہے۔ میکے میں عورت نے، لڑکی کے رُوپ میں کیسی ہی تکلیفیں اُٹھائی ہوں۔ میکے کی یادیں کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہوں، پھر بھی اُن کانٹوں میں سدا ایک پھول مہکتا رہتا ہے ـــــــ یادوں کا پھول: ـــــــ سدا بہار پھول!!

شازی تار پاکر تڑپ اُٹھی ـــــــ اُس کے میکے کی بھولی بسری نشانی لے دے کے صرف ایک باجی ہی تو رہ گئی تھیں۔ ماں باپ کبھی کے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ایک بھائی تھا جو بچپن ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ یادوں کا تمام تر مرکز صرف باجی تھیں۔ لیکن کس قدر عجیب بات تھی کہ وہ دل و جان سے اِتنا چاہنے کے باوجود کبھی نکہت سے مل سکی نہ خط و کتابت کا ذریعہ ہی باقی رہا۔ بات کچھ بھی نہ تھی بہت سالوں پہلے جب نکہت بیاہی جا چکی تھی، امّی ابا دونوں زندہ تھے ـــــــ شازی ابھی تعلیم حاصل کر رہی تھی کہ اُس کے لئے اقبال کا پیام آگیا۔ نکہت اُس پیام پر سخت معترض تھی ـــــــ "امّی ابا بوڑھے ہو چکے ہیں، یہ کام میرا اور انور کا ہے کہ ہم تمہارے بُرے بھلے کے بارے میں سوچیں، اور شازی! یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم خالہ بی کے پالے ہوئے لڑکے سے تمہاری شادی کر دیں۔"

خود شازی کا اپنا یہ خیال تھا کہ کم سے کم باجی کی طرح بی۔ اے تو کر ہی لے۔ بُری گھڑی پُوچھ کر نہیں آتی۔ اللہ نہ کرے کبھی بُرا بھلا وقت آگیا تو اتنی تعلیم تو رہے کہ نوکری کرکے اپنا پیٹ آپ پال سکے ـــــــ لیکن اقبال کی دیوانی محبت کچھ بھی نہ ہونے دیتی ـــــــ!؟ ایک دو دن ٹلے نہیں کہ وہ اپنی لمبی سی گاڑی لے کر آن موجود! ـــــــ وہی تاک جھانک کا سلسلہ ـــــــ وہی راستہ روک کر ہلکی سی چھیڑ چھاڑ ـــــــ کبھی اِس کمرے سے اُس کمرے میں جانے تک شازی کو روک لینا اور اظہارِ محبت کر ڈالنا ـــــــ "یقین کرو شازی میں خودکشی کر لوں گا ـــــــ اگر تم نے ہاں نہ کی!"

باجی سے یہ ساری باتیں پوشیدہ نہ تھیں۔ خیر محبت کی سرگوشیاں وہ نہ بھی سُنتیں لیکن دن رات تحائف جو چلے آ رہے تھے۔ کبھی قیمتی ساڑیاں، کبھی جڑاؤ زیور (جو شازی کی کمزوری تھے) کبھی فارن کی خوشبوئیں ـــــــ کبھی اس اعتراف کے ساتھ میک اَپ کا سامان کہ "شازی! تم تو خود ایک حور ہو تمہیں میک اپ کی بھلا کیا ضرورت ہے؟" یہ ساری باتیں تو وہ خود کھلی آنکھوں دیکھ رہی تھیں۔ انھیں اصل اعتراض اقبال کے چھچھورپن پر تھا۔ پیسہ پاکر کوئی یوں اپنی اوقات نہیں بھول جایا کرتا۔ امّی ابا کو ذاتی طور پر قطعاً کوئی اعتراض نہ تھا۔ آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا اچھے خاندان کا لڑکا تھا۔ صرف یہ تھا کہ اُس نے خالہ بی کے یہاں برتن بھانڈے تک دھوئے تھے، بازار سے کوڑی پیسہ لاکر کے سودا سلف لایا تھا۔ دھوبی کی طرح دھنا دھن گھر بھر کی غلاظت سے بھرے کپڑے دھوئے تھے اور گھر پر جو ماسٹر صاحب پڑھانے آتے تھے اُن کے آگے بیٹھ کر پل پل کر قرآن شریف پڑھا تھا۔ جوتے کھا کھا کر جھوم جھوم کر آگے پیچھے ڈول ڈول کر ا۔ ب۔ ت۔ سے شروع کرکے پورا قاعدہ ختم کر ڈالا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچویں میں داخلہ لے لیا تھا اور پھر ایسا پڑھا ایسا پڑھا کہ کسی کے پیسے کی حاجت رہی نہ ہاتھ پھیلانے کی۔ ہر کلاس میں پہلا نمبر آنے پر وظیفہ ملتا رہا اور بی۔ اے کرکے جب اُس نے خالو صاحب کو سلام کیا تو اُنھوں نے خوش ہو کر پانچ سَو روپے انعام دیئے۔ اُنہی پانچ سَو سے اُس نے سامان کی چھوٹی سی دوکان ڈال لی ـــــــ جو بڑھتے بڑھتے "اقبال اینڈ سنز" بن گئی۔ پہلے پہلے خاندان بھر میں اُس "اینڈ سنز" پر بڑی ہنسی اُڑی مگر اقبال نے بڑی خوش دلی سے جواب دیا ـــــــ "ارے باپ موجود ہے تو بیٹے بھی آ ہی جائیں گے!" پہلے دُکان میں ایک نوکر بڑھا۔ پھر دوسرا نوکر آیا۔ پھر دُکان وسیع کی گئی۔ پھر فون آیا۔ پھر گھر خریدا گیا۔ پھر گھر میں فون لگ گیا پھر اچھے کی باری آئی۔ لیکن گھر چھوٹا محسوس ہوا تو بڑی سی جگہ خرید کر خوبصورت سا بنگلہ بنوایا گیا۔ پھر گاڑی آئی۔ پھر چھوٹی کی بجائے لمبی گاڑی آئی۔ پھر آنکھوں میں حسین خواب آئے۔ خوابوں میں ایک حسین پیکر آیا ـــــــ وہ حسین صورت جس پر دل بچپن سے فدا تھا ـــــــ جسے دیکھنے سے آنکھوں میں ٹھنڈک بھر جاتی تھی اور دل پھول کی طرح کھل اُٹھتا تھا۔ جب دھیلے ساتھ ہوں تو انسان چاند پر بھی ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ پھر شازی تو اِسی زمین کا چاند تھی ـــــــ اور لڑکیاں ہوتی ہی اِسی لئے ہیں کہ خوبصورت ہوں، پڑھی لکھی ہوں، دُنیاوی آداب سے آشنا ہوں تو اچھے بُرے لڑکے آئیں اور بیاہ لے جائیں۔ پھر اقبال میں کون سی کمی تھی ـــــــ؟ یہ سب باتیں امّی ابا سوچتے تھے، لیکن پتہ نہیں نکہت کے دل میں کون سی گرہ تھی جو کھلنے ہی میں نہ آتی تھی۔ وہ خود بی۔ اے پاس تھی خوبصورت تھی، دو پیارے پیارے بچّوں کی ماں تھی۔ لیکن وہ جو بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اولاد مرد کے نصیب سے، دولت عورت کے نصیب سے!" تو یہ تو خدا کا شکر تھا کہ اُس نے صاحبِ اولاد کیا تھا کہ ایک لڑکی، ایک لڑکا، دو دو پھول عنایت کر دئے تھے لیکن جہاں تک دولت کا تعلق تھا وہ بس یونہی سی تھی۔ انور کسی دفتر میں تین سو روپے پاتا تھا اور یہ روپے کھاتے پیتے برابر ہو جاتے تھے۔ نکہت کو گھر کا کام کاج خود کرنا پڑتا تھا۔ کبھی محلے میں کوئی تقریب ہوتی ہے، کبھی ... کے دوست آجائیں تو خاطر داری کو ... [illegible]

ہوتا ہوتا سکون برباد کر دیتا ــــ اقبال کے ہاں کی زندگی تقریباً مغرب زدہ تھی۔ لمبی سی میز تھی، کھانے والا وہی ایک تھا، مودّب بیرا کھانے تک سروس بجا لاتا رہتا۔ پھر آئے دن کی پارٹیاں تھیں، جن میں وہ خاندان کے سبھی لوگوں کو بلاتا، جن جن کا نمک کھایا تھا سبھی کو مدعو کرتا ــــ اور بعد در بعد ہوتی ہوئی باتیں یہاں سے وہاں تک پھیل جاتیں کہ اقبال تو ایسی زندگی گزار رہا ہے کہ بس ــــ!

نکہت نے جب کمر ہی باندھ لی کہ اس پیام کو رد کرنا ہی ہے تو شازی کی بھی آنکھیں کھلیں۔ کون لڑکی ایک محبت بھرے دل کے ساتھ زندگی کا عیش و عشرت نہیں چاہتی۔ پھر باجی اس آڑ کو لے کر کیوں بیٹھ گئی ہیں کہ وہ کسی زمانے میں پالا ہوا لڑکا تھا۔ ایک لڑکی پانے کے لئے تعلیم، شخصیت، وجاہت، دولت اور محبت کے ساتھ ساتھ جو رکھ رکھاؤ ضروری ہوتا ہے وہ سب تو اقبال میں موجود ہے۔ ایسی بے پناہ چاہت پھر پتہ نہیں نصیب ہو یا نہ ہو۔ ایک دن اقبال آ گیا ہی تھا۔ پاس وہ پیکٹ بھی پڑا ہوا تھا جو شازی نے ابھی کھول کر دیکھا تک نہیں تھا۔ نکہت ادھر سے گزری تو شازی نے پاس پڑا تکیہ اُٹھا کر اُس پر رکھ دیا۔

نکہت چڑ کر بولی ــــ

"امی ابا بھلے ہی اتنے روشن خیال ہیں تو ہوں کہ کسی کنوارے غیر لڑکے کا آنا جانا، لین دین، ہنسی مذاق مائنڈ نہ کریں۔ لیکن شازی! میں ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔"

شازی نے بڑی بڑی خوابناک آنکھیں اُٹھا کر کہا ــــ "خیر ــــ باجی! جب کوئی لڑکی کسی لڑکے کو اپنے من مندر کا دیوتا بنا لیتی ہے تو کسی طرح کی غیریت باقی نہیں رہ جاتی۔ میں اقبال کو اپنا شوہر مان چکی ہوں!"

دونوں بہنوں میں آج تک اس طرح کی کوئی بات نہ ہوئی تھی اور جو ہوئی تو ایسی کہ کسی قسم کی کوئی جھجک ہی باقی نہ رہی۔ اتنی دیدہ دلیری سے شازی نے کیسے اُس کے سامنے ایسی بے حجابانہ باتیں کر دیں ــــ "اُس کی شادی تو ماں باپ نے طے کی تھی، اُس نے تو دخل تک نہ دیا تھا۔ پھر یہ شازی کس طرح ایسی آزاد ہو گئی؟" نکہت نے بے حد غصے کے ساتھ تقریباً چلا کر کہا۔

"شازی! تم بھول رہی ہو کہ میں تمہاری بڑی بہن ہوں! اور یہ کہ ہماری مشرقی تہذیب کے اپنے چند اصول ہیں۔ کیا تم ایک ایسے لڑکے کو بطور شوہر قبول کر کے خوش رہ سکو گی، جس نے دعوتوں میں بارہا تمہارے جھوٹے ہاتھ دھلائے ہیں ــــ؟"

نکہت نے سوچا تھا شازی اس طرح گڑگڑا کر یاد دلانے سے اقبال کا بچپنا سوچ کر بھڑک اُٹھے گی، لیکن اُس نے بے حد پیار سے جواب دیا۔

"باجی! وہ ہاتھ جو آج اتنی محبت سے میری طرف بڑھے ہیں، بچپن سے ان آنکھوں کے سامنے رہے ہیں ــــ اور پیار سے جو ہاتھ آگے بڑھتا ہے وہ حقیر نہیں بے حد عظیم ہوتا ہے!"

نکہت حیران رہ گئی۔ سمجھ گئی کہ شازی اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کبھی نہ کرے گی۔ نہ وہ بچی تھی نہ جاہل، اپنا بُرا بھلا خود بھی تو سمجھ سکتی تھی۔ وہ نکہت کی بے بنیاد سی بات تو کہ اقبال کا ماضی ذلیل تھا، کسی صورت سے ماننے کو تیار نہ تھی۔ نکہت اُسی دن یہ فیصلہ سنا کر اپنے سسرال چلی گئی کہ "میں ایسی شادی میں شرکت کر کے خود کو ذلیل نہیں کرنا چاہتی جہاں نوکروں کو دامادوں کا درجہ دیا جائے ــــ اور نہ اب میں کبھی شازی سے ملنا ہی پسند کروں گی!"

---

دن کیسے بیت جاتے ہیں! ہوا کی مانند ــــ اُن کے بھی جو عیش و عشرت میں مگن ہوتے ہیں اور اُن کے بھی جن کی زندگی کی کتاب کا ہر ہر ورق مصیبتوں اور کلفتوں سے عبارت ہوتا ہے۔ ان تمام سالوں میں دونوں بہنوں میں کسی طرح کی خط و کتابت رہی نہ وہ ملیں ہی ــــ دُنیا کا کوئی سکھ ایسا نہ تھا جو شازی نے اُٹھا نہ لیا ہو۔ تین پیارے پیارے بچوں کی وہ ایک خوش ترین ماں تھی جن میں ایک گڑیا سی بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ اس طرح اقبال اینڈ سنز واقعی اقبال اینڈ سنز بن چکی تھی ــــ مُنّاؤں کے ہنڈولے میں جھولتی ہوئی شازی کبھی کبھی دل میں ایک کسک سی محسوس کرتی ــــ میکے کی تڑپ۔ شوہر کا بے پناہ پیار اسے میسّر تھا۔ بچے تھے۔ شاندار و پُر وقار کوٹھی، ہر جدید فیشن اور فرنیچر سے آراستہ، پہننے کے لئے بے پناہ حسین ملبوسات، کپڑے، جواہرات، سواری کے لئے دو دو خوبصورت کاریں اور میاں کی وہ چاہت کہ نئی نویلی دلہنیں رشک کریں۔ غم اور آلام عورت کو بوڑھا بناتے ہیں۔ دن اور رات کی کسی گردش نے کسی عورت کو آج تک بڑھاپے کا راستہ نہیں بتایا۔ بتایا ہے تو شوہر کی عدم توجہی، بے قدری، غربت و افلاس اور بدلی ہوئی نگاہوں نے ــــ اسی لئے شازی اتنے سال گزر جانے پہ بھی اُسی طرح شاداب، جوان اور اُمنگوں سے بھرپور تھی، جیسے ڈالی پر کھلا ہوا تازہ تازہ گلاب! ان تمام باتوں کے ہوتے بھی کبھی کبھی شدت سے اُس کا جی چاہتا، اپنے میکے کی ایک ہی نشانی، باجی سے ملے۔ باجی سے خوب باتیں کرے۔ باجی کے ہاں جائے۔ اُنھیں اپنے ہاں بلائے۔ اُنھیں تحفوں سے لاد دے۔ اُنھیں ہر ممکن خوشی دے سکے۔ بے حد خلوص اور محبت کے ساتھ اُنھیں یہ بھی بتائے کہ "دیکھیے باجی آپ کے تمام تر خدشے کتنے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ آپ کو یہ فکر تھی کہ اقبال چھوٹا ہے، وہ مجھے خوش نہ رکھ سکے گا۔ زیادہ دولت ہاتھ آئی ہے۔ مجھے

چند مہینوں میں مسل ہوئی کلی کی طرح پھینک دے گا اور نت نئے ساتھی عیش و طرب کے [illegible]۔ کتنے سطحی خیالات آپ کو تھے۔ دیکھئے اقبال نے مجھے کس طرح خوش رکھا ہے، کس طرح میرے دل کو اپنی محبت سے اور اپنے دل کو میری محبت سے بھر رکھا ہے کہ کبھی بھی زندگی میں ہلکا سا دُکھ کا نام و نشان تک نہیں۔ اِسی محبت کی فراوانی نے میری جوانی کو کبھی نہ مرجھانے والا سدا بہار پھول بنا دیا ہے!" وہ یہ سب سوچتی لیکن اِتنی ہمت نہ پاتی کہ خط لکھے یا انھیں بلائے ——— سوچتی اگر باجی نے دھتکار دیا یا میرا محبت بھرا بلاوا قبول نہ کیا تو میں برداشت نہ کرسکوں گی۔ اقبال بھی شاید اچھا نہ سمجھے۔

اور آج ———

اور آج اچانک اُسے میکے سے بُلاوا آگیا۔ لیکن اُس کے دل نے اُسے آگاہ کیا، یہ خوشی کا لمحہ نہیں ہے۔ یہ بُری گھڑی ہے۔ اس کا دل رہ رہ کر کہہ رہا تھا۔ کچھ ہونے والا ہے، کچھ ہونے والا ہے ——— تار ہاتھ میں لئے، کتنی ہی دیر تو وہ یونہی کھڑی ماضی کی ہر ہر بات سوچا کی۔ پھر اِکدم تیزی سے اقبال کے کمرے کی طرف دَوڑی۔

"اقبال ——— پلیز اقبال جلدی کرو۔ ہمیں فوراً جانا ہے!"

اقبال ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا ——— "کیا ہوا شازی ڈیر؟ اتنی گھبرا کیوں رہی ہو ——— ہوا کیا؟"

اِکدم شازی بچوں کی طرح رونے لگی ——— "اقبال! باجی کی طبیعت بے حد خراب ہے۔ دیکھ لو انور بھائی نے بُلایا ہے"

اقبال اُس کی تسلی کے لئے ہنس کر بولا ——— "تم تو پاگل ہو میری جان! اس تار سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ نہ کرے باجی علیل ہیں؟"

"اقبال ——— بعض باتیں دل خود سمجھا دیتا ہے۔ تم چلو۔ ابھی چلو پلیز!"

"لیکن اِتنے سالوں میں کیا پتہ انور صاحب کا تبادلہ کہیں اور ہو چکا ہو۔ ہمیں اُن کا پتہ بھی تو نہیں معلوم۔ پہلے تو شاید وہ کلکتے ہوا کرتے تھے"

"میں نے تار پر دیکھ لیا ہے۔ وہ کلکتے ہی سے آیا ہے۔ تم پلیز فوراً پلین سے سیٹیں بُک کروالو!"

"میری جان! پریشانی میں تم بالکل بدحواس ہو رہی ہو۔ بغیر ریزرویشن کے ہم اِس طرح کیسے ٹکٹ حاصل کرسکتے ہیں۔ ذرا تو سوچو۔ ٹھہرو میں پہلے کال کرلوں ———"

جب تک اقبال ٹیلیفون پر بات کرتا رہا شازی کتنی بار مری اور کتنی بار جی۔

———

بستر پر ہڈیوں کا ایک ہار سا پڑا ہوا تھا [illegible] رہ گئی۔ اُف! اُس کی پھول جیسی باجی! اُس نے آنسوؤں کو [illegible] بمشکل سی کوشش کی۔

"انور بھائی ——— باجی کی ایسی حالت کب سے [illegible] پہلے سے اطلاع تو دی ہوتی کبھی ———"

انور پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا ——— "وہ اطلاع [illegible] ڈاکٹرز نے آخری اسٹیج بتایا ہے۔ میں نے سوچا اب تو آپ کو اطلاع [illegible] وہ حالات کے ہاتھوں خاصا بے حس ہو گیا تھا۔ بے حد احساسات سے عاری لہجے میں وہ نکہت کی بیماری کی تفصیل دیتا رہا ——— اِتنے میں نکہت نے آنکھیں کھول دیں ——— اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر سے مُوند لیں۔ وہ کہہ رہا تھا "کئی بار ایسا ہو چکا کہ معلوم ہوتا ہے آخری لمحہ آگیا لیکن جانے کون سی پھانس اِن کے دل میں اٹکی ہوئی ہے کہ پھر وہی حالت، وہی تکلیف، وہی حالت ہو جاتی ہے۔ لیکن مشکل آسان نہیں ہو چکتی"

شازی نے کمرے پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ انتہائی غربت کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ تین سو روپے پانے والا شوہر اِتنی طویل بیماری سے اگر یہی [illegible] تو شاید بے جا نہیں۔ اُس نے لرز کر سوچا۔

نکہت نے ایک بار اور آنکھیں کھولیں اور جیسے شازی کو بہت کوشش سے پہچان کر دھیمے دھیمے بولی۔

"ائے ——— تُو ——— شازی . . . ؟"

شازی اُس پر جُھکی۔ آنسوؤں کے مارے بات نکلتی نہ تھی "ہاں باجی! انور بھائی نے مجھے تار دیا اور میں اُڑی چلی آئی ——— اب آپ. . ." لیکن نکہت نے بات کاٹ کر دھیمے سے پُوچھا۔

"اُڑی چلی آئی ——— ؟ پلین سے ——— ؟ لیکن مجھے تو . . کسی نے بتایا تھا کہ . . . اقبال کی فرم ڈوب گئی . . . وہ دیوالیہ ہو گئے . . . پھر . . ." اِکدم شازی کی آنکھوں سے بادل ہٹ گئے۔ وہ سکون کا سانس لے کر بولی۔

"باجی ——— آپ نے غلط نہیں سُنا تھا۔ واقعی ہم دیوالیہ ہو گئے۔ زندگی میں بہت دُکھ اُٹھا لیا تھا باجی اُسی کی یہ سزا تھی . . ."

نکہت کے چہرے پر ایک عجیب سی بحالی ——— "پھر اقبال . . . کیا کرتے ہیں . . . غریبی کے ہاتھوں پریشان ہو کر . . . [illegible] تو ذکر تے ہوں گے؟"

شازی نے اُس کے ماتھے پر بے حد پیار سے [illegible]

۔۔۔ وہ پیار محبت تو ایک خواب تھا جو

۔۔۔ اور انور باہر جاکر باتیں کرنے لگے تھے۔ اقبال شازی کے ۔۔۔ بدلے ہوئے رویے سے سخت بدحواس ہوکر باہر نکل گیا تھا۔ اندر بھی اُسی کے ۔۔۔ پڑا تھا۔ اُنھیں جاتے دیکھ کر نکہت نے آخری سوال بہت مشکل سے ادا کیا۔

"تمھارے بچے ـــــ سُنا تھا تین بچے۔ کہاں ہیں ـــــ لائیں نہیں؟"

شازی بے چارگی سے بولی۔ ـــــ "باجی اتنا کرایہ کہاں سے لاتی کہ سب کو ساتھ لے آتی۔ پڑوسن کے ہاں چھوڑ آئی ہوں ـــــ" (اُس کی آنکھوں میں اپنے تینوں موٹے تازے صحت مند شریر بچے گھوم گئے۔ جو اپنی اپنی آپا پر لدے ہوئے ہوں گے ـــــ!)

نکہت کے چہرے پر اِک نور سا چھا گیا۔ اُس نے آخری بار بہت محبت سے شازی کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا ـــــ "ہم دونوں ہی ایک کشتی کی سوار ہیں شازی! ہم دونوں ہی۔۔۔" اور اکدم دیکھتے ہی دیکھتے ایسی آسانی سے اُس کا دم نکل گیا جیسے غبارے میں سے ہوا نکل جائے ـــــ!

شازی کی چیخوں کی آواز سُن کر دونوں مرد کمرے میں لپکے ہوئے آئے۔ انور نے سفید چادر نکہت کے چہرے تک کھینچ دی۔ اقبال شازی کو سنبھالتا ہوا کمرے کے باہر لے آیا۔ وہ اُسے چمکارتا ہوا بولا۔

"شدید غم نے تمھیں بدحواس کر دیا ہے شازی ڈیر! ذرا کھلی ہوئی ہوا میں سانس لو اور مجھے یہ بتاؤ تم نے نکہت باجی سے۔۔۔"

شازی سسک اُٹھی ـــــ "تم نہیں سمجھو گے اقبال! تم نہیں سمجھ سکو گے ـــــ میں نے باجی کے سینے سے وہ پھانس نکال دی ہے جس نے اُنھیں سکون سے مرنے سے روک رکھا تھا۔۔۔ میں یہ سب نہ کہتی تو وہ کبھی سکون سے نہ مر پاتیں۔۔"

اقبال واقعی کچھ نہ سمجھ سکا ـــــ!!

---

# غزلیں

پروفیسر اختر نظمی، ایم اے بی۔ ٹی ـــــ

دیکھ میرے لئے آنسو نہ بہا، مان بھی جا
تو مری راہ میں شعلے نہ بچھا، مان بھی جا

پھر یہی خواب نظر آئیں گے اِن دیکھے سے
اپنے خوابوں کو حقیقت نہ بنا، مان بھی جا

دیکھ یوں جرأتِ رندانہ پہ حرف آئے گا
کانپتے ہاتھوں سے ساغر نہ اُٹھا، مان بھی جا

تجھ پہ پڑ جائے نہ سایہ مری رُسوائی کا
تو زمانے کی نگاہوں میں نہ آ، مان بھی جا

لوگ افسانے بہت جلد بنا لیتے ہیں
اپنی اُلفت کو نہ افسانہ بنا، مان بھی جا

فاصلے اور نہ بڑھ جائیں تمناؤں کے
آرزوؤں کے قریب اور نہ آ، مان بھی جا

قیس و فرہاد کے افسانوں میں کیا ہے نظمی
اِن افسانوں سے افسانہ بنا، مان بھی جا

اختر نظمی

ـــــ امتیاز علی خاں عرشی رامپوری

آؤ پھر پردہ درِ دل سے اُٹھا کر دیکھیں
خلوتِ ناز کو دوبارہ سجا کر دیکھیں

مدتوں سے نہیں چھالوں میں تپکن کی لذت
نخوتِ پا کو پھر اِن پہ ہنسا کر دیکھیں

دل کی آزادی و راحت طلبی نے مارا
اِس کو پھر تازہ مصیبت میں پھنسا کر دیکھیں

زخمِ دل بھر کے ہوا جاتا ہے اچھا، آؤ
اِس پہ پھر نشترِ فصاد لگا کر دیکھیں

کون کہتا ہے کہ باگیر ہے ہستی اُس کی
تیرے کوچے میں مجھے دوست بٹھا کر دیکھیں

دل و دیں پاس نہیں جان تو ابھی باقی ہے
خلوتِ ناز میں پھر اُس کو بلا کر دیکھیں

مُردہ مُردہ سے ہوئے جاتے ہیں ہم بے عرشی
اشکِ خوں سے پھر اُنھیں گرما کر دیکھیں

عرشی

افسانہ

# آخری الفاظ

—— پرنسپل کنہیالال کپور۔ ایم۔ اے

دیانند متھراداس کالج۔ موگا (پنجاب)

۲ مئی ۱۹۶۷ء

ڈیئر مولانا خوشتر گرامی صاحب!

جیسے بیسویں صدی! مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ ناک تک پونچھنے کی فرصت نہیں۔ چہ جائیکہ آپ کے حکم کی تعمیل کی جاتے۔ حکم عدولی کی سزا بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ "تیرونشتر" میں آپ وہ خبر لیں گے کہ خیروعافیت معلوم ہوجائے گی۔ کچھ فرصت نکال کر ایک مضمون نما افسانہ یا افسانہ نما مضمون گھسیٹا ہے۔ شاید آپ کو پسند آئے۔ عنوان ہے "آخری الفاظ"۔ اگر اسے رسالہ کے آخری صفحوں میں شائع کیا جاتے تو بہتر مناسب ہوگا . . .

آپ کا —— کنہیا لال کپور

عظیم راہنما کوکا کولا نوش فرما رہے تھے کہ یکلخت اُن پر فالج گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ پکار کر کہتے —— "بوتل کو میرے ہاتھ سے چھینا کر چلا" گیا! وہ چل بسے۔

اُن کی وفات پر ہر شخص نے اطمینان کی سانس لی۔ کیونکہ مرحوم آخری عمر میں کچھ اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تھے جنھیں سُن کر داغ کا یہ مصرع پڑھنے کو جی چاہتا تھا:

وہ اِس جینے سے مرجاتے تو اچھا!

مرحوم کے جاں بحق ہونے کی سب سے زیادہ خوشی اُس جوتشی کو ہوئی جو ہر سال اُن کے مرنے کی پیش گوئی کیا کرتا تھا اور جس نے تنگ آکر امسال یہ اعلان کیا تھا —— "اگر جناب راہنما اِس برس بھی اللہ کو پیارے نہ ہوئے تو میں خودکشی کر لوں گا!"

مرحوم کے حواریوں نے بذریعۂ قرعہ اندازی ایک حجام کو اُن کا جانشین مقرر کیا جس کا نام ماتا دین تھا۔ اِس فیصلے پر عموماً مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ نئے راہنما نے اپنی پہلی پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ "ایک عظیم راہنما میں صرف دو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اُس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہو اور وہ قوم کا سر مونڈ سکے۔ خدا کے فضل سے مجھ میں یہ دونوں خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اِس لئے قوم کو مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔" قوم نے انھیں اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور ساتھ ہی یہ مطالبہ کیا کہ اُسے مرحوم کے آخری الفاظ سے آگاہ کیا جاتے۔

ماتا دین بخوبی جانتے تھے کہ موت نے مرحوم کو الوداع تک کہنے کی مہلت نہ دی تھی۔ چہ جائیکہ وہ قوم کے نام کوئی پیغام دے سکتے۔ لیکن قوم یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ جو شخص زندگی میں اِتنا باتونی ہو کر آئے دن اپنی تقریروں سے قوم کو بور کرتا ہے وہ مرتے وقت کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ ماتا دین نے وعدہ کیا کہ وہ ایک ہفتے کے بعد قوم کو مرحوم کے آخری الفاظ سے مطلع کریں گے۔

سب سے پہلے اُنھوں نے مرحوم کی بیگم سے انٹرویو کیا۔ "ہمارے محبوب راہنما اور آپ کے باوفا خاوند نے مرنے سے دو ایک دن پہلے آپ سے کیا گفتگو کی تھی؟"

بیگم نے جواب میں کہا "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں راست گوئی سے کام لوں تو آپ کو اُن کی گفتگو سن کر مایوسی ہوگی۔"

"پھر بھی اُنھوں نے کیا کہا تھا؟"

"اُنھوں نے کہا تھا، بیگم! مجھے معلوم نہ تھا تمہارے شباب پر اتنی جلدی بڑھاپے کا سایہ پڑ جائے گا۔ اگر تم برا نہ مانو تو میں تم سے طلاق لے لوں!"

"اس کے علاوہ اور کیا باتیں ہوئیں؟"

"یہ کہ تم خواہ مخواہ میری شراب نوشی پر اعتراض کرتی ہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ شراب پیے بغیر میں نشہ بندی پر تقریر نہیں کر سکتا۔"

"اس کے علاوہ ؟"

"اس کے علاوہ یہ کہا جب ہماری شادی ہوئی تھی تم میکے سے اپنے ساتھ ایک سفادسرلائی تھیں، وہ نہایت قبول صورت تھی لیکن دو ایک مہینے کے بعد تم نے اُسے برخاست کر دیا تھا۔ محض اس شک کی بنا پر کہ وہ میرے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتی ہے۔ تمھارا یہ گناہ میں آج تک معاف نہ کر سکا۔"

"اور بھی کچھ کہا تھا اُنھوں نے ؟"

"ہاں۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ حالات تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔ کسی وقت بھی کوئی بڑا دھماکہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا ہم بیس پچیس لاکھ روپیہ کسی غیر ملکی بنک میں جمع کرا دیں۔ اور جونہی عوام بغاوت کا علم بلند کریں بذریعہ ہوائی جہاز یہاں سے بھاگ جائیں۔"

"تو کیا اُنھوں نے اتنا روپیہ کسی غیر ملکی بنک میں جمع کرایا ؟"

"نہیں۔ کیونکہ دوسرے دن وہ وفات پا گئے۔"

مرحوم راہنما کی اہلیہ محترمہ نے جتنی باتیں بتائیں اُن میں سے کوئی بھی کام کی نہ تھی۔ اس لئے ماتا دین نے مرحوم کے بڑے لڑکے سے سوال کیا۔

"آپ کے والد نے آپ سے آخری ملاقات کے دوران کیا کہا تھا ؟"

"اُنھوں نے مجھے سخت سُست کہنے کے بعد فرمایا تھا۔ غریب لڑکیوں کا چاہے وہ کتنی خوبصورت ہوں تعاقب کرنا فضول ہے۔ اگر تمھیں پیار ہی کرنا ہے تو کسی امیر زادی سے کرو تاکہ جہیز میں کافی روپیہ لائے۔"

"اور بھی کچھ کہا تھا ؟"

"جی ہاں۔ یہ کہا تھا تم متواتر چار سال سے بی۔ اے میں فیل ہو رہے ہو۔ تمھاری کامیابی کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ تمھیں امتحان میں نقل کرنے کی سہولتیں دی جائیں اور ممتحنوں سے مل لیا جائے۔ وہ تمھیں رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیں۔"

"مرحوم آپ کو کس پیشے میں بھجوانا چاہتے تھے ؟"

"اُن کا خیال تھا کہ اپنے وطن میں بہترین پیشہ سیاست ہے۔ اُن کی دلی تمنا تھی کہ میں اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قوم کی راہنمائی کروں۔"

"وہ سیاست کو بہترین پیشہ کیوں تصور کرتے تھے ؟"

"وہ سمجھتے تھے کہ اس پیشے کی بدولت سرمایہ لگائے بغیر بہت سا سرمایہ جمع کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھے ؟"

"جی ہاں اُن کی اپنی مثال اُن کے سامنے تھی۔ وہ ایک غریب تیلی کے لڑکے تھے جسے دو وقت کا کھانا بھی مشکل سے نصیب ہوتا تھا لیکن سیاست میں پڑنے کے بعد اُن کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی ہنسی مذاق میں فرمایا کرتے تھے میں تیلی کا بیٹا ہوں۔ قوم کا تیل نکال کر چھوڑوں گا۔"

ماتا دین کو یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ اُنھوں نے مرحوم کی بڑی بیٹی سے رجوع کیا۔ موخر الذکر نے اُنھیں بتایا کہ مرحوم نے مرنے سے ایک دن پہلے اُس سے کہا تھا، پُرانے زمانے اور آج کل کی لڑکی میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ وہ گڑیوں میں کھیلتی تھی اور یہ لڑکوں میں کھیلتی ہے۔ تم کافی ترقی یافتہ ہو تاہم پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کسی ایسے نوجوان کے جال میں پھنس جاؤ جو قرض کی مے پیتا اور بلا ٹکٹ سفر کرتا ہو۔ لڑکی وہی دانشمند ہوتی ہے جو امیر ترین شوہر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔"

اِس انٹرویو کے بعد ماتا دین نے مرحوم کے کسی رشتے دار سے ملنا مناسب نہ سمجھا۔ حسنِ اتفاق سے اُنھیں مرحوم کی ایک ذاتی ڈائری مل گئی جس میں کئی طرح کے اندراجات تھے۔ ماتا دین بہت غور سے اُن کا مطالعہ کرنے لگے تاکہ اُن میں سے کسی اندراج کو مرحوم کے آخری الفاظ سے منسوب کیا جا سکے۔

۲۸ فروری کو مرحوم نے لکھا تھا — "آج کا دن بہت اچھا گزرا۔ مس میم سے ملاقات ہوئی۔ چھوکری بُری نہیں۔ چالاک بھی کافی معلوم ہوتی ہے۔ سونے کی سمگلنگ میں اِس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ کوئی شک بھی نہ کرے گا۔ میں نے اُسے نفع کا دس فیصد ادا کرنے کی پیشکش کی ہے۔ لیکن ابھی مانتی نہیں۔ اُمید ہے پندرہ فیصد پر مان جائے گی۔"

۴ مارچ کے تحت یہ اندراج تھا — "سیٹھ گلاب دل سیمنٹ کا کوٹا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا ہے اگر وہ پچاس ہزار بطور نذرانہ ادا کریں تو اپنے رسوخ سے کوٹا دلوا سکتا ہوں۔"

۲۵ اپریل کو اُنھوں نے ایک ایسی دعوت کا ذکر کیا تھا جس کے اختتام پر ایک مشہور رقاصہ نے نیم عریاں لباس میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ مرحوم نے رقاصہ کے خد و خال کا چٹخارے لے لے کر ذکر کیا تھا۔

۶ مئی کو اُنھوں نے صرف دو سطریں لکھی تھیں "سیاست اور ایمانداری کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ میری رائے میں ایماندار سیاستدان سے زیادہ بیوقوف شخص مشکل ہی سے ملے گا۔"

ماتا دین جوں جوں ڈائری کے اوراق پڑھتے گئے اُن کا رنگ فق ہوتا گیا اور اس اندراج پر تو اُنھوں نے اپنا سر پیٹ لیا — "[illegible] کو اپنی بیوی بنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ [illegible] کو زہر دے دیا جائے۔"

ماتا دین نے ڈائری بند کر دی اور فیصلہ کیا کہ خود ہی ایک بیان لکھ کر اسے مرحوم کے آخری الفاظ کا نام دے دیا جائے۔ بہت غور و فکر کے بعد انھوں نے مندرجہ ذیل الفاظ قلم بند کئے۔

"عزیز ہم وطنو! کاش میں چند سال اور زندہ رہتا اور قوم کی مزید خدمت کر سکتا۔ لیکن افسوس خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ عزیزو! میں نے ہمیشہ قوم کے مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ہر قسم کی رشوت ستانی کا خاتمہ کیا جائے۔ نشہ بندی کی تحریک کو کامیاب بنایا جائے۔ مادّی اقدار کی بجائے روحانی اقدار کی سرپرستی کی جائے۔ گھریلو زندگی کو بہتر بنانے کے لئے سب بچہ شوہروں کو سمجھایا جائے کہ وہ اپنی بیویوں کی قدر کریں۔ جہیز کی لعنت کو ختم کیا جائے۔ بیواؤں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے اور ایسی تفریحات کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے جو نوجوانوں کے جذبات کو بھڑکاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر قوم نے میرے آخری الفاظ پر عمل کیا تو اس کا مستقبل نہایت شاندار ہوگا۔"

ایک ہفتے کے بعد جب ماتا دین نے مرحوم کے آخری الفاظ قوم کو پڑھ کر سنائے تو قوم نے یک زبان ہو کر ذوق کا یہ مصرع دہرایا ؎

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے!

---

# غزل

**پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی**

محبت سے جس کو محبت نہیں
زمانے کو اس کی ضرورت نہیں

مجھے عذر ہی دل کے دینے میں کیا
مری جان حاضر میں حجت نہیں

محبت بھری اُن کی دل کش ادا
قیامت ہے لیکن قیامت نہیں

محل گفتگو کا ملا بھی تو کیا
یہاں بات کہنے کی ہمت نہیں

پلاتا ہے زہر آب اُنھیں کو فلک
جنھیں اس کے پینے کی عادت نہیں

تمھاری قسم میں تمھاری قسم
صداقت تو یہ ہے صداقت نہیں

محبت وہی ہے جو بے لوث ہو
غرض کی محبت، محبت نہیں

بہت ہیں چمن آشیاں کے لئے
خدائی کسی کی وراثت نہیں

وہی دکھ ہے دکھ اپنے گھر میں جو ہو
پرائی مصیبت مصیبت نہیں

بسر عمر کی جوش میں نے وہاں
ادب کی جہاں کوئی قیمت نہیں

عرش ملسیانی

افسانہ

# سراب

ڈاکٹر حامدی کاشمیری ایم۔اے پی ایچ ڈی

۲۹۹۔ جواہر نگر، سرینگر، کشمیر

۱۵ر اپریل ۱۹۹۷ء

پیارے بھائی! آداب

... آپ کی محبت کا کیا جواب ہو سکتا ہے! خدا کے فضل سے اب ہم اچھے ہیں۔ لیجئے تازہ افسانہ "سراب" حاضرِ خدمت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اور قارئین کو پسند آئے گا۔ جدید دور میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں انسان کا جذباتی کردار بھی نئے سانچوں میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ اس افسانے میں اسی موضوع کے ایک پہلو کی عکاسی کی گئی ہے۔ اپنی رائے ضرور لکھئے ... امید ہے افسانہ نمبر پوری آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آئے گا۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

آپ کا بھائی

حامدی کاشمیری

---

ناٹک اکادمی میں سپیشل آفیسر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے اُسے پندرہ بیس ہی دن ہوئے تھے اور وہ ابھی تک اُس نئے ماحول میں اپنے آپ کو اجنبی سا محسوس کر رہا تھا، لیکن اِس عرصے میں جو چیز اُسے بھائی تھی، وہ مس اُرملا کی شخصیت تھی، کتنی کشش اور جاذبیت تھی اُس کی شخصیت میں۔ اُس کے زردی مائل رُخساروں پر غم کی متانت تھی، اُس کے اُبھرے اُبھرے پپوٹے نیندوں سے بوجھل تھے، لیکن تھکی تھکی سی اپنی آنکھیں افسردہ اور بے خواب سی نظر آتی تھیں، اُس کی نگاہیں سامنے اور دائیں بائیں یوں اُٹھتیں، جیسے وہ بہت بلندی سے نیچے دیکھ رہی ہو، لپ اسٹک سے عاری اُس کے خشک ہونٹ نازک اور حساس تھے، اُس کا قد لمبا تھا، ہاتھ پاؤں لمبے لمبے، جو نسوانی نزاکت کے بجائے سختی کا احساس دلاتے اور جب وہ چلتی، اپنے اونچے شانوں پر اُلجھے اُلجھے بالوں کے سیاہ ریشمی انبار سنبھالے ہوئے، تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ایک سرو آزاد جھومتا ہوا چل رہا ہے، اُسے بارہا احساس ہوا تھا کہ وہ چل رہی ہے اور فضا اُس کے قدموں میں تڑپ رہی ہے اُس کی ایک نگاہِ غلط انداز کے لئے!

پندرہ بیس ہی دنوں میں اُس کی حالت اضطراب کی سی ہو گئی تھی، لڑکیاں اِن اور بھی تھیں، نازک اندام، شوخ و شنگ، آزاد خیال، ایک سے ایک بڑھ کر، کچھ سنگیت کے پروگراموں میں حصہ لیتی تھیں، کئی لڑکیاں ڈراموں میں پارٹ ادا کرتی تھیں اور جب بھی انھیں کسی کام سے اُس سے ملنے کی نوبت آتی تو وہ مسکراہٹ کے پھولوں کی بارش کرتیں، لیکن اُس کی آنکھیں اُن کی طرف اُٹھنے کی روادار بھی نہ تھیں، غالباً اِس لئے کہ وہ پہلے بھی عورتوں میں کام کر چکا تھا اور وہ کئی حسین چہرے دیکھ چکا تھا، لیکن مس اُرملا کی بات اور تھی، وہ نہ تو میوزک سیکشن اور نہ ڈرامہ سیکشن ہی سے وابستہ تھی، وہ آفس میں ٹائپ کے کام پر مامور تھی، اُس کے اُداس اور خاموش چہرے کی تمکنت نے پہلی ہی نظر کے بعد اُسے اُس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا تھا، وہ جب بھی اُس کے کمرے میں آتی تو وہ ایک عجیب سی بے نام سی بے چینی محسوس کرتا، اور ایک لمحے کے لئے وہ بھول جاتا کہ اُس نے کس مقصد کے لئے اُسے بُلایا تھا، فوراً اُسے احساس ہوتا کہ وہ اپنے جسم میں جاگی سی ہوئی اور سوئی سوئی سی تیز شعاعیں لے کر اُس کے سامنے کھڑی ہے اور وہ جلدی سے کسی قدر گھبراہٹ میں ٹائپ کا نیا کام سونپ دیتا، وہ چلی جاتی اور اُس کا چہرہ ویسا ہی خاموش ہوتا، جیسا کمرے میں داخل ہونے کے وقت تھا، لیکن اُس کے لہراتے ہوئے جسم پر خوبصورت ساڑی کی خوشبو کی لہریں کمرے میں پھیل جاتیں اور وہ سامنے ٹیبل پر رکھے پیڈ پر بے معنی سی لکیریں بناتے اور بگاڑتے ہوئے نہ جانے کن خیالوں میں بھٹک جاتا!

اُس دن وہ پرائم ہوٹل کے وسیع ہال میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ٹیبل پر تنہا بیٹھا تھا اور سگریٹ پھونک رہا تھا، شام ہو چکی تھی، بہت اُداس شام تھی اور ہوٹل کے ہال میں مدھم سی برقی روشنی میں اُداسی اور تنہائی کا احساس تیز ہو رہا تھا، ہال تقریباً خالی پڑا تھا، صرف ہال کے وسط میں ایک نوجوان ملٹری آفیسر ایک ادھیڑ عمر کی عورت سے مانو نیاز کی باتوں میں معروف تھا اور رہ رہ کر قہقہے لگا رہا تھا، عورت، ایک قیمتی ساڑی میں ملبوس تھی، اُس کے چہرے پر میک اَپ کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں اور ہونٹ لپ اسٹک سے انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔

اُس نے نفرت اور بیزاری سے اُن کی طرف دیکھا، کونٹر پر بیٹھا ہوا فربہ اندام منیجر ایک پرانے سے رجسٹر میں گم تھا، ہوا بند تھی اور گرمی اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ اُس نے زور سے سانس لی۔ اُس کی اُکتاہٹ بڑھ گئی تھی، آج دفتر میں بھی اُس کا دل نہ لگا تھا، عجیب بے چینی سی رہی، اُرملا آج لیو پر تھی اور دفتر کا ماحول بے رنگ اور مصنوعی سا محسوس ہوا۔ ایک مشین کی طرح وہ کاغذات کو دیکھتا رہا اور دستخط کرتا رہا۔

اِتنے میں ہال کا دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم انسان نیوی بلیو پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس ہال میں داخل ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے ایک دراز قامت عورت آئی، وہ دونوں گیلری کی سمت جانے لگے اور وہ ٹیبل پر پڑے ہوئے آج کے اخباروں کو پھر اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔

"معاف کیجیے، آپ یہاں بیٹھے ہیں! میں نے دیکھا اور چلی آئی۔"

"اوہ آپ!" وہ دراز قامت عورت میرے سامنے کھڑی تھی ——

مس اُرملا! اُس کے دمکتے ہوئے ماتھے پر پسینے کی ننھی بوندیں کانپ رہی تھیں۔

"جی ہاں ——" وہ آہستہ سے مسکرائی: "یہ میرے فرینڈ ہیں آنند جی، ربر فیکٹری چلاتے ہیں، کل ہی بمبئی سے لوٹے ہیں ——"

"اِن کی تعریف؟" آنند جی نے اپنے مصنوعی دانتوں کی نمائش کی۔

"آپ —— آپ ہمارے باس ہیں ——" وہ پھر مسکرائی۔

"واہ، یہ باس کی بھی خوب کہی، بھئی یہ دفتر نہیں، ہوٹل ہے۔ ہم دوستوں کی طرح مل رہے ہیں، بیٹھیے ——"

"اچھا تو آپ انھیں کا ذکر کر رہی تھیں؟ صاحب آپ تو قسمت والے ہیں، اُرملا آپ کی تعریفیں کرتی تھکتی نہیں۔"

یہ اُرملا کا ایک نیا رُوپ تھا۔

نیا رُوپ!

اُس کی آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔

ہم کافی پی رہے تھے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے سیاست، اقتصادیات، بڑھتی ہوئی آبادی، فیملی پلاننگ، [illegible] حیرت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا کہ اُرملا ہر موضوع پر بڑے اعتماد کے ساتھ [illegible] کے اظہارِ خیال کر رہی تھی۔ اُس کی معلومات کافی وسیع تھیں، بات بات پر وہ [illegible] اور کتابوں کے حوالے دیتی رہی، اُس کی یادداشت بھی غضب کی تھی [illegible] کے مالک تو بس ہوں ہاں کرتے رہے اور بیچ بیچ میں مصنوعی دانتوں کی [illegible] اُس سے کئی بار بحث پر اُتر آئی اور وہ اس وقت رُک گئی جب آنند جی نے [illegible] ہوئی سونے کی گھڑی دیکھی اور معذرت پیش کرتے ہوئے [illegible] سے اولڈ سٹی جانا ہے۔

وہ چلے گئے اور ٹیبل پر اُرملا اور وہ بیٹھے رہے۔

اُرملا خاموش تھی اور وہ سوچ رہا تھا وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے! بعض حقیقتوں پر تو خوابوں ہی کا گمان ہونے لگتا ہے!

شام کے لمحے رنگ اور خوشبو میں ڈوب رہے تھے!

"آج دن بھر دفتر میں طبیعت بوجھل سی رہی ——" اُس نے گفتگو کا ایک نیا رُخ نکالا۔

اُرملا نے خاموشی سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس کی آنکھوں میں اُداسی کا سُرمئی دُھواں سا اُٹھنے لگا تھا اور اُس کا سارا وجود کسی گہری سوچ میں گم ہو رہا تھا!

"اِس صدی کے ہر انسان کی زندگی بوجھل ہے، ہر لمحہ بوجھل ہے، میں سوچتی ہوں دل کی سچی خوشی کتنی نایاب ہے، ایک خیال ہے اور بس ——"

"آپ کو فلسفے سے لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔"

"کیسے معلوم ہوا آپ کو؟"

"آپ کی باتوں سے، معمولی سی بات کو بھی آپ Philosophise کرتی ہیں ——"

"میرے سوچنے کا ایک ڈھنگ ہے، آپ چاہیں تو اسے فلسفہ کہیں، [illegible] میں فلسفے کی سٹوڈنٹ نہیں رہی ہوں ——"

"کمال ہے! آپ سیریس ہو گئیں! میں تو یونہی کہہ رہا تھا ——"

"انسان زندگی کی یکسانیت سے اُکتا جاتا ہے، وہ تبدیلی چاہتا ہے، نہیں تو اُس کا ذہن مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے ——" اُرملا بغیر کسی تامل کے کہتی رہی، اُس کے چہرے پر خیالوں کی دُھند پھیل رہی تھی۔

اُس نے نیا سگریٹ سُلگایا اور اُس کے چہرے کو [illegible] نظروں سے دیکھتا رہا، وہ سوچ رہا تھا، اُرملا فلسفیوں کی طرح باتیں کرتی ہے تو کتنی پُرکشش معلوم ہوتی ہے، لیکن —— لیکن یہ کونسی عمر ہے فلسفہ طرازیوں کی، یہ عمر تو محبت اور شباب

کہ وہ اسرار گتھیوں میں کھو جانے کی ہے، یہ عمر تو شادی کی ہے، ازدواجی زندگی کے پُر ملیح وادیوں سے لطف لینے کی عمر!

اُرملا تم شادی کیوں نہیں کرتیں؟

اُرملا تم اتنی بے رحم کیوں ہو، دوست بنانے میں تو تمہارا کوئی ثانی نہیں اور جو تمہارے قریب آتا ہے وہ تمہارا دیوانہ بن جاتا ہے اور جب وہ تم سے شادی کی درخواست کرتا ہے تو تم بدل جاتی ہو اُسے ٹھکرا دیتی ہو، اُس سے نفرت کرتی ہو ---- اور -- اور ایک نیا افسانہ وجود میں آتا ہے، کتنے افسانے وابستہ ہیں تمہاری زندگی سے، سچی بات تو یہ ہے کہ تم اب ایک حقیقی کردار سے زیادہ افسانوی کردار معلوم ہوتی ہو ---- خوب!

لیکن کیا تمہارے سینے میں عورت کا نازک سا دل نہیں دھڑکتا؟

وہ اُس سے یہ ساری باتیں پوچھنا چاہتا تھا اُس نے طرح طرح کے افسانے اُس کے بارے میں سُن رکھے تھے اور جتنی باتیں وہ اس کے بارے میں سنتا وہ اُس میں اور زیادہ دلچسپی لیتا، وہ اُسے سمجھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا، داناؤں نے سچ کہا ہے کہ عورت کو سمجھنا کارِ دشوار والا معاملہ ہے، وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ ہماری دنیا میں ایسی عورت کی آزاد خیالی لوگوں کی برداشت سے باہر ہے اور جب اُن کی کچھ نہیں چلتی تو اپنی زبانیں بلا روک چلاتے ہیں اور ایسی ایسی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں کہ اُن کے تخیل کی داد دینا پڑتی ہے۔

اور اُرملا کہہ رہی تھی: ...

"آج میں سارا دن گھر میں قید رہی، ڈیڈی بیمار تھے، انھوں نے صبح سخت اصرار کیا کہ میں گھر ہی رہوں، اُن کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے ..."

"کیا تکلیف ہے انھیں؟"

"بلڈ پریشر ---- میں خود ڈاکٹر کو بلانے گئی، کیا کرتی، گھر میں کوئی اور ایسی ذمے داری کے قابل نہیں، سب کام مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں، حالات ہی کچھ ایسے ہیں، خیر جانے دیجیے ---- شام ہو رہی تھی، گھر میں میرا دم گھٹنے لگا اور میں نکل آئی، میں ہمیشہ گھر سے دُور بھاگتی ہوں، گھر میں مجھے وحشت ہوتی ہے ---- پارک روڈ پر آنند جی ملے، اچھے آدمی ہیں، بزنس ٹور شروع کر رہا ہے اور پھر یہاں آپ سے ملاقات ہوئی ----"

"کیوں نہ بلیوارڈ پر کچھ دیر کے لیے ٹہلا جائے، کیا خیال ہے؟"

"Good idea really!" اُس کے لہجے میں خوشی کی ایک لہر چمک اٹھی۔

آئینے کی طرح چمکتی ہوئی سڑک بجلی کے قمقموں کی روشنی میں انھیں ٹھنڈک لے گئی، سامنے درختوں کی گھنی چھاؤں سے چاند آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا، ہوا کے تازہ جھونکے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہے تھے۔

اُرملا شاخِ گل کی طرح لچکتی ہوئی، مہکتی ہوئی قدم بڑھا رہی تھی: اُس کی کمر کے گرد اُس نے اپنا دایاں بازو حمائل کیا تھا۔

اُس دن دفتر میں بہت گہما گہمی رہی، مدراس سے عورتوں کا ایک کلچرل وفد آیا تھا اور وہ دفتر میں چائے پر مدعو تھے، اُرملا کچھ دیر تک اُن کے پاس بیٹھی رہی، عورتوں کے ہجوم میں اس کی نظر اُرملا ہی پر مرکوز رہی۔

فوراً اُٹھ کر اُس کے پاس چلی آئی۔

"کیوں اُرملا، ہو چکی مہمان نوازی؟"

"مہمان ہی جان کر میں اتنی دیر تک اُن کے پاس بیٹھی رہی ---- سچی بات تو یہ ہے کہ عورتوں کی company میری برداشت سے باہر ہے، عورت کوئی بھی ہو، کہیں کی بھی ہو، سیدھی سادی عورت ہو یا کلاکار، سیاست داں ہو ---- بور ہوتی ہے، چند ہی موضوعات ہیں اُن کے ---- بچوں کی بیماریاں، گھر کے کام، کچن کی صفائی، سالن بنانے کے طریقے، کپڑوں کے نئے ڈیزائن، شوہر پر اپنی برتری ---- پٹی پٹائی باتیں، بوریت ----!"

"یہ نہ بھولو کہ تم بھی اسی طبقے کی ایک فرد ہو ----" وہ ہنس پڑا۔

"لیکن مجھے کبھی احساس نہیں ہوتا کہ میں بھی عورت ہوں ----" وہ سنجیدہ تھی: "بات یہ ہے کہ میں ہمیشہ عورتوں سے دور ہی رہی ہوں، یہاں تک کہ ممی سے بھی میں مانوس نہ ہو سکی، اصل میں ممی نے مجھے کبھی ماں کا پیار نہیں دیا، میری کائنات ڈیڈی تھے، انھوں نے میری پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، بچپن میں میں اُن کے پاس ہی سوتی، وہی مجھے جگاتے، نہلاتے، کپڑے پہناتے اور اسکول لے جاتے اور پھر میں برابر لڑکوں کے اسکول میں پڑھتی رہی، مردانہ کالج ہی سے میں نے بی۔اے کی ڈگری لی۔"

"یہی وجہ ہے کہ تم مردوں میں ایٹ ایز محسوس کرتی ہو اور عورتوں میں ---"

"عورتوں میں میری سانس گھٹتی ہے ----"

وہ شام انھوں نے ساتھ ہی کیبری میں گزاری۔

اُرملا اتنی تیزی سے اُس کے وجود پر چھا کر رہ جائے گی اُسے معلوم نہ تھا، وہ اُس کی روح کا ایک حصہ بن چکی تھی، اُس کے جسم کے ذرّے ذرّے میں رچ بس چکی تھی، وہ اب اُس کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا، اُسے لوگوں کی باتوں پر ہنسی آتی تھی، لیکن لوگوں کی باتوں کی کون پروا کرتا ہے، ابھی پچھلے اتوار کی بات ہے اُس کے ایک دوست نے اُرملا کے بارے میں ایک نیا انکشاف کرنا چاہا ----

"آپ کو نہیں معلوم، ان کا خاندان ہی کیا ہے؟ اس کی ماں بڑی فیشن ایبل بیوی ہے، ہائی سرکلز میں گھومتی ہے، کلب جاتی ہے اور بڑے لوگوں کے ساتھ مختلف میں ڈانس اور تفریح کرتی ہے۔ سنا ہے شوہر نے کھلی چھٹی دے رکھی ہے اور اُرملا بھی ——"

"لیکن مسٹر قطع کلام معاف، آپ کو معلوم ہے؟"

"کیا؟"

"اُرملا کی ماں اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"ہیں! —— بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کتنے لوگوں نے اُسے دیکھا ہے؟"

"آپ نے دیکھا ہے؟"

"نہیں تو —— ہاں لیکن ......"

اور اُس نے وسا کی بے بسی پر ایک پُر زور قہقہہ لگایا۔

اُسے پورا یقین ہو چکا تھا کہ جس عورت کی رفاقت کے لئے کئی برسوں سے وہ ترس رہا ہے، وہ اُرملا ہے، ابھی ابھی وہ یہاں سے گھر لوٹ چکی ہے اور اُس کے آس پاس ابھی تک اُس کے خوشبوؤں میں بسے ہوئے بدن کے مہکتے سائے سرسرا رہے ہیں، وہ اپنے بازوؤں پر ابھی تک اُس کے اُلجھے اُلجھے خوشبودار بالوں کے ریشمی بوجھ کو محسوس کر رہا ہے، اُس کی آنکھوں کی حیات افروز چمک، اُس کی باتیں، اُس کی خاموشی ......

"اُرملا" اُس کی رُوح پکار رہی تھی، "ٹھہرو، کہاں جاتی ہو، تمھیں کیا معلوم، تمہارے بعد میری کیا حالت ہو جاتی ہے۔ میں اضطراب کی آگ میں جلتا ہوں اور تم چلی گئی ہو اور میرا کمرہ تمہارے ہاتھوں کے لمس سے جگمگا رہا ہے۔ تم نے ہر چیز قرینے سے رکھی ہے، میرے کپڑے ہینگروں پر ٹانگ دئے ہیں، ٹی سیٹ الماری میں آئینے کی طرح چمک رہا ہے، تم ہر چیز میں بسی ہو، لیکن تم نہیں ہو —— یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میری زندگی کب سے ویران ہے، زندگی کے [illegible] برس بیت گئے اور میرا گھر ابھی تک ویران ہے۔ مجھے اب تنہائی سے ڈر معلوم ہوتا ہے اور زندگی پھیکی پھیکی سی بے جان معلوم ہوتی ہے۔ در و دیوار ویران نظر آتے ہیں [illegible] دھواں اُڑ رہی ہے اور میری سانسیں گھٹ رہی ہیں۔ ڈیڈی سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے اور ممی تو یہی حسرت لے کر چل بسیں، لیکن [illegible] اور تمہاری زندگی کے بارے میں میری ساری دلیلیں اور فلسفہ [illegible]

[illegible] ہیں رنگ چھائے [illegible] میں آج ہی ڈیڈی کو خط [illegible] شادی کی تاریخ مقرر کر دیں، کتنی مدت ہو گئی انھیں ہاں ہے مجھے اُرملا کی نوکری پسند نہیں، [illegible] لڑکیاں دکھتی ہیں کل جب میں نے اُس کی [illegible] اپنے [illegible] آنکھیں بھیگ گئیں [illegible] کہا اُرملا [illegible] اُرملا، اب تم یہ نوکری چھوڑ دو، تمھیں شادی سے پہلے ہی

ڈر ہے کہ تمہارے بچے بڑی ہو کر ——

اُس کا دل بے حد مسرور تھا اور اُس نے [illegible] روشن کیا۔

اتوار کو اُس نے ایک نیا سوٹ پہنا [illegible]

وہ اُسے جس دن کی [illegible] سے آگاہ کر چکا تھا۔

اور دوسرے دن اُرملا سے [illegible] کی [illegible]

ایک خوبصورت سی کوٹھی کے [illegible] سے بنگلے میں داخل ہوا۔ بنگلے کی دیواریں بہت پرانی ہو چکی تھیں [illegible] کی منتظر تھی۔

وہ ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ اُرملا کسی کام سے باہر گئی اور اُس نے دیکھا [illegible] لگا ہوا ہے لیکن اب وہ کسی قدر بوسیدہ ہو چکا تھا، کھڑکی کے [illegible] چکا تھا، لکڑی کی منقش چھت [illegible] چند تصویریں اخروٹ کی لکڑی کے فریموں میں لگی ہوئی تھیں [illegible] کھلونے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔

چند لمحوں میں چائے آ گئی۔

وہ چائے پیتے رہے اور اُرملا کہتی رہی [illegible] گئے تک وہ کتابوں میں کھوئی رہتی ہے، اُس کی [illegible] گڑیاں بیتی تھی، لیکن اب وہ بھی بے اثر ہونے لگی ہیں [illegible] کٹ جاتی ہیں۔

وہ دونوں اصل موضوع [illegible]

وہ چائے پی چکے تھے [illegible]

ٹوسٹ بہت لذیذ [illegible]

پوچھ ہی لیا۔

[illegible]

تھا

[illegible]

ایک [illegible]

مقامِ سوال نے کچھ بھرایا اور پیچھے دروازے سے ایک معمر آدمی،
جھریوں بھرے چہرے پر جھریوں کا جال لئے ہوئے، لمبی سی ناک پر طلائی رنگ کے موٹے فریم کا چشمہ لگائے، منقش لاٹھی کے سہارے اندر آگئے۔

"ان سے ملئے، میرے ڈیڈی ——— اور آپ ہیں کمار صاحب ——"

وہ سامنے کی کرسی پر احتیاط سے بیٹھ گئے اور چشمے کے اوپر سے اندر کو دھنسی ہوئی اور گھستی آنکھیں اُسے نظر آئیں، اُن کے بال چاندی بن چکے تھے، بھویں اور مونچھیں بھی سفید ہو چکی تھیں، اُن کے دائیں ہاتھ پر رعشہ طاری تھا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی"

وہ خالی خالی نظروں سے اُسے گھورتے رہے اور چپ رہے۔

وہ سٹپٹایا!

"ڈیڈی ذرا اونچی آواز میں سنتے ہیں، کچھ ———" اُرملا بولی۔

اور پھر وہ کافی اونچی آواز سے بولتا رہا اور وہ بھی ٹھہر ٹھہر کر سرگوشیوں میں بولتے رہے ... معلوم ہوا کہ وہ دس بارہ سال پہلے ریٹائرڈ ہو چکے ہیں، تحصیلدار کے عہدے پر فائز رہے ہیں، جوانی میں بڑے ٹھاٹھ تھے، انھوں نے بنگلہ بھی بنوایا، ایک کار بھی رکھی تھی، لیکن اب وہ گیرج میں بیکار پڑی ہے، اُرملا انھیں بے حد عزیز ہے اُن کی کائنات۔ اُن کی آنکھوں کی روشنی! اُرملا کو وہ بیٹا سمجھتے ہیں ——— اس کے بعد وہ زمانے کی شکایتوں پر اتر آئے، آجکل قیمتوں پر کنٹرول نہیں، روپیہ ہاتھ میں آکر ہوا ہو جاتا ہے، ایک زمانہ وہ تھا کہ نوسے روپے اُن کی تنخواہ تھی، ہر چیز میسر تھی، اور آجکل کے زمانے میں جینا مشکل ہو گیا ہے ———

وہ سنتا رہا ......

اُرملا کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ دانتوں سے اُنگلی کا ناخن کاٹ رہی تھی۔

وہ کمرے سے نکلے، خاموشی کرب انگیز ہو گئی۔

دوسرے لمحے چست لباس میں ملبوس تقریباً پچیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی بزنس پالش مسکراہٹ کے ساتھ کمرے کے اندر آئی اور پھر دوسری لڑکی، پھر تیسری ... وہ صوفوں پر بیٹھ گئیں، کمرہ حسن رنگ اور خوشبو سے بھر گیا!

"یہ نیلما ہے ... کالج میں پڑھتی ہے، آپ کو دیکھنے کی بہت خواہش رکھتی ہے، ڈراموں میں حصہ لیتی ہے، پچھلے سال اسے گولڈ میڈل مل چکا ہے اور یہ نیلما، اس سال دسویں کے امتحان ... ہے وہ نیلما کو ... آنکھوں میں ... بھی کر ...

میڈیکل سیٹ نہیں مل سکی اور یہ پروفیسٹ کے طور پر گھر میں بیٹھی ہے ——— کہتی ہے اگر مجھے ڈاکٹری کی سیٹ نہ ملی تو میں سیوسائیڈ کر لوں گی ——— پگلی! تاحشر شباب کا مکمل نمونہ ہے، بال ترشے ہوئے، اُس کے اُبھرے ہوئے نقرئی سینے کا بیشتر حصہ کھلا تھا۔

مائی گاڈ! ——— خوبصورت لڑکیوں کا یہ ہجوم! یہ کون ہیں ہمکلا کی سہیلیاں؟ نہیں تو ... اس کی ——— کیا ڈرامہ ہو رہا ہے یہ! — اور یہ کردار ——— ؟

"یہ میری بہنیں ہیں، کمار صاحب!"

"بہنیں؟"

"جی ہاں، سگی بہنیں" اُرملا کا لہجہ سنجیدہ تھا، اُس کے چہرے پر پریشانی تھی، اُس کی آنکھوں کی شگفتگی بجھ چکی تھی "ہمارے گھر میں ڈیڈی ہیں جن سے آپ مل چکے ہیں اور ہم چار بہنیں ہیں، ممی ہم سے بچھڑ چکی ہیں، میں عمر میں سب سے بڑی ہوں، ڈیڈی مجھے بیٹا کہہ کر پکارتے ہیں، وہ کبھی تسلیم نہیں کرتے کہ میں لڑکی ہوں ——— کوئی اُن کے سامنے کہے تو ناراض ہو جاتے ہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود یقین نہیں آتا کہ میں لڑکی ہوں ——— میں مردوں کی طرح نوکری کر رہی ہوں، لڑکی ہونے کے باوجود کر رہی ہوں، مہینے کی ہر پہلی کو ڈیڈی برآمدے پر میرے منتظر رہتے ہیں، وہ دوپہر ہی سے میری راہ دیکھتے ہیں اور جب میں آتی ہوں ساری تنخواہ اُن کی کانپتی ہوئی ہتھیلیوں میں تھما دیتی ہوں ——— عجیب چکر ہے!"

وہ اچانک خاموش ہو گئی!

اور ڈرامے کے کردار ایک ایک کرکے خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔

اور شام کو جب وہ اپنے مکان کی طرف لوٹ رہا تھا تو وہ سوچ رہا تھا اُرملا کی شخصیت کتنی تہہ دار ہے، کتنی کمپلکس، ایسی عورت کو سمجھنے کے لئے ایک عمر ہونی چاہئے اور ... بھاگتی ہوئی زندگی میں اتنی فرصت کسے نصیب ہوگی ———

اُس نے ایک لمبی سانس لی اور وہ مطمئن ہو کر چلنے لگا۔

شام ... ویران سایوں میں اُس کا راستہ لمبا ہوتا جا رہا تھا!

---

رسالہ نہ ملنے کی شکایت ... (۲)

... میری ... میری زندگی
... اور ... بھی ——— میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک سورج

# نغمہ

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور، ایم۔اے، ایم۔او۔ایل، پی ایچ۔ڈی

زہے قسمت برسنا اشکِ خوں کا کم نہیں ہوتا
غمِ جاناں بدخشاں ریز ہو تو غم نہیں ہوتا

دکھاتے ہیں وہ اپنا عالمِ بے پردگی دل میں
جہاں کچھ بھی نظر آلودۂ عالم نہیں ہوتا

ہمارے عشق کو دشواریاں درکار ہیں یارب
یہ دریا تیز رَو بے جادۂ پُرخم نہیں ہوتا

نئی تہذیب زائد مشعلیں ناحق جلاتی ہے
بھٹکنے کے لئے اتنا اندھیرا کم نہیں ہوتا

ڈبو دی آبرو سوزِ جگر نے دیدۂ تر کی
یہ کیا رونے میں رونا ہو کہ دامن نم نہیں ہوتا

بجز بے حاصلی اس بحثِ لاطائل سے کیا حاصل
نزاعِ باہمی کا فیصلہ باہم نہیں ہوتا

غریبوں ہی میں بٹتی ہے غمِ ایام کی دولت
امیروں کے لئے یہ ورثۂ آدم نہیں ہوتا

بہارِ جلوہ آرا سے عبث منسوب ہے شورش
جنونِ شورساماں کا کوئی موسم نہیں ہوتا

جوانی کے سوا روتے ہیں سب تا زندگی جس کو
کسی کا کچھ زیادہ دیر تک ماتم نہیں ہوتا

وہ کب ہوتا ہے تیرے رمزِ نامکشوف سے واقف
جو اپنے منکشف اسرار کا محرم نہیں ہوتا

شراب و ساقی و مطرب میسر ہیں ہمیں انور
خدا رکھے یہاں کس روز جشنِ جم نہیں ہوتا

منوہر سہائے انور
۱۱/م مالویہ نگر نئی دہلی

افسانہ

# اجی بس شکریہ

مہندر ناتھ۔ بی۔ اے

۱۵، چیمبر بلڈنگ، مادھوداس پاستا روڈ، دادر، بمبئی ۱۴

۱۰ راپریل ۱۹۶۷ء

جناب خوشتر صاحب! آداب

آپ کا محبت نامہ ملا۔ کھول کر پڑھنے لگا تو پڑھا نہ گیا۔ کمبخت بینائی اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ عینک کے بغیر کچھ پڑھا نہیں جاتا۔ عینک کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پتہ چلا کہ عینک غائب ہے! لیجئے آنکھوں کے ہوتے ہوئے اندھے ہو گئے! بمبئی میں جیب کتروں کی بھرمار ہے۔ بس چاروں طرف خدا کی مار ہے! اب افسانہ نمبر کے لئے افسانہ کیسے لکھا جائے؟ آپ کے اصرار کا اندازہ کر کے پڑوسی کی طرف رُخ کیا۔ عینک مانگی اور افسانہ لکھا اور اب افسانہ نمبر کے لئے بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے افسانہ آپ کو پسند آجائے۔ ورنہ دوسرا افسانہ لکھنے کے لئے ایک اور عینک بنوانی پڑے گی۔ جب تک افسانہ نمبر مارکیٹ میں آجائے گا! میرا شکریہ ادا نہ کیجئے گا، میرے پڑوسی کو دعا دیجئے گا۔ جس نے مجھے چند گھنٹوں کے لئے آنکھیں دیں۔ آج معلوم ہوا کہ آنکھوں سے بڑھ کر اِس دُنیا میں اور کوئی چیز نہیں!

آپ کا ——— [دستخط]

جب ذکیہ اور انور کی پہلی ملاقات ہوئی تو دورانِ گفتگو میں انور، ذکیہ کی بے باکی سے بے حد متاثر ہوا۔ یوں اُس وقت ذکیہ کے پاس اُس بے باکی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اگر ہوتا تو انور اُس سے ضرور متاثر ہوتا۔ دونوں نے ایک حماقت ضرور کی تھی۔ دونوں اِس فلمی دُنیا میں قسمت آزمانے آئے تھے۔ ذکیہ ایکٹرس بننے آئی تھی، انور رائیٹر! دونوں نے شکستِ فاش کھائی۔ یوں دونوں کو کام ملتا تھا لیکن زندہ رہنے کے لئے۔

"آپ کو میں نے کہیں دیکھا ہے ضرور!" جس طرح انور نے یہ فقرہ کہا اُس سے ادیبانہ رنگ جھلکتا تھا۔

"کسی فلم میں دیکھا ہوگا آپ نے؟"

"ہاں۔ ہاں، کسی فلم میں دیکھا ہے آپ کو۔ فلم کا نام تو بھول گیا اِس وقت، لیکن غضب کا کام تھا آپ کا۔ واہ۔ واہ! جان ڈال دی تھی آپ نے!"

"شکریہ! آپ کیا کرتے ہیں؟"

"کہانی نویس ہوں۔ فلموں کے مکالمے لکھتا ہوں۔ ابھی تک قسمت کا ستارہ نہیں چمکا۔ ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ اگر کوئی فلم سیٹ ہو گئی تو سمجھئے پو بارہ! کہاں رہتی ہیں آپ؟"

"باندرہ ——— اور آپ؟"

"اجی کیا عرض کروں ذکیہ صاحبہ! بمبئی میں کام تو مل جاتا ہے، لیکن رہنے کے لئے معقول اور مناسب جگہ نہیں ملتی۔ دس سال سے مکان کی تلاش میں سرگرداں ہوں لیکن ابھی تک رہنے کے لئے کوئی اچھا مکان نہ ملا۔ اِس عرصے میں کئی مکان بدل چکا ہوں۔ آج کل ایک دوست کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا کام کچھ ایسا ہے ذکیہ صاحبہ! کہ مجھے لکھنے کے لئے سکون چاہئے۔ ماحول خوشگوار ہو، شور و غل کم ہو۔ تنہائی ہو، تاکہ میں چُپ چاپ بیٹھ کر سوچ سکوں اور پھر لکھوں اور ایسی فلمی کہانی لکھوں کہ فلمی دُنیا میں ایک تہلکہ مچ جائے۔ جس سے میری زندگی بنے اور میری زندگی کے ساتھ کسی اور کی بھی ——— میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک ——— سورج

طلوع ہوتا ہے تو کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے منور ہو جاتا ہے۔"

"واہ واہ! انور صاحب! آپ تو پیدائشی ادیب معلوم ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر ذکیہ نے انور پر ایک نگاہ التفات ڈالی۔ انور خوبرو تھا۔ ذکیہ سے زیادہ پڑھا لکھا، زیادہ مہذب، باسلیقہ اور ادیب بھی تھا اور سنا گیا ہے ادیب بڑے HUMAN ہوتے ہیں!

آج کل بچارا گردش میں کھا رہا ہے۔ کیوں نہ اس کی مدد کی جائے "آپ ہمارے ہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ میرے پاس تین کمرے ہیں۔ ایک کمرہ آپ کو دوں گی۔"

"کتنا کرایہ دینا پڑے گا؟"

"پچاس روپے۔"

"منظور! آپ نے ایک بہت بڑے مسئلے کو حل کر دیا۔ گھر کا پتہ بتائیے تاکہ جلد ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔" ذکیہ نے گھر کا ایڈریس بتایا۔ انور نے ڈائری میں نوٹ کیا۔ آداب بجا کر جانے کی اجازت مانگی۔

---

چند دنوں کے بعد انور اپنا سامان لے کر ذکیہ کے گھر آگیا۔ دو مہینوں کا کرایہ پیشگی دیا۔ انور کو یہاں آکر معلوم ہوا، ذکیہ کے ساتھ اس کی ماں رہتی ہے اور اس کی ایک بیٹی بھی، جو کسی دفتر میں نوکر ہے۔ ذکیہ نے انور کا سامان دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ انور کی معقول آمدنی نہیں۔ بس گزارے والی بات ہے۔ پھر بھی انور میں کام کرنے اور آگے بڑھنے کی تمنا تھی۔ اس سے پہلے اس کی زندگی میں جتنے آدمی آئے تھے، ان سے انور زیادہ پڑھا تھا، زیادہ مہذب اور باسلیقہ تھا۔ اور پھر انور ادیب تھا۔ سنتے ہیں، ادیب بہت حساس ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتے ہیں۔ بہت نازک مزاج اور ذکی الحس ہوتے ہیں۔ نہ جانے ذکیہ کے دل و دماغ میں یہ خیال کیسے جاگزیں ہوا کہ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آجائیں تو مستقبل میں ایک خوشگوار اور باعث فخر زندگی کا آغاز ہو سکتا ہے۔

شاید انور نے بھی کچھ سوچا ہوگا۔ فلمی دنیا میں جدوجہد کرنے کے بعد اس نے دیکھ لیا کہ چوٹی پر پہنچنے کے لئے بہت وقت لگے گا اور یہ ضروری نہیں کہ ہر ادیب بام عروج پر پہنچ جائے۔ حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا ہوگا۔ اگر ذکیہ سے راہ و رسم بڑھائی جائے تو کیا ہرج ہے۔ گو عورت ذرا گنوار سی ہے، منہ پھٹ ہے اور ادھیڑ عمر کی ہوگی۔ پھر بھی کماتی تو ہے۔ تین کمرے کا فلیٹ ہے اس کے پاس۔ اس عورت کو باسلیقہ اور مہذب بنایا جا سکتا ہے۔ ذرا محنت کرنی پڑے گی۔

انور نے اپنے چھوٹے سے کمرے کو سجا لیا۔ ایک پلنگ، ایک تپائی، کتابوں کی الماری، دو ٹرنک، ایک شلف، چند گلاس، ایک صراحی [illegible] اس کا سرمایہ حیات تھیں۔ یہی پونجی تھی اس کے [illegible] ایسی کہانی لکھنا چاہتا تھا جو انقلاب برپا کر دے اور [illegible] وہ سکون کا متلاشی تھا۔ اسے اس کمرے میں [illegible] مل گیا۔

اکثر ذکیہ اس کے کمرے میں آتی اور بہت بے تکلفی [illegible] سامنے بیٹھ جاتی۔ روکھے بال، ڈھیلے ڈھالے کپڑے، باتیں [illegible] قہقہہ لگاتی۔ نسائیت تو نام کو بھی اس میں نہ تھی۔

"چائے بنواؤں؟"

"جی نہیں۔"

"اسے اپنا ہی گھر سمجھئے۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

ذکیہ نے شلوار کا پائنچہ اونچا کیا اور اپنی پنڈلی پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ پنڈلی بے حد صاف اور شفاف تھی۔ گوری گوری اور رخساروں سے زیادہ ملائم نظر آتی تھی لیکن یہ حرکت بہت غیر شاعرانہ اور ناشائستہ تھی۔

"آپ کھانا ہمارے ہاں کیوں نہیں کھاتے؟ بلقیس بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں۔"

"کھانا آپ کیوں نہیں پکاتیں؟"

"آپ ہی بتائیے! میں اتنے کام کیسے کر سکتی ہوں۔ سٹوڈیو میں جانا پڑتا ہے، پروڈیوسروں سے ملنا پڑتا ہے کام ڈھونڈنے کے لئے۔ پھر کام کر کے اس کے دام وصول کرنا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے صاحب! اس کا تجربہ تو آپ کو ہوگا۔ میں کھانا جانتی ہوں، کھانا پکانا نہیں جانتی۔"

"ہاتھ بٹانے میں کیا ہرج ہے۔ بچاری بوڑھی ہیں، اتنا کام کیسے کرتی ہوں گی؟"

"بس کر لیتی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے ذکیہ نے دونوں پاؤں کرسی پر رکھے اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

انور نے ذکیہ کو اس پوز میں دیکھا تو آپے سے باہر ہو گیا۔

"معاف کیجئے گا۔ اگر میں کوئی گستاخی کروں؟"

"شوق سے کیجئے! میں تو اس کے انتظار میں ہوں۔"

"دیکھئے، عورتوں کو اس طرح نہیں بیٹھنا چاہئے مردوں کے سامنے۔ عجیب سا معلوم ہوتا ہے مجھے۔ میں اس خاندان میں پلا ہوں جہاں شائستہ اور تہذیب لڑکیوں کی سب سے بڑی صفت ہوتی ہے۔ تمیز سے بات کرنا، سلیقے سے

اتنا بیٹھنا لکھنے کا فرض ہوتا ہے جسے آپ نے مردوں کو ملت دے دی۔ ذرا تمیز سے بیٹھیے۔"

ذکیہ نے دونوں ٹانگیں نیچے کر لیں۔

"آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں۔ میں آپ کی صحبت میں بہت کچھ سیکھ لوں گی۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہر روز آپ کا کمرہ صاف کر دیا کروں۔"

"کمرہ ضرور صاف کیجیے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ کوئی سامان پر ہاتھ نہ صاف کر جائے۔ آپ میرے موڈ اور مزاج کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میں ادیب ہوں، بے حد حساس ہوں۔ اگر کمرے میں میری مرضی کے مطابق چیزیں نہ رکھی جائیں تو موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ میں کام نہیں کر سکتا۔ اس لیے کمرہ صاف کرتے ہوئے اس بات کا دھیان رکھیے کہ جو چیز جہاں پڑی ہوئی ہو وہیں رکھی جائے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔"

"میں لکھنے کے موڈ میں ہوں اس وقت۔"

"تو لکھیے، روکتا کون ہے۔"

"جب کوئی میرے سامنے بیٹھا ہو تو میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا۔"

"چلیے میں آپ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جاتی ہوں۔"

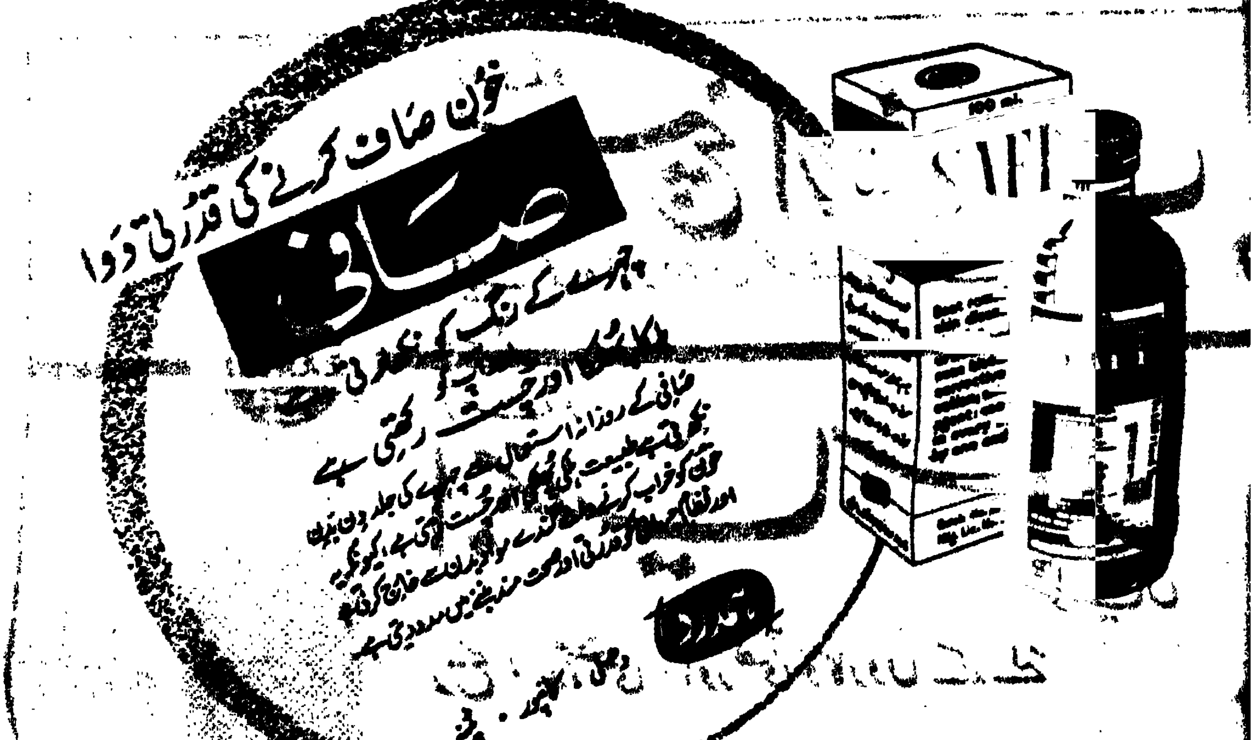
"ذکیہ صاحبہ! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، بخدا اسے مذاق نہ سمجھیے۔ لکھنا بچوں کا کھیل نہیں۔ میں ادیب ہوں کوئی چمار نہیں کہ سب کے آگے جوتیاں گانٹھتا پھروں! ادیب قوم کے معمار ہوتے ہیں۔ قلم کی جنبش سے قوموں کی قسمت بدل دیتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے چشمے انہیں سے پھوٹتے ہیں۔ میں اس قوم کا فرد ہوں جس کے آگے بڑے بڑے بادشاہوں اور شہنشاہوں نے سر جھکایا ہے۔ آپ میری بات مانیے جس طرح میں کہتا ہوں کیجیے گا۔ اس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور میری بھی۔"

اس چھوٹی سی تقریر نے ذکیہ کے ذہن پر بہت اچھا اثر ڈالا۔

"آج سے جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی میں کروں گی۔" یہ کہہ کر ذکیہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

---

ذکیہ کی اماں نے ایک دن کہہ دیا تھا: "بیٹی! تم نے زندگی کی اونچ نیچ دیکھ لی۔ اب تم عمر کے اس حصے میں ہو جب تمہیں ایک اچھے انسان سے شادی کر لینی چاہیے۔ چند سالوں کے بعد بوڑھی ہو جاؤ گی۔ پھر کوئی نہ پوچھے گا تمہیں۔ یہ لڑکا برا نہیں، پڑھا لکھا ہے، مہذب ہے۔ تمہیں سے بات کرتا ہے ... اس کے ساتھ



شادی کر لوگی تو زندگی سنور جائے گی تمہاری۔"

اِس شاندار، دلکش اور دلفریب مستقبل کو مدِّنظر رکھ کر ذکیہ نے اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کی۔ جیسا انور نے کہا، اُس نے کیا۔ انور نے چند ایسی باتیں کہی تھیں جن پر عمل کرنا آسان نہ تھا۔ مثلاً ذکیہ کھلکھلا کر نہ ہنسے۔ مردوں کے ساتھ گپیں نہ ہانکے۔ شرم و حیا کو مدِّنظر رکھ کر بات کرے اور مردوں کی طرح چلنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا بے حد معیوب ہے۔ نسائیت تو عورت کی سب سے بڑی صفت ہوتی ہے۔ اسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اور جب تک عورت تہذیب اور سلیقے کے دائرے میں رہ کر بات کرتی ہے تو مرد کو ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔ اِس لئے جب کبھی کوئی چیز پیش کی جائے تو جھک کر آداب کرو اور پھر چپکے سے بیٹھ جاؤ یا چلی جاؤ۔ بس اِس طرح کی چند اور باتیں تھیں، جن پر ذکیہ نے چلنے کا قصد کر لیا۔

---

ایک رات جب موسم بڑا پیارا پیارا تھا۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا اور ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اور ذکیہ نے آئینے کے سامنے دو گھنٹے کھڑی ہو کر بالوں کو آراستہ کیا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ انور اُسے دیکھے، اُس کے بالوں کی تعریف کرے، اور جب اُسے اِس بات کا پکا یقین ہو گیا کہ انور اِدھر نہ آئے گا تو وہ سیدھی انور کے کمرے کی طرف چلی۔

انور نے اُس کی طرف دیکھا اور اُس کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں۔

"اندر آنے سے پہلے دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے کہ نہیں؟"

"دروازہ تو کھلا تھا!"

"پھر بھی اندر آنے سے پہلے دروازہ کھٹکھٹا لینا چاہئے۔ تہذیب کے یہی اصول ہیں۔"

"آپ نے پہلے نہیں کہا۔"

"کیا ہر بات بتائی جاتی ہے۔ میں آپ کو اتنا جاہل نہیں سمجھتا تھا؟"

"معاف کیجئے غلطی ہو گئی۔"

"پھر اِس طرح کی غلطی نہ ہو۔ میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ میں اِس وقت ایک کہانی سوچ رہا تھا اور کلائمکس تک پہنچ گیا تھا کہ آپ تشریف لے آئیں۔ سارا معاملہ چوپٹ کر دیا آپ نے! اور کس نے کہا تھا آپ کو اِس طرح کے بال بنانے کے لئے؟ بالکل بھوتنی نظر آتی ہیں آپ!"

"یہ بال آپ کو پسند نہیں؟"

"بالکل نہیں! معاف کیجئے گا۔ ابھی تک میری اور آپ کی شادی نہیں ہوئی! اگر شادی ہو جاتی اور میری اماں آپ کے بال دیکھتیں تو اُسی وقت وہ اپنے سر کے بال نوچ لیتیں۔ اچھا ہی ہوا ابھی تک شادی نہیں ہوئی ورنہ ——" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

ذکیہ تو اس لئے آئی تھی کہ انور اس کے بالوں کو دیکھ کر اس کی تعریف کرے گا، وہ میٹھے بول بولے گا، پیار سے بٹھائے گا، دل کی باتیں سنائے گا، کہے گا یہ کیسا پیار ہے، یہ کیسی محبت ہے! یہ کیسی اُلفت ہے! جہاں انسان اپنے دل کی بات نہ کہہ سکے۔ وہ کیسا عاشق تھا ـــــ عاشق تھا یا معلم۔ چلئے صاحب انور اُس سے عشق نہیں کرتا۔ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اُس کا ہونے والا خاوند ہے! کیا ایسے خاوند کے سامنے کبھی بیوی کو بات کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ کیا وہ اپنے منہ کو سی لے؟ اپنے جذبات کا خون کرے؟ کیا تہذیب و تمدن کے چشمے اسی انسان سے پھوٹتے ہیں؟ باقی سب لوگ جاہل اور احمق ہیں؟ کیا بات یوں سمجھائی جاتی ہے کیا وہ واقعی ذہین نہیں ہے؟ وہ اتنے دنوں تک بھاڑ جھونکتی رہی؟ میرے حضور! اگر سمجھانا ہے تو سلیقے سے سمجھائیے ـــــ وہ سوچتی رہی اور اُس کا دماغ آتشیں ہوتا گیا۔ یہ کہاں کا ادیب ہے، کس ملک کا باشندہ ہے! کیا صرف ادیب ہی حساس ہوتا ہے اور دوسرے لوگ حساس نہیں ہوتے؟ ذکیہ نے پھر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا۔ بہت دور چاند نظر آیا۔ وہ چاند کو دیکھ کر چپ ہو گئی۔ پھر اُس نے تہیہ کیا کہ وہ ایک نئی عورت بن کر انور سے ملنے آئے گی اور اُسے شکایت کا موقع نہ دے گی۔

---

ایک دو بار وہ انور کے ساتھ گھومنے گئی اور گھومتے پھرتے ہوئے اُس نے آئس کریم کی فرمائش کی۔ انور حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا: "راہ چلتے آئس کریم نہیں کھاتے۔ یہ بچوں والی عادتیں چھوڑ دیجئے!"

راہ چلتے ذکیہ کے ایک اور واقف کار مل گئے۔ ذکیہ اُن سے باتیں کرنے لگی۔ جب انور کے قریب پہنچی تو انور غصے سے بھنّایا ہوا تھا۔

"اسی لئے میں آپ کو اپنے ساتھ نہیں لاتا۔ آپ کو میرے ساتھ چلنے کی تمیز ہی نہیں!"

"ہوا کیا؟"

"آپ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟"

"یہ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اور سٹوڈیو میں کام کرتے ہیں۔"

"میں تو انھیں نہیں جانتا۔ میں نے انھیں سٹوڈیو میں جھاڑو دیتے ہوئے دیکھا ہے! یہ گھٹیا قسم کے لوگ ہیں اور آپ ایسے لوگوں سے گفتگو کر رہی تھیں۔"

"بات کرنے میں کیا ہرج ہے۔ آخر یہ لوگ بھی انسان ہیں!"

"مگر یہ باریک نکتہ آپ کی سمجھ میں آجائے تو آپ بھی عقل مند ہو جائیں۔ آپ واقعی جاہل ہیں!" انور نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"چلئے گھر!" ذکیہ نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

اگلے دن عید تھی۔ ذکیہ نے ریشمی ساڑی پہنی اور بالوں کو آراستہ کیا اور سوئیاں لے کر انور کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"عید مبارک!"

"دروازہ نہیں کھٹکھٹایا آپ نے؟"

"معافی چاہتی ہوں! لیجئے سوئیاں!"

"میز پر رکھئے۔"

"کھائیے نا!"

"کھا لوں گا۔ جلدی بھی کیا ہے؟"

"میں کیسی لگتی ہوں؟"

"بہت بُری! آپ ساڑی میں بالکل اچھی نہیں لگتیں!"

"کس لباس میں اچھی نظر آتی ہوں؟"

"قمیص اور شلوار میں۔"

"ابھی پہن کر آتی ہوں۔" وہ جانے لگی۔

"جانے سے پہلے یہ بتائیے، میز کے قریب جو ماچس کی تیلی پڑی ہوئی ہے وہ کس نے پھینکی؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"کمرہ آپ نے صاف کیا تھا؟"

"ہاں!"

"پھر یہ تیلی کیوں نہیں اُٹھائی؟"

"بس نظر نہیں پڑی۔"

"یہ چادر آپ نے بچھائی تھی؟"

"جی ہاں!"

"یہ شکنیں دیکھیں آپ نے؟"

وہ شکنیں درست کرنے لگی۔

"اِس وقت رہنے دیجئے گا۔"

"یہ گلاس آپ نے رکھا تھا؟"

"جی ہاں!"

"میں گلاس ہمیشہ میز پر رکھتا ہوں۔ آپ نے اسے الماری پر کیوں رکھا؟"

"معافی چاہتی ہوں!"

"اور یہ کتاب میں نے بک شلف پر رکھی تھی اور آپ نے اسے میز پر رکھا! کیوں؟"

"میں کہتا ہوں آپ کچھ نہیں سیکھ سکتیں!"

"سیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"آپ نہیں سیکھ سکیں گی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ ذہین نہیں ہیں۔ معاف کیجئے، اگر میں صاف بیانی سے کام لوں اور یہ کہہ دوں کہ آپ ڈفر ہیں ڈفر!"

ذکیہ کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ذکیہ نے اُس وقت یوں محسوس کیا، اگر اس وقت اُس نے جواب نہ دیا تو اُس کا کلیجہ پھٹ جائے گا اور وہ پاگل ہو جائے گی ——!

"حضور ہنسئے اور کان کھول کر سُنئے۔ نو مہینوں سے آپ کی بکواس سُن رہی ہوں!"

"بکواس؟" انور چلّایا۔

"ہاں۔ ہاں بکواس! آپ مجھے مہذّب بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں! شاید آپ مجھ سے پیار کرتے ہوں، جس کا مجھے یقین نہیں آتا! اگر آپ کو مجھ سے ذرا بھی پیار ہوتا، مجھ سے شادی کرنے کی چھوٹی سی خواہش بھی ہوتی تو ہر بار آپ کے منہ سے غیر مہذّب، غیر شائستہ الفاظ نہ نکلتے۔ میں آپ کو بتا دوں، جب میں پہلی بار بمبئی میں آئی تھی تو بالکل اکیلی تھی۔ بے یار و مددگار! میں نے محنت کی، مزدوری کی، چھوٹے چھوٹے رول کئے۔ اپنی دو لڑکیوں کو پالا، پڑھایا۔ ماں کی خدمت کی۔ پھر ایک لڑکی کی شادی کی۔ دوسری کو نوکر کرایا اور اسی شہر میں رہ کر، اپنی محنت کے بل بوتے پر تین کمرے کا فلیٹ لیا اور آپ مجھے جاہل، ڈفر، احمق اور نہ جانے کن کن لفظوں سے نوازتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے، آپ نے اس شہر میں بارہ سال رہ کر کیا کرلیا؟ آپ نے مہذّب بن کر کیا کرلیا؟ آپ کے پاس نہ نام ہے، نہ کام اور نہ مکان! میں نے تو ترس کھا کر آپ کو ایک کمرہ دیا، مجھے اِس کمرے کے سو روپے ملتے تھے اور میں آپ سے پچاس روپے ماہوار لیتی ہوں۔ نو مہینوں سے میں آپ کی خدمت کر رہی ہوں۔ آپ کے کمرے میں جھاڑو دیتی ہوں، آپ کا بستر بچھاتی ہوں۔ جب آپ بیمار ہوئے، میں نے آپ کی خدمت کی۔ آپ کے لئے ساری ساری رات جاگی! اور چولھے کے آگے بیٹھ کر آپ کے لئے اعلیٰ پکوان پکائے۔ آپ نے اِس خدمت کے عوض مجھے گالیاں دیں اور مجھ سے یہی کہتے رہے —— آپ کا گلاس کہاں رکھوں؟ میز پر یا الماری پر؟ چادر پر شکن نہ پڑے، دروازہ کھٹکھٹا کر آؤں، زور سے نہ ہنسوں، قہقہے نہ لگاؤں۔ آپ صرف جاہل ہی نہیں، جاہلِ اعظم ہیں! میں آپ سے ہرگز ہرگز

شادی نہ کروں گی! اور یہ آپ کو ایک [illegible] کرنے کو خالی کر کے کہیں اور جگہ چلے جائیں! سنا آپ نے؟"

"اجی سُنئے تو —— میں تو آپ کا [illegible] ——"

"اجی بس شکریہ!" یہ کہہ کر [illegible] کمرے سے نکل گئی۔

---

# غزل

## ساحر نظامی

رت جگے ہم نے گلستاں میں منائے بھی تو کیا ... فصلِ [illegible] بھی تو کیا
مستقل پیاس ہے اک عمر کا حاصل ساقی ... [illegible] بھی تو کیا
وہی آنسو ہیں اِن آنکھوں میں جو کل تک تھے ... [illegible] بھی تو کیا
گر پلانی تھی تو جی بھر کے پلائی ہوتی ... ایک [illegible] بھی تو کیا
آج بھی میرے چمن میں ہیں خزاں کے سائے ... [illegible] بھی تو کیا
مستقل موت ہے جسموں کی تسلسل [illegible] ... [illegible] بھی تو کیا
حاصلِ ساز ہیں مطرب ہی ٹوٹے ہوئے تار ... ہم نے [illegible] طوفان اُٹھا بھی تو کیا
میرے احساس میں پوشیدہ ہیں نادیدہ خلیل ... [illegible] بھی تو کیا
اک حقیقت ہیں ابھی یاد دنیا کہ جن کے ... [illegible] بھی تو کیا
اُن کی تقدیر یہی بجھنا ہے سحر ہونے تک ... [illegible] بھی تو کیا

آئینہ ٹوٹ سکے [illegible] کہیں اے ساحر
دل کے [illegible] بھی تو کیا

افسانہ

# چمکتے آنسو

کوثر چاندپوری

ہمدرد کلینک [illegible] روڈ [illegible] دہلی

۱۵ راپریل ۱۹۶۷ء

برخوردار! سلام اور دعا

آپ کی حیات کے آخری دنوں کا یہ سب سے موضوعِ گفتگو تھی ایک بزرگ نے اس سے بہت آگے بڑھ کر یہ کہا
کہ ادب میں مقصد کا مطالبہ کرنا غلط ہے لیکن یہ جائز نہیں، پھر ایسے شخص کا جو انسانیت دوست ہو۔
ادیب اپنا ہی کام کرتا ہے تو اچھا ہے۔ اُسے فرشتہ بن کر عالمِ بالا میں پرواز نہ کرنی چاہیے، بات یہ ہے کہ سیاست
ادب سے متاثر ہونے کی بجائے خود اس پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اُسی کا نتیجہ ہے کہ خلوص جو ادب کی جان ہے،
مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ افسانے اور ڈرامے سے لے کر تنقید تک یہی کیفیت ہے۔ بلکہ تنقید کا حال اور بُرا ہے
ہر بوالہوس حسن پرست بنا ہوا ہے، اور شیوۂ اہلِ نظر کی آبرو باقی نہیں رہی۔ دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے...

نیاز آگیں —— [signature] چاند [illegible]

نرسنگ ہوم کے جنرل وارڈ میں داخل ہوتے ہی وہ حیران رہ گئی۔ سفید براق دیواریں، ان میں جگہ جگہ بجلی کے قمقمے لگے ہوئے، خوبصورت دروازے، ان پر نیلگوں پردے، خوشنما چھت اور اس میں لگے ہوئے پنکھے جو [illegible] سینما کی حسین تصویر کے مانند چل رہے تھے اور اُن کے ہلکے سے جھونکوں کی ٹھنڈی لہریں پھیلنے لگی تھیں۔ برابر برابر پلنگ، اُن پر صاف چادریں، پلنگوں کے درمیان مناسب فاصلہ کتنا اچھا ہے یہ نرسنگ ہوم، جنت میں مرنے کے بعد بھی جانا یقینی نہیں، جہاں سا تھی ہی میں آنے کا موقع مل گیا۔ یہاں ضرور تندرست ہو کر یہاں سے نکلے ہوں گے، مگر میں نکلتے ہوں تو کوئی ارمان شاید ہی ساتھ لیے جاتے ہوں۔ اُسے جو پلنگ دیا گیا تھا، اس پر نرم گدا بچھا ہوا تھا۔ اوپر بے داغ چادر لگی ہوئی تھی جیسے معصوم کی روح ہو۔ بیٹھنے سے پہلے اُس نے اپنے کپڑوں کو دیکھا تھا، بستر پر بیٹھتے ہوئے ڈر معلوم ہوا کہیں میلا نہ ہو جائے۔ اُس پر وہ جھجکتی ہوئی نرس کے اشارے پر وہ اکڑوں بیٹھ گئی۔ جلد ہی ہسپتال کے کپڑے پہنا دیئے گئے۔ چوڑے پائنچوں کا پاجامہ، ڈھیلی ڈھالی دھاری دار قمیص۔ یہ لباس پہنتے ہی یقین ہو گیا کہ وہ ضرور اچھی ہو جائے گی۔

جوڑوں میں مسیحائی ملے گی۔ بخار اُتر جائے گا اور دل کی دھڑکنیں تھم جائیں گی۔ وہ چھاتی تو نکل جائے گی کہ کوشش نہ کرنے کا بہانہ نہ ملے۔ [illegible] سا اُس کا کاڑھا دیکھا۔ ایک آدمی نے بازو کی رگ میں سے خون نکال کر کانچ کی نلکی میں بھر لیا۔ سوئی چبھتے وقت معمولی سی تکلیف ہوئی لیکن نلکی میں لال لال لہو دیکھ کر بہت سکون ہوا۔ پھٹے گندے کپڑوں کے نیچے اور میلی سی کھال کے اندر چھپے ہوئے رگوں کے جال میں بھی ایسا شہابی خون ہو سکتا ہے جس میں شفق کی سُرخی ہو اور دھنک کی سی چمک ہو۔ گویا رگوں میں بھی لالہ پھول سکتا ہے اور گلاب کی کلیاں مسکرا سکتی ہیں۔ دوا کی پہلی خوراک کانچ کے خوبصورت گلاس میں پلائی گئی۔ اُس کا ذائقہ کتنا ہی کڑوا کسیلا رہا ہو، گلاس کی چمک دمک دیکھ کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ شربت پی رہی ہو، جو آپ ہی آپ حلق سے اُترتا جا رہا ہو۔ نرسیں اور آیائیں سفید لباس میں اس طرح پلنگوں کے آس پاس فرش پر چل پھر رہی تھیں، جیسے کبوتریاں دانے کی تلاش میں گھوم رہی ہوں۔ پہلے ہی گھنٹے میں ہول دل کے دورے ہلکے ہو گئے اور جکڑے ہوئے جوڑ جیسے پگھلنے لگے ہوں۔ وہ نئے ماحول کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ پانچ بج گئے۔

اور بیماریوں کے واقعات سنانے لگے۔ انھیں سات بجے تک آزادی سے بستروں کے قریب اسٹول پر بیٹھ کر باتیں کرنی تھیں۔ اُسے یہاں آئے اگرچہ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی پھر بھی اُس کے احساس میں عارف کے لئے اشتیاق کی ہلکی سی تڑپ بیدار ہونی وہ سوچنے لگی۔ عارف اُسے دیکھنے آئے گا۔ وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کردے گا۔

'گھبراہٹ تو نہیں ہوئی ؟'

'دیکھو کتنی اچھی جگہ ہے !'

زندگی انھیں کی ہے جو ایسے صاف ستھرے ہوادار مکانوں کے مالک ہیں، بھلا کیا ہے ہم تو گندے علاقے کے بوسیدہ گھروں میں یوں دن گزارتے ہیں جیسے آنتوں میں کیڑے پل رہے ہوں۔

عارف اور وہ دونوں غریب گھرانے میں پیدا ہوکر جوان ہوئے تھے اور اتفاق سے دونوں رومان پرست تھے۔ اُن کی شادی مشرقی رسم و رواج کے خلاف اپنی مرضی سے ہوئی تھی۔ اُس کی بنیاد صرف دو مسکراہٹوں پر قائم ہوئی تھی۔ اس میں سے پہلی عارف کے لبوں پر نمودار ہوئی تھی اور دوسری اُس کے ہونٹوں پر۔ پھر وہ ایک ہوگئے تھے اور وہ مسکراہٹیں ایک دوسرے کے اندر جذب ہوگئی تھیں۔ بالکل اُسی طرح جیسے پھولوں کا رس شہد کی مکھیاں چوس لیتی ہیں۔ وہ عارف کا انتظار کرتی رہی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وہ پہلی بار اُس کے جیون کی اُداس وادیوں میں داخل ہورہا ہے۔ اُس نے صرف ایک ہی بار اُسے دیکھا ہے۔ وہ شادی کا وعدہ کرکے گیا ہے اور جلد ہی آنے والا ہے۔ لوگوں کے آنے کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اُن میں سے بعض کے ہاتھوں میں تھیلے تھے۔ بعض پلاسٹک کی باسکٹ انگلیوں میں پھنسائے ہوئے تھے ان میں مختلف قسم کے پھل تھے۔ سیب، سنترے، انگور، چیکو اور پپیتے۔ اُسے عارف کے آنے کا پورا یقین تھا لیکن وہ پھلوں کی کوئی باسکٹ بھی لائے گا، یہ بات یقینی نہ تھی وہ دونوں دھندلکوں میں گھرے ہوئے تھے۔ جن میں اُمید کی کرنیں منجمد ہو جاتی ہیں۔ وہ جس وقت گھر سے چلی ہے رکشا کے پیسے بھی مشکل ہی سے فراہم ہوسکے تھے۔ اتنی سی دیر میں عارف نے پھلوں کا انتظام کہاں سے کرلیا ہوگا۔ قریب کے پلنگ پر بیٹھی ہوئی عورت کا شوہر اسٹول پر بیٹھا اناناس چھیل رہا تھا۔ اُس کی تُرش و شیریں خوشبو فیملی وارڈ میں پھیلتی جارہی تھی اور چھلکے نیچے رکھی ہوئی تام چینی کی بالٹی میں گرتے جارہے تھے۔ اُس کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں، لیکن وہ کنکھیوں سے اناناس کو کاٹتی ہوئی اُس چھری کو بھی دیکھتی جارہی تھی جو بہت پُرخلوص انگلیوں کی گرفت میں تھی۔ اُن میں محبت کا رس تھا۔ چھری اب تیزی سے پھانکیں اُتارنے لگی تھی۔ عورت نے اُس وقت تک اُس سے کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ اپنے شوہر ہی سے گفتگو میں مگن تھی۔ دونوں لگاتار ایک دوسرے سے سوالات کئے جارہے تھے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی کسی طرف سے کوئی لیکچر شروع ہوجاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جنم جنم کی ملاقات کے بعد ابھی ملے ہوں۔

"کیسی ہو ؟"

"وہ دعاں گیا تھا۔ کہ تم بہت یاد آرہی ہو گا"

"جھگڑ پسند آئی ؟"

"اکیلے ہی سوئے تھے کہ بات کرو ؟"

"تمھیں نیند آگئی تھی ؟"

"میں پوچھتی ہوں کھانا وقت پر کھایا تھا ؟"

"گھر تو یاد نہیں آیا ؟"

"کورٹ سے کب لوٹے تھے ؟"

انھیں دو گھنٹے کا وقت بہت تھوڑا معلوم ہورہا تھا۔ ساری باتیں ایک ہی سانس میں کرلینا چاہتے تھے۔ عورت تو نہ جانے کب سے ذہن میں سوالات کی لسٹ تیار کررہی تھی۔ سلسلہ ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ بڑی توجہ سے انھیں سُن کر اندازہ لگا رہی تھی، کتنی محبت ہے میاں بیوی میں! اُسی وقت عورت کا ہاتھ اناناس کی ایک پھانک لئے اُس کی جانب بڑھا۔

"لو بہن !"

وہ چونک گئی۔ سوچنے لگی کتنا پریم ہے ان کے دلوں میں۔ یہ دوسروں کو بھی اِس میں شریک کرسکتے ہیں۔ اُسے ہمت ہی نہ ہوئی کہ اناناس لینے سے انکار کرکے خلوص کو ٹھکرانا آسان بھی تو نہیں۔ جس اپنائیت سے اُس نے ہاتھ بڑھایا تھا وہ اناناس سے زیادہ خوش ذائقہ تھی اور اُس نرسنگ ہوم سے زیادہ حسین تھی۔

'نہیں، نہیں ڈیر! رہنے دو' یہ الفاظ اُس کے منہ سے نکلے ضرور لیکن ہونٹوں پر جم سے گئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے گرم دودھ فریج میں رکھتے ہی منجمد ہو جاتا ہے۔ اُس نے اناناس لے کر منہ کھول دیا اور دانتوں سے کاٹ کر کھانے لگی وہ میٹھا بھی تھا اور کھٹا بھی، تُرشی ناگوار نہیں تھی۔ سچ مچ اناناس بہت اچھا ہے شاید گوروکھپور کا ہوگا۔ آم کا سا مزہ آرہا ہے۔ اُسی وقت اُس نے دیکھا جو تھے پلنگ کے قریب ایک شخص کھڑا باسکٹ میں سے آم نکال رہا ہے اور انھیں سائڈ ٹیبل پر رکھتا جارہا ہے۔ اُس نے دور سے آموں کو پہچاننے کی کوشش کی، شاید سفیدہ ہو، ہوسکتا ہے لنگڑا یا چوسہ ہو۔ اب تو ہر قسم کے آم ساتھ ہی ساتھ آجاتے ہیں۔ اساڑھ ساون اور بھادوں کی کوئی قید ہی نہیں۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔ خالہ اور بھانجی کی شادی ایک ساتھ ہونے لگی بلکہ بھانجی خالہ سے پہلے ہی ماں بن جاتی ہے۔ اُس نے ابھی آدھی ہی پھانک کھائی تھی کہ عورت نے پھر ہاتھ بڑھا کر کہا

"ایک اور؟"

"ابھی تو بہت باقی ہے۔"

"اے لو، عورتیں تو ایک دم اتنے تمام تھوڑی لیتی ہیں کہ گٹھلیوں اور چھلکوں کے انبار تھوڑی کر چھوڑنے لگتے ہیں!" یہ کہتے وقت وہ آموں والی میز کو دیکھتی جا رہی تھی۔ آموں والی عورت اس شکایت کو سمجھتے ہوئے بولی۔

"یہ باتیں پرانی ہو چکیں، اب تو ناس چھلکوں سمیت کھائے جاتے ہیں اور آموں کی گٹھلیاں تک بھی نگل لی جاتی ہیں۔"

"آم آپ ادھر بھیج دیں۔ گٹھلیاں نگلی نہیں جائیں گی سب لوٹا دی جائیں گی۔"

اس جملے کو سن کر بہت سی عورتیں ہنس پڑیں۔ یوں بھی سارے بیمار ہنسی دل لگی کے موڈ میں تھے۔ ملاقات کے یہ گھنٹے نرسنگ ہوم کی جان تھے اور تھکے ہوئے مریض بھی ہنسنے لگتے تھے۔ اپنے پیاروں کو دیکھ کر سب کے دلوں سے خوشی کے طوفان امڈنے لگتے تھے۔ پہلے چھ ہو چکے تھے۔ عارف کا پتہ نہ تھا۔ وہ پھل توڑ کر لاتا آپ بھی غائب ہو گیا۔ معلوم نہیں کیا حادثہ ہوا۔ پیسوں کا بندوبست نہیں ہو سکا شاید پیشگی سیٹلمنٹ مشکل ہی سے دیتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے نوکر روپیہ لے کر بھاگ نہ جائے۔ ویسے بھی ہڑتالوں کی اس آنچ میں مالک نوکروں کی دشمنی سمجھنے لگے ہیں۔ اُن کے نزدیک وفاداری اور نمک حلالی کی روایت ختم ہو چکی ہے۔ وہ انھیں خیالات میں اُلجھی ہوئی تھی کہ عارف ایک شرمیلی سی مسکراہٹ ہونٹوں پہ لئے اندر آ گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں تھیلا نہیں تھا، باسکٹ بھی نہیں تھی۔ لبوں پہ پٹریاں جمی ہوئی تھیں سوکھے ہونٹ مسکراہٹ سے اِس طرح ہلتے معلوم ہو رہے تھے جیسے شاخوں میں لگے زرد پتے خزاں کی ہوا سے ہلا کرتے ہیں۔ اُس کا جی چاہا ان زرد سوکھے پتوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر اس شرمیلے تبسم کو چوس لے۔

"آ گئے تمھارے ہزبینڈ؟"

عورت نے کچھ اس انداز سے پوچھا کہ وہ سمجھی شاید عورت اپنا قرض مانگ رہی ہے۔ وہ پوچھ رہی ہے کیا لائے تمھارے وہ؟ لاؤ ہمیں بھی کھلاؤ۔ اسی لمحے آیائیں ایک مریضہ کو اسٹریچر پر ڈال کر لائیں۔ کسی نے کہا اسے: بارشن ہوا ہے۔

"ابارشن؟"

"ہاں اس کا حمل گرا ہے۔"

"یعنی اُمید ٹوٹی ہے۔"

وہ شرما گئی۔ عارف کو دیکھ کر اُسے بھی تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے اُس کے ساتھ بھی یہی ہو گیا ہو۔

عارف نے آتے ہی اسٹول سرکا کر پلنگ کے قریب کیا اور بیٹھتے ہی بولا۔

"روپے جمع کرا دیئے، تم اطمینان سے جتنے دن یہاں رہ سکتی ہو۔"

"بہت اچھا ہوا!" اُس نے خوش ہو کر کہا: "مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بغیر ٹکٹ ریل میں بیٹھ گئی ہوں نہ جانے کہاں پکڑی جاؤں اور روپے آئے کہاں سے؟"

"روپے آجکل آیا نہیں کرتے لائے جاتے ہیں اور یہ پوچھنے کی ضرورت کیا ہے تمھیں؟"

"خیر نہیں پوچھتی، پیسے دے دیئے میرے سر کا بوجھ اُتر گیا۔"

ایک لمحے کے لئے اُسے نرسنگ ہوم کے در و دیوار پر پیار سا آنے لگا۔ جیسے یہ سب کچھ اُسی کا ہو! کتنا لگاؤ ہوتا ہے انسان کو اپنی چیز سے، وہ کرائے کے گھر ہی سے نہیں دس بائی دس کے اُس چار فٹ ٹکڑے سے بھی محبت کرنے لگتا ہے جہاں وہ چار دن سونے کا موقع پا جاتا ہے۔ پولس کے ڈنڈے کھا کر بھی اُسے چھوڑنے پہ تیار نہیں ہوا کرتا۔ قریب والی عورت اپنے شوہر سے اسی طرح باتیں کئے جا رہی تھی۔ سوالات کا تعلق وہی انداز تھا جو ساون بھادوں کی جھڑی کا ہوا کرتا ہے۔ کسی نے محسوس تک نہ کیا تھا کہ عارف اُس کے لئے پھل لایا ہے یا نہیں۔ عارف کے ہاتھ میں روپے کی رسید تھی۔ جسے وہ ریل کا ٹکٹ سمجھ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر اُس کے دل سے احساسِ کمتری ہٹتا جا رہا تھا اور وہ نرسنگ ہوم کی مالک بنتی جا رہی تھی۔ سات بجتے ہی فیملی وارڈ خالی ہونے لگا، چڑیاں سی اُڑنے لگیں۔ عارف نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"خون ٹیسٹ ہو گیا؟"

"ہاں میری رگ سے ڈھیر سارا خون نکال لیا گیا۔"

"دو تین بوندیں ہی لی ہوں گی۔"

"اُن بوندوں میں بھی تو جان ہو گی۔"

"اتنی جان میں دیدوں گا تمھیں، دوسرے ٹیسٹ بھی ہو گئے؟"

"پتہ نہیں۔"

"کیوں نہیں، آج کی عورت تو یہ بھی جانتی ہے کہ پرائم منسٹر کون ہے، تمھیں اتنی سی بات کا بھی پتہ نہیں؟"

"مجھے انتظار ہی سے فرصت نہیں ملی۔"

"کس کا انتظار تھا؟"

"کالے چور کا!"

"اچھا تو اب ہم اِس سطح پر آ گئے، عشق بڑی بلا ہے بھائی اس میں سب

پھوٹ رہا ہے"

اسی وقت ایک نرس پاس سے گزری۔ اس کے ماتھے پر سرخ ٹیکہ تھا ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگی تھی۔ وہ جیا اور نرس میں اوٹ آسمان پر اڑتے ہوئے ابر کے اس ٹکڑے سے مشابہ تھی جسے بارش کا پرچم سمجھا جاتا ہے۔ اسے فضا میں بھٹکتے ہوئے کبوتر کی مانند اڑتا دیکھ کر پانی پینے کی آس بندھ جاتی ہے۔

"سسٹر!" ——— عارف نے اسے مخاطب کیا۔

"بولو!"

"ان کا یورین ٹیسٹ ہو گیا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوکھے بادل کی مانند بغیر برسے اور گرجے چلی گئی اور عارف سوچتا رہ گیا۔

"جواب کیوں نہیں دیا اس نے؟"

"گونگی ہے"

"میں کی بیٹی اور اتنی بد اخلاق!"

قریب کی عورت کا شوہر بولا ———

"جنرل وارڈ ہے مسٹر! غنیمت ہے کہ اس نے آپ کو ڈانٹا نہیں۔ کبھی لڑکیاں اس لئے نرس بنتی ہیں کہ مریضوں کی خدمت کریں گی لیکن اس پیشے میں آ کر بہت سی لڑکیاں دل شکنی ہی کو اپنی ڈیوٹی سمجھنے لگتی ہیں۔ سفید پرچم امن کا نشان نہیں رہا، وہ جنگ کا اعلان بن گیا ہے"

---

عورتوں کے رشتے دار اسی طرح روزانہ پھل لاتے رہے اور عارف خالی ہاتھ اپنی بیوی شکیلہ کو دیکھنے آتا رہا۔

شکیلہ ایک مہینہ تک یہاں رہی۔ قاعدے کے مطابق تیس تاریخ کو اسے مصارف کا بل دے دیا گیا۔ عارف میزان دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ جمع کی ہوئی رقم منہا کرنے کے بعد اسے ساٹھ روپے اور دینے تھے۔ علاج کا سلسلہ ابھی دس بیس روز اور چلنا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شکیلہ بالکل ویسی ہی بن جائے جیسی شادی سے پہلے تھی۔ اس کی آنکھوں میں کنول کھلنے لگیں، ہونٹوں پر لالہ کھل اٹھے اور رخسار دمکنے لگیں۔ اس دن عارف نے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ وہ سوچ میں ڈوبا رہا۔ کبھی کبھی نرسنگ ہوم میں بلاوا سا آجاتا اور وہ بری طرح چونک جاتا۔ آس پاس بولنے والوں کی باتیں اس کے کانوں میں بالکل نہ آرہی تھیں۔ ماحول پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

اگلے دن سب عورتوں کے رشتے دار آئے اور شکیلہ اکیلی بیٹھی سوچتی رہی عارف کیوں نہیں آیا؟

"کیوں نہیں آیا؟"

"بل کا میزان دیکھ کر گیا؟"

شوہر [illegible] ہے لیکن [illegible] نہیں ہوتی، اس کے [illegible] ہے۔

"بتائیں کیا عارف کو معلوم نہیں؟"

"وہ سب کچھ جانتا ہے"

قریب والی عورت کو کچھ کہنے سے [illegible] اس کے ساتھ جتنے پھل تھے، شکیلہ کے سرہانے [illegible] دل ہی دل میں کہنے لگی۔

"پہلے بیس منٹ ہی اٹھا دیا!"

نوجوان انگور غصے سے تڑک کر [illegible] اس نے تھوڑے سے انگور پلیٹ میں رکھ کر شکیلہ کو دیتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچ رہی ہو ڈیر؟"

شکیلہ اس کے اخلاق اور [illegible] یہ الفاظ سن کر رو پڑی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جو جنگل کی جھیل کے مانند خشک تھیں۔ عارف اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی نہ آیا۔ شکیلہ کی الجھن بڑھنے لگی۔ شہر کی فضا خراب تھی۔ کئی بار شور مچا تو فساد ہو گیا جیسے کرفیو لگا ہوا ہے۔ نرسنگ ہوم میں شہر کے فساد کا بس اتنا ہی اثر تھا کہ وحشت کی خبریں سننے میں آجاتی تھیں۔ عورتیں اسی طرح بس بولے جاتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا نرسنگ ہوم اور شہر کے درمیان کوئی دیوار ہے جس کے [illegible] بالکل رسائی نہیں۔ کبھی کبھی شکیلہ سوچنے لگتی۔ شہر بھر کے لوگ آدمیوں کو [illegible] بنا کر یہاں کیوں نہیں بھر دیا جاتا۔ گنگا الٹی بہنے لگی ہے۔ بیماری انسان کو امن سے رہنا سکھاتی ہے۔

ساتویں دن عارف کو فون کیا گیا جس کا نمبر فائل میں درج تھا۔ وہاں کا اسسٹنٹ منیجر بول رہا تھا۔

"ہم منیجر صاحب بول رہا ہے"

"کس کو پوچھتے ہو؟ نمبر سے بول رہے" فون کے کچھ جملے میں آواز نہیں آئی"

"عارف بابو ——— عارف بابو؟ اسے تو [illegible] گیا، سالا بڑا گھپلے باز آدمی نکلا۔ عارف یہاں نہیں ہے بابا، تو کل نہیں ہو گا"

شکیلہ یہ اطلاع پا کر انگاروں پر لوٹنے لگی۔ [illegible] کبھی گھر [illegible] نرسنگ ہوم میں یہ خبر

کئی دن گزر گئے۔ شکیلہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی یہ جانتے ہوئے کہ اب وہ کبھی ٹھیک نہ ہوگی شوہر کی موت کے بعد اس کے ساتھ اسی طرح ہمدردی کے جا رہے تھے، لیکن قسم پرستی بیمار ہو گئی۔ شکیلہ سمجھ رہی تھی کہ قریب والی عورت کو سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ شکیلہ کی ... سے نگہ ہر دم چوٹ کی بیمار رہتی ہے۔ اس طرح ... کرتے چلا کر عارف ... نہیں ... شہر کی فضا مسموم تھی۔ وہ باہر قدم بھی نہیں نکال سکتی تھی کوئی عزیز بھی قریب نہیں تھا جس سے عارف کا حال معلوم کراتی۔ ایک ہفتہ اسی طرح بیت گیا۔ شکیلہ کی حالت پاگلوں کی سی رہنے لگی تھی ایک شام کو کسی نے دروازے کی زنجیر ہلائی۔ شکیلہ نے جلدی سے کواڑ کھول کر دیکھا باہر عارف کھڑا تھا۔ میلے کپڑے، بڑھے ہوئے خشک بال، آنکھیں چمک سے محروم، لیکن ہونٹوں پہ دبی دبی سی مسکراہٹ جس سے شکیلہ اور عارف کی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

"تم آگئے؟" شکیلہ نے ایک دم بانہیں پھیلا دیں اور عارف کو ان میں جکڑ لیا کہیں پھر وہ بھاگ جائے۔

"ہاں آگیا، کیول رام مسوری ایڈووکیٹ میرے وکیل بنے ضمانت بھی کرا دی۔ انھوں نے یہ سب کچھ تمہاری نرسنگ ہوم والی پڑوسن کی بدولت کیا۔ مسوری کہہ رہے تھے دریا وتی بعد ... فون کرتی ہے کہ کوئی کام ہو تو ہمیں کر بتائے آپ کے گھر والے کی دھن لگی ہوئی ہے۔ کہتی ہے شکیلہ کے ... جلدی سے نہیں تو وہ پھر بیمار پڑ جائے گی۔"

"مسوری صاحب دریا وتی کے شوہر ہیں، کتنے اچھے ہیں یہ لوگ۔ ساری دنیا ایسی کیوں نہیں ہو جاتی!"

"کیوں نہیں ہو جاتی ساری دنیا ان جیسی؟" شکیلہ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ اس کے آنسوؤں میں خوشی کی چمک بھی تھی اور احسانمندی کے جذبے کی نمی بھی!

---

# غزل

سیدہ حجاب ترمذی

سنہری شام ڈھلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے
فضا سونا اُگلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

سرِ گلشن بصد نازک خرامی تم بھی آ جاؤ
نسیم اِٹھلا کے چلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

یقینِ وعدۂ فردا پہ میری آرزو اب تک
کفِ افسوس ملتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

چمن کے مے کدے میں رقصِ جامِ گل ارے توبہ
شرابِ رنگ ڈھلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

نفس مجروح چہرہ فق، نظر تصویرِ محرومی
فغاں دل سے نکلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

بڑی پرکیف ہیں رُمان پرور چاندنی راتیں
شمیمِ شوق چلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

حریمِ عشق پر چھایا ہوا ہے کیفِ تنہائی
فقط اک شمع جلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

نفس کی آمد و شد میرے حق میں اِک قیامت ہے
چھری سی دل پہ چلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

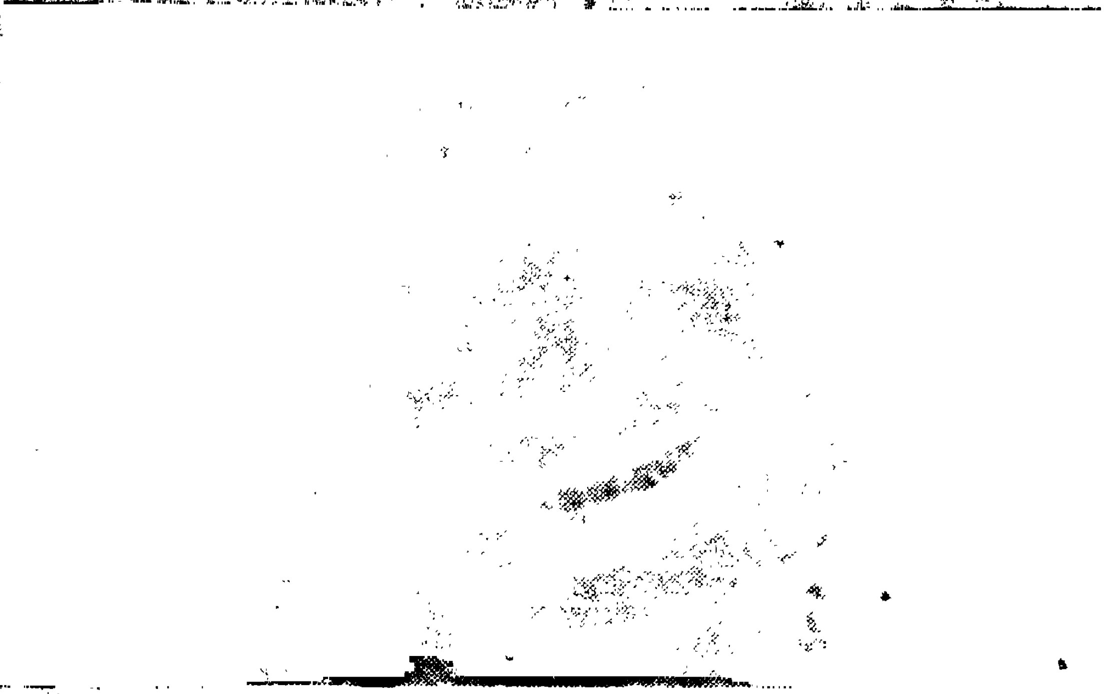
بہار آئی، کھلے گل، کروٹیں لینے لگا سبزہ
فضا پہلو بدلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

میں اپنے حال سے بیزار سا کچھ ہوتا جاتا ہوں
بساطِ دل بدلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

محبت میری جبرِ وقت سے مجبور ہو ہو کر
نئے پہلو بدلتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

حجابِ مضطرب کیا یاد اب تم کو نہ آئے گا
تمنا ہاتھ ملتی ہے نہ جانے تم کب آؤ گے

سیدہ حجاب ترمذی



افسانہ

# کوئی لیتا تھا ترا نام وفا آخرِ شب

رام لعل

آر۔۳۹، مٹی اسٹوری بلڈنگ، چار باغ، لکھنؤ ۱

۲۱ر اپریل ۱۹۶۷ء

برادرم خوشتر صاحب! آداب

...آج افسانہ بھی بھیج رہا ہوں۔ اِس افسانے کا عنوان میں نے مخدوم محی الدین کے اِس شعر سے لیا ہے

سانس رکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی　　کوئی لیتا تھا ترا نام وفا آخرِ شب

ہم افسانے کی نثر کو شاعری سے لاکھ بچانے کی کوشش کریں لیکن کچھ نازک ترین کیفیتوں کا اظہار کسی ایک شعر یا اُس کے ٹکڑے سے ہی ایسی خوبی سے ہوتا ہے کہ اُس کے بغیر اپنی تخلیق نامکمل سی معلوم ہوتی ہے یوں بھی انسان نے اپنے احساسات کا اظہار نظم میں کرنا پہلے سیکھا، نثر میں اُس کے بعد۔ لیکن موجودہ دور میں نثر انسان کے مقصد کے اظہار میں شاعری سے آگے نکل گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نثر اپنے تخلیقی سفر میں محض تازگی یا نغمگی کے احساس کے لئے کبھی کبھی شعر کے سمن زار سے بھی خوشہ چینی کر لیتی ہے۔ لیکن چھوڑئیے اِس بحث کو۔ اِس بحث میں تو میرے آپ کے علاوہ اور بہت سے ذہن بھی اُلجھ کر رہ جائیں گے۔ ہاں آپ کو مخدوم صاحب کی اِس غزل کے باقی اشعار بھی سناتا ہوں۔ سنا ہے کتنے مریض حسین و حیات آفریں اشعار سن کر ہی صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے آپ پر کیا اثر ہوتا ہے:...)

آپ کا مخلص ——— رام لعل

---

نرمش نے جب ڈاکٹر کوٹھاری کے یہاں رات کے کھانے کی دعوت قبول کی تو اُس کا دل احسان مندی کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ وہ کسی طرح انکار نہ کر سکا!

اُس کی بیوی رنتا بیمار ہو کر کئی ہفتے سینی ٹوریم میں پڑی رہی تھی۔ پندرہ دن پہلے وہ چل بسی تھی۔ بالکل اچانک! جس وقت اُسے ڈاکٹر کوٹھاری کا تار ملا [illegible] ہو سکتا تھا۔ اُس کا یہاں پہنچنا اس لئے بھی محال تھا کہ راتے کا سفر کر کے [illegible] سے [illegible] کر دی تھی۔ [illegible] وہ کچھ نہ [illegible] پہنچ سکے گا۔

نرمش [illegible] جب [illegible] ڈاکٹر کوٹھاری [illegible] نگرانی میں سپرد کرا ہی دیتا۔ کتنے لوگوں کے مرنے کے بعد اُن کا کچھ بھی نہیں ہوتا ——— یعنی وہ سب کسی اہتمام سے نہیں ہوتا بس فانی جسم کو مرنے والے کے اعتقاد کے مطابق آگ کے غضبناک شعلوں یا زمین کی بے چین کوکھ کے سپرد کر دیا جاتا ہے! پہلے تو نرمش کے جی میں آئی کہ ڈاکٹر کے تار کا کوئی جواب ہی نہ دے پھر خیال آیا ہو سکتا ہے ڈاکٹر کا کچھ بل باقی ہو! وہ کچھ ایسے اخراجات بھی یقیناً برداشت کرتا رہا ہوگا جن کے بارے میں نرمش اُسے کبھی کبھی لکھ دیا کرتا تھا۔

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی وائف کی لاش [illegible]"

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ [illegible] جاتیں جو عام طور پر ہمارے اسپتال [illegible]"

"میں آپ کی وائف کا کیس [illegible] میں چھپواؤں گا۔ دنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹر اس کیس پر بحث کریں گے!"

جب وہ رنتا کو یہاں چھوڑ جانے کے لئے آیا تھا ڈاکٹر کوٹھاری نے اپنے

گارڈن کے بھرے رونق پالسوں سے بنے گیٹ پر یہ سب کچھ کہا تھا جو اسے ابھی تک یاد تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی اور نرمی سے دبا کر یہ بھی کہا تھا ۔۔۔ مسٹر دنیش! آپ بہت خوش قسمت ہیں آپ کو اتنی ذہین اور خوبصورت وائف ملی ہے۔ میں اسے فوراً اچھا کر دوں گا۔ آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں!"

لیکن دنیش نے یہ سارا عرصہ رتنا کی موت کی دعائیں مانگتے ہوئے گزارا تھا۔ خوبصورت اور ذہین بیوی کی موت کے لئے! پتہ نہیں ڈاکٹر نے اس کا کیس دنیا کے کس کس میڈیکل جرنل میں شائع کرایا تھا! اُسے کون کون سی نایاب دوائیں مہیا کر رہا تھا! لیکن وہ تو اپنے دوستوں سے اکثر یہی کہتا رہا تھا، ہمیشہ بیمار رہنے والی بیوی کا جلد سے جلد مر جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات وہ ڈاکٹر کوٹھاری کے سامنے نہیں کہہ سکا تھا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے، وہ اس سے اپنی بیوی کو مار ڈالنے کے لئے کہہ رہا ہے!۔

رتنا دنیش کی خواہش کے مطابق مر گئی تھی۔ ڈاکٹر کوٹھاری کی ساری کوششوں کے باوجود مر گئی تھی۔ اس سے دنیش کو ایک گہری تسکین ملی تھی۔ جیسے وہ چھ سال کی طویل ازدواجی قید سے بہت مشکل سے آزاد ہو گیا ہے!

ڈاکٹر کوٹھاری دنیش کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر اپنی بیوی کو کھانے کے سلسلے میں ضروری ہدایات دینے کے لئے اندر چلا گیا تو دنیش صوفے میں سے نکل کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ رتنا کی موت اور ڈاکٹر کے سلوک نے اس کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ شام جو اب کافی گہری ہو چکی تھی اُسے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ اس کے اندرونی کرب کو اور بڑھانے والی شام۔ سورج ایک پہاڑی کے پیچھے جا کر بالکل ڈوب چکا تھا۔ شفق کی سرخی جو کچھ دیر پہلے آسمان کے ایک بڑے حصے پر پھیلی ہوئی تھی، اس کی اب ایک پتلی سی لکیر ہی باقی رہ گئی تھی۔ سفید بادل کے چھوٹے سے ٹکڑے پر جو کسی کا آنچل ہی معلوم ہوتا تھا! نیچے گھاٹی میں چیل اور دیودار کے اونچے اونچے ہرے پیڑوں کے سلسلے اب تاریک ستونوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ دھوئیں کے کھمبے بھی معلوم ہوتے تھے جنھوں نے آسمان کو زمین پہ اوپر گرنے سے روک رکھا ہو! کسی کسی مکان میں سے بس ذرا ذرا سی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ وہ معمولی سا ہوٹل بھی، جس میں وہ اپنا سامان رکھ کر یہاں چلا آیا تھا، اب دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس ہوٹل میں زیادہ تر زیر علاج مریضوں کے رشتے دار ہی آکر ٹھہرتے تھے مستقل یا عارضی طور پر! ملٹری کا کنوائے جو تھوڑی دیر پہلے سڑک پر سے ہو کر شمال مشرقی سرحدی چوکیوں کی طرف جا رہا تھا اب اس کے بھاری ٹرکوں کا شور ختم ہو چکا تھا۔

اچانک دنیش نے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سُنی تو اس نے گھوم کر دیکھا۔ ڈاکٹر کی نیپالی بیوی میز پر گلاس رکھنے آئی تھی۔ سفید ساڑی اور نیلی شال میں ملبوس! خاموش اور پُرکشش! اُسے دیکھتے ہی ... جب اس نے یہاں آکر ڈاکٹر کا پتہ پوچھا تھا تو اُس وقت وہ آسمانی ... تھی۔ اُس نے اس کی طرف بہت اُداس نظروں سے دیکھا تھا۔ شاید اُس کی آنکھیں ہی ایسی تھیں کہ وہ اُداس نظر آتی تھی۔ دنیش نے اُس کی طرف سے دیکھا وہ میز پر گلاس رکھ کر الماری کی طرف گئی۔ الماری میں سے اس نے وہسکی کی ایک بوتل نکال کر میز پر رکھی اور دنیش کی طرف ایسے دیکھا جیسے اس سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ لیکن اسی وقت دوسرے کمرے سے ڈاکٹر کی آواز سنائی دی اور وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ڈاکٹر ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو اس نے کپڑے تبدیل کئے ہوئے تھے۔ اس نے رات کے لباس پر ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا اور گلے کے گرد ایک مفلر بھی لپیٹ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پائپ، تمباکو کا ٹن اور پائپ کا دوسرا سامان تھا۔ اس نے دنیش کو میز کے پاس بلایا جس کے سامنے بیٹھ کر وہ بوتل کا کارک کھول رہا تھا۔ اس نے بوتل دکھاتے ہوئے اس سے پوچھا ۔۔۔ "یہ سب چلے گا نا؟"

دنیش نے یوں ہی سا پس و پیش کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں بس تھوڑی ہی سی لوں گا۔ ڈپریشن (DEPRESSION) کو ختم کرنے کے لئے!"

"اسی لئے تو میں نے وائف سے کہا آج ہم لوگ کچھ ڈرنک کریں گے۔! بوتل نکال کر رکھ دے!"

دنیش نے گلاس ہاتھ میں لے کر ڈاکٹر کی طرف ایک بار پھر تشکر آمیز نظروں سے دیکھا۔ وہ اب بہت واضح الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے اس کے بولنے سے پہلے ہی اس کی بیوی کا ذکر چھیڑ دیا ۔۔۔ "آپ کو معلوم ہے میں نے آپ کی مسز سے بے شمار سوالات کئے تھے۔ اس نے جو جوابات دیئے انھیں میں کبھی تو ٹیپ کرتا رہا کبھی اپنی ڈائری میں قلم بند! اُس نے اس سلسلے میں مجھے کبھی مایوس نہ کیا۔ لیکن میں نے بھی اس کے ذہن پر بوجھ نہ ڈالا۔ اُسے رفتہ رفتہ آرام اور اطمینان ہی سے سب کچھ کہنے کا موقع دیا، جو کچھ بھی اس نے کہنا چاہا۔ وہ کبھی کبھی نیند میں بڑبڑاتی بھی تھی۔ آپ کو معلوم ہے؟ نہیں! تعجب ہے شوہر ہو کر آپ کو یہ معلوم نہ ہو سکا۔ خیر میں نے وہ ایک بار اس کی بڑبڑاہٹ چپکے سے ٹیپ کر لی۔ آپ کو سناؤں؟ اچھا۔ ابھی لو!"

دنیش کے لئے ڈاکٹر کی شخصیت پہلے سے زیادہ حیران کن اور تحقیق ہی گئی۔ پچاس برس کی عمر میں بھی وہ کتنا مستعد تھا! جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے! وہ جلدی سے ٹیپ ریکارڈر اٹھا لایا۔ پہلے اس کی بیٹری ٹیسٹ کی۔ اس میں کوئی نقص پا کر جلدی جلدی اس میں نئے سیل ڈالنے لگا۔ دنیش بہت غور سے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اور چہرے پر نمایاں ہوتی ہوئی بے ذہنی کو دیکھتا رہا۔

"تم تم یہاں؟ —— تم تم تم یہاں! —— کب؟"

"ہاں یہ غیر ضروری اچھا ہے —— اچھا تم!"

جیسے بیسوں قفلوں کے بے ربط اور مُبہم جملے! کرب کی خاموش فضا میں رہ رہ کر یاد کر کے چھوڑ گی۔ دنیش بڑی مشکل سے اپنے آنسو روک سکا۔ ڈاکٹر نے کتنی بار ٹیپ گھما کر لگایا اور کہا ——

"ان جملوں سے میں کوئی خاص مطلب نہ نکال پایا۔ نیند میں آدمی اِسی طرح ٹوٹے پھوٹے جملے ہی کہہ سکتا ہے۔ اچھا اب آپ کو میں اُس کی وہ باتیں سنواتا ہوں جو اُس نے میرے مختلف سوالوں کے جواب میں کہی تھیں۔"

ڈاکٹر نے ایک اور ٹیپ لگایا۔ اِس بیچ میں ڈاکٹر کی بیوی چپکے سے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور گلاس کیوبس بریڑ سے کھینچ کر واپس چلی گئی تھی۔ اُس کے آنے کا ایک مقصد غالباً یہ معلوم کرنا بھی تھا کہ انھیں کھانا کھا لینے کے لئے ابھی کہا جائے یا نہیں!

"مجھے اپنی تعلیم و تربیت اچانک بیکار محسوس ہونے لگی۔ جیسے اُن کا کوئی مقصد ہی نہ ہو! اچھا ہوتا اگر میں ایک اَن پڑھ گنوار لڑکی رہتی اور میرا آدمی میری کسی غلطی پر کبھی میرے منھ پر غصے سے طمانچہ مار دیتا کبھی پیار سے مجھے گلے سے لگا لیتا!"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ہم ہمیشہ اپنے لئے نہیں جیتے۔ دوسروں کے لئے بھی جیتے ہیں لیکن کوئی اس بات کا احساس تو کرے!"

جب تک ٹیپ چلتا رہا ڈاکٹر نے ایک بار بھی دنیش کی طرف نہ دیکھا۔ وہ جلدی جلدی گلاس بنا کر پیتا رہا۔ اب اُس نے اپنا پائپ بھی سُلگا لیا تھا — رتنا کی مدھر کانپتی ہوئی آواز بھرپور خاموشی میں ایک سُبک کشتی کی طرح تیرتی رہی۔ ڈاکٹر کے پائپ میں سے دھواں نکل نکل کر فضا میں اُڑتا رہا اور عجیب عجیب سی شکلیں بنا بنا کر تحلیل ہوتا رہا۔ دنیش نے اپنی بیوی کی آواز ایک مدت کے بعد سُنی تھی۔ جو کچھ رتنا نے ڈاکٹر سے کہا تھا وہ اُس کے سامنے کبھی نہیں کہا تھا! اُس کے سامنے تو وہ بس ایک مُہر بہ لب مورتی بن کر رہ گئی تھی!

اچانک ڈاکٹر نے ٹیپ مشین کا سوئچ آف کر دیا اور کہا —— "میں آپ کو اُس کے خوابوں کی کچھ تفصیل سناؤں! میں نے کئی ہفتے روزانہ صبح تڑکے اُس کے وارڈ میں جا کر جب ابھی اُس کی نیند ہی نہ کھلی ہوتی تھی، اُس سے اُس کے خواب سُنے۔ میری کوشش یہ رہی کہ جاگنے کے بعد اس کا کوئی بھی خواب محو نہ ہونے پائے! عام طور پر آنکھ کھلتے ہی خواب کا ریشمی آنچل ہاتھ سے سرک جاتا ہے! بہت کوشش کرنے پر بھی پھر وہ ہاتھ میں نہ آ پاتا! مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ آپ کی وائف بے حد کا موڈیٹو (ACCOMMODATIVE) رہی! اس نے میرے ساتھ پوری طرح کوآپریٹ کیا۔ اُس نے مجھے کچھ ایسے خواب بھی سُنائے جو سائیکاٹری ..... (PSYCHIATRY) کا ایک اہم باب بن سکتے ہیں؟

یہ کہہ کر وہ ایک ڈائری اُٹھا لایا۔ ڈائری میں سے ایک صفحہ سنانے لگا۔

"۲ جنوری کو اُس نے مجھے یہ خواب سُنایا تھا —— میں ایک گہرے تالاب میں تیرتی پھرتی ہوں۔ تالاب میں بہت سی مچھلیاں ہیں جو میرے بدن کو چھوتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ میں اپنے بدن میں بے حد گدگدی محسوس کرتی ہوں۔ میں اور زیادہ پھرتی سے تیرنے لگتی ہوں۔ خوب گہرائی میں غوطے لگاتی ہوں اور منھ میں پانی بھر بھر کر زور زور سے آسمان کی طرف چھوڑ دیتی ہوں سارا پانی پلٹ کر میرے اوپر آ گرتا ہے۔ یہ دیکھ کر اچانک میرے کانوں میں کسی کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ بجلی کا ایک کھمبا تالاب کے عین کنارے پر نصب تھا وہ اچانک ایک خوبصورت صحت مند مرد بن جاتا ہے۔ وہی مجھ پر ہنس رہا ہے۔ پھر وہ مجھے پکڑنے کے لئے اپنے لمبے لمبے بازو پانی میں ڈال دیتا ہے۔ اُس کے بازو بڑی بڑی مچھلیاں بن جاتے ہیں۔ میں گھبرا کر کبھی اِدھر غوطہ لگاتی ہوں کبھی اُدھر! اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے —— !"

ڈاکٹر نے ڈائری کے چند اوراق اور پلٹے اور ایک جگہ رُک کر کہا۔

"۳۱ جنوری۔ ایک خواب سے ڈر کر میں تین بار جاگی ہوں۔ پھر کتنی ہی دیر تک نیند نہ آئی۔ جب بھی آنکھ لگی پھر اُسی خواب کا سلسلہ شروع ہو گیا وہ خواب کچھ اِس طرح سے تھا —— میرے ڈیڈی گولف کھیلتے ہوئے اچانک گر گئے۔ اگرچہ وہ زندگی بھر ٹینس کے کھلاڑی رہے! میں اُنھیں ہسپتال میں انجکشن لگاتی ہوں۔ حالانکہ انجکشن لگانا مجھے نہیں آتا۔ میں نے کبھی ڈاکٹر یا نرس بننے کی بات بھی نہیں سوچی۔ میں اُن کی گردن پر انجکشن لگانا چاہتی ہوں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے اُن کی گردن کی پُشت تانے اُگے ہوئے ننھے ننھے کانٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ میں اُن کانٹوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتی ہوں تو میری انگلیوں کو ایک ٹھنڈی ٹھنڈی چبھن سی محسوس ہوتی ہے۔ ایک طرح کا سُکھ دینے والی چبھن! (یہ بات آپ کی وائف نے میرے پوچھنے پر ہی بتائی!) پھر اچانک میرے ہاتھ میں ایک بطخ آ جاتی ہے۔ سفید سفید کومل سی بطخ۔ اُس کی سُرخ چونچ مجھے بہت پسند ہے۔ میں اُس کی سُرخ چونچ کو کتنی دیر تک اپنے رُخسار سے لگائے بیٹھی رہتی ہوں۔ پھر میں اس کی چونچ کو اپنے منھ میں ڈال لیتی ہوں۔ لیکن بطخ زور زور سے کلکراتی اور پھڑ پھڑاتی ہوئی میرے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے —— اور میں جاگ اُٹھتی ہوں!"

دنیش نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے ڈائری لے لی۔ اُس میں کئی مہینوں تک بہت باقاعدگی سے خوابوں کی روئیداد تحریر کی گئی تھی۔ اُس نے جلدی جلدی کئی صفحات پلٹ ڈالے۔ پھر ایک جگہ رُک کر پڑھنے لگا —— ۱۲ مارچ۔ میں نے

کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ میرے ذہن میں کوئی بھی ایسا پسندیدہ چہرہ نہیں ہے جس کے خدوخال بیان کر سکوں لیکن پھر بھی میں ہمیشہ محسوس کرتی رہی ہوں کہ کوئی میرا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ جہاں جہاں میں جاتی ہوں۔ میں گھر سے باہر بہت کم نکلتی ہوں۔ کبھی اکیلی نہیں جاتی۔ شادی کے بعد میں نے خود کو بالکل بند سا کر لیا ہے۔ یہ قید میں نے خود ہی اپنے اوپر عائد کی ہے .... SELF IMPOSED IMPRISONMENT لیکن اس قید میں بھی کوئی مجھے دیکھنے کے لئے چلا آتا ہے۔ آج میں نے خواب میں جو بڑے بڑے آبشار دیکھے ہیں وہ مجھے اُسی آدمی کی لمبی چلتی پھرتی ہی معلوم ہوئی ہیں۔ آبشاروں سے ذرا دُور ایک چٹان پر بیٹھی ہوں۔ پانی کے چھینٹے اُڑ اُڑ کر مجھ تک پہنچ رہے ہیں۔ اور میں اُن چھینٹوں سے بہت محظوظ ہو رہی ہوں۔ میری ہنسی آپ سے آپ پھوٹی پڑتی ہے۔ جہاں آبشار گر رہے ہیں وہاں سفید جھاگ کا ایک پہاڑ سا بنا ہوا ہے جو سفید دھواں بھی معلوم ہوتا ہے۔ اُس سفید دھوئیں میں سے اچانک ایک کشتی ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اُس کشتی میں وہی آدمی منہ پھیر کے بیٹھا ہوا ہے اور کشتی کھے رہا ہے۔ وہ کشتی کو جھاگ میں سے باہر نکال لانا چاہتا ہے لیکن ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ کشتی اچانک ڈوبنے لگتی ہے اور میں زور سے چیخ اٹھتی ہوں!"

دنیش ڈائری کو میز پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ بڑی بڑی حیران، چمکتی ہوئی آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر بولا ——— "یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب! بالکل یہی خواب میں نے بھی دیکھا تھا۔ رتنا کی موت کی خبر سننے سے لگ بھگ تین روز پہلے! لیکن اُس نے مجھے اِس خواب کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ اُس نے مجھے کبھی خط ہی نہ لکھا۔ جب سے میں اُسے یہاں چھوڑ کر گیا۔ میں نے بھی اُسے کبھی نہ لکھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں میں صرف آپ ہی کو خط لکھ کر اُس کی خیریت جان لیتا تھا لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے ہم دونوں نے ایک ہی خواب دیکھا!"

ڈاکٹر نے پوچھا ——— "اُس خواب میں آپ کہاں تھے؟ ——— کشتی میں یا کنارے پر؟"

"کشتی میں ڈاکٹر صاحب! کشتی میں! میں نے جس طرح رتنا کو ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ وہی شکل اِس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے تیر سی رہی ہے! اُس کی ہنسی اِس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ وہ سمجھ رہی تھی میں جھاگ میں ڈوب جاؤں گا ——— اِسی لئے وہ ہنس رہی ہے! جب میں ہمت ہار بیٹھا اور ڈوبنے لگا تو مجھے اُس کی چیخ سنائی دی! اور میری آنکھ کھل گئی! اور عجیب بات یہ بھی ہے کہ میں صبح اُٹھتے ہی اِس خواب کو بالکل بھول گیا۔ آج تک بھولا ہی رہا لیکن یہ ڈائری پڑھ کر مجھے سب کچھ یاد آ گیا جیسے میں نے یہ خواب ابھی ابھی دیکھا ہو!"

ڈاکٹر کوٹھاری اور دنیش کتنی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف دونوں کا تڑپنے والی نظروں سے دیکھ [illegible] ڈائننگ ٹیبل پر ڈاکٹر کی بیوی کھانا لگانے لگی۔ [illegible] گئی۔ دونوں نے سر گھما کر میز پر لگی ہوئی پلیٹوں کی طرف دیکھا [illegible] دونوں کی نظریں ایک بار پھر ملیں اور دونوں [illegible] جا بیٹھے۔ ایک دوسرے کے آمنے سامنے! ڈاکٹر کی بیوی [illegible] تھی۔ تینوں بہت خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

کھانا کھاتے کھاتے اچانک دنیش کہنے لگا ——— "ڈاکٹر صاحب آپ سمجھتے ہوں گے رتنا کی بیماری کا کارن میں ہوں! اُس کے [illegible] سن کر ہر کوئی یہی اندازہ لگائے گا۔ میں نے اُسے جس طرح [illegible] طرح بے پروائی برتی اُس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے میں نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ چند لمحوں کے لئے گلاس کو ہونٹوں سے لگائے کے [illegible] نے ڈاکٹر اور اُس کی نیپالی بیوی پر بھی نظر ڈالی۔ ڈاکٹر ایک بڑی بوٹی سے اپنے چھوٹے چھوٹے دانتوں سے دھیرے دھیرے گوشت اُتار رہا تھا! بہت احتیاط سے! اور اُس کی بیوی دونوں ہاتھوں میں پیالہ اُٹھائے دھیرے دھیرے چکن شوپ سوپ کر رہی تھی۔

دنیش نے کہا ——— "آئی لوڈ رتنا! (I LOVED RATNA)

اُسے ہزاروں میں انتخاب کر کے میں نے اپنی پتنی بنایا تھا لیکن [illegible] لڑکی شادی کر کے بھی ذہنی طور پر اپنے باپ کے گھر سے جدا نہیں ہو پاتی۔ وہ [illegible] رہتی ہیں، وہاں کی ہر چیز کے ساتھ، وہاں کے ہر فرد کے ساتھ، اُن کی محبت ATTACHMENT اور نفرت اور سارے اپنے ٹیوڈز کے ساتھ جن کے درمیان اُن کا بچپن اور جوانی کے آغاز کا حصہ گزرتا ہے۔ وہ انہیں کسی طرح فراموش کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے رتنا پر اپنے باپ کی محبت کا بہت گہرا سایہ تھا کیونکہ وہ ہر وقت اُس کی تعریف کرتی رہتی تھی۔ اُسی کے گُن گاتی تھی۔ اور سچی بات بتاؤں! اُس گھر میں [illegible] ایک آدمی مجھے سخت ناپسند تھا۔ اس بات کی صحیح وجہ مجھے نہیں معلوم لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں اس کو کبھی اپنے دل میں کوئی جگہ نہ بنا سکا۔ میرے اور رتنا کے درمیان [illegible] بنا رہا اُس کا اصلی سبب وہی تھا۔ میں جب رتنا کی طرف سے کسی طرح کی ذہنی تبدیلی سے قطعی طور پر مایوس ہو گیا تو میں بھی اُسے نظرانداز کرنے لگا جیسے [illegible] آدمی ایک صدمہ کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی دیر سے گھر آتا ہے۔ کبھی دوستوں کی صحبت میں زیادہ اطمینان پاتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی دوسری عورت بھی اپنی زندگی میں داخل کر [illegible] ہے میں ایک فرسٹریٹڈ (FRUSTRATED) شوہر [illegible] ہوں۔ لیکن رتنا نے کبھی مجھ سے شکایت نہ کی کبھی زبان پر گلہ [illegible]

اُس نے مجھے یہ نہیں لکھا کہ میں نے کیوں ایسا احسان اختیار کیا تھا۔ لیکن آج مجھے یہ محسوس ہوا ہے اُس نے مجھ سے کہیں بڑھ کر محبت بھی کی ہے! مجھے ذہنی تکلیف کا احساس تو ضرور ہوا ہے لیکن میں کیا کر سکتا ہوں اب! ڈاکٹر صاحب! آپ نے اُس کی بہت زیادہ خبر گیری کی ہے۔ اُس کے سخت بیماری کے لمحات میں اُس کا ساتھ دیا ہے جو صرف میرا فرض تھا! آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ لیکن آپ سے کیا میں اس بات کی اُمید رکھوں کہ آپ مجھے رتنا کی آواز واپس کر دیں گے؟ اُس کے خطوط اور اُس کی ساری باتیں مجھے واپس کر دیں گے جو آپ کے پاس محفوظ ہیں؟"

اُس نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس کی طرف کئی لمحوں تک ٹکٹکی لگا کر دیکھا۔ ڈاکٹر بھی اُس کی طرف اُسی طرح دیکھتا رہا۔ اچانک اُس کی بیوی نے اُس سے کہا۔

"آپ کے پاس تو اُن کی قیمتی استھیاں بھی رکھی ہیں! کیا انہیں واپس نہ کیجیے گا؟"

ڈاکٹر نے گھور کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں غصہ تھا، سخت خفگی تھی۔ عورت بےچاری سہم گئی۔ جلدی سے اُٹھ کر میز پر سے خالی پلیٹیں اکٹھی کرنے لگی۔ ڈاکٹر نے میز پر سے اُٹھتے ہوئے کہا ——— "میرے پاس آپ کی وائف کی کئی چیزیں محفوظ ہیں۔ اُس کے کپڑے، اُس کی تصویریں جو اُس نے یہاں آ کر اُتروائیں اور وہ خطوط جو اُس نے آپ ہی کو لکھے لیکن کبھی پوسٹ نہ کئے! ایسا اُس نے میرے ہی مشورے پر کیا۔ ورنہ شاید اُن خطوط کو پڑھ کر آپ یہاں کبھی نہ آتے، اُس کے علاج کے مصارف بھی بھیجنا بند کر دیتے! اُس نے مجھے لکھ کر دے دیا تھا کہ میں اس کی کوئی چیز آپ کے حوالے نہ کروں! وہ آپ کو کبھی پسند نہیں کرتی تھی۔ چاہتی تھی آپ کو اُس کی موت کی اطلاع بھی نہ دی جائے! لیکن یہ اطلاع مجھے قانون کے ڈر سے آپ کو بھجوانی پڑی۔ مجبور تھا! اُمید ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گے! میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا!"

یہ کہہ کر ڈاکٹر ہاتھ دھونے چلا گیا۔ اُس کی بیوی ابھی تک میز پر سے پلیٹیں سمیٹ رہی تھی جنہیں ایک نوکر اُٹھا اُٹھا کر لے جا رہا تھا۔ اس نے ایک دو بار دنیش کی طرف ہمدردی بھری نظروں سے دیکھا پھر وہ بھی وہاں سے چلی گئی۔

دنیش ابھی تک میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ دونوں کہنیاں ٹیکے اور خلا میں گھورتا ہوا سا!

جب ڈاکٹر کمرے میں واپس آیا تو دنیش آگے بڑھ کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر منت بھرا ——— "پلیز ڈاکٹر! میں آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ شاید یہاں سے جلد از جلد چلا جانا چاہتا ہوں۔ لیکن آپ سے میری ایک درخواست ہے۔ رتنا کی یادگاریں مجھے عنایت کر دیجیے۔ سب نہ سہی، اُس کی استھیاں ہی دے دیجیے۔ اُن پر تو میرا قانونی حق بھی ہو سکتا ہے!"

ڈاکٹر نے پائپ میں تازہ تمباکو بھرتے ہوئے کہا ——— "آپ کا اُن استھیوں پر بھی کوئی حق نہیں ہے۔ آپ نے لکھا تھا ——— میری بیوی کی لاش کو پھونکنے کے لیے میرا انتظار نہ کیا جائے! آپ نے یہ نہیں لکھا تھا کہ اُس کی راکھ اور استھیاں سنبھال کر رکھ لی جائیں۔ جب کوئی یہ نہیں لکھتا تو مرنے والوں کی پوری راکھ ندی میں بہا دی جاتی ہے!"

جس ڈاکٹر کو وہ صبح مہربان اور شفیق سمجھ رہا تھا وہ کتنا سخت دل اور بےرحم تھا! معلوم ہوتا تھا وہ اِس چٹان میں گداز پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اِس بات کی ساری اُمید توڑ کر اُس نے آخری بار اُس سے درخواست کی ———

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے میرے دل میں رتنا کی محبت جگا دی ہوتی تو میں آپ سے کچھ بھی نہ مانگتا۔ آپ سے مل کر فوراً واپس چلا جاتا! لیکن جب آپ نے میرے سامنے اتنا کچھ رکھ ہی دیا ہے تو اُن میں سے صرف ایک چیز لے جانے کی اجازت مجھے ضرور دیجیے! اُس کی استھیاں ہی! اگر آپ مجھ پر یہ احسان نہ فرمائیں گے تو میں یہاں سے جاؤں گا ہی نہیں! یہ میرا اٹل فیصلہ ہے!"

یہ کہہ کر اُس نے ڈاکٹر کوٹھاری کی طرف ایسی نظر سے دیکھا جس میں عزم تھا، سختی تھی، محبت کا ایک سچا اور صالح جذبہ تھا۔ ڈاکٹر نے بھی اُس کی طرف گہری نظر سے دیکھا جس میں غصہ تھا، خشونت تھی، اور رشک و حسد کی ایک ایسی سُلگتی ہوئی کیفیت بھی جو دنیش کو اس سے پہلے دکھائی نہ دی تھی۔ اُس وقت تک اُس نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں نرمی ہی نرمی دیکھی تھی۔ اپنے مریضوں اور اُن کے وارثوں کے تئیں خلوص و محبت کا ایک بہتا ہوا دریا سا!

ڈاکٹر نے ایک جھٹکے کے ساتھ دانتوں کے درمیان پھنسا ہوا اپنا پائپ کھینچا اور بولا ——— "ٹھیک ہے! بیٹھیے۔ استھیاں آپ کو لا دیتا ہوں!"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ کچھ دیر تک کمرے میں بہت گہری اور سنگین سی خاموشی رہی۔ وہ وہاں اکیلا ہی کھڑا تھا۔ کمرے کے وسط میں۔ اچانک اندر جانے والے کمرے کا پردہ ہلا تو اُسے احساس ہوا کہ ڈاکٹر کی بیوی پردے کے پیچھے موجود ہے۔ وہ وہاں سے اُن کی ساری باتیں سُن رہی تھی۔ اُسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر ڈاکٹر کی بیوی سامنے آ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں اُون کا ایک پلاسٹک کا تھیلا تھا جس میں اُون کے گولے، ادھورا سویٹر اور سلائیاں تھیں۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ سلائیاں چلاتی ہوئی بولی ———

"آپ نے اُن سے اپنی محبت کا ذکر کیوں کیا؟ ——— لوگ اپنی بیوی کی محبت کا ذکر کرتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کو غصہ آ جاتا ہے!"

بقیہ صفحہ [illegible]

"کیوں! ــــــ کیا انھیں یقین نہیں آتا کہ کوئی اپنی بیوی سے محبت کر سکتا ہے!"

"جن عورتوں کو ٹی بی ہو جاتی ہے اُن میں سے زیادہ تر کو یہاں مرنے ہی کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اُن کے شوہر پھر کبھی پلٹ کر نہیں آتے۔ روپیہ پیسہ بھجواتے رہتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں چاہتے کہ اُن کی بیوی اچھی ہو کر کبھی واپس بھی آ جائے! یہ بات ڈاکٹر صاحب کے دل میں وشواس کی طرح بیٹھ چکی ہے۔ یہ وشواس اُن کے دل میں کئی برسوں کے تجربے کے بعد بیٹھا ہے۔ اسی وشواس نے اُن کے دل میں بیمار عورتوں سے ہمدردی اور محبت بھی پیدا کی ہے اور بیمار عورتوں کا انتظار کرنا بھی انھیں سکھا دیا ہے۔ وہ ہمیشہ ایسی عورتوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں جو اس لیے مایوس ہو کر یہاں نہیں آتیں کہ وہ کبھی اچھی نہ ہو سکیں گی! بلکہ اُن کی مایوسی کا اصل کارن یہ ہوتا ہے کہ انھیں یہاں سے پھر کبھی واپس نہیں لے جایا جائے گا!"

یہ کہتے کہتے اُس کے آنسو نکل پڑے۔ وہ چند لمحوں تک اپنی انگلیوں سے آنکھوں کو بند کر کے بیٹھی رہی۔ جیسے آنسوؤں کے سیلاب کے آگے بند باندھ دیا ہو! اُس کی گود سے اُون کا گولا نکل کر فرش پر گر پڑا۔ فرش پر لڑھکتا لڑھکتا بہت دور تک چلا گیا۔ پھر اُس نے کرسی کے بازو پر اپنا سر ڈال دیا اور سسکتی ہوئی بولی۔

"مجھے معاف کر دیجیے۔ میں یوں ہی بک گئی! میرے دُکھ نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں بھی کبھی یہاں بیمار ہو کر آئی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھ سے بھی ہمدردی اور محبت کی تھی۔ میں اچھی ہو گئی تو انھوں نے مجھ سے شادی کر لی۔ لیکن شادی کے بعد مجھے معلوم ہوا وہ تو ہر بیمار عورت سے محبت کرتے ہیں۔ ہر بیمار عورت کو اپنا سمجھ کر اُس کا علاج کرتے ہیں۔ ہر بیمار عورت بھی اُن کی محبت اور ہمدردی پا کر سیج جاتی ہے۔ جو عورتیں اچھی ہو کر واپس چلی جاتی ہیں وہ ڈاکٹر کو اُداس بنا جاتی ہیں۔ جو عورتیں مر جاتی ہیں وہ بھی ہمیشہ اُداس ہی رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب اب پاگل ہو چکے ہیں! لیکن یہ بات کوئی اور نہیں سمجھ سکتا!"

یہ سُن کر دنیش کی آنکھوں میں غصے کی لہر آ گئی۔ رشک و حسد کی جلن سے اُس کا سارا بدن دہک اُٹھا۔ ایک انگارے کی طرح!

ڈاکٹر ابھی تک لَوٹا نہ تھا۔ اُسے گئے ہوئے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر کی بیوی سے پوچھا ــــــ "کیا وہ بہت دور گئے ہیں؟"

ڈاکٹر کی بیوی کو بھی جیسے وقت گزر جانے کا احساس ہوا۔ وہ آنکھیں پونچھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش جس کی نمی پردہ ہٹانے سے ہوا کے ساتھ ساتھ اندر آ گئی۔ اُس نے کہا ــــــ وہ بہت دور تو نہیں گئے۔ بس ہسپتال کے پیچھے ہی ایک شمشان ہے لیکن انھیں بارش میں جانا نہیں چاہیے تھا۔ اس بہانے ہی تو وہاں جا سکتے تھے۔"

"میں جانتا ہوں اُن کے پیچھے" ... دنیش نے ...

اُس کی آنکھوں میں غصے کی بے تابی ...

"نہیں، آپ اکیلے وہاں نہ جا سکیں گے ... بلکہ انھیں اِس وقت تک آ جانا چاہیے تھا!"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے اندر گئی۔ وہاں سے ...

وہ ایک چھاتا اور ایک ٹارچ بھی لے آئی۔ چھاتا دنیش کے ... کرتی ہوئی بولی ــــــ

"ایک بات اور سُنیے! آپ اُن سے کچھ کہیں گے تو نہیں؟"

دنیش چپ کھڑا رہ گیا۔ بہت دیر تک چپ کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں غصے کی کیفیت پر اب ندامت غالب آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کی جلد کے نیچے بھی کئی لہریں چل رہی تھیں۔ پھر جیسے ایک طویل کشمکش سے نکل کر اُس نے ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے کہا ــــــ "کسی سے کچھ کہنے کا مجھے حق ہی کیا ہے؟ ڈاکٹر کو، نہ رتنا کو! رتنا تو اب اس دنیا ہی میں نہیں ہے! لیکن میں اب جاؤں گا۔ اپنے ہوٹل کو واپس جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب سے میری طرف سے معذرت کر لیجیے گا۔ میں آپ کا چھاتا لے جاؤں! یہ ٹارچ بھی مجھے دے دیجیے۔ آپ کی یہ دونوں چیزیں میں ہوٹل میں چھوڑ جاؤں گا۔ صبح وہاں سے منگوا لیجیے گا۔ شکریہ!"

یہ کہہ کر اُس نے ڈاکٹر کی بیوی کی طرف بہت مشکل سے دیکھا اور پھر جلدی سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر کی اُداس آنکھوں والی نرمل بیوی اُسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ پہاڑی پگڈنڈی پر ٹارچ کی مدد سے روشنی کے چھوٹے چھوٹے دائرے بناتا ہوا جا رہا تھا جنھیں رات کا اندھیرا ہر قدم پر ہڑپ کر لیتا تھا۔ نگل جاتا تھا!

---

# غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم۔ اے

فلک کو لے پڑوں دُودِ فغاں سے
لڑادوں آسماں کو آسماں سے

پسینا، وحشت آنکھوں میں، گلا خُشک
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

سمجھنا کم نہ ہم اہلِ زمیں کو
اُترتے ہیں صحیفے آسماں سے

کسی سے کیا ملے گا جو مِلا ہے
سہارا ناتواں کو ناتواں سے

ازل سے تا ابد کی ہے کہانی
سُناتے ہیں جسے سب درمیاں سے

بنالیتی حیاتِ کامراں کیا
شکایت کیا حیاتِ رائگاں سے

ہمیں اے کاش اِن رازوں کو سمجھیں
جنھیں ہم کہہ گئے ہیں رازداں سے

نظر اپنی جُدا تھی اُس کی لیکن
کہاں تک بات پہنچی ہے کہاں سے

رہیں کب تک غُبارِ خاطرِ دوست
اب اُٹھ جائیں گے تیرے آستاں سے

نہ ظاہر داریوں کو راہ دو تم
نوازو عشق کو لُطفِ نہاں سے

مجھے ڈھونڈھا کرے اب اِک زمانہ
مِٹا ہوں میں ترے جورِ نہاں سے

یہی موقع ہے عرضِ مُدعا کا
نظر آتے ہیں وہ کُچھ بدگماں سے

بہت اہلِ نظر دیکھے ہیں ہم نے
جھپک جاتے ہیں جو چشمِ بُتاں سے

کسی کو دیکھ کر ایسا لگا ہے
کہ جاگے ہیں ہم اِک خوابِ گراں سے

نفس کی آمد و شُد تو ہے لیکن
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

یہاں آنے کو آتے ہیں بہت لوگ
یہ سُنتے کوئی آیا ہے وہاں سے

خوشا قسمت یہ تمہیدِ کرم ہے
نظر آتے ہیں وہ کُچھ سرگراں سے

بدن چہرہ ہی چہرہ ہے سراپا
اُنھیں دیکھیں تو دیکھیں بھی کہاں سے

حجابِ ناز ہیں یا جلوۂ حُسن
اُٹھا دو اب یہ پردہ درمیاں سے

بہت مُشکل ہے یارو شیوۂ غم
نظر آتے ہیں ہم بھی شادماں سے

ہنسوں بولوں گا میں سب سے زرا[1] میں
ابھی چونکا ہوں یادِ رفتگاں سے

مرے آغوش میں ہے آج وہ چاند
خبر آئی تھی جس کی کہکشاں سے

تجھے کہنا تھی جو اِک بات اے دل
چھپایا ہے اِسی کو رازداں سے

بہت پیچھے مجھے جانا پڑے گا
ہر اِک نے بات اُٹھائی درمیاں سے

گُپھاؤں میں پلی تھی نسلِ آدم
اُبھر آئیں یہ تہذیبیں کہاں سے

لگیں سب صورتیں پرچھائیاں سی
کُہستاں بھی نظر آئے دُھواں سے

وجود و نیستی تھے جب مکمّل
نِکل آئے کہاں ہم درمیاں سے

کوئی آواز کانوں میں برابر
فراق آتی تو ہے لیکن کہاں سے

فراق گورکھپوری

[1] زرا میں یعنی تھوڑی دیر میں۔ فراق

افسانہ

# ہم نشیں

عظیم اقبال۔ ایم۔ اے

گنج ملا، بتیا (بہار)

۶ مارچ ۱۹۶۷ء    محترم بھائی! آداب

زیرِ نظر کہانی میں اعلیٰ سوسائٹی کی ایک معزز خاتون کے نقش و نگار ملاحظہ کیجئے ــــ طبقاتی نظام کے اندر ایک ہی کام کی حیثیت، اہمیت اور وقعت بدلتی رہتی ہے۔ اس کی مبہم سی وضاحت نقطۂ عروج پر ہو گئی ہے اور میرا موضوع بھی یہی تھا۔۔۔

خیر اندیش ــــ ــــ عظیم اقبال

میرے بازوؤں کے حلقے میں وہ پھڑک رہی تھی۔

کبھی کبھی جب قدم ڈگمگا جاتے تو اُس کے رخسار میرے چہرے کے بہت نزدیک ہوتے۔ کئی طرح کی ملی جُلی خوشبوئیں میری ناک میں سمانے لگتیں۔ میری گرفت کچھ اور مضبوط ہو جاتی۔ ذرا سی لغزش کا احساس ہوتا اور میں سونیا کو کسی قریبی نیم تاریک گوشے میں کھینچ لے جاتا۔ آرکسٹرا کی دُھن گونجتی رہتی۔ ہلکے جذبات سُلگتے رہتے ــــ سونیا میری بانہوں میں اُن دنوں بھی رہی ہے جب اُس کے عارض اتنے تابناک نہ تھے، ہونٹوں میں اتنا گداز بھی نہ تھا۔ نہ بازو ہی ایسے بھرے بھرے اور سڈول تھے۔ آج تو وہ سراپا قیامت ہے۔ شیمپین کے کئی جام پی کر بھی اتنا سُرور نہیں آتا، جتنا نشہ اُس کی ایک ہلکی مُسکراہٹ میں ہے۔ جب وہ ہنستی ہے تو گالوں میں ہلکے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ یونہی ہنستی رہے اور یہ گڑھے۔۔۔ عجیب کشش ہے ان میں! میرے لبوں سے سگریٹ چھین کر اکثر ایک آدھ کش لگاتی ہے۔ پھر کچھ ایسے انداز میں ہونٹ سکوڑتی ہے کہ میں خود کو سنبھال نہیں پاتا۔ عورت کے حُسن کا مرکز یہ ہونٹ ہی تو ہوتے ہیں۔ کبھی دلربائی کے ساتھ احتجاج کرتی ہے۔

"نو! دِس اِز ویری اِنڈیسنٹ!"

میں مان بھی جاؤں تو دل نہیں مانتا۔ اُسے آتی جاتی نگاہوں کی پروا ہوتی ہے دبے دبے قہقہوں کی۔ حجاب سے گھٹن پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے لئے زہر ہے۔ چند لمحوں کی چھوٹی سی یہ زندگی! کوئی کتنے لبادے اوڑھے، کیسے کیسے نقاب چڑھائے!

اُس کیف آگیں شام کو ہوٹل نٹ راج میں بال روم کیلئے وہ میری ہم رقص تھی۔

ابھی ابھی ہم نے شراب کے کئی جام چڑھائے تھے۔ اُس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں۔ میری رگوں میں چنگاریاں دہک رہی تھیں۔ موسیقی کی لہروں کے ساتھ ساتھ تھرکنے والے جوڑوں کے قدم نپے تُلے انداز میں گھوم رہے تھے۔ گرد و پیش میں رومان کی فراوانی تھی۔ اُس کی ہتھیلیوں میں بلا کا گداز تھا اور حرارت! شاید اُس پر نشے کا کچھ زیادہ اثر ہو رہا تھا۔ وہ بار بار لڑکھڑا جاتی۔ میں سنبھال لیتا۔

"اوہ نو!" وہ ہونٹ سکوڑتی۔ پھر مُسکرا دیتی۔

"تمہاری مُسکراہٹ کے بغیر سُرور ہی نہیں آتا!"

"فراڈ!"

"بالکل سچ!"

"کبھی کبھی تم ایسی بات کہہ دیتے ہو۔۔" سونیا نے ماتھے پر آئی ہوئی ایک لٹ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"تم ہی بتاؤ کس مشکل سے مل پائی ہو۔ ایسا بھی کیا غیروں کے درمیان اپنوں کو فراموش کر دیا جائے" میں نے شکوہ کیا۔

"مجھے یاد کرتے ہو؟"

"ہاں ہر لمحہ۔ ہر گھڑی!"

"جھوٹے!"

"بائی گاڈ!"

"سوئی!"

# قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

| | | |
|---|---|---|
| آتش گل | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| کلیات اقبال | ڈاکٹر اقبال | چھ روپے |
| جنون و ہوش | جوش ملسیانی | چار روپے |
| ہفت رنگ | عرش ملسیانی | تین روپے |
| آہنگ حجاز | " | ایک روپیہ |
| [illegible] | ساحر ہوشیارپوری | تین روپے |
| دستک | نرش کمار شاد | دو روپے ۲۵ پیسے |
| پتوار | " | دو روپے ۵۰ پیسے |
| [illegible] | " | دو روپے ۲۵ پیسے |
| [illegible] | " | تین روپے |
| [illegible] | " | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| [illegible] | " | تین روپے |
| رباعیات محروم | تلوک چند محروم | تین روپے ۷۵ پیسے |
| [illegible] | " | سات روپے ۵۰ پیسے |
| روپ | فراق گورکھپوری | تین روپے ۵۰ پیسے |
| روح کائنات | " | تین روپے ۵۰ پیسے |
| مشعل | " | دو روپے ۷۵ پیسے |
| بیکراں | جگن ناتھ آزاد | چار روپے ۵۰ پیسے |
| ستاروں سے ذروں تک | " | دو روپے ۷۵ پیسے |
| کلیات اکبر الہ آبادی (اول) | اکبر الہ آبادی | پانچ روپے |
| حصہ دوم | " | چھ روپے |
| کلیات اختر شیرانی | اختر شیرانی | آٹھ روپے |
| رعنائیاں | شکیل بدایونی | تین روپے |
| صنم و حرم | " | دو روپے ۲۵ پیسے |
| [illegible] رعنا | جلی رعنا | تین روپے ۵۰ پیسے |
| شبنم شبنم | سرشار [illegible] | پانچ روپے |
| [illegible] | | چھ روپے |

| | | |
|---|---|---|
| خرابات | عبدالحمید عدم | چار روپے |
| رمِ آہو | " | چار روپے |
| گلنار | " | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قول و قرار | " | تین روپے ۵۰ پیسے |
| گردشِ جام | " | دو روپے ۲۵ پیسے |
| بطِ مے | " | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گجر | قتیل شفائی | تین روپے |
| رسالتِ مآب | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| اسلام اور عورت | مولانا مظہر الدین | تین روپے |
| نماز کیا ہے | مولانا محمد علی | دو روپے ۲۵ پیسے |
| نیا نو دن | راشد سہسوانی | پانچ روپے ۷۰ پیسے |
| غم دیئے مستقل | انیس مرزا | چار روپے ۵۰ پیسے |
| شرارت | جمیل انجم | تین روپے |
| عشق اور خون | رائیڈن ہگرڈ | سات روپے |
| سوکھا ساون | انیس مرزا | دو روپے ۵۰ پیسے |
| محبت اور جرم | انور کمال حسینی | دو روپے ۵۰ پیسے |
| فن اور تنقید | " | چار روپے ۵۰ پیسے |

**آئینۂ اصلاح** ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر معہ توجیہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

**جوش ملسیانی** کے مکمل حالات زندگی، انتخاب کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۴۸ صفحے ضخامت، ۵۰۰ صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

**مضراب** شباب للت کے ایک ایک شعر میں اُس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اُس نے سارے جہان کے دُکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپیہ۔

**گلستانِ ہزار رنگ** جس میں تقریباً چار ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دئے گئے ہیں۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اُردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۷۵ پیسے۔

**شاہنامۂ اسلام** جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام۔ چار حصوں میں جن میں تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتی سولہ روپے اب صرف نو روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

**تلامذۂ غالب** غالبیات کے مشہور ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پورے صفحہ کی تقریباً تیس تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

**کفر و ایمان** پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت اختر کا نام نامی ہی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے۔ کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ درد مند دل کی گرمی بھی ہے۔ قیمت چار روپیہ۔

**گردِ راہ** ضیا فتح آبادی کا چوتھا مجموعۂ کلام۔۔۔ ضیا ایک صاحب طرز شاعر ہیں۔ اُن کے انداز بیان اور لب و لہجہ میں انفرادیت و ندرت ہے۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

پتہ: رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

افسانہ

# ہم نشیں

عظیم اقبال۔ ایم۔ اے

گنج ۱، بتیا (بہار)

۶ مارچ ۱۹۶۷ء

محترم بھائی! آداب

زیرِ نظر کہانی میں اعلیٰ سوسائٹی کی ایک معزز خاتون کے نقش و نگار ملاحظہ کیجئے ـــــ طبقاتی نظام کے اندر ایک ہی کام کی حیثیت، اہمیت اور وقعت بدلتی رہتی ہے۔ اس کی مبہم سی وضاحت نقطۂ عروج پر ہوگئی ہے اور میرا موضوع بھی یہی تھا . . .

خیر اندیش ـــــ - عظیم اقبال

میرے بازوؤں کے حلقے میں وہ پھر تھرک رہی تھی۔

کبھی کبھی جب قدم ڈگمگا جاتے تو اُس کے رخسار میرے چہرے کے بہت ب ہوتے۔ کئی طرح کی ملی جلی خوشبوئیں میری ناک میں سمانے لگتیں۔ میری ت کچھ اور مضبوط ہوجاتی۔ ذرا سی لغزش کا احساس ہوتا اور میں سونیا کو کسی ) نیم تاریک گوشے میں کھینچ لے جاتا۔ آرکسٹرا کی دھن گونجتی رہتی۔ ہلکے جذبات ‍ رہتے ـــــ سونیا میری بانہوں میں اُن دنوں بھی رہی ہے جب اُس کے ں اتنے تابناک نہ تھے، ہونٹوں میں اتنا گداز بھی نہ تھا۔ نہ بازو ہی ایسے بھرے ے اور سڈول تھے۔ آج تو وہ سراپا قیامت ہے۔ شیمپین کے کئی جام پی کر بھی اتنا نہیں آتا، جتنا نشہ اُس کی ایک ہلکی مسکراہٹ میں ہے۔ جب وہ ہنستی ہے تو گالوں لکے گڑھے پڑجاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ یونہی ہنستی رہے اور یہ گڑھے... عجیب ں ہے ان میں! میرے لبوں سے سگریٹ چھین کر اکثر ایک آدھ کش لگاتی ہے۔ پھر کچھ انداز میں ہونٹ سکوڑتی ہے کہ میں خود کو سنبھال نہیں پاتا۔ عورت کے حسن کا مرکز یہ ـ ہی تو ہوتے ہیں۔ کبھی دلربائی کے ساتھ احتجاج کرتی ہے۔

"نو! دِس از ویری اِنڈیسنٹ!"

میں مان بھی جاؤں تو دل نہیں مانتا۔ اُسے آتی جاتی نگاہوں کی پروا ہوتی ہے ہ دبے قہقہوں کی۔ حجاب سے گھٹن پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے لئے زہر ہے۔ چند لمحوں ‍ ٹی سی یہ زندگی! کوئی کتنے لبادے اوڑھے، کیسے کیسے نقاب چڑھائے!

اُس کیف انگیں شام کو ہوٹل نٹ راج میں بال روم کیلئے وہ میری ہم رقص تھی۔

ابھی ابھی ہم نے شراب کے کئی جام چڑھائے تھے۔ اُس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں۔ میری رگوں میں چنگاریاں دہک رہی تھیں۔ موسیقی کی لہروں کے ساتھ ساتھ ناچنے والے جوڑوں کے قدم نپے تُلے انداز میں گھوم رہے تھے۔ گرد و پیش میں رومان کی فراوانی تھی۔ اُس کی ہتھیلیوں میں بلا کا گداز تھا اور حرارت! شاید اُس پر نشے کا کچھ زیادہ اثر ہو رہا تھا۔ وہ بار بار لڑکھڑا جاتی۔ میں سنبھال لیتا۔

"اوہ نو!" وہ ہونٹ سکوڑتی۔ پھر مسکرا دیتی۔

"تمھاری مسکراہٹ کے بغیر سرور ہی نہیں آتا!"

"فراڈ!"

"بالکل سچ!"

"کبھی کبھی تم الٹی بات کہہ دیتے ہو..." سونیا نے ماتھے پر آئی ہوئی ایک لٹ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"تم ہی بتاؤ کس مشکل سے مِل پائی ہو۔ ایسا بھی کیا غیروں کے درمیان اپنوں کو فراموش کر دیا جائے" میں نے شکوہ کیا۔

"مجھے یاد کرتے ہو؟"

"ہاں ہر لمحہ۔ ہر گھڑی!"

"جھوٹے!"

"بائی گاڈ!"

"سونی!"

"ہوں"

"سنہا صاحب کے مزاج کیسے ہیں؟ آج کل ملاقات ہی نہیں ہوتی"

"اوہ! پتی دیو؟ زیادہ مشغول ہیں۔ بزنس والوں کو فرصت کہاں رہتی ہے"

"مجھے تو رہتی ہے"

"ویکڈ مین! لڑکیوں کے لئے نا؟"

وہ ہنسنے لگی۔ خوشبو کی لپٹیں اُٹھیں۔ میں نے اُسے اور قریب کھینچا۔

آرکسٹرا تھم گیا۔ رقص کا پہلا راؤنڈ ختم ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہم ایک خالی میز کی جانب بڑھے۔

"ہیلو سونیا! کیسی ہو؟"

"سونی ڈارلنگ!"

"ونڈر فل! ہاؤ ایکسلنٹ یو لُک!"

"سونیا پلیز۔ ایک نظر اِدھر بھی!"

"مائی سویٹی . . ."

اُس کے شناسائی اُسے گھیرے رہتے۔ کوئی اُس کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا، کوئی بانہیں تھام رہا تھا، کسی نے اُسے گلے لگایا، کسی اور نے گال تھپتھپایا۔ وہ ہولے ہولے مُسکراتی رہی۔ سونیا کے کتنے سارے دوست ہیں۔ اُس کے ساتھ کہیں چلے جائیے۔ شہر کے کسی گوشے میں، کسی محفل میں۔ ہر جگہ اُس کے دوست موجود ہیں۔ سونیا کو اپنے دوستوں پر ناز ہے۔ اُس کے دوست اُس پر فریفتہ رہتے ہیں۔ اُس نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا اور دوستی کی بُنیادیں خوش سلیقگی ہی پر تو استوار ہوتی ہیں۔

مال کے جنوبی گوشے میں بمبیٹرلم تھی۔ ہم وہیں چلے آئے۔ میں نے شراب کا آرڈر دے دیا۔ سونیا میک اپ درست کرنے لگی۔ لپ اسٹک کی تہ بالکل ماند پڑ گئی تھی۔ گالوں کی سُرخی بھی مدھم ہو چلی تھی۔ پرس کے چھوٹے سے آئینے میں دیکھ دیکھ کر وہ اپنی نوک پلک سنوار رہی تھی۔ میں نے جام میں شراب ڈالی۔ پھر سوڈا ملانے لگا۔

"تمہارے لئے بھی؟" میں نے سونیا سے پوچھا۔

"بس تھوڑی سی" جواب ملا۔

عجیب عورت ہے۔ ابھی بہک رہی تھی، لڑکھڑا رہی تھی، لیکن پینے سے باز نہ آئے گی۔ میں سوچنے لگا۔ پھر عجیب سی گدگدی کا احساس ہوا۔ کتنی گزری ہوئی راتوں کے مست و مدہوش کُن سائے نگاہوں میں جُھوم اُٹھے۔ ہاں وہ دائیں طرف گردن سے بہت نیچے، جہاں سُرخ سپید گوشت کی دلفریب تہیں ہیں، وہیں ایک بڑا سا تِل ہے۔ اُسی طرف برف سی اُجلی شفاف مِڈریف سے اوپر ایک اور کالا دھبہ ہے۔ اُس کے نیول کی گہرائی! توبہ توبہ! اُس کی پنڈلیوں پر بھورے رنگ کے چھوٹے چھوٹے بہت سے بال ہیں اور اُس کے جسم کی حدّت! مجھے محسوس ہوا میرے پُورے بدن پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہوں۔

"اِس سال بھی شادی نہیں کی۔ تنہائی میں نیند کیسے آتی ہے تمہیں؟" سونیا نے میری سوچ کو منتشر کر دیا۔

"راتیں کٹ ہی جاتی ہیں کسی نہ کسی طرح" میں ہلکے سے ہنس دیا۔

"آج میرے یہاں رہ جاؤ . . ." میں نے اپنی خواہش اُس کے سامنے رکھ دی۔

اُس نے اپنی نگاہیں جُھکائیں۔ پل بھر کو چُپ رہی، پھر بولی۔

"آج نہیں، کبھی اور سہی"

میں کچھ نہ بولا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بنانے لگا۔

"بُرا مان گئے؟" سونیا نے میرے ہونٹوں سے سگریٹ چھین کر اپنے ہونٹوں میں داب لیا۔

"زبردستی تو ہے نہیں۔ تمہاری مرضی" میں نے دوسرا سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

"دراصل آج کے لئے کمیٹ (Commit) کر چکی ہوں اور تم جانتے ہی ہو دوستوں کو میں ناراض نہیں کر سکتی"

"خیر! کبھی کو کال (Call) کر لوں گا۔ جذبات کو کچلنے کا میں عادی نہیں"

"ویل!" حیرت سے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں "کیا تم آوارہ عورتوں سے بھی ملتے ہو؟"

میں خاموش رہا۔ سگریٹ کا ایک ہلکا کش کھینچ کر دھواں اُس کے چہرے پہ چھوڑ دیا۔

"ناٹی بوائے! تمہارا ٹیسٹ (Taste) اتنا خراب کیوں ہو گیا ہے؟"

میں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ وہ مجھے گھورنے لگی۔

آرکسٹرا پھر شروع ہو گیا تھا۔ رقص کے دوسرے دور کے لئے جوڑے فلور پر آنے لگے تھے۔ میں نے سونیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لڑکھڑاتی ہوئی وہ اُٹھی اور میری بانہوں میں آ گئی!!

---

# خدوخال

محمود سعیدی

متناسب زفرق تا بہ قدم    جیسے آذر کے خواب کی تکمیل
سربسر حُسن اُس کا ہر انداز    جیسے شاعر کا شاہکارِ جمیل

—— ○○ ——

جیسے پھولوں سے ہولدی کوئی شاخ    تن نازک پہ بوجھ گہنوں کا
بار بار اِس الوکھی سج دھج پر    چھیڑ سکھیوں کی، پیار بہنوں کا

—— ○○ ——

جیسے اِک اجنبی سفر کے لئے    کشتیٔ نُور آسماں سے چلے
گھر سے بابل کے یوں چلی ڈولی    بوئے گُل جیسے گلستاں سے چلے

—— ○○ ——

نشۂ موجِ انبساط میں گُم    دل کے سب عقدہ ہائے پیچیدہ
پیکرِ نازِ بے خبر، بے سدھ    پہلوئے آرزو میں خوابیدہ

—— ○○ ——

صبح ہوتے ہی سب بھرم کھولا    رات کے رازداں یہ کیسے ہیں!
گیسوؤں میں یہ برہمی کیوں ہے؟    عارضوں پہ نشاں یہ کیسے ہیں!

—— ○○ ——

حُسن کی سادگی کے ساتھ آخر    عشق اِک تازہ کھیل، کھیل گیا
کچھ ادائی بھی، کر گیا برداشت    بے رُخی کا بھی وار جھیل گیا

—— ○○ ——

کیفِ آسودگی کے ساتھ ہی ساتھ    دل پہ کچھ وسوسے بھی طاری ہیں
پہلا پہلا سفر ہے خوابوں کا    پاؤں چلنے میں بھار بھاری ہیں

—— ○○ ——

رات کو جاگتی رہی تا دیر    اپنے خوابوں کے پاسبان کے ساتھ
پھر بھی وہ نُورِ دیدۂ آفاق    جاگ اُٹھی صبح کی اذان کے ساتھ

—— ○○ ——

سر بہ سجدہ وہ سرو قد، یعنی    نازِ خود عالمِ نیاز میں ہے
آسمانوں سے ڈھل رہا ہے نُور    صبح کی روشنی نماز میں ہے

—— ○○ ——

زُلف کی چھاؤں کے گلابی دن    چمپئی چاندنی کی راتیں ہیں
جی رہا ہے جو اُس کی قربت میں    دن اُسی کے اُسی کی راتیں ہیں

—— ○○ ——

# نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| شکست کے بعد | کرشن چندر | چار روپیہ پچاس پیسے |
| طوفان کی کلیاں | " | چار روپے |
| گرجے کی واپسی | " | تین روپے |
| الٹا درخت | " | دو روپے پچہتر پیسے |
| دروازہ | " | دو روپے پچیس پیسے |
| سسرال | شوکت تھانوی | دو روپے |
| مسٹر ۵۰ | " | تین روپے پچاس پیسے |
| بقراط | " | دو روپے پچاس پیسے |
| جی ہاں پٹے ہیں | " | تین روپے پچیس پیسے |
| جوڑ توڑ | " | پانچ روپے |
| داماد | " | دو روپیہ پچیس پیسے |
| گوشۂ عافیت | پریم چند | پانچ روپے |
| جوگیان ہستی مکمل | " | گیارہ روپے |
| دودھ کی قیمت | " | تین روپے |
| خاک پروانہ | " | تین روپے |
| صبح زندگی | راشد الخیری | دو روپے |
| شب زندگی | " | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| شام زندگی | " | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| سیدہ کی بیٹی | رازق الخیری | تین روپے |
| سمن پوش | مجنوں گورکھپوری | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| اقبال | " | چار روپے |
| گرد کارواں | کنھیا لال کپور | تین روپے |
| سنگ و خشت | " | دو روپیہ پچاس پیسے |
| سونا گاچھی | جمنا داس اختر | چار روپے پچاس پیسے |
| شعلۂ سنگ | کوثر چاندپوری | تین روپے پچاس پیسے |
| شمع | اے آر خاتون | پانچ روپے |
| چشمہ | " | دس روپے پچہتر پیسے |
| شکیلہ | مسعود ہمایوں | چار روپے پچیس پیسے |

| | | |
|---|---|---|
| شکست ظلمت | مخمور جالندھری | ایک روپیہ پچہتر پیسے |
| آرزو کی کلیاں | " | ایک روپیہ پچہتر پیسے |
| پہلی محبت | " | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| خواب گاہ میں | " | تین روپے پچاس پیسے |
| دنیا کے مشہور سائنسداں | " | دو روپے پچیس پیسے |
| شائستہ | نادرہ خاتون | چار روپے پچاس پیسے |
| ظالم | سعید امرت | دو روپے پچاس پیسے |
| فتح خیبر | صادق حسین | چار روپے |
| مقابلہ | خان محبوب طرزی | تین روپے |
| نیلوفر | " | تین روپے |
| اکبری دروازہ | " | چار روپے |
| دوشیزۂ روم | " | تین روپے |
| دیوانہ | " | تین روپے |
| دو دیوانے | " | دو روپے پچاس پیسے |
| سیلاب | " | تین روپے |
| گناہ | دت بھارتی | دو روپے پچاس پیسے |
| اندھیرے اجالے | عادل رشید | تین روپے |
| بہار آنے تک | " | تین روپے پچاس پیسے |
| دو پھول | " | تین روپے پچاس پیسے |
| مغرور | رئیس احمد جعفری | چار روپے پچاس پیسے |
| قیامت | ذکی انور | دو روپے پچاس پیسے |
| سازش | " | دو روپے پچاس پیسے |
| گورا | ٹیگور | چار روپے پچاس پیسے |
| لٹ گئی بہار | ضیا عظیم آبادی | تین روپے پچاس پیسے |
| دل ہی تو ہے | " | چار روپے پچیس پیسے |
| ممتاز | ایم اسلم | آٹھ روپے |
| آخری رات | " | پانچ روپے |
| ریحانہ | " | سات روپے |

| | | |
|---|---|---|
| ودوہ | مہندر ناتھ | چار روپے پچہتر پیسے |
| گلی گلی | رام لعل | چار روپے |
| فردوس گوش | حضرت جوش ملسیانی | چار روپے |
| کفر و ایمان | ہری چند اختر | چار روپے |
| وسکی کی بوتل | موہن یادو | دو روپے |
| لنکن نے کہا | منور لکھنوی | تین روپے |
| موٹر میکینک گائڈ | شیو ناتھ تسکین | چار روپے |
| موٹر ڈرائیونگ | کرشنا نند شوا | چار روپے پچاس پیسے |
| کیا خوب آدمی تھا | | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| عجیب لڑکی | اوم پرکاش نامی | تین روپے |
| ہمارا نبیل (بچوں کیلئے) | خوشتر گرامی | پچاس پیسے |
| ہمارا سبھاش " ہندی " | | پچاس پیسے |
| اجالے سے پہلے | ابراہیم جلیس | دو روپے پچاس پیسے |
| ابھرتے جوبن | اظہار اثر | دو روپے |
| آندھی میں چراغ | غلام الثقلین | سات روپے پچاس پیسے |
| اقوال زریں | مصطفےٰ احسن زیدی | پچاس پیسے |
| انارکلی | امتیاز علی تاج | دو روپے پچاس پیسے |
| آشا دیپ بجھ نا | ستیہ پرکاش سنگر | دو روپے |
| ابراہیم لنکن | چندر موہن لامبہ | ایک روپیہ پچہتر پیسے |
| انسانیت موت کے دروازے پر | مولانا ابوالکلام آزاد | تین روپیہ پچاس پیسے |
| اصلی مکمل باورچی خانہ | جے سی داس ساجد | تین روپے پچاس پیسے |
| جینے کے لئے | ستیہ پال آنند | دو روپیہ پچاس پیسے |
| پچیس سال بعد | امرتا پریتم | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| حادثہ | قیسی رامپوری | پانچ روپے پچاس پیسے |
| خون | شہزادہ تبسم | چار روپے |
| رضیہ کا شاہی دسترخوان | رضیہ سلطانہ | دو روپے پچاس پیسے |
| رسیلی | شہزادہ تبسم | دو روپے پچاس پیسے |
| زمین کے چھالے | آزاد ملیح آبادی | تین روپے پچاس پیسے |

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۲، دہلی

افسانہ

# بُجھتے دیئے کی لَو

بشیشر پردیپ ایم-ایس سی

۱۸ اگلستان کالونی - بندریا باغ لکھنؤ

۱۸ / اپریل ۱۹۶۷ء

محترمی خوشتر صاحب - تسلیم

... ایک بے بس زندگی کی کہانی ہے، کسی کی عاجزی اور معصوم حسرتوں کا افسانہ ہے۔ اُمید ہے موضوع کا تنوع آپ کو اور قارئین "بیسویں صدی" کو پسند آئے گا۔ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا ——
آپ افسانہ نمبر کی تیاریوں میں مشغول ہوں گے۔ اسے حسین سے حسین ترین بنانے کی کوششوں میں لگے ہونگے!
خدا کرے یہ افسانہ نمبر بھی اپنی گزشتہ روایت کو قائم رکھتا ہوا اُردو ادب میں ایک نیا سنگِ میل ثابت ہو!

"بیسویں صدی" کے لیے نیک دُعاؤں کے ساتھ،

آپ کا —— بشیشر پردیپ

مسکراتا گلاب!

لڑکیوں نے مس نگم کو خطاب دیا تھا ——

سیکنڈ ایر کی لڑکیوں کو فیئرول پارٹی دی گئی تو آنرز لسٹ میں سینئر لڑکیوں کے ساتھ ٹیچروں کو بھی خطابات سے نوازا گیا۔ اور پرنسپل مس شوبھا نگم کے خطاب پر ہال تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔ پچھلے برس اور اس سے پہلے بھی کئی بار ایسے موقعوں پر لڑکیوں نے مس نگم کے بھاری جسم کو اُس کے خطاب کا موضوع بنایا تھا۔ لیکن اس سال اُس کی موجودہ صحت اور شخصیت نے جیسے انھیں اپنا نظریہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا!

مس نگم کا مٹاپا ڈائٹنگ یا ورزش سے دُور نہیں ہوا تھا۔ اُس کے پیٹ میں رسولی تھی۔ آپریشن سے رسولی نکالی گئی تو نہ جانے آپریشن کا یہ کوئی طبّی اثر تھا یا قدرت کا کرشمہ کہ اُس کا جسم دُبلا ہو گیا۔ رسولی دس پونڈ کی تھی لیکن اُس کے وزن میں کمی چالیس پونڈ کی ہو گئی۔ اور مس نگم جب ہسپتال سے لوٹی تو اُس کا رنگ زرد تھا، بدن چھریرا اور خوبصورت نکل آیا تھا!

اور اُس کے بعد مس نگم نے اپنا وزن برقرار رکھنے کا تہیّہ کر لیا۔

ہو سکتا ہے اُس کا وزن پھر بڑھ جاتا اور جسم بھاری ہو جاتا اگر اُس کے دل میں اُس وقت اچانک شادی کی خواہش بیدار نہ ہو جاتی!

مس نگم کی عمر اُس وقت بتیس برس کی تھی جسم بھاری تھا لیکن اُس کی گوری رنگت، بیضوی چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ اور موٹی موٹی سیاہ آنکھیں اس بات کی شاہد تھیں کہ مس نگم کا شمار کسی وقت حسین عورتوں میں رہا ہوگا۔ اُسے دیکھنے کے بعد یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اگر اُس نے اپنے جسم کی پروا کی ہوتی، اُسے یوں موٹا نہ ہونے دیا ہوتا تو وہ ایک خوبصورت عورت ہوتی۔

ڈاکٹر نے رسولی نکالتے وقت آس پاس کا تھوڑا سا گوشت بائی اوپسی (BIOPSY) کے لیے نکال لیا۔ جانچ کی گئی تو پتہ چلا مس نگم کو کینسر ہے اور مرض اُس منزل پر پہنچ چکا ہے کہ مزید آپریشن کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

مس نگم کے باپ ماں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

کینسر!

بے بسی!!

موت کا انتظار!!!

شوبھا ختم ہو جائے گی کیا؟! ہمیں چھوڑ کر چلی جائے گی کیا —— ؟!

ڈاکٹر نے یہ کیا کہہ دیا ہے ـــــ ؟!

ڈاکٹر بولا۔

"یقیناً یہ بدقسمتی کی بات ہے لیکن جو کچھ بھی ہے اُسے آپ ہی کو برداشت کرنا ہے۔ صرف آپ لوگوں کو ـــــ پھر اُسے دلیری کے ساتھ کیوں نہ برداشت کریں۔ میرا خیال ہے آپ مریضہ سے مرض کو راز ہی میں رکھیں تو بہتر ہوگا۔ اِس طرح آپ اُس کی زندگی میں کچھ اضافہ کرسکیں گے ـــــ"

اور اُنھوں نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ہامی بھرلی ـــــ !

دو ہفتے کے بعد جب مس نگم ہسپتال سے لوٹ رہی تھی تو اُس کے باپ ماں کے ہونٹوں پر بناوٹی مسرت تھی۔ وہ اپنے دلوں میں اُس کی بھیانک بیماری کے دُکھ کو چھپائے ہوئے تھے۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر حقیقی خوشی ناچ رہی تھی۔ وہ اپنے جسم کو بہت ہلکا محسوس کررہی تھی۔ گھر پہنچ کر جب وہ پہلی بار قدِ آدم آئینے کے سامنے آئی تو وہ خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہ سکی۔ آئینے میں کھڑی مس نگم کسی طرح چوبیس پچیس برس کی عمر سے زیادہ کی نہ تھی !

یعنی ـــــ یعنی وہ اب بھی شادی کرسکتی ہے ! ـــــ اور اُس کے کانوں میں ڈاکٹر کے وہ الفاظ گونجنے لگے جو اُس نے آپریشن سے پہلے اپنے اسسٹنٹ سے کہے تھے۔

وہ آپریشن تھیٹر سے ملحقہ پری آپریشن روم میں تھی۔ اُسے بے ہوشی کا انجکشن لگاتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تھا۔

"آپریشن کرتے وقت ہمیں اِس بات کا خاص خیال رکھنا ہے کہ مس نگم اگر مستقبل قریب میں کبھی شادی کا ارادہ کریں تو وہ ماں بننے کے قابل ہوں ـــــ"

ڈاکٹر کا خیال ہے۔ وہ اب بھی شادی کا ارادہ کرسکتی ہے ـــــ اور ـــــ اور ماں بن سکتی ہے !

اور وہ بیڈ پر لیٹی لیٹی شرماسی گئی ـــــ

اور آپریشن کے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو ڈاکٹر کے پوچھنے پر "کیسی طبیعت ہے آپ کی مس نگم ـــــ ؟" اُس نے ڈاکٹر ہی سے سوال کر ڈالا تھا۔

"ڈاکٹر ـــــ آپریشن ٹھیک ہوا ہے نا ـــــ ؟ وہ ـــــ وہ ـــــ"

اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ جھجک سی گئی اور اپنی اس جھجک کو مٹانے کے لئے یونہی کراہ اُٹھی۔

ڈاکٹر اُس کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

بولا ـــــ

"آپریشن کامیاب ہوا ہے مس نگم ـــــ بس اب آپ چیر فل رہا کیجئے ـــــ چیر فل ـــــ ہاں ـــــ"

اُس نے ہوسلے سے اُس کے شانوں کو تھپتھپا دیا۔

وہ صرف دو ہفتے ہسپتال میں رہی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا اُس نے غیر معمولی تیزی سے مکمل صحت حاصل کرلی تھی۔ ہسپتال میں رہنے کے دَوران اُس نے اکثر سوچا۔ ڈاکٹر نے آپریشن کرتے وقت اِس بات کا : اس خیال رکھا ہے کہ اگر وہ شادی کرلے تو ماں بن سکے !

یعنی ـــــ یعنی وہ اب بھی مکمل عورت ہے۔ اب بھی وہ ماں بن سکتی ہے۔ اور یہ سوچ کر اُسے ایک انوکھی مسرت کا احساس ہوتا، ایک عجیب سکون محسوس ہوتا۔ کئی بار اُسے ننھے مُنّے دو ہاتھ اپنے گالوں پر پھیلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے دو بازو گلے میں حائل ہوتے محسوس ہوتے اور وہ چونک اُٹھتی۔ اور پھر ان سب احساسات کو الگ سے اپنے دل کو ایک گوشے میں رکھ دیتی جیسے یہ احساسات اُس کا نہایت قیمتی سرمایہ ہوں !

آئینہ ڈاکٹر کے خیال کی تائید کررہا تھا۔ جب ڈاکٹر نے اُس کی ماں بننے کی صلاحیت کو بحال رکھنے کے لئے خاص احتیاط سے کام لیا ہے تو وہ ماں کیوں نہ بنے ! وہ شادی کیوں نہ کرے ؟! اب تک وہ شادی سے انکار کرتی آئی تھی۔ وہ اِس بات کو بھول ہی گئی تھی کہ شادی سے انکار کرکے وہ عورت کی سب سے بڑی خوبی سے محروم ہو رہی تھی !

جب پہلے پہل اُس نے شادی سے انکار کیا تھا تو اُس کے ماں باپ نے اُس کے انکار کو محض لڑکیوں کی فطری شرم اور گھر چھوڑنے کے دُکھ پر محمول کیا تھا۔ لیکن جب اُس نے بعد میں سختی سے منع کردیا تو وہ خاموش ہوگئے۔ اُس کے پتا جی ذرا آزاد خیال آدمی تھے۔ انھوں نے اُسے زیادہ مجبور کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے لگی۔ اُسے ٹیچنگ زیادہ پسند تھی اور اُس نے اپنے لئے یہی ذریعۂ معاش چُنا۔ کچھ آزاد زندگی اور بے فکری۔ کچھ پیسے کی فراوانی اور کچھ جنسِ مخالف سے غیر دلچسپی۔ اُس کا جسم بھاری ہونا شروع ہوگیا۔ پہلے کچھ عرصے تو وہ پریشان رہی اپنی اِس بدلتی ہوئی ہیئت کو دیکھ کر۔ لیکن پھر اُس نے اِس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ ہاں البتہ اِس مُٹاپے کا اُس پر اتنا ردِعمل ضرور ہوا کہ وہ شادی کے خیال سے اور دُور ہوگئی !

جوں جوں آپریشن کو وقت گزرتا گیا اُس کی صحت گرنے کے بجائے اچھی ہوتی گئی۔ رنگ نکھرتا گیا اور جسم سڈول ہوتا گیا۔ اور یہ دیکھ کر اُس کے والدین کو حیرت ہوئی۔ اور پھر حیرت کی جگہ مسرت نے لے لی لیکن جب بھی وہ اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے، کینسر کا خونخوار دیو انھیں اُس کے سامنے جبڑے کھولے نظر آتا۔ شاید یہ دیو اپنے شکار کو صحت مند اور تندرست بناکر ہی نگلنا چاہتا ہے ! اور وہ اپنی مسرت کو دل ہی میں دبا دیتے۔

آپریشن کو پورا ایک سال ہو چکا ہے اور مس نگم بیکا گلاب کی طرح کھل اٹھی ہے۔ کوئی بھی دیکھنے والا اُسے چوبیس پچیس برس کی عمر سے زیادہ کا نہیں سمجھ سکتا۔ نجانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی کبھی بہت ہی مہلک مرض والے مریض نہایت دلکش دکھائی دیتے ہیں! ایک خاص معصومیت، ایک انوکھی محبوبیت اُن کی شخصیت کا اہم جزو بن جاتی ہے! —— مس نگم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی تو دیکھتی ہی رہ جاتی!

اور ایک دن اُس نے شارنا اسکول کی ایک ٹیچر کے سامنے شادی کے لئے اپنا خیال ظاہر کر دیا —— اور جب بات منہ سے نکل گئی تو اُس نے برملا کہہ دیا۔ ——

"جی ہاں —— وہ اب شادی کا ارادہ رکھتی ہے —— " اسکول کی ٹیچروں نے تو اُس کے لئے میچ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اُس کے ماں باپ نے اس طرف ذرا بھی توجہ نہ کی اور یہ دیکھ کر اُسے صدمہ ہوا —— اُس کی شادی ہو جانے پر وہ لوگ اس کی تنخواہ سے محروم ہو جائیں گے —— شاید اس لئے —— ؟ ——

لیکن —— لیکن وہ نہ بھی چاہیں تو بھی وہ شادی کر سکتی ہے —— !

اور اُس نے ارادہ کر لیا وہ خود ہی اپنی شادی طے کرے گی —— اور چند ہی روز میں ایک ٹیچر کی مدد سے ایک جگہ بات چل نکلی ——

سندیپ پی۔ سی۔ ایس تھا —— اور پینتیس برس کا ہو جانے پر بھی کنوارا تھا —— لیکن پچھلے کچھ دنوں سے اُس نے اچانک شادی کے لئے سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ شوبھا نگم سے ملا تو ہزار جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا —— دوسری ہی ملاقات میں اُس نے شادی کے لئے اپنی رضامندی دے دی۔

جب مس نگم نے گھر میں بات کی تو اُسے یہ دیکھ کر بہت کوفت ہوئی کہ اُس کی شادی طے ہو جانے پر اُس کے ماں باپ دونوں کے چہرے فق ہو گئے تھے —— !

اس کی غیر حاضری میں ماں باپ میں بحث ہوئی۔ باپ اس حق میں تھا کہ لب ولہجا کو اُس کے مہلک مرض کے بارے میں بتا دینا چاہئے اور اُسے شادی سے روک دینا چاہئے۔ لیکن ماں کا کہنا تھا "جب وہ تندرست ہو گئی ہے تو اُس کی خوشیوں کا خاتمہ کر دینا کہاں تک صحیح ہے اور پھر ہو سکتا ہے وہ اس طرح کافی عرصے تک زندہ رہ سکے!"

آخر ماں کی بات مان لی گئی اور دونوں نے اپنی خوشی کا اظہار کر دیا ——

شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شادی میں چند ہی روز رہتے تھے۔ شوبھا خوش تھی۔ اُس کے ماں باپ خوش تھے۔ اُس کے اسکول کی اُستانیاں اور لڑکیاں خوش تھیں کہ اچانک اُس نے اعلان کر دیا —— وہ شادی نہیں کرے گی! —— وہ کسی کے بندھن میں نہیں بندھنا چاہتی! وہ اپنے سوچے ہوئے راستے سے بھٹک گئی تھی لیکن شکر ہے کہ جلد لوٹ آئی ——!!

اور اُس کے اس اعلان سے سب کو ایک زبردست دھکا لگا ——

لڑکا اُس نے خود پسند کیا تھا۔ منگنی اُس نے خود طے کی تھی۔ شادی کی تاریخ اُس نے خود مقرر کی تھی۔ اس لئے والدین کو اُس کے منگنی کے توڑ دینے سے کوئی سماجی اُلجھن یا پریشانی تو نہیں ہوئی۔ لیکن ایک ایسی خوشی جس کے قبول کرنے کے لئے انہوں نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو تیار کیا تھا، اُن کے پاس آنے سے پہلے ہی اُن سے دور ہو گئی تھی۔ اس بات کا انہیں دُکھ ضرور ہوا۔

سندیپ نے سُنا تو اُسے بھی اپنی محبت کے یُوں ختم ہو جانے کا دُکھ ہوا —— مس نگم کو سمجھانے کے لئے اُس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دینے کے لئے وہ اُس کے گھر چلا آیا۔

مس نگم اُس سے نہایت خندہ پیشانی سے ملی۔

سندیپ بولا۔

"میرا خیال تھا محبت کی چنگاری دونوں طرف برابر سُلگتی ہے لیکن آپ کے یوں منگنی توڑ دینے سے مجھے اپنا یہ خیال غلط نظر آ رہا ہے ——"

مس نگم چند لمحے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

"سندیپ صاحب! آپ کے ان جذبات کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے۔ میرے دل میں کوئی ایسا جذبہ نہیں ہے —— میں شادی سے نفرت کرتی تھی۔ اب بھی نفرت کرتی ہوں اور ہمیشہ نفرت کرتی رہوں گی۔ نہ جانے میں کیسے بہک گئی تھی۔ اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ میں نے آپ کے ساتھ بات چیت شروع کر کے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کیا۔ اس کے لئے میں آپ سے معافی چاہتی ہوں —— لیکن ساری زندگی کا دُکھ مول لینے سے یہ تھوڑی سی پریشانی اچھی ہے۔ میں کبھی ازدواجی زندگی میں خوش نہیں رہ سکتی —— اور نہ کسی کو خوش رکھ سکتی ہوں۔ میں مجبور ہوں سندیپ صاحب! مجبور اور بے بس!"

اور سندیپ ناکام و نامُراد واپس چلا آیا ——

اور اُس رات مس نگم نے اپنی ڈائری میں لکھا ——

'یقیناً خوشی کے دو تین سال جی لینا بہتر ہیں ایک پوری دُکھ بھری زندگی بتا دینے سے۔ لیکن کسی کو دھوکے میں رکھ کر میں خوشی کے یہ چند سال کیوں بتاؤں؟

اور پھر یہ محبت کی بھی تو توہین ہے کہ اپنے محبوب کو دھوکے میں رکھا جائے! —— مجھے اگر اپنی میڈیکل رپورٹ کا پتہ نہ چلتا اور شادی ہو جاتی تو یہ کتنی بڑی ٹریجیڈی ہوتی —— محبت کو خود غرضی کا نام مل جاتا! —— اور سندیپ کو سب بات بتا کر میں اُس کی محبت کا امتحان بھی تو نہیں لینا چاہتی! —— محبت کا بھرم قائم رہنا ہی اچھا ہے۔

ماں باپ نے اپنے پیار سے مجبور ہو کر مجھ سے یہ سب چھپائے رکھا ہے۔

افسانہ

# بجھتے دیئے کی لَو

بشیشر پردیپ ایم۔ایس سی

۱۸ ـ گلستان کالونی۔ بندریا باغ ،لکھنؤ

۱۸ اپریل ۱۹۶۷ء

محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

... ایک بے بس زندگی کی کہانی ہے۔ کسی کی عارضی اور معصوم مسرّتوں کا افسانہ ہے۔ اُمید ہے موضوع کا تنوع آپ کو اور قارئینِ "بیسویں صدی" کو پسند آئے گا۔ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا ـــــــ

آپ افسانہ نمبر کی تیاریوں میں مشغول ہوں گے۔ اسے حسین سے حسین ترین بنانے کی کوششوں میں لگے ہونگے! خدا کرے یہ افسانہ نمبر بھی اپنی گزشتہ روایات کو قائم رکھتا ہوا اُردو ادب میں ایک نیا سنگِ میل ثابت ہو!

"بیسویں صدی" کے لئے نیک دُعاؤں کے ساتھ

آپ کا ـــــــ بشیشر پردیپ

مسکراتا گلاب!

لڑکیوں نے مس نگم کو خطاب دیا تھا ـــــــ

سیکنڈ ایر کی لڑکیوں کو فیئرول پارٹی دی گئی تو آنرز لسٹ میں سینئر لڑکیوں کے ساتھ ٹیچروں کو بھی خطابات سے نوازا گیا۔ اور پرنسپل مس شوبھا نگم کے خطاب پر ہال تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔ پچھلے برس اور اس سے پہلے بھی کئی بار ایسے موقعوں پر لڑکیوں نے مس نگم کے بھاری جسم کو اُس کے خطاب کا موضوع بنایا تھا۔ لیکن اس بار اُس کی موجودہ صحت اور شخصیت نے جیسے انھیں اپنا نظریہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا!

مس نگم کا مُٹاپا ڈائٹنگ یا ورزش سے دُور نہیں ہوا تھا۔ اُس کے پیٹ میں رسولی تھی۔ آپریشن سے رسولی نکالی گئی تو نہ جانے آپریشن کا یہ کوئی طبّی اثر تھا یا قدرت کا کرشمہ کہ اُس کا جسم دُبلا ہو گیا۔ رسولی دس پونڈ کی تھی لیکن اُس کے وزن میں کمی چالیس پونڈ کی ہو گئی۔ اور مس نگم جب ہسپتال سے لَوٹی تو اُس کا رنگ زرد تھا، لیکن جسم چھریرا اور خوبصورت نکل آیا تھا!

اور اُس کے بعد مس نگم نے اپنا وزن برقرار رکھنے کا تہیّہ کر لیا۔

ہو سکتا ہے اُس کا وزن پھر بڑھ جاتا اور جسم بھاری ہو جاتا اگر اُس کے دل میں اُس وقت اچانک شادی کی خواہش بیدار نہ ہو جاتی!

مس نگم کی عمر اُس وقت بتیس برس کی تھی جسم بھاری تھا لیکن اُس کی گوری رنگت، بیضوی چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ اور موٹی موٹی سیاہ آنکھیں اس بات کی شاہد تھیں کہ مس نگم کا شمار کسی وقت حسین عورتوں میں رہا ہوگا۔ اُسے دیکھنے کے بعد یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اگر اُس نے اپنے جسم کی پروا کی ہوتی، اُسے یوں موٹا نہ ہونے دیا ہوتا تو وہ ایک خوبصورت عورت ہوتی۔

ڈاکٹر نے رسولی نکالتے وقت آس پاس کا تھوڑا سا گوشت بائی اوپسی (BIOPSY) کے لئے نکال لیا۔ جانچ کی گئی تو پتہ چلا مس نگم کو کینسر ہے اور مرض اُس منزل پر پہنچ چکا ہے کہ مزید آپریشن کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

مس نگم کے باپ ماں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

کینسر!

بے بسی!!

موت کا انتظار!!!

شوبھا ختم ہو جائے گی کیا ؟! ہمیں چھوڑ کر چلی جائے گی کیا ـــــ ؟!

ڈاکٹر نے یہ کیا کہہ دیا ہے —— ؟!

ڈاکٹر بولا۔

"یقیناً یہ بدقسمتی کی بات ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہے اُسے آپ ہی کو برداشت کرنا ہے۔ صرف آپ لوگوں کو —— پھر اُسے دلیری کے ساتھ کیوں نہ برداشت کریں۔ میرا خیال ہے آپ مریضہ سے مرض کو راز ہی میں رکھیں تو بہتر ہوگا۔ اِس طرح آپ اُس کی زندگی میں کچھ اضافہ کر سکیں گے —— ۔"

اور اُنھوں نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ہامی بھر لی —— !

دو ہفتے کے بعد جب مِس نگم ہسپتال سے لَوٹ رہی تھی تو اُس کے باپ ماں کے ہونٹوں پر بناوٹی مسرت تھی۔ وہ اپنے دلوں میں اُس کی بھیانک بیماری کے دکھ کو چھپائے ہوئے تھے۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر حقیقی خوشی ناچ رہی تھی۔ وہ اپنے جسم کو بہت ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ گھر پہنچ کر جب وہ پہلی بار قدِآدم آئینے کے سامنے آئی تو وہ خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہ سکی۔ آئینے میں کھڑی مِس نگم کسی طرح چوبیس پچیس برس کی عمر سے زیادہ کی نہ تھی!

یعنی —— یعنی وہ اب بھی شادی کر سکتی ہے! —— اور اُس کے کانوں میں ڈاکٹر کے وہ الفاظ گونجنے لگے جو اُس نے آپریشن سے پہلے اپنے اسسٹنٹ سے کہے تھے۔

وہ آپریشن تھیٹر سے ملحقہ پری آپریشن رُوم میں تھی۔ اُسے بے ہوشی کا انجکشن لگاتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تھا۔

"آپریشن کرتے وقت ہمیں اِس بات کا خاص خیال رکھنا ہے کہ مِس نگم اگر مستقبل قریب میں کبھی شادی کا ارادہ کر لیں تو وہ ماں بننے کے قابل ہوں —— "

ڈاکٹر کا خیال ہے۔ وہ اب بھی شادی کا ارادہ کر سکتی ہے —— اور —— اور ماں بن سکتی ہے!

اور وہ بیڈ پر لیٹی لیٹی شرما سی گئی ——

اور آپریشن کے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو ڈاکٹر کے پوچھنے پر "کیسی طبیعت ہے آپ کی مِس نگم —— ؟" اُس نے ڈاکٹر ہی سے سوال کر ڈالا تھا۔

"ڈاکٹر —— آپریشن ٹھیک ہوا ہے نا —— ؟ وہ —— وہ —— "

اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ جھجک سی گئی اور اپنی اس جھجک کو مٹانے کے لئے یونہی کراہ اُٹھی۔

ڈاکٹر اُس کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

بولا ——

"آپریشن کامیاب ہوا ہے مِس نگم —— بس اب آپ چیرفُل رہا کیجئے —— "

چیرفُل —— ہاں ——

اُس نے ہولے سے اُس کے شانوں کو تھپتھپا دیا۔

وہ صرف دو ہفتے ہسپتال میں رہی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا اُس نے غیر معمولی تیزی سے مکمل صحت حاصل کر لی تھی۔ ہسپتال میں رہنے کے دَوران اُس نے اکثر سوچا۔ ڈاکٹر نے آپریشن کرتے وقت اِس بات کا خیال رکھا ہے کہ اگر وہ شادی کرے تو ماں بن سکے! یعنی —— یعنی وہ اب بھی مکمل عورت ہے۔ اب بھی وہ ماں بن سکتی ہے اور یہ سوچ کر اُسے ایک انوکھی مسرت کا احساس ہوتا، ایک عجیب سکون محسوس ہوتا۔ کئی بار اُسے ننھے مُنّے دو ہاتھ اپنے گالوں پر پھیلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے دو بازو گلے میں حائل ہوتے محسوس ہوتے اور وہ چونک اُٹھتی۔ اور پھر ان سب احساسات کو الگ سے اپنے دل کو ایک گوشے میں رکھ دیتی۔ جیسے یہ احساسات اُس کا نہایت قیمتی سرمایہ ہوں!

آئینہ ڈاکٹر کے خیال کی تائید کر رہا تھا۔ جب ڈاکٹر نے اُس کی ماں بننے کی صلاحیت کو بحال رکھنے کے لئے خاص احتیاط سے کام لیا ہے تو وہ ماں کیوں نہ بنے! وہ شادی کیوں نہ کرے؟! اب تک وہ شادی سے انکار کرتی آئی تھی۔ وہ اِس بات کو بھول ہی گئی تھی کہ شادی سے انکار کر کے وہ عورت کی سب سے بڑی خوبی سے محروم ہو رہی تھی!

جب پہلے پہل اُس نے شادی سے انکار کیا تھا تو اُس کے ماں باپ نے اُس کے انکار کو محض لڑکیوں کی فطری شرم اور گھر چھوڑنے کے دُکھ پر محمول کیا تھا۔ لیکن جب اُس نے بعد میں سختی سے منع کر دیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ اُس کے پتا جی ذرا آزاد خیال آدمی تھے۔ انھوں نے اُسے زیادہ مجبور کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے لگی۔ اُسے ٹیچنگ زیادہ پسند تھی اور اُس نے اپنے لئے یہی ذریعۂ معاش چُنا۔ کچھ آزاد زندگی اور بے فکری۔ کچھ پیسے کی فراوانی اور کچھ جنسِ مخالف سے غیر دلچسپی۔ اُس کا جسم بھاری ہونا شروع ہو گیا۔ پہلے کچھ عرصے تو وہ پریشان رہی اپنی اِس بدلتی ہوئی ہیئت کو دیکھ کر۔ لیکن پھر اُس نے اِس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ ہاں البتہ اِس مُٹاپے کا اُس پر اتنا ردِّعمل ضرور ہوا کہ وہ شادی کے خیال سے اور دُور ہو گئی:

جُوں جُوں آپریشن کو وقت گزرتا گیا اُس کی صحت گرنے کے بجائے اچھی ہوتی گئی۔ رنگ نکھرتا گیا اور جسم سڈول ہوتا گیا۔ اور یہ دیکھ کر اس کے والدین کو حیرت ہوئی۔ اور پھر حیرت کی جگہ مسرت نے لے لی لیکن جب بھی وہ اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے، کینسر کا خونخوار دیو انھیں اُس کے سامنے جبڑے کھولے نظر آتا۔ شاید یہ دیو اپنے شکار کو صحت مند اور تندرست بنا کر ہی نگلنا چاہتا ہے! اور وہ اپنی مسرت کو دل ہی میں دبا دیتے۔

---

آپریشن کو پورا ایک سال ہو چکا ہے اور مس نگم ترو تازہ گلاب کی طرح کھل اُٹھی ہے۔ کوئی بھی دیکھنے والا اُسے چوبیس پچیس برس کی عمر سے زیادہ کا نہیں سمجھ سکتا نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی کبھی بہت ہی مہلک مرض والے مریض نہایت دلکش دکھائی دیتے ہیں! ایک خاص معصومیت، ایک انوکھی محبوبیت اُن کی شخصیت کا اہم جزو بن جاتی ہے! ـــــ مس نگم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی تو دیکھتی ہی رہ جاتی اور ایک دن اُس نے شاردا اسکول کی ایک ٹیچر کے سامنے شادی کے لئے اپنا خیال ظاہر کر دیا ـــــ اور جب بات منہ سے نکل گئی تو اُس نے برملا کہہ دیا۔ ـــــ

"جی ہاں ـــــ وہ اب شادی کا ارادہ رکھتی ہے ـــــ" اسکول کی ٹیچروں نے تو اُس کے لئے بیچ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اُس کے ماں باپ نے اِس طرف ذرا بھی توجہ نہ کی اور یہ دیکھ کر اُسے صدمہ ہوا ـــــ اُس کی شادی ہو جانے پر وہ لوگ اس کی تنخواہ سے محروم ہو جائیں گے ـــــ شاید اِس لئے ـــــ؟ ـــــ

لیکن ـــــ لیکن وہ نہ بھی چاہیں تو بھی وہ شادی کر سکتی ہے ـــــ!

اور اُس نے ارادہ کر لیا وہ خود ہی اپنی شادی طے کرے گی ـــــ اور چند ہی روز میں ایک ٹیچر کی مدد سے ایک جگہ بات چل نکلی ـــــ

سندیپ پی۔سی۔ایس تھا ـــــ اور پینتیس برس کا ہو جانے پر بھی کنوارا تھا ـــــ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے اُس نے اچانک شادی کے لئے سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ شوبھا نگم سے ملا تو ہزار جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا ـــــ دوسری ہی ملاقات میں اُس نے شادی کے لئے اپنی رضامندی دے دی۔

جب مس نگم نے گھر میں بات کی تو اُسے یہ دیکھ کر بہت کوفت ہوئی کہ اُس کی شادی طے ہو جانے پر اُس کے ماں باپ دونوں کے چہرے فق ہو گئے تھے ـــــ!

اس کی غیر حاضری میں ماں باپ میں بحث ہوئی۔ باپ اس حق میں تھا کہ اب شوبھا کو اُس کے مہلک مرض کے بارے میں بتا دینا چاہئے اور اُسے شادی سے روک دینا چاہئے۔ لیکن ماں کا کہنا تھا "جب وہ تندرست ہو گئی ہے تو اُس کی خوشیوں کا خاتمہ کر دینا کہاں تک صحیح ہے اور پھر ہو سکتا ہے وہ اِس طرح کافی عرصے تک زندہ رہ سکے!"

آخر ماں کی بات مان لی گئی اور دونوں نے اپنی خوشی کا اظہار کر دیا ـــــ

شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شادی میں چند ہی روز رہتے تھے۔ شوبھا خوش تھی۔ اُس کے ماں باپ خوش تھے۔ اُس کے اسکول کی اُستانیاں اور لڑکیاں خوش تھیں کہ اچانک اُس نے اعلان کر دیا ـــــ وہ شادی نہیں کرے گی! ـــــ وہ شادی کے بندھن میں نہیں بندھنا چاہتی! وہ اپنے سوچے ہوئے راستے سے بھٹک گئی تھی لیکن شکر ہے کہ جلد لوٹ آئی ـــــ!!

اور اُس کے اِس اعلان سے سب کو ایک زبردست دھکا لگا ـــــ

لڑکا اُس نے خود پسند کیا تھا۔ منگنی اُس نے خود طے کی تھی شادی کی تاریخ اُس نے خود مقرر کی تھی۔ اِس لئے والدین کو اُس کے منگنی کے توڑ دینے سے کوئی سماجی اُلجھن یا پریشانی تو نہیں ہوئی۔ لیکن ایک ایسی خوشی جس کے قبول کرنے کے لئے انہوں نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو تیار کیا تھا، اُن کے پاس آنے سے پہلے ہی اُن سے دور ہو گئی تھی۔ اِس بات کا انھیں دُکھ ضرور ہوا۔

سندیپ نے سُنا تو اُسے بھی اپنی محبت کے یُوں ختم ہو جانے کا دُکھ ہوا ـــــ مس نگم کو سمجھانے کے لئے اُس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دینے کے لئے وہ اُس کے گھر چلا آیا۔

مس نگم اُس سے نہایت خندہ پیشانی سے ملی۔

سندیپ بولا۔

"میرا خیال تھا محبت کی چنگاری دونوں طرف برابر سُلگتی ہے لیکن آپ کے یوں منگنی توڑ دینے سے مجھے اپنا یہ خیال غلط نظر آ رہا ہے ـــــ"

مس نگم چند لمحے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

"سندیپ صاحب! آپ کے اِن جذبات کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے۔ میرے دل میں کوئی ایسا جذبہ نہیں ہے ـــــ میں شادی سے نفرت کرتی تھی۔ اب بھی نفرت کرتی ہوں اور ہمیشہ نفرت کرتی رہوں گی۔ نہ جانے میں کیسے بہک گئی تھی۔ اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ میں نے آپ کے ساتھ بات چیت شروع کر کے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کیا۔ اِس کے لئے میں آپ سے معافی چاہتی ہوں ـــــ لیکن ساری زندگی کا دُکھ مول لینے سے یہ تھوڑی سی پریشانی اچھی ہے۔ میں کبھی ازدواجی زندگی میں خوش نہیں رہ سکتی ـــــ اور نہ کسی کو خوش رکھ سکتی ہوں۔ میں مجبور ہوں سندیپ صاحب! مجبور اور بے بس!"

اور سندیپ ناکام و نامراد واپس چلا آیا ـــــ

اور اُس رات مس نگم نے اپنی ڈائری میں لکھا ـــــ

'یقیناً خوشی کے دو تین سال جی لینا بہتر ہیں ایک پوری دکھ بھری زندگی بتا دینے سے لیکن کسی کو دھوکے میں رکھ کر میں خوشی کے یہ چند سال کیوں بِتاؤں؟

اور پھر یہ محبت کی بھی تو توہین ہے کہ اپنے محبوب کو دھوکے میں رکھا جائے! ـــــ مجھے اگر اپنی میڈیکل رپورٹ کا پتہ نہ چلتا اور شادی ہو جاتی تو یہ کتنی بڑی ٹریجیڈی ہوتی ـــــ محبت کو خود غرضی کا نام مل جاتا! ـــــ اور سندیپ کو سب بات بتا کر میں اُس کی محبت کا امتحان بھی تو نہیں لینا چاہتی! ـــــ محبت کا بھرم قائم رہنا ہی اچھا ہے۔

ماں باپ نے اپنے پیار سے مجبور ہو کر مجھ سے یہ سب چھپائے رکھا ہے۔

دے پیارے تو اب بھی نہیں جانتے کہ میں اپنی مُہلک بیماری کے بارے میں جان گئی ہوں۔
انھیں یہ سب بتاکر میں اُن کے دُکھ کو کیوں بڑھاؤں ــــ ؟
کل تک مجھے پتہ نہ تھا ــــ اور میں انجانے میں اپنی مُہلک بیماری سے
لڑتی رہی ــــ لیکن اب ــــ اب اِس کے بارے میں جان لینے کے بعد بھی
میں اس کا مقابلہ کرسکوں گی کیا ــــ ؟ مجھے یہی دیکھنا ہے ــــ !
مجھے دیکھنا ہے کہ اب میں اپنی موت کو کتنے عرصے اپنے سے دُور رکھ
سکوں گی ــــ "
اور اُس نے ڈائری بند کردی اور پلکوں پر چھلک کر آئے ہوئے آنسوؤں
کو پونچھ ڈالا ــــ

---

# غزل

مُجھ پر آج اِس قدر مہرباں وہ ہوگئے
دامنِ حیات سے داغِ زیست دُھو گئے

بحرِ غم سے آج ہم ابر پار ہوگئے
خود سفینۂ حیات آ کے وہ ڈبو گئے

منزلوں کی گود میں لوگ جاکے سو گئے
ہم رہِ حیات کی گردشوں میں کھو گئے

ہوشیار کس قدر اہلِ عشق ہوگئے
اُن کو ڈھونڈنے چلے اور خود ہی کھو گئے

سادگی میں لُٹ گئے سادگی میں کھو گئے
جس نے ہنس کے بات کی ہم اُسی کے ہوگئے

تم نے لُطف کی نظر مجھ پہ کی یہ کیا کیا
اور دل میں تیرِ غم سینکڑوں چُبھو گئے

عزم جن کے تھے جواں پستیوں کے باوجود
باوقار بن گئے تاجدار ہوگئے

وجہ خوابِ دائمی تھی وہ جُنبشِ نظر
تیغ کی ہوائیں تھیں ... لوگ سو گئے

کُچھ تو خود ہی پست تھے راہیوں کے حوصلے
اور کُچھ دراز تر فاصلے بھی ہوگئے

منزلِ سکونِ دل دَیر ہے کہ ہے حرم؟
کتنے قافلے اِسی جُستجو میں کھو گئے

کس سے پھر چھپو گے تم یہ بھی دل میں سوچ لو
پست حوصلے اگر اہلِ دل کے ہوگئے

رات ہم نے کاٹ دی انتظارِ صبح میں
اور جب سحر ہوئی رُونما تو سو گئے

امتحاں وفاؤں کا آبر یُوں لیا گیا
زندگی کے درد میں وہ مجھے سمو گئے

ابراحسنی گنوری

افسانے سے بھی دلچسپ تاریخی حقائق

# گنگا سے نیل تک

ظفر پیامی۔ ایم۔ اے

... نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی

۲۳ اپریل ۱۹۶۷ء                برادرِ محترم!

تسلیم! پچھلے شمارے میں "گنگا سے نیل تک" ملاحظہ ... پچھلی ... کی ایک شام ... میں نے ادب اور تاریخ کو سمونے کا نسبتاً ایک نیا تجربہ کیا تھا۔ میرے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات اور کیا ہوگی کہ آپ نے اور بیسویں صدی کے قارئین نے اسے پسند کیا۔ اسی سے حوصلہ پاکر اس مرتبہ تحقیق، تاریخی حقائق اور سیاحانہ مشاہدات کو ادبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کی اور بیسویں صدی کے ہزاروں قارئین کی رائے کا مجھے انتظار رہے گا ——— یہ کہنا تو حقیقت کو دہرانا ہوگا کہ اپنے تجربات کی ... صرف آپ ہی کے پاس ہو سکتی ہے۔ ہاں اب "افسانہ نمبر" کے لئے بھی مجھ سے فرمائش کرتے ہیں تو "تاریخی حقائق" کی ... بیسویں صدی کے معیار کا لامثال ذوق ظاہر ہوتا ہے مگر اس حقیقت کی نوید بھی ملتی ہے کہ آپ کے بلند عزائم کے طفیل اس بار بھی "افسانہ نمبر" ادبی دنیا کی سب سے حسین تخلیقات کا مجموعہ ہوگا! ایک بات بتائیے کیا آپ اپنی ہی "خوشترانہ" روایتوں کو توڑتے ہوئے ... معیار پر پہنچتے پہنچتے بھی حوصلہ نہ ہاریں گے؟

نیازمند ——— ظفر پیامی

حُسن کی حسین ترین ادا وہ ہے جو عشق کو خود سے بیگانہ نہیں ہونے دیتی۔ ہماری محبت کا عظیم ترین اظہار بھی وہ احساس ہے جہاں ہمیں اپنے محبوب میں بہت کچھ ایسا نظر آجائے جو ہمارا اپنا ہے۔ جسے ہم پہچانتے ہیں، جسے ہم بہت دنوں سے جانتے ہیں، جس کے بغیر ہماری شخصیت، ہمارا کردار اور ہمارا شعور مکمل نہیں ہو سکتا۔

عرب دنیا کے ایک سیلانی کو عرب بازاروں میں گھومتے ہوئے ایسا بہت کچھ مل جائے گا جو اجنبی ہوتے ہوئے بھی بیگانہ نظر نہیں آتا۔ جو غیر ہوتے ہوئے بھی ان جانا نہیں معلوم ہوتا۔ گنگ و نیل میں قربت کے ان رشتوں کو ہند و عرب میں یگانگت کے ان بندھنوں کو اور بغداد و قاہرہ سے دلی اور لکھنؤ کی مشابہت کو ماضی کے صنم تراشوں نے وجود عطا کیا ہے۔ حال کے معماروں نے زندہ جاوید بنا دیا ہے اور مستقبل کے دوست گردوں نے ابدیت اور لافانی بنا ڈالا ہے۔

ان رشتوں کو تاک وذوں کا وجود عطا کیا انہی نے جن نے جس کے ایک سرا ہے کا نام ہندوستان ہے اور دوسرے کا عربستان۔

... ہند کی ازلی لہروں کی مانند ہند و عرب دوستی کی موجیں تاریخ کے ہر دور میں ابھر کر دونوں خطوں کے علم و عمل، فکر و خیال، تجارت و سیاست، تمدن و معاشرت پر یگانگی کے انمٹ سوتوں کو نئی حیات اور نئی توانائی بخشتی رہی ہیں۔ انہی رشتوں کو قربت کی سنہری زنجیر عطا کی ہے۔ ہند و عرب کو ملانے والے ان سینکڑوں میل لمبے صحراؤں نے جو نہ جانے کتنی صدیوں، کتنے مذہبوں اور کتنے تمدنوں کی گزرگاہ رہے ہیں۔ جہاں پر جب جان و دل ہتھیلی پر رکھ کر تجارت کرنے والے تاجروں، نگاہوں سے دنیا مسحور کرنے والے سیاحوں،

## محبت

پرستش کر محبت کرنے والوں کی تلاش کر
خدا ملتا ہے دل میں جب محبت دل میں ہوتی ہے ——— بتول سعیدی

نظر اس دور میں مجھ کو ترا جینا نہیں آتا
کہ مہلائے محبت کا تجھے پینا نہیں آتا ——— اقبال

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا ——— محمود دہلوی

محبت اے معاذاللہ محبت دم نکل جائے
اگر محسوس بھی اتنی ہو جتنی دل میں ہوتی ہے ——— نامعلوم

اپنے احساسِ محبت کو بھی کھو دیتی ہے
جب محبت سببِ غم نہیں ہونے پاتی ——— نامعلوم

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ جھنکاری ایم۔ اے، کلکتہ

قسمت کے دھنی بادشاہوں اور نورِ معرفت سے روشن ذہنوں والے بندگانِ حق کے کارواں چلا کرتے تھے تو اونٹوں کے قدموں کی ایک ایک چاپ کے ساتھ کئی قرنوں اور کئی صدیوں کے فاصلے ختم ہو جاتے تھے۔ یہی وہ کارواں تھے جنھوں نے ہند و عرب کی جغرافیائی دوری کو ذہنی قربت کا جامہ پہنایا۔ ہزاروں سال قدیم تاریخ کے لق و دق صحرا میں کھو جانے والے انہی جواں دل اور جواں حوصلہ مسافروں نے ایک کے فکر و فن کو دوسرے کے لئے مفید بنایا۔ آپس کے کمال سے باہمی استفادے کا فن سکھلایا، ایک دوسرے کے عرفانِ حق سے قلب و شعور کو نور بخشا۔ ہند و عرب کو تجارت میں ساتھی، سیاست میں ہمسفر اور مذہب میں ہم مشرب بنانے کا عمل بھی بحر و بر کے انہی مسافروں نے شروع کیا جنھوں نے کبھی صحراؤں کی کڑی دھوپ سے سوزِ یقین حاصل کیا اور کبھی بحرِ ہند کی طوفانی لہروں سے عزم و عمل کا حوصلہ پایا۔

بحر و بر کی یکتائی کے یہ رشتے اتنے ہی قدیم ہیں جتنا کہ گنگ و جمن کا میدان اور دجلہ و فرات کی وادی! اپنائیت کے یہی رشتے ہند و عرب کے قومی تمدنوں کو آج بھی اتنا ہی حسین و تابناک بناتے ہوئے ہیں جتنا کہ اس وقت جبکہ حُدی خواں نوجوانوں کے جلو میں اونٹوں کے کارواں چلا کرتے تھے اور بحر و باد کے دوش پر سوار ہو کر دونوں دیشوں کے تاجر مسرت و خوشحالی کا بیوپار کیا کرتے تھے۔ انہی رشتوں کا پرتو ان عرب بازاروں میں جگہ جگہ موجود ہے جہاں چلتے چلتے آج بھی "حلوائی" کی دوکان سے زیبی زیبی کی صدا کانوں میں گونجتی ہے اور مٹھائی کی ہر دوکان پر "حلو" کا بورڈ آویزاں ہے۔ قریب جا کر دیکھتے ہیں تو عرب زیبی کو اپنے ہاں کی جلیبی سے مختلف نہیں پاتے۔ مورخوں کا خیال ہے کہ ہماری جلیبی کی اصلی صورت عرب "زبیبا" ہی تھی۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ وہاں کی "زیبی" بسکٹ کی طرح کاغذ کے پیکٹ میں لپٹی ملتی ہے اور کھانے میں ہماری جلیبی کی بہ نسبت قدرے خشک ہوتی ہے۔

اِنہی پانچ ہزار سالہ تعلقات کی ایک چاپ قدم قدم پر آپ کو کسی "مطعم" میں ملے گی جہاں پر نہ کھانے کی چیزوں یعنی "طعام" کے نام اجنبی معلوم ہوتے ہیں اور نہ مہمان نوازی کی روایتیں۔ "کوفتہ" اور "کباب" میں ایسی کوئی ندرت نظر نہیں آتی جو مانوس نہ معلوم ہوتی ہو۔ ہاں یہ بات اور ہے وہ جسے "کباب" کہتے ہیں اسے ہم بھنے گوشت کا نام دے سکتے ہیں اور جو "کوفتہ" ہے اُسے گول شامی کباب کہا جا سکتا ہے۔

ذرا آگے بڑھئے تو کسی ریستوران کے ریڈیو سے آتی ہی تیزی کے ساتھ موسیقی "بہتی" ہوئی سنائی دے گی جتنی کہ ہمارے ہاں کے ذہنوں کی قربت کا ذکر آیا ہے تو بغداد کی وہ شام بار بار یاد آ رہی ہے جب میرا ایک عراقی دوست مجھے اور میری بیوی کو اپنے "معلو" تھے گھر اپنے خاندان کے ارکان سے ملانے لے گیا۔ میرا دوست یوسف بن لطیفی اپنے ماں باپ، تین بھائی بہنوں اور بڑے بھائی کے پورے خاندان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتا تھا۔ مغرب میں اِس قسم کے "مشترکہ خاندان" کو جہالت کہا جاتا اور ہندوستان میں ہنستے کھیلتے کنبے کے تصور کا جیتا جاگتا اظہار!

جب ہم پہنچے تو یوسف کی چھوٹی بہن کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جو چند ہی دن بعد تھی۔ ہونے والی دُلہن شرمائی لجائی ہوئی ایک طرف بیٹھی تھی۔ اُس کی بہنوں، بھابی اور سہیلیوں میں سے کوئی جامۂ عروسی پر زرتار کھینچنے میں مصروف تھی اور کوئی گلے کی مالا میں موتی ٹانکنے میں۔ یوسف کی دو چھوٹی چھوٹی بھتیجیاں بسورے جا رہی تھیں کہ شادی کے لئے اُن کے خاص جوڑے ابھی تک سِل کر نہیں آئے!

اِتنے میں ہونے والے سمدھیوں کے گھر سے کچھ لوگ آ گئے۔ اِس گھر میں یوں پُراحترام سا سناٹا چھا گیا جیسے کسی بہت بڑے سیاسی معاہدے پر دستخط ہونے ہوں۔ اِسی دَوران آنے والوں کی خاطر مدارات بھی ہونے لگی اور نوجوانوں میں دبی دبی چھیڑ چھاڑ بھی۔ یوسف کی بہنیں آنے ہونے والے دُولہا کی رشتے کی کسی بہن کا نام لے کر مسلسل چھیڑتی رہیں۔ وہ بھی انتہائی لاابالی شان سے چھیڑ چھاڑ جھیلنے کے لئے سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا مگر جونہی ابا جان ذرا سا کھانستے ہوئے کمرے میں

ہوئے تو سگریٹ والا ہاتھ پیچھے کرکے خالص ہندوستانی نوجوان کے انداز میں ادب سے کھڑا ہوگیا۔ ابّا جان جب تک کمرے میں رہے ہر طرف یوں خاموشی چھائی رہی جیسے شریر بچوں کے ہجوم میں کوئی انتہائی سخت اُستاد آگیا ہو! ابّا جان گئے تو پھر ہنسی کے گول گپّے پھوٹنے شروع ہوگئے۔ کوئی ہونے والی دُلہن کو اُس کے دولہا کا خط دکھا کر چھیڑنے لگی۔ خط اُس نے اپنی دُلہن کی بھابی کو لکھا تھا کہ شادی سے پہلے متوسط طبقے کے گھروں میں لڑکے لڑکی کے درمیان خط و کتابت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن باتیں تمام اپنی دُلہن ہی سے طے کی تھیں۔ دُلہن کی بہن نے لڑکے کے "بدصورت" ہونے پر ذرا آواز کسا تو دُلہن کی ماں نے اُسے گھر کا۔ بڑی لڑکی، جتنی لمبی آپ نہیں ہے اُس سے زیادہ لمبی زبان ہے! آجکل ایسے خدمت گزار لڑکے ملتے کہاں ہیں۔ سارے بغداد میں چراغ لے کر ڈھونڈو تو بھی نہ ملے ایسا خوبرو، ہنس مکھ، اطاعت شعار اور کماؤ بر۔ وہ تو بھلا ہو تیری ممانی کا جس نے ہمارا میل کروا دیا۔ ورنہ کبھی کہاں وہ لوگ اور کہاں ہم! پھر میری بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے وہ بولی "بی بی، بس اللہ کی دین ہے۔ لڑکا انجینئر ہے۔ خیر سے ولایت ہو آیا ہے۔ اپنی "ہندا" کے لئے اتنا لایا ہے کہ شہزادی کے لئے بھی ناکافی ہو" پھر امّاں تسبیح پکڑ کر شکرِ حق ادا کرنے لگی اور لڑکوں اور لڑکیوں نے وہی ہنسی ٹھٹھے شروع کردئے۔ اب کوئی بتائے کہ یہ منظر بغداد کا ہے یا دلی کا؟

پان والے کی دوکان سے اُبھرتے فلمی گیت۔ گیتوں کی دُھنیں مانوس سی معلوم ہوتی ہیں۔ پاس ہی سے نوجوان راہ چلتی اَن جانی محبوباؤں کو دیکھ کر "چھم چھم" اور "آوارہ ہوں" کا نعرۂ مستانہ لگا کر گزر جاتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی فلموں کے گیت خاصے چل رہے ہیں۔ یہاں پر ہندی فلموں کے مکالمے ہی عربی میں "ڈب" نہیں ہوتے، گیتوں کے الفاظ بھی "ڈب" کردئے جاتے ہیں۔ حالانکہ موسیقی وہی ہوتی ہے۔ اِسی پر ایک واقفِ حال ہندوستانی بہت فخر سے کہتا ہے قاہرہ کی فلمی دُنیا میں بھی ایسے ایسے شاعر موجود ہیں جو "ریڈی میڈ" گانے لکھنے میں بمبئی کے فلمی شاعروں کو مات کردیں ـــــ یہ لوگ ہندوستانی فلموں کی موسیقی میں یوں عربی الفاظ بھر دیتے ہیں جیسے گیت عربی ہی میں گایا گیا تھا۔

فلموں کی بات چلی تو پوسٹروں پر ویسے ہی "حُب" و "شباب" و "رومان" سے "مزیّن" فلموں کے اشتہار نظر آتے ہیں۔ ویسے ہی مجنوں صفت ہیرو اور ویسی ہی لیلیٰ مزاج ہیروئنیں۔ اچانک نظر کچھ ناموں پر ٹھہر جاتی ہے "سمیرہ جمال" "فیروز" "فاطمہ" کیا یہ اجنبی نام ہیں؟ کیا "یوسف" اور "کمال" غیر ملکی ہیں؟ کیا اِن میں کوئی قربت نظر نہیں آتی؟

اپنی بہن کے نام پر کچھ شرما کر میرا عرب دوست بہت فخر سے مجھے بتاتا ہے کہ

## دیر و حرم

جنابِ شیخ سے کہہ دو، اگر سمجھانے آئے ہیں
نہ ہم دیر و حرم ہوتے ہوئے میخانے آئے ہیں ـــــ بیکل اُتساہی

چراغِ دیر و حرم کب کے بجھ گئے اے جوشؔ
ہنوز شمع ہے روشن شراب خانے کی ـــــ جوش ملیح آبادی

حرم اور دَیر دونوں نظر آرہے ہیں ویراں
نہ وہاں خدا نمائی، نہ یہاں صنم نمائی ـــــ [illegible]

منسوب کوئی دَیر سے، کوئی حرم سے ہے
اِک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے ـــــ [illegible]

امیرؔ جاتے ہو بُت خانے کی زیارت کو
پڑے جو راہ میں کعبہ سلام کر لینا ـــــ امیر مینائی

مرسلہ۔ ایس۔ ایس۔ بھنڈاری، ایم۔ اے، کلکتہ

عرب دُنیا میں آج بھی "ہندا" اُس حسین ترین بچّی کا نام رکھا جاتا ہے جس کی موہنی صورت کا جواب سرزمینِ ہند کے سوا اور کہیں نہ مِل سکتا ہو۔ وہاں کی رومانی شاعری میں یہ نام ایسے ہی مشہور ہے جیسے شیریں یا لیلیٰ فارسی میں۔

اِسی روایت کا ذکر میں یروشلم کی ایک مشہور سماجی کارکن خاتون سے کرتا ہوں تو وہ شرما جاتی ہیں۔ اُن کا اپنا نام ہے "ہندا عزیز" لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کہتی ہیں ناموں کا لین دین تو آج بھی جاری ہے۔ آپ بھی ہمارے نام اپناتے ہیں اور ہم آپ کے۔ مثلاً ہمارے لئے یہی کیا کم فخر کی بات ہے کہ آپ کے عظیم ترین رہنما اور دُنیا کے امن کے مسیحا جواہر لال نہرو کے نام کے تینوں اجزاء عربی ہیں۔ ذہن ایک لمحے کے لئے ایک خوشگوار سا دھچکا کھا کر رُکتا ہے اور پھر احساس ہوتا ہے کہ اِس میں شک ہی کیا ہے۔ جواہر لال تو اپنے اُردو دستخطوں میں "جواہر لعل" ہی لکھتے تھے۔ "جواہر" "لعل" اور "نہر" تینوں عربی ہی الفاظ تو ہیں۔

– زباندانی سے تھوڑی سی واقفیت بڑھتی ہے تو اور بھی بے شمار الفاظ ایسے نظر آتے ہیں جن کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ انھیں عربوں نے ہندوستان سے لیا تھا یا ہندوستان نے عربوں سے؟ عربوں کا عموماً یہی اصرار ہوتا ہے کہ وہ الفاظ سرزمینِ ہند ہی سے آئے ہیں۔ اِس لئے کہ یہ اشیاء وہاں تھیں ہی نہیں۔ اِسی صدیوں پرانے میل ملاپ اور لین دین کی یادگار مِسک، کافور، نارجیل، لیمن،

ثبوت اور صندل جیسے الفاظ ہیں جن کے ہندی متبادل مشک، کپور، ناریل، لیموں، چمپئی اور صندل بھی ہمارے لئے اتنے ہی مانوس ہیں جتنے ان کی معرّب صورتیں۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی جامعہ ازہر قاہرہ کے شیخ مرحوم کے وہ الفاظ یاد آجاتے ہیں جو انھوں نے مجھے رخصت کرتے وقت کہے تھے: "سیدی! آپ اس مقدس و مبارک سرزمین سے ہیں جس نے دنیا کو علم کی روشنی دی، جس نے ہمارے ان گنت فلسفیوں کو معرفت کے زینوں سے روشناس کروایا، جس نے سرزمین ایشیا پر سب سے پہلے فرنگی کی غلامی کی زنجیر کاٹی، اور جس کے نوادرات کا ذکر خود قرآن حکیم میں ہے۔"

شیخ الازہر کے نائب نے اس جملے کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ مانیتیں کی ...، زنجبیل و کافور اور دوسری بہت سی جو ہندوستان ہی سے ... جاتے تھے۔ یوں ذہن پر ایک بار پھر اس حسین و عظیم الشان ... کے ... کھل جاتے ہیں جس میں آج سے پانچ ہزار برس پہلے عرب جہازیوں کے قافلے ... عمان اور یمن سے ہوکر سندھ، مالابار اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہوں پر ... کرتے تھے جہاں سے وہ لوگ بہت سی اشیاء لیتے اور دیتے تھے۔ ... کی تہذیبوں کو روشن و تابناک بنایا۔ ... زمانے کی ... موپلا ہیں جو انھی عرب جہازیوں کے جانشین ... وطن عزیز بھی۔

اسی زمانے کی یادگار یہ روایت ہے کہ حضرت سلیمان کے معبد خاص میں جلنے کے لئے عنبر و لوبان ہندوستان سے بیت المقدس جاتا تھا۔ بیت المقدس میں حضرت عیسیٰ کے مقام ولادت اور مقام شہادت کے عظیم کلیساؤں میں آج بھی ... عنبر و لوبان اور دھوپ جلتے ہیں۔ وہاں ... پادری جب دن رات یونانی ... ذکر کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے وید منتر پڑھے جا رہے ہوں۔

اسی ... کا عکس اس قیاس میں ملتا ہے کہ آدم نے کرۂ ارض پر پہلا قدم جس زمین پر رکھا وہ سراندیپ کی دھرتی تھی جسے ابن ابی حاتم جنوبی ہندوستان کا حصہ بتاتے ہیں۔ ... کی اسی قربت کا ایک دلنشیں اظہار ماضی کے عرب ماہروں کا ... جنھوں نے ان چار دریاؤں یعنی نیل، فرات، جیحوں اور سیحوں کا منبع جنت میں بیان کیا ہے۔ ان میں سیحوں سے مراد وسط ایشیا کا کوئی دریا نہیں بلکہ گنگا یا سندھ ہے۔ مجھ جیسے ... کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے کون سی روایت کتنی درست ہے اور کتنی غلط۔ لیکن مجھے یہاں برنارڈ شا کا قول یاد آجاتا ہے کہ تاریخ میں سچ اور جھوٹ کی حیثیت محض اضافی ہوتی ہے کیونکہ لکھنے والے اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

برنارڈ شا کی اس آنکھ سے ہند عرب تعلقات کو اگر دیکھئے تو یہاں پر خوشگوار یادوں کے حسین سلسلوں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ روایت اور تاریخ ہی کے ڈانڈے ہمیں یادوں کے ان حسین سلسلوں تک پہنچاتے ہیں جب مصر قدیم کے باشندوں اور سرزمین گنگا و سندھ کے دراوڑوں میں اتنی قربت تھی کہ ان غروب شدہ تہذیبوں کے آثار پر آج بھی جب نگاہ پڑتی ہے تو یہ سوچنا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے بھی ذہنوں میں فاصلے کتنے کم ہوا کرتے تھے۔

قدیم مصری معبدوں پر آج بھی ایک بچھڑا مقدس جانور کی شکل میں نظر آتا ہے۔ ہر فرعون کی ممی کے ساتھ سونے کا ایک ٹکڑا دفن کیا جاتا ہندوستانی گائے کی مانند بچھڑے سے ہی یہ خیال وابستہ تھا کہ مرنے والا اسی کی پونچھ کے سہارے بحر الام پار کرے گا۔

سورج دیوتا کی عبادت کے بارے میں بھی یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ بت کس نے کسے سکھایا اور ذرا پیچھے ہٹئے تو وہ زمانے زندہ تصویریں بن کر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں جب ہندی دراوڑوں کے اجداد نے مٹی کے برتن بنانے پکانے اور ان پر روغن چڑھانے کا فن بابل و نینوا کے فنکاروں سے سیکھا اور وسط مشرق کے قدیم باسیوں کو "ایک اناج کے پھول" یعنی کپاس سے ایسا کپڑا بننا سکھایا جس کی بدولت انھیں بھیڑوں کی اون اور ریشم کے کپڑوں کی منتوں مرادوں سے بھی نجات مل گئی اور تپتے ہوئے صحراؤں کی گرمی میں جسم کو ٹھنڈک ملی۔

تاریخ کی بھول بھلیوں میں گھومتے ہوئے یہ پتہ لگانا تو مشکل ہو جاتا ہے کہ ریشم سرزمین چین سے ہندوستان کیسے آیا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ ریشم اور کپاس دونوں ہی کا تحفہ سرزمین گنگا اور سندھ نے دجلہ و فرات کو دیا تھا۔ لیکن انھی تحفوں کو پاکر عربوں نے ہندوستان کو عالمی تمدن کی ایک بہت بڑی دین بھی عطا کی اور وہ تھا سلا ہوا لباس۔ ... کی تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان میں سلے ہوئے کپڑے پہننے کا پہلے پہل رواج سندھ اور مالابار کے ساحل پر اترنے والے مسلمان عرب تاجروں سے شروع ہوا اور مسلمان بادشاہوں کے بعد ہی وہ مقبول ہوا۔ شلوار، پاجامہ، قمیص اسی زمانے کی یادگاریں ہیں۔ اس سے بھی پہلے زمانے کی ایک نادر یادگار شطرنج ہے جسے مغرب نے عربوں سے لیا اور عربوں نے جسے شاید ہندوستان کے قدیم کھیل چوسر کو نئی شکل دے کر اپنایا۔

ہند عرب رفاقت کے تخلیقی عمل نے ایک دوسرے کی زندگیوں ہی کو زیادہ مکمل اور زیادہ حسین نہیں بنایا، تہذیب عالم پر بھی اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں

# افسانۂ ہنر

اس کی اہم ترین مثال ریاضی ہے۔ عربوں نے ہندوستان کی اس عظیم میراث سے جو کچھ لیا اُس کا یہ ایک اظہار ہی ہے کہ عربی اعداد کو آج بھی "ہندسہ" کہا جاتا ہے بہت دنوں تک تو عرب انہی ہندسوں کو "رقم الہند" ہی کا نام دیتے رہے۔ ہندوستان ہی سے عربوں کو وہ "صفر" ملا جس نے علم ریاضی میں اتنا ہی عظیم انقلاب برپا کر دیا جتنا کہ تعمیر اور مشین کی دنیا میں پہیے کی ایجاد نے۔ اسی ذہنی رفاقت کا تخلیقی پہلو یہ بھی تھا کہ عربوں نے ہندوستان سے صفر حاصل کیا تو پھر اپنے "ہندسوں" سے وہ کمالات دکھائے کہ آج یہ تصور بھی ممکن نہیں ہے کہ مغربی سائنس کی بنیاد عربی ریاضی کی دین کے بغیر رکھی جا سکتی تھی۔

قبل از تاریخ کے ماضی کی ایک یادگار فولاد کا استعمال ہے۔ کہتے ہیں کہ ہتھیاروں کی صورت میں اس کا پہلی بار استعمال سکندر اعظم ہی کی فوج سے سر زمین ہند پر کیا۔ عرب والوں کو تو ناز ہے کہ سیف الہند کا جواب نہیں پیش نہیں کر سکتی۔ دمشق میں فولاد کے کارخانوں کی اہمیت اسی وقت میں وہی تھی جو آج کے یورپ اور انگلستان نے شیفیلڈ کی۔ عرب دنیا میں زمانۂ قبل از اسلام سے صلیبی جنگوں کے دور تک فولاد ہندی سے بنی ہوا "مہند" ہوتی تھی [illegible] تھا اس "مہند العربی" کی کاٹ کو لاجواب سمجھا جاتا رہا۔ عربوں کو دمشق کا جو [illegible] شمشیر زن کہا گیا ہے تو یہ فخر ہندوستان کو حاصل ہے کہ [illegible] مہیا کی جس کا جواب نہ مشرق ہی میں تھا اور نہ مغرب ہی میں!

زمانۂ قبل از تاریخ کے صحراؤں میں آج بھی اُن [illegible] عربوں کے قدموں کے نشان [illegible] جنھوں نے ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک سفر کر کے ہندوستان کو عربستان کی [illegible] موتی دیے اور عربوں کا دامن ہندوستان کے ہیرے [illegible] جواہرات سے بھر دیا۔ اسی زمانے کے تو عربی اور ہندی فن تعمیر میں آج بھی نمایاں ہیں۔ عربی گنبد اور ہندی کنول میں جو مشابہت نظر آتی ہے [illegible] اور یہ اتفاق!!

ہندیوں نے اپنے فن تعمیر میں محراب و مینار کا [illegible] عربوں سے سیکھا جو ظہور اسلام سے بھی کئی صدیاں پہلے ساحل کیرلا و مالابار پر آباد ہو گئے تھے۔ انہی عرب آبادکاروں کے جواں ہمت قوموں کے [illegible] ساحل کیرلا پر قائم اس "کلیسائے شام" کی صورت میں آج بھی زندہ و تابندہ ہیں جسے دنیا کے قدیم ترین عیسائی کلیسا ہونے کا فخر حاصل ہے۔ روایت [illegible] رہے کہ شام سے آنے والے عیسائی مشنریوں نے سان طامس کی رہنمائی میں یہ کلیسا اتی عیسائیت کی شہادت کے پچاس سال بعد ہی قائم کر دیا تھا۔ فخر و حیرت کا مقام یہ ہے کہ اس

وقت اس کلیسا کے قیام پر نہ شور و فساد ہوا اور نہ کشت و خون۔ وجہ شاید یہ ہو کہ مذہب فرنگی حاکموں کے پلو میں نہیں، عرب تاجروں کا ہم سفر بن کر آیا تھا۔ خدا جانے فرنگی حاکم کے نفس ہی میں وہ کون سی قیامت نہاں ہے کہ اس کے منہ سے نکلا ہوا پیغام امن بھی صور فنا کا رنگ اختیار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ بہر حال اسی ساحل مالابار کو یہ فخر و امتیاز بھی حاصل ہے کہ غالباً یہیں سے بقول اقبال "میر عرب" کو "ٹھنڈی" ہوا آئی تھی اور یہیں پر پہلی بار فرزندان ہندوستان نے امن و انسانیت کا وہ پیغام [illegible] اسلام کہتی ہے اور جو اپنا عظیم ترین سرمایۂ افتخار [illegible]

[illegible] اور دل کو تازگی و [illegible] فلسفہ و فکر، تہذیب و تمدن، و سیاست و [illegible] کی تاریخ ہیں [illegible] دور [illegible] شکوہ کو [illegible] کا نام دینا پڑا۔ علم و عرفان کی [illegible] کو کوئی بھی [illegible] موتی کی جولانی [illegible] ساحل پر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے تعلقات [illegible] روشن [illegible] [illegible] فکروں اور [illegible] سکیں۔

علم و فکر کی دنیا میں اسلام کی عظیم ترین [illegible] کی ہمہ گیری، وسعت اور گہرائی نے ہندی فن و فلسفہ کو بھی پھلنے پھولنے اور

اقوامِ عالم تک پہنچنے کا راستہ دکھایا۔ عربی کی بدولت پہلی بار ایک ایسا مشترک ذریعۂ بیان مِلا جس کے سمجھنے والے ساحلِ جاوا سے لے کر ساحلِ فرانس تک موجود تھے طلوعِ اسلام کی ایک دوسری دین خلفائے وقت کی علمی سرپرستی تھی۔ اِس کے سہارے ہند و عرب رابطوں کو پہلی بار ایک باقاعدہ علم کی صورت عطا ہو سکی۔ عالمِ عربی میں اسلام نے جو ایک مرکزی سیاسی طاقت پیدا کی۔ اُس نے ہند و عرب تعلقات کو بھی ایک ایسی باقاعدگی اور استواری عطا کی جس کے باعث صدیوں تک ہندوستان سے لے کر مراکش و اسپین تک کی سرزمین کو ایک ہی تہذیبی وحدت کی حیثیت حاصل رہی۔

اسلام کے بعد پیدا ہونے والی یہ تہذیبی وحدت تہذیبی غلبے کی اُس صورت سے قطعاً مختلف تھی جو غیر مُلکی حملہ آوروں کی فتوحات کے جلو میں آتا ہے۔ یورپین سامراج کے تہذیبی غلبے کے برعکس علم و تہذیب کے اِن رشتوں کی بُنیاد ایک دوسرے کے ذہنی و فکری سرمائے سے فیض اُٹھانے کی خواہش تھی۔ اُس میں نہ دوسرے کو نیچا دکھانے کا جذبہ کارفرما تھا اور نہ غلاموں کو "آدابِ بندگی" سے آگاہ کرنے کے جنون کو دخل تھا۔ مکمل مساوات کی بُنیادوں پر ایک دوسرے سے علمی و فکری فیض اُٹھانے کے اِس تجربے کی مثال شاید تاریخِ عالم کے کسی دوسرے دَور میں مشکل ہی سے ملے۔

اِس تہذیبی اشتراک کے نقوش آج بھی ہمارے ذہنوں پر اتنے گہرے ہیں کہ تاریخ کی گزرگاہوں کی تاریکی کے باوجود بہت سے نشانات آج بھی اِس قدر روشن و تاباں ہیں کہ آنے والی کئی نسلیں بھی اِن سے کسبِ نور کرتی رہیں گی۔

ہند و عرب اشتراک کا روشن ترین دَور عباسی خلیفوں کے عہد ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اِس روشنی میں جہاں عباسی خلفاء خصوصاً ہارون الرشید اور منصور کی علم دوستی کا دخل تھا وہاں اُن کے جدّی وزرائے اعظم برامکہ کی ہند پرستی کا بھی ہاتھ تھا۔ برامکہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور بغداد کیسے پہنچے؟ اِن کی تفاصیل کے بارے میں مورّخوں میں لاکھ اختلافات موجود ہیں۔ لیکن یہ حقیقت بحث طلب نہیں معلوم ہوتی کہ برامکہ ہندی نژاد بودھ تھے جو غالباً پانچویں یا چھٹی ہی صدی عیسوی میں بلخ میں آباد ہو گئے تھے۔ اِس اندازے کی کڑیوں کو البیرونی کے اس بیان سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اُس دَور میں شام کی سرحدوں تک بودھ مت کا بول بالا تھا۔ اسکندر کے حملے نے جہاں تسخیرِ ہند کا راستہ کھولا وہاں ہندی علم و فلسفے کے پھیلنے کے لئے بھی راہیں پیدا کر دی تھیں۔ برامکہ شاید انہی راہوں پر چلتے ہوئے پہلے بلخ پہنچے اور پھر بغداد۔ صدیوں میں اُنھوں نے بہت کچھ ترک کیا اور بہت کچھ اپنایا لیکن خمیرِ ہندی کا گہرا اثر اُن کے ذہنوں سے نہ جا سکتا تھا اور نہ گیا۔

آٹھویں صدی کے اُسی روشن و رنگین دَور میں ہندی عالموں کا ایک عظیم الشّان وفد خلفائے بغداد کے دربار میں پہنچا۔ اُن لوگوں میں اہلِ ادب بھی تھے، اہلِ فلسفہ بھی، اہلِ طب بھی اور اہلِ زبان بھی۔ بہلہ ایسے لاثانی فلسفی اور منکہ ایسے روایت ساز طبیب بھی ہندی تہذیب کے اُن علمبرداروں میں شامل تھے جنھیں عباسی خلفاء کی علم پروری کی کشش وادیٔ گنگ و جمن سے سرزمینِ دجلہ و فرات تک کھینچ لائی تھی۔ منکہ یا مانک وید کے بارے میں مشہور ہے کہ جب دُنیا کے تمام طبیب خلیفہ کا مرض تک بتانے سے قاصر رہے تب مانک اجین سے بغداد پہنچا۔ اُس نے شکل دیکھتے ہی مرض کی تشخیص کی اور وقت کے عظیم ترین حاکم کو تین دنوں میں بھلا چنگا کر دیا۔

عِلمی لین دین کے اِسی تاریخ ساز دَور میں ہندی عربی ترجموں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ دہلی و طنجہ تک کروڑوں ذہن ایک ہی علمی اِکائی کے رشتے میں پروئے گئے۔ ہندوستانی علمِ ریاضی کی مشہور کتاب "سدھانت" چانکیہ کے ارتھ شاستر اور کہانیوں کے امر خزانے پنچ تنتر کا عربی ترجمہ کلیلہ و دمنہ کے نام سے اُسی علم آفریں دَور میں ہوا جس کی رہنمائی پیغمبرِ اسلام کا یہ ارشاد کر رہا تھا کہ "علم حاصل کرو خواہ اُس کے لئے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے"۔

تہذیبی تعصب، لسانی عصبیت اور تمدّنی تصادم کے موجودہ دَور میں ذہن سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ خدایا، وہ کیسے لوگ تھے جنھوں نے ذہنِ انسانی کی ہر دین کو یوں جھولیاں پھیلا کر سمیٹ لیا جیسے صدیوں تک وہ اِسی شرفِ قبولیت کے انتظار میں رہی تھی۔ ایک عجیب تماشا ہے کہ جس دَور میں بھی جو تہذیب بھی سب سے زیادہ پھیلی اور بڑھی وہی دَور اُس کے قلب و نظر کی وسعت و فراغت کا دَور بھی ثابت ہوا۔ اِس کے برعکس مرتی ہوئی ہر تہذیب نے اپنے آس پاس نفرت و تعصب کی ایسی دیواریں کھڑی کر دیں جن کے باعث مٹتے ہوئے تمدّن کی موت اور بھی قریب آ گئی اور کوئی ایسا پُرسانِ حال بھی نہ رہا جو اِس بے جان لاش کو ٹھکانے لگا دے۔

کِسی تمدّن کے لئے بھی اِس سے المناک لمحہ اور کوئی نہیں ہو سکتا جب اُس کے علمبرداروں پر دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگنے اور اپنے ذہنی سانچوں میں ڈھالنے کا جنون سوار ہو جائے۔ تہذیبوں کے عالمِ نزع کا یہ سماں بڑا ہی بھیانک ہوتا ہے جب اپنی موت کا لاشعوری خوف اُنھیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ دوسروں کے تمدّن کے سارے چراغ گُل کرنے پر تُل جائیں۔ ذہنوں کے اِس

گھُپ اندھیرے میں اور نگاہوں کی اس بے بصری کے بعد عظیم الشّان تہذیبوں کو فراموش شدہ تاریخوں کا حصّہ بنتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

نسلِ انسانی کی تاریخ ہمیشہ ممنون رہے گی کہ ذہنِ انسانی کی ناقابلِ تقسیم وحدت کا راز اس نے سب سے پہلے عربوں ہی سے پایا اور انہی کے ہاتھوں اس نے اُسے علم و عمل کی روشن تعبیروں میں بدلتے دیکھا۔ ہند کے تہذیبی خزانوں سے فیض پانے کی عرب خواہش ہی نے اَن گنت عربی عالموں اور مترجموں کو ترغیب دی کہ وہ اپنی تہذیب کے روشن ترین دَور میں بھی دوسری تہذیبوں کی روشنیوں سے بجا طور استفادہ لیتے رہیں۔ یہ اسی دَور کا کرشمہ تھا کہ عربوں میں ہندوستان کے اُس فلسفے نے جگہ بنانی شروع کی جسے عربوں نے تصوّف کا نام دیا اور ہندوؤں نے ویدانت اور بھگتی کا۔ عرب و ہند کے کئی عالموں کا تو یہ خیال بھی ہے کہ اقبال نے میرِ عرب کو ٹھنڈی ہوا آنے کا جو اشارہ کیا تھا اُس کی بُنیاد بھی وحدتِ حق کا وہ تصوّر تھا جسے شاید سب سے پہلے ہندو فلسفے ہی نے اُپنشدوں کے رُوپ میں دُنیا کو دیا تھا۔ یہ اندازہ شاید بحث طلب ہو لیکن یہ مسلّم و مصدّق حقیقت بہر حال اپنی جگہ پر موجود ہے کہ طلوعِ اسلام کے تقریباً ایک سو سال بعد تصوّف کے جو اوّلین نظریات عالمِ عرب میں پیدا ہوئے اُن کا زمانہ قریب قریب وہی تھا جبکہ تیزی کے ساتھ ہندی کتابوں کے عربی ترجمے ہو رہے تھے۔

وقت کے ساتھ چند صدیاں آگے بڑھنے پر ہمیں روایت و تاریخ کی ملی جلی روشنی میں لپٹا ہوا ایک پیکرِ نُور منصور الحلاج کے جسمِ خاکی میں دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے لبوں پر "انا الحق" کا نعرہ ہے اور روح میں اُپنشد کے اُس پیغامِ معرفت کی گھلاوٹ ہے جو خدائی سے انسانی روح کا رشتہ جوڑ دیتا ہے۔ روایت و تاریخ نے مل کر منصور الحلاج کو وہ عظمت عطا کی ہے کہ اس پر ایران کی وہ خاکِ پاک بھی نازاں ہے جس میں وہ پلا بڑھا۔ بغداد کی وہ سرزمین بھی جہاں وہ عرفانِ حق کے جرم میں ہر اس آزمائش سے گزرا جو بندۂ خاکی کو نُورِ خدائی اور شانِ کبریائی عطا کرتی ہے اور اسی منصور پر فخر ہے۔ بھارت کی دھرتی کو جہاں پر اس نے یوگیوں اور سنتوں کے آشرموں میں بیس برس گزارنے کے بعد بغداد پہنچ کر انا الحق کا نعرہ بلند کیا۔ انا الحق کے اس نعرے نے تین سو سال بعد دمشق کے سربلند صوفی اور سرتاج شاعر ابن العربی کے مقاماتِ مکیہ میں ایک باقاعدہ نظامِ معرفت کی شکل اختیار کر لی۔ انا الحق ایک نعرہ ہی نہیں رہا، اُسے اب ایک فلسفے کا قالب اور نظریۂ فکر کا رُوپ عطا ہو گیا۔

کہتے ہیں ابن العربی ہی نے دمشق کے ایک سنسکرت داں صوفی کی مدد سے ہندوستانی یوگ کی کتاب "امرت کنڈ" کا ترجمہ عربی میں کیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس زمانے میں علم و ادب کے شہ پاروں کے ترجمے حکّامِ بالا کی خوشنودی کے مرہونِ منّت اور سیاست کے خداؤں کی مصلحتوں کے محتاج نہ ہوئے تھے۔ نہ جانے وہ کیسے لوگ ہوں گے جو محض اپنی تشنہ روح کی پیاس بجھانے کے لئے اتنے بڑے کام کر گزرتے تھے جنھیں یہ کام کرتے ہوئے نہ اعزازوں کا خیال آتا اور نہ عطیوں کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اس بے نیازی کی وجہ ہند و عرب رشتوں کی مضبوطی بھی تھی اور ایک قدرِ مطلق کی حیثیت سے علم کا احترام بھی۔

بابل و نینوا کی سرزمین اور نالندہ و ٹکشلا کی دھرتی کے ذہنی رشتوں کی قربت کا درخشاں ترین اظہار العربی سے بھی دو سو سال بعد یعنی پندرھویں صدی میں حضرت امام الغزالی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفۂ طریقت میں ہوا جس نے تصوّف اور شریعت میں حدِ جُدائی مٹا کر یہ ثابت کر دیا کہ کلِ مطلق کی ذات اور انسان کا خُدائی شعور کوئی دو علیحدہ حقیقتیں نہیں ہیں ایک ہی نگینے کے دو پرتو ہیں۔

علم و فلسفے کے اس لین دین کی بُنیاد نہ تو بادشاہوں کی عنایتوں پر تھی اور نہ کسی استعماری غلبے پر۔ استعماری غلبہ اگر ہوتا تو شاید یہ لین دین مغربی تہذیب کی مانند یک طرفہ ہی ہو کر رہ جاتی۔ مغرب کے اہلِ حکومت یہی سمجھتے رہے کہ وہ بندوں کو آدابِ شہنشاہی سکھا رہے ہیں لیکن آخر کار وہ خود ذہنی اور فکری طور پر تہی دامن اور قلاش ہو کر رہ گئے ہیں جس روشنی سے وہ مشرقی تہذیب کے خرمنوں کو آگ لگانا چاہتے تھے وہ اُن کے اپنے گھروں کو تاریک کر گئی۔

ہند و عرب تعلقات میں یہ صورت پیدا نہیں ہوئی یہاں چراغوں سے چراغ جلے اور پھر نئے چراغوں ہی نے پُرانے چراغوں کو نئی روشنی اور تابندگی عطا کی۔ یہاں ویدانت نے اگر تصوّف کو فکر و نظر کی جولانیاں عطا کیں تو پھر تصوّف نے بھی ہندوستان آکر ایک گرتی ہوئی تہذیب اور بکھرتے ہوئے نظامِ فکر کو ایک نئی زندگی بخشی۔

آج یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو چکا ہے کہ نانک، کبیر، فرید اور رس خان کے فلسفۂ وحدت اور بھگتی رس میں کتنا حصّہ ہندوستانی ویدانت کا ہے اور کتنا عربی تصوّف کا۔

گورو نانک کا جب ذکر آتا ہے تو بغداد کی وہ خاموش و پُرسکون سی زیارت ایک زندہ حقیقت بن کر میرے سامنے آجاتی ہے جو اتنی ہی سادہ اور پُرشکوہ ہے جتنی اِس مردِ حق کی ذات جس نے پیغامِ معرفت دیتے وقت نہ بابر جیسے حکمراں کے عتاب کی پروا کی اور نہ پنڈتوں، مُلّاؤں اور راہبوں کے ظالمانہ فتوؤں کی۔ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مبارک کے عقب میں ایستادہ یہ سادہ سی زیارت گاہ یادگار ہے اُس زمانے کی جب بندگانِ حق کی روح کی پیاس کی راہ میں

نہ ہزاروں میل طویل صحرا حائل ہو سکتے تھے اور نہ برسوں طویل بے سروسامان سفر کی صعوبتیں۔ یہ مقام جہاں حضرت نانک پیر رحمتہ اللہ علیہ نے مراقبے میں چالیس دن بھی گزارے تھے اور نہ جانے کتنے دنوں تک صوفیائے عصر سے تبادلۂ خیالات بھی کیا ہوگا۔ اب کون انکار کر سکتا ہے اس حقیقت سے کہ روح کی دُنیا نہ ملکوں کی حدوں میں محدود ہوتی ہے اور نہ تنگ نظری کی زنجیروں میں قید۔

روح کی دُنیا ہی کی اِس بادشاہت کا ایک زندہ و تابندہ اظہار قرآنی آیتوں سے مزیّن وہ چغہ ہے جو مکّہ شریف کے صوفیوں نے دیارِ ہند کے اِس عظیم سپوت کو پہنایا تھا۔ یہ چغہ آج بھی ہندوستان ہی کے سرحدی قصبے ڈیرہ بابا نانک کے ایک گوردوارے میں مزیّن و محفوظ ہے۔ ہر برس اِس پر ایک بھاری میلہ "میلہ چولا صاحب" کے نام سے بھی لگتا ہے۔ ہزاروں سیدھے سادے کسان آتے ہیں۔ کھیلتے کودتے اور بھنگڑا ناچتے ہوئے۔ ہر سال لاکھوں مشتاقانِ دید کو اِس متبرک نشانی کے درشن کرائے جاتے ہیں جو یادگار ہے اُس زمانے کی جب مذہب کا مفہوم انسان کو تہذیب و شرافت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کراتا تھا، انسانوں کو انسانوں سے لڑانا نہیں۔

گورونانک کی زیارتِ مکّہ و بغداد کے بھی بہت پہلے بلکہ مطلعِ عرب پر طلوعِ اسلام کے چند سال بعد ہی سے قرآن کا کلمۂ حق دیارِ ہند کی بستیوں میں بھی گونجنے لگا تھا۔ یہ فتح وہ تھی جو محمد بن قاسم کی تسخیرِ سندھ سے کہیں زیادہ دیرپا بھی ثابت ہوئی !!

---

# غزلیں

## پروفیسر محمد منشاء الرحمن خاں منشاؔ ایم۔اے

خواب دیکھے تھے محبت کے سُہانے کیا کیا
جن کی تعبیر میں غم پائے نہ جانے کیا کیا

رسم و راہِ نگہ و دل تو بہت سادہ تھی
اِن سے دنیا نے بنائے ہیں فسانے کیا کیا

برسرِ راہِ جنوں، سوزِ دروں کے باعث
نام روشن کئے مجھ آبلہ پا نے کیا کیا

پُوچھنا ہو تو کوئی غنچہ و گُل سے پُوچھے
فتنے گُلشن میں جگائے ہیں صبا نے کیا کیا

کچھ خبر بھی ہے تجھے بزم میں اے پیکرِ ناز
راز کھولے ہیں تری طرزِ حیا نے کیا کیا

بخش کر اِک دلِ غم فطرت و آلام پسند
ہم غریبوں کو نوازا ہے خدا نے کیا کیا

دیکھ کر آج کے یاروں کا چلن اے منشاؔ
یاد آئے ہمیں احباب پُرانے کیا کیا

محمد منشاء الرحمن خاں منشاؔ

## رئیسؔ رامپوری

شاید آجائے گا ساقی کو ترس اب کے برس
مِل سکا مجھ کو نہ اُن آنکھوں کا رس اب کے برس

گُلشنِ دہر کا ماحول ہی زندانی ہے
راس آیا مجھے پھولوں بھی قفس اب کے برس

ایسی چھائی تھیں کہاں غم کی گھٹائیں پہلے
ہاں مرے دیدۂ تر خوب برس اب کے برس

اُف وہ اُن مدھ بھری آنکھوں کے چھلکتے ہوئے جام
بڑھ گئی اور بھی پینے کی ہوس اب کے برس

وہ تو کچھ رنگ پہ موسم تھا کہ گاہے گاہے
پی لیا میں نے بھی انگور کا رس اب کے برس

پہلے یہ کب تھا کہ وہ میرے ہیں، میں اُن کا ہوں
اُن کی یادوں نے ستایا ہے تو بس اب کے برس

پھڑپھڑانے کو ترستا ہی رہوں میں صیّاد
اِس قدر بھی پرِ پرواز نہ کس اب کے برس

جادہ پیما نہ ہوا قافلہ کیا کوئی رئیسؔ
آئی کانوں میں نہ آوازِ جرس اب کے برس

رئیس رامپوری

افسانہ

# ٹھا ــــ ٹھا!

پروفیسر جوگندر پال۔ ایم۔ اے

پارک۔ چلا، مقبرہ روڈ، یونیورسٹی کارنر، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

۲۷ر اپریل ۶۷ء — برادرم خوشتر صاحب، باخلوص

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنی نئی کہانی "ٹھا ــ ٹھا!" بھیج رہا ہوں۔ بڑی اسمارٹ اور رواں دواں کہانی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ـــ بہترین خواہشات کے ساتھ!

آپ کا ـــــ جوگندر پال

---

موڑ پر کالے سنگھ کو گھوڑے کی لگام کھینچتے دیکھ کر جرنیل سنگھ نے مُنہ کھولا تو معلوم ہوا جیسے کسی گپھا سے غیبی صدا نے کالے سنگھ کو متنبہ کرنا چاہا ہو "میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے سردار، آج نہ جاؤ۔"

"بڑا شک اور وہم ہوئی کہ کوئی ڈاکو کا پُتر بھی نہیں ٹال سکتا جرنیلے!" کالے سنگھ نے اپنے گھوڑے کا رُخ تنہا راستے کی طرف کر لیا۔ "ست سری اکال!" اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی "چل پُترا!"

جرنیل سنگھ نے اُس کی پُشت پر اُڑتی ہوئی گرد پر نظریں جما کر سوچا، سردار ہمارا جی بھر کے ڈاکو ہے۔ مجال ہے ڈر بھی ذرا چھو بھی گیا ہو، مگر اُس کا من گواہی دے رہا تھا کہ آج کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔

"سردارا ــــ!" اُس نے دل ہی دل میں چلا کر اپنے ساتھی کو آواز دی۔

پہلے تو اُسے خیال آیا چپکے سے اپنے سردار کی حفاظت کے لئے اُس کے پیچھے پیچھے ہو لے۔ لیکن وہ ڈرتا تھا، کالے سنگھ ظالم اُسے اپنے ساتھ پا کر نظروں ہی نظروں میں کھا جائے گا۔ زر لوٹنے کے لئے وہ سب کو ساتھ لے جاتا تھا لیکن نیکھاں کے گھر ڈاکہ ڈالنے کے لئے وہ سدا اکیلا ہی جاتا۔ اپنے ساتھیوں سے وہ کئی بار کہہ چکا تھا کہ اپنی عورت سے ملنے جاؤ تو ہمیشہ اکیلے جاؤ۔ ہیجڑے کھُلے عام پیار کرتے ہیں اور لُک چھُپ کے، خون، پر مرد بچّے کا کام ہے، کھُلے عام خون بہائے اور لُک چھُپ کے پیار کرے۔ اور تو اور، کئی بار تو وہ اپنی نظریں بھی بچا کے نیکھاں کے چبوترے پر پہنچ جاتا اور اُسے پتہ نہ چلتا کہ وہ کس راستے سے یہاں آ پہنچا ہے۔

جرنیل سنگھ نے اپنے صافے میں گانٹھ باندھ کر اپنے آپ سے کہا کہ آج کالے سنگھ سلامتی سے لوٹ آیا تو وہ سب ساتھیوں کو کڑاہ پرشاد کا بھوگ کرائے گا۔ اپنے راستے پر گھوڑا ڈالنے سے پہلے اُس نے ایک بار پھر کالے سنگھ کی طرف نظر اُٹھائی۔

کالے سنگھ کا لشکر نہایت تزک و احتشام سے پا بہ رکاب تھا۔ سوا لاکھ کی اِس تنہا سواری سے یہ اُجڑا ہوا کچّا راستہ اچانک آباد ہو کر برات کا سماں پیش کرنے لگا۔ ڈُولے کے دبتو دتے باجے کے سُر نکل رہے تھے اور آس پاس سارا جنگل اپنے کیڑے مکوڑوں سمیت سر دُھن رہا تھا۔

"نیکھاں!" کالے سنگھ کی کومل سی چاہ اُس کے فولادی بدن سے نکل کر اپنے محبوب کی پُر خطر راہ پر اُڑ رہی تھی۔ "نی نیکھاں!" جیسے اُس کا نام پکار کر ہی ڈاکو نے اُس سے اپنی پیار کی ساری باتیں کہہ ڈالی ہوں۔ "ادّے نیکھاں!" نیکھاں کو کالے سنگھ سے سدا یہ شکایت رہتی کہ وہ اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں کرتا، بس اُس کے نام ہی کی مالا جپتا رہتا ہے۔

اور کالے سنگھ اپنی جٹّی کو سمجھاتا کہ باتیں کرنا گرنتھی جی کا کام ہے، ڈاکو تو واہگورو کا دھیان کر کے شری کرپان جھٹکنا جانتا ہے یا یوگی رانجھا بن کے اپنی جٹّی کے نام کی رٹ لگانا۔

شری پنج ککوں کے ساتھ ساتھ کالے سنگھ کی کمر پر ایک چھوٹی پستول بھی

لٹکی رہتی لیکن وہ موقعے پر پستول کو استعمال کرنا ہمیشہ بھول جاتا۔ پستول سے اُسے مرنا پسند تھا نہ مارنا۔ اپنے مضبوط جسم کو وہ "لوہے دا پٹ" کہا کرتا جس پر پستول چلائیں تو گولی مڑ کر نیچے اگر سے لیکن اگر کبھی اتفاق سے کوئی گولی اس کے لوہے کے پٹ کو چھید کر اندر چلی گئی تو ــــ تو ــــ! اُسے احساس تھا کہ باہر اگرچہ وہ نرا پرا لوہا ہے تاہم لوہے کے اندر بہت کومل اور کچی رگیں ہیں جن میں کوئی ظالم گولی جا گھسی تو وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے گا یا شاید مر کر بھی اُسے سدا اسی حالت میں زندہ رہنا پڑے۔ سو وہ اپنے اُس دشمن کو بھی سجن سمجھے گا جو اُس کا سر نہایت صفائی سے شری کرپان جی سے یوں ایکدم کاٹ دے جیسے پچھلے ہفتے اس نے کسی ناپ تول کے بغیر جھٹ سے کرتارے ڈاکو کی گردن کاٹی تھی اور کرتارے ایک دم بجھ کر شانت ہو گیا تھا۔ ایکدم موت یا ایکدم زندگی! ــــ کالے سنگھ نے راہ میں گھوڑا روک لیا اور نیچے چھلانگ لگا کر دونوں ہاتھ باندھ لئے اور سچے پادشاہ سے پرارتھنا کرنے لگا کہ وہ مرے تو کٹ کر مرے۔ جو سجن اُسے یوں ایک ہی جھٹکے میں کاٹ کر مارے گا وہ مر کر بھی اُس کا منہ چوم کر مرے گا ــــ پھر وہ اُچھل کر گھوڑے کی پیٹھ پر دوبارہ سج گیا۔ "اُڑ چل پُترا!"

اور بے زبان گھوڑا ہنہنا کر ہوا سے باتیں کرنے لگا، یہ باتیں :-

"اری، یوں دم سادھے خوف سے مری کیوں جا رہی ہو؟ تمہارے پاس چاندی ہے نہ سونا، نہ کچھ اور۔ تمہاری طرح کسی کا اندر باہر خالی ہو تو اُسے میرے ڈاکو سردار سے کیا ڈر؟ ــــ آؤ، میرے ساتھ مزے سے اُڑ اُڑ کر چلو، آؤ، کالے سنگھ کو تیز تیز کرپان چلانے کی طرح تیز تیز اُڑنا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ تو اپنی لیکھاں سے بھی اسی لئے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس سے محبت کرتے ہوئے اُسے یہی معلوم ہوتا ہے، وہ تیز تیز اُڑ رہا ہے!"

"شاباشے پُترا!" اپنے گھوڑے پر بیٹھے، ہوا میں اُڑتے ڈاکو کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ساری دُنیا کو پیچھے چھوڑ کر کہیں آگے جا رہا ہے۔ اپنی مکھن سے پلی ہوئی کٹار مونچھوں کو تاؤ دے کر وہ ٹھوڑی پر داڑھی کے بال ٹٹولنے لگا۔ شاید لیکھاں سے متعلق سوچتے ہوئے وہ وہاں سے اپنے دو ایک سفید بال جڑ سے اکھیڑنا چاہ رہا ہو۔

"شاباشے پُترا!"

"لیکھاں کا بُوڑھا باپ کبیر کے دوہے گا گا کر تھک کر اب اپنی چارپائی پر اُونگھ رہا ہوگا اور لیکھاں اپنے کمسن بیٹے (میرے بیٹے) کو تھپتھپا کر سُلا رہی ہوگی۔ بہت شریر اور پیارا بچہ ہے۔ واہگورو اُسے میری عمر بھی دے دے۔"

جب لیکھاں نے پہلی بار اُسے بتایا کہ واہگورو نے اُس کی کوکھ میں بچہ ڈالا ہے تو کالے سنگھ کی مونچھ کا تاؤ خوب اُبھر آیا۔

"واہگورو تو بہت شریف ہے لیکھاں۔ یہ کام میرا ہے، کالے ڈاکو کا!"

اور لیکھاں اچانک اُداس ہو گئی تھی۔

"میں سوچتی ہوں کالیا، لوگ میرے بیٹے کو ڈاکو کا پُوت کہیں گے تو اُس پر کیا بیتے گی؟"

"تُو فکر نہ کر لیکھاں! میں اپنے پُتر کو اپنے سے بھی بڑا ڈاکو بناؤں گا!"

"نیں کالیا، تُو اب ڈاکے ڈالنے چھوڑ ہی دے۔"

"تُو تو اِس تراں باتاں کرتی ہے جیسے میں نے تیرے ساتھ بیاہ کیا ہو۔"

"بیاہ سے کیا ہوتا ہے کالے! کچھ بھی ہو، میرے پُتر کا پیا تو تُو ہی ہے۔"

"بھلیئے دی رنئے، یہ مو کا ہنسنے کا ہے یا رونے کا؟ ہیں؟ ــــ ہس ــــ ہس ــــ اوئے ہس نا! ــــ" وہ اُسے گدگدانے لگا اور لیکھاں ڈاکو کی قسمت بن کر ہنسنے لگی۔

"میری لیکھاں، تو میرے نصیب کا لیکھ ہے۔ سَو آدمیوں کا خون کر کے بھی اس سے گلے ملتا ہوں تو اپنی بے گناہی کا یقین ہونے لگتا ہے۔ واہگورو نے کیا چیز بنائی ہے! مہتاب جیسی آنکھیں جن کی گہرائی میں غرق ہو کر لاش نہ ملے، ناک کی ڈھلوان، جیسے ہم اپنے گاؤں کی پہاڑی سے دوڑ کر نیچے گھر کے دروازے پر آ کھڑے ہوں اور اَدھ کھلا منہ، مانو کوئی یار کے تصور کو ہوا میں چوم لینا چاہتا ہو!"

"آ کالیا، بیاہ کر ہی لیں۔" بچہ پیدا ہونے سے چند روز پہلے لیکھاں نے اُس سے کہا تھا۔ "پر کیا فائدہ؟ پھر بھی میں کون سی لمبردارنی بن جاؤں گی۔"

"اپنے سارے خزانے تمہارے پیٹ میں لا دیتے ہیں ری، تم کسی لمبردارنی سے کم ہو کیا؟"

"نہیں کالیا، تو ڈاکے ڈالنے چھوڑ دے۔ کیا فائدہ؟ ہر ڈاکو آخر میں اپنی ہی بیوی کے سہاگ پر ڈاکہ ڈالتا ہے!"

"اسی لئے تو میں تم سے بیاہ نہیں کرتا رانیے! کہ میری موت کے بعد بھی تمہارا سہاگ بنا رہے!"

"چل اوئے پُترا!"

جیسے سارا جنگل دوڑ رہا تھا اور کالے سنگھ کھڑے کھڑے آکاش کے چھتر تلے اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر لیکھاں کے گلے میں باہیں ڈالے بیٹھا تھا۔

لیکھاں کے لڑکا پیدا ہوا تو اُس کی ننھی مُنی کوملتا کو محسوس کر کرکے اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ پیکر کالے سنگھ کے نہایت چھوٹے اور سلونے باطن پر نظر رہا ہوتے ہے۔

"اب کوئی فکر نہیں لیکھاں۔ میں مر بھی گیا تو میری یہ دولت تمھارے پاس اپنے آپ بڑھتی ہی چلی جائے گی!"

ٹھا۔ ٹھا!

ٹھا ٹھا۔ ٹھا!

دفعتاً کالے سنگھ پر چاروں طرف سے گولیوں کی بوچھار ہونے لگی۔

ٹھا ٹھا ٹھا!

پولیس نے آج پھر اُسے ٹریپ کر لیا تھا۔

اُس نے نہایت تندی سے چلتے گھوڑے سے درخت کی ایک ٹہنی تھام لی اور لنگور کی طرح اُچھل کر درخت پر پہنچ گیا۔

گھوڑے کی پیٹھ خالی ہوئی تو وہ اور تیز رفتار سے دوڑنے لگا۔ وہ ڈاکو کا گھوڑا ہی کیا جو تعاقب کرنے والوں کی آنکھوں میں دھرتی کی ساری خاک نہ جھونکے۔ پولیس کی دو جیپ گاڑیاں جیسے ڈاکو کے تعاقب میں گھوڑے کے پیچھے لگ گئیں۔ اور گھوڑا گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں جاکر اور زیادہ گھنی جھاڑیوں میں داخل ہونے لگا، جیسے انھیں چیلنج کر رہا ہو "آؤ، ہمت ہو تو جہنم تک میرا پیچھا کرتے ہو۔ آؤ!"

کالے سنگھ درخت کی چوٹی پر بیٹھا پولیس کو پریشان دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا، اُن کی طرف دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ڈاکو اطمینان کی سانس لے کر مُسکرانے لگا، پھر اُس نے اپنی عقابی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا اور آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگا۔ اُترتے اُترتے اچانک کچھ خطرہ محسوس کرکے وہ دھرتی پر کُود پڑا۔

"ہاتھ اوپر کرو!" پولیس کا ایک سپاہی سنگین تانے اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

ہاتھ اوپر کرتے ہوئے کالے سنگھ سپاہی کے کندھوں کے پیچھے دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگا جیسے اُس کا کوئی ساتھی آگیا ہو اور سپاہی پر وار کرنے لگا ہو۔

سپاہی نے گھبرا کر سر موڑ لیا اور کالے سنگھ نے بجلی کی سی تیزی سے کرپان نکال کر اُس کی گردن پر وار کیا۔

سپاہی کا سر اُس کے پاؤں پر آگرا اور دھڑ چند لمحوں کے لئے ویسے ہی کھڑا رہا اور پھر جیسے مرنے کے بعد اُسے اپنی موت کا احساس ہوا ہو اور دھڑ بھی بے جان ہو کر گر پڑا۔

خون سے رنگی ہوئی کرپان کو اُسی طرح اپنے ہاتھ میں لئے ڈاکو کو خیال گزرا، دو آنکھیں اُسے گھور رہی ہیں۔ اُس نے لاشعوری طور پر کٹے ہوئے سپاہی کے چہرے کی طرف سر گھمایا۔

مُردہ چہرے پر دو مہیب آنکھیں! — مہیب آنکھیں مُردہ نہیں ہوتیں۔ وہ ذرا بد حواس ہوکر انھیں اپنی کرپان کے کونے سے کُھرچنے لگا اور بد ہیئت ہوکر وہ اور مہیب ہوگئیں اور زندہ معلوم ہونے لگیں۔

ڈاکو نے اپنے ڈر کو دبانے کے لئے قہقہہ لگایا اور قہقہے کی گونج کے ساتھ ساتھ اُس کے آس پاس خالی ہوا میں آنکھوں کے بہت سے جوڑے نمودار ہونے لگے۔

اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اور سنگینوں کی چبھن محسوس کرکے اپنے دونوں بازو جوڑ کر آگے بڑھا دئے۔

کٹ — لک!" ہتھکڑی کی آواز۔

"ایسے! اِس نے تو شریفوں کی طرح فوراً ہتھیار ڈال دئے۔" پولیس انسپکٹر اپنے اسسٹنٹ سے کہہ رہا تھا۔ "میرا خیال تھا حراست سے پہلے خوب مار دھاڑ ہوگی۔"

اور کالے سنگھ سوچ رہا تھا اپنی بیوی کے سہاگ پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے ڈاکو بھی شریف ہو جاتا ہے!!

---



---

# تحفہ

قتیل شفائی

نہ خط لکھے وہ نہ آئے ملنے بہت ستایا ہے سنگدل نے
ہزار شکوے ہیں لیکن اے دل کسی کا تحفہ قبول کر لے

ابھی تو وہ رُوبرو نہیں ہے وہ آئے گا تو گلے بھی ہوں گے
دبی دبی رنجشوں کے پیچھے وفاؤں کے سلسلے بھی ہوں گے
ابھی تو آئی نہیں وہ منزل ہزار شکوے ہیں لیکن اے دل
کسی کا تحفہ قبول کر لے

نہ ہوتا گر اُس کو پیار ہم سے تو اُس کا پیغام بھی نہ آتا
ہمیں جو محسوس ہو رہا ہے وہ ہم کو آرام بھی نہ آتا
یہی تو ہے زندگی کا حاصل ہزار شکوے ہیں لیکن اے دل
کسی کا تحفہ قبول کر لے

رہا ہے جو بے نیاز اب تک وہ کچھ نہ کچھ بے قرار بھی ہے
ہمیشہ جس نے ہمیں رُلایا وہ دل میں اب شرمسار بھی ہے
کرم پہ وہ ہو چکا ہے مائل ہزار شکوے ہیں لیکن اے دل
کسی کا تحفہ قبول کر لے

کسی کا بھیجا ہوا یہ تحفہ گلے سے اپنے لگا کے رکھنا
لگے نہ اِس کو نظر کسی کی نظر سے اِس کو بچا کے رکھنا
تری بھی دھڑکن ہے اِس میں شامل ہزار شکوے ہیں لیکن اے دل
کسی کا تحفہ قبول کر لے

قتیل شفائی

افسانہ

# چمکتے سکّے

م۔ک۔ مہتاب ایم۔ اے

ای۔ جی ۹۸۴ پریم نگر جالندھر

۳۱ مارچ ۱۹۶۷ء

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

.... میں تو سمجھتا ہوں "بیسویں صدی" کا ہر شمارہ ہی افسانہ نمبر ہوتا ہے جسے دوسرے ممالک کے لوگ بھی اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں اور تین تین برس بعد بھی اُن کا ذکر کرتے رہتے ہیں اِسی لئے افسانہ نمبر کے لئے نہایت اچھا افسانہ بھیجنے کی فرمائش میری سمجھ میں نہ آئی۔ ایک افسانہ پہلے بھی بھیج چکا ہوں۔ لیجئے ایک اور افسانہ "چمکتے سکّے" ارسالِ خدمت ہے۔ افسانہ سماج کے ایک جدید رُجحان کے بارے میں ہے۔ اُمید ہے قارئین پسند کریں گے....

آپ کا عزیز ــــ م۔ک۔ مہتاب

---

پنڈت جی کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر چلی آ رہی تھی اور وہ اخبار پڑھتے پڑھتے جھنجھلا رہا تھا۔

"بکواس! سب بکواس!! ترقی کے اِس دَور میں جب سائنس اور ٹیکنالوجی نے ملک کی کایا پلٹ دی یہ باتیں کیسے مانی جا سکتی ہیں۔ لیکن ابھی ہمارے ہاں کتنے ضعیف الاعتقاد لوگ موجود ہیں۔ کیا بُت بنے بیٹھے ہیں اور پنڈت جی کی باتوں پر یقین کئے جاتے ہیں۔ یہ کون باور کر سکتا ہے کہ شیر کے پاس سونے کے کنگن تھے۔ وہ جوہڑ کے اُس پار بیٹھا دھوپ میں اُن کنگنوں کی نمائش کیا کرتا تھا۔ کنگنوں کی چمک سے راہ گیروں کی آنکھیں چُندھیا جایا کرتی تھیں۔ لیکن شیر تو شیر ہی ہے بوڑھا ہو یا جوان۔ لوگ ڈر کے مارے اُس طرف قدم نہ بڑھاتے تھے۔ آخر ایک دن ایک غریب براہمن جو عمر بھر اپنی بیوی کے لئے سونے کے کنگن نہ بنوا سکا تھا شیر کے بہکانے میں آ ہی گیا اور جوہڑ کے دلدل میں اُتر گیا۔

"ہوں۔ بکواس!" ہربنس نے جھنجھلا کر اخبار میز پر پھینکتے ہوئے کہا: "بھلا کبھی شیر بھی انسانوں سے باتیں کرتے ہیں؟" اور وہ کتھا سُننے والوں کی ضعیف الاعتقادی پر آنسو بہاتا ہوا بوٹ کے تسمے باندھنے لگا۔ غریب براہمن کا حشر سُننے کے لئے شاید وہ ابھی کچھ دیر اور کمرے میں بیٹھا کتھا سُنتا رہتا۔ لیکن اُسے تو آج شالیمار میں کافی پینے کے لئے جانا تھا۔ شالیمار کا نام ذہن میں آتے ہی اُسے ایک دم کتنی ہی باتیں یاد آ گئیں۔

اُس نے اتوار کے لئے کتنا بڑا کام اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ اِسی مقصد سے اُس نے دو روز پہلے اپنی دوست پروفیسر مس سنجیت سنگھ سے فون پر بات بھی طے کی تھی۔ وہ یقیناً تیار بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ پھر وہ اپنے آپ ہی ہنستے ہوئے کہنے لگا: "یہ بھی کیسی تہذیب ہے کہ ایک جوان لڑکی والدین سے کوسوں دُور ایک الگ مکان میں رہتی ہے۔ معقول تنخواہ ہے، زندگی کے سب لوازم میسّر ہیں، دوست ملنے کے لئے آتے ہیں۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ قہقہے لگتے ہیں، مشروبات چلتے ہیں۔ اِن مباحثوں میں دوپہر کے کھانے سے شام کی چائے کا وقت ہو جاتا ہے اور منتشر ہوتے وقت سب کی زبان پر یہی فقرہ ہوتا ہے "واٹ اے ہیپی ٹائم!" (وقت کیسا اچھا گزرا ہے!)

"یہ ہیپی ٹائم بھی کیا چیز ہے جسے حاصل کرنے کے لئے سب پریشان ہیں اور اپنی قیمتی سے قیمتی چیز قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہ مسرت کی گھڑیاں اب گھر میں بیوی بچوں کی رفاقت میں میسّر نہیں ہوتیں، گھریلو اُلجھنوں کو سُلجھانے میں نہیں ملتیں بلکہ خوشی کے یہ لمحات اب سینما گھروں، ہوٹلوں، کلبوں، باروں، ریستورانوں یا دوستوں کی محفلوں تک محدود ہو گئے ہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی ناآسودگی کا شکار ہے۔

اس ناآسودگی سے فرار حاصل کرنے کے لئے وہ خوشی کے لمحات کے پیچھے بھاگ رہا ہے لیکن یہ لمحات اتنے تیز رفتار ہیں کہ انھیں پکڑتے پکڑتے دم اُکھڑنے لگتا ہے۔

آخر مسٹر منجیت سنگھ کو کونسی ناآسودگی ہے؟ معقول تنخواہ ہے، کار ہے، عزت ہے۔ کہتی ہے گاؤں میں ڈیڈی کی کافی زمین ہے۔ کھاتا پیتا زمیندار گھرانا ہے۔ پھر بھی اس کی زندگی نامکمل ہے۔ یہ اپنی مخلیں عورتوں تک ہی کیوں محدود نہیں رکھتی۔ جس سے دو چار بار ملی اپنی فیاضی کے دروازے اُس پر کھول دیئے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ اگر آج سے پچاس برس پہلے کا زمانہ ہوتا تو وہ یوں منجیت جیسی خوبرو لڑکی کے ساتھ بے کھٹکے ملاقات کا تصور تک ذہن میں نہ لا سکتا۔ حویلی کے دروازے سے میں گز دُور ہی دو نیزہ بردار پہرے دار اُس کی راہ روک لیتے اور ایک قدم آگے بڑھانے سے زندگی اور موت کا سوال پیدا ہو جاتا۔ لیکن نئے دَور میں تہذیب نے کتنی خوبصورت انگڑائیاں لی ہیں۔ حُسن کی محافظ پتھر کی دیواریں گلاب کے پودوں میں بدل گئی ہیں، جن کے مہکتے سایوں میں منجیتی کا فراط لڑکیاں اپنے دوستوں کا انتظار کرتی ہیں یا اُن کی رفاقت میں تنہائی کے لمحے بسر کرتی ہیں۔

"نہیں۔ نہیں!" ہربنس نے سر جھٹک کر موجوں کے دائرے سے نکلنے کی کوشش کی۔" اُسے پنڈت جی کی کتھا نہیں سُننی چاہئے تھی۔ یہ دَورِ جاہلیت کے نمائندے صنعتی دَور کی مشینوں میں پس جائیں تو اچھا ہے۔ یہ لوگ سرپٹ دَوڑتے گھوڑے کی ٹانگیں پکڑ کر اُسے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ پاؤں تلے روندے جائیں گے۔

البتہ پنڈت جی اس حد تک تو دُرست کہتے تھے کہ خوشی کے یہ لمحات حاصل کرنے کے لئے کبھی کبھی ہم کیسی پستیوں میں اُتر جاتے ہیں۔ بے شک منجیت کے دروازے پر نیزہ بردار پہرے دار نہ ہوں گے۔ بے شک پتھر کی اونچی دیواریں اُس کے حُسن کی محافظ نہ ہوں گی۔ بے شک اُسے مس سنگھ کو گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھا کر قلعے کی دیوار سے چھلانگ نہ لگانی ہوگی وہ تو خود بن سنور کر بیٹھی اُس کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ پھر بھی اخلاق کا تقاضا تو یہ ہے کہ اُسے اِس مقصد کے لئے مِس سنگھ کے ہاں نہ جانا چاہئے۔

لیکن خیالات کی ایک اور رَو نے یہ کہہ کر اس خیال کو رَد کر دیا کہ یہ سب تو پنڈت جی کا فرسودہ نظریہ ہے۔ اور یہ نظریہ جدید زندگی کے تقاضوں کے سراسر منافی ہے۔ زندگی تو خوشی ہے۔ خوشی شالیمار کے نیم روشن اندھیرے ہیں۔ خوشی کلب ہے۔ خوشی نازک بدنوں کا قُرب ہے۔ خوشی بہکتے ہوئے قہقہے ہیں۔ اور وہ راہ چلتے چلتے سوچنے لگا۔

خوش رہنا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اگر جوگندر سنگھ خوش رہنا چاہتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جوگندر سنگھ ایک ریٹائرڈ فوجی اور کامیاب زمیندار۔ بچّوں کی ذمّہ داریوں سے فارغ ہے۔ کماتا ہے کھاتا ہے۔ مزیدار باتیں کرتا ہے۔ جی بھر کر ہنستا ہے۔ لیکن یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اُسے بزرگ کہہ کر پکارے۔ کیونکہ عمر کا احساس اُسے زندگی کے پُرلطف زمانے میں کنکر کی طرح موت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ کا پتہ دیتا ہے یہی سبب ہے کہ مجھ سے دگنی عمر ہونے پر بھی مجھے دوست کہہ کر پکارتا ہے جب بھی شہر آتا ہے مجھے ضرور شالیمار کی بار میں لے جاتا ہے۔ وہاں زندگی کے پُرلطف قہقہے سُناتا ہے اور میری جوانی کی حماقتوں کو سُن سُن کر محظوظ ہوتا ہے۔ وہاں سے اُٹھنا نہیں چاہتا۔ کافی ختم ہوتی ہے تو سینکس منگوا لیتا ہے اور اس کے بعد پھر کافی کا آرڈر دے دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے زندگی کے حقیقی لمحات وہی ہیں جو شالیمار کی بار میں جوان لڑکیوں کی صحبت میں گزر جائیں۔

جوگندر سنگھ اکثر کسی ایسی میز پر بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے جہاں قریب ہی لڑکیاں بیٹھی ہوں۔ شوخیوں کی شعاعیں بکھیر رہی ہوں۔ دُھوئیں کی لہروں پر قہقہے رقصاں ہوں۔ میں جوگندر سنگھ کی بزرگی اور آنکھوں کی تسکین کے اِس شغل کا موازنہ کر کے ہنسنے لگتا ہوں۔ لیکن بات اس سے آگے کبھی نہیں بڑھی۔ وہ قریب بیٹھے رہنے کے باوجود لڑکیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اپنی باتیں مجھے سُناتا ہے اور میرے تجربات خود سُنتا رہتا ہے۔ اگر جوگندر سنگھ کو اس ماحول میں بیٹھے رہنے سے خوشی ہوتی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

گزشتہ ہفتے جب وہ شالیمار آیا تھا تو ہماری میز پر ہی دو شوخ و شنگ لڑکیاں اور اُن کے دو ساتھی لڑکے بیٹھے تھے۔ اُن کی باتیں سُننے سے جسم میں خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن جب وہ اچانک اُٹھ گئے تو جوگندر سنگھ کا سُرخ چہرہ ایکدم اُتر گیا۔

وہ سر جُھکائے نیم جان سا بیٹھا رہا۔ پھر سرد آہ بھر کر بولا ——

"ہربنس! تمہارے ساتھ تو کبھی کوئی لڑکی کافی ہاؤس نہیں آتی۔ کیا یہ باتیں جو تم مجھے سُنایا کرتے ہو سب افسانے ہی ہیں؟"

جوگندر سنگھ کی بات پر اُس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ——

"بس اتنی سی بات پر مایوس ہو گئے جوگندر سنگھ جی! شالیمار کی بہار پر خزاں نہیں آ سکتی۔ دو لڑکیاں اُٹھ کر گئی ہیں تو ابھی چار آ بیٹھیں گی۔"

"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہاں لڑکیاں دیکھنے آتا ہوں؟" جوگندر سنگھ نے قدرے ناراض ہو کر کہا۔

اُس کا جی چاہا جوگندر سنگھ کے اس تجاہلِ عارفانہ پر اُس کے جھاڑی بھر کر جسم سے لپٹ جائے اور زور زور سے قہقہے لگائے۔ لیکن اُس نے بات کاٹتے ہوئے کہا ——

"جوگندر سنگھ جی! آپ مجھے شاید غلط سمجھ رہے ہیں!"

"نہیں بھائی ہربنس! میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں یہ شکلیں [illegible]

[illegible] دیکھے جا رہا ہے وہاں سے کہ شالامار میں [illegible] بس کچھ حسین مناظر یاد [illegible] اگر ہم یہ منظر [illegible] آنکھوں کے سامنے رہ جائیں تو کیا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب [illegible] آ رہی ہیں۔ تم [illegible] سب لوگ تم سے واقف ہیں لیکن میں نے تمہارے ساتھ کبھی کسی لڑکی کو آتے نہیں دیکھا۔

"کیا مطلب؟" اُس نے جوگندر سنگھ سے وضاحت چاہی۔

"میرے کہنے کا مطلب ہے اگر تم چاہو تو بے شک ایک دو دوست لڑکیاں لے آیا کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں تو اپنی کافی پیوں گا اور تمہاری باتیں سنوں گا۔ زندگی کتنا بڑا بوجھ ہے۔ شالیمار کی یہ محفلیں اس بوجھ کو کتنا ہلکا کر دیتی ہیں۔"

"لیکن یہ بہت مہنگا شغل ہے جوگندر سنگھ جی!" اُس نے پھر ہنسنے کی کوشش کی۔

"نہیں، نہیں۔ تم پیسے کی فکر نہ کیا کرو۔ پیسہ تو خود انسان پر بوجھ ہے جو [illegible] کو دبائے رکھتا ہے۔ یہ بوجھ تو ہلکا ہوتا رہے تو اچھا ہے۔"

ہربنس جوگندر سنگھ کی ان باتوں پر خوب ہنسا تھا۔ مس سنگھ کو شالیمار میں پارٹی کی دعوت دیتے ہوئے بھی ہنس رہا تھا۔ اُس نے مس سنگھ کو بتایا تھا کہ آج وہاں اُس کے کچھ اور دوست بھی ہوں گے۔ وہ اُسے اپنے ایک بزرگ مہربان سے بھی ملائے گا جس کی زندگی گوناگوں تجربات سے پُر ہے۔ اگر پرومیلا مہرہ کے شوہر دلی آگئے تو وہ بھی ضرور آئے گی۔ ایسی دلچسپ محفل ہوگی کہ وہ ان لمحات کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

اور منجیت جب اُس کے ساتھ شالیمار آئی تو وہ ایک شگفتہ پھول معلوم ہو رہی تھی جس کی پتی پتی سے حسن اور خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا آج وہ جوگندر سنگھ پر اپنے تعلقات کی دھاک بٹھا دے گا۔

شالیمار میں آکر اُس نے دیکھا جوگندر سنگھ پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اور ہیڈ [illegible] کے بالمقابل کمرے میں طے شدہ پروگرام کے مطابق بیٹھا ان لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کا سفید بالوں سے گھرا سرخ چمکتا ہوا چہرہ سبز پردے کی اوٹ سے دکھائی دے رہا تھا۔ ہربنس نے منجیت سے کہا وہ سامنے کمرے میں چل کر بیٹھے وہاں اُس کے وہی بزرگ دوست بیٹھے ہیں۔ وہ خود ابھی مسز مہرہ کو فون کر کے اور آرڈر دے کر آ رہا ہے۔

لیکن جب ہربنس فون کر کے لوٹا تو مس سنگھ پرس کو انگلی پر گھماتے ہوئے نہایت پریشانی کی حالت میں کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ اُس کی ساڑی فرش پر گھسٹتی جا رہی تھی۔ اس کے بال پریشان تھے اور وہ ہربنس کی آواز سنے بغیر نہایت تیزی سے سیڑھیاں اُتر گئی جیسے کسی بچھو نے اُسے ڈنک مار دیا ہو۔

کمرے کے اندر سبز پردے کی اوٹ میں جوگندر سنگھ تصویر کی طرح [illegible] تھوڑا سا [illegible] صوفے پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں جو زندگی کے حُسن کو سمیٹ لینا چاہتی تھیں کسی منظر کی تاب نہ لا کر بند ہو گئی تھیں۔ اُس کی ہتھیلی پر [illegible] ہوئے [illegible] شیشے کی سطح پر بکھر گئے تھے۔

ہربنس پردے کے مانند دروازے میں لٹکا رہ گیا۔

اور پنڈت جی کی آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی ایک بوڑھا شیر جو شکار نہیں کر سکتا تھا جوہڑ کے پار بیٹھا سونے کے کنگنوں کی دھوپ میں نمائش کیا کرتا تھا ———

بیسویں صدی دہلی

---

# غزل

اسما سعیدی ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ

اِس چشمِ منتظر کا سہارا نہیں رہا
اب آسمان پر کوئی تارا نہیں رہا

اب بحرِ غم سے پار اُترنا محال ہے
کشتی نہیں رہی ہے کنارا نہیں رہا

اب کیا نظر مناظرِ ہستی کی سمت اُٹھے
رعنائی جس میں تھی وہ نظارا نہیں رہا

گلہائے انبساط نہ دو اب فریبِ تم
کچھ اعتبار ہم کو تمہارا نہیں رہا

صبر و قرار و ضبط کی تلقین نہ کیجئے
صبر و قرار و ضبط کا یارا نہیں رہا

وہ زندگی بھی کیا جو سہاروں پہ چل سکے
اچھا ہوا جو کوئی سہارا نہیں رہا

اُٹھتی نہیں ہے آہ دلِ سردِ عشق سے
آتش کدے میں کوئی شرارا نہیں رہا

کل اپنے اختیار میں تھی کائناتِ دہر
اب اختیار خود پہ ہمارا نہیں رہا

بدلی ہوئی نظر میں کہاں جنبشِ کرم
اب اُس نظر میں کوئی اشارا نہیں رہا

اسما جو دردِ عشق نے کی دل سے بیوفائی
دل کو بھی دردِ عشق گوارا نہیں رہا

اسما سعیدی

# مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

| | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| افسانہ کہہ رہی ہوں | خورش باش ایم اے | دو روپے | دو پھول | عادل رشید | تین روپے ۹۵ " | قیامت | [illegible] | [illegible] |
| اندھیرے | اختر عادل روپ | دو روپے | دو سال پہلے دو سال بعد | زبیدہ خاتون | چھ روپے | ساونی | " | [illegible] |
| آگ اور دھواں | م م راجندر ایم اے | دو روپے ۵۰ نئے پیسے | زریں سلسلہ | شفیق انور | دو روپے | [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| اندھیرے اجالے | عادل رشید | تین روپے | زہر | ذکی انور | چھ روپے | گرداب | [illegible] | [illegible] |
| اندھیری راتیں | ریوتی سرن شرما | تین روپے ۵۰ نئے پیسے | برہیں | قیسی رامپوری | چار روپے | ناگ دیوتا | [illegible] | [illegible] |
| ایک چہرہ ایک دھوکا | رام سرن شرما | تین روپے ۵۰ نئے پیسے | اچھی صورت بری نگاہ | ریاض ارشد | تین روپے | خون کے چھینٹے | " | [illegible] |
| بیگم صاحبہ | شوکت تھانوی | تین روپے ۵۰ نئے پیسے | کانٹے | رضیہ سجاد ظہیر | تین روپے ۵۰ نئے پیسے | خوابگاہ میں | " | تین روپے ۵۰ " |
| داماد | " | دو روپے ۵۰ نئے پیسے | مجھے تم سے محبت ہے | نقی نور | تین روپے ۵۰ " | فراق | [illegible] | تین روپے ۵۰ " |
| پگلی | " | تین روپے ۵۰ نئے پیسے | نئے قدم | ہاجرہ نازلی | چار روپے ۵۰ " | پیاسا | " | تین روپے ۵۰ " |
| بے غیرت | مضطر ہاشمی | چار روپے ۲۵ " | ننگی جوانی | سعید لمرت | دو روپے | پراسرار قاصد | " | دو روپے |
| بادل تھے | کرشن چندر ایم اے | پانچ روپے ۹۵ " | رہگذر | انیس مرزا | چار روپے ۵۰ نئے پیسے | پراسرار قاتل | " | دو روپے |
| پہلی لڑکی | راز داں ایم اے | دو روپے ۹۵ نئے پیسے | خوفناک محبت | عبدالحلیم شرر | تین روپے | پیاس | [illegible] | تین روپے ۵۰ " |
| انور | فیاض علی | آٹھ روپے ۵۰ " | شعلہ | انتصار حسین | تین روپے | محبت روتی ہے | غلام عباس | دو روپے |
| برہمن | کرشن گوپال عابد | چار روپے ۵۰ " | کرنیں | شفیق الرحمٰن | تین روپے | مالوا | میکسم گورکی ترجمہ نرش کمار شاد | ایک روپیہ ۵۰ " |
| ستم | " | چار روپے ۷۵ " | ناظم کی آپ بیتی | ایم اسلم | تین روپے | کھیت میں لہو | تاجور سامری | ایک روپیہ ۷۵ " |
| گھائل | " | تین روپے ۹۵ " | ایک دل ہزار غم | عزیز بدایونی | دو روپے ۵۰ نئے پیسے | جی ہاں بیٹے ہیں | شوکت تھانوی | تین روپے ۵۰ " |
| ظالم | سعید لمرت | دو روپے ۵۰ " | زرینہ | رئیس احمد جعفری | چھ روپے ۵۰ نئے پیسے | پردے کے پیچھے | منٹو | دو روپے ۵۰ " |
| جانے والے | اختر عادل روپ | تین روپے ۵۰ " | ننگا شہر | احمد شجاع | پانچ روپے | ملک صحرا | ادم پرکاش تاثیر | دو روپے ۵۰ " |
| جاگی ہوئی بہار | وحشی محمود آبادی | چار روپے | دروازہ | نادرہ خاتون | پانچ روپے | خاموش نغمہ | " | چار روپے |
| چوٹ | دت بھارتی | تین روپے ۵۰ نئے پیسے | چندر کلا | جمنا داس اختر | دو روپے ۵۰ نئے پیسے | آتش گل (مجموعہ کلام) | جگر مراد آبادی | پانچ روپے |
| گناہ | " | دو روپے ۹۵ نئے پیسے | جلن | " | دو روپے ۵۰ " | باقیات اقبال " | ڈاکٹر اقبال | تین روپے |
| حالِ دل | بیگم توقیر دیانت حسین | تین روپے ۵۰ " | رادھا الزبتھ | " | دو روپے ۵۰ " | تلخیاں (کلاں) " | ساحر | چھ روپے |
| خاتون | انتصار حسین | تین روپے | پاپی | " | چار روپے | تلخیاں (خورد) " | ساحر | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| حاجی مراد | قیسی رامپوری | چار روپے | سونا گاچی | " | چار روپے ۵۰ " | پرچھائیاں " | ساحر | ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے |
| پاگل | رئیس احمد جعفری | چھ روپے | طوفانوں کی کہانی | " | چار روپے ۵۰ " | انسانیت موت کے دروازے پر (مولانا آزاد) | | تین روپے ۵۰ " |
| جنم ابرو (نظم) | عبدالحمید عدم | دو روپے ۵۰ نئے پیسے | جوار بھاٹا | " | چار روپے ۵۰ " | [illegible] | [illegible] | [illegible] |

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی

افسانہ

# طلسم عشق ربا

پروفیسر زکی انور ایم۔اے

ڈپارٹمنٹ آف اردو، کریم سٹی کالج، ساکچی، جمشید پور نمبر ۱

برادر گرامی قدر! تسلیم

...ایک مزے کی بات سنئے۔ عصمہ اپنے زمانے کے عاشقوں سے عشق کرتی ہوگی لیکن قارئین عصمہ اور فیروز سے عشق کرنے لگے ہیں۔ پھر یہی تقاضا تھا کہ عصمہ کہاں گئی؟ فیروز کہاں گیا؟ اِس لئے پھر اُن دونوں کو پکڑ لایا ہوں اور ایک "عشق ربا" "طلسم" کا افسانہ بھیج رہا ہوں ——— بیسویں صدی برادری کانفرنس کا کام آگے بڑھ رہا ہے اور جلد ہی ہم لوگ کسی قطعی فیصلے تک پہنچ جائیں گے۔ برادری کے کچھ لوگ اِس سلسلے میں بڑے بے چین نظر آ رہے ہیں لیکن ہم سوچتے ہیں ——— دیر آید درست آید! ——— اُردو کے بہت بڑے سپاہی خوشتر گرامی کی سرپرستی میں یہ کانفرنس یقیناً اُس مظلوم زبان کے لئے بھی کچھ کرے گی جس زبان کے دوست بھی دشمن، دشمن بھی دشمن اور جسے زیادہ طور پر ذاتی فائدے کے لئے استعمال کیا گیا اور کیا جا رہا ہے...

آپ کا ——— زکی

کلکتہ: ۲۰ جون ۶۶ء

پیاری بھابی! تسلیم

آپ کا تو ہرگز نہیں لیکن میں اُس لڑکی کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں جس نے نریندر کو اپنی محبت میں گرفتار کرکے آپ کو پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ نہ وہ ایسا کرتی نہ آپ پریشان ہوتیں اور نہ مجھے خط ہی لکھتیں۔ ہاں! اِس بات کے لئے میں آپ کا شکر گزار ضرور ہوں کہ آپ نے مجھے اِس قابل سمجھا کہ میں آپ کی مدد کر سکوں گا اور یقین کیجئے بھابی، اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میں آپ لوگوں کے لئے اپنی جان تک کی بازی لگا دینا عین سعادت سمجھتا لیکن عشق کے معاملے میں میں معذور ہوں کہ میں آپ کی کچھ مدد نہ کر سکوں گا ویسے آپ یقین کیجئے عشق ایک میعادی بیماری ہے اور میعاد پوری ہونے کے بعد از خود مریض صحت یاب ہو جاتا ہے۔ جس زمانے میں محبوبائیں پکچر نہیں دیکھتی تھیں، یعنی فلمیں بنتی ہی نہ تھیں۔ کلب گھر تھے ہی نہیں۔ شاپنگ کا شوق انھیں نہ تھا یعنی جس زمانے میں عشق پر کچھ زیادہ خرچ نہیں آتا تھا، تب میعاد ذرا لمبی ہوتی تھی اور اب تو جلد ہی محبوب کی کمر اینٹھ جاتی ہے اور عشق میں کمر کا اینٹھ جانا صحت کی علامت ہے۔ میاں نریندر کو کُل ڈھائی سو روپے تو ملتے ہی ہیں۔ گھبرائیے نہیں ان کی کمر بہت جلد اینٹھ جائے گی اور اللہ شفا دے گا۔

یہ پڑھ کر اتفاقاتِ زمانہ پر بہت ہنسی آئی۔ یہاں میرے ایک دوست کے چھوٹے بھائی پر میر حسن کے سحر البیان کی کوئی پری عاشق ہو گئی ہے۔ اُس کا علاج مشہور گنڈے ساز مولانا قدیر صاحب کر رہے تھے کہ وہ کیس میں نے اُچک لیا ہے۔ اب وہاں بھی جب آپ نے مولانا قدیر ہی سے رجوع کیا ہے اور میں وہ کیس بھی اُچک لوں، تو کتنی بُری بات ہوگی۔ بے چارے کو کمانے کا سندیسہ انھیں کے گنڈے استعمال کیجئے۔ کیا عجب ہے کہ نریندر کی محبوبہ بھی کوئی پری وغیرہ ہو۔ کیوں کہ اپنے دوست کے چھوٹے بھائی کا کیس ہاتھ میں لے کر میں بہت پچھتا رہا ہوں۔ میں نے سمجھا تھا کہ اُس کی محبوبہ کوئی چالاک لڑکی ہے جو بھوت پریت کی فلمیں دیکھ دیکھ کر بھوت پریت بن کر اپنے محبوب کو چکمہ دے رہی ہے۔ لیکن حالات رونگٹے کھڑے کر دینے کی حد تک برعکس نکلے۔ وہ تو سچ مچ کوئی آتما ہے اور آتماؤں سے نپٹنا میرے بس کا روگ نہیں۔ مولانا قدیر صاحب خود بھی بھوت پریت کے قبیلے سے تعلق

سکتے ہیں اس لئے وہ اس طرح کا کیس بڑی چابک دستی سے ہینڈل کر لیتے ہیں۔

ایک بات اور عرض کروں گا۔ آپ نریندر کی شادی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی لڑکی سے ضرور ہی کریں۔ اگر وہ لڑکی نریندر کی ہی محبوبہ ہو تو کیا حرج ہے؟ یہی بات کہ اس لڑکی کی ذات پات اور حسب نسب کا کوئی پتہ نہیں —— بھابی! کیا یہی کافی نہیں کہ وہ ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی ہے؟

میری باتوں کا برا نہ مانئے۔ ان پر سنجیدگی سے غور فرمائیے۔

بھائی صاحب کو نمستے کہئے، بچوں کو پیار اور میاں فرہاد کو دعائیں۔

آپ کا اپنا —— فیروز چشتی

کلکتہ: ۳ر جولائی ۶۶ء

فیروز! خوش رہو

تمہارا خط مل گیا تھا اور ملتے ہی میں نے کام شروع کر دیا تھا۔ نریندر سے ملتا رہا —— اور اب وہ میرا دوست ہے۔ تمہارا خیال درست ہے بے شک وہ "لڑکی" ہی ہے۔ اسی لئے تصویر نہیں بھیج رہا ہوں —— دفتر کا وقت ہو گیا ہے اس لئے باقی پھر کبھی۔ تمہارے خاص خط کا انتظار کر رہا ہوں!

تمہارا —— ریاض شاہد

کٹک: ۸ر جولائی ۶۶ء

پیارے ریاض! خوش رہو

تمہارا خط مل گیا۔ بڑی تسلی ہوئی جب تم نے لکھا کہ تمہارے دوست نریندر کی محبوبہ گوشت پوست کی بنی ہوئی کوئی جیتی جاگتی لڑکی ہے، کوئی آتما یا بھوت پریت نہیں۔ شاہد! نریندر صرف تمہارا دوست ہی نہیں میرا بھی عزیز ہے۔ وہ میری بہت ہی پیاری بھابی کا چھوٹا بھائی ہے۔ عشق کرنے سے پہلے تک مجھے خط بھی لکھا کرتا تھا لیکن جب سے عشق شروع کیا ہے، بے چارے کو فرصت ہی کہاں ملتی ہو گی۔ اس کی دیدی یعنی میری بھابی نے مجھے لکھا تھا کہ میں کوئی ایسی ترکیب کروں کہ نریندر عشق سے باز آ جائے۔ لیکن میں نے انہیں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اس معاملے میں وہ مجھے معاف ہی رکھیں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ صرف میری حرکت پر نریندر ساری دنیا کو گالی دے اور گاتا پھرے ——

دو دلوں کو یہ دنیا ملنے ہی نہیں دیتی     [illegible] ہی نہیں دیتی

اور اگر نریندر بگڑنے لگے تو پھر کیا وقت رہ جائے گی ——

ہم عشق کریں گے [illegible]     [illegible] ہے یہ تو [illegible] نہیں ہے

اب نریندر سے ملاقات ہو تو میری جانب سے کہہ دینا

ہاں ریاض! مجھے بھی تو کل پتا چل گیا ہے کہ میاں [illegible]

آج کل روحوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ روحوں کا ایک [illegible] میں ہوا، چار کیس بمبئی میں اور دو دلچسپ کیس دلی میں [illegible]۔ ایک میاں اسلم کا کیس ہے۔ اسی لئے نریندر کی محبوبہ کی طرف سے ہی [illegible] شکر ہے کہ وہاں ایسی کوئی بات نہیں۔ حالات لکھتے رہنا۔

(نوٹ:۔ نوٹ کی یہ سطر اچھی طرح [illegible])

تمہارا —— فیروز چشتی

کلکتہ: ۲۰ر جولائی ۶۶ء

بھائی صاحب! نمستے

بہت شرمندہ ہوں کہ بہت دنوں سے آپ کو کوئی خط نہ لکھ سکا ظاہر ہے کہ جب چھوٹا ہو کر میں آپ کو خط نہ لکھوں گا تو آپ تو میرے بزرگ ہیں آپ سے کیوں شکایت کروں۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خط نہ لکھتے ہوئے بھی آپ نے میرا جس قدر خیال رکھا ہے۔ شاید کوئی اپنا بھائی بھی اتنا خیال رکھے۔ دیدی کو جو خط آپ نے لکھا تھا وہ بھی میں نے پڑھا تھا اور ریاض شاہد صاحب بھی آپ کا خط مجھے دکھایا کرتے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ بُرے وقتوں میں انسان کا اپنا سایہ بھی اس سے جدا ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ کی ذات میرے لئے تاریکیوں میں روشنی کی ایک کرن ہے۔ جب سے مالتی میری زندگی میں آئی ہے وہ لوگ جو میری زندگی میں نہ جانے کب سے شامل تھے آہستہ آہستہ الگ ہوتے جا رہے ہیں۔ مالتی اگر کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ لیکن وہ ایک شریف، خاندانی اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ پتہ نہیں دیدی میرے لئے اور کیسی لڑکی پسند کرتیں جو مجھ سے خفا ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں آپ جیسے ہمدرد بھائی کا سایہ میرے سر پر ہو تو مجھے تو میں حالات سے بالکل خوفزدہ نہیں۔ بھگوان نے چاہا تو ہم دونوں بہت جلد جنم جنم کے ساتھی بن جائیں گے بس آپ آشیرواد دیجئے۔

ایک بات معلوم کر کے بہت ہنسی آئی کہ آپ مالتی کو کوئی [illegible] سمجھ بیٹھے تھے۔ نہیں بھائی صاحب وہ بالکل ایک [illegible] ہے [illegible] لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی [illegible] کوئی [illegible] ضرور بتائیے گا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] —— نریندر

گنگ، ۲۶ جولائی ۱۹۹۰ء

عزیزی نریندر، خوش رہو

تمہارا خط ملا۔ بھائی! میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ محبت سو فیصدی بکواس ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ ایک مرد کو ایک عورت کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک عورت کو ایک مرد کی۔ اب اگر یہ ضرورت طرفین کی پسند کے مطابق ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لو میرج کی کامیابی کی شرح بہت ہی مایوس کن ہے۔ لیکن اس سے لو میرج کی افادیت کم نہیں ہوتی۔ تم اور مالتی شوق سے شادی رچاؤ۔ میرا آشیرواد تمہارے ساتھ ہوگا۔ خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے!

تم سے پہلے ریاض بھی مجھے یقین دلا چکا ہے کہ مالتی سو فیصدی گوشت پوست کی ایک جیتی جاگتی لڑکی ہے۔ تمہارے اس سوال کا جواب بے شک دلچسپ ہے کہ میں نے مالتی پر کبھی کسی آتما کا شک کیوں کیا؟ بات یہ ہے نریندر کہ آج کل آتماؤں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ آتماؤں کے نصف درجن معاشقے کے بارے میں تو میں جانتا ہوں اور ان معاشقوں میں ایسے ایسے ہیبت ناک اور مافوق الفطرت واقعات رونما ہوئے ہیں کہ کئی بار تو میں نے تمہاری بھابی کے بارے میں بھی بڑی سنجیدگی سے غور کیا کہ کہیں یہ بھی کوئی آتما تو نہیں! پرسوں تو بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز خبر میں نے سنی۔ خبر کی ہیبت کا اندازہ تم اس سے لگا سکتے ہو کہ بی بی سی اور وائس آف امریکہ سے یہ خبر نشر ہوئی ہے، میرا خیال ہے آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوئی ہوگی۔ خبر یہ ہے کہ مدراس میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی حیرت انگیز محبت کی ابتدا کیسے ہوئی؟ ——— ایک لڑکا جس کا نام ایم پی راؤ ہے ایک دن پکچر دیکھنے گیا۔ ابھی وہ ٹکٹ بھی نہیں خرید سکا تھا کہ ٹیکسی سے ایک لڑکی اتری اور اس نے نہایت خوشامدانہ انداز میں کہا کہ وہ اس لڑکی کا ٹکٹ بھی لا دے کیونکہ اسے اپنی کسی سہیلی کو فون کرنا تھا۔ لڑکا رضامند ہو گیا اور لڑکی اسے ٹکٹ کے پیسے دے کر ٹیلیفون بوتھ کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے پاس آئس کریم کے دو کپ تھے۔ دونوں ہال میں ساتھ بیٹھے اور آئس کریم کھانے لگے۔ جبھی لڑکے نے محسوس کیا کہ یکایک وہ لڑکی اس کی بغل سے غائب ہو گئی تھی۔ ایم پی راؤ بہت گھبرایا لیکن اسی وقت پکچر شروع ہو گئی۔ ہال میں اندھیرا ہو گیا۔ راؤ نے اس لڑکی کو ٹٹولا لیکن وہاں کوئی لڑکی تو نہ تھی البتہ راؤ کا ہاتھ ایک بلی کے نرم جسم اور چکنے بالوں پر پڑا اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور تب کسی لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ وہ لڑکی وہی تھی۔ راؤ نے اس سے [illegible]

آئی تھی ہو گئی اور پکچر ہاؤس ہی میں راؤ اور اس لڑکی میں محبت ٹھن گئی ——— نریندر یہ تو محض ایک واقعہ تھا لیکن اس سلسلے میں جو بات سب سے زیادہ حیرت انگیز اور ہیبت ناک ہے وہ یہ ہے کہ لندن کے مسٹر کے۔ ولنگٹن اور نیویارک کے مسٹر رابرٹ کی محبت بھی تقریباً اسی طرح شروع ہوئی تھی اور اب مسٹر ولنگٹن، مسٹر رابرٹ اور مدراس کا ایم پی راؤ، تینوں ایک ہی مرض دردِ قولنج میں مبتلا ہیں ——— اب ذرا کلیجہ تھام کر سنو نریندر! تم نے میرے ساتھ اکثر ایک خوبصورت خوش پوش نوجوان کو دیکھا ہوگا جس کے بال گھونگھریالے ہیں۔ ٹیڈی پتلون پہنتا ہے اور کسی قدر ناک سے بولتا ہے۔ اس کا نام اسلم ہے۔ پرسوں بی بی سی اور وائس آف امریکہ کے نشریے سن سن کر بیچارہ دس پندرہ منٹ تک حواس باختہ رہا۔ یقین کرو آج سے ایک ماہ پہلے اسلم میاں کا عشق بھی ایک لڑکی سے بالکل انہیں حالات میں شروع ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلم میاں کی محبوبہ کسی سہیلی کو فون کرنے نہیں، کچھ دور کھڑی اپنی ایک سہیلی سے ملنے گئی تھی اور وہاں سے وہ مونگ پھلی کے دو پیکٹ لے کر لوٹی تھی اور وہاں سے جب وہ غائب ہوئی تھی تو اس کی خالی سیٹ پر بلی نہیں تھی، ایک خوبصورت سا بچہ تھا جس کے بارے میں اسلم کی محبوبہ نے بتایا تھا کہ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی کسی عورت کا تھا اور ایک فرق یہ بھی کہ اسلم کی محبوبہ پان لے کر نہیں آئی تھی لیکن واپس آنے پر وہ عطر کی طرح مہک رہی تھی! کہانی کا آخری حصہ ہوبہو ایک ہے۔ یعنی میاں اسلم بھی دردِ قولنج کے شکار ہیں۔ میں تو ان لغویات کا قائل نہیں لیکن مولانا قدیر کا کہنا ہے کہ اسلم کی محبوبہ کوئی بری روح ہے اور اسلم کا گردہ نکال کر کھانے کی فکر میں ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ دتی کے روحانی معاشقوں کے بارے میں کیا خبر آتی ہے۔

تم خدا کے لئے گلے میں کوئی تعویذ ضرور ڈال لو۔ ویسے میں ان حماقتوں کا سرے سے قائل نہیں لیکن بیک وقت مدراس، لندن اور نیویارک کے علاوہ خود اپنے گھر کے واقعات نے ایمان بگاڑ ڈالا ہے۔

خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

تمہارا بھائی ——— فیروز [illegible]

کلکتہ، یکم اگست ۱۹۹۰ء

[illegible] سے بینڈل کر لیتے ہیں۔
[illegible] نریندر کی شادی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ
[illegible] ہو تو کیا حرج ہے؟

رہی یہ بات [illegible]
کیا یہی کافی نہیں کہ وہ ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی ہے؟
میری باتوں کا بُرا نہ مانئے۔ اِن پر سنجیدگی سے غور فرمایئے۔
بھائی صاحب کو نمستے کہئے، بچوں کو پیار اور میاں فرہاد کو دعائیں۔

آپ کا اپنا ——— فیروز چشتی

اب نریندر سے ملاقات ہو تو میری دعائیں کہہ دینا۔
ہاں ریاض! مجھے بھی قائل ہونا پڑ گیا ہے کہ میاں اسلم کی محبوبہ کوئی روح ہے، آج کل روحوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ روحوں کا ایک مشہور کیس مدراس میں ہوا، چار کیس بمبئی میں اور دو دلچسپ کیس دلّی میں ابھی چل ہی رہے ہیں۔ ایک [illegible] نریندر کی محبوبہ کی طرف سے جی ڈر گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہاں [illegible]

(نوٹ:۔ نوٹ کی یہ سطر اچھی طرح مٹا کر یہ خط نریندر کو ضرور دکھا دو)

تمہارا ——— فیروز چشتی

کلکتہ: ۳ر جولائی ۶۶ء

فیروز! خوش رہو

تمہارا خط مل گیا تھا اور ملتے ہی میں نے کام شروع کر دیا تھا۔ نریندر سے ملا، ملتا رہا ——— اور اب وہ میرا دوست ہے۔ تمہارا خیال درست ہے بے شک [illegible] "کی" ہی ہے۔ اِسی لئے تصویر نہیں بھیج رہا ہوں ——— دفتر کا وقت ہو گیا ہے اِس [illegible] کبھی۔ تمہارے خاص خط کا انتظار کر رہا ہوں!

تمہارا ——— ریاض شاہد

کٹک: ۸ر جولائی ۶۶ء

پیارے ریاض! خوش رہو

تمہارا خط مل گیا۔ بڑی تسلّی ہوئی جب تم نے لکھا کہ تمہارے دوست نریندر کی محبوبہ گوشت پوست کی بنی ہوئی کوئی جیتی جاگتی لڑکی ہے، کوئی آتما یا بھوت پریت نہیں۔ شاہد! نریندر صرف تمہارا دوست ہی نہیں میرا بھی عزیز ہے۔ وہ میری بہت ہی پیاری بھابی کا چھوٹا بھائی ہے۔ عشق کرنے سے پہلے تک مجھے خط بھی لکھا کرتا تھا لیکن جب سے عشق شروع کیا ہے، بے چارے کو فرصت ہی کہاں ملتی ہو گی۔ اُس کی دیدی یعنی میری بھابی نے مجھے لکھا تھا کہ میں کوئی ایسی ترکیب کروں کہ نریندر عشق سے باز آجائے لیکن میں نے انھیں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اِس معاملے میں وہ مجھے معاف ہی رکھیں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ صرف میری حرکت پر نریندر ساری دُنیا کو گالی دے اور گاتا پھرے ———

دو دلوں کو یہ دُنیا ملنے ہی نہیں دیتی ❋ آشاؤں کی کلیوں کو کھِلنے ہی نہیں دیتی

اور اگر نریندر یہ گانے لگے تو میری کیا وقعت رہ جائے گی ———

ہم عشق کریں گے ہمیں کچھ ڈر تو نہیں ہے ❋ سرکاری سڑک ہے یہ ترا گھر تو نہیں ہے

کلکتہ: ۲۰ر جولائی ۶۶ء

بھائی صاحب! نمستے

بہت شرمندہ ہوں کہ بہت دنوں سے آپ کو کوئی خط نہ [illegible] کہ جب چھوٹا ہو کر میں آپ کو خط نہ لکھوں گا تو [illegible] شکایت کروں [illegible] خیال رکھا ہے۔ شاید [illegible]

[illegible]

بات [illegible]
لئے اور کیسی لڑکی [illegible]
بھائی کا سایہ میرے سر پر [illegible]
چاہا تو ہم دونوں بہت جلد [illegible]
ایک بات معلوم [illegible]
نہیں بھائی صاحب وہ بالکل ایک عام [illegible]
سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر آپ کو یہ شک کیسے ہوا کہ [illegible]
بے چینی سے آپ کے اُس دلچسپ خط کا انتظار کروں گا۔
بھابی جی کو سادر پرنام۔ ننھے منّوں کو پیار۔

آپ کا پیارا بھائی ——— [illegible]

کٹک: ۲۶ر جولائی ۹۶ء

عزیزی نریندر، خوش رہو

تمھارا خط ملا۔ بھائی! میں تو اِس بات کا قائل ہوں کہ محبت [illegible]
بکواس ہے حقیقت [illegible] ایک [illegible]
ایک عورت کو ایک مرد [illegible]
[illegible]

[illegible] بی بی سی
انڈیا ریڈیو سے بھی نشر [illegible]
[illegible] کی حیرت انگیز محبت کی ابتدا [illegible]
ایک دن پکچر دیکھنے گیا۔ ابھی وہ ٹکٹ بھی نہیں خرید سکا تھا کہ
[illegible] اور اُس نے نہایت خوشامدانہ انداز میں کہا کہ وہ اُسے
[illegible] چونکہ اُسے اپنی کسی سہیلی کو فون کرنا تھا۔ لڑکا رضامند ہوگیا
پیسے دے کر ٹیلیفون بوتھ کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب
[illegible] پاس آئس کریم کے دو کپ تھے۔ دونوں ہال میں ساتھ بیٹھے اور
[illegible] لگے۔ جبھی لڑکے نے محسوس کیا کہ یکایک وہ لڑکی اُس کی بغل سے غائب
[illegible] ایم پی راؤ بہت گھبرایا لیکن اُسی وقت پکچر شروع ہوگئی۔ ہال میں اندھیرا
[illegible] راؤ نے اُس لڑکی کو ٹٹولا لیکن وہاں کوئی لڑکی تو نہ تھی البتہ راؤ کا ہاتھ ایک
[illegible] کے نرم جسم اور چکنے بالوں پر پڑا اور وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور تب کسی لڑکی نے
اُس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ وہ لڑکی وہی تھی۔ راؤ نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلی
گئی تھی تو اُس نے بتایا کہ وہ پان لینے گئی تھی اور پان کی دو بہت ہی معطر گلوریاں
اُس نے راؤ کی طرف بڑھا دیں۔ راؤ نے بلی کی بات کہی تو اُس نے ہنس کر بتایا کہ اِس
ہاؤس کے منیجر نے ایک بلی پالی ہے۔ وہ بلی اکثر خالی سیٹوں پر بیٹھ جایا کرتی ہے۔ بات

ہنسی ٹھٹھے میں ٹل گئی اور پکچر ہاؤس ہی میں راؤ اور اُس لڑکی میں محبت ٹھن گئی۔۔۔ نریندر
یہ تو محض ایک واقعہ تھا لیکن اِس سلسلے میں [illegible] زیادہ حیرت انگیز اور
[illegible] واشنگٹن اور نیویارک کے مسٹر رابرٹ
[illegible] ہوئی تھی اور اب مسٹر ولنگٹن، مسٹر رابرٹ اور
[illegible] ایک ہی مرض درد قولنج میں مبتلا ہیں۔۔۔ اب ذرا
[illegible] نے میرے ساتھ اکثر ایک خوبصورت خوش پوش نوجوان
ہوتا جس کے بال [illegible] ہے اور کسی قدر ناک
[illegible]
[illegible] وائس آف امریکہ کے نشریے
خود راقم [illegible] ایک
[illegible] تھا۔
[illegible] کو فو [illegible]
[illegible] کر لوئی
[illegible] نہیں تھی،
[illegible] پیچھے کی سیٹ پر
[illegible]
[illegible] حقیقت ہو بہو
[illegible] روحانیات کا قائل
[illegible] سائنس کی روح ہے اور اسلام کا
[illegible] نہیں
گروہ [illegible]
[illegible] روحانی معشوقوں کے بارے میں کیا خبر آتی ہے۔
تم خدا کے لئے گلے میں کوئی تعویذ ضرور ڈال لو۔ ویسے میں اِن حماقتوں کا
سرے سے قائل نہیں لیکن بیک وقت مدراس، لندن اور نیویارک کے علاوہ خود
اپنے گھر کے واقعات نے ایمان بگاڑ ڈالا ہے۔
خدا تمھیں اپنے حفظ و اماں میں رکھے۔

تمھارا بھائی ۔۔۔۔۔ فیروز چشتی

کلکتہ: یکم اگست ۹۶ء

بھائی صاحب نمستے

آپ کے خط نے مجھے پاگل بنا رکھا ہے۔ خدا کے لئے مجھے بچائیے ورنہ میں
مر جاؤں گا۔ اگر مرا نہیں تو پاگل ہو جاؤں گا۔ یقین کیجئے کہ میری اور مالتی کی محبت بھی
کافی حد تک انھیں حالات میں شروع ہوئی تھی بس صرف یہ فرق تھا کہ مالتی مجھے

رکھتے ہیں اِس لئے وہ اِس طرح کا کھیل بڑی چابک دستی سے ہینڈل کر لیتے ہیں۔

ایک بات اور عرض کروں گا۔ آپ نریندر کی شادی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی لڑکی سے ضرور ہی کر دیں۔ اگر وہ لڑکی نریندر کی ہی محبوبہ ہو تو کیا حرج ہے ؟ رہی یہ بات کہ اُس لڑکی کی ذات پات اور حسب نسب کا کوئی پتہ نہیں ——— بھابی! کیا یہی کافی نہیں کہ وہ ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی ہے ؟

میری باتوں کا بُرا نہ مانئے۔ اِن پر سنجیدگی سے غور فرمایئے۔

بھائی صاحب کو نمستے کہئے، بچوں کو پیار اور میاں فرہاد کو دعائیں۔

آپ کا اپنا ——— فیروز چشتی

کلکتہ: ۲ر جولائی ۶۶ء

فیروز! خوش رہو

تمہارا خط مل گیا تھا اور ملتے ہی میں نے کام شروع کر دیا تھا۔ نریندر سے پہلے ملتا رہا ——— اور اب وہ میرا دوست ہے۔ تمہارا خیال درست ہے بے شک وہ لڑکی "۰ ہی" ہے۔ اِسی لئے تصویر نہیں بھیج رہا ہوں ——— دفتر کا وقت ہو گیا ہے اس لئے باقی پھر کبھی۔ تمہارے خاص خط کا انتظار کر رہا ہوں!

تمہارا ——— ریاض شاہد

کلکتہ: ۸ر جولائی ۶۶ء

پیارے ریاض! خوش رہو

تمہارا خط مل گیا۔ بڑی تسلی ہوئی جب تم نے لکھا کہ تمہارے دوست نریندر کی محبوبہ گوشت پوست کی بنی ہوئی کوئی جیتی جاگتی لڑکی ہے، کوئی آتما یا بھوت پریت نہیں۔ شاہد! نریندر صرف تمہارا دوست ہی نہیں میرا بھی عزیز ہے۔ وہ میری بہت ہی پیاری بھابی کا چھوٹا بھائی ہے۔ عشق کرنے سے پہلے تک مجھے خط بھی لکھا کرتا تھا لیکن جب سے عشق شروع کیا ہے، بے چارے کو فرصت ہی کہاں ملتی ہو گی۔ اُس کی دیدی یعنی میری بھابی نے مجھے لکھا تھا کہ میں کوئی ایسی ترکیب کروں کہ نریندر عشق سے باز آ جائے لیکن میں نے انھیں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اِس معاملے میں وہ مجھے معاف ہی رکھیں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ صرف میری حرکت پر نریندر ساری دُنیا کو گالی دے اور گاتا پھرے ———

دو دلوں کو یہ دُنیا ملنے ہی نہیں دیتی  آشاؤں کی کلیوں کو کھِلنے ہی نہیں دیتی

اور اگر نریندر یہ گانے لگے تو میری کیا وقعت رہ جائے گی ———

ہم عشق کریں گے ہیں کچھ ڈر تو نہیں ہے  سرکاری سڑک ہے یہ ترا گھر تو نہیں ہے

اب نریندر سے ملاقات ہو تو میری دعائیں کہہ دینا۔

ہاں ریاض! مجھے بھی قتل ہوتا پتہ لگا ہے کہ میاں اسلم کی [illegible] آج کل رومانوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ رومانس کا ایک [illegible] میں ہوا، چار کیس بمبئی میں اور دو دلچسپ کیس دلی میں ابھی چل رہے ہیں۔ ایک میاں اسلم کا کیس ہے۔ اِسی لئے نریندر کی محبوبہ کی طرف سے [illegible] شکر ہے کہ وہاں ایسی کوئی بات نہیں۔ حالات لکھتے رہنا۔

(نوٹ:۔ نوٹ کی یہ سطر اچھی طرح [illegible])

تمہارا ——— فیروز چشتی

کلکتہ: ۲۰ر جولائی ۶۶ء

بھائی صاحب! نمستے

بہت شرمندہ ہوں کہ بہت دنوں سے آپ کو کوئی خط نہ لکھ سکا۔ ظاہر ہے کہ جب چھوٹا ہو کر میں آپ کو خط نہ لکھوں گا تو آپ تو میرے بزرگ ہیں، آپ سے کیوں شکایت کروں۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خط نہ لکھتے ہوئے بھی آپ نے میرا جس قدر خیال رکھا ہے۔ شاید کوئی اپنا بھائی بھی اِتنا خیال رکھے۔ دیدی کو جو خط آپ نے لکھا تھا وہ بھی میں نے پڑھا تھا اور ریاض شاہد صاحب بھی آپ کا خط مجھے دکھایا کرتے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ بُرے وقتوں میں انسان کا اپنا سایہ بھی اُس سے جُدا ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ کی ذات میرے لئے تاریکیوں میں روشنی کی ایک کرن ہے۔ جب سے مالتی میری زندگی میں آئی ہے وہ لوگ جو میری زندگی میں نہ جانے کب سے شامل تھے آہستہ آہستہ الگ ہوتے جا رہے ہیں۔ مالتی اگر کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ لیکن وہ ایک شریف، خاندانی اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ پتہ نہیں دیدی میرے لئے اور کیسی لڑکی پسند کرتیں جو مجھ سے خفا ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں آپ جیسے ہمدرد بھائی کا سایہ میرے سر پر ہو تو مجھے تو میں حالات سے بالکل خوفزدہ نہیں۔ بھگوان نے چاہا تو ہم دونوں بہت جلد جنم جنم کے ساتھی بن جائیں گے۔ بس آپ مجھے آشیرواد دیجئے۔

ایک بات معلوم کر کے بہت ہنسی آئی کہ آپ مالتی کو کوئی آتما وغیرہ سمجھ بیٹھے تھے۔ نہیں بھائی صاحب وہ بالکل ایک عام لڑکی ہے، کوئی آتما نہیں لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر آپ کو یہ شک کیسے ہوا کہ مالتی بھی کوئی آتما ہے۔ ضرور بتایئے۔ میں بے چینی سے آپ کے اُس دلچسپ خط کا انتظار کروں گا۔

بھابی جی کو سادر پرنام۔ ننھے مُنّوں کو پیار۔

آپ کا پیارا بھائی ——— نریندر

کٹک: ۲۶ر جولائی ۱۹۶۶ء

عزیزی نریندر، بخوش رہو

تمہارا خط ملا۔ بھائی! میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ محبت وغیرہ سو فیصدی بکواس ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ ایک مرد کو ایک عورت کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک عورت کو ایک مرد کی۔ اب اگر یہ ضرورت طرفین کی پسند کے مطابق ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ لو میرج کی کامیابی کی شرح بہت ہی مایوس کن ہے۔ لیکن اس سے لو میرج کی افادیت کم نہیں ہوتی۔ تم اور مالتی شوق سے شادی رچاؤ۔ میرا آشیرواد تمہارے ساتھ ہوگا۔ خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش و خرّم رکھے!

تم سے پہلے رواش بھی مجھے یقین دلا چکا ہے کہ مالتی سو فیصدی گوشت پوست کی ایک جیتی جاگتی لڑکی ہے۔ تمہارے اس سوال کا جواب بے شک دلچسپ ہے کہ میں نے مالتی پر کبھی کسی آتما کا شک کیوں کیا؟ بات یہ ہے نریندر کہ آج کل آتماؤں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ آتماؤں کے نصف درجن معاشقے کے بارے میں تو میں جانتا ہوں اور ان معاشقوں میں ایسے ایسے ہیبت ناک اور مافوق الفطرت واقعات رونما ہوئے ہیں کہ کسی پار تو میں نے تمہاری بھابی کے بارے میں بھی بڑی سنجیدگی سے غور کیا کہ کہیں یہ بھی کوئی آتما تو نہیں! پرسوں تو بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز خبر میں نے سُنی۔ خبر کی اہمیت کا اندازہ تم اس سے لگا سکتے ہو کہ بی بی سی اور وائس آف امریکہ سے یہ خبر نشر ہوئی ہے، میرا خیال ہے آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوئی ہوگی۔ خبر یہ ہے کہ مدراس میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی حیرت انگیز محبت کی ابتدا کیسے ہوئی؟ —— ایک لڑکا جس کا نام ایم پی راؤ ہے ایک دن پکچر دیکھنے گیا۔ ابھی وہ ٹکٹ بھی نہیں خرید سکا تھا کہ ٹیکسی سے ایک لڑکی اُتری اور اس نے نہایت خوشامدانہ انداز میں کہا کہ وہ اُس لڑکی کا ٹکٹ بھی لا دے کیونکہ اُسے اپنی کسی سہیلی کو فون کرنا تھا۔ لڑکا رضامند ہو گیا اور لڑکی اُسے ٹکٹ کے پیسے دے کر ٹیلیفون بوتھ کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس آئی تو اُس کے پاس آئس کریم کے دو کپ تھے۔ دونوں ہال میں ساتھ بیٹھے اور آئس کریم کھانے لگے۔ جبھی لڑکے نے محسوس کیا کہ یکایک وہ لڑکی اُس کی بغل سے غائب ہو گئی تھی۔ ایم پی راؤ بہت گھبرایا لیکن اُسی وقت پکچر شروع ہو گئی۔ ہال میں اندھیرا ہو گیا۔ راؤ نے اُس لڑکی کو ٹٹولا لیکن وہاں کوئی لڑکی تو نہ تھی البتہ راؤ کا ہاتھ ایک بلّی کے نرم جسم اور چکنے بالوں پر پڑا اور وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور تب کسی لڑکی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ وہ لڑکی وہی تھی۔ راؤ نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی تو اُس نے بتایا کہ وہ پان لینے گئی تھی اور پان کی دو بہت ہی معطر گلوریاں اُس نے راؤ کی طرف بڑھا دیں۔ راؤ نے بلّی کی بات کہی تو اُس نے ہنس کر بتایا کہ اِس ہاؤس کے منیجر نے ایک بلّی پالی ہے جو بلّی اکثر خالی سیٹوں پر بیٹھ جایا کرتی ہے ... بات

اٹکی تھی ہو گئی اور پکچر ہاؤس ہی میں راؤ اور اُس لڑکی میں محبت ٹھن گئی —— نریندر یہ تو محض ایک واقعہ تھا لیکن اِس سلسلے میں جو بات حد سے زیادہ حیرت انگیز اور ہیبت ناک ہے وہ یہ ہے کہ لندن کے مسٹر کے۔ ولنگٹن اور نیویارک کے مسٹر رابرٹ کی محبت بھی تقریباً اِسی طرح شروع ہوئی تھی اور اب مسٹر ولنگٹن، مسٹر رابرٹ اور مدراس کا ایم پی راؤ، تینوں ایک ہی مرض دردِ قولنج میں مبتلا ہیں —— اب ذرا کلیجہ تھام کر سُنو نریندر! تم نے میرے ساتھ اکثر ایک خوبصورت خوش پوش نوجوان کو دیکھا ہوگا جس کے بال گھنگھریالے ہیں۔ ٹیڈی پتلون پہنتا ہے اور کسی قدر ناک سے بولتا ہے اُس کا نام اسلم ہے۔ پرسوں بی بی سی اور وائس آف امریکہ کے نشریے سُن سُن کر بیچارہ دس پندرہ منٹ تک حواس باختہ رہا۔ یقین کرو آج سے ایک ماہ پہلے اسلم میاں کا عشق بھی ایک لڑکی سے بالکل انہیں حالات میں شروع ہوا تھا۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ اسلم میاں کی محبوبہ کسی سہیلی کو فون کرنے نہیں، کچھ دُور کھڑی اپنی ایک سہیلی سے ملنے گئی تھی اور وہاں سے وہ مونگ پھلی کے دو پیکٹ لے کر لوٹی تھی اور ہال سے جب وہ غائب ہوئی تھی تو اُس کی خالی سیٹ پر بلّی نہیں تھی، ایک خوبصورت سا بچہ تھا جس کے بارے میں اسلم کی محبوبہ نے بتلایا تھا کہ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی کسی عورت کا تھا اور ایک فرق یہ بھی کہ اسلم کی محبوبہ پان لے کر نہیں آئی تھی لیکن واپس آنے پر وہ عطر کی طرح مہک رہی تھی! کہانی کا آخری حصہ ہوبہو ایک ہے۔ یعنی میاں اسلم بھی دردِ قولنج کے شکار ہیں۔ میں تو اِن لغویات کا قائل نہیں لیکن مولانا قدیر کا کہنا ہے کہ اسلم کی محبوبہ کوئی بُری روح ہے اور اسلم کا گردہ نکال کر کھانے کی فکر میں ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ دِلّی کے روحانی معاشقوں کے بارے میں کیا خبر آتی ہے۔

تم خدا کے لئے گلے میں کوئی تعویذ ضرور ڈال لو۔ ویسے میں اِن حماقتوں کا سرے سے قائل نہیں لیکن بیک وقت مدراس، لندن اور نیویارک کے علاوہ خود اپنے گھر کے واقعات نے ایمان بگاڑ ڈالا ہے۔

خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

تمہارا بھائی —— فیروز چغتائی

کلکتہ: یکم اگست ۱۹۶۶ء

بھائی صاحب، نمستے

آپ کے خط نے مجھے پاگل بنا رکھا ہے۔ خدا کے لئے مجھے بچائیے ورنہ میں مر جاؤں گا۔ اگر مرا نہیں تو پاگل ہو جاؤں گا۔ یقین کیجئے کہ میری اور مالتی کی محبت بھی بالکل انہیں حالات میں شروع ہوئی تھی بس صرف یہ فرق تھا کہ مالتی سے

ٹکٹ کے پیسے صرف کر کے تو قوالی کرنے گئی تھی۔ نرملی سے ملنے وہ اس قدر بےکل تھی کہ کتاب
خریدنے گئی تھی۔ یہ اس کی ہابی ہے۔ لیکن واپسی پر اس کے ہاتھ میں ٹکٹ کے دو حصے
تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ جیسے اسے بےحد پسند ہیں ہال میں وہ بھی پبلک غائب ہو گئی تھی۔
لیکن اس کی سیٹ خالی رہی تھی۔ البتہ واپسی پر وہ بھی مسٹر راؤ کی محبوبہ کی طرح پان
کی بہت سی معطر گلوریاں لے کر آئی تھی۔

آپ کا خط ریاض نے بھی پڑھا اور دیر تک ہنستا رہا۔ پھر بولا کسی طرح آپ کو ہماری محبت کی ابتدا کا حال معلوم ہو گیا ہے اور اب آپ مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن میں نے اسے یقین دلایا کہ میں نے اپنی محبت کی ابتدا کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا ہے۔ وہ سب کچھ میری ڈائری میں ضرور درج ہے لیکن اسی ڈائری میں مالتی کی تصویر بھی ہے۔ اس لئے میں وہ ڈائری اپنے کوٹ کے اندر کی جیب میں اپنے دل کے پاس رکھتا ہوں۔

بھائی صاحب! اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ میری ڈائری دیدی نے یا کسی نے دیکھ کر آپ کو مطلع کر دیا ہے تو اس سے آگے کی بات جو اچانک میرے قلب کی حرکت بند کرنے کے لئے کافی ہے، یہ ہے کہ ریاض مجھے زبردستی شہر کے مشہور ڈاکٹر، ڈاکٹر مکرجی کے پاس لے گیا اور اس کمبخت نے میرا معائنہ کر کے بتایا کہ میری آنت میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے اور میں بہت جلد قولنج کا شکار ہو جاؤں گا۔

میرے بھیا! میری مدد کیجئے، میری جان بچائیے۔

آپ کا پریشان حال بھائی ——— نریندر

ایک تار: کٹک۔ ۴ اگست ۶۶ء ۲ بجے دن

مالتی سے ملے بغیر فوراً یہاں آجاؤ!

——— فیروز

کلکتہ: ۱۳ اگست ۶۶ء

میرے بہت پیارے بھائی فیروز! بھگوان تمہیں ہمیشہ خوش رکھے

تم نے مجھ پر جو عظیم احسان کیا ہے میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ تم نے میرا نریندر مجھے واپس دلا دیا۔ بھگوان تمہیں اس نیکی کا بدلہ دے گا۔ مجھ سے بھی جو کچھ انعام چاہو لے لو۔ بولو کیا لوگے؟

سچ کہتی ہوں فیروز! تمہارا مایوس کن خط پا کر میں بہت روئی تھی کہ ماتاجی نے مرتے وقت جو امانت مجھے سونپی تھی میں اسے بچا کر رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکوں گی۔ نریندر کی محبوبہ کے بارے میں کئی لوگوں نے مجھے اور تمہارے بھائی صاحب نے بھی بتایا تھا کہ وہ ایک پہلے درجے کی آوارہ اور فراڈ لڑکی ہے۔ بہتوں سے رومان لڑا کر انھیں

تباہ کر چکی ہے۔ [illegible] نریندر بھی کسی کی ایک [illegible] کے سوا اور کیا چارہ تھا؟ لیکن اب [illegible] نفرت کرتا ہے اور اس کا نام لیتے ہی اس کے چہرے پر نفرت [illegible] ہو جاتے ہیں۔ کچھ دنوں تک تو اس کی پلکوں کی [illegible] ڈاکٹر مکرجی نے اسے بتایا ہے کہ اب اسے کوئی خطرہ نہیں [illegible]۔۔۔

فیروز! تم جادوگر ہو۔ پتہ نہیں تم نے کیا جادو کر دیا۔ [illegible] بے حد احسان مند ہیں اور تمہیں [illegible] نریندر کی شادی کرنے والے ہیں۔ تم نہ آؤ گے تو [illegible] بچوں کو پیار۔

تمہاری بھابی ——— نرملا

کٹک: ۲۲ اگست ۶۶ء

پیاری بھابی! نمستے

آپ کا خط ملا۔ بھابی جان! وہ لڑکی آوارہ اور فراڈ ہی نہیں اپنے دیس کی کرسٹن کیلر ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور اس سے متعلق درجنوں کہانیاں لکھ چکا ہوں۔ اس کا نام مالتی نہیں [illegible] ہے!

آپ مجھے انعام دینا چاہتی ہیں۔ ٹھیک ہے نریندر کی شادی پر آؤں گا تو ہمیشہ کی طرح مسکرا کر میرا شریر فیروز [illegible] دیجئے گا۔ اس سے بڑا انعام اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ انعام وہ طلسم ہے جس کے آگے [illegible] کے طلسم پر قوی استدلال کرنے والوں کے گنگے بالکل ہلکے ہو جاتے ہیں۔ یہ انعام وہ تریاق ہے جو [illegible] محبت کے مرض کا واحد علاج ہے اور یہی ہے وہ انعام جو [illegible] کا طلسم توڑ [illegible] ہے! ——— لیکن اس انعام کے علاوہ [illegible] آپ کو اور [illegible] نہیں [illegible] پر رقم ایک جیب کترے کو دی گئی ہے جس [illegible] ریاض کے حوالے کر دیجئے ——— جس [illegible] آپ کے [illegible] خط انھیں فوراً دیجئے اور اس خط کو [illegible] ورنہ آپ اس سے ہاتھ بیٹھیں گی ——— تفصیل نریندر کی شادی [illegible]!

آپ کا [illegible] ——— !

# غزلیں

## رعنا جگی، بی۔ اے

محبت کچھ گماں ہے کچھ یقیں ہے
یہ گُل کچھ شبنمیں کچھ آتشیں ہے

نشاط افزا ہے جذبات آفریں ہے
نگاہِ ناز کتنی دل نشیں ہے

نظر سے دُور ہے دل سے قریں ہے
گماں ہے یا ترا جلوہ یقیں ہے

یہی دوزخ، یہی خلدِ بریں ہے
یہ دنیا صرف دُنیا ہی نہیں ہے

جبیں کو خود جو سنگِ در نہ کر دے
وہ سجدہ اصل میں ننگِ جبیں ہے

کبھی ہے زندگی گُل کا تبسم
کبھی زخمِ دلِ اندوہگیں ہے

نہیں ہے منحصر سجدوں پہ طاعت
عبادت رہنِ سنگ در نہیں ہے

خِرد، وہم و گماں کی ایک صورت
جنوں اک شکلِ معراجِ یقیں ہے

شعاعِ آفتابِ شام میں بھی
کچھ اندازِ نگاہِ واپسیں ہے

تری زلفوں کے پیچ و خم میں شاید
مری قسمت کا پیچ و خم نہیں ہے

یہ دنیا یہی کفرِ محبت
یہی کفرِ محبت میرا دیں ہے

صنم خانۂ حسنِ نظر، دیر
حرم، سجدہ گہِ ذوقِ یقیں ہے

محبت کے بغیر انسان رعنا
اگر زندہ بھی ہے زندہ نہیں ہے

رعنا جگی

## عائشہ انصاری زلفی بھوپالی

جلوے کی اُن کے تاب نہیں آرزو تو ہے
اک سعیِ رائگاں ہی سہی جستجو تو ہے

دل بے خبر سہی مگر اِک جستجو تو ہے
بھولے ہوئے ہیں تجھ کو مگر آرزو تو ہے

وہ جانِ رنگ و بو جو حجابوں میں ہے تو ہو
عالم تمام جلوہ گہِ رنگ و بُو تو ہے

کہتے ہیں اپنی سنتے ہیں میری ہر ایک بات
وہ روبرو نہیں ہیں نہ ہوں گفتگو تو ہے

دونوں جہاں کے ہاتھ سے جانے کا غم نہیں
دل کے حریمِ شوق میں وہ خوبرو تو ہے

ساقی ترا کرم ہے کہ مجھ سے فقیر کی
رندانِ بادہ خوار میں کچھ آبرو تو ہے

رونا ہمارا اشک پہ کچھ منحصر نہیں
آنکھیں ہوں کیوں اُداس کہ دل میں لہو تو ہے

کیا کم ہے یہ تسلیِ خاطر کے واسطے
انجامِ جستجو نہ سہی جستجو تو ہے

ساقی پلا بھی دے یہ بہانے ہیں کس لئے
ساغر نہیں ہے شیشہ نہیں ہے سبو تو ہے

نظریں اُسے نہ دیکھ سکیں ہم نہ پا سکیں
دل کو مگر یقیں ہے کوئی روبرو تو ہے

جب تابِ دید ہی نہ ہو زلفی تو کیا کریں
مانا کہ اُن کی جلوہ گری چار سُو تو ہے

عائشہ زلفی

# مُلک کے مایۂ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے دلچسپ شاہکار

**آج کی بات** آپ کے محبوب افسانہ نگار جناب جگدیش بن کے دلچسپ بلند پایہ افسانوں کا حسین مجموعہ جن کے کرداروں کے قہقہوں اور آنسوؤں کو آپ اپنے قہقہے اور اپنے آنسو سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

**جو عورت ننگی ہے** نامور فنکار ام اعل کی رومان پرور اور تلخ کہانیوں کا حسین مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

**میرے سپنے** نامور افسانہ نگار خاتون پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

**سنگھار کرتے ہیں** پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں کے اس مجموعے کے ہر صفحے پر جذبات کا ایک محشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ قیمت دو روپے

**دُکھتی رگیں** ہر افسانے میں جوانی کا اضطراب ہے، حُسن کی بیکلی ہے، عشق کی بیقراری ہے۔ مصنفہ جناب شمس مظفر پوری۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

**ایک حمام میں تین ننگے** زندگی کی عریاں تصویریں۔ وقت کی دُکھتی ہوئی رگ پر سعید امرت کی فنکارانہ ضرب۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

**کالی راتیں** سعید امرت کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ۔ تشنہ جوانیوں کے اندھے جذبات کی ترجمان۔ بہکے ہوئے بڑھاپے کی ہوسناکیوں پر نشتر ہیں اور کالی راتوں میں رینگنے والے گناہوں پر ضرب کاری ہیں۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

**یہ لڑکیاں** رنگ رنگ کی شوخ و شنگ لڑکیوں کے جذبات و احساسات کی تصویریں۔ اختر ملیح آبادی کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

**عورت ایک پہیلی** کیا عورت واقعی ایک پہیلی ہے؟ سمجھ میں نہ آنے والی پہیلی؟ اس کا جواب آپ راج کنول کے سولہ دلکش رومانی افسانوں میں پائیں گے قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

**پوسٹ مارٹم** عرش ملسیانی کے مزاحیہ افسانوں اور مضامین کا حسین و جمیل مجموعہ جس میں مسکراہٹوں اور قہقہوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ قیمت سوا دو روپے۔

**سیاہ تاج محل** موہن آورے کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔

**فردوس** اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک بے مثال شاہکار [illegible] اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب دوسرا ایڈیشن [illegible] کے ساتھ نہایت آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد [illegible] روپے۔

**۱۸۵۷ء کی دلّی** جناب مہیشور دیال نے اس میں تاریخی [illegible] کو ایک پُرکیف داستان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس میں آپ حُسن و شباب کی رنگینیوں ہی سے نہیں، جذبۂ حُبّ الوطنی، ایثار، اخوت و محبت اور وفاداری کے چشموں سے بھی سیراب ہوں گے۔ دلّی کی ٹکسالی زبان، قلعۂ معلّٰے کی [illegible] والی زبان کی حلاوت آپ کو جناب مہیشور دیال ہی کے زورِ قلم میں پائیں گے کیونکہ یہ اُن کی اپنی مادری زبان ہے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

**ڈارلنگ** جناب نریش کمار شاد کے منتخب طبع زاد افسانوں کا بے مثل اور حسین و جمیل مجموعہ۔ قیمت دو روپے۔ ۵۰ نئے پیسے۔

**سُرخ حاشیے** اُردو کے مشاہیر ادیبوں کے دلچسپ لطیفے۔ قیمت دو روپے پچھتر نئے پیسے۔

**راکھ تلے** غیر ملکی افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانے ہندوستانی لباس میں۔ قیمت دو روپے۔

**مالوا** میکسم گورکی کے شہرۂ آفاق ناولٹ کا ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

**نورا** ایک رقاصہ کو اپنے اندر نئی جاذبیت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا لاثانی قربانیاں دینی پڑیں۔ قیمت صرف دو روپے [illegible]۔

**شہرِ دل** جناب محسن زیدی کی غزلوں کا حسین انتخاب۔ محسن زیدی نے شہرِ دل کو آرزوؤں کی نوخیز کلیوں سے سجایا ہے۔ قیمت صرف دو روپے۔

**سفینہ و ساحل** جناب عزیز وارثی کا مجموعۂ کلام جن کی شاعری میں اتنی توانائی، قوت اور دلآویزی ہے کہ نسلوں تک فراموش نہ کیا جا سکے گی۔ قیمت صرف چار روپے

**گلِ رعنا** جناب برج لال جگی رعنا کا تازہ مجموعۂ کلام جو موجودہ دور کی بہترین خوبیوں سے مزین ہے جس کے مطالعہ کے بعد آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ گلِ رعنا واقعی بہترین شعری مجموعہ ہے۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

افسانہ

# گیلے پتھروں کی مہک

نور شاہ

ایڈیٹر ماہنامہ " دیہات سدھار "
کمیونٹی ڈیولپمنٹ اینڈ این ای ایس جموں (توی)

۸ ؍ اپریل ۱۹۶۷ء

برادرِ محترم : آداب

. . . " اُجلے چہرے " کے بعد " گیلے پتھروں کی مہک " حاضرِ خدمت ہے۔ یہ کہانی میں نے عام روش اور ٹکنیک سے ہٹ کر بہت کاوش سے لکھی ہے ــــــ میرے ایک قریبی دوست دیدار آہی کو مجھ سے شکایت ہے کہ میری کہانیوں میں ڈل جھیل کی خوبصورتیوں ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک مقالے میں میرے متعلق لکھا ہے ـــ " نور شاہ کشمیر کی سب سے حسین جگہ ڈل جھیل کے کنارے کھیلا اور پروان چڑھا پھر بھی اُسے کسی حُسن کی تلاش پریشان رکھتی ہے جس کے جذبے نے نور شاہ سے یہ کہانیاں لکھوائی ہیں۔ کبھی یہ تلاش ختم ہوگی نہ کبھی نور کی کہانیوں کا بہاؤ رُکے گا " ـــــ بہر حال اب کی بار انھیں شکایت نہ ہوگی۔ میں ڈل جھیل کی گہرائیوں سے نکل کر لولاب کے پہاڑوں اور جنگلوں کی وسعتوں میں چلا آیا ہوں۔ " گیلے پتھروں کی مہک " ایک پہاڑی کی کہانی ہے۔ گل محمد پہاڑوں کی بستی کا ایک " سمبل " بن کر ابھرتا ہے۔ میں اس کی سادگی، خلوص، پیار اور قربانی کو پیش کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، یہ آپ اور قارئین ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک جگہ رسول میر کا ذکر بھی آیا ہے۔ رسول میر کشمیری زبان کا عظیم شاعر گزرا ہے۔ اُس کے تصورِ حُسن و عشق میں انفرادیت ہے اور اُن کے اسلوب میں نئی شادابیوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں !

آپ کا اپنا ـــــ نور شاہ

---

میں جانتا تھا کہ میری غیر حاضری میں میری کُٹیا صبا بہت ویران اور تنہا تنہا سی رہی ہوگی۔ اِسی لئے دلّی میں جب میرا کام ختم ہوا میں نے لال محمد کو ایک مختصر سا خط لکھا اور اپنی آمد کی اطلاع دی۔ یوں تو دلّی میں میرے اور بھی کام تھے جن کے لئے وہاں رُکنا بہت ضروری تھا لیکن میں ذہنی طور پر وہاں کے ماحول سے کافی اُکتا چُکا تھا اور ویسے بھی جون کے مہینے میں لوگ کشمیر جانے کی سوچتے ہیں اور کشمیر تو میرا گھر ہے۔

سرینگر پہنچتے ہی میں نے سکون اور شادمانی کی سانس لی۔ وہ رات مجھے سرینگر میں ہی گزارنا پڑی اور میں دوسری صبح لولاب چلا گیا۔ یہ جگہ سرینگر سے کوئی ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں میں نے جنگلات کا ایک بہت بڑا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور اپنے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے۔ میرے اُسی گھر کا نام صبا ہے۔

صبا ہرے بھرے نشیبوں کے دامن میں یاقوت کی طرح دَمکتا ہوا سُرخ رنگ کا ایک نگینہ ہے۔ چیل کے چھتناروں کے سائے میں دھیرے دھیرے سانس لیتی ہوئی صبا میں کتنا سکون ہے، کتنی شانتی ہے۔ تھپک تھپک کر سُلا دینے والی کیفیت ہے ــــــ اور پھر یہاں کبھی کبھی سکون کی چند تھپکیوں اور چیل کے درختوں کی سرسراہٹ کی معطر سانسوں میں دیکھتے دیکھتے میری نظروں کے سامنے ایک سحر آلود

سراپا بکھر جاتا ہے۔ یہ سراپا شکیلہ کا ہے اور میں یہ سراپا دیکھ کر ان نشیبوں کی ہریالی کو چاٹتا ہوا ایک چھوٹے سے نیلے آسمان کی بلندیوں میں بھٹکنے لگتا ہوں اور پھر سُرخ رنگ کی چھت والی صبا اپنی سانس روک لیتی ہے۔ چیل کی شاخیں اپنی سرسراہٹ ملتوی کر دیتی ہیں اور ایک آواز اُبھرتی ہے۔

"میں آگئی ہوں اقبال! میری طرف دیکھو!"

میں شکیلہ کی آواز کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور آہستہ آہستہ شکیلہ کا سراپا رستوں میر کا گیت بن کر دھڑکنے لگتا ہے۔

' دیکھو میرے رُخساروں کے گُلاب تیرا قرار لُوٹنے کو آئے ہیں!

دیکھو میرے ہونٹوں کے یہ انارِ شیریں تیری پیاس بُجھانے آئے ہیں!!

دیکھو میں چنبیلی کا رنگ اور زعفران کا پھول بن کر آئی ہوں!!! '

دفعتہً میری نگاہیں جنگل کی خاموشیوں کو چیرتی ہوئی ایک بڑی کوٹھی کے آنگن میں ٹھہرتی ہیں اور میرے سینے کی گہرائیوں سے ایک دبی دبی سی آواز اُبھرتی ہے۔

"شکیلہ چلی جا۔ صبا کی تنہائیوں میں مُخل نہ ہو جا۔ صبا نے اب تمہارا رُوپ اپنا لیا ہے اور مجھے یہ رُوپ پسند ہے۔ یہ میرے دُکھ اور سُکھ بانٹتی ہے۔ یہ صبا بے حد پیاری ہے۔ اِس کی تنہائیاں مجھے اچھی لگتی ہیں"

لمحے گزرتے ہیں!

شکیلہ کی یاد اُس کا خیال اِسی سینے کی گہرائیوں میں دفن ہو جاتا ہے اور میں صبا کی تنہائیوں کو اپنے سینے سے لگا کر سو جاتا ہوں۔

---

صبا سامنے کھڑی ہے۔

لال محمد محوِ انتظار ہے۔

"کیسے ہو لال محمد؟"

"ٹھیک ہوں صاحب!"

میں نے صبا کے اندر قدم رکھا ہے۔ وہی رُوپ وہی سکون اور وہی شانتی ہر شے میں قرینہ ہے۔ ہر چیز میں ترتیب ہے اور میں ایک لمبا سا سانس لے کر سوچ میں ڈوب جاتا ہوں۔

"کیا بات ہے صاحب؟"

"کچھ بھی نہیں لال محمد! بس ایسے ہی میں سوچ رہا تھا کہ صبا نے میری غیر حاضری میں ڈھیر ساری تنہائیاں محسوس کی ہوں گی"

"ایک بات کہوں صاحب؟"

"کہو لال محمد"

لال محمد زیرِ لب مسکراتا ہے۔

"صاحب اس سال میں آپ کی ایک بھی نہ سنوں گا۔ اسی سال آپ ایک چاند سی دُلہن لائیں گے۔ نہیں تو میں رُوٹھ کر چلا جاؤں گا!"

"پھر وہی فرسودہ بات؟"

لال محمد خاموش ہو جاتا ہے اور سامنے دیوار پر لگی ہوئی سنو سکس کی پینٹنگ کو دیکھنے لگتا ہے۔ شاید یہ جان کر کہ میری زندگی بھی ان لکیروں کی طرح اُلجھی ہوئی ہے!!

اور ہاں میں لال محمد سے آپ کا تعارف کرانا ہی بھول گیا۔ جب سے میں نے یہ ٹھیکے داری کا کام سنبھال لیا ہے لال محمد میرے ساتھ ہے۔ سچ اگر میں کچھ ہوں تو اُس میں لال محمد کی محنت، خلوص اور ایمانداری کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اُسے میرے ساتھ جیسے رُوحانی لگاؤ سا ہو گیا ہے۔ وہ میرے بُرے بھلے سے واقف ہے۔ میری زندگی کی تاریخ کے اوراق اُس کے سامنے بکھرے پڑے ہیں!

"لال محمد!"

"ہاں صاحب!"

"کام کیسا چل رہا ہے۔ مزدور کام پر آرہے ہیں نا۔ کتنی ساری کھدائی ہوئی؟"

"اقبال بابو سب ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کیجئے"

"اچھا لال محمد میرے لئے کافی بنوا دو۔ سُلطان ہے نا؟"

"نہیں صاحب وہ ابھی نہیں آیا —— ہاں صاحب ایک اور بات!"

"کیا ہے؟"

"ایک خط آیا تھا آپ کی غیر حاضری میں۔ یہ سامنے پڑا ہے۔ ذرا ایک نظر دیکھ لیجئے"

وہ مُسکرا رہا ہے۔

"تم خود ہی دیکھ لیتے لال محمد!"

"توبہ توبہ میں آپ کے پرائیویٹ کاغذات کیسے دیکھ لیتا۔ نہیں صاحب بڑا گناہ ہے!"

لال محمد کے ہونٹ اب شرارت سے ہنس رہے ہیں۔

"میں چلا صاحب۔ کافی ابھی بھجاتا ہوں۔ دیکھ لیجئے نا یہ خط!"

لال محمد چلا گیا۔

خط سامنے پڑا ہے۔ نیلے رنگ کا لفافہ مجھ سے ہرا بھرا لگ رہا ہے میرے ہاتھ لفافے کی طرف بڑھتے بڑھتے رُک جاتے ہیں۔۔۔ یہ شکیلہ کا خط ہے۔ جب دل

کے رشتے ہی مرگئے ہوں تو اِن کو زندہ کرنے سے بھلا کیا مل جاتا ہے۔ میں نے سگریٹ سُلگا لیا ہے۔ نہ جانے دل کے کس گوشے سے آواز آتی ہے۔

"پڑھ لو ایک بار۔ پڑھ لینے میں حرج ہی کیا ہے؟"

میں نے خط اُٹھا لیا ہے۔ کھول لیا ہے اور اب کرسی سے ٹیک لگائے پڑھ رہا ہوں۔ لکھا ہے۔۔۔۔۔۔۔

"اقبال ۔۔۔۔ اگر تم نے اس خط کا بھی جواب نہ دیا تو میں سمجھوں گی کہ پیار کا وہ نرم و نازک رشتہ ختم ہو چکا ہے جس کی تکمیل ہم دونوں نے مل کر چاندنی راتوں میں کی تھی اور وہ ایک دوسرے کو اپنانے کے عہد و پیمان بھی ختم ہو چکے ہیں۔ تم تو جانتے ہی ہو تقدیر نے ایک عجیب کھیل کھیلا ہے مجھ سے۔ میں تمھاری نہ بن سکی اور نہ اُن کی ہی جن کے ساتھ میری شادی ہوئی۔ اب بیتی باتوں کو دُہرانے سے کیا ملے گا۔ بس تقدیر نے مجھے عمر کے اِس دور میں، بیوگی کی راکھ ملنے کے لئے مجبور کیا ہے جب ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ایک دُکھ اور سُکھ بانٹنے والے کا ساتھ چاہئے۔ میری چوڑیوں کی کھنک ختم ہو چکی ہے۔ میری مانگ کا رنگ اُڑ چکا ہے۔ میرے پاپا نے میری شادی تم سے اِس لئے نہ کی کہ تب تک تم بہت غریب تھے۔ تمھیں اپنانے کے لئے کیا کیا جتن نہ کئے لیکن میری آواز دبا دی گئی۔ آج تم دولتمند ہو، امیر ہو، تمھارے پاس سب کچھ ہے اور میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ چند آنسو! چند یادیں! کب تک۔ اِن کے سہارے جیوں گی۔ تمھیں اب بھی میری ضرورت ہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے ۔۔ میں اب بھی تم سے پیار کرتی ہوں اقبال ۔۔۔!"

میرا سگریٹ بُجھ چکا ہے۔ میں لائٹر جلاتا ہوں۔ سگریٹ سُلگاتا ہوں اور پھر آدھا پڑھے ہوئے خط کو لائٹر کی لَو کی نذر کرتا ہوں اب یہاں کچھ نہیں صرف راکھ ہے! اور بس ہوا کے ایک جھونکے کا انتظار ہے! یہ راکھ ابھی ابھی اُڑ کر جنگل کی وسعتوں میں کھو جائے گی۔

"میں تم سے اب بھی پیار کرتی ہوں اقبال!"

پیار ۔۔۔ شکیلہ اب بھی مجھ سے پیار کرتی ہے جیسے پیار جسم کو چھپانے کا کوئی کپڑا ہو جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا اُتار دیا۔ شکیلہ اب بھی میری بننا چاہتی ہے۔ مجھے اپنانا چاہتی ہے ۔۔۔ اونھو! جھوٹی چیز! پرائی شے! تب کہاں تھے یہ عہد و پیمان جب کوئی اور اُس کی جوانی اور خوبصورتی کا رس پی رہا تھا ۔۔۔!!

میں اب ایک لمبی سانس لے کر کرسی پر ڈھیر ہو گیا ہوں۔ کافی کا کپ سامنے پڑا ہے۔ باہر کوئی مزدور لکڑیاں کاٹ رہا ہے۔ لکڑیوں کو کاٹنے کی آواز کے ساتھ ساتھ لال محمد کے حقے کی گڑگڑاہٹ بھی سُنائی دے رہی ہے۔

لمحے گزر رہے ہیں۔

میں نے ایک اور سگریٹ سُلگا لیا ہے۔ لکڑیاں کاٹنے کی آواز بدستور آرہی ہے۔ اُس آواز کے ساتھ کسی پہاڑی گیت کے بول بھی کانوں میں سرسرانے لگے ہیں۔ کوئی مزدور ہوگا۔ اپنی تھکاوٹ دُور کرنے کے لئے کوئی پہاڑی گیت الاپ رہا ہوگا۔ گیت کی لے تیز ہو رہی ہے اور قطرہ قطرہ رس میرے کانوں میں ٹپکنے لگا ہے۔۔۔

میں کھڑا ہو گیا ہوں اور کھڑکی کی اوٹ سے باہر دیکھ رہا ہوں:

باہر کچھ مزدور ہیں۔ سبھی کام میں مصروف ہیں۔ اُدھر ایک درخت کے سائے میں ایک لمبے قد کا لڑکا لکڑیاں کاٹ رہا ہے اور بہت انہماک سے گیت بھی گائے جا رہا ہے۔ بے حد پیارا گیت ہے۔ بے حد پیارے بول ہیں۔ میں انھیں سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن کیا گیتوں کے بول سمجھنے کے لئے زبان کا جاننا لازمی ہے۔ گیتوں کی تو ایک ہی زبان ہوتی ہے ایک ہی لے ہوتی ہے۔ میں سُن رہا ہوں اور مجھ پر ایک عجیب سی خاموشی طاری ہوتی جا رہی ہے۔

دفعتاً وہ لمبے قد کا لڑکا خاموش ہو گیا ہے۔ اب میں نے کھڑکی کا پٹ پوری طرح سے کھول دیا ہے۔ وہ بے ساختہ میری طرف دیکھ رہا ہے ایک کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ۔ اُس کے چہرے پر ایک دہشت سی چھائی ہوئی ہے۔ وہ اب لکڑیاں کاٹنے میں تیزی سے مشغول ہو گیا ہے۔ میں نے لال محمد کو اندر آنے کا اشارہ کیا ہے۔

"کیا ہے صاحب؟"

"وہ نیا چھوکرا کون ہے؟"

"گل محمد ہے صاحب کسی پہاڑی علاقے کا رہنے والا۔ کام ڈھونڈ رہا تھا میں نے رکھ لیا!"

"کب سے کام پر آرہا ہے؟"

"بہت دن ہوئے صاحب!"

"ٹھیک ہے اُسے اندر بلاؤ!"

"صاحب شاید آپ اُس کا گانا سُن کر ناراض ہو گئے۔ پگلا ہے بیچارہ۔ ذرا اپنی عادت سے مجبور ہے۔ پر میں ابھی کہوں گا صاحب، کل سے یہ گانا وانا بند!"

"میں کہتا ہوں اُسے میرے پاس لاؤ!"

لال محمد کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن میری آنکھوں میں غصے کی ایک آن دیکھی سی لہر دیکھ کر دروازے سے باہر چلا گیا ہے۔ وہ میری نرمی گرمی سے واقف ہے۔

گل محمد دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا ہے۔ ننگے پاؤں، کیچڑ میں لت پت ہاتھوں میں کلہاڑا۔ جھکی ہوئی آنکھیں۔ میں اُس کے پاؤں کی طرف دیکھ رہا ہوں اور وہ بوکھلاہٹ میں پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اُس نے گھبراہٹ میں کلہاڑا فرش پر نیچے

رکھ دیا ہے۔

"بابوجی!"

چھریرا بدن، چوڑی پیشانی، چوڑا کھلا سینہ اور سینے پر پیتل کا ایک بڑا سا تعویذ، بازوؤں کی مچھلیاں سخت، گندمی رنگ کا کتابی چہرہ، بال گھنگریلے لیکن گرد میں اَٹے ہوئے اور آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش، وحشت سے بھرپور کشش!

"کیا ہے بابوجی؟"

آواز میں نہ مردانہ پن ہے اور نہ زنانہ پن ہی۔ بس دونوں آوازوں کا ایک خمار آلود سنگم!

"تم نے یہ گیت کہاں سے سیکھے ہیں؟"

اُس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مُسکان پھیل گئی اور اس کے سپید سپید دانت اور بھی نمایاں ہو گئے ہیں۔ میں اندر ہی اندر اپنے بے ترتیب دانتوں پر زبان پھیر رہا ہوں۔

"گیت سکھاتا کون ہے بابوجی۔ بس کوئی گیت ایسے ہی من کو بھا جاتا ہے۔"

وہ پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کو کُھرچنے لگا ہے۔

"کیوں گاتے ہو یہ گیت؟"

وہ خوف زدہ ہو رہا ہے۔

"غلطی ہو گئی بابوجی۔ اب کبھی نہ گاؤں گا!"

اُس کے ہاتھ بے ساختہ طور پر معافی کے لئے جُڑ گئے ہیں!

"لال محمد نے گل سمجھا دی ہے میرے کو۔"

"ایسی بات نہیں گل محمد! جب بھی تمہارا من کرے گا لیا کرو۔"

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں اُس کی آنکھوں کی چمک اور وحشت میں کھو رہا ہوں۔ اب اُس نے کلہاڑا سنبھال لیا ہے۔

"جاؤں بابوجی؟"

اور میں نے سر کے اشارے سے اُس سے جانے کو کہا ہے۔ وہ جا چکا ہے لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے اُس کی دہشت زدہ آنکھیں اب بھی مجھے گھور رہی ہیں۔ اُس کے ہونٹ اب بھی کسی گیت کو جنم دے رہے ہیں۔

---

میں ابھی ابھی میجر داس کے میس سے ڈنر کھا کر آ رہا ہوں۔ گل محمد برآمدے میں میرا منتظر ہے۔

"تم ابھی سوئے نہیں لال محمد؟"

"نہیں صاحب آپ ہی کا انتظار تھا۔"

"سلطان کب واپس آ رہا ہے وہ ایک مہینے کی چھٹی پر گیا تھا نا؟"

"شاید وہ اب نہ آئے گا۔"

"تو پھر کسی اور لڑکے کا انتظام کرو۔ تمہیں میرے لئے بہت رات گئے تک جاگنا پڑتا ہے۔"

"ایسی بات نہیں صاحب۔ ہاں اگر آپ میری مانیں تو گل محمد کو رکھ لیجئے۔ اچھا چھوکرا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

---

پھر وہی گیت درد سے بھرپور گیت! آواز میں بلا کا کرب۔ گیت الاپتے ہوئے گل محمد کبھی کبھی یکدم خاموش ہو جاتا ہے اور پہروں نیلے آکاش کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ جیسے اُسے کسی شے کی تلاش ہے۔ جیسے ابھی ابھی ایک تارا آسمان سے ٹوٹ کر اُس کی گود میں گر جائے گا اور وہ ......!

"گل محمد!"

"ہاں صاحب!"

"اب کوئی کہانی سُناؤ۔"

"کون سی کہانی؟"

"پہاڑوں کی کہانی!"

وہ مجھے کہانی سُناتا ہے۔ بہت مزے لے کر سُناتا ہے۔ پھر یہ کہانی سُناتے سُناتے وہ کھو جاتا ہے اور کھوتے کھوتے اپنے گاؤں پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے گاؤں کا نقشہ کچھ اِس انداز سے میرے سامنے کھینچتا ہے کہ میرا دل وہاں جانے کے لئے مچل اُٹھتا ہے۔

"گل محمد میں ضرور تمہارے گاؤں آؤں گا!"

"بابوجی وہ تو ساڈی خوش نصیبی ہوگی۔ ہاں ایک گل کہہ دوں۔ کبھی آنا ہو تو وہ نالی ساتھ لانا۔ بابو!"

"کیا تسکار ہوتا ہے وہاں!"

"ہاں ہاں ضرور!"

"مجھے اب نیند آ رہی ہے۔ میں سو جانا چاہتا ہوں۔"

---

صبا سامنے کھڑی ہے۔

میں دو دن سرینگر میں رہ کر لوٹ آیا ہوں۔

گل محمد کھڑے ہیں ہے۔ بے حد پریشان نظر آتا ہے۔ ہاتھ میں گلے کا تعویذ لئے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے بار بار دبا رہا ہے جیسے کاٹ کر رکھ دینا چاہتا ہو۔

"گل محمد!"

وہ جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہے۔

"کیسے آئے بابوجی؟"

"کیا بات ہے گل محمد، تم پریشان کیوں ہو؟"

وہ پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کو کھرچنے لگا ہے۔

"گل محمد میں تم سے پوچھ رہا ہوں"

گل محمد نے اب اپنی آنکھیں میری طرف اُٹھائی ہیں۔ ان آنکھوں کے پیالے چھلکنے ہی کو ہیں۔

"بابوجی!"

وہ تعویذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہتا ہے۔

"کیا بات ہے گل محمد؟"

"بابوجی تعویذ کی ڈور کٹ گئی!"

میں ہنس پڑتا ہوں۔

"ارے تعویذ کی ڈور کٹ گئی۔ پھر سے گانٹھ لو۔ اس میں رونے دھونے کی کیا بات ہے؟"

"بابوجی بڑی بدشگونی کی گل ہے۔ ڈور کٹ گئی، میری زندگی ہی کٹ گئی!"

وہ رو رہا ہے اور روتے روتے کہہ رہا ہے ---

"یہ تعویذ مریم نے آپ میرے گلے میں ڈالا تھا"

میں چونک اُٹھتا ہوں۔

"مریم کون؟"

اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے۔

"معاف کرو بابوجی۔ جانے کیا اُلٹی سیدھی گلاں کرنے لگا"

"گل محمد!" میں چیخ رہا ہوں "مجھ سے چھپاتے ہو میں بھی انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل ہے!"

میں نے جذباتی بن کر ایک ہی لمحے میں درمیان میں کھڑی دیوار کو ڈھا دیا ہے۔ گل محمد بہت تذبذب میں ہے۔

"کہو گل محمد!"

"بابوجی! مریم اور میں بچپن کے ساتھی ہیں۔ وہ پہاڑوں اور مرگھاروں میں پلی ہوئی ایک ہرنی کی طرح ہے۔ بڑی جدی۔ ہم روز ملتے۔ ڈھور ڈنگرے کر ڈھونڈ تھک جاتے، کسی درخت کے سائے میں بیٹھتے۔ ایک ساتھ بالکل نال نال۔ نالے کی سان سان اور جنگلی پھولوں کی خوشبو۔ وہ پھول توڑتی اور ناک کے پاس لے کر تھنے زور سے سکیڑ لیتی اور جب سونگھ سونگھ کر اس کا من بھر جاتا تو وہ پھول میرے کو دے کر کہتی ---- لے تو بھی سونگھ لے گلا۔ اس مشک سے تو میں پاگل ہو جاتی ہوں!"

میں نے سگریٹ سلگا لیا ہے۔

"میں نے کہا نا بابوجی! مریم بڑی جدی ہے۔ ایک دن میں اُسے اکیلی چھوڑ کر ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپ گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ وہ مجھے بلاتی رہی میں خاموش رہا۔ بابوجی! پھر وہ رونے لگی۔ جب وہ رو رو کر تھک گئی میں یکدم اس کے سامنے آیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی بابوجی اور اُس نے زور سے ---- یہ جو نشان اس ہاتھ پر آپ دیکھ رہے ہیں یہ اُسی نے کاٹا ہے۔ بڑی جدی کڑی ہے!"

گل محمد خاموش ہو گیا ہے۔ جانے کیا سوچ رہا ہے۔

"بابوجی!"

"ہاں کہو پھر؟"

"پھر بابوجی مریم کا باپ مر گیا۔ وہ اپنے چاچا غفور خاں کے پاس رہنے لگی۔ غفور خاں بڑا چالاک ہے۔ بڑا ہی مکار۔ تین بیٹیاں ہیں اس کی بابوجی! غفور خاں مریم پر ظلم کرتا ہے۔ بڑی مشکل سے روٹی دیتا ہے"

"تم نے مریم کے ساتھ شادی کیوں نہیں کی؟"

"غفور خاں کہتا ہے پہلے بہت سے روپے لاؤ پھر شادی کی بات کرو۔ اسی لئے بابوجی یہاں آیا ہوں۔ نوکری کرتا ہوں پیسہ کرنے کے لئے"

"تم مریم سے مل کر آئے تھے؟"

"ہاں مل کر آیا تھا۔ اُسی نے یہ تعویذ میرے گلے میں باندھا تھا اور کہا تھا۔ جا یہ تعویذ تیری رکھوالی کرے گا"

وہ تعویذ کو بغور دیکھ رہا ہے۔

"بابوجی میں پنڈ جانا چاہتا ہوں۔ مریم کسی مصیبت میں ہے"

"ارے پاگل تم کیسے جانتے ہو کہ مریم کسی مصیبت میں ہے؟"

"تعویذ کی ڈور کٹ گئی نا بابوجی!"

"اچھا چلے جانا۔ روپیہ بھی لے جانا۔ تمہارے روپے تو ہیں ہی میرے پاس۔ میں لال محمد کو کہہ دوں گا"

"نہیں بابوجی ابھی روپیہ نہیں چاہئے۔ میں ایسے ہی جاؤں گا ابھی ....!"

گل محمد چلا گیا ہے۔ پاگل ہے اسی لئے محبت کرتا ہے۔

اونہہ محبت!

ایک دن کسی اور کو اپنا کر چلی جائے گی اور پھر میری طرح ازل ازل کی تنہائیاں ہوں گی!

---

پھر وہی زندگی ہے وہی ماحول ہے۔ سب کچھ وہی ہے۔ میں ہوں صبا ہے اور ہم دونوں کی مشترکہ تنہائیاں ہیں۔ ان تنہائیوں میں ایک آواز اُبھرتی ہے۔

"میں آگئی ہوں اقبال!"

یہ آواز مجھے دُور بہت دُور لے جاتی ہے۔ یہاں یہ آواز کئی اور آوازوں میں گھل مِل جاتی ہے۔ شہنائیاں بجتی ہیں۔ قمقمے جلتے ہیں۔ محرابیں بنتی ہیں اور شکیلہ دُلہن بن جاتی ہے۔ اُس کی شادی ہو جاتی ہے۔ ایک مائیننگ انجنیئر کے ساتھ۔ میں چیخنا چاہتا ہوں لیکن میری آواز پلٹ کر آتی ہے اور میں زندگی کے ہر موڑ پر اکیلا رہ جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں زندگی اب ایک بیکار سی چیز ہے میرے لئے۔ مجھ جیسے لوگوں کو محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مجھے مرجانا چاہئے۔ میں خودکشی کی سوچتا ہوں اور سوچتے سوچتے کچھ پاتا ہوں۔ زندگی مرنے کے لئے نہیں جینے کے لئے ہے! اور میں قریب آتا ہوں زندگی کے۔ اپنی تنہائیوں سے پیار کرنے لگتا ہوں۔ ایک دوست سے معمولی سی رقم اُدھار لے کر ٹھیکے داری کا کام شروع کرتا ہوں۔ زندگی دھیرے دھیرے سنبھل جاتی ہے۔ میں بڑے بڑے ٹھیکے لیتا ہوں۔ میں سب کچھ پاتا ہوں جس کے لئے شکیلہ نے مجھے ٹھکرا دیا تھا —— کوٹھی، کار، بنک بیلنس!!

اور پھر ایک حادثہ ہو جاتا ہے۔

مائننگ انجنیئر کی موت کان میں کام کرتے کرتے ایک بڑا پتھر لُڑھکنے سے ہو جاتی ہے۔ شکیلہ بیوہ ہو جاتی ہے۔ یہ خبر سُن کر مجھے نہ خوشی ہوتی ہے اور نہ دُکھ ہی!

---

وقت کی چند بُوندیں!

سکون کی چند تھپکیاں!!

اور اپنی تنہائیاں —— ازل ازل کی تنہائیاں!!!

میرے کانوں میں کسی پہاڑی گیت کے بول سرسرانے لگے ہیں ؎

'میرا ماہی مجھ سے دُور ہے اور وہ پھولوں کا شیدائی ہے اِسی لئے میں نے آنگن میں پھول اُگا رکھے ہیں!

'میرا ماہی مجھ سے دُور ہے اور وہ ہیروں کا شوقین ہے۔ پر میرے پاس آنسوؤں کے ہیروں کے سِوا کیا ہے۔ میں اِسی لئے شب و روز آنسو بہاتا ہوں!'

گل محمد کی آواز ہے۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں۔

"گل محمد میرے پاس آؤ!"

گل محمد اندر آتا ہے۔ اُس کے چہرے کا انداز ہی بگڑ چکا ہے۔ ڈھلا چہرہ! اندر کو پچکے ہوئے گال۔ آنکھوں میں وہی پُرانی وحشت! وہی پُرانی دیوانگیاں!!

"اتنے دنوں کہاں رہے؟"

وہ خاموش ہے۔

"ارے بھائی کچھ تو بولو۔ بیمار تھے کیا؟"

اُس کی آنکھیں چھلکنے لگی ہیں۔ آنسوؤں کی ایک ننھی دھار اُس کے چہرے کو چُھو کر فرش کو تر کرنے لگی ہے۔

"میں نہ کہتا تھا بابو! مریم کا چاچا انسان نہیں حیوان ہے۔ ڈھور ڈنگر میں عقل کہاں۔ وہ حرامزادہ پکا بے غیرت نکلا۔ بابوجی اُس نے مریم کا سودا کیا!"

"اوہ! تو مریم کی شادی کہیں اور ہو گئی؟"

"ایسی گل ہوتی تو دُکھ نا ہوتا۔ مگر۔۔۔"

"کیا بات ہوئی؟"

"بابوجی اُس نے ایک شکاری سے مریم کی محبت لٹوا لی۔ کیا جمانہ آیا ہو بابوجی۔ میں کہتا ہوں یہ جمین پھٹ کیوں نہیں جاتی! یہ آسمان ٹوٹ کیوں نہیں پڑتا ایسے لوگوں پر؟"

وہ زار زار رو رہا ہے۔

"پر وہ شکاری تھا کون؟"

"شکار کے لئے آیا تھا۔ مریم کو دیکھا اور پسند کیا۔"

"دھیرج رکھو گل محمد! زندگی میں ایسے حادثات ہو ہی جاتے ہیں۔ اور پھر اِن حادثوں پر اپنی زندگی کو قربان کرنا اچھی بات نہیں۔ زندگی جینے کے لئے ہے۔"

"بابوجی!"

"ہاں گل محمد! بھول جاؤ مریم کو۔ نئی زندگی شروع کرو تمہارا زخم خود ہی بھر جائے گا —— شادی ہی کی بات ہے نا۔ میں کرا دوں گا تمہاری شادی۔"

"بابوجی معاف کرنا ایک گل کہوں؟"

"کیا ہے؟"

"میرے پیسے چُکا دو بابوجی!"

"ہاں ہاں لے جانا۔ لیکن جلدی کیا ہے؟"

"نہیں بابوجی۔ بہت جلدی ہے۔ مریم اکیلی ہے نا۔ میں اب اُسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تم ہوش میں ہو گل محمد؟ ایک ایسی لڑکی کو اپنانے کی سوچ رہے ہو جو

کسی اسکے پاس رہ چکی ہے۔ چاہے اپنی مرضی سے یا زبردستی۔ جھوٹی چیز ہے وہ۔ وہ مرجھائی ہوئی کلی ہے۔ اُس کا رس کوئی اور نچوڑ چکا ہے ـــــ اُس کی کیا عزت ہے کلی محمد۔ وہ ایک بیوہ کی مانند ہے ـــــ بیوہ، ابھاگن!!

"بابوجی!"

اُس نے اپنے ہاتھوں سے چہرے کو چھپا لیا ہے

"بابوجی کیا آپ نے جندگی میں کبھی پیار نہیں کیا۔ بابوجی آپ نے کبھی پیار کیا ہوتا تو ایسی گل نہ کہتے ـــــ"

گل محمد اب رو رہا ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کیا میں نے واقعی زندگی میں کبھی پیار کیا ہے ـــــ اور آہستہ آہستہ شکیلہ کا سراپا میری نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

"میں آگئی ہوں اقبال۔ میری طرف دیکھو!"

---

# غزلیں

## محسن زیدی، ایم۔ اے

لاؤ شرابِ ناب بہت جی اُداس ہے
ہو غم کا سدِّ باب بہت جی اُداس ہے

طاری ہے دل پہ آج جو اِک حزن بے سبب
ہر سانس ہے عذاب بہت جی اُداس ہے

ہو چشم اشکبار تو ہو انبساطِ روح
کُھل جائے دل کا باب بہت جی اُداس ہے

حُسن اور اِس قدر ہو کسی کے لئے ملول
دیکھا ہے کل جو خواب بہت جی اُداس ہے

آ بیٹھئے فقیرِ محبت کے پاس بھی
کیجے نہ اجتناب بہت جی اُداس ہے

مانگیں نگاہِ ناز سے اب زندگی کہ موت
مُشکل ہے انتخاب بہت جی اُداس ہے

ناکامِ آرزو کو ہیں یہ خواب ہی بہت
چھینو نہ اپنے خواب بہت جی اُداس ہے

تشنہ لبانِ زیست کہاں تشنگی بجھائیں
ہر سمت ہیں سراب بہت جی اُداس ہے

اِک بے کسی ہے اور یہاں کوئی بھی نہیں
کس سے کریں خطاب بہت جی اُداس ہے

دیکھو صبا گئی تو ہے لے کر پیامِ شوق
کب آئے گا جواب بہت جی اُداس ہے

پرچھائیاں خیال کی بہلا سکیں گی کیا
کیا اعتبارِ خواب بہت جی اُداس ہے

محسن سُنی نہ جائے گی اب داستانِ غم
رہنے دو یہ کتاب بہت جی اُداس ہے

محسن زیدی

## سید یزدانی جالندھری

کچھ تم نے کہا اور نہ کچھ میں نے سُنا ہے
کیا جانئے کس بات پہ ہنگامہ بپا ہے

تسلیم و رضا شیوۂ اربابِ وفا ہے
زخموں سے ہے دل چور تو ہونٹوں پہ دُعا ہے

تنہائی میں اکثر مجھے محسوس ہوا ہے
جس طرح کوئی میری طرف دیکھ رہا ہے

ڈھونڈا کوئی ساتھی جو کبھی دشتِ وفا میں
اِک اپنا ہی سایہ مجھے ہمراہ ملا ہے

سینے میں ہے محفوظ متاعِ غمِ دوراں
دیباچۂ ایام مرے دل پہ لکھا ہے

محرومِ محبت نہیں ٹوٹا ہوا دل بھی
ٹوٹے ہوئے تاروں میں بھی موجود ضیا ہے

آہٹ سی شبِ غم جو تجھے دی ہے سُنائی
اے دل وہ ترے اپنے دھڑکنے کی صدا ہے

چپکے سے کوئی یاد چلی آئی ہے دل میں
ویرانے میں جس طرح کوئی پھول کھلا ہے

آتا ہی نہیں دل میں رہائی کا تصور
دلچسپ بہت جُرمِ محبت کی سزا ہے

ہو خیر چراغانِ سرِ راہگزر کی
سُنتے ہیں بہت تیز زمانے کی ہوا ہے

یک رنگ کہاں ہوتی ہے انسان کی فطرت
ہر پھول کی خوشبو ہے الگ، رنگ جُدا ہے

مغرور نہ ہو خود پہ تو اے شمعِ فروزاں
پروانے کی آنکھوں میں کوئی اور ضیا ہے

افشائے حقیقت ہے حقیقت میں بڑا جرم
منصور پہ یہ راز سرِ دار کُھلا ہے

نیند آئی ہے یزدانی مضطر کو سکوں سے
یہ موت ہی یا دوست کے دامن کی ہوا ہے

یزدانی جالندھری

# ملک کے مایہ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے نئے شاہکار ناول

## جنھیں ادارۂ "بیسویں صدی" نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے

- جب سائنس کے بل بوتے پر چاند، مریخ اور دوسرے سیاروں تک پہنچنا بچوں کا کھیل ہو جائے گا۔
- جب مرد نہ صرف عورت بلکہ ماں بن کر اولاد کی پرورش کریں گے۔
- جب پورا نظامِ زندگی حسن و شباب اور مستی و رعنائی کے زیرِ نگیں ہو جائے گا۔
- جب عورت، مرد کے پنجۂ اقتدار سے آزاد ہو کر معاشرے پر چھا جائے گی

اُردو ادب میں ایک انوکھا تجربہ۔ حیرت انگیز واقعات پر مشتمل ایک دل فریب ناول

حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دیش

### فریدہ موہنی (ناول)

کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔

صدیوں بعد کی فضاؤں میں لکھی ہوئی عجیب و غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاند پوری کا لکھا ہوا بیحد شوخ دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضا میں پرواز کراتا ہے۔ اور نئی زندگی کا سنگِ بنیاد رکھتا ہے۔ انتہائی دلکش در شگفتہ اندازِ نگارش۔ جاذبِ نظر کتابت و طباعت، بہترین کاغذ، دیدہ زیب سہ رنگا گردپوش۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

### نئے فرہاد

جناب پروفیسر شکیل الرحمٰن ایم اے کا اچھوتا شاہکار ناول

ایک بڑی شوگر فیکٹری کے منیجر کی ہوسناکیوں اور حسن پرستیوں کی بھیانک تصویر۔ جس نے بہارِ حسن و شباب کو خوش آمدید کہتی ہوئی نازک اور معصوم کلیوں کو سنہری، روپہلی سکوں کی جھنکار کے بل پر رقص و نغمہ اور شراب و شعر کے طوفان میں غرق کر کے گناہ پر مجبور کر دیا۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے اسٹیج پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دل چسپ کہانی جو آپ کے دل و دماغ پر چھا جائے گی۔ شکیل الرحمٰن کے اسٹائل میں اِنکی انفرادیت کی جاذبیت ہے، حسن ہے، زور ہے، جوش اور شگفتگی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک تیز اور شفاف چشمہ بہہ رہا ہے اور اُس کا بہاؤ ہمیں اپنے ساتھ بہا لے جائے گا۔ بہترین کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، دیدہ زیب ڈسٹ کور۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

فرانس کے عظیم ترین ناول نگار ابیے پریوس کا غیر فانی شاہکار

### راہیں شباب کی

- جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔
- جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔
- جسے عشق و محبت کی بے نظیر داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔
- جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارۂ "بیسویں صدی" نے شائع کیا ہے۔
- جس کی اشاعت پر پیرس کے رنگین ماحول میں ایک زلزلہ آ گیا۔
- جسے نوخیز لڑکیاں ہی نہیں بوڑھے بھی حاصل کرنے کیلئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں

عشق و محبت کا جاوداں افسانہ جس کے سامنے وامق و عذرا، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کے قصّے بھی ہیچ ہیں۔ اِس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلن سے بھی زیادہ حسین اور عظیم ہے مترجمہ جناب مخمور جالندھری۔ نظر فریب کتابت و طباعت، بہت عمدہ کاغذ، قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

### یادوں کے کھنڈر

جناب ٹھاکر پونچھی کا ایک بے حد دلچسپ نیا سماجی ناول

جس میں اُن معصوم محبتوں، ناکامیوں اور حسرتوں کی حسین داستانیں بیان کی گئی ہیں جنھوں نے اپنے کمسن خیالوں میں محبت کے حسین و سہانے محل تعمیر کئے لیکن حقیقی زندگی میں صرف یادوں کے تاریک کھنڈر ہی نصیب ہوئے۔ "یادوں کے کھنڈر" کے دردناک قہقہے، سسکتی ڈوبتی آہیں، خاموش پلکوں پر منجمد آنسو، آج کے معاشرے کے وہ گھناؤنے نقوش اُجاگر کرتے ہیں جو محبت کی موت ہیں، اور زندگی کے قاتل۔ ایک ایک سطر میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے فاضل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ و انداز سے اُجاگر کیا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص و محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے جھلکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

**پتہ:- رسالہ بیسویں صدی - دہلی**

افسانہ

# روشنی کا مینار

عفت موہانی۔ ایم۔ اے

۱۱۴۴۳-۴-۳۱ غیرت خاں لین۔ حیدر آباد۔ اے پی

۴ اپریل ۱۹۹۷ء

برادر معظم! تسلیمات

آپ کی توجہ اور محبت ہے کہ "بیسویں صدی" پابندی سے نکل رہا ہے ——— اُن حضرات سے مجھے سخت شکایت ہے جو مسلسل آپ کے متعلق بدشگونی کر رہے ہیں، حالانکہ مزن فال بد سبھی جانتے ہیں۔ نہ جانے یہ خیالات کا اثر تھا یا دماغ کی پراگندگی۔ کل میں نے بھی ایک پریشان کن خواب دیکھا کہ خدانخواستہ آپ نہایت شدت سے علیل ہوگئے ہیں اور "بیسویں صدی" کا جو شمارہ آیا ہے اُس میں "تیر و نشتر" نہیں ہیں ——— ایک حدیث شریف کے مطابق میں نے اپنے خواب کی تعبیر دانشمند آدمی سے لی ہے اور یقین ہے کہ آپ انشاء اللہ میری عمر پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے۔ وہ ہمارے درمیان سے ایک شفیق، مہربان اور دردمند ہستی کو تادیر نہ اٹھائے گا! کاش! تا دور آفتاب نہ اٹھائے!! ——— اُردو کے لئے آپ کا وجود حالات کی تاریکی میں روشنی کا مینار ہے! . . .

آپ کی بہن ——— عفت موہانی

---

یہ محسوس کرکے اُس کے دل پر ایک دھکا سا لگا کہ آج کے بعد وہ یہ گھر اور یہ شہر نامعلوم مدت کے لئے چھوڑ جائے گی۔ جب ایک قیدی کو اپنی تنگ و تاریک کوٹھری سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر یہ تو اُس کا اپنا گھر تھا۔ جہاں وہ بیاہ کے بعد نئی نئی آئی تھی۔ لیکن اس طرح آسودہ نظر آتی تھی جیسے بغیر کسی جادہ پیمائی کے اپنی محبوب منزل تک آپہنچی ہو۔ منزل ——— جس کے خواب اُس نے کبھی دیکھے تھے۔ اُن پریشان خوابوں کی اُس نے کبھی دل خوش کن تعبیریں ڈھونڈنے کی ناکام کوششیں نہیں کیں۔ وہ جانتی تھی، سبھی خوابوں کی تعبیریں نہیں ہوتیں۔ بعض خواب پریشاں بھی ہوتے ہیں۔ مگر منزل ہی کی طرح اُسے اپنے بھولے ہوئے خوابوں کی تعبیر اقبال کے پیکرِ محسوس میں ملی، تو وہ سمجھ نہ سکی، اپنی خوشیوں کے اظہار کا کون سا پیرایہ اختیار کرے۔ اُس ننھے بچے کی طرح بوکھلانے لگی جسے کسی نے دفعتہً بن مانگے من چاہا کھلونا دے دیا ہو۔

اقبال کی محبت میں کھو کر وہ خود کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن وہ اُسے پہلے ہی دن سے بے پناہ سنجیدہ اور افسردہ سے محسوس ہوئے۔ اپنے آپ میں کھوئے۔ جیسے اپنی کوئی قیمتی چیز کہیں رکھ کر بھول گئے ہوں۔ اُس نے انھیں تنہائی میں آہیں بھرتے دیکھا تھا اور نامعلوم سی رقابت کا ننھا سا شعلہ اُس کے دل میں جل اٹھا تھا۔ ویسے جب وہ پاس ہوتے تو اپنے مہکتے ہوئے پیار میں اُس کا وجود دبا دیتے۔ وہ اُن کی اُداسی سے مضطرب ہو اٹھتی! ایسا کون سا دُکھ ہے جس نے انھیں بے قرار کر رکھا ہے۔ وہ گورنمنٹ سروس کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ دولت قدم چوم رہی تھی۔ کئی سال کا ارمان دیکھا لیکن پسندیدہ جیون ساتھی ملا ہے پھر کیا بات ہے؟ کئی بار وہ بھی دُکھی ہوگئی۔

"آپ کیا سوچتے رہتے ہیں؟ کیا کوئی ایسی بات ہے جو آپ مجھے بتانا نہیں چاہتے!" اُس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ سیاہ دراز پلکوں پر شبنم کے تارے چمکتے ہوئے اقبال نے دیکھ لئے۔

"نہیں نہیں۔۔ عزیزہ! ایسی کوئی بات نہیں! بے بنیاد باتیں نہ سوچا کرو۔

خواہ مخواہ اُداس ہوتی ہو!"

شادی کے بعد دو مہینے یوں گزر گئے جیسے کسی دلکش کتاب کے ورق پر ورق اُلٹتے چلے جائیں اور اب اقبال کے ساتھ وہ فارن جا رہی تھی۔

نہ جانے پھر کب یہاں آنا ہو۔ آ بھی سکے گی یا نہیں؟ ماں باپ سے نامعلوم مدّت کے لئے جُدائی کا تصوّر اُس کے لئے کربناک تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اُس سے رخصت ہوئے تھے۔ ابّا کی بوڑھی آنکھوں میں یوں نمی چھلک رہی تھی جیسے اندھے کنویں کی گہرائی میں پانی! امّی نے گلے لگا کر چوم لیا تھا —— اور اُسے اپنی شادی کا دن یاد آگیا تھا۔ کون سی آنکھ تھی جو پُرنم نہ تھی۔ عنیزہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بابل کا آنگن چھوڑ کر پی کے نگر جا رہی تھی! وہ گھر ہمیشہ کے لئے چھُوٹ رہا تھا جہاں اُس نے جنم لیا تھا، گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا۔ نیم کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں تلے

---

- اے اللہ میرے اوقات زندگی میں برکت دے اور انھیں صحیح طریقے پر صرف کرنے کی توفیق بخش۔ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ)
- انتقام میں جلدی کرنا کریموں کا شیوہ نہیں۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- جس میں یہ دس وصف ہیں وہ بہترین اخلاق کا مالک ہے۔ سچ بولنا، لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ، مستحق کا سوال نہ رد کرنا، احسان کا بدلہ احسان سے دینا، صلۂ رحم، امانت، ہمسائے کی رعایت، ہمنشیں کا پاس و لحاظ، شرم و حیا، مہمان کی خاطر و مدارات۔
(حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا)
- علم کا مقصود خدا کا خوف ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)

---

نکولیوں کی بینڈ کلیا ایکا ئی تھی اور جب نیم کے سفید سفید ننھے ننھے پھُول ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے اُس پر نچھاور ہوئے تو اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ شباب کی پہلی کرن مسکراہٹ کا رُوپ دھار کر لبوں پر بکھر گئی۔

بہار آگئی ——

اور جوانی کے شوخ و شریر چنچل احساس نے اُس کے انگ انگ میں مٹھاس بھر دی۔ اپنے آپ انجانی راہوں پر قدم اُٹھاتے وہ پیا کے دیس آپہنچی۔ جہاں کے راستے الگ تھے۔ منزل نئی تھی۔ پھر ایک سنگی ساتھی نے اُس کی کلائی تھام لی اور اپنی راہ پر لے کر چلا گیا!

پھر پچھلے ساتھ چھُوٹے، ناطے ٹُوٹے —— اور بے اختیار اُسے اپنی ایک ہمدرد ساتھی کی یاد آئی! دل میں ایک ٹیس جاگی۔ آج وہ سب سے مل چکی ہے اور

آج ہی اپنی چہیتی پروفیسر مس عذرا جمیل سے نہیں مل سکی جن کی پُر اسرار شخصیت اور گہرائی میں چھُپے ہوئے ماضی سے اُسے محبت بھی تھی اور دلچسپی بھی!... جنھوں نے اُس کی زندگی میں قدم قدم پر اپنی مُسکراہٹوں سے چراغ جلائے تھے آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا تھا!... لیکن جن کی زندگی میں تاریکی تھی اور آنسوؤں کی دھند میں آگے کے راستے ڈُوب گئے تھے۔

عُنیزہ کی نگاہیں دُور بہت دُور پہاڑوں کی برف پوش بلندیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ آفتاب کی زرد زرد روشنی برف پر زر باری کر رہی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ اُداس ہوتی گئی۔ وقت کم تھا۔ رختِ سفر تیار ہے! ابھی ابھی اقبال اپنے دوستوں سے مل کر آئیں گے اور وہ چلی جائے گی! اُس کا دل اضطراب سے دھڑکنے لگا۔ نہ جانے دل پر کیسا بوجھ رہ جائے گا۔ اگر پردیس میں عذرا جمیل کی یاد آئی!!

پھر وہ ضبط نہ کر سکی۔ چوکیدار سے کہہ کر کہ وہ صاحب کے آنے کے وقت تک آجائے گی۔ دل میں دید و شنید کے لاکھوں طوفان سمیٹے جمیل کالج پہنچ گئی۔

پروفیسر مس عذرا جمیل کہیں باہر جا رہی تھیں لیکن اپنے کمپاؤنڈ میں اپنی سب سے زیادہ عزیز اور پیاری شاگرد عُنیزہ کو دیکھ کر حیرت و مسرّت سے چیخ اُٹھیں۔ اپنا پرس میز پر پھینک دیا۔ پھر کچھ وہ بڑھیں کچھ عُنیزہ۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

وہ خوشبو جو اچانک عذرا جمیل نے محسوس کی تھی۔ اُن کے رگ و پے میں بجلی کی سرد آگ بن کر دوڑ گئی۔ ساری دُنیا کی خوشبوؤں سے جُدا ہیجان انگیز اور جذبات آفریں سُہاگ کی خوشبو... جس سے اُن کا پینتیس سال کا کنوارا پن ناآشنا تھا۔ اُنھوں نے حیرت سے سر اُٹھایا اور کچھ عجیب انداز سے عُنیزہ کے شانے دبوچ لئے۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ عُنیزہ اپنی بے تاب صبحوں اور بے خواب راتوں کا ساتھی پا چکی ہے!! وہ عجیب سی جھینپ اور خجالت میں مبتلا تھیں۔ شادی شُدہ لوگوں کا قُرب اُن کے لئے ناگوار ہوتا تھا۔ خاص کر اب یہ لڑکی —— جسے وہ پڑھا چکی تھیں:

"بہت بے مروّت ہو!" جب وہ ڈرائنگ روم میں پاس پاس بیٹھ گئیں تو اچانک عذرا جمیل نے عُنیزہ کا گُلابی گُلابی رخسار اپنی چٹکی میں دبا لیا اور وہ اُن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر شرمیلی سی ہنسی ہنس پڑی۔

"مُبارکباد تو ہرگز نہ دوں گی۔ کیونکہ تم نے مجھے خبر بھی نہ کی ——!" وہ شکوہ کناں لہجے میں بولیں۔ پھر مُسکرا پڑیں: "میں تو تم سے خفا ہو جانے کا منصوبہ بنا رہی ہوں!"

"ایسا ستم نہ کیجئے گا مس جمیل!" وہ جلدی سے بول پڑی "یقین کیجئے۔ شادی بہت جلدی میں ہوئی۔ اُن کی امّی کی حالت یکایک بہت بگڑ گئی تھی کسی کو بھی بلایا نہ جا سکا اور آج . . . میں آخری بار آپ سے ملنے آئی ہوں۔ پھر آپ کہاں اور میں کہاں۔ آج ہی ہم بچھڑ رہے ہیں!"

"نہیں! اُن کی آنکھوں میں اداسی تیرنے لگی۔ سچ کہو!"

"یقین کیجئے۔" عنیزہ نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میرا دل دُکھتا ہے مس جمیل! اب تک مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا تھا کہ میری بیوی ہونے سے بھی میرے روحانی قرب پر اثر انداز نہ ہو سکے گی۔ لیکن اب یہ سوچ کر دل پر آرے چل رہے ہیں کہ نہ جانے کب تک آپ سے نہ مل سکوں گی۔ مجھے بے حد دُکھ ہے۔ آپ کی زندگی اور تنہائی کے بارے میں سوچتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے آپ حالات کے سمندر میں ہاتھ پیر مار رہی ہیں اور آپ کو تنکے کا سہارا بھی نہ ملا ہو۔

"تنہائیاں ـــــ" مس عذرا جمیل پھیکی سی ہنسی ہنس دیں۔ "یہ تمہارے تصوّر کا فریب ہے عنیزہ! انسان کسی کی رفاقت کے بغیر جی نہیں سکتا! اور وہ بدنصیب جنھیں دُنیا نے کچھ بھی نہیں دیا، اپنی انجمن الگ سجا لیتے ہیں۔ جہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے، جس کی چاہ میں انسان، انسانیت کی بلندی سے نیچے گر پڑتا ہے۔ میں نے بھی ایک زمانے میں یہ سب کچھ چاہا تھا۔ پگلی لڑکی! جو آج کل تمہاری حیات کا سرچشمہ ہے . . . لیکن میں بھٹک گئی، بھول گئی اُن راستوں کے پیچ و خم جو دل کی منزل تک مجھے پہنچا سکتے۔ ہرے بھرے گلستانوں کے قریب میں نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئی: جہاں سے واپسی مجھے نصیب نہ ہو سکی!

پُراسرار مس عذرا جمیل۔ جن کی زندگی ایک معمّہ، جن کا طرزِ حیات ایک چیستاں تھا۔ نہ جانے کون سے احساس سے مجبور ہو گئی تھیں کہ دل کے نہاں خانے میں سالہا سال سے خوابیدہ راز اُن کی زبان پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ بے خودی اور خود فراموشی کا وہ جاں گسل لمحہ جب اُنھوں نے سوچا تھا۔ اگر یہ آتش فشاں اندر اندر کھولتا رہا تو ایک دن پھٹ جائے گا اور آتش فشاں پہاڑ یہ کب دیکھتا ہے کہ سینکڑوں بستیاں تباہ کرنے سے پہلے خود اُس کی پتھریلی سی چھاتی پھٹ جاتی ہے!

"کب جاؤ گی تم؟" اُنھوں نے یک بیک چونک کر پوچھا۔

"بس کل کا سورج ہمیں یہاں نہ دیکھے گا" وہ اپنی کلائی پر چمکتی ہوئی ننھی سی گھڑی دیکھ کر بولی "صرف تین گھنٹے بعد یہاں سے نکل جائیں گے!"

پھر چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے عنیزہ نے بڑی ہمت سے کہا "آپ کی یہ باتیں میرے دل کی گہرائیوں سے ہمیشہ کسک بن بن کر میرے وجود پر اُبھرتی رہیں گی۔ مس جمیل! اب آپ بھی اپنی زندگی کا ایک ساتھی چُن لیجئے!"

"تنہائیوں کا ساتھی؟" ہمیشہ کی طرح بات کو دوہرا کر وہ پھر ہنس پڑیں۔ "وہ تو میرے پاس ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ جس کے دیوتا سے میں کبھی بے وفائی نہیں کر سکتی۔ خواب کی دُنیا میں میرے لئے بہت کچھ ہے۔ جو اس بھری پُری دُنیا میں کہیں نہیں ہے۔ یہ تعلیمی اور ادبی مشاغل کسی درد کا درماں نہیں۔ ہیں عنیزہ، اس زنداں میں نہ صبح ہوتی ہے نہ شام۔ یہاں قبر کی سی سیلن ہے اور موت کی سی ٹھنڈک۔ دن کا سورج، باہر کی دُنیا۔ وہ کرنیں وہ صبح و شام۔ یہ سب کہاں ہیں۔ میں کہاں ہوں؟ ـــــ کاش! مجھے پتہ چل جاتا۔ وہ کہاں ہیں، کدھر ہیں، کیسے ہیں؟ اب بھی میری یادوں سے اُن کے ماضی میں چراغاں ہوتا ہے یا وہ روشنی کا مینار حالات کے بحرِ بیکراں میں اپنی آب و تاب ہمیشہ کے لئے

---

- فرمانبردار اولاد، صحت مند جسم، دانا دوست، وفادار بیوی جسے یہ میسّر ہوں اُسے مسرت ہی مسرت ہے۔ (ہندی ادب)
- دھرم چند رسوم و علوم کا نام نہیں۔ حُسنِ ادب اور اخلاق کا دوسرا نام ہے۔ (سوامی ویویکانند جی)
- جہالت، بیماری اور غریبی کے خلاف برابر جہاد کرتے رہو۔ (پنڈت جواہر لال نہرو)
- علم بغیر عمل کے بیکار ہے اور عمل بغیر علم کے بیکار ہے۔ (گورو گرنتھ صاحب)
- عمل کے بغیر عبادت ایسی ہے جیسی بارش کے بغیر بادل۔ (ٹھاکر ہری چند جی)

---

کھو بیٹھا!

عنیزہ کا اشتیاق بڑھ گیا۔ کیا وہ اپنا ماضی دُہرا رہی تھیں۔

"آپ کی باتیں راز بنتی جا رہی ہیں پروفیسر . . . صاف صاف کہئے!" وہ ہزار چاہنے پر خود پر قابو نہ پا سکی۔

"صاف صاف . . ." اُنھوں نے صوفے کی پُشت سے ٹیک لگا لی اور خوابناک لہجے میں بولیں۔ جیسے خود سے مخاطب ہوں! بعض درد ایسے پیارے ہوتے ہیں جن کے آگے ساری دُنیا کے درماں حقیر معلوم ہوتے ہیں تم وہ سب کچھ جاننا چاہتی ہو جس پر بے نام سے اسرار کا گردپوش چڑھا ہوا ہے۔ عنیزہ! بابا کی موت میرے ہوش کی بات نہیں ہے۔ امّی کی محبت نے کبھی باپ کی شفقت کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ لیکن جب امّی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرا ساتھ چھوڑا تب

احساس ہوا کہ قدرت نے میرے ہمہ گیر تبسم کا بہت ہولناک تاوان لے لیا تھا۔ امی کی ابدی جدائی ستم انگیز تھی۔ میری چارہ گر اور غمگسار میری کلاس فیلو تھیں جنہوں نے اپنے دل پر میرے غم کو محسوس کیا تھا۔

انہی میں شمسہ اور اس کے بھائی بھی تھے۔ سب سے الگ۔ سب سے جُدا۔۔

شمسہ میری بہت پیاری ساتھی تھی۔ جس کی محبت میں ماں کی ماتا، بہن کا خلوص اور ایک دوست کا تعلق خاطر تھا اور شمسہ کے بھائی جان ——— کیسے شریف تھے دونوں بہن بھائی۔ جیسے وہ مجسم عظمت و رفعت ہو گئے ہوں! عالی ظرفی اور عالی نسبی جن کے خمیر میں تھی۔ جو سنجیدگی سے ہنستے اور وقار سے گفتگو کرتے۔ آہستہ آہستہ لہجے میں۔ جیسے لبوں سے نہیں دل کی زبان میں بول رہے ہوں۔ میں اُن سے متاثر ہوتی گئی۔ شمسہ کی شادی کے بعد ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اتنے قریب کہ اگر چاہتے تو ایک دوسرے کے سینے پر سر رکھ کر دل کی دھڑکنیں سُن لیتے۔ اُس مدھر سنگیت میں اپنے آپ کو رچا بسا محسوس کر لیتے جو تیز تیز دھڑکنیں الاپتی تھیں۔

محبت سن و سال اونچ نیچ نہیں دیکھتی۔ اب بھی نہ دیکھا کہ عمر میں میں اُن سے پانچ منزلیں زیادہ طے کر گئی تھی! نہ انھوں نے محسوس کیا۔ میں بے چین ہوتی گئی۔ میرا پیار ایسا پیار تھا جیسے مُدت کے پیاسے لبوں سے کوئی لبریز جام لگا دے! وہ اپنی محبت میں محتاط تھے۔ کچھ ایسے مجبور سے جیسے دل کچھ اور چاہتا ہو، جسم کچھ اور ——— اور حالات کسی اور ہی دھارے پر بہالے جائیں۔ اُن کی آنکھوں میں ایک کربناک سکوت گہرا ہوتا گیا۔ ہونٹوں پر کراہتے ہوئے نالے۔ چیختے دل کی آواز ——— جو مجھے قریب کرنا چاہتا تھا اور قریب ——— اور وہ خود گریزاں تھے۔ میرے خوابوں کو اپنے خوابوں میں مدغم کئے وہ ایسی تعبیر کے انتظار میں تھے، جو خود بخود سامنے آ جائے۔ اُن کا وجود میری شخصیت کا ایک ناگزیر حصہ تھا۔ ہر پل ہر آن میں اُن کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میری محبت میں پہاڑی ندی سا بہاؤ تھا۔ آتش فشاں کی سی گرمی تھی اور ساتھ ہی چاند کی کرنوں کی سی نرمی، نُور اور کچنار کی کلیوں کی سی دھیمی دھیمی رچی بسی مہک!

اُنھیں بھی اندازہ تھا۔ وہ بھی اُسی آگ میں سُلگ رہے تھے لیکن نہ جانے کون سا احساس اُن کے پژمُردہ لبوں پر خاموشی کی مہر ثبت رکھتا۔

ایک دن میری پلکوں پر آنسو دیکھ کر انھوں نے کہا تھا۔

"محبت آپ کا مستقبل نہیں ہے عذرا! پیار کی راہیں آپ کو کسی منزل تک پہنچانے کی بجائے راستے ہی میں بھٹکا دیں گی۔ میں تو ہوا کا ایک جھونکا ہوں۔ اپنا پیار واپس لے لیجئے۔"

اور میں نے سسکتے کراہتے اُن کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ دل پیار کی مدھر راگنیاں سُنا رہا تھا مگر جسم تپ رہا تھا۔ اُن کی بانہوں کا حلقہ میرے گرد تنگ ہو گیا۔

بے خود و بے خبری سے انھوں نے میری گردن پر اپنے لب رکھ دیئے۔ اُن کا لہجہ آنسوؤں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

"عذرا! مجھ بدنصیب کو تم نے جن نگاہوں سے دیکھا ہے، میں اُنھیں سرچشمۂ حیات سمجھ بیٹھا ہوں۔ تم پہلی ہستی ہو جس نے میری خشک اور ویران زندگی میں پیار کے پھول کھلائے ہیں۔ آہ! کاش! یہ نہ ہوتا۔ میں مجبور ہوں عذرا! حالات کی زنجیروں نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔ میں کسی اور کا ہوں۔ بہت پہلے کی بات ہے جب یہ حادثہ میری زندگی میں آیا تھا۔ میری بھی کچھ مشکلات تھیں۔ اپنے ماں باپ کے فیصلے پر میں نے سر جھکا دیا۔ اب ماں باپ نہیں ہیں لیکن وہ اٹل فیصلہ اسی طرح قائم ہے جسے توڑنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ عذرا! زندگی کے اصول بعض وقت بندھن ثابت ہوتے ہیں۔ زندگی کے گردش کرتے ہوئے پہیے اُن میں ایسا جکڑ لیتے ہیں کہ پھر نکالے نہیں نکلتے! شاید دل بھی اُسی کا ہو جاتا۔ اگر تم مجھے نہ ملی ہوتیں۔ اب میں کیا کروں۔ زندہ رہوں تمھارے لئے یا مر جاؤں اپنے سکون کے لئے!

اور اُن کی بانہوں میں ہوتے ہوئے میں نے خود کو اُن سے اِس قدر دُور محسوس کیا جیسے چکور کے لئے چاند!

محبت بڑی عجیب چیز ہے عزیزہ! جتنی شیریں اُتنی ہی تلخ۔ شام و سحر کی گردشوں میں وہ وجود لپٹا ہوا تھا۔ صبح و شام کی دلکشی اُن کے حُسن سے معمور تھی۔ چاند اور ستاروں میں وہ چہرہ مُسکراتا ہوا دکھائی دیتا۔ میرا پاگل پن اُن کا اضطراب آفریں گریز بڑھتا گیا۔ مداوا میرے بس میں نہ تھا۔ فرض محبت نے قدموں کی زنجیر بن گئی تھی!

اور پھر ——— میری ناکام زندگی میں وہ شام بھی آ گئی۔ جس نے پھر کبھی اُس کی صبح کا منہ نہ دیکھا! اُن کی امی سخت بیمار تھیں۔ اُن کا جانا ضروری تھا۔

وہ مجھے دیکھ رہے تھے اور آنکھوں کا کربناک سکوت ہولناک ہو گیا تھا۔

وہ قیامت جس کا ہمیں انتظار تھا آ پہنچی تھی!

ہمارے درمیان آنسوؤں کی چلمن پڑی تھی۔ کچھ کہنے سُننے کا یارا ہی نہ تھا۔ وہ جانتے تھے اور مجھے بھی معلوم تھا۔ اب ہم نہ مل سکیں گے۔ ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکیں گے۔ آہ! دل چاہ رہا تھا، چھین لوں اپنے محبوب کو اُن لوگوں کے مضبوط شکنجوں سے جو انھیں مجھ سے جُدا کر رہے تھے۔ دل بغاوت پر آمادہ تھے۔ ہم نے محبت کی تھی! محبت کے نام پر دھوکے دیئے تھے نہ دھوکے کھائے تھے!

لیکن جاں بلب ماں کی منتظر آنکھوں نے مجھے پتھر کر دیا! اور دوسری معصوم و مظلوم ہستی، جس نے مُدتوں ایک خیالی دیوتا کی دل ہی دل میں پرستش کی تھی۔ جسے دیکھا نہ تھا لیکن جو اُس کا ایمان، اُس کی زندگی کا سرمایہ تھا میں نہیں چاہتی تھی۔ محرومِ اُلفت کے آنسو مجھے غرق کر دیں۔ اُس کی آہیں مجھے پھونک دیں۔ اُس کی

محبت کے گنبد پر میں اپنے پیار کا محل کھڑا کروں! میں جسے چاہتی تھی، اُس کی بربادی کی خواہاں تو نہ تھی۔ میں نے انہیں واپس کر دیا۔ ایک دیا جلایا ایک میں نے بجھا دیا۔ کسی کے لئے ایثار کرنا بہت مسرت آفریں ہوتا ہے۔ محبت ایثار اور قربانی کا سبق سکھاتی ہے۔ زندگی کا نہیں!

اور یوں بے شمار آنسوؤں، لاتعداد آہوں اور جراحتوں کے بدلے مجھے دے کر چلے گئے۔ اُف! جو لطف دینے میں ہے وہ لینے میں کہاں؟ ہم نے عہد و پیماں کئے۔ اب زندگی کے کسی موڑ پر ہم اپنی بے چینیوں کو بڑھانے کے لئے کبھی نہ ملیں گے۔ بالکل اجنبی کی طرح پاس سے گزر جائیں گے جن میں کوئی اظہار ہوتا ہے نہ رشتہ۔ نہ خون کا، نہ دل کا اور نہ انسانیت کا! شاید اسی طرح بیتاب دل کو قرار آسکتا!

اور پھر ہم کبھی نہ ملے!

سورج سے اُس کی کرنیں جدا نہیں کی جا سکتیں۔ چاند سے اُس کی چاندنی کوئی نہیں چھین سکتا۔ کہکشاں کا حسن کوئی لوٹ نہیں سکتا! بہار سے اُس کی لطافتیں الگ نہیں ہو سکتیں۔ لیکن —— ہم ایک سمندر کے دو کنارے تھے۔ ایک یہاں تو دوسرا اُفق کی بیکراں وسعتوں میں گم ——

مس عذرا جمیل اب خاموش تھیں۔ وہ بھی خاموش بیٹھی تھی۔ صرف دیوار گیر گھڑی کے دل کی دھڑکن سکوت کا جادو توڑ رہی تھی۔

اُس کی پُرنم آنکھیں مس جمیل کے حسین اور پُر وقار چہرے کا طواف کر رہی تھیں جس پر دُکھ کے سائے میں عظمت و محبت کے نقوش خوابیدہ تھے۔

اُس کے ذہن میں وہ مستحکم و مضبوط چٹانیں پھر گئیں جو سالہا سال سے اپنے مقام پر ایستادہ تھیں۔ چٹانیں جن کا ایک مقام ہوتا ہے۔ جو اٹل ہوتی ہیں لیکن اُن پتھروں کا بھی دل ہوتا ہے، جن میں پیار کا چشمۂ ترنم بکھیرتا نہ جانے کہاں سے پھوٹتا ہے اور نہ جانے کہاں تک بہتا چلا جاتا ہے!

عُنیزہ کی محبت عقیدت سے بدل گئی۔ پُراسرار مس عذرا جمیل جو ہمیشہ غالب کا سمجھ میں نہ آنے والا شعر بنی رہتی تھیں۔ اپنی تشریح کے بعد زیادہ پیاری معلوم ہونے لگی تھیں۔ وہ اُسے ایک آسمانی مخلوق معلوم ہو رہی تھیں۔ اُن کے چہرے پر محبت کا نور اور ایثار کا حسن چھایا ہوا تھا۔ اُسے تو آج معلوم ہوا وہ کیا تھیں؟!

عُنیزہ نے چپکے سے آنسو پونچھے اور مس عذرا جمال اُس کے تاثر پر پھر ہنس پڑیں۔

"محبت، بادۂ تلخ ہے عُنیزہ! اُس کا سرور اُس کے خمار سے بڑھ کر اذیت ناک ہے! لیکن محبت کی ناکامی ہی میں اُس کا سارا حسن پوشیدہ ہے اور پھر اس جہانِ خراب میں زندہ رہنے کے لئے کچھ جانی بوجھی غلطیاں بھی ہونی چاہئیں۔ مگر ایک غلطی —— آہ! جس کی تلافی نہیں۔ کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی ہے، ٹیس بن کر ابھرتی ہے۔ ہم نے یہ عہد کیوں کیا تھا کہ پھر کبھی زندگی میں نہ ملیں گے!!"

اب اپنے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹنے پر مس عذرا جمیل بھی ہنسنے لگیں۔ کچھ شرمندگی، کچھ واماندگی ——!

وقت کے پل بھاگ رہے تھے!

وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں ——

"شکوہ تو نہ کرو گی کہ فضول باتوں میں وقت گنوایا۔ لیکن تم جانو عُنیزہ! آج میرے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ محبت بغیر رازدار کے پھیکی پھیکی معلوم ہوتی ہے!؟"

"اچھا" عُنیزہ پھر شریر ہو گئی "لیکن یہ کیسا راز ہے کہ نہ آپ نے اپنے محبوب کا نام بتایا نہ درشن کرائے؟!"

"دیکھو گی؟" اُنھوں نے کہا "میرے ساتھ خواب گاہ تک چلو۔"

دو لمحوں بعد جب وہ خواب گاہ میں پہنچی تو اپنے تکیے کے نیچے سے سنہرے فریم میں چھوٹی سی ایک تصویر نکال کر مس عذرا جمیل نے اُسے تھما دی۔

اچانک اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے روشنی کا ازلی و ابدی مینار اپنے مقام سے اکھڑ کر سمندر کی تاریکیوں میں ڈوب گیا ہو! اور بے بادبان کی کشتی لہروں کے رحم و کرم پر بہہ چلی ہو جس کا کوئی ناخدا نہ ہو!

"اقبال!" اُس کے لب کانپے اور تصویر ہاتھ سے چھوٹ گئی!!

# غزلیں

**ضیا فتح آبادی ایم۔اے**

رازِ کون و مکاں ہے تیرا بدن
حاصلِ دو جہاں ہے تیرا بدن

مڑتی، لہراتی، گاتی، بل کھاتی
موجِ آبِ رواں ہے تیرا بدن

دل میں خوشبو کہاں سے آتی ہے
آنکھ سے جب نہاں ہے تیرا بدن

سرمگیں آنکھ، ساغرِ مئے ناب
نشۂ جاوداں ہے تیرا بدن

لوچ، نرمی، سرور، جاں بخشی
نغمگی کا سماں ہے تیرا بدن

محورِ حرص و آز، مرکزِ شوق
آرزو کا جہاں ہے تیرا بدن

جوشِ فصلِ بہار، تیرا شباب
خندۂ گلستاں ہے تیرا بدن

اِک مجسّم غزل کہوں تجھ کو
شاعری کی زباں ہے تیرا بدن

اِس غزل پر ضیا کا یہ دعویٰ
میرا حُسنِ بیاں ہے تیرا بدن

ضیا فتح آبادی

**اخلاق سہسوانی**

تُمہارا غم ہمیں منظور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے
محبت اِس قدر مجبُور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

کوئی حد بھی ہے آخر آنسوؤں کے اِس تسلسل کی
دل اِتنا درد سے معمُور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

زمانہ اِرتقاء کی منزلوں پر ہے، مگر اِنساں
ابھی اِنسانیت سے دُور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

بدل دیں ہم نے راہیں، بلکہ رہبر تک بدل ڈالے
مگر منزل ابھی تک دُور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

گُل افسردہ، کلی پژمردہ، شبنم اشک ریزاں سی
مگر یہ باغباں مسرُور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

یہ دنیا ہے، یہاں مختار بھی مجبُور ہے، لیکن؟
یہاں مختار بھی مجبُور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

اب اِن کو کون سمجھائے جو مجھ سے پُوچھتے یہ ہیں
کہ تو عقل و خرد سے دُور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

کبھی فصلِ خزاں سے بھی ہمیں تھا پیار، لیکن اب
بہاروں میں بھی دل رنجُور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

یہ کیا جادو کیا اخلاق اُن کی یاد نے آکر؟
ہماری شامِ غم پُرنُور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

اخلاق سہسوانی

**سراج ادیبی، ایم۔اے**

شدتِ غم سے آنکھ بھر آئی
چھُٹ گیا دامنِ شکیبائی

رُوح فرسا ہے کس قدر یارب
شامِ غم کی اُداس تنہائی

ہر نظر اُس کی زندگی افزا
ہر نفس حاملِ مسیحائی

کر گئی مُضطرب مرے دل کو
اِک مجسّم حیا کی انگڑائی

ہر اشارہ ہے اُس کا سحر و فسوں
ہے خموشی بھی اُس کی گویائی

دیکھ کر آج راہ کو پُرخار
شاد ہے میری آبلہ پائی

ہیں برابر نگاہِ عاشق میں
اِک جنُوں اور ہزار دانائی

ذرّے ذرّے کو اپنی محفل کے
اُس نے بخشی ہے ایک رعنائی

میرے افکارِ عرش پیما سے
بڑھ گئی فکر و فن کی رعنائی

میرے اِس گھر کی تیرگی میں سراج
وہ جو آئے تو روشنی آئی

لیس سراج الحسن سراج ادیبی

افسانہ

# تصویرِ فریب

ظفر عالمگیر ایم۔اے۔ایم۔سی

۳-بی-۲۴/۴-ناظم آباد-کراچی ۱۸

۱۰ اپریل ۱۹۶۷ء

خوشتر بھائی! تسلیمات

آپ کے سارے خطوط ملے اور یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں ایک کا بھی جواب نہ دے سکا۔ اس کا سبب میرا ذاتی تساہل نہیں ہے، میری وہ مصروفیات ہیں جنھوں نے لکھنے پڑھنے کے وقت کے ساتھ ساتھ اس کام کا جذبہ بھی مجھ سے چھین لیا ہے۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا کہ دن دفتر کی مصروفیات کی نذر ہو جاتا ہے اور اُن مصروفیات سے نجات پانے کے بعد لکھنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ زبردستی لکھنے کی عادت میں آج تک نہ ڈال سکا۔ گزشتہ سات سال سے بنگالی گروپ آف انڈسٹریز سے وابستہ ہوں۔ سات ماہ پہلے مجھے ترقی دی گئی اور آفس سکریٹری کم کمرشل آفیسر بنا دیا گیا ہوں۔ اس عہدے کی ذمہ داریوں نے میرا کام ہی تمام کر دیا۔ ساڑھے گیارہ سو روپے ماہوار مل رہے ہیں۔ زندگی خوب گزر رہی ہے۔ لیکن لکھنے لکھانے کو ترسنے لگا ہوں۔ کہنے کو تو روزانہ آپ کو ایک افسانہ ارسال کر سکتا ہوں لیکن یہ افسانے میرے افسانے نہ ہوں گے۔ پاکستان کے انگریزی اخبارات و رسائل کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔ اُردو کے اخبارات اور رسائل مجھے گھاس نہیں ڈالتے۔ یہ افسانہ جو آپ کو افسانہ نمبر کے لئے ارسال کر رہا ہوں ایک سال سے زیرِ تکمیل تھا جیسے پڑھتے ہوئے آپ کو اندازہ ہوگا۔ اس کا آغاز بہت اچھے موڈ میں کیا گیا لیکن اختتام جی سے اُٹھ کر کیا گیا ہے۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ قارئین مایوس نہ ہوں گے۔

ثریا اور زیب نے آپ کو آداب و احترام سے سلام لکھوایا ہے ——

آپ کی پُرخلوص دعاؤں کا متمنی —— آپ کا اپنا

---

"بھابی! میری وہ تصویر کہاں گئی؟" اپنی میز کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر نسرین کمرے سے نکلی تو کچن میں بھابی کے سر پر جا دھمکی۔

"کیوں بھابی؟" نسرین نے جل کر پوچھا۔ بھابی اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔

"کیا ہے؟" بھابی نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"میری وہ تصویر کہاں ہے؟"

"مجھے کیا خبر؟"

"آپ نے دیکھی ہے؟"

"نہیں"

"پھر؟"

"پھر کیا؟"

"پھر کہاں گئی وہ تصویر؟"

"ارے تم پاگل تو نہیں ہوئی ہو، مجھے کیا معلوم کہاں گئی تمھاری تصویر۔ میں کوئی تمھاری چیزوں کی نگرانی کرتی رہتی ہوں، عجیب لڑکی ہو!"

"عجیب میں ہوں یا آپ؟"

"تم مجھے خواہ مخواہ پریشان نہ کرو نسرین!"

"سات سمندر پار بھی آپ کا جواب نہ ملے گا بھابی! سارا دن آپ گھر میں رہیں اور آپ کو کچھ خبر نہیں میری تصویر کہاں گئی؟"

"مجھے کیا خبر کیا ہوئی تمہاری تصویر، تم دے آئی ہوگی کسی کو!"

"کس کو دے کر آؤں گی؟ کون ہے؟"

"میں کیا جانوں کوئی ہے بھی یا نہیں!"

"پھر جانے بغیر آپ نے کیوں گل افشانی فرمائی؟"

"نسرین تم یہاں سے جاؤ اور اپنا کام کرو!"

"کام کیا خاک ہوگا مجھ سے اب، گھر میں قدم رکھتے ہی آدمی..... DISMOOD ہو جائے تو گھر کا ہے کو ہوا، اس سے تو جہنم اچھا!"

"تو دہیں جا رہو، منع کس نے کیا ہے آپ کو! کس نے تمہیں سر پر بٹھا رکھا ہے!"

"جی ہاں!" نسرین منہ بنا کر اپنے کمرے میں جا دبکی۔ کچھ دیر بعد جب وہ کھانے کی میز پر بیٹھی تو ایک بار پھر اس نے وہی موضوع چھیڑ دیا۔

"بھابی! آج کوئی آیا تھا؟"

"ہاں حامد آیا تھا!"

"حامد بھائی میرے کمرے میں گئے تھے؟"

"شاید، مجھے یاد نہیں ہے!" بھابی چپ ہو گئیں لیکن تو ڑا ہی وہ چونک پڑیں۔

"اچھا تو تم اپنی تصویر کا کھوج لگا رہی ہو، میں اب سمجھی!"

"حامد بھائی نے نہیں لی ہوگی لیکن کوئی تو میری تصویر اٹھا لے گیا ہے!"

"ہو سکتا ہے لیکن تمہارے کمرے میں کوئی گیا ہی نہیں، حامد آیا تھا، وہ شاید اخبار لینے گیا تھا۔ لیکن حامد ایسی حرکت نہیں کر سکتا، اور ہاں اُن کا نوکر آیا تھا، کیا نام ہے اُس کا؟"

"رشید"

"ہاں رشید آیا تھا۔ جمال آپا نے دس روپے منگوائے تھے!"

"اور کوئی؟"

"اور تو کوئی نہیں آیا!"

"پھر تصویر کہاں گئی بھابی!"

"تمہارے بھائی نے کھو جانے کے خیال سے کہیں اٹھا کر نہ رکھ دی ہو!"

"ہو سکتا ہے بھائی جان نے کہیں رکھ دی ہو!"

کچھ دیر بعد بھائی جان آئے تو نسرین نے پوچھا۔

"وہ میری تصویر آپ نے لی تھی؟"

"جی وہ آپ کی کون سی تصویر؟" بھائی جان مذاق پر آمادہ تھے۔

"اُف فوہ!" نسرین جھنجھلائی۔

"کون سی تصویر بھئی!"

"وہ جو اتوار کو میں نے کھنچوائی تھی!"

"وہ تصویر میں نے نہیں لی!"

"میرے اللہ! پھر وہ تصویر کہاں گئی؟"

"تم کہیں رکھ کر بھول گئی ہوگی!"

"میں کالج جاتے ہوئے میز پر ڈال گئی تھی!"

"کوئی جیب میں ڈال لے گیا ہوگا!"

"آپ ہی نے چھپائی ہے پھر تو!"

"میں تمہارے کالج جانے سے پہلے جا چکا تھا۔ بھلا میں نے تصویر کیونکر چھپائی ہے؟"

"پھر کہاں گئی؟"

"اللہ بہتر جانتا ہے!"

"آپ نے نہیں لی، بھابی نے نہیں دیکھی، حامد بھائی آئے تھے وہ میرے کمرے میں نہیں گئے، جمال آپا کا نوکر رشید آیا تھا، اُس نے نہیں لی۔ پھر کون لے گیا ہوگا بھابی، اور کوئی تو نہیں آیا تھا؟"

"اور کون آ سکتا ہے گھر میں، تم ہوش میں ہو؟" بھابی نے تیور بدلے۔

"تیلو آئی تھی؟"

"نہیں"

"ستابی؟"

"نہ رتابی بیگم آئیں نہ جیلانی خانم تشریف لائیں!"

"آپ کیوں منہ جلا رہی ہیں اپنا، میں نے آپ کو تو کچھ نہیں کہا ہے!"

"مجھے کیا پڑی ہے جو تمہاری کسی چیز کو ہاتھ لگاؤں!"

"آپ کو اس لئے بُرا لگا نا کہ میں نے حامد بھائی کا نام لیا ہے!"

"میرا بھائی ہے تم اُسے بُرا کہو گی تو کیا میں تمہارا منہ میٹھا کروں گی؟"

"آپ تو اپنے بھائی کا منہ میٹھا کریں، کسی سے آپ کو کیا غرض، ہم آپ کے کون ہوتے ہیں!"

"آپ کیسے چپ بیٹھے اپنی بہن کی بکواس سنتے رہتے ہیں!" بھابی نے اپنے شوہر کی خبر لی۔

"جی ہاں ہم کچھ کہتے ہیں تو بکواس ہوتی ہے آپ کے منہ سے تو پھول جھڑتے ہیں!" نسرین نے کہا۔

"نسرین!" بھائی جان نے سختی سے کہا۔

"آپ تو بس اشارہ پاتے ہی آپکل پڑے MOST OBEDIENT SERVANT" نسرین اپنے بھائی سے اُلجھ پڑی۔

"بکواس بند کرو بس!" بھائی جان نے نسرین کو ڈانٹا، وہ اُٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"حامد بھائی ذرا آئیں تو ایسی خبر لوں گی کہ یاد کریں گے۔ خدا جانے بھائی جان کی قسمت کو کیا ہوا تھا کہ یہ گلے پڑی ہیں، نہ صورت اچھی نہ سیرت اچھی نہ گھرانہ اچھا، دو کوڑی کے لوگ!" نسرین اپنے کمرے میں بیٹھی بہت دیر تک کڑھتی رہی۔ اگر اُس نے حامد کا نام لیا تھا تو ایسا کیا جرم کیا تھا کہ بھابی کے منہ کا ذائقہ ہی بدل گیا ——— کچھ دیر تک وہ اکیلی بیٹھی بھابی کو خراجِ تحسین پیش کرتی رہی اور پھر حامد کی غائبانہ تعریف و توصیف کا سلسلہ رہا ———

"بڑے ویسے لوگ ہیں، میں تو قدم قدم پہ اُن کا ساتھ دوں اور یہ ذرا سی بات پر پیچھے جھاڑنے لگیں!" نسرین بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی اور بستر پر دراز ہو گئی۔

"آخر حامد بھائی کو میری تصویر اُڑانے کی کیا ضرورت تھی، کہیں . . . ."

بستر پر لیٹے ہوئے نسرین نے سوچا اور پھر خیال ادھورا رہ گیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ — کہیں . . . ." نسرین نے ایک لمحے کے لئے چاہا کہ یہ خیال اُس کے ذہن سے نکل جائے۔

"چلو اب سو جائیں بہت دیر ہو چکی" اُس نے اونچی آواز سے کہا وہ اپنے اس ادھورے خیال سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

"بہت بُری بات ہے، یہ کونسی اچھی رہتی ہیں میرے ساتھ جوان کے بھائی مجھے پھولوں میں تولیں گے!" نسرین سوچتے سوچتے سو گئی۔

---

صبح آٹھ بجے بھائی جان کے دوست حشمت نے آواز دی، وہ روزانہ دفتر جاتے ہوئے اسکوٹر پر ادھر آتا۔ اور پھر دونوں آفس روانہ ہو جاتے اور دونوں ساتھ ہی واپس آتے۔ دونوں کی دوستی بظاہر تو اس بنا پر تھی کہ دونوں ایک ہی آفس کی ایک ہی برانچ میں کام کرتے تھے لیکن اس آمدورفت کے پس پردہ کچھ اور تھا بھائی جان سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں لیکن نسرین اس راز سے واقف تھی۔ حشمت کی آنکھوں نے یہ راز فاش کر دیا تھا اور جب نگاہوں نگاہوں میں باتیں ہوتی ہیں تو پھر کوئی تیسرا مشکل ہی سے کچھ سمجھ پاتا ہے۔ حشمت تُلا ہوا تھا لیکن نسرین نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

حشمت نے ایک آواز دی، اسکوٹر کھڑا کیا اور اندر آ گیا۔

"بس دو منٹ، چل رہا ہوں" نسرین کے بھائی جان نے کہا۔

"آپ کی وہ کہاں ہیں؟" حشمت نے پوچھا۔

"اندر، کچن میں"

"بھابی! چائے ملے گی؟" حشمت کچن کی طرف چلا۔ نسرین کتابیں لئے ہوئے اپنے کمرے سے نکلی وہ کالج جا رہی تھی، حشمت پر اُس کی نظر پڑی تو وہ خواہ مخواہ پوچھ بیٹھی۔

"کیوں جناب! یہ دھندا آپ نے کب سے شروع کر دیا ہے، میری تصویر کیوں اُڑا لے گئے آپ؟"

"ہمارا بس چلے تو ہم جناب ہی کو اُڑا لے جائیں!" حشمت نے آہستہ سے کہا اور کچن کی طرف نکل گیا۔ اُس نے پہلی بار نسرین کو اتنی بے تکلفی سے مخاطب کیا تھا۔ نسرین نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے کہیں سُن نہ لیا ہو اور پھر وہ چُپ چاپ وہاں سے کھسک گئی۔ خواہ مخواہ حامد اور حشمت کے متعلق سوچتی ہوئی جیسے ترازو میں کوئی دو چیزیں تول رہی ہو۔

حامد ——— بھابی کا چھوٹا بھائی!

حشمت ——— بھیا کا دوست!!

تیسرے دن حامد گھر آیا تو بھابی نے پوچھا۔

"کیوں حامد تم اُس دن آئے تھے تو نسرین کی تصویر اُٹھا لے گئے تھے؟"

"جی!" حامد چونکا۔ نسرین نے سُنا تو اپنے کمرے کے دریچے سے سر باہر نکالا، حامد ابھی صحن میں تھا۔

"نسرین کی تصویر تم اُٹھا لے گئے تھے؟"

"نہیں، آپ سے کس نے کہا ہے؟"

"نسرین کی ایک تصویر کھو گئی ہے وہ میرے سر ہو رہی تھی کہ شاید تم لے گئے ہو"

"میں نے آپ سے کب کہا تھا کہ حامد . . . ." نسرین بل کھاتی ہوئی کمرے سے نکلی لیکن وہ پوری بات نہ کہہ سکی۔ وہ حامد کو حامد بھائی کہا کرتی تھی۔

"میں نے کب کہا تھا کہ انہوں نے میری تصویر لی ہے" نسرین نے بات پوری کر دی۔

"اس دن تو تم لوگ بہر حال بہت اچھل رہی تھیں!" بھابی نے چڑایا۔

"آپ کی آپا نے تو میری ناک میں دم کر دیا ہے، سچ کہتی ہوں، میں کچھ کہتی ہوں، یہ کچھ بکتی ہیں!" نسرین نے حامد سے صفائی دی۔

"جی ہاں قصور تو میرے دماغ میں ہے تم کربلا کی بات کرتی ہو تو میں بھی ہوں پانی پت کا تذکرہ ہے!" بھابی نے طنز کیا۔ حامد بے چارہ مسکرا کر چپ ہو رہا۔

"بھابی کچھ کہیں میں نے آپ پہ الزام نہیں لگایا ہے" ایک بار پھر نسرین نے حامد سے کہا۔

"الزام لگانے میں کون سی کسر رہ گئی تھی!" بھابی پھر بولیں۔

"یہ تو یوں ہی کہتی رہتی ہیں" نسرین نے دھیرے سے کہا۔ حامد پھر بھی چپ رہا۔ نسرین حامد سے اس انداز سے مخاطب تھی جیسے حامد کو اس کی ہر بات کا یقین ہو اور اپنی بہن کی باتوں کو وہ سن ہی نہ رہا ہو——

---

"او ہو نسرین! تم کدھر بھول پڑیں؟" حامد کی چھوٹی بہن گوہر جیسے چیخ پڑی۔ نسرین اچانک کالج سے چلی تو اپنی بھابی کے میکے جا پہنچی —— حامد کے گھر جہاں وہ کبھی کبھار ہی جاتی تھی۔

"ارے میں آج کوئی نئی آئی ہوں جو تمہیں اتنی حیرت ہوئی!"

"نئی تو نہیں آئی ہو مگر..."

"چلو چلو اب آنے جانے کا تذکرہ رہنے دو!" نسرین نے گوہر کی بات کاٹی۔ نسرین اپنی بھابی کے میکے مہینوں کے بعد گئی تھی اور اس سے پہلے وہ تنہا کبھی نہیں گئی تھی۔

"آج تم آئیں کیسے؟ کوئی خاص بات تو نہیں ہے نا؟"

"تم سناؤ، خیریت سے ہو نا؟"

"کیا مقصد پایا ہے ہم نے بھی، نسرین ہماری خیریت پوچھنے آئی ہیں"

"مجھے فرصت ہی کہاں نصیب ہوتی ہے جو میں روز آیا کروں"

"ایسے کہہ رہی ہو جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں، کیوں؟"

"بھابی میری رپورٹ دیا کرتی ہوں گی آپ لوگوں کو!"

"آپا تمہارے لینے میں نہ دینے میں، اُن کا نام کیوں لیتی ہو"

"تمہیں ابھی معلوم ہی کیا ہے تم تو سمجھتی ہو سارے زمانے کی نیکیاں ختم ہو گئیں تمہاری آپا پر!"

"ہم خدانخواستہ ایسا سمجھیں لیکن آپا میں ایسی کوئی برائی بھی نہیں ہے، ایسی سیدھی سادی بھابی ملی ہے تمہیں..."

"سیدھی سادی ہیں [illegible]"

"بات تک تو سیدھی کرتی نہیں آتی تمہیں! [illegible] پڑھنے جاتی ہو یا کسی..."

"تم کیا دو قدم بڑھ جاتا [illegible] میں سے کچھ تو خبر آئے تھے میرے!"

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ نہیں آئے تھے [illegible] ہو کچھ تو بیں سے سو خبر آئے تھے تمہارے لیے!"

"اچھا بھئی! ہم چلے تم تو بالکل مرنے مارنے پہ [illegible]" نسرین نے موضوع بدلنے کی بھرپور کوشش کی۔

"مرنا مارنا تو آپ کا پیشہ ہے!" گوہر پھر بھی نہ چوکی اور نسرین [illegible] گئی۔

"ارے؟" حامد مکان میں داخل ہوا۔

"آداب عرض!" نسرین نے خود کو سنبھالتے ہوئے حامد کو سلام کیا۔

"معلوم ہوتا ہے چاند ستاروں نے اپنے راستے تبدیل کر دیئے ہیں!" حامد کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"جی نہیں، نسرین اپنا راستہ بھول گئی ہیں!" گوہر بولی۔ نسرین نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"چلو، اللہ کا شکر ہے ہنسی آئی تو!"

"گوہر! تمہیں آج کیا ہو گیا ہے؟" نسرین حامد کی موجودگی کی بنا پر گفتگو کا انداز بدل رہی تھی۔

"مجھے تو کچھ نہیں ہوا، ہاں تمہیں کچھ ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جبھی سب [illegible] بھول گئی ہو"

"میرے اللہ! اب بس بھی کرو، کب تک راستے کی گردان کرتی رہو گی!" نسرین نے ہتھیار ڈال دیئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہ لوٹ آئی۔ گھنٹوں وہ گوہر کے متعلق سوچتی رہی۔ ابھی بھابی کے میکے میں اس کی خیر مقدم کا چرچا ہو رہا تھا کہ ایک بار پھر وہ اچانک کالج سے وہاں جا دھمکی —— گوہر کالج سے آئی ہی تھی۔ برقع اُتار کر وہ پلٹی تو صحن میں آتے نسرین نظر آئی۔

"اللہ اکبر! ہمارے خارجی تعلقات اب کچھ بہتر ہوتے جا رہے ہیں!"

"پھر تم نے، گوہر..."

"اچھا اچھا بھائی! اب نہیں بولیں گے مگر یہ [illegible] بتا دو ہمارے گھر کے نصیب کیونکر جاگ اُٹھے ہیں؟"

[illegible] کے قریب آگئی ہیں؟"

"[illegible] پڑھ رہی ہو نا؟" گوہر نے [illegible] سے پوچھا۔

"ماشاء اللہ!" نسرین نے [illegible] سے کہا جیسے اُس کے دل [illegible] تک [illegible] دیکھی اُس کی حالت [illegible] کے سامنے [illegible] کا تذکرہ آگیا ہو۔

"[illegible] ہو گئیں، کیا ہوا تمھیں؟" گوہر نے [illegible]

"کچھ نہیں۔" نسرین سوچ رہی تھی گوہر کو یہ خیال آیا بھی کیسے؟ کوئی [illegible] کیوں دیکھا۔

"کچھ تو سوچ رہی ہو!"

"میں سوچ رہی ہوں، گوہر اتنی بڑی ہوگئی اسے بات کرنا کب آنے لگا!"

"اچھا تو تمھیں گوہر کی فکر ہوگئی ہے، میری سرپرستی کب سے فرمانے لگی ہیں آپ؟" گوہر نے کہا۔

"چلو تمھیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔"

"تمھاری قسم جو اس وقت مذاق سوجھا ہو مجھے!"

"پڑھائی کیسے چل رہی ہے؟" نسرین نے فوراً موضوع بدل دیا۔

"ارے تم تو واقعی سرپرستی فرمانے پر تُلی بیٹھی ہو، بابا کسی یتیم خانے کا رُخ کرو!"

"تم بھی تو یتیم ہو!" نسرین نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔

"یتیم تو ہوں لیکن باپ اتنا چھوڑ گیا ہے کہ ڈٹ کر کھا رہی ہوں، اپنے بھائی کی روٹیاں تو نہیں توڑ رہی ہوں نا!" گوہر نے نسرین پر چوٹ کی۔ نسرین کی ساری ضروریات کی تکمیل اُس کے بھائی ہی کے ذمے تھیں۔ نسرین کا چہرہ ایک بار سُرخ ہوگیا لیکن اُس نے ایک بار پھر کوشش کی کہ بات نہ بگڑے۔

"کون کسی کی روٹی توڑتا ہے گوہر! سب کو اللہ روزی دیتا ہے۔"

"روزی تو اللہ ہی دیتا ہے لیکن کسی کو عزت سے اور کسی کو ذلیل کر کے!" گوہر نے پھر چوٹ کی۔

"اُف فوہ! تم تو بالکل عالم فاضل ہوگئی ہو!"

"آپ کے مقابلے میں بھلا ہم کیا؟"

"کون کہتا ہے؟" نسرین اب بھی اپنے جذبات کو پی رہی تھی۔

"وہ تم کہتی ہو!"

"ارے!"

"ارے دور سے کیا؟ آپ کو تو اپنی قابلیت پر بڑا ناز ہے نا، آپ کے پلّے کا کوئی اس ملک میں پیدا ہی نہیں ہوا!" گوہر نے نسرین کے احساسِ برتری کو نوازا۔

"تم سے یہ کس نے کہہ دیا گوہر؟" نسرین نے بہت پیار سے پوچھا۔

"اخباروں میں چھپ گیا، ریڈیو سے نشر ہوگیا ہم نے تو یہی سُنا ہے کہ آپ پیغمبری کا دعویٰ فرمانے والی ہیں لیکن مسئلہ ابھی زیرِ غور ہے۔"

نسرین نے پھیکا سا قہقہہ لگایا۔

"لیکن نسرین! ایک بات ہماری سمجھ سے باہر ہے۔"

"کون سی بات؟"

"آپ نے کبھی ہم کو گدھا جان کر گھاس تک نہ ڈالی، آپ ہمارے ہاں کیوں کر قدم رنجہ فرمانے لگیں، نہ ہمارا گھر ٹھکانے کا، نہ ہمارا خاندان ٹھکانے کا، نہ ہم کسی کام کے، آپ کیسے مہربان ہو رہی ہیں ہم پر؟" گوہر نسرین کی پچھلی باتوں کو دُہرا رہی تھی۔

"میں نے یہ کب کہا ہے؟"

"کہا نہیں تو ارشاد فرمایا ہوگا!"

"بھابی جان نے تم سے میرے متعلق جانے کیا کیا کہہ رکھا ہے۔"

"خدا کرے جو آپا آپ کے متعلق ہم سے کچھ کہیں، انھیں تو اپنے مقدر پہ ناز ہے کہ کیسے اونچے گھرانے میں بیاہی گئی ہیں، کیسا شوہر پایا ہے اور کتنی اچھی نند ہو تم! بھلا وہ تمھاری شکایت کیوں کرنے لگیں۔"

نسرین نے کوئی جواب نہ دیا جیسے ان الفاظ سے اُس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ حامد موجود نہیں تھا۔ وہ اُس کا انتظار کر رہی تھی ——— لیکن گوہر کے جملوں کی تاب لانا بھی تو اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ اُس نے فوراً پھر آنے کا بہانہ تلاش کیا۔

"تمھارے کالج میں انگلش کے نوٹس لکھوا رہے ہیں؟"

"ہاں ہاں!"

"مجھے ایک دو دن کے لئے اپنی نوٹ بک دے سکتی ہو؟"

"کیوں؟"

"ہمارے کالج کا حال تو تمھیں معلوم ہی ہے، میں بہت پریشان تھی کہ اس سال اسٹڈی کیسے ہوگی؟"

"لیکن تم تو ہمارے کالج کا مذاق اُڑاتی تھیں!"

"وہ تو میں یونہی کہتی تھی، تمھاری نوٹ بک میں ایک دو دن میں

[illegible]

"اچھا بے چارہ"

نسرین دیر تک نسرین کی باتیں یاد آتی رہیں۔ لیکن ان کے آ جانے سے بھابی سے محبت کی پینگیں بڑھانے لگی۔ گھر کے کام کاج میں وہ [illegible] بھابی کا ہاتھ بٹاتی تھی اور بھابی کے ننھے فلادر کو بہت جلد سنبھالا تھا لیکن [illegible] میں تبدیلی پیدا ہوئی، کالج سے واپس آتے ہوئے وہ فلادر کے لئے [illegible] لے آتی اور شام کو جب بھابی کچن میں مصروف ہوتیں، نسرین فلادر کو اپنے کمرے میں بٹھائے رکھتی، اُس سے دنیا بھر کی باتیں کرتی، اُسے پریوں اور شہزادوں کی کہانیاں سُناتی، اُس کے ساتھ کھیلتی، اُسے کاغذ وغیرہ کے کھلونے بنا دیتی۔ فلادر نسرین سے قدرے ڈرا کرتا تھا لیکن بہت جلد وہ نسرین سے گھل مل گیا، وہ روزانہ اُس کے کالج سے آنے کا انتظار کرتا اور جیسے ہی وہ قدم رکھتی وہ دوڑ کر اپنی ٹافی وصول کر لیتا۔

---

دوپہر کا وقت تھا، نسرین کالج سے لوٹی تو بھابی سر باندھے ہوئے پڑی تھیں، درد اس قدر تھا کہ سر اُٹھایا نہ جاتا تھا، نسرین نے بام سے مالش کی اور فلادر کو کھانا کھلایا۔

"جب آپ کو اتنی تکلیف تھی تو کھانے پکانے کی کیا ضرورت تھی، میں آکر پکا لیتی" اُس نے بھابی سے کہا۔

"میں نے سوچا بچہ بھی بھوکا رہے گا تم بھی بھوکی آؤ گی"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں بھابی!" نسرین شام تک بھابی کے سرہانے بیٹھی کچھ کچھ دیر کے بعد سر دباتی رہی۔ چھ بجے تو وہ اُٹھی۔

"بھائی جان کو گھر کی ذرا سی فکر نہیں رہتی۔ آپ نے اُنھیں بالکل نکما بنا دیا ہے بھابی!"

"آجائیں گے"

"وہ حشمت کی دُم میں بندھے ہوئے کہیں گھوم رہے ہوں گے اُنھیں کیا، گھر میں کوئی جئے یا مرے!"

نسرین کُڑھتی رہی۔ ساڑھے چھ بجے حامد پہنچا۔

"اچھا ہوا آپ آگئے آپ بھابی کے پاس بیٹھیں میں ڈاکٹر سے دوا لے آؤں" نسرین نے کہا۔

"حامد لے آئے گا" بھابی نے روکا۔

"ارے واہ!"

"آپ [illegible]

[illegible]

"ابھی آئی ہوں بھابی [illegible] آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس کا [illegible]

"آپ یہاں بیٹھیں میں [illegible] دوں گی اور آپ کو بھی" نسرین نے ایک [illegible] وہ کسی مروت نہیں ——— حامد نہیں ——— [illegible]

——— وہ جب دوا لے کر واپس ہوئی تو اُس کے [illegible] سے باتیں کر رہے تھے۔

"آپ تشریف لے آئے ماشاءاللہ!"

"جی ہاں"

"جی ہاں، وہ آپ کو گھر کی فکر ہے نہ بیوی کی فکر [illegible] دو کوڑی کا اسکوٹر کیا ہاتھ لگ گیا ہے ہماری مصیبت ہو گئی ہے۔ کبھی تو [illegible] دیکھئے، دوپہر سے بھابی کا بُرا حال ہے۔ ابھی تک آپ کا انتظار [illegible] کر رہی تھا لانی گئی تھی" نسرین بھائی جان سے کہہ رہی تھی لیکن حامد کو [illegible]

"اب دوا لے آئی ہو تو جلدی سے پلا دو" بھائی جان نے کہا۔

"جلدی سے پلا دو، آپ کا دل بڑا سخت ہے، آپ کو کسی کی تکلیف کا احساس تک نہیں ہوتا"

"اچھا اب دوا پلا کر تم چائے بناؤ ہم سب کے لئے"

"دوا تو پلا رہی ہوں، چائے بھی بناؤں گی لیکن آپ کو چائے نہیں ملے گی!"

"میں بنا دیتی ہوں" بھابی نے منہ پر سے چادر ہٹائی۔

"چلئے چلئے آپ لیٹی رہیں، آپ ہی نے تو بگاڑا ہے بھائی جان کو" نسرین ماننے کو تیار نہ تھی۔

"اچھا آج ہم چائے بنائیں گے!" بھائی جان نے [illegible]

"آپا میں چائے بنا دوں؟" حامد نے نسرین کی بھابی سے پوچھا۔

"جی نہیں" نسرین نے فوراً ٹوک دیا۔

"تمہارے بھائی جان کو کہیں غصہ آگیا [illegible] خراب رہے گا" بھابی نے سمجھایا۔

"غصہ کیوں آنے لگا" [illegible]

"گوہر نے کہا ہے کل [illegible]

[illegible]

"[illegible] نہیں جانتی گی
[illegible] انہیں پریشان کرتا
[illegible]"

"[illegible]"

"میری طرف سے [illegible] بہت بہت شکریہ [illegible]!"

[illegible]

[illegible] بھائی جان [illegible] نسرین [illegible] ہنس پڑی۔

"نہیں جا رہی چائے میں پسینے پسینے ہو گئے آپ؟"

"نہیں چائے [illegible] کہ [illegible] اس کا مزہ یاد رہے گا!"

"جی ہاں!" نسرین نے قہقہہ چھوڑ دیا۔

کچھ دیر بعد حامد جانے لگا تو نسرین نے پیچھے سے ادھر اُدھر دیکھا کہ کہیں بھائی جان موجود نہیں اور اصرار کیا۔

"بس ابھی سے پھر تو بھنگے، کھانا کھا کر جائیے گا!"

"کھانا اپنے بھائی لائق پکا ہے نسرین، کم پڑ جائے گا" بھابی نے دھیرے سے ٹوکا۔

"مجھے بھوک نہیں بھابی، اگر بھوک لگی بھی تو دو ایک روٹیاں ڈال لوں گی"

نسرین بھابی سے کہہ رہی تھی لیکن اس کی نگاہیں حامد پر مرکوز تھیں۔

"بھئی تکلف نہ کرو" حامد نے کہا

"آپ سے کاہے کا تکلف!" نسرین نے اتنے دھیرے سے کہا کہ بھابی بھی سن سکیں۔

"نہیں نہیں، میں کھانا دیر سے کھاتا ہوں" حامد گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ نسرین نے اُسے بھر پور نگاہوں سے دیکھا۔

"میں جا رہا ہوں آپا" حامد چل پڑا۔ نسرین دھیرے سے اُس کے پیچھے چلی، دروازہ بند کرنے، جیسے ہی وہ دروازے میں پہنچا نسرین قدم بڑھا کر اُس سے قریب ہو گئی۔

"آپ بڑے ہی ویسے آدمی ہیں!" نسرین نے کہا۔

"مجھے اچھا کس نے کہا ہے!" حامد دروازے سے نکل گیا۔

"پھر آپ کب آ رہے ہیں؟" نسرین نے رُکتے رُکتے پوچھا، حامد سن نہ سکا [illegible] دروازہ [illegible] وہ [illegible] اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب روئے ——

[illegible] وہ بھابی کے پاس جا بیٹھی۔

"نسرین تمہارے بھائی کہاں ہیں؟" بھابی نے کہا۔

"نہا رہے ہیں" نسرین کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔

"مجھے ایک بات بتاؤ گی؟"

"جی" نسرین کا دل اُچھلنے لگا۔

"سچ سچ!"

"ہاں" نسرین گھبرا گئی تھی۔

"حامد نے تم سے کچھ کہا ہے؟"

"وہ کیا کہیں گے" نسرین کے پسینے چھوٹ گئے۔

"تم حامد سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"نہیں" نسرین کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔

"حامد سے تمہارا کچھ کہنا بیکار ہے"

"کیوں؟" نسرین کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی، ورنہ ممکن تھا بھابی اُسے سمجھاتیں۔ نسرین خود اپنے ہی سوال کا جواب تلاش کرتی رہی۔ رات کو اُس نے کھانا کھایا اور نہ ساری رات سو سکی۔ اُس کے ذہن میں سوالات کا ایک سلسلہ تھا اور کسی سوال کا قطعی جواب وہ تلاش نہ کر سکی۔

بھابی کو کیوں کر اندازہ ہوا کہ نسرین حامد کی طرف مائل ہے؟

بھابی نے اُسے کیوں منع کیا؟

اُس کا حامد سے کچھ کہنا بیکار کیوں ہوگا؟

کیا حامد کسی اور کو چاہتا ہے اور بھابی اس راز سے واقف ہیں؟

کیا بھابی یہ نہیں چاہتیں کہ وہ حامد کا خواب دیکھے؟

صبح جب نسرین جاگی، حشمت آ چکا تھا اور حسب عادت بھائی جان بجلت تمام ٹائی باندھ رہے تھے۔ حشمت صحن میں کھڑا چائے پی رہا تھا ——
نسرین دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی اپنے کمرے کے دروازے میں پہنچی اور حشمت کو دیکھ کر لوٹ گئی۔

"اب سو کر اٹھی ہیں آپ؟ آپ کے امتحان میں کتنے دن ہیں؟" حشمت نے اونچی آواز سے کہا اور پھر دروازے سے جھک کر اُس نے دھیرے سے کہا۔

"آپ قیامت سے کم نہیں ہیں!"

"آپ انتہائی بدتمیز آدمی ہیں!" نسرین نے اُسے جھڑک دیا، حشمت جھجک کے ایک طرف ہو گیا۔ جیسے ہی وہ بھائی جان کے ساتھ باہر نکلا نسرین بھابی کے پاس جا دھمکی۔

"بھابی!" اُس کا موڈ خراب تھا۔ بھابی چونکیں۔

"کیا ہوا؟"

"بھائی جان سے کہئے اپنے حشمت کو گھر میں نہ بلایا کریں بہت بدتمیز ہے۔"

"... ہاں کیا تو حشمت بھائی کی عادت ہے نسرین! پھر انھوں نے کیا بات کہی؟"

"آپ نے شاید نہیں بھابی، دروازے سے منہ ڈال کر کہہ رہا تھا آپ [illegible] سے کم نہیں ہیں۔ ایک دن اور اُس نے کہا تھا چلو ابس چلتے تو آپ کو اُڑا لے جائیں، میں کسی دن جوتا اُٹھا کر اُس کے منہ پر دے ماروں گی آپ بھائی جان سے کہہ دیں۔"

"میں ضرور کہوں گی!" بھابی نے وعدہ کیا۔

نسرین کالج نہیں گئی ---- وہ خاموش ابھی ہوئی تھی، دوپہر کو کھانے پر بھابی نے کہا۔

"تم اتنی DIS MOOD کیوں ہو نسرین! حشمت بھائی نے سچ ہی تو کہا ہے۔"

"بھابی! میرے سامنے اُس کمینے کا نام نہ لیجئے!"

"ارے ارے، تم تو بے حد غصے میں ہو حشمت بھائی بہت اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"جی ہاں، بہت اچھا خاندان ہوگا۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں، اُن کی امّی کو تو تم ابھی طرح جانتی ہو ابھی پچھلے ہفتے اُنھوں نے مجھے اور تمہارے بھائی جان کو گھر بلوایا تھا حشمت بھائی کے لئے تمہارا رشتہ مانگنے کے لئے۔"

نسرین نے بھابی کو گھور کر دیکھا۔

"تم بھی تو ایک دو بار اُن کے گھر جا چکی ہو، وہ حشمت بھائی کا گھر تو نہیں ہے اُن کے چچا کا گھر ہے لیکن رکھ رکھاؤ سے بہت اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں [illegible] بھائی کی موت کے بعد اپنی بھابی اور بھتیجے کو اس طرح رکھا کہ نہ حشمت بھائی کو محسوس ہوا کہ اُن کے باپ مرگئے ہیں اور نہ اُن کی امّی کو کوئی تکلیف ہوئی۔ حشمت بھائی کا مکان بن رہا ہے دو تین مہینوں میں تیار ہو جائے گا، حشمت بھائی وہاں جا رہیں گے اور اُن کے ساتھ اُن کی امّی اور...." بھابی رک گئیں۔

"اور کیا؟"

"اور تم!"

"یہ نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں ہو سکتا بھابی!"

[illegible]

سکون سے رہو گی، تنخواہ اچھی ہے، [illegible]

دوست ہیں کیونکہ بہت اچھا ہے [illegible] پسند کرتا ہے۔"

"چھوڑیئے بھابی! مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے۔"

"تمہارے بھائی جان تو اُن کی امّی سے ہاں [illegible] میں سب کچھ طے ہو جائے گا۔"

"بھائی جان سے آپ صاف صاف کہہ دیں [illegible] ایم اے کروں گی پہلے۔"

"شادی کے بعد کر لینا!"

"میں کرنا ہی نہیں چاہتی!"

"کنواری رہو گی؟"

"جی ہاں!"

"بُری بات ہے!"

"کوئی بُری بات نہیں ہے۔ آپ بھائی جان سے کہہ دیں کہ اگر انھوں نے اپنی چلائی تو بُرا ہوگا!"

"آخر کیوں؟"

"وہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔"

"دوسرا ڈھونڈ دیں؟"

"کیا آپ لوگوں کو میں بوجھ لگ رہی ہوں؟"

"خدا نہ کرے تم بُری لگو، لیکن حشمت بہت اچھا ہے نسرین!"

"آپ اپنی بہن سے کرا دیں۔"

"مگر حشمت بھائی نے تمہیں پسند کیا ہے۔"

"ہوتا کون ہے وہ پسند کرنے والا [illegible]

[illegible]

[illegible] تیار ہو چکے تھے اور [illegible] نسرین بھر گئی۔

"بھائی! آپ [illegible]"

"[illegible] نسرین"

[illegible] نسرین [illegible] گئی۔

---

جب حامد کئی دن تک نہ آیا تو نسرین کو اندیشہ ہوا کہ شاید بھابی نے اسے آنے سے منع کر دیا ہو۔ وہ اور [illegible] کے بہانے گئی بھی تو حامد نہ مل سکا۔ بس اتنا ہی [illegible] اور حشمت کے آنے سے پہلے دفتر جانے کے لئے تیار [illegible] حشمت کے اسکوٹر کی آواز پر وہ فوراً گھر سے نکل جاتے تاکہ حشمت اندر آ جائے۔ دو تین بار بھابی نے حشمت کے متعلق گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی تو نسرین بگڑ گئی۔

"بھابی! آئندہ سے خدا کے لئے حشمت کا نام نہ لیں ورنہ میں یہ سمجھوں گی کہ میں آپ لوگوں پر بوجھ بن گئی ہوں" نسرین نے آخر جھنجھلا کر کہا۔ بھابی چپ ہو گئیں۔ سہ پہر کو حامد آیا۔ نسرین پھول کی طرح کھل اٹھی۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ——— بھابی چائے بنانے کچن میں پہنچیں تو نسرین بھی ساتھ گئی۔

"بھابی! انگریزی کے ایک دو سبق میری سمجھ میں نہیں آ رہے ہیں میں حامد بھائی سے سمجھ لوں؟"

"تمہارے بھائی جان کے آنے کا وقت ہو رہا ہے نسرین! پھر کبھی سمجھ لینا" بھابی نے ٹال دیا۔ نسرین جل کر رہ گئی۔

"یہ کیوں رقیب روسیاہ بن رہی ہیں!" نسرین سوچتی ہوئی چپکے سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے چائے نہیں پی ——— رات کھانا بھی نہ کھایا ——— وہ رات گئے تک نیا [illegible] سے الجھی رہی۔

"بھابی سوچتی ہوں گی میرے ماں باپ ہیں، نہ بھائی کے پاس کچھ ہے، نہ باپ نے کچھ چھوڑا۔ ایسی لڑکی سے کیا فائدہ ہوگا، اپنے بھائی کے لئے کماتی کی لڑکی ڈھونڈیں گی تاکہ گھر بھر لے۔ اسی لئے تو بھابی کی لو میں لگی رہتی ہیں" ——— بہت دیر تک وہ [illegible] بھابی کو [illegible] کرتی رہی اور پھر حامد کا اس نے [illegible] ———

[illegible]

[illegible]

لگی اور حامد کے تصور سے اُسے کوفت ہونے لگی۔

---

ایک دوپہر جب وہ کالج سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چلی تو اُسے حامد سائیکل پر نظر آیا۔ وہ دوسری جانب سے آ رہا تھا اور اُسے دیکھتا ہوا وہ برابر سے نکل گیا۔ نسرین رُک گئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا حامد اُسی رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ وہ کھڑی دیکھتی رہی۔ کچھ دُور جا کر حامد کے جی میں نہ جانے کیا آئی اُس نے گھوم کر دیکھا ——— نسرین کو کھڑی دیکھ کر وہ اس خیال سے پلٹا کہ شاید کچھ کہنا چاہتی ہو ———

"کیسے رُک گئیں آپ؟" حامد نے پوچھا۔

"یوں ہی" نسرین کے لبوں پر کلیوں کا معصوم تبسم تھا۔

"کام تھا؟"

"اُونہوں ہونہہ" نسرین نے ایک ادا سے کہا۔

"بس کے لئے کھڑی ہو، یہاں بس تو نہیں رُکتی۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"میں یہ سوچ کر پلٹ آیا کہ شاید آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں" حامد انتہائی بے نیازی سے روانہ ہونے کو تھا۔

"جی ہاں میں ہی کچھ کہنا چاہتی ہوں آپ کے تو زبان ہی نہیں ہے!" نسرین نے بل کر کہا۔

"جی؟" حامد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"ٹھیک کہا نا میں نے؟"

"میں سمجھ ہی نہ سکا آپ کیا کہہ رہی ہیں!"

"آپ تو آگے نکل گئے تھے پلٹ کر کیوں آئے پھر؟" نسرین نے سنبھل کر پوچھا۔

"اس لئے کہ شاید آپ کچھ کہنے کو رُکی ہوں"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، یہ تو آپ ہی بہتر جانتی ہیں!"

"میں تو سب ہی کچھ بہتر جانتی ہوں، آپ تو کچھ نہیں جانتے نا؟"

"میں واقعی کچھ نہیں جانتا!" حامد [illegible] تھا۔

"جب آپ کچھ نہیں جانتے تو تشریف لے جائیے!" نسرین نے [illegible] انداز سے کہا۔ حامد [illegible]

"[illegible]"

"[illegible]"

"آپ میری ۔۔۔۔ نسرین ہکلا گئی۔ [illegible] تصویر کے [illegible] یاد آتی ہو [illegible]

"آپ کو [illegible] صاف صاف کیوں نہیں کہتے یہ پہیلیاں [illegible] بھجوانی [illegible] نے کسی قدر جھنجھلا کر کہا۔

"آپ کے پاس میری ایک چیز ہے آپ کو یاد ہے ؟"

"میرے پاس آپ کی کوئی چیز نہیں ہے !"

"آپ جھوٹ بھی بولتے ہیں ؟"

"صرف عمل کے اعتبار سے گفتگو کرنی پڑتی ہے لیکن میرے پاس آپ کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"اچھا" نسرین جھنجھلا کر چل پڑی۔

حامد بھی روانہ ہو گیا۔ دو چار قدم چل کر نسرین پھر ٹھٹکی، اُس نے پلٹ کر حامد کو دیکھا وہ سائیکل پر چلا جا رہا تھا۔ وہ کھڑی اُسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔۔۔۔ بس اسٹاپ پر حسب معمول لڑکیوں کا ہجوم تھا اور اس ہجوم کی بناء پر نسرین کو بس پکڑنے میں اکثر دیر ہو جاتی، لیکن بس اسٹاپ پر آ کر رکنے والی ہر بس میں وہ سوار ہونے کی کوشش ضرور کرتی، لیکن حامد سے الجھ کر جب وہ بس اسٹاپ پر پہنچی تو بہت دیر تک اس انداز سے کھڑی رہی جیسے اُسے وہاں سے کہیں جانا ہی نہ ہو۔ جب وہ گھر پہنچی تو صحن میں حامد کی سائیکل دیکھ کر اُس کا حلق خشک ہو گیا۔ بھابی اُس کا انتظار کرتی تھک گئی تھیں اور کچن میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔ جیسے ہی فلاور کی نظر نسرین پر پڑی وہ لپکا۔

"آنٹی ٹافی !"

"اوہو! فلاور آج میں تمہارے لئے ٹافی لانا بھول ہی گئی !" نسرین کو اچانک یاد آیا۔ فلاور نے رونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اُس نے پرس سے چونی نکال کر اُسے تھما دی۔

"حامد ماما کے ساتھ سائیکل پر جا کے لے آؤ !" نسرین نے جھک کر فلاور کو چوم لیا پیار سے نہیں بلکہ عادتاً۔

"میری سمجھ میں اب بھی نہ آیا آپ وہاں کیا کہہ رہی تھیں ؟" حامد اچانک سامنے سے چہرے بھائی جان کے کمرے سے نمودار ہوا۔

"خدا کے لئے یہاں تو چپ رہو، یہ سُن لیں گی تو میری جان کو آ جائیں گی۔" نسرین نے جھنجھلا کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور کچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں بھابی بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔ نسرین نے پلٹ کر دیکھا جیسے ہی قدم رکھا اُس کی نظر میز پر [illegible] جہاں وہ تصویر موجود تھی ۔۔۔۔ نسرین کی وہی تصویر جو کھو گئی تھی ۔۔۔۔ [illegible] وہ اُسے دیکھتے ہی گھبرا گئی اور نظروں سے حامد کو دیکھا۔

"[illegible]"

[illegible]

"نہیں نسرین [illegible]"

"معلوم ہے تمہیں [illegible] ؟"

"نہیں نسرین [illegible]"

"بھابی آپا [illegible]" گیا تو انھوں نے چپکے سے دوپٹے کے پلو [illegible] ہونے لگی انھیں۔

"ابھی جا کر دیکھتی ہوں اُسے !" نسرین [illegible]

"بھابی آپا نے اُسے نکال دیا تھی، [illegible]"

"اللہ ! یہ نوکرانیاں کتنی جلدی بھاگ جاتی ہیں !" نسرین [illegible] گئی۔ نوکرانیوں کے جھنجھٹ سے کام ختم کرنے کو جی نہیں تھا ۔۔۔۔ [illegible] کافی چاہ رہا تھا۔

"آج تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی چلو منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو" بھابی نے کہا۔

"کھاؤں گی !"

"چلو پہلے کھانا کھا لو !"

"بھابی ! اب آپ میری جان نہ کھائیں، آدمی پڑھ پڑھ کر [illegible] پریشان کرنے لگے" نسرین نے بہت جلے بھنے انداز سے کہا۔

"ارے ! تم تو آج کاٹ کھانے دوڑ رہی ہو !"

"جی ہاں پاگل ہو گئی ہوں نا میں، کاٹ کھاؤں گی [illegible] گی !"

"تمہارا تو دماغ خراب ہو رہا ہے، میری بلا سے نہ کھاؤ !" بھابی کچن میں چلی گئیں اور نسرین نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا ۔۔۔۔ وہ جی بھر کے رونا چاہتی تھی لیکن روئے کیوں کر ۔۔۔۔ آدمی کو اپنے گریبان پر بھی تو [illegible]

## عالمِ خیال میں ـــــــ

# جگر مرادآبادی سے انٹرویو

ـــــــ نریش کمار شاد

۱۵۳۷۔ نانک پورہ نئی دہلی ۳

۲۲ر اپریل ۱۹۶۷ء

مشفقی و مکرمی قبلہ خوشتر صاحب! آداب عرض

بیسویں صدی کے افسانہ نمبر کے لئے افسانہ نمبر کی شان کے شایان ایک انٹرویو ارسال کر رہا ہوں۔ اسے پڑھئے اور داد دیجئے میری کاوش' اور جگر صاحب کے پھڑکتے ہوئے اشعار کی ـــــــ مئی کے بیسویں صدی میں آپ نے "سرگوشیاں" کے تحت اردو کے مستقبل سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے۔

اردو کے پرستار چاہیں تو اردو کا مستقبل روشن و تابناک ہوگا،

لیکن جناب! اردو کے پرستاروں کے چاہنے سے کیا ہوگا۔ اپنے اِس ناموافق دور میں اِس ستائی ہوئی بدنصیب زبان کو جو محافظ نصیب ہوئے ہیں اُن کے کالے کرتوت کیا آپ کے پیشِ نظر نہیں ہیں؟ کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ اردو کے موجودہ ٹھیکیدار اِس زبان کی بقا سے کہیں زیادہ اپنی بقا اور اپنے سیاسی، سماجی یا معاشی کاروبار کے لئے فکرمند ہیں۔ اِس ضمن میں تفصیل سے لکھ کر اُن کے گھناؤنے چہرے اور اپنے دل کے داغ کیا نمایاں کروں۔ صرف میری ایک نئی رُباعی سُن لیجئے ؎

پُردرد ہے کتنی داستانِ اُردو　　مظلوم ہے کس قدر زبانِ اُردو
اُردو کے محافظ جو بنے بیٹھے ہیں　　دراصل وہی ہیں قاتلانِ اُردو!

میرے خیال میں تو اِس سوال کا جواب یہ ہونا چاہئے تھا کہ اگر اُردو کے صاحبِ اقتدار محافظ خویش پروری کی چوب پر اِس خوبصورت زبان کو ہلاک کرنے کی کوشش نہ فرمائیں تو یہ اتنی سخت جان ہے کہ حالات کی ناسازگاری کے باوجود زندہ رہ سکے گی۔

آپ کا نیازمند ـــــــ نریش کمار شاد

---

شاد:۔ "مخدومی و محترمی جگر صاحب! خالص غزل گو شاعر ہوتے ہوئے اور اپنی بے تحاشا رندی و سرمستی کے باوجود آپ نے زندگی کے حقائق سے کبھی گریز نہیں کیا۔ قحطِ بنگال سے متاثر ہو کر آپ نے نہایت دردانگیز غزل نما نظم کہی۔

؎ بنگال کے میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں

اور تقسیمِ وطن کی بہیمیت اور خوں ریزی نے بھی آپ کے شاعرانہ شعور کو غم اور غصے سے بھر دیا اور آپ نے پھر ایک طویل نظم نما غزل کہتے ہوئے یہ نعرہ بلند کیا ؎

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

اِس لئے میں تو یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ کے کلام میں سیاسی شعور کا فقدان ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی کی طرح میرا

بھی یہ ایمان ہے کہ خارجی حالات و حوادث سے موجودہ غزل گویوں میں آپ سے زیادہ براہِ راست متاثر ہونے والا شاید ہی اور کوئی ہو۔ اس تمہید سے میرا مقصد آپ کا سیاسی نقطۂ نظر معلوم کرنا ہے قبلۂ عالم :-

جگر :- "اُن کا جو فرض ہے اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"

شاد :- "بے شک، بے شک۔ آپ کی رُومانی شاعری بجائے خود اس حقیقت کا خوبصورت ثبوت ہے کہ آپ مجسّم محبت تھے۔ واقعی میں نے انٹرویو کا آغاز کچھ مناسب ڈھنگ سے نہیں کیا۔ گفتگو کی ابتدا ہی مجھے عشق سے کرنی چاہیے تھی کیونکہ آپ کے عشق کے افسانے تو اس دُنیا میں بُوئے گل کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلا عشق تو غالباً آپ نے بجنور کی وحیدن سے کیا اور اُس سے رشتۂ ازدواج میں بھی منسلک ہو گئے لیکن جلد ہی وحیدن کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے بعد آپ مین پوری کی ایک طوائف شیرازن کی زُلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوئے جس کے بالاخانے کو آپ طُور کہا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ بتانے سے مقصود یہ ہے کہ آپ بے شک و شبہ ایک مستند عاشق ہیں اور آپ کے اکثر اشعار میں بھی شخصی عشق کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں اس لئے براہِ کرم یہ فرمایئے کہ آپ کے نزدیک محبت کیا ہے؟"

جگر :- "اِک لفظِ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے"

شاد :- "سبحان اللہ اور اس سلسلے میں حضرت! ایک بہت عامیانہ سا سوال بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ محبت کی جاتی ہے یا محبت ہو جاتی ہے؟"

جگر :- "محبت کی باتیں محبت ہی جانے
معمے نہیں ہیں یہ سمجھانے والے"

شاد :- "یہ تو آپ ٹالنے والی بات کر رہے ہیں قبلہ! محبت کی کیفیت سے متعلق اپنا ذاتی تجربہ تو بیان فرمایئے۔"

جگر :- "محبت اثر کرتی ہے چپکے چپکے
محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں"

شاد :- "تو گویا آپ کی رائے میں محبت آہستہ آہستہ ہوتی ہے ایک دم نہیں ہوتی۔"

جگر :- "ٹوٹ پڑتا ہے دفعتاً جو عشق
وہ کبھی دیرپا نہیں ہوتا"

شاد :- "اور محبت، آپ کے خیال میں اصل حقیقت ہے یا اصل مجاز؟"

جگر :- "محبت اصلِ حقیقت، محبت اصلِ مجاز
وہ کم نظر تھے جو بیگانۂ مجاز رہے"

شاد :- "بہت خوب! اور آپ کے نزدیک عشق آسان ہے یا مشکل؟"

جگر :- "یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے"

شاد :- "حُسن اور عشق کی مختصر ترین تعریف آپ کی نظر میں کیا ہے؟"

جگر :- "حُسن یکسر جذب و گریز
عشق یکسر ترک و طلب"

شاد :- "حُسن کی تعریف ذرا اور واضح طور پر فرمایئے۔"

جگر :- "حُسن وہی ہے حُسن کہ ظالم
ہاتھ لگے اور ہاتھ نہ آئے"

شاد :- "اور آپ کی رائے میں جگر صاحب! محبت کی منزل کیا ہے؟"

جگر :- "محبت کی منزل ہی شاید نہیں ہے
کہ جب دیکھیے امتحاں اور بھی ہیں"

شاد :- "جی ہاں بالکل بجا ارشاد فرمایا۔ مجھے یاد آیا یہ بھی تو آپ ہی کا شعر ہے ؎
خدا جانے محبت کون سی منزل کو کہتے ہیں
نہ جس کی ابتدا ہی ہے، نہ جس کی انتہا ہی ہے
یہ فرمایئے کہ کیا ہر انسان کے دل میں آپ کی طرح والہانہ محبت کا چراغ روشن ہو سکتا ہے؟"

جگر :- "اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں"

شاد :- "بعض بزرگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ عشق محض جوانی کا کھیل ہے۔"

جگر :- "عشق ہے پیارے کھیل نہیں
عشق ہے کارِ شیشہ و آہن"

شاد :- "یہ تو آپ مانتے ہیں نا جگر صاحب! کہ اس کارِ شیشہ و آہن میں انسانی خودداری قطعاً بیکار ثابت ہوتی ہے اور محبت میں بالعموم ہر عاشق کو ذلیل ہونا پڑتا ہے جیسا کہ حکیم مومن خاں مومن نے بھی اپنے ایک شعر میں اعتراف کیا ہے ؎
اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا"

جگر :۔ "محبت میں کہاں ممکن ذلیل و خوار ہو جانا
کہ پہلی شرط ہے انسان کا خوددار ہو جانا"

شاد :۔ "کیا تجربہ ہے آپ کا۔ کیا عشق اور تمنا لازم و ملزوم ہیں ؟"

جگر :۔ "وہ بھی ہے اِک مقام عشق جہاں
ہر تمنا گناہ ہوتی ہے"

شاد :۔ "اور عشق میں دل کو سکون کب حاصل ہوتا ہے ؟"

جگر :۔ "دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا"

شاد :۔ "دنیا نے آپ کے محبت بھرے دل پر جو ستم توڑے اور آپ کی وفا کو جس طرح رُسوا کیا اُس کی یاد تو آپ کو عدم آباد میں بھی آتی ہوگی ؟"

جگر :۔ "دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب کچھ بھی نہیں مجھ کو محبت کے سوا یاد"

شاد :۔ "اور کیا اپنے عشقِ اوّلیں کی یاد بھی نہیں آتی ؟"

جگر :۔ "وہ سماں آج بھی ہے یاد جگر
ہاں مگر جیسے خواب کا عالم !"

شاد :۔ "اِس حقیقت سے تو آپ انکار نہیں کرسکتے کہ اِس دنیا میں اپنی پُرشوق زندگی کا لطف آپ نے خوب اُٹھایا !"

جگر :۔ "کیا لطف پوچھتے ہو پُرشوق زندگی کے
جی جی اُٹھا ہوں مرکے، مر مر گیا ہوں جی کے"

شاد :۔ "جگر صاحب ! محبت کے علاوہ شراب نوشی بھی تو آپ کے شاعرانہ کردار میں نمایاں ترین اہمیت رکھتی ہے اور خود آپ کے اپنے بقول ؎

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا !

لیکن شراب آپ کی ہلاکت کا باعث نہ ہوسکی۔ رندِ دریا نوش ہونے کے باوجود شراب کو یک دم ترک کر دینا آپ کا ایک ایسا غیر معمولی کارنامہ ہے جس سے آپ کی شخصیت کی عظمت اور قوتِ ارادہ کی پختگی کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ پھر بھی ایک بات بتایئے حضرت ! کہ ترکِ مے نوشی کے بعد آپ کیا محسوس کرتے رہے ؟"

جگر :۔ "اسے سمجھے نہ سمجھے کوئی لیکن واقعہ یہ ہے
کہ ترکِ مے کشی پر بھی وہی ہے میکشی اپنی !"

شاد :۔ "یہ مے کشی تو واقعی بڑی عجیب و غریب ہے صاحب !"

جگر :۔ "مری رندی بھی کیا رندی، مری مستی بھی کیا مستی
مری توبہ بھی بن جاتی ہے میخانہ بجام اکثر"

شاد :۔ "شراب چھوڑنے کے بارے میں یوں تو آپ سے متعلق کئی روایتیں مشہور ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی تھے۔ تصوّف اور صوفیائے کرام سے تو آپ کی رُوحانی وابستگی رہی ہے اور میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ پیر شاہ عبدالغنی منگلوری کے آپ مُرید تھے اور سلسلۂ چشتیہ سے آپ کا تعلق تھا اور پھر ایک مدت تک آپ نے اصغر گونڈوی ایسے صوفی شاعر کی صحبت کا فیض بھی حاصل کیا ہے۔ اِس لئے رموزِ معرفت سے آگہی تو آپ کو ضرور ہوگی اِسی لئے اِس سلسلے میں آپ سے چند باتیں دریافت کرنے کا آرزومند ہوں۔ پہلے تو یہ بتانے کی تکلیف کیجئے کہ دل کیا ہے ؟"

"دل کیا ہے نقشِ حُسنِ حقیقت طراز کا
آئینہ کیا ہے عکس ہے آئینہ ساز کا"

شاد :۔ "جزاک اللہ ! اور قبلہ ! آپ کے نزدیک کافر اور مومن میں کیا فرق ہے ؟"

جگر :۔ "یہی تو فرق ہے بس کافر و مومن میں اے غافل !
کہ اُس کے لاکھ کعبے اور اِس کا ایک کعبہ ہے !"

شاد :۔ "اور آپ کے خیال میں انسان کیا ہے ؟"

جگر :۔ "تصویر اُمیدوں کی، آئینہ ملالوں کا
انساں جسے کہتے ہیں محشر ہے خیالوں کا"

شاد :۔ "لیکن بندہ پرور ! یہ محشرِ خیال تو اب خیالوں ہی کی نہیں، حقیقتوں کی دنیا میں بھی حشر بپا کر رہا ہے اور مہر و ماہ تک کو تسخیر کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہے"

جگر :۔ "یہی زمیں ترا مسکن، یہی ترا مدفن
اِسی زمین سے تُو مہر و ماہ پیدا کر"

شاد :۔ "پھر بھی کیا اِس دَور کے ابنِ آدم کا ذوقِ آگہی آپ کے نزدیک قابلِ ستائش نہیں ؟"

جگر :۔ "باہمہ ذوقِ آگہی، ہائے رے پستئ بشر
سارے جہاں کا جائزہ، اپنے جہاں سے بے خبر !"

شاد :۔ "اچھا یہ بتایئے کہ آپ کی رائے میں انسانی زندگی کیا ہے ؟"

جگر :۔ "زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ
موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ ہوتا نہیں"

شاد:۔ "اور موت ؟"

جگر:۔ "موت کیا ایک لفظِ بے معنی
جس کو مارا حیات نے مارا"

شاد:۔ "لیکن یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ موت کو زندگی پر دسترس حاصل ہے"

جگر:۔ "اجل خود زندگی سے کانپتی ہے
اجل کی زندگی پر دسترس کیا"

شاد:۔ "لیکن محترم جگر صاحب! انسانی زندگی ہے تو بے ثبات ؟"

جگر:۔ "تو محبت کو لازوال بنا
زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات"

شاد:۔ "جی ہاں شاعرِ رُومان ہونے کی وجہ سے آپ تو یہی مشورہ دیں گے۔ یہ فرمائیے کہ انسانی زندگی کا منصب آپ کی نظر میں کیا ہے ؟"

جگر:۔ "زندگی ہے نام جہد و جنگ کا
موت کیا ہے بھول جانا چاہئے"

شاد:۔ "اور ہماری اِس دنیا کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جسے آپ مستقل طور پر خیرباد کہہ چکے ہیں"

جگر:۔ "دنیا بھی کیا مقام ہے جس میں کہ بار ہا
ہنسنا پڑا ہے قلبِ شکستہ لئے ہوئے"

شاد:۔ "اب ذرا شعر و شاعری سے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بتائیے کہ آپ کے نزدیک شاعری کی تعریف کیا ہے ؟"

جگر:۔ "ہستیٔ شاعر اللہ اللہ، حُسن کی منزل، عشق کا مسکن
رنگیں فطرت، سادہ طبیعت، فرش نشیں اور عرش نشیمن"

شاد:۔ "ہم تو جگر صاحب! آپ کو اپنے وقت کا شہریارِ غزل سمجھتے ہیں لیکن خود آپ کی اپنی شاعری کے بارے میں کیا رائے ہے ؟"

جگر:۔ "تکلف سے، تصنع سے بَری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی"

شاد:۔ "اور آپ کی نظر میں آپ کا کمالِ شعر کیا ہے ؟"

جگر:۔ "میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا"

شاد:۔ "ایک کامیاب شاعر بننے میں آپ کی دنیا میں سب سے زیادہ مدد کس نے کی ؟"

جگر:۔ "اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا"

شاد:۔ "یہ صحیح ہے جگر صاحب! کہ آپ نے اپنا نام خود بنایا ہے لیکن پھر بھی زمانے کی اہمیت سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے۔ ہر ایک کو بنا نہیں سکتا لیکن زمانہ ہر کسی کو مٹا تو سکتا ہے"

جگر:۔ "ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں"

شاد:۔ "کیا جواب ہے اِس خود اعتمادی کا جگر صاحب! یہ فرمائیے کہ ہمارے جدید ترین شعر و ادب کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں ؟"

جگر:۔ "صرف نقالی ہے مغرب کی جگر
شعر میں اب مشرقیت ہی نہیں"

شاد:۔ "آخر میں قبلہ و کعبہ! ہم زندہ انسانوں کو کوئی ایسی نصیحت فرمائیے جو آپ کے تجربے کا ماحصل ہو"

جگر:۔ "انسان کو لازم ہے رہے دُور ریا سے
یہ چیز جُدا کرتی ہے بندے کو خدا سے"

---





[redacted]

افسانہ

# اُجلی موجیں میلا ساحل

## اسنیٰ رباب

۵۔ اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی

۲۵ راپریل ۶۷ء

محترم! اسلام خلوص

اب سے کوئی سال سوا سال پہلے ، ایک بہن نے "کہیں بہار سے" مجھے ایک خط لکھا تھا ۔ ادھورے تجلوں ، تشنہ آرزوؤں کے اس مکتوب سے میں بے حد متاثر ہوئی تھی ۔ اُس نے مجھ سے اپنی تحریر پر مبنی ، کہانی لکھنے کے لئے شدید خواہش کا اظہار بھی کیا تھا ۔ صداقتوں میں لپٹی ، ناکامیوں میں گھری اُس داستان کو میں نے تو بس اپنی زبان دے دی ہے ۔ میرا اپنا اِس میں کچھ بھی نہیں ۔ صرف انجام میرے تخیل کی دین ہے ۔ اپنی اِس کوشش میں میں کہاں تک کامیاب ہوں یہ تو آپ کی ادب نواز نظریں اور پڑھنے والوں کی پرکھنے والی نگاہیں ہی بتا سکیں گی ۔ بہر صورت اِس لیے کا کوئی افادی پہلو نکل سکے تو یہ میرا سب سے بڑا انعام ہوگا ——— ادب میں "افادی و غیر افادی" پہلو کی بحث کو گو میں تضیع اوقات سمجھتی ہوں لیکن وہ ادب جو زندگی کی نوک پلک سنوارنے کا سلیقہ نہیں رکھتا اُس کی زندگی بھی بس کچھ ہی دن کی ہوتی ہے ——— پیشِ نظر کہانی "افسانہ نمبر" کے لئے اگر آپ کے حکم کی تعمیل ہو گئی ہو تو تحریر فرمائیں ——— یاد رکھیئے ، آپ کے سامنے بہت ڈرتے ڈرتے آتی ہوں . . .

آپ کی بھتیجی ——— اسنیٰ رباب

"پونم کے چاند کی اِس نرم آغوش کی قسم ، میں تمھارا ہوں !"

"پرویز ، تم نے چاند کی پھیلی ہوئی باہوں کو اپنے پیار کا شاہد بنایا ہے مجھے ڈر لگنے لگا ہے ۔ چندا کی پھیلی ہوئی آغوش ، کچھ دنوں بعد ، جب سمٹنے لگے گی تو شب کے اندھیرے پھر اکیلے رہ جائیں گے ۔ آنسوؤں سے آکاش کے دامن کو تر کر دیں گے ۔ جھلمل کرتے ہوئے یہ آنسو دیپ کہیں میرے نصیب کے آنچل پر نہ بکھر جائیں !"

"میری زندگی ! تم یہ کیسی باتیں کرتی ہو ! چندا سے کہیں چاندنی بھی جدا ہوئی ہے ؟"

"ٹھیک ہے ، چاند اور چاندنی جنم جنم کے میت ہیں ۔ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں ہیں ۔ لیکن اندھیرے جب روشنی سے پیار کی آرزو دل میں بسا لیتے ہیں ، تو انجام کار انھیں پھر سیاہ پوش ہونا پڑتا ہے ۔ چاند کا کیا ہے ، تھوڑے دنوں اندھیروں کو اپنی باہوں میں چھپا لیتا ہے ، پھر اپنی چاندنی کو کلیجے سے لگائے بہت دُور کہیں پیار کی وادیوں میں کھو جاتا ہے ۔ اندھیرے اکیلے رہ جاتے ہیں ۔ صدیوں سے یہی کھیل ہوتا رہا ہے ۔ آئندہ بھی نہ جانے کب تک ایسا ہی ہوتا رہے گا !"

"آج یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو ، میری بہار ——— !"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں ۔ میں بھی تو اندھیرا ہوں ۔ تم سے ، اپنے آرزو کے چاند سے ، میں نے نیہہ لگائی ہے ۔ انجام کیا ہوگا ۔ سوچتی ہوں تو دل بُری طرح دھڑکنے لگتا ہے ۔"

"میں تمھارا ہوں بہار ——— !" پرویز نے اُسے باہوں میں جکڑ لیا ۔

"اور سدا میرے رہو گے ؟"

"ساری زندگی !"

"اپنی چاندنی کی قسم کھاؤ !"

"تم ہی تو میری چاندنی ہو !"

"یہ میں بہت بار سن چکی ہوں"

"اور کیا سننا چاہتی ہو؟"

"اب وہ سب کچھ سننا چاہتی ہوں جس کا وعدہ تم، روز، دو سال سے کرتے رہے ہو۔ تعلیم تمھاری کب کی مکمل ہو چکی۔ تم نوکر بھی ہو گئے۔ ماشاء اللہ خوب کما بھی رہے ہو۔ اب اور کس بات کا انتظار ہے؟ مجھ سے تو اب پل بھر کی تمھاری جدائی برداشت نہیں ہوتی۔"

"اور یہ پہاڑ سا دن تم کس طرح گزار لیتی ہو؟" پرویز نے مسکراتے ہوئے نغماب [illegible]ش کی۔

[illegible] نکہت بار گرم گرم سانسوں کے لطیف انتظار میں، جو شب کے ندتار آنچل میں لجاتی شرماتی، سب کی نظروں سے بچتی، میرے لب و رخسار پر جھکے سے سایہ کر لیتی ہیں"

"سچ ——!"

"یہ تم اپنے دل سے پوچھو"

"دل —— وہ تو تمھارے پاس ہے!"

"اور میں تمھارے کتنی قریب ہوں؟"

"اتنی قریب، جتنی پھول کے ساتھ اس کی رنگت، اس کی نکہت!!"

"اور اگر رنگت اڑ جائے؟"

"تو پھول بھی فنا ہو جاتا ہے"

"اتنے قریب ہو کر بھی تم مجھے روز ان ہیبت ناک تنہائیوں کی طرف لوٹا دیتے ہو، جن سے دامن چھڑا کر رات کی ابھرتی جوانی میں چھپتی چھپاتی میں تمھارے پاس چلی آتی ہوں۔ پیار کی باہنوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہوں۔ ڈھلتی ہوئی رات کی پگڈنڈی پر میرے بوجھل قدم تم سے کچھ نہیں کہتے پرویز ——؟ آخر تم مجھے کب پیار کے ڈولے میں بٹھا کر آرزو کے رنگ محل میں دلہن بنا کر لاؤ گے ——؟ میرے ہاتھوں سے اب ضبط کا دامن چھوٹا جا رہا ہے!"

"ابھی کچھ دن اور انتظار کر لو ڈارلنگ!"

"لمحوں کی رہگزر اتنی طویل نہ کرو ڈیر، جن پر چلتے چلتے میری آس کے پاؤں ہی تھک کر رہ جائیں"

"تم فکر کیوں کرتی ہو؟ جلد ہی تمھاری رہگزر میں آرزو کے پھول بچھا دوں گا"

"اور اگر کوئی کانٹا میرے پلنے انتظار میں چبھ کر رہ گیا؟"

"ایسا ہرگز نہ ہوگا"

"کیسے ——؟"

"میں نے امی سے کہہ جو دیا ہے"

"کیا کہہ دیا ہے؟"

"وہی، جس کی آرزو میں تمھاری آنکھوں کے دیپ سدا جلا کرتے ہیں۔ جس کے انتظار میں تمھارے دل کی دھڑکنیں سازِ بے خودی چھیڑ دیتی ہیں"

"سچ ——!" اس کی باہنوں میں اور کھنچنے کے انداز میں پاس سمٹ گیا۔

"اب بھی کچھ شک ہے ——؟"

"ایسا نہ کہو ڈیر ——! تم پر شک کروں گی تو اس [illegible] موت نہ آ جائے گی"

"پھر ——؟"

"بات پھیل گئی ہے۔ محلے کی عورتیں روز امی کے کان میں کھسر پھسر کرتی ہیں۔ مجھے بے حد ڈر لگنے لگا ہے"

"اور امی ...؟" پرویز بات کاٹتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"امی تو مجھے بہت پریشان نظر آتی ہیں۔ کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔ بے وجہ اِدھر اُدھر ٹہلا کرتی ہیں۔ مجھ سے بات بھی بس واجبی ہی کرتی ہیں۔ ان کے رویے میں اب وہ پہلی سی بیساختگی نظر نہیں آتی"

"اور شگفتہ ——؟"

"اس کی کچھ نہ پوچھو —— اس کا دن بہار، رات چاندنی، صبح تبسم اور شام سرمستیوں کا نکھار بن چکی ہے"

"وہ پھر ——؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتی"

"تم سے کس طرح ملتی ہے؟"

"نکہت فزا تبسم کی شہانی رعنائیوں کے ساتھ!"

"پڑھنے لکھنے میں اس کی دلچسپی کا کیا عالم ہے؟"

"اکثر رات کو تم سے جدا ہو کر جب چپکے سے میں اپنے پلنگ پر جا لیٹتی ہوں تو تھوڑی دیر بعد وہ بھی جاگ جاتی ہے۔ ہاتھ منہ دھوتی ہے اور اپنی سینے پر کتابوں میں نہ جانے کیا کچھ ڈھونڈنے لگتی ہے"

"اسے تم پر کوئی شک تو نہیں؟"

"یہ میں کہہ نہیں سکتی"

"تم ذرا اس کا پتہ لگانے کی کوشش تو کرو"

"اچھا"

"اف۔ پورے ساڑھے تین بج گئے ۔۔۔۔۔" باہنوں کے ہار کو پیار سے اپنے گلے سے جدا کرتے ہوئے، بائیں ہاتھ کی کلائی میں بندھی گھڑی سے وقت دیکھ کر پلنگ سے اٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

"بس پندرہ منٹ اور،" پرویز نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں، اب پھر کل!" حجاب آلود تبسم سے اس نے پرویز کی آنکھوں میں جھانکا۔

تیزی سے وہ پلنگ سے اتری۔ کپڑوں کی سلوٹیں درست کیں۔ دونوں بازوؤں پر بے پروائی سے دوپٹہ ڈالا اور ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اپنی مخروطی انگلیوں سے آوارہ لٹیں درست کر کے سلیقے سے ہیرپن لگائی اور دروازے کی طرف مڑی۔

"خدا حافظ!" پرویز کے گلے میں ایک بار پھر باہنوں کا ہار ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

پنجوں کے بل چلتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ تاریکیاں اس کے بھی تیز قدموں کے ساتھ اس کے دامن سے لپٹی چلی آئیں۔

---

پرویز، غضب ہو گیا ۔۔۔۔۔! رات جب تمھاری باہنوں میں آرزو کی پیاس بجھا کر، صبوحی ڈگمگاتی میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو امّی دروازے کے پیچھے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ چپکے سے میں نے دروازہ کھولا تو وہ اور پیچھے ہٹ گئیں۔ میں جیسے ہی آگے بڑھی انھوں نے پیچھے سے میری چوٹی پکڑ لی۔ امّی کو دیکھ کر میں کانپ گئی۔ لرزنے لگی۔ آگے بڑھتے ہوئے قدم جیسے زمین سے چپٹ کر رہ گئے۔ جدائی کی اس آخری شب میں سرما کی برفانی ہوائیں لُو کے تھپیڑوں کی طرح میرے احساسات میں سوئیاں چبھونے لگیں۔ باہر فضاؤں میں چندا کی نشہ بار شرمیلی شرمیلی کرنیں نیم روز آفتاب کی خاردار شعاعیں بن کر میرے قلب و جگر میں اترنے لگیں۔ گردن کے نیچے، سینے پر، بازوؤں کے انتہائی نشیب میں میری فراک بھیگ گئی۔ میرے چہرے پر ابھرنے والے پسینے کے قطرے جنھیں تم سچے موتی سمجھ کر اپنے نکہت بار لبوں سے چنتے رہتے ہو، آنسوؤں کی لکیریں بن کر مجھے ستانے لگے۔ میں تمھیں کیا بتاؤں اس وقت مجھے کیا ہو گیا! تمھاری دلکش شبیہ جسے ہر لمحہ ہر لحظہ میں اپنے تصور کی آنکھوں میں چھپائے، پیار کے کلیجے سے لگائے پھرتی ہوں۔ اس وقت مجھ سے بچھڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔ شاید وہ بھی ڈر کر مجھ سے جدا ہو گئی تھی ۔۔۔۔۔ کہیں تم بھی تو میرا ساتھ نہ چھوڑ دو گے؟ میں مر جاؤں گی، فنا ہو جاؤں گی۔ وفا کا ایمان لُٹ جائے گا۔ محبت کی شمع گل ہو جائے گی۔ پیار کے دیپ بجھ جائیں گے۔ کیا ہوگا ڈیر! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری عقل کام نہیں کرتی۔ حوصلے میرا ساتھ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ ارادے مضمحل نظر آتے ہیں۔ ہمتیں جواب دینے لگی ہیں۔ کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ ہر طرف اندھیرے، ہر سو مایوسی، چاروں اور تراشا ... نہ جانے کیا ہو ۔۔۔۔۔ گو امّی نے اپنی زبان سے مجھ سے کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی قہر آلود نظریں میرے کلیجے میں اتر گئیں۔ ان کے معصوم چہرے پر شکست خوردگی کا جلال شعلہ بن کر میرے وجود کو بھسم کرنے لگا۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک ان کے سامنے اسی طرح کھڑی رہی۔ خاموش، خاموش، پریشان پریشان۔ نظریں لاکھ ہمت کرنے پر بھی اوپر اٹھائے نہ اٹھ سکیں۔ دل کی دھڑکنیں پورے عروج پر پہنچ کر آخری دھڑکن میں تبدیل ہونے لگیں لیکن میں زمین میں نہ سما سکی۔ دھرتی ماں باہنیں پھیلا کر مجھے اپنے کلیجے میں نہ چھپا سکی۔ شاید دھرتی ماں بھی مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ جبھی تو شریر نظروں سے دھرتی ماں بھی میری مجبوریوں کا مذاق اڑاتی رہی۔ مجھے چھی چھی کرتی رہی۔ مجھ سے اپنی مٹی کی پاکیزگی مٹانے کا بدلہ لیتی رہی۔

اور پھر میرے کانوں میں جیسے اگنی دھارا بہہ نکلی۔

"جا، ہٹ، دفان (دفع) ہو میری نظروں سے!"

میرے بائیں گال پر زندگی میں پہلی چپت نے مجھ سے میری امّی کا پیار چھین لیا۔ میں لُٹ گئی۔ تباہ و برباد ہو گئی! کبھی وہ بھی امّی تھیں جو میری بڑی سے بڑی غلطی پر آنکھوں میں شفقتوں کا خمار لئے سدا مجھے اپنے گلے لگا کر گھنٹوں پیار کرتیں۔ بے وجہ روٹھ جانے پر بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر مجھے منایا کرتیں۔ میری ضدیں پوری کرتیں۔ آج بھی وہی امّی تھیں جن کی آنکھوں میں نفرت کا اندھیرا، جن کے ہونٹوں پر تلخیوں کے زہر آلود نشتر، جن کے ہاتھوں میں وحشت کی تلواریں تھیں۔ میں لڑکھڑاتی ڈگمگاتی کب اپنے بستر کی خاردار یخ بستہ تنہائیوں کی آغوش میں اسیر ہو گئی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میری آنکھوں سے پشیمانی کی کتنی ندیاں بہہ نکلیں۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں۔ میری بے سہارا سسکیوں نے کمرے کی خاموشیوں کو کس قدر رازداں بنایا، میں کہہ نہیں سکتی ۔۔۔۔۔! شنّو حسب دستور جاگ گئی تھی۔ سسکیوں کی آواز پر یا نہ جانے کیوں وہ میرے پاس آئی اور اس نے لحاف میرے منہ سے الٹ دیا۔ میں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پتہ نہیں کیسے اور کب میں اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ زبان سے نہ میری کچھ نکل سکا اور نہ اس نے کچھ دریافت کیا۔ بادل برس کر کھلے تو مجھے اندازہ ہوا جیسے وہ سب کچھ جانتی ہے۔ سبھی کچھ سمجھتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں نہ تو حیرت تھی اور نہ مجھ سے ہمدردی کی لکیریں۔ وہ مجھے مطمئن نظر آ رہی تھی۔ مجھے اپنی بدلی ہوئی تقدیر پر رونا آ گیا لیکن آنکھیں آنسوؤں کا خزانہ لُٹا چکی تھیں۔ اس لئے خشک رہیں۔

سب پھر تھوڑی دیر بعد ـــــ شاید اسی کمرے کی طرف آرہی ہیں میرا دل مجنوں کی طرح دھڑکنے لگا ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے ہیں۔

مشتو شام کو کالج سے واپسی پر تمہاری طرف سے گزرے گی۔ اس کے ہاتھ خط کا جواب دینا نہ بھولنا ڈیر!

اچھا ایک پیارا سا وعدہ اور

منہ میں ہچکولے کھاتی ہوئی ایک بے بس ناؤ کا

تمہاری بہار

---

ڈیر ـــــ!

آج یہ پھر کبھی ختم نہ ہونے والی چوتھی اُداس رات مجھے ڈسنے چلی آئی ہے۔ ان لمحوں سے جُدا ہوئے ایک زمانہ بیت گیا، جن کی قیمت میں نے ماں کا پیار لُٹا کر ادا کی ہے۔ تمھیں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ دل مایوسیوں کے غار میں دھنسنے لگا ہے۔ کوئی اُمید، کوئی اُجالا، کوئی کِرن دکھائی نہیں دیتی۔ آنکھیں گہری تاریکیوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ اِن تین راتوں میں کس کم بخت کی پل بھر کو بھی آنکھ لگی ـــــ! تم کانٹوں کی سیج پر کروٹیں بدلتے رہے تو میں بھی تو شعلوں کی آغوش میں بے چینیوں سے ہمکنار رہی۔ تم نے شکوہ کر کے مجھے اور ہلکان کر دیا۔ کبھی تمہاری بانہوں کی خوشگوار چاندنی میں مستیوں کے جھولے جھولا کرتی تھی، آج تمہاری جُدائی کی آگ میں جل رہی ہوں۔ کسی کو میری خبر نہیں۔ کوئی میری پروا نہیں کرتا۔ اِن تین دنوں میں امی ایک بار بھی مجھ سے ہمکلام نہیں ہوئیں۔ گھر میں اب وہ رُکتی بھی کب ہیں؟ نہ جانے صبح ہی صبح کہاں چلی جاتی ہیں۔ صبح غائب، شام لاپتہ! اِس سے پہلے تو گھنٹہ بھر بھی مشکل سے باہر رہتی ہوں گی۔ نہ جانے کس پریشانی میں پھرتی ہیں۔ ابا حضور بھی دفتر سے بہت تاخیر سے لوٹنے لگے ہیں۔ اکثر تو رات کو گیارہ گیارہ بج جاتے ہیں۔ اِس سے پہلے تو چھ بجے کے بعد شاید ہی گھر سے باہر رہے ہوں ـــــ اُن کے آتے ہی سارے گھر میں قہقہوں، مسرتوں کا گلزار کھل اُٹھتا تھا اور اب ـــــ؟ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے موت نے سارے گھر کی مسرتوں کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ امی ابو کی غیر حاضری سے میرا ماتھا ٹھنکنے لگا ہے۔ دن میں بُرے بُرے خیال آتے ہیں۔ کہیں کچھ ہو تو نہیں جائے گا۔ خدا خیر کرے!

ہاں، مشتو ضرور کبھی کبھی مجھ سے بول لیتی ہے۔ لیکن میں ہی بے حیا بن کر اُس سے پہلے بات کرتی ہوں۔ اپنی ضرورت جو ہوئی ـــــ! نہ بولوں گی تو تم تک میرے خط کون لے جائے گا۔ تمہاری عطر بیز تحریر کو میں آنکھوں سے کیسے لگا سکوں گی، سینہ پر رکھ کر اُن لمحوں کو کیسے لوٹا سکوں گی جو کبھی تمہارے پہلو میں گزارے ہیں لیکن ڈارلنگ ـــــ تم تو ابھی سے بدلنے لگے۔ ابھی سے مجھ پر بھول گئے۔ یہی پہچان ـــــ تین دنوں میں میرے نو خطوں کے جواب میں صرف ایک مختصر خط! مختصر؟ میں جانتی ہوں تم پریشان ہو، میں سمجھتی ہوں تمہارا دماغ بھی الجھا ہوا ہے لیکن تم مجھے نہیں دیکھتے۔ اتنی پابندیوں، اِس قدر قیود کے باوجود روزانہ تین تین خط لکھتی ہوں۔ مشتو کی خوشامد کرتی ہوں۔ اِس سے پہلے میں نے کبھی اُس سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ منہ تک دھوکہ دیا اور آج وقت پڑنے پر اُس کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اُس سے التجائیں کرتی ہوں۔ اُس کے سامنے منت سماجت کرتی ہوں اُس کی آنکھوں میں تڑپتی ہوئی غصے کی لہریں دیکھتی ہوں اور خاموش رہتی ہوں کچھ نہیں کہتی۔ منہ بند ہے، زبان پر تالے لگ گئے ہیں۔ نہ جانے کیوں وہ اِس قدر بدل گئی ہے ـــــ! پہلے تو کبھی مجھ سے آنکھ ملانے کی جرأت تک نہ کی تھی میرے ادنیٰ اشارے پر سر تسلیم خم کر لیا کرتی تھی۔ نیچی نظریں کئے اپنے کام میں لگی رہتی تھی۔ حکم عدولی کا تو سوال ہی کیا ـــــ! لیکن اِس واقعے کے کچھ دن پہلے سے نہ معلوم کیوں کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی ہے۔ مجھے اب اِس کا واضح طور پر اندازہ ہونے لگا ہے۔ بہت سوچتی ہوں لیکن وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن اُس سے میں بگاڑ بھی نہیں سکتی!

میری طرف سے تمہارے سب اندیشے بے سبب ہیں۔ میں اور بدل جاؤں! سورج اور چمکنا چھوڑ دے! لہریں اور تڑپنا بند کر دیں۔ چاند اور مستیاں دو لٹنے، یہ کیسے ممکن ہے۔ تم بتاؤ، آخر تمہارے دل میں یہ سوال کیا ہی کیوں؟ تم نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں، مجھے سمجھا نہیں، میرے جسم کے گداز کو تم نے اپنے بازوؤں کا اسیر ضرور کیا لیکن میرے دل میں پیار کی کنواری آشاؤں کے لمس سے تمہارا دل آشنا نہ ہو سکا۔ میری آرزوؤں کی البیلی چھاؤں میں تم نے جھک کر نہ دیکھا۔ مجھے تم سے بڑی شکایت ہے۔ یقین رکھو میں ہر لمحہ، ہر قیمت پر تمہاری ہوں! ساری زندگی تمہارے گلے میں بانہیں ڈالے تمہاری رہوں گی! میرے ارادے ـــــ؟ پہاڑ کی طرح اٹل ہیں۔ میرے عزائم ـــــ؟ سورج سے زیادہ روشن ہیں۔ کوئی طاقت مجھے تمہاری بننے سے نہیں روک سکتی۔ کوئی قوت مجھے تم سے الگ نہیں کر سکتی۔ میں اپنی جان کی بازی لگا دوں گی اور تمہارے قدموں کی خاک بن جاؤں گی۔ تم ذرا ہمت تو کرو۔ سارا اندھیرا دور ہو جائے گا۔ پہلے خط میں جیسا لکھ چکی ہوں اُس پر پورا پورا عمل کرنا ہے۔ میں اپنے ساتھ بہت کچھ لے چلوں گی۔ گھر سے نکل کر کسی طرح تکلیف نہ ہوگی۔ آزاد ہواؤں، کھلی فضاؤں میں ہم اپنی جوتے کم آب کو بحر بے کراں میں بدلنے کا سلیقہ رکھتے ہیں!

کم ہمت نہ ہو۔ جلدی کرو۔ وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے!

بے قرار ـــــ تمہاری بہار



[redacted]

کمرے! اچھا بھئی، رات کو مشتو کو بھی بھیج دوں گی۔ ایسی کون سی بات ہے جو تمھیں صرف زبانی ہی کہنی ہے!

---

اِدھر، جلدی سے گلے لگا لو!

منہ میٹھا کراؤ تو ایک بات بتاؤں ——! نہیں بتاتی۔ ایسے ہرگز نہ بتاؤں گی، چاہے ہاں باہوں میں جکڑ کر تم میری جان ہی کیوں نہ نکال لو۔ دیکھو یہ اچھا نہیں ہے۔ تصوّر میں آ آ کر ستاتے ہو۔ بے وجہ پریشان کرتے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہوا، نہ مٹھائی، نہ انعام، چاہتے ہیں بات معلوم کرنے ! اچھا بابا بتاتی ہوں، بتاتی ہوں! ذرا صبر تو کرو۔ مجھے سانس تو لینے دو۔ پہلے اپنے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کرو۔ تھوڑی دُور اور ہٹ کر کھڑے ہو۔ ایسے نہیں۔ یوں۔ اُس طرف۔ ذرا اور پرے۔ آنکھیں بند کرو!

انگوٹھا ——!

لو بس بوجھ لیا نا ——! بڑے آئے بقراط کہیں کے! اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے ہیں، بڑے چالاک بنتے ہیں۔ روز رات کو شتو کو بلاتے ہیں اور کچھ بھی نہیں کہتے۔ بے وجہ پریشان کرتے ہیں۔ واپسی پر شتو سے پوچھتی ہوں تو بس مُسکرا دیتی ہے، کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہے۔ بہت کیا تو ملا دیا تمھارا خط پکڑا دیا۔ دو ہفتے سے روز یہی ہو رہا ہے۔ اب تمھیں صاف ستھرے کاغذ پر لکھنے کی بھی کیا ضرورت ہے! جس کا کام ہے خود کرے گا۔ جس کی بھیگے گی خود نچوڑ لے گا۔ جو بیمار پڑے گا خود علاج بھی کرا لے گا۔ تمھیں کیا پڑی ہے ——! تمھیں کسی سے کیا مطلب —— بتاؤ، اب تک تم نے کیا ہی کیا ہے؟ کہتے تھے امی سے کہہ دیا ہے۔ کیا خاک کہہ دیا ہے! یہی نا کہ آرام سے گھر بیٹھی رہیں اور لڑکیوں والے اُن کے در پر روز سجدہ ریزی کرتے رہیں۔ صبح و شام چکر کاٹتے رہیں اور وہ ادائے بے نیازی سے "آج کل، آج کل" کرتی رہیں۔ کیا تمھاری امی روز پاؤں میں مہندی لگا کر بیٹھ جاتی ہیں؟ چلنے پھرنے میں تکلیف ہو تو کار وغیرہ کا انتظام بھی کرایا جا سکتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا!

میری امی کو خوب پریشان کر لو، خوب ستا لو، ابو سے اچھی طرح ہتھ جوڑیاں کرا لو۔ کہیں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ لیکن اب وہ دن بھی کچھ زیادہ دُور نہیں، جس کی راہ میں برسوں سے پلکیں بچھائے بیٹھی ہوں۔ جس کے لئے بچپن سے آنکھیں چُرا کر جوانی کے گلے آ لگی ہوں۔ یاد رکھو، میں بھی ایک ایک سے ناک رگڑوا لوں گی۔ چُن چُن کر بدلے لوں گی۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا ہے اور کوئی کہتا تو یقین بھی نہ کرتی۔ تمھاری امی کے اِتنے دماغ، اِتنے ٹھسّے، اِس قدر نخرے ——! میرے چاند کی ساری کی پونجی کے بدلے میں راضی ہوئی ہیں تمھاری امی ——!! کچھ سُنا آپ نے حضور؟ اپنے پڑھے لکھے لڑکے کی اور قیمت لگائی ہوتی۔ اپنی عزت اور آبرو کی حفاظت میں میرے ابو، امی اِس سے بھی بڑی قیمت ادا کر سکتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے تمھارے لئے کتنے لڑکی والے تمھاری امی کے حضور میں روز جبیں سائی کرتے رہے ہوں گے۔ یہ بھی درست ہے، تم اُن چند ایسے گنے لڑکوں میں ہو جن کے بازار کا بھاؤ کافی اونچا ہے۔ لیکن کیا پیار کی کوئی قیمت ہے؟ کیا خلوص کے کوئی دام لگ سکتا ہے؟ کیا شرافت روپوں میں بک سکتی ہے؟ اگر ایسا ہے اور واقعی ایسا ہی ہے تو تمھاری امی نے ٹھیک ہی کیا۔ اپنے بیٹے کی مُنہ مانگی قیمت وصول کر لی۔ تم اُن کے نہیں اب ہمارے ہو۔ اُن کے ہو جنھوں نے منہ مانگے داموں پر تمھیں حاصل کیا ہے۔

میری امی کتنی اچھی ہیں! میرے لئے اُنھیں کیا کیا تکلیفیں اُٹھانا پڑی ہیں —— کتنی دشواریوں سے گزرنا پڑا ہے۔ کتنے کانٹوں سے اُلجھنا پڑا ہے۔ کتنا ستایا ہے میں نے اُنھیں ——! ہفتوں سے جوتیاں توڑ رہی ہیں۔ بچپن میں میری پسند کے کھلونے لا کر دیتی تھیں۔ اپنے ہاتھوں سے گڑیاں کاڑھ کر دیا کرتی تھیں۔ جاپانی، چینی، ایرانی سبھی طرح کی گڑیاں میرے گڑیا گھر میں آج تک بھی پڑی ہیں۔ جس گڑیا پر بازار میں نظر پڑی، بڑی سے بڑی قیمت پر خرید کر مجھے دی۔ اِتنی بڑی ہو گئی لیکن گڑیا گڈّوں کا شوق ابھی تک نہ گیا۔ آج اُنھوں نے میری پسند کا، میرے کنوارے ارمانوں کا، البیلے خوابوں کا شہزادہ لا کر میری مانگ میں سندور بھر دیا ہے۔ ہائے اللہ! میں کتنی بُری ہوں! میں نے اپنی پیاری سی امی کے لئے کیسے بُرے بُرے خیال اپنے دل میں بٹھا لئے تھے۔ یا اللہ تو مجھے معاف کر دینا۔ امی تو خیر معاف کر ہی دیں گی، جب اُن کی گود میں سر رکھ کر میں رو دوں گی۔

چاند کی بیس بھی اب دُور نہیں ہے۔ تمھاری امی بھی نکاح کی تیاریوں میں لگ گئی ہوں گی۔ لیکن حضور، منہ دھو رکھئے۔ رخصتی میں ابھی پورے چھ ماہ پڑے ہیں چھ ماہ —— ! ذرا آپ بھی تو انتظار کا لُطف اُٹھائیے۔ کسی کو یوں ہی تڑپانا رائیگاں نہیں جاتا۔

اچھا جناب، معاف بھی کر دیجیے! میں واقعی نہ جانے کیا اَلا بَلا بک گئی۔ آپ کی امی اور آپ کے پاپا آپ ہی کے نہیں، میرے بھی ماں باپ ہیں۔ میں بھلا اُن کے حضور میں گستاخی کی جرأت کروں گی، تمھیں یقین آ سکتا ہے ——؟ میری زبان نہ جل جائے گی!!

اندھیری رات کی سُہانی صبح
تمھاری بہار

مشتو ——!
مِری!"

"تم خاموش کیوں ہو؟"

"نہیں تو۔"

"پھر مسکرانے کی وجہ؟"

"سوچ رہی تھی سب کچھ کیسے بدل گیا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو راستہ ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ٹوٹنے کی ساری راہیں سپنوں میں بدل گئی ہوں۔ آنکھ کھلی اور سب کچھ غائب؟"

"تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جی بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کی دعا سے بھلا مجھے ہو ہی کیا سکتا ہے!"

"اور یہ چہرہ اُترا اُترا کیوں ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ میں ذرا اِس وقت اپنے قدموں کے سامنے بچھی راہوں کو غور سے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ راہیں کچھ گڈمڈ سی ہو کر رہ گئی ہیں۔ کہیں میں راستہ تو نہیں بھول گئی پرویز ——؟"

"تم راستہ کیسے بھولو گی! میں جو تمھارے ساتھ ہوں۔"

"تم اب میرے ساتھ کہاں ہو! باجی کے ساتھ تمھارے نکاح کو ایک مہینہ ہونے کو آیا۔ بار بار تم مجھ سے یہی کہتے رہے، نکاح ہرگز نہ ہوگا! مجھے تسلیاں دیتے رہے۔ میری آنکھوں کے خمار، میری زلفوں کی مہک، میری کمر کی لچک کی قسمیں کھا کھا کر میرے ساتھ زندگی گزارنے کے وعدے کرتے رہے —— اور پھر طوفان آیا اور گزر گیا۔ باجی تمھاری ہو گئیں۔"

"میں تو اب بھی تمھارا ہوں!"

"جی ہاں، تم اب بھی میرے ہو! بالکل اُن دو مسافروں کی طرح جن کی منزلیں الگ الگ ہوتی ہیں لیکن پھر بھی عارضی طور پر ایک دوسرے کے بے حد قریب ہو جاتے ہیں۔ علیحدگی کا تصور اور جدائی کا خیال تک انھیں ہلکان نہیں کر پاتا۔"

"نہیں، یہ بات تو نہیں۔"

"تو پھر اپنا وعدہ پورا کرو!"

"وعدہ پورا ہوگا اور ضرور ہوگا۔"

"پرویز، تم تو خیر اور بھی رُک سکتے ہو لیکن بتاؤ اب میں کیا کروں؟"

"کیوں ——؟"

"تم سمجھے کیوں نہیں! مجھے کئی دنوں سے روزدن میں کئی کئی بار متلی آتی ہے۔ اوّل تو بھوک ہی بند ہو گئی۔ جو تھوڑا بہت کھاتی ہوں اُلٹ دیتی ہوں۔ آنکھوں کے سامنے ہر دم اندھیرا رہتا ہے۔ دماغ میں ہر وقت چکر، ٹانگیں کانپتی رہتی۔ اب اور کیا بتاؤں تمھیں —— ؟ میں پچھلے دنوں میں چپکے چپکے کئی بار مٹی کھا گئی۔ مجھے سوندھی سوندھی مٹی

بہت اچھی لگتی ہے۔"

"ایں ——؟"

"جی ہاں —— ! باجی میری اِس حالت کو دیکھ کر [illegible] شاید سب کچھ سمجھ گئی ہیں۔ اگر تم نے اب بھی جلدی چلنے کا کوئی راستہ [illegible] میں زہر کھا لوں گی!"

"گھبراؤ نہیں۔" پرویز نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں اب چلی۔ دیکھو کل اِس سلسلے میں [illegible]"

---

دلہن چڑھاتی کمرے میں آئیں تو سہیلی کی چیخ نکل گئی، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"پرویز، پچھلے کئی دنوں سے شنو کی حالت دیکھ کر مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ لیکن رات پچھلے پہر جب وہ چپکے سے اٹیچی کیس لئے کمرے سے باہر نکلی تو میں نے دوڑ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اوّل شب سے ہی وہ مجھے کچھ بےچین سی نظر آ رہی تھی۔ میری بھی آنکھ نہ لگی۔ لحاف کے ایک کونے سے میں اُس کی حالت دیکھتی رہی۔ میرے اچانک —— اِس طرح ہاتھ تھام لینے سے وہ گھبرا گئی اور پھر میرے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ اُس نے مجھے وہ سبھی کچھ بتا دیا جس کے سہارے وہ اپنی منزل کی طرف چل پڑی تھی۔ میں نے اُسے تسلی دی، سمجھایا اور وعدہ کیا ہے میں اُس کا سہاگ اُسے لوٹا دوں گی۔ میں اپنی معصوم بہن کی زندگی بچا لوں گی۔ اپنے ماں باپ کی عزت کی حفاظت کروں گی۔ تم سے بس ایک التجا ہے۔ تم میری بھولی بہن کو اب اور دھوکا نہ دینا۔ اُس کا ہاتھ سدا کے لئے تھام لینا۔ مجھے سنبھال، میری امّی کو مایوس نہ کرنا۔ میرے پاپا کی عزت کو سر بازار نیلام ہونے سے بچا لینا۔ تم میں اگر ذرا سی شرافت، تھوڑی سی حمیت اور ادنیٰ سی بھی انسانیت باقی ہے تو اپنے ماضی کو بھول کر اپنے حال کو داغدار ہونے سے بچا لینا۔ اِس سے تمھارا بھلا ہوگا، آنے والی نسلوں کا بھلا ہوگا۔ ایک بار زندگی، شاید تمھاری اِس معمولی قربانی سے مسکرانے کا چلن سیکھ لے۔"

بہار کا جنازہ خزاں کے دوش پر دھوم سے اُٹھا۔ آنکھیں روئیں، دل تڑپے اور ناکامیوں کے مزار پر آہوں نے پھول برسا دیے۔

جنازہ میں سبھی تھے لیکن پرویز کا کہیں پتہ نہ تھا!!

سو [illegible] جیسے ذہنی [illegible] آزاد [illegible]
میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے [illegible]

---

طنزیہ

# خط لکھیں گے...

## فکر تونسوی کے طنزیہ خطوط کا سلسلہ (۵)

### فوٹو گرافر کے نام ———•

اے مسٹر فوٹو گرافر!

یہ صحیح ہے کہ میری شکل و صورت اچھی نہیں۔ وہ صرف اچھی نہیں بلکہ باقاعدہ بھونڈی ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم میرا فوٹو مجھ سے بھی زیادہ بھونڈا بنا لو۔ خدا کی قسم! مجھے تو یہ فوٹو دیکھ کر اپنے آپ سے گھِن آگئی۔ اگر میں شریف نہ ہوتا تو تمھیں محب علی کی طرح شنا تا، تمھاری گردن اڑا دیتا، تمھارے خلاف شہر بھر میں پوسٹر لگوا دیتا۔ لیکن میں خاموشی سے لوٹ آیا۔ تم میری خاموشی سے یہ سمجھے کہ فوٹو بہترین تھا۔ مجھے پسند آگیا۔ تم اپنے ڈیفنس میں کہہ سکتے ہو کہ کیمرہ جھوٹ نہیں بولتا۔ جیسا شکل دیکھ چپ۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کیمرہ اگر جھوٹ نہیں بول سکتا تھا مگر تم تو بول سکتے تھے۔ تم ہی ایسے زاویے سے فوٹو لیتے کہ میں یوسفِ ثانی بن کر فوٹو میں اُبھر آتا۔ ارے مجھ سے تو اُس سبھکارن کی فوٹو کہیں کتنا خوبصورت تھی جو تم نے کھینچ کر اپنے سٹوڈیو میں لٹکا رکھی تھی۔ میرا خیال ہے میری شکل میں نقص نہیں ہے، تمھارے آرٹ میں نقص ہے۔ اے احمق! اپنے کرٹ کو خوبصورت بناؤ دوسروں کی بدصورتی پر نہ جاؤ۔ فوٹو گرافی کی سائنس بے حد ترقی کر گئی ہے۔ وہ تو ایک اُلّو کو بھی بلبل بنا رہی ہے۔

اچھا چلو! میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ میرے نقش بے ڈھب ہیں تو تم صاف کہہ دیتے کہ صاحب! آپ کافی مکروہ آدمی ہیں، تصویر بھی مکروہ آئے گی تو شاید (بلکہ یقیناً) میں فوٹو ہی نہ کھنچواتا۔ حالانکہ میں نے سٹوڈیو میں تمھارے ہر حکم کی تعمیل کی۔ بال بھی سنوارے، تمھاری نکٹائی بھی مانگ کر باندھی، چہرے پہ جذبات بھی طاری کئے [illegible] تم کو اچھا لگا۔ تم نے میری ٹھوڑی کو دس پندرہ بار اِدھر اُدھر [illegible] فوٹو میں بصیرت کا پیوستہ رہا۔

[illegible] بدصورت [illegible] ہوں [illegible] دیکھتا ہوں۔ مجھے تو اپنے چہرے پر کوئی نقص نظر نہیں آیا۔ نہ جانے تمھارے کیمرے کو یہ نقص کیسے نظر آگئے۔ یہ کیمرہ بیچ ڈالو۔ ساری خرابی اِسی کیمرے میں ہے۔

### بے نام دیوانے کے نام ———•

اے خدا کے خاص بندے!

میں ہر روز جب دہلی کے حسین ترین علاقے کناٹ پلیس سے گزرتا ہوں تمھیں ایک کراسنگ کے سرے پر کھڑا دیکھتا ہوں۔ لمبا کوٹ، تنگی پتلون پہنے، آنکھوں پر چشمہ لگائے تم دُور خلاؤں میں تکتے رہتے ہو۔ بائیں ہاتھ میں پرانے بوٹ کا ایک جوڑا پکڑے ہوئے اور پاؤں سے ننگے۔ حالانکہ بوٹ پاؤں میں پہننے کے لئے ہوتے ہیں، ہاتھوں میں پکڑنے کے لئے نہیں۔ لیکن مجھے کبھی ہمت نہ ہوئی کہ تم سے کہوں بوٹ پہن لو۔ کیوں اپنے پاؤں تار کول کے تپتے ہوئے فرش پر جلاتے ہو؟ کیونکہ ایک بار میں نے تمھارے ساتھ بات کرنے کی گستاخی کی تھی۔ میں نے صرف تمھارا نام پوچھا تھا۔ لیکن تم نے میری بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور مجھے شک کی نگاہ سے دیکھ کر تیزی سے منہ پھیر کر ایک طرف چل دئے اور دوسرا نگاہ پھر گز دُور جا کر کھڑے ہو گئے۔ شاید تم سہم گئے کہ میں تمھارے بوٹ چھین کر بھاگ جاؤں گا۔ پیارے دیوانے! تمھارا شک بجا تھا۔ ہم لوگ جو ابھی دیوانے نہیں ہوتے دوسروں کا مال چھین چھین کر ہی تو زندگی گزار رہے ہیں۔

تمھارے نین نقش گواہی دیتے ہیں کہ تم کوئی تعلیم یافتہ انسان ہو، کسی شریف اور مہذب گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ ذہانت تمھاری آنکھوں میں صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ تو پھر تم دیوانے کیسے ہو گئے؟ کیا ذہانت کا انجام دیوانگی ہوتا ہے؟ [illegible] کس کی [illegible] عمر بھر اِسی کراسنگ پر کھڑے رہو گے؟ تم کسی سے [illegible] اپنا غم بتاتے بھی تو نہیں، کیا اِتنی بڑی دنیا کو تم اِس کا اہل ہی نہیں سمجھتے کہ اُسے اپنا غم بتایا جائے؟ کیا الفاظ تمھارے سینے میں کلبلاتے نہیں ہیں، وہ زبان پر کیوں

نہیں آتے اور پھر یہ ٹوٹے، پُرانے پھٹے ہوئے بُوٹ۔ اِن کے پیچھے کون سی کہانی ہے؟
پیارے دیوانے! یہ سب باتیں کتنی پُراسرار ہیں؟ کتنا ہیجان ہے اِن میں!
کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں تمھاری اِس مسلسل خاموش کیفیت میں۔ میرا خیال ہے اگر آتے جاتے چند دنوں میں تم نے اپنا اسرار نہ کھولا تو میں بھی تمھاری طرح پاگل ہو جاؤں گا۔ خدا کے لئے یا تو میرے ساتھ کھل جاؤ یا اِس کراسنگ سے چلے جاؤ۔ جہاں سے مجھے ہر روز گزرنا پڑتا ہے۔ کسی اور کراسنگ پر چلے جاؤ۔ خود تو ڈوبے ہو صنم، مجھ کو کیوں لے ڈوبنا چاہتے ہو۔
ایک دھمکی:۔ اگر تم نے جواب نہ دیا یا کراسنگ نہ بدلا تو میں بھی تمھارے مقابلے پر دیوانہ بن کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ میرے پاس بھی پُرانے بُوٹ ہیں اور میں دیکھوں گا تم کتنے پانی میں ہو؟

## سینما کے منیجر کے نام ——●

جناب... (جو بھی آپ کا نام ہے)

آپ سے ایک حسین شکایت ہے۔ کل جب آپ کے سینما ہال میں دوپہر کے بارہ بجے کا شو چل رہا تھا، آپ نے ایک دم ہال کی ساری روشنیاں "اون" کر دیں اور پھر آپ جانتے ہیں کیا ہوا؟ ہال میں بیٹھے ہوئے نوّے فیصدی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کتنے شرمندہ ہو گئے کہ ایک دم شریف اور مہذب بننے پر مجبور ہو گئے۔ تاریکی نے اُن کی رومانٹک کیفیتوں کو اپنی مہربان آغوش میں چھپا رکھا تھا مگر روشنی نے انھیں ایک دم "نارمل" ہو جانے کی چیتاونی دے دی۔ ذرا سوچئے صرف ایک سیکنڈ کے مختصر لمحے میں نارمل ہو جانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ نے یہ ایک نازیبا حرکت کی۔ آپ نے اہلِ محبت کی توہین کی۔ آپ انتہائی تنگ ظرف انسان ہیں۔ آپ یہ برداشت ہی نہیں کر سکے کہ اہلِ شباب اپنی پیاسی آرزوؤں کی تسکین کا سامان کر سکیں۔ کیا آپ نے اپنی جوانی میں کسی کے لب و رخسار کو باعثِ تسکینِ دل و جان نہیں بنایا تھا۔ کیا آپ جوانی میں بھی اِسی طرح بُوڑھے تھے، اِسی طرح حاسد تھے، اِسی طرح تنگ نظر تھے۔

آپ کی اِس حرکت سے شہر کے اہلِ شباب میں سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے اور ممکن ہے وہ آپ کے سینما کا بائیکاٹ کر دیں۔ اِس سے تو آپ کا بزنس تباہ ہو جائے گا۔ دوسروں کے راز افشا کرنا نہ تو کوئی مہذب فعل ہے اور نہ دیش بھگتی۔ اگر آپ کو اخلاقی سدھار کا اِتنا ہی شوق ہے تو سینما کی منیجری چھوڑ دیجئے اور سادھو سماج کے ممبر بن جائیے۔ سچ مچ میں تو وہ منظر دیکھ کر کانپ اُٹھا تھا جب روشنی ہوتے ہی کئی ہاتھ رُک گئے، کئی ہونٹ شرما گئے، کئی بوسے رُک گئے، کئی آنکھیں، کئی شانے اور کئی سر [illegible] گئے۔ خدا لگتی کہئے اگر آپ بھی اِسی منظر کا حصّہ بنے ہوتے تو آپ پر کیا گزرتی؟ (دُکھی ہے عاشقی)
اُمید ہے آپ یہ خط پڑھ کر کافی شرمندہ ہوئے ہوں گے۔ اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے شرمندہ ہونے میں بڑی عظمت ہے جناب... (جو بھی آپ کا نام ہے)

## ایک گورنمنٹ کنٹریکٹر کے نام ——●

شری کرشن داس جی!

آپ گورنمنٹ (جو عوام کی ہے، عوام کے لئے ہے، عوام کی [illegible]) سے جو فراڈ کرتے رہتے ہیں، مجھے اُس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیونکہ اِس کا تعلق کچھ گہری باتوں سے ہے یعنی نظامِ حکومت، سیاسی فلسفہ، اخلاقی قدریں اور سوشلزم وغیرہ کی گہرائیوں سے۔ اور گہرائی کو نہ آپ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھنا چاہتے ہیں۔
میں تو آپ کی توجہ صرف دو چار عام فہم باتوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ آپ کی جو دخترِ نیک اختر ہے نا؟ جس نے اپنا آبائی نام ردّی کی ٹوکری میں پھینک کر ایک فلم ایکٹریس کا نام اپنا لیا ہے۔ اُس کے ہاتھ جلد سے جلد حنائی کروا دیجئے۔ ورنہ وہ کوئی ایسا گل کھِلا دے گی جس سے آپ کے خاندان کی عزت (جو گورنمنٹ سے فراڈ کی بنیاد پر قائم ہے) لڑکھڑانے لگے گی۔ جس پروفیسر کے پاس وہ ادبِ عالیہ کی ٹیوشن پڑھتی ہے، وہ کئی بار میرے پاس آکر زار و قطار رو چکا ہے کہ اُس لڑکی کو لٹریچر سے رتّی بھر دلچسپی نہیں۔ اُس کا صرف جسم حسین ہے دماغ حسین نہیں ہے اور اگر وہ فیل ہو گئی (جس کی پیش گوئی بلا جھجک کی جا سکتی ہے) تو رسوائی کا داغ خواہ مخواہ میرے ماتھے پر لگ جائے گا —— وہ بے چارا پروفیسر آپ سے یہ کھری اور کھُردری بات اِس لئے نہیں کہہ سکتا کہ وہ افلاس زدہ ہے جیسا کہ ہر انٹلکچول ہوتا ہے اُسے ہر ماہ دو سو روپے ٹیوشن فیس ملتی ہے۔ جسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کی انتہائی نالائق لڑکی کے ہاتھوں علم و ادب کی توہین ہو جائے۔ لہٰذا وہ بے چارا تذبذب میں ہے۔
کرشن جی! اِس صورتِ حال کا شریفانہ علاج یہ ہے کہ آپ اُسے مزید پڑھانا بند کر دیں۔ اُسے صرف اِس لئے پڑھائے جانا کہ آپ کے پاس روپے کی افراط ہے، ایک ناشائستہ حرکت ہے۔ وہ صرف شباب زدہ لڑکی ہے اُس پر ادبی ذوق ٹھونسنا شباب اور ادب دونوں پر ظلم ہے۔ لہٰذا میری مانئے اُس کی فوراً شادی کر دیجئے تاکہ وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے۔ البتہ اگر آپ کے پاس روپے کی اِتنی فراوانی ہے تو پروفیسر مذکور کو ویسے ہی دو سو روپے ماہوار دیا کیجئے۔ آپ کو تو روپے ضائع کرنا ہیں، لڑکی پر بھی ضائع ہو رہے ہیں۔ مجھ جیسے [illegible]

خالی ہو گئے

برات مانئے آپ کی دختر نیک اختر اُس بدنصیب سے عشق کرتی ہے۔
حالانکہ وہ غریب شادی شدہ ہے لیکن آپ کی لڑکی اُس سے بھی عشق کر سکتی ہے۔
چاہے وہ اُس کا خاندانی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اُسے کسی بھی خاوند کے ساتھ رخصتی کر دیجئے۔
آپ کی عزت، لڑکی کا شباب اور اب مالیہ تینوں چیزیں محفوظ ہو جائیں گی۔

## ڈاکٹر ناتھ جی کے نام ——●

ڈیر بدنصیب ڈاکٹر!

میں جب ہر روز آپ کے کلنک کے سامنے سے گزرتا ہوں۔ آپ تنہائی کے ہاتھوں نالاں ہو کر سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں مجھے آپ پر رحم آتا تھا کہ آپ کے پاس کوئی مریض نہیں آتا۔ لیکن اب مجھے آپ پر غصہ آتا ہے کہ آپ آخر اپنی پریکٹس چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ آپ اس ملک میں چائے کی دکان کھول سکتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی فیکٹری چلا سکتے ہیں۔ بوٹ شاپ کا بورڈ لگا سکتے ہیں۔ اس ملک میں چائے تک تو سوڈا واٹر بک سکتا ہے۔ لکڑی اور شلغم تک بک سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے لئے کسی کوالی فکیشن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چائے بیچنے والے یونیورسٹی کی ڈگریاں لے کر نہیں آتے۔ آپ نے ڈگری حاصل کر کے سمجھ لیا کہ اب آپ معزز ہو گئے ہیں اور سوسائٹی آپ کے قدموں پر زر و سیم لا کر ڈال دے گی۔ لیکن افسوس بلکہ ہائے ہائے ڈاکٹر ناتھ جی! سوسائٹی نے آپ کی قدر نہیں کی۔ آپ کو اس بلندی پر پہنچا دیا کہ اب آپ نہ اس بلندی سے نیچے اُتر سکتے ہیں (مثلاً لکڑیاں نہیں بیچ سکتے) اور نہ اس بلندی پر قائم رہ سکتے ہیں۔

میں یہ نہیں مانتا کہ ملک میں مریضوں کی کمی ہے۔ کمی اگر ہے تو آپ کے نصیب میں ہے۔ کیونکہ میں نے سُنا ہے کہ آپ کے پاس اگر کوئی بھولا بھٹکا مریض آ بھی جاتا ہے تو آپ اُسے دوائی نہیں دیتے بلکہ نصیحت دینے لگتے ہیں کہ علاج مت کرو، پرہیز کیا کرو۔ حالانکہ ڈاکٹر! مریض کو علاج کا دھوکا چاہیئے۔ دھوکے سے ہی روپے ملتے ہیں، پرہیز سے نہیں۔

اگر آپ سادھو سماج میں شامل ہو جائیں تو کیسا رہے گا؟

---

**نغمۂ سرمد** شہید سرمد کی فارسی رباعیوں کا ترجمہ اُردو رباعیوں میں از عرش ملسیانی۔ سرمد کے سوانح بھی کتاب میں درج ہیں۔ پہلے اصل رباعی ہے اس کے نیچے اُردو ترجمہ۔ اُردو اور فارسی ادب اور تصوف کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نادر تحفہ۔ قیمت پانچ روپے۔

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

---



افسانہ

# ایک تارہ بجھا بجھا سا

شعیب شمس۔ ایم۔ اے (ڈبل) گولڈ میڈلسٹ

صفدر منزل، کریم چک۔ چھپرہ (بہار)

۸ اپریل ۶۷ء

محترمی! اسلام خلوص

میں ہولی اور بقر عید کی تعطیل میں اپنے وطن موتی ہاری چلا گیا تھا۔ پیر میں موچ آجانے کی وجہ سے کافی تاخیر سے لوٹا تو آپ کا خط ملا۔ افسانہ کی پسندیدگی کا شکریہ ——— آپ نے افسانہ نمبر کے لئے "خوبصورت اور دلچسپ" افسانے کی فرمائش کی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ خوبصورت اور دلچسپ افسانے سے آپ کی کیا مراد ہے۔ پھر بھی تعمیلِ حکم کر رہا ہوں۔ کافی دیر ہو چکی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ یہ افسانہ آپ کے "افسانوی دستاویز" میں جگہ پاسکے گا۔ اس لئے کہ آپ خاص نمبروں کی تیاری بہت ہی پہلے سے شروع کر دیتے ہیں اور "دیر" کے قطعاً قائل نہیں ہیں۔ پھر بھی ایک اُمیدِ موہوم کے سہارے افسانہ روانہ خدمت ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مجھے آپ کی خفگی کا بھی تو خوف ہے۔ میں آپ کے خلوص سے محروم ہونا نہیں چاہتا . . .

آپ کا اپنا ——— شعیب شمس

"زندگی بہت پیاری شے ہے اِسے یوں رائیگاں نہیں کرتے میری جان؟"

سلمیٰ کا خط جب بھی آتا میں جھنجلا سی جاتی۔ بس ایک جملہ اور وہ بھی چبھتا ہوا فلسفیانہ سا جملہ اور اُس کی اِس حرکت سے مجھے بہت کوفت ہوتی۔ کمبخت فلسفی کی خالہ۔ پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے۔ بی۔ اے کیا کر لیا جیسے تعلیم کی ساری دولت سے مالا مال ہو گئی ہو۔ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ لاکھوں بار لکھ چکی ہوں، دھمکیاں بھی دے چکی ہوں کہ ایسے تشنہ اور مختصر خطوط نہ لکھا کرو۔ اِن سے تشفی نہیں ہوتی اور اگر اب تم نے مختصر خطوط لکھے تو میں سلسلۂ مراسلت ہی بند کر دوں گی لیکن اُس کمبخت پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

"یہ مشینی دَور بہت ہی کرب انگیز ہے۔ آج کی اِس دُنیا میں کسے اتنی فرصت ہے کہ طویل خط پڑھے اور لکھے ——— مجھے تو فضول گوئی پر مجبور نہ کرو۔"

اچھا تو گویا میں فضول گوئی کرتی ہوں اور اپنے دلی جذبات کو الفاظ کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنے اوقات کر رہی ہوں۔ جاؤ یا تمہارے منہ کون لگے کون جانے مجھے اُجڈ، جاہل اور جاہل کہہ کر تم دشنام طرازی پر اُتر آؤ۔ بہتر ہے کہ میں تمہیں خط ہی نہ لکھوں۔ مجھے تو اپنی فضول گوئی سے بہت پیار ہے اور میں اپنے اِس پیار کو کھونا نہیں چاہتی۔ یہ دولتِ دل بڑی ہی قیمتی شے ہے اِسے یوں کون برباد کرے۔

"تم نے خط لکھنا بند کر دیا۔ جانتی ہوں خفا ہو لیکن ایسی بھی کیا خفگی۔ مان جاؤ۔ کیوں خود بھی گناہ گار بنتی ہو اور مجھے بھی گناہ گار بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

یا خدا پھر وہی حرکت۔ پھر وہی مختصر سا خط۔ یہ سلمیٰ کی بچی آخر کس مٹی کی بنی ہے!؟ اُس پر تو کچھ بھی اثر نہیں کرتا۔ نہ غصّے کا جادو ہی چلتا ہے اور نہ میری منطق ہی کام کرتی ہے۔ آخر یہ ایسی کیوں ہو گئی ہے؟ ——— جب تک یہاں تھی یہ ایسی تو نہ تھی۔ خود ہی گھُس گھُس کر بیٹھتی تھی اور نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ اُس کی باتیں سُننے میں مجھے بھی بہت لطف آتا تھا اور میں ہمیشہ اُس کا انتظار کیا کرتی تھی کہ وہ آئے تو کچھ رازو نیاز کی باتیں ہوں، عجیب عجیب سی باتیں بعض اوقات تو خود وہ بھی شرما جایا کرتی تھی۔ اُس کے گالوں کی لوییں شفق کی طرح دمکنے

گئی تھیں۔

"نجمی! ذرا میرے کان تو چھو کر دیکھ" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کان پر رکھ دیتی۔

"ارے تیرے تو گال بھی تمتما اُٹھے ہیں! کہاں سے یہ ساری باتیں سیکھ کر آئی ہو تم؟ کیا کالج کی ساری کتابوں میں ایسی ہی باتیں بھری رہتی ہیں؟"

"زندگی اسی کا نام ہے میری جان!" اور وہ مجھے اس طرح بھینچ لیتی کہ میرا انگ انگ جیسے ٹوٹ جاتا۔

"بُوا! کئی دنوں سے سلمیٰ نظر نہیں آئی۔ سب خیریت تو ہے نا؟" سلمیٰ کی ماما امی جان سے کھُسر پھُسر کر رہی تھیں۔ آخر یہ رازداری کیسی؟ ——— کہیں خدانخواستہ کوئی بات تو نہیں ہو گئی۔

---

- تین باتوں سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ محفل میں آنے والوں کو جگہ دینا، سلام کرنا، لوگوں کو اچھے ناموں سے پکارنا۔ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ)
- اوقاتِ فرصت کو غنیمت جانو۔ یہ ایسے بادل ہیں جو جا کر پھر نہیں آتے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- اُس کے لئے کہیں پناہ نہیں جو خدا سے بے خوف، خلق آزار اور بد خُو، حق تعالیٰ سے دُور ہے۔ (حضرت بایزید بسطامیؒ)
- جواں مرد وہ ہے جو رنج پہنچانے والے کو بھی رنج نہ پہنچائے۔ (مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ)
- لوگوں کی بھلائیوں کو ظاہر کرو اور بُرائیوں کو چھپاؤ۔ (حضرت امام غزالیؒ)

---

"سلمیٰ بٹیا تو کئی دنوں سے بخار میں پڑی ہیں" بُوا نے اپنی ناک سُڑ سُڑاتے ہوئے جواب دیا۔

اور جب میں سلمیٰ کے یہاں پہنچی تو وہ سر سے پاؤں تک کمبل لپیٹے پڑی تھی۔ اُسے تیز بخار تھا۔ آج وہ بہت اُداس تھی۔ باتوں باتوں میں سرد آہ بھر کر اُس نے آج پھر کہا۔

"کیا میری اُمید کا دامن ہمیشہ خالی ہی رہے گا نجمی؟"

اور سلمیٰ نے اپنے دامن کو رنگارنگ پھولوں سے بھرنے کی سبیل ڈھونڈ ہی نکالی۔ یہ اور بات ہے کہ پھولوں کی اُمید میں اُس کا دامن کانٹوں سے بھر گیا۔ کانٹوں سے اُس دامن کو آزاد کرانے میں میرا وجود بھی کئی جگہ سے لہولہان ہو گیا۔ میں زندگی کے اُس بھیانک رُوپ کا تصور ہی کر کے کانپ اُٹھی ——— میرا دامن لٹ گیا ——— ہائے اللہ اب کیا ہوگا؟

"ارشد بھائی! سلمیٰ کی زندگی کو تباہ کرنے کی ساری ذمہ داری آپ کے سر آتی ہے اور آپ کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ آپ اُس کا ہاتھ تھام لیں۔ اُس کا سہارا بن جائیں۔"

"میں مجبور ہوں نجمی! میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ سلمیٰ خود ہی مجھ سے ٹکرائی تھیں۔ بھلا اِس میں میرا کیا قصور؟"

"آپ کا اِس میں کوئی قصور نہیں اِس لئے کہ آپ مرد ہیں اور قصور وار عورت ہے۔ آپ جانتے ہیں سلمیٰ کی زندگی اِس طرح تباہ ہو جائے گی؟"

"میں کیا جانوں؟"

اور میری باتوں کا جواب دئے بغیر ہی ارشد کمرے سے باہر نکل گئے اور ایسا گئے کہ پھر کبھی گھوم کر دیکھنے کی بھی کوشش نہ کی۔ شاید انھیں اپنے نقوش پا ہی نظر آجاتے اور وہ متاسف ہو کر سلمیٰ کو اپنی بانہوں میں چھپا لیتے ——— لیکن وہ ایسا کرنے ہی کیوں لگے۔ انھیں تو سلمیٰ پست کردار نظر آتی تھی ——— ایک جذباتی لڑکی جو ارشد کے علاوہ کسی اور کی بھی بن سکتی ہے۔

"آج کی دُنیا غرض کی دُنیا ہے نجمی! ایسے کانٹوں سے کون الجھے جو پھولوں کی حفاظت بھی نہ کر سکتے ہوں۔"

"آپ سے خدا سمجھے گا ارشد بھائی" اور میں بلبلا کر انھیں کوسنے دینے لگتی۔ لیکن ارشد موجود ہوتا جب تو سُنتا اُس کی تو عادت تھی کہ اپنی باتیں کہتا اور چلا جاتا اور سلمیٰ ——— وہ تلخ سی مسکراہٹ بکھیر کر رہ جاتی۔ کتنا غم پوشیدہ تھا اُس کی مسکراہٹ میں۔ جیسے سارے زمانے کا درد سمٹ آیا ہو۔

"ایسی گندی باتیں سوچ کر کیوں اپنی زندگی تباہ کرتی ہو نجمی!"

بھلا ایسے موقعوں پر کوئی ضبط کرے بھی تو کیسے؟ ——— اور میں اُس سے لپٹ کر پھوٹ پڑتی۔ لیکن سلمیٰ کی آنکھیں؟ ——— وہ تو اب بھی خشک تھیں اور میں حیرت و استعجاب کے عالم میں اُس کا منہ دیکھتی رہ جاتی۔

"زندگی اسی کا نام ہے نجمی! مجھے حیرت سے یوں گھور کر نہ دیکھو۔ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

"تو کیا اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی تمھیں ملال نہیں؟"

"ملال؟ ——— ہنہہ۔ . . ملال کس بات کا؟ میں آگ سے کھیلتی ہوں تو جل کر خاک تو ہونا ہے ———۔"

لیکن میں جانتی تھی کہ ایسی باتیں کہتے وقت اُس کے دل پر کیا بیتتی ہوگی ——— سلمیٰ خود کو دھوکا دے رہی تھی ——— فریب مسلسل!

# آنسان کی مجبر

"سلمی یہ اداس کیوں ہو کر باتیں کرتی ہو؟"
"کیسی باتیں؟"
"زندگی کی رنگینیوں کی جو تم اکثر کیا کرتی تھیں۔"
"حسینہ حیات کا وہ باب بہت پیچھے چھوٹ گیا نجمی! اور میں پلٹ کر ماضی کو دیکھنے کی قائل نہیں ہوں۔"
"لیکن ماضی کی روایات سے یوں متنفر نہ ہونا چاہیے۔"
"اگر روایات صحت مند ہوں تب نا!"
"تو کیا ——؟"
"ہاں نجمی! میں اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر دینا چاہتی ہوں۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے اور اب..؟!"
"کیا...؟"
"تم مجھے غلط تو نہ سمجھو گی؟"
"تم اپنی باتیں کہو بھی تو۔"
"مجھے اپنی غلطی پر اب افسوس بھی ہوتا ہے۔"
اور میں نے دیکھا اس کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔ آنسوؤں کو اس نے دوپٹے کے آنچل میں جذب کر لیا۔
"میرے آنسو مجھے بہت عزیز ہیں۔ میں ان کی بہت حفاظت کرتی ہوں۔ اور انھیں سنبھال کر رکھ دیتی ہوں شاید کبھی کسی کے لئے درسِ عبرت ہوں۔"

---

سلمی ہمیشہ کھوئی کھوئی سی رہتی۔ نہ جانے دور خلا میں کیا تلاش کرتی رہتی اور جب دور آسمان کی نیلگوں وسعتوں سے کوئی تارہ ٹوٹ کر گرتا تو وہ بیتابانہ اپنے آنچل پھیلا دیتی۔
"تم ٹوٹتے ہوئے تاروں کو آنچل میں بھر لینے کی خواہش کیوں کرتی ہو؟"
"جن تاروں کو آسمان کی وسعتیں بھی خود میں نہ چھپا سکیں شاید انھیں میرے دامن میں سکون میسر آجائے۔"
اور جب تارے اس کے دامن کا رخ نہ کرتے تو وہ بے چارگی سے مسکرا پڑتی۔
"بدنصیب!"
"کون؟"
"یہ تارے —— نجمی! یہ تارے بھی میری ہی طرح بدنصیب ہیں۔ انھیں بھی کہیں پناہ نہیں ملتی۔ پتہ نہیں آسمان سے ٹوٹ کر کس ویرانے میں کھو جاتے ہوں گے ——"
اور وہ سسک پڑتی ——
"سلمی!"
"ہوں۔"
"ایک بات کہوں مانو گی؟"
"کہو۔"
"تم اب شادی کر لو۔"
"نہیں نجمی! میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"
"آخر کیوں؟" میں بلبلا اٹھی۔

---

- جاہل کا ذاتی تجربہ بہت محدود ہوتا ہے اور عالم کا مطالعہ اس کی فکر کو بہت وسیع کر دیتا ہے۔ (فرینکلن)
- ایک ذہین عورت سے ملاقات کسی وقت بھی انسان کی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔ (ہینری ونسنٹ)
- دنیا میں کوئی آپ کی اپنی ذات کے سوا آپ کو ناکام نہیں بنا سکتا۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- جس کام کو آپ کر سکتے ہیں یا سمجھتے ہیں کہ کر سکیں گے اسے شروع کیجیے جرأت میں جلال، طاقت اور جادو ہے۔ کام شروع کیجیے ختم اپنے آپ ہو جائے گا۔ (گیٹے)
- کثرتِ کار تفکرات کی بہترین دوا ہے۔ (ڈیل کارنیگی)

---

"میں کسی کو دھوکا دینا نہیں چاہتی اور اب تنہائی مجھے بہت پیاری محسوس ہوتی ہے۔ اسی تنہائی کے سہارے تو میں زندہ ہوں۔ اگر یہ بھی مجھ سے چھین لی گئی تو سسک سسک کر مر جانے سے مجھے کوئی نہ روک سکے گا اور کون جانے تنہائی کی لازوال دولت کھو دینے کے بعد بھی زندگی راس نہ آئی تو ——"
اور سلمی مجھے کچھ ایسی پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی کہ میں بھی بوکھلا جاتی۔ میں اس کی ان باتوں کا جواب بھی کیا دے سکتی تھی —— میرے پاس جواب دینے کے لئے کوئی بات بھی تو نہ تھی۔
اور پھر سلمی چلی گئی —— [illegible]
[illegible]
[illegible]

"محمود پر قابو پاؤ سلمیٰ! اگر زندگی رہی تو ہم انشاء اللہ پھر ضرور ملیں گے۔"

"خط لکھو گی نا نجمی؟"

"میں تو لکھوں گی ہی۔ تم اپنی کہو۔"

"میں کسی کا دل توڑنا نہیں جانتی ——— انسان کا دل تو شیشہ ہے نجمی! میں شیشوں کی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ بھلے ہی کوئی دوسرا اسے ٹھوکر لگا کر چلا جائے۔"

---

سلمیٰ چلی گئی۔ میں اکیلی رہ گئی۔ اتنے دنوں کے درمیان میں نے کسی اور کو سہیلی بنانے کی کوشش بھی تو نہ کی تھی اور سلمیٰ نے اس کا موقع ہی کب دیا۔ میں تو جب بھی اس سے ملی اس کی باتوں میں گم ہو کر رہ گئی۔

"دو دن کے بعد تمھاری شادی ہے۔ خدا تمھیں زندگی کا یہ نیا سفر مبارک کرے نجمی! کوشش کرنا کہ زندگی کی دشوار گزار راہوں میں کوئی پیچیدہ موڑ نہ آنے پائے۔ لاکھوں مبارکباد میری پیاری، میری بہن، میری دلہن!"

اور شادی کے موقعے پر اس کی غیر حاضری کا تصور کر کے میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

سلمیٰ کے خطوط برابر آتے رہے لیکن وہ مختصر خطوط [illegible] مجھے۔ لیکن ان مختصر خطوط میں بھی زندگی کی کتنی داستانیں پوشیدہ تھیں یہ میں ہی جانتی تھی ———

اور آج ——— آج سلمیٰ کا آخری خط مجھے ملا ہے [illegible] ———

"میں جس ستارے کی تمنا میں اب تک اپنا دامن پھیلائے [illegible] بخود وہ ستارہ میرے آنچل میں آ گرا ہے۔ مجھے اب کسی [illegible] میں سانسوں کے اس طلسم سے آزاد ہو رہی ہوں ——— میرا [illegible] بھاری سا کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ شاید میں ستاروں کی آغوش میں جا رہی ہوں ——— ہاں نجمی! کوئی کہاں تک ضبط کرے۔ آخر ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ صبر و ضبط نے میری روح تک کو مجروح کر دیا ہے ——— لیکن میری ایک ہی خواہش ہے اسے ضرور پورا کر دینا ——— اپنے بچے کا نام ارشد ہرگز نہ رکھنا!"

آسمان کی پنہائیوں میں ایک ستارہ ٹوٹ کر گم ہو گیا ہے اور میں کانپ گئی ہوں!!

---

# غزلیں

**عنوان چشتی ایم۔اے**

نکہت بن کے جو خوشبوئے بدن رات گئے
پھول کھلتا ہے سرِ شاخِ چمن رات گئے

جھومنے لگی وہ گل بہکے، وہ شبنم برسی
بولنے لگے ہیں اسرارِ چمن رات گئے

قدِ گیسو کے لئے کوئی کنایہ ہی سہی
چھیڑ دیجے تذکرۂ دار و رسن رات گئے

اُف یہ بھڑکے ہوئے جذبات کے شعلے اے دوست
اُف یہ بھیگا ہوا شبنم سے بدن رات گئے

تیرے گیسو کے تصور میں بڑے شوق کے ساتھ
کھولتا رہتا ہوں بستر کی شکن رات گئے

جیسے دریا میں چراغوں کے سفر کا منظر
اُف یہ بیدار ستارے، یہ گگن رات گئے

رُوح سو جاتی ہے خوابیدہ مقدر کی طرح
جاگتا ہے مگر احساسِ بدن رات گئے

پھیلتا جاتا ہے عنوانؔ غزل کا جادو
ہوتی جاتی ہے حسیں بزمِ سخن رات گئے

عنوان

**پریم وار برٹنی**

اپنے آنچل پہ ستاروں سے مرا نام نہ لکھ
میں ترا خواب ہوں پلکوں میں سجا لے مجھ کو

میری فطرت ہے محبت کی مچلتی ہوئی لہر
اپنے سینے کے سمندر میں چھپا لے مجھ کو

زندگی چاندنی راتوں کا حسیں رُوپ لئے
سنگِ مرمر کے جزیروں میں اُتر آئی ہے

تیرے مہندی لگے ہاتھوں کو چھوا ہے جب بھی
سات رنگوں کی فضا ذہن میں لہرائی ہے

تیرے مستی بھرے ہونٹوں کا پگھلتا ہوا لمس
گنگناتا ہے مری رُوح کی تنہائی میں

کسی شیشے کسی ساغر کسی صہبا میں کہاں
وہ جو مستی ہے ترے جسم کی انگڑائی میں

اپنی ابریشمیں زُلفوں کے گھنیرے سائے
میری نیندوں کے شبستانوں میں لہرانے دے

مجھ کو بنتے ہوئے خوابوں کا مقدر بن کر
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سما جانے دے

پریم وار برٹنی

**شہر یار پرواز ایم۔اے**

پھر اک جنوں کو لئے چل پڑے ہیں دیوانے
کدھر ہے منزلِ مقصود یہ خدا جانے

بہار آئے گی کب، اور کب وہ دیوانے
اِسی خیال میں جھوما کئے ہیں دیوانے

قیودِ دیر و حرم سے ہوئے جو بیگانے
نئے خدا و صنم ڈھال لیں گے دیوانے

ستم اور جفا کے ارادے نہیں نہیں توبہ
جفا کے وہم مجھے آ گئے تجھے بہکانے

سحر تو سادہ و بے رنگ سی حقیقت ہو
اندھیری رات کے دل میں تو لاکھ افسانے

وہ التفاتِ فراواں، وہ نشۂ پیماں
تری نگاہِ خفی کاش ہم کو پہچانے

مئے دوشینہ کی گرمی ہنوز باقی ہے
ہیں چُور چُور کھنکتے ہیں پھر بھی پیمانے

جنوں پہ فاش ہے ترِ حیات اے پروازؔ
غریب عقل بھلا زندگی کو کیا جانے

شہر یار پرواز

# کھنڈر

ش۔ نذیر الدین

معرفت غوث محی الدین صاحب مکان نمبر ۴/۱۲۹ طیب لینڈ روڈ ۲۔ بلی (ضلع دھارواڑ)

۱۹ مارچ ۱۹۷۶ء

محترم بھائی! آداب

ایک افسانہ "کھنڈر" کے ساتھ "بزمِ بیسویں صدی" میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میری یہ کوشش اگر "بیسویں صدی" کے معیار کو چھو لے تو شاملِ اشاعت کرلیں۔ . .

آپ کا ——— ش۔ نذیر الدین

---

اُس وقت ہوا بالکل نہیں تھی۔ یوکلپٹس کے لمبے لمبے درخت خاموش کھڑے تھے۔ ندی بہہ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے خاموش خاموش سی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا، وقت کی رفتار ایک دم سست ہوگئی ہو۔ سامنے جلتی ہوئی آگ کی تپش میں میں نے اُس کے چہرے پر جذبات کے کئی ملے جُلے نشیب و فراز کو صاف محسوس کیا۔ وہ آگ کے سامنے بیٹھی آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر چیچک کے داغ آگ کی سُرخ تپش سے تانبے کے گھڑے پر لگے ہوئے چکیلے نشانوں کی طرح چمک رہے تھے۔

اس پہاڑی پر ہم ہرن کے شکار کے لئے آئے ہوئے تھے۔ یہاں سے ڈاک بنگلہ آٹھ میل دُور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ہے، جس کے نیچے سے ندی کسی حسینہ کی لمبی سانس کی طرح گزر گئی ہے۔ پہاڑی کی ڈھلوان پر یوکلپٹس کے بے شمار درخت بے ترتیب کھڑے ہیں۔ جب ہوا کے سرد جھونکے چلتے ہیں تو یوکلپٹس کے یہ بے شمار درخت جھوم جھوم کر فضا میں ایسا کیف انگیز نغمہ چھیڑ دیتے ہیں جسے سُن کر ایسا محسوس ہوتا ہے، اپنا وجود پگھل کر اس نغمہ کی لَے پر تیرتا چلا جا رہا ہو! ——— اِس حسین وادی کو قدرت نے جس قدر خوبصورت بنایا ہے، انسانوں کی بنائی ہوئی صدیوں پُرانی عمارتوں کے کھنڈروں نے اسے بدصورت بنانے کی کوشش کی ہے۔ جگہ جگہ قدیم عمارتوں کے کھنڈر اس وادی پر بدنما داغوں کی طرح اُبھرے ہوئے ہیں۔ پھر بھی اِس رومان انگیز وادی میں قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ان بدنما داغوں کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

لاجونتی یہاں کی ایک جوان لڑکی ہے۔ اُس کی جھونپڑی ڈاک بنگلہ کی بائیں جانب پہاڑی ڈھلوان کے اختتام پر ندی کے کنارے ہے۔ اُس کا بوڑھا باپ ڈاک بنگلہ میں آنے والے مسافروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے تین دن ہوگئے تھے۔ ان تین دنوں میں طاہرہ اور سُشما لاجونتی سے کچھ اِس طرح گھُل مِل گئی تھیں جیسے وہ اُسے برسوں سے جانتی ہوں۔ وہ سارا دن اُس کے ساتھ اِس وادی میں گھوما کرتیں اور میں یہاں کے کھنڈروں میں اپنا سر پھوڑتا رہتا۔ میرا تعلق محکمۂ آثارِ قدیمہ سے ہے۔ میں یہاں ڈیوٹی پر آیا ہوا تھا۔ میرا کام اِن کھنڈروں کو کھُدوا کر اِن سے برآمد ہونے والی چیزوں کا قدیم تہذیب سے تعلق دریافت کرنا تھا۔

میری اور میرے ساتھی راجیش کی ڈیوٹی جب اُس وادی میں لگی تو راجیش نے یہ پروگرام بنایا کہ ہم اپنے ساتھ اپنی بیویوں کو بھی لے چلیں۔ اِس پروگرام کے تحت جب سفر کی تیاری مکمل ہوگئی تو اچانک راجیش کو دفتر کے کام سے چار دن کے لئے رُک جانا پڑا۔ اِس لئے اُس نے اپنی نئی نویلی دُلہن سُشما کو میرے اور طاہرہ کے ساتھ یہ کہہ کر بھیج دیا کہ وہ چار دن بعد آئے گا۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے تین دن ہوگئے تھے۔ کل دوپہر کو راجیش آنے والا تھا۔ اُس کے آتے ہی کھُدائی شروع کردینی تھی۔ اِس لئے میں نے سوچا، راجیش کے آنے سے پہلے ہی شکار کا پروگرام مکمل کرلوں۔ کیونکہ مجھے شکار کا بہت شوق ہے۔

اُس جنگل میں شکار کھیلنے کی بہت ممانعت تھی۔ لیکن میں نے یہاں کے

ایک شکاری مچھلے کے ذریعے قادیست گھر کو کچھ نے والا آج ایک دن شکار کیلئے کی اجازت لے لی تھی۔ مچھلے نے مجھ سے کہا تھا صبح جب سورج کی کرنیں ندی کے ٹھنڈے پانی کو گرمانے لگتی ہیں تو ہرنوں کا جھنڈ یہاں سے گزرتا ہے اور اسی وقت شکار کھیلا جائے گا۔

جب شکار کا پروگرام بنا تو طاہرہ اور شمشاد نے اپنی سہیلی لاجونتی کو بھی ساتھ لے لیا۔ طاہرہ نے مجھ سے کہا تھا کہ لاجونتی کی خاموش طبیعت اور اس کا کھویا کھویا پن ماضی کے کسی بھیانک واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ آج رات لاجونتی کو اپنے ماضی سے پردہ ہٹانے پر مجبور کرے گی تاکہ میں خیمے کے پیچھے کی اوٹ سے اس کی کہانی سن سکوں۔

رات زیادہ سرد نہیں تھی۔ پاس کے خیمے سے مچھلے اور اس کے ساتھیوں کے ملے جلے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ میں اپنے خیمے میں بستر پر لیٹا پردے کی اوٹ سے آگ کے گرد بیٹھی ہوئی ان تینوں عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ جن میں ایک تو میری بیوی طاہرہ تھی۔ دوسری سیاہ چیچک زدہ چہرے والی بدصورت لاجونتی! اور تیسری عورت تھی میرے ساتھی راجیش کی نئی نویلی خوبصورت دلہن شمشاد جس کی سیاہ زلفیں بکھر کر رات کی تاریکی میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔

کہانی کی تمہید شروع ہو گئی تھی اور لاجونتی کا چہرہ اجنتا کی گپھاؤں کی طرح جذبات سے عاری ہو چلا تھا۔

لاجونتی کہہ رہی تھی ——— "وہ ایک ایسی ہی رات تھی بی بی جی! جب وہ یہاں آیا تھا ——— یہ سنسان سی راتیں بڑی بے درد ہوتی ہیں۔ ان راتوں میں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ اس وقت میرا دل چاہتا ہے' میں ندی کے ٹھنڈے پانی میں اپنے وجود کو چھپا لوں! ——— تین سال پہلے کی بات ہے۔ وہ آپ کے بابو کی طرح ان کھنڈروں میں جانے کیا ڈھونڈتا تھا۔ انہیں کھدواتا، مٹی اور پتھروں کے ڈھیروں کو ہٹاتا، ان کی تصویریں بناتا، موٹی موٹی کتابیں پڑھتا اور ان کھنڈروں میں کھو جاتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ مٹی اور پتھروں سے ڈھکے ہوئے یہ کھنڈر مجھے بہت ہی بدصورت لگتے ہیں۔ بالکل میری طرح! میں بھی بدصورت ہوں نا بی بی جی؟"

"نہیں تو، تم سے کس نے کہا" طاہرہ لاجونتی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ ہنس پڑی۔

"آئینہ جھوٹ نہیں بولتا بی بی جی! میں ان کھنڈروں کی طرح بدصورت ہوں۔ اسے ان کھنڈروں سے پیار تھا۔ شاید اسی لئے وہ مجھے بھی چاہتا تھا۔ ورنہ ایک شہری نوجوان کے لئے مجھ میں کون سی کشش ہے..." وہ خاموش ہو گئی۔

کہ یہ کھنڈر [illegible] کشش [illegible] ہو [illegible] ہنسی!

"اس کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔ [illegible] کی تعریف کرتا۔ میرے سیاہ چہرے کو اپنے ہاتھوں میں [illegible] میں تیرتا ہوا کنول ہے ——— مسکراتا ہوا گلاب ہو ——— [illegible] پہاڑی پر کھلا ہوا کوئی کا ایک پھول ہے۔ [illegible] کو آئینے کی نظر سے نہ دیکھو۔ میری آنکھوں [illegible] ——— اس کی آنکھوں میں اپنی تصویر دیکھ لیتی۔ سب کچھ [illegible] مجھے محسوس ہوتا میرا چہرہ [illegible] جھیل میں تیرتا ہوا کنول [illegible] ہو ... !" لاجونتی ہنس پڑی۔

"آخر ہوں نا ایک عورت؟" وہ معنی خیز نگاہوں سے [illegible] کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے ان سے اس بات کی تصدیق چاہتی ہو کہ وہ [illegible] یا نہیں؟ دونوں عورتیں اس سے نگاہیں چرا کر یوکلپٹس کے لمبے درختوں کو دیکھنے لگیں جیسے لاجونتی کے اس سوال کا جواب ان کے پاس نہیں، یوکلپٹس کے [illegible] درختوں کے پاس ہے یا پہاڑیوں سے گزرتی ہوئی الھڑ ندی جانتی ہو یا پھر [illegible] کھنڈر!

"میں نے اس کے شانے پر سر رکھ کر کئی بار کہا [illegible] میں بہت ہی بدصورت ہوں۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ، کیا میل ——— میری اس بات پر وہ مسکرا دیتا اور میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہتا ——— قوس قزح کے رنگوں سے رنگی ہوئی تصویر کو اگر خوبصورت کہتے ہیں تو سیاہ پتھر سے تراشا ہوا پیکر بھی خوبصورت کہلاتا ہے۔ قدرت کی مصوری کے کئی نمونے ہیں۔ اس کی مصوری کا ایک نمونہ قوس قزح کے رنگوں سے رنگا ہوا ہوتا ہے، تو دوسرا پتھر [illegible] سے تراشا ہوا پیکر! تم قدرت کی مصوری کا دوسرا نمونہ ہو! تم میں اجنتا کی مورتیوں کا تقدس ہے تو ایلورا کی گپھاؤں میں پھیلی ہوئی کہانیوں کا خلوص! تم تاریکی کا ایک سورج ہو جس کی کرنوں سے پھوٹتی ہوئی پیار کی روشنی نے مجھے منور کر دیا ہے اور میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں ——— اس کی یہ باتیں میرے سارے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتیں اور میں اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا کر سب کچھ بھول جاتی۔ اپنی بدصورتی کو، اپنے [illegible] باپ کو، اس چھوٹے سے گاؤں کو اور اپنے آپ کو، سب کچھ ..." جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ تینوں عورتیں خاموش تھیں سامنے جلتی ہوئی آگ [illegible] تھی۔ لاجونتی آہستہ آہستہ لکڑی سے آگ کرید رہی تھی۔ [illegible] میں دبی ہوئی ماضی کی چنگاریوں کو خیالات کی انگلیوں سے کرید رہی ہو۔

پھر جب اس نے پیتا باپو کر سب کچھ بتا گیا تھا سارے گاؤں کو معلوم ہو گیا اور ۔۔۔ میاں منشیں کھڑی ہو گئیں۔ لیکن اس نے ایک ہی لمحہ میں ساری مصیبت کو ۔۔۔ دیا۔ اس نے میرے باپو اور گاؤں والوں سے کہہ دیا، وہ مجھے بیاہ کر اپنے شہر لے جائے گا ۔۔۔۔ اُس دن میرے بیاہ کی تاریخ مقرر ہوئی . . " وہ شرما گئی۔ ۔۔۔ جس طرح ہر لڑکی اپنی بیاہ کی بات پر شرما جاتی ہے۔

" ساون کے مہینے کی پندرہ تاریخ کو ہمارا بیاہ تھا۔ اُس دن کے ٹھیک آٹھ دن پہلے . . " وہ خاموش ہو کر خلا میں گھور رہی تھی جیسے اپنے سامنے اپنے آپ کو دلہن بنی دیکھ رہی ہو۔

" پھر ؟ " سشما نے آہستہ سے پوچھا۔ وہ چونک پڑی۔

" پھر . . باپو میرے بیاہ کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا کہ دس تاریخ کے دن ڈاکیہ اُس کے نام ایک تار لے آیا۔ جسے پڑھ کر اُس نے کہا اُس کے دفتر سے آیا ہے اور اسے وہاں فوراً طلب کیا گیا ہے . . . یہ سن کر میں اور باپو دونوں پریشان ہو گئے لیکن اُس نے باپو سے کہا، وہ شادی کی تیاریاں کر لے۔ وہ یہاں ٹھیک وقت پر پہنچ جائے گا۔ اُسی دن شام کو وہ باپو سے اجازت لے کر مجھ سے بیاہ کے دن آنے کا وعدہ کر کے یہاں سے چلا گیا۔ بیاہ کے دن منڈپ سجائے میں دلہن بنی اُس کی راہ دیکھتی رہی۔ لیکن وہ نہ آیا . . . آج تک نہ آیا !! " اُس نے مسکرا کر دونوں عورتوں کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ لیکن لاجونتی کے چہرے پر تو مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایسا اعتماد چمک رہا تھا جیسے منڈپ میں بیٹھی اپنے دولہا کا انتظار کرتی ہوئی دلہن کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔

" کیا تمہیں ابھی اُس کا انتظار ہے ؟ " سشما نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

" ہاں ! "

" اُس کی چٹھیاں تو آتی ہوں گی ؟ " طاہرہ نے پوچھا۔

" نہیں ! ۔۔۔۔ مجھے تو اُس کا نام بھی معلوم نہیں بی بی جی ! میں تو اُسے بابو کہہ کر پکارتی تھی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سے شہر کا رہنے والا ہے ! "

" تم بہت ہی بھولی ہو لاجونتی ! تم نے اُسے پہچاننے میں غلطی کی۔ اُس نے تمہیں دھوکا دیا ! " سشما کی اِس بات پر وہ مسکرا دی۔

وہ آئے گا بی بی جی ! ضرور آئے گا ! اُسے یہاں کے کھنڈروں سے پیار ہے اور میں بھی تو ایک کھنڈر ہوں ! " اچانک ہوا تیز ہو گئی اور اُس کے ساتھ ہی بارش کی بڑی بڑی بوندیں بھی گرنے لگیں۔ تینوں عورتیں اُٹھ کر خیمہ میں چلی گئیں۔

ساری رات بارش ہوتی رہی۔ صبح ہم شکار کھیلے بغیر ہی ڈاک بنگلہ واپس آ گئے۔

دوپہر کو راجیش آنے والا تھا۔ صبح دس بجے میں نہانے ندی پر چلا گیا۔ جب وہاں سے لوٹا تو مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ کیونکہ جیپ میں سارا سامان بھرا جا چکا تھا اور جیپ تیار کھڑی تھی۔

" ہمیں بس اسٹینڈ تک چھوڑ آیئے۔ ہم دونوں واپس جا رہی ہیں " طاہرہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

" کیوں ؟ "

" بس ایسے ہی ! " سشما خاموش تھی۔

" ارے بھئی ! دوپہر کو راجیش آ رہا ہے اور . . "

" میں نے کہا نا کہ ہمیں ابھی جانا ہے " طاہرہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور سشما کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ میں خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ چل پڑی۔ پتہ نہیں لاجونتی کہاں تھی۔

" طاہرہ ! آخر بات کیا ہے۔ کچھ تو کہو ؟ "

" صبح لاجونتی نے اپنے بابو کی تصویر دکھائی . . . وہ تصویر . . . آپ کے دوست راجیش کی تھی ! جس کی نئی نویلی دلہن پیچھے بیٹھی ہوئی ہے ! " اسٹیرنگ پر میرے ہاتھ کانپ گئے۔ طاہرہ کی آنکھوں میں چھلکتا ہوا اعتماد مجھ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

جیپ گزر رہی ہے۔ راستے کے اُس پار کھنڈر خاموش کھڑے ہیں ۔۔۔۔ کتنی ہی صدیاں گزر گئیں اِنھیں کھودتے ہوئے۔ پتہ نہیں اور کتنی صدیوں تک ہم اِنھیں کھودتے رہیں گے ۔۔۔۔ یہ دو عورتیں اِن کھنڈروں سے دُور بھاگ رہی ہیں۔ اِنھیں بس اسٹینڈ پر چھوڑ کر مجھے پھر وہیں جانا ہے جہاں ایک کھنڈر ! ۔۔۔۔ ایک لاجونتی ! اپنے بابو کا انتظار کر رہی ہے !!!

---

**مضمون نگار حضرات** سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضامین کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں اُنھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر ہوں گے۔ (ایڈیٹر)

ایک شکاری بھیکا لے کے ذریعے فاریسٹ گارڈ کو کچھ دے دلا کر آج ایک دن شکار کھیلنے کی اجازت لے لی تھی۔ بھیکا لے نے مجھ سے کہا تھا، صبح جب سورج کی کرنیں ندی کے ٹھنڈے پانی کو گرمانے لگتی ہیں تو ہرنوں کا جھنڈ یہاں سے گزرتا ہے اور اسی وقت شکار کھیلا جائے گا۔

جب شکار کا پروگرام بنا تو طاہرہ اور شمشا نے اپنی سہیلی لاجونتی کو بھی ساتھ لے لیا۔ طاہرہ نے مجھ سے کہا تھا کہ لاجونتی کی خاموش طبیعت اور اس کا کھویا کھویا پن ماضی کے کسی بھیانک واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ آج رات لاجونتی کو اپنے ماضی سے پردہ ہٹانے پر مجبور کرے گی تاکہ میں خیمے کے پیچھے کی اوٹ سے اس کی کہانی سن سکوں۔

رات زیادہ سرد نہیں تھی۔ پاس کے خیمے سے بھیکا لے اور اس کے ساتھیوں کے ملے جلے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ میں اپنے خیمے میں بستر پر لیٹا پردے کی اوٹ سے آگ کے گرد بیٹھی ہوئی ان تینوں عورتوں کو دیکھ رہا تھا جن میں ایک تو میری بیوی طاہرہ تھی۔ دوسری سیاہ چیچک زدہ چہرے والی بدصورت لاجونتی اور تیسری عورت تھی میرے ساتھی راجیش کی نئی نویلی خوبصورت دلہن شمشا جس کی سیاہ زلفیں بکھر کر رات کی تاریکی میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔

کہانی کی تمہید شروع ہو گئی تھی اور لاجونتی کا چہرہ اجنتا کی گپھاؤں کی طرح جذبات سے عاری ہو چلا تھا۔

لاجونتی کہہ رہی تھی ——— "وہ ایک ایسی ہی رات تھی بی بی جی! جب وہ یہاں آیا تھا ——— یہ سنسان سی راتیں بڑی بے درد ہوتی ہیں۔ ان راتوں میں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ اس وقت میرا دل چاہتا ہے، میں ندی کے ٹھنڈے پانی میں اپنے وجود کو چھپا لوں! ——— یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔ وہ آپ کے بابو کی طرح ان کھنڈروں میں جانے کیا ڈھونڈتا تھا۔ انہیں کھودتا، مٹی اور پتھروں کے ڈھیروں کو ہٹاتا، ان کی تصویریں بناتا، موٹی موٹی کتابیں پڑھتا اور ان کھنڈروں میں کھو جاتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ مٹی اور پتھر سے ڈھکے ہوئے یہ کھنڈر مجھے بہت ہی بدصورت لگتے ہیں۔ بالکل میری طرح! میں بھی بدصورت ہوں نا بی بی جی؟"

"نہیں تو، تم سے کس نے کہا؟" طاہرہ لاجونتی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ ہنس پڑی۔

"آئینہ جھوٹ نہیں بولتا بی بی جی! میں ان کھنڈروں کی طرح بدصورت ہوں۔ اسے ان کھنڈروں سے پیار تھا۔ شاید اسی لئے وہ مجھے بھی چاہتا تھا۔ ورنہ ایک شہری نوجوان کے لئے مجھ میں کون سی کشش ہے...؟" وہ خاموش ہو گئی۔

پھر کبھی کبھی ان کھنڈروں میں کھوئی کھوئی سی پھرتی [illegible] کھلکھلا کر ہنس دی!

اس کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔ وہ میری [illegible] کی تعریف کرتا۔ میرے سیاہ چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہتا [illegible] جھیل میں تیرتا ہوا کنول ہے ——— مسکراتا ہوا گلاب ہے ——— [illegible] پہاڑی پر کھلا ہوا کوئی کا ایک پھول ہے۔ وہ کہتا [illegible] کو آئینے کی نظر سے نہ دیکھو۔ میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو ——— اور میں اس کی آنکھوں میں اپنی تصویر دیکھ لیتی۔ سب کچھ بھول کر اس کی آنکھوں میں [illegible] مجھے محسوس ہوتا میرا چہرہ سچ مچ جھیل میں تیرتا ہوا کنول ہو، مسکراتا ہوا گلاب ہو...!" لاجونتی ہنس پڑی۔

"آخر ہوں نا ایک عورت؟" وہ معنی خیز نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھنے لگی جیسے ان سے اس بات کی تصدیق چاہتی ہو کہ وہ عورت ہے یا نہیں؟ دونوں عورتیں اس سے نگاہیں چرا کر یوکلپٹس کے لمبے درختوں کو دیکھنے لگیں جیسے لاجونتی کے اس سوال کا جواب ان کے پاس نہیں، یوکلپٹس کے ان درختوں کے پاس ہے یا پہاڑیوں سے گزرتی ہوئی الھڑ ندی جانتی ہو یا پھر سامنے کے کھنڈر!

"میں نے اس کے شانے پر سر رکھ کر کئی بار کہا تھا، بابو جی! میں بہت ہی بدصورت ہوں۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ، کیا میل ——— میری بات سن کر وہ مسکرا دیتا اور میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہتا ——— قوس قزح کے رنگوں سے رنگی ہوئی تصویر کو اگر خوبصورت کہتے ہیں تو سیاہ پتھر میں تراشا ہوا پیکر بھی خوبصورت کہلاتا ہے۔ قدرت کی مصوری کے کئی نمونے ہیں۔ اس کی مصوری کا ایک نمونہ قوس قزح کے رنگوں سے رنگا ہوا ہوتا ہے، تو دوسرا پتھر میں نزاکت سے تراشا ہوا پیکر! تم قدرت کی مصوری کا دوسرا نمونہ ہو لاجو! تم میں اجنتا کی مورتیوں کا تقدس ہے تو ایلورا کی گپھاؤں میں پھیلی ہوئی کہانیوں کا خلوص! تم تاریکی کا ایک سورج ہو جس کی کرنوں سے پھوٹتی ہوئی پیار کی روشنی نے مجھے منور کر دیا ہے اور میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں ——— اس کی یہ باتیں میرے سارے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتیں اور میں اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا کر سب کچھ بھول جاتی۔ اپنی بدصورتی کو، اپنے ماں باپ کو، اس چھوٹے سے گاؤں کو اور اپنے آپ کو، سب کچھ!" جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ تینوں عورتیں خاموش تھیں۔ سامنے جلتی ہوئی آگ مدھم پڑ چلی تھی۔ لاجونتی آہستہ آہستہ لکڑی سے آگ کرید رہی تھی جیسے اپنے سینے میں دبی ہوئی ماضی کی چنگاریوں کو خیالات کی انگلیوں سے کرید رہی ہو!

میرے پیچھے بھاگ کر جب بابو کو پتہ چل گیا تو سارے گاؤں کو معلوم ہو گیا اور پھر میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن اُس نے ایک ہی لمحہ میں ساری مصیبتوں کو ختم کر دیا۔ اُس نے میرے باپو اور گاؤں والوں سے کہہ دیا، وہ مجھ سے بیاہ کر کے اپنے شہر لے جانا چاہتا ہے ـــــ اُسی دن میرے بیاہ کی تاریخ مقرر ہوئی۔۔" وہ شرما گئی۔ اُسی طرح جس طرح ہر لڑکی اپنی بیاہ کی بات پر شرما جاتی ہے۔

"ساون کے مہینے کی پندرہ تاریخ کو ہمارا بیاہ تھا۔ اُس دن کے ٹھیک آٹھ دن بعد۔۔" وہ خاموش ہو کر خلا میں گھور رہی تھی جیسے اپنے سامنے اپنے آپ کو دلہن بنی دیکھ رہی ہو۔

"پھر؟" سشما نے آہستہ سے پوچھا۔ وہ چونک پڑی۔

"پھر۔۔ بابو میرے بیاہ کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا کہ اُس تاریخ کے دن ڈاکیہ اُس کے نام ایک تار لے آیا جسے پڑھ کر اُس نے کہا اُس کے دفتر سے آیا ہے اور اُسے وہاں فوراً طلب کیا گیا ہے۔۔۔ یہ سن کر میں اور باپو دونوں پریشان ہو گئے لیکن اُس نے باپو سے کہا، وہ شادی کی تیاریاں کر لے۔ وہ یہاں ٹھیک وقت پر پہنچ جائے گا۔ اُسی دن شام کو وہ باپو سے اجازت لے کر مجھ سے بیاہ کے دن آنے کا وعدہ کر کے یہاں سے چلا گیا۔ بیاہ کے دن منڈپ سجائے میں دلہن بنی اُس کی راہ دیکھتی رہی۔ لیکن وہ نہ آیا۔۔۔ آج تک نہ آیا!!" اُس نے مسکرا کر دونوں عورتوں کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ لیکن لاجونتی کے چہرے پر تو مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایسا اعتماد چمک رہا تھا جیسے منڈپ میں بیٹھی اپنے دولہا کا انتظار کرتی ہوئی دلہن کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔

"کیا تمہیں ابھی اُس کا انتظار ہے؟" سشما نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں!"

"اُس کی چٹھیاں تو آتی ہوں گی؟" طاہرہ نے پوچھا۔

"نہیں! ـــــ مجھے تو اُس کا نام بھی معلوم نہیں بی بی جی! میں تو اُسے بابو کہہ کر پکارتی تھی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سے شہر کا رہنے والا ہے۔"

"تم بہت ہی بھولی ہو لاجونتی! تم نے اُسے پہچاننے میں غلطی کی۔ اُس نے تمہیں دھوکا دیا!" سشما کی اِس بات پر وہ مسکرا دی۔

"وہ آئے گا بی بی جی! ضرور آئے گا! اُسے یہاں کے کھنڈروں سے پیار ہے اور میں بھی تو ایک کھنڈر ہوں!" اچانک ہوا تیز ہو گئی اور اُس کے ساتھ ہی بارش کی بڑی بڑی بوندیں بھی گرنے لگیں۔ تینوں عورتیں اُٹھ کر خیمہ میں چلی گئیں۔

ساری رات بارش ہوتی رہی۔ صبح ہم شکار کھیلے بغیر ہی ڈاک بنگلہ واپس آ گئے۔

دوپہر کو راجیش آنے والا تھا۔ صبح دس بجے میں نہانے ندی پر چلا گیا جب وہاں سے لوٹا تو مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ کیونکہ جیپ میں سارا سامان بھرا جا چکا تھا اور جیپ تیار کھڑی تھی۔

"ہمیں بس اسٹینڈ تک چھوڑ آئیے۔ ہم دونوں واپس جا رہی ہیں۔" طاہرہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی!" سشما خاموش تھی۔

"ارے بھئی! دوپہر کو راجیش آ رہا ہے اور۔۔"

"میں نے کہا نا کہ ہمیں ابھی جانا ہے۔" طاہرہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور سشما کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ میں خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ چل پڑی۔ پتہ نہیں لاجونتی کہاں تھی۔

"طاہرہ! آخر بات کیا ہے۔ کچھ تو کہو؟"

"صبح لاجونتی نے اپنے بابو کی تصویر دکھائی۔۔۔ وہ تصویر۔۔ آپ کے دوست راجیش کی تھی! جس کی نئی نویلی دلہن پیچھے بیٹھی ہوئی ہے!" اسٹیرنگ پر میرے ہاتھ کانپ گئے۔ طاہرہ کی آنکھوں میں چھلکتا ہوا اعتماد مجھ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

جیپ گزر رہی ہے۔ راستے کے اُس پار کھنڈر خاموش کھڑے ہیں ـــــ کتنی ہی صدیاں گزر گئیں انہیں کھودتے ہوئے۔ پتہ نہیں اور کتنی صدیوں تک ہم انہیں کھودتے رہیں گے ـــــ یہ دو عورتیں اِن کھنڈروں سے دُور بھاگ رہی ہیں۔ انہیں بس اسٹینڈ پر چھوڑ کر مجھے پھر وہیں جانا ہے جہاں ایک کھنڈر! ـــــ ایک لاجونتی! اپنے بابو کا انتظار کر رہی ہے!!!

---

# غزل

حقی حزیں، ایم اے

اگرچہ کوئی نہیں رہنمائے کوئے حبیب
مگر قدم ہیں کہ خود اٹھ رہے ہیں سوئے حبیب

خوشا یہ تکملۂ ذوقِ جستجوئے حبیب
نظر کے سامنے ہے بزمِ رنگ و بوئے حبیب

نہ عرضِ حال، نہ تابِ نظر، نہ جرأتِ شوق
نہ جانے کون سا عالم ہے روبروئے حبیب

اسی کی اک نگہِ لطف کا کرشمہ ہے
کہاں ہم اور کہاں ورنہ آرزوئے حبیب

وہی نزاکتِ دل ہے، وہی شدید احساس
مزاجِ عشق سے ملتی ہوئی ہے خوئے حبیب

مشامِ جاں ہے معطر جو ہر نفس میرا
بسی ہوئی ہے مرے پیرہن میں بوئے حبیب

یہ وصف کم نہیں کچھ میری شاعری کا حزیں
غزل میں ہے مری اندازِ گفتگوئے حبیب

حزیں

پروفیسر عبدالرب عرفان، ایم اے

نہ غم کا غم نہ خوشی کی خوشی رہی مجھ کو
یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی مجھ کو

بھٹک رہا ہوں غم و یاس کے اندھیروں میں
نہیں ہے کوئی دکھائے جو روشنی مجھ کو

ہے کون میرے سوا جو اٹھائے ناز اس کے
کرے گی یاد مرے بعد زندگی مجھ کو

کسی بہانے سہی اک جوابِ غم تو ہوا
کہ اپنے حال پہ آج آ گئی ہنسی مجھ کو

مجھے تلاش کرو اب غبارِ ماضی میں
کہ راہ میں کہیں چھوڑ آئی زندگی مجھ کو

بلائے گردشِ ایام کیا قیامت ہے
کبھی کبھی تو نہ یاد آئے آپ بھی مجھ کو

وہ آج بن گیا ارمانِ زندگی عرفان
کبھی ملا تھا کہیں کوئی اجنبی مجھ کو

[illegible]

اخگر مشتاق رحیم آبادی

کیا کہوں کس قدر الجھنیں بڑھ گئیں
تیری زلفِ شکن در شکن دیکھ کر

عہدِ فرقت میں یادوں کی پرچھائیاں
جیسے جاگا ہوں خوابِ چمن دیکھ کر

کیا کہیں کن خیالوں میں ہم کھو گئے
آج مہتاب کا بانکپن دیکھ کر

آج کچھ جرأتِ عرضِ مطلب ہوئی
بندہ پرور کو شیریں سخن دیکھ کر

دشمنوں سے مروت بھی رکھنی پڑی
آج کے دوستوں کا چلن دیکھ کر

رہروِ رہزنوں کا بھی ڈر ہے، مگر
رہنماؤں کا بھی کر و فن دیکھ کر

کیسا ہی غم ہو اخگر گوارا کرو
کون جیتا ہے رنج و محن دیکھ کر

اخگر

افسانہ

# قاتل

پروفیسر عاصی کرنالی۔ ایم۔ اے

۲۶۷۔ ممتاز آباد۔ ملتان

۱۹ر اپریل ۶۷ء

گرامی قدر! تسلیمات

دو ماہ سے علالت کا چکر ہے۔ اُدھر کالج کی مصروفیات علالت کی ناز برداری تک کا موقع نہیں دیتیں۔ یہ بھی اچھا ہی ہے۔ مصروفیات میں بیماری کا احساس ذہن پر غالب نہیں آتا۔ افسانہ نمبر کے لئے طلب نامہ پہنچا۔ ناسازیٔ طبع کو پسِ پُشت ڈالا اور ارشادِ گرامی کی تعمیل میں لگ گیا۔ دَورانِ تحریر جی لگا رہا اور طبیعت بشاش رہی۔ ایک افسانہ "قاتل" ارسال ہے۔ پُورا یقین ہے کہ آپ کو پسند آئے گا اور قارئینِ "بیسویں صدی" کو بھی!

آپ کا ——— عاصی کرنالی

"رحمان صاحب!"

"مسٹر رحمان!"

"وہ تو باہر گئے ہوئے ہیں" ایک نسوانی آواز نے جواب دیا۔

"بھئی! ہم اُن کے دوست ہیں۔ دوسرے شہر سے آئے ہیں۔ کب تک آئیں گے رحمان صاحب؟"

"شام تک لَوٹ آنے کی اُمید ہے۔ میں بیٹھک کھلوائے دیتی ہوں۔ آپ تشریف رکھیے"

"شکریہ!"

اکبر اور رمضان نے پُراسرار نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور بیٹھک میں داخل ہو گئے۔

بیٹھک خوبصورتی سے آراستہ کی گئی تھی۔ پہاڑوں، آبشاروں، سبزہ زاروں کی سینریاں ظاہر کرتی تھیں کہ مسٹر رحمان فطرت اور آرٹ کے شیدائی ہیں۔ دونوں نے گردن گھما گھما کر ہر چیز کو دیکھا۔ اچانک اکبر کی نظر ایک تصویر پر پڑی اور جمی رہ گئی۔

"کتنا خوبصورت بچہ ہے!" اکبر نے رمضان کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"پھول کی طرح مسکرا رہا ہے"

اکبر تصویر کی طرف بڑھا۔ "شاہد رحمان ——— واہ کتنا اچھا نام ہے!"

"چھوڑو اُستاد! تم بھی کہاں کھو گئے؟" رمضان بیزاری سے بولا۔ "یہ بتاؤ سیٹھ آخر رحمان کو قتل کیوں کرانا چاہتا ہے؟"

"آہستہ بولو!" اکبر نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "شاید کوئی کاروباری تنازعہ ہے"

"بہتر ہوتا ہم آدھی رقم پیشگی لے لیتے" رمضان نے اکبر پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ "شراب کا قرض بڑھتا جا رہا ہے۔ کل تو انکار ہی ہو چلا تھا۔ بڑی منتوں سے ایک بوتل مل سکی"

"سیٹھ قابلِ اعتبار آدمی ہے۔ کام ہوتے ہی پُوری رقم ادا کر دے گا۔ تین ہزار میرے، دو ہزار تمہارے!"

رمضان نے خوشی سے اکبر کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"اُستاد زندہ باد!"

دروازہ کھلا۔ نوکرانی ٹرے میں شربت لے آئی۔ دونوں نے سیر ہو کر پیا۔

"بی بی جی پوچھتی ہیں" نوکرانی نے دوپٹے کا پلّو سینے پر لپیٹتے ہوئے کہا۔ "آپ دوپہر کا کھانا کس وقت کھاتے ہیں؟"

"ایک بجے" اکبر نے جواب دیا۔

نوکرانی چلی گئی۔

"بہت ظالم ہو شیا ہے اُستاد! اِس طرح شکایت کر رہی تھی کہ میرا تو دل ٹوٹ کے رہ گیا۔"

اکبر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ محویت سے بچے کی تصویر دیکھ رہا تھا۔

"اُستاد! پھر کھو گئے؟"

"رمضان! اِس کی نظریں دل میں اُتری جا رہی ہیں!"

"اُستاد! میں نے پہلے بھی کہا تھا، اُستانی جی کو طلاق دے دو اور دوسری اُستانی جی لے آؤ۔ کب تک لاولد رہو گے۔ اپنا چھوکرا ہو گیا تو دوسروں کو گلا چھوڑ دو گے۔"

اکبر نے ایک لمبی آہ بھری۔ رمضان کو ایک نظر دیکھا اور پھر تصویر پر نظریں جمادیں۔

"اُستاد! صفایا کس طرح کرنا ہے رحمان کا؟"

اکبر نے سوتے میں دھنستے ہوئے کہا "بہت سادہ ترکیب ہے۔ پہلے آہستے سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دینا۔ میں اُسے باتوں میں لگائے رکھوں گا۔ پھر پیچھے سے آکر اُس کا گلا مضبوطی سے دبوچ لینا۔ میں بجلی کی سی پھرتی سے اُس کے منہ میں رومال ٹھونس دوں گا اور خنجر اُس کے دل میں اُتار دوں گا۔"

"بھاگنا کس طرح ہوگا؟" رمضان نے پوچھا۔

"یہ قتل رات کو نو دس بجے ہوگا۔ اِتنے میں ہم اُسے باتوں میں اُلجھائے رکھیں گے۔ یہاں تک کہ گھر والے مطمئن ہو کر سو جائیں گے۔ پھر معاملہ صاف ہے! اور ہاں گلی میں ایک بلب لگا ہوا ہے۔ رات ہوتے ہی تم اُسے اینٹ کا نشانہ بنا دینا۔ ہر طرف اندھیرا ہوگا۔ ہم صاف بچ نکلیں گے۔"

"اُستاد! ہم نے رحمان کی گھر والی سے کہا ہے، ہم رحمان کے دوست ہیں۔ رحمان تو ہمیں جانتا تک نہیں۔"

"بے وقوف! ہم اُس سے کہیں گے۔ ہم کپڑے کے تھوک بیوپاری ہیں۔ بزنس کے سلسلے میں آئے ہیں۔ یہ قصہ تم مجھ پر چھوڑو۔ تم اپنی ڈیوٹی کا خیال رکھو اور بس!"

"بے فکر رہو اُستاد! آخر کس کا چیلا ہوں؟"

دونوں مُسکرائے۔ مُسکراتے ہوئے اکبر کی نظر پھر بچے کی تصویر پر جا پڑی۔

"جیسے مجھی کو دیکھ رہا ہے یہ بچہ!"

رمضان نے جھلا کر تصویر کو دیکھا۔ وہ تیزی سے تصویر کی طرف بڑھا اور اُسے پلٹ کر رکھ دیا۔

"نہیں رمضان! یہ تصویر سیدھی رہنے دو۔"

"اُستاد! یہ بیٹھے کے آئے ہیں۔ ہم اپنے دشمن کے گھر میں [illegible] بچہ ہے۔ ہمیں سانپ کے ساتھ سنپولیے کو بھی ختم کر دینا چاہیے۔"

"ہاں ٹھیک ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں اُستاد! دل کو مضبوط رکھو۔ یہ قتل کرنے والے آدمی کو تصویروں میں نہیں کھو جانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے رمضان! اِس تصویر کو چکنا چور کر ڈالو۔ [illegible] اِسی طرح پلٹی ہوئی رہنے دو۔"

دونوں نے کپڑے بدلے اور صوفوں پر دراز ہو گئے۔ سفر کی تکان تھی۔ نیند نے آلیا۔

کچھ دیر بعد بیٹھک میں ایک مسلسل آواز سے اکبر کی آنکھ کھل گئی۔

"اُٹھیے، اُٹھیے نا آپ۔ کھانا تیار ہے۔ اُٹھیے بھی!" ایک بچہ سامنے کھڑا تھا۔

اکبر نے بچے کو غور سے دیکھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے تصویر میں جان پڑ گئی ہو ــــ رمضان بھی جاگ گیا۔

"تم کون ہو بچے؟" اکبر نے چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سوال کیا۔

"میرا نام شاہد ہے۔ میں اپنے ابّو جان کا بیٹا ہوں۔"

"ابّو جان کے بیٹے ہو۔ اچھا بیٹھو، ہمارے پاس بیٹھو!"

"ہم نہیں بیٹھتے۔ ہمیں بھوک لگی ہے۔ دیکھیے نا! ہم ابھی ابھی اسکول سے آرہے ہیں۔ کیا آپ کو بھوک نہیں لگ رہی ہے۔ آپ اسکول سے نہیں آرہے ہیں؟"

اکبر ہنس پڑا۔ "نہیں ہم دوسرے شہر سے آرہے ہیں۔ ویسے بھوک ہمیں بھی لگ رہی ہے۔"

"ہماری بھوک تو شام کو مٹے گی بالو!" رمضان نے بچے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بدتمیزی مت کرو رمضان!" اکبر نے ڈانٹ پلائی۔

رمضان نے نفرت سے دوسری طرف مُنہ پھیر لیا!

نوکرانی کھانا لے آئی۔ سب کھانے لگے۔

"آپ ہمارے ابّو جی سے ملنے آئے ہیں؟"

"ہاں" اکبر نے کہا۔

"آپ ابّو جی کے رشتے دار ہیں؟"

"نہیں! ہم اُن کے دوست ہیں۔ پکّے دوست!"

"پھر تو آپ ہمارے چچا جان ہوئے، پکّے چچا جان! بتایئے آپ ہمارے لیے

کیا اللہ دتے ہیں۔ پرسوں ابو جی کے ایک دوست آئے تھے، وہ ہمارے لئے ٹافیاں لائے تھے۔ آپ ٹافیاں کھائیں گے۔ اللہ نہیں چچا جان! ٹافیاں تو بچے کھاتے ہیں۔ آپ تو بڑے ہیں۔"

"نہیں، میں کہاں بچہ ہوں شاہد! ایک کمزور سا بچہ جو اپنے جذبات کا غلام ہے۔"

"آپ بچے ہیں!" شاہد کھلکھلا اُٹھا: "آپ تو مونچھوں والے بچے ہیں چچا جان!"

پھر قہقہے لگانے لگا ـــــ کھانا ختم ہوا۔

رمضان دوسرے صوفے پر جا بیٹھا اور بیزاری سے سگریٹ کے کش لگانے لگا۔

بچہ تیزی سے اندر گیا اور ایک پیکٹ اُٹھا لایا۔

"دیکھئے یہ چابی والی موٹر ہے، یہ ہوائی جہاز ہے، یہ گھوڑا ہے چچا جان! کل یہ اوپر سے گر گیا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی۔"

"ایک گردن آج ٹوٹے گی بابو!" رمضان نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

"بکواس نہ کرو رمضان! ورنہ۔۔۔"

"اُستاد! میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ویسے ہی بات منہ سے نکل گئی۔"

"گردن تو گھوڑے کی ہوتی ہے چچا جان! کہیں موٹر یا ہوائی جہاز کی بھی گردن ہوتی ہے جو ٹوٹے گی۔ کہیں اس ٹینک کی گردن ہے؟ اس جھولے کی گردن ہے؟"

بچے نے رمضان کی طرف گھورتے ہوئے یہ ساری بات کہہ ڈالی۔

رمضان خالی نظروں سے چھت کی طرف دیکھتا رہا۔

"چچا جان! ہمارے ابو بہت اچھے ہیں۔ یہ سب کھلونے وہی لاتے ہیں۔ کل وہ اور بہت سے کھلونے لائیں گے۔ کل ہماری سالگرہ ہے نا چچا جان! آپ اس میں شامل ہوں گے نا! اچھے چچا جان! آپ آ جائیں گے تو نہیں۔ دیکھئے ہم آپ سے تحفہ نہیں لیں گے اور سنئے ہم آپ کو بہت مزیدار کیک کھلائیں گے۔ پچھلے سال ہمارے گھر بہت بڑا کیک آیا تھا۔ ابو کہتے تھے اب کے اُس سے بھی بڑا لائیں گے۔ ہم آپ کو چپکے سے کیک کھلا دیں گے۔ اب تو خوش ہیں نا آپ؟"

"تمہارے ابو جان تمہیں مارتے تو نہیں؟"

"اللہ چچا جان! کبھی نہیں۔ امی ضرور مارتی ہیں۔ یہ امی جان بہت بُری ہیں۔ کل ہم نے آٹھ ٹافیاں چپکے سے اُڑا لیں۔ آخر سب ہمارے ہی لئے آئی ہیں نا! امی نے دیکھ لیا۔ پھر تو چچا جان! ہمیں مرغا بننا پڑا۔ آٹھ ٹافیاں چرائی تھیں نا۔ آٹھ دفعہ ککڑوں کوں کہنا پڑا۔ تب چھٹی ملی۔ ابو جان بہت اچھے ہیں۔ کہتے ہیں تجھے ڈاکٹر بناؤں گا۔ جب میں ڈاکٹر بن جاؤں گا تو سب کو دوا کھلایا کروں گا۔ آپ کو بھی اتنی دوا کھلاؤں گا کہ روٹی کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔"

"شاہد! تم میرا علاج کرو گے؟"

"ضرور، آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

"دمہ ہے مجھے۔"

"یہ کیا ہوتا ہے چچا جان؟"

"بیٹا! سانس اُکھڑتی ہے۔"

"اللہ چچا جان! وہ تو میں ابھی ٹھیک کر دیتا ہوں۔ ذرا ٹھہرئے۔"

شاہد تیزی کے ساتھ اندر گیا اور واپس آکر کہا۔

"یہ لیجئے ٹافی، اسے چوس لیجئے۔ بس آرام ہو جائے گا۔"

ظفر اس بھولپن پر مچل اُٹھا۔ اس نے شاہد کو گود میں اُٹھایا اور بے اختیار اس کا منہ چوم لیا!

"ویسے تو میں اب بھی ڈاکٹر ہوں چچا جان! ذرا ٹھہرئے میں آپ کو اپنا سامان دکھلاتا ہوں۔"

وہ پھر تیزی سے اندر گیا اور ایک گتے کا ڈبہ اُٹھا لایا۔

"دیکھئے یہ شیشیاں ہیں۔ اِن میں دوائیں بھری ہیں اور یہ انجکشن ہے۔"

"یہ تو پورا سامان تیار ہے" اکبر نے رنگ دار پانی اور لوہے کی ایک کیل دیکھ کر کہا "تم تو پورے ڈاکٹر بن گئے ہو!"

"اور کیا! لائیے آپ کے انجکشن لگاؤں!"

اکبر نے بایاں ہاتھ آگے کر دیا۔

ننھے ڈاکٹر نے اکبر کی آستین چڑھائی۔ کیل کو رنگ دار پانی میں ڈبویا اور اکبر کے بازو میں چبھو دیا۔

"سی!" اکبر کے منہ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔

"ارے چچاجان! آپ تو ڈر گئے۔ ہمارے انجکشن سے تکلیف کہاں ہوتی ہے۔ بس اب آپ کو آرام آگیا۔ وہ ... آپ کا ... وہ ... دیمو بھی ختم!"

"دیمو کیا بیٹا؟ اچھا وہ دمہ۔ ہاں بھئی وہ تو ختم ہو گیا۔"

"بس چچاجان! میں جلد ہی پکا ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ میرے ابوجان کہتے ہیں تمھیں جہاز میں وہاں ... وہاں ... مجھے یاد نہیں رہا، کیا نام ہے وہاں بھیجوں گا اور کہتے تھے جب تم بڑے ڈاکٹر بن جاؤ گے تو غریبوں کا مفت علاج کرنا۔ چچاجان! آپ بھی غریب بن جائیے۔ پھر آپ کا علاج بھی مفت!"

نوکرانی داخل ہوئی "شاہد! بی بی جی بلا رہی ہیں۔ کہتی ہیں سو جاؤ، نہیں؟"

"اچھا چچاجان! ہم چلے۔ ہم سوئیں گے۔ آپ کے سوتے ہوئے۔ کھلونے یہیں رہیں گے۔ ہاں ایک بات یاد آئی۔ یہ گھوڑا لیجیے آپ [illegible] اس کی گردن لا دیتے ہیں۔ اتنے میں آپ اسے جوڑ دیجیے گا۔"

وہ تیزی سے بھاگا۔ تیزی سے واپس آیا۔

"لیجیے اس کی گردن اور دیکھیے چچاجان! اِس طرح [illegible] دو گے!"

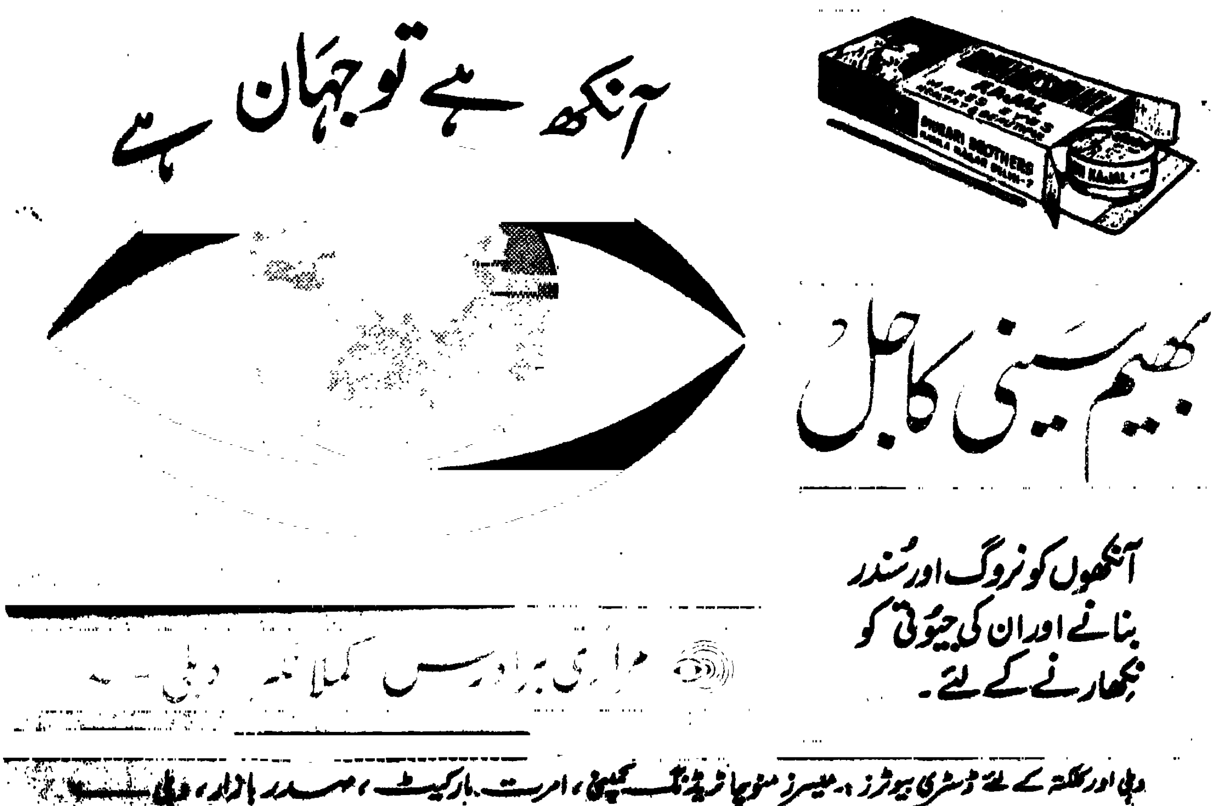
شاہد اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد مسٹر رحمان گھر میں داخل ہوئے۔

"وہ بیٹھک میں آپ کے کوئی دوست بیٹھے ہیں" بیگم رحمان نے کہا "کہیں باہر سے آئے ہیں۔"

مسٹر رحمان بیٹھک میں داخل ہوئے۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ شاہد کے کھلونے صوفے پر دھرے تھے۔ ٹوٹا ہوا گھوڑا بھی —— اس کی گردن تلے کاغذ کا ایک پرزہ دبا ہوا تھا ——

"شاہد کو ڈاکٹر ضرور بنائیے —— آپ کے دوست؟"



# غزلیں

**پروفیسر شباب للت بھیتی ایم کام**

دل کی ہر کیفیتِ درد کو سمجھا ہوتا
تو بھی اے دوست جو میری طرح تنہا ہوتا

خاک میرے دلِ سوزاں کی نہ اُٹھتی پھرتی
شُعلۂ عشق اگر دل میں نہ بھڑکا ہوتا

زندگی درد کا تپتا ہوا صحرا ہوتی
نرم یادوں کا اگر اس پہ نہ سایا ہوتا

پھیر دیتا میں رُخِ موجِ حوادث اے دوست
تیری بانہوں کا اگر مجھ کو سہارا ہوتا

میری صورت کی طرف دیکھنے والو تم نے
میرے دل میں بھی کبھی جھانک کے دیکھا ہوتا

تیری محفل سے مجھے اور اُٹھاتا کوئی
تیرا شامل نہ اگر اس میں اشارا ہوتا

کافرِ راہِ وفا پر جو نہ ہوتا بیتاب
عشق رسوا ہی نہیں پیار بھی جھوٹا ہوتا

شباب

**امینہ خاتون عشرت بی اے**

حُسنِ حجاب آرا جب بے نقاب ہوگا
انگڑائی لے گا محشر عالم خراب ہوگا

نظریں بچا کے جب وہ گزریں گے سامنے
اُس وقت میرے دل میں اِک انقلاب ہوگا

یہ اضطرابِ دل ہی دراصل زندگی ہے
اِس کے بغیر ہم کو جینا عذاب ہوگا

کچھ دیکھنے نہ دے گا نظّارہ سوزِ جلوہ
اُن کے ظہور میں بھی رنگِ حجاب ہوگا

ایسا بھی دَورِ نازک آئے گا عاشقی میں
عالم ہمارے دل کا مثلِ حباب ہوگا

تر دامنی پہ زاہد! مغرور کیوں نہ ہم ہوں
رحمت کا سب سے پہلے ہم سے خطاب ہوگا

اے آتشِ محبت تیرے کرم کے صدقے
سوزِ غمِ نہاں سے دل آفتاب ہوگا

امینہ خاتون عشرت

**آزاد گورداسپوری بی اے**

تھے وہ پردوں میں تو دل پردوں سے بہلانا پڑا
چشمِ بینا کو فریبِ رنگ و بُو کھانا پڑا

دوست کی مرضی میں ہم کو جذب ہو جانا پڑا
گیت غم کا زندگی کے ساز پر گانا پڑا

عشق کی آشفتہ حالی میں بلا کا تھا اثر
حُسن کو آخر نیازِ شوق بن جانا پڑا

اللہ اللہ داستانِ عشق کی دلچسپیاں
ایک افسانے کو سو سو بار دُہرانا پڑا

ایک نامعلوم شے کو ڈھونڈنے کے واسطے
وسعتِ کون و مکاں سے بھی گزر جانا پڑا

عزمِ کامل کے لئے کیا سنگِ راہ و سدِّ راہ
آ گیا جو بھی مقابل اُس سے ٹکرانا پڑا

دوستی کی لاج رکھنے کے لئے آزاد کو
اِک فریبِ دوستی ہر حال میں کھانا پڑا

افسانہ

# ...گھر ہونے تک

راز یوسفی

۳۳/۱- دھرم پورہ- لاہور نمبر ۱۵

۱۸/ اپریل ۱۹۹۷ء — محترم خوشتر صاحب! سلام عقیدت

افسانہ نمبر کے لئے "گھر ہونے تک" پیشِ خدمت کر رہا ہوں۔ شراب پرانی ہے لیکن پیمانہ نیا ہے۔ ماں کی مامتا ایک ایسا سدا بہار پھول ہے جسے اندیشۂ خزاں نہیں۔ وقت کی ان گنت گردشوں کے باوجود یہ موضوع پرانا نہیں ہو سکتا۔ اسلوبِ تحریر میں جدت ہو تو پرانی سے پرانی بات بھی نئے انداز میں کہی جا سکتی ہے۔ یہی بات اِس مقولے کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن یہ سعی کہاں تک کامیاب ہے؟ اِس کا صحیح فیصلہ تو آپ کر سکتے ہیں یا "بیسویں صدی" کے ذہین قارئین۔ جو بال کی کھال تک اتار دینے کا شعور وادراک رکھتے ہیں۔۔۔

نیازکیش —— راز یوسفی

حسبِ معمول آج بھی کافی ہاؤس میں خاصی گہما گہمی تھی۔ گرم اور ٹھنڈی کافی کے دور چل رہے تھے۔ قہقہے کھنک رہے تھے۔ آنچل سرسرا رہے تھے۔ رنگین اور مہکتے ہوئے آنچل! جن کی سرسراہٹ سے جذبات کی خاموش ندی میں ایک طوفان سا آجاتا تھا۔ کہیں آس پاس کسی نسوانی قہقہے کی گونج ابھرتی، ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک ساتھ بہت سے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔ ایسے کیف پرور اور رومانی ماحول میں بھی شکیل ایک میز کے گرد تنہا اور اداس بیٹھا تھا۔ اس کی بجھی بجھی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں۔ جیسے کسی کی متلاشی ہوں یا انہیں کسی کی آمد کا انتظار ہو۔

لیکن یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی۔ وہ پچھلے پانچ سال سے بڑی پابندی کے ساتھ اپنی شامیں اسی کافی ہاؤس میں گزار رہا تھا۔ وہ شام کے پھیلتے ہوئے سایوں کی جلو میں یہاں آجاتا۔ یہیں شام کا کھانا کھاتا اور جب رات بھیگنے لگتی اور کافی ہاؤس کی چہل پہل ختم ہو جاتی تو بہت تھکے ہوئے انداز میں کرسی سے اٹھتا اور کاؤنٹر کلرک کو بل ادا کر کے اپنے گھر کی راہ لیتا۔

شکیل کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار میں اس کا نام کھرے سکے کی طرح چلتا تھا اور پانچ ہی سال کے عرصے میں اس نے اتنی دولت کمالی تھی جو ساری زندگی عیش و آرام سے گزارنے کے لئے بہت کافی تھی۔ وہ بیک وقت کئی بنگلوں کا مالک تھا۔ بیش قیمت کار میں ہوا کے دوش پر اڑتا تھا اور تنہا ایک بنگلے میں بڑے ٹھاٹھ کی زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن کوئی اس بھید کو نہیں جانتا تھا، کہ اسے تنہائی سے کیوں پیار ہے؟ وہ کیوں اپنا گھر نہیں بسا لیتا اور کب تک تنہائی کا زہر اپنی جوان رگوں میں سموتا رہے گا؟ یہ سب کچھ ایک سربستہ راز تھا۔

وہ کافی ہاؤس کا مستقل گاہک تھا۔ کئی لوگوں نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے کبھی کسی کو لفٹ نہیں دی اور نہ کسی کو اپنے غم میں شریک ہونے کا موقع دیا۔ یہی وجہ تھی کہ رفتہ رفتہ کافی ہاؤس کے آنے جانے والوں نے اس کے وجود کو نظر انداز کر دیا تھا اور صرف تنہائی اس کی شریکِ حیات بن کر رہ گئی تھی۔

آج بھی جب وہ کافی ہاؤس میں داخل ہوا تو ہر کام حسبِ معمول ہو رہا تھا۔ شام کے دھندلکے رات کی سیاہی سے ہم آغوش ہو رہے تھے۔ کافی ہاؤس کے ہال میں بجلی کے قمقمے اس کے دل کے سدا بہار داغوں کی طرح جل رہے تھے۔ وہ پچھلے ایک تنہا میز کے پاس آبیٹھا تھا۔ بیرے نے اسے میز کے گرد بیٹھا دیکھ کر فوراً ہی ٹھنڈی کافی کی ٹرے اس کی میز پر لگا دی تھی۔ کیونکہ کافی ہاؤس کا ہر بیرا اس کا

آشنا شناس ہو چکا تھا۔ وہ بہت چپ چپ رہتا تھا۔ کبھی کوئی بیرا اُسے آرڈر دینے کی زحمت نہیں دیتا تھا اور پھر وہ ٹپ بھی اتنی فراخدلی سے کرتا تھا کہ ہر بیرا اُسے دیکھتے ہی اُس کی طرف لپکتا تھا۔

کافی کے تلخ گھونٹ پیتے ہوئے ہر روز کی طرح آج بھی وہ اپنے تلخ ماضی کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں کرید رہا تھا۔ عذرا کا مہکتا ہوا تصور اُسے گرد و پیش سے بے نیاز بنا رہا تھا۔

عذرا اُس کافر جمال دوشیزہ کا نام تھا جو کسی زمانے میں غارت گرِ ضبط اور دشمنِ تمکین و ہوش رہ چکی تھی۔ وہ اُس زمانے سے اُسے جانتا تھا جب وہ ایک کالج گرل کی حیثیت سے اُس کے کالج میں تعلیم حاصل کرنے آئی تھی اور چند ہی دنوں میں اُس سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ اُس کے دل و دماغ میں رچ بس گئی تھی۔

عذرا نے اُس کے جذبات کو ٹھکرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ چند ہی دنوں کے میل جول نے اُنھیں ایک دوسرے سے بہت ہی قریب کر دیا تھا اور وہ یک جان و دو قالب ہو کر رہ گئے تھے۔ کالج میں اُن کی باہمی رفاقت ایک ضرب المثل بن کر رہ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ ساتھ گھومتے پھرتے دکھائی دیتے۔ سیر و تفریح، سینما، پکنک، پارٹی اور ہر سوشل تقریب میں اُن کا یکجا ہونا ایک ضروری امر تھا۔ لیکن اِس حد سے بڑھتے ہوئے رومان نے شکیل کی تمام ذہنی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیا۔ اُس کا تعلیمی کیریر تباہ ہو گیا۔ بی۔ اے کے آخری سال میں سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ عذرا اپنے امتحان میں پاس ہو کر گریجویٹ بن گئی۔ مگر شکیل بُری طرح ناکام ہوا۔

اُس ناکامی نے اُس کا مستقبل تاریک کر دیا۔ وہ ایک غریب ماں باپ کا بیٹا تھا جنھوں نے اُسے بی۔ اے تک تعلیم دلانے میں نہ جانے کتنی صعوبتیں اُٹھائی تھیں۔ اُن کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں اور وہ صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ شکیل اپنے بوڑھے باپ کی پُرنم آنکھوں کی تاب نہ لا سکا۔ اُس کا جی تعلیم سے اُچاٹ ہو گیا اور وہ ملازمت کی تلاش میں سڑکوں کی خاک چھاننے لگا۔ مگر ملازمت عنقا کی طرح غائب تھی۔ وہ ہر صبح کو گوہرِ مقصد کی تلاش میں نکلتا اور شام کو خالی دامن لئے واپس آ جاتا۔

عذرا شکیل کو پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو جاتی۔ لیکن ایک نازک اندام لڑکی جس نے زندگی کا کوئی تاریک پہلو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اِس بھڑکتی ہوئی آگ کی تپش کو محسوس کرنے سے ہمیشہ قاصر رہتی جو شکیل کے سینے میں آتشِ نمرود کی طرح جل رہی تھی۔

ایک روز اچانک مال روڈ پر شکیل سے ملاقات ہو گئی۔ اُسے دیکھتے ہی عذرا کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور اُس کے ہونٹوں سے [illegible] اُس نے شیریں لہجے میں پوچھا:

"کل کہاں سے غائب ہو [illegible] شکیل [illegible] کبھی نہیں دکھلاتے!"

"مجھے اُسی غار میں چھپا رہنے دو عذرا! اب میری [illegible] رہی کہ تمھیں دکھا سکوں۔"

"کیسی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہے ہو۔ کیا ہوا تمھاری [illegible] چہرہ ہے، وہی ناک نقشہ۔ کون سی بات ہے جو عذرا سے بھی تبدیل ہو گئی ہو؟"

"میرا دل تبدیل ہو چکا ہے عذرا!"

"کیا کسی اور سے آنکھیں لڑ گئی ہیں؟"

"ہاں عذرا! یونہی سمجھ لو۔"

"اوہ! تو یوں کہو نا؟" جیسے تیر کی طرح کھینچ کے ہوا عذرا ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔

"عذرا! محبت دو نوجوان دلوں کی غلط فہمی کا نتیجہ ہوتی ہے اور ہم کافی عرصہ اِس غلط فہمی کا شکار رہ چکے ہیں۔ لیکن کالج کی زندگی کو خیرباد کہنے کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ محبت سے زیادہ ایک اور سنگین حقیقت بھی ہے اور وہ ہے بھوک کا مسئلہ! جو تلاشِ معاش سے حل ہو سکتا ہے اور میں اِس مقصد کے حصول میں آج تک ناکام ہوں۔ میں تمھارے قابل نہیں ہوں۔ عذرا، مجھے بھول جاؤ!"

"میں تمھاری کوئی بات سُننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ تم احساسِ کمتری کا شکار ہو۔ میں تمھیں اِس گڑھے سے نکال کر ہی دم لوں گی۔ تم ملازمت چاہتے ہو نا؟ اِس کا انتظام ہو جائے گا۔ میرے ڈیڈی بڑے اثر و رسوخ کے مالک ہیں۔ آج شام کو بنگلے پر آؤ۔ ساتھ ہی چائے پئیں گے۔"

"اور تمھارے ڈیڈی نے مجھے دھکے مار کر باہر نکال دیا، تب کیا ہوگا؟"

"میرے ڈیڈی بہت فراخدل ہیں اور تم سے تو اچھی طرح واقف ہیں۔"

"پھر بھی مجھے دولت مندوں سے ڈر لگتا ہے۔ اُن کی نگاہیں پھرتے دیر نہیں لگتی۔"

"اب باتیں نہ بناؤ اور سیدھے شام کو بنگلے پر آ جاؤ۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

شکیل اُسی شام کو عذرا کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ عذرا کے ڈیڈی اُس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ وہ کسی زمانے میں فوجی کرنیل رہ چکے تھے۔ اِس لئے

[illegible] سے ملی ہوئی [illegible] تھا اور ان سے نگاہیں ملا کر بات کرتا تھا
[illegible] ہوتا تھا۔ لیکن شکیل سے ملتے وقت اُن کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر تھا
جس سے شکیل کو [illegible] کا احساس ہوتا اور وہ خوش تھا کہ [illegible] آنکھوں نے جب
اس کی [illegible] جسم اور جاذبِ نظر [illegible] دیکھا تو خوش ہو کر بولے: "بھئی
شکیل [illegible] تم جیسا [illegible] جوان فوجی ملازمت کے لئے
بہت [illegible] ثابت ہو سکتا ہے۔"

"میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ مگر ——"

"تو پھر تیار رہو" عذرا کے ڈیڈی بات کاٹ کر بولے: "تم بہت جلد فوج میں [illegible] جاؤ گے۔"

اور پھر واقعی کچھ دنوں بعد اُسے کمیشن مل گیا۔ شکیل کی مسرتوں کی انتہا نہ رہی۔ ایک کامیاب زندگی کے تصور سے اُس کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ جب وہ فوجی وردی پہن کر بازار سے گزرتا تو ہر نگاہ کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔ اُس کا گٹھا ہوا جسم اور مردانہ چہرہ فوجی وردی پہنتے ہی نکھر جاتا۔

وہ بچپن ہی سے دلیر اور جفاکش تھا۔ اِس لئے تمام اعلیٰ فوجی افسر اُس سے بہت خوش تھے۔ وہ بہت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا اور چند ہی سالوں میں میجر کے معزز عہدے تک پہنچ گیا۔ اب وہ ایک ذمّے دار افسر بھی تھا اور قابلِ اعتماد شہری بھی۔ وہ ابھی تک عذرا کا ممنونِ احسان تھا اور عذرا نے بھی اُس کی محبت فراموش نہیں کی تھی۔

میجر بننے کے بعد جب کچھ دنوں کی رخصت پر وہ اپنے گھر واپس آیا تو عذرا کو پلیٹ فارم پر اپنا منتظر پایا۔ کیونکہ آنے سے پہلے اُس نے عذرا کو تار کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔

گاڑی جب آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی پلیٹ فارم پر رُکی تو عذرا بے قابو ہو کر اُس کی طرف لپکی اور ابھی اُس نے قدم گاڑی سے نیچے بھی نہیں رکھا تھا کہ وہ بے اختیار ہو کر اُس سے لپٹ گئی۔ اُس کی غلافی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان ہلکورے لے رہا تھا اور جذبات کی شدّت سے اُس کے ہونٹوں پر مہرِ سکوت لگ گئی تھی۔

"اب میں زیادہ دیر تک تمھاری جُدائی برداشت نہیں کر سکتی شکیل!" عذرا نے یہ جملہ کچھ ایسے خلوص سے کہا تھا کہ شکیل اُس کی تاب نہ لا سکا۔ وہ خود بھی تو عذرا کے بغیر اپنی زندگی میں ایک عظیم خلا محسوس کرتا تھا۔ اِس لئے اِس مرتبہ جب وہ اپنی چھٹیاں گزار کر ڈیوٹی پر واپس گیا تو اکیلا نہ تھا۔ عذرا کا حسین وجود بھی شریکِ سفر تھا اور وہ اِس کامیابی پر اِتنا مسرور اور نازاں تھا جیسے اُسے ہفتِ اقلیم کی سلطنت مل گئی ہو!

## غزل

کرشن موہن ایم اے

رُخسار و گیسو سے صبح و شام کا رشتہ
چشم و لب سے کیف و رنگِ جام کا رشتہ

ہر موسم کا اپنا سوز و درد الگ ہے
حُسن و عشق سے ہے دورِ ایّام کا رشتہ

زیست کے ہنگاموں کی کچھ پہچان تو ہوتی
عیش ہی تک محدود ہے دورِ جام کا رشتہ

سوزِ دروں سے رہنِ جنوں ہوں کیسا غضب ہے
پھر بھی عزیزِ دل ہے ننگ و نام کا رشتہ

اب اُن کو ہم سے پہلا سا پیار کہاں ہے
نام کو لیکن باقی ہے پیغام کا رشتہ

شوخ نگاہوں سے پاتا ہے تسکینِ دل
میری آنکھوں سے ہے حُسنِ بام کا رشتہ

کرشن موہن

دو سال کا رومانی عرصہ پر لگا کر اُڑ گیا۔ اُن دونوں کی ازدواجی زندگی بے حد کامیاب تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے اور ایک دوسرے کے جذبات کی پاسداری کرتے تھے۔ اِس عرصے میں وہ ایک ننھے مُنّے بچّے کے ماں باپ بھی بن چکے تھے۔ جو اُن کی شاخِ حیات پر کھِلنے والا پہلا خوش رنگ پھول تھا!

دن گزرتے چلے گئے —— پھر اچانک ایک روز بہت بڑا بھونچال آیا۔ جس نے باہمی اعتماد کی فضا کو زہر آلود بنا دیا۔

اُس رات شکیل رات کے دو بجے گھر واپس آیا تھا۔ اُس کا سُوٹ جگہ جگہ سے مسکا ہوا تھا اور جسم سے شراب کی بدبو کے بھبکے اُڑ رہے تھے۔ عذرا نے اِس سے پہلے شکیل کو کبھی اِس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دیر کے لئے اُس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ پھر وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرج کر بولی۔

"یہ تم ہو! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ایسی ذلیل حرکت بھی کر سکتے ہو۔ تم خوب جانتے ہو مجھے شراب سے کتنی نفرت ہے؟"

"میں نے شراب نہیں پی عذرا! میں تمھارے سر کی قسم کھاتا ہوں۔" "میں نے شراب کو چھُوا تک نہیں" شکیل نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں اپنی بے گناہی کا یقین دلایا۔

"بھوت! اور وہ بھی اس ڈھٹائی کے ساتھ! اگر تم نے شراب نہیں پی تو یہ شراب کی بدبو کہاں سے آرہی ہے؟"

"پہلے میری پوری بات سن لو۔ میں چند ایسے دوستوں کی محفل میں پھنس گیا تھا جہاں شراب کا دور چل رہا تھا، وہ چاہتے تھے میں بھی اُن کا ساتھ دوں لیکن جب میں رضامند نہ ہوا تو انھوں نے زبردستی شراب میرے سوٹ پر انڈیل دی۔ اس کھینچا تانی میں میرا سوٹ بھی کئی جگہ سے پھٹ گیا۔"

"عذرِ گناہ بدتر از گناہ! میں اس من گھڑت کہانی پر یقین نہیں کر سکتی۔ صبح ہوتے ہی یہ گھر چھوڑ دوں گی! اب اس جہنم میں رہنا میرے ضبط سے باہر ہے۔"

شکیل نے ہر چند اُسے اپنی معصومیت کا یقین دلایا لیکن عذرا کا شک دور نہ ہوا۔ اس نے اپنے لختِ جگر کی بھی پروا نہ کی اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی اپنے میکے چلی گئی۔

---

اس اچانک اُفتاد سے شکیل ایک ایسے ذہنی صدمے سے دوچار ہوا جس نے کچھ دنوں کے لیے اُس کا ذہنی توازن درہم برہم کر دیا۔ اُس پر بیماری کا حملہ اتنا شدید ہوا کہ اُسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ پھر صحت یاب ہونے کے بعد اُس کا دل فوجی ملازمت سے بھی اُچاٹ ہو گیا اور وہ [illegible] سے سبکدوش ہو گیا۔ لیکن زندہ رہنے کے لئے [illegible] بہلانے کے لئے اُس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا دھندا شروع کر دیا [illegible] اتنی برکت ہوئی کہ وقت کے بہت ہی قلیل وقفے میں وہ [illegible] لیکن غم کی وہ گرہ جو دل میں بیٹھ گئی تھی، آج تک نہ کھل سکی تھی اور [illegible] ہلکا کرنے کے لئے وہ تلخ کافی کو اپنے رگ و ریشے میں [illegible] حصولِ بے خودی کے لئے شراب کے تلخ گھونٹوں کو حلق سے نیچے [illegible] پسند نہ تھا۔

وہ ابھی یہیں تک سوچ پایا تھا کہ اُس کی نگاہیں کافی ہاؤس کے [illegible] دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ ایک عورت جو حُسن و شباب کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی، کمالِ بے نیازی سے کافی ہاؤس میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ [illegible] اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ ہو بہو عذرا تھی! وہی [illegible] وہی غلافی آنکھیں، وہی شانوں پر لہراتی ہوئی زلفیں، وہی [illegible] وہی پُروقار چال۔ اگر وہ سچ مچ عذرا تھی، تو آج کی عذرا اور پانچ سال پہلے کی عذرا میں ذرہ برابر بھی تو فرق نہ تھا!

کچھ دیر عذرا اُسے پھر جھجک کر اُس نے اِدھر اُدھر نگاہیں گھمائیں پھر آہستہ آہستہ چلتی ایک خالی میز کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ شکیل کی میز بھی قریب ہی تھی۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر بیرا اُس کے پاس آیا۔ اُس نے سرگوشی میں آرڈر دیا۔

"ٹھنڈی کافی!"

شکیل چونک اُٹھا۔ عذرا کو بھی تو ٹھنڈی کافی ہی پسند تھی۔ اُسے سنّاٹا ہوگیا۔ پھر اُس نے اپنی آنکھیں اُس پر جمادیں۔ وہ سچ مچ عذرا تھی! اُس کا دل زخمی پرندے کی طرح زور زور سے پھڑپھڑانے لگا۔ اُس کا جی چاہا اُٹھ کر بھاگ جائے اور پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھے۔ وہ اِس سنگدل عذرا سے کوئی واسطہ نہ رکھنا چاہتا تھا جس نے اُس کی زندگی کی رگ رگ سے خوشیوں کا رس نچوڑ لیا تھا۔ وہ ایسی بے رحم ماں تھی جسے اپنے جگر کے ٹکڑے کا بھی خیال نہ آیا۔ لیکن نہ جانے کون سی طاقت نے اُس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر بھی تو نہ جاسکتا تھا۔

پھر اچانک عذرا اپنی جگہ سے اُٹھی اور کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اُس کی میز کے پاس آکر کھڑی ہوگئی اور بمشکل کہہ پائی "کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟"

شکیل بُت بنا بیٹھا رہا۔ جیسے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ پھر وہ اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر خالی کرسی پر بیٹھ گئی اور دیر تک خلا میں بے مقصد گھورتی رہی۔ شکیل کے دل کی دھڑکن بھی تیز تھی "میں صرف آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ میں غلطی پر تھی۔ آپ کے تمام دوستوں نے فرداً فرداً مجھے اِس بات کا یقین دلایا تھا کہ آپ نے اُس رات شراب نہیں پی تھی۔ مجھے یقین بھی آگیا تھا لیکن میری جھوٹی انا آڑے آگئی۔ میں آسانی سے شکست ماننے کو تیار نہیں تھی۔ آپ میں اخلاقی جرأت ہوتی، تو شاید بات اِتنا طول نہ پکڑتی لیکن آج میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر یہاں چلی آئی ہوں۔ میں ایک نظر اپنے بچّے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ سے اور کچھ نہیں چاہئے۔ میں اُسے ایک بار اپنے کلیجے سے لگانا چاہتی ہوں۔ گھر سے باہر قدم نکالتے وقت میں نے سمجھا تھا کہ ماں کی ممتا ایک قصّے کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن پانچ سال کے طویل عرصے نے مجھے اِس تلخ حقیقت کا احساس دلایا ہے کہ ماں بننے کے بعد ایک ماں میں ممتا کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ میں شوہر کی جُدائی برداشت کرسکتی ہوں۔ لیکن اپنی ممتا کو کچل دینا میرے بس کی بات نہیں۔ اب میں زیادہ دیر تک یہ عذاب نہیں جھیل سکتی۔ میری جھوٹی انا ایک ایسا کھلونا ہے، جو ممتا کے ہاتھوں چکنا چُور ہوچکا ہے۔ میں نے اُس شکستہ شیشے کی کرچیاں تک اُٹھا کر باہر پھینک دی ہیں۔ خدا کے لئے مجھے میرے بچّے سے ملا دیجئے۔ میں اُسے ایک بار جی بھر کر دیکھنا چاہتی ہوں!"

عذرا کی سانس بُری طرح پھُول رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کے برساتی نالوں کی طرح بہہ رہے تھے اور شکیل کے جھوٹے صبر و ضبط کا وہ بندھ جو اُس نے اپنے گرد باندھ رکھا تھا، ایک ہی زوردار جھٹکے میں ٹوٹ چکا تھا اُس کے ہاتھ غیر ارادی طور پر اُٹھے اور عذرا کے ہاتھوں سے مل گئے۔

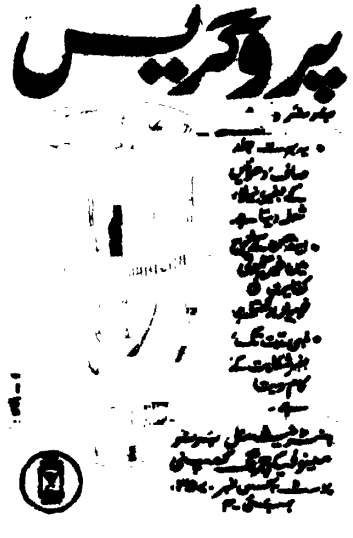
بیرا عذرا سے پُوچھ رہا تھا "بیگم صاحب! کافی کا سیٹ آپ کی ٹیبل پر لگا دوں؟"

"نہیں اِسی میز پر لے آؤ!" شکیل نے مُسکراتے ہوئے کہا اور بیرا شکیل کو پہلی بار مُسکراتے ہوئے دیکھ کر حیرت میں ڈوب گیا!!

---



---



# آپس کی بات ...
# شاباش، میرے بیٹے

تمہاری اسکول کی رپورٹ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ اچھے نمبر لئے ہیں تم نے ... پچھلی بار سے بہتر ہیں ——— اور اب تو تم اسکول میں دوپہر کے کھانے کی اسکیم میں بھی ہاتھ بٹاتے ہو!

لیکن ——— تم یہ بات نہیں جانتے۔ میں آٹھواں درجہ پاس کرنے کے بعد اپنی پڑھائی جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ آس پاس دس دس میل تک کوئی ہائی اسکول نہ تھا ——— دادا جی مجھے ہوسٹل میں بھیجنے پر راضی نہ تھے ——— اُس وقت میری عمر ہی کیا تھی! ——— اور پھر اخراجات بھی ایک مسئلہ بنے ہوئے تھے۔

او، یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا ——— ایسا لگتا ہے، آج کا دن بڑا مبارک ہے۔ نرودی کے ماسٹر جی کا خط آیا ہے۔ لکھا ہے، نرودی سائنس میں اعلیٰ قابلیت رکھتا ہے۔ اُسے اس کے لئے وظیفہ دیا گیا ہے۔

سُنو ——— مجھے اُمید ہے نرودی کو یہیں فیکٹری میں کوئی اچھا کام مل جائے گا۔ جب ضلع کے صدر مقام پر پہلی فیکٹری بنی تھی ——— تو ہم اُسے بڑے شوق کے ساتھ دیکھنے گئے تھے۔ شوق کے ساتھ! ——— ہاں۔ اُس فیکٹری کو دیکھنے کے لئے ہم نے ۲۰ میل کا لمبا سفر بیل گاڑی سے طے کیا تھا۔

ہاں، زمانہ سچ مچ بدل گیا ہے۔

## یہ ترقی پلان سے ہوئی ہے

| | ۱۹۵۱ء | ۱۹۶۵ء |
|---|---|---|
| ۶ سے ۱۱ برس عمر گروپ کے اسکول جانے والے بچوں کی تعداد (دس لاکھ میں) | ۱۹٫۱۵ | ۵۱٫۵۰ |
| وظائف پر صرف ہوئی رقم (کروڑ روپئے میں) | ۷٫۲۵ | ۳۵٫۰۰ |
| ٹیکنیکل تعلیم کے لئے دستیاب نشستیں (ڈگری) | ۴۱۲۰ | ۲۴۷۰۹ |






زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارگر اشارات

## ۱ • کیا نمک مضرِ صحت ہے؟

نمک کو ہم ایک بہت معمولی چیز سمجھتے ہیں۔ اِس ہولناک اور ہوشربا گرانی کے زمانے میں بھی سب سے ارزاں چیز نمک ہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لئے نمک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

نمک ہماری غذا کا ایک ضروری جزو ہے۔ اگر کھانے میں نمک نہ ہو تو وہ پھیکا اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ نمک ہماری غذا کو مزیدار ہی نہیں بناتا بلکہ اِس کا استعمال صحت و تندرستی کو قائم رکھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ یہ غذا کو ہضم ہونے میں مدد دیتا ہے۔ خون، ہڈیوں اور عضلات کی ساخت میں کام آتا ہے۔ اگر انسان کو نمک نہ ملے یا وہ اِسے چھوڑ دے تو اُس کے جسم میں نمک کی جو مقدار قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے وہ کم ہو جاتی ہے اور انسان بہت سے امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نمک کے استعمال سے غذا کے ہضم ہونے میں مدد ملتی ہے۔ نمک معدے اور آنتوں کو صاف کرتا ہے۔ قوتِ ہاضمہ میں اضافہ کرتا ہے، بھوک لگاتا ہے۔ گرم و خشک اور قبض کشا ہے۔ قوتِ ہضم کے لئے مفید ہے۔ بدہضمی اور پیٹ کے درد کو دُور کرتا ہے۔ کھٹی ڈکاروں کو روکتا ہے اور ریاح کو تحلیل کرتا ہے اور جراثیم کش ہے۔

نمک انسان کی غذا اور خون کا ایک ضروری جزو ہے۔ اگر یہ انسان کو نہ ملے تو وہ کمزور اور نحیف ہو جاتا ہے۔ مختلف پھلوں اور سبزیوں سے بھی انسان نمک حاصل کرتا ہے۔ اس کے باوجود غذا میں کچھ زاید نمک بھی ملانا پڑتا ہے۔ مگر اِس کا زیادہ استعمال مضرِ صحت ہے۔ بعض پوشیدہ امراض اور ہائی بلڈ پریشر میں اِس کا استعمال منع ہے۔ موتیا بند اور امراضِ چشم میں نمک کا استعمال مضر ہے۔ نمک زیادہ کھانے سے مرضِ سرطان، معدے کی رسولی اور بینائی میں کمزوری پیدا ہوتی ہے اور پیاس بڑھتی ہے۔ نمک کا استعمال حدِ اعتدال ہی میں ہونا چاہئے۔

جسمانی توانائی کا انحصار نمک ہی پر ہے۔ ماسکو سے واپسی کے وقت نپولین کے سپاہی کیڑے مکوڑوں کی طرح محض اِس وجہ سے مرے کہ اُن کی غذا میں نمک نہیں تھا۔

## ۲ • خوبصورتی کا راز ——— بہتر غذا

خوبصورتی کا راز بہتر اور متوازن غذا میں پوشیدہ ہے۔ بہتر اور متوازن غذا سے جسم کی جلد ملائم اور شفاف رہتی ہے۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے، چہرے پر رونق آجاتی ہے، بال چمکیلے ہو جاتے ہیں اور دل میں ہر دم ایک نئی اُمنگ موجزن ہوتی رہتی ہے۔ لیکن آج جسے دیکھئے آنکھیں بے نور، چہرے سے رونق کافور، رنگ ایسے بجھے بجھے نظر آتے ہیں جیسے بجھی ہوئی شمع کی راکھ ہو۔ دلوں میں اُمنگ ہے نہ ترنگ۔ اِس کا سب سے بڑا سبب غذائی بے اعتدالیاں اور ناقص غذا ہے۔ آپ صرف چار ہفتہ بہتر اور متوازن غذا کا استعمال پابندی سے کر کے دیکھئے۔ آپ اپنے اندر ایک نئی تبدیلی پائیں گے۔ آپ کے جسم پر ایک نئے حُسن کا نکھار ہوگا۔

آج کل ہم جو بجھی ہوئی صورتیں اور بھدے چہرے دیکھتے ہیں، اِس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کو وہ غذائیت میسّر نہیں، جو اُن کے چہروں کو دلکش اور خوبصورت بنا سکے۔ ایسے لوگ آج ہی سے بہتر غذا کا استعمال شروع کر دیں تو اُن کا حُسن بہت جلد نکھر آئے گا۔ بجھی ہوئی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ اگر آپ

جلد خشک اور مٹیالے رنگ کی ہو گئی ہو تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کے جسم میں وٹامن اے اور سی کی کمی ہے۔ یہ کمی پوری کرنے کے لئے ایک گلاس سنترہ کے عرق کا روزانہ استعمال کیجئے یا ایک ایک دن کے بعد تازہ اور کچی سبزیاں جتنی آپ کھا سکتے ہیں کھایئے۔ ان سبزیوں میں ٹماٹر، مولی، گاجر، چقندر، کھیرا اور دوسری سبز پتے والی ترکاریاں ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ وٹامن سی کی کمی سے جلد خشک اور مٹیالی ہو جاتی ہے۔ یہ سبزیاں اس شکایت کو دُور کر دیتی ہیں۔ اگر آپ کے مسوڑھوں سے خون رِس رہا ہو اور نتھنے متورم ہو گئے ہوں تو اس سے ظاہر ہے کہ آپ کے جسم میں وٹامن سی کی کمی ہے اور اگر آپ کے ہاتھ کی پچھلی جانب والی جلد پھٹنے اور ابرو پر پھنسیاں یا کھردرا پن پیدا ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو وٹامن بی اور اے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے جگر، گردے، بیضۂ مرغ، ترکاریاں اور پھل استعمال کیجئے۔ وٹامن اے کی ضرورت دو کچی گاجریں ہر روز کھانے سے پوری ہو سکتی ہے۔ اگر یہ نہ مل سکے تو مکھن اور زرد رنگ کے پھل اور ترکاریاں استعمال کیجئے۔ وٹامن سی میں اور اوصاف کے علاوہ یہ بھی ایک صفت پائی جاتی ہے کہ وہ جلد کو چمکدار بناتی اور آنکھوں کو طرح طرح کی تکالیف سے محفوظ رکھتی ہے۔ بال خشک اور بدنما ہو جائیں تو انھیں چمکدار اور ملائم بنانے کے لئے سیب، انناس، گوبھی، کاہو، پیاز، لہسن اور مچھلی کا تیل، استعمال کیجئے۔

جہاں تک ممکن ہو ترکاریاں اور پھل تازہ اور کچے استعمال کئے جائیں۔ خاص کر ایسی چیزیں، جن میں وٹامن سی ہو۔ اگر ترکاریاں پکانی بھی جائیں تو انھیں دیر تک نہ پکانا چاہئے۔ تاکہ ان کی غذائی اہمیت و افادیت محفوظ رہے۔

وٹامن سی کے اجزاء بہت لطیف اور نازک ہوتے ہیں جو تیز آنچ پر پکانے اور زیادہ بھوننے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ کچی سبزیاں اور ترکاریاں کھانا زیادہ مفید ہے۔ سلاد، گاجر، ٹماٹر، مولی، پیاز، کھیرا، چقندر اور ککڑی وغیرہ کچا ہی کھانا زیادہ مفید ہے۔ ان چیزوں میں وٹامن سی کے اجزاء بکثرت موجود ہیں۔ پھلوں میں لیموں، سنگترہ، سیب، آم، انگور، پپیتا اور انناس میں وٹامن سی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

انھیں مشوروں میں حُسن کا راز پوشیدہ ہے۔ ان پر عمل کر کے آپ یقیناً خوبصورت بن سکتے ہیں۔

## ۳۔ آپ پر مہربان بنئے

بیکاری اور بھیانک گرانی کے دَور میں ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جو پریشان نہ ہوں۔ مالی مشکلات دُور کرنے کے لئے، مالی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے دل وجان سے کوشش کرنی چاہئے لیکن اس کوشش میں کامیابی نہ ہو یا خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو آزردہ خاطر اور مایوس و ملول نہیں ہونا چاہئے۔ اِس طرح مشکلات کا اندھیرا اور گہرا ہو جائے گا۔

ہم حالات اور مشکلات سے پریشان ہو کر دوسروں سے مدد کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن بہت کم لوگ ہیں جو دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ حالات کے اس اندھیرے میں آپ کو مشہور مفکر ڈیل کارنیگی کے اِس مشورہ سے سکون بخش روشنی ملے گی۔

"اگر ہم اپنے حالات کو بہتر نہیں بنا سکتے تو کم از کم اپنے رویّہ تو تبدیل کر سکتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ دوسرے لوگ بھی پریشان ہوتی ہیں۔ ہم غالباً اِس لئے پریشان رہتے ہیں کہ ہم اپنے دوست کی برابری نہیں کر سکتے اور ہمارا دوست شاید اِس لئے پریشان ہے کہ وہ اپنے پڑوسی سے کم ہے اور ہمارے دوست کا پڑوسی غالباً اس لئے پریشان ہے کہ وہ اپنے دوست کی برابری نہیں کر سکتا۔"

دُنیا کی بعض بڑی شخصیتوں کو بھی مالی مشکلات پیش آتی رہی ہیں مگر ہماری ساری خواہشات اور آرزوئیں پوری نہیں ہو سکتیں تو ہمیں پریشانی اور افسردگی سے اپنی زندگی کو تلخ اور عرصۂ حیات کو تنگ نہ بنا لینا چاہئے۔ ہمیں اپنے آپ پر مہربان بننا چاہئے۔

روم کا عظیم فلسفی سنیکا کہتا ہے ——— "آپ کے پاس جو کچھ موجود ہے، اگر آپ کی نظروں میں وہ ناکافی ہے، پھر آپ ساری دُنیا کے بھی مالک کیوں نہ ہوں، آپ ہمیشہ آزردہ و پریشان ہی رہیں گے۔"

اگر آپ کوشش کرنے کے باوجود اپنی مالی حالت کو بہتر نہیں بنا سکتے تو کم از کم اپنی ذات پر رحم کرنا چاہئے، جو بدل نہیں سکتا، اُس پر کڑھنا اور آزردہ نہ ہونا چاہئے۔

## ۴ • سوہنجنے کی پھلیاں ——— ایک مفید سبزی

سوہنجنے کو سوجنا اور سوجھنا بھی کہتے ہیں۔ اس کے درخت لوگ عام طور باغوں اور پارکوں میں لگاتے ہیں۔ موسم بہار میں اس میں خوبصورت پھولوں کے گچھے لگتے ہیں۔ پھولوں کے بعد اس میں آدھ آدھ گز لمبی اور موٹی پھلیاں لگتی ہیں۔ ان پھلیوں کو گوشت کے ساتھ پکا کر کھاتے ہیں۔ آلو کے ساتھ بھی پکاتے ہیں۔ بے حد لذیذ اور مفید ترکاری ہوتی ہے۔

سوہنجنے کی پھلیاں مزاج کے اعتبار سے گرم و خشک ہوتی ہیں۔ جسم میں

گرمی اور خشکی پیدا کرتی ہیں۔ ریاح کو دور کرتی ہیں۔ بادی و بلغمی امراض میں فائدہ بخش ہیں۔ کھانسی، دمہ، ورم طحال، گٹھیا اور کمر کے درد میں ان کی ترکاری پکاکر کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔

آنتوں میں ریاح ہوں تو خارج ہوتے ہیں۔ کیڑے ہوں تو ہلاک ہو کر نکل جاتے ہیں۔ اس کے چھلکوں کو بھی پکاکر کھاتے ہیں۔ ان سے بھی یہی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

سہجنے کی کچی پھلیوں کا اچار بھی لذیذ اور بہت سے امراض کے لئے مفید ہوتا ہے۔ بھوک کی کمی، دردِ شکم، دردِ کمر، گٹھیا اور فالج و لقوہ میں فائدہ بخش ہے۔ نیز تمام بلغمی امراض میں مفید ہے۔ قوت ہاضمہ میں اضافہ کرتا ہے۔ بلغم اور ریاح کو دور کرتا ہے۔ بھوک بڑھاتا ہے اور کھول کر پیشاب لاتا ہے۔ اچار متواتر کھانے سے بڑھا ہوا پیٹ کم ہو جاتا ہے۔

## ۵● کامیابی کا راز

ماہرینِ سائنس نے حال ہی میں اِس بات کی تحقیق کی ہے کہ کسی انسان کو کامیابی کیوں اور کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ —— جن لوگوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اُن کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ۹۰ فیصدی سے بھی زیادہ لوگ ایسے کاموں میں مصروف ہیں، جنھیں وہ بہت پسند کرتے ہیں اور جو اُن کے میلانِ طبع کے مطابق ہیں۔ جو شخص اپنے کام سے مسرت حاصل نہیں کرتا وہ شاید ہی کوئی کامیابی حاصل کر سکے۔ چاہے وہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے۔ اِس بات کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں کہ زیادہ تر ناکامی اِسی وجہ سے ہوتی ہے کہ کام طبیعت کے مطابق نہ تھا۔

جن لوگوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اور کامیاب و کامراں ہوئے ہیں، وہ کوئی غیر معمولی قابلیت و صلاحیت کے مالک نہیں ہیں لیکن اُن سب میں ایک وصف مشترک ہے۔ وہ مستقل مزاج اور ثابت قدم ہیں اور وہ اِس امر کی اہلیت معمولی معیار سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں کہ کسی کام کو انجام دینے میں زیادہ سے زیادہ توجہ اور وقت صرف کریں اور جب تک اُسے پورا نہ کرلیں اُس میں لگے رہیں۔ مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود اپنے کام کو انجام دیتے رہیں۔ اگر آپ کو استقلال اور ثابت قدمی کی دولت میسر ہے تو آپ کو کامیاب و کامراں ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا!

## ۶● انسان کی سب سے بڑی دولت

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے —— "انسان کی سب سے بڑی دولت اُس کا دماغ ہے۔ آپ اپنے دماغ کو استعمال کرکے اور ایک مقصد کا تعین کرکے بڑی سے بڑی دولت کما سکتے ہیں۔ یہ دولت آپ محنت سے کمائیں گے اِس لئے اِس کے ضائع ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

جو دولت بغیر محنت و مشقت کے آتی ہے وہ اِسی طرح بغیر کسی مقصد کو پورا کئے ہوئے نکل جاتی ہے۔

بہت سے کاہل اور کم حوصلہ لوگ اُن لوگوں کو بہت رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جنھیں زندگی میں ایسی ملازمتیں مل گئی ہیں جن کے ذریعے وہ کافی ناجائز روپے کما سکتے ہیں۔ اِس طرح کے مواقع ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ واقعی بہت چھوٹی جگہوں پر بعض اوقات رشوتوں کا اِتنا زور ہوتا ہے کہ ایک معمولی کلرک بھی ہزاروں روپے کماتا ہے۔ یہ چیز اُن دلوں میں بعض اوقات گناہ کی ترغیب پیدا کرتی ہے جو رات دن کی مشقت اور محنت کے باوجود دو وقت آرام و سکون سے روٹی کھانے سے مجبور ہیں۔ حالانکہ اُن دونوں کی سرکاری تنخواہ بالکل برابر ہوتی ہے۔ اُن نیک اور ایماندار انسانوں کو چاہئے کہ وہ بے ایمانی اور بددیانتی سے کمائی ہوئی دولت سے خوفزدہ رہیں۔ خود اُن کے سامنے ایسی بہت سی مثالیں ہوں گی۔ جب اُن حریص اور خودغرض انسانوں کو اپنے لالچ کا پورا پھل ملا اور وہ طرح طرح کی ذلتوں اور قید و بند کی مصیبتوں میں گرفتار ہوئے۔

## ۷● املی —— ایک مفید چیز

املی کی چٹنی ہی لذیذ نہیں ہوتی۔ دوائی اعتبار سے بھی املی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ طبیعت اِس کی سرد و خشک ہے۔ ملین اور قبض کشا ہے۔ گرمی کی وجہ سے ہونے والی دل کی دھڑکن اور صفراوی قے، صفراوی متلی کے لئے املی کا شربت بناکر پینا مفید ہے۔ املی بھوک بڑھاتی ہے۔ صفراوی اسہال کو دور کرتی ہے۔ خصوصاً اِس کی سرخ قسم زیادہ نافع ہے۔ صفرا کو پاخانہ کے ذریعے خارج کر دیتی ہے۔ معدے اور جگر کی سوزش دور کرتی ہے۔ پیاس کی زیادتی کو روکتی ہے۔ بخار کی حالت میں قے یا پیاس کی زیادتی ہو تو اُسے بھی رفع کرتی ہے یہاں تک غشی اور کرب اور بے چینی کی حالت میں بھی بہت مفید ہے۔

قے، بدہضمی، پیاس، بدہضمی، جوشِ خون، دوران سر میں نافع ہے۔ اور اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ دل کی گرمی کو فوراً دور کرتی ہے۔

املی ہائی بلڈ پریشر کے لئے بھی مفید ہے۔ گرم بخاروں کو دور کرتی ہے۔ مفرح قلب ہے۔ صفراوی سر درد میں نافع ہے۔

املی خشک و تر خارش کو دور کرتی ہے۔ پانچ تولہ املی رات کو سب کو گر

ایک [illegible] پانی میں تل کر چھان لیں اور صبح کے وقت پیسی ہوئی ملا کر پئیں خشک و تر خارش کے لئے مجرب نسخہ ہے۔

آیورویدک طریقۂ علاج میں بھی املی کے کثیر فوائد بیان کئے گئے ہیں۔ محرک کی کمی دور کرتا ہے، کھانے کی خواہش پیدا کرتی ہے، معدے کی گرانی اور خشکی کو دور کرتی ہے، مقوی قلب ہے۔ دورانِ سر کے لئے بھی مفید ہے۔ صفرا کی تیزی رفع کرنے کے لئے املی کا استعمال مجرب ہے۔ گرمیوں کے موسم میں لُو کی سمیت کو رفع کرتی ہے۔ معدے کے بخارات کو تسکین دیتی اور زائل کرتی ہے۔

املی کے اندر کے بیج کا باریک سفوف ہموزن مصری ملا کر استعمال کرنا پوشیدہ امراض میں بہت مفید ہے۔

اس کا زیادہ استعمال مضر ہے۔ کھانسی ہوتی ہے۔ آنتوں میں خراش بھی ہوجاتی ہے۔ صبح کو نہار مُنہ کھانا بھی مضر ہے۔ کچی املی اور تازہ نورس کا استعمال سُدے پیدا کرتا ہے۔ نفاخ و دیر ہضم ہے۔

## ۸• کامیابی کا زینہ ــــــ ناکامی!

یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ناکامیاں ہی کامیابی کا زینہ بنتی ہیں۔ لیکن یہ روشن حقیقت ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــ "ہر شخص کی کامیابی اُس کی ناکامیوں کے رشتوں سے ناپی جاسکتی ہے ــــ جب ہم ٹھوکریں کھاتے ہیں تو ہم بہت قیمتی تجربے حاصل کرتے ہیں اور یہی تجربہ ہماری زندگی کا راستہ بدلنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

قدرت کی یہ پوشیدہ بات جسے ہم ناکامی کہتے ہیں، دراصل میں وقتی شکست ہے جو ہمیں ہمارے مقصدِ حیات کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے میرا ایمان ہے کہ ناکامی کی خاموش زبان اپنے اندر مستی کا ایک طلسم لئے ہوئے ہوتی ہے۔ میں تو کہوں گا یہ ایک آفاقی زبان ہے، جس کے ذریعہ قدرت ہمیں خبردار کرتی ہے کہ دیکھو ایسا نہ کرنا، اس میں تمھاری بہبودی نہیں۔

مجھے مسرت ہے کہ میں نے بہت سی ناکامیوں میں تجربہ کیا ہے۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ مجھ میں اتنی ہمت و جرأت پیدا ہوگئی کہ میں وہ کام کرنے پر آمادہ ہوگیا جو میں عام حالات میں شاید کبھی نہ کرتا۔

## ۹• ایک عجیب بات!

دُنیا میں [illegible] بہت سے لوگ [illegible] نہیں کرتے لیکن حالات کو الزام دیتے ہیں کبھی [illegible] حالات کا شکوہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ــــ "دُنیا میں بہت سے لوگ [illegible] جو ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر دُنیا کے [illegible] پیٹ کا سوال نہ ہو، بیماری سدِّراہ نہ ہو تو ہم بہت سے کارنامے [illegible] سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے، اس میں [illegible] دُنیا کے بڑے سے بڑے کام تکلیفوں اور مصیبتوں میں [illegible] لوگوں نے یہ کام کئے ہیں جو اپنے دست و بازو اور دل و دماغ [illegible] حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں اور اپنے مقصدِ حیات [illegible] کوشاں رہتے ہیں۔"

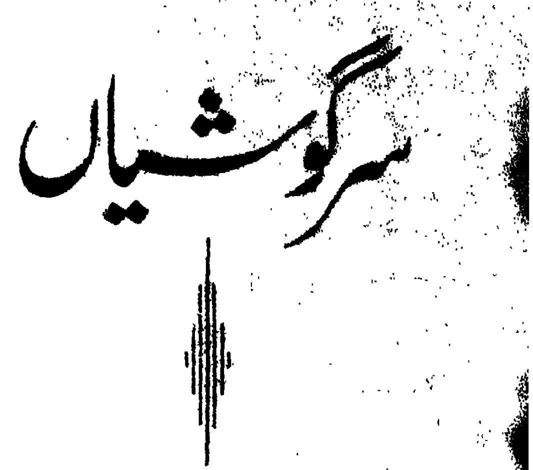
یہ عجیب بات ہے کہ اُن لوگوں کو جو فرصت کے متمنّی رہتے ہیں فرصت ملتی ہے لیکن وہ کرتے کچھ نہیں۔ جن بلند حوصلہ انسانوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ تہذیب و تمدّن کو ترقی دی ہے۔ وہ فرصت رکھنے والے [illegible] لوگوں میں سے نہیں تھے جنھیں ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی جدوجہد میں فرصت کے لمحات بہت کم ملے۔

اس آئینے میں آپ اپنا عکس دیکھئے ــــ آپ کن لوگوں میں ہیں؟





[redacted]



اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش دہریانہ سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

## سوال و جواب

**ایم۔ رحمانی۔ انارکلی، پورنیہ**

س۔ ہندوستان میں مغربی تہذیب کا مستقبل؟

ج۔ درخشاں ہے!

س۔ آپ کس تہذیب کے حامی ہیں، مشرقی یا مغربی کے؟

ج۔ مشرق سے مغرب کا کیا مقابلہ؟

مشرق نورِ سحر کی وادی
مغرب ظلمتِ شب کا جنگل

---

**نور احمد کوثر، چنیوٹ**

س۔ دُنیا کا سب سے بڑا سیاست داں کون ہے؟

ج۔ جو سیاسی مقابلوں میں ناکام ہو کر بھی بددل و منفعل نہیں ہوتا۔ جو ناکامی کو بھی کامیابی ہی سمجھتا ہے۔ جو شکست کو بھی فتح سمجھتا ہے۔

س۔ اسلام کب ظہور میں آیا؟

ج۔ آج سے تیرہ سو سال پہلے۔ آپ کا نام نور احمد ہے اور یہ بھی نہیں جانتے؟ حیرت کی بات ہے۔

س۔ یہ شعر کس کا ہے؟

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ج۔ غالب کا۔

---

**زبیر احمد رشید احمد قریشی۔ احمد آباد**

س۔ نزاکت پر کوئی شعر تحریر فرمائیں۔

ج۔ دشنام دوست طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

س۔ اگر کوئی بہت زیادہ نزاکت کرے تو؟

ج۔ عورت ہو تو اُس کا نام نزاکت بانو ہوگا۔ مرد ہو تو نزاکت حسین!

---

**شمس الحق عثمانی۔ دہلی**

س۔ راجہ مہدی علی خاں کی مزاحیہ شاعری اور طنزیہ مضامین کا کوئی مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اگر ہوا ہے تو کس نام اور کس ادارے سے؟

ج۔ بہت سے لوگ اِس دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر لوگ کامیاب ہو گئے تو راجہ صاحب کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کے بہت سے مجموعے پائیں گے۔

---

**نشاط زہلی۔ عادل آباد**

س۔ زندگی کا پودا کب سوکھ جاتا ہے؟

ج۔ جب اُسے عمل کا پانی نہیں ملتا۔

س۔ زندگی کا مزہ کب کرکرا ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب زندگی کسی کاہل اور بے عمل کے پالے پڑ جاتی ہے۔

س۔ وکالت اور جھوٹ میں کیا رشتہ ہے۔

ج۔ جو سیاست اور فریب میں ہے۔

---

**اشفاق احمد۔ ہوڑہ**

س۔ خوشتر بھیا! آپ اتنے افسانے کہاں سے پاتے ہیں؟

ج۔ اپنے پُرخلوص فنکاروں کے پُرخلوص تعاون سے۔

س۔ انسان کا ہمراز کون بن سکتا ہے؟

ج۔ قابلِ اعتماد انسان!

---

### حسن آرا مہتاب۔ کلکتہ

س۔ انسان کی زندگی کا وہ کون سا لمحہ ہے جو گزر جانے کے بعد پھر نہیں آتا؟

ج۔ زندگی کا کوئی لمحہ گزر جانے کے بعد پھر نہیں آتا۔ اسی لئے زندگی کا ہر لمحہ بہت قیمتی ہے۔

س۔ خودی اور خودداری...؟

ج۔ خودی اور خودداری میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ دونوں اچھے اوصاف ہیں کچھ لوگ خود پرستی کو خودداری سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھنے والے غلط سمجھتے ہیں۔

س۔ کوئی ایسا شعر سنایئے جس میں سادگی اور خیال کی بلندی ہو اور بندش بھی اچھی ہو۔

ج۔ زخم جب بھی کوئی ذہن و دل پہ لگا تو زندگی کی طرف ایک دریچہ کھلا
ہم بھی گویا کسی ساز کے تار ہیں چوٹ کھاتے رہے گنگناتے رہے

---

### ڈاکٹر سید خورشید علی۔ امراوتی کیمپ

س۔ دنیا کا مذہب صرف انسانیت ہو تو...؟

ج۔ دنیا جنت بن جائے!

س۔ زندگی اور سماج میں کیا رشتہ ہے؟

ج۔ بہت گہرا رشتہ ہے۔ زندگی کا سماج سے گہرا رشتہ نہ ہوتا تو سماج وجود میں نہ آتا۔

---

### خواجہ تاج احمد۔ نرمل (آندھرا)

س۔ خوشتر بھیا! ہم مرتبہ جوڑے زیادہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں یا ہم خیال؟

ج۔ ہم خیال۔

س۔ آپ شراب کے نقصانات کے شدت سے حامی ہیں۔ اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ آپ شراب بہت پیتے ہیں۔ اس کی وجہ؟

ج۔ یہ ہوائی کسی ظالم نے اڑائی ہوگی! شراب کیا ہم تو سگریٹ بھی نہیں پیتے! ہم نے شراب

### [illegible]

س۔ آپ کے خیال میں مسئلہ کشمیر کا حل کیا ہونا چاہئے؟

ج۔ جو فریقین کو مطمئن کر سکے۔

---

### نسرین خاتون۔ لال باغ پٹنہ

س۔ آنند؟

ج۔ بڑی آنند تھی سحر مسکرائے
اندھیرے گھنیرے اجالے نہ آئے

س۔ رشک و حسد؟

ج۔ حاسد کو یک دم نہیں راس جہاں میں!

س۔ ترقی کا راز؟

ج۔ گر ترقی چاہتے ہو اس سے کسب نور کرو
آسمانِ ارتقا کا نیرِ تاباں ہے علم

---

### شاہد عرفانی۔ کلکتہ

س۔ جب انسان کی ہر تمنا پامال ہو جائے؟

ج۔ جب بھی بددل نہ ہونا چاہئے۔ تخریب کی انتہا تعمیر کی ابتدا ہوتی ہے۔

س۔ دورِ حاضر کے ادیب؟

ج۔ گفتار کے غازی!

س۔ انسان کو جب ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آئے تو اس وقت اسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ عزم و حوصلہ کے چراغ کی لو اور بڑھا دینی چاہئے!

---

### محمد نصرت اللہ امتیاز۔ بنگار پیٹ

س۔ بھیا! بتلایئے، میں جس پانے کی تمنا اپنے دل میں رکھتا ہوں، کیا اسے پا سکتا ہوں؟

ج۔ یہ تو حالات پر۔۔۔ اپنی کوششوں پر موقوف ہے۔

ج۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

---

### محمد عبد الجبار خورشید۔ [illegible]

س۔ کیا مہدی حسن جیسے [illegible] پیدا ہوں گے؟

ج۔ مایوسی کفر ہے۔ [illegible] نہ ہونا چاہئے۔ [illegible] صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔۔۔
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

س۔ کیا خودکشی کرنے والا انسان [illegible] کی موت مرتا ہے؟

ج۔ جی نہیں۔

---

### شکیلہ بانو نظیر حسین۔ [illegible]

س۔ لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ہم لڑکیوں کو تعلیم دلوانا بہت ضروری سمجھتے ہیں لیکن ایسی تعلیم نہیں جو انھیں چراغِ خانہ سے شمعِ محفل بنا دے۔

س۔ علم و ہنر میں کیا فرق ہے؟

ج۔ جو علم و عمل میں فرق ہے۔

س۔ دل اور دولت میں کیا فرق ہے؟

ج۔ دل سے دولت کو کیا نسبت!

---

### گوردیال سنگھ پروانہ۔ امرتسر

س۔ آسام کا صدر مقام کہاں ہے؟

ج۔ شیلانگ۔

س۔ آپ بتا سکتے ہیں مدراس کی سرکاری زبان انگریزی ہے یا ہندی؟

ج۔ مدراس کی سرکاری زبان تامل ہے۔

عبدالرحمٰن داؤدی۔ بھٹکل

س۔ اگر زندگی میں صرف دُکھ ہی دُکھ ہوں تو؟

ج۔ دُکھ کو سُکھ بنا لینا چاہئے۔

س۔ آج کا سماج؟

ج۔ چھلنی میں چھید جیسا ہے۔ آج کا سماج اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتا، دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھتا ہے۔

س۔ آج کی معاشرت؟

ج۔ آج کی معاشرت بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔ آج کی معاشرت لوگوں کی اقتصادی حالت سے بلند ہے، اِس لئے تکلیف دہ بن گئی ہے۔

---

ساجن داس ناوانی لس بیلہ (پاکستان)

س۔ زندگی کانٹوں کی سیج ہو تو؟

ج۔ آپ کے بلند حوصلے اُسے پھولوں کی سیج بنا سکتے ہیں۔

س۔ محبت سکون کیوں برباد کرتی ہے؟

ج۔ محبت سب کچھ برباد کر دیتی ہے۔

س۔ زندگی کو پھول کہا جائے یا پتھر؟

ج۔ یہ تو اپنے عزم و حوصلہ کی بات ہے — کوئی زندگی کو پھول بنالے یا پتھر!

---

اے۔ اے۔ رشید آنبوری۔ راجمندری

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت گھر کی رونق ہے؟

ج۔ جی ہاں کہتے ہیں بے گھری گھر بھوت کا ڈیرہ!

س۔ کامیابی اور ترقی حاصل کرنے کے لئے کن اصولوں کو اپنانا چاہیئے؟

ج۔ ناقابلِ شکست عزم — اَن تھک عمل کو۔

---

عابدہ بیگم شکر نگر نظام آباد (اے۔ پی)

س۔ جب انسان غریب ہو جاتا ہے تو اُسے اپنے بھی

اپنا کھانا پکا پاتے ہیں اور جب امیری غریبی کو مات کر دیتی ہے تب غیر بھی اپنا کہنے لگتے ہیں۔ انسان نے دولت ہی کو سب کچھ کیوں سمجھ رکھا ہے؟

ج۔ کم ہیں اور کتنا نظریہ دولت کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔

س۔ ہندوستان میں روز بروز بیکاری بڑھتی جا رہی ہے اور دوسری طرف نت نئی اسکیموں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ شہروں میں جگمگاتی بجلیاں ہیں اور غریب دیہاتی مشکل سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ جنھیں تیل کا چراغ جلانا بھی دشوار ہے۔ کیا غریبوں کے سینے میں دل نہیں۔ کیا وہ اسی طرح مرتے رہیں گے؟

ج۔ بانو! ؎

تنگ محل میں آگ لگے تو دھرتی پر اجیالا ہو

جب تک پونجی پتی زندہ ہیں تب تک یہ اندھیرا ہے

---

نیاز مونگیری۔ مونگیر

س۔ خوشتر بھائی! میں ایک ایسے کمیونسٹ کو جانتا ہوں جو فرقہ پرستی پھیلانے میں مصروف رہتا ہے۔ اُس کے ساتھ کون سا رویّہ اختیار کیا جائے؟

ج۔ جو اُس کے "شایانِ شان" ہو!

س۔ ترقی پسند کسے کہتے ہیں؟

ج۔ جو زندگی کی نئی قدروں، نئی راہوں اور نئے خیالات کو اپنائے۔

---

عبید صیفی۔ بنگلور

س۔ ہر مذہب انسانیت سکھاتا ہے لیکن انسان کیا سیکھتا ہے۔

ج۔ اچھا انسان انسانیت سیکھتا ہے۔ بُرا انسان بربریت و حیوانیت سیکھتا ہے۔

س۔ پچھلے چار برس سے بیسویں صدی کے پرچے میرے پاس محفوظ ہیں۔ نہ تلف کرنے کو جی چاہتا ہے، نہ کسی کو دینے کو۔ رکھ کر بھی کیا کروں؟

ج۔ حیرت ہے، آپ بیسویں صدی کے پرچوں کے متعلق ایسا سوچتے ہیں۔ بلند ذوق و صاحبِ نظر بیسویں صدی کے پرچوں کو گرانقدر ادبی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ آپ بھی تو انھیں کسی کو دینا چاہتے ہیں نہ تلف کرنا چاہتے ہیں۔

---

شیر محمد۔ باسنی ناگور۔ راجستھان

س۔ باپ کیا ہے؟

ج۔ جسے کالج میں پڑھنے کے بعد بیشتر بیٹے خبطی سمجھتے ہیں! — کبھی حضرت اکبر الہ آبادی نے فرمایا تھا ؎

ہم ایسی کُل کتب قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں

کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

س۔ خوبصورت عورت کیا ہے؟

ج۔ قدرت کا سب سے حسین شاہکار!

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ!

س۔ نیک بخت عورت کیا ہے؟

ج۔ بہت بڑی نعمت! بہت بڑی دولت!

---

سعیدہ بانو۔ راولپنڈی

س۔ بھائی جان! حضرت جگر مراد آبادی کا پورا نام کیا ہے؟

ج۔ علی سکندر نام ہے۔ جگر تخلص۔

---


اپ لی انکھیں راز سے آگاہ ہیں!
ہاں! آپکے چہرے کی دلکشی کے راز کو وہ بخوبی جانتی ہیں۔ وہ
ٹھنڈی افغان سنو سے پوری طرح مانوس ہیں — آپ کی
پسندیدہ بیوٹی ایڈ۔ آپ کی آنکھیں آپ کے صحیح انتخاب کی معترف ہیں۔
افغان سنو
آپکے چہرے میں خوشگوار تبدیلی لاتی ہے۔ ملاحت سے بھرپور
افغان سنو آپ کے چہرے کے داغوں کو صاف کرتی ہے۔ جھریوں اور
کیلوں کی اُلجھنیں ختم ہوجاتی ہیں۔ افغان سنو کا شکریہ — کہ اس کے
استعمال سے آپ کا چہرہ دن بھر تر و تازہ اور جاذب نظر رہتا ہے۔
افغان سنو آپ کی پسندیدہ بیوٹی ایڈ۔
ای۔ ایس۔ پاٹن والا — بمبئی۔ ۷۷

**شوکت علی خاں ۔ امرا پوری**

س۔ ادیب بننے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ کسی اچھے ادیب کا دامن پکڑ کر کامیابی کی منزل کی طرف بڑھنا چاہئے، کلاسیکی ہوتی ادبی تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

س۔ ایک ادیب کا نصب العین کیا ہونا چاہئے؟

ج۔ ملک اور معاشرے میں عزم و عمل کی روح بیدار کرنا۔

س۔ ایک اچھے افسانے کی آپ کے نزدیک کیا تعریف ہے؟

ج۔ اس میں وہ سب کچھ ہو جو ایک اچھے افسانے میں ہونا چاہئے۔ مثال کے لئے بیسویں صدی میں آنے والے افسانے ملاحظہ فرمائیں۔ سرگوشیاں میں تفصیل سے بتانا ممکن نہیں ہے۔

---

**سلمیٰ نگار تبسم ۔ اورنگ آباد ۔ گیا**

س۔ دنیا میں انسان کے آنے کا مقصد؟

ج۔ امن و انسانیت کے نام پر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانا!

س۔ دنیا میں سب سے بڑی خوشی؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دینا!

---

**سلمہ فردوس ۔ سرینگر ۔ کشمیر**

س۔ بھیا! دل کی جھوٹی تسلی کا نام خدا کیوں رکھ دیا گیا ہے؟

ج۔ بانو! یہ تو اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ اس عظیم سچائی کا جو نام چاہیں رکھ لیں۔ دل کی جھوٹی تسلی یا دل کا سچا سکون!

س۔ ایک ناکام زندگی خود کو کب تک فریب دے؟

ج۔ جب تک خود کو حقیقت کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنالے۔

---

**ملا بعد التسعید ۔ منڈلی ۔ بھٹکل**

س۔ میں جس چیز کے قریب جاتا ہوں، وہ چیز مجھے دیکھ کر دور بھاگتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ اس چیز کے لئے آپ کے دل میں سچی لگن نہ ہوگی۔

س۔ دل میں لگی ہوئی آگ کو کس طرح بجھاؤں؟

ج۔ آنکھوں کے پانی سے!

---

**ایس۔ ایم۔ رحمٰن الحق ۔ دہلی**

س۔ اگر کسی کو غصہ جلدی آئے تو؟

ج۔ غصہ کے بُرے نتائج پر ہر وقت نظر رکھے۔

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت وہ پھل ہے جسے جو کھائے وہ پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے؟

ج۔ ایسا سوچنا، ایسا کہنا بالکل جھوٹ ہے۔

---

**عبدالحمید خاں ۔ برہانپور**

س۔ خوشتر بھیا! آج کل لوک سبھا میں نیتا لوگ آپس میں غیر مہذب ہنگامے کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ تاکہ انھیں ووٹ دے کر لوک سبھا میں بھیجنے والے یہ نہ کہیں کہ وہاں جا کر یہ لوگ کچھ نہیں کرتے!

س۔ ساغر نظامی کا کوئی حسین شعر سنائیے۔

ج۔ سراب ہے کہ حجابِ دھند لکا اُفق کی لالی نظر کا دھوکا
نئے اندھیروں کا قافلہ ہے یہ کاروانِ سحر نہیں ہے

---

**اے۔ رشید ۔ بشری پور**

س۔ انسان کی زندگی کا سب سے خوبصورت پہلو؟

ج۔ نکوکاری و صداقت شعاری۔

س۔ سچائی کی کیا پہچان ہے؟

ج۔ سچائی کبھی باطل سے شکست نہیں کھاتی۔

س۔ زندگی کب بھلی معلوم ہوتی ہے؟

ج۔ جب زندگی کے دامن کو بُرائیوں کے داغ دھبوں سے دور رکھا جائے۔

---

**سیفی عباسی ۔ برہانپور**

س۔ جو انسان گھر والوں پر بوجھ اور ان کی پریشانیوں کا باعث ہو؟

ج۔ وہ اچھا انسان نہیں۔

س۔ جو انسان اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں عذاب بنالے؟

ج۔ وہ اپنا سب سے بڑا دشمن ہے!

---

**کرشن لال بھلّہ ۔ نئی دہلی**

س۔ بھیا! آج کل مہنگائی سے ہم عوام کو دن میں تارے نظر آ رہے ہیں۔ حالات کی کڑی دھوپ سے کیا وزیروں کے چہروں پر بھی پسینہ آ رہا ہے؟

ج۔ نہیں بھیا! وزیروں کی بات کیا پوچھتے ہو۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے ؎

وزیروں کی کیا بات یہ تو خزاں میں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں!

---

**زیب نسیم ۔ ملکاپور**

س۔ خوشتر بھیا! کیا آپ صرف غیر معمولی سوالات کے جواب دینا پسند کرتے ہیں؟

ج۔ ہم ہر طرح کے معقول سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ مثال کے لئے اپنے ہی سوالات کو دیکھئے۔

س۔ اپنی تعریف آپ ہی کرنے والے شخص کی تعریف؟

ج۔ ایسا شخص تعریف سے بلند ہوتا ہے!

[illegible]

سید ضیاء الرحمٰن۔ صادق پور، پٹنہ

س۔ علامہ اقبال اور اکبر الٰہ آبادی کے نصیحت آموز اشعار سنائیں۔

ج۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر سنئے ؎

چند غنچوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

علامہ اقبال کا ایک شعر سنئے ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

---

محمد نور الہدیٰ انور جکرو دھرلوپری۔ راور کیلا

س۔ زمانے کے لحاظ سے کس کا درجہ بلند ہے —— عزت، عظمت، محبت یا دولت؟

ج۔ آج کے زمانے میں دولت کا درجہ سب سے بلند ہے۔

س۔ انسان زندگی سے مایوس ہو جائے تو اُسے کس راستے کو اختیار کرنا چاہیے؟

ج۔ جس راستے میں مایوسی کی تاریکی نہ ہو، جس راستے میں اُمید کا اُجالا ہو۔

---

نیاز احمد قریشی۔ لاہور

س۔ آپ کی نظر میں سب سے اچھا مذہب کون سا ہے؟

ج۔ سارے مذاہب اچھے ہیں۔

---

واجدہ قریشی۔ مراد آباد

س۔ بھائی جان! دُنیا کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ ۱۹۷۰ میں تین ارب تیرہ کروڑ پچاس لاکھ تھی۔ چار سالوں میں اور اضافہ ہوا ہوگا۔

س۔ ساری دُنیا میں کتنے مسلمان ہیں؟

ج۔ [illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

---

واعظ یا سید ابو الہدیٰ [illegible]

س۔ انسان کا نفس انسان کو برائی کی طرف کیوں لے جاتا ہے؟

ج۔ بندہ نواز! آپ واعظ ہیں اور ہم سے پوچھتے ہیں، ہم تو واعظ ہیں نہ ملا!

س۔ ایک طالب علم کو افسانے یا ناول کا مطالعہ کرنا چاہیے یا نہیں؟

ج۔ کیوں نہیں مگر تعلیم میں رکاوٹ نہ بن سکے!

س۔ ہندوستان میں لوگوں کی اوسط عمر کیا ہے؟

ج۔ اس قیامت خیز گرانی کے دور میں یہ پوچھئے، لوگ کیسے زندہ ہیں؟

### غالب حسین اخلاقی۔ ساہی

س۔ سیاست داں کی زندگی؟

ج۔ شہرت سے پہلے پرزوال رنگ لاتی ہے۔

س۔ کیا اُردو ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے؟

ج۔ بھائی جان! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہندی کے حامی سُنیں گے تو آپ پر آوازے کسیں گے۔ دیوانہ ہے دیوانہ! دیوانے کو کیا کہیے! آپ پوچھتے ہیں کیا اُردو ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے؟ اور ہندی کے حامی سربراہ کہتے ہیں اُردو کوئی زبان ہی نہیں!

س۔ کیا یہ شعر غالب کا ہے؟

لیڈروں کی کمی نہیں غالب
ایک کیا بے شمار ملتے ہیں

ج۔ یہ شعر غالب کا ہے لیکن مرزا غالب کا نہیں۔ غالب حسین اخلاقی کا ہے۔

---

### اے۔ ایس ملک۔ راولپنڈی

س۔ کسی اچھے جریدے کا ایڈیٹر اگر اپنے کسی پروانے کے خطوں کا جواب نہ دے تو اُسے آپ کیا کہیں گے؟

ج۔ کسی اچھے جریدے کا معروف ایڈیٹر اگر اپنے کسی بیکار پروانے کے خطوط کا جواب نہ دے سکے تو اُسے آپ کیا کہیں گے؟ اس معروف اور مجبور ایڈیٹر سے گلہ کرنے والے کو آپ کیا کہیں گے؟

---

### ایم الیاس الساجدی۔ الہ آباد

س۔ کیا حُسن کا معیار حُسنِ نظر ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ وہ قیس ایک سے ایک حسین و [illegible]

---

### اک پرتوِ نقش بیقیاس کے اشارا
### خود حُسن حقیقت نہیں دھوکا ہے نظر کا

س۔ مقصدِ حیات؟

ج۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو وطن کی آن اور شان پر مرمٹنے کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتے ہیں! مبارک ہیں وہ فرزندانِ وطن جنھوں نے مادرِ وطن کی آن اور شان پر مرمٹنے کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا!!

---

### محمد اشفاق فاروقی۔ الہ آباد

س۔ بھائی جان! کیا دشمن دوبارہ سچا دوست بن سکتا ہے؟

ج۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

س۔ کتاب ___؟

ج۔ ملٹن نے کہا ہے ___ ایک اچھی کتاب سلیم الفطرت انسان کے لئے زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔ ایک دوسرے مفکر جارج ایلیٹ نے کہا ہے ___ دانشمندانہ طرز پر لکھی ہوئی کتاب مقبروں کے مانند واجب الاحترام ہے۔

---

### عطیہ صدیقی۔ علیگڑھ

س۔ میری سہیلی سعیدہ کہتی ہے، مولانا نیاز فتحپوری کا انتقال ہوگیا! کیا یہ منحوس خبر صحیح ہے؟

ج۔ جی ہاں ___ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

س۔ علامہ نیاز نقاد اور انشا پرداز ہی ہیں یا شاعر بھی ہیں؟

ج۔ علامہ شاعر بھی تھے۔

---

### مظاہر ہلدوی۔ سورجگرہا

س۔ ظلم و بربریت کو مٹانے کے لئے اسلحہ کیوں نہیں تیار کئے جاتے؟

ج۔ مدت ہوئی ظلم و بربریت کو مٹانے کے لئے اسلحہ ایجاد ہوئے ہیں۔ ظلم و بربریت کو ختم کرنے کے لئے عزم و حوصلہ، ظلم و بربریت کے خلاف جوش و ولولہ کبھی ختم نہ ہونے والے اسلحہ ہیں!

س۔ کیا "بیسویں صدی" ہر ماہ ہم لوگوں کو کسی نئے ادیب سے متعارف کراتا ہے؟

ج۔ "بیسویں صدی" آپ کے سامنے ہے۔

---

### رضیہ جمیل زیدی۔ علیگڑھ

س۔ اقبال کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ ہر فرد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

---

### محمد عمر پہلوان۔ عادل آباد۔ دکن

س۔ بلبل مذکر ہے یا مؤنث؟

ج۔ اہلِ دہلی کے نزدیک مذکر۔ اہلِ لکھنؤ کے نزدیک مؤنث۔

---

### سید محمد اختر جاہ۔ کلکتہ

س۔ فانی کا مشہور شعر ہے

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

خوشتر بھیا! کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ زندگی ایک معمہ اور دیوانے کا خواب ہے؟

ج۔ اپنا اپنا خیال ہے۔ ہم زندگی کو معمہ سمجھتے ہیں نہ دیوانے کا خواب ___ ہم زندگی کو ایک [illegible]

# پونٹ

# خرید

## رعایتی قیمت پر

رعایتی قیمت کا اعلان جولائی میں کیا جائے گا
اعلان کا انتظار کیجیے

یونٹوں کے فائدے: • اچھا منافع • محفوظ سرمایہ
• ٹیکس کی چھوٹ • بھنانے میں آسانی

یونٹ ہولڈر ۳۰ جون سے پہلے پہلے درخواستیں دے کر یونٹوں سے
ہونے والے منافع سے رعایتی قیمت پر اور یونٹ خرید سکتے ہیں

# یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا

۴۵، ویر نریمان روڈ، بمبئی ۱
۸، کونسل ہاؤس اسٹریٹ، کلکتہ ۱
ریزرو بینک بلڈنگ، مدراس ۱


اگست
DELHI
31(8)
Rs 1.25



تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں ——— غالب

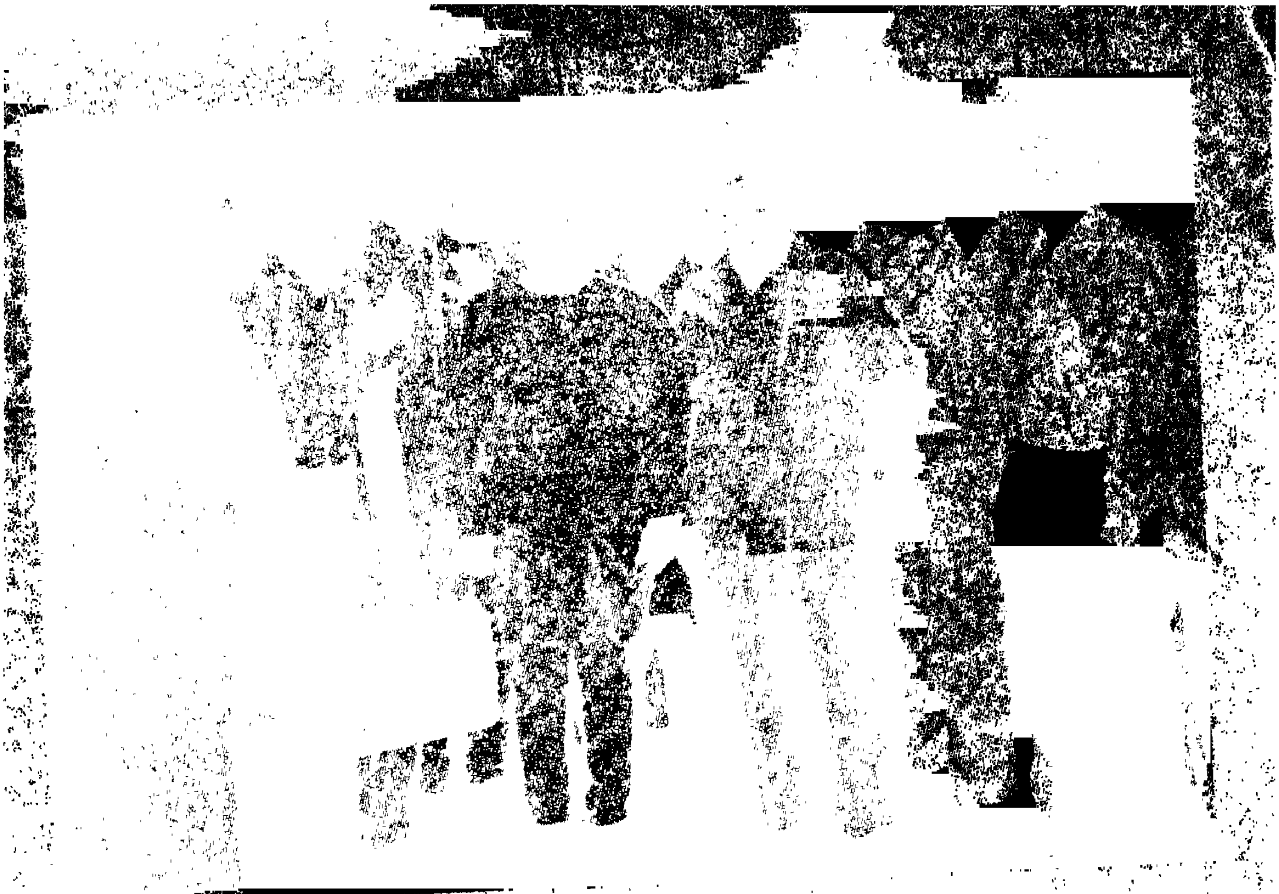
فوٹو: سورج۔ این شرما۔ جے پور



نادیدہ بہاروں کا نکھارا مکھڑا　　بیلے کی کلی، صبح کا تارا مکھڑا
جنت کے وجود پر ہے مہرِ تصدیق　　حوروں کا ثبوت ہے تمہارا مکھڑا

جوشؔ ملیح آبادی

فوٹو:۔ کے۔ وارثی۔ بمبئی

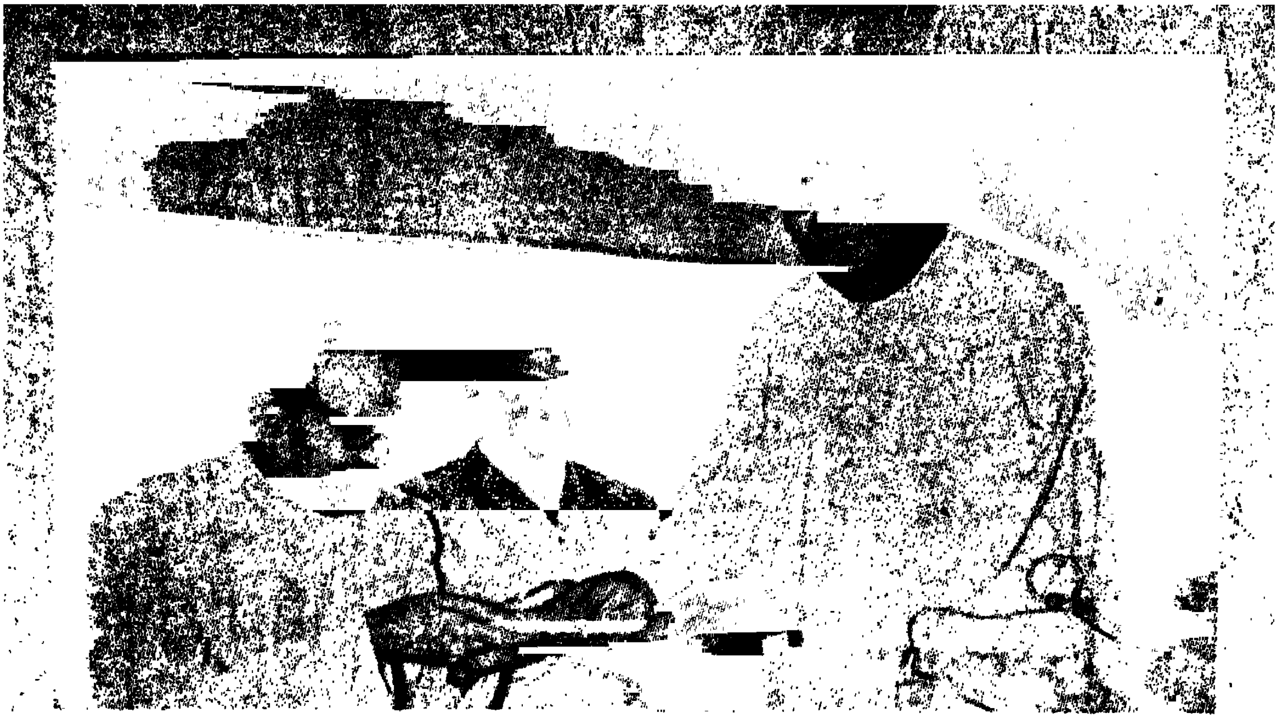


اُردو کے اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعر پورن کمار ہوشؔ کی اوّلیں شعری تصنیف "آغازِ" کی اشاعت پر دہلی کے مُقتدر ادیبوں اور صحافیوں کی طرف سے ایک پرتکلف عصرانہ دیا گیا ـــــ تصویر میں سیاہ چشمہ پہنے شہریار پرواز، بہارؔ برنی ، خوشترؔ گرامی ، نریش کمار شادؔ ، بسمل سعیدی ٹونکی ، رنبیر جی ، ساغرؔ نظامی ، پورن کمار ہوشؔ ، فکرؔ تونسوی ، ہربنس ساہنی اور مودود صدیقی فرحاں و شاداں کھڑے ہیں اور پیش پیش ہیں۔ خوشترؔ گرامی جنھوں نے اس تقریب کی رسم افتتاح ادا کی اور رنبیر جی نے صدارت فرمائی ؏

ـــــ ۔۔۔۔۔۔۔



پرتکلف دعوت کے اختتام پر خوشتر گرامی نے پورن کمار ہوش کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ "نئے اور ہونہار ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنا میرا مسلک رہا ہے۔ اس طرح نہ صرف میں اپنا ادبی اور اخلاقی فرض ہی ادا کرتا ہوں بلکہ اپنی جذباتی اور رُوحانی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہوں - مجھے خوشی ہے کہ ہوش صاحب کی شاعری رُو بہ ارتقا ہے اور میری انقلاب پسند فطرت کے عین مطابق ، ان کا اندازِ نگارش اور اندازِ بیان بھی انقلابی اور مجاہدانہ ہے - اِن کے کلام کی گہرائی اور گیرائی بھی اِن کے درخشاں مستقبل کا پیش خیمہ ہے"۔



ہندوستان کے نامور صحافی اور روزنامہ "ملاپ" دہلی کے مدیرِاعلیٰ رنبیر جی پریذیڈنٹ آل انڈیا نیوزپیپرز اڈیٹرز کانفرنس نے اپنی صدارتی تقریر میں مصنّف کو خراجِ تحسین ادا کرنے کے بعد اُن کی تصنیف کی ایک جلد اُردو کے بلند مرتبت شاعر جناب ساغر نظامی کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "ساغر صاحب! بلاشُبہ آپ کی شاعری نے اپنے وقت میں اُردو کی ایک نسل کو متاثر کیا ہے لیکن آج میں تازہ ترین نسل کی شاعری کا ایک ایسا تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جسے رات کو ایک بار شروع کرنے کے بعد میں اِسے آخر تک پڑھے بغیر سو نہیں سکا اور کم از کم آپ کی ایک رات کی نیند بھی حرام کرنے کا آرزومند ہوں۔" ساغر صاحب نے خندہ پیشانی سے کتاب لیتے ہوئے کہا

"شکریہ، جناب خوشتر گرامی یہ ارمغان مجھے دے چکے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ پورن کمار ہوش ایک نیا وجود، نئی آواز اور ایک نیا ہوش رُبا نغمہ ہے جس کی فکر و احساس اِک نئی گیرائی، تازگی اور توانائی کی حامل ہے۔"

۱۔ [illegible]
۲۔ [illegible] — [illegible]
۳۔ [illegible] — افسانہ — [illegible] ایم۔ اے
۴۔ غزل — [illegible]
۵۔ غزل — [illegible]
۶۔ غزل — [illegible] ایم۔ اے
۷۔ [illegible] — افسانہ — [illegible]
۸۔ غزل — [illegible]
۹۔ [illegible] — افسانہ — [illegible] ایم۔ اے
۱۰۔ غزل — [illegible] ایم۔ اے
۱۱۔ غزل — [illegible]
۱۲۔ غزل — [illegible] ایم۔ اے
۱۳۔ [illegible] — افسانہ — [illegible]
۱۴۔ غزل — [illegible]
۱۵۔ [illegible] — [illegible]
۱۶۔ [illegible] — افسانہ — [illegible]
۱۷۔ [illegible] — [illegible]
۱۸۔ [illegible] — افسانہ — [illegible]
۱۹۔ [illegible] — [illegible] ایم۔ اے
۲۰۔ [illegible] — افسانہ — [illegible]
۲۱۔ [illegible] — [illegible]

۲۴۔ غزل — ذکی سلطانپوری

۲۵۔ غزل — چندر پرکاش جوہر بجنوری

۲۶۔ ہنستی — افسانہ — حسن اجمل مکرت۔ ایم۔ اے

۲۷۔ غزل — نفیس سندیلوی

۲۸۔ غزل — رئیس رامپوری

۲۹۔ غزل — بسمل کپورتھلوی

۳۰۔ راکھ کے ڈھیر میں — افسانہ — رفیعہ شبنم منچری۔ بی۔ اے (آنرز)

۳۱۔ غزل — ضیا فتح آبادی۔ ایم۔ اے — ۷۵

۳۲۔ غزل — تمکین سرمست — ۷۵

۳۳۔ کلائمکس — افسانہ — عبدالقیوم خاں نذر ہوشیاری — ۷۷

۳۴۔ غزل — مظہر کامل — ۸۱

۳۵۔ غزل — راشدہ فضلی — ۸۱

۳۶۔ غزل — اودے سنگھ مخمور — ۸۲

۳۷۔ خط لکھیں گے — طنزیہ — فکر تونسوی — ۸۳

۳۹۔ غزل — م۔ ع۔ س خمار بنگلوری — ۸۵

۳۹۔ غزل — ناز قادری۔ بی۔ اے (آنرز) — ۸۷

۴۰۔ غزل — رضی الدین احمد یاد بچھرایونی — ۸۷

۴۱۔ غزل — نیلوفر ناہید (علیگ) — ۸۷

۴۲۔ خوشبو گلاب کی سی — افسانہ — ظہیر گیلانی — ۸۹

۴۳۔ صحت و زندگی — آم تن دوائی اور غذائی اہمیت — کیا آپ پریشان رہتے ہیں؟

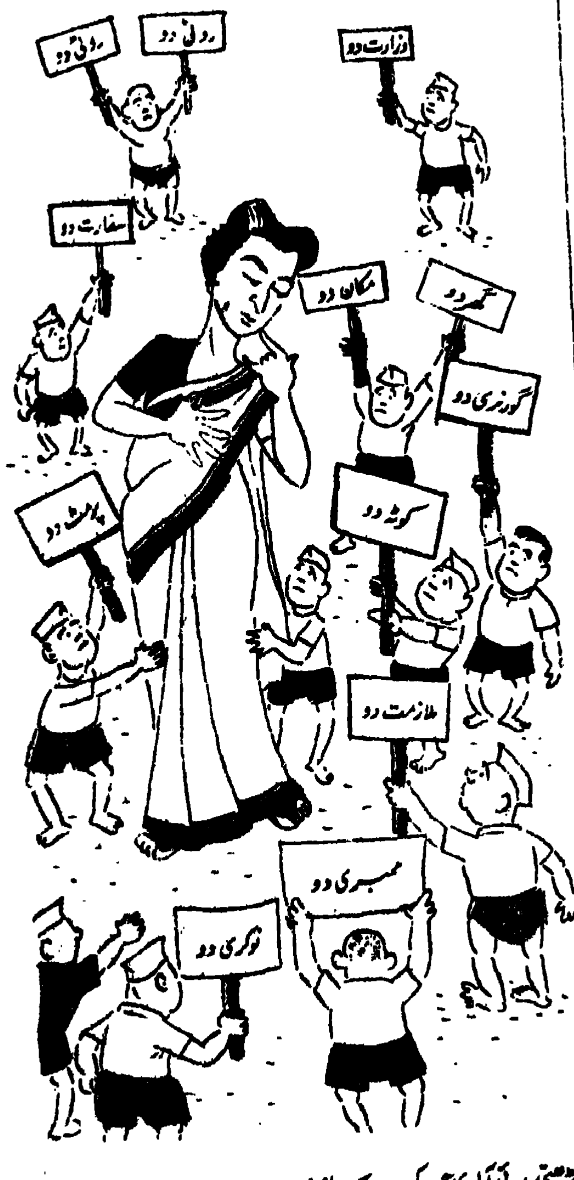
اپنی غذا کی طرف توجہ کیجئے — مایوسی صحت کی دشمن ہے — ناشپاتی، ایک طاقت بخش پھل

کسی پر نکتہ چینی نہ کیجئے — ایک نادر مشورہ

۴۴۔ سرگوشیاں — سوال و جواب — ۹۵

# تیر و نشتر

خوشتر گرامی




"بڑھتی ہوئی آبادی حکومت کے لئے زبردست دردِ سر ہے" ایک عنوان

"ہریانہ اور پنجاب کے الگ الگ گورنر ہوں گے" ایک خبر ——— ایک گورنر کی اور جگہ نکلی۔ ہائے ہوتے کانگریسی درخواستیں بھیجیں۔

"ڈیفنس خرچ میں کمی" ایک عنوان ——— وزیروں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے۔

"دِلّی میں تعلیم پر کنٹرول کی اسکیم" ایک عنوان ——— خالی کنٹرول سے کام نہ چلے گا۔ راشننگ بھی کیجئے۔

"چین بھارت کے ساتھ جنگ کے لئے پھر تیار" ایک خبر ——— اُسے اتنا ضرور بتادو کہ اب وزیرِ دفاع کرشنا مینن نہیں۔

"چین سے تعلقات توڑ لئے جائیں" راجہ جی کا مطالبہ ——— معقول ہے۔ بشرطیکہ سوتنتر پارٹی امریکہ اور اسرائیل سے تعلقات توڑ لے۔

"کانگریس کے اعلیٰ لیڈروں میں ارادے کی مضبوطی بہت کم ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے" ایک تقریر ——— عمل کرنا اور ارادے کی مضبوطی دکھانا جنتا کا کام ہے۔ لیڈروں کا کام دعوے کرنا اور بھول جانا ہوتا ہے۔

"پیکنگ میں چینیوں کی غنڈہ گردی" ایک خبر ——— وہ اُن کا گھر ہے۔ وہاں تو جو بھی کریں کم ہے۔ وہ تو نئی دِلّی میں غنڈہ گردی کر گئے جہاں مہمان تھے۔

"اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کا ارادہ نہیں" وزیرِ خارجہ مسٹر چھاگلہ کا بیان ——— اسرائیل کا کام اس کے بغیر بہت اچھا چل رہا ہے۔ اُس کا روپیہ سلامت چاہئے۔ اُسے ایجنٹ بہت مل جائیں گے۔ آپ کے تسلیم نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔



• الیکشن میں کانگریس کی شکست کے ذمّے دار لیڈر ہیں ؛ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں تقریریں۔

---

• روس میں تشخیص امراض کی کامیاب مشین ایجاد ہوگئی ؛ ایک خبر ——— کیا وہ سیاسی امراض کی بھی تشخیص کرتی ہے۔

• ہریانہ سرکار جائدادوں کے انتقال پر اسٹامپ فیس بڑھانے لگی ؛ ایک خبر ——— ایسی بھی کیا سنگدلی۔ کم از کم انتقال پر تو فیس نہ بڑھاؤ۔

• پنجاب کا محکمہ انکم ٹیکس امریکہ کے نقشِ قدم پر ؛ ایک عنوان ——— گورنام سنگھ وزارت کو مبارکباد۔ امریکہ کے نظارے نظر آنے لگے۔

• چودھری چینی ہسپتال سے ڈسچارج ؛ ایک خبر ——— ہسپتال نے کیا انھیں تو ہندوستان سے ڈسچارج کرنے کی ضرورت ہے۔

• راجستھان اسمبلی میں چیلنج بازی ؛ ایک خبر ——— باکسنگ کے لئے یا کبڈی کے لئے۔

• ہانگ کانگ پر چین کی نگاہیں ؛ ایک خبر ——— اللہ کرے اس کے دیدے پھوٹ جائیں۔ کم بخت سب کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھتا ہے۔

• ہنومان گڑھ میں نرمی اور گرانی کا زور ؛ ایک خبر ——— [illegible] انتظار کیجئے ارزانی شروع ہوجائے گی۔

• گاندھی نگر میں غنڈہ گردی ؛ ایک [illegible] کے نام پر۔

• راجستھان اسمبلی میں گرما گرمی ؛ ایک [illegible] کے اثرات ہیں۔

• وزیر محنت کا بیان ؛ ایک عنوان ——— محنت نہیں کرنی پڑتی۔ کھڑے ہوئے [illegible]



"ہندوستانی کہتے ہیں" ـــ ہندوستان سے نکالا جانے والا چینی جاسوس چن لوچن ہوائی اڈے پر پہونچا۔

• "ہندوستان سے خوش نہیں" ایک خبر ـــــ بے خبر ہوں ہمارے دشمن۔
...ں تو خبریں ہی خبریں ہیں ـــ بلکہ اخبار ہیں۔

• "پیداوار کی صلاحیت میں اضافہ" ایک عنوان ـــــ پہلے تو لوٹ کا
سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب ساتھ کا کام شروع کر دیا ہے۔

• "انتخابات میں غیر ملکی سرمایہ کا استعمال" ایک عنوان ـــــ کیا
...سکتے ہے۔ اپنے دیش کی سمپتی محفوظ رہی۔

• "ملاوٹ کرنا چھوڑ دو۔ ورنہ . ." ایک عنوان ـــــ ورنہ پھر
ملاوٹ جاری ہے۔ اسے قانوناً جائز قرار دے دیا جائے گا۔

• "یہ یو۔ پی ہے" ایک عنوان ـــــ جہاں چرن سنگھ کو شری
سی۔ بی گپتا نے معمولی وزارت نہیں دی تھی اور اب وہ وزیر اعلیٰ بنے
بیٹھے ہیں۔

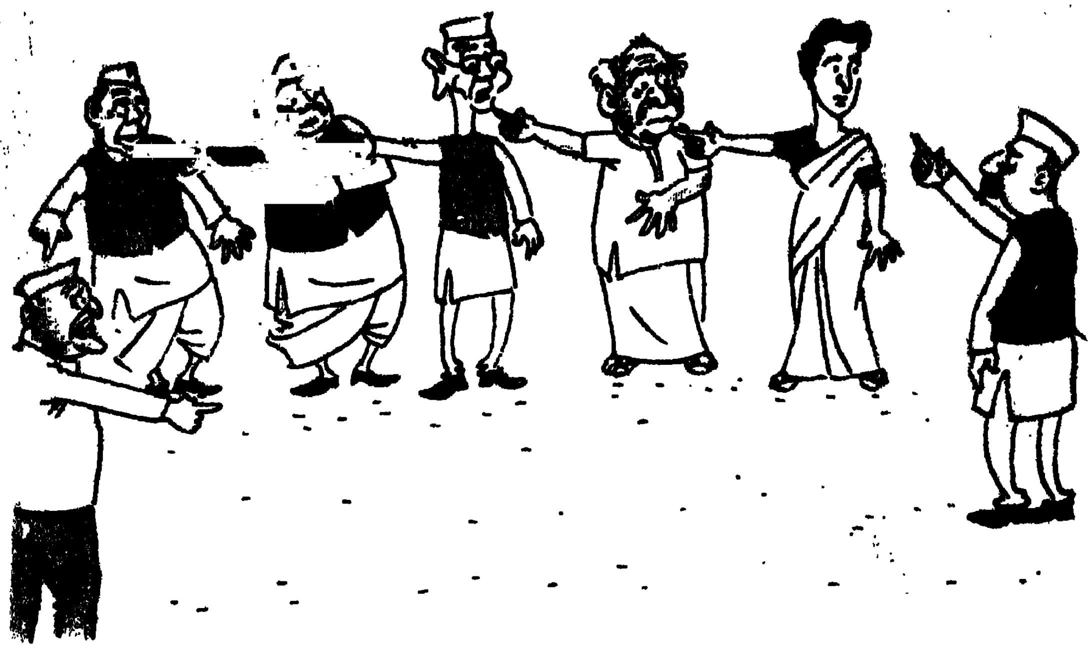
• "برطانیہ کی بد دیانتی اور امریکہ کی پشت پناہی سے غاصبوں کی ایک
...م وجود میں آئی" ایک عنوان ـــــ اور اس کا نام اسرائیل رکھا گیا جو اب
...یا بھر کو آنکھیں دکھا رہی ہے۔

• "زمین کی قیمت گر رہی ہے" ایک خبر ـــــ اس پر مکان بنائیے۔
...ایہ کے علاوہ پگڑی بھی ملے گی۔

• "کوئلے کے گودام میں بم" ایک خبر ـــــ آگ سلگانے کا آسان طریقہ۔

• "گھیراؤ کی شدید مذمت" ایک عنوان ـــــ یوں کہیے گھیراؤ کی
...ں کی انتہائی گہرائی سے مذمت۔

• "اسرائیل ایٹم بم بنائے گا" ایک خبر ـــــ اس زحمت کی کیا ضرورت
...ہے۔ چچا سام بنا بنایا جو سپلائی کر دیں گے۔



• الیکشن میں کانگرس کی شکست کے ذمّے دار لیڈر ہیں " آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں تقریریں۔

---

• "روس میں تشخیص امراض کی کامیاب مشین ایجاد ہوگئی" ایک خبر ــــــ کیا وہ سیاسی امراض کی بھی تشخیص کرتی ہے۔

• "ہریانہ سرکار جائدادوں کے انتقال پر اسٹامپ فیس بڑھانے لگی" ایک خبر ــــــ ایسی بھی کیا سنگدلی۔ کم از کم انتقال پر تو فیس نہ بڑھاؤ۔

• "پنجاب کا محکمہ انکم ٹیکس امریکہ کے نقشِ قدم پر" ایک عنوان ــــــ گورنام سنگھ وزارت کو مبارکباد۔ امریکہ کے نظارے نظر آنے لگے۔

• "چھ زخمی ہسپتال سے ڈسچارج" ایک خبر ــــــ ہسپتال سے کیا انھیں تو ہندوستان سے ڈسچارج کرنے کی ضرورت ہے۔

• "راجستھان اسمبلی میں چیلنج بازی" ایک خبر ــــــ باکسنگ کے لئے یا کبڈی کے لئے۔

• "ہانگ کانگ پر چین کی نگاہیں" ایک خبر ــــــ اللہ کرے اس کے دیدے پھوٹ جائیں۔ کم بخت سب کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔

• "ہنومان گڑھ میں گرمی اور گرانی کا زور" ایک خبر ــــــ سردی کا انتظار کیجئے ارزانی شروع ہوجائے گی۔

• "گاندھی نگر میں غنڈہ گردی" ایک خبر ــــــ گاندھی جی کے نام پر۔

• "راجستھان اسمبلی میں گرماگرمی" ایک خبر ــــــ موسم کے اثرات ہیں۔

• "وزیرِ محنت کا بیان" ایک عنوان ــــــ جس کے دینے میں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ کھڑے ہوئے اور دے ڈالا۔

• ہندوستان بے خبر نہیں " ایک خبر ـــــ بے خبر ہوں ہمارے دشمن۔
یہاں تو خبریں ہی خبریں ہیں ـــ بلکہ اخبار ہیں۔

---

• پیداواری صلاحیت میں ساجھا " ایک عنوان ـــــ پہلے تو لوٹ کا
سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب ساجھے کا کام شروع کر دیا ہے۔

---

• انتخابات میں غیر ملکی سرمایے کا استعمال " ایک عنوان ـــــ کیا
مضائقہ ہے۔ اپنے دیش کی سمپتی محفوظ رہی۔

---

• ملاوٹ کرنا چھوڑ دو۔ ورنہ . . " ایک عنوان ـــــ ورنہ پھر
ملاوٹ جاری رہے۔ اِسے قانوناً جائز قرار دے دیا جائے گا۔

---

• "یہ یو پی ہے " ایک عنوان ـــــ جہاں چرن سنگھ کو شری
سی۔ بی گپتا نے معمولی وزارت نہیں دی تھی اور اب وہ وزیرِ اعلیٰ بنے
بیٹھے ہیں۔

---

• برطانیہ کی بد دیانتی اور امریکہ کی پُشت پناہی سے غاصبوں کی ایک
قوم وجود میں آئی " ایک عنوان ـــــ اور اُس کا نام اسرائیل رکھا گیا جو اب
دُنیا بھر کو آنکھیں دکھا رہی ہے۔

---

• "زمین کی قیمت گر رہی ہے " ایک خبر ـــــ اُس پر مکان بنائیے۔
کرایہ کے علاوہ پگڑی بھی ملے گی۔

---

• "کوئلے کے گودام میں بم " ایک خبر ـــــ آگ سُلگانے کا آسان طریقہ۔

---

• "گھیراؤ کی شدید مذمت " ایک عنوان ـــــ یوں کہیے گھیراؤ کی
دل کی انتہائی گہرائی سے مذمت۔

---

• اسرائیل ایٹم بم بنائے گا " ایک خبر ـــــ اِس زحمت کی کیا ضرورت
ہے۔ چچا سام بنا بنایا جو سپلائی کر دیں گے۔

---



"ہندوستانی کُتے ہیں" ـــــ ہندوستان سے نکالا جانے والا چینی جاسوس چن لو چن ہوائی اڈے پر بھونکا۔




"چین کے ہائیڈروجن بم کا تجربہ کامیاب" ایک خبر

---

"وزارت توڑنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوگی" راؤ بیریندر سنگھ کا اعلان۔ ــــ اِس لئے کہ آپ کو وزارت میں توسیع کرنی آتی ہے۔

"جھگی جھونپڑی ہٹانے کی اسکیم" ایک عنوان ــــ وزارتِ بحالیات کا نیا مشغلہ۔

"بھوکے اور بے روزگار عوام کی طرف سے احتجاج" ایک خبر ــــ اِس کے بعد تو پیٹ بھر گیا ہوگا۔

"محکمۂ فوڈ کے کرمچاریوں کی بھوک ہڑتال" ایک خبر ــــ کیا انھیں بھی خوراک نہیں ملتی کہ ہڑتال کی نوبت آگئی۔

"کانگریس کی شکستوں کے لئے لیڈر ذمّے دار ہیں" ایک عنوان ــــ

وہ جنتا کو الزام دیتے تھے۔ قصور اپنا نکل آیا۔

"علیحدہ فوڈ زون ختم کئے جائیں" پنجاب کے لینڈ لارڈوں کا مطالبہ ــــ اور اگر پنجاب کا علیحدہ صوبہ بھی ختم کر دیا جائے تو کیسا رہے گا۔

"یو۔پی میں انگریزی میں فیل ہونے والوں کو پاس کرنے کا مطالبہ" ایک خبر ــــ یہی لیل و نہار رہے تو اگلے برس تمام مضمونوں میں فیل ہونے پر بھی پاس کرنے کا مطالبہ ہوگا۔

"جگراؤں میں ۱۱ دہشناک بس حادثہ" ایک خبر ــــ نہیں صاحب جگر خراش حادثہ۔

پریت نگر میں آتشِ عشق" ایک عنوان ــــ

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

"برلا کے تنخواہ دار" ایک عنوان ——— آپ کو حسد کیوں ہے۔ آپ کو بل جائے تو آپ بھی لے لیں۔

"بیشی امداد لینے والوں کو ننگا کرنے پر زور" ایک عنوان ——— اس لئے آئندہ امداد لینے والے خود ہی کپڑے پہن کر نہ جائیں۔

"ماہانہ ادبی نشست کا فیصلہ" ایک عنوان ——— پھر بھی لوگوں نے ادب نہ سیکھا تو کیا ہوگا۔

"اسرائیل یروشلم کو بین الاقوامی کنٹرول میں دینے پر آمادہ" ایک خبر ——— اس لئے کہ اس کے اپنے گھر سے کچھ نہیں جاتا۔

"اردو کے لئے جدوجہد کی ضرورت" ایک خبر ——— مشاعرے کیجئے، قوالیاں گائیے اور قراردادیں منظور کیجئے۔

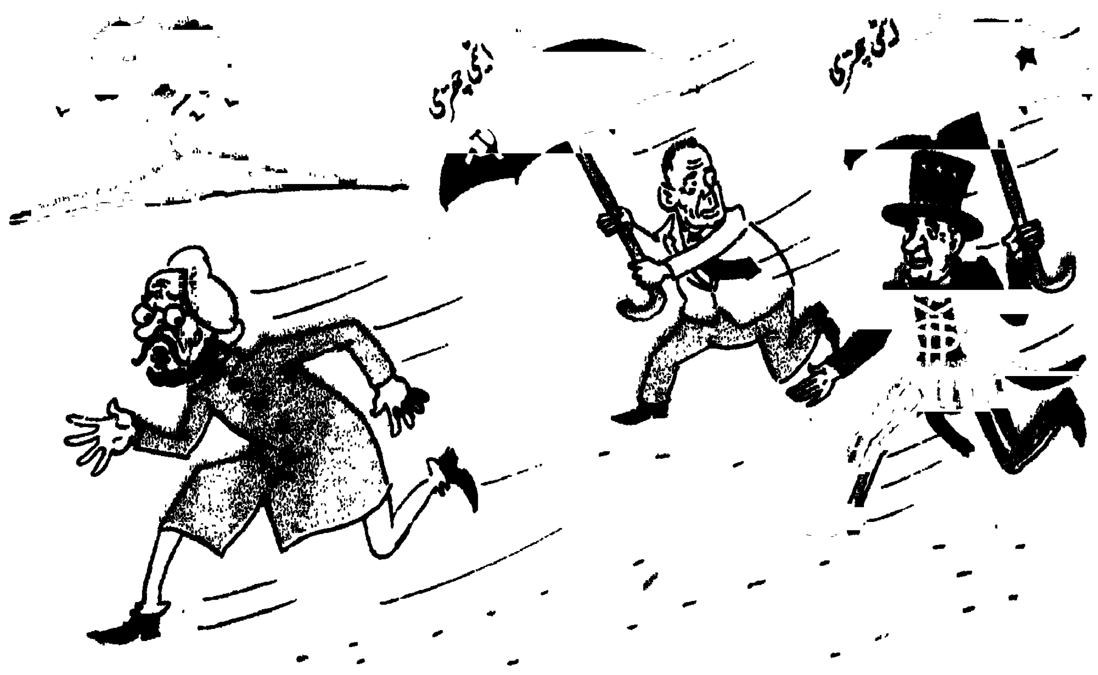
"مغربی بنگال میں انتشار کا سبب غذا کی قلت ہے" ایک خبر ——— کبھی آپ اسے حکومت کی نااہلی سے تعبیر کریں۔

"پانچ سال کے اندر ہندی ایڈمنسٹریشن کی زبان بن جائے گی" ایک مقالہ ——— قانون کا ڈنڈا سلامت رہے۔ یقیناً بن جائے گی۔

"گورکھپور میں ہیجڑے کا قتل" ایک خبر ——— بڑی نامردی کا کام ہے۔

"بازارِ حسن پر پولیس کا چھاپہ۔ آٹھ نابالغ لڑکیاں برآمد" ایک خبر ——— اور بالغ لڑکیوں کو چھوٹ ہے۔ وہ بازارِ حسن میں درآمد کی جاسکتی ہیں۔

"خودکشی کا ملزم گرفتار" ایک خبر ——— اور خودکشی کرنے کے بعد۔ کمال ہے پولیس کا۔




"ایٹمی چھتری کی تجویز ناقابلِ قبول" سردار سورن سنگھ کا اعلان

# جمال عبدالناصر

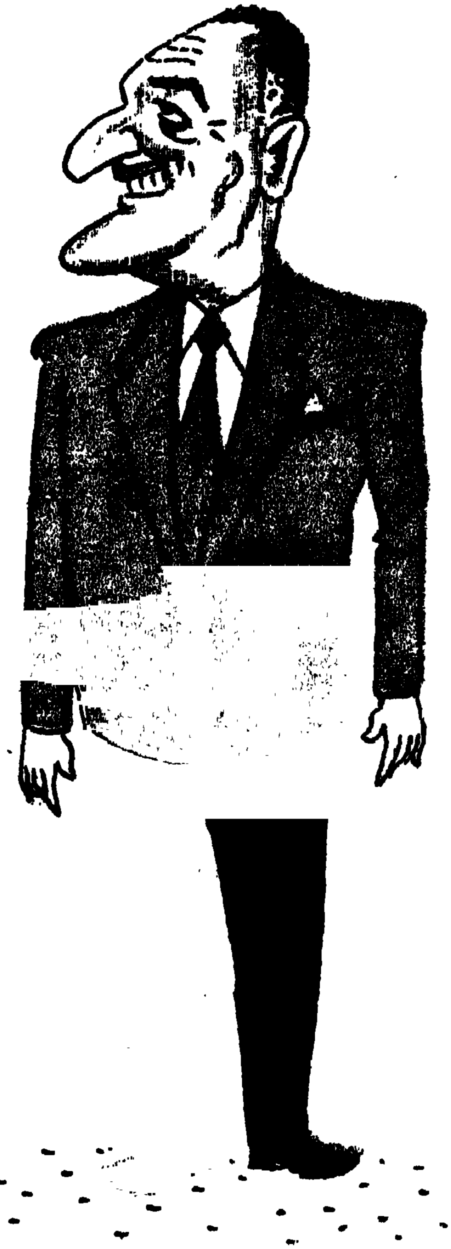
## خوشترگرامی

سروقد، کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، لمبی اونچی ناک۔ جواب تمام دُنیائے عرب کی ناموس ہے۔ لبوں پر ہر وقت مُسکراہٹ جس میں سامراجیوں کے لئے ہر وقت زہر گُھلتا رہتا ہے۔ یہ ہیں متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر ——

جمال عبدالناصر

ایک معمولی اُستاد کے بیٹے ہیں۔ اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ آج قاہرہ پر حکومت کر رہے ہیں مگر تمام دُنیا کی توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ غلام قوموں کی آزادی، خود مختاری اور اتحاد و یکجہتی کے علمبردار ہیں۔ ہندوستان کے مخلص دوست ہیں۔ گوا کو آزاد کرانے کے وقت پرتگال کا جہاز روک کر ہماری عملی مدد کی تھی —— دُنیائے عرب میں اینگلو امریکی سامراجیوں کے حلقہ میں اِن کے عزم و عمل سے تو شگاف پڑگیا تھا مگر اب وہ خود اُن کی سازشوں کی آماجگاہ بن گئے۔ نہر سویز کو سامراجیوں کے چنگل سے آزاد کرایا تو وہ غضب ناک ہوکر مصر پر ٹوٹ پڑے مگر ناصر کا استقلال و استقامت اِنھیں بچا لے گیا۔ لیکن اِس دفعہ فی الحال علاقے کے اعتبار سے سامراجیوں کی سازش کامیاب ہوگئی۔ مگر ناصر بدستور ایک چٹان کی طرح موجود اور علامہ اقبال کے اِس شعر کی تفسیر بنے ہوئے ہیں ؎

[illegible] کی عظمت سے [illegible] ہیں افلاک
[illegible] ہاتھ سے [illegible] کی تصویر



افسانہ

# وائٹ کالر

م۔ک۔ مہتاب۔ ایم۔ اے

ای۔ جی۔ ۴۹۸۴، پریم نگر۔ جالندھر

۱۷ مئی ۶۷ء مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

. . . ایک کہانی "وائٹ کالر" سفید پوش طبقے سے متعلق بھیج رہا ہوں جو اس طبقے کی حقیقت حال کا اشاریہ ہو سکتی ہے۔ اُمید ہے قارئین پسند کریں گے۔ گزشتہ چند ماہ سے حالات کچھ عجیب ہیں۔ کریم کافی "اور آخری بس" کے بارے میں بہت سے پرستاران "بیسویں صدی" کے خطوط کا جواب بھی نہ دے سکا ـــــ اِدھر میدانوں میں تو سورج آگ برسا رہا ہے۔ آپ پہاڑ کب تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب کے مجھے بھی ساتھ لے چلئے۔ آپ سے جی بھر کر باتیں کروں گا۔ لیکن چھوڑئیے کیا جاتا ہے۔ جو لطف گرمی میں ہے وہ سردی میں کہاں۔ حرارت ہی تو حقیقی زندگی ہے!

آپ کا عزیز ـــــ م۔ک۔ مہتاب

"اس سرکار کا کیا دماغ چل گیا ہے۔ سات سات منزلہ عمارتیں کھڑی کر دی ہیں۔ یہ نہیں سوچا کہ یہاں بجلی بھی فیل ہو سکتی ہے اور لفٹ بھی خراب ہو سکتی ہے اور جو عمدہ خوراک ملتی ہے اُسے کھا کر یہ سات منزلیں طے کرتے کرتے آدمی کی حرکت قلب بھی بند ہو سکتی ہے" ہرہنس نے ہاتھ میں پڑے رسائل ہرنام کی میز پر رکھ دئے اور نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ہرنام نے پسینے میں شرابور ہرہنس کی طرف دیکھا۔ اُس کی اُنگلیاں ٹائپ رائٹر کی تختی حروف پر ہی رُک گئیں۔ حسب عادت اُس کی آنکھوں اور مونچھوں کے زیر سایہ ہونٹوں کے کناروں پر مُسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ وہ اُٹھا اور ہرہنس کو سینے سے بھینچتے ہوئے بولا۔

"کچھ آدمی پیدا ہی شکایت کے لئے ہوتے ہیں۔ ماں باپ سے شکوہ بھائی بہن کی شکایت، محبوب سے گلہ، اگر اور کچھ نہ ہو تو حالات کا شکوہ۔ پھر بھی شکایت کے لئے کوئی موضوع نہ ملے تو غریب حکومت تو موجود ہے اُسی کی شکایت سہی۔ بندۂ خدا اپنی قسمت کی شکایت کیوں نہیں کرتے۔ جب تم نیچے تھے تو بتی بند تھی لفٹ کام نہیں کر رہی تھی۔ اب تم اوپر آئے ہو تو بتی آگئی ہے" ہرنام نے ریک پر رکھے ہوئے ڈی لکس پنکھے کا بٹن دبا دیا اور ہوا کی زوردار لہریں ہرہنس کے چہرے پر بالوں سے کھیلنے لگیں۔

"روز تمہارے اس بھون کے قریب سے گزر جاتا ہوں۔ زمین سے آسمان پر کون ملنے کے لئے آئے!"

"پھر بھی تم بچپن کی دوستی کا دم بھرتے ہو" ہرنام نے مُسکرا کر کہا۔

"تم تو خوب جانتے ہو یہ دِلّی ہے۔ یہاں کی دوستی یہی ہے کہ تم سال میں دوست کو کتنی بار یاد کرتے ہو یا سرکاری فون سے اُسے کتنی بار فون کرتے ہو" ہرہنس نے پنکھے کی رفتار کم کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پورے نو ماہ بعد ملے ہو اور پھر کہتے ہو میں دلّی ہی میں رہتا ہوں۔ چلو اوپر کافی ہاؤس میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ہرہنس کو خیال آیا کہ وہ جس غرض کے لئے ہرنام کے پاس آیا ہے وہ راستے ہی میں کہہ دے لیکن اُسے یہ سوچ کر ہمت نہ ہوئی کہ وہ شخص جو اُس سے اتنے خلوص اور گرمجوشی کا اظہار کر رہا ہے کہیں ایکدم سردی نہ ہو جائے۔ کیونکہ اُدھار محبت کی قینچی ہے۔

بیرے نے دو گلاس ٹھنڈا پانی میز پر لگا دیا۔ ہرنام اپنا گلاس ہرہنس کے گلاس سے ٹکراتے ہوئے بولا۔

"دوست مجھے تم سے مل کر ناقابلِ بیان خوشی ہو رہی ہے! بولو اِس خوشی میں کیا کھاؤ گے۔ آملیٹ، فِش، مٹن سینڈوچ، مٹن کٹلس بہت جلدی بولو میرے صاحب کو ہر پندرہ منٹ بعد گھنٹی دبانے کا شوق ہے۔"

ہربنس جواب دینے کی بجائے ہنسنے لگا۔

"بھئی ہنسنے سے تو بھوک اور زیادہ لگتی ہے جلدی بولو تکلف برطرف!"

"جو تمہاری مرضی" ہربنس نے سوچوں کے سمندر سے سر اُبھار کر کہا۔

"اگر میری ہی مرضی ہے تو ایک ایک آملیٹ اور ایک ایک پلیٹ مٹن کٹلس لاؤ"

بیرے کو آرڈر دے کر وہ دونوں پھر باتوں میں اُلجھ گئے۔ ہربنس سوچ رہا تھا کہ وہ ہرنام سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ اُس کے پاس اِس خاطر مدارات کے لئے نہیں آیا۔ وہ تو کچھ روپے اُدھار مانگنے آیا ہے اُسے بچی کا داخلہ بھجوانا ہے۔ اگر فیس جمع نہ ہوئی تو وہ امتحان نہ دے سکے گی۔ اگر امتحان نہ دیا تو تعلیم بند ہو جائے گی پھر آشا اُس کے لئے آشا نہیں نراشا بن جائے گی۔ لیکن اُس کی زبان نہیں کھل رہی تھی۔ ہرنام اُس سے کتنے پیار اور تپاک کا اظہار کر رہا ہے۔ ایسے میں وہ رونی صورت بنا کر کیا کہے کہ اُسے کچھ روپے اُدھار دو۔

"یار بہت دن بعد ملے ہو۔ اپنے رومانس کی بات سُناؤ" ہرنام نے پلیٹوں میں چھُری کانٹے درست کرتے ہوئے کہا "وہ وجے لکشمی تمہارے چکر میں آگئی ہو۔ یار لڑکی واقعی لاجواب ہے۔ کچھ دن ہوئے اُسے میں نے تمہارے صاحب کے ساتھ پارک ریستوراں میں کولڈ کافی پیتے دیکھا تھا۔ سچ کہتا ہوں اُس کے جسم سے روشنی کی شعاعیں چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ ہنستی تھی تو ہال میں بتیوں کی روشنی مدھم پڑ جاتی تھی۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ تم نے بھی کس شاخِ گل پر ہاتھ رکھا ہے۔ لیکن اِس خیال سے طبیعت بدمزہ بھی ہو جاتی تھی کہ دوسرے لوگ بھی اِسی شاخ پر ہاتھ رکھے ہوتے ہیں۔ تمہارا صاحب وجے کو تمہارے ہی لئے کیوں نہیں چھوڑ سکتا۔ اُسے تو دہلی کی نفیس سے نفیس لڑکیاں دل بہلانے کے لئے مل سکتی ہیں۔ اُس روز تمہاری وجے نے ناک میں لونگ پہن رکھی تھی جو کسی کسی وقت خوب چمکتی تھی اور میں چھُری کانٹا پلیٹ میں رکھ کر پنجابی کا وہ بول یاد کرنے لگتا تھا جو تم نے بھی سُنا ہوگا۔

"تیری لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل چھُٹ گئے" ـــــ یار تم اُسے صاحب کے ساتھ جانے ہی کیوں دیتے ہو روز خود ہی کیوں سیر و تفریح کے لئے نہیں لے جاتے؟"

"قہ۔قہ۔قہ" ہربنس نے قہقہہ لگایا اور پھر سگریٹ سُلگاتے ہوئے بولا۔

"وجے لکشمی کے ساتھ تو اپنا عشق صرف تین تاریخ کو ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" کٹلس کا ٹکڑا ہرنام کے کانٹے پر ٹنگا رہ گیا۔

"مطلب یہ کہ رشوت میں نہیں لیتا۔ تنخواہ میں سے جتنے پیسے میرے جیب خرچ کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اُس سے تین تاریخ کو وجے لکشمی کے ساتھ ایک بار کہیں جانے ہو جاتی ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ اُس دن کسی اور کو وقت نہیں دیتی۔ میں اِس سے زیادہ افورڈ نہیں کر سکتا اِس لئے مرزا غالب کی طرح کُڑھتا نہیں ہوں کہ اگر لکھوائے خط اُن کو تو کوئی ہم سے لکھوائے! باقی دن وہ چاہے بڑے صاحب کے ساتھ جائے یا چھوٹے کے! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔"

"تم عجیب مرد ہو؟" ہربنس نے بیرے کو دو آئس کریم کافی لانے کے لئے کہا۔

"کیوں آج لُٹنے کا ارادہ کر کے آئے ہو۔ سمپل کافی منگوا لو" ہربنس نے ہنستے ہوئے ہرنام سے کہا۔

"رہنے دو تم اپنی کفایت شعاری۔ کیوں مرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ کچھ کھایا پیا کرو۔ تم لوٹ کر کیا کھوگے کہ جو زینے چڑھ کر ہرنام کے پاس گیا تھا اُس نے گرم پانی پلا کر نیچے دھکیل دیا۔ تم مجھے اِتنے ہی اچھے لگتے ہو جتنی تمہیں وجے لکشمی! کیا باغ و بہار چیز ہے یار! ایمان سے اگر تم اُس کا تبادلہ یہاں ہمارے دفتر میں کرا دو تو آدھے لوگ کام چھوڑ دیں اور آدھے باولے ہو جائیں! لیکن مجھے تو تمہاری مردانگی پر شک ہوتا ہے۔"

"گولی مارو مردانگی کو۔ اِتنا کیا کم ہے کہ وہ مجھ سے ہنستی بولتی ہے۔ گھر کی سب کُلفتیں اُس سے دو باتیں کر کے فراموش ہو جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں سرکار نے یہی ایک کام ڈھنگ کا کیا ہے۔ دفتروں میں میزوں پہ گُلدستے سجا دئے ہیں جن کی خوشبو سے دفتر مہکا مہکا رہتا ہے۔ طبیعت بہل جاتی ہے۔ بابو لوگ بال سنوار کر اپنی کرسیوں پر جمے رہتے ہیں۔ کپڑے خوب پریس کر کے آتے ہیں۔ کہیں کوئی شکن نظر نہیں آتی۔ ہرنام یہ خوبرو لڑکیاں بھی کیا کلوروفارم قسم کی چیز ہیں۔ اِن سے دو باتیں ہو جائیں تو اور کوئی شدھ بُدھ نہیں رہتی۔"

"واہ واہ کیا غضب کی بات کی ہے ہربنس! بولتے جاؤ مجھے لطف آ رہا ہے۔ ہماری کینٹین کی آئس کریم کافی بھی پی کر دیکھو۔ اگلی تین تاریخ کو وجے لکشمی کو بھی اِدھر ہی لے آنا۔ پھر وہ چمچے سے آئس کریم کا ٹکڑا مُنہ میں رکھتے ہوئے بولا اہا۔ ہا لڑکیاں! لڑکیاں ہی ہوتی ہیں ہربنس!"

اور ہربنس کو اپنا سڑا کافی کے گلاس میں ڈبو کر گھونٹ بھرتے ہوئے اپنی لڑکی آشا کا خیال آیا جس کی فیس داخلہ جمع کرانے کی فکر میں وہ کل سے غلطاں تھا۔

لیکن ابھی کچھ روپوں کی اور ضرورت تھی۔ لڑکیاں لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ اگر آشا لڑکا ہوتی تو وہ اُس سے کہتا جاؤ دفع ہو جاؤ پڑھو یا رومان لڑاؤ میں نے تمھیں روپے دینے کا ذمہ نہیں لے رکھا۔ لیکن آشا تو لڑکی تھی اور اُس کی ذہنی منطق میں زہر گھول رہی تھی۔ اگر وہ آٹھویں بھی پاس نہ کر سکی تو ہربنس کے کندھوں پر اُس کا بوجھ کتنا بڑھ جائے گا۔ آشا نے اُس کے ذہن سے وجے لکشمی کو نکال باہر کیا۔ اُس کے جسم پر پسینہ آگیا۔ اُس کا جی چاہا گلاس سے ہاتھ اُٹھا کر ہربنس کے سامنے پسار دے لیکن ہاتھ گلاس پر یوں جم گیا تھا جیسے بجلی کے کھمبے کے ساتھ چپک گیا ہو۔ وہ سر گلاس سے نکال کر صرف اتنا کہہ سکا۔

"ہرنام!"

"میں سب سمجھتا ہوں پیارے! یہ عشق بڑی بلا ہے۔ اسے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی کوئی تمیز نہیں۔ میرا صاحب دفتر آتے ہوتے دو چار بار ایک پڑوسی لڑکی کو کار میں لفٹ دیتا رہا ہے۔ اب وہ بے وفا تو کسی اور چھوکرے کے ساتھ سکوٹر پر دفتر چلی جاتی ہے اور یہ بدنصیب اُس کے فلیٹ کے سامنے کھڑا پانچ پانچ منٹ ہارن دیتا رہتا ہے۔ سُناؤ کافی کیسی ہے؟"

"تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ نہ تمھاری پُرخلوص محبت اور نہ کافی کی لذّت ہی کے لئے۔ بس جی چاہتا ہے ہر روز اِدھر آجایا کروں۔"

"قہ قہ قہ" ہرنام ہنسا اور عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا "تم کب آتے ہو۔ چلو تین تاریخ کو وجے لکشمی کو لے کر ہی آجایا کرو۔ کچھ دلچسپ باتیں ہو جایا کریں گی۔ یہاں مدراس کا اسپیشل بڑا بہت لذیذ بنتا ہے۔ اے بیرا۔ دو بڑے!"

ہربنس کے روکنے کے باوجود ہرنام نے آرڈر دے دیا۔ ہربنس ہنستے ہوئے کہنے لگا "ہرنام! تمھاری باتیں سُن کر مجھے فراق کا وہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

آؤ حُسنِ یار کی باتیں کریں
زُلف کی رخسار کی باتیں کریں

"اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ باتیں تو بہت کم خرچ بالا نشیں ہوتی ہیں۔ سارا مہینہ فرج ٹیلی ویژن کولر ٹرانسسٹر تیار کرنے والی کمپنیوں کے خوبصورت اشتہار دیکھتے ہیں۔ مختلف کمپنیوں کے سامان کی کوالٹی اور قیمتوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ اِن ضروریاتِ زندگی کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ کی رقم اور قابلِ ادائیگی بلوں کی رقوم کا موازنہ کرکے خاموش ہو جاتے ہیں اور ہفتہ بعد پھر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ہربنس! ایمان سے اگر باتیں کرنے پر بھی پابندی ہو تو آدھے لوگ دلی جذبات کے ہیجان سے پاگل ہو جائیں۔ تمھاری وجے لکشمی کی باتیں سُن کر کتنا لطف آتا ہے۔ تم چاہتے ہو باتیں بھی نہ کریں اور قبر بن کر خاموش بیٹھے رہیں۔ تم یہ بڑے کھاؤ کیا خوشبودار اور لذیذ ہیں اور ایسی ہی لذیذ کوئی بات سُناؤ۔"

"نہیں دوست تم بہت زیادہ تکلف کر رہے ہو۔"

"تکلف پر بھیجو لعنت۔ اِتنے دنوں بعد ملے ہو اور مجھے کچھ خدمت کا موقع بھی نہیں دینا چاہتے۔ گھبراؤ نہیں پیارے دُنیا میں اور رکھا بھی کیا ہے۔ باقی تو آنکھیں دیکھ لیں گی اور زبان باتیں کرے گی۔" ہرنام نے ہربنس کے کندھے دبا کر اُسے بٹھاتے ہوئے کہا۔

ہرنام نے پھر کسی حسین لڑکی کا ذکر چھیڑ دیا۔ ہربنس خاموش بیٹھ گیا۔ لیکن دلی اضطراب اُس کے چہرے سے عیاں تھا۔ وہ حُسن اور عشق کی دنیا سے نکل کر دونوں ہاتھ ہرنام کے آگے پھیلا دینا چاہتا تھا کہ اُسے صبح آشا کے سکول جانا ہے۔ لیکن حقائق کی تلخ دُنیا کی نسبت رومان کی خیالی دُنیا کتنی خوبصورت ہے۔ وہاں کتنا سرور اور مسرت ہے۔ وجے کتنی خوبصورت ہے۔ ہرنام کی آنکھیں اُس کے ذکر ہی سے کیسی چمک رہی ہیں۔ اگر وہ کسی دن وجے کو یہاں لے بھی آئے تو ہرنام اُسے ایک پائی خرچ نہ کرنے دے اور وجے بھی اِس خوش باش انسان سے مل کر کتنی خوش ہو!

"سُناؤ دوست لطف آیا یا نہیں۔ ہم پنجابی جس طرح جان لڑا کر عشق کرتے ہیں یہ سالے مدراسی اُتنی محنت سے رگڑ رگڑ کر دوسوں کے لئے مصالحہ تیار کرتے ہیں۔ آہاہا۔ کیا خوشبودار تھا جیسے کسی . . ."

"بس۔ بس۔ بس! رہنے دو اب زُلف اور رخسار کو۔ آجاؤ نا کسی دن ہمارے دفتر تمھاری طبیعت کچھ سنبھل جائے۔" ہربنس نے پلیٹ اُٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔

"تجویز تو بہت اچھی ہے دوست! لیکن اپنا صاحب تو اپنے پر اِتنا زیادہ عاشق ہے کہ اپنی سرگرمیاں تو باتیں ہی کرنے تک محدود ہو گئی ہیں۔ اچھا بولو اب ایک ایک کپ اسے ون ہاٹ کافی کا ہو جائے؟"

"پاگل ہو گئے ہو کیا۔ نہیں، نہیں" ہربنس نے چونکتے ہوئے کہا۔

"دوست! اِتنے دن بعد ملے ہو۔ کیا یاد کرو گے؟"

"نہیں۔ بس دوست بس!" اور ہربنس نے دستِ سوال دراز کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

بیرا بِل لے آیا اور ہرنام نے جھٹ سے نوٹ نکال کر طشتری میں رکھ دیا۔ دونوں ٹھنڈا پانی پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

"ہرنام! ایک کام سے آیا تھا۔ بُرا تو نہ مانو گے۔ کل آشا کی فیس جمع کرانی ہے ورنہ اُس کا نام کٹ جائے گا۔ آٹھ دس روپے دے سکو گے؟ دو تاریخ کو لوٹا

جاؤں گا" ہرنس ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔ اس کا رنگ زرد ہوگیا اور کنپٹیوں سے پسینے کی دھاریں بہنے لگیں۔

ہرنام نے گلاس اطمینان سے میز پر رکھ دیا اور بولا۔

"اتنی سی بات کے لئے تم نے بہت دیر لگا دی ہے یار! آتے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ بات کا بُرا تو نہ مانو گے؟ میرے پاس یہی نوٹ تھا جو میں نے بل چکا دیا ہے اور اب پانی پیتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ شام کو کس دوست سے ٹکٹ لے کر گھر جاؤں!!"

---

مدیر "بیسویں صدی" کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہوسکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاسکتے۔

---

# غزلیں

**عرش طلیانی، بی۔اے**

اِک بات لاکھ وجہِ ملامات ہوگئی
یہ بات ہوگئی تو بڑی بات ہوگئی

اب وعدۂ دل سے تعلقِ اوقات ہوگئی
قندِ نبات اُن کی ہر اک بات ہوگئی

سنجیدہ تھے ہم اور بھی سنجیدہ ہوگئے
کل ناگہاں جو اُن سے مُلاقات ہوگئی

تھے وہ بھی دن کہ دل کو تمنائے لُطف تھی
اب خوش نہیں کرم پہ بھی کیا بات ہوگئی

ساقی کی آنکھ اشک فشاں ہے چمن میں آج
رِندو سبُو اُٹھاؤ کہ برسات ہوگئی

بڑھتی گئی اُمید دلِ نااُمید کی
کونپل کبھی یہ ڈال کبھی پات ہوگئی

وہ رِند عرش قابلِ صد احترام ہیں
جن کی دُعائے مے بھی مناجات ہوگئی

**شکیل بدایونی، بی۔اے**

تہمتِ آب و گِل اُٹھا نہ سکی
زندگی زندگی کو پا نہ سکی

داستانِ حیات تھی سادہ
پھر بھی ظالم سمجھ میں آ نہ سکی

ہائے وہ بدنصیب پروانے
شمع جن کو کبھی جلا نہ سکی

ربطِ باہم تو دیکھئے کہ بہار
اُن سے پہلے چمن میں آ نہ سکی

رُوح جب تک ہوئی نہ ہم آواز
زندگی سازِ نو پہ گا نہ سکی

کتنی وُسعت ہے دو جہاں میں شکیلؔ
میری ہستی مگر سما نہ سکی

**پروفیسر عبدالرب عرفان ایم اے**

نظریں ملا کے آج کسی کی نظر سے ہم
ٹکرا گئے ہیں گردشِ شام و سحر سے ہم

محرومیوں نے بڑھ کے ہمارے قدم لئے
مقصود کی تلاش میں نکلے جدھر سے ہم

اے اشکِ بیقرار نہ پلکوں سے تو ڈھلک
ہاں دیکھ گر نہ جائیں کسی کی نظر سے ہم

اللہ رے احتیاطِ محبت کہ بزم میں
ہم سے وہ اور اُن سے رہے بےخبر سے ہم

رُسوائیاں ازل سے مقدر ہیں عشق کی
کیا غم جو گر چکے ہیں جہاں کی نظر سے ہم

ہر لحظہ اک پیام تھا اُن کی نگاہ میں
یہ اور بات ہے کہ رہے بےخبر سے ہم

عرفاںؔ سرفروشیٔ منصُور کی قسم
دامانِ حق نہ چھوڑیں گے سولی کے ڈر سے ہم

# زہر

مہندر ناتھ۔ بی۔ اے

۱۵۔ چیرو بلڈنگ۔ مادھوداس پاستا روڈ۔ دادر۔ بمبئی نمبر ۱۴

یکم مئی ۱۹۶۷ء — برادرِ محترم! تسلیمات

ایک افسانہ "زہر" ارسالِ خدمت ہے۔ آپ نے اکثر عورتوں کی بے وفائی کے قصے پڑھے ہوں گے۔ یہ مردوں کی تخلیق کی ہوئی دُنیا ہے۔ اِس لئے عورت کو ہر حالت میں دُکھ سہنا ہے۔ میں نے "زہر" میں مرد کی بے وفائی کا ذکر کیا ہے۔ اِس افسانے کا ہیرو اپنی بیوی اور معشوقہ دونوں کو دھوکا دیتا ہے۔ بیوی رونے دھونے کی قائل نہیں۔ جب اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ اُس کا خاوند واقعی فریبی ہے تو وہ اُس سے الگ ہو جاتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار ہمارے ہیرو کو احساس ہوتا ہے کہ دونوں کو دھوکا دے کر اُس نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے ——— آج کل گرمی خوب پڑ رہی ہے۔ کام کاج کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ دِلّی میں تو قیامت کی گرمی ہوگی! یعنی بالکل ناقابلِ برداشت! چند دنوں کے لئے بمبئی چلے آیئے۔ سمندر کی ہوائیں دل کو ٹھنڈک پہنچائیں گی . . .

آپ کا ——— مہندر ناتھ

---

رمو نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور وہیں کھڑی ہو گئی۔ گرمی سے رخسار شعلوں کی طرح بھڑک اُٹھے تھے اور ایک زُلف بل کھاتی ہوئی پیشانی پر لرز رہی تھی۔

"بس تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے رمو!"

"میرا نام رمو نہیں، رکمنی ہے راکیش!"

"جب رکمنی کہتا ہوں تو زبان لڑکھڑا سی جاتی ہے اور جب رمو کہتا ہوں تو یوں محسوس کرتا ہوں، جیسے بالائی کھا رہا ہوں!"

"بالائی سمجھتے ہو عورت کو؟"

"اِس وقت بحث کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیا اوپر تک نہیں چلوگی؟"

"نہیں۔"

"چوٹی قریب ہی ہے۔"

"کسی موٹی اور صحت مند عورت کا سہارا لو۔ میں دُبلی پتلی لڑکی ہوں جب زیادہ چلتی ہوں تو دم پھولنے لگتا ہے۔ یوں بھی تم اوپر جا کر کیا کروگے؟"

"چڑھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ سانس پھولتی ہے، رگوں میں خون جوش مارنے لگتا ہے۔ جسم کا ہر مسام کھل جاتا ہے۔ اور پھیپھڑوں میں تازہ ہوا ———"

"اِس چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھنے سے بہتر بات تو یہ ہوگی کہ تم کسی دن دارا سنگھ سے ایک دو ہاتھ کر لو۔ ہر جوڑ ایسا کھل جائے گا کہ دوبارہ جوڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔"

"شکریہ اِس مشورے کا۔"

ایک بات تو میری سمجھ سے باہر ہے کہ تم شہر سے بھاگ کر ویرانے کی طرف کیوں آتے ہو؟"

"کیا یہ ویرانہ ہے؟ دیکھتی نہیں، کتنی خوبصورت جگہ ہے!"

"تو پھر بیٹھ جاؤ۔"

وہ اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

"ذرا مجھ سے دُور بیٹھو۔"

"قریب آنے سے کیا ہوگا؟"

"وہی ہوگا، جو منظورِ خدا ہوگا!" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

بڑی پیاری ہنسی تھی۔ راکیش نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں، ننھے ننھے سرخ پھول اُن کی طرف جھانک رہے تھے۔ ہوا ذرا تیز اور تُند تھی۔ آسمان نیلا۔ اوپر نگاہ کرو تو چوٹی کے آگے پھیلا ہوا نیلا آکاش تھا۔ نیچے نگاہ کرو تو ایک پھیلی ہوئی وادی۔ مکان، درخت اور اُس سے بہت آگے چاندی کی طرح چمکتا ہوا سمندر۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمھیں!"

"ابھی تک جی نہیں بھرا؟"

"جی بھر جاتا تو تمھارے ساتھ کیوں آتا؟"

"مجھے تو گھر بیٹھ کر دیکھ سکتے ہو!"

"نہ کوئی گھر میرا ہے نہ تیرا۔ تم اپنی بہن کے پاس رہتی ہو اور میں اپنے دوست کے ساتھ۔ نہ تم میرے گھر آسکتی ہو، نہ میں تمھارے گھر جا سکتا ہوں۔"

"تو آؤ ایک گھر آباد کرلیں۔"

"یعنی اپنی باقی ماندہ زندگی برباد کرلیں!"

"تم نے کبھی سنجیدگی سے میری باتوں پر غور نہیں کیا۔ ہر بات کو ہنسی مذاق میں ٹال دیتے ہو۔"

"جب تمھاری صورت دیکھتا ہوں تو سنجیدہ نہیں رہ سکتا۔"

"کیا میں کارٹون ہوں؟"

"تمھاری محبت نے مجھے کارٹون بنا دیا ہے! پرماتما کی قسم! جب تمھاری بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کسی گہری جھیل کے نیلے پانیوں میں کھو گیا ہوں۔ جب اِن سیاہ بالوں پر نگاہ ڈالتا ہوں، تو لگتا ہوں کے آگے ایک خوبصورت اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ جب اِن لرزتے ہوئے ہونٹوں ——"

"بس بس! یہ شاعرانہ اندازِ بیان ترک کیجیے حضور! میرے بال سیاہ نہیں بھورے ہیں اور تم میرے ساتھ تقریباً ڈیڑھ سال سے گھوم رہے ہو اور تمھیں ابھی تک اِس بات کا اندازہ نہیں ہوا کہ میرے بال بھورے ہیں یا سیاہ؟ خیر! تمھیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟"

"بے اندازہ!"

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ! تم نے مجھے بمبئی کا کونہ کونہ دکھا دیا۔ ہر ریستوراں میں لے گئے اور اچھے اچھے کھانے کھلائے۔ میرے ساتھ پکچر ہاؤس میں گئے۔ شام پڑتے ہی سمندر کے کنارے چلے گئے اور تم نے مجھے رومانی گفتگو کے جال میں پھنسا لیا۔ میں ایک ندی کی طرح تمھارے حسین خیالوں کی آغوش میں بہتی رہی۔ لیکن مجھے کوئی سمندر نہ ملا، جو مجھے جذب کر لیتا ——"

"لڑنے کے موڈ میں ہو؟"

"نہیں راکیش! فیصلہ کرنے کے موڈ میں ہوں۔ آخر کب تک ——"

"جانتی ہو، جہاں ہم بیٹھے ہوتے ہیں، یہاں ہر روز نہ آسکیں گے۔"

"میں آنا بھی نہیں چاہتی۔"

"زندگی بہت مختصر سی ہوتی ہے۔ ایسے لمحے بار بار نہیں آتے!"

"یہ لمحے اب مجھے بور کرنے لگے ہیں۔ نہ جانے تمھیں اِن لمحوں سے کیسے خوشی ملتی ہے۔"

"جب تم سامنے ہوتی ہو تو مجھے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ ہوا بڑی پیاری لگتی ہے، یہ جھاڑیاں، یہ پھول، اِن کی ہلکی ہلکی سی شگندھ۔ یہ ہری ہری گھاس، یہ چھوٹے چھوٹے کنکر اور یہ ڈھلتی ہوئی شام۔ تیز اور تُند ہوا اور یہ تمھاری آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار!"

"خمار نہیں راکیش! بیمار ہوں۔ یرقان ہونے والا ہے راکیش!"

"پرماتما نہ کرے!"

"آتما اور پرماتما کی بات نہ کرو۔ تم سے رہائی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن کوشش کرنے پر بھی چھٹکارا نہ پاسکی۔ تمھیں اپنا بنا کے دیکھ لیا۔ تمھاری ہر خوشی کو اپنی خوشی جانا اور تمھاری ہر تمنا کو اپنی تمنا سمجھا۔ لیکن اب راہ بدلنے کو جی چاہتا ہے راکیش!"

راکیش نے رمو کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ رمو نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"میرا ہاتھ پکڑو۔ رمو!"

"اب ہاتھ چھوڑنے کو جی چاہتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ نیچے کی طرف بھاگی۔ ہوا میں ہرے رنگ کا آنچل لہرانے لگا اور بھورے بھورے بال گورے گورے گالوں پر بکھر گئے۔

---

اندھیرا زیادہ گہرا نہ تھا ——

"کل جو کچھ میں نے کہا تھا، اُس کا جواب چاہتی ہوں۔"

"اگر میں یہ کہہ دوں، جو کچھ تم مجھے سمجھتی رہی ہو، میں اُس کے بالکل برعکس ہوں۔"

"یعنی ——؟"

"تم مجھے دیوتا سمجھتی رہیں اور میں شیطان نکلا۔ میں تم سے جھوٹ بولتا رہا۔ تم سے کہتا رہا تم سے شادی کروں گا اور تم میرے جھانسے میں آکر مجھ سے پیار کرتی رہیں۔"

اور آج جب میں شادی سے انکار کر رہا ہوں تو مجھے شیطان کہنے میں کیا ہرج ہے ؟"

"انسان بننے کی کوشش کرو ۔"

"جب حالات شیطان بننے پر مجبور کر دیں تو انسان بننا بیوقوفی ہے میری کوئی معقول آمدنی نہیں ۔ میں اپنے دوستوں سے روپیہ اُدھار لے کر تم پر خرچ کرتا رہا ۔ میں گھر سے روپے منگوا کر اپنا پیٹ پالتا رہا اور تمھارے آگے میں نے ہمیشہ ایک شاندار محل تعمیر کیا اور تمھیں بتاتا رہا کہ میں کتنی اچھی زندگی گزار رہا ہوں ۔ تم نے میری ظاہری چمک دمک دیکھی ۔ میرے چہرے کی بناوٹ اور میرے دلکش خد و خال پر فریفتہ ہو گئیں ۔ لیکن میرے اندر جو ٹوٹا ہوا کرکٹ بھرا ہوا ہے، اُس پر تمھاری نگاہ نہ گئی !"

"اس سے پہلے تم نے مجھے کیوں نہ بتایا ؟"

"میں تمھیں کھونا نہیں چاہتا تھا !"

"اور اب ــــــ ؟"

"کیا میں تمھارے احسانوں کا بدلہ نہ چکاؤں ؟ تم ایک جھوٹے اور مکار انسان سے محبت کرتی رہیں اور اب اپنی خوشیوں کو تباہ کر کے بھلائی کی راہ دکھا رہا ہوں ۔"

"یہ کہنے کی ضرورت نہیں !" وہ جانے کے لئے اُٹھی ۔

"بیٹھو گی نہیں ؟"

"جو کچھ تم کہہ چکے ہو اُس کے بعد بیٹھنا شرافت نہیں !"

"کیا کوئی موٹی سی گالی دے کر نہ جاؤ گی ؟"

"گالی ــــــ !"

"Bastard تو کہہ کر جاؤ ۔"

رمو نے مُڑ کر دیکھا ۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے ۔

جب رمو چلی گئی تو وہ سوچنے لگا ، اُس نے کیا کیا ۔ وہ کس کے سہارے زندہ رہے ! اِتنا فاضل وقت کیسے کٹے گا ۔ وہ کس کے انتظار میں سوئے گا ، وہ کس کے انتظار میں جاگے گا ۔ اُس نے خود اپنی کشتی کو ڈبو دیا ۔ اِتنی اچھی لڑکی کہاں ملے گی ! اب دلکش اور دلنواز شامیں کبھی واپس نہ آئیں گی ۔ وہ گورا گورا سا مکھڑا ، وہ موٹی موٹی روشن روشن آنکھیں ، وہ لرزتے ہوئے ہونٹ اب کبھی نہ دیکھ سکے گا !ــــ یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ سو گیا ۔

---

صبح جب آنکھ کھلی تو اُس کا سر بھاری تھا ۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا ۔ وہ اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا محسوس کر رہا تھا ۔ ہاں اُس کی دُنیا اُجڑ چکی تھی ۔ پھر بھی اُس نے ہاتھ منہ دھو کر چائے منگوائی ۔ ابھی چائے کا گھونٹ پیا ہی تھا کہ ڈاکیے نے ایک لفافہ پھینکا ۔ بھیجنے والے کا نام دیکھ کر وہ خوشی سے اُچھل پڑا ۔ ہاں یہ اُس کی بیوی کا خط تھا ۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے خط کھولا ۔ ایک رشتہ ٹوٹ گیا تھا ، دوسرا رشتہ ــــ اُس کی بیوی رُوٹھ کر چلی گئی تھی ۔ واپس آ جائے تو زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا شاید وہ بھر جائے ۔

لکھا تھا ــــــ

پران ناتھ !

لفظ پران ناتھ پڑھ کر وہ بے حد خوش ہوا ۔

سوچا تو یہی تھا کہ ساری زندگی آپ کا ساتھ دوں گی ۔ لیکن اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو رشتہ ٹوٹ گیا اُسے جوڑنا بیوقوفی ہے ۔ میری ایک سہیلی نے کہا ہے آپ کو میری بالکل پروا نہیں ۔ آپ کسی اور لڑکی سے پیار کرتے ہیں ۔ اُسی کے ساتھ دن رات گھومتے ہیں اور شاید آپ اُس سے شادی کرنا چاہتے ہیں ۔ ضرور کیجئے شادی اُس سے ۔ میں منع نہ کروں گی ۔ مجھے رنج صرف اِس بات کا ہے کہ آپ نے جتنے خط مجھے لکھے اُن میں کسی ایک خط میں اِس چاہت کا ذکر نہ کیا ۔ آپ مجھے تسلیاں دیتے رہے کہ آپ ابھی تک بیکار ہیں ۔ کام نہیں ملا ، فاقے کر رہے ہیں ۔ اِس لئے میں اپنے پتا جی سے روپے لے کر آپ کو بھیجتی رہی اور آپ روپے لے کر دوسری لڑکی کے ساتھ گلچھرے اُڑاتے رہے ۔ میں کسی ایسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنا نہیں چاہتی جو اِتنا بڑا دھوکے باز ہو ! اب مجھے صرف اِس بات کا افسوس ہے کہ اِتنے دنوں تک آپ مجھے بیوقوف بناتے رہے ! اب میں ایسی ذلّت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں !

ــــــ رینو

راکیش نے چائے کا دوسرا گھونٹ لیا ۔ حلق میں اُترتے ہی اُس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ چائے نہ پی رہا ہو ، زہر پی رہا ہو !!

---



میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھکو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

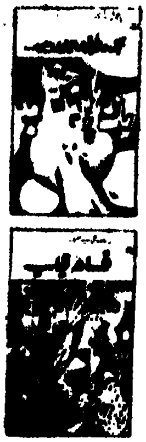




ہندوستان میں
ہندی پاکٹ بکس کا سب سے پہلا اور
ملک گیر شہرت کا حامل ادارہ

# ہند پاکٹ بکس





جس کا معیار ضرب المثل اور مطبوعات مقبولِ عام ہیں۔

اب ہندی کے ساتھ ساتھ اردو پاکٹ بکس کے میدان میں بھی پیش پیش ہے۔ ہمارا مقصد نہ صرف اردو کے بلند پایہ مشاہیر کے شاہکار پیش کرنا ہے بلکہ ملکی و غیر ملکی زبانوں کے مقبول اور گراں مایہ ادب — ناول، افسانہ، شاعری، طنز و مزاح، سیاحت، علم و سائنس، اخلاقیات، جنسیات وغیرہ کو بھی اردو لباس پہنا کر ارزاں قیمت پر اہلِ ذوق تک پہونچانا ہے۔

## نئی کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| نرملا | (ناول) | منشی پریم چند |
| | (قیمت دو روپے) | |
| ایک عورت ہزار دیوانے | (ناول) | کرشن چندر |
| | (قیمت دو روپے) | |
| بک رہا ہوں جنوں میں... | (طنز و مزاح) | پرکاش پنڈت |
| فسانۂ عجائب | (ناول) | رجب علی بیگ سرور |
| قتل کا راز | (جاسوسی ناول) | کرنل رنجیت |
| جان پہچان | (افسانہ نگاروں کے انٹرویو) | نرش کمار شاد |
| گلکاریاں | (شعر و شاعری) | فراق گورکھپوری |
| شادی کے بعد | (جنسیات) | ڈاکٹر لکشمی نارائن |

نوٹ: قیمت ساتھ دی ہوئی کتابوں کے علاوہ فی کتاب ایک روپیہ



## دیگر مطبوعات

### ناول

| | |
|---|---|
| مٹی کے صنم | کرشن چندر |
| زرگاؤں کی رانی | کرشن چندر |
| دل کی دنیا | عصمت چغتائی |
| ایک معمولی لڑکی | بلونت سنگھ |
| عورت اور آبشار | بلونت سنگھ |
| شام اور لڑکی | اے۔ حمید |
| خوشبو کا خواب (قیمت دو روپے) | اے۔ حمید |
| لندن کی ایک رات | سجاد ظہیر |
| شہید | ملک راج آنند |
| ناگ منی | امرتا پریتم |
| خلش | امرتا پریتم |
| جگنو اور ستارے | جیلانی بانو |
| بند گلی | ہنس راج رہبر |
| اُجلا آنچل | کرتار سنگھ دُگل |
| میلی چاندنی | گلشن نندہ |
| بن بیاہی ماں | گوربخش سنگھ |
| محبت یا ہوس | ٹالسٹائی |
| یاد | پرل بک |
| قصۂ چار درویش | میر امن دہلوی |

### جاسوسی ناول

| | |
|---|---|
| ہانگ کانگ کی حسینہ | کرشن چندر |

### افسانے

| | |
|---|---|
| جوگیا | راجندر سنگھ بیدی |
| پلنگ | اوپندر ناتھ اشک |
| ایک عورت ہزار جلوے | علی عباس حسینی |
| فرانس کے عظیم ناول (اختصار) | مرتبہ: رانگے راگھو |
| روس کے عظیم ناول (اختصار) | مرتبہ: رانگے راگھو |
| انگریزی کے عظیم ناول (اختصار) | مرتبہ: رانگے راگھو |

### طنز و مزاح

| | |
|---|---|
| کاغذ کے کرشمے | کرشن چندر |
| فلمی قاعدہ | کرشن چندر |
| گستاخیاں | کنہیا لال کپور |
| کامریڈ شیخ چلی | کنہیا لال کپور |
| وارنٹ گرفتاری | فکر تونسوی |
| نئے شگوفے | شفیق الرحمٰن |
| ادبی لطیفے | مرتبہ: نرش کمار شاد |

### شعر و شاعری

| | |
|---|---|
| اردو کی بہترین غزلیں | مرتبہ: پرکاش پنڈت |
| اردو کی بہترین رومانی نظمیں | مرتبہ: پرکاش پنڈت |
| پاکستان کی اردو شاعری | مرتبہ: پرکاش پنڈت |
| بہترین رباعیاں اور قطعے | مرتبہ: پرکاش پنڈت |
| ۱۹۶۶ء کی منتخب شاعری | مرتبہ: پرکاش پنڈت |
| گیتانجلی (رابندر ناتھ ٹیگور) | ترجمہ: پرکاش پنڈت |

### سوانح

| | |
|---|---|
| لال بہادر شاستری | مہاویر ادھیکاری |

### سیاحت

| | |
|---|---|
| پاکستان کا سفر | بلراج ساہنی |

### اخلاقیات

| | |
|---|---|
| میری سنو | خلیل جبران |
| انمول موتی | مرتبہ: مانس ہنس |
| کامیابی کے راز | سویٹ مارڈن |

### جنسیات

| | |
|---|---|
| عورت مرد | ڈاکٹر لکشمی نارائن |
| برتھ کنٹرول | ڈاکٹر لکشمی نارائن |
| جنسی مسائل | ڈاکٹر لکشمی نارائن |
| میاں بیوی کے جنسی تعلقات | ڈاکٹر لکشمی نارائن |
| جنسی تعلقات کے عجیب و غریب پہلو | ڈاکٹر لکشمی نارائن |

# غزل

نذیر بنارسی

ڈھلکے جب تک نہ رات کا آنچل
غمِ جاناں ہمارے ساتھ ٹہل

کہیں اُن پر نہ آنچ آجائے
میری شمعِ وفا سنبھل کر جل

دیدنی ہوگی آج کی برکھا
اُمڈ آئے ہیں درد کے بادل

میں ہوں اپنی نگاہ کا مارا
ہوگئی تھی مری طرف سے پہل

پھر ہوا خونِ حسرتِ معصوم
دل ہے یا بے گناہوں کا مقتل

سر بکف پھر رہا ہے دیوانہ
موت کمبخت جھانکتی ہے بغل

میں ہوں مشکل پسند میرا کیا
سوچیے اپنی مشکلوں کا حل

جس طرف ہو نہ کوئی نقشِ قدم
اے جنوں مجھ کو اُس طرف لے چل

غور سے سن رہے ہیں وہ چھپ کر
جانے کیا بک رہا ہے اِک پاگل

زندگی پر نہ پاؤں پڑ جائے
کاروانِ طرب سنبھل کر چل

میں نے دیکھا ہے حادثہ ایسا
ہنستے ہنستے بھی آگئی ہے اجل

یوں ہے پہلو میں اب دلِ بے کیف
جیسے خالی شراب کی بوتل

عشق تاریک تیرا مستقبل
حسن کا فیصلہ اگر ہے اٹل

کتنے نقشِ وفا اُبھر نہ سکے
ہوگئے دفن کتنے تاج محل

میری دنیا بدل دے یہ منظور
مالکِ زندگی نظر نہ بدل

آ کہ تیرے بغیر جانِ حیات
زندگی جیسا لفظ ہے مہمل

زندگی جانے کب دغا دے جائے
آج کی بات آج، کل کی، کل

بارگاہِ فراق میں بہ ادب
پیش کردے نذیر اپنی غزل


صرف سات ہی دن میں...
زیادہ صاف، نرم اور خوبصورت جلد!
جلد کتنی بے رونق تھی... پارٹی بڑی شاندار ہونے والی تھی اور سات ہی دن باقی تھے۔ دعوت نامہ پاکر میں بہت خوش تھی۔ مگر اپنی جلد کی وجہ سے طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہو رہے تھے کس قدر بے رونق تھی وہ! سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں!
پہلی بار کریم کا لگانا: اچانک مجھے پونڈس کے سات دن والے حسن افزا پلان کا خیال آیا۔ پھر ہفتہ بھر ہر رات دو بار میں اپنے چہرے پر پونڈس کولڈ کریم لگاتی رہی۔ پہلی بار لگانے کر اوپری میل کچیل اور دن بھر کا "میک اپ" نکل جائے۔
دوسری بار کریم کا لگانا: دوسری بار... بھی تو حسن کا راز ہے۔ اس لئے کہ مساموں کی ان گہرائیوں میں جما ہوا میل صاف ہو جائے جہاں صابن کا جھاگ یا پانی نہیں پہنچ سکتے
سات دن بعد: ... لوگ میرے خوبصورت اور دمکتے ہوئے چہرے کو بڑے اشتیاق سے دیکھتے ہیں! پونڈس کے سات دن والے حسن افزا پلان نے واقعی کمال کر دیا! آپ بھی آزمایئے۔ پونڈس کولڈ کریم کے استعمال سے صرف سات دن میں آپ کی جلد بھی زیادہ ملائم اور خوبصورت ہو جائے گی۔
پونڈس
کولڈ کریم
جلد کی صفائی کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی کریم
ڈاک خرچ کے لئے ۱۵ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر مفت مطلع دالاکت بچہ '7 DAYS TO BEAUTY'
اس پتہ سے منگایئے:
چیز برو پونڈز انکارپوریٹڈ، ۱۴۱، گنی پواسٹریٹ، بمبئی-۱
چیز برو پونڈز انکارپوریٹڈ
(محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ ایس۔ اے۔ میں تشکیل شدہ)
Ponds
P. 5507

افسانہ

# دھڑکنوں کے فاصلے

عظیم اقبال۔ ایم۔ اے

گنج ملہ، بتیا (بہار)

۲۰ مئی ۹۷ء

برادرم! آداب و نیاز

اِس بار دھڑکنوں کے فاصلے بھیج رہا ہوں۔ بظاہر یہ ایک رومانی تخلیق ہے لیکن اس میں ایک لطیف کرب بھی پوشیدہ ہے۔ امید ہے قارئین اسے محسوس کئے بغیر نہ رہ سکیں گے ——۔ اپنی گرانقدر رائے سے نوازئیے . . .

مخلص ——— عظیم اقبال

---

ہاں ڈارلنگ! تم یہاں کھو جاؤ گی، خود کو بھول جاؤ گی۔

یہ روشنیاں، یہ ہنگامے تم پر چھا جائیں گی۔ اس چہل پہل، اس رونق میں حسن اور رعنائی کے سوا تمہیں کچھ اور نظر نہ آئے گا۔ اندھیروں سے دور اُجالوں کے اس دیش میں صرف خواب دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ تم کہو گی، میں تو حقیقت پرست تھی خوابوں کی بات کب سے کرنے لگی؟ بانو، میری جان! سچ مچ میں بہت بدل گئی ہوں۔ ہر وقت، ہر لمحہ خواب دیکھتی رہتی ہوں۔ اس لئے کہ خواب کے بغیر حقیقت کا وجود نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اِسی سرزمین پر آکر سمجھ سکی ہوں۔ کتنا ولولہ ہے یہاں، کتنی زندگی! چلتی، کودتی، دوڑتی ہوئی متحرک زندگی!

سفر میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ سینکڑوں فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے بے حد لطف آیا۔ راستے میں ہم کراچی، دہران، قاہرہ، ایتھنس، زوریخ، لندن، اسٹرڈم کے ایرپورٹ پر تھوڑی دیر کے لئے رُکے تھے۔ پھر اسکاٹ لینڈ، گرین لینڈ اور کناڈا کو پیچھے چھوڑتے ہوئے نیویارک پہنچ گئے۔ کینیڈی انٹرنیشنل ایرپورٹ پر ہم نے آخری بار لینڈ کیا۔ ساجد ہمیں لینے آئے تھے۔ وہ کون ہیں اُن کے ساتھ؟ سیاہ چشمہ لگائے ہوئے وجیہہ اور اسمارٹ! چہرہ کچھ جانا پہچانا سا معلوم ہوا۔ ساجد نے بڑھ کر شکیل کو میرے ہاتھ سے کھینچ لیا اور اپنے بازوؤں میں تھام لیا اُسے۔

"میرے بیٹے! کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ ارے کتنا دُبلا ہو گیا ہے تو! ——"

"ویل، مسز اشفاق میٹ مائی وائف اینڈ سن —— چچا کو آداب کرو بیٹا۔"

اوہ! یہ ڈاکٹر اشفاق تھے! آنکھوں کے سامنے یکلخت جھپاکا ہوا اور پھر اندھیرا گُھپ! مشکل سے خود کو سنبھال سکی۔ ضبط سے کام لو ڈارلنگ! وجہ بتاؤں گی۔ تم سے کیا چھپانا۔

بانو! جہاں جہاں سے میں گزری ہوں لوگوں میں نیا جوش، نیا ولولہ دیکھا ہے۔ اُن میں جینے کی اُمنگ دیکھی ہے، مرنے کی حسرت نہیں دیکھی۔ ہندوستان ابھی صدیوں پیچھے ہے۔ وہاں دل کی بات زبان تک نہیں لائی جا سکتی۔ نگاہوں پر پابندیاں ہیں۔ ذہنوں پر قفل پڑے ہیں، اور یہ وہ ہے کہ مجھے بہت پسند ہے۔ یہاں ہر طرح کی آزادی ہے۔ ساجد کی پریکٹس بہت اچھی چلتی ہے۔ میڈیکل چارجز یہاں بہت زیادہ ہیں نا! ہمارا بنگلہ ایرکنڈیشنڈ ہے، اپنی کار ہے، گھر میں فریج ہے، ٹیلی ویژن ہے، ٹیپ ریکارڈر ہے۔ ہر کام کے لئے مشینیں ہیں۔ سب کچھ ہے۔ شکیل کو اسکول میں داخلہ مل گیا۔ زندگی رواں دواں ہے۔ اپنے بارے میں کیا، کتنے منصوبے بنا چکی ہوں، پھر بتاؤں گی۔ جی چاہتا ہے بانو تمہیں بھی یہاں کھینچ لاؤں۔ آؤ گی؟

ڈاکٹر اشفاق کو دیکھ کر میں کیوں بے چین ہو گئی؟

لو، تمہارے سامنے اپنے دل کے نہاں خانوں کو کھول رہی ہوں، غور سے سنو۔ یہ یادیں اُن دنوں کی ہیں جب ڈاکٹر اشفاق، صرف اشفاق احمد تھے۔ وہ ہمارے دُور کے عزیز ہیں۔ کچھ بھائی وغیرہ کا رشتہ ہے۔ دونوں گھروں میں ہماری آمد و رفت تھی۔ یہ آنا جانا تو بچپن سے تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں ہائی اسکول کی طالبہ تھی اُن دنوں اشفاق بھائی بہت ستاتے تھے۔

"اے ترنم تو اتنی موٹی کیسے ہو گئی؟ ایک رات میں یہ تبدیلی کیوں کر

ممکن ہے۔ اوہ! سمجھا۔ مسٹریس نے بید سے خبر لی ہے کیا، یا سہیلیوں کے شغلے پڑھے ہیں؟"

"اوں، ہوں۔ آپ تو ہمیشہ مذاق کرتے ہیں" میں ٹھنک کر کہتی۔

"اُف! تمھارے ہاتھ کتنے سرد ہیں! پھر برف چُرا کر کھایا ہے؟"

"اللہ قسم! برف تو آج آئی نہیں"

"تمھارے ہاتھ کی لکیریں ذرا دیکھوں"

"نہیں ـــــ نہیں! میں نہیں دکھلاؤں گی۔ آپ اوٹ پٹانگ بک دیں گے۔ اچھا پہلے اپنے بارے میں بتایئے"

"کیا بتاؤں؟"

میری سمجھ میں نہ آیا کیا پوچھوں۔ اتنے میں افشاں بول پڑی۔

"اچھا آپ یہ بتایئے اشفاق بھائی کہ آپ کی شادی کب ہوگی؟"

"ہوں، ٹھیک ہے۔ بتایئے" میں نے کہا۔

کچھ دیر وہ خاموش رہے۔ پھر کہنے لگے۔

"میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں۔ شاید کنوارا ہی رہ جاؤں گا"

"ہمیں بے وقوف بناتے ہیں" کوثر میاں نے اپنی ہوشیاری جتائی۔

"مجھے چھوڑو نا۔ لاؤ تم اپنا ہاتھ دو" انھوں نے میری کلائی تھام لی۔ میں کسمسا کر رہ گئی۔

"شبنم، افشاں، کوثر ـــــ تم لوگ بھی دیکھو۔ یہ سن لائن ہے، یہ ہارٹ لائن، یہ ہیڈ لائن، یہ ماؤنٹ آف وینس، یہ گرڈل آف مرکری ـــــ یوں سب ٹھیک ہے، لیکن ترنم جھوٹ بہت بولے گی۔ تو میں نالو نے جھوٹ!"

"چھوڑیئے میرا ہاتھ!" میں ناراض ہوگئی۔ سب ہنسنے لگے۔ میں نے انھیں گھورا اور وہاں سے اٹھ کر بھاگ گئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر سسک پڑی پھر ہتھیلیوں کو غور سے دیکھا۔ لکیریں تو بہت سی تھیں۔ گڈمڈ۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میرے کانوں میں اشفاق بھائی کی آواز آئی۔

"میری بات کا یقین نہیں تو کیرو کی کتاب دیکھ لو"

میں نے تکیے میں مُنہ چھپا لیا۔

ایک شام باتھ روم سے نکل کر بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ تم جانتی ہو میرے بال شروع ہی سے کتنے گھنے اور لمبے رہے ہیں۔ ہاں تو میرے بال سیلنگ فین کی ہوا کے دوش پر لہرا رہے تھے۔ کرسی پر بیٹھی میں ایک ناول پڑھنے لگی۔ اچانک ہی اشفاق بھائی آدھمکے۔ انھوں نے میرے بالوں کا ایک گچھا چہرے پر ڈال دیا۔ میرے رخساروں سے اُن کی ہتھیلیاں مَس کر رہی تھیں۔

"ذرا مسکرا دو۔ چاند کی روشنی بڑھ جائے گی"

میری تو جان نکل گئی۔ آنکھیں بند ہوگئیں اور جب انھوں نے زلفوں کے ہاتھوں کو ہولے سے ہٹایا تو ایسا محسوس ہوا میری رگوں میں خون کی گردش معمول سے کہیں زیادہ ہوگئی ہو۔ سامنے شبنم ہنستی ہوئی چلی آرہی تھی۔ میں نے پلکیں جھکا دیں۔

"بیٹھئے۔ کب آئے آپ؟ جی! آئی امی!" امی کی آواز پر میں لپکی۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ عجیب سا سرور میں محسوس کر رہی تھی۔ اس رات میں نے کیسے کیسے سہانے خواب دیکھے اور ہر بار ہنس پڑی، مسکرا پڑی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کوئی گدگدی کر رہا ہے۔ سورج کی کرنیں پھیلیں تو جی چاہا صبح کو رات میں بدل دوں۔ نرم گداز بستر پہ پڑی رہوں اور خوابوں کا یہ سلسلہ کبھی نہ ٹوٹے۔ میرے دل میں ایک میٹھا میٹھا درد جاگنے لگا۔ سچ کہتی ہوں آئینے کے سامنے جب گئی تو اپنی صورت پر پیار آگیا۔ کیسی کیسی خوبصورت عورتیں دُنیا میں ہوں گی لیکن اپنے سامنے سب کا وجود ہیچ معلوم ہوا۔ کسی نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔

"تم بہت خوبصورت ہو ترنم! تم سا کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں! آؤ تمھیں باہوں میں سمیٹ لوں" اور شرما کر خود اپنی باہوں میں میں سمٹ گئی۔

لمحے گزرتے رہے۔ دھڑکنیں بڑھتی گئیں۔ وقت تیز رو ہوگیا تھا۔ اشفاق کا ہیولے ہمیشہ نگاہوں میں اُجاگر ہوتا رہتا۔ کبھی مدھم مدھم کبھی پُرنور!

اب میں تنہائی پسند ہوگئی تھی۔ کیا کچھ سوچتی رہتی۔ ذہن میں خلا ہوتا لیکن گھنٹوں چُپ چاپ بیٹھی رہتی۔ کسی نہ کسی سمت نگاہیں جمی رہتیں۔ نہ جانے کیا ہوگیا تھا مجھے؟ کوئی رازدار بھی نہ تھا۔ کس سے اپنی اُلجھن کہتی۔ گھر میں بڑا ہونا بھی ایک کوفت ہے۔

ایک خوشگوار شام کا ذکر ہے۔

سکنڈری بورڈ کے امتحان میں چند روز رہ گئے تھے۔ میں بُری طرح مشغول تھی، لیکن کوئی بھی ایسی کتاب میں نے نہیں پڑھی جس میں اشفاق کی شباہتیں نہ اُبھری ہوں۔ پڑھتے پڑھتے بے خیالی میں اُن کا نام میرے لبوں سے نہ نکلا ہو۔ اردگرد کی ہر شے میں اُن کے وجود کی خوشبو رچی سی تھی۔ میں اسٹڈی کر رہی تھی۔ گھر کے دوسرے لوگ پکچر گئے تھے۔ اشفاق آئے اور انھوں نے پیچھے سے میری آنکھیں مُوند لیں۔ اِدھر میری سانسوں میں طوفان آگیا۔ جسم تپنے لگا۔ لویں انگارہ ہوگئیں۔ ذرا ہوش میں آئی تو اشفاق میری ہتھیلیوں کو اپنی ہتھیلیوں سے مسلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"تمھارے بغیر میرا جینا دشوار ہو جائے گا، ترنم! مجھے جیون کے صحراؤں میں تنہا نہ چھوڑ دینا۔ کہاں بھٹکتا پھروں گا میں تمھارے بغیر۔ تم نہیں تو کچھ بھی نہیں"

میرے کانوں میں شہد گھُند گھُند ٹپکتا رہا۔

اُسی وقت اُنھوں نے میری اُنگلیوں کو اُلٹا پلٹا اور میری انگوٹھی اُتارنی چاہی۔

"اِسے رہنے دو نا۔ تمھاری نشانی رہے گی۔"

بےساختہ میری زبان سے نکل گیا۔

"آپ کیا کیجئے گا۔ بہت معمولی سی ہے۔"

"تمھیں نہ دیکھ پاؤں گا تو اُسے دیکھ کر قرار آجائے گا۔ تم اِس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔"

انگوٹھی اُن کی انگلیوں میں پہنچ گئی تھی۔ اُسے وہ ہونٹوں تک لے گئے، اور آہستہ سے چوم لیا —— مجھ پر نشہ سا چھا گیا۔ میرے دل و دماغ سے جب یہ نشہ اُترا میں سکنڈری بورڈ آگرا منیشن پاس کر چکی تھی۔ ڈاکٹر ساجد کا رشتہ گھر والوں نے بلا جھجک منظور کر لیا۔ شادی ہو گئی۔ میں نے جذبات کو کچل دیا۔ ارمانوں کا، سپنوں کا گلا گھونٹ دیا۔ ہر دم افسردہ سی رہتی۔ میرے غموں کا مداوا کون کرتا بھلا۔ میں نے آنسو پی لئے، خاموش، گم سُم رہی۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں جس ماحول میں پلتی ہیں اُن سے اِس کے سوا اور کیا اُمید کی جا سکتی ہے —— پتہ نہیں اشفاق نے بارات میں شرکت کی یا نہیں۔ میں تو شور و غُل میں کھوئی ہوئی تھی۔ احساسات کی آندھیاں مجھے بےدم کئے دے رہی تھیں۔ اشفاق کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ میری اور اُن کی باتیں معلوم بھی کسے تھیں۔ چوتھی کے بعد سُسرال سے واپس آئی تو اشفاق کی جانب سے ایک پارسل مجھے ملا۔ پاسترناک کی ایک کتاب تھی The Fifty poems۔ میں نے صفحات اُلٹے۔ اُنھوں نے کہیں کچھ نہیں لکھا تھا۔ میں مضطرب ہو گئی، اُداس ہو گئی۔ اُسی کتاب میں ایک نظم ہے "جُدائی"۔ دو جگہ سُرخ پنسل سے نشان لگے تھے۔ میں پڑھنے لگی۔

*She was as dear to him, as close*
*In all her ways and features,*
*as is the sea-shore to the wave*
*the ocean to the beaches*

تکیہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ آخری نشان شدہ الفاظ میری روح کی گہرائیوں میں اُترتے چلے گئے۔

*As over rushes, after storm*
*the swell of water surges*
*Into deepness of his soul*
*her memory sub merges*

اور گھنٹوں میں بےحس و حرکت پڑی رہی۔

حسرتیں اشک بن بن کر بہتی رہیں۔ لیکن وقت تو مسیحا ہے۔ میرے دکھوں پر رفتہ رفتہ فراموشی کا مُرہم پھیلانے لگا۔ میں نے سُنا اشفاق نے میڈیکل میں داخلہ لے لیا ہے۔ پھر یہ بھی سُنا وہ ڈاکٹر بن گئے۔ پھر یہ بھی کہ راک فیلر فاؤنڈیشن کے وظیفہ پر وہ امریکہ ہائر اسٹڈیز کے لئے گئے ہیں۔ اِس دوران ساجد کا گورنمنٹ آف انڈیا کی سروس کا کنٹریکٹ ختم ہو گیا تھا۔ ہمارے منصوبے کے مطابق اب تک ایک بچہ ہوا ہے —— شکیل۔ گزشتہ دنوں ہم نے اُس کی آٹھویں سالگرہ منائی ہے۔ اپنی نئی دُنیا میں داخل ہو کر پچھلی باتیں ذہن سے نکلتی گئیں۔ ساجد مجھے بہت چاہتے تھے۔ ہمیشہ میری خوشی اور مرضی کا اُنھوں نے احترام کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، جب سے اِنھیں میری قربت ملی ہے اُن کی زندگی سے راحتوں نے کبھی مُنہ نہیں موڑا۔ اُن کی اُمنگیں جوان ہوتی گئیں۔ وہ امریکہ چلے آئے۔ اونچی ڈگریاں لیں اور اب یہاں کے شہری بن گئے ہیں۔ یہاں آکر مجھے بھی کافی تسکین ملی ہے لیکن اشفاق کو دیکھ کر پھر اضطراب کا احساس ہو چلا ہے۔

---

بانو، میری جان! دیکھتی ہوں ہندوستان کی جو کہانی ادھوری رہ گئی تھی وہ امریکہ میں پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ میں نے اک خواب سا دیکھا ہے۔ کاش وہ پُورا ہو جائے!

یہاں ڈاکٹر اشفاق کا بنگلہ ہمارے بنگلہ کے قریب ہی ہے۔ ساجد اکثر اُنھیں اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ اُن کی موجودگی میں میں نروس ہو جاتی ہوں۔ کِسی لمحہ میری نیچی نگاہیں اُن کی جانب اُٹھتی ہیں تو اُن کا کملایا ہوا چہرہ دیکھ کر خود کو سنبھال نہیں پاتی۔ اُن کی اُنگلی میں میری انگوٹھی ابھی تک موجود ہے۔ ساجد نے ایک دن اُس کے بارے میں استفسار کیا۔

"ڈاکٹر! یہ کھلونوں والی انگوٹھی تم نے کیوں پہن رکھی ہے؟"

میری رگوں میں خون کا دباؤ بڑھ گیا۔ وہ ہولے سے مُسکرائے۔

"کِسی کی نشانی ہے۔ اِسے دیکھ کر شانتی ملتی ہے۔"

میں پسینے میں شرابور ہو گئی۔

اشفاق نے اب تک شادی نہیں کی۔ پُوچھنے پر سادگی سے کہتے ہیں۔

"ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں اور کِسی کا دامن تھامتا ہوں تو لہولہان ہونا پڑتا ہے، دھتکار کھانی پڑتی ہے۔"

یہ سُن کر میرے قلب و جگر پر برچھیاں چل جاتی ہیں۔

ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ اشفاق نے اُسے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ اُسے بےحد

پیدا کرتے ہیں۔ اُس کی امریکن کنواری ماں ڈاکٹر اشفاق کے زیرِ علاج تھی۔ وہ ساری دُنیا میں تنہا تھی۔ صرف غم اُس کے ہمدم تھے۔ مرتے وقت اپنی پھول سی بچی وہ اشفاق کو سونپ گئی تھی۔ اشفاق اُسے [illegible] بہ بڑی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ایک دن میں نے اُن سے کہا۔

"بہ بی کا کوئی اچھا سا نام کیوں نہیں رکھ دیتے ؟"

اُن کی نظریں میری طرف اُٹھیں۔

"میرے ذہن میں بس ایک ہی نام تو ہے"

"کیا ؟"

"ترنم !"

ایسا محسوس ہوا میں صوفے میں دھنس جاؤں گی۔ برف کی بڑی بڑی سِلیں مجھ پر گرنے لگیں۔ ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے اور میں نے خود کو اتنا ہلکا محسوس کیا جیسے ایک حقیر ذرّہ ہوں !

اب میں نے سوچ لیا ہے کہ دیکھتی رہوں گی ترنم کا دامن کلیوں کے ہاتھوں سے نہ چھوٹنے پائے۔ کوئی اُسے لہولہان نہ کرے۔ اِس خواب کو میں حقیقت میں ضرور بدلوں گی۔ یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ میرے آہنی ارادوں کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

---

اپنی سہیلی کی تحریریں پڑھ کر بانو کے چہرے کا گلاب کھل اُٹھا۔ ترنم کی یادیں، خلوص اور محبت کی خوشبوئیں اُس کے نتھنوں سے ٹکرائیں اور سب کا سب نشہ اُس کے وجود کو سرشار کر گیا !!

---

# غزلیں

### —— پروفیسر اختر نظمی، ایم۔ اے ——

دل شریکِ غم ہوا، اور غم شریکِ دل ہوا
حاصلِ الفت اگر یہ ہے تو کیا حاصل ہوا؟

بات ہی کیا رہ گئی ہے رازداروں کے لئے
اپنا افسانہ تو اب افسانۂ محفل ہوا

دونوں تاریکی میں ہیں اچھا ہے رہنے دیجئے
آپ کا ماضی ہوا، یا میرا استقبل ہوا

میں نے ساغر چھو لیا تھا صرف اتنی بات تھی
ایک ہنگامہ سا ہنگامہ سرِ محفل ہوا

موجزن ہیں قلزمِ ہستی کے ہر قطرے میں ہم
ایک ہے اپنے لئے طوفان ہو یا ساحل ہوا

بارہا میں نے بنائے زندگی کے راستے
میں ہی اکثر زندگی کی راہ میں حائل ہوا

سوچتا ہوں سوچتا رہتا ہوں نظمی دیر تک
میں ہجومِ آرزو میں کس لئے شامل ہوا

### —— ڈاکٹر امرت لعل، عشرتؔ ایم۔ اے۔ ڈی لٹ ——

کیا وقت آ گیا ہے کہ انسان کے لئے
جینے کی آرزو بھی مصیبت سے کم نہیں

اے دوست بے نوا نہ سمجھ مجھ فقیر کو
میرا خلوص بھی کسی دولت سے کم نہیں

تم جس کو دے رہے ہو فقط دل لگی کا نام
میرے خیال میں وہ محبت سے کم نہیں

اے آفتابِ حُسن ترے انتظار میں
غم کی پہاڑ رات قیامت سے کم نہیں

عشرتؔ فریفتہ ہوں بنارس کے حُسن پر
یہ بتکدہ مرے لئے جنت سے کم نہیں

### —— نرتیقس ایم۔ اے ——

یُوں نہ مجھ کو پیار سے لِلّٰہ دیکھو بار بار
یہ ادا تو اور بھی کرتی ہے دل کو بے قرار

وعدہ کر کے بھی نہ تم آؤ، تمہیں ہے اختیار
ہم کریں گے رات دن پھر بھی تمہارا انتظار

لو خدا حافظ مرے ہوش و خرد کا دوستو!
پھُول پھر کھلنے لگے پھر آ گئی فصلِ بہار

گفتگو میٹھی، دلوں میں بغض نیت میں فساد
کیجئے کیا خاک دنیا میں کسی کا اعتبار

ہم تو جب جانیں مصیبت میں کسی کے کام آئے
ورنہ یُوں کہنے کو ہیں دنیا میں لاکھوں جاں نثار

ہم تو اکثر غرق رہتے ہیں جوانی میں نرتیقس
اور ہوں گے جن کو ہے عہدِ جوانی سازگار

# لمحے کی سوغات

مجیب صدیقی

کمرہ نمبر ۲۳۱۔ براڈکاسٹنگ ہاؤس
آل انڈیا ریڈیو۔ نئی دلی ۱

۲۶ اپریل ۱۹۶۷ء — کرم گستر! سلام و نیاز

آپ کا گراں قدر جریدہ "بیسویں صدی" مدتوں سے زیرِ مطالعہ رہا ہے اور میں یہ اعتراف کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں کہ میرے ذوقِ افسانہ نگاری کو پروان چڑھانے میں "بیسویں صدی" کا بڑا ہاتھ ہے — قومی وحدت اور اردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور آج اس راہ میں جتنے بھی چراغ جگمگا رہے ہیں انہیں میں آپ کا نامِ نامی بھی شامل ہے۔

پہلی بار بزمِ "بیسویں صدی" میں ایک افسانہ لے کر حاضر ہوا ہوں —

گر قبول افتد زہے عز و شرف

نیاز کیش — مجیب صدیقی

---

میں اس وقت آئینے کے سامنے بیٹھی ہوں — کہتے ہیں آئینے کا سامنا کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے آئینوں سے کتراتا ہے۔ لیکن میں کسی آئینے سے نہیں ڈرتی ... — میری عمر آج اٹھائیس سال کی ہو چکی ہے۔ اور ان اٹھائیس برسوں کے تمام کڑوے کسیلے تجربات نے ریگ مال کی طرح میری زنگ آلود نظر کو رگڑ رگڑ کر شفاف بنا دیا ہے۔ اب دنیا کا ہر نقش جب بھی میں چاہتی ہوں میری نظر کے آئینے میں واضح ہو کر ابھرتا ہے۔ اب تو میں آئینہ ہوں، اور یہ پوری دنیا ایک پیشہ ور مجرم ... پھر نظریں چرائے تو دنیا مجھ سے چرائے۔ میں کسی سے کیوں کترانے لگی۔

میں تو اس وقت بھی آئینے کے سامنے بیٹھی ہوں لیکن لیکن یہ آئینہ — شیشے کا ٹکڑا — بیچارہ چہرے کے بھدے خدوخال کے سوا اور دکھا ہی کیا سکتا ہے!

میرا چہرہ میری نظروں کے سامنے ہے۔ میں نے آج خوب سنگار کیا ہے خوب سج دھج رہی ہوں۔ اور اتنی سج دھج کے بعد میں اپنے آپ سے پوچھ رہی ہوں۔

'شبنم! کیا تیرا روپ، تیری سندرتا، تیرے ناز و انداز اس قابل ہیں کہ کسی اچھے بھلے ہوشمند آدمی کو پاگل بنا سکیں؟'

اس سوال کو میں اپنے آپ سے کئی بار پوچھ چکی ہوں — پوچھے جا رہی ہوں — 'بتا نا شبنم! کیا تیرا روپ — تیرا حسن اس قابل ہے کہ ...' — لیکن جواب میں ہر بار میرے ہونٹوں پر صرف ایک مسکراہٹ پھیل کر رہ جاتی ہے۔ بے معنی سی مسکراہٹ! نہ جانے اس مسکراہٹ کا کیا مطلب ہے کوئی نہیں ہے جو اس مسکراہٹ کا مفہوم مجھے سمجھائے — اگر — اگر یہ میرے سوال کا مثبت جواب ہے تو — تو حسن — جنہیں میں نے اپنی روح کا خلوص بخشا، جن کے قدموں میں اپنی ساری عمر کی عقیدت، اپنی محبت نثار کر دی۔ وہی مجھ سے منہ موڑ کر، میرے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر کیوں چلے گئے — کیوں آخر کیوں؟

وہ لمحہ — وہ دن آج بھی میرے ہر احساس پر بھاری ہے۔ جب میں نے سارے زمانے کا سوز و گداز اپنائیت اور چاہت سمیٹ کر حسن سے کہا

تھا ـــــ ـــــ

"میرے محسن!"

"ہوں"

"میں جب تم سے دُور ہوتی ہوں، اور تمہاری یاد میں محبت کا کوئی نغمہ گنگناتی ہوں تو وہ صرف نغمہ ہی نہیں ہوتا میری لاچاری بھی ہوتی ہے ـــــ"

"تم تو پاگل ہو!"

"تم نے ٹھیک کہا محسن! لیکن سوچتی ہوں۔ کیا میں اب ایسی ہو گئی ہوں کہ پاگلوں کو بھی پاگل نظر آتی ہوں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب تم شاید کبھی نہ سمجھو گے محسن ۔ جانتے ہو بچپن میں میری ایک سہیلی تھی۔ ہاں میں اُسے سہیلی ہی کہوں گی ـــــ حالانکہ میری اور اُس کی عمر میں بہت فرق تھا۔ میں نے بس ابھی ہوش ہی سنبھالا تھا اور وہ جوان ہو چکی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ بے حد حسین ـــــ میں اُس سے بے پناہ پیار کرتی تھی اور وہ بھی مجھے بے حد چاہتی تھی نہ جانے کیوں ـــــ"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر ایک دن میں نے سُنا، اُس کی برات آنے والی ہے ـــــ اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ برات کے بعد وہ اِس شہر کو دور کسی دوسری جگہ چلی جائے گی ـــــ میں یہ سنتے ہی اپنی سہیلی کی گود میں مُنھ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ روتی رہی۔ یہاں تک کہ اُس کی برات بھی آ گئی۔ میری سہیلی کا خوب سنگار کیا گیا۔ اُسے خوب سجایا گیا ـــــ شاید اِسی کو دُلہن بننا کہتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا، اور اُس سے لپٹ گئی تھی۔ برات آئی اور آ کر واپس چلی گئی۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہوئی، میری سہیلی براتیوں کے ساتھ نہیں گئی۔ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی ـــــ خوشی سے اِدھر اُدھر اُچھلتی پھری۔ لیکن میری سہیلی ـــــ؟؟ وہ ـــ وہ تو برابر روتی رہی۔ میں اُس کے رونے کا سبب جاننا چاہتی تھی۔ میں نے سب سے پوچھا۔ لیکن یا تو کسی نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔ یا اُن کا بتایا ہوا میری سمجھ میں نہ آیا ـــــ اور میں اُس کے آنسو پونچھتے پونچھتے ہی بڑی ہو گئی۔ لیکن اس وقت تک میری سہیلی کے چہرے پر جُھریاں پڑ چکی تھیں ـــــ وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو گئی تھی اور تب مجھے پتہ چلا کہ اُس کے گھر والے وعدے کے مطابق جہیز کا انتظام نہ کر سکے تھے۔ برات اسی لئے واپس چلی گئی تھی۔

جس دن مجھے اس تلخ حقیقت کا علم ہوا تھا۔ اُسی دن، اُسی لمحے اچانک زندگی میں پہلی بار میں نے اپنے بارے میں سوچا تھا ـــــ آئینے میں خود کو دیکھا تھا۔ اپنی مجبوریوں کی طرف دیکھا تھا جس کی ساری عمر میرے باپ کے ظلم و ستم سہتے ہوئے گُذری تھی ـــــ اپنے حالات کی طرف دیکھا تھا اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے تھے۔ میری آنکھوں میں کڑوا دھواں بھر گیا تھا اور میں روئے جا رہی تھی۔ وہ دھواں میری بدصورتی کا تھا۔ میری ماں کی مجبوری کا تھا ـــــ یا میرے گھر کے بگڑے ہوئے حالات کا تھا، مجھے نہیں معلوم ـــــ میں تو بس روئے جا رہی تھی۔ روتی جا رہی تھی کہ اچانک مجھے ـــــ تم مل گئے ـــــ میرے محسن! میں سوچتی ہوں اگر تم مجھے نہ ملے ہوتے تو وہ کڑوا دھواں میرے حلق میں پھنس گیا ہوتا اور میں کب کی مر چکی ہوتی!!

"شبنم!"

"اوں"

"تم بات کہیں سے شروع کرو۔ آخر میں تان اپنی ہی ذات پر لا کر توڑتی ہو"

"محسن! تم سچ مچ ہی میرے محسن ہو۔ تمہاری نظروں نے مجھے کسی قابل سمجھا۔ تمہارا یہ احسان میں ایک لمحے کو بھی نہیں بھول پاتی ہوں۔ اِسی لئے میں اپنے آپ کو نہیں بھول پاتی ہوں ـــــ"

"شبنم بات اپنی ہو یا پرائی لیکن بات کرتے وقت انصاف کو ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہئے"

"میں نے کون سی ناانصافی کی محسن!"

"تم نے اپنی سہیلی کی کہانی اِس انداز سے سُنائی جیسے ساری ہمدردیاں کی مستحق صرف تمہاری سہیلی ہی ہو"

"اور تمہارے نزدیک کیا یہ حقیقت نہیں ہے محسن؟"

"نہیں شبنم نہیں ـــــ آخر اُس انسان کی بھی تو اپنی کچھ تمنائیں، کچھ خواب اور کچھ مجبوریاں ہوں گی"

"محسن! یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میرا جی دھڑکنے لگا ہے!"

"کیوں؟"

"نہ جانے کیوں محسن ـــــ اچھا چھوڑو دوسروں کی باتیں ـــــ تم ـــــ تم میرے بارے میں بتاؤ ـــــ میرے بارے میں!"

"ہم دونوں ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں"

"اور ـــــ ـــــ؟"

"اور ـــــ اور بس"

"اور ـــــ اور کچھ بھی نہیں ـــــ کبھی بھی نہیں؟"

محبت سادہ اور سیدھی سی بات ہے شبنم! ہر لڑکی چاہتی ہے کہ اُسے کوئی پیار کرے۔ بیاہ کر جائے نہیں اس کی تو چاہ کرے —— تمہارے اندر بھی جذبہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہارے اِس جذبے کو کہیں سے کوئی بڑھاوا نہ ملا۔ میں نے تمہارے جذبے کی قدر بھی کی اور شاید حوصلہ افزائی بھی —— لیکن اِس کے یہ معنی تو نہیں کہ ——"

"محسن! تم فریبی ہو! مکار ہو! جھوٹے ہو! تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ میں تمہارا منہ نوچ لوں گی! تمہارا خون پی جاؤں گی —— میں ——"

اور آج میں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے چہرے کے اُن نشانات کو دیکھ رہی ہوں —— جو نشان اُس دن میں نے محسن کے بجائے اپنا ہی چہرہ نوچ کر ڈال لئے تھے۔ اُن نشانوں نے میرے چہرے کے بھدے پن میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ جبھی تو آج اتنی رات گئے میں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے آپ سے پوچھ رہی ہوں "بتا شبنم! کیا تیرا روپ، تیری سندرتا اور تیرے ناز و ادا اِس قابل ہیں کہ کسی اچھے بھلے خوش شکل آدمی کو پاگل بنا سکیں ...؟"

اور جواب میں ایک بار پھر میرے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ میں اس مسکراہٹ کو دیکھ کر ایک بار پھر سوچ رہی ہوں، اس بار کی یہ مسکراہٹ اگر میرے سوال کا نفی میں جواب ہے تو —— تو اختر —— ہاں اختر جن پر میں نے خلوص تو خلوص کبھی اپنائیت کی ایک نظر بھی نہ ڈالی کبھی کچھ نہ دے سکی میں انھیں۔ پھر وہ میرے لئے کیوں دیوانے ہیں؟ ہاں یہ اُن کی دیوانگی ہی تو ہے جس کے تحت انھوں نے اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا ہے۔ آج سہ پہر ہی تو انھوں نے اپنا فیصلہ بتاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

"شبنم!"

"ہوں"

"جانتی ہو میری بہن کی شادی جس کے ساتھ ہونے والی ہے وہ میری بہن کا بہت اچھا دوست ہے۔"

"ہوگا۔"

"نہیں —— وہ ایک دوسرے سے —— محبت کرتے ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟"

"میرا مطلب ہے اگر —— اگر اُن دونوں کی شادی نہ ہوسکی تو وہ یا تو —— چھپ کر کہیں بھاگ جائیں گے یا زہر کھالیں گے۔"

"پھر ——؟"

"اِس کا اثر میری چھوٹی بہنوں پر بھی پڑے گا —— بدنام ہو جائے گا اور پھر اُن کی شادیوں میں بھی دشواری ہوگی۔"

"پھر اُن دونوں کی شادی کردو۔"

"کیسے کردوں شبنم —— اُس لڑکے کی بھی تو ایک بہن ہے۔"

"اور اس نے تمہاری بہن کی شادی ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تم اُس لڑکی کی بہن سے شادی کرو!"

"ہاں —— ہاں شبنم —— یہی وہ بات ہے جسے میرے ماں باپ اور میری سسرال والے مجھ سے کہنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے کہتے ہیں۔"

"پھر —— پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"م —— م —— میں —— میرے سوچنے کے لئے کیا ہے۔ شبنم! میں نے تم سے صرف محبت ہی نہیں کی تمہاری پرستش کرتا ہوں تمہیں پوجتا ہوں۔ تمہارا حسین تصور، تمہارا ہوشربا حسن مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی کب دیتا ہے ——"

"پھر —— ؟"

"پھر کچھ نہیں شبنم —— میں نے یہاں سے سینکڑوں میل دور بہت قصداً اپنا ٹرانسفر کروالیا ہے اور کل صبح ہم چپ چاپ اپنی شادی کورٹ میں کرکے یہاں سے ہمیشہ کے لئے چل پڑیں گے —— بس یہی میرا فیصلہ ہے ——"

"اختر!"

"ہوں ——"

"اپنا فیصلہ سُناتے وقت تمہاری آواز بھرا کیوں گئی تھی؟"

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں شبنم —— اپنے بوڑھے ماں باپ کا خیال آگیا تھا۔"

"تم بہت بزدل ہو اختر —— میں ایسے بزدل کے ساتھ ..."

"نہیں نہیں شبنم —— خدا کے لئے کچھ بُرا منہ سے مت نکالو نہیں تو میرا دم گھٹ جائے گا —— وہ تو بس —— بس یوں ہی نہ جانے کیوں ایک خیال سا آگیا تھا —— تمہارے بغیر تو شبنم سانس لینا بھی گناہ ہے —— عذاب ہے —— میں اپنا فیصلہ تو تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ تم میرے فیصلے سے متفق ہو نا —— ؟"

"لیکن آئندہ تمہارے اندر ایسی کمزوری کے آثار دیکھنا میں برداشت نہیں کروں گی!"

"بالکل نہیں شبنم —— آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوسکتا۔ کبھی نہیں!"

اور اُس کے بعد میں اِس وقت رات کی تنہائی میں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے چہرے کو دیکھ دیکھ کر خود سے سوال کر رہی ہوں۔ "بتا شبنم! کیا تیرا رُوپ تیرا حُسن اس قابل ہے کہ" —— لیکن اب یہ سب کچھ سوچنے کی مجھے ضرورت ہی کیا ہے —— اختر اپنا فیصلہ مجھے بتا چکے ہیں۔ بس اتنا کافی ہے —— ہُنہ! بیچارے اختر!! عجیب ذات ہوتی ہے اِن مَردوں کی بھی —— نہیں جُھکتے تو آسمانوں کی بلندی اور عرش کی عظمت کے آگے بھی جبیں جُھکتے اور جُھکتے ہیں تو خندق اور کنواں کچھ نہیں دیکھتے —— لیکن میں اب اِس طرح سے کیوں سوچ رہی ہوں۔ میں خود جب تاریکیوں میں گر رہی تھی —— جب مجھے سہاروں کی ضرورت تھی۔ جب میرا خلوص۔ میری رُوح کا تقدس مجروح ہو کر چیخ اُٹھا تھا۔ تب کسی نے میرا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ کسی نے مجھ پر رحم نہیں کھایا تھا —— میں بدصورت ہوں: اس احساس نے مجھے گُھلا گُھلا کر مارا ہے —— میری مجبور ماں میرے لئے جہیز کا انتظام نہیں کر سکتی۔ اس تصور نے مجھے بھری جوانی میں گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا —— میں نے جن کی نظرِ عنایت کی پرستش کی جنہیں سب سے بڑا مُحسن سمجھ کر سر جُھکایا وہی مجھ سے مُنہ موڑ کر چل دئے —— آج عمر کے جس موڑ پر میں پہنچ گئی ہوں۔ وہاں اختر کے پاگل پن کے سوا میرا بھی ہاتھ کون تھام سکتا ہے —— پھر —— پھر دنیا مجھ سے کس مُنہ سے رحم کی بھیک مانگ سکتی ہے —— یہ دنیا —— ظلم کی مستحق دنیا —— میں بھی اس پر ستم ڈھاؤں گی —— جی بھر کے —— ہاں جی بھر کے ——

میرے ذہن میں اب کوئی انتشار نہیں —— بس ایک واضح تصویر ہے۔ حالات کی —— معاملات کی —— جبھی تو میں آئینے کے پاس سے اُٹھ کر اب اپنے بستر میں آگئی ہوں —— مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں اب سونا چاہتی ہوں —— میں اب سوؤں گی —— اطمینان سے ——!!

---

اور اگلے دن صبح پروگرام کے مطابق جب اختر شبنم کے کمرے میں داخل ہوا تو شبنم سر سے پیر تک چادر تانے بے خبر سو رہی تھی —— لیکن اُس کے پلنگ کے پاس ہی میز پر اختر کے نام شبنم کا لکھا ہوا ایک خط رکھا تھا۔ اختر نے خط اُٹھا لیا —— لکھا تھا —— "کل جب اپنا فیصلہ سُناتے ہوئے تمہاری آواز بھرائی تھی۔ اُسی وقت میرے اندر —— دُور کہیں —— میری رُوح بھی زور زور سے پھڑپھڑائی تھی —— ایسے جیسے صیاد کی گرفت میں پرندہ آخری بار رہائی کے لئے کوشش کرتا ہے۔ میرا آج کا فیصلہ اُسی لمحے کی سوغات ہے —— دیکھنا یہ برباد نہ جائے ——

تمہاری
شبنم"

اور اختر نے جھپٹ کر شبنم کے چہرے سے چادر ہٹا دی —— اور وہ سہم گیا —— شبنم کا چہرہ بھی ڈھلی ہوئی چاندنی کی طرح زرد تھا [illegible] جس میں زندگی کی ایک رمق تک نہ تھی !!

---

# غزل

سید حجاب ترمذی

دل کی دُنیا تباہ کون کرے؟ — رات دن آہ آہ کون کرے؟
ہر نفس آہ آہ کون کرے؟ — دل کو اتنا تباہ کون کرے؟
قلبِ کونین تھر تھرا اُٹھا — نالۂ بے پناہ کون کرے؟
حُسنِ بے پردہ حُسن ہی کیا ہے — اُس کی جانب نگاہ کون کرے؟
اے تغافل شعار تیرے سوا — پُرسشِ گاہ گاہ کون کرے؟
حُسن کی شان جَور پرور ہے — جرأتِ رسم و راہ کون کرے؟
لذّتِ سوزِ ضبطِ آہ نہ پوچھ — غم سے گھبرا کے آہ کون کرے!
نظر آتے ہیں پھول افسردہ — سُوئے گُلشن نگاہ کون کرے؟
رشکِ فردوس ہے یہ دنیا بھی — حُور و غلماں کی چاہ کون کرے!
جاں بلب کوئی ہے تو ہونے دو — زحمتِ یک نگاہ کون کرے؟
کم نہیں اِن سے ذرّہ ہائے وطن — حسرتِ مہر و ماہ کون کرے؟

جیسی کچھ مرضئ خدا ہو حجاب
خواہشِ عزّ و جاہ کون کرے؟

# قرۃ العین حیدر سے انٹرویو

________ نریش کمار شاد

۹۳ (۱۹۵ - اے، اولڈ) گوتم پور - دہلی

۱۳ مئی ،۷۶ء — مخدومی خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

یہ تمام مہینہ سیر و سیاحت میں گزرا۔ پنجاب میں جانے کے بعد ۱۲ مئی کو حیدر آباد پہنچا۔ وہاں اس رات کو ادبی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ایک آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ کئی سال کے بعد ایسے شائستہ اور معیاری مشاعرے میں شامل ہونے کی مسرت مجھے نصیب ہوئی جس کے سامعین واقعی باذوق اور زیادہ تر شعراء فی الواقع آزری شاعر اور محض موسیقار نہیں تھے۔ عام طور پر آج کل جس نوعیت کے مشاعرے ہو رہے ہیں اس کے پیشِ نظر تو میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ ؎

قوال سے کوئی اور افسر کوئی — ملتا نہیں ڈھونڈے سے سخن ور کوئی
اس دور میں اردو کا نہیں ہے دشمن — اردو کے مشاعرے سے بڑھ کر کوئی

لیکن حیدر آباد کے اس مشاعرے نے میرے نقطۂ نظر کی تردید میں بہت خوبصورت اور جیتا جاگتا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ مشاعرے میں دوسرے شعراء کے علاوہ شکیل بدایونی بھی شامل تھے اور انھیں کے اصرار پر دوسرے دن میں ان کے ساتھ ہوائی جہاز کے ذریعے حیدر آباد سے بمبئی پہنچ گیا۔ سفر کے دوران میں آپ کا بہت ذکر رہا۔ شکیل صاحب کو افسوس تھا کہ اپنی علالت کی بنا پر وہ "بیسویں صدی" کی قلمی اعانت سے معذور رہے ہیں۔ بمبئی پہنچ کر سب سے پہلا کام انھوں نے یہی کیا کہ اپنا تازہ ترین غیر مطبوعہ کلام "بیسویں صدی" کے لئے نوٹ کرنے کے بعد میرے حوالے کیا۔ جو اس خط کے ساتھ ہی آپ کو بھیج رہا ہوں۔ بمبئی میں کئی ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ سب سے زیادہ دلچسپ ملاقات جس باوقار ادبی شخصیت سے ہوئی اور جو باتیں ہوئیں وہ انٹرویو کی صورت میں ملاحظہ فرمایئے۔

آپ کا ________ نریش کمار شاد

---

ش۔ محترمہ! سب سے پہلے تو یہ فرمایئے کہ مختصر افسانے کی آپ کے نزدیک مختصر ترین تعریف کیا ہے؟

ق۔ فنی اعتبار سے پڑھنے والے پر یہ ظاہر نہ ہو کہ جو بات کہی گئی ہے وہ ادھوری رہ گئی ہے۔ حالانکہ بعض اوقات ادھورا پن ہی کسی مختصر افسانے کا حُسن ثابت ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر افسانے کو پینٹنگ کے نقطۂ نظر سے دیکھنے والے چند خطوط سے پوری تصویر کو بھی اُبھار کر کیا جا سکتا ہے اور Miniature مصوری کے مانند جزئیات سے بھرپور افسانہ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن بہر صورت موضوع پر گرفت مضبوط ہونی چاہیئے۔ علاوہ ازیں فنکار کے لئے خلوص اور دیانت داری بھی بے حد ضروری ہے۔

ش۔ آپ کے آخری جملے سے مجھے بے اختیار پریم چند کا خیال آ گیا ہے۔ یہ بتایئے کہ پریم چند کے بعد آپ اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کسے مانتی ہیں؟

ق۔ پریم چند بلاشبہ اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار تھے۔ اُن کی تاریخی اہمیت بھی

مسلّم ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُن کے ناولوں اور افسانوں کی تکنیک پُرانی ہے جیسے رابندر ناتھ ٹیگور کے ناولوں اور افسانوں کی تکنیک پُرانی ہے۔ پریم چند کے بعد سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی اور جیلانی بانو بھی ایسے افسانہ نگار ہیں جو بخوبی جانتے ہیں کہ افسانہ کیوں کر لکھا جاتا ہے۔ محمد حسن عسکری اور عزیز احمد نے بھی جب تک لکھا بہت اچھا لکھا ہے۔ بالکل نئے افسانہ نگاروں میں بھی بعض لوگ بہت اچھے افسانے لکھ رہے ہیں۔

ش ۔ آپ نے لکھنا کب شروع کیا؟

ق ۔ جب میں شاید چھ برس کی تھی۔ اُس وقت گڑیوں کی ایک کہانی لکھی تھی۔ ذرا اور بڑی ہونے پر میں نے اپنی گڑیوں کا اسکول کھولا تھا اور اُن کے لئے چھوٹی چھوٹی چار ورقی "کتابیں" لکھی تھیں۔ پھر ۱۹۳۸ء بچّوں کے مشہور اخبار "پھول" میں لکھنا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۴ء میں "ہمایوں" میں "یہ باتیں" کے عنوان سے میرا پہلا افسانہ شائع ہوا۔

ش ۔ آپ کی ادبی زندگی میں کیا کسی نے آپ کی رہنمائی بھی کی؟

ق ۔ کسی نے قطعاً کوئی رہنمائی نہیں کی۔ والدِ محترم سجّاد حیدر یلدرم زندہ ہوتے تو کچھ سمجھاتے اور اصلاح دیتے لیکن جب میں نے افسانے لکھنے شروع کئے تو اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ اُس زمانے کی میری تحریروں کو جو بے حد مقبول ہوئیں آج تک بہت سے نوعمر لڑکے اور لڑکیاں اپنا ماڈل بنائے ہیں اور اُسی انداز کے افسانے لکھ رہے ہیں۔

ش ۔ کیا ادیب پیدائشی ہوتا ہے یا بنایا بھی جا سکتا ہے؟

ق ۔ پیدائشی Talent بھی ہوتا ہے اور ماحول کے اثرات بھی ادبی ذوق کی نشوونما کر سکتے ہیں لیکن امریکن یونیورسٹیوں کے Writers Workshops میری نظر میں بے معنی ہیں۔

ش ۔ کیا آپ اپنی کسی ادبی تخلیق پر نادم بھی ہیں؟

ق ۔ میں سولہ سترہ برس کی عمر سے افسانے لکھ رہی ہوں۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی تخلیقات نا پختہ تھیں اور اب اُن کے متعلق سوچ کر ہنسی آتی ہے۔

ش ۔ ابتدا میں تو شاید آپ کو یہ سوال عجیب سا معلوم ہوتا لیکن اب تو آپ بآسانی تجزیہ کر سکتی ہیں کہ آپ لکھنے کیوں لگیں؟

ق ۔ بعض گھرانوں کا ماحول ادبی ہوتا ہے جیسے بعض گھرانوں کے ماحول پر میوزک، اسپورٹس یا سیاست کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ جس خاندان میں آنکھ کھولی کئی

نسلوں سے کچھ پڑھنا ہی اُن کا معمول تھا۔

ش ۔ شروع میں آپ نے اپنے والدِ محترم کی تصنیفات [illegible]

ق ۔ شعوری طور پر تو نہیں نیم شعوری طور پر ممکن ہے کیا ہو [illegible] بے حد نفیس اور خوبصورت تھی لیکن میں کچھ روزمرہ زبان لکھتی ہوں جس میں انگریزی الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ حالانکہ مجھے چاہئے تھا میں اُن کے اسلوب کی پیروی کرتی لیکن اس کھچڑی زبان لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ [illegible] کی انگریزی کی بولی اور وہ سب آس پاس کے لوگ بولتے ہیں، اُس ماحول کی عکّاسی کرتے کرتے وہی زبان بھی لکھنے لگی۔

ش ۔ اب یہ بتلائیے کہ آپ افسانہ لکھنے کیسے لگی ہیں؟

ق ۔ کوئی بھی خیال، واقعہ یا کردار مجھے افسانہ لکھنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ بعض موضوع ایسے Compelling ہوتے ہیں کہ اُن کے متعلق لکھنا ہی پڑتا ہے کیونکہ لکھنے سے انسان کو ایک طرح کا Liberation حاصل ہو جاتا ہے۔

ش ۔ کیا افسانہ لکھنے سے پہلے اُس کی تکنیک کے بارے میں بھی آپ سوچتی ہیں؟

ق ۔ جی نہیں۔

ش ۔ ظاہر ہے کوئی ادیب سماجی شعور کے بغیر ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا لیکن کیا سیاسی شعور کے بغیر بھی ادب کی تخلیق ممکن نہیں ہے۔

ق ۔ اس ضمن میں کوئی کُلیہ وضع نہیں کیا جا سکتا۔ ہر لکھنے والے کی الگ الگ اُفتادِ طبع ہوتی ہے۔ بہت سے لکھنے والے ایسے ہوتے ہیں جو براہِ راست کسی مخصوص سیاسی نظریے سے وابستہ نہیں ہوتے پھر بھی جو شخص لکھنا شروع کرے گا اُس میں کم از کم اتنا شعور تو ہوگا ہی کہ وہ کیوں اور کن حالات میں لکھ رہا ہے۔ پھر بھی سیاسی نظریہ ادیب کا خالص ذاتی امر ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ وقتی حالات کا اُس دور کے ادب پہ اثر پڑتا ہے۔

ش ۔ اس مقام پر میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟

ق ۔ ہندوستان کے لئے اُنھیں آدرشوں کی ضرورت ہے جن کی بنیاد پر ملک کی قومی تحریک کا آغاز ہوا۔ آج کے حالات میں مجھے تو ایک متوازن قوم پرستی اور سوشلسٹ ہیومنزم کا سسٹم ہی معقول رویہ معلوم ہوتا ہے۔

ش ۔ حُبّ الوطنی اور بین الاقوامی اقدار میں آپ کس کو ترجیح دیتی ہیں؟

ق ۔ یہ سلسلہ ہمارا اور آپ کا [illegible] دنیا ایک ہے [illegible] میں ساری دنیا کا مستقبل ہمارا اپنا مستقبل ہے [illegible]

[illegible] کی تلاش ہوتی ہے۔

ش۔ لیکن بعض حالات میں شعبۂ الٰہی کا حسن کی ایک صورت ہی تو اختیار کر سکتی ہے اور اس صورت میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔

ق۔ کسی خاص صورتِ حال پر میں کوئی بات نہیں کہہ رہی ہوں۔ یہاں مسئلہ وفاداریوں کا ہے جو ایک بہت اہم اور بنیادی انسانی مسئلہ ہے۔

ش۔ اُردو کے ترقی پسند ادب کی تحریک سے آپ کس حد تک متاثر ہیں؟

ق۔ میں نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا لیکن میں انھیں ترقی پسند ادیبوں سے متاثر تھی جو کلاسیکی اُردو ادب کی طرح ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں نے اس وقت کے مروجہ ترقی پسند موضوعات پر نہیں لکھا اور نہ کسی ادیب کے اسٹائل کا شعوری طور سے اثر قبول کیا۔ ہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھے اس زمانے میں بڑا سخت ری ایکشنری افسانہ نگار سمجھا جاتا تھا۔ یہاں پر ہماری جدید تنقید کے Grooves کی بات آ جائے گی۔

ش۔ کیا ادیب اور انا کا چولی دامن کا ساتھ ہے؟

ق۔ ہر وہ شخص جو زندہ ہے ایک مجسم انا ہے۔ اس کی اپنی ایک شخصیت ہے۔ اس لئے ہر شخص میں انا کا ہونا انسانی فطرت کا تقاضا ہے لیکن ایک فن کار میں دوسرے لوگوں کی بہ نسبت انا کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہی انا جب بڑھ جاتی ہے تو بیمارانہ قسم کے Egoism اور Egotism میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو فنکار جیسے اداکار یا مغنی Performing arts سے تعلق رکھتے ہیں ان میں انا بھی زیادہ ہوتی ہے۔

ش۔ ایک ادیبہ کی حیثیت سے آپ اپنے آپ کو اُردو ادب میں کیا اہمیت دیتی ہیں؟

ق۔ میں اپنے آپ کو ادیب کی حیثیت سے کوئی بڑی اہمیت نہیں دیتی۔ ادیب ہونا میرے لئے کوئی Personality Problem نہیں ہے۔

ش۔ یہ آپ مانتی ہیں کہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت ادیب میں انا زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عام انسانوں کی بہ نسبت [illegible] کا احساس بھی زیادہ ہوگا۔ براہِ کرم وضاحت سے فرمائیے کہ آپ ذاتی طور پر شہرت کو کیا اہمیت دیتی ہیں؟

ق۔ بات یہ ہے کہ [illegible]
[illegible]

بنانے کے لئے پبلسٹی کی ہے۔ اس لئے میں ادبی پبلسٹی کی حقیقت سے بھی خوب واقف ہوں۔ شہرت کا Phenomenon مجھے کافی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے میرے خلاف جب لکھا جاتا ہے اور زیادہ تر میرے خلاف ہی لکھا جاتا ہے تو میں اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی ہوں۔ اس لئے آپ نے "قرۃ العین کا فن"، "میرے افسانے میری نظر میں" وغیرہ قسم کے مضامین نہ پڑھے ہوں گے۔ میرے ناول "آگ کے دریا" کے خلاف بھی جو عجیب و غریب اور بے سر و پا مضامین لکھے گئے میں نے ان کی تردید یا اپنی موافقت میں بھی کچھ نہیں لکھا یا لکھوایا۔ پھر بھی بعض اوقات کچھ لوگوں کی دروغ بیانی پر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ انھیں دنوں میں نے کسی رسالے میں پاکستان کے ایک ناول نگار عبداللہ حسین سے ایک انٹرویو پڑھا جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ان کی نظر میں قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں ہے اور وہ اس سے بالکل متاثر نہیں ہیں لیکن ان کے جس ناول "اداس نسلیں" کے سلسلے میں ان سے یہ انٹرویو لیا گیا تھا اس میں پورے کے پورے صفحے، پیراگراف اور مکالمے میرے ناولوں "میرے بھی صنم خانے"، "سفینۂ غمِ دل" اور "آگ کے دریا" سے ماخوذ ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے یہاں غیر جانبدارانہ اور متوازن ادبی تنقید کا خاصہ فقدان ہے۔ ہمارے یہاں جو چند اچھی چیزیں لکھی جاتی ہیں یا تو انھیں آسمان پر چڑھایا جاتا ہے یا ان کے خلاف مہم شروع کر دی جاتی ہے۔ چھوٹے ہی پیمانے کے ادب میں یہ صورتِ حال ممکن ہے۔

ش۔ کیا خیال ہے آپ کا کیا ادب ادیب کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے؟

ق۔ اس سلسلے میں بھی کوئی کلیہ وضع نہیں کیا جا سکتا کیونکہ چند جرائم پیشہ حضرات بھی بڑے ادیب رہ چکے ہیں اور ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسانی ذہن بے حد عجیب و غریب اور ناقابلِ فہم ہے۔ وہ طرح طرح سے اپنا اظہار کرتا ہے اور مختلف طریقوں پر انسان کی پہلودار شخصیت کے نقش و نگار اُجاگر کرتا ہے۔

ش۔ آپ کا شوقِ سیاحت تو خیر موروثی ہے۔ یہ بتلائیے کہ آپ نے دنیا کے کس کس ملک کی سیاحت کی؟

ق۔ بہت بچپنے سے بہت سفر کئے ہیں۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو مغرب اور مشرق کے بیشتر ممالک کی سیاحت کی۔

ش۔ اس سیاحت نے آپ کی تخلیقی صلاحیتوں پر کیا اثر ڈالا؟

ق۔ مجھے انسانوں سے بے حد دلچسپی ہے اور میں نے مشرق اور مغرب کے ہر ملک میں

ہیں۔ ان کے جذبات، ردِ عمل اور ذہنی
رویوں میں تہذیبی، تاریخی اور نسلی تفاوت کے باوجود زیادہ فرق نہیں۔ اسی
سے انسانیت کی ایکتا مجھے ایک بے رنگ سیاسی نعرہ نہیں معلوم ہوتی۔

ش۔ اس ملاقات سے آپ کو یہ اندازہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ ہمارے یہاں کے
ادب کا میدان نسبتاً محدود ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟

ق۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ۸۰ فیصدی قوم جاہل ہے۔ دوسری وجہ یہ
ہے کہ تعلیم یافتہ انھیں کو سمجھا جاتا ہے جنھوں نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے۔
جو صرف دیسی زبانیں جاننے والے تقریباً لوگ لٹریچر کے زمرے میں شمار
کئے جاتے ہیں۔ لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد کم ہے اس لئے ادب کا
سکوپ بھی کم ہے۔ جس ادب کا سماج سے رشتہ پیدا کرنے کی ضرورت محسوس
کی جاتی ہے اس سماج کی اکثریت ادب کو سمجھنا تو درکنار پڑھنا بھی نہیں
جانتی۔ ہمارا ادب ہماری سیاسی اور اقتصادی مجبوریوں کا شکار ہے۔

ش۔ مغربی ادب سے تو آپ خاص طور پر بہت زیادہ متاثر ہیں۔ یہ بتایئے کہ
آپ کے پسندیدہ مغربی ادیب کون کون سے ہیں؟

ق۔ انگریزی ایم۔ اے میں میرا مضمون تھا۔ جدید انگریزی ادب پر میں نے انگلستان
میں ایک کورس بھی کیا تھا اور جدید انگریزی شاعری اور ناول میرا خاص
موضوع رہے ہیں۔ میرے پسندیدہ مصنفوں کی فہرست بہت زیادہ طویل
ہے۔ میرے لئے ایک Myth یہ ہے کہ ورجینا وولف سے بہت زیادہ متاثر
ہوئی ہوں لیکن میرے جن افسانوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ورجینیا کا
ان پر بہت زیادہ اثر ہے وہ میں نے اس زمانے میں لکھے تھے جب میرا انگریزی
ادب کا مطالعہ ایم۔ اے کی کتابوں سے آگے نہ تھا۔ دوسری Myth میرے
لئے یہ ہے کہ فیوڈل طبقے کی نقیب ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس طبقے سے بخوبی
واقف ہونے کی وجہ سے میں نے اپنی تخلیقات میں اسی طبقے کی عکاسی کی
ہے۔ میں جب کسانوں سے واقف ہی نہیں تو ان کے بارے میں لکھتی
کیوں کر؟

ش۔ اور ہمارا جدید ادب خصوصاً افسانوی ادب مغربی ادب سے کس حد تک
متاثر ہے؟

ق۔ ہمارا پرانا بیشتر ادب تصوف کا ادب ہے۔ نثر میں داستانیں یا مذہبی علوم پر
کتابیں تھیں۔ سماجی اور سیاسی بے اطمینانی کا اظہار علامتوں کے ذریعے
شاعری میں بھی کیا گیا لیکن تاریخی وجوہ کی بنا پر ہمارے ہاں اور پورے مشرق
میں اس عقلیت پرستی اور تجدیدِ علوم کا زمانہ نہ آسکا جس کی وجہ سے

یورپ میں نشاۃِ جدید شروع ہوا۔ ترکی اور مصر [illegible]
کے اثرات ہی نے مشرق میں نیا ادب پیدا کیا۔ [illegible]
غلام تھے اس لئے ہم نے انھیں کی پیروی کی۔ [illegible]
نو آبادیوں نے فرانسیسی ادب کی تقلید کی۔ [illegible]
کے علاوہ جو کبھی غلام نہیں رہا ایشیا [illegible]
کمزور ہے جس کا سبب ظاہر ہے کہ ہم مغرب کی نقالی [illegible]
مجبور ہیں۔ مثال کے طور پر مغربی ایشیا [illegible]
ادب میں جو نئی تحریکیں شروع ہوئیں ان پر فرانسیسی [illegible] کی چھاپ تھی۔
ہمارا ماڈل برطانیہ کا وکٹوریائی لٹریچر تھا۔ ہمارے اور عرب کے اپنے مسائل
الگ تھے۔ اس لئے ہمارے ہاں شروع میں [illegible]
پھر سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں یعنی ہندوستان میں
[illegible] وائیں اور بائیں بازو کے سیاسی پروٹسٹ میں
تبدیل ہو گیا۔ مغرب ہی کے اثر سے ہمارے یہاں یہ نیا احساس بھی پیدا ہوا
کہ عوام تک ہمارا ادب پہنچنا چاہئے۔ شاعری میں [illegible] کے جو تجربے
ایذرا پاؤنڈ اور ان کا گروپ آج سے کوئی پچپن سال پہلے کر رہا تھا ہمارے
یہاں آج ہو رہے ہیں اور انھیں جدید شاعری کہا جا رہا ہے۔

ش۔ ہمارے یہاں کے جدید ترین ادبی رجحانات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ق۔ مغربی ادب نے مغرب کی مختلف سماجی، نفسیاتی، ذہنی اور روحانی الجھنوں
اور جنگ و امن کے مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ پہلے
حصولِ آزادی اور بھوک تھا۔ اب بھوک ہی بھوک ہے۔ ان کے ہاں افراط کا
سماج ہے لیکن ہمارے ذہنی مسائل دوسرے ہیں۔ ہمارے یہاں کرنے اور
سوچنے ہی کو کچھ نہیں۔ ہم تو محض اہلِ مغرب کی نقالی کر سکتے ہیں۔ ہمارا
سماج بھوکا اور جاہل ہے۔ ہمارا نیا فنکار بھی جب یہ کہتا ہے کہ میں تنہا ہوں
یا alienated ہوں یا Outsider ہوں تو اس کی تنہائی [illegible] سماج کے
آدرش کی تنہائی ہے جس کا سماج آزادی کے بعد بھی اب تک پنپ نہیں
سکا ہے اور اس کی تنہائی اور فرسٹریشن یورپ کے ادیبوں کی تنہائی
سے مختلف ہے۔ اکثر فنکاروں کے ذہنی ارتقا میں ایک ایسا مقام آتا ہے
جب وہ ادب کے مسلّمہ اصولوں سے بغاوت کرتے ہیں اور پھر اس مقام
سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ ابہام [illegible] کی باتیں [illegible] میں آتی ہیں
لیکن ادب کی تبلیغی Requirement [illegible]
کرتا ہے کیونکہ [illegible] کی Maturity کی ہر منزل [illegible]

[illegible] اعلیٰ پایہ کے
ناول [illegible] ناول بھی لکھے ہیں لیکن ہمارے
[illegible] کوئی ناول بھی نہیں لکھے [illegible]
[illegible] سٹوری پر ہنگامہ رہا ہے۔ ان کے باوجود ہمارے لکھنے والوں میں
بعض کامیاب ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں۔ تجربوں کی منزل سے گذر کر یقیناً
وہ زیادہ اچھا ادب تخلیق کریں گے۔ وقت سب سے [illegible] اور اصلی
کسوٹی ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہنا چاہوں گی
کہ ادبی دہشت پسندی ادب کی تہذیب سے مختلف چیز ہے۔ ہم اپنے
[illegible] ان کا ادب کرتے تھے۔ [illegible] ادیب اپنے
[illegible] کے لئے اپنی تحریروں میں کچھ بہت زیادہ مہذب الفاظ
استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ یہ رویہ غالباً بدلتی ہوئی قدروں کا عکاس ہے۔

ش ۔ آخر میں ہندوستان میں اُردو کے مسئلے پر کچھ فرمانے کی زحمت گوارا کیجئے۔

ق ۔ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ دیوناگری رسم الخط اُردو کی بقا کا ضامن ہو سکتا ہے مجھے ان سے اتفاق نہیں۔ ہر رسم الخط کا اپنا کیرکٹر ہوتا ہے۔ اُردو ایک زبان نہیں ایک تہذیب ہے۔

ش ۔ لیکن ہمارے یہاں اب اس تہذیب کا مستقبل کیا ہے؟

ق ۔ ہو سکتا ہے آئندہ [illegible] سال تک یہ تہذیب آثارِ قدیمہ میں شامل ہو جائے۔ کیونکہ نئے معاشرے میں اُردو [illegible] سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ سنجیدہ موضوعات پر بہت ہی کم کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ فلمی اور جاسوسی ہی رسالوں کے ذریعے اُردو عوام تک پہنچ رہی ہے۔ اُردو شاید بہ حیثیت اُردو زندہ نہ رہ سکے گی۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ البتہ فلموں کے ذریعے عوام کے اجتماعی شعور میں شامل ہو جائے گا اور وہ ہندی کہلائے گا۔ لیکن کون جانتا ہے کہ آج سے پچیس یا پچاس سال بعد ہندوستان کس سیاسی اور سماجی موڑ پر جا پہنچے گا۔ اُردو اور دوسرے قومی مسئلوں کے مستقبل کا انحصار دراصل آنے والے زمانے کے حالات پر ہے۔

---



نوٹ ۔ ہر [illegible] طلب فرمائیں۔

۔ یہی دیکھا کہ انسان بنیادی طور پر ایک ہیں۔ اُن کے جذبات، ردِ عمل اور ذہنی ہیئتوں میں تہذیبی، تاریخی اور نسلی تفاوت کے باوجود زیادہ فرق نہیں۔ اسی وجہ سے انسانیت کی ایکتا مجھے ایک بے گُن سیاسی نعرہ نہیں معلوم ہوتی۔

ش۔ اِن مباحث سے آپ کو یہ اندازہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ ہمارے یہاں کے ادب کا میدان نسبتاً محدود ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟

ق۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ۸۵ فیصدی قوم جاہل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ انھیں کو سمجھا جاتا ہے جنھوں نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے۔ بقیہ صرف دیسی زبانیں جاننے والے تقریباً لوک لٹریچر کے زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد کم ہے اِس لئے ادب کا سکوپ بھی کم ہے۔ جس ادب کا سماج سے رشتہ پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اُس سماج کی اکثریت ادب کو سمجھنا تو درکنار پڑھنا بھی نہیں جانتی۔ ہمارا ادب، ہماری سیاسی اور اقتصادی مجبوریوں کا شکار ہے۔

ش۔ مغربی ادب سے تو آپ خاص طور پر بہت زیادہ متاثر ہیں۔ یہ بتائیے کہ آپ کے پسندیدہ مغربی ادیب کون کون سے ہیں؟

ق۔ انگریزی ایم۔ اے میں میرا مضمون تھا۔ جدید انگریزی ادب پر میں نے انگلستان میں ایک کورس بھی کیا تھا اور جدید انگریزی شاعری اور ناول میرا خاص موضوع رہے ہیں۔ میرے پسندیدہ مصنفوں کی فہرست بہت زیادہ طویل ہے۔ میرے لئے ایک Myth یہ ہے کہ ورجینا وولف سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہوں۔ لیکن میرے جن افسانوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ورجینیا کا اُن پر بہت زیادہ اثر ہے وہ میں نے اُس زمانے میں لکھے تھے جب میرا انگریزی ادب کا مطالعہ ایم۔ اے کی کتابوں سے آگے نہ تھا۔ دوسری Myth میرے لئے یہ ہے کہ فیوڈل طبقے کی نقیب ہوں۔ ظاہر ہے کہ اُس طبقے سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے میں نے اپنی تخلیقات میں اُسی طبقے کی عکاسی کی ہے۔ میں جب کسانوں سے واقف ہی نہیں تو اُن کے بارے میں لکھتی کیوں کر؟

ش۔ اور ہمارا جدید ادب خصوصاً افسانوی ادب مغربی ادب سے کس حد تک متاثر ہے؟

ق۔ ہمارا پرانا بیشتر ادب تصوف کا ادب ہے۔ نثر میں داستانیں یا مذہبی علوم پر کتابیں تھیں۔ سماجی اور سیاسی [illegible] کا اظہار علامتوں کے ذریعے شاعری میں ہی کیا گیا لیکن تاریخی وجوہ کی بنا پر [illegible] مشرقی [illegible] اور جدید علوم کا [illegible]

[illegible] پھر جدید شروع ہوا۔ [illegible] مغرب [illegible] کے اثر ہی سے شروع ہوا۔ ادب پیدا کیا [illegible] غلام تھے اِس لئے ہم نے انھیں کی پیروی کی۔ [illegible] نو آبادیوں نے فرانسیسی ادب کی تقلید کی۔ [illegible] کے علاوہ جو کبھی غلام نہیں رہا ایشیا اور افریقہ [illegible] کمزور ہے جس کا سبب ظاہر ہے کہ ہم مغرب کی نقالی [illegible] پر مجبور ہیں۔ مثال کے طور پر مغربی ایشیا ہے۔ [illegible] ادب میں جو نئی تحریکیں شروع ہوئیں وہ فرانسیسی [illegible] کی چھاپ تھی۔ ہمارا ماڈل برطانیہ کا وکٹورین لٹریچر تھا۔ ہمارے اور مغرب کے مسائل الگ تھے۔ اِس لئے ہمارے ہاں شروع میں [illegible] پھر سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں یعنی ہندوستان میں Social protest دائیں اور بائیں بازو کے سیاسی پروٹسٹ میں تبدیل ہوگیا۔ مغرب ہی کے اثر سے ہمارے یہاں یہ نیا احساس بھی پیدا ہوا کہ عوام تک ہمارا ادب پہنچنا چاہئے۔ شاعری میں [illegible] کے تجربے ایذرا پاؤنڈ اور اُن کا گروپ آج سے کوئی پچپن سال پہلے کر چکا ہے۔ ہمارے یہاں آج ہو رہے ہیں اور انھیں جدید شاعری کہا جا رہا ہے۔

ش۔ ہمارے یہاں کے جدید ترین ادبی رجحانات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ق۔ مغربی ادب نے مغرب کی مختلف سماجی، نفسیاتی، ذہنی اور روحانی الجھنوں اور جنگ و امن کے مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ پہلے حصولِ آزادی اور بھوک تھا۔ اب بھوک ہی بھوک ہے۔ اُن کا [illegible] سماج ہے لیکن ہمارے ذہنی مسائل دوسرے ہیں۔ ہمارے یہاں [illegible] سوچنے ہی کو کچھ نہیں۔ ہم تو محض اہلِ مغرب کی نقالی کر سکتے ہیں۔ ہمارا سماج بھوکا اور جاہل ہے۔ ہمارا نیا فنکار بھی جب یہ کہتا ہے کہ میں تنہا ہوں یا Outsider ہوں تو اُس کی تنہائی Conventional [illegible] کے آرٹسٹ کی تنہائی ہے جس کا سماج آزادی کے بعد بھی اب تک [illegible] سکا ہے اور اُس کی تنہائی اور فرسٹریشن یورپ کے ادیبوں کی [illegible] سے مختلف ہے۔ [illegible] فنکاروں کے ذہنی رجحانات [illegible] جدید ادب [illegible]

[illegible]

... کر رہا ہے۔ جہاں تک اعلیٰ پایے کے
ناول لکھنے کا تعلق ہے، چند اچھے ناول بھی لکھے گئے ہیں لیکن ہمارے
یہاں تو ابھی اعلیٰ پیمانے کے پچیس ناول بھی نہیں لکھے گئے ... ناول
اور ... سٹوری پر ہنگامہ بپا ہے۔ اس کے باوجود ...
بعض کامیاب ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں۔ تجربوں کی منزل سے گزر کر شاید
وہ زیادہ اچھا ادب تخلیق کریں گے۔ وقت سب سے بڑا منصف اور ایسی
کسوٹی ہے جس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اس خطے میں یہ بھی کہنا چاہوں گا
کہ ادبی دہشت پسندی ادب کی تہذیب سے مختلف چیز ہے۔ ہم اپنے
... ادب کرتے تھے۔ آج کل نئے ادیب اپنے
... اپنی تحریروں میں کچھ بہت زیادہ معیوب الفاظ
استعمال کرتے ہیں۔ یہ رویہ غالباً بدلتی ہوئی قدروں کا عکاس ہے۔

ش۔ آخر میں ذرا ہندوستان میں اردو کے مسئلے پر کچھ فرمانے کی زحمت گوارا کیجیے۔

ق۔ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ دیوناگری رسم الخط اردو کی بقا کا ضامن ہو سکتا ہے مجھے ان سے اتفاق نہیں۔ ہر رسم الخط کا اپنا کیرکٹر ہوتا ہے۔ اردو ایک زبان نہیں ایک تہذیب ہے۔

ش۔ لیکن ہمارے یہاں اب اس تہذیب کا مستقبل کیا ہے؟

ق۔ ہو سکتا ہے آئندہ پچیس سال تک یہ تہذیب آثارِ قدیمہ میں شامل ہو جائے۔ کیونکہ معاشرے میں اردو پڑھنے والے تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ سنجیدہ موضوعات پر بہت ہی کم کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ فلمی اور جاسوسی ہی رسالوں کے ذریعے اردو عوام تک پہنچ رہی ہے۔ اردو شاید بہ حیثیت اردو زندہ نہ رہ سکے گی۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ البتہ فلموں کے ذریعے عوام کے اجتماعی شعور میں شامل ہو جائے گا اور وہ ہندی کہلائے گا۔ لیکن کون جانتا ہے کہ آج سے پچیس یا پچاس سال بعد ہندوستان کس سیاسی اور سماجی موڑ پر جا پہنچے گا۔ اردو اور دوسرے قومی مسئلوں کے مستقبل کا انحصار دراصل آنے والے زمانے کے حالات پر ہے۔

---

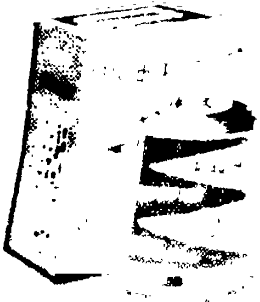


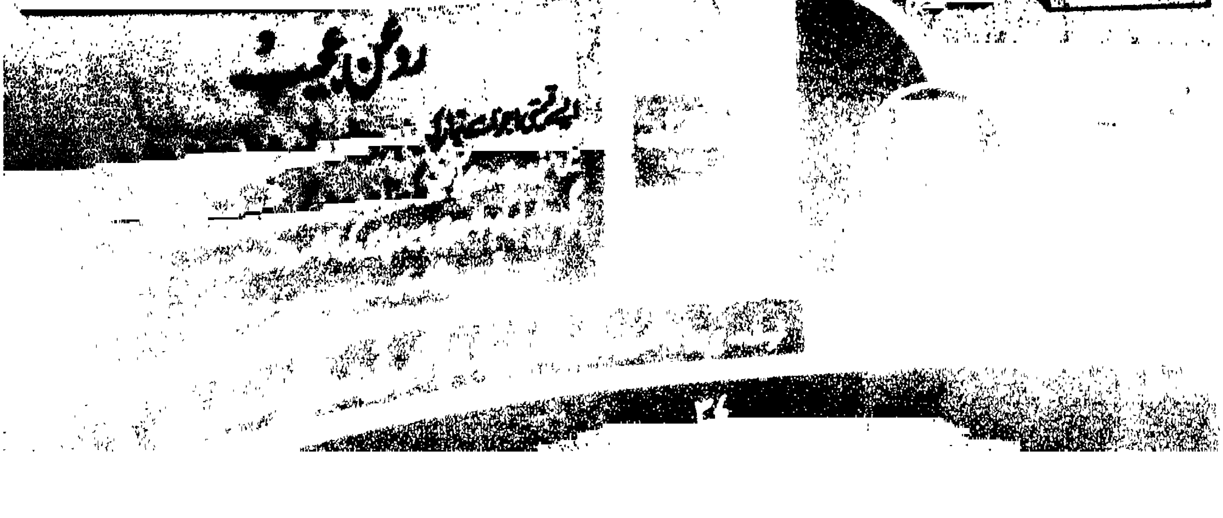
---










اسٹیج کے انعامات

افسانہ

# دُردِ تہِ جام...

س۔ش۔ مشہدی

اے۔ ڈی۔ ایس۔ او، اررِیا

۲۷ مئی ۱۹۹۷ء

گرامی محترم! ہدیۂ خلوص و نیاز

"سوویٹ سُلطان" کی اشاعت کے بعد مجھے قارئین کے جو خطوط ملے ہیں اُن میں بیشتر نے مجھ سے نفسیاتی کہانی لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ اُن کی فرمائش کے پیشِ نظر ایک نفسیاتی کہانی "دُردِ تہِ جام" ارسال خدمت ہے۔ اس کہانی میں نفسیات کے تلخ ترین باب ایڈی پس کمپلکس (آبائی اُبھاؤ) کی طرف ایک لطیف سا اشارہ کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ یہ حقیقت اتنی تلخ اور ہمارے ذہنی و سماجی اقدار کے اتنی منافی ہے کہ قلم وضاحت کی جسارت نہیں کر سکتا ــــ اس کے علاوہ ہمارے یہاں شادی کے رسم و رواج اور آنکھوں کی تنویمی قوت کی طرف بھی میں نے دھیان دیا ہے۔ یہ رسمیں بہ ظاہر بے معنی تو ہیں مگر ہماری تہذیب میں کچھ اس طرح رچ بس گئی ہیں کہ زندگی کا ایک جزو بن گئی ہیں۔ پتہ نہیں میں اس تشریح میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں۔

مجھے اطلاع ملی ہے کہ چند پاکستانی جریدوں نے "بیسویں صدی" سے میرے افسانے نقل کئے ہیں، بلکہ "نقّاد" نے تو میری کہانی پر مصنف کا نام بھی بدل دیا ہے۔ اس ادبی 'بلیک مارکٹنگ' کا شکوہ کس سے کیا جائے۔ اگر یہ جریدے مجھے اطلاع بھی دے دیتے تو میں سمجھتا کہ مجھے میرا حق مل گیا ہے ــــ "دُردِ تہِ جام" پر آپ کی اور قارئین کی آرا کا مجھے بے تابی سے انتظار رہے گا۔

خلوص کیش ــــ ش۔ش۔ مشہدی

"آج شہانی ہے رات چندا تم اُگیو....
سہرے پر اُگیو، کنگنے پر اُگیو.... آج شہانی ہے رات...."

ڈھولک کی تال اور ہارمونیم کی مترنم آواز پر قوال جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔ پردے کے پیچھے آنچلوں کی سرسراہٹ اور جلوؤں کا ہجوم، دروازے پر کھڑے باراتیوں کے ذوقِ نظارہ کا امتحان لے رہا تھا۔ بارات دروازے لگ رہی تھی۔ رسم کے مطابق باراتی نوشے کو دلہن کے گھر تک پہنچانے آئے تھے۔ اور رشید میاں قوال ترکی ٹوپی پہنے نوشے کا راستہ روکے، جھوم جھوم کر "آج شہانی ہے رات" الاپ کر رہے تھے۔ چست پاجامہ، سلیم شاہی جوتی، شیروانی اور اُس پر گوٹ لگی ہوئی ریشمی عبا میں ملبوس، راشد سر پر ریشمی عمامہ اور پھولوں میں اُلجھائے ہوئے بادلوں کا سہرا باندھے، دوستوں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا۔ دروازے پر پڑے ہوئے ریشمی پردوں کے پیچھے دُلہن کے گھر کی عورتیں نوشے کے استقبال کے لئے بے چین تھیں اور باہر کھڑے ہوئے براتی جلوے چُرانے کے لئے بے قرار تھے۔ کبھی ہوا یا کسی کی شرارت سے پردہ سرک جاتا تو جیسے بجلی سی کوند جاتی۔ رنگ برنگ کے شوخ اور بھڑکیلے لباس میں بکھری ہوئی دوشیزائیں متجسس نگاہوں سے باراتیوں کا نظارہ کرنے کے لئے بے چین تھیں۔ کبھی دو نگاہوں کا تصادم ہو جاتا تو کوئی نیلا جھک کر تسلیم کر دیتا اور فضا میں قہقہے گونج اُٹھتے۔ باراتیوں کے لئے سب سے دلچسپ گھڑی

[illegible]

... کر انے گئیں ... [illegible]

[illegible]

[illegible] کے ہجوم نے اُسے اپنے [illegible] کی آنکھیں جلوؤں کی فراوانی سے خیرہ ہوگئیں۔ چند کمسن [illegible] بڑھ کر راشد سے اتنی قریب ہوگئیں کہ راشد کو اُن کا لمس محسوس ہونے لگا اور اُس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ اُس کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ صنفِ نازک سے اتنا قریب تھا۔ بچپن سے آج تک اُسے لڑکیوں کا قرب نصیب نہیں ہوا تھا۔ ماں نے بچپن ہی میں اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بہن کوئی تھی ہی نہیں۔ اُس کی پرورش بھی روایتی قدامت پسند ماحول میں ہوئی تھی جہاں اختلاط کی اجازت نہ تھی۔ اُس کی عمر بھی کیا تھی۔ اکیسویں سالگرہ پوری ہوتے ہی خاں صاحب نے ویران حویلی کو پھر سے آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور راشد نے ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح سرِ تسلیم خم کر دیا۔

یکایک اِس اندر سبھا میں آکر راشد کا گھبرا جانا فطری بات تھی۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ خود پر قابو پا سکے مگر دل تو سینے سے باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ اِتنے میں ایک معمر خاتون ہاتھ میں چاندی کا تھال لئے آگے آئیں جس پر گنگا جمنی چراغ جل رہے تھے۔ پان سے نوشے کے گال سینکے گئے، چاول چوا ئے گئے، آرتی اُتاری گئی اور گویا استقبال کی تمہید پوری ہوئی۔ عورتیں راشد کو اپنے جلو میں لے آنگن میں آگئیں جہاں شامیانے کے نیچے ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ تخت پر مخملیں قالین اور گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا جس کے ایک کنارے پر سُہانے جوڑے میں سمٹی ہوئی دُلہن، راشد کی آرزوؤں کا پیکر بنی بیٹھی تھی۔ مہندی، اُبٹن اور سہاگ کے عطر میں پھولوں کی خوشبو نے مل کر عجیب سی فضا بنا دی تھی۔ اُس پر خوبصورت کپڑوں میں شوخ و طرار لڑکیوں کے ہجوم نے عجیب سا الف لیلوی ماحول بنا دیا تھا۔ کہیں قہقہے بلند ہو رہے تھے، کہیں دُولہا پر جملے کسے جا رہے تھے اور مراثنیں ڈھولک کی تال پر چیخ چیخ کر گا رہی تھیں

ٹونہ میری لاڈو کا ... ٹونہ اماں پیاری کا ٹونہ

ایسا ٹونہ دو اماں بی بی

میاں پلّا نہ چھوڑے ... ٹونہ میری لاڈو کا....

[illegible] کے [illegible]

رسم ادا کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ راشد وسط [illegible] گھر والوں کی اِس رنگین رسم سے واقف تھا وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ راشد [illegible] کے سر پہ اپنا آنچل ڈال دیا جیسے میراثنوں کے ٹونے سے اُٹھتے ہوئے [illegible] کی حفاظت کر رہی ہو۔

راشد نے اپنے اعصاب پہ قابو پانے کی کوشش کی اور سہرے کی [illegible] کے پیچھے سے نظریں اُٹھا کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ ہر طرف رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ جلوؤں کی اِس فراوانی میں نظر کو ٹھہرنے کی تاب نہ تھی لیکن اچانک راشد کی نظر ایک نقطہ پہ جم کر رہ گئی.... اُس کے بالکل سامنے ایک پیکرِ جمال سفید شفون کے پیرہن ہلکے نیلے رنگ کا دوپٹہ ڈالے راشد کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ راشد کی نگاہ [illegible] رہ گئی۔ کتابی چہرہ، سپید رنگ اور اُس پر نوخیزگی کی ہلکی سُرخی ... نیلے دوپٹے کے پس منظر میں وہ بالکل اُس چاندنی طرح تھی جو آسمان کی نیلگوں فضاؤں میں اپنے شباب کی کرنیں بکھیر رہا ہو۔ مگر راشد تو اُن مقناطیسی شہابی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے نکلتی ہوئی شعاعوں نے اُس کے اعصاب کو منجمد کر دیا تھا....

وہ آنکھیں تھیں یا گہری جھیل، جس میں راشد ڈوبتا ہی چلا گیا... بہت نیچے بہت نیچے .... یہاں تک کہ اُسے گہرائی کا احساس بھی نہ رہا... اُن آنکھوں میں نہ جانے کیسی کشش تھی، جو راشد کی نگاہوں سے گزرتی ہوئی جگر تک اُتر گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُن آنکھوں نے اُس کے سارے وجود کو گھیر لیا ہے۔ جیسے وہ ان آنکھوں کا ازل سے متلاشی رہا ہو — وہ آنکھیں راشد کی کیفیت سے بے نیاز نوشہ کی طرف دیکھ رہی تھیں اور راشد ماحول سے بے نیاز اُن آنکھوں کے جام سے سیراب ہو رہا تھا ... اُس کا جی چاہا کہ سہرے کی اُن لڑیوں کو نوچ کر پھینک دے جو اُس کے جلوؤں میں حائل ہو رہی تھیں اور جی بھر کر اُن آنکھوں کی طرف دیکھتا رہے جو اُسے ایک عجیب سی راحت بخش رہی تھیں۔ نہ جانے راشد کب تک اُن آنکھوں کی گہرائی میں ڈوبا رہتا کہ ایک کھنکتی سی آواز اُبھری —

"خالہ بی، رسم شروع کیجئے! رات کافی ہو گئی ہے۔" [illegible]

راشد نے چاہا کہ اُن مقناطیسی آنکھوں سے اپنی نظر ہٹا لے۔ مگر [illegible]

[illegible] ہی تھا... اس کا بھی جا [illegible] ان آنکھوں کو تا حیات اسی طرح [illegible] [illegible] ان آنکھوں کو اپنی آنکھوں میں ضم [illegible] — [illegible] - راشد کو اُن میں اپنائیت کا احساس [illegible] ..... اِتنے میں ایک معمر خاتون طشت پر شربت کا گلاس لئے آگے بڑھیں اور وہ مرمریں پیکر ہجوم میں گم ہو گیا۔ راشد کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے ہاتھ سے جام چھین لیا ہو.... اُس کی تشنگی اور بڑھ [illegible] گئی ہو۔ مگر وہ آنکھیں اب اوجھل ہو چکی تھیں —

دُلہن کی خالہ اپنے ہاتھوں سے راشد کو شربت پلانے لگیں.... اُسے پہلے ہی سمجھا دیا گیا تھا کہ آسانی سے شربت نہ پینا اس لئے وہ خاموش بیٹھا رہا اور [illegible] گئی تھا۔

"اتنی آسانی سے نوشے میاں شربت نہیں پئیں گے ،" جان ! دُلہن کی بڑی بہن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی نوشہ میاں کو دُودھ پینے کی عادت ہے، شربت کیا پئیں گے ،" ایک خاتون نے مذاق کیا اور محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ ایک معمر اور سنجیدہ صورت خاتون نے طشت پر چاندی کے بٹوے میں سلامی کے گیارہ سو روپے لا کر رکھ دیئے۔ آپا نے راشد کے کان میں آہستہ سے کہا "میاں، خوشدامن کو سلام کرو۔" اور راشد نے میکانکی انداز میں سر کو جُھکا کر سلام کیا۔ پھر شربت کا ایک گھونٹ پیا اور رسموں کا سلسلہ چلتا رہا۔ وہ عورتوں کی فرمائش بے نیازی سے پوری کرتا رہا، قہقہے اُبلتے رہے اور میراثنیں گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتی رہیں۔

میاں بنڑے کو لگ جیئوں چوٹ رے
کنگنوا میں نا پینوں گی.... میاں بنڑے کو....

مگر راشد کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا.... اُس کی پیاسی نظر اُن آنکھوں کی جستجو کر رہی تھی جنھوں نے ایک لمحے میں راشد کے وجود کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ ایسی واردات سے واقف نہ تھا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کون میں ایسی تحیّری کیفیت بھی ہو سکتی ہے۔ محفل کی تمام رنگینیوں سے بے نیاز وہ اُس میخانے کا متلاشی تھا جو ریگستان کے سراب کی طرح دفعتہً نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اتنے میں کسی کی آواز اُبھری۔

"مشاطہ بی ! اب آرسی مصحف کرو۔ رات کے دو بج گئے !" اور راشد چونک اُٹھا۔ وہ دو گھنٹوں سے یہاں بیٹھا تھا لیکن اُسے وقت کے گزرنے کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ اُسے اس کا بھی احساس نہ رہا کہ اُس کے خوابوں کی تعبیر اُس کی دُلہن سہاگ رات کی ساری رنگینیوں کے ساتھ اُس کی آرزوؤں کا مجسمہ بنی، اُس سے صرف دو فٹ کی دُوری پر بیٹھی تھی.... وہ جس کی آرزوئیں اُس کی تنہائیوں میں رچ بس گئی تھیں۔ مگر آج اُس سے اِس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی کسی [illegible] — راشد کا چنچل پن ختم کرنے لگا۔ آخر کیا بات تھی اُن آنکھوں میں جس نے اُس کی مدتوں کی تمناؤں کو یکسر خاکستر کر دیا تھا۔

سُرخ زمین پر چاندی کی چھاپ دیئے شہانے جوڑے میں دُلہن سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ آرسی مصحف کی رسم شروع ہوئی۔ مشاطہ خوبصورت سا آئینہ لئے دُلہن کے قریب بیٹھی گا رہی تھی ——

"رُونمائی ہے مری چاندی سی شہزادی کی
رُونمائی ہے...."

"نوشہ میاں سورۃ اخلاص پڑھیئے اور دُلہن کے چاند سے مُکھڑے کو دیکھیئے"

مشاطہ نے کہا اور راشد کا ذہن اس نعان پرور لمحے کے تصوّر سے جھنجنا اُٹھا جب وہ پہلی بار اپنی شریکِ حیات کا عکس آئینے میں دیکھے گا —— مشاطہ نے گھونگھٹ سرکا کر اس طرح آئینے کو رکھا کہ قمر کا عکس اُس میں آگیا.... چاروں طرف سے مہتابیاں چھوٹنے لگیں اور اُس کی تیز دُودھیا روشنی میں راشد نے دھڑکتے ہوئے دل سے آئینے میں اپنی آرزوؤں کا عکس دیکھا —— اُس کی شریانوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی.... عکس یقیناً اپنے نام کی تفسیر تھا.... افشاں سے چُنی ہوئی مانگ، بجلی سے سجائے ہوئے عارض و رُخسار اور پیراہن عروسی سے اُٹھتی ہوئی خوشبوئیں رچی بسی قمر اپنے نام کی تشریح کر رہی تھی.... راشد کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے جسم کا سارا خون تیزی کے ساتھ دماغ کی طرف دوڑ رہا ہے۔ فرطِ جذبات سے اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا.... جیب سے طلائی گھڑی نکال کر اُس نے دُلہن کی کلائی پر باندھ دی جو رُونمائی کا تحفہ تھی اور دوبارہ دھڑکتے ہوئے دل سے آئینے میں عکسِ رُخِ مہوش دیکھنے لگا.... دُلہن کی آنکھیں رسم کے مطابق بند تھیں یا شاید نازک پلکیں حیا کے بوجھ سے جُھک گئی تھیں....

دفعتاً راشد کو اپنی گردن پر ایک عجیب سی گرمی کا احساس ہوا۔ اُس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی اور غیر ارادی طور پر اُس نے مُڑ کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا.... وہی آنکھیں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ ایک لمحے کو آنکھیں چار ہوئیں اور وہ آنکھیں جُھک کر پیچھے ہٹ گئیں لیکن راشد کا سکون درہم برہم کر گئیں۔ عجیب اجتناب کا عالم تھا اُن آنکھوں میں جیسے راشد کی تشنگی کا راز اُنھیں معلوم ہو گیا تھا۔

رسمیں ہوتی رہیں اور پھر راشد کو حجلۂ عروسی میں دُلہن کے ساتھ چھوڑ دیا گیا مگر راشد کا ذہن کہیں اور بھٹکتا رہا۔ اُس کے جذبات پہلے ہی ٹھنڈے پڑ چکے تھے اور وہ اس خلوت میں بھی قمر سے وہ باتیں نہ کہہ سکا جن کا ارمان لے کر وہ دولہا بنا تھا۔

---

یہی ہوتی ہے جب سنجیدہ مزاج لوگ بھی تھوڑی دیر کے لئے سنجیدگی کا لبادہ اُتار کر منچلے بن جاتے ہیں۔ قوال کی بلند آواز ڈھولکیے کی تال کے ساتھ گھٹ بڑھ رہی تھی۔ اتنے میں ایک معمر شخص آگے بڑھے اور چند نوٹ قوال کے ہارمونیم پر رکھ دیئے۔ قوال نے جھک کر سلام کیا اور راستے سے ہٹ گیا۔ اندر سے دو خواتین آئیں اور نوشہ کا بازو پکڑ کر اندر لے گئیں... باراتیوں نے آخری بار جلوؤں کی ضیاباری سے آنکھوں کو سیراب کیا۔

راشد کا دل دھڑکنے لگا۔ اندر پہنچتے ہی عورتوں کے ہجوم نے اُسے اپنے حلقے میں لے لیا اور اُس کی آنکھیں جلوؤں کی یورش سے خیرہ ہوگئیں۔ چند کمسن لڑکیاں جو ناکتخداؤں میں تھیں، بڑھ کر راشد سے اتنی قریب ہوگئیں کہ راشد کو اُن کا لمس محسوس ہونے لگا اور اُس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ اُس کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ صنفِ نازک سے اتنا قریب تھا۔ بچپن سے آج تک اُسے لڑکیوں کا قرب نصیب نہیں ہوا تھا۔ ماں نے بچپن ہی میں اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بہن کوئی تھی ہی نہیں۔ اُس کی پرورش بھی روایتی قدامت پسند ماحول میں ہوئی تھی جہاں اختلاط کی اجازت نہ تھی۔ اُس کی عمر بھی کیا تھی۔ اکیسویں سالگرہ پوری ہوتے ہی خاں صاحب نے ویران حویلی کو بہو سے آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور راشد نے ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح سرِ تسلیم خم کر دیا۔

یکایک اِس اندرسبھا میں آکر راشد کا گھبرا جانا فطری بات تھی۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ خود پر قابو پا سکے مگر دل تو سینے سے باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ اِتنے میں ایک معمر خاتون ہاتھ میں چاندی کا تھال لئے آگے آئیں جس پر گنگا جمنی چراغ جل رہے تھے۔ پان سے نوشے کے گال سینکے گئے، چاول چڑھائے گئے، آرتی اُتاری گئی اور گویا استقبال کی تمہید پوری ہوئی۔ عورتیں راشد کو اپنے جلو میں لے آنگن میں آگئیں جہاں شامیانے کے نیچے ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ تخت پر مخملیں قالین اور گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا جس کے ایک کنارے پر سنہانے جوڑے میں سمٹی ہوئی دُلہن، راشد کی آرزوؤں کا پیکر بنی بیٹھی تھی۔ مہندی، اُبٹن اور سہاگ کے عطر میں پھولوں کی خوشبو نے مل کر عجیب سی فضا بنا دی تھی۔ اُس پر خوبصورت کپڑوں میں شوخ و طرار لڑکیوں کے ہجوم نے عجیب سا الف لیلوی ماحول بنا دیا تھا۔ کہیں قہقہے بلند ہو رہے تھے، کہیں دولہا پر جملے کسے جا رہے تھے اور مراثنیں ڈھولک کی تال پر چیخ چیخ کر گا رہی تھیں

ٹونہ میری لاڈو کا... ٹونہ اماں پیاری کا ٹونہ
ایسا ٹونہ دو اماں بی بی
میاں پلا نہ چھوڑے... ٹونہ میری لاڈو کا....

راشد کو دُلہن کے پاس بٹھا دیا گیا۔ اُس نے دزدیدہ [illegible] طرف دیکھا جو اُس کے مبہم خوابوں کی تعبیر تھی۔ سنہانے جوڑے میں [illegible] تھی۔ راشد کا تنفس تیز ہو گیا... آخر اُس کی بے خواب راتیں اور [illegible] ہیں، اُس کے تصور نے شریکِ حیات کا جو خاکہ بنایا تھا آج اُس میں رنگ بھر [illegible] تھا۔ دُلہن کے لباس سے آتی ہوئی خوشبو، راشد کے دماغ کو معطر کئے [illegible] تھی۔

رسم ادا کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ راشد دولہا کے [illegible] گھرانوں کی اِس رنگین رسم سے واقف تھا وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ راشد [illegible] کے سر پہ اپنا آنچل ڈال دیا جیسے میراثنوں کے ٹونے سے آنے والے [illegible] کی حفاظت کر رہی ہو۔

راشد نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی اور سہرے کی لڑیوں کے پیچھے سے نظریں اُٹھا کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ ہر طرف رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ جلوؤں کی اِس فراوانی میں نظر کو ٹھہرنے کی تاب نہ تھی لیکن اچانک راشد کی نظر ایک نقطہ پہ جم کر رہ گئی... اُس کے بالکل سامنے ایک پیکرِ جمال، سفید شمیز کے اوپر ہلکے نیلے رنگ کا دوپٹہ ڈالے راشد کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ راشد کی نگاہ جم کر رہ گئی۔ کتابی چہرہ، سپید رنگ اور اُس پر دوشیزگی کی ہلکی سُرخی... نیلے دوپٹے کے پس منظر میں وہ بالکل اُس چاند کی طرح تھی جو آسمان کی نیلگوں فضاؤں میں اپنے شباب کی کرنیں بکھیر رہا ہو۔ مگر راشد تو اُن مقناطیسی شہابی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے نکلتی ہوئی شعاعوں نے اُس کے اعصاب کو منجمد کر دیا تھا...

وہ آنکھیں تھیں یا گہری جھیل، جس میں راشد ڈوبتا ہی چلا گیا... بہت نیچے بہت نیچے... یہاں تک کہ اُسے گہرائی کا احساس بھی نہ رہا... اُن آنکھوں میں نہ جانے کیسی کشش تھی جو راشد کی نگاہوں سے گزرتی ہوئی جگر تک اُتر گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُن آنکھوں نے اُس کے سارے وجود کو گھیر لیا ہے۔ جیسے وہ اِن آنکھوں کا ازل سے متلاشی رہا ہو۔ وہ آنکھیں راشد کی کیفیت سے بے نیاز نوشہ کی طرف دیکھ رہی تھیں اور راشد ماحول سے بے نیاز اُن آنکھوں کے جام سے سیراب ہو رہا تھا... اُس کا جی چاہا کہ سہرے کی اُن لڑیوں کو نوچ کر پھینک دے جو اُس کے جلوؤں میں حائل ہو رہی تھیں اور جی بھر کر اُن آنکھوں کی طرف دیکھتا رہے جو اُسے ایک عجیب سی راحت بخش رہی تھیں۔ نجانے راشد کب تک اُن آنکھوں کی گہرائی میں ڈوبا رہتا کہ ایک کھنکتی سی آواز اُبھری —

"خالہ بی رسم شروع کیجئے! رات کافی گزر گئی ہے۔" [illegible]

راشد نے چاہا کہ اُن مقناطیسی آنکھوں سے اپنی نظر ہٹا لے مگر [illegible]

[illegible] ... اس کا جی چاہا کاش وہ اِن آنکھوں کو تاحیات اسی طرح دیکھتا رہے ... کاش [illegible] کاش وہ ان آنکھوں کو اپنی آنکھوں میں ضم کر سکتا ..... وہ آنکھیں کتنی گہری تھیں۔ راشد کو اُن میں اپنائیت کا احساس ہوا جیسے وہ کب سے اُسے بلا رہی ہوں ..... اتنے میں ایک معمر خاتون طشت میں شربت کا گلاس لئے آگئیں اور وہ منظر بکھر کر ہجوم میں گم ہو گیا۔ راشد کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے ہاتھ سے جام چھین لیا ہو.... اُس کی تشنگی اور بڑھ گئی اور وہ بے چین ہو گیا۔ مگر وہ آنکھیں اب اوجھل ہو چکی تھیں ـــــ

دُلہن کی خالہ اپنے ہاتھوں سے راشد کو شربت پلانے لگیں.... اُسے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ آسانی سے شربت نہ پینا اس لئے وہ خاموش بیٹھا رہا اور لڑکیوں کا قہقہہ گونج اُٹھا۔

" اتنی آسانی سے نوشے میاں شربت نہیں پئیں گے خالہ جان" دُلہن کی بڑی بہن نے ہنستے ہوئے کہا۔

" ابھی نوشہ میاں کو دودھ پینے کی عادت ہے، شربت کیا پئیں گے؟" ایک خاتون نے مذاق کیا اور محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ ایک معمر اور سنجیدہ صورت خاتون نے طشت پر چاندی کے بٹوے میں سلامی کے گیارہ سو روپے لاکر رکھ دیئے۔ آپا نے راشد کے کان میں آہستہ سے کہا: "میاں، خوشدامن کو سلام کرو" اور راشد نے میکانیکی انداز میں سر کو جھکا کر سلام کیا۔ پھر شربت کا ایک گھونٹ پیا اور رسموں کا سلسلہ چلتا رہا۔ وہ عورتوں کی فرمائش بے نیازی سے پوری کرتا رہا۔ قہقہے اُبلتے رہے اور میراثنیں گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتی رہیں۔

میاں بندرے کو لنگ جیوں چوٹ رے
کنگنوا میں نا پہنوں گی.... میاں بندرے کی....

مگر راشد کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا.... اُس کی پیاسی نگاہ اُن آنکھوں کی جستجو کر رہی تھی جنھوں نے ایک لمحے میں راشد کے وجود کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ ایسی واردات سے واقف نہ تھا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ آنکھوں میں ایسی سحر انگیز کیفیت بھی ہو سکتی ہے۔ محفل کی تمام رنگینیوں سے بے نیاز وہ اُس میخانے کا متلاشی تھا جو ریگستان کے سراب کی طرح دفعتاً نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اتنے میں کسی کی آواز اُبھری۔

" مشاطہ بی! اب آرسی مصحف کرو۔ رات کے دو بج گئے!" اور راشد چونک اُٹھا۔ وہ دو گھنٹوں سے یہاں بیٹھا تھا لیکن اُسے وقت کے گزرنے کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ اُسے اس کا بھی احساس نہ ہوا کہ اُس کے خوابوں کی تعبیر اُس کی دُلہن سہاگ رات کی ساری رنگینیوں کے ساتھ، اُس کی آرزوؤں کا مجسمہ بنی، اُس سے صرف دو فٹ کی دوری پر بیٹھی تھی.... وہ جس کی آرزوئیں اُس کی تنہائیوں میں رچ بس گئی تھیں۔ سچ تو اُس سے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی کس قدر دور تھی ـــــ راشد کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ آخر کیا بات تھی اُن آنکھوں میں جنھوں نے اُس کی مدتوں کی تمناؤں کو یکسر خاکستر کر دیا تھا۔

سُرخ زمین پر چاندی کی چھاپ دیئے سنہلے جوڑے میں دُلہن سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ آرسی مصحف کی رسم شروع ہوئی۔ مشاطہ خوبصورت سا آئینہ لئے دُلہن کے قریب بیٹھی گا رہی تھی ـــــ

" رونمائی ہے مری چاند سی شہزادی کی
رونمائی ہے ...."

" نوشہ میاں سورۂ اخلاص پڑھیئے اور دُلہن کے چاند سے مکھڑے کو دیکھیئے" مشاطہ نے کہا اور راشد کا ذہن اس رُومان پرور لمحے کے تصور سے جھنجھنا اُٹھا جب وہ پہلی بار اپنی شریکِ حیات کا عکس آئینے میں دیکھے گا ـــــ مشاطہ نے گھونگھٹ سرکا کر اس طرح آئینے کو رکھا کہ قمر کا عکس اُس میں آگیا.... چاروں طرف سے مہتابیاں چھوٹنے لگیں اور اُس کی تیز چندھیا دینے والی روشنی میں راشد نے دھڑکتے ہوئے دل سے آئینے میں اپنی آرزوؤں کا عکس دیکھا ـــــ اُس کی شریانوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی.... عکس یقیناً اپنے نام کی تفسیر تھا.... افشاں سے چنی ہوئی مانگ، بجلی سے سجائے ہوئے عارض و رُخسار اور پیراہنِ عروسی سے اُٹھتی ہوئی خوشبو میں رچی بسی قمر اپنے نام کی تشریح کر رہی تھی.... راشد کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے جسم کا سارا خون تیزی کے ساتھ دماغ کی طرف دوڑ رہا ہے۔ فرطِ جذبات سے اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ جیب سے طلائی گھڑی نکال کر اُس نے دُلہن کی کلائی پر باندھ دی جو رونمائی کا تحفہ تھی اور دوبارہ دھڑکتے ہوئے دل سے آئینے میں عکسِ رُخِ مہوش دیکھنے لگا.... دُلہن کی آنکھیں رسم کے مطابق بند تھیں یا شاید نازک پلکیں حیا کے بوجھ سے جھک گئی تھیں.... دفعتاً راشد کو اپنی گردن پر ایک عجیب سی گرمی کا احساس ہوا۔ اُس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی اور غیر ارادی طور پر اُس نے مُڑ کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا.... وہی آنکھیں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ ایک لمحے کو آنکھیں چار ہوئیں اور وہ آنکھیں گھبرا کر پیچھے ہٹ گئیں لیکن راشد کا سکون درہم برہم کر گئیں۔ عجیب اجتناب کا عالم تھا اُن آنکھوں میں جیسے راشد کی تشنگی کا راز انھیں معلوم ہو گیا تھا۔

رسمیں ہوتی رہیں اور پھر راشد کو حجلۂ عروسی میں دُلہن کے ساتھ چھوڑ دیا گیا مگر راشد کا ذہن کہیں اور بھٹکتا رہا۔ اُس کے جذبات پر اولے پڑ چکے تھے اور وہ اس خلوت میں بھی قمر سے وہ باتیں نہ کہہ سکا جن کا ارمان لے کر وہ دولہا بنا تھا۔

---

راشد کا ماضی ایک کھلی ہوئی کتاب تھا جس کے سارے اوراق تقریباً
سفید تھے۔ اُس کی زندگی ایک ایسی شاہراہ تھی جس پر حادثات کے نقوش اُبھر سکے
تھے۔ اُس کے والد نے اس شاہراہ کی بڑی حفاظت کی تھی اور اُسے تمام آلائش اور
گندگی سے دُور رکھ کر آئینہ بنا دیا تھا یہی راشد کا شعور تھا جو جھیل کے پانی کی طرح شفاف
تھا۔ مگر اس شاہراہ کی تعمیر میں کچھ ایسے سنگ و آہن بھی تھے جو خان صاحب کے
کرخت لب و لہجے کے دباؤ سے دب کر اُس کی تہوں میں جا چھپے تھے جو بظاہر دکھائی
تو نہ دیتے تھے لیکن شاہراہ کی تہوں میں دب کر ایک ایسی ذہنی گرہ بن گئے تھے جس کا
احساس نہ تو شاہراہ کے معمار کو تھا اور نہ خود شاہراہ کو۔ یہی راشد کا لاشعور تھا۔

راشد کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ صرف سات سال کا تھا تو اُس کی
ماں اُسے چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو بے حد چاہتا تھا۔ جب
ماں اُسے گود میں لے کر پیار کرتی تو راشد ٹکٹکی باندھے اُس کی آنکھوں میں ممتا کا اتھاہ
پیار دیکھتا رہتا۔۔۔ اُن شفیق آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے عجیب سی تسکین و
راحت ملتی ۔۔۔ وہ خود کو بے حد محفوظ محسوس کرتا۔ اُس کا جی چاہتا خود کو اُن آنکھوں
میں چھپا لے جہاں اُس کے باپ کا کرخت چہرہ اور کڑی کڑی مونچھیں اُسے دکھائی نہ
دیں۔ اُسے اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہوئے اُس کی ماں مُسکرا دیتی اور ہلکے سے اُس
کے ماتھے پر پیار کر لیتی اور راشد پر نیند کا غلبہ طاری ہو جاتا۔ نہ جانے کیوں بچپن ہی سے
اُسے باپ سے خوف معلوم ہوتا تھا۔ جب بھی خان صاحب اُسے پیار کرنے کے لئے
بڑھتے تو اُن کی بڑی بڑی سُرخ آنکھیں دیکھ کر راشد کو جھُرجھُری آجاتی۔ وہ جب راشد
کو پیار کرتے تو اُن کی کڑی مونچھیں اُس کے گال میں چُبھنے لگتیں اور تب راشد کو تکلیف
سے زیادہ اُبکائی سی آنے لگتی۔ اسی لئے وہ باپ سے دُور دُور رہتا اور باپ سے دوری
ماں سے مزید قُربت میں تبدیل ہوتی رہتی۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک رات سوتے میں جب وہ کوئی بھیانک خواب
دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دیکھا، کوئی خوفناک دیو اُس کی ماں کو اُٹھائے لئے جا رہا ہے اور
وہ ماں کے پیروں سے لپٹا اُسے چھُڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس نے ماں کی آنکھوں
میں بھی خوف کے آثار دیکھے تھے اور جب اُس نے دیو کی طرف دیکھا تو اُسے ایسا
محسوس ہوا جیسے وہ دیو اس کے باپ کا ہم شکل ہو۔ مارے خوف کے وہ چیخ اُٹھا۔ نیند
ٹوٹی تو ماں اُس کے بستر پر نہ تھی۔ وہ زور زور سے رونے لگا اور اُس کی ماں دوڑتی
ہوئی اُس کے پلنگ پر آگئی اور راشد کو سینے سے لگا لیا۔ اُس وقت اُس نے باپ
کی کرخت آواز بھی سُنی تھی جو کہہ رہا تھا "یہ کم بخت ماں سے الگ رہ ہی نہیں سکتا
ہر وقت روتا رہتا ہے" اور راشد اور زور زور سے رونے لگا تھا۔ ماں نے اُسے چھاتی
سے دبوچ لیا اور بہت دیر تک پیار کیا تب جا کر وہ چُپ ہوا تھا۔ اُسی دن سے باپ
کے خلاف عجیب سی نفرت اُس کے ذہن میں [illegible]
راشد کو وہ دن بھی یاد تھے جب اُس کی ماں ہر وقت پلنگ پر [illegible]
تھی اور اُس نے راشد کو پیار کرنا بھی کم کر دیا تھا۔ اُس کی ماں نے بتایا تھا کہ اس کے گھر
ایک اور ننھا آنے والا ہے۔۔۔ پھر ایک دن گھر میں [illegible]
ننھا پیدا ہوا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ننھا اور ماں دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُسے
اچھی طرح یاد تھا کہ جب سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا وہ لوگوں کی نظر بچا کر اُس کمرے
میں چلا گیا تھا، جہاں اُس کی ماں ایک پلنگ پر سوئی ہوئی تھی اور اُس کا جسم
سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اُس نے آہستہ سے سر پر سے چادر کھسکائی تھی اور
ماں کے زرد چہرے اور بند آنکھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر نہ جانے اُسے کیا
سوجھی کہ اُس نے اپنی نازک اُنگلیوں سے ماں کی آنکھوں پر گری ہوئی پلکوں کو اُٹھانا
چاہا تھا۔۔۔ اور پھر جیسے ہی اس نے بے جان پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھا، مارے
خوف کے اُس کی چیخیں نکل گئیں اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ اُسے جب ہوش
آیا تو اُس نے خود کو مسہری پر پایا تھا اور اُس کے والد، آیا اور ڈاکٹر اُسے گھیرے
کھڑے تھے۔

سب کچھ ختم ہو گیا لیکن راشد کے خام ذہن میں یہ بات جم کر رہ گئی تھی
کہ اُس کی ماں کی موت کا ذمہ دار اُس کا باپ ہے۔ اُس کے خوابوں کا دیو ہمیشہ اُس
کے ذہن پر مسلط رہتا، اور ماں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اُس کے ذہن پر ہتھوڑے
برساتی رہتیں۔ وہ ماں کی اُن شفیق آنکھوں کا متلاشی رہتا لیکن وہ آنکھیں شاید
اُس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُوٹھ گئی تھیں۔

قمر سے شادی کے بعد راشد نے اپنے تمام غم اور ساری اُلجھنوں کو قمر
کی قربت میں گم کر دینے کی کوشش کی۔ خوف کی مہکتی ہوئی تنہائیوں میں راشد نے
راز و نیاز کی باتیں بھی کیں اور اُس کی گھنیری زُلفوں میں اپنی زندگی کی اُکتا دینے
والی یکسوئی کو نہ ایک حد تک گم بھی کر چکا تھا۔ قمر کی قربت سے بسی رنگین راتوں
کی قوسِ قزح نے راشد کی زندگی میں کیف و رنگ کی ترنگیں بھی بکھیر دی تھیں
اور اُس کی تشنہ آرزوئیں ایک حد تک آسودگی کا دامن بھی پا چکی تھیں۔ لیکن ان
سب کے باوجود راشد اپنے ذہن کو اُن آنکھوں کے جادو سے آزاد نہ کر سکا تھا جو
شادی کی رات ایک لمحے کو نظر آئی تھیں۔ مگر جو اُس کی زندگی پر امربیل کی طرح چھا
چھا گئی تھیں۔ جب بھی وہ تنہا ہوتا وہ آنکھیں خلاء سے اُسے دیکھنے لگتیں۔۔۔ جب
کبھی وہ بے خیالی میں چھت کی طرف دیکھتا اُس کی آنکھوں کے سامنے دو نقطے اُبھرنے
لگتے جو دھیرے دھیرے دو آنکھوں کا روپ دھار لیتے اور راشد اُن کی جاذبیت
میں ڈوب جاتا ۔۔۔ اُس کا جی چاہتا وہ اِس گہرائی میں ڈوبتا ہی چلا جائے بہت

[illegible] یہاں تک کہ اُس کا [illegible] آنکھوں [illegible] معلوم ہو جاتا کہ نہ جانے کونسی [illegible] آنکھوں میں۔

[illegible] راشد بستر پر لیٹا اُن آنکھوں کی جاذبیت میں گم تھا جو چھت کے [illegible] رہی تھیں ... نہ جانے کب تک وہ اُس جام سے [illegible] کہ [illegible] کے ذہن نے کروٹ لی اور وہ سوچنے لگا کہ وہ اِن آنکھوں کی جاذبیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے [illegible] بے لوث محبت کے ساتھ بڑی بے انصافی کر رہا ہے [illegible] جس نے اپنا سب کچھ راشد کی نذر کر دیا تھا، ایک مجسّم شکوہ بن کر اُس کے ذہن پر چھا گئی اور اُس نے اپنا سر جھٹک دیا اور سوچنے لگا، آخر اُن آنکھوں میں ایسی کونسی مقناطیسی طاقت ہے جس کے آگے قمر کا حسن اور اُس کی محبت ماند پڑ گئی ہے ... وہ کونسا پیمانہ ہے جس کی اَن دیکھی شراب کے نشے نے سہاگ رات کی دلکشی کو پھیکا کر دیا ہے ... اور تب اُسے خیال آیا کہ میر نے نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے، لکھ کر کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں کیا تھا ... راشد نے ذہن کو بھٹکنے کی اجازت دے دی اور آنکھوں کی مقناطیسیت پر غور کرنے لگا ... اُسے امام غزالی کا وہ جملہ یاد آگیا جو اُس نے کسی کتاب میں دیکھا تھا کہ "تمام آفتیں آنکھوں سے پیدا ہوتی ہیں" اور اس کی صداقت پر اُسے یقین آگیا۔ جبھی تو پشتو زبان کے کسی شاعر نے لکھا ہے ___ "آنکھوں نے میرے لئے غم بنا دیا ہے۔ اب اُنہیں میں بانس کی طرح سلی ہوئی رکھوں گا" ___ واقعی بڑی ظالم ہوتی ہیں یہ آنکھیں ... اور اسی لئے تو خود ربِّ جلیل نے سورۃ النور میں مردوں اور عورتوں دونوں کو تاکید کی ہے کہ "اپنی نگاہیں نیچی رکھیں" اور ٹھیک ہی تو تاکید کی ہے، اِن آنکھوں نے میرا سکون بھی تو درہم برہم کر دیا ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ مہا کوی سور داس نے اپنی آنکھیں پھوڑ لی تھیں۔ اور اسی لئے تو یونانی دیو مالا کے ایڈی پس کو جب معلوم ہوا تھا کہ ملکہ جوکیٹا حقیقت میں اُس کی ماں تھی، تو اُس نے بھی اِن ظالم آنکھوں کو پھوڑ ڈالا تھا ...

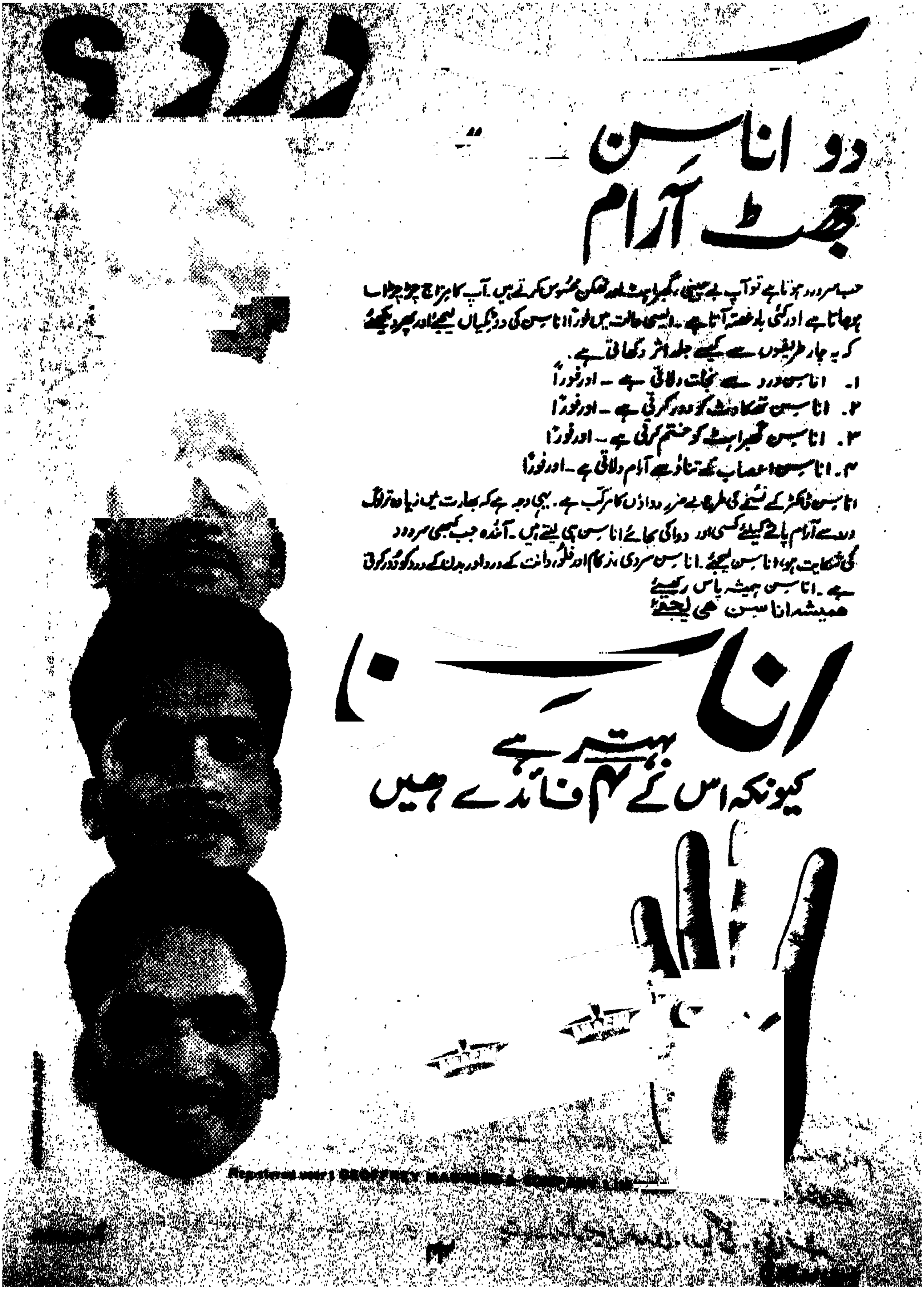
ایڈی پس کا نام آتے ہی راشد کا ذہن بہک کر ایڈی پس کمپلکس ___ (Oedipus Complex) تک جا پہنچا ... اُسے یاد آیا کہ فرائڈ کی ایک کتاب میں اُس نے پڑھا تھا کہ یہ وہ اُلجھاؤ ہے جس میں فرد لاشعوری طور پر اپنے مخالف صنف کے والدین سے وابستگی کا متمنّی ہوتا ہے۔ اور اسی لئے بیٹی کو باپ سے اور ماں کو بیٹے سے زیادہ لگاؤ رہتا ہے ... راشد کے ذہن کو جھٹکا سا لگا ... یہ سب بکواس ہے ... اُسے فرائڈ کے اس غیر اخلاقی نظریئے پر بے حد غصہ آیا جس نے ماں بیٹے کے پاکیزہ رشتے کو آلودہ کرنے کی کوشش کی ہے ... اُس کا جی چاہا، فرائڈ سامنے ہوتا تو وہ اُس کا منہ نوچ لیتا ... اُس کی داڑھی نوچ ڈالتا۔ اُسے ایک عجیب سے کرب اور ذہنی بے چینی کا احساس ہوا اور وہ دفعتہً بستر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، جیسے ذہن کو اس کرب سے آزاد کرانا چاہتا ہو۔

دفعتہً اُس کی نظر سامنے دیوار پر ٹنگی، ماں کی تصویر پر پڑی جسے وہ بچپن ہی سے دیکھتا آرہا تھا اور ماں کی آنکھوں پر اُس کی نظر جم کر رہ گئی ... اُس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا، اُس کا سارا وجود کسی تصور سے کانپ اُٹھا ... دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں اور اُس نے منہ میں ایک عجیب سی تلخی محسوس کی ... جیسے شراب پیتے پیتے کسی نے اُسے زہر کا جام پلا دیا ہو ... اُس نے اُن آنکھوں کی طرف پھر دیکھا اور بے اختیاری طور پر فرش پر تھوک دیا جیسے منہ سے تلخی دور کرنا چاہتا ہو۔

"بیسویں صدی" کے خاص نمبر اُردو شعر و ادب کی رہگزار میں منزلیں بناتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ تازہ افسانہ نمبر بھی ایک نئی منزل کی نشاندہی کرتا ہے مگر اِس نمبر کو جو خصوصیت دوسرے نمبروں سے ممتاز بناتی ہے وہ اُردو کے سب سے بڑے مربی و محسن صدرِ جمہوریہ ہند محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے فوٹو، انہیں کے کارٹون اور آپ کے خوشتر نگار قلم کی خوشتر ین قلمی تصویر کی موجودگی ہے۔ یہ سب کچھ اتنا وقیع ہے کہ اگر اِسے افسانہ نمبر کی جگہ ڈاکٹر ذاکر نمبر کہیں تو مناسب ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کی کامیابی اُردو کی کامیابی ہے اور یقین ہے کہ اُردو کو موصوف سے جو توقعات اور اُمیدیں وابستہ ہیں اُن کے بر آنے کا وقت قریب آگیا ہے کاروانِ اُردو اور تیزی سے آگے بڑھے گا اور بیسویں صدی اور اُس کے خاص نمبر اسی طرح سنگِ میل کا کام دیتے رہیں گے ...

نیاز کیش خاکسار ضیا فتح آبادی (بمبئی)

"بیسویں صدی" میں وہی مضامینِ نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔


درد
دو اناسن
جھٹ آرام
جب سر درد ہوتا ہے تو آپ بے چینی، گھبراہٹ اور تھکن محسوس کرتے ہیں۔ آپ کا مزاج چڑچڑا سا ہوجاتا ہے اور کئی بار غصہ آتا ہے۔ ایسی حالت میں فوراً اناسن کی دو ٹکیاں لیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ چار طریقوں سے کیسے جلد اثر دکھاتی ہے۔
۱۔ اناسن درد سے نجات دلاتی ہے ـ اور فوراً
۲۔ اناسن تھکاوٹ کو دور کرتی ہے ـ اور فوراً
۳۔ اناسن گھبراہٹ کو ختم کرتی ہے ـ اور فوراً
۴۔ اناسن اعصاب کے تناؤ سے آرام دلاتی ہے ـ اور فوراً
اناسن ڈاکٹر کے نسخے کی طرح بے ضرر دواؤں کا مرکب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں زیادہ تر لوگ درد سے آرام پانے کیلئے کسی اور دوا کی بجائے اناسن ہی لیتے ہیں۔ آئندہ جب کبھی سر درد کی شکایت ہو، اناسن لیجئے۔ اناسن سردی، نزلہ زکام اور فلو، دانت کے درد اور بدن کے درد کو دور کرتی ہے۔ اناسن ہمیشہ پاس رکھیئے
ہمیشہ اناسن ہی لیجئے
اناسن
بہتر ہے
کیونکہ اس کے ۴ فائدے ہیں

# جوانی

پروفیسر ایم۔ اے۔ حفیظ بنارسی ایم۔ اے

جوانی میں ہر اک شے دل نشیں معلوم ہوتی ہے  
جواں ہو دل تو ہر صورت حسیں معلوم ہوتی ہے

جوانی بے پیئے بھی رات دن مخمور رہتی ہے  
جوانی آپ ہی اپنے نشے میں چُور رہتی ہے

جوانی آتشِ جذبات کی شعلہ فشانی ہے  
جوانی موجۂ احساس کی دل کش روانی ہے

جوانی قلبِ انساں میں نئے ارماں جگاتی ہے  
جوانی ہر قدم پر اِک نئی منزل دکھاتی ہے

جوانی موجۂ طوفاں سے ٹکرانے کا قصہ ہے  
جوانی بے خطر جاں باز دیوانے کا قصہ ہے

جوانی حُسن کی دُنیا جوانی عشق کا عالم  
جوانی رندی و مستی، جوانی لغزشِ پیہم

جوانی بے نیازِ گردشِ ایام ہوتی ہے  
جوانی میکدے کی ایک رنگیں شام ہوتی ہے

جوانی اِک تبسم ہے، جوانی اِک ترنّم ہے  
جوانی گفتگو دل کی، نگاہوں کا تکلّم ہے

نہیں مرعوب ہوتی یہ کسی کی طمطراقی سے  
جوانی چھین لیتی ہے پیالہ دستِ ساقی سے

جوانی راگ ہے پیارے، جوانی رنگ ہے پیارے  
جوانی شعر و نغمہ چنگِ خوش آہنگ ہے پیارے

جوانی رُت ہے پھولوں کی، جوانی پھاگ ہے پیارے  
جوانی ایک بجلی اک گرج اک آگ ہے پیارے

جوانی قلقلِ مینا، جوانی ساغر و مُل ہے  
جوانی فصلِ بادہ ہے، جوانی موسمِ گُل ہے

جوانی میں نصیحت باعثِ آزار ہوتی ہے  
جوانی ناصحوں سے برسرِ پیکار ہوتی ہے

جوانی خود علاجِ سرگرانی ڈھونڈ لیتی ہے  
جوانی مقتلوں میں زندگانی ڈھونڈ لیتی ہے

لہو سے نقشِ ہائے زندگی میں رنگ بھر جاؤ  
تمہیں جو کام ہے کرنا، جوانی ہی میں کر جاؤ

یہ گرمی یہ حرارت زندگی پھر پا نہیں سکتی  
جوانی جب گزر جاتی ہے واپس آ نہیں سکتی


آپ کے پاؤں کی زینت کیلئے
Bata
دلکش نیا فیشن

افسانہ

# بھولی یادیں

——— ڈاکٹر سیّد رضا حسین ایم۔بی۔بی۔ایس

۲۔ گورنمنٹ فلیٹ، جواہر نگر، سرینگر کشمیر

۹ مئی ۱۹۶۷

جنابِ محترم خوشتر گرامی صاحب! آداب و خلوص

.... لیجئے "بھولی یادیں" حاضرِ خدمت ہیں۔ کچھ "یادیں" تلخ ہیں، کچھ سہانی اور خوشگوار۔ اُمید ہے پسند آئیں گی ——— "ریت کی دیوار" کافی پسند کیا گیا۔ کئی خطوط سامنے پڑے ہیں۔ سب کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال اِن صفحات کے ذریعے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں ...

احقر ——— سیّد رضا

---

بہار کی سانولی سلونی ایک شام تھی وہ ———

سارے دن کا تھکا ہارا سورج جھکتے جھکتے زمین بوس ہو چلا تھا ———

ہولے ہولے چندا یوں اُبھرنے لگا تھا جیسے سورج کے چھپنے ہی کا منتظر رہا ہو ——— ہلکی، ٹھنڈی ہوا، کہیں حسین گداز گالوں کو سہلاتی، کہیں رنگ برنگے آنچل لہراتی، اور کہیں ——— خشک بکھرے بالوں کو اُلجھاتی، پریشان نحیف چہروں پر خاک اُڑاتی اپنی کارکردگی سے بے پروا، کسی انجانی، اَن دیکھی دُھن میں مگن رواں دواں تھی!

اُسے تو روانی پسند ہے نا!

اور میں اُس شام سارا دن دفتری فائیلوں میں اُلجھے رہنے کے بعد، اپنی وائلن لئے پبلک گارڈن آ پہنچا تھا ——— باغ میں سرسبز گھاس پر ٹہلتے ٹہلتے میں ایک تنہا مقام پر جا بیٹھا ——— سُرمئی اندھیروں کو چیرنے والی ٹھنڈی روپہلی کرنیں بکھیرنے والے، دُور اُفق میں اُبھرتے چندا پہ نظریں جا ٹکیں۔ نہ جانے کیوں ذہن خالی خالی، دل اُداس اُداس سا تھا ——— اور جب دل اُداس ہو تو ساری کائنات اُداس سی معلوم ہوتی ہے! ایسے میں وائلن میرے شانے سے جا لگی، تار میری انگلیوں تلے تڑپنے لگے۔ ایک پیاری سی، سوز میں ڈوبی ہوئی دُھن جنم لینے لگی۔ چاند پر مرکوز آنکھوں کے پپوٹے جھکنے لگے۔ وائلن بجتی رہی۔ میری انگلیاں اُس کے تاروں کو تڑپا تڑپا کر پُرسوز نغمے فضا میں بکھیرتی رہیں ——— چاند اُس کے ساتھی تارے چاروں طرف بکھرے پھول میں ——— میری ہستی تک ——— اُس پُرسوز دُھن میں تحلیل ہوتی محسوس ہونے لگی۔ چاندنی رات میں، تنہائی کے عالم میں جب وائلن بجاتا ہوں، تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے مجھے!

پھر نہ جانے کہاں سے بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا ——— چندا ——— میرے چندا کے سامنے آ ٹکا۔ کچھ دیر کے لئے چاندنی مدھم پڑ گئی۔ وائلن پر چلتی میری انگلیاں رُک گئیں ——— بے اختیار میری آنکھیں بند ہو گئیں پھر ——— اُن میں نمی آ گئی۔ اکثر ہوتا ہے ایسا ——— ! نہ جانے کیوں ——— !! نہ جانے کیوں ——— !!!

بادل پھٹ گیا ——— روپہلی، ٹھنڈی کرنیں پھر چار سو پھیل چلیں ——— میری نظریں پھر چندا پر جا ٹکیں۔ ایک مانوس، پیاری سی صورت کے دُھندلے دُھندلے نقوش اُس پر اُبھرنے لگے۔ وہ مکھڑا۔ ہاں، چندا ہی سا تھا وہ بھی ——— ! فرق صرف اتنا تھا کہ چاند پر ایک بدنما داغ ہے۔ لیکن قدرت کا شاہکار، دھرتی کا وہ چاند اُس سے مبرا تھا ——— ! ——— ذہن کے کسی گوشے میں آہٹ سی ہوئی۔ ایک پیارا سا نام اُبھرا ——— شیریں ——— ! ہاں یہی تھا اُس کا نام۔ بیتے دنوں کی یاد تازہ ہو چلی پھر ———

پچھلے موسمِ گرما میں جولائی کا مہینہ بہت گرم تھا۔ وادی میں بھی گرمی بہت زیادہ تھی۔ اُن دنوں لوگ جوق در جوق صحت افزا مقاموں کی طرف جا رہے تھے ———

ایک دن، جب گرمی کی شدت بہت بڑھ گئی تو چند دن کے لئے میں بھی پہلگام چلا گیا
یوں تو وادیٔ کشمیر میں قدرت نے ہر طرف حسین نظارے بکھیر رکھے ہیں — لیکن
پہلگام پہنچ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت کے حُسن کی معراج اگر کہیں ہے تو بس یہیں
ہے!

گلمرگ ہوٹل میں ایک کمرہ مخصوص کروا لیا تھا میں نے۔

اُس شام مطلع ابر آلود تھا اور سفر کی تکان بھی تھی۔ میں نے وہ شام کمرے ہی میں گزارنی چاہی تھی۔ تھکن کے ساتھ ساتھ تنہائی کا احساس شدت اختیار کرنے لگا تھا — ایسے لمحات میں میری وائلن میری بہترین ساتھی ہوا کرتی ہے۔ اُس کے تار میری انگلیوں تلے تھرکنے لگے۔ ہلکی، مُسحور آواز اُبھرنے لگی۔ مجھ میں اور وائلن میں ایک عجیب سا رشتہ ہے — میری انگلیوں کے لمس سے اُس کے تار مچلنے لگتے ہیں۔ اُن کے یوں مچلنے سے بڑی سُریلی بڑی پیاری سی دُھن اُبھرنے لگتی ہے، جو میرے دل کی عمیق گہرائیوں میں اُتر کر ایک کسک سی پیدا کر دیتی ہے۔ اسی کسک کے زیرِ اثر میری انگلیاں وائلن کے تاروں کو اور تڑپانے لگتی ہیں — پھر سازوں کی اِس ملکہ سے اُبھرنے والی آواز ہر طرف سوز ہی سوز پھیلا دیتی ہے۔ سب کچھ سوز و ساز میں ڈوب جاتا ہے پھر — میں — ہاں — میں بھی —!

تیزی سے حرکت کرتی میری انگلیاں اچانک رُک گئیں۔ میری ساری توجہ اُن آنکھوں میں مرکوز ہو گئی تھی، جو کھلی کھڑکی سے کمرے میں جھانک رہی تھیں — نغمہ رُکتے ہی اُن میں قدرے جنبش ہوئی اور پھر حیا بار نظریں جُھک گئیں۔ میں کھڑکی کی طرف بڑھا۔

"میں وائلن سُن رہی تھی —" انداز ایسا ہی تھا، جیسے چور رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو — "کتنی اچھی بجاتے ہیں آپ — بند کیوں کر دی —؟"

"سُننا چاہتی ہیں تو اندر آ جائیے نا!"

"ج — جی — اِس وقت — ہم — میرا مطلب ہے میں اور دادی سیر کو جا رہی ہیں — پھر کسی وقت — —" بوکھلاہٹ —! حجاب —!!

"آپ یہیں مقیم ہیں کیا —؟"

"جی ہاں — ہم اِس کمرے میں ٹھہرے ہیں —" اُس نے ایک طرف اُنگلی اُٹھا دی۔

"وائلن کب سُننا چاہیں گی آپ —؟" دل کی بات لب پہ آ پہنچی۔

"کل شام کو — اچھا اجازت دیجئے ..." وہ مُڑنے لگی۔

"سُنئے —" اُٹھتے قدم رُک گئے — استفہامیہ نگاہیں میری طرف اُٹھیں اور میں بوکھلا گیا۔

"آپ کی تعریف —؟" جلدی میں یہی بات منہ سے نکلی

"شیریں — اور آپ —؟"

"... فرہاد — !" دل نے جواب دیا — لیکن زبان صرف "راشد" — کہہ پائی — وہ چل دی — مجھے محسوس ہوا کہ شیریں جاتے جاتے میرے دل میں ایک طوفان بپا کر گئی — شفاف چہرے پہ سُرخ و سپید رنگت، آنکھوں میں کچھ معصوم کچھ شوخ چمک، گہرے نیلے ساٹن کی شلوار قمیص میں ملبوس وہ بجلی کی مانند — یہ سب دل میں کچھ ایسے جذبات اُجاگر کر گئے جو اُس کے نام ہی کی طرح شیریں تھے۔

رات دیر تک ذہن اِن جذبات کی رَو میں بھٹکتا رہا پھر —

اگلی صبح دس بج چکے تو میں وادی کی سیر کرنے نکل پڑا — چاروں طرف سے بلند پہاڑیوں سے گھری وادی کے بیچوں بیچ بہنے والی پہاڑی ندی کی پُر شور رفتار، برف سے ڈھکی فلک بوس پہاڑی چوٹیاں، اُن پر ایستادہ دیوہیکل دیو قامت درخت، اُن سب پر ایک سائبان کی مانند تنا نیلا وسیع آسمان اور ایک کونے سے سیاہ بادلوں کی اوٹ سے جھانکتے سورج کی کرنوں کا سُنہری جال کتنا دلکش، کتنا پیارا تھا وہ منظر —!

شبنم سے تر سبز نرم دوب پر ٹہلتے ٹہلتے میں آبادی سے کافی دور نکل آیا تھا — کسی کار کے ہارن کی اچانک گونج نے چونکا دیا مجھے۔ دائیں طرف نئی طرز کی ساخت کی ایک خوبصورت کار کھڑی نظر آئی — مجھے متوجہ پا کر ہارن بار بار بجایا جانے لگا جیسے اُسی طرف بُلایا جا رہا ہو — میں کار کی طرف بڑھنے لگا اور جب اُس کے قریب پہنچا تو کچھ ٹھٹک سا گیا اُس لڑکی کو دیکھ کر جو اسٹیرنگ کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔

"ہیلپ پلیز — میں — اُف — میرے پاؤں میں موچ آ — گئی ہے" وہ دائیں پاؤں کی طرف اشارہ کر رہی تھی "میں کار ... اُف نہیں چلا سکتی اب — کیا آپ کار — چلاتے ہیں —؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا — نظریں اُس کا سرسری جائزہ لینے لگیں — بال خالص مغربی انداز میں تراشے گئے تھے۔ اچھے خاصے چہرے پر خوبصورت میک اپ اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی موٹی تہہ چڑھی تھی — بغیر بازو کے بلاؤز میں سینہ ضرورت سے زیادہ عُریاں تھا — سُرخ رنگ کی مختصر سی چُست پتلون گوری گداز پنڈلیوں کے کافی اوپر ہی رُک گئی تھی۔ دائیں پنڈلی کے گرد سُنہری ریشمی رومال بندھا تھا اور پاؤں میں اونچی ایڑی کے سفید سینڈل۔

"آپ ... آپ ایک شریف آدمی ہو کر ... ایک آفت زدہ مصیبت زدہ لڑکی کی مدد نہیں کریں گے کیا؟" اُس نے کار کا دروازہ کھول دیا اور

مسکراہٹ کر رہ گئی۔
میں نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ کار سڑک پر پھسلنے لگی۔
"میں ہٹ نمبر ۲ میں ٹھہری ہوئی ہوں ——" اس کے بتاتے ہوئے راستہ پوچھنا مناسب سمجھا تھا۔
"میرے ساتھ میرا بٹلر اور آیا ہیں ! " میں خاموشی سے سنتا رہا —
مسکراتی رہی
"میں شہر میں کالج میں انگریزی کی پروفیسر ہوں —— شہناز کہتے ہیں مجھے۔"
"— شیلے اور کیٹس — کاش انھوں نے پہلگام کی سیر کی ہوتی۔ اُن کی شاعری میں اور حسن سمو گیا ہوتا! "
"— اوہ! کتنا حسین ہے یہ سماں — — ! "
خاموشی —— ! خاموشی —— !!
"مسٹر —— ! "
"ہوں —— ؟ " میں نے اس کی طرف دیکھا۔
"آپ —— بہرے ہیں یا گونگے —— ؟ " لہجے میں جھلاہٹ تھی۔
"آپ کیا سمجھتی ہیں ؟ " میں اُس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔
"کچھ نہیں —— آپ ایک چٹان ہیں —— بے حس، خشک، بنجر! " نسوانیت کو ٹھیس لگے تو چیخ اُٹھتی ہے وہ —— !
کار چلتی رہی — —
"رُک جائیے یہیں ! " کچھ دیر بعد وہ بولی — "وہ رہی میری رہائش گاہ —— مجھے —— اُف —— وہاں تک پیدل جانا ہوگا —— آپ —— آپ ذرا سہارا دیجئے نا پلیز —— ! "
میرے کاندھے پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ وہ چلنے لگی —— وہ ایک بار شستاتی کیونکہ بھی تو کچھ اس انداز سے کہ سر میرے شانے کو چھونے لگتا —— خیالات میں کھویا میں اُس کے ساتھ چلتا رہا جب تک وہ برآمدے میں داخل ہوئی ——
"آیا —— او بٹلر —— جانے کہاں مر گئے سب —— آئیے پلیز، آپ اندر چلئے نا —— چائے کی ایک پیالی —— " لہجہ بے حد ملتجیانہ تھا۔
"جی نہیں، شکریہ — — اِس وقت معافی چاہوں گا! "
"ممنون تو میں ہوں —— آپ —— آپ کتنے اچھے ہیں، ورنہ میں گھر کیسے پہنچ پاتی —— ؟ " وہ میرے سامنے بالکل قریب آ رُکی مجھے ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔

"اور یہاں محترمہ، اونچی ایڑی کے سینڈل بال روم کے لئے موزوں ہیں پہلگام کی پہاڑیوں کے لئے نہیں —— اِس کا ذرا خیال رہے —— ! "
میں نے ردِّ عمل دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور تیزی سے لوٹ پڑا۔
وہ سارا دن عجیب کشمکش میں گزرا —— کبھی شیریں تخیل میں اُبھرتی، کبھی شہناز —— عورت کے دو رُخ، تصویر کے دو پہلو —— کبھی ایک پہلو سامنے آتا کبھی دوسرا —— اور میں دونوں کا موازنہ کرنے لگتا —— عورت ایک پہیلی ہے بار ہا یہ الفاظ پڑھے اور سُنے تھے میں نے —— لیکن اُس پہیلی میں اُلجھنے کا وہ پہلا اتفاق تھا —— ! سچ مچ اُلجھ کر رہ گیا تھا ذہن —— !!
میں بہت بے صبری سے منتظر رہا سورج ڈھلنے کا — میرے ضبط کو آزماتا رہا وہ کٹھور —— لیکن کب تک —— ؟ اُسے ڈھلنا تھا، سو ڈھل چکا —— ! شام کے ٹھنڈے سائے بڑھ آئے پھر — کل ہی کی طرح چندا — — میرا چندا مشرقی پہاڑیوں کی اوٹ سے اُبھر آیا —— کچھ لمحے اور گزرے —— ہلکی سی آہٹ ہوئی تو میری بے قرار نظریں کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف اُٹھ گئیں۔
ہاں، شیریں ہی تھی وہ —— وہ کچھ اس انداز میں کھڑی تھی کہ چودھویں کا پورا چاند اُس کے سر کے پیچھے چھپ گیا تھا اور وہاں سے چاندنی یوں پھیلتی معلوم ہو رہی تھی جیسے اس کے سر کے پیچھے وہ پہلی روشنی کا منبع ہو کوئی — بغیر پلک جھپکائے دیکھتا رہ گیا میں —— !
"آداب —— ! " سر کو تھوڑا سا جھکا کے، دایاں ہاتھ بہت سلیقے سے لمحہ بھر کو پیشانی تک اُٹھایا تھا اُس نے۔
"آں —— " میں چونک اُٹھا —— "آداب —— آپ تشریف لائیے نا! "
آگے بڑھ کے میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر چلی آئی اور میرے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"کہئے پہلگام پسند آیا آپ کو ؟ " شہر سے لائے ہوئے کچھ بادام اور کشمش پیش کئے میں نے۔
"جی — جی ہاں اکثر آتی ہوں یہاں —— شکریہ —— ! " وہ کھانے لگی۔
"شیریں صاحبہ — آپ کرتی کیا ہیں —— ؟ " کچھ وقفے کے بعد میں نے پوچھا۔
"دادی کی خدمت — ! " برجستہ جواب پر مسکرا اُٹھا میں۔ وہ بھی مسکرانے لگی "جی میرا مطلب ہے دادی اکثر بیمار رہتی ہیں۔ اور اُن کی دیکھ بھال میں ہی کرتی ہوں —— اِس دُنیا میں وہی میری سب کچھ ہیں اور میں اُن کی سب کچھ —— شہر میں کچھ جائیداد ہے، جس سے کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔ بس کٹ رہے ہیں دن —— "

"اوہ —— مجھے افسوس ہوا یہ سُن کر —— خیر، دادی کہاں ہیں اِس وقت ——؟"

"کمرے میں آرام کر رہی ہیں —— راشد صاحب، آپ وائلن خوب بجاتے ہیں۔ اُس کی آواز کل شام کو مجھے کھینچ لائی تھی آپ کے سامنے۔"

"پسندیدگی کے لئے شکریہ —— بس یونہی کچھ اُلٹے سیدھے ہاتھ چلا لیتا ہوں وائلن پر۔"

"تو پھر شروع کیجئے نا یہ اُلٹے سیدھے ہاتھ چلانے ——!" اُس نے شوخی سے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی —— پھر میں نے سکوت توڑا ——

"شیریں صاحبہ —— اگر لیمپ بجھا دوں —— تو —— آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا ——؟"

چند لمحے وہ میری بات کو تولتی رہی، میری سنجیدہ آنکھوں میں جھانکتی رہی اور پھر بولی۔

"جی نہیں —— آپ بجھا دیجئے لیمپ ——" میں نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھا ہوا لیمپ بجھا دیا۔

لیکن کمرے میں اندھیرا نہیں ہوا —— کھلی کھڑکی سے آنے والی چاندنی کسی حد تک کمرے کو منور کئے رہی۔

میں نے اپنی وائلن سنبھال لی —— غیر ارادی طور پر میری نگاہیں چندا پر جا ٹکیں —— میری انگلیاں حرکت میں آگئیں پھر —— اور وائلن بجنے لگی ——!

کہہ چکا ہوں کہ مجھ میں اور وائلن میں ایک عجیب سا رشتہ ہے۔ میری انگلیوں کے لمس سے اس کے تار مچلنے لگتے ہیں۔ اُن کے یوں مچلنے سے بے حد سُریلا، بہت پیارا سا سُر اُبھرنے لگتا ہے، جو میرے دل کی عمیق گہرائیوں میں اُتر کر ایک کسک سی پیدا کر دیتا ہے۔ اُسی کسک کے زیرِ اثر میری انگلیاں، وائلن کے تاروں کو اور تڑپانے لگتی ہیں - اور پھر —— سازوں کی اُس ملک سے اُبھرنے والی آواز، ہر طرف سوز ہی سوز پھیلا دیتی ہے۔ سب کچھ سوز و ساز میں ڈوب جاتا ہے —— سب کچھ سوز و ساز میں ڈوب گیا پھر —— میں بھی —— شیریں بھی ——!!

"بس —— بس کیجئے راشد صاحب! بس کیجئے —— بس کیجئے!"

اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا —— میں نے میز پر پڑا ہوا لیمپ روشن کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اور بھیگے گالوں پر کاجل کے نشان دیکھ کر میں حیران ہو گیا —— میں سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا رہا اُسے۔

"یہ اِتنا سوز کہاں سے اُمڈ آتا ہے آپ کی وائلن میں ——!" وہ جذبات کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آہ ——!" ایک سسکی سی نکل پائی۔ اِس کا جواب پھر کبھی دوں گا —— اب کھانا کھا لیں۔

"جی نہیں —— شکریہ —— میں کھا چکی ہوں —— اچھا تو اجازت دیجئے اب ——" وہ اُٹھ بیٹھی۔

"دادی سے نہیں ملائیے گا مجھے ——؟" نہ جانے کیوں میں پوچھ بیٹھا۔

"اوہ —— ضرور —— ضرور —— کل صبح تشریف لائیے نا ہمارے کمرے میں —— اچھا شب بخیر!"

"شب بخیر ——!!" میں اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

ساری رات پھر نغموں کی بارش ہوا کی —— ایسے میں نیند کب آتی ہے۔ صبح بیدار ہوتے ہوتے نو بج گئے تھے۔ جلدی جلدی تیار ہو کر ناشتے کے بعد میں شیریں کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ شیریں نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور مجھے اندر لے چلی۔

"دادی، یہ ہیں راشد صاحب۔ جن کی تعریف صبح کر چکی ہوں میں" وہ کہہ رہی تھی۔ بہت خلوص سے میں نے آداب پیش کیا —— اور اُن کے پاس کی کرسی پر جا بیٹھا۔

"جیتے رہو بیٹا —— شیریں چائے بنا لاؤ" اور وہ چائے بنانے چلی گئی۔

دادی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ میں سُنتا رہا اور سوچتا رہا۔ کبھی دادی بھی شیریں ہی کی طرح نوجوان، الھڑ دوشیزہ رہی ہوں گی۔ اُن کے گالوں کے گلاب، اُن کی سیاہ لانبی زُلفوں، اُن کی آنکھوں کی چمک سے نہ جانے کتنے دل گرما جاتے ہوں گے۔ اور آج —— آج یہ ایک لاغر —— ہڈیوں کا پنجر بن چکی ہیں! اب ایک ایک دن —— نہیں - ایک ایک پل مشکل سے گزر رہا ہوگا —— شیریں چائے لے آئی۔ میری نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ میں نے سوچا، ایک دن آئے گا، جب شیریں کے شاداب گلابی ہونٹ پھیکے پڑ جائیں گے، اِس کی آنکھوں کی چمک ماند ہو جائے گی، اس کے شفاف حسین چہرے پر بے شمار جھرّیاں ہوں گی —— اور —— اور بستر پر پڑی وہ اُس گھڑی کی منتظر ہوگی جو اسے قیدِ حیات سے چھٹکارا دلا سکے —— شہزاد —— ہاں، اِس کے ساتھ بھی یہی ہوگا ——!

"چائے لیجئے" خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ میں نے پیالی اُس کے ہاتھ سے لے لی اور ایک گھونٹ پی لیا۔

"کتنی شیریں ہے ——!" زیرِ لب یہ جملہ دادی کے کانوں تک نہ پہنچ سکا۔


[redacted]

"کون ـــــ ؟" شوخ و شنگ نگاہیں میری طرف اُٹھیں۔

"میں چائے کے متعلق کہہ رہا ہوں ـــــ" تھوڑا اُسے چھیڑنے کا تھا۔ وہ شرماسی گئی۔ وادی کے بس رسیدہ کان اُونچا سنتے تھے۔ وہ ہماری دھیمی گفتگو سُن سکیں۔ پھر بھی دبی مسکراہٹ کے آثار دکھائی دئیے اُن کے نحیف چہرے پر۔ ایسی ہی ہلکی پھلکی شرارت آمیز باتوں میں اچھا خاصہ وقت کٹ گیا۔

اُس دن کے بعد ہم کئی بار ملے ـــــ کتنے ہی گھنٹے ساتھ گزار دیئے ہم نے۔ کبھی بہتی ندی کنارے، کبھی برف سے ڈھکی چوٹیوں پر چڑھتے اُترتے اور کبھی گھڑ سواری کرتے۔ شیریں بہت بھلی معلوم ہوئی مجھے۔ اُس کی شائستہ زبان، اُس کا بات کرنے کا انداز بہت معصوم، بہت پیارا معلوم ہوا مجھے۔ کتنی سادگی تھی اُس کی پوشاک میں، اُس کے رہن سہن میں ـــــ اور ایک بار جب اُس کی فرمائش پر میں وائلن بجا چکا تو وہ اپنا سوال دُہرا بیٹھی۔

"اتنا سوز کہاں سے اُمڈ آتا ہے آپ کی وائلن میں ــ ؟"

"کیا کرو گی سُن کر ـــ ؟" نہ جانے میرا لہجہ کیوں بھاری ہو گیا تھا۔

"کیا اپنا دل میرے سامنے نہیں ـــــ ؟"

"اچھا تو سُنو ـــــ محرومیوں اور مجبوریوں سے دوچار انسان کے دل میں کرب اور تڑپ کے سوا ہوتا ہی کیا ہے شیریں ؟ اور جب دل کی کیفیت ایسی ہو تو انسان سے سرزد ہونے والی ہر حرکت، ہر بات میں سوز کی جھلک ملے گی تمہیں۔"

"راشد صاحب ـــــ کہتے ہیں چہرہ دل کا آئینہ ہوا کرتا ہے، لیکن آپ کے چہرے پر ایسے جذبات کی کوئی جھلک نہیں ملتی ـــــ خیر، یہ میری خوش نصیبی ہوگی اگر میں آپ کے دُکھوں کا بوجھ ہلکا کر سکوں ـــــ"

"میں تو بس اتنا جانتا ہوں شیریں ـــــ دل میں دنیا جہان کی حسرتیں پنہاں ہوں، یا رنج و الم کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہوں ـــــ ہونٹوں پر مسکراہٹ رہنی ہی چاہیئے ـــــ ! ہنسو، تو سبھی ہنستے ہیں تمہارے ساتھ۔ کبھی، کہیں ایسا بھی دیکھا ہے تم نے کہ دل کا دُکھڑا لے بیٹھو اور لوگ تمہارے دُکھوں پہ آنسو بہانے بیٹھ جائیں ـــــ ؟ شاید ہی ہوتا ہے ایسا ـــ ! خیر چھوڑو یہ باتیں اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ چلو گھر چلے چلیں اب ـــــ" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اُس کے چہرے پر آئی ہوئی اُداسی کی جھلک مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔ خاموشی سے ہم راستہ طے کرنے لگے۔

پھر ایک شام پہلگام کلب میں ایک تفریحی پروگرام ہوا تھا۔ جس میں حاضرین کی فرمائش پر وائلن بجائی تھی میں نے۔ ہال کو تالیوں کے شور سے گونجتا چھوڑ کر میں باہر نکل آیا تھا اور وائلن سنبھالے ہوٹل کی طرف چل پڑا تھا۔

کچھ ہی دُور چل پایا تھا کہ پیچھے سے کار کے ہارن کی آواز سُنائی دی۔ میں سڑک کے کنارے ہٹ کر چلنے لگا۔ لیکن وہ کار بڑھتی بڑھتی میرے قریب آ رُکی۔

"عید کا چاند ہو گئے حضور ـــ !" ایک نسوانی آواز چہکی ـــــ میں نے مُڑ کر دیکھا۔

"اوہ ـــــ آپ ـــ ! کہئے مزاج اچھا تو ہے !" میں کار میں بیٹھی شہناز سے مخاطب تھا۔

"جی ہاں، خوب مزاج پُرسی کی نا آپ نے ـــــ !" اُس نے گِلہ کیا۔

"جی ـــــ وہ ـــــ بات یہ ہے کہ کچھ مصروف رہا اِن دنوں ـــــ" میں نے فرار کی راہ تلاش کی۔

"اجی صاحب، یہ بھی مصروف رہنے کی جگہ ہے کیا ـــــ ؟ مصروفیات سے تنگ آ کر ہی تو لوگ یہاں بے فکری کے چند دن گزارنے آتے ہیں ـــــ خیر آپ کار میں بیٹھ جایئے۔"

"جی میں ـــــ اِس وقت ـــ"

"دیکھیے مسٹر راشد، آج کی شام ہم ساتھ گزاریں گے، رات کا کھانا میرے ہاں ہوگا ـــــ اور اس کے بعد میں آپ کو رہائش گاہ پر چھوڑ آؤں گی ـــــ"

"لیکن ـــــ"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اب پروگرام بن چکا، آیئے آپ دوسرے دروازے سے یہاں بیٹھ جایئے" اُس نے مجھے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں انکار نہ کر سکا۔ اُس کے ساتھ جا بیٹھا ـــــ وہ خوبصورت امریکی کار بغیر آواز کئے چل پڑی۔

"کلب میں آپ کی وائلن بجتی سُنی، بہت پسند آئی ـــ بہت خوب ہے یہ فن۔ کیا آپ پروفیشنل فن کار ہیں ـــــ ؟"

"جی نہیں یہ تو ایک شغل ہے۔ میں ایک فرم میں دو سو روپے ماہوار پہ ملازم ہوں ـــــ !"

"اوہ ـــــ فن کار کی بے قدری میں ہمارا ملک ثانی نہیں رکھتا ـــ !"

میں خاموش رہا ـــــ کار ٹیڑھی میڑھی پہاڑی سڑک پر پھسلتی، شہناز کی رہائش گاہ کے قریب جا رُکی۔

میں اُس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، جسے بہت نفاست سے سجا رکھا تھا اُس نے۔

"آپ بیٹھئے میں ابھی حاضر ہوتی ہوں" کہتی ہوئی شہناز دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ آئی تو اُس کے ساتھ آیا پھلوں کی طشتری بڑے میں

سجا سے لا رہی تھی۔ شہناز میرے قریب صوفے پر آ بیٹھی۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔
"راشد صاحب —— آپ —— میرا مطلب ہے، آپ اکیلے ہیں کیا
—؟" وہ بہت معنی خیز لہجے میں پوچھ رہی تھی —— میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"بالکل ——؟"
سر اثبات میں پھر ہلا —— کچھ دیر وہ اپنی ساری کے پلو کو انگلیوں میں
مروڑتی رہی —— شاید وہ مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔
"تنہائیوں میں کیا آپ نے کبھی کسی کی کمی محسوس نہیں کی —— میرا مطلب
ہے۔ تنہائی سے تنگ نہیں آ جاتے آپ ——؟" وہ سراپا سوال ہو گئی۔
"اونہوں —— ہونہہ ——" اب کے سر نفی میں ہلا دیا میں نے۔
"اُف —— بہت کٹھن ہے —— بہت مشکل ہے آپ کو سمجھنا ——؟"
وہ ہاتھ ملنے لگی۔

"کوشش ہی کیوں کرتی ہیں ——؟" کیا جواب دے پاتی وہ ——!!
صوفے پہ وہ میرے قریب اور بڑھ آئی —— ایک لمحے کے لئے اُس نے
میرے شانے پہ اپنا ہاتھ رکھا، پھر جلدی سے یوں ہٹا لیا جیسے برقی تار کو چھو لیا ہو انجانے
میں ——

"میں —— میں کیسے سمجھاؤں آپ کو —— مسٹر راشد —— مگر نہیں،
مجھے کہہ ڈالنا چاہیئے سب کچھ —— میں —— ہاں، میں آپ سے پیار کرتی ہوں ——
پیار ہو جاتا ہے نا ——؟ مجھے اُسی دن پیار ہو گیا تھا جس دن پہلی بار دیکھا تھا آپ
کو اور آپ کے سہارے میں گھر تک پہنچ پائی تھی ——! —— آپ کے اس پُروقار
چہرے، اِن سوچ میں ڈوبی رہنے والی آنکھوں، اِن سیاہ گھنیری پلکوں، آپ کے
اِس کشادہ سینے، اِن سڈول بازوؤں —— آپ کی ہر ادا، ہر چیز سے پیار ہے مجھے۔
مسٹر راشد، ہر ادا سے پیار ہے مجھے ——"
جذبات کی تیز رَو میں بہہ نکلی تھی شہناز —— میں خالی خالی نظروں سے
اُفق میں دیکھتا رہا۔

"ادھر دیکھئے، میری طرف —— مجھے دیکھئے —— کیا میں آپ کو بھلی
نہیں لگتی ——؟ جوان ہوں میں، خوبصورت بھی ہوں، امیر بھی کیا کمی ہے مجھ میں؟"
"خوبصورتی اور دولت ہی سب کچھ نہیں دنیا میں ——" بھاری لہجے
میں یہی مختصر جواب دے سکا میں۔
"تو —— تو کہیئے اور کس چیز کی تلاش ہے آپ کو ——؟"
میں کھویا سا، اُفق میں گھورتا رہا صرف ——!
"ڈیڈی شہر کے امیر ترین اشخاص میں سے ہیں۔ اُن کی دولتوں ہی سے

[illegible] وکسوں سے پہلی سالانہ دلہنیں روتی ہے چہرہ اُس نے اُٹھا کی کلائی ہے —— [illegible]
بکھرے ہیں —— میں —— میں بڑی ہی بھی جوانی ہیں اُن کی ہر بات کی —— [illegible]
تو یہ بھی کچھ آپ کا ہو سکتا ہے؟"
نہ جانے اب بھی کیوں خاموش رہا میں —— ——
"او راشد صاحب —— حُسن جب بھکاری بن کر [illegible]
دامن پھیلا دے —— تو —— تو اُسے ٹھکرایا نہیں جاتا [illegible]
جاتا ہے —— راشد صاحب پیار سے بھر دیجئے میرا دامن ——" [illegible]
ڈوب کر رہ گئی تھی پھر —— ——
اُس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا۔
"ضبط سے کام لو شہناز۔" میں اُس کا سر سہلانے لگا۔
آہستہ آہستہ وہ خود پر قابو پانے لگی تھی۔
پھر کھانا آ گیا —— بہت پُرتکلف تھے کھانے۔ خاموشی سے کھاتے رہے ہم۔
اس کے بعد ہم کچھ دیر ریڈیو گرام پر اچھے اچھے ریکارڈ سنتے رہے اور جب رات کچھ بیگ
چلی تو شہناز مجھے کار میں مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آئی۔ جدا ہونے لگے تو ایک سسکی سی نکل
پڑی اُس کے منہ سے اور پھر اُس کی کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ بھاری قدموں سے میں
اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔
اُس کے تیسرے دن کا واقعہ ہے یہ ——
صبح ہی سے طبیعت کچھ بھاری بھاری سی تھی۔ شاید اس لئے کہ رات میں
اچھی طرح سو نہ سکا تھا۔ دُور وادی میں سیاحوں کو گھوڑے دوڑاتے دیکھ کر جی چاہا کچھ
دیر میں بھی اس شغل سے محظوظ ہو لوں —— اور اس ارادے سے میں اُسی طرف
چل نکلا۔

"گھوڑا بابو!"
"گھوڑا بابو!"

دو چار آدمی میری طرف لپکے۔ میں بے اختیار مسکرا اُٹھا —— اُن کا انداز
کچھ ایسا ہی تھا، جیسے بابو کو گھوڑا کہہ کر مخاطب کر رہے ہوں وہ۔ ویسے کئی کئی آواز
"ٹٹو صاحب" کی بھی اُبھر رہی تھی وہاں ——!
ایک اچھا سا گھوڑا چن کر میں اُس پر سوار ہو گیا اور اُسے ایک پہاڑی
پگڈنڈی کی طرف لے چلا۔ گھوڑے کا مالک ہاتھ میں چھڑی لئے، ایک کشمیری لوک گیت
گنگناتا پیچھے پیچھے چل رہا تھا —— ایک بھرپور نظر میں نے گرد و نواح پر ڈالی ——
دُور دُور تک سر بفلک، برف سے ڈھکی چوٹیاں اور اُن پر سے نیچے گرتے جھرنوں
کی جھنکار، کافی نیچے چھوٹ گئی وادی میں بکھرے لالہ زار —— سب کتنے بھلے [illegible]

تھے۔ اُن خوبصورت قدرتی مناظر میں کھویا سا میں گھوڑا پہاڑی پر اوپر ——— اور اوپر بڑھتا رہا ——— اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اندھیرا سا چھا گیا ہو ——— ایک گہرے، دبیز بادل نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"بابو ——— رُک جاؤ بابو ——" گھوڑے والا جو کافی پیچھے رہ گیا تھا چلا اُٹھا۔ میں نے لگام کھینچ لی۔ گھوڑا رُک تو گیا۔ لیکن ٹھوکر لگنے کے باعث توازن قائم نہ رکھ سکا اور گر پڑا ——— میں نے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ جانے کتنی فٹ، کتنی دیر تک لُڑھکتا رہا میں ——— اور ایسے میں سر کسی پتھر سے ٹکرا گیا، تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا اور گہرا ہوتا چلا گیا ——— میں بے ہوش ہو چلا تھا ———

آنکھ کھلی تو میں مقامی ہسپتال کے ایک کمرے میں پڑا تھا۔ سر، چہرے، ہاتھوں اور دونوں ٹانگوں پر پٹیاں بندھی تھیں ——— اور جسم کا ایک ایک حصہ شدید درد میں مُبتلا تھا ——— سامنے دیوار پہ لگے ہوئے ایک خوشنما کلنڈر پر میری نظریں جا ٹکیں ——— اوہ ——— حیرت اور گھبراہٹ کے مِلے جُلے تاثر میں میں نے اُٹھنے کی کوشش کی ——— لیکن نحیف زخمی جسم ساتھ نہ دے سکا ——— سر چکرا گیا۔

تو کیا میں نے پانچ دن بے ہوشی کے عالم میں گزار دیئے ———؟ "لیٹے رہیئے۔ آپکو پورے آرام کی ضرورت ہے" نرس کہہ رہی تھی ——— اُسی سے معلوم ہوا کہ غریب گھوڑے والا بہت مشکل سے ہسپتال پہنچا سکا تھا مجھے ———

"اِن دنوں ——— مجھ سے ملنے تو نہیں آیا کوئی ———؟" میں نرس سے پوچھ بیٹھا۔ دل میں شیریں کی ——— ہاں شہناز کی بھی ——— یاد تازہ ہو چلی تھی ——— !

"جی ہاں ——— کچھ لوگ اور دو لڑکیاں کبھی کبھی آتے رہے۔ لیکن ڈاکٹر نے کسی کو آپ کے کمرے میں آنے کی اجازت نہیں دی تھی ——— ابھی آپ کو مکمل طور سے آرام کی ضرورت ہے ——— چار روز کے بعد غیر ضروری پٹیاں کھول دی جائیں گی۔ آپ کی طبیعت بہتر ہو چکی ہوگی، تب آپ دوستوں سے مل سکیں گے" وہ کہتی رہی۔

میں بے صبری سے اُس دن کا انتظار کرنے لگا۔ اکثر سوچتا، شیریں مجھے پھر پا کر کتنی خوش ہوگی۔ اُس کا معصوم شگفتہ چہرہ کنول کی طرح کِھل اُٹھے گا مجھے دیکھ کر ——— اور ——— اور میں اُسے بہت پیار سے بھینچ لوں گا پھر ——— !

اور بے چاری شہناز، نہ جانے اُس جذباتی لڑکی کی کیا حالت ہوئی ہوگی اِس حادثے کی خبر سن کر ——— !

چار کٹھن دن کٹ ہی گئے ———

اُس روز صبح سویرے نرس نے مجھے ایک انجکشن لگا دیا ——— کچھ دیر بعد ہلکا سا خمار قدرے غنودگی سی محسوس ہونے لگی مجھے۔ نہ جانے وقت کی رفتار اتنی سُست کیوں پڑ گئی تھی اُس روز ——— بہت مشکل سے نو بجے ——— اور پھر ڈاکٹر اور نرس دواؤں کی ٹرالی کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے ——— نرس پٹیاں کھولنے لگی۔ ایک ایک کر کے پٹیاں کُھلتی رہیں اور میری بے قراری ہر لمحہ ایک ایسے پنچھی کی طرح بڑھتی رہی جو بند پنجرہ کُھلنے کا منتظر ہو ——— ! ڈاکٹر نے مندمل ہوتے ہوئے سارے زخموں کو باری باری دیکھا اور اُن پر مناسب دوائیں لگا دیں۔ سر کی چوٹ شاید شدید تھی کیونکہ وہاں پھر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ باقی زخموں پر شاید پٹیوں کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اب ——— پھر ڈاکٹر اور نرس چلے گئے۔

"اب آپ اندر جا سکتی ہیں ———" باہر سے ڈاکٹر کی آواز سُنائی دی۔

قدموں کی ہلکی سی چاپ ہوئی ——— میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ میری نظریں دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ پردہ تھوڑا سا ہلا ——— پھر اُٹھ گیا ——— شیریں اور شہناز ——— دو حسین و جمیل پریاں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ بے پناہ شگفتگی تھی اُن کے چہروں پر، بے پناہ حُسن ——— ! اُن کے ہاتھوں میں خوشنما گلدستے تھے جو غالباً مجھے پیش کرنے کے لئے لا رہی تھیں وہ۔ میں بستر پر اُٹھ بیٹھا ——— اچانک ——— اُن کے بڑھتے قدم رُک سے گئے ——— ! چہروں پر رقصاں مُسکراہٹیں پھیکی سی پڑ گئیں ——— اور شیریں کے ہاتھوں سے گلدستہ زمین پر جا گرا ——— کچھ دیر ویران کھوئی کھوئی نظروں سے دونوں میری طرف دیکھتی رہیں اور میں اُنھیں ——— ایک لمحے کو شیریں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا ——— تحیّر اور دُکھ کے تاثرات اُس کے چہرے پر گہرے ہوتے چلے گئے۔ اُس کے ہونٹ کانپے، کچھ کہنا چاہا اُس نے لیکن زبان ساتھ نہ دے سکی ——— کسی گہری کشمکش میں مبتلا تھی وہ ——— میں نے شہناز کی طرف دیکھا ——— اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور جذبات سے عاری تھا ——— اچانک اُن دونوں کی نظریں باہم ٹکرائیں، جُھک گئیں ——— اور وہ یوں لوٹ چلیں جیسے جسے تلاش کرتی وہ اس کمرے میں آئی تھیں ——— وہ ——— وہ میں نہ تھا !!!

"شیریں ——— شہناز ——— !!" بے اختیار میں پکار اُٹھا ———

لیکن وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ دیوار پر آویزاں شیشے کی طرف میں جلدی سے لپکا ——— اُف ——— میرے خدا ——— ! وہ خواب تھا یا حقیقت ——— ؟

لیکن نہیں، حقیقت ہی تھی وہ ——— ! میرے دائیں رُخسار پہ ایک گہرا بدنما زخم تھا۔ پیشانی پہ بے شمار خراشوں کے نشان تھے ——— اور ——— اور دائیں کان کا صرف نچلا نصف حصہ باقی بچا تھا ——— ! ایک دم آنکھوں میں سیلاب سا آنے لگا پھر ——— لیکن میں نے اُسے بہت سختی سے روک دیا ——— میری نظریں اُس گلدستے پر پڑیں، جو شیریں کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اب فرش

یہ پڑا تھا —— ساتھ ہی ذہن میں کچھ جانی پہچانی آوازیں اُبھر آئیں ——

'راشد صاحب، یہ میری خوش نصیبی ہو گی اگر میں آپ کے دُکھوں کا بوجھ ہلکا کرسکوں،' یہ شیریں تھی -!

'آپ کی ہر ادا، ہر چیز سے پیار ہے مجھے، مسٹر راشد —— اور —— حُسن جب بھکاری بن کر اتنی عاجزی سے دامن پھیلا دے، تو اُسے ٹھکرایا نہیں جاتا، دامن پیار سے بھر دیا جاتا ہے - راشد صاحب، پیار سے بھر دیجئے میرا دامن —— سسکیوں میں ڈوبی شہناز تھی یہ ——!!

—— وہی شیریں، وہی شہناز، چند ہی لمحے پہلے مجھے اِس حال میں دیکھ کر یوں نظریں چُرا گئیں، جیسے یہ مکروہ چہرہ اپنی رونق، اپنا وقار کھو جانے کے بعد اُن کے پیار سے محروم ہو چکا ہو -! —— عورت مشرق کی شیریں ہو یا مغرب زدہ شہناز بہرحال عورت ہے —— سو رہے گی ——!

پھر، ایک طوفان سا اُٹھا دل میں —— بہت بھیانک، بہت خوفناک —— -! جذبات کے زیرِ اثر میں اُن پھولوں کی طرف بڑھنے لگا، جو زمین پر گر کر بھی مُسکرائے جا رہے تھے —— اور —— اُنھیں پیروں تلے مسل ڈالنے کو پاؤں اُٹھایا ہی تھا میں نے کہ —— دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک آواز اُبھری —— میرے ضمیر کی آواز —— ! —— شیریں نے مجھے ٹھکرا کر حقیقت پسندی کا ثبوت دیا تھا۔ آج کی دنیا ظاہرداری ہی پر مرتی ہے نا —— پھر مجھے اپنا کر وہ اپنی بھرپور جوانی میں ناسور لگا لیتی تو کیونکر —— ؟ ساری زندگی اُسے چین ملتا نہ مجھے —— !

رہی شہناز، تو اُس سے وفا کی اُمید تھی ہی کب —— ؟

"بس کیجئے صاحب، رات بہت بھیگ چکی —— " خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ پبلک گارڈنز کا مالی نہ جانے کب سے میرے قریب بیٹھا وائلن سُن رہا تھا۔ فلک پر چندا کافی اُبھر چکا تھا اب - چاندنی پورے جوبن پر تھی - لیکن —— میرے دل و دماغ میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی ——! اُنھیں تاریکیوں میں بھٹکتا، میں گھر کی طرف چل دیا —— وائلن میرے سینے سے لگی تھی - یہی میری بہترین رفیقہ ہے -! شیریں سے بہتر —— !! شہناز سے بھی ——!!!

---

## رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔ اِس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶)

# تین مختصر نظمیں

کرشن موہن ایم۔اے

## طلوعِ آفتاب

یہ طلوعِ آفتاب اور یہ کرنوں کا جال
دلکش و کیف آفریں زیورِ رُوئے زمیں
جیسے کوئی نازنیں خوشدل و روشن جبیں
اپنے عاشق کے لئے وا کرے آغوشِ ناز
اور گلے میں ڈال دے
اپنی چاہت کی کمند

## سڑک —— اِک تماشائی

سڑک ہے اِک تماشائی حسینوں کے جلوس آئے
شہوں کے کارواں گزرے چمکتے اور بھڑکیلے
مگر سارے نشاں گزرے چمک ہے ایک ہرجائی
بھڑک ہے ایک ہرجائی سڑک ہے اِک تماشائی

## شعورِ حُسن

قلم کو قوسِ قزح کے پُرکیف و خوشنما رنگوں میں ڈبو دے
بکھیر دے گردِ زرفشاں تیتلیوں کے نازک اداپروں سے
ٹھٹھر ہر مقام پر فکر و آگہی کے
تو پھر کہیں جا کے ذکر عورت کے حُسنِ عشرت فزا کا کرے

افسانہ

# شعلوں کی بانہہ میں

ظفر اقبال سہسرامی

معرفت کیلاش پرشاد جیسوال، سرکاری گوالہ سہسرام (بہار)

مہ زبی ۲۰۰ جو نیشنل تو شہر صاحب ، تسلیمات

لیجئے "شعلوں کی بانہہ میں" آفاق حاضر ہے۔ اُس کے آنسو میں شبنمی سردرت تو نہ ملے گی لیکن آتشیں میں ٹھنڈک کہاں؟ اُس کی سب سے بڑی غلطی وہی ہے جس کے اظہار میں ایک ہنگرین مفکر نے کہا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی مسرتوں سے دکھ کے پہلو نکالتا ہے اور پھر اُس دکھ کے پیچھے اپنی زندگی تباہ کرتا ہے۔ یہی خیال میری کہانی کا محرک ہے۔ اس خیال سے آپ متفق ہو سکتے ہیں۔ میرے کہنے کے انداز سے آپ کو اختلاف ہو تو آفاق کی بدنصیبی اور میری محرومی ہوگی . . .

خلوص کار ـــــــــ ظفر

---

تار روبینہ کے ہاتھ میں پہنچا۔

اور روبینہ کا چہرہ کھل اُٹھا۔ کھلے ہوئے چہرے پر چمکتی آنکھیں ــ بے پناہ مسرت کی غماز تھیں لیکن وہ اپنی مسرت کو چھپانے کے لئے چہرے پر معمہ جیسی سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے زینہ طے کرنے لگی تو اوپر سے آتی ہوئی صبیحہ نے اُسے روک لیا۔

"کون تھا روبی؟"

"کوئی تھا!" روبی نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

"مجھے نہ بتاؤ گی؟"

"آپی ڈیر! کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں چھپا کر رکھنے میں لطف آتا ہے تاکہ دوسرے اس تجسس میں پریشان ہوں کہ کیا ہے؟"

"پہیلی بجھوانے لگیں!"

صبیحہ نے اُسے پریشان کرنا چاہا۔ جب تک روبینہ کی اماں بھی آگئیں اور کچھ برہم لہجے میں کہا۔

"روبی! تو کام تو کرتی نہیں۔ باتیں بناتی پھرتی ہے!"

"اماں حضور! یہ دیکھئے"

روبینہ نے بے حد خوشی میں کہا اور تار دکھاتے ہوئے بتایا کہ کل شام کی ٹرین سے بھائی جان تشریف لا رہے ہیں۔ اِس خبر سے اماں بھی خوش ہوگئیں اور صبیحہ ـــــ

سکوت شب میں جیسے بانسری کی سُریلی آواز رس گھولنے لگی۔ اُس نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر دلنواز تبسم تھا اور پھول جیسے کومل چہرے پر شبنمی رات کا ٹھنڈک سایہ۔ اماں کے جاتے ہی صبیحہ نے اُسے ٹہوکا لگایا۔

"مجھ سے چھپا رہی تھیں نا؟"

"لیکن بتانا بھی تو آپ ہی کو تھا۔ اِس لئے میں پہلے آپ کے پاس آرہی تھی۔"

پھر وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے نیچے اُتر گئیں۔

دس دن پہلے

جب صدر دروازے پر رکشا رُکا تو روبینہ نے یہی سمجھا کہ بھائی جان آگئے! گرمی کی تعطیل شروع ہو چکی تھی۔ اُس کا کالج بھی بند ہو چکا تھا لیکن آفاق کی بجائے دو اجنبی صورتیں نظر آئیں تو وہ حیرت میں پڑ گئی۔ اِس سے پہلے اُس نے دیکھا بھی نہ تھا۔ بعد میں اماں نے بتایا کہ اُس کے ابا کی چچی اماں یعنی اُس کی دادی اماں تھیں اور ان کے ساتھ اُن کی پوتی صبیحہ ـــــ دادی اماں سے تو وہ اتنی خوشی نہ ہوئی لیکن صبیحہ سے مِل کر بہت مسرور ہوئی۔ صبیحہ عمر میں اُس سے بڑی ضرور تھی لیکن اپنے قد و قامت اور اکہرے بدن کی وجہ سے چھوٹی ہی معلوم ہوتی تھی۔ روبینہ کا زیادہ وقت صبیحہ کے ساتھ گزر رہا تھا اور میل جول اتنا بڑھ گیا تھا کہ بہناپے کی سرحد کو پھلانگ کر دوستی کی حد میں پہنچ چکی تھی۔ جہاں ساری باتیں ہوتیں وہاں آفاق کا ذکر

## ترک

کر رسمِ جفا نہ یک بہ یک ترک
کیا جانیے جی پہ کیا گزر جائے — فانی بدایونی

ترکِ تعلقات کو اِک لمحہ چاہیے
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا — تنا کانپوری

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
مگر اِس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں — فراق گورکھپوری

دیکھا ہے رہِ ترکِ محبت پہ بھی چل کر
دشوار ہے یہ راہ گزر اور زیادہ — نامعلوم

سخت مشکل ہے سنبھل کر چلنا
جادۂ ترکِ محبت ہی سہی — تدش صدیقی

مرسلہ:- ایس۔ ایس۔ بھنڈاری ایم۔ اے، کلکتہ

بھی آجاتا اور اس ذکر میں روبینہ کا لب و لہجہ اتنا شیریں ہوتا کہ ایک لمحے کے لئے یہ شیرینی صبیحہ کے احساس میں گھل کر اس کی رگوں میں دوڑ جاتی اور پھر اس سے آرزوئے دید کا جذبہ بڑی سرکشی کے ساتھ سر اٹھانے لگتا۔ صبیحہ ان تمام محسوسات کو اس طرح دبا لیتی جیسے اس کا تعلق سننے کی حد تک ہوتا۔ اس کا دل کسی تاثر کو قبول نہ کر رہا تھا۔

دوسری شام ——————

جب باہر شام کے سائے سُبک خرامی سے بہہ رہے تھے اور آنے والی ہوا میں ہلکی ہلکی برودت پیدا ہو چکی تھی، صبیحہ گلدانوں میں تازہ پھول سجاتے ہوئے اپنی لگن میں گنگنا رہی تھی تو آفاق دروازے پر کھڑا اُسے خاموش دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں ہلچل تھی اور احساس میں تموّج ——— اُسے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اِک گلستاں میں پہنچا جو جوہی کے پھولوں سے بھری اس شاخ کو دیکھ رہا تھا جو بادِ صبا کی اٹکھیلیوں سے جھوم رہی ہو۔ پھر کسی تامل اور توقف کے بغیر اس نے ٹوک دیا۔

"گانا بُرا نہیں گنگنانا بُرا ہے!"

یہ آواز نہیں کسی ہاتھ کا سایہ تھا جو غلطی سے لاجونتی پر پڑ گیا ہو۔ صبیحہ بھی اپنے سامنے آفاق کو دیکھ کر کچھ اُسی کیفیت میں ڈوب گئی۔ آفاق کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کچھ شوخ لہجے میں بولا۔

"اس ہاتھ کا شکریہ جس نے میرے ویران گلدان کو پھولوں سے آباد کیا اور اس ہونٹ کا شکریہ جس نے میرے سُنسان کمرے کو اپنے ترنم سے بسایا!"

صبیحہ سنتی رہی۔ کچھ بولی نہیں اور جب آفاق ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو یہ ہولے سے کمرے سے نکل آئی جیسے نسیمِ صبح کا ایک جھونکا آئے اور گزر جائے۔ لیکن صبیحہ ملائم سی مہک کی طرح اس کے پورے وجود میں بس گئی تھی۔ جیسے اس نے "ملٹر پرفیوم" کہنا چاہا تھا۔

سورج کی کنواری کرنیں جس طرح کائنات کے ذرات کو چمکا دیتی ہیں، آفاق نے بھی محسوس کیا کہ اِس بار صبیحہ کے وجود نے اپنے کو سمک سے اس کے شعور کے ہر تاریک گوشے کو روشن اور تابندہ کر دیا۔ ویسے بھی اس کی طبیعت پہلے سے بہت محتاط اور متین تھی۔ اس کی زندگی میں کئی بیاترس وانتے کا نغمہ الاپتی آئیں۔ کچھ بوسیاں ورڈز ورتھ کے حزنیہ گیت سُناتی ملیں لیکن وہ مجاز کی اس نورا کو غیر شعوری طور پر تلاش کر رہا تھا جس کا خواب حقیقتِ منتظر میں ڈھل کر اس کے شعور میں لہرا جائے، احساس پر چھا جائے اور خیال پر مسلط ہو جائے۔ صبیحہ اُسے کچھ ایسی ہی محسوس ہوئی۔ جب تک کوئی نامعلوم سی آرزو کسی سانچے میں نہیں ڈھلتی، تجسس کا جذبہ اور کرید کا احساس دل میں موجود ہوتا ہے اور جب وہی لطیف آرزو اِک پیکرِ سیمیں کا روپ دھار لے، پھر تجسس اور کرید نہیں ہوتی بلکہ بہت ہی مہکا مہکا، بہکا بہکا جذبہ ہوتا ہے۔ جذبہ انسان کے دل پر حکمرانی کرتا ہے اور محکوم دل اس کے سامنے سر جھکائے ہر اطاعت کے لئے تیار ملتا ہے۔ آفاق کا دل بھی اسی جذبے کے تحت مجبور تھا۔ صبیحہ اس کے خیالوں کی رعنائی، جواں سال امنگوں کی برنائی اور اٹھتی عمر کے ولولوں کی مہک بن کر دشمنِ سکوں ہو گئی تھی پھر بھی اس نے اپنی فطری متانت کا دامن نہ چھوڑا اور نہ پیش قدمی ہی کی۔

گرمی کے دن رات یونہی تپاتے رہتے ہیں ———

پھر اضطراب کے دن اور التہاب کی راتیں آنے اور بے چین کرنے لگیں۔

ایک دوپہر میں وہ اخبار دیکھ رہا تھا اور ٹرانزسٹر پر فلمی ریکارڈنگ ——— ہو رہی تھی۔ صبیحہ چائے لے کر آئی۔

"آپ چائے پئیں گے نا؟"

اپنے "ملٹر پرفیوم" کو متبسم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے میں چائے کا عادی نہیں، خصوصاً دوپہر میں۔ لیکن خیالِ خاطر تھا آپ پی لوں گا۔"

"خیالِ خاطرِ احباب کوئی مانگ ہے؟" صبیحہ نے زیرِ لب تبسم سے پوچھا۔

— وہ اُن سے قریب بیٹھا بولا کہ جاہوں کے ہاتھ میں بیساد قوت ہے۔ یہ
ہاتھ جسے نصیب ہوجائے اُسے بھاگوان کہتے ہیں۔"
"اچھا چائے پیجیے۔"
صبیحہ نے پیالی اُس کے سامنے رکھ دی۔ وہ بھی پیالی اُٹھا کر چسکیاں لینے لگا۔
لیکن اُس کی آنکھیں حریمِ ذات کا طواف کر رہی تھیں۔ اِس سے پہلے صبیحہ روبینہ کے ساتھ اُس کے پاس کئی بار آچکی تھی اور باتیں بھی کر چکی تھی۔ آج تو روبینہ کے سو جانے پر چائے کو بہانہ بنا کر وہ ملنے آئی تھی لیکن باتیں کسی طرح کی ہوں؟ ویسے دونوں کی آنکھیں زبان رکھتی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی باتیں سُن رہے تھے۔
صبیحہ کو کھڑے دیکھ کر آفاق نے کہا۔
"بیٹھ جایئے!" اور اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھاتے ہوئے پُوچھا: "آپ کس کالج میں پڑھ رہی ہیں؟"
"اور آپ کالج میں کیا پڑھاتے ہیں؟"
"بہت خوب!" وہ مُسکرایا۔ پھر اپنی سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا: "جو ایک عورت کی آنکھ میں پڑھا جا سکتا ہے!"
"پھر لوگ کالج میں کیوں پڑھتے ہیں؟"
"جنھیں وہ آنکھیں نہ مِل سکیں!"
"اُن آنکھوں میں کیا ہوتا ہے؟"
"فطرت کا وہ راز جو جینے کا شعور بتاتا ہے!"
آفاق نے بہت سنجیدگی سے جذباتی لہجے میں کہا۔ لیکن اُس کے دیکھنے کا انداز جیسے صبیحہ کی سحر بار و سحر طراز آنکھوں سے پُوچھ رہا تھا۔
"آپ کی آنکھوں میں اِس دل کو بسا دوں تو؟ —— پھر محبت کے یہ انمول لمحے جاوداں نہیں ہو سکتے!"
صبیحہ خاموش بُت کی طرح کھڑی رہی۔
اِک خوشبو اُڑتی رہی۔
کچھ راز کُھلتے رہے ——
اور دل کے نازک جذبے حُسنِ معصوم کی ٹھنڈک سے متاثر ہوتے رہے۔
صبیحہ کے ہونٹوں کا تبسم اُس کی تخیل میں شررِ آوارہ کی طرح رقص کر رہا تھا۔ تو نظروں کی گرم شعاعوں کا جال اُس کے گرد پھیلتا جا رہا تھا۔ تنہائی کے لمحے کو شرارت سُوجھی۔ اِک رندانہ جرأت بن کر وہ لمحہ اُس کی رگوں میں دوڑا۔ آفاق نے سوچا پھولوں سے لدی چمپا کی اِس شاخ کو جو خوشبو کے نازک بوجھ سے جُھکی جُھکی تھی بڑھ کر اپنے بیتاب سینے سے لگالے۔

## حدیثِ دل

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اِک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
علی جواد زیدی

کعبہ بھی ہے، دیر بھی، طُور بھی ہے
اِس بے دلی سے دل کی حقیقت نہ پُوچھیے
نوح ناروی

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلہ کہو
مت اِس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو
مرزا جان جاناں مظہر

جو غم میں کسی اور کے شامل نہیں ہوتا
کچھ اور بَلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا
امیر مینائی

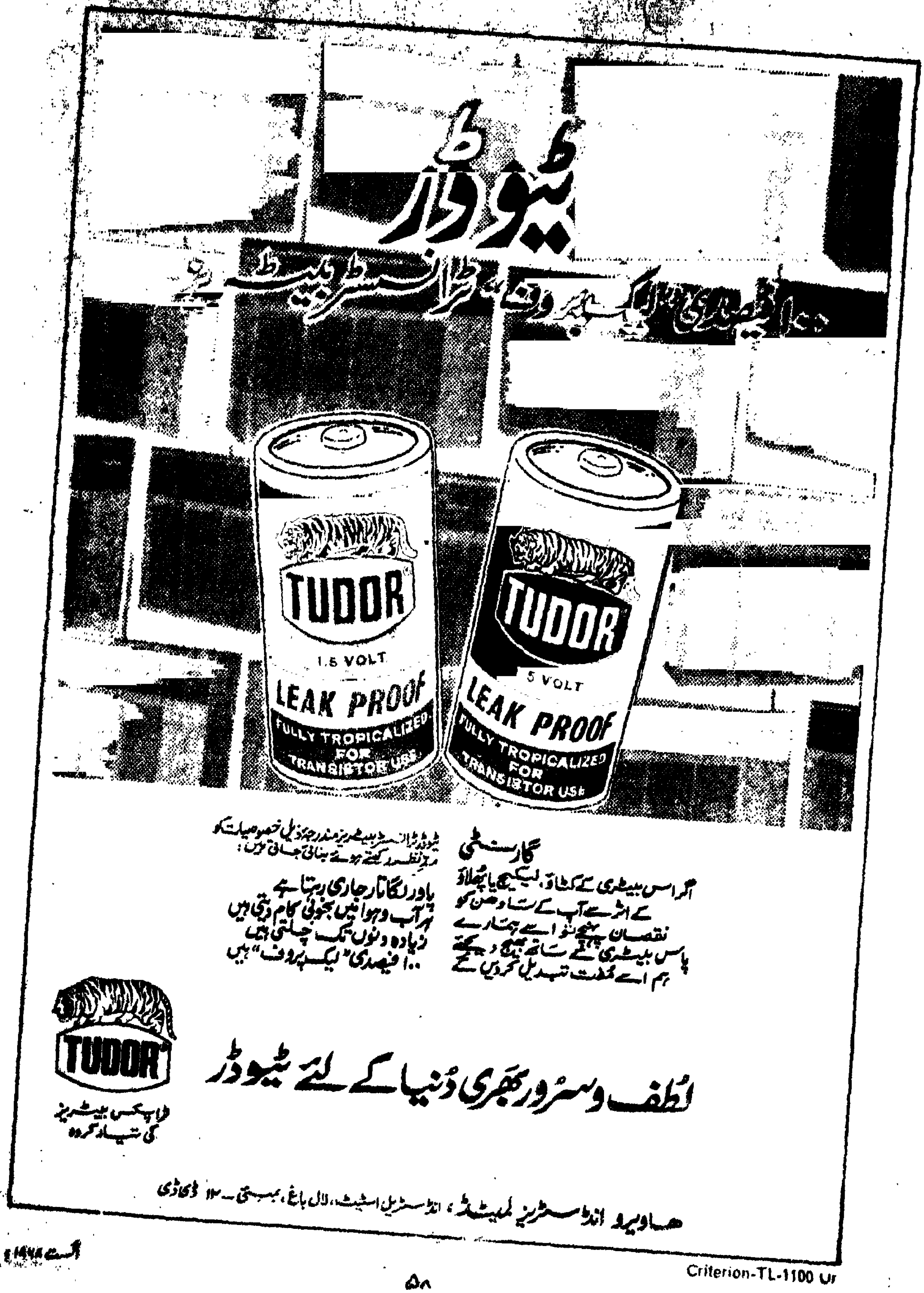
دل دے تو اِس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گُزار دے
داغ

مرسلہ:- سید قدیر، گولکنڈہ، حیدرآباد

"آپ خاموش مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں؟"
صبیحہ نے سکوت سے اُکتا کر پُوچھا۔ آفاق کا سحر ٹُوٹ ہی رہا تھا کہ روبینہ آگئی —— اور بات کا موضوع ہی بدل گیا۔

---

اُس دوپہر کی ملاقات کے بعد بھی صبیحہ کے کانپتے ہونٹوں کی فسوں کار ہنسی اُس کے کتنے پہلوؤں کو آفاق کے سامنے بے نقاب کر چکی تھی۔ اُس نے محسوس بھی کیا کہ صبیحہ کے اندر اُس سے مِل کر جو اعتماد اور تمکنت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ اپنائیت کی غماز ہے۔ پہلے سے وہ کتنی بدل چُکی ہے۔ ہر لمحہ اُس کی آنکھوں سے چھلکا چھلکا سرور اور ہر بات کرنے میں غرور۔ چال میں رندانہ بہک اور چہرے پر کچھ پا لینے کی چمک اُس صبیحہ میں نہ تھی جو پہلے مِلی تھی۔ پہلے تو اِک شرم تھی، جھجک تھی اور اب حجاب آلود نظروں میں بیباکی تھی۔ لبوں کی بھیگی بھیگی سلوٹوں میں شوخی تھی۔
"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" اُسے کہیں جاتے دیکھ کر راستہ روک لیتی۔
"دھوپ تیز ہو رہی ہے!"
"مجھے تیز دھوپ کی فکر نہیں گھنیری زُلفوں کا سایہ تو ہے نا! آپ کیوں...؟"
"یا اللہ میں کیا کروں؟" بڑی عاجزی سے کہتی "کتنی بار کہا کہ آپ مجھے آپ نہ کہا کریں!"



ٹیوڈر
1.5 VOLT
TUDOR
LEAK PROOF
FULLY TROPICALIZED FOR TRANSISTOR USE
5 VOLT
TUDOR
LEAK PROOF
FULLY TROPICALIZED FOR TRANSISTOR USE
گارنٹی
اگر اس بیٹری کے کٹاؤ، لیکیج یا پھلاؤ
کے اثر سے آپ کے سیٹ کو
نقصان پہنچے تو اسے ہمارے
پاس بیٹری کے ساتھ بھیج دیجئے
ہم اسے مفت تبدیل کر دیں گے
ٹیوڈر ٹرانسسٹر بیٹریز مندرجہ ذیل خصوصیات کو
مدِنظر رکھتے ہوئے بنائی جاتی ہیں:
پاور لگاتار جاری رہتا ہے
ہر آب و ہوا میں بخوبی کام دیتی ہیں
زیادہ دنوں تک چلتی ہیں
۱۰۰ فیصدی "لیک پروف" ہیں
TUDOR
ڈاپکس بیٹریز
کی تیار کردہ
لطف و سرور بھری دنیا کے لئے ٹیوڈر
ہاویرو انڈسٹریز لمیٹڈ، انڈسٹریل اسٹیٹ، لال باغ، بمبئی ـ ۱۲ ڈی ڈی

"میں بھول جاتا ہوں صابی!"

"مجھے بھی آپ بھول جائیں گے۔"

صبیحہ پھر اس انداز سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی کہ وہ مخمور ہو جاتا۔

"بادلوں کے ٹکڑوں کو تم نے چھلکتے دیکھا ہے صابی!"

"آپ کو اپنے پاس دیکھا ہے!"

اور اس طرح ہنستی بھاگ جاتی جیسے نقرئی بتے کھنک اُٹھے ہوں۔

---

یونیورسٹی بند ہونے پر گھر آتے ہوئے آفاق نے سوچا تھا، جم کر اسٹڈی کرے گا کسی پوزیشن کے بغیر ایم۔اے کرنا اُس کے خیال میں کوئی کارنامہ نہ تھا فرسٹ کلاس تو وہ یوں بھی لا سکتا ہے۔ اپنے لئے ہوئے مضمون پر اُسے اِتنا اعتماد تھا لیکن یہاں آکر اُس کے سارے خیال دَم توڑ بیٹھے۔ کیونکہ نگارستان کی اِک زہرہ نگار نے سوچوں کے سر سراتے ہوئے پردے میں سمٹ گلزار کی رنگینی اور رعنائی بکھیر دی تھی۔ اِس بار تو وہ اماں سے جی بھر کر باتیں نہ کر سکا۔ صبیحہ کی دادی اماں کے پاس زیادہ بیٹھ نہ سکا۔ روبینہ کے تعلیمی مشاغل کو چیک نہ کر سکا۔ بس اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب دیکھتا رہتا اور تصوّر میں صابی کا پیکرِ سیمیں متحرّک ہوتا۔ کان دروازے پر لگے ہوتے۔ کبھی روبینہ کے ساتھ صبیحہ بیٹھی کسی موضوع پر بحث کرتی اور کبھی تنہا بیٹھی بہکی بہکی باتیں کرتی رہتی۔

"جی چاہتا ہے چاند کی آغوش میں چلی جاؤں!"

"یا چاند ہی سمٹ کر تمھاری آغوش بن جائے تو!"

"ناممکن!" وہ کہتی "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اچھا یہ بتائیے، آپ کو پھول کیوں پسند ہیں؟"

"اِس لئے کہ مجھے ایک عورت پسند ہے!"

"عورت اور پھول میں کیا رشتہ؟"

"نسائیت اور لطافت کی کشش دونوں میں ہے!"

"آپ ہر معاملے میں عورت کو کیوں کھینچ لیتے ہیں؟"

"ہر معاملے کی بات میں عورت اِس لئے آجاتی ہے کہ مناظرِ فطرت کی ساری حسن اور دلکشی کو نچوڑ کر خدا نے عورت کو بنایا ہے۔ تم اُس کا مجسّم نمونہ ہو!"

"باتیں بنانا آپ خوب جانتے ہیں!"

"یہ فن میں نے تم سے سیکھا ہے!"

ایسی ہی باتیں ہوتی رہتیں اور سبھی کو یہ بڑھتا ہوا میل جول معلوم تھا۔ جب ہی صبیحہ کی دادی اماں نے آفاق کی اماں سے اُن کے رشتے کی بات چلا دی تھی۔

آفاق کی اماں کو بھی صبیحہ پسند تھی۔ اِس پر وہ رضامند ہو گئی تھیں۔ لیکن یہ بات ابھی آفاق کو نہیں معلوم تھی۔ وہ تو یہی سوچ رہا تھا کہ جس آہوئے رمیدہ کی رم خوردگی میں رقص کا سرور پا رہا تھا۔ وہ رقص ٹوٹ گیا تو کیا ہوگا؟ صبیحہ کے جانے کے بعد جو آتشیں طوفان اُٹھے گا، وہ اُسے جلا کر خاکستر کر ڈالے گا اور روح غم کے تلخ احساس کی زنجیر میں جکڑی کس قدر گھٹے گی۔ اِس کا تصوّر ہی اُسے سہما رہا تھا۔

لیکن ایک دن وہ بازار سے لوٹا تو صبیحہ کو ڈھونڈنے لگا کیونکہ اپنی پسند کی ایک بہترین ساڑی اُس نے خریدی تھی۔ روبینہ کے کمرے میں وہ تنہا اپنے بستر پر لیٹی ہوئی ملی۔ آفاق کو دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔

"چائے نہ پلاؤ گی؟"

"ضرور۔ ابھی لائی!"

کہتی ہوئی وہ کمرے سے نکل گئی۔ آفاق غیر ارادی طور پر ٹھہر گیا۔ اُس نے حریصانہ نظر سے تکیے کو دیکھا اور سونگھ لینے کی خواہش کے تحت وہ بڑھا۔ جوں ہی تکیہ اُٹھایا۔ اِک سبز لفافہ ملا۔ اُس نے جلدی سے کھلے ہوئے لفافے سے خط نکالا اور پھر تحریر کو پڑھ کر اُس کے دماغ کی رگیں سنسنانے لگیں۔ بہ دِقت تمام اُسی طرح لفافے کو تکیے کے نیچے رکھ کر چلا آیا۔

اپنے کمرے میں آکر کپڑے تبدیل کئے بغیر وہ اِک صوفے پر گر پڑا۔ اُس کے اعضاء شِکست ہو رہے تھے اور ذہن کے ہیروشیما پر بم گرنے سے جو تباہی آئی تھی، وہ رُو بہ اصلاح نہیں ہوا تھا۔ اُس کے سامنے شک کے ننگے اور سیاہ فام عفریت وحشیانہ رقص کر رہے تھے۔ جب تک صبیحہ چائے لے کر آگئی۔ اُس نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"خدا خیر کرے!" وہ چہکی "بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں!"

"تم جا سکتی ہو!" اُس کا لہجہ کچھ درشت تھا۔

"کیا بات ہے ـــــ مزاجِ درست برہم کیوں ہو گیا؟"

"کچھ نہیں صابی!" اُس نے بمشکل تمام اپنا لہجہ بدلا اور مُسکرایا "کیا خدا نے ہر خوبصورت چہرے کے پیچھے ایک مکروہ اور خبیث فطرت کو چھپا رکھا ہے؟"

آفاق کہہ رہا تھا اور صبیحہ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے مہیب سائے اُس کی سمت بڑھ رہے ہیں۔ یہ سائے اُس کی رُوح میں اُتر رہے ہیں اور دل کے خرمن میں آگ لگ رہی ہے۔ دھُواں پھیل رہا ہے۔ نہ جانے کتنی کشاکش کو توڑ کر اُس کے خاموش ہونٹ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔ لیکن زبان خشک ہے۔ آواز رُک گئی ہے ـــــ آفاق اُس کی کیفیت سے بے نیاز اپنی چڑھی ہوئی تیوریوں کو چھپا نہ سکا۔

"کاش! تم ایک عورت کی پاکیزگی پر بدنما داغ نہ ہوتیں!"

اور اپنی ساری تلخی کو سمیٹے وہ تیز قدموں سے باہر نکل آیا

اسی دن۔ گھر پر اطلاع دیئے بغیر پہلی ٹرین سے وہ اپنے ایک دوست کے ہاں آ گیا۔ اس کے اس طرح چلے جانے سے گھر کے لوگ پریشان تھے۔ صبیحہ کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ حادثہ ہی کچھ اس طرح واقع ہوا کہ صبیحہ کسی ایک خیال پر نہ آ پائی لیکن آفاق کی برہمی اور درشتی نے اس کا دل توڑ دیا۔ کبھی چاندنی کے ساز پر فطرت کو گنگناتے سن رہی تھی اور اب سُلگتے آنسو کی آنچ پر اپنے کانپتے وجود کو پگھلتے دیکھ رہی تھی اور اسی پگھلے پگھلے وجود میں ایک دن وہ اپنی دادی اماں کے ساتھ گھر کو لوٹ گئی۔ آفاق اپنے گھر سے دور صبیحہ کے منحوس چہرے سے دور اپنے دوست کے ہاں صرف یونیورسٹی کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنی روح کی کربناکی کا اظہار اس نے دوست سے بھی نہ کیا۔ صبیحہ پھانس بن کر اس کی روح میں چبھ رہی تھی اور وہ زندگی کے پُر ہول خارزاروں سے گزر رہا تھا۔ احساس کے تلوے خارِ مغیلاں سے لہولہان ہو رہے تھے اور نفرت و حقارت کی بھٹی سُلگ رہی تھی۔ وہ خاموش بجھا بجھا سیہ پوش فضا میں اپنے دل کی بربادی پر کڑھ رہا تھا۔

اور جب واپس گھر آیا ــــــــ

اور صبیحہ کے چلے جانے کی بات سنی تو اک اطمینان کی سانس لی جیسے اک کانٹا نکل گیا یا بوجھ اتر گیا۔ ماحول کا سونا پن دل میں کچوکا لگاتا۔ وہ شوخیاں اور بیباکیاں، حیا سے جھکی جھکی نگاہیں، باتوں کی نغمگی کمرے کی سوگوار فضا میں چھناکا پیدا کرتی۔ لیکن اسی لمحے وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا۔

اور ایک دن اسے صبیحہ کے مرنے کی بھی خبر ملی۔ اماں نے ماتم پرسی میں جاتے ہوئے اس سے بھی چلنے کو کہا۔ لیکن وہ انکار کر گیا۔ اور پڑھنے کا بہانہ کر کے انھیں ٹال دیا۔ صبیحہ کی موت نے اس کے دل پر کوئی اثر نہیں کیا اور نہ آنسو ہی نکلے۔ بلکہ ہونٹوں پر بہت ہی زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ روبینہ اس تبدیلی پر متحیر تھی۔

پھر اسے ایک لفافہ ملا۔ جو روبینہ کے نام تھا۔ روبینہ کے خط کو وہ پڑھنا نہیں چاہ رہا تھا لیکن جانے کس جذبے کے تحت اس نے لفافہ کھول لیا اور پڑھنے لگا۔

"روبی ڈیر! صبیحہ کی اچانک موت کا کوئی سبب تو معلوم نہ ہو سکا۔ صرف حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ ظاہر ہے۔ آج ہم میں صبیحہ نہیں رہی اور نہ اب ایسی صبیحہ پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی غم تو دل کو پگھلا رہا ہے۔ مرنے سے پہلے میں اس سے ملی تھی۔ اس نے بتایا کہ میرے کچھ خطوط تمہارے پاس رہ گئے ہیں جو وہ جلدی میں نہ لا سکی تھی۔ وہ میری رازداں اور رازدار تھی مجھے امید ہے کہ تم بھی اسے راز رکھو گی اور میرے خطوط بہت جلد لوٹا دو گی۔

تمہاری ــــ صباحت

خط پڑھ کر کچھ دیر کے لئے وہ الجھ گیا۔ پھر روبینہ سے مل کر اور بہت سمجھا بجھا کر اس نے وہ سارے خطوط دیکھے۔ جن میں وہ لفافہ بھی تھا تحریر ایک انداز ایک۔ کوئی فرق نہیں ــــــ اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اور سر چکرانے لگا۔ جیسے کسی نے اس کے سینے میں خنجر پیوست کر دیا ہو۔ وہ سینہ تھامے کراہ اٹھا۔

"صابی کا قاتل میں ہوں روبی!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جان!"

"ہاں روبی!"

اس کی آنکھوں سے خشک سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ روح کا زخم گہرا ہو گیا تھا۔ وہ بے حد تکلیف اور اذیت سے تڑپ کر بولا۔

"میں نے اسی لفافے کو دیکھ کر اس پر شک کیا۔ اسے برا بھلا کہہ ڈالا نہیں معلوم تھا کہ میں نے لفافہ دیکھا ہے اور نہ میں نے بتایا ہی۔ میری سرد مہری اور بے التفاتی نے اس کی جان لی۔ بلکہ غلطی اور دھوکے میں اس نے اپنی جان کھوئی۔"

اور پھر وہ خاموش روبینہ کے آنسو سے بھیگے چہرے کو دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اسے محسوس ہوا جیسے صابی ابھی یہیں ہے۔

ابھی اس کی سانسوں کی خوشبو مل رہی ہے!

قدموں کی آہٹ مل رہی ہے!

اس کی جھکی جھکی نگاہیں اٹھ کر بیباک ہو رہی ہیں!

اور ہونٹوں کی بھیگی بھیگی سلوٹیں شوخ ہو رہی ہیں!

وہ اک بار بڑھتے جنون کی وحشت خیزی میں چیخ اٹھا۔

"صابی! یہ تمہاری موت نہیں میری موت ہے!!"

اور وہ پھوٹ پڑا!!

# غزلیں

**آزاد گورداسپوری، بی اے**

یہ دل محوِ خیالِ خام کیوں ہے سوچنا ہوگا
انھیں کا ذکر صبح و شام کیوں ہے سوچنا ہوگا

محبت کے سوا ہر چیز فانی ہے تو پھر آخر
محبت موردِ الزام کیوں ہے سوچنا ہوگا

سنا ہے اب وہ کہتے ہیں ہماری داستاں سن کر
ذرا سی بات پر کہرام کیوں ہے سوچنا ہوگا

چلو مانا تمھیں مجھ سے محبت ہی نہیں لیکن
تمھارے لب پہ میرا نام کیوں ہے سوچنا ہوگا

چمن کو جس نے سینچا تھا جگر کا خون دے دے کر
وہ طائر آج زیرِ دام کیوں ہے سوچنا ہوگا

نظامِ میکدہ کے ساتھ ساقی کی روش بدلی
مگر بے کیف ہر اک جام کیوں ہے سوچنا ہوگا

سنوارا جن کے ہاتھوں نے کبھی خم خانۂ ہستی
انھیں کو اب تلاشِ جام کیوں ہے سوچنا ہوگا

محبت کے لئے آغوش وا کس کی نہیں ہوتی
فقط آزاد ہی بدنام کیوں ہے سوچنا ہوگا

**ذکیہ سلطانہ نیّر**

نویدِ شوق سہی پر کسے گوارا ہے
یہ غم جو آپ کے چہرے سے آشکارا ہے

ہوائیں لاکھ پیامِ بہار دیں لیکن
ترے بغیر یہ موسم کسے گوارا ہے

زمانہ حسن کو تغافل شعار کہتا ہے
بہت قریب سے اُس نے مجھے پکارا ہے

کبھی گلوں میں کبھی ڈوبتے ستاروں میں
کہاں کہاں مرے دل نے تجھے پکارا ہے

یہ ناخدا سے کہو میری جستجو نہ کرے
میں اب وہاں ہوں بھنور بھی جہاں کنارا ہے

تری نگاہِ کرم کے شہید ہیں ہم تو
وہ اور ہیں جنھیں تیری جفا نے مارا ہے

اُدھر گھنی گھنی پلکوں پہ رخصتی آنسو
اور آسماں پہ اِدھر صبح کا ستارا ہے

کہاں یہ بیخودیٔ شوق اور کہاں نیّر
یہ سب تری نگہِ خاص کا اشارا ہے

**چندر پرکاش جوہر بجنوری**

رازِ سربستۂ حیات نہ پوچھ
اور کچھ پوچھ دل کی بات نہ پوچھ

ذکرِ آغازِ التفات نہ چھیڑ
مجھ سے انجامِ التفات نہ پوچھ

عشق اور حسن میں ہے کیا رشتہ
یہ ہیں نازک معاملات نہ پوچھ

میرا انجام دیکھ آنکھوں سے
انتہائے غمِ حیات نہ پوچھ

کیا بتاؤں سبب تباہی کا
جانتا ہوں مگر یہ بات نہ پوچھ

کتنے دلچسپ کتنے رنگیں ہیں
یہ محبت کے حادثات نہ پوچھ

غمِ سود و زیاں نہیں مجھ کو
عشق میں کیا ملا یہ بات نہ پوچھ

جو دکھایا نصیب نے، دیکھا
غم نصیبوں کے واقعات نہ پوچھ

دیکھ محسوس کرکے اے جوہر
کیا کسی کے ہے دل میں بات نہ پوچھ

# نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| شکست کے بعد | کرشن چندر | چار روپیہ پچاس پیسے |
| طوفان کی کلیاں | " | چار روپے |
| گدھے کی واپسی | " | تین روپے |
| الٹا درخت | " | دو روپے پچھتر پیسے |
| دروازہ | " | دو روپے پچیس پیسے |
| سسرال | شوکت تھانوی | دو روپے |
| سٹرہ ۵۰ | " | تین روپے پچاس پیسے |
| بقراط | " | دو روپے پچاس پیسے |
| جی ہاں پٹے ہیں | " | تین روپے پچیس پیسے |
| جوڑ توڑ | " | پانچ روپے |
| داماد | " | دو روپیہ پچیس پیسے |
| گوشۂ عافیت | پریم چند | پانچ روپے |
| چوگان ہستی مکمل | " | گیارہ روپے |
| دودھ کی قیمت | " | تین روپے |
| خاک پروانہ | " | تین روپے |
| صبح زندگی | راشد الخیری | دو روپے |
| شب زندگی | " | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| شام زندگی | " | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| سیدہ کی بیٹی | رازق الخیری | تین روپے |
| سمن پوش | مجنوں گورکھپوری | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| اقبال | " | چار روپے |
| گرد کارواں | کنہیا لال کپور | تین روپے |
| سنگ و خشت | " | دو روپیہ پچاس پیسے |
| سوناگاچھی | جمنا داس اختر | چار روپے پچاس پیسے |
| شعلۂ سنگ | کوثر چاندپوری | تین روپے پچاس پیسے |
| شمع | اے آر خاتون | پانچ روپے |
| چشمہ | " | دس روپے پچھتر پیسے |
| شکیلہ | مسعود ہمایوں | چار روپے پچیس پیسے |

| | | |
|---|---|---|
| شکست ظلمت | محمود جالندھری | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| آرزو کی کلیاں | " | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| پہلی محبت | " | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| خواب گاہ میں | " | تین روپے پچاس پیسے |
| دنیا کے مشہور سائنسداں | " | دو روپے پچیس پیسے |
| شائستہ | نادرہ خاتون | چار روپے [illegible] پیسے |
| ظالم | سعید امرت | دو روپے پچاس پیسے |
| فتح خیبر | صادق حسین | چار روپے |
| مقابلہ | خان محبوب طرزی | تین روپے |
| نیلوفر | " | تین روپے |
| اکبری دروازہ | " | چار روپے |
| دوشیزۂ روم | " | تین روپے |
| دیوانہ | " | تین روپے |
| دو دیوانے | " | دو روپے پچاس پیسے |
| سیلاب | " | تین روپے |
| [illegible] | دت بھارتی | دو روپے پچاس پیسے |
| اندھیرے اجالے | عادل رشید | تین روپے |
| بہار آنے تک | " | تین روپے پچاس پیسے |
| دو پھول | " | تین روپے پچانوے پیسے |
| مفرور | رئیس احمد جعفری | چار روپے پچاس پیسے |
| قیامت | ذکی انور | دو روپے پچاس پیسے |
| سازش | " | دو روپے پچاس پیسے |
| گورا | ٹیگور | چار روپے پچاس پیسے |
| لٹ گئی بہار | ضیا عظیم آبادی | تین روپے پچاس پیسے |
| دل ہی تو ہے | " | چار روپے پچیس پیسے |
| ممتاز | ایم اسلم | آٹھ روپے |
| آخری رات | " | پانچ روپے |
| ریحانہ | " | سات روپے |

| | | |
|---|---|---|
| وعدہ | مہندر ناتھ | پانچ روپے پچھتر پیسے |
| گلی گلی | رام لعل | چار روپے |
| فردوس گوش | حضرت جوش ملسیانی | چھ روپے |
| کفر و ایمان | ہری چند اختر | چار روپے |
| وسکی کی بوتل | موہن یاور | دو روپے |
| لنکن نے کہا | منور لکھنوی | تین روپے |
| موٹر میکینک گائڈ | شیو ناتھ تسکین | چار روپے |
| موٹر ڈرائیونگ | کرشنانند شرما | چار روپے پچاس پیسے |
| کیا خوب آدمی تھا | | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| عجیب لڑکی | اوم پرکاش نامی | تین روپے |
| ہمارا اٹلس (بچوں کیلئے) | خوشتر گرامی | پچاس پیسے |
| ہمارا اسماش | " ہندی | پچاس پیسے |
| اجالے سے پہلے | ابراہیم جلیس | دو روپے پچاس پیسے |
| ابھرتے جوبن | اظہار اثر | دو روپے |
| آندھی میں چراغ | غلام الثقلین | سات روپے پچاس پیسے |
| اقوال زریں | مصطفیٰ احسن زیدی | پچاس پیسے |
| انارکلی | امتیاز علی تاج | دو روپے پچاس پیسے |
| آشا دیپ بجھے نا | ست پرکاش سنگر | دو روپیہ |
| ابراہیم لنکن | چندر موہن لامبہ | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| انسانیت موت کے دروازے پر | مولانا ابوالکلام آزاد | تین روپیہ پچاس پیسے |
| اصلی مکمل باورچی خانہ | جے سی داس صاحب | تین روپے پچاس پیسے |
| جینے کے لئے | ستیہ پال آنند | دو روپیہ پچاس پیسے |
| چھبیس سال بعد | امرتا پریتم | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| حادثہ | قیسی رامپوری | پانچ روپے پچاس پیسے |
| خون | شہزادہ تبسم | چار روپے |
| رضیہ کا شاہی دسترخوان | رضیہ سلطانہ | دو روپے پچاس پیسے |
| رسیلی | شہزادہ تبسم | دو روپے پچاس پیسے |
| زمین کے چھالے | آزاد ملیح آبادی | تین روپے پچاس پیسے |

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

# ضدّی

حسن اجمل مسرت۔ ایم۔ اے

۳ می، ناظم آباد۔ کراچی

۱۷ اپریل ۶۷ء

بزرگوارم! آداب

تازہ شمارہ اور آپ کا خط ایک ساتھ ملے۔ آپ کی فرمائش اور "دلچسپ شاہکار" کی قید کا جواب تو یہی تھا کہ افسانہ نمبر کے لئے میں "لیلیٰ کی وصیت" لکھ بھیجوں لیکن آپ کے پڑھنے والوں اور قلمکاروں کی دھمکیاں یاد کرکے ہمت نہیں پڑی۔ اس لئے "ضدّی" بھیج رہا ہوں۔ عنوان کے پرانے پن پر نہ جائیے۔ بات بڑی حد تک نئی ہے۔ میں نے اس کہانی میں اپنی بدنصیب نسل کے المیہ کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ——— "ضدّی" اُس دور کے انسان کی کہانی ہے جس کے وجود میں بیک وقت دو انسان بستے ہیں۔ ایک وہ جو کسی پیشہ ور دلال کی طرح غیر جذباتی انداز سے زندگی کو Deal کرتا ہے اور ایک وہ جو زندگی کا احترام کرتا ہے، اصول اور آدرش کی بات کرتا ہے۔ اس رسہ کشی میں جیت عموماً پہلے قسم کے انسان کی ہوتی ہے مگر کبھی کبھی جب دوسری قسم کا انسان جیت جاتا ہے تو اُس کا انجام کم و بیش وہی ہوتا ہے جس انجام سے انور کو دوچار ہونا پڑا۔ یہی انسان کی ٹریجڈی ہے ——— افسانہ نمبر کے لئے اتنے کم وقت میں اس سے اچھی کوشش نہیں کرسکتا تھا۔ اب پسند اور ناپسند آپ کے اختیار میں ہے۔ اُمید ہے آپ اپنی مخلصانہ رائے سے جلد نوازیں گے اور خوش و خرم اور صحت مند ہوں گے۔ کاش کہانیوں کی تخلیق کی طرح مہ و سال پر بھی ہمیں قدرت ہوتی تو ہم آپ کو امر بنا کر خود جلدی جانے کو ترجیح دیتے!

احقر ——— حسن اجمل مسرت

---

لاش کے گرد بھیڑ جمع تھی۔

مرنے والا عمر کے اُس حصے میں تھا جسے جوانی کہتے ہیں لیکن اُس کے لاغر جسم اور بے نور آنکھوں سے جوانی کی آخری پرچھائیاں بھی گزر چکی تھیں۔ اُس کے جسم پر معمولی لباس تھا جس کا بیشتر حصہ اب خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اُس کے پاس ہی کاغذ کا ایک پلندہ پڑا تھا جو غالباً اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا اور کاغذ ہوا کے رُخ پر دُور دُور تک اُڑتے چلے گئے تھے۔ بس اُس کے سینے کو روندکر چلی گئی تھی۔ اُس کا سینہ اندر کو پچک گیا تھا اور آنکھیں باہر اُبل آئی تھیں۔ وہ سڑک کے بیچوں بیچ چت پڑا ہوا تھا اور اُس کی کھلی ہوئی آنکھیں آسمان کی طرف اِس انداز سے اُٹھی ہوئی تھیں جیسے قدرت سے اپنی بے نوری کا قصاص مانگ رہی ہوں! لوگوں کی وہ بھیڑ جو اُس کے گرد بالکل مشینی انداز میں جمع ہوگئی تھی مُہر بہ لب تھی۔ اُس بھیڑ میں کوئی بھی اُس کا شناسا نظر نہ آتا تھا۔ پھر چند لمحوں بعد وہ لوگ جنھیں کہیں پہنچنے کی جلدی تھی اُسے نظر انداز کرکے آگے بڑھ گئے اور اب بھیڑ میں صرف وہ بے فکرے رہ گئے جنھیں یا تو کوئی اور کام نہ تھا یا پھر اُس انسانی بھوسے کا نظارہ اُن کی ایذا پسندی کی تسکین کا سبب تھا۔

پھر مجمع سے ایک آواز آئی "ارے بس کا نمبر بھی دیکھا کسی نے؟"

مگر سوال کرنے والے کو اُس کا جواب نہ ملا۔ ظاہر ہے جواب دے کر گواہوں کی فہرست میں شامل ہونے کی کسے فرصت تھی!

"نہ معلوم بیچارہ کون ہے؟" کسی نے افسوسناک لہجے میں کہا۔

"یہ کاغذات دیکھیں تو پتہ چلے" مگر کسی نے اُس کے کاغذات کو نہیں چھوا ———

پہنچ صرف پولیس کو جا سکتی تھا اور پولیس لاپتہ تھی۔

"صورت سے تو پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"چہ چہ ـــــ پتہ نہیں غریب کہاں کے ارادے سے نکلا ہوگا۔"

اور پھر یہ مجمع بھی آہستہ آہستہ چھٹتا گیا۔ پھر جب وہاں صرف چند لوگ رہ گئے تو میں اس کے قریب چلا آیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی بے نور آنکھیں صرف مجھی کو تلاش کر رہی تھیں۔ پورے مجمع میں صرف میں ہی تھا جو اسے پہچانتا تھا ـــــ وہ انور تھا!

"یہ تم نے کیا کر لیا انور ـــــ؟" میں اس کے بے جان جسم سے لپٹ گیا۔

"اوہ تم!" انور نے ہمیشہ کی طرح مجھے حقارت سے دیکھا۔ "تمھیں شاید اسی دن کا انتظار تھا!"

---

- تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہا اس پر غم نہ کرو۔ (قرآن پاک)
- اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ (سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- ایمان چار ستون پر قائم ہے، صبر، یقین، عدل، جد و جہد
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- وہ غلطی قابل درگزر نہیں جو دیدہ و دانستہ ہو۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس سے عزت و آبرو کو برقرار رکھا جائے۔
(حضرت امام حسینؓ)
- حلال رزق کے لئے سعی کرنے والا خدا کا دوست ہے۔
(حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ)

---

"ایسا نہ کہو انور۔ مجھے دکھ ہے" میں نے کہا۔ "مجھے صرف تمہاری محبت یہاں کھینچ لائی ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔ میرا خیال ہے تم اس امید میں یہاں آئے ہو کہ اس وقت شاید میں تم سے اپنی شکست کا اعتراف کر لوں گا۔"

"نہیں۔ مجھے اس کی توقع نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تم ضدی ہو۔"

اس پر انور بڑے ہٹیلے انداز سے مسکرایا۔ "تو وعدہ کرو آج مجھ سے بحث نہ کروگے۔"

"وعدہ کرتا ہوں۔"

"تو آؤ آج ہم دوستوں کی طرح باتیں کریں۔"

اور میں نے انور کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

---

[illegible] زندگی میں انور سے میرا ہمیشہ اختلاف رہا۔ ہم زندگی [illegible] رشتہ رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم ہم میں سے کون غلطی پر تھا مگر [illegible] کہہ سکتا ہوں کہ انور نے اگر زندگی کو اس زاویے سے دیکھنے کی عادت [illegible] میں نے تمام عمر اسے ترغیب دی تو اس کی لاش آج یوں بے نور آنکھیں [illegible] کو تک رہی ہوتیں۔ میں نے ساری زندگی انور کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن انور ـــــ اسے ضد تھی کہ وہ مجھ سے کسی مسئلہ پر بھی سمجھوتہ نہ کرے گا!

انور سے پہلی ان بن اس وقت ہوئی جب ہم یونیورسٹی میں معاشیات پڑھ رہے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ انور سے ایک لڑکی کو پیار ہوگیا تھا اور وہ انور کے لئے دنیا تج دینے کو تیار تھی ـــــ شہلا اب تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ نازک نازک سی وہ لڑکی کئی ملوں کے مالک کی بیٹی تھی اور نہ معلوم وہ کون سا جذبہ تھا جس نے اسے انور کا گرویدہ بنا دیا۔ حالانکہ انور کی منہ بولتی معاشی کمتری ایک ایسا اشتہار تھی جسے پڑھنے کے بعد اسے صرف حقارت سے مسکرا کر آگے بڑھ جانا چاہئے تھا مگر وہ تھم گئی تھی، مچل گئی تھی اور یونیورسٹی میگزین میں الٹی سیدھی کہانیاں لکھنے والا گم سم سا انور اس سے کسی نوخیز دوشیزہ کی طرح کترانے لگا تھا لیکن وہ لڑکی تو ہر موڑ پر اس کا راستہ روکنے پر آمادہ تھی۔ اور تب انور نے ایک دن مجھ سے مشورہ کیا تھا۔

"موقعے سے فائدہ اٹھاؤ احمق۔ اس سے سول میرج کر لو" میں نے اسے مشورہ دیا۔

"تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میں اسے اپنا کر اس کی زندگی کی ساری مسرتیں چھین لوں۔"

"لیکن یہ فیصلہ تو اس کا ہے۔ تمہارا نہیں۔"

"کسی کا بھی۔ مگر جانتے ہو اس فیصلے کا انجام؟ اس کے گھر والے اسے دوبارہ منہ لگانا بھی پسند نہ کریں گے۔"

"یہ سب وقتی باتیں ہیں۔ تم اس سے چپ چاپ شادی کر لو اور وقت کا انتظار کرو۔ تمہاری [illegible] ملوں کی ملکیت [illegible] کسی نہ کسی دن ہے گی۔"

"[illegible] سمجھا۔ تم چاہتے ہو میں اسے دولت کے حصول کا ذریعہ بنا لوں؟"

"[illegible] میں کوئی [illegible] بھی نہیں ہے۔ دیکھو انور ڈیئر! زندگی میں بار بار ایسے مواقع نہیں [illegible] کرتے۔"

"[illegible]"

"تم [illegible] ہو۔"

[illegible] اس لڑکی کو ایک دن [illegible]
سمجھا دیا کہ [illegible] ہے اور وہ لڑکی رو کر چپ ہو گئی ـــــ پھر [illegible]

ہوتے ہوئے بھی قربت تھی۔ اُس نے فلاں میروں لے مسٹر خان سے شادی کرلی اور اب قریب قریب تمام بیگم خان لندن پیرس اور روم میں موسموں کی مناسبت سے قیام کرتی ہے اور مجھے یقین ہے اب بھی وہ کبھی کبھی انور کو ضرور یاد کرتی ہوگی —— لیکن صرف اُس موقعے پر جب وہ ایک ایسے گدھے کو دیکھتی ہوگی جو بے پناہ بوجھ سے لدا ہوا چڑھائی طے کرنے کی جدوجہد کر رہا ہو!

انور نے بھی تو زندگی کا بوجھ اسی طرح لاد رکھا تھا۔

اور میں نے کتنی کوشش کی کہ اُس کی زندگی سنور جائے۔

ایسا ہی ایک موقع اور بھی آیا تھا۔ اُن دنوں ہم سول سروس کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے اور ہم میں سے ہر اُمیدوار بورڈ کے ممبروں کی تسخیر کے نسخوں کی تلاش میں تھا اور اُس تلاش کے دوران جو نسخہ ہمارے ہاتھ لگا وہ انتہائی تیر بہدف تھا۔ بورڈ کے ممبروں میں سے ایک صاحب کو ایک عدد سعید داماد کی تلاش تھی۔ سول سرونٹ قسم کے داماد کی۔ سیدھی سادی بات تھی۔ اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ بورڈ کے ممبر کو داماد مل جاتا اور بورڈ کو سول سرونٹ۔ مگر انور —— وہ واقعی ایک ایسا گدھا تھا جو کتابوں کا بوجھ لادنے سے عالم نہیں ہو سکتا تھا۔

"میں ایسی سفارش پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"یہ سفارش نہیں سوکس ہے انور ڈیر! اور سوکس اور سفارش میں بڑا فرق ہے۔ سفارش یکطرفہ ہوتی ہے اور سوکس میں دونوں ہاتھ تالیاں بجاتے ہیں۔"

"تو گویا میں ملازمت کے لئے اُن صاحبزادی کو اپنے گلے منڈھ لوں؟"

"کیا حرج ہے؟"

"حرج یہ ہے کہ اُن صاحبزادی کے نوکیلے ناخن دیکھ کر مجھے گھِن آتی ہے اور اُن کی ترشی ہوئی زلفوں پر دُم نچی ہوئی مرغی کا گمان ہوتا ہے!"

"اونہہ۔ کڑوی دوا سمجھ کر آنکھ بند کرکے پی جاؤ!"

"اور جب آنکھ کھُلے تو؟"

"تو اُسے پہچاننے سے انکار کر دینا۔ اُس وقت تک تمھاری ملازمت پکی ہو چکی ہوگی اور اُن کے والدِ محترم کا زور ٹوٹ چکا ہوگا۔"

"پھر وہی کمینہ پن!"

اب ظاہر ہے انور کا حشر کیا ہونا تھا۔ اُس کے انٹرویو کے دوران ممبران یوں اُکتائے اُکتائے سے بیٹھے رہے جیسے وہ کسی بے حد بور فلم کے تماشائی ہوں —— اور جب صغیر کی باری آئی تو سب نے یوں سر جوڑ لئے جیسے اُکتا دینے والی فلم انتہائی دلخوش کُن اختتام کو پہنچی ہو —— اور پھر ایک روز جب انور حسبِ معمول تلاشِ معاش میں اخبار کھنگال رہا تھا تو اُس کی نظر صغیر اور اُن صاحبزادی کی شادی کی تصویروں پر پڑ گئی اور اُس روز پھر ہم ایک دوسرے سے دیر تک جھگڑتے رہے۔

---

پڑھ لکھ کر ملازمت سب کو مل جاتی ہے لیکن ملازمت سے فائدہ اُٹھانے کا سلیقہ صرف چند افراد کو ہوتا ہے۔ انور اُس سلیقے سے بھی محروم تھا ورنہ ایک ٹیکسٹائل مل کی سیلز منیجری کوئی بُری نوکری نہیں ہے۔ جبکہ اُس ملازمت میں کام کم اور تفریح کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ جہاں تک کپڑے کی نکاسی اور فروخت کا تعلق ہے اُس کے لئے شہر بے شمار دلالوں اور تاجروں سے بھرا پڑا تھا۔ انور کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ مل سے برآمد ہونے والے کپڑے کو جہاں تک ممکن ہو سکے ایکسائز اور چنگی والوں کے سایے سے بچائے رہے اور اُس کے لئے اُسے کوئی خاص دردِ سری بھی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ لینے دینے کے معاملے میں سیٹھ دولت بھائی چاندی والا ویسے بھی متعلقہ افسروں میں نیک نام تھے اور پھر

---

- جس گھر میں عورتیں دُکھی رہتی ہیں وہ گھر جلد ہی تباہ ہو جاتا ہے۔
  (منوسمرتی)
- زخم کھا کر ہی انسان سُرخ رو ہوتا ہے۔ چراغ کو زیادہ روشن کرنے کے لئے بتی کاٹ دیتے ہیں۔ (ہندی ادب)
- جسے ایشور نے گرایا دُنیا کی کوئی طاقت اُسے پستی سے نہیں نکال سکتی۔
  (سوامی سارشد انند جی)
- پرایا ہو یا اپنا، بھائی بندھو ہو یا مِتر، دوست ہو یا دشمن، جو بھی مصیبت میں ہو، اُس کی مدد کرنے، اُس کی حفاظت کرنے کا نام دَیا اور رحم ہے۔ (منوسمرتی)

---

اگر انور ہی کی طرح کا کوئی ضِدی اہلکار آ بھی ٹپکے تو اُس کی تسخیر کے لئے انور کا سجا ہوا ایر کنڈیشنڈ آفس، انتہائی کوآپریٹو قسم کی پورشین اسٹینو اور پھر اسٹینو کی مُسکراہٹ کے جلو میں پیش کی جانے والی مشروبات کافی ہوتی تھیں اور اگر اہلکار ضرورت سے زیادہ ضِدی ثابت ہو تو سیٹھ دولت بھائی چاندی والا کا ہاتھ جیب سے نکل کر میز کے نیچے جانے میں کتنی دیر لگتی تھی!

ایسی ملازمت جس میں مالک اور افسران دونوں کی کمزوریوں سے واقفیت ہو بڑی پکی ہوتی ہے اور اصولاً انور کو ترقی کرتے کرتے دولت بھائی کی کسی مل کا حصے دار ہو جانا چاہئے تھا لیکن وہی ضد۔

"یہ دھوکہ ہے۔ جعلسازی ہے۔ فراڈ ہے!!"

"یہ کچھ نہیں ہے پیارے صرف بزنس ہے! اور بزنس میں ہر دوست بھائی بھی

سکتا ہے۔ عقلمندی یہی ہے کہ چُپ چاپ اپنا کام کرتے رہو۔"

"نہیں۔ مجھ سے یہ فراڈ نہ ہوگا۔ میں یہ ملازمت نہیں کر سکتا!"

"تم نہ کرو گے تو کوئی اور کرے گا ـــــ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھارے علیحدہ ہو جانے سے یہ چکّر رُک جائے گا؟"

"اور اگر میں اس چکّر کو روکنے کی کوشش کروں؟"

"خدا کے لئے یہ غضب نہ کرنا انور!!"

لیکن انور ضدّی تھا۔ نہ معلوم کیا کر بیٹھا کہ ایک صبح مِل پر چھاپہ پڑ گیا۔ سیٹھ دولت بھائی نے سیلز کے حالات سے لاعلمی ظاہر کی۔ اُن کی انتہائی کوآپریٹو قسم کی یونیشین اسٹینو نے دولت بھائی کے حق میں شہادت دی۔ چھاپہ مارنے والوں نے انور کے آفس سے کچھ بوگس چالان اور اُس کے گھر سے کپڑے کی کچھ گانٹھیں برآمد کر لیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ دولت بھائی مدّعی قرار پائے اور انور ایک ایسے جُرم میں ماخوذ ہو گیا جس کی تعزیرات میں کم از کم سزا چھ ماہ تھی۔ بہت ممکن تھا اُسے سزا بھی ہو جاتی لیکن افسران نے غالباً اُس کی نوجوانی پر ترس کھاتے ہوئے سیٹھ دولت بھائی کو راضی کر لیا اور سیٹھ دولت بھائی نے ایک ذومعنی قسم کا تحریری بیان لے کر اُسے دھکّے دے کر مِل کی چہار دیواری سے باہر نکال دیا۔

زندگی کی وہ چڑھائی جس پر وہ کسی گدھے کی طرح بوجھ سے لدا ہوا چل رہا تھا اب اور عمودی ہو گئی تھی۔ اور میرے ساتھ اُس کے تعلّقات تلخ ہوتے جا رہے تھے ـــ اور اب وہ انتہائی تلخ کہانیاں لکھنے لگا تھا۔

لیکن شاہدہ نے ایک دن اُن تلخیوں میں بڑی خاموشی سے شیرینی گھول دی۔

خاموش خاموش سی وہ گھریلو لڑکی انور کے پڑوس میں نئی آئی تھی اور اُس کی آمد کے چند دن بعد ہی انور کو یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے اُس کے مختصر سے فلیٹ میں بے نام سی دھڑکنیں جاگ اُٹھی ہوں۔ رات گئے جب وہ سارے شہر کی آوارہ گردی کے بعد تھکن سے چُور ہو کر واپس آیا تو چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک، مبہم سی جمائی یا کوئی اور بے نام سی جنبش اُسے احساس دلا دیتی کہ شاہدہ ابھی جاگ رہی تھی اور تب اُسے محسوس ہوتا جیسے سارے دن کی تھکن یکلخت بھاپ بن کر اُڑ گئی ہو!

پھر رفتہ رفتہ چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک نے نگاہوں کے مبہم اشاروں کی شکل اختیار کر لی اور اشاروں کو آہستہ آہستہ زبان مل گئی۔

اور ایک دن شاہدہ نے اُس سے شرماتے ہوئے پوچھا "آپ اِتنی رات گئے کیوں آتے ہیں۔ کیا آپ کا گھر میں جی نہیں لگتا؟"

"گھر میں ہے کون جو جی لگے گا؟"

اور شاہدہ آپ ہی آپ اور بھی شرما گئی۔

پھر ایک دن اُس نے شاہدہ سے پوچھ لیا "تمھارے گھر میں کس کس کے کمانے کی کیا؟ ... رہتی ہے ـ کہ ... رہتی ہو؟"

اور شاہدہ کا چہرہ تاریک ہو گیا "ابا کو ورکر کا مرض ہے۔ اُن کے لئے تو ... قدم چلنا بھی محال ہے۔"

"اوہ! ایسی صورت میں ـــــ" اور اُس کے ہونٹوں تک ایک نیا اقتصادی معاشی سوال آتے آتے رہ گیا۔

اور اُس معاشی سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ تھا کہ اِس چھوٹے سے کُنبے کی کفالت کا بوجھ بڑی حد تک شاہدہ کے کاندھوں پر تھا۔

"ابا کو پنشن ملتی ہے لیکن اُن کی روز کی بیماری، احمد کی تعلیم اور پھر یہ گرانی ـــــ"

اور شاہدہ کو اِس گرانی سے لڑنے کے لئے ساری ساری رات کڑھائی یا سلائی کرنی پڑتی تھی اور اُس کی آنکھوں کی سُرخی مستقل ہو کر رہ گئی تھی۔

اور اُس دن کے بعد سے انور نے اپنی ضروریات تشنہ چھوڑ دیں ـــ زندگی کی اُس عمودی چڑھائی میں اُس لڑکی کو سہارے کی ضرورت تھی اور اُسے سہارا دینے کے لئے انور نے راتوں کی آوارگی چھوڑ دی۔ بلا مقصد کافی ہاؤس میں بیٹھنا ترک کر دیا یہاں تک کہ اکثر ایسا ہوتا کہ اُس کے پاس سگریٹ خریدنے کے بھی پیسے نہ بچتے لیکن یہ تشنگی اُسے بہت لذّت انگیز معلوم ہوتی اور اب عموماً یہ ہوتا کہ رات کے سنّاٹے میں دیوار کے اُس پار شاہدہ اپنے فلیٹ میں سر جھکائے کڑھائی میں مشغول ہوتی اور دیوار کے اِس پار اپنے کمرے میں وہ اُس خاموش اور گھریلو لڑکی کی کہانیاں لکھتا جس کے کاندھوں پر دائم المرض باپ اور ایک ناسمجھ بھائی کی کفالت کا بوجھ تھا اور جس کی آنکھیں راتوں کی لگاتار محنت سے سُرخ رہنے لگی تھیں۔

پھر ایک دن اُس نے گھما پھرا کر شاہدہ سے کہا "شاہدہ! تمھیں شکایت تھی کہ میں اِتنی رات گئے گھر کیوں آتا ہوں اور میرا گھر میں جی کیوں نہیں لگتا؟"

"اور آپ نے تڑ سے اُس کا جواب بھی دے دیا تھا" مُسکرا کر اُس نے کہا۔

"لیکن اب میں سوچتا ہوں گھر میں میرا جی لگ سکتا ہے بشرطیکہ ـــــ بشرطیکہ تم اِس گھر کو اپنے وجود کی روشنی دے سکو!"

"انور صاحب!" شرمانا ایک فوری ردِّعمل تھا جس پر اُس نے جلد ہی قابو پا لیا۔ پھر افسردگی کے ساتھ بولی "ایسا نہ سوچیے۔ میں ابا کی ضعیفی کا واحد سہارا ہوں اور اُنھیں اِس سہارے کی شدید ضرورت ہے!"

"تم غلط سمجھیں شاہدہ۔ ہم دونوں مِل کر اُن کا سہارا بنیں گے؟"

"کاش ایسا ہو سکتا لیکن میں جانتی ہوں یہ ناممکن ہے" اُس نے کہا "ہماری

اور آپ پہلے ہی کون سی کم تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں ——— میں جانتی ہوں آپ کے پاس کبھی کبھی ہفتے ہیں جب سگریٹ کے پیسے بھی ختم ہو جاتے ہیں اور آپ پیدل دفتر جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ نہیں انور صاحب! میں زندگی میں آپ کو کوئی سکھ نہ دے سکوں گی۔"

"میرے لئے سب سے بڑا سکھ تمھاری قربت ہے شاہدہ!"

"صرف جذبات کی حد تک ——— اور مجھے آپ سے جذباتی پن کی توقع نہیں ہے۔"

اُس نے کہا: "میں محسن کش نہیں ہوں انور صاحب! آپ نے میرے کنبہ پر احسانات کئے ہیں اور اُن احسانات کا یہ صلہ نہیں ہے کہ میں اپنی زندگی کا بوجھ بھی آپ پر ڈال دوں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو شاہدہ! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

لیکن شاہدہ نے اُسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اُس کی سُرخ سُرخ آنکھیں اور سُرخ ہو گئیں اور وہ خاموشی سے اندر چلی گئی۔

پھر ایک دن محلے کے پنساری سے اُس کی شادی ہو گئی۔

اور انور نے اپنے فلیٹ میں ہمیشہ کے لئے تالا لگا دیا۔

پھر ایک دن وہ شہر چھوڑنے کے ارادے سے اپنا سامان لئے گیا تو زینوں پر اُسے شاہدہ نے روک لیا۔

"سُنا ہے آپ شہر چھوڑ رہے ہیں؟"

انور نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"میری وجہ سے؟"

"نہیں تو ——— یونہی بس کہیں جی نہیں لگتا۔"

"میرا بھی کہیں جی نہیں لگتا۔" اور اُس کی آواز بھر آگئی۔

"یہ خبر میرے لئے غیر متوقع ہے!"

"ضرور ہو گی۔ کیونکہ آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ اپنے کنبہ کا دوسرا سہارا ڈھونڈ لیا ہے۔" اُس کی آنکھیں پھر سرخ ہونے لگیں۔ "لیکن آپ مجھے غلط سمجھتے ہیں انور صاحب! آپ جانتے ہیں مجھے اُس شخص سے دُکھ کے سوا اور کیا مل سکتا ہے جس کا ذہن ہر وقت ڈنڈی مارنے کی فکر میں رہتا ہو اور جس کے جسم سے ہر وقت ہلدی اور مصالحوں کی بُو آتی ہو!"

"پھر ——— پھر تم نے اپنی زندگی کیوں برباد کر لی نا سمجھ لڑکی!؟"

"مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ ہاں میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ شاید اِس میں آپ کی بہتری ہو!"

"میری بہتری! شاہدہ ——— شاہدہ! تم نے زندگی کو ایک پہیلی کی طرح بُوجھا ہے اور تم اُس کا غلط جواب نکال بیٹھی ہو!"

"ہو سکتا ہے آپ کا خیال صحیح ہو۔ لیکن یہ پہیلی آپ کی سمجھ میں اُسوقت خود بخود آجائے گی جب آپ کی کنپٹیوں کے بال سفید ہونے لگیں گے۔" اُس نے کہا اور اُس کی آواز کپکپا گئی: "زندگی کی چڑھائی بڑی ظالم ہے انور صاحب۔ اِس میں ہر فرد کو اپنا بوجھ تنہا اُٹھانا پڑتا ہے۔"

"یہ بوجھ اب بھی بٹ سکتا ہے شاہدہ۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔"

"نہیں نہیں۔ ایسی باتیں نہ سوچئے۔ آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ یہاں سے دُور چلے جایئے۔ مجھے بھولنے کی کوشش کیجئے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔" اُس نے آنسو روکتے ہوئے کہا اور پلٹ کر واپس چلی گئی۔ پھر بالکل غیر متوقع طور پر مُڑی اور پنجوں کے بل کھڑی ہو کر اُس نے انور کی پیشانی کا بوسہ لیا اور ایک جھپاکے سے اندر چلی گئی۔

انور نیچے اُترا تو اُس کے ہاتھوں میں اُن کہانیوں کا پلندہ تھا جو اُس نے شاہدہ کے لئے لکھی تھیں اور اُس کی پیشانی پر وہ بوسہ دھڑک رہا تھا جو نہ جانے کس جذبے سے ثبت ہوا تھا۔

اور اُس نے اپنا سر تھام لیا: "سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں؟"

میں نے ہمیشہ کی طرح اُسے صحیح رائے دی: "بھگا لے جاؤ اُسے!"

"پھر وہی کمینگی!"

"اِس میں کمینگی کی کیا بات ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ شاہدہ کے بغیر تمھاری زندگی ویران ہو جائے گی تو ہمت کرو۔ اُسے بھگا لے جاؤ!"

"یہ ناممکن ہے!"

"تو پھر تم بزدل ہو۔ اِتنے بزدل کہ تمھیں اپنے ارمانوں کا بھی پاس نہیں ہے!"

"ہاں میں بزدل ہوں۔ مجھے اپنے ارمانوں کا بھی پاس نہیں ہے لیکن میں زندگی کو تمھاری نظروں سے نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں اِسے مقدس سمجھتا ہوں۔" اُس نے کہا: "اور تم ——— تم زندگی کو کسبی سمجھتے ہو اور اِسے ایک بھڑوے کی نظر سے دیکھتے ہو!!"

یہ ہماری آخری گفتگو تھی اور اِس کے بعد انور سے اُس وقت ملاقات ہوئی جب اُس کی لاش سڑک کے بیچوں بیچ پڑی ہوئی خالی خالی نظروں سے آسمان کو تک رہی تھی اور وہ اوراق جن میں شاہدہ کی کہانیاں سموئی ہوئی تھیں زخمی پرندوں کی طرح چاروں طرف پھڑ پھڑا رہے تھے۔

اور انور کو اب بھی یہ ضد تھی کہ وہ اپنی شکست تسلیم نہ کرے گا!

---

"دیکھو انور میں تم سے بحث نہیں کرتا لیکن تم خود فیصلہ کر لو کہ ہم میں سے غلطی پر کون تھا۔ اگر تم نے میری بات مان لی ہوتی اور شہلا سے سِول میرج کر لیتے تو

آج تم کئی ملوں کے مالک ہوتے۔ یا اگر تم نے سول سروس میں کامیابی کے نسخے کو آزمایا ہوتا تو آج تم کسی ضلع کے حاکم ضرور ہوتے۔ کم از کم تمہیں دولت سبحانی چاچاجی سے اختلاف نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اِس طرح تم اُن کے کاروبار میں حصہ دار بن سکتے تھے —— اور اگر تم سے یہ کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا تو پھر شاہدہ کو بھگا لے جانا کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا ——!"

"خدا کے لئے اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے سکون کی ضرورت ہے —— میں آج سے تمہیں آزادی دیتا ہوں"

"کاش یہ فیصلہ تم پہلے کر لیتے۔ تمہارے بغیر میری آزادی لاحاصل ہے —— ہمارا سفر تو ایک ساتھ شروع ہوا تھا اور ایک ساتھ ہی ختم ہوگا"

اور یوں ہمارا سفر ختم ہو گیا۔

اب غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ میں کوئی اور نہیں —— خود انور ہوں اور زندگی بھر اپنے آپ سے لڑتا رہا ہوں!!

---

# غزلیں

## نفیس سندیلوی

نہ تمنا ہے، نہ حسرت ہے، نہ ارماں کوئی
مجھ سا دنیا میں نہیں بے سروساماں کوئی

میرے ہی قتل کی تھی اُس نگہِ ناز کو فکر
نہ بنا پھر ہدفِ ناوکِ مژگاں کوئی

وہ یہ کہتے ہیں کہ مرنا تو بہت مشکل ہے
میں یہ کہتا ہوں کہ جینا نہیں آساں کوئی

ایک وحشت سی برستی ہے درِ زنداں پر
نہ رہا بعد مرے رونقِ زنداں کوئی

اُن کے جاتے ہی گئے صبر، سکوں، ہوش و حواس
نہ رہا ہائے شریکِ شبِ ہجراں کوئی

یوں تو اللہ کو قدرت ہے ملا دے ورنہ
اُن سے ملنے کا نفیس اب نہیں امکاں کوئی

## رئیس رامپوری

کون کہتا ہے کہ پی کر دُور ہو جاتے ہیں غم
اور یاد آتی ہیں باتیں اور تڑپاتے ہیں غم

مسکرا کر اپنی خودداری کی رکھ لیتا ہوں لاج
مسکراہٹ کے حسیں پردے میں چھپ جاتے ہیں غم

وہ کبھی جو مسکرا کر پوچھ لیتے ہیں مزاج
موتیوں کی شکل میں پلکوں پہ آ جاتے ہیں غم

احتیاط و ضبط بن جاتا ہے جس دل کا مزاج
ایسے دل کا چپکے چپکے کام کر جاتے ہیں غم

تشنہ کامانِ محبت کے فسانے ہی سناؤ
اِس طرح اے ہمدمو آنکھوں سے بہہ جاتے ہیں غم

شعر کہہ لیتا ہوں اِن کے فیض سے میں بھی رئیس
خیر سے اِتنا کرم مجھ پر بھی فرماتے ہیں غم

## بسمل کپورتھلوی

خزاں کے دَور میں سروِ چمن نے ہنس ہنس کر
مذاقِ اہلِ گلستاں کی آبرو رکھ لی

مری نظر میں سمٹ کر حسین جلووں نے
خیالِ تنگیٔ داماں کی آبرو رکھ لی

نگاہِ ناز نے فرما کے زحمتِ پرسش
ہمارے حالِ پریشاں کی آبرو رکھ لی

مری نگاہ میں شائستۂ پرستش ہے
وہ کفر جس نے کہ ایماں کی آبرو رکھ لی

کبھی نہ چاند ستاروں کا راز کھل سکتا
نئے شعور نے انساں کی آبرو رکھ لی

طلب کی راہ میں سب کچھ لٹا کے بسمل نے
ہر ایک بے سروساماں کی آبرو رکھ لی

افسانہ

# راکھ کے ڈھیر میں...

رفیعہ شبنم منیجری۔ بی۔ اے (آنرز)

۷/۱۶ بی۔ آئی۔ ٹی بلاک۔ ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی ۳

یکم مئی ۱۹۶۷ء

محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات

گزشتہ دنوں کچھ ایسی مصروفیات نے آگھیرا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہ ملا۔ حالانکہ "بیسویں صدی" برابر ملتا رہا اور "تیر و نشتر" کے ذریعے آپ سے دو دو باتیں بھی ہوتی رہیں..... لیجئے اب "راکھ کے ڈھیر میں" بھیج رہی ہوں۔ افسانہ کے متعلق کچھ نہ کہوں گی اس کے سوا کہ جب میں نے یہ افسانہ لکھا، اُس وقت میرے دماغ میں غالب کا صرف یہ شعر تھا ؎

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا  کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟

دیکھئے تو اس "راکھ کے ڈھیر میں" کون سی چنگاریاں پوشیدہ ہیں؟؟..... رضا بھائی (رضاء الجبار) کے خط سے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ ختنہ دہلوی قسم کے حضرت، جو آپ کے اور "بیسویں صدی" کے نام کے سہارے دھوکا دہی کا ایک پروگرام بنائے ہوئے تھے، اپنے مقصد میں ناکام ہوگئے اور اب اُنھوں نے معافی مانگ لی ہے۔ اس سلسلے میں، میں نے آپ کو پہلے بھی مطلع کیا تھا کہ اس قسم کے عناصر کا قلع قمع کرنا نہایت ضروری ہے۔

مخلص ...... رفیعہ شبنم منیجری

---

شام کے سائے شمسان کی خاموش فضا پر چھا گئے ہیں اور دہکتے ہوئے نارنجی شعلے مدھم ہوتے جا رہے ہیں۔ سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر پر میری نگاہیں اب بھی ٹھہری ہوئی ہیں۔ "چٹاخ" کی آواز کے ساتھ لکڑیاں کوئلہ ہوگئی ہیں، کوئلے بجھ گئے ہیں، چنگاریاں ماند پڑ گئی ہیں اور راکھ باقی رہ گئی ہے۔ سُرمئی، سیاہ اور سفید سفید راکھ، مگر.....!!

گرم گرم راکھ کے ڈھیر میں اب بھی کچھ چنگاریاں باقی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سی چنگاریاں جو ایک ساتھ دہک کر ایک لپکتے ہوئے شعلے میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ نہ جانے یہ شعلہ کب بجھے گا؟ یہ چنگاریاں کب راکھ ہوں گی؟ میں ان چنگاریوں کے بجھنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس شعلے کے مدھم پڑ جانے کا منتظر ہوں۔ بس یہ آخری شعلہ بجھ جائے اور میں ساری راکھ جمع کر کے ایک خوبصورت سے منقش ہوتے ٹین کے ڈبے میں محفوظ کر لوں۔ کیونکہ یہ راکھ بہت قیمتی ہے۔ صدیوں پُرانی تہذیب، صدیوں پُرانے رسم و رواج، صدیوں پُرانی مجبوریاں، انسان کی ازلی تشنگی، ابدی محرومی، دائمی مایوسی..... نہ جانے کیا کیا چھپا ہے اِس راکھ کے ڈھیر میں۔ اس چھوٹے سے شمسان کی خوبصورت سی چتا پر، جہاں لکڑیاں جمی ہوئی ہیں اور شعلے اُٹھ رہے ہیں۔ ہندوستان جل رہا ہے، ایشیا جل رہا ہے، مشرق جل رہا ہے اور مشرق کے رسوم و رواج جل رہے ہیں۔ چتا سے اُٹھتے ہوئے اِن شعلوں میں لال قلعہ کے پتھروں اور خاکِ پانی پت کے ذرّوں کی سی سُرخی ہے اور... اور...

میری نگاہیں اب بھی اُن شعلوں پہ مرکوز ہیں۔ سُرخ سُرخ دہکتے ہوئے، مچلتے ہوئے شعلے! اپنی لال اور لمبی زبان سے پُوری ایک تہذیب کی کہانی سُنا رہے ہیں۔ وہ تہذیب جس نے ہندوستان کو "وشال بھارت" بنا دیا تھا۔ آج اُسی بھارت کی ایک بیٹی آگ میں جل رہی ہے!!

لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں مدھم پڑ گئی ہیں۔ شعلے بجھ گئے ہیں۔ آس پاس کی راکھ ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے۔ ہوائیں بھی سائیں سائیں کرنے لگی ہیں۔ شمسان

کا سنّاٹا اپنی خاموشی کی زبان میں جلنے والوں کی داستان سُنا رہا ہے۔ اُن کی داستان جو خود اپنی ہی آگ میں جلتے رہے اور راکھ ہو گئے۔

"یہ راکھ بہت مقدس ہے۔ اِسے اِدھر اُدھر نہ پھینکو۔ اِسے گنگا میں بہا دو۔ سُنا اُمیش اِسے گنگا میں بہا دو"

"یہ کون پکار رہا ہے؟" شمسان کے اِس سنّاٹے میں کس نے مجھے آواز دی ہے۔

"اُمیش! بیٹا اُمیش!!" اور میں سرتاپا چونک گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے اِس آواز کے پیچھے لپک جاؤں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا آواز کہاں سے آرہی ہے۔ نہ جانے کہاں سے؟ شاید بہت دُور آسمان کی گہرائیوں سے۔ نہیں نہیں، اِس شمسان کے ایک ایک ذرّے سے۔ نہیں، بلکہ اُس چتا سے جہاں لکڑیوں کے انبار کے نیچے ایک جسم جل رہا ہے۔ جھرّیوں سے بھرا، ایک کمزور، لاغر اور نحیف سا جسم!! برسوں اپنے احساسات کی بھٹی

---

- بخل اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہوتے۔

(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

- وہ کھانا جو پُوری اشتہا کے بغیر کھایا جائے ایک طرح کی معصیت ہے۔

(مولانا جلال الدین رومیؒ)

- خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرو۔

(حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ)

- والدین کے چہروں پر محبت سے نظر کرنا بھی خدا کی خوشنودی کا موجب ہے۔

(حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ)

- انتقام میں جلدی کریموں کا شیوہ نہیں۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)

---

میں جلنے والا جسم!! جو اب راکھ بنتا جا رہا ہے۔ ہاں شاید اُسی راکھ سے یہ آواز آرہی ہے۔ میں نے راکھ پر نگاہیں جما دی ہیں۔

"میری راکھ گنگا میں بہا دینا۔ بیٹا اُمیش سُن رہے ہو نا؟؟"

"دادی۔۔۔!!" میں چیخ اُٹھتا ہوں۔ کپکپاتی ہوئی آواز مجھ سے دُور ہو چکی ہے۔ کچھ اور چنگاریاں بُجھ گئی ہیں، کچھ اور شعلے مدھم پڑ گئے ہیں۔ سنّاٹا کچھ اور بڑھ آیا ہے۔ اندھیرے کچھ اور پھیل گئے ہیں اور راکھ کے ڈھیر میں وہ شعلہ اب بھی رقص کر رہا ہے۔ دہکتا، لپکتا نارنجی شعلہ! آخر یہ بُجھ کیوں نہیں جاتا؟ میں کب تک اِس کے بُجھنے کا انتظار کروں!

"یہ شعلہ کبھی نہ بُجھے گا اُمیش! کبھی نہیں!!" پھر وہی آواز میرے کانوں میں گونج اُٹھی ہے اور پھر شمسان کے نگراں پنڈت نے بلند آواز میں "ہری اوم" کا نعرہ لگا کر میری رگ رگ کو جھنجھوڑ دیا ہے۔

واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ شعلہ کبھی نہ بُجھے گا۔ سارا جسم خاک ہو گیا ہے۔ وہ سر جس میں چتوڑ کا غرور خوابیدہ ہے، دہلی کی عظمت پوشیدہ ہے اور میسور کی مریادا دفن ہے۔ جو کسی کے آگے نہ جھکا۔ بال، جو دلّی کے آگے بھی نہیں (?) راستے پر اَٹل ارادے کے ساتھ بڑھنے والے پاؤں خاک ہو چکے ہیں اور یہ ہاتھ جنھوں نے تہذیب کو سنوارا ہے، جنھوں نے مجھے تھپک تھپک کر سُلایا ہے، مجھے اپنی گود میں بہلایا ہے۔ یہ ہاتھ جل گئے ہیں، راکھ ہو گئے ہیں۔ یہ زبان جس نے مجھے لوریاں سُنائی تھیں، پیار اور محبت، شجاعت اور عظمت کے گیت سُنائے تھے۔ ایسے گیت جو آج بھی مجھے زندہ رہنے کا عزم بخشتا ہے۔ وہ شجاعت بخشی ہے جو تلوار کی نوک پر بھی مسکراتی ہے۔ سب کچھ تو خاک ہو گیا ہے۔ یہ جسم، یہ ہاتھ، یہ پاؤں، یہ چہرہ جس کی ایک ایک جھرّی حُسنِ رفتہ کے افسانے کا ایک ورق تھی۔ سب کچھ خاک ہو گیا ہے لیکن یہ ایک شعلہ۔ راکھ کے ڈھیر کے عین وسط میں یہ ایک دہکتا، لپکتا ہوا شعلہ کیسا ہے؟ کیوں نہیں بُجھ جاتا؟ یہ کیوں نہیں راکھ ہو جاتا؟ میں اِس کے بُجھنے کا انتظار کر رہا ہوں اور شاید ساری زندگی کرتا رہوں گا لیکن یہ شعلہ نہ بُجھے گا۔ کبھی نہ بُجھے گا اُمیش!۔۔۔ یہ وہ شعلہ ہے جسے آدمیت کی ازلی آگ نے جنم دیا ہے۔ یہ وہ شعلہ ہے جس کی روشنی میں میرا زہر پی کر بھی مُسکراتی رہی۔ یہ وہ شعلہ ہے جس میں جل کر زلیخا جوان ہو گئی۔ یہ وہ شعلہ ہے جس نے ریگزاروں میں پھول کِھلائے ہیں۔ یہ شاستری کے سینے سے اُٹھنے والا وہ شعلہ ہے جس نے سرزمینِ تاشقند کو ہندوستانی تہذیب کی روشنی دی ہے۔ یہ انسانی جذبات و احساسات کا شعلہ ہے۔ یہ نہ بُجھے گا اُمیش!! کبھی نہ بُجھے گا۔ اگر یہ راکھ ہو گیا تو ہندوستان کے کھیت اِسے اپنی مقدس آغوش میں سمیٹ لیں گے۔

شعلہ اور راکھ!!

میں گھبرا سا گیا ہوں اور میرے سامنے راکھ کا ڈھیر ہے۔ اچانک اِس پر کچھ نقوش اُبھر آتے ہیں۔ کچھ انسانی نقوش! اور میں چونک اُٹھتا ہوں۔ دادی کا سراپا میری نظروں کے سامنے ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا اِس بوڑھی، دُبلی پتلی کمزور سی عورت کے سینے میں یہ شعلہ پچاس برس تک کیسے جلتا رہا؟ حالات کی آندھیاں اِسے بُجھا کیوں نہ سکیں؟ اور آج یہ شعلہ اِتنا دہک کیوں رہا ہے؟ اِتنا تیز کیوں ہو گیا ہے؟

دادی نے مجھے بہت شفقت سے پالا ہے۔ میرے لئے وہ ساری ساری رات جاگتی رہی ہیں۔ کبھی کبھی اُنھوں نے میرے لئے ماں سے لڑائی بھی کی ہے۔ اُسے ڈانٹ ڈپٹا بھی ہے۔ دادی ساری زندگی میرے لئے محبت اور شفقت کا پیکر بنی رہیں۔ اُنھوں نے تمام بچوں کو اِتنی ہی شفقت سے پالا ہے۔ تارا، آشا، سریش اور آنند سبھی نے تو اُن کی گود میں آنکھیں کھولیں۔ ماں سے ہمارا صرف اِتنا ہی تعلق ہے کہ

اُس سے ہمیں جنم دیا ہے اور ہمیں دودھ پلایا ہے۔ ورنہ ہمارے لئے سب کچھ تو دادی ہی ہیں۔ اُنھیں ایک لمحہ بھی ہمیں تنہا چھوڑنا گوارا نہیں اور دادا کو اس سے نفرت رہی۔ ساری زندگی وہ دادی سے لڑتے جھگڑتے رہے اور ماں کہتی ہے ہ اُن کے پتا جی جانتے تھے کہ شروع ہی سے ان میں کبھی نہ بنی۔ نہ جانے کیوں؟ حالانکہ دادا بڑے سمجھدار تھے۔ خوش مزاج، ہمدرد، محبت کرنے والے، جذباتی۔ ساری خوبیاں تو اُن میں موجود تھیں۔ دراز قد، باریک مونچھیں، بارعب چہرہ۔ سر پر جب وہ صافہ باندھ کر گھر سے نکلتے تھے تو گاؤں کی عورتیں آنگن سے جھانک جھانک کر رشک سے دادی کی طرف دیکھتی تھیں۔ لیکن دادی ——— وہ حسب معمول اپنی ساریاں رنگنے میں مصروف رہتیں۔ اپنے گھیر دار لہنگے پر بیل بوٹے کاڑھتی رہتیں یا پھر ڈھول پر گیت گاتیں۔ دادی بہت اچھا گاتی تھیں۔ اُنھوں نے ہمیں بھی اکثر لوریاں سُنائی ہیں، گیت سُناتے ہیں اور اُن کی آواز میں ہم ڈوب ڈوب گئے ہیں لیکن نہ جانے کیوں؟ جب بھی دادی نے گایا ہے مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے اُن کی آواز بہت دُور سے آرہی ہے۔ دُور، بہت دُور سے۔ جیسے میرے سامنے بیٹھی ہوئی اِس بوڑھی عورت کے حلق سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ اُن کے گلے کا سوز، وہ درد، وہ گداز، وہ کشش!! ——— میں اکثر اُس میں کھو گیا ہوں اور اُس وقت چونکا ہوں جب دادی نے گیت ختم کر دیا ہے۔ اور اپنی پلکوں پر کانپتے ہوئے آنسو اپنی اُنگلیوں کے سِروں میں چپکے سے جذب کر لئے ہیں۔ دادی سمجھتی ہیں میں نے اُن کے آنسو نہیں دیکھے ہیں لیکن میں جانتا ہوں، دادی کی لمبی سفید پلکوں پر چمکتے ہوئے یہ موتی میرے دامن میں بھی آگرے ہیں اور میں انھیں اپنی ہتھیلیوں پر سجائے اُن کی آب و تاب کی قیمت لگا رہا ہوں۔

دادی کی شخصیت ہمیشہ میرے لئے کشش کا باعث بنی رہی ہیں میں اُنھیں چاہتا رہا ہوں بچپن سے۔ ماں اکثر کہتی ہے "بڑھیا کا دماغ چل گیا ہے" اور میں کہنا چاہتا ہوں۔ "ماں! چلنا ہی تو زندگی کی دلیل ہے۔ حرکت ہی تو حیات کی ضامن ہے۔ جمود تو موت ہے۔ جب تک چلتے رہیں، زندگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ چاہے دماغ چلے، چاہے دل دھڑکے، چاہے قدم حرکت کریں۔ لیکن یہ چلنا زندگی کا ثبوت ضرور ہے۔ ماں! تم نہ سمجھو گی دادی کو۔ تم ہندوستانی بہوئیں ہمیشہ اپنی ساس کو غلط سمجھتی رہیں۔ اِن بوڑھے، جھرّیوں بھرے چہرے کے پیچھے زندگی کی جو لکیریں [illegible] کی جو تحریریں نقش ہیں، انھیں تمھاری نگاہیں نہیں پڑھ سکتیں [illegible] ہتی ہو۔ اپنا سکھ، اپنا آرام اور اپنے پتی کا پیار اور بس ——— !! لیکن تمھیں اس سے نفرت ہے جس نے تمھارے پتی کو، تمھارے محبوب کو جنم دیا ہے۔ ماں! تم نہ سمجھو گی۔ دادی مجھے اتنی ہی عزیز ہیں جتنے پتا جی اور جتنی تم۔ اِس لئے کہ دادی [illegible] پتا جی نہ ہوتے اور پتا جی نہ ہوتے تو تم نہ ہوتیں اور تم نہ ہوتیں تو میں نہ ہوتا!! دیکھا ماں! تخلیق کا یہ سلسلہ کتنا طویل، کتنا خوبصورت اور کتنا اہم ہے! اِس لئے اِس پہلی کڑی کو نہ بھولو جس نے اِتنے حلقوں کو جوڑ کر ایک آہنی زنجیر بنائی ہے۔ وہ زنجیر جس میں ایک پورا سماج جکڑا ہوا نظر آتا ہے، ایک پورا معاشرہ اُس کا اسیر ہے، پوری دُنیا اُس میں بندھی ہوئی ہے۔

ماں پر کیا منحصر ہے۔ دادا نے بھی کب سمجھا دادی کو۔ وہ تو بس اِتنا جانتے رہے کہ یہ بڑھیا جو جوانی میں حوروں کو بھی شرماتی تھی، جس کی صندلی باہیں اکثر اُن کی باہوں سے ٹکراتی رہیں، جس کی سیاہ زُلفیں اکثر اُن کے شانوں پر بکھرتی رہیں، ایک عورت ہے۔ صرف عورت! جو مرد کی پہلی اور آخری آرزو ہے۔ عورت! جس کی خواہش آدم نے کی تھی۔ عورت، جو مرد کا فطری تقاضہ ہے۔ بس عورت!! اور کچھ بھی نہیں!! لیکن میں جانتا ہوں دادی صرف عورت نہیں۔ وہ دادا کی پتنی بھی ہے اور پتا جی کی ماں بھی ہے اور ماں کی ساس بھی اور اپنے پوتوں کی دادی بھی۔ اور . . . اور . . . وہ ایک کائنات ہے، ایک دُنیا ہے، ایک عالم

. . . ——— . . . ——— . . . ——— . . .

- دُنیا کی ہر شے حسین ہے، لیکن چشم بینا کی شرط لازم ہے۔
(کنفیوشش)
- حُسن ایک غیر فانی شے ہے۔ یہ ایک شے سے دوسری شے میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔
(بائبل)
- جہاز کو سمندر سے واپس لایا جا سکتا ہے لیکن زبان سے نکلے ہوئے الفاظ واپس نہیں لائے جا سکتے۔
(ملائی ادب)
- دُنیا کا ہر حسین مرقع دائمی مسرّت کا سرمایہ دار ہوتا ہے۔
(کیٹس)
- حُسن اور نیکی لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔
(سافو)

. . . ——— . . . ——— . . . ——— . . .

ہے۔ مگر . . . مگر . . . دادی کو دادا نے سمجھا نہ ماں نے۔ دادی نے دادا کے آگے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ جب تک دادا جیتے رہے وہ خاموش خاموش، چُپ چاپ زندگی گزارتی رہیں کبھی اپنے کاموں میں مصروف، کبھی دادا کی خدمت میں مشغول اور کبھی ہمارے پیار میں ڈوبی ہوئی ——— اور پھر دادا مر گئے۔

دادی کی خاموشی پھر بھی نہ ٹوٹی۔ ہاں وہ احتجاج ضرور زندہ ہو گیا جو دادا کے وجود سے ڈر کر سہم کر دادی کے وجود کے کسی گوشے میں چھپ گیا تھا اور پچیس برس تک [illegible] چھپا رہا لیکن پچیس برس میں تو یہ احتجاج جوان ہو چکا تھا مضبوط، توانا اور قوی [illegible] کے کچھ ہاتھ آگے بڑھے۔ دادی کے گلے کی طرف، سیاہ موتیوں کی اُس مالا کو توڑنے کے لئے جو دادا اور دادی کی ازدواجی زندگی کی ضامن تھی۔ ایک کمزور [illegible] سیاہ!! جو ہر عورت مرد کو اپناتے وقت بخوشی اپنی گردن میں ڈال



ڈیڈی آپ کہتے تھے کہ بینک میں آپ کا
روپیہ پھُولتا پھلتا ہے۔ وہ کیسے ڈیڈی!
میری طرح کئی لوگ بینک میں اپنا روپیہ جمع کرتے ہیں۔ اس طرح بینک کے پاس ڈھیروں روپئے
جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر بینک کچھ رقم، فیکٹریوں، دکانوں، اور حکومت کو اُن کے کاروبار کو چلانے کے
لئے دیتا ہے۔ تھوڑے دنوں بعد یہ رقم اور ساتھ ساتھ کچھ سُود واپس کر دیا جاتا ہے۔
چونکہ بینک نے میری رقم کو بھی کام میں لایا ہے اس لئے اس سُود میں سے کچھ حصّہ مجھے دیدیا
جاتا ہے۔ یُوں میرا روپیہ پیسہ پھُولتا پھلتا ہے۔ اگر میں بینک میں روپئے نہ جمع کروں تو پھر
ان میں اضافہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟
لیکن آپ تو پنجاب نیشنل بینک میں روپیہ جمع کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے نا؟
ہاں۔ وہی تو میرا بینک ہے۔ یہ سب سے قدیم ترین اور بڑے بینکوں میں سے
ایک ہے جس کی آج ۸۵۰ سے بھی زیادہ شاخیں ہیں۔
پنجاب نیشنل بینک

لیتی ہے جیسے عمر بھر کے لئے اُن کی غلامی کا طوق پہن رہی ہو لیکن آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ ایک عورت اور مرد کا یہ حسین عہد و پیمان سیاہ رنگ کا اظہار کیوں کرتا ہے؟ دادی کے گلے میں پھنسا ہوا وہ سیاہ دھاگا اُن کی زندگی کی تاریکی کا غماز نہیں تو اور کیا تھا؟ اور وہی سماج جس نے ایک دن شہنائیوں کی گونج میں یہ پھندا دادی کے گلے میں ڈالا تھا آج اُسے اس پھندے سے آزاد کر رہا تھا کیا قیامت ہے!! جس کی نشانی کو عمر بھر رگِ گلو سے قریب رکھا ہو سانس کے ٹوٹتے ہی اُسے مٹا دیا جائے؟ سانس کا رشتہ کیا ٹوٹا، سارے بندھن ٹوٹ گئے لیکن وہ بندھن جو دل کے ہوتے ہیں، جو روح کے ہوتے ہیں کیا وہ بھی سماج کے ہاتھوں میں ہیں؟

"نہیں نہیں ۔۔۔ اسے نہ توڑو ۔۔۔" دادی چیخ اٹھی تھیں۔ دادی کا وہ پچپن سالہ جوان احتجاج چیخ اُٹھا تھا اور سارے میں سناٹا سا چھا گیا تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی جیسے وقت سے پہلے دادا کی لاش اُٹھ رہی ہو۔ ماں نے ایک عجیب انداز سے مُنہ بنا کر دادی کی طرف دیکھا تھا لیکن دادی کے چہرے پر تو کچھ بھی نہ تھا۔ صرف پلکوں پر کچھ آنسو تھے اور آنکھوں میں عجیب سی پرچھائیاں۔ جنھیں سماج کی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔

"اسے توڑنے دو کاکی۔ تمھارا سہاگ ہی اُجڑ گیا تو اسے پہن کر کیا کرو گی؟"

رادھے کی ماں نے بڑی ہمت سے کہا تھا "نہیں نہیں" دادی کا جوان احتجاج آج پہلی بار اتنی زور سے چیخا تھا "میرا سہاگ نہیں اُجڑا۔ وہ زندہ ہے۔ وہ زندہ ہے!" دادی کی چیخ سارے آنگن میں گونج اُٹھی تھی۔ ماں کے چہرے پر وحشت چھا گئی تھی اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

"وہ زندہ ہے۔ وہ زندہ ہے!" چاروں طرف سے یہی آواز آ رہی تھی اور سماج کے بڑھتے ہوئے ہاتھ رُک گئے تھے۔ ایک ایک کر کے سب جا چکے تھے۔ دادی کے جوان احتجاج نے صدیوں پُرانے، بوڑھے سماج کو ایک ہی جست میں پچھاڑ دیا تھا۔ ماں بڑبڑا رہی تھی، پتا جی حیران تھے اور ہم سب پریشان سے!!!

دادا کی موت کے پانچ سال بعد تک دادی جیتی رہیں۔ ایک سہاگن کی طرح۔ ناک میں کیل اور گلے میں موتیوں کی مالا اور کوئی انھیں کچھ نہ کہہ سکا۔ کس میں ہمت تھی جو دل اور روح کے رشتوں سے انکار کرتا۔ اُس دن پہلی بار دادی کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے میں نے سوچا تھا۔

"سماج کو ایسی ہی عورت کی ضرورت ہے۔ سنا ماں! میری دادی امر ہے؟" میں نے دادی کی گود میں سر رکھ دیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں اور دادی ہمیشہ کی طرح میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی تھیں۔ اچانک آشا اور لتا کے قہقہوں نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول لی تھیں۔

حُسن و شباب کا ایک حسین پیکر، سرتاپا قیامت!! وہ آشا کے ساتھ کھڑی تھی اور دادی اُسے گہری نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اُس میں اپنے شباب کو تلاش کر رہی ہوں اور میں دادی کی آنکھوں میں لمحہ بہ لمحہ اُبھرتی ہوئی پرچھائیوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا "نمستے ۔۔۔!"

اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ دادی نے اُسے آشیرواد دے کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا اور حسب معمول ہر نو وارد کی طرح اُس سے بھی اُس کا شجرۂ نسب پوچھ رہی تھیں۔ خاندان کا حال دریافت کر رہی تھیں۔

"اچھا اچھا ۔ تو تم امر چند کی پوتی ہو؟" اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا "کیسے ہیں تمھارے دادا؟" دادی اُس سے پوچھ رہی تھیں اور غیر ارادی طور پر اُن کا ہاتھ تیزی سے گلے میں پڑی ہوئی سیاہ موتیوں کی مالا سے کھیل رہا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر پریشانی کے آثار اُبھر آئے تھے اور حسین پیشانی پر پسینے کے قطرے!

"آج کل بہت بیمار ہیں۔ دن میں کئی کئی بار دل کے دورے پڑتے ہیں گھنٹوں بے ہوش رہتے ہیں۔ شہر کے تمام ڈاکٹر جواب دے گئے تو دادا نے بس ایک ہی رٹ لگا دی۔ مجھے گاؤں لے چلو۔ میں وہیں مروں گا۔ اپنے گاؤں کے برگد کے پیڑ تلے اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ ہم پرسوں ہی شہر سے آئے ہیں" لڑکی کی آواز رُندھ گئی۔

لڑکی جا چکی ہے۔ دادی بھی اپنے کام میں ہمیشہ کی طرح مصروف ہو گئی ہیں لیکن اُن کے گلے میں پڑی ہوئی سیاہ موتیوں کی لڑی ٹوٹ گئی ہے اور موتی ایک ایک کر کے گر رہے ہیں۔ جیسے اُن کا سہاگ دم توڑ رہا ہو۔ بہت کم موتی باقی رہے ہیں لیکن آج خلافِ معمول دادی کام میں اتنی کیوں کھوئی ہوئی ہیں کہ انھیں اس کا بھی احساس نہیں اور

میں نے رات کی خاموشی سے گھبرا کر آنکھیں بند کر لی ہیں۔

رات گزر چکی ہے اور صبح نمودار ہو چکی ہے۔ خوبصورت، حسین اور دلکش صبح! بالکل اُس لڑکی کی طرح جو امر چند کی پوتی ہے۔ امر چند جو اس گاؤں کا تنہا تعلیم یافتہ بُوڑھا ہے۔ کہتے ہیں جب تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ شہر سے گاؤں لوٹا تھا تو صرف ایک دن یہاں ٹھہرا تھا۔ سُنا ہے اُس دن اُس کی کامیابی کی خوشی میں ساری رات جشن ہوتا رہا تھا اور گاؤں والے کہتے ہیں آج تک گاؤں میں اتنی دھوم دھام کبھی نہیں ہوئی۔ اُسی دن برگد کے پیڑ تلے رادھا اور کرشن کا ناٹک کھیلا گیا تھا۔ اُسی دن دادا اور دادی کی شادی ہوئی تھی۔ اُسی دن گاؤں والوں نے اپنی دو عزیز ہستیوں کو رخصت کیا تھا۔ دادی کو، جو ڈولی میں بیٹھ کر دادا کے گھر جا رہی تھیں اور رام چند کو، جو اپنے گاؤں کی حسین یادوں کو دامن میں لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شہر جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں؟؟ اُسی دن۔۔۔ اُسی دن۔۔۔" اور میں چونک جاتا ہوں۔ آشا میرے قریب آ کر سسکتی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔

"بھیا۔۔۔ دادی مر گئیں۔"

"دادی مر گئیں!!!" میں چیخ اُٹھتا ہوں۔ "نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا!!" مگر۔۔۔

شمسان کی یہ خاموشی اور یہ جلتی ہوئی لکڑیاں چیخ چیخ کر مجھے حقیقت کا احساس دلا رہی ہیں۔ سب کچھ راکھ ہو چکا ہے، سب کچھ! ۔۔۔ میرے سامنے راکھ کا ایک ڈھیر باقی رہ گیا ہے۔ صرف ایک ڈھیر۔ گرم گرم سی راکھ، بجھی ہوئی چنگاریاں اور مدھم ہوتے ہوئے شعلے!!

میں پھر راکھ کے ڈھیر پر نگاہیں جما دیتا ہوں اور اُس شعلے کے بجھنے کا منتظر ہوں جو بہت دیر سے بھڑک رہا ہے۔ آخر یہ شعلہ بجھ کیوں نہیں جاتا؟ آخر یہ اتنا روشن کیوں ہے؟

"یہ شعلہ کبھی نہ بجھے گا۔ کبھی نہیں ۔۔۔" کوئی میرے کانوں میں کہہ اُٹھتا ہے اور میں چونک جاتا ہوں۔

شمسان کے سناٹے میں ایک بار پھر "ہری اوم" کا وِرد گونج اُٹھا ہے۔ میں نے چونک کر نظریں اُٹھائی ہیں۔ شام کی تاریکی میں کچھ اُجالا سا ہو گیا ہے۔ قدموں کی آہٹیں اس کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ آوازیں صاف سُنائی دے رہی ہیں۔ شاید کوئی دوسری چِتا لائی جا رہی ہے۔

آخر کون مر گیا؟؟

لوگ قریب آ گئے ہیں۔ لاش قریب آ گئی ہے۔ قریب، اور قریب!! جیسے برسوں بعد یوسف اپنی زلیخا کی تلاش میں آئے ہوں۔ یا کرشن میرا کو تسلی دینے چلے آئے ہوں۔ لاش اور قریب آ گئی ہے اور لاکھ اجنبیت کے باوجود میں نے اُس بوڑھے چہرے کو پہچان لیا ہے۔ آخر امر چند مر گیا۔۔۔ امر چند مر گیا!! سُنا دادی! امر چند مر گیا۔ آج گاؤں کی دو قدیم یادیں راکھ کے ڈھیر میں دبا دی گئیں دادی! دو مقدس یادیں!! میں نے راکھ پر نگاہیں جما دی ہیں۔ مگر یہ کیا؟ ۔۔۔ بہت دیر سے دہکنے والا شعلہ، جو نہ جانے کس کے انتظار میں اب تک جل رہا تھا، آرام کی نیند سو چکا ہے۔ امر چند کی لاش کے آس پاس لکڑیاں جلائی جا رہی ہیں اور میں سوچ رہا ہوں جب ان دونوں جسموں کی راکھ ایک دوسرے میں مل جائے گی تو یہ اس خوبصورت سے زمین کے ٹکڑے میں بکھر کر گنگا میں بہا دی جائے گی۔ اس لئے گنگا جل بہت مقدس ہے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب، گنگا جل کے قطروں اور میری آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی طرح مقدس!!!

# غزلیں

## ضیا فتح آبادی، ایم۔ اے

چھیڑا ہے غم نے راگ مرا دل اُداس ہے
گھر میں لگی ہے آگ مرا دل اُداس ہے

رُخ سے نقاب اُٹھاؤ کہ خورشید ہو طلوع
ڈستا ہے شب کا ناگ مرا دل اُداس ہے

آ اور آ قریب کہ قربت ہے زندگی
مجھ سے نہ دُور بھاگ مرا دل اُداس ہے

ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و ساغر، سبو و جام
وہ رنگ ہے نہ راگ مرا دل اُداس ہے

اُس دن کو کوستا ہوں کہا دل نے مجھ سے جب
اِس زندگی سے بھاگ مرا دل اُداس ہے

کس سے کہوں کہ ہے رگِ احساس پر گراں
شام و سحر کا راگ مرا دل اُداس ہے

تو محوِ خوابِ ناز ہے، سوتی ہے کائنات
وقتِ سحر ہے جاگ مرا دل اُداس ہے

چھیڑا بغیر تیری توجہ کے میں نے کیوں
آسودگی کا راگ مرا دل اُداس ہے

کرتی ہے شمعِ محفلِ ہستی میں روشنی
خود کو لگا کے آگ مرا دل اُداس ہے

ساقی کے پاس بھی نہ ملی درد کی دوا!
جام و سبو کو تیاگ مرا دل اُداس ہے

انسان کی رگوں میں رواں ہے بجائے خون
گر برف گاہ آگ مرا دل اُداس ہے

لیتا ہوں تیری زلف کے سائے میں سانس اور
کہتا ہوں اُن کہی آگ مرا دل اُداس ہے

فصلِ خزاں میں کیوں ہے ضیا گُل کا خار کا
سانا پنا، اپنا راگ مرا دل اُداس ہے

## تمکین سرمست

تمناؤں سے حُسن و عشق کی گودوں میں پلتے تھے
رہِ ہستی کی ہر منزل میں جادو بن کے چلتے تھے

نگاہوں کی طلب دل کا تقاضا بن کے رہتے تھے
نہ جانے اور ہم آپس میں کیا کیا بن کے رہتے تھے

ہمیں امکان کی حد سے گزر جانا بھی آتا تھا
سما کر آنکھوں میں، دل میں اُتر جانا بھی آتا تھا

تمناؤں کا ہو جاتا تھا سودا آنکھوں آنکھوں میں
اکیلے ہی ہوا کرتے تھے ہم رہ کر بھی لاکھوں میں

نظر بن کر مرے ارمان نہیں جب گدگداتے تھے
ستارے جھینپ جاتے تھے ملائک مسکراتے تھے

حیاتِ شوق کی ہر سانس بن جاتی تھی خوشبو میں
خوشی تو جب دھڑکتا تھا مرا دل اُن کے پہلو میں

وہ میرا مست ہو جانا وہ اُن کا جھینپ سا جانا
وہ کھو جانا مرا وہ ہنس کے اُن کا مجھ کو پا جانا

شگوفے سے چٹکتے تھے جوانی کی ترنگوں میں
رچا کرتی تھی ہولی رات دن دل کی اُمنگوں میں

متاعِ زندگانی بے خودی کی جان ہوتی تھی
گناہوں میں بھی اک معصومیت کی شان ہوتی تھی

اگر فکرِ غمِ فردا ڈرا دیتی تھی دونوں کو
محبت لوریاں دے کر سُلا دیتی تھی دونوں کو

نشے میں چُور تھے آپے سے باہر ہو کے جیتے تھے
محبت کے سوا ہم اپنا سب کچھ کھو کے جیتے تھے

خدائی سی کیا کرتے تھے جانِ بندگی بن کر
سما جاتے تھے ہم اک دوسرے میں زندگی بن کر

وفورِ بیخودی میں ایک ہو جاتے تھے ہم دونوں
محبت جھومنے لگتی تھی کھو جاتے تھے ہم دونوں

شباب و شعر کا مفہوم جب ہم سے عبارت تھا
ارے کیا ہو گیا وہ دورِ معراجِ محبت کا

# مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| نغمات لکھ رہی ہوں | عرش باش ایم اے | دو روپے |
| اندھیرے | اختر عادل روپ | دو روپے |
| آگ اور دھواں | م۔م۔ راجندر ایم اے | دو روپے ۲۵ نئے پیسے |
| اندھیرے اجالے | عادل رشید | تین روپے |
| اندھیری راتیں | ریوتی سرن شرما | تین روپے ۹۰ نئے پیسے |
| ایک پیار ایک دھوکا | رام لعل | تین روپے ۲۵ نئے پیسے |
| بیگم صاحبہ | شوکت تھانوی | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| داماد | | دو روپے ۲۵ نئے پیسے |
| پگلی | " | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| بے غیرت | مصطفیٰ ہاشمی | چار روپے ۲۵ " |
| باون پتے | کرشن چندر ایم اے | پانچ روپے ۹۵ " |
| پہلی لڑکی | رزداں ایم اے | دو روپے ۹۵ نئے پیسے |
| انور | فیاض علی | آٹھ روپے ۵۰ " |
| برہمن | کرشن گوپال عابد | چار روپے ۵۰ |
| ستم | " | چار روپے ۵۰ |
| گھائل | " | تین روپے ۹۵ " |
| ظالم | سعید امرت | دو روپے ۵۰ |
| جانے والے | اختر عادل روپ | تین روپے ۵۰ " |
| جلتی ہوئی بہار | وحشی محمود آبادی | چار روپے |
| [illegible] | دت بھارتی | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| [illegible] | | دو روپے ۷۵ نئے پیسے |

| | | |
|---|---|---|
| دو پھول | عادل رشید | تین روپے ۹۵ " |
| دو سال پہلے دو سال بعد | زبیدہ خاتون | چھ روپے |
| فریب مسلسل | شفیق بانو | دو روپے |
| زہر | ذکی انور | چھ روپے |
| برجیس | قیسی رامپوری | چار روپے |
| اچھوتی مورت پیاسی نگاہ | ریاض ارشد | تین روپے |
| سکوت | ضمیر سجاد ظہیر | تین روپے ۹۵ نئے پیسے |
| مجھے تم سے محبت ہے | نقی نور | تین روپے ۵۰ " |
| ننھے قدم | ہاجرہ نازلی | چار روپے ۵۰ " |
| ننگی جوانی | سعید امرت | دو روپے |
| رہ گذر | انیس مرزا | چار روپے ۵۰ نئے پیسے |
| خوفناک محبت | عبدالحلیم شرر | تین روپے |
| شاہدہ | انتصار حسین | تین روپے |
| کرب | شفیق الرحمٰن | تین روپے |
| ناظمہ کی آپ بیتی | ایم اسلم | تین روپے |
| ایک دل ہزار غم | ع۔ بز بدایونی | دو روپے ۵۰ نئے پیسے |
| زرینہ | رئیس احمد جعفری | چھ روپے ۵۰ نئے پیسے |
| ننگا شہر | احمد شجاع | پانچ روپے |
| دیوانہ | نادرہ خاتون | پانچ روپے |
| بند کلا | جمنا داس اختر | دو روپے ۵۰ نئے پیسے |
| جلن | [illegible] | دو روپے [illegible] " |

| | | |
|---|---|---|
| قیامت | ذکی انور | دو روپے [illegible] |
| سازش | " | دو روپے ۵۰ " |
| کانٹوں کی سیج | رضیہ اختر [illegible] | پانچ روپے |
| گمراہ | قیسی رامپوری | چار روپے [illegible] |
| ناگ دیوتا | محمود رضا [illegible] | دو روپے ۵۰ " |
| خون کے چھینٹے | " | دو روپے ۵۰ " |
| خوابگاہ میں | " | تین روپے ۵۰ " |
| ذاق | نگیت بھارتی | تین روپے ۵۰ " |
| پیاسا | " | تین روپے ۵۰ " |
| پُراسرار قاصد | " | دو روپے |
| پُراسرار قاتل | " | دو روپے |
| پیاس | کے۔ ایل ترانہ بی اے | تین روپے ۵۰ " |
| محبت روٹی ہے | غلام عباس | دو روپے |
| مالوا | میکسم گورکی ترجمہ: نرش کمار شاد | ایک روپیہ ۵۰ " |
| کھیت میں لہو | تاجور سامری | ایک روپیہ ۵۰ " |
| جی ہاں پٹے ہیں | شوکت تھانوی | تین روپے ۵۰ " |
| پردے کے پیچھے | منٹو | دو روپے ۵۰ " |
| ملکۂ صحرا | اوم پرکاش نامی | دو روپے ۵۰ " |
| خاموش نغمہ | | چار روپے |
| آتش گل (مجموعۂ کلام) | جگر مراد آبادی | [illegible] |
| باقیاتِ اقبال | [illegible] | [illegible] |

[illegible]

[illegible] ——— بہت دیر سے دیکھنے والا افسانہ [illegible]

بیسویں صدی دہلی

# کلائمکس

عبدالقیوم خان نذر بونیاری

معرفت پوسٹ آفس ترکانجن ضلع بارہ مولہ کشمیر

۱۲ مارچ ۹۷ء

چچا خوش صاحب! آداب و نیاز

"بیسویں صدی تک کے لئے ایک افسانہ "کلائمکس" ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے آپ اور قارئین کرام پسند فرمائیں گے۔ کہانی ذرا طویل ہو گئی ہے۔ لیکن دلچسپی کہیں کم نہیں ہوئی۔

تشنۂ کرم

ا ب عبدالقیوم خان نذر بونیاری

گھر پہنچتے ہی نصیر کی نظر ایک لفافے پر پڑی، جو صبح ہی ڈاکیہ اُس کے کمرے میں ڈال کر چلا گیا تھا۔

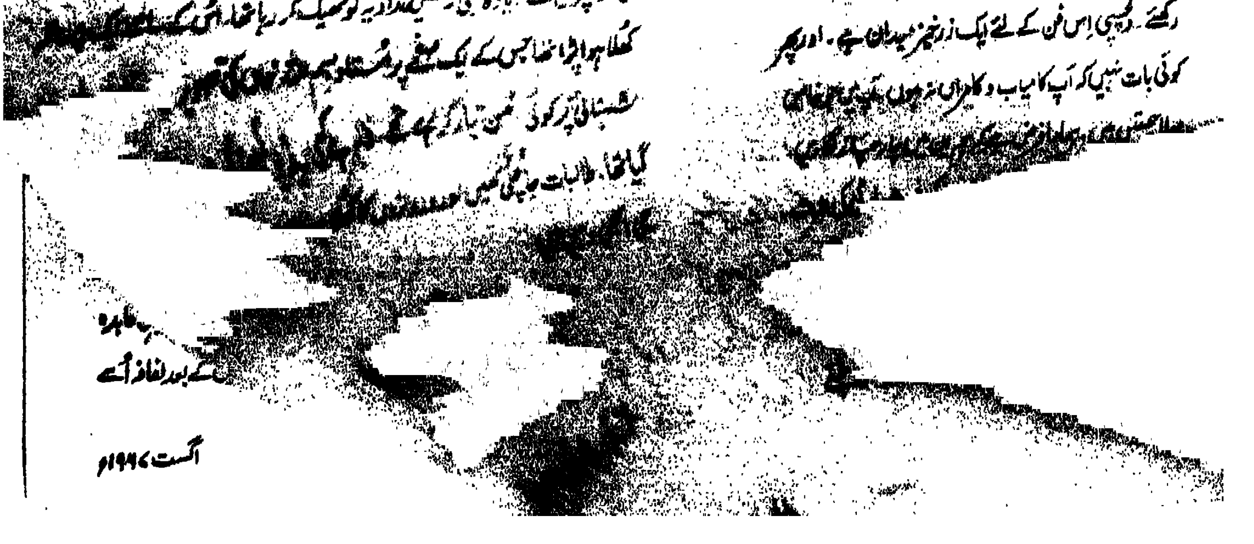
نصیر نے کوٹ کھونٹی پر لٹکانے کے بعد سب سے پہلے وہ لفافہ کھولا۔ وہ بیتابی سے خط پڑھنے لگا۔ پہلے تو اُس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور اُس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ لیکن جوں جوں وہ خط پڑھتا گیا مسرت کی جگہ مایوسی لینے لگی۔ خط پڑھ کر اُس نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس لی۔ خط میں لکھا تھا ...

ڈیر نصیر!

کافی عرصے سے آپ کا نیا ... نہ کر سکا۔ آج جب میں اپنے آفس میں پہنچا تو اُسی وقت آپ کی بھیجی ہوئی کہانی "محبت کا زہر" ملی۔ کہانی اچھی ہے اور میں اُسے شریک اشاعت کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن وعدہ نہیں کرتا۔ آپ کوشش جاری رکھئے۔ دلچسپی اس فن کے لئے ایک زرخیز میدان ہے۔ اور پھر کوئی بات نہیں کہ آپ کامیاب و کامران نہ ہوں۔ آپ ... لوگوں کی تکالیف، مصائب اور ان کی ضروریات اور اپنے گرد و پیش کے ماحول میں سو کر، بخوبی جائزہ لے کر اپنے قلم کو ان کے لئے استعمال کریں۔ اس طرح سماج کی خدمت بھی ہو سکتی ہے اور آپ کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع مل سکتا ہے۔ ہم اس موضوع پر لکھے گئے مضامین کا ہمیشہ خیر مقدم کریں گے۔ جے جنتا

آپ کا دوست ——— مدیر

دوسرے دن جب چار بجے سکول سے چھٹی ہوئی تو نصیر گھر کے بجائے گرلز پرائمری سکول پر پہنچا۔ سکول کا بوڑھا چپراسی باہر دالان میں بینچ پر بیٹھا ہوا کسی بت کی طرح ایک ہاتھ ٹھوڑی پر رکھ کر ایک ہاتھ سے اپنی مونچھوں کا ... کی مونچھیں ... بارہ لمبی ... کو ٹھیک کر رہا تھا۔ اُس کے ... کھلا ہوا پڑا تھا جس کے ایک صفحے پر ... شبستانی پر کوئی ... تیار کر ... گیا تھا۔ ... نہیں ...



... پر عاہرہ

... کے بعد لفافہ آئے

ہوئے بولا۔

"آپ شاید اونچا سنتے ہیں۔ میرا تو چلا چلا کر گلا بیٹھ گیا۔"

"کون ہے؟" اُستانی جی نے اندر سے برقعہ ڈال کر نکلتے ہوئے کریمو (چپراسی) سے پوچھا۔ نصیر پر نظر پڑتے ہی اُستانی جی نے نقاب اپنے رُخِ زیبا پر ڈال لیا۔ اس دوران چپراسی رسالہ جیب میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتا رہا اور آخر اُس نے توڑ مروڑ کر کوٹ کی جیب میں ٹھونس ہی دیا۔

"جج... جی... میں نصیر ہوں۔ میں پرائمری سکول کا مدرّس ہوں۔ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔" وہ نقاب ڈالنے سے پہلے اُستانی جی کا رُخِ تاباں دیکھ چکا تھا اور وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو رہا تھا کیونکہ وہ ایک عورت کے پاس اپنی سفارش کرانے کی غرض سے آیا تھا۔

"فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

ستم ظریفی یہ تھی کہ اُستانی صاحبہ نصیر کو بخوبی دیکھ سکتی تھیں، لیکن نصیر تھا کہ وہ دل ہی دل میں کسی کا یہ مصرع پڑھ رہا تھا ؎

نہ آنکھ دیکھ سکی جب وہ بے نقاب ہوا!

"جی آپ تشریف رکھئے تو میں اطمینان سے عرض کروں۔"

"لیکن مجھے تو شہر پہنچنا ہے۔ ساڑھے چار تو بج گئے پانچ بجے تو بس آ رہی ہوگی۔" اُستانی جی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر دیکھتے ہوئے نصیر سے کہا۔

"اچھا چلئے سڑک تک..." اُستانی جی نے کہا "کریمو چچا آپ سکول بند کر دیجئے۔"

وہ دونوں سڑک تک بالکل خاموش رہے۔ نصیر کو اپنے آپ پر رشک ہونے لگا۔

"فرمائیے..."

نصیر اتنی جلدی اِس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ دعا کر رہا تھا کہ یہ سفر اور لمبا ہو جاتے اور اُسے دیر تک ایک صنفِ نازک کی رفاقت حاصل رہے۔ وہ ایکدم چونک کر کھڑا ہو گیا۔

"شیخ صاحب یعنی میرا مطلب ہے اخبار "سچ" کے مُدیر آپ کے والد صاحب ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"میں کبھی کبھی اپنے فاضل وقت میں کہانیاں لکھتا رہتا ہوں۔"

"اچھا، کویتائیں بھی شاید لکھتے ہوں گے۔"

"جی نہیں، کہانیاں تو لکھتا ہوں لیکن آج تک جتنی بھی لکھی ہیں، کچھ تو دیمک کی غذا بن چکی ہیں اور کچھ میرے صندوق کی زینت ہیں۔ بہت کوشش کی لیکن کسی اخبار یا رسالے میں وہ شائع نہ ہو سکیں۔ ایک بار حضرت ... لیکن بدقسمتی سے وہ "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق نہ تھیں اس لئے واپس آ گئیں۔"

"اُن میں خامیاں ہوں گی۔ آپ کسی سے اصلاح و مشورہ کیوں نہیں لیتے؟"

"کس سے لوں۔ ایک دوست نے مشورہ دیا تھا کہ اشاعت سے پہلے اپنی کہانیاں جناب آسی رام نگری کو بھیجا کروں۔ لیکن سُنتا ہوں وہ کوئی سرمایہ دار نہیں، قلم کے مزدور ہیں۔ اِس لئے اپنے وقت کا معاوضہ لینے کے لئے مجبور ہیں ... یہ حالت ہے کہ تنخواہ میں سے چند پیسے بھی اپنے جیب خرچ کے لئے نہیں بچتے۔ آٹا ... کو ملتا ہے اور چاول ایک روپیہ کا نو چھٹانک۔" نصیر اِس طرح سلمہ (اُستانی جی) کو اپنا حال بتا رہا تھا جیسے شرنارتھی کسی اخباری نمائندے کے سامنے انٹرویو دیتے ہیں۔

"عجیب مصیبت ہے، جب گھر پہنچتی ہوں تو دو چار شاعر یا افسانہ نگار گھر میں بھی ابّا جان کا انتظار کرتے ہوئے ملتے ہیں اور اب یہاں بھی اطمینان کی سانس نہیں لینے دیتے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ بھی اس مہلک مرض کا شکار ہو گئے ہیں جس میں مُلک کے بیشتر لوگ بُوڑھے، جوان اور طالب علم مبتلا ہیں۔ میرے خیال میں آج پڑھنے والوں سے زیادہ لکھنے والے ہیں۔ کیا میں غلط تو نہیں کہتی؟"

"جی آپ کا کہنا ٹھیک ہے۔ لیکن کیا کروں میرے سر پر کہانیاں لکھنے کا بھوت اِس طرح مسلّط ہو گیا ہے کہ بس توبہ ہی بھلی!"

"میں تو کہوں گی آپ افسانہ لکھنا چھوڑ دیجئے۔"

"یہ میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے آپ کی زبان سے یہ الفاظ سُننے کی توقع نہ تھی۔"

"آپ جو بھی سمجھیں لیکن میں یہ بتا دینا مناسب سمجھتی ہوں کہ مجھے اِن کہانیاں لکھنے اور شعر کہنے والے لوگوں سے اِتنی نفرت ہے کہ بس میرا خدا ہی جانتا ہے۔ اِن لوگوں سے ایسے بھاگتی ہوں جیسے کوئی کسی بلا سے بھاگتا ہے! اور خاص کر مجھے آپ کو دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ آپ کو یہ سب لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ تو مفلس یا قلاش معلوم نہیں ہوتے۔ آپ تو نوکری کرتے ہیں۔"

"جی آپ پھر اُسی پہلو پر پہنچ گئی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں کہ افسانہ لکھنا یا شعر کہنا ایک فن ہے۔ آرٹ ہے اور ایک آرٹسٹ کی اِس سے زیادہ اور کیا خواہش ہو سکتی ہے کہ وہ بھی اپنے دل میں بلند خیال پیدا کر سکے اور اِن خیالوں سے وہ آسمان کی وسعتوں کو چھو سکتا ہے۔ آسمان سے تارے توڑ سکتا ہے۔ سماج کے لئے ایک آدرش پروگرام بنا سکتا ہے۔ وہ قیمتی سے قیمتی مشوروں کو اپنے قلم کے سہارے ... دنیا کو مستفید کر سکتا ہے۔ ادب کی خدمت کر سکتا ہے۔ نام پیدا کر سکتا ہے۔ اگر ایک افسانہ نگار

اپنے افسانوں کو کلچر، تمدن اور معاشرت کا آئینہ دار بناتا ہے اور صحیح زندگی کی عکاسی کرتا ہے تو ایک شاعر خودی کا پیغام دیتا ہے۔ ایک کہانی کار رومان میں اعلیٰ کردار کو پیش کرتا ہے تو ایک شاعر اپنے کلام سے لوگوں کو زندگی کا صحیح مقصد جاننے کا درس دیتا ہے۔ میں شاعروں کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ البتہ ایک افسانہ نگار کے بارے میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ . . .

"لیکن یہی باتیں تو ضروری نہیں۔ اگر اس کے برعکس آپ فوج میں بھرتی ہو جائیں تو ملک کا زیادہ بھلا ہو سکتا ہے۔"

"قدرت نے ہر انسان کو ایک ایسا رجحان دیا ہے کہ جس جہت وہ لگاؤ رکھتا ہو وہ اس سے زیادہ اور کسی معاملے کو اہم نہیں سمجھتا۔

"اس وقت ملک میں جو طبقاتی تضاد پایا جا رہا ہے اس کے لئے تو سبھی لوگوں کو اہم رول ادا کرنا ہے۔ لیڈر تو لیڈری ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ فوجی ملک کی حفاظت کے لئے ڈاکٹر لوگوں کی صحت کی دیکھ بھال کے لئے۔ انجینئر ملک کی تعمیر کے لئے۔ اُستاد تو قوم کا معمار ہے اور ادیب ادب اور سماج کی خدمت کے لئے۔ وہ کبھی سماج میں جا کر گلیاں صاف نہیں کرتے لیکن اُن کا قلم سماج کی بہت ساری بُرائیاں دُور کر سکتا ہے۔"

اور اب آپ اس فن کے بارے میں پوچھیں گی۔ قدرت نے جسے اس فن کا ذوق عطا کیا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اور کام میں لا سکتا ہے۔ سونا جب تک تجوری میں رہتا ہے اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ سونا ہی ہوتا ہے لیکن اُس کی قدر پیتل کے اُن ٹکڑوں سے زیادہ نہیں ہوتی جو صرف اُجالے میں چمکتے نظر آتے ہیں۔

"لیکن میں نہیں سمجھتی کہ آپ کے اِن افسانوں اور کہانیوں میں کیا ہوتا ہے؟"

"فضول من گھڑت قصے، اوٹ پٹانگ با . . . یہ کیا فن ہوا جھوٹ بولنا بھی کوئی فن ہے؟"

"لیجئے آپ پھر وہی بحث کرنے لگیں۔ ابھی ابھی آپ کو کتنا سمجھایا لیکن آپ کچھ نہ سمجھیں۔ یہ بات تو اُس آدمی کی بات ہوئی جو ساری رات رامائن سُنتا رہا اور جب صبح ہوئی تو پوچھا "وہ سیتا کون تھی؟"

"اچھا معاف کیجئے میں اب جا رہی ہوں۔ گاڑی کو دو چار ہی منٹ رہ گئے ہیں۔"

"لیکن میں جو عرض کرنا چاہتا تھا وہ تو آپ نے سُنا ہی نہیں۔"

"بتایئے جلدی کیجئے!"

"آپ اطمینان سے سُنئے۔ آج آپ کہیں نہ جائیں گی۔ آج ایک کہانی کا سین کہ میں آپ کو دعوت دے رہا ہوں جو بہر حال آپ کو قبول کرنی ہی پڑے گی میرا گھر زیادہ دُور نہیں۔"

چند ثانیے بعد وہ پھر گھر کی طرف واپس آ رہے تھے۔

"اچھا میں ابا جان کو آج ہی لکھ دوں گی کہ وہ آپ کی کہانیاں شائع کیا کریں۔"

"شکریہ!"

نصیر کہنے لگا ـــــ "ہاں تو ایک اور ملاقات اور پھر بس کہانی کا انجام مگر . . ."

"جی آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں؟"

"جی نہیں میں تو ایک کہانی کا پلاٹ بنا رہا ہوں۔ جس کا آغاز آج کے اس واقعے سے ہوا۔"

"کس واقعے سے؟"

"اِس ہماری پہلی ملاقات سے" یہ کہہ کر وہ کچھ جھینپ سا گیا۔

سلمہ سر جھکائے چلتی رہی اور نصیر اس کے چہرے کو نہ دیکھ سکا کیونکہ ابھی اُس کے چہرے پر نقاب تھا۔

"آپ سے ایک اور عرض کرنا چاہتا ہوں گستاخی معاف!"

"فرمایئے . . ."

"اگر آپ اس نقاب کو اپنے رُخِ زیبا سے ہٹا ہی دیں تو اچھا رہتا اور یہاں تو کوئی غیر بھی نہیں۔"

"ایک ادیب کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

"ادیب کے سینے میں بھی تو دل ہوتا ہے۔" نصیر کہنے کو تو کہہ گیا لیکن پھر حواس قائم رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"دیکھیے آپ خفا نہ ہو جایئے۔ یہ تو محض پلاٹ کے لئے الفاظ کی ترتیب ہے۔"

"کہانی کا پلاٹ ـــــ؟ تو اس کہانی کا انجام کیا ہوگا؟"

"جی اس کہانی کا انجام تو آپ کے دو لفظوں کا محتاج ہے۔ اگر آپ وہ دو لفظ اسی وقت اپنی زبان سے ارشاد فرما دیں تو سمجھئے کہانی ختم . . .!!"

"بھلا میں کیسے ایک ادیب کے معاملے میں مداخلت کروں۔" سلمہ نے سادگی سے کہا۔

سلیمہ نصیر کے گھر پہنچ گئی۔

دوسرے دن جب وہ دونوں اپنی اپنی ڈیوٹی پر نکلے تو نصیر اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ سوچنے لگا ـــــ کاش ہم اسی طرح ہمیشہ گھر سے نکلا کرتے۔ کیا وہ وقت بھی آ سکتا ہے؟ کیوں نہیں . . . اس کے ساتھ ہی اُسے اپنا افسانہ یاد آیا۔ اُس نے اُس افسانے کو کاغذ پر لکھ دیا تھا۔ آج سلمہ اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ کر نصیر کے ساتھ چل رہی تھی۔ دوسرے دن نصیر نے سلمہ کے لئے اپنی چھوٹی بہن عابدہ کو جو سلمہ ہی کے سکول میں پڑھتی تھی ایک لفافہ دیا۔ کچھ دنوں کے بعد لفافہ اُسے

واپس ملا۔ نصیر نے کھولا اور آخری سطریں پڑھیں ——

"نصیر! تمہارے ساتھ پہلی ملاقات کے بعد مجھے اپنی دُنیا بدلتی ہوئی نظر آئی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ افسانہ نگاروں اور شاعروں سے میں بہت ڈرتی تھی لیکن تم سے ملنے کے وقت جیسے کسی نے میرے مُنہ پر تالا لگا دیا تھا اور پیروں میں زنجیریں۔ میں اب ایک نئی دُنیا میں آگئی ہوں جہاں پیار ہے رومان ہے اور اس نئی دُنیا کی دریافت مجھے تم ہی نے کرائی۔ مجھے تمہارے اِس طرح لکھنے کی جرأت پر حیرت ہوئی لیکن دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ خدا نے ہمیں ایک دوسرے کے لئے پیدا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تم ادیب بنے اور مجھے خدا نے ایک مُدیر کے گھر پیدا کیا۔ اگر تم اِس افسانے کو حقیقت بنانا چاہتے ہو تو میں پھر بھی اِس کا انجام بتانے سے قاصر ہوں۔ آپ ابّا جان سے پُوچھ لیجئے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں"

دوسرے دن نصیر سلمہ کے والد کے دفتر میں تھا۔ شیخ صاحب نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: آپ کی کہانی "گُلمرگ" تو شائع ہو چکی ہے۔ لیکن میں آپ کو مبارکباد نہیں دے سکتا کیونکہ بے شمار لوگوں کے خط آئے ہیں جو لکھتے ہیں کہ یہ کہانی فضول اور واہیات تھی"

نصیر بولا —— "شیخ صاحب! میں کبھی کہانیاں نہ لکھوں گا اور نہ آپ کو بھیجوں گا۔ البتہ آج جو کہانی لایا ہوں اُس کا انجام آپ پُورا کر دیجئے"

"تو گویا آپ آج اپنی کہانی کی تصحیح بھی مجھ سے کروا رہے ہیں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ آپ تشریف لے جایئے!"

"جی آپ سے تو میں صرف ایک جملہ لکھنے کے لئے درخواست کرتا ہوں اور اُس کا معاوضہ یہ دس روپے کا نوٹ!"

شیخ صاحب دل ہی دل میں خوش ہوئے اور مُسکرا کر کہنے لگے "میاں یہ روپے تو آپ اپنے پاس ہی رکھئے۔ لایئے کہانی تو دیکھوں"

کہانی کو غور سے پڑھتے وقت نصیر دیکھ رہا تھا کہ شیخ صاحب کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوئیں اور وہ اپنے عینک کے موٹے شیشے میں سے اپنی آنکھیں ایسے پھیرتے جیسے بُوڑھا بوم اُجالے میں"

آخری جملے اُنھوں نے اونچی آواز سے پڑھے اور اپنا قلم اُٹھا کر لکھ دیا۔

"سلمہ کی رائے دریافت کرنے کے بعد نصیر نے اُس کے باپ سے پُوچھا..."

یہ لکھ کر وہ کچھ سوچنے لگے۔ پھر بولے "کیا لکھوں میاں! تمہارا مطلب ہے اختتام بہرحال اچھا ہی ہونا چاہئے"

"جی ہاں"

"اگر وہ دونوں محبت کرتے ہیں تو اُنھیں جیون ساتھی بن جانا چاہئے"

"شیخ صاحب زندہ باد!" نصیر نے نعرہ لگایا۔

نعرے کی آواز سُن کر سلمہ بھی آگئی۔

شیخ صاحب فرطِ حیرت سے بُت بنے دیکھ رہے تھے!

"شیخ صاحب اِس کہانی کا ہیرو نصیر آپ کے سامنے کھڑا ہے اور یہ ہیں اس کی ہیروئن سلمہ!"

"کیا؟... کیا تم دونوں...!!"

اِس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔

"ابّا جان اب آپ اپنی زبان سے فرمایئے جو آپ نے اِس کہانی کا کلائمکس لکھا ہے"

شیخ صاحب کے ہونٹوں پر پُر وقار تبسم تھا اور نصیر سر جھکائے اُن کے سامنے کھڑا تھا۔

کچھ دِنوں کے بعد نصیر اور سلمہ جیون ساتھی بن گئے!!

---





[redacted]

# غزلیں

## مظہر عامل

چشمِ بیمار کی گفتار سمجھ لیتے ہیں
ہم تجھے اے نگہِ یار سمجھ لیتے ہیں

ہے یہ بازارِ محبت میں انوکھا دستور
بکنے والے کو خریدار سمجھ لیتے ہیں

مست ہوتا ہوں جو آنکھوں سے تمہاری پی کر
جانے کتنے مجھے میخوار سمجھ لیتے ہیں

جس کسی چھاؤں میں کچھ دل کو سکوں ملتا ہو
ہم ترا سایۂ دیوار سمجھ لیتے ہیں

آپ کے حکم کی تعمیل میں ہو کر مجبور
خیر ہم اپنے کو مختار سمجھ لیتے ہیں

کون کس حال میں ہے کیا تمہیں معلوم نہیں
یہ تو ہم جیسے گنہگار سمجھ لیتے ہیں

ہم کسی حال میں ہوں آپ کے مظہر ہی تو ہیں
ہر ادا آپ کی سرکار سمجھ لیتے ہیں

## راشد فضلی

حاصلِ کیفِ جاوداں: تو ہی نہیں جو مہرباں
کس کو سناؤں حالِ دل، کس کو بناؤں رازداں

لطفِ بہارِ زندگی سوز و تپِ غمِ نہاں
رشکِ نشاطِ سرمدی تیری ادائے جانستاں

سوزِ نوا سے پھونک دے شورشِ بزمِ گلستاں
مرغِ شکستہ پر نہ کر شکوۂ جورِ باغباں

ہے یہ وفورِ بےخودی، دل کو ہے آرزو یہی
میری جبینِ شوق ہو، اور ترا سنگِ آستاں

منتِ فصلِ گل نہیں دستِ جنوں کے فیض سے
دامنِ پارہ پارہ کی بکھری ہوئی ہیں دھجیاں

موسمِ گل کا ذکر کیا، برق و خزاں کی فکر کیا
میرا کوئی چمن نہیں، اور نہ کوئی آشیاں

تیرے کرم نے بخش دیں ذوقِ طلب کی وسعتیں
ورنہ کہاں یہ ظرف اور فضلیِ ناتواں کہاں

## اودے سنگھ مصوّر

اُن کو اظہارِ شکایات پہ رونا آیا
مجھ کو بے سود ملاقات پہ رونا آیا

سوزِ دل، سوزِ جگر، ضبطِ الم، ضبطِ فغاں
عشق کی رسم و روایات پہ رونا آیا

یوں تو پہلے بھی نہ تھی دل میں کوئی خوش فہمی
آج تو اُن سے ملاقات پہ رونا آیا

ابتدا عشق کی جو کچھ بھی رہی ہو لیکن
انتہا یہ ہے کہ ہر بات پہ رونا آیا

اِک طرف جام پہ جام ایک طرف تشنہ لبی
ہائے اِس نظمِ خرابات پہ رونا آیا

تیرے نغموں میں مچلتے نہیں میرے ارماں
اے مغنّی ترے نغمات پہ رونا آیا

چہرۂ زیست جھلس ڈالا مصوّر اس نے
شدّتِ گرمیِ جذبات پہ رونا آیا

# شاہکار ناول جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں

ٹھاکر پونچھی کے لکھے ہوئے ناول

**رات کے گھونگھٹ** جس میں نئی تہذیب کے اُن فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا مصنف نے آج کے سماج کے حسین چہروں سے پارسائی کے رنگین گھونگھٹ اُلٹ دیئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

**شمع ہر رنگ میں جلتی ہے** اُن مردوں کی کہانی جو عورت کو ایسے عُریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

**زلف کے سر ہونے تک** عشق و محبت اور حُسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین بے سہارا لڑکوں کی حسین ترین کہانی۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

**پوسٹ مارٹم** عرشؔ ملسیانی کے مزاحیہ افسانوں اور مضامین کا حسین و جمیل مجموعہ جس میں مسکراہٹوں اور قہقہوں کی ایک دُنیا آباد ہے۔ قیمت سوا دو روپے۔

**سنباہ تاج محل** موہن یادو کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔

**پیاسے بادل** ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

**یادوں کے کھنڈر** حیات کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ناول جس میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے۔ قابل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ و انداز سے اُبھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص پرور محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے تھرکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

**نورا** ایک رقاصہ کو اپنے اندر نئی جاذبیت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا لاثانی قربانیاں دینی پڑیں۔ قیمت صرف دو روپے پچاس پیسے۔

**زنجیر** ایک گناہگار لڑکی کی حسین و جمیل داستان۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پُر پیچ رومان پرور داستان جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے جسے زکی انور نے لکھا اور ادارہ "بیسویں صدی" نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

**پگھلتے خواب** اُردو ادب کے جواں سال ادیب پروفیسر حامدی کاشمیری کا ایک دلچسپ رُومانی ناول جس میں آپ کو کشمیر جنت نظیر کے حسین و دلفریب مناظر اور اُن مناظر تلے بہکتی سسکتی کہانیوں کے خدوخال صاف دکھائی دیں گے۔ قیمت صرف دو روپے۔

**نئے فرہاد** پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اچھوتا شاہکار ناول۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے اسٹیج پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی۔ قیمت صرف دو روپے۔

**راہیں شباب کی** فرانس کے عظیم ترین ناول نگار آنیٹے پرپوس کا غیر فانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، جسے عشق و محبت کی سب سے عظیم داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اِس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور سیلین سے بھی زیادہ حسین اور عظیم ہے۔ مترجمہ جناب مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

**طوفانِ بہار** روس کے عدیم المثال ناول نگار تورگنیف کا رومانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جسے دُنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رُومان قرار دیا ہے اور جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ قیمت تین روپے۔

**بھیگی راتیں** فرانس کے عدیم المثال ناول نگار ایمل زولا کا مقبول ترین ناول انسان میں چھپے ہوئے حیوان کا افسانہ، اپنے محبوب کیلئے محبوبہ کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کی کہانی۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

**فرنڈ مونی** حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔ صدیوں بعد کی فضاؤں میں لکھی ہوئی ایک عجیب و غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا یہ صد شوخ و دلچسپ ناول ہمارے قاری کو کئی ہزار سال آگے کی فضاؤں میں پرواز کراتا ہے۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی - دہلی نمبر۶

# خط لکھیں گے...

فکر تونسوی کے طنزیہ خطوط کا سلسلہ ۶

## مندر کے مہنت کے نام

قابلِ تعظیم شری شرلی ناتھ جی!

جے چڑھاوے کی۔ شہر میں افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ آپ کی نوجوان لڑکی (سُنا ہے بہت بھونڈی ہے) بسلسلۂ عشق ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔ مقامِ تعجب ہے کہ آپ لاکھوں روپے کی جائداد کے مالک تھے مگر اس کے باوجود آپ کی لڑکی بداخلاق نکلی۔ اس کا مطلب ہے اخلاق اور چیز ہے، عشق اور چیز ہے اور آپ کے روپے کا پیرہن صرف کاغذی ہے۔ آپ نے اتنا روپیہ جمع کرکے سچ مچ جھک مارا۔

اور شرلی ناتھ جی! سُنا ہے وہ نوجوان مندر کے ایک غریب بھگت تلسی رام کا لڑکا تھا اور یہ بھی سُنا ہے کہ آپ کی بیٹی اپنے غریب محبوب کی حوصلہ افزائی کی خاطر ایک لاکھ روپے کے زیور اور نقدی بھی اُڑا کر لے گئی۔ بظاہر یہ کتنی نیچ حرکت ہے۔ عاشق اور معشوق دونوں کی۔ ہوسکتا ہے اِس سے عاشق صاحب کا افلاس کم ہوجائے۔ مگر یہ روپیہ چڑھاوے کا تھا جو بھگوان کی بھینٹ کیا گیا تھا اور جو بھگوان کی بجائے عاشق کو مل گیا۔ تو کیا عاشق بھی بھگوان ہوتا ہے؟ کیا یہ چڑھاوا دراصل عاشق کو چڑھایا گیا تھا؟ چڑھاوا چڑھانے والوں سے اِس امر کی وضاحت ضرور کروا لیجئے کیونکہ بھگوان کئی روپ بدل کر دُنیا میں آتا جاتا رہتا ہے۔

لیکن شرلی ناتھ جی! آپ نے یہ کیا کیا کہ اُس بیچارے غریب بھگت کو غنڈوں سے پِٹوا ڈالا؟ اُس پر مندر کا داخلہ بھی بند کر دیا؟ عشق آپ کی لڑکی نے کیا، مندر کا داخلہ بھگت پر بند کر دیا گیا۔ کیا بھگوان آپ سے ناراض نہیں ہوجائے گا؟ یہ بہت بُری بات ہے کہ جس بھگوان کی آپ کمائی کھاتے ہیں اُسی سے نہیں ڈرتے۔ یہ صحیح ہے کہ لڑکی کے اغوا سے آپ کی رُسوائی ہوئی لیکن ہوسکتا ہے بھگوان ہی آپکی رُسوائی کرانا چاہتا ہو۔ کیونکہ آپ خود ہی تو مندر میں اُپدیش دیا کرتے تھے کہ بھگوان کی رضا کے بغیر پتہ تک نہیں ہلتا۔ لہٰذا آپ کی رُسوائی کا پتہ بھی بھگوان کی مرضی ہی سے ہلا۔ لڑکی بھاگی تو بھگوان کی مرضی سے، بھگت کو مار پڑی تو بھی بھگوان کی مرضی سے اور آپ جو پچھلے دنوں پارلیمنٹ کا الیکشن ہار گئے تھے وہ بھی بھگوان کی مرضی سے۔ الیکشن پر آپ کا اڑھائی لاکھ روپیہ ڈوب گیا تو بھی بھگوان کی رضا سے۔ آپ کے پاس جو لاکھوں روپے جمع ہوگئے ہیں وہ اِسی طرح بھگوان کی مرضی سے تقسیم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ایک لاکھ روپیہ آپ کی لڑکی لے گئی، اڑھائی لاکھ الیکشن میں چلا گیا اور باقی روپیہ بھی اِسی طرح مختلف سمتوں میں چڑھاوے کے طور پر چڑھتا رہے گا۔ ہوسکتا ہے آپ کا چھوٹا لڑکا جواری بن جائے اور کچھ روپیہ جوے میں اُڑا دے۔ مجھے شک ہے شرلی ناتھ جی! کہ بھگوان روپے کی تقسیم میں سوشلسٹ واقع ہوا ہے۔ اِس لئے اگر آپ بھگوان کے سچے پُجاری ہیں تو آپ کو بھی بھگوان کے اِس سوشلسٹ نظام کی تعریف کرنی چاہئے اور مزید پیسے کی غیر متوقع تقسیم کے "حادثوں" کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

اور سُنایئے، اُس قتل کے مقدمے کا کیا بنا؟ جو آپ پر اس مندر کے چھوٹے پُجاری کے قتل کے سلسلے میں چل رہا تھا۔ رشوت وغیرہ دے کر اپنی گلو خلاصی کیوں نہیں کرلیتے؟ آخر روپیہ کم بخت اور کس وقت کام آئے گا؟

## بھگت تلسی رام کے نام

پیارے بھگت جی!

مہنت شرلی ناتھ کے غنڈوں نے آپ کو پیٹ ڈالا مجھے آپ سے ہمدردی ہے مگر غنڈے تو پیٹا ہی کرتے ہیں۔ اگر آپ غنڈے ہوتے تو آپ بھی کسی نہ کسی کو ضرور پیٹتے۔ مگر یہ سُن کر سخت افسوس ہوا کہ آپ باوجود منع کرنے کے مندر میں چوری چوری گھس گئے اور

بھگوان کی مورتی کے سامنے پرارتھنا کرنے بیٹھ گئے کہ وہ آپ کے بیٹے کو عقلِ سلیم عطا کرے اور وہ اُس بھونڈی لڑکی کو واپس لاکر مہنت کے حوالے کردے۔

اور سُنا ہے جب آپ یہ پرارتھنا کر رہے تھے تو مہنت کے غنڈوں نے گھس کر آپ کو چوٹی سے پکڑ لیا اور الزام لگایا کہ آپ چڑھاوے کی رقم چُرا کر جیب میں ڈال رہے تھے۔ اِس الزام میں انھوں نے آپ کے گھٹنے کی ہڈی توڑ دی۔ پرارتھنا کا یہ صلہ آپ کو ملا۔ آپ تو کہا کرتے تھے کہ بھگوان بھگت کی فریاد سُنتا ہے۔ کیا آپ نے یہ فریاد کی تھی کہ اے بھگوان میرا گھٹنا توڑ دے؟ یا بھگوان آپ کی فریاد کا مفہوم نہیں سمجھا۔ مگر بھگوان تو، سُنا ہے دُنیا کی ہر زبان اور ہر مفہوم کو جانتا سمجھتا ہے۔ سچ مچ عجیب گڑبڑ ہے کہ یہ غنڈے خدا نے بھیجے یا شیطان نے۔ جو فریاد خدا کے پاس کی گئی تھی وہ مگر شیطان کے پاس کیسے پہنچ گئی؟ کسی دن موقع ملے تو بھگوان سے اُس کی وضاحت تو کروالیجئے۔

ایک مختصر سی عرض اور بھی کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے بیٹے نے ایک بھونڈی لڑکی کو اپنا دل کیوں دے دیا؟ اُس کا ذوقِ حُسن کافی گھٹیا معلوم ہوتا ہے اور اگر اُس نے روپے کے لالچ میں آکر عشق کیا تو اِس کا مطلب ہے اُس کا ذوقِ عشق بھی کافی گھٹیا ہے۔ ایسے گھٹیا دل و دماغ کے لڑکے کا باپ بننا واقعی توہین انگیز ہے۔ حیرت ہے کہ آپ بھگوان کے اتنے پُرانے اور تجربہ کار بھگت ہیں۔ مگر بھگوان نے کبھی آپ کو یہ نہیں سمجھایا کہ اپنے بیٹے کی صالح اور صحت مند تربیت کرو۔ صرف بھگوان کے سامنے کھڑتالیں بجانے اور جھوم جھوم کر اُس کی آستتی کے بھجن گانے سے تو بیٹے کی تربیت نہیں ہوجاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کھڑتالیں بجانے میں مصروف رہے اور ایک لالچی لڑکا، عاشق کا بہروپ بھر کر ایک بھونڈی لڑکی کو اغوا کرکے لے گیا۔ مہنت کی رُسوائی ہوئی۔ آپ کی پٹائی ہوئی اور بھگتی کی جگ ہنسائی ہوئی۔

بھگت جی! مجھے اگر آپ سے ہمدردی ہے تو صرف اِس لئے کہ آپ غریب ہیں۔ اور اسی لئے علاقے کے حاکم اور معززین سبھی مہنت شُرلی ناتھ کی حمایت کر رہے ہیں اور سارا الزام آپ پر دھر رہے ہیں۔ کاش! آپ بھی اہلِ زر ہوتے تو آپ کا لڑکا ہیرو کہلاتا اور فلمساز اِس واقعہ پر ایک عظیم الشّان عاشقانہ فلم تیار کر لیتے۔ اِس فلم کے تیار نہ ہونے پر سچ مچ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ بھگوان سے پرارتھنا کیجئے کہ وہ آپ کو بھی کسی مندر کا مہنت بنادے۔

## خدا کے نام ——●

اللہ تعالیٰ صاحب!

تیرا کھیل بھی میری سمجھ سے باہر ہے کہ ایک غلیظ جسم اور مکروہ ذہن کے مالک کو مندر کا مہنت شُرلی ناتھ بنا دیا۔ کیا یہ فعل کرکے تُو نے ایک دھرم ستھان کی توہین نہیں کی؟ چلو یہ توہین بھی ہم گوارا کر لیتے۔ لیکن تُو نے اُسے لاکھوں روپے کا مالک بھی بنا دیا۔ حالانکہ تُو جانتا ہے کہ روپیہ بڑی ستم گر چیز ہے۔ وہ انسان کو پست کر دیتا ہے۔ کیا تو یہی چاہتا تھا کہ دھرم کا ایک محافظ پست ہوجائے اور اُس کی نوجوان لڑکی گھر سے بھاگ جائے؟ میں پُوچھتا ہوں اگر شُرلی ناتھ کو رُسوا کرنا ہی مقصود تھا تو کیا اِس کے بغیر اُسے رُسوا نہیں کر سکتا تھا اور پھر تماشائی ذہنیت کے خدا! تُو نے ایک غضب اور بھی ڈھا دیا کہ ایک خوبصورت اور دلکش بھگت زادے کو ایک بھونڈی لڑکی پر عاشق کروا دیا۔ کیا تیری اِس بھری پُری دُنیا میں اُس کے لئے کوئی حسین لڑکی نہیں تھی۔ آخر یہ تیری لیلا کیا ہے؟ کیا تو بھگت تُلسی رام کی بھی شُرلی ناتھ کی طرح توہین کروانا چاہتا تھا۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ وہ بیچارا صِدق دل سے تیرا بھگت تھا۔ اپنے بھگتوں سے تیرا یہ سلوک مجھے کچھ پسند نہیں آیا۔ بھلا اُس غریب کو اُس وقت غنڈوں سے پٹوانے کی کیا ضرورت تھی، جب وہ تیرے حضور میں اپنی فریاد سُنا رہا تھا۔

میں جانتا ہوں کہ شُرلی ناتھ کو تُو نے جان بُوجھ کر اور پلاننگ کے مطابق ذلیل کیا اور وہ واقعی اُسی قابل تھا لیکن بھگت تُلسی رام کی پٹائی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تجھے اس کی جلد سے جلد تلافی کرنی چاہئے۔ سُنا ہے تمھاری لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ لیکن اِس کیس میں تو تیری لاٹھی نے اچھا خاصا ہنگامہ مچا دیا۔ شُرلی اور تُلسی کے دو خاندانوں میں ایک مستقل دُشمنی کی بُنیاد ڈال دی۔ اب اگر وہ لڑکا اور لڑکی اپنے عشق کو کامیابی کی منزل تک لے بھی جائیں یعنی شادی بھی کرلیں تو بھی سُکھ چین کی زندگی تو نہیں گزار سکیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ آنے والے




[redacted]

چند دنوں میں تم کچھ اور دھماکے کروگے یعنی ہوسکتا ہے مہنت شرلی ناتھ انتقام پر تُل جائے اور وہ بھگت تُلسی داس کا صفایا کرئے یا بھگت تُلسی رام خودکشی کرلے، یا وہ عاشق جوڑا کسی غنڈے کے ہتھے چڑھ کر اپنا مال ومتاع گنوا بیٹھے یعنی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ شرلی ناتھ تک خودکشی کرسکتا ہے۔ تجھ سے کچھ بعید نہیں اے خدا! کر تو کیا کچھ نہ کر ڈالے۔ ہم سب انسان تیرے ہاتھ میں کھلونے ہیں اور ہم اتنے بھولے بھالے ہیں کہ کھلونوں کے اس تیرے کھیل کو اپنے کرموں کا پھل سمجھ کر چپ ہوجاتے ہیں۔

میں سچ کہتا ہوں، مجھے یہ تیرے انداز پسند نہیں ہیں۔ اگرچہ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ میری پسند اور تمھاری پسند میں بڑا فرق ہے۔ وہی فرق جو انسان اور خدا میں ہوتا ہے۔ گستاخی معاف اے خدا! یہ خط تمھیں بے تکلفی میں لکھ ڈالا ہے۔ اس گستاخی کی مجھے سزا نہ دے دینا یعنی مندر کا مہنت نہ بنا ڈالنا۔ آمین آمین، آمین!

## شیطان کے نام —— ●

اے خدا کے نیگیٹو!

ایک امر کی وضاحت چاہتا ہوں۔ اُمید ہے آپ ٹھیک ٹھیک جواب دیں گے۔ شیطانی نہیں کریں گے۔

ابھی ابھی ہمارے شہر میں ایک دُرگھٹنا ہوئی ہے، وہی مہنت شرلی ناتھ کی بھونڈی لڑکی کے اغوا کی۔ اُمید ہے یہ واقعہ آپ کے علم میں ہوگا۔ بلکہ حضور ہی اس واقعے کی پُشت پر ہوں گے۔ کیونکہ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ سب شیطان کی کارستانی ہے۔ اگرچہ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ مہنت شرلی ناتھ کی رُوح میں گھس گئے تھے۔ یا اُس کی بھونڈی لڑکی کے اندر یا بھگت تُلسی رام اور اُس کے لڑکے کے اندر یا اُن غنڈوں کے اندر جنھوں نے بھگت تلسی رام کی بھگتی میں خلل ڈال دیا یا اُس چڑھاوے کے روپے کے اندر جو اس سارے جھگڑے کی جڑ بُنیاد ہے —— اور یا آپ ان سب چیزوں کے اندر موجود تھے اور آپ نے ہر ایک کو اُس کی استطاعت اور توفیق کے مطابق بہکا دیا تھا

شیطان صاحب جی! وضاحت طلب صرف یہ امر ہے کہ خدا بھی ہر چیز میں موجود رہتا ہے اور اب معلوم ہوا ہے کہ آپ بھی ہر چیز میں تشریف رکھتے ہیں تو یہ معمہ کیا ہے؟ قاعدے کے مطابق جہاں خدا موجود ہو وہاں آپ نہیں رہ سکتے اور جہاں آپ کا سکہ چلتا ہے، وہاں سے خدا بھاگ جاتا ہے۔ لیکن اس "شرلی کیس" میں معاملہ برعکس ہے، کہ آپ دونوں حضرات موجود ہیں۔ دو متضاد طاقتوں کا ایک ہی جگہ شیر وشکر ہوکر رہنا ایک عجیب وغریب شبہ پیدا کرتا ہے کہ کہیں آپ اور خدا دونوں کی ملی بھگت تو نہیں ہے؟ یعنی آپ دونوں یک جان دو قالب تو نہیں ہیں اور صرف دکھانے کے

خود پر الگ الگ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ ہر انسان کے اندر خدا بھی موجود رہتا ہے اور شیطان بھی۔ صرف تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کہ کسی میں شیطان ذرا زیادہ ہے خدا کم ہے اور اگر خدا زیادہ ہے تو شیطان ذرا کم ہے —— اور آپ جب کبھی کوئی گھناؤنا منصوبہ بناتے ہیں تو مل کر بناتے ہیں کہ کسی کو چڑھاوے کے لالچ میں چپ کروا دیا تو اس کی نوجوان لڑکی کو بھونڈی شکل عطا کر دی۔ کسی کو خندق میں دھکیل دیا تو کسی کو بھونڈی سی لڑکی پر عاشق کر دیا۔ دھرم کے محافظ کو ایک طرف دھرم کا قاتل بھی بنا ڈالا اور دوسری طرف سماج میں عزت اور مرتبہ بھی عطا کر دیا۔ خدا پرست مسلم قوم کو بدنام کروا ڈالا اور اس کے لڑکے کو عشق کا عظیم مرتبہ دے کر کے ایک لاکھ روپیہ بھی دلوا دیا۔

مسٹر شیطان! بس میں یہی وضاحت چاہتا ہوں کہ کیا واقعی آپ اور خدا دونوں ایک ہیں اور اگر ایک ہیں تو دُوئی کا سوانگ کیوں رچاتے پھرتے ہیں اور اگر دو ہیں تو پھر دونوں بیک وقت ایک انسان کے اندر کیوں اور کیسے رہتے ہیں؟ اُمید ہے آپ وضاحتی جواب ضرور دیں گے اور اگر میرا شبہ صحیح ہو تو جواب دینے کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

# غزلیں

### م۔ع۔س۔ خار بنگلوری

جب کوئی پھول مُسکرایا ہے
مجھ کو تیرا خیال آیا ہے

لے کے انگڑائی کِھل گئیں کلیاں
جانے گلشن میں کون آیا ہے

اب کسی پر نظر نہیں رُکتی
جب سے آنکھوں میں تُو سمایا ہے

حُسن کی ہر جفا کو سہہ لینا
بس یہی عشق نے سِکھایا ہے

پھُول لانے چمن میں پہنچا تھا
خارؔ دامن میں بھر کے لایا ہے

### نازؔ قادری بی۔اے (آنرز)

آج پھر درد نے لی انگڑائی
تُو نے پھر یاد کیا ہے شاید

کوئی آواز، نہ کوئی نغمہ
سازِ دل ٹُوٹ گیا ہے شاید

دلِ ویراں میں تری یاد کا نُور
قبر پر دیپ جلا ہے شاید

روشنی دُور تلک پھیل گئی
دل کا ہر داغ جلا ہے شاید

ہر خوشی رُوٹھ رہی ہے اے نازؔ
زندگی مجھ سے خفا ہے شاید

### رضی الدین احمد یادؔ بچھرایونی

دستِ قاتل سے اِک معجزہ سا ہوا
وار اوچھا رہا، زخم گہرا ہوا

ہر نفس گرمیٔ عشق تڑپائے ہے
دل میں شُعلہ ہے کوئی دہکتا ہوا

آج پھر اُس نے دیکھا مجھے پیار سے
آج پھر دل کا ہر نقش گہرا ہوا

اشک آنکھوں سے جاری ہیں کچھ اسطرح
جیسے گنگا میں پانی ہو بہتا ہوا

آج دیکھا ہے واعظ کو بھی یادؔ نے
اُن کی راہوں میں گِرتا سنبھلتا ہوا

### نیلوفر ناہید (علیگ)

مدّت میں ہو رہی ہے گُل و یاسمن کی بات
لِللہ اب نہ چھیڑیئے رنج و محن کی بات

ہنسنے دو میرے زخمِ جگر کو ابھی کچھ اور
کرتے رہو یونہی مرے ناوک فگن کی بات

تقدیر میں جو دل کی لکھا تھا وہ ہوگیا
اب کیا کرو گے سُن کے اُس اُجڑے چمن کی بات

رہ رہ کے آ رہی ہے دلِ گُم شُدہ کی یاد
اللہ! کس نے چھیڑ دی اُس انجمن کی بات

جو خود ہیں نیلوفر مری دیوانگی کا راز
اب اُن کے لب پہ ہے مرے دیوانہ پن کی بات

# مُلک کے مایۂ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے نئے شاہکار ناول

## جنھیں ادارۂ بیسویں صدی نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے

○ جب سائنس کے بل بوتے پر چاند، مریخ اور دوسرے سیاروں تک پہنچا جا چکا ہو گا۔
○ جب مرد نہ صرف عورت بلکہ ماں بنکر اولاد کی پرورش کریں گے۔
○ جب پورا نظامِ زندگی حسن و شباب اور مستی و رعنائی کے زیرِ نگیں ہو جائے گا۔
○ جب عورت، مرد کے پنجۂ اقتدار سے آزاد ہو کر معاشرے پر چھا جائے گی۔

اُردو ادب میں ایک انوکھا تجربہ۔ حیرت انگیز واقعات پر مشتمل ایک دل فریب ناول

## فریدہ موہنی (ناول)

حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔

صدیوں بعد کی فضاؤں میں لکھی ہوئی عجیب و غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بیحد شوخ دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضا میں پرواز کراتا ہے۔ اور نئی زندگی کا سنگِ بنیاد رکھتا ہے۔ انتہائی دلکش اور شگفتہ اندازِ نگارش۔ جاذبِ نظر کتابت و طباعت، بہترین کاغذ، دیدہ زیب سہ رنگا گرد پوش۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

## نئے فرہاد

جناب پروفیسر شکیل الرحمٰن ایم۔ اے کا اچھوتا شاہکار ناول ایک بڑی شوگر فیکٹری کے منیجر کی ہوسناکیوں اور حسن پرستیوں کی بھیانک تصویر۔ جس نے بہارِ حسن و شباب کو خوش آمدید کہتی ہوئی نازک اور معصوم کلیوں کو سُنہری، روپہلی سکّوں کی جھنکار کے بل پر رقص و نغمہ اور شراب و شعر کے طوفان میں غرق کر کے گناہ پر مجبور کر دیا۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے اسٹیج پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی جو آپ کے دل و دماغ پر چھا جائے گی۔ شکیل الرحمٰن کے اسٹائل میں اُن کی انفرادیت کی جاذبیت ہے، حسن ہے، زور ہے، جوش اور شگفتگی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک تیز اور شفاف چشمہ بہہ رہا ہے اور اُس کا بہاؤ ہمیں اپنے ساتھ بہائے جائے گا۔ بہترین کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، دیدہ زیب ڈسٹ کور۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

فرانس کے عظیم ترین ناول نگار ایبے پریوسٹ کا غیر فانی شاہکار

## راہیں شباب کی

○ جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔
○ جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔
○ جسے عشق و محبت کی بے نظیر داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔
○ جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارۂ بیسویں صدی نے شائع کیا ہے۔
○ جس کی اشاعت پر پیرس کے رنگین ماحول میں ایک زلزلہ آ گیا۔
○ جسے نوخیز لڑکیاں ہی نہیں بوڑھے بھی حاصل کرنے کیلئے ترستے ہیں

عشق و محبت کا جاوداں افسانہ جس کے سامنے وامق و عذرا، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کے قصّے بھی ہیچ ہیں۔ اِس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور سلمیٰ سے بھی زیادہ حسین اور عظیم ہے۔ مترجمہ جناب محمور جالندھری۔ نظر فریب کتابت و طباعت، بہت عمدہ کاغذ، قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

## یادوں کے کھنڈر

جناب ٹھاکر پونچھی کا ایک بے حد دلچسپ نیا رومانی ناول جس میں اُن معصوم محبتوں، ناکامیوں اور حسرتوں کی حسین داستانیں بیان کی گئی ہیں جنھوں نے اپنے کمسن خیالوں میں محبت کے حسین محل تعمیر کئے لیکن حقیقی زندگی میں صرف یادوں کے تاریک کھنڈر ہی نصیب ہوئے۔ یادوں کے کھنڈر کے درد ناک قہقہے، سسکتی ٹھنڈی آہیں، خاموش پلکوں پر منجمد آنسو، آج کے معاشرے کے وہ گھناؤنے نقوش اُبھار کرتے ہیں جو محبت کی موت ہیں، اور زندگی کے قاتل۔ ایک ایک سطر میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان چل رہا ہے۔ فاضل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگین انداز سے اُبھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص پر مبنی محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی - دہلی

افسانہ

# خوشبو گلاب کی سی

## ظہیر گیلانی

مقام و پوسٹ گیلان۔ ضلع مونگیر (بہار)
یکم مئی ۶۷ء

محترمی! تسلیم و نیاز

"بیسویں صدی" کی بزم میں ایک افسانہ "خوشبو گلاب کی سی" لے کر پہلی بار شریک ہو رہا ہوں۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ "بیسویں صدی" میں وہی افسانے شائع ہوتے ہیں جو اس کے بلند معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ مجھے اپنی کاوش پر پورا بھروسہ ہے۔ آپ بھی دیکھئے اور مطلع کیجئے کہ میں کامیاب رہا یا نہیں — اِس سے پہلے اِسی عنوان سے (خوشبو گلاب کی سی) ظفر اوگانوی کا افسانہ "بیسویں صدی" میں شائع ہو چکا ہے۔ اُس میں افسانہ کے ہیرو نے ہیروئن کو حاصل کرنا چاہا تھا لیکن ناکام رہا۔ تب ہیرو نے اپنے لڑکے کے لئے ہیروئن کی لڑکی (خوشبو گلاب کی سی) کو حاصل کر لیا۔ اِسی لئے ظفر اوگانوی سے معذرت کے ساتھ لکھ رہا ہوں . . .

نیاز مند — ظفر گیلانی

---

ساجد جوان تھا، اُس کے ارمان اور تمنائیں جوان تھیں، اُمنگیں اور آرزوئیں جوان تھیں، جذبات اور احساسات جوان تھے اور جوانیوں کے اِس ہجوم میں وہ اپنے ذہن کے پردے پر حسین تصویریں کھینچ رہا تھا۔ ایک خیالی مُلک سنسار بسا رہا تھا۔ جہاں ہر طرف عیش و عشرت، پیار محبت کے نغمے ابل رہے تھے اور وہ اُس دلکش نغمے میں گُم تھا۔

ساجد کا اسٹوڈیو اور سونے کا کمرہ ایک ہی تھا۔ ساجد جو تصویر بنا رہا تھا وہ ایک خوبصورت جوان لڑکی کی تھی۔ ایسی لڑکی جسے دیکھ کر کوئی شاعر کہہ اُٹھتا —

"خوشبو گلاب کی سی!"

حُسن و دلکشی کے اعتبار سے ساجد، سیما سے مطمئن تھا لیکن سیما کے پوز سے مطمئن نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا ایسے زاویے سے، ایسے پوز سے سیما کو پیش کرے جو زاویہ اور پوز دیکھنے والوں کو متاثر کرنے میں اُس کے حُسن کی مدد کرے۔ کیونکہ یہ ساجد کی آخری تصویر تھی۔ اُس نے عہد کر لیا تھا کہ اِس کے بعد کوئی تصویر نہ بنائے گا۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے سیما کو سماج کے بندھن میں باندھ کر قید کر لے گا۔ سیما بھی تیار تھی مگر شرط یہ تھی کہ وہ تصویر مقابلہ میں اوّل انعام پائے۔ ساجد ایک مشہور آرٹسٹ تھا اور اُسے اپنے فن اور اپنے موقلم پر اتنا بھروسہ تھا کہ اُس نے سیما کی شرط مان لی تھی اور پھر وہ تصویر بنانے میں دن رات لگا رہا۔

مقابلہ کا دن آگیا۔ تصویر سے نقاب اُلٹ دیا گیا۔ "اُف!" دیکھنے والوں کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔ لوگ تصویر کے حُسن و رعنائی میں اِس طرح کھو گئے جیسے وہ خود تصویرِ حیرت ہوں!

تصویر دیکھنے والوں نے ساجد کے ہاں جا کر اُسے ایسی شاہکار تصویر بنانے اور اُس پر مقابلے میں اوّل انعام پانے پر مبارکباد دی۔ لیکن ساجد کو اِس سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ کیونکہ اُسے سیما کا انتظار تھا۔ لیکن سیما نہ آئی۔ دوسرے دن ڈاک سے ساجد کو ایک مختصر خط ملا —

"ساجد! اِس تصویر سے میرے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے۔ جس وقت تمھیں یہ خط ملے گا ہم لوگ یہاں سے بہت دُور جا چکے ہوں گے۔ اب مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ!

سیما —"

اِس کے بعد ساجد اپنی دُنیا سے نکل کر ایک لمحہ کے لئے بھی اُس دنیا میں قدم نہ رکھ سکا جس میں رنگ تھا، بُو تھی۔ احساس تھا، نفرت تھی۔ محبت تھی، دشمنی تھی۔ فریب تھا اور بے وفائی تھی ـــــــ وہ دن رات اپنے کمرے میں رہتا۔ کبھی کبھی کھڑکی کے پاس چلا جاتا تھا اور قہقہے لگاتا ہوا گھوم جاتا تھا اور اِس طرح ۱۲ سال گزر گئے۔ اُس کا مرض لاعلاج ہو گیا۔ گھر والے بھی مایوس ہو گئے۔ اُس کی آنکھ کی روشنی دُھندلا گئی۔ اُس کی عجیب حالت ہو گئی۔ اب وہ کسی کو بھی نہ پہچانتا تھا۔

---

دن کی روشنی رات کی تاریکی میں ڈوب چکی تھی اور پُورن ماشی کا چاند کسی دیہقانی دوشیزہ کے ماتھے پر لگی ہوئی بندی کی طرح چمک رہا تھا اور نرم رو ہوا کے مست خرام جھونکوں سے باغ کے پودے جھوم رہے تھے اور کلیاں مُسکرا رہی تھیں۔ سنگِ مرمر کے چبوترے کے قریب فوارے سے پانی کے قطرے زمین پر موتی بکھیر رہے تھے اور باغ میں کیف آگیں فضا چھائی ہوئی تھی۔ سامنے تالاب کے شفاف پانی میں چاند کا عکس اُبھرا ہوا تھا اور سنگِ مرمر کے چبوترے کی جانب سے ایک حسین عورت ساجد کے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔

اُسے دیکھ کر ساجد کی عجیب حالت ہو گئی ـــــ جیسے ساجد وہ ساجد نہ ہو۔

وہ کھڑکی پر آکر کھڑا ہو گیا۔ "معبود دروازہ کھول دو میں تصویر لینے آئی ہوں۔" وہ حسین عورت کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر کہنے لگی۔ ساجد نے دروازہ کھول دیا اور بغیر پلک جھپکائے عورت کو دیکھتا رہا ـــــ "تم ... تم وہی ہو۔ ذرا بھی نہیں بدلیں۔ آج بھی تمہارا حُسن چاند کو شرما رہا ہے۔ تمہاری آنکھیں آج بھی ویسی ہی ہیں۔ تمہارے بال آج بھی سیاہ ہیں۔ تم ... تم میں ذرا بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ تم ایک نہ ایک دن ضرور آؤ گی!" ساجد جذباتی ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اُس کا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ اُس نے عورت کا ہاتھ پکڑ لیا: "سیماب تم مجھے ..."

"چٹاخ ...!!" ساجد لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ شاید اسی دن کا اُسے انتظار تھا اور وہ "خوشبو گلاب کی سی" اپنی ماں سیما کی تصویر لے کر جا چکی تھی!!

---



---



# صحت و زندگی

**زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات**

## ١ • آم کی دوائی اور غذائی اہمیت

آم خوش ذائقہ اور لذیذ پھل ہی نہیں، طبی نقطۂ نگاہ سے بھی گوناگوں اوصاف و خواص کا حامل ہے۔ برطانیہ کے سرکردہ طبی ماہرین نے آم سے متعلق ریسرچ کرنے کے بعد اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ آم میں وٹامنز اے، بی اور سی وافر مقدار میں ہیں۔ دوسرے غذائی اجزا و پروٹین، چکنائی، نشاستہ اور شکر کے علاوہ چونا، فاسفورس اور فولاد بھی ہیں۔

آم نیا خون پیدا کرتا ہے۔ مقوی ہونے کے علاوہ مفرح بھی ہے۔ جسم کو موٹا کرتا ہے۔ جلد کی رنگت کو نکھارتا ہے اور چہرے کی رونق کو بڑھاتا ہے۔ اعضائے رئیسہ دل، دماغ، معدہ، مثانہ اور گردے کو قوت دیتا ہے۔ خون بڑھاتا ہے اور خون کو صاف بھی کرتا ہے۔ قبض کو رفع کرتا ہے۔

میٹھے آم حاملہ عورتوں کے لئے سودمند ہیں۔ اس سے طاقتور اور تندرست بچہ پیدا ہوتا ہے۔ آم میں غذائی جوہر زیادہ ہیں۔ اس لئے خصوصیت سے بچوں کی نشوونما کے لئے بہت مفید ہے۔

دق کے مریضوں کے لئے آم بہت مفید غذا ہے۔

غذائی اوصاف کے ساتھ آم دوائی اہمیت کا بھی حامل ہے۔

آم کے خشک پتے حقے میں بطور تمباکو پینا ریاح گردہ کے لئے مفید ہے۔ اس سے حلق کے زخم کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔

آم کے درخت کے وہ پتے جو خود درخت سے گر جائیں، انھیں ہاتھ سے خوب مَل کر حقے میں تمباکو کی طرح پینا حلق کے ایسے گہرے زخم کے لئے بھی مفید ہے جس میں ناک، تالو اور حلق کے راستے ایک ہو جائیں۔ چالیس دن تک مسلسل استعمال کرنا چاہئے۔

آم کی گٹھلی کا سفوف چھ ماشہ روزانہ نہار منہ صبح کے وقت پانی کے ساتھ استعمال کرنے سے دمہ سے نجات مل جاتی ہے۔ اگر تلی بڑھ جائے تو میٹھے آم کے رس میں شہد ملا کر پینے سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ ایک چھٹانک رس میں ایک تولہ شہد ملا کر روزانہ صبح کے وقت پینے سے تلی کا ورم دُور ہو جاتا ہے۔ تلی کے مریضوں کے لئے آم کا اچار ایک مجرب دوا ہے۔ روٹی کے ساتھ آم کا اچار کھایا کریں۔ آم کی گٹھلی کا سفوف دو ماشہ روزانہ نہار منہ کھانے سے ایک ہفتہ میں آنتوں کے کیڑے مر جاتے ہیں۔

ہاضمہ کی کمزوری میں آم کے پانچ تولہ رس میں سونٹھ دو ماشہ ملا کر صبح نہار منہ پینے سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔

روزانہ علی الصبح نہار منہ شیریں آم چوس کر، دودھ میں سونٹھ اور چھوہارے اُبال کر پینے سے جسم کی کمزوری دُور ہوتی ہے۔ اس سے نیا خون بنتا ہے اور صاف بھی ہوتا ہے۔ یہ مقوی باہ ہے اور بدن کو بھی موٹا کرتا ہے۔ یوں بھی آم کھانے کے بعد دودھ پینا طاقت بخش اور صحت بخش ہے ——— شیریں آم کے پاؤ بھر رس میں چھ چھ ماشہ ادرک کا رس اور بقدر ذائقہ چینی ملا کر پینا مقوی دماغ ہے۔ یہ قلب و جگر کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ جسم کی لاغری دُور ہو کر موٹاپا پیدا ہوتا ہے۔

دستوں کی شکایت میں آم بہت مفید ہے۔ آم کی گٹھلی بھون کر، اس کے ہم وزن دانہ الائچی خورد ملا کر، خوب باریک کر کے دو تین ماشہ ہمراہ پانی پینے سے دستوں کی شکایت دُور ہو جاتی ہے۔

آم جگر کے لئے نقصان دہ ہے اور ترش آم جگر کے لئے زیادہ مضر ہے۔ میٹھا آم جب تک زیادہ نہ کھایا جائے نقصان نہیں کرتا۔ جگر کی خرابی والے اسے حدِ اعتدال میں کھائیں۔

آم کے تین چار تازہ پتے خوب چبائیں اور لعابِ دہن تھوکتے جائیں چند دن

مسلسل عمل کرنے سے چلتے ہوئے ٹانگ مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مسوڑھوں کا خون بند ہو جاتا ہے۔ مسوڑھوں کا ڈھیلا پن اور اُن کی کمزوری ختم ہو جاتی ہے۔ دانتوں اور مسوڑھوں کی اکثر شکایتوں میں یہ عمل بہت مفید اور مجرب ہے۔

باریک اچھے پانی میں ملا کر اس کی کُلیاں کرنے سے مسوڑھوں کے ورم سے نجات مل جاتی ہے۔

آم کے پُرانے اچار کا تیل سر کے گنج کے لئے مفید ہے۔ اچار جتنا پُرانا ہوگا اُس کا تیل اُتنا ہی مفید ہوگا۔ ایک برس کا پُرانا ہونا ضروری ہے۔ اُس میں سے تیل الگ کرکے ایک شیشی میں رکھ لیں اور روزانہ سر پر اُس کی مالش کریں۔ چند ہفتوں کے استعمال سے سر پر بال پیدا ہو جائیں گے۔

ایک سال کے پُرانے اچار کا تیل بدن پر ملنے سے خارش جاتی رہتی ہے۔ تیل لگانے کے بعد جَو کا آٹا بطور اُبٹن مالش کرنا چاہئے۔

آم کا اچار صفراوی مزاج والوں کے لئے نفع بخش ہے۔ اُس سے بھوک بڑھتی ہے۔ روٹی کے ساتھ کھانے سے ورم طحال کے لئے مفید ہے۔ آم کا مربّہ دل اور دماغ کو قوت دیتا ہے اور بواسیر میں نافع ہے۔

کچے آم کے چھلکے الگ کرنے کے بعد اُسے باریک کتر کر چار گھنٹے تک پانی میں بھگو دیں۔ یہاں تک کہ اُس کی ترشی نکل جائے۔ اس کے بعد پانی سے صاف کرکے حسبِ ذائقہ چینی یا مصری ملا دی جائے کہ میٹھا ہو جائے۔ یہ مقوی قلب و معدہ ہے۔ لُو زدہ کو کھلانا بھی مفید ہے ——— موسم گرما میں لُو کا حملہ ہو تو کچے آم اُبال کر اُن کا رس نکال لیں اور اُس میں نمک، سیاہ مرچ اور بھُنا ہوا زیرہ ملا کر اسے پئیں۔ اِس سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ بہت زود ہضم، بھوک آور اور لذیذ بھی ہے۔

## ۲ • کیا آپ پریشان رہتے ہیں؟

کبھی کبھی یا اکثر آپ بھی پریشان رہتے ہوں گے۔ آج کی دُنیا میں ایسا کون ہے جو پریشان نہ ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ پریشان رہنا بہت ہی مہلک بات ہے۔ ہندی زبان کے ایک مفکر نے کہا ہے ——— "چنتا چتا تک پہنچا دیتی ہے"۔ ——— دماغی امراض کے ماہر ایک مشہور ڈاکٹر فلپ پولشن کہتے ہیں ——— "مجھے اِس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اگر کوئی انسان خود کو پریشانیوں سے بچائے رکھے تو وہ اپنی عمر میں کم سے کم دس برس کا اضافہ کر لے گا"۔

ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ——— "پریشانیاں اور اُلجھنیں آپ کو گنٹھیے اور وجع مفاصل میں مبتلا کرکے آپ کو ہمیشہ کے لئے گردشی کرسی میں پھینک سکتی ہیں۔ "بہت کم چیزیں اتنی جلدی عورت کو بڑھاپے کی منزل تک پہنچا سکتی ہیں یا اُس کے خدوخال بگاڑ سکتی ہیں جس قدر کہ فکریں اور پریشانیاں! تسلسلِ عدم چہرے کو مجسمہ بنا دیتے ہیں۔ اُن سے جبڑے لٹک جاتے ہیں اور چہرے پر جھرّیاں پڑ جاتی ہیں۔"

لیکن پریشانیوں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اُن سے بچے اور محفوظ رہنے کے لئے روشن راہیں آپ کے سامنے ہیں۔ پریشانیوں سے بچنے، پریشانیوں کو شکست دینے کے لئے اِن مشوروں پر عمل کیجئے :-

• امراضِ دماغی کے معالج ڈاکٹر جے۔ اے۔ ونشر کہتے ہیں ——— "عام طور پر ہم اُس وقت زیادہ پریشان ہوتے ہیں، جب ہم اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں"۔

درحقیقت یہ پریشان ہونے کی بات نہیں۔ ہم اپنی غلطیوں کی مدد سے ترقّی کرتے ہیں، جیسے ایک بچہ گر گر کر چلنا سیکھتا ہے۔ غلطیوں سے پریشان ہونے کے بجائے اُن کا بغور مطالعہ کیجئے اور اُنھیں نفع بخش بنا لیجئے۔

کسی پریشان کُن صورتِ حال سے گریز کرکے یا بچ کر آپ اُسے حل نہیں کر سکتے۔ اگر آپ پریشانیوں کو ایک چیلنج سمجھ کر اُن کا مقابلہ کریں تو اُنھیں آسانی سے پسپا کر سکتے ہیں۔

پریشانی سے محفوظ رہنے کے لئے خود اعتمادی کو اپنا پُشت پناہ بنا لیجئے۔

زندگی میں آئے دن طرح طرح کے مسئلے اور معاملات پیش آتے رہتے ہیں اور طرح طرح سے وہ حل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اِس یقین سے بہت اطمینان ہوتا ہے کہ اب سے پہلے ہم پریشانیوں پر غلبہ پاتے رہے ہیں اور اُسی طرح اب بھی اُن پر غالب آ جائیں گے۔

ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ——— "اپنی تمام قوت "آج" سے نمٹنے میں صرف کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو پھر گزرے ہوئے کل کے واقعات پر غم و رنج اور آنے والے کل کی فکروں کے لئے تمھارے دل میں گنجائش نہ رہے گی۔ زیادہ تر پریشانیاں مستقبل کے متوقع حالات سے متعلق ہوتی ہیں۔ یا پھر گزرے ہوئے واقعات پر رنج و غم کرنے سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں، جن کے لئے وقت برباد کرنا اور خود کو پریشان کرنا انتہائی حماقت ہے۔

## ۳ • اپنی غذا کی طرف توجہ کیجئے

تندرست و توانا رہنے کے لئے غذا کا انتخاب ہمیشہ دانشمندی سے کرنا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح اُسے سلیقے اور سمجھ داری سے استعمال کرنا بھی اُتنا ہی اہم ہے۔ زندگی اور صحت سے پُوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے کھانے کے

اصول اور طریقہ موسمی حالات کے مطابق ہونا لازمی ہیں۔ آب و ہوا اور موسم کو غذا کے انتخاب میں پوری اہمیت دینی چاہئے۔

غذائیں صحت بخش اور مقوی ہونے کے باوجود یکساں طور پر ہر موسم کے مطابق نہیں ہوتیں۔ اس لئے غذا کے انتخاب میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ غذا میں موسم، آب و ہوا، وقت اور پیشے وغیرہ کی پوری رعایت ملحوظ رہنی چاہئے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو ایسی غذا تجویز کرنی چاہئے جسے اپنے تجربات میں مفید پایا ہو۔

گرمیوں کے موسم میں دستر خوان پر رکھی ہوئی غذاؤں میں سے وہ غذائیں طبعی طور پر زیادہ مفید اور جاذب نظر ہوتی ہیں، جو دیکھنے میں آنکھوں کو ٹھنڈی معلوم ہوتی ہوں۔ جیسے سبز اور تر و تازہ ترکاریاں، شاداب اور رنگین پھل، پھلوں کے رس، برف سے ٹھنڈا کیا ہوا دودھ وغیرہ۔ یہ غذائیں وٹامنز اور معدنیات سے بھرپور ہوتی ہیں اور ان میں موسم گرما کی ضرورت کے اعتبار سے پانی بھی وافر ہوتا ہے۔

ہمارے جسم کو گرمی کے موسم میں سردی کے موسم کی طرح زیادہ ایندھن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے گرمی میں کم حرارت والی غذا بہتر ہوتی ہے۔ مٹھائیاں، ثقیل، مرغن اور دیر ہضم غذائیں، حلوے، کیک، کباب وغیرہ اس موسم کے مطابق نہیں ہیں اور خشک میوہ جات کے مقابلے میں تر پھل بہتر ہوتے ہیں۔ اس موسم میں نشاستے دار چیزیں جیسے آلو اور چاول بھی کم کھانی چاہئیں۔ اس موسم میں زیادہ سے زیادہ زود ہضم اور ہلکی غذائیں استعمال کرنی چاہئیں تاکہ طبیعت ہلکی پھلکی اور شگفتہ رہے۔ ہلکی غذائیں اندرونی اعضا کے خون کے دباؤ کو بھی رفع کرتی ہیں۔ تازہ پھل، پتے دار اور زود ہضم سبزیاں اور پھلوں کے رس بہت آسانی سے ہضم ہو جاتے ہیں۔ لیموں کی سکنجبین، دہی اور چھاچھ اس موسم میں خاص طور پر عمدہ غذائیں ہیں۔

## ۴ • مایوسی صحت کی دشمن ہے

قوت خیال کے فائدوں پر شک کرنا اور قنوطیت و مایوسی کو دل میں جگہ دے کر "فلسفۂ شکست خوردگی" پر عامل ہونا صحت یابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ مایوسی صحت کی دشمن ہے۔ ایک ماہر معالج کا کہنا ہے مرض سرطان کے اچھے نہ ہونے کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ اس مرض کو ناقابل علاج اور مہلک ہونے کی شہرت حاصل ہو گئی ہے۔ جب مریض یہ سن لیتا ہے کہ اُسے سرطان ہو گیا ہے تو وہ خود بخود صحت یابی کی اُمید کھو بیٹھتا ہے۔ صحت یابی کی اُمید ترک کر دیتا ہے اور یہ مایوسی اور اس امر کا یقین کہ وہ کبھی اچھا نہ ہوگا، کبھی صحت یاب نہ ہوگا، اس کے



تحت شعوری دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے اور عملی طور پر صحت یابی کو روکتا ہے۔

دوسری بیماریوں میں بھی یہی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ مایوس لوگ جلد صحت یاب نہیں ہوتے۔ ان کا وہ خیال کہ وہ بہت دنوں تک بیمار رہیں گے حقیقت میں اُنہیں بہت دنوں تک بیمار رکھتا ہے اور مرض کو سنگین بنا دیتا ہے۔ اگر ہم یقین کر لیں کہ اچھے ہو رہے ہیں اور دماغی قوتوں کو صحیح راستے پر لگا دیں تو اس سے ہمارے مکمل شفایابی کو مدد ملے گی۔

## ۵ • ناشپاتی ــــ ایک طاقت بخش پھل

اس کا مزاج سرد تر ہے۔ بعض اطبا نے اسے سیب کا بدل قرار دیا ہے۔ جدید تحقیق نے بھی اس نظریہ کی تائید کی ہے کہ ناشپاتی اور سیب کے غذائی اجزاء قریباً برابر ہیں۔ سیب قابض ہے اور ناشپاتی قبض کشا۔ ہضم بھی سیب سے جلد ہوتی ہے۔

یہ دل و دماغ، معدے اور جگر کو طاقت دیتی ہے۔ دماغ کے خلیات کو تقویت بخشتی ہے اور دماغ میں تراوٹ پہنچاتی ہے۔

پیاس کو بجھاتی ہے۔ خون کی تیزی کو کم کرتی ہے اور صفرا کے جوش کو کم کرتی ہے۔ نرم ناشپاتی قبض کو دور کرتی ہے۔ سخت ناشپاتی قابض ہے گویا کوئی بھی انسان قدرت کے اس بیش بہا عطیہ سے محروم نہ رہے۔ جسے دست آ رہے ہوں وہ سخت ناشپاتی کھائے، جسے قبض ہو نرم ناشپاتی کھائے۔

چھلکے سمیت کھانے سے جلد ہضم ہو جاتی ہے۔ چھلکا اُتار کر کھانے سے دیر

میں ہضم ہوتی ہے۔

کشمیری ناشپاتی اور کشمیر میں ہونے والے ناشپاتی جیسے پھل بگو گوشے کے بھی یہی اوصاف ہیں۔ بگو گوشہ زود ہضم، فرحت بخش اور نسبتاً خوش ذائقہ ہوتا ہے۔

تبخیر معدہ کے لئے بھی ناشپاتی مفید ہے۔ خون کو گاڑھا کر دیتی ہے۔ جن لوگوں کے بدن کے کسی حصے سے خون خارج ہوتا ہو ان کے لئے ناشپاتی بہترین غذا ہے۔

ناشپاتی کھانے کے بعد کھانی چاہئے۔ کھانے کے بعد کھائیں تو ملین ہے صفرا کی خرابیوں کو دور کرتی ہے۔ ناشپاتی کھانے کے بعد زیادہ ٹھنڈا پانی پینا مضر ہے۔

ناشپاتی میں پروٹین، چکنائی، نشاستہ دار شکر لیے اجزاء کے علاوہ چونا، فولاد اور فاسفورس بھی ہے۔ اس میں وٹامن اے، بی، سی ہے۔

یہ صرف فرحت بخش اور خوش ذائقہ پھل نہیں۔ کافی قوت بخش غذا بھی ہے۔ ایک بڑی ناشپاتی میں ۱۰۸ کیلوریز قوت ہوتی ہے۔ مریضوں کے لئے بھی مفید ہے اور تندرستوں کے لئے بھی۔

ناشپاتی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے خوب پکی ہوئی ناشپاتی کھانی چاہئے۔

## ۶● کسی پر نکتہ چینی نہ کیجئے

اگر آپ ہر دلعزیز بننا چاہتے ہیں، اگر آپ اپنی زندگی کو تلخیوں سے بچانا چاہتے ہیں تو دوسروں کی زندگی میں تلخی کے چھینٹے نہ ڈالئے کسی پر نکتہ چینی نہ کیجئے۔

ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ۔۔۔۔ "نکتہ چینی نہایت خطرناک شعلہ ہے۔ ایسا شعلہ جو غرور کے بارود خانے میں دھماکا پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا دھماکا جو موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔"

ٹامس ہارڈی نے اپنے ناولوں سے انگریزی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ لیکن اس پر شدید و تلخ نکتہ چینی ہوئی تو اس نے تخیلی افسانے لکھنے بند کر دئے۔ اسی نکتہ چینی نے نامور انگریز شاعر ٹامس چیٹرٹن کو خودکشی پر مجبور کر دیا۔

ہر بیوقوف نکتہ چینی، مذمت اور شکایت کرنے کا اہل ہے اور بہت سے بیوقوف ایسا کرتے بھی ہیں۔

کارلائل کہتا ہے ۔۔۔۔ "بڑا آدمی چھوٹوں سے برتاؤ کرتے وقت بھی اپنی بڑائی کا اظہار کرتا ہے۔"

لوگوں پر نکتہ چینی کرنے سے پہلے ہمیں انھیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں کیوں کرتے ہیں۔ یہ بات نکتہ چینی کی بہ نسبت زیادہ مفید اور خوشگوار ہے اور اس سے ہمدردی، بُردباری اور شفقت پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا ۔۔۔۔ "جب تک انسان موت کی منزل تک نہیں پہنچ جاتا خدا بھی اس کے اعمال کا محاسبہ نہیں کرتا اس لئے آپ اور میں ایسا کیوں کریں؟"

دوسروں پر نکتہ چینی کرنے سے پہلے خود بھی نکتہ چینی کی تلخی برداشت کرنے کے لئے تیار رہئے۔ دوسروں پر صحیح نکتہ چینی کر کے آپ غلط نکتہ چینیوں کا ہدف بھی بن سکتے ہیں۔ لوگوں پر نکتہ چینی کرنے والا اپنی مقبولیت کھو دیتا ہے۔

بیسویں صدی دہلی

## ۷● ایک زرّیں مشورہ

مشہور مفکر ڈگلس لرٹن نے لکھا ہے ۔۔۔۔ "اگر آپ کو اپنے مسائل اتنے بڑے، اتنے سنگین محسوس ہوتے ہیں جن کا کوئی حل آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تو آپ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر نظر جمائے رکھنے کی بجائے ان پہاڑوں کے دامن کی وادیوں پر نگاہ کیجئے۔ بڑے بڑے مسائل کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیجئے، جنھیں آپ بآسانی حل کرنے پر قادر ہوں۔ اگر آپ کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے تو دارالمطالعہ اور شبانہ درسگاہوں میں داخل ہو کر اپنی یہ کمی پوری کر لیجئے۔ اگر آپ کے دوستوں کا حلقہ محدود ہے تو خوف و رعایت کو پس پشت ڈالئے اور نئے نئے لوگوں سے جان پہچان پیدا کیجئے اور اپنے حلقہ احباب کو وسیع کیجئے۔ یہ آپ کے اپنے عمل کی بات ہے۔

کیا آپ نے خود کو ایک کمتر انسان مان لیا ہے؟ آخر کیوں مان لیا ہے؟ کیا آپ کے سارے دوست احباب یا واقف کار تمام غلطیوں سے مبرا ہیں؟ ایک بات ہمیشہ یاد رکھئے کہ کمتر ہونے اور محسوس کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ عیب ہر ایک میں ہوتا ہے، لیکن وہ ہر وقت اسی کے بارے میں نہیں سوچتا۔ پھر آپ کیوں ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے سوچتے رہیں؟ آپ میں کچھ عیب ہیں تو کیا ہوا، ہم سبھوں میں ہیں۔"

---

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے۔
بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

---

# سرگوشیاں

## سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ غیر علمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

---

### سی۔ ایم۔ ہارون۔ مدراس

س۔ شراب اور عورت میں کیا فرق ہے؟

ج۔ شراب انسان کو ہوش و حواس سے محروم کر دیتی ہے۔ عورت انسان کو ہوشمندی بخشتی ہے۔

س۔ کیا موت اندھی ہوتی ہے؟

ج۔ موت اندھی نہ ہوتی تو مظلوموں کی زندگی اجیرن کرنے والے ظالم زندہ نہ رہتے۔

س۔ خلوص و محبت کی کتنی منزلیں ہیں؟

ج۔ ایک! خلوص و محبت پر خود غرضی کا سایہ نہ پڑنے دیں۔

---

### محمد سرور۔ کویت

س۔ بھیّا! حکومت عوام کے لئے ہوتی ہے یا عوام حکومت کے لئے؟

ج۔ اِتنی واضح حقیقت آپ نہیں جانتے؟ عوام حکومت کے لئے ہوتے ہیں! حکومت اُنہیں جس طرح چاہے استعمال کرے۔

س۔ بیسویں صدی میں آپ حکومت کے خلاف لکھتے ہیں کیا حکومت پر اُس کا کچھ اثر ہوتا ہے؟ اگر نہیں، تو کیوں نہیں؟

ج۔ حق بات کہنے والے اپنی حق گوئی کا حاصل نہیں دیکھتے۔ حق بات کہنا ہی اُن کی کامیابی، اُن کا حاصل ہوتا ہے۔

س۔ ایک غریب مُلک کو خوراک کی ضرورت ہوتی ہے یا اسلحہ کی؟

ج۔ پیٹ کی آگ بُجھانے کے لئے خوراک کی، مُلک کی سرحدوں پر بھڑکتی ہوئی آگ کو سرد کرنے کے لئے اسلحہ کی بھی۔

---

### محمد عمر رمضانی۔ عادل آباد

س۔ دولت کی ہَوَس کا انجام؟

ج۔ عبرت ناک ہوتا ہے۔

س۔ تلخ زندگی کا مُستقبل؟

ج۔ جد و جہد کی جائے تو شیریں ہو سکتا ہے۔

---

### ایم۔ زین الحق۔ ڈیسہ گڑھ

س۔ عورت آگ کب ہوتی ہے؟

ج۔ جب اُس شبنم کو شعلہ بننے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔

س۔ غم زدہ انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ مُسکراتے ہوئے گُنگُنانا چاہئے ———

ہے بڑی چیز انبساط مگر
غم نہ ہو تو حیات کچھ بھی نہیں

---

### محمد مطیع اللہ خاں مطیعؔ۔ موتی ہاری

س۔ عورت ایک داستان ہے یا کسی افسانے کا عنوان؟

ج۔ عورت کوئی داستان ہے نہ کسی افسانے کا عنوان ——— عورت عورت ہے! کائنات کی درخشندہ و تابندہ حقیقت!

---

### باقر علی پروازؔ۔ رام گڑھ کینٹ

س۔ موت اور حیات میں کتنا فاصلہ ہے؟

ج۔ زندگی اور موت میں ہے اِک قدم کا ہیر پھیر
فاصلہ کچھ بھی نہیں اور راہ میں منزل بہت

س۔ جمیلؔ مظہری کا کوئی شعر سُنایئے۔

ج۔ اُن ستاروں کی اُجالے میں ضرورت کیا ہے
جو اندھیرے میں چراغِ رہِ فردا نہ بنے

# قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

| | | |
|---|---|---|
| آتش گل | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| کلیات اقبال | ڈاکٹر اقبال | چھ روپے |
| جنون و ہوش | جوش ملسیانی | چار روپے |
| ہفت رنگ | عرش ملسیانی | تین روپے |
| آہنگ حجاز | 〃 | ایک روپیہ |
| سحر نزن | ساحر ہوشیارپوری | تین روپے |
| دستک | نرش کمار شاد | دو روپے ۲۵ پیسے |
| پھوار | 〃 | دو روپے ۵۰ پیسے |
| فنکار | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قاشیں | 〃 | تین روپے |
| آیات جنوں | 〃 | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| سنگم | 〃 | تین روپے |
| رباعیات محروم | تلوک چند محروم | تین روپے ۷۵ پیسے |
| گنج معانی | 〃 | سات روپے ۵۰ پیسے |
| روپ | فراق گورکھپوری | تین روپے ۵۰ پیسے |
| رمز و کنایات | 〃 | تین روپے ۵۰ پیسے |
| مشعل | 〃 | دو روپے ۷۵ پیسے |
| بیکراں | جگن ناتھ آزاد | چار روپے ۵۰ پیسے |
| ستاروں سے ذروں تک | 〃 | دو روپے ۷۵ پیسے |
| کلیات اکبر الہ آبادی (اول) | اکبر الہ آبادی | پانچ روپے |
| 〃 حصہ دوم | 〃 | چھ روپے |
| کلیات اختر شیرانی | اختر شیرانی | آٹھ روپے |
| رعنائیاں | شکیل بدایونی | تین روپے |
| صنم و حرم | 〃 | دو روپے ۷۵ پیسے |
| گل رعنا | تجلی رعنا | تین روپے ۵۰ پیسے |
| شبنم شبنم | کرشن موہن | پانچ روپے |
| دل ناداں | 〃 | چھ روپے |

| | | |
|---|---|---|
| خرابات | عبدالحمید عدم | چار روپے |
| رم آہو | 〃 | چار روپے |
| گلنار | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قول و قرار | 〃 | تین روپے ۵۰ پیسے |
| گردش جام | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| بطِ مے | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گجر | قتیل شفائی | تین روپے |
| رسالت مآب | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| اسلام اور عورت | مولانا مظہر الدین | تین روپے |
| نماز کیا ہے | مولانا محمد علی | دو روپے ۲۵ پیسے |
| نیا نو دن | راشد سہسوانی | پانچ روپے ۷۵ پیسے |
| غم و تے مستقل | انیس مرزا | چار روپے ۵۰ پیسے |
| شرارت | جمیل انجم | تین روپے |
| عشق اور خون | رائیڈن ہگرڈ | سات روپے |
| سوکھا ساون | انیس مرزا | دو روپے ۵۰ پیسے |
| محبت اور جرم | انور کمال حسینی | دو روپے ۷۵ پیسے |
| فن اور تنقید | 〃 | چار روپے ۵۰ پیسے |
| نوائے دل | منشاء الرحمٰن خاں منشاء | دو روپے ۵۰ پیسے |
| شاہنامۂ اسلام | حفیظ جالندھری | نو روپے نو روپے |
| تلامذۂ غالب | مالک رام | سات روپے ۷۵ پیسے |
| یادیں | اختر الایمان | چھ روپے |
| مضراب | شباب للت | تین روپے |
| تماشائی | کرشن موہن | ایک روپیہ |
| روپ رس (ہندی رسم الخط میں) | 〃 | ایک روپیہ |
| نگاہِ ناز | 〃 | ایک روپیہ |
| تبسم غم | وسیم بریلوی | دو روپے ۵۰ پیسے |
| دیوان مصحفی | مرتبہ:۔ نور نقوی | بارہ روپے |

**آئینۂ اصلاح** ابو الفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات ملک کے ادنی شاعروں کے کلام پر مع توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

**کفر و ایمان** پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت آخر کلام ملک کے استاد ہیں اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ درد مند دل کی گرمی بھی ہے۔ قیمت چار روپے۔

**شاہنامۂ اسلام** جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام۔ چار حصوں میں جن میں تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتی سولہ روپے اب صرف نو روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

**مضراب** شباب للت کے ایک ایک شعر میں آپ کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں انہوں نے سارے جہان کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

**گردِ راہ** ضیا فتح آبادی کا چوتھا مجموعۂ کلام۔۔۔ ضیا ایک صاحب طرز شاعر ہیں۔ اُن کے اندازِ بیان اور لب و لہجہ میں انفرادیت و ندرت ہے قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

**آوازیں** اُبھرتے ہوئے جواں سال شاعر ترپورن کمار ہوش کے قطعات اور نظموں کا منفرد مجموعہ جس میں رومان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ آپ کی اپنی آواز بھی ہے قیمت تین روپے۔

**چاندنی اساڑھ کی** راج نرائن راز کی نظموں کا مجموعہ۔ لوک گیتوں کی سی سادگی، پرکاری، تازگی اور شگفتگی۔ ان میں ایک نئے انداز کی نغماتی تشویق بھی ہے۔ سہ رنگا گرد پوش، کاغذ آفسیٹ۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ قیمت صرف تین روپے۔

### ماں منی دیپ۔ کلکتہ

س۔ آج کل کے انسانوں میں خلوص کیوں نہیں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ ـــــــ

آدمی آدمی کے پیکر میں
اور کچھ ہوگا آدمی نہ رہا!

س۔ مجاز کا کوئی حیات افروز شعر سنائیے۔

ج۔ مجاز کا ایک انقلابی شعر سُنئے ؎

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

---

### عزیز تلہری۔ تلہر

س۔ انسان فرشتہ سے برتر ہے لیکن اس دور میں شیطان سے بدتر ہوگیا ہے! اس کی وجہ؟

ج۔ اس لئے کہ انسان انسان نہ رہا۔ انسان نے انسانیت کا دامن چھوڑ دیا۔

س۔ دنیا میں جاہلوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ ہر جاہل اپنے کو عالم سمجھتا ہے!

س۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کی شخصیت پر روشنی ڈالئے۔

ج۔ علامہ موصوف بہت بڑے شاعر ہی نہ تھے، شاعر گر تھے۔ اُن کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ اُن کے بہت سے ایسے شاگرد ہیں، جو اب اُستاد ہیں اور اُن کے بھی بہت سے شاگرد ہیں۔

---

### صبغت اللہ انصاری۔ پورنیہ

س۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں دنیا کی سب سے ضخیم کتاب کا نام کیا ہے اور وہ کس زبان میں ہے؟

ج۔ دنیا کی سب سے ضخیم کتاب چین کی ڈکشنری ہے۔ ایک اخباری بیان کے مطابق اس کی پانچ ہزار بیس جلدیں ہیں۔

س۔ یہ بتایئے دنیا کی سب سے بڑی لائبریری کہاں ہے اور اس میں کتنی کتابیں ہیں؟

ج۔ دنیا کی سب سے بڑی لائبریری امریکہ کے مشہور واشنگٹن میں ہے۔ اس کا نام کانگرس لائبریری ہے۔ اس میں تین کروڑ چالیس لاکھ کتابیں ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں، دنیا کی سب سے بڑی لائبریری ماسکو (روس) میں لینن لائبریری ہے۔

---

### رخسانہ اختر۔ سرینگر۔ کشمیر

س۔ سیاست میں حصہ لیں تو دوست زیادہ ہوں گے یا دشمن؟

ج۔ سیاست میں حصہ لینے والے خود اپنے دشمن بن جاتے ہیں۔

س۔ کوئی درد بھرا شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

سحر ہونے کو ہے اب سوئے در دیکھا نہیں جاتا
کہ چشم منتظر پتھرا گئی کیا تم نہ آؤ گے؟

س۔ محبت کی آخری منزل کیا ہے؟

ج۔ حسرت و یاس، تباہی و بربادی!

---

### رفیعہ زیدی۔ علیگڑھ

س۔ بھائی جان! زندگی کے موضوع پر کوئی حسین شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

حیات ہر رنگ میں حسیں ہے ہر اک ادا اس کی دلنشیں ہے
اُٹھے تو خوشبو، گرے تو جھرنا، رُکے تو اک آہوانہ رم ہے

س۔ بھائی جان! یہ شعر کس کا ہے؟

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

ج۔ جگر مرادآبادی کا۔

داجد علی جاوید۔ عادل آباد۔ اے پی

س۔ جگر مرادآبادی کو شراب زیادہ پسند تھی یا شاعری؟

ج۔ شاعری! کیونکہ انھیں شراب پسند تھی تو شاعری کے لئے! وہ بھی غالب کے ہمنوا تھے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

س۔ مشہور افسانہ نگار آسی رام نگری نے کس زمانے میں افسانے لکھے تھے؟ اُن کے افسانوں کے نام بتایئے۔

ج۔ آسی صاحب نے اتنا زیادہ لکھا ہے کہ خود انھیں بھی اپنے افسانوں کے عنوان اور تعداد یاد نہ ہوگی۔ "بیسویں صدی" اور دوسرے ممتاز صحائف کے فائل اس حقیقت کے شاہد ہیں۔

---

طلعت افضل حیدرآبادی۔ بسنت نگر

س۔ خوشتر صاحب! آپ بتا سکتے ہیں "تیر و نشتر" میں آپ کی بیباکی کیا معنی رکھتی ہے؟ آپ ڈرتے کیوں نہیں؟

ج۔ راہِ طلب کے دیوانے کب روکے رُکتے ہیں
عزمِ محکم کے آگے کیا زنداں کیا زنجیر!

س۔ محبت سے پیش آنے پر نشتر ملے تو؟

ج۔ وہ "چاقو" کا نشتر نہ ہو تو مسکرا کر قبول کر لیجئے۔

س۔ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔

ج۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد کو آویزۂ گوش بنا لیجئے ــــ جب لوگوں کی نیتیں فاسد ہو جاتی ہیں تو دنیا سے برکتیں اٹھ جاتی ہیں۔

---

ناز بریلوی۔ جسولی۔ بریلی

س۔ ذرا بتایئے تو کانگریس یا شیوسینا کی سیاسی طرز کیا ہے؟

ج۔ یہ کسی کانگریسی وزیر سے پوچھئے۔

س۔ میں بے حد حساس ہوں، اس لئے غمِ دیگراں نے میری صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ مشورہ دیجئے کہ اس دُکھ کا سدِّباب کیسے ہو؟

ج۔ ہم مشورہ کے بجائے آپ کو مبارکباد دیں گے ــــ مبارک ہیں وہ انسان جو دوسرے کا غم کھاتے ہیں، دوسروں کے دُکھ سے دُکھی اور دوسروں کے سُکھ سے سُکھی رہتے ہیں۔ جو صرف اپنے لئے جیا وہ کیا جیا!

---

جر جیس احمد عادل۔ پورنیہ

س۔ زندگی کو کامیاب بنانے کا نسخہ بتایئے تاکہ اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکوں۔

ج۔ سرگوشیوں میں بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ جاننے کے لئے "بیسویں صدی" میں "صحت و زندگی" کے تحت زندگی آموز و حیات افروز اشارات پڑھا کیجئے جنھیں پڑھ کر ہزاروں زندگیاں سنور گئیں۔

س۔ ہندوستان کی مختلف پارٹیوں میں کامیاب پارٹی کسے کہہ سکتے ہیں؟

ج۔ کسی کو نہیں۔ ویسے ساری ہی پارٹیاں خود کو کامیاب کہتی ہیں!

---

کریم رحمٰن۔ مالیگاؤں

س۔ زندگی کب خوشگوار بنتی ہے؟

ج۔ جب زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے جدوجہد کی جاتی ہے۔

س۔ دُنیا کا سب سے بڑا ادیب کون ہے؟

ج۔ جو دوسرے ادیبوں کی تخلیقات کو کمال فنکاری سے اپنا کہہ کر شائع کروا دے!

س۔ اگر مذاہب نہ ہوں تو؟

ج۔ مذاہب کے نام پر فساد نہیں ہوں گے [illegible] اخلاقی برائیاں بہت بڑھ جائیں گی ــــ مذہب بہترین نظامِ حیات ہے۔

---

شیخ امیر پروانہ۔ کریم نگر

س۔ طالب علم کو اپنی زندگی [illegible] کرنا چاہئے؟

ج۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے اپنا ہر لمحہ تعلیم کی تکمیل پر صرف کرنا چاہئے۔

س۔ دیہاتی زندگی اور شہری زندگی میں کون سی زندگی اچھی ہے؟

ج۔ ایک گاؤں کے باسی کے خیالات سُنئے ؎

گاؤں ہیں اتنے پیارے سُندر
سورگ ہیں جیسے یہ دھرتی پر
یہاں نہیں 'تہذیب' کی لعنت
دشمنِ صحت، رہزنِ راحت
گاؤں کی سُندر بالائیں
من کو موہیں جی کو لُبھائیں
مُکھڑے ان کے زرد نہیں ہیں
شیام رنگ ہیں پھر بھی حسیں ہیں
سچ ہے کہیں جو حضرت آسی
گاؤں کے باسی سورگ نواسی

---

ع۔ ق۔ لاری۔ لار

س۔ آجکل ہر شخص غرض کا بندہ کیوں نظر آتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ آجکل ہر شخص غرض کا بندہ ہو گیا ہے۔

س۔ وفادار دوست نایاب کیوں ہو گئے؟

ج۔ وفادار دوستوں پر آج کے بے وفا "چاقو" کا سایہ پڑ گیا۔

### ایم۔ عبدالسلام۔ شمسی دہلی

س۔ آپ کی رائے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی کامیابی کانگریس کی جیت ہے یا ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی جیت؟

ج۔ کانگریس کی بھی جیت ہے اور ڈاکٹر صاحب کی عظیم و ہر دلعزیز شخصیت کی بھی۔ اس سے زیادہ جمہوریت کی جیت ہے!

س۔ نئے راشٹر پتی شری وی۔ وی۔ گری کہاں کے رہنے والے ہیں اور اس منصب پر فائز ہونے سے پہلے کیا کرتے تھے؟

ج۔ آپ اڑیسہ کے برہمپور نامی مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ راشٹر پتی بننے سے پہلے میسور کے گورنر تھے۔

---

### سجاد قریشی۔ گورکھپور

س۔ آپ بتا سکتے ہیں چین میں کتنے مسلمان ہیں؟

ج۔ ۵ کروڑ

س۔ اور روس میں کتنے مسلمان ہیں؟

ج۔ تقریباً ایک کروڑ ۵۰ لاکھ۔

---

### عارف شاد۔ پٹنہ

س۔ چچا جان! کوئی زندگی کی تمنا کرے اور مر جائے۔ کوئی موت کو آوازیں دے اور زندہ رہنے پر مجبور کر دیا جائے۔ بتایئے بدنصیب کون ہے؟

ج۔ اِس دَور میں دونوں! جب ——
زندگی بھی موت کے سائے سے کم نہیں!

س۔ کوئی غم آگیں شعر سنایئے۔

ج۔ سُنئے ؎

مری حیات ہے محرومِ مدعائے حیات
وہ رہگزر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

س۔ دُنیا کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ ۶۲ء میں ۳ ارب ۱۳ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی۔

---

### نکہت زیدی۔ بحرین

س۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

ج۔ مولانا کی عظیم شخصیت و عظمت ہمارے وہم و گمان سے بہت بلند تھی۔ کسی نے مولانا کے بارے میں بالکل بجا کہا ہے ——

ترے وجود سے ہے آبروئے لوح و قلم
سرِ خیال ترے آستانِ فکر پہ خم
گرہ کشائے معانی ہے تیرا ناخنِ فکر
اشارہ شرحِ مطالب، نگاہ ساغرِ جم
مجسّم ایک ہی پیکر میں ہم نے دیکھا ہے
جمالِ سطوتِ خلّاق و عظمتِ آدم!

---

### ایم۔ اے۔ آلف بستوی۔ دلوریا لال بستی

س۔ کیا "بیسویں صدی" میں منتخب اشعار بھیجنے کا صرف ایس۔ ایس ہنکاری صاحب ہی کا حصہ ہے؟

ج۔ آپ بھی بصد شوق بھیج سکتے ہیں۔

س۔ "بیسویں صدی" میں افسانوں کی ترتیب افسانہ نگاروں کی شخصیت یا اُن کے فن کے لحاظ سے ہوتی ہے؟

ج۔ فنکار کے فن اور افسانہ کے معیار کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

---

### محمد امین امروہوی۔ میرٹھ

س۔ کیا چین میں مسلمانوں پر ظلم و جبر کئے جا رہے ہیں؟

ج۔ چنگیز اور ہلاکو کی اولاد سے اور کیا اُمید کی جا سکتی ہے؟

... افسانہ نمبر اپنے لباسِ تحریر میں عروسِ جمیل سے زیادہ حسین اور دلکش ہے۔ "بیسویں صدی" کے ذریعے آپ نے اُردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً اِس قابل ہیں کہ آبِ زر سے لکھی جائیں۔ اِس بحرانی دَور میں اپنی شاندار روایات کو قائم رکھنا آپ ہی کا کام ہے۔ افسانہ نمبر کا ہر ورق آپ کی محنت، خوش سلیقگی، بلند نظری اور شگفتہ ذوق کی غمازی کرتا ہے ...

(پروفیسر) سراج الحسن سراج ادیب۔ مہاراجہ کالج میسور

س۔ آج کل ہندوستان میں کس چیز کا درجہ اونچا ہے؟

ج۔ ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں کا! جو آسمان کو چھونے لگی ہیں!!

---

### محمد حنیف احمد۔ آرہ

س۔ نئے وزیرِ اطلاعات و نشریات کے۔ کے شاہ کے پورے نام سے مطلع کریں۔

ج۔ نام سے کیا لینا ہے۔ دیکھیے کام کیا کرتے ہیں!

س۔ نئی غیر کانگرسی حکومت میں اُردو کا مستقبل؟

ج۔ پہلی کانگرسی حکومت ہو یا نئی غیر کانگرسی حکومت —— اُردو کے مستقبل کو اُردو کے پرستار تاریک بنا سکتے ہیں یا روشن و تابناک!

---

### نگار فاطمہ فاروقی۔ ردولوی

س۔ خوشتر صاحب! اسرار الحق مجاز کا کوئی حیات افروز شعر سنایئے۔

ج۔ سُنئے ؎

محوِ سفر ہوں گرمِ سفر ہوں
میری نظر میں رفعت نہ پستی

### محبوب ردولی بارہ بنکی

س۔ صحت و زندگی کیا وہی کتاب ہے جسے آپ لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کر چکے ہیں۔ اب اس کی قیمت تین روپیہ ہے؟

ج۔ اس کتاب کا نام "صحت و جوانی" ہے۔ "صحت و زندگی" دوسری کتاب ہے۔ وہ بھی اب تک ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے۔

س۔ کیا آپ مشاعرہ کی محفل میں جگر کو کسی شعر میں روتے ہوئے دکھا سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو ان کا کوئی رومانی ہی شعر سنائیے۔

ج۔ سماعت فرمائیے یہ شعر ؎

غم ہے کیا زینۂ صفات و ذات
غم نہیں ہے تو آرزو، نہ حیات

---

### محمد پرویز انوار، بہار شریف (پٹنہ)

س۔ زندگی تلخ ہو اور ہر طرف مایوسی اور ناکامی نظر آتی ہو تو؟

ج۔ جب بھی بددل نہ ہونا چاہئے ——
صبح پھوٹے گی اسی شام کی تاریکی سے!

س۔ کیا محبت ہی زندگی کی تفسیر ہے؟

ج۔ جی ہاں، لیکن یہ فلمی محبت نہیں —— زندگی سے محبت، حق و صداقت سے محبت، امن و عافیت سے محبت، ملک و قوم سے محبت!

س۔ عورت کا محبت بھرا دل کائنات کی سب سے بڑی شے ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

---

### محمد معصوم انصاری کاسگنجوی، بہار شریف

س۔ بھیّا! بڑھتی ہوئی گرانی کہاں جا کر دم لے گی؟

ج۔ جہاں لوگ بھوک سے دم توڑ دیں گے!

---

س۔ بھیّا! ہمارا دیش شانتی کا پجاری ہے لیکن ہمارا پڑوسی ملک ہماری شانتی کو ختم کرنے کے لئے کیوں بیقرار ہے؟

ج۔ یہ اپنی اپنی فطرت ہے۔ کاش ہمارے پڑوسی ملک اس حقیقت کو سمجھتے!

---

### شامنا سکسینہ، ہندو یونیورسٹی، بنارس

س۔ بھیّا! آپ بتا سکتے ہیں، بھارت میں کتنی بھاشائیں بولی جاتی ہیں؟

ج۔ کچھ دن ہوئے مردم شماری کے رجسٹرار اشوک مترا نے انکشاف کیا تھا، بھارت میں بارہ سو بھاشائیں بولی جاتی ہیں۔

س۔ اتر پردیش میں کتنے لوگ اردو بولتے ہیں؟

ج۔ تقریباً ۸۰ لاکھ —— یہ سرکاری اعداد و شمار ہیں۔ ورنہ سچائی یہ ہے کہ اس سے کہیں زیادہ لوگ اردو بولتے ہیں۔ پڑھے لکھے عوام جو زبان بولتے ہیں وہ اردو ہی تو ہے۔ یہاں تک کہ اسٹیج پر اردو کے خلاف تقریریں کرنے والے بھی اپنے گھروں میں اردو بولتے ہیں۔

---

### شمیم اختر، گیا

س۔ کربلا کی جنگ کیوں اور کس کے بیچ ہوئی؟

ج۔ کربلا کی جنگ حق و باطل کی جنگ تھی جو حق پرستوں اور باطل پرستوں کے درمیان ہوئی۔

---

### محمد سلیم خاں رانی ساگری، گومرہ، دھنبار

س۔ کچھ دن ہوئے "بیسویں صدی" کے ایک شمارے میں تشنہ مظفرپوری کا ایک افسانہ "آبرو" چھپا ہے۔ اس کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مرد ہیں۔ لیکن اسی پرچہ کے صفحہ نمبر ۱۰۴ پر دوسرا افسانہ دیکھتی رہی، تشنہ مظفرپوری ہی کا چھپا ہے لیکن اس میں وہ عورت معلوم ہوتی ہیں کیونکہ مصنفہ تشنہ مظفرپوری لکھا ہے۔ کیا دو افسانہ نگاروں کا نام تشنہ مظفرپوری ہے؟

ج۔ آپ کی نظر کو دھوکا ہوا ہے۔ "بیسویں صدی" میں کسی افسانہ پر مصنف یا مصنفہ نہیں لکھا جاتا۔ دوسری بات یہ کہ ایک ہی شمارے میں ایک ہی فن کار کی دو تخلیقات کبھی نہیں پیش کی جاتیں۔ آپ وہ شمارہ پھر بغور دیکھیں حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔

---

### خواجہ حسین آمبور (مدراس)

س۔ خمار بارہ بنکوی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

کہیں شعر و نغمہ بن کے کہیں آنسوؤں میں ڈھل کے
وہ مجھے ملے تو لیکن ملے صورتیں بدل کے

س۔ اپنی پسند کا کوئی شعر سنائیے۔ شاعر کا نام بھی لکھیے۔

ج۔ علامہ اقبال کا ایک شعر سنئے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے!

س۔ مخدوم محی الدین کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

چٹک رہی ہے کسی یاد کی کلی دل میں
نظر میں رقصِ بہاراں کی صبح و شام لئے

---

### معذرت

"بیسویں صدی" ماہ جون کے شمارہ میں افسر امروہوی ایم۔ اے کے نام سے جو غزل شائع ہوئی ہے وہ دراصل افسر بسوانی صاحب کی ہے۔ ادارہ کو کتابت کی اس غلطی کا بہت افسوس ہے۔

**شفاء اللہ۔ چکر دھر پور۔ سنگھ بھوم**

س۔ آج کل ہندوستان میں ہر جگہ ہڑتال کیوں ہو رہی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ ملک کے سربراہ اور ارباب حکومت مایوس سے ہوں۔ یہ سوچیں کہ وہ ایوان حکومت میں دھینگا مشتی کر کے عوام کے لئے آدرش پیش کرتے ہیں اور عوام باہر ہڑتالیں بھی نہیں کرتے!

س۔ ہندوستان میں غریبوں کی تعداد بڑھتی کیوں جا رہی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ غریب نواز و غربا پرور حکومت نے انھیں پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کا خاطر خواہ موقع دے رکھا ہے!

س۔ ہندوستان دوسرے دیسوں کی بہ نسبت زیادہ غریب کیوں ہے؟

ج۔ آپ کی نظر میں غریب ہوگا۔ عالمی اسٹیج پر ارباب حکومت کی تقریروں میں امیر ہے، خوش حال ہے!

---

**ایم۔ اے۔ خاں۔ سمبل پور**

س۔ زندگی ——؟

ج۔ زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ؟
موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ ہوتا نہیں

س۔ اسلام کے معنی؟

ج۔ گردن جھکانا۔ مان لینا۔

س۔ غالب کا کوئی اچھا سا شعر سنائیے۔

ج۔ غالب کے خاص رنگ میں ان کا ایک شعر سنئے ؎

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نظر جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

**شہاب الدین احمد شوخ بارھوی**

س۔ خوشتر بھائی جان! شاعر کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

ج۔ بھائی جان! آپ شاعر ہیں اور وہ بھی شوخ! اور ہم سے شاعر کے معنی پوچھ رہے ہیں! لغات میں شاعر کے معنی ہیں اشعار کہنے والا اور یہی اصطلاحی معنی بھی ہیں۔

س۔ کیا شاعر اور مصور کے خواب ایک ہی ہیں؟

ج۔ بہت حد تک دونوں کے خواب ایک ہی ہوتے ہیں۔

س۔ حُسن اور شراب میں کیا فرق ہے؟

ج۔ شراب خوار کینسر کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حُسن کے پرستار کی حیات خوشگوار بن جاتی ہے۔ خوشگوار حیات طویل ہوتی ہے۔

---

**سکریٹری انقلاب لائبریری۔ باسنی**

س۔ محترم خوشتر بھائی! کیا چین پاکستان کو ایٹم بم بنانے میں مدد دے سکتا ہے؟

ج۔ ایسے فریب کار سب کو صرف حسین فریب دیتے ہیں!

س۔ علامہ اقبال کا کوئی تاثر انگیز شعر سنائیے۔

ج۔ شاعر مشرق کے سارے شعر تاثر انگیز ہیں۔ ایک شعر آپ بھی سنئے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

---

**محمد عرفان انصاری۔ باگڈیگی بستی (جھریا)**

س۔ خوشتر بھائی! یہ شعر کس کا ہے؟

انگڑائیاں نہ لینے پائے تھے وہ اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

ج۔ یہ شعر نظام رامپوری کا ہے۔ لیکن آپ نے غلط لکھا ہے۔ صحیح یہ ہے ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

س۔ بھائی جان! اگر بچہ اور استاد دونوں ایک جگہ مل جائیں تو ہم پہلے کس کی طرف متوجہ ہوں؟

ج۔ استاد کے ہاتھ میں مولا بخش ہو تو بچہ کی طرف۔ استاد کے ہاتھ میں مولا بخش نہ ہو تو استاد کی طرف!

---

**سیتا رام شرما۔ چنڈی گڑھ**

س۔ آپ اللہ کے ماننے والے ہیں یا ایشور کے؟

ج۔ دونوں کے! ہم ہر سچائی کے پرستار ہیں۔

س۔ زیادہ وفادار عورت ہے یا شراب؟

ج۔ عورت کی مہر و وفا کا جواب نہیں!

س۔ میں سچ کہتا ہوں عورت اور شراب میں کوئی فرق نہیں! آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ عورت کے متعلق ہمارے یہی خیالات نہیں ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین کی یہی رائے ہے کہ عورت امرت ہے!

---

**عثمان۔ اورنگ آباد**

س۔ راجہ مہدی علی خاں کی اچانک موت سے آپ پر کیا گزری؟

ج۔ اس غم کے اظہار کے لئے [illegible] الفاظ نہیں ہیں!




ایڈیٹر پرنٹر پبلشر: خوشتر گرامی ——— مطبوعہ: [illegible] پرنٹنگ ورکس [illegible] بازار دہلی۔ [illegible]

Registered with the Registrar of Newspapers ...

BISWIN SADI

31 ST. YEAR OF PUBLICATION

Telephones Office 271637 Residence 619927

ستمبر





یہ سیم و زر کی بہاروں کا دورِ سرمستی    مری فسردگیٔ روح کو نہ راس آیا
بجھی بجھی سی جوانی، تھکی تھکی سی حیات    میں سوچتی ہوں تجھے کھو کے میں نے کیا پایا

نریش کمار شاد



گزشتہ دنوں دلّی میں انجمن ترقّی اُردو کی نئی تنظیم کے تحت ایک اہم اجلاس منعقد ہوا جس میں دلّی میں یوم اُردو منانے کے علاوہ بہت سے تعمیری فیصلے کئے گئے۔ کیمرے کی آنکھ سے نہ بچنے والوں میں ہیں صغیر احمد صوفی ، خوشتر گرامی ، کوثر چاندپوری، بہار برنی ، منوّر لکھنوی ، بیگم تیمور جہاں ، پرنسپل قمر قرشوری ، بسمل سعیدی ٹونکی ، سیّد ناظم حسین ، رفیق عزیز ، ظفر ادیب ۔





صدر اور نائب صدر کے علاوہ پرنسپل قمر قرشوری کی موجودگی میں جناب بہار برنی نے اجلاس کے اس فیصلے کو قلم بند کیا کہ صدر اور جنرل سکریٹری کے علاوہ تعلیمی سب کمیٹی میں پرنسپل قمر قرشوری اور بیگم مظہر سعید کے ساتھ دلّی میں اُردو اسکولوں کے نمائندے بھی شامل کئے جائیں تاکہ دلّی میں اُردو زبان کی ترویج و ترقی کی رفتار تیز تر ہوسکے۔



جاں نثارانِ اُردو، خوشتر گرامی، کوثر چاند پوری اور [illegible]
جناب کوثر اُردو کے ایک ایسے ادیب ہیں جو ادب برائے زندگی کے ساتھ ساتھ زندگی برائے ادب [illegible]
جناب بہار برنی اُردو کے ایک ایسے مخلص اور سرگرم کارکن ہیں جو گفتار کے نہیں کردار کے



خوشترگرامی کے نورِ نظر عزیزی وجے کمار، ٹیلی ویژن انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے جب جرمنی گئے تو عزیز و اقربا نے انھیں الوداع کہی اور شکستہ دل و شکستہ خصال جناب صالح الدین صاحب نے یہ شعر پڑھ کر سب کے دلی جذبات کی ترجمانی کی ؎

بہ سفر رفتنت مبارک باد
بہ سلامت روی و باز آئی



[illegible]
[illegible]

ایسی نعمت ہے اگر کوئی تو وہ اے مہرباں
صرف ماں



——— اور اپنے فرزندِ دلبند کو رُخصت کرتے ہوئے خوشترگرامی تو بالکل اپنے نام کی ضد بن کر رہ گئے اور جذبات کی شدت میں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے، بھرائی ہوئی آواز اور غم آگیں لہجے میں بمشکل صرف اتنا کہہ سکے

رُخصت، اے نُورِ نظر! تیرا خدا حافظ ہے
رُخصت، اے جانِ پدر! تیرا خدا حافظ ہے
مری دُعائیں جو اِن آنسوؤں میں شامل ہیں
یہی دُعائیں تجھے مجھ سے پھر ملائیں گی

مفارقت کے اِس جذبات انگیز منظر کو دیکھ کر سبھی کی پلکیں نمناک ہوگئیں۔

[illegible] ــــــــ [illegible]

غزل ــــــــ [illegible]

غزل ــــــــ آزر بریلوی

۳۴۔ سینٹ پیٹرس ــــــــ افسانہ ــــــــ پرنسپل جگدیش ایم اے

۳۵۔ غزل ــــــــ [illegible] ــــــــ

۳۶۔ غزل ــــــــ آفسر امروہوی۔ ایم۔ اے ــــــــ ۶۵

۳۷۔ غزل ــــــــ عابد سناوری ــــــــ ۶۵

۳۸۔ رات اور نہار ــــــــ ایم۔ ایف پرویز۔ ایم۔ اے ــــــــ ۶۶

۳۹۔ غزل ــــــــ زبیر فاروقی مہرودی ــــــــ ۷۳

۴۰۔ غزل ــــــــ خزاں چند نسیم ــــــــ ۷۳

۴۱۔ غزل ــــــــ ساغر وارثی عابدی شاہجہاں پوری ــــــــ ۷۳

۴۲۔ اپنا ہی گریباں بھول گئے ــــــــ شاہد فریدی ــــــــ ۷۵

۴۳۔ غزل ــــــــ سید یزدانی جالندھری ــــــــ ۸۳

۴۴۔ غزل ــــــــ اختر واصفی ــــــــ ۸۳

۴۵۔ خط لکھیں گے ــــــــ فکر تونسوی ــــــــ ۸۵

۴۶۔ غزل ــــــــ بیتاب پیلی بھیتی۔ ایم۔ کام ــــــــ ۸۷

۴۷۔ افسانہ نمبر دیکھا ــــــــ اہل قلم حضرات ــــــــ ۸۹

۴۸۔ صحت و زندگی ــــــــ کیا آپ جانتے ہیں؟ ــــــــ صحت کے لئے بھاجی ــــــــ

ناکامی سے بد دل نہ ہوں ــــــــ زندگی کے لئے صحت کی اہمیت ــــــــ خوشی کی تلاش ــــــــ ۹۱

۴۹۔ سرگوشیاں ــــــــ سوال و جواب ــــــــ ۹۵


مستقل خریداروں کی خدمت میں افسانہ نمبر بلا قیمت بھیجا جا رہا ہے [illegible]
کے لئے آپ آج ہی سالانہ قیمت مبلغ چھ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر [illegible]
[illegible] افسانہ نمبر کے لئے آپ کو زائد قیمت نہ دینی پڑے۔ سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں آپ ۲۔۰ پیسے کا فائدہ ہوگا۔ [illegible]
[illegible] نمبروں کے علاوہ دو، دو روپے قیمت کے دو خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں۔

رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

[redacted]

# تیر و نشتر

خوشتر گرامی



چرن سنگھ نے [illegible]

• کانگریس میں ٹوٹنا: ایک خبر ——— معلوم نہیں اس دفعہ کہنے والے نے کونسی استعمال کی ہے جسے دیکھ کر ٹوٹنا جاتا ہے۔

• کلکتہ میں کانگریس کے جلسے میں آنسو گیس کا استعمال: ایک خبر ——— اِس کی ضرورت تو نہیں تھی۔ وہ بیچارے تو پہلے ہی رو رہے ہیں۔

• پانی کی سپلائی کی اسکیمیں: ایک خبر ——— دلّی والے اسکیم والے معلوم کرنے کے خواہشمند۔

• ہریانہ میں بڑھاپے کی پنشن بند نہیں ہوئی: ایک خبر ——— راؤ اینڈ کمپنی نے اپنے مستقبل کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

• ہندوستان کو غذائی مدد ملنے کے امکانات روشن ہو گئے: ایک عنوان ——— اور زیادہ بڑا بلب استعمال کیجئے۔ امکانات اور روشن ہو جائیں گے۔

• کیرالا کے چینی چین کے جاسوس نہیں: وزیرِ اعلیٰ نمبودری پد کا بیان ——— اسے پنجابی میں کہتے ہیں "خوا مخوا گواہ ٹڈو"۔

• چین اور پاکستان ہندوستان کو دشمن نمبر ا سمجھتے ہیں: ایک عنوان ——— اور پاگلوں کے کیا سینگ ہوتے ہیں؟

• اسرائیلی یہودیوں میں صدر جانسن مقبول ترین شخصیت ہیں: ایک خبر ——— اِس لئے کہ ان داتا، دھن داتا اور بم داتا وہی تو ہے۔

• دلّی میں پانی کی کمی: ایک خبر ——— چرن سنگھ کے راج میں کربلا کے



" مرکزی وزارت میں توسیع نہیں ہوگی " اندرا گاندھی کا اعلان

---

وزیرِ صحت نے کہا: ہر اُس مرد یا عورت کو ایک ریڈیو سیٹ دیا جائے گا جو اپنے آپ کو اولاد کے ناقابل بنوائے گا ـــــــ تاکہ وہ بچے کی جگہ ریڈیو گود میں لئے پھرے۔

• علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے حکومت کی اسکیم " ایک عنوان ـــــــ مگر مطمئن رہئے کہ اِن میں وہ ایک زبان نہ ہوگی جس کا ذکر سارے فسانے میں نہیں۔

" موجودہ حکومت نے کانگریس کے مقابلے میں زیادہ بہتر کام کیا ہے " وزیرِ اعلیٰ مدراس کا دعویٰ ـــــــ اپنے منہ میاں مٹھو بن رہے ہو۔ ابھی تو جمعہ جمعہ آٹھ ہی دن ہوئے ہیں حکومت کو۔

• برطانیہ میں تیل کا راشن " ایک خبر ـــــ اسرائیل کی مدد کرنے کا نتیجہ ؏
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

" ماؤسی تنگ کے افکار کی چنگاری " ایک عنوان ـــــــ جس سے آج چین جل رہا ہے اور جا بجا چینی سُلگ رہے ہیں۔

• اُردو کے سلسلے میں تمام سرکاری وعدے کاغذی ہیں۔ عملی طور پر کچھ نہیں کیا جا رہا " ایک مقالہ ـــــــ اسے کیا آپ بے عملی کہتے ہیں کہ اب تک اُردو کو کہیں بھی علاقائی زبان نہیں بننے دیا گیا۔

" غیر ملکی امداد سے چلنے والے منصوبوں کی رفتار سست کی جائے گی " ایک عنوان ـــــــ رفتار سست کرنا کافی نہیں، بالکل بریک لگا دیا جانا چاہئے۔ تاکہ ہم اپنی مدد آپ کرنے کے قابل ہو سکیں۔

کسی خاتون ملازمہ کو تیسرے بچے کی پیدائش کے بعد زچگی کی چھٹی نہ ملے گی " حکومت ہند کا فیصلہ ـــــــ مرد کو تو پہلے بچے کی پیدائش پر بھی کوئی چھٹی نہیں دیتی سرکار۔



"یو۔پی اسمبلی کے ممبروں میں فساد۔ ایک دوسرے پر گھونسوں اور جوتوں کی بارش۔"

"زبان اور سرحدی تحفظ کے مسئلے پر میں خود کو جن سنگھ کے نزدیک پیار ہوں" ڈاکٹر لوہیا ــــــ بالکل قریب ہو جائیے، گلے ملئے۔

"میری پالیسی سے متفق نہیں تو دوسرا لیڈر چن لو" وزیراعظم کا نکتہ چینوں کو جواب ــــــ او ــــــ زندہ باد جواہر لال کی بیٹی۔

"جھگی جھونپڑی والوں کو پنکھا کالونی میں متبادل جگہ" ایک خبر ــــــ تاکہ انھیں پنکھا خریدنا نہ پڑے۔

"ماؤ کے مخالف ہارے نہیں" ریڈیو پیکنگ کا اعتراف ــــــ بلکہ چھاتی پر مونگ دل رہے ہیں۔

"آگ سے مت کھیلو" اسرائیل کو انتباہ ــــــ ورنہ راکھ ہو جاؤ گے برخوردار۔

"اردو کو یو۔پی میں ثانوی زبان نہ بنایا گیا تو ری پبلکن حکومت سے نکل جائیں گے" ایک خبر ــــــ اپنی وزارت کھوئیں گے کسی جن سنگھی کی قسمت کھل جائے گی۔

"بجٹ کے ٹیکسوں میں رعایتیں" ایک عنوان ــــــ ایسی جیسے آٹے میں نمک یا تل پر سفیدی۔

"دلی سے ڈبل روٹی کی برآمد بند" ایک خبر ــــــ مگر سنگل روٹی کی اجازت ہے۔

"بل پیش کرنے کے وقت وزیر غائب" ایک عنوان ــــــ غنیمت ہے کہ بل تو حاضر تھا۔

"حصار میں سیلاب کا خطرہ ٹل گیا" ایک خبر ــــــ مگر چنڈی گڑھ میں تو ہر وقت امکان ہے۔ راؤ وزارت اور گورنام سنگھ وزارت لرزتی رہتی ہے۔



کانگریس نے راجے مہاراجوں کے جیب خرچ ختم کرنے کی تجویز منظور کی ہے۔



بہت سے کانگریسی ممبر اپوزیشن لیڈر گوالیار کی راج ماتا کی لیڈرشپ میں قائم شدہ سنڈیکیٹ دَل میں شامل ہوگئے ہیں۔

---

• "چار برس میں عوام پر چالیس ارب کے نئے ٹیکس" پروفیسر رنگا کا انکشاف ـــــــ

نرخ بالاکن کہ ارزانی ہنوز

---

• کاغذ کے تاجر کی مسروقہ کار برآمد" ایک خبر ـــــــ کار بھی کاغذ ہی کی ہوگی۔ یا پھر چوری کاغذی ہوئی ہوگی۔

---

• "پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں بدعنوانیاں" ایک خبر ـــــ پرائیویٹ قسم کی۔

---

• "آسام میں ایک نئی سیاسی جماعت کا قیام" ایک خبر ـــــــ یہ سوچا ہوگا کہ نئی ریاست بننے والی ہے تو نئی سیاست بھی شروع کی جائے۔

---

• "چھانٹی نہیں ہوگی اور بونس زیرِ غور" ایک عنوان ـــــــ یعنی دو دو اور چپڑی ہوئی۔

---

• "دِلّی کے قریب ہریانہ کی دو کالونیاں منظور ہوں گی" ایک خبر ـــــــ تاکہ وہاں قانونی طور پر شراب تیار ہو اور پھر دلّی میں غیر قانونی طور پر فروخت ہوسکے۔

---

• "ہم سیاہ فام انقلاب لانا چاہتے ہیں" امریکہ کی سیاہ فام کانفرنس کا فیصلہ ـــــ اِس کے لئے تارکول کا بڑا لمبا خرچ ہوگا۔

---

• "مکمل شراب بندی کی کوئی مدت متعین نہیں ہے" وزارتِ داخلہ کے منسٹر آف اسٹیٹ کا بیان ـــــ اِس لئے غم پر غم لنڈھاؤ۔ ڈرکس کا ہے۔

---

• "رومانیہ بھی اسرائیل کا مخالف ہوگیا" ایک خبر ـــــ جس جس کی آنکھ کھلتی جائے گی اِسی راستے پر چلتا جائے گا۔

---

• "کمپنی باغ سے نوزائیدہ بچہ ملا" ایک خبر ـــــ کمپنی کا مال ہوگا۔

---

• "وزارت کو خطرہ نہیں مگر پھر بھی وزارت میں توسیع ہو گی" وزیرِ اعلیٰ بہار کا اعلان ——— عقلمند وہ ہے جو ہوا کا رُخ پہچان لے۔ اچھا فیصلہ ہے۔ بڑی تیز و تند ہوائیں چل رہی ہیں۔

• "سنیکت ودھایک دل یوپی کے پروگرام میں اُردو کو تسلیم کرنے کی پالیسی شامل۔ اب اس پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا؟" اسمبلی اور کونسل میں تقریریں ——— یہ پروگرام ہاتھی کے دانت ہیں۔ دکھانے کے اور کھانے کے اور۔

• "موجودہ حالات میں اُجرتوں کو منجمد کرنے کا کوئی سوال نہیں" وزیرِ محنت ——— بلکہ گرمی میں اُن کا منجمد ہونا ممکن بھی نہیں۔

• "اُردو کتاب ضبط" ایک خبر ——— کرم ہے بندہ پرور کا۔ کہیں تو یاد آئی اُردو کی۔

• "ملک کی غذائی صورتِ حال بہت کٹھن ہے" اندرا گاندھی ——— لہٰذا کھانے پینے میں کٹھنائیاں پیدا ہوں گی۔

• "آندھرا کو حیرانی" ایک عنوان ——— اور مدھیہ پردیش کو پشیمانی۔

• "سب زبانوں کے لئے ایک رسم الخط ہونا چاہئے" وزیرِ ٹرانسپورٹ کی رائے ——— ایسی رائے کو کسی جہاز میں رکھ کر اُسے بغیر پائلٹ کے فضا میں چھوڑ دیجئے۔

• "شاستری جی کی یاد میں ٹکٹ" ایک خبر ——— بڑی فضول خرچی ہے۔

• "مرکزی کابینہ میں امکانی ردّ و بدل کی تردید" ایک خبر ——— ع
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

• "ایک ممبر نے تین دن میں تین بار پارٹی بدلی" ایک خبر ——— جمہوریت میں ایک نئی کنونشن قائم کردی۔



"ایوب گورنمنٹ میرا پیچھا کر رہی ہے" مسٹر بھٹو کا الزام

# چو این لائی

## خوشتر گرامی

پست قامت، پست فطرت، چہرہ کتابی، پلپلی سی آنکھیں، گال پچکے ہوئے، منہ پر زردی، ابرو کے ایک ایک بال میں ایک ایک فتنہ چھپا ہوا، پھوڑی ناک، اُلٹے بال۔ یہ ہیں چین کے وزیرِ اعظم



جس ہانڈی میں کھائیں اُسی میں چھید کریں۔ جس سے ہاتھ ملائیں اُسی کے لئے مارِ آستین ثابت ہوں۔ اِن کی دوستی میں بھی گھاٹا، دشمنی میں بھی نقصان۔ احسان فراموش اِتنے کہ اپنے آقا و مولا روس کو بھی ڈسنے پر تُلے رہتے ہیں ——— ہر قدم پر فساد، ہر کلام میں گالی۔ ہر پڑوسی سے لڑائی۔ جس مُلک میں جائیں جاسوسی کریں۔ توڑ پھوڑ میں مشغول رہیں۔ جواہر کے جوہر نہ بھائے، خروشچیف کے لئے خدشے پیدا کئے۔ نہ ڈپلومیٹ کی عزت، نہ اخبار نویس کا احترام ——— برما سے لڑائی، ملائیشیا سے تناتنی، انڈونیشیا سے جھگڑا، منگولیا سے اَن بَن، روس سے تُو تُو مَیں مَیں اور ہندوستان سے تو مستقل چھیڑ خانی ہے۔

مختصر یہ کہ ع

افسانہ

# گستاخی معاف

م۔ک۔ مہتاب ایم۔ اے

ای۔ جی۔ ۹۰۴، پریم نگر۔ جالندھر
۳۰ جون ۱۹۹۶ء

محترم خوشتر صاحب! آداب

افسانہ نمبر ملا۔ یہ رنگ برنگے پھولوں کا حسین گلدستہ ہے جس کی خوشبو اتنی جلدی ملک کی سرحدیں پار کر گئی ہے کہ مجھے اس کی تعریف میں متحدہ عرب جمہوریہ اور تانزانیہ سے بھی خطوط ملے ہیں —— آپ کو یہ قابلِ رشک کامیابی مبارک ہو! کچھ دوستوں کے اصرار پر ایک طربیہ افسانہ ارسالِ خدمت ہے امید ہے انھیں پسند آئے گا....

آپ کا اپنا —— م۔ک۔ مہتاب

ریتا جب اُترنے کے لئے گاڑی کے دروازے میں آئی تو پرکاش اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ بیس بائیس برس کی بھرپور جوانی، سبز رنگ کی گرم پتلون، سیاہ رنگ کی چُست جرسی اور کندھوں پر لہراتا ہوا پیازی رنگ کا ہاف کوٹ، تراشے ہوئے خوبصورت بالوں پر پھول دار ریشمی رُومال، روشن آنکھیں، چمکتا ہوا چہرہ۔ ریتا نے ہاتھ جوڑ کر پرکاش کو نمستے کی اور پرکاش جواب میں نمستے کہنے کی بجائے کہہ اُٹھا "گولڈن ایپل!" واقعی ریتا پکا ہوا سنہرا سیب معلوم ہو رہی تھی۔ پرکاش نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اُن کے ہاں جو مہمان آ رہے ہیں وہ ایسے ہوں گے۔ ریتا کی نانی اُس کے ساتھ تھی۔ کوئی ساٹھ باسٹھ برس کی خوش پوش بڑھیا جس کے سفید ریشمی لباس پر کالا شال کیا پھب رہا تھا۔ جس کے لباس سے عطر کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ جس کے مصنوعی دانت اور سُنہرے فریم کا نفیس چشمہ اُس کے چہرے پر بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔

پرکاش نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ سامان اُٹھوایا اور اُن سے آگے آگے قلیوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا لیکن نانی اور دوہتی نے ایک ہی نظر میں اُس پر نہ جانے کیا جادو کیا تھا کہ وہ قلیوں کو ہدایت دینے کے بجائے بار بار مُڑ کر دیکھ لیتا تھا۔ گولڈن ایپل اُسے اس پیاری سی لڑکی کے لئے کتنی خوبصورت تشبیہ سُوجھی تھی۔

"پرکاش بیٹا! ہمارے ساتھ چلو نا۔ یوں تو ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے۔"

ریتا کی نانی نے دم لینے کے لئے رُک کر آواز دی۔ پرکاش اُن کے قریب آ کر بولا۔ "مجھے تو ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک تو قلی تیز چلتے ہیں۔ دوسرے آپ لوگوں سے زیادہ جان پہچان بھی نہیں۔"

"اوہو! تمہاری جان پہچان نہیں تو کیا ہوا۔ ہماری تو ہے۔ تمہاری ممی نے تمھیں کچھ بتایا نہیں۔ وہ میرے ہاتھوں میں ہی پل کر بڑی ہوئی۔ بیاہ کر ہمارے ہی پڑوس میں آئی۔ پھر تمہاری اور ریتا کی ممی سہیلیاں ہیں۔ ریتا کی ممی کو تمھاری ممی ہی نے تو لکھا تھا یہاں موسم بہت اچھا ہے مونا کو بھیج دے۔ کچھ دن دل بہل جائے گا۔ اور میں بھی ساتھ چلی آئی۔ دلی کی گرمی تو جہنم کی آگ سے کم نہیں۔ کرشنا نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ یہاں موسم کتنا اچھا ہے۔ چار ہی قدم چل کر سفر کی ساری تکان دُور ہو جاتی ہے لیکن کرشنا خود اسٹیشن پر کیوں نہ آئی۔"

"وہ —— وہ" پرکاش جیسے ریتا کے حُسن میں کھو گیا ہو اور جواب دینے میں گھبرا گیا ہو۔ "وہ ۔ ماتا جی مہاسو گئی ہیں۔ پرسوں ہی پتا جی کا خط آیا تھا کہ انھیں بخار ہے۔ اس لئے وہ کچھ دنوں کے لئے چلی گئی ہیں۔"

"کاکا اور گڈی تو یہیں ہوں گے۔"

"وہ بھی ساتھ ہی گئے ہیں۔ کہتی تھیں وہ نہ ہوں گی تو اُن کی دیکھ بھال

مشکل ہوگی۔ پھر بچوں کے جانے سے پتا جی کی صحت بھی شاید جلد سدھر جائے۔"

"نہیں کہہ دیتیں ہم رُک جاتے۔ اُن کے بغیر یہاں کیا لطف ہوگا؟"

"پھر کیا ہوا۔ وہ مجھے سب سمجھا گئی ہیں۔ لازم ہے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ آپ کو جب کہیں گھومنے پھرنے جانا ہو مجھے بتا دیا کیجئے۔ میں چھٹی لے لیا کروں گا۔"

ریتا پرکاش کی بات پر مسکرا دی۔ جیسے سنہرے سیب پر سورج کی کوئی کرن کھیلنے لگی ہو۔

"بیٹا تم ملازم کہاں ہو؟" نانی نے پوچھا۔

"میں لائف انشورنس کارپوریشن میں ہوں اور ..." اور وہ گلیوں کو کاٹ دیتا ہوا ایسا لگ گیا جو پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے کی بجائے نیچے اُتر رہے تھے۔

گھر پہ اُنھیں آرام کے سب سامان مہیا کر کے پرکاش دفتر چلا گیا۔ جب لوٹا تو دونوں جانے کب سے اُس کی منتظر تھیں۔

"کیا میں بھی آپ کو نانی جی کہا کروں؟"

"ہاں ہاں۔ کرشنا اور لیلا دونوں میری بیٹیاں ہی تو ہیں۔"

"لیکن آپ چُپ چُپ کیوں بیٹھی ہیں نانی جی؟"

"یونہی سوچ رہے ہیں کہ آئے تو دل بہلانے تھے۔ مگر یہاں اکیلے بیٹھ کر تو دل اور بھی اُداس ہوگا۔"

"آپ بے فکر رہیے۔ میں حاضر ہوں۔ شام ہو لینے دیجئے ہم سیر کے لئے چلیں گے۔ ریتا کہاں ہے؟"

"وہ اندر لباس تبدیل کر رہی ہے۔ کیا تم چائے نہیں پیو گے؟"

"کیوں نہیں ضرور پیوں گا۔ مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ آپ لوگ آ گئے، ورنہ نہ جانے یہ دن تنہائی میں کیسے کٹتے۔"

پرکاش نے ملازم کو آواز دی پھر خود ہی اُٹھ کر میز پر چائے کے لئے سامان لگانے لگا۔ اتنے میں ریتا کمرے میں داخل ہوئی جیسے پھولوں کی خوشبو کا کوئی جھونکا پردہ ہٹا کر کمرے میں آ گیا ہو۔ پرکاش اُس پیکرِ حُسن کو خراجِ تحسین پیش کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہی لڑکی جو صبح اینگلو انڈین معلوم ہوتی تھی اب خالص لکھنوی انداز میں نکھرا ہوا چاند دکھائی دے رہی تھی۔ سفید اطلس کا پاجامہ، چکن کی قمیص اور کندھوں پر سرسراتا ریشمی دوپٹہ۔ کیا پھبن تھی۔ اُسے دیکھتے دیکھتے پرکاش کے ہاتھ سے دو بار پیالی قالین پر گری اور ایک بار تو بدحواسی میں اُس نے چائے کے پیالے کی بجائے چینی دودھ دانی میں ڈال دی۔

ریتا مُسکرائی پھر ہنسی ضبط نہ کر سکی جیسے فوارہ چھوٹ پڑا ہو۔

"معاف کرو ریتا۔ جب اجنبی لوگ ملتے ہیں تو کچھ جھجک ہوا ہی کرتی ہے۔"

پرکاش نے بات بنائی۔

"تو کیا آپ ابھی اجنبی ہیں؟" نانی جی ہنستی ہوئی بولیں۔

پھر وہ سب مختلف موضوعات پر باتیں کرنے لگے۔ ماضی کی باتیں، حال کی باتیں، مستقبل کی باتیں۔ ریتا کے شوقِ مصوّری اور نوکری کی باتیں، پرکاش کی کرکٹ سے دلچسپی کی باتیں۔ کرشنا اور لیلا کے بچپن کی باتیں۔

سورج ڈھلنے تک نانی جی کو کچھ ایک سوشل ہو گیا تھا۔ شال کو اچھی طرح اوڑھتی ہوئی بولیں "بیٹا مجھے تو سردی محسوس ہو رہی ہے۔ تم دونوں ہی سیر کے لئے چلے جاؤ لیکن دُور نہ جانا۔ ریتا بہت تھکی ہوئی ہے۔"

ریتا کے ساتھ چلتے ہوئے پرکاش یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اُڑتا چلا جا رہا ہو۔ پھر اس کی میٹھی میٹھی باتیں اور ہلکی ہلکی مُسکان اُسے ایک نئی زندگی کا پیغام دے رہی تھی۔ شناسا لوگوں سے بچتا ہوا وہ ریتا کو ایک غیر آباد سڑک سے کافی ہاؤس لے گیا۔ کافی ہاؤس میں بیٹھا وہ ریتا کو پہاڑ پر آنے والے سیلانیوں کے قصّے سُناتا رہا۔ ریتا نے اُسے بتایا کہ وہ کپڑے کے ایک کارخانے کے لئے سکرین پرنٹنگ کے ڈیزائن تیار کرتی ہے —— وہ بہت تھک گئی تھی۔ کچھ باتوں کو بھولنا چاہتی تھی۔ دہلی کی تھکا دینے والی زندگی کی گھٹن سے کچھ دن باہر جانا چاہتی تھی۔ اور پرکاش نے اُسے یقین دلایا کہ اُسے یہاں اتنی تفریح ملے گی کہ جب وہ لوٹے گی تو گلاب کی پتی کی طرح تر و تازہ ہو گی۔ وہ یہاں جی بھر کر تصویریں بنا سکے گی۔

(اور ایک ہی ملاقات میں وہ تعارف کی کئی منزلیں طے کر گئے)

صبح جب پرکاش چائے کا پیغام دینے کے لئے ریتا کے کمرے میں آیا تو ریتا بورڈ پر کاغذ لگائے ایزل ہاتھ میں پکڑے رنگوں کا کھیل کھیل رہی تھی اور کھڑکی میں سے نظر آتے ہوئے طلوعِ آفتاب کے منظر کو کاغذ پر اُتار رہی تھی۔

"بہت خوب! بہت خوب!! ریتا تم جتنی حسین ہو اُس سے کہیں زیادہ خوبصورت تمہارا فن ہے!"

جواب میں ریتا بولی نہیں۔ جھکی جھکی نظروں سے پرکاش کو دیکھا پھر ناک سکوڑ کر ہنسنے لگی جیسے کہہ رہی ہو آپ کو میرے حُسن کا کیسے خیال آ گیا صاحب؟

پھر وہ باتیں کرنے لگے۔ ریتا اپنی کچھ تصویریں اٹیچی میں سے نکال لائی۔ اور پرکاش ہر تصویر پر داد دینے لگا۔

"میں بھی تمہیں کچھ تصویریں دکھاؤں۔" پرکاش کو ایک دم ایک خیال آ گیا۔

"کس کی تصویریں؟" ریتا نے اپنی تصویر کو آخری ٹچ دیتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ایک بزرگ تھے۔ میرے پتا جی کے چچا۔ بہت دلچسپ آدمی تھے۔ عمر کے آخری دنوں تک بڑی خوبصورت تصویریں بناتے رہے۔ اُن کی کچھ تصویریں پتا جی کے ہاتھ بھی لگیں۔ وہ ابھی تک ہمارے ہاں رکھی ہیں۔"

اور پرکاش میز کی دراز میں سے البم اُٹھا لایا۔ ریتا مُنھ میں اُنگلی دابے اس بزرگ کے فن کی داد دیتی رہی۔

البم کے آخر میں ایک پورٹریٹ بھی تھا کسی نہایت خوبصورت لڑکی کا چہرہ۔ "یہ کون ہے؟" ریتا نے تصویر میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو کچھ علم نہیں۔ اُن کی سب تصویریں قدرتی مناظر ہی کی ہیں۔ البم میں صرف یہی پورٹریٹ ہے جس میں کسی کے جذبات یا شاید اُن کے اپنے جذبات کا اظہار ہے۔ پتا جی کو بھی یہ تصویر بہت پسند ہے۔ میرے خیال میں اِسی لڑکی کی کچھ اور تصویریں بھی اُنھوں نے بنائیں۔ آڑے سیدھے خطوط میں، پتّوں اور تنکوں میں، سیاہ و سفید رنگوں میں، بادلوں میں، کئی تو تصویریں معلوم ہی نہیں ہوتی تھیں حقیقی مناظر معلوم ہوتے تھے لیکن ہر تصویر میں ایک انسانی چہرہ اُبھرتا ہوا دکھائی دیتا تھا بالکل یہی چہرہ!"

"وہ تصویریں کہاں ہیں؟" ریتا کی دلچسپی بڑھ گئی۔

"کوئی کسی کے پاس چلی گئی کوئی کسی کے پاس۔ اُنھوں نے تو عمر بھر شادی نہیں کی۔ نہ کبھی گھر بنایا۔ گھومتے ہی رہے۔ ہمارے ایک اور بزرگ کہا کرتے ہیں۔ آنند جی کیا خوب انسان تھا اُس کا عقیدہ تھا انسان تو دریا میں بہتا ہوا پانی ہے۔ جو کناروں سے کھیلتا پھولوں کو چُومتا آخر سمندر میں جذب ہو جاتا ہے۔ کیا پانی کو بھی کبھی کسی نے بیڑیاں پہنائی ہیں۔"

"خوب بہت خوبصورت خیال ہے!" ریتا جذباتی ہو کر تالی بجانے لگی۔ تصویر اُٹھا کر رکھ دی۔ ہاتھ دھوئے اور لباس تبدیل کرتے ہوئے بولی۔

"لیکن ندی کے پانی میں ہمیشہ ایک ہی چہرے کا عکس کیسے دکھائی دے سکتا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن جتنی تصویریں میں نے دیکھی ہیں اُن میں تو ایک ہی عکس دکھائی دیا۔ پتا جی کہتے ہیں شاید اُن کے ذہن پر کوئی تصویر اپنا مستقل نقش چھوڑ گئی تھی۔"

"بہت اچھی تصویر ہے۔" اور مونا ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"کیا بات ہے؟"

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ تصویر میری نانی جی کی ہو!"

اور دونوں اس خیال پر بہت دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔

"نہیں۔ پرکاش ذرا غور سے دیکھو تو سہی۔ ذرا آنکھوں میں جھانکو میں غلط نہیں کہتی۔"

"چلو نانی جی سے پُوچھ ہی کیوں نہ لیں۔"

نانی جی تصویر دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولیں۔

"کیا یہ تصویر شری آنند کی بنائی ہوئی ہے!"

"ہاں۔ ہاں۔ وہ میرے پتا جی کے چچا تھے۔ بہت اچھے فن کار تھے ساری زندگی کنوارے رہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں گھوم کر تصویریں بناتے رہتے پھر ایک روز کسی پہاڑ ہی میں گم ہو گئے۔

"اچھا" نانی جی نے حیرت سے کہا۔

اور اگلے دن ریتا اور پرکاش جب سیر کے لئے گئے تو ریتا نے پرکاش کو بتایا کہ نانی جی نے اُسے تصویر کی داستان سُنائی ہے۔ آپ کے آنند جی کو میری نانی جی سے پیار تھا لیکن وہ کبھی کُھل کر پیار کا اظہار نہ کر سکے اور نانی جی بھی یہی سمجھے رہیں کہ آنند ایک آوارہ مزاج نوجوان ہے۔ بہتے دریا کا پانی ہے جسے کہیں قرار نہیں ہے۔ ایسے شخص کے دامن سے بندھ کر اُن کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔

"قہ۔ قہ۔ قہ۔ قہ" پرکاش نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "لڑکیاں کتنی بے وقوف ہوتی ہیں۔ کتنی جلدی فیصلے کر لیتی ہیں۔ کس طرح لوگوں کی زندگی سے کھلواڑ کرتی ہیں۔ اگر نانی جی نے آنند جی کے من میں جھانک کر دیکھ لیا ہوتا تو انھیں پتہ چل جاتا کہ وہ کیوں عمر بھر اُنھیں کی تصویریں بناتے رہے۔ ہو سکتا ہے وہ جنگلوں اور کہساروں میں اسی لئے بھٹکتے رہے ہوں۔ بے وقوف لڑکیاں۔۔۔ کیا تمہاری نانی جی سمجھتی تھیں کہ آنند جی کے پاس کچھ نہ تھا۔ اُن کی تصویریں یورپ اور امریکہ میں بکتی تھیں۔ ان کی ایک ہی نمائش سے انھیں امریکہ سے کئی ہزار ڈالر ملے تھے۔ انھیں اپنا مطلوب مل گیا ہوتا تو وہ اب لاکھوں کے مالک ہوتے! اب بھی وہ اپنی وصیت میں آرٹ کے اسکولوں کے لئے ایک لاکھ روپیہ چھوڑ گئے ہیں۔

"اچھا!" ریتا نے حیرت سے پوچھا۔

"جبھی تو میں تمہاری نانی جی کو بے وقوف کہہ رہا ہوں جنھوں نے دولت، عزت، شہرت سب اِس لئے ٹھکرا دی کہ وہ پردہ اُٹھا کر نہ دیکھ سکیں۔ اگر ایک [illegible] انسان ٹھکرائے جانے کے بعد بہتے دریا کا پانی ہو جائے تو اس میں اُس کا کیا قصور ہے۔ میں نے تو خود اُن کی زندگی سے یہی سبق حاصل کیا ہے کہ پانی اگر کہیں رُک جائے تو اس میں سڑاند آ جاتی ہے۔ جہاں سے خوشی حاصل ہو حاصل کی جائے۔ کناروں سے کھیلا جائے۔ پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کی جائے اور اپنی جھولی مسرتوں سے بھر لی جائے۔"

"لیکن آپ خود ہی تو کہہ رہے ہیں کہ آنند جی زخم کھانے کے بعد اِس خیال کے حامی ہو گئے تھے۔"

"ہاں ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک شخص کی غلطی دوسرے کے لئے سبق تو بن سکتی ہے۔"

ماڈ گھل جانے کے بعد نانی جی پرکاش اور ریتا کے پاس کم بیٹھنے لگی تھیں۔ وہ دونوں زیادہ تر اکیلے ہی گھومنے پھرنے جاتے۔

پرکاش کو شملے میں رہتے ہوئے کئی برس ہو گئے تھے لیکن اُسے وہاں کی زندگی پہلے کبھی اتنی حسین نہ معلوم ہوتی تھی۔ ریتا بھی کیا تھی ایک حسین ماڈل جس پر ہر لباس اور ہر میک اَپ بے حد جچتا تھا۔ وہ ایک مصور ہی نہیں خود تصویر بھی تھی! آہستہ آہستہ ریتا کا دل بھی لگنے لگا۔ بجھی ہوئی ریتا۔ چند ہی دن میں شگفتہ پھول دکھائی دینے لگی۔ رنگ برنگے پھولوں سے دل بہلانے والا پرکاش جس نے ماں سے کہہ دیا تھا کہ وہ شادی کرے گا ہی نہیں ایک ہی پھول کا بھنورا بن کر رہ گیا تھا۔

وہ دفتر سے ایک ہفتہ چھٹی پر رہا۔ اور یہ دن اور راتیں اُسے اپنی زندگی کا ایک انوکھا باب معلوم ہونے لگیں۔

ایک شام انہیں پکچر دیکھنے کے لئے جانا تھا۔ ریتا اپنے کمرے میں بیٹھی لباس تبدیل کر رہی تھی۔ پرکاش باہر نانی جی کے پاس بیٹھا اُن سے اُن کے ماضی کی باتیں کر رہا تھا۔ نانی جی پوچھنے لگیں۔

"پرکاش تم نے انجینئرنگ کیوں نہیں؟"

"یہ تو اپنا اپنا شوق ہے مجھے انتظامیہ لائن پسند ہے۔"

"یہ ڈیزائن انجینئرنگ کی ملازمت کیسی ہوتی ہے؟"

"اگر کسی اچھی فرم یا کارخانے کی ملازمت ہو تو بہت اچھی ہے۔ یہ لوگ خوب کماتے ہیں اور کارخانوں کی کامیابی میں اُن کا بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ آپ کس کے لئے پوچھنا چاہتی ہیں؟"

"وہ ہمارے ہاں ایک مسٹر ہریش ہیں ڈیزائن انجینئر۔ اُسی کارخانے میں جہاں ریتا کام کرتی ہے۔"

"پھر کیا؟" ہریش نے قدرے گھبراہٹ سے پوچھا۔

"کیا ریتا نے تمہیں اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں تو!" ایک انجانے خوف سے جیسے ہریش کا دم گھٹنے لگا۔

"ہریش کے ماں باپ ریتا کے رشتے کے لئے بہت زور دے رہے ہیں۔ ہریش بھی ریتا کو بہت چاہتا ہے لیکن نہ جانے کیوں ریتا رضامندی کا اظہار نہیں کر رہی ہے۔ کچھ ڈرتی ہے۔ شاید کسی نے غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ ہمیں ہریش پسند ہے لیکن ہم اپنی پسند کے لئے ریتا کو مجبور نہیں کرنا چاہتے۔ اِسی لئے ریتا کی ممی نے کہا میں اسے کچھ دن باہر لے جاؤں تاکہ ایک تو اس کی طبیعت سنبھل جائے۔ دوسرے وہ لوگ تو ہر روز اب ہمارے گھر آ کر دباؤ ڈالنے لگے تھے۔"

پرکاش میں شاید اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ تھی وہ جانے کیا آدھا کپ وہیں چھوڑ کر دروازے کا پردہ ایک طرف کھینچتے ہوئے ریتا کے کمرے میں چلا گیا۔

ریتا آئینے کے سامنے بیٹھی چہرے کے خدوخال دُرست کر رہی تھی۔ کمرہ بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پلنگ سے ایک شال کھینچ کر سینے پر ڈال لی پرکاش کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ نتھنے پھول رہے تھے۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی

"کیا بات ہے پرکاش؟" ریتا نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ ہریش کون ہے؟"

"آپ کو ہریش سے کیا مطلب ہے؟"

"مطلب ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں تم نے ہریش کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟" پرکاش نے ریتا کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"میں آج ممی کو لکھ رہی ہوں مجھے شادی سے کوئی انکار نہیں۔"

"نہیں یہ شادی نہیں ہو سکتی!" پرکاش نے دونوں ہاتھ ریتا کے کندھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

"شادی میری ہوگی۔ میری مرضی سے ہوگی۔ آپ اِس پر پابندی لگانے والے کون ہیں؟"

"اگر تمہیں ہریش ہی کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا تو میرے ساتھ یہ سوانگ رچانے کا کیا مطلب تھا؟ مجھے اُلجھنوں میں کیوں ڈالا؟"

"میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا۔ کوئی وعدہ نہیں کیا۔ آپ بھی دل بہلا رہے تھے اور میں بھی تکان دُور کر رہی تھی۔"

"تو کیا یہ سب دل بہلاوا تھا؟" پرکاش نے ریتا کے کندھے جھنجھوڑ دیئے۔

"آپ خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ انسان دریا کا پانی ہے۔ پھولوں سے دل بہلاتا ہے۔ کہیں ٹھہر جائے تو اُس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ میں آپ کے بارے میں سوچ بھی کیسے سکتی تھی۔ اگر آپ کو میرے ساتھ دل بہلانے کا حق ہے تو کیا مجھے آپ کے ساتھ گھومنے پھرنے کا بھی حق نہیں؟"




"بے وقوف نہ بنو لڑکی! تم جلد بازی میں یہ غلط فیصلہ کر کے پچھتاؤ گی جس طرح آج تک تمہاری نانی پچھتا رہی ہے۔"

"میں اپنے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہوں۔"

"لیکن میرے جذبات سے کھیلنے اور مجھے پاگل کر دینے کا حق تمہیں نہیں ہے! اب تمہیں اِس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ تمہیں میرا فیصلہ ماننا ہوگا!"

"کیا؟"

"تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔ ورنہ...."

"ورنہ کیا....؟" ریتا نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

پرکاش کے ہاتھ ریتا کے کندھوں سے اُس کی گردن پر آگئے اور وہ اونچی آواز میں بولا۔

"ورنہ میں تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں یہاں کسی کھڈ میں پھینک دوں گا اور خود کسی پہاڑ میں گم ہو جاؤں گا!"

"اچھا! مجھے سوچنے دیجیئے۔" ریتا نے ہاتھ سے پرکاش کی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے اُکھڑی اُکھڑی سانسوں میں کہا۔

"نہیں۔ مجھے ابھی فیصلہ چاہیئے!" پرکاش نے گرفت اور سخت کر دی۔

"اچھ.... چھا۔ اچھا!"

اتنے میں ریتا کی نانی اندر آگئی۔ پرکاش نے جھٹ ریتا کا ہاتھ تھام لیا اور بولا "نانی جی! ریتا نے فیصلہ کر لیا ہے!"

"کیا؟"

"بس یہی!" اور اُس نے ریتا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

"کیا تمہیں ریتا پسند ہے؟"

"کیوں نہیں؟"

"لیکن تمہاری ممی نے تو لکھا تھا کہ تم شادی کرو گے ہی نہیں۔"

"شادی میری ہوگی۔ اس کا فیصلہ مجھے ہی کرنا ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارا یہاں آنے کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔"

نانی جی کا چہرہ خوشی سے کھِل اُٹھا۔

"کیا۔ کیا۔ کیا کہا ہے آپ نے۔ کیا یہ سب ڈرامہ ہی تھا؟" پرکاش نے حیرانی سے نانی جی اور ریتا کی طرف دیکھا۔

نانی خاموش تھیں۔ ریتا مُسکرائی اور لکھنوی انداز میں آداب بجا لاتے ہوئے بولی۔

"گُستاخی معاف!"

# غزل

کرشن موہن
ایم۔اے

یہ شب بہت حسیں ہے، غزل ابتدا کرو
فردا کا غم نہیں ہے، غزل ابتدا کرو

بے نغمہ و سرود کی، دنیا کو احتیاج
دنیا بہت حزیں ہے، غزل ابتدا کرو

مدت سے اہلِ عشق کے قلب و دماغ میں
اِک تیرگی مکیں ہے، غزل ابتدا کرو

رونق فروزِ خانۂ مہجور آج رات
محبوبِ مہ جبیں ہے، غزل ابتدا کرو

اُس کی نظر میں بادۂ رنگیں کی آنچ ہے
ہونٹوں میں انگبیں ہے، غزل ابتدا کرو

تاروں کی بزمِ ناز میں رخشندہ چاند کا
کیا حُسنِ شبنمیں ہے، غزل ابتدا کرو

اب تابِ انتظار نہیں ساقیِ حسیں
کوثر بہ ساتگیں ہے، غزل ابتدا کرو

اِک مُدتِ مدید سے قلبِ فسُردہ میں
کیفِ الم نہیں ہے، غزل ابتدا کرو

میری اُداسیوں کا مداوا ہے کیفِ شعر
اب تک مجھے یقیں ہے، غزل ابتدا کرو

گو قدرِ شعر عام نہیں ہے، چراغِ فکر
روشن کہیں کہیں ہے، غزل ابتدا کرو

میرے دلِ رمیدہ کو دُنیا کی فکر کیا
دنیا تو نکتہ چیں ہے، غزل ابتدا کرو

صَرفِ ستم فلک ہے ذرا ساز چھیڑ دو
مائل بہ کیں زمیں ہے، غزل ابتدا کرو

اب آس کا وہ رنگ نہیں ہے فسونِ یاس
دل کے بہت قریں ہے، غزل ابتدا کرو

گر رنگِ یاسیت ہے نمایاں تو کیا، اُمید
اِک مارِ آستیں ہے، غزل ابتدا کرو

معنی کے زیوراتِ حسیں میں جڑا ہوا
ہر شعر اِک نگیں ہے، غزل ابتدا کرو

اشعارِ کیف خیز و دل افزا کی منتظر
تحسین و آفریں ہے، غزل ابتدا کرو

# دیواریں

رشید انور ۔ بی ۔ ایس ۔ سی

۹۹۴۔ موتی رود۔ چھاؤنی اورنگ آباد (مہاراشٹر)

۲۶ر جون ۱۹۹۷ء            محترم بھائی! تسلیمات

اپنی نئی کہانی "دیواریں" بھیج رہا ہوں ـــــ بڑی طویل خاموشی کے بعد حاضر ہوا ہوں۔ جی تو چاہتا ہے "بیسویں صدی" کے لئے مسلسل لکھتا رہوں لیکن حالات بڑے بے وفا ہیں جو ہر وقت حائل ہوتے ہیں۔ پرچہ پابندی سے مل رہا ہے جس کے لئے ممنون ہوں ـــــ قریب اور دُور کے، اجنبی اور جانے پہچانے اُن سب دوستوں کا شکر گزار ہوں جن کے مسلسل تقاضوں نے کہانی لکھوائی ـــــ اُمید ہے میری اِس کہانی پر بھی اِن دوستوں کی رائے مجھے ملے گی ...

آپ کا مخلص ـــــ رشید انور

---

سارا راستہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گھوڑے کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگھرو مسلسل بج رہے تھے۔ تانگے کے پچھلے حصے سے آمنہ اور مسرت کے باتیں کرنے کی آواز دھیمے سُروں میں سُنائی دے رہی تھی اور میری نگاہوں کے سامنے ایلزی کے لرزتے ہوئے سُنہری بال، اُس کے بے حد خوبصورت چمکیلے دانت اور اُس کی سُرخ سُوجی ہوئی آنکھیں بار بار اُبھرتی اور دُھندلاتی جا رہی تھیں۔ ٹرین اسٹارٹ ہونے سے پہلے جب اُس کی نظر مسرت پر پڑی اور مسرت نے اپنی آنکھوں کے آنسو اُس سے چُھپانا چاہے تو میں نے دیکھا، وہ مُنّی کا ہاتھ تھام چکی تھی، اُس کی نظریں نیچی تھیں اور پلیٹ فارم کے سخت فرش پر اُس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور میں کھویا کھویا سا ریلوے اسٹیشن کے اُس گوشے میں اپنی دونوں بہنوں اور ایلزی کرنز کو ایک دوسرے سے نظریں چُراتے اور سِسکتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ٹرین جب چلی تو ایلزی نے دوسرے مسافروں کی طرح دروازے میں کھڑے رہ کر اپنا رومال لہراتے ہوئے ہم تینوں کو الوداع نہیں کہی۔ وہ کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کی موٹی اور سرد سلاخوں کو تھام کر بیٹھ گئی۔ ہم تینوں رینگتی ہوئی ٹرین کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور ٹرین کی رفتار لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی تو اُس کی گرفت اُن سلاخوں پر سخت ہو چکی تھی اور وہ اُن سلاخوں پر سر رکھے رو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کھڑکی کی اُن سلاخوں کو توڑ کر وہ ہمارے پاس آنا چاہتی ہو ـــــ لیکن لوہے کی وہ مضبوط سلاخیں اور اُس کے تھرتھراتے کانپتے ہاتھ ـــــ!!

اُس کی ساری کوششیں بیکار تھیں۔ ہمارے ہاتھ فضا میں لہراتے رہے اور تھوڑی ہی دیر بعد دندناتی، چیختی چنگھاڑتی ہوئی ٹرین کی پچھلی روشنیاں بھی آہستہ آہستہ اندھیروں میں گم ہو گئیں تو ہم تینوں بڑے اُداس سے بھاری بھاری قدموں سے چلتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی بڑی عمارت سے باہر چلے آئے۔

ہر سال کی طرح یہ چھٹیاں بھی ہمارے شہر کے لئے وہی مصروف زندگی لائی تھیں۔ اَن گنت اجنبی اور نئے چہرے شہر کے ہوٹلوں، شاپنگ سینٹرس اور سڑکوں پر نظر آنے لگے تھے۔ ہمارے شہر کی تاریخی اور مشہور زمانہ یادگاروں کے آس پاس ایک میلہ سا لگ گیا تھا۔ دو سال سے میں اپنی چھٹی اور سہولت کے دنوں میں مقامی انفارمیشن آفس کی طرف سے ٹورسٹوں کے لئے گائیڈنگ کر رہا تھا اور اس بار بھی میری مصروفیت ابتدا ہی سے تھکا دینے والی تھی۔ وہ شاید اتوار کا دن تھا اور میں ایک بڑی پارٹی لئے ایلورا کے غاروں میں اُن اجنبی لوگوں کے سامنے ہزاروں سال پہلے کی تاریخ کے صفحات اُلٹ رہا تھا۔ میری زبان سے قدیم زمانے کی داستانوں کو سُنتے اور مختلف سوالات کرتے ہوئے اُن لوگوں میں نہ جانے کیوں میری نظر بار بار اُس غیر ملکی لڑکی پر ٹھہر جاتی۔ شاید اُس کی وہ خاموش سی آنکھیں اور اُداس چہرہ ہی تھا جو دوسرے تمام کھلکھلاتے ہوئے چہروں میں نمایاں محسوس ہو رہا تھا۔ اُس خوبصورت سی سُنہرے بالوں اور ہلکے نیلے رنگ کی آنکھوں والی لڑکی [illegible]

ہوئے چہرے کے متعلق میں کوئی ڈھنگ کی بات نہ سوچ سکا۔ ایلورہ کے خوبصورت سے ریسٹورنٹ میں جب ہم لنچ کے لئے آ بیٹھے تو میں نے اُسی کی میز پر بیٹھنا پسند کیا۔ اُس نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ میں اُس سے دلچسپی لے رہا ہوں۔ کافی کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے وہ اپنے متعلق بتانے لگی ——— ایلزی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ ابھی چھوٹی ہی تھی۔ اپنے پاپا کی اُنگلی تھام کر بازاروں میں گھومنے کی تمنا ابھی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ پاپا ایک دن ٹرین کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے اور وہ اپنی روتی ہوئی ماں سے جا لپٹی۔ اُس کا جی چاہتا اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے وہ یوں ہی ماں کو تھامے رہے۔ جب بھی وہ ماں سے الگ ہوتی، اُس کے کانوں میں ٹرین کی سیٹیاں سی بجنے لگتیں اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے دہاڑتی اور آگ اُگلتی ہوئی ٹرین اُس کی ماں کی طرف بڑھ رہی ہے جو لمحوں میں اتنی محبت کرنے والی ماں کا نام و نشان بھی مٹا دے گی اور وہ سسکتی کانپتی دوڑ کر ماں سے لپٹ جاتی لیکن ماں ایک دن اُس کا ہاتھ پڑوسیوں کے ہاتھ میں دے کر اپنے بُوڑھے بھائی کی موت کا سوگ منانے کے لئے اپنے گاؤں گئی اور اپنے بھائی کی موت کا سوگ مناتی ہوئی آنسو بھری آنکھوں سے اُس نے اپنی عزیز ایلزی کو دیکھنا چاہا تو اُس کے اور اُس کی بیٹی کے درمیان ایک ناقابلِ تسخیر دیوار کھڑی ہو چکی تھی۔ جس سایہ دار درخت تلے ایلزی کو اپنی کمسنی کے دن گزارنے تھے وہ اُس سے دُور کر دیا گیا۔ ماں اپنی ساری محبت لئے مشرقی جرمنی کے اُس گاؤں میں تڑپتی رہی اور حالات کی تیز دھوپ میں زندگی کے نہ جانے کتنے ہی حادثوں کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ اکیلی رہ گئی اور پھر جب جُدائی کا وقفہ ختم ہوا اور اُس لکیر پر جہاں جرمنی دو حصّوں میں تقسیم ہو، اسلحہ اور سنگین لئے سپاہی گھومتے رہتے ہیں اُس دن کوئی سپاہی کوئی سنگین نہ رہی اور دونوں طرف کے لوگ اُس لکیر پر لگی ہوئی تیز اور نوکیلے تاروں کی باڑ کی پروا کئے بغیر ایک دوسرے سے لپٹ گئے تو ایلزی ہلکے گلابی رنگ کا وہ سوئٹر جو اُس نے ماں کے لئے بڑے چاؤ سے بنایا تھا اور پھولوں کا گلدستہ لئے کرسمس کی اُس روشن اور موسیقی ریز رات میں کھڑی ماں کا انتظار کرتی رہی۔ گلدستے کے سارے پھول مُرجھا گئے۔ اُس کی آنکھیں آنسو بہا بہا کر تھک گئیں اور سوئٹر کا ایک ایک تار اُس سے سرگوشیاں کرتا رہا ——— "ماں کیوں نہیں آئی۔ آخر اپنی ماں کیوں نہیں آئی؟" تو ایلزی پھولوں کا وہ گلدستہ تقسیم و تفریق کی اُس لکیر پر، محبت بانٹنے والی اور دل بانٹنے والی اُس لکیر پر رکھ کر چلی آئی اور اُس نے سوئٹر کو اپنی برکھا کی طرح برستی ہوئی آنکھوں سے لگا کر سوچا ——— "ماں اب نہ آسکے گی ——— ماں اب کبھی نہ آسکے گی۔ ظالموں نے اُس کی ماں کو اُس سے چھین لیا۔ اتنی پیاری اور اتنی محبوب ماں کی موت پر اُس چھوٹے سے گاؤں میں پتہ نہیں کسی آنکھ نے آنسو بھی بہایا ہو گا یا نہیں ——— ؟" اپنے بھرے پُرے شہر میں ماں کے بغیر اُسے ویرانوں کا احساس ہوتا۔ یوں جیسے کسی صحرا میں بھٹک رہی ہو۔ جہاں کوئی سایہ نہیں کہ دُکھوں سے نڈھال ہو جائے۔ حالات کے ا ٓثار چڑھاؤ سے دَم پھولنے لگے تو گھڑی دو گھڑی رُک کر اپنی سانس ہی درست کر لے۔ اُس نے اپنے آپ کو ہر لمحہ ہر گھڑی مصروف رکھا۔ اپنی تعلیم جاری رکھی۔ پہلے ایک کھلونے بنانے والی کمپنی میں اور کالج ہو آنے کے بعد ایک اخبار کے دفتر میں کام کرنے لگی اور اب وہ یونیورسٹی میں تاریخ کی طالبہ تھی۔

لنچ ختم کرنے کے بعد آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم دونوں جب ریسٹورنٹ کے دروازے میں آ کھڑے ہوئے تو مجھے اُس نیلگوں آنکھوں والی ایلزی کرنر کے دُکھوں کا بہت خیال آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ تاریخ میں ڈاکٹریٹ کر رہی ہے۔ پھر وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائے گی۔ لیکن اُس سے پہلے خدا اُسے نہ جانے کس کس طرح سے آزمانا چاہتا ہے۔ مجھ سے بات چیت کے دوران اُس کا لہجہ مسلسل اُداس سا رہا۔ اُس کی وجہ پُوری طرح میرے ذہن میں صاف نہ ہو سکی تو میں نے اُس سے کہا، شاید اُسے یہاں ہمارے مُلک میں اور اِن تاریخی غاروں کے قریب آ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ میرے اِس سوال پر اُس نے بتایا کہ ہندوستان اور یہاں کے لوگ اُس کا دیرینہ خواب ہیں۔ اِن غاروں کے متعلق اور ہماری تہذیب کے متعلق اُس نے دن رات پڑھا ہے، ہزار تکلیفوں سے یہاں کی زبانیں سیکھی ہیں۔ خوابوں میں ایلورا اور اجنتا کے غاروں کی تاریکی میں وہ گھنٹوں دبے پاؤں گھومتی رہی ہے۔ یہاں کے ایک ایک ذرّے میں بسی ہوئی دیومالاؤں کی کہانیوں سے اُسے بہت لگاوٹ ہے ——— پھر چہرے پر اِتنا دُکھ اور اِتنی اُداسی کیسی؟؟ میرے سوال پر اُس نے میری طرف بڑے کرب سے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اُن لوگوں کی طرف دیکھنے لگی جو لنچ سے فارغ ہو کر اب ہماری طرف آ رہے تھے اور سرچ لائٹ کی روشنی میں میں پھر ایلورہ کی ایک ایک مورت اور ایک ایک تصویر کا پس منظر اُن لوگوں کو سمجھانے لگا جن کے ساتھ میں آیا تھا اور اُن لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہر بار میری نظریں ایلزی کرنر کی طرف اُٹھتی رہیں اور ہر بار میں بھُولتا رہا کہ میں کس ٹاپک پر بول رہا ہوں۔ ہماری بس جب واپس ہوئی تو دن کم رہ گیا تھا۔ شہر میں جب میں سارے مسافروں سے الگ ہونے لگا تو اُس نے مجھ سے رات کے کھانے کے لئے اصرار کیا اور اُس کے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے جب میں نے اُس سے آئندہ پروگرام کے متعلق پُوچھا تو اُس نے کہا، اِس پارٹی کے ساتھ کل وہ اجنتا نہ جا سکے گی کیونکہ کل وہ بمبئی واپس جا رہی ہے اور شاید پھر کبھی وہ خوابوں کی اِس حسین وادی میں قدم نہ رکھ سکے جس کے لئے اُس نے کیا کیا نہ سوچا تھا۔ میرے بار بار پوچھنے پر اُس نے ہوٹل کے دریچے سے بہت دُور تاریکی میں نظریں جماتے ہوئے کہا، وہ بہت محدود زرِ مبادلہ ایکسچینج پر اِس سفر کے لئے روانہ ہوئی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کم از کم پندرہ دن یہاں کے اِس پُرسکون ماحول میں گزارے اور ہندوستان سے متعلق اُس کی وہ کتاب جسے لکھنے کے لئے وہ بڑی بے چین تھی، یہاں کی فضاؤں سے زیادہ سے زیادہ روشنی

حاصل کرسکے۔ لیکن بمبئی سے یہاں تک کے سفر کے دَوران میں پتہ نہیں کون ہوگا وہ جس نے اُس کا سب کچھ چھین لیا۔ وہ اپنے اُس سوٹ کیس کو کہاں کہاں تلاش کرتی پھرتی ــــ اور اب اُس کے پاس بہت کم پیسے تھے۔ میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ میں نے سوچا کیسے ہیں یہ لوگ۔ کیا گھر آیا مہمان اِسی برتاؤ کا مستحق ہوتا ہے ـــــــ؟؟ ایلزی کی آنکھوں میں یہ لرزتے آنسو اِس لئے نہ تھے کہ کوئی اُس کا سوٹ کیس اُٹھائے گیا تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ اُس کی آنکھوں کے یہ آنسو اُس کے دل سے اُمڈتے ہوئے کچھ سوال تھے ــــ اُمید آخر ہنستی کیوں ہے؟ اور ہنستی ہے تو یوں ٹوٹ کیوں جاتی ہے؟ زندگی کے ہر موڑ پر بے وفا حالات اُس کا اثاثہ یوں کیوں چھین لیتے ہیں؟؟ یہ دردِ مسلسل کیا ہے ــــ؟ لب ابھی مُسکرانا چاہتے ہیں کہ آنکھیں چھلک پڑتی ہیں ــــــ اُس نے دوسرے دن اجنتا جانے سے انکار اور بمبئی واپس جانے کے لئے بہت ضد کی لیکن جب ہم ہوٹل سے نِکلا تو وہ دوسرے دن پارٹی کے ساتھ اجنتا چلنے کے لئے راضی ہو چکی تھی۔ اجنتا کا سفر بہت طویل تھا۔ میرے ساتھ اور میری قربت کو وہ بہت اہمیت دے رہی تھی۔ وہ راستے بھر مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ پتلی پتلی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے اور نیم تاریک غاروں کے نقش و نگار کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا، وہ اپنے آپ کو سنبھالنے اور اپنے چہرے سے کل والی اُداسی کا خول اُتارنے کی کامیاب کوشش کر رہی تھی۔ واپسی میں پہلی بار میں نے اُس کی ہنسی کی آواز سُنی۔ وہ بڑے پیارے انداز میں ہنستی تھی۔ جانے کیوں اپنے سُنہرے بالوں کی بار بار پیشانی پر جھُول جانے والی ایک لٹ کو سنوارتی ہوئی اُس لڑکی پر مجھے بے حد پیار آیا۔ جب اُس نے اپنے ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ ہمارے شہر میں ایک دن اور ٹھہرنا چاہتی ہے تو مجھے ایک عجیب مسرت کا احساس ہوا۔ وہ میری دوستی اور اپنائیت کی بے حد ممنون تھی۔ اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اُس کے ہاتھوں کا وہ لمس بڑا دوستانہ اور پُر خلوص تھا۔ پھر اُس نے پُوچھا۔

"اچھا دوست! اِس شہر کی کون سی چیزیں بہت اچھی ہیں۔ مجھے بتاؤ تو ذرا!" میں نے جواب دیا۔

"بہت سی چیزیں ہیں یہاں دیکھنے کے قابل۔"

"نہیں۔ سب سے اچھی چیز کون سی ہے۔ جو تمھیں بے حد پسند ہے۔ جہاں جا کر تم اپنے سارے دُکھ بھُول جاتے ہو۔ جہاں جا کر مجھے خوشی ملے۔ کیا یہاں کوئی ایسی جگہ بھی ہے؟" وہ بڑی بے چین تھی۔ اُس خوشی کو حاصل کرنے کے لئے جس کے لئے وہ دربدر بھٹک رہی تھی۔

"ہاں ہے ایسی جگہ یہاں پر۔ جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ جہاں میں اپنے سارے دُکھ بھُول جاتا ہوں۔"

"کہاں ہے وہ؟ کیسی جگہ ہے؟ اُس کی تاریخ کیا ہے؟" وہ بچّوں کی طرح مچل اُٹھی تو میں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ انسانی زندگی کی تاریخ کا سب سے اہم باب ہے۔ وہ انسانی زندگی کے ایوان کا سب سے روشن دریچہ ــــ وہ میرا گھر ہے۔ جہاں میری ماں رہتی ہے اور میرے لئے اِس شہر میں، اِس دُنیا میں اُس گھر اور اُس عورت سے اہم کچھ بھی نہیں ــــ"

لمحوں میں اُداسی ہمارے چاروں طرف چھا گئی۔ میں خاموش چھت پر نظریں جمائے رہا اور کچھ دیر میری آواز کا انتظار کر کے وہ کھڑی ہو گئی ــــ "چلو۔ گھر چلیں تمھارے" لیکن وہ بہت تھکی ہوئی تھی اور رات بھی زیادہ ہو چکی تھی اِس لئے دوسرے دن صبح ہوٹل آنے کا وعدہ کر کے میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

سردیوں کی اُس شام بڑھتی ہوئی تاریکی میں دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے چلتے جب وہ اندر داخل ہوئی تو وہ حیرت سے ایک ایک چیز کو تک رہی تھی۔ ایسی دُنیا کبھی کاہے کو دیکھی ہوگی اُس نے؟ گھر کا ایک ایک فرد اُس مہمان کا منتظر تھا۔ اماں بی نے اُس کی بلائیں لیں۔ آمنہ اور مسرت اُس کے دائیں بائیں آ بیٹھیں اور پپّو اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر جھُولنے لگا۔ گھر کے سامنے کے اُس چھوٹے سے چمن کی ہری ہری گھاس پر میں کھڑا اُن سب کو دیکھ رہا تھا اور اُن کِھلنڈری لڑکیوں کے قہقہے سُن کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارے گھر کا کوئی بچھڑا ہوا ساتھی لوٹ آیا ہو۔ ہم سب کو عزیز، بہت اچھا اور بہت پیارا! اُس دن ایلزی کی ہنستی ہوئی آواز اُن سب میں اونچی اور بھرپور تھی۔ اُس کی ہنسی میں مجھے پپّو کی سی معصومیت کا احساس ہوتا تھا۔ پھر ایلزی کو اُس کا کمرہ دکھایا گیا جسے سجانے میں آمنہ اور مسرت نے آج سارا دن کھانا تک نہ کھایا تھا۔ جس کمرے میں رہ کر ایلزی ایلورہ اور اجنتا کے نقش و نگار کو اپنے صفحات پر اُتارے گی۔ ایلزی نے بڑی بے بسی سے آمنہ کو اور مجھے دیکھا۔ جیسے اپنی وجہ سے وہ ہم سب کو تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی لیکن آمنہ نے اُس سے کہہ دیا کہ یہ کسی اور کا نہیں، اماں بی کا حکم ہے اور اماں بی کا حکم اِس چار دیواری میں قدم رکھنے کے بعد کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اماں بی کے تسبیح پھیرتے ہاتھوں کو دیکھ کر وہ ایک لمحہ رُک گئی۔ وہ ہمارے ساتھ چل کر اُن کے کمرے میں اِس لئے آئی تھی کہ اماں بی سے اجازت لے سکے۔ اُن کے بیٹے نے، اور لمحوں میں اپنی ہو جانے والی اُن لڑکیوں نے، جو محبت اُسے دی تھی وہی اُس کے لئے بہت تھا اور اب وہ کل ہی بمبئی واپس جانا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اماں بی دعا پڑھ کر اپنے بچّوں کے سینے پر دَم کرنے لگیں۔ اُنھوں نے اِن کِھلتے ہوئے پھُولوں کے لئے ایک خوش آیند زندگی کی دعا کی اور آمنہ اور مسرت کے بعد اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر جیسے ہی اُنھوں نے اُس کی پیشانی چُومی وہ بے تحاشہ اماں بی کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ جیسے یہ آنسو بڑے زمانے سے اُس کی آنکھوں کی دیواروں نے

ہوئے چہرے کے متعلق میں کوئی ڈھنگ کی بات نہ سوچ سکا۔ ایلورہ کے خوبصورت ریسٹورنٹ میں جب ہم لنچ کے لئے آبیٹھے تو میں نے اُسی کی میز پر بیٹھنا پسند کیا۔ اُس نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ میں اُس سے دلچسپی لے رہا ہوں۔ کافی کی ہلکی ہلکی چُسکیاں لیتے ہوئے وہ اپنے متعلق بتانے لگی ——— ایلزی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ ابھی چھوٹی ہی تھی۔ اپنے پاپا کی اُنگلی تھام کر بازاروں میں گھومنے کی تمنا ابھی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ پاپا ایک دن ٹرین کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے اور وہ اپنی روتی ہوئی ماں سے جا لپٹی۔ اُس کا جی چاہتا اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے وہ یوں ہی ماں کو تھامے رہے۔ جب بھی وہ ماں سے الگ ہوتی، اُس کے کانوں میں ٹرین کی سیٹیاں سی بجنے لگتیں اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے دہاڑتی اور آگ اُگلتی ہوئی ٹرین اُس کی ماں کی طرف بڑھ رہی ہے جو لمحوں میں اتنی محبت کرنے والی ماں کا نام و نشان بھی مٹا دے گی اور وہ سسکتی کانپتی دوڑ کر ماں سے لپٹ جاتی لیکن ماں ایک دن اُس کا ہاتھ چھڑا کر یوں کے ہاتھوں میں دے کر اپنے بوڑھے بھائی کی موت کا سوگ منانے کے لئے اپنے گاؤں گئی اور اپنے بھائی کی موت کا سوگ مناتی ہوئی آنسو بھری آنکھوں سے اُس نے اپنی عزیز ایلزی کو دیکھنا چاہا تو اُس کے اور اُس کی بیٹی کے درمیان ایک ناقابلِ تسخیر دیوار کھڑی ہو چکی تھی۔ جس سایہ دار درخت تلے ایلزی کو اپنی کمسنی کے دن گزارنے تھے وہ اُس سے دور کر دیا گیا۔ ماں اپنی ساری محبت لئے مشرقی جرمنی کے اُس گاؤں میں تڑپتی رہی اور حالات کی تیز دھوپ میں زندگی کے نہ جانے کتنے ہی حادثوں کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ اکیلی رہ گئی اور پھر جب جُدائی کا دور ختم ہوا اور اُس لکیر پر جہاں جرمنی دو حصّوں میں تقسیم ہوتا ہے اور سنگین لئے سپاہی گھومتے رہتے ہیں اُس دن کوئی سپاہی کوئی سنگین نہ رہی اور دونوں طرف کے لوگ اُس لکیر پر لگی ہوئی تیز اور نوکیلے تاروں کی باڑ کی پروا کئے بغیر ایک دوسرے سے لپٹ گئے تو ایلزی ہلکے گلابی رنگ کا وہ سوئٹر جو اُس نے ماں کے لئے بڑے چاؤ سے بنایا تھا اور پھولوں کا گلدستہ لئے کرسمس کی اُس روشن اور موسیقی ریز رات میں کھڑی ماں کا انتظار کرتی رہی۔ گلدستے کے سارے پھول مُرجھا گئے۔ اُس کی آنکھیں آنسو بہا بہا کر تھک گئیں اور سوئٹر کا ایک ایک تار اُس سے سرگوشیاں کرتا رہا ——— "ماں کیوں نہیں آئی۔ آخر اپنی ماں کیوں نہیں آئی؟" تو ایلزی پھولوں کا وہ گلدستہ تقسیم و تفریق کی اُس لکیر پر، محبت بانٹنے والی اور دل بانٹنے والی اُس لکیر پر رکھ کر چلی آئی اور اُس نے سوئٹر کو اپنی برکھا کی طرح برستی ہوئی آنکھوں سے لگا کر سوچا ——— ماں اب نہ آئے گی ——— ماں اب کبھی نہ آئے گی۔ ظالموں نے اُس کی ماں کو اُس سے چھین لیا۔ اِتنی پیاری اور اِتنی محبوب ماں کی موت پر اُس چھوٹے سے گاؤں میں پتہ نہیں کسی آنکھ نے آنسو بھی بہایا ہو گا یا نہیں ———؟ اپنے بھرے پُرے شہر میں ماں کے بغیر اُسے ویرانوں کا احساس ہوتا۔ یوں جیسے کسی صحرا میں بھٹک رہی ہو۔ جہاں کوئی سایہ نہیں کہ دُکھوں سے نڈھال ہو جائے۔ حالات کے اُتار چڑھاؤ سے دم گھٹنے لگے تو گھڑی دو گھڑی رُک کر اپنی سانس ہی درست کر لے۔ اُس نے اپنے آپ کو ہر لمحہ ہر گھڑی مصروف رکھا۔ اپنی تعلیم جاری رکھی۔ پہلے ایک کھلونے بنانے والی کمپنی میں لوہا گالی ہوائی کرنے کے بعد ایک اخبار کے دفتر میں کام کرنے لگی اور اب وہ یونیورسٹی میں تاریخ کی طالبہ تھی۔

لنچ ختم کرنے کے بعد آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم دونوں جب ریسٹورنٹ کے دروازے میں آکھڑے ہوئے تو اُداس نیلگوں آنکھوں والی ایلزی کا گریز کے لمحوں کا مجھے بہت خیال آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ تاریخ میں ڈاکٹریٹ کر رہی ہے۔ پھر وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائے گی۔ لیکن اُس سے پہلے خدا اُسے نہ جانے کس کس طرح آزمانا چاہتا ہے۔ مجھ سے بات چیت کے دوران اُس کا لہجہ مسلسل اُداس سا رہا۔ اُس کی وجہ پوری طرح میرے ذہن میں صاف نہ ہو سکی تو میں نے اُس سے کہا، شاید اُسے یہاں ہمارے مُلک میں اور اِن تاریک غاروں کے قریب آکر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ میرے اِس سوال پر اُس نے بتایا کہ ہندوستان اور یہاں کے لوگ اُس کا دیرینہ خواب ہیں۔ اِن غاروں کے متعلق اور ہماری تہذیب کے متعلق اُس نے دن رات پڑھا ہے، ہزار تکلیفوں سے یہاں کی زبانیں سیکھی ہیں۔ خوابوں میں ایلورا اور اجنتا کے غاروں کی تاریکی میں وہ گھنٹوں دبے پاؤں گھومتی رہی ہے۔ یہاں کے ایک ایک ذرّے میں بسی ہوئی دیومالاؤں کی کہانیوں سے اُسے بہت لگاوٹ ہے ——— پھر چہرے پر اتنا دُکھ اور اِتنی اُداسی کیسی؟؟ میرے سوال پر اُس نے میری طرف بڑے کرب سے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اُن لوگوں کی طرف دیکھنے لگی جو لنچ سے فارغ ہو کر اب ہماری طرف آ رہے تھے اور سرچ لائٹ کی روشنی میں میں پھر ایلورہ کی ایک ایک مورت اور ایک ایک تصویر کا پس منظر اُن لوگوں کو سمجھانے لگا جن کے ساتھ میں آیا تھا اور اُن لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہر بار میری نظر ایلزی کریز کی طرف اُٹھتی رہی اور ہر بار میں بھولتا رہا کہ میں کس ٹاپک پر بول رہا ہوں۔ ہماری بس جب واپس ہوئی تو دن کم رہ گیا تھا۔ شہر میں جب میں سارے مسافروں سے الگ ہونے لگا تو اُس نے مجھ سے رات کے کھانے کے لئے اصرار کیا اور اُس کے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے جب میں نے اُس سے آئندہ پروگرام کے متعلق پوچھا تو اُس نے کہا، اِس پارٹی کے ساتھ کل وہ اجنتا نہ جا سکے گی کیونکہ کل وہ بمبئی واپس جا رہی ہے اور شاید پھر کبھی وہ خوابوں کی اِس حسین وادی میں قدم نہ رکھ سکے جس کے لئے اُس نے کیا کیا نہ سوچا تھا۔ میرے بار بار پوچھنے پر اُس نے ہوٹل کے دریچے سے بہت دُور تاریکی میں نظریں جماتے ہوئے کہا وہ بہت محدود زرِمبادلہ ایکسچینج پر اِس سفر کے لئے روانہ ہوئی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کم از کم پندرہ دن یہاں کے اِس پُرسکون ماحول میں گزارے اور ہندوستان سے متعلق اُس کی وہ کتاب جسے لکھنے کے لئے وہ بڑی بے چین تھی، یہاں کی فضاؤں سے زیادہ سے زیادہ روشنی

حاصل کر سکے۔ لیکن بمبئی سے یہاں تک کے سفر کے دوران میں پتہ نہیں کون ہوگا وہ جس نے اُس کا سب کچھ چھین لیا۔ وہ لپنے اُس شوخ کیس کو کہاں کہاں تلاش کرتی پھرتی — اور اب اُس کے پاس بہت کم پیسے تھے۔ میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے میں نے سوچا کیسے ہیں یہ لوگ۔ کیا گھر آیا مہمان اِسی برتاؤ کا مستحق ہوتا ہے — ؟ ایلزی کی آنکھوں میں پیار بھرتے آنسو اِس لئے نہ تھے کہ کوئی اُس کا شوٹ کیس اُڑا لے گیا تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ اُس کی آنکھوں کے یہ آنسو اُس کے دل سے اُمڈتے ہوئے کچھ سوال تھے — اُمید آخر بندھتی کیوں ہے ؟ اور بندھتی ہے تو یوں ٹوٹ کیوں جاتی ہے ؟ زندگی کے ہر موڑ پر بے وفا حالات اُس کا اثاثہ یوں کیوں چھین لیتے ہیں ؟ ؟ یہ درد مسلسل کیا ہے — ؟ لب ابھی مُسکرانا چاہتے ہیں کہ آنکھیں چھلک پڑتی ہیں — اُس نے دوسرے دن اجنتا جانے سے انکار اور بمبئی واپس جانے کے لئے بہت ضد کی لیکن جب میں ہوٹل سے نکلا تو وہ دوسرے دن پارٹی کے ساتھ اجنتا چلنے کے لئے راضی ہو چکی تھی۔ اجنتا کا سفر بہت طویل تھا۔ میرے ساتھ اور میری قربت کو وہ بہت اہمیت دے رہی تھی۔ وہ راستے بھر مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ پتلی پتلی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے اور نیم تاریک — غاروں کے نقش و نگار کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا، وہ اپنے آپ کو سنبھالنے اور اپنے چہرے سے کل والی اُداسی کا خول اُتارنے کی کامیاب کوشش کر رہی تھی۔ واپسی میں پہلی بار میں نے اُس کی ہنسی کی آواز سُنی۔ وہ بڑے پیارے انداز میں ہنستی تھی۔ نہ جانے کیوں اپنے سُنہرے بالوں کی بار بار پیشانی پر جھُول جانے والی ایک لٹ کو سنوارتی ہوئی اُس لڑکی پر مجھے بے حد پیار آیا۔ جب اُس نے اپنے ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ ہمارے شہر میں ایک دن اور ٹھہرنا چاہتی ہے تو مجھے ایک عجیب مسرت کا احساس ہوا۔ وہ میری دوستی اور اپنائیت کی بے حد ممنون تھی۔ اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اُس کے ہاتھوں کا وہ لمس بڑا دوستانہ اور پُر خلوص تھا۔ پھر اُس نے پُوچھا۔

"اچھا دوست! اِس شہر کی کون سی چیزیں بہت اچھی ہیں۔ مجھے بتاؤ تو ذرا!"

میں نے جواب دیا۔

"بہت سی چیزیں ہیں یہاں دیکھنے کے قابل۔"

"نہیں۔ سب سے اچھی چیز کون سی ہے۔ جو تمھیں بے حد پسند ہے۔ جہاں جا کر تم اپنے سارے دُکھ بھُول جاتے ہو۔ جہاں جا کر مجھے خوشی ملے۔ کیا یہاں کوئی ایسی جگہ بھی ہے ؟" وہ بڑی بے چین تھی۔ اُس خوشی کو حاصل کرنے کے لئے جس کے لئے وہ در بدر بھٹک رہی تھی۔

"ہاں ہے ایسی جگہ یہاں پر۔ جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ جہاں میں اپنے سارے دُکھ بھُول جاتا ہوں۔"

"کہاں ہے وہ ؟ کیسی جگہ ہے ؟ اُس کی تاریخ کیا ہے ؟" وہ بچوں کی طرح مچل اُٹھی تو میں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ انسانی زندگی کی تاریخ کا سب سے اہم باب ہے۔ وہ انسانی زندگی کے ایوان کا سب سے روشن در ہے — وہ میرا گھر ہے۔ جہاں میری ماں رہتی ہے اور میرے لئے اِس شہر میں، اِس دُنیا میں اُس گھر اور اُس عورت سے اہم کچھ بھی نہیں —" لمحوں میں اُداسی ہمارے چاروں طرف چھا گئی۔ میں خاموش چھت پر نظریں جمائے رہا اور کچھ دیر میری آواز کا انتظار کر کے وہ کھڑی ہو گئی — "چلو۔ گھر چلیں تمھارے۔" لیکن وہ بہت تھکی ہوئی تھی اور رات بھی زیادہ جا چکی تھی اِس لئے دوسرے دن صبح ہوٹل آنے کا وعدہ کر کے میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

سردیوں کی اُس شام بڑھتی ہوئی تاریکی میں دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے چلتے جب وہ اندر داخل ہوئی تو وہ حیرت سے ایک ایک چیز کو تک رہی تھی۔ ایسی دُنیا کبھی کاہے کو دیکھی ہوگی اُس نے ؟ گھر کا ایک ایک فرد اُس مہمان کا منتظر تھا۔ اماں بی نے اُس کی بلائیں لیں۔ آمنہ اور مسرت اُس کے دائیں بائیں آ بیٹھیں اور پپّو اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھُولنے لگا۔ گھر کے سامنے کے اُس چھوٹے سے چمن کی ہری ہری گھاس پر میں کھڑا اُن سب کو دیکھ رہا تھا اور اُن کھلنڈری لڑکیوں کے قہقہے سُن کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارے گھر کا کوئی بچھڑا ہوا ساتھی لوٹ آیا ہو۔ ہم سب کو عزیز، بہت اچھا اور بہت پیارا ! اُس دن ایلزی کی ہنستی ہوئی آواز اُن سب میں اونچی اور بھرپور تھی۔ اُس کی ہنسی میں مجھے پپّو کی سی معصومیت کا احساس ہوتا تھا۔ پھر ایلزی کو اُس کا کمرہ دکھایا گیا جسے سجانے میں آمنہ اور مسرت نے آج سارا دن کھانا تک نہ کھایا تھا۔ جس کمرے میں رہ کر ایلزی ایلورہ اور اجنتا کے نقش و نگار کو اپنے صفحات پر اُتارے گی۔ ایلزی نے بڑی بے بسی سے آمنہ کو اور مجھے دیکھا۔ جیسے اپنی وجہ سے وہ ہم سب کو تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی لیکن آمنہ نے اُس سے کہہ دیا کہ یہ کسی اور کا نہیں، اماں بی کا حکم ہے اور اماں بی کا حکم اِس چار دیواری میں قدم رکھنے کے بعد کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اماں بی کے تسبیح پھیرتے ہاتھوں کو دیکھ کر وہ ایک لمحہ رُک گئی۔ وہ ہمارے ساتھ چل کر اُن کے کمرے میں اِس لئے آئی تھی کہ اماں بی سے اجازت لے سکے۔ اُن کے بیٹے نے، اور لمحوں میں اپنی ہو جانے والی اُن لڑکیوں نے، جو محبت اُسے دی تھی، وہی اُس کے لئے بہت تھا اور اب وہ کل ہی بمبئی واپس جانا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اماں بی دعا پڑھ کر اپنے بچّوں کے سینے پر دَم کرنے لگیں۔ اُنھوں نے اِن کھِلتے ہوئے پھُولوں کے لئے ایک خوش آیند زندگی کی دعا کی اور آمنہ اور مسرت کے بعد اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر جیسے ہی اُنھوں نے اُس کی پیشانی چومی وہ بے تحاشہ اماں بی کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ جیسے یہ آنسو بڑے زمانے سے اُس کی آنکھوں کی دیواروں نے

روک رکھے تھے۔ شاید اُس وقت سے جب وہ پھولوں کا مہکتا ہوا گلدستہ کرسمس کی رات کی سیاہی کی نذر کر آئی تھی۔

پھر اُس نے ایلورہ اور اجنتا میں اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ روزانہ شام تک اپنا کام ختم کر کے لوٹ آتی۔ میں اِدھر اپنی مصروفیتوں سے پیچھا چھڑا کر رات گئے گھر پہنچتا اور کھانے کے بعد میں، آمنہ، مسرت اور ایلزی گھر سے دُور اکیلے اور چاندنی میں نہائے ہوئے راستوں کی طرف نکل پڑتے۔ اُسے مسرت کی آواز بے حد پسند تھی اس لئے روزانہ ہی وہ مسرت کے سر ہو جاتی اور پھر رابعہ ورانی کے چاندنی میں دودھ کی طرح چمکتے ہوئے مقبرے میں یا پن چکی کی گرتی ہوئی آبشار کی موسیقی میں مسرت کی درد بھری آواز گونجتی تو سانس رُکنے سی لگتی۔ ایک عجیب اور گمبھیر سا سماں بندھ جاتا اور میں سوچنے لگتا، ہر ایک کو ٹوکہ دو رو کے راستوں پہ رے جانے والے یہ گیت اور مسرت کی پُرسوز کانپتی ہوئی آواز ایلزی کو اتنی کیوں پسند ہے؟ لیکن اِس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا کیونکہ اُسے بہت سی باتیں پسند تھیں۔ ہمارے آنگن میں پڑے چنبیلی کے منڈیے کے مہکتے پھولوں پر وہ جان دیتی تھی۔ ڈھولک پر شادی کے گیت گاتی الھڑ لڑکیاں اُسے پسند تھیں۔ ہاتھوں پر بہار دکھاتے ہوئے مہندی کے رنگ کی وہ دیوانی تھی۔ اپنے سروں پر دوپٹے کے پلو درست کرتے ہوئے صبح اُٹھ کر آداب کرنے والی آمنہ اور مسرت کا انداز اُسے پسند تھا۔ اماں بی کی دامن بھر دعائیں، بلائیں لیتی ہوئی چٹختی انگلیاں اور اُن کی محبت بھری ڈانٹ اُسے پسند تھی۔ اُس کی پسند میں نہ جانے اور کیا کیا تھا۔

پندرہ دن ڈیڑھ مہینے میں بدل گئے۔ اُس نے جب بھی جانے کی بات چھیڑی آمنہ اور مسرت نے اُس کی ڈھیروں خوشامدیں کیں۔ اُس کے ہمارے پاس قیام کے وہ شاید آخری دن تھے۔ آمنہ اپنی کسی سہیلی کے پاس گئی ہوئی تھی اور مسرت کی طبیعت اچھی نہ تھی۔ اِس لئے رات گئے ہم دونوں ہی گھر سے نکل پڑے۔ مجھے یاد نہیں وہ کتنا لمبا راستہ ہم نے خاموشی میں گزار دیا۔ وہ خلافِ معمول بہت خاموش تھی اور میں سگریٹ کے کش کھینچ رہا تھا۔ بڑی دیر بعد اُس نے ڈسنے والی اُس خاموشی کو توڑا۔

"تم اتنا سگریٹ کیوں پیتے ہو آخر ——؟" میں اُس کے اِس بے تکے سوال پر ہنس پڑا۔

"بہت پیتا ہوں کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں —— بے حد!" اُس نے اپنے بالوں کی لٹ چہرے سے ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا چھوڑ دوں گا۔"

"پرامز؟"

"ہاں پرامز!" اُس نے کھلکھلا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تم بہت اچھے ہو!" وہ دل کی گہرائیوں سے ہنس رہی تھی۔

"ہائیں ——؟" میں حیرت سے چیخا "کیا یہ تمھیں آج ہی معلوم ہوا؟"

"مذاق مت کرو۔ بتاؤ سچ مچ تم اتنے اچھے کیوں ہو؟" میں نے اُس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو چلتا ہوں میں۔ اِس راستے پر بے وقوف بنانے کے لئے تمھیں کوئی اور بھی مل سکتا ہے —— یہ مہربانی مجھ پر کیوں؟" لیکن اُس نے میرا ہاتھ نہ چھوڑا اور تھوڑی دیر ناراض ہو کر چُپ چاپ چلتی رہی۔ پھر اُس نے پلکیں جھپکائے بغیر میرے چہرے پہ نظریں جما دیں۔ میں گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آج بہت جذباتی ہو رہی تھی اور اُس کے دل و دماغ میں جیسے سوچ کے جھکڑ سے چل رہے تھے۔ اُس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ایک بات پوچھوں؟" میں صرف اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ "وہ کون ہے جسے تم بے حد چاہتے ہو؟"

"میں —— میں سبھی کو بے حد چاہتا ہوں۔ ہر چیز کو، ہر انسان کو اور ——"

وہ ایکدم جھلا گئی۔

"اوہو —— سب نہیں —— وہ اکیلی کون ہے۔ کون لڑکی ہے وہ جسے تم چاہتے ہو۔ جو تمھیں بہت بہت چاہتی ہے؟"

"شاید کوئی بھی نہیں۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ —— بتاؤ نا پلیز ——؟"

"وہ —— وہ شاید میری بیوی ہے!"

"کون ہے تمھاری بیوی؟ کیا یہ بھی نہ بتاؤ گے ——؟" اُس کا اشتیاق عروج کو پہنچ چکا تھا۔

"ایلزی! میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ لڑکی کون ہے جو مجھے چاہتی ہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ میری بیوی کون ہو گی۔ ہماری زندگی نے ہمیں دُکھوں کی سوغات اور جھوٹی اُمیدوں کی دُنیا کے سوا دیا ہی کیا ہے —— تم یوں پوچھتی ہو یہ سب؟ کیوں آخر ——؟" نہ جانے زندگی کی کتنی محرومیاں اور کتنی مایوسیاں ایک ہی لمحے میں میرے سامنے اپنی بھیانک صورت لئے آکھڑی ہوئیں۔ میرے لہجے کی تیزی اور درد سے جیسے وہ ایک ہی لمحے میں کانپ کر سہم گئی اور پھر پتہ نہیں گھر پہنچتے ہوئے وہ سارا ہی طویل راستہ ہم نے خاموشی میں کس طرح کاٹ دیا۔ جس دن وہ جانے والی تھی گھر کے سارے لوگ صبح سے مصروف تھے۔ شام گئے جب میں گھر پہنچا تو آمنہ، مسرت اپنے کمرے میں جا لیٹا تو نہ جانے کتنی ہی بار وہ مسلسل میرے کمرے میں آئی [illegible] اُس سے کوئی بات نہ کر سکا۔ جب بھی اُس کی طرف نظر پڑی اُسکی زبان [illegible]

رات کی ٹرین کے لئے تانگے والے نے گھر پہ آواز دی تو در و دیوار پر یوں اُداسی چھا گئی اور سب یوں سسکنے لگے کہ میری آنکھوں کے اُن آنسوؤں نے جنھیں میں نہ جانے کب سے سنبھال رہا تھا سارے منظر دھندلا دیے۔

تاریک سے راستے پر تانگہ اپنی اُلجھی رفتار سے چل رہا تھا۔ اب اُس کے گھوڑے کے ٹاپوں اور گھنگھروؤں کی آواز کے سوا کچھ بھی نہ تھا کیونکہ آمنہ اور مسرت بھی بہت دیر ہوئی خاموش ہو چکی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم نے اُسے جو اپنا تھا، جو بہت پیارا اور عزیز تھا سمندر کی بھیانک موجوں میں خود ہی دھکیل دیا ہو۔ اُس کے ہمارے درمیان واقعی کتنا بھیانک اور گہرا سمندر تھا کہ چاہتے بھی تو اُس کنارے تک نہ جا پاتے۔ تانگہ گھر کے سامنے رکا تو یہ دیکھ کر دل کو جھٹکا سا لگا کہ اماں بی ابھی تک گھر کے دروازے میں چپ چاپ اپنے مُنہ کو ساری کا پلو لگائے کھڑی ہیں۔ گھر میں پھیلی ہوئی خاموشی کو توڑنے کی کسی نے بھی کوشش نہ کی اور سب اپنے اپنے بستروں پر جا لیٹے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک بڑا سا پیکٹ اور اُس کا خط میری ٹیبل پر رکھا ہوا تھا ــــــ

"کیسے گائڈ ہو ــــ؟ اجنبی لوگوں کو راستہ بتاتے ہو اور خود اپنی راہ سے لاعلم ہو۔ زندگی کے راستے پر یوں اکیلے کب تک چلو گے آخر؟ ــــ بھولے بھی اتنے ہو کہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ لڑکی کون ہے جو تمھیں بے حد چاہتی ہے ــــ ذرا دماغ پر زور دیتے تو یہ اتنا مشکل بھی نہ تھا۔ کوئی بھی میرے اس سوال کا جواب نہ دے سکا کہ تم اتنے اچھے کیوں ہو آخر۔ تمھاری آنکھیں ڈبڈبائی سی کیوں لگتی تھیں آخر۔ اماں بی کے پاس اتنا پیار کہاں سے آگیا ــــ؟ آمنہ اور مسرت میری بہنیں کیوں نہیں ہیں ــــ اور اگر ہیں تو یہ کیسے رشتے ہیں؟ کیسے ناطے ہیں جو ٹوٹ رہے ہیں۔ آج تو دے دو میرے سوالوں کے جواب؟ ــــ ان لمحوں میں تو بتا دو کہ پپو تمھاری غیر موجودگی میں مجھے تمھارا نام لے کر کیوں چھیڑتا تھا؟ ــــ کرسمس کی اُس رات سے یہ سوئٹر اپنے سینے سے لگائے لگائے پھرتی رہی ہوں ــــ اماں بی کو اُن کی امانت دے دینا۔ بعض انسانوں کی زندگی میں ہر ہر قدم پر یہ دیواریں کیوں کھڑی ہو جاتی ہیں؟ ــــ چاروں طرف ــــ ہر طرف ــــ ایسی دیواریں جو نظر نہیں آتیں لیکن بہت اونچی اور ناقابلِ تسخیر ہوتی ہیں ــــ میں نے تم ... ایک دن کہا تھا نا کہ ٹرین کا تصور میں نے جب بھی کیا ہے میری نظروں میں خون میں لتھڑے ہوئے ٹریڈی آ گئے ہیں۔ تڑپتی ہوئی ممی، سسکتے اور ماتم کرتے ہوئے لوگ

# غزلیں ــ تین ناتمام غزلیں

ــــ شکیل بدایونی بی۔ اے ــــ

مہرباں ہو کے رل گئے وہ گلے ۔۔۔ اب اندھیرا نہیں چراغ تلے
آڑ لے کر وضو کی اے ساقی ۔۔۔ عمر بھر زاہدوں نے ہاتھ ملے
آنچ آنے نہ دوں گا گلشن پر ۔۔۔ آشیانہ مرا رہے کہ جلے

ــــ (۲) ــــ

غم سے چھٹ کر حیات ہے کہ نہیں ۔۔۔ سوچتا ہوں یہ بات ہے کہ نہیں
وہ جو آئیں تو میں بھی یہ دیکھوں ۔۔۔ میرے قابو میں رات ہے کہ نہیں
اُن لبوں پر ہیں تذکرے کیا کیا ۔۔۔ کچھ مرے دل کی بات ہے کہ نہیں

ــــ (۳) ــــ

خرد آج رنگین تر ہے جنوں سے ۔۔۔ سیاست رنگی ہے محبت کے خوں سے
یہ کیا خلفشارِ جہاں ہے کہ جس میں ۔۔۔ نہ جینا سکوں سے، نہ مرنا سکوں سے
بنے آتشِ عشق گلزار کیوں کر
ہر اک سینہ خالی ہے سوزِ دروں سے

---

میری نظروں میں رینگ گئے ہیں۔ بسے بسلائے گھر اُجڑ گئے ہیں اور میں سب کچھ ہار کر ایک ایسی ویران راہ پر چل پڑی ہوں جو کہیں ختم نہیں ہوتی ــــ آج رات بھی ٹرین آئے گی ــــ کل بھی ٹرین آئے گی ــــ یہ ٹرین کیوں آتی ہے آخر ــــ کیوں؟ ــــ آخر کیوں ــــ؟؟"

خط کے آخری حروف میری نظروں میں دھندلا سے گئے اور میں نے اپنی برستی ہوئی آنکھیں اُس سوئٹر پر رکھ دیں ــــ!!



صرف سات ہی دن میں...
زیادہ صاف، نرم اور خوبصورت جلد!
جلد کتنی بے رونق تھی... پارٹی بڑی شاندار ہونے والی تھی اور سات ہی دن باقی تھے۔ دعوت نامہ پاکر میں بہت خوش تھی۔ مگر اپنی جلد کی وجہ سے طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہو رہے تھے کس قدر بے رونق تھی وہ! سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں!
پہلی بار کریم کا لگانا: اچانک مجھے پونڈز کے سات دن والے حسن افزا پلان کا خیال آیا۔ پھر ہفتہ بھر ہر رات دو بار میں اپنے چہرے پر پونڈز کولڈ کریم لگاتی رہی۔ پہلی بار اس لئے کہ اوپری میل کچیل اور دن بھر کا "میک اپ" نکل جائے۔
دوسری بار کریم کا لگانا: دوسری بار — یہی تو حسن کا راز ہے۔ اس لئے کہ مسامات کی ان گہرائیوں میں جما ہوا میل صاف ہو جائے جہاں صابن کا جھاگ یا پانی نہیں پہنچ سکتا
Pond's
پونڈز
کولڈ کریم
جلد کی صفائی کے لئے دنیا میں
سب سے زیادہ استعمال ہونے والی کریم
ڈاک خرچ کے لئے ۱۵ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر مفت ملنے والا کتابچہ '7 DAYS TO BEAUTY'
اس پتہ سے منگائیے:
چیز برو پونڈز انکارپوریٹڈ، ۱۳۴، گن بو اسٹریٹ، بمبئی-۱
سات دن بعد: پارٹی بے حد کامیاب رہی۔ لوگ میرے خوبصورت اور دمکتے ہوئے چہرے کو بڑے اشتیاق سے دیکھتے رہے! پونڈز کے سات دن والے حسن افزا پلان نے واقعی کمال کر دیا! آپ بھی آزمائیے۔ پونڈز کولڈ کریم کے استعمال سے صرف سات دن میں آپ کی جلد بھی زیادہ ملائم اور خوبصورت ہو جائے گی!
P. 5587
چیز برو پونڈز انکارپوریٹڈ
(محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ ایس۔ اے۔ میں تشکیل شدہ)

افسانہ

# یادوں کا الاؤ

شعیب شمس۔ ایم۔ اے

صفدر منزل۔ کریم چک۔ چھپرہ (بہار)

۲۲ ؍ جون ۶۷ء بھائی جان! سلامِ خلوص

. . . اس سے قبل بھی ایک افسانہ "چھپکلی" ارسالِ خدمت کر چکا ہوں۔ اب تک رسید سے محروم ہوں۔ آپ مجھ سے خفا تو نہیں ——— ایک اور افسانہ "یادوں کا الاؤ" ارسالِ خدمت ہے پسند آجائے تو شریکِ اشاعت کر لیں۔ ممنون ہوں گا ——— رسید و بمفید مشوروں کا انتظار کروں گا . . .

آپ کا اپنا ——— شعیب شمس

"بھی! تو نے کہا تھا نا "رخشی! میں تیری شادی میں ضرور آؤں گی ——— ڈھولک پر تھاپ لگا کر گیت گاؤں گی، تجھے خوبصورت گہنوں میں سجاؤں گی۔ مانگ میں تاروں کی افشاں بھروں گی۔ یہ سارے کام میں خود اپنے ہی ہاتھوں کروں گی رخشی! اور جب مڑوے کے نیچے دولہا بیٹھ جائے گا تو آرسی مصحف کی رسم ادا کرانے کے لئے میں تجھے اپنے بازوؤں میں سنبھال کر مڑوے کے نیچے لے جاؤں گی اور تو اس طرح ہولے ہولے قدم اٹھائے گی جیسے من من بھر کے ہوں ——— تجھ سے لاکھ کہوں گی پگلی آنکھیں کھول اور اپنے من درپن کی آشاؤں کا درشن کر لے لیکن تو اپنی آنکھیں بند کئے رہے گی اور جب کسی کی گرم سانسیں تیری پلکوں پر بکھریں گی تو آنکھیں خود بخود کھل جائیں گی جیسے منہ بند کلیاں!" ——— اور تیری ان باتوں سے شرما کر جب میں بھاگی تو کمرے کی دیوار میں لگی سلاخ سے ٹکرا گئی۔ خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔ میں "ترا اُف" کہہ کر سر تھامے بیٹھ گئی۔ لیکن تو بہت زیادہ گھبرا گئی تھی اور اسی گھبراہٹ کے عالم میں تو نے اپنا قیمتی دوپٹہ پھاڑ ڈالا جو تیرے بھیا نے دو دن ہوئے تجھے لا کر دیا تھا اور گھر واپس جانے پر صرف اتنی سی بات کے لئے تیری امی نے تجھے کوسنے دئے تھے۔ لیکن تو تو پگلی ہے۔ تجھے ان سب باتوں کا کیا خیال اور دھم دھم کرتی پھر دوسرے دن آموجود ہوئی۔ امی نے لاکھ سمجھایا۔

"بیٹی! جوان جہان لڑکیوں کو اس طرح تنہا نہ گھومنا چاہئے۔"

"تو پھر خالہ میں ساتھی کہاں سے ڈھونڈ لاؤں؟" تو کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

امی بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں اور سچ بھابھی! مجھے بھی تمہاری ہنسی بڑی زہر لگی تھی۔ اس لئے نہیں کہ تمہارے ہنسنے کا انداز کچھ بے حجابانہ تھا نہیں پگلی! مجھے یہ خوف تھا کہ امی کیا سوچتی ہوں گی کہ رخشی کی کیسی کیسی سہیلیاں ہیں!

"رخشی! تیرے ماتھے کا زخم کیسا ہے بہن!"

"میں بالکل نہیں۔ دو ایک دن میں اچھا ہو جائے گا۔"

"تو نے کوئی دوا بھی لگائی یا نہیں؟"

"اتنی سی چوٹ کا اتنا خیال کون کرے۔"

"لا اپنا ماتھا ادھر لا پگلی!"

"تو کیا کرے گی بھلا؟"

"مرہم پٹی کروں گی۔"

"تو ڈاکٹر کب سے ہو گئی؟"

"ڈاکٹر نہیں ہوں تو کیا ہوا۔ اپنے ہونٹ تیرے زخم پر رکھ دوں گی خلوص کی آنچ سے زخم خود بخود بھر جائیں گے۔"

اور سچ بہن! جب تو نے میرے زخموں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے تو مجھے بڑا سکون ملا تھا۔ لیکن دل کے زخم کبھی بھرے ہیں نہ بھریں گے۔ لاکھ خلوص کی آنچ لگاؤ ٹیس بڑھتی ہی جاتی ہے اور زندگی غم کا ایک عکسِ جمیل بن کر جب نظروں کے سامنے آتی ہے تو انسان کانپ اٹھتا ہے ——— توبہ! زندگی کے یہی رنگ ہے تو میں ایسی زندگی

سے باز آئی!

"رخشی! میں نے بہت کوشش کی کہ زندگی میں کوئی ایسا موڑ نہ آنے پائے جب انسان غم کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بن جاتا ہے۔ لیکن ... لیکن میری مجبوری میری راہوں کا کانٹا بن گئی۔"

اور یہ جانے بغیر کہ ارشد کی کیا مجبوری تھی، وہ کون سے حالات تھے جنھوں نے ارشد کو میرے متعلق اِتنا سخت ترین فیصلہ کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے ارشد کو بخش دیا۔ اُس سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکی۔ صرف یاس و حسرت کی تصویر بنی اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ بھی کچھ اِس طرح دھیرے دھیرے قدم اُٹھا رہا تھا جیسے برسوں کا تھکا ہارا مسافر جو زندگی کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے بالکل تھک چکا ہے۔ اُس کے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔ کوئی زندگی ہی نہیں۔ ہاں بہن! ارشد چلا گیا۔ میں دیکھتی رہ گئی اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میں نے ہنسی خوشی اُسے الوداع بھی نہ کہا حالانکہ وہ میرا اخلاقی فرض تھا۔

"رخشی! تمھارے ماتھے پر یہ نشان کیسا ہے؟"

"یہ نشان میری بہن کی یادگار ہے۔"

اور پھر تم بڑی شدت سے مجھے یاد آگئی تھیں۔ تمھارا خلوص، تمھارا پیار اور زخموں پر تمھاری مہرِ محبت! ـــــ یہ ساری باتیں مجھے اِس شدت سے یاد آگئیں کہ میں بے چین ہو گئی۔ جی چاہا کسی طرح تم تک پہنچ جاؤں۔ لیکن اُن دنوں بات ہی کچھ اور تھی۔ میں کہیں جانا بھی چاہتی تو نہ جا سکتی تھی۔ ارشد سائے کی طرح میرے پیچھے لگے رہتے تھے۔ دیکھنے والے سمجھتے جیسے میرے ابّو جان کے لئے اللہ میاں نے اِس بڑھاپے میں بیٹھے بٹھائے ایک داماد بھیج دیا ہو۔ اوروں کو چھوڑو خود میں بھی یہی سمجھتی تھی۔ عجیب عجیب سے خواب بُن رکھے تھے میں نے۔ بہت ہی خوبصورت اور سُنہرے خوابوں کے جال! لیکن وہ کیسے جال تھے کہ اُن میں پھنس جانے کے بعد بھی میں آزاد ہوں۔ کوئی مجھے چاند کے پالنے میں بٹھا کر دُور گگن کی سیر کرانے نہ لے گیا اور میری یہ حسرت میرے دل ہی میں رہ گئی۔ گھٹ گئی میری تمنا۔ میری خواہشوں نے ہچکیاں لے لیں۔ بڑی تکلیف دہ ہچکیاں تھیں میری جان! اب تک اُس آگ میں جل رہی ہوں۔ میرا سارا وجود لرز کر رہ گیا ہے۔ زندگی کا بوجھ اب سوہانِ روح ہو گیا ہے میرے لئے۔ سوچتی ہوں سانسوں کی اِس آمد و رفت سے کب نجات ملے گی۔ کمبخت چھٹکارا ہی مِل جائے اِس ناہنجار زندگی سے ـــــ تم ہی بتاؤ میری جان! کہ اِس زندگی نے مجھے کونسا سُکھ دیا ہے۔ میں نے تمھیں اپنا خلوص دیا، تم نے مجھ سے عشق جیسا پیار کیا اور پھر ایک دن اپنے سپنوں کی دُنیا میں حسین نقش و نگار بنانے کی تمنائیں لئے تم پیا کے دیس چلی گئیں۔ مجھے تنہا چھوڑ کر۔ عورت کی زندگی بھی عجیب ہے۔ وہ جب بھی کوئی نیا گھروندا بنا کر اُس کی تزئین و آرائش کی کوشش کرتی ہے، ایک نئی مصیبت سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ ہاں بھئی! اُسے مصیبت ہی کہہ لو۔ لیکن وہ بھی اِتنی بدبخت ہے کہ نئے ماحول اور اجنبی حالات کو اِس طرح اپنا لیتی ہے جیسے اِسی گہوارے میں پلی ہو اور نہ اپنائے تو کرے بھی کیا۔ دربدر کی ٹھوکریں کھانے سے تو بہتر ہے کہ کسی اجنبی کو اپنے گلے کا ہار بنا لو۔ تم بھی سسرال جاتے وقت خوش نہ تھیں۔ کتنا بلک بلک کر تم روئی تھیں۔ گنگا جمنا بہادی تھی تم نے۔ لاکھ ضبط کرنے پر بھی میری آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے۔ لیکن کون جانے ممکن ہے تمھارے دل میں لڈو ہی پھوٹ رہے ہوں۔

صبحی! میری بہن! ہمیں بھول نہ جانا!" اور تمھاری بے پناہ ہچکیاں ہی تمھارا جواب تھیں۔ تم کچھ بولنا بھی چاہتیں تو نہ بول سکتی تھیں۔ تم نے بھی سوچا ہوگا یوں پھر پھر بول کر نکو کون بنے، اپنا مذاق کون اُڑوائے ـــــ پھر تم اِس طرح گئیں کہ کبھی لَوٹ کر بھی نہ دیکھا۔ نیا ماحول تمھیں اِتنا راس آیا کہ تم نے سب کو فراموش کر دیا۔ اپنے ابّو کا پیار، امّی کا ایثار، بھائی بہنوں کا خلوص، اپنی رخشی کی محبت، ساری باتیں یک لخت تمھارے ذہن اور دل سے نکل گئیں اور یاد رہی تو بس ایک بات، اپنا شوہر، اپنی ازدواجی زندگی! ـــــ یقین جانو میری بہن! تمھارے جانے کے بعد میں بالکل بے سہارا ہو کر رہ گئی تھی۔ کسی کام میں جی لگتا تھا اور نہ پڑھنے لکھنے میں۔ کتنی بار سوچا، نامکمل کہانیوں کو ایک شکل دے دوں۔ لیکن تو بہ کرو جب ذہن کو یکسوئی نصیب نہ ہو تو کہانیاں کبھی جنم لے سکتی ہیں۔ بھلے ہی ذہنوں میں پلتی رہیں لیکن جب کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھو تو بس چند آڑے ترچھے نقوش جیسے پکاسو کا جدید آرٹ جسے دُور سے دیکھ کر ہی کسی سبزی فروش کی دکان یاد آجائے۔

میں بالکل تنہا اور بور زندگی گزار رہی تھی کہ ایسے میں ارشد آٹکرائے۔ ارشد کو تم نہیں جانتیں ـــــ ہاں! جانو گی بھی کیسے ـــــ میری زندگی کا یہ حادثہ تو تمھارے جانے کے بعد پیش آیا۔ لیکن بہت ہی تکلیف دہ حادثہ تھا میری جان! میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر ارشد ہی کو اپنی زندگی کا محور سمجھ بیٹھی۔ ایک بانکا چھبیلا، وجیہہ، خوبصورت، خوش مزاج، خوش اخلاق اور خوش پوشاک، انجینئر جس نے آتے ہی میرے خرمنِ ہوش و خرد پر وہ شب خون مارا کہ میں بے سُدھ ہو گئی۔

"رخشی! میری زندگی کو ایک سہارے کی ضرورت ہے۔"

مجھے اُس کے یہ الفاظ آج بھی یاد ہیں۔ لیکن یہ سہارا ڈھونڈنے والے کِس ویرانے میں کھو جاتے ہیں۔ کیسی تاریکیاں اُنھیں اپنے پردوں میں سمیٹ لیتی ہیں۔ کچھ تم ہی بتاؤ نا ـــــ لیکن تم بھلا رموز و اسرار کے اِن نکتوں پر کیا روشنی ڈال سکو گی۔ تمھیں تو بچوں کو سنبھالنے کے سِوا اور کچھ آتا بھی نہ ہوگا۔ کتنی قابلِ رحم

ہوتی ہیں یہ زرخرید لونڈیاں جو فرائض کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن کر رہ جاتی ہیں۔

ارشد کی دلچسپیاں دیکھ کر ابّو جان بہت خوش تھے۔ جیسے اللہ میاں نے بیٹھے بٹھائے اُن کی نصیبوں جلی بیٹی کے لئے ایک بر بھیج دیا تھا۔ امّی جان تو چھپکے چھپکے پان چباتے وقت گیت بھی گا لیا کرتی تھیں جیسے آنے والے دنوں کی تمنّا میں گیت گانے کی مشق کر رہی ہوں، کہیں کوئی بول بھول نہ جائیں، سُر نہ بدل جائے اور میں تھی کہ روز بنت نئے خواب بُنا کرتی تھی۔ کبھی خوابوں ہی میں ہنی مون منانے مسوری پہنچ جاتی تھی، کبھی کشمیر کی خوشنما وادیوں میں اور کبھی بمبئی کی چوڑی چکلی سڑکوں پر ـــــ آخر انجینئر ہے وہ اِتنا بھی نہ کرے گا۔ ہوسکتا ہے پیرس کی بھی سیر کرا دے!

"میم صاحب! اِس ساری کی قیمت محض ڈیڑھ سو روپے ہے۔ آپ ایک پیس ضرور لے لیں۔ آپ کے جسم پر خوب کھلے گی ـــــ آپ پیسوں کی فکر نہ کریں منیم جی کوٹھی سے جاکر لے آئیں گے۔"

لیکن واہ ری قسمت ـــــ میں اِس جھٹکے سے زمین پر گر پڑی کہ سارے خواب بکھر کر رہ گئے۔

"رخشی! میں محاذِ جنگ پر جا رہا ہوں۔ مادرِ وطن کی پکار میرے کانوں میں آرہی ہے ـــــ یقین تو ہے فتح و کامرانی کے پرچم لہراتا جلد ہی واپس آؤں گا اور اگر نہ آیا تو مجھے بھول جانے کی کوشش کرنا۔"

ہاں بھئی! جیسے کسی کو اپنے خیالوں میں بسا کر بھول جانا بہت آسان ہے لیکن میں ارشد کو ضرور معاف کر دیتی اِس لئے کہ مجھے بھی اپنے وطن سے بے اندازہ محبت ہے۔ میں اپنی مانگ کے سیندور سے زیادہ دھرتی ماتا کی مانگ کی افشاں کی حفاظت کی خواہشمند ہوں۔ دھرتی ماں کی مانگ کیسے سُونی ہونے دیتی لیکن ارشد کا وہ صرف ایک بہانہ تھا۔ ایک حسین فریب! اور میں اُس فریب سے بہل گئی میری نظروں میں ارشد کی عزّت و وقعت اور زیادہ بڑھ گئی۔ مجھے خود اپنی ذات سے پیار محسوس ہونے لگا تھا ـــــ فخر ہوتا تھا مجھے اپنے آپ پر اور اگر حقیقتاً ایسا ہوتا تو میں ایک نئی زندگی کی تمنّا دل میں لئے ساری عمر کنواری بیٹھی رہ جاتی۔

لیکن؟ ـــــ لیکن ارشد نے محض خوش آیند دِنوں کی تمنّا میں خود کو بیس ہزار روپوں میں بیچ دیا۔ ہاں بھئی! اب تو زندگی کی بھی قیمتیں لگنے لگی ہیں۔ میرے ابّو جان کے پاس اِتنی دولت کہاں تھی بھلا جو وہ اپنی چہیتی بیٹی کی زندگی کے لئے ایک انجینئر کا مستقبل خرید سکتے ـــــ میں ہار گئی۔ میرا پیار، میرا خلوص، میری چاہت ـــــ سب کو زبردست شکست ہوئی اور اب؟ ـــــ اب میں اپنے سپنوں کے شیش محل کے بکھرے ہوئے ذرّے یکجا کرنے میں مصروف ہوں۔

"رخشی! میری مجبوری میری راہوں کا کانٹا بن گئی۔"

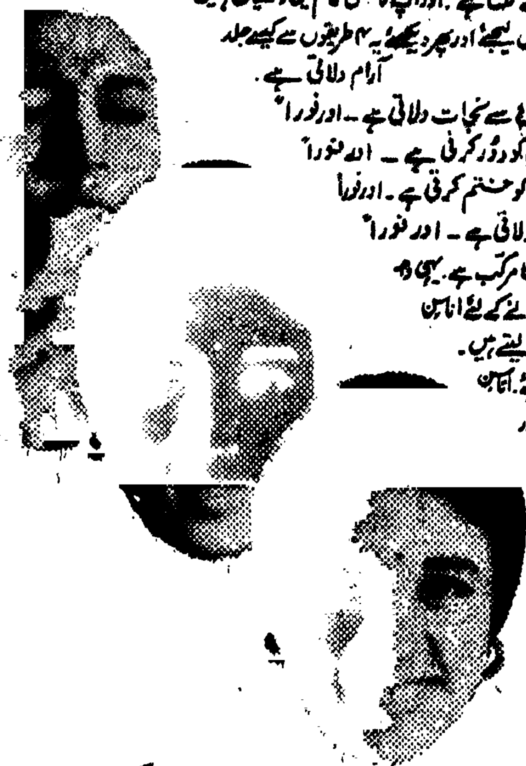
اب میں اُس سے یہ کیسے کہتی "ارشد! تم نے میری مجبوریوں کا کوئی خیال نہ کیا۔ تمہاری صرف ایک مجبوری تھی۔ لیکن میری ساری زندگی مجبوری و محرومی بن کر رہ جائے گی!"

امّی جان اب شادی کے گیت نہیں گنگناتیں ـــــ ابّو جان کی مسکراہٹیں ماند پڑ گئیں۔ وہ مضمحل نظر آنے لگے تھے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد گھر میں شادی کی تیاریاں پھر زور پکڑ گئیں۔ ابّو جان نے میونسپلٹی کے کسی کلرک کو اپنا داماد بنانے کا تہیّہ کر لیا ہے۔ آج سے دو ہفتے بعد میں بھی تمہاری ہی طرح روتی سسکتی ایک اجنبی ماحول میں پھینک دی جاؤں گی لیکن کیا میں خود کو نئے ماحول کے مطابق ڈھال سکوں گی؟ ـــــ اب جو بھی ہو۔ تن بہ تقدیر آگ میں جل مروں گی ـــــ لیکن تمہارا وعدہ کیا ہوا! ـــــ کیا تم ڈھولک پر تھاپ لگا کر گیت نہ گاؤ گی؟ مجھے خوبصورت گہنوں میں نہ سجاؤ گی؟ مانگ میں تاروں کی افشاں کون بھرے گا؟ مجھے اپنے بازوؤں میں سنبھال کر مَڑوے تک کون لے جائے گا؟ ـــــ مجھے میرے من دیوتا کی جھوٹی آشاؤں کا درشن کرا جاؤ میری پیاری! ـــــ میری بہن! میری اپّی! ـــــ میری جان ـــــ!!"

# سردی، زکام اور فلو؟

## ۴ اناسن سے
## جھٹ آرام

سردی، زکام سے آپ پریشان ہو جاتے ہیں۔ آپ کی ناک بہنے لگتی ہے۔ اور چھینک چھینک کر آپ کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ درد سے آپ کا جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ اور آپ کا کسی کام میں دھیان نہیں لگتا۔ ایسی حالت میں فوراً اناسن کی دو ٹکیاں لیجئے اور پھر دیکھئے یہ ۴ طریقوں سے کیسے جلد آرام دلاتی ہے۔



۱۔ اناسن سردی، زکام اور فلو کی تکلیفوں سے نجات دلاتی ہے۔ اور فوراً
۲۔ اناسن تھکاوٹ کو دور کرتی ہے۔ اور فوراً
۳۔ اناسن گھبراہٹ کو ختم کرتی ہے۔ اور فوراً
۴۔ اناسن اعصاب کے تناؤ سے آرام دلاتی ہے۔ اور فوراً

اناسن ڈاکٹر کے نسخے کی طرح بے ضرر دواؤں کا مرکب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں زیادہ تر لوگ درد سے آرام پانے کے لئے اناسن ہی لیتے ہیں۔

سردی و زکام کی پہلی علامت میں ہی اناسن لیجئے۔ اناسن سردرد، دانت کے درد اور بدن کے درد کو بھی دور کرتی ہے۔ اناسن ہمیشہ پاس رکھیئے۔

ہمیشہ اناسن ہی لیجئے۔

# اناسن

بہتر ہے
کیونکہ اس کے ۴ فائدے ہیں




Regd. user: GEOFFREY MANNERS & CO. LTD.

# غزل

## نذیر بنارسی

مضطرب ہے نگاہ، جی بے کل
آنے والا ہے کوئی جانِ غزل

چھلکا چھلکا سا جامِ نورِ سحر
ڈھلکا ڈھلکا سا رات کا آنچل

ہے کچھ ایسی حسین زمینِ فراق
دیکھ کر چل پڑی ہماری غزل

زُلف کے سائے میں رُخِ پرنُور
زیرِ شامِ ابد ہے صبحِ ازل

مُنھ اندھیرے ترا تبسّمِ لب
بھور میں جیسے کھل رہا ہو کنول

سامنے دیکھ آ گیا کوئی
گرتی پڑتی ہوئی نگاہ سنبھل

لبِ رنگیں سے زندگی گُلرنگ
گردشِ خُوں سے جسم رنگ محل

عارضِ سُرخ سُرخ پر گیسو
شفق آلود جس طرح بادل

نازکی سے ذرا ادا نالاں
بارِ مستی سے ہر نظر بوجھل

رِند دیکھے اگر نظر بھر کے
ہاتھ سے گر پڑے بھری بوتل

دل کے دو آتشہ نہ بن جائے
آن ذ، آواز اور میری غزل

آمنے سامنے ہیں ناز و نیاز
دیکھیں ہوتی ہے کس طرف سے پہل

ہائے رے دولتیں محبت کی
نقرئی ساعتیں سنہرے پل

زندگی ہے زمیں پہ نغمہ سرا
بجتی ہے آسماں پر چھاگل

عالمِ بے خودی معاذ اللہ
دونوں عالم نگاہ سے اوجھل

دل کی دھڑکن کا ساتھ دیتا جا
جس اشارے پہ چل رہا ہے چل

باندھ آنچل میں اے عروسِ بہار
کھو نہ جائے نذیرؔ کی ہے غزل



# کلائمکس

نکہت ریحانہ، ایم۔اے

نکہت ریحانہ، زینت منزل، انکیا پورہ (کیمپ)، امراؤتی، مہاراشٹر
یکم جولائی ۱۹۶۷ء

مشفق و محترم چچا جان! تسلیم و تکریم

تعلیمی مصروفیات کے باوجود میں "بیسویں صدی" کا مطالعہ بہت شوق سے کرتی ہوں۔ "بیسویں صدی" میرا محبوب صحیفہ ہے۔ اپنی ایک تازہ ترین تخلیق لے کر اس یقین و اعتماد کے ساتھ "بیسویں صدی" کی بزم میں پہلی بار شریک ہو رہی ہوں کہ آپ فنکار کو نہیں فن کو دیکھتے ہیں ——— آپ نے بہت سے ذرّوں کو آفتاب بنایا ہے۔ میں بھی ایک ننھی سی کرن ہوں اور آپ کا دامن پکڑ کر، آپ سے نُور و ضیا پا کر کہکشاں نہیں تو ایک چھوٹا سا ستارہ ضرور بن سکتی ہوں۔ مجھے یہ یقین و اعتماد "بیسویں صدی" کے سالہا سال کے مطالعے نے بخشا ہے۔

افسانہ کے متعلق میں خود کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ آپ کی بلند نگاہ ہی دیکھ سکتی ہے کہ میں کہاں تک کامیاب ہو سکی ہوں۔ آپ کی گراں قدر رائے میرے لئے مشعلِ راہ ہوگی۔

خلوص آگیں ——— نکہت ریحانہ

---

"تمہارے خیالات کتنے عجیب ہیں!"

"تمہاری محبت سے زیادہ مضحکہ خیز نہیں!"

"تم اِس لطیف جذبے سے آشنا ہی کب ہو!"

"تمہارے دامن سے بندھ کر میں کس چیز سے آشنا ہوئی جو اس لطیف جذبے سے بہرہ ور ہوتی"

"کیا تمہارے نزدیک جذبات کی آسودگی ہی سب کچھ ہے؟"

"ہاں!"

"رُوحانی سکون کی کوئی اہمیت نہیں؟"

"......!"

"کیوں سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو؟"

"جسے تم سراب کہہ رہے ہو وہ آج زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے سراب کے پیچھے تو میں اُس وقت بھاگی تھی جب تمہیں اپنا شریکِ زندگی بنانے کا فیصلہ کیا تھا!!"

"پہلے تو تمہارے خیالات ایسے نہ تھے!"

"پہلے تم بھی ایسے نہ تھے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ تم سے اپنا مستقبل وابستہ کر کے اندھیرے ہی ملیں گے تو اپنی زندگی کے اُجالے چھوڑ کر ان اندھیروں کو کیوں اپناتی!"

"تم چاہو تو اپنے پیار کی شمع جلا کر ان اندھیروں کو دُور کر سکتی ہو!!"

"تمہارے اندھیرے تمہیں کو مُبارک! میں اِن سے نکلنے کی ہمت رکھتی ہوں!"

"نہیں فردوس! تم مجھے اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتیں!"

"روک سکو تو روک لو!"

"اتنی ظالم نہ بنو مجھے سنبھلنے کا موقع دو۔"

"کیا یہ طویل سات سال سنبھلنے کے لئے کافی نہ تھے؟ تم چاہتے تو اس

عرصے میں بہت کچھ کر سکتے تھے۔ ایک ایسی شاہی فرم سے وابستہ ہو۔ باس کے خاص آدمی ہو۔ وہ تمہیں بیٹے کی طرح چاہتا ہے۔ خزانے کی کنجیاں بھی تمہارے ہی پاس رہتی ہیں۔ پھر بھی تمہاری آمدنی میں ایک پائی کا بھی اضافہ نہ ہوا۔ گھر میں بھی کوئی نیا سامان نہ آیا۔ میرا جسم قیمتی ملبوسات و زیورات سے محروم رہا۔ ہم سوسائٹی میں اپنے لئے کوئی جگہ نہ بنا سکے۔ تمہاری حالت تو اُس پیاسے کی ہے جو کنوئیں کے پاس آکر بھی پیاسا ہی رہا۔ لیکن میں اب اس محرومی سے اکتا چکی۔ میں اپنی پیاسی زندگی کو سیراب کرنا چاہتی ہوں!!"

"تم مجھے غبن کی ترغیب دے رہی ہو—!"

"جسے تم غبن کہہ رہے ہو، وہ تمہاری ہمت کی پستی ہے۔ تم اِن پستیوں کو شوق سے اپنا سکتے ہو۔ لیکن میں وہاں تک تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گی۔"

"مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع دو—"

"نہیں!— تم نے ہمیشہ مجھے سبز باغ دکھائے۔ میں جذبات کے دھارے میں بہہ گئی۔ تمہاری باتوں کے سحر میں کھو گئی۔ لیکن اب یہ سحر ٹوٹ چکا ہے۔ میں خوابوں سے حقیقت کی دنیا میں آگئی ہوں۔ جہاں میرے جسم کے کچھ تقاضے ہیں دل کی کچھ خواہشات ہیں۔ ذہن کی کچھ مانگیں ہیں۔ اب میں نے انھیں پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے—!!"

یہ چنگاریاں تو ہمیشہ ہی فراز کے خرمنِ دل پر گرتی تھیں لیکن آج فردوس مجسم آگ بن گئی تھی۔ اِس آگ میں اُسے اپنا چھوٹا سا گھر جلتا محسوس ہوا — فراز گھبرا گیا۔ وہ فردوس کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے فردوس سے بے پناہ محبت تھی۔ لیکن آج فردوس نے اپنی محبت کی جو قیمت رکھی تھی۔ اُس نے فراز کی روح کو مجروح کر ڈالا تھا۔ اُسے اپنا ضمیر خنجر تلے ذبح ہوتا نظر آیا۔ اک بے چینی— اک کشمکش— آخر ایک دن اُس نے سب کچھ کھو کر فردوس کی محبت کو پا لیا۔ لیکن نہیں— شاید سب کچھ کھو کر بھی وہ فردوس کی محبت سے محروم رہا۔ اُس نے فردوس کو بھی کھو دیا۔

فرم کے حساب سے ایک بھاری رقم کی چوری کے جرم میں اُسے جیل بھیج دیا گیا۔ فردوس کی نظروں میں اُس کی رہی سہی اہمیت، رہا سہا وقار بھی ختم ہو گیا— وہ اپنے چھ سالہ بیٹے شاہد کو لے کر اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔ اُس کے والد نے تھوڑی بہت دوڑ دھوپ کی لیکن وہ فراز کو سزا سے نہ بچا سکے۔ ننھا شاہد جب بھی باپ کی یاد میں تڑپتا، مچلتا، فردوس کو احساسِ گناہ کے اَن گنت سانپ ڈسنے دوڑتے۔ دولت کی چمکتی دھوپ میں اُس نے اپنے سہاگ کے پھول جلا ڈالے جب کبھی شاہد پوچھتا "ممی! پاپا کو پولس کیوں پکڑ لے گئی؟"، تو احساسِ ندامت سے [illegible] جاتی۔

دھیرے دھیرے گزرتے وقت نے یہ احساسِ ندامت بھی مٹا دیا۔ اب زندگی اپنے معمول پر آگئی تھی۔ اُس نے باہر آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ اکثر شامیں کلب میں گزرنے لگیں— پھر ایک شام— اُس کی پُرسکون زندگی میں جذبات کی ایسی طوفان خیز لہریں اُٹھیں کہ وہ تیز و تند دھارے میں تنکے کی طرح بہتی چلی گئی— کنارے سے بہت دُور!

---

"اچھا! اب اِن سے ملو۔ یہ ہیں ....!"

"میں اِنھیں جانتا ہوں!"

"ہیں!— بھئی تم اِنھیں کیسے جان سکتے ہو— نہیں! مذاق کرتے ہو!" راج ہنس دیا۔

"میں اِس وقت قطعی سنجیدہ ہوں۔"

"اچھا تو مسٹر سنجیدہ! بتلائیے یہ کون ہیں؟"

"کیٹس کا مجسم تخیل! صانعِ قدرت کا حسین شاہکار!!"

اُس کے رخسار گلنار ہو گئے۔ آنکھوں میں حیا کے ڈورے مچلنے لگے۔ کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا: "یہ وہی ہے— وہی۔ جس کی تلاش میں تم اب تک بھٹکتی رہیں"

"آپ کہاں کھو گئیں مسز فراز! تعارف تو ابھی ادھورا ہے" راج نے چوٹ کی۔

"اِن سے ملئے یہ ہیں مسٹر آفاق — حال ہی میں یہاں کے محکمۂ پولس میں منتقل ہو کر آئے ہیں۔ یہ محکمہ اِنھوں نے شوقیہ اپنایا ہے۔ ورنہ لکھ پتی باپ کے بگڑے شہزادے ہیں۔ اور میرے .....!"

"یہ تم تعارف کروا رہے ہو یا میرا شجرۂ نسب بیان کر رہے ہو؟"

"ارے ظالم جملہ تو پورا کرنے دیا ہوتا— ہاں! تو میں کہہ رہا تھا یہ میرے بہت قریبی دشمن ہیں۔ اپنے آپ کو بہت دلچسپ پوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں انسان کو آفاق کی بلندیوں پر پہنچا دیتے ہیں!"

"اور دوسری ملاقات میں؟" مسز شاہ نے سوال کیا۔

"فرش کی پستیوں پر لا پٹکتے ہیں!!"

"اچھا تو یہ میری تعریف ہو رہی ہے۔ سچ ہے تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا!"

ایک پُر زور قہقہہ پڑا۔ پھر اُسے پتہ ہی نہ چلا وہ شام کیسے بیتی۔ بس اُسے اتنا یاد تھا کہ وہ اور آفاق ساتھ ہی رہے۔ آفاق کی [illegible] میں [illegible]

[illegible] کر رہا تھا ------- اور جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو آفاق کی خوشبو میں اُس کے پہلو میں بیٹھا پایا۔ کار آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد اُسے کسی مرد کا قرب حاصل ہوا تھا۔ یہی وہ مسرور کن زندگی تھی جس کی آرزو میں فردوس نے اپنا آشیاں خود ہی پھونک ڈالا تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے آفاق کوئی شہزادہ ہو جو اُسے پریوں کے دیس میں اُٹھائے لیے جا رہا ہو۔ آفاق کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا، ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر تھے۔ نظریں ونڈ سکرین پر۔ کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔

"یہی ہے تیرے سپنوں کا شہزادہ!"

کسی نامعلوم جذبے سے مغلوب ہو کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ کچھ لمحے یونہی بیت گئے۔ اچانک اُسے آفاق کی آواز سُنائی دی۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

"براہِ کرم اپنی منزل تک میری رہبری کیجیے۔"

اُس کا دل چاہا کہہ دے ------- "میری اپنی کوئی منزل نہیں تم جہاں پہنچ کے رُک گئے، بس وہی میری منزل ہوگی"، لیکن وہ یہ سب نہ کہہ سکی۔

"آگے جو چوراہا نظر آ رہا ہے۔ وہاں سے دائیں طرف موڑ لیجیے۔ ایک سُنسان لمبی سی سڑک چلی گئی ہے۔ جو آگے کیمپ ایریا کو جاتی ہے۔ وہیں سرکٹ ہاؤس کے سامنے میرے ڈیڈی کی کوٹھی ہے!"

"آپ اپنے ڈیڈی کے پاس رہتی ہیں؟"

"ہاں ------" اُس نے مختصر سا جواب دیا تاکہ بات ختم ہو جائے لیکن بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ بات تو ابھی شروع ہوئی تھی۔

"آپ کے ہسبنڈ؟" اُس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سوال ادھورا ہوتے ہوئے بھی پورا تھا۔ فردوس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"وہ! وہ جیل میں ہیں ----"

"آئی سی!" آفاق کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"کیا میں وجہ جان سکتا ہوں؟"

"انھوں نے فرم کے حساب میں کئی ہزار کی گڑبڑ کر دی تھی۔"

"یعنی۔ غبن؟"

وہ خاموش رہی۔

"انھوں نے ایسا کیوں کیا؟"

نظریں اٹھ نہ سکیں۔ زبان نے جھوٹ کا دامن تھاما۔

"اپنی بے شمار خواہشات کی تکمیل کے لئے [illegible] ----"

"پھر ایسے شخص سے آپ نے شادی کیوں کی؟"

"کسی کا کردار اُس کے چہرے پر تو لکھا نہیں ہوتا!"

حیرت ہے آپ نے سات سال ایسے شخص سے نباہ کیا! اس سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آپ جیسی شریکِ زندگی پا کر بھی وہ اچھی راہ پر نہ آ سکے۔"

"آفاق صاحب! پھول اور کانٹے ایک ہی شاخ پر بہت قریب قریب رہتے ہیں۔ مگر جس طرح پھول کے سراپا میں کانٹوں کی چبھن پیدا نہیں ہو سکتی اسی طرح کانٹے بھی پھول کی نرمی سے محروم رہتے ہیں۔ ہماری زندگی بھی اسی طرح گزری۔ ٹرین کی دو پٹڑیوں کی طرح۔ جو ساتھ چلتے ہوئے بھی کبھی نہیں ملتیں ------- میں نے سات برس کانٹوں سے نباہ کیا ہے۔ میں نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ اپنی عادتوں سے مجبور تھے۔ جب انھیں اپنی نشاط کوشیوں کے لئے اپنی اقتصادی حالت کا دامن تنگ محسوس ہوا تو انھوں نے ناجائز طریقے اپنائے۔ اور پھر...."

جھوٹ نے بھی شرما کر اُس کی زبان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اور وہ ---- وہ الفاظ ڈھونڈتی ہی رہ گئی۔ احساسِ گناہ کا بوجھ اٹھائے نہیں بن رہا تھا۔ آخر نڈھال ہو کر اُس نے سیٹ کی پشت سے اپنا سر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کار چلتی رہی۔

---

چاندی کی نقرئی کرنیں سیدھی صوفے کا طواف کر رہی تھیں جس پر فردوس آفاق کی باہوں کا سہارا لئے لیٹی تھی۔ کوٹھی میں گہرا سکوت تھا۔ اُس کے والدین گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اوپر بیڈ روم میں ننھا شاہد اپنے چاروں طرف کھلونے بکھیرے، اپنی چھوٹی سی بندوق کو سینے پر رکھے سو رہا تھا۔ فردوس کے چہرے پر اُداسی کے گہرے سائے تھے۔ آفاق بھی بُجھا بُجھا سا تھا۔ وہ اس وقت فل یونیفارم میں تھا اور ڈیوٹی پر جانے سے پہلے فردوس سے ملنے آیا تھا۔ اچانک اُس نے جُھک کر فردوس کی عنبریں زُلفوں میں اپنا منہ چھپا لیا اور درد میں ڈوبی آواز میں کہا ------

"یہ کیا ہو گیا۔ فردوس! مجھے اپنی جنّت سے اتنی جلدی نکلنا پڑے گا۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا!"

فردوس تڑپ اُٹھی۔ "ایسا نہ کہو آفاق! تم تو میری زندگی کی تکمیل ہو۔ اگر تم چلے گئے تو میرا وجود ادھورا ہی رہ جائے گا!"

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ کل تمہارے [illegible] آ جائیں گے۔ پھر اس جنّت کے دروازے میرے لئے ہمیشہ [illegible]"

"نہیں! میں اُس کے اندھیرے فلیٹ میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ وہاں تو میرا دم گھٹ جائے گا!!"

"پھر کیا کرو گی؟"

"تم ــــ میں اُس سے طلاق لے لوں گی۔ جیل سے نکلنے کے بعد اُس کی زندگی نفرت انگیز اور نفرت آمیز ہو جائے گی۔ اگر اُس میں ذرا بھی غیرت ہوگی تو اپنے [illegible] اندھیروں میں منہ چھپا کر کہیں کھو جائے گا۔ میں اپنے شاہد کی زندگی پر ایک سزا یافتہ مجرم کا سایہ ہرگز نہ پڑنے دوں گی۔ میں اُس کی رینگتی، سسکتی زندگی کا سہارا نہیں بن سکتی۔ آفاق! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ بولو! مجھے سہارا دو گے؟"

آفاق کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل اٹھی "او! شیور ڈارلنگ!"

فردوس نے اٹکتے اٹکتے کہا "ایک بات پوچھوں آفاق؟"

"ضرور!"

"تمہاری دنیا میں میرے شاہد کے لئے بھی جگہ نکل سکے گی نا؟ میں اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ میں سب کچھ کر سکتی ہوں، لیکن اپنی ممتا کا گلا نہیں گھونٹ سکتی ــــ وعدہ کرتی ہوں۔ وہ تمہاری خوشیوں میں کبھی مخل نہ ہو گا۔"

آفاق اُس پر جھک گیا ــــ "میں تمہارے ان پاک جذبات کی قدر کرتا ہوں، فردوس! مجھے خوشی ہوگی اگر شاہد اپنی ننھی منی مسکراہٹوں سے میرے گھر کو منور کر دے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ تم بھی اِس سے لاعلم نہیں۔ یاد ہے تمہیں! پہلی بار اُس نے ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کر کیا کہا تھا "ممی! یہ پولس تم کو پکڑ کر لے جائے گا۔ اسے اپنے گھر مت آنے دو۔ یہ پاپا کو بھی پکڑ کر لے گیا تھا۔ پھر وہ اپنی چھوٹی سی بندوق لے کر مجھ پر دوڑا تھا۔"

فردوس ہنسنے لگی ــــ "اِس کا خیال نہ کرو آفاق۔ یہ تو اُس کے بچپنے کی باتیں ہیں۔ جب تم اُس کے پاپا بن جاؤ گے تو میں اس نفرت کا رُخ محبت میں بدل دوں گی۔"

اچانک آفاق گھڑی دیکھتا کھڑا ہو گیا ــــ "ارے نو بج گئے؟ اور مجھے ایک جگہ ڈیوٹی پر جانا ہے! ایک دوست سے ضروری کام بھی ہے۔" اور وہ جلدی سے اپنی ہیٹ اُٹھا کر چل دیا۔ فردوس دروازے تک اُسے چھوڑنے آئی۔ آفاق نے جھک کر اُس کے ہاتھوں کو چوما اور چلا گیا۔

ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب آفاق اپنے افسر دوست کے گھر سے اُس کے ساتھ ڈیوٹی پر جانے کے لئے نکلا تو اُسے خیال آیا۔ وہ اپنا پستول فردوس کے گھر ہی بھول آیا ہے! شاید ہولسٹر سے گر پڑا تھا۔ وہ اُسی وقت فردوس کے گھر پہنچا۔ کوٹھی میں خاموشی تھی۔ صرف اوپر فردوس کے بیڈ روم میں روشنی تھی۔ اُسے حیرت ہوئی کہ فردوس ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اُس نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا! اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ سامنے شاہد کھڑا تھا۔ آفاق کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں نفرت کی چنگاریاں برسانے لگیں۔ آفاق اُس کے قریب سے نکل کر سیدھا صوفے کی طرف گیا اور تبھی اُسے اوپر فردوس کے تیز لہجے میں کسی مرد سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ سو فیصدی اُس کے شوہر فراز کی آواز ہے۔ لیکن وہ تو کل آنے والا تھا۔ پھر آج ــــ؟

اس نے خاموشی سے باہر نکل جانا ہی بہتر سمجھا۔ بہت تلاش کرنے پر بھی اُسے صوفے پر پستول نہ ملا۔ وہ مُڑا اور پھر اُس کا خون جیسے اُس کی رگوں میں جم سا گیا۔ شاہد اُس کی طرف پستول کا رُخ کئے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ بمشکل آفاق نے کہا ــــ

"یہ کیا کرتے ہو شاہد؟ پستول مجھے دو۔ وہ لوڈڈ ہے!"

شاہد اپنی پوری قوت سے چیخا ــــ "نہیں میں تم کو بندوق نہیں دوں گا! میں تم کو ختم کر دوں گا!"

اُس نے منہ سے ٹھیں کی آواز نکالی۔ آفاق کو محسوس ہوا کہ [illegible] وہ لرز گیا۔ شاہد چیخے جا رہا تھا "میں تم کو مار ڈالوں گا! تم ممی کو لے جانے [illegible] ممی پاپا کے پاس ہیں۔ آج ہمارے پاپا آ گئے! ہمارے لئے [illegible] لائے ہیں۔ چھوٹی سی بندوق بھی! لیکن میں تمہاری بندوق بھی [illegible] سے کہہ کر تم کو...."

"شاہد!!" اچانک فردوس کی خوفزدہ آواز اُبھری [illegible] سُن کر فردوس اور فراز زینے تک آ گئے تھے۔ شاہد زینے [illegible] تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر دونوں گھبرا گئے۔ فردوس [illegible] کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"پستول پھینک دو بیٹے! اُس میں گولیاں بھری [illegible] میرے بچے! نہیں تو گولی مجھے لگ جائے گی۔ میں تمہاری ممی ہوں [illegible] ہوں!! پھینک دو پستول!"

اب شاہد کی پوری توجہ فردوس اور آفاق پر تھی [illegible] جانا اور دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ شاہد کی طرف [illegible] کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ جبھی شاہد نے اُسے دیکھ لیا۔ اُس [illegible] کی کوشش کی۔

"نہیں پاپا! میں آپ کو بھی بندوق نہ دوں گا! میں [illegible] مار ڈالوں گا! یہ روز ممی کو تنگ کرنے جاتا تھا۔ میں گھر پر اکیلا [illegible]

مار ڈالوں گا!!"

فراد نے گھبراہٹ میں اُس کے ہاتھوں سے پستول چھیننے کے لئے ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ انجانے میں پستول چل چکی تھی۔ فضا میں ایک ننھی سی چیخ بلند ہوئی۔ پستول شاہد کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا پڑی۔ دوسرے لمحے اُس کا بے جان جسم فراد کے ہاتھوں پر جھول گیا۔

اور کمرہ فردوس کی دل خراش چیخوں سے گونجنے لگی!!!

---

(اس حقیقت کو افسانے کا روپ دے کر سوچ رہی ہوں —— کسی شعلہ طراز فنکار کے شاہکار کا کلائمکس اس حقیقت کے انجام سے زیادہ تاثر انگیز ہو سکتا ہے ؟؟)

---

# غزلیں

## کاشف الہاشمی اوجینی

وقت کی دھوپ کڑی ہے تو کوئی بات نہیں
آزمائش کی گھڑی ہے تو کوئی بات نہیں

زندگی منزلِ مقصود پہ پہنچے گی ضرور
راہ میں موت کھڑی ہے تو کوئی بات نہیں

[illegible] اک زندہ حقیقت ہے یقیناً ہوگی
ہجر کی رات بڑی ہے تو کوئی بات نہیں

[illegible]رف راتیں ہی نہیں دن بھی بڑے ہوتے ہیں
آج کی رات بڑی ہے تو کوئی بات نہیں

[illegible] بڑی بات نہیں ایک توجہ کی نظر
آپ کہتے ہیں بڑی ہے تو کوئی بات نہیں

[illegible] بھی زندگی ٹھہرے گی بڑے کام کی چیز
آج بیکار پڑی ہے تو کوئی بات نہیں

ہم بہت چین سے ہیں گوشۂ گمنامی میں
شہر میں ڈھونڈ پڑی ہے تو کوئی بات نہیں

[illegible] ہے کم آپ کی تفریح کا ساماں تو ہوا
ہم پہ اُفتاد پڑی ہے تو کوئی بات نہیں

زندگی بخش سمجھتے ہیں جسے ہم، وہ نظر
جان لینے پہ اَڑی ہے تو کوئی بات نہیں

شکر ہے دل تو سلامت ہے ابھی پہلو میں
آنکھ اگر ان سے لڑی ہے تو کوئی بات نہیں

کاشف بے سر و ساماں تری راہوں میں اگر
غم کی دیوار کھڑی ہے تو کوئی بات نہیں

## سیّد جاذب ترمذی

شاہد و مشہود یکجا ہیں بہ فیضانِ وفا
در حقیقت دو دلوں پر ہے یہ احسانِ وفا

غور سے سُن لیں یہ اربابِ گلستانِ وفا
خونِ دل سے سینچنا ہے ہر خیابانِ وفا

اِس حقیقت سے ہیں واقف کہ نگہبانِ وفا
زندگی افسانۂ دل ہے بہ عنوانِ وفا

اِک طرف حُسن مجسّم اِک طرف عشقِ تمام
بالمشافہ ہو رہے ہیں عہد و پیمانِ وفا

اُس لبِ نازک پہ ہلکا سا تبسم تھا ضرور
اب وہ اظہارِ محبت ہو کہ [illegible] وفا

پا گئے یہ راز شاید نوجوانانِ وفا
زندگی ہی زندگی ہے زیرِ دامانِ وفا

جا رہے ہیں سُوئے منزل حشر سامانِ وفا
دل میں مستحکم ارادے لب پہ اعلانِ وفا

آ نہیں سکتا کبھی ناکامیابی کا خیال
کامیابی سے [illegible] دامانِ وفا

عشق میں ہے شرطِ اوّل اعتمادِ باہمی
عذر باطل ہے کہ دُنیا میں ہو فقدانِ وفا

مرکزِ اخلاص سے جُنبش نہ ہونی چاہیے
مرکزِ اخلاص ہے بُنیادِ ایوانِ وفا

موجِ طوفانِ وفا میں کشتیِ دل ہے حباب
کس طرف لے جائے دیکھیں موجِ طوفانِ وفا

"نہیں! میں اُس کے اندھیروں میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ وہاں تو میرا دم گھٹ جائے گا!!"

"پھر کیا کرو گی؟"

"تمہا —— میں اُس سے طلاق لے لوں گی۔ جیل سے نکلنے کے بعد اُس کی زندگی نفرت انگیز اور نفرت آگیں ہو جائے گی۔ اگر اُس میں ذرا بھی غیرت ہوگی تو اپنے اندھیروں میں منہ چھپا کر کہیں کھو جائے گا۔ میں اپنے شاہد کی زندگی پر ایک سزا یافتہ مجرم کا سایہ ہرگز نہیں پڑنے دوں گی۔ میں اُس کی رینگتی، سسکتی زندگی کا سہارا نہیں بن سکتی۔ آفاق! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ بولو! مجھے سہارا دو گے؟"

آفاق کے چہرے پر بے حد دل آویز مسکراہٹ پھیل اٹھی "اوہ! شیور ڈارلنگ!"

فردوس نے رُکتے رُکتے کہا۔ "ایک بات پوچھوں آفاق؟"

"ضرور!"

"تمہاری دنیا میں میرے شاہد کے لئے بھی جگہ نکل سکے گی نا؟ میں اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ لیکن اپنی ممتا کا گلا نہیں گھونٹ سکتی ...... وعدہ کرتی ہوں۔ وہ تمہاری خوشیوں میں کبھی مخل نہ ہوگا!"

آفاق اُس پر جھک پڑا ——— "میں تمہارے اِن پاک جذبات کی قدر کرتا ہوں، فردوس! مجھے خوشی ہوگی اگر شاہد اپنی ننھی مُنّی مسکراہٹوں سے میرے گھر کو منوّر کر دے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ تم بھی اس سے لاعلم نہیں۔ یاد ہے تمہیں! پہلی بار اُس نے ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کر کیا کہا تھا "ممی! یہ پولس تم کو پکڑ کر لے جائے گا۔ اسے اپنے گھر مت آنے دو۔ یہ پاپا کو بھی پکڑ کر لے گیا تھا۔ پھر وہ اپنی چھوٹی سی بندوق لے کر مجھ پر دوڑا تھا۔"

فردوس ہنسنے لگی ——— "اس کا خیال نہ کرو آفاق۔ یہ تو اُس کے بچپنے کی باتیں ہیں۔ جب تم اُس کے پاپا بن جاؤ گے تو میں اس نفرت کا رُخ محبت میں بدل دوں گی!"

اچانک آفاق گھڑی دیکھتا کھڑا ہو گیا ——— "ارے نو بج گئے؟ اور مجھے ایک جگہ ڈیوٹی پر جانا ہے! ایک دوست سے ضروری کام بھی ہے۔" اور وہ جلدی سے اپنی ہیٹ اُٹھا کر چل دیا۔ فردوس دروازے تک اُسے چھوڑنے آئی۔ آفاق نے جھک کر اُس کے ہاتھوں کو چوما اور چلا گیا۔

ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب آفاق اپنے افسر دوست کے گھر سے اُس کے ساتھ ڈیوٹی پر جانے کے لئے نکلا تو اُسے خیال آیا۔ وہ اپنا پستول فردوس کے گھر ہی بھول آیا ہے! شاید ہولسٹر سے گر پڑا تھا۔ وہ اُسی وقت فردوس کے گھر پہنچا۔ کوٹھی میں خاموشی تھی۔ صرف اوپر فردوس کے بیڈ روم میں روشنی تھی۔ اُسے حیرت ہوئی کہ فردوس ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اُس نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ سامنے شاہد کھڑا تھا۔ آفاق کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں نفرت کی چنگاریاں برسانے لگیں۔ آفاق اُس کے قریب سے نکل کر سیدھا صوفے کی طرف گیا اور تبھی اُسے اوپر فردوس کے تیز لہجے میں کسی مرد سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ سو فیصدی اُس کے شوہر فراز کی آواز ہے۔ لیکن وہ تو کل آنے والا تھا۔ پھر آج ———؟

اس نے خاموشی سے باہر نکل جانا ہی بہتر سمجھا۔ بہت تلاش کرنے پر بھی اُسے صوفے پر پستول نہ ملا۔ وہ مُڑا اور پھر اُس کا خون جیسے اُس کی رگوں میں جم سا گیا۔ شاہد اُس کی طرف پستول کا رُخ کئے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ بمشکل آفاق نے کہا ———

"یہ کیا کرتے ہو شاہد؟ پستول مجھے دو۔ وہ لوڈڈ ہے!"

شاہد اپنی پوری قوت سے چیخا ——— "نہیں میں تم کو بندوق نہیں دوں گا! میں تم کو ٹھیں کر دوں گا!"

اُس نے منھ سے ٹھیں کی آواز نکالی۔ آفاق کو محسوس ہوا گولی چل ہی گئی۔ وہ لرز گیا۔ شاہد چیخے جا رہا تھا "میں تم کو مار ڈالوں گا! تم ممی کو لے جانے آئے ہو نا! ممی پاپا کے پاس ہیں۔ آج ہمارے پاپا آ گئے! ہمارے لئے بہت سارے کھلونے لائے ہیں۔ چھوٹی سی بندوق بھی! لیکن میں تمہاری بندوق بھی رکھوں گا۔ میں پاپا سے کہہ کر تم کو......"

"شاہد!!" اچانک فردوس کی خوفزدہ آواز اُبھری۔ شاہد کی چیخیں سُن کر فردوس اور فراز زینے تک آ گئے تھے۔ شاہد زینے کی طرف منھ کئے ہی کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر دونوں گھبرا گئے۔ فردوس دوڑتی ہوئی آ کر آفاق کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"پستول پھینک دو بیٹے! اُس میں گولیاں بھری ہیں۔ پھینک دو میرے بچے! نہیں تو گولی مجھے لگ جائے گی۔ میں تمہاری ممی ہوں۔ تمہاری ماں ہوں!! پھینک دو پستول!"

اب شاہد کی پوری توجہ فردوس اور آفاق پر تھی۔ فراز نے موقع غنیمت جانا اور دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ شاہد کی طرف بڑھنے لگا۔ آخر وہ اُس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ جبھی شاہد نے اُسے دیکھ لیا۔ اُس نے پستول چھپانے کی کوشش کی۔

"نہیں پاپا! میں آپ کو بھی بندوق نہ دوں گا! میں اس پولس کو مار ڈالوں گا! یہ روز ممی کو آ کر لے جاتا تھا۔ میں گھر پر اکیلا رہتا تھا۔ میں اس کو

مار ڈالوں گا!"

فراد نے گھبراہٹ میں اس کے ہاتھوں سے پستول چھیننے کے لئے ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ ایک زوردار دھماکا ہوا! انجانے میں پستول چل چکی تھی۔ فضا میں ایک نحیف سی چیخ بلند ہوئی۔ پستول شاہدہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔ دوسرے لمحے اس کا بے جان جسم فراد کے ہاتھوں پر جھول گیا۔

اور کوٹھی فردوس کی دل خراش چیخوں سے گونجنے لگی!!!

---

(اس حقیقت کو افسانے کا روپ دے کر سوچ رہی ہوں ——— کسی شعلہ طراز فنکار کے شاہکار کا کلائمکس اس حقیقت کے انجام سے زیادہ تاثر انگیز ہو سکتا ہے؟؟)

---

# غزلیں

## کاشف الہاشمی اوجینی

وقت کی دھوپ کڑی ہے تو کوئی بات نہیں
آزمائش کی گھڑی ہے تو کوئی بات نہیں

زندگی منزلِ مقصود پہ پہنچے گی ضرور
راہ میں موت کھڑی ہے تو کوئی بات نہیں

صبح اک زندہ حقیقت ہے، یقیناً ہوگی
ہجر کی رات بڑی ہے تو کوئی بات نہیں

صرف راتیں ہی نہیں دن بھی بڑے ہوتے ہیں
آج کی رات بڑی ہے تو کوئی بات نہیں

کچھ بڑی بات نہیں ایک توجہ کی نظر
آپ کہتے ہیں بڑی ہے تو کوئی بات نہیں

کل یہی زندگی ٹھہرے گی بڑے کام کی چیز
آج بیکار پڑی ہے تو کوئی بات نہیں

ہم بہت جی سے ہیں گوشۂ گمنامی میں
شہر میں ڈھونڈ پڑی ہے تو کوئی بات نہیں

کم سے کم آپ کی تفریح کا ساماں تو ہوا
ہم پہ اُفتاد پڑی ہے تو کوئی بات نہیں

زندگی بخش سمجھتے ہیں جسے ہم، وہ نظر
جان لینے پہ اَڑی ہے تو کوئی بات نہیں

شکر ہے دل تو سلامت ہے ابھی پہلو میں
آنکھ اگر ان سے لڑی ہے تو کوئی بات نہیں

کاشفِ بے سروساماں تری راہوں میں اگر
غم کی دیوار کھڑی ہے تو کوئی بات نہیں

## سید حباب ترمذی

شاہد و مشہود یکجا ہیں بہ فیضانِ وفا
درحقیقت دو دلوں پر ہے یہ احسانِ وفا

غور سے سن لیں یہ اربابِ گلستانِ وفا
خونِ دل سے سینچنا ہے ہر خیابانِ وفا

اِس حقیقت سے ہیں واقف نگہبانِ وفا
زندگی افسانۂ دل ہے بہ عنوانِ وفا

اِک طرف حسن مجسّم، اِک طرف عشقِ تمام
بالمشافہ ہو رہے ہیں عہد و پیمانِ وفا

اُس لبِ نازک پہ ہلکا سا تبسّم تھا ضرور
اب وہ اظہارِ محبت ہو کہ اعلانِ وفا

پا گئے یہ راز شاید نونہالانِ وفا
زندگی ہی زندگی ہے زیرِ دامانِ وفا

جا رہے ہیں سوئے منزل حشر سامانِ وفا
دل میں مستحکم ارادے لب پہ اعلانِ وفا

آ نہیں سکتا کبھی ناکامیابی کا خیال
کامیابی سے ہے مالامال دامانِ وفا

عشق میں ہے شرطِ اوّل اعتمادِ باہمی
عذرِ باطل ہے کہ دنیا میں ہے فقدانِ وفا

مرکزِ اخلاص سے جنبش نہ ہونی چاہیے
مرکزِ اخلاص ہے بنیادِ ایوانِ وفا

موجِ طوفانِ وفا میں کشتیِ دل ہے حباب
کس طرف لے جائے دیکھیں موجِ طوفانِ وفا



# فانی بدایونی سے انٹرویو

نریش کمار شاد

۶۲۔ تیمار پور۔ دہلی

۲۶ر جون ۱۹۶۷ء

محترم خوشتر صاحب! تسلیم

میں اب موتی باغ سے تیمار پور میں آگیا ہوں یعنی نئی دلّی سے پُرانی دلّی میں۔ جو بادی النظر میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ کیونکہ یہ محض دس پندرہ میل کا فاصلہ ہے۔ لیکن آپ یقین مانئے کہ اس معمولی سے فاصلے کو طے کرنے کے لئے، کرتے ہوئے اور کرنے کے بعد مجھے جن پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اور ہونا پڑ رہا ہے اُن کے پیشِ نظر تو یہ گمان ہو رہا ہے کہ راجدھانی کے ایک کوارٹر سے دوسرے سرکاری کوارٹر میں منتقل نہیں ہوا ہوں بلکہ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ وطن کے بعد میرے دل و دماغ پر جو چوٹیں پڑی تھیں بیس سال کے بعد ذرا چھوٹے پیمانے پر اُن کی ریہرسل ہوئی ہے! بہرکیف نئے کوارٹر میں آتو گیا ہوں لیکن یہ کہنے کا مجاز ابھی تک نہیں ہوں کہ ؎

گزر گئی ترے مسنوں پہ یہ بھی تیرہ شبی

کیونکہ اس کوارٹر کے لئے بجلی کا کنکشن ابھی تک نہیں ملا۔ یہاں بھی خدا کے فضل سے تیرہ بختی ہی نے خیر مقدم کیا ہے اور فی الحال رات تو رات ؎

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا گماں ہے

بجلی نہ ہونے سے پنکھا بھی نہیں چل سکتا۔ اس لئے اس قیامت کی گرمی میں یوں سمجھئے کہ پسینے کی روشنائی سے یہ خط لکھ رہا ہوں! ——— "بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر موصول ہو گیا تھا۔ اُس کی ورق گردانی بھی میں نے ضرور کی تھی لیکن مطالعے کے لئے وقت نہ مل سکا اور اب تو کوارٹر تبدیل کرنے کی وجہ سے میری سب کتابیں، ضروری کاغذات و مسودات اور اخبارات و رسائل گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اب بھی اگر یہ نمبر آسانی سے دستیاب ہو سکتا تو اُسے پڑھنے کے لئے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی وقت نکالنے کی کوشش کرتا اور اس خط میں اُس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتا لیکن آپ بھی میری طرح دعا دیجئے یہاں بجلی سپلائی کرنے والے محکمے کو! علامہ اقبالؔ نے تو یہ شکوہ کیا تھا کہ ؎

برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر!

اور مجھے شکایت یہ ہے کہ ؎

بجلی کھلتی ہے تو ہم سوختہ سامانوں کی!

"افسانہ نمبر" کے سلسلے میں مجھے "بیسویں صدی" کے قارئین کی طرف سے بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں

اور ابھی تک ہو رہے ہیں۔ اُس میں آپ کے نام میں نے جو خط تحریر کیا ہے اور اُردو کے مستقبل کے بارے میں جس نظریے کا اظہار کیا ہے اُس کی تائید تو بہت سے لوگوں نے کی ہے لیکن بعض اصحاب کو میری یہ صاف گوئی ناگوار بھی گذری ہے۔ اِس ضمن میں تفصیل سے تو پھر کبھی اطمینان سے لکھوں گا۔ اِن خطوں کے علاوہ مجھے ایسے خط بھی ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نمبر میں میرے لکھے ہوئے عالمِ خیال میں جگر مرادآبادی سے انٹرویو کو میری توقع سے کہیں زیادہ "بیسویں صدی" کے پرستاروں نے پسند کیا ہے اِس لئے اِس خط کے ساتھ اُسی نوعیت کا ایک اور انٹرویو بھیج رہا ہوں ——— خدا کرے کہ آپ میری طرح "مع الخیر" نہ ہوں۔

آپ کا ——— نریش کمار شاد

---

شاد :۔ "فانی صاحب! آپ کے کلام میں اگرچہ کہیں کہیں ایسے شعر بھی مل جاتے ہیں ؎

بھر کے ساقی! جام مے اک اور لا اک اور لا
ان نشیلی انکھڑیوں میں پھر حجاب آنے کو ہے

اور ؎

چشمِ ساقی کی وہ مخمور نگاہی توبہ
آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

لیکن جوش ملیح آبادی نے آپ کا ذکر کرتے ہوئے کہیں لکھا ہے کہ ایک رات فانی کے مکان میں چند یارانِ خرابات جمع تھے اور شغلِ مے نوشی جاری تھا۔ فانی ایک گوشے میں ایک ایسے برہمن کے مانند لیٹے یا یوں کہنا چاہیے کہ پڑے ہوئے تھے جس کے سامنے گائے ذبح کی جا رہی ہو ——— اِس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بادہ و جام کا نظارہ کرنے والوں میں تو تھے مگر شراب کا پینا ناجائز سمجھتے تھے۔ کیوں حضرت! کیا سچ مچ آپ شاعر ہونے کے باوجود شراب نہیں پیتے تھے؟"

فانی :۔ "پی اور وہ پی ازل میں کہ اُترے نہ حشر تک
یادش بخیر دل بھی عجب بادہ نوش تھا"

شاد :۔ "ہمارے ایک بہت بڑے ناقد سید احتشام حسین نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ انتقال کے وقت آپ کی عمر باسٹھ سال کی تھی اور اگر آپ کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، آپ کی موت بہت پہلے واقع ہو چکی تھی یا واقع ہونا شروع ہو چکی تھی اور یہ باسٹھ سال ایک مرگِ مسلسل کی طرح گزرے۔ آپ اِس بات سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں اور زندگی کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟"

فانی :۔ "محتاجِ اجل کیوں ہے خود اپنی قضا ہو جا
غیرت ہے تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا"

شاد :۔ "سُبحان اللہ! کیا خودداری ہے! لیکن جناب! اگر آپ کے نزدیک انسانی غیرت کا یہی تقاضا ہے تو پھر اِس دنیا کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

فانی :۔ "کیفیتِ ظہورِ فنا کے سوا نہیں
ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے"

شاد :۔ "اِس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ کی نظر میں زندگی اور موت میں کوئی بُنیادی فرق نہیں؟"

فانی :۔ "زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے"

شاد :۔ "آپ تو زندگی بھر موت کے پجاری تھے جبھی تو اپنے شعروں میں آپ نے موت کو زندگی سے بھی خوبصورت بنا دیا ہے لیکن گستاخی معاف یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ موت کو واقعی اتنا ہی حسین سمجھتے ہوں جتنا کہ آپ کے شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ آپ کے بعض معتبر اور قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ جب آپ بسترِ مرگ پر دراز تھے اور آپ کو یہ بتایا گیا تھا کہ آپ کی انرجی ابھی ضائع نہیں ہوئی اور آپ ابھی مر نہیں سکتے تو پریشان اور رنجیدہ ہونے کی بجائے آپ کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا تھا گویا آپ نے فرائڈ کے اِس قول کی تصدیق کر دی تھی کہ ہم اکثر جس چیز سے اپنی سخت نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اُس کے لئے ہمارے دل میں ایک دبی ہوئی خواہش ہوتی ہے؟"

فانی :۔ "اہلِ دنیا مجھے سمجھ لیں گے
دل کسی دن فنا ہو تو کریں"

شاد :۔ "کیا اِس دنیا نے آپ پر اتنے ظلم توڑے کہ آپ کا اپنا دل واقعی بیگانہ ہو کر رہ گیا؟"

فانی:۔ "جو ہم پہ ہوئی ایسی بیداد کی ہوگی
اللہ کے بندوں پر اللہ کے دشمن نے"

شاد:۔ "فانی صاحب! آپ یاسیات کے امام ہیں اور یاسیت کی فراوانی نے آپ کو سراپا درد بنا دیا۔"

فانی:۔ "یاس نے وہ بھی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانیؔ نامید کو موت کا آسرا دیا"

شاد:۔ "اچھا یہ بتائیے کہ فکر معاش جب آپ کے وطن سے آپ کو حیدرآباد لے گیا تو وہاں آپ کیا محسوس کرتے رہے؟"

فانی:۔ "گردش وہی یہاں بھی سپہرِ کہن میں تھی
غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی"

شاد:۔ "اس وقت مجھے بے اختیار آپ کا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎
غم وہ راحت جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں
دم وہ مشکل ہے کہ موت آئے تو آساں ہو جائے

مسلسل غم والم کا شکار رہنے سے آپ کو غم اور موت سے محبت سی ہوگئی۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کا غم آپ ہی کا غم نہیں ایک پورے معاشرے کا غم ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ قدرت کی طرف سے آپ کو میر کا دل اور غالب کا دماغ عطا ہوا تھا پھر بھی اپنی زبانِ مبارک سے یہ فرمایئے کہ آپ غم کو خوشی پر ترجیح کیوں دیتے رہے؟"

فانی:۔ "غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو"

شاد:۔ "آپ انسانی زندگی کو محض جبر سمجھتے ہیں نا؟"

فانی:۔ "زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں"

شاد:۔ "یہ بتایئے کہ کیا مرنے سے قیدِ حیات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے؟"

فانی:۔ "مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے"

شاد:۔ "اس بارے میں تو خیر دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ آپ ایک حقیقی شاعر ہیں فانی صاحب! آپ کے عقائد سے ہزار اختلاف ہو سکتا ہے لیکن یہ تو ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ آپ کا کلام آپ کی سوگوار زندگی سے ہم آہنگ اور آپ کی شاعری آپ کے کردار کی سچی تصویر ہے لیکن حضور اپنی ذات کے متعلق آپ کی اپنی کیا رائے ہے؟"

فانی:۔ "فانیؔ! دہ میں ہوں نقطۂ موہوم اتصال
جس میں عدم کی دونوں حدیں ہیں ملی ہوئی"

شاد:۔ "بہت خوب اور جناب! حقیقت اور مجاز میں آپ اساسی طور پر کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟"

فانی:۔ "آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے
تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز!"

شاد:۔ "آپ کے بعض عزیزوں کا دعویٰ ہے کہ آپ کے دل میں عشق کا شعلہ کبھی نہیں بھڑکا لیکن آپ کا کلام اس دعوے کی تردید کرتا ہے۔ میرے خیال میں تو حسن وعشق کے رنگین معاملات سے آپ کافی حد تک آشنا رہے ہیں۔ آپ کے اس طرح کے اشعار بھی یہی ثابت کرتے ہیں ؎
پھر دل سے فانیؔ سارے کے سارے نقشِ جفا مٹ جاتے ہیں
جس وقت وہ ظالم سامنے آکر جانِ حیا ہو جاتا ہے"

---

پڑتی ہیں ابھی دل پر شرمائی ہوئی نظریں
جو وار وہ کرتے ہیں بھرپور نہیں کرتے

---

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول گئے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

---

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

---

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

---

تو مستِ خود آرائی، ہم حسن کے متوالے
جو ہے تری محفل میں غافل نظر آتا ہے

---

روحِ اربابِ محبت کی لرز جاتی ہے
تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

بہرکیف یہ فرمایئے کہ جذبۂ محبت کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے

ہے؟"

فانی:۔ "میری اک عمرِ فانی نزع کے عالم میں گذری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں"

شاد:۔ "آپ کا تجربہ کیا ہے محبت آسان ہے یا مشکل؟"

فانی:۔ "سنئے تھے محبت آساں ہے واللہ بہت آساں ہے مگر
اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل سی مشکل میں نہیں"

شاد:۔ "ابتدائے عشق کے زمانے کا اپنا کوئی شعر یاد ہو تو سنائیے"

فانی:۔ "ابتدائے عشق ہے لطفِ شباب آنے کو ہے
صبر رخصت ہو رہا ہے اضطراب آنے کو ہے"

شاد:۔ "اپنے دل کے شوقِ مضطرب کا انجام آپ نے کیا پایا؟"

فانی:۔ "شوقِ بے تاب کا انجام تحیر پایا
دل سمجھتے تھے جسے دیدۂ حیراں نکلا"

شاد:۔ "اور اپنے شوق کی ناکامی کا آپ پر کیا ردِ عمل ہوا؟"

فانی:۔ "شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا"

شاد:۔ "لیکن اس ناکامی کے سبب دل سے زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے دل کی یاد تو آپ کو ضرور آتی ہوگی کوئی شعر اُس کی یاد میں کہا ہو تو ارشاد فرمائیے"

فانی:۔ "دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے
اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا"

شاد:۔ "اور دل کی مفارقت کے بعد آپ کی زندگی کیسے گذری؟"

فانی:۔ "زیست تھی بیکار فانی دل کے بعد
جان تھی، قربان کی، اچھا کیا"

شاد:۔ "اور اب موت کے بعد آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟"

فانی:۔ "سکونِ قلب میسر ہے موت ہی سے سہی
غرض کہ خاتمۂ رنجِ اضطراب ہوا"

---



---

# ہار جیت

ڈاکٹر کیول دھیر

میڈیکل آفیسر۔ جیتو منڈی۔ پنجاب

۱۸ر جون ۶۷ء                    میرے اچھے بھائی جان!

آپ مجھ سے ناراض ہوں گے۔ ہونا بھی چاہیئے۔ اِس لئے کہ ایک عرصے سے "بیسویں صدی" کی محفل ہی سے غیر حاضر نہیں ہوں، آپ کو خط تک نہ لکھ سکا۔ اپنی غلطی کا مجھے اعتراف ہے۔ معافی کا خواستگار ہوں ـــــ اور آپ کو معاف کرنا ہی ہوگا کیونکہ یہ میرا حق ہے۔ آپ کا چھوٹا بھائی ہونے کے علاوہ پہلی بار ایسی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اپنا حق مانگنے کے لئے یہ دونوں باتیں ہی کافی ہیں۔ آپ نے اگر معاف نہ کیا تو دہلی آکر آپ کے گرد بھی گھیراؤ ڈالا جا سکتا ہے ـــــ لیجئے، ایک افسانہ "ہار جیت" پیشِ خدمت ہے۔ اِس کی طوالت دیکھ کر ہو سکتا ہے آپ حکم صادر فرما دیں کہ اِسے "بیرنگ" ہی لوٹا دو۔ لیکن میری بات پہلے سُن لیجئے گا ـــ بہت کوشش کی کہ اختصار سے کام لوں لیکن بات بنی نہیں۔ یہ افسانہ سات مہینے پہلے لکھنا شروع کیا تھا اور اُس وقت میرے سامنے پلاٹ ادھورا ہی تھا۔ کیونکہ اِس کا تعلق ٹھوس حقائق سے ہے اور اُس وقت اختتام واضح نہ تھا۔ اِس لئے یہ ادھورا ہی پڑا رہا۔ چند روز قبل جب ڈرامائی انداز میں یہ کہانی ختم ہو گئی اور ایک نئی کہانی نے جنم لے لیا تو میں اپنے اِس نامکمل افسانے کو مکمل کرنے کی خواہش دبا نہ سکا۔ جیسا کہ میں نے کہا، کہانی ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔ اپنے الفاظ میں اِسے میں نے صرف بیان کر دیا ہے۔ اِس لئے اِس میں کہیں کوئی کمی کرنا مناسب نہ معلوم ہوا کیونکہ اِس طرح کہانی کے کئی پہلو کمزور ہو جاتے ـــــ افسانہ 'شوخ' نہیں نہایت 'سیدھا سادہ' ہے لیکن اِس کی خصوصیت و اہمیت خاص انداز کی ہے۔ ہمارے سامنے ہمارے اپنے ہی سماج کی اُن خواتین سے متعلق چند ایسے اہم ترین سوال آتے ہیں جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ 'آزادی اور برابری' کے 'حقوق' کا جنون ہندوستانی عورت کو کہاں لے جا رہا ہے؟ اِس کا انجام کیا ہے؟ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ دُنیا کی ہر عورت جذباتی ہوتی ہے اور جب جذبات کی شدت جنونی کیفیت کے ساتھ مل جاتی ہے تو نتائج خطرناک ہی ہوتے ہیں ـــــ بُنیادی طور پر میری یہ کہانی ایسے ہی چند اہم سوالات سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ میری رائے میں اِسے "بیسویں صدی" میں ضرور شریکِ اشاعت کیا جانا چاہیئے تاکہ دل و دماغ کی گہرائی میں اُتر کر ہم سب اِن اہم ترین سماجی مسائل کی جانب متوجہ ہو سکیں ـــــ آپ کی صحت اب کیسی ہے؟ میری دعا ہے کہ آپ ہمیشہ صحت یاب رہیں اور ہماری غلطیوں کو معاف کرتے رہیں۔ زیرِ نظر افسانہ نمبر سے بھی بہتر نمبر پیش فرماتے رہیں۔ اُردو کے ضعیف جسم میں زندگی کی دھڑکنیں پیدا کرتے رہیں اور اپنی محبت و خلوص سے ہمیں نوازتے رہیں۔ (آمین)

خاکسار ـــــ کیول دھیر

"ٹھیک بات کہوں دوست؟"

روی جو بات کہنا چاہتا تھا اُس کا اندازہ کرن کو تھا لیکن جیسے انجان بنتے ہوئے اُس نے اپنی سنجیدہ نگاہیں اُس کی جانب اُٹھا دیں اور سگریٹ کا آخری کش لینے کے بعد اُسے ایش ٹرے کی نذر کرتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے؟"

"تم اپنے کندھے پر ایک بکھری اور بہکی ہوئی زندگی کا بوجھ اُٹھائے چل رہے ہو۔ مجھے شک ہے کہیں اس بوجھ تلے تم دب نہ جاؤ؟"

کرن اپنے مخصوص انداز میں صرف مُسکرا دیا۔ اُس کی نگاہیں اب بھی روی کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ دیکھ رہا تھا ہمیشہ کی طرح آج بھی اُس کا دوست جذباتی ہو گیا ہے۔ جب کبھی روی نے اُس کی بیتی زندگی کے بے حس جسم میں روح پھونکنے کی ضد کی تھی تبھی کرن نے اُسے اُلجھا دیا تھا۔ اب کی بار بھی کرن سوچ رہا تھا کہ وہ اُسے کیسے دوسری باتوں میں اُلجھائے۔

"تم کتنے دن یہاں رہو گے؟"

کرن نے موضوع بدلنا چاہا۔

"اِس بار شاید تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکو گے کرن!" روی نے اُس کی کوشش ناکام بنا دی۔ "آخر وجہ کیا ہے جو زندگی کے اُجالوں سے بھاگ کر تم اندھیروں میں بھٹکنا چاہتے ہو۔ زندگی جینے کے لئے ہے بھائی میرے!"

روی کو اِتنا سنجیدہ دیکھ کر کرن بھی سنجیدہ ہو گیا۔ شاید وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ آج وہ روی کو دوسری باتوں میں اُلجھا نہ سکے گا۔

"بھلا کب تک خاموش رہ سکو گے تم؟"

کرن کو اپنے آپ میں اُلجھے دیکھ کر روی نے اُس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ مجھے صرف اُنھیں راستوں پر چلنا ہے جن سے آج میرے قدم مانوس ہو چکے ہیں۔ مجھے اُس زندگی کی یاد نہ دلاؤ روی جو کبھی میرے لئے ایک حقیقت تھی لیکن اب تو وہ سب خواب بن چکا ہے۔" کرن کے لہجے میں تناؤ تھا۔ الفاظ میں تلخی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کا ذہن ماضی کی حقیقت کا احساس پا کر اُلجھ سا گیا ہو اور اِس اُلجھن سے نکلنے کے لئے وہ بے چین ہو گیا ہو۔

روی کی نگاہیں اب بھی کرن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ صاف طور سے اُن تغیرات کو دیکھ رہا تھا جو کرن کی آنکھوں میں اُبھر کر مٹ رہے تھے۔

"لیکن کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے، جن راہوں سے تمھارے قدم مانوس ہو چکے ہیں آخر تمھیں یہ لے کہاں جائیں گے؟"

"موت کی وادیوں کی طرف!"

روی چونک گیا۔ تنہائی کے لمحوں میں جب بھی اُس نے کرن کے بارے میں سوچا تھا اُسے خدشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں اُس کا دوست خودکشی کرنے کا فیصلہ نہ کر بیٹھے! اِس وقت تو وہ خود ہی یہ بات کہہ رہا تھا۔

"تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

روی جیسے چیخ پڑا۔

کرن نے خالی خالی نگاہوں سے روی کی جانب دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اپنی توجہ سامنے پڑے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف منتقل کر دی۔ لیکن وہ [illegible] کچھ بولا نہیں۔

"زندگی سے بھاگ کر موت کا سہارا ڈھونڈنے والے انسان بزدل ہوتے ہیں۔ جب میں یہ سوچتا ہوں، میرا دوست بھی ایک ایسا ہی بزدل انسان ہے تو مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ کاش میں تمھارا دوست نہ ہوتا!"

روی کے الفاظ برف کی طرح سرد تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ یہاں آ کر میں نے اپنا اور تمھارا وقت ضائع کیا ہے۔ آج ہی رات کی گاڑی سے میں لوٹ رہا ہوں... میں یہ بھول جانے کی کوشش کروں گا کہ کرن میرا کوئی دوست تھا۔"

"روی!" کرن پوری شدت سے چیخا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہیں روی کے چہرے تک پہنچ کر ٹھہر گئی تھیں۔ ذہن جیسے ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ چند لمحے پہلے جو شدید جھٹکا اُسے لگا تھا، اُس کے زیرِ اثر جسم کا ہر رواں اب بھی کانپ رہا تھا۔ شاید اُس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ روی یوں جذباتی ہو کر انتہا تک پہنچ جائے گا۔

روی کے چہرے پر ڈوبتے اُبھرتے جذبات کا ردِّ عمل نمایاں ہو گیا تھا اور کبھی گہری سوچ میں غرق اُس کا ذہن نہ جانے کن گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا۔

بظاہر کرن کی نگاہیں ابھی تک روی کے چہرے پر جمی تھیں لیکن ذہن میں بیتی زندگی کی ہر کہانی تصویر کی طرح اُجاگر ہو اُٹھی تھی اور وہ اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ روی کے بارے میں اور... اور... !!

---

روی اور کرن کی دوستی کا آغاز اُس وقت ہوا تھا جب وہ ابھی ننھی معصوم زندگی کے دائرے میں اُچھل کود رہے تھے۔ روی کے ڈیڈی سرکاری ملازمت میں تھے اور کانپور میں اُن کا تبادلہ ہونے پر اُنھیں کرائے کا جو مکان ملا تھا وہ کرن کے ڈیڈی کا تھا۔ اُس مکان کی اوپری منزل پر وہ خود رہتے تھے اور نیچے کا حصہ کرائے پر دے دیتے تھے۔ اُس وقت روی صرف پانچ برس کا تھا اور کرن اُس کا ہم عمر تھا۔

روی اور کرن کی دوستی نے دونوں خاندانوں کو بھی مضبوط رشتے میں باندھ دیا تھا، بلکہ دوستی، خلوص اور پیار کے ایک نئے جذبے کو بھی جنم دیا تھا۔ روی اور کرن کا وجود الگ تھا، اُن کے جسم الگ تھے، لیکن اِن میں حرکت ایسا تھا جیسے ایک تھا۔ زندگی کے ہر گام پر، ہر منزل کی جانب دونوں ساتھ ساتھ بڑھے تھے۔ ایک دوسرے سے دونوں نے بھرپور محبت کی تھی۔

یہ کالج کا زمانہ تھا۔ روی بی۔ ایس۔ سی کا اسٹوڈنٹ تھا اور کرن بی۔ اے کے آخری سال میں تھا۔ دونوں نے زندگی کے دو الگ راستے اختیار کئے تھے۔ روی ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اور کرن کی خواہش تھی کہ وہ ایم۔ اے کرنے کے بعد صحافت کی دُنیا میں قدم رکھے گا۔ دونوں ساتھ ساتھ کالج آتے تھے اور پھر مختلف شعبوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ روی دن بھر زیادہ مصروف رہتا تھا اِس لئے کالج کے اوقات میں اُن کی ملاقات بے حد مختصر ہوتی تھی۔ اس کے برعکس کرن روی کی طرح زیادہ مصروف نہ رہتا تھا اور اپنا خالی وقت وہ کالج کی زندگی سے وابستہ مختلف دلچسپیوں میں گزار دیتا تھا۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد پھر دونوں اپنی ایک الگ دُنیا میں لوٹ آتے تھے۔ ہر دن کا یہی معمول تھا۔

ونیتا بھی بی۔ اے فائنل کی طالبہ تھی اور اسی سال اُس نے یہاں داخلہ لیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ ونیتا نے جب سے کالج میں قدم رکھا تھا، یہاں کا ماحول ہی بدل گیا تھا —— جیسے کالج کی زندگی ایک نئے دَور میں داخل ہوئی ہو۔ پہلے ہی دن ونیتا نے سبھی کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ جیسے ہی فرسٹ پیریڈ شروع ہوا تھا اور پروفیسر صاحب نے اپنی سیٹ لی تھی ونیتا نے اپنی جگہ کھڑے ہوتے ہوئے اُن سے کچھ کہنے کی اجازت مانگی تھی۔ اجازت حاصل کر کے وہ اُن کے قریب آکھڑی ہوئی تھی اور اپنے ساتھی طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

"دوستو! آپ لوگ اور یہاں کا ماحول میرے لئے سب کچھ قطعی نیا ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ آج ہی کالج کے اوقات ختم ہونے کے بعد ہم سب ساتھ ہی چائے پئیں۔ آپ لوگ میری یہ دعوت قبول کریں تو مجھے خوشی ہوگی۔۔۔"

ونیتا کی طرف سے دی گئی دعوت سبھی نے قبول کی تھی۔ اِسی واقعہ کے ساتھ اُس کے بارے میں چہ میگوئیاں بھی ہونے لگی تھیں۔ کالج کی تاریخ میں اپنی طرح کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

اس طرح چند ہی دنوں میں ونیتا کالج کی زندگی میں یوں رچ بس گئی جیسے برسوں سے وہ یہیں تعلیم حاصل کر رہی ہو۔ نہ صرف کالج کی ساتھی لڑکیوں میں اُس نے ایک اہم مقام حاصل کر لیا، لڑکوں پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ سب سے وہ اِس طرح پیش آتی، جیسے اُن کی پرانی دوستی ہو۔ ہر موضوع پر وہ کھل کر باتیں کرتی۔ کالج کی زندگی کے ہر شعبے میں وہ نمایاں دلچسپی لیتی۔ کلاس روم میں دوسروں کے قہقہوں کے ساتھ اُس کے قہقہے بھی گونجتے۔ کھیل کے میدان میں بلا جھجک ہر کسی کے مقابل اُتر آتی۔ بحث مباحثے میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی —— غرض ہر جگہ اور ہر طرح وہ آگے ہی رہتی۔

ونیتا کی شخصیت نے لڑکوں کو گفتگو کا ایک نیا موضوع عطا کیا تھا۔ ہر شخص اپنے مخصوص انداز میں اُس کے بارے میں ریمارکس دیتا۔ عام طور پر لڑکوں کی یہ رائے تھی کہ وہ 'فلرٹ' قسم کی لڑکی ہے۔ اِس کی وجہ محض یہ تھی کہ آج تک یہاں کے ماحول میں ایسی دوسری کوئی لڑکی انھوں نے نہیں دیکھی تھی۔

لیکن اِس واقعہ نے ماحول پر جیسے سکتہ طاری کر دیا تھا۔ وِل شوخ فطرت کا منچلا نوجوان تھا اور اپنے گروپ کا 'رِنگ لیڈر' بھی تھا۔ اپنے دوستوں کے درمیان وہ ونیتا کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"سالی قیامت ہے —— لیکن اپنے جال سے بچ کر جائے گی کہاں! نام بدل دینا اگر اُسے نہ پھنساؤں۔ بس۔۔۔"

لیکن وِل اپنی بات پوری کہہ بھی نہ پایا تھا کہ ونیتا اُس کے ٹھیک سامنے آکھڑی ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اُس کے بائیں رخسار پر پوری قوت کے ساتھ ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

"مسٹر! دوسروں کی عزت کرنا سیکھو!" یہ کہہ کر ونیتا لوٹ گئی۔ وِل یہ نہ جانتا تھا کہ اُس کے قریب ہی ونیتا گلاب کے پودے کی اوٹ میں بیٹھی مطالعہ کر رہی ہے۔

اِس واقعہ کے بعد کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ ونیتا کے بارے میں چرچا کرے۔ یہاں تک کہ وِل بھی خاموش ہو رہا۔

کرن ایک خاموش تماشائی کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ونیتا کا ذکر کبھی ہوا بھی تو صرف اُس کے اور روی کے درمیان ہی محدود رہا۔ روی سائنس کی پڑھائی میں اِتنا مصروف تھا کہ اُس نے زیادہ دلچسپی نہ لی لیکن کرن کی رائے تھی کہ ونیتا آج کے سماج کی ایک آزاد خیال سُلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ اُسے اِس حقیقت کا اعتراف بھی تھا کہ اُس کی پرورش پنجاب کی اُس سرزمین پر ہوئی ہے جہاں کی سماجی زندگی میں یہاں جیسی گھُٹن نہیں ہے۔ اِسی لئے وہ اُس کی عزت بھی کرتا تھا لیکن وہ محض خاموش تماشائی ہی تھا۔

گزشتہ تین برس سے کرن کالج میگزین کا ایڈیٹر چلا آ رہا تھا۔ ہر سالانہ چناؤ کے موقع پر اُسے بلا مقابلہ ہی چن لیا گیا تھا لیکن اِس بار چناؤ ہوا تو ونیتا نے بازی

## حدیثِ دل

مرے دل سے جنت کو نسبت کہاں ہے
وہ بندوں کا گھر یہ خدا کا مکاں ہے ——— ثاقب لکھنوی

کوئی دل کا مقام سمجھائے
گھر ہے یا سبزہ زار ہے کیا ہے ——— فراق گورکھپوری

اگر تو پھر کبھی دنیا بنائے
تو اے اللہ! دل پیدا نہ کرنا ——— عاشق

عاشق کا ذرا سا دل خوش کرنا ہی کیا اس کا
جھوٹا ہو کہ سچا ہو وعدہ تو کیا ہوتا ——— داغ

اُن کے بچپن میں اِسی چیز کی بِکری تھی فقط
دل ہی دل بیچتے پھرتے تھے کھلونے والے ——— یاس

مرسلہ: ایس ایس ہنگاری، ایم اے، کلکتہ

جیت لی۔ پہلی بار کرن نے محسوس کیا اُسے شکست ہوئی ہے لیکن یہ احساس محض وقتی تھا۔ اور جلد ہی وہ اِس واقعہ کو بھول گیا۔

اِس واقعہ کے چند روز بعد کالج کی لٹریری کلب کی طرف سے منعقد ہونے والے ایک مباحثے میں بھی جب کرن کو ونیتا کے مقابلے میں ہار ہوئی تو ذہنی طور پر اُسے چوٹ سی لگی۔ تیسرا واقعہ اُس وقت ہوا جب بیڈ منٹن کے مقابلے میں ونیتا اور کرن آمنے سامنے ہوئے۔ اِس بار بھی بازی ونیتا ہی نے جیت لی اور اِس ہار نے کرن پر گہرا اثر ڈالا۔ اُس نے کبھی ونیتا سے ٹکرانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن قدرتی طور پر ہی ہر بار اُس کا مقابلہ ونیتا سے ہوا تھا اور اُسے ہار ماننی پڑی تھی۔ اِس ٹکراؤ کا دونوں پر متضاد اثر ہوا تھا۔ اپنی کامیابی سے ونیتا جہاں مغرور ہو گئی تھی، کرن کو اپنی شکست سے دُکھ ہوا تھا لیکن اُس کے ذہن میں کوئی غلط بات پیدا نہ ہوئی تھی۔ اُس نے ضبط کا دامن نہ چھوڑا اور نہ اپنے وِشواس ہی کو کم ہونے دیا۔

اُنہی دنوں بہار میں سیلاب آنے سے سینکڑوں، ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے اور وہاں قحط جیسی حالت پیدا ہو گئی۔ کالج یونین کی میٹنگ میں کرن نے یہ تحریک پیش کی کہ طلباء کو اپنے طور پر بہار کے دُکھی اور مصیبت زدہ عوام کے لئے فنڈ جمع کرنا چاہئے۔ تحریک اتفاق رائے سے پاس ہو گئی۔ اِس مقصد کے لئے لڑکے اور لڑکیوں کے دو الگ گروپ بنا دیے گئے۔ یہ اتفاق ہی تھا یہاں بھی ونیتا اور کرن آمنے سامنے آکھڑے ہوئے۔

لڑکوں کے گروپ کا انچارج کرن تھا اور لڑکیوں کے گروپ کا انچارج [illegible] بار کرن بازی جیت گیا تھا۔ تقلت فرق سے اُس نے [illegible] رقم جمع کی تھی۔

کرن نے ایک اور بازی اُس وقت جیت لی جب کلاس ٹیسٹ کا نتیجہ سامنے آیا۔ اپنی کلاس میں وہ اوّل پوزیشن پر تھا اور ونیتا کچھ نمبروں سے [illegible] رہ گئی تھی۔

ونیتا پر جو ردِ عمل ہوا یہ کرن پر ہوئے ردِ عمل سے قطعی مختلف تھا۔ اُس میں اِتنا ضبط نہ تھا کہ وہ اپنی شکست کو برداشت کر پاتی۔ اُس کے غرور کو نیچا دیکھنا پڑا تھا اور اِس پر وہ تلملا اُٹھی تھی۔ جیسے اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر وہ اُسے شکست دے گی۔ کوئی انسان جب انتقام کی آگ میں جلتا ہے تو اُس کی فطرت اُسے چیلنج کرنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔ ایسی ہی حالت ونیتا کی ہو گئی تھی اور ہر موقع پر وہ کوشاں ہوتی تھی کہ کرن کو مقابلے کے لئے چیلنج کرے۔

کامن روم میں ونیتا نے ٹیبل ٹینس کے کھیل کے لئے کرن کو چیلنج کیا لیکن وہ ہار گئی۔ بیڈ منٹن کی بازی بھی وہ نہ جیت سکی اور جب کالج کا سالانہ جلسہ ہوا تو کرن کو اُس سے زیادہ انعامات حاصل ہوئے۔ پے در پے شکستوں نے ونیتا کو جیسے کرن کا دشمن ہی بنا ڈالا تھا۔ لیکن کرن پر اِس کا کوئی اثر نہ تھا۔ ونیتا کے ماتھے کی ہر شکن کے جواب میں وہ ہمیشہ ہی مسکرایا تھا۔

اِسی دوران سالانہ امتحان کا وقت قریب آگیا اور سارے طلباء کی طرح ونیتا اور کرن بھی پڑھنے کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ مقابلے کا جوش وقتی طور پر تھم گیا تھا۔

---

امتحان ختم ہو گیا اور ساتھ ہی وہ طوفان بھی تھم گیا جس نے کالج کی زندگی میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ روی اور کرن سیر و تفریح کے لئے نینی تال چلے گئے تھے۔ جہاں پہلی بار کرن نے روی سے ونیتا کے بارے میں تفصیل سے بات کی تھی۔ روی حالات سے واقف تھا لیکن ابھی تک اُس نے کبھی ونیتا کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا تھا۔

"کرن! ونیتا آخر ایک عورت ہے۔ ایک ایسی عورت جس نے آج کے سماج میں مرد کی برابری کے حقوق کا نعرہ بلند کیا ہے۔ وہ مرد کی برابری ہی نہیں کرنا چاہتی ہے، اُس سے بھی دو قدم آگے رہنا چاہتی ہے۔ یہ عجیب سا جنون ہے عورت کا اور ونیتا بھی اِسی جنون کا شکار ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ یہ جنون کہیں اُسے تباہ نہ کر ڈالے"

روی نے ونیتا کے بارے میں اپنے دل کی بات کہی تو کرن کچھ سوچ کر بیچ کانپ سا گیا۔ اتنی گہرائی سے اُس نے کبھی سوچا نہ تھا لیکن اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ روی کی بات کہیں حقیقت نہ بن جائے۔ نہ جانے کیوں وہ افسردہ ہو گیا تھا۔ روی نے محسوس کیا تو اُس نے بات کا موضوع بدل دیا اور بات وہیں ختم ہو گئی۔

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ کرن اپنے کالج میں اوّل ہی نہیں آیا تھا، یونیورسٹی میں اُسے دوسری پوزیشن حاصل ہوئی تھی۔ ونیتا اُس سے بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ روی بھی اعلیٰ پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ برسوں تک دن رات ساتھ رہنے کے بعد روی اور کرن جُدا ہو رہے تھے۔ روی کو میڈیکل کالج کلکتہ میں داخلہ ملا تھا لیکن کرن کانپور ہی میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا تھا۔

زندگی نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ روی کلکتہ روانہ ہو چکا تھا۔ کرن نے ایم۔اے پارٹ اوّل میں داخلہ لے لیا تھا۔ ونیتا نے بھی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پہلے ہی دن جب کرن کالج پہنچا تھا تو ساتھی طلباء ہی نے نہیں کالج سٹاف نے بھی اُسے مبارکباد دی تھی لیکن ایک ونیتا ہی تھی جو سب سے الگ تھلگ تھی۔ کرن کی نگاہوں نے جب اُس کا سرسری جائزہ لیا تھا تو اُسے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے رقابت کی آگ میں وہ سُلگ رہی تھی۔ تبھی اُسے روی کے الفاظ یاد آ گئے تھے اور اُس کے دل کا درد اور بھی بڑھ گیا تھا لیکن درد کو دبا کر وہ خاموش ہی رہا تھا۔

ونیتا کی طرف سے پچھلے برس کی کہانیاں پھر دُہرائی جانے لگیں۔ بات بات پر وہ نہ صرف کرن سے ٹکرانے کی کوشش کرتی بلکہ کسی ایسے موقعے کی بھی متلاشی رہتی جس سے وہ اُس کی توہین کر سکے۔ لیکن کرن نہایت فراخدلی سے مُسکراتا ہوا پیش آتا۔

دِل ـــــ جس کے گستاخ الفاظ پر ونیتا نے اُسے تھپّڑ رسید کیا تھا، اب اِس بات کی کوشش کر رہا تھا کہ ونیتا کے قریب ہو سکے۔ شاید ونیتا کی کمزوری کا راز اُس نے پالیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کرن کی مخالفت ہی کا اظہار نہ کرتا، ونیتا کے جذبات کو چھیڑ کر اُسے اپنی ہمدردی کا احساس دلانے کی بھی کوشش کرتا۔ اپنے مقصد میں کسی حد تک اُسے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ونیتا کا جھکاؤ دِل کی جانب محسوس کر کے کرن ٹھیک ویسے ہی چونکا تھا جیسے ایک بار روی کی بات نے اُسے چونکا دیا تھا۔ کرن بخوبی سمجھتا تھا کہ دِل ونیتا کی کمزوری کا پورا فائدہ اُٹھا رہا ہے اور عین ممکن ہے ونیتا اُس کے جال میں پھنس کر اپنے آپ کو تباہ کر لے۔

کرن کو پہلی بار روی کے دُور ہونے کا شدید احساس ہوا تھا۔ کئی روز سے وہ ونیتا کے لئے فکرمند تھا اور چاہتا تھا کہ روی سے اِس سلسلے میں مشورہ کرے۔ لیکن روی اُس سے بہت دُور تھا۔ آخر اپنے دل سے اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کسی حالت میں بھی وہ ونیتا کی زندگی کو برباد نہ ہونے دے گا۔ ونیتا سے بے شک اُسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور نہ اُس کے سامنے کوئی ذاتی مقصد ہی تھا۔ صرف اس لئے وہ ونیتا سے دلچسپی لے رہا تھا کہ اپنے آپ کو اُس نے ونیتا کی بربادی کی ایک وجہ سمجھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک زندگی محض اُس کے باعث غمناک بن جائے۔

ونیتا ایک الگ انداز سے سوچ رہی تھی۔ دِل کے بارے میں سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی وہ اُس کے ساتھ اپنی دلچسپی دکھانے لگی تھی تاکہ کرن کے جذبات کو چوٹ دے سکے۔ ونیتا بلا کی حسین تھی، بے حد سمارٹ بھی تھی اور فیشن میں تو کوئی اُس کا مدِ مقابل تھا ہی نہیں۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کرن کے خلاف وہ اپنے حُسن کی آزمائش کرے گی۔ اُس کے اندھے جنون نے شاید اُسے یہ بھول جانے کے لئے مجبور کر دیا تھا کہ وہ بھارت کی ناری ہے جس نے ہمیشہ ہی نئے آدرشوں کو جنم دیا ہے، جس نے اپنے عظیم کردار سے دیش اور سماج کی عظمتوں کو آگے بڑھایا ہے۔

دِل اور ونیتا کے بڑھتے ہوئے تعلقات کو دیکھ کر ایک دن کرن نے ونیتا سے بات کرنے کا آخری فیصلہ کر لیا۔

"مِس ونیتا!" کرن نے ونیتا کو آہستہ سے مخاطب کیا۔ وہ اکیلی ہی کامن روم کی طرف جا رہی تھی۔ ونیتا نے مُڑ کر دیکھا، ایک لمحے کے لئے رُکی اور پھر آگے بڑھ گئی۔

"میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی" ونیتا کے ان الفاظ نے کرن کی توہین کی تھی لیکن وہ مُسکرا کر رہ گیا۔ ونیتا کو شاید اِس سے خوشی ہوئی تھی۔

## آدمی

اے آسمان! تیرے خدا کا نہیں ہے خوف
ڈرتے ہیں اے زمین ترے آدمی سے ہم ـــــ جوشؔ ملیح آبادی

آدمی ، جانور ، فرشتہ ، خدا
آدمی کی ہیں کس قدر قسمیں ـــــ حالیؔ

شیخ صاحب گر فرشتہ ہوں تو ہوں
آدمی ہونا بہت دُشوار ہے ـــــ داغؔ

لاگ ہو یا لگاؤ ہو، کچھ بھی نہیں تو کچھ نہیں
بَن کے فرشتہ آدمی بزمِ جہاں میں آئے کیوں ـــــ ذوقؔ

آدمی آدمی سے مِلتا ہے
دل مگر کم کسی سے مِلتا ہے ـــــ جگرؔ مرادآبادی

مرسلہ:- ایس۔ایس۔جھنکارین ایم۔اے، کلکتہ

پچھلے دنوں میں کئی بار کرن نے ونیتا کو مخاطب کیا تھا، اُس نے بات کرنی چاہی تھی لیکن ونیتا نے ہر بار اُسے ٹھکرا دیا تھا اِس پر بھی کرن چاہتا تھا کہ وہ ایک بار ونیتا سے بات کر سکے گا۔ اُدھر ونیتا سمجھ رہی تھی کہ اُس کا تیر نشانے پر لگا ہے اور کرن اُس کے لئے بیتاب ہو اُٹھا ہے۔ یہی موقع ہے کہ اب اُسے کرن کو لفٹ دینی چاہیئے اور جب اُس کے جذبات بے قابو ہو جائیں، محبت میں وہ دیوانہ ہو جائے تو وہ اُسے ٹھکرا دے گی۔ تب . . . تب . . . آنے والے اُن لمحات کا تصوّر کر کے ونیتا چنچل ہو گئی۔ اُس کا چہرہ یوں کھل اُٹھا جیسے اُس کے من کی مُراد بر آئی ہو۔ "تب میرے دل کو تسکین حاصل ہو گی" ہونٹوں ہی ہونٹوں میں وہ بدبدائی اور آرام کرسی کی پُشت پر اپنے آپ کو پھینک کر آنکھیں مُوند لیں۔

---

"مس ونیتا!" کرن نے پکارا تو وہ رُک گئی۔

"کہیئے" یہ پہلا موقع تھا کہ ونیتا نے کرن سے بات کی تھی۔ دونوں کامن روم کی گیلری میں ایک طرف کھڑے باتیں کرتے رہے۔ کرن نے اِن باتوں میں وِل کا کہیں ذکر کیا تھا "آپ کی ناراضگی کی وجہ میں سمجھ نہیں سکا ہوں۔ ہمیں اچھے دوستوں کی طرح رہنا چاہیئے" کرن نے کئی بار ونیتا سے یہی بات کہی تھی اور آج کی یہ ملاقات ونیتا کے اِن الفاظ کے ساتھ ختم ہوئی تھی "غلط فہمی دُور ہو گئی کرن۔ آج سے ہم دوست ہیں" کرن جب ونیتا سے الگ ہوا تھا تو اُس نے ونیتا کی گہری آنکھوں میں شوخی رقصاں دیکھی تھی۔ ہونٹوں میں دبی مسکان کی مٹھاس محسوس کی تھی۔

ونیتا خوش تھی ــــ اِس لئے کہ کرن کے گرد نہایت کامیابی سے اُس نے جال پھیلا دیا تھا۔ خوش کرن بھی تھا ــ اِس لئے کہ اُن دونوں کے درمیان نہ صرف تلخی ختم ہو گئی تھی بلکہ وِل کی سازش کو بے نقاب کرنے کا راستہ بھی صاف ہو گیا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ ونیتا اور کرن کی دوستی مستحکم ہوتی گئی۔ کرن تو ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔ ونیتا نے جس مقصد کے لئے وِل کا سہارا لیا تھا وہ پُورا ہو گیا تھا۔ اِس لئے وِل کے ساتھ اُس نے تعلقات ختم کر لئے تھے۔ اِس بات کی سب سے زیادہ خوشی کرن کو ہوئی تھی۔

کرن اور روی میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا ــــ کرن اپنے خیالات کی اطلاع اُسے دیتا رہا تھا۔ جب روی چند روز کے لئے کانپور آیا تو کرن نے ساری باتیں کہہ دیں ــــ "... ونیتا کے بارے میں یہ میری رائے ہے روی! یہ بھی حقیقت ہے کہ میرا من اُسے پیار کرتا ہے اور بلاشبہ وہ زندگی کی منزل میں قابلِ رشک ہمسفر ہوگی۔ آخری فیصلہ تمھیں کرنا ہے"

"ٹھیک ہے کرن! تمھاری ہی خوشی میری خوشی ہے۔ ونیتا اگر تمھیں پسند ہے اور تم سمجھتے ہو کہ تم دونوں کی محبت کامیاب ازدواجی زندگی کی بنیاد بن سکے گی تو اس سے بہتر بات اور کیا ہو گی" کرن کی طرف دیکھتے ہوئے روی نے اطمینان کی بات کہہ دی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا ــــ "لیکن کیا ونیتا بھی شادی کے لئے رضامند ہے؟"

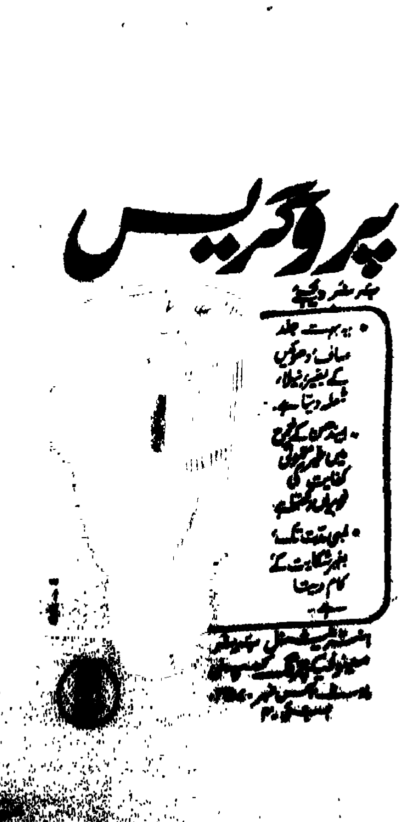
"اِس سلسلے میں ابھی اُس سے بات نہیں ہوئی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اِس فیصلے کا وہ خیر مقدم کرے گی ــــ" کرن نے جواب دیا۔ "اور پاپا، ممی سے تم بات کرو گے"

"میں آج ہی اُن سے ذکر کروں گا۔ ویسے انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مجھے پُوری اُمید ہے" روی نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

اور جب روی نے رات کے کھانے پر کرن اور ونیتا کے بارے میں بات کی تو توقع کے مطابق سبھی نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اب آخری فیصلہ کرن اور ونیتا کو کرنا تھا۔

کرن ونیتا سے ملا تو اُس نے کہا: "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ آؤ گیلری کی طرف چلیں" ونیتا مُسکرا دی اور کرن کے ساتھ چلتی ہوئی بولی۔

"مجھے بھی تم سے ایک ضروری کام تھا" کامن روم سے ہوتے ہوئے جب



وہ گیٹ تک پہنچ گئے تو ونیتا نے اپنے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر کرن کی طرف بڑھا دیا ——— "دل تو تمہارے پڑوس میں اٹکی رہتی ہوں" اور وہ اُسی لمحے لوٹ آئی کرن نے جب لفافہ چاک کرکے کارڈ پڑھا تو جیسے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ——— کانپ اٹھا وہ ——— ونیتا کی سگائی کسی اور سے ہو رہی تھی اور کرن کو تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ کارڈ کے دوسری طرف ونیتا نے لکھا تھا۔

"محبت کا ناٹک ختم ہوا مسٹر کرن! ونیتا نے کبھی شکست تسلیم نہیں کی۔ زندگی کے اِس داؤ میں تمہیں شکست دے کر میں نے پچھلا حساب بیباق کر دیا ہے"

کرن کے خواب و خیال میں بھی یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ ونیتا کی محبت محض ایک دھوکا ہے، ایک فریب ہے، انتقام لینے کا وہ جذبہ ہے جس کے جنون میں اُس نے دل کی دھڑکنوں تک کا سودا کیا ہے۔ پیار کے مقدس جذبے کی توہین کی ہے۔ اُس نے ونیتا پر وشواس کیا تھا۔ اُس کی محبت کو زندگی کا بیش قیمت سرمایہ سمجھا تھا اور اپنے مستقبل کو اس کی چاہت کے رنگوں سے سنوارنے کی شدید خواہش محسوس کی تھی۔ لیکن ونیتا نے اچانک ہی اُسے بھیانک طوفان کی زد میں پھینک دیا تھا ——— ونیتا نے اس کے وشواس کو مجروح کیا تھا، اُس کے دھڑکتے ہوئے جذبات کو کچل ڈالا تھا۔

کرن نے اپنے دل کے زخم کسی کو نہ دکھائے۔ یہاں تک کہ روی کو بھی اُس نے نہ بتایا کہ اُس کے ساتھ کیا بیتی ہے؟ دو روز بعد کلکتہ روانہ ہونے سے پہلے روی نے پوچھا تو اس نے کہا تھا ——— "ونیتا جلد ہی اپنے فیصلے سے آگاہ کرے گی۔ میں تمہیں خط لکھوں گا"

---

چوٹ اتنی شدید تھی کہ کرن اُسے برداشت نہ کر سکا۔ اپنے آپ کو لاکھ سمجھایا، لاکھ کوشش کی کہ ضبط کا بند نہ ٹوٹے، ضبط کا دامن نہ چھوٹے، لیکن اپنے آپ ہی وہ ہار گیا اور کسی سے کچھ کہے بغیر کانپور کو خیرباد کہہ کر دہلی چلا آیا۔ اُس نے اپنی تعلیم ہی ادھوری نہیں چھوڑ دی تھی، خاندان کے کسی فرد کو بھی نہ بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ یہاں تک کہ روی کو بھی اُس نے نہیں لکھا تھا۔

کرن کو دہلی آئے قریب چھ سال ہو رہے تھے لیکن ابھی تک اپنے آپ کو وہ الگ تھلگ ہی رکھے ہوئے تھا۔ اِس دوران نہ جانے کتنی بار اُس نے روی کو خط لکھنے کی خواہش کی تھی لیکن ہر بار خود ہی اُسے کچل ڈالا تھا۔ اب وہ پہلے جیسا کرن نہ تھا۔ اِس قلیل سی مدت میں وہ بہت آگے بڑھ آیا تھا۔ دہلی آ کر اُس نے اپنی [illegible] نئی زندگی کا آغاز ایک مقامی اخبار کی ملازمت سے کیا تھا لیکن اب وہ ایک اہم ترین پبلی [illegible] کا ڈائرکٹر تھا۔ راجدھانی کے سیاسی و سماجی حلقوں میں اُسے بلند مقام حاصل تھا۔ شاندار بنگلہ، کار اور دوسری طرح کی سہولیات اُسے میسّر تھیں۔ لیکن دل کو چین نصیب نہ ہوا تھا۔ جو زخم اُسے ونیتا نے دیا تھا وہ اب بھی تازہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ دل کا زخم مندمل نہ ہوا۔ اُس کی ٹیس اور بڑھ گئی تھی۔ شاید اِس درد و کرب سے چھٹکارا پانے کے لئے ہی اُس نے شراب کا سہارا لیا تھا لیکن یہ اپنے آپ کو دھوکا دینا تھا!

ایک روز دہلی میں اچانک ہی کرن اور روی آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

روی اب ڈاکٹر بن گیا تھا اور سرکاری ملازمت میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ یہاں وہ میڈیکل کانفرنس میں حصّہ لینے کے لئے آیا تھا۔ آج کے اجلاس میں کرن پریس ایجنسی کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو تھا ——— اور یہیں اِن دونوں کی ملاقات ہو گئی تھی۔

کرن کی زندگی کی غمناک داستان سُن کر روی بے حد دُکھی ہوا تھا۔ اُس نے کہا تھا ——— "بھگوان ونیتا کو کبھی معاف نہ کریں گے۔ اُس نے پیار جیسے مقدس جذبے کی توہین ہی نہیں کی ہے، ہنستی مسکراتی ایک زندگی کو کانٹوں کی چبھن بھی دی ہے"

روی چند روز کرن کے ساتھ رہ کر لوٹ گیا۔ کرن کو پھر پا کر اُسے جتنی خوشی ہوئی تھی اُس کی بے کیف اور پُر درد زندگی کے دُکھ نے اُسے اُس سے زیادہ دُکھی بنایا تھا۔ اُسے اِس بات کا بھی دُکھ تھا کہ کرن ہموار راستوں پر چلتے ہوئے بھی بھٹک گیا ہے۔ اُس کی حد سے بڑھی ہوئی شراب نوشی اور اپنے آپ ہی میں سلگتے رہنے کی حقیقت روی پر ظاہر ہو چکی تھی اور وہ اِس کا ایک ہی حل سوچتا تھا کہ کرن شادی کر لے۔ شاید نئی زندگی اُسے راس آ جائے اور اپنے ماضی کو بھول کر پھر اپنی دُنیا میں وہ لوٹ آئے۔

روی کو جب بھی موقع ملتا وہ کرن سے ملنے چلا آتا تھا اور ہر بار وہ اُسے شادی کر لینے کے لئے رضامند کر لینے کی کوشش کرتا تھا لیکن کرن بات ٹال جاتا تھا۔ ونیتا نے اُسے ایسی چوٹ دی تھی کہ عورت کے نام سے بھی اُسے شدید نفرت ہو گئی تھی۔

لیکن اب کی بار روی آیا تو اُس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اُسے کسی طرح شادی کے لئے رضامند کرے گا۔ جب کرن نے صاف کہہ دیا کہ وہ کبھی شادی نہ کرے گا تو روی جذباتی ہو گیا اور آخر اپنی دوستی کو بھی داؤ پر لگا دیا۔

"تو ٹھیک ہے کرن! جو تمہارے من میں آئے وہی کرو۔ میں کون ہوتا ہوں کچھ کہنے والا" روی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ آواز بھیگ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی رو دے گا۔ "تم بھی بھول جانا کہ روی تمہارا دوست تھا۔ میں جا رہا ہوں"

روی دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس کے کمرے کے باہر قدم رکھنے سے پہلے ہی کرن نے اپنی بانہوں کا گھیرا اس کے گرد ڈال دیا ——— "روی! یہ نہیں ہو سکتا۔ پیار کا! میری زندگی تمہارے پیار سے زیادہ قیمتی نہیں ہے ——— جیسا تم چاہو گے، وہ ہوش میں کر دوں گا روی . . ." کرن سچ مچ رو دیا تھا۔ روی کی آنکھوں میں رکے آنسو سیلاب کی طرح بہہ نکلے تھے اور اس نے کرن کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

---

روی کی کوششیں بر آئیں اور کرن کو ایک نئی زندگی مل گئی۔ شانتی ایک اوسط گھرانے کی پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی تھی۔ روی نے کرن کے دل کی درد بھری دھڑکنوں کا احساس پا لیا تھا اور کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جو اپنے پیار سے اس درد کو دور کر سکے۔ شانتی ایسی ہی لڑکی تھی جسے روی نے آخر تلاش کر لیا تھا۔

تین برس پہلے کرن کی شادی ہوئی تھی اور اب وہ ایک ننھے سے بچے کا باپ بھی تھا۔ ماضی کو بھول کر جس نئی زندگی کو اس نے اپنایا تھا، اس میں ہر طرح مطمئن تھا وہ۔ ہر لمحہ مسرتوں اور شادمانیوں کا مسکن بنا تھا، ہر دن محبت کی ایک نئی کہانی نے جنم لیا تھا اور ہر خواہش کی تکمیل ہوئی تھی۔ چند ماہ پہلے جب روی بھی تبدیل ہو کر دہلی منتقل ہو گیا تھا تو ان کی زندگی ایک نئے انداز میں سج سنور گئی تھی۔

انھیں دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔

چھٹی کا دن تھا اور روی کرن کے ننھے بچے کی معصوم مسکراہٹوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ان دنوں وہ کرن ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ کرن بہت سویرے ہی پالم ہوائی اڈے پر چلا گیا تھا جہاں کسی ملک کے سربراہ کی آمد تھی۔ شانتی کچن میں تھی۔ بچے نے ابھی اچھی طرح چلنا نہیں سیکھا تھا۔ روی اسے اپنی انگلیوں کے سہارے چلنا سکھا رہا تھا۔ تبھی اس کی نظر کوٹھی کے صدر دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ جہاں کوئی اجنبی عورت نوکر سے کچھ دریافت کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اس لئے روی نہ پہچان سکا کہ وہ کون ہے؟ دوسرے ہی لمحے جب نوکر کے ساتھ وہ اندر کی طرف بڑھی تو روی کو مانوس سا چہرہ دکھائی دیا لیکن اسے اس نے اس وقت پہچانا جب وہ قریب آ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اکدم چونک اٹھا تھا ——— اس کے ٹھیک سامنے ونیتا کھڑی تھی۔

ونیتا نے بھی روی کو پہچان لیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی، پاؤں کانپنے لگے تھے ——— شاید چکرا کر وہ گر جاتی اگر روی نے بڑھ کر اسے سہارا نہ دیا ہوتا۔

ونیتا اس وقت روی کے کنسلٹیشن روم (Consultation Room) میں لیٹی ہوئی تھی۔ روی کو دیکھ کر وہ بیہوش ہو گئی تھی اور اسی حالت میں اسے یہاں لایا گیا تھا لیکن اب وہ ہوش میں تھی اور گھبرائی سی روی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟" روی نے ونیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ صرف سر ہلا کر اپنے ٹھیک ہونے کا اشارہ کر دیا۔ روی دیکھ رہا تھا کہ کتنی بدل گئی ہے ونیتا! چند برس پہلے اور اب کی ونیتا میں جیسے پچیس برس کا فرق پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں مچلتی شوخیاں، ہونٹوں میں دبی شرارت بھری مسکان، چہرے پر دہکتی سرخی، بے پناہ حسن کی چاندنی ——— کبھی یہ سب کچھ تھا لیکن اب کچھ بھی نہ تھا! ونیتا اتنی نحیف ہو گئی تھی کہ روی اسے پہچان ہی نہ سکا تھا۔

"میں ڈاکٹر روی سے ملنے آئی تھی لیکن معلوم نہ تھا کہ وہ آپ ہی ہیں۔" ونیتا نے روی کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر نحیف سی آواز میں کہا۔ روی نے چونک کر اسے دیکھا لیکن خاموش رہا ——— شاید وہ ونیتا کو کچھ اور کہنے کا موقع دے رہا تھا۔

"آپ نے میرے یہاں آنے کا مقصد نہیں پوچھا؟" ونیتا اب اپنے حواس پر قابو پا چکی تھی۔

"کہئے؟" مختصر سا جواب تھا روی کا۔ ونیتا تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔

"مجھے آپ کی مدد چاہئے . . ." اور بلا جھجک اس نے روی سے ساری بات کہہ دی۔

وہ ماں بننے والی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کوکھ سے کوئی بچہ جنم لے۔ روی سمجھتا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اسی لئے اس نے پوچھ بھی لیا تھا کہ وہ کیوں ایسا چاہتی ہے؟ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ اس کی شادی نہیں ہوئی تو وہ کانپ اٹھا، لرز اٹھا ——— اور جب اسے ونیتا کی زندگی کی المناک داستان معلوم ہوئی تو اس پر اسے بے حد رحم آیا ——— ذہن میں یہ خیال گھوم گیا ——— کاش! عورت آزادی اور برابری کے جنون میں ان حدود کو پار نہ کرتی جن میں رہ کر اسے پوجا کا مقام حاصل تھا ——— یہی جنون تھا جس نے ونیتا کی زندگی کو کانٹوں کی چبھن عطا کی ہے۔ اسی جنون میں اس نے سب سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن ایسی ٹھوکر کھائی کہ سب سے پیچھے رہ گئی اور ساتھ ہی زندگی کے محسن کو اس نے داغدار کر لیا، اپنی محبت کا اس نے گلا گھونٹ لیا، اپنے روشن مستقبل کو اندھیروں کی گود میں پھینک دیا اور گناہ آلودہ بھٹکی بہکی ہوئی زندگی کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے اب وہ صرف زندہ ہے ——— ایک مردہ زندگی کی پرچھائیں ہے ——— اور بس!!!

"ونیتا! کبھی سوچا تم نے کہ اپنے آپ پر تم نے کتنا ظلم کیا ہے، کرن کی زندگی پر کتنا ظلم کیا ہے ——— اور یہ سب آخر ہوا کیوں؟" ونیتا اپنی کہانی سنا چکی تو

روی نے اُس سے پوچھا۔

"سوچا تھا روی بابو! لیکن اُس وقت جب میرے قدم بہک چکے تھے... تب میں نے بہت کوشش کی کہ کرن کو پھر حاصل کر لوں تاکہ بہکی ہوئی زندگی سنبھل جائے لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ کرن کا کوئی پتہ نہ چل سکا اور میری بہکی ہوئی زندگی آخر بھٹک گئی... انجام سامنے ہے لیکن کرن... اپنے کئے کی سزا میں پا رہی ہوں، مجھے اِس کا دُکھ نہیں، دُکھ صرف اِس بات کا ہے کہ میری وجہ سے سزا کرن کو کاٹنی پڑی ہے۔ کاش! وہ کہیں مِل جاتے تو میں اُن کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کر لیتی۔ اپنی ہاری ہوئی زندگی اُن کے قدموں میں ڈال کر معافی مانگ لیتی.. لیکن نہ جانے کہاں ہیں وہ؟ کس حال میں ہیں؟" ونیتا کے دل کا درد، مجروح جذبات کی کسک اور شکست خوردہ بھٹکی ہوئی زندگی کی ساری مایوسی آنسو بن کر اُس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑی تھی۔ وہ زار و قطار رونے لگی تھی۔ روی کا دل بھی بھر آیا تھا اور سوچنے لگا تھا وہ کیسے بتائے کہ جہاں وہ بیٹھی ہے یہ کرن ہی کا بنگلہ ہے اور... اور... ذہن جیسے اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

"تم بہت دیر سے پہنچی ہو ونیتا! کرن اب کسی اور کا ہو چکا ہے" ہمت کر کے کہہ ہی دیا روی نے "تمہارے لئے وہ تڑپا ہے، بیقرار رہا ہے۔ تمہاری طرح ہی شاید وہ بھی بھٹک گیا ہوتا لیکن شانتی نے اُسے ایک نئی زندگی کے اُجالے بخشے ہیں۔ شانتی اُس کی بیوی ہے" روی نے دیکھا اچانک ہی ونیتا کا چہرہ کِھل اُٹھا تھا، ہونٹ دھیمے سے مُسکا اُٹھے تھے اور آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"روی بابو! اب میرے مَن کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے —— بھگوان اُنھیں پُرمسرت زندگی عطا کرے —— ہمیشہ خوش رہیں وہ! بھگوان اُس دیوی کی مانگ ہمیشہ بھری رکھیں جس نے کرن کی محبت کو دھڑکنیں بخشی ہیں... اب مجھے کسی ڈاکٹر کی مدد نہیں چاہئے۔ میری آخری آرزو پوری ہو گئی —— اب میں سُکھ سے مر سکوں گی۔ میری روح بیقرار نہ رہے گی —— !"

ونیتا اُٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔ روی کے جذبات الفاظ میں جذب ہو کر چیخ اُٹھے —— ونیتا —— !"

"ونیتا!" اُس کے اُٹھے ہوئے قدم رُک گئے۔ دروازے میں کرن کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا —— اُسی نے پکارا تھا ونیتا کو —— "زندگی کی ہار کو جیت میں بدلو ونیتا! میری طرف دیکھو، میں بھی ہار گیا تھا اور تمہاری ہی طرح موت کی آغوش میں لیٹ جانا چاہتا تھا لیکن روی نے مجھے راستہ دکھایا اور شانتی نے سہارا دے کر ہار کو جیت میں بدل دیا... ہار اور جیت اِس زندگی کے دو مختلف پہلو ہیں زندگی ختم کر دینے سے تو جیت بھی مر جاتی ہے۔ زندگی کو زندہ رکھ کر ہی ہار کو جیت میں بدلا جا سکتا ہے!"

"لیکن میں اِس قابل نہیں ہوں کرن —— [illegible] ونیتا اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپا کر سسک اُٹھی۔ تبھی [illegible] اپنے ہاتھوں کا سہارا دیا اور روی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا —— [illegible] میں بہت دیر سے کھڑا سب سُن رہا تھا۔ سب جانتے ہوئے بھی میں [illegible] کہ تم ونیتا سے شادی کر لو ——"

"کرن! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ونیتا سے تم نے محبت..." روی [illegible] نہ کہہ پایا تھا کہ کرن نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"ہاں روی! ونیتا سے میں نے محبت کی ہے اور آج اپنی محبت میں اپنے دوست کو سونپنا چاہتا ہوں —— محبت اور شادی دو الگ باتیں ہیں، ضروری نہیں کہ اِنھیں یکجا کیا ہی جائے۔"

اِس سے پہلے کہ ونیتا کچھ کہتی —— روی کچھ کہتا —— کرن نے ونیتا کا ہاتھ روی کے ہاتھ میں دے کر اوپر اپنے ہونٹ رکھ دئے۔ روی بے اختیار کرن سے لپٹ گیا اور ونیتا نے جھک کر اُس کے پاؤں چھو لئے۔ دروازے میں کھڑی شانتی نے مُسکراتے ہوئے اپنے ننھے بچے کے رخسار چُوم لئے۔ جیسے محبت اور ممتا کے سوتے پھوٹ پڑے ہوں —— !!

# غزلیں

## پروفیسر اختر نقی، ایم۔اے

سکوں کا ذکر نہیں زندگی کی باتوں میں
نہاں ہیں درد کے پہلو خوشی کی باتوں میں

یہاں سے لوٹ کے جانے کی کوئی راہ نہیں
ہم آگئے ہیں کہاں تک کسی کی باتوں میں

نہیں ہے موجِ تبسم مرے لبوں کے لئے
یہ بات بھول گیا تھا خوشی کی باتوں میں

نہ جانے آج یہ کس تشنہ لب کی یاد آئی
ہمارا جی نہ لگا میکشی کی باتوں میں

فریبِ لفظ و بیاں کے سوا کچھ اور نہیں
مگر کشش ہے بہت دوستی کی باتوں میں

نہ مل سکا کوئی اپنوں میں ہم زباں اپنا
شریک ہو گئے اِک اجنبی کی باتوں میں

بہت حسین ہے اندازِ گفتگو نقی
مگر خلوص نہیں ہے کسی کی باتوں میں

## سعید اعجاز

ہوس کاریِ رنداں توبہ توبہ
صراحی جام ہوتی جا رہی ہے

جہاں تک سایۂ گیسو ہے اُن کا
وہاں تک شام ہوتی جا رہی ہے

اُمیدِ مرگِ ناکامی بھی توبہ
خیالِ خام ہوتی جا رہی ہے

تمہاری زُلف کی صورت کشی میں
گھٹا ناکام ہوتی جا رہی ہے

یہ کیا اندھیر ہے دَورِ ترقی
سحر بھی شام ہوتی جا رہی ہے

خرامِ ناز کی شہرت نہ پوچھو
صبا گمنام ہوتی جا رہی ہے

دلِ اعجاز کے نغموں کی ہر لَے
ترا پیغام ہوتی جا رہی ہے

## محبوب نظر ٹکاردی

شعلۂ یاد سے دل میرا تپاں رہتا ہے
رات دن ذِکر ترا وردِ زباں رہتا ہے

مجھ کو آتا ہے کسی رشکِ بہاراں کا خیال
جس جگہ تذکرۂ لالہ رُخاں رہتا ہے

ہم نے بخشی ہے محبت کو یقیں کی منزل
اور ہوں گے وہ جنھیں وہم و گماں رہتا ہے

جو بھی آتا ہے ترے کوچے میں ملنے کے لئے
پھر اُسے فکرِ غمِ زیست کہاں رہتا ہے

ہم تو ہر حال میں ہیں عہدِ وفا کے پابند
تختۂ دار پہ بھی پاسِ زباں رہتا ہے

اَے نظر رازِ محبت کو چھپاؤں کیوں کر
صورتِ اشک یہ کیسے عیاں [illegible]

# مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| افسانہ لکھ رہا ہوں | خوش باش ایم اے | دو روپے |
| اندھیرے | اختر عادل روپ | دو روپے |
| آگ اور دھواں | م م راجندر ایم اے | دو روپے ۵۰ نئے پیسے |
| اندھیرے اجالے | عادل رشید | تین روپے |
| اندھیری راتیں | ریوتی سرن شرما | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| ایک جھلک دو رنگا | رام سروپ شرما | تین روپے ۱۰ نئے پیسے |
| بیگم سلمیٰ | شوکت تھانوی | تین روپے ۷۵ نئے پیسے |
| طرار | ″ | دو روپے ۷۵ نئے پیسے |
| بجلی | ″ | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| [illegible] | مضطر ہاشمی | چار روپے ۲۵ ″ |
| بارات | کرشن چندر ایم اے | پانچ روپے ۹۵ ″ |
| پہلی لڑکی | رازدان ایم اے | دو روپے ۷۵ نئے پیسے |
| [illegible] | فیاض علی | آٹھ روپے ۵۰ ″ |
| [illegible] | کرشن گوپال عابد | چار روپے ۵۰ ″ |
| ستم | ″ | چار روپے ۷۵ ″ |
| گھاتل | ″ | تین روپے ۹۵ ″ |
| ظالم | سعید عشرت | دو روپے ۵۰ ″ |
| جانے والے | اختر عادل | تین روپے ۵۰ ″ |
| جاتی ہوئی بہار | وحشی محمود آبادی | چار روپے |
| چوٹ | دت بھارتی | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| گناہ | ″ | دو روپے ۹۵ نئے پیسے |
| حالِ دل | بیگم [illegible] حسینی | تین روپے ۵۰ ″ |
| [illegible] | انتصار حسین | تین روپے |
| حاصل مراد | قیسی رامپوری | چار روپے |
| پاگل | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| زخم ہائے دل (نظم) | عبدالحمید عدم | دو روپے ۷۵ نئے پیسے |

| | | |
|---|---|---|
| دو کنول | عادل رشید | تین روپے ۹۵ ″ |
| دو سال پہلے دو سال بعد | زبیدہ خاتون | چھ روپے |
| فریب مسلسل | شفیق بانو | دو روپے |
| زہر | نکی نور | چھ روپے |
| برہن | قیسی رامپوری | چار روپے |
| اچھی صورت بری نگاہ | ریاض ارشد | تین روپے |
| سناٹے | رضیہ سجاد ظہیر | تین روپے ۹۵ نئے پیسے |
| مجھے تم سے محبت ہے | نکی نور | تین روپے ۵۰ ″ |
| نئے قدم | ہاجرہ نازلی | چار روپے ۵۰ ″ |
| ننگی جوانی | سعید عشرت | دو روپے |
| رہگزر | انیس مرزا | چار روپے ۷۵ نئے پیسے |
| خوفناک محبت | عبدالحلیم شرر | تین روپے |
| شاہدہ | انتصار حسین | تین روپے |
| کرنیں | شفیق الرحمٰن | تین روپے |
| ناظر کی آپ بیتی | ایم اسلم | تین روپے |
| ایک دل ہزار غم | عزیز بدایونی | دو روپے ۵ نئے پیسے |
| [illegible] | رئیس احمد جعفری | چھ روپے ۵۰ نئے پیسے |
| ننگا شہر | احمد شجاع | پانچ روپے |
| دردانہ | نادرہ خاتون | پانچ روپے |
| چندر کلا | جمنا داس اختر | دو روپے ۵۰ نئے پیسے |
| جال | ″ | دو روپے ۵۰ ″ |
| رادھا الزبتھ | ″ | دو روپے ۵۰ ″ |
| پاپی | ″ | چار روپے |
| سونا گاچی | ″ | چار روپے ۵۰ ″ |
| طوفانوں کی کہانی | ″ | چار روپے ۵۰ ″ |
| جوار بھاٹا | ″ | چار روپے ۵۰ ″ |

| | | |
|---|---|---|
| قیامت | نکی نور | دو روپے [illegible] |
| سازش | ″ | دو روپے ۵۰ ″ |
| کانٹوں کی سیج | رشید اختر ندوی | پانچ روپے |
| گمراہ | قیسی رامپوری | چار روپے [illegible] |
| ناگ دیوتا | محمود [illegible] | دو روپے ۵۰ ″ |
| خون کے چھینٹے | ″ | دو روپے ۵۰ ″ |
| خوابگاہ میں | ″ | تین روپے ۵۰ ″ |
| فراق | رنگین بھارتی | تین روپے ۵۰ ″ |
| پیاسا | ″ | تین روپے ۵۰ ″ |
| پراسرار قاصد | ″ | دو روپے |
| پراسرار قاتل | ″ | دو روپے |
| پیاس | کے۔ ایل ترانہ بی اے | تین روپے ۵۰ ″ |
| محبت روتی ہے | غلام عباس | دو روپے |
| مالوا | میکسم گورکی ترجمہ نرش کمار شاد | ایک روپیہ ۵۰ ″ |
| کھیت میں لہو | تاجور سامری | ایک روپیہ ۵۰ ″ |
| جی ہاں بیٹے ہیں | شوکت تھانوی | تین روپے ۱۲ ″ |
| پردے کے پیچھے | منٹو | دو روپے ۵۰ ″ |
| ملکۂ صحرا | اوم پرکاش شاد | دو روپے ۵۰ ″ |
| خاموش نغمہ | ″ | چار روپے |
| آتش گل (مجموعہ کلام) | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| باقیات اقبال ″ | ڈاکٹر اقبال | [illegible] |
| تلخیاں (کلاں) ″ | ساحر | چھ روپے |
| تلخیاں (خورد) ″ | ساحر | [illegible] |
| پرچھائیاں ″ | ساحر | [illegible] |
| انسانیت موت کے دروازے پر | [illegible] | [illegible] |
| [illegible] | [illegible] | [illegible] |

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی دہلی

بیسویں صدی دہلی

افسانہ

# سپنے جاگے، آئی رات...

رفیعہ شبنم منیجری۔ ایم۔ اے

۱۴/ بی۔ آئی۔ ٹی بلاک۔ ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی نمبر ۳

۲۳ جون ۷۶ء — محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات

. . . کچھ دن ہوئے آپ کی خدمت میں ایک افسانہ "راکھ کے ڈھیر میں" ارسال کیا تھا مگر رسید سے ابھی تک محروم ہوں۔ کہیں وہ خاک کے ڈھیر میں تو تبدیل نہیں ہو گیا؟ ——— بہرحال اب "سپنے جاگے آئی رات" ارسال کر رہی ہوں۔ قبول فرمایئے گا ——— افسانہ نمبر نظر سے گزرا حسبِ معمول نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ نور شاہ، واجدہ باجی اور شعیب اعظمی کے افسانے پسند آئے۔ آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دینے کو جی چاہتا ہے ——— میرے نام کے آگے جو تھوڑی سی تبدیلی آپ دیکھ رہے ہیں وہ محض اس بات کی غماز ہے کہ میں نے امسال بمبئی یونیورسٹی میں اُردو (ایم۔ اے) میں ٹاپ کیا ہے۔

مخلص ——— رفیعہ شبنم منیجری

---

رات ———!!

سیاہ اور تاریک، اُداس اور خاموش، افسردہ اور طویل رات بیت گئی ہے۔

کچھ موہوم سے سائے دیواروں پر لہرائے اور غائب ہو گئے ہیں۔ پرچھائیاں دھندلی پڑ گئی ہیں اور بوڑھی کاکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی ہے۔ اس کے چہرے کی ایک ایک جھری ہنس رہی ہے۔ نہ جانے کیوں؟ اس کی بوڑھی نابینا آنکھوں میں ایک چمک آ گئی ہے۔ پپّو اور بالا اس کے قدموں میں بیٹھے کہانی سن رہے ہیں۔

وہی ہزاروں، لاکھوں برس پرانی کہانی!

انسان کے گناہوں کی طرح کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی!!

خلاقِ اعظم کی طرح ہمیشہ زندہ رہنے والی کہانی!!!

جس کا کوئی سرا نہیں مگر اس بوڑھی کاکی کی زندگی کا سرا اب ختم ہو گا؟ نہ جانے کب سے یہ اپنے بیمار، نحیف و نزار جسم کا بوجھ اُٹھائے زندہ ہے لیکن آن جانے، ان دیکھے سپنے کی طرح!! سپنے! ——— [illegible] جوان ہوتے [illegible] میں ڈھل سکے [illegible] کی ایک [illegible] ——— [illegible]

مونا لزا ——— [illegible] ——— [illegible]!!

اور پھر ——— [illegible]

دنوں کی سرد راکھ! پلکوں پر اٹا ہوا گرد و غبار اور کاکی کے سوکھے بالوں میں اُلجھی ہوئی دھول!!

لیکن اس دھول سے اب بھی ایک ہلکی ہلکی سی خوشبو اُٹھتی ہے۔ لپٹیں بڑھتی ہیں۔ شعلہ بن جاتی ہیں۔ تاریک راتوں میں اُجالا ہو جاتا ہے ———!! آنگن کے وسط میں چارپائی پر لیٹی ہوئی بوڑھی کاکی کو سب بچے اسی طرح گھیر لیتے ہیں۔ کوئی اس کے پیر دابتا ہے۔ کوئی ہاتھوں کی جھریاں مٹانے کے لئے سرسوں کے تیل کی مالش کرتا ہے۔ کوئی اس کے سفید بالوں میں جوئیں تلاش کرتا ہے اور بوڑھی کاکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ وہی برسوں پرانی مسکراہٹ!!

اس کی [illegible] ہوتی ہے۔ ہونٹ [illegible] ہیں اور وہ اپنی بینائی سے محروم آنکھوں [illegible] انداز میں ایک کہانی [illegible] ہے

[illegible]

کلائمکس پر !!

پوری کہانی تو ہم دونوں نے سُنی ہے۔ اُس وقت، جب اُس کہانی کی ابتدا ہوئی۔ پھر خیالات کے تانے بانے بُنے گئے، سپنوں اور آرزوؤں کی باتیں ہوئیں، یادوں کی سپاٹ وادی میں کچھ کھائیاں آئیں، گہرائیاں آئیں، گڑھے آئے !!—— اور بوڑھی کاکی کی آواز کانپ گئی اور اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہانی جاری رکھی۔

"ہاں تو پھر یوں ہوا —— پھر یوں ہوا —— ؟؟

"کیا ہوا کاکی ؟" تم بھی چونکیں اور میں بھی۔

کیونکہ پریتما دبے قدموں سے چلتی ہوئی تمہارے پاس آکر بیٹھ گئی۔ تمہارے کندھوں پر اپنا سارا بوجھ ڈالنے اور تمہارا دُبلا پتلا کندھا اُس کے گداز بدن کے بوجھ سے کچھ نیچے جھک گیا۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا پھر پریتما کی طرف۔ پھر کاکی کے

---

- ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کرو، نصیحت کرو۔ (قرآن پاک)
- اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، ناحق خون کرنا، جھوٹی گواہی دینا بڑے گناہ ہیں۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جبر، بدگمانی کی عادت نہ ڈالو۔ لوگوں کی عیب جوئی نہ کرو نہ ایسی باتوں کو اپنے کانوں تک پہنچنے دو، حسد نہ کرو، بغض نہ کرو، کسی کی عدم موجودگی میں اُس کی بُرائی نہ کرو۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- سخاوت یہ ہے کہ بے مانگے دیا جائے۔ سوال پر جو دیا جائے وہ بخشش ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- شکم ہو یا تو کہ ہر حال میں نہار کو یاد رکھو۔ (حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ)

---

پوپلے چہرے کی جانب اور پھر ——

"پھر کیا ہوا کاکی ؟" میں نے، تم نے اور پریتما نے ایک ساتھ پوچھا۔

کاکی نے نہ جانے کس کی خوشبو پائی کہ چونک کر پہلو بدلا اور بولی۔

"پھر ؟ —— پھر کہانی ختم ہو گئی"

"اتنی جلدی کہانی کیسے ختم ہو گئی کاکی ؟" تم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"چھوٹی سی تھی سیدھی سادی، غریب کی بیٹی کی طرح !! بس اسی لئے اتنی جلدی ختم ہو گئی" کاکی نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔

اور تمہاری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے تمہاری سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔ پھر پریتما کی نیلی جھیل میں غوطہ لگایا اور جب کاکی کے بے نور لبالوں سے واپس لوٹا تو شام ڈھل چکی تھی۔ اندھیرا بڑھ آیا تھا۔ سناٹا فضاؤں میں تیرنے لگا تھا اور تمہارے گھر کی کچی دیوار پر کچھ موہوم سے سائے منڈلا کر غائب ہو گئے تھے !!

کچھ سائے —— چلتے پھرتے سائے !! —— اور پھر تمام سائے ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ کاکی کہتی ہے۔ یہ سائے وہ بھٹکی ہوئی روحیں ہیں جو زندگی میں کچھ بھی نہ پا سکیں۔ جن کے سپنے ادھورے رہ گئے، آرزوئیں تشنہ رہ گئیں، جن کی پیاس بجھ نہ سکی اور چلتے پھرتے وجود چند متحرک سایوں میں تبدیل ہو گئے۔ یہ بھٹکتی روحیں، یہ متحرک سائے ہر دور میں گوشت پوست کے پیکروں کی تلاش میں رہتے ہیں اور کسی نہ کسی وجود سے چمٹ جاتے ہیں اور جب دو وجود ایک ہو جاتے ہیں تو یہ بھٹکتے ہوئے سائے بھی ایک ہو جاتے ہیں۔

کاکی ٹھیک ہی کہتی ہے۔

میں اور تم !! —— ہم دونوں بھی دو بھٹکتی ہوئی روحیں ہیں۔ دو متحرک سائے !! کسی وجود کی تلاش میں سرگرداں !! ایک ہو جانے کے لئے بے قرار !! ایک دوسرے میں سما جانے کے لئے بے چین !!

مگر یہ بات تو بہت پرانی ہے !! کاکی کی اس لوک کہانی کی طرح۔ وہی ایک چھپکلی اور ایک گرگٹ کی کہانی !!

"کسی بوڑھے برگد کی کھوہ میں ایک چھپکلی رہتی تھی۔ سوکھی سڑی دبلی پتلی، ملگجے سے رنگ کی !! —— بھدے سے، معمولی سے نقوش والی، ایک معصوم، چھوٹی سی چھپکلی !! بیسے —— بیسے —— !! اور میری سوچ اس کے آگے قدم توڑ دیتی ہے۔ میری نظر تمہارے دُبلے پتلے جسم پر، تمہارے ملگجے رنگ پر اور تمہارے معمولی سے نقوش پر جمی ہوئی ہے۔ کاکی نے اِسی لئے کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔

"اسی بوڑھے برگد کے تنے میں ایک گرگٹ رہتا تھا۔ موٹا تازہ، تن دھن، خوبصورت سے رنگوں کا مالک۔ جو اکثر چھپ چھپ کر چھپکلی کو دیکھا کرتا"

میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے مگر کاکی کی بوڑھی آنکھوں نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ تمہارے سانولے چہرے پر شرم کی ایک ہلکی سی لکیر دوڑ گئی ہے۔ کاکی کی کہانی کچھ اور آگے بڑھ آئی ہے۔

"روزانہ چھپکلی کھوہ سے باہر نکل آتی۔ گرگٹ تنے پر سے پھسلتا ہوا اُس کے قریب آجاتا۔ اُسے تکا کرتا۔ کبھی اپنی لال لال زبان نکال کر اُس سے باتیں کرتا، اُس سے نہ جانے کیا کچھ کہتا۔ چھپکلی کچھ سمجھتی، کچھ سمجھ نہ پاتی لیکن ہولے سے مسکرا دیتی اور گرگٹ بھی خوشی سے اپنا رنگ بدل دیتا !! —— کبھی نیلا، کبھی لال، کبھی سبز، کبھی زرد !! اور بے چاری چھپکلی پریشان ہو جاتی۔ اپنے گرگٹ کو پہچان لینا اُس کے لئے مشکل ہو جاتا۔ وہ تھک ہار کر تنے کے قریب کے بھورے پتھر پہ اپنا سر ٹیک دیتی اور گول گول آنکھوں سے گرگٹ کو تلاش کرتی رہتی"

تب تم ٹھنک کر چارپائی سے اپنا سر ٹیک دیتی ہو اور اپنی سیاہ آنکھوں سے دھانے کے تلاش کر رہی ہو کہانی اور آگے بڑھ آئی ہو۔

"اور جب گرگٹ دیکھتا کہ چھپکلی اُس کی تلاش میں پریشان ہو کر ہار چکی ہے تو پھر وہ جھٹ سے اپنا اصلی رنگ اپنا لیتا اور تنے کے پیچھے سے نکل کر اُس کے سامنے آجاتا۔ چھپکلی خوش ہوجاتی اور خوشی سے چیں چیں کرنے لگتی"

تمھارے چہرے پر بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے اور میں نے بوڑھی کاکی کے جھرّی دار چہرے پر نگاہیں جمادی ہیں۔

"دونوں اسی طرح روزانہ ملتے۔ آپس میں شرارتیں کرتے چھیڑ چھاڑ ہوتی اور خوشی کے نشے میں چُور دہ سارے برگد پر اِدھر سے اُدھر پھُدکتے رہتے۔ لیکن ایک دن ——"

بوڑھی کاکی کی خلافِ معمول کانپنے لگی ہے۔ تمھارے بدن میں بھی ایک جھرجھری سی آگئی ہے اور میں نے بوڑھی کاکی کی آواز پر کان لگا دیئے ہیں اور ایک دن ——!!

ایک دن ——!!!

"کیا ہوا ایک دن؟" تم نے پریشان ہو کر کاکی سے پوچھا ہے۔ تمھارا دُبلا پتلا، سوکھا سوکھا ہاتھ کاکی کے کندھوں کو جھنجوڑ رہا ہے۔

"پھر کیا ہوا کاکی؟" میں نے سوال کیا ہے۔ اچانک کاکی نے کسی کی خوشبو پاکر چونک کر پہلو بدلا ہے۔

"پھر یُوں ہوا —— پھر یُوں ہوا کہ کہانی ختم ہوگئی —— اور تم ہمیشہ کی طرح جھنجھلا اُٹھی ہو۔

"کاکی! ہر بار کہانی یہیں آکر کیوں ختم ہو جاتی ہے؟" تم نے جھلّا کر پوچھا ہے۔

لیکن کاکی خلاء میں گھُور رہی ہے۔

"کیا یہ کہانی آگے نہیں بڑھ سکتی؟"

"نہیں —— ابھی نہیں!!"

"آخر کیوں؟"

"اِس لئے کہ ابھی اِسے انتظار ہے۔"

"کس کا؟"

"وقت کا"

"وقت؟ کیسا وقت کاکی؟" اور کاکی مسکرانے لگی ہے۔

"جب —— جب برگد پر بہار آئے گی۔ نئی پتّیاں مُسکرائیں گی۔ ٹہنیاں خوشبوؤں سے لد جائیں گی اور —— اور ——"

کاکی نے پھر بات ادھوری چھوڑ دی ہے اور رات بیت گئی ہے۔ میں اب بھی بوڑھے برگد کے گھنے سائے میں بیٹھا کاکی کی کہانی کے متعلق سوچ رہا ہوں۔

وہی کہانی —— ایک چھپکلی اور گرگٹ کی!

ایک سوکھی سوکھی دُبلی پتلی لڑکی اور ایک تنومند جوان کی!!

شانو کی کہانی اور راجہ کی کہانی!! —— تمھاری کہانی اور میری کہانی ——

نہیں، ہم دونوں کی کہانی!!!

اور کہانی شروع ہوگئی ہے۔

تم اپنے دُبلے پتلے، سوکھے جسم کو سمیٹے، اپنے گھر کی کچی دیوار کا سہارا لئے کھڑی ہو اور میں سامنے کے برآمدے سے تمھیں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہوں! تم میری نظروں کی تاب نہ لاکر گھبرا سی گئی ہو۔ میں دل کے اضطراب سے شکست کھا کر تمھارے اور قریب آگیا ہوں۔ تمھارے دُبلے پتلے، سانولے پیکر کے بہت قریب!! —— تمھارے

* * *

- بداعمالیوں کے داغ اشکِ ندامت سے دُھلتے ہیں۔ (سوامی ساؤشیدانند جی)
- چاندی ظاہر میں سفید ہوتی ہے لیکن ہاتھوں اور دل کو سیاہ کر دیتی ہے۔ (پرم ہنس رام کرشن دیو)
- جو بے مانگے تجھے اِتنی نعمتیں دے رہا ہے وہ تجھے روزی سے مایوس نہ رکھے گا۔ (بھرتری ہری)
- ہر حال میں ہمیشہ اپنے آپ کو بلند اخلاق، بلند خیال اور بلند معیار ثابت کرو۔ (سوامی ویویکانند)
- ہر نیکی اور خوبی اپنانے کے قابل ہے چاہے وہ آپ کے دشمن میں ہو۔ (ماتا ریحانہ جی)

* * *

ہونٹوں پر ایک مُسکراہٹ پھیل گئی ہے اور میرے ہونٹوں پر بھی!! ہم دونوں مُسکرا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈُوبے ہوئے۔

شام کے سائے بڑھ آئے ہیں اور تم کچّی دیواروں کے اُس چھوٹے سے نیم پختہ مکان کے تنگ دروازے میں غائب ہو چکی ہو۔ میں پھر اپنے برآمدے میں لَوٹ آیا ہوں۔

کہانی اور آگے بڑھ آئی ہے۔ بہار کی اُجلی اُجلی صبح کی مانند!

روزانہ کی طرح آج بھی تم میرے قریب ہو۔ آنگن کے ڈُوبتے سایوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کی باتوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر تمھارے بالوں میں دھواں چھوڑ دیا ہے اور تم دھوئیں کے مرغولوں سے اُلجھ گئی ہو۔ تم نے مشتعل ہو کر میرے ہاتھوں سے سگریٹ چھین لیا ہے اور دُور

بہت دور پھینک دیا ہے۔ میرے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ ہے میں نے پیکٹ سے دوسرا سگریٹ نکال کر پھر سلگا لیا ہے۔

"میں کہتی ہوں سگریٹ پینا چھوڑ دو" تم جھنجھلا اٹھی ہو۔

لیکن یہ میرے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ رقصاں ہے۔

"تمھاری صحت برباد ہو جائے گی" تم نے بزرگانہ انداز میں کہا ہے۔

"اچھا" میری آنکھوں میں حیرت کی لہریں اُٹھ رہی ہیں۔

"ہاں! ——— ڈاکٹر ریمونڈ پرل نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بُنیاد پر اعلان کیا ہے کہ جو لوگ کثرت سے سگریٹ پیتے ہیں ان کی عمر کم ہو جاتی ہے"

"اور ———؟"

"ڈاکٹر مارس فریڈل تجربہ کے بعد بیان کرتا ہے کہ صرف ایک سگریٹ پینے سے ستّی فیصدی اشخاص کے دورانِ خون میں تغیر پیدا ہو سکتا ہے" تم کسی پروفیسر کے انداز میں کہہ رہی ہو۔

"اور ———" میرے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ ہے۔

"ڈاکٹر ہارڈے ٹیلیو ویل لکھتا ہے تمباکو موت کے سایہ کا ایک قریبی رشتہ دار ہے۔ اس کا خاص زہریلا جُز نکوٹین ہوتا ہے جو ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے" تم اس انداز میں کہہ رہی ہو جیسے سارے جہان کی معلومات تم نے حاصل کر لی ہے۔

"واقعی؟" میرے چہرے پر مصنوعی حیرت کے آثار ہیں۔

"ڈاکٹر وفس پالنگ نے اپنے ایک لیکچر کے دوران کہا۔ ایک پیکٹ سگریٹ سے انسان کی عمر ایک بٹہ پانچ کم ہو جاتی ہے" تمھارا چہرہ فخر کے احساس سے سُرخ ہو گیا ہے اور میں نے ایک اناڑی طالب علم کی طرح تمھارے آگے سرِ تسلیم خم کر لیا ہے۔

"پہلے یہ بتاؤ شانو! تم نے ڈائجسٹ کب سے پڑھنا شروع کر دیا ہے؟"

"تمھیں کس نے بتایا؟" تم جھنجھلا اُٹھی ہو۔

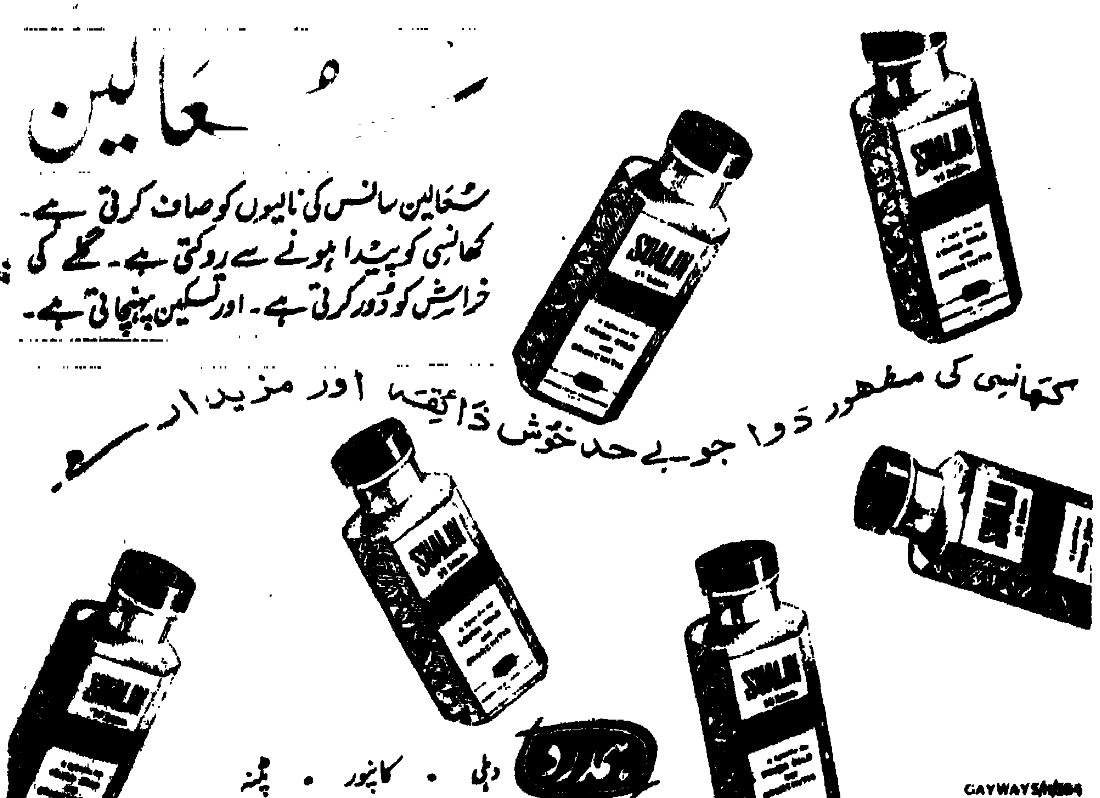
"پھر تمھاری معلومات میں یہ اضافہ کہاں سے ہو گیا؟"

"تمھیں اس سے کیا۔ تم سمجھتے ہو مجھے انگریزی آتی نہیں سکتی۔ میں سب کچھ پڑھ سکتی ہوں سمجھے! تمھارا نام بھی، تمھارا خط بھی، تمھاری کہانیاں بھی!" تم نے فخر سے سینہ تان کر کہا ہے اور تمھارے سوکھے چہرے کی ہڈیاں کچھ اور اُبھر آئی ہیں۔

"کس نے سکھا دی تمھیں انگریزی؟"

"ہے کوئی۔ تمھیں اس سے کیا؟"

"اچھا نہ بتاؤ لیکن اتنا جان لو۔ میں انگریزی میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ اُردو میں لکھتا ہوں۔ جو تمھیں نہیں آتی۔ سمجھیں؟ بے وقوف! جھوٹ بولا کرو تو ذرا سوچ سمجھ کر!"



اور تمھاری آنکھوں میں میری آنکھ کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا ہے میں کچھ ایسی رواں سے بوڑھی کاکی کی نابینا آنکھوں میں اُبھر آتے ہیں۔ کتنی مشابہت ہے تمھاری اور اس کی آنکھوں میں!! میں نے گھبرا کر اپنی نظریں ہٹا دی ہیں۔

کہانی اب بھی ختم نہیں ہوئی ــــــ جانے کیوں تمھیں بوڑھی کاکی سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے "کہانی اتنی جلدی کیوں ختم ہو گئی؟" اور مجھے ہمیشہ یہ اُلجھن رہی ہے کہ "کہانی آخر ختم کیوں نہیں ہو جاتی؟" مگر ــــــ یہ کہانی ختم نہ ہو گی۔ کچھ کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں شاید! جو ختم ہونا نہیں جانتیں۔ قیامت تک یوں ہی زندہ رہتی ہیں۔ میری اور تمھاری کہانی کی طرح۔ نہیں، ایک چھپکلی اور ایک گرگٹ کی کہانی کی طرح ــــــ!!

خیالات کے تانے بانے کچھ اور بڑھ آئے ہیں!!

ہم دونوں کو شام کے سایوں میں گیت گاتے گاتے زمانہ ہو گیا ہے۔ روزانہ ہم آنگن کے ڈھلتے سایوں میں ملتے ہیں۔ سرگوشیاں کرتے ہیں، ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں، پھر اپنے اپنے راستوں پر چلے جاتے ہیں۔ تم اپنے نیم پختہ مکان کی جانب اور میں اپنی کوٹھی کے برآمدے میں!!

کہانی نے ایک نیا موڑ لیا ہے ــــــ!!

آنگن کی اس ٹیڑھی میڑھی سی پگڈنڈی پر تم اُداس کھڑی ہو۔ میں اپنے برآمدے سے تمھاری طرف چلا آیا ہوں اور حسبِ معمول تمھارے بالوں میں سگریٹ کا دھواں چھوڑ دیا ہے، لیکن آج تم دھوئیں کے مرغولوں سے اُلجھ نہیں رہی ہو۔ تم نے جھنجھلا کر میرے ہاتھوں سے سگریٹ چھین کر دُور پھینکی بھی نہیں۔ تم نے سگریٹ نوشی کے متعلق کوئی لیکچر بھی نہیں دیا۔ وہی لیکچر، وہی تمام باتیں جو تم پریتما سے سُن کر آتی ہو اور میرے سامنے فخریہ انداز میں یوں دُہراتی ہو جیسے تم نے ساری دُنیا کی کتابیں پڑھ لی ہیں۔

پریتما!! ــــــ تمھاری ہمدرد اور غمگسار۔ قصبہ کی وہ نئی لیڈی ڈاکٹر جو اسپتال کے افتتاح کے چند روز بعد یہاں آئی ہے اور اپنے خوبصورت سے نیلے رنگ کے کوارٹر میں رہتی ہے۔ تم میں اور پریتما میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمھارا مکان نیم پختہ ہے۔ اس کی کچی دیواروں سے پانی کے ریلے بہہ کر ایک عجیب سی سیلن پیدا کر دیتے ہیں۔ برسات میں تمھارے گھر کی چھت ٹپکتی ہے تو تمھیں اپنی بوڑھی ماں اور معذور باپ کے ساتھ میرے برآمدے میں پناہ لینی پڑتی ہے اور پریتما کے پاس ایک خوبصورت سا کوارٹر ہے۔ جس کے دروازوں اور کھڑکیوں پر ہلکے گلابی رنگ کے پردے لہراتے ہیں۔ پختہ سیمنٹ کی دیواروں پر پینٹ کی ہوئی ماڈرن آرٹ کی بہترین تصویر اور فریم آویزاں ہیں، خوبصورت سے شیلف میں نہ جانے کتنی کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ تمھارے یہاں تو گیتا کے علاوہ اور کوئی کتاب نہیں۔ پریتما آرٹ، سائنس، نفسیات اور معاشیات کے متعلق بڑے سے بڑے ادیب کی کتاب بھی بڑی آسانی سے پڑھ لیتی ہے، سمجھ لیتی ہے مگر تم گیتا کے علاوہ نہ ایک لفظ پڑھ سکتی ہو، نہ سمجھ سکتی ہو۔ تمھیں اپنی بوڑھی ماں اور معذور باپ کے لئے کھانا خود ہی پکانا پڑتا ہے مگر پریتما کے کھانے کے لئے ایک خادمہ مقرر ہے۔ تم دُبلی پتلی، سوکھی ہو اور پریتما کا بھرا بھرا گداز بدن مونالزا کی یاد دلاتا ہے۔ تمھاری سیاہ آنکھیں ہر وقت متجسس رہتی ہیں نہ جانے کیوں؟ اور پریتما کی نیلی جھیل سی آنکھوں میں ایک پُرسکون ٹھہراؤ ہے ڈل کے پانی کی طرح!!

تم اور پریتما!! ــــــ نہیں صرف پریتما!!

کہانی کلائمکس پر آ چکی ہے۔ کہانی اب ختم نہیں ہو گی۔ تمھیں اب بوڑھی کاکی سے کوئی شکایت نہ ہو گی۔ اس لئے کہ کہانی کو جس وقت کا انتظار تھا، وہ آ گیا۔ بوڑھی کاکی کی آواز میں پھر لرزش پیدا ہو گئی ہے۔ کہانی آگے بڑھنے کے باوجود آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ بوڑھی کاکی کے لبوں پر صرف چند الفاظ جم گئے ہیں۔

"اور ایک دن ــــــ"

"کیا ہوا ایک دن؟" تم نے پریشان ہو کر کاکی سے پوچھا ہے۔ تمھارا دُبلا پتلا سوکھا ہاتھ کاکی کے کندھوں کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ کاکی نے کہانی جاری رکھی ہے۔

"ہاں تو پھر ــــــ پھر یوں ہوا ــــــ کہ ــــــ"

"کیا ہوا کاکی؟" تم بھی چونکی ہو اور میں بھی۔ کیونکہ پریتما دبے قدموں سے چلتی ہوئی آ کر تمھارے پاس بیٹھ گئی ہے۔ تمھارے کندھوں پر اپنا سارا بوجھ ڈالے اور تمھارا دُبلا پتلا کندھا اُس کے گداز بدن کے بوجھ سے کچھ نیچے جھک آیا ہے۔ میں نے تمھاری طرف دیکھا، پھر پریتما کی طرف، پھر کاکی کے پوپلے چہرے پر نگاہیں جما دی ہیں۔

"پھر؟ ــــــ پھر کہانی ختم ہو گئی۔

ہاں! کہانی ختم ہو گئی ــــــ بہت جلد۔ نہیں بہت دیر میں!! ــــــ اور آج تم اُداس اُداس آئی ہو۔ میرے استفسار پر تمھاری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ تمھاری ہچکیاں بندھ گئی ہیں اور میرے کندھے پر سر رکھے تم ہولے ہولے سسک رہی ہو۔

"مجھے ــــــ مجھے یہاں سے لے چلو راجہ ــــــ!!" تمھاری پیشکش پر میں چونک گیا ہوں۔

"آخر کیوں؟"

"ماں نے حامی بھر لی ہے"

"پھر تو بڑی خوشی کی بات ہے"

"راجہ! ــــــ میں مر جاؤں گی۔ اِس سے پہلے کہ سر چو بارات لے کر میرے گھر آئے، تم پہنچ جاؤ۔ ماں کو اب بھی تمھارا انتظار ہے۔ مگر وہ خود تم سے نہ کہے گی ــــــ غیرت مند ہے نا؟؟"

تم اب بھی سسک رہی ہو اور میں سوچ میں غرق ہو گیا ہوں۔ کہانی نے

رنگ بدل لیا ہے۔ نہیں گرگٹ نے رنگ بدل دیا ہے۔ اب اُس کے سامنے کوئی بھی چھپکلی نہیں۔ ایک خوبصورت سی گلہری ہے۔ گلابی اور چمکتا ہوا رنگ!!۔۔۔ اور گرگٹ گلہری کی طرف بڑھ گیا ہے۔ چھپکلی کسمسا کر رہ گئی ہے۔ اپنے گرگٹ کو ڈھونڈ رہی ہے۔ کون سمجھائے اُسے !!

"تمہاری یہ تلاش بے سُود ہے شانو! تمہارا راجہ اب تمہارا نہیں رہا۔ وہ دیکھو اِس آنگن کی بجائے اُس کے قدم اسپتال کے کمپاؤنڈ میں ایک نیلے کوارٹر کی جانب اُٹھ گئے ہیں۔ دروازے پر پڑا ہوا گلابی پردہ لہرا رہا ہے۔ دہلیز پر پریتا کھڑی ہے۔ اپنی نیلی آنکھوں میں ساری دُنیا کی محبت سمیٹے۔ تمہاری سیاہ آنکھوں میں یہ خوبصورتی کہاں ہے شانو؟ کہیں زندگی کے سودے یوں بھی ہوتے ہیں؟ یہ تو ایک چھیڑ چھاڑ تھی پگلی! بس ایک چھیڑ چھاڑ ۔۔۔۔ "

لیکن تم نے کچھ نہیں کہا ہے۔ تم خاموشی سے اپنے مکان کے تنگ دروازے کے اندر دُور کہیں دُور غائب ہوگئی ہے۔ اور ۔۔۔ رات بڑھ آئی ہے۔ سائے دراز ہوگئے ہیں۔ اندھیرا پھیل گیا ہے اور بُوڑھی کاکی تھک کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی ہے۔

کہانی یہیں ختم ہوگئی !!!

لیکن آج بیس سال بعد لوٹ کر اپنے گاؤں آیا ہوں تو نہ جانے کس لمحے میں یہ سوئی ہوئی کہانی پھر جاگ گئی ہے۔ گاؤں کا ذرّہ ذرّہ جانا پہچانا سا ہے۔ وہی برآمدہ، وہی آنگن، وہی کچا مکان جس کی دیواریں اب گر چکی ہیں جن پر گھاس اُگ آرام کر رہے ہیں۔ وہی برگد کا پیڑ، وہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی بوڑھی کاکی اور چنچل معصوم اور شوخ، الھڑ اور حسین بالا کا ہاتھ تھامے بوڑھی کاکی سے کہانی سن رہا ہے۔

وہی ہزاروں برس پُرانی کہانی!۔۔ ایک چھپکلی اور ایک گرگٹ کی کہانی!!

گرگٹ رنگ بدل چکا ہے۔ لیکن آج چھپکلی نہیں جس کی آنکھیں زندگی بھر اپنے گرگٹ کو تلاش کرتی رہیں۔ آج گلہری بھی نہیں، جس نے گرگٹ کو اپنے جال میں پھنسایا اور پھر ایک کھوہ میں لے جا کر ہمیشہ کے لئے قید کرکے خود کسی اور شکار کی تلاش میں چلی گئی۔ آج کوئی نہیں۔ شانو بھی نہیں، پریتا بھی نہیں!۔۔۔۔ صرف میں زندہ ہوں۔ اپنی زندگی کا بوجھ اُٹھائے۔ گلی گلی اپنی شانو کو تلاش کرتا ہوا۔ مگر نہ جانے شانو کہاں چلی گئی۔ اُس کی بوڑھی ماں اور معذور باپ کب کے مر کھپ گئے۔ لیکن شانو؟ اُس نے سرجو سے شادی نہیں کی اور سرجو گاؤں کی ایک مہترانی کے ساتھ کہیں فرار ہوگیا۔

مگر شانو؟ ۔۔۔ شانو؟ ۔۔۔ نیم پختہ مکان کی ڈھتی ہوئی دیواریں مجھ پر ہنس رہی ہیں۔ میری اُنگلیوں میں سگریٹ کی تپش محسوس ہو رہی ہے۔ دھوئیں کے مرغولے چاروں طرف پھیل گئے ہیں۔ رات آگئی ہے۔ سیاہ اور تاریک رات ۔۔۔!!

اور میرے سپنے ایک ایک کرکے پھر جاگ اٹھے ہیں۔ میں برآمدے کی ریلنگ کا سہارا لئے آنگن کے اندھیرے میں چارپائی پر بچوں میں گھری ہوئی بوڑھی کاکی کا دھندلا چہرہ دیکھ رہا ہوں اور کہانی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔

شانو چلی گئی۔ نہ جانے کہاں؟ نہیں، بلکہ میں چلا گیا۔ ڈاکٹر پریتا کے ساتھ۔ اس کے لئے میں نے اپنے گاؤں کی ہر یاد کو دفن کر دیا۔ پھر ہم شہر چلے آئے۔ پریتا اور میں!! شادی کے تین سال کتنے کرب میں کاٹے تھے میں نے! پریتا کے نت نئے دوست، اس کی اپنی دلچسپیاں، کلب، ڈانس، پارٹیاں، ہنگامے، پک نکیں! اور ——— میری تنہائی، بے بسی، اُداسی!! ——— اور پھر ——— ایک دن پریتا چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے کہا تھا۔

"تم سے شادی کرکے میں نے حماقت کی ہے۔ مجھے اب پتہ چلا کہ میں تمہارے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ ہم دونوں پھر اُن راہوں پر لوٹ جائیں جہاں سے ایک دن ہم اس منزل پر آئے تھے۔"

اور پپّو کو میری گود میں ڈال کر پریتا چلی گئی۔ ایک سال کا ننھا مُنّا پپّو، جو آج اٹھارہ سال کا خوبصورت نوجوان ہے اور بالا کا ہاتھ تھامے بوڑھی کاکی کی کہانی سن رہا ہے۔ مجھے کاکی کی کانپتی ہوئی آواز اب بھی سُنائی دے رہی ہے۔ نہ جانے ابتک کیسے جی گئی کاکی؟ کتنے لوگ اس کے سامنے آئے اور چلے گئے۔ کوئی بھی نہ بچا۔ ہاں، کاکی بھی تو مر گئی۔ مگر نہیں۔ میں نے جو خبر سُنی تھی وہ غلط تھی۔ کاکی یہ کہانی سُنانے کے لئے آج بھی زندہ ہے۔

"پھر کیا ہوا کاکی؟" اچانک پپّو کی آواز سُنائی دی ہے اور میں نے دُور سے محسوس کر لیا ہے کہ اُس کی گرفت بالا کے ہاتھوں پر اور مضبوط ہو گئی ہے۔

"پھر؟ ——— پھر چھپکلی اپنے گرگٹ کو تلاش کرتے کرتے بوڑھی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں روتے روتے اندھی ہو گئیں لیکن گرگٹ نہ مل سکا۔ اس نے گلہری کی محبت میں کچھ ایسا رنگ بدلا تھا کہ وہ ساری زندگی اُسے نہ پا سکی۔ اور ایک دن ——— گرگٹ اور گلہری اس بوڑھے برگد سے دُور کسی اور بستی میں چلے گئے۔"

بوڑھی کاکی کی آواز کانپ گئی ہے اور وہ اپنی بے نور آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے چارپائی پر لیٹ گئی ہے۔ میں پپّو کو بلانے کی غرض سے یہاں چلا آیا ہوں۔ وہ اور بالا اب بھی کہانی میں غرق ہیں۔ میں ان کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔ بوڑھی کاکی کا چہرہ اب میرے سامنے ہے۔ اس کی آواز لرز رہی ہے۔ بالا کی بھیگی پلکوں کے ساتھ سسکیوں کی آواز سُن کر وہ کہہ رہی ہے۔

"رونے کی کوئی بات نہیں بیٹی! ایسا ہی ہوتا ہے جب کہانی شروع ہوتی ہے تو ہنسی ساتھ رہتی ہے۔ جب کہانی دم توڑ دیتی ہے تو آنسو ایسے ہی نکل آتے ہیں مگر تم نہ رو، بیٹی! ——— ہر گرگٹ میرے راجہ جیسا تو نہیں ہو سکتا۔"

"شانو ...!!" بوڑھی کاکی کو میں نے پہچان لیا ہے۔ وہی نقوش، وہی رنگ، وہی سوکھا ڈھانچہ!!

"آنکھیں کھولو شانو! گرگٹ اپنے اصلی رنگ کو اپنا چکا ہے ———!! لیکن بوڑھی کاکی کی بند ہوتی ہوئی پلکیں ایک لمحے کے لئے لرز کر ٹھہر گئی ہیں۔

"تمہارا راجہ تمہارے پاس آگیا ہے شانو!!" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا ہے اور شانو کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے مگر ———

شانو کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ وہ خاموش ہو چکی ہے۔ اُس کی سوکھی بانہوں میں زندگی کی کوئی لہر نہیں، کوئی گرمی نہیں۔ بے نور آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی ہیں۔ کہانی کو جس لمحے کا انتظار تھا، وہ آگیا اور کہانی ختم ہو گئی۔ صرف شانو کی آواز رات کے اندھیرے میں تیر رہی ہے۔

"ہر گرگٹ میرے راجہ جیسا تو نہیں ہو سکتا ..."

تم نے ٹھیک کہا ہے شانو! ہر گرگٹ تمہارے راجہ جیسا تو نہیں ہو سکتا میرا پپّو ایسا نہیں ہوگا شانو! ——— میں نے پپّو کا ہاتھ بالا کے ہاتھوں میں ہمیشہ کے لئے دے دیا ہے اور مُسکرا رہا ہوں مگر ———

رات بیت گئی ہے۔ پپّو کے کمرے کی بتی بجھ گئی ہے لیکن میرے سارے سپنے ایک بار پھر جاگ اٹھے ہیں!!

---

# غزلیں

## آزاد گلاٹی، ایم۔اے

جو داغ ترے غم کی دعاؤں سے پلے ہیں
وہ میرے مقدر کا دیا بن کے جلے ہیں
معلوم ہیں اُن کو رہِ اُلفت کے تقاضے
جو آبلہ پایانِ جنوں اس پہ چلے ہیں
یہ آپ کی نظروں پہ ہے جس رنگ میں دیکھیں
ہم لوگ حقیقت میں بُرے ہیں نہ بھلے ہیں
ٹھکرا کے جسے ہم یہ سمجھتے تھے جئیں گے
اُس عہدِ گزشتہ کے لئے ہاتھ ملے ہیں
وہ اشک جو پلکوں ہی پہ رُک جاتے تھے اکثر
آزاد! وہ اشعار کے سانچوں میں ڈھلے ہیں

## طارق ایرایانی، ایم۔اے

گُل کی قبا پہن کر پھونکا مجھے شرر نے
آخر تباہ کر کے چھوڑا تری نظر نے
پروازِ صحنِ گلشن ہم کو نہ راس آئی
صیاد کو جگایا آوازِ بال و پر نے
غنچوں سے آگ نکلی شعلے اُٹھے گُلوں سے
اُن کی جو یاد آئی تڑپا دیا سحر نے
حسرت بھری نظر نے تڑپا دیا انھیں بھی
کیسا اثر دکھایا اِس عشقِ بے اثر نے
قربان ہو رہی ہے جس پر بہار طارق
چھوڑا ہے نقشِ رنگیں وہ حضرتِ جگر نے

## آزاد گورداسپوری، بی۔اے

محبت کے سوا ہر چیز فانی ہے جہاں والو
محبت موردِ الزام کیوں ہے سوچنا ہوگا
چلو مانا تمھیں مجھ سے محبت ہی نہیں لیکن
تمہارے لب پہ میرا نام کیوں ہے سوچنا ہوگا
سنوارا جن کے ہاتھوں نے کبھی میخانۂ ہستی
انھیں کو اب تلاشِ جام کیوں ہے سوچنا ہوگا
سُنا ہے اب وہ کہتے ہیں ہماری داستاں سُن کر
ذرا سی بات پر کہرام کیوں ہے سوچنا ہوگا
محبت کے لئے آغوشِ وا کس کی نہیں ہوتی
فقط آزاد ہی بدنام کیوں ہے سوچنا ہوگا

## ناز بریلوی

تصور میں کوئی آتا ہوا محسوس ہوتا ہے
فضائے دل کو مہکاتا ہوا محسوس ہوتا ہے
پناہِ دامنِ ساقی ہے، یا آغوشِ جنت ہے
کہ ہر غم مجھ سے گھبراتا ہوا محسوس ہوتا ہے
گھٹائیں کیوں نہ برسیں جھوم کر صحنِ گلستاں میں
کوئی زلفوں کو لہراتا ہوا محسوس ہوتا ہے
محبت کا وہ نغمہ جس کی میں نے ابتدا کی تھی
اب اُن کے لب پہ لہراتا ہوا محسوس ہوتا ہے
چمن میں آج کیا اے ناز کوئی آنے والا ہے!
یہ کیوں ہر پھول شرماتا ہوا محسوس ہوتا ہے

افسانچے

# سیٹلائیٹس

پرنسپل جوگندر پال۔ ایم۔ اے

"پارک ولا" مقبرہ روڈ، یونیورسٹی کارنر۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر)

۳۰ جون ۶۷ء          برادر محترم! آداب

"بیسویں صدی" کا یہ خاص نمبر بھی حسبِ روایت متنوع، تابناک اور خیال افروز ہے اور آپ کے بلند و برتر حوصلوں کا آئینہ دار! ـــــ لیجئے اب کے "بیسویں صدی" کے لئے "سیٹلائیٹس" بھیج رہا ہوں۔ ان افسانچوں کا پُرگو اختصار ملاحظہ فرمایئے۔ کہاوتی تدبّر کوزے میں دریا بند کرتا ہے اور بس، لیکن یہاں دو عالم کو دو سطروں میں پیش کرنے کا مسئلہ درپیش تھا! پڑھ لیجئے اور داد دیجئے۔          بہترین خواہشات کے ساتھ!

آپ کا ـــــــ جوگندر پال

---

میرا راکٹ اس اجنبی سیارے کی سطح پر لینڈ ہوا تو دروازہ کھول کر میں باہر آیا اور ایک شیطان نما شخص کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"آؤ بھائی، رُک کیوں گئے؟" شیطان گویا تھا "تم اپنی منزل پر آپہنچے ہو۔"

"منزل؟"

"ہاں، مجھے یقین تھا کہ نسلِ آدم کبھی نہ کبھی جیتے جی جہنم تک آپہنچے گی!"

---

"تم یہاں نہیں رہ سکتے!" جنّت کے باہر ایک فرشتے نے ایسٹروناٹ کو روکا۔

"کیوں؟"

"یہاں صرف روحوں کا آپریشن کیا جاتا ہے مگر تم اپنا جسم اٹھا لائے ہو۔ جاؤ!"

---

"آج سے کتنی ہزار صدیاں پہلے ـــــ یا نہ جانے کب ـــــ کُرۂ ارض پر بھی انسانی نسل آباد تھی ـــــ"

"ناممکن! میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہاں ہیومن یا کوئی اور لائف ناممکن ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن ہوا یہ کہ کُرۂ ارض کے لوگوں نے فارن ایکسچینج کے لئے اپنی کُل آکسیجن یہاں ہمارے سیارے میں ایکسپورٹ کر دی ـــــ!"

---

خلا کی لامحدودیت اُس کی بے چہرگی سے ہے اور اس بے چہرہ عالم کے حُسن کا سُراغ ہمیں سیاروں کے روشن چہروں سے ملتا ہے۔ جیسے لامحدود، بے چہرہ جذبوں کی لَو محبوب چہروں سے۔

---

"جب تم کنوارے تھے تو میں تمہیں چاندسی معلوم ہوتی تھی مگر اب ـــــ"

"لڑتی کیوں ہو بھئی!" خلا باز نے جواب دیا "اب بھی ویسی ہی معلوم ہوتی ہو لیکن پہلے تم لاکھوں میل دور تھیں اور اب تمہارے پاس آ کر معلوم ہوا ہے کہ ـــــ"

---

"خلا میں پہنچ کر آپ کو کیا محسوس ہوا؟" اخبار کے رپورٹروں نے خلا باز سے پوچھا۔

"مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک نہایت شاندار حرف ہوں لیکن اپنے سیاق و سباق سے باہر آ کے ویران اور بے مطلب ہو گیا ہوں۔"

"اور زمین پر پہنچ کر اب آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟"

"ایک معمولی، سادہ سا لفظ، جو اپنی مخصوص عبارت میں از سرِ نو آباد ہو کر اپنا تمام تر مطلب ادا کرنے لگا ہے۔"

---

ایک نئے سیارے پر پہنچ کر ایسٹروناٹ کو پتہ چلا کہ خدا کا مسکن یہیں ہے۔ ڈھونڈتے

ڈھونڈتے خدا بن ہی جاتا ہے۔ ایسٹرونات بھی تلاش کرتے کرتے خدا کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ ابھی وہ اندر جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور ایسٹرونات اندر سے برآمد ہوا۔

"ہارڈ لک، اولڈ بواسئے!" اس نے باہر کھڑے ہوئے ایسٹرونات سے کہا۔

"گاڈ آل مائی یہاں سے اُٹھ کر اب ہماری دُنیا میں جا بسا ہے!"

"کیوں؟"

"اُس کی ڈائری میں درج ہے کہ انسان اب دُور دُور دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا ہے، اِس لئے اُس کی نظر سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اُس کے پاس پاس ہی رہا جائے!"

---

اہلِ مریخ نے مجھے مُنہ سے بولتا ہوا پایا تو نہایت متعجب ہوئے کہ کُرۂ ارض کا انسان دیکھنے میں تو ہماری طرح انسان ہے مگر ہمارے جانوروں کے مانند بولتا مُنہ سے ہے۔ وہاں انسان ذہن سے بولتے ہیں اور جانور مُنہ سے۔ یعنی انسان اپنی بات کرتے ہوئے کوئی زبان نہیں بولتے بلکہ زبان کے بغیر براہِ راست اپنی بات کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے جانور ہماری طرح اپنی نسلی اور علاقائی بولیاں بولتے ہیں۔ سب گدھے ہماری طرح اپنی اپنی بولی کو مضحکہ خیز، بلند آواز اور وثوق سے پیش کرتے ہیں۔

ایک بوڑھے جانور نے مجھے سمجھایا: "ہم محض اپنی زبان کی وجہ سے انسان سے کمتر ہیں، کیونکہ زبان سے فکر متعین ہو جاتی ہے اور اِس طرح فکر کی غیر جانبداری ختم!"

---

"خلا کی بے کرانی کا تماشا کرتے ہوئے آپ کیا سوچ رہے تھے؟"

"میں سوچ رہا تھا" خلا باز نے جواب دیا، "کہ ہر چھوٹی یا بڑی محبوب کائنات اپنے کناروں کی بدولت ہی معرضِ وجود میں آتی ہے!"

---

چاند پر اپنے اپنے مُلک کے لئے خفیہ طور پر کام کرتے ہوئے دو دشمن ممالک کے ایسٹروناٹس کی اچانک ملاقات ہو گئی۔

ایک نے بے اختیار آگے بڑھ کر دوسرے کو گلے لگا لیا۔

"شکر ہے اپنی ذات اور زمین کا کوئی آدمی تو مِلا!"

اور راوی کا بیان ہے کہ دونوں باہم شراب پی رہے تھے کہ اچانک ایک نے اپنے فرائض کا خیال کر کے دوسرے کو قتل کرنے کی سوچی اور نشے میں لہرا لہرا کر اپنی دانست میں اُسے قتل کرنے کے لئے اپنی کنپٹی پر فائر کر دیا۔

---

ہماری زمین کی ماضی کی عظمتیں تارے بن بن کر آسمان پر ٹمٹما رہی ہیں۔

اور ایسا محسوس ہوتا ہے، بس اب ـــــــ ابھی بجھ جائیں گی۔

لیکن وہ اُسی طرح ٹمٹماتی رہتی ہیں۔

جیسے ٹمٹما ٹمٹما کر سوچتی ہوں، آخر تو ہمیں بجھنا ہی ہے لیکن ہمارے بجھنے سے پہلے حال کے امکانات واضح ہو لیں۔ یہ نو عمر عظمتیں ہماری رفتوں کے قریب تر آئیں۔

---

دُنیا کی دو بڑی مخالف طاقتوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کُرۂ فلک کو دو ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور یوں ایک کے دو سیّارے بنا کر چین سے علیحدہ علیحدہ رہیں۔

اور اب دونوں قوتوں کے ایکسپرٹ مطالعہ کر رہے ہیں کہ اِن دو سیّاروں میں سے کس کی ملٹری پوزیشن بہتر ہو گی۔

---

مریخ کے سفیر کو ہماری دُنیا کی ایک نہایت مشہور یونیورسٹی نے اسپیشل فنکشن منعقد کر کے آنریری ڈاکٹریٹ کی سند پیش کی۔

سفیر نے سند کو ایک طرف میز پر ڈال دیا اور ہچکچاہٹ آمیز خفگی سے اپنے میزبانوں کو بتایا کہ ہمارے ہاں سند صرف خواندگی کی دی جاتی ہے اور علم برتر کو ہر سند سے بالاتر سمجھا جاتا ہے۔ علم کوئی متعین شے نہیں کہ اُس کی پہچان کسی سند کے ہی اطراف میں ممکن ہو۔

---

"جب آپ کا راکٹ کُرۂ زمین سے باہر خلا میں جا پہنچا تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟"

"مجھے محسوس ہوا، خدا نے ایک بار پھر مجھے جنت سے باہر نکال پھینکا ہے!"

---

# غزلیں

## تابش سلطانپوری

کھلا ہے میکدے کا در جو پینا ہے چلو رندو
کسی کے پاس چل کر خود ہی پیمانے نہیں آتے

نہیں کیا حسن کی اب گرمئ بازار شہروں میں
نظر مدت سے صحراؤں میں دیوانے نہیں آتے

مجھے حالات نے خود ایک افسانہ بنا ڈالا
مرے ہونٹوں پہ اب الفت کے افسانے نہیں آتے

جواں ہوتا ہے شعلہ عشق کا تاریک راتوں میں
جلا دو دن میں شمعیں لاکھ پروانے نہیں آتے

سمجھ میں آ گیا شاید، نہ سمجھے گا یہ دیوانہ
کہ اب احباب میرے مجھ کو سمجھانے نہیں آتے

میں سب کا دوست ہوں سب لوگ میرے دوست ہیں تابش!
نظر مجھ کو تو اس محفل میں بیگانے نہیں آتے

## اکبر امروہوی، ایم۔اے

اب تک یہ گماں رندِ خرابات لئے ہے
ساقی کا تغافل بھی مدارات لئے ہے

وہ مدحِ جنوں ہو کہ تمسخر ہو خرد کا
دیوانے کی ہر بات کوئی بات لئے ہے

رہزن ہیں کہ تنہا بھی گزرنے نہیں دیتے
دل ہے کہ تمناؤں کی بارات لئے ہے

ہر لمحہ بدلتا ہوا اِک عالمِ صد رنگ
اُن کی سی ادا گردشِ حالات لئے ہے

اکبر کو سمجھنے میں ذرا دیر لگے گی
دیوانہ ہے بے ربط خیالات لئے ہے

## عابد مناوری

دل میں جذبات کی اِک بزم سجی ہو جیسے
آج بھی اِس میں تری یاد بسی ہو جیسے

یہ تصور کا کرشمہ ہے کہ اعجازِ خیال
رُو برُو میرے وہی "چندر مکھی" ہو جیسے

جام اٹھانے کا یہ انداز تو دیکھے کوئی
اِس سے پہلے بھی کہیں شیخ نے پی ہو جیسے

ایک مدت سے تری یاد کی آہٹ بھی نہیں
دل کسی گاؤں کی سنسان گلی ہو جیسے

ایک پل بھی نہیں ہوتے وہ نظر سے اوجھل
اُن کی صورت مری آنکھوں میں بسی ہو جیسے

ایسے عابد سے بغل گیر ہوئے رنج و الم
اِک یہی شخص مقدر کا دھنی ہو جیسے






ESP

افسانہ

# راستے اور خار

ایم۔ ایف۔ پرویز۔ ایم۔ اے

آفس آف دی ڈپٹی ڈائرکٹر آف اکاؤنٹس اینڈ ٹریژریز۔ لاکالج بلڈنگ۔ پونہ ۴

۵؍جولائی ۱۹۶۷ء مکرمی ومحترمی خوشتر گرامی صاحب! تسلیم بعد تعظیم

"بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر دیکھ کر بے اختیار دل چاہنے لگا آپ کی بزم میں حاضر ہو جاؤں۔ ایک کہانی لے کر پہلی بار اس بزم میں شامل ہونے کی جرأت کر رہا ہوں۔ میری تخلیق "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ بہت ممکن ہے اِس افسانے کی اشاعت کے بعد ہمیشہ کیلئے "افسانہ نگار" بن جاؤں۔ دوسری صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر کبھی لکھنے کی جرأت نہ کر سکوں ـــــ افسانہ نمبر آپ کی بے پناہ کوششوں کا قابلِ رشک نتیجہ ہے۔ آپ کی اُردو دوستی، اُردو دشمنوں کو حیران کئے دیتی ہے اور وہ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں خدا کرے اُردو کے سر پر آپ کا سایہ لازوال رہے اور بیسویں صدی کے بعد جب اکیسویں صدی آئے تب بھی آپ علم و ادب کی محفل میں اسی رنگ میں نظر آئیں! ـــــ خدا آپ کو طویل عمر دے اور ہمیشہ صحت مند رکھے!

مخلص وخیر اندیش ـــــ ایم۔ ایف۔ پرویز

---

میں نے مسودہ اُسے دیا تو وہ کہانی کا اختتام پڑھ کر بے اختیار رو پڑی۔ آنسو اُس کے رخساروں سے ڈھلک کر اُس کی سفید ساری کے دودھیا آنچل میں جذب ہونے لگے اور میں اُداس اُداس نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ بالکل چُپ چاپ۔ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں نے چاہا میں اُس کے رخساروں سے ڈھلکتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھ لوں اور اُس سے کہوں۔

"پروین ـــــ اِس میں رونے کی کون سی بات ہے۔ یہ تو کہانی ہے، کہانی کار کی تخلیق ـــــ حقیقت تو نہیں ہے۔ اچھا لاؤ میں اِس کہانی کا انجام بدل دوں۔"

میں نے مسودہ اُس کے ہاتھ سے لے لیا اور میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں میں اپنے ڈھلکتے آنسو اُس سے نہ چھپا سکا۔ آنسو ڈھلکتے رہے غیر ارادی طور پر جیسے انھیں آج ہی بہہ نکلنا تھا۔

شام کرب انگیز تھی اور دل درد سے ڈوبا جا رہا تھا۔ سارا سماں اُداس تھا اور روح میں کوئی درد گھو رہا تھا۔

آجکل چھٹیوں کے دن تھے۔ یونیورسٹی کیمپس میں بمشکل کوئی دکھائی دیتا تھا۔ صرف کچھ پہرے دار، مالی اور نوکر چاکر نظر آ جاتے تھے کبھی کبھی ریسرچ اسٹوڈنٹس بھی آ نکلتے تھے۔

شام ڈھلنے لگی اور مہکی مہکی ہواؤں میں پروین کے گیسوؤں کی رچی بسی خوشبو دل و دماغ کو معطر کرتی رہی۔ پھر اندھیرا پھیل گیا۔ سہما سہما اور سمٹا سمٹا سا اندھیرا! اور جب پروین کے آنسو تھم گئے تب وہ مسکرا پڑی۔ شاید اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں بھی مسکرا دیا۔

"پروین ـــــ!"

"جی!"

"کیا تم ایسے ہی رو دیا کرتی ہو ذرا ذرا سی باتوں پر؟"

"نہیں تو!"

"پھر تم آج یکایک کیوں رو پڑی تھیں؟"

"مجھے نہیں معلوم" اُس نے کہا۔

اور میں اپنے سوال پر خود ہی حیران رہ گیا۔ اُس کے رونے کا سبب جانتے ہوئے بھی میں اُسی سے سبب دریافت کر رہا تھا۔

ہم لوٹنے لگے۔ کیمپس سے باہر سڑک کے اُس پار ہوٹلوں میں فلمی نغمے

گونج رہے تھے۔ بسیں آ آ کر اسٹاپ پر رکتیں اور پھر چل پڑتیں۔

گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اُس نے ایک بار اپنی پلکیں اُٹھائیں، اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں خاموش جھیل کی طرح پُرسکون دکھائی دے رہی تھیں اور اُن میں اب بھی نمی تھی۔

"تم پھر رو رہا ہو؟"

"آنسو ہی اب میرے ساتھی ہیں نعیم ——— انھیں نہ روکو۔ یہ بھی خشک ہو جائیں تو میرا ساتھ کون دے گا۔ انھیں بہنے دو۔" اُس نے کہا۔

ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا۔ اُس کی لہراتی ہوئی زُلفوں کو چھیڑتا ہوا گزر گیا۔ سڑک کے اُس پار موسیقی کی لہریں اُبھریں اور ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔

آج ہم اتفاقیہ ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے۔ کئی دنوں کے بعد ——— اور پروین میرے سامنے تھی۔ وہ یونیورسٹی میں لیکچرر ہو گئی تھی اور میں ایک آفس میں سینئر آفیسر! اس طویل عرصے کے بعد بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم اُسی خلوص سے ملے۔ اُتنے ہی متاثر ہوئے جیسے پہلے ہوا کرتے تھے اور آج مجھے ہماری بالکل پہلی ملاقات یاد آ گئی جب ہم دونوں اِسی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے! وہ سائکلوجی کی طالبہ تھی اور میں آرٹ کا متعلم۔ ایسی ہی ایک شام کو جب میں تیزی سے یونیورسٹی کینٹین میں داخل ہو رہا تھا کہ اُس سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ باہر نکل رہی تھی۔ اُس کے لبوں پر اطمینان بخش مُسکراہٹ تھی اور اُس کے چہرے سے محبت اور معصومیت کا پاکیزہ عکس جھلک رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اُسے بہت ہی کم دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ دوسری فیکلٹی میں پڑھتی تھی۔ ویسے بھی میں لڑکیوں سے دُور دُور رہتا تھا۔ اوّل تو میں تنہائی پسند تھا اور پھر لڑکیوں کی دوستی اِس مہنگائی کے زمانے میں بڑی مہنگی ہو جاتی ہے۔ یہ جان کر مجھے اپنی تنہائی سے زیادہ پیار تھا۔ لیکن اُس دن اچانک ہی [illegible] اُس کا سامنا ہو گیا تو وہ مجھے دیکھ کر یوں مُسکرا دی جیسے مجھے پہچانتی ہو۔ جواب میں میں بھی سر جھکا کر مُسکرا دیا اور اُس کے گالوں پر پھیلے ہوئے شفق کے رنگوں کو [illegible] سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"آیئے کافی پیئیں۔" میں نے بلا سوچے سمجھے اُسے دعوت دے دی اور اپنی اس جسارت پر خود ہی حیران رہ گیا۔

"شکریہ!" اُس نے کہا۔ "میں ابھی ابھی کافی پی کر آ رہی ہوں۔"

"تو کیا حرج ہے ایک کپ اور سہی!" میرے لہجے میں التجا تھی۔

"نہیں ——— پلیز، پھر کسی وقت سہی۔ پلیز!" اُس نے یوں کہا جیسے کافی کا ایک اور کپ پی لینا اُس کے بس سے باہر ہو۔

پھر نہ جانے میرے چہرے پر کیوں بے بسی کے آثار پیدا ہو گئے ——— جسے وہ بھانپ گئی اور بولی۔

"چلئے آپ کی خاطر ایک آدھ کپ پی ہی لوں۔" اُس نے کہا اور میں خوشی سے کھل اُٹھا تھا۔ اُس کے قریب بیٹھے بیٹھے مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی خوشبو کے پودوں سے بھری کسی وادی میں آ نکلا ہوں اور میرے چاروں طرف خوشبو ہی خوشبو بکھری ہو اور میرے قدموں تلے کلیوں کے ڈھیر ہوں اور میری آنکھوں میں رنگین تتلیاں رقص کر رہی ہوں اور پروین میری رگ رگ میں [illegible] گھر دیکھتے ہی دیکھتے، پل بھر میں ———!

وہ چُپ چاپ کافی پیتی رہی اور میں مُسکراتا رہا۔

"اِس بار کون سی کہانی لکھی ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"کہانی؟ ——— ہاں ——— کہانی ——— اِس بار ——— [illegible]

بس وہ ایک، اب نام بھی یاد نہیں آ رہا ———" میں بوکھلا کر چُپ [illegible]

جُملہ ادھورا چھوڑ کر پوچھ بیٹھا۔ "لیکن آپ کو کیسے معلوم کہ میں کہانیاں [illegible]

وہ مُسکرا دی۔ "ایک سہیلی نے آپ کا تعارف کرا دیا تھا۔"

"اچھا!"

ہم دونوں چُپ ہو گئے۔

جب میں اُس سے قدرے مانوس ہو گیا تو ملنے [illegible]

لینا شروع کیا۔ وہ اِتنی حسین تھی جتنی پہلی [illegible]

چہرے میں اُس کی آنکھیں اور ہونٹ بڑی [illegible]

---

اب مجھے نہیں یاد کہ ہم [illegible]

کیا کیا سوچتے رہتے۔ اُس [illegible]

پارکوں میں سینما ہال [illegible]

گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی [illegible]

بنا لیا اور پھر کوئی دن [illegible]

میں سکون سے [illegible]

میٹھی آواز [illegible]

رہتی وہ بھی مجھ سے [illegible]

خوبصورت راتوں میں [illegible]

میں پھیل جاتے اور دھیرے دھیرے [illegible]

یونیورسٹی ہاسٹل کے قریب اُس کا انتظار کرتا [illegible]

دید کے لئے سڑکوں پر آوارہ گردی [illegible]

اُسے ٹھکو دشوار رہتا۔ میری زندگی کا ہر لمحہ اُس کے لئے وقف ہوگیا ——— میرا وجود اُس کے بغیر نامکمل تھا، بالکل نامکمل ——— میں اُس میں گُم تھا اور وہ مجھ میں ——— اور زندگی کتنی سہانی تھی اور ہر راہ پھولوں سے سجی سنوری تھی۔

لیکن دھیرے دھیرے خزاں کے جھونکے آنے لگے۔ اُس کے پیار کے پھول، جو میں نے اپنی راہوں میں بکھرے دیکھے تھے، اب بکھر کر دُور دُور اُڑنے لگے۔ راستے پتھریلے ہوگئے، دن سوگوار ہوگئے اور وہ مجھ سے دُور ہوتی جارہی تھی۔

یونیورسٹی میں، اور پھر شہر بھر میں ہمارے رومان کے افسانے بنائے جانے لگے۔ مجھ پر اور پروین پر پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔ گھر والوں نے، محلے والوں نے، اپنوں نے، غیروں نے سبھی نے روک ٹوک شروع کردی۔ وقت بے وقت گھر سے نکلنا بند ہونے لگا۔

---

اُس شام جب میں اُسے ہوسٹل تک چھوڑ کر گھر لوٹا تو ماں میری منتظر تھی۔ مجھے ایک خبر سُنانے کے لئے بیتاب تھی۔ میری میز پر کھانا لگا دینے کے بعد وہ میرے قریب آبیٹھی اور بولی "بیٹے! آج میرا ایک سپنا پورا ہوگیا۔ تمہارے ... نے زلیخا کو مانگ لیا ہے۔ بیٹے، وہ اتنی حسین، اتنی خوبصورت، اتنی پیاری ہے ... تو دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ سارے شہر میں اُس کا کوئی ثانی نہیں۔ بہت بڑے ... ہے۔ اُس کے ابا کی بمبئی میں کئی ملیں ہیں اور وہ شہر کے رئیسوں ... اور ماں کہتی رہی اور میں سُنتا رہا اور چمکتی ہوئی کاروں اور فلک بوس ... عمارتوں سے مجھے پروین کی مُسکراہٹ کا عکس نظر آتا رہا۔ میں نے ماں سے ... بات نہیں کہی ... چُپ ہوگیا۔ پروین نشیلے خوابوں کی طرح میرے ذہن پر چھائی رہی۔ اُس کا تصور ذہن میں مہکتا رہا اور میں نے ماں سے کہہ دیا "میں زلیخا سے کبھی شادی نہیں کروں گا ——— !"

ماں پہلے تو سٹپٹا گئیں پھر اُس نے سخت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ پھر قسمیں ... ہاتھ جوڑے ——— اور دوسرے دن بیمار ہوگئیں۔ میرے بڑے بھائی ... وجہ پوچھی تو میں نے سب ماجرا کہہ سُنایا۔ وہ سُن کر چُپ ہوگئے۔

... پروین ملی تو بے حد اُداس تھی۔ اُس کی آنکھوں سے ... موتی ٹپک رہے تھے سفید ساری کا آنچل بھیگا ہوا تھا۔

"نعیم! ہمارے سپنے ٹوٹ گئے نا آخر؟" اُس نے کہا۔

میں چُپ رہا۔

"نعیم! تم چاند سی دُلہن لے آؤ۔ میرے خواب نہ دیکھو نعیم ———" اُس کی آواز گلے میں رُک سی گئی۔

"کیا تمہارے سوا کوئی لڑکی میری بن سکتی ہے؟"

"یہ نادانی کی باتیں ہیں۔ سب کچھ ممکن ہے، ہر چیز ممکن ہے ——— مان جاؤ۔ ماں کا کہنا مان جاؤ ———" وہ سسکیاں لینے لگی۔

"یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔"

اُس نے مجھ سے نہ ملنے کا فیصلہ کرلیا اور وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

حیران و پریشان میں دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پتے کھڑکھڑاتے رہے۔ خزاں کی ہواؤں سے بکھرے ہوئے زرد پتے اور زرد چاندنی نے فضا میں درد ہی درد بھر دیا تھا۔ روح سوگوار اور بوجھل ہوگئی تھی۔ میری نظر سامنے پھیلی ہوئی جھیل پر پڑی۔ کسی نے چُپکے سے میرے کان میں کہا "نعیم! تم اِس جھیل کو دیکھ رہے ہو؟ اس کا پانی گرمیوں میں سوکھ جاتا ہے۔ لیکن پھر تھوڑے ہی دنوں میں جب بارش ہوتی ہے تو یہ پانی سے لبریز ہو جاتی ہے۔ اِس تبدیلی کا مطلب سمجھتے ہو؟"

میں سوچتا رہا۔ وہ دُور گھنی جھاڑیوں میں غائب ہوگئی اور میں گھنٹوں اُس کا انتظار کرتا رہا۔

پھر کئی دن، کئی مہینے بیت گئے ——— اور کئی سال۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ کہاں چلی گئی تھی۔ اُس نے شاید شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ عرصے تک ——— مجھ پر جنونی کیفیت طاری رہی۔ میں نے ٹھیک سے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ آوارہ گردی شروع کردی۔ جن راستوں پر وہ ملا کرتی تھی، ان راستوں پر رُک رُک کر اُسے آوازیں دیا کیا۔ اُسے پکارا کرتا ... مگر میری آواز سُننے والا کوئی نہ تھا۔

تین سال یوں ہی بیت گئے۔ مجھے کچھ قرار آچلا تھا لیکن وحشت اور دیوانگی ابھی بدستور طاری تھی۔ پھر میری دُکھی ماں نے مجھے مجبور کردیا کہ میں زلیخا سے شادی کرلوں۔ زلیخا خوابوں جیسی خوبصورت تھی اور بہاروں جیسی شگفتہ اور جھرنوں جیسی چنچل!

اُس رات شہنائیوں کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ نشیلی خوشبو کی مہک میں جب زلیخا مہکتی لچکتی میرے پاس آئی تو مجھے پروین بے انتہا یاد آئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے دُور جھاڑیوں میں کھڑی وہ مجھے تک رہی ہے ... پیڑوں کے پیچھے جب چاند ڈوبتا نظر آیا جب بھی وہ مجھے اپنے قریب محسوس ہوتی رہی۔

میں نے اُس کے بعد بھی پروین کو بہت تلاش کیا لیکن اُس نے مجھے شادی کی مبارکباد بھی نہ دی۔

میں کہانیاں لکھنے لگا۔ افسانہ نگار بن گیا۔ میرے افسانے ملک کے اچھے اچھے رسائل میں چھپنے لگے۔ کئی پڑھنے والے مجھے خطوط لکھنے اور میرے پروانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ میں سوچتا کاش ان ڈھیر سارے خطوں میں کسی دن پروین کا خط نکل آئے!

اور ایک دن اُداس اُداس سا دل میں ایسی ہی آس لئے میں اپنی ڈاک

گونج رہے تھے۔ بسیں آآکر اسٹاپ پر رُکتیں اور پھر چل پڑتیں۔

گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ رُک گئی۔ اُس نے ایک بار اپنی پلکیں اُٹھائیں، اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں خاموش جھیل کی طرح پُرسکون دکھائی دے رہی تھیں اور اُن میں اب بھی نمی تھی۔

"تم پھر رو رہی ہو؟"

"آنسو ہی اب میرے ساتھی ہیں نسیم —— انہیں نہ روکو یہ بھی خشک ہو جائیں تو میرا ساتھ کون دے گا۔ انہیں بہنے دو" اُس نے کہا۔

ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا۔ اُس کی لہراتی ہوئی زُلفوں کو چھیڑتا ہوا گزر گیا۔ سڑک کے اُس پار موسیقی کی لہریں اُبھریں اور ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔

آج ہم اتفاقیہ ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے۔ کئی دنوں کے بعد —— اور پروین میرے سامنے تھی۔ وہ یونیورسٹی میں لیکچرر ہو گئی تھی اور میں ایک آفس میں سینئر آفیسر! اِس طویل عرصے کے بعد بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم اُسی خلوص سے ملے۔ اُتنے ہی متاثر ہوئے جیسے پہلے ہوا کرتے تھے اور آج مجھے ہماری بالکل پہلی ملاقات یاد آ گئی جب ہم دونوں اِسی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے! وہ سائکلوجی کی طالبہ تھی اور میں آرٹ کا متعلم۔ ایسی ہی ایک شام کو جب میں تیزی سے یونیورسٹی کینٹین میں داخل ہو رہا تھا کہ اُس سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ باہر نکل رہی تھی۔ اُس کے لبوں پر اطمینان بخش مسکراہٹ تھی اور اُس کے چہرے سے محبت اور معصومیت کا پاکیزہ عکس جھلک رہا تھا۔ میں نے اِس سے پہلے اُسے بہت ہی کم دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ دوسری فیکلٹی میں پڑھتی تھی۔ ویسے بھی میں لڑکیوں سے دُور دُور رہتا تھا۔ اوّل تو میں تنہائی پسند تھا اور پھر لڑکیوں کی دوستی اِس مہنگائی کے زمانے میں بڑی مہنگی ہو جاتی ہے، یہ جان کر مجھے اپنی تنہائی سے زیادہ پیار تھا۔ لیکن اُس دن اچانک ہی جب اُس کا سامنا ہو گیا تو وہ مجھے دیکھ کر یوں مسکرا دی جیسے مجھے پہچانتی ہو۔ جواب میں میں بھی سر جھکا کر مسکرا دیا اور اُس کے گالوں پر پھیلے ہوئے شفق کے رنگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"آیئے کافی پئیں" میں نے بلا سوچے سمجھے اُسے دعوت دے دی اور اپنی اِس جسارت پر خود ہی حیران رہ گیا۔

"شکریہ!" اُس نے کہا "میں ابھی ابھی کافی پی کر آ رہی ہوں"

"تو کیا حرج ہے ایک کپ اور سہی!" میرے لہجے میں التجا تھی۔

"نہیں —— پلیز۔ پھر کسی وقت سہی۔ پلیز!" اُس نے یوں کہا جیسے کافی کا ایک اور کپ پی لینا اُس کے بس سے باہر ہو۔

پھر نہ جانے میرے چہرے پر کیوں بے بسی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جسے وہ بھانپ گئی اور بولی۔

"چلئے آپ کی خاطر ایک آدھ کپ پی ہی لوں" اُس نے کہا اور میں خوشی سے کھل اُٹھا تھا۔ اُس کے قریب بیٹھے بیٹھے مجھے محسوس ہوا جیسے میں خوشبو کے پودوں سے بھری کسی وادی میں آ نکلا ہوں اور میرے چاروں طرف خوشبو ہی خوشبو بکھری ہو اور میرے قدموں تلے کلیوں کے ڈھیر ہوں اور میری آنکھوں میں رنگین تتلیاں رقص کر رہی ہوں اور پروین میری رگ و پے میں سماتی چلی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، پل بھر میں ——!

وہ چُپ چاپ کافی پیتی رہی اور میں مسکراتا رہا۔

"اِس بار کون سی کہانی لکھی ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"کہانی؟ —— ہاں —— کہانی —— اِس بار —— اِس بار میں نے بس وہ ایک، اب نام بھی یاد نہیں آ رہا ——" میں بوکھلا کر چُپ سا ہو گیا اور اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر پوچھ بیٹھا "لیکن آپ کو کیسے معلوم کہ میں کہانیاں لکھتا ہوں؟"

وہ مسکرا دی "ایک سہیلی نے آپ کا تعارف کرا دیا تھا"

"اچھا!"

ہم دونوں چُپ ہو گئے۔

جب میں اُس سے قدرے مانوس ہو گیا تو میں نے اُس کے چہرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ اِتنی حسین نہ تھی جتنی پہلی ہی جھلک میں نظر آنے لگتی تھی۔ پورے چہرے میں اُس کی آنکھیں اور ہونٹ ہی پُرکشش تھے۔

---

اب مجھے نہیں یاد کہ ہم کینٹین میں کتنی دیر بیٹھے اور ایک دوسرے کے متعلق کیا کیا سوچتے رہے۔ اُس ملاقات کے بعد ہم کئی مرتبہ ملے۔ خوبصورت ہوٹلوں میں۔ پارکوں میں، سنیما ہال میں —— راستوں پر —— اور ہر بار وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔ اُس کی مسکراہٹوں نے دل کی ویران وادیوں میں نشیمن بنا لیا اور پھر کوئی دن ایسا نہ گزرا جب میں اُس سے نہ ملا ہوں۔ اُس کی غیر موجودگی میں سکون سے رہنا مشکل تھا۔ ہر لمحہ نگاہیں اُس کی متلاشی رہتیں۔ کان اُس کی میٹھی آواز سُننے کے لئے بیقرار رہتے اور آنکھوں میں ہر دم اُس کی دید کی تڑپ رہتی۔ وہ بھی مجھ سے اِتنی ہی متاثر تھی۔ میرے لئے یوں ہی بیقرار رہا کرتی تھی۔

خوبصورت راتوں میں جب چاندنی کے سائے پونا کی پہاڑی وادیوں میں پھیل جاتے اور دھیرے دھیرے برف جیسی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں تب میں یونیورسٹی ہاسٹل کے قریب اُس کا انتظار کرتا۔ دھوپ اور تپتی دوپہر میں اُس کی دید کے لئے سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا اور خوشگوار صبحوں میں صبا کی لہروں میں

اُسے ڈھونڈتا رہتا۔ میری زندگی کا ہر لمحہ اُس کے لئے وقف ہوگیا ـــــ میرا وجود اُس کے بغیر نامکمل تھا، بالکل نامکمل ـــــ میں اُس میں گم تھا اور وہ مجھ میں ـــــ اور زندگی پُر بہار تھی اور ہر راہ پھولوں سے سجی سنوری تھی۔

لیکن دھیرے دھیرے خزاں کے جھونکے آنے لگے۔ اُس کے پیار کے پھول، جو میں نے اپنی راہوں میں بکھرے دیکھے تھے، اب بکھر کر دُور دُور اُڑنے لگے۔ راستے پتھریلے ہوگئے، دن سوگوار ہوگئے اور وہ مجھ سے دُور ہوتی جا رہی تھی۔

یونیورسٹی میں، اور پھر شہر بھر میں ہمارے رومان کے افسانے بنائے جانے لگے۔ مجھ پر اور پروین پر پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔ گھر والوں نے، محلے والوں نے، اپنوں نے، غیروں نے سبھی نے روک ٹوک شروع کر دی۔ وقت بے وقت گھر سے نکلنا بند ہونے لگا۔

---

اُس شام جب میں اُسے ہوسٹل تک چھوڑ کر گھر لوٹا تو ماں میری منتظر تھی۔ وہ مجھے ایک خبر سنانے کے لئے بیتاب تھی۔ میری میز پر کھانا لگا دینے کے بعد وہ پھر میرے قریب آ بیٹھی اور بولی: "بیٹے! آج میرا ایک سپنا پورا ہوگیا۔ تمہارے لئے میں نے زلیخا کو مانگ لیا ہے۔ بیٹے، وہ اتنی حسین، اتنی خوبصورت، اتنی پیاری ہے کہ تم دیکھو تو دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ سارے شہر میں اُس کا کوئی ثانی نہیں۔ پھر بڑے گھرانے کی ہے۔ اُس کے ابا کی بمبئی میں کئی ملیں ہیں اور وہ شہر کے رئیسوں میں ـــــ" اور ماں کہتی رہی اور میں سنتا رہا اور چمکتی ہوئی کاروں اور فلک بوس عمارتوں کے گوشوں سے مجھے پروین کی مسکراہٹ کا عکس نظر آتا رہا۔ میں نے ماں سے کچھ نہ کہا۔ اُس کی بات اَن سُنی کر کے چُپ ہوگیا۔ پروین نشیلے خوابوں کی طرح میری آنکھوں میں خمار بن کر چھائی رہی۔ اُس کا تصوّر ذہن میں مہکتا رہا اور میں نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا: "میں زلیخا سے کبھی شادی نہیں کروں گا ـــــ!"

ماں پہلے تو سٹپٹا گئی پھر اُس نے سخت غم و غصّہ کا اظہار کیا۔ پھر قسمیں دلائیں، پھر ہاتھ جوڑے ـــــ اور دوسرے دن بیمار ہوگئیں۔ میرے بڑے بھائی نے انکار کی وجہ پوچھی تو میں نے سب ماجرا کہہ سنایا۔ وہ سُن کر چُپ ہوگئے۔

دوسرے دن پروین ملی تو بے حد اُداس تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ٹپک رہے تھے۔ سفید ساری کا آنچل بھیگا ہوا تھا۔

"نعیم! سُہانے سپنے ٹوٹ گئے نا آخر؟" اُس نے کہا۔

میں چُپ رہا۔

"نعیم! تم چاند سی دُلہن لے آؤ۔ میرے خواب نہ دیکھو نعیم ـــــ" اُس کی آواز گلے میں اٹک سی گئی۔

"کیا تمہارے سوا کوئی لڑکی میری بن سکتی ہے؟"

"یہ نادانی کی باتیں ہیں۔ سب کچھ ممکن ہے، ہر چیز ممکن ہے ـــــ مان جاؤ۔ ماں کا کہنا مان جاؤ ـــــ" وہ سسکیاں لینے لگی۔

"یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔"

اُس نے مجھ سے نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

حیران و پریشان میں دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پتے کھڑکھڑاتے رہے۔ خزاں کی ہواؤں سے بکھرے ہوئے زرد پتّے اور زرد چاندنی نے فضا میں درد ہی درد بھر دیا تھا۔ روح سوگوار اور بوجھل ہوگئی تھی۔ میری نظر سامنے پھیلی ہوئی جھیل پر پڑی۔ کسی نے چپکے سے میرے کان میں کہا: "نعیم! تم اس جھیل کو دیکھ رہے ہو نا! اِس کا پانی گرمیوں میں سوکھ جاتا ہے۔ لیکن پھر تھوڑے ہی دنوں میں جب بارش ہوتی ہے تو یہ پانی سے لبریز ہو جاتی ہے۔ اِس تبدیلی کا مطلب سمجھتے ہو؟"

میں سوچتا رہا۔ وہ دُور گھنی جھاڑیوں میں غائب ہوگئی اور میں گھنٹوں اُس کا انتظار کرتا رہا۔

پھر کئی دن، کئی مہینے بیت گئے ـــــ اور کئی سال! مجھے نہیں معلوم تھا وہ کہاں چلی گئی تھی۔ اُس نے شاید شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ عرصے تک ـــــ مجھ پر جنونی کیفیت طاری رہی۔ میں نے ٹھیک سے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ آوارہ گردی شروع کر دی۔ جن راستوں پر وہ ملا کرتی تھی، ان راستوں پر رُک کر اُسے آوازیں دیا کرتا۔ اُسے پکارا کرتا ـــــ مگر میری آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔

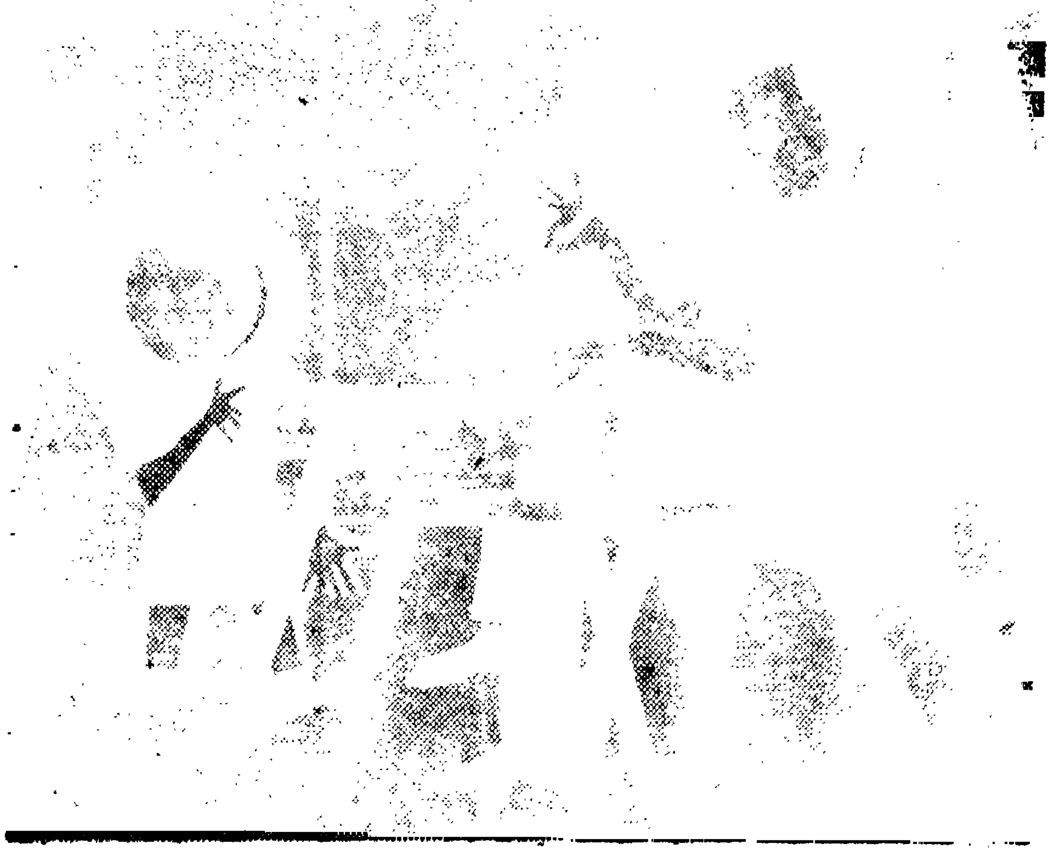
تین سال یوں ہی بیت گئے۔ مجھے کچھ کچھ قرار آچلا تھا۔ لیکن وحشت اور دیوانگی سی ہر دم طاری رہتی۔ پھر میری دُکھی ماں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں زلیخا سے شادی کر لوں۔ زلیخا جو حوروں جیسی خوبصورت تھی اور بہاروں جیسی شگفتہ اور ہرنوں جیسی چنچل!

اُس رات شہنائیوں کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ نشیلی خوشبو کی مہک میں جب زلیخا مہکتی چہکتی میرے پاس آئی تو مجھے پروین بے انتہا یاد آئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے دُور جھاڑیوں میں کھڑی وہ مجھے تک رہی ہے ـــــ پہاڑوں کے پیچھے جب چاند ڈوبتا نظر آیا جب بھی وہ مجھے اپنے قریب محسوس ہوتی رہی۔

میں نے اُس کے بعد بھی پروین کو بہت تلاش کیا لیکن اُس نے مجھے شادی کی مبارکباد بھی نہ دی۔

میں کہانیاں لکھنے لگا۔ افسانہ نگار بن گیا۔ میرے افسانے ملک کے اچھے اچھے رسائل میں چھپنے لگے۔ کئی پڑھنے والے مجھے خطوط لکھتے اور میرے پروانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ میں سوچتا کاش اِن ڈھیر سارے خطوں میں کسی دن پروین کا خط نکل آئے!

اور ایک دن اُداس اُداس سا دل میں ایسی ہی آس لئے میں اپنی ڈاک



دیکھ رہا تھا کہ ایک خط مجھے بڑا مانوس سا معلوم ہوا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے لفافہ چاک کیا تو پروین کی تحریر سامنے تھی! اس نے لکھا تھا ——

نسیم!

تمھیں دیکھے برسوں ہوگئے، آنکھیں ترس گئیں۔ کتنے سال خود پر قابو رکھا، سوچا تھا، تمھارے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مر جاؤں گی، مٹ جاؤں گی مگر میں اس ارادے میں ناکام ہوگئی ہوں نسیم! اب بھی اگر تمھیں یاد نہ کیا تو موت بھی چین سے مرنے نہ دے گی۔ آنکھیں ہر سو تمھیں ڈھونڈتی ہیں۔ کیا تم بھی مجھے یاد کرتے رہے۔ تم پر جو گزری اس کا اندازہ مجھے ہے نسیم۔ لیکن میں مجبور تھی۔ تمھارے سامنے آ نہ سکی، تم سے مل نہ سکی۔ میں نے اپنا فیصلہ اٹل کر لیا تھا اور پھر میرے ساتھ جو کچھ ہوا، کاش تم اسے بھی جان لیتے —— شاید تمھیں معلوم بھی ہوگا۔ ہمارے ابا کے ایک عزیز ترین دوست کا ایک لڑکا تھا جو لندن میں پڑھتا تھا۔ بچپن ہی میں ابا جان کی وساطت سے اس سے میری بات طے ہوگئی تھی، بلکہ منگنی بھی ہوگئی تھی اور میں یہ بات تم سے کبھی کہہ نہ سکی۔ لاکھ کوشش کی، ہر بار چاہا کہ تمھیں بتاؤں مگر ناکام رہی —— شاید اسی لئے کہ تم سے بے حد محبت کرنے لگی تھی اور ایک دن اچانک ہی وہ حضرت لندن سے تشریف لے آئے۔ ان کے آتے ہی والد صاحب نے تاریخ مقرر کر دی —— اور میں بوکھلا کر رہ گئی کہ کیا کروں —— اسی شام تمھارے بھائی صاحب میرے گھر آئے اور انھوں نے میری مشکل حل کر دی —— جانتے ہو نسیم انھوں نے کیا کہا؟ —— انھوں نے کہا، وہ اپنے خوبصورت ترین حسین و جمیل بھائی کو مجھ سے نہیں بیاہ سکتے۔ کیونکہ میں معمولی رنگ روپ کی لڑکی ہوں (وہی لڑکی جس کی مسکراہٹوں پر تم جان چھڑکتے تھے) اور مجھے نسیم سے قطع تعلق کر لینا چاہئے۔ اور پھر انھوں نے میرے ابا جان سے بھی نہ جانے کیا کیا باتیں کیں۔ رات گئے ابا میرے کمرے میں آئے۔ اپنی نمناک پلکوں سے انھوں نے میری اداس آنکھوں سے ڈھلکتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور بولے "بیٹی! نعیم کا خیال چھوڑ دو" اور دوسرے دن میں تمھیں الوداع کہہ کر چلی آئی۔ ہمیشہ کے لئے تم سے دور !!

میں انگلینڈ چلی آئی۔ اب میرے پاس ایک خوبصورت ساگھر بھی ہے —— لیکن —— لیکن نہ جانے جیون میں کیا کمی ہے جو ہر دم دل میں ایک خلش سی رہتی ہے۔ بارہا تمھارا خیال آتا ہے —— تم یاد آتے ہو تو اب بھی رو پڑتی ہوں۔ آج جب میں بہت اداس ہوں تو مجبوراً تمھیں یاد کیا ہے۔ بھارت آئے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں۔ کاش تم سے کسی دن ملاقات ہو جائے۔

غمزدہ —— پروین

خط وہیں چھوڑ کر میں نیم پاگلوں جیسا باہر نکل پڑا۔ پروین سے ملنے کے لئے۔ زلیخا نے یہ خط پڑھ لیا۔ اسے غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی کہ میں نے اس سے یہ بات برسوں چھپائے رکھی۔ وہ دن بھر منہ بسورے پڑی رہی۔ اس نے میرے لئے چائے نہیں بنائی۔

میں پروین سے مل کر آیا تو بے حد خوش تھا اور وہ اپنے کمرے میں پڑی رو رہی تھی۔ میں نے زلیخا کو منانا ضروری نہیں سمجھا۔ کچھ دنوں کے بعد حالات پرسکون ہوگئے۔

---

لیکن میری زندگی میں ایک اور زلزلہ آگیا۔ میرا سکون پھر چھن گیا ایک شام مجھے اطلاع ملی کہ پروین کے شوہر نے اسے طلاق دے دی۔ وہ پھر یورپ چلا گیا اور اس نے وہاں ایک انگریز لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ پروین پھر جیون میں تنہا بھٹکنے کے لئے چھوڑ دی گئی تھی۔ اب اس کے پاس اس کا ننھا ہے اور زندگی کی تلخ یادیں ہیں اور وہ اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہی ہے۔

اور جب میں وہاں پہنچا تو وہ بے حد اداس تھی۔ آنسو اس کے رخساروں سے ڈھلک کر اس کی سفید ساری کے دودھیا آنچل میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ میں جب بھی اس سے ملتا وہ سفید ساری میں ملبوس دکھائی دیتی —— اس نے پھر مجھ سے ملنا جلنا بند کر دیا —— دن بیتے چلے جا رہے تھے اور آج ہم اتفاقیہ پھر ایک دوسرے کے سامنے آگئے تھے۔ لیکن اب وہ کچھ مطمئن سی دکھائی دیتی تھی۔ اور بات بات پر ہنس دیتی تھی۔ اس کی اس تبدیلی کو دیکھ کر مجھے خوشی بھی ہوئی۔ اس نے بتایا وہ تعلیمی مشاغل میں گم ہو کر پچھلی زندگی کی ہر یاد دل کی گہرائیوں میں دفن کر دے گی۔

---

پروین کے لئے اب بھی میرے دل میں وہی احساسات ہیں۔ میں اب بھی اس سے ملنے کے لئے بے چین رہتا ہوں۔ زلیخا کو شکایت پیدا ہو چلی ہے۔ میں اس سے بے توجہی برتنے لگا ہوں۔ زلیخا کا حسن بھی اب مجھے پھیکا پھیکا سا معلوم ہوتا ہے۔ وہ مرمر کی ایک بے جان مورت کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ میں پہلے کی طرح گھنٹوں اس کے گورے گورے رخساروں پہ ہاتھ رکھے اس کی آنکھوں میں نہیں جھانکتا۔ مدت سے مجھے اس کے گلاب جیسے سرخ ہونٹوں کا بھی خیال نہیں آیا ہے۔ میں چڑچڑا سا ہوگیا ہوں۔

یہ وہی دن تھا اور وہی مہینہ تھا۔ وہی موسم اور وہی فضا تھی جب پہلی بار میں پروین سے ملا تھا اور اُسے چائے کی دعوت دی تھی۔ میرا موڈ آج یکایک بگڑ گیا تھا۔ میں گھر آکر زلیخا سے بھی اُلجھ پڑا۔ اُس نے میرے لئے چائے نہیں بنائی تھی۔ کیونکہ شکر کسی صورت نہیں مل رہی تھی۔ مجھے اس بات کا علم تھا۔ پھر بھی میں زلیخا سے لڑ پڑا۔

اور پھر میں سیدھا پروین کے ہاں پہنچ گیا وہ مجھے دیکھ کر اُداس ہو گئی۔

"کیوں کیا بات ہے پروین؟"

"کچھ نہیں ـــــ یہ تم وقت بے وقت کیوں میرے پاس چلے آتے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف سر جھکا لیا۔

"پروین! آج کل میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا" کچھ دیر کے بعد میں نے کہا "میرا دل اب گھر میں بھی نہیں لگتا ـــــ" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ زلیخا وہاں آدھمکی۔ پہلی بار اُس نے یہ جسارت کی تھی۔ وہ شعلوں کی طرح برس پڑی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ گھر آکر میں نے زلیخا سے بات نہیں کی۔ کئی دن ہم دونوں چُپ چُپ رہے۔

---

دوسرے دن رات کے آخری لمحوں میں جب چاند سِسک رہا تھا تب میں باہر نکل پڑا۔ سرد ہوا سینے میں چُبھ رہی تھی۔ میں تیزی سے قدم اُٹھاتے چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیکھ نہیں رہا تھا۔ کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔

یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی سایہ میرے پیچھے پیچھے آرہا ہو۔ میں نے رفتار اور بھی تیز کر دی۔

چاند ڈوب رہا تھا بادلوں کے پیچھے پہاڑوں کی اوٹ میں۔

پروین کے گھر کے سامنے پہنچ کر میں ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا خاموش کھڑا ٹھنڈی ہواؤں میں لہراتے درختوں کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد پھر ہمت کی اور پروین کے کمرے کی طرف جا پہنچا۔ دروازہ بالکل کھلا ہوا تھا۔ ایک چھوٹے سے پلنگ پر پروین سوئی ہوئی تھی۔ اُس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ قریب ہی کاغذ کا ایک پُرزہ تھا۔ یہ اُسی نے لکھا تھا ـــــ

پیارے نعیم!

ایک سیدھی سادی سی لڑکی کے پیار میں تم دیوانے ہو گئے ہو۔ لیکن مجھے اطمینان ہے کہ تمہارا پیار میرے لئے سچا ہے۔ اب مجھے دُنیا سے کوئی شکوہ اور شکایت نہیں کرنی ہے۔ تمہارا پیار جو میرے ساتھ ہے۔ اُسے تکمیل تک پہنچا دو ڈیر۔ بس اُسے مکمل کر دو۔ میری ایک آرزو پوری کر دو۔ اپنی زلیخا سے غفلت نہ برتو۔ اُسے سچا پیار دو۔ ورنہ اُس کے پھول سے عارض کمہلا جائیں گے۔ میرے بعد میرے ننھے کو یتیم خانے میں داخل کرا دینا۔ خدا حافظ!

تمہاری ـــــ ٹپکی

میں نے گھبرا کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ جو برف کی طرح سرد تھا الغرض جب میں گھبرایا ہوا اِس بات کی اطلاع دینے اپنے گھر آیا تو معلوم ہوا زلیخا کمرے میں نہیں ہے۔ ماما نے کہا "وہ ابھی ابھی باہر گئی ہے۔ کہتی تھی آج جھیل میں نہانے کو جی چاہتا ہے"۔ میں گھبرا کر اُس کے کمرے کی طرف گیا۔ ایک پُرزے پر لکھا تھا "تمہارا راستہ صاف ہے۔ اِک کانٹا کم ہو گیا!" میں نے وحشت اور دیوانگی سے سر پیٹ لیا ہے۔ اب میرے پاس دو ہی یادیں ہیں۔ میرا اپنا اور پروین کا ننھا بچہ! جب وہ دونوں لڑ پڑتے ہیں تو مجھے یہ بھیانک دن یاد آجاتا ہے اور میں ایک گوشے میں بیٹھ کر افسانے لکھنے لگتا ہوں!!

# غزلیں

### زبیر فاروقی صبر صدی

تیرے نگر میں ہم کو ملے ہیں رنج و غم و آلام بہت
آنکھ ہے سوزِ نمناک ہر اپنی دل ہے سونا کام بہت

مُرغِ چمن ہُشیار چمن کا رنگ ہے بدلا بدلا سا
گُلشن میں صیاد نے اب کے پھیلائے ہیں دام بہت

تیری زُلفوں کے سائے سے یہ گھڑی ہتی ٹلتی ہے
راس آئی ہے دیوانے کو ویرانے کی شام بہت

ساقی تیرے جام و صہبا سیرابوں کو مُبارک ہوں
ہم سے تشنہ کاموں کو ہے تیری نظر کا جام بہت

ہم جو نہیں تو موسمِ گُل میں ایک قیامت برپا ہے
پھُول پریشاں شاخیں ویراں کلیاں ہیں بے آرام بہت

گردشِ دوراں کے غم سے آزاد ہیں اپنے قلب و جگر
رُوٹھ نہ ہم سے اے غمِ جاناں تجھ سے ہی آرام بہت

اُن کو زبیرؔ اب سُنتے ہیں احساسِ ندامت ہوتا ہے
جب سے عشق کی رُسوائی کا افسانہ ہے عام بہت

### خزاں چند بتیم

بخشا مجھے وہ دردِ جو درماں سے کم نہیں
اندازِ جور بھی ترا احساں سے کم نہیں

پست و بلند سے ہوئی بالا مری نظر
تختہ بھی مجھ کو تختِ سلیماں سے کم نہیں

اُن کی نظر سے زخمِ جگر اور کھُل گیا
مرہم بھی میرے حق میں نمکداں سے کم نہیں

روشن ہوا انھیں سے شبستانِ آرزو
سینے کے داغ مجھ کو چراغاں سے کم نہیں

تُو پاس ہو تو دشت ہے باغِ جناں مجھے
تیرے بغیر ارم بھی بیاباں سے کم نہیں

صبحِ وطن کہ مطلعِ انوار تھی کبھی
اب اے بتیمؔ شامِ غریباں سے کم نہیں

### شاغر وارثی عابدی شاہجہانپوری

وقت کی اُفتاد پیہم گردشِ ایام کیا
میرے ہونٹوں تک نہ آنے دے گی تیرا نام کیا

ایک ہی مرکز پہ قائم ہے جہانِ آرزو
انقلابِ آسماں کیا دَورِ صبح و شام کیا

میں نے یہ مانا کہ میں ترکِ تعلق کر تو لوں
بھُول جائے گا تمہیں میرا دلِ ناکام کیا

آپ کی اُلفت نے بخشا ہے مجھے سوزِ حیات
چھین سکتا ہے زمانہ مجھ سے یہ انعام کیا

میرے ذوقِ میکشی نے مجھ کو رُسوا کر دیا
آپ کی مخمور آنکھوں پر کوئی الزام کیا

کیوں ہے ساغرؔ یہ خلش کیوں ہے یہ سوزِ مستقل
التفات اُن کی نگاہوں کا رہا ناکام کیا

# اپنا ہی گریباں بھول گئے

شاہد فریدی

[illegible] (میسور اسٹیٹ)

محترم و معظم خوشتر صاحب! آداب

میں جب .A.R.I دہلی آیا تھا مجھے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ میں "تاجدارِ ادب" سے مل کر اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل کر لوں گا مگر جب میں آپ کے دفتر پہنچا آپ سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکا اور یہ سوچ کر مایوس لوٹا . . . If wishes were horses۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے آگرہ جاتے ہوئے اسٹیشن سے آپ کو فون کیا تھا، آپ نے مجھے بہت سی دعائیں دیں۔ اگر اس وقت میں آپ کے سامنے ہوتا تو خوشی کے اُن آنسوؤں کو جو میری آنکھوں میں مچل رہے تھے، روکنا مشکل ہو جاتا۔ آپ کی آواز کتنی میٹھی اور دلنشیں تھی جس کی حلاوت میں آگرہ اور لوٹنے میں بھی برابر محسوس کرتا رہا ——— میری کہانی "فرشتہ" کی اشاعت پر جہاں بہت سے خطوط آئے ہیں اُن میں ایک خط میرے وطن گلبرگہ سے بھی لکھا گیا ہے۔ ایک محترمہ نے پوچھا ہے کہ میں Pessimistic ہوں یا Optimistic۔ مجھے تو گہرے اندھیروں میں بھی ہمیشہ روشنی کی ایک نازک کرن کی تلاش رہی ہے اور رہتی ہے ——— اپنی کہانی "اپنا ہی گریباں بھول گئے" لکھتے وقت میرے تصور میں انسانیت کے وہ عظیم پیکر تھے جنھوں نے ملک کے لئے عظیم قربانیاں دیں۔ جن کے نعرے تھے "آرام حرام ہے" "جے جوان جے کسان"۔ اگر کہانی آپ کو متاثر کرے تو سمجھوں گا میری کاوش رائیگاں نہیں گئی ——— اختتامِ کورس کے بعد اور عملی زندگی کے آغاز کے درمیان جو بھی مختصر یا طویل وقفہ ملے گا اُسے اپنے وطن ہی کی سرزمین پر گزارنے کا ارادہ رکھتا ہوں اس لئے براہِ مہربانی پتہ کی تبدیلی نوٹ فرمائیے ——— آپ کی مزید دعاؤں کا متمنی!

خلوص کیش ——— شاہد فریدی

---

میں اُس دن سیمینار میں اپنا مقالہ پڑھ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں میرے ساتھی مجھ سے سوالات کر رہے تھے اور ڈاکٹر درِش پانڈے جانے کے بجائے گُم سُم بیٹھے ہوئے پُوری توجہ سے میرا مقالہ سُن رہے تھے۔ پھر میں نے اور میرے ساتھیوں نے دیکھا لیبارٹری کے دروازے پر ایک برق سی لہرائی۔ ایک قیامت، جوانی کے نشے میں چُور، اپنے ایک ہاتھ میں ساڑی کا آنچل اور دوسرے ہاتھ میں سیاہ چشمہ لئے کھڑی تھی۔

"یس؟" پروفیسر نے اُس سے پُوچھا۔

"کیا میں جعفر یزدانی سے مل سکتی ہوں؟" اُس نے اپنے مرمریں شانوں پر پڑی ہوئی زلفوں کو ایک جھٹکا دے کر کہا۔

اپنا نام سُن کر مجھے ایک لمحہ کے لئے حیرت ہوئی۔ وہ میرے لئے قطعی اجنبی تھی۔

"آپ تھوڑی دیر انتظار کیجئے!" پروفیسر نے اُس سے کہا۔

جب میں اپنا مقالہ ختم کر کے باہر آیا، میں نے دیکھا ہیوڈس کلر کے پھول اپنی نیم باز آنکھوں سے پورچ میں کھڑی ہوئی اُس قیامت کو دیکھ رہے تھے کیمسٹری اور پتھالوجی لیبارٹریز کے بیچ میں جو چمن تھا، مجھے محسوس ہوا جیسے چمن کے سارے پھول اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔


آہا!... کتنا مُلائم!
کتنا عمدہ!
کیسا ملائی دار! کیسا نرم!
اتنا لذیذ!
ویک فیلڈ
کسٹرڈ پاؤڈر
آپ کی دعوت میں چار چاند لگاتا ہے۔
اس سے لاجواب پڈنگ ... ڈیسرٹ وغیرہ کی لذت بڑھ جاتی ہے۔ جو ذائقہ دار خوشبوؤں میں ملتا ہے۔
makes the difference
House of Weikfield produces a wide range of world renowned specialised Food Products....at its space-age, garden factory.
ویک فیلڈ پراڈکٹس کمپنی (انڈیا) ویک فیلڈ اسٹیٹ

افسانہ

# ...اپنا ہی گریباں بھول گئے

شاہد فریدی

مومن پورہ۔ میک گلی۔ گلبرگہ۔ (میسور اسٹیٹ)

۲۵ مئی ۸۶ء — محترم مظفر حنفی صاحب! آداب

میں جب A.R.I. دہلی آیا تھا مجھے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ میں "تاجدارِ ادب" سے مِل کر اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل کر لوں گا مگر جب میں آپ کے دفتر پہنچا آپ سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکا اور یہ سوچ کر مایوس لوٹا ... If wishes were horses. آپ کو یاد ہوگا میں نے آگرہ جاتے ہوئے اسٹیشن سے آپ کو فون کیا تھا، آپ نے مجھے بہت سی دعائیں دیں۔ اگر اس وقت میں آپ کے سامنے ہوتا تو خوشی کے اُن آنسوؤں کو جو میری آنکھوں میں مچل رہے تھے، روکنا مشکل ہو جاتا۔ آپ کی آواز کتنی میٹھی اور دلنشیں تھی جس کی حلاوت میں آگرہ اور اوٹی میں بھی برابر محسوس کرتا رہا —— میری کہانی "فرشتہ" کی اشاعت پر جہاں بہت سے خطوط آئے ہیں اُن میں ایک خط میرے وطن گلبرگہ سے بھی لکھا گیا ہے۔ ایک محترمہ نے پوچھا ہے کہ میں Pessimistic ہوں یا Optimistic۔ مجھے تو گہرے اندھیروں میں بھی ہمیشہ روشنی کی ایک نازک کرن کی تلاش رہی ہے اور رہتی ہے —— اپنی کہانی "اپنا ہی گریباں بھول گئے" لکھتے وقت میرے تصور میں انسانیت کے وہ عظیم پیکر تھے جنھوں نے مُلک کے لئے عظیم قربانیاں دیں۔ جن کے نعرے تھے "آرام حرام ہے" "جے جوان جے کسان"۔ اگر کہانی آپ کو متاثر کرے تو سمجھوں گا میری کاوش رائیگاں نہیں گئی —— انہتام کورس کے بعد اور عملی زندگی کے آغاز کے درمیان جو بھی مختصر یا طویل وقفہ ملے گا اُسے اپنے وطن ہی کی سرزمین پر گزارنے کا ارادہ رکھتا ہوں، اس لئے براہِ مہربانی پتہ کی تبدیلی نوٹ فرمایئے —— آپ کی مزید دعاؤں کا متمنی!

خلوص کیش —— شاہد فریدی

---

میں اُس دن سیمینار میں اپنا مقالہ پڑھ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں میرے ساتھی مجھ سے سوالات کر رہے تھے اور ڈاکٹر دریش پانڈے چائے کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے ہوئے پوری توجہ سے میرا مقالہ سُن رہے تھے۔ پھر میں نے اور میرے ساتھیوں نے دیکھا، لیبارٹری کے دروازے پر ایک برق سی لہرائی۔ ایک قیامت جوانی کے نشے میں چُور اپنے ایک ہاتھ میں ساڑی کا آنچل اور دوسرے ہاتھ میں سیاہ چشمہ لئے کھڑی تھی۔

"یس!" پروفیسر نے اُس سے پوچھا۔

"کیا میں جعفر فرزندانی سے مل سکتی ہوں؟" اُس نے اپنے مرمریں شانوں پر پڑی ہوئی زلفوں کو ایک جھٹکا دے کر کہا۔

اپنا نام سُن کر مجھے ایک لمحہ کے لئے حیرت ہوئی۔ وہ میرے لئے قطعی اجنبی تھی۔

"آپ تھوڑی دیر انتظار کیجئے!" پروفیسر نے اُس سے کہا۔

جب میں اپنا مقالہ ختم کر کے باہر آیا، میں نے دیکھا رہوڈس کلر کے پھول اپنی نیم باز آنکھوں سے پورچ میں کھڑی ہوئی اُس قیامت کو دیکھ رہے تھے۔ کیمسٹری اور پیتھالوجی لیباریٹریز کے بیچ میں جو چمن تھا، مجھے محسوس ہوا جیسے چمن کے سارے پھول اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اُس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر میرے لئے کار کا دروازہ کھولا اور میں چپ چاپ اُس کی بازو کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ کار ڈرائیو کرتی ہوئی ہاسٹل تک لے آئی۔ اُس کے ڈرائیونگ کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ میرے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"تشریف رکھئے!" میں نے اُس سے کہا۔

وہ پلنگ پر بیٹھ گئی جس پر تقی سوتا تھا۔

اُس کی نظریں کھڑکی سے باہر صنوبر کے درختوں پر سے ہوتی ہوئی میز پر رکھے ہوئے فریم پر آکر ٹھہر گئیں جس میں میری اور تقی کی تصویریں تھیں۔

"فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں!" میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ اپنے پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدتی ہوئی کچھ دیر تک نہ جانے کیا سوچتی

---

- اپنے قلب کو نصیحت سے توانائی دو، اُسے حکمت سے منوّر کرو اور لوگوں سے بے نیاز ہو کر اُسے قوت پہنچاؤ۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہٗ)
- گناہ ایک طرح کا ناسور ہے، اُسے ترک نہ کیا تو بڑھتا ہی جائے گا۔
(حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہٗ)
- جو ایسے دوست کا جویا ہے جس میں کوئی عیب نہ ہو، اُسے کبھی دوست نہ ملے گا۔ (حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہٗ)
- جو اپنی زبان اور اپنے کردار پر نگاہ رکھتا ہے اُس کی روح ہر طرح کے عذاب سے بچی رہتی ہے۔ (عربی ادب)

---

رہی۔ پھر اُس نے کہا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے تقی آپ کی ہر بات مانتے ہیں؟"

"میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا! ویسے تقی میرا عزیز ترین دوست ہے!"

"دیکھئے یزدانی صاحب! میں تقی کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی مگر میں انھیں بچپن سے چاہتی ہوں۔ اب میری باجی اور دولہا بھائی کی خواہش ہے کہ ہم دونوں ایک ہو جائیں۔ کوئی چار سال پہلے تقی اپنی بھابی اور بھائی جان سے ناراض ہو کر گھر سے چلے آئے۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ یہاں ہیں۔ میں ساری زندگی آپ کا یہ احسان نہ بھولوں گی اگر۔ ۔ ۔؟"

"دیکھئے محترمہ! میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن میں پوری کوشش کروں گا کہ میں آپ کے کسی کام آسکوں۔"

میں اُس لڑکی کو ہاسٹل کے گیٹ تک چھوڑ کر واپس آنے تک وقت تقی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"عجیب فطرت کا آدمی ہے یہ تقی بھی! میرا سب سے گہرا دوست ہوتے ہوئے بھی آج تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ بستی میں کہاں رہتا ہے۔ وہ آٹھ دس دن میں ایک بار مجھ سے ملنے ضرور آتا اور وہ بھی رات کے وقت۔ میرے کمرے اور کبوڈ کی ایک چابی اُس کے پاس بھی تھی۔ وہ جب آتا میری میز پر سے یا کبوڈ میں سے میری کتابیں لے کر پڑھتا رہتا۔ بعض وقت اُس کے سامنے تین چار کتابیں کھلی ہوتیں کبھی اُس کے سامنے دھان اور گیہوں کی کاشت پر کتابیں ہوتیں تو کبھی پھلوں کی کاشت پر کتابیں پڑھتا رہتا۔ اُسے رات کے دو دو بجے تک کتابوں میں کھویا ہوا دیکھ کر مجھے اپنے آپ پر شرم آتی تھی اور میں سوچتا، میں ایگریکلچر کا اسٹوڈنٹ ہوتے ہوئے بھی اِتنا نہیں پڑھتا جتنی دلچسپی سے وہ میری کتابیں پڑھتا رہتا ہے۔ صبح وہ مجھ سے ملے بغیر ہی چلا جاتا۔ کبھی کبھی اس سے ایک ایک ماہ تک ملاقات نہ ہوتی اور اُس کے ملنے جلنے والے مجھ سے پوچھتے تقی کہاں ہے؟"

وہ یونیورسٹی میں رجسٹرار کا پی۔ اے تھا۔ مجھے اُسی سے معلوم ہوا تھا کہ اُس کے والد اور وائس چانسلر بچپن کے گہرے دوست تھے۔ جب وہ پہلی بار اپنے والد کا نام بتا کر ملا، اُنھوں نے تقی کو اپنے پاس ہی ٹھہرنے کے لئے کہا تھا لیکن وہ جیسے بھی ہو نوکری کرنا چاہتا تھا۔ یہ اور بات تھی کبھی کبھی وائس چانسلر اصرار کر کے اُسے اپنی کار میں گھر لے جاتے تھے۔ یونیورسٹی میں اُس کی ہر سفارش ہر جگہ چلتی تھی۔ داخلے سے لیکر اسکالرشپ تک کے لئے وہ لڑکوں اور لڑکیوں کی سفارش کرتا پھرتا تھا۔ اِسی لئے وہ لڑکوں اور لڑکیوں میں عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

دوسرے دن لائبریری کے ایک تنہا گوشے میں بیٹھا نوٹس لے رہا تھا کسی نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ جعفر یزدانی ہیں؟"

میرے قریب ایک نوجوان کھڑا تھا جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی کپڑوں کی کریز تباہ حال، بکھرے ہوئے بال تیل کو ترس رہے تھے۔

"فرمایئے! میں ہی جعفر یزدانی ہوں!"

"تقی صاحب اِس وقت کہاں مِل سکیں گے؟"

میں نے اُس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی، اُس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ بھی میری طرح ایک اسٹوڈنٹ ہے۔

"میں کہہ نہیں سکتا وہ اِس وقت کہاں مِل سکیں گے۔"

میری بات سُن کر اُس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی اور وہ تھکے ہوئے قدموں

سے واپس چلا جاؤں گا۔"

"شمو!" میں نے اُسے آواز دی۔

"کوئی بہت ضروری کام ہو تو مجھ سے کہہ سکتے ہو۔"

"جی کام تو بہت ضروری تھا مگر۔ ۔" وہ مجھ سے کچھ کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

"دیکھیں تکلف نہ برتو تم مجھے تقی کی جگہ سمجھ سکتے ہو۔"

کچھ دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا، پھر اُس نے کہا۔

"اگر وہ پانچ بجے سے پہلے آئیں تو ان سے کہئے کہ میڈیکل کالج سے پال آیا تھا۔ آج پانچ بجے تک امتحان کی فیس داخل کرنے کی آخری تاریخ ہے اور اگر کل تک Mess Bill نہ دیا گیا تو Mess سے بھی میرا نام خارج ہو جائے گا۔"

"تمھیں کتنے روپوں کی ضرورت ہے؟"

"جی کوئی دو سو روپوں کی!"

میں نے اُسے پوسٹ آفس سے دو سو روپے نکال کر دے دئے۔

اُس کے دوسرے دن میں نے تقی کو میڈیکل سٹور سے نکلتے دیکھا۔ اُس کے ہاتھوں میں دواؤں کا ایک بڑا پیکٹ تھا۔ اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی جیسے اُس نے کئی دن سے شیو نہ کیا ہو اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مسلسل کئی راتوں سے جاگتا رہا ہو۔

"ہیلو اولڈ بوائے!" اُس نے ہمیشہ کی طرح مسکرا کر کہا۔

"تقی! اگر تمھیں فرصت ہو تو آج رات ہاسٹل آجاؤ!" میں نے اُس سے کہا۔

پھر تین دن تک وہ میرے پاس نہ آیا۔ چوتھے دن جب میں رات کے گیارہ بجے لائبریری سے لوٹا، وہ میرے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ میں نے اُس پر نظر ڈالی۔ وہ کچھ کھویا کھویا اُداس سا کھڑکی کے باہر صنوبر کے درختوں کے پیچھے سے اُبھرتے ہوئے چاند کو تک رہا تھا۔

"تقی! کس پال نام کا ایک لڑکا تم سے ملنے آیا تھا۔"

"پال!" وہ کچھ دیر تک نہ جانے کیا سوچتا رہا۔

"تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں تقی! میں نے اُسے دو سو روپے دے دئے ہیں!"

"تم نے اچھا کیا جعفر! میں دو ماہ سے پال کو کچھ بھی نہ بھجوا سکا۔"

کتنا دردمند دل دیا ہے خدا نے تقی کو! میں نے سوچا۔

"شگفتہ یاسمین نام کی ایک لڑکی بھی آئی تھی تم سے ملنے! کیا یہ سچ ہے تقی کہ تم سب کی بات ٹال سکتے ہو مگر میری بات نہیں ٹال سکتے۔"

"ہاں یہ سچ ہے! لیکن اولڈ بوائے آئندہ اُس لڑکی سے نہ ملنا!"

"کیا یہ بھی سچ ہے تقی کہ شگفتہ تمھیں بچپن سے چاہتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو تم۔ ۔"

"یہ جھوٹ ہے!" وہ چیخ پڑا۔

اُس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔

"اُس سے پوچھو! اُس وقت اُس کی چاہت کہاں سو گئی تھی جب بھابی مجھ پر گھونسے برساتی تھیں اور میں چُپ چاپ پِٹتا رہتا تھا۔ اور یہ دیکھو!" اُس نے قمیص اُٹھا کر اپنی پیٹھ میرے سامنے کی۔ اُس کی پُشت پر جلے ہوئے داغوں کے نشان دیکھ کر میرے بدن میں ایک جھُرجھُری سی آگئی۔

"یہ نشان دیکھتے ہو جعفر! کہاں تھی اُس کی چاہت جس کا وہ آج تمھارے پاس دعویٰ کرنے آئی ہے اور کیوں نہیں ٹوٹا اُس کے آنسوؤں کا بند، جس وقت میری پیٹھ پر گرم سلاخ کے چرکے لگائے جا رہے تھے؟"

- اگر آپ دوسروں کے جذبات و احساسات سمجھیں اور ان کے ساتھ مل کر چلنے کی کوشش کریں تو اِس طرح آپ کو وہ قوت اور قدرت حاصل ہوگی جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے! (ڈاکٹر نپولین ہل)
- خبردار! خواہشوں کے جال میں نہ پھنسنا۔ اِن خواہشوں نے جو ستم فرشتوں پر ڈھایا وہ کسے معلوم نہیں (شیکسپیئر)
- دُنیا کی آدھی آبادی کی ناخوشی کا سبب ہے ـــ دوسروں سے حسد اور خود سے بے اطمینانی! (ڈاکٹر مارڈن)
- گھوڑے سے گرے ہوتے اور اُس کی پیٹھ پر سوار میں مصالحت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (برناڈ شا)

کبھی کبھی میں تنہائیوں میں یہ محسوس کرتا ہوں یہ چرکے میری پیٹھ پر نہیں، میری رُوح پر لگائے گئے ہیں!

"اور آج شگفتہ تمھارے پاس یہ کہنے آئی ہے کہ وہ مجھے بچپن سے چاہتی ہے! شگفتہ اُس وقت میرے قریب تک نہ آئی جب میں درد کی تاب نہ لا کر تڑپتا رہتا تھا اور اُس وقت بھی اُسے میرا خیال نہ آیا جب مجھے نمونیا ہو گیا تھا! مگر ایک ایسی بھی ہستی تھی جعفر! جو مجھے اپنے گھر لے جا کر میرے زخموں پر مرہم لگاتی ہوئی چُپ چاپ آنسو بہاتی تھی جب میں اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھتا مجھے اُن آنسوؤں میں ایک گہوارہ نظر آتا اور محسوس کرتا میں ایک چھوٹا سا بچہ بن گیا ہوں اور اُس گہوارے میں جھُول رہا ہوں اور وہ ہستی تھی رقیہ! جو ساری ساری رات جاگ کر میری تیمارداری کرتی تھی اور جب میں نمونیے سے اچھا ہو گیا، میری خدمت کرتے کرتے رقیہ خود بیمار پڑ گئی۔ اب شگفتہ

تمہارے پاس آنے تو اُس سے پوچھو، وہ اُس وقت چپ کیوں رہتی تھی جب سب اُس کی مجھ سے کہتیں یہ حرام خور ایک تو مفت کی روٹیاں توڑتا ہے، اوپر سے گیارہ گیارہ بجے تک لالٹین جلاتا ہے ؟“

کیا کبھی شگفتہ نے مجھے اپنے کمرے میں آکر پڑھنے کے لئے کہا تھا ؟

وہ رقیہ تھی جو مجھے اپنے کمرے لے جاتی اور میرے سامنے قندیل لاکر رکھتی تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، لیکن اُس اندھیرے میں بھی مجھے اُجالے کی ایک ننھی سی کرن دکھائی دیتی تھی کتنی معصوم تھی رقیہ ! میری بے کسی اور اپنی بے بسی پر ہمیشہ چپ چاپ آنسو بہاتی تھی اور جب میں گھر سے بھاگ جانے کے بارے میں سوچتا، وہ مجھ سے کہتی۔

’تقی ! کیا تمہیں اپنے والدین کی آرزوؤں کا احترام نہیں !؟‘

جب میں سات برس کا تھا میری امی مجھ سے کہتیں میرا تقی بڑا ہوکر ڈاکٹر بنے گا!‘

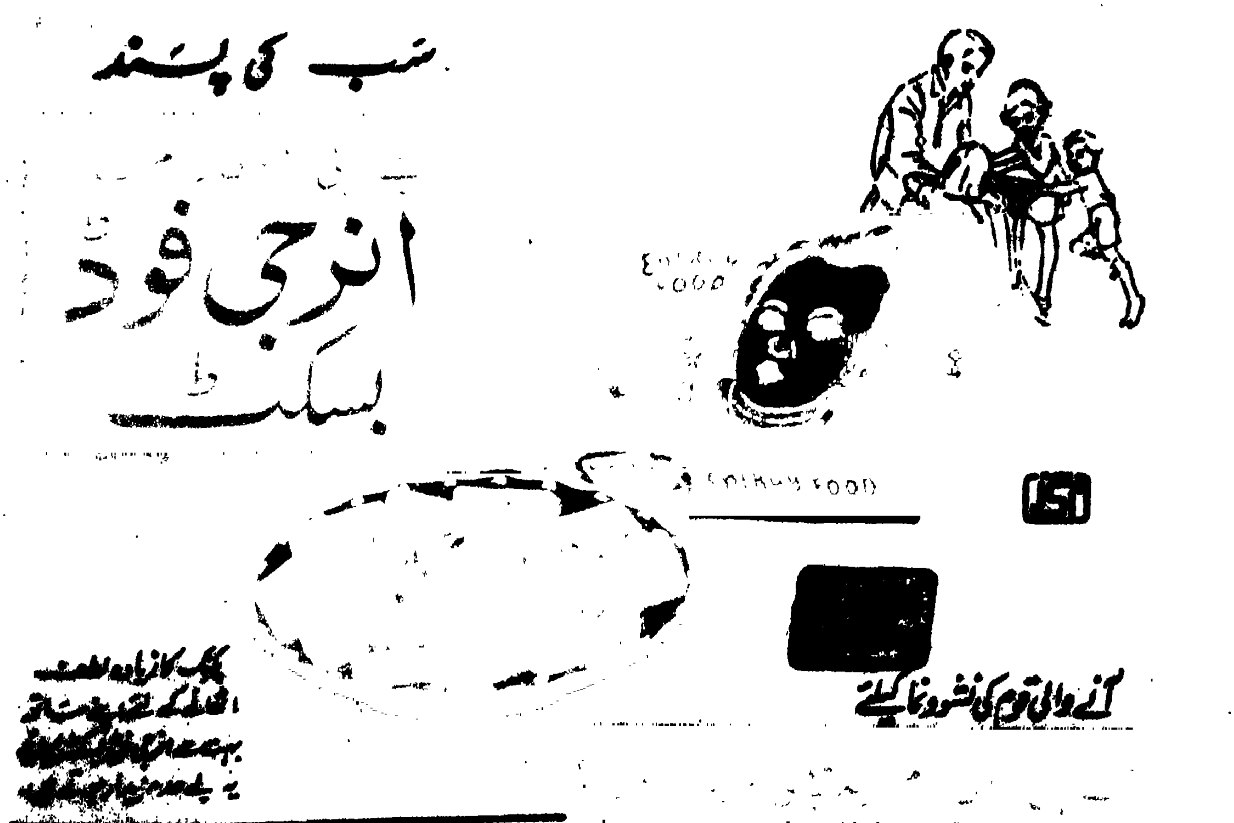
ہاں ! میرے ابا مسکرا کر کہتے۔

’میں اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بناؤں گا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیجوں گا! اور جب وہ وہاں سے لوٹے گا اپنی قوم کی اتنی خدمت کرے گا کہ ساری قوم اُس پر فخر کرے گی !‘

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں جعفر ! میرے اور آسمان کے [illegible] چار آنکھیں ہمیشہ روتے جاگتے میری طرف تکتی رہتی ہیں۔ پھر [illegible] ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ ہزاروں کی جائداد میں میرا بھی حصہ تھا مگر [illegible] پیسے اور ایک چھوٹی سی نوکری کے لئے کئی جگہ ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ [illegible] کرتے ہوئے بی۔ اے کرلیا۔ میں نے سوچا تھا جب مجھے کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی میں رقیہ کو ہمیشہ کے لئے اپنا لوں گا مگر اُس وقت تک زمانہ رقیہ کو مجھ سے [illegible] وہ بھی میری ہی طرح بدقسمت تھی۔ شادی کے دو سال بعد اُس کا شوہر [illegible] مرتے اُس کے لئے ایک لڑکا اور دق جیسی مہلک بیماری چھوڑ گیا۔

تم نے تین دن پہلے میرے ہاتھوں میں دواؤں کا ایک پیکٹ دیکھا تھا وہ رقیہ کے لئے تھا۔

”تم انٹلکچول ہو جعفر ! ذرا اُس انسان کی دلی کیفیت کا اندازہ کرو جس کے ماں باپ اپنے دل میں آرزو لئے اِس دُنیا سے چل بسے کہ وہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنائیں گے، جس کے شعور میں یہ بات بچپن ہی سے ہو کر بڑا ہوکر اسے ڈاکٹر بننا ہے پھر قسمت اُسے ایک ایسے انسان کے سامنے جاکر کھڑا کر دیتی ہے جس کے گلے میں اسٹیتھسکوپ ہوتا ہے۔ جو کسی زمانے میں اُس کا کلاس فیلو تھا، وہی ڈاکٹر رقیہ کی تشخیص کرتا ہے پھر



پھر شوہر ایک نیم تکمہ کر دیتا ہے، تم سمجھ سکتے ہو جعفر! اُس کے دل کی کیا کیفیت ہوگی اور کیسے جذبات سے دوچار ہوا ہوگا۔ جب اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اُس کا دامن بھگوتے رہے ہوں گے! قسمت یہیں بس نہیں کرتی۔ ذرا سوچو کیا اُس کی روحانی موت واقع نہ ہوگی جب اُس کی محبوبہ بستر پر پڑی کھانستی ہے اور تنگدستی کے سبب تاب ہو جاتی ہے اور وہ اُسے اپنے سینے سے لگا لیتا ہے پھر بھی اُس کی کھانسی نہیں رکتی اور وہ خون کی قے کرتی ہے۔ اُس کی جیب نوٹوں سے بھری ہوتی ہے اور وہ اُسے لے کر رات کے دو بجے ڈاکٹروں کا دروازہ کھٹکھٹاتا پھرتا ہے، اُسے صبح آنے کے لئے کہا جاتا ہے، پھر وہ ہسپتال جاتا ہے جہاں اُس کے سامنے اُس کی محبوبہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیتی ہے اور وہ اُس سے لپٹ کر روتا ہوا سوچتا ہے، وہ اپنی بے کسی اور اپنی بے بسی پر رو رہا ہے یا اُس کی موت پر! ابھی کچھ دن پہلے میرے وکیل نے بھائی جان کو نوٹس بھیجا تھا انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ آج نہیں تو کل، ہزاروں کی جائداد میں میرا بھی حصہ ہوگا اور اب اسی لئے وہ لوگ میرے ساتھ یہ چال چل رہے ہیں۔ شگفتہ جو اپنے کیرکٹر کی وجہ سے بدنام ہے، جس کی راتیں کلبوں میں گزرتی ہیں۔ وہ لوگ شگفتہ کو میرے گلے ڈالنا چاہتے ہیں، ایک تیر اور دو شکار! اگر بھائی جان مجھے پوناشیم سیانائیڈ دیں تو میں خوشی سے کھانے کے لئے تیار ہوں مگر شگفتہ وہ میرے لئے سلو پوائزن ہے جعفر!

”اور یہ سچ ہے جعفر! کہ میں تمہاری بات کو کبھی ٹھکرا نہیں سکتا۔ اگر تم کہو تو میں شگفتہ کے ساتھ شادی بھی کر سکتا ہوں۔“

”مجھے بہت افسوس ہے تقی! میں تمہارے ماضی سے بے خبر تھا۔“

”میرے ننھے ادیب! تم بچے ہو، ابھی تم نے دُنیا نہیں دیکھی!“ اُس نے میرے گال پر تھپکی دی: ”چلو رات بہت ہو چکی ہے اب سو جاؤ!“

جب میں صبح اُٹھا وہ اپنے بستر پر نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح چلا جاتا تھا لیکن آج وہ میرے نام ایک خط چھوڑ گیا تھا۔

مائی ڈیر جعفر!

میں یہاں سے دُور جا رہا ہوں۔ کہاں، یہ میں خود نہیں جانتا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے فرار کا راستہ اختیار کیا ہے۔ میں انسانیت کی خدمت کروں گا اور ضرور کروں گا کیونکہ یہ میری صبا اور رانی کی آرزو تھی۔

تم جلد ہی میرے وکیل سے مل لینا۔ میں نے اپنی ساری جائداد رقیہ کے بیٹے کے نام کر دی ہے، جسے میں نے یہاں سے دُور ایک کانونٹ میں شریک کرا دیا ہے۔ اب اس بات کی ذمہ داری تم پر ہے کہ تم اُسے ڈاکٹر بناؤ تاکہ دُنیا پھر اُس کے ساتھ بھی تقی جیسا مذاق نہ کر سکے اور جب وہ بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کے بارے میں پوچھے تو اُس سے کہنا کہ اُس کی ماں بہت اچھی تھی۔ تم رقیہ کی تصویر بنا کر کہنا کہ بیک وقت ماں اور باپ دونوں وہی تھی۔ تمہارے نام میں نے بنک میں پانچ ہزار روپے جمع کرا دئے ہیں اگر ہو سکے تو اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلے جاؤ یا پھر اپنی ہی کسی فیلڈ میں ریسرچ کرو تاکہ انسانیت کی خدمت ہو سکے۔

تمہارا
تقی

میری نظریں میز پر رکھے ہوئے فریم پر پڑیں، جس میں میری اور تقی کی تصویریں تھیں۔ میری تصویر اب فریم میں نہیں تھی اور تقی اپنی تصویر میں ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا۔

زمانے نے تقی کو مجھ سے چھین لیا۔ چھ سال گزر گئے

اُن دنوں اپنی نظر سے گزرنے والے ہر اُس میگزین میں جس کا تعلق زراعت سے ہوتا، میں نے یہ خاص بات دیکھی کہ تقریباً ہر میگزین میں آندھرا پردیش کے ایک خاص فارم کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا رہا تھا جس کی پیداوار نہ صرف غیر معمولی تھی بلکہ کئی کاشتکاروں کے ریکارڈ توڑ دئے تھے۔ مجھے جلد ہی کالج کی طرف سے اُس فارم کو دیکھنے کا موقع ملا۔

اُس چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ کر جب میں اُس فارم ہاؤز کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا، اُس وقت ایک نوجوان چھوٹے سے لینڈ سکیپ گارڈن کے لان پر بچھی بید کی کرسی پر بیٹھا کوئی میگزین دیکھ رہا تھا۔ اُس کے قریب پہنچ کر میں نے اُسے اپنا کارڈ دکھایا۔

”میں اپنے باس کی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں جناب!“ اُس نے میرا کارڈ دیکھ کر کہا۔

”تشریف رکھئے جناب! ہمیں بڑی مسرت ہوتی ہے جب آپ جیسے لوگ ہمارا فارم دیکھنے آتے ہیں۔“

پھر کچھ دیر بعد وہ مجھے اپنے ساتھ فارم دکھانے لے گیا۔

کوئی پچیس ایکڑ زمین پر لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھ کر مجھے ایک فرحت و تازگی کا احساس ہوا۔ مجھے بچپن ہی سے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو دیکھ کر ایک انجانی مسرت ہوتی ہے اور شاید اسی لئے مجھے شہروں میں نیان کے ٹیوب اور بھیڑ دیکھ کر ایک وحشت سی ہوتی ہے۔ کچے راستے کے دونوں طرف یوکیپٹس کے درخت تھے اور پوری زمین کو کئی بلاکوں میں تقسیم کر کے ہر بلاک پر ایک ایک سائن بورڈ لگایا گیا تھا۔

جب ہم اُس بلاک کے قریب پہنچے جہاں گنے کی کاشت کی گئی تھی میرے قدم خود بخود رک گئے کتنی بھرپور فصل تھی ہر جانب گنا ہی گنا کی ایک سی فصل لگی تھی

زراعت کے جدید طریقوں کو اپنانے پر بھی آج تک ایسی فصل نہ ہوئی تھی کہ جب ہم اُن کھیتوں میں داخل ہوئے جہاں گیہوں کی بالیاں مسکرا رہی تھیں جن پر گیہوں کی بہار آ رہی تھی ہمارے علاقے میں بُری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ وہاں سے میری نظر دھان کے کھیتوں پر گئی جہاں دھان کی پکی ہوئی بالیاں ہنس ہنس کر ایک دوسرے کے گلے مل رہی تھیں۔ میں ایک گھنٹے تک سرسبز فارم میں جا کر طرح طرح کی فصلوں کو دیکھتا رہا۔ کسی میں انگور کی کاشت کی گئی تھی، کہیں ترکاریاں اُگائی گئی تھیں تو کسی میں Hybrid جوار کی کاشت کی گئی تھی اور ہر فصل مسکرا کر پودوں کی ہر اس بیماری اور کیڑوں کو چیلنج کر رہی تھی جس سے مُلک کو ہر سال کروڑوں روپوں کا نقصان ہوتا ہے۔

میں فارم دیکھ کر اس نوجوان کے ساتھ واپس ہوا۔ وہ مجھے لان پر چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ واپسی میں اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی جس میں تازہ پھل رکھے ہوئے تھے۔

"کہیے جناب! آپ کو ہمارا فارم پسند آیا؟" اس نے چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"اگر آپ نے کوئی مشورہ دیا تو ہمیں بہت خوشی ہوگی جناب!"

"مشورہ!" میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔

"میرے دوست! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ میں بھی چند دن تمھارے ساتھ گزار دوں تاکہ میں بھی تم لوگوں سے کچھ اور سیکھ سکوں!"

"آپ ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں جناب!"

ہم دونوں چُپ چاپ چائے پیتے رہے۔

"میرا خیال ہے زراعت کے جدید اور سائنٹفک طریقوں کو اپنانے کے ساتھ آپ لوگوں نے کافی محنت بھی کی ہے۔"

"بالکل صحیح فرمایا جناب آپ نے! زمین میں بیج ڈالنے کے بعد سے فصل تیار ہونے تک ہمارے بابا خود ہر فصل کا ایسے ہی خیال رکھتے ہیں جیسے ایک شفیق ماں اپنے بچوں کی نگہداشت کرتی ہے۔ Insecticide اور Fertilizer سے لے کر Fungicide اور آبپاشی ہر کام وہ خود کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک ایکڑ زمین سے ایک سو ٹن گنا پیدا کرتے ہیں اور کوئی چار گنٹہ زمین سے ہمیں آٹھ دس ہزار کے انگور ملتے ہیں!"

"ہمیں اپنے فارم پر فخر ہے جناب! بتائیے کہ سارے ملک میں ہے ایسا فارم کہیں؟"

"اور اس سے زیادہ ہمیں اپنے بابا پر فخر ہے! انھیں صرف کام کی دھن لگی رہتی ہے [illegible] کام ہی [illegible] کا ایمان [illegible] ہے! اور جو اس بات پر یقین رکھتے [illegible]

اور ابھی [illegible] کیڑوں کو کنٹرول کرنے

کے لئے نئے نئے تجربے کرتے رہتے ہیں!"

"یہی نہیں جناب! وہ خالی وقت میں گاؤں کے کسانوں کے کھیتوں میں جا کر اُن کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور اکثر گرد و نواح کے دیہات میں اپنا ٹریکٹر لے کر چلے جاتے ہیں اور کسانوں کو بڑے خلوص اور محبت سے کاشت کے جدید طریقے سمجھاتے ہیں اور خود اُن کے کھیتوں میں گھنٹوں کام کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہم سے بھی یہی کہتے ہیں کہ کام ہی کو اپنا ایمان سمجھو اور کام ہی کو اپنا انعام!

"اور یہ سچ ہے جناب! زمین میں بیج ڈالنے کے بعد جب زمین سے پودے نکلتے ہیں تو انھیں دیکھ کر ہمارا دل خوشی سے بھر جاتا ہے اور جب گیہوں اور دھان کی بالیاں پک جاتی ہیں تو انھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے ہماری محنت کا پھل مل گیا ہو!

"ہماری ترقی کو دیکھ کر گورنمنٹ اکثر گرام سیوک ٹریننگ سینٹر کے نوجوانوں کو یہاں بھیجتی ہے لیکچر ختم ہونے کے بعد ہمارے بابا ان نوجوانوں سے کہتے ہیں۔

"ملک کی بہت سی امیدیں آپ لوگوں سے وابستہ ہیں۔ آپ کے کندھوں پر ملک کی اہم ذمہ داریاں ہیں اور آپ کو ملک کا بہت بڑا مقدس فرض پورا کرنا ہے، یاد رکھیے! حکومت ہی سب کچھ نہیں کر سکتی ہمیں اپنے طور پر بھی بہت کچھ کرنا چاہیے!"

آج ہمارا ملک نازک دور سے گزر رہا ہے اور ایسے وقت میں اگر کچھ کر سکتے ہیں تو وہ صرف آپ لوگ ہیں۔

"اگر ملک کے نوجوان کام کو اپنا ایمان اور فرض سمجھیں تو وہ دن دور نہ ہوگا جب ہمارے ملک میں ہر طرف ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے ہوں گے اور ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ باہر سے اناج خریدنے کے بجائے دوسرے ملکوں کو اپنے ملک سے اناج بھجوا سکیں۔

"اب میری ہی مثال لیجیے جناب! میں ایک آرٹس گریجویٹ ہوں۔ نوکری نہ ملنے کی وجہ سے میں بیکار مارا مارا پھر رہا تھا۔ پھر ایک دن ان سے ملاقات ہوئی انھوں نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی۔ میں یہاں اپنی خوشی سے آیا ہوں میرے علاوہ دو نوجوان اور ہیں جو میری طرح گریجویٹ ہیں۔ ان میں سے ایک نے تو بے کاری سے تنگ آ کر خودکشی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"آپ خود سوچیے جناب! مشکل سے نوکری مل بھی جاتی تو مجھے ساری عمر ڈیڑھ دو سو روپوں میں گزارہ کرنا پڑتا۔ مگر اب یہاں ہمیں سال بھر کے اناج کے علاوہ ہر ماہ دو تین سو روپے مل جاتے ہیں!"

"کیا تمھارے بابا یہیں رہتے ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

[illegible]

[illegible] دیا۔

"وہاں دو کرتے ہیں۔ اگر آپ رات کے وقت چلے جائیں تو آپ کو ٹیپ ریکارڈ سنتے ہوئے ٹہلیں گے یا پھر گنگناتے ہوئے ملیں گے۔

*Lives of great men all remind us*
*We can make our lives sublime*
*And, departing, leave behind us*
*Footprints on the sand of time.*

مگر انھیں یہاں تک پہنچنے کے لئے بہت سی مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلنی پڑیں۔ جن کا ذکر کرتے ہوئے آج بھی گاؤں کے کسان جھینپ جاتے ہیں۔ آج سے چوبیس برس پہلے جب انھوں نے یہ زمین خریدی، گاؤں والوں نے انھیں پاگل سمجھا تھا کیونکہ اُس وقت تک اس زمین پر کسی قسم کی بھی کاشت نہ کی گئی تھی۔ جب وہ زمین میں ہل چلاتے راستے سے گزرنے والے کسان ان کی طرف دیکھ کر ہنستے تھے لیکن وہ اپنی دُھن کے پکے تھے۔ جیٹھ کی کڑی دھوپ میں وہ پسینے سے نہا جاتے، چہرہ سرخ ہو جاتا اور ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے۔ گاؤں کی کوئی شریر لڑکی ان سے کہتی۔

"بابو تو شہر واپس چلا جا! تیرے ہاتھ قلم پکڑنے کے لئے ہیں ہل چلانے کے لئے نہیں؟"

اور وہ مسکرا کر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتے رہتے ـــــ مگر ایک لڑکی ایسی بھی تھی، جب وہ اپنے کھیت میں بیج ڈالتے انھیں بیج ڈالنا سکھاتی، تپتی ہوئی دھوپ اور موسلا دھار بارش میں ان کے ساتھ کام کرتی۔ گاؤں والے کہتے ہیں ایک بڑی فوج کا جرنیل شکست کھا سکتا ہے مگر بابو صاحب شکست نہیں کھا سکتے! جب فصل پک کر تیار ہو گئی وہ لڑکی انھیں درانتی چلاتے ہوئے دیکھ کر مسکرا دیتی۔ پھر انھیں درانتی پکڑنا سکھاتی۔ شروع میں گاؤں والوں نے انھیں کنویں سے پانی تک لینے نہ دیا اور انھیں بہت تکلیفیں دیں مگر جب ان کی پہلی فصل تیار ہو گئی انھوں نے اپنی ضرورت کے لئے اناج رکھ کر باقی اناج گاؤں کے غریب کسانوں میں بانٹ دیا۔ پھر گاؤں والے دھیرے دھیرے انھیں پہچان گئے۔

کسی کا بچہ بیمار ہوتا تو وہ خود اُسے لے کر شہر چلے جاتے اور گاؤں والوں کو بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ دلاتے اور خالی اوقات میں دوسرے کسانوں کے کھیتوں میں چلے جاتے تاکہ وہ ان کا ہاتھ بٹا سکیں اور خود کچھ سیکھیں۔ وہ کسانوں کو اخبار پڑھ کر سنایا کرتے اور ضرورت کے وقت ہمیشہ ان کی مدد کرتے۔ پھر آہستہ آہستہ گاؤں والے انھیں چاہنے لگے۔

آج وہ ہم سے کہتے ہیں۔

"گاؤں کے یہ لوگ بہت معصوم ہیں! تم پیار کے دو میٹھے بول اِن کی جھولی میں ڈال دو پھر دیکھو یہ تمھاری جھولی پیار سے بھر دیتے ہیں!"

انھوں نے گاؤں والوں کو، غریب کسانوں کو جو قرض لیتے تھے ساہوکاروں کے پنجے سے چھڑا دیا۔ گاؤں میں کہیں آپ کو Fragmentation نہ ملے گا انھی کی کوششیں

ہے سرکاری دواخانہ اور سکول ہے اور یہاں تک بجلی کی روشنی بھی آگئی ہے۔ سارا گاؤں خوشحال ہے۔ گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ہر طرح کی چیز مناسب داموں میں ملتی ہے۔ آج گاؤں والوں کا اپنا ڈیری فارم ہے جہاں گاؤں والوں کو خالص دودھ ملتا ہے پھر بچا ہوا دودھ شہر چلا جاتا ہے۔ اب تو یہاں ایک ٹریکٹر بھی آگیا ہے۔ یہاں کے کسان ہمارے باس سے ٹریکٹر چلانا سیکھ رہے ہیں۔

"آپ گاؤں کے کسی شخص کے سامنے ان کا نام لیجئے وہ اُن کی عقیدت سے جھک جائے گا یہاں تک کہ وہ اُن کے لئے اپنی جان دینے میں بھی فخر محسوس کرے گا۔ آج سارے گاؤں میں اُن کی پرستش ہوتی ہے۔

"اور وہ کتنا رومانی منظر ہوتا ہے جناب! جب وہ اپنے کھیتوں میں بالکل ایک امریکی کسان کی طرح ٹریکٹر چلاتے ہوتے ہیں! وہی لڑکی جس کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے، اُن کے لئے اپنے سر پہ روٹی رکھے اور ہاتھ میں چھاچھ کا لوٹا لئے آتی ہے۔

"وہ دیکھ رہے ہیں آپ!" اُس نے دُور درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں ایک باؤلی ہے۔ جب وہ تھک جاتے ہیں تو اُس لڑکی کے ساتھ اُن درختوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں اور وہ لڑکی انھیں اپنے ہاتھوں سے روٹی کھلاتی ہے۔ پھر وہ تازہ دم ہو کر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔"

اُس کسان کے بارے میں اتنا کچھ سننے کے بعد میرے دل میں بھی اُس کے لئے عقیدت سی پیدا ہو گئی۔

اور اس سے پہلے کہ میں اُس نوجوان سے کچھ پوچھوں ایک کسان بھاگتا ہوا آیا۔

"بابو جی! جلدی چلئے۔ بابو جی کو ایک بیل نے مار کر زخمی کر دیا ہے۔"

"میرے ساتھ آیئے!" وہ نوجوان میرا ہاتھ پکڑ کر جیپ کی طرف لپکا۔

راستے میں گاؤں کے اُس کسان سے معلوم ہوا کہ وہ شخص جس کے لئے گاؤں والوں کے دلوں میں محبت تھی، شہر سے واپس آرہا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا معصوم بچہ کھیل رہا تھا۔ کسی طرف سے ایک بپھرا ہوا بیل آگیا اور اِس سے پہلے کہ بچہ بیل کے پاؤں میں آکر کچل جاتا، اُس شخص نے بچے کو ایک طرف دھکیل دیا۔ مگر بگڑے ہوئے بیل نے اُس شخص کو بُری طرح روند ڈالا۔

جب ہم وہاں پہنچے سارا گاؤں اُس شخص کے گرد جمع ہو کر رو رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا، میں ایک برتن لے کر اُن سارے آنسوؤں کو جمع کر لوں جو ہندو اور مسلمانوں کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے اور اُن لوگوں سے پوچھوں جو اُس عظیم ہستی کو مذہب کے نام پر گاؤں سے پانی نہیں لینے دیتے تھے، ان سے کہوں اِس برتن سے الگ کر سکتے ہو تو لے لو اپنے اپنے آنسو!

میں لوگوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا تاکہ اس عظیم انسان کو دیکھ سکوں اور اس سے پہلے کہ میں اس ہستی سے لپٹ سکوں، گاؤں کی وہی لڑکی بھیڑ کو چیرتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

تو یہ ہے وہ عظیم ہستی جو ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی تھی!

میں نے سوچا۔

منتھی! تم ڈاکٹر تو نہ بن سکے مگر ایک کسان بن کر بھی تم نے انسانیت کی بہت خدمت کی! میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے جیسے وہ مجھ سے کہہ رہے ہوں۔

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے!

---

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

---

# غزلیں

### یزدانی جالندھری

شگفتِ گل تری آواز ٹھہری ۔۔۔ نوا میری شکستِ ساز ٹھہری
ہو کس پر اعتمادِ راز داری ۔۔۔ نگاہِ شوق جب غماز ٹھہری
بگولوں کی طرح دشتِ وفا میں ۔۔۔ مری وحشت ہی سرافراز ٹھہری
یہ نیرنگِ لبِ اعجاز توبہ! ۔۔۔ کہ ہر جنبشِ حدیثِ راز ٹھہری
جبینِ شوق کے سجدوں کا حاصل ۔۔۔ کسی کی جلوہ گاہِ ناز ٹھہری
لیا ہے گردشِ دوراں نے کب دم ۔۔۔ کہاں یہ خانہ بر انداز ٹھہری
دمِ آخر سکونِ دل ملا ہے ۔۔۔ ہماری موت ہی دم ساز ٹھہری
قفس میں قیدِ تنہائی کا باعث ۔۔۔ مری کوتاہیٔ پرواز ٹھہری
فرازِ طور سے دار و رسن تک ۔۔۔ وفا میری ہی سرفراز ٹھہری
منتقی! تیرا فن محتاج و رسوا ۔۔۔ کرے تیری گدائے ساز ٹھہری

ترے یزدانی مضطر کی ہستی
امانت دارِ سوز و ساز ٹھہری

### اختر واصفی

بس جان لو کہ ہے یہی شیطان دوستو ۔۔۔ جو آدمی بھی تم کو فرشتا دکھائی دے
ہم جانتے ہیں وہ بھی ہمارا رقیب ہے ۔۔۔ اُس کی گلی سے جو بھی نکلتا دکھائی دے
اِس تیز روشنی میں تو چلنا محال ہے ۔۔۔ کچھ تو دیئے بجھاؤ کہ رستا دکھائی دے
بحرِ جہاں میں ہم ہیں وہ گرداب آشنا ۔۔۔ جن کو ہر ایک موج سفینا دکھائی دے
ہو جس کے پاس دردِ نہاں کا مرے علاج ۔۔۔ لاؤ کہیں جو ایسا مسیحا دکھائی دے
مشکل تو ہے یہی کہ تجھ ایسا نہیں کوئی ۔۔۔ پوجوں نہ کیوں اُسے جو تجھ ایسا دکھائی دے
سو رنگ سے نہاں ہیں پسِ پردہ بھی ہر رخ ۔۔۔ پردہ کبھی جو اُٹھے تو کیا کیا دکھائی دے
سُنتے ہیں شور جس کی بڑائی کا دہر میں ۔۔۔ دیکھیں اگر ٹٹول کے چھوٹا دکھائی دے
رہ کر وطن میں بھی یہی حسرت رہی ہمیں ۔۔۔ اے کاش کوئی شخص شناسا دکھائی دے

میلہ لگا ہوا ہے مگر پھر بھی ہر کوئی
اختر بھرے جہان میں تنہا دکھائی دے

# قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

| | | |
|---|---|---|
| آتشِ گل | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| کلیاتِ اقبال | ڈاکٹر اقبال | چھ روپے |
| جنون و ہوش | جوش ملسیانی | چار روپے |
| ہفت رنگ | عرش ملسیانی | تین روپے |
| آہنگِ حجاز | ۔ | ایک روپیہ |
| سحرِ غزل | ساحر ہوشیارپوری | تین روپے |
| دستک | نریش کمار شاد | دو روپے ۲۵ پیسے |
| پھوار | ۔ | دو روپے ۵۰ پیسے |
| فکار | ۔ | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قاشیں | ۔ | تین روپے |
| آیاتِ جنوں | | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| سنگم | ۔ | تین روپے |
| رباعیاتِ محروم | تلوک چند محروم | تین روپے ۷۵ پیسے |
| گنجِ معانی | ۔ | سات روپے ۵۰ پیسے |
| رُوپ | فراق گورکھپوری | تین روپے ۵۰ پیسے |
| رمز و کنایات | ۔ | تین روپے ۵۰ پیسے |
| شعلہ | ۔ | دو روپے ۷۵ پیسے |
| بیکراں | جگن ناتھ آزاد | چار روپے ۵۰ پیسے |
| ستاروں سے ذروں تک | ۔ | دو روپے ۷۵ پیسے |
| کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی (اوّل) | اکبر الٰہ آبادی | پانچ روپے |
| حصہ دوم | ۔ | چھ روپے |
| کلیاتِ اختر شیرانی | اختر شیرانی | آٹھ روپے |
| رعنائیاں | شکیل بدایونی | تین روپے |
| صنم و حرم | ۔ | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گلِ رعنا | [illegible] | تین روپے ۵۰ پیسے |
| شبنم شبنم | کرشن موہن | پانچ روپے |
| دلِ ناداں | ۔ | چھ روپے |

| | | |
|---|---|---|
| خرابات | عبدالحمید عدم | چار روپے |
| رمِ آہو | ۔ | چار روپے |
| گلنار | ۔ | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قول و قرار | ۔ | تین روپے ۵۰ پیسے |
| گردشِ جام | ۔ | دو روپے ۲۵ پیسے |
| بطِ مے | ۔ | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گجر | قتیل شفائی | تین روپے |
| رسالت مآب | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| اسلام اور عورت | مولانا مظہر الدین | تین روپے |
| نماز کیا ہے | مولانا محمد علی | دو روپے ۲۵ پیسے |
| نیا نو دن | راشد سہسوانی | پانچ روپے ۷۰ پیسے |
| غم دوئے مستقل | انیس مرزا | چار روپے ۵۰ پیسے |
| شرارت | جمیل انجم | تین روپے |
| عشق اور خون | رائیڈر ہگرڈ | سات روپے |
| سو کا ساون | انیس مرزا | دو روپے ۵۰ پیسے |
| محبت اور جرم | انور کمال حسینی | دو روپے ۷۵ پیسے |
| فن اور تنقید | ۔ | چار روپے ۵۰ پیسے |
| نوائے دل | منشاء الرحمٰن خاں منشاء | دو روپے ۵۰ پیسے |
| شاہنامۂ اسلام | حفیظ جالندھری | نو روپے ۰۰ ۔ روپے |
| تلامذۂ غالب | مالک رام | سات روپے ۷۵ پیسے |
| یادیں | اختر الایمان | چھ روپے |
| مضراب | شباب للت | تین روپے |
| تماشائی | کرشن موہن | ایک روپیہ |
| روپ رس (ہندی رسم الخط میں) | ۔ | ایک روپیہ |
| نگاہِ ناز | ۔ | ایک روپیہ |
| تبسمِ غم | وسیم بریلوی | دو روپے ۵۰ پیسے |
| دیوانِ مصحفی | مرتبہ: نور نقوی | بارہ روپے |

**آئینۂ اطلاع** [illegible] سوم پر [illegible] اس کتاب [illegible] مبتدی [illegible] نہ جاننے والے شعراء کے لئے [illegible] قیمت تین روپے۔

**کفر و ایمان** پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت اختر کا نام ہی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے کلام میں اختر کے نشتروں کے ساتھ درد مند دل کی گرمی بھی ہے قیمت چار روپے۔

**شاہنامۂ اسلام** جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں جن میں تیرہ سو سال اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے تقسیم کے بعد چھپا ہے قیمت سولہ روپے اب صرف نو روپے میں پیش کیا جا رہا ہے محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

**مضراب** شباب للت کے ایک ایک شعر میں اُس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اُس نے سارے جہان کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

**گردِ راہ** ضیا فتح آبادی کا چوتھا مجموعۂ کلام ضیا ایک صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ اُن کے [illegible] لب و لہجہ میں انفرادیت و ندرت ہے۔ قیمت [illegible]

**آوازیں** اُبھرتے ہوئے جواں سال شاعر [illegible] کی غزلیات اور نظموں کا مختصر مجموعہ [illegible] چاشنی کے ساتھ ساتھ آپ کی اپنی آواز [illegible]

**چاندنی اساڑھ کی** راج نرائن راز کی [illegible] لوک گیتوں کی [illegible] تازگی اور شگفتگی۔ ان میں [illegible] بھی ہے۔ سر رنگا کر [illegible] اعلیٰ۔ قیمت صرف تین روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

طنزیہ

# خط لکھیں گے...

فکر تونسوی کے طنزیہ خطوط کا سلسلہ ۷

## شری ڈھولک داس جی چیف منسٹر کے نام

شریمان جی!

اُس دن اشوکا ہوٹل میں چمکتی ہوئی چھری سے مُرغِ مُسلّم کی ایک ٹانگ چیرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ ہمارے عوام کُتّوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں میں اُس وقت خاموش رہا۔ کیونکہ مجھے آپ سے ایک کافی ذلّت انگیز کام نکالنا تھا لیکن جب میرا کام نہیں نکل سکا تو مجھے بے حد اشتعال آیا کہ آپ نے عوام کو کُتّا کہہ کر اپنی پست قامت ہیکڑی کا ثبوت دیا تھا۔ مُرغِ مُسلّم کی ٹانگ چیر کر کھانے والے کو کوئی حق نہیں کہ وہ عوام کے افلاس پر آنسو بہائے۔ اگر آپ دہلی میں آکر سلم ایریا کی کسی جھونپڑی میں قیام فرماتے تو آپ کو چیف منسٹری کی گدی سے کوئی اُتار نہ دیتا۔ تم وزیر لوگ سب فراڈ ہو۔ دو رُخے ہو مکّار ہو، بدنیت ہو، کرپٹ ہو، نالائق ہو، بے دین ہو، بے شرم ہو، بے . . . (باقی خالی جگہیں خود پُر کر لو)

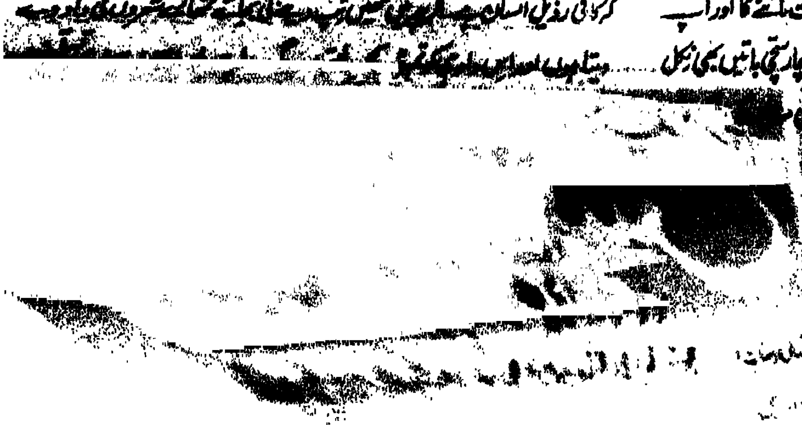
یہ خط صرف غصّے کے عالم میں لکھ دیا ہے۔ اِس لئے بُرا مت مانئے گا اور آپ جانتے ہیں غصّہ انسان کو پاگل کر دیتا ہے اور پاگل کے مُنہ سے دو چار سچی باتیں بھی نکل جاتی ہیں ـــــ آپ دہلی کب آ رہے ہیں تاکہ آپ سے اپنی گستاخی کی [illegible]

ـــ ہے ہو لیکن تمھاری عادتیں تو تم نے خود ایجاد کی ہیں۔ اُن کی ذمّے داری تو برہمن پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ مثلاً تم گاہکوں کو اپنے شعر سُناتے ہو۔ ظالم! اگر تمھیں شاعری ہی کرنا تھی تو بیرے کیوں بنے پھرتے ہو، شاعر بنو۔ شاعروں کی طرح کافی ہاؤس میں آیا کرو۔ بیرے کو آرڈر دیا کرو اور پھر کافی کے ایک ایک گھونٹ پر ایک ایک شعر اُگلا کرو تاکہ تمھارے شعروں کی پرچھائیاں تمھاری روح کی غمّاز بن کر کافی ہاؤس کی ایک ایک چیز پر جاکر سیاپا کریں اور کائنات کی نامکمّل تمنّاؤں کے نوحے پڑھا کریں۔

لیکن دولت رام! معاف کرنا دوست! تم بیک وقت بیرے بھی ہو اور شاعر بھی۔ دُنیا کو بیک وقت سموسے اور پکوڑے بھی سپلائی کرتے ہو اور شعر بھی۔ یہ دو رنگی چھوڑ دو کیونکہ اِس کا اثر تم پر نہیں مجھ پر پڑتا ہے یعنی میں بطور شاعر تمھاری عزّت کرنا چاہتا ہوں مگر بطور بیرا تمھیں بے عزّت کرنا چاہتا ہوں۔ نتیجہ یہ کہ نہ میں تمھاری عزّت کر سکتا ہوں نہ بے عزّتی جب بھی تمھیں ٹپ [illegible]

یہ لکھتا ہوں تو ہاتھ کانپ جاتا ہے کہ میں ایک شاعر کو ٹپ [illegible] کر رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے تمھیں کبھی ٹپ نہیں دی۔ نہ جانے تم میرے متعلق کیا سوچتے ہوگے کہ کافی رذیل انسان ہے [illegible]

[illegible]



## کافی ہاؤس کے بیرے کے نام

دولت رام!

سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ اگر تم بھی دولت [illegible]

کہیں تمھارے ہوٹل کے مالک کا [illegible]

[illegible]

دو صرف سے بدل [illegible]

[illegible]

کبھی برہمن سے رکھوا [illegible]

[illegible] شہر میں، قصبے میں، کسی بنگلے میں

ے تمھیں دل دیا ہے تمھارے دیدار سے محروم ہوں۔

ہمارا ایڈریس معلوم نہیں ہے اور تمھاری پرابلم یہ ہے کہ

[illegible] مہدی دہلی

لونڈے کو دو چار کرارے گھونسے جماتے تھے جو بلیک میں فلم کی ٹکٹیں بیچ رہا تھا۔ اُس وقت بے اختیار میرا جی چاہا تھا کہ تمھیں بھی دو چار گھونسے جمادوں۔ کیونکہ میری ان گنہگار آنکھوں نے کئی مرتبہ دیکھا ہے کہ تم بھی بلیک میں ٹکٹیں بیچا کرتے ہو۔ لیکن میں تمھیں گھونسے نہیں لگا سکا۔ کیونکہ اُس وقت تم ایک سرکاری ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔ تم قانون کی حفاظت کر رہے تھے اور ایک مجرم کو سزا دے کر ایک بھلا کام کر رہے تھے۔

لیکن پیارے تلسی رام! کیا یہ بھی ایک بھلا کام نہیں ہوگا۔ اگر تمھیں بھی اُسی جرم میں وہی سزا دی جاتی جو اُس لفنگے لونڈے کو مل رہی تھی۔ میں مانتا ہوں کہ تم لفنگے نہیں ہو۔ تمھاری تنخواہ کم ہے۔ اِس کمی کو تم بلیک کی ٹکٹوں کے ذریعے پورا کر رہے ہو۔ ایک جرم کر کے تم اپنے افلاس کے رِستے ہوئے بچے کو چھپا دیتے ہو۔ ہمارے یہاں افلاس کوئی جرم نہیں ہے مگر افلاس کو چھپا کر جیب بھرنا جرم ہے۔ لیکن تلسی رام! جرم بہرکیف جرم ہے اور اس اعتبار سے تم میں اور لفنگے لونڈے میں کوئی فرق نہیں رہا۔ قانون کا محافظ اور قانون شکن دونوں جب ایک سطح پر آجائیں تو سماج کا ڈھانچہ لڑکھڑانے لگتا ہے۔ اس لیے تم نے دُہرا جرم کیا ہے۔ ایک تو بلیک میں ٹکٹیں بیچیں اور دوسرے اس جرم کو چھپالیا۔ میں تمھارا یہ دُہرا جرم بھی برداشت کر لیتا اگر تم اُس لفنگے لونڈے کو گھونسے نہ جماتے۔ ایک مجرم کو کوئی حق نہیں کہ اپنے ساتھی مجرم کو سزا دے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم مجرموں کو سزائیں دینے کا رواج چھوڑ دو۔ قانون شکنی اور قانون کی حفاظت دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ تم اپنے افلاس کا علاج کرتے چلے جاؤ۔ اس سے زیادہ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لونڈے کو گھونسے لگاتے وقت تم نہایت بھونڈے لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا تم تکلف کر رہے ہو، اپنے آپ سے جھوٹ بول رہے ہو۔ قانون کو مضحکہ خیز بنا رہے ہو۔ اپنی ضمیر کو . . . معاف کرنا، ضمیر کا ذکر میں نے خواہ مخواہ چھیڑ دیا۔ کیونکہ ضمیر تو افلاس میں مرجایا کرتی ہے —— مرجاتی ہے نا تلسی رام!

## بُل ڈاگ کے نام —— ●

مکرمی و محترمی بُل ڈاگ صاحب!

اجازت ہو تو حضور کی خدمت میں ایک دو باتیں عرض کروں!

مجھے اِس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ تم نے سیٹھ گھامڑ چند جی کے ہاں سروس کیوں کر لی۔ لیکن مجھے یہ اعتراض ضرور ہے کہ تم نے ایک غریب آدمی کی روزی پر لات ماری ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ تم سے پہلے سیٹھ جی کی کوٹھی کے باہر ایک گورکھا چوکیدار تعینات تھا۔ جو اگرچہ تمھاری طرح بھیانک تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بلاوجہ ہر وزیٹر پہ جھپٹتا نہیں تھا (تمھاری طرح) اُس نے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کیا اور اِس جرم میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ سیٹھ گھامڑ چند نے اُس کی جگہ تمھیں ملازم رکھ لیا کیونکہ تم تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ نہیں کرتے اور پھر سیٹھ جی نے یہ افواہ بھی سُن رکھی تھی کہ کتے انسان سے زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔ ایسی افواہ گورکھا چوکیدار کے متعلق کبھی نہیں اُڑی تھی۔ حالانکہ وہ تم ایسے جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارتا تھا۔

جنابِ بُل ڈاگ! تم سیٹھ جی کے خزانے اور مال و متاع کی حفاظت کرتے ہو۔ اگرچہ لوٹ کھسوٹ کے مال و متاع کی حفاظت کرنا کوئی شرافت نہیں ہے۔ لیکن نوکری آخر نوکری ہے۔ نوکری کا اخلاقی قدروں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ گورکھا چوکیدار بھی تو لوٹ کے مال کی حفاظت پر مامور تھا۔ اس لیے جو جرم ایک انسان کر سکتا ہے کتا کیوں نہیں کر سکتا۔ لیکن مسٹر بُل ڈاگ! تم میں اور گورکھا چوکیدار میں ایک بنیادی فرق ہے کہ گورکھا اپنی محنت کا حق حاصل کرنے کے لیے چیخ چلا سکتا تھا۔ تم سے یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے تم احمق ہو، بے غیرت ہو، بے شعور ہو اور سیٹھ گھامڑ چند تمھاری اس بیچارگی اور مجبوری کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ حالانکہ کام تم وہی کرتے ہو جو گورکھا چوکیدار کرتا تھا۔ یعنی چور کے مال کو چور کے ہاتھ سے بچاتا تھا۔ کام دونوں کا مشترک ہے لیکن معاوضہ دونوں کا

تنگ آچکے ہو اور جانتے ہو اس سے انسانی محنت کی قیمت مارکیٹ میں کتنی گر گئی ہے۔ تم انسانوں کے مقابلے پر انسانوں ایسے کام کرنے لگے۔ انسانوں کی مارکیٹ میں تمہارے داخل ہونے سے سخت کمپی ٹیشن شروع ہوگیا اور سیٹھ جی نے گورکھا چوکیدار کو لات مار کر باہر نکال دیا اور تم بڑی بے حیائی کے ساتھ اس کی جگہ پر تعینات ہوگئے۔ تمہارا یہ اقدام انتہائی نازیبا اور غیر انسانی بھی!

میں نہیں جانتا میرے اس خط کا تم پر کوئی اثر ہوگا یا نہیں۔ لیکن تمہیں ساری صورتِ حالات سمجھانا میرا فرض تھا جو میں نے پورا کر دیا۔ وہ گورکھا چوکیدار تم سے سخت ناراض ہے اور مجھے شک ہے کہ وہ کسی دن غصے میں آکر تمہارے دانت توڑ دے گا۔ ذرا بچ کے رہنا۔ بے روزگاری بہت بری چیز ہوتی ہے مسٹر!

## لالہ جھینگر داس کے نام ——●

جھینگر جی! پالاگن

آپ ہر مہینے کی پورنماشی کو اپنے گھر میں بھگوتی جاگرن کرواتے ہیں۔ ڈھول تاشے، گھنگھرو، مُرلیاں، ہارمونیم، چمٹے، لاؤڈ سپیکر—— یعنی بھگوتی کو رجھانے کے لئے آپ خاصے شور و غل کا سامان مہیا کر لیتے ہیں۔ میں مقدس بھگوتی کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس سے خوش ہوتی ہے یا نہیں لیکن اہلِ محلّہ کے متعلق میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے حد نالاں ہیں۔ رات بھر ان کی نیند حرام ہوجاتی ہے۔ پہلے وہ مچھروں سے تنگ تھے اب جاگرن سے بھی تنگ ہیں۔ مچھروں کے علاج کے لئے تو وہ مچھر دانی لے آتے ہیں۔ لیکن جاگرن کی مچھر دانی ابھی ایجاد نہیں ہوئی۔ آپ بھگوان کی بھگتی کریں یہ ایک نیک فعل ہے۔ آپ موٹر پارٹس کی بلیک کرتے ہیں یہ بھی کوئی برا فعل نہیں۔ بھگتی اور بلیک میں آپ ایک ناطہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ کوشش بھی کوئی خاص غلط نہیں۔ لیکن بھگوان کے لئے (جن کے آپ بھگت ہیں) شانتی اور خاموشی کے ساتھ بھگتی کیا کیجئے۔ بلیک کے کارن آپ کے من میں جو ہیجان رہتا ہے، اسے آپ شانت کرنا چاہتے ہیں تو لاؤڈ سپیکر بجا بجا کر کیوں شانت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آپ کو کسی نے انتہائی غلط اطلاع دی ہے کہ ڈھول تاشوں اور لاؤڈ سپیکروں سے من کا ہیجان کم ہوجاتا ہے۔ اوں ہوں جھینگر داس جی! شور و غل مچا کر محلّے والوں کو یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ آپ بھگوان کے بھگت ہیں۔ محلّے والے موٹر پارٹس کی بلیک ہرگز نہیں کرتے۔ ان کے من میں کوئی ہیجان نہیں۔ اپنے ہیجان کو شانت کرنے کے لئے پڑوسیوں کو اشانت مت کیا کیجئے۔

ویسے بائی دی وے، کبھی بھگوان سے بھی پوچھ لیا کیجئے کہ وہ آپ کی غل غپاڑے والی بھگتی سے خوش ہے یا دکھی۔ میرا مطلب ہے رسک (RISK) کیوں لیتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی ساری بھگتی ضائع چلی جا رہی ہو اور آپ اس وہم میں ہوں کہ معاملہ بڑا "ہٹ" جا رہا ہے۔

## ان دیکھی محبوبہ کے نام ——●

جانِ من!

میں نہیں جانتا تم کہاں رہتی ہو؟ کس شہر میں، قصبے میں، کسی بنگلے میں یا سلم ایریا میں؟ جب سے میں نے تمہیں دل دیا ہے تمہارے دیدار سے محروم ہوں۔ میری پرابلم یہ ہے کہ مجھے تمہارا ایڈریس معلوم نہیں ہے اور تمہاری پرابلم یہ ہے کہ

# غزل

### بیتاب پیلی بھیتی، ایم۔ کام

شاہراہوں میں ہو خواب گاہوں میں ہو شہرِ حسنِ تمنا کی باہوں میں ہو
میری غزلوں میں ہو میرے گیتوں میں ہو میری فکر و نظر کی پناہوں میں ہو
میری فریاد میں میرے نالوں میں ہو میرے اشکوں میں ہو میری آہوں میں ہو
دل کی دھڑکن میں تم میری سانسوں میں تم تم مرے پاس ہو میری باہوں میں ہو
تم سمجھتے نہیں ہو اگر کچھ ابھی مجھ سے پوچھو بہ اندازِ عشوہ گری
تم ہی تم چاند تاروں کی محفل میں ہو تم ہی تم حسن کی جلوہ گاہوں میں ہو
عشق کے عجز و تسلیم سے ہے یہ سب غمزہ و ناز و عشوہ ادا بے رخی
عشق خوددار ہو تو یقیں مانئے حسن بھی عشق کی بارگاہوں میں ہو
سادگی میں کہوں یا اسے حسنِ ظن، کچھ بھی ہو یہ حقیقت مگر تلخ ہے
میرے خوں میں ڈبو کر بھی تم انگلیاں یہ سمجھتے رہے بے گناہوں میں ہو
حادثاتِ زمانہ کا رخ موڑ دوں، پھر تو میں وقت کی گردشیں روک دوں
مجھ کو اتنا یقیں ہو تمہاری قسم، تم مرے دوست ہو خیر خواہوں میں ہو
کون بیتاب ہو اب مرے واسطے، دل پریشاں تو ہے کون تسکین دے
کس کی نظریں اٹھیں میرے غم کی طرف صرف شوقِ ستم جب نگاہوں میں ہو

تمھیں میرے عشق کی کوئی اطلاع نہیں۔ رات کی کالی گہری تنہائیوں میں خواب کے رنگین پروں پر اُڑ کر تم آجاتی ہو اور ہم دونوں خواب ہی خواب میں پھولوں اور خوشبوؤں اور رنگوں کے جزیرے میں پہنچ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی نگاہوں میں ڈوب جاتے ہیں، کھو جاتے ہیں۔ اس حد تک کھو جاتے ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے سے ایڈریس پوچھنا بھی بھول جاتا ہے۔ یہ ہماری حماقت ہے ڈارلنگ! ہم نے کبھی ایک دوسرے کا نام تک نہیں پوچھا، نہ مالی حالت کا تذکرہ کیا۔ عشق میں دیوانگی شاید اسے ہی کہتے ہیں۔

اور پیاری! جب رات بھی جاتی ہے تم بھی چلی جاتی ہو اور میں دن کی چکاچوند روشنی میں اکیلا رہ جاتا ہوں۔ تمھارے ہجر میں آنسو بہاتا ہوں، فلمی گانے گاتا ہوں، آہیں وغیرہ بھرتا ہوں۔ تمھارے بغیر سگریٹ کے کش میں بھی لذت نہیں رہتی۔ پاگلوں کی طرح گھر سے باہر نکل آتا ہوں۔ راہ چلتی ہر حسینہ کی طرف لپکتا ہوں کہ شاید تم مجھے پہچان کر رک جاؤ۔ اس سلسلے میں ایک دو حسیناؤں سے سینڈل بھی کھائے۔ لیکن آہ! تم نہیں ملیں۔ نہ جانے تم اس شہر میں رہتی بھی ہو یا نہیں۔ کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ تمھارا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ تم نے ابھی جنم ہی نہیں لیا۔ تم صرف ایک روح ہو جو جسم کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے رات کو میرے خوابوں کی وادی میں آن اُترتی ہو۔

لیکن اے میرے خوابوں کی ملکہ! اب میں تم سے تنگ آگیا ہوں۔ خدا کے لئے میرے خوابوں میں مت آیا کرو۔ اگر آنا ہو تو دن میں آؤ، ٹیلی فون کرو، نامۂ محبت لکھو۔ اگر تم سے یہ نہیں ہو سکتا تو جہنم میں جاؤ۔ مجھ سے عاشقانہ تعلقات توڑ دو اور کسی دوسرے کو نشانہ بناؤ۔ محلے میں آخر اور بھی کئی عاشق پڑے ہیں، اکیلے میں تھوڑا ہوں۔

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیل ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶ لکھنا کافی ہے۔ منیجر

## مُفت حاصِل کیجئے

**صحت اور جوانی**

صحت و جوانی اور حسن و شباب کے وہ رموز جنھیں جاننا آپ کے لئے نہایت ضروری اور مفید ہے، اس کتاب میں عام فہم زبان میں تفصیل کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ اپنے ایسے راز بیان کئے گئے ہیں جنھیں جاننے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ آپ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ کتاب اشتہارات سے پاک ہے محض بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لئے مفت تقسیم کی جارہی ہے۔ آپ بھی خط لکھ کر بلاقیمت منگوا سکتے ہیں۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶

## قابلِ مُطالعہ معیاری کتب

| | | |
|---|---|---|
| سیرتِ خاتم الانبیاء | مولانا محمد شفیع صاحب | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| سوشلزم | پرنسپل چھبلداس | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| وہ ایک لمحہ جاوداں | کشور زیدی | دو روپے |
| اردو | جگن ناتھ آزاد | پچاس پیسے |
| تعلیم دینے کا فن | ڈاکٹر منوہر سہائے انور | تین روپیہ پچاس پیسے |
| ذوقِ جنوں | آل احمد سرورؔ | تین روپے پچاس پیسے |
| رشیدہ کی کشیدہ کاری | | تین روپے پچاس پیسے |
| شبنم کشیدہ کاری | | ایک روپیہ |
| شمع کشیدہ کاری | | چار روپے پچاس پیسے |
| قدسیہ کشیدہ کاری | | ایک روپیہ |
| دلہن کشیدہ کاری | | دو روپیہ پچاس پیسے |
| بیگم کشیدہ کاری | | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| گلشن کشیدہ کاری | زینب انور | دو روپیہ |

| | | |
|---|---|---|
| سموم و صبا | جوش ملیح آبادی | آٹھ روپے |
| شکوہ جواب شکوہ | ڈاکٹر اقبال | پچیس پیسے |
| بالِ جبریل | " | تین روپے پچاس پیسے |
| انجمنِ در گرفتہ | جوش ملسیانی | دس روپے |
| نقشِ فریادی | فیض | دو روپے پچیس پیسے |
| آہنگِ حجاز | عرش ملسیانی | ایک روپیہ |
| ہفت رنگ | عرش ملسیانی | تین روپے |
| قول و قرار | عبدالحمید عدم | دو روپیہ پچاس پیسے |
| رنگ و آہنگ | " | ایک روپیہ |
| آہنگ | مجاز | تین روپے |
| شگفتہ | ساغر نظامی | بارہ روپے |
| گلستانِ ہزار رنگ | سید بہار الدین | د.۳ روپے |
| سنگم | نریش کمار شادؔ | تین روپے |

| | | |
|---|---|---|
| سرگذاور وارد | نریش کمار شاد | دو روپے پچاس پیسے |
| پھوار | " | دو روپے پچاس پیسے |
| دھنک | " | دو روپے پچیس پیسے |
| ڈارلنگ | " | دو روپے پچاس پیسے |
| آتشِ گل | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| صنم و حرم | شکیل بدایونی | ایک روپیہ |
| رعنائیاں | " | تین روپے پچاس پیسے |
| گفتنی | مخمور سعیدی | دو روپے |
| گلِ رعنا | برج لال رعنا جگی | تین روپے پچاس پیسے |
| دلِ ناداں | کرشن موہن ایم اے | چھ روپے |
| شبنم شبنم | " | پانچ روپے |
| تماشائی | " | ایک روپیہ |
| گرد راہ | ضیا فتح آبادی ایم اے | تین روپے پچاس پیسے |
| ساز و نغمہ | بسمل کپور تھلوی | تین روپے |
| آہنگِ حیات | پروفیسر نشاط الرحمان خاں نشاط | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |

ملنے کا پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

# افسانہ نمبر دیکھا

## اہلِ قلم حضرات کی رائیں

. . . آپ کے ہاتھ چُوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ افسانہ نمبر صرف خوبصورت ہی نہیں معیاری بھی ہے۔ کچھ سرکاری اور نیم سرکاری رسالے تو قیمت دے کر بھی اتنا مواد نہیں خرید سکتے۔ ہزاروں روپے رائلٹی دے کر بھی وہ اتنا بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ ایسے کارنامے تو صرف محبت اور خلوص سے سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔ "بیسویں صدی" میں لکھنے والوں کی محبت ہر چیز میں جھلکتی ہے۔ اِس دُلہن کو سنوارنے اور سجانے میں جانے آپ کی اور آپ کے فنکاروں کی کتنی دھڑکنیں شامل ہیں۔ تاج محل پیسے سے نہیں محبت سے تعمیر ہوا تھا . . .

پُشکر ناتھ (سری نگر)

---

. . . شعر و ادب کا یہ خوش رنگ اور اچھوتا شاہکار اِس حقیقت کا معترف ہے کہ دُنیائے صحافت کی جن بلندیوں پر آپ پہنچ چکے ہیں وہاں کی گرد بھی دوسروں کو نہیں ملی۔ جاں نثارِ "بیسویں صدی" آپ کی پُرخلوص شخصیت کے چاروں طرف اِس طرح منڈلاتے ہیں جیسے شمع پر پروانے! ـــــ جذبۂ اُردو دوستی، خدمت، لگن، شرافت اور انسانیت کی سچی تصویر اگر کسی کو دیکھنا ہو تو میں تو یہی کہوں گا کہ وہ صرف آپ کو دیکھے اور پھر کہے کہ خلوص کا فقدان ہے؟ انسانیت اور شرافت عنقا ہیں؟ میرا یقین ہے اُس کو اپنا خیال بدلنا پڑے گا . . .

(پروفیسر) بیتاب سینی بھیتی

---

. . . اِس بار بھی افسانہ نمبر بے حد خوبصورت اور بلند پایہ ہے ـــــ میں اِس کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں ڈوبا ہوا ہوں . . .

(پروفیسر) حامدی کاشمیری (سرینگر)

---

. . . آپ کے خاص نمبر میری نظروں سے مسلسل گزر رہے ہیں اور میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتی ہوں کہ ہر خاص نمبر اپنے پیشرو سے کہیں زیادہ حسین و جاذبِ نظر ہوتا ہے! خدا آپ کی سعی مشکور فرمائے۔ پرچے کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے! شاید آپ ہی کی کوششوں سے غریب و مظلوم اُردو کو اُس کا اپنا مقام مل جائے . . .

عفت موہانی (حیدرآباد)

---

. . . آپ نے جس خوبصورتی کے ساتھ ادب پاروں کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اِس معاملے میں اُردو صحافت میں کوئی آپ کی ہمسری نہیں کرسکتا . . .

مدثر حسین رضوی (امروہہ)

---

. . . توقعات کے مطابق یہ شمارہ بھی تخلیقات کے معیار، حُسنِ ترتیب اور رنگا رنگ عنوانات کے اعتبار سے اُس معیار کے عین مطابق ہے جو گزشتہ تیس برس کے طویل عرصے میں "بیسویں صدی" نے قائم کیا ہے۔ ادبی ماہناموں کی تاریخ میں ایسی مثال مشکل ہی سے ملے گی اور اِس میں شک نہیں کہ تقسیمِ وطن کے بعد "بیسویں صدی" کا باقاعدگی سے آب و تاب کے ساتھ شائع ہونا اُردو زبان کی ایک بڑی گراں قدر خدمت ہے۔ توقع ہے کہ حسبِ سابق اِس خصوصی شمارہ کا بھی علمی اور ادبی حلقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا . . .

بہار برنی (روزنامہ الجمعیت دہلی)

---

. . . افسانہ نمبر دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ اگر یہ نمبر پاکستان آیا ہوتا تو ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں اور پھر بھی سینکڑوں لوگ محروم رہ جاتے۔ خدا کرے کہ ہند و پاک میں اچھے پڑوسیوں جیسے تعلقات ہو جائیں اور دونوں ملکوں کے عوام سگے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگیں، اور دونوں طرف سے رسائل کی آمد و رفت بحال ہو جائے، آمین، ثم آمین ـــــ افسانہ نمبر میں عنوان چشتی کی جو غزل چھپی ہے وہ جون سنہ رواں کے "مجلس" لاہور میں چھپ چکی ہے۔ "بیسویں صدی" کے ساتھ یہ غیر ذمّے دار لوگ یہ غیریت کا برتاؤ کیوں کرنے لگے ہیں۔ آپ اِس معاملے میں انتہائی سخت ہیں پھر بھی بعض پست فطرت آپ کو فریب دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں . . .

حباب ترمذی (کراچی)

---

. . . انتہائی دلکش، جاذبِ نظر اور شاندار افسانہ نمبر دیکھ کر مسرت و شادمانی کی شمعیں جل اٹھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اِس نمبر نے شعر و ادب کی شاہراہ کو تابناک اور درخشاں بنا دیا ہے تو اِس میں مبالغہ کی گنجائش نہیں . . .

حفیظ مالیگانوی۔ مالیگاؤں (ناسک)

# مُلک کے مایۂ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے نئے شاہکار ناول

## جنھیں ادارۂ بیسویں صدی نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے

- جب سائنس کے بل بوتے پر چاند، مریخ اور دوسرے سیاروں تک پہنچنے کا تجربہ مکمل ہو جائے گا۔
- جب مرد نہ صرف عورت بلکہ ماں بن کر اولاد کی پرورش کریں گے۔
- جب پورا نظامِ زندگی حُسن و شباب، ادّیت و رعنائی کے زیرِ نگیں ہو جائے گا۔
- جب عورت، مرد کے پنجۂ اقتدار سے آزاد ہو کر معاشرے پر چھا جائے گی۔

اُردو ادب میں ایک انوکھا تجربہ۔ حیرت انگیز واقعات پر مشتمل ایک دل فریب ناول

## فریدہ موہنی (ناول)

حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جُرم تھا۔

صدیوں بعد کی فضاؤں میں لکھی ہوئی عجیب و غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاند پوری کا لکھا ہوا بے حد شوخ دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضا میں پرواز کراتا ہے۔ اور نئی زندگی کا سنگِ بنیاد رکھتا ہے۔ انتہائی دلکش اور شگفتہ اندازِ نگارش۔ جاذبِ نظر کتابت و طباعت، بہترین کاغذ، دیدہ زیب سہ رنگا گرد پوش۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

## نئے فرہاد

جناب پروفیسر شکیل الرحمٰن ایم اے کا اچھوتا شاہکار ناول ایک بڑی شوگر فیکٹری کے منیجر کی ہوسناکیوں اور حُسن پرستیوں کی بھیانک تصویر جس نے بہارِ حُسن و شباب کو خوش آمدید کہتی ہوئی نازک اور معصوم کلیوں کو سنہری، روپہلی سکّوں کی جھنکار کے بل پر رقص و نغمہ اور شراب و شعر کے طوفان میں غرق کر کے گناہ پر مجبور کر دیا۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے اسٹیج پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دل چسپ کہانی جو آپ کے دل و دماغ پر چھا جائے گی شکیل الرحمٰن کے اسٹائل میں انکی انفرادیت کی جاذبیت ہے حُسن ہے، زور ہے، جوش اور شگفتگی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک تیز اور شفاف چشمہ بہہ رہا ہے اور اُس کا بہاؤ ہمیں اپنے ساتھ بہا لے جائے گا بہترین کتابت و طباعت عمدہ کاغذ، دیدہ زیب ڈسٹ کور۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

فرانس کے عظیم ترین ناول نگار اینے پر یوس کا غیر فانی شاہکار

## راہیں شباب کی

- جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔
- جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔
- جسے عشق و محبت کی بے نظیر داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔
- جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارۂ "بیسویں صدی" نے شائع کیا ہے۔
- جس کی اشاعت پر پیرس کے رنگین ماحول میں ایک زلزلہ آ گیا۔
- جسے نوخیز لڑکیاں ہی نہیں بوڑھے بھی حاصل کرنے کیلئے دوڑ دھوپ کرتے رہے

عشق و محبت کا جاوداں افسانہ جس کے سامنے وامق و عذرا، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کے قصے بھی ہیچ ہیں۔ اس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلن سے بھی زیادہ حسین اور عظیم ہے مترجمہ جناب مخمور جالندھری۔ نظر فریب کتابت و طباعت، بہت عمدہ کاغذ، قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

## یادوں کے کھنڈر

جناب ٹھاکر پونچھی کا ایک بے حد دلچسپ نیا رومانی ناول جس میں اُن معصوم محبتوں، ناکامیوں اور حسرتوں کی حسین داستانیں بیان کی گئی ہیں جنھوں نے اپنے کمسن خیالوں میں محبت کے حسین محل تعمیر کئے لیکن حقیقی زندگی میں صرف یادوں کے تاریک کھنڈر ہی نصیب ہوتے۔ "یادوں کے کھنڈر" کے دردناک قہقہے، سسکتی ڈوبتی آہیں، خاموش پلکوں پر منجمد آنسو، آج کے معاشرے کے وہ گھناؤنے نقوش اُجاگر کرتے ہیں جو محبت کی موت ہیں، اور زندگی کے قاتل۔ ایک ایک سطر میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے فاضل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ انداز سے اُبھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص پرور محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے ہکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی - دہلی




زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

## ۱● انگور ـــــ صحت و توانائی کا خزانہ

انگور کی تاثیر گرم و تر ہے۔ انگور کا رس (گلوکوز) پانی یا دودھ میں ملا کر پیا جائے تو اس کی تاثیر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ کھٹ مٹھا انگور معتدل ہوتا ہے۔ نہ زیادہ سرد اور نہ گرم۔ انگور جتنا زیادہ میٹھا ہو اتنا ہی زیادہ گرم ہوتا ہے ـــــ انگور دل، دماغ، معدہ اور آنتوں کو طاقت دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے پاخانہ کھل کر آتا ہے۔ آنکھوں کی بینائی تیز ہوتی ہے اور جسم مضبوط اور توانا ہوتا ہے۔ انگور تپ دق، کھانسی، پھیپھڑے کی کمزوری، نزلہ و زکام، دمہ اور تلی میں ایک بے نظیر دوا ہے۔

انگور میں وٹامن اے، بی اور سی ہوتے ہیں۔ وٹامن بی اور سی بہتات میں ہے۔ چونکہ انگور میں فولاد بھی ہے۔ اس لئے یہ خون بڑھاتا ہے۔ جن لوگوں کو خون کی کمی محسوس ہوتی ہو ان کے لئے انگور ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ جب جسمانی طاقت جواب دے گئی ہو محض چند دن انگور کھانے سے نئی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔

انگور میں سائٹرک ایسڈ بہت ہے۔ یہ مثانہ اور گردے کی تمام خرابیاں دور کرتا ہے اور گردوں کو قوت بخشتا ہے۔ پیشاب کو بہاتا ہے اور جسم سے یورک ایسڈ کو ضائع کرتا ہے اور انسان گٹھیا سے محفوظ رہتا ہے۔ پرانا بخار اور تپ دق کے مریضوں کے لئے انگور آب حیات ہے۔ ٹائیفائڈ بخار میں انگور سے مریض کی طاقت بحال رہتی ہے اور پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں۔

شہد میں انگور کا رس ملا کر پینے سے کھانسی سے نجات مل جاتی ہے۔ انگور کا رس پینے کے بعد پانی ہرگز نہیں پینا چاہئے۔ ورنہ کھانسی بڑھ جائے گی۔ بچوں کو کتنا ہی قبض کیوں نہ ہو، انگور کے رس کا ایک چمچہ دینے سے فوراً قبض رفع ہو جاتا ہے اور ایک دست آجاتا ہے ـــــ دانت نکالنے کے زمانے میں اگر بچوں کو صبح و شام ایک ایک چمچہ انگور کا رس دیا جائے تو وہ دانت نکالنے کی تکلیف سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور سوکھے کی بیماری بھی نہیں ہوتی اور صحت و توانائی قائم رہتی ہے۔

حاملہ عورت کو اگر انگور باقاعدگی سے دیا جائے تو اسے مروڑ، اپھارہ اور قبض کی شکایت نہیں ہوتی۔ تندرست اور مضبوط بچہ پیدا ہوتا ہے۔ انگریز اپنے بچوں کو تندرست اور مضبوط بنانے کے لئے انگور کا رس (پورٹ وائن) باقاعدگی سے پلاتے ہیں۔ ایک چمچہ انگور کے رس میں شہد ملا کر بچوں کو دیا جائے تو بچوں کی صحت اور توانائی پر اس کا نمایاں اثر پڑتا ہے۔

انگور خون صالح پیدا کرتا ہے۔ مصفی خون ہے۔ سوداوی مادہ رفع کرتا ہے۔ مزاج میں اعتدال پیدا کرتا ہے۔ سینے اور پھیپھڑے کو قوی کرتا ہے۔ جگر، معدے اور انتڑیوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ تمام اعضائے رئیسہ کو تقویت پہنچاتا ہے۔ مادہ تولید میں اضافہ کرتا ہے اور مقوی باہ ہے۔ بدن کو فربہ اور قوی کرتا ہے۔ انگور کو باقاعدہ استعمال کیا جائے تو دبلا پتلا آدمی بھی کچھ دنوں میں فربہ ہو جاتا ہے۔

کسی موسم میں انگور نہ ملیں تو کشمش استعمال کریں کشمش انگور کی سوکھی ہوئی شکل ہے۔

شیخ بوعلی سینا کی رائے میں انگور میں ویسی ہی غذائیت ہے جیسی انجیر میں ہے۔ انگور کے دانوں کو چوس کر کھانے میں زیادہ غذائیت حاصل ہوتی ہے۔ آب انگور یعنی انگور کے رس کو نچوڑ کر پینے میں غذائیت کم ہے۔ روٹی کے ساتھ انگور کھانے سے زیادہ غذائیت حاصل ہوتی ہے۔ صبح نہار منہ کھانا مضر ہے۔ انگور کھانے کے فوراً بعد پانی پینا نقصان دہ ہے۔ اس سے معدے میں ریاح پیدا ہوتے ہیں اور انگور ہضم نہیں ہوتا۔

ایام زچگی میں جبکہ جسم سے زیادہ خون خارج ہو گیا ہو، انگور کا رس آب حیات کا کام کرتا ہے۔ انگور کا رس روزانہ صبح و شام پانچ پانچ تولہ پینے سے

نزلے کا مرض جاتا رہتا ہے۔ دل کے درد اور دھڑکن میں انگور کا رس بہت مفید ہے۔ درد اور دھڑکن فوراً دُور ہو جاتی ہے۔

کچے انگور کا استعمال خون و صفرا کی حرارت کو زائل کرتا ہے۔ قاطعِ صفرا بھی ہے۔ معدے میں جو بلغمی رطوبات جمع ہو جاتی ہیں اُنھیں دُور کرتا ہے۔ دستوں کو روکتا ہے۔ مقوی جگر اور مقوی بدن ہے۔ پیاس اور اعضا کی سستی کو رفع کرتا ہے۔

انگورِ خام کو پیس کر حمام میں غسل کے وقت بدن پر مالش کرنے سے پسینے میں خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ اِس کی مالش سے خشک خارش کے چھوٹے دانوں کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ خارشِ تر کے لئے بھی اِس کی مالش مفید ہے۔ اسے پیس کر سرکے کے ساتھ ملا کر مالش کرنا ناسور اور زہریلے زخموں کے لئے نفع بخش ہے۔

کچے انگور میں کچھ نقصانات بھی ہیں۔ کچے انگور متواتر کھانا سرد مزاج والوں کے لئے مضر ہے۔ ایسے لوگوں کے معدے کو کمزور کرتا ہے۔ مروڑ اور تولیدِ ریاح ہوتی ہے اور سینے میں درد ہو جاتا ہے۔

## ۲ • کیا آپ جانتے ہیں؟

صحت اور تندرستی کی تقویت کے لئے گھی، دودھ اور دوسری مقوی غذائیں ہی کافی نہیں ہیں ـــــ بہت سے لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ دودھ، گھی اور دوسری صحت بخش مقوی غذاؤں کی طرح تندرستی کی تقویت اور صحت کی بحالی کے لئے معدنی نمک بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

ماہرین کی تحقیق و تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ انسان کے جسم کی نشو و نما کے لئے کیلشیم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیلشیم ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے۔ خون صاف رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کیلشیم کی کمی سے ہڈیاں کمزور اور دانت خراب ہو جاتے ہیں۔

کیلشیم دودھ، پنیر، سبز دالیں، شلجم، گاجر، گری دار میوے، انڈے کی زردی، خشک لوبیا، کالے چنے، پھول گوبھی، کچی بند گوبھی، پالک، مٹر، سلاد، مولی، لیموں، سنگترہ، انگور، خشک انجیر، ساگ چولائی، میتھی اور تلوں کے تیل سے حاصل کر سکتے ہیں۔ دودھ، دہی، مکھن، لسی، چھاچھ، پنیر اور انڈے کی زردی میں کیلشیم زیادہ ہوتا ہے۔

کیلشیم کے علاوہ سوڈیم، فاسفورس، گندھک، میگنیشیم اور دوسری معدنیات بھی انسان کے جسم کی نشو و نما کے لئے مفید ہی نہیں بہت ضروری ہیں۔ سوڈیم قوتِ ہاضمہ کو تقویت دیتا اور ہاضمہ کے فعل کو تیز کرتا ہے۔ سوڈیم کی مدد سے جسم فولاد کو قبول کرتا ہے۔ جسم میں سوڈیم کی موجودگی نزلہ اور بہرے پن سے محفوظ رکھتی ہے۔ سوڈیم گردوں اور جگر کی پتھریوں اور جوڑوں میں سے یورک ایسڈ کو پگھلا کر خارج کرتا ہے۔ بدہضمی اور گیسی ڈکاروں میں مفید ہے۔ پٹھوں کو مضبوط اور اعضا کو چست کرتا ہے۔ جوڑوں کو صاف اور لچکدار بناتا ہے۔ ہڈیوں اور دانتوں کو خراب ہونے سے روکتا ہے۔ قبض کشا ہے۔ غذا میں سوڈیم کی کمی سے جسم کا وزن کم ہوتا ہے، بھوک کم لگتی ہے اور بدہضمی رہتی ہے۔

سوڈیم خشک پھلوں، دودھ، پنیر، پالک، شلجم، مولی، گاجر، کھیرا، بند گوبھی، اسٹابری، چقندر، تربوز، ٹماٹر وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

دماغ اور اعصاب کو تقویت پہنچانے اور ہڈیوں، دانتوں اور بالوں کی نشو و نما میں مدد دینے میں فاسفورس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کی خوراک میں مناسب مقدار میں فاسفورس کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ جسم میں فاسفورس کی کمی سے دماغی تھکن، ضعفِ اعصاب کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں۔

سن رسیدہ آدمیوں کے مقابلے میں بچوں کو اپنی ہڈیوں اور دانتوں کی پرورش کے لئے کیلشیم اور فاسفورس کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

دودھ، مغزیات، ناریل، انڈے کی زردی، خشک دودھ، لوبیا، مٹر، گیہوں، سیب، بادام، اخروٹ، جَو، چنے، شلجم، مولی، گاجر، کھیرا، گوبھی، پالک، انجیر، مچھلی اور پرندوں کے گوشت میں بھی فاسفورس کی وافر مقدار ہوتی ہے۔

## ۳ • صحت کے لئے جماہی

جماہی لینا صرف انسانوں تک محدود نہیں ہے۔ اکثر جانور بھی جماہی لیتے ہیں۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جماہی لینا ایک قدرتی فعل ہے اور قدرت اِس سے بہت مفید کام لیتی ہے۔

ہم اکثر جماہیاں لیتے ہیں اور رات کو سونے سے پہلے ہمارا سب سے آخری کام جماہی لینا ہوتا ہے۔ پھر بھی جماہیوں کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔

آج کل سائنسداں جماہی کے متعلق تحقیقات میں مصروف ہیں۔ اُن کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جماہی لینے کا خاص سبب یہ ہے کہ جماہی ہماری صحت کے لئے مفید ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جماہی سے بعض امراض کی تشخیص میں مدد ملتی ہے۔

نظامِ عصبی، خون کی نالیوں کا جال، آلاتِ تنفس، یہ سب جماہی لینے

وقت زور شور کے ساتھ سرگرم عمل ہوجاتے ہیں۔ جماہی کے متعلق تحقیقات کرنے والے کہتے ہیں جماہی تازہ ہوا کو خون تک پہنچاتی ہے، رگوں کو ڈھیلا کرتی ہے اور دورانِ خون کو تیز کرتی ہے۔ اِس کے علاوہ جماہی سے سینہ، منہ اور کمر کے پٹھوں کی کارکردگی کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب ہم جماہی لیتے ہیں تو یہ عمل ہماری تندرستی کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ نیز جماہی کے متعلق جدید ترین تحقیق یہ ہے کہ جماہی مرض کی علامت کی تشخیص کے لئے ایک سائنٹفک تدبیر ہے اور اُس کی مدد سے بیماری کی رفتار کے متعلق پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔

بعض دماغی عارضوں میں معالج کو جماہی سے تشخیص میں مدد ملتی ہے۔

## ۴ • ناکامی سے بددل نہ ہوں

ناکامی سے بددل نہ ہوں ـــــ آپ کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی۔ ناکامی سے کوئی بددل کیسے نہ ہو ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ بددل نہ ہوں تو ناکامی کامیابی بن سکتی ہے۔ ناکامی سے کامیابی کی راہیں نکل سکتی ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ میں نے بہت سی ناکامیوں کا تجربہ کیا ہے۔ اُس کا اثر یہ ہوا کہ مجھ میں اتنی ہمت و جرأت پیدا ہوگئی کہ میں وہ کام کرنے پر آمادہ ہوگیا جو میں عام حالات میں شاید کبھی نہ کرتا۔

ناکامی اُس وقت نہایت تلخ ہوجاتی ہے جب اُسے مستقل شکست سمجھ لیا جائے اور انسان بددل ہوکر، عمل کا دامن چھوڑ کر اپنے آپ کو قضا و قدر کے حوالے کردے لیکن اِس سے آپ کوئی سبق حاصل کرتے ہیں تو یہ ہمیشہ آپ کے لئے باعثِ زحمت نہیں، بہت بڑی رحمت ہے۔

اُس انسان کے لئے ناکامی کوئی حقیقت نہیں رکھتی جس نے اُسے وقتی شکست سمجھا ہے اور اِس شکست کو فتح میں بدلنے کا عزم رکھتا ہے لیکن اگر وہ مکمل ناکامی قبول کرلیتا ہے تو اُسے مکمل تباہی سے کوئی روک نہیں سکتا، کوئی بچا نہیں سکتا۔

اگر آپ کسی وقت شکست کا شکار ہوں اور آپ مایوس نہ ہوں، ہمت نہ ہاریں تو یہ آپ میں اتنی قوت پیدا کردے گی کہ آپ اپنی زندگی میں اپنے مقصدِ حیات کو پورا کرنے میں یقیناً کامیاب ہوں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ دُنیا میں کوئی آپ کی اپنی ذات کے سوا آپ کو ناکام نہیں بنا سکتا!

## ۵ • لباس کی اہمیت

عام طور پر لباس کو ستر پوشی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے یا فیشن کا تقاضا خیال کیا جاتا ہے۔ بہت کم لوگ اِس حقیقت کی طرف دھیان دیتے ہیں کہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے لباس بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ میں دُنیا میں ہزاروں آدمیوں سے مِلا ہوں۔ میں نے آج تک جن لوگوں کو ترقی کی آخری منزل پر دیکھا وہ وہی لوگ تھے جو لباس کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے۔

خراب کپڑوں کی عادت انسان کو غربت اور مفلسی کا برابر یقین دلاتی رہتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اُسے مِل جاتی ہیں۔ اکثر ہم اُن لوگوں سے جو ہم سے بلند ہیں صرف اِس لئے ملتے ہوئے جھجکتے اور شرماتے ہیں کہ ہمارے خیال کے مطابق ہمارے کپڑے ایسے نہیں ہوتے کہ ہم اُن سے مِل سکیں۔

ہم جو لباس پہنتے ہیں، دوسروں کے لئے نہیں پہنتے، اپنے لئے پہنتے ہیں۔ اگر ہم ہر روز ایک نیا سوٹ پہنیں تو اُس سے ہمارے اندر جو جوش و ولولہ پیدا ہوگا وہ کسی اور چیز سے نہیں ہوسکتا۔ ہم محسوس کریں گے کہ ہم کسی سے کم نہیں ہیں، بلکہ دوسروں سے بہت اچھے، بہت بہتر ہیں۔ اِس طرح بے جا شرم، جھجک، خوف ہمارے ذہن سے نکل جائے گا۔

آپ نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ اگر آپ کسی بڑے افسر سے ملنے کے لئے جائیں اور آپ کے کپڑے اچھے نہ ہوں تو آپ بار بار سوچیں گے کہ مجھے مِلنا چاہئے یا نہیں؛ یہی چیز آپ کی قوت اور یقین کو کمزور کردیتی ہے اور جس کام، جس بات کے لئے آپ جاتے ہیں اُس کے پورے اظہار میں ناکام رہتے ہیں۔ اِس کے برعکس اگر آپ ایسا لباس پہنے ہوئے ہیں جو نہایت اعلیٰ درجے کا ہے تو آپ بلا جھجک ـــــ اور بلا احساسِ پستی بڑے سے بڑے افسر سے مِل کر اپنا ما فی الضمیر ادا کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

## ۶ • زندگی کے لئے صحت کی اہمیت

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ کتنے کم لوگوں کو اِس کا احساس ہے کہ جسمانی حالت پر صحت اور صحت پر ہمت اور حوصلے کا دار و مدار ہے اور بے حوصلہ انسان تو انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ اگر انسان ہمت ہار بیٹھے تو زندگی کی کیسے پرواہ ہوگی۔ ہمت دل کی گھڑی کی سب سے بڑی کمانی ہے اور انسانی انجن کو حرکت دینے اور چلانے والا پہیہ ہے۔

اگر تمھارا جسم بیمار ہے، تمھیں کوئی مرض لاحق ہے تو یہ علامت ہے اِس بات کی، نشان ہے اِس امر کا کہ جسم کے جس حصّے میں تکلیف ہے وہاں کی کوٹھریاں مثبت پیدا کرنے والی اپنی طاقت کھو بیٹھی ہیں اور اب مُردہ ہوگئی ہیں۔ کام

نہیں کرسکتیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تم نیک اور پاکیزہ خیالات سے اُن کی اس حالت کو تبدیل کردو۔

کامل تندرستی سے انسان کی ساری قوتیں جاگ اُٹھتی ہیں۔ توانا ہوجاتی ہیں۔ دل اور دماغ میں روشنی پیدا ہوجاتی ہے۔ سارے ذہنی اور دماغی کاموں کی قابلیت کا دارومدار کامل صحت پر ہے۔

## ۷۔ کام کی طرح آرام بھی ضروری ہے

صحت مند رہنے کے لئے ورزش ضروری ہے۔ لیکن کام کے ساتھ آرام کے وقفے بھی ضروری ہیں۔ آرام کے لمحات میں عصبی اضطراب، چیخ پکار سے بچئے۔ رواروی اور عجلت کاری کے بجائے آرام اور اطمینان سے کام کرنا چاہیئے۔ اس سے آپ کا ہاضمہ، آپ کے اعصاب درست ہوں گے۔ آپ تازگی و توانائی کے ساتھ کام کرسکیں گے۔

صحت مندی اور تندرستی کے لئے چند باتوں کا ہر جگہ اور ہر وقت خیال رکھنا مفید ہے۔ صفائی، تازہ ہوا، غذا، ضروری ورزش، لباس اور آرام اور ان کے ساتھ صبح و شام کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

کام، ایسا کام جس میں انسان پوری دلچسپی لے سکے، آسودہ خاطری کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایک حقیقت ہے کہ کام کی موزونیت اور دلچسپی کے باوجود تھکن ایک قدرتی امر ہے۔ محنت و مشقت کی حالت میں ہماری جسمانی اور ذہنی قوتیں خرچ ہوتی رہتی ہیں، اُنھیں بحال کرنے کے لئے آرام کرنا ضروری ہے۔ ہمارا جسمانی نظام خود بخود یہ مطالبہ کرتا ہے کہ چند گھنٹوں کی مصروفیت کے بعد اُسے سستانے کا موقع ملنا چاہیئے۔

انسان تو انسان اگر مشینوں سے بھی لگاتار کام لیا جائے اور اُنھیں آرام نہ دیا جائے تو اُن کی کارکردگی ہی کو نقصان نہیں پہنچتا، اُن کی عمر بھی کم ہوجاتی ہے۔ اس لئے اگر لوہے یا فولاد کی بے جان مشینوں کو آرام کی ضرورت ہے تو گوشت پوست کے انسان کو اس کی کتنی ضرورت ہوگی، ظاہر ہے۔

جب آپ تھک جائیں تو چند منٹ ہی کے لئے سہی، اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیجئے۔ بستر پر چت لیٹ جایئے یا آرام کرسی پر نیم دراز ہوجایئے۔ جسم کے کسی حصے میں تناؤ کی کیفیت نہ ہو۔ کوئی پیچیدگی یا مشکل آپ کے دماغ کو پریشان نہ کرے۔ اس پر کسی بھی سنجیدہ سوچ بچار کا بوجھ نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں اعصاب میں کسی طرح کا کھنچاؤ نہ ہو۔ ایسا کرکے تھوڑی ہی دیر کے بعد آپ اپنے اندر نئی قوت محسوس کریں گے

## ۸۔ خوشی کی تلاش

دُنیا میں بھلا ایسا کون ہوگا جسے خوشی کی تلاش نہ ہو، جو شاد و مسرور رہنا نہ چاہتا ہو۔ کسی نے کہا ہے ——— مسرت کی تمنا ہو تو غم کی انتہا کرلے۔ اپنا اپنا خیال ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسرت کی تمنا ہو تو غم کی انتہا ہی کرلینا ضروری نہیں ہے۔ مسرت کے حصول کے اور بھی ذرائع ہیں۔

جو لوگ خوشی کے منتظر رہتے اور متوقع رہتے ہیں، خوشگوار توقعات قائم کرتے ہیں)، وہ خوش رہتے ہیں۔ ایک روسی فلسفی کا قول ہے ——— "وہ انسان خوش نہیں رہ سکتا جو خوشی کی توقع نہیں رکھتا۔ اگر دل نفرت یا خود غرضی سے بھرا ہو تو خوشی کی روشنی اس میں سے پھوٹ کر نہیں نکل سکتی۔ خوش رہنے کے لئے گناہوں اور غلطیوں سے بچنا بہت ضروری ہے۔ جو گناہ سرزد ہوچکے ہیں، اُنھیں بھول جاؤ۔"

مشہور فلسفی البرٹ ہوبارڈ کا قول ہے ——— "صبح کو دس بجے تک شاد و مسرور رہو، پھر دن کا باقی حصہ خود ہی اپنی خبرگیری کرلے گا۔" ہنری ڈیوڈ تھورو صبح کو سب سے پہلے خود کو کوئی خوشی کی خبر سنایا کرتا تھا۔ اس کا وہ کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیتا تھا۔ وہ خود سے کہتا ——— "میرا دُنیا میں پیدا ہونا ہی خوش نصیبی کی بات ہے۔ اگر میں پیدا نہ ہوتا تو ستاروں کی روشنی کیسے دیکھتا۔ پھولوں کی خوشبو کیسے سونگھتا، انسانوں کی آنکھوں میں محبت کی چمک کیسے دیکھتا۔"

اپنی زندگی کا دامن مسرت کے پھولوں اور خوشی کی کلیوں سے بھرنے کے لئے یہ بھی ایک طریقہ ہے، دوسروں کو کچھ دیا جائے۔ روپیہ، وقت، نصیحت اور تسلی۔ کوئی چیز جو تم اپنے پاس سے دوسروں تک اُن کی مدد کرنے کے لئے پہنچاؤ۔

اپنی زندگی کو مسرت سے معمور کرنے کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ آپ کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ آپ زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور اُن پر غالب آسکتے ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— "اگر کوئی مشکل درپیش ہو تو مسکرا دو۔ مشکلات کے مقابلے میں جم کر بیٹھ جاؤ۔ مشکلات یقیناً تم سے شکست کھا جائیں گی۔"

---

### رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ چیک کرنے کے بعد بیسویں صدی ہر ماہ باقاعدگی سے سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمہ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی)

# سرگوشیاں

## سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو، زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ———— (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

---

**عبدالوحید باوزیر۔ الکویت**

س۔ خوشتر بھائی! اِس دور میں کون چیز زیادہ اہمیت رکھتی ہے ———— دولت، ماں، بیوی؟

ج۔ کسی کی نظر میں دولت۔ کسی کی نظر میں بیوی! ماں کس شمار میں ہے!!

س۔ سعادت مند اور بدبخت میں کیا فرق ہے؟

ج۔ سعادت مند دولت اور بیوی پر ماں کو ترجیح دیتا ہے۔ بدبخت دولت اور بیوی کو ماں پر ترجیح دیتا ہے۔

س۔ انسان اپنے کئے پر کب پچھتاتا ہے؟

ج۔ جب اُس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔

---

**واعظ بازید پوری۔ ڈیسر گڑھ**

س۔ کیا دولت مند لوگ بھی دُکھی ہوا کرتے ہیں؟

ج۔ کیوں نہیں۔ سُکھ اور دُکھ کا تعلق دل سے ہے۔ غریب اپنی لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے ہیں ———— دولت مند سنانے کے پھیر کا بوجھ دل پر لئے سکون باطن سے محروم رہتے ہیں، دُکھی رہتے ہیں۔

---

**مس ریحانہ بیگم۔ بجنور**

س۔ کیا شجرِ حیات کے پھول صرف خوش مزاج لوگوں کے لئے کھلتے ہیں؟

ج۔ جی ہاں! خشک مزاج لوگوں کے حصے میں کانٹے ہی آتے ہیں۔

س۔ انسان اُن چیزوں کی تمنا کیوں کرتا ہے جن کا پانا ناممکن ہے۔

ج۔ انسان فطرتاً حریص ہے۔

---

**مس شاداں ناز۔ پٹنہ**

س۔ بھیا! زندگی راس نہ آئے تو؟

ج۔ زندگی کو قابلِ رشک زندگی بنانے کے لئے جدوجہد کیجئے۔

س۔ بھائی جان! اُس رشتے دار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو ہر وقت طنز کے نشتر چُبھوئے؟

ج۔ وہ دشمن نما دوست ہوگا۔

س۔ کانٹوں میں اُلجھ کر پھول توڑنا عقلمندی ہے یا بیوقوفی؟

ج۔ پھول ہاتھ آجائے تو عقلمندی ہے۔ پھول ہاتھ نہ آئے تو بیوقوفی!

---

**محمد شمیم شیشہ باڑی پرکھنڈ۔ پورنیہ**

س۔ ایک شاعر کا قول ہے ———— "دُنیا میں عورت نہ ہوتی تو فتنہ و فساد نہ ہوتا" بتلایئے شاعر کا یہ قول کہاں تک صحیح ہے؟

ج۔ اُس شاعر نے بالزاک کا یہ قول نہ پڑھا ہوگا ———— "عورت کا دل محبت کا سمندر بیکراں ہے۔ اس کا خشک ہونا ناممکن ہے" ———— اُس شاعر نے مولیؔ کا یہ قول نہ پڑھا ہوگا ———— "عورت محبت ہے اور محبت عورت ہے"

---

# ملک کے مایہ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے دلچسپ شاہکار

## خاوند بیوی کا رہنما

## پریم شاستر — کام شاستر — گربھ شاستر

ان کتابوں میں ایسے ایسے راز اور نکتے بیان کئے گئے ہیں جن کا جاننا نوجوان جوڑوں کے لئے بہت ضروری ہے۔ ایسے ایسے کار آمد نکتے جو کہ صرف تجربہ کار سے تجربہ کار خاوندوں کو بھی معلوم نہیں اور جنہیں جاننے کے بعد آپ کو شادی کی کامل مسرتیں حاصل ہوں گی۔ گھر کو بہشت بنانے کی تدابیر تفصیل سے لکھدی گئی ہیں۔ خاوند اور بیوی کے لئے ان کتب کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک انسان کے لئے ہوا اور غذا ضروری ہے۔

ان کتب کی خوبیوں کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان جیسے غریب ملک میں ان کتب کی چھ لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں فروخت نہیں ہو سکتی۔

پریم شاستر باتصویر ———— قیمت اردو تین روپے ہندی تین روپے
کام شاستر باتصویر ———— قیمت اردو تین روپے ہندی تین روپے
گربھ شاستر باتصویر ———— قیمت اردو تین روپے ہندی تین روپے

**زنجیر** ایک گناہ گار لڑکی کی حسین و جمیل داستان، جس کے گناہ یہ تھے کہ وہ غریب تھی۔ وہ حسن و جمال کا مجسمہ تھی۔ وہ قصبہ کے ایک اسکول میں کام کرتی تھی۔ وہ تنہا تھی اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ ایک شریف گھر کے لڑکے سے محبت کرتی تھی چنانچہ وہ ایک شریف وکیل صاحب کو گناہوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی نظر آئی اور وکیل صاحب نے اسے اپنی بہو بنانے سے انکار کر دیا۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پر پیچ رومان پرور داستان ہے جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اٹھیں گے، جسے زکی انور نے لکھا اور ادارہ بیسویں صدی دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

<u>فردوس</u> اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک لازوال شاہکار۔ اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب دوسرا ایڈیشن لازمی کے اصلاح نہایت آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

<u>۱۸۵۷ء کی دلی</u> جناب مہیشور دیال نے اس میں تاریخی حقائق کے سارے نقوش کو ایک پرکیف داستان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس میں آپ حسن و شباب کی رنگینیوں ہی سے نہیں بلکہ جذبۂ حب الوطنی، ایثار، اخوت و محبت اور رواداری کے چشموں سے بھی سیراب ہوں گے۔ دلی کی ٹکسالی زبان، محاورے اور روزمرہ کی پہلی سطر سے لے کر آخر تک دلی والی زبان کی حلاوت آپ کو جناب مہیشور دیال ہی کے زور قلم میں پائیں گے کیونکہ یہ ان کی اپنی مادری زبان ہے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

<u>ڈارنگ</u> جناب نریش کمار شاد کے منتخب طبع زاد افسانوں کا بے مثل اور حسین و جمیل مجموعہ۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

<u>سرخ حاشیے</u> اردو کے مشاہیر ادیبوں کے دلچسپ لطیفے۔ قیمت دو روپے پچھتر نئے پیسے۔

<u>راکھ تلے</u> غیر ملکی افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانے ہندوستانی لباس میں۔ قیمت دو روپے

<u>مالوا</u> میکسم گورکی کے شہرۂ آفاق ناولٹ کا ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

<u>ہفت رنگ</u> جناب نوبت رائے ملسیانی کے کلام کا مجموعہ۔
قیمت تین روپے

<u>شہر دل</u> جناب محسن زیدی کی غزلوں کا حسین انتخاب۔ محسن زیدی نے شہر دل کو آرزوؤں کی نوخیز کلیوں سے سجایا ہے۔ قیمت صرف دو روپے۔

<u>سفینہ و ساحل</u> جناب عزیز وارثی کا مجموعۂ کلام۔ ان کی شاعری میں اتنی توانائی، قوت اور دلآویزی ہے کہ برسوں تک فراموش نہ کیا جا سکے گی۔ قیمت صرف چار روپے

<u>گل رعنا</u> جناب برج لال رعنا کا تازہ مجموعۂ کلام جو موجودہ دور کی بہترین نظموں، غزلوں سے مزین ہے جس کے مطالعہ کے بعد آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ گل رعنا واقعی بہترین شعری مجموعہ ہے۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

**پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶**

## محمد نسیم اختر۔ کلکتہ

س۔ خوبصورت عورت آنکھوں کی مسرت ہوتی ہے
اور خوب سیرت عورت؟

ج۔ روح اور دل کی مسرت!

س۔ کیا حُسن کی پرستش سے خدا ملتا ہے؟

ج۔ خدا کی اطاعت و محبت سے خدا ملتا ہے۔

---

## کلیم الدین کلیمی۔ بمبئی

س۔ دولت، علم اور ہُنر اِن تینوں میں زیادہ اہم
درجہ کس کو دینا چاہئے؟

ج۔ آج کی دُنیا میں دولت کے آگے علم اور ہُنر کی
کون قدر کرتا ہے۔ دولت سب کو خرید
لیتی ہے۔

---

س۔ عورت پھول ہے یا شبنم؟

ج۔ پھول بھی شبنم بھی! ــــــ اور حالات سے
مجبور ہو کر شعلہ بھی بن جاتی ہے!

س۔ انسان کو غم کب ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے
یا شادی کے بعد؟

ج۔ نہ شادی سے پہلے، نہ شادی کے بعد!
اور حالات سازگار نہ ہوں تو شادی سے پہلے
بھی اور شادی کے بعد بھی!

س۔ انسان کو بُرے کام کا احساس کب ہوتا
ہے؟

ج۔ جب ضمیر جاگتا ہے۔

---

## نوشابہ پروین۔ پورولیا

س۔ دُنیا ترقی کر رہی ہے یا پستی کی طرف جا رہی
ہے؟

ج۔ بانو! دُنیا ہر لمحہ ترقی کر رہی ہے۔ اتنی ترقی کہ
[illegible]

ترقی کی انتہا کو پہنچ کر پستی کی طرف لوٹ
رہی ہے!

س۔ بھیا! مجھے اور پڑھنے کا شوق ہے، لیکن میں
اپنے ماں باپ سے مجبور ہوں۔ بتایئے میں
کیا کروں؟

ج۔ ماں باپ جہاں دیدہ ہوتے ہیں۔ اپنی اولاد
کے بہی خواہ ہوتے ہیں۔ آپ کو اپنے
والدین کے فیصلے کا احترام کرنا چاہئے، ان پر
اعتماد کرنا چاہئے۔

---

## پروین بھاگلپوری

س۔ چچا جان! لوگ یہ کیوں پُوچھتے ہیں کہ آپ کا
مذہب کیا ہے؟ کیا انسان کے لئے صرف
انسان ہونا کافی نہیں؟

ج۔ بے شک انسان کے لئے انسان ہونا کافی
ہے۔

س۔ خود اعتمادی اور خود پسندی میں کیا فرق
ہے؟

ج۔ خود اعتمادی انسان کو کامیابی کی روشن
راہیں دکھاتی ہے۔ خود پسندی گُمراہ کر دیتی
ہے۔

---

## میمونہ سلطانہ۔ کھنڈوہ

س۔ خواب میں دُھواں دکھائی دے تو اُس خواب
کی تعبیر کیا ہوگی؟

ج۔ کہتے ہیں خواب کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے۔ آپ
اپنے خواب کی تعبیر خود ہی سمجھ لیں۔

س۔ غریب ہندوستان کا مستقبل؟

ج۔ اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے!
چھین کر چاند ستاروں سے اُجالا لے لیں!

---

## وقار احمد کیتھوی نیترہاٹ۔ رانچی

س۔ فکر و سوچ اور پریشانی سے کسی طرح نجات
نہ ملے تو؟

ج۔ اپنے سے زیادہ بدحال اور پریشان لوگوں
کو دیکھ کر سکون حاصل کرنا چاہئے۔

---

## عذرا فاطمہ۔ حیدرآباد دکن

س۔ خوشتر بھیا! غم اور خوشی کے موضوع پر کوئی
اچھا سا شعر سنایئے۔

ج۔ سُنئے ؎

مزاجِ غم سے جنھیں آگہی نہیں ہوتی
خوشی کے وقت بھی ان کو خوشی نہیں ہوتی

س۔ ہندوستان کا سب سے اچھا افسانہ نگار
کون ہے؟

ج۔ ایشیا کے عظیم فنکار کرشن چندر!

س۔ بھیا! کیا یہ سچ ہے ــــــ
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

ج۔ جی ہاں۔ اِس لئے کہ ــــــ
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

---

## محمد عبدالسمیع پروانہ۔ ونگلور

س۔ زندگی کا سب سے حسین دور کون سا ہے
بھائی جان؟

ج۔ بچپن!

س۔ ہندوستان کے جملہ مسلمانوں کی تعداد کیا
ہے؟ کیا وہ سب خوشحال ہیں؟ اگر نہیں تو
کیوں؟

ج۔ ہندوستان کے جملہ مسلمانوں کی تعداد
۵ کروڑ ہے۔ خوشحالی اور بدحالی تو اپنے
عزم و عمل پر موقوف ہے۔

---

**سید ابوالحسن زاہد۔ رامپور**

س۔ کیا آپ بیسویں صدی کے سرورق پر عورت کی تصویر دیتے ہیں۔ اِس کے بجائے کوئی خوبصورت سینری یا "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق کوئی خوبصورت پھول وغیرہ چھاپ دیں تو زیادہ بہتر ہے۔ میں نے صرف اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

ج۔ "بیسویں صدی" کے بیشتر قارئین "بیسویں صدی" کے سرورق پر عورت ہی کی تصویر پسند کرتے ہیں۔

س۔ "بیسویں صدی" یہیں سے چھپ کر پاکستان جاتا ہے یا پاکستان میں چھپتا ہے؟

ج۔ یہیں سے چھپ کر جاتا ہے۔

---

**مظہر الحق کشن گنج بازار۔ پورنیہ**

س۔ ایسا معلوم ہوتا ہے غم میری زندگی کا جز بن گیا ہے۔ بتایئے اسے کس طرح دُور کروں؟

ج۔ آپ غم سے گھبراتے کیوں ہیں۔ ہمارے ہمنوا بن جایئے۔ یہ گنگناتے ہوئے شاہراہِ حیات پر گامزن رہیئے ——

یہ کہہ کر دلِ غم سے مرے تو جلے بڑھاتے ہیں
غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں

س۔ آپ نے "بیسویں صدی" کو ادب کا گلدستہ بنانے کا فن کس سے سیکھا ہے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے فنکاروں اور "بیسویں صدی" کے پرستاروں سے!

---

**مس انجم رعنا۔ گورکھپور**

س۔ بھائی جان! کیا آپ بتا سکتے ہیں اُردو کے پہلے باقاعدہ صاحبِ دیوان شاعر حضرت امیر خسرو ہیں یا وَلی دکنی؟

ج۔ صاحبِ گلستانِ ہزار رنگ نے لکھا ہے —— "پہلے پہل من حیث زبان اُردو کو استعمال کرنے اور اُس میں شاعری کرنے کا سہرا سلطان محمد قلی قطب شاہ بانیٔ سلطنت قطب شاہیہ کے سر ہے" —— مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے —— "وَلی دکنی اُردو کے سب سے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں"

---

**بی۔ ایم۔ ہارون نیولی**

س۔ وقت سے پہلے موت؟

ج۔ عبرتناک ہوتی ہے اور حسرتناک بھی!

س۔ کیا انفرادی زندگی سے انسان کو مسرت حاصل ہو سکتی ہے؟

ج۔ آج کے ننگِ انسانیت انسانوں سے دُور رہ کر یقیناً انسان کو مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔

س۔ حالیہ جنرل الیکشن کے بعد اُردو کا مستقبل؟

ج۔ نئی حکومتیں اور نئے اربابِ حکومت اُردو پرستاروں کو کانگریس کے حکمرانوں کی طرح شاید وعدوں کے سبز باغ بھی نہ دکھائیں۔ جس اُردو کو کروڑوں ہندو بولتے ہیں اور اُس کے پرستار ہیں۔ اُس اُردو کو عرب اور ایران سے آئی ہوئی صرف مسلمانوں کی زبان کہہ کر اُسے دیس نکالا دے رہے ہیں۔

---

**محمد احمد اللہ صدیقی۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی**

س۔ آج کل تعلیم کا معیار اور طالب علموں کا کردار دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ کیا اِس کے ذمے دار

(ا) خود طالب علم ہیں؟

یا

(ب) اُن کے والدین؟

یا

(ج) آج کل کے اساتذہ؟

یا

(د) بگڑا ہوا ماحول اور نظامِ تعلیم ہے؟ کیا خیال ہے آپ کا؟

ج۔ اِس کا ذمے دار بگڑا ہوا ماحول اور ناقص نظامِ تعلیم ہے —— آج کل کے اساتذہ اور طلباء بھی بہت حد تک ذمے دار ہیں۔

س۔ طالب علمانہ زندگی میں ملک اور قوم کی عملی خدمت کس طرح کی جا سکتی ہے؟

ج۔ ہنگامہ آرائیوں سے دُور رہ کر ہنگامہ آرائیوں کی آگ کو ہوا نہ دے کر! —— نیز اِس وقت ملک و قوم کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ طلباء شور و شر اور ہنگامہ آرائیوں میں حصّہ نہ لیں۔

---

**نظام قاسم بچپر دکھی۔ سارن**

س۔ بہار میں اُردو کے لئے محترم غلام سرور کی جد و جہد سے متعلق آپ کا خیال؟

ج۔ ہماری اور اُردو کے ہر پرستار کی نیک تمنائیں اُن کے ساتھ ہیں۔

س۔ حدِ نظر تک اندھیرے کا بیکراں سمندر موجزن ہے۔ روشنی کہاں سے لاؤں؟ کب تک اور بھٹکتا پھروں؟ کوئی اُمید؟؟

ج۔ اُجالا ہی نہیں لے کم نظر شامِ تمنّا میں
بصیرت ہو تو اکثر تیرگی بھی کام آتی ہے

مصطفےٰ ابدالی اسلام پوری ۔ پٹنہ

س۔ ایک لڑکی کی زندگی میں سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی ہے؟

ج۔ جوانی کے آنگن میں قدم رکھنے کے بعد دلہن اور ماں بننا!

س۔ خزاں آنے سے پہلے ہی پتے جھڑنے لگیں تو؟

ج۔ خزاں نصیب گلوں کی فسردگی پہ نہ جا
بچھڑنے گا رزم بہاراں یہاں کبھی نہ کبھی

---

حبیب احسن ۔ علی نگر ، گورکھپور

س۔ چچاجان! دارالحکومت دہلی سے اردو کے کتنے ماہنامے نکلتے ہیں؟ دو ایک کے نام بتائیں۔

ج۔ دہلی سے اردو کے بہت سے پرچے نکلتے ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں۔ شمع ، سریتا ، مولوی ، سرفہ ، بانو ، کھلونا ، تحریک ، آستانہ ، خاتونِ مشرق۔

س۔ کیا واقعی نیک نامی انسانیت کا زیور ہے؟ اگر ہاں تو بہت سے لوگ اپنی شخصیت کو اس زیور سے کیوں نہیں سجاتے؟

ج۔ ایسے لوگ بد ذوق جو ہوتے ہیں۔

---

محمد امین انجم ۔ آسام

س۔ ماں کو اپنے بیٹے سے زیادہ محبت ہوتی ہے یا بیوی کو اپنے شوہر سے؟

ج۔ ماں کو بیٹے سے ۔ ماں کی محبت کا جواب نہیں!

س۔ آج کل دنیا میں اتنی زیادہ برائیاں کیوں ہورہی ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ اچھے لوگ کم ہوتے جارہے ہیں۔ اچھائیوں کے قدرداں کم ہوتے جارہے ہیں۔

س۔ زیادہ پڑھی ہوئی لڑکیاں کم پڑھی ہوئی لڑکیوں سے زیادہ فیشن پرست ہوجاتی ہیں۔ اس لئے آپ کی رائے میں لڑکیوں کو زیادہ تعلیم دینی چاہئے یا نہیں؟

ج۔ زیادہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ساری لڑکیاں فیشن پرستی میں حدِ اعتدال سے آگے نہیں بڑھ جاتیں۔

---

سید عارف الدین ۔ حیدرآباد

س۔ خوش تحریر صاحب! راجہ مہدی علی خاں مرحوم کا ایک شعر سنایئے۔

ج۔ ان کی ایک نظم ادیب کی محبوبہ کا ایک شعر سنئے ۔

پلادو آنکھوں سے تاکہ مجھکو کچھ کل اور سرور آئے
بہت ہی غم مجھکو عاشقی کے ، پتہ بتا ڈگمگا رہا ہوں

س۔ آج کل کی لڑکیاں تنگ لباس کب تک پہنتی رہیں گی؟

ج۔ جب تک مردوں کی نظر وسیع نہ ہوگی۔

س۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو کس طرح روکا جاسکتا ہے؟

ج۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا خوف دل میں جاگزیں کرکے۔

---

ڈاکٹر نصیر صدیقی ۔ بھشترا ۔ ہگلی

س۔ چچاجان! آپ نے ماہِ جون کے "بیسویں صدی" میں ایک سوال کے جواب میں ساری دنیا میں مسلمانوں کی آبادی ۵۵ کروڑ بتائی ہے۔ دوسری جگہ ساری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۷۵ کروڑ بتائی ہے۔ آخر صحیح تعداد کیا ہے؟

ج۔ پروفیسر علی عباس حسینی نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ صبح نو پٹنہ کے اپریل ۱۹۶۴ء کے شمارے میں ساری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۵۵ کروڑ لکھی ہے۔ کئی مصنفین ۷۵ کروڑ لکھتے ہیں۔



آل انڈیا سکھ فیڈریشن کے بانی اخبار ”اجیت“ ، ”ہند سماچار“ ، ”پرتاپ“ وغیرہ کو ایک لمبی عرصہ تک پڑھتے رہے، ”رنجیت“ ، ”منتخل“ کے ایڈیٹر اور ملک کے مشہور صحافی لالہ جگت نارنگ جو ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ آپ ہندوستان میں پنجابی صحافت کے بزرگ تھے اور آزادی کی جدوجہد کے لئے شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے ، ڈاکٹر ستیہ پال اور بابا کھڑک سنگھ جیسے قومی رہنماؤں کے ساتھ کام کرتے رہے۔ آپ گزشتہ دس سال سے آل انڈیا نیوز پیپر ایڈیٹرز کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ آپ کی المناک موت کا پنجاب کے علاوہ ممالکِ غیر میں بھی ماتم منایا گیا۔

س۔ برتھ کنٹرول انسانی نقطۂ نظر سے کیا ایسا نہیں کہ یہ انسانیت کی توہین نہیں ہے جبکہ خالق و رازق اللہ تعالیٰ ہے؟

ج۔ برتھ کنٹرول انسانیت کی توہین ہے لیکن کسی خاص صورت میں حدِ اعتدال کا لحاظ رکھنا بھی مصلحت اندیشی کے مترادف ہے۔

# نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| [illegible] | کرشن چندر | [illegible] |
| [illegible] | ″ | چار روپے |
| [illegible] | ″ | تین روپے |
| [illegible] | ″ | دو روپے پچھتر پیسے |
| [illegible] | ″ | دو روپے پچیس پیسے |
| [illegible] | شوکت تھانوی | دو روپے |
| [illegible] | ″ | تین روپے پچاس پیسے |
| [illegible] | ″ | دو روپے پچاس پیسے |
| [illegible] | ″ | تین روپے پچیس پیسے |
| [illegible] | ″ | پانچ روپے |
| [illegible] | ″ | دو روپے پچیس پیسے |
| [illegible] | پریم چند | پانچ روپے |
| [illegible] | ″ | گیارہ روپے |
| [illegible] | ″ | تین روپے |
| [illegible] | ″ | تین روپے |
| صبح زندگی | راشد الخیری | دو روپے |
| شب زندگی | ″ | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| شام زندگی | ″ | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| [illegible] | رازق الخیری | تین روپے |
| [illegible] | [illegible] | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| [illegible] | | چار روپے |
| [illegible] | [illegible] | تین روپے |

| | | |
|---|---|---|
| [illegible] | [illegible] | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| [illegible] کلیاں | ″ | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| [illegible] | ″ | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| خوابگاہیں | ″ | تین روپے پچاس پیسے |
| دنیا کے مشہور سائنسدان | ″ | دو روپے پچیس پیسے |
| شائستہ | [illegible] | چار روپے پچاس پیسے |
| ظالم | [illegible] | دو روپے پچاس پیسے |
| فتح خیبر | صادق حسین | چار روپے |
| مقابلہ | [illegible] | تین روپے |
| نیلوفر | ″ | تین روپے |
| [illegible] | ″ | چار روپے |
| [illegible] | ″ | تین روپے |
| [illegible] | ″ | تین روپے |
| دو دیوانے | ″ | دو روپے پچاس پیسے |
| سیلاب | ″ | تین روپے |
| گناہ | دت بھارتی | دو روپے پچاس پیسے |
| اندھیرے اجالے | [illegible] | تین روپے |
| [illegible] | ″ | تین روپے پچاس پیسے |
| دو پھول | ″ | تین روپے [illegible] پیسے |
| مفرور | رئیس احمد جعفری | پانچ روپے پچاس پیسے |
| قیامت | [illegible] | دو روپے پچاس پیسے |
| سازش | ″ | دو روپے پچاس پیسے |

| | | |
|---|---|---|
| [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| گلی گلی | [illegible] | چار روپے |
| [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| [illegible] | [illegible] | دو روپے |
| [illegible] | [illegible] | تین روپے |
| موٹر میکینک گائیڈ | [illegible] | چار روپے |
| موٹر ڈرائیونگ | [illegible] | چار روپے پچاس پیسے |
| کیا خوب آدمی تھا | | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| عجیب لڑکی | [illegible] | تین روپے |
| ہمارا نبی (بچوں کیلئے) | [illegible] | پچاس پیسے |
| [illegible] ″ ہندی | ″ | پچاس پیسے |
| اجالے سے پہلے | ابراہیم جلیس | دو روپے پچاس پیسے |
| [illegible] | [illegible] | دو روپے |
| [illegible] | [illegible] | سات روپے پچاس پیسے |
| [illegible] | [illegible] | پچاس پیسے |
| انارکلی | امتیاز علی تاج | [illegible] پچاس پیسے |
| [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| ابراہیم لنکن | [illegible] | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| انسانیت موت کے دروازے پر | مولانا ابوالکلام آزاد | [illegible] |
| [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| [illegible] | ستیہ پال آنند | [illegible] |

ملتان، [illegible] پوسٹ بکس نمبر [illegible]

[illegible]

س۔ چندا ماما زمین سے کتنے فاصلے پر ہے؟

ج۔ ۲۴۰۰۰۰ میل کے فاصلے پر۔

---

خورشید پرویز فیروزآباد

س۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت؟

ج۔ ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔

س۔ دنیا کی آبادی میں مسلمان کس درجہ پر ہیں؟

ج۔ تیسرے درجے پر۔ دنیا میں سب سے زیادہ عیسائی ہیں، پھر بودھ، پھر مسلمان۔

---

سلمیٰ قریشی۔ الہ آباد

س۔ بھائی جان! ہمارے نئے راشٹرپتی کی عمر کیا ہے؟

ج۔ ستّر سال۔

س۔ ہمارے نئے صدر راشٹرپتی کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے کیا کرتے تھے؟

ج۔ بہار کے گورنر تھے۔

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں، موصوف نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کہاں سے حاصل کی ہے؟

ج۔ برلن یونیورسٹی سے۔

---

ثاقب صدیقی۔ حیدرآباد دکن

س۔ ریڈیو کس نے ایجاد کیا اور کب؟

ج۔ اٹلی کے جی مارکونی نے ۱۸۹۵ء میں ایجاد کیا۔

[illegible] سے تھیں

[illegible]

کا معیار اور انداز پیش نظر رکھ کر۔

---

ع۔ ق۔ لاری۔ لار۔ دیوریا

س۔ جدوجہد کے عوض مایوسیاں ہی نصیب ہوں تو کیا کریں؟

ج۔ جدوجہد جاری رکھیں۔

س۔ آج کل ہر انسان غرض کا بندہ کیوں نظر آتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ آج کل ہر شخص غرض کا بندہ ہو گیا ہے۔

س۔ وفادار دوست نایاب کیوں ہو گئے؟

ج۔ وفادار دوستوں پر چین کے چاؤ کا سایہ پڑ گیا!

---

سعیدہ ناز۔ سہسوان۔ بدایوں

س۔ بھائی جان! کیا آپ بتا سکتے ہیں حالیہ انتخابات میں کتنے ووٹروں نے حصہ لیا؟

ج۔ ۲۴ کروڑ ۷۰ لاکھ نے۔

س۔ اور کیا یہ بھی بتا سکتے ہیں اس الیکشن پر کتنا خرچ ہوا؟

ج۔ تقریباً ۵ کروڑ!

---

رضی الدین حیدر۔ رامپور

س۔ یہ شعر کس کا ہے؟

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

ج۔ یہ شعر صفی لکھنوی کا ہے۔

---

عبدالمجید خاں [illegible]

س۔ خوشتر بھیا! آج کل [illegible] کے جھگڑے چھوڑ کر [illegible] کی مذمت کیوں

نہیں کرتے؟

ج۔ کاش خدا انھیں اس کی توفیق دے!

س۔ خوشتر بھیا! ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اتنا زیادہ کیوں بکتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ ان کے پاس بکنے کے سوا کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔

س۔ ساغر کا ساغر پر کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ ساغر پر تو نہیں جام پر ایک شعر سنئے ؎

ذوقِ عمل کا بھی ساقی کی نظر کو ہے خیال
کہنہ دے پی کے کوئی ایک ہی دو جام کہیں

---

مہرالنساء قہر۔ گلبرگہ

س۔ قوت برداشت عورت میں زیادہ ہوتی ہے یا مرد میں؟

ج۔ عورت میں!

س۔ والدین، حسن و جوانی دنیا میں خریدی کیوں نہیں جاتی؟

ج۔ آپ کا سوال وضاحت طلب ہے بھوک سے سسکتی جوانی، بھوک سے نڈھال حسن کوڑیوں کے مول بکتا ہے!

س۔ میری ایک سہیلی بار بار میٹرک میں فیل ہو رہی ہے۔ مشورہ دیجئے وہ کیا کرے؟

ج۔ وہ اپنے ذہن و احساس پر مایوسی کا سایہ بھی نہ پڑنے دیں ـــــ ناکامی ہی کامیابی کا زینہ بنتی ہے۔

---

احمد ریاض قریشی بی اے [illegible]

س۔ [illegible]

[illegible]

ج۔ [illegible]

**صلاح الدین ضیاء بیجاپور**

س۔ میں اپنے لڑکے کا نام بھی خوشتر رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟

ج۔ بصد شوق رکھئے۔ لوگ تو اپنے بیٹوں کے نام پیغمبروں کے نام پر رکھتے ہیں۔ ہم کس شمار میں ہیں۔

---

**شمیم احمد خاں۔ پٹنہ**

س۔ کیا واجد مہدی علی کی وہ مشہور تخلیق جو "بیسویں صدی" میں "مشہور اہلِ قلم کے محبوب مشغلے" کے عنوان سے قسط وار شائع ہوئی تھی کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ جلد ہی وہ کتاب منظرِ عام پر آجائے گی۔

س۔ کیا آپ "تیر و نشتر" کو کتابی شکل میں شائع کرنے والے ہیں؟

ج۔ جی ہاں —— لوگوں کا اشتیاق و اصرار حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔

---

**کے۔ ایچ۔ عابدی۔ حیدرآباد دکن**

س۔ خوشتر بھائی! میں ایک عجیب الجھن میں مبتلا ہوں۔ بہت غور و خوض کیا لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ آخر آپ سے رجوع کر رہا ہوں۔ آپ کے فیصلے کو آخری فیصلہ سمجھوں گا —— میں اوسطاً ایک اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ لیکن مطمئن نہیں ہوں۔ زندگی میں اور آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ جس کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے اور ذاتی طور پر میں اس موقف میں بھی ہوں۔ لیکن والدین کی خدمت بھی زیرِ غور ہے۔ اگر آخرالذکر پر عمل کروں تو پھر آئندہ مجھے موقعہ نہ رہے گا۔ ایسے میں بتائیے مجھے اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دینا چاہئے (جیسا کہ آپ نے مئی، ۱۹۸۱ء کے "بیسویں صدی" کے "صحت و زندگی" کے کالم "خود کو پہچانئے" میں تحریر کیا ہے) یا پھر والدین کے خیال کو ترجیح دوں؟ —— خدارا ضرور جواب دیجئے گا کیونکہ میرے مستقبل کا سوال ہے۔

ج۔ والدین کی خدمت، والدین کی خوشنودی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ وہ اپنی خوشی سے آپ کو آگے پڑھنے، آگے بڑھنے کی اجازت دیں تو آگے پڑھئے۔

---

. . . . .

س۔ تاریخ ہند میں چند شہنشاہوں کے دورِ حکومت کو سنہرا زمانہ کہا جاتا ہے۔ کانگرسی دورِ حکومت کو کس نام سے یاد کیا جائے گا؟

ج۔ کانگرسی حکومت اور کانگرسی دورِ حکومت اربابِ حکومت کے لئے سنہرا ہی دورِ حکومت ہے۔ اب مورخ اس دور کو جس نام سے موسوم کرے۔ مورخ متعصب نہ ہوا تو اسے سنہرا ہی دورِ حکومت کہے گا۔

س۔ "بیسویں صدی" میں آپ صرف عورتوں ہی کے حسین فوٹو شائع کرتے ہیں۔ کیا مرد حسین نہیں ہوتے؟ دنیا میں اور بھی تو بہت سی حسین چیزیں ہیں؟

ج۔ "بیسویں صدی" "بیسویں صدی" کے قارئین کا ہے۔ وہ جیسی تصویریں پسند کرتے ہیں، ہم پیش کرتے ہیں۔

س۔ اپریل کے "بیسویں صدی" میں "سرگوشیاں" صفحہ ۹۲ پر کتابت کی ایک نمایاں غلطی نمودار ہے۔ غور فرمائیے۔

ج۔ بندہ نواز! اپریل کا "بیسویں صدی" کی سرگوشیاں کے صفحہ ۹۲ پر جسے آپ نے غلطی سمجھا ہے، معاف فرمائیے وہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ بعض لوگ سوالات لکھتے ہیں لیکن اپنا نام اور مقام لکھنا بھول جاتے ہیں۔ پھر غریب کاتب کیا کرے۔ اس کی کیا غلطی ہے؟ خود آپ نے بھی وہی کیا ہے، اپنا نام پتہ نہیں لکھا ہے۔

---

**سعیدہ بیگم۔ حیدرآباد دکن**

س۔ دنیا میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والا کون ملک ہے؟

ج۔ چین!

س۔ پُرمسرت گھریلو زندگی گزارنے کے لئے عورت کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ پُرخلوص خدمت کو اپنا شیوہ و شعار بنا لینا چاہئے۔

س۔ ہندوستان میں کانگرسی حکو[illegible] کب ختم ہوگا؟

ج۔ کانگرسیوں کی باہمی پھوٹ [illegible] جلد ہی ختم ہو جائے گا۔

---

**محمد امانت [illegible]**

س۔ کلیم عاجز [illegible] [illegible]

[illegible]

ج۔ [illegible]

[illegible]

ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر: خوشتر گرامی —— مطبوعہ: دلّی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ مقامِ اشاعت: [illegible] —— [illegible] بیسویں صدی [illegible] دہلی

# ڈکشنریاں صنعت وحرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

## کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

[illegible]

## صنعت و حرفت

[illegible]

## خانہ داری

[illegible]

# [illegible] مصنفین کی مشہور کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| شکست کے بعد | کرشن چندر | [illegible] |
| طوفان کی کلیاں | 〃 | چار روپے |
| [illegible] | 〃 | تین روپے |
| [illegible] | 〃 | دو روپے پچھتر پیسے |
| [illegible] | 〃 | دو روپے پچیس پیسے |
| [illegible] | شوکت تھانوی | دو روپے |
| [illegible] | 〃 | تین روپے پچاس پیسے |
| [illegible] | 〃 | دو روپے پچاس پیسے |
| [illegible] | 〃 | تین روپے پچیس پیسے |
| [illegible] | 〃 | پانچ روپے |
| [illegible] | 〃 | دو روپے پچیس پیسے |
| گؤدان | پریم چند | پانچ روپے |
| [illegible] | 〃 | گیارہ روپے |
| [illegible] | 〃 | تین روپے |
| [illegible] | 〃 | تین روپے |
| صبح زندگی | راشد الخیری | دو روپے |
| شب زندگی | 〃 | ایک روپیہ [illegible] |
| شام زندگی | 〃 | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| سیدہ کی بیٹی | رازق الخیری | تین روپے |
| [illegible] | مجنوں گورکھپوری | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| [illegible] | 〃 | چار روپے |
| [illegible] | کنہیا لال کپور | تین روپے |
| سنگ و خشت | 〃 | دو روپیہ پچاس پیسے |
| [illegible] | جاں نثار اختر | چار روپے پچاس پیسے |
| شعلۂ سنگ | کوثر چاندپوری | تین روپے پچاس پیسے |
| شمع | اے آر خاتون | پانچ روپے |
| چشمہ | 〃 | دس روپے پچھتر پیسے |
| [illegible] | مسرور جہاں | چار روپے پچیس پیسے |

| | | |
|---|---|---|
| شکست طلسم | [illegible] | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| تمنا کی کلیاں | 〃 | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| پہلی محبت | 〃 | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| خواب گاہیں | 〃 | تین روپے پچاس پیسے |
| دنیا کے مشہور سائنسداں | 〃 | دو روپے پچیس پیسے |
| شائستہ | نادرہ خاتون | چار روپے پچاس پیسے |
| ظالم | سیارہ | دو روپے پچاس پیسے |
| فتح خیبر | صادق حسین | چار روپے |
| مقابلہ | خان محبوب طرزی | تین روپے |
| نیلوفر | 〃 | تین روپے |
| اکبری دستور | 〃 | چار روپے |
| دوشیزۂ [illegible] | 〃 | تین روپے |
| [illegible] | 〃 | تین روپے |
| دو دیوانے | 〃 | دو روپے پچاس پیسے |
| سیلاب | 〃 | تین روپے |
| گناہ | دت بھارتی | دو روپے پچاس پیسے |
| اندھیرے اجالے | [illegible] رشید | تین روپے |
| [illegible] | 〃 | تین روپے پچاس پیسے |
| دو پھول | 〃 | تین روپے پچھتر پیسے |
| مفرور | رئیس احمد جعفری | پانچ روپے پچاس پیسے |
| قیامت | [illegible] | دو روپے پچاس پیسے |
| ساحل | 〃 | دو روپے پچاس پیسے |
| گورا | ٹیگور | پانچ روپے پچاس پیسے |
| [illegible] | [illegible] | تین روپے پچاس پیسے |
| دل ہی تو ہے | 〃 | پانچ روپے پچیس پیسے |
| ممتاز | ایم اسلم | آٹھ روپے |
| آخری داغ | 〃 | پانچ روپے |
| ریحانہ | 〃 | سات روپے |

| | | |
|---|---|---|
| وعدہ | [illegible] | چار روپے پچھتر پیسے |
| [illegible] | [illegible] | چار روپے |
| فردوس گوش | [illegible] | چار روپے |
| کفر و ایمان | ہری چند اختر | چار روپے |
| وسکی کی بوتل | [illegible] | دو روپے |
| [illegible] | [illegible] لکھنوی | تین روپے |
| موٹر میکینک گائڈ | شیو ناتھ سکسینہ | چار روپے |
| موٹر ڈرائیونگ | [illegible] | چار روپے پچاس پیسے |
| کیا خوب آدمی تھا | | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| عجیب لڑکی | اوم پرکاش [illegible] | تین روپے |
| [illegible] | [illegible] | پچاس پیسے |
| [illegible] | 〃 | پچاس پیسے |
| اجالے سے پہلے | ابراہیم جلیس | دو روپے پچاس پیسے |
| ابھرتے جوبن | [illegible] | دو روپے |
| اندھیرے میں چراغ | [illegible] | سات روپے پچاس پیسے |
| [illegible] | [illegible] | پچاس پیسے |
| انارکلی | امتیاز علی تاج | دو روپے پچاس پیسے |
| آشا دیپ بجھا | [illegible] | دو روپے |
| ابراہیم لنکن | [illegible] | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| انسانیت موت کے دروازے پر | مولانا ابوالکلام آزاد | تین روپے پچاس پیسے |
| اصلی مکمل باورچی خانہ | [illegible] | تین روپے پچاس پیسے |
| جینے کے لئے | ستیہ پال آنند | دو روپے پچاس پیسے |
| پچیس سال بعد | [illegible] | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| حادثہ | قیس رامپوری | پانچ روپے پچاس پیسے |
| خون | شہزاد تبسم | چار روپے |
| رضیہ کا شاہی دسترخوان | رضیہ سلطانہ | دو روپے پچاس پیسے |
| رسیلی | شہزاد تبسم | دو روپے پچاس پیسے |
| زمین کے [illegible] | [illegible] | تین روپے پچاس پیسے |

طلب کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۳۲، دہلی

دلجیت کور۔ آدمپور

س۔ بھیا! چاند زمین سے کتنے فاصلے پر ہے؟

ج۔ ۲۳۰۰۰۰ میل کے فاصلے پر۔

---

خورشید پرویز۔ فیروزآباد

س۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت؟

ج۔ ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔

س۔ دنیا کی آبادی میں مسلمان کس درجہ پر ہیں؟

ج۔ تیسرے درجے پر۔ دنیا میں سب سے زیادہ عیسائی ہیں، پھر بودھ، پھر مسلمان۔

---

سلمیٰ قریشی۔ الٰہ آباد

س۔ بھائی جان! ہمارے نئے راشٹرپتی کی عمر کیا ہے؟

ج۔ ستر سال۔

س۔ ہمارے نئے صدر راشٹرپتی کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے کیا کرتے تھے؟

ج۔ بہار کے گورنر تھے۔

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں، موصوف نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کہاں سے حاصل کی ہے؟

ج۔ برلن یونیورسٹی سے۔

---

ثاقب صدیقی۔ حیدرآباد دکن

س۔ ریڈیو کس نے ایجاد کیا اور کب؟

ج۔ اٹلی کے جی مارکونی نے ۱۸۹۵ء میں ایجاد کیا۔

س۔ کیا ہم "بیسویں صدی" کے لئے تصویریں بھیج سکتے ہیں؟

ج۔ بصد شوق بھیج سکتے ہیں لیکن بیسویں صدی کا معیار اور انداز پیش نظر رکھ کر۔

---

ع۔ق۔ لاری۔ لار۔ دیوریا

س۔ جدوجہد کے عوض مایوسیاں ہی نصیب ہوں تو کیا کریں؟

ج۔ جدوجہد جاری رکھیں۔

س۔ آج کل ہر انسان غرض کا بندہ کیوں نظر آتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ آج کل ہر شخص غرض کا بندہ ہو گیا ہے۔

س۔ وفادار دوست نایاب کیوں ہو گئے؟

ج۔ وفادار دوستوں پر ہمین کے پالو کا سایہ پڑ گیا!

---

سعیدہ ناز۔ سہسوان۔ بدایوں

س۔ بھائی جان! کیا آپ بتا سکتے ہیں حالیہ انتخابات میں کتنے ووٹروں نے حصہ لیا؟

ج۔ ۲۲ کروڑ ۸۰ لاکھ نے۔

س۔ اور کیا یہ بھی بتا سکتے ہیں اس الیکشن پر کتنا خرچ ہوا؟

ج۔ تقریباً ۹۰ کروڑ!

---

رضی الدین حیدر۔ رامپور

س۔ یہ شعر کس کا ہے؟

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

ج۔ یہ شعر مصحفی لکھنوی کا ہے۔

---

عبدالمجید خاں۔ برہانپور۔ ایم پی

س۔ خوشتر بھیا! آج کل نیتا آپس کے جھگڑے چھوڑ کر بہار کے بھوکوں کی خدمت کیوں نہیں کرتے؟

ج۔ کاش ان کو انھیں اس کی توفیق [illegible]

س۔ خوشتر بھیا! ڈاکٹر رام منوہر لوہیا [illegible] کیوں کہتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ ان کے پاس کہنے کے سوا کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔

س۔ ساغر کا ساغر پر کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ ساغر پر تو نہیں جام پر ایک شعر سنئے ؎

ذوقِ عمل کا بھی ساقی کی نظر کو ہے خیال
کہہ دے پی کے کوئی ایک ہی دو جام کہ بس

---

مہرالنساء قمر۔ گلبرگہ

س۔ قوت برداشت عورت میں زیادہ ہوتی ہے یا مرد میں؟

ج۔ عورت میں!

س۔ والدین، حُسن و جوانی دنیا میں خریدی کیوں نہیں جاتی؟

ج۔ آپ کا سوال وضاحت طلب ہے بھوک سے سسکتی جوانی، بھوک سے نڈھال حُسن کوڑیوں کے مول بکتا ہے!

س۔ میری ایک سہیلی بار بار میٹرک میں فیل ہو رہی ہے مشورہ دیجئے وہ کیا کرے؟

ج۔ وہ اپنے ذہن و احساس پر مایوسی کا سایہ بھی نہ پڑنے دیں ــــــ ناکامی ہی کامیابی کا زینہ بنتی ہے۔

---

احمد ریاض قریشی بی اے علیگڑھ

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎

سمجھتی ہیں مآلِ گل مگر کیا جبرِ فطرت ہے!
ہر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

ج۔ یہ شعر حضرت جوش ملیح آبادی کا ہے۔

[illegible]

نسیم اعظمی، پٹنہ

س۔ کیا علامہ [illegible] کی وہ مشہور تخلیق جو
بیسویں صدی میں "شہپال" [illegible] کے
[illegible] قسط وار شائع
ہوئی تھی کتابی شکل میں شائع ہوئی ہے؟

ج۔ [illegible] جلد ہی وہ کتاب منظر عام پر آجائے گی۔

س۔ [illegible] "تیر و نشتر" کو کتابی شکل میں شائع
کیوں نہیں کرتے ہیں؟

ج۔ [illegible] —— لوگوں کا اشتیاق و اصرار
بہت بڑھتا جا رہا ہے۔

---

کے۔ ایم۔ عابدی، حیدرآباد دکن

س۔ محترم بھائی! میں ایک عجیب الجھن میں مبتلا
ہوں۔ بہت غور و خوض کیا لیکن کسی نتیجے پر
نہیں پہنچ سکا۔ آخر آپ سے رجوع کر رہا ہوں۔
آپ کے فیصلے کو آخری فیصلہ سمجھوں گا ——
میں اوسطاً ایک اچھے عہدے پر فائز ہوں۔
لیکن مطمئن نہیں ہوں۔ زندگی میں اور آگے
بڑھنا چاہتا ہوں۔ جس کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل
کرنا ضروری ہے اور ذاتی طور پر میں اس
موقف میں بھی ہوں۔ لیکن والدین کی خدمت
بھی زیر غور ہے۔ اگر آخر الذکر پر عمل کروں تو
پھر آگے نہ بڑھ سکوں گا۔ ایسے میں بتائیے
[illegible]
(جیسا کہ آپ نے [illegible]
سے صحت و زندگی [illegible]
میں تحریر کیا ہے) یا پھر والدین کی خدمت کو
ترجیح دوں؟ —— نہایت ضروری جواب
دیجئے کیونکہ یہ میرے مستقبل کا سوال ہے۔

ج۔ والدین کی خدمت اور والدین کی خوشنودی
کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ وہ اپنی خوشی
سے آپ کو آگے پڑھنے اور آگے بڑھنے کی اجازت
دیں تو آگے پڑھئے۔

---

. . . . .

س۔ تاریخ ہند میں چند شہنشاہوں کے دورِ حکومت
کو سنہرا زمانہ کہا جاتا ہے۔ کانگریسی دورِ
حکومت کو کس نام سے یاد کیا جائے گا؟

ج۔ کانگریسی حکومت اور کانگریسی دورِ حکومت
اربابِ حکومت کے لئے سنہرا دورِ حکومت
ہے۔ اب مورخ اس دور کو جس نام سے
موسوم کرے۔ مورخ متعصب نہ ہوا تو اسے
سنہرا ہی دورِ حکومت کہے گا۔

س۔ "بیسویں صدی" میں آپ صرف عورتوں ہی
کے حسین فوٹو شائع کرتے ہیں۔ کیا مرد
حسین نہیں ہوتے؟ دنیا میں اور بھی تو
بہت سی حسین چیزیں ہیں؟

ج۔ "بیسویں صدی" بیسویں صدی کے قارئین
کا ہے۔ وہ جیسی تصویریں پسند کرتے ہیں
ہم پیش کرتے ہیں۔

س۔ اپریل کے "بیسویں صدی" میں سرگوشیاں
صفحہ ۹۲ پر کتابت کی ایک نمایاں غلطی
ہو گئی ہے۔ غور فرمائیے۔

[illegible]
[illegible] نہیں لکھا ہے۔

---

سید [illegible] حیدرآباد دکن

س۔ دنیا میں سب سے [illegible]
کون [illegible] ہے؟

ج۔ [illegible]!

س۔ پرسکون گھریلو زندگی گزارنے کے لئے عورت
کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ پرخلوص خدمت کو اپنا شعار بنا
لینا چاہئے۔

س۔ ہندوستان میں کانگریسی حکومت کا [illegible]
کب ختم ہوگا؟

ج۔ کانگریسیوں کی باہمی پھوٹ کا یہی عالم رہا تو
جلد ہی ختم ہو جائے گا۔

---

محمد امانت [illegible] پٹنہ [illegible]

س۔ کلیم [illegible] عظیم آبادی [illegible]
[illegible]
اور [illegible]

ج۔ [illegible]

Regd. No. D 100

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 630/57

BISWIN SADI

31 ST. YEAR OF PUBLICATION

Telephones Office 271637 Residence 619927





بے داغ، دلاویز، کنوارا مکھڑا  ماہِ کامل سے بھی ہے پیارا مکھڑا
آنکھوں میں سماتا ہے گلِ تر بن کر  شبنم سے دھلا ہوا تمہارا مکھڑا

نرش کمار شاد ——— فوٹو: روشن لال وششٹ۔ چمپلور



نئے خیال ، نئے ولولے ، نئے جذبے
تصوّرات کو جھولا جھلائے جاتے ہیں

فوٹو : سورج این شرما ۔ جے پور



سرورنیشنل گارڈن شمی محلہ لائل پور

۵ اگست ۱۹۶۷ء

محترم خوشتر چچا جان! سلام

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں ۳۰ جولائی ۱۹۶۷ء کو اعجاز نسرین سے اعجاز نسیم بن گئی ہوں - یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ آپ کو شادی کا دعوتی کارڈ شادی کے پندرہ دن بعد ملے گا - قارئین "بیسویں صدی" کے لئے شادی کی تصاویر بھجوا رہی ہوں - بمل بھیا (بمبئی) اور آزاد چچا کو بھی بتا دیجیئے گا - کنول بیٹی کے بعد اب آپ دوسری بیٹی کے فرض سے بھی سبکدوش ہوگئے ہیں۔

چچا جان مجھے اب بھی قدم قدم پر آپ کی دعاؤں اور خلوص کی ضرورت ہے - نسیم صاحب ٹھیک ٹھاک ہیں آداب کہہ رہے ہیں...

آپ کی بیٹی

اعجاز نسیم

عزیزہ بیٹی کی شادی خانہ آبادی پر مدیر "بیسویں صدی" خلوص دل سے اپنی نیک دعاؤں کے پھول بھیجتے ہوئے یقین دلاتا ہے کہ زمین کی تقسیم سے دل کبھی تقسیم نہیں ہوسکتے۔ ؎

کون کرسکتا ہے تقسیم دلوں کی جاگیر



نسیم سرور نکاح کے رجسٹر پر دستخط کرتے ہوئے

میری دعا ہے پھولے پھلے اس جہان میں نوشہ رہے کلیدِ درِ جاں لئے ہوئے



نسیم سرور اور اعجاز نسیم

ان کو حاصل ہو بہارِ زندگی اور رہیں یہ کامگارِ زندگی



صالحہ کوثر ——— اور ——— ظفر احمد نظامی

پچھلے دنوں اُردو کے نامور اور کہنہ مشق افسانہ نگار حضرت کوثر چاندپوری کی صاحب زادی صالحہ کوثر ایم۔ اے کی شادی خانہ آبادی جواں سال شاعر و ادیب پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم۔ اے کے ساتھ بھوپال میں ہوئی ہے

میری دُعا یہ ہے، نئے ہندوستان میں دونوں کے ماتھے پر ہو نئی زندگی کا نُور



عقد کے بعد کا منظر

پہلی صف میں کھڑے ہیں وحید پرواز، رام لعل، ظفر احمد نظامی، سہیل احمد سہروردی، کوثر چاندپوری، مقصود اصغر اور دوسری صف میں مقار صدیقی، محمد عثمان، پروفیسر فاروق احمد جیلانی، خان عبدالودود خان، فرمان عثمانی، بے بی غوثیہ، ظہیر صدیقی اور عزیز اندوری ہے

ٹیلیفون دفتر ——— ۲۱۹۳۷
ٹیلیفون رہائش ——— ۴۱۹۹۲۰


۱۔ تیر و نشتر ——— خوشتر گرامی ——— ۹
۲۔ تازہ بہ تازہ ——— خوشتر گرامی ——— ۱۴
۳۔ چوٹ ——— افسانہ ——— ظفر عالمگیر یوسف زئی۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ سی ——— ۱۵
۴۔ غزل ——— کرشن موہن۔ ایم۔ اے ——— ۲۳
۵۔ ستات بار ——— افسانہ ——— م۔ ک۔ مہتاب۔ ایم۔ اے ——— ۲۵
۶۔ غزل ——— پروفیسر ایم۔ اے حفیظ بنارسی۔ ایم۔ اے ——— ۲۹
۷۔ غزل ——— احسان دانش ——— ۲۹
۸۔ سسکیاں ——— افسانہ ——— پرنسپل قمر فرشوری۔ ایم۔ اے ——— ۳۱
۹۔ تغافل ——— مختلف شعراء ——— ۳۲
۱۰۔ انتظار ——— مختلف شعراء ——— ۳۴
۱۱۔ خد و خال ——— مخمور سعیدی ——— ۳۵
۱۲۔ ہرجائی ——— افسانہ ——— زکی انور۔ ایم۔ اے ——— ۳۸
۱۳۔ غزل ——— سید حباب ترمذی ——— ۴۳
۱۴۔ غزل ——— افسانہ ——— مس صفیہ سلطانہ۔ بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ ——— ۴۵
۱۵۔ غزل ——— پروفیسر محمد نشاط الرحمٰن خان منشاؔ۔ ایم۔ اے ——— ۴۹
۱۶۔ غزل ——— حباب ہاشمی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ ——— ۴۹


قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ پچیس پیسے
چندہ سالانہ بیرون ہند [illegible]

۱۷۔ [illegible] ——— ڈاکٹر [illegible] ——— [illegible]

۱۸۔ [illegible] ——— ریشن [illegible] ——— [illegible]

۱۹۔ ماضی کے کھنڈر ——— مس نگہت ریحانہ ایم۔اے ——— [illegible]

۲۰۔ غزل ——— شفیع کرنی ——— [illegible]

۲۱۔ غزل ——— سعادت نظیر ایم۔اے ——— [illegible]

۲۲۔ گھر کی دیوار ——— مس نسیم قیوم بی۔ایس۔سی ——— [illegible]

۲۳۔ غزل ——— سعادت جاہ ——— ۶۳

۲۴۔ غزل ——— شباب للت ایم۔اے ——— ۶۴

۲۵۔ پیارا یوسف ——— ظفر اوگانوی۔ایم۔اے ——— ۶۵

۲۶۔ غزل ——— سعیدہ سلطانہ شمسہ لکھنوی ——— ۸۲

۲۷۔ غزل ——— ناز بریلوی ——— ۸۱

۲۸۔ غزل ——— عابد مناوری ——— ۸۱

۲۹۔ خط لکھیں گے ——— فکر تونسوی ——— ۸۳

۳۰۔ دردآشنا ——— ریاض اقبال ——— ۸۶

۳۱۔ صحت وزندگی ——— آپ کے خیالات ———

دانتوں کی حفاظت ——— خود اعتمادی پیدا کیجئے ———

آپ ہمیشہ جوان رہ سکتے ہیں ——— ۹۱

۳۲۔ سرگوشیاں ——— ۹۳

# تیر و نشتر

خوشتر گرامی

"ہندوستان میں جمہوری نظام بحال رہے گا" ایک عنوان ـــــ
لیکن جب تک وزیروں، بیوروکریٹوں، پولیس افسروں، بیوپاریوں اور سیاسی لیڈروں کی اولادیں ہیں ـــــ جمہوریت کے قائم رہنے کے امکانات ہیں؟

"محکمات بالخصوص رہنے والے افسروں کی خبر لی جائے گی" پنجاب سرکار کی وارننگ ـــــ اور بالخصوص رہنے والے وزیروں کی خبر کون لے گا؟ اس کا اختیار افسروں کو ہونا چاہیے۔

"بہار وزارت میں توسیع کا فیصلہ" ایک خبر ـــــ جن لوگوں نے تختہ الٹ دینے کی دھمکی دی ہوگی ان کے وارے نیارے ہوں گے۔

"میسور میں نشہ بندی ختم" ایک خبر ـــــ گاندھی جی کی نام لیوا کانگریسی حکومت کے ہاتھوں۔

"بہت سے راجے مہاراجے کانگریس سے الگ ہو گئے" ایک خبر ـــــ
مرتے وقت کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔

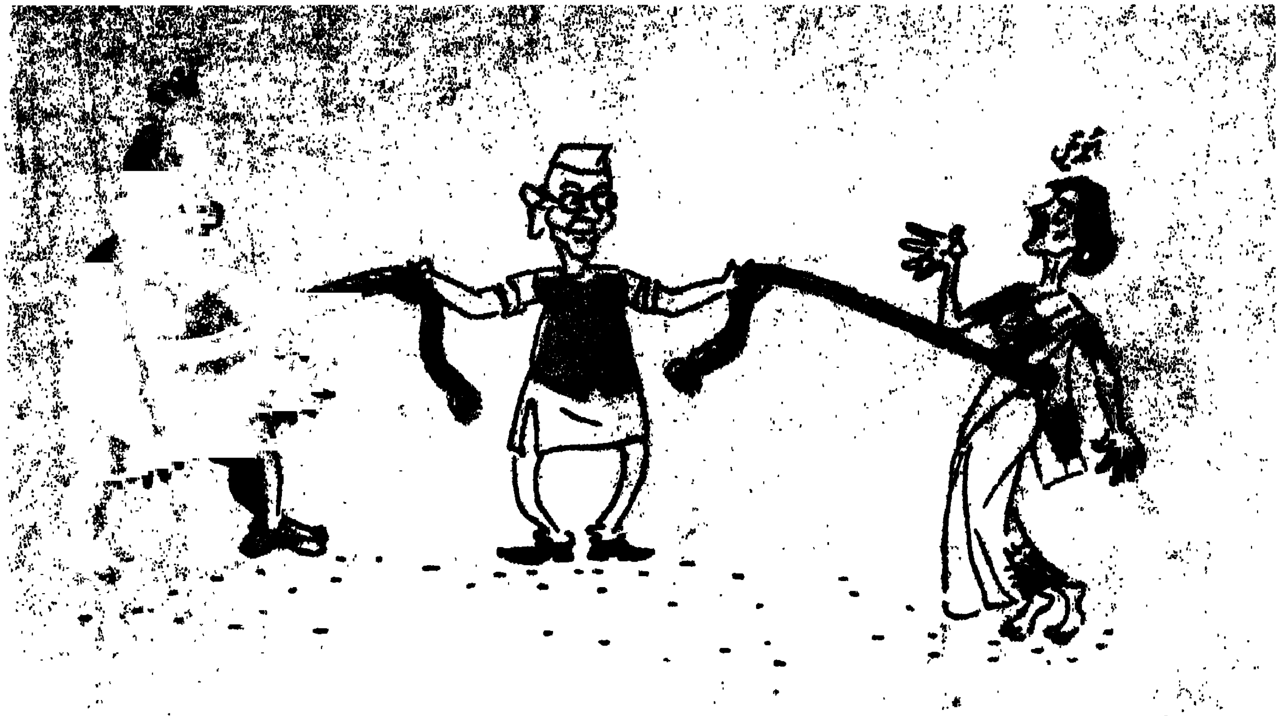
"بڑے بڑے لوگ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور محفوظ رہتے ہیں" ایک تبصرہ ـــــ بلکہ وہ قانون داں اور قانون ساز کہلاتے ہیں۔

"چینی غنڈوں نے فرنیچر توڑ ڈالا اور ریکارڈ جلا دیا" ایک خبر ـــــ
یہ غنڈے نہیں سرخ محافظ ہیں اور اس حرکت کا نام ہے کلچرل انقلاب۔

"راجستھانی زبان کو تسلیم کیا جائے" ایک مطالبہ ـــــ یہاں تسلیم شدہ اردو کو یار لوگ تسلیم نہیں ہونے دے رہے ہیں۔ راجستھانی بیچاری تو ہے کس قطار و شمار میں۔



"راجدھانی میں جرائم کی رفتار میں اضافہ" ایک




اُجرتوں اور قیمتوں پر روک کے لئے مرارجی ڈیسائی کا چابک

---

• ہمانسشیل رنگے ہاتھوں گرفتار — یہ ایک خبر — بیچارے کو ہاتھ دھونے کا موقع بھی نہ ملا۔

• ایک بھارت کانگریس ممبر کا واک آؤٹ — یہ ایک خبر — اِس بیچارے کو کیا کہئے آج کل تو کانگریس سے لوگوں نے واک آؤٹ کی تحریک شروع کر رکھی ہے۔

• مرکز پر کیرل حکومت کے خلاف سازش کا الزام — یہ ایک عنوان — کوئی تعجب نہیں، دو مخالف ملکوں کی حکومتیں جو ٹھہریں۔

• بڑھاپے کی پنشن ابھی رائج نہیں ہوگی — یہ ایک خبر — اِس لئے کہ نیتاؤں پر ابھی بڑھاپا نہیں آیا۔

• لکھنؤ میں انگریز جرنلی خاتون گرفتار — یہ ایک خبر — اگر خاتون جگہ صنف نازک ہوتی تو اس بیچاری کا دکھ درد سمجھ سکتی۔

• آزادی کی نعمتیں کہاں ہیں؟ — ایک سوال —
وزیروں کی کوٹھیوں میں
اُن کے سیکریٹریوں کے گھروں میں
اُن کے پی۔ اے کی جیب میں
اُن کے عزیزوں اور رشتے داروں میں

• بھارت سرکار نے نئی چینی پالیسی کا اعلان کر دیا — ایک عنوان — مگر ذرا بھی میٹھا نہیں بلکہ بہت کڑوا ہے۔

• دلی ڈویلپمنٹ اتھارٹی خود مکان تعمیر کرے گی — ایک خبر — مکان مالکوں کو گاہک سامنے دیکھ کر منہ میں پانی بھر آئے گا۔

• بس لوٹ کر ڈاکو فرار — ایک خبر — ڈاکو بس میں کیا کرتے بیٹھے رہتے۔

[illegible] حکومت کے [illegible] ایک خبر ——— [illegible]

گیانی ذیل سنگھ (پنجاب) متحدہ محاذ میں۔ ایک خبر ——— کیا متحدہ ہو سکے گا جو وزارت کی لاش نکلنے والی ہے۔

۔ اجناس کی تقسیم پر کنٹرول کے لئے سرکاری پلان کا اعلان جلد ہوگا۔
مرارجی ڈیسائی کا بیان ——— گویا کنٹرول جیسا سنہرا اعلان۔

کانگریس بہت اٹھا رہی ہے۔ ایک عنوان ———
کروزارت کی خاطر پانی منہ دلیں گے۔
کروزارت کے کروڑوں سے آنکھیں چرالیں گے۔
کرایت بوم [illegible] لیں گے۔ لنگی [illegible] گے۔
کر بلیک مارکیٹیں اور ذخیرہ اندوزوں کی پشت پناہی کریں گے۔
[illegible] سے [illegible] کے سرکار سے بھتے وصول کریں گے۔
[illegible] میں غیر ملکی [illegible] کے تبادلے کروائیں گے۔

۔ ٹیکس ختم کرا کر دم لیں گے۔ ایک خبر ——— اور مرارجی ڈیسائی کے دور میں۔ توبہ، معاذ اللہ۔

۔ اندرا سرکار کا حشر بھی مہرا سرکار جیسا ہوگا۔ اٹل بہاری کی پیشگوئی
——— منہ دھو لیجئے۔ وزارت آپ کی باندی بننے کو تیار ہے۔

۔ اردو کے بارے میں ایس۔ ایس کی دو زبانیں۔ ایک عنوان ———
یعنی با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام۔

چرن سنگھ کے استعفے پر اخباری تبصرہ: حکومت کوئی بھی نہیں گرے گا۔
اور سارے معاملات طے ہو جائیں گے۔ ——— ٹھیک پہچانا آپ نے۔ ہاتھ آئی وزارت کون ٹھکرا دیتا ہے۔



راجے مہاراجے پریوی پرس کے مسئلے پر حکومت سے ٹکر لینے کی تیاریوں میں





"اسرائیل کو سامراجی طاقتوں نے جنم دیا اور وہ اُن کی کٹھ پتلی ہے" ——— ایک عنوان

---

"بھارت سیوک سماج کا گودام لُٹ لیا گیا" ایک خبر ——— سماج سیوا کا یہ طریقہ تو بھارت سیوک سماج والوں کو معلوم نہ ہوگا۔

"سیاسی رنگ دینے سے مسائل حل نہ ہوں گے" یہ چوہان کا انتباہ ——— اس لئے کہ یہ رنگ پکا ہے۔ چڑھ گیا تو پھر اُترنا مشکل ہو جائے گا۔

"دلی کی کچہری میں سنسنی" یہ ایک خبر ——— ججوں، ملزموں اور وکیلوں کی [illegible]

"بھوکے پیٹ نہیں پڑھیں گے۔ طلباء نے اسکول کو آگ لگا دی" یہ ایک خبر ——— اور اُن کا پیٹ بھر گیا۔

"آگرے میں میدے کے ٹرک پکڑے گئے" یہ ایک خبر ——— تبھی تو ڈبل روٹی ناپید ہو گئی کیونکہ اب میدے کے ٹرک بننے لگے۔

"پنجاب کے ٹیچروں نے وزیر تعلیم کا گھیراؤ کیا" ایک خبر ——— وزیروں کو تعلیم دینے کا طریقہ۔

"اُردو کے نام پر وطن دشمن سرگرمیاں" یہ ایک ہندو مہاسبھائی لیڈر کی چیتاونی ——— مہاشہ جی کے خیال میں اُردو کی مخالفت وطن دشمنی نہیں۔

"خوش وضع پتلون" یہ ایک عنوان ——— وہ ہے جو ٹانگوں میں پہننے کے بعد غلاف چڑھی سارنگی معلوم ہو۔

"پاکستان سے امریکن شانتی مشن کے تمام والنٹیئر نکال دیئے گئے" یہ ایک خبر ——— اور بھارت میں بدستور دندنا رہے ہیں۔ ہمارا دیش شانتی پریمی جو ٹھہرا۔

"نئی قسم کی گندم کے تجربے ہو رہے ہیں" یہ ایک خبر ——— اور کھانے والے سب کے سب پُرانے ہی ہیں۔

"جنتا سامنے دہلی کی سڑکوں پر نہیں — مسٹر دیسائی تسلیم ہو رہا ہے"
عملی سطح پر مظاہرات ـــــ شری ... ہماری ... ہے
اور دلی میں مسرا ... آتی ہے۔

"دلی سے جو کی برآمد ممنوع" — ایک خبر ـــــ اس لئے کہ یہیں جو کا پانی
نکالا جائے گا ـــــ اور اُسے بیئر کے حسین نام سے نوازا جائے گا۔

"تعلیم کے بجائے ٹیکنیک" — عنوان ـــــ اور جغرافیہ کا سبق دو۔

"گاؤں گاؤں میں ٹی وی" — ایک خبر ـــــ گھر بیٹھے سمندر کے نظارے کا
موقع ملے گا گاؤں گاؤں والوں کو۔

"پچھلے برس قومی آمدنی میں اضافہ ہوا" — ایک عنوان ـــــ اس برس کی
بات کرو ـــــ جب سے ملہوترا جی وزیرِ خزانہ ہیں۔

"گورنام سنگھ کو پرنام کرو۔ ڈپٹی اسپیکر پنجاب اسمبلی کا استعفیٰ" — ایک خبر
ـــــ ہمت کر کے دو چار ساتھی بنا کر کھاؤ قلابازی۔ پھر بیڑا پار ہے۔

"نہرو کی مخالفت غلط بنیادوں پر" — شری جمنا داس اختر مدیر سویرا ـــــ
جن لوگوں کو مخالفت کرنی ہے اُن کے لئے صحیح غلط کیا۔

"ریوالور کی نوک پر ڈکیتی" — ایک خبر ـــــ ہو سکتا ہے اگر مال ریوالور کی
نوک میں بھی محفوظ نہ رہا تو پھر کہاں رہے گا۔

"چین اب ایٹمی آبدوزیں تیار کر رہا ہے" — ایک خبر ـــــ تاکہ وقت
آنے پر دنیا سے منہ چھپانے کے لئے اُن میں بیٹھ کر ڈبکی لگا سکیں۔

"دلی میں مورچے لگیں گے" — ایک خبر ـــــ بیچاری دلی اب انہیں کاموں
کے لئے رہ گئی ہے۔



مدراس میں کانگریسیوں پر حملے

# ماؤزے تنگ

## [illegible]

ٹھگنا چپٹا، گول صفاچٹ چہرہ، [illegible] لومڑی کی سی آنکھیں، سر لق و دق کی سرزمین۔ جس پر اکا دکا گھاس کی بالیں نظر آتی ہیں۔ کینہ پرور ہاتھی جیسے بھدے بھدے [illegible] قد۔ یہ ہیں ——



امن بذریعۂ جنگ کے علمبردار۔ بزعم خود مارکس ازم اور لینن ازم کے ٹھیکیدار۔ شعراء کا اسلوب بندی، شعراء کا جگل بازی۔ پگڑی اچھال، دریدہ دہن، محسن کش، بکری کی کھال میں خونخوار بھیڑیا —— خاکم بدہن چینیوں کے نزدیک ان کا خدا جو پہاڑ اکھاڑ سکتا ہے، سمندر پھاڑ سکتا ہے۔ زمین کا تختہ الٹ سکتا ہے، آسمان کے تارے توڑ کر لا سکتا ہے۔ لیکن عالم یہ ہے کہ کوشش اور خواہش کے باوجود اپنے ہی ملک میں صدر چین لیو شاؤچی کو نہیں ہٹا سکتا اور جس کے ہتھکنڈوں کی بدولت آج چینی خون میں نہا رہے ہیں۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں۔ آج لوگ اس کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں مگر علامہ اقبال کی روح پکار کر کہہ رہی ہے کہ کل ؏

# چوٹ

——— ظفر عالمگیر یوسف زئی ایم اے ایم سی

۴۴-۴/۴/ب-۳، ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸
۳ جولائی ۱۹۶۷ء

فرخ بھائی! تسلیمات

آپ نے کسی خط میں اپنی صحت کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے پھر بھی "بیسویں صدی" کے بعض خطوط سے کچھ تشویش ناک اندازے ہوتے۔ خدا کرے میرے اندازے غلط ہوں اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ کے شاملِ حال ہوں۔ ہم گنہگار، خطاکار، بے پروا، تغافل پسند، دنیادار سب کچھ ہی ہیں، اللہ کی رحمتیں بھی تو بے کراں ہیں۔ اُن بیکراں وسعتوں میں ہماری خطاؤں کی حقیقت کیا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سمندر کی موجیں تنکوں کو کشتی بنا دیں۔ صحت کے بارے میں آپ کو کچھ لکھنا عجیب سی بات ہے۔ لیکن یہ کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ آپ کثرتِ کار کو حتی الامکان کم کریں۔ اُردو ادب کے "بیسویں صدی" اسکول کو اب آپ کی خدمت سے زیادہ سرپرستی کی ضرورت ہے۔

ایک مزاحیہ افسانہ ارسالِ خدمت ہے۔ افسانہ نمبر کے لئے میں نے تصویر آپ کو بھیج دی تھی۔ اُس کے دیر سے پہنچنے کی بنا پر شائع نہ ہو سکنے کا اختر اور انور کو بے حد افسوس ہے۔ میری کوئی چیز کہیں شائع ہوتی ہے تو میں شاذ ہی کسی کو دکھاتا یا اُس کا کہیں تذکرہ کرتا ہوں۔ ثریا کو میری یہ عادت کبھی پسند نہ آئی۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ جب دوسرے آپ کے سامنے اپنی بڑائی ہانکتے ہیں تو آپ کیوں چپ رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ اپنا اپنا ظرف ہے لیکن اختر اور انور نے ثریا کی خواہش پوری کر دی ہے۔ دونوں اچھے خاصے پروپیگنڈا سکریٹری بنے ہوئے ہیں۔ میرے عزیز و اقارب اور دوست احباب کے علاوہ دونوں اپنے دوستوں اور اسکول کی ٹیچرس تک کو میری چیزیں دکھاتے پھرتے ہیں۔ اس دعوے کے ساتھ کہ ہمارے ابو کی طرح کوئی اُردو اور انگریزی نہیں لکھ سکتا۔ اختر کو پھر بھی شعور آگیا ہے۔ انور تو بالکل بچہ ہے اُس کا دعویٰ ہے کہ کسی کے ابو کی اتنی تنخواہ بھی نہیں ہو سکتی۔ میں نے کئی بار منع کیا تو چوری چھپے یہ مہم جاری رہی۔ ممکن ہے چوری چھپے محترمہ ثریا آرم زیب صاحبہ کی سرپرستی بھی رہی ہے۔ اب میں نے اس سلسلے میں کچھ کہنا چھوڑ دیا ہے ——— ایک اور تخلیق راجہ مہدی علی خان کے انداز میں جلد ارسال کروں گا، انشاء اللہ اسی ہفتے!

آپ کا ——— ظفر عالمگیر

---

بات کے دھنی رہے تھے۔ مولوی بدرالحسن صاحب سفید براق کی [illegible] شیروانی پہنے، سر کی ٹوپی اوڑھے، چھڑی گھماتے پھندنا ہلاتے، مستقبل کا حسین خواب دیکھتے، جھومتے جھامتے گھر کی طرف رواں دواں تھے۔ منشی عبدالغنی نے انھیں دیکھا۔ دونوں بے حد بے تکلف دوست تھے۔

"ابے او مولوی! ذرا ادھر تو آ، بات سُن!"

"کہو!" مولوی صاحب رُک گئے۔

"کبھی کا اخبار دیکھا؟"

"نہیں، کیوں خیر تو ہے؟"

"تجھے اپنی تو کوئی فکر ہے ہی نہیں، خان بہادر صمد یار خان نے اشتہار دیا ہے"

"کاہے کا اشتہار؟"

"اُن کی لڑکی کے لئے رشتہ درکار ہے"

"ہشت یار!" مولوی صاحب چلنے کو تھے کہ منشی جی نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"تیری جان کی قسم! سچ کہہ رہا ہوں، گھر جا کر دیکھ لینا اخبار تو ہوگا"

"دیکھ کر کیا کروں؟"

"قسمت آزمائی ہو جائے" منشی جی نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"وہاں مجھے کون گھاس ڈالے گا؟"

"خان بہادر کی لڑکی کون سی حسین ہوگی۔ ہو سکتا ہے اُس کی عمر بھی زیادہ ہو۔ لڑکی اچھی ہوتی تو لوگ دوڑے دوڑے پھرتے۔ اشتہار بازی کی نوبت کیوں آتی، تیرے لئے ٹھیک رہے گی"

"تمہارا کیا خیال ہے سچ سچ بتاؤ؟" مولوی صاحب کی رال ہی نہیں ٹپکی بلکہ منہ بھی [illegible] پڑا۔

"ابے میں کوئی مذاق کر رہا ہوں؟"

"تو مجھے جوتیاں کھلوائے گا!" مولوی صاحب کو یقین نہ آتا تھا لیکن منشی جی نے قسمیں کھا کر سمجھایا تو بات مولوی صاحب کی سمجھ میں آگئی اور یہ طے پایا کہ اگلی صبح آٹھ بجے وہ خان بہادر صمد یار خان کے بنگلے پر پہنچ جائیں۔ منشی جی سے رخصت ہو کر مولوی صاحب گھر پہنچے تو گیارہ بج چکے تھے، لڑکا سو چکا تھا، بیوی برسوں ہوئے قبر میں جا سوئی تھی اب اخبار کون ڈھونڈ کر دیتا۔ کچھ دیر انھوں نے اخبار تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن نہ ملا تو وہ بستر پر دراز ہو گئے۔ کچھ دیر بعد اُٹھے اور لڑکے کو جگانے کی کوشش کی لیکن وہ کمال بے نیازی سے پڑا سوتا رہا۔

"بہت بُرا زمانہ آگیا ہے۔ اولاد کو باپ کا ادب لحاظ تو رہا ہی نہیں"

مولوی صاحب بڑبڑاتے ہوئے بستر پر جا پڑے۔ کچھ دیر تک تو وہ دل ہی دل میں کُڑھتے اور زمانے کی خرابی اور اولاد کی نافرمانیوں پر افسوس کرتے رہے لیکن حسین مستقبل کے دلفریب خواب انھیں جلد ہی لے اُڑے۔ نوجوان اور کنواری لڑکی کا تصور ہی کس قدر ولولہ انگیز ہوتا ہے اور پھر اس عمر میں جبکہ بال سفید ہو چلے ہوں! ایسی لڑکی

کے [illegible] کے تصورات [illegible]

سے صبح کی جماعت تک [illegible] نہ لگی۔ مولوی صاحب [illegible]

کے ایک دو بار انھوں نے آئینہ بھی دیکھا اور [illegible]

صبح صبح اُٹھ کر جب انھوں نے ایک بار پھر آئینہ دیکھا تو [illegible]

کھنچا ہوا نظر آیا اس لئے جلدی سے نہا کر نکلے اور [illegible]

بے چارا ابھی جماہیاں ہی لے رہا تھا۔

"ذرا کُلّی کر کے بیڑی جلا لیں تو [illegible]"

"ارے آج تم یوں ہی سگریٹ جلا لو لو یہ لو!" [illegible]

سگریٹ پیش کر دیا۔

"کُلّی کئے بنا مزہ نہیں آئے گا ماسٹر جی!" [illegible] سگریٹ جلا کر اُس کے برابر بیٹھا تو مولوی صاحب نے کہا۔

"ذرا اچھی طرح سے، ہاں، اِدھر اُدھر کوئی بال رہ نہ جائے"

"کیا فرماتے ہیں جی آپ؟ میں اور بال رہنے دوں؟ عمر گزر [illegible] صاف کرتے!"

"ہاں ہاں درست ہے لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے"

"آج کیا بات ہے حضور، اتنے سویرے نکل آئے آپ؟"

"آخر ہونا حجام!"

"حجام تو ہوں ہی"

"اخبار نہیں پڑھتے ہو؟"

"اخبار تو آجکل بڑے بڑے لوگ نہیں پڑھتے، میں ٹھہرا [illegible] والا"

"اچھا بھائی اچھا، سنو میں سناتا ہوں"

"کوئی فلم کی کہانی سناؤ گے؟"

"آخر ہونا حجام، کل کے اخبار میں ایک اشتہار نکلا ہے کہ ایک شریف خاندان کی نوجوان لڑکی کے لئے رشتے کی ضرورت ہے۔ کوئی خان بہادر ہیں اُن کی طرف سے اشتہار نکلا ہے۔ ملاقات کے لئے وقت آج کا دیا ہے میں وہیں جا رہا ہوں اللہ کا نام لے کر، کام بن گیا تو خوش کر دوں گا تمہارا!"

"اپنے لڑکے کے لئے؟"

"آخر ہونا حجام!"

"کیوں؟"

"ارے میاں میں اپنے لئے جا رہا ہوں!"

پوچھتے ہو!"

"پیسے نہیں تو کیا تمہارے لئے جاؤں گا؟"

"لڑکی کی شادی کر دینا تھا اب آپ کو کیا ہے"

"ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ وہ کیا جانے شادی وادی کیا ہوتی ہے"

"کونسی کلاس میں پڑھتے ہیں؟"

"ارے میاں وہ پڑھتا وڑھتا نہیں ہے۔ وہ ورکشاپ میں ملازم ہے ڈھائی سو روپے مہینہ ملتا ہے۔ ڈھائی سو!"

"میں تو سمجھا تھا چوتھی پانچویں کلاس میں پڑھتے ہوں گے"

"آخر ہوا تمام؟"

"داڑھی تو ہو چکی، دیکھ لیں"

"دیکھنا یہ دو بال ادھر کو نکل آئے ہیں خط ان کا اگلا دینا!"

"اچھا سرکار اچھا اور اب گیا گلا!"

"ایک نظر اور دیکھ لو آئینے کی طرح"

"دیکھ لیا سرکار!"

"بتاؤ کتنے پیسے دوں، جلدی سے بتاؤ!"

"روپیہ دے جائیں آج تو، صبح صبح کا وقت ہے، آپ کے لئے دعا کروں گا"

"اچھا تو آج تم روپیہ ہی لو!"

مولوی صاحب اصلاح بنوا کر چلے، گھر پہنچے، منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے، جوتا چمکایا، ٹوپی اوڑھی اور آئینے میں ایک نظر دیکھ کر روانہ ہو گئے۔

مولوی صاحب گھر سے چلے تو صدر بازار میں ڈاکٹر عبداللطیف کے دواخانے پر جا پہنچے۔ ابھی ساڑھے سات نہیں ہوئے تھے۔ دواخانہ بند پڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا مکان دواخانے کے برابر ہی تھا۔ مولوی صاحب نے دو قدم بڑھ کر الیکٹرک بل دبائی۔

دو تین منٹ انتظار کرنے کے بعد انھوں نے ایک بار پھر بل بجائی۔

"ارے کہاں جا مرا، مجید! او مجید! دیکھ باہر ملک الموت تو نہیں آ پہنچا!" ڈاکٹر صاحب گرجے۔ مولوی صاحب دروازے سے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ چند منٹ اسی عالم میں گزر گئے تو مولوی صاحب نے جی کڑا کر کے ایک بار پھر گھنٹی بجا دی۔

"لاحول ولا قوۃ! ناک میں دم کر دیا ہے مریضوں نے، دن نکلا نہیں کہ آن پہنچے!" ڈاکٹر صاحب شیو کر رہے تھے، چہرے پر کریم پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے تیزی سے ریزر چلانا شروع کیا۔ شیو ابھی ختم کیا ہی تھا کہ ایک بار پھر گھنٹی بجی۔

"کوئی کمبخت ہی کا مریض معلوم ہوتا ہے!" ڈاکٹر صاحب تولیے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے چلے۔ مولوی صاحب نے سانس روک لیا ۔۔۔ دروازہ کھلا

"کون صاحب ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟"

"اوہو السلام علیکم، آپ استراحت تو نہیں فرما رہے تھے؟"

"حجامت فرما رہا تھا، کہئے کیسے زحمت فرمائی آپ نے؟" ڈاکٹر صاحب جھنجھلائے ہوئے تھے۔

"آج دواخانہ بند کیوں ہے یعنی کہ دواخانہ کھلا کیوں نہیں ہے؟"

"دواخانہ نو بجے کھلتا ہے۔"

"آپ کچھ ناراض ہیں؟"

"ناراض تو نہیں ہوں، عرض کرنا یہ تھا کہ بورڈ پر دواخانے کے اوقات درج ہیں آپ پڑھ سکتے ہیں۔"

"اب کیا وقت ہو گا آپ کی گھڑی میں؟" مولوی صاحب نے کھسیانے پن سے پوچھا۔

"گھڑی میں جو بجا ہو گا بجا ہو گا۔ میری صورت پر تو آپ کو بارہ بجتے دکھائی دے رہے ہوں گے!"

"ویسے سب خیریت ہے نا؟"

"جناب میں ڈاکٹر ہوں، آپ اپنی خیریت بتلائیے!"

"میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"جی ہاں آئیے!" ڈاکٹر صاحب انتہائی ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

مولوی صاحب اندر داخل ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔

"آپ نے کیسے زحمت فرمائی خدانخواستہ آپ کو...."

"سنیئے صاحب! آج تک نہ بیماری میرے پاس پھٹکی ہے اور نہ بیماری کے پاس میں پھٹکا!"

"زہے نصیب! پھر آپ آج ڈاکٹر کے پاس کیوں کر پھٹکے؟"

"ہوں ہوں ہوں!" مولوی صاحب بے ساختہ ہنس پڑے۔

"ہوں ہوں ہوں، بات دراصل یہ ہے ہوں ہوں ہوں!" مولوی صاحب کی ہنسی نہ رکتی تھی۔

"بات دراصل یہ ہے کہ کشتہ چاہئیے آپ کو، وہ حکیم کے پاس ملے گا" ڈاکٹر صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔

"ارے صاحب لعنت بھیجئے کشتے پر! اب تک جوان ہوں آپ کی دعا سے!"

"ڈاکٹر دعا نہیں دیتا، صرف دوا دیتا ہے!"

"میں کہنا چاہتا تھا کہ آپ نے کل کا اخبار تو دیکھا ہی ہوگا"

"آپ اخبار وخبار رہنے دیں۔ میں اخبار نہیں پڑھتا ہوں۔ آپ تو یہ بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آخر ہونا تو جام!" مولوی صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"جی؟" ڈاکٹر صاحب سوالیہ نشان بن گئے۔

"او ہو معاف کیجیے گا منہ سے نکل گیا بے خیالی میں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ یہ لیں، یہ پورے پچاس ہیں پچاس!"

"ان کا کیا کیا جائے؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ کل کے اخبار میں اشتہار نکلا ہے رشتے کے لئے میں وہاں جا رہا ہوں۔ کیا لڑکی والے آپ کا نسخہ مانگیں گے اور آپ سے کوئی کوتاہی ہو جانے کا خطرہ ہے؟"

"نہیں صاحب! آپ تو مجھے ایک سرٹیفکیٹ لکھ دیں"

"کس قسم کا سرٹیفکیٹ؟"

"یہی کہ بس یہی کہ میں اس قابل ہوں"

"یعنی کہ آپ شادی کے قابل ہیں جوانمرد ہیں!"

"بس بس جی، اس میں یہ ضرور لکھئے گا کہ میں نے باقاعدہ معائنہ کر لیا ہے"

"سنئے جناب، پہلے تو آپ کو کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے اور پھر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کا کوئی ڈاکٹر آپ کو یہ سرٹیفکیٹ نہ دے گا!"

"کیوں؟"

"سب ہی جانتے ہیں کہ شادی وہی کرتا ہے جو اس قابل ہوتا ہے، ورنہ محلے والوں کے لئے تو کوئی کسی کو اپنے گلے کا ہار نہیں بناتا!"

"سمجھے نہیں آپ، یہ بات آپ بالکل نہیں سمجھے آخر..."

"ہونا تو جام!" ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹی۔

"خدا نہ کرے خدا نہ کرے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ نوجوان آدمی ہیں۔ آپ یہ نکتہ بالکل نہیں سمجھے"

"یہ نکتہ کوئی بھینس کا انڈا تو نہیں ہے نا؟"

"سنئے سنئے میں سمجھاؤں آپ کو، رشتے کا اشتہار اخبار میں چھپا ہے نہ جانے کتنے آئیں"

"ممکن ہے لائن لگ جائے"

"[illegible]"

"دیکھا ہی نہیں آپ نے ... کی خبریں!"

"جی ہاں جی ہاں! اب تو چاول بھی [illegible]"

"اسی لئے تو میں اپنے لڑکے کی شادی [illegible] تو کروں"

"کیا عمر ہے اس کی؟"

"یہی کوئی ستائیس اٹھائیس سال ہوگی بلکہ [illegible] رہ جاتا ہے"

"آپ کے خیالات قابل قدر ہیں مگر سرٹیفکیٹ کا معاملہ [illegible] آیا آپ کسی دوسرے ڈاکٹر سے لیں"

"نہیں صاحب، اچھے تجربہ کار [illegible] آپ کا نام بڑا ہے۔ آپ شہر کے بڑے ڈاکٹر مانے جاتے ہیں [illegible] اور ہوگی"

"اچھا تو مجھے معائنہ کرنا ہی پڑے گا" ڈاکٹر صاحب [illegible]

"بسم اللہ! جلدی سے کر ڈالئے معائنہ، مجھے آٹھ بجے [illegible]"

"ذرا نبض دکھائیے تو"

"لیجئے!" مولوی صاحب نے ہاتھ بڑھایا اور ڈاکٹر صاحب نے [illegible] سنجیدگی سے شمار شروع کیا۔

"اب ذرا آنکھیں ادھر ادھر گھمائیے تو، ہاں ذرا اور تیزی سے!"

مولوی صاحب نے اس طرح آنکھیں گھمائیں جیسے [illegible]

"آپ کی آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟"

"رات دیر سے سویا تھا"

"اللہ اکبر! اس عمر میں شادی کے خیال سے آپ کی نیند اڑ گئی تھی"

"ڈاکٹر صاحب! کوئی ازکار رفتہ بوڑھا تو ہوں نہیں!"

"آپ کے بال کب سے سفید ہو رہے ہیں؟"

"پانچ چھ سال سے"

"آپ بھول تو نہیں رہے ہیں؟"

"ویسے یہ سلسلہ بارہ چودہ سال سے ہے لیکن زیادہ تر بال تو [illegible] چار پانچ سال سے سفید ہوئے ہیں"

"خضاب کا استعمال کرتے ہیں؟"

"خضاب اس لئے نہیں [illegible]"

[illegible]

[illegible] خدا [illegible] جنت الفردوس

میں جگہ دے۔"

"آمین!"

"بہت نیک [illegible] مثالی [illegible] ہو گئے ہیں [illegible]" مولوی صاحب پر رقت طاری ہو گئی۔

"وہ مثال آپ نے اسے یاد کرتے ہوئے گزار دیئے۔" ڈاکٹر صاحب کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔

"یاد تو ہر وقت کرتا رہتا ہوں۔ اُن کی موت پر سوچا تھا زندگی کے دن یونہی گزر جائیں گے لیکن بزرگوں سے کہیں گھر کا کام ہوتا ہے۔ میں نے ایک بیوہ کو گھر میں ڈال لیا تھا۔" مولوی صاحب کے ہر لفظ سے مظلومیت ٹپک رہی تھی۔

"گھر ڈال لی تھی! یعنی"

"یعنی عقد کر لیا تھا ایک بیوہ سے۔"

"وہ نیک بخت اب کہاں ہے؟"

"میوہ شاہ قبرستان میں، اگلے برس وہ قضا کر گئی۔"

"ذرا دو قدم چلئے تو سہی۔"

"چلوں! یونہی کر میں چلوں؟"

"جی ہاں آپ ذرا چلیں۔"

"لیجئے!" مولوی صاحب اُٹھے اور اکڑ کر دو قدم اُدھر اور دو قدم اِدھر چل کر بیٹھ گئے۔

"کہیئے چال سے کیا معلوم ہوا آپ کو؟"

"آپ نے بال تو یونہی سفید کر لئے ہیں۔"

"ارے لعنت بھیجئے صاحب! یہ تو انفلوئنزا گرا تھا، اچھا ہوا کہ آنکھ پر نہیں گرا ورنہ اندھا ہو جاتا!"

"جی ہاں۔"

"کانوں پر گرتا تو سماعت جاتی رہتی، زبان پر گرتا تو بے زبان ہو جاتا، سینے پر گرتا تو دق اور سل جیسے موذی امراض کا شکار ہو کر میوہ شاہ کی نذر ہو چکا ہوتا۔ وہ تو اللہ کا کرم ہو گیا!"

"آپ باتیں بہت کرتے ہیں۔"

"یہ عارضہ مجھے بچپن ہی سے ہے۔ خدا جنت نصیب کرے، والد مرحوم [illegible] زبان کا دھنی ہے!"

"میں آپ کو لکھ دیتا ہوں کہ آپ شادی کے قابل ہیں۔"

"دو ایک ذرا جلدی سے لکھ دیجئے گا۔ خدا آپ کے دواخانے کو ترقی دے۔ چاند کی طرح آپ کا اقبال چمکے!"

"آپ کا اسمِ گرامی؟"

"خاکسار کا نام بدرالحسن ولد قمرالحسن وظیفہ یاب صدر مدرس گورنمنٹ سیکنڈری اسکول۔"

"عمر؟"

"پینتالیس سال۔"

"جی؟" ڈاکٹر صاحب چونکے۔

"پچاس سے اوپر ہوں لیکن آپ دو چار سال کم کر دیں۔"

"یہ تو آپ خود بھی نہیں کر سکتے!"

"بریکٹ میں ضرور لکھ دیجئے گا یا نوٹ لگا دیجئے گا کہ بال نزلے کی وجہ سے قبل از وقت سفید ہو گئے ہیں۔" مولوی صاحب اُچک کر ڈاکٹر صاحب کے برابر جا بیٹھے۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس کی بڑی شدید ضرورت ہے! اور یہ بھی لکھیئے گا کہ طویل عمر تک پہنچنے کا قوی امکان ہے اور ہاں ایک دو جملے اس قسم کے ہوں کہ جسمانی حالت آج کل کے نوجوانوں سے بہتر ہے۔ یہ لکھنا بھی نہ بھولئے کہ تفصیلی معائنہ کیا گیا ہے اور ....." مولوی صاحب کہتے کہتے کھڑے ہو گئے۔

"اتنا شور نہ کیجئے میں کچھ اُلٹا سیدھا نہ لکھ جاؤں۔"

"اُلٹا نہ لکھیئے ڈاکٹر صاحب ہر چیز سیدھی لکھیئے۔ یہ بھی لکھ دیجئے گا کہ آج تک کسی مہلک مرض میں مبتلا نہیں ہوا ہے۔"

"آپ چپ تو رہیں میں سرٹیفکٹ لکھ رہا ہوں ہسٹری شیٹ نہیں لکھ رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا ڈاکٹر صاحب! خدا آپ کا بھلا کرے، آپ کا اقبال چمکے، آپ کا کاروبار دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے!" مولوی صاحب ایک طرف کھڑے ہوئے دُعائیں دیتے رہے اور جب سرٹیفکٹ لکھا جا چکا تو اس تیزی سے نکلے کہ سلام دعا تک یاد نہ رہی۔ سڑک پر پہنچے، رکشا روکا اور خان بہادر صمد یار خاں کے بنگلے پر جا دھمکے۔ دو چار منٹ تو کھڑے بنگلے ہی کو دیکھتے رہے۔ دلکش باغیچے کے درمیان ایک خوبصورت بنگلہ دیکھ کر ارمانوں کے چراغ جل اُٹھے۔ گیٹ بند تھا۔ گیٹ کے آس پاس کوئی نہ تھا اور نہ کمپاؤنڈ میں کوئی نظر آتا تھا۔ گیٹ تکتے جاتے ٹہلنے لگ

لیا تھا کہ کہیں کوئی ولایتی نسل کا تندرست و توانا کتا استقبال نہ کر بیٹھے۔ کچھ دیر تک کوئی صورت نظر نہ آئی تو جی کڑا کر کے گیٹ تک پہنچے۔ گیٹ کے پاس مالی روشیں درست کر رہا تھا۔

"ارے میاں، او بھیا ذرا سننا، یہ بنگلہ خان بہادر صاحب کا ہے نا؟"

"تم کو بھول ہوئی ہے یہاں کوئی خان بہادر نہیں رہتا!" مالی نے روکھے پن سے کہا۔

"مجھے بھول نہیں ہوئی، تمھیں بھول ہوئی ہے، لال مسجد کے سامنے یہی تو بنگلہ ہے۔ میں بالکل ٹھیک آیا ہوں، کیا تم بتا سکتے ہو، یہاں کون رہتے ہیں؟"

"صمد یار خاں صاحب!"

"میں بالکل ٹھیک آیا ہوں، منشی جی نے خان صاحب کہا ہوگا، مجھے خان بہادر یاد رہ گیا۔"

"کون منشی جی؟" مالی گیٹ میں آ کھڑا ہوا۔

"تم کیا سمجھو گے، جاؤ خان صاحب کو اطلاع دو وہ کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ باہر کے کمرے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔"

"بس تو تم جا کر کہہ دو، موقع اچھا ہے اے رب العالمین مدد فرمایئے!" مولوی صاحب کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں۔

"مگر آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"ارے میاں اپنے گھر سے آیا ہوں۔"

"کسی یتیم خانے سے تو نہیں آئے ہو نا؟" مالی نے مولوی صاحب کا سراپا جائزہ لیا۔

"نہیں بھائی نہیں میں چندہ مانگنے نہیں آیا ہوں۔ تم اطلاع دو شاباش!"

مالی اندر گیا تو مولوی صاحب نے باغیچے پر ایک نظر ڈالی اور آہستہ سے کہا "بنگلہ تو خوب ہے، انشاء اللہ کام بن گیا تو منشی جی کو آج ہی مٹھائی کھلاؤں گا!"

جب وہ خان صاحب کے پُرتکلف ڈرائینگ روم میں پہنچے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اتنے آرام دہ اور خوبصورت صوفے تو مولوی صاحب نے کہیں دیکھے ہی نہ تھے، نہ ایسے شمع دان اور نہ ایسا دلفریب قالین! پردے [illegible] اس قدر خوشنما تھے کہ مولوی صاحب کی روح جھوم اٹھی۔

"خاکسار سلام عرض کرتا ہے!" مولوی صاحب نے کھنکار کر کہا۔ ڈرائنگ روم میں ایک طرف صوفے پر ایک بھاری بھرکم شخص بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ چہرے سے وجاہت ٹپک رہی تھی اور شخصیت بے حد رعب دار تھی۔ اُس کے بھرے ہوئے چہرے پر گھنی سیاہ مونچھیں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ [illegible] نظر ڈالی۔

"بیٹھ جائیے!" اتنا کہہ کر وہ پھر مطالعے میں محو ہو گیا۔

"پروردگار تیرا شکر ہے لاکھ لاکھ شکر ہے مالک!" مولوی صاحب نے آہستہ سے کہا اور جھجکتے جھجکتے خان صاحب [illegible]

"بڑی اہم خبر کا مطالعہ فرما رہے ہیں آپ! [illegible] نہیں ہوئی؟" آخر مولوی صاحب سے رہا نہ گیا۔

"نہیں" — مختصر سے جواب کے بعد مولوی صاحب [illegible] چند منٹ کے بعد خان صاحب نے اخبار ایک طرف ڈالا اور مولوی صاحب سے مخاطب ہوئے۔

"ہاں صاحب اب فرمائیں کیسے زحمت کی آپ نے؟"

"اب میں کیا عرض کروں، جناب نے کل اشتہار دیا تھا اخبار میں؟" مولوی صاحب شرما رہے تھے۔

"میں نے؟" خان صاحب اپنے ذہن پر زور ڈال رہے تھے۔

"جی ہاں"

"کاہے کا اشتہار بھئی؟"

"اب میں کیا عرض کروں، وہ رشتے کے لئے۔"

"کس کا رشتہ، کیسا رشتہ، کیسا اشتہار؟" خان صاحب کے لہجے سے بیزاری اور جھنجھلاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

"آپ کی صاحبزادی کے رشتے کے لئے۔"

"کیا بکتے ہو؟" خان صاحب سیدھے ہو بیٹھے اور ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"واہ میں بک رہا ہوں، کل تو آپ نے اشتہار دیا ہے۔" مولوی صاحب کسی قدر ترچھے ہو بیٹھے، اس طرح کہ ان کا چہرہ دیوار کی طرف ہو گیا۔

"آپ کے مزاج تو درست ہیں؟ حواس ٹھکانے ہیں؟"

"جی ہاں اللہ کا فضل ہے" مولوی صاحب [illegible]

"میں سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہوں" خان صاحب [illegible]

"مذاق کی [illegible]" [illegible] ٹھونک کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"جناب صمد یار خاں صاحب سے انھوں نے اشتہار دیا ہے۔"

"کون سا اشتہار؟"

"جی ہاں! مولوی صاحب کے رشتے کے لئے"

"مگر اس ہوشیاری سے... تمہارا سر توڑ دوں گا" خان صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"واہ بھئی واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اشتہار دے کر شریفوں کو گھر بلانا اور پھر ان کے سر توڑنا قیامت آ گئی ہے نا ہوئی!" مولوی صاحب انتہائی سکون سے صوفے پر بیٹھے رہے۔

"معلوم ہوتا ہے تم کسی شرارت کی نیت سے آئے ہو!"

"شرارت کی نیت تو آپ کی معلوم ہوتی ہے، میں ایک شریف آدمی ہوں!"

"صورت سے تو بدمعاش معلوم ہوتے ہو!"

"آپ زیادہ گل افشانی نہ فرمائیں۔ لڑکی نہ دینا ہو تو صاف صاف کہئے۔"

"اب جو لڑکی کی بات کی تو زبان کھینچ لوں گا! کس نے اشتہار دیا ہے؟"

"آپ نے!"

"کس اخبار میں؟"

"اخبار تو میں ساتھ نہیں لایا ہوں۔"

"نام بتاؤ اخبار کا، کسی نے مجھے بدنام کرنے کے لئے اشتہار تو نہیں دیا ہے؟"

"نام —— نام تو مجھے یاد نہیں ہے۔"

"تم نے خود پڑھا ہے؟ تم لکھنا پڑھنا جانتے ہو؟" خان صاحب بیٹھ گئے۔

"جی ہاں لکھنا پڑھنا خوب جانتا ہوں۔ پندرہ برس گورنمنٹ سیکنڈری اسکول کا اسسٹنٹ رہ چکا ہوں لیکن اخبار میں نے خود نہیں پڑھا۔"

"پھر تمہیں یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ اشتہار چھپا ہے۔ تمہیں الہام ہوتا ہے یا تمہارے گھر وحی آتی ہے؟" خان صاحب گرجے۔

"ذرا آپ آہستہ بولیں۔ میں آپ کو سارا قصہ سناتا ہوں، من و عن سناتا ہوں۔" مولوی صاحب کے اعصاب جواب دے رہے تھے، انہیں احساس ہو گیا تھا کہ منشی جی نے انہیں چوٹ دی تھی۔

"جلدی سناؤ ورنہ [illegible] منشی [illegible]!"

"سناتا ہوں سناتا ہوں۔ مجھے تو یہ سب کچھ منشی جی کا کیا دھرا معلوم ہوتا ہے۔"

"منشی جی کون؟"

"منشی جی میرے ایک دوست ہیں انہوں نے کل رات ساڑھے دس گیارہ بجے مجھ سے کہا کہ لال مسجد کے سامنے بنگلے میں جو خان صاحب رہتے ہیں انہوں نے اشتہار دیا ہے اور کل صبح نو بجے بلوایا ہے بنگلے پر ملاقات کے لئے، منشی جی ہی نے مجھ سے کہا تھا ورنہ میں ایک شریف آدمی ہوں، خدا گواہ ہے میں کسی شرارت کی نیت سے نہیں آیا ہوں۔"

"کہاں رہتے ہو تم؟"

"اب آپ مجھے اجازت دیں السلام علیکم۔" مولوی صاحب دروازے کی طرف لپکے۔

"خبردار جو قدم باہر نکالا، بیٹھ جاؤ!" خان صاحب پھر گرجے۔

"حضور! مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے اس فاش غلطی پر، مجھے معاف فرمائیں آپ!"

"تم رہتے کہاں ہو؟"

"میں حضور سے کیا عرض کروں، میں سچ عرض کر رہا ہوں کہ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"لیکن میں کیسے مان لوں!" خان صاحب نے میز پر مکا مارا۔

"میرے چہرے کو غور سے ملاحظہ فرمائیں، صبح سویرے اصلاح بنوائی ہے، صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ یہ سب کچھ موقع کے اعتبار سے میں نے کیا ہے۔ یہ بس ایک اتفاق ہے کہ...."

"روزے گلے پڑ گئے!"

"اور پھر یہ سرٹیفکٹ ملاحظہ فرمائیں۔"

"کاہے کا سرٹیفکٹ؟"

"ملاحظہ فرمائیں اطمینانِ قلب کے لئے، ایک نظر ڈال لیں تشفی ہو جائے گی۔" بصد احترام سے مولوی صاحب نے ڈاکٹر عبداللطیف کا سرٹیفکٹ پیش کیا۔ خان صاحب نے ایک سانس میں اسے پڑھ ڈالا اور ایک طرف پھینک دیا۔

"یہ سرٹیفکٹ تم نے کیوں حاصل کیا؟"

"اس خیال سے حضور! کہ رشتے کے لئے نوجوان بھی آئیں گے ممکن ہے لڑکی والے سرٹیفکٹ مانگ بیٹھیں۔"

"تم نے یہ سرٹیفکٹ پڑھا ہے؟"

"جناب آپ کا خادم، یہ خاکسار انگریزی زبان سے یوں ہی واقف ہے شد بد۔"

"مگر تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ تم سیکنڈری اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے ہو؟"

"جی ہاں تشریف لے جائیے جس وقت [illegible] خطرناک شکل [illegible]

تھا اب تو سیکنڈ شفٹ ہو چکا ہے"

"مرنے کا ارادہ نہیں ہے؟" خان صاحب نے انتہائی حقارت آمیز انداز

سے پوچھا۔

"حضور کمال کرتے ہیں انسان کی زندگی میں دو ہی کام سب سے زیادہ

بلکہ سارے ہی کاموں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ ایک پیدا ہونا اور دوسرا مرنا اور خدا کی

شان ملاحظہ فرمائیے کہ دونوں بلا ارادہ اور بلا قصد، نہ پیدا ہونے والے کا پیدا ہونے کا

ارادہ ہوتا ہے نہ مرنے والے کا مرنے کا ارادہ۔ اچھا اب آپ میری طرف سے دل

صاف کریں اور خاکسار کو اجازت دیں۔"

"ہونہہ، شادی کا خیال اس عمر میں کیوں ہوا ہے؟"

"کیا میری عمر [illegible]"

"کل ملک الموت اگر آپ کا پروانہ لے آپہنچیں تو آپ کی بیوی کہاں جائے

گی۔ آپ کے مزار پر ایک دن بھی اسے پناہ نہ ملے گی!"

[illegible] صاحب کا سرٹیفکیٹ [illegible] پچیس سال

[illegible] سے ورزش کرتا رہا ہوں اور [illegible]

صاحب [illegible] عمر پانے کا قوی امکان ہے۔"

"آپ کونسی ورزش کرتے رہے ہیں؟"

"دیسی یعنی ڈنڈ بیٹھک، ایک سانس میں [illegible]"

"آج آپ رخصت ہونے سے پہلے [illegible]"

"واہ یہ بھی کوئی [illegible]"

[illegible]

ملازم [illegible] ملازم [illegible]

"ہاں [illegible]"

"آپ ... مولوی صاحب [illegible]"

"[illegible] بیٹھک لگائیں اور تشریف لے جائیں!"

"لیکن کوئی قصور بھی تو ہو میرا، آپ تو خواہ مخواہ موقع کی نزاکت کو

سمجھنے کی کوشش کرنا ہی نہیں چاہتے" مولوی صاحب بل کھا رہے تھے کہ ملازم ہنٹر

لے پہنچا۔ خان صاحب نے ہنٹر ہاتھ میں لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھک لگاؤ ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا سمجھے؟" خان صاحب پھر

گرجے، ادھر مولوی صاحب کے کان کھڑے ہوگئے کسی خاتون کی آواز پر۔

"اے ہے صبح ہی صبح آپ کیوں میرے بچے کو سزا دے رہے ہیں؟"

[illegible]

[illegible] لیکن [illegible] مولوی صاحب [illegible]

"[illegible] یہ کون ہیں؟" بیگم صاحبہ [illegible]

"آپ [illegible]"

"خدا نہ کرے میں کسی کی سفارش [illegible]

[illegible] رہے ہیں"

"ان سے [illegible] اعمال [illegible]"

"تو کیا چندہ مانگنے آئے ہیں؟"

"جی نہیں جی نہیں" مولوی صاحب [illegible]

[illegible]

سیدھا سادہ آدمی ہوں"

"[illegible]" خان صاحب نے

بیگم [illegible]

[illegible]

[illegible] میاں [illegible]

"[illegible] میاں نہیں تو کیا ابھی بچے ہو؟" [illegible]

[illegible]

"[illegible] اب آپ [illegible] اجازت دیں"

[illegible]

[illegible]

"[illegible]"

غلطی ہوگئی ہے جس کی میں [illegible]

"ایسی کیا غلطی ہوگئی تھی [illegible]"

یہ سلسلہ کیا ہے؟

"بڑی فاش غلطی ہوئی ہے [illegible]"

رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"تم چپ رہو جی [illegible] آپ کو [illegible]

شخص شادی کرنے کی فکر میں ہے۔ اس [illegible]

کسی دوست نے بہکا دیا ہے کہ لال مسجد کے سامنے خان [illegible]

رہتے ہیں ان کا اشتہار اخبار میں نکلا ہے کہ ان کی لڑکی [illegible]

یہ صاحب دونوں منٹ کی ادھار پر اسٹریک سے کر کے آئے ہیں لڑکی مانگنے !"

"دیکھئے بیگم صاحبہ! " مولوی صاحب ہکلاتے ہوئے جیسے اس طرح کہ گھسیٹیں۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں، مجھے بے وقوف بنایا گیا ہے، مجھے دھوکا دیا گیا ہے، مجھ سے فریب کیا گیا ہے " مولوی صاحب کی آواز شرما گئی۔

"آپ اس ذلیل کو پولیس کے حوالے کر دیجیئے نا!" بیگم نے آگ بگولہ ہو کر کہا۔
"بیگم اس کے لئے اتنی سزا کافی ہے کہ یہ پانچ سو بیٹھک لگائے اور اپنا راستہ لے!"

"ٹھیک ہے چلو، بڑے میاں شروع ہو جاؤ!" بیگم نے کہا۔
"آپ اس بوڑھے پر کچھ تو ترس کھائیں!"
"بڈھا ہے تو شادی کرنے کیوں چلا ہے! تجھے اتنی سی بات سمجھ میں نہ آئی کہ خان صاحب کیا تیری طرح ٹکر گدے ہیں جو اپنی بیٹی کے لئے اشتہار دیں گے؟"
"جی میں کیا عرض کروں! میری عقل تو جیسے ماری گئی ہے۔ آپ مجھے ازراہ کرم معاف فرما دیں، آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ خدا کی قسم! آپ کا زندگی بھر ممنون رہوں گا!"
"تم ایسے نہ مانو گے، چلو دونوں کان پکڑو!" بیگم نے خان صاحب کی طرف غرض سے ہاتھ بڑھایا۔
"کان آپ پکڑیں، میں تو چلا!" مولوی صاحب نے ایک چھلانگ لگائی

خان صاحب نے ملازم کو للکارا۔ مولوی صاحب گیٹ پر پہنچے تو گیٹ بند تھا۔ کنڈے میں تالا لگا ہوا تھا۔ چھوٹا گیٹ بھی کھلا نہ دیا۔۔۔ ادھر ملازم اور بیگم کے دوڑنے کی آواز جو آئی تو اچھل کر گیٹ پر چڑھ گئے لیکن ہوش و حواس بجا نہیں تھے، کودے تو شیروانی کا پچھلا حصہ اٹک گیا۔۔۔ منہ کے بل گرے۔۔۔ نہ گرنے کا انہیں صدمہ ہوا نہ شیروانی کے پھٹنے کا قلق۔۔۔ گرتے ہی اٹھے اور لپک کر سامنے والی گلی میں گھسے، تیں اندھی ہو رہی تھیں۔۔۔ گلی میں وارد ہوئے تو ایک برقع پوش خاتون سے جا ٹکرائے۔۔۔ وہ بے چاری ایک طرف جا پڑی۔۔۔ مولوی صاحب سرپٹ دوڑ گئے۔۔۔ بغیر فل اسٹاپ اور کوما۔۔۔ کئی گلیوں سے ہوتے ہوئے مشک شاہ کی مسجد میں پہنچ کر دم لیا۔۔۔ وہاں شیروانی کا جو جائزہ لیا تو خون کے دھبے نظر آئے۔ گیٹ کی نوکدار سلاخ نے ران کو چیر دیا تھا۔۔۔ بے چارے مولوی صاحب تاب نہ لا سکے اور چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گئے۔۔۔

---

# غزل

کرشن موہن، ایم۔ اے

رنگ رسیا ذرا سنبھل کر چل — رُوپ کی دھوپ ہے بڑی چنچل
اُمڈا اُمڈا یہ سانولا بادل — شوخ رجنی کی آنکھ کا کاجل
اِس کے ہر رُوپ میں ہے رنگ نیا — زندگی بھی ہو جیسے ایک غزل
سُوکھتا جا رہا ہے جسم کا پیڑ — ہے مگر سبز پیار کی کونپل
کیسے نپٹے ہوس کے طوفان سے — اپنا من جو ہے اک کنول کومل
دامنی کا یہ چمپئی لہرا — کامنی بامنی کا ہے آنچل
غم کے سانپ اِس کے گرد لپٹے ہیں — میرے دل کا درخت ہے صندل
اشک بچتا رہے کہ بڑے کام آئے — دُکھی دھرتی کا من ہوا شیتل
شوخ سورج کا سوانگ ہے سنا — جلتے پاؤں کی ہے بہت ہلچل
نین بے چین تھے مرے، دن رین — رہتے تھے تیری ہی لگن میں مگن
کِھل اُٹھا ہے ترے مِلن سے من — ہو گئیں میری کامنائیں سپھل
تیری رعنائی میں نشاطِ دوام — تیری معصومیت میں حُسنِ ازل
سہہ سکا کون دارِ فانی میں — وقت کی تیکھی چتونوں کے بل
من میں بستے ہیں رات دن ساجن — گرچہ آنکھوں سے ہو گئے اوجھل

ہم تو جوگی ہیں، وشو کے دُکھ سے
کرشن موہن ہے اپنا من بوجھل

"جی ہاں قصہ یوں ہے کہ جس وقت [illegible] شرقاوہ مکمل چالیس [illegible] تھا اب تو سیکنڈ شو ہی ہو چکا ہے۔"

"مرنے کا ارادہ نہیں ہے؟" خان صاحب نے انتہائی حقارت آمیز لہجہ سے پوچھا۔

"حضور کمال کرتے ہیں، انسان کی زندگی میں دو ہی کام سب سے زیادہ بلکہ سارے ہی کاموں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ ایک پیدا ہونا اور دوسرا مرنا! اللہ خدا کی شان ملاحظہ فرمائیے کہ دونوں بلا ارادہ اور بلا قصد، نہ پیدا ہونے والے کا پیدا ہونے کا ارادہ ہوتا ہے نہ مرنے والے کا مرنے کا ارادہ۔ اچھا اب آپ میری طرف سے دل صاف کریں اور عائکہ کا اجازت دیں۔"

"ہونہہ، شادی کا خیال اس عمر میں کیوں ہوا ہے؟"

"جی میری عمر!"

"کل ملک الموت اگر آپ کا پروانہ لئے آپہنچیں تو آپ کی بیوی کہاں جائے گی۔ آپ کے مزار مبارک میں بھی اُسے پناہ نہ ملے گی!"

"آپ نے ڈاکٹر صاحب کا سرٹیفکٹ ملاحظہ نہیں فرمایا۔ پینتالیس سال میری عمر ہے جس میں چالیس برس پابندی سے ورزش کرتا رہا ہوں اور پھر ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ میرے طویل عمر پانے کا قوی امکان ہے۔"

"آپ کونسی ورزش کرتے رہے ہیں؟"

"دیسی، یعنی کہ ڈنڈ بیٹھک، ایک سانس میں سو سو ڈنڈ نکالے ہیں۔"

"آج آپ رخصت ہونے سے پہلے پانچ سو بیٹھک لگا جائیں!"

"واہ یہ بھی کوئی مذاق ہوا، واہ!"

"میں مذاق تو کرتا ہی نہیں ہوں" خان صاحب نے گرج کر کہا اور ملازم کو آواز دی۔ ملازم دوڑتا ہوا پہنچا۔

"جاؤ میرا ہنٹر اٹھا لاؤ!"

"یہ آپ . . . ." مولوی صاحب کے چھکے چھوٹ گئے۔

"یہ وہ کچھ نہیں پانچ سو بیٹھک لگائیں اور تشریف لے جائیں!"

"لیکن کوئی قصور بھی تو ہو میرا، آپ تو خواہ مخواہ موقع کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہی نہیں چاہتے" مولوی صاحب بل کھا رہے تھے کہ ملازم ہنٹر لے پہنچا۔ خان صاحب نے ہنٹر ہاتھ میں لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھک لگاؤ ورنہ کھال اُدھیڑ دوں گا سمجھے؟" خان صاحب پھر گرجے، اُدھر مولوی صاحب کے کان کھڑے ہو گئے کسی خاتون کی آواز پر۔

"اے ہے صبح ہی صبح آپ کیوں میرے بچے کو سزا دے رہے ہیں؟"

[illegible] کیا ہے اس نے [illegible] تھیں لیکن فوراً ہی مولوی صاحب پر نظر پڑی۔

"اُئیں، یہ کون ہیں؟" بیگم صاحبہ سٹ گئیں۔

"آپ انہیں کی سفارش فرما رہی ہیں [illegible]"

"خدا کرے میں کسی کی سفارش کروں [illegible] ہو رہے ہیں۔"

"ان حضرت پر مسٹر [illegible] تھے فی الحال شادی کا خیال [illegible]"

"تو کیا چندہ مانگنے آئے ہیں؟"

"جی نہیں جی نہیں" مولوی صاحب نے [illegible] دوست ہیں خیر جی انھوں نے مجھے بہلا پھسلا کر بھیجا کہ جاؤ، میں [illegible] سیدھا سادہ آدمی ہوں۔"

"ان سے یہ تو پوچھو یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟" خان صاحب نے بیگم سے کہا۔

"کیوں بڑے میاں، کیوں آئے ہو؟"

"بڑے میاں؛ یعنی کہ بڑے میاں؟" مولوی صاحب [illegible]

"بڑے میاں نہیں تو کیا ابھی بچے ہو؟ قبر کے کنارے آ بیٹھے ہو [illegible] کب اندر منہ کے بل گر پڑو۔"

"مجھے اب آپ لوگ اجازت دیں۔"

"میں نہیں سمجھی یہ سارا قصہ کیا ہے؟" بیگم پھر خان صاحب سے مخاطب ہوئیں۔

"قصہ وصہ کچھ نہیں ہے بیگم صاحبہ قبلہ! قصہ مختصر یہ ہے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے جس کی میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں اور اجازت چاہتا ہوں۔"

"ایسی کیا غلطی ہو گئی بھئی؟" بیگم صاحبہ ابھی تک پریشان تھیں کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے؟

"بڑی فاش غلطی ہوئی ہے بیگم صاحبہ قبلہ!" مولوی صاحب نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"تم چپ رہو جی، میں آپ کو سناتا ہوں!" خان صاحب نے کہا "یہ شخص شادی کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کے سر شادی کا بھوت سوار ہے [illegible] کسی دوست نے بہکا دیا ہے کہ لال سڑک کے سامنے خان صاحب [illegible] میں رہتے ہیں اُن کا اشتہار اخبار میں نکلا ہے کہ اُن کی لڑکی کے لئے رشتہ [illegible]

یہ صاحب بری طرح گھبرا کر سر پٹک کے رہ گئے ہیں لڑکی نکلنے !“

”دیکھیے بیگم صاحبہ!“ مولوی صاحب ہکلائے جیسے مجھے اس طرح نہ گھسیں۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں، مجھے بے وقوف بنایا گیا ہے، مجھے دھوکا دیا گیا ہے، مجھ سے فریب کیا گیا ہے“ مولوی صاحب کی گھگھی بندھ گئی۔

”آپ اس ذلیل کو پولیس کے حوالے کر دیجیے نا!“ بیگم نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ ”بیگم اس کے لئے اتنی سزا کافی ہے کہ یہ پانچ سو بیٹھک لگائے اور اپنا راستہ لے!“

”ٹھیک ہے۔ چلو، بڑے میاں شروع ہو جاؤ!“ بیگم نے کہا۔

”آپ اس بڈھے پر کچھ تو ترس کھائیں!“

”بڈھا ہے تو شادی کرنے کیوں چلا ہے! تجھے اتنی سی بات سمجھ میں نہ آئی کہ خان صاحب کیا تیری طرح ٹکڑ گدے ہیں جو اپنی بیٹی کے لئے اشتہار دیں گے؟“

”جی میں کیا عرض کروں! میری عقل تو جیسے ماری گئی ہے، آپ مجھے اللہ اکرم معاف فرما دیں۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا! خدا کی قسم! آپ کا زندگی بھر ممنون رہوں گا!“

”تم ایسے نہ مانو گے، چلو دونوں کان پکڑو!“ بیگم نے خان صاحب کی طرف ہنٹر کی غرض سے ہاتھ بڑھایا۔

”کان آپ پکڑیں، میں تو چلا!“ مولوی صاحب نے ایک چھلانگ لگائی اور یہ جا وہ جا!

خان صاحب نے ملازم کو للکارا۔ مولوی صاحب گیٹ پر پہنچے تو گیٹ بند تھا۔ اوسان خطا تھے۔ بڑے کنڈے میں تالا لگا ہوا تھا، چھوٹا کنڈا سجھائی نہ دیا۔ ادھر سے ملازم آواز دے رہا تھا اور پھر کتے کے غرانے کی آواز جو آئی تو اچھل کر گیٹ پر چڑھے اور آناً فاناً میں باہر کود گئے۔ لیکن ہوش و حواس بجا نہیں تھے، کودے تو شیروانی کا پچھلا دامن کسی سلاخ سے اٹک گیا ——— منہ کے بل گرے ——— نہ گرنے کا انھیں صدمہ ہوا، نہ شیروانی کے پھٹنے کا قلق۔ ——— گرتے ہی اٹھے اور لپک کر سامنے والی گلی میں گھسے، آنکھیں اندھی ہو رہی تھیں ——— گلی میں وارد ہوئے تو ایک برقع پوش خاتون سے جا ٹکرائے ——— وہ بے چاری ایک طرف جا پڑی ——— مولوی صاحب سرپٹ دوڑ گئے ——— بغیر فل اسٹاپ اور کوما ——— کئی گلیوں سے ہوتے ہوئے خشک شاہ کی مسجد میں پہنچ کر دم لیا ——— وہاں شیروانی کا جو جائزہ لیا تو خون کے دھبے نظر آئے، گیٹ کی نوکیلی سلاخ نے ران کو چیر دیا تھا ——— بے چارے مولوی صاحب تاب نہ لا سکے اور چکرا کر فرش پر پڑ گئے ———

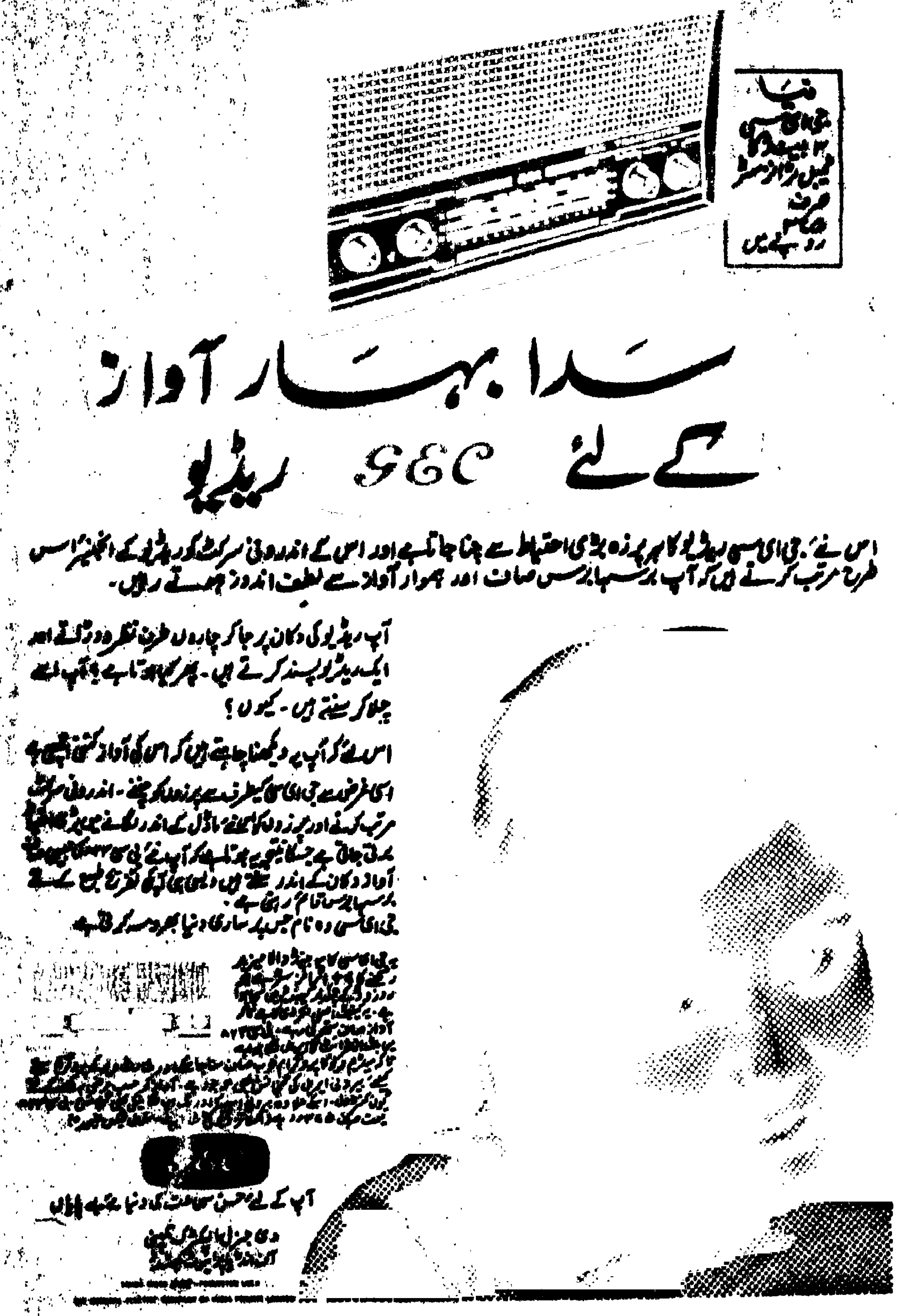
---

# غزل

کرشن موہن، ایم۔ اے

رنگ رسیا ذرا سنبھل کر چل — روپ کی دھوپ ہے بڑی چنچل
امڈا امڈا یہ سانولا بادل — شوخ رجنی کی آنکھ کا کاجل
اس کے ہر روپ میں ہے رنگ نیا — زندگی بھی ہو جیسے ایک غزل
سوکھتا جا رہا ہے جسم کا پیڑ — ہے مگر سبز پیار کی کونپل
کیسے نپٹے ہوس کے طوفان سے — اپنا من جو ہے اک کنول کومل
دامنی کا یہ چمپئی لہرا — کامنی بامنی کا ہے آنچل
غم کے سانپ اس کے گرد لپٹے ہیں — میرے دل کا درخت ہے صندل
اشک پچھتاوے کے بڑے کام آئے — دکھی دھرتی کا من ہوا شیتل
شوخ سورج کا سوانگ ہے سونا — بھولے پاتال کی ہے پت پیتل
نین بے چین تھے مرے، دن رین — رہتے تھے تیری ہی لگن میں سجل
کھل اٹھا ہے ترے ملن سے من — ہو گئیں میری کامنائیں سپھل
تیری رعنائی میں نشاطِ دوام — تیری معصومیت میں حسنِ ازل
سہہ سکا کون دارِ فانی میں — وقت کی تیکھی چتونوں کے بل
من میں بستے ہیں رات دن ساجن — گرچہ آنکھوں سے ہو گئے اوجھل

ہم تو جوگی ہیں، وشو کے دکھ سے
کرشن موہن ہے اپنا من بوجھل


سدا بہار آواز
کے لئے GEC ریڈیو
اس لئے جی ای سی ریڈیو کا ہر پرزہ بڑی احتیاط سے چنا جاتا ہے اور اس کے اندرونی سرکٹ کو ریڈیو کے انجینئر اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ آپ برسہا برس صاف اور ہموار آواز سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔
آپ ریڈیو کی دکان پر جاکر چاروں طرف نظر دوڑاتے اور ایک ریڈیو پسند کرتے ہیں۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ آپ اسے چلا کر سنتے ہیں۔ کیوں؟
اس لئے کہ آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کی آواز کتنی اچھی ہے
جی ای سی وہ نام جس پر ساری دنیا بھروسہ کرتی ہے
آپ کے لئے حسن سماعت کی دنیا سجاتے ہیں

# سات بار

م۔ک۔ مہتاب۔ ایم۔ اے

ڈبلیو زیڈ۔ ۲۴۲، شیو نگر۔ نئی دہلی نمبر ۱۸

یکم اگست ۶۷ء

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

دیکھئے نوکری اور قسمت کے چکر کتنے بلوان ہوتے ہیں۔ اگر آدمی خودداری کے دامن کو نہ چھوڑنا چاہے تو اس چکر کے ساتھ چلنا لازمی ہو جاتا ہے۔ میں بھی آپ کے شہر میں آ پہنچا ہوں جہاں چالیس لاکھ لوگوں کے ہجوم میں ایک انسان قطرے کی مانند بے حقیقت ہو جاتا ہے لیکن اگر قطرے کو آپ کی صحبت کا شرف حاصل ہو جائے تو وہ گوہر بھی بن سکتا ہے ——— کار بزرگ سے ممنون کریں ——— ایک کہانی "سات بار" ارسال ہے۔ اُمید ہے قارئین پسند فرمائیں گے . . .

خیر اندیش ——— م۔ک۔ مہتاب

جب آپ کے مکان میں یا آپ کے پڑوس میں کوئی خوبصورت عورت آکر رہنے لگے تو سمجھئے کہ آپ پر ایک طرح کی دفعہ ۱۴۴ لگ گئی اور ایک مصیبت کھڑی ہو گئی کیونکہ آپ کی طبیعت ہر وقت دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے کو چاہتی ہے اور اگر آپ یہ پابندی توڑ دیں تو اس کے امکانی نتائج سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس خلاف ورزی سے محلے میں آپ کی شرافت کا بھانڈا پھوٹ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس عورت کے شوہر کے پاس سولہ بور کے پستول سے لے کر تھری ناٹ تھری کی بندوق تک کسی بھی قسم کے آتشیں اسلحہ کا لائسنس ہو اور آپ کی آنکھیں بہشت کا حسن دیکھنے سے پہلے بہار جنت دیکھنے لگیں!

سویتا کے شوہر کے پاس نہ تو پستول کا لائسنس تھا نہ بندوق کا! ان کے گھر میں جو اسلحہ تھا وہ صرف گھنی پلکوں کی چلمن سویتا کی نرگسی آنکھیں تھیں جنھیں انسان ایک بار آنکھ بھر کر دیکھ لے تو آرام سے رو رو کر بے ہوش رہ سکتا ہے یا سویتا کے سُرمئی مائل سیاہ بالوں کی لمبی چوٹی تھی جس کے سرے پر وہ ربڑ کا چھلا ڈال کر یوں اُچھالتی تھی جیسے آسمان سے کالی گھٹا کی چادر کو لپیٹ کر چوکس کی چھت پہ پھینک دیا ہو۔

اس لئے جب کچھ عرصے کے تذبذب کے بعد میں نے پہلی بار دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی تو کوئی گولی نہیں چلی۔ البتہ یوں محسوس ہوا جیسے وہ ناگ چوٹی بن کر میری گردن کے گرد لپٹ گئی ہو!

سویتا ایک بھولی سی لڑکی ہے۔ ایک مہذب اور شریف پروفیسر کی بیوی ہے جو اکثر مکان کے سامنے لان میں مونڈھا بچھائے موٹی موٹی کتابوں میں مستغرق رہتا ہے جو چاہتا ہے سویتا اُس کے سامنے بیٹھی پڑھتی رہے اور جب وہ مطالعے سے اُکتا جائے تو اُس کے پیچھے سکوٹر پہ بیٹھی فضا کو اپنے جسم اور بالوں کی خوشبو سے مہکاتی گھومنے چلے۔ سویتا کے ڈھولک کی طرح کسے ہوئے جسم پر پنجابی، لکھنوی، بنگالی، مرہٹی، مدراسی ہر لباس خوب پھبتا ہے۔ اُسے بال بنانے کے اتنے ڈھنگ آتے ہیں کہ وہ ہر دن ایک نئی عورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک انجانی سی تحریک کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں ہمسائگی اور شرافت کی پابندیاں توڑ کر روز دو تین بار اُسے دیکھنے کے لئے سیڑھیوں پر آ جاتا ہوں لیکن جب بھی وہ میری طرف دیکھتی ہے میں مُنہ پھیر لیتا ہوں۔ لیکن ہمارا غائبانہ تعارف ہو چکا ہے۔ میں اُن کے دروازے پر لگی نیم پلیٹ سے جانتا ہوں کہ وہ سویتا ہے اور وہ خود جانتی ہو گی کہ پڑوس کے مکان کے دروازے پر لکھا نام نریندر ایم۔ اے میرا ہی نام ہو گا۔ اِس سے زیادہ مجھے اُن لوگوں سے کچھ دلچسپی بھی نہیں ہے۔ وہ ایک خوش حال، خوش باش جوڑا ہے اور میرے اپنے تفریحی اور تعلیمی مشاغل ہیں۔ انھیں شادی شدہ زندگی پسند ہے مجھے آزادی۔ میرے لئے وہ ایک خوبصورت پھول ہے جو پڑوس کے

عکاں کے برآمدے میں کھِلا ہے۔ مجھے اُسے توڑنے کی تمنا نہیں۔ بس کبھی نظر آجاتا ہے تو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

پہلی بار جب میں سویتا سے ملا تو رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ وہ گھنٹی کا بٹن دبا کر میرے سونے کے کمرے ہی میں چلی آئی تھی۔ میں نے کتاب سے نظر اُٹھا کر دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ جیسے بہار چپکے سے پردہ ہٹا کر چلی آئی ہو۔ اُس کی پریشان زُلفیں کھلے سینے پر بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ روشن آنکھوں میں غم کے سائے تھے۔

"نریندر جی!" وہ بات کرتے ہوئے ہکلا رہی تھی۔

"کیا آپ میرا نام جانتی ہیں؟" اور اُس نے اثبات میں سر ہلایا جیسے کمرے میں زلزلہ آگیا ہو۔

"فرمائیے سویتا دیوی!"

"کمار صاحب ابھی تک نہیں لوٹے۔ مجھے اکیلے میں بہت ڈر معلوم ہو رہا ہے۔"

"اس مسئلے کے تو دو ہی حل ہو سکتے ہیں۔" میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"پہلا یہ کہ جب تک کمار صاحب نہیں آتے۔ آپ یہیں بیٹھئے۔ لیکن یہ شاید آپ کو پسند نہ ہو اور دوسرا یہ کہ میں آپ کے پاس چل بیٹھوں جو شاید آپ کے پتی دیو کو پسند نہ ہو۔"

"میرا مطلب تھا کہ آپ کہیں سے پتہ۔۔۔" وہ بات پوری نہ کر سکی۔

"پتہ اِس وقت کہاں کر سکتا ہوں؟"

"میرا مطلب تھا کیا آپ ریسرچ لیبارٹری تک جا سکتے ہیں؟"

میں بادلِ ناخواستہ سکوٹر نکال کر چلا گیا۔ پروفیسر بتی نیچی جھکائے خوردبین پر نگاہ لگائے بیٹھا تھا۔ میں نے سویتا کے اکیلے پن کا ذکر کیا تو وہ نگاہ خوردبین سے ہٹائے بغیر بولا۔

"مجھے علم ہے آپ نے کیوں تکلیف کی؟"

میں شرمندہ سا ہو کر لوٹ آیا۔ میری بلا سے وہ ساری رات آیا یا نہیں، سویتا سوئی یا نہیں۔ میں لحاف اوڑھ کر لمبی تان کے سوتا رہا۔

دوسری بار میں اُس سے ٹیپر بازار میں ملا۔

میں کونٹر پر باقی پیسے لے رہا تھا۔ سویتا نے میری آستین کو چھوتے ہوئے کہا۔

"نریندر جی! ذرا بات سنئے!" میں اُسے اچانک وہاں پاکر بہت حیران ہوا۔

وہ بہت خوبصورت نظر آرہی تھی۔ آج اُس کے خشک بال اُس کی نیم عریاں گوری پیٹھ پر جھول رہے تھے۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔

"کہیے کیا حکم ہے؟"

"بات۔۔۔ بات۔۔۔ عرض۔۔۔" وہ رُکتے رُکتے بولی "عرض ہے کہ میں نے قمیضوں اور بلاؤزوں کے لئے کپڑے کے کچھ ٹکڑے کٹوائے ہیں لیکن [illegible] کر نکلے ہیں۔ بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ آپ کو دیکھ کر کچھ جان میں جان آئی ہے۔"

میں نے اپنے ہاتھ کے نوٹ اُس کے سامنے رکھ دیئے۔ اُس نے اُن میں سے چھبیس روپے اُٹھا لئے اور اپنے نفاست سے رنگے گلابی ہونٹوں سے ایسا خوبصورت شکریہ ادا کرتے ہوئے چلی گئی کہ اگر وہ سب روپے لے جاتی تو بھی مجھے کچھ ملال نہ ہوتا۔

میں ساری رات اور پھر سارا دن ان تصورات میں کھویا رہا کہ جب وہ روپے لوٹانے آئے گی تو اُس سے کیا کیا باتیں ہوں گی۔ میں کون کون سے مکالمے بولوں گا۔ اُس نے کون سی خوشبو لگا رکھی ہو گی۔ ساڑی میں سے اُس کی کمر کا کتنا حصہ نمایاں ہو گا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ شام کو میں نے چھت پر جا کر دیکھا نیچے لان میں میاں بیوی دونوں کرسیاں نکالے بیٹھے تھے ہنس رہے تھے۔ چائے سے لبالب پیالے رکھے تھے۔ سویتا کی نظریں جھکی تھیں۔ صرف چائے سے بھاپ اُٹھ کر اِدھر آرہی تھی۔

سویتا سے تیسری بار میں آکاش محل میں ملا جو ہمارے شہر میں تیسرا [illegible] ہے۔ اِس کا مالک شنشے بابو ہمارا دوست ہے۔ اُس کے ہاں پارٹی تھی۔ عورتیں خوب سج دھج کر آئی تھیں لیکن سویتا تو اُس روز بالکل جادوگرنی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے اسمارٹ آنکھوں کی بالائی پلکوں پر سیاہ حاشیے ڈال رکھے تھے۔ گلے میں سیاہ موتیوں کا ہار اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ سیاہ اور سبز ساڑی میں وہ اندھیرے اُجالے کا امتیاز معلوم ہو رہی تھی۔ میں اُسے روپیوں کی بات یاد دلا کر بات کرنے کے لئے کوئی ڈھنگ نکالنا چاہتا تھا لیکن سوچا ایسا نہ ہو وہ اُسے میرا اوچھا پن نہ سمجھے۔

واپسی پر شنشے سے ہاتھ ملایا تو اُس نے چھبیس روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے جو کمار صاحب مجھے دینے کے لئے کہہ گئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ہتھوڑے کی ایک ہی ضرب سے شیشے پر بنی سب تصویریں چکنا چور کر دی ہوں۔ ایک دھند کے پردے نے مجھے گھیر لیا۔ آخر اِس کا مطلب کیا ہے؟ لیکن دوسرے دن جب میں سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا تو برآمدے میں کھڑی سویتا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا جیسے دھند کا پردہ پھٹ گیا ہو۔ میں نے کہا۔

"روپے لوٹانے کی اتنی جلدی کیا تھی؟"

جواب میں وہ پھر مسکرائی اور نگاہ جھکالی۔

سویتا سے پانچویں بار میں پولیس انسپکٹر جوشی کے مکان پر ملا۔ اُس نے مجھے بلا بھیجا تھا۔ وہ میرا دوست ہے پہلے بھی کئی بار اُس کا سلام آچکا ہے، آیا کرتا ہے۔ لیکن آج جب میں اُس کے کمرے میں گیا تو سویتا اور پروفیسر کمار بھی وہاں موجود تھے۔ کمار صاحب کچھ رنجیدہ معلوم ہوتے تھے۔ شاید میاں بیوی میں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔

شاید مجھے صلح صفائی کرانے کے لئے بلایا گیا ہو لیکن جوشی مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"معاف کرنا نریندر! میں نے آج تمہیں دوست کے طور پر نہیں بلایا پولیس انسپکٹر کے طور پر طلب کیا ہے!"

"میرا قصور؟"

"میں قصور وصور کچھ نہیں جانتا۔ کیا آپ ایک ہفتے کے اندر اندر اپنا مکان تبدیل کرسکتے ہیں؟"

"ہمارا اپنا مکان ہے۔ تبدیل کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔"

"مجھے اس سے کچھ غرض نہیں۔ علاقے کے انچارج کے طور پر مجھے امن و قانون سے واسطہ ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا شمار محلے کے شریف لوگوں میں ہوتا رہے تو بہتر ہوگا کہ آپ پندرہ دن میں مکان بدل لیجئے۔"

میں نے پروفیسر کمار کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے سویتا کو دیکھا۔ وہ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ بہت پُرسکون تھا۔ دل کی بات تو خدا ہی جانتا ہے۔ یہ لوگ میری شکایت کرنے کیوں آئے تھے؟ اس لئے کہ میں نے سویتا کے کہنے پر اس کا پیغام پروفیسر کو پہنچایا تھا؟ اس لئے کہ میں نے سویتا کی مالی ضرورت پوری کرکے اُسے پریشانی سے بچایا تھا۔ کیا یہ سوچنا بھی جرم تھا کہ سویتا ایک خوبصورت عورت ہے جسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے؟ کیا یہ شکایت سویتا نے کی تھی؟ لیکن وہ تو جب بھی اُسے ملی خندہ پیشانی سے ملی۔ کیا شکایت پروفیسر نے کی؟ لیکن اُسے کوئی بدگمانی کیوں کر ہوسکتی ہے۔ وہ تو دن رات کتابوں کی الماریوں میں بند رہتا تھا۔ ظاہر تھا کہ شکایت سویتا نے ہی کی ہوگی ورنہ اُسے خود انسپکٹر کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔

اور پندرہ دن میں اسی اُدھیڑ بُن میں گرفتار رہا۔ یہ اچھے لوگ بھی کیا بُرے ہوتے ہیں۔ نگاہیں جھکائے جھکائے دوسروں کی عزت کا دیوالہ نکال دیتے ہیں۔ اب میں زیادہ وقت مکان سے باہر رہتا یا کمرے میں بند! لیکن پندرہ دن میں نہ تو کچھ ہوا اور نہ میں نے مکان ہی بدلا۔ اب بھی حسبِ دستور شام کو کمار اور سویتا لان میں بیٹھے چائے پی رہے ہوتے۔ چائے کی پیالیوں میں کوئی طوفان نہیں ہوتا صرف پیاری پیاری بھاپ اُٹھ رہی ہوتی۔

سویتا اب بھی اُتنی ہی حسین، اُتنی ہی دلکش تھی۔ اُس کی نگاہیں دعوتِ مجسم تھیں۔ لیکن یہ جھکی ہوئی نظریں میرے لئے سزا سے کم نہ تھیں۔ کیا وہ مجھے اوباش یا لفنگا سمجھتی ہے؟ میں کسی نہ کسی طرح یہ تاثر دور کرنا چاہتا تھا۔

غلط فہمی ہو تو اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ اگر پھر بھی آپ ناراض ہو تو آپ کی مرضی!"

سویتا رقعہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ میرے دل سے ایک بوجھ ہلکا ہوگیا ہر دم ملامت کرنے والا ضمیر خاموش ہوگیا اور میں بہت سکون سے پہلے کی طرح اپنے مشاغل میں ڈوب گیا۔ مجھے اب کچھ علم ہی نہ تھا کہ پڑوس میں وہ لوگ رہتے بھی ہیں یا چلے گئے ہیں۔ میں نے چھت پر آنا جانا بند کر دیا۔

سویتا سے چھٹی بار اُس وقت ملاقات ہوئی جب میں اُسے تقریب قریب بھول چکا تھا۔ ملاقات مقامی مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوئی۔ میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ سویتا، کمار اور اُن کا وکیل مدعیوں کے کٹہرے میں تھے۔ کمار کے چہرے پر غصے کی لکیریں تھیں لیکن سویتا کا چہرہ یوں پُرسکون تھا جیسے جھیل کی ساکن سطح پر پورنماشی کا چاند تیر رہا ہو۔ استغاثہ سویتا ہی کی طرف سے دائر کیا گیا تھا اور مجھ پر پڑوسی کی بیوی سے ناشائستہ مذاق کرنے، ورغلانے، اغوا کا ارادہ رکھنے وغیرہ کے نہ جانے کون کون سے الزامات عائد کرکے نیک چلنی کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔

میں نے دادِ طلب نگاہوں سے سویتا کی طرف دیکھا کہ کیا میری شرافت کا یہی صلہ تھا لیکن آج اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جن سے ٹکرا کر میری نظر لوٹ آئی۔

میں نے اپنی صفائی میں صرف یہ کہا کہ اگر سویتا اپنے الزامات عدالت میں دُہرائے تو میں ہر سزا قبول کرلوں گا۔ لیکن وکیل استغاثہ کا کہنا تھا کہ استغاثہ سویتا کے دستخطوں سے دائر کیا گیا ہے۔ ملزم اب مستغیث پر جرح کرکے اُس سے باتیں کرکے ذہنی لذت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہی وہ الزام ہے جو اُس پر عائد ہوتا ہے۔ یہ عدالت ہے ڈرامے کا سٹیج نہیں۔

میں ضمانت پر نیک چلنی کی بیڑیاں پہن کر گھر آگیا۔ زندگی ایک بوجھ محسوس ہونے لگی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ بات بات پر مسکرا دینے والی سویتا ایسی ذلیل عورت ہوگی۔ لیکن درخواست پر میں نے خود سویتا کے دستخط دیکھے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ مجھے سزا دلا کر اُسے ضرور رنج ہوا ہوگا لیکن وہ ہنسی ہنسی گھر لوٹ رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ عورت دُنیا کا سب سے مشکل معمہ ہے۔ انسان کتنے ہی متبادل الفاظ سوچتا ہے لیکن ہر نئے لفظ کی تلاش کے ساتھ غلطیاں بڑھتی جاتی ہیں۔

---

ایک دن موقع پاکر میں نے ایک رقعہ اُس کے سامنے پھینک دیا۔ اُس میں لکھا تھا ــــــ سویتا جی! مجھے نہ آپ سے کچھ غرض ہے نہ سروکار۔ اگر آپ کو کوئی

سویتا سے ساتویں بار قریباً ایک ماہ بعد ملا جب صبح سویرے وہ میرے برآمدے میں کھڑی گھنٹی کا بٹن دبا رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ اندر آگئی۔

اُس کے ہاتھ میں اٹیچی تھا۔ چہرے پر حسبِ سابق سنجیدگی کی نقاب تھی اور آنکھیں
چنگاریوں کی طرح روشن تھیں۔ غصے سے میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ مجھے یقین
ہو گیا کہ وہ کہیں باہر سے آئی ہوگی۔ پروفیسر گھر پہ نہ ہوگا اور یہ ضعیف عورت
کہتا ہوگی کہ میں پھر اُس کے کہنے پر پروفیسر کے پاس ریسرچ لیبارٹری چلا آؤں۔
لیکن میری عزت نفس میں بڑھ کر بے حسی کی درخواست کیسی؟

"کیا آپ کے پاس کھانے کو کچھ ہوگا؟" میں اُس کا سوال سن کر حیران رہ گیا۔
اور سوچنے لگا اگر رقم دینے کی سزا ضمانت ہے تو کھانا دینے کی سزا عمر قید سے
کیا کم ہوگی! کیا یہ عورت پاگل تو نہیں؟

"کیا مطلب؟" میں نے نہایت بیگانگی سے کہا۔

"میں تین... دن... سے" وہ بات پوری نہ کر سکی۔

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ جائیے اپنا تار توڑ لیجیے" میں نے قدرے
غصے میں کہا۔

اُس نے بلاؤز میں سے ایک زرد لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ کھولا تو
میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہی کاغذ تھا جس پر میں نے رقعہ لکھ کر معافی مانگی تھی پروفیسر
کدہ نے لکھا تھا——

"تمہاری ریسرچ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ [illegible]
تمہارے پاس رہ کر کچھ کھو گئی ہو۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔ جب [illegible]
پاس پہنچو گی میں بہت شرمندہ ہو چکا ہوں گا!"

غصے سے میرے نتھنے پھڑکنے لگے۔ میرا جی چاہا اُس کا [illegible]
پھینک دوں۔ میں نے اُس کا اٹیچی کیس اُٹھایا اور کہا "آپ [illegible]
سے تشریف لے جائیے!" لیکن جب میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی [illegible]
کی نمائش نمایاں ہو رہی تھیں جیسے ذہن کی چٹانوں پر [illegible]
چھائی ہوئی گھٹا کھل کر برس رہی ہو۔ میں باہر برسات میں بھیگتا [illegible]
کیس کے ہینڈل پر میری گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ اٹیچی کیس میرے ہاتھ سے
گر گیا اور میں نے میز پر رکھی ناشتے کی ٹرے پر سے پردہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"جلدی کیجیے ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے!"

---

"بیسویں صدی" کے غیر ملکی خریدار سالانہ قیمت بائیس شلنگ بذریعہ [illegible]
پوسٹل آرڈر بند لفافہ رجسٹری بھیجیں۔ رجسٹری ملتے ہی رسالہ جاری کر دیا جائے گا۔ اس
رقم میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو قیمتی خاص نمبر بھی دستیاب ہیں۔

منیجر رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۲

---

# غزلیں

## پروفیسر ایم اے حفیظ بنارسی ایم اے

حُسن سے دوستی تھی، بہت دن ہوئے
زندگی زندگی تھی، بہت دن ہوئے

لوگ کہتے ہیں جس کو مئے سرخوشی
میرے ساغر میں بھی تھی، بہت دن ہوئے

میری آلم گشتگی، میری دیوانگی
رشکِ صد آگہی تھی، بہت دن ہوئے

سجدۂ شوق تھے، اور پائے صنم
بندگی بندگی تھی، بہت دن ہوئے

کوئی غم ہی نہ تھا اُن کے غم کے سوا
عاشقی عاشقی تھی، بہت دن ہوئے

دل تھا اور ایک دُنیائے حُسنِ خیال
روز و شب شاعری تھی، بہت دن ہوئے

بےقراری میں بھی ایک آرام تھا
غم میں بھی اِک خوشی تھی، بہت دن ہوئے

میرے ہمراہ اِک چاند کو دیکھ کر
رہگذر ہنس پڑی تھی، بہت دن ہوئے

اُن کی آنکھوں کے مستی بھرے جام سے
توبہ ٹکرا گئی تھی، بہت دن ہوئے

ہے اُسی کی سزا یہ حیات اے حفیظ
اِک خطا ہو گئی تھی، بہت دن ہوئے

## احسان دانش

لبوں کو سی کے کب تک آہ کی تاثیر دیکھیں گے!
کوئی ترکیب سوچیں گے، کوئی تدبیر دیکھیں گے

یہ زندانِ عناصر کی گھٹن دائم نہیں رہتی
کسی دن خود بخود ٹوٹی ہوئی زنجیر دیکھیں گے

ہے کتنا زود رس شیرینیٔ الفاظ کا افسوں
کہاں تک اُن پہ کرتی ہے اثر تقریر دیکھیں گے

نظر کب تک در و دیوار کے خاموش پردوں پر؟
چلو اُٹھو کوئی مُنھ بولتی تصویر دیکھیں گے!

نہ اُلجھو بے سبب ہم سے بڑی خوش فہم ہے دنیا!
وہ کیا سوچیں گے جب یہ بیٹھتی تعمیر دیکھیں گے؟

سزا ہو یا جزا، جس کا عمل اس کی امانت ہے
جنھوں نے خواب دیکھا ہے وہی تعبیر دیکھیں گے

مجھے بھی کر گئے مجبور وہ ترکِ تبسم پر
اُنھیں بھی دیکھنے والے بہت دلگیر دیکھیں گے

پسینہ نزع کا ماتھے پہ آیا آئینہ لاؤ!!
ہم اپنی زندگی کی آخری تصویر دیکھیں گے

وہ دن نزدیک ہے دانش ہمارے جاننے والے
کئی تصویر ڈھونڈیں گے، کئی تحریر دیکھیں گے

# انڈین آئل ہمارا ہے!





اس فیکٹری میں جہاں میں کام کرتا ہوں، کسی طرح کی 'صنعتی رکاوٹ' نہیں ہے، کیونکہ انڈین آئل مشینری میں کام آنے والے ہر قسم کے بہترین موبل تیل، گریس اور مرکبات (کمپاؤنڈ) فراہم کرتا ہے۔ تاکہ مشینوں کے پرزے بغیر کسی مزاحمت کے کام کرتے رہیں۔ علاوہ ازیں لبریکیشن کے مسائل کے بارے میں مشورہ دینے کے لئے ٹکنیکل ماہرین کی خدمات بھی مہیا کی جاتی ہیں۔

انڈین آئل عوام کے لئے پیداوار بڑھانے میں میرے ساتھ پورا تعاون کر رہا ہے۔ میرے بالکل نئے ٹریکٹر کے لئے ہائی اسپیڈ ڈیزل آئل اور آبپاشی کے پمپ کے لئے ہلکا ڈیزل آئل بہم پہنچاتا ہے۔ زمین کو زرخیز بنانے اور کھاد کے لئے نفتھا (آتشگیر مادہ) اور میرے کھیت میں کام آنے والے اوزاروں کے لئے لبریکینٹس (چکنائی) پہنچاتا ہے۔

انڈین آئل یہ سب کچھ اس لئے کرنے کے قابل ہے کیونکہ یہ ہمارا اپنا ہے۔

اقتصادی خوشحالی کے لئے قومی ٹرسٹ

**انڈین آئل کارپوریشن لمیٹڈ**

افسانہ

# سِسکیاں

پرنسپل قمر قرشوری۔ ایم۔ اے
فتح پوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول۔ دہلی نمبر ۶

محترم! احترام و خلوص

"بیسویں صدی" کے لئے ایک کہانی بھیج رہا ہوں ـــــ اس میں میں نے کوئی نئی بات نہیں پیش کی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ کہانی دل کو چھو رہی ہے۔ اگر آپ کے دل کو بھی چھو سکی تو سمجھوں گا میری کاوش رائگاں نہیں گئی ـــــ!

خلوص آگیں ـــــ قمر قرشوری

---

"ذرا سُنئے!" احمد نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کسی دوسری سیٹ پر جا بیٹھیں تو اچھا ہو۔"

"کیوں؟"

"میں عجب کشمکش میں مبتلا ہوں۔"

"میری وجہ سے؟"

"جی ہاں آپ کی وجہ سے . . . پکچر کا سارا لطف خاک میں ملا جا رہا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں!"

"معاف کیجئے آپ کے بالوں سے کچھ ایسی خوشبو آرہی ہے کہ مجھے بار بار اِدھر توجہ ہو جانا پڑتا ہے۔"

"شٹ اپ!"

"خاموش! خاموش! ارے بھئی چپ بھی رہو!!" کی آوازوں نے دونوں کو اسکرین کی طرف متوجہ کر دیا۔ میں احمد کی اِس جرأت پر حیران تھا کہ کمبخت کو بیٹھے بیٹھے یہ کیا شوجھی جو ایک اجنبی لڑکی سے یوں بے تکلف ہو کر مذاق شروع کر دیا۔

"کیوں احمد!" میں نے سینما ہال سے نکلتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ "اس شٹ اپ سے کچھ ذلت محسوس ہوئی یا نہیں؟"

"تم تصویر کا ہمیشہ ایک ہی رُخ دیکھتے ہو۔" اُس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا: "شٹ اپ کے معنی پر تو تم نے غور کیا لیکن طرزِ ادا کو نہیں دیکھا ـــــ ہائے کس ادا سے ظالم نے کہا ہے: شٹ اپ! اجی جی چاہتا ہے کہ . . ."

"کہ تارے ہوں، چاندنی رات ہو، دریا کا کنارا ہو ـــــ دور کہیں کوئی آج اپنی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا ہوا کوئی مدھر گیت گا تا ہو۔ ایسے میں تم ہو اور تمھاری وہ ہوں ـــــ وہ "شٹ اپ" کہے جائیں اور تم اُس کے ترنم سے متاثر ہو کر خودکشی پر تیار ہو جاؤ! ـــــ کیوں یہی جی چاہتا ہے نا" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم ہو پاگل!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہم جیسے حُسن پرست تو کوچۂ خوباں سے چلی جائے آسنہ پہ ایمان رکھتے ہیں۔ مرنا اور خودکشی کرنا تم جیسے شاعروں ہی کو زیب دیتا ہے۔"

"لیکن یہ تو بتاؤ یہ ہے کون؟"

"ارے تم زہرہ کو نہیں جانتے؟"

"کون؟ وہ اپنے کلاس والی زہرہ؟"

"ہاں! وہی ظالم!" اور یہ کہہ کر وہ ایک شعر گنگنانے لگا۔

---

ہمارا وہ پیریڈ [illegible] تھا میں اور احمد ٹہلتے ٹہلتے [illegible] کی طرف نکل گئے۔ سامنے [illegible] احمد [illegible] ہوئے کہا۔ "تیرے خوابوں کی دنیا [illegible] تھا کہ [illegible] اُس طرف کو اور اُس کے پیچھے پیچھے میں بھی

"ذرا سُنئے!" اُس نے زہرہ کے قریب جا کر کہا۔ "آپ یوں میرے پیچھے

# سسکیاں

پرنسپل قمر فرشوری۔ ایم۔ اے

[illegible] مسلم ہائر سکنڈری اسکول۔ دہلی نمبر

محترم! احترام و خلوص

"بیسویں صدی کے لئے ایک کہانی بھیج رہا ہوں ——— اس میں میں نے کوئی نئی بات نہیں پیش کی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ کہانی دل کو چھو رہی ہے۔ اگر آپ کے دل کو بھی چھو سکی تو سمجھوں گا میری کاوش رائگاں نہیں گئی ——— !

خلوص آگیں ——— قمر فرشوری

---

"ذرا سنئے!" احمد نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کسی دوسری سیٹ پر جا بیٹھیں تو اچھا ہو۔"

"کیوں؟"

"میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں۔"

"میری وجہ سے؟"

"جی ہاں آپ کی وجہ سے . . . پکچر کا سارا لطف خاک میں ملا جا رہا ہے"

"میں سمجھی نہیں!"

"معاف کیجئے آپ کے بالوں سے کچھ ایسی خوشبو آ رہی ہے کہ مجھے بار بار ادھر متوجہ ہو جانا پڑتا ہے۔"

"شٹ اپ!"

"خاموش، خاموش! ارے بھئی چپ بھی رہو!!" کی آوازوں نے دونوں کو اسکرین کی طرف متوجہ کر دیا۔ میں احمد کی اس جرأت پر حیران تھا کہ کمبخت کو بیٹھے بیٹھے کیا سوجھی جو ایک اجنبی لڑکی سے یوں بے تکلف ہو کر مذاق شروع کر دیا۔

"کیوں احمد" میں نے سنیما ہال سے نکلتے ہوئے اس سے پوچھا "اس شٹ اپ سے کچھ ذلت محسوس ہوئی یا نہیں؟"

"تم تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھتے ہو" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "شٹ اپ کے معنی پر تو تم نے غور کیا لیکن طرزِ ادا کو نہیں دیکھا ——— ہائے کس ادا سے ظالم نے کہا ہے "شٹ اپ" جی چاہتا ہے کہ . . . "

"کہ تارے ہوں، چاندنی رات ہو، دریا کا کنارا ہو ——— دور کہیں کوئی آج اپنی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا ہوا کوئی مدھر گیت گاتا ہو۔ ایسے میں تم ہو اور تمہاری د ہوں ——— وہ "شٹ اپ" کہے جائیں اور تم اس کے ترنم سے متاثر ہو کر خودکشی پر تیار ہو جاؤ! ——— کیوں یہی جی چاہتا ہے نا" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم ہو پاگل!" وہ مسکراتے ہوئے بولا "ہم جیسے حسن پرست تو 'چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ' پر ایمان رکھتے ہیں۔ مرنا اور خودکشی کرنا تم جیسے ست لوگوں ہی کو زیب دیتا ہے۔"

"لیکن یہ تو بتاؤ یہ ہے کون؟"

"ارے تم زہرہ کو نہیں جانتے؟"

"کون؟ وہ اپنے کلاس والی زہرہ؟"

"ہاں! وہی ظالم!" اور یہ کہہ کر وہ ایک شعر گنگنانے لگا۔

---

ہمارا وہ پیریڈ خالی تھا۔ میں اور احمد ٹہلتے ٹہلتے ریڈنگ روم کی طرف نکل گئے۔ سامنے سے زہرہ آ رہی تھی۔ "وہ دیکھو!" میں نے احمد کو ٹہوکتے ہوئے کہا۔ "تیرے خوابوں کی دنیا خراماں خراماں چلی آ رہی ہے" یہ سننا تھا کہ احمد لپکا اس طرف کو اور اس کے پیچھے پیچھے میں بھی۔

"ذرا سنئے!" احمد نے زہرہ کے قریب جا کر کہا "یہ آپ کہنا میرے پیچھے

## تغافل

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اِک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے ——— فیض [illegible]

کس کس کو دئے تیرے تغافل کا دل جواب
اکثر تو رو گیا ہوں جھکا کر نظر کو میں ——— [illegible]

دل گوارا نہیں کرتا ہے شکستِ اُمید
ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے ——— [illegible]

وہ اُس کا تغافل کہ مجھے تم سے سروکار
میری یہ گزارش کہ مجھے بھول نہ جانا ——— [illegible]

اندیشۂ رُسوائی توجہ میں تو کم ہے
پہلے گی تغافل سے خبر اور زیادہ ——— نامعلوم

مرسلہ: [illegible] حیدرآباد

پاگل ہو گئی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اُس نے غصّے سے پوچھا۔

”مطلب آپ اُس وقت سمجھیں گی؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”جب میں فیل ہو جاؤں گا!“

”صاف صاف کہیے!“ اُس نے بیزاری کے انداز میں کہا۔

”ایسی باتیں صاف صاف نہیں کہی جاتیں۔“ وہ بولا۔ ”لیکن جب آپ کا اصرار ہے تو مجھے صاف طور پر کہنا ہی پڑے گا۔ دیکھئے بُرا نہ مانئے گا۔ آپ کی اجازت ہی سے کہہ رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج پروفیسر فاروقی کتنا اہم لیکچر دے رہے تھے۔ لیکن میں ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا...... آپ سوچ رہی ہوں گی کہ اس میں آپ کا کیا قصور ہے لیکن...“

”جو کچھ کہنا ہے جلدی کہیے!“ زہرہ نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سُنئے تو!“ اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آج کا لیکچر میری سمجھ میں نہ آنے کی وجہ آپ کی ذات ہے۔ آپ کے یہ چھ سات بال“ اُس نے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کچھ اِس انداز سے آپ کے رُخ پر بکھرے ہوئے ہیں کہ...“

”مسٹر احمد!“ اُس کا حسین چہرہ غصّے سے دمک اُٹھا۔ ”آپ انسانیت کی حدود سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔“

”لیکن میں تو...“

”شٹ اپ!“

---

اُس دن میں اور احمد یونیورسٹی پارک میں ٹہل رہے تھے [illegible] ایک کُنج کی طرف نکل گئے۔ زہرہ بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔

”دیکھو!“ میں نے احمد کے کُہنی مارتے ہوئے کہا۔ ”بہاری گلیوں [illegible] روپ دھار لیا ہے!“

”کون؟... زہرہ!“ وہ بے اختیار ہو کر بولا۔ زہرہ [illegible] دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا... کچھ سوچا... اور پھر دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

”احمد!“ وہ مری مری آواز میں بولی۔ ”خدا کے لئے یہ مذاق [illegible] کچھ نہ جائے گا میں بدنام ہو جاؤں گی۔“

”آہ زہرہ!...“ اِس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں سمجھتا ہوں اِس سے زیادہ اُسے کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں نے جُملے کو پُورا کر دیا تھا۔ اُف! میرے دل و دماغ پر ایک بجلی سی گر پڑی۔ [illegible] زندہ دل نوجوان اور یوں کیوپڈ کے بے پناہ تیروں کی زد میں آ جائے سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ میں نے کلاس جاتے ہوئے سوچا۔

---

یونیورسٹی امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ احمد کبھی کبھی مجھ سے ملتا لیکن اُس کی زندگی اب میرے لئے ایک معمّہ بن کر رہ گئی تھی۔ کبھی وہ بہت خوش نظر آتا اور کبھی بہت زیادہ رنجیدہ۔ میں بھی اپنے دل کو یہ سوچ کر تسلّی دے لیتا کہ

زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

امتحان ختم ہو جانے کے بعد ایک شام میں احمد کے یہاں گیا۔ معلوم ہوا سنیما گئے ہیں۔ کچھ اور کام تو تھا نہیں، میں نے سوچا کیوں نہ سنیما ہی دیکھ لیا جائے۔ میں جس وقت وہاں پہنچا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ ابھی چل کر اپنی جگہ پر بیٹھا ہی تھا کہ سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے صاحب کی آواز سنائی دی۔ ”تمہارے آج آپ کے بالوں سے پھر ویسی ہی خوشبو آ رہی ہے!“ ——— اور پھر مجھے اندھیرے میں دو سائے ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوئے معلوم ہوئے۔

”اچھا! حضرت یہاں موجود ہیں!“ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا [illegible] ذرا ہو لینے دو انٹرول۔ دیکھا جائے گا۔

[illegible]

[illegible] ہوگئی تھی لیکن ... کا خیال آجاتا تو یہ شعلے [illegible] کر دل و دماغ میں گردش کرنے لگتے۔

میں ایک انٹرویو کے سلسلے میں دہلی جا رہا تھا۔ لکھنؤ جنکشن پر مسافروں کی بیج پکار سے آنکھ کھل گئی۔ اسٹیشن کے ہنگامے کچھ ایسے دلچسپ تھے کہ میں اُن میں کھو گیا لیکن ایک نسوانی آواز نے میرے خیالات کو درہم برہم کر دیا۔

"شاہد! اب تم سو جاؤ میں بیج تھیں جگا دوں گی"

میں نے مڑکر دیکھا، بیس بائیس برس کی ایک عورت چار پانچ سال کے ایک بچے کو سامنے کی برتھ پر لیٹنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

"آواز کچھ مانوس معلوم ہوتی ہے"۔ میں نے اُس پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ "لیکن... ارے! میں اب اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا "یہ تو زہرہ ہے!"

"زہرہ!" میں نے شک کے لہجے میں پوچھا "کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

وہ میرے اس تخاطب سے چونک سی پڑی۔ ایک نظر مجھے غور سے دیکھا اور پھر مسکرا کر بولی۔

"فیروز صاحب! کیا واقعی میں اتنی بدل گئی ہوں کہ پہچانی نہیں جا سکتی!"

"اوہ زہرہ! معاف کرنا میں پہچان تو گیا تھا لیکن پھر بھی..."

"آپ کو کچھ شک تھا!"

"جی!"

"اور سنائیے... کیا کر رہے ہیں آپ آجکل؟"

"فی الحال تو بیکار ہوں"

"واقعی آج کل نوکری بہت مشکل سے ملتی ہے۔ آپ کے اور ساتھی آج کل کہاں ہیں؟"

میں اُس زمانے میں اتنا عدیم الفرصت رہا کہ مجھے خود اپنی خبر نہیں رہی۔" میں نے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"احمد سے کتنی ملتی ہوئی شکل ہے!"

"جی ہاں... ایں... نہیں نہیں تو... احمد سے تو بالکل نہیں ملتی!"

اب وہ گھبرا گئی تھی۔

"احمد ہیں تو بخیریت؟"

"مجھے کچھ علم نہیں!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ کو علم نہیں!" میں نے حیرت سے پوچھا "یعنی آپ اور وہ..."

"ہاں میں سمجھ گئی" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "آپ کا مطلب ہے

# انتظار

تمام عمر ترا انتظار کریں گے
مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے ——— شاہد صدیقی

میں انتظار کروں گا ترا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تُو آئے ——— [illegible]

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے
بیٹھے ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے ——— جگر مرادآبادی

چراغِ زندگانی بجھ رہا ہے
وہ جانِ انتظار آئے نہ آئے ——— [illegible]

بہارِ جانفزا، بلبل کے نغمے، چاندنی راتیں
ہر اک شے آنے والی آگئی کیا تم نہ آؤ گے ——— [illegible] اختر

مرسلہ۔ سید قدیر گولکنڈہ، حیدرآباد

ہم ایک دوسرے کے شریکِ حیات کیوں نہ بن سکے؟ — فیروز صاحب! تقدیر کے کاندھے پر نہ جانے کتنی تدبیروں کے جنازے نکل چکے ہیں۔ پہلے زمانے کی آتشیں نگاہوں نے ہمارے خرمنِ محبت کو خاک کر دینا چاہا۔ لیکن احمد — اُف! وہ بدنصیب طعن و تشنیع کے تیز و تند دھاروں میں میرا ہاتھ پکڑے چٹان کی طرح کھڑا رہا لیکن وہ آخری لہر — الٰہی توبہ! اُس کے قدم ڈگمگا گئے۔ میرا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ہم دونوں سیلِ حیات کے مختلف دھاروں پر بہنے لگے... مجھے نہیں معلوم وہ کدھر نکل گیا۔ ہاں میں بدنصیب ابھی تک زندہ بھی جاتی ہوں — فیروز صاحب! آپ ہمارے فسانۂ حیات کے شروع کے چند باب پڑھ چکے ہیں اس لئے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ انجام سے آپ کو بے خبر رکھوں — "ہماری محبت" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی "یونیورسٹی کے ہر لڑکے کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگی۔ لیکن ہمیں بالکل پروا نہ تھی — اندھے کیوپڈ کے بتائے ہوئے تیرہ و تار راستوں پر چلتے ہوئے ہمیں جگمگاتی ہوئی راہوں کی خبر بھی کیا ہو سکتی تھی۔ ہماری بدنامی اب یونیورسٹی کی حدود سے نکل کر اب رشتے داروں تک پھیل چکی تھی۔ کسی نے آنکھیں دکھائیں، کسی نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا، کوئی خود ڈوب مرنے کو تیار ہو گیا اور کوئی زہر دینے کو — لیکن محبت کی چھوٹی سی چنگاری اب شعلوں میں تبدیل ہو چکی تھی اور یہ آگ نہ لگائے لگتی ہے اور نہ بجھائے بجھتی ہے۔ ہم اپنے ارادہ پر اٹل تھے۔ احمد کہا کرتا تھا دنیا کی

یہ فاصلے ہماری محبت کو کم کرنے کی بجائے اور بڑھا رہے ہیں اور یہ اکیلا پن ____ تعلق کے مضبوط بازو جتنا بھی ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرتے تھے، اتنا ہی ہم ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔ میں اب اپنا زیادہ وقت احمد کے ساتھ گزارتی تھی لیکن پھر بھی مجھے ایک پریشانی سی تھی۔ پہلے تو گھر میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے حسن محسوس ہونے لگتی تھی۔ لیکن اب کچھ دنوں سے میں دیکھ رہی تھی، پورے گھر پر ایک عجیب خاموشی طاری ہے ____ ایک شام جو میں گھر واپس آئی ____ سو چتے ہوئے بولی: تو مجھے گھر میں غیر معمولی چہل پہل دیکھی۔ وہیں میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج کوئی بات ضرور ہے۔ جتنا میں غور کرتی اتنی ہی میری طبیعت اور پریشان ہوتی گھبرا کر میں اباجان کی لائبریری میں چلی آئی۔ میں ابھی آکر بیٹھی بھی نہ تھی کہ اباجان کی آواز سنائی دی۔

"زہرہ! آج تمہاری شادی ہے!"

اور یہ الفاظ نہ تھے نشتر تھے جنھوں نے میرے سینے کو چھلنی کر ڈالا۔

"لیکن اباجان سنئے تو۔" میں نے ان کے قریب جاتے ہوئے کہا۔

"میں ایک لفظ نہیں سننا چاہتا!" وہ دروازے سے نکلتے ہوئے بولے ____ "مجھے سب کچھ علم ہے!!"

فیروز صاحب! اُس وقت میں بے بس تھی۔ نہ کہیں جا سکتی تھی اور نہ کسی سے کچھ کہہ سکتی تھی [illegible] مگر [illegible] ہاں کچھ خیال سا ہے کہ کچھ [illegible] گئے ____ تھوڑی دیر بعد ایک [illegible] میں [illegible] دوسرے دن اگر ہم بمبئی اُتر ے ____ میرے شوہر [illegible] وہ بمشکل بول سکتی تھی۔

"لیکن احمد ____" میں نے بیتابی سے [illegible] پوچھا۔

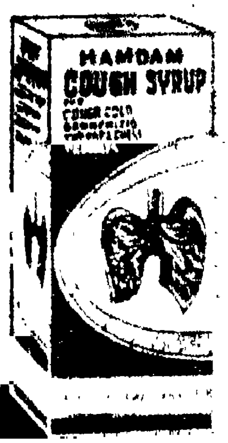
"احمد کے متعلق [illegible] نہ ہو سکا ہیں [illegible] ____ دق ہو گیا ہے۔ لیکن اب تو بہت دنوں سے اُن کی کوئی خبر نہیں ____ [illegible] آنکھیں سُرخ ہو چکی تھیں۔

گاڑی کی رفتار سُست ہو گئی تھی۔ سامنے [illegible] کی روشنیاں چمک رہی تھیں اور میں دیوانوں کی طرح بیٹھا اُس کا منہ تک رہا تھا۔

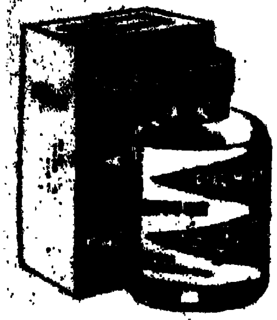
ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے اپنا سوٹ کیس سنبھالا۔ وہ کھڑکی پر سر رکھے رو رہی تھی ____ نہ جانے کیوں میرا دل ڈوبنے لگا۔

اِس واقعہ کو مدت ہو گئی، لیکن نہ جانے کیوں تنہائی میں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، میرے کانوں میں زہرہ کی سسکیاں گونج رہی ہیں!!

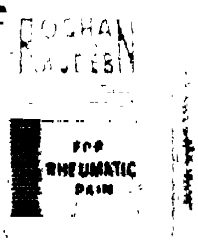










# خد و خال

محمود سعیدی

کبھی سیتا، کبھی وہ ساوتری
داستاں جس کے عشقِ سادہ کی
کہیں سلمیٰ، کہیں وہ شیریں ہے
کتنی رنگیں ہے، کتنی شیریں ہے

کہیں مریم کی پاک دامانی
اندلس کے آئی ہے وہ کبھی
کہیں ذوقِ گُنہ زلیخا کا
کبھی دھارا ہے رُوپ رادھا کا

وادیٔ نیل کی قلوپطرہ
کہیں اُس کا جلال جلوہ نما
ارضِ یونان کی حسیں سیفو
کہیں اُس کے جمال کا پرتو

بن گئی ہے کہیں سلوی بھی
اُس کی نیرنگیٔ تجسّس کا
اور کہیں پدمنی کے بھیس میں ہے
اِک نیا رُوپ دیس دیس میں ہے

جہانگیری کو اُس نے سکھلائے
بنی فرقِ زمینِ ہند کا تاج
عدل و انصاف کے اصول کبھی
اُس کے قدموں تلے کی دُھول کبھی

کبھی خندہ بلب چتا میں جلی
کبھی سرشارِ اُلفت اور کبھی
کہیں میداں میں آئی تیغ بہ دست
نشۂ انتقام سے بدمست

پہلوئے ظلمتِ ہوس میں کہیں
اور کہیں آسمانِ عفت کا
ایک بجھتا ہوا شرارہ ہے
جگمگاتا ہوا ستارہ ہے

صوفی و فلسفی و دانش ور
اُس کی خوشبو کے قید کرنے کو
دل و جاں میں بسائے اُس کا خیال
بُن رہے ہیں تخیلات کے جال

اُس کی دُھاریں نے سرفروشوں کے
اُس کے لُطفِ نظر سے محرومی
دل بڑھائے ہیں رزم گاہوں میں
بن گئی زُہد خانقاہوں میں

گونج سب میں اُسی کی آہٹ کی
مطربوں نے جو ساز چھیڑے ہیں
سب اُسی کی صدا کے سائے ہیں
شاعروں نے جو گیت گائے ہیں

کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں
جا رہا ہے بلندیوں کی طرف
اُس کی زُلفوں کی طرح لہراتا
اُس کی خلوت کی راہ دکھلاتا

چشمِ دہقاں میں کھیت سرسوں کا
اُس کا سندیس لے کے دھرتی پر
اُس کے آنچل کی طرح لہرائے
ہر برس رُت بسنت کی آئے

ضامنِ زندگیٔ دیدہ و دل
کاروبارِ حیاتِ فانی میں
آرزو آفریں جمال اُس کا
نغمۂ عزم و عمل خیال اُس کا

عُمدہ
چُورا چائے
میں
سب سے
لاجواب




# لپٹن کی ہمالین گولڈن ڈسٹ چائے

دیکھتے ہی دیکھتے اس چائے سے آپ پیالی پر پیالی مزیدار خوشبودار
اور خوش رنگ چائے حاصل کر سکیں گے۔
خود پیجئے مہمانوں کو بھی پیش کیجئے
پینے میں تسکین بخش، پلانے میں
تسلی بخش۔ لپٹن ہمالین
گولڈن ڈسٹ چائے کا جواب نہیں۔



لپٹن یعنی
LIPTON
اچھی چائے

LHGC-1 URDU

# ہرجائی

زکی انور۔ ایم۔ اے

شعبہ اردو، کریم سٹی کالج جمشید پور

۲۷ جولائی ۶۷ء

بھائی جان! تسلیم

ہماری ٹرین دس بج کر چالیس منٹ پر تھی اور اُس دن صبح سے ہی کچھ بارش بھی ہو رہی تھی۔ میں نے کوشش تو کی کہ صبح سویرے نظام الدین پہنچ کر آپ سے الوداعی ملاقات کر آؤں لیکن یہ نہ ہو سکا۔ کچھ لوگ ملنے آگئے اور میں مجبور ہو گیا۔ لیکن اُردو بازار میں صدیقی صاحب سے ملاقات ہو گئی اور میں نے صرف الوداعی سلام آپ کو بھیج دیا۔ آتے وقت آپ سے نہ مل سکنے کا بہت افسوس ہے ——— آپ کے حکم کی تعمیل فوری طور پر نہ ہو سکی۔ اب افسانہ "ہرجائی" ارسالِ خدمت ہے۔ اس افسانے میں کچھ نئی باتیں ہیں اور یہ باتیں میں نے اپنے پڑھنے والوں کے خطوں کی روشنی میں پیدا کی ہیں ——— بے شک عصمہ کی کہانیوں کا تسلسل بور بھی کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ کہانی عصمہ کی کہانی نہیں ہے۔ پڑھنے والوں (نہیں بلکہ پڑھنے والیوں) کا یہ خیال بھی بالکل درست ہے کہ "ہمارے سماج میں صرف عصمہ ہی نہیں، عاصم بھی موجود ہیں۔" اس لئے یہ کہانی ایک "عاصم" کی کہانی ——— یہ بات بھی درست ہے کہ پڑھتے وقت مقام اور خط کی تاریخ وغیرہ یاد رکھنا پڑھنے والوں کی یکسوئی بھی ختم کر دیتا ہے اور افسانے کی افسانویت بھی ختم ہو جاتی ہے اس لئے اب کے میں نے خطوں پر صرف نمبر ڈال دیئے ہیں ——— پتہ نہیں یہ تبدیلیاں اور کہانی آپ کو پسند آتی ہیں یا نہیں . . .

آپ کا ——— زکی انور

---

۱

بہت پیاری ناہید! خوش رہو

خدا تمھارے معصوم دل کا سکون اور پیاری پیاری خوبصورت آنکھوں کی نیند تمھیں واپس لوٹائے!

تمھارا پہلا خط بھی مجھے مل گیا تھا جس میں تم نے محض اشاروں میں اپنی زندگی کی نئی حالتوں کا ذکر کیا تھا۔ معاف کرنا ناہید! میں تمھارے اُس خط کا جواب نہ لکھ سکی تھی۔

اب پچھلے دنوں یہ تمھارا طویل خط ملا ہے جو اس وقت میرے سامنے پڑا اپنی زبان سے کہہ رہا ہے میں بیگانہ تھا یزداں کے پرستاروں کی محفل میں غنیمت ہے کہ انساں کے پرستاروں میں آپہنچا۔

تمھارا خط پڑھ کر ملال بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی، ہنسی بھی آئی اور آنکھیں کچھ بھیگی بھیگی سی بھی محسوس ہونے لگیں۔

یہ بات تو بہرحال ملال کی ہے کہ تم جیسی سیدھی سادی لڑکی بھی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کیوپڈ کا نشانہ بن ہی گئی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ اب تمھیں اپنی زندگی کی سیدھی سپاٹ راہوں میں کچھ نئے موڑ ملیں گے، کچھ اُتار آئے گا ان راہوں میں اور کچھ چڑھاؤ! اور یہ سب کچھ تمھاری زندگی کو زیادہ پرکشش، زیادہ کامیاب اور سچ پوچھو تو زیادہ رنگین بنا دیں گے۔ حرارت اور حرکت ہی تو زندگی ہیں۔ ان کے بغیر زندگی، زندگی نہیں ہوتی بلکہ زندگی کا ایک ناپ کی ہوئی کاوش ہوتی ہے۔ اس لئے یہ میرے لئے خوشی سے پاگل ہو جانے ہی کی بات تو ہے کہ میری عزیز ترین ناہید موت کی سی بے حس و حرکت زندگی سے دامن چھڑا کر نکل بھاگی ہے اور

[illegible] ہے

ٹھیک ہی ہے [illegible] میری جان!

کیں اکثر [illegible] سے [illegible]

جس کی ایک ہی بات سے [illegible] ہے

اب جب آنسوؤں کی یاد آتی ہے تو میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ پتہ نہیں میری آنکھوں کی یہ نمی ہے یا پھر سوچتی ہوں کہ اس نمی میں تمہارے آنسو بھی شامل ہیں... خدا تمہیں آنسوؤں سے بچائے۔

اب کچھ اور نہ لکھ سکوں گی ناہید!

پرویز بہت اطمینان سے میرے سینے کے مدفن میں پڑی تھیں، میں نے پھر سے جگا دیا ہے تو پھر ان کا کیا قصور؟ جو زخم بھرے بھی نہ تھے لیکن میں نے تو آپ کو تسلی دینے کے لئے ان کے بھر جانے کا اعلان کر دیا تھا اور اب آج تمہارا خط پانے کے بعد میں خود ہی ان زخموں پر نشتر لگا کر نمک پاشی کرنے لگی ہوں تو پھر بیچارے زخموں کا کیا قصور!

ناہید! اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں اور بہت ہی وحشت ناک انداز میں بارش ہو رہی ہے۔ شاید آج میں سو نہ سکوں گی۔ لیکن اب تمہیں کچھ اور لکھنے کی ہمت نہیں۔ بس اس دعا کے ساتھ خط ختم کرتی ہوں۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے!

ہاں میری ناہید! ایسے طوفان ہی تو محبت کی معراج ہوتے ہیں!

تمہاری اپنی ——— پروین

——— ۲ ———

میری زندگی!

تو آج تمہیں تمہارے نام سے خط نہیں لکھ رہا ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آتی کہ جب ہم نے زندگی کی طویل راہوں پر زندگی کی آخری دھڑکنوں تک ہم سفر بنے رہنے کا عہد کر لیا ہے تو پھر یہ احتیاط کیوں، یہ خوف کیوں، یہ گھبراہٹ کیوں؟

آؤ ——— ہم اعلان کر دیں کہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنا سب کچھ بنا لیا ہے۔ تھوڑی سی ہمت کرو اور سوچو کہ ہماری زندگیاں ہماری اپنی ہیں کسی اور کی نہیں۔ ہمارے غم ہمارے اپنے ہیں کسی اور کے نہیں اور ہماری خوشی بھی بنیادی طور پر ہماری ہی ہے۔ جس کا جی چاہے ہماری خوشی میں شریک ہو لے، یہ اور بات ہے لیکن ہماری زندگی پر تو کسی کی اجارہ داری برداشت نہیں کی جا سکتی۔ میں نے تو ممی سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ تم میری زندگی میں کچھ اس طرح سے داخل ہو گئی ہو کہ [illegible] تمہارے [illegible] وقت [illegible] کہہ چکی ہوں گی اور اب جلدی کچھ فیصلہ ہو جائے گا [illegible] ہو گا وہی جو میں چاہوں گا۔ جو ہم چاہیں گے!

تم بھی تو کچھ کرو، بس تھوڑی سی ہمت [illegible]

ڈاکٹر صاحب کی بچی کی برتھ ڈے پارٹی میں تم کیوں نہیں آئیں [illegible] بیقرار نظریں چاروں طرف تمہیں تلاش کرتی رہیں۔ ہر آنے والی لڑکی کے [illegible] امید بندھتی اور جب وہ لڑکی تم نہ ہوتیں تو کتنی مایوسی ہوتی [illegible] آخر کار تمہاری غیر حاضری نے میرے لئے اتنی دلکش محفل کا احساس پہلے [illegible] بے کیف بنا دیا۔

لیکن دل کا درد کون دیکھتا ہے۔ کسی نے مجھ سے پوچھا [illegible] تم تنہا ایک کنارے کی کرسی پر کیوں بیٹھے ہو۔ پوچھا تو [illegible] نے مجھے گانے پر مجبور کیا اور مجھے بہر حال گانا ہی پڑا اور میں نے تمہاری وہ پسندیدہ غزل کسی نہ کسی طرح گا دی۔

دل کو سکون روح کو آرام آ گیا
موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا

لیکن وہاں تو عالم یہ تھا کہ نہ دل کو سکون نہ روح کو آرام [illegible] پیغام تو کیا اس کرب ناک ماحول میں موت بھی آ کے نام نہیں لے رہی تھی!

آج ضرور ملو ——— ورنہ پھر تمہیں مجھ سے تو کیا میری قبر سے ملنے کے [illegible] پتہ نہیں کن کن دشواریوں سے گورستان تک پہنچنا ہو گا۔

میں انفارمیشن بیورو کے ویٹنگ روم میں شام کے پانچ بجے تمہارا انتظار کروں گا۔

خدا کرے تم آ جاؤ۔

خدا کرے وہ کھلیں حشر تک جنوں کے پاؤں
ابھی مناظر دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں

تمہارا ہی ——— [illegible]

——— ۳ ———

میری پیاری پروین آپا! آداب

آپ کا شفقت نامہ ملا۔ کیا آپ بھی کمال کرتی ہیں! ——— [illegible] صبر، سکون اور ضبط وغیرہ کی باتیں کر کے یا تو آپ مجھے فریب دے رہی ہیں [illegible] ان یادوں کو تھپک تھپک کر سلانا چاہتی ہیں جو جاگ رہی ہیں کبھی میرے [illegible] اٹھتی تھیں۔ ورنہ آپا پیاری! آپ تو مجھ سے کہیں زیادہ [illegible]

[illegible] منتظر [illegible] شروع تک

[illegible] رہی۔

[illegible] ہے آپ کو اب تو اس بے سکونی میں لطف آنے لگا ہے، نہیں یہ سکون میسر ہو جائے گا تو پھر کیا ہو گا میں سوچتی ہوں کہ ایک عجیب سی، [illegible] زندگی ہو گی وہ۔ میں تو ابھی اس بے سکونی پر خوش ہوں۔

آپ کو یاد ہو گا آپا! آپ نے کبھی مجھے جگر کے ایک شعر کے ذریعے مبارکباد دی تھی کہ میں کرشنوں کی دُنیا سے انسان کی دُنیا میں آگئی اور آج اُسی غزل کا ایک شعر میرا [illegible] تصویر نظر آتا ہے اور میں کتنا خوش ہوں۔

جو طالب ہیں سکونِ زندگی اُن کو مبارک ہو

ہلاکِ جستجو تھا میں کہ آوارہ دن میں آپہنچا

لیکن یہ جستجو ——— اُف خدا کی پناہ! آپا میری پیاری آپا!! کل کیا ہو گا؟

لیکن میں کل سے مایوس نہیں۔ اس لئے ایک خوشخبری سُنئے ——— نازش کی ممی نے مجھے کسی دن بلایا ہے! دوسری خوشخبری یہ ہے آپا کہ نازش کی ممی چاہے کچھ بھی فیصلہ صادر فرمائیں، ہو گا وہی جو نازش چاہے گا۔۔ یا غالباً جو ہم چاہیں گے!

لیکن ڈر جاتی ہوں میری آپا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کبھی کبھی ذہن میں کوئی گونج اُٹھتا ہے۔

سفینے عین دریا کے کنارے ڈوب جاتے ہیں!

میرے لئے دعا کیجئے آپا ——— دعا اور صرف دعا!

آپ کی ——— ناہید

——— ۴ ———

باجی محترمہ! تسلیم

یہاں ہر طرح خیریت ہے اور خداوند قدوس سے آپ لوگوں کی خیریت کی خواستگار ہوں۔

یہ خط ایک خاص غرض کے تحت لکھ رہی ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ اور دولہا بھائی اِس خط پر سنجیدگی سے غور کریں گے

سُنئے ——— کئی دنوں سے مُنّے میاں یہ کہہ رہے تھے کہ اُن کی کوئی دوست لڑکی مجھ سے ملنا چاہتی ہے اور میں نے مُنّے میاں کا دل رکھنے کے لئے اُس سے ملنا منظور کر لیا۔ کل وہ لڑکی آئی تھی۔ اُس کا نام ناہید ہے۔ بی۔ اے فائنل میں پڑھتی ہے۔ بے شک اتنی حسین بھی ہے کہ کوئی بھی اپنا سب کچھ اُس پر لُٹانے کو تیار ہو سکتا ہے۔ مُنّے میاں پر مجھے آپ کو لاکھ بھروسہ ہو لیکن کسی کے دل پر کوئی بھروسہ نہیں کر سکتا اور میں کسی بھی قیمت پر یہ تو ہرگز نہیں برداشت کر سکتی کہ خاندانی وقار خاک میں مل جائے۔

صرف ایک معمولی سرکاری افسر کی بیٹی ہے اور بس!

باجی! دُنیا میں بے شمار ایسی لڑکیاں ہیں جو شادی کے بعد بھی پڑھتی رہتی ہیں مجھے یقین ہے کہ یاسمین شادی کے بعد بھی اِسی طرح پڑھتی رہے گی۔ اُسے تعلیم کا شوق ہی نہیں خبط اور جنون ہے۔ وہ کسی بھی حال میں کسی بھی چیز کو اپنی تعلیم کی راہ میں حائل نہ ہونے دے گی۔

کیا یہ بہتر نہ ہو کہ ہم کسی آنے والے خطرے کا پہلے ہی سے راستہ روک دیں۔ میری رائے ہے کہ جتنا تو جلد سے جلد ہو جائے کہ یاسمین اور مُنّے میاں کا عقد کر دیا جائے۔

مہربانی کر کے اِس خط کا جواب سوچ سمجھ کر اور جلد دیجئے۔ ہاں مُنّے کے ڈیڈی کی بھی یہی رائے ہے وہ خود ہی خط لکھتے لیکن وہ آجکل بہت پریشان ہیں۔ کارخانے میں ہڑتال چل رہی ہے۔

دولہا بھائی کو آداب، بچوں کو پیار۔

خدا کرے آپ لوگ خیریت سے ہوں۔

آپ کی بہن ——— سلمیٰ

——— ۵ ———

میری پیاری اپی رانی! پیار

آج میں بے حد خوش ہوں آپا ——— بے حد خوش۔ اتنی خوش کہ سوچتی ہوں کہیں خوشی کے مارے میرا دم ہی نہ نکل جائے۔

سُنئے پیاری آپا! کل اُنھوں نے مجھے اپنی ممی سے ملایا اور اُن کی ممی مجھ سے کچھ اس طرح ملیں جیسے میں جنم جنم سے اُن کی کوئی اپنی ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے نازش سے کہیں زیادہ اُن کی ممی مجھ پر فریفتہ ہو گئی تھیں۔

اور آج صبح کی چائے نازش نے ابّاجان اور امّی جان کے ساتھ پی اور یک لخت میری آپا! ہمارے سفر کا ایک طویل حصہ طے پا گیا ——— اب منزل دُور نہیں آپا ——— اب منزل دُور نہیں!

ابّاجان جلد ہی نازش کے ڈیڈی سے ملیں گے اور۔۔۔ اور۔۔۔ یا اللہ میں بھی کیسی بے شرم ہوں۔ جائیے اب اور کچھ نہ لکھوں گی۔

لیکن آپ کو نہ لکھوں گی تو پھر اور کسے لکھوں گی۔

تو ——— آپا ڈارلنگ! ابھی کچھ دیر پہلے وہ آئے تھے میں اُن سے کھل کر تو مل نہ سکی لیکن جب وہ جانے لگے تو میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس آئے اور پھر کاغذ کی ایک چھوٹی سی گولی کھڑکی سے میرے کمرے میں آگری۔

آپ کو اپنی حبادوگری پر بہت ناز ہے۔ بتایئے تو کاغذ کی اُس گولی میں


ویک فیلڈ
کسٹرڈ پاؤڈر
آپ کی دعوت میں چار چاند لگاتا ہے۔
اس بے لاجواب پڈنگ... ڈیسرٹ وغیرہ کی لذت بہت
بڑھ جاتی ہے۔ جو ذائقہ دار خوشبو میں ملتا ہے۔
makes the difference
House of Wakefield produces a wide range of world renowned speciaised Food Products...at its space-age garden factory.

تم بتا سکتی ہو آپ میری اپی اور تک ـــــ کتنی ہی ایک
جیسی بے شمار باتیں ہیں اور بھی انگوٹھی سے بھی زیادہ قیمتی ایک
چیز ـــــ وہ چیز جس پر سارے جہاں کی دولت صدقے کر دی جائے پھر بھی حق
ادا نہ ہو۔

وہ اُن کا خط تھا اپی ـــــ اُن کا خط ! جن کا وجود میری زندگی ہے،
جن کی ایک ایک سانس میری کائنات ہے جن کی ایک نظر میری دنیا ہے اور جن کے
ایک ایک لمحے کا احساس میرا قلب ہے اگر ان کے بغیر دنیا میں رہ سکا ہی کیا ہے!
انھوں نے لکھا ہے ـــــ

"جانِ تمنا ـــــ مجھ کو سخت ملال ہے کہ وہ تم پر کچھ اس قدر خفا ہو گئیں
کہ بے خودی کے عالم میں وہ اپنی پسند کی سند کے طور پر تمہیں کوئی تحفہ نہ دے سکیں۔
اس لئے یہ حقیر سا تحفہ اُنھوں نے بھیجا ہے، لیکن سخت تاکید کی ہے کہ ابھی تم اِس کا
تذکرہ کسی سے نہ کرنا"

لیکن آپا پیاری آپ سے بھی بھلا کچھ چھپایا جا سکتا ہے۔

آپا پیاری ـــــ ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ کسی کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر
ہو جائے؟ پھر کیا ہوگا آپا ـــــ کل کیا ہوگا آپا؟

میں نے پہلے بھی آپ سے پوچھا تھا کہ کل کیا ہوگا؟ لیکن آپ نے اِس کے سوا
اور کچھ نہیں لکھا کہ ـــــ یہ مت پوچھو کل کیا ہوگا؟

میری آپا! بتائیے نا کل کیا ہونے والا ہے؟ اُف! میں تو کل کے نام ہی سے
کانپ کانپ اُٹھتی ہوں۔

ذرا کان پاس لائیے ـــــ آج شام کو ہم ساتھ ہی پکچر دیکھیں گے۔

آپ کی ـــــ ناہید

ـــــ ۶ ـــــ

پاگل لڑکی ! عمر دراز ہو

تیرا خط ملا اور بہت ہنسی آئی۔ میں اتنی ہنسی، اِتنی ہنسی کہ آنکھوں سے آنسو
نکل آئے۔ جیسے کہ بڑا بھاری جرم ہو۔ ناہید میری جان اُدنیا اتفاقات سے خالی نہیں۔ اب
تو کل کے لئے کیوں پریشان ہے میری جان! کل تیرا ہے ـــــ جا سنوار کر رکھیو اس
کل کو۔ خدا نصیب اُس کل کو زیادہ سے زیادہ رنگین بنائے۔ ہاں ناہید اِس اتفاق ہی
کو کہتے ہیں کہ ہم نے کل کو شکست دے کر تماشا گر لیا۔ ورنہ یہ کل کسی کا دوست نہیں۔ یہ ظالم
کل کسی کو سکھ سے جینے ہی نہیں دیتا۔

اچھا میری جان ـــــ مبارک ہو کہ تُو نے ساری دُنیا جیت لی!

شاید آپ نے پہلے بھی دیکھا میرا دل ہکتے ہیں لیکن بہت جلد آپ کی گرتی
شادی کر لوں ـــــ کرلوں گی ناہید ابھی تو تم نے نہیں کہا تم جیسا بالکل گیا ہے
ساری زندگی پڑی ہے۔ کبھی کرلوں گی۔

لیکن خدا تجھے جلد سے جلد دُلہن بنائے!

تمھاری ـــــ پروین

ـــــ ۷ ـــــ

آپا میری آپا! آداب

آج صبح ہی آپ کو ایک خط پوسٹ کر چکی ہوں اور اب یہ خط رات کے
گیارہ بجے لکھ رہی ہوں۔

آپا ـــــ یہ خط صرف ایک سوال ہے اور اگر آپ نے اِس سوال کا جواب نہ
دیا تو شاید میں بوکھلا کر مر جاؤں گی۔

یہ بتائیے آپا! کہ گناہ کیا ہے؟ کیا چیز ہے گناہ میری آپا؟ خدا کے لئے بتلائیے
اور میری تسلی کیجئے کیونکہ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ گناہ نہیں بلکہ منزل بالکل قریب نظر آ کر
پیروں میں جو لغزش آ جاتی ہے، وہی لغزش تھی آج کی بات۔

کچھ دیجئے میری پیاری اپی کہ وہ سب کچھ ایک بے خبری تھی، ایک پیاس تھی،
ایک تقاضا تھا ـــــ گناہ ہرگز نہیں۔

اپی ـــــ ہم بکھر نہ جاتے بلکہ ہم وہاں سے لکھ رہی ہیں جہاں ہمارا وجود دو
سایوں سے زیادہ اور کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے ـــــ دو پیاسے سائے ـــــ اور ایک
نیا غم ـــــ اُف! میں پاگل ہو جاؤں گی۔ خدا کے لئے مجھے ابھی خط لکھئے اور لکھ دیجئے
میری پیاری اپی کہ ناہید تُو نے گناہ نہیں کیا ہے۔

آپ کو اپنی قیافہ شناسی پر بہت ناز ہے نا اور اُن کے بارے میں کچھ بتانے کے
لئے آپ نے اُن کی تصویر مانگی تھی نا؟ ـــــ لیجئے اب تصویر حاضر ہے۔ بتلائیے تو وہ ۔۔
وہ میری ناؤ پار لگا دیں گے نا؟ ـــــ میری آپا چاہے آپ کی قیافہ شناسی کچھ بھی کہے،
چاہے تصویر کچھ بھی بولے، لیکن خدا کے لئے مجھے لکھ دیجئے کہ ناہید تیری ناؤ کنارے تک
پہنچ گئی۔

آپ کی بہن ـــــ ناہید

ـــــ ۸ ـــــ

پیاری ناہید! خوش رہو

اُف ـــــ اگر صرف پندرہ بیس منٹ پہلے تمھارا یہ دوسرا خط ملا ہوتا تو
پورے پندرہ پیسے بچ جاتے۔ ابھی بس ابھی مشکل سے پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے
کہ میں نے تمھارے پہلے خط کا جواب پوسٹ کر کے گھر بھیجا ہے۔

تمہارا یہ تصویر خط پاکر پہلے تو مجھے اتنی ہنسی آئی کہ اتنی ہنسی [illegible] میں بیان نہیں کر سکتی اور جب میں نے تمہارا خط پڑھا تو رو پڑی۔

یہ کوئی پہیلی یا معمہ نہیں ہے ناہید! جیسے ہی میں نے لفافہ چاک کیا، تمہارے نازش صاحب کی تصویر نیچے میرے پاؤں پر گر گئی اور جب میں نے تصویر اٹھائی تو بے تحاشا ہنسی آگئی۔ کیونکہ اُس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے تمہارے نازش صاحب میرے قدموں میں آکر گڑگڑا رہے ہوں کہ ـــــ خدا کے لئے میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ خدا کے لئے میرے اور ناہید کے درمیان جو دبیز تاریک پردہ حائل ہے اُسے جوں کا توں رہنے دو۔ ہم تاریکی ہی میں مل پاکر رہیں گے۔ ہمیں اُجالا نہیں چاہئے ـــــ خدا کے لئے اُجالا نہ کرو ورنہ ناہید مجھے پہچان لے گی۔

اور میں ہنستی رہی، ... ہنستی رہی ...

اور پھر ہنسی ہنسی میں ہی میں تمہارا خط پڑھنے لگی اور پھر میں رو پڑی۔

میری جان ـــــ گناہ بہرحال گناہ ہے اُسے کسی بھی دوسرے خوبصورت نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔ بے صبری، پیاس یا لغزش وہ خوبصورت الفاظ ہیں جو گناہ کرنے والوں نے اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے وضع کر لئے ہیں۔

ہاں ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ تم فریب خوردہ ہو اور فریب خوردگی گناہ کی سب ناکیاں کچھ تو کم کر ہی دیتی ہیں۔ بے شک تمہارا گناہ ایک ایسا گناہ ہے جس پر فریب کی چمکار چوند کر دینے والی قلعی کر دی گئی تھی۔

خدا تمہیں بخش دے۔

اے اپنے آپ پر ظلم ڈھانے والی لڑکی کاش تو آج سے پہلے ہی محض چند دنوں کے لئے اپنے محبوب کی تصویر کی پرستش ختم کر کے تصویر میرے پاس بھیج دیتی تو یہ قصہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا جسے میں آج ختم کر رہی ہوں۔ آج ـــــ جب کہ تو بہت آگے نکل چکی ہے ـــــ خدا تجھے سکون عطا کرے اور واپس لے آئے۔

ناہید پیاری! کیا تو اُس ظالم کو جانتی ہے جس کی یاد میری روح کا ناسور بن کر رہ گئی ہے؟ ـــــ ہاں تو ضرور جانتی ہے۔ لیکن تو یہ جانتی ہے اُس کا نام جاوید تھا۔ بے شک اُس کا نام جاوید ہی تھا۔ یعنی میری زندگی میں وہ جاوید ہی کے نام سے داخل ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انجمن سے وہ ہمیشہ یہ کہتا رہا تھا کہ اُس کا نام نیاز ہے اور انجمن نے بھی مجھے یہ بات اُس وقت بتائی تھی جب میں ... جب میں پتہ نہیں کتنی دور نکل چکی تھی!

لیکن میں تجھے یہ نہیں لکھنے جا رہی ہوں کہ تیرا نازش میرا جاوید ہے۔ تو لاکھ میری اپنی سہی۔ اگر تو سگی بھی ہوتی تو بھلا میں یہ جگر کہاں سے لاتی کہ اپنی ساری کائنات تیری جھولی میں ڈال دوں۔

[illegible]
کے لئے اُس کی بہت سی تصویریں موجود ہیں [illegible]
اُس کی تصویروں کے سوا اور نظر ہی کیا آتا ہے

پیاری ناہید! مجھے فخر ہے کہ تم نے ہمیشہ اور ہر قدم پر میری عزت [illegible] کی ہے اور میری بات مانی ہے۔ مجھے یقین ہے اب جلد ہی تجھے میری ضرورت محسوس ہو گی اور اُس وقت تم چاہو گی کہ کاش میں تمہارے پاس ہوتی، تم سے قریب ہوتی [illegible] اسی لئے پہلے ہی سے میں اپنے آپ کو تمہارے وجود سے قریب تر کئے دے رہی ہوں۔ آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ اور ایک بات سنو ـــــ

ناہید! تمہارے اُس گناہ سے بھی کہیں زیادہ عظیم اور سنگین ایک گناہ [illegible] اور ہے اور وہ ہے فرار، وہ ہے بزدلی، وہ ہے الفتوں سے گھبرا جانا۔ بظاہر خودکشی ہوتی ہے موت لیکن اُس کے اندر ہزاروں لاکھوں طوفان چھپے ہوتے ہیں۔

ایک عورت کا سچا وقار ہے اُس کی وہ زندگی جسے اپنا کر شمع بجھ نہیں سکتی۔

جان نہ دینا میری جان ـــــ تجھے میری قسم! اس سے زیادہ قیمتی جان کبھی نہ گنوانا۔

چلو یہ اچھا ہوا کہ ہم دو بہت پیاری سہیلیاں ہر اعتبار سے ایک ہو گئیں اب ہنس بھی دے پگلی ـــــ ہنس دے نا!

ایک خوبصورت شعر سنو ـــــ

رقیب غم زدہ اب صبر کر لے
کبھی اُس سے مری بھی دوستی تھی

خدا تجھے سکون بخشے۔

تمہاری ہی ـــــ [illegible]

# غزل

سید حباب ترمذی

اُن سے ملنے یوں نہ جانا چاہیے
کوئی ملنے کا بہانا چاہیے

یوں دُعا کو ہاتھ اُٹھانا چاہیے
ہاتھ اُٹھا کر بھول جانا چاہیے

ضبطِ دل کو آزمانا چاہیے
ہر ستم پر مُسکرانا چاہیے

چار چاند اس میں لگانا چاہیے
زندگی کو جگمگانا چاہیے

نغمہ ہے، نکہت ہے، دَورِ جام ہے
اب اُنھیں محفل میں آنا چاہیے

حائلِ نظارہ ہے خود چشمِ شوق
اب یہ پردہ بھی اُٹھانا چاہیے

اب محبت میں وہ آیا ہے مقام
ہم کو اُن سے رُوٹھ جانا چاہیے

موت ہے دراصل ایسی زندگی
موت کا جس کو بہانا چاہیے

اس قدر ارزاں نہ ہو انساں جہاں
اِک جہاں ایسا بسانا چاہیے

ناصحا یہ بھی مگر ہم کو بتا
اُن کو کیوں کر بھول جانا چاہیے

آپ کا دیدار ہوگا حشر میں
حشر ہونے کو زمانا چاہیے

کر رہے ہیں پھر وہ تجدیدِ وفا
پھر حسیں دھوکا یہ کھانا چاہیے

کیوں رہے اوروں کی دنیا میں کوئی
اپنی دنیا خود بنانا چاہیے

ناخدا نااہل ہو جس کا جباب
وہ سفینہ ڈوب جانا چاہیے

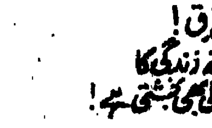
یڈون 'روش'
لیجئے...
درد غائب...



... اور آپ میں ایک نئی پھرتی !

یہی تو خوبی ہے سیریڈون کی ! سیریڈون کے متوازن فارمولے کی بدولت درد اور اس سے پیدا ہونیوالا تناؤ دُور ہو جاتا ہے اور بدن میں ایک نئی پھرتی آجاتی ہے ۔ اسی میں تو ہے سارا فرق ! آپ صاف ذہن کے ساتھ فوراً کام شروع کر سکتے ہیں اور اپنے دوست احباب کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہیں سیریڈون کی ایک ہی ٹکیہ درد دُور کرتی ہے، آرام پہنچاتی ہے اور تازگی بھی بخشتی ہے ! سیریڈون ہمیشہ اپنے پاس رکھئے ۔ بچوں کے لئے صرف پاؤ سے آدھی ٹکیہ کافی ہے ۔

سر کا درد
دانت کا درد
بدن کا درد اور
ان دنوں کی تکلیف
سیریڈون کی ایک ہی
ٹکیہ سے غائب !



'روش' کی تیار کردہ
سول ڈسٹری بیوٹرز : وولٹاس لیمیٹڈ

افسانہ

# منزل

مس صفیہ سلطانہ بی اے بی ایڈ

معرفت قاری عبدالخالق صاحب، محلہ شیرازاں، سہارنپور

۲۲ اگست ۱۹۶۷ء

محترمی! آداب و خلوص

ایک افسانہ "منزل" ارسال خدمت ہے۔ اِس افسانے میں ایک یونیورسل پرابلم کو سُلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ افسانے کا معیار "بیسویں صدی" کے معیار سے میل کھاتا ہے۔ اگر میرا یقین درست ہے تو براہِ مہربانی اِسے "بیسویں صدی" کے صفحات پر جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیجئے ——— میرے کئی افسانے ہند و پاک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ میرا افسانہ "بیسویں صدی" میں شائع ہو سکا تو میری ایک دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی . . .

——— صفیہ سلطانہ

جمال کے ہاتھ کانپ گئے اور گلاس سے ٹھنڈا پانی چھلک کر اُس کی پینٹ پر گر گیا۔ اُس نے باقی پانی جلدی سے اپنے مُنہ میں اُلٹ کر ٹیبل لیمپ کا سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ ماؤتھ آرگن کی سوگوار سی دُھن ابھی تک اُس کے احساس کو مجروح کر رہی تھی۔

وہ پچھلے ایک ہفتے سے ساز کی اِس آواز سے فرار ڈھونڈ رہا تھا۔ روزانہ شام ڈھلتے ہی ساتھ والی بالکونی سے ماؤتھ آرگن کی مدھم سی لہریں بلند ہونے لگتیں۔ پھر اُن کا بہاؤ بتدریج تیز ہوتا جاتا اور جمال کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کے سینے میں جمی ہوئی درد کی چٹان بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ اِسی طرح بڑھتے بڑھتے وہ ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ جائے گی۔

بدھ کی شام کو وہ اپنے دوست امر دیپ کی عیادت کر کے واپس آ رہا تھا۔ امر دیپ اسکوٹر کے حادثے میں زخمی ہو گیا تھا۔ جمال کے تصور میں اُس وقت اپنے دوست کی بجھی بجھی سی مُسکراہٹ اور اُس کے گھر والوں کے اُداس چہرے گھوم رہے تھے۔ اِنہیں خیالوں میں کھویا ہوا وہ اپنے گھر کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک ہی ماؤتھ آرگن کی آواز سُن کر وہ ٹھٹک گیا۔ اُس کی نگاہیں بے اختیار اوپر چلی گئیں۔ توقیر صاحب کی بالکونی میں ایک سیاہ آنچل لہرا رہا تھا۔ جمال نے آگے بڑھ کر اپنے دروازے کا تالا کھولا اور تیزی سے زینے طے کر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اِس چھوٹی سی چڑھائی سے خلافِ معمول اُس کی سانس پھول گئی تھی۔ دل کی دھڑکنیں کانوں میں گونج رہی تھیں اور ماؤتھ آرگن کی دُھن کے ساتھ مِل کر اُسے بے چین کئے دے رہی تھیں۔ اِس چھوٹے سے انسٹرومنٹ نے اُسے ایلس کی یاد دلا دی تھی۔ ایلس بہت پیاری دُھن میں ماؤتھ آرگن بجاتی تھی۔ وہ اور ماؤتھ آرگن، دونوں لازم و ملزوم تھے اور جمال کو دونوں ہی سے پیار تھا۔

اب سے تین سال پہلے ایلس اِس چھوٹے سے انسٹرومنٹ کے ساتھ اُس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اور جمال کی زندگی اُسی کے محور پر گھومنے لگی تھی۔ وقت چلتے چلتے ذرا تھم گیا تھا۔ کائنات خود بخود گنگنانے لگی تھی۔ پھر ایک دن اچانک وہ محور ٹوٹ گیا اور جمال خلا کی وسعتوں میں جھُول کر رہ گیا۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے کسی اور کے گلے میں ایلس کی باہوں کا ہار دیکھا تھا۔ اُس وقت ایلس کے گلے میں وہ قیمتی ہار جگمگا رہا تھا جس کی قیمت جمال ادا نہ کر سکا تھا۔

آٹھ مہینے مینٹل ہاسپٹل میں گزار کر جب وہ باہر نکلا تو دُنیا ہمیشہ کی طرح جوان تھی۔ لیکن جمال کو ایسا محسوس ہوا جیسے دُنیا کا سُہاگ لُٹ چکا ہے اور وقت دھیرے دھیرے سِسک رہا ہے۔

جمال نے ایلس کو بھُلانے کے لئے نت نئی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ اپنے دماغ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے لگا۔ جس رات اُسے ایلس کی یاد زیادہ ستاتی وہ گھنٹوں میتھمیٹکس کے مشکل سوالات حل کیا کرتا۔ لوگ اپنا غم شراب میں بھُلاتے ہیں۔


میں انجینیر
بننا چاہتا
ہوں

[illegible]

"[illegible] کیوں آئی ہے؟"

"آج آ گئی ہیں [illegible]؟"

[illegible] جمال نے پھر پوچھا۔

"وہ کب واپس جائیں گی؟"

"جب اُن کی چھٹیاں ختم ہو جائیں گی۔"

جمال اُٹھ کر رہ گیا۔ اُسے خاموش دیکھ کر تیمور وہاں سے بھاگ گیا۔

شام کے وقت کھانا پکانے کے لیے جمال نے اسٹوو جلایا۔ ابھی تو پھر وہی سوگوار سی دُھن فضا میں پھیلنے لگی۔ جمال کی آنکھوں سے وحشت برسنے لگی۔ اُس نے فوراً اسٹوو بند کر دیا۔ کٹے ہوئے آلوؤں کی پلیٹ اور گُندھا ہوا آٹا الماری میں رکھ کر وہ باہر نکل گیا۔ کئی گھنٹے شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد جب وہ واپس آیا تو فضا خاموش تھی۔ وہ بغیر کچھ کھائے پیے بستر پر لیٹ گیا۔ صبح تک آٹے میں خمیر اُٹھ گیا تھا اور آلوؤں کے ٹکڑے سیاہ ہو گئے تھے۔ جمال نے دونوں چیزیں دھوبی کی بھینس کو ڈال دیا۔

اُس دن سے جمال نے شام کو کھانا پکانا چھوڑ دیا۔ وہ کافی رات تک سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ جب بھوک لگتی تو کسی ہوٹل میں جا کر موبل آئل میں بنی ہوئی سبزی اور سیل کھری جلے آٹے کی روٹیاں پیٹ میں ڈال لیتا۔ اندر چپ کے زخم سب بھرنے لگے تھے لیکن جمال کے دیرینہ زخموں کے ٹانکے ٹوٹ گئے تھے۔ درد کی شدت نے اُسے نیم پاگل بنا دیا تھا۔

ایک دن پھر اُس نے تیمور کو راستے میں روک لیا۔ وہ اپنی آنٹی کے لیے دہی لینے جا رہا تھا۔ جمال نے پوچھا۔

"[illegible]"

[illegible] جمال نے کہا۔

"[illegible] تو پھر چھوٹا پڑ جائے گا۔"

"چھوٹے کو [illegible] لیکن ہم اپنی آنٹی کو [illegible]"

جمال نے [illegible] اندازہ لگایا [illegible]

"تمہاری آنٹی [illegible] میرا مطلب ہے کہ [illegible] کیا کرتی ہیں؟"

[illegible] سوال کیا۔

جمال [illegible] ان کا کیا نام نہیں بتاتا۔

[illegible] دیکھ کر تیمور سہم گیا۔ اُس نے آہستہ سے کہا [illegible] پتہ نہیں [illegible] ہم [illegible] لیتے؟"

جمال نے [illegible] نظر ڈالی۔ بالکنی میں ایک سایہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

ایک دن جمال گھومنے کے لیے تفریح گاہ چلا گیا۔ وہ سڑک کی ایک خوبصورت باڑھ کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا کہ اُس کا ٹکراؤ تیمور سے ہو گیا۔ تیمور کا ہاتھ اُسی نے تھام رکھا تھا جس کی ایک آدھ جھلک وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اُس کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ سفید لکھنوی ساری میں اُس کا ابھرا ابھرا جسم کافی پُرکشش نظر آ رہا تھا۔ گورے گورے خوبصورت چہرے پر نرگسی آنکھیں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ ریشمیں سیاہ بالوں کی لمبی چوٹی سینے پر پڑی تھی۔

جمال کی صورت دیکھتے ہی تیمور کو کچھ یاد آ گیا۔ اُس نے زور سے کہا۔

"ممّی نے ہماری آنٹی کہہ رہی تھیں کہ میں باجا بجاتی ہوں تو آپ کے پیٹ میں درد کیوں ہوتا ہے؟"

تیمور کے ہاتھ پر دباؤ شاید بڑھ گیا تھا۔ اُس نے جلدی سے گردن اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں اُسے خاموشی سے فہمائش کر رہی تھیں۔ تیمور کچھ نہ سمجھ کر جمال کی طرف دیکھنے لگا۔ جمال نے مسکرا کر کہا۔

"بیٹے! تمہارے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

وہ اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔ جمال نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ "آپ غالباً آنٹی ریشم ہیں؟"

"میں تیمور کی آنٹی ہوں۔" وہ ریشمی لب پہلی بار ہلے۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کو اسی رشتے سے جانتا ہوں۔ کئی دن سے میں آپ سے ملنا چاہتا تھا یہ سوچ کر۔ ۔" بات ادھوری چھوڑ کر وہ سوچنے لگا کہ پوری بات سن کر وہ اُسے پاگل تو نہیں سمجھے گی۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" ریشم نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ۔ ۔ ۔ کہ آپ ماؤتھ آرگن بہت اچھا بجاتی ہیں۔" اس کی ہمت بیچ ہی میں جواب دے گئی تھی۔

"اچھا۔ ۔ ۔" ریشم مسکرانے لگی۔ پھر بولی: "لیکن میں نے تو سُنا تھا کہ آپ کو اس باجے سے نفرت ہے۔"

ٹیپو اُن دونوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر تھوڑی دُور پر لگی ہوئی پھسلنی کی طرف بھاگ گیا۔ جمال نے سوچا، جب بات چھڑ ہی گئی ہے تو پوری کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شاید روزانہ کی وحشت سے نجات ہی مل جائے۔ اُس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"آپ نے ٹھیک سُنا ہے مِس ریشم! ماؤتھ آرگن کی آواز سُن کر مجھے سخت وحشت ہوتی ہے۔ جس وقت آپ ماؤتھ آرگن بجاتی ہیں میں شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہوں۔ ایک زمانے میں اِس آواز پر میں بےخود ہو جایا کرتا تھا۔ ایلس کی نکالی ہوئی پیاری دُھنیں ابھی تک میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں۔ جب ایلس مجھے ٹھکرا کر چلی گئی تو میں اُس کی یاد میں پاگل ہو گیا۔ اُسے بُھلانے کے لئے مجھے جو کچھ کرنا پڑا اُسے میں ہی جانتا ہوں لیکن آپ نے میری زندگی میں ماضی کی کراہیں بھر دی ہیں۔ ۔ ۔" اس کا لہجہ بےحد اُداس ہو گیا تھا۔

ریشم اُس کی داستان سے بےحد متاثر نظر آ رہی تھی۔ اُس کی ڈبڈبائی ہوئی سی آنکھیں کچھ اور دلکش ہو گئی تھیں۔ جمال نے پھر کہا: "انسانیت کے ناطے اگر آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے تو آپ میری موجودگی میں ماؤتھ آرگن نہ بجایا کریں۔ آپ کے لئے یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں ہے۔"

ریشم نے گہری سانس لے کر جواب دیا: "بڑی بات کیسے نہیں ہے جمال صاحب! آپ کی داستان۔ ۔ ۔ میری بھی اپنی داستان ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جس چیز کو آپ بُھلانا چاہتے ہیں میں اُسے بُھولنا نہیں چاہتی۔ ۔ ۔"

جمال کو ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اُس نے ایک قریبی درخت کا سہارا لے لیا۔ [illegible] وقت ایک دھماکا ہوا اور ٹیپو کے زور زور سے رونے کی آواز آنے لگی۔ وہ [illegible] پر سے گر گیا تھا۔ ریشم نے دوڑ کر اُسے گود میں اُٹھا لیا۔

جمال نے باقی تمام دن گھر پر گزارا۔ ریشم کی زبان سے نکلا ہوا صرف ایک جملہ [illegible] گونجتا رہا۔ اور رات ہو گئی۔ یہ اُسی رات کا ذکر ہے جب ماؤتھ آرگن کی آواز سُن کر جمال کے ہاتھ سے پیالی کا گلاس اٹھ آیا تھا۔ دو اپنے بستر پر لیٹا [illegible] کے بغیر اندھیرے کمرے میں سانس روکے کھڑا تھا۔ اس میں [illegible] تھی۔ جمال سوچ رہا تھا۔ ریشم کا بیری طرح مجبور ہے۔ مجھے بھی صبر کر کے اُس کی مجبوری کو برداشت کرنا چاہئے یا روز کی طرح اِس ماحول سے فرار ہو جانا چاہئے۔

ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ خلافِ معمول ساز جلد ہی بند ہو گیا۔ جمال کے سینے میں دیر سے گھٹی ہوئی سانس آزاد ہو گئی۔ اُس کے چہرے سے پسینہ بہہ رہا تھا اور فضا خاموش تھی۔ پھر یہ خاموشی طویل ہو گئی۔ اِسی طرح وہ راتیں گزر گئیں۔ لیکن جمال کی قسمت میں سکون نہیں تھا۔ اب وہ دوسری کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس نے ریشم کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اِس خود غرضی کے لئے اُس کا ضمیر ہر وقت اُسے ملامت کرنے لگا۔

تیسری رات جمال کے لئے فیصلہ کُن تھی۔ تکلیف دہ سناٹے میں وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح ہوئی تو اُس نے ٹیپو کے ذریعے ریشم کے پاس اپنے دل کی دھڑکنیں بھیجیں۔

شام کے وقت جمال اُسی روش پر ٹہل رہا تھا جہاں تین دن پہلے ریشم سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس کے جسم پر اُس کا بہترین لباس تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹیپو کے ساتھ وہاں ریشم پہنچ گئی۔ آج وہ سُنہرے بارڈر والی چاکلیٹی رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے چہرے پر سرسوں کھِل رہی تھی۔

جمال نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا: "یہ حقیقت ہے کہ آپ کو میری وجہ سے بہت تکلیف اُٹھانی پڑی ہے۔"

"اِس حقیقت سے مجھے انکار نہیں ہے۔" اُس نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔

"میں اپنی خود غرضی کے لئے بہت شرمندہ ہوں۔ اِس ندامت کی آگ میں پچھلے تین دنوں سے جل رہا ہوں۔ ۔ ۔ اور۔ ۔" جمال نے بات ادھوری چھوڑ کر پینٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی گیند نکالی اور ٹیپو کو دیتے ہوئے بولا۔

"یہ گیند لو اور سامنے جا کر بچوں کے ساتھ کھیلو۔ ہم یہاں سے تمہارا کھیل دیکھیں گے۔"

ٹیپو گیند لے کر چلا گیا۔ ریشم کے ہونٹوں پر مانگی ہوئی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"معافی مانگنے کے لئے اِتنی احتیاط کی ضرورت نہیں ہے۔ ۔ ۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آئندہ بھی آپ کے جذبات کا احترام کرنے کی کوشش کروں گی۔"

[illegible] ایک دوسرے کی عادت کا

[illegible] چاہتا ہے ہم دونوں اس زمانے کے ٹھکرائے ہوئے ہیں۔ اِس لئے ایک دوسرے کے درد کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ... ذرا رُک کر اس نے پوچھا: "میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

ریشم کی آنکھیں حیرت سے پوری کھل گئی تھیں۔ اس کے مُنہ سے نکلا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ کھوئی ہوئی منزل کے غم میں ساری زندگی اپنا خون جلانے کی بجائے ہم کیوں نہ ایک دوسرے کے لئے منزل بن جائیں۔ مجھے یقین ہے اس طرح ہمارا کھویا ہوا سکون واپس مل جائے گا۔ ..." جمال کی کے لہجے میں بجز باتیت کی بجائے یقین کی جھلکیاں تھیں۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ جمال نے جیب سے ایک نیا [illegible] نکالا اور [illegible] کے حال سے بات کرتے ہوئے بولا۔

"میں اِس موضوع پر بہت کچھ سوچ چکا ہوں۔ میں شاید ایک جذباتی عاشق نہ بن سکوں۔ لیکن آپ مجھے ایک ہمدرد اور مخلص دوست پائیں گی۔ ... مجھے بتایئے کہ کیا آپ زمانے کے ٹھکرائے ہوئے ایک سادہ لوح انسان کی زندگی کا سہارا بننا پسند کریں گی؟"

ریشم نے بہت گہری نظر سے جمال کا جائزہ لیا۔ اُس کے چہرے پر شرافت کا نُور تھا۔ وہ ہر طرح قابلِ اعتماد نظر آتا تھا۔ ریشم کا سر خود بخود جھک گیا۔ اُس نے آہستہ سے اپنے سر پر ساڑی کا آنچل ڈال لیا۔

جب نیپو گیند کھیل کر واپس آیا تو اُس نے دیکھا انکل جمال ایک پتھر کی بنچ پر بیٹھے ہوئے جھوم جھوم کر ماؤتھ آرگن بجا رہے تھے۔ آنٹی ریشم اُن کے قریب بیٹھی تھیں۔ بہت ہی قریب! شاید انھیں نیند آگئی تھی!!

---

# غزلیں

پروفیسر محمد نشار الرحمٰن خاں نشار، ایم۔اے

جب کبھی آگیا خیال اُن کا ... آنکھ میں پھر گیا جمال اُن کا
کوئی دیکھے تو دیکھتا ہی رہے ... کیا کہیں حُسنِ بے مثال اُن کا
ہر ادا کیف زا و لُطف آگیں ... رُوح پرور ہے ہر کمال اُن کا
وہ مجسّم بہار ساماں ہیں ... جاذبِ دل ہے بال بال اُن کا
مست آنکھوں کی مستیاں توبہ ... دل ہے مستانہ حسبِ حال اُن کا
جیسے جادو بھرا ہے لہجے میں ... اُف رے اندازِ قیل قال اُن کا
ہم نے دیکھا انھیں بہر عالم ... کوئی پُوچھے ہمیں سے حال اُن کا
سو سہاروں کا اِک سہارا ہے ... بس غمِ عشق لازوال اُن کا

چاہ میں اُن کی جو مٹے نشار
قابلِ رشک ہے مآل اُن کا

جناب ہاشمی ایم۔اے، بی۔ایڈ

کِس طرح سے طے ہو گا زیست کا سفر تنہا ... ہم بھی ہیں اِدھر تنہا تم بھی ہو اُدھر تنہا
مارے مارے پھرتے ہیں کیسے در بدر تنہا! ... آج تک ہیں گردش میں شام اور سحر تنہا
بیکسی کی لذّت سے آشنا نہیں ہو تُو ... مجھ کو یونہی رہنے دے میرے چارہ گر تنہا
شہرِ دل سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے ... آج کتنی سُونی ہے دل کی رہگذر تنہا
کون اپنا ہمدم ہے کون غمگسار اپنا ... چھوڑ کر گئے مجھ کو میرے ہمسفر تنہا
کِس کی پیروی کیجے کِس کو رہنما کہئے ... خود بھٹکتے پھرتے ہیں کتنے راہبر تنہا

اے جناب لاکھوں ہیں اہلِ فن زمانے میں
کون آج دیکھے گا آپ کا ہُنر تنہا


یہ خوبصورت ڈیزائن کے نرم اور حسین باٹا کے سینڈل انتہائی
ہلکے ہیں اور جنہیں پہن کر آپ اپنے پاؤں میں آرام محسوس
کریں گی۔ نرم چمڑے سے آپ کے پاؤں کی حفاظت ہوتی ہے۔
اندر بھی ملائم چمڑے یا کپڑے کا استر، ہر موقعہ
اور مناسبت کے لحاظ سے مختلف دلکش رنگ
چمکیلے ڈھلے ہوئے سول اور نیچی ہلکی ڈھلی ہوئی
ایڑی۔ ہمارے یہاں آئیے اور
ایک جوڑا پہن کر تو دیکھئے
Bata

# جلتا صحرا

ڈاکٹر حامدی کاشمیری [illegible]

۲۳۰ جواہر نگر سرینگر

۲۰ جولائی ۱۹۹۰

برادرِ محترم! آداب و خلوص

ایک تازہ ترین افسانہ "جلتا صحرا" ارسال کر رہا ہوں۔ اس افسانے میں میں نے ایک الٹرا ماڈرن عورت کے ظاہر اور باطن کے تضاد کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ جدید معاشرے میں ایسی عورتیں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کا سامنا بھی کسی ایسی عورت سے ہوا ہو۔ اپنی رائے سے نوازیئے، منتظر رہوں گا ——— افسانہ نمبر کے بعد "بیسویں صدی" کا تازہ شمارہ ملا، شکریہ! واقعی ہر شمارہ حسن و رنگ کا ایک جیتا جاگتا مرقع بن کر آتا ہے ——— طبیعت کیسی ہے اب؟ خیریت نامے کے لیے ترستا ہوں۔

آپ کا ——— حامدی کاشمیری

---

وہ رنگین رات ———

خوبصورت ہال کے ترنم سے [illegible] غبار میں ہر طرف کے سفید چمکتے ہوئے [illegible] چھلکتے ارغوانی جام چھلک رہے تھے، شراب میں نہائے ہوئے ہونٹ آتش برسا رہے تھے، چہرے سرخ ہیروں کی طرح دمک رہے تھے، اور آنکھوں سے [illegible] نکل کے سمندر ابھر رہے تھے، آرکسٹرا کے سامنے خوبصورت ڈانس [illegible] انگریزی ساز [illegible] کی ایک [illegible] دُھن پیش کر رہے تھے اور رنگ [illegible] فرش پر ایک تنومند [illegible] افسر کی بانہوں میں ایک نازک سی عورت اپنی نرم و نازک بانہیں پھیلائے رقص کر رہی تھی، اور اس کی آنکھوں کی چمک، تبسم آلود ہونٹوں کی آگ اور [illegible] بانہوں کی [illegible] حرکت ترنم سی [illegible] اور پُراسرار روشنی بکھیر رہی تھی، جیسے ابر آلود سمندر کی [illegible] سطح پر بجلیاں تیر رہی ہوں!

مسز [illegible] کے ساتھ [illegible] خوبصورت [illegible] [illegible]

سفید [illegible] قمیص [illegible] معلوم ہو رہے تھے، اُن کے [illegible] گال بھرے بھرے نظر آ رہے تھے اور دونوں کنپٹیوں کے اوپر لٹکے ہوئے سفید بالوں کے گچھے بھلے معلوم ہو رہے تھے، اُن کے لب و لہجہ اور [illegible] چہرے پر اس وقت [illegible] کا نور سا پھیلا ہوا تھا۔ [illegible] [illegible] اس کے جسم کے [illegible] مسز [illegible] پچھلے [illegible] خوبصورت [illegible] اسٹیشن [illegible] [illegible] [illegible] شخصیت کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] ہیں؛

"شاید تمہیں خود نہیں معلوم کہ تم کیا ہو؟ تمہارے اندر ایک ایسی چیز ہے جو —"

"آپ مجھے بنا رہے ہیں!" وہ ہنس پڑی۔

"نہیں، میں سچی بات کہہ رہا ہوں، تم — تم زندگی کی ایک تڑپتی ہوئی بجلی ہو اور یہ بات میں نے بہت کم عورتوں میں پائی ہے، میں کافی گھوما ہوں، کتنی عورتوں کو میں نے دیکھا ہے، لیکن جس زندگی اور زندہ دلی کی مجھے تلاش تھی وہ کہیں نہ ملی، میں اپنی زندگی کی سرد تنہائی میں زندگی کی گرمی اور رونق گھول دینا چاہتا ہوں اور وہ مجھے تم —"

وہ اُس کی لانبی لانبی مخروطی انگلیوں سے کھیلنے لگے، اور اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ رنگین رات ازل سے ابد تک آہستہ آہستہ موج در موج بہہ رہی ہو اور —

اتوار کو انھوں نے کلب میں اپنی شادی کی شاندار پارٹی دی۔

وہ حسبِ عادت مسرت، زندہ دلی اور شگفتگی کا ایک جیتا جاگتا مرقع بنی ہوئی تھی اور اپنی عمر سے کئی سال کم معلوم ہو رہی تھی۔ پینتیس چھتیس سال کی یہ عورت تیس سال سے بھی کم عمر کی نظر آ رہی تھی، ایک جوان عورت جس کے ہر عضوِ بدن سے نشہ میں ڈوبی ہوئی جوانی پھوٹی پڑتی تھی، جس کے دودھیا سفید بازو چاندنی کی شاخ کی طرح کومل تھے، جس کی آنکھوں میں دہکے ہوئے شباب کا نشہ تیر رہا تھا، جس کی دراز پلکیں کاجل سے بوجھل تھیں، اور جس کے ترشے ہوئے بال کالی گھٹاؤں کی طرح اُس کی لانبی سفید گردن پر سایہ فگن تھے، ساڑی پہننے کے فن میں وہ بہت ماہر تھی اور کلب کی ہر عورت اِس بات کی کھلے دل سے معترف تھی۔ وہ روز نئی ساڑی پہنتی، ایک سے ایک نفیس، نئے نئے ڈیزائن، کلر کمبینیشن، نظر فریب، دل کش، اور ساڑی وہ یوں پہنتی کہ جسم کے تمام خطوط نکھر نکھر اُٹھتے، کہیں پر کوئی شکن یا سلوٹ نہ رہ جاتی، اور ہر روز اُس کا جسم نئی ساڑی میں آئینے کی مانند چمک اُٹھتا، اور دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں، وہ موجِ ہوا کی طرح اِدھر سے اُدھر جاتی، ہلکی پھلکی، اُس کا چلنا بھی رقص کی ایک ادا لئے ہوئے تھا، وہ ہنستی تو دور دور تک جیسے روشنی کے دائرے پھیل پھیل جاتے۔

شادی کے بعد ہی وہ کلب کی سکریٹری منتخب ہوئی تھی، کلب کی کلچرل لائف کا اب واقعی آغاز ہوا تھا، اُس نے دو ایک ایکٹ کے ڈرامے کرائے جو بہت پسند کئے گئے، اِن ڈراموں میں عورتوں کی اداکاری فن کے اعلیٰ معیار کو چھو رہی تھی، مکالموں کی ادائیگی، تلفظ اور لہجے کے آتار چڑھاؤ میں فطری رچاؤ تھا، اور اُس کا سہرا مسز سہائے ہی کے سر تھا، وہ خود انگریزی اچھی جانتی تھی۔ کانونٹ میں تعلیم پائی تھی۔ اور ایسے حلقوں میں اُٹھتی بیٹھتی رہی تھی جہاں انگریزی اپنی ہی زبان تھی۔ پہلے ڈرامے کی خوبصورت پروڈکشن کے لئے مسز سہائے کو ہر طرف سے مبارکباد ملی، لیکن دوسرے

[illegible]

اعتراض بھی کیا تھا، دیکھنے کے [illegible] عریاں جسم کے ہر عضو سے کرن پھوٹ رہی تھی، لیکن کسی نے [illegible] پرواہ کی۔ ڈرامے پر ایک اور اعتراض یہ کیا گیا کہ ہیرو کا پارٹ کلب کا ایک [illegible] کر رہا تھا جس نے اداکاری تو اچھی کی، لیکن ہیروئن کے ساتھ اُس کا [illegible] مسز سہائے نے اِس اعتراض کو بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور لڑکا اُس کا [illegible] کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتا؛ بھلا اُن کے مقابلے میں [illegible] ہے! اُس نے لوگوں کی دلیل کا مضحکہ اڑایا، حالانکہ اُس نے [illegible] مستقل ممبروں اور خاص کر اُس کے شوہر نے اس ڈرامے کی بہت تعریف کی۔

عجیب سی قہقہہ بار شام تھی —— اُن کی شادی کی دوسری سالگرہ تھی۔

ڈرائنگ روم میں اب چند ہی مہمان رہ گئے تھے، جگمگاتی ہوئی فضا خوشبو سے بوجھل تھی۔ تازہ ہوا کے جھونکوں سے کھڑکیوں کے ریشمی پردے رہ رہ کر سرسراتے، ڈاکٹر کاری چست قمیص اور تنگ پاجامے میں ایک چینی گڑیا سی معلوم ہو رہی تھی، مسٹر شنکر اور مسز شنکر جانے کے لئے پر تول رہے تھے، اُن کے ساتھ اُن کی [illegible] تھی جو بہت شریر تھی اور ایک لمحے کے لئے بھی آرام سے نہ بیٹھ سکتی تھی، مسز سہائے چاہتی تھی کہ وہ جلد سے جلد چلے جائیں تاکہ اس چھوکرے سے Daniel سے [illegible] ملے اور وہ اطمینان سے بات کر سکیں۔ بچوں سے اُسے یوں بھی نفرت تھی اور [illegible] میں اُن کی موجودگی اُسے بہت کھلتی۔ مسز کرامت اپنے سڈول جسم کی [illegible] کے ساتھ صوفہ سیٹ پر بیٹھی تھی اور ہر بات پر خفیف سا قہقہہ بلند کرتی۔ اُس کے سفید چمکتے ہوئے دانتوں پر پان کی ہلکی سی سُرخی پھیل گئی تھی، ہونٹ انگاروں کی طرح دہک رہے تھے، اُس کے خاوند ایک بڑے بزنس مین تھے، لیکن وہ تین سال سے امریکہ گئے ہوئے تھے۔ مسز کرامت ہر نئے آدمی سے مل کر اپنے شوہر کی تعریفیں کیا کرتی، وہ ابھی ابھی اُن کی طرف سے آئے ہوئے تازہ خط کے بعض پیراگراف مسز سہائے کو سنا چکی تھی۔ مسز سہائے بھی حسبِ عادت اپنے بھتیجے خالد کی پرسنلٹی کا ذکر کر رہی تھی، مسز کرامت کو اُس پر رشک آ رہا تھا۔

مسز سہائے جب بھی اپنے شوہر کی خاموش محبت، رکھ رکھاؤ، شائستگی اور اُن کے اعلیٰ مذاق کا ذکر کرتی تو اُس کے چہرے پر مسرت کی روشنی رقص کرتی۔ اُس دن جب ہم ریڈوا اور اُس کے ہسبنڈ کے ساتھ پہاڑ کی سیر کو گئے، ہمارے وہاں [illegible] لیکن رات کو نہ لوٹ سکے، کیونکہ کار کے ایک پہیے میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی [illegible]

مجبوراً ہمیں ریسٹ ہاؤس ہی میں رکنا پڑا۔ چاندنی رات تھی، خاموشی تھی، گھنے جنگل میں کبھی جانوروں کی خوفناک آوازیں آرہی تھیں۔ ریسٹ ہاؤس تو ڈر ہی گئی تھی بیچاری، لیکن میں نے بہت سمجھایا کہ اسے بہت اطمینان سے سوئی۔ دوسرے دن جب ہم گھر لوٹے تو معلوم ہوا کہ مسٹر سہائے ساری رات صوفہ سیٹ پر بیٹھا انتظار کرتے رہے، انھوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا ــــــ"

"واہ، مجبوری تو ایسی، شادی کے بعد بھی ایسے چاہنے والے مل گئے ــــ" مسز کرامت نے ہنس کر کہا۔

"یوں تو وہ بہت سیریس ٹائپ ہیں، اصولوں اور ضابطوں کے پابند، لیکن میرے سامنے آتے ہیں ــــ"

"تو ہستی گم ہوتی ہے غریب کی ــــ" ڈاکٹر کماری نے جملہ پورا کیا۔

ایک قہقہہ بلند ہوا۔

"ایک بات بتاؤں؟" اُس نے سرگوشی کی۔

"ضرور بتائیے!"

"سچی بات تو یہ ہے کہ مرد بیچارہ عورت کے مقابلے میں بہت بھولا ہے، بہت ہی معصوم، عورت کے ایک ہی لمس سے اُس کے تکلف کی ساری تہیں پگھل جاتی ہیں اور پھر اُس کی روح چمکتی ہے، خالص سونے کی مانند ــــ"

"اور عورت؟" مسز کرامت مسز سہائے کی شاعرانہ گفتگو سے متاثر ہو رہی تھی۔

"عورت بڑی کمپلکس ہے، بڑی ظالم، اُس کے ستر پردے بھی اٹھ جائیں پھر بھی اُس کی روح ستر ہزار پردوں میں چھپی رہتی ہے ــــ"

"یہ کیا راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں؟" مسٹر شنکر نے پاپ کا کش لے لیا، اُس کے چہرے کے چیچک کے داغوں میں پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔

"مردوں کے خلاف سازش ہو رہی ہے!" ڈاکٹر کماری چہکی، اُس کی گول گول سی سرمگیں آنکھیں طلائی فریم والی عینک کے پیچھے بہت خوبصورت تھیں۔

"خوب ــــ!" مسٹر سہائے مسکرائے۔

---

اُن کی شادی کا یہ تیسرا سال تھا ــــــ

وہ دونوں مسرور تھے، اپنی اپنی خوش قسمتی پر نازاں، ایک دوسرے میں کھوئے! اور اُن کے دوست اور جان پہچان کے لوگ اُن کی باہمی محبت کی لازوال مسرتوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں جلتے تھے، مسز سہائے ہر وقت صرف مسٹر سہائے کی خوبیاں گنگناتی، وہ بڑے لبرل ہیں، ہر بات میں اُس کے ہم خیال، انھوں نے اپنی مسز کو پوری آزادی دی ہے وہ پارٹیاں اٹینڈ کرتی، باقاعدگی سے کلب جاتی، ہوٹلوں میں بیٹھتی، سیر و تفریح کے پروگرام بناتی، سینما جاتی، کلچرل پروگرام پیش کرنے میں مصروف رہتی، کبھی کبھی مسٹر سہائے بھی سیر و تفریح میں اُس کا ساتھ دیتے، لیکن مائننگ انجینئر ہونے کے تعلق سے انھیں آئے دن دور دراز پہاڑی علاقوں کا دورہ کرنا پڑتا، اور کبھی کبھی وہ دو تین دن تک دورے ہی پر رہتے۔ وہ امریکہ بھی ہو آئے تھے، اس لئے وہ عورتوں کی آزادی اور سوسائٹی میں اُن کے رکس ہونے کو ایک فطری بات سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ڈھائی سال کی ازدواجی زندگی میں مسز سہائے سے اُن کے تعلقات میں کوئی رخنہ پیدا نہ ہوا، اور نہ کبھی انھوں نے اُس کے کسی معاملے میں دخل اندازی کی۔ مسز سہائے کے لئے وہ ایک پرفیکٹ جنٹلمین کا نمونہ تھے ــــــ اُسے اکثر یاد آتا، راجندر سے اُس نے اسی لئے طلاق لی تھی، راجندر اُس کی ہر بات سے اختلاف کرتا، اُس کی ہر حرکت پر احتساب کرتا، بات بات پر بحث پر اتر آتا، اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے ہاتھا پائی پر اتر آتا اور بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے دل میں یہ پھانس تھی کہ وہ کلب کیوں جاتی ہے، بیک ورڈ!

اور اُس کے پہلے شوہر امرناتھ؟ روپے پیسے کی تو اُن کے پاس کمی نہ تھی لیکن عجیب انسان تھے وہ، آدرش وادی، ہر بات میں اخلاق، شرم و حیا، مذہب، عقیدے رسمیں ــــ وہ تو آثارِ قدیمہ کی کوئی دلچسپ چیز تھے، انھیں تو بس یہی فکر تھی کہ اُن کے گھر میں بچوں کی پوری فوج ہو، بچوں کو وہ سورگ جانے کا پروانہ سمجھتے تھے۔ المختصر دو سال اُن کے گھر میں رہ کر اُس کی زندگی جہنم بن چکی تھی ــ ــ تیسرا آدمی، جو اُس کی زندگی میں آیا تھا، ایک بھاری بھرکم جسم والا وکیل تھا، ایل۔ایل۔بی کی ڈگری تو اُس کے پاس تھی، لیکن جو کبھی عدالت نہیں گیا اور نہ کوئی مؤکل اُس کے دروازے پر آیا، جو اپنی موروثی جائیداد اور بے پناہ دولت کے ہاتھوں پریشان تھا اور جس سے ریل کے دوران کے سفر میں ملاقات ہوئی تھی، اُس کے ساتھ وہ ایک سال تک رہی، لیکن جب ہارٹ فیلیر سے اُس کی موت ہو گئی اور ارتھی نکلی تو گھر میں ایک ہنگامہ بپا ہوا، معلوم ہوا کہ وکیل صاحب نے اپنی ساری جائیداد اور روپیہ اپنی پہلی بیوی کے نام لکھ کر دیا ہے، جس کے بطن سے متواتر چھ لڑکیاں ہوئی تھیں۔ ادھر گھر سے ارتھی نکلی، اُدھر پوری فوج آن واحد میں کوٹھی پر حملہ آور ہوئی اور بغیر کسی رُکاوٹ کے ہر چیز پر قابض ہو گئی۔ اور وہ جان بچا لاکھوں پائے کو ٹھکراتے ہوئے وہاں سے نکلی ــــــ وہ جب بہت ہی شگفتہ موڈ میں یہ باتیں اپنے دوستوں کو سناتی تو خوب قہقہے بلند ہوتے۔ اُس کی باتوں کا انداز بھی کہ دلچسپ تھا، وہ باتیں کرتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے سننے والوں کے کانوں میں شہد گھل رہا ہے۔

---

دو دن متواتر بارش ہوتی رہی، زوروں کی بارش، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بارش اب تھمنے کا نام نہ لے گی۔ وہ شیشے کے دریچے سے باہر دیکھتی رہی اور سامنے بھیگے ہوئے

[illegible]

[illegible] —— !

—— ؟

[illegible]

[illegible] لیکن [illegible] ——

وہ [illegible] کہ وہ مسز گراہمسن کے ہاں چلی جائے [illegible] وہاں سے

[illegible] ——  لیکن [illegible]

کہ گھر والوں [illegible] لیکن وہ [illegible] نہیں، بچے اُس کے

لئے [illegible] نہ رکھتے۔ وہ اُن سے قریب رہتی، لیکن اُن سے نفرت کرتی،

اُسے صرف اپنے آپ سے محبت تھی یا اپنے شوہر سے۔

اُسی شام کو مسٹر سہائے آ گئے۔ بخار کی شدت سے اُن کا سارا جسم کانپ رہا

تھا۔

وہ خوش ہوئی۔

وہ کانپ اٹھی۔

اور پھر وہ تین دن تک بستر پر پڑے رہے۔ سارا دن [illegible] کی بارش میں بھیگنے سے اُنھیں ٹھنڈ لگی تھی اور سارا جسم اکڑ گیا تھا۔ وہ تینوں دن پوری مستعدی اور پیار سے اُن کی تیمارداری کرتی رہی۔ دو راتیں وہ ایک پل نہ سوئی، اُن کے سرہانے کرسی پر بیٹھی رہی اور اُنھیں پانی کے ساتھ گولیاں دیتی رہی۔ تیسرے دن اُن کا بخار اُتر گیا تو اُس کی جان میں جان آئی۔

آج وہ بالکل اچھے نظر آ رہے تھے اور برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔

سامنے لان کے سفید ستونوں پر [illegible] بیلوں کی [illegible] بیل پر تازہ پھول کھلے تھے۔

"تمہیں پا کر میں بہت خوش ہوں، لیکن ——"

"لیکن کیا؟"

[illegible]

[illegible] ——

[illegible]

اپنے شوہر کے چہرے [illegible]

بہت [illegible] ——

[illegible]

ہوئے محسوس [illegible] کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے، [illegible] —— [illegible]

آج کا کیا پروگرام ہے؟" اُس نے سگریٹ سلگایا۔

"آج تو آپ [illegible] کل [illegible] —— [illegible]

ٹھیک ہے نا؟" وہ اُن کے بہت قریب آ چکی تھی۔

---

دو مہینے گزر گئے!

وہ رائل کیفے میں لمبے لمبے بالوں والے آرٹسٹ پرکاش کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شراب کا نشہ لہریں لے رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سُرخی تھی اور پسینے کے چمکتے ہوئے قطرے لرزاں تھے۔ سینے کا بالائی حصہ کھلا ہوا تھا جو کُندن کی طرح دمک رہا تھا۔ سلیولیس بازو مرمر کی طرح چمک رہے تھے، اور اُن کی چھلکتی ہوئی روشنی سے پرکاش کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

پرکاش سے دس پندرہ دن پہلے ہی ملاقات ہوئی تھی جب اُس نے کلب کے ہال میں اپنی [illegible] پینٹنگس کے اعلیٰ نمونوں کی نمائش کی تھی۔ نمائش کے [illegible] انتظامات اور [illegible] کامیاب بنانے میں مسز سہائے کا ہاتھ تھا اور [illegible]

پرکاش دلی لوٹنے کے بجائے [illegible] پہاڑ کے نظاروں [illegible] اُس پر لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی ہوئیں [illegible] تک کہا کہ [illegible]

اور جس دن پرکاش نے اُس سے شادی کرنے کی [illegible] مسز گراہمسن اُس کے گھر آئی تھی۔

"پرکاش [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible]

"لیکن مسٹر سہانے ———؟"

"ا ا ا ———"

"تم ہنس رہی ہو؟"

"ہاں ——— میں کب تک اُس عجیب و غریب انسان کو برداشت کرتی ... [illegible] کیا جاتے ہیں، آدمی بہت سادہ لگتا ہو لیکن [illegible] اُنھوں نے تو میری زندگی اجیرن کر دی ہے کچھ [illegible] سے پہلے میں نے اُن سے زبردستی طلاق لی اور ——— اپنی گلو خلاصی کی ——— [illegible]

اُسے محسوس ہوا جیسے مسز کرامت کو اُس کی باتوں پر یقین نہیں آرہا ہے ——— !

مسز کرامت چلی گئی تو وہ سیدھی بیڈ روم میں گئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے ڈرائر سے مسٹر سہانے کا وہ مختصر سا خط نکالا جو انھوں نے بمبئی جاتے وقت اُس کے لئے چھوڑا تھا۔ اُس نے ہونٹ چبائے اور خط کو پھاڑ ڈالا اور اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور پُرزے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے۔

"میں نے بمبئی ٹرانسفر کرالی ہے اور تمہارے لئے طلاق کا انتظام کیا ہے۔ تین سال تک میں تمہارے ساتھ رہا، لیکن میرے دل کا زخم گہرا ہوتا گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں نے ایک بنجر صحرا میں قدم رکھا ہے، جہاں ریت اُڑتی ہے اور گھاس کا تنکا بھی نہیں اُگتا ——— جہاں تنہائی ہے، خاموشی ہے ——— لیکن ———

اُف ——— ! یہ آواز ——— یہ آوازیں ——— مسٹر سہانے ———

راجندر ——— امرناتھ ——— وکیل صاحب اور ——— ———

خط کے پُرزے ناچتے ہوئے ویران سڑک پر بکھر رہے تھے۔

منتشر حروف جملوں میں ڈھل رہے تھے اور جملے دہکتے ہوئے سلاخوں کی طرح اُس کی آنکھوں میں چبھ رہے تھے!

وہ اندھی ہو رہی تھی!

اُس نے جلدی سے کھڑکی بند کی۔ دفعتاً اُسے محسوس ہوا وہ پچیس برسوں سے اپنے وجود کے جلتے ہوئے صحرا میں تنہا سفر کر رہی ہے۔ صحرا جل رہا ہے، کہیں کوئی سایہ نہیں، کوئی پیڑ نہیں، کچھ بھی نہیں ———

اُس کی سانس گھٹنے لگی اور اپنے جسم کے بوجھ کو اُس نے بہت بیزاری سے بستر پر پھینک دیا۔



فلم اسٹار آشا پاریکھ
"میں اپنے رنگ رُوپ کی دیکھ بھال لکس سے کرتی ہُوں"
آپ کا رنگ رُوپ بھی نہایت اہم ہے —
اس کے شایانِ شان بھی دیکھ بھال کا
وہی ساز و سامان ہے — خالص، ملائم
لکس ٹائلیٹ صابن۔
آشا پاریکھ کہتی ہیں: "صرف لکس چار
رنگوں میں ملتا ہے اور سفید بھی۔ اور اس
کی خوشبو، کیتنی دِلفریب ہے!"
لکس ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا حُسن بخش صابن
LUX
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

# شانِ نزول

نریش کمار شاد

۶۲ تیمار پور۔ دہلی
۲۲ جولائی ۱۹۶۷ء

بندہ پرور! صحافیٔ مقبول!!

پہلے تو کیجئے سلام قبول۔ اور پھر دیکھئے یہ "شانِ نزول"۔ جو نہیں صرف میرا شوقِ فضول۔ کیونکہ گلزارِ شاعری کے یہ پھول۔ پڑھنے والوں میں ہیں بہت مقبول۔ جو بھی اِس ضمن میں ہوئے موصول۔ بھیج سکتا ہوں اُن محطوں کی نقول۔ آپ ہوں گے مگر بہت مشغول۔ شعر میں آج یہ خلافِ اصول۔ لکھ رہا ہوں جو نامۂ مجہول۔ محض شوخی پہ کیجئے محمول۔ ہِل گئی ہے کوئی دماغ کی چول۔ بالارادہ نہیں ہوئی ہے یہ بھول۔

میں وہی
آپ کا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ شادِ ملول
(گاہ معقول، گاہ نامعقول)

---

ایک مشاعرے میں جس کی صدارت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کر رہے تھے اور جہاں کئی شاعروں کے علاوہ جوشؔ اور ساحر ہوشیار پوری ایسے مُستند بادہ نوش شاعر بھی شامل تھے مولانا انور صابری نے "ہے ساقی" کی ردیف میں اپنی غزل پڑھی اور جونہی اُس غزل کا یہ مقطع سُنایا ؎

تری مستی بھری آنکھوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا
یہ انور صابری کیوں مُفت میں بدنام ہے ساقی

تو پنڈت ہری چند اختر نے بے اختیار یہ شعر موزوں کر دیا ؎

سحر سے جوشؔ سے ساحر سے تو واقف ہے مے خانہ
یہ انور صابری کس مسخرے کا نام ہے ساقی

---

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ وطن کے بعد جب لاہور ہندوؤں سے خالی ہو گیا اور وہاں کی حکومت نے پنجاب میں امتناعِ شراب کا قانون بھی نافذ کر دیا تو احسان دانشؔ نے یہ شعر کہا ؎

---

نہ بت کدوں میں چراغاں نہ میکدوں میں ہجوم
تمام شہر مسلماں ہے دیکھئے کیا ہو!

---

بہت مدت کے بعد جب ایک دن بسمل سعیدی کی اپنے ایک دیرینہ محبوب سے اچانک ملاقات ہو گئی تو بے اختیار اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس محبوب نے جب ادائے دلبری کے ساتھ اِس اشکباری کی وجہ دریافت کی تو بسمل صاحب نے ذرا تامل کے بعد جواب میں یہ شعر موزوں کر دیا ؎

تیرے لئے جو آنسو آنکھوں سے بہہ رہے ہیں
آنسو نہیں یہ میری آنکھوں کے قہقہے ہیں

---

اِس سال ۲۷ اپریل سے ۳۰ اپریل تک بجلی کے کارکنوں کی ہڑتال کی وجہ سے سارے پنجاب میں بجلی بند رہی۔ انھیں دنوں میں ایک رات جب جوشؔ ملسیانی کا ماتھا اپنے مکان کے دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا تو انھوں نے اندھیرے ہی میں یہ شعر کہہ کر

عرشؔ ملسیانی اور دشمن داغی کا ثبوت بہم پہنچایا ؎

کہہ رہا تھا ایک چوکیدار ۔ بجلی بند ہے
لوگ چوروں سے رہیں ہشیار ۔ بجلی بند ہے
کارخانوں میں بھی چکر چل گیا تقدیر کا
سارے انجن ہو گئے بے کار ۔ بجلی بند ہے
کچھ لکھیں تو کیا لکھیں ہم کچھ پڑھیں تو کیا پڑھیں
لکھنا پڑھنا ہو گیا دشوار ۔ بجلی بند ہے
آئنے میں اپنی صورت بھی نظر آتی نہیں
اب کہاں کی حسرتِ دیدار ۔ بجلی بند ہے
کیا بتائیں آپ کو ہم ملک میں کیا کچھ ہوا
کون چھاپے آج کا اخبار ۔ بجلی بند ہے
گھر سے باہر جب قدم رکھا تو آئی یہ صدا
دیکھ کر چلنا مری سرکار ۔ بجلی بند ہے
چلتے چلتے کھا کے ٹھوکر ایک راہی نے کہا
بجلی والوں پر خدا کی مار ۔ بجلی بند ہے!

---

زردؔ نکودری اور عرشؔ ملسیانی بچپن کے بے تکلف دوست ہیں اور عرشؔ صاحب کا تخلص بھی زردؔ ہی صاحب کا تجویز کیا ہوا ہے۔ ایک بار زردؔ صاحب کے کسی خط کا جواب عرشؔ صاحب نے خاموشی میں دیا تو زردؔ صاحب نے انھیں ایک اور خط لکھ کر اُس میں بڑی جلی کٹی سنائیں۔ یہ خط جس وقت عرشؔ صاحب کو موصول ہوا وہ غالبؔ کی اس زمین میں غزل کہہ رہے تھے ؎

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

خط پڑھ کر یہ شعر بھی موزوں ہو گیا ؎

کیوں مجھی پر برس پڑے حضرت
زردؔ صاحب یہ ماجرا کیا ہے؟

اور غزل زردؔ صاحب کو بھیج دی۔ زردؔ صاحب نے بھی جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

میرے خط کے جواب میں چُپ ہو
بندہ پرور! تمھیں ہوا کیا ہے؟

---

ڈاکٹر ذاکر حسین جب نائب صدر جمہوریۂ ہند تھے تو گوپی ناتھ امنؔ انھیں

ایک دن درخت لگانے کے لئے دہلی کے قریب کسی پارک میں لے گئے۔ وہاں سرکاری اور غیر سرکاری حضرات کا بڑا مجمع تھا جن کے اصرار پر ذاکر صاحب کو تقریر کرنی پڑی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے فرمایا کہ درختوں میں ایک خوبی ہے کہ فائدہ پہنچاتے ہیں لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ اتنی سی بات سُن کر امنؔ صاحب نے اپنی نئی غزل کے لئے زمین تلاش کر لی اور مطلع میں ذاکر صاحب کی اسی بات کو منظوم کر دیا ؎

انساں سے ہیں بلند شجر، بولتے نہیں
دیتے ہیں سایہ اور ثمر، بولتے نہیں

---

لکھنؤ میں ایک شادی کی تقریب میں مہتاب نامی ایک طوائف کا مجرا تھا۔ مہتاب واقعی اتنی حسین تھی کہ مہتابِ ارضی معلوم ہوتی تھی۔ سعادت یار خاں رنگینؔ نے جب اُس کی طرف نگاہ کی تو بے تاب ہو کر فی البدیہہ یہ مطلع کہہ دیا ؎

تھی شعلہ یا وہ برق کہ جی میرا جل گیا
ایسی ہی کی نگاہ کہ بس دم نکل گیا

---

سر سید کی زندگی میں تو اکبرؔ الٰہ آبادی اُن کے مخالفوں میں تھے لیکن سر سید کی وفات کے بعد اکبرؔ بھی اُن کے مشن کی افادیت پر ایمان لے آئے اور اپنے اس قطعے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبرؔ
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

---

کئی سال پہلے کی بات ہے شکیلؔ بدایونی اُس وقت علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے۔ کسی مشاعرے کے سلسلے میں وہ آگرے گئے تو طاہر فاروقی کے یہاں قیام کیا۔ طاہر صاحب بہت زندہ دل انسان تھے۔ شام کو اُن کے یہاں جب شاعروں کا اچھا خاصا مجمع ہو گیا تو طاہر صاحب نے تمام شاعروں سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ مصرع پڑھا ؎

نظر اُٹھتے ہی ساقی کی چھلک جاتے ہیں پیمانے

اور دس منٹ کے اندر اندر اس مصرعِ طرح میں ہر شاعر سے ایک ایک شعر کہنے کی فرمائش کی لیکن شرط یہ عائد کی کہ شعر منفرد حیثیت کا حامل ہونا چاہئے۔ سب شاعروں نے فکر سخن کی اور دس منٹ کے بعد اپنا اپنا شعر سُنا دیا۔ اُن تمام شعروں میں شکیلؔ کا یہ شعر متفقہ طور پر بہترین قرار پایا ؎

ہوا جاتا ہے کم ذوقِ وفا، دورِ ترقی میں
کہ اب جلتے نہیں بے ہوش ہو جاتے ہیں پروانے

---

اپنے سرکاری دفتر میں اپنے سے بڑے بابو کی خدمت میں جب بھی میں نے عرضداشت پیش کی تو انھوں نے غالباً اپنے احساسِ برتری کی بنا پر اُس کا جواب خاموشی ہی میں دیا۔ کچھ دنوں کے بعد جب اُن کے اِس ناگوار رویّے کو میں نے شدّت سے محسوس کیا تو انتقاماً اپنا رویّہ ترک کر دیا۔ اور اِس صورتِ حال میں مجھ سے یہ رُباعی موزوں ہو گئی ہے

کرنا ہے جو رفتہ سر میں گزارا مجھ کو
نااہل کی صحبت بھی گوارا مجھ کو
لیکن پئے تعظیم تو مجبور نہ کر
اے جبرِ حیات! تو خدارا مجھ کو

---

شیخ امام بخش ناسخ نے ایک بار پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی سے مذاق کرتے ہوئے کہا پنڈت جی ایک مصرع ہو گیا ہے۔ دوسرا سوجھ نہیں رہا ورنہ شعر ہو جائے مصرع یہ ہے ؎

شیخ نے مسجد بنا، مسمار بُت خانہ کیا

نسیم نے یہ سنتے ہی ناسخ کی اِس مذہبی چوٹ کا برجستہ جواب دیا ع

تب تو اِک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

---

مومن خاں مومن نے صرف دو قصیدے اربابِ دنیا کی تعریف میں کہے ہیں۔ ایک نواب وزیر الدولہ رئیس ٹونک کی شان میں، جن سے مومن کو روحانی نسبت تھی لیکن اِس میں بھی دربار کی حاضری سے معذرت کا اظہار کیا ہے اور پٹیالہ کے ایک رئیس راجہ کرم سنگھ کے بھائی راجہ کنور اجیت سنگھ کی تعریف میں، جن کی سخاوتیں اپنے وقت میں ضرب المثل تھیں اور جنھوں نے ایک بار اپنے یہاں بڑی عزت و تعظیم سے بلا کر کچھ نجوم اور کچھ شعر و سخن کی باتیں کرنے کے بعد مومن کو ایک ہتھنی نذرانے کے طور پر دی تھی۔ جب اِس نذرانے کو مومن نے قبول کر لیا تو عبداللہ خاں آوج نے طنزاً یہ شعر کہا تھا ؎

ہتھنیوں میں وہ مومن مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

---

۱۹۳۵ء میں جب مسجد شہید گنج لاہور کے جھگڑے کا آغاز ہوا تو تحریکِ شہید گنج کی مسجد کی مجلس عمل کا مرکز بھی شہید گنج ہی میں تھا اور ایک صاحب مولا بخش اُس کے ڈکٹیٹر تھے جنھیں حکومت نے گرفتار کر لیا اور اُن ہی دنوں اتفاق سے سکھوں کی کرپانوں سے پابندی اُٹھ گئی۔ اِس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے علامہ اقبال نے "ایکس شاعر" کے فرضی نام سے یہ شعر کہا ؎

ہوئیں آزاد جب لاہور میں سکھوں کی کرپانیں
مسلمانوں کے مولا بخش کو سرکار نے پکڑا

---

جوش ملیح آبادی جذباتی طور پر غزل کے مخالف ہیں لیکن جن دنوں جگر مرادآبادی کی اِس غزل کا بہت چرچا تھا ؎

وصل سے شاد کیا ہجر سے ناشاد کیا
اُس نے جس طرح سے چاہا مجھے برباد کیا

خود بھی اِس زمین میں غزل کہنے پر مجبور ہو گئے، لیکن اپنی غزل کا مقطع انھوں نے جگر کے مطلع کی ہنسی اُڑاتے ہوئے کہا ؎

کچھ نہیں اِس کے سوا جوش حریفوں کا کلام
"وصل سے شاد کیا، ہجر سے ناشاد کیا"

---

میرزا آگاہ دہلوی کے شاگرد رشید میرزا آئل دہلوی جن کا یہ انتہائی مشہور اور زندۂ جاوید شعر ہے ؎

یہ کہہ کے چھیڑتے ہیں جوانانِ بادہ خوار
آئل تمھیں سلام کہا ہے بہار نے

ایک دن اپنے بے تکلف شاعر دوستوں میں بیٹھے ہوئے تھے کہ باتوں باتوں میں کسی دوست نے ایک پرانے اُستاد کا یہ شعر سُنا دیا ؎

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہیدِ ناز کی تربت کہاں ہے

شعر سُن کر ایک لمحے کے لئے آئل چونکے اور دوسرے ہی لمحے اِس کے جواب میں یہ شعر کہہ کر سُنا دیا ؎

جہاں دم بھر کو ٹھہرے ہو کر وہ کافر مسکرایا تھا
شہیدِ ناز کی تربت وہیں معلوم ہوتی ہے

---

نوح ناروی کے اپنے بیان کے مطابق ایک رات عالمِ خواب میں اُستاد داغ دہلوی سے اُن کی ملاقات ہوئی اور داغ صاحب نے اُن سے کوئی تازہ شعر سُنانے

کی فرمائش کی۔ نوح صاحب نے اُسی عالم میں یہ مطلع کہہ کر سُنایا ؎

گلزارِ جہاں میں آئی خزاں شاخوں سے جدا ہر پتہ ہے
پھولوں کا مجھے افسوس نہیں کلیوں کا قلق البتہ ہے

شعر سُن کر اُستاد کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگے پہلا مصرع نامناسب ہے خزاں میں بھی شاخوں سے ہر پتہ جدا نہیں ہو جاتا اس لئے مصرعِ اُولےٰ اس طرح بنا لو ع

گلزارِ جہاں میں آئی خزاں پژمُردہ غم ہر پتہ ہے

---

مشہور رُباعی گو شاعر امجد حیدرآبادی کو ایک رات خواب میں ایک بزرگ نظر آئے اور انھوں نے امجد سے کہا کہ اندھا ہو جا، بہرہ ہو جا، گونگا ہو جا! ان الفاظ سے امجد کے دل و دماغ نے نہایت گہرا اثر قبول کیا اور یہ رُباعی موزوں ہو گئی ؎

تو کان کا کچا ہے تو بہرا ہو جا
بد بیں ہے اگر آنکھ تو اندھا ہو جا
گالی، غیبت، دروغ گوئی کب تک
امجد کیوں بولتا ہے گونگا ہو جا

دوسرے دن وہی بزرگ خواب میں پھر امجد صاحب کو نظر آئے اور کہنے لگے، اُن کا مفہوم ابھی ادا نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی موضوع پر امجد صاحب نے یہ دوسری رباعی کہی ؎

مت سُن پرائے کی بات بہرا ہو جا
مت کہہ اسرارِ غیب گونگا ہو جا
وہ روئے لطیف اور یہ ناپاک نظر
امجد کیا دیکھتا ہے اندھا ہو جا!

---

افسانہ

# ماضی کے کھنڈر

مس نکہت ریحانہ۔ ایم۔ اے

"زینت منزل" اکلیاپورہ (کیمپ) امراوتی (مہاراشٹر اسٹیٹ)

یکم جولائی ۱۹۶۷ء

مشفق و محترم چچا جان! خلوص و احترام

اپنی ایک تازہ ترین تخلیق کے ساتھ "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو رہی ہوں۔ زیر نظر افسانہ، افسانہ کم حقیقت زیادہ ہے ـــــ میں اس حقیقت کو افسانے کا روپ دینے میں کہاں تک کامیاب ہو سکی ہوں، یہ آپ کی بلند نگاہ ہی دیکھ سکتی ہے ـــــ آپ کی گرانقدر رائے میرے لئے مشعل راہ ہوگی . . .

سراپا خلوص۔ ـــــ نکہت ریحانہ

غضب کی سردی تھی۔ خاموشی نے تمام ہنگاموں کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ تاریکی کے دیو نے تمام اُجالیوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ رات کسی گناہ گار کے دل کی طرح سیاہ اور بھیانک تھی۔ فضا کسی بیوہ کے دل کی طرح ویران اور اُداس تھی۔ ایسی بھیانک فضا میں وہ ماحول سے بے خبر نہ جانے کب سے کھڑکی سے لگی کھڑی تھی۔ محویت کا یہ عالم تھا کہ اُسے سردی کی شدت کا احساس بھی نہ تھا اور یہ احساس ہوتا بھی کیوں جبکہ اُس کا وجود ہی سراپا آگ بنا سُلگ رہا تھا۔ سرد ہوائیں اُس کے جسم سے آکر ٹکراتیں اور اس کے وجود کی گرمی سے گھبرا کر لوٹ جاتیں۔ وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر ماضی کے کھنڈروں میں بھٹک رہی تھی۔ ماضی جسے وہ ذہن کے پردے سے ہٹا دینا چاہتی تھی جس نے وقتی خوشیوں کے ساتھ سُلگتی، تڑپتی کربناک یادوں کو بھی اُس کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور اُسے محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے دہکتے انگاروں سے اُس کی گود بھر دی ہو۔ ماضی میں اُسے ایسے زخم بھی ملے تھے جنھیں وقت کا مرہم بھی مُندمل نہ کر سکا۔ جو وقت کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ جوان ہوتے گئے اور جنھوں نے اُس کی زندگی کے جام کی شیرینیوں میں زہر گھول دیا تھا جن کے اثر سے وہ درد و کرب میں ڈوبی یادوں کے کھنڈر میں تنہا بھٹکتی پھر رہی تھی ـــــ لیکن نہیں۔ میں تنہا نہیں تھی۔ اِن کھنڈروں کے گوشے گوشے سے اُسے سہیل کا مُسکراتا چہرہ جھانکتا نظر آ رہا تھا۔ سہیل! جس کی یاد اُسے ماضی کی طرف کھینچ لے جاتی تھی اور پھر وہ گھنٹوں اُسی کے خیالات میں کھو جاتی تھی۔ آج بھی وہ مسلسل سہیل ہی کے متعلق سوچ رہی تھی اور تب اُسے سہیل سے پہلی ملاقات یاد آ گئی اور پھر تو جیسے ماضی کے صحیفے کے اوراق خود بخود اُلٹتے چلے گئے۔

بہت سُہانی دوپہر تھی۔ دو دن سے لگاتار بارش ہونے کے بعد مطلع صاف ہو گیا تھا۔ وہ اس کالج میں نو وارد تھی۔ پچھلے ہی ہفتے گورنمنٹ سائنس کالج میں بطور لکچرر اس کا تقرر ہوا تھا۔ فرصت کے اوقات میں وہ لائبریری کے اسی تنہا گوشے میں آ بیٹھتی۔ مطالعہ میں وقت اچھی طرح گزر جاتا۔ اگلا پیریڈ شروع ہونے میں تھوڑی ہی دیر تھی۔ اسی لئے اس نے کتاب بند کر کے میز پر ڈال دی اور اپنی کتابیں سمیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑکی سے باہر نظر ڈالی تو پانی تھما ہوا تھا۔ وہ جلد جلد قدم اٹھاتی لائبریری کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ لگاتار بارش سے زمین چپکنی ہو گئی تھی۔ جونہی آخری سیڑھی سے اتر کر اُس نے زمین پر قدم رکھنا چاہا اُس کا پیر پھسل گیا۔ اُس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کے لئے اُسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے سہارا دیا ہو۔ وہ دو مضبوط بازوؤں کے حلقے میں تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے جانے کیا ہوا کہ دونوں ہی زمین پر آ رہے۔ وہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہی کہ اُسے جان بوجھ کر گرایا گیا ہے۔ وہ غصے سے پلٹ پڑی۔ پھر جیسے اُس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ وہ مبہوت سی اُسے تکتی رہ گئی۔ پھر جانے کس طرح اُس کی زبان سے نکلا "سہیل!"۔

پہلے تو وہ چونک پڑا ـــــ "تو آپ مجھے جانتی ہیں؟"

اُس کے ہونٹوں پر رینگ جانے والی شرارت آمیز مُسکراہٹ نے اُسے چونکا دیا۔

وہ سنبھل گئی۔ شرم اور غصے کی لہر نے اُس کے چہرے کو گلنار بنا دیا۔ وہ جلتی ہوئی پھڑپھڑاتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ غصے میں اُسے اپنی تکلیف کا احساس بھی نہ رہا۔ اُس نے اپنی خشمگیں نظریں اوپر اُٹھائیں۔

"یہ کیا حرکت تھی؟"

"جی! " اُس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ "میں نے کیا کیا! میں تو آپ کو سنبھال رہا تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اپنے ساتھ آپ مجھے بھی لے ڈوبیں۔"

"کیا مطلب؟" غصے سے اُس کی آواز بھرا گئی۔ ——— "شرم نہیں آتی آپ کو؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "شرم! میری شرم اتنی بے شرم نہیں جو وقت بے وقت آ سکے۔"

---

- اگر تم نیکی اختیار کرو گے تو اُس میں تمہاری ہی بھلائی ہے اور اگر تم نے بُرائی اختیار کی تو وہ بھی اپنے حق میں کی۔ (قرآن پاک)
- تم میں سے کوئی مؤمن کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- غریبوں کی خدمت کرنے والا (اجر و ثواب میں) صائم النہار اور قائم اللیل کے برابر ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جس نے اپنے کسی بھائی کی حاجت روائی کی، قیامت کے دن خدا اُس کی حاجتیں بر لائے گا۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

---

وہ جل ہی تو گئی ——— "جی نہیں! آپ جیسوں کے پاس آتے تو شرم کو بھی شرم آئے!"

اُس نے بہت معصومیت سے کہا۔ "جی ہاں۔ جب آپ فرماتی ہیں تو یہی سچ ہوگا۔"

اُس کے اس انداز پر ضبط کے باوجود اُسے ہنسی آگئی۔ جسے بہت مشکل سے اُس نے ضبط کیا۔ پھر بھی ہونٹوں پر چھا جانے والی ہلکی سی مسکراہٹ کو وہ دبا نہ سکی۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ لیکن سہیل نے اُسے مسکراتے دیکھ لیا تھا۔ اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ پھر ایک دلفریب مسکراہٹ اُس کے لبوں پر مچل اُٹھی ——— "آپ نے بالکل بجا فرمایا شاید اسی لئے مجھے شرم نہیں آئی اور پھر شرمانا مردوں کو زیب نہیں دیتا۔ شرم تو عورتوں کا زیور ہے اور آپ شرما رہی ہیں۔ بس یہی کافی ہے۔"

وہ اُس کی اِس بے باکی پر حیران رہ گئی۔ اُسے اُس پر بے حد غصہ آیا۔ ابھی وہ کوئی سخت بات کہنے ہی والی تھی کہ اچانک گھنٹی بج اُٹھی۔ کلاسوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ سہیل نے موقع غنیمت جانا اور اُسے حیران و پریشان چھوڑ کر لمبے لمبے قدم اُٹھاتا وہاں سے چلا گیا اور وہ اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اُس کے سرو قامت جسم پر سفید لباس بہت بھلا لگ رہا تھا۔ پھر اُس کے کپڑوں پر کیچڑ کے دھبے دیکھ کر بے اختیار اُسے ہنسی آگئی۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی نظر اپنے کپڑوں پر پڑی۔ قیمتی ساری کا ناس ہو گیا تھا۔ وہ اپنی اِس حالت پر جھینپ سی گئی اور جلدی جلدی قدم اُٹھاتی ایک طرف چلی گئی۔

اِس واقعے کے بعد وہ اُسے نظر انداز نہ کر سکی۔ ایک عجیب کشمکش، ایک عجیب اُلجھن نے اُسے گھیر لیا تھا۔ وہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی کہ جانے انجانے میں سہیل اُس کی طرف کھنچتا چلا آ رہا ہے۔ وہ بے چین ہو گئی ——— یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سہیل اُس سے کتنا چھوٹا ہے۔ کتنا چھوٹا۔ اُس کی نظروں میں محض ایک بچہ! اور پھر۔ اور پھر۔ . . اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کس طرح اُسے سمجھائے اور۔ وہ سمجھانے کا موقع ہی کب دیتا تھا۔ وہ تو اپنی دُھن میں انجام سے بے خبر آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ بھی غیر ارادی طور پر سہیل کی طرف کھنچی چلی گئی۔ مگر اُس کی محبت وہ رُوپ اختیار نہ کر سکی جس کا ارمان اُسے سہیل کی آنکھوں میں مچلتا نظر آ رہا تھا۔ وہ کانپ جاتی ——— . . . "نہیں، نہیں! ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ وہ سہیل کو کچھ نہ دے سکے گی۔ کچھ بھی نہیں!"

باوجود کوشش کے بھی وہ سہیل سے کھل کر اِس موضوع پر بات نہ کر سکی۔ سہیل کا دل ٹوٹ جائے یہ اُسے کسی قیمت پر منظور نہ تھا۔ لیکن ———

لمحے آئے۔ بیتے۔ سال گزر گیا۔ امتحانات شروع ہوئے۔ ختم ہو گئے اور پھر آخری دن۔ پرچہ دینے کے بعد وہ سیدھا سیما کے پاس آیا۔ آنکھوں میں گہری اُداسی، ویرانی، بے بسی اور ہونٹوں پر مجبور و بے جان مسکراہٹ لئے ——— اُس کا دل تڑپ اُٹھا۔ وہ اِس اُداسی کا سبب جانتی تھی۔ ورنہ سہیل نے پرچے تو بہت اچھے کئے تھے۔ اُس نے نہایت اپنائیت سے پوچھا۔

"اتنے خاموش کیوں ہو سہیل؟" ——— جواب میں وہ پلک جھپکائے بغیر اُسے دیکھتا رہا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو!" ——— اُس کے لہجے میں ساری دنیا کا پیار سمٹ آیا تھا۔

وہ چونک پڑا۔ "جی! کچھ نہیں ——— آج کالج کا آخری دن ہے۔ رات کی گاڑی سے میں گھر چلا جاؤں گا۔ پورے دو ماہ کے لئے۔ جو میرے لئے دو صدیوں سے

کم نہیں ہے۔

"تو ایسی میں اُداس ہونے کی کیا بات ہے" اُس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"آپ کے لئے تو کوئی بات نہیں اور ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہوں جیسے میری روح جسم سے جدا ہو رہی ہے ـــــ میں آج چلا جاؤں گا۔ لیکن دل نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اکیلے بھٹکے گا بیچارہ کہاں کہاں ـــ جانے کہاں ـــ ہو سکے تو اُسے سہارا دینا بڑا احسان ہوگا آپ کا!" اُس کا گلا شدتِ جذبات سے رندھ گیا۔

ستیما کے جذبات تو چیخ اُٹھے۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ سہیل پھر رُک رُک کر کہنے لگا۔

"میں آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک التجا ضرور ہے۔ اس دوران مجھے بھول نہ جانا ـــــ میرے لئے یہی ایک بات سکون کا باعث ہوگی کہ میرا خیال آپ کے دل میں ہے ـــــ ہو سکے تو میرے لئے دعا بھی کرنا۔"

اُس نے اپنی دلی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بہت محبت سے جواب دیا۔

"کیسی بات کرتے ہو سہیل! تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ میں تمہیں بھول جاؤں گی۔ تم نہیں جانتے تم مجھے کتنے عزیز ہو۔ میں تمہارے جذبات سے بے خبر نہیں۔ تم جانتے ہو عورت کتنی مجبور ہے۔ اسے میری مجبوری سمجھ کر مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارے خلوص سے بہت متاثر ہوں۔ تمہارے لئے تو ہر وقت میرے دل سے دعا نکلتی ہے۔ خدا تمہیں اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔"

سہیل کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ اُبھر آئی ـ "ایسا نہ کہئے! اِس دعا میں ایک طرح سے آپ کے لئے بددعا کا بھی پہلو نکلتا ہے!"

وہ اُس کا مطلب سمجھ تو گئی۔ لیکن خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ سہیل کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو گیا۔ بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔

"کاش! زندگی کے کسی موڑ پر میں آپ کے خیالات بدل سکوں۔"

سہیل کو محسوس ہوا اگر کچھ دیر اور وہ اُس کے پاس رُکا تو شاید اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکے گا۔ اُس نے وہاں سے ہٹ جانا ہی بہتر سمجھا۔ یکایک وہ مڑا اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔

"کاش زندگی کے کسی موڑ پر میں تمہارے خیالات بدل سکوں!" ستیما نے زیرِ لب دُہرایا اور اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔

دو ماہ بعد کالج کھل گئے۔ سہیل نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔ اُسے ولایت جانے کے لئے اسکالرشپ مل گیا۔ ویسے بھی اُس کے والدین اُسے اپنے خرچ پر بھی بھیجنے کو تیار تھے۔ لیکن جب اُس نے اُسی کالج میں ایم۔ ایس سی میں داخلہ لیا تو سب ہی چونک پڑے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت جانے کی خواہش بچپن ہی سے اُس کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ سب ہی جانتے تھے۔ پھر اچانک اُسے کیا ہو گیا۔ جو وہ جانے سے انکار کر رہا ہے۔ والدین، دوست، پرنسپل سب سمجھا کر تھک گئے لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ کسی اور کالج میں بھی اُس نے انکار کر دیا تھا۔

اور تب اُسے محسوس ہوا کہ وہ سہیل کے روشن مستقبل کی راہ میں ایک ایسا پتھر بن گئی ہے جس سے ٹھوکر کھا کر، جس سے ٹکرا کر وہ زخمی ہو گیا ہے۔ اب اُس میں اُٹھنے کی سکت بھی نہ رہ گئی ہے ـــــ وہ جانتی تھی کہ محض اُس کی وجہ سے سہیل نے جانے سے انکار کیا ہے۔ لیکن وہ کیا کرے وہ بھی تو مجبور ہے۔ وہ اپنے ضمیر کو اتنا بڑا دھوکا نہیں دے سکتی، اپنے دل پر اتنا ظلم نہیں کر سکتی۔ وہ... لیکن دوسری صورت میں وہ سہیل کا مستقبل برباد کر رہی ہے۔ یہ غم بھی تو اُس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا تھا۔ نہیں! وہ ایسا کبھی نہ ہونے دے گی! اب اُسے صرف ایک راستہ نظر آ رہا تھا جس کے سہارے وہ سہیل کو ولایت جانے پر آمادہ کر سکتی تھی۔ لیکن اِس پُرخطر راہ پر چلنے سے پہلے اُسے جھوٹ اور فریب کا لبادہ اوڑھنا پڑے گا۔ ضمیر کا خون کرنا ہوگا۔ اگر اِس طرح بھی وہ سہیل کا مستقبل بچا سکی تو شاید اُس کی روح کو کچھ سکون مل جائے۔ سہیل کی حالت اُس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اُسے تو چُپ سی لگ گئی تھی۔ ہر وقت خاموش رہتا تھا۔ اُس کے مزاج کی شگفتگی، وہ زندہ دلی نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ سب اُس کی اِس تبدیلی پر حیران تھے۔ اُس سے پُوچھا بھی گیا۔ لیکن وہ کب کسی کو کچھ بتاتا تھا۔ بس ہر وقت بے چین نظر آتا تھا۔

آخر ایک طویل کشمکش کے بعد ایک روز ـــــ اُس نے چپراسی کے ذریعے سہیل کو لائبریری میں بُلوایا۔ اُس وقت کچھ لڑکے اور پروفیسر بیٹھے مطالعے میں غرق تھے۔ وہ سہیل کو لے کر الگ ایک گوشے میں گئی۔ بڑی الماریوں کے درمیان اٹکتا پردہ برابر کیا

---

- ماننے سے خوشی اُسی طرح بڑھتی ہے جس طرح دھرتی میں بویا ہوا بیج فصل بنتا ہے۔ (گرو گرنتھ صاحب)
- دل آنکھ کے تابع ہے۔ آنکھ بگڑ گئی تو دل بگڑ جائے گا۔ (ماتا ریحانہ جی)
- جس کے ساتھ خدا ہے اُسے کسی کی کیا پروا۔ (سوامی سارشبدا...)
- دن رات جسم سنوارنے والو! کبھی جسم کے فنا کے بعد زندہ رہنے والی روح کو بھی سنوارو۔ (سوامی سارشبدانند جی)
- انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو جس سے انسانیت کا دامن داغدار ہو جائے۔ (ٹھاکر سری چند جی)

---

سہیل کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔ سہیل حیران تھا کیونکہ سیما نے پہلی بار اُسے بلایا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح بات شروع کرے۔ آخر ہمت کر کے اُس نے پوچھ ہی لیا۔

"سہیل! میں نے سنا ہے تمہیں ولایت جانے کے لئے اسکالرشپ مل رہا ہے؟"

اُس نے ایک گہری سانس لی۔ "جی! آپ نے ٹھیک سنا ہے۔"

"تو پھر کب جانے کا ارادہ ہے؟" وہ پوچھ بیٹھی۔

"کبھی نہیں!" سہیل نے جیسے سسکی لی۔

سیما نے اپنی استفہامیہ نظریں اُٹھائیں۔ "کیوں؟"

"بس۔ یونہی۔ مجھے ولایت نہیں جانا ہے۔" وہ اُداسی سے بولا۔

"مجھے بھی وجہ نہ بتاؤ گے؟" اُس نے التجا کی۔

"نہیں" وہ بہت صفائی سے بولا اور سیما چونک پڑی۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ سہیل اُسے اتنا صاف جواب دے گا۔

"آخر کیوں؟" اُس نے بے چینی سے پوچھا۔

سہیل نے بہت ٹھیرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اس کی وجہ آپ جانتی ہیں۔"

اس اچانک جملے کے لئے وہ تیار نہ تھی۔ "یہ تم کیسے کہہ رہے ہو کہ میں جانتی ہوں۔ میں کیسے جان سکتی ہوں کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔" اُس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

وہ تڑپ اُٹھا۔ "خدارا! یہ تو نہ کہئے کہ آپ نہیں جانتیں کہ میرے دل میں کیا ہے۔ آپ ہی تو وہ واحد ہستی ہیں جو سب کچھ جانتی ہیں ــــــ سب کچھ ــــــ پھر بھی آپ انجان بنیں تو میں کیا کروں! آخر آپ مجھے اتنا سادہ لوح کیوں سمجھتی ہیں۔ کیا میں ــــــ"

اُس کا جملہ پُورا ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔

"یہ بات نہیں سہیل! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم نہیں جانتے تم میرے لئے کیا ہو۔ اسی لئے چاہتی ہوں اسکالرشپ منظور کر لو اور چلے جاؤ۔"

"جب آپ مرہم نہیں رکھ سکتیں تو زخموں پر نمک بھی کیوں چھڑکتی ہیں۔"

"اِتنے بدگمان نہ بنو سہیل! میرے خلوص کا یوں مذاق نہ اُڑاؤ۔" وہ بڑے درد سے بولی۔

"مذاق!" وہ بھڑک اُٹھا۔ "اور آپ کو پُورا حق ہے میری محبت کا مذاق اُڑانے کا، میرے جذبات سے یوں کھیلنے کا۔" وہ روہانسی آواز میں بولا۔

"یہیں تو تم غلطی پر ہو سہیل! میں تمہارا مذاق نہیں اُڑا رہی۔ میں نے تو اِس لئے کہا تھا کہ تم میرا کہا مان لوگے۔"

"اِتنا بھروسا ہے آپ کو مجھ پر؟"

[illegible]

[illegible]

وہ خاموش رہی پھر سہیل نے خود ہی ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"خیر! اگر میں آپ کی بات مان لوں تو کیا دیں گی آپ مجھے؟"

اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ "تو کیا تم میرا کہا مان لوگے؟"

"ہاں! مگر ایک شرط پر!"

"وہ کیا؟"

"منظور ہو تو بتاؤں!"

"ہاں مجھے منظور ہے۔" سیما نے جلدی سے کہا۔

"وعدہ کیجئے!" سہیل نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اُس نے بھی اپنا کانپتا ہوا ہاتھ سہیل کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ سہیل نے ہلکے سے اُس کا ہاتھ دبا دیا۔ اُس نے کچھ نہ کہا۔

"میں اُمید رکھوں آپ وعدہ خلافی نہیں کریں گی؟" سہیل کے لہجے میں خوف تھا۔

"اِتنا بھی بھروسا نہیں سہیل؟" اُس نے کہا۔ "بتاؤ نا کیا شرط ہے۔ ..."

میں منسوب بھی کر دیا۔

سہیل نے ذرا جھجک کر کہا: "آپ میرا انتظار کریں گی؟"

"انتظار؟" وہ چونک پڑی۔ جھٹکے سے اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

آخر سہیل نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا ——— "ہاں انتظار ——— میں آپ کے اصرار پہ آپ کے کہنے سے چلا تو جاؤں گا لیکن اس شرط پر کہ میری واپسی پر آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری بن جائیں گی؟" بہت مشکل سے اس نے یہ جملے ادا کئے۔ احساس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ سیما کی رنگت پہلے تو سرخ ہوئی۔ پھر اس پر زردی چھا گئی اور پھر ——— پھر اس کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا۔ اس کے ارادے متزلزل ہوتے گئے۔ قریب تھا کہ وہ کوئی سخت جملہ کہہ دیتی کہ سہیل کی مایوسیوں کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبی آواز ابھری۔

"میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ . . ."

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کچھ دیر سوچا پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

"اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ جونہی سہیل مڑا۔ وہ جیسے کسی خواب سے چونک پڑی۔

"سہیل! ٹھیرو! میرا جواب تو سنتے جاؤ۔ مجھے تمہاری ——— یہ شرط ——— منظور ہے۔"

سہیل وہیں ٹھٹک گیا۔ چند لمحے حیران نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"کیا! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

"ہاں سہیل! تم ٹھیک ہی سن رہے ہو۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح شکست خوردہ آواز میں بولی ——— لیکن سہیل کو ہوش کہاں تھا جو وہ اس کے لہجے کی شکست خوردگی کو محسوس کر سکتا۔ اس بے خودی کے عالم میں اچانک ہی وہ سیما سے لپٹ گیا۔ وہ گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"ہیں! سہیل! یہ کیا کرتے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ ہم اس وقت لائبریری میں ہیں۔"

سہیل نے خجل ہو کر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ پھر بھی اس کے چہرے پر خوشی کے ہزاروں سورج جگمگا اٹھے۔ وہ بے خودی میں سلام و کلام کے بغیر ہی تیزی سے پردہ ہٹا کر باہر نکل گیا اور سیما نڈھال سی کرسی پر گر پڑی اور پھر چند ہی گھنٹوں میں سارے میں یہ بات پھیل گئی کہ سہیل ولایت جا رہا ہے!

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب سہیل ولایت جانے کی تیاری کرنے اس شہر سے اپنے گھر جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جدائی کے غم کے باوجود ایک اطمینان تھا۔ سیما سے رخصت ہونے جب وہ اس کے پاس گیا تو اس نے زیادہ کچھ نہ کہا۔ چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جیسے اس کی شبیہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔

"میں جا رہا ہوں خود کو آپ کے قابل بنانے کیونکہ میں نے اپنے مستقبل سے آپ کا مستقبل بھی وابستہ کر لیا ہے۔ خدا کی مدد کے بعد صرف آپ ہی کی دعاؤں کا طالب ہوں۔ اگر یہ شامل حال رہیں تو انشاء اللہ وہاں سے ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر آؤں گا اور آپ کو کبھی لمحے کے لئے بھی یہ محسوس نہ ہو گا کہ آپ نے میرے حق میں فیصلہ کرنے میں کوئی غلطی کی ہے!!" پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ دل بہت نازک ہے کوئی صدمہ برداشت نہ کر سکے گا۔"

اس ایک جملے میں جو التجائیں پوشیدہ تھے، سیما ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ الفاظ اس نے ایسے رقت آمیز لہجے میں کہے کہ سیما کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ پھر وہ جھکا۔ اس نے ہولے سے سیما کے دونوں ہاتھ تھامے۔ انھیں اپنی آنکھوں تک لے گیا۔ پھر آہستہ سے اس کے ہاتھ چھوڑ دئے اور جلد ہی منہ موڑ کے "خدا حافظ" کہتا چلا گیا۔ پھر بھی سیما نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لئے تھے اور جیسے سہیل کے آنسوؤں کا ہر قطرہ اس کی آنکھ میں امڈ آیا۔ وہ تڑپ اٹھی اور سہیل چلا گیا۔

سہیل چلا گیا اور کالج کی ساری رنگینیاں اپنے ساتھ لے گیا۔ سیما نے تو یہی محسوس کیا۔ دن گزرتے رہے۔ شامیں ڈھلتی رہیں۔ راتیں بیتتی گئیں۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے اور ان بدلتے ہوئے ماہ و سال کے ساتھ سیما اور سہیل کی زندگی کی راہیں بھی بدلتی رہیں۔ ان بدلتی راہوں نے اُسے ایک دوراہے پر لا کر کھڑا کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کرے؟ کہاں جائے؟

اور اب ——— کل صبح ہی سے سہیل واپس آ رہا تھا۔ اُسے اپنانے لیکن وہ تو تسلیم کی ہو چکی تھی۔ تسلیم جو نہ صرف اس کا شوہر تھا بلکہ سہیل کا بڑا بھائی بھی۔ گھونگھٹ اُلٹتے ہی یہ حقیقت اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ قدرت کی اس ستم ظریفی پر وہ کراہ اٹھی۔ تسلیم سے اس نے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ وہ اس کی نظروں میں ذلیل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لئے تسلیم سے کچھ کہنے کی کبھی ہمت ہی نہ کر سکی۔ سب کے اصرار کے باوجود اُس نے سہیل کو اپنی تصویر نہ بھیجنے دی۔ سہیل سے تو اس نے پہلے ہی وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اس سے کبھی [illegible] کی خط و کتابت نہ کرے گا اور اس کی صرف اِک "ہاں" پر سہیل نے ہر بات مان لی تھی۔ تو کیا سہیل کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا کر وہ اُسے پاتال کی گہرائیوں میں دھکیل دے گی۔ نہیں۔ نہیں۔

"اگر نہیں! تو پھر؟ پھر وہ کیا کرے؟" وہ خوف سے سہیلی سی ہو گئی۔ دونوں

ہاتھوں سے اُس نے سر تھام لیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ ابھی گر پڑے گی! ابھی گری۔ اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے اور اِس سے پہلے کہ وہ گر جاتی دو مضبوط بازوؤں نے اُسے سنبھال لیا۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ——— "سلیم!"

"سیما! کیا ہوا۔ یہ تمھیں یکایک کیا ہو گیا؟ کمرے کی بتی بھی روشن نہ کی اور اِس غضب کی سردی میں کھلی کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔ کیا بیمار ہونے کا اِرادہ ہے؟"

پھر اُسے سہارا دے کر سلیم مسہری تک لے آیا۔ وہ بے دم ہو کر مسہری پر گر پڑی۔

سلیم نے اُس کے بال سہلاتے ہوئے کہا: "اِسی لئے کہا تھا اِتنا کام نہ کرو۔ دیکھو کیا حالت بنالی ہے۔ سہیل تمھیں اِس حالت میں دیکھ کر کیا کہے گا۔ یہی نا کہ بھائی کو کسی اور سے محبت تھی۔ بھیا نے زبردستی اُن سے شادی رچالی۔ اِسی لئے یہ حالت بنا رکھی ہے ——— اگر یہ نہیں تو میرے انتخاب پر وہ مجھ سے لڑے گا ضرور کہ بھیا نے کیسی لڑکی سے شادی کر لی۔ وہ بہت نفاست پسند ہے۔ اُس کا معیارِ حُسن بہت بلند ہے۔ کم بخت کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔ اگر تمھیں بھی اُس نے پسند نہ کیا تو جانتی ہو کیا ہوگا؟" اُس نے مُنہ بسور کر کہا۔

"مجھے مجبوراً دوسری شادی کرنی پڑے گی!" اُس نے سیما کو ہنسانا چاہا لیکن وہ رو پڑی۔ اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

وہ کراہ اُٹھی ——— "خدا کے لئے ایسا نہ کہیے۔ کہیں آپ سچ مچ ہی مجھ سے نہ رُوٹھ جائیں ———"

سلیم بے اختیار ہنس پڑا: "پگلی کہیں کی! اپنی جان سے رُوٹھنے کا نتیجہ جانتی ہو کیا ہوتا ہے۔ موت! اور ابھی میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں تو تمھیں ہنسانے کے لئے مذاق کر رہا تھا اور تم رو پڑیں۔" اُس نے بہت پیار سے کہا۔

"اچھا میری حسین گڑیا! اب تم سو جاؤ۔ کل تمھیں بہت حسین نظر آنا ہے۔"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن وہ رات بھر نہ سو سکی۔ سلیم و سہیل کے جملے اُس کے ذہن پر ہتھوڑے برساتے رہے۔۔۔ "اور ابھی میں مرنا نہیں چاہتا" ——— "یہ دل بہت نازک ہے کوئی صدمہ برداشت نہ کر سکے گا۔"

"اُف! سہیل! تم نے مجھے کیسی آزمائش میں ڈال دیا۔ میری تمھاری محبت میں کتنا تضاد ہے۔ میں نے تمھیں چاہا۔ دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ محض اِس لئے ——— اِس لئے کہ تم میرے مرحوم بھائی سہیل کے ہم شکل تھے۔ تمھارے رُوپ میں میں نے اپنے سہیل کو پالیا تھا۔ پہلی بار تمھیں دیکھتے ہی میرے لبوں سے "سہیل" نکلا تھا۔ تم سمجھے میں نے تمھیں پکارا تھا۔ میں نے تمھیں بہن کا پیار دینا چاہا۔ جسے تم نے ٹھکرا دیا۔ کاش تم اُسے قبول کر لیتے۔ آخر تمھاری ضد کے آگے مجھے جھوٹے وعدے کرنے پڑے۔ میں بہن بھائی کی محبت کے مقدس جذبات پر کیچڑ نہیں اُچھال سکتی تھی۔ اِسی لئے میں نے خود کو سلیم کے سپرد کر دیا۔

کیونکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ تم ایک کامیاب ڈاکٹر بن چکے تھے مگر اب ——— آہ! سہیل! کاش تم وہیں رہ جاتے! کسی سے شادی کر لیتے! کاش تم مجھے بھول جاتے!"

صبح جب وہ جاگی تو سلیم اپنے والد کے ساتھ ہوائی اڈّے کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ وہ دھڑکتے دل سے اُٹھی اور سہمی سہمی گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ سہیل کے آنے کی خوشی میں کوٹھی دُلہن کی طرح سجائی گئی تھی۔ شام کو ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دعوت نامے تقسیم کئے جا چکے تھے۔ لیکن جانے کیوں اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کوشش کے باوجود وہ اِس خیال کو اپنے دل سے نکال نہ سکی۔ آج وقت جیسے ہوا کے دوش پر اُڑا جا رہا تھا اور وہ چاہتی تھی وقت کی رفتار کچھ تھم جائے تاکہ وہ خود کو سہیل کا سامنا کرنے کے لئے تیار کر سکے۔

سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے سہیل کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ سیما فون کی طرف لپکی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُس نے لرزتے ہاتھوں سے ریسیور اُٹھا لیا اور کانپتی آواز میں پوچھا: "ہلو!"

دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا۔ اُس نے "ہاں" کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا اور پھر چند لمحے تک کوئی بولتا رہا۔ سیما سُنتی رہی۔ اچانک اُس کی رنگت سفید پڑ گئی۔ آنکھیں باہر کو اُبل پڑیں۔ اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ ریسیور اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ لڑکھڑا گئی اور اِس سے پہلے کہ کوئی اُسے سنبھالتا وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

سہیل جس پلین سے آ رہا تھا۔ ہوائی اڈّے تک پہنچنے سے چند لمحات پہلے کچھ ہی میل کے فاصلے پر اُس میں یکایک آگ لگ گئی تھی!!

# غزلیں

## شفیق کوٹی

نیا تجربہ تو کرتے نیا راستہ بدل کے
ذرا آپ دیکھتے تو کبھی میرے ساتھ چل کے

مجھے بھول جانے والے تجھے اِس کا علم بھی ہے
ترا غم جواں ہوا ہے مرے آنسوؤں میں پل کے

میں یہ بات کس سے پوچھوں کہ اب اُن کا کیا بنے گا
جو چراغ بجھ گئے ہیں تری انجمن میں جل کے

نہ بہار میں لطافت، نہ گلوں کی انجمن میں
ہوں عجیب کشمکش میں تری بزم سے نکل کے

جنھیں عمر بھر سراہا، جنھیں دوست میں نے سمجھا
وہی ناگ ڈس رہے ہیں مری آستیں میں پل کے

اب اُنھیں کہاں میں ڈھونڈوں اب اُنھیں کہاں میں پاؤں
جو بچھڑ گئے ہیں مجھ سے مرے دم کے ساتھ چل کے

مجھے ایک دن ملے گا مری روشنی کا مرکز
کبھی چھٹ ہی جائیں گے یہ مرے بخت کے دھندلکے

مری رُوح کی غذا ہیں یہ شفیق شعر میرے
نہ ہیں میرؔ کی غزل کے، نہ ہیں داغؔ کی غزل کے

## سعادت نظیر ایم اے

دلِ ناشاد کو جب شاد نہیں کر سکتے
گھر اُمیدوں کا تم آباد نہیں کر سکتے

جو سمجھتے ہیں، محبت کے تقاضے کیا ہیں!
ضبط کر سکتے ہیں، فریاد نہیں کر سکتے

ہم سا مجبور بھی دنیا میں نہ ہوگا کوئی
اپنی ہستی کو بھی برباد نہیں کر سکتے

دوستی کا جو بھرا کرتے ہیں دم آٹھ پہر
وقت پر وہ بھی تو امداد نہیں کر سکتے

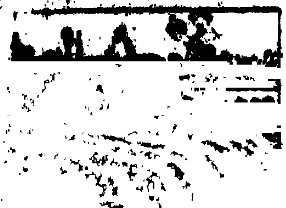
ستمِ گُل کا ہے ہر مُرغِ چمن فریادی
ہم زباں رکھ کے بھی فریاد نہیں کر سکتے

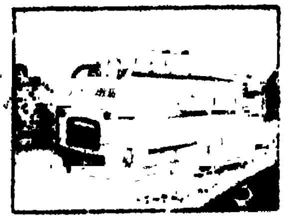
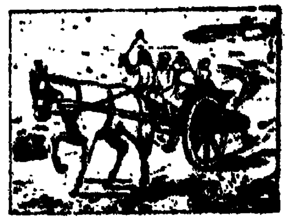
عہدِ حاضر کی بدلتی ہوئی قدروں کی قسم!
تم مکمل مری رُوداد نہیں کر سکتے

ایک وہ، جن کے لئے عیش کے ہنگامے ہیں
ایک ہم وا لبِ فریاد نہیں کر سکتے

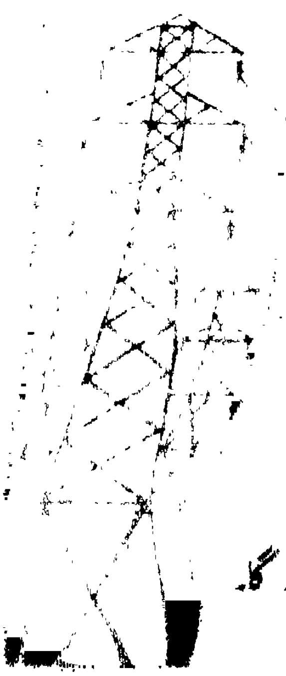
ایک زنجیر ہے احساس کی، ہر لمحہ، نظیر
کبھی آپ اپنے کو آزاد نہیں کر سکتے

# خوشحالی بذریعہ پلاننگ



قومی اقتصادیات میں بتدریج ترقی
پہلے تین پلانوں کے سنگھٹن کی مظہر ہے




## چوتھے پلان میں

## پنجاب بہت کچھ کرنے کا مشتاق ہے

ڈویلپمنٹ اور سوشل سروس سکیموں
میں مبلغ 280 کروڑ روپیہ صرف کیا جائے گا۔

پنجاب پبلک ریلیشنز



افسانہ

# گھر کی دیوار

ـــــــــــ مس انیس قیوم بی۔ ایس سی

۲۲/۷ سی کلاس، سٹے پلی، حیدرآباد۔ اے پی

۲۰ جولائی ۷۶ء  مکرمی و محترمی خوشتر چچا جان! آداب و اخلاص،

افسانوں کے انتخاب کے وقت فن اور معیار یہ دو ہی چیزیں آپ کے پیشِ نظر رہتی ہیں۔ اس کا مجھے بخوبی پتہ ہے۔ لیجیے پہلی بار "گھر کی دیوار" کے ساتھ "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو رہی ہوں اور مجھے پورا بھروسا ہے کہ میری یہ کاوش آپ کو اور "بیسویں صدی" کے اُن پرستاروں کو ضرور پسند آئے گی جنھوں نے اس مقبول جریدے میں لکھنے کی مجھ سے فرمائش کی تھی ـــــ افسانے کے بارے میں صرف اتنا کہوں گی کہ . . . "ہر طرح کی دیوار گرائی جا سکتی ہے۔ لیکن . . . لیکن گھر کی دیوار . . . اسے بھلا کون گرا سکتا ہے؟"

آپ کی تشنۂ کرم بھتیجی ـــــ انیس قیوم

---

آج وہ بےحد اُداس تھا۔ اتنا اُداس کہ زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ پہلا حادثہ تھا جس نے پرکاش کے ذہن کو ماؤف کر دیا تھا جس نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں اور وہ فطری طور پر اپنے آپ کو مضمحل سا محسوس کر رہا تھا۔

اپنا روم بند کر کے وہ باہر برآمدے میں آیا۔ دُور کہیں اُفق پر لندن کی زرد [illegible] ہوتی جا رہی تھی۔ فضائیں اسی طرح خنکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ماحول [illegible] سا تھا۔ اس نے ان فضاؤں میں، ان ہواؤں میں، سارے سبزہ زاروں میں [illegible] اپنا ہمدرد، اپنا غم گسار تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اُسے کچھ [illegible] شفاف سنگِ مرمر جیسی سڑک پر نظر ڈالی۔ نوجوان [illegible] لہرا رہی تھیں۔ انگریز [illegible] کی خوبصورت [illegible] اب بھی [illegible] تھے خوبصورت [illegible] تھیں۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ پردیس میں کتنا تنہا [illegible] نہ اس کا شفیق باپ ہے نہ ماں!

[illegible] وہ ذہنی طور پر چونک پڑا۔

[illegible] پھر اس کی موت کے بارے میں سوچنے لگا۔ ماں کا ہنستا مسکراتا نوجوان چہرہ اس کے ذہن کے اُفق پر نمودار ہو گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ماں اس کے بالکل قریب کھڑی ہو اور اُسے اپنے سینے میں بھینچ لینے کو بیتاب ہو۔ آگے بڑھ کر ـــــ اس نے سامنے کی سبز آہنی پینٹڈ جالی کو مضبوطی سے تھام لیا اور اس کے ہونٹ بےقرار ہو کر فریاد کر اُٹھے . . .

"ماں! تم نے میری واپسی تک انتظار بھی نہ کیا" اور پھر وہ اپنا چہرہ چھپائے رونے لگا۔ جب روتے روتے تھک چکا تو اس نے آنکھوں کے حلقوں میں سوزش سی محسوس کی۔ رومال سے چہرہ صاف کر کے اس نے ایک بار پھر اپنے روم کا جائزہ لیا کہ اُسے لاک بھی کیا کہ نہیں! پھر ہولے ہولے زینے اُترنے لگا۔ سامنے والے شیر ہوٹل تک پہنچنے میں اور کار تلاش کرنے میں اسے کوئی دشواری نہ ہوئی۔ وہ جیسے ہی [illegible] ہوٹل کی فضاؤں میں انگریزی موسیقی کی دھن گھل رہی تھی۔ ماحول سے بےپروا ہو کر اس نے پتلون کی پچھلی جیب سے پتا جی کا وہی تار نکالا جو آج ہی اسے ملا تھا۔ چھوٹا سا دو انگل کا پرزہ اس کے ہاتھوں میں تھا جس پر انڈین ٹریڈ مارک بنا ہوا تھا۔ چوتھی بار پھر اس نے اپنے پتا جی کی موٹے موٹے لفظوں والی تحریر کو پڑھا

بیٹا پرکاش!

آج سویرے تمہاری ماتا جی سورگباش ہو گئیں۔ تم پردیس میں رنج نہ کرنا۔

۲۷ اکتوبر  تمہارا دکھیارا پتا ـــــ دیال چند

پھر وہ دائیں ہاتھ سے اپنے گال کے سہارے ایک بار پھر آسمان کی وسعتوں کو گھورنے لگا۔ لیکن یہاں آسمان نہ تھا۔ چھتیں تھیں۔ رنگ برنگی جن پر انسانوں کی عریاں تصویریں رقص کر رہی تھیں۔

پرکاش چند نے ایک سرد آہ بھری اور نظریں جھکا لیں۔ تار پھر جیب میں رکھ لیا اور بولستے کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

"اتنی دیر کرتے ہو بولستے!" سامنے آتے ہوئے بولستے سے وہ بگڑ بیٹھا۔

"کیا چیز چاہئے" ــــــ بولستے نے اُس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

"صرف ایک کپ کافی! کولڈ!"

بیٹھے بیٹھے اس نے پھر کڑیاں ملائیں۔ گاؤں کے اُس ماحول کو یاد کرنے لگا۔ جس میں وہ خود پیدا ہوا تھا۔ لہلہاتے کھیتوں اور دھن سٹریوں میں کام کرتا، اُس کا پتا معمولی لکھا پڑھا جانتا تھا۔ لیکن سارے گاؤں میں اُس کا پتا ہی ایسا شخص تھا جس نے اپنے بیٹے کو فارن بھیجا تھا اور آج وہ لندن میں پورے تین سال سے مقیم تھا۔ صرف ایک ماہ اور ہو جاتا تو وہ اپنے گاؤں میں ہوتا۔ اپنی ماں سے ملتا۔ اپنے پتا جی سے ملتا۔ اپنے بھائی بہنوں کو گلے سے لگاتا۔

لیکن آج کے تار نے تو اُس کی رہی سہی زندگی کی سکت بھی چھین لی تھی۔

'ماں اگر بچھڑ جائے تو وہ کیسے جی سکے گا؟' اُس نے عجیب انداز سے سوچا۔

پھر اچانک اُس کے ذہن نے کروٹ لی۔ اُس نے اپنے آپ کو ڈھارس بھی دے ڈالی۔

'دُنیا میں انسان پیدا ہوتا ہے تو مرنا بھی ضرور ہے۔ ایک نہ ایک دن اُسے بھی اُس طرف لوٹ کر جانا ہے۔ جس طرف سے وہ آیا تھا ــــــ اور پھر ماں باپ تو سبھی کے مرتے ہیں۔ کسی کے آگے تو کسی کے پیچھے!'

کافی آچکی تھی۔ اُس نے پی ــــــ اور پھر پیمنٹ کے بعد اُٹھ گیا۔

اُس ڈھارس نے جب اُس کا غم کچھ ہلکا کیا تو لندن میں اُس کی رہائش کا آخری مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ اُس کا رزلٹ بھی آؤٹ ہو چکا تھا۔ وہ پاس بھی ہو گیا۔ لیکن اُسے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ آخر یہ خوشی کی خبر کسے سناتا؟

لیکن یہ سوچ کر اُسے ضرور سکون سا محسوس ہوتا کہ دو چار دنوں میں وہ اپنے گاؤں پہنچ جائے گا۔ اُن حسین وادیوں، سبزہ زاروں، کھیت کی دھن سٹریوں کو چوم چوم لے گا۔ جنھوں نے آج اُسے یہ اعزاز پانے کی دعا دی تھی ــــــ اور اُس کان ندی کے کنارے ضرور جائے گا۔ جس کے موڑ پر گھنا سا پیپل کا درخت ہے جس کے پتے عجیب آواز سے سرسراتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ اُس سے ملے گا جو آج سے تین سال پہلے اس وعدے پر جُدا ہوئی تھی کہ پرکاش! بھگوان کرے تم جلد سے جلد کامیاب لوٹو! میں اسی پیپل کے نیچے اسی ندی کے کنارے تمھاری پرتیکشا کروں گی!

شانتی ــــــ اُس کے دل نے ہولے سے نام دُہرایا۔

اپنے روم میں بیٹھے بیٹھے وہ انہیں خیالوں میں گم تھا۔ غم اور خوشی کا ملا جلا جذبہ اُس کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ پوسٹ مین نے آواز دی۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ خط لینے کو لپکا۔ اپنے حواس بحال کرکے دل کی دھڑکن کو قابو میں رکھا۔

اُس کے پتا جی کا خط تھا! وہی موٹے موٹے حروف والی تحریر تھی جس سے انوکھی سی خوشبو اُٹھ رہی تھی ــــــ پھر وہ پڑھ رہا تھا۔

بیٹا پرکاش! جگ جگ جیو

کل ہی تمھارا پتر ملا تھا کہ تم آٹھ دس دن میں آ رہے ہو۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ میرا ایک بیٹا ولایت سے پڑھ کر آ رہا ہے۔ ایک خوشخبری سنا دوں۔ میں، روی، شیکھر اور بے بی کی خاطر دوسری بہو لا چکا ہوں۔ آخر اُن کی پڑھائی لکھائی اور دیکھ بھال بھی تو ہے نا! تمھاری نئی ماں بہت اچھی ہے!

تمھارا پتا ــــــ دیال چند

یکم دسمبر

خط پڑھ کر اُسے ایک گونہ سکون ہوا۔ ایک عجیب سا اطمینان ہوا اور تھوڑی تھوڑی خوشی بھی کہ اُس کی نئی ماں اچھی بھی ہے۔ اُسے اپنے پتا جی کی عظمت کا احساس ہوا کہ انہیں بچوں کا کتنا خیال ہے۔ بچوں ہی کی خاطر اُنھوں نے دوسری شادی بھی کر لی۔ ماتا جی کے ساتھ کم سے کم تیس برس کا جیون بتا کر اُن کے یوں بچھڑ جانے سے وہ کتنے دُکھی ہوئے ہوں گے۔ کتنا بوجھ اُن کے محنت کش کندھوں پر ٹوٹ پڑا ہوگا۔

خیر پتا جی نے جو کچھ کیا اچھا ہی کیا۔ لوگ تو کئی کئی شادیاں رچا لیتے ہیں۔ لیکن اُس کا پتا تو اب بھی جوان تھا۔ سارا کام خود کرتا تھا۔ ابھی اُس کی عمر صرف پینتالیس سال تھی۔ شادی کے وقت پتا جی کی عمر سولہ سال اور ماں کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔

اور پھر چار دن بعد وہ طیارے سے اُتر کر ٹرین کیاچ کرکے اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ راستے ہی میں کان ندی پڑتی تھی۔ وہ پیدل تھا۔ ہاتھ میں صرف ایک سوٹ کیس تھا اور جسم پر فالسئی رنگ کا سوٹ!

اُس نے دیکھا ندی کے کنارے کھڑا پیپل کا پیڑ اُداسیاں بکھیر رہا تھا۔ اُس کے پتے یکلخت خاموش تھے۔ جیسے سہم گئے ہوں۔ اُس نے شانتی کو اُس کے سائے میں تلاش کیا۔ لیکن صرف تنہائی تھی تنہائی!

پھر اُس نے دیکھا دُور سے ایک لڑکی اپنی نازک سی کمر پر گاگر رکھے چلی آ رہی تھی۔

اس کا گھر آلسٹ نہ پایا تھا۔

لیکن جب کسی شہر کے باہر کی جھلک نظر آئی تو تھوڑے سے گھر گھٹ آشکار کیا۔

پرکاش کے دل پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اُس کے ہونٹ پکار اُٹھے۔

"شانتی !!"

"پرکاش !!!" وہ بھی محبوب سی پرکاش کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ گاگر نیچے رکھ دیا۔ اُس کے سر سے آنچل ڈھلک سا گیا تھا۔ پرکاش نے دیکھا اُس کے گورے گلے میں منگل سوتر مُسکرا رہا تھا۔ جیسے اُس کا مذاق اُڑا رہا ہو!

"تم نے شادی بھی کر لی !" پرکاش جیسے باؤلا ہو گیا۔

"میں مجبور تھی پرکاش بابو !"

"یہاں کی ہر عورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ ایک سے وعدہ کرتی ہے ایک سے شادی کرتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا تمھیں منگل سوتر پہننے کی اتنی تمنا تھی !"

"پرکاش ———!" شانتی جیسے چیخ پڑی!

"میں اُسے جان سے مار دوں گا شانتی جس نے تمھیں مجھ سے چھینا ہے۔ اپنی راہ میں آ کھڑی ہونے والی اُس منحوس دیوار کو گرا دوں گا جو میرے اور تمھارے درمیان اُٹھائی گئی ہے !"

"تم ایسا نہ کر سکو گے پرکاش ! نہ کر سکو گے !!" اُس نے گاگر اُٹھایا اور رہنا پانی بھرے جس راستے سے آئی تھی اُسی راستے پر چل دی۔

وہ کچھ دیر قسمت کے اِس کھیل میں اُلجھا رہا پھر اُٹھا ندی کے پانی سے مُنہ ہاتھ دھوئے، سوٹ کیس سنبھالا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

اُس کے پتا جی نے اُس کے آنے کی خبر پاتے ہی ایک خوبصورت سا کمرہ بھی بنوا دیا تھا جس پر پھونس اور گھاس ڈال کر چھت اور لکڑی کو نئی وضع قطع سے تراش کر دروازے، کھڑکیاں بنائی گئی تھیں۔

"پتا جی !" اُس نے سامنے کھڑے اپنے پینتالیس سالہ باپ کے چرن پکڑ لئے جو آج بھی اتنا ہی جوان معلوم ہو رہا تھا جتنا آج سے تین سال پہلے اُسے رخصت کرتے وقت تھا۔

"بھیا !!!" روی، شیکھر اور بے بی تینوں جیسے پرکاش پر جھپٹ پڑے۔ اُسے نئے کمرے میں لا کر کھڑا کیا ——— ہر چیز قرینے سے لگی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں انگلش ٹائپ کا رائٹنگ ٹیبل رکھا تھا جس پر سُرخ رنگ کا ٹیبل لیمپ خاموش تھا۔ بغل میں شیلف دھرا تھا لیکن سرے سے خالی تھا۔ کوٹ پتلون لٹکانے کے لئے ہینگرز ایک چھوٹی سی لکڑی پر لٹکے ہوئے تھے اور قریب ہی دو کرسیاں تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بڑا سا آئینہ تھا، جس پر صابن، تیل کنگھی، پاؤڈر، کریم سجا کے رکھا گیا تھا۔

کمرے کے بڑے حصے میں چھوٹا سا تخت تھا جس پر قیمتی چادر بچھی ہوئی تھی۔

پاسپورٹ تھا اور اُس کے گھر کے دروازے پر انگریزی تالا پڑا تھا۔

"ماں کہاں ہے بابو جی ؟" اُس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"بیٹے تمھاری نئی ماں نند کے یہاں گئی ہے" اُس کے باپ نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد اُس کی نئی ماں اُس کے سامنے تھی۔ گھونگھٹ میں لپٹی ہوئی بیس بائیس سال کی جوان لڑکی !

"شانتی !!!" اُس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

"ماں !!!" اُس کے ہونٹ نہ چاہتے ہوئے بول گئے۔

اور اُس کی نئی ماں اُسے آشیرواد دیتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

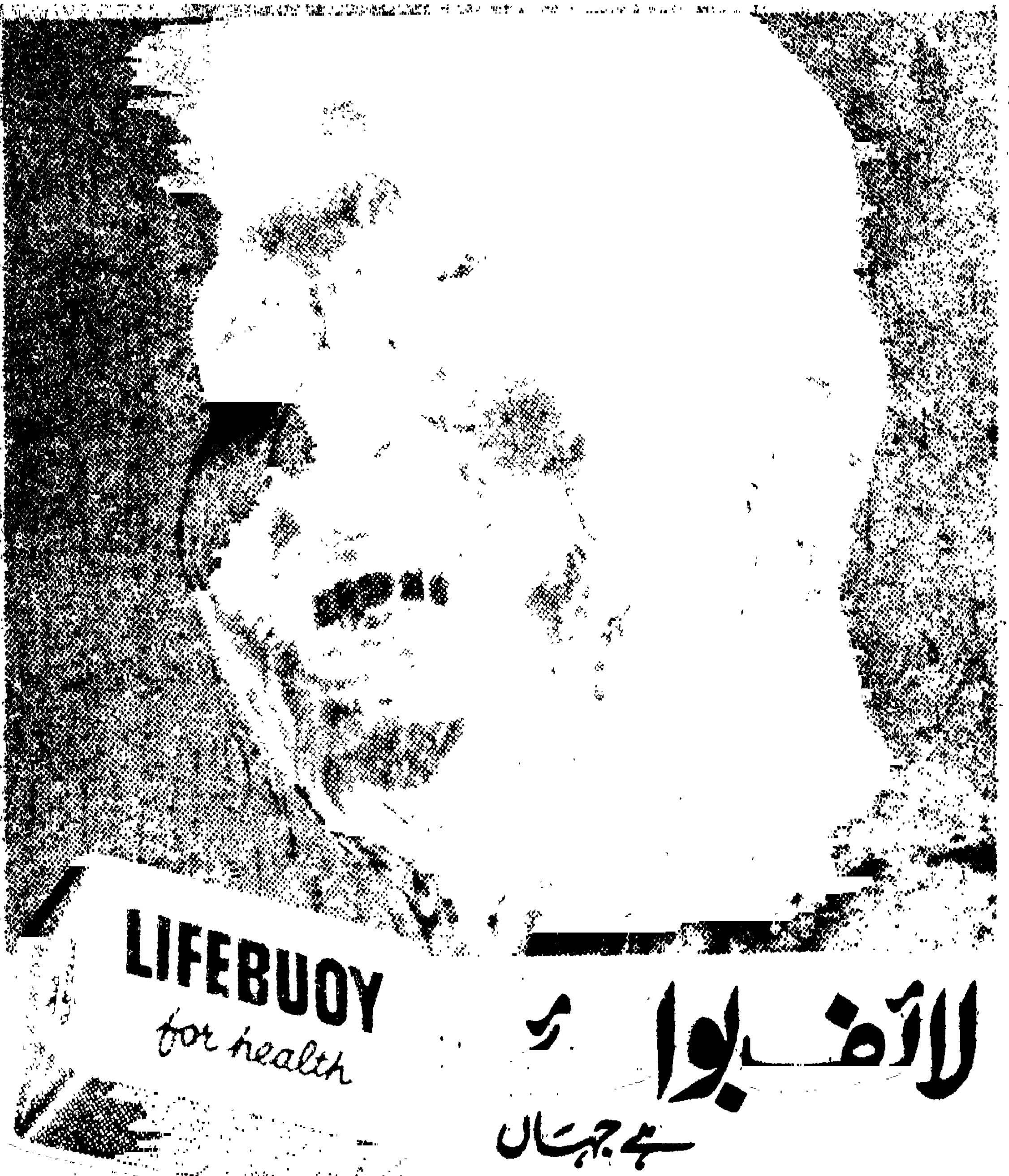
"جگ جگ جیو پرکاش ! میں بھاگیہ وان ہوں مجھے دیال جیسا پتی اور پرکاش جیسا بیٹا ملا !" ——— اور وہ آنسوؤں کو روکتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

راستے کی دیوار اور گھر کی دیوار میں کتنا فرق ہوتا ہے ؟

راستے کی دیوار تو ہر کوئی گرا سکتا ہے لیکن گھر کی دیوار ——— گھر کی دیوار بھلا کون گرا سکتا ہے !! ——— اُف ———!!!

---

مدیر "بیسویں صدی" کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔


LIFEBUOY
for health

# غزلیں

## سعادت بجاہ

ہو چکیں اُن کی جفائیں سب کی سب
رہ گئیں اپنی وفائیں سب کی سب

عشوے کی برچھی کہ غمزے کی چھُری
شوق سے وہ آزمائیں سب کی سب

چاک کر دیتی ہیں کلیاں باغ میں
دیکھ کر اُن کو قبائیں سب کی سب

یادِ بے ہنگام اور آہِ سحر
اُن کو یاں تک کھینچ لائیں سب کی سب

باغ میں اُن کا تبسم دیکھ کر
کیوں نہ کلیاں مُسکرائیں سب کی سب

چارہ گر ہے دردِ میرا دردِ دل
بے اثر ہوں گی دوائیں سب کی سب

ایک مجھ پر چرخِ کج رفتار سے
ہوتی ہیں نازل بلائیں سب کی سب

خامشی اُن کی یہ دیتی ہے جواب
رائیگاں ہیں التجائیں سب کی سب

بندہ ہے عاجز سعادتؔ یا غفور
پیش ہیں اُس کی خطائیں سب کی سب

## شباب للت ایم اے

ظلم کی آندھیاں شوق سے لاؤ تم وہ کوئی اور ہوں گے جو ڈر جائیں گے
چند تنکے ہی میرے نشیمن کے ہیں کیا ہوا جو یہ تنکے بکھر جائیں گے

جن پہ سایا تمہاری نگاہوں کا ہے وہ کرشمے جلوں سے گزر جائیں گے
منزلیں بڑھ کے چومیں گی اُن کے قدم جو تمہاری نظر چوم کر جائیں گے

حُسنِ معصوم سے جب ملی تھی نظر کس کو معلوم تھا اس سے بے خبر
اِک ندامت جسارت کی پاداش میں سامنے ہم پہ کیا کیا گزر جائیں گے

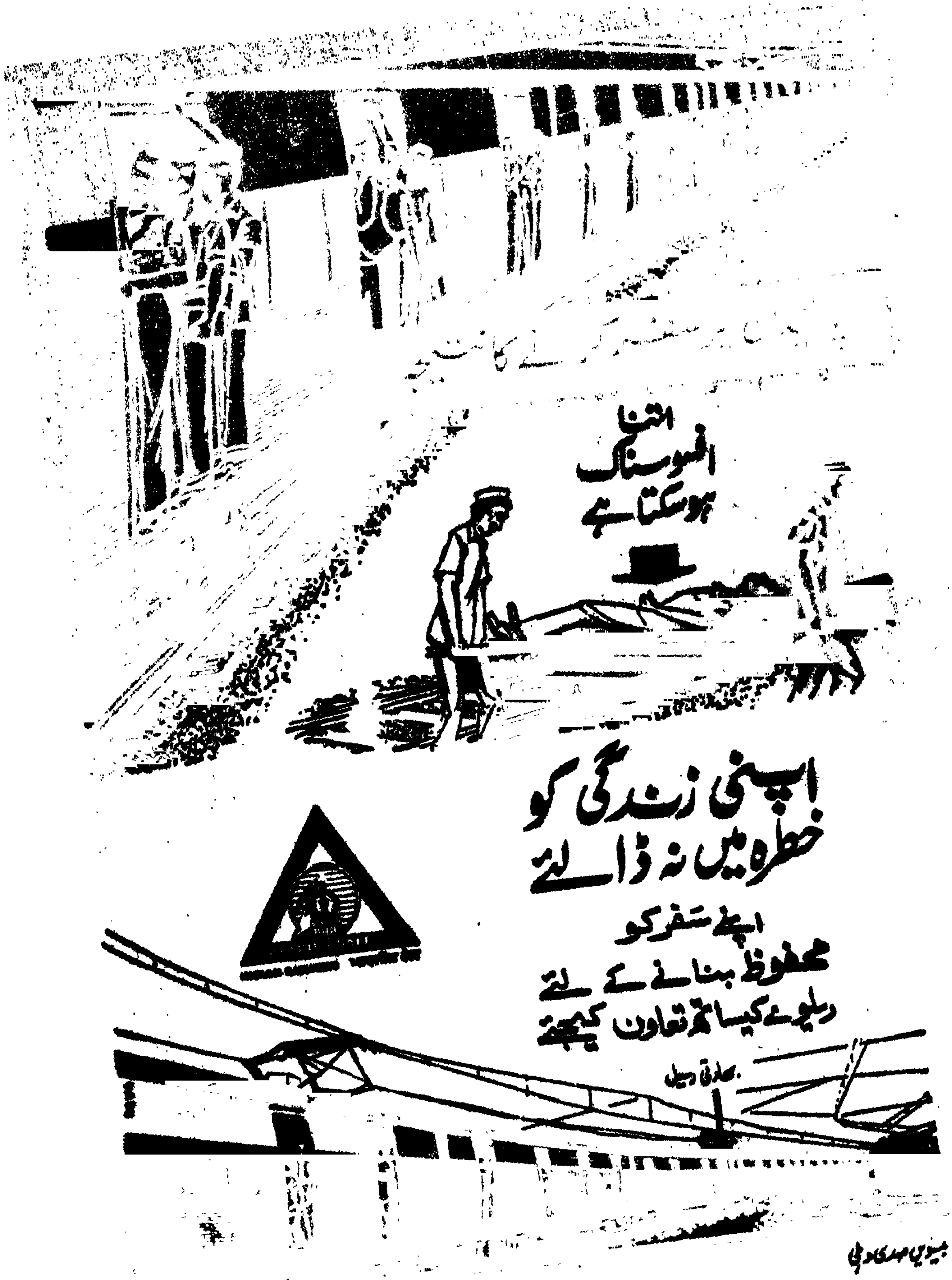
چھیڑ کر یوں نہ دل پر ستم توڑیے اب مرے حال ہی پر مجھے چھوڑیے
دیکھیے آپ کے دامنِ ناز پر میرے اشکوں کے موتی بکھر جائیں گے

میں نے تو اِک فقط چھیڑنے کے لئے بات چھیڑی تھی ترکِ ملاقات کی
مجھ کو اے جانِ اخلاص کیا تھی خبر تیری آنکھوں کے پیالے بھر جائیں گے

چارہ سازی کے پردے میں اے دوستو! تم نے حالات کو اور اُلجھا دیا
اب مجھے چھوڑ دو میرے حالات پر میرے حالات خود ہی سنور جائیں گے

تم نے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھایا تو ہے رنگِ نور اِک فضاؤں پہ چھایا تو ہے
اپنے عارض چھُپا لو وگرنہ ابھی ماہ و انجم کے چہرے اُتر جائیں گے

آئیے سامنے ہی وہ مے خانہ ہے آج موسم بھی رنگین و مستانہ ہے
چل کے بیٹھیں گھڑی بھر شبابؔ اُس جگہ چند لمحے خوشی سے گزر جائیں گے


اتنا
افسوسناک
ہو سکتا ہے
اپنی زندگی کو
خطرہ میں نہ ڈالئے
اپنے سفر کو
محفوظ بنانے کے لئے
ریلوے کیساتھ تعاون کیجئے

# پیراہنِ یوسف

ظفر اوگانوی۔ ایم۔ اے

نشیمن، [illegible] روڈ، پٹنہ نمبر ۴

۲۴ جولائی ۶۷ء گرامی قدر!

عرصے سے کچھ نہیں لکھ سکا۔ افسوس بھی ہے اور خوشی بھی۔ خوشی اس لئے کہ ان دنوں لکھے لکھانے کا کوئی حاصل نہیں! بہرکیف ایک افسانہ "پیراہنِ یوسف" ارسال ہے۔ میں طویل افسانے پسند نہیں کرتا لیکن کبھی کبھی مجبوری کے تحت طوالت سے مفر بھی ممکن نہیں۔ افسانہ پڑھنے کے بعد احساس ہوگا کہ وقت ضائع نہیں ہوا۔

آپکا ——— ظفر اوگانوی

---

میں تھا۔ وہ مجھ سے بالکل اسی طرح قریب تھا جیسے مجھ سے میرا میں۔

میں نے اُسے پچھلے دس سال کے عرصے میں دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ اُس کے ہر دکھ اور تکلیف میں جہاں تک ہو سکا، میں نے ساتھ دیا تھا۔ آج غیر معمولی حالات کی دھند کچھ اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ایک شخص دوسرے کو دیکھتا نہیں اور اگر دیکھ بھی لے تو پہچان نہیں سکتا۔ لیکن میں جب تنہا ہوتا ہوں تو ماضی کی وادیوں میں جانے کے لئے خود کو مجبور پاتا ہوں۔

وہ جب پٹنہ آیا اور اُس نے ٹیوشن کرکے ایک عزم کے ساتھ تعلیم جاری رکھی تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک مردِ آہن ہے۔ اُس کی زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے اور وہ اُسے کسی بھی قیمت پر ضرور حاصل کرے گا۔ جب گلابی سردیوں میں وہ کالا، پھٹا ہوا چسٹر پہن کر کالج جاتا اور سوٹ پہن کر آنے والے دولت مند طلبا و اُس سے ہٹ کر بیٹھا کرتے اور کترا کر چلا کرتے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا وہ اپنے وقت کا برنارڈ شا ہے۔ ذہین اور معصوم! جس نے صرف یہ سوچا کہ اُس کے فرائض کیا ہیں جس کا اس بات پر یقین تھا کہ زندگی میں محنت اور فکری انفرادیت ہی دو بڑی طاقتیں ہیں۔ اس لئے وہ اپنی غربت کے باوجود کبھی کمتری کے احساس کا شکار نہ ہوا۔ اُس نے اپنے سارے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور جب وہ مالابار ٹریڈنگ کمپنی میں سات سو روپے کی بڑی تنخواہ کے ساتھ بمبئی چلا گیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اب اُس کی ساری تکلیفیں ختم ہو جائیں گی۔ اُس کا چھ سالہ پرانا چسٹر جو کبھی ڈرائی کلین کے لئے نہیں دیا گیا تھا، اُتر جائے گا اور اب اُس کے جسم پر ٹیریلین کا خوبصورت اور قیمتی سوٹ ہوگا، ایک کار ہوگی، ایک فلیٹ ہوگا اور جب دو تین سال کے [illegible] کہیں اچانک ملاقات ہو جائے گی تو وہ مجھے گلے سے لگا لے گا اور بہت [illegible] میں حیرت کے ساتھ پوچھے گا۔

"ڈارلنگ! تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں وہی قادر ہوں نا۔ پرانے کوٹ والا؟"

اُس کی معصوم محبت مجھے اپنی طرف کھینچ لے گی۔

"بھلا تجھے کون نہ پہچانے گا۔ جو خود کو یاد رکھتے ہیں انھیں کس طرح بھلایا جا سکتا ہے؟"

اُس کے بعد میری نگاہیں اُس کے پیچھے کھڑی ہوئی خوبصورت سی لڑکی کی طرف اٹھ جائیں گی۔ اُس کا کوئی بہت ہی خوبصورت سا نام ہوگا۔ نغمی، شاذی، نسرین یا اور کسی موڈرن نام سے وہ اُسے مخاطب کرے گا۔

"بھئی فوزی! یہ تم اس طرح چوروں کی طرح کیوں چھپی کھڑی ہو۔ دیکھو ادھر آؤ۔ یہی اپنا دوست راشد ہے! اور راشد! تم اپنی بھابی فوزیہ سے ملو۔"

پھر ہم تینوں ماضی کو یاد کرتے ہوئے کالج کے ساتھیوں کی خیریت پوچھتے ہوئے، گزرے ہوئے حسین لمحوں کو آواز دیتے ہوئے کوالٹی ریستوران میں جائیں گے اور وہاں میں فوزیہ بھابی سے پوچھوں گا۔

"آپ کیا لیں گی؟"

جانے شرمائیں گی اور قادر کی طرف دیکھ کر نظریں جھکالیں گی۔

"آپ کیا لیں گے؟"

اس پر مجھ ایک جملے سے مذاق کا موقع مل جائے گا۔

"ایک ہی چیز تو تھی لینے کی لیکن اب تو وہ قادر کے حصے میں چلی گئی۔"

قادر اس مذاق پر کھلکھلا پڑے گا۔

"بھئی واہ! کیا بات پیدا کی ہے!"

آخر کار ہم دونوں لڑکیوں کے اوپر فیصلہ چھوڑ دیں گے۔ مجبور ہو کر انھیں کچھ نہ کچھ تو منگانا ہی پڑے گا۔ مشکل یہ ہوگی کہ بھابی بھی دوسری لڑکیوں کی طرح آئس کریم کا آرڈر دیں گی اور میں برف کس طرح کھا سکوں گا۔ میرا گلا اس وقت بھی شاید اس قابل نہ ہو سکے لیکن قادر اور بھابی کا ساتھ تو دینا ہی ہوگا نا۔ یا تو برف ہی

---

- جو خلق کے ساتھ خلیق ہو وہ خالق سے نزدیک تر ہے۔

(حضرت سید نا عبد القادر جیلانیؒ)

- مستحق سائل کو تمہارا کا ہدیہ سمجھو جو بندے کی طرف بھیجا گیا ہے۔

(حضرت سید نا عبد القادر جیلانیؒ)

- غریب کو کچھ دو تو احسان نہ جتاؤ، بلکہ احسان مند ہو کہ اس نے قبول کر لیا۔ (حضرت امام غزالیؒ)

- تم دوسروں کی قدر کرو تاکہ تمہاری بھی قدر کی جائے۔ (حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ)

- جہل، سستی، بے کسی اور ناکسی یہ بد بختی کے آثار ہیں۔

(حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ)

---

ہوگی مگر پُر خلوص ہاتھوں سے زہر بھی پیا جائے تو امرت بن جاتا ہے۔ پھر تیری ان دنوں کی قرمزی پیالیوں میں برف پگھل رہی ہوگی۔ قہقہے اُبل رہے ہوں گے اور بغل کے ٹیبل پر بیٹھا ہوا ایک تو ندیل آدمی اپنی فربہ اندام بیوی سے سرگوشی کر رہا ہوگا۔

"یہ تینوں پاگل ہیں! انھیں ہوٹل میں بیٹھنے کے آداب بھی نہیں معلوم!"

لیکن ہم آداب و آئین کی پروا کئے بغیر ہنستے رہیں گے اور اس وقت تک اپنے خلوص، اپنی محبت اور اپنی رفاقت کا ایک دوسرے کو یقین دلاتے رہیں گے جب تک ہوٹل کا منیجر آکر ہم سے معذرت نہ کرے۔

"کوئی قادر صاحب ہوٹل کے باہر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

کوئی تین سال کے طویل عرصے کے بعد یوں اچانک قادر کا نام سن کر میں چونک پڑا۔ اپنے دوستوں کو کچھ بتائے بغیر کاؤنٹی کے بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔ دروازے کے باہر [illegible] کھڑا تھا۔ [illegible] ملگجی سی ہوگئی تھی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، رنگ [illegible] مجھے دیکھ کر کچھ اس طرح مسکرایا جیسے اس نے مجھے بہت عرصے بعد پہچان لیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ پھیکی اور دردناک تھی۔ ایسے میں مجھے کیا کرنا چاہئے کس طرح ہم کلام ہونا چاہئے کس انداز میں اس کی اس حالت کے متعلق پوچھوں۔ یہ سب میرے ذہن میں اس وقت بھی تھا لیکن میری زبان جیسے بند ہو گئی تھی۔ میری آنکھیں اس کے بے ترتیب اُلجھے ہوئے بالوں میں اٹک جاتیں۔ کبھی اس کے میلے کالے چیسٹر کی لٹکی ہوئی جیب پر آکر رک جاتیں لیکن میں سوچ رہا تھا قادر جو سامنے کھڑا ہے اور اپنے کاندھے پر اپنا ہی جنازہ لئے میرے پاس آگیا ہے۔ اسے کس طرح اپنایا جائے۔ لیکن قادر نے خود ہی میری یہ مشکل آسان کر دی۔

"راشد! تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں قادر ہوں نا! یہ دیکھو میرا پرانا کالا چیسٹر!"

وہ میرے کچھ اور قریب آیا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد، آنکھوں کے اندر پیلے ڈورے میرے دل میں چبھ رہے تھے۔ پھر بھی میں خاموش تھا اور وہ میرے شانے کو اپنے سوکھے ہوئے کمزور ہاتھوں سے تھپتھپا رہا تھا۔

"راشد! تم میرے سب سے قریبی دوست رہے ہو نا۔ بتاؤ راشد!"

اس کے بعد ہی میرا دل کٹ کٹ گیا۔

"میں کبھی تمہارا دوست ضرور تھا لیکن اب نہیں ہوں۔ تم نے دوستی اور محبت کے سارے رشتے بمبئی جا کر ختم کر دئے۔ بتاؤ، تم نے میرے کسی خط کا کبھی جواب دیا۔ تین سال میں تم نے بھولے سے بھی کبھی اپنی خیریت لکھی؟ کبھی تم نے مجھے اپنے دکھ بتائے؟ اور آج تم دوستی کی تجدید کرنے آئے ہو! اگر واقعی میں تمہارا دوست تھا تو تم نے مجھے لکھا ہوتا کہ تم پریشان ہو۔ تم نے مجھے بتایا ہوتا کہ مصیبت میں گھرے ہوئے ہو، کہ ہو تا کہ تم بیکار ہو۔ لیکن تم نے تو اس کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ آج اس حال میں تم مجھے اپنا دوست کہہ رہے ہو جبکہ میں اور میری محبت شاید تمہارے لئے اب بے سود ہو چکی ہے۔"

میں نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور قادر کو اپنے ساتھ کھینچنے لگا۔

"چلو گھر چلیں۔"

اس نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور نظریں جھکائے کمتری کے احساس کے ساتھ کہنے لگا۔

"میں تمہارے ساتھ گھر ضرور چلوں گا۔ لیکن مجھے اس وقت کچھ پیسے چاہئیں۔"

پھر میں نے اسے سب کچھ صاف صاف اُس کے سامنے کہہ دیا۔ پر میں تو ہر طرح بہلا ہوا سا بیٹھا تھا۔ اُس نے نقد بیس ہزار روپے کی صورت میں ہار دیے لئے اور پھر مجھے واپس کر دیے۔ اُس نے روپے لے کر چھٹی کی چیز جیب میں ٹھونسے میں مسکرا دیا اور فرید وہ کی طرف پھر کچھ بہانے لگا۔ مجھے اِس انداز پر نیا کچھ پر بے انتہا غصہ آیا لیکن پی گیا کہ میں اس وقت کسی طرح اُس کا دل نہ توڑ سکتا تھا۔ لیکن اُس وقت بھی مجھے بس ایک بات کا احساس بار بار ہو رہا تھا کہ وہ اِس حال میں یہ روپے لے کر کہاں جا رہا ہے۔ کے مجھے کچھ کہنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو غیر شعوری طور پر میں بھی اُس کے پیچھے ہو لیا تو میں نے دیکھا وہ فٹ پاتھ کے فاصلے پر چل رہا تھا۔ بڑک سیدھی اور سنسان تھی۔ اس لئے میں اُس سے دور رہنے کے باوجود مطمئن تھا کہ اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں گا۔ اُس کے قدم مجرموں کی طرح تیز تھے اور میں اُس کے پیچھے ایک سی۔ آئی۔ ڈی افسر کی طرح بہت ہی محتاط انداز سے چل رہا تھا۔ وہ بڑھتا رہا۔ کوٹھیاں پیچھے چھوٹتی گئیں۔ گلشن بلڈنگ، ریڈیو اسٹیشن، سکندرہ منزل، نیپال ایرلائنز بلڈنگ، ہالی وڈ انشورنس کارپوریشن، ہوٹل راجستھان، گریڈ ہوٹل، پرنس بار میں نے دیکھا وہ کسی جھجک کے بغیر پرنس بار میں گھس گیا۔ میں آج تک کبھی بار یا میخانے میں نہیں گیا تھا۔ اِس لئے میرے قدم بار کے گیٹ کے باہر ہی رُک گئے اور تجسس و تشویش کے ساتھ یہ سوال دل میں اُٹھنے لگا کہ مجھے اِس وقت بار میں جانا چاہئے یا نہیں؟ اگر کسی جاننے پہچاننے شخص نے مجھے دیکھ لیا تو میری پارسائی کی دھجیاں اُڑ جائیں گی۔ پھر کس کے پاس اتنی فرصت ہو گی کہ مجھ سے اِس حقیقت کی تحقیق کرے کہ میں نے بار میں جا کر چائے پی تھی یا شراب لنڈھائی تھی۔ لیکن میں نے اِس سوال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور بار کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ بار کا ہال وسیع اور مرتب تھا۔ قرینے کے ساتھ ٹیبل سجائے گئے تھے۔ چند ٹیبل کے سوا سبھی خالی تھے۔ اور قادر ہال کے آخری سرے کے آخری ٹیبل پر تنہا بیٹھا تھا۔ اُس کی پیٹھ بار کے مرکزی گیٹ کی طرف تھی اِس لئے اُس نے مجھے داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں اُس سے پچھلے ٹیبل کی کرسی پر بہت ہی خاموشی کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا ویٹر ایک ٹرے میں دو بوتلیں، ایک خالی گلاس قادر کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ یہ سب کچھ مجھے پاگل بنا دینے کے لئے کافی تھا۔ میں اپنے ہی سامنے اپنے سب سے اچھے دوست کو شراب پیتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُس کے سامنے جا کر بیٹھا۔

"قادر یہ سب کیا ہے؟"

وہ مُرجھاتے ہوئے گلاب کی طرح کچھ اِس انداز میں مُسکرایا کہ میرے سارے جذبات ہی سرد پڑ گئے۔

"چلو اچھا ہوا تم بھی آگئے۔ دیکھو یہ تھری ایکس رَم کا ادھا ہے۔ یہ سوڈے کی بوتل ہے اور یہ آملیٹ کی پلیٹ۔ اب ہم دونوں ایک ساتھ پیا کریں گے کیوں؟"

اِس موقعے پر میں اپنی بے بسی کا ماتم کرنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتا تھا۔ میں چاہتا تو شراب کی بوتل اُٹھا کر دیوار پر دے مارتا۔ لیکن اِس احساس نے مجھے مفلوج بنا دیا کہ قادر کا دل اِس اذیت کو برداشت نہ کر سکا تو کیا ہو گا۔ اِس لئے میں نے اپنے آپ سے اِس بات پر مصالحت کر لی کہ آخری بار اُسے پینے کا موقع دے دینا چاہئے۔ اِس کے بعد میں اُسے صحیح راستے پر لے آؤں گا۔ وہ میرے ساتھ رہے گا۔ زندگی میں دلچسپی لے گا تو خود بخود وہ اپنے غم بھول جائے گا۔ شاید اسی لئے میں نے اُس سے یہ کہا تھا۔

"قادر پیارے! تم نے یہ سب کیوں کیا۔ تم اِس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے تھے۔ وعدہ کرو کہ آج کے بعد پھر اِس زہر کو منہ لگاؤ گے؟"

"تمہیں اِس سے پہلے پوچھنا چاہئے کہ میں نے شراب کیوں شروع کی؟ میں

- کامیابی یا ناکامی کا انحصار زیادہ تر تمہاری خود اعتمادی اور تمہاری سخت محنت پر ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- بعض لوگ اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ اپنی زندگی کے آخری حصے کو ناخوشگوار بنانے میں صرف کر دیتے ہیں۔ (ایک مغربی مفکر)
- اپنی اصلاح سب سے مشکل کام ہے اور دوسروں پر نکتہ چینی سب سے آسان۔ (ہربرٹ اسپنسر)
- مایوسی انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- بدلہ لینے والا اپنے دشمن ہی کی سطح پر رہتا ہے اور معاف کر دینے والا اُس سے بلند ہو جاتا ہے۔ (بیکن)

اِتنا نیچے کس طرح آگیا۔ لیکن تمہیں شاید یہ سب کچھ سُننے کی ہمت نہیں ہے، اِسی لئے تم مجھ سے مستقبل کی بات کرتے ہو۔ لیکن اُس شخص کا مستقبل ہی کیا ہو گا جس نے زندگی کی ایک ایک بازی ہاری ہو۔ جس کا رختِ سفر لُٹ چکا ہو۔ بھلا ایک بھکاری کے پاس کیا ہو سکتا ہے۔ اب کیا رکھا ہے دوست اِس زندگی میں؟"

اُس نے تھری ایکس کی بوتل کھول کر خالی گلاس میں شراب انڈیلی اور جب چھن چھن کرتا ہوا سوڈے کا پانی شراب کے گدلے سُرخ رنگ کو لیمن سیٹ ہوتے جاتے سے رنگ پہ لے آیا تو شراب اور سوڈے کا بلبلا جھاگ گلاس کی سطح سے ہوتے ہوتے ٹیبل پر آن گرا۔ شراب کی بُو سے میرا دماغ پھٹ رہا تھا۔ لیکن میں اپنے دوست کے لئے بیٹھا ہوا تھا اور اُس کی مجبوری کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اُسی وقت مجھے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ قادر کو میں اپنے ہی ہاتھوں سے زہر دے رہا ہوں۔ اگر وہ مر گیا تو اُس کا قاتل

پی جیا اور کہا ہوگا۔ کہہ کر چھلکا اور سوچتا رہا ایک گھونٹ، دو گھونٹ۔ جب پہلا گلاس ختم ہو گیا تو اُس کے چہرے پر ایک ایسی تازگی آگئی جو موت سے چند ساعت پہلے چہرے پر آجایا کرتی ہے۔ اُس کے بعد شرابی کی گنگی اُس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

"مرا شد! تم کیوں نہیں پیتے؟"

میں اِس غیر متوقع سوال سے گھبرا گیا اور کچھ بے تکی سی بات بول گیا۔

"تم یہ بھی پوچھ سکتے تھے کہ میں مر کیوں نہیں جاتا۔ زندہ کیوں ہوں؟"

"مگر ۔۔۔ چلو یہ سوال ٹھیک ہو گا؟"

میں نے غالباً اُس وقت یہی بات کہی تھی۔

"میں اپنے اور پراکے دونوں کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں؟"

اُس نے چار مینار کی ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر مجھے بڑھایا۔ میں سگریٹ نہیں پیتا پھر بھی میں نے اُس کی دل شکنی کے خیال سے سگریٹ لے کر سلگا لیا اور انگلیوں میں دبائے رہا۔ دوسری طرف اُس نے جلدی جلدی دو کش لئے اور اُس کے منہ سے نکلا ہوا کثیف دھواں ٹیبل کے چاروں طرف منڈلانے لگا۔ اُس کا تیسرا کش پہلے کے مقابلے میں زیادہ طویل تھا۔ اُس نے ایش ٹرے میں راکھ جھاڑی اور اُس کی بھنویں تن گئیں۔

"آپ اُس کے متعلق کیا فیصلہ دیں گے جس کا نہ کوئی اپنا ہو اور نہ پرایا؟"

میں نے جواب دیا۔

"اُسے چاہئے کہ وہ کسی کو بھی اپنا بنالے اور محبت کرے۔"

اُس نے اِس بات پر اتنا زور دار قہقہہ لگایا کہ آس پاس کے لوگ ہماری طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

"محبت! احمق کہیں کے! پھر کبھی اِس لفظ کو میرے سامنے دُہرانے کی جرأت نہ کرنا!"

دوسرا گلاس ختم کرتے ہی اُس کے چہرے پر ایک ہلکی سی سُرخی آگئی۔

"تم بمبئی گئے ہو۔ اگر کبھی جانا ہو تو مالابار ٹریڈنگ کمپنی کے جنرل منیجر فضل سے ضرور ملنا۔ وہ اپنی بیوی شوکت سے تمہارا تعارف کرائے گا ۔۔۔۔ ویٹر! اے یار! ایک ڈبل آملیٹ اور لاؤ!"

میں خاموشی کے ساتھ اُس کے چہرے کی طرف تکے جا رہا تھا اور یہ چاہ رہا تھا، وہ خوب بولے اور اپنے سارے دُکھ اُگل دے۔

"شوکت! کتنا پیارا نام ہے! بالکل اپنے نام ہی کی طرح وہ خوبصورت بھی تھی۔ یہ سالا ویٹر اب تک آملیٹ کا بچہ نہیں لایا۔ سوری! بچے کا آملیٹ۔ اوہ نو۔ ویٹر کا بچہ!"

ویٹر کا بچہ!"

تیزی کے ساتھ اُس پر نشہ چڑھ رہا تھا۔ اُس کے جملے بے ربط ہونے لگے تھے اور میری تشویش بڑھ رہی تھی کہ اب تک وہ کوئی خاص بات ہی نہیں بتا پایا ہے۔ اِس لئے مجھے اُسے سہارا دینا پڑا تھا۔

"جنرل منیجر کی بیوی، شوکت حسین تھی؟"

"صرف حسین نہیں بے انتہا حسین تھی۔ اُس کے چہرے پر کوئی داغ نہ تھا۔ تم نے چاند کو دیکھا ہے نا۔ اُس میں تمہیں کچھ نقوش نظر آتے ہوں گے۔ وہ شاید چاند کا داغ کہلاتے ہیں۔ لیکن شوکت کے چہرے پر شعلے کی ایک سُرخی تھی۔ کوئی داغ نہ تھا۔"

اب وہ شاعری کے موڈ میں آگیا تھا۔ اِس لئے میں نے اُسے پھر لقمہ دیا۔

"شوکت، جنرل منیجر کی بیوی تھی اور بے حد حسین تھی۔ پھر ۔۔۔؟"

تین سال پہلے جب میں بمبئی پہنچا تھا۔ اُسی سال اُن کی شادی ہوئی تھی۔ منیجر نے شوکت سے جب پہلی بار تعارف کرایا تو وہ مجھے بجھی ہوئی نظر آئی تھی۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ دوسری بار شوکت نے مجھ سے خود ہی ملاقات کی۔ تیسری بار اُس نے مجھے اپنے فلیٹ میں اُس وقت بلایا جب فلیٹ میں تقریباً کوئی نہ تھا۔ اِس طرح وہ مجھ پر امر بیل کی طرح چھاتی چلی گئی اور اُس کے پیار بھرے لفظوں کی زنجیروں میں میرا عضو عضو جکڑ گیا۔ لیکن اس کے باوجود میں سوچتا رہا ۔۔۔ سگریٹ کی ڈبیہ کہاں گئی؟"

سگریٹ کی ڈبیہ اُس کے سامنے ہی ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی اور وہ خود کھوئی ہوئی جیبیں تلاش کر رہا تھا۔ میں نے سگریٹ اُس کے سامنے بڑھا دیا۔

"تم نے یہ تو سوچا ہوتا اُس کی شادی ہو چکی ہے۔"

"میں نے بھی ٹھیک اُسی ٹرم میں سوچا تھا۔ اِسی لئے میں پہلے اُس سے کتراتا رہا اور بے حد منطقی ہو کر اُسے بھی سمجھاتا رہا کہ نتائج کتنے تلخ ہوں گے۔ لیکن جب شوکت نے فیصلہ کُن انداز میں مجھ سے یہ کہا، وہ اپنے شوہر سے طلاق لے لے گی اور مجھ سے شادی کرکے سکون کے ساتھ رہ سکے گی تو میرے دل میں بھی اُس کے لئے جگہ ہو گئی تھی لیکن . . ."

نشے کی زیادتی کی وجہ سے وہ کچھ بے کلی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ پہلے وہ اپنی ہتھیلی کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر انگلیوں سے ٹیبل کو تھپتھپانے لگا اور پھر اُس نے خالی گلاس کو اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اُس کے بعد مایوسی کے عالم میں اُس کا سر کرسی کے پچھلے حصے پر جا کر ٹک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں غنودگی چھانے لگی۔ میں نے اُس کے کاندھوں پر جب ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑا اور کہنے لگا۔

"لیکن ایک سال گزر جانے کے بعد بھی شوکت نے طلاق نہیں لی، اور اُس ایک سال میں ایک عجیب بات میں نے یہ محسوس کی کہ وہ جب بھی مجھ سے ملتی اپنے شوہر کی شکایت کرتی اور جب منیجر سے ملاقات ہوتی تو وہ شوکت کی بے انتہا تعریف کرتا۔ دیکھئے

...صاحب! شوکت میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ آٹھ بجے کے بعد وہ مجھے آفس میں بیٹھا نہیں رہنے دیتی۔ مگر دوسرے منٹ ٹیلیفون پر کہے گی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے! اچھا یہ سب فائلیں کل کے لئے رکھ دیجئے ــــــ لیکن واللہ! تم میرے دل کی وسعت کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے ہو کہ میں نے اس کے باوجود شوکت پر خدا کی طرح بھروسہ کیا۔ میں نے اپنے شک کو کبھی سر اُٹھانے کا موقع ہی نہ دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شوکت کو اگر واقعی میرے ساتھ رہنے میں سکون مل سکتا ہے تو میں اُسے کسی بھی قیمت پر یہ سکون بہم پہنچاؤں گا کہ اُس کا یہ حق اُسے ملنا ہی چاہئے۔"

میں نے ویٹر کو اشارے سے بلا کر پہلے کافی کا آرڈر دیا اور وہ بولتا رہا۔

"ایک موقع پر تو اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میں اُس کی مدد نہ کروں گا تو وہ زہر کھالے گی! اب تم ہی بتاؤ کیا اپنے ہی ہاتھوں سے اُس شخص کو زہر دے سکتے ہو جو تمہارے ہی رحم و کرم پر زندہ ہے ــــــ یہ شراب بھی کمبخت ختم ہو گئی۔ اور پیو گے؟ تم نے کیوں پینا شروع کر دی راشد؟ دیکھو میں کہاں پیتا ہوں؟"

میرا جی چاہا تھا کہ گال پر ایک زوردار طمانچہ لگاؤں کہ اُس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے۔ لیکن اُس کی بے بسی پر میری آنکھیں نم ہو گئیں اور دل بے چین ہو گیا۔

"دو سال تک میں شوکت کی محبت میں سلگتا رہا، جلتا رہا۔ اُس کے وعدوں پر زندگی کے دن گنتا رہا اور ایک دن اُسی شوکت نے جس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میرے لئے تم ہی سب کچھ ہو۔ تمہارے لئے زہر کھا لوں گی! اُسی شوکت نے بہت ہی بھولپن سے مجھے زہر دے دیا ــــــ"

اُس نے اپنے پرانے چیسٹر کے ایک سوراخ میں انگلیاں ڈالیں اور ایک مُڑا تُڑا خط نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اسے کھولا، شکنیں برابر کیں اور پڑھنے لگا۔

"مکرمی قادر صاحب! معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کو دو سال تک پُرفریب طریقے سے اپنی محبت کا یقین دلایا اور آپ نے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھ پر انجام کار اعتماد کر ہی لیا۔ آپ کی معصوم شرافت پر افسوس کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے تو ایک انتقام لینا تھا۔ کیا کروں کہ اُس کی زد میں آپ ہی کی معصومیت آگئی۔ یہ آپ کی بدقسمتی ہے۔ میرے پاس اس کے لئے کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہے۔ آپ تو پوچھنا چاہیں گے کہ آخر اس اقدام کا سبب کیا ہے؟ بات اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ میں نے اپنی تمام تمناؤں کے ساتھ ایک ایسے شخص کو چاہا تھا جو میرا آئیڈیل تھا۔ لیکن والدین نے میری مرضی جانے بغیر منیجر سے شادی کر دی۔ میری تمناؤں کے ایک ایک بت توڑ دیے گئے۔ عورت کی مجبوری سے غلط فائدہ اُٹھایا گیا۔ شادی کے بعد ہمارے یہاں کی عورتیں اپنی بے بسی اور مجبوری کا لبادہ اوڑھ کر حالات سے سمجھوتہ کر لیا کرتی ہیں۔ میں [illegible] ہوں۔ یہ [illegible] تو [illegible] ہوں اور [illegible] سامنے [illegible] پہن لیا ہے میرے پاس [illegible] کہ میں بھی کسی کی زندگی سے کھیلوں۔ کسی کو [illegible] سسکتے ہوئے دیکھوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں ایک جیسے عورت کی تقدیس پر چوٹ لگائے لیکن تقدیس کا مطلب یہ کہاں ہے کہ اپنی تمناؤں کے خون [illegible] اور ناکام حسرتوں کو گلے لگا کر ساری زندگی اپنے ماضی کا تصور کئے جائے۔ یہاں۔ کل سے غالباً آپ کی ملازمت ختم ہو جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیے ــــــ مسز شوکت امام"

میں نے غصے میں خط پھاڑ ڈالا اور اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایش ٹرے میں ڈال دیا۔
اب قادر پر نیند کا غلبہ ہو چکا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں کسی طرح اُسے اپنے فلیٹ میں لایا اور اپنے بستر پر ڈال کر ایک ضروری کام سے باہر چلا گیا۔ وہاں مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب میں واپس آیا تو مجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ قادر وہاں نہیں تھا۔ لیکن اُس کا چیسٹر ہینگر پر لٹکا ہوا تھا جس سے اِس کی نشاندہی ہو رہی تھی کہ وہ یہیں کہیں ہے اور کچھ ہی دیر میں آ جائے گا۔ لیکن وہ نہ آیا۔ میں نے ہفتوں اور مہینوں تک اُس کا انتظار کیا لیکن وہ نہ آیا اور نہ اُس کے بارے میں کچھ معلوم ہی ہو سکا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

پھر بھی میری نگاہیں جب اُس کے کالے پھٹے پرانے چیسٹر کی طرف اُٹھ جاتی ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے وہ چیسٹر نہیں ہے پیراہن یوسف ہے۔ جسے دیکھ کر میرا دل بھر آتا ہے۔ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور قادر اپنی مکمل شخصیت کے ساتھ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"راشد! تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ یہ دیکھو میرا پرانا کالا چیسٹر!"

---

# غزلیں

**سید سلطان حشمت لکھنوی**

اک ترے واسطے دُنیا کو بُھلایا میں نے
اے غمِ دوست مگر چین نہ پایا میں نے

بُجھ گیا صبح کو اُمید کی شمعوں کی طرح
اک دیا وہ سرِ مژگاں جو جلایا میں نے

بے وفا! تیری محبت میں خدا شاہد ہے
اک زمانے کا ستم دل پہ اُٹھایا میں نے

لبِ خاموش پہ شکوے تھے نہ آہیں نہ گلے
یوں غمِ دل کو زمانے سے چھپایا میں نے

دل کو جب بھی تری یادوں نے پریشان کیا
تیری تصویر کو سینے سے لگایا میں نے

تیری رُسوائی کا دہشت میں بھی تو دھیان رہا
نام لکھ لکھ کے کئی بار مٹایا میں نے

برق نے پھونک دیا چشم زدن میں حشمت
آشیاں صحنِ چمن میں جو بنایا میں نے

**ناز بریلوی**

جہانِ حُسن کے رنگیں نظارے ہم کو لے ڈوبے
جنھیں اپنا بنایا وہ سہارے ہم کو لے ڈوبے

کہاں شکوہ ہے غیروں کے چلن کا ہم کو اے ہمدم
شکایت صرف اتنی ہی ہمارے ہم کو لے ڈوبے

کہاں کا ضبط، کس کا عہد، کیسی حرمتِ توبہ!
بھری محفل میں ساقی کے اشارے ہم کو لے ڈوبے

محبت کی نشانی بن کے جو مژگاں تک آئے تھے
وہ آنسو ضبط کی غیرت کے مارے ہم کو لے ڈوبے

شبِ فرقت تو ہم نے جیسے تیسے کاٹ دی لیکن
سحر کو ڈوبنے والے ستارے ہم کو لے ڈوبے

بہت محفوظ رکھا دل کو طوفانِ تمنا سے!
مگر معصوم نظروں کے اشارے ہم کو لے ڈوبے

نگاہیں ہوں کہ دل، اے نازؔ طوفانِ محبت میں
ہمیں جن پر بھروسا تھا وہ سارے ہم کو لے ڈوبے

**عابد مناوری**

مُشکلِ راہِ محبت سے ڈرانے والے
ہم کسی طور پلٹ کر نہیں جانے والے

تیری گفتار ہے دلچسپ بہت اے ناصح!
تیری باتوں میں مگر ہم نہیں آنے والے

دیکھ کر عزم و یقیں راہروں کے دل میں
راہ خود بھول گئے راہ دکھانے والے

تجھ کو تڑپائے نہ تنہائی کا احساس کہیں
یہ ذرا سوچ لے اے رُوٹھ کے جانے والے

ہم پئیں یا نہ پئیں اس سے انھیں کیا مطلب
حضرتِ شیخ ہیں کون آنکھ دکھانے والے

کس کو اے گردشِ تقدیر ڈراتی ہے عبث
ہم ہیں تدبیر سے تقدیر بنانے والے

واہ اور آہ کا سنگم ہے ہر اک شعر اُس کا
جو غزل حضرتِ عابدؔ ہیں سُنانے والے

# میں ہوں اب بیس برس کا...

میرا جنم آزاد بھارت میں ہوا۔ میں نے تو ہمیشہ آزاد فضاؤں میں سانس لیا ہے۔ اور جب جب میں نے قوم کو محنتی اور جوانوں کے باوجود ترقی کرتے دیکھا ہے میں بار بار حیرت کے دریا میں ڈوب گیا ہوں۔ آج ہمارے ملک کو ایک زبردست چیلنج در پیش ہے۔ متعدد مشکلوں سے سامنا ہے۔ لیکن ہمیں بھارت کی شبیہ دیکھنا [illegible] ہے۔ ایک نیا بھارت تعمیر کرنا ہے۔ یہ کام اتنا ہی دشوار ہے اور مشکل نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے ملک کی روایت ہمیشہ عظیم اور [illegible] ہمیں ابھرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔

مجھے اس بات پر واقعی بڑا فخر ہے کہ آزادی کے بعد اس مختصر سی مدت میں ہمارے یہاں ہر قسم کا ساز و سامان - چھوٹی سی چھوٹی سوئی سے لیکر جیٹ جہاز اور کمپیوٹر تک تیار ہونے لگے ہیں۔ سوچو تو ہم نے ان بیس برسوں میں کتنی ترقی کی ہے۔ ذرا اندازہ تو کیجئے بیس برس پہلے ملک کی حیثیت کیا حال تھا۔ سوئی سلائی سے لیکر بلیڈ تک ہمیں باہر کے ملکوں سے منگانے پڑتے تھے۔

بہتر مستقبل ہمارا منتظر ہے، ہمیں اس کے لئے آج بلکہ ابھی سے حوصلے اور ثابت قدمی سے کام کرنا چاہیئے۔ مجھے پورا پورا اعتماد ہے۔

## خود اعتمادی سے قوم کی تعمیر ہوتی ہے



# خط لکھیں گے...

فکر تونسوی کے طنزیہ خطوط کا سلسلہ ۸

## رام گوپال کے نام

شریمان رام گوپال جی!

معاف کیجئے آپ انتہائی بور آدمی ہیں۔ ہر روز اور ہمیشہ اُس وقت میرے گھر آدھمکتے ہیں جب میں کوئی نہ کوئی بے حد ضروری کام کرتا ہوتا ہوں۔ سچ سچ بتایئے آپ کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ میں اِس وقت ضروری کام کر رہا ہوں اور آپ کو فوراً جا کر مجھے بور کرنا چاہئے۔

اور پھر آپ میرے دوست بھی نہیں ہیں (میں دوست بنانے کی بجائے کنوئیں میں چھلانگ لگانا بہتر سمجھتا ہوں) لیکن اس کے باوجود آپ بے تکلفی جتاتے ہیں۔ مثلاً کل آپ نے ایش ٹرے میری میز پر اُلٹ دی، میرا ایک رسالہ اُٹھا کر لے گئے اور آدھا رسالہ واپس کیا، چائے سگریٹ پلانے کا (شرمناک) مطالبہ کر دیتے ہیں۔ اپنی بیوی کے پھوہڑپن کا رونا روتے ہیں حالانکہ آپ خود بھی کافی پھوہڑ ہیں اور کل تو آپ نے بے تکلفی کی حد کر دی کہ مجھ سے دس روپے اُدھار بھی مانگ لئے ——— یہ ساری علامتیں دوستی کی ہیں اور خدا کی قسم! بہت خطرناک ہیں!

رام گوپال! میں صدق دلی سے چاہتا ہوں کہ آپ کو بلکہ تمھیں عقل آجائے کہ میرے تمھارے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ میں ایک بھلا آدمی ہوں اور تم، سنا ہے، ایک بار جوئے کے الزام میں پکڑے گئے تھے۔ میں ایک رومانٹک انسان ہوں اور تم رومانس کو بداخلاقی سمجھتے ہو۔ تم غلط شعر پڑھتے ہو اور تمھاری بدنصیبی سے میں نہ صرف صحیح شعر کو سمجھ لیتا ہوں بلکہ صحیح شعر کہہ بھی سکتا ہوں لیکن اس کے باوجود اگر میں آپ کو برداشت کر لیتا ہوں تو یہ میری بے وقوفی ہے لیکن میری بیوقوفی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کو عقل نہ آئے۔ میں اپنے گھر آنے والے سے بدسلوکی نہیں کر سکتا۔ لیکن آپ مجھ سے بدسلوکی کو روا سمجھتے ہیں۔ (شیم! شیم!!)

اِس خط کے بعد بھی آپ نے میرے گھر آنا ترک نہ کیا تو میں ہی اپنے گھر آنا ترک کر دوں گا اور کسی سرائے میں رہنے لگوں گا۔

## بابو نیکی رام کے نام

سنگدل نیکی رام!

خدا تمھیں نیک بننے کی شکتی عطا کرے۔ تم نے مجھ سے اکیاون روپے رشوت لی تھی تاکہ میں نے جو میونسپل حکام کی اجازت لئے بغیر اپنے مکان کی ناجائز تعمیر کر لی ہے۔ تم اُس کی رپورٹ نہ کرو۔ بلکہ ہیرا پھیری کر کے اِس ناجائز مکان کی ناجائز منظوری بھی لے دوگے۔ یہ ایک بہادرانہ وعدہ تھا جو تم نے مجھ ایسے بے ایمان سے کیا تھا لیکن تم بھی بے ایمان اور بزدل نکلے۔ میں سمجھتا تھا بے ایمانوں کا بھی ایک اخلاق ہوتا ہے کیونکہ ایماندار آدمی اگر اخلاق کا ثبوت دیں تو اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن بے ایمان اگر اخلاق دکھائے تو یہ ایک معجزہ بن جاتا ہے۔ لیکن افسوس! تم رشوت کے اکیاون روپے بھی ڈکار گئے اور میرا کام بھی نہیں کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارے علاقے سے تمھارا تبادلہ ہو گیا ہے اور اب ایک نیا ہاؤس انسپکٹر آتما رام تعینات ہو گیا ہے۔ تمھارا فرض تھا کہ میرے اکیاون روپے بھی آتما رام کو ٹرانسفر کر دیتے۔ لیکن تم سے اتنی سی دیانت بھی نہ ہو سکی۔ چنانچہ کل میں نے آتما رام کو اور اکیاون روپے دئے (وہ اکسٹھ روپے مانگ رہا تھا۔ کہتا تھا مہنگائی کی وجہ سے رشوت کا ریٹ بڑھ گیا ہے) اِس لئے اب مناسب یہی ہے کہ تم میرے اکیاون روپے لوٹا دو۔ تم میرا سگریٹ کا پورا پیکٹ بھی اُٹھا کر لے گئے تھے۔ میں اُس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتا۔ لیکن اکیاون روپے پر تو میرا بدستور حق ہے۔ تم اُسے قرض سمجھ کر ہی لوٹا دو۔ رشوت تو خیر ذلیل چیز ہے مگر قرض تو ذلیل چیز نہیں ہے۔ بڑی بڑی گورنمنٹیں قرضے لیتی ہیں۔

بائی دی وے، یہ تو بتا دو کہ آتما رام کیسا آدمی ہے۔ کیا وہ بھی تمھاری نسل سے ہے یا اگلے زمانے کے کچھ آثار اُس میں باقی ہیں (سنا ہے تمھیں پچھلے دنوں ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کا کتنا بل آیا تھا؟)

## محلے کے دھوبی کے نام ——●

گنیشی ڈیر!

کل شام کو تم دہلی کے خوش پوش اور دولت مند علاقے کناٹ پلیس میں سے گزر رہے تھے۔ تمھاری ملکہ ممتاز محل یعنی تمھاری بیوی بھی ہمراہ تھی۔ اُس علاقے میں شہر کی امیرزادیاں اپنے حُسن اور دولت کی نمائش کے لئے ہر شام کو ٹہلا کرتی ہیں۔ تمھیں بھی اُن کی نقل کرنے کی سُوجھی۔ تم دونوں میاں بیوی اپنے ارمانوں کی لاش کو کندھا دینے کے لئے نہیں بلکہ سنوار کر کناٹ پلیس میں گھمانے کے لئے لے آئے۔ ہائے! کتنا دلگداز منظر تھا یہ کہ تم حُسن و دولت کی اُس نگری میں بالکل منفرد معلوم ہو رہے تھے۔ تمھاری دھوبیانہ انفرادیت تمھاری ہر حرکت سے ٹپک ٹپک پڑتی تھی۔

گنیشی! اپنی پیاسی کامناؤں کو خوبصورت فریب دینے میں کوئی بُرائی نہیں۔ یہ صرف تمھاری نہیں، ہر انسان کی ٹریجڈی ہے۔ لیکن میں یہ دیکھ کر چونک اُٹھا کہ تمھاری بیگم نے میری وائف کی ساڑھی زیبِ تن کر رکھی تھی۔ بُرا نہ ماننا، پہلی نظر میں تو مجھے سخت دھوکا ہوا کہ میں دھوبن کو اپنی بیوی سمجھ بیٹھا جو نہ جانے کس غیر مرد کے ساتھ جا رہی تھی۔ لیکن جب میں نے غیر مرد یعنی تمھاری طرف دیکھا تو جانِ من تم نے بھی میرا سوٹ پہن رکھا تھا! ظاہر ہے کہ وہ تمھاری بیوی تھی میری نہیں، صرف سوٹ بدلا تھا شوہر نہیں۔

میرا جی چاہا تھا تمھیں روک لوں اور کہوں "میرا لباس اُتار دو!" لیکن میں نے جی کو سمجھایا کہ سرِ بازار گنیشی کی بے عزتی ہو جائے گی۔ کناٹ پلیس کی امیرزادیوں کے سامنے تمھاری بیوی بے عزت ہو جائے گی۔ اِس سے اُنھیں شیطانی مسرت حاصل ہو گی۔ کیونکہ جب کوئی غریب آدمی عزت دار بن کر نکلتا ہے تو وہ مارے حسد کے جل بُھن جاتی ہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ تم دوسروں کا لباس پہن کر عزت دار بنے پھرتے ہو، یہ امیرزادے اور امیرزادیاں بھی تو دوسروں کی محنت کے چور ہیں، دوسروں کی محنت چُرا کر اپنا لباس تیار کر کے پہنے پھرتے ہیں۔ اُن کا لباس تو سرِ بازار کوئی نہیں اُتارتا تو پھر میں تمھارا لباس اُتار کر تمھیں بے عزت کیوں کروں؟

دیکھا گنیشی! میں نے تمھارے حق میں کتنا گہرا نکتہ نکالا؟ داد تو دے دو ظالم!

لیکن دھوبی صاحب! میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ آیندہ ایسا رِسک Risk نہ لینا۔ اگر میری بیوی میرے ساتھ ہوتی تو تمھاری پوزیشن یقیناً خطرے میں پڑ جاتی یا میرے بجائے تم کسی اور کا لباس پہن کر نکلتے تو شاید وہ سرِ بازار تمھیں بے آبرو کر دیتا۔ اِس لئے تمھیں یہ مصنوعی زندگی گزارنے کا رومانٹک پروگرام ترک کر دینا چاہئے۔

کیا یہی ظالم ہے دوست! وہ دوسروں کو رشوت کے ... لیک آخری بات اور! تم امیرانہ لباس پہن کر کناٹ پلیس کے ... ہوٹل میں کیوں نہیں گئے۔ میونسپل پارک کے بنچ پر بیٹھ کر اپنی بیوی کو رنگ ... کیوں کھلاتے رہے؟

## شاپ انسپکٹر کے نام ——●

اے مسٹر جو کھم ناتھ جی!

تم سے یہ پُوچھنا تو حماقت ہے کہ تم نے اتنی دولت کیسے پیدا کر لی جبکہ تم صرف ڈھائی تین سو روپے ماہانہ کے "بابو" ہو۔ جن سے تم پیٹ کی دال بھی باقاعدگی سے نہیں کھا سکتے۔ لیکن تمھاری ہر شام گنگا ہوٹل میں گزرتی ہے۔ جہاں کے بیرے تک پانچ روپے سے کم "ٹِپ" لینا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

بُرا مت ماننا دوست! میں عہدِ قدیم کا جنگلی ہوں، میں تمھیں اُن اخلاقی قدروں سے ناپتا ہوں جو کھنڈروں کے زمانے میں پائی جاتی تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اُس طرح کی زندگی گزارو جس طرح تم خود مدعی ہو۔ لیکن تم اسے میری قدامت پرستی سمجھ کر نظر انداز کر دو۔ تم عہدِ حاضر کی نبض پہچانتے ہو جبکہ میرے اقدار اور آدرش کی نبضیں چھوٹ رہی ہیں۔ اِس لئے تم یہ سوچ کر تسلی کر سکتے ہو کہ یہ بڈھا بکتا ہے۔ لیکن اے بٹنے کے عزیزی جوکھم ناتھ! ایک بار پھر بُرا مت ماننا۔ تم اپنی اندھی کمائی سے دو چار کام تو کر جاؤ۔ یہ تمھارے بھلے کے کام ہیں، مثلاً تمھاری ناک بے حد بھونڈی ہے۔ جو آدمی ایک بیرے کو پانچ روپے ٹِپ دے سکتا ہے اُس کی ناک اتنی بھدی نہیں ہونی چاہئے۔ پلاسٹک سرجری سے اسے ترشوا ہی لو، نئی ناک ... گھڑوا لو۔ تمھاری دائیں ٹانگ گھٹنے کے نیچے سے ذرا ٹیڑھی ہے، اسے بھی سیدھا کرا لو۔ تمھارے ہاتھ کی اُنگلیوں پر نہ جانے کب کی کالی نحوستیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اِن اُنگلیوں سے جب تم سلاد یا وہسکی کا گلاس پکڑتے ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ایک تھرڈ کلاس آدمی کو چیف منسٹر بنا دیا گیا ہے! یہ باتیں صرف جمالیات کے نقطۂ نگاہ سے کہہ رہا ہوں۔ ورنہ مجھے تمھارے بھرشٹاچار پر کوئی اعتراض نہیں۔ انسان ذہنی طور پر بھرشٹاچاری ہو تو کم از کم جسمانی طور پر تو حسین ہو۔ نہ جسم نہ ذہن۔ اِس کے باوجود سماج میں تمھاری عزت و شوکت ہو، یہ بات البتہ قابلِ اعتراض ہے۔ دونوں میں سے ایک خوبی تو پیدا کرو ظالم!

## مالک مکان کے نام ——●

جناب گرگٹ شاہ جی!

میں نے کئی بار آپ سے درخواست کی کہ آپ نے جو مکان مجھے کرائے پر دے

رکھا ہے، میرا کرایہ بڑھا دیجئے کیونکہ مارکیٹ میں کرائے تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور آپ ابھی تک آنکھ کی طرح خاموش گم سم بیٹھے ہیں۔ لیکن آپ نے میری ایک نہیں سنی حالانکہ آپ جانتے ہیں، یہ بھی نہیں سوچتے کہ آپ کو گردو پیش کی شرمناک تبدیلیوں کا علم نہ ہو۔ ایک بات جو گلی تک دس روپے میں مل جاتا تھا اب پچیس روپے تک جا پہنچا ہے۔ کل میری اپنی گنہگار آنکھوں کے سامنے ایک دکاندار نے پانچ پیسے والا سگریٹ کے سات پیسے مانگ لئے تو گاہک نے اُسے چھرا مار کر زخمی کر دیا، کیوں؟ — کیونکہ اب مہنگائی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ہے۔

گوگر شاہ جی! میں یہ نہیں کہتا کہ آپ میرے پیٹ میں چھرا اُتار دیں۔ لیکن کم از کم آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ آپ مجھ پر غنڈے اور لُچّے چھوڑ دیں، یا آپ مجھے یہ دھمکی تو دے دیں کہ کرایہ بڑھاؤ ورنہ تمہارا سامان اُٹھا کر گلی میں پھینک دوں گا! آپ مجھے کسی سپاہی اور مقبول سے طریقوں سے پریشان کر سکتے ہیں۔ لیکن آہ! گوگر شاہ جی! آپ کچھ بھی تو نہیں کرتے۔ بلکہ پرسوں آپ نے میری کوٹھڑی کی مرمت بھی کروا دی۔ حالانکہ آج کل تو رواج یہ چل پڑا ہے کہ اگر پرانے کی مرمت بھی کروانی ہو تو مالک مکان اس آڑ میں کرایہ بڑھا دیتے ہیں۔

آپ کی یہ خاموشی میرے لئے سوہانِ روح بنی جا رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ خاموشی کہیں اچانک طوفان کی طرح نہ پھٹ پڑے۔ پڑوسی کرایہ داروں کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا کرایہ بڑھ نہیں رہا تو وہ مجھے لعنت ملامت کرنے لگتے ہیں۔ کئی ایک نے تو میرا سوشل بائیکاٹ بھی کر دیا ہے۔ وہ مارے حسد کے مجھ سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں کہ میں مالک مکان کا خفیہ ایجنٹ ہوں۔

لہٰذا گوگر شاہ جی! اس خط کو ایک وارننگ سمجھئے اور میرا کرایہ فوراً بڑھا دیجئے۔ ورنہ میں آپ کے خلاف ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کر دوں گا! کیونکہ آپ نے سماج اور پڑوس میں میری عزت خطرے میں ڈال دی ہے اور میں کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

## سکول ماسٹر کے نام ——— •

پیارے ماسٹر شمیر چند

مجھے کسی نے بتایا کہ آپ کی چوتھی نوجوان لڑکی رمبھا ستائیس سال کی ہو چکی ہے۔ مگر اس کے لئے آپ کو کوئی دولہا نہیں مل رہا ہے۔ اگرچہ لڑکی گریجویٹ ہے مگر آپ غریب ہیں اور غریب کی بیٹی بیٹی نہیں ہوتی!

معاف کیجئے ماسٹر جی! مجھے رمبھا سے نہیں آپ سے ایک شکایت ہے، کہ جب آپ اس کے پیٹ کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے تو آپ نے رمبھا کو پیدا ہی کیوں کیا۔ پیدا کر دیا تھا تو اُسے بیٹی کیوں کہا۔ ایک شکایت مجھے رمبھا سے بھی ہے کہ وہ ایک غریب سکول ماسٹر کے گھر کیوں پیدا ہوئی، شہر میں کئی امیر آدمی اور بھی تو رہتے تھے وہاں پیدا ہو جاتی اور اگر سکول ماسٹر کے گھر پیدا ہو بھی گئی تھی تو جوان کیوں ہو گئی، جوان ہونے سے پہلے ہی کیوں نہ اس دُنیا سے چل دی، جہاں انسان سے نہیں پیسے سے شادی کی جاتی ہے۔ لوگ روپے کو دُلہن بنا کر ڈولی میں بٹھا لے جاتے ہیں۔ روپے ہی کو رمبھا سمجھ کر بیاہ کر لے جاتے ہیں۔

اب مصیبت یہ ہے ماسٹر جی! کہ رمبھا کسی سے پیار بھی تو نہیں کر سکتی کیونکہ اس سے آپ کے خاندان کی عزت خطرے میں پڑ جائے گی۔ حالانکہ عزت پہلے ہی سے خطرے میں پڑ چکی ہے۔ اس لئے میرا مشورہ مانئے، رمبھا یا آپ دونوں میں سے ایک کو ضرور خودکشی کر لینی چاہیئے۔ شاید اس خودکشی کی دھرتی میں سے کوئی پھول اُگ آئے جو غریب نوجوان لڑکیوں کی ازدواجی زُلفوں میں ٹانکا جا سکے!!

---

## رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (مینجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۲)

# باپ سے بیٹے کو

آج ہتھ کرگھا کپڑے نے ان کی اعلیٰ روایتوں کے [illegible] گزشتہ ۲۵ صدیوں سے، باپ سے بیٹے کو ورثے میں ملتا آیا ہے۔ ہر نسل نے اپنے ہنر، اپنی فنی قوت اور تخلیقی صلاحیتوں کو انہیں چیزوں سے ظاہر کیا ہے۔ آزادی کے بعد یعنی گزشتہ بیس برسوں میں سرکار کی مالی و تکنیکی امداد سے ہتھ کرگھا صنعت نے بڑی ترقی پائی ہے۔ دنیا بھر کے سوتی کپڑا تیار کرنے والے ملکوں میں بھارت کا نمبر تیسرا ہے۔ لیکن کم ہی لوگ یہ جانتے ہیں کہ بھارت میں تیار ہونے والے سوتی کپڑے کا ایک چوتھائی حصہ ایسا ہے جو ہتھ کرگھوں پر بنا جاتا ہے۔ اس وقت ملک میں ۳۰ لاکھ ہتھ کرگھے ہیں۔ اس صنعت میں ۸۰ لاکھ لوگوں کو روزگار حاصل ہے۔ جبکہ سوتی کپڑے کے کارخانوں میں کل ۱۰ لاکھ لوگ ملازم ہیں۔ ہتھ کرگھا بنکروں کے نزدیک یہ فن ذریعۂ معاش ہی نہیں، طرزِ زندگی بھی ہے۔



بھارتی ہتھ کرگھا کپڑے، ۲۵ صدیوں کی روایت اور ہنرمندی کے نمونے



# دردآشنا

## ـــــــــــ ریاض اقبال

معرفت جناب ہی ہلف محمد اسمٰعیل
شوگر فیکٹری لمیٹڈ۔ پوسٹ آفس موتی پور۔ ضلع مظفرپور (بہار)

۱۰ر جولائی ۱۹۹۷ء          محترم چچا جان! تسلیم

آپ نے "بیسویں صدی" کے ذریعے دُنیائے ادب میں بہت سے چراغ روشن کئے ہیں . . . آج ایک اور چراغ روشن ہونے کی اُمید لئے آپ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کیا آپ اسے روشنی نہیں بخشیں گے؟

آپ کا بھتیجا ـــــــــــ ریاض اقبال

---

ایک بار پھر میں اُسی دیار میں آگیا ہوں۔

کشمیر میں ہمارا آج پانچواں دن تھا۔ کشمیر جنت نظیر۔ جہاں لوگ سکون پانے کے لئے آتے ہیں۔ دل و دماغ کو تازگی بخشنے کے لئے آتے ہیں لیکن . . لیکن مجھے اِس کشمیر نے سکون کیوں نہیں دیا۔ میرے دل و دماغ کا چین کہاں کھو گیا ہے۔ کشمیر کی یاد سے میرے دل میں ایک کسک سی کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ میرے خدا کیا اب مجھے کبھی سکون نہ ملے گا؟

دُور کے پہاڑوں پر برف باری کا منظر کتنا دلکش ہے۔ لیکن
اچانک روحی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
"یہ روز روز برف باری کیوں ہوتی ہے سلیم؟"

میرے خدا! اِتنی مطابقت؟ میں جوبات سوچ رہا تھا وہی میرے سامنے ابھر آئے گی؟ یہ روز روز برف کیوں گرتی ہے۔ کیا کسی کے سینے میں سُلگتی ہوئی آگ کو ٹھنڈی کرنے کے لئے؟

آج سے چار سال پہلے بھی وادیٔ کشمیر میں میرے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی تھی۔
"یہ روز روز برف باری کیوں ہوتی ہے سلیم بابو؟"

کمرے میں ہوا کا ایک ٹھنک جھونکا آیا اور ساتھ ہی میرے صحیفۂ حیات کے اوراق پھڑ پھڑانے لگے۔ ایک۔ دو۔ تین اور چار!

آج سے چار سال پہلے میں یونیورسٹی ٹورسٹ پارٹی کے ساتھ زندگی میں پہلی بار جنت نظیر کشمیر میں داخل ہوا تھا اور پھر ایک حسین شام کو افشاں مجھے ملی تھی۔ افشاں! جس نے مجھ جیسے اصول پرست انسان کے ذہنی سکون کو بھی لوٹ لیا اور اُس جذبۂ بے اختیار کے آگے میں نے بھی اپنا سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ حالانکہ افشاں سے پہلی ملاقات بالکل اتفاقیہ تھی۔ افشاں ـــــ ایک سادہ سی معصوم کشمیری لڑکی۔ ڈل کے کنارے میں نے اُس سے پوچھا تھا: "تمہارا نام کیا ہے؟"

اُس نے مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ کر کہا: "میرا نام افشاں ہے۔"

"واہ بھئی! بہت خوبصورت نام ہے تمہارا" میں نے کہا۔

"جی بابو؟" وہ مجھے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

میں بوکھلا کر بول اُٹھا: "مطلب یہ کہ مجھے تمہارا نام بہت پسند آیا۔"

"اچھا اچھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟" کچھ دیر بعد اُس نے پوچھا۔

"میرا نام سلیم ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا نام بھی بہت اچھا ہے" یہ اُس نے کہا اور ہنس پڑی۔ اُس کی اِس ادا پر میں بھی ہنس پڑا۔ کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔

ایک دن چاروں طرف سے بادل گھر آئے تھے۔ برف باری کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ افشاں نے اچانک مجھ سے پوچھا تھا: "یہ روز روز برف باری کیوں ہوتی ہے سلیم بابو؟"

عجیب سا سوال تھا۔ کیوں تمہیں برف کا گرنا پسند نہیں؟ میں نے اُس

سے پوچھا۔

"دیکھونا۔ ابھی ہم نے اطمینان سے باتیں بھی نہیں کیں اور برف گرنے لگی۔"

"اچھا تو تمہیں مجھ سے باتیں کرنا پسند ہے؟" میری آنکھیں اُس کی آنکھوں میں سما گئیں۔ اِسی عالم میں چند خوبصورت لمحے گزر گئے۔ پھر اُس کی پلکیں جھک گئیں۔

"اچھا سلیم بابو! اب میں جاتی ہوں۔ تم ہمارے گھر چلو نا؟"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے جواب دیا: "تم بہت اچھی ہو افشاں! میں تمہارے گھر کسی دن ضرور چلوں گا۔ اور سنو تم کل اسی جگہ مجھ سے ملو گی نا؟"

اُس کی پلکیں جھکی رہیں۔ اُس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ برف کے دھندلکوں میں گم ہوتی چلی گئی۔

اُس کے بعد ہم روز ملنے لگے۔ ایک دن وہ اصرار کر کے مجھے اپنے گھر لے گئی۔ جہاں اُس نے اپنے بابا گل خان سے میرا تعارف کرایا۔ گل خان مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خلوص اور مروّت سے بھرپور کشمیری زندگی۔ باپ اور بیٹی خلوص و محبت کے زندہ پیکر تھے۔ گل خان کا پیشہ پھلوں کی تجارت تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے افشاں اور گل خان کے درمیان بیٹھ کر اجنبیت کا قطعی احساس نہ ہو سکا۔

ہماری ٹورسٹ پارٹی کا کشمیر میں صرف بیس دن قیام کا پروگرام تھا۔ وقت پلک جھپکتے گزر رہا تھا۔ اس درمیان میں اور افشاں کئی بار ملے۔ ہم نے ایک دوسرے کو کبھی نہ بھولنے کے وعدے کیے۔ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جانے کے لئے پیمان باندھے، عہدِ وفا کیا۔ آخر وہ دن آ پہنچا جب مجھے افشاں اور کشمیر سے رخصت ہو کر زندگی کی گوناں گوں مصروفیات کا سامنا کرنا تھا۔ آخری بار میں اور افشاں ڈل کے کنارے ملے تھے۔ ہمارے دل جدائی کے غم کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔

افشاں نے سسکیوں کے درمیان مجھ سے پوچھا: "تم مجھے بھول تو نہ جاؤ گے سلیم؟"

"تم اِس طرح روؤ گی تو میں یہاں سے جا کیسے سکوں گا" میں نے اُسے تسلی دی: "میں پھر بہت جلد کشمیر آؤں گا اور... اور ہمیشہ کے لئے تمہیں اپنا بنا لوں گا افشاں!"

اُس کا کنول جیسا چہرہ سسکیوں اور مسکراہٹوں کا سنگم بن گیا اور اسی عالم میں ایک خوشگوار سی کسک لے کر کشمیر سے رخصت ہوا۔

چھ مہینے بیت گئے۔ میں نے یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کر لی اور ٹریننگ کے لئے مجھے بمبئی جانا پڑا۔ اگلے چھ ماہ میں میں نے ٹریننگ بھی پوری کر لی اور یہ عرصہ میری زندگی کا کربناک ترین عرصہ بن گیا۔ بمبئی کے قیام کے دوران میرے والدین نے میری شادی روحی سے طے کر دی۔ دن اور تاریخ تک مقرر کر دی گئی تھی۔ یہ سُن کر مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ بہت مشکل سے میں نے خود پر قابو پایا۔ والدین کی شفقت، محبت اور ارمانوں کا واحد مرکز صرف میری ذات تھی۔ میرے انکار کا صدمہ شاید اُن کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا۔ کوشش کے باوجود میں اُن کے فیصلے کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ گونگا اور بہرہ بن کر میں نے اُن کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔

روحی میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ لیکن افشاں کی یاد کوشش کے باوجود میرے دل سے دُور نہ ہو سکی۔ میرا ضمیر مجھے مجرم کہہ رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اب افشاں کی یاد ایک خلش بن کر ہمیشہ کے لئے مجھ سے وابستہ ہو چکی ہے۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ روحی کو افشاں سے متعلق سب کچھ بتا کر اپنے ضمیر کے بوجھ کو ہلکا کر لوں لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ خدا جانے روحی میرے بارے میں کیا خیال کرتی۔

اِسی کوشش میں دو سال گزر گئے۔ روحی قدم قدم پر میرے لئے اپنی محبت کے پھول نچھاور کئے جا رہی تھی اور میں اُسے اپنی جھوٹی محبت کا یقین دلاتا رہا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا میرے خیالات کو منتشر کرتا ہوا گزر گیا۔ میں نے چونک کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔

"افشاں! تمہارا مجرم آج پھر کشمیر آ پہنچا ہے۔ تمہاری یادیں لئے!" میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکل گیا۔

میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ بادل صاف

بیٹھے تھے اور بہت خوشگوار سنہری دھوپ نکل آئی تھی۔ میں اُٹھ کر روحی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ خلافِ معمول اُس وقت سو رہی تھی۔ میں نے اُسے جگایا "کیوں روحی! تمھاری طبیعت تو اچھی ہے؟"

وہ آنکھیں ملتے ہوئے مجھے دیکھ کر مسکرائی "سر میں کچھ درد محسوس ہو رہا ہے۔ شاید آج شام کی سیر میں تمھارا ساتھ نہ دے سکوں۔ اس لئے تم اکیلے ہی سیر کر آؤ۔ لیکن دیکھو جانے سے پہلے میرے لئے ویٹر سے چائے ضرور بھجوا دینا!"

کچھ دیر بعد میں اپنا لانگ کوٹ کندھوں پر ڈالے ہوٹل سے باہر نکلا۔ سورج مغرب میں آگ کا ایک بڑا سا گولا معلوم ہو رہا تھا اور شفق میں کئی رنگین لہریے بکھر گئے تھے۔ نہ جانے کیوں آج افشاں کی یاد مجھے کسی پہلو چین نہ لینے دے رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ ایک بار پھر آج سے چار سال پہلے کی فضاؤں میں پہنچ جاؤں۔ میری نگاہ ڈل کے اُس کنارے کی طرف اُٹھ گئی جہاں آج سے چار سال پہلے میں نے اور افشاں نے محبت کے عہد و پیمان کئے تھے۔ میں نے حسرت سے ڈل کی سطح پر تیرتے ہوئے شکاروں کو دیکھا۔ گل خان کے نورانی چہرے پر میں نے محبت و شفقت کی لکیریں دیکھی تھیں۔ فضا میں ٹھنڈک کچھ اور بڑھ گئی تھی اور میرے قدم غیر ارادی طور پر ایک طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے اور پھر اُس وقت میں کانپ اُٹھا جب میں نے خود کو افشاں کے مکان کے دروازے پر پایا۔ میرے خدا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ دل چاہا یہاں سے بھاگ جاؤں جلد از جلد! جتنا تیز ہو سکے! لیکن کوئی انجانی سی کشش اور قوت مجھے روک رہی تھی۔ زمین نے گویا میرے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر دستک دی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور پھر افشاں میرے سامنے کھڑی تھی۔

"سلیم بابو تم؟" افشاں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"ہاں افشاں! میں پھر آ گیا ہوں!" میں اپنے دل کی بدلتی ہوئی حالت پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"اندر آ جاؤ سلیم بابو!" اُس نے دیوانہ وار میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ کمرے میں پہنچ کر میں پلنگ پر اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"سلیم! میں مجبور تھی سلیم! تم مجھے غلط نہ سمجھو!" وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ "تمھارے جانے کے صرف ایک سال بعد میں ایوب سے بیاہ دی گئی۔ میں ... میں کوشش کے باوجود بابا کی بات کو ٹھکرا نہ سکی۔ میں تمھاری مجرم ہوں سلیم! میں قصور وار ہوں۔"

میری رگ و پے میں ایک مسرت آمیز ٹھنڈک دوڑ گئی۔ میں نے سہارا دے کر افشاں کے آنسو پونچھے۔ "قصور وار یا مجرم ہم دونوں میں سے کوئی نہیں افشاں! تمھاری طرح میں بھی مجبور کر دیا گیا تھا۔"

"تو کیا تمھاری بھی شا... شادی؟" افشاں کے لہجے میں تحیر تھا۔

"ہاں افشاں! اب روحی میری زندگی کی منزل کی ہمسفر ہے۔" میں نے کہا۔ افشاں کے چہرے پر اچانک مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

ایک گھنٹے کے بعد میں افشاں کے گھر سے نکلا۔ سورج کب کا غروب ہو چکا تھا اور اب بلند و بالا پہاڑوں کے پیچھے سے چاند اپنا سر اُٹھا رہا تھا۔ ہر شے پر چاندنی کا غلاف دبیز ہوتا جا رہا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا جیسے میرے ضمیر کی وہ خلش اور آواز جس نے مجھے بے چین کر رکھا تھا آج ہمیشہ کے لئے معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ میرے قدم تیزی سے ہوٹل کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں روحی میرا انتظار کر رہی تھی۔ روحی میری زندگی اور میری منزل!!!

---



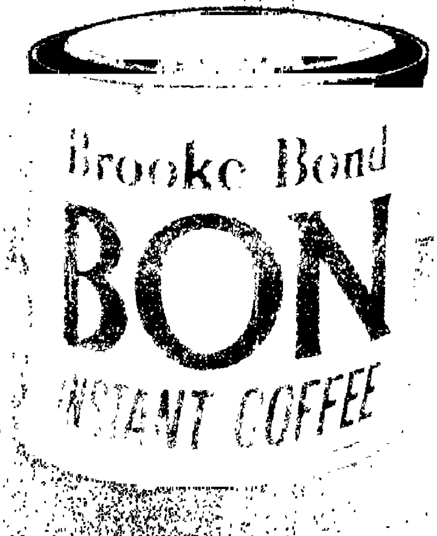

بروک بانڈ

# بون

انسٹینٹ کافی

کیف انگیز

ذائقے والی




اس کو تیار کرنا بے حد آسان ہے۔ بس اتنا کیجئے کہ چائے کا چمچ بھر بون لے کر اس میں گرم پانی ڈال دیجئے اور آپ کی اصلی کافی کی پیالی فوراً تیار ہے۔ اسی طرح بون سے پیالی پیالی خوشبودار ذائقہ کافی تیار ہو جاتی ہے۔

یہ اس لئے پیش کی جا رہی ہے کہ آپ اصلی کافی کی لذت سے بہرہ مند ہو سکیں۔ گرم پانی ڈالتے ہی اصلی کافی کے دانے ننھے ننھے ذروں کے کیف انگیز ذائقے [illegible] ہو جاتے ہیں۔ [illegible] خالص اور [illegible] کافی ہے۔

بون کافی کے نفیس ترین بیج [illegible] سے چنی ہے اور آپ کی خدمت میں ایسے ہوا بند [illegible] میں پہنچتی ہے جو اس کی ساری تاثیر، خصوصیات اور تازگی کو [illegible] طرح محفوظ رکھنے کے ضامن ہیں۔ فوراً تیار ہو جانے والی کافی۔ بون کا [illegible] آج ہی حاصل کر لیجئے جو تمام خوبیوں اور لذتوں سے مالا مال اور اپنے انتہائی کیف انگیز ذائقہ کی وجہ سے بے مثال ہے۔

بروک بانڈ انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ کی بہترین احتیاط سے تیار کردہ۔



# صحت و زندگی

**زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات**

## ۱۔ انناس ــــ ایک صحت بخش پھل

انناس سرد تر اور مفرح پھل ہے۔ یہ زود ہضم اور مقوی قلب و جگر ہے۔ دل دماغ، جگر اور معدے کو طاقت اور تقویت بخشتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے ہونے والی دل کی دھڑکن کے لئے بہت مفید ہے۔ پیاس کو دور کرتا ہے۔ لاغر کو فربہ اور کمزور کو طاقت بخشتا ہے۔ صفرا اور خون کی حدت کو دور کر کے حالتِ اعتدال پر لاتا ہے۔ چہرے کے رنگ کو نکھارتا اور جسمانی کمزوری کو دور کرتا ہے۔ مقوی باہ ہے، بھوک بڑھاتا ہے۔ پکے ہوئے انناس کے پھل کا رس بخار کی حالت میں معدی رطوبت کی تیزی کو ہلکا کرتا ہے۔ یرقان میں بھی مفید ہے۔

پکے ہوئے انناس کا رس صفراوی بخار میں نافع ہے۔ پیشاب لا کر بخار کی گرمی کو دور کرتا ہے۔ بدن کو ٹھنڈک دیتا ہے۔ جگر کی گرمی اور صفرا کی حدت کو [illegible] جسم کے فاسد مواد کو پیشاب کے ذریعے خارج کرتا ہے۔

پیشاب کم آتا ہو، پیشاب میں [illegible] ہوتا ہو، جگر اور تلی بڑھ گئی ہو، بھوک کم لگتی ہو تو پکا ہوا انناس کھانے سے افاقہ ہوتا ہے۔

جن لوگوں کو مرغن اور ثقیل غذائیں اور گوشت ہضم نہ ہوتا ہو ان کے لئے انناس کا باقاعدہ استعمال بہت مفید ہے۔ زیادہ گوشت کھانے والوں کو بھی انناس کا استعمال رکھنا چاہئے۔

ضعفِ معدہ اور ضعفِ قلب کے مریضوں کے لئے انناس بہت مفید ہے۔ [illegible] سرد مزاج والوں اور حاملہ عورتوں کو مضر ہے۔ [illegible]

روزانہ کھانے سے بینائی تیز ہوتی ہے۔

کچے انناس میں ترشی اور تیزی ہوتی ہے جس کے کھانے سے زبان، منہ اور حلق میں خراش پیدا ہو جاتی ہے۔ کچا پھل ایسے آدمی کو کافی مقدار میں کھلایا جائے جس کے پیٹ میں کیڑے ہوں تو سارے کیڑے باہر نکل آتے ہیں۔ کچا انناس کیڑے کے مادہ کو جڑ سے ختم کر دیتا ہے۔ پھر کیڑے پیدا نہیں ہوتے۔

انناس کا شربت مفرح قلب ہے۔ خصوصاً جن کے قلب اور جگر میں حرارت ہو، بہت مفید ہے۔ کیونکہ جگر کی گرمی اور صفرا کی حدت کو دور کرتا ہے۔ آبِ انناس ایک سیر، عرق گلاب دو چھٹانک، عرق بید مشک ایک چھٹانک، قند سفید آدھا سیر بدستور شربت تیار کر کے موسم گرما میں صبح و شام استعمال کریں۔

آبِ انناس چار تولہ تھوڑا نمک ملا کر صبح و شام پینے سے یرقان کا مرض جاتا رہتا ہے۔ جگر کی گرمی اور کمزوری دور ہوتی ہے۔

آبِ انناس چار تولہ میں [illegible] دو تولہ، مصری ایک تولہ ملا کر رات کو شبنم میں رکھ دیں۔ صبح کو اس کا پینا صفراوی اور دموی بخار کے لئے مفید ہے۔ اس سے گردے اور مثانہ کی پتھری زائل ہوتی ہے۔ [illegible] حالات میں تپ اور گھبراہٹ کیلئے بہت مفید ہے۔

انناس کے پتوں کو کچل کر رس نچوڑ لیں۔ اسے پھریری کے ذریعے بچھو اور بھڑ کے ڈنک کے مقام پر لگانے سے درد اور سوزش [illegible] ہے اور زہر اتر جاتا ہے۔

انناس کے چھلکے کو باریک پیس کر پھوڑوں اور ورم کے مقام پر لیپ کرنے سے پھوڑے اور ورم تحلیل ہو جاتے ہیں۔

## ۲۔ آپ کے خیالات

[illegible]

عجیب و غریب قوت ہے۔ عام لوگ یہ نہیں جانتے کہ خیالات بڑی بیش گراں مایہ ہیں۔

اگر آپ اپنے خیالات کو طریقے سے استعمال کریں تو یہ آپ کی ناکامیوں اور آپ کی غلطیوں کو آپ کے بے پناہ مرحلے میں خوشحال کرے گا۔ یہ بات وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے اپنے ذہن کو استعمال کیا ہے اور اس حقیقت سے آشنا ہوئے ہیں۔ ہماری بہت بڑی ناکامی یا بہت بڑی بدنصیبی بعض اوقات ہمارے سامنے سنہرے مواقع پیش کر دیتی ہے۔ جب تک آپ اپنی کوششوں میں اپنے خیالات کو شامل نہ کریں آپ یہ نہ معلوم کر سکیں گے کہ آپ کی صلاحیتیں کیا ہیں۔ اگر آپ ساری زندگی صرف ہاتھ سے کام کرتے رہیں تو زندگی میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکیں گے۔ لیکن اگر آپ انھیں ہاتھوں کے ساتھ اپنے خیالات سے بھی مدد لیں تو آپ زندگی کے ہر میدان میں کامیاب و کامران ہو سکتے ہیں

## ۳ • دانتوں کی حفاظت

دانتوں کی حفاظت کرنا حسن و خوبصورتی ہی کے لئے ضروری نہیں ہے۔ ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ دانت ہماری صحت کے ضامن ہیں۔ جب دانت مضبوط نہیں ہوتے تو غذا اچھی طرح نہیں چبائی جا سکتی۔

سابق شہنشاہ برطانیہ پرنس آف ویلز نے دانتوں کے ایک اسپتال کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے کہا تھا ــــــ "اگر آپ آئندہ نسلوں کو توانا اور قوم کو مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں تو دانتوں کی حفاظت پوری توجہ اور کامل شغف سے کوشش کیجئے"۔

میدے اور شکر سے تیار ہونے والی چیزوں اور گوشت کا زیادہ استعمال دانتوں کے لئے مضر ہے۔ گرم کھانے کے فوراً بعد ٹھنڈا پانی پی لینے سے بھی دانتوں کی جڑیں کمزور ہو جاتی ہیں۔

اگر آپ کی غذا میں اُن اجزاء کی کمی ہے جن سے دانتوں کی تعمیر اور نشو و نما ہوتی ہے، تو آپ کو دانتوں کی کوئی نہ کوئی تکلیف ہوتی رہے گی۔ اگر آپ کی غذا میں ہڈیوں کی تعمیر کرنے والے اجزاء کی کمی ہے تو آپ کے دانت یقیناً کمزور رہیں گے اور زیادہ دنوں تک آپ کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔

دانتوں کی حفاظت اور انھیں امراض سے محفوظ اور مضبوط رکھنے کے لئے پھل اور پھلوں کے رس کا استعمال ضروری ہے۔ گاجر، مولی، امرود، کھیرا، ککڑی، آملہ اور دوسرے پھلوں کے رس دانتوں کو مضبوط بناتے ہیں اور اُن کا سڑنا روکتے ہیں۔ ہر ترش پھل دانتوں کے لئے مفید ہے۔ خاص کر مالٹا اور سنگترہ کھانے کے بعد صاف پانی سے کلی کرنے کے بعد دانتوں کی صفائی اور چمک دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔

دانتوں کو امراض سے محفوظ رکھنے کے لئے غذا میں کیلشیم کی مناسب مقدار کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ایک جوان آدمی کی غذا میں روزانہ دس گرین کیلشیم کا ہونا ضروری ہے۔ یہ دس گرین کیلشیم چوکر سمیت آٹے کی روٹی، پتّے دار ہری سبزی پالک، شلغم، مٹر، گاجر، باتھوا، لال چولائی، سلاد، مکھن، لسّی، چھاچھ، دودھ، انڈا، پنیر اور بادام میں ملے گا۔

دانتوں کو مضبوط اور محفوظ رکھنے کے لئے ہاضمے کا درست رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ دانتوں پر پیٹ کی حالت کا بے حد اثر ہوتا ہے۔

غذا اور دانتوں کا خاص تعلق ہے۔ کھانا کھانے کے بعد کلّی نہ کرنا دانتوں کے لئے تباہ کن عادت ہے۔ کھانا کھانے کے بعد غذا کے چھوٹے چھوٹے ذرّے دانتوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ اگر انھیں صاف نہ کیا جائے تو یہ ذرّے سڑ کر بدبو پیدا کر دیتے ہیں اور اُن سے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور نتیجے کے طور پر دانت پائیوریا جیسے مہلک مرض کا شکار ہو کر اپنی صحت ہی نہیں کھو دیتے، اپنی زندگی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

دانتوں کی صفائی کے لئے نیم اور کیکر کی مسواک کرنا سب سے بہتر اور مفید عمل ہے۔

تین حصّے لاہوری نمک اور ایک حصّہ پھٹکری کا منجن بنا کر سرسوں کے تیل میں ملا کر دانتوں پر ملنا بے حد مفید ہے۔ یہ پائیوریا کی بے حد آسان، بے حد کم قیمت اور مجرّب دوا ہے۔ یہ کم قیمت منجن بازاروں میں بکنے والی قیمتی ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ پاؤڈروں سے کہیں زیادہ مفید ہے۔

## ۴ • خوف اور فکر کو دل سے دُور رکھئے

مشہور مفکّر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــــ "خوف اور فکر انسان کی بڑی کمزوری ہے۔ یہ ہمارے ذہن کو گندہ، ہماری قوتِ فیصلہ کو شل اور ہمیں پریشان کر دیتا ہے۔ کسی کام میں بھی کامیابی کے لئے لازمی ہے کہ خوف اور فکر کو ذہن کی گہرائیوں سے نکال دیا جائے۔

ایک انسان جس کا دل خوف سے معمور ہے وہ نہ صرف اپنی ترقی کے مواقع اور اپنا مستقبل برباد کر دیتا ہے۔ وہ نادانستہ طور پر اس شخص پر نامرادی کے اثرات ڈالتا ہے جس سے وہ ملتا جلتا اور باتیں کرتا ہے۔

فکر کرنے کی عادت کو ایک اٹل فیصلے سے موت کے گھاٹ اتار دیجئے کیونکہ فکر کم سے کم قیمت پر بھی حاصل کی جانے کے قابل نہیں۔ زندگی سے حاصل ہونے والی حقیر شے بھی فکر سے بہت زیادہ قیمتی ہو گی ــــــ اس فیصلے کے بعد

آپ میں [illegible] سکونِ قلب اور ترقی کی خواہش پیدا ہو جائے گی۔

[illegible] انسان کے خوف اور پریشانی سے متاثر ہوتے ہیں تو خود اور زندگی [illegible] اقدامات پر عمل نہیں کرتے۔

## ۵• خود اعتمادی پیدا کیجیے

بعض لوگ کبھی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر زندگی کے ہر میدان میں [illegible] ہیں۔ [illegible] فرق کو نہیں سمجھتے —— وہ خودی کو خود اعتمادی سمجھتے ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے —— خود اعتمادی کا انحصار انسان کے علم پر ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، لیکن خودی کا دار و مدار بیجا ری تمنا یا خواہش پر ہے۔ وہ انسان جسے اپنی چیز پر خواہ مخواہ کا غرور ہوتا ہے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس طرح وہ دوسروں کو اپنے خلاف کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو دوسروں سے اتنا بلند سمجھتا ہے کہ ان کی کسی مفید بات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ خود اعتمادی میں انسان چند عملی اقدامات کرتا ہے اور اس کے بعد اظہار کرتا ہے۔ اس کے برخلاف خودی میں انسان کسی عملی اقدام کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور خود اپنے لیے گڑھا کھودتا رہتا ہے۔

اگر آپ میں خود اعتمادی کا جوہر ہے تو دوسروں کو اس کا موقع دیجیے کہ وہ اسے آپ میں تلاش کر کے آپ کو بتائیں۔ وہ اس بات کو معلوم کر کے بہت خوش ہوں گے اور آپ کے دل سے خواہ مخواہ کی بڑائی اور غرور و تمکنت کا خیال نکل جائے گا۔ جو انسان خودی کے نشے میں ڈوبا رہتا ہے وہ مواقع کو ہمیشہ دھتکارتا رہتا ہے لیکن خود اعتماد انسان کے پاس مواقع کھنچ کھنچ کر آتے ہیں۔

## ۶• آپ ہمیشہ جوان رہ سکتے ہیں

دُنیا میں کون ایسا انسان ہوگا جو یہ راز نہ جاننا چاہتا ہو —— مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے یہ راز بتایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے —— "صحیح خیال کے ذریعے ہی ہمیشہ جوان بلکہ نوجوان بنا رہنا ممکن ہے۔ جیسا جیسا ہم اپنے آپ کو بوڑھا خیال کرتے اور محسوس کرتے ہیں، ویسے ویسے ہی ہم بوڑھے بنتے جاتے ہیں کیونکہ خیالات اور احساسات ہی ہماری صورت اور شکل کو بدل ڈالتے ہیں۔ ہماری صحت در اصل ہمارے خیالات ہی پر منحصر ہے۔

اگر دماغ میں روشن، خوش رو، خوش باش، پُر اُمید، جوانی کی تصویر رکھی جائے۔ ان شاندار کارناموں کی تصویر جو عہدِ شباب کا حصہ ہیں، جوانی کے خواب، خیالات، اُمیدوں اور تمام صفات کی، جو جوانی ہی میں بروئے کار آتی ہیں، تو تمھاری جوانی برقرار رہے گی۔ تمھارے شباب پر بڑھاپے کا سایہ نہ پڑے گا۔ تم پر عمر کا، سال و سن کا کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔ اگر تم یہ خیال کرتے رہو گے کہ تم جوان ہو تو یقیناً تم جوان ہی بنے رہو گے۔ اگر تم اپنے ذہن میں صحت اور تندرستی کی تصویر رکھو گے تو تم یقیناً تندرست و توانا رہو گے۔

## ۷• اپنی گھریلو زندگی کو پُر مسرت بنائیے

آپ کے گھر میں دولت بھری ہو، سماج میں آپ کی بڑی عزت ہو۔ لیکن آپ کی گھریلو زندگی میں سکون نہ ہو۔ آپ کی گھریلو زندگی پُر مسرت نہ ہو تو ساری دولت کا کچھ حاصل نہیں۔ باہر کی عزت آپ کو دل کی راحت نہیں دے سکتی۔

آپ اپنی گھریلو زندگی کو پُر مسرت بنانا چاہتے ہیں تو مشہور مفکر ڈیل کارنیگی کے ان مشوروں پر عمل کیجیے :-

- ہرگز ہرگز عیب جوئی نہ کیجیے۔
- اپنے ساتھی کو نیچا دکھانے کی کوشش نہ کیجیے۔
- نکتہ چینی نہ کیجیے۔
- خلوصِ دل سے داد دیجیے۔
- جس موقعے پر بھی، جب بھی آپ اپنے ساتھی کی جانب توجہ کر سکیں ضرور کریں۔
- اخلاق سے پیش آیئے۔
- بیوی بچوں میں دل و جان سے دلچسپی لیجیے۔
- شادی سے پہلے یا بعد بھی، اس موضوع پر کسی اچھی کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

---

### رسائل پر ایک نئی مصیبت

گورنمنٹ چھوٹے اور درمیانہ درجے کے اخبارات و رسائل کی مدد کرنے کے زبانی دعوے تو بہت کرتی ہے مگر عملی طور پر ان کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ ۱۴ اگست سے اخبارات اور کتب کا محصول ڈاک ناقابلِ برداشت حد تک بڑھا دیا گیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر بہت سے چھوٹے اور درمیانہ درجے کے اخبارات و رسائل کے بند ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں —— آج سے بیس سال پہلے بیسویں صدی کے پایہ کے رسائل پر فی پرچہ ایک پیسہ کے حساب سے محصول ڈاک لگا کرتا تھا۔ بعد میں دو پیسے اور پھر تین پیسے فی پرچہ ہوا اور اب ۱۴ اگست سے ۵۰ گرام کے وزن تک پرچوں پر تین پیسے کی بجائے پانچ پیسے کر دیا گیا ہے۔ رجسٹری اور وی۔ پی کی شرح میں بھی اضافہ ہو گیا ہے —— حکومت نے اگر اضافہ کی اس شرح پر نظر ثانی نہ کی تو یقیناً چھوٹے اور درمیانہ درجے کے بہت سے اخبارات و رسائل موت کی نیند سو جائیں گے۔ زیر نظر شمارہ پر ہمیں پندرہ سو روپے زائد محصول ڈاک ادا کرنا پڑا —— جون ۱۹۶۶ء سے ہندوستانی سکّے کی قیمت گرنے کے باعث درمیانہ درجے کے اخبارات و رسائل پہلے ہی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ گیارہ روپے فی رِم والا نیوز پرنٹ اٹھارہ روپے فی رِم دستیاب ہوتا ہے اور اخبارات و رسائل کو ہزاروں روپے ماہوار نقصان ہو رہا ہے۔

# سرگوشیاں

## سوال و جواب

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، سماجی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات شائع کیے جائیں گے۔ غیر اخلاقی، تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش قسم کے سوالات شامل اشاعت نہیں کیے جائیں گے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

---

**سراج الدین۔ کلکتہ**

س۔ ہندوستان میں جمہوریت کا مستقبل کہاں تک روشن ہے؟

ج۔ جمہوریت کے مخالفوں کے لیے مایوس کن حد تک! راشٹرپتی کے انتخاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی قابل رشک کامیابی اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

س۔ ہندوستان کا سب سے زیادہ زرخیز علاقہ کون سا ہے؟

ج۔ پنجاب

س۔ میں سکون کا متلاشی ہوں۔ کیا عالم خلوت میں جا بسوں؟

ج۔ خلوت میں تو پریشان کن خیالات سکون کو اور پریشان کرتے ہیں۔ سکون باہر نہیں ملتا۔ سکون کی تلاش ہے تو اپنے دل میں جھانکئے۔

---

**پروین جمال پھلواری شریف۔ پٹنہ**

س۔ فیض احمد فیض کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

ج۔ ۱۹۱۰ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

س۔ مجاز کی شاعری میں صرف انقلاب ہی انقلاب ہے یا حسن و عشق کے گیت بھی ملتے ہیں؟

ج۔ مجاز انقلابی سے زیادہ رومانی شاعر تھے۔ ان کا ایک رومانی شعر سنئے ؎

یہ آفتاب نہیں ہے کہ ماہتاب نہیں
سبھی ہے حسن مگر عشق کا جواب نہیں

س۔ ایک اچھے جیون ساتھی کی پہچان؟

ج۔ وہ اپنے جیون ساتھی کی خوشی اور خوشنودی کے لئے اپنی ہر خوشی قربان کر دیتا ہے۔

---

**حنیف خان۔ این پٹھان دھولیہ**

س۔ آج زندگی کا معیار گرتا کیوں جا رہا ہے؟

ج۔ جب ضروریات زندگی کی قیمتیں حد سے اونچی ہو جاتی ہیں تو زندگی کا معیار گر جاتا ہے۔

س۔ عورت کا مقام دنیا کے دانشمند بلند بتلاتے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ عورت کا مقام بے شک بلند ہے۔ مشہور مفکر جے برڈ نے لکھا ہے ــــ "عورت تقدیس و تعظیم کے لئے پیدا کی گئی ہے" ـــ ایک دوسرے دانشور نے کہا ہے ـــ "عورت بے شک فرشتہ ہے لیکن آزاد نہیں۔ اس لئے تو فرشتہ سے بالاتر ہے۔"

---

**محمد لقمان۔ چندن بارہ چمپارن۔ بہار**

س۔ خوشتر بھیا! ہمارے ایک دوست ہیں وہ کہتے ہیں انسان محنت سے ترقی کرتا ہے اور میں کہتا ہوں انسان قسمت سے ترقی کرتا ہے۔ اب اس کا فیصلہ آپ پر ہے۔

ج۔ انسان محنت سے ترقی کرتا ہے اور تدبیر کے نتیجے کا تقدیر نام ہے۔

س۔ آج کل دیکھا جا رہا ہے کہ جو جتنا زیادہ امیر ہے اور امیر ہوتا جا رہا ہے اور جو غریب ہے وہ غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

ج۔ یہ ارباب حکومت کی نوازش ہے!

س۔ انسان زندگی سے کب بیزار ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب زندگی کو تلخ اور زندگی کی راہ کو پرخار بنا لیتا ہے۔

---

یہ حسن ...... اور کہا

س۔ کیا کسی افسانہ کو پڑھنے کے بعد ہی اس کے عنوان پر غور کرنا چاہئیے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے کہ ویسے افسانہ ختم ہونے کے بعد ذہن پر جو تاثر طاری ہو اس کے مطابق عنوان رکھنا چاہئیے۔

س۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ اُردو کو اس کا صحیح مقام مل جائے گا؟

ج۔ آج کا انسان ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے، چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُردو کا حق دلانے کے لئے اُردو کے پرستار اسی لگن، اسی ولولے، اسی حوصلے سے آمادہ ہو جائیں تو یقیناً اُردو کو اس کا صحیح مقام مل جانا کچھ مشکل نہیں۔

---

علی اصغر آرزو۔ گیا

س۔ بھارت کے وزیر خارجہ کا نام موہن چند چھاگلہ ہے یا محمد کریم چھاگلہ؟

ج۔ محمد کریم چھاگلہ۔

س۔ آرزوؤں کی حد؟

ج۔ آرزوؤں کی کوئی حد نہیں۔ دانشمند انسان اپنی آرزوؤں کا دامن وسیع نہیں ہونے دیتا۔

---

محمد قیس حیات خنجر کورجی پٹنہ

س۔ چاند پر سے زمین کی سطح کیسی معلوم ہوتی ہے؟

ج۔ یہ تو چاند پر پہنچنے کی کوشش کرنے والے بتا سکتے ہیں۔ ہم اپنی زمین ہی کو آسمان اور اس کے نقشوں کو جہنم ہونا دیکھنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

س۔ موجودہ حکومت کی کابینہ ٹھیک تاش کے پتوں کی طرح ۵۲ وزراء پر مشتمل ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟

ج۔ اس لئے کہ تاش کے کھیل کی طرح آج کی حکومت بھی ایک کھیل ہے۔

---

ہدایت علی ساحل۔ گھیری تالیلہ بہار

س۔ زندگی میں انسان دھوکہ کب کھاتا ہے؟

ج۔ زندگی میں انسان قدم قدم پر دھوکا کھاتا ہے۔

س۔ جدید عورت؟

ج۔ جدید عورت ایسا آئینہ ہے جس میں دُنیا جدید مرد کا عکس دیکھتی ہے۔

س۔ شادی کب کرنی چاہئیے؟

ج۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد۔

---

گنگا ولی محمد ابراہیم ناز بھٹکلی۔ بنگلور

س۔ دنیا میں عزت کی حفاظت کیسے کرنی چاہئیے؟

ج۔ جان دے کر بھی!

س۔ انسان اپنے آپ کو کب بھول جاتا ہے؟

ج۔ جب یاد نہ کرنے، یاد نہ رکھنے والی باتوں کی یاد سے دل کو معمور کر لیتا ہے۔

---

شمس الحسن کاظمی گریڈیہہ۔ بہار

س۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے بہتر مستقبل کے لئے کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہئیے؟

ج۔ اپنے دل کے دامن پر احساسِ کمتری کا سایہ بھی نہ پڑنے دیں۔ اس یقین و اعتماد کے ساتھ زندگی گزاریں کہ ملک میں اُن کے حقوق بھی سب کے برابر ہیں۔

س۔ موجودہ سائنسی دَور میں مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں؟

ج۔ ہر دَور میں مذہب کی ضرورت رہی ہے۔ آج تک سائنسی دَور میں تو مذہب کی ضرورت

شدید ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ انسان انسانیت سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان خدا سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔

س۔ یہ شعر کس کا ہے؟

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

ج۔ یہ شعر کسی کا ہو۔ اچھا شعر ہے۔

---

ایم۔ آئی۔ کے۔ تاز حیدرآبادی۔ ورنگل

س۔ آپ اُردو زبان کو زندہ رکھنے کے لئے ہمیشہ جدوجہد کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سیویں صدی تو نہیں جو اُردو میں شائع ہوتا ہے؟

ج۔ آپ کا ذہن رسا بہت دُور کی کوڑی لایا ہے۔ اب تک اس حقیقت تک کسی کی نظر نہیں گئی تھی!

س۔ ہارے ہوئے وزیر اور ناکام عاشق دونوں میں کس کو زیادہ صدمہ پہنچتا ہے؟

ج۔ ہارے ہوئے وزیر کو! وزارت کی کرسی میں جو کشش ہے وہ محبوبہ میں بھی نہیں۔

---

بلقیس اطہر حیدرآباد دکن

س۔ خوشتر بھیا! بچے بوڑھوں کا مذاق کیوں اُڑاتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں، وہ ہمیشہ بچے ہی رہیں گے، بوڑھے نہ ہوں گے۔

س۔ آج کی دُنیا میں اتنی ظاہر داری کیوں ہے؟

ج۔ جب باطن میں کچھ نہیں رہتا تو ظاہر داری ہی رہ جاتی ہے۔

س۔ نصیحت تلخ کیوں لگتی ہے؟

ج۔ نصیحت بیوقوفوں کو تلخ لگتی ہے، سمجھداروں کو میٹھی معلوم ہوتی ہے۔

محمد خواجہ عبید علی صابری سدری بچہ۔ آگرہ

س۔ آج کل گدھے گھوڑوں میں کیوں ملتے ہیں؟

ج۔ یہ "ایک گدھے کی سرگزشت" کے مصنف کرشن چندر ہی بتا سکتے ہیں۔

س۔ بھیا! زمانۂ حال میں آپ سرکاری ملازمت کو ترجیح دیتے ہیں یا خانگی ملازمت کو؟

ج۔ سرکاری ملازمت بہرحال بہتر ہوگی۔

---

مہر شاہ۔ ماہ نگر۔ لکھنؤ

س۔ میں بہت دنوں سے بیسویں صدی پڑھ رہی ہوں۔ میں نے اس کے مطالعے اور معیار کی روشنی میں ایک کہانی لکھی ہے۔ آپ کو کیسے چھپنے کو بھیجوں؟

ج۔ ایڈیٹر بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۲

---

آفتاب احمد شوری۔ آسنسول

س۔ پاکستان میں مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ دس کروڑ۔

س۔ اقبال کا کوئی شعر سنائیں۔

ج۔ کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

---

محمد رفیع انصاری بھیونڈی۔ مہاراشٹر

س۔ امنِ عالم کا انحصار؟

ج۔ امن دشمن طاقتوں کے خلاف دنیا کی امن پسند طاقتوں کی تنظیم پر ہے۔

---

س۔ بھیا [illegible]
[illegible]

ج۔ انہوں [illegible]

س۔ حضرت [illegible]

ج۔ مجتبیٰ [illegible]
[illegible]

---

آفتاب عالم، جمشید پور

س۔ خورشید صاحب کسی ایسے کتب فروش کا پتہ بتلائیے جہاں اردو ادب کی بہترین کتابیں ملتی ہوں۔

ج۔ آپ بیسویں صدی کے ادارے سے ہر علم و فن کی کتابیں منگا سکتے ہیں۔

---

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر منی آرڈر یہ ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لیے پتہ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۲ لکھنا کافی ہے۔

---

**بیسویں صدی کی کشیدہ کاری** وہ کتاب جو یورپ کی بہترین کتب کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس مفید کتاب میں کشیدہ کاری کے وہ تمام نمونے پیش کیے گئے ہیں جو ہندوستان اور ولایت میں رائج ہیں۔ اور جنہیں ہندوستانی اور یورپین عورتیں بہت پسند کرتی ہیں۔ اونچے گھرانے کی معزز خواتین اور چوٹی کے زنانہ رسائل کی رائے ہے کہ کشیدہ کاری پر اس سے بہتر کتاب آج تک مارکیٹ میں پیش نہیں کی گئی۔ اردو ہندی مشترکہ زبانوں میں شائع کی گئی ہے۔ تحفہ میں دینے کے لیے بہترین چیز ہے۔ معزز گھرانے کی خواتین یہ مفید کتاب اپنی پیاری لڑکیوں کو جہیز میں دیتی ہیں۔ قیمت فی جلد صرف چار روپے

**طوفانِ بہار** روس کے عدیم المثال ناول نگار تورگنیف کا رومانی شاہکار جسے حضرت مخمور جالندھری نے اردو کا لباس پہنایا ہے جس کا ترجمہ دنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جس کا شمار دنیا کے دس عظیم رومانی ناولوں میں ہوتا ہے۔ جس کی دو کروڑ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ جسے دنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے اور جسے اردو میں پہلی مرتبہ ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ یہ ناول پاکیزہ اور دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان ہے۔ جاذبِ نظر کتابت و طباعت۔ عمدہ کاغذ، پختہ جلد۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

---

اردو کی بہترین کتابوں کے پہلی قیمتوں کے مقابلے پر نصف سے بھی کم قیمت پر

# سستے ایڈیشن

**حرف حرف** فیض احمد فیض کا تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ اور تازہ کلام ایک ہی جلد میں۔ قیمت تین روپے

**چھیڑ غالب سے چلی جائے** مرزا غالب کی زندگی اور شاعری پر فیچروں، ڈراموں اور مزاحیہ تحریروں کا خوبصورت انتخاب۔ قیمت تین روپے

**پری خانہ** واجد علی شاہ لکھنؤ کی خود نوشت داستانِ معاشقہ۔ قیمت دو روپے

**چچا چھکن** امتیاز علی تاج کے تخلیق کردہ مزاحیہ کردار کے کارنامے۔ قیمت ایک روپیہ [illegible]

**رسومِ دہلی** دہلی کے کلچر پر سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ کی مستند ترین کتاب مع مقدمہ و فرہنگ یوسف بخاری۔ قیمت دو روپے

**بہو کی تلاش اور دوسرے ڈرامے** [illegible] قیمت دو روپے

**غمِ غلط** شوکت تھانوی کا طنزیہ و مزاحیہ کلام۔ قیمت ایک روپیہ

**ٹیڑھی لکیر** اردو کا عظیم ترین ناول۔ از عصمت چغتائی۔ سستا ایڈیشن پانچ روپے۔ خاص ایڈیشن [illegible]

**آج کے ڈرامے انارکلی پر ایک نظر** تنقیدی کتاب۔ از انور [illegible]۔ قیمت ایک روپیہ

**جزیرۂ سخنوراں** غلام عباس کا مشہور طنزیہ و مزاحیہ ناول۔ قیمت ایک روپیہ

---

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۲

سید احمد ... گڑھ

س۔ آپ لفظ ... کو کس کسوٹی پر آزمایا ہے؟

ج۔ غریبی کسوٹی پر۔

س۔ زندگی صرف محبت ہی نہیں ہے اے دوست! تو اور کیا ہے؟

ج۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا!

---

عبدالحبیب خاں۔ بھلائی نگر بھلائی

س۔ زندگی سے پیار یا پیار سے زندگی ہے؟

ج۔ زندگی سے پیار!

س۔ محبت کرنا اچھا ہے یا بُرا؟

ج۔ ملک و وطن سے محبت کرنا، ماں، باپ، بھائی بہن سے محبت کرنا اچھا ہے!

---

محمد رفیع عالم جوہر۔ پٹنہ

س۔ انسان موت سے کیوں ڈرتا ہے؟

ج۔ موت سے وہی انسان ڈرتا ہے جو زندگی کی حقیقت سے ناآشنا ہوتا ہے۔

س۔ زندگی میں حسن و کشش پیدا کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ زندگی کو ... سے ... چاہئے۔

---

پرویز جمال۔ حیدرآباد دکن

س۔ علم کے فوائد؟

ج۔ علم ہی سرمایۂ بخشش گوہر مقصود ہے
بحرِ ہستی کی صدف پہ قطرۂ نیساں ہے علم
علم ہی تو پیکرِ انسانیت کی جان ہے
یہ جس کے پاس ہو وہ آدمی ہوتا ہے

س۔ دُبلا ہونے کی ترکیب بتائیے۔

ج۔ اس ہوشربا گرانی کے دور میں لوگوں کو جینے کے لالے پڑے ہیں کتنے لوگ فاقوں سے مرگئے ہیں اور آپ دُبلے ہونے کی ترکیب پوچھ رہے ہیں! مجھے اندیشہ کہ تا شوہر ... مجھے تو ... کل آپ بھی دُبلے ہو جائیں گے۔

س۔ انسان کے لئے زندگی میں سب سے مشکل کام کیا ہوتا ہے؟

ج۔ مشکلات سے شکست کھا جانے والوں کے لئے ہر کام مشکل ہو جاتا ہے۔ مشکلات کو شکست دینے کا ناقابلِ شکست عزم کر لینے والوں کے لئے زندگی میں کوئی کام مشکل نہیں ہوتا۔

---

انور حسین۔ چھپرہ

س۔ انسان اور احساس؟

ج۔ احساس سے عاری انسان انسان نہیں!

س۔ سیاست اور فریب میں کیا رشتہ ہے؟

ج۔ ایک ہی حقیقت کے یہ دو نام ہیں۔ سیاست، فریب کا خوبصورت و پُر وقار نام ہے۔

س۔ میں اس وقت ایک لطیفہ سننے کے موڈ میں ہوں۔

ج۔ لطیفہ نہیں ایک شعر سنئے ؎
ایک ڈھلتی ہوئی رات ... کی سوغات ہے
... تو

---

معراج الحسن عابدی۔ بھلائی، علیگڑھ

س۔ عبادت و صداقت میں کس کا درجہ بڑا ہے؟

ج۔ صداقت بداماں، صداقت بکنار، عبادت کا!

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ آج کے دور میں تو ——— زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا!

---

باقر علی پرواز۔ رام گڑھ کینٹ

س۔ منزل کی جستجو میں خود ہی گم ہو جائے تو؟

ج۔ ایسے جستجو کرنے والوں کے منزل خود قدم چومتی ہے۔

س۔ عشق اگر آگ کا دریا ہے تو حسن؟

ج۔ بھائی جان! ایک عشق ہی علاجِ غمِ زندگی نہیں!

---

بشیر احمد۔ ہندو پور۔ آندھرا

س۔ "بیسویں صدی" میں آپ نے کبھی فرقہ وارانہ فسادات پر، فرقہ پرستوں کی مذمت نہیں کی؟

ج۔ ہم جس خلوص اور بیباکی سے فرقہ پرستوں کی مذمت کرتے ہیں، کم لوگ کرتے ہوں گے۔

---

فرزند فاروقی۔ بجنور

س۔ کیا دُکھ میں سُکھ پوشیدہ ہے؟

ج۔ جی ہاں، دُکھ کے بغیر سُکھ نہیں ملتا۔

س۔ آنکھوں میں اندھیرا کب چھا جاتا ہے؟

ج۔ جب دل میں اندھیرا چھا جاتا ہے جب ماحول پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

---

محمد عبدالرحیم۔ ناپلی حیدرآباد دکن

س۔ بعض لوگ تنقید نگار سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ بیشتر تنقید نگار صرف تنقیص کے لئے تنقید کرتے ہیں۔

س۔ اگر شوہر شاعر، بیوی شاعرہ، لڑکا لیڈر اور لڑکی فلمی اداکارہ ہو تو گھر کی کیا رونق ہوگی؟

ج۔ ایسا گھر دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکل جائے گا۔
این خانہ تمام آفتاب است!

س۔ گرما کی تعطیلات کا اہم مصرف؟

ج۔ یہ تو اپنے اپنے ذوق پر منحصر ہے۔

---

محی الدین احمد محمد لقمان مرادآباد

س۔ شکستہ تر بہ حالت میں بھی ایمان داری کہاں تک عقلمندی یا بیوقوفی ہے؟

ج۔ ایمانداری ہر حالت میں عقلمندی ہے۔

س۔ اردو ہی سے بالخصوص آپ کی محبت کی وجہ؟

ج۔ اس لئے کہ اُردو سب سے اچھی زبان ہے۔

س۔ ہندوستان میں ہندوستانیت کا مستقبل؟

ج۔ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔

---

نجمہ انصاری بھیونڈی

س۔ محنت کرنے کے باوجود کامیابی حاصل نہ ہو تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ جد و جہد جاری رکھنی چاہئے۔ جد و جہد کبھی رائیگاں نہیں جاتی ؎

اے شکوہ سنج شوخیٔ تقدیر دیکھنا
ذوقِ عمل ہی تیرا کہیں خام تو نہیں

س۔ کوئی حیات افروز شعر سنائیے۔

ج۔ ہم سببِ طوفاں کا خوف کھا کر یوں کر لو ناخدا کی خواہش
میں مدتوں سے اپنی کشتی کا آپ ہی ناخدا رہا ہوں

س۔ اُمید؟

ج۔ اُمید و ناامیدی کا باہم ہونا وہی جانے
کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہو ساحل سے

---

احمد حسین ساحل ہارونی۔ کوٹہ۔ راجستھان

س۔ میں اپاہج ہوں۔ پھر بھی میری محبوبہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ خوشتر بھیا! بتائیے میں کیا کروں؟

ج۔ اُسے سمجھائیے اُس کی زندگی تباہ نہ کیجئے۔

س۔ خوشتر صاحب انسانوں میں انسانیت کیوں ختم ہو گئی؟

ج۔ یہ ٹھیک کہ ہم بھی موجود ہیں ؎
آدمی آدمی کے پیکر میں
اور کچھ ہوگا آدمی نہ رہا

س۔ میں انٹرمیڈیٹ پاس ہوں اور درزی کا کام کرتا ہوں۔ مجھے نوکری پسند نہیں۔ لوگ مجھے طعنہ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں اتنا پڑھا اور بھاڑ جھونکا! آپ بتائیے کیا میں غلط راہ پر ہوں؟

ج۔ دوسرے کی ملازمت سے اپنی مزدوری کہیں اچھی ہوتی ہے۔ نوکری بندگی بےچارگی ہوتی ہے۔

---

سید قدرت علی جلگاؤں

س۔ خوشتر صاحب! دلی سکون کب ملتا ہے؟

ج۔ دوسروں کی بھلائی کر کے۔ دوسروں کو خوشی دے کر۔

س۔ سیاست سے کیا فائدے ہیں؟

ج۔ سیاست کے طفیل ایک نااہل بھی لیڈر اور منسٹر بن جاتا ہے۔

---

حسین عزمی بارکس حیدرآباد

س۔ کیا شیخ عبداللہ کشمیری شاعر ہیں یا ادیب؟

ج۔ شیخ عبداللہ لیڈر ہیں۔ شیخ عبداللہ کے بارے میں یہ سوچنا شاعری ہے!

---

انجم نکہت آرزو۔ پٹنہ

س۔ انسان کی سب سے پہلی اور آخری خواہش کیا ہوتی ہے؟

ج۔ ہر انسان کی ایک ہی خواہش نہیں ہوتی۔ ایڈیٹر کی خواہش اور ہوتی ہے منسٹر کی خواہش کچھ اور۔

س۔ اگر انسان کی ساری خواہشیں پوری ہو جائیں تو؟

ج۔ مکمل آسودگی زندگی کی موت ہے۔

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

---

نصیر احمد قریشی۔ احمدآباد

س۔ کیا ذکر کی چھاؤں میں شکست پلتی ہے؟

ج۔ جی ہاں کسی نے کہا ہے ؎
غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں!

س۔ کیا سچا شاعر پیغمبری کا کام انجام دے سکتا ہے؟

ج۔ سچا شاعر پیغمبری کا کام تو انجام نہیں دے سکتا۔ لیکن مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں ارشاد فرمایا ہے ؎
شاعری جزویست از پیغمبری

س۔ ماں کی مامتا اور محبوب کی اُلفت میں کتنا فرق ہے؟

ج۔ ماں کی مامتا کا جواب نہیں۔

---

خواجہ کلیم الدین محمود۔ کریم نگر۔ آندھرا

س۔ کامیابی کا راز کیا ہے؟

ج۔ عزم محکم جہد پیہم!

س۔ انسان کا سب سے پہلا فرض کیا ہے؟

ج۔ صحیح معنوں میں انسان بننا۔



[illegible] پبلشر خوشتر گرامی ——— مطبوعہ [illegible] دہلی [illegible]

BISWIN SADI
YEAR OF PUBLICATION
Telephones Office 271637 Residence



# بیسویں صدی

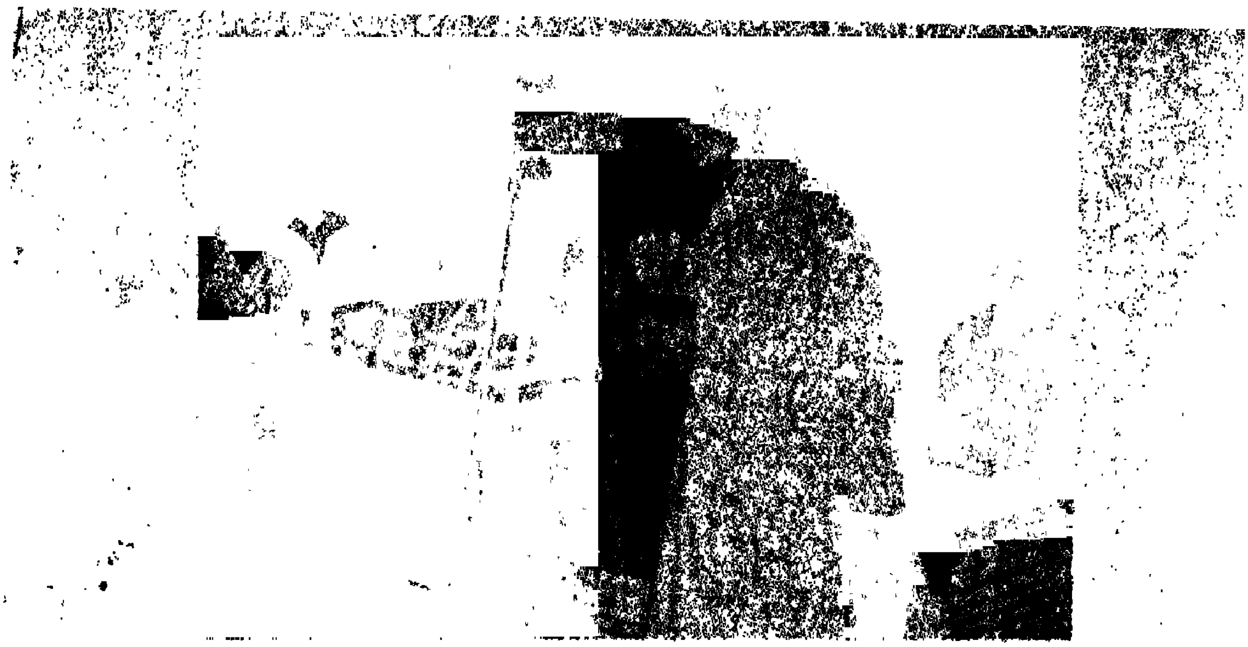
نومبر



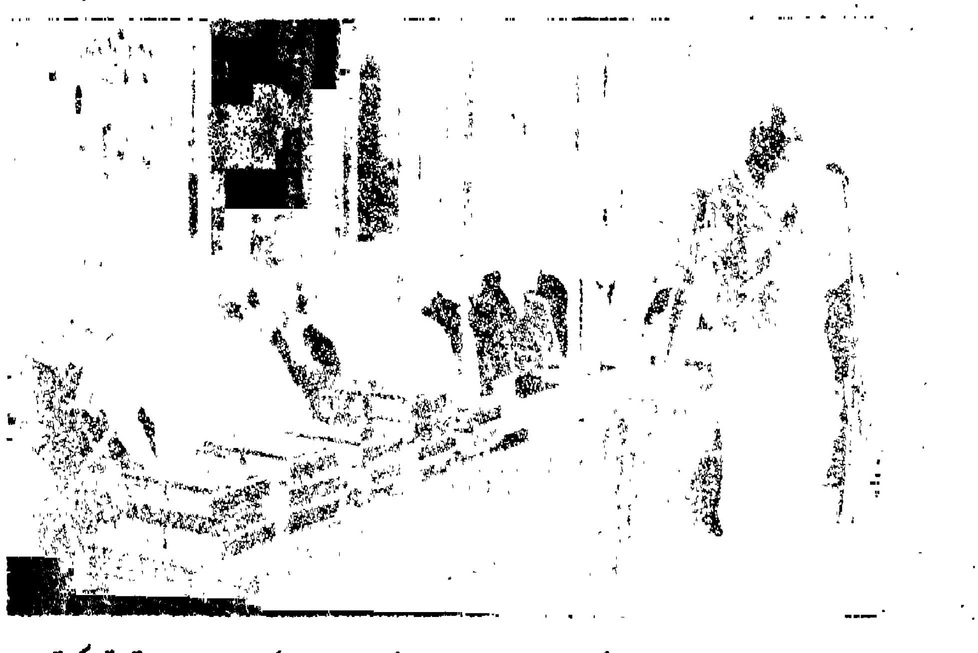


آنکھوں میں سحر چھلک رہی ہے گویا
ہونٹوں سے شفق ڈھلک رہی ہے گویا
یوں پھیلے ہوئے جسم میں رقصاں ہے شباب
پیمانے سے مے چھلک رہی ہے گویا

نریش کمار شاد ——— فوٹو: سورج. این. شرما جے پور



ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے عظیم الشان، تاریخ ساز اور مبسوط "کرشن چندر نمبر" کی اشاعت کے بعد بمبئی میں "یوپیا" کے زیرِ اہتمام ایک عظیم جلسہ ہوا جس میں بمبئی کی برگزیدہ ادبی شخصیتوں نے حصّہ لیا اور کرشن چندر کے علاوہ ماہنامہ "شاعر" کے مدیرِ اعلیٰ حضرت اعجاز صدیقی کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ـــــ اعجاز صاحب گزشتہ اڑتیس سال سے اُردو زبان و ادب کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔ "شاعر" کا ۷۲۸ صفحات کا دیدہ زیب اور معیاری کرشن چندر نمبر" مرتب کرکے انھوں نے ہندوستان کے اُردو رسائل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے ـــــ جناب اعجاز صدیقی تقریر فرما رہے ہیں۔



جلسے میں جناب کرشن چندر کے چھوٹے بھائی، مدیر "شاعر" کے دستِ راست اور اُردو کے نامور افسانہ نگار جناب مہندر ناتھ تقریر کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں ـــــ "کرشن میرے بڑے بھائی اور بڑے پیارے بھائی ہیں۔ اِس کے علاوہ وہ بہت بڑے ادیب بھی ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی شخصیت اور فن کے بارے میں کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ بہرکیف اگر "شاعر" کا کرشن چندر نمبر پڑھ لیا جائے تو اُن کی شخصیت اور اُن کا فن سب کے سامنے آئینہ ہوگا۔ اعجاز صاحب کی خدمات بہت طویل و عظیم ہیں۔ انھیں بجا طور پر ہندوستان کا "بابائے اُردو" کہا جا سکتا ہے"۔



نامور افسانہ نگار خاتون سلمیٰ صدیقی کو بھی سامعین کے اصرار نے تقریر کے لئے بُلا ہی لیا اور سلمیٰ نے کرشن چندر کی شخصیت کو موضوعِ تقریر بناتے ہوئے فرمایا ــــ "کرشن کی زندگی ایک عام انسان ہی کی سی ہے۔ وہ بہت سیدھے سادے نیک انسان ہیں۔ کرداروں کو ڈھونڈنے کے لئے وہ معمولی معمولی آدمیوں تک پہنچ جاتے ہیں اور فٹ پاتھ تک پہنچنے میں بھی اُنھوں نے کبھی گریز نہیں کیا۔" ــــ تصویر میں بائیں طرف واجدہ تبسم کے شوہر جناب اشفاق موجود ہیں۔



واجدہ تبسم اپنی کہانیوں میں جتنی بے باک اور شوخ ہیں تقریر کے میدان میں اُتنی ہی محتاط اور سنجیدہ ہیں۔ بہرکیف اپنی "شارٹ لپ" تقریر میں فرما رہی ہیں ــــ "مجھے کرشن چندر سے بے حد عقیدت ہے۔ میں اُن کی فنّی اور تخلیقی عظمت کی ہمیشہ سے قائل رہی ہوں۔"



پچھلے دنوں چیمسفورڈ کلب نئی دہلی میں حضرت عرش ملسیانی کے سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے، عمر گراں مایہ کے ۷۵ سال گزارنے، اور اُن کے تیسرے مجموعۂ کلام "شرارِ رنگ" کے اجرا کی تقریب میں ایک عظیم ادبی محفل ہوئی جس کی صدارت جناب دی بشنکر آئی۔سی۔ایس سکریٹری وزارتِ خارجہ نے فرمائی۔ اور جس میں بے شمار مقامی شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے علاوہ مہمانِ خصوصی کے طور پر حضرت جوش ملیح آبادی بھی شریک ہوئے اور انھوں نے عرش صاحب کی ذات اور شاعری سے متعلق اپنا مختصر لیکن بصیرت افروز مضمون پڑھا۔



اس پُرکیف ادبی تقریب میں دوسرے مقرّرین کے علاوہ عرش صاحب کے پُرانے مزاج داں، رفیقِ خاص اور یارِ غار جناب گوپی ناتھ امن نے بھی بڑی دلچسپ اور معلومات افزا تقریر فرمائی اور خوش طبع عرش صاحب کی شاعری اور طبّاعی کے متعدد واقعات بیان کئے ــــــ سامعین میں کرشن موہن، خوشتر گرامی، ساحر نظامی، زکیہ سلطانہ نیّر اور رنبیرجی کی صورتیں نمایاں ہیں۔



اُردو صحافت کے میرِ کارواں اور روزنامہ "ملاپ" کے چیف ایڈیٹر جناب رنبیر پچھلے دنوں جب آل انڈیا نیوز پیپر ایڈیٹرز کانفرنس کے انیسویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرنے کے لئے حیدرآباد پہنچے تو سکندرآباد کے اسٹیشن پر ارکانِ استقبالیہ کے علاوہ وزیرِ مال شری وی۔بی۔راجو اور وزیرِ اطلاعات شری کوشٹالکشمی بائی جی نے بھی آپ کا خیر مقدم کیا اور حیدرآباد کی بعض سماجی اور ادبی انجمنوں نے بھی اِس ہر دل عزیز اور بلند مرتبت صحافی کی گل پوشی کی۔



راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین اِس تاریخی کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لئے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اجلاس شروع ہونے سے پہلے رنبیر جی نے اپنے مخصوص متبسم انداز میں اُن سے کہا ــــــ "چند سال پہلے بھارت کے چھوٹے اور درمیانے درجے کے اخبار نویسوں کو اپنی ایک الگ تنظیم قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی تاکہ وہ بھی اپنے مفاد کا تحفظ کر سکیں۔ اس صورتِ حال کی ذمہ داری اُن بڑے اخباروں پر ہے جو چھوٹے اخباروں کے حقوق کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ میں چھوٹے بڑے کے اِس اختلاف کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور اِس کارِ خیر کے لئے مجھے آپ کی آشیرواد درکار ہے۔"

"میری دعا ہے کہ آپ اپنے مشن میں کامیاب ہوں" جناب ڈاکٹر ذاکر حسین نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

ٹیلیفون دفتر ...... ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ...... ۶۱۹۹۲۷


۱۔ تیرِ نظر — خوشتر گرامی — ۹
۲۔ زبیری — خوشتر گرامی — ۱۴
۳۔ دُنیا کی سب سے بڑی کتاب — کرشن چندر۔ ایم۔ اے — ۱۵
۴۔ غزل — کرشن موہن۔ ایم۔ اے — ۲۱
۵۔ سانولی لڑکی — پروفیسر ڈاکٹر حامدی کاشمیری۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی — ۲۳
۶۔ غزل — پروفیسر بیتاب پیلی بھیتی۔ ایم کام (علیگ) — ۲۹
۷۔ غزل — سید حباب ترمذی — ۲۹
۸۔ کارسپانڈنس — پرنسپل جوگندر پال۔ ایم۔ اے — ۳۱
۹۔ غزل — پروفیسر عبدالتہ عرفان۔ ایم۔ اے — ۳۳
۱۰۔ سایہ زُلف کا — عظیم اقبال۔ ایم۔ اے — ۳۵
۱۱۔ غزل — پروفیسر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا۔ ایم۔ اے — ۳۸
۱۲۔ غزل — مس عز آرا اشفاق — ۳۸
۱۳۔ عشق کی ریس — زکی انور۔ ایم۔ اے — ۳۹
۱۴۔ غزل — سید جرّار حیدر جرّار۔ بی۔ اے — ۴۵
۱۵۔ غزل — چندر پرکاش جوہر بجنوری — ۴۵
۱۶۔ غزل — کیفت احمد صدیقی — ۴۵


قیمت فی پرچہ

۱۷۔ تمہید ——— تحسین سرور، ایم اے ——— [illegible]
۱۸۔ حدیثِ دل ——— محفلِ شعراء ——— [illegible]
۱۹۔ گفتگو ——— محفلِ شعراء ——— [illegible]
۲۰۔ ماہِ نو ——— سہیل احمد، بی اے، ایل ایل بی ——— [illegible]
۲۱۔ غزل ——— اختر مشتاق رحیم آبادی ——— ۴۱
۲۲۔ غزل ——— پورن کمار ہوش ——— ۴۱
۲۳۔ شانِ نزول ——— نریش کمار شاد ——— ۴۳
۲۴۔ منظر پسِ منظر ——— شعیب شمسی، ایم اے ——— ۴۹
۲۵۔ غزل ——— نذیر اختر ——— ۶۴
۲۶۔ غزل ——— قمر انصاری بدایونی ——— ۶۴
۲۷۔ غزل ——— محمود نشتری کامل ملیگ ——— ۶۴
۲۸۔ دل ریزہ ریزہ ——— ناز قادری، بی اے (آنرز) ——— ۶۵
۲۹۔ خط لکھیں گے ——— لشکر غزنوی ——— ۶۹
۳۰۔ عمر شاید نہ کرے آج وفا ——— ولایت علی ——— ۸۳
۳۱۔ صحت و زندگی ——— اجوائن، ایک مفید چیز ——— قبض کشا گولیاں ——— یقین، ایک مقناطیسی قوت
کپاس کی غذائی و دوائی اہمیت ——— ایک بڑی غلطی ——— کامیابی کا راز ——— آج کا انسان ——— ۸۷
۳۲۔ سرگوشیاں ——— ۹۱

# تیر و نشتر

• "بناسپتی کی قیمتوں میں کمی" ایک خبر ــــ مگر بناسپتی کا استعمال بند ہونے کا خطرہ پیدا ہوا۔

• "بھوکوں پر لاٹھی چارج" ایک خبر ــــ لاٹھیاں کھا کر تو پیٹ بھر گیا ہوگا۔

• "یوپی میں جہالت کا اضافہ" ایک خبر ــــ جدید قسم کے لیڈر پیدا ہوں گے۔

• "راجہ کی راجستھان یونیورسٹی میں" ایک خبر ــــ ہے کوئی صاحب جو اپنی راج گدی پیش کرے۔

• "پنجاب کے سابق وزیروں کے گول مال کی تحقیقات شروع ہوگئی" ایک خبر ــــ موجودہ وزیروں کی تحقیقات کے لئے ان کے سابق ہونے کا انتظار کیا جائے۔

• "دلّی میں گندی بستیوں کی صفائی" ایک عنوان ــــ اس سے زیادہ ضروری دلّی سے گندی سیاسی جماعتوں کو صاف کرنا ہے۔

• "مسٹر بلراج مدھوک پیشہ ور ایجی ٹیٹر ہیں" کشمیر کانگریس کے صدر سید میر قاسم کا بیان ــــ اور مشہور یہ ہے کہ پروفیسر ہیں۔

• "طالب علموں کو سیاست میں نہیں گھسنا چاہئے" مرکزی وزیر قانون کا بیان ــــ اس لئے کہ یہ گھسنے کی جگہ نہیں، یہاں تیرا جاتا ہے۔

• "منافقت نے جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے" ایک عنوان ــــ البتہ فرقہ پرستوں اور فسادیوں کا نام تو روشن ہوگیا۔



• "مرارجی ڈیسائی نے امریکی پریس کلب میں ہندوستان کی تصویر پیش کی" ــــ ایک عنوان




ہندوستانی:- میرے لئے کہاں جگہ ہے؟

• پنجاب کے جیل میں کالج "ایک عنوان ـــــ دیکھیں اب کون کون لیڈر اپنے بچوں اور رشتے داروں کے بچوں کو اس میں داخل کرانے کی کوشش اور سفارش کرتا ہے۔

• کلکتہ میں تھیٹر کے باہر لاٹھی چارج "ایک خبر ـــــ ایک ڈرامہ اندر ہو رہا تھا۔ ایک باہر شروع ہو گیا۔

• سماجی بہبود کا کام "ایک عنوان ـــــ وزیروں اور سیاسی لیڈروں کی طرف سے اپنے عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں کو ٹھیکے، پرمٹ، لائسنس اور کوٹے دلانا۔

• یو۔پی میں صنعتی قرضوں کا غلط استعمال ہو رہا ہے "ایک خبر ـــــ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ کیا یو۔پی، کیا سی۔پی۔ بیدردنا سارے دیش کا رونا ہے۔

• بھکاری کی وصیت "ایک عنوان ـــــ بیٹا! کبھی وزارت نہ مانگنا۔

چھن جائے گی تو کہیں کے نہ رہو گے۔ گھر کے بھی جاؤ گے اور گھاٹ کے بھی۔

• راجستھان میں فرنٹ کا ایک اور ممبر فرنٹ میں شامل ہو گیا "ایک خبر ـــــ یوں کہئے کہ فرنٹ کا ایک ممبر اور فرنٹ ہو گیا۔

• تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لئے تعلیمی کانفرنس ہوگی "ایک خبر ـــــ جس میں تقریریں ہوں گی، ریزولیوشن منظور ہوں گے، لنچ اور ڈنر ہوں گے اور آخر میں ـــ عمل صفر۔

• چینی کے متعلق حکومت ہند کی پالیسی میں تبدیلی "ایک عنوان ـــــ جس سے عوام میں زبردست بے چینی۔

• جن سنگھ دلی میں اردو کو مٹانا نہیں چاہتا "ایک عنوان ـــــ اردو پھر بھی نہ مری تو کیا ہو گا۔





ہندوستان میں سیاحت کے بین الاقوامی سال کا آغاز

• مرارجی ڈیسائی کی بی پوشش کاغذی لباس پہنیں گی: ایک خبر ——— داد دیجیے مرزا غالب کی روشن ضمیری کی کہ انہوں نے بہت پہلے اس کی تصویر دیکھ کر کہا تھا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

• دل بدل کرنے والوں کو دس سال قید با مشقت کی سزا: ایک عنوان ——— اور جو ایک پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر اور دوسری پارٹی میں شامل ہو کر دل بدل کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کیا حکم ہے۔

• جن سنگھ کے صدر شری بلراج مدھوک نے مسز اندرا گاندھی کو نکالی بتاتے ہوئے کہا: ہمیں کام کے لیڈر چاہئیں ——— اور ہمیں ایسے لیڈر نہیں چاہئیں جو امریکہ کے ایجنٹ ہوں۔ کھائیں ہندوستان کا اور گائیں امریکہ کا۔

• روس کی امداد پر بھروسہ نہ کرنا: ماسکو پہنچ کر صدر ایوب کو چین کی وارننگ ——— بلکہ چین کی دوستی پر بھروسہ کرنا۔ چچا غالب نے کیا خوب کہا ہے

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

• اپنے مفاد پر ملک کے مفاد کو مقدم رکھو: مسز اندرا گاندھی ——— آپ نے اپنے ہی فلسفے کی بات کہی۔ ملک تو آپ کا ہے۔ آپ خیال رکھیں۔

• بوڑھے مریضوں کو مرنے دو۔ لندن کے ہسپتال کا انوکھا حکم: ایک عنوان ——— انوکھے پن کی کیا بات ہے۔ ہمارے یہاں بچوں کا فیملی پلاننگ ہے۔ وہاں بوڑھوں کا فیملی پلاننگ شروع کیا جا رہا ہوگا۔

• پاکستان میں مسٹر بھٹو نئی پارٹی بنا رہے ہیں: ایک خبر ——— اور اب تک کیا بھاڑ جھونک رہے تھے۔

• دہرہ دون میں بازاری مجنوں گرفتار: ایک خبر ——— اور لیلیٰ بیچاری پر کیا گزری ہوگی۔



"چین اُلٹی سیدھی باتیں کرتا ہے" وزیراعظم لنکا کا بیان —— سیدھی بالکل نہیں اُلٹی ہی اُلٹی باتیں کرتا ہے۔

---

"جنوبی ہند کے متعصب ہندی دشمن لوگوں کے خلاف کارروائی کی جائے" الٰہ آباد کے جلسے میں مطالبہ —— اور رانچی کے متعصب اُردو دشمن لوگوں کے بارے میں کیا ارشاد ہے۔

"مشتعل سینا کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں ہوگی" مرکزی وزیر قانون کا بیان —— یہ حق وزیر قانون کے حق میں محفوظ ہے۔

"ہندی کو وطن پرستی کے ساتھ وابستہ کرنا حماقت ہے" یو۔پی سوتنتر پارٹی کے لیڈر کا بیان —— معلوم ہوتا ہے آپ نہ ہندو ہیں نہ ہندوستانی۔ آپ کا دھرم یہ ہونا چاہیے۔ ہندی، ہندو، ہندوستانی۔

"بس کے حادثے میں پندرہ زخمی" ایک خبر —— بس مسافروں کی بے بسی۔

"اخبار نویس بھوت کے پھندے میں" ایک خبر —— یوں کہیے بھوت کو بھوت چمٹ گیا۔

"راجستھان میں شکار کے جانوروں کی قلت" ایک خبر —— انسانوں سے تو جانوروں کا فیملی پلاننگ ہی کامیاب رہا۔

"ہماری قومی بیداری اور آزادی کی تحریک میں اُردو شاعری نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں" دلی ایڈمنسٹریشن کے جریدہ "پیام دلی" میں شائع شدہ دلی کے لیفٹیننٹ گورنر کی تقریر —— لہٰذا آزادی کے بعد قومی تعمیر اور آزادی کے استحکام کے لئے اُردو کو اس کا جائز حق اور صحیح مقام دینے کی ضرورت نہیں۔

"کمیونسٹ پارٹی نے نوجوان بیوی جن سنگھ سے شادی کر لی ہے" [illegible] —— نوجوان بیوی ملے تو اچھے اچھے نظریات قربان کر دیتے ہیں۔

"چور بھاگنے کی کوشش میں ناکام ہوگیا۔" ایک خبر ——— اور اس طرح زندگی کی بازی ہار گیا۔

"دو ہزار سے قبل ہی دلّی میں شکاگو کے نظارے۔" ایک عنوان ——— مقامِ شکر ہے کہ ہم بھی امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کی صف میں پہنچ گئے۔

"ایک ہی مرد سے چار بار شادی۔" ایک خبر ——— مزیدار ہانڈی ہو تو بار بار پکائی جاتی ہے۔

"چور اپنے جوتے چھوڑ بھاگا۔" ایک خبر ——— بھاگتے چور کی لنگوٹی سمجھ کر رکھ لئے جائیں۔

"دلّی ایڈمنسٹریشن کی بیوپاریوں سے ملی بھگت۔" ایک عنوان ——— جب انھوں نے زیل سنگھ کو کامیاب کر دیا ہے تو ملی بھگت میں کیا حرج ہے۔

"آئندہ برس ملکی پیداوار سے اناج کی ضرورت پوری ہوجائے گی۔" ——— کی یقین دہانی ؎

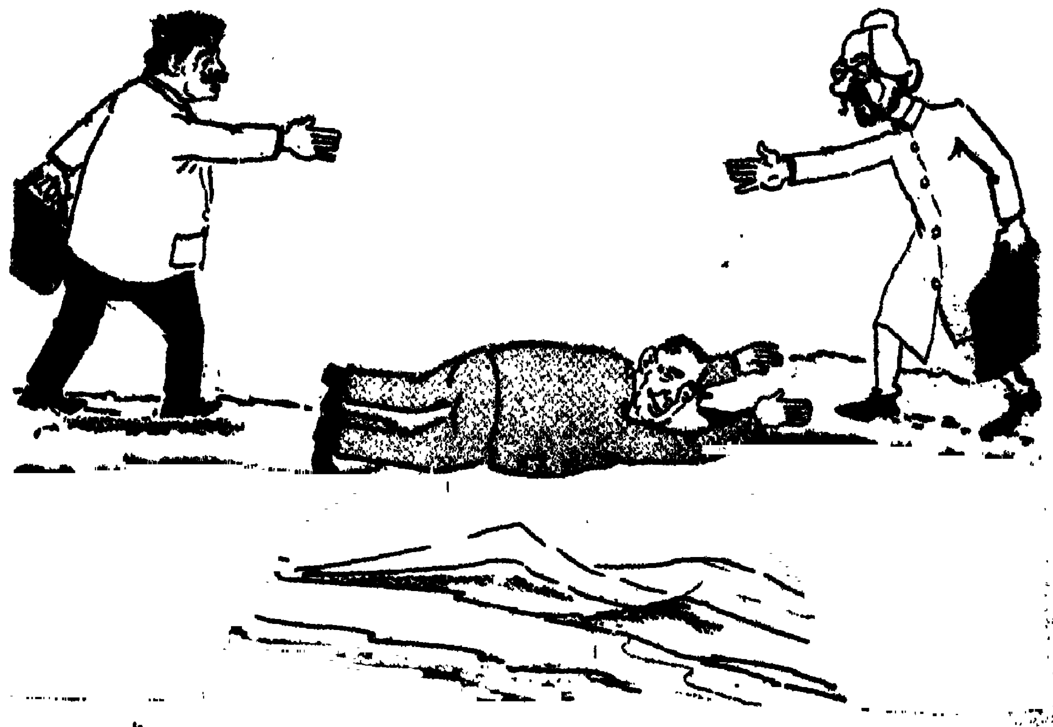
ترے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

"فارموسا نے جنگ کی تیاریاں تیز کر دیں۔" ایک خبر ——— مینڈک کو بھی زکام ہوا۔

"نشانہ بازی کا مقابلہ۔ بڈھے بھی شریک ہوں گے۔" ایک خبر ——— کہیں وہ بیچارے خود نشانہ نہ بن جائیں۔

"ہندوستان میں اندھوں کے لئے آنکھوں کا بنک۔" ایک عنوان ——— قائم کر کے بصیرت و بصارت کا ثبوت دیا۔

"وزارتِ تعلیم کا افسر لاپتہ۔" ایک خبر ——— بکارِ سرکار گم شد۔



"ہند اور پاکستان کے تعلقات بہتر بنانے کے لئے اعلانِ تاشقند بہترین بنیاد ہے۔" وزیراعظم روس

گہرا گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، لمبی اور اونچی ناک،
کلین شیو، کرزنی چہرہ، کھدر کا لمبا کرتہ، کھدر کا چوڑی دار پاجامہ
اس پر جواہر کٹ واسکٹ، کشتی نما کشمیری ٹوپی۔ یہ ہیں اردو کے ایک
عظیم اخبار روزانہ "ملاپ" کے عظیم ایڈیٹر ——



خود بھی صرف رنبیر لکھتے ہیں۔ احباب بھی پیار سے رنبیر جی کہتے ہیں۔ کشمیری
ٹوپی کے نیچے ایک سنگلاخ چٹیل زمین ہے۔ بال کم و بیش تمام گردشِ
لیل و نہار کی نذر ہو چکے ہیں اور کچھ دانت دندان شکن صحافتی معرکہ
آرائیوں کی نذر —— تحریکِ آزادی میں پھانسی کے تختے
سے بچے ہیں۔ قلم میں دیش بھگتی اور حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔
قد چھوٹا ہے، دل بہت بڑا ہے۔ دوستوں کے دوست تو سبھی
ہوتے ہیں۔ یہ دشمنوں سے بھی پیار کرتے ہیں —— اب آل انڈیا
نیوز پیپر ایڈیٹرز کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے ہیں جو پوری اردو صحافت
کے لئے وجہِ امتیاز اور باعثِ فخر و مسرت ہے۔ اردو سے انہیں
محبت ہے۔ اردو کے حق میں درد بھرے مضامین لکھتے ہیں۔ خود
لیڈر بننا پسند نہیں کرتے۔ لیڈر گر ہیں مگر لیڈروں سے
اچھی تقریریں کرتے ہیں۔ اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی ——
مدیر "بیسویں صدی" کو ان سے والہانہ عشق ہے۔ ط

# دُنیا کی سب سے بڑی کتاب

کرشن چندر۔ ایم۔ اے

گرونواس، فنشینگ روڈ، کھار۔ بمبئی ۵۲

۱۲ ستمبر ۶۷ء

برادرم خوشتر صاحب! آداب

اِس خط کے ساتھ آپ کو ایک افسانہ "دُنیا کی سب سے بڑی کتاب" بھیج رہا ہوں اِس کے بعد بہار کا سفرنامہ شروع کروں گا۔ عنوان ہے "بمبئی سے بہار تک" اگر مناسب سمجھیں تو اعلان کر دیں۔ اُس سفرنامے کے بعد جرمنی کا سفرنامہ شروع ہوگا۔ یہ دونوں سفرنامے آپ ہی کو دوں گا۔ اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے اور آپ کے پاؤں کی تکلیف بھی پہلے سے بہت کم ہو گئی ہوگی . . .

مخلص ——— کرشن چندر

---

"کتاب . . . ہاں کتاب . . . وہ کتاب تو میں ضرور لکھوں گا" رفیق حسین نے بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا: "اور وہی ایک کتاب میری زندگی کا حاصل ہوگی!"

"مگر کب لکھوگے وہ کتاب؟" ظفر نے جھنجلا کر پوچھا: "بیس برس سے یہی سُن رہا ہوں۔ اب شروع کر رہا ہوں۔ اب شروع کر رہا ہوں۔ کب آئے گی وہ نیک ساعت؟"

"بس ایک ذرا فہمیدہ کی شادی کر لوں" رفیق نے ظفر کی طرف جھک کر بڑی گرمجوشی سے کہا: "پھر لکھوں گا کتاب!"

کتاب کا ذکر کرتے ہی رفیق کے چہرے پر ایک عجیب روشنی پھیل گئی۔ آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک آگئی اور وہ اپنے تابناک ادبی مستقبل کے زرفشاں لمحوں میں کھو گیا۔

رفیق اور ظفر دونوں بچپن کے دوست تھے۔ میٹرک تک ساتھ پڑھتے رہے۔ پھر رفیق کالج میں چلا گیا۔ ظفر کے ماں باپ غریب تھے۔ اِس لئے وہ تعلیم آگے جاری نہ رکھ سکا۔ یوں بھی اُسے نصاب کی کتابوں سے بہت کم دلچسپی تھی۔

سکول کی کتابیں کھولتے ہی اُسے جماہیاں آنے لگتی تھیں۔ ہاں شعر و شاعری، ناولوں اور قصے کہانیوں میں اُس کا جی بہت لگتا تھا۔ جب رفیق حسین بی۔ ایس۔ سی میں داخل ہوا، اُس وقت تک ظفر ایک مشہور ادیب بن چکا تھا۔ اُس کے کلام کے دو مجموعے اور تین ناول چھپ چکے تھے۔ موقر ادبی جریدوں میں اُس کا نام عزت اور احترام سے پیش کیا جانے لگا تھا۔ فاضل تنقید نگار ممتاز نوجوان ادیبوں میں اُسے نمایاں درجہ دیتے تھے۔ محتاط سے محتاط ناشر بھی اب اُس کی کتابوں کی آدھی رائلٹی تک ادا کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر چکے تھے۔ ادب کے سب سے بڑے نقاد جمال احمد جمال نے اِس کی کتاب "سرمایۂ گل" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "اگر ظفر نے شاعری کے پیرہن میں محض لطفِ سخن کی خاطر وارداتِ رنج و محن کو سمیٹتے ہوئے ذاتی لگن کے انعکاف میں خلاقانہ شاعری کے علائم ترک کر دئے تو ایک دن وہ بہت بڑا ناول نگار ہوگا ———"

ظاہر ہے اس تبصرے کے بعد کسی کو اِس کے بارے میں تذبذب کیوں ہوتا۔ ظفر نے خیرپور کی نگینہ بیکری میں جہاں وہ کلرک کی حیثیت سے ملازم تھا، اپنا استعفیٰ داخل کر دیا اور اپنی پوری زندگی ادب کے لئے وقف کر دینے کا مصمم ارادہ لے کر دلّی چلا آیا، کہ یہ شہرِ دلپذیر ہمیشہ سے باکمالوں کے خیالوں کا مرکز بنتا رہا ہے۔ خیرپور سے دلّی ہجرت کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں ظفر کا جگری دوست رفیق حسین بی۔ ایس۔ سی میں پڑھتا تھا۔

رفیق حسین بھی ادیب بننا چاہتا تھا۔ ظفر کی طرح اُسے بھی ناولیں پڑھنے اور قصے کہانیاں گھڑنے کا شوق تھا۔ میٹرک تک دونوں دوست اکثر ایک ہی موضوع پر خامہ فرسائی کیا کرتے اور اپنے اُستادوں سے داد پاتے بلکہ اکثر رفیق زورِ بیان اور

تجربانی تنہائی میں ظفر سے باتیں کرتا تھا۔ مگر رفیق کے خیالات دوسرے تھے۔ رفیق کا کردار بھی مختلف تھا۔ وہ کسی حد تک دبّو اور شرمیلا تھا۔ بغاوت کا جذبہ اُس کے دل میں بھی تھا لیکن اپنے ماں باپ کے سامنے اُس کے اظہار کی ہمت اپنے میں نہیں پاتا تھا۔ بس دل مسوس کے رہ جاتا تھا۔ ظفر بہت جلد کسی فیصلے پر پہنچ جاتا تھا۔ رفیق آسانی سے کوئی فیصلہ نہ کر پاتا تھا۔ اِس طرح بھی ٹھیک ہے اور اُس طرح بھی۔ ویسے قباحت اِس طرح بھی ہے اور اُس طرح بھی۔ زندگی دو دھاری تلوار ہے اور دو نیم شاخ گل بھی۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ ہمیشہ یونہی سوچ کے رہ جاتا تھا۔ ظفر اپنے دوست کی کمزور طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا اور اُس کی اُفتادِ طبع پر کڑھتا بھی تھا۔ وہ اکثر رفیق سے کہا کرتا ”یوں اپنے گھر والوں سے دبے دبے رہے تو زندگی بھر کچھ نہ کر پاؤ گے۔ اپنے دل و دماغ کے باغیانہ اور سرکش جذبوں کو اظہار کا موقع دو۔ تمھارا طرزِ تحریر مجھ سے بہتر ہے۔ سچ کہتا ہوں اگر لکھنا شروع کر دو گے تو چند سالوں میں ادب کی دُنیا میں نام پیدا کر لو گے۔ یوں گمنامی کی زندگی بسر کرتے ہوئے مر جانا کیا تمھیں اچھا لگتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں سے کام نہ لو گے تو تمھاری روح کو زنگ لگ جائے گا“

رفیق نے ڈرتے ڈرتے ظفر سے کہا تھا۔

”ایک ناول تو شروع کیا ہے . . .“

”کہاں تک ہو گیا ہے؟“

”ابھی تو صرف تین باب ہوئے ہیں“

”سناؤ“

رفیق نے بہت لیت و لعل کرنے کے بعد انتہائی مجبوری کی حالت میں ظفر کو اپنے ناول کے ابتدائی تین باب پڑھ کر سنائے۔ ظفر سُن کر اُچھل پڑا۔ کیسا انوکھا اندازِ بیاں ہے۔ کردار گوشت پوست کے زندہ اور متحرک انسان معلوم ہوتے ہیں۔ سچ کہتا ہوں رفیق تم اپنے آپ پر ظلم کرو گے۔ ادب پر اور دُنیا پر۔ اگر تم نے جلد سے جلد اِس ناول کو مکمل نہ کیا تو میں زندگی بھر تمھیں معاف نہ کروں گا!“

رفیق اپنے دوست کی تعریف پر جھینپ سا گیا۔ نگاہیں نیچی کر کے بولا ”نہیں مکمل تو کروں گا لیکن بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کر لینے کے بعد . . . والد صاحب کہتے ہیں فرسٹ کلاس لینا چاہئے تمھیں . . .“

”اسے جہنّم میں ڈالو بی۔ ایس۔ سی کو اور فرسٹ کلاس کو . . . کیوں اپنی شاندار صلاحیت کو برباد کرتے ہو۔ ابھی اِسی دم بغاوت کر دو اپنے ماں باپ کی روایت پرستی کے خلاف اور میرے ساتھ آ جاؤ۔ ہم دونوں دوست مل کر اپنی ادبی زندگی کے لئے تگ و دو کریں گے“

رفیق فرطِ مسرت سے ظفر کے گلے لگ گیا۔ بولا ”پہلے بی۔ ایس۔ سی کر لوں۔ بس صرف بی۔ ایس۔ سی کر لینے دو مجھے . . . پھر میں یہ کتاب . . .“

ظفر نے میز پر زور سے ہاتھ مارا اور غصّے کی حالت میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

بی۔ ایس۔ سی کر لینے کے بعد رفیق حسین اپنے والد کے زور دینے پر مکینکل انجینئرنگ کا ڈپلوما حاصل کرنے کے لئے انجینئرنگ کالج میں داخل ہو گیا۔ ظفر کے شدید احتجاج کرنے پر اُس نے اپنے دوست کو بارک پور کالج سے خط بھی لکھا جس میں اپنی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے عہد کیا تھا کہ ایک بار انجینئر بن جانے کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے اُن اخلاقی ذمّے داری سے عہدہ برآ ہو جائے گا جو اپنے والد کا خواب پورا کر دینے کے سلسلے میں ایک بیٹے کی حیثیت سے اُس پر عائد ہوتی ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ انجینئر بن جانے اور ایک معقول مشاہرہ پانے کے بعد اُسے وہ قلبی سکون اور اطمینان بھی حاصل ہو گا جس کے سہارے وہ اپنی فرصت کے سارے اوقات ادب کے لئے وقف کر سکے گا۔ وہ نامکمل ناول ابھی تک میرے پاس ہے۔ انجینئر بن جانے کے بعد میں سب سے پہلے اُسی کو مکمل کروں گا۔ یہ میرا آپ سے آخری وعدہ ہے۔

ظفر یہ خط پا کے چپ ہو گیا۔ کوئی کسی کو زبردستی ادیب نہیں بنا سکتا۔ پھر اُس کی اپنی ادبی زندگی تھی۔ اُسے خود ابھی بہت دُور جانا تھا۔ وہ خاموش تو ضرور ہو گیا لیکن اپنی ادبی جدّوجہد، کاوش اور کامیابی کے دوران اپنے دوست کو نہیں بھولا۔ گاہے گاہے دونوں دوست ملتے رہتے۔ ایک دوسرے سے خط و کتابت بھی کرتے رہتے۔ دونوں مل کر ادبی زندگی کی منزلیں ایک ساتھ طے کرنے کے خواب دیکھتے۔ ظفر بیقرار تھا۔ کب رفیق انجینئر بنے اور اپنا وعدہ پورا کرے۔

لیکن مکینکل انجینئر کا ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد اچانک رفیق کے والد کو کینسر ہو گیا۔ ایک دم بھرے پُرے کھاتے پیتے گھر کے حالات نے پلٹا کھایا۔ اِن حالات سے مجبور ہو کر رفیق کو ایک بار پھر ادیب بننے کا خیال ترک کر دینا پڑا۔ اسے جلد ہی ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ اب جو بھی روپیہ اُسے ملتا وہ اُسے اپنے باپ کے معالجے پر پھونک دیتا۔ پانچ سال وہ اپنے باپ کا علاج کرتا رہا۔ امریکہ تک ہو آیا لیکن کینسر تو ایک لاعلاج مرض ہے۔ پانچ سال کے بعد اُس کے والد کا انتقال ہو گیا۔

پھر اپنی بیوہ ماں اور تین بھائیوں کی پرورش اور تعلیم کا بوجھ اُس پر پڑ گیا۔ لیکن رفیق نے ہمّت نہ ہاری۔ جیسے تیسے کر کے اُس نے یہ سات آٹھ سال بھی گزار دئے۔ اپنے بھائیوں کو معقول تعلیم دلائی اور انھیں برسرِ روزگار کیا اور جب تینوں بھائی کمانے لگے تو اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ ”اب اپنی زندگی کی حسرت پوری کر سکوں گا میرے دوست!“ اُس نے ظفر کو خط لکھا۔ ”چھ ماہ کے اندر اندر تمھیں میرے ناول کا مسودہ مکمل مسودہ مل جائے گا۔ یہ میرا تم سے آخری وعدہ ہے!“

لیکن انھیں دنوں میں ملک تقسیم ہو گیا اور اس کی خالہ اپنی پانچ بچیوں اور دو چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو لے کر اس کی ماں کے گھر میں آ کر رہنے لگی۔ کیونکہ اس کا خاوند شرافت علی فسادات میں مارا گیا تھا اور اب اس کی غریب بیوہ اور اس کے سات بچوں کا کوئی سہارا نہیں رہ گیا تھا۔

رفیق حسین کے تینوں بھائیوں کو اپنی خالہ کی مدد کرنی چاہیے تھی اور رفیق نے انھیں لکھا بھی تھا۔ لیکن ان تینوں کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنی اپنی الجھنوں میں گرفتار تھے یا قربانی کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے یا اُن کی بیویوں نے انھیں اجازت نہ دی۔ کچھ بھی ہوا اپنی خالہ اور اس کے سات بچوں کا بوجھ رفیق کے سر آن پڑا اور جس طرح بھی ہوا اُسے اس بوجھ کو اٹھا لینا پڑا۔

ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ خانم سے اُسے بے پناہ محبت تھی اور خانم بھی چھ سال سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جس طرح اُن کا نامکمل ناول اس کا انتظار کر رہا تھا لیکن جس دن رفیق نے اپنی بیوہ خالہ اور اس کے سات بچوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ اُس دن اُس کے کندھوں پر کوئی ایسی جگہ نہیں رہ گئی تھی جہاں وہ خانم کو بٹھا سکے۔ نتیجے میں سسکتی خانم پاکستان چلی گئی۔ اُس دن رفیق بہت رو یا تھا۔

پھر اُس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور کام پر چلا گیا۔ اُس دن کے بعد کسی نے اُسے سر اُٹھا کر چلتے ہوئے نہ دیکھا۔ اس کے کندھے جھکے جھکے رہتے۔ کسی نے اُسے نگاہ اٹھا کر اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے نہ پایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کتراتا ہو۔ وہ جھکا جھکا چلتا، مضبوط بھاری بوجھل قدموں سے۔ دیر تک راتوں کو وہ نقشے اور خاکے دیکھتا رہتا کیونکہ حکومت نے اُسے گنگا پر ایک بہت بڑا پل تعمیر کرنے کی ذمے داری سونپی تھی۔ وہ انتہائی قابل، لائق اور دیانت دار افسر تھا ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب ملائمت، گھلاوٹ اور حلاوت اُس کے کردار میں آتی جا رہی تھی۔ جیسے کسی نامعلوم کیمیائی عمل سے اس کی زندگی کی ساری تلخی شہد بن گئی ہوں۔ اس سے نفرت کرنا بہت مشکل تھا اور اس کے قریب بیٹھ کر اس سے ہمدردی محسوس نہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

اُس نے خانم کو لکھا۔ "تمھیں تم تو یاد نہیں آتی ہو۔ تمھاری حویلی کا پرانا پھاٹک یاد آتا ہے اور ندی کنارے وہ جگہ جہاں ہم دونوں آ کر سامنے بیٹھ کر گیلی سنہری بالو کو اپنی انگلیوں سے کھود کھود کر اس میں سے میٹھے پانی کا چشمہ ڈھونڈا کرتے تھے۔ مجھے حویلی کی مغربی جانب وہ دو چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں یاد آتی ہیں جن کے درمیان ایک طاقچہ تھا۔ کھڑکی میں کھڑی ہو کر تم میری راہ تکا کرتی تھیں۔ کیا معلوم تمھاری سبک چمپئی انگلیوں کو قرار آ گیا ہو۔ میں تو ابھی تک اپنی انگلیوں سے سنہری ریت کھودتا ہوں اور میٹھے پانی کا چشمہ تلاش کرتا ہوں۔"

جواب میں خانم نے اُسے اپنے بچے کی تصویر بھیجی تھی۔
ترسائی ہوئی عورت بہت بے رحم ہوتی ہے۔
دیر تک گردن جھکائے وہ اُس ننھے بچے کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ اُس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔
ریت ہی ریت . . . کتنی دور . . . کتنا گہرا۔ کہاں ہے وہ میٹھے پانی کا چشمہ۔ ہے بھی یا نہیں!
شاید لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔

اُس نے ظفر کو خط لکھا ——— "میں نے خانم کی یاد کو بھی وہیں رکھ دیا ہے جہاں میں نے اُس کتاب کو رکھا ہے۔ دونوں مجھ سے بہت دور ہوتی جا رہی ہیں۔ شاید دنیا میں انسان کے اہم ترین کام وہی ہوتے ہیں جنھیں وہ کر نہیں سکتا!"

ظفر نے اُس کے خط کا جواب نہ دیا۔ چند دنوں تک رفیق کے دماغ میں کھلبلی مچی رہی پھر اُس نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا۔ اُس کے اندر زندگی کے چھوٹے چھوٹے غیر اہم کاموں میں اپنے آپ کو الجھا کر زندگی کی بڑی آرزوؤں سے کترا کر گزر جانے کی عادت پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی تو یہ پل بنانا ہے۔ اس سے گنگا کا علاقہ کھلے گا۔ کنور پور کے غلے کی تجارت بڑھے گی۔ کسان اپنا اناج بہتر قیمت پر بیچ سکیں گے۔

پھر فہمیدہ کی شادی کرنی ہوگی۔ فہمیدہ رفیق کی خالہ کی سب سے بڑی لڑکی ہے۔

"پھر دوسرا پل!" ظفر نے پوچھا اور رفیق نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر نفیسہ کی شادی؟" ظفر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

(نفیسہ خالہ کی دوسری لڑکی ہے) جب اس پر بھی رفیق نے اثبات میں سر ہلا دیا تو ظفر دیر تک خاموشی سے اُس کا منہ تکتا رہا۔ پھر اکدم اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور رفیق نے سوچا ——— سڑکیں تو ہوں گی ہی۔ نفیسہ کے بعد شمسہ کی شادی ہوگی۔ پھر کوئی ہسپتال۔ کوئی بلڈنگ۔ کوئی باندھ۔ کسی سیکرٹریٹ کی کوئی عمارت، نقشے، خاکے، ہزاروں مزدور، سینکڑوں ٹھیکیدار، درجنوں انجینیر، کرینیں، ڈیزل انجن، سیمنٹ کے بورے، خیموں میں آگ جلتی ہوئی، جھاڑیوں میں گزرنے والی ہوا سسکیاں لیتی ہوئی۔ پاؤں کیچڑ میں پھنس گیا ہے۔ رفیق دیر تک پاؤں کیچڑ سے نہیں نکالتا۔ وہ کیوں اپنا پاؤں کیچڑ سے نہیں نکالتا۔ وہ کیوں کتاب نہیں لکھتا؟ جس کے خالی اوراق روز رات کو اُس کے سینے پر کھل کر کھڑکھڑاتے ہوئے پریشان کرتے ہیں۔ دو مُرجھیوں کے درمیان ایک بار حسن کھلتا ہے اور دو پتّے کے ہالے میں چاند نکلتا ہے۔ لیکن اُس کا پاؤں تو کیچڑ میں ہے۔

رفیق نے دھیرے سے ایک لمبی سانس لی اور پاؤں کو کیچڑ سے نکال لیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بھاری قدموں اور تھکے جوتوں سے نشان بناتا ہوا اپنے خیمے کی طرف جانے لگا۔

دو ماہ میں یہ باندھ بن جائے گا اور اگلے سال خالہ کی تیسری لڑکی کی شادی بھی ہو جائے گی اور عرفان میٹرک پاس کرے گا لیکن خیر تو ابھی بہت دُور ہے۔

یونہی چالیس برس گزر گئے۔ یونہی پچاس برس گزر گئے۔ یونہی گھسیٹتے گھسیٹتے وہ پچپن برس کا ہو گیا۔ اب اُس نے سارے وعدے پُورے کر لئے تھے اور سب کے قرضے چکا دیئے تھے۔ اُس کی ماں مر چکی تھی۔ اُس کی خالہ کی پانچوں لڑکیوں کی شادی ہو گئی تھی۔ دونوں لڑکوں نے معقول تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اُس کی خالہ کا گھر نواسیوں اور نواسوں سے بھر گیا تھا۔ اُس کے تینوں بھائی خوشحال اور مطمئن تھے، مگن اور مسرور تھے۔ چلو یہ قرضہ بھی ادا ہو گیا اور وہ وعدہ بھی پُورا ہو گیا جو اُس نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ ایک انجینئر بنے گا۔ درجنوں پُل، عمارتیں، باندھ، بلڈنگیں، بلاکس، سکول اور کالج۔ اِن سب کی تصویریں اُس نے ایک البم میں سجا رکھی تھیں۔ دوسرے البم میں اس کے خاندان کے لوگوں کی تصویریں تھیں۔ جب وہ پچپن برس کا ہوا تو اُس نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ بہت ہو گیا! بہت ہو گیا! اب میرے کندھے سیدھے ہیں۔ کسی کا بار نہیں ہے ان پر۔ بس جی بہت ہو گیا۔ اب میں کتاب لکھوں گا۔ اپنی کتاب . . .

لیکن وہ مشین کا ایک بے حد کارآمد پُرزہ تھا۔ حکومت اُس کے کام سے بے حد خوش تھی۔ وہ اُسے ترقی دے کر ملازمت میں توسیع دے کر اور بہتر سے بہتر عہدہ دے کر رکھنے کے لئے تیار تھی۔ لیکن یکایک رفیق نے فیصلہ کر لیا۔ وہ فیصلہ جو وہ زندگی بھر کبھی نہ کر سکا تھا۔ اب وہ ملازمت نہ کرے گا، ہرگز نہ کرے گا! بس کتاب لکھے گا۔

اِس لئے افسروں، دوستوں، رشتے داروں کے سمجھانے کے باوجود اُس نے کسی کی نہ مانی۔ اُس نے پنشن لے لی، شہر چھوڑ دیا اور کتاب لکھنے کے لئے خانم کے گاؤں چلا گیا۔

"میں نے یہاں پر ایک کاٹیج بنا لیا ہے" اُس نے ظفر کو خط لکھا۔ "جہاں سے میں خانم کے گھر کی بُرجیوں کو دیکھ سکتا ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ پُرسکون دیہاتی فضا ہے۔ کاٹیج کے قریب میرے بچپن کی ندی بہتی ہے۔ دُور تک ہرے بھرے ٹیلے ہیں۔ ٹیلوں سے پرے اونچے پہاڑ ہیں۔ اب میں یہیں بیٹھ کر اپنا ناول پُورا کروں گا۔ میں نے سب کام ختم کر لئے ہیں۔ کسی کا کوئی قرض مجھ پر نہیں رہا۔ بس اب میں ہوں اور میری کتاب ہے!"

---

کوئی دو سال بعد پھر ظفر کے نام اُس کا ایک خط آیا۔

"آیا تھا کتاب لکھنے کے لئے، اپنی ادبی زندگی شروع کرنے کے لئے، ادیب بننے کے لئے۔ لیکن یہاں آکر عجیب پریشانی میں پڑ گیا۔ سارے گاؤں میں اور آس پاس کے پانچ سات گاؤں میں کوئی سکول نہیں ہے۔ تم کسی ایسے گاؤں میں گئے کتاب لکھ سکتے ہو جس میں ایک بھی سکول نہ ہو۔ یہ کتاب کی بے عزتی ہے۔ اس لئے میں نے اپنا کاٹیج ہی سکول کھول لیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے مجھ اتنے بڑے کاٹیج کی کیا ضرورت تھی۔ میرے لئے تو ایک کمرہ کافی ہے۔ دو سال سے بچوں کو پڑھا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں کوئی اچھا سا ایماندار مدرس مل جائے تو اُس کے حوالے یہ سکول کر دوں اور پھر اطمینان سے اپنی کتاب . . ."

ظفر نے خط آگے نہیں پڑھا۔ غصے میں اُٹھا کے پھینک دیا۔

ایک سال بعد پھر رفیق نے اُسے خط لکھا۔

"تم نے اپنے خط میں مجھے جتنی گالیاں دی ہیں وہ سب درست ہیں۔ لیکن میری بھی تو سنو۔ سکول کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ آس پاس کے گاؤں سے بھی لڑکے آنے لگے ہیں۔ دو مدرس بھی رکھ لئے ہیں پھر بھی فرصت نہیں ملتی۔ گاؤں میں ایک ڈاکٹر، وید یا حکیم بھی نہیں ہے۔ میں نے ہی لگے ہومیوپیتھی کا کورس پُورا کر لیا ہے۔ اب دوا بھی دیتا ہوں۔ خدا نے ہاتھ میں شفا بھی دے دی ہے۔ دُور دُور سے لوگ دوا لینے آتے ہیں۔ میں کسی سے پیسے نہیں لیتا۔ معقول پنشن ملتی ہے۔ اکیلا آدمی ہوں۔ پیسہ کیا قبر میں لے جاؤں گا۔ عجب اُلجھن ہو رہی ہے۔ لیکن مُدرس ہوں، ڈاکٹر ہوں۔ کبھی کبھی اَن پڑھ دیہاتیوں کے خط بھی لکھنا پڑتے ہیں۔ اُن کے جھگڑے بھی نپٹانے پڑتے ہیں۔ بالکل بچوں کی طرح ہیں ہمارے دیہات کے لوگ۔ کچھ نہیں سمجھتے، کچھ نہیں جانتے۔ دُنیا کتنی بدل گئی ہے۔ سائنس کتنی ترقی کر گئی ہے، کچھ معلوم نہیں ہے انھیں۔ سوچتا ہوں بالغوں کے لئے بھی ایک کلاس شروع کر دوں۔ لیکن سُنو وہ کتاب . . ."

پُرزے پُرزے کر کے ظفر نے وہ خط ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ طے کر لیا۔ اب کبھی وہ رفیق کو خط نہ لکھے گا۔

---

لیکن رفیق کے خط برابر آتے رہے۔

"گاؤں میں سُوکھا پڑ گیا ہے۔ گاؤں میں ہیضہ پھیلا ہے۔ گاؤں میں قحط پڑا ہے۔ لوگ کال سے بدحال ہوتے جاتے ہیں۔ پنچایت میں دھوکے باز لوگ آ رہے ہیں۔ زراعت کا ڈھرا وہی پُرانے ڈھنگ کا ہے۔ اِسے تو بدلنا ہی ہوگا۔ لیکن کوئی بتاتا نہیں۔ اِن غریب اَن پڑھ لوگوں کو۔ کوئی کچھ نہیں سمجھاتا۔ آج کل کھیتی باڑی پر کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ اور میرا خیال ہے . . ."

ظفر نے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آتشدان میں پھینک دیا۔

ظفر نے کیانتی کا ایک لمبا گھونٹ لے کر ... باہر کے منظر

دیکھا۔ باہر پہاڑی ڈھلوانوں نے بادلوں کے ... ہوئے تھے وہ دل

کی پہاڑی ندیوں، جھیل پر بہت کی کلیاں گزر رہی تھیں اور دوسرے کمرے میں ظفر کی اطالوی محبوبہ اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

ہندوستان سے آئے ہوئے اس جھیل خط نے چند لمحوں کے لئے روم شام کا خوبصورت افسوں توڑ دیا تھا۔ ظفر نے شام کا کیف پھر سے واپس کرنے کے لئے کیانتی کے لطیف، نفیس، نازک ذائقے کو لہر در لہر اپنی زبان پر پھیر لیا۔ اب وہ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ روم کے ایک مشہور پبلشر نے جو موریویا کا بھی پبلشر ہے۔ اُس کے چھ بڑے ناولوں کو اطالوی زبان میں شائع کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔ دوسرے کمرے میں . . . اُس نے پورا گھونٹ حلق سے نیچے اُتار لیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

---

اور اب وہ رفیق کے ساتھ خانم کے گاؤں میں سے گزر رہا تھا۔ رفیق کے پیہم اصرار پر اُسے اس گاؤں میں آنا ہی پڑا۔ رفیق کے خطوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے اب وہ واقعی سچے دل اور گہری لگن سے اپنی کتاب کو لکھنے کے لئے بیتاب ہے۔ اُس کے خط میں شعلوں کی سی تڑپ اور بیقراری تھی۔ وہ بار بار اُسے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ ظفر سے انکار کا کوئی ہرج نہیں ہے۔ اپنے بچپن کے دوست کی خاطر اپنی آرام دہ زندگی کے چند دن ایک دور افتادہ گاؤں میں ضائع کر سکتا ہے۔ تقریباً بیس برس کے بعد وہ اب رفیق سے ملے گا۔

لیکن ظفر اِس دُور افتادہ گاؤں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا۔ صاف ستھرا بسا بسا گاؤں۔ دیہاتیوں کے کپڑے معمولی اور موٹے لیکن پھٹے پُرانے بالکل نہیں کم قیمت کے لیکن صاف ستھرے اور قاعدے کے۔

اور لوگوں کی آنکھوں میں وہ چمک، اطمینان اور بھروسہ جو فراغت اور محنت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ کھیتوں میں بھوری اور سنہری فصلیں گنجان اور لہلہاتی ہوئی۔ سکول میں بچے کتابیں کھولے ہوئے۔ گھروں میں عورتیں سہانے گیت گنگناتی کام کرتی ہوئی۔ وہ زندگی جو اُس نے یورپ کے دیہات میں دیکھی تھی وہی زندگی وہ آج اپنے وطن کے ایک گاؤں میں دیکھ رہا تھا اور یہ سب کچھ رفیق کے دم سے ہوا تھا۔ ظفر دیکھ رہا تھا، رفیق کو لوگ اُسی محبت، عزت اور اپنائیت سے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی باہر سے آنے والا پڑھا لکھا پنشنر نہ ہو بلکہ اُن کے اپنے ہی گاؤں کا کوئی شفیق بزرگ ہو یا شاید اُن کا باپ ہی ہو۔

ظفر نے یہ بھی دیکھا کہ رفیق بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں رعشہ ہے اور سر بھی بار بار ہلتا ہے۔ حالانکہ ظفر اور رفیق دونوں کی عمر برابر تھی۔ لیکن دیکھنے میں رفیق ظفر سے بہت بوڑھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رفیق نے اپنے بڑھاپے کے خلاف مطلق کوئی جدوجہد نہیں کی۔ اُس نے بڑھاپے کو بہت

خوش دلی سے منظور کیا تھا۔ اس کے برعکس ظفر کا چہرہ ایک لڑتے ہوئے آدمی کا چہرہ تھا۔ ایسا چہرہ جو ہر پیدا ہونے والی جھری کے خلاف احتجاج کر رہا ہو۔ رفیق کی نگاہوں میں بہت میٹھا سا درد تھا۔ ماتھے پر عجیب سی معصومیت تھی، مسکراہٹ میں عجیب سی اپنائیت تھی۔ جیسے اُس تبسم کے لئے اس جہان میں کوئی اجنبی نہ ہو۔ ظفر کی پوری شخصیت میں ایک فاصلہ تھا اپنی انا میں سمٹا ہوا۔ ایک ہالہ تھا دولت کا، شہرت کا، چاروں طرف کھنچا ہوا۔ ایک مغرور کامیاب آدمی اپنی ذات میں سمٹا ہوا . . . ہر لحظہ ہراساں . . . کہیں ایسا نہ ہو زندگی کے کسی لمحے میں اُسے اپنے مرتبے کے مطابق عزت نہ ملے۔ باہر کی دُنیا کو دیکھتے ہوئے اتنی عظیم الشان کامیابی کے بعد بھی شک و شبہات اور عدم تحفظ کے موہوم وسوسے اُس کے دل و دماغ میں بار بار اُٹھ جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ چوکنا سا رہتا تھا ہمیشہ محتاط۔ ہر فقرے میں دشمنی کی بو سونگھنے والا . . .

لیکن رفیق کے دل میں کسی طرح کی غیریت نہ تھی۔ وہ اُس سے اُسی طرح ملا جس طرح آج سے بیس سال پہلے، آج سے تیس سال پہلے، آج سے پچاس سال پہلے ملا تھا۔ وہی بے ریا محبت اور رفاقت کا جذبہ . . . جیسے عمر اور فاصلہ، خیالات کا اختلاف، دولت اور شہرت کا ہالہ اُس کے لئے ہیچ ہو یا شاید وہ اِس سے واقف نہ ہو اور اگر واقف بھی ہو تو اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھتا ہو۔

---

"لیکن اتنے برس تم نے اِس کام کو ٹالا کیوں؟" ظفر نے رات کے کھانے کے بعد رفیق سے پوچھا۔

رفیق کچھ محجوب سا ہو کر بولا "میں نے اُسے خود سے ٹالا نہیں خود سے ٹالتا رہا لیکن اب میں لکھوں گا۔ آج رات ہی سے شروع کروں گا لیکن میں چاہتا تھا کہ جب میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے جا رہا ہوں، تم میرے پاس رہو۔ کم سے کم پہلے چند دن کے لئے . . ."

"میں سات دن سے زیادہ نہ ٹھہر سکوں گا" ظفر نے اُسے بتایا۔

"بہت ہیں میرے لئے یہ سات ہی دن بہت ہیں!" رفیق نے مسرت سے بھرے لہجے میں کہا۔ کتاب لکھنے کی آرزو نے اُس کی آنکھوں میں قرب و وصال کی سی چمک پیدا کر رکھی تھی۔

"گو میرے ہاتھوں میں ہلکا سا رعشہ ہے۔ لیکن خیالات اُمڈے چلے آ رہے ہیں میں آج رات ہی سے کتاب شروع کر دوں گا۔"

---

صبح دم جس وقت ظفر رفیق کے کمرے میں داخل ہوا تو اُس وقت بھی رفیق اپنی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا جھکا ہوا لکھ رہا تھا۔ اُس کی پشت ظفر کی طرف تھی۔

رفیق نے دھیمے سے ایک لمبی سانس لی اور پاؤں کو کیچڑ سے نکال لیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بھاری قدموں اور گیلے جوتوں سے نشان بناتا ہوا اپنے خیمے کی طرف جانے لگا۔

دو ماہ میں یہ باندھ بن جائے گا اور اگلے سال خالہ کی تیسری لڑکی کی شادی بھی ہو جائے گی اور عرفان میٹرک پاس کرے گا لیکن خیر تو ابھی بہت دُور ہے۔

یونہی چالیس برس گزر گئے۔ یونہی پچاس برس گزر گئے۔ یونہی گھسیٹتے گھسیٹتے وہ پچپن برس کا ہو گیا۔ اب اُس نے سارے وعدے پورے کر لئے تھے اور سب کے قرضے چکا دیئے تھے۔ اُس کی ماں مر چکی تھی۔ اُس کی خالہ کی پانچوں لڑکیوں کی شادی ہو گئی تھی۔ دونوں لڑکوں نے معقول تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اُس کی خالہ کا گھر نیکیوں اور مرادوں سے بھر گیا تھا۔ اُس کے تینوں بھائی خوشحال اور مطمئن تھے، مگن اور مسرور تھے۔ چلو یہ قرضہ بھی ادا ہو گیا اور وہ وعدہ بھی پورا ہو گیا جو اُس نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ ایک انجینئر بنے گا۔ درجنوں پل، عمارتیں، باندھ، بلڈنگیں، بلاکس، سکول اور کالج۔ ان سب کی تصویریں اُس نے ایک البم میں سجا رکھی تھیں۔ دوسرے البم میں اس کے خاندان کے لوگوں کی تصویریں تھیں۔ جب وہ پچپن برس کا ہوا تو اس نے ریٹائرڈ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

بہت ہو گیا! بہت ہو گیا! اب میرے کندھے سیدھے ہیں۔ کسی کا بار نہیں ہے ان پر۔ بس جی بہت ہو گیا۔ اب میں کتاب لکھوں گا۔ اپنی کتاب . . .

لیکن وہ مشین کا ایک بے حد کارآمد پرزہ تھا۔ حکومت اُس کے کام سے بے حد خوش تھی۔ وہ اُسے ترقی دے کر، ملازمت میں توسیع دے کر اور بہتر سے بہتر عہدہ دے کر رکھنے کے لئے تیار تھی۔ لیکن یکایک رفیق نے فیصلہ کر لیا۔ وہ فیصلہ جو وہ زندگی بھر کبھی نہ کر سکا تھا۔

اب وہ ملازمت نہ کرے گا، ہرگز نہ کرے گا! بس کتاب لکھے گا۔

اس لئے افسروں، دوستوں، رشتے داروں کے سمجھانے کے باوجود اُس نے کسی کی نہ مانی۔ اُس نے پنشن لے لی، شہر چھوڑ دیا اور کتاب لکھنے کے لئے خانم کے گاؤں چلا گیا۔

وہاں اُس نے ظفر کو خط لکھا: "میں نے یہاں پر ایک کاٹج بنا لیا ہے۔ جہاں سے میں خانم کے گھر کی بُرجیوں کو دیکھ ـــــــ سکتا ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ پُرسکون دیہاتی فضا ہے۔ کاٹج کے قریب میرے بچپن کی ندی بہتی ہے۔ دُور تک ہرے بھرے ٹیلے ہیں۔ ٹیلوں سے پرے اونچے پہاڑ ہیں۔ اب میں یہاں بیٹھ کر اپنا ناول پورا کروں گا۔ میں نے سب کام ختم کر لئے ہیں۔ کسی کا کوئی قرض مجھ پر نہیں رہا۔ بس اب میں ہوں اور میری کتاب ہے!"

---

کوئی دو سال بعد پھر ظفر کے نام اُس کا ایک خط آیا۔

"آیا تھا کتاب لکھنے کے لئے، اپنی ادبی زندگی شروع کرنے کے لئے، ادیب بننے کے لئے۔ لیکن یہاں آکر عجیب پریشانی میں پڑ گیا۔ سارے گاؤں میں اور آس پاس کے پانچ سات گاؤں میں کوئی سکول نہیں ہے۔ تم کبھی ایسے گاؤں میں کیسے کتاب لکھ سکتے ہو جس میں ایک بھی سکول نہ ہو۔ یہ کتاب کی بے عزتی ہے۔ اس لئے میں نے اپنے کاٹج میں سکول کھول لیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے مجھے اتنے بڑے کاٹج کی کیا ضرورت ہے۔ میرے لئے تو ایک کمرہ کافی ہے۔ دو سال سے بچوں کو پڑھا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں کوئی اچھا اور ایماندار مدرس مل جائے تو اُس کے حوالے یہ سکول کر دوں اور پھر اطمینان سے اپنی کتاب . . ."

ظفر نے خط آگے نہیں پڑھا۔ غصے میں اُٹھا کے پھینک دیا۔

ایک سال بعد پھر رفیق نے اُسے خط لکھا۔

"تم نے اپنے خط میں مجھے جتنی گالیاں دی ہیں وہ سب درست ہیں۔ لیکن میری بھی تو سنو۔ سکول کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ آس پاس کے گاؤں سے بھی لڑکے آنے لگے ہیں۔ دو مدرس بھی رکھ لئے ہیں پھر بھی فرصت نہیں ملتی۔ گاؤں میں ایک ڈاکٹر، وید یا حکیم بھی نہیں ہے۔ میں نے جی لگا کے ہومیوپیتھی کا کورس پورا کر لیا ہے۔ اب دوا بھی دیتا ہوں۔ خدا نے ہاتھ میں شفا بھی مجھے دی ہے۔ دُور دُور سے لوگ دوا لینے آتے ہیں۔ میں کسی سے پیسے نہیں لیتا۔ معقول پنشن ملتی ہے۔ اکیلا آدمی ہوں۔ پیسہ کیا قبر میں لے جاؤں گا۔ عجب اُلجھن ہو رہی ہے۔ لیکن مدرس ہوں، ڈاکٹر ہوں، کبھی کبھی ان پڑھ دیہاتیوں کے خط بھی لکھنا پڑتے ہیں۔ اُن کے جھگڑے بھی نپٹانے پڑتے ہیں۔ کل بچوں کی طرح ہیں ہمارے دیہات کے لوگ۔ کچھ نہیں سمجھتے، کچھ نہیں جانتے۔ دُنیا کتنی بدل گئی ہے، سائنس کتنی ترقی کر گئی ہے، کچھ معلوم نہیں ہے انھیں۔ سوچتا ہوں بالغوں کے لئے بھی ایک کلاس شروع کر دوں۔ لیکن سنو وہ کتاب . . ."

پرزے پرزے کرکے ظفر نے وہ خط ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ طے کر لیا۔ اب کبھی وہ رفیق کو خط نہ لکھے گا۔

---

لیکن رفیق کے خط برابر آتے رہے۔

"گاؤں میں سوکھا پڑ گیا ہے۔ گاؤں میں ہیضہ پھیلا ہے۔ گاؤں میں قحط پڑا ہے۔ لوگ کال سے بدحال ہوتے جاتے ہیں۔ پنچایت میں دھوکے باز لوگ آ رہے ہیں۔ زراعت کا ڈھرا وہی پرانے ڈھنگ کا ہے۔ اسے تو بدلنا ہی ہوگا۔ لیکن کوئی بتاتا نہیں ان غریب ان پڑھ لوگوں کو۔ کوئی کچھ نہیں سمجھاتا۔ آج کل کھیتی باڑی پر کتابیں پڑھ رہا ہوں اور میرا خیال ہے . . ."

ظفر نے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے آتش دان میں پھینک دیا۔

ظفر نے کیانتی کا ایک لمبا گھونٹ لے کر محراب دار کھڑکیوں سے باہر کے منظر کو دیکھا۔ باہر پہاڑی ڈھلوانوں نے بادلوں کے سپید لبادے اوڑھ لئے تھے اور [illegible]

کی پرانی روش پیپل پر برف کی کلیاں گر رہی تھیں اور دوسرے کمرے میں ظفر کی اطالوی محبوبہ اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

ہندوستان سے آئے ہوئے اس مجہول خط نے چند لمحوں کے لئے روش شام کا خوبصورت افسوں توڑ دیا تھا۔ ظفر نے شام کا کیف پھر سے حاصل کرنے کے لئے کیا نتی کے لطیف رنغمیں، نازک ذائقے کو دوبارہ اپنی زبان پر پھیر لیا۔ اب وہ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ روم کے ایک مشہور پبلشر نے جو موریویا کا بھی پبلشر ہے۔ اُس کے چھ بڑے ناولوں کو اطالوی زبان میں شائع کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔ دوسرے کمرے میں . . . اُس نے پورا گھونٹ حلق سے نیچے اُتار لیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

---

اور اب وہ رفیق کے ساتھ خانم کے گاؤں میں سے گزر رہا تھا۔ رفیق کے بیہم اصرار پر اُسے اس گاؤں میں آنا ہی پڑا۔ رفیق کے خطوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے اب وہ واقعی سچے دل اور گہری لگن سے اپنی کتاب کو لکھنے کے لئے بیتاب ہے۔ اُس کے خطوں میں شعلوں کی سی تڑپ اور بیقراری تھی۔ وہ بار بار اُسے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ ظفر انکار نہ کر سکا۔ کوئی ہرج نہیں ہے۔ اپنے بچپن کے دوست کی خاطر اپنی آرام دہ زندگی کے چند دن ایک دُور افتادہ گاؤں میں ضائع کر سکتا ہے۔ تقریباً بیس برس کے بعد وہ اب رفیق سے ملے گا۔

لیکن ظفر اس دُور افتادہ گاؤں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا۔ صاف ستھرا لپا پُتا گاؤں۔ دیہاتیوں کے کپڑے معمولی اور موٹے لیکن پھٹے پُرانے بالکل نہیں کم قیمت کے لیکن صاف ستھرے اور قاعدے کے۔

اور لوگوں کی آنکھوں میں وہ چمک۔ اطمینان اور بھروسہ جو فراغت اور محنت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ کھیتوں میں سُنہری اور سُنہری فصلیں گُنجان اور لہلہاتی ہوئی۔ سکول میں بچے کتابیں کھولے ہوئے۔ گھروں میں عورتیں سُہانے گیت گُنگُناتی کام کرتی ہوئی۔ وہ زندگی جو اُس نے یورپ کے دیہات میں دیکھی تھی وہی زندگی وہ آج اپنے وطن کے ایک گاؤں میں دیکھ رہا تھا اور یہ سب کچھ رفیق کے دم سے ہوا تھا۔ ظفر دیکھ رہا تھا۔ رفیق کو لوگ اُسی محبت، عزت اور اپنائیت سے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی باہر سے آنے والا بُڈھا پنشنر نہ ہو بلکہ اُن کے اپنے ہی گاؤں کا کوئی شفیق بزرگ ہو یا شاید اُن کا باپ ہی ہو۔

ظفر نے یہ بھی دیکھا کہ رفیق بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں رعشہ ہے اور سر بھی بار بار ہلتا ہے۔ حالانکہ ظفر اور رفیق دونوں کی عمر برابر تھی۔ لیکن دیکھنے میں رفیق ظفر سے بہت بوڑھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رفیق نے اپنے بڑھاپے کے خلاف مطلق کوئی جد و جہد نہیں کی۔ اُس نے بڑھاپے کو بہت خوش دلی سے منظور کیا تھا۔ اس کے برعکس ظفر کا چہرہ ایک لڑتے ہوئے آدمی کا چہرہ تھا۔ ایسا چہرہ جو ہر پیدا ہونے والی جھری کے خلاف احتجاج کر رہا ہو۔ رفیق کی نگاہوں میں بہت میٹھا سا درد تھا۔ ماتھے پر عجیب سی معصومیت تھی۔ مسکراہٹ میں عجیب سی اپنائیت تھی۔ جیسے اُس ہستی کے لئے اس جہان میں کوئی اجنبی نہ ہو۔ ظفر کی پوری شخصیت میں ایک فاصلہ تھا اپنی انا میں سمٹا ہوا۔ ایک ہالہ تھا دولت کا، شہرت کا، چاروں طرف کھنچا ہوا۔ ایک مغرور کامیاب آدمی اپنی ذات میں سمٹا ہوا . . . ہر لحظہ ہراساں . . . کہیں ایسا نہ ہو زندگی کے کسی لمحے میں اُسے اپنے مرتبے کے مطابق عزت نہ ملے۔ باہر کی دُنیا کو دیکھتے ہوئے اتنی عظیم الشان کامیابی کے بعد بھی شک و شُبہات اور عدم تحفظ کے موہوم وسوسے اُس کے دل و دماغ میں بار بار اُٹھ جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ چوکنا سا رہتا تھا۔ ہمیشہ محتاط۔ ہر فقرے میں دشمنی کی بو سونگھنے والا . . .

لیکن رفیق کے دل میں کسی طرح کی غیریت نہ تھی۔ وہ اُس سے اُسی طرح ملا جس طرح آج سے بیس سال پہلے، آج سے تیس سال پہلے، آج سے پچاس سال پہلے ملا تھا۔ وہی بے ریا محبت اور رفاقت کا جذبہ . . . جیسے عمر اور فاصلہ، خیالات کا اختلاف، دولت اور شہرت کا ہالہ اُس کے لئے ہیچ ہو یا شاید وہ اس سے واقف نہ ہو اور اگر واقف بھی ہو تو اسے درخور اعتنا نہ سمجھتا ہو۔

---

"لیکن اتنے برس تم نے اس کام کو ٹالا کیوں؟" ظفر نے رات کے کھانے کے بعد رفیق سے پوچھا۔

رفیق کچھ محجوب سا ہو کر بولا "میں نے ٹالا نہیں خود سے ٹلتا رہا لیکن اب میں لکھوں گا۔ آج رات ہی سے شروع کروں گا لیکن میں چاہتا تھا کہ جب میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے جا رہا ہوں تم میرے پاس رہو۔ کم سے کم پہلے چند دن کے لئے . . ."

"میں سات دن سے زیادہ نہ ٹھہر سکوں گا" ظفر نے اُسے بتایا۔

"بہت ہیں، میرے لئے یہ سات ہی دن بہت ہیں!" رفیق نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ کتاب لکھنے کی آرزو نے اُس کی آنکھوں میں قرب و وصال کی سی چمک پیدا کر دی تھی۔

"گو میرے ہاتھوں میں ہلکا سا رعشہ ہے۔ لیکن خیالات اُمڈے چلے آ رہے ہیں میں آج رات ہی سے کتاب شروع کر دوں گا"

---

صبح دم جس وقت ظفر رفیق کے کمرے میں داخل ہوا تو اُس وقت بھی رفیق اپنی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا جھکا ہوا لکھ رہا تھا۔ اُس کی پُشت ظفر کی طرف تھی۔

ظفر دروازے سے چلّایا: "ارے رفیق کیا آج ہی کتاب ختم کر و گے؟ ناشتہ کر و گے . . .
دس بج رہے ہیں۔ دکھاؤ کتنے ورق لکھ ڈالے ہیں تم نے . . . " یہ کہتا کہتا وہ رفیق کی
میز کے قریب چلا گیا۔ قریب جاتے جاتے وہ کچھ ٹھٹکا۔

پھر دھک سے رہ گیا!

رفیق رات کو کرسی پر بیٹھے بیٹھے مرگیا تھا! اس کے ہاتھ میں قلم تھا سامنے کی
کھڑکی کھلی تھی جس میں سے خانم کی حویلی کی دو برجیاں اور ان کے درمیان ایک خالی
پارچہ نظر آتا تھا۔ رفیق کی بے جان، بے نور آنکھیں اسی پارچے پر ٹکی تھیں۔

ظفر نے جھک کر پیڈ کی طرف دیکھا۔

پیڈ کا ورق خالی تھا

ظفر چند ثانیوں کے لئے رفیق کی کرسی کی پشت کو پکڑے حیران اور ششدر
کھڑا رہا۔ چند ثانیوں کے لئے اس کے خیالات منجمد ہوگئے تھے۔ پھر اس کا ہاتھ بے اختیار
رفیق کے کندھے پر گیا، اور اس کے خیالات دھیرے دھیرے بہہ نکلے . . .

. . تو . . . تو . . . رفیق مرگیا ہے اپنی زندگی کا بہترین کام اور اپنی حیات
کی ارفع ترین آرزو پوری کئے بغیر . . . رفیق مُردہ ہے۔ رفیق جو لکھتا تو مجھ سے بہتر لکھتا۔
لیکن آج رفیق کو کوئی نہیں جانتا۔ کل کے اخبار میں کوئی سرخی نہ ہوگی کیونکہ اس نے
اپنی صلاحیتوں کو دبا کر راکھ کر دیا اور راکھ کو کوئی نہیں پہچانتا۔ وہ بڑا آدمی بن سکتا تھا۔
لیکن اس نے اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں الجھا کر ختم کر دیا۔ رفیق کی زندگی پر
نظر ڈالتے ہوئے ظفر کے دل میں اپنے دوست کے لئے شدید جھنجلاہٹ اور کسی قدر
نفرت کے جذبات ابھرنے لگے۔

پھر یکایک اس کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ ٹھیک ہے۔ وہ شیکسپیئر، کالیداس،
ارسطو، غالب نہ بن سکا۔ وہ اپنے عہد کا ظفر بھی نہ بن سکا۔ تو کیا ہوا؟ کیا زندگی صرف
ایک عمود پر گزارنے کا نام ہے؟ کیا وہ زندگی جو دھرتی کے متوازی گزاری جاتی ہے
زندگی نہیں ہوتی۔ کیا دھان کے کھیت کو محض اس لئے حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے
کہ وہ مونٹ ایورسٹ نہیں ہے؟ پھر کون ایک چھوٹا سا پل بنائے گا کہ لوگ اس پر سے
گزر سکیں اور کون ایک گاؤں میں بیٹھ کر کام کرے گا کہ کسی کے منہ میں دو دانے جا سکیں
اور کون اپنی محبت کو قربان کرے گا کہ ایک بیوہ کی بچیوں کی شادی ہو سکے؟ آج کل کے
عہد میں بڑی احمقانہ باتیں ہیں ایسی۔

لیکن کیا زندگی انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں، مجبور قربانیوں، معمولی کاموں،
حقیر مہربانیوں اور دل شکستہ محنتوں کا نام نہیں ہے۔ جن کا کوئی صلہ نہیں ہے۔ کوئی شہرت
کوئی عظمت نہیں . . لیکن جس کے بغیر زندگی کا یہ تسلسل کسی طرح ممکن نہیں . . .

پھر میں رفیق کو کس طرح کوسوں؟ کیا کتاب صرف وہ کتاب ہوتی ہے جو
حرفوں سے عبارت ہوتی ہے۔ جسے لفظ لکھتے ہیں اور داستانیں جانتے ہیں۔ شاید
کتاب لکھنے کا کوئی دوسرا طریقہ بھی ہے۔ شاید قطرہ قطرہ اپنی آرزوؤں کا خون کرتے
ہوئے رفیق بھی ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ شاید ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی میں ایک
کتاب لکھتا ہے۔ شاید یہ کورا ورق بھی ادب کا بہترین شاہکار ہے . . .

ظفر کی آنکھیں پُرنم ہو چلی تھیں۔ دھیرے دھیرے رفیق کا لاشہ تھپتھپاتے
ہوئے اس نے اپنے خیالات کے جذباتی دھارے کو روکا۔ ابھی تو اسے گاؤں والوں کو خبر
کرنی ہوگی۔ جنازے کا انتظام کرنا ہوگا۔ قبر . . . اور . . .

---

رفیق کو مرے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔ اس کے رشتے دار اسے بھول
چکے ہیں۔ اب تو گاؤں میں بھی کوئی اس کا نام نہیں جانتا۔ اس کی قبر بھی ڈھ چکی ہے
صرف ظفر کا لگایا ہوا کتبہ آدھا زمین میں دھنسا اور آدھا ترچھا کھڑا ہے۔ کسی طرح باقی
ہے۔ جسے گردن ٹیڑھی کرکے پڑھنا پڑتا ہے اور جس پر یہ عجیب و غریب عبارت
کندہ ہے

"یہاں دُنیا کا سب سے بڑا ادیب دفن ہے!"

---



---

# غزل

کرشن موہن ایم۔اے

ہم نے مانا ، ہے ناگزیر اجل — زندگی کا بھی فیصلہ ہے اٹل

وصلِ کیف و نشاط ہے چھل بل — بے وفا ہے حیات کی ہلچل

اے دلِ زار بے قرار ہے کیوں — تجھ پہ وہ مہرباں ہے سوچ سنبھل

مُفت کا اضطراب مول نہ لے — ہر نیا چہرہ دیکھ کر نہ مچل

وصلِ جاناں کی ہے تڑپ دل میں — زندگی ہو گئی ہے طولِ اَمل

تیری آنکھوں میں ہے چمک ایسی — جھیل میں جیسے مُسکرائے کنول

فکرِ فردا بھی چاہیئے ہر دم — سینۂ ماضیِ حسیں نہ مَسل

اے حوادث کی آسیا تھم جا — میری چھاتی پہ اور مونگ نہ دل

اپنے کتنے ہی خیر خواہوں کا — یہ جہانِ خراب ہے مقتل

زندگی ایک ایسی مُشکل ہے — جس کا ملتا نہیں ہے کوئی حل

زیست کے چہرۂ نگاریں پر — عملِ بد سے مت سیاہی مَل

کیا قیامت ہے عقل کے ہاتھوں — نوعِ انساں ہو گئی پاگل

ظرفِ انساں کا آزماتی ہے — زندگی ہے شراب کی بوتل

کہیں پہچان بھی نہ مُشکل ہو — اِس قدر جلد بھی نہ رنگ بدل

دل کہ مدفن ہے آرزوؤں کا — فکر و احساس کا ہے تاج محل

ہر طرف ہے ترا فسوں طاری — تیری چاہت میں ہے جہاں بیکل

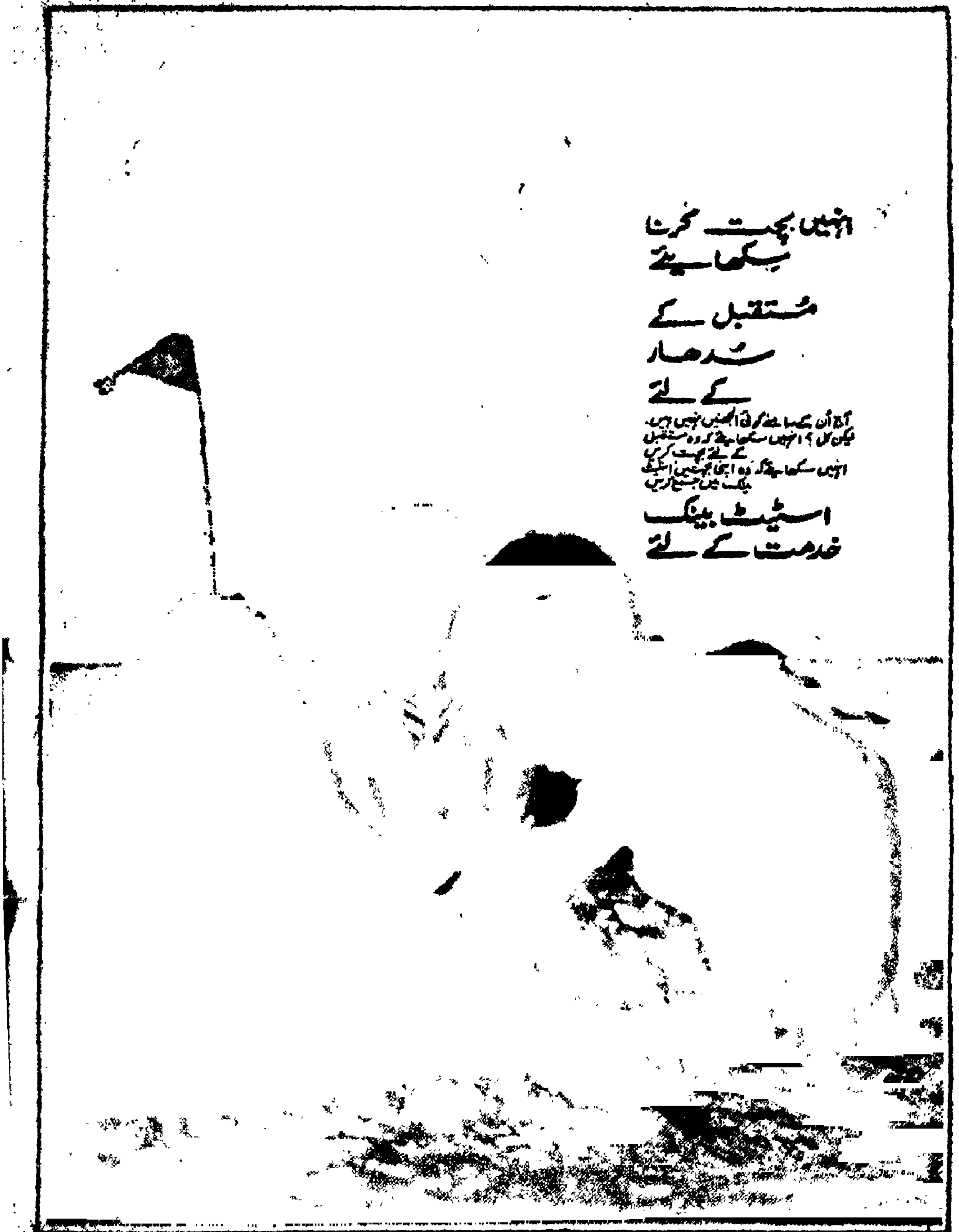
ہے نہیں پوچ ہر پُرانی سوچ — ہر نئی سوچ بھی نہیں مہمل

گرچہ ہم ہیں قصور وارِ شوق — آپ نے کی پہل تو پہلے پہل

بن گئی حُسنِ فکر کے باعث — میری آوارگی بھی حُسنِ عمل

کرشن موہن ہوس ہے ایک قفس

حلقۂ کید و فن سے جلد نکل


انہیں بچت کرنا
سکھایئے
مستقبل کے
سدھار
کے لئے
اسٹیٹ بینک
خدمت کے لئے

# سانولی لڑکی

پروفیسر ڈاکٹر حامدی کاشمیری ایم۔ اے پی۔ ایچ ڈی

۳۹۶۔ جواہر نگر، سری نگر

۲ راگست ۱۹۶۷ء

برادرِ محترم! آداب

ایک تازہ ترین افسانہ "سانولی لڑکی" ملاحظہ ہو۔۔۔ اُمید ہے آپ کو اور قارئین کرام کو پسند آئے گا۔ اِس میں عورت کی شخصیت کے ایک پہلو کی عکاسی کی کوشش کی گئی ہے۔۔۔ جواہر نگر کالونی جیتے جاگتے، حسین اور رنگین افسانوں سے آباد ہے۔ ایک اور افسانہ جلد ہی بھجوا رہا ہوں۔۔۔ آپ کے خط کا انتظار رہے!

آپ کا۔۔ ۔ حامدی کاشمیری

وہ بپھر اُٹھی:

غصّے سے اُس کے سانولے چہرے پر چنگاریاں سی دوڑ گئیں، اُس کے پتلے پتلے ہونٹ تھرتھرائے اور ایک شعلہ بار نگاہ مجھ پر ڈال کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی پیر پٹختی ہوئی۔

اور میں بھونچکا سا رہ گیا۔

میرے جذبات کا کھولتا ہوا سمندر سرد پڑ چکا تھا اور سارے بدن پر ٹھنڈے پسینے آگئے تھے۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

میں حیران تھا یہ اچانک سنیتا کو کیا ہوگیا؟ میں نے ابھی اُس کے ہاتھ کو چھو بھی نہیں لیا تھا کہ وہ برہم ہوئی۔ آج تک وہ کبھی اِس انداز سے مجھ سے پیش نہ آئی تھی۔ دو سال ہوگئے مجھے اُن کے مکان کے ایک سیٹ میں رہتے ہوئے، لیکن اِن دو برسوں میں وہ ہمیشہ مجھے محبت اور شفقت کا جیتا جاگتا پیکر نظر آئی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ سنیتا ہی نے میری پتنی لاجونتی کے اچانک انتقال کے بعد غم کے بھیانک تلاطم میں میری زندگی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے لگایا تھا۔ اپنے بے باک اور مخلص قہقہوں سے، اپنے سچے پیار سے، اپنی زندہ دلی سے ——

سنیتا میری زندگی کا واحد سہارا بن چکی تھی اور اُس کی ماں کی شخصیت میں مجھے اپنی ماں کی تصویر نظر آئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میرا تبادلہ اِس شہر میں ہوا تو بس کے سفر میں سُنیتا اور اُس کی بوڑھی ماں سے ملاقات ہوئی۔ سنیتا ایک پتلی سی لمبے قد کی لڑکی تھی اُبھرے سانولے رنگ کی، اُس کے چھوٹے سے چہرے کے خد و خال جاذبِ نظر تھے، چہرے کے سانولے رنگ میں ہلکی سی چمک تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ہیرے جیسی چمک کبھی ماند نہ پڑ جائے گی، سیاہ پلکوں سے ڈھکی ہوئی گہری سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر کسی خاموش سیاہ جنگل کا خیال آتا، بہت نازک تھی وہ۔ ایک موجۂ ہوا سے بھی نازک، بولیں دیکھنے کی ہوا اور جو چھونے سے ہوا ہو جائے گی، مجھے سنیتا میں بہت دلکشی نظر آتی، سفر لطف سے کٹ رہا تھا۔ ہم ایک ہی سیٹ پر بیٹھے تھے، راستے میں سُنیتا کی ماں کی طبیعت کچھ خراب ہوئی تو میں اُس کے لئے دوا لایا، پانی کا انتظام کیا، سنیتا اور میں نے ساتھ ہی ایک ہوٹل میں کھانا کھایا، وہ مجھ سے بہت جلد گھل مل گئی اور بہت بے تکلفی اور پیار سے مجھ سے باتیں کرتی رہی، ہنستی رہی، وہ ہنستی تو اُس کے سفید دانت چمک اُٹھتے جیسے دھند میں بجلی چمک جاتی اور جب وہ طویل سفر اختتام کو پہنچا تو سنیتا اور اُس کی ماں نے بہت اصرار کے بعد نئی کالونی

تھا اپنے نئے مکان میں ایک سیٹ کرائے پر لینے کے لئے مجھے مجبور کیا۔ سُنیتا کی ماں کی دلیل یہ تھی کہ وہ ہر سال ایک سیٹ کرائے پر دیتے ہیں، آپ کو مکان کی ضرورت ہی ہے، اس لئے وہی سیٹ لیجئے اور میں رضامند ہوگیا۔

مکان نئی وضع کا بنا ہوا تھا۔ لیکن ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ باہر دیواروں پر ابھی پلاسٹر نہیں ہوا تھا اور دروازے اور کھڑکیاں بھی رنگ روغن سے عاری تھیں، یہ مکان سُنیتا کے سورگباشی پتاجی نے بنوایا تھا اور ابھی انھیں نئے مکان میں شفٹ کئے ہوئے ڈیڑھ سال کا بھی عرصہ نہ ہوا تھا کہ وہ حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئے اور پھر وہ ماں بیٹی تنہا رہ گئے۔ سُنیتا کو مجبوراً کالج کی تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ اپنے ہی کالج میں ٹائپسٹ کے کام پر مامور ہوگئی۔

اُس نے اپنے پتا کی اچانک موت کے صدمے کو سہار لیا اور اپنی بیمار ماں کو اتنا پیار دیا کہ وہ پتی کے غم کو بھول گئی۔ وہ ماں سے بہت پیار کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شادی کی ہامی نہیں بھرتی تھی، ..... "میں شادی نہیں کروں گی!" وہ فیصلہ کن لہجے میں کہتی ..... "میں ساری زندگی ماں کے ساتھ رہوں گی!" ماں یہ سُن کر رو دیتی، لیکن سنیتا اپنی ضد پہ قائم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی ماں کو اچھے اچھے رشتے بھی لوٹانے پڑے۔ سنیتا کی کائنات اُس کی ماں تھی اور ماں کے بغیر وہ جینے کا تصور بھی نہ کرسکتی تھی ..... عجیب لڑکی!

میں دوسری منزل میں رہنے لگا اور خود وہ پہلی منزل میں رہتے آئے تھے۔

مجھے یہاں بھی انجینیر صاحب کے ساتھ دُور دراز پہاڑی علاقوں کے دوروں پر جانا پڑتا تھا، اس لئے مجھے الگ کچن کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور نہ خود کھانا پکانے کی ضرورت پڑی، میں عموماً ہوٹل میں کھانا کھاتا اور چائے خود ہی اسٹوو پر بنا تا۔ سُنیتا نے کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ میں کھانا اُنھیں کے ساتھ کھاؤں، لیکن میں نے انکار کیا اور اپنی ضد پر قائم رہا۔ اس مکان میں چند مشکلوں کا سامنا کرنے کے باوجود مجھے گھر سے زیادہ آرام اور سکون ملا، صبح کو سنیتا میرے کمرے کے دروازے پر ہولے سے دستک دے کے چلی جاتی، یہ اُس کا معمول تھا۔ اور میری آنکھ کھل جاتی۔ میں اُٹھتا، نہا دھو کے جب میں کمرے میں آتا تو کمرہ آئینے کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا، دفتر کی فائلیں اور بکھرے ہوئے کاغذات ایک جگہ سلیقے سے رکھے ہوتے، کپڑے ہینگروں پر ٹنگے ہوتے اور ٹیبل پر تازہ پھولوں کا گلدستہ! وہ میرا کتنا خیال رکھتی! آہستہ آہستہ لاجونتی کا زخم بھرنے لگا۔ سنیتا میری کم گوئی اور مستقل اُداسی کو بھانپ گئی تھی۔ وہ فرصت کے لمحات میں میرے پاس آکر مجھ سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتی، اور ایک دن جب میں نے اُسے بتایا کہ میری بیوی صرف ایک سال کی رفاقت کے بعد مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی اور یہ کہتے ہوئے میں اپنے جذبات پہ قابو نہ رکھ سکا تو وہ بہت اُداس ہوئی اور

میں نے دیکھا، اُس کی لانبی لانبی سیاہ پلکوں پر آنسو لرز رہے ہیں۔

"سُنیتا ..... تمہاری آنکھوں میں آنسو ..... ارے ....."

"نہیں تو ....." وہ ہنسنے لگی، اُس کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو بھی ہنس رہے تھے!

میں پگھل کر رہ گیا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب وہ میرے دل کی خاموش گہرائیوں میں اُتر گئی، میں نے فرطِ جذبات میں اُسے سینے سے لگا لینا چاہا۔ اُس کا نازک سا جسم کانپ رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی .....

"میں آپ کو دُکھی نہیں دیکھ سکتی ..... میں ..... آپ کو ....."

اُس کا گلا رُندھ گیا اور وہ سسکتی رہی۔

سُنیتا مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ اُس دن جب میں ساری رات بخار میں جلتا رہا تو وہ ساری رات میرے سرہانے شمع کی طرح جلتی رہی ..... پگھلتی رہی۔ صبح تو میری طبیعت سنبھل چکی تھی، لیکن سنیتا کی حالت ناگفتہ بہ تھی، رو رو کر اُس نے اپنا بُرا حال کیا تھا، اُس کی سیاہ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ تاریک ہوگیا تھا۔

"سنیتا نے رو رو کر اپنی آنکھیں خراب کر ڈالیں، دو دن سے کچھ کھایا نہیں ..... میں نے لاکھ کہا بیٹی کھانا کھاؤ، وہ اچھے ہو جائیں گے، لیکن وہ کب مانتی ..... ضدی ہے نا بہت، بچپن سے اُس کی یہ عادت ہے، جو بات دل میں آتی ہے وہی کرتی ہے، لاکھ سمجھاؤ نہیں مانتی۔ اُس کے پتاجی کی طبیعت بھی بالکل ایسی تھی۔ عجیب لڑکی ہے، آپ کے لئے تو بس گھلتی جاتی ہے" شام کو ماں دیر تک بولتی رہی اور میں اُس کے بارے میں رات گئے تک سوچتا رہا۔

لیکن ..... اُس دن اُس کی ناراضگی کی کیا وجہ تھی؟ میرے خیالوں میں اچانک زہر پھیل گیا۔

وہ پاگل ہوگئی تھی ..... اور .....

اُس کی ماں تین چار دنوں سے بیمار تھی، اور میں اتفاق سے اُن دنوں [illegible] رات کو دیر سے لوٹتا، ہوٹل سے کھانا کھا کر۔ اُن دنوں دفتر میں کام کا کافی پریشر [illegible] لئے جسم تکان سے چُور ہو جاتا، کمرے میں داخل ہوتے ہی بستر پر گر پڑتا اور سو جاتا۔ مجھے مطلق خیال نہ رہا کہ سُنیتا کی ماں سخت بیمار ہوئی تھی اور رات کے دو بجے سُنیتا کو خود جا کر ڈاکٹر کو بلانا پڑا تھا۔ بھلا مجھے یہ سب کچھ کیسے پتہ چلتا؟ لیکن سُنیتا کی یہ [illegible] ..... مجھے Explain کرنے کا موقع بھی نہ دیا۔ وہ ناراض ہوگئی تو ہوا کرے۔ میرا جذباتی ردِعمل تیز تھا بہت تیز! مجھے اُس کے رویئے سے بے حد اذیت پہنچی تھی اور میں اندر ہی اندر تلملا رہا تھا!

ایک ہفتہ ہوگیا میں نے سنیتا کی صورت تو کیا، اُس کا سایہ تک نہ دیکھا اور
سچ تو یہ ہے میں بھی اُسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ رہ رہ کر مجھے اُس کی بے سبب ناراضگی کا
خیال آتا اور میرے دماغ کی نسیں غم و غصے سے تن جاتیں!
اُس نے اپنے آپ کو کیا سمجھ رکھا ہے ــــ مغرور! شدید ناراضگی کے
جذبے کے تحت اُس کی ماں کی مزاج پرسی پر بھی میری طبیعت آمادہ نہ ہوتی اور آٹھویں
دن جب سنیتا مجھے لان میں نظر آئی تو اس نے میری طرف آڑی نگاہ بھی نہ اٹھائی،
جیسے میرا وجود ہی نہ ہو۔ اُس کے چہرے پر رات کی سیاہی تھی۔ جہاں بھر کا غم و غصہ۔
ــــ ہُنھ! میرے لئے اب وہاں ایک لمحہ گزارنا بھی مشکل تھا۔ مجھے تیز کانٹوں کی
طرح میرے احساس میں چبھتے رہے، پھر ــــ پھر جب میں دلی گیا تو میں اُس سے
نہیں، اُس کی ماں سے ملا۔ کرائے کے بقیہ روپے ادا کئے اور کہا کہ میں ایک ہفتے کے
لئے گھر جا رہا ہوں ــــ

میں چھ سال کے بعد یہاں لوٹا ہوں ــ!
چھ سال!
اِس طویل عرصے میں میں زندگی کے نشیب و فراز سے گزر چکا ہوں میں
نے زمانے کے کتنے سرد و گرم دیکھے ہیں ــــ ماضی خواب بن چکا ہے اور حال
ــــ؟ حال کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی انسان کو کس طرح بدل کے رکھ دیتی ہے۔ لمحے
دُھواں بن کے اُڑتے ہیں۔ میں پرسوں یہاں پہنچا ہوں، چھ ہفتے کے مشن ٹور پر۔ میرا
قیام مین چوک میں نیشنل ہوٹل میں ہے اور آج سب سے پہلے میں نے سنیتا کے گھر
جانے کا فیصلہ کیا۔ دل میں ایک عجیب سی خواہش جاگ پڑی ــــ کیوں نہ سنیتا اور
اُس کی ماں سے مِل لیا جائے، آج اتوار ہے، وہ گھر ہی میں ہوگی ــــ تانگہ چل رہا
ہے، سڑک خاموش ہے، گھوڑے کی ٹاپوں کی ٹخ ٹخ کی آواز خاموشی میں ڈوب رہی
ہے، تازہ دھوپ سڑک کے دورویہ درختوں کی پتیوں سے چھن چھن کر سڑک پر روشنی
کے دائرے بنا رہی ہے اور میرے ذہن میں یادوں کے روپہلے دائرے بنتے جا رہے
ہیں ... پھیل رہے ہیں، سمٹ رہے ہیں!
ــــ میں شیو بنا رہا تھا۔ بلیڈ نیا تھا اور میری ذرا سی چوک سے میری
ٹھوڑی زخمی ہوگئی اور اُس سے خون بہنے لگا۔
"جناب پانی تیار ہے۔ جلدی کیجئے نو بج رہے ہیں!" سنیتا دروازے پر
آکر مسکرا رہی تھی، معاً اس کی نظر میری ٹھوڑی پر پڑی، جہاں سے خون بہہ رہا تھا۔
"ارے یہ کیا ــــ؟ خون ــــ اتنا گہرا زخم!" وہ جلدی سے میرے قریب
آئی، اور میرے چہرے کے اتنے قریب اپنا چہرہ لے آئی کہ اُس کی سانسیں میرے ہونٹوں
سے ٹکرانے لگیں۔ اُس کی گہری آنکھوں میں تردد تھا اور چہرے پر فکر کے بادل۔
"کوئی بات نہیں سُنیتا، معمولی سی خراش ہے" شیو بناتے ہوئے ایسی
خراشیں تو لگ جاتی ہیں ــــ" میں اُسے سمجھا رہا تھا، لیکن اُس کے چہرے سے
یہ مترشح ہو رہا تھا کہ اُس کے دل میں ایک گہرا گھاؤ پڑ گیا ہے ــــ پگلی!
اُس دن سُنیتا کا جنم دن تھا!
میں شام کو سجاتا ہوا آیا۔ میں نے دیکھا اُس کے کمرے میں نئی سج دھج ہے
اور سُنیتا دُلہن کی طرح سہیلیوں کے ہجوم میں بنی سنوری بیٹھی ہے اور سہیلیوں کی
ہنسی مذاق میں شریک ہے۔ میں اُس کے لئے جدید ساخت کا ایک خوبصورت سا
پرس لایا تھا، جسے دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوئی، اُس کی سیاہ آنکھوں سے روشنی پھوٹ
نکلی اور سانولا چہرہ ہیرے کی طرح دمکنے لگا۔ ماں نے مجھے دُعائیں دیں اور سُنیتا کی خوبرو
سہیلیاں مجھے توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ میں بے چین ہو رہا تھا۔ میرے چہرے
پر پسینہ آرہا تھا۔
سُنیتا خوشی سے بولی ـــــ "تم سب کیوں انھیں گھورے جا رہی ہو، یہ
عورتوں سے بہت ڈرتے ہیں!" اِس پر ایک قہقہہ پڑا، جیسے کئی ساز ایک ساتھ بج
اُٹھے اور فرار کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر میں بھی ہنس پڑا اور جب مہمان رخصت ہو چکے تو
سنیتا کے کمرے میں سنیتا اور میں تھا ــــ میں ابھی تک ماں کے جملوں پر غور کر رہا
تھا۔
"سنیتا میرے بُڑھاپے کا سہارا ہے ــــ آپ سے بہت پیار کرتی ہے،
آپ کو ذرا دیر ہو جائے تو پاگل ہو جاتی ہے، روتی ہے پگلی، بات بات پر روتی ہے،
بچپن سے اِس کی یہ عادت بن گئی، بہت ضدی لڑکی ہے۔ یہ چاہتی ہے آپ ہمیشہ
ہمارے ساتھ رہیں۔ آپ کو دیکھ کر یہ خوش رہتی ہے"
اور جب وہ دُعائیں دیتی ہوئی کمرے سے نکلی تو ہم دونوں خاموش تھے،
اپنے اپنے خیالوں کی دُھند میں کھوئے ہوئے! بات بہت آگے بڑھ چکی تھی اور مجھے
یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنا خوش قسمت بھی ہوں ــــ مجھ غم نصیب کے ساتھ
سنیتا جیسی لڑکی ــــ شاید اِس نتیجے پر پہنچنے میں میں عجلت سے کام لے رہا
ہوں ــــ سُنیتا اور میں ــــ عمروں کا یہ تفاوت!
میں زیادہ دیر تک اِس غلط فہمی میں مبتلا رہنا نہیں چاہتا تھا۔
میں نے سُنیتا سے کہا ــــ
"سُنیتا میں بہت ہی بدقسمت انسان ہوں، لاجونتی کی موت میری دنیا
کو ویران کر چکی ہے ــــ کتنی پیاری تھی وہ! بس اُسی کو دیکھ دیکھ کے میں جی رہا
تھا ــــ اور پھر وہ اُمید سے رہی، میری مسرتوں کی اب کوئی حد نہ تھی لیکن وہ

مجھے چھوڑ کر چلی گئی، پیدا ہونے سے پہلے ہی بچہ بھی مر گیا اور وہ بھی ــــــ مجھ میں
اب رکھا ہی کیا ہے، میں ایک بجھا ہوا چراغ ہوں ــــــ"

وہ سنتی رہی، خاموش، اُداس، متفکر!

خاموشی کا لمحہ طویل ہو گیا۔

بہت اداس شام تھی!

ڈوبتے سورج کی کرنیں لان کی دیوار کے ساتھ عشق پیچاں کی گھنی بیلوں پر کانپ رہی تھیں، برآمدے پر خاموشی تھی اور سنیتا کے سانولے چہرے پر اُداسی تھی! اُس کی سیاہ آنکھوں میں درد اور کرب کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں۔

"ماں کہاں چلی گئی ہے ـــ؟"

"بوڑھی ماں کے پاس ــــ"

"وہی جو یہاں آتی ہے کبھی کبھی؟ کہیں نزدیک ہی [illegible] ہے ــ؟"

"جی ــــ" وہ بیزاری سے بولی۔

"تم رو کیوں رہی تھیں؟"

"نہیں تو ــــ"

"بات کیا ہے سنیتا، مجھے بتاؤ، میں کوئی غیر تھوڑا ہی ہوں ـــ"

"بوڑھی ماں آئی تھی اُس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں ـــ ہم جانتے ہی نہیں انھیں، بس چلی آئیں، آتے ہی سیدھے کچن میں گھس گئیں، مجھ سے پانی مانگا میں نے لا کر دیا اور پھر ــــ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے گھورتی رہیں جیسے مجھے زندہ کھا جائیں گی ــــ بوڑھی ماں بولی، یہی سنیتا ہے ــــ تو بات میری سمجھ میں آئی، میرے دل میں آیا کہ پانی کا گلاس بوڑھی کے پوپلے منھ پر دے ماروں ـــ میں جانے لگی تو دونوں عورتیں کھسر پھسر کرنے لگیں ـــ [illegible] ابھی ہے لیکن ذرا [illegible] دروازے سے نکلتے ہوئے ایک عورت کی بات میرے کانوں سے ٹکرائی!

"اچھا تو یہ بات ہے ـــ وہ لڑکی کو دیکھنے آئی تھیں ـــ"

"کیوں آئی تھیں؟ کس نے کہا تھا؟"

"ماں نے کہا ہوگا ـــ"

"ماں نے؟ نہیں تو۔ پھر تو مجھے بھی معلوم ہوتا۔ بوڑھی ماں خود ہی لے آئی تھی انھیں ـــ بڑی ڈھیٹ ہے۔ پچھلی بار بھی ایک عورت کو لے کر آئی تھی۔ پھر ہم نے بہت ڈانٹا تھا۔"

"بھئی یہ اُس کا پیشہ ہے لیکن تمہاری اُداسی کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شکر کرو تم انھیں کالی نظر آئیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے والے کی نظر پر منحصر ہے۔ میں تمھیں دیکھتا ہوں تو میری دنیا روشن ہوتی ہے۔"

میرے جذباتی لہجے سے وہ بہت متاثر ہوئی۔

اُس کے چہرے سے اُداسی کے سائے چھٹ گئے!

یادوں کے روپہلے دائرے سمٹتے رہے!

میں دلی پہنچا تو اتفاق سے میرا تبادلہ الٰہ آباد ہو گیا اور وہاں چھ سال تک میرا قیام رہا۔

---

وقت کے ہاتھ کتنے بے رحم ہوتے ہیں، دلوں کے درمیان کتنی سنگین دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں!

[illegible] سنیتا کو بھول چکی تھی، جیسے میں کبھی اُس کی زندگی میں آیا ہی نہ تھا اور میں [illegible] بھی آہستہ آہستہ اُسے بھول گیا۔ تیسرے سال میں نے دوسری شادی [illegible] کیونکہ اب مجھے [illegible] معلوم ہوتا تھا اور [illegible] گھر ویران تھا۔ کھانے پینے کے سلسلے میں کئی تکلیفوں کا سامنا تھا۔ حسنِ اتفاق سے مجھے ایک ستھرا اور گھریلو انداز کی بیوی ملی، اور تین سال میں میرے تین بچے ہوئے ـ [illegible] یہ گھر بس چکا تھا، میری شامیں دلچسپ تھیں [illegible] ہنگامہ آرا، پُر رونق!

اور چھ سال پہلے کے رومانی لمحے غبار بن کے اُڑ چکے تھے!

تانگہ ایک جھٹکے کے ساتھ نئی کالونی میں ہاؤس نمبر ۱۱ کے گیٹ کے سامنے رُکا

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا ــــ

میں نے [illegible] پر دستک دی

تھوڑی دیر میں گیٹ کھلا اور میں نے دیکھا میرے سامنے سنیتا کھڑی تھی،
وہی [illegible] سانولے رنگ کی [illegible] سیاہ آنکھوں پر سیاہ پلکوں [illegible] ـ ـ [illegible] جنگل!

[illegible] حلقے پڑ چکے تھے۔

[illegible] ـــ وہ کچھ بوڑھی سی نظر آ رہی تھی۔

وہ خاموش [illegible] رہی ـــ حیرت کے ملے جلے تاثر کے ساتھ اور دوسرے لمحے اس کے [illegible] پھیلنے لگی ـــ

"آپ؟ ـ کب آئے آپ؟"

"شکر ہے تم نے مجھے پہچانا ـ میرے بال سفید ہو چکے ہیں [illegible] ـــ"

"[illegible] یہاں کتنے عرصے کیا کر رہے ہیں؟"

میں سنیتا کے خلوص کی گرمی کی تاب نہ لا سکا ــــ:

"ان کو گزرے ہوئے دو سال بیت گئے ــــ آپ کو وہ آخری سانس تک یاد کرتی رہیں، بلاتی رہیں، لیکن ــــ اور جب سے میں تنہا ہوں ــــ آپ نے بھی حد کر دی، ایک ہفتے کے لئے ماں سے رخصت لی تھی، مجھ سے مل کر بھی نہیں گئے، میں اس قابل تھی ہی نہیں، ایک ہفتہ بیت گیا، پھر ایک مہینہ بیت گیا، آپ آئے نہ کوئی خط ہی بھیجا، ہم انتظار کرتے کرتے تھک گئے ــــ پھر ایک سال گزر گیا، دو سال، تین سال ــــ چار سال ــــ کتنے سال! مجھے محسوس ہوتا ہے صدیاں بیت چکی ہیں اور آپ صدیوں کے بعد آئے ہیں!"

میں اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی اور تھرتھری کو محسوس کر رہا تھا، میں نے دیکھا اس کے سیاہ بالوں میں چاندی کے بہت سے تار چمک رہے ہیں، اس کے سانولے چہرے پر ایک غیر معمولی وقار تھا۔

اور میرے ہونٹ گونگے تھے۔

انسان کی زندگی کے وہ لمحے کتنے جانگداز ہوتے ہیں، جب وہ بہت کچھ کہنا چاہے، لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکے:

"جو کچھ ہونا تھا سنیتا ہو چکا ہے، اب پرانے زخموں کو کریدنے سے کیا فائدہ ہے ــــ" مشکل سے یہ جملہ میری زبان سے نکلا، گھسا پٹا جملہ، جذبات سے عاری۔ ــــ میں چاہتا تھا کہ گفتگو کا رخ موڑ دیا جائے اور ہم اپنی اپنی ازدواجی زندگیوں کے دکھ سکھ کی باتیں کریں ــــ چھ سال پہلے کا زمانہ تو اب خواب و خیال تھا۔

خواب و خیال!

میں نے ہمت کر کے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"اور سناؤ سنیتا، کیسی گزر رہی ہے ــــ" میں نے پوچھا، حالانکہ میں پوچھنا چاہتا تھا ــــ

"سنیتا، تم نے شادی تو کی ہوگی ــــ کب کی شادی؟ شادی پر تو مجھے بلانا چاہئے تھا ــــ کتنے بچے ہیں تمہارے ــــ؟" لیکن میں یہ سب کچھ پوچھ نہ سکا، اور سنیتا کہہ رہی تھی ــــ اس کے جملوں میں عجیب بے ربطی تھی، انتشار تھا، جیسے وہ کسی گہرے خواب میں بڑبڑا رہی تھی۔

"انسان اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا ــــ اسے جینے کے لئے سہارے کی ضرورت ہے ــــ اس بھری دنیا میں دل گھبراتا ہے، دیواریں اجنبی نظر آتی ہیں ــــ راستے بھاگتے ہیں اور منزل کھو جاتی ہے ــــ دفتر میں سبھی پوچھتے ہیں، سنیتا تم شادی کیوں نہیں کرتی ہو ــــ میں کیا جواب دوں بھلا ــــ انسان کی سوچیں تھک جاتی ہیں، لیکن میں مسکراتی ہوں ــــ شادی ایک بار ہوتی ہے، بار بار نہیں ہوتی ــــ لیکن میں کسی سے کچھ نہیں کہتی ــــ خاموشی بھی ایک سہارا ہے"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

خاموشی کا ایک بھاری لمحہ ــــ دم گھٹا دینے والا!

میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی گہری اداس آنکھوں میں دیکھا، ان کی آنکھوں میں گہرا کرب تھا!

"سنیتا ــــ!" ایک چیخ میرے خشک گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

میرا جسم کانپ اٹھا۔

میری نگاہوں میں میری بیوی اور تین بچے ایک ایک کر کے گھوم گئے۔

اور سنیتا کی آنکھوں کے گہرے سیاہ جنگل بھیگ رہے تھے ــــ!!

---



---

# غزلیں

پروفیسر بیتاب بیلی بھیتی، ایم۔ کام (علیگ)

دیکھتی رہی مجھ کو غم سے رہگزر تنہا
تو نے جب مجھے چھوڑا میرے ہم سفر تنہا

کس خلوص سے بڑھ کر اپنی بانہیں پھیلادیں
گردشِ زمانہ نے مجھ کو دیکھ کر تنہا

تو نے یہ نہیں سوچا تو نے یہ نہیں سمجھا
کس طرح سے طے ہوگا زیست کا سفر تنہا

درد کی گھٹاؤں میں غم کے ان دھندلکوں میں
چھوڑ کر گیا اے دوست تو مجھے کدھر تنہا

مجھ کو اپنے دکھ دیدو مجھ کو اپنے غم دیدو
کوئی ہے جو یہ کہہ دے مجھ کو دیکھ کر تنہا

ہو کوئی شریکِ غم کوئی تو یہ دکھ بانٹے
کب سے چل رہا ہوں میں غم کی راہ پر تنہا

حسن کو زمانے میں کوئی کچھ نہیں کہتا
تہمتیں ہزاروں ہیں عشق ہی کے سر تنہا

تیری ریشمی پلکیں غم سے کیوں ہوئیں بوجھل
جادۂ محبت پر مجھ کو دیکھ کر تنہا

تو ہے کس لئے آخر پھر ملول و رنجیدہ
غم تو میں اٹھاتا ہوں اپنے دوش پر تنہا

تو ہی اب سہارا دے اپنی نرم بانہوں کا
مجھ سے طے نہیں ہوتی پیار کی ڈگر تنہا

غم کی آگ میں بیتاب یوں سلگتا رہتا ہوں
جیسے دیپ جلتا ہے شب میں طاق پر تنہا

سید حجاب ترمذی

عشق کا جب چراغ جلتا ہے
حسن خود کروٹیں بدلتا ہے

کام آتا نہیں کسی کا خلوص
گر کے خود آدمی سنبھلتا ہے

کانپتا ہے وفا کے نام سے دل
جب کوئی بے وفا نکلتا ہے

دل کو بھی اک لگی ہوئی ہے لو
یہ بھی مثلِ چراغ جلتا ہے

کوئی گم راہِ شوق کر کے مجھے
ہر قدم ساتھ ساتھ چلتا ہے

وقت کو کروٹیں بدلنے دو
نظمِ عالم ابھی بدلتا ہے

کیف ہے سب کو بزمِ جاناں میں
آنکھوں آنکھوں میں دور چلتا ہے

کوئی ارمان دل نہیں نکلا
اسی حسرت میں دم نکلتا ہے

جا رہے ہو تسلیاں دے کر
دل کہیں اس طرح بہلتا ہے

کوئی جادہ ہو کوئی منزل ہو
غم مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

کھیلتی ہے ہنسی لبوں پہ حجاب
دل میں طوفانِ غم مچلتا ہے

# کارسپانڈنس

پرنسپل جوگندر پال، ایم اے

ایس۔ بی۔ ای۔ ایس۔ کالج، اورنگ آباد
۸ اگست ۱۹۹۷ء

برادرم خوشتر صاحب! آداب

لیجئے آپ کا خط ملتے ہی آگیا ہوں اور "بیسویں صدی" کے لئے اپنی بڑی پیاری نئی کہانی "کارسپانڈنس" لایا ہوں۔ کہانی کی پھبن اور فکر محسوس کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بڑی شوخ خاتون "ڈاکٹریٹ" کے سنجیدہ اکادمی لباس میں نظر آ رہی ہو اور یہ پتہ نہ چلے کہ وہ سنجیدہ زیادہ ہے یا شوخ زیادہ ہے۔

اُردو ادب کی روایت ہے کہ محبوب سے مخاطب ہو کر گویا دنیا جہان سے باتیں کر لی جاتی ہیں۔
اب یہیں دیکھئے نا، خط آپ کے نام ہے اور ہے یہ دراصل "بیسویں صدی" کے قارئین کے لئے۔ سو آپ کو ایک غیر ادبی، یعنی ذاتی خط الگ لکھوں گا . . .

آپ کا ——— جوگندر پال

---

دفتر کی کوئی آٹھ نو چٹھیوں سے نمٹنے کے بعد میں آخری پر بھی اپنے دستخط کرنے لگا تو اچانک آخر میں "یورز ڈائلکٹیکلی" پڑھ کر اُسے شروع سے بغور پڑھنے لگا۔

"ایمل ڈیئر! اگرچہ آپ مجھ سے بے جا خفا ہیں، پھر بھی میں اُس وقت تک اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا جب تک میری تشفی نہ ہو جائے کہ آپ مجھ سے خفا نہیں ...."

مِس ایمل بخوبی واقف تھی کہ مجھے کہاں، کب، کیا کہنا ہے۔ کسی بزنس پارٹی کی چٹھی ہوتی تو اُس کا صریح اور منطقی لہجہ میری فرم کے کسی غیر منطقی مفاد کا باعث بنتا اور کوئی ذاتی مکتوب ہوتا تو وہ الفاظ کو کچھ ایسی غیر واضح نشست میں لے آتی کہ مفہوم کسی شبہے والی پوزیشن میں واضح ہو کر کام کر جاتا۔

مِس ایمل میری پرسنل سکریٹری تھی اور کسی بزنس مین کی پرسنل سکریٹری دراصل اُس کی بزنس سکریٹری ہی ہوتی ہے لیکن اُسے میرے ذاتی مسئلوں پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ مجھے [illegible] سے الرجی ہے۔ ذاتی [illegible] بہت پیارا لگتی ہے)، اِس لئے وہ ہمیشہ میرے آفس میں جانے سے پہلے چپکے باہر سے قہوے میں دودھ ملا کر بھیجتی۔ میری عادت تھی کہ کرسی پر بیٹھ کر بائیں پہلو میں جُھک جاتا، اِس لئے وہ کرسی کی گدی کو ہمیشہ دائیں جانب ٹکا کر رکھتی، اور جب، ان میں چپراسی سے سگریٹ کا دوسرا پیکٹ منگوا لیتا وہ چپکے سے موقع ملتے ہی پیکٹ کو میز سے غائب کر دیتی کیونکہ گزشتہ کاٹن سیزن میں کثرتِ کار سے ایک دن آفس میں مجھ پر اختلاجِ قلب کا دورہ پڑا تھا اور ڈاکٹر نے اُس کی موجودگی میں مجھے بہت کم تعداد میں سگریٹ پینے کا مشورہ دیا تھا۔

کبھی میں سگریٹ پیتا ہوتا تو وہ بہت معصوم، مظلوم سی مسکراہٹ سے شکایت کرتی: "آپ سگریٹ پینا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

اور میں سگریٹ بجھا کر اُس کی طرف دیکھ کے مسکرانے لگتا اور جی ہی جی میں مجھے اپنی اِس طاعت پر غصہ آتا اور غصہ بھی اچھا لگتا۔

مِس ایمل کو میری ہر سوچ اور ہر عمل کا پورا علم تھا جیسے وہ اپنے جسم میں بھی ہو اور میرے ذہن میں بھی، جیسے میں نے اُسے اپنی کوئی بات بتائی ہو جب بھی اُسے اُس بات کا علم ہو۔ ایک بار میں اپنے ایک بزنس ڈیل کے بارے

میں بڑی اُلجھن میں تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کروں یا نہ کروں۔

"ارے ـــــ ے! ـــ!!" دفعتاً مس ٹریل کے فائل میں اپنی ایک تازہ چٹھی کی کاپی دیکھ کر میں چونک پڑا۔ ہوا یہ کہ آج صبح مس اجل نے یہ چٹھی میرے دستخط کے لئے بھیجی تھی جس میں وہ اُس مشورے کو منسوخ کر چکی تھی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ درحقیقت میں یہ ٹریل کیس ہی کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے اپنے ذہن کی اتنی خبر نہ تھی جتنی مس اجل کو۔

بسا اوقات میں اپنے ذہن سے دُور جا نکلتا لیکن وہ سدا وہیں میرا انتظار کرتی رہتی اور میرے آفس کے مانند اُسے بھی بہت بنا سنوار کر رکھتی۔ ہر شے نہایت قرینے سے اور میرے آرام اور طلب کے عین مطابق پڑی ہوتی تاکہ میں وہاں رہوں تو سکون سے اور باہر جاؤں تو لوٹنے کی خواہش ہو۔ میں اپنے ذہن کے اندر ہوتا یا باہر، مس اجل ہر دم وہیں ہوتی۔ وہ میرے ذہن کی، شعور و ادراک کی محافظ ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں اگر وہ نہ ہو تو میرا کیا ہو؟

کوئی ایک سال ہوا ہوگا، وہ پندرہ دن کی رخصت پر اپنے ماں باپ سے ملنے گئی اور مجھے یہی کھٹکا لگا رہا کہ وہ لوٹ کر نہ آئے گی۔ لیکن دس ہی دن کے بعد وہ واپس آگئی۔

"پانچ دن پہلے ہی چلی آئیں؟"

"میں ـــــ وہ ـــــ بس آگئی ہوں۔"

اُس کی شکل سے معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کے رخصت کے دن چین سے نہیں گزرے۔

"بس یہی سوچتی رہی کہ یہاں کام کیسے چل رہا ہوگا؟"

میں چاہ رہا تھا کہ وہ کہے: "میں اتنے دن آپ کے بغیر کیسے رہ سکتی تھی؟"

لیکن وہ بولی: "کام سے ہاتھ یہاں اتنے بھرے رہتے ہیں کہ خالی ہاتھ بہت وہ سا معلوم ہوتا ہے۔" جیسے کوئی سہاگن کہہ رہی ہو میکے جا کر چوڑے سے بھرے بھرے ہاتھ سدا یہی یاد دلاتے ہیں کہ یہاں تمہارا اب کوئی کام نہیں رہا گوری!

"امی میری شادی کا ذکر کر رہی تھیں۔"

میرے چونکنے سے وہ خوش نظر آنے لگی۔

"لیکن میں نے انکار کر دیا۔"

"کیوں؟" میں نے اُسے یونہی پوچھا جیسے اُس کے کسی اچھے خاصے آفس ڈرافٹ کی صحت پر اعتراض کرنا چاہا ہو۔

کیا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے؟ اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتی، یا کہنا نہیں چاہتی تو جو اتنے سارے خطوط لکھ کر بغیر میرے دستخط کے لئے میز پر بھیجتی ہے اُن سب کے ساتھ ہی محبت کا بھی ایک صاف سا مراسلہ ڈرافٹ کر کے۔ بہت عجیب لگتی ہے! اب یہ معلوم ہوا کہ [illegible] ہے؟ میں کچھ یوں ہی بک جاؤں تو کیا معلوم اُسے ناگوار گزرے۔ اور ڈرافٹ نہیں پرسنل سکریٹریوں سے فلرٹ کرتے ہیں، شاید وہ بھی یہی سمجھے کہ میں اُس سے عشق [illegible] اور ـــــ اور پھر ـــــ جیسے اُس فلم کا سین تھا! ـــــ "کیا آپ مجھے غریب سمجھ کر میری آبرو کا سودا کرنا چاہتے ہیں! ـــــ میں ـــــ میں ـــــ یہ لیجئے میں اپنا استعفیٰ پیش کرتی ہوں!"

نہ ـــــ نہ بابا! میں یہ رسک نہ لوں گا! کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی اور وہ واقعی چلی گئی تو ـــــ تو ـــــ! آخر وہ خود آپ ہی یہ ٹریجڈی کیوں نہیں پیش کرتی۔ اگر اُسے محبت ہے تو پہل اُسی کی طرف سے ہونی چاہئے۔ میرے سبھی کام کرتی ہے، اُسے معلوم ہے کہ مجھے سب سے کیا کہنا ہے۔ کسی بزنس مین سے، فرم کے کسی ملازم سے، کسی دوست یا رشتہ دار سے ـــــ سب سے۔ یہاں تک کہ مجھ سے کچھ مشورہ کئے بغیر میری طرف سے وہ میرے باپ کے خطوط کے جواب میں بھی بالکل وہی لکھ دیتی ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ یقیناً اُسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ مجھے اُس سے کیا کہنا ہے۔ اُس کا فرض ہے کہ میری طرف سے آپ ہی اپنے آپ سے وہ کچھ کہہ ڈالے جو مجھے اُس سے کہنا ہے اور اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دے۔ میں اُس سے فلرٹ نہیں کرنا چاہتا، بلکہ ـــــ

وہ دبے پاؤں میرے آفس میں داخل ہو کر میرے اور دروازے کے درمیان آدھا فاصلہ طے کر چکی تھی۔

"آؤ!" میں عادتاً اپنی جوشش اکثر یں آواز کو دبا کر اس طرح گویا ہوا جیسے کسی بزنس پارٹی سے کوئی نہایت منفعت بخش بزنس ڈیل کرتے ہوئے اپنی مسرت کو دبا لیتا ہوں۔

وہ وہیں رُک کر بہت اعتماد سے مسکرانے لگی۔

میں نے چاہا اُس کے بزنس لیٹر کے اسٹائل میں کوئی لمبی چوڑی تمہید باندھے بغیر میں ابھی اُس سے کہہ دوں "آؤ ہم دونوں شادی ـــــ"

وہ اُسی طرح مسکرا رہی تھی۔

"آؤ نا، بیٹھو!"

میرے ذہن میں کئی خیالات [illegible] منتشر ہو رہے تھے۔ میری پریشانی ظاہر تھی، جیسے میری میز پر کئی فائل بکھرے پڑے ہوں اور مس اجل کی کچھ ضرورت ہو اور وہ کہیں ہو پھر بھی مل نہ رہا ہو۔ ایسے موقعوں پر وہ مجھ سے میری ضرورت کا فائل میز کے کسی کونے سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیتی۔

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی، بے حد خوبصورت، اٹریکٹ، کلپ خان، جس پر گویا اُس کے براؤن رنگ کے انتہا پسند نظر کا "فوری توجہ" کا براؤن لیبل لگا ہوا ہو۔

اور میں جیسے وہ لیبل دیکھ کر بے حد ارجنٹ انداز میں اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"آپ ـــــ پریشان نظر آ رہے ہیں؟"

"ہاں بھئی، تم ہر پیپر پر ارجنٹ اٹینشن، کا فلیگ جو لگا بھیجتی ہو" میں نے میز پر سگریٹ کی ڈبیہ تلاش کرتے ہوئے جواب دیا "اِس وقت تک ٹینشن ہے ـــــ"

"وہ آپ کی بائیں طرف رکھی ہے" اُس نے سگریٹ کی ڈبیہ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تم نے میرے ڈیرا انکل کو خوب چٹھی لکھی ہے" میں نے سگریٹ سُلگا لیا اور دھواں میرے منھ سے نکل کر اُس کے منھ کے پاس پہنچ کر اپنا وجود کھو بیٹھا۔

"میں اکثر سوچتا ہوں میں اپنے ساتھ اِس لئے ہوں کہ تم میرے ساتھ ہو

"میں سوچ رہا تھا اپنے دل کی بات آج اُس سے کہہ ہی دوں لیکن اپنی اِس تمہید سے مجھے کوفت ہونے لگی۔

وہ اب مُسکرا نہیں رہی تھی، پھر بھی یونہی معلوم ہو رہا تھا کہ بہت سکون سے مُسکرا رہی ہے، جیسے کسی چٹھی کے بھدّے سے ڈرافٹ کو پڑھ کر بات تو اُس کی سمجھ میں آگئی ہو لیکن اس کی خواہش ہو کہ یہی بات بڑی رواں، شستہ اور دلنواز عبارت میں فٹ ہو جائے۔

وہ منتظر رہی، حالانکہ وہ بخوبی جانتی تھی کہ میرے الفاظ بہت بے ربط ہوتے ہیں۔

میں نے جھلّا کر کہا "سیٹھ رام پرشاد کی چٹھی کا جواب ہم نے ابھی تک نہیں دیا"

وہ ہنس دی اور آدھی اُٹھ کر گویا ہوئی "ڈرافٹ تیار ہے، لے آؤں؟"

"نہیں اب بہت دیر ہو گئی ہے" میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا "کل کر لیں گے"

"ہہ ہا ہہ ـــــ ہہ ہا ہہ ہہ ـــــ!"

میرے پہلو کے کمرے سے قہقہوں کی آواز سُنائی دی۔ شاید میرا اسٹاف سمجھ رہا تھا کہ میں آفس سے چھٹی کر کے جا چکا ہوں۔

"ارے بھئی، چلے گئے دونوں؟"

"ہاں، کسی پوش ہوٹل کے تنہا کمرے میں گُلچھرے اُڑا رہے ہوں گے؟" کیش کلرک ایکسپورٹ کلرک کو جواب دے رہا تھا "یار، یہ مِس اجبل ـــــ"

مِس اجبل کا براؤن منھ شرم اور غصّے سے اور براؤن ہونے لگا جیسے ہمارے دفتر کا موسٹ ارجنٹ اٹینشن، کا گہرا براؤن فلیگ!

میں نے اپنی تمام تر توجہ اُس پر مرکوز کر دی۔

میری طرف سے تم ہر شخص کی چٹھی کا جواب دیتی ہو۔ اُس سے بالکل وہی کہتی ہو جو میرے دل میں ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے تم سے کیا کہنا ہے؟"

"اُس کا تو پورا ڈرافٹ خود آپ ہی کو تیار کرنا پڑے گا!"

---

# غزل

پروفیسر عبدالرب عرفان ایم۔اے

ارمان و آرزو سے عبارت ہے زندگی
اِک واقعہ ہے یہ کہ محبّت ہے زندگی

اللہ رے یہ ناز و ادائے غم و خوشی
کِس شوخ کی حسین شرارت ہے زندگی

ہر چند جلوہ گر سبھی رنگِ مجاز میں
آئینۂ جمالِ حقیقت ہے زندگی

دُشواریوں کے دم سے ہر سامانِ صد نشاط
دُشواریاں نہ ہوں تو مصیبت ہے زندگی

یُوں جی رہا ہے کوئی تمہارے دیار میں
جیسے کہ اُس غریب پہ تُہمت ہے زندگی

عرفان آپ جس سے ابھی آشنا نہیں
وہ سوزِ ناتمامِ محبّت ہے زندگی



فلم اسٹار
ہیلن کہتی ہیں:
"میں اپنے
رنگ روپ کی دیکھ بھال
لکس سے کرتی ہوں"
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

# سایہ زلف کا

عظیم اقبال ایم اے

کنج نمبر ۱، بیتیا ریاست
۱۰ جولائی ۱۹۹۷ء

برادرم! آداب و نیاز

ادھر قارئین نے بہت دلچسپ خطوط بھیجے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک خاتون نے مجھ سے پوچھا تھا عورتوں کی نفسیات کی عکاسی اتنی کامیابی سے میں کس طرح کر لیتا ہوں؟ میرے جواب سے انھیں تعجب ہوا۔ اُن کی پریشانی اور خفگی جب میں نے بتایا کہ ابھی تجرد کی زندگی بتا رہا ہوں اور صنفِ لطیف کے سایوں سے بہت دور ہوں! کسی بھی کردار کے جائزے اور مطالعے کے وقت ماحول کی ساری کیفیتیں خود میں نے محسوس کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور شاید اسی لئے میری تحریروں نے اتنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ بزمِ نشیمن پڑھ کر بیشتر خواتین نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ دوسری طرف مردوں کی اکثریت نے اُسے سراہا ہے۔ اوّل الذکر طبقے سے مجھے شدید ہمدردی ہے۔ اپنی اس تخلیق میں سرمایہ دارانہ نظام کی ایک ہلکی جھلک میں نے پیش کی تھی۔ میرا قلم حقیقت کی نقاب کشائی کرتا تھا۔ میں اس سلسلے میں کسی وطن کا قطعی معتقد نہیں۔ سایہ زلف کا پڑھئے اور داد دیجئے۔ نیلم کا کیا قصور؟ اُس کی معصومیت بالکل بے داغ ہے۔ یہ صرف حالات کے تقاضے ہیں۔

خلوص کیش ———— عظیم اقبال

---

ایک ادا سے وہ مسکرائی۔ جو نظروں کو سکوڑ کر آخری گوشوں میں لپٹ گئی اور شکیل کی آنکھوں کے سامنے شکیل کی پرچھائیاں اُبھر آئیں۔

نیلم! جب کبھی تم مسکراتی ہو، چاند تاروں کی روشنی مدھم ہونے لگتی ہے۔ چاندنی مرجھا جاتی ہے۔ گھٹائیں رقص کرتی ہیں۔۔۔"

نیلم نے ایسا محسوس کیا شکیل نے اپنی گرم ہتھیلی اُس کے رخسار سے لگا دی۔ نیلم کے دہکتے رخسار سامنے آئے۔ وہ ہوش کھونے لگے۔ اُس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے عیاں ہو گئے۔

"بس خدا! اب تم شرمسار سی کیوں ہو رہی ہو۔ جان بچا کر رہا۔ جاؤ! اب چھوڑ دو۔ ظالم چھوڑ دیجئے ورنہ کچھ ہو جاتا ہے۔"

زینت کے نقوش واضح ہو گئے تھے۔ نیلم نے اُدھر نگاہیں اٹھائیں۔ اُس کے سراپا کا سرسری جائزہ لیا۔

"بس آپی بس! ایکدم ختم ہی کیجئے۔ کسی کی طرح آپ بھی بسنے لگی ہیں۔ آئی ایم سوری! کوئی اسٹوڈنٹ بھی چلے نا۔ کیا لگ رہی ہیں؟ بالوں کی چوٹی سی لٹ آپ کی پیشانی پر کیسی بکھری ہے! مائی ڈارلنگ آپی! آنکھیں کرتی ہیں۔ دیکھئے نا۔ کیسی لگتی ہوں میں؟ یہ جوڑا مجھے خوب اچھا لگتا۔ کاجل کی لکیریں ابھرتی ہیں۔ گالوں کی سرخی بھی تو نہیں؟ پاؤڈر کا داغ تو نہیں رہ گیا؟"

نیلم کے اعضا زینت سے یقیناً زیادہ متناسب تھے۔ آئینہ کم سنی میں نیلم شدید مطلوم ہوئی۔ زینت کے بدن میں اتنا متناسب تناسب تھا کہ بچپن کی بیماری نے بھی بدن کو بگاڑ دیا تھا۔ بہتی سی زندگی کچھ گزرتی تھی۔ نیلم کی آنکھوں میں پڑھنے کی لگن ہمیشہ رہتی تھی۔

"قیامت! سر سے پیر تک ایک محشر بپا کئے ہوئے۔ اگر میں لڑکا ہوتی۔!"

"دھت! آپا۔۔! مجھے بنانے لگیں" نیلم شرما گئی۔ زینت نے اُسے بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

کچھ دنوں سے نیلم اپنے اندر بہت ساری تبدیلیاں محسوس کر رہی تھی۔ یکایک جسم پر گوشت کی تہیں موٹی ہونے لگی تھیں۔ ہتھیلیاں گرم رہتیں۔ رُخسار تپ رہے ہوتے۔ خوشگوار موسم میں بھی پسینے کی بوندیں گالوں پر اُبھر آتیں۔ گھڑی گھڑی طبیعت اُداس رہتی۔ تنہائی کے اوقات سکون بخش ہوتے۔ طرح طرح کے خیالات میں کھو جاتی۔ بیٹھے بیٹھے یونہی مُسکرا پڑتی۔ کبھی ہنسی کی بات بھی بُری لگتی۔ غسل خانے کے قدِ آدم آئینے میں اکثر اُس نے اپنی شبیہ جی بھر کے دیکھی تھی۔ تن کر انگڑائیاں لی تھیں۔ اُس وقت اُسے کسی فلم کی ہیروئن یاد آجاتی۔ پورا منظر نگاہوں میں گھوم جاتا۔ ہیرو اور ہیروئن کی رُومانی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگتیں۔ اُس کے ہونٹ کانپ جاتے۔ کسی خمار کے زیرِ اثر لڑکھڑا جاتی۔ تھکے ہاتھوں سے شاور کھول دیتی۔ پانی کی پھواریں خنک قطرے تیزی سے اس کے بدن کے نشیب و فراز میں لڑھکنے لگتے۔ اس کی پلکیں بند ہو جاتیں ــــــ۔ دیر تک پورے بدن پر صابن کے ملائم جھاگ ملتی رہتی۔ کیف کی ترنگیں اُس کی نسوں میں رواں ہو جاتیں۔ لطیف گدگدی کا احساس ہوتا۔ پھر وہ چونک جاتی، گھبرا جاتی۔ خود سے حجاب آنے لگتا۔

"مائی گڈنس! یہ کیا ہوتا جا رہا ہے مجھے!"

وہ سوچتی ــــــ 'یہ کیا دیوانہ پن ہے؟ جی چاہتا ہے خوب قہقہے لگاؤں۔ فضاؤں میں اُڑتی پھروں! کوئی مجھے۔۔۔۔' اُس کی سانسیں اُبلنے لگتیں۔ ایسے میں ممی کی ڈپٹ سُنائی دیتی۔

"سارا دن نہاتی رہو گی کیا؟ زکام ہو جائے گا۔ جلدی باہر آؤ!" اس آواز پر نیلم کسی اناڑی مجرم کی طرح سہم جاتی ہے۔

بالوں کو شانے پر بکھیر کر دیر تک بالکونی میں چکر لگاتی تھی۔ خم دار کمر سے بھی نیچے اُس کے بالوں کے آخری سرے جھُولتے رہتے۔ ہوا چلتی تو لٹیں اُڑنے لگتیں۔ نیچے گلی میں آتے جاتے لوگ اُچٹتی سی نظر اُوپر ڈالتے۔ پھر اُن کی نگاہیں نیلم پر منجمد ہونے لگتیں ۔ کوئی ٹھنڈی سانس بھرتا۔ نیلم کے جسم میں سوئیاں سی چبھ جاتیں۔ بے نیازی سے وہ اُڑتی ہوئی لٹوں کو سنبھالنے لگتی۔

ممی نے اپنی پسند سے اُس کی پوشاکوں کے ڈیزائن تراشے تھے۔ شلوار میں تھرکتی ہوئی گُڑیا کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ چُست پاجامہ اور بدن پر چپکے ہوئے جمپر پہن کر مغل آرٹ کا نمونہ بن جاتی۔ غرارہ اُس کے حُسن کو تمکنت بخشتا تھا۔ ممی فیشن کے رسالوں کی ورق گردانی کر کے نیلم کے لئے نئے اسٹائل تلاش کرتیں۔ نئے کپڑے پہنا کر ہر لادیتے سے

اُسے دیکھتیں اور سوچنے لگتیں۔ لڑکیاں کس تیزی سے [illegible] جیسے پہلے نیلم نے اپنی چودھویں سالگرہ منائی تھی۔ اس کے [illegible] کیا تھا۔ اب کیا نیلم کو دیکھ کر اُن کی ہمت ہوسکے گی کہ اُسے قریب [illegible] سوچنے لگی تھیں۔

اپنے جسم کی دلفریبیوں سے نیلم واقف تھی۔ اسکول بس میں جاتی تھی [illegible] پر چلتے پھرتے لوگ اُسے کس طرح دیکھتے تھے! اُس کی سہیلیاں اُسے کھینچ کر [illegible] اُس کا دم گھٹنے لگتا۔ ساتھ ہی اُسے بے حد سکون کا احساس ہوتا۔ خالی [illegible] سہیلیاں اُسے گھیر لیتیں۔ اسکول کے احاطے کے کسی دُور افتادہ گوشے میں محفل جم جاتی۔ نیلم گاتی بھی بہت خوب تھی۔ اُس کے گیت کے لئے سب اصرار کرتیں۔ ایک 'دو' 'تین' چار کئی کئی گیت وہ سُناتی۔ گانے میں اُسے بھی لُطف آتا تھا۔ سہیلیاں تعریف کرتی جاتیں۔ پھر آپس میں اشارے بازی ہوتی۔ آپ بیتی شروع ہو جاتی۔ من گھڑت قصے سُنائے جاتے۔ کچھ سُننے کی سب کی باری آتی۔

"میرے پڑوس میں کالج کا ایک لڑکا رہتا ہے۔ میری کھڑکی اور اُس کی کھڑکی آمنے سامنے ہے۔ جب بھی میں نے پردہ سرکایا ہے وہ بے حیائی سے دانت کھیسنتا ہے۔ کئی بار جھُک کر سلام بھی کر چکا ہے۔"

"مکھڑا کیسا ہے اس کا؟"

"بس ہے! کوئی خاص بات نہیں۔"

"تب بُرا کیا ہے؟ ایک عدد پریم پتر بھیج دو۔ وہ بزدل ہے جو دل کی بات کہتے جھجکتا ہے۔"

نیلم کی دھڑکنیں تیز تر ہو جاتیں۔ کچھ کہنے کی اُس کی باری آتی تو ٹال جاتی۔

"میں تو صرف گانا سُنا سکتی ہوں، کہانی نہیں۔"

"جھوٹ!"

"مکاری کرتی ہو۔"

"تیرے حُسن کی آنچ میں کون جلنا نہ چاہتا ہوگا!"

نیلم کو شدید اُمس کا احساس ہوتا۔

"نہیں، نہیں ــــــ سچ ہے۔ بالکل سچ۔ خدا کی قسم!" وہ جھنجھلاہٹ سے کہتی۔

تنہائی میں نیلم کی بدحواسیاں اور شدت اختیار کر لیتیں۔ ڈیڈی اکثر دَورے پر رہتے۔ بھائی جان دُور دراز جگہ پر تعلیم کے حصُول میں لگے تھے۔ سال میں ایک آدھ بار آجاتے۔ گھر میں ممی تھیں اور [illegible] جو نیلم کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتیں۔ پہلے وہ اُن سے اپنی ساری باتیں کہہ دیتی تھی، لیکن اِدھر کچھ دنوں سے اُن کے سامنے

باں پالتے ہوئے بھی اُسے وحشت سی ہوتی۔ اُن کی نگاہوں سے اُسے خوف آتا۔ اُن کے سامنے وہ سہم سمٹ جاتی۔ وہ اُس سے پیار کی باتیں کرتیں مسکراتیں۔

نیلم ٹکٹکی لگائے اُن کی طرف دیکھتی رہتی۔ ذہن خلاؤں میں بھٹک رہا ہوتا۔

"کچھ سنتی بھی ہو۔ ایسے گم صم کیوں ہو؟"

یکایک وہ چونک جاتی۔

"جی! ہاں ہاں!! کیا کہہ رہی تھیں آپ؟"

ممی زور سے ہنس دیتیں۔

"پگلی! کتنی بھولی ہے تو!"

اُنھیں خیال آتا —— یہ زمانہ لڑکیوں کے لئے ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ ہوش نہیں رہتا۔ سوتے جاگتے صرف خواب دیکھتی ہیں۔ زرتار جالوں میں پھنسی رہتی ہیں۔ پریوں کے دیس میں سیر کرتی ہیں۔ کوئی حسین و خوبرو شہزادہ اُن کا تعاقب کرتا ہے۔ وہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ معصوم نیلم! میری پیاری بچی!

---

امسال گرمیوں میں اُن کے بھائی جان آئے تو شکیل اور زینت کو بھی اُن کی ممی نے بلا لیا۔ چند دنوں تک خوب گہما گہمی رہی۔ دو چار روز بعد بھائی جان اُکتا گئے۔ تفریح کے زیادہ شائق نہ تھے۔ پڑھنے لکھنے میں جو وقت گزرتا اُسی کو زندگی کا حاصل سمجھتے۔ ایک صبح اُٹھے اور کالج روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ ممی روکتی رہیں۔ نیلم نے منتیں کیں، زینت نے قسمیں دلائیں، شکیل نے دوستی کا واسطہ دیا لیکن بھائی جان کی ضد کیا رہی جو مان جاتے۔ یکایک ماحول سوگوار ہو گیا۔ شکیل بھائی اور زینت آپا بھی گھر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ممی نے کہا سنا۔

"نیلم بے چاری گھبرا جائے گی۔ تنہائی میں یونہی بے حال رہتی ہے۔ تمہارے ساتھ کچھ جی لگ گیا ہے اُس کا۔ اُس کی خاطر تو ٹھہر جاؤ!"

وہ لوگ بے بس ہو گئے۔

نیلم کے چہرے پر رونق آ گئی۔

---

ممی کی طرح رفیعہ آنٹی کے بھی دو ہی بچے تھے۔ شکیل جو ملازم ہو چکے تھے۔ زینت میٹرک کر چکی تھیں۔ اب اُن کی شادی کے پیغامات کا سلسلہ جاری تھا۔ پہلے بھی عموماً تعطیلات میں زینت اور شکیل خالہ جان کے یہاں آتے تھے۔ تقریبات میں اکثر کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔ نیلم بھی آنٹی کی سہ منزلہ عمارت کے گوشے گوشے میں چوکڑیاں بھر چکی تھی۔ لان میں زینت آپا کی سہیلیوں کے ساتھ دوڑ کی بازی لگتی کیاریوں سے گلاب توڑے جاتے۔ جوڑے سجتے۔ جھرمٹ کے کنج میں بیٹھ کر سرگوشیاں ہوتیں۔ شکیل بھائی نے نیلم کو دھپکیاں لگائی تھیں۔ شرارت سے اُس کی چوٹی پکڑ کر کھینچی تھی۔ اُس کی چیخ نکل جاتی۔ وہ بمشکل سنبھالتے ہوئے وہ آنٹی کے پاس بھاگ جاتی۔ آنٹی سے شکیل بھائی کی شکایت کرتی۔ آنٹی شکیل کو ڈانٹتیں۔ شکیل کو وہ زبان نکال کر چڑا دیتی۔ اپنی جیت پر بہت خوش ہوتی۔

اِس بار شکیل نے پورے دو برس بعد نیلم کو دیکھا۔ اب وہ ننھی سی گڑیا نہ تھی۔ کلی پھول بننے کے لئے بیتاب تھی۔ اُس کے شوخ و نازک اعضا کی خوشبوئیں ماحول کو مہکا رہی تھیں۔ شکیل نے نیلم کے اِس روپ کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ وہ اجنبی سی معلوم ہوئی۔ پہلے کی ساری دھینگا مشتی وہ بھول گئے۔ اُنھوں نے نہ چپت لگائی، نہ چوٹی پکڑی، نہ دھپکی ماری۔ حیرت و استعجاب سے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی کوئی مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔ نیلم ایک انجانے جذبے سے سرشار تھی۔ ایک شریر مسکراہٹ اُس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اُس کی آنکھوں میں شفق کی سرخیاں اُبھر آئیں —— اب نیلم کے اُلجھے اُلجھے خیالوں کی زد میں شکیل بندھتے جا رہے تھے۔ سب کی نگاہوں سے بچ کر شکیل کی جانب وہ دیکھتی۔ کبھی دونوں کی آنکھیں مل جاتیں، نظریں ہم آغوش ہو جاتیں۔ عجب کسک سی وہ محسوس کرتی۔ ایک درد جاگ اُٹھتا۔ تنہائی میں شکیل کے سائے اُبھرنے لگتے۔ انگڑائیاں لیتے ہوئے اچانک ایسا محسوس ہوتا وہ آ ہی تو گئے! گھبرا کر وہ ہاتھ گرا دیتی۔ شرمائی لجائی کنوا بیاں کتنی حسین لگتی ہیں! وہ چاہتی شکیل اس کا دامن تھام کر اپنی طرف کھینچیں۔ وہ تکرار کریں۔ وہ اصرار کریں۔ جب بات بنے تو وہ اُس کے کاندھے پر اپنا سر ٹکائے ہوں۔ اُن کی سانسوں کی حرارت سے وہ پگھل رہی ہو۔ اُس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے دھیمے سے وہ اس کا ہاتھ تھام لیں اور کہیں ——

"مجھے تم سے محبت ہے! بے پناہ۔ میری جان! تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا!" وہ یکایک اپنی شبک شبک اُنگلیاں اُن کے ہونٹوں پر رکھ دے اور وہ فرطِ محبت سے اُس کا ہاتھ چوم لیں۔

---

اُس رات کئی بار نیلم پر غنودگی چھائی لیکن نیند نہ آئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کروٹیں بدلتی جا رہی تھی۔ کمرے میں زیرو پاور کا نیلا بلب روشن تھا۔ برسات کی پھوار سے موسم خنک ہو گیا تھا۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ جاتے۔ بیلے کی بھینی بھینی خوشبو ماحول کو معطر کر رہی تھی۔ سرہانے سے اُس نے کلائی کی گھڑی اُٹھائی۔ ایک بجنے میں چند سیکنڈ باقی تھے۔ سونے کے لئے وہ پھر کوشش کرنے لگی۔ بے چینی میں آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ اُس کے ذہن میں خیالوں کا ایسا لا متناہی سلسلہ تھا کہ وہ بار بار نیند کے لئے سائے

[illegible] تھی کہ کوئی دریچہ تھا۔ وہ [illegible] بستر پر شکنیں پڑی تھیں۔ سامنے [illegible] پلنگ پر زینت آپا مزے سے سو رہی تھیں۔ نیلم نے بستر سے اٹھ کر ٹیبل کے اوپر سے پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئی۔ اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ زینت آپا اب بھی کسی سے ہمکلام تھیں۔ نیلم کمرے میں ٹہلنے لگی۔ کئی چکر لگا ڈالے لیکن اضطراب کم نہ ہوا وہ کمرے سے باہر نکلی۔ سناٹے میں مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز زندگی کا ثبوت دے رہی تھی۔ جھینگروں کی موسیقی بھی فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ دبے قدموں سے وہ آگے بڑھنے لگی۔ یہ ممی کا کمرہ تھا۔ اندر گہری خاموشی تھی۔ ڈیڈی باہر گئے تھے۔ ممی کا کمرہ مقفل تھا۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے قدم قدم پر [illegible] جا رہی ہو اور پکڑے جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کمرے میں شکیل [illegible] نے کواڑ پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ نیلم نے کواڑ پر ہاتھ رکھا [illegible] آواز ہوئی۔ پھر نیلم کے قدموں کی چاپ ابھری۔ شکیل جاگ پڑے۔

”کون ہے؟“ شکیل نے پکارا۔ ”کون؟“

نیلم کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔ تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی۔ بستر پر اوندھے منہ گر پڑی اور روتے ہوئے سسکیاں بھرنے لگی۔

---

# غزلیں

**پروفیسر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء ایم۔ اے**

بے قراری کے مزے سوزشِ پیہم کی بہار
ہم نے لُوٹی ہے محبت میں عجب غم کی بہار

اُن کے فیضانِ کرم ہی کا ہے اِک عکسِ جمیل
خندۂ زخم ہو یا دیدۂ پُرنم کی بہار

صاف کہتی ہے یہ آشفتہ مزاجی دل کی
اِس نے دیکھی ہے کسی گیسوئے برہم کی بہار

یوں تو دلکش ہے جمالِ مہ و انجم بھی مگر
اور ہی چیز ہے اُس حسنِ مجسم کی بہار

جلوۂ غنچہ و گُل ہو کہ فضاؤں کا نکھار
صحنِ گلشن میں ہے سب آپ ہی کے دم کی بہار

دیدہ و دل کو عطا کرتی ہے سامانِ نشاط
آتشِ گُل میں مچلتی ہوئی شبنم کی بہار

منشاؔ نکھرے جو ذرا اور شعورِ انساں
تب کہیں دیدنی ہو گلشنِ عالم کی بہار

**مس غزالہ اشفاق**

انجان سے جذبات کا احساس ہوا ہے
وہ آئے تو ہر بات کا احساس ہوا ہے

اِس زیست میں آئے ہیں کئی ایسے بھی لمحے
گزرے ہوئے دن رات کا احساس ہوا ہے

کچھ وہ بھی کشیدہ سے رہا کرتے ہیں مجھ سے
کچھ مجھ کو بھی حالات کا احساس ہوا ہے

دیکھو تو سہی آج کہ دُنیائے غرض میں
کِس کِس کو مکافات کا احساس ہوا ہے

اب تو وہ تصور میں بھی شرماتے ہیں مجھ سے
شاید مرے جذبات کا احساس ہوا ہے

اللہ رے بے ساختہ نظروں کا تصادم
جذبات کو جذبات کا احساس ہوا ہے

اِس دورِ تغیر میں غزالہ مجھے اکثر
بدلی ہوئی ہر بات کا احساس ہوا ہے

# عشق کا ریس

زکی انور ایم۔ اے

شعبۂ اردو، کریم سٹی کالج، جمشید پور نمبر ۱
۸ر اگست ۶۷ء
بھائی جان! تسلیم

. . . دیکھئے کس قدر جلد آپ کے حکم کی تعمیل ہو رہی ہے اور کہانی حسبِ ارشاد دلچسپ بھی ہے (" چسپ" تو بہرحال ہے البتہ "دل" کا معاملہ ذرا مشکوک ہے۔ کیا عجب ہے کسی کو "دماغ چسپ" محسوس ہو) ——— پاگل خانے اور خواکوؤں کے اڈّے کو چھوڑ کر کہیں سے بھی دس نوجوان بلا لحاظِ جنس پکڑ لیجیے انشاء اللہ اُن میں سے نو عاشق ہوں گے یا معشوق یعنی یہ موجودہ نسل عشق کی نسل ہے، عشق کا ریس ہے ——— جیسے آریائی نسل، دراوڑ نسل، ریڈ انڈین ریس وغیرہ ——— اب آگے بڑھئے۔ آپ نے گھوڑوں کا ریس نہ دیکھا ہوگا کیونکہ وہاں مجوا ہوتا ہے۔ اسکول اور کالج کے بچوں کا ریس نہ دیکھا ہوگا کیونکہ آپ کو فرصت نہیں ملتی۔ مذہبی مُلّاؤں اور پنڈتوں کے ریس سے بھی آپ کو دلچسپی نہیں اور سیاسی گھوڑوں کے ریس کا تو آپ مذاق ہی اُڑاتے رہتے ہیں لیکن کوئی نہ کوئی ریس تو آدمی کو دیکھنا ہی چاہئے۔ ریس میں حصہ لینا صحت کے لئے مفید ہے اور دیکھنا آنکھوں کے لئے ——— اِسی لئے آپ کو عاشقوں اور محبوباؤں کا ریس دکھا رہا ہوں۔ دیکھئے اور کلیپنگ کیجئے۔ ویسے میری طرف سے پوری اجازت ہے کہ اگر کوئی باذوق چاہے تو یہ ریس دیکھ کر کلیپنگ کرنے کے بدلے سینہ کوبی بھی کر سکتا ہے۔ ہنگامہ بہرحال چاہئے کیونکہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے ریس کے میدان کی رونق! (اچھی اور باوزن پیروڈی نہیں ہوئی، نہ ہی جدید ترین شاعری ہے) ——— جدید ترین شاعری کی بات نکلی تو میرے ہم پیشہ دوست پروفیسر بھارتی مدنی کی ایک نظم سُن لیجیے ———

وقت کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہے اِک طوطا
کر رہا ہے کاؤں کاؤں۔ کاف کاف،
اور کوّا چُپ کھڑا ہے
وقت کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہے ایک طوطا
سر ہے اُس کا زرد و تر
دھڑ ہے اُس کا مثلِ نیل
دُم ندارد
یہ روایت کا ہے بھوت ———

آداب عرض ہے بھائی جان! کیسا بھرتا ہے ڈال کر میں نے آپ کے یہ نظم بیسویں صدی میں چھپوا دی! . . .

آپ کا اپنا ——— زکی انور

جانِ جاں! تسلیم

کل میں آپ کو خط نہ بھیج سکی۔ کیا کروں بہت کم موقع ملتا ہے۔ آج میں کالج گئی تھی اور وعدے کے مطابق مجھے آپ کو بُلوانا چاہیئے تھا۔ لیکن کالج کی سہیلیاں ہر وقت ساتھ رہتی ہیں۔ آپ کی دید کی اُمید لئے میں آج تنہا آئی تھی کہ شاید راستے میں کہیں عید کا چاند نکل آئے۔ لیکن میری ایسی قسمت کہاں کہ کوئی راستے میں میرے لئے انتظار کی زحمت گوارا کرے!

آپ نے مجھے میں جگوتی کے گھر میں آنے کو لکھا ہے لیکن میری جان! اُس کے بالکل عقب میں میرے ایک لیکچرر کا مکان ہے۔ میرا وہاں جانا ہرگز مناسب نہیں۔

ایک بات ——— اور وہ ایک بات بڑی عجیب سی ہے۔ کہنے کی ہمت تو نہیں پڑتی لیکن کہہ رہی ہوں اور اِس اُمید کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ آپ بُرا ہرگز نہ مانیں گے۔

آج میری ملاقات عصمت سے ہو گئی۔ وہ امتحان دینے آئی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں آپ کی بات نکل آئی۔ وہ میری بہت ہی نزدیکی اور بے جھجک سہیلی ہے۔ اُس نے آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا اور جو کچھ اُس نے بتایا وہ بڑے بھروسے اور یقین کے ساتھ بتایا۔ اُس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ آپ بڑے باتونی ہیں۔ بے وفا۔ عصمت کچھ اِس طرح کہہ رہی تھی جیسے وہ اپنی ہی بیتی کہہ رہی ہو۔ مجھے تو کچھ بھی یقین نہیں آیا۔ لیکن ہمارا ساتھ کوئی چار دن کا ساتھ نہیں، جنم جنم کا ساتھ ہے اِس لئے میں التجا کرتی ہوں کہ آپ سچ سچ بتائیں کہ قصّہ کیا ہے؟

کل تو آپ سچ مچ ناراض ہو گئے تھے۔ میں نے تو ویسے ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ آپ شادی کر لیجئے۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں آپ کو اِتنا تو سمجھنا چاہیئے تھا کہ جب ہم نے زندگی کا لمبا سفر ساتھ ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر اور کسی سے شادی کا کیا مطلب؟

ہاں ——— عصمت سے متعلق ایک بات تو میں بھول ہی گئی۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ دیکھنا شبنم وہ تمھیں ضرور دھوکا دے گا! لیکن یہ بھی سُن لیجئے کہ اِس کے جواب میں میں نے کہا تھا۔ مجھے اُن پر بھروسہ ہے وہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتے! اور وہ مُسکراتی ہوئی خاموش ہو گئی تھی۔ لیکن اُس کی مُسکراہٹ میں جو زہر تھا، مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ زہر میری رگوں میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔

میرے مقصود۔ میرے منزلِ مقصود! مجھے قتل کر دینا لیکن مجھے دھوکا نہ دینا۔ کیونکہ فریب خوردگی کے کرب کو کم کرنے کے لئے جو موت میں قبول کروں گی وہ بڑی اذیت ناک ہو گی۔ جبکہ تمھارے ہاتھ سے مر جانا میں ہنستے ہنستے منظور کر لوں گی۔

اب اجازت دو ——— تمھاری اپنی ——— شبنم

شبنم! میری جان

میں تو شاید یں کرتے کرتے ہار گیا لیکن تم کبھی مجھ سے تم کہہ کر مخاطب نہ ہوئیں۔ لیکن خدا بھلا کرے محبت کے اُس جذبے کا جسے جنون کہتے ہیں۔ کل والا خط بھی تم نے ہمیشہ کی طرح "آپ" ہی سے شروع کیا ہے لیکن خط کے آخر میں میرے جنونِ عشق نے بہرحال تمھیں مجبور ہی کر ڈالا کہ تم، مجھے تم سے خطاب کرو!

میری جان! اِسی کا نام جنون ہے، جذبہ ہے اور وارفتگی ہے یقیناً میں اپنی عبادت میں اُس مقام پر پہنچ گیا ہوں، جب ذرا گردن جھکاؤں نہ صرف تمھاری تصویر دیکھ لوں بلکہ تم سے باتیں کر لوں اور تمھارا ہاتھ چُوم لوں!

عصمت نے جو کچھ کہا ہے بالکل درست ہے۔ میں اُس کے ساتھ بے شک باتونی رہا۔ میں نے اُس کے ساتھ یقیناً بے وفائی کی اور مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اُسے دھوکا دیا۔ لیکن کیوں؟ ——— اِس کیوں کا جواب تم ذرا عصمت ہی سے پُوچھنا اور اگر مجھ سے ہی سُننے پر بضد ہو تم تو سُنو ——— ہم بس ایک بار اتفاق سے کہیں مل گئے۔ اُس نے ہماری فٹ بال ٹیم کی فتح پر مبارکباد دی مجھے، اور پھر محبت ٹھن گئی۔ اور اِس بات کا اندازہ لگا لینے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہوئی کہ وہ مجھ سے فیشن کے طور پر عشق کر رہی ہے یعنی جس طرح تنگ لباس خونخوار ناخن اور اُلجھے پریشان بال وغیرہ فیشن میں شامل ہیں اُس نے ایک مجھے بھی شامل کر لیا تھا۔ پتہ نہیں میری حیثیت کا سنیما کی تھی یا کاسمیٹک کی۔ لیکن میں تھا بہرحال فیشن کی ایک چیز۔

اور جب میں اپنے اِس احساس میں پختہ ہو گیا شبنم تو پھر میں بھی اُس ریس میں شامل ہو گیا جسے عصمت تنہا دوڑ کر جیت لینا چاہتی تھی۔ اب ہم دونوں فرضی اور خالصاً بناوٹی محبت کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ کبھی وہ آغا حشر کے کسی عشقیہ ڈرامے کے مکالمے یاد کر کے آتی اور مجھ سے کئی میل آگے نکل جاتی اور کبھی میں کئی کئی دن شیو نہ بنوا کر اُسے پیچھے چھوڑ دیتا۔ کبھی وہ گلیسرین کے آنسو بہاتی اور کبھی میں پیاز کا بخار لے آتا (نوٹ کر لو شبنم! پیاز کچل کر بغلوں میں دبا کر لیٹ جانے سے دو گھنٹے میں بخار آ جاتا ہے۔ شاید تمھیں بھی یہ نسخہ کبھی کام دے جائے) کبھی اُسے ٹی بی ہونے لگتی اور کبھی مجھ میں مرگی کے آثار شروع ہو جاتے۔ کبھی وہ خودکشی کے لئے خواب آور ٹکیاں خریدتی اور کبھی میں پھانسی کے لئے مرنے کے لئے ریشمی رسّی خرید لیتا (جو دراصل امّاں مرحومہ کی گھر کی ضرورت کے لئے منگائی جاتی) خلاصہ یہ کہ ہم میں دو برس تک شدید رسّہ کشی چلتی رہی لیکن یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کون جیتا کون ہارا۔ اِس لئے ٹرافی ہم میں سے کسی کو نہ مل سکی ——— اب عالم یہ ہے کہ اپنی سہیلیوں سے وہ مجھے بے وفا کہتی ہے اور اپنے دوستوں میں بیٹھا میں اپنے سینے پر زور سے گھونسا مار کر

کہتا ہوں ہائے ظالم تو نے مجھے تباہ کر دیا! یعنی مس ونگ اب بھی چل رہی ہے۔
میری جان، جانِ بہار! میں نے دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے تمہیں
میری باتوں کی صداقت پر شک ہو تو ہو، تمہارا دل مجھے کبھی بے وفا اور دھوکے باز
نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے کہ وہ دل تمہارا نہیں میرا ہے۔
کل ضرور ملو ورنہ پھر حشر تک انتظار کرنا ہوگا!
تمہارا ـــــــ مقصود

ـــــــ ۳ ـــــــ

پیارے مقصود! خوش رہو
سارے خطوط مجھے ملتے رہے ہیں۔ لیکن آج کل میں اتنا مصروف ہوں کہ تمہیں شکریہ کا ایک خط بھی نہ لکھ سکا۔
تم نے اپنی اور شبنم کی محبت سے متعلق میری رائے دریافت کی ہے یعنی مقصود! جہاں تک اس کے خطوں کا تعلق ہے یقیناً ایسا معلوم ہوتا ہے وہ بھی تم سے محبت کر رہی ہے۔ لیکن میرے یار! محبت کا تعلق دل سے ہے خط سے نہیں۔ خط تو ایسے بھی لکھے جا سکتے ہیں کہ فرہاد اور قیس قبر پھاڑ کر نکل آئیں کہ اب خط نویسی سیکھنے کے بعد عشق کریں گے۔ لیکن میرے یہ لکھنے سے تم بد دل نہ ہو جاؤ۔ شبنم کی محبت پر مجھے ہرگز شبہ نہیں ہے اور بات کہ ملاوٹ کی اس دنیا میں خود اپنے ہاتھ سے دوہا ہوا دودھ بھی کھاتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملازم پر شک ہونے لگتا ہے۔ خدا کرے تمہاری شبنم کے خط اور اُس کی محبت خالص ہو!
تمہارے اور عصمت کے درمیان جو ریس ہوتی رہی اُس کا حال پڑھ کر بے حد ہنسی آئی۔ ماشاء اللہ تم خط بہت پیارے لکھتے ہو۔ رہی بات اُس ٹرافی کی جو نہ تم پاسکے نہ عصمت! یار مقصود!! وہ میرے پاس بھیج دو میں وقت ضرورت استعمال کروں گا!
محبت کرو اور بہت دن جیو۔ لیکن عزیزم! یہ دھیان رہے کہ محبت سے نہ تو روٹی تیار ہوتی ہے نہ پتلون سل سکتی ہے اور نہ امتحان ہی میں عشق کرنے والوں کے لئے رعایتی نمبر ہوں گے۔ لہٰذا یاد رکھو کہ تعلیم مقدم ہے!
تمہارا بھائی ـــــــ فیروز

ـــــــ ۴ ـــــــ

پیارے بھائی جان! تسلیم
اپنے دو خطوں کی کاربن کاپی اور شبنم کے سات خطوں کی نقل ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ ابھی تک آپ نے ان خطوط کے بارے میں یہ نہیں لکھا کہ یہ خط آپ کے کام آئیں گے یا نہیں۔ پیارے بھائی جان! اب تو وہ زمانہ نہیں رہا کہ عاشقوں سے ناٹک لکھے جائیں، نوٹنکی کھیلے جائیں، ڈرامے اسٹیج ہوں یا فلم بنیں۔ اب تو ہم عاشقوں کے لئے لے دے کر ایک ہی سہارا رہ گیا ہے یعنی ناول لکھنے والے بھائی لوگ کرم فرمائی کریں اور ہماری محبت کا تاج محل تعمیر کر دیں۔ خاص طور پر آپ تو بہت بڑا کام کر رہے ہیں کہ ہم عاشقوں کے خطوں سے افسانے تیار کرتے رہتے ہیں جب ہی تو لڑکے اور لڑکیاں چاہے وہ عشق کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں آپ کے دیوانے ہیں، متوالے ہیں، شیدائی ہیں ـــــ کہئے میرے پیارے بھیا! ہماری محبت کا ناول چاقو اور چراغ“ کب تک آپ لکھیں گے۔ لکھ دیجئے بھائی جان تاکہ جب تک دنیا میں چاقو باقی ہے اور جب تک چراغ مار کر لوگ باقی ہیں ہماری محبت زندہ رہے!
کل پرسوں آپ کو ایک پارسل ملے گا جس کے اندر سے ایک عدد ٹرافی برآمد ہوگی۔ اسلان کر دیجئے کہ یہ ٹرافی اُسی خوش نصیب لڑکے یا لڑکی کو ملے گی جو اپنے مقابل محبوب یا محبوبہ کو زیادہ سے زیادہ دھوکا دے سکے!
آپ نے تفریح کی تھی لیکن میں نے سوچا فی زمانہ ایسے مقابلوں کی سخت ضرورت ہے۔
آپ کی دعاؤں کا طالب ـــــــ مقصود

ـــــــ ۵ ـــــــ

مائی ڈیر مقصود سلمہٗ! خوش رہو
تمہارے تینوں خط ملے تھے۔ تیسرے خط میں تم بہت غصے تھے پھر بھی میں تمہیں بروقت جواب نہیں دے سکی۔ بھائی تم اپنی شبنم سے میرا مقابلہ کرو گے تو یہ زیادتی ہوگی۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ عشق کر رہی ہے۔ میں بھی تمہارے بھیا سے عشق کر رہی تھی تو خط لکھنے کے معاملے میں شبنم کی نانی تھی۔ نماز قضا ہو جائے تو ہو جائے لیکن کیا مجال ہے کہ صبح، دوپہر، شام، تینوں وقت ایک ایک خط لکھنا ناغہ ہو جائے۔ فرض کرو کہ میں تم سے عشق بھی کرنے لگ جاؤں تو شبنم کی سی پابندی سے ہرگز خط نہیں لکھ سکتی۔ کیونکہ مجھے تو اپنے اُن عاشقوں کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے نا جن میں سے کوئی اسکول کے لئے تیار پاؤں پٹکتے ہوئے فریاد کرتا ہے ٹفن بکس... ٹفن بکس... میرا ٹفن بکس کہاں ہے، کوئی عاشق فراک کا بٹن بند کروانے کے لئے ہنگامہ مچاتا ہے، کوئی کنگھا لئے بال سنوارنے کے لئے فریاد کرتا ہے جب کوئی لوری دے کر سلانے کی ضد کرنے لگتا ہے۔ ذرا بی شبنم ایک آدھ بچہ دے لیں پھر تم سے بات کروں گی۔ بشرطیکہ وہ بچے تمہارے بھی ہوں یعنی اُن سے تمہاری شادی ہو لے تب دیکھوں گی عشق کہاں جاتا ہے؟
جیسے تم غیر سنجیدہ، ویسے تمہارے بھیا واہیات ـــــ تم نے سچ مچ کی ٹرافی بھیج دی ہے اور تمہارے بھیا نے دوستوں میں سچ مچ اعلان کر دیا ہے کہ یہ ٹرافی اُس کو ملے گی جو ثابت کر دے کہ وہ سب سے بڑا نقلی عاشق ہے ـــــ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات سنو، وہ یہ ہے کہ میری بہن شکیلہ چپکے سے مقابلے میں شریک ہو گئی ہے

# انڈین آئل
## ہمارا ہے





انڈین آئل کے باعث مجھے اسٹوو کے پاس کٹھن گھنٹے گذارنے سے نجات مل گئی ہے۔ اب مجھے شہری مصروفیات کے لئے بھی کافی وقت مل جاتا ہے۔ انڈین ۔ جو انڈین آئل کی سیال پٹرولیم گیس ہے ۔ کی وجہ سے میرا کھانا جلدی، صفائی سے اور بآسانی پک جاتا ہے۔

انڈین آئل کی وجہ سے میرے اور والدہ کے گھریلو کام کاج میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔ یہ جیوتی مٹی کا تیل بھی سپلائی کرتا ہے جس سے ہمارے گھر کا چراغ روشن ہوتا ہے اور کھانا پکتا ہے۔ مٹی کا تیل ہمارے گاؤں میں بیل گاڑی سے پہنچتا ہے لیکن انڈین آئل یقینی طور پر اس کا انتظام کرتا ہے کہ یہ ہر گاؤں، قصبہ اور دیہات میں پہنچے چاہے وہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں۔ اور اس کے لئے ٹینکر، ویگن اور ٹینک ٹرک، بحری وسیلے، اونٹ اور خچر گاڑیاں، ہاتھ گاڑیاں غرض ہر طرح کے ذرائع نقل و حمل استعمال کئے جاتے ہیں۔

انڈین آئل یہ سب اس لئے کرنے کے قابل ہے کیونکہ یہ ہمارا اپنا ہے۔

INDIANOIL

اقتصادی خوشحالی کے لئے قومی ٹرسٹ
**انڈین آئل کارپوریشن لمیٹیڈ**

IOC 7718 DUR.

اور جو مولانا بچوں کو مذہبی تعلیم دینے آیا کرتے تھے، تمھیں یاد ہوگا مولانا دلدار بخش، اب وہ شکیلہ کو فارسی پڑھاتے ہیں اور شکو رانی بےچاری مولانا کو پیر توت بنا رہی ہے۔ جب کہ ریحانہ سے ظفر صاحب عشق کر رہے ہیں اور بہت ہی زور شور سے عشق کر رہے ہیں! میں نے بھی اللہ کا نام لے کر ڈنڈ شروع کر دی ہے اور کل ہی میں نے نریش بھائی کو ایک خوبصورت سا رومال پریزنٹ کیا ہے۔ شگفتلا دیدی اچھن دولہے سے پریم کر رہی ہیں اور ایس ڈی او صاحب زنانہ کالج کی انگریزی کی لیکچرر مسز بھلا دواج سے ـــــ ایک ہنگامہ برپا ہے لیکن اس سلسلے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس لڑائی کے بارے میں جوڑے کے دونوں ہی فرد کو کچھ نہیں معلوم ہے۔ معلوم ہے تو صرف ایک تو دوسرا بےچارہ بظاہر کچھ نہیں جانتا ہے لیکن یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سچی محبت بھلا کون کرنے لگا؟ خلاصہ یہ کہ شکیلہ، ریحانہ باجی، میں، شگفتلا دیدی اور ایس ڈی او صاحب سب ہی اپنی جگہ لڑائی جیتنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ لیکن میرے پیارے مقصود میاں! میں سمجھتی ہوں یہ لڑائی واپس تمھارے ہی شہر کو چلی جائے گی۔ کیونکہ تمھاری شبنم رانی نے تمھیں اب تک یہ نہیں بتایا ہے کہ اُن کی شادی بچپن ہی میں ہو چکی ہے اور اُن کے خاوندِ نامدار زندہ سلامت ہیں!

تمھارے بھیا آج دو بجے کے پلین سے بمبئی گئے۔ غالباً پرسوں آئیں گے اور اگر اُن کی کہانی کے سیٹ پر جانے کی بات ہوئی تو پھر ایک ہفتہ تک اُنھیں وہاں رہنا ہوگا۔

تمھاری داستانِ عشق عرف "چاقو اور چراغ" المعروف بہ قصہ چمن بھائی بہ تصویر یہ لکھی جانے لگی ہے اور فیروز صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ لونڈا ابھی کیا نام لے گا، عنوان اچھا ہے ـــــ "چاقو اور چراغ"۔ اِس لئے میں اِس کی فلمی کہانی لکھوں گا۔ اب ملنگ بابا کے نام سے فاتحہ کرو۔

حیرت ہے کہ شبنم مجھے کیوں یاد کرتی ہے اور کیوں اُس نے مجھے سلام لکھوایا ہے۔ جب کہ میں جانتی ہوں کہ عصمہ کی طرح وہ بھی خواہ مخواہ مجھ سے بدظن ہے حالانکہ عصمہ یا شبنم کی کہانی نہ میں لکھتی ہوں نہ فیروز صاحب کو لکھنے پر اکساتی ہوں۔

خدا کرے تم بخیر ہو۔

تمھاری بھابی ـــــ ذکیہ

٦

پیارے مقصود!

ہاں تمھیں درست خبر ملی ہے، تم نے مخبر کا نام چھپا لیا ہے لیکن میں جانتی ہوں یہ مخبری یا تو فیروز صاحب نے کی ہے یا اُن کی بیگم نے۔ لیکن یہ درست ہے مقصود کہ میں شادی شدہ تو نہیں لیکن میرا عقد ہو چکا ہے۔ لیکن شادی نہیں ہو سکتی۔ عقد کے فوراً ہی بعد میرے بزرگوں اور رشتہ داروں نے خدا کے فضل و کرم سے یہ محسوس کر لیا کہ اگر میری شادی اُس میٹرک فیل لڑکے سے ہو گئی تو پھر وہ شادی شادی نہ ہوگی بلکہ میرا ماتم ہوگا۔ اس لئے عنقریب معاملہ ختم ہو جائے گا۔ چاہے اِس کی صورت عدالت ہی کیوں نہ ہو۔

میرے مقصود! میں نے تم سے اِس لئے محبت نہیں کی ہے کہ تم فیشن کے طور پر محبوب بنائے جانے کے لئے حد درجہ فِٹ ہو۔ نوجوان، خوبصورت، تندرست اور شہرت یافتہ کھلاڑی۔ میں نے تمھیں دل سے پیار کیا ہے اور تمھارے سوا کسی اور کی تصویر اِس دل میں کبھی نہیں بسا سکتی۔

سُنو مقصود! خط و کتابت سے باتیں کرنے میں مجھے ذرا بھی تشفی نہیں ہوتی۔ میں تم سے تنہائی میں اور رُوبرو کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی موقع تلاش کرو۔ میں بھی موقع کی فکر میں ہوں۔

تم نے میری مرضی کے بغیر بیگم فیروز کو میرا سلام کیوں لکھا؟ میں کسی کی خوشامد نہیں کرتی۔ فیروز صاحب میرا افسانہ لکھیں، ناول لکھیں یا فلم بنا ڈالیں۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ـــــ میں عصمہ نہیں ہوں جو "کسی بھی قیمت" پر فیروز صاحب کو دوست بنانے کی کوشش کروں۔

خدا کرے تم اچھے ہو۔

تمھاری اور صرف تمھاری ـــــ شبنم

٧

برادرم مقصود! خوش رہو

پرسوں بمبئی سے واپس آیا۔ کل سارا دن سویا کیا۔ آج ہوش آیا تو سب سے پہلے میں نے ڈاک دیکھی اور اب جواب لکھنے کی باری ہے اور سب سے پہلے تمھیں مخاطب کر رہا ہوں۔

شبنم کے جس خط کی نقل تم نے بھیجی ہے اُس میں ایک بہت بڑی بات ہے۔ اگر وہ بات میں عصمہ کو لکھ دوں تو اپنے وقت کی مشہور اسپورٹس گرل عصمہ سرِ بازار تمھاری شبنم کو اُٹھا کر پٹک دے گی۔ شبنم کو سمجھا دو۔ عصمہ کو میری دوست بننے میں کچھ بھی قیمت نہیں ادا کرنی پڑی۔ اُس کا کردار سنبھل گیا اور وہ میری دوست ہی نہیں بہت اچھی بہن بن چکی ہے۔ شبنم کے خط سے یہ شبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ میں اُن لڑکیوں کو بلیک میل کرتا ہوں جن کے خفیہ حالات مجھے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اب تک میں نے کسی کو بلیک میل کیا ہو یا نہیں یہ الگ بات ہے لیکن شبنم سے صاف صاف کہہ دو کہ اگر وہ مجھ سے "دن کی روشنی میں" مل کر اپنی اور میری پوزیشن صاف نہ کرے گی تو ہو سکتا ہے میں اُسے ضرور بلیک میل کر ڈالوں۔

اُس کا خط پڑھ کر بے حد غصہ آیا اور میں اب تک غصے میں ہوں اور اگر میں آج غصے میں نہ ہوتا تو ابھی تمھارے اور شبنم کے عشق کو کچھ اور چلنے دیتا۔ لیکن غصے میں

بڑے سے بڑا راز فاش کرنے کی روایت چلی آئی ہے اور میں روایت کی اہمیت کا قائل ہوں۔ لہٰذا عرض ہے کہ اپنے دل میں تمہارے علاوہ کسی اور کی تصویر نہ بسا سکنے والی شبنم نے تمہیں مسلسل ایک سال اور سات مہینے تک احمق بنایا ہے۔ آج سے ایک سال سات مہینے پہلے اُس کی نسبت احمد دین صاحب وکیل کے بیٹے محمد دین سے طے پا چکی ہے اور اب بہت جلد شادی ہونے والی ہے۔ حیرت ہے کہ ایک شہر میں رہتے ہوئے تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ اُمید ہے تم بخیر ہو گے۔

تمہارا ——— فیروز

——— ۸ ———

بھائی جان! تسلیم

آپ کا خط ملا۔ میں نے آپ کا پیغام شبنم کو پہنچا دیا۔ پسینے پسینے ہو گئی اور بولی کہ آپ یہاں آئیں گے تو ضرور آپ سے مل کر معاملہ صاف کرے گی۔

بھائی جان مجھے سب کچھ معلوم تھا۔ ایک سال سات مہینے پہلے کی بات بھی اور ایک سال سات مہینے بعد یعنی پرسوں کی بات بھی کہ شادی کے لئے محمد دین میاں کے سوٹ کا کپڑا خود شبنم نے اپنی پسند سے خریدا ہے۔ اور اس سات مہینے اور ایک سال کے اندر جو کچھ ہوتا رہا اُس کا علم بھی خاکسار کو ہے ——— میری آوارگی کا چرچا، میری غریبی پر نفرت اور میرے بی۔ اے نہ پاس کر سکنے پر حقارت اور ٹیڑھے منہ اور مسور کی دال جیسے محاورے کا بے تحاشا استعمال! ——— لیکن بھائی جان میں تو اس فکر میں تھا کہ موڈرن اسپورٹس والوں نے ٹرافی کی قیمت کے لئے ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ لہٰذا کیوں نہ ٹرافی جیت لوں اور کم بخت کو ٹرافی ہی واپس لوٹا دوں۔ لیکن حالات بہرحال میرے خلاف ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اپنی پیاری بھابی سے ۲۶ روپے پچاس پیسے قرض لے کر ٹرافی کی قیمت ہی دینی ہو گی۔

آج کل شبنم ہی کا ستارہ چمکا ہوا ہے اور اگر آپ کے ہاں کسی کو ٹرافی نہ ملی تو یقیناً شبنم ہی کو ملے گی۔ کیونکہ وہ آج ایک گھنٹہ اور ستائیس منٹ تک میرے سامنے باقاعدہ روتی رہی اور عشق کا پرچار کرتی رہی جب کہ عصمت سے مجھے معلوم ہوا کہ شبنم اپنی شادی سے مطمئن ہی نہیں بلکہ اتنی خوش ہے کہ ابھی عقد بھی نہیں ہوا اور محمد دین کو لمبے چوڑے خط لکھا کرتی ہے اور محمد دین کی تصویر پر روزانہ پھول کے ہار لٹکاتی ہے! ——— بھیج ہی دیجئے ٹرافی اُس کم بخت کو!

آپ کا ——— مقصود

——— ۹ ———

محترمہ شبنم صاحبہ!

آپ کو میں یہ پہلا خط لکھ رہا ہوں اور اگر میاں مقصود نے مجھے عشق ایک فراڈ کے مقابلے کا بھی نہ بتایا ہوتا تو یہ خط بھی نہ لکھتا۔

"عشق ایک فراڈ" کے مقابلے کی تفصیل آپ نے پڑھ کر مقصود سے معلوم کر لی ہے مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ ہمارے ہاں بھی ایک سے ایک کم بخت عشق کا مظاہرہ کرنے والا چابک دست عاشقوں اور معشوقوں نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا اور ہم سب کو یقین تھا کہ اسکول سے لے کر کالج اور پھر شہر کی ڈرامیٹک کلب کے ڈراموں میں حصہ لے کر ٹرافی جیتنے والی میری سالی شکیلہ ہی یہ ٹرافی بھی جیتے گی کیونکہ اُس نے عشق کے سلسلے میں عبدالشکور صاحب کو چار شادیوں کی افادیت پر تقریر کرنے تک پر مجبور کر دیا تھا اور وہ عنقریب ذکیہ کو شادی کا پیغام بھی بھیجنے کو تھے۔

خاکسار کو بھی اپنے بارے میں کچھ خوش فہمی تھی کیونکہ ریحانہ صاحبہ میرا حد سے زیادہ خیال کرنے لگی تھیں اور اپنی امی سے اُنھوں نے کہہ دیا تھا کہ ابھی وہ شادی کے بارے میں کچھ نہیں سوچتیں، بس ہمارا دواج ایک دن سول میرج کے لئے کورٹ پہنچ گئی تھیں اس لئے ایس۔ ڈی۔ او صاحب بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ٹرافی وہ ہی لیں گے!

لیکن کل آپ کے اور مقصود کے عشق کا معاملہ زیر بحث آیا اور ہم سب نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ٹرافی آپ کی ہے!

مبارک ہو۔ ٹرافی مبارک ہو!!

خیر خواہ ——— فیروز

نوٹ:۔ مہربانی کر کے یہ ضرور لکھئے کہ مسلسل ایک گھنٹہ ستائیس منٹ تک رونے کے لئے آپ نے کیا چیز استعمال کی تھی؟ ——— کمال کر دیا آپ نے!!

# غزلیں

## سیّد جرار حیدر جرّار آروی

مری نظر میں ہے وہ نقابِ رُخِ منوّر اُٹھی اُٹھی سی
بنا ہوں آئینۂ تحیّر ہے نبضِ ہستی رُکی رُکی سی

مرے تصوّر میں آج تک ہے وصال کے بعد کا وہ منظر
دراز گیسو کھلے کھلے سے وہ مست آنکھیں جھکی جھکی سی

نظر کا دھوکا ہے رنگِ عالم کہ ایک ماتم ہے زندگی کا
نقوشِ ہستی مٹے مٹے سے دلوں کی دنیا لُٹی لُٹی سی

چلے بھی آؤ کہ حسرتوں کے چراغ گُل ہو رہے ہیں دیکھو
سحر نمودار ہو رہی ہے اُفق کی جانب ڈھلی ڈھلی سی

گُلوں کی رنگت شفق کی سُرخی فلک پہ جرّار ماہ و انجم
عروسِ فطرت ہے جلوہ فرما روش روش پہ چھپی چھپی سی

## چندر پرکاش جوہر بجنوری

جمالِ دوست جو زیرِ نقاب ہوتا ہے
اِک آفتاب پسِ آفتاب ہوتا ہے

تری نگاہ کی گردش ارے معاذ اللہ
کہ جیسے رقص میں جامِ شراب ہوتا ہے

کوئی ہزار محبت میں احتیاط کرے
خراب ہونا ہے جس کو خراب ہوتا ہے

مجھے بھی بخش دے اے رحمتِ غریب نواز
سُنا ہے تیرا کرم بے حساب ہوتا ہے

میں اپنے دل کی نزاکت کو کیا کہوں جوہر
کسی کا قُرب بھی اکثر عذاب ہوتا ہے

## کیف احمد صدیقی

یہ کس کی یاد ہوئی بے قرار آنکھوں میں
سمٹ گئی ہے شبِ انتظار آنکھوں میں

چلے بھی آؤ کہ اب تابِ انتظار نہیں
مریضِ ہجر کی ہے جانِ زار آنکھوں میں

وہ جس کی یاد سے دل میں گلاب کھلتے تھے
کھٹک رہا ہے وہی مثلِ خار آنکھوں میں

دہک رہا ہے اِک آتش فشاں مرے دل میں
پگھل رہا ہے مگر برف زار آنکھوں میں

رگوں میں خونِ تمنا ہے منجمد لیکن
رواں ہے درد کا اِک آبشار آنکھوں میں

# تجدید

آر۔ ایل ساگر۔ ایم۔ اے

۴۔ہاسٹیڈ ویلی۔ شملہ نمبر ۴

۱۱ اگست ۶۷ء

محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

ایک طبعزاد اور غیر مطبوعہ افسانہ "تجدید" ارسال ہے۔ اُمید ہے آپ پسند فرمائیں گے ــــــ میرے بیشتر افسانے اور مضامین انگریزی جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ اُردو میں میں نے کم ہی لکھا ہے، گو مجھے اِس سے گہرا لگاؤ ہے۔ "بیسویں صدی" اِس "مظلوم" زبان کی بڑی گرانقدر خدمت کر رہا ہے اور اس میں نئے اور پُرانے لکھنے والوں کا ایک نہایت خوبصورت امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ "بیسویں صدی" کی وسیع دکثیر ریڈرشپ نے مجھے اِس میں لکھنے کے لئے اُکسایا ہے . . .

نیاز مند ــــــ آر۔ ایل ساگر

آسمان پر ہلکے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ آج شاید پھر برف گرے گی۔ شملے میں شدید برف باری ہو چکی ہے۔ سردی میں بڑا تیکھا پن آ گیا ہے۔ مکانوں کی ڈھلوانی چھتیں، درختوں کی شاخیں، بجلی کے تار، سڑکیں اور بَل کھاتے ہوئے راستے برف کی تہہ سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ دیو قامت پائن کے درخت اپنے بازوؤں پر برف کے سفید گالے اُٹھائے خاموشی اور سکون سے سر جھکائے کھڑے ہیں۔ کافی ہاؤس اور دفتروں میں کوئلے کے سٹوو جلنے لگے ہیں۔ جن کے اِرد گِرد لوگ ہاتھوں کو سینکتے ہوئے موسم پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ سرِ شام ہوا میں خنکی بڑھ جاتی ہے۔ رات کو بستر میں گرم پانی کی بوتل لے کر سونا پڑتا ہے۔

آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے بمبئی سے آئے ہوئے فلم یونٹ مقامی ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ کالج کے نوجوان لڑکے ہوٹل کے چکر لگاتے ہیں تاکہ فلمی ستاروں سے متعارف ہو سکیں اور اُن سے آٹوگراف لے سکیں۔

ہوٹل کے ٹیرس پر کالے چشمے لگائے دو ادھیڑ عمر کے شخص آسمان پر اُبھرتے ہوئے ہلکے ہلکے بادلوں کو دیکھ کر سر ہلا رہے ہیں۔ دونوں فلم فوٹوگرافر ہیں اور اِس رائے کا اظہار کر رہے ہیں کہ آسمان ابر آلود ہے اِس لئے آج شوٹنگ نہ ہو سکے گی کیونکہ کلر فلم کی شوٹنگ کے لئے سورج کی روشنی ضروری ہے۔

مال روڈ پر بڑے اسمارٹ کپڑے پہنے خوبصورت لڑکے لڑکیاں سکٹس اُٹھائے Ice-skating rink سے لوٹتے ہوئے خوش گپیاں کرتے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ آج پُورے تین دن کے بعد سکیٹنگ کا سیشن ہوا ہے۔

پرمار لنچ پیک کروا کر اپنے اردلی سے بستر اور دوسرا سامان اُٹھوا کر نیچے کارٹ روڈ پر اپنی جیپ کی طرف گیا ہے۔ وہ دفتر کے ایک ضروری کام کے سلسلے میں دو دن کے ٹُور پر ہے۔

میں بستر میں رضائی اوڑھے لیٹا ہوا آج کے پروگرام کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کچھ دیر پہلے میں ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا لیکن ہاتھ سردی کے مارے یخ ہو گئے۔ میں نے ناول میز پر رکھ دیا اور ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔ آنکھیں بند کر کے نیم غنودگی کے عالم میں اپنے بھٹکتے آوارہ خیالات کو ترتیب دینے لگا۔ ابھی میں اِس بے مطلب، بے ربط اور دلچسپ ذہنی کھیل میں مصروف تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اِس سلسلے کو منقطع کر دیا۔ یہ دستک مانوس اور جانی پہچانی تھی۔ میرا بیرا گوردیال جب بھی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو اُس میں موسیقی نما تھپ تھپ سی ہوتی ہے۔ گوردیال آفیسرز میس کا پُرانا نوکر ہے، آج کل یہاں زیادہ لوگ نہیں ہیں اِس لئے اُسے فرصت کا وقت کاٹنا دشوار ہے۔ شام کو وہ چائے لے کر آتا ہے تو میرے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ زمانے کی تیزی سے بدلتی ہوئی روِش اور بڑھتی ہوئی قیمتوں پر

## حدیثِ دل

آہ اپنی بیکسی کا ہوگیا ہم کو یقیں
دل کو دیکھا اور انہیں دل میں نہاں کر رو دیئے ——— قیصر

جانے دل کی دھڑکن میں اعتدال کب آئے
سامنے سے گزرے ہیں وہ ابھی ابھی تنہا ——— احسان دانش

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی ——— فیض احمد فیض

چار دن کی زندگی ہے کاٹ دو ہنس بول کر
دل لگا لو پھر قفس ہی آشیاں ہو جائے گا ——— یگانہ چنگیزی

دل سے جب دل کو راہ ہوتی ہے
آہ ہوتی ہے واہ ہوتی ہے ——— جگر مرادآبادی

مرسلہ۔ ایس۔ ایس۔ ہنکاری ایم۔ اے، کلکتہ

اظہارِ تشویش کرتا ہے۔

میری آواز سُن کر گوردیال نے دروازہ کھولا اور بتایا کہ میرا فون ہے۔

میں ایک سُست جنبش کے ساتھ بستر سے اُٹھا، گاؤن پہنا اور ایش ٹرے پر سے سُلگتا ہوا سگریٹ انگلیوں میں تھاما اور چپل گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

چلتے چلتے میں سوچنے لگا ——— فون کس کا ہو سکتا ہے؟ میں نے باہر کی چُندھیا دینے والی روشنی کا مقابلہ کرنے کے لئے آنکھوں کو بے بس پایا۔ آنکھوں کی پُتلیاں خود بخود سُکڑ گئیں تاکہ تیز روشنی سے مانوس ہو سکیں۔ جب کبھی فون آتا ہے مجھ پر ایک جانی پہچانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اِس اضطراری عمل میں مجھے شک و اعتبار کے تانے بانے میں اُلجھ کر بڑا لطف آتا ہے۔ "فون کس کا ہے؟" اِس سوال کا جواب تلاش کرنے میں جو ایک طرح کی ذہنی مشق ہے اور قیاس آرائی کرنے میں جو نفسیاتی اُلجھاؤ ہے وہ میرے لئے پسندیدہ اور خوشگوار اضطراب سے بھرپور مشغلہ ہے۔ لمحاتی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میری زندگی کا سکون چھن گیا ہے۔ اِس بے بنیاد احساسِ محرومی سے مجھے اُلفت ہو چکی ہے۔

خود پیدا کردہ بے بسی کا یہ عالم مجھے بے حد پسند ہے۔ جیسے میں سوچنا شروع کرتا ہوں کئی لوگ ذہن میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ میں ایک ایک کے بارے میں قیاس آرائی کرتا ہوں اور آہستہ آہستہ کمپاؤنڈ کو پار کرکے فون والے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں۔ اِن چند لمحات میں جو میرے کمرے سے اُس کمرے تک جانے میں صرف ہوتے ہیں خیالات کے اَن گنت تانے بانے بُنے جاتے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہواؤں میں پرواز کرتے کرتے میں اچانک دھرتی پر اُتر آیا ہوں۔

فون کا ریسیور اُٹھاتے وقت مجھ پر بالکل ویسی ہی بے کسی، بے اطمینانی سی حیرت اور انجانے خوف طاری ہو جاتے ہیں جو اُس طالب علم کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں جو امتحان دینے کے بعد نتیجے کے انتظار میں کرب ناک سسپنس سے گزر کر ایک صبح اُس اخبار کو دیکھتا ہے جس میں نتیجہ شائع ہوتا ہے۔ اُس کا بے یار و مددگار اور سہما ہوا دل بالکل ایسے ہی دھڑکتا ہے جیسے اِن حالات میں میرا دل ——— وہ سوچتا ہے کون سی ڈویژن آئی ہے، کتنے نمبر ہیں، اور میں قیاس لگاتا ہوں کس کا فون ہوگا؟

اِس وقت بھی میں ایسی ہی شک و دو میں گرفتار اور سراسیمہ کر دینے والے تذبذب میں اُلجھا ہوا ذہن کے پردے پر کئی لوگوں کی تصویریں دیکھتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا کمپاؤنڈ کو پار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر سیٹھ کا فون نہیں ہو سکتا۔ میں نے سوچا اُس کی آج ایمرجنسی ڈیوٹی ہے۔ شملے میں آئے ہوئے ڈاکٹر کو ابھی ایک سال نہیں ہوا۔ اُس کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے اور وہ دہلی میں پوسٹڈ ہے۔ گرمیوں میں وہ ڈاکٹر کے ساتھ ڈیڑھ ماہ گزار کر گئی ہے۔ ڈاکٹر سیٹھ بہت خاموش طبع انسان ہے لیکن بلا کی تیز نگاہ رکھتا ہے۔ وہ کئی بار پرائیویٹ کلنک کھولنے کا ارادہ کر چکا ہے۔ کیونکہ بقول اُس کے "سرکاری ہسپتالوں میں ملازمت آزادانہ سوچ اور شعور کو مکمل طور پر تباہ کر دیتی ہے۔"

ڈاکٹر کے سینے میں ایک بے حد ہمدرد اور حساس دل ہے لیکن اُسے بڑی جھلاّہٹ اور اذیت ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ڈاکٹری پیشے کی قدر و قیمت، روایتی وضعداری مٹی میں ملائی جا رہی ہے۔ ہسپتال کی پالٹیکس کو دیکھ کر اُس کا خون کھول اُٹھتا ہے۔

اُس کے کئی ساتھی فزیشن سیمپل بازار میں فروخت کرتے ہیں۔

"شاید پروفیسر راجن نے فون کیا ہو۔"

لیکن آج کل وہ پونم شرما سے فلرٹیشن کر رہا ہے۔ مجھ سے ملنے وہ اُس وقت آتا ہے جب صنفِ نازک کے آنچل کی ہوا اُسے میسّر نہیں ہوتی۔ جب وہ مجھے فون کرتا ہے یا ملنے کے لئے آتا ہے میں اُسی لمحہ اندازہ لگا لیتا ہوں کہ اُس نے ایک اور عشق میں مات کھائی ہے۔ ناکامی کا ایک اور تمغہ اپنے سینے پر ٹانکا ہے۔ پروفیسر راجن کو میں ناکام برداشت نہیں کر سکتا۔ گاہے گاہے اُس کی کمپنی میں دلچسپی لے لیتا ہوں۔ اگر راجن مسلسل کئی روز تک مجھ سے ملتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسی فلم دیکھ رہا ہوں جس میں کوئی ناکارہ مسخرہ ہیرو کا رول ادا کر رہا ہو!

دوسرے الفاظ میں اس مفروضے کو سائنٹفک زبان میں تو گوارا کیا جا سکتا ہے
لیکن ہیرو کے بدل میں دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی ہے۔

پروفیسر راجن اور پُونم کی ملاقات بہت دلچسپ اور قریب قریب فلمی حالات میں ہوئی تھی۔ راجن اور چندر کانت ایک دن یہ بحث کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ ہندوستان میں لیکچرار لوگ پرولتاری ہیں یا بورژوا، برابر میں ایک رکشا کو چار آدمی کھینچتے ہوئے جا رہے تھے۔ اُن میں سے ایک معمر شخص کُود کر باہر آ گیا اور راجن اور چندر کانت سے کہنے لگا۔

"قطع کلام معاف! مجھے آپ لوگوں کی بحث سے دلچسپی ہے میں نے آکسفورڈ سے فلسفے میں ایم۔ اے کیا ہے۔ اِن دنوں یہاں ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔"

رکشا والے کو پیسے ادا کر کے وہ ان دونوں کو اپنی مختصر سی کوٹھی گرین ہل لے گیا۔ بحث میں بہت دلچسپی سے حصّہ لیا۔ پھر اپنی بڑی لڑکی سے ملایا اور کہنے لگا۔

"پُونم! انھیں پیانو پر کوئی دلکش دُھن سُناؤ!"

کافی پلائی اور پھر آنے کی دعوت دی۔ راجن کی خدا ترس اور فیاض فطرت نے اس دعوت کو صدقِ دلی سے قبول کر لیا۔

ابھی پرسوں ہی میں مال روڈ پر گھوم رہا تھا کہ ایک مانوس آواز نے چونکایا۔ دیکھا تو کیفے ڈی پارک کے اوپن برانڈے میں راجن اپنے تین دوستوں کے ساتھ کافی پی رہا ہے۔ نیچے مال روڈ پر لوگوں کی آمد و رفت بڑھ رہی ہے۔

میں نے کافی کا پیالہ اُٹھایا اور ایک تلخ گھونٹ بھرا۔

"ارے نیچے دیکھو کیا شے جا رہی ہے؟"

"جولیتا ہے۔"

"پُر کشش؟"

"یس! ST. BEDES میں پڑھتی ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"پڑھنے میں NIL ہے لیکن بقول اپنے دوست کے اِس کا TALENT (تخلیقی قوت) اور جوہر ایک اور میدان میں آب و تاب سے چمکیں گے۔"

"بہت خوب! کیا بے رحمی اور چابک دستی سے کردار کا خاکہ کھینچا ہے!"

"شکریہ، پیٹن پلیس (Peyton place) میں مصنّف نے ایک لڑکی کو صرف ایک فقرے میں یوں بیان کیا ہے ——————

'She was flat in Important places'

یہ فقرہ کئی روز سے میرے ذہن پر لہرا رہا ہے۔

"گریٹ، غضب کا اسٹائل ہے!"

## گفتگو

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے رُوبرو کرتے
ہم اور بُلبُلِ ناشاد گفتگو کرتے —— ذوقؔ

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر —— غالبؔ

تیرے ستم سے مجھ کو مِلا رُتبۂ کلیم
اِک وجہِ گفتگو نکل آئی خدا کے ساتھ —— انورؔ

میری اُن کی گفتگو دیکھے کوئی
جیسے بندہ اور خدا باتیں کریں —— نواب سعید

غلط سمجھ کے نہیں دیکھتا ہوں تیری طرف
یہ دیکھتا ہوں کہ اندازِ گفتگو کیا ہے —— نامعلوم

مرسلہ:۔ ایس۔ ایس ہتکاری، ایم۔ اے، کلکتہ

"نیا 'ٹائم' دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"اُس میں لکھا ہے سیاسی مبصّر ایک ایسا شخص ہے جو یہ پیش گوئی کرے کہ کل کیا ہوگا اور اگلے دن یہ تشریح کرے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا۔"

"بہت خوب!"

"پروفیسر راجن کو تم کیسے Define کرو گے؟"

"ایک نیک نیت، مسکین صورت انسان جس کا جذبۂ رحم ہر جوان لڑکی کو دیکھ کر بیدار ہو جائے۔"

"اور وہ اُس سے جسمانی ہمدردی کرنے لگے!"

"ونڈر فل، غضب ہے!"

"بکواس، نان سینس!"

"شٹ اپ!"

"یُو شٹ اپ!!"

میں تیز اور بلند آہنگ فقروں کی بوچھار سے بچ کر اور اس فی البدیہہ ڈرامے کے پہلے ایکٹ کو ادھورا چھوڑ کر پھر مال روڈ پر چلا آیا۔ میں نے سوچا پروفیسر راجن بہت بڑا اسناب (SNOB) ہے تھرڈ ریٹ انٹلیکچوئل ہے۔ گھٹیا قسم کا

انقلابی ہے۔ غلط قسم کے احساسِ برتری کا شکار ہے۔ نفسیاتی کیس ہے۔ پروفیشنل عاشق ہے۔

اِن خوبیوں کے علاوہ پروفیسر راجن سخت جان ہے۔

بھتری چیترز فار پروفیسر راجن۔

پی اِز گریٹ۔

پروفیسر راجن کی گریٹ نیس (Great ness) اُس کی سطحی اور ملمع شدہ وفا کی طرح دھندلی اور ماند پڑ گئی اور یہ خیال برق کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔

ہو سکتا ہے پال نے فون کیا ہو!

پال میرا پُرانا اور بے تکلف دوست ہے۔ میری اور اُس کی دوستی بہت استوار ہے۔ اُس کی بُنیادیں مضبوط اور گہری ہیں۔ غالباً اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری دوستی کا انحصار خطوط کے تبادلے یا روزانہ ملاقاتوں پر نہیں۔ نہ ہماری دوستی ضروری طور پر ایک دوسرے کے لئے کارآمد ہونے کی مرہون ہے۔ ہم میں گویا ذہنی معاہدہ ہو چکا ہے کہ خطوط نہ لکھنے سے کسی طرح کی اُلجھن اور غلط فہمی نہ ہوگی۔ اِس عجیب یارانے کے بہت سے دلچسپ، صحت مند اور خوبصورت پہلو ہیں۔

میری طرح پال کو زندگی سے ناقابلِ شکست لگاؤ اور شدید محبت ہے۔ وہ بھی زندگی میں نئے تجربات کو بہت اہم اور ضروری سمجھتا ہے۔ اپنی ذاتی زندگی میں پابندیوں کو اُس نے کبھی راستے میں نہیں آنے دیا۔ ایک معرکہ خیز فلسفہ اور انفرادی اصول اُس کے بیشتر اعمال کی بُنیاد ہوتے ہیں۔ وہ یقیناً مفکر نہیں ہے لیکن ایک سوچنے والا ذہن اور محسوس کرنے والا دل اُس کے پاس ہے۔ وہ قریب قریب بے ضرر ہے لیکن بے بس کر دینے کی حد تک ضدی اور اکھڑ بھی ہے۔

پال اپنی شریکِ حیات اور اکلوتے لڑکے کے ہمراہ یہاں برف باری دیکھنے آیا ہے۔ آخری مرتبہ ہم تقریباً دو سال پہلے ملے تھے۔ کچھ مُدت پہلے پال نے ماؤنٹ آبو سے مجھے خط لکھا تھا۔ میں اُن دنوں پریشانی کے عالم میں تھا۔ Pancreatitis کی نامُراد بیماری میں مبتلا تھا۔ بڑے قابل ڈاکٹر کے زیرِ علاج تھا۔ کافی خرچہ ہو رہا تھا۔ میں نے پال سے اپنے کٹھن ایام کا ذکر کیا۔ اُس نے لکھا تھا ______

"تم حقیقتاً یاس انگیز اور حسرت ناک دَور سے گزر رہے ہو جس کی ایک جھلک تمہارے خط سے ملتی ہے۔ کاش تمہیں کوئی قابلِ قدر اور قابلِ رشک چارہ ساز مِل جائے۔ تم نے پھر حیرت سے پوچھا ہے کہ میں ماؤنٹ آبو کیوں آیا ہوں۔ میرے یہاں آنے کی سب سے بڑی وجہ میری یہ تمنا ہے کہ کسی odd جگہ پر جاؤں۔ بقولِ غالبؔ جہاں کوئی نہ ہو۔ کوئی سے مُراد شناسا ہے۔

زندگی میں اختصار کا قائل ہوتا جا رہا ہوں۔ اس لئے اِس مختصر سے پوسٹ کارڈ پر اکتفا کر رہا ہوں۔ کبھی ملاقات ہوئی تو تفصیل سے بات ہوگی۔

یہاں بہت سے نئے لوگوں سے دوستی ہو گئی ہے۔ چند ہستیاں واقعی قابلِ ذکر ہیں۔ زیادہ ٹورسٹ گجراتی، مراٹھی اور راجستھانی ہیں۔ یہ علاقہ پہلے بمبئی کے صوبے میں تھا لیکن ابھی تک یہاں شراب بندی کا قانون نافذ ہے۔ حالانکہ سارے راجستھان میں شراب بندی نہیں ہے۔ موسم کیف آور ہے لیکن کیف کا مزید سامان حاصل کرنے کے لئے بمبئی کا قانون حائل ہے۔ آب نشاط انگیز کے لئے لائسنس لینا پڑتا ہے۔

شام نکّی لیک کے کنارے بوٹنگ وغیرہ کی دلچسپی میں گزرتی ہے۔ ایک سٹیمر بھی موجود ہے۔ جھیل بڑی وسیع ہے اور بے حد گہری ہے۔ کئی جگہ اندازاً ۔۔ فٹ گہری ہے۔

اِس دوران میں قُرب و جوار میں بیشتر تاریخی اہمیت رکھنے والی اور ٹورسٹ دلچسپی کی جگہیں دیکھ لی ہیں۔

وقت اور موڈ ساتھ دیں تو لکھنا۔

تمہارا ______ پال

پال واقعی زندگی میں اختصار کا قائل ہے۔ شملے آنے سے پہلے اُس نے مجھے تار دیا ______

"Reaching Monday Morning"

اور یہ بغیر کسی تمہید کے کیا گیا تھا۔

چارہ ساز کا خیال آتے ہی میں نے قیاس آرائی کی کہ ممکن ہے رما مہرہ نے فون کیا ہو۔ درحقیقت دل کے نہاں خانے میں دبکی چھپی اُس وقت ایک شدید آرزو یہ تھی کہ فون کے دوسرے سرے پر رما ہو۔ دل کے عمیق گوشے میں یہ نحیف جذبہ سِسک رہا تھا ______ "کاش رما نے فون کیا ہو!"

میں نے اِس حقیر، نزار اور بے معنی خواہش کو فوراً اپنی عیارانہ اور خوددارانا کے تلے کُچل دیا۔ لیکن رما کے فون آنے کی اُمید اور روشنی سے بھرپور جذبہ یکایک مستحکم ہو گیا۔ اُس نے پُھنکار کر کہا ______ "اگر رما کا فون ہوا تو؟"

میں نے اِس کرخت اور ہراساں کر دینے والے سوال کو پُوری قوت سے جھٹک دیا اور ایک تضحیکی قہقہہ لگا کر اُسے اور زیادہ مغلوب کرنے کی سعی کی ______ بلکہ انجانے طور پر ہوا میں مُکّہ بھی لہرایا تاکہ اُسے مزید گزند پہنچا سکوں۔

پچھلے ہفتے کی تلخ بحث اور معمولی جھگڑے کے بعد میں رما سے نہیں ملا تھا۔ جھگڑا کچھ زیادہ سیریس نہیں تھا۔ ایک نہایت ہی ذرا سی بات پر بات بڑھ گئی اور اُس نے

میں نے رما کو فون نہیں کیا تھا۔ سوچا اُسے یہ احساس نہ ہو جائے کہ میں نے شکست تسلیم کر لی ہے یا اپنے سلوک پر شرمندہ ہوں۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں اور رما ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔ اپنے بیگانہ لمحات میں میں نے شدت سے محسوس کیا ہے کہ رما میرے لئے میرے وجود کے لئے بہت ضروری ہے۔ وہ میری زندگی کا اہم جزو ہے۔ میرے لئے اُس کے دل میں بے لوث چاہت ہے۔ وہ ایک مقامی سکول میں آرٹ ٹیچر ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے کبھی کبھی میں اُس کے خلوص کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہوں ـــــ پھر حقیقت سے آشنا ہو کر مجھے خود پر طیش آتا ہے کہ میں بہت جلد باز ہوں۔ عجلت میں فیصلے کرتا ہوں۔ اُس روز کے جھگڑے کی وجہ بھی ایک ایسی ہی بات تھی۔

وہ نحیف و ناتواں اور ضدی تمنا ـــــ کاش فون رما کا ہو! ـــــ میرے سارے وجود میں ایک پھانس کی طرح اٹکی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے سانس لینا دشوار ہونے لگا۔

میں نے اُس وقت ایک بہت اہم فیصلہ کیا، فون اگر رما کا بھی ہو تو پریشانی اور انتشار کی قطعی کوئی بات نہیں۔ اگر اُس نے ملنے کے لئے کہا تو میری طرف سے دو ٹوک انکار کے سوا کوئی دوسرا جواب نہ ملے گا۔ مجھے اپنے اِس فیصلے کی پختگی پر بڑا اطمینان ہوا۔ یہ ٹھوس اور قطعی فیصلہ کرنے کے فوراً بعد میں نے خود کو فون والے کمرے میں پایا۔

رسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف جو مہین میٹھی آواز تھی۔ وہ رما مہرہ ہی کی تھی۔

"میں سکینڈل پوائنٹ پر آپ کی منتظر ہوں۔ دس منٹ میں آجایئے"

بغیر کسی تاسف اور پشیمانی کے احساس کے میں نے بلا تامل کہا ـــــ "ابھی پہنچ رہا ہوں"

جب میں کپڑے بدل کر تیار ہو رہا تھا تو مجھے اپنی غلط رو، جھوٹی انا کو شکست فاش دے کر عظیم اور بے پایاں مسرت ہو رہی تھی۔

میں اوورکوٹ بائیں ہاتھ پر ڈال کر جب کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو فراق کا یہ شعر گنگنانے لگا ـــــ

سُنا ہے پہلے بھی ایسے میں بُجھ گئے ہیں چراغ
دلوں کی خیر مناؤ بڑی اُداس ہے رات!
بادل اور نیچے جھک آئے ہیں اور برف گرنے لگی ہے۔

میں رما سے ملنے جا رہا ہوں ـــــ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، فضا میں ہر طرف خوشبو اُڑ رہی ہے! مجھ پر کیف و سرور چھاتا جا رہا ہے!!

افسانہ

# خالی ہاتھ

سہیل اعجاز۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

آلوک بھون۔ بالاگھاٹ روڈ۔ واراسیونی (مدھیہ پردیش)

۱۵ اپریل ۶۹ء خوشبو بھائی! ہدیۂ خلوص

طویل خاموشی کے بعد "خالی ہاتھ" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اِس کہانی کو تو برسوں پہلے لکھا تھا۔ لیکن ادھوری تھی کیونکہ اسے میں چاہا اختتام نہ دے سکا تھا۔ جب جب چاہا کہ اسے مکمل کر دوں تو اس کہانی کے اہم کردار مجھ سے بدگمان ہو گئے اور مجھے مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ کہانی میرے دل پر ایک بوجھ بن گئی۔ یقین مانیے کہ میرا دل چاہتا تھا اِس کہانی کو کم از کم میں تو راز ہی رہنے دوں لیکن میرے اندر کا فنکار تو کچھ اور ہی چاہتا تھا اور آخرکار اُس کی ضد اور پاگل پن کے آگے مجھے اپنا سر جھکانا پڑا۔ اِس کہانی کو اپنے انجام تک لانے کے لئے مجھے کن مراحل سے گزرنا پڑا ہے وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اُسے اس کہانی سے کوئی دکھ نہ پہنچے ورنہ اُس کی آتما کو شراپ شاید مجھے سکون نہ لینے دے گا اور اسی خیال کے تحت میں نے واقعات کو کافی موڑ دے دیا ہے۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک کہانی کو میں نے حقیقت کا روپ دیا ہے یا اُس نے ایک حقیقت کو کہانی سمجھ کر کہہ ڈالا۔ بہرحال کہانی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کی گرانقدر رائے کا منتظر ہوں ۔۔۔ "بیسویں صدی" مجھے پابندی سے مل رہا ہے۔ آپ کے خلوص کا معترف ہوں کہ میری طویل خاموشی کے بعد بھی آپ نے مجھے فراموش نہیں کیا۔۔۔

خلوص کار ۔۔۔ ۔۔۔ سہیل اعجاز صدیقی

---

شاہینہ جب نسرین کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہ کھڑکی میں سے آنکھیں پھاڑے اندھیروں میں گھور رہی تھی جیسے اُسے کسی آنے والے کا انتظار ہو۔

"نسرین! تمہارا یہ انتظار مجھے پاگل کر دے گا۔ اِن لمحوں میں کون آئے گا؟"

"میں ستاروں کی دھول میں اپنے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی؟"

"پاگل جیسی باتیں نہ کرو۔"

"شاہینہ! ایسے لمحات میں میں اکثر جذباتی ہو جاتی ہوں۔"

"وجہ؟"

"جو اُداسیاں یہ مجھے بخشتے ہیں وہی تو میری زندگی ہے۔" نسرین کی آواز ٹوٹی ٹوٹی تھی۔ وہ دیر تک خلاؤں میں گھورتی رہی۔ اُس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ کہنے لگی۔

"ایک عجیب سی کہانی ہے جو ایسی ہی اُداس، غم بستہ راتوں میں جنم لیتی ہے اور ہر سحر کے پہلے دم توڑ دیتی ہے۔"

"نسرین! تمھیں آج یہ کیا ہو گیا ہے؟"

"شاہینہ! تم نے کبھی کسی کو چاہا ہے؟"

"آج یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"مجھے خود بھی نہیں معلوم!" وہ باہر دیکھنے لگی۔ پھر چند لمحوں بعد اچانک سہم کر شاہینہ سے لپٹ گئی جیسے اُس نے جاگتے جاگتے کوئی بھیانک سپنا دیکھا ہو۔ اُس کے ہونٹ لرزنے لگے اور فضا میں سسکیاں بلند ہوئیں "میرا دل گھبراتا ہے شاہینہ! آج کی رات کتنی بھیانک ہے! میری اِن اُداس آنکھوں پر اندھیروں کے پھائے رکھ دو تاکہ مجھے نیند آ سکے۔ اِس رات میں میرا دم گھٹتا ہے۔ ایسی ہی راتیں میری زیست

کے درد کو چھیڑتی ہیں۔ کاش زندگی میں ایک ایسی ہی لمبی رات ہو جو میری ساری زخمی سانسوں کو ایک ہی بار چوس لے۔ تاکہ جستجو اور انجام کے کناروں کی یہ تلاش ختم ہو جائے ۔۔۔ لیکن شاید یہ آرزو، آرزو ہی رہے گی اور میں ہمیشہ حالات کی دھند میں اُلجھی ہوئی کرن کی طرح جھلکتی رہوں گی اور میری آنکھیں اِنھیں اُداسیوں میں جلتی رہیں گی ۔۔۔۔ وہ دیر تک کسی معصوم بچے کی طرح شاہینہ کی آغوش میں پڑی رہی، بڑبڑاتی رہی اور روتی رہی۔ شاہینہ نے اُس کے گرم جلتے ہوئے رخساروں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اُس نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"نسرین! اِس طرح اُداس نہ ہوا کرو ورنہ میں مرجاؤں گی!"

"کیا تم مجھے بہت چاہتی ہو؟"

"اپنی زندگی سے بھی زیادہ!"

---

- تم سے تمھارے اعمال کے متعلق ضرور باز پُرس ہوگی۔ (قرآن پاک)
- تم میں خدا کے نزدیک بزرگ و محترم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ (قرآن پاک)
- سخی اللہ سے قریب، جنت سے قریب اور آتشِ دوزخ سے دُور ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- اللہ تعالیٰ کریم ہے اور کرم اُسے محبوب ہے۔ سخی ہے اور سخاوت اُسے محبوب ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- حرص سے روزی تو بڑھتی نہیں، لیکن آدمی کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)

---

"خدا کے لیے رحم کرو شاہینہ! ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی!" نسرین نے ہنس کر کہا اور شاہینہ نے ایک بار پھر اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور کہنے لگی۔

"جب میں تم سے پہلی بار ملی تھی تو نہ جانے کیوں مجھے تم سے اِتنی عقیدت ہوگئی تھی۔ پہلی بار دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ زندگی میں ایک پَل کے لیے تم سے جُدا نہ ہوں۔ ہمیشہ تمھارے پاس رہوں اور یہی میں نے پرویز سے کہا تھا" پرویز کا نام لیتے ہی اُس کے چہرے پر حیا کی قوسوں نے اپنی تکمیل شروع کردی۔ شرم سے بوجھل پلکوں نے آنکھوں کے گلابی ڈوروں کو اپنے دامن میں چھپالیا۔ نسرین نے اُس کی جھکی ہوئی پلکوں کو شرارت سے بھرپور نظروں سے دیکھا۔

"شاہینہ! تمھیں پرویز سے محبت ہے؟"

شاہینہ خاموش رہی۔ اُس کے چہرے کے رنگ اور گہرے ہوگئے۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے نسرین کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور پھر اُس نے اپنا چہرہ نسرین کی آغوش میں چھپالیا۔

"پرویز تو میری زندگی ہے نسرین!"

"مجھے ڈر ہے کہ راہوں کے سناٹے تمھیں لوٹ نہ لیں!"

شاہینہ اُداس ہوگئی۔ وہ دُور خلاؤں میں گھورنے لگی۔ کمرے میں قبرستان جیسا سناٹا چھاگیا۔ شاہینہ کے چہرے پر یاسیت دیکھ کر نسرین تڑپ اُٹھی اور جذبات سے مجبور ہوکر وہ اپنے ماضی کے اَوراق شاہینہ کے سامنے پلٹنے لگی۔

رات کافی بیت چکی تھی۔

شاہینہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔

وہ سوچنے لگی نسرین کے خیالوں میں کتنی یاسیت ہے۔ یہ شاید نسرین کے حالات کی اُن ویرانیوں کی دین ہے جس کا زہر اُس کی رگ رگ میں پیوست ہوچکا ہے۔ نسرین نے بھی کسی کو چاہا تھا، کسی کو پانے کی تمنا کی تھی۔ لیکن اِس پرستش کی اُسے کتنی بڑی سزا ملی ہے کہ آج بھی اُس کی آنکھیں کسی کے انتظار کی چتا پر سُلگ رہی ہیں۔ اُس کے خوابوں کی ویران بستیوں میں ہر سمت اُداس بے اُفق راتوں کا دھواں ہے ۔۔۔۔۔

اُس وقت نسرین کے ماضی کے شکستہ مقبروں کی کربناک چیخیں اُس کے ذہن سے ٹکرا رہی تھیں اور وہ اُن سے لپٹ کر اُن زخمی سانسوں کا وزن محسوس کر رہی تھی جو نسرین کے وجود کی زبان پر قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔

"کیا نسرین کی طرح مجھے بھی راہوں کی ویرانیاں لوٹ لیں گی؟" اُس کے ذہن کی سطح پر اچانک ایک سوال اُبھرا اور اُس کے قدم خوابوں کی بستیوں کی جانب مُڑ گئے ۔۔۔۔۔

وہ جُوہی کے درخت کے قریب کھڑی تھی۔

اُس کے جُوڑے میں بیلے کی کلیاں سجی ہوئی تھیں۔ ہر سمت شبنمی فضاؤں میں رنگ و نُور کی کمانیں لچک رہی تھیں۔ وہ اپنے کالج کی ایک شرمیلی طالبہ تھی جو دانتے کی محبوبہ کے نام سے مشہور تھی۔ کسی منچلے لڑکے کے ذہن میں ایک بار خیال آیا تھا کہ نورا نظم لکھنے سے پہلے مجاز نے اِس شرمیلی لڑکی کو ضرور دیکھا ہوگا۔ بعض کہتے تھے کہ لیونارڈو نے مونالیزا کو جنم دینے کے پہلے اِسے ہنستے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔ ایک بار پریشان بال والے ایک خوبصورت لڑکے نے اُسے لکھا تھا۔

"صدیوں کی جستجو اپنے لرزتے ہاتھوں میں لیے ہوئے میں تمھارے حسین مقدّس تصوّر کی عبادت میں جھک گیا ہوں۔ میرے اُداس ہونٹوں پر صرف ایک بار اپنے لبریز ہونٹ رکھ دو تاکہ میں اُن آیتوں کا لمس محسوس کرسکوں جن کی تخلیق تم نے کی ہے۔"

...مگر وہ اُداس ہوگئی تھی۔ اُس نے اپنے تصور میں اُس نوجوان کو [illegible]

"[illegible] تمھارے ساتھ ہوں [illegible] ہیں [illegible] ہیں لیکن پھر بھی یہی تمھارے پریشان بالوں کو سنواریں گی۔ رسم رواج [illegible] ۔۔۔۔ مجھے [illegible] دیکھنے [illegible] کوشش نہ کرو ورنہ تم اُداس [illegible] سے [illegible] دیکھا نہ کرو ورنہ میں بدنام ہو جاؤں گی۔"

حسینوں کو وہ پریشان بال والا لڑکا اسے کالج گیٹ سے گھورتا رہا۔ بارہا اُس کی [illegible] پلکوں کے شوخ و شنگ تجلوں نے اُس کی جھیل سی آنکھوں سے گلابی ڈوروں [illegible] کرنے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش رہی۔

وہ سوچنے لگی ۔۔۔۔۔۔

"جانے وہ لوگ کہاں ہوں گے، وہ لڑکا کہاں ہوگا؟ کیا آج بھی اُسے اُس کا انتظار رہتا ہوگا؟"

اُس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

ہوا کا ایک خوشبودار جھونکا اُس کے پاس سے گزرا۔ اُس کے قدم اور آگے بڑھ گئے۔

وہ لیوپینسکو کے درختوں کے نزدیک کھڑی تھی جن کے سائے ٹھنڈے تھے۔

وہ مقامی کالج میں لیکچرر تھی۔ کالج میں اُس کے تقرر نے پروفیسر پرویز کی زندگی میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا کر دی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کائنات نے اُس کی زندگی کی پُرسکون جھیل میں شاہینہ کو ایک کنکر کی طرح پھینک دیا ہو۔ جس نے پہلے تو لہروں کے ننھے ننھے دائرے بنائے جو آہستہ آہستہ طوفانی لہروں میں بدل گئے۔ شاہینہ اُس جھیل میں کنول کی طرح شبنمیں تبسم بکھیر رہی تھی لیکن پروفیسر کے چاروں طرف طوفان تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اِن طوفانی لہروں پر قابو نہ پا سکا اور آخر کار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس نے شاہینہ کی قربت کا آنچل تھام لیا اور پھر ایک دن پروفیسر نے اُس سے کہا تھا۔

"مجھے مخملیں اندھیروں کی گود میں لے لو ورنہ اِن بجھتے ہوئے اُجالوں کی دھول میں میرا دم گھٹ جائے گا!"

پرویز کی زبان سے یہ جملہ سُن کر اُس کے چہرے پر حیا کے سب کنول کھل کر گلنار ہو گئے تھے۔ اُس کے ہونٹوں کی جیسی دھوپ پک گئی تھی۔ برسوں بعد اُسے اپنی مہکتی ہوئی سانسوں سے بوجھل سینے کے اندر آشاؤں کے ٹھنڈے ٹھنڈے شبک جزیروں کے وجود کا احساس ہوا اور وہ پرویز کے قریب آگئی۔ پرویز کے جذبات کے سمندروں سے کنارے چھلکنے لگے۔ ہونٹوں کی سرگوشیاں بڑھنے لگیں۔

"شاہینہ! تمھاری خوبصورت آنکھوں میں ڈوب کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے روح سے بے نام اُمنگوں کا بوجھ ہٹ گیا ہو۔"

"تمھاری قربت پا کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کائنات کی ہر شے میرے ہاتھوں میں آ کر تھم گئی ہے!"

"برسوں بعد تمھاری جھیل سی آنکھوں میں اپنے شہرِ دل کی وہ شباہت دیکھ رہا ہوں جس کی خاطر زندگی نے اَن گنت خواب دیکھے تھے۔"

"کتنے مقدس ہیں یہ لمحے جنھیں ہم جی رہے ہیں۔ کاش یہ لمحے امر ہو جائیں!"

دفعتاً ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سوچوں کی شمعیں خاموش ہو گئیں۔ ماضی کے لمحات گمبھیر اندھیروں میں گم ہو گئے اور اُس کی نگاہوں کے سامنے صرف نسرین کی

---

- بندہ اُن تحفوں کی قدر نہیں کرتا جو اُسے دیے جائیں، بلکہ اُن کی قدر کرتا ہے جو غریبوں پر تقسیم ہوں۔ (مہاتما بدھ)
- جس کے پاس یادِ خدا کی پونجی ہے اُس کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ (ہندی ادب)
- اے کبیر! درویش کی صحبت میں خدا یاد آتا ہے۔ یہی لمحے کام کے ہیں۔ باقی سب بیکار۔ (کبیر داس)
- جس نے خدا کی اطاعت کی، نانک! اُسے کیا کمی ہے۔ جو مانگا سو پایا۔ (گرو نانک جی)
- انسان کا سب سے بڑا دشمن گناہ ہے۔ (سوامی سارشدانند جی)

---

جلتی ہوئی دو اُداس آنکھیں رہ گئیں۔ وہ دو آنکھیں اُسے دیر تک گھورتی رہیں جیسے وہ کہہ رہی ہوں "میں اُن اندھیروں کا زخم ہوں جن کی ویرانیوں میں نسرین لُٹ گئی تھی!"

وہ سہم گئی۔ اُس نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سوچوں کے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر دیا۔

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

لیکن وہ دونوں کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ چند لمحوں بعد پرویز نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"شاہینہ! نسرین نے تمھیں جس وہم میں مبتلا کر دیا ہے اُس کا علاج فی الحال تو ممکن نہیں۔"

"دوسروں کے جیون سے سبق لینا کوئی وہم نہیں۔"

"میرا کہنا مانو تو تم نسرین سے ملنا چھوڑ دو۔ ورنہ تم پاگل ہو جاؤ گی۔ نہ جانے کیوں اُس کی شخصیت تمہارے ذہن و احساس پر اس طرح چھا گئی ہے کہ تم اُن بے معنی سوچوں کو دُور ہی نہیں کرنا چاہتی ہو جنھیں اُس نے تمھیں بخشا ہے۔"

"پرویز! نسرین کے لئے ایسا نہ کہو۔ تمہارے وجود کے ساتھ ساتھ اُس کا وجود بھی میری زندگی کا ایک اہم حصّہ بن چکا ہے۔"

"نسرین کو اتنی غیر معمولی اہمیت دے کر ہی تو تم نے اپنا یہ حال بنایا ہے۔"

"وہ ہستی ہی اتنی عظیم ہے پرویز! ایک بار میں تمھیں اُس سے ضرور ملواؤں گی۔ اُس کی زندگی اور اُس کے حالات تو میرے لئے ایک معمّہ بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ بھی کتنی عجیب شخصیت ہے۔ کبھی ہنستے ہنستے رونے لگتی ہے اور کبھی روتے روتے ہنسنے لگتی ہے۔ اُس کا چہرہ حسرت و یاس کی ایک دھندلی سی تصویر بن کر رہ گیا ہے۔ اُس کا کمھلایا ہوا چہرہ کتنے ہی ارمانوں کا مدفن ہے جس کا ہر نقش، ہر رنگ اپنی آغوش میں ایک تڑپ، ایک کسک لے کر خاموش ہو چکا ہے۔ خوبصورت ہونٹوں کی باریک سلوٹیں بے بس حالات سے سرگوشیاں کرتے کرتے پژمردہ ہو چکی ہیں۔ وہ مغموم آنکھیں جیسے صدیوں سے جاگتے جاگتے تھک گئی ہوں۔ کبھی اُنھیں بھی آنے والوں کا انتظار رہتا ہوگا۔ کسی نے انھیں ضرور چاہا ہوگا۔ نہ جانے کتنے خوبصورت استعاروں اور تشبیہات نے انھیں اپنے گھیرے میں لیا ہوگا۔ کتنے خوبصورت دلاسوں نے اُنھیں زندگی بخشی ہوگی ـــــ اور پھر کسی اُداس شام کو دھندلکوں نے دم توڑا ہوگا۔ کسی نے اپنی منزل پالی ہوگی اور ـــــ"

"بس کرو شاہینہ! تمہارے یہ جذبات مجھے پاگل کر دیں گے!" پروفیسر جذبات پر قابو نہ پا سکا اور شاہینہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اُس نے اپنا سر پرویز کے کندھوں پر رکھ دیا اور جیسے وہ خواب میں بڑبڑانے لگی۔

"پرویز! خدا کے لئے مجھے اِس انجام سے بچالو۔ میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار تمھیں چاہا ہے۔"

شاہینہ کی ٹوٹی ٹوٹی آواز نے اُس کے جذبات کی شمعیں روشن کر دیں۔ اُس نے شاہینہ کے اُداس چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اُس نے شاہینہ کی چھلکتی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"شاہینہ! تم تو میری زندگی ہو!"

---

اُس شام نسرین اُداس تھی

لیکن شاہینہ اور پرویز کی آمد سے اُس کے چہرے کے گلاب کھل اُٹھے تھے۔

مختصر سے تعارف کے بعد ماحول پر خاموشی چھا گئی۔ اُس وقت پرویز اور نسرین کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کا ہر لمحہ ماتم میں ہے ـــــ نسرین کو دیکھنے کے بعد پرویز کسی گہری سوچ میں گُم ہو گیا تھا۔

"آپ کا غائبانہ تعارف تو بہت پہلے ہو چکا تھا" پرویز کو ایسا محسوس ہوا جیسے نسرین نے اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو لیکن وہ خاموش رہا۔

"شاہینہ! اکثر آپ کے تذکرے کیا کرتی تھی۔"

"جی! پرویز جیسے کسی خواب سے چونک اُٹھا ہو۔

"آپ کیا پئیں گے۔ کافی یا چائے؟"

"مجھے صرف ایک گلاس پانی کی ضرورت ہے۔" اُسے اپنے حلق میں خشکی کا احساس ہوا۔

نسرین کافی تیار کرنے کے لئے جا چکی تھی لیکن پرویز اُس آواز کی نغمگی میں کھو گیا تھا جو برسوں بعد اُس نے سُنی تھی۔ اُس وقت وہ نسرین کی اُداس آنکھوں کے آئینے میں اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں جلتے بجھتے اُجالوں میں اُس کے ماضی کی دھول دُور دُور تک اُڑ رہی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے آپ یہاں آکر کچھ بور ہو رہے ہیں" نسرین نے کافی کی پیالی پرویز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ایسا نہ سوچئے مجھے تو آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی۔"

"یہ جملہ تو ہر ملنے والا کہتا ہے" نسرین کے اس جملے پر پرویز کچھ جھینپ سا گیا۔ اُس نے اپنی نظریں نیچی کرلیں۔

"آپ یہاں تنہا ہی ہیں؟"

"نہیں" نسرین کے اِس غیر متوقع جواب پر شاہینہ اور پرویز کے چہروں پر حیرت و استعجاب کی لہریں پھیل گئیں۔

"نسرین یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"شاہینہ! تمہارے سوال کا جواب دوں یا ـــــ"

"سوال میں نے کیا تھا"

"میرے ساتھ میرا ماضی ہے" نسرین کا جواب سُن کر دونوں خاموش ہو گئے اور پرویز کو ایسا محسوس ہوا جیسے نسرین درد کی شدّت سے کراہ اُٹھی ہو ـــــ پھر رسمی گفتگو کے بعد پرویز اور شاہینہ وہاں سے رخصت ہو گئے اور نسرین تصوّرات کے بند شیشوں سے جانے والوں کو دیر تک گھورتی رہی۔

---

رات کے آنچل پر ستاروں کے چراغ ٹمٹما رہے تھے۔

لیکن پرویز اپنے ماضی کے اندھیروں میں گرتے ہوئے کمزور ستاروں کی روشنی کی طرف رینگ رہا تھا۔ روشنی کے یہ دھبّے اُسے کالج کے اُس وسیع ہال میں لے گئے جہاں

سالانہ فنکشن کے سلسلے میں ایک ڈرامہ اسٹیج کیا جارہا تھا جس میں اُس کے مقابل ایک دُبلی پتلی چھریرے بدن کی لڑکی انارکلی کا رول ادا کر رہی تھی۔

رُومان پرور ماحول میں جذباتی مکالمے ارمانوں کو لَو دے رہے تھے۔ جذبات کی گھنی شاخوں پر شوخ اُمنگوں کی کلیاں برس رہی تھیں ——— اور جب مہکتی ہوئی سانسوں سے بوجھل سینوں میں قربتوں کا صندل سُلگنے لگا تو اچانک اسٹیج کی روشنیاں بُجھ گئیں ——— اور اسی طرح ڈرامے کے اختتام تک کئی بار روشنیاں جلتی بجھتی رہیں۔

پھر اُس دن سے وہ لڑکی انارکلی کے نام سے کالج میں جانی پہچانی جانے لگی اور پرویز کو سلیم کا خطاب بخشا گیا۔

لمحے بیتتے رہے۔ کالج کی رنگین فضاؤں میں اُن کی محبت جوان ہوتی رہی اور ہونٹوں کے معصوم دلاسوں کی وسعتیں بڑھتی رہیں۔

وقت کے قدم تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

اور وہ دونوں ہر بھاگتے ہوئے لمحے کو پکڑنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

کالج کی مختصر سی زندگی ختم ہوگئی اور وہ لڑکی اپنے سپنوں کے آنگن میں ہاتھ پھیلائے ہی کھڑی رہ گئی ——— وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا اور لڑکی کو صرف اُداسیاں اور انتظار ہی ملا۔ وہ جلتی دوپہروں میں ریلوے پلیٹ فارم پر اُس کا انتظار کرنے لگی۔ اپنی جلتی ہوئی آنکھوں میں مِلن کی آس لئے اپنے آنسوؤں کو بہلانے لگی ——— پھر رفتہ رفتہ ہونٹوں کے معصوم دلاسے وقت اور حالات کے اندھیروں میں گُم ہوگئے۔ اُمیدیں مسلسل ہچکیوں میں ڈھلنے لگیں اور وہ آزردہ فضاؤں کے دامن میں پت جھڑ کے پھول کی طرح بھٹکنے لگی۔

اور پھر ایک دن اُسے سینی ٹوریم میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں وہ اپنے سینے میں ویران ہوتی راتوں کا درد لئے حالات کی خاموش جھیل پر تنہا بہہ رہی تھی۔ ہر طرف ہر سمت اُداس سِسکتی ہوئی شاموں کا دھواں تھا۔ اُس کی ہر آہٹ، ہر حسرت لرز کے خاموش ہو چکی تھی۔ مایوسیوں کے بے جان ہاتھوں پر یادوں کے چراغ دھوئیں کے کفن پہنے ہوئے سسک رہے تھے۔ لیکن وہ خاموش تھی۔

جہاں تک وہ سوچ چکا تھا وہاں تک اُس کا ماضی اُس کے لئے پُرسکون تھا۔ لیکن اُس کے آگے ماضی کے جو لمحات تھے وہ روح فرسا اور اذیت ناک تھے۔

ہوا کا ایک شاداب جھونکا اُس کے قریب سے گُزرا اور اُس نے اپنے تصوّرات کو ایک خوبصورت موڑ دے کر سوچا اُس جذباتی لڑکی کی یہ کہانی تو اُس نے برسوں پہلے سُنی تھی جو کالج کے رنگین ماحول سے شروع ہو کر سینی ٹوریم میں ختم ہوگئی ——— پھر دوسرے ہی لمحے اُس کے ذہن کی سطح پر نسرین کا چہرہ اُبھرا ——— وہی افسردہ آنکھیں، پژمردہ چہرہ، خشک اور ویران ہونٹ۔ اُسے پہلی بار اُن نقوش میں ٹھہرے ہوئے درد کا احساس ہوا۔ بے نور آنکھوں میں آنسو ایک لہر آئی اور ایک ناگنی کی تڑپ رہ گئی۔ وہ تڑپ اُٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے تصوّرات کے آنگن میں نسرین کو دیر تک گھورتا رہا ——— پھر نسرین کے چہرے کے اُکھڑے پھیکے رنگ مُسکرانے لگے۔ ویران ہونٹوں پر ابدی پیار کی شمعیں جل اُٹھیں۔ دق زدہ چہرے پر زندگی کی رمق دوڑ گئی ——— اُس نے ایک فاتحانہ مُسکراہٹ کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

---

شام اپنا شرمئی آنچل لہراتی ہوئی اُس کے تصوّرات کے آنگن میں آہستہ آہستہ اُتر رہی تھی۔

کافی دنوں کے بعد آج ایک شام ملی تھی جس کا ہر لمحہ وہ پرویز کی قربت سے سنوارنا چاہتی تھی۔ سارے راستے نہ جانے کتنے پروگرام اُس کے ذہن نے بنا ڈالے لیکن پرویز کی غیر موجودگی نے اُسے مایوس کر دیا تھا۔ ذہن اور دل کی کافی کشمکش کے بعد اُس نے پرویز کا انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا اور اسی خیال کے تحت ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئی۔

سامنے پرویز کی تصویر ایک خوبصورت البم میں مُسکرا رہی تھی۔ اُس نے کئی بار تصویر کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر خود بخود شرما گئی۔ اُس کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے بجلی کے تار پر اُس کی اُنگلی رُک گئی ہو۔ وہ ہلکے ہلکے، میٹھے میٹھے جھٹکے محسوس کرنے لگی ——— پھر اُس کے ذہن میں خیال آیا ابھی چند لمحوں بعد پرویز آئے گا۔ اُس کے آتے ہی وہ سمٹ کر اپنا سر جُھکا لے گی اور خاموش رہے گی۔ پرویز بے چین ہو اُٹھے گا۔ وہ آہستہ سے اُس کے پاس آئے گا۔ کہے گا "شاہینہ! میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ ادا صرف مجھے ستانے کے لئے اپنائی ہے۔" وہ پھر بھی خاموش رہے گی۔ اِس پر وہ کہے گا۔

"کم از کم میری خطا تو بتا دو!"

یہ جُملہ سُننے کے بعد بھی وہ اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لے گی۔ تب وہ اُس کے پاس بیٹھ جائے گا۔ اُس کی سانسوں کا تنفس تیز ہو جائے گا۔ وہ منانے کے انداز میں کہے گا۔

"اگر تم اِس طرح مجھ سے رُوٹھی رہو گی تو میں مر جاؤں گا!"

تب وہ کہے گی ——— "اِس ڈائیلاگ کو سُنتے سُنتے میں بور ہو چکی ہوں!"

وہ خاموش ہو جائے گا اور جذبات سے بھرے ہوئے لہجے میں کہے گا۔

"شاہینہ! خدا کے لئے میری محبت کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھو۔ میں نے اپنی تمام قوتوں سے تمھیں چاہا ہے۔"

جواب میں وہ رُوٹھے ہوئے انداز میں کہے گی۔

"تم ایسی شاموں میں مجھے تنہا چھوڑ کر کیوں چلے جاتے ہو؟"

اور وہ ندامت سے لبریز آواز میں کہے گا۔

"شاہینہ! ایک بار اور معاف کر دو۔ آئندہ ان لمحوں میں تمھیں چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں گا!"

پھر ایک قہقہہ فضا میں بلند ہوگا اور وہ اُس کے قریب اِس طرح سمٹ جائے گی جیسے رات کے تاریک پردوں پر چاندنی سمٹتی ہے۔

وہ یہیں تک سوچ سکی تھی کہ کلاک کی بے ہنگم آوازوں نے اُس کے تصورات کے تانے بانے توڑ دیئے اور تب اُسے پرویز کے انتظار کی بربریت کا احساس ہوا۔۔۔

پھر یکایک اُس کے ذہن میں ایک شرارت آئی۔ اُس نے اپنے پرس سے قلم نکالا اور کونے میں رکھے ہوئے رائٹنگ پیڈ کو اُٹھایا۔ لیکن پیڈ کے پہلے ہی صفحے پر پرویز کی تحریر دیکھ کر اُس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا! اور اُسے حروف دھندلے دھندلے سے دکھائی دینے لگے۔ پرویز نے لکھا تھا! ـــــ

"نسرین! بہروں سوچنے کے بعد آج میں نے ڈرتے ڈرتے قلم اُٹھایا ہے۔ تم سے ملنے کے بعد جو مجھ پر گذری ہے میں ہی جانتا ہوں۔ کافی کشمکش کے بعد بھی میں تمھارے خیال کو اپنے ذہن و احساس سے نہ نکال سکا۔ میں تم سے تنہائی میں بہت کچھ کہنا سُننا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم مجھے کل شام اپنے مکان پہ تنہا ملو۔ مجھے اُمید ہے تم مجھے مایوس نہ کرو گی۔"

لرزتے ہاتھوں سے اُس نے پیڈ کو اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ وہ صوفہ میں دھنسی ہوئی کھوئے کھوئے وقت کو خالی نگاہوں سے گھورنے لگی۔ ماحول میں دُور دُور تک دھوئیں کی دُھند چھا گئی۔ جو اجنبی لمحے اُس کا سہاگ بن کر آئے تھے وہ سب کے سب اُجڑ گئے۔ بیتے ہوئے لمحوں کے بکھرے بکھرے خیال آئے تو وہ بہت پیچھے چلی گئی ـــ وہ اُس وقت سمندر کی طوفانی لہروں پر اُبھرتی ڈوبتی ہوئی کناروں کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن کناروں کی روشنیاں حالات کے اندھیروں میں ایک ایک کر کے ڈوب رہی تھیں اور وہ تاریک راہوں میں اندھیروں کی اُڑتی ہوئی گرد کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی ـــــ نسرین کا خیال آتے ہی اُس کا دل دھڑکنے لگا اور اُس دھڑکن اور اُس آواز میں اُسے نسرین کی خوبصورت آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسو دھندلے دھندلے دکھائی دینے لگے جیسے اُس کے انتظار کے چراغوں نے اپنی مدھم اُداس سی آنکھیں کھول دی ہوں۔ اُس کی لانبی سیاہ پلکوں پر آنسوؤں کے ننھے ننھے موتی جھلملا رہے تھے۔ اُس نے آہستہ سے آنکھیں خشک کیں اور دامن کی ہوا سے کر دل کے چراغ گُل کرتے اور بوجھل قدموں سے ڈرائنگ روم سے باہر آگئی۔

پرویز بہت خوش تھا۔ اُس نے گہرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور اُس کے کوٹ کے کالر میں سُرخ گلاب لگا ہوا تھا۔ اُس وقت اُس کے دل میں ارمانوں کا ایک ہجوم تھا۔ جوں جوں وہ نسرین کے مکان کے قریب ہوتا جا رہا تھا اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ نہ جانے نسرین نے اُس کے خط کا اپنے دل پر کیا اثر لیا ہوگا؟ نسرین کے سامنے شاہینہ کا بھی مسئلہ ہوگا؟ وہ جانے کتنے سوال وہ شاہینہ کے بارے میں کرے گی؟

وہ نسرین سے کیا کہے گا؟ ـــ ایسے کئی سوالات اُس کے ذہن سے ٹکرائے اور دوسرے ہی لمحے اُس نے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ نسرین سے سب کچھ بتا دے گا جیسے وہ خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔

"میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ تم وہی ہو جس کے ساتھ راوی و چناب کے کناروں پر چاندنی راتیں شیلی و کیٹس کی نظمیں پڑھ کر گزاری ہیں۔ نہ جانے کتنی شامیں میں نے تمھارے ساتھ شالیمار باغ میں بتائی ہیں۔ پہاڑی مقامات میں تمھیں مری سب سے زیادہ پسند تھا اور ہماری کتنی ہی گرمیاں ایک ساتھ وہاں گزری ہیں۔ تمھیں سُرخ گلاب کتنا پسند تھا۔ میں تمھاری فرمائش پر اپنے کوٹ کے کالر میں ہمیشہ سُرخ گلاب لگاتا تھا۔ کہو تو میں وہ نام بھی بتا دوں جو تم نے مجھے پیار سے بخشا تھا۔ حمایت علی شاعر اور قتیل شفائی تمھارے پسندیدہ شاعر تھے اور میں تمھاری فرمائش پر اُن کی غزلیں تمھیں سُنایا کرتا تھا۔ تم نے اپنے ڈرائنگ روم میں ایک خوبصورت سے فریم میں میری وہ تصویر لگا رکھی تھی جو خود تم نے اپنے کیمرے سے کھینچی تھی۔ تمھاری اُداس آنکھوں میں مجھے وہ نشانات دکھ رہے ہیں جہاں ہماری محبت کی صلیب ٹوٹی تھی۔"

اُس نے سوچا جب نسرین کے چہرے پر شرم کے گلاب کھل اُٹھیں گے تو وہ اُس سے کہے گا، اب اُسے جلتی دوپہروں میں ریلوے پلیٹ فارم پر اُس کا انتظار نہ کرنا پڑے گا۔ اُس کی اُداس آنکھوں میں اُس کی یاد کبھی آنسو بن کر نہ لہرائے گی۔ ماضی میں جو کبھی ہوا اور جیسے گزرا اُسے ایک خواب سمجھ کر بھول جایئے اور اُن چمکیلی صبحوں کی طرف اپنے قدم بڑھایئے جو برسوں سے ہماری منتظر ہیں اور اُن راتوں کو نہ لوٹایئے جن کی ویرانیوں میں ہماری محبت اُجڑ گئی۔

پھر یکلخت اُس کی سوچوں کے سوتے خشک ہو گئے۔ سامنے نسرین کا مکان تھا۔ سانسوں کا شور مدھم ہوا تو اُس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کال بیل پر رکھ دیا۔ رومال سے پسینہ خشک کرنے کے بعد اُس کی نظریں آنے والے قدموں کی طرف اُٹھ گئیں۔ اُس کی سانسوں کا تنفس بڑھ گیا ـــ اُس نے اپنی نظریں آنے والے چہرے پر

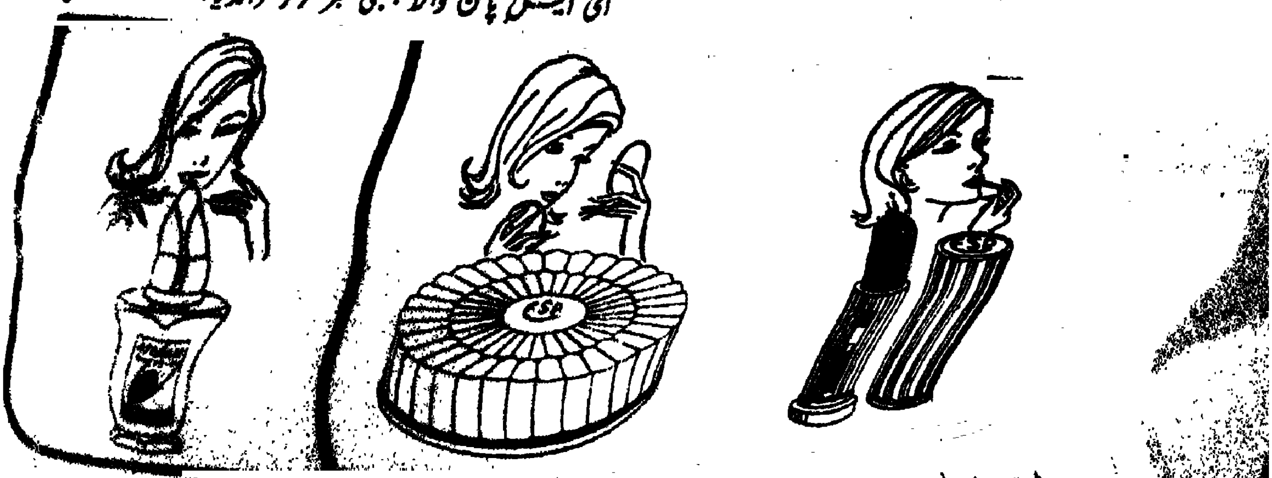
کیا وہ
خوبصورت ہے
یقیناً
وہ ہے

اس کی خوبصورتی افغان اسنو بیوٹی ایڈز کی مرہونِ منت ہے۔ افزائے حسن ایڈز جنھوں نے لکھوکھا نازنینوں کو جلالی حُسن اور پائیدار دلکشی سے مستفید کیا ہے۔

افغان اسنو: چہرے کی دلکشی پیدا کرنے والی عمدہ ترین ایڈ۔
افغان اسنو: جلد کیلئے بےنظیر ٹانک جو دھبّوں اور جھریوں کو دور کرکے چہرے کو مانند شبنم نرم و ملائم بناتی ہے۔
افغان اسنو پاؤڈر: چہرے کے داغوں کو چھپانے اور ملاحت پیدا کرنے کیلئے چار مختلف شیڈوں میں ملتا ہے۔
افغان اسنو لپ اسٹک: لبوں کو دلکش اور رسیلا بنانے کیلئے بےشمار شیڈوں میں دستیاب ہے۔
افغان اسنو نیل پالش: چمکتے ہوئے رنگوں میں ہر مذاق کے مطابق جو ناخنوں کو سخت ہونے سے بچاتا ہے۔
افغان کریم کیک: کریم کے ساتھ تیار شدہ پاؤڈر خوبصورت ڈبیوں میں ایک فوری بیوٹی ایڈ جو کسی بھی میک اپ کے ساتھ خوب سنوار کر قدرتی خوبصورتی پیدا کرتا ہے۔

# افغان اسنو بیوٹی ایڈز

ای ایس پاٹن والا بمبئی نمبر 77 (انڈیا)



بیسویں صدی دہلی

درگوند کردیں۔
"فرزانہ ـــــــ"
"کیا مس نسرین موجود ہیں؟" اُسے اپنے حلق میں کانٹوں کے چبھنے کا احساس ہوا۔
"وہ تو کالج سے استعفیٰ دے کر کل ہی چلی گئیں۔"
اس وقت اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے گرم سیسہ اس کے کانوں میں ڈال دیا ہو۔ اس کے احساس کے سارے تار ایک جھنکار کے ساتھ ٹوٹ گئے۔ اُس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس کے ہاتھ میں شاہینہ کا خط تھا جس میں اس نے لکھا تھا ــــــ
"میں تمہاری زندگی میں خالی ہاتھ آئی تھی اور اب خالی ہاتھ واپس جا رہی ہوں۔ پرویز! مجھے یاد نہ کرنا اور نہ اب تنہائیوں میں میری باتیں کرنا ورنہ میں راہ بھول جاؤں گی۔"
ہر سمت اُداسیاں رو رہی تھیں اور اس کے قدم پُر پیچ راہوں کی جانب بڑھ رہے تھے!!

---

# غزلیات

## اختر مشتاق رحیم آبادی

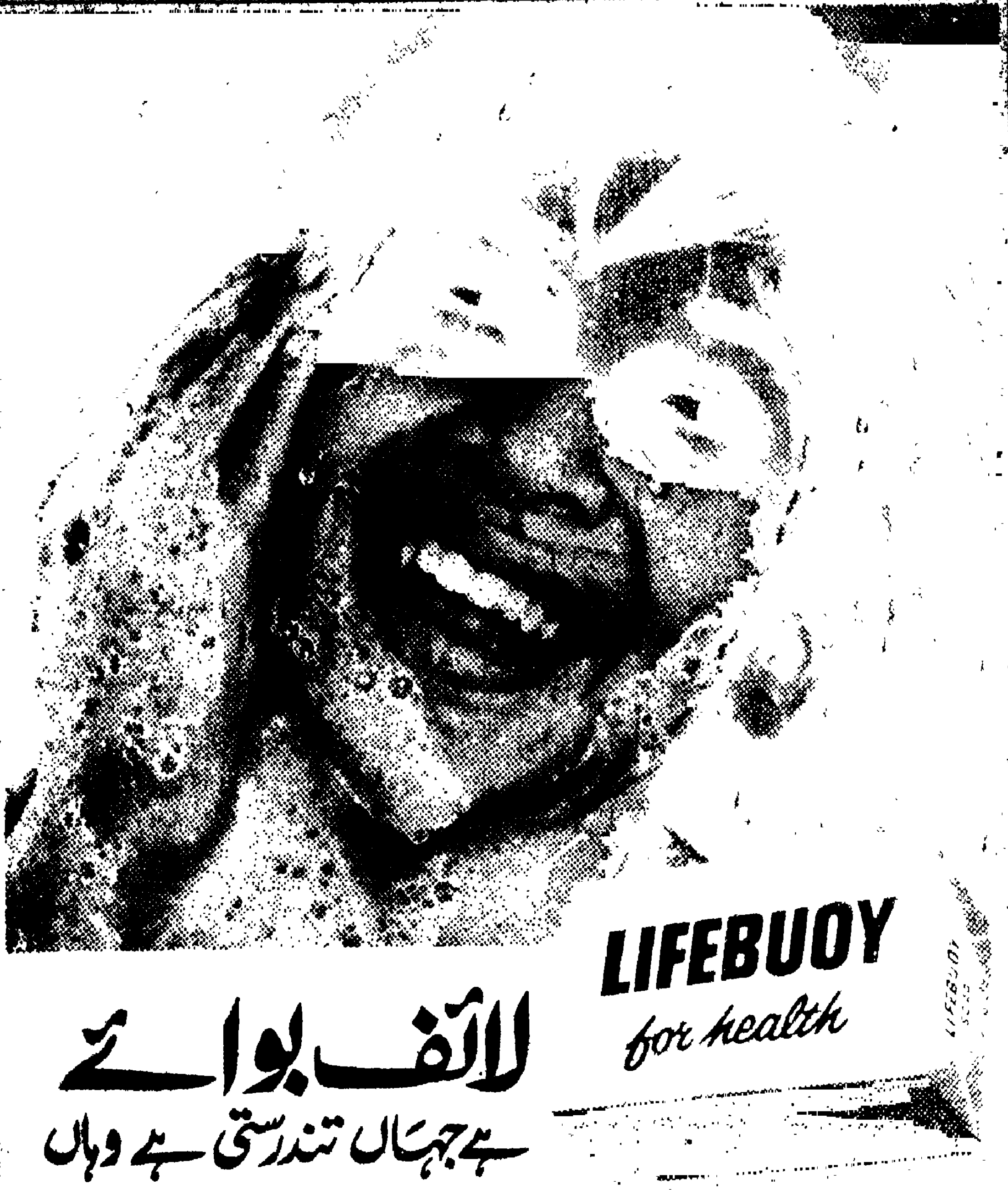
ہر نفس ناز اٹھانے کی ضرورت نہ رہی — زندگی! تجھ کو منانے کی ضرورت نہ رہی
تیرے قامت نے اٹھائی وہ قیامت کہ نہ پوچھ — اب قیامت کے بھی آنے کی ضرورت نہ رہی
اے فلک! کر ہی گیا کام مرا سوزِ نفس — اب تجھے برق گرانے کی ضرورت نہ رہی
شامِ ہجراں دلِ پُر غم ہی سے لَو اُٹھنے لگی — اب کوئی شمع جلانے کی ضرورت نہ رہی
کون جانے یہ تغافل بھی کسی جبر سے ہے — یا انھیں عہد نبھانے کی ضرورت نہ رہی
کون دے گا دلِ دیوانہ تجھے دادِ جنوں! — اب انھیں تیرے فسانے کی ضرورت نہ رہی
آپ اب کوششِ تادیبِ ستم بھی کر لیں — اب کوئی بات بنانے کی ضرورت نہ رہی
ہم اک منجملۂ خاصانِ خرابات بھی تھے — ہاں مگر اب یہ بتانے کی ضرورت نہ رہی
[illegible]ب محرومیٔ جاوید دکھانے والے! — اب تجھے میرے جگانے کی ضرورت نہ رہی
[illegible]لوں ہی نے سب اسرارِ جنوں کھول دیا — اب کوئی راز چھپانے کی ضرورت نہ رہی

کوئی شکوہ تو ہمیں بھی تھا کسی سے اختر
لیکن اب بات بڑھانے کی ضرورت نہ رہی

## پورن کمار ہوش

گرچہ پروردۂ بہار ہیں ہم — غمِ دوراں کے شاہکار ہیں ہم
دلِ جواں حسرتوں کا مرگھٹ ہے — اک سلگتا ہوا دیار ہیں ہم
کوئی منزل نہ راہرو کوئی — سونی سونی سی رہگزار ہیں ہم
یا اسیرِ غمِ زمانہ رہے — یا گرفتارِ زلفِ یار ہیں ہم
ہدفِ بے رُخیٔ حسن نہیں — نازشِ عشق کے شکار ہیں ہم
آنکھ ویراں ہے لب خموش مگر — کل زمانے پہ آشکار ہیں ہم
ایک مدت سے تم ہو دل کے قریب — ایک مدت سے بے قرار ہیں ہم
موجِ بادِ صبا سے ڈرتے ہیں — موجِ طوفاں میں کوہسار ہیں ہم
تا کجا کارواں کریں گے گریز — جرسِ وقت کی پکار ہیں ہم

جس کی گلیوں میں ہوش تھے رسوا
آج اسی شہر کا وقار ہیں ہم




# لائف بوائے

## ہے جہاں تندرستی ہے وہاں

لائف بوائے سے نہائیے اور ہر بار تازگی کی ترنگ، تندرستی کی اُمنگ کا لطف اٹھائیے۔
لائف بوائے سے نہا کر آپ کی طبیعت کِھل اُٹھے گی، کیونکہ اس میں
اعلیٰ صابن کے سبھی اوصاف ہیں اور اپنی مخصوص خوبیاں بھی...

## لائف بوائے میل میں چھپے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

لنطاس L. 52-140-43 UD

# شانِ نزول

نریش کمار شاد

۹۲۔ تیمار پور۔ دہلی

۲۲ راگست ۶۷ء مکرم و معظم! تسلیم و نیاز

حسبِ معمول شانِ نزول بھیج رہا ہوں اور داد دیتا ہوں آپ کی عالی ظرفی کی کہ آپ نے تو مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ میرے کسی کرم فرما نے اُن کے اپنے الفاظ میں میری "خباثتوں" کی جہاں اور بہت سی اطلاعات بہم پہنچائی ہیں وہاں اِس حیرت انگیز انکشاف سے بھی آپ کی معلومات میں اضافہ فرمایا ہے کہ "بیسویں صدی" کے کسی پچھلے شمارے میں آپ کے نام میرا جو خط شائع ہوا ہے اُس میں میری یہ رباعی ؎

قوال ہے کوئی اور افسر کوئی — ملتا نہیں ڈھونڈے سے سخن ور کوئی
اِس دور میں اُردو کا نہیں ہے دشمن — اُردو کے مشاعرے سے بڑھ کر کوئی

کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی کے خلاف زہر افشانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اِس قیاس پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا اگر خوش قسمتی سے ظ

ایسے شگوفے ہیں بہت سے جو فسانے ہیں

والی بات نہ ہوتی۔ ایک دُنیا جانتی ہے کہ آپ کی طرح میں بھی کنور صاحب کا دیرینہ عقیدت مند ہوں لیکن قصیدہ خواں نہیں۔ اُن کی ذات اور شاعری سے متعلق اپنے کئی مطبوعہ مضامین کی صورت میں اپنے تاثرات و خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ میں اُنھیں فی الواقع مجموعی اور بنیادی اعتبار سے بہت ہی اچھا انسان سمجھتا ہوں اور یہ بھی مانتا ہوں کہ اُن کا ذوقِ شعری بہت شائستہ اور سُلجھا ہوا ہے اور اُن میں ایک بہت اچھے شاعر کے اوصاف بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ لیکن اِس فنِ شریف کے لئے جس مسلسل لگن اور شدید ذہنی اور فکری ریاضت کی ضرورت ہے اپنے گوناگوں مشاغل کی وجہ سے وہ اُن کے بس کا روگ نہیں۔ تاہم موجودہ صورت میں بھی میں اُنھیں سرے سے کوئی غیر اہم شاعر نہیں سمجھتا۔ میری ایسی باتوں سے مجھے یقین ہے کنور صاحب ایسے وسیع النظر اور کشادہ دل کو تو نہیں لیکن اُن ستم ظریفوں کو ضرور خباثت ضرور محسوس ہوتی ہے جو بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ کنور صاحب کے جملہ حقوق صرف اُنھیں کے نام محفوظ ہیں اور جن کی آنکھوں میں کنور صاحب سے میری وابستگی اور یگانگی کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور جو کنور صاحب کو مجھ سے بدگمان اور بدظن کرنے کے لئے نت نئے شگوفے چھوڑتے رہتے ہیں۔ اِس سے پہلے تو مجھ پر وار کرنے کے لئے وہ میری بلا نوشی کو ایک ہتھیار کی طرح استعمال کرتے تھے لیکن جب یہ ہتھیار کُند ہو گیا تو وہ اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے اور اُنھوں نے میرے باطن کا ایکس رے کرنے کے بعد یہ "خبث" ڈھونڈ نکالا حالانکہ شعر و ادب کی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اِس رباعی میں افسر سے مُراد کون سے افسر ہو سکتے ہیں۔ کنور صاحب تو خیر اب افسر رہے بھی نہیں لیکن ہندو پاک کے بے شمار افسروں کے علاوہ اس دہلی ہی میں ایسے کئی افسر موجود ہیں جنھیں شاعر کہنا اپنی بے ذوقی کا

ثبوت دیتا ہے لیکن میں نے تو بہ حیثیت مجموعی یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ فی زمانہ بالعموم ہمارے شاعروں میں ایسے قوالوں
اور افسروں کی بہتات ہوتی ہے جو شاعروں کی ذیل میں نہیں آتے۔ یہی نہیں بلکہ میں نے تو اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر
اس تلخ حقیقت کا اظہار یوں بھی کیا ہے کہ ؎

کم ظرف ہے سو بدمست اللہ اللہ    ذوق اور ہوا اتنا پست اللہ اللہ
اُردو کے جو نام سے بھی آگاہ نہیں    اُردو کے ہیں سرپرست اللہ اللہ!

اس لئے آپ کے توسط سے میں اپنے ایسے تمام کرم فرماؤں کی خدمت میں صرف اِتنا ہی عرض کرنا چاہوں گا کہ ؎

خنجر سخت جاں ہے چھری تیز چاہئے

اِس کے علاوہ اُن کی شان میں کچھ اور کہوں تو ممکن ہے اُن کی دل آزاری کا باعث ہو۔ کیا کروں علی حزیں کی طرح
میرا شیوہ یہ نہیں کہ ؎

گر دل این قدر بن کین است کہ مردم دارند    ہر کہ یک دل شکند کعبہ تعمیر کند

بلکہ میری سب سے بڑی "خباثت" یہ ہے کہ میں ایسے تمام اصحاب کا بھی خلوصِ دل سے احسان مند ہوں جیسا کہ میں نے
اپنی ایک رباعی میں بھی لکھا ہے ؎

آشفتہ بیانی مجھے جینے دیتی؟    یہ دشمنِ جانی مجھے جینے دیتی؟
ممنون ہوں اربابِ حسد کا ورنہ    کیا ہیچمدانی مجھے جینے دیتی؟

آشفتہ بیان وہیچمدان ——— زرِش نگار شاد

---

فراقؔ گورکھپوری سے ایک محبوب نے جب اُن سے یہ دریافت کیا کہ کیا آپ کو میری آنکھیں اب بھی اُتنی ہی اچھی لگتی ہیں جتنی پہلے۔ تو فراقؔ صاحب اُس وقت ایک نئی غزل کہہ رہے تھے اور یہ شعر اِس سوال کے جواب میں اُسی غزل میں نازل ہو گیا ؎

وہ تیری نرم دوشیزہ نگاہی دل نہیں بھولا
اٹھی جب جب نظر تیری نگاہِ اوّلیں نکلی

---

الیکشن کے زمانے میں کوئی کانگریسی اُمیدوار جمہوریت کے موضوع پر بہت طول طویل تقریر کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ بہت شاندار دعوے بھی فرما رہے تھے جگرؔ مرادآبادی ذاتی طور پر انھیں ایک مُدت سے جانتے تھے۔ اِس لئے چند لمحوں تک تقریر سُننے کے بعد مقرر سے متعلق یہ شعر موزوں کر دیئے ؎

آپ کے سب اصول جمہوری    جیسے کاغذ کے پھول کچھ رنگیں
مختصر یہ کہ آپ خود کیا ہیں    آپ کی ذہنیت ہے کتنی حسیں
آپ کہتے ہیں کچھ، عمل کچھ ہیں    اِس کے شاہد ہیں آسمان و زمیں
میں بس اِتنا ہی عرض کرتا ہوں    آپ جمہوریت کے اہل نہیں

---

جوشؔ ملسیانی جن دنوں ایک درس گاہ میں اُردو اور فارسی کے معلم تھے۔ ایک روز اپنی کلاس میں پڑھانے کے لئے آئے تو تیز آندھی شروع ہو گئی۔ جوشؔ صاحب نے چلتے چلتے ہی یہ شعر موزوں کر لیا اور جماعت کے کمرے میں پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اِسے بلیک بورڈ پر لکھ دیا ؎

اور ہوتے ہیں جو محفل میں خموش آتے ہیں
آندھیاں آتی ہیں جب حضرتِ جوشؔ آتے ہیں

---

نانک چند نازؔ نے ایک بار کوئی سیاسی نظم کہتے ہوئے گھنٹی کی بجائے اُس پنجابی نام "ٹلی" کو نظم کرنا چاہا لیکن قافیے مشدد نہ تھے۔ اِس لئے نازؔ صاحب گلّی کے قوافی پر "ٹلی" کو "ٹلی" باندھ گئے۔ مولینا ظفر علی خاں کی نظر سے نازؔ کی یہ نظم گزری تو پہلے تو چیں بہ جبیں ہوئے پھر ہنستے کا ایک کش لے کر یہ قطعہ موزوں کر دیا ؎

گھنٹی ہے کہ ٹلی ہے یہ عقدہ نہیں کھلتا
ہے اہلِ زباں میں کچھ اسی بات کا غوغا
ٹلی کو بھی جب نازؔ ٹلی نظم میں باندھے
پھر کیوں نہ بیاں کرے دبایو کا گھنٹا

ایک صاحب حسین ابن شبلی نے دینیات سے متعلق ایک کتاب لکھ کر اس کا مسودہ اظہارِ خیال کی غرض سے اکبر الہ آبادی کی خدمت میں روانہ کیا تو اکبر نے اس کے مطالعہ کے بعد یہ شعر موزوں کیا اور مسودے کے ساتھ مصنف کو واپس بھیج دیا:

الف دین نے خوب لکھی کتاب
کہ ہے دین نے پائی راہِ ثواب

---

مالیر کوٹلہ میں ایک مشاعرے کے بعد جب رات تقریباً بیت چکی تھی چند شاعروں نے طے کیا کہ سونے کی بجائے ہر شاعر حذف و اضافت کے بغیر اگر پوری غزل نہیں تو کم از کم چار شعر کہہ کر ابھی سنائے۔ اس شرط کو پورا کرتے ہوئے میں نے حسب ذیل غزل موزوں کی:

تم نظر میں اگر سماؤ گے    پھر نظر بھی ہمیں نہ آؤ گے
ہم بہت خود پسند ہیں صاحب    تم ہمیں کیا پسند آؤ گے
زندگی سے فریب کرتے ہو    سادہ لوحو! فریب کھاؤ گے
لوگ کہتے ہیں تم بھی پیتے ہو    ہم تو مانیں گے جب پلاؤ گے
جب بھی پاؤ گے شاد کو تنہا
تم یقیناً اداس پاؤ گے

---

جوش ملیح آبادی کو ایک بار کراچی کی ایک ایسی ادبی محفل میں شریک ہونا پڑا جس میں ادیبوں کی اکثریت یونیورسٹی کے ڈاکٹروں پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں کی تحقیقی اور علمی گفتگو کچھ زیادہ خوش گوار محسوس نہ ہوئی اور جب انھوں نے اپنا تازہ کلام سنایا تو شدت سے یہ بھی محسوس کیا کہ زیادہ تر ڈاکٹر حضرات شعر فہمی کے معاملے میں کورے ہیں تو جوش صاحب کی طبیعت اور بھی مکدر ہوگئی اور اس تکدر کو دور کرنے کے لئے انھوں نے یہ رباعی کہی:

یہ لوگ جو ڈاکٹر جتادھاری ہیں
ناواقفِ شیوہ ہائے فن کاری ہیں
ان کو سمجھو نہ تاجدارانِ علوم
یہ کشتِ ہنر کے صرف پٹواری ہیں

---

شاد عارفی کے ایک چچا دولت خاں رام پور آئے اور جب تک شاد صاحب کے یہاں رہے یہی اصرار کرتے رہے کہ آپ میرے ساتھ ہی پاکستان چلے چلیے۔ شاد صاحب یہی کہتے رہے کہ پاکستان کے عزیزوں اور دوستوں کے ہزاروں تو خیر جھوٹ ہے لیکن بے شمار خطوط اس سلسلے میں موصول ہو چکے ہیں۔ میں نے انھیں بھی یہی جواب دیا ہے اور یہی جواب آپ کے لئے بھی ہے کہ میری خواہش یہ ہے کہ میں بھارت میں مروں۔ بھارت میں بھی اس طرح کہ جیل میں موت آئے تاکہ میری شاعری کی تلخی پر مہر لگ جائے۔ دولت خاں شاد صاحب کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور جب برابر یہی رٹ لگاتے رہے کہ پورا پاکستان آپ کا منتظر ہے۔ آپ خدا کے لئے اپنے حال پر رحم کیجئے اور وہاں جاکر آباد ہو جائیے تو شاد صاحب نے چند لموں کی فکر کے بعد یہ قطعہ موزوں کیا اور انھیں سنا دیا:

منتظر ہے پاکستان اور میں نہ جاؤں گا
برہمن کے معرے پر طبع آزماؤں گا
چاہتا ہوں بھارت کا نام اور اونچا ہو
سوچتا ہوں مسجد سے جوتیاں چراؤں گا

---

لکھنؤ میں جب سعادت یار خاں رنگین دہلوی میرزا حاجی بیگ سے ملے تو میرزا صاحب نے ایک ہی زمین میں جرأت اور رضا کے دو مطلعے انھیں سنائے۔ جرأت کا مطلع تھا:

کانوں میں اس کے پھول نہیں ہیں گلاب کے
ٹکڑے شفق کے پہلو میں ہیں آفتاب کے

اور رضا کا مطلع تھا:

سے ہیں اس کے کانوں میں اس آب و تاب کے
جیسے کہ برگ سبز ہوں نیچے گلاب کے

رنگین نے جب دونوں مطلعوں کی داد دی تو میرزا صاحب نے انھیں بھی اس موضوع پر اور اس بحر میں فکر کرنے کی دعوت دی۔ رنگین نے ذرا تأمل کے بعد قافیہ بدل کر یہ مطلع کہہ دیا:

موتی ہیں دونوں کانوں میں اس خوش نگاہ کے
چمکے ہیں یا کہ تارے یہ نزدیک ماہ کے

---

شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ایک دن جب ایک خوش جمال سقنی کو دیکھا تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایک عاشقانہ غزل کہتے ہوئے اس میں ظریفانہ لب و لہجہ اختیار کرنے کے بعد براہِ راست قسم کے یہ تین شعر بھی موزوں کر دیے:

پانی بھرے ہے یار دیاں قرمزی دوشالا    لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا
کاندھے پہ مشک لے کر جب قد کو خم کرے ہے    کافر کا نقشہ محسن ہو جائے ہے دوبالا
دریائے خوں میں کیوں کر ہم نیم قد نہ ڈوبیں    لنگی کے رنگ سے جب واں تا کمر ہو لالا!

---

ہیر رانجھے کے عشق و محبت کا مشہور قصہ سرزمین پنجاب کے لافانی شاعر وارث شاہ

[illegible] نظم کہا ہے جس سے سید انشاء اللہ خاں انشاء نے ایک رات پنجابیوں کی کسی محفل میں سُنا تو
بے حد زیادہ متاثر ہو کر اُسی وقت یہ شعر کہہ دیا ؎

سُنایا رات کو قصّہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

---

ایک بار دہلی کے شعراء نے یہ تین مصرعے
۱۔ ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا
۲۔ اِس لئے قبر میں رکھا انھیں زنجیر سمیت
۳۔ من ہمی روم بہ کعبہ و دل می رود بہ دیر
امتحان کے طور پر لکھنؤ بھیجے اور لکھنؤ کے شعراء سے اِن مصرعوں پر مصرعے لگانے کی فرمائش
کی۔ پہلے مصرعے پر شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا مصرع لگا کر شعر یوں مکمل کیا ؎

ڈال دو سایہ اپنے آنچل کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

دوسرے مصرعے پر آتش لکھنوی نے مصرع لگایا اور یہ شعر ہو گیا ؎

حشر میں حشر نہ برپا کریں یہ دیوانے
اِس لئے قبر میں رکھا انھیں زنجیر سمیت

اور تیسرے مصرعے کو پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی نے اِس شعر کا روپ بخشا ؎

دارم نہ دین و کفر بہر یک قدم دو سیر
من می روم بہ کعبہ و دل می رود بہ دیر

---

بہادر شاہ ظفر نے ایک بار مرزا غالب کو تحفۃً بیسن کے بیج بھیجے تو غالب نے
شکریے کے طور پر یہ رباعی کہہ کر بھیج دی ؎

اِن بیسن کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے!

---

ذوق دہلوی اپنے اُستاد شاہ نصیر کی موجودگی میں اپنی نئی غزل سُنا رہے تھے
جونہی مطلع پڑھا ؎

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کے
ایسا یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کے

تو نصیر نے فرمایا کہ ذوق یہاں [illegible]
نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کے
ذوق نے کچھ تامّل کے بعد کہا کہ قبلہ گستاخی معاف دونے میں پھول رکھنا ہوتا ہے بٹوے میں نہیں
ہوتا۔ میری ناقص رائے میں تو مناسب یوں ہے کہ ؎

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کے
ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کے

---

جب گورنر جنرل فریزر کے قتل کے جرم میں اکتوبر ۱۸۲۵ء میں مرزا داغؔ دہلوی
کے والد نواب شمس الدین خاں کو پھانسی دے دی گئی تو محمد مظفر خاں گرم نے اس
واقعے کا معمّہ کی شکل میں یہ قطعۂ تاریخ کہا جس کو اگر اُلٹا جائے تو ۱۲۵۲ھ ہوتے ہیں ؎

یہ دست درازیِ ستم کس سے بیاں ہو
بے حشر و گنہ مسندِ نواب کو اُلٹا
تاریخ میں نئی طرز سے لکھ گرم
کیا چرخ نے نوابیِ سہراب کو اُلٹا

---

حضرت داغؔ دہلوی سعد آباد ضلع متھرا میں اپنے دوست اور شاگرد کنور اعظم علی
خاں کے مہمان تھے۔ ایک روز دونوں شام کو کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اور
اُن کے سامنے کنور صاحب کا ایک سات آٹھ سال کا بچہ کھیل رہا تھا۔ بچے کو شرارت جو
سُوجھی تو ایک کرسی پر چڑھ کر نہایت صفائی سے ایک بُلبل کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا
اور بُلبل کو باہر نکال کر ایک ڈورے سے اُس کا پاؤں باندھ دیا اور بچہ اُسے ہوا میں اُڑانے کی
کوشش کرنے لگا۔ کنور صاحب نے بچے کی اِس حرکت کو بغور دیکھتے ہوئے یہ مصرع کہا ؎

پر کے بدلے پاؤں باندھا بُلبلِ ناشاد کا

داغؔ نے مصرع سُنا تو فوراً دوسرا مصرع اُن کے ذہن میں آ گیا اور کنور صاحب سے کہنے
لگے۔ لیجئے آپ کا پورا شعر ہو گیا ؎

پر کے بدلے پاؤں باندھا بُلبلِ ناشاد کا
کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے ابھی صیّاد کا

---

۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں فرنگی سرکار کے خلاف جو تاریخی ہنگامہ برپا ہوا تھا
اُس کی عظیم الشان کامیابی سے خائف ہو کر انگریز حکمرانوں نے ہندوستانیوں سے ہتھیار لے لئے
تھے اور سارے ہندوستان کو نہتا کر دیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب انگریزی حکومت کی طرف سے اہلِ پنجاب کو
تلوار رکھنے کی اجازت ملی تو علامہ اقبال نے یہ شعر اُس موقعے پر کہا ؎

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدِ جاں باز ہے یا حیدرِ کرار

---

بیخود موہانی اور آرزو لکھنوی دونوں باکمال اُستاد ایک شام کو وکٹوریہ پارک لکھنؤ میں ٹہلتے ہوئے آگئے۔ وہاں دورانِ گفتگو میں بیخود نے کہا، صاحب ایک شعر ہو گیا ہے، سُنئے ؎

رکھی ہے لاشِ بُلبل صیاد کہہ رہا ہے
اِس کو قفس نے مارا یا آشیاں نے مارا

آرزو نے پہلے تو شعر کی تعریف کی پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے پہلے مصرعے میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے شعر یوں کر دیا جائے تو بہتر ہو گا ؎

مُردہ پڑی ہے بُلبل صیاد سوچ میں ہے
اِس کو قفس نے مارا یا آشیاں نے مارا

---

بیخود دہلوی جب کسی ریاست میں ملازم تھے تو ایک رئیس کی محفلِ خاص روزانہ رات کو سجا کرتی تھی۔ شراب کا دَور چلتا اور رئیس کی منظورِ نظر طوائف جام بھر بھر کر مقربین کو پیش کرتی۔ اُن مقربین میں بیخود بھی شامل تھے۔ پرہیزگار ہونے کے باوجود طوائف سے انکار کرنے کی مجال کیوں کر کر سکتے تھے۔ اُس سے جام لے لیتے لیکن مُنہ تک لے جا کر چپکے سے اپنے گریبان میں اُلٹ لیتے۔ اِس دلچسپ صورتِ حال کے پیشِ نظر اُنھوں نے یہ شعر کہا ؎

بیخود کے لب بھی تر نہ ہوئے وقتِ مے کشی
آلودۂ شراب گریباں ہی رہا

---

ایک مشاعرے میں چند بر خود غلط طفلانِ سخن جو بزعمِ خویش بڑے شاعروں سے بھی بڑے ہیں، موجود تھے۔ اُن میں سلام مچھلی شہری کے ایک شاگرد بھی تھے جو طرح طرح کی چہلیں کر رہے تھے اور سلام کی مے کشی پر چھینٹے ڈال رہے تھے۔ جب مشاعرے میں سلام صاحب کے پڑھنے کی باری آئی تو اُنھوں نے فی البدیہہ یہ قطعہ پڑھ دیا اور ابنِ سعادت مند" کے علاوہ دوسرے خوب صورت طفلانِ سخن پر بھی گویا گھڑوں پانی پڑ گیا ؎

تمھاری روشنی مغرور ہو کر بھی فسردہ ہے
پریشاں جگنوؤ، چمکو شرارہ بن کے دِکھلا دو
چلو میں اپنی تابانی پہ بادل ڈال دیتا ہوں
مگر تم چاند تو کیا اِک ستارہ بن کے دِکھلا دو

---

۳۹-۱۹۳۸ء کی بات ہے کہ بدایوں کے قریب ایک شوگر فیکٹری میں طرحی مشاعرہ تھا مصرعِ طرح تھا ؎

میری آنکھوں میں گلستاں ہی گلستاں ہوتا

مشاعرے میں متعدد اساتذۂ فن شریک تھے اور بالعموم شعر کے کسی فنی پہلو پر ہی زیادہ داد دی جاتی تھی۔ شعرا کی پسندیدگی کا یہ رنگ دیکھ کر شکیل بدایونی نے اسی وقت یہ شعر کہہ کر اپنی طرحی غزل میں شامل کر لیا اور بعد میں یہی شعر حاصلِ مشاعرہ بھی ثابت ہوا۔

تُو نے سوچا کبھی دامن کو بچانے والے!
کچھ شکست ہاتھ میں ہوتی تو یہ داماں ہوتا

"بیسویں صدی" میں وہی مضامینِ نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔



آہا! یہ پُرکشش پکوان
صرف ۲۷ منٹ میں
تیار ہو گئے!
اس کے لئے
TEMPO
ٹیمپو پریشر کُکر کا شکریہ
وقت بے وقت مہمان آپہنچتے ہیں۔ تب ان کو نفیس سے نفیس کھانا منٹوں میں تیار کر کے پیش کرنا ہوتا ہے۔
ٹیمپو پریشر کُکر آپ کے پاس ہوگا۔ وہ آپ کے گھر کی عزت بنائے رکھے گا۔ چند ہی منٹوں میں طرح طرح کا کھانا تیار کر دے گا اور آپ کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں رہے گی۔
ہر ٹیمپو پریشر کُکر پہلے سے ٹسٹ کیا ہوا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ آپ کے پاس پہنچ کر بالکل ٹھیک کام دے سکے۔ ان میں میٹل سیفٹی والو لگے ہوئے ہیں
ہر ٹیمپو پریشر کُکر پانچ سال کے لئے گارنٹی شدہ ہے۔
کانٹی نینٹل ٹریڈنگ کمپنی آف انڈیا
ای۔۲/۲۲ جھنڈے والا ایکسٹینشن نئی دلی ۵۵ فون:۔ ۵۶۸۵۴۱
graphiceds/CT/160
لوکل ایجنٹ:۔
ہیرا لال اینڈ سنز، ۶۱۲۰ صدر بازار، دہلی۔ ۶ فون:۔ ۲۲۷۲۹۴

افسانہ

# منظر پسِ منظر

شعیب شمس۔ ایم اے

صفدر منزل۔ کریم چک۔ چھپرہ (بہار)

۲۸ جولائی ۹۶ء بھائی جان! خلوص و احترام

"یادوں کا الاؤ" آپ کو پسند آگیا۔ میری خوش قسمتی۔ شکریہ۔ "چھپکلی" ڈاک کی بدعنوانیوں کی نذر ہوگیا۔ میری کم نصیبی۔ اُس کی نقل لاکھ تلاش کرتا ہوں ملتی ہی نہیں ——— آپ کے خلوص نے کچھ اتنا متاثر کیا ہے کہ دوسرا افسانہ "منظر پسِ منظر" بھیج رہا ہوں۔ اِس افسانے میں آپ کو کئی فلش بیک نظر آئیں گے اور ہر فلیش بیک بذاتِ خود ایک افسانہ ہے۔ زندگی اتنی کٹھن اور دشوار ہوگئی ہے کہ معمولی حادثات بھی بڑے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے اِس افسانے میں ویٹر کے کردار کو بھی اُبھارنے کی کوشش کی ہے اور یہ ضمنی کردار جدید سوسائٹی کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ رامو کو فکر ہے تو بس یہ کہ کوئی اُسے رامو کہہ کر نہیں پکارتا۔ یہ سماج کے ایک فرد کا المیہ ہے۔ مجھے یقین ہے افسانہ آپ کو ضرور پسند آئے گا ——— "دلِ ریزہ ریزہ" اور "اِک تارا اُنجھا بُجھا سا" کو قارئینِ "بیسویں صدی" نے بہت زیادہ سراہا اور میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ میری اِس حوصلہ افزائی میں آپ کے خلوص کو بہت زیادہ دخل ہے . . .

آپ کا اپنا ——— شعیب شمس

---

نہ جانے زندگی کیوں اتنی سخت ہوگئی ہے جیسے پہاڑ کی اونچی چوٹی جسے انسان اگر چھونا بھی چاہے تو نہ چھو سکے اور اگر تن زنگ کی طرح جانبازی دکھائی اور اونچی چوٹی پر پہنچ بھی گیا تو کپڑے لٹکے رہو۔ ہوا میں معلق، کوئی مدد کو بھی نہ پہنچے گا۔ اور ایسے میں کوئی مدد کو آئے بھی تو کیوں؟ خودکشی کرنے کی سوچ ہی لی ہے تو مرد اور اگر ہاتھ چھوٹے یا چٹان پر جمے ہوئے پیر پھسلے تو دھڑام سے ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں۔ چلو قصہ ختم۔ خس کم جہاں پاک! اور اگر حوصلے ذرا بلند ہوئے، حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکو تو چیونٹیوں کی طرح پیٹ کے بل سرکتے رہو۔ ایک انچ ——— دو انچ ——— تین انچ۔ کچھ اور ہمت کی تو کئی سو گز تک سرکتے ہوئے چلے گئے اور جب چوٹی سے نیچے واپس آئے تو ناک چپٹی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، گالوں پر جھرّیاں پڑی ہوئی، بال ایسے جیسے برسوں تیل نصیب نہ ہوا ہو۔ لو اب خاندان کے افراد بھی نہیں پہچانتے۔ بچے الگ چیخ مار کر ماں کی گود میں دبک گئے۔ بیوی جلتی ہوئی لکڑی لے کر مارنے دوڑی۔

"خبردار! خبیث کی شکل لے کر میرے بچوں کو خوفزدہ کرنے آیا ہے۔ کیا تیرے بال بچے نہیں ہیں؟ ——— اگر ہوں گے بھی تو وہ اب زندہ تھوڑے ہی ہوں گے کب کے مر کھپ چکے ہوں گے۔ تیری منحوس اور خوفناک شکل دیکھ کر ہی ہارٹ فیل کر گیا ہوگا اُن کا۔ توبہ توبہ اِس مرد کے ساتھ اس کی بیوی کیسے زندگی گزارتی ہوگی بھگوان بھی کیسی کیسی شکلیں بناتے ہیں۔ رات کی تنہائیوں اور اندھیروں میں کبھی دیکھوں تو ڈر جاؤں۔"

"اِس کے بیوی بچے بھی ہوں گے تب نا۔ بہو! چاول کے چند دانے دے کر اِسے چلتا کرو۔ بچے خوف سے سوکھے جارہے ہیں۔ خون پانی ہو رہا ہے اِن کا۔ جلدی دفعان کرو اِس کلموہے کو!"

لو اب اپنے ہی دروازے پر تمھیں جھڑکیاں سُننے کو بھی مل رہی ہیں اور تم فقیر، خبیث، بدصورت، منحوس، کلموہے، بھوت کیا کیا نہیں بنا دیئے گئے۔ بھئی ایسی زندگی سے تو بہتر ہے کہ انسان سنکھیا کھا کر خاموشی سے چادر تان کر سو رہے۔ بہت ہوگا بال بچے،

عزیز و اقارب، اپنے پرائے، دوست دشمن رو پیٹ کر چپ ہو رہیں گے۔ بیوی کلیجے پر پتھر رکھ کر صبر کرلے گی۔ ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالے گی، مانگ سے سیندور پونچھ دے گی، ماتھے پر بھی بندیا لونچ ڈالے گی۔ لیکن اپنے ہی شوہر کو خبیث، منحوس، بھوت اور کلموہا تو کہے گی اور اگر یہ بھی اُسے پتہ چل جائے کہ اُس نے اپنے شوہر کو، اپنے سہاگ کو، اپنی مانگ کے سیندور کو بدروح اور خبیث کہا ہے تو وہ اپنے بال نوچ ڈالے۔

ہے بھگوان! یہ میں نے کیا کر دیا! میرے پاپوں کو چھما کیجئے بھگوان! میں نے انجانے میں اپنی عاقبت بگاڑ لی۔

ہاں جی! ہندوستانی عورتوں کو اپنے شوہر کی نہیں اپنی عاقبت سنوارنے کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔ وہ اگر اپنے شوہر کی خدمت کرتی ہیں، اُن کے پاؤں دباتی ہیں، سر میں تیل دیتی ہیں، اُن کے بچوں کو اپنی چھاتی کا سارا لہو نچوڑ کر پلا دیتی ہیں تو اس لئے نہیں کہ وہ بڑی شوہر پرست ہیں۔ توبہ کیجئے صاحب! کون ہندوستانی عورت پتی ورتا ہے۔ وہ تو خود کو پتی ورتا ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے، ڈھونگ رچاتی ہے پتی ورتا کا۔ مذہب اور سماج نے تو اُس کے کان بھر دئے ہیں کہ پتی کی سیوا کرو تمھیں سورگ ملے گا اور وہ بس اُسی سورگ کو حاصل کرنے کے لئے صبح و شام، دن رات، ساری زندگی اپنے پتی دیو کی سیوا کر رہی ہے کہ کہیں ہاتھ سے سورگ نہ نکل جائے! اور پتی بیچارہ ہے کہ اپنی ساری زندگی بیوی اور بچوں کے لئے روٹیاں مہیا کرنے میں برباد کر دیتا ہے۔ اُسے اپنے چہرے پر پھیلتی ہوئی جھریوں کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ سالہا سال کولہو کے بیل کی طرح اپنے کام میں لگا رہتا ہے جیسے وہ انسان نہ ہو مشین کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہو جو دن رات [illegible] کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے اور جب گھس گیا تو نکال کر دور کونے میں پھینک دیا گیا اور اُس کی جگہ دوسرے پرزے نے لے لی۔ چلئے پھر وہی چکر پھر وہی رگڑ۔ ہتھوڑے کی آہنی ضرب اور قبرستان کا ایک کونہ ——— اور جب دن بھر کا تھکا ماندہ گھر پہنچا تو سارے دن کی کمائی پتنی کے ہاتھ میں دے کر کھاٹ پر لیٹ گیا۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ تم نے آج دن بھر کچھ کھایا بھی ہے یا فاقہ ہی گزرا؟

"چائے لاؤں صاحب؟"

"آں!" ونود نے نظریں اوپر اُٹھائیں تو سامنے سفید وردی میں ملبوس بیرا کھڑا نظر آیا۔ اُس کی کمر پر کسی ہوئی سُرخ رنگ کی پٹی اور سر پر سفید ٹوپی اُسے بہت بھلی معلوم ہوئی۔

"تمھارا نام کیا ہے؟" ونود نے آرڈر دینے کی بجائے ایک بے معنی سا سوال کر دیا۔

"میرا نام... میرا نام رمیش ہے۔ ماں باپ رامو کہتے تھے لیکن یہاں آکر تو صرف بوائے، بیرا اور ویٹر ہو کر رہ گیا ہوں۔ کوئی مجھے رامو کہہ کر پکارتا ہی نہیں۔ بہت دن ہو گئے اِس نام کو سُنے ہوئے اور اب تو جیسے میں خود ہی اپنا نام بھول گیا ہوں۔ کبھی رات کو اپنے کمرے میں پڑا پڑا خود ہی رامو! رامو! پکار لیتا ہوں کہ تسکین ہو جاتی ہے۔"

بیرا باتونی تھا ——— بیرے ویسے بھی بہت زیادہ باتونی ہوتے ہیں۔ اور پھر رامو تو کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ گاؤں کے پاٹھ شالہ کی چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ [illegible] یاد نہ کرنے پر گرو جی نے ڈنڈے سے خبر لی اور وہ بھاگ کر شہر چلا آیا۔ [illegible]

"تو تمھارا نام رامو ہے؟"

"جی ہاں صاحب۔"

"یہ وردی تمھیں ہر ماہ ملتی ہے؟"

"نہیں صاحب! سال میں دو مرتبہ۔"

"تب تو تمھیں کپڑے بنوانے کی ضرورت بھی نہ پڑتی ہوگی؟"

"بنواتا ہوں صاحب۔"

"کیوں؟"

"ایک سیٹ ہر سال گاؤں بھیج دیتا ہوں یا بھائی آکر لے جاتا ہے۔"

"بوائے!" سامنے بیٹھے ہوئے ہندوستانی جوڑے نے انگریزی لہجے میں آواز دی۔

"صاحب! میں آپ کے لئے چائے لاتا ہوں۔" وہ آگے بڑھ گیا۔

"اور ہاں گُسنو! پیسٹری بھی لیتے آنا۔"

بعض ہندوستانی نوجوان کوٹ پینٹ پہن کر خود کو مغربی تہذیب کا صحیح نمائندہ سمجھنے لگتے ہیں اور اگر ان کے پہلو میں خرمنِ ہوش و خرد پر بجلیاں گرانے والی کوئی پلاسٹک محبوبہ ہوئی تو وہ خود کو ڈیوک آف اڈنبرا سے کم نہیں سمجھتے جیسے اُڑتی ہوئی ایک خوش رنگ تیتلی کو اپنی اُنگلیوں میں پکڑ لینے کے بعد اُنھیں دیتا لیا ہو یا مل گئی ہو! نوجوان فخریہ انداز میں اپنے اِرد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا جیسے زبانِ حال سے کہہ رہا ہو۔

"دیکھو میں اِس دُنیائے رنگ و بو کا سب سے خوش رنگ گلاب ہوں اور خوش قسمت ترین! میری شخصیت کو میری گرل فرینڈ نے خوشبوؤں کے بے شمار جھونکے دے کے ہیں اور میں سرشار ہو رہا ہوں!" اور سامنے بیٹھی ہوئی ناز و ادا کی پُتلی کچھ اِس طرح بیر بہوٹی کی طرح سمٹی جا رہی تھی جیسے اِتنی تیز روشنی میں وہ پہلی بار کسی [illegible] آگئی ہو۔ لیکن نہیں ——— ارے تو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ تو تتلی ہے [illegible] جو پتہ نہیں برسوں سے کتنے نوجوانوں کو کتنی بار جھانسے دے چکی ہے۔ [illegible] نوجوان ہی ہم متواتر فریب کھاتے جاتے ہیں۔ حسین فریب۔ خوبصورت دھوکا!

"ونود! مجھے نیلما نہ کہا کرو!"

"ٹھیک ہے"

"مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"نیلو۔"

"نیلو؟"

"ہاں نیلو!"

"تم بھی ٹھیک ہی کہتی ہو نیلما میں رومانیت بھی نہیں اور تم تو رومان کی بھوکی ہو۔ تمھیں نام کی معنویت سے کیا مطلب؟"

"تم شاید میری شخصیت پر کیچڑ اُچھالنا چاہتے ہو۔"

"توبہ کرو۔ میں بھلا اِس کی جرأت کر سکتا ہوں؟"

"تو پھر تم نے میرے نام کا مذاق کیوں اُڑایا؟"

"میں تو زندگی کا مذاق اُڑا رہا ہوں نیلو! جی چاہتا ہے خوب زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ اتنے تیز قہقہے کہ سارا وجود منتشر ہو جائے۔ خود میری شخصیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر شیرازوں کی طرح بکھر جائے اور میں اُن بکھرے ہوئے شیرازوں کو یکجا کرنے میں اپنی ساری قوت صرف کر دوں۔ اتنا تھک جاؤں کہ مدہوش ہو کر تمھاری بانہوں میں گر پڑوں اور تم پیار سے میرے ہاتھوں کو چوم لو۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر ــــ پھر میں بھی پیار سے تمھارا ہاتھ چوم لوں گا۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر میں تمھاری سیاہ گھنیری زلفوں میں اپنی انگلیاں پھنسا دوں گا۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر میں تمھارے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دوں گا! اور . . ."

میں نے تو سمجھا تھا کہ اِس بات پر وہ شرما کر "دھت" کہہ دے گی اور میں شرم سے جھکی ہوئی گردن اُٹھا کر اُس کی بند پلکوں پر اپنے جلتے ہوئے گرم ہونٹ رکھ دوں گا ــــ لیکن وہ سب کچھ نہ ہوا۔ نیلو ایک قدم اور آگے بڑھ گئی۔

"پھر کیا ہوگا؟"

"کب؟ ــــ پھر؟ ــــ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔ تم اپنی راہ جاؤ گی اور میں اپنی راہ!"

"پھر کیا ہوگا؟"

"تمھارا سر! ہماری محبت نہیں نبھ سکتی نیلو! بائی بائی!"

"گڈ بائی لوفر عاشق!"

"صاحب چائے!" بیرا چائے کی ٹرے لئے سامنے کھڑا تھا۔

"رامو!"

"جی صاحب!"

"پیسٹری نہیں لائے؟"

"ابھی لاتا ہوں صاحب!"

نیلما نے شکر ملا کر چائے کی پیالی نوجوان کے آگے سرکا دی:

"دلیپ! تم مجھے نیلو کیوں کہتے ہو؟"

"مجھے چھوٹے نام زیادہ پسند ہیں۔"

"اور کوئی بات نہیں؟"

"تمھارے اِس چھوٹے سے نام میں آسمان جیسی نیلگوں وسعتیں پنہاں ہیں اور جب میں تمھیں نیلو پکارتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان سے اُتر کر کئی تاروں نے تمھاری مانگ میں افشاں بھر دی ہو!"

"دھت!" نیلو نے شرما کر گردن جھکا دی۔ اُس کی پلکیں حیا کے بارے جھک گئی تھیں۔ شاید اب دلیپ ہولے سے اُس کی ٹھوڑی اُٹھا کر اُس کی بند پلکوں کو اپنی گرم سانسوں کا لمس دے گا۔ لیکن توبہ! کچھ بھی تو نہ ہوا۔ دلیپ شاید افلاطونی محبت کے اسرار و رموز سے ناواقف تھا۔

"نیلو! تمھاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"پی لوں گی" اور نیلو نے دلیپ کو ایسی نظروں سے گھورا جیسے اُسے اُس کی یہ ادائے بے اعتنائی بہت بُری معلوم ہوئی ہو۔

لتا کی پلکیں بھی سہاگ رات میں کچھ ایسی ہی جھکی جھکی اور بھیگی بھیگی سی تھیں۔ لیکن نہیں اُن پلکوں پر حیا کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ جیسے سبزہ پر شبنم سی جم گئی ہو۔ کمرے کی فضا میں مہندی، اُبٹن اور جوانی کی ملی جُلی خوشبو سے رومان سا بکھر گیا تھا اور بے اختیار ونود نے لتا کی پلکوں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے۔ لتا کا سر شرم سے اور بھی جھک گیا اور جھکتے جھکتے اُس کے شانوں سے آ لگا۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"ــــــ"

"آپ نے شاید نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے؟"

"ــــــ"

"ٹھیک ہی ہے صاحب جب کوئی بات ہی نہیں کرنی ہے تو لیجئے میں سو جاتا ہوں۔"

"اُوئی ماں!" ونود لتا کو گُدگُدانے لگا تھا۔

"اب پوچھوں؟"

"کیا؟"

"ایک بات۔"

"پوچھئے۔"

"میں آپ کو اچھا لگتا ہوں؟"

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر اگنی کے گرد سات پھیرے کیوں لگائے تھے؟"

"مجبوراً۔"

"کیسی مجبوری؟"

"دل نے مجبور کیا۔"

"دل نے کیوں مجبور کیا؟"

"اس لئے کہ آپ پسند آگئے تھے۔"

"سچ؟"

"ہاں سچ۔"

"صاحب پیسٹری لے آیا ہوں۔"

"رامو تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

"ابھی نہیں صاحب۔"

"کرو گے؟"

"نہیں صاحب۔"

"کیوں؟"

"خود تو دوسروں کے ٹکڑوں پر پل رہا ہوں اُسے کس کے سہارے لے آؤں۔"

"گاؤں میں کچھ زمینیں نہیں ہیں؟"

"اگر زمین ہوتی تو یہاں کیوں پڑا رہتا۔ کھیتوں میں ہل چلاتا، ماہیئے گاتا، گنوں کا رس پیتا، ماں باپ بال بچوں کی سیوا کرتا۔"

"تمہارے دل میں ماں باپ بھائی بہن کا پیار ہے؟"

"اُسی پیار کو زندہ رکھنے کے لئے تو صبح سے شام تک ایک پیر پر کھڑا رہتا ہوں۔"

"تمہیں یہ کام بالکل پسند نہیں؟"

"نہیں صاحب!"

"تو کوئی دوسرا کام تلاش کر لو۔"

"کسی دوسرے کام میں اس سے زیادہ پریشانیاں ہوں گی۔"

"وہ کیسے؟"

"یہاں کھانے کا سہارا تو ہے۔ دوسری جگہ تو خود کیا کھاؤں گا اور گھر کیا بھیجوں گا۔ ماں باپ بھائی بہن کو کیا کھلاؤں گا۔" پھر اچانک ہی اُس نے عجیب سا سوال کر دیا "آپ ڈانس نہیں کرتے؟"

"زندگی کے اسٹیج پر ناچتا ہوں!"

اور جب نیلو دلیپ کے ساتھ پہلی چوٹی دھن کے قریب سے گزری تو اُس نے کہا۔

"میں زندگی کے اسٹیج پر ناچنے والوں کو ننگی کا ناچ نچا سکتی ہوں۔"

نیلو ٹھیک کہتی ہے۔ زندگی کے اسٹیج پر ناچنے والوں کو جدید تہذیب اور آج کے معاشرہ نے ننگی کا ناچ ناچنے پر مجبور کر دیا ہے اور چکر لگاتے لگاتے انسان اتنا بے سدھ ہو جاتا ہے کہ وہ نئے معاشرہ اور نئے سماجی نظام کے قدموں میں پڑا ہچکیاں لینے لگتا ہے۔ آخری ہچکیاں ـــــ لیکن معاشرہ کو اُس پر بھی رحم نہیں آتا اور وہ ایک انسان کو مرتا دیکھ کر ٹھوکر لگاتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کسی دوسرے شکار کی تلاش میں۔ اور یہ دائرہ اُس وقت تکمیل کو پہنچتا ہے جب بغاوت کی آندھی خود اُس معاشرہ ہی کو داخلِ شکم کر لیتی ہے۔

"تم بھی کسی دن آنے والے حالات کے قدموں میں پڑی ہچکیاں لیتی نظر آؤ گی نیلو! اور کوئی تمہیں دو قطرے پانی دینے میں بھی جھجک محسوس کرے گا۔ انقلاب تو بہت بڑی چیز ہے۔ پوتر جل کو اپوتر کون کرے۔ سماج کے ناسور کو ہر شخص ختم کر دینا چاہتا ہے۔ میری بھی خواہش ہے کہ سماج کے جسم سے کوڑھ کا بدنما دھبہ کھرچ کر مٹا دیا جائے۔ لیکن صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"رات کافی گزر چکی ہے اب چلنا چاہئے!" قریب بیٹھے ہوئے نئے شادی شدہ جوڑے نے باہم سرگوشی کی۔

"اُف بارہ بج گئے! صبح کا گھر سے نکلا ہوا ہوں۔ رامو بل لاؤ!"

"آپ کل بھی آئیں گے صاحب؟" رامو بل لئے سامنے کھڑا تھا۔

"نہیں رامو کل نہیں اب پھر ایک مہینے کے بعد۔"

"کیوں صاحب؟"

"تنخواہ پہلی تاریخ روز تھوڑے ہی آتی ہے۔"

اور جب دلیپ ریسٹورنٹ سے باہر نکلا رات کافی بھیگ چکی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ تا میرے انتظار میں اب تک جاگتی ہوگی۔ وہ دروازہ کھول کر کتنی بار باہر اندھیرے میں جھانک بھی چکی ہوگی۔ پپو، گڈو، ڈولی، گڑیا سب سو گئے ہوں گے میں بھی کتنا ظالم ہوں! میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ٹافیاں لیتا آؤں گا اور وہ سب ٹافی کا انتظار کرکے

سوچکے ہوں گے۔ لیکن ڈولی ہرگز نہ سوئی ہوگی۔ اُسے تو اپنی گڑیا کی فکر ہوگی۔ کانچ کی وہ بڑی سی گڑیا جو اُس نے اپنے ماما جی کے گھر جاتے ہوئے شوکیس میں دیکھی تھی۔

"ممی! میں وہ گڑیا لوں گی۔"

"پاپا سے کہو" لتا نے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔

"ہاں بیٹی! تنخواہ ملتے ہی لا دوں گا۔"

اور آج گھر سے نکلتے ہی اُس نے کہا تھا۔

"پاپا! آج آپ کو تنخواہ ملے گی نا؟"

"ہاں بیٹی!"

"میری وہ کانچ والی گڑیا ضرور لیتے آئیے گا!" پتہ نہیں بچّوں کا حافظہ اتنا تیز کیوں ہوتا ہے اور وہ اپنے مطلب کی بات کبھی نہیں بھولتے۔

اگر ڈولی جاگی ہوگی تو کیا ہوگا؟ شاید وہ روٹھ کر مجھ سے بولنا بھی بند کر دے۔ ہُنہہ! بچّی ہی ہے۔ بہلا لوں گا اور صرف دو ٹافیوں میں بہل جائے گی۔

"آپ نے آج بہت دیر کر دی۔"

"ڈولی سو گئی ہے کیا؟"

"ہاں! لیکن کیا بات ہے؟ کیوں پوچھ رہے ہیں اُسے؟"

"چلو اچھا ہی ہوا۔ میں اُس کی کانچ کی گڑیا نہیں لا سکا۔ یہ لو دو سو بیس روپے ہیں۔ بچّوں سے بچنے کے لئے اب تک ہوٹل میں بیٹھا رہا۔ صرف دو روپے خرچ ہوئے ہیں لیکن پچیس روپے بچ گئے۔"

"کیسے؟" لتا حیران تھی۔

"کانچ کی گڑیا ستائیس روپے کچھ پیسوں کو آتی ہے۔"

"بچّے تو ضدی ہوتے ہی ہیں اُن کی خواہشوں کا انسان کتنا خیال کرے۔" لتا نے روپے بکس میں رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا کہ دیر ہونے سے مجھ پر کیا بیتتی ہوگی۔ کیسی کیسی باتیں میں نے سوچ لی تھیں۔"

"تم نے سوچا ہوگا کہ میں ٹرک کے نیچے آگیا۔"

"بھگوان نہ کرے۔ کیوں ایسی بُری باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں جیب نہ کٹ گئی ہو!"

"تو؟"

"تو کیا۔ سارا مہینہ کیسے گزرتا؟ فاقے کرنے پڑتے۔ آپ کپڑے اُتاریئے میں کھانا لگاتی ہوں۔"

چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ لتا کو میری یا اپنے سہاگ کی فکر نہ تھی۔ اُسے یہ فکر تھی کہ سارا مہینہ کھائیں گے کیا؟ پتی کے بچّوں کی سیوا کیسے کر دوں گی؟ اور بھلا خالی پیٹ کبھی پتی کی بھی سیوا ہوتی ہے۔ ہے بھگوان یہاں بھی وہی سورگ پراپت کرنے کا چکر!!

# غزلیں

## نذیر اختر

کیا ہوا کیوں خفا ہوا کوئی
رات بھر سوچتا رہا کوئی

عمر بھر فیصلہ نہ کر پائے
باوفا ہے کہ بے وفا کوئی

ہو گئے ہنستے ہنستے ہم گُم صُم
پاس سے جب گُزر گیا کوئی

اِک زمانہ بچھڑ گیا اُس سے
ہو گیا جب سے آپ کا کوئی

ایک تکمیلِ خواب کی خاطر
عمر بھر جاگتا رہا کوئی

[illegible] گزر گیا اختر
[illegible]

## قمر انصاری بدایونی

وہ گیسو جب کبھی لہرا گئے ہیں
اندھیرے روشنی پر چھا گئے ہیں

جو خود طوفان سے ٹکرا گئے ہیں
وہ ساحل پر سفینے آ گئے ہیں

ترے کوچے سے جب گُزرا ہوں ظالم
"تری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں"

اُنھیں جینے کا کوئی حق نہیں ہے
غمِ دوراں سے جو گھبرا گئے ہیں

پریشاں ہو گئی ہیں جب وہ زُلفیں
گھٹاؤں کو پسینے آ گئے ہیں

وہ کہتے ہیں قمر [illegible] مگر
[illegible] گئے ہیں

## محمود زمخشری کامل علیگ

دل ہوا کیسے دھواں یاد نہیں
کب گری برقِ تپاں یاد نہیں

ہوش کھوئے تھے کہاں یاد نہیں
کون تھا آفتِ جاں یاد نہیں

مصلحت کے جو ہیں آدابِ اصول
وہ ہیں اہلِ جہاں یاد نہیں

تھا جو اک حاصلِ کونین وہ دل
ہم نے کھویا ہے کہاں یاد نہیں

ایک بے چینی کا احساس تو ہے
لذتِ دردِ نہاں یاد نہیں

خوگرِ غم تو ہوں محمود مگر
غم ہے کیوں بارِ گراں یاد نہیں

# دلِ ریزہ ریزہ

تارؔ قادری۔ بی۔ اے (آنرز)

یونائٹیڈ ہاتھ اینڈ اسکین کمپنی۔ برہم پورہ (مظفر پور)

بھائی جان! تسلیمات

"یادوں کے دریچے" کے بعد "دلِ ریزہ ریزہ" ارسالِ خدمت ہے۔ توقع ہے آپ اسے بھی "بیسویں صدی" کے کسی گوشے میں جگہ دیں گے اور قارئین شرفِ قبولیت عطا کریں گے۔ بہرحال مجھے آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا ــــــ "یادوں کے دریچے" کی اشاعت پر اب تک خطوط آ رہے ہیں جو "بیسویں صدی" کی غیر معمولی مقبولیت کا ثبوت ہے . . .

نیازمند ــــــ تارؔ قادری

---

اور تصویر اُس کے ہاتھوں سے گر گئی!

خوبصورت فریم ٹوٹ گیا۔ شکستہ شیشے کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے شیشے کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اُس کے دل کی گہرائیوں میں سوئیوں کی طرح چبھ رہے ہوں!!

"میں بیٹھ سکتا ہوں؟"

اسلم مسکراتے ہوئے بولا۔

"شوق سے تشریف رکھئے۔"

اُس نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اور ہم سب خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

بیرے کو بُلا کر اُس نے چار کپ چائے کا آرڈر دیا۔

"یہ ہیں ہمارے کلاس فیلو مسٹر شاہد۔ انگریزی میں آنرز لے رکھا ہے۔ آپ کو اُردو ادب سے بھی ذوق ہے اور اچھے اشعار کہتے ہیں ــــــ" اسلم نے اپنے مخصوص انداز میں اُس شخص کا تعارف کرایا ــــــ "اور یہ ہیں ہر یامن اکنامکس آنرز اور آپ ہیں یونس۔ آپ نے بھی اکنامکس آنرز لے رکھا ہے۔"

اتنے میں بیرا چائے کی پیالیاں رکھ گیا اور ہم سب پینے لگے۔

"کچھ سنائیے شاہد صاحب!"

میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ اسلم اور یونس نے میری تائید کی۔

شاہد کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

چائے ختم کرنے کے بعد ہمارے اصرار پر اُس نے نہایت مترنم لہجے میں اپنی پُرسوز غزل سنائی۔ غزل سناتے وقت اُس کے چہرے سے غم و اندوہ، یاس و ناامیدی کا ترشح ہو رہا تھا۔

اُس کے اس بے پناہ غم اور لامحدود یاس کا راز جاننے کے لئے میرے دل میں تجسس جاگ اٹھا لیکن میں نے پہلی ملاقات میں کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

"الکا" ہوٹل کی عالیشان بلڈنگ سے نکل کر ہم فٹ پاتھ پر آ گئے۔ کچھ دُور چلنے کے بعد ہماری دو راہیں تھیں۔ شاہد کو کمپنی باغ جانا تھا اور ہمیں ہاسپٹل۔ اِس لئے ہم نے وہاں سے اپنی اپنی راہ پکڑ لی۔

آخر ایک دن شاہد کو بھی ہاسپٹل میں جگہ مل گئی، وہ ہمارا روم میٹ بھی ہو گیا۔

اب ہماری زندگی مسرتوں اور رنگینیوں کے درمیان گزرنے لگی۔ رفتہ رفتہ شاہد سے میری گہری دوستی ہو گئی اور بہت جلد ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

اکثر شاہد کو میں بہت مغموم پاتا۔ ایک دن میں نے اُس کی زندگی کی اِس الم کی کے بارے میں پوچھ ہی لیا جس نے اُس کے روز و شب کو حسرتوں میں بدل دیا تھا۔ اُس نے اپنی کہانی سنائی۔ کہانی سناتے ہوئے اُس کی پلکیں کئی بار نم ہو گئیں۔

"اُس لڑکی کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نام تو کچھ اور ہے لیکن سب اُسے چاند کہتے ہیں۔ وہ چاند کہے جانے کی مستحق

بھی تھی" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

وہ چاند کا عشق تھا جس نے اُسے ذہنی کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ چاند کی یاد تھی جو اس کے ذہن و احساس پر چھائی رہتی تھی۔

چاند سے اس کی ملاقات شیریں کے ذریعے ہوئی تھی۔ وہ شیریں کی کلاس فیلو تھی اور سہیلی بھی اور شیریں شاہد کی ماموں زاد بہن تھی۔ شاہد نے اپنے ماموں کے ہاں رہ کر آئی۔ اے کیا تھا۔

چاند بہت حسین اور خوبصورت تھی۔ اس نے پہلی بار چاند کو دیکھا تو اس کے حسین خدوخال دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ حُسن و جمال کے سحر میں کھو سا گیا اور اُسے مبہوت دیکھ کر شیریں نے طنز کیا تھا:

"کہاں کھو گئے شاہد بھائی؟"

اس دن ایک گھنٹہ تک ادبی گفتگو ہوتی رہی۔ چاند بھی گفتگو میں حصہ لے رہی تھی۔ دورانِ گفتگو اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک لبوں پر معصوم تبسم آتا تو شگوفے کھل جاتے۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ اس کی سنجیدگی اور بلند خیالات نے شاہد کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

اس رات وہ سو نہ سکا اور نہایت کرب و اضطراب کے عالم میں رات کے پچھلے پہر تک اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ آج تک وہ کسی کے حُسن و شباب سے متاثر نہ ہوا تھا لیکن اس دن چاند کے ملکوتی حُسن نے اُسے بے حد متاثر کیا۔ وہ اجنتا کے کسی سنگ تراش کا شاہکار معلوم ہو رہی تھی۔

ہر وقت وہ اس کی یاد میں تڑپنے لگا۔ اس کے حساس دل میں ایک انوکھی خلش اور نرالی چبھن کا احساس ہونے لگا۔ اب اس کی شاعری میں ایک وجدانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ سوز و گداز آگیا اور اس نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے نظم کو اپنایا۔

چاند بھی شاہد کی شخصیت سے کافی متاثر ہوئی۔ وہ اکثر شیریں کے گھر آیا کرتی اور کبھی کبھی جب شاہد نہ ہوتا اس کے کمرے میں چلی جاتی۔ شاہد کی کتابیں ... ایک ایک شے کا جائزہ لیتی اور انجانے جذبے کے تحت میز اور بستر کو ... اس کی کتابیں ... اور ... کو قرینے سے ٹھیک سلجھا دیتی۔ ... شاہد کے کمرے میں ... حسرت اور پیار بھری نظروں سے ہر شے کو دیکھتی واپس چلی جاتی۔

شاہد کی جذبات انگیز نظموں نے چاند کو زندگی کے سوز و ساز سے آشنا کیا۔ اس کی روح ایک انجانی تڑپ سے آشنا ہوئی۔ پہلی بار اس کے دل میں محبت کا جذبہ ابھرا۔ رفتہ رفتہ شاہد اس کے احساسات و تصورات کی دنیا پر چھا گیا۔ بے پناہ محبت نے اس کی آنکھوں کی نیند چھین لی۔ اس کی پُرسکون اور مطمئن زندگی میں تلاطم آگیا۔ ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ محبت کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں کسی کو پکارنے لگیں۔

لیکن وہ اظہارِ محبت سے قاصر تھی۔ وہ زبان نہ کھول سکتی تھی، اس لئے کہ وہ مشرقی خاتون تھی جس کے سینے میں دل تو ہوتا ہے لیکن منہ میں زبان نہیں ہوتی۔ ... میں کسی دیوتا کی پوجا کر سکتی ہے لیکن دستِ دعا نہیں اٹھا سکتی، جو اپنے جذبات اور تمناؤں کا گلا گھونٹ سکتی ہے لیکن خود ان کی تکمیل کی جانب قدم نہیں بڑھا سکتی۔ نسوانی فطرت کو یہ کب گوارا ہے کہ وہ خود کسی سے محبت کی بھیک مانگے ــــــ!! اس لئے وہ اپنی اس خاموش محبت کی دھیمی دھیمی آنچ میں گیلی لکڑی کی طرح سُلگتی رہی ؎

شعلۂ عشق دل میں فروزاں رہا
زندگی شمع کی طرح جلتی رہی

---

چھٹی کا دن تھا۔ چاند شیریں سے ملنے آئی لیکن وہ گھر پر نہ تھی۔ شاہد بھی کہیں گیا ہوا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں چلی گئی اور پلنگ پر لیٹ کر ... کا تازہ شمارہ پڑھنے لگی جس میں شاہد کی ایک نظم تھی۔ ... شاہد کمرے میں داخل ہوا اور وہ سراسیمگی کے عالم میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں کی نگاہیں مل گئیں۔ دونوں کو ایسا محسوس ہوا ؎

نظر اُن سے ٹکرائی دل نے یہ سمجھا
مری زندگی میں بہار آ رہی ہے

چاند کمرے سے باہر جانے لگی۔

"ارے واہ! یہ کیا؟ بیٹھ جاؤ نا چاند۔"

شاہد نے کرسی کی طرف انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ بیٹھ گئی۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں لیکن پھر شاہد کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔
"تم کتنی حسین ہو؟"

چاند کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوگئی ـــــ ہر عورت اپنے حسن کی تعریف سُن کر مسرت محسوس کرتی ہے۔

پھر یہ شعر بے ساختہ شاہد کی زبان پر آگیا ؎

تیری مست آنکھوں کے قربان جاؤں
شرابِ محبت بھری چل رہی ہے

چاند لاجونتی کی طرح شرما گئی۔ بار حیا سے اس کی گھنی لانبی پلکیں جھک گئیں اور رخساروں پر شفق کی سی سُرخی پھیل گئی۔

شاہد جذبات کی رَو میں بہت کچھ کہہ گیا اور وہ شرم سے پسینے میں نہا سی گئی۔

شاہد کے الفاظ اس کے کانوں میں کیف و سرور کی لہریں بن کر مدھر رس گھولنے لگے اور اس کے ذہن میں نشاط و انبساط کی کہکشاں جگمگا اُٹھی۔ آج پہلی بار محبت کے نرم و نازک اور جذبات انگیز الفاظ سے اس کے کان آشنا ہوئے۔ پہلی بار وہ محبت کی وجدانی کیفیت سے آگاہ ہوئی۔ اُسے ساری کائنات فرطِ مسرت سے ناچتی ہوئی محسوس ہوئی اور اُس کا دل وفورِ محبت سے دھڑکنے لگا ؎

عالمِ قربتِ یار کیا پُوچھئے
دل دھڑکتا رہا، جاں مچلتی رہی

چاند کی رگ و پے میں پیار کا آتشیں لاوا پھُوٹنے لگا۔ دل میں محبت کا سمندر موجزن اور چہرے پر پیار مترشح تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی، جذبۂ محبت اُسے اکسا رہا تھا کہ وہ محبت کا جواب محبت سے دے لیکن اُس کی زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی، نسوانیت نے اُسے زبان کھولنے سے قاصر رکھا لیکن آنکھیں دلی کیفیات کی غمازی کر رہی تھیں۔

---

رفتہ رفتہ اُن کی ملاقاتیں بڑھتی رہیں۔ دُوریاں قربت میں بدلتی گئیں۔ اُن کے درمیان سے تکلفات کی دیواریں خود بخود گرتی گئیں اور دونوں کے دلوں میں محبت پروان چڑھتی رہی۔

لیکن ایک دن روایات و رسومات نے اُن کی محبت کا گلا گھونٹ دیا، اُن کی تمناؤں کا خون کر دیا۔ آشاؤں کی چِتا سُلگ گئی اور چاند ایک سرمایہ دار کے ہاتھوں بیچ دی گئی۔ وہ زبان نہ کھول سکی۔ اپنی زندگی اپنے والدین کی مسرتوں اور خوشیوں کے لئے قربان کر دی۔

شاہد کی دُنیا ویران ہو کر رہ گئی۔ اُس کے خوابوں کے شیش محل چکنا چُور ہو گئے۔ اُس کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا اور اُسی وقت سے وہ مجسم کرب و اضطراب بن کر رہ گیا۔

ایک دن بازار سے لوٹتے ہوئے میں اپنی شادی کی یادگار تصویروں میں فریم لگوا کر واپس آیا تو شاہد کمرے میں میرا منتظر تھا۔ جب وہ میرے ہاتھوں سے فریم کی ہوئی تصویریں لے کر دیکھنے لگا تو اُس کی نظر ایک فریم پر جا کر رُک گئی جس کے نیچے خوشخط تحریر میں "فرحت ریاض" لکھا تھا۔ تصویر دیکھتے ہی وہ تلملا گیا۔ میں نے محسوس کیا اُس کی آنکھیں نمناک ہو رہی ہیں۔ اُس کے لب پھڑپھڑائے۔

"چاند !"

اور تصویر اُس کے ہاتھوں سے گر گئی۔

خوبصورت فریم ٹوٹ گیا۔ شیشے کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے شیشے کے یہ ٹکڑے اس کے دل کی گہرائیوں میں سُوئیوں کی طرح چُبھ رہے ہوں !!


چادریں ... جنہیں دیکھتے ہی آرام کرنے کو جی چاہے!
بامبے ڈائینگ کی خوشنما اور ملائم بیوکیبل چادریں بہترین سوت کی بنائی جاتی ہیں اور اپنی
مخصوص بناوٹ کی بدولت نہایت آرام دہ اور پائدار ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بڑے
دلکش ہوتے ہیں۔ یہ چادریں سادہ رنگوں میں، چوڑی دھاریوں والی اور دوسرے مختلف
ڈزائنوں کی آتی ہیں۔ (ان سے میل کھانے والے تولیے بھی ملتے ہیں!)
دُنیا بھر میں مشہور بیوکیبل چادریں استعمال کرکے چین کی نیند سوئیے ــــ اور
ساتھ ہی اپنے بڈ روم کے پُرسکون ماحول کو زیادہ دلکش بنائیے! آج ہی خریدئیے!
بامبے ڈائینگ
BD 6236

# خط لکھیں گے...

——— فکر تونسوی کے طنزیہ خطوط کا سلسلہ ۹ ——— ———

## ...ے کے نام ——— •

کمینے!

معاف کرنا، القاب قدرے غیر مہذبانہ ہوگیا لیکن تمھارے لئے دوسرے القاب
...وں نہیں لگے۔ میری مجبوری اور اپنی ذات کو دیکھ کر یہ القاب قبول کر لو۔
میرے اِس نامہ محبت کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے گھر میں ایک چوہے دان ہے۔ تم نے
...ر دیکھا ہوگا کم بخت! اور تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسے ہم چوہے پھانسنے کے لئے لائے
...ی کو جہیز میں دینے کے لئے نہیں لائے۔ لیکن ہمیں شکوہ ہے کہ تم اُس میں پھنسنے کا
...ہی لیتے۔ تم سے پہلے جتنے چوہے ہمارے گھر میں تشریف لائے سبھی ایک ایک کرکے
...ے اور کھا کر اس کو پھانسی دے گئے۔ لیکن جب سے تم آئے ہو چوہے دان کا مصرف
...گیا ہے۔ ...کہ چوہوں کی یہ قومی روایت رہی ہے کہ شیشے کا ایک گلاس یا چائے کا
...ادر ...ورا ... چوہے دان میں پھنس گئے۔ لیکن تم گلاس اور کپ بھی توڑتے ہو،
...کر جاتے ہو اور پھر بھی تم اتنے بے حیا ہو کر چوہے دان کو منہ تک نہیں لگاتے۔
...ی کی ایک بیش قیمت روایت توڑ رہے ہو۔ جُرم کرکے سزا سے بچنا انسانوں کا کام ہے،
...نہیں۔ یہ تمھارا اخلاقی فرض تھا کہ احساسِ گناہ سے اندھے ہو کر کسی دن چوہے دان
...جاتے لیکن تم نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ تم شاید سمجھتے ہو کہ ہم شریف ہیں۔ اِس لئے تمھیں کچھ
...لیکن یہ تمھاری غلط فہمی ہے۔ ہم بھی شریف نہیں بلکہ انسان بن کر تمھیں دکھا دیں گے۔
...ی ...گیا ہم ... مرنے کی دھمکی! ——— اِس لئے شرافت اسی میں ہے کہ تم ...
...کار اور طور پر چوہے دان میں حاضر ہو جاؤ۔ تمھاری وجہ سے دوسرے چوہے بھی ...
...کہتے ہیں کہ ہم چوہوں کی دانائی کے قائل ہیں۔ اِس لئے پھنس جاؤ بیٹا ورنہ...... میاؤں!

## ...ی کے نام ——— •

...بہت ...کی ...!

یہ خط تمہیں ... گمبیر داس کے گھر کے پتہ پر بھیج رہا ہوں کیونکہ سنا ہے کہ

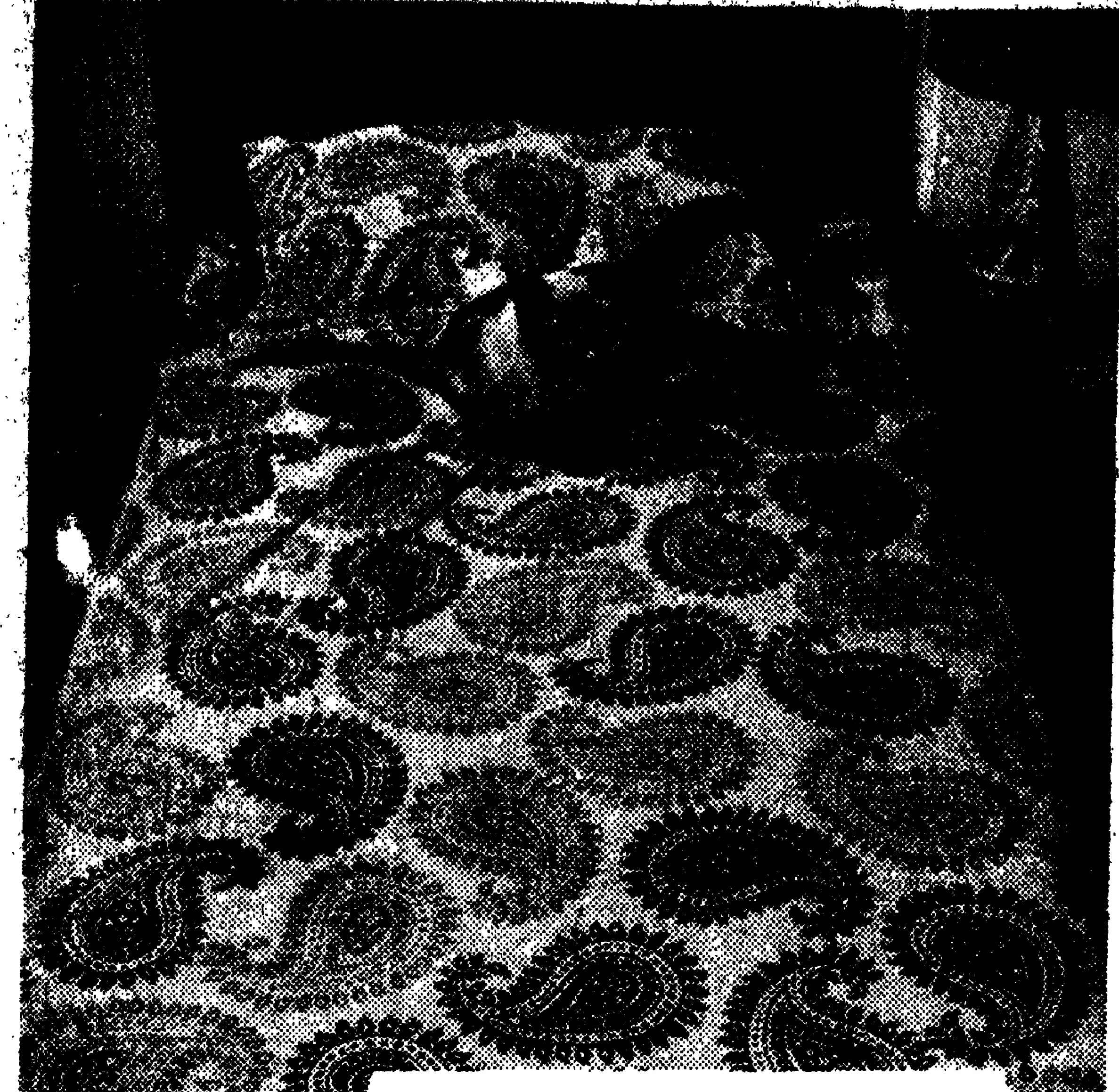
کرنے کے بعد جب تم لوٹی تھیں اور ایک کلو سونا سمگل کرکے ساتھ لائی تھیں تو گمبیر داس تمھیں بہلا پھسلا کر اپنے گھر لے گیا تھا۔

دیکھو بلّی! تمھیں یہ معلوم کرکے بہت مسرت ہوگی کہ ہمارے گھر میں ایک بہت موٹا تازہ چوہا دہ رہا ہے۔ اُس کی فربہی کا سبب ہماری بے بسی اور اُس کی ڈھٹائی ہے۔ اُس کے پیٹ میں نہ جانے کتنے انواع و اقسام کے کھانے پہنچ چکے ہیں۔ پھل، کیک، گوشت، مکھن، دودھ، ملائی، پلاؤ، بادام، گھی، ڈبل روٹیاں ——— کیا کیا گنوائیں موسی! جو چیز ہاتھ لگتی ہے، چٹ کر جاتا ہے۔ ہم تو اُس حرامخور کو یوں پال پوس رہے ہیں جیسے وہ ہمارا داماد ہو! اور کل ...تو نقول ... اہمیہ خرمہ کے وہ وہسکی کی بوتل کے اردگرد بھی گھوم رہا تھا یعنی وہ بادہ خواری پر بھی اُترنے کو ہے۔

محترمہ! ہم اُس چوہے سے نالاں ہیں۔ کیونکہ ایک تو وہ چوہے دان کی گرفت میں نہیں ... مد ڈپلومیٹ ہو گیا ہے اور دوسرے کھا کھا کر ... کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ انتہائی بدتمیز اور بدشعور بن گیا ہے۔ جیسا کہ ... آدمی ہو جاتا ہے اور کل تو اُس نے حماقت کی حد کر دی کہ دیوانِ غالب کو کتر کتر کر اُس کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ یعنی وہ اب ناشروں کی طرح شعر و ادب کا بھی دشمن بن گیا ہے۔ خدا سوچو غالب سے اُسے کیا دشمنی؟

اِس لئے موسی! میں غالب کے نام پر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمارے گھر لوٹ آؤ۔ ہمارے تمھارے تعلقات کافی پرانے ہیں۔ اُن تعلقات کے واسطے ہی آ جاؤ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے گھر والوں نے تمھیں کافی ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائی تھی کیونکہ تم ایک بلے کو بھی ہمارے گھر لے آئی تھیں اور اُس کے ساتھ رنگ رلیاں منایا کرتی تھیں۔ ہم نے اُسے بُرا سمجھا کیونکہ تم عشق میں اندھی ہو کر چوہے پکڑنا بھول گئی تھیں۔ ہم تمھیں پینے کے لئے جو دودھ دیتے تم چوری چھپے اُس بلے کو پلا دیتیں۔ ہم نے تمھیں کئی بار سمجھایا کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ ؎

تمھیں چاہوں تمھارے چاہنے والے کو بھی چاہوں
مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ سودا ہو نہیں سکتا!



# خط لکھیں گے...

## فکر تونسوی کے طنزیہ خطوط کا سلسلہ ۹

### چوہے کے نام ●

کمینے!

معاف کرنا، القاب قدرے غیر مہذبانہ ہو گیا لیکن تمہارے لئے دوسرے القاب کچھ موزوں نہیں لگے۔ میری مجبوری اور اپنی ذات کو دیکھ کر یہ القاب قبول کر لو۔

میرے اس نامۂ محبت کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے گھر میں ایک چوہے دان ہے تم نے تو کئی بار دیکھا ہوگا کم بخت! اور تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسے ہم چوہے پھانسنے کے لئے لائے ہیں۔ بلی کو جہیز میں دینے کے لئے نہیں لائے لیکن ہمیں شکوہ ہے کہ تم اس میں پھنسنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ تم سے پہلے جتنے چوہے ہمارے گھر میں تشریف لائے سبھی ایک ایک کر کے گرفتار ہوتے اور کیفر کردار کو پہنچا دئے گئے۔ لیکن جب سے تم آئے ہو چوہے دان کا مصرف ہی ختم ہو گیا ہے۔ حالانکہ چوہوں کی یہ قومی روایت رہی ہے کہ شیشے کا ایک گلاس یا چائے کا کپ توڑا اور بطور سزا چوہے دان میں پھنس گئے۔ لیکن تم گلاس اور کپ بھی توڑتے ہو، کپڑے بھی کتر جاتے ہو اور پھر بھی تم اتنے بے حیا ہو کہ چوہے دان کو منہ تک نہیں لگاتے۔ تم چوہا نسل کی ایک بیش قیمت روایت توڑ رہے ہو۔ جرم کر کے سزا سے بچنا انسانوں کا کام ہے، چوہوں کا نہیں۔ یہ تمہارا اخلاقی فرض تھا کہ احساس گناہ سے اندھے ہو کر کسی دن چوہے دان میں گھس جاتے لیکن تم نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ تم شاید سمجھتے ہو کہ ہم شریف ہیں۔ اس لئے تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ ہم بھی شریف نہیں بلکہ انسان بن کر تمہیں دکھا دیں گے۔ یا تم اس گھر میں رہو گے یا ہم! اسے صرف دھمکی نہ سمجھنا! ـــ اس لئے شرافت اسی میں ہے کہ تم یہ خط پڑھتے ہی رضاکارانہ طور پر چوہے دان میں حاضر ہو جاؤ۔ تمہاری وجہ سے دوسرے چوہے بھی جو اب تک گھر نہیں آتے تھے حالانکہ ہم چوہوں کی دراندازی کے قائل ہیں۔ اس لئے پھنس جاؤ ورنہ...... ملیں گے!

### بلی کے نام ●

پیاری شبنم سب کی موسی!

یہ خط تمہیں شری گھیسو داس کے گھر کے پتہ پر بھیج رہا ہوں کیونکہ سنا ہے کہ

...کے بعد جب تم لوٹی تھیں اور ایک بلو سونا سمگل کر کے ساتھ لائی تھیں تو گھیسو داس تمہیں بہلا پھسلا کر اپنے گھر لے گیا تھا۔

دیکھو بی بلی! تمہیں یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوگی کہ ہمارے گھر میں ایک بہت موٹا تازہ چوہا رہتا ہے اس کی فربہی کا سبب ہماری بے بسی اور اس کی ڈھٹائی ہے۔ اس کے پیٹ میں نہ جانے کتنے انواع و اقسام کے کھانے پہنچ چکے ہیں۔ پھل، کیک، گوشت، مکھن، دودھ، ملائی، پلاؤ، بادام، گھی، ڈبل روٹیاں ـــ کیا کیا گنواؤں موسی! جو چیز ہاتھ لگتی ہے، چٹ کر جاتا ہے۔ ہم تو اس حرام خور کو یوں پال پوس رہے ہیں جیسے وہ ہمارا داماد ہو! اور کل رات تو بقول میری اہلیہ محترمہ کے وہ وہسکی کی بوتل کے اردگرد بھی گھوم رہا تھا۔ یعنی وہ بادہ خواری پر بھی اترنے کو ہے

محترمہ! ہم اس چوہے سے نالاں ہیں۔ کیونکہ ایک تو وہ چوہے دان کی گرفت میں نہیں آتا۔۔۔۔ حد ڈپلومیٹ ہو گیا ہے اور دوسرے کھا کھا کر ہینکڑی باز بھی ہو گیا ہے۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ انتہائی بدتمیز اور بدشعور بن گیا ہے۔ جیسا کہ حرام کا مال کھا کھا کر آدمی ہو جاتا ہے اور کل تو اس نے حماقت کی حد کر دی کہ دیوان غالب کو کتر کتر کر اس کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ یعنی وہ اب ناشروں کی طرح شعر و ادب کا بھی دشمن بن گیا ہے۔ ذرا سوچو غالب سے اسے کیا دشمنی؟

اس لئے موسی! میں غالب کے نام پر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمارے گھر لوٹ آؤ۔ ہمارے تمہارے تعلقات کافی پرانے ہیں۔ ان تعلقات کے واسطے سے ہی آ جاؤ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے گھر والوں نے تمہیں کافی ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائی تھی کیونکہ تم ایک بلے کو بھی ہمارے گھر لے آئی تھیں اور اس کے ساتھ رنگ رلیاں منایا کرتی تھیں۔ ہم نے اسے برا سمجھا کیونکہ تم عشق میں اندھی ہو کر چوہے پکڑنا بھول گئی تھیں۔ ہم تمہیں پینے کے لئے جو دودھ دیتے تم چوری چھپے اس لفنگے کو پلا دیتیں۔ ہم نے تمہیں کئی بار سمجھایا کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ ـــ

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں
مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ سودا ہو نہیں سکتا!

[illegible] ہو گئیں اور اسی سوال پر ہم میں تکرار بھی ہو گئی اور ایک دن میرے بیٹے [illegible] کو ڈنڈا مارا تو تم نے بطور احتجاج میرے بیٹے کو اپنے پنجے سے لہولہان کر دیا اور پھر تم ناراض ہو کر بھاگ گئیں۔ (اور سسرال کو چلی گئیں)

لیکن موسی اب میں سمجھتا ہوں کہ عشق ایک ازلی سچائی ہے اور تمہارے عشق میں ہماری مزاحمت غلط تھی۔ حماقت تھی بلکہ بداخلاقی تھی۔ تم ہمیں معاف کر دو اور لوٹ آؤ۔ وہ موٹا چوہا اور ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور اگر اس بلے سے تمہارا عشق اب بھی چل رہا ہو تو اسے بھی ہمراہ لے آؤ۔ کم از کم اس حرامخور چوہے کے مقابلے پر تو وہ بلا بہتر ہے کہ وہ عاشق ہے، چور تو نہیں ہے۔

## کوے کے نام ———●

میاں کوے

کل تم نے جو اوچھی حرکت کی، جانتے ہو وہ گردن زدنی تھی۔ تم صبح ہی صبح ہماری منڈیر پر آگئے اور کائیں کائیں کر کے ہمیں بتانے لگے کہ آج تمہارے گھر میں ایک منی آرڈر آنے والا ہے۔ چنانچہ ہم نے تمہیں فرشتۂ رحمت سمجھا اور تمہاری یوں آؤ بھگت کی جیسے کوئی اپنے سالے بہنوئی کی تواضع کرتا ہے۔ والد صاحب نے تمہیں پستے کے دانے تک کھلا دئے، تمہیں چائے کا کپ پیش کیا گیا اور جاتے جاتے تم ہماری کانسی کی ایک پیالی بھی منہ میں دبا کر لے گئے۔ لیکن ہم نے تمہیں کچھ نہیں کہا کہ چلو اپنا خاص فرینڈ ہے۔ پیالی واپس لا دے گا۔

لیکن اے دروغ گو! تمہاری اطلاع انتہائی غلط نکلی۔ ہم نے منی آرڈر کے آنے کی خوشی میں کھیر بانٹی، بلیک میں انڈے خرید کر کھائے بلکہ ایک بھکاری آیا تو اسے حسب عادت دھتکارنے کی بجائے اسے ایک روپیہ خیرات بھی دے دی۔ لیکن جب ہم یہ احمقانہ خوشیاں منا رہے تھے، عین اسی وقت منی آرڈر کی بجائے مہمان ہمارے گھر آگئے۔ ایک میاں بیوی اور ماشاء اللہ پانچ ان کے بچے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ہمارے رشتے دار تھے۔ لیکن ہر صحیح چیز سے تو محبت نہیں کی جا سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم احتراماً خاموش رہے اور مہمان حضرات عادتاً عیش کرنے لگے۔ نہ جانے ہماری خاموشی سے فائدہ اٹھا کر وہ کتنا کچھ چٹ کر گئے!

اے بدطینت نامہ بر! آخر تم نے ہمیں غلط اطلاع کیوں پہنچائی؟ ہمارے ساتھ دھوکا کیوں کیا؟ تم نے صرف اپنی ہوس کی خاطر جھوٹ بولا۔ اگر تم ہمیں صاف صاف بتا دیتے کہ تمہارے گھر منی آرڈر نہیں بلکہ مہمان آرہے ہیں تو ہم قبل از وقت کچھ فرار کا بندوبست تو کر لیتے۔ کھیر اور انڈے اور خیرات وغیرہ کی عیاشی تو نہ کرتے۔ الغرض تم نے ہمیں گمراہ کیا۔ ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ تم نے مہمان کا ترجمہ منی آرڈر کر دیا۔ تم غلط مترجم ہو۔ تم [illegible] ہو [illegible] تو جانتے ہو [illegible] کا [illegible] تم کو انسانیت ہے۔

اور ہاں اگر تم آئندہ ہمارے گھر کی نامہ بری ترک کر دو تو ہم کسی دوسرے [illegible] اور دیانت دار کوے کا بندوبست کر لیں گے۔ آئندہ ہمیں [illegible] لیکن اس سے پہلے وہ ہماری کانسی کی پیالی ضرور لوٹا جاؤ۔ تاکہ ہمارے تمہارے درمیان تعلقات کی کوئی علامت بھی باقی نہ رہے۔

## کبوتر کے نام ———●

ڈیر فخر قوم!

کل تم اپنے پروں سے باندھ کر میری محبوبہ کا جو نامۂ محبت لائے تھے وہ میں نے بغور پڑھ لیا ہے۔ مگر مجھے سخت افسوس ہے کہ وہ خط میری محبوبہ کا نہیں تھا کسی بدلی چند نامی عاشق کی محبوبہ "ڈولی" کا تھا۔ تم غلط ایڈریس پر یہ خط چھوڑ گئے۔ ڈولی نام کی میری کوئی محبوبہ نہیں ہے اور وہ اتنی بدخط بھی نہیں ہے۔ وہ تو موتی پروتی ہے۔

میں نہیں جانتا یہ تمہاری غلطی تھی یا شرارت۔ لیکن ڈیر کبوتر! اس کے نتائج بڑے دردناک ہوں گے۔ کیونکہ ادھر بیچارا بدلی چند اپنی محبوبہ کے خط کے انتظار میں دفتر بھی نہ گیا ہوگا اور تڑپ تڑپ کر دیا نے کتنے سگریٹ پھونک چکا ہوگا اور پھر اس خط میں اس کی محبوبہ نے تحریر کیا تھا کہ وہ شاہجہاں ہوٹل میں اس کا انتظار کرے گی۔ گویا ادھر ایک بیچاری حسینہ ہوٹل میں پہلو بدل رہی ہوگی اور اپنے عاشق کو بے وفا وغیرہ کہہ کر ناحق گالیاں دے رہی ہوگی۔ جی چاہتا تھا کبوتر میاں! کہ بدلی چند کی بجائے میں ڈولی سے ملنے پہنچ جاؤں اور تمہاری شکایت کروں کہ تمہارا عاشق بے وفا نہیں ہے۔ تمہارا کبوتر بے وفا ہے۔ اپنا کبوتر بدلو۔ عاشق مت بدلو (مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ "ڈولی" نہ جانے کیا سمجھتی؟)

لیکن سب سے بڑا ایک اور خدشہ مجھے لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں تم میری محبوبہ کا خط بدلی چند کو نہ دے آئے ہو۔ کیونکہ اگر تم "ڈولی" کا خط مجھے دے سکتے ہو تو کیا میری "اوشا ڈارلنگ" کا خط اس کم بخت بدلی چند کو نہیں دے سکتے؟ اگر سچ مچ ایسا ہو گیا ہے تو ظالم! بدلی چند میرے راز عشق سے آگاہ ہو جائے گا۔ موت تمہاری تھوڑی سی حماقت سے کتنا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ تم اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ تم نہیں جانتے عشق کتنی نازک چیز ہوتی ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی کبوتری سے عشق کیا ہے؟

خدا کے لئے سچ سچ بتاؤ کہ کیا میری محبوبہ نے تمہیں کوئی خط دیا تھا اور وہ تم نے غلط پتے پر ڈلیور کر دیا۔ اے خدا! ہر کبوتر کو عقل سلیم عطا کر!

# طوطے کے نام

مسٹر مٹھو!

میرا خط پاکر تمھیں تعجب تو ضرور ہوگا کہ دو جان نہ پہچان، لیکن فکر تونسوی نے مجھے خط کیوں لکھ ڈالا؟ لیکن پیارے! میں صحافی، بیہودگی کا عادی ہوں اور تم معاشرے میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہو۔ اس لئے تم سے صرف چند استفسارات کرنا چاہتا ہوں، تاکہ معلوم کرسکوں کہ انسانوں کے ساتھ تمھارے تعلقات کی صحیح صحیح نوعیت کیا ہے؟

مثلاً کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم جنگل کے ایک آوارہ پنچھی ہو، تم جہاں چاہو جاسکتے ہو، جو کھانا چاہو کھا سکتے ہو۔ درختوں کے پھل تمھاری "ڈسپوزل" پر رہتے ہیں۔ تم کتر کتر کر ان کا ستیاناس کرسکتے ہو۔ مگر اس آزادی کے باوجود تم نے انسان کی غلامی کیوں قبول کرلی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمھارا صرف خارجی فضا تو آزاد ہو، لیکن تمھاری ذہنیت غلامانہ ہے۔ (اس دوغلے پن پر تمھیں شرم آنی چاہیے)

اور پھر تمھارے اندر یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ انسانوں کی آواز کی ہو بہو نقل کرلیتے ہو، یعنی تم نقل نویس ہو، اوریجنل نہیں ہو۔ تمھارے پاس اپنا کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے مانگے کا ہے۔ تم صرف انسانی آواز کا بھونڈا سا چربہ ہو۔ کیا یہ صورت حالات تمھیں پسند ہے؟ کیا نقل نویسی کی زندگی گزار کر تم فخر کرسکتے ہو؟ دوسروں کے سہارے زندہ رہنا اگرچہ جہالت تو ہے ہی لیکن غیرت مندی بھی نہیں ہے۔ اس لئے پیارے! اوریجنل بننے کی کوشش کرو۔ کیا تمھیں خدا نے وہ ذہن عطا نہیں کیا جو خود سوچتا ہے، خود عمل کرتا ہے اور خود بولتا ہے اور خودی کے بوتے پر زندہ رہتا ہے۔

اور پھر سُنا ہے تم بے وفا بھی ہو۔ جو مالک تمھیں پستہ کھلاتا ہے، تم اس سے آنکھیں پھیر لیتے ہو۔ ذرا سوچو، یہ کوئی شرفاء کا کام ہے۔ مہذب طریقہ تو یہی ہے کہ جس کا کھاؤ اُسی کا گاؤ۔ یہ نہیں کہ کھاؤ تو کسی کا، لیکن گن کسی کے بھی نہ گاؤ۔ بلکہ موقع ملے تو پنجرے سے نکل کر کسی اور کے گھر بھاگ جاؤ۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمھاری آنکھ کا پانی کیوں مر گیا ہے؟ یا اس میں ازل ہی سے پانی نہیں تھا اور کیا کبھی تمھارے اندر حیا پیدا ہونے کے امکانات بھی ہیں یا بالکل چوپٹ کیس ہے۔

میرے ان استفسارات کے جواب میں صرف ٹیں ٹیں نہ کرنا، مدلل جواب دینا۔

---



افسانہ

# عمر شاید نہ کرے آج وفا

## ولایت علی

۵۔ پتھر گلی، شاہ نور علی گنج۔ الٰہ آباد (یو۔ پی)

محترم خوشتر گرامی صاحب آداب

میں نے یہ کہانی اپنے محبوب جریدہ کے لئے لکھی ہے جسے "دنیا" بیسویں صدی کے نام سے موسوم کرتی ہے اور آج جبکہ میں اپنی اس تخلیق کو آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں تو میرے ہاتھ لرز رہے ہیں، نہ جانے کیوں؟ ——— اس کہانی کا عنوان میرے شفیق چلے ہی دوست تبسم شفائی کا منتخب کیا ہوا ہے جو ان دنوں Infection disease Hospital Gaya کے ٹی۔ بی وارڈ میں پڑا سسک رہا ہے اور آپ کی بزم میں اکثر شامل ہو چکا ہے ——— کہانی کے متعلق کیا عرض کروں بس غالب کے اس شعر کی تفسیر سمجھ لیجئے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا ——— درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

آپ کی اور قارئین "بیسویں صدی" کی رائے کا منتظر ہوں۔ خدا کرے "بیسویں صدی" اسی طرح آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہے . . .

آپ کا نیاز کیش ——— ولایت علی

---

نسرین نے کھانستے کھانستے اپنا سر سیمنٹ کے چکنے فرش کی طرف جھکا دیا۔ خون کے سرخ دھبے چکنے فرش پر پھیلتے گئے اور نسرین انھیں غور سے دیکھتی رہی۔ اچانک اُن سرخ دھبوں میں اُسے ایک جانی پہچانی شکل نظر آئی۔

"پرویز!"

وہ سوچنے لگی ——— جس کی بدولت آج میں سینی ٹوریم میں ہوں کتنی سکون کی جگہ ہے یہ سینی ٹوریم بھی۔ لمبا چوڑا کمرہ جس کے دونوں طرف قطار میں لوہے کی مسہریاں لگی ہیں۔ بلب کی دھیمی روشنی مریضوں کے چہروں پر پڑ رہی ہے۔ ہر چہرہ زردی میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی کے چہرے پر زندگی کے کوئی آثار نمایاں نہیں ہیں۔

آج نہ معلوم اب تک نائٹ ڈیوٹی والی نرس کیوں نہیں آئی۔ یہ آج اتنی تاریکی کیوں ہے ہر طرف اُداسی ہی اُداسی ہے۔ باہر باغ میں کھلے ہوئے بیلے اور مونگرے کے پھولوں کو کیا ہو گیا ہے؟ باہر سے آتی ہوئی ہوائیں اُن کی خوشبوؤں کو کیوں ساتھ نہیں لاتیں ... معلوم ہوتا ہے انھیں بھی ٹی۔ بی ہو گئی ہے۔ بیلے اور مونگرے کے پھولوں کے پھیپھڑے بھی داغدار ہو چکے ہیں۔

نیند بھی نہیں آتی۔ آج کی رات تو پہاڑ معلوم ہو رہی ہے۔ آج صبح ہی تو ڈاکٹر رائے کہہ رہے تھے۔

"مس نسرین اب آپ کی صحت پہلے کی بہ نسبت اچھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو سینی ٹوریم سے چھٹی مل جائے گی"

"ڈاکٹر صاحب! میں جانتی ہوں مجھے اس سینی ٹوریم سے کوئی زندہ باہر نہیں لے جا سکتا۔ میں تو آئی ہی ہوں یہاں سسک سسک کر دم توڑنے کے لئے!"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ چند ہی دنوں میں آپ بالکل اچھی ہو جائیں گی۔ اچھا یہ بتائیے آپ نے اپنی تصویر مکمل کی؟ دیکھئے پرسوں آرٹ کی نمائش ہونے والی ہے اور آپ تصویر بہت اچھی بناتی ہیں۔ میں آپ کی تصویر Delhi art festival میں بھیجوں گا اور مجھے اُمید ہے کہ آپ کی تصویر فرسٹ پرائز لے گی! ——— اچھا گڈ بائی! خوش رہنا سیکھو!"

یس ڈاکٹر ——— ہونہہ۔ ڈاکٹر رائے بھی کتنے سیدھے ہیں! میں کس کے لئے خوش

نہ سکتی ہوں۔ آگر خواہش ہی رہنا ہوتا تو میں سینے قدیم آتی ہی کیوں۔ ڈاکٹر کو کیا معلوم میں
سینے فریم کیسے آتی ہوں۔ آخر کیونکر میں حسین تصویر بناؤں۔ آخر کس کے لئے تصویر بناؤں۔
کون سو جو میری تصویروں کو پسند کرے گا۔ میں شہرت کی بھوکی نہیں ہوں جو تصویر بناتی۔ کیا
بھلا میں تصویر بنا کے۔ لیکن نہیں میں بناؤں گی تصویر۔ ضرور بناؤں گی! آخری تصویر!!
اور شاید شاہکار!! ڈاکٹر سے درخواست کروں گی کہ وہ اسے کسی بھی صورت سے Delhi
Art festival میں بھیج دیں۔ وہ بھی تو دہلی ہی میں ہوگا۔ وہ ضرور آئے گا
Art festival میں۔ وہ تو فن کا پجاری ہے۔ وہیں تو اس سے ملاقات
ہوئی تھی۔

"پرویز!"
دل کے گوشے سے آواز آئی اور ماضی کے دریچے خود بخود کھلنے لگے۔ دہلی میں

---

- زمین پر چلنے والا ایسا کوئی ذی حیات نہیں جس کے رزق کا ذمے دار اللہ تعالیٰ نہ ہو۔ (قرآنِ پاک)
- خدا کسی قوم کے حالات نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے حالات نہ بدلے۔ (قرآنِ پاک)
- خدا تمہارے جسموں اور مالوں کو نہیں دیکھتا، دلوں اور کاموں کے خلوص کو دیکھتا ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- شرک کے بعد بدترین معصیت خلقِ خدا کی ایذا رسانی ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- فیاض خدا کا دوست ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

---

[illegible] کی نمائش تھی اور میں نے بھی اپنی ایک تصویر نمائش میں لگائی تھی۔ شام کو تیز تیز
قدم اٹھاتی نمائش کی طرف جا رہی تھی، اپنے فن کی داد وصول کرنے۔ دیکھیں کون کون میری
تصویر کو پسند کرتا ہے؟

نمائش میں پہنچ کر میں Salesman کے ٹیبل کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میری
تصویر سامنے ٹنگی تھی۔ نیچے موٹے حروف میں لکھا تھا "مس نسرین"۔ ابھی میں اپنی تصویر دیکھنے
میں محو تھی کہ یکایک میری نگاہ اُس پر پڑی۔ وہ قیمتی سوٹ میں ملبوس ہاتھوں میں سگریٹ
دبائے گہری تنقیدی نظر سے میری تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ شخصیت جاذبِ نظر تھی اور شکل ہی
سے جذباتی معلوم ہو رہا تھا۔

اب وہ اُسی ٹیبل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا، وہ تصویر جو مس نسرین صاحبہ کی ہے اُس کی کیا قیمت ہوگی؟"

اُس نے Salesman کو مخاطب کیا۔

"جی پچاس روپے!" سیلس مین نے کہا۔

اُس نے پچاس روپے مجھے دے کر تصویر لے لی ——— کتنی اچھی تصویر بنائی
ہے! رنگوں کا انتخاب، بیک گراؤنڈ سب اتنا پیارا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ تصویر ایسی
ہے کہ واقعی کوئی جیتی جاگتی الھڑ دیہاتی لڑکی اپنے پی کے انتظار میں بیٹھی ہو۔ سیلس مین
سے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

"کہئے تو میں آپ کو اُن سے ملا دوں جنھوں نے اتنے اچھے خیالات کو کاغذ کی
سطح پر رنگوں کے امتزاج سے اُبھارا ہے" سیلس مین نے میری طرف اشارہ کیا۔

"یہی ہیں مس نسرین!"

"آداب عرض کرتا ہوں! مجھے پرویز کہتے ہیں۔ غالباً آپ نے پرویز ایکسپورٹ
امپورٹ کا نام سنا ہوگا"

"جی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی!"

"خوشی تو مجھے ہونی چاہئے۔ کیونکہ میں اس وقت فن اور فنکار دونوں کو دیکھ
رہا ہوں! پہلے تو صرف فن ہی کی تعریف کر رہا تھا۔ کیا معلوم تھا فنکار اپنے فن سے بھی
بلند ہے!"

میں نے شرم سے اپنی پلکیں جھکا لیں۔

"اچھا اب میں چلوں گی مجھے دیر ہو رہی ہے"

"کہاں تک جائیں گی آپ؟" اُس کی آواز میرا تعاقب کرتی ہوئی اُبھری۔

"جی مجھے چاندنی چوک تک جانا ہے۔ میں چلی جاؤں گی"

"اوہ ہو تو چلئے نا! مجھے بھی اُسی طرف جانا ہے۔ میں آپ کو کار میں چھوڑ دوں گا"

اور میں بغیر کسی انکار کے اُس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ نہ جانے کیوں میں اُس کی طرف
غیر ارادی طور پر کھنچی چلی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا میں اُسے برسوں سے جانتی ہوں۔
دل چاہا اُسے سب کچھ بتا دوں اُسی لمحہ کہ جس فنکار اور فن کی تعریف کر رہے ہو اگر اُس کی
خانگی زندگی کے بارے میں سن لوگے تو شاید اُسے اپنے ساتھ کار میں بٹھا بھی نہ سکوگے۔ میں
اُس کی باتوں میں نہ جانے کیوں بے پناہ اپنائیت محسوس کر رہی تھی۔

کار فراٹے بھرتی دہلی کی چکنی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور میں اپنے خیالات کے
تانے بانے بُننے میں لگی تھی کہ یکبارگی اُس کی آواز پھر کانوں سے ٹکرائی۔

"مس نسرین! لوگ دو چار ملاقاتوں کے بعد بے تکلف ہو جایا کرتے ہیں
لیکن میں اُن سب لوگوں سے مختلف ہوں۔ میری یہ فطرت ہے کہ جو چیز اچھی معلوم ہو
سے جلد اُسے حاصل کر لو۔ آپ کے فن کی میں بہت [illegible] اور آپ [illegible]
کے سامنے ہیں! ——— کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اُن کے [illegible]

مجھے پہلے تو اُس کی ان باتوں پر بے حد غصہ آیا۔ ایک تو پہلی ملاقات اور اُس پر یہ بے باکانہ انداز لیکن نہ جانے کیوں اُس کے کہنے کا انداز اتنا پیارا تھا کہ میں موم کی طرح پگھلنے لگی۔ بولی۔

"پرویز صاحب! ابھی آپ نے صرف میرے فن کو دیکھا ہے سیدھی سادی سی ایک تصویر جسے دیکھ کر آپ نے سمجھا کہ ایک دیہاتی لڑکی اپنے پی کے انتظار میں بیٹھی ہے اور آپ کو میرا فن بے حد پسند آیا۔ حالانکہ آپ صرف فن کے پرستار ہیں اور میں نہ صرف فن کی پرستار ہوں بلکہ خود بھی ایک فنکار ہوں۔ روز نت نئے انداز سے کینوس پر بے شمار رنگوں کے امتزاج سے نہ جانے کتنے تخیلات کو جنم دے چکی ہوں لیکن سچ پوچھئے تو آج تک خود میں اپنی تقدیر کے کینوس پر کھنچی ہوئی اُن لکیروں کو نہیں سمجھ پائی ہوں جسے ایک ایسے فنکار نے بنایا ہے جسے کسی کی پسند ناپسند کا خیال ہی نہیں رہتا ــــ پرویز صاحب! روز میں اور میرے جیسے بے شمار فنکار ہزاروں فن کی تخلیق کرتے ہیں اور اب تو فن میں بھی سیدھی سادی شکلوں کی بجائے ٹیڑھی میڑھی لکیروں نے جگہ لے لی ہے۔ غالباً آپ نے تجریدی آرٹ کا مطالعہ کیا ہوگا۔ میرے خیال میں تجریدی آرٹ دھوکا ہے جسے فنکار یہ سوچ کر بناتے ہیں کہ وہ چند ٹیڑھی میڑھی لکیروں سے ایک گدھے کی تصویر کینوس پر بنا رہا ہے لیکن وہ تصویر جب ہم دیکھیں تو اُسے شیر سمجھیں، آپ دیکھئے تو اُسے بکری سمجھئے۔ اسی طرح مختلف لوگ دیکھتے رہیں اور مختلف چیزیں سمجھتے رہیں۔

بہر حال میں تجریدی آرٹ کی قدر صرف اس لئے کرتی ہوں کہ فنکار صرف ایک تخلیق کو ذہن میں رکھ کر تصویر بناتا ہے اور پرستار اُسے جب دیکھتے ہیں تو اپنے اپنے تخیلات کی بنا پر اُسے ویسا ہی روپ دے لیتے ہیں۔

"خیر میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ آج انسان ترقی کے اُس دور میں ہے جہاں وہ صرف چند ٹیڑھی میڑھی لکیروں کو دیکھ کر دوسروں کے تخیلات کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ لیکن میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں پرویز صاحب کہ تقدیر کے کینوس پر بنے ہوئے اُن خاکوں کو پہچانتے پہچانتے ساری زندگی گزر جاتی ہے لیکن پھر بھی اُس کا فن سمجھ میں نہیں آتا اور میں بھی دنوں اُسی کے فن کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"بچپن سے اب تک میری سمجھ میں اُس کا فن نہیں آ رہا ہے جب کبھی میں لال رنگ سے کینوس پر لکیریں کھینچنا شروع کرتی ہوں نہ جانے کہاں سے کالی لکیریں پورے کینوس پر چھا جاتی ہیں اور پھر سب کچھ غلط ملط ہو جاتا ہے۔ بچپن ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُس وقت سے اپنے چچا کے یہاں رہتی ہوں۔ میٹرک تک تعلیم چچا نے دلوائی، اُس کے بعد میں نے خود اپنے فن کی مدد سے بی۔ اے کیا ہے۔ زندگی ایک عذاب بن گئی ہے۔ چچا چچی مجھے ایک بوجھ سمجھ کر اپنے اوپر لادے ہیں اور میں اب تک اُسی فن کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں جو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اب تک لال رنگ لے کر کینوس پر لکیریں کھینچتی رہتی ہوں کبھی تو ایسا ہوگا جب کالی لکیریں کینوس پر نہ اُبھریں گی؟"

"نسرین صاحبہ! مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ شکایت بھی ہے! آپ پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی ہیں۔ آپ کو اس طرح دل چھوٹا نہ کرنا چاہئے۔

میں مانتا ہوں کہ فنکار ہونے کے ناطے آپ حساس دل کی بھی مالک ہوں گی۔ لیکن اس کے معنی تو ہرگز یہ نہیں ہیں کہ دل کو آپ ایک شیشہ بنا لیں جسے چھوٹی سی کنکری بھی توڑ سکتی ہے۔ اگر آپ تقدیر کے کینوس پر بنائے ہوئے فن کو سمجھنا چاہتی ہیں تو اُس کے لئے عزم، ہمت اور حوصلہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑئیے۔ ایک وقت آئے گا جب آپ اُس فن کو بھی سمجھنے لگیں گی۔ میں آپ کے برعکس بالکل جذباتی آدمی ہوں جو سوچتا ہوں کر گزرتا ہوں کیونکہ میرا اپنا خیال ہے کہ زیادہ سوچنے والے کبھی کبھی غلط کام بھی کر جاتے ہیں۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج سے ہم آپ دونوں کینوس پر لال رنگوں سے لکیریں

---

- مجھے شہرت و ناموری درکار نہیں اور نہ مجھے اُس کی شفقتوں کا انتظار ہے کیونکہ وہ جب ملتی ہے تو بلا طلب ملتی ہے۔ (پوپ الگزانڈر)
- جتنی جتنی میری عمر بڑھتی جاتی ہے، محنت و جفاکشی کی اہمیت کا احساس قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ (والٹیر)
- شریف انسان وہ ہوتا ہے جو اُس وقت بھی نرمی اور شائستگی کا مظاہرہ کرتا ہے جب اُسے کسی سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ (ولیم لیون فلپس)
- کسی کے محاسن کی تعریف و تحسین کرنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ اُس کے اوصاف کو اپنانے کی کوشش کرو۔ (کارل مارکس)
- اولین کاموں کو اولین فرصت میں کرو۔ (جارج برنارڈ شا)

---

کھینچنا شروع کریں اور پھر دیکھیں کہ کالی لکیریں کیسے اُن لال رنگوں کو غلط ملط کرتی ہیں!"

"پرویز صاحب! خدارا اتنی بلندی پر نہ پہنچ جائیے جہاں سے میں خود اپنے آپ کو بھی نہ پہچان سکوں!"

"نسرین! اس کائنات میں سانس لینے والے سب برابر ہیں!"

"اچھا اب کار روک لیجئے مجھے یہیں اُترنا ہے۔"

"بُرا نہ مانو تو پوچھوں کل کہاں ملوگی؟"

"میں گھر سے تو بہت کم نکلتی ہوں پھر بھی آپ کہیں تو میں آپ سے ملاقات کر سکتی ہوں۔"

"میں کل یہیں چھ بجے شام کو تمہارا انتظار کروں گا۔"

اور پرویز کی کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

پرویز بے حد جذباتی تھا۔ وہ کسی بات میں دیر بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس کی عادت بچوں جیسی تھی۔ کھلونے کو دیکھا اور مچل گئے۔ دو ہی چار ملاقاتوں کے بعد اُس نے مجھ سے کہا۔

"نسرین! میں نے اپنے ڈیڈی سے بات کی تھی اور تمھارے سارے حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"تو وہ کیا بولے؟"

"نسرین! وہ سرمایہ دار ہیں۔ اُنھیں کیا معلوم محبت کیا ہوتی ہے۔ یہ ہر چیز پیسے میں تولتے ہیں۔ اُنھوں نے میری نسبت کہیں اور طے کر دی ہے۔ لیکن تم مت پریشان ہو۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا ہے کہ میں شادی کروں گا تو نسرین سے، نہیں تو کہیں نہ کروں گا! اور میں نسرین کے لئے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں!!"

"پرویز! اتنے جذباتی نہ ہو کہ خود تمھاری زندگی تلخ ہو جائے۔ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں بہت بدنصیب ہوں۔ پرویز! جانتے ہو ایسی تقدیر نے مجھے ہر ہر گام پر دھوکے دیئے ہیں۔ بھلا اس موقع پر کب چوکتی؟"

"لیکن نسرین! اس میں تمھارا کیا قصور ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا ساری دُنیا اب پیسے والوں کے ہاتھوں فروخت ہو چکی ہے؟ کیا ہم پیسے کے بغیر ایک دُوسرے کا دل بھی نہیں جیت سکتے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمھیں اپنے والدین کا احترام کرنا چاہئے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں تمھیں بھی نہیں چھوڑ سکتا!"

"پرویز! بس ایک راستہ ہے، تم اپنے والدین کو منالو۔ میں تمھارا انتظار کرتی رہوں گی۔ آخر وہ تمھارے والدین ہیں۔ آج نہیں تو کل راضی ہو ہی جائیں گے۔"

"وعدہ کرو کہ تم روز ملتی رہو گی؟"

"وعدہ کرتی ہوں!"

اس کے بعد میں دو چار بار اور پرویز سے ملی اور اس نے یہی کہا کہ ابھی میرے والدین راضی نہیں ہوئے ہیں لیکن وہ مُصر تھا کہ ان کی مرضی کے بغیر شادی کر لیں۔ لیکن میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا۔ آخر مجھے کیا حق تھا والدین سے ان کا لڑکا چھیننے کا اور پھر مجھے تو پرویز کے ساتھ ہی ساتھ ان کے ماں باپ کا بھی پیار چاہئے تھا کیونکہ میں خود ماں باپ کے پیار کے لئے ترستی رہی تھی۔

اور میں نے رفتہ رفتہ پرویز سے ملنا بند کر دیا تاکہ وہ مجھے بے وفا سمجھ کر بھول جائے۔ اُسے دیکھ کر کبھی میں نظریں بچا کر نکل جاتی۔ میں جانتی تھی کہ اتنا ہی پرویز کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ وہ بے حد جذباتی ہے۔ میری سہیلی سلمٰی جو میری ہمراز تھی اکثر کہتی۔

"نسرین! پرویز صاحب تمھیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ایک بار تو ان سے مل لے۔"

میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک کر زمین پر [illegible] میں نے پرویز سے ملنا بند کر دیا اور پھر ایک بار [illegible] چکی تھیں۔

سلمٰی اکثر پرویز صاحب کی باتیں کرتی۔

"نسرین! پرویز صاحب آج ملے تھے کہہ رہے تھے نسرین بہت [illegible] میری محبت ٹھکرا دی۔ کتنی بزدل اور کتنی بے وفا ہے! اب میں سیٹھ کریم کی لڑکی سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔"

یہ سن کر میں بہت روئی۔ اِتنا روئی کہ مجھے شام سے بخار آ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ خوشی بھی تھی کہ پرویز اپنے والدین کی مرضی سے شادی کر رہا ہے۔ خدا پرویز کو ہمیشہ خوش رکھے! شکایت پرویز سے نہیں تھی کیونکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بے حد جذباتی ہے اور وہ جو کچھ سوچتا ہے کر گزرتا ہے۔ شکوہ تو صرف اتنا تھا کہ وہ مجھے بے وفا کیوں کہتا ہے۔ کاش اسے میں اپنا دل چیر کر دکھا سکتی!"

اور اس کے بعد میری طبیعت برابر خراب رہنے لگی۔ آخر میں ڈاکٹر نے مجھے سینی ٹوریم بھیجنے کو کہا کیونکہ میرا دایاں پھیپھڑا [illegible] چکا تھا اور یہ روگ بھی میں نے خود ہی لگایا تھا۔ پڑوس میں دق کی ایک مریضہ تھی جس کے پاس میں گھنٹوں بیٹھی باتیں کرتی۔ اس کے منہ کے پاس منہ لے جا کر باتیں کرتی۔ میں چاہتی تھی کہ میں پرویز کی زندگی سے بہت دور چلی جاؤں۔ مجھے اب اپنی زندگی سے کوئی پیار نہ تھا۔

اور آج جب میں سینی ٹوریم میں ہوں مجھے ایک سکون ہے۔ ایک بہت بڑا سکون ہے! یہاں کوئی مجھے بے وفا کہنے والا نہیں ہے اور اب تو پرویز کی شادی بھی ہو چکی ہے۔

میری محنت برباد نہیں گئی۔ میں نے اپنی قربانی دے کر پرویز کی زندگی میں پیار بھر دیا ہے؟ نہیں میں بے وفا کیسے ہو سکتی ہوں——میں پرویز کو بتا دوں گی کہ میں بے وفا نہیں ہوں۔ دیکھو میں نے تمھارے لئے کیا کیا ہے!

"ڈاکٹر! یہ تصویر [illegible] دینا۔ ڈاکٹر! یہ میری وفا کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر! میری سانس اُکھڑ رہی ہے۔ مجھے کھانسی آ رہی ہے۔"

اور نسرین کی آنکھیں ایک طرف کو ڈھلک جاتی ہیں۔ [illegible] ہونٹوں کے درمیان میں پرویز کی تصویر صاف نظر آ رہی ہے اور نسرین کی بنائی ہوئی تصویر کے کینوس پر کالی لکیریں چھا جاتی ہیں!!

مدیرہ [illegible] کے نام خط لکھتے وقت [illegible]

[illegible]



# صحت و زندگی

**زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات**

## ۱ • صحت کے لئے ہنسی

عملی تجربات کی بنا پر ماہرینِ صحت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ہنسنا سب سے زیادہ مفیدِ صحت اور سب سے زیادہ حیات بخش عمل ہے۔ اس سے بھوک بڑھتی ہے اور قوتِ ہضم بھی، دورانِ خون میں بھی سرعت پیدا ہو جاتی ہے اور تنفس میں بھی، آنکھوں میں بھی چمک پیدا ہو جاتی ہے اور رخساروں پر بھی سُرخی جھلکنے لگتی ہے۔

ڈاکٹر جولیس فلیچر کا قول ہے کہ ہنسی صحت کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا غذا کا چبانا۔

مسرت اور خوش دلی کی حالت میں انسان جو غذا کھاتا ہے وہ اُس کے بدن کو لگتی ہے اور بآسانی ہضم ہو جاتی ہے۔ غم اور غصّے کی حالت میں انسان خواہ کچھ بھی کھائے لیکن تغذیہ صحیح نہیں ہوتا اور کھانا بدن کو نہیں لگتا۔ بعض ڈاکٹروں کی تو یہ رائے ہے کہ بددلی، رنج اور غصّے کی حالت میں کھانا کھانے سے نہ کھانا بہتر ہے۔

ہنسنے سے آلاتِ ہضم کی ورزش ہو جاتی ہے۔ کھانے کے بعد اُسے ہضم کرنے کے لئے معدے کو ہاضم رطوبت کی ایک بڑی مقدار میں ضرورت ہوتی ہے اور ہنسنا اُس رطوبت کی پیدائش و افزائش کا سبب بن جاتا ہے۔

ہنسنا آلاتِ ہضم ہی پر اچھا اثر نہیں ڈالتا۔ دورانِ خون کے آلات پر بھی بہت مفید اثر ڈالتا ہے۔

ایک فاضل ڈاکٹر نے لکھا ہے ــــــ یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ کھل کر ہنسنے سے قلب کے عضلات میں طاقت اور اُس کی حرکتوں میں باقاعدگی پیدا ہوتی ہے۔

ہنسنے سے خون کی صفائی بھی اچھی طرح عمل میں آتی ہے اور آکسیجن بڑی مقدار میں خون میں پہنچ کر اُسے تر و تازہ کر دیتی ہے۔ لوگ تنفس کی ورزش اسی لئے کرتے ہیں کہ ان کے پھیپھڑوں میں بہت سی آکسیجن پہنچ سکے۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ قدرت نے ہنسنے میں تنفس کی ایک ایسی ورزش پنہاں رکھی ہے جو معمولی تنفس کی بہ نسبت سات گُنی زیادہ آکسیجن پھیپھڑوں میں پہنچا دیتی ہے۔ ہم ایک بار میں تنفس کے ساتھ ہوا کے ساڑھے تین سو کیوبک سینٹی میٹر پھیپھڑوں میں بھرتے ہیں حالانکہ پھیپھڑوں میں اس سے دس گُنی زیادہ ہوا کی گنجائش ہوتی ہے اور ایک اچھا قہقہہ تقریباً ڈھائی ہزار کیوبک سینٹی میٹر ہوا ہمارے پھیپھڑوں میں پہنچا دیتا ہے۔ اتنی ہوا ملنے سے خون بالکل صاف اور نہایت سُرخ ہو جاتا ہے اور اس سے جسم کی نشو و نما اتنی ہی اچھی طرح عمل میں آتی ہے جیسے صاف دُھوپ پاکر پودے پھولتے اور پھلتے ہیں۔

ہنسنے سے صرف یہی نہیں کہ جسمانی صحت کو فائدہ پہنچتا ہے، اس سے روح کو بھی سکون اور راحت میسر آتی ہے۔ دل کا کنول کھل جاتا ہے اور خیالات کی پراگندگی و افسردگی دُور ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر ریلیس نے لکھا ہے ــــــ خوب ہنسو اور صحت مند رہو۔ بیمار ہو تو اچھے ہو جاؤ۔ انھیں یقین تھا کہ ہنسی ایک عظیم دوا ہے۔

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ــــــ مُسکراؤ اگر تم دُبلے پتلے ہو۔

## ۲ • اجوائن ــــــ ایک مفید چیز

اجوائن بظاہر ایک بہت معمولی سی چیز ہے مگر گوناگوں خواص کی حامل ہے۔ اس کی تاثیر نہایت گرم ہے۔ ریاح، قولنج، خرابیٔ ہضم، اسہال، ہیضہ، دردِ شکم، نفخ، ہسٹریا وغیرہ میں نہایت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ریاح کے اخراج کے لئے اسے تنہا یا ہینگ، لاہوری نمک اور زیرہ ملا کر استعمال کرنا بہت مفید ہے۔ بدہضمی کا رفع

کرنے کے لئے ایک چمچ اجوائن اجمودی نمک کے ساتھ کھلانا ایک مجرب نسخہ ہے۔ حلق کی خراش اور کھانسی کے لئے بھی اجوائن بے حد مفید ہے۔ خشک بلغم اور خشک کھانسی کو نرم و رقیق کرنے کے لئے چھاچھ کے ساتھ اجوائن دینا چاہئے۔ کثرتِ شراب نوشی کے تدارک کے لئے بھی اجوائن کا استعمال فائدہ بخش ہے۔ تشنج، درد شکم اور قولنج میں اجوائن پیس کر ضماد کرنے سے بے حد فائدہ ہوتا ہے۔ دمے میں اجوائن کی گرم پوٹلی سینے پر رکھنے سے سکون ہوتا ہے۔ ہیضے اور غشی میں اجوائن کی گرم پوٹلی سے استعمال کو سینک کر گرمی پہنچائی جاتی ہے۔ درد سر، شقیقہ اور ہذیان میں اجوائن کی دھونی بے حد فائدہ ہوتا ہے۔

پرانے زخموں کا مواد روکنے کے لئے اجوائن کے بیجوں کے غسول، مرہم وغیرہ استعمال کئے جاتے ہیں۔

اجوائن کا تیل ہیضہ، نفخ و ریاح، اسہال، سوءِ ہضم، ہسٹریا، درد شکم کے لئے بے حد مفید ہے۔ اس کے دو چار قطرے شکر میں ملا کر کھلانے چاہئیں۔ وجع المفاصل (گٹھیا) اور عصبی دردوں میں اجوائن کے تیل کی مالش بہت مفید ہے۔

اجوائن کے بیجوں سے کشید کیا ہوا عرق قولنج، ریاحی و تشنجی درد شکم وغیرہ کے لئے ایک بہترین دوا ہے۔ ابتدائی ہیضہ میں اسہال اور قے کو روکنے اور نظام جسم کو تحریک و طاقت بخشنے کے لئے عرق اجوائن دو اونس، چونے کا پانی ایک اونس، ٹنچر آف اوپیم (صفیۂ افیون) پانچ قطرے ملا کر دینا بے حد مفید ہے۔

## ۳ • قبض کشا گولیاں

قبض کو اُمّ الامراض (بیماریوں کی ماں) کہا گیا ہے اور یہ سو فیصدی حقیقت ہے۔ قدیم اطبا نے قبض کے لئے بہت سی دوائیں لکھی ہیں۔ زمانۂ حال کے طبیبوں نے بھی اس طرف کافی توجہ کی ہے۔

لیکن آج کل رواج ہو گیا ہے کہ قبض کے مریض قبض دُور کرنے کے لئے قبض کشا گولیاں کھاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قبض کشا گولیاں قبض کا مستقل علاج ہرگز نہیں۔ ان کی ضرورت تو کبھی کبھار ہی ہو سکتی ہے، جب کہ آنتوں میں اس قدر ملغوبا اکٹھا ہو گیا ہو کہ قدرتی طور سے اُس کا اخراج ناممکن ہو ورنہ روزمرّہ کے استعمال سے تو اور بھی قبض بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ آنتوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور عضلات میں ایک تشنج پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن میں وہ انقباض نہیں باقی رہتی، جس کی وجہ سے فضلہ بلا کسی دشواری کے خارج ہو جائے۔ بہت کم لوگ اس بات کو سمجھ پاتے ہیں کہ قبض کے بارے میں فکرمند رہنے سے اعصابی تشنج میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نامناسب غذا سے بھی یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اس بات کا تہیہ کر لیا جائے کہ دو ایک دن یا اُس سے

بھی کچھ زیادہ عرصے تک اجابت نہ ہونے سے پریشان نہ ہوں گے تو اعصاب کو عمل پیدا ہونے کا موقع دیں گے تو اُن سے فطری طور پر اجابت ہونے لگے گی۔ جہاں ایک بار قبض کشا گولی کھانے کی خواہش پر قابو حاصل ہو گیا تو قبض کا رجحان خود بخود ختم ہو جائے گا۔

## ۴ • یقین ـــــ ایک مقناطیسی قوت

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے کہ سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ اُڑنے کی خواہش ہی کے باعث شاہین کے پر نکل آئے، آپ کی آرزوئیں ہی آپ کے پر بنیں گی جن کی بدولت آپ کامیابی کے آسمان پر پرواز کر سکیں گے۔ جہاں آپ کا اپنی خواہش کی کامیابی میں یقین ٹوٹ جاتا ہے وہیں آپ کی کامیابی بھی رُک جاتی ہے۔ یقین ہی وہ حیرت انگیز مقناطیس ہے جو کامیابی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہر کامیابی کی بنیاد میں خواہش کارفرما ہے۔ تہذیب و تمدن کی تعمیر میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہر عظیم کامیابی یا ایجاد کا بیج اُس کی آرزو ہی میں تھا۔ ایک غریب لڑکے یا لڑکی کی کامیابی کا سہرا اُس آرزو کے سر ہے جس پر انھیں اٹل یقین تھا اور جسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اُنھوں نے تن من وقف کر دیا۔

## ۵ • کپاس کی غذائی و دوائی اہمیت

عام طور پر کپاس کو صرف روئی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ غذائی اور دوائی اعتبار سے بھی بہت سے اوصاف و خواص کی حامل ہے۔

اس کے بیج کو بنولہ کہتے ہیں۔ اُسی سے روئی نکلتی ہے۔ اُس کے پودے سے "کلوڈیم" (محلول) بنتا ہے جو زخموں پر لگایا جاتا ہے اور اُنھیں بیرونی سرایت سے محفوظ رکھتا ہے۔

کپاس کے پھولوں سے شربت بنتا ہے جو مالیخولیا کے لئے مفید ہے۔ بیج طاقت بخش اور مقوی باہ ہوتے ہیں۔ تیل چکنائی کے لئے اور متورم جوڑوں پر لگانے کے لئے کارآمد ہوتا ہے۔

اس کے بیج (بنولہ) میں بہت غذائیت ہوتی ہے۔ زیادہ دودھ حاصل کرنے کے لئے یہ مویشی کو کھلائے جاتے ہیں اور دوا کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ان کا تیل نکال کر جلدی امراض میں جلد پر لگاتے ہیں۔

## ۶ • ذہنی انتشار ـــــ ایک مہلک مرض

اس دور میں شاید ہی کوئی ہو، جو ذہنی انتشار کا شکار نہ ہو۔ یہ بظاہر چھوٹی سی بات ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے بہت بڑی بات ہے۔

ڈاکٹر ... نے لکھا ہے ـــــ یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سی بیماریوں کی ابتدا دماغ سے ہوتی ہے۔ ایک ڈاکٹر کی تحقیق یہ ہے کہ نفرت سے جسم میں ایک زہر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا آسان ہے کہ اگر دماغی حالت کچھ عرصے تک ایسی ہی رہے تو اس کا نتیجہ بہت مہلک ہوگا۔

بہت سے معالج اور ماہرینِ صحت و زندگی اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ غصہ، پریشانی، حسد، نفرت میں مبتلا رہنا خون ہی کو پتلا نہیں کر دیتا، نظامِ ہضم کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔ دماغ کی کو شریانیں ہیں اور جسم کے دوسرے حصوں میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے اور یوں جسم کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

## ۷۔ ایک بڑی غلطی

انسان بہت سی غلطیاں کرتا ہے اور برابر غلطیاں کرتا رہتا ہے۔ کچھ غلطیاں ایسی ہیں جو بظاہر بہت چھوٹی، بہت معمولی ہوتی ہیں لیکن نتیجے کے اعتبار سے بہت بڑی ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر ملمان نے لکھا ہے ـــــ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ذہنی اور دماغی تجزیے کا فن جانتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ہر کام بے دلی کے طور پر کرتے ہیں، حالانکہ طبیعت کام کرنے کو نہیں چاہتی۔ جو کام بھی وہ کرتے ہیں پوری آزادی سے نہیں کر سکتے۔ وہ کشمکش میں رہتے ہیں۔ جو کام وہ کر رہے ہیں اس کے علاوہ ان کے دماغ کو کسی اور بات کی فکر اور غم لگا رہتا ہے۔ ان کے دماغ ہر وقت اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ کیا معلوم کیا ہوگا یا کیا ہو جائے گا۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہر لمحہ لاشعوری طور پر بہت سی فاضل قوت ضائع کرتے رہتے ہیں۔

فکر اور رنج و غم کے ساتھ ساتھ خیالات جاری رہتا ہے جو انسان کو کمزور کرتا رہتا ہے اور دماغی اور ذہنی قوتوں کو کام پر مرکوز کرنے سے مانع آتا ہے۔ دماغ کی ایسی تربیت ہونی چاہیے کہ وہ خود بخود تمام ذہنی نقصان اور ضیاع کو روک دے تاکہ تمام قوتیں اس کام پر جو اس وقت ہاتھ میں ہو، لگائی جا سکیں۔ تب اور صرف تب ہی کام پوری قوت سے ہو سکے گا بلکہ اس کے کرنے سے تکان بھی نہ ہوگی۔

بہت سے چست و چالاک اور باہمت لوگ نہیں سمجھتے اور انھیں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کتنی تیزی سے اپنی قوتِ عمل کو ضائع کر رہے ہیں۔ وہ اپنے تیل کو بہت جلد جلا ڈالتے ہیں۔ ان کی اندرونی آگ بہت تیز ہوتی ہے۔ ایسے لوگ عموماً بہت تیز طبیعت اور نہایت چست و چالاک ہوتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ اپنی تیزی کو ذرا کم کر دیں اور زیادہ غور و فکر سے کام کیا کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے حساس لوگ اکثر بہت کام کرتے ہیں کیونکہ وہ بہت حوصلہ مند ہوتے ہیں، باہمت ہوتے ہیں اور ہمت سے بڑھ کر کام کر ڈالتے ہیں۔ وہ اپنی طاقت کو اتنی تیزی سے خرچ کر ڈالتے ہیں، جس قدر جلد وہ پیدا بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کبھی پریشان اور اداس ہو جاتے ہیں۔ انھیں بددلی کا احساس ہوتا ہے اور وہ ملول و حزیں رہتے ہیں۔

## ۸۔ کامیابی کا راز

اپنے اپنے خیالات و نظریات کے مطابق لوگوں نے کامیابی کے راز بتائے ہیں لیکن جن دانشوروں نے اپنے تجربات کی روشنی میں کامیابی کے راز بتائے ہیں وہ زیادہ قیمتی ہیں۔ مشہور مفکر ڈگلس لرٹن نے لکھا ہے ـــــ گزشتہ کئی سال سے کاروباری دنیا سے متعلق رہنے کی بنا پر مجھے مختلف کاروبار اور کاروباری شخصیتوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور بغیر کسی استثنا کے میں نے یہ دیکھا ہے کہ تمام کاروبار کی کامیابی کی بنا ٹھوس اور مثبت دماغوں کی قوت ہے اور وہ کاروبار جنھوں نے ناکامی کا منہ دیکھا ہے ان کے پس پشت منفی رجحانات کا عمل کارفرما نظر آیا ہے۔ مجھے حسرت ہے کہ میں کسی ایسی ممتاز اور ہمہ گیر شخصیت کو دیکھوں جس کا نقطۂ نظر منفی نہ ہو۔ مجھے حسرت ہے کہ میں کسی ایسی ناکامی کا مشاہدہ کروں جس کی پشت پر ٹھوس اور بھرپور رجحانات کارفرما ہوں۔

کامیابی ہمیشہ ان لوگوں کی گرویدہ رہی ہے جو راسخ عزم، ٹھوس اور بھرپور قوتوں کے مالک ہیں۔

## ۹۔ آج کا انسان

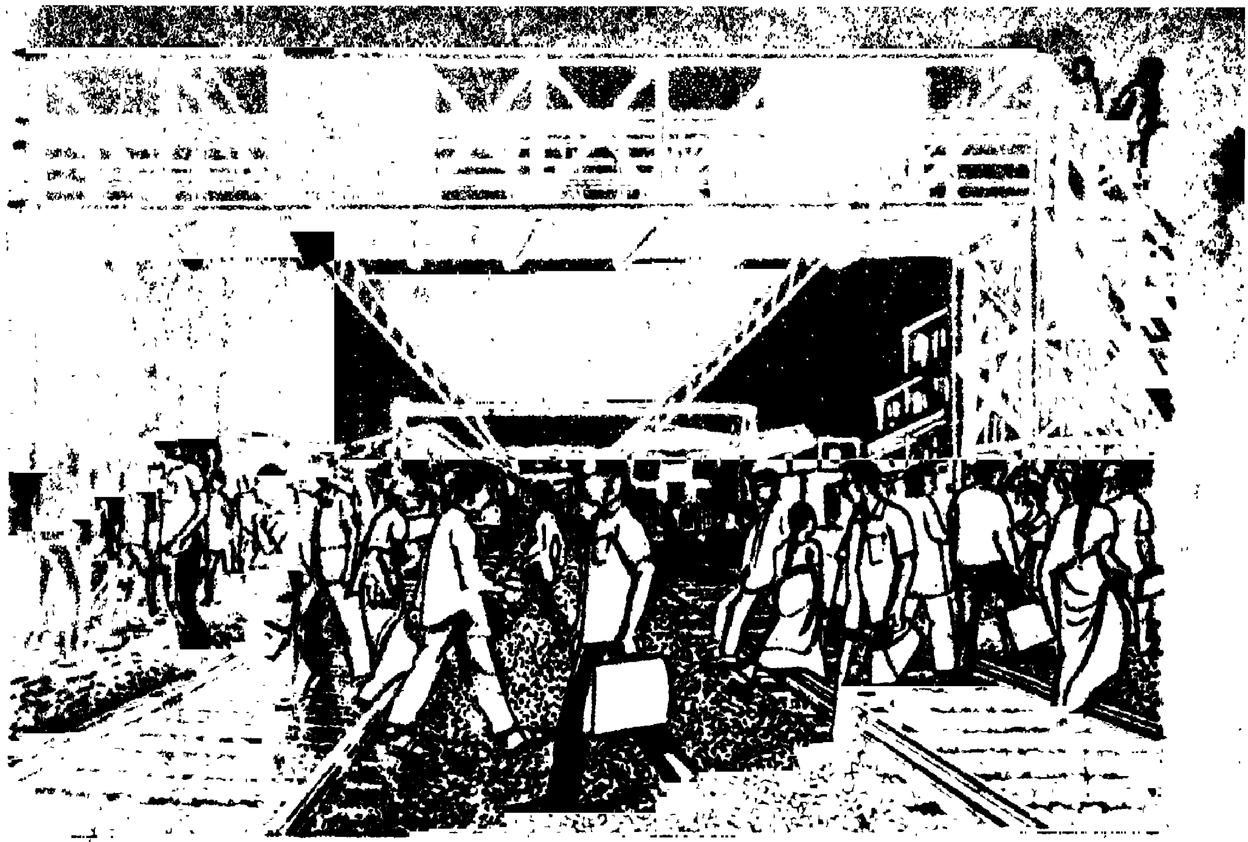
آج کے انسان کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے ؎

جس پہ خالق کو بھی تھا ناز یہ انساں ہے وہی!

آج کا انسان ؎

آدمی آدمی کے پیکر میں  اور کچھ ہوگا، آدمی نہ رہا!

ایک مفکر کہتا ہے ـــــ عہدِ جدید کا انسان ایک تنگ راستے پر ایک ایسے تباہ کن جہنم کے کنارے چل رہا ہے کہ وہ کبھی اس کا تصور نہیں کر سکتا! انسان نفسیاتی فکر و تشویش میں مبتلا ہے۔ جذباتی کشمکش اور الجھن سے پارہ پارہ ہے۔ معاشی خوف و اندیشہ سے پریشان حال اور درماندہ ہے۔ سیاسی شکوک و شبہات کی زد میں ہے۔ انسان بہ حیثیہ پرندے کی شاہراہ کامزن ہے۔ وہ ایک ایسا پرندہ بن گیا ہے جو نہ اڑ سکتا ہے اور نہ پکڑے جانے سے بچ سکتا ہے۔



ریل کی پٹریوں کو پار کرنا
خطرناک ہے

# اپنی زندگی کو خطرہ میں کیوں ڈالتے ہیں؟

برائے مہربانی ریلوے لائن پار کرنے کے لئے
اوور برج یا جائز کراسنگ استعمال کیجئے

اپنے سفر کو محفوظ بنانے کے لئے ریلوے
کے ساتھ تعاون کیجئے



# سرگوشیاں

## سوال و جواب

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ غیر اخلاق، تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ............ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

---

**اے۔ رشید بشری پور**

س۔ غریب کی آہ؟

ج۔ کبھی غریب کی آہ میں اثر ہوتا تھا۔ اب غریب کی آہ بھی بے اثر ہو گئی ہے!

س۔ کانگریس کا مستقبل؟

ج۔ اقتدار کے لئے لڑنے والے سرمایہ داروں اور ذخیرہ اندوزوں کی پشت پناہی کرنے والے کانگریسیوں کے ہاتھ میں ہے!

---

**اشرف۔ بنگارپیٹ**

س۔ خوشتر بھائی! احمق اور بے وقوف میں کیا فرق ہے؟

ج۔ جو چھوٹے بڑے سگے بھائیوں میں فرق ہوتا ہے۔

س۔ دنیا میں سب سے بڑا بے وقوف کون ہے؟

ج۔ جو اپنے کو سب سے بڑا عقلمند سمجھتا ہے!

س۔ عورت کا دل ایک مندر ہے تو مرد کا دل؟

ج۔ حسین تصورات کا صنم خانہ ــــ رنگین خیالات کا نگار خانہ!

---

**نسیم حامدی۔ بمبئی**

س۔ بھیا! غریبوں نے کیا قصور کیا ہے جو سرمایہ دار غریبوں کی لاش پر اپنے عشرت کدے بنا کر غریبوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔

ج۔ غریبوں کا قصور یہ ہے کہ وہ امیروں کے عشرت کدوں کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں اور اُف نہیں کرتے!

س۔ یہ بڑھتی ہوئی عریانی، مذہب سے بے تعلقی کا اصل سبب کیا ہے؟

ج۔ غلط ماحول، غلط معاشرہ!

س۔ آج کی چور بازاری، رشوت خوری اور بد دیانتی کا جنازہ کب نکلے گا؟

ج۔ چور بازاری، رشوت ستانی اور بد دیانتی کرنے والوں کو شہ دینے والے اور اُن کی پشت پناہی کرنے والے اربابِ حکومت ہی یہ بتا سکتے ہیں!

---

**نور الحق سلیم۔ میسور**

س۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں جوانی اندھی ہوتی ہے۔ بتلائیے بڑھاپا کیا ہے؟

ج۔ فہم و بصیرت کا پیکر!

س۔ بھائی صاحب: عورتوں نے ہر طرح کا فیشن کیا اور آج بھی پوری توجہ سے کر رہی ہیں، لیکن وہ اپنی قمیص میں جیب کیوں نہیں لگاتیں؟

ج۔ تاکہ وحشت و دیوانگی میں جیب و گریباں چاک کرنا مردوں ہی کا حصّہ رہے!

---

**سعیدہ خانم شاہدہ۔ بلگندہ کورگ**

س۔ انسان کی عزت فیشن پرستی سے بڑھتی ہے یا بلند اخلاق، بلند کردار سے؟

ج۔ بلند اخلاق، بلند کردار سے۔

س۔ انسان کی زندگی اتنی سستی کیوں ہو گئی ہے؟

ج۔ خدا کا شکر کیجئے، کوئی چیز سستی تو ہے۔

س۔ انسان کو اپنی آبرو پیاری ہوتی ہے یا آرزو؟

ج۔ اچھے انسان کو آبرو پیاری ہوتی ہے۔ وہ آبرو کے لئے ہر آرزو قربان کر دیتا ہے۔

---

یہ دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ یہ ہمیشہ خوش خوش اور چاق چوبند دکھائی دیتی ہیں۔ کڑی محنت اور اچھے کام کی بدولت آپ ٹائپسٹ سے ترقی کرکے اس عہدے پر پہونچی ہیں۔ ان کا کہنا ہے: "میں اپنا کام خوب دل لگا کر کرتی ہوں۔ اس لئے کہ مجھے گھر بار یا بچوں کی طرف سے کوئی فکر یا اُلجھن پریشان نہیں کرتی۔ میری اور میرے خاوند کی آمدنی سے ہمارے چھوٹے سے کُنبے کی سبھی ضرورتیں بخوبی پُوری ہو جاتی ہیں۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ تینوں اچھی تعلیم پا رہے ہیں۔ انہیں ہر قسم کی معقول سہولتیں حاصل ہیں۔ ہمارا تیسرا بچہ چھ برس کا ہے۔ جب وہ ہوا تھا، اسی وقت ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اب ہمارے یہاں اور بچہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں، میں بہت ہی خوش ہوں۔"



## یہ خوش ہیں ——

## اور آپ ؟



[illegible] ۔ [illegible]

س۔ [illegible] کوئی ایسا شعر سنائیے جس میں ہنسی بھی ہو اور آنسو بھی۔

ج۔ [illegible] دل کا درد چھپا کر سب کو ہنسانے والا اپنا دل کا درد اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اس سے ایسے شعر کی توقع کیوں رکھتی ہیں جس میں آنسو بھی ہوں۔ اُسی کا ایک شعر سنئے ؎

بری محبت کی داستاں اُن کے روبرو چھوڑ کر ملسیانی

[illegible] آنسو ابھی مُنہ میں آرہا ہوں

س۔ اس شعر کے مقابل کوئی شعر سنائیے۔

دل کے شکستہ ساز پہ نغمے اُبل پڑے

پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل پڑے

ج۔ شکستہ دل پر ایک خوبصورت شعر سنئے ؎

دل شکستہ ہوں نکل آتے ہیں آنسو اکثر

ٹپک پڑتی ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

---

ایم۔ اے۔ حمید زماں بشیر آباد دکن

س۔ دماغ کے لئے مطالعہ اور جسم کے لئے ورزش ضروری ہے۔ لیکن غم آشنا دل کے لئے؟

ج۔ بیش از بیش غم! کسی نے کہا ہے ؎

ہے بڑی چیز انبساط مگر

غم نہیں تو حیات کچھ بھی نہیں

س۔ عقل مند کی رہنمائی ——

عقل کرتی ہے

یا فکر کرتی ہے

یا جستجو کرتی ہے

یا تجربہ ۔ ۔ ۔ ؟

ج۔ فکر، جستجو اور تجربہ!

---

خریدار نمبر ۲۵-۱۸۰۔ چکمگلور

س۔ جملۂ زبان اور دیوناگری رسم الخط کے کیا معنی ہیں؟

[illegible]

ج۔ ہندی (جو کہ اکثر ہندی اخبارات اور کتابیں چھپتی ہیں) دیوناگری رسم الخط کہتے ہیں۔

س۔ آپ کی نظر میں برقعے کا پردہ کیسا ہے؟

ج۔ مَردوں کی نظروں پہ پڑنے کو پردہ ہٹنے دیں تو برقعے کا پردہ اچھا ہے۔

س۔ ایمی دور کا مستقبل؟

ج۔ دھواں! دھواں!! دھواں!!

آفتاب احمد۔ یو۔ پی۔ شکر نگر

س۔ کیا آپ کی زندگی غم کا دریا ہے؟

ج۔ کبھی نہ تھی، لیکن آج تو درد و غم کا سمندر بنتی جارہی ہے!

س۔ اپنی سالگرہ کی تاریخ بتائیں تاکہ تحفہ بھیج سکوں۔

ج۔ سالگرہ بڑے آدمیوں کی منائی جاتی ہے اور ہم تو بڑے ہیں نہ چھوٹے!

نصرت النساء آفرین۔ محبوب نگر۔ دکن

س۔ [illegible] بھیا! کسی سے شادی کرنے کے لیے سیرت دیکھنی چاہیئے یا صورت؟

ج۔ سیرت!

س۔ میری سہیلی مجھ سے روٹھی ہوئی ہے۔ منانے کے لیے کوئی اچھا شعر لکھیے۔

ج۔ صدقے اس روٹھ کے جانے کے
جیسے ہم دوست آشنا ہی نہیں

---

حمید ادیب بن بہلول پورہ۔ بلدوانی

س۔ کمیونزم کیا ہمیشہ مذہب کی نفی کرتا ہے؟

ج۔ ہمیشہ مذہب کی نفی نہیں کرتا، لیکن مذہب کا حامی بھی نہیں۔

س۔ حصول علم کا شوق، اندرونی اور خارجی پریشانیاں۔ کس طرح شوق پورا کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کے لیے سکون بنیادی چیز ہے۔

ج۔ سچا جذبہ، سچی لگن ہو تو ہر حالت میں حصول علم کا شوق پورا کیا جا سکتا ہے۔

س۔ شعر میں اول غنائیت ہو بعد میں معنویت! آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ہماری رائے میں شعر کہتے ہوئے معنویت کو مقدم رکھنا چاہیئے۔

---

دو سہیلیاں ن۔ ع۔ دیوبند

س۔ بھائی جان! ہم نے دسمبر ۶۵ء کے "بیسویں صدی" میں ایک سوال پڑھا تھا ––– "ہندوستان کی حکومت اگر عورت کے ہاتھ میں آ جائے؟" آپ نے جواب دیا تھا ––– "مرد رشک سے زہر کھا کر مر جائیں گے!" ––– اب جبکہ [illegible]

[illegible] مر گئے [illegible]؟

ج۔ بانو! ہم تو بس یہی باتیں کر [illegible] مرد ہیں انداز حکمرانی پر جن کی موت مر چکے ہیں!

---

محمد غلام رسول۔ آسنسول

س۔ ایک موقعے پر اپنی تقریر میں پنڈت نہرو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کلکتہ جلوس کا مرکز ہے ––– پچھلے دنوں وہ بات سامنے ہی آگئی۔ "ہیجڑوں" کا جلوس، تو کبھی بیبیوں کا جلوس، کبھی مردوں کا جلوس! کہیے آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ اس اعتبار سے ہندوستان کا ہر شہر آج کل کلکتہ بن گیا ہے! سارا ہندوستان جلوس کا دیس بن گیا ہے!

---

نسیمہ زیدی۔ نئی دہلی

س۔ میری ایک سہیلی کہتی ہیں، ٹھاکر پونچھی دوسرے کرشن چندر ہیں۔ آپ صاحب نظر ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ایک معمولی ذرّے کو آفتاب سے کیا نسبت ––– کہاں ذرّہ ذرّہ، کہاں آفتاب!

---

سہیل احمد سہسرامی۔ کلکتہ

س۔ بھائی جان! آپ اور مرحوم راجہ مہدی علی خاں میں کیا رشتہ تھا؟

ج۔ جسم و جان میں جو رشتہ ہوتا ہے۔

س۔ یہ بتلائیے راجہ مہدی علی خاں نے کس فلم میں اداکاری کی تھی؟

ج۔ فلمستان کی مشہور فلم "آٹھ دن" میں جس کی کہانی سعادت حسن منٹو نے تحریر کی تھی۔

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible] علامہ اقبال [illegible] ایک شعر [illegible]

[illegible]

---

احمد لطیف۔ مالیر

س۔ سب دولت کو چاہتے ہیں، مگر دولت کسے چاہتی ہے؟

ج۔ اپنے بے محل چاہنے والوں کو [illegible] چاہتی جو لوگ اسے پانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، انھیں چاہتی ہے۔

---

شاہدہ پروین۔ گورکھپور

س۔ بھائی جان! اردو کی مستقل [illegible]؟

ج۔ شاہد عزیزہ۔

**ایک درخواست**

[illegible]

[illegible] بیسویں صدی کے سوال [illegible]

دہلی کے لئے

[illegible]

[illegible]

## ناردرن ریلوے

# ٹائم ٹیبل نوٹس

مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۹۷ء سے ٹائم ٹیبل میں عام ترمیم کی جائے گی۔ اہم تبدیلیاں ذیل میں درج ہیں۔

### ۱۔ نئی ٹرینیں

ٹرین نمبر 1۔جی این ڈی / 2۔جی این ڈی، جو دہلی اور غازی آباد کے درمیان چلتی ہے۔ اس میں ڈنکور تک اور سے توسیع کر دی جائے گی۔ اس کے علاوہ مزید دو ٹرینوں کا سٹ یعنی 1۔جی ڈی / 2۔جی/ڈی غازی آباد اور ڈنکور کے درمیان جاری کیا جائے گا۔

### ۲۔ جو ٹرینیں تیز کی گئیں

جن ٹرینوں کی رفتار 5 سے لے کر 35 منٹ تک تیز کی گئی ہے۔ اُن کی تعداد 54 ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل ٹرینیں شامل ہیں۔

I 1۔ اَپ ہوڑہ دہلی میل 10 منٹ

II 85۔اَپ آسام میل 35 منٹ

III 86 ڈاؤن آسام میل 15 منٹ۔

### ۳۔ ٹرینوں کے اوقات میں اہم تبدیلیاں

I 22۔اَپ ساودرن اے سی ایکسپریس نئی دہلی سے 16۔19 بجے کی بجائے 15۔17 بجے چھوٹے گی۔

II 86 ڈاؤن آسام میل دہلی سے 10.25 بجے کی بجائے 8.45 بجے چھوٹے گی۔

III 85۔اَپ آسام میل دہلی 17.25 بجے کی بجائے 16.50 بجے پہنچے گی۔

IV 16۔اپ جی ٹی ایکسپریس نیو دہلی سے 19.45 بجے کی بجائے 19.35 بجے چلے گی۔

V 91۔اپ بیکانیر میل دہلی سے 21.55 بجے کی بجائے 21.20 بجے چلے گی۔

VI 5۔اپ دہلی امرتسر ایکسپریس دہلی سے 22.45 بجے کی بجائے 23.00 بجے چلے گی۔

## ۴۔ ٹریکشن کی تبدیلی

۱۔اپ/2 ڈاؤن ہوڑہ دہلی کالکا میل گاڑیاں مغلسرائے اور کانپور کے درمیان الیکٹرک ٹریکشن سے چلیں گی ۔۔۔۔۔۔ 85۔اپ/86 ڈاؤن آسام میل مغلسرائے کانپور سیکشن پر ڈیزل ٹریکشن سے چلیں گی۔

## ۵۔ نئی تھرڈ کلاس سلیپر کوچیں

ایک ٹو ٹائر تھرڈ کلاس سلیپر کوچ جودھپور اور احمد آباد کے درمیان ۲۰۹۔اپ/3۔اپ اور 4 ڈاؤن 210 ڈاؤن ٹرینوں کے ساتھ چلے گی۔

## ۶۔ نشستوں کا اضافہ

(ا) زیادہ بھیڑ کی رکاوٹ میں سہولت دینے کے لئے دہلی۔جودھپور میل ٹرینوں (93۔اپ/94 ڈاؤن) کے ساتھ ایک زائد تھرڈ کلاس کوچ لگائی جائے گی۔

(ب) 5۔اپ/6 ڈاؤن امرتسر ہوڑہ میل گاڑیوں میں وارانسی اور ہوڑہ کے درمیان موجودہ کمپوزٹ I اور III کلاس کوچ کو تبدیل کر دیا جائے گا اور اس کی بجائے دو ڈبے ایک بوگی فرسٹ کلاس اور ایک بوگی تھرڈ کلاس لگائی جائے گی۔

## دہلی، نیو دہلی پر اہم ٹرینوں کے شیڈول

| | دہلی | | نئی دہلی | |
|---|---|---|---|---|
| | روانگی | آمد | روانگی | آمد |
| (i) ۱۔اپ ہوڑہ، دہلی، کالکا میل | 22-30 | 19-45 | — | — |
| (ii) 2 ڈاؤن کالکا، دہلی، ہوڑہ میل | 8-00 | 6-35 | — | — |
| (iii) 3 ڈاؤن۔ 31 اپ فرنٹیر میل | 21-20 | 19-40 | 19-27 | 19-12 |
| (IV) 32 ڈاؤن۔ 4 اپ فرنٹیر میل | 8-25 | 6-40 | 8-45 | 8-35 |
| (V) 6 ڈاؤن۔ 57 اپ پنجاب میل | 21-45 | 20-35 | 20-25 | 20-15 |

| | دہلی روانگی | دہلی آمد | نئی دہلی روانگی | نئی دہلی آمد |
|---|---|---|---|---|
| (vi) 5ڈاؤن۔ 6آپ پنجاب میل | 7-15 | 5-45 | 7-35 | 7-25 |
| (vii) 27فپ۔ 28ڈاؤن نیو دہلی امرتسر فلائنگ میل | — | — | 12-50 | 21-10 |
| (viii) 29آپ۔ 30ڈاؤن لکھنؤ میل | 20-45 | 7-50 | — | — |
| (ix) 85آپ۔ 86ڈاؤن آسام میل | 16-50 | 8-45 | — | — |
| (x) 33آپ۔ 34ڈاؤن کشمیر میل | 21-25 | 5-00 | — | — |
| (xi) 25آپ بمبئی، امرتسر اے سی ایکسپریس | — | — | 11-40 | 10-35 |
| (xii) 26ڈاؤن امرتسر، بمبئی اے سی ایکسپریس | — | — | 16-40 | 14-45 |
| (xiii) 81آپ ہوڑہ، امرتسر اے سی ایکسپریس | — | — | 11-40 | 10-55 |
| (xiv) 82ڈاؤن امرتسر، ہوڑہ اے سی ایکسپریس | — | — | 16-15 | 14-45 |
| (xv) 15ڈاؤن۔ 16آپ جی ٹی ایکسپریس | — | — | 19-35 | 10-10 |
| (xvi) 21ڈاؤن۔ 22آپ سادرن اے سی ایکسپریس | — | — | 17-15 | 11-10 |
| (xvii) 79ڈاؤن۔ 80آپ تاج ایکسپریس | — | — | 7-00 | 22-05 |
| (xviii) 11 اپ۔ 12ڈاؤن دہلی، ہوڑہ ایکسپریس | 21-45 | 6-05 | — | — |
| (xix) 13آپ۔ 14ڈاؤن سیالدہ ایکسپریس | 20-10 | 10-05 | — | — |
| (xx) 83آپ۔ 84ڈاؤن لکھنؤ ایکسپریس | 21-00 | 7-25 | — | — |
| (xxi) 19 ڈاؤن بمبئی سنٹرل دہرہ دون ایکسپریس | 8-15 | 6-20 | 6-05 | 5-55 |
| (xxii) 20آپ دہرہ دون، بمبئی سنٹرل ایکسپریس | 21 55 | 20-15 | 22-15 | 22-05 |
| (xxiii) 67ڈاؤن بمبئی وی ٹی پٹھانکوٹ ایکسپریس | — | — | 7-25 | 6-35 |
| (xxiv) 68آپ پٹھانکوٹ، بمبئی وی ٹی ایکسپریس | — | — | 21-45 | 20-40 |
| (xxv) 59آپ۔ 60 ڈاؤن سری نگر ایکسپریس | — | — | 21-00 | 10-05 |
| (xxvi) 41آپ۔ 42ڈاؤن مسوری ایکسپریس | 22-00 | 6-45 | — | — |
| (xxvii) 63ڈاؤن ہوڑہ، دہلی طوفان ایکسپریس | — | 17-25 | 17-15 | 17-05 |
| (xxviii) 64آپ دہلی، ہوڑہ طوفان ایکسپریس | 10-05 | — | 10-23 | 10-15 |
| (xxix) 39آپ۔ 40ڈاؤن ہوڑہ، دہلی جنتا ایکسپریس | 16-55 | 8-35 | — | — |
| (xxx) 45آپ۔ 46ڈاؤن دہلی، امرتسر جنتا ایکسپریس | 23-00 | 6-23 | — | — |

# قابلِ مطالعہ معیاری کتب

| | | |
|---|---|---|
| سیرت خاتم الانبیاء | مولانا محمد شفیع صاحب | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| سوشلزم | پرنسپل بھیلاس | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| وہ اک لمحہ جاوداں | کشور ہندی | دو روپے |
| اردو | جگن ناتھ آزاد | پچاس پیسے |
| تعلیم دینے کا فن | ڈاکٹر منوہر سہائے انور | تین روپیہ پچاس پیسے |
| ذوقِ جنوں | آل احمد سرور | تین روپے پچاس پیسے |
| رشیدہ کی کشیدہ کاری | | تین روپے پچاس پیسے |
| شبنم کشیدہ کاری | | ایک روپیہ |
| شمع کشیدہ کاری | | چار روپے پچاس پیسے |
| قدسیہ کشیدہ کاری | | ایک روپیہ |
| دلہن کشیدہ کاری | | دو روپیہ پچاس پیسے |
| بیگم کشیدہ کاری | | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| گلشن کشیدہ کاری | زینب انور | دو روپیہ |

| | | |
|---|---|---|
| سموم و صبا | جوش ملیح آبادی | آٹھ روپے |
| شکوہ جواب شکوہ | ڈاکٹر اقبال | پچیس پیسے |
| بالِ جبریل | 〃 | تین روپے پچاس پیسے |
| ابھینندن گرنتھ | جوش ملسیانی | دس روپے |
| نقشِ فریادی | فیض | دو روپے پچیس پیسے |
| آہنگ حجاز | عرش ملسیانی | ایک روپیہ |
| ہفت رنگ | عرش ملسیانی | تین روپے |
| قول و قرار | عبدالحمید عدم | دو روپیہ پچاس پیسے |
| رنگ و آہنگ | 〃 | ایک روپیہ |
| آہنگ | مجاز | تین روپے |
| شگفتہ | ساغر نظامی | بارہ روپے |
| گلستان ہزار رنگ | سید بہار الدین | دس روپے |
| سنگم | نرنش کمار شاد | تین روپے |

| | | |
|---|---|---|
| سرقہ اور توارد | نرنش کمار شاد | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| پھوار | 〃 | دو روپے پچاس پیسے |
| دستک | 〃 | دو روپے پچیس پیسے |
| ڈارلنگ | 〃 | دو روپے پچاس پیسے |
| آتشِ گل | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| صنم و حرم | شکیل بدایونی | ایک روپیہ |
| رعنائیاں | 〃 | تین روپے پچاس پیسے |
| گفتنی | مخمور سعیدی | دو روپے |
| گل رعنا | بسنت لال رعنا جگی | تین روپے پچاس پیسے |
| دلِ ناداں | کرشن موہن ایم اے | چار روپے |
| شبنم شبنم | 〃 | پانچ روپے |
| تماشائی | 〃 | ایک روپیہ |
| گردِ راہ | ضیا فتح آبادی ایم اے | تین روپے پچاس پیسے |
| سازِ نغمہ | بسمل کپور شطوری | تین روپے |
| آہنگِ حیات | پروفیسر عبدالرحمٰن | ایک روپیہ |

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 630/57

AB

**BIŞWIN SADI**

31 ST. YEAR OF PUBLICATION

Telephones Office 271637 Residence 619927

ॐ



با وصفِ سکوت نغمہ زن ہوں جیسے
خود اپنے ہی کیف میں مگن ہوں جیسے
اس چہرۂ گلرنگ پہ چنچل آنکھیں
اِک باغ میں دو مست ہرن ہوں جیسے

نریش کمار شاد ——— فوٹو: سورج۔ این۔ شرما جے پور



جنگِ آزادی کے بیباک مجاہد قومی زندگی کے نامور رہنما اور پنجابی زبان کے محبوب ادیب اور ہر دل عزیز شاعر گیانی گورمکھ سنگھ مسافر کو اُن کے ۷۹ ویں جنم دن پر " ابھینندن گرنتھ " پیش کرنے کے لیے پچھلے دنوں نئی دہلی میں جو تقریب منعقد ہوئی اُس میں اُردو صحافت کے میر کارواں روزنامہ " ملاپ " کے چیف ایڈیٹر اور آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس کے پریذیڈنٹ جناب رنبیر، عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریۂ ہند کو پھولوں کا ہار پہناتے ہوئے ٭



آسمانِ سیاست وادب کے آفتاب و ماہتاب گیانی گورمکھ سنگھ مسافر اور عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند مشغولِ گفتگو ہیں۔ دونوں سیاسی زندگی میں داخل ہونے سے پہلے کامیاب معلّم تھے اور دونوں محبّ الوطن سیاست داں ہوتے ہوئے بنیادی اعتبار سے ایسے نیک دل، پُرخلوص اور انسانیت دوست ادیب ہیں جنھوں نے ادب کی تعمیری اور صحت مند روایات کو آگے بڑھایا۔ دونوں کی باعمل زندگی کا واحد عظیم مقصد مُلک اور قوم کی بہبودی اور بیداری سے عبارت ہے۔ جن کا ادب اور جن کی سیاست اہلِ وطن کی بہتری اور ترقی کے لیے مخصوص ہے +



رنبیر جی نے اپنی تقریر میں فرمایا: "گیانی جی دیش بھگت سیاست داں ہیں۔ دیش کی آزادی اور ایکتا کے لئے انھوں نے زندگی بھر جدوجہد کی۔ وہ پنجاب کانگریس کے پردھان رہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی اور لوک سبھا کے ممبر بھی۔ کچھ مدت کے لئے پنجاب کے تکھ منتری کے فرائض بھی سرانجام دیے۔ ہوسکتا ہے کہ انھیں یہ عہدے پھر بھی مل جائیں لیکن گیانی جی ان عہدوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی شاعری کے باعث ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ تکھ منتری مسافر، پارلیمنٹ کا ممبر مسافر اور کانگریس کا پردھان مسافر ایک نہ ایک دن چلا جائے گا لیکن شاعر مسافر ہمیشہ زندہ رہے گا۔" ✣



ہندوستان کے شہرۂ آفاق ناول نگار ملک راج آنند نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "گیانی گورمکھ سنگھ مسافر اُن لوگوں میں سے ہیں جو گاندھی جی کی تعلیمات کے زیرِ اثر دنیائے ادب سے دنیائے سیاست میں آئے۔ نہایت گہری عوامی محبت اور بے پایاں حُبّ الوطنی ان کی محبوب شخصیت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان کی سیاسی اور ادبی زندگی میں کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ دونوں حیثیتوں سے وہ حق و صداقت کے علم بردار اور جمہوریت و انسانیت کے پرستار ہیں اور نہایت سچے اور عظیم محبّ الوطن ہیں" ✣



عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے گیانی جی کو "ابھینندن گرنتھ" پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "میں یہ ابھینندن گرنتھ گیانی جی کی خدمت میں اُن طلبا کی طرف سے پیش کر رہا ہوں جنھیں اُنھوں نے پڑھایا۔ اُن دوستوں کی طرف سے بھی پیش کرتا ہوں جنھوں نے اِسے مرتب کیا۔ اُن کی طرف سے بھی پیش کرتا ہوں جو اِن کے مخالف ہیں۔ اُن کی طرف سے بھی جو ادیب اور شاعر ہیں۔ اُن کی طرف سے بھی جو سیاست داں ہیں اور اُن کی طرف سے بھی جو عام شہری ہیں۔ کیونکہ اِن سب کی نظر میں اپنی ادبی، سیاسی اور عوامی کارگزاریوں کی وجہ سے وہ محترم ہیں۔"



آخر میں گیانی گورمکھ سنگھ مسافر نے اپنی تقریر میں حاضرین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد شاعر کی ذمہ داریوں کو اجاگر کیا اور فرمایا کہ شاعر ہی اقوام میں اپنے جذبات سے عروج و زوال لایا کرتے ہیں۔ شاعر ہی اُن امراض کو جانتا ہے جو ملک و قوم میں پھیلتے ہیں اور شاعر ہی اُن کا علاج تجویز کرتا ہے اور زندگی میں بہار اور نکھار لاتا ہے۔ میں اپنی ہمہ گیر زندگی میں شعر و سخن کے لئے ہمیشہ وقت نکالتا رہا اور شاعری کے بل پر ہی میدانِ سیاست میں [illegible]

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | تیر و نشتر | خوشتر گرامی | ۹ |
| ۲ | دائی بی جمال | خوشتر گرامی | ۱۴ |
| ۳ | شعلہ سا لپک جائے ہے | کوثر چاندپوری | ۱۵ |
| ۴ | غزل | الطاف مشہدی | ۱۹ |
| ۵ | جلاوطن | رام لعل | ۲۱ |
| ۶ | غزل | ضیا فتح آبادی۔ ایم۔ اے | ۲۴ |
| ۷ | وظیفۂ غم دل | پروفیسر زکی انور۔ ایم۔ اے | ۲۵ |
| ۸ | غزل | مس آسما سعیدی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ | ۳۱ |
| ۹ | غزل | سید حباب ترمذی | ۳۱ |
| ۱۰ | بند تالے | ڈاکٹر ست پرکاش سنگر۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی | ۳۳ |
| ۱۱ | آنکھیں | مختلف شعراء | ۳۴ |
| ۱۲ | رقیب | مختلف شعراء | ۳۵ |
| ۱۳ | غزل | پروفیسر سہیل اختر۔ ایم۔ اے | ۳۶ |
| ۱۴ | غزل | پرکاش ناتھ پرویز۔ ایم۔ اے | ۳۷ |
| ۱۵ | [illegible] | نریش کمار شاد | ۳۹ |




ایک روپیہ پچیس پیسے

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۷ - غزل | | [illegible] | [illegible] |
| ۱۸ - [illegible] | افسانہ | [illegible] | [illegible] |
| ۱۹ - غزل | | [illegible] | [illegible] |
| ۲۰ - غزل | | [illegible] | [illegible] |
| ۲۱ - غزل | | [illegible] | [illegible] |
| ۲۲ - [illegible]ش | افسانہ | [illegible] | [illegible] |
| ۲۳ - غزل | | [illegible] عرفان | [illegible] |
| ۲۴ - غزل | | اختر [illegible] | [illegible] |
| ۲۵ - غزل | | [illegible] حکیم | [illegible] |
| ۲۶ - [illegible] | افسانہ | [illegible] ایم اے | [illegible] |
| ۲۷ - [illegible] کہیں گے | [illegible] | [illegible] تونسوی | [illegible] |
| ۲۸ - دوسرا ہیرو | افسانہ | ایم [illegible] راہی | [illegible] |
| ۲۹ - غزل | | [illegible] تشتری | [illegible] |
| ۳۰ - غزل | | قلب سرشار | [illegible] |
| ۳۱ - تنہائی | افسانہ | اختر عابد [illegible] | [illegible] |
| ۳۲ - صحت و زندگی — [illegible] — [illegible] — [illegible] — [illegible] | | | |
| [illegible] — اپنی [illegible] — صحت کا راز — [illegible] | | | [illegible] |
| ۳۳ - سرگوشیاں | | سوال و جواب | [illegible] |


[illegible]

منیجر رسالہ [illegible] دریا گنج دہلی [illegible]

خوشتر گرامی





چین کے نئی تجربات پر ہندوستان کو تشویش

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible]

[illegible]

گرانی کو فوراً ختم کر دوں۔

[illegible] کر دوں۔

[illegible] کر دوں۔

[illegible] کر دوں۔

[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

بہار کے فرقہ وارانہ فسادات میں جن سنگھ اور آر. ایس. ایس کا ہاتھ تھا۔ ایک خبر ——— ہاتھ ہی نہیں پیر بھی بلکہ سر بھی۔ بالفاظ دیگر از سر تا پا شامل تھا۔

——— [illegible]

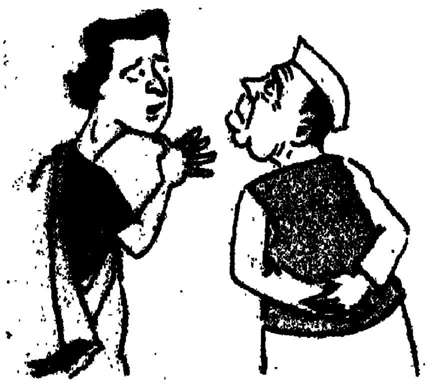
——— [illegible]



غیر ملک کی غذا خیراتی ختم ہو گئی [illegible] امداد [illegible] ہاتھ پر [illegible]

- بمبئی میں بکروں کا قحط ۔ ایک خبر ـــــ کیا کتے کھائے جائیں
- لوگ موقع بے موقع بھونکتے رہتے ہیں۔
- سرکاری زبان بل جلد از جلد منظور کیا جائے ۔ ایک خبر ـــــ تاکہ سرکار بولنے لگے۔
- خورد و نوش (غذائی غلے) کی قلت ختم کرنے کی کوئی تجویز نہیں ۔ ایک خبر ـــــ البتہ شکم توڑ تجویز زیر غور ہے۔
- پانی سے بجلی روٹی کا پلانٹ لگے گا ۔ ایک خبر ـــــ پھر لوگ روٹی کھانے سے بے نیاز ہو جائیں گے۔
- طلبا کا شاندار کارنامہ ۔ ایک عنوان ـــــ
  کلاس سے غیر حاضری
  استادوں کا گھیراؤ
  فرنیچر کی تباہی
  پولیس پر پتھراؤ
  جلوس، جلسے، نعرے بازی، ہنگامہ آرائی
- ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی سے عوام منتشر پریشان ۔ ایک عنوان ـــــ اور فرقہ پرستوں کے گھر میں دیوالی۔
- دالیں زیادہ مقدار میں پیدا کی جائیں ۔ ایک عنوان ـــــ اس میں فیملی پلاننگ کی ضرورت نہیں۔
- ہر آدمی کو ترقی کا یکساں موقع ملنا چاہیے ۔ ایک عنوان ـــــ [illegible] صرف ایک دن ترقی [illegible]
- ہندی نے پاگل بنا رکھا ہے ۔ ایک عنوان ـــــ اسی لئے بعض





• شری چوان اور شریمتی اندرا گاندھی کو ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی پر زبردست تشویش: ایک عنوان

[illegible]

• [illegible] — کشتی [illegible] ...

• [illegible] ایک عنوان — ترکی وزارت کے مطالبات کو [illegible]

• [illegible] کا تبصرہ: ایک عنوان — [illegible]

• [illegible] ایک عنوان — امن پسندوں کی [illegible]

• ہندی [illegible] سے ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا [illegible] — ہندی [illegible] ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی

• فسادات اتفاقی نہیں ہیں: ایک عنوان — سوچے سمجھے اور منصوبہ بندی کے مطابق ہیں۔

• صرف انگریزی ملک کو متحد رکھ سکتی ہے: سابق گورنر یو۔پی کی تقریر — [illegible] گورنری نہیں کرنی ہوگی ورنہ یہ بات نہ کہتے

• امریکہ میں ہندوستانی [illegible] کی مقبولیت: ایک خبر — [illegible] ہندوستانی [illegible] بہت مقبول ہوں گے

• [illegible] ایک خبر — [illegible] مہنگائی کا [illegible]



• غیر ممالک کی غلط تشہیر ... ہو گئی ... [illegible] ... سے ... پر ... کا [illegible]

---

• بمبئی میں بھکاریوں کا قلع قمع ایک خبر ——— لیکن کھائے جائیں۔

لوگ دو وقت ... [illegible] ... رہتے ہیں۔

---

• سرکاری زبان جلد از جلد منظور کیا جائے گا ایک خبر ——— تاکہ سرکار بدلنے لگے۔

• فوڈ ... (غذائی قلت) ... [illegible] ... تجویز ... [illegible]
البتہ شکم ... تجویز زیر غور ہے۔

---

• پانی چڑھنے ڈبل روٹی کا پلانٹ لگے گا ایک خبر ——— پھر لوگ ... سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

• طلبہ کا ... [illegible] ... ایک ... ———
کلاس سے غیر حاضری
اساتذہ کا مقاطعہ
فرنیچر کی تباہی
پولیس پر پتھراؤ
جلوس ... [illegible]

---

• ملک میں فرقہ وارانہ ... سے ... مشہور ... ایک اعلان ———
... [illegible] ... کے گھر میں ...

---

• ... زیادہ مقدار میں پیدا کی جائیں گی ایک خبر ——— اس میں ... [illegible] ... کی ضرورت نہیں۔

• ... [illegible] ... ایک ... ———
صرف ایک دن ... [illegible]

---

• ہندی ... [illegible] ... ایک ... ——— ... [illegible]

... [illegible] ... دہلی





"شری چوان اور شریمتی اندرا گاندھی کو ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی پر زبردست تشویش" ایک عنوان

[illegible] ایک خبر
[illegible]

---

[illegible] —— کا فقدان ہے..

---

[illegible] ایک عنوان —— تو گویا [illegible] کو ختم کر دیں

---

[illegible] ایک عنوان —— [illegible] پر مسئلہ ہے

---

[illegible] ایک عنوان —— اور فرقوں کی افراط۔

---

"ہندی تحریک سے ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا" راج گوپال آچاریہ —— ہندی کے علاوہ [illegible] ہیں جو ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گی۔

---

"غلطیاں اتفاقی نہیں ہیں" ایک عنوان —— سوچے سمجھے اور منصوبہ بندی کے مطابق ہیں۔

---

"صرف انگریزی ملک کو متحد رکھ سکتی ہے" سابق گورنر یو۔پی کی تقریر —— آپ کو آئندہ گورنری نہیں کرنی ہوگی ورنہ یہ بات نہ کہتے۔

---

"امریکہ میں ہندوستانی طلبہ کی مقبولیت" ایک خبر ——
[illegible] ہندوستانی [illegible] وہاں [illegible] بہت مقبول ہوں گے۔

---

[illegible] ایک خبر —— اس پر مہنگائی کا رونا ہے [illegible]



غیر ملک کی غذا [illegible] ہو گئی ہیں۔ [illegible]

---

بھیک میں ریکارڈ اضافہ — ایک خبر ——— لیگ کماتے جا رہے ہیں۔

لوگ موقع بے موقع [illegible] رہتے ہیں۔

---

سرکاری زبان بل جلد از جلد منظور کیا جائے — ایک خبر ——— تاکہ سرکار بولنے لگے۔

---

فوڈ زون (غذائی خطے) توڑ دئے گئے — [illegible] ایک عنوان ———
البتہ شکم توڑ تجویز زیر غور ہے۔

---

پانی پت میں ڈبل روٹی کا پلانٹ لگے گا — ایک خبر ——— پھر لوگ روٹی کھانے سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

---

طلبہ کا شاندار کارنامہ — ایک عنوان ———

کلاس سے غیر حاضری
اُستادوں کا مقاطعہ
فرنیچر کی تباہی
پولیس پر پتھراؤ
جلوس و جلسے نعرے بازی ہنگامہ آرائی

---

بنگال میں فرقہ وارانہ کشیدگی سے ہم منشی پریشان — ایک عنوان ———
اب فرقہ پرستوں کے گھر میں دیوالی۔

---

مرغیاں زیادہ مقدار میں پیدا کی جائیں — ایک تجویز ——— اس میں فیملی پلاننگ کی ضرورت نہیں۔

---

[illegible] — ایک [illegible] ——— [illegible]
صرف ایک دن [illegible]

---

ہندی سنیما [illegible] — ایک عنوان ——— [illegible]

[illegible] دہلی

[illegible]

[illegible] ایک عنوان ——— [illegible]

[illegible] ایک عنوان ——— [illegible]

[illegible] ایک عنوان ——— [illegible] رہا ہے۔

[illegible] ایک عنوان ——— اور [illegible] کی افراط۔

ہندی [illegible] ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے: راجہ گوپال آچاریہ ——— ہندی [illegible] ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

فسادات اتفاقیہ نہیں ہیں: ایک عنوان ——— سوچے سمجھے اور منصوبہ بندی کے مطابق ہیں۔

صرف انگریزی ملک کو متحد رکھ سکتی ہے: سابق گورنر یو۔پی کی تقریر ——— اب آپ کو گورنری نہیں کرنی ہوگی، ورنہ یہ بات نہ کہتے۔

امریکہ میں ہندوستانی [illegible] کی مقبولیت: ایک خبر ——— [illegible] ہندوستانی [illegible] بہت مقبول ہوں گے۔

[illegible] ایک خبر ——— [illegible] مہنگائی کا رونا ہے [illegible]





شری چوان اور شریمتی اندرا گاندھی کو ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی پر زبردست تشویش: ایک عنوان



گاندھی جی کے خوابوں کے سماج کی تعمیر کی جائے … بھارتیہ جنتا پارٹی کی تفسیر — تاکہ انسانی ضرورتیں کم سے کم ہو جائیں اور ایک سنسکرتی … [illegible]

---

سیمپیر میلنا دینا بند کر دو — ایک خبر — تو پھر شادی کس سے کریں؟

---

• فادی پور میں ڈاکوؤں اور دیہاتیوں میں جنگ۔ ڈاکوؤں کا فرار — ایک خبر — ڈاکوؤں کو حق ہے کہ آئندہ وہ اپنے نام کے ساتھ غازی لکھا کریں۔

---

• روس پھر بازی لے گیا — ایک عنوان — یعنی امریکہ پھر ہار گیا
تنقید ہے کہ
گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

---

… نے زمین چھوڑ دیا — ایک خبر — غنیمت ہے … نے
… چاہا تھا … اعلان کر ڈالا
ورنہ ہم چیزیں … [illegible]

---

• فرانس میں شرح پیدائش کم ہو رہی ہے — جنرل ڈیگال کا تشویش … ایک خبر

---

— ہندوستانیوں کی شہادت … [illegible]

---

• بھارتی سنسکرتی کی ترقی کے لئے انگریزی کا … [illegible]
عنوان — یعنی بھارتی سنسکرتی کی ترقی کے لئے اردو کی ترقی ضروری ہے۔

---

چین سنگھ کمیرا کے خلاف … ایک عنوان — … [illegible]
… کے … گئے ہیں اور انہیں کمیرے کی ضرورت ہے

---

• … [illegible] — …
… [illegible]

---

… [illegible]
… [illegible]
… آئی۔

[illegible] ـــــ [illegible] کے متعلق سے مغربی [illegible]

[illegible]

[illegible] کا جائزہ لیتے ہوئے گورنر مغربی [illegible] ـــــ [illegible] کی طاقت ہے [illegible]

[illegible] کی ایک خبر ـــــ خاندانی منصوبہ بندی والے [illegible]

[illegible] ایک عنوان ـــــ چکر ہی نہیں بلکہ گھن چکر اور دہرا چکر۔

[illegible] سے ٹکرا کر [illegible] آ گرگیا : ایک خبر ـــــ بھارت کی بہادر [illegible] گئے کا [illegible]

شیخ محمد عبداللہ نے گاؤں کا سیلاب دیکھا : ایک خبر ـــــ شیخ صاحب کہہ سکتے ہیں کہ

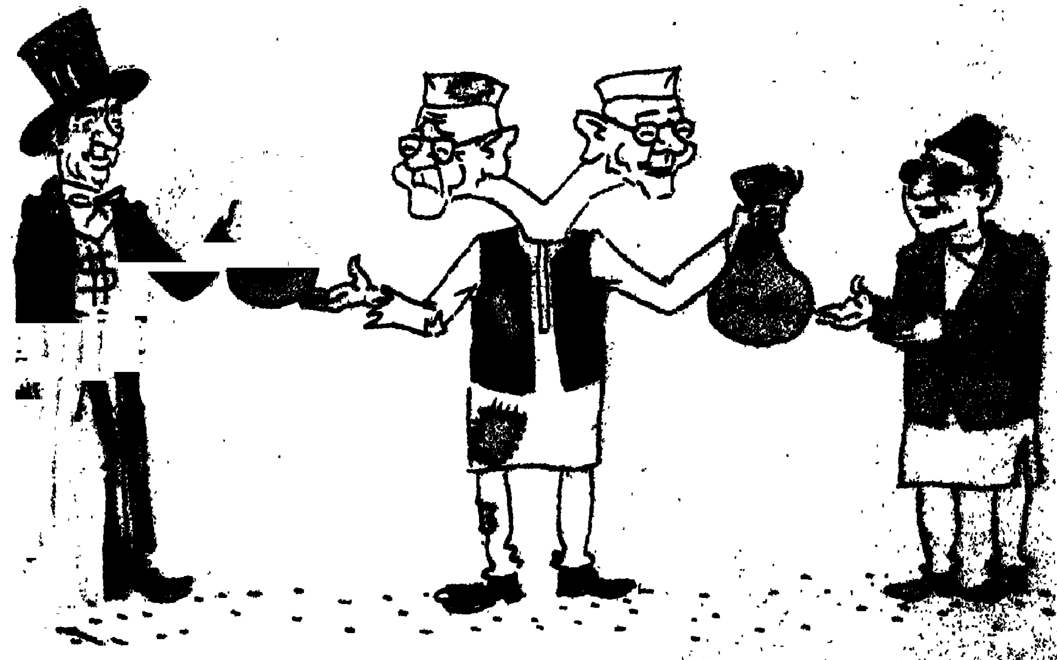
[illegible]

ادبی نشست کے دوران میں ہنگامہ : ایک [illegible] ـــــ یوں کہیے ادبی نشست کے دوران میں بے ادبی۔

یوپی کی حکومت اردو کو اس کا جائز مقام دینے کے وعدے سے منحرف ہو گئی : ایک مقالہ ـــــ جن سنگھ کے ڈنڈے سے گھبرا گئی۔

زبان کی بنیاد پر ملکی اتحاد : ایک عنوان ـــــ اور ہندی کے جنون کے اس دور میں۔

آئین کا تقاضا ہے کہ فرقہ وارانہ تشدد کو ختم کیا جائے : ایک عنوان ـــــ جب کہ آئین کی وفاداری کا حلف لے کر فرقہ وارانہ ہنگامے کیے جائیں۔



[illegible] مرارجی ڈیسائی کی طرف سے نیپال کو امداد کی یقین دہانی۔

# شری وائی۔ بی۔ چوہان

[illegible]

[illegible]

شری وائی۔ بی۔ چوہان

[illegible]
ہندوستان کا [illegible]
[illegible]
ہندی ہے۔ تقریباً مہاتما گاندھی کی ہندوستانی [illegible]
گیا ـــ بمبئی کے وزیر اعلیٰ [illegible]
کے دوست [illegible]
اس کی [illegible] تو آپ کو [illegible] کے طور پر
تلاش کیا گیا۔ آپ شیواجی کے [illegible]
[illegible]
پہلے [illegible] رابطہ تھا اور وزیر دفاع تھے [illegible]
[illegible] اور وزیر داخلہ ہیں پہلے [illegible]
[illegible]
[illegible] کہیں [illegible]
کہیں [illegible]
[illegible]
[illegible]

عنادل باغ کے [illegible]



# شعلہ سا لپک جائے ہے...

کوثر چاندپوری

ہمدرد کلینک، آصف علی روڈ، نئی دہلی

۴؍ستمبر ۱۹۹۶ء

خوشتر صاحب! راحت و سکون

موسم کے تیور بہت خشمناک ہیں، دریائے جمنا کا نظارہ بڑا ہیبت ناک تھا! دو مرتبہ دیکھا، ایک بار اوکھلے میں دوسری مرتبہ ریلوے برج سے، میں نے پتہ نامکان تبدیل کر دیا ہے۔ یہ تبدیلی اقتصادی نقطۂ نظر سے بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ محلہ دریا ہے چند اوراقِ مصورہ کا اضافہ ہو گیا ہے۔

نیاز کیش ـــــــــ کوثر چاندپوری

---

اُلجھی ہوئی کالی گھٹا جیسے اپنے بال شانوں پر بکھیر کر اپنے سرو جیسے قد پر اتراتی آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر وہ اپنی دراز قامتی پر غور کرتی اور کولہوں تک لٹکتے ہوئے بالوں کو دیکھتی تو ایک عجیب فخر کا احساس ہوتا، لیکن جلد ہی یہ تاثر گہرے رنج اور افسوس میں بدل جاتا۔ وہ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں اور گورے پچکے رخساروں پر اُبھری ہوئی ہڈیوں کو دیکھ کر بری طرح گھبرا جاتی۔ رگوں میں دوڑتا ہوا گرم خون افسردگی کی ٹھنڈک سے منجمد ہو جاتا۔ وہ ہمت کر کے بار بار اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کرتی، نہیں میں حسین ہوں، میرا سرخ و سفید رنگ، لمبا قد اور آنکھوں سے برستا ہوا خمار خوبصورتی ہی کی علامت ہے۔ لیکن فوراً ہی خود تنقیدی کی صلاحیت بیدار ہو جاتی۔ وہ اپنے رخساروں پر ہڈیوں کا اُبھار محسوس کرتی اور بجھتے دیوں کی طرح آنکھوں میں بجھتی ہوئی روشنی کا جائزہ لیتی تو ساری خوشی ہی کافور ہو جاتی اور ایک دم خیال کی دوسری لہر آتی اور وہ حقیقت پسندی کے ساتھ سوچتی کہ اتنے عیوب کی موجودگی میں محض قد اور بالوں کی بنا پر کون مجھے حسین کہہ سکتا ہے۔ رنگ کھلا ہوا ضرور ہے۔ اس میں ہلکی سی سرخی بھی جھلکتی ہے لیکن ان چیزوں کی اہمیت ہی کیا ہے۔ میں دیکھنے والوں کو ہرگز اچھی نہیں معلوم ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی نے اظہارِ محبت نہیں کیا۔ نہ کسی نے میرے نام رنگین اور مہکتے ہوئے لفافوں میں بند کر کے محبت آمیز خطوط بھیجے۔ مجھ سے اب تک کسی نے مجھے اپنی محبوبہ بنانے کی عزت نہیں بخشی۔ میری دوشیزگی جنگل میں کھلے ہوئے پھول کی مانند ہے جس پر بھونرے نہیں منڈلاتے۔ پھر ایک بار وہ اپنی آنکھوں اور رخساروں پر نظر ڈال کر نہایت حسرت انگیز لہجے میں گنگنانے لگتی۔

ہم ازل ہی سے ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے

اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں اور دل کی دھڑکنیں مدھم ہونے لگتیں،

اسی احساسِ محرومی کا نتیجہ تھا کہ اس نے پوری توجہ تعلیم پر مرکوز کر دی تھی۔ ساتھی لڑکیاں اسے کھیل میں حصہ لینے پر اکساتیں لیکن وہ پورے انہماک سے اسٹڈی میں معروف رہتی۔ وہ مل کر مذاق اڑانے لگتیں ـــ

"ڈاکٹر بننے جا رہی ہے بے چاری!"

دوسری کہتی ـــــ

"نہیں ڈی لٹ کی تیاری کر رہی ہے پروفیسر بنے گی کالج میں!"

"تم سب بنا رہی ہو غریب کو؟" تیسری کہتی "دراصل یہ کسی کے نام کی مالا جپتی ہے تنہائی میں!"

"ٹھیک کہا تم نے!" چوتھی کہتی۔

اسی درمیان دور بیٹھی ہوئی کوئی شریر سی لڑکی چلا کر کہتی "اور میری رائے میں یہ پاگل ہو کر مینٹل ہاسپٹل کو آباد کرے گی!"

وہ ان پھبتیوں کی طرف بالکل توجہ نہ کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ مذاق میں حصہ لینے والی وہی ہیں جنہیں مہینے میں دس بیس لو لیٹرز موصول ہوتے ہیں۔ اُن میں سے بعض کی منگنی ہو چکی ہے۔ اور بعض تصوّر کی رنگین وادیوں میں تتلیوں کی طرح اُڑتی پھر رہی ہیں۔ انھیں مستقبل کی طرف سے اطمینان ہے۔ پڑھیں یا نہ پڑھیں اُن کے لئے شوہروں اور پرستاروں کی کمی نہیں۔ بہت سی لڑکیاں تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے شوہروں کے ساتھ افریقہ، جرمنی، امریکہ، دکن اور بنگال چلی گئیں۔ پھر فیل ہو ہو کر پڑھتی رہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی آگے چل کر وہ ناموری حاصل نہ کر سکی جو اُسے میسّر آئی۔ اُس نے دو سال پہلے ہی ایم۔ اے۔ ڈی کرنے کے بعد گرلس کالج میں لیکچرر شپ حاصل کرلی ہے۔ ایک ترقی بھی مل چکی ہے۔ اُس کے پاس امتحان کی کاپیاں آتی ہیں۔ اُن کا معاوضہ ملتا ہے۔ بنک بیلنس ہر مہینے بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال برابر ستاتا رہتا ہے کہ آج تک کوئی نوجوان ایسا نہ ملا جس نے اُس کی آنکھوں، بالوں یا قد کی تعریف کی ہو کسی نے اظہارِ محبت کے بعد شادی کی درخواست بھی نہیں کی۔ وہ تنہائی میں اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، "شہناز! تم کتنی خوبصورت ہو! تمہاری آنکھیں ہر لمحہ زندگی کا ایک نیا پیغام دیتی ہیں۔ تمہارے رخسار گلاب کی کلیوں کو شرماتے ہیں!" اُس نے ناولوں اور افسانوں ہی میں یہ جملے پڑھے تھے۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کاش میں بھی ناول یا کہانی کا کردار ہوتی! چاہے میرا کوئی وجود نہ ہوتا۔ عمر کے ساتھ ساتھ محرومی اور نامرادی کا یہ نقش گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تنہا ایک خوبصورت کوارٹر میں رہتی تھی جو اُس کے نام الاٹ ہو چکا تھا۔ شام کو بہت سی لڑکیاں جمع ہو جاتیں۔ اُن میں سے کچھ ایسی بھی ہوتیں جو اُسے رازدار سمجھ کر دوستوں کے محبت نامے دکھا کر پوچھتیں ——

"شہناز! یہ کوئی فریب تو نہیں کرے گا میرے ساتھ؟"

"سچ کہو میرا گرویدہ ہے اور شادی ہی کرنا چاہتا ہے!"

"اس طرح کی رومانی شادیوں کی بنیاد کھوکھلی تو نہیں ہوتی؟"

"میری اچھی شہناز! تو سائیکالوجی کی ماہر ہے بتا اِن الفاظ میں جھوٹ تو نہیں؟"

وہ دل ہی دل میں کہتی! تم محبت کے فریبوں سے ڈرتی ہو! میں تو عمر بھر اس طرح کے دھوکے کھا سکتی ہوں! تم کتنی خوش نصیب ہو کہ تمہیں کسی نے اپنے خواب کا نشانہ بنایا! یہاں تو بوڑھے ہونے کو آئے اور کسی نے پوچھا تک نہیں! دل بہت چاہتا ہے کہ رومانی دھڑکنیں بھی بُری طرح زیر و زبر کر ڈالیں لیکن یہ آرزو پوری ہی نہیں ہوتی۔ سانس میں کبھی تیزی نہیں آتی، زندگی کا ساز نہ جانے کب سے مضراب کے لئے تڑپ رہا ہے، کوئی نغمہ زنی کرنے والا نصیب ہی نہیں ہوتا!"

[illegible] جاتی تھی [illegible] میں خیالات کے بگولے رقص کر رہے تھے۔ وہ [illegible] تنہا ہوں۔ کوئی قدم سے قدم اور شانے سے شانہ ملا کر چلنے والا [illegible] ہواؤں کے دوش پر میرے لئے خوشی کا کوئی پیغام نہیں۔ [illegible] سے کہہ کہ بغیر رُکے پرستش ہو جانا چاہتی ہیں۔ کیا میری [illegible] رہے گی؟ اِس میں اُمید کی کوئی کرن کبھی نہ چمکے گی۔ [illegible] لمس کا اشتیاق یونہی دم توڑ دے گا؟ اُس کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے شبنم کی بوندوں کے مانند جھلملانے لگے۔ وہ انھیں پونچھ بھی نہ سکی تھی کہ ایک شخص قریب سے گزرتے گزرتے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور نہایت شائستگی سے بولا ——

"اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غالباً آپ مس شہناز ہیں؟"

اُس نے نگاہیں اُٹھا کر نوجوان کی طرف دیکھا اُس کی آنکھوں میں [illegible] کے اندھیرے اسی طرح [illegible] تھے اور ان گنت آرزوئیں سسکتی [illegible] تھیں۔

"جی ہاں میرا ہی نام شہناز ہے۔"

"انگلش پڑھاتی ہیں آپ؟"

"جی ہاں"

"میری بھتیجی ہر وقت آپ کی تعریفیں کرتی ہے۔ اس وقت میں سوچتا ہوں اُس نے جو کچھ کہا تھا اُس میں کوئی شاعرانہ مبالغہ نہ تھا۔ واقعی آپ کا [illegible] شانوں پر لہراتے ہوئے بال جو ساون کی رات سے زیادہ تاریک ہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کتنے خوبصورت ہیں! اور یہ آنکھیں جن میں میخانے کروٹیں لیتے نظر آ رہے ہیں! ان رخساروں کے اوپر کتنی پیاری معلوم ہوتی ہیں اور آپ کی [illegible] بجلیوں کی سی تڑپ ہے!" پہلی بار یہ الفاظ سُن کر وہ کھو سی گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بہت سی شراب پی گئی ہے اور اُس کا نشہ دل و دماغ پر چھا گیا ہے۔ برسات کی تیز ہوائیں اُسے اُڑائے لئے جا رہی تھیں۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی اور [illegible] پاؤں نکال کر ناخنوں سے زمین کریدنے لگی۔ ہوائیں اور تیز ہو گئیں۔ شام کی [illegible] شفق کی لالی پھوٹ پڑی گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آنے لگیں۔ اُس نے نوجوان کی [illegible] کا جواب نہ دیا جیسے دیکھنے والے سے بالکل مشتاق تھی۔ اُس کا جی چاہا [illegible] بولتا رہے، کبھی چپ نہ ہو۔ لیکن وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا گیا [illegible] مڑ کر جاتی تو اُس وقت [illegible] روشن ہو گئے [illegible] اپنا مستقبل درخشاں نظر آنے لگا۔ وہ سوچنے لگی میں نے اُس کا نام [illegible] پوچھا۔ نہ جانے پھر وہ کہیں ملتا بھی ہے، اُس کی بھتیجی کا نام [illegible]

مگر [illegible] اُس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"کیا بات [illegible]؟"

"جیب [illegible] تمہارے پاس؟"

"اُس [illegible] آگے جا کر پوچھے ——

"وہ کون تھا؟"

"کیا نام ہے اُس کا؟"

"کوئی شاعر یا افسانہ نگار تو نہیں؟"

"وہ جھوٹ تو نہیں بولتا؟"

"فریب تو نہ دے گا؟"

"کیا سچ مچ میری آنکھوں میں خمار اور چہرے پر سرخی ہے؟"

"کیا واقعی میرا قد بہت دلکش اور بال فریب ہیں؟"

اُس کی سب باتیں ٹھیک ہیں اور ضرور ٹھیک ہیں تو میرا خیال ہے، دنیا کے سارے نوجوان اندھے ہیں۔ کسی نے اب تک میری اِن خوبیوں کو کیوں نہیں سراہا؟

اگلے روز وہ کلاس روم میں داخل ہوئی تو شاہدہ نے اُسے ہلکے سرخ رنگ کا ایک لفافہ دیا جو قیمتی قسم کے سینٹ میں بسا ہوا تھا۔

"کس کا ہے؟"

"آپ کا!"

"میں پوچھتی ہوں کس نے دیا ہے؟"

"سہیل صاحب نے۔"

"کون ہیں وہ؟"

"ایڈیٹر ہیں میگزین نکالتے ہیں۔"

"شاید تمہارے چچا بھی ہیں۔"

"جی ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں۔"

شہناز کے دل میں شاہدہ کے لئے محبت کا ایک طوفان اُمڈ پڑا۔ وہ ذرا آگے بڑھی تاکہ اُسے سینے سے لگا کر خوب پیار کرے لیکن کچھ سوچ کر رک گئی اور کرسی پر بیٹھ کر خط پڑھنے لگی۔

اُس میں وہی کل والے الفاظ دہرائے گئے تھے اور پھر ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا گیا تھا۔

اگلی شام کو آسمان صاف ہو چکا تھا۔ ہوا میں تیزی اور خنکی ویسی ہی تھی۔ شہناز ٹھیک پھر ایک بار گئی۔ سہیل پہلے سے موجود تھا۔ وہ سینٹ کی بنچ پر بیٹھا دریائی بدصورت مرغابیوں کا نظارہ کر رہا تھا، جو دیوانہ وار ایک دوسرے کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور سلام کرنے کے بعد بولا۔

"مجھے سہیل کہتے ہیں۔"

اُس نے غور سے سہیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

"ایک میگزین نکالتا ہوں۔ بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"غربت کوئی عیب نہیں سہیل صاحب! عیب امارت میں ہو سکتے ہیں۔ مفلسی تو بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ وہ عزائم کو ابھارتی ہے۔ انسان کو ماحول سے دلچسپی لینے پر مجبور کرتی ہے اور بڑے آدمیوں میں زیادہ تر وہی ہیں جو کسی غریب خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔"

"شکریہ! —— آپ کے خیالات بھی آپ کی طرح حسین ہیں۔ کاش ہمارے ملک کی ساری عورتیں اتنی ہی روشن خیال ہو جائیں۔"

"زیادہ تعریف نہ کیجئے سہیل صاحب میں مغرور ہو جاؤں گی۔ کل ہی کی باتوں نے بہک جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ خدارا اتنا سراہئے کہ میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤں۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بات غلط نہیں۔"

"میرا خیال ہے بہت سی باتیں جھوٹ ہیں۔"

"ایک شعر سنئے۔" سہیل بولا۔

"کیا آپ شاعر ہیں؟"

"نہیں۔"

"افسانہ نگار؟"

"نہیں۔"

"پھر ضرور سنائیے۔"

"سنئے۔"

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

"قد اور بالوں سے گزر کر آپ آواز تک جا پہنچے!"

"آپ تنہا کیوں ہیں اب تک؟" سہیل نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

"کیا مطلب؟"

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟"

اُس کے جسم میں نیچے سے اوپر تک سنسنی دوڑ گئی۔ سوال مفہوم اور لہجے کے اعتبار سے بالکل نیا تھا۔ اُس نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر کہہ دے: "جی ہاں میں اکیلی اندھیرے میں بھٹک رہی ہوں۔ اس دنیا میں کوئی نہیں جو میرا ہاتھ تھام کر سہارا دے سکے، لیکن وہ بول نہ سکی۔ مشکل سے صرف اتنا ہی کہہ سکی ——

"تنہائی جرم تو نہیں!"

"سماجی نقطۂ نظر سے جرم نہیں تکلیف دہ ضرور ہے۔ کیا میں اس کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟"

"دریافت تو نہیں کر سکتے بلکہ جب پوچھ ہی رہے ہیں تو میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ ہر بات کی وجہ معلوم نہیں ہوا کرتی۔"

"اگر کوئی آپ سے ساری زندگی کی رفاقت کا عہد لینا چاہے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟"

"میں کہتا ہوں اگر میں...."

"ان کہئے کیا چاہتے ہیں آپ!"

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں، اجازت ہو تو دوسرا خط میں خود ہی پیش کر دوں۔"

سہیل نے جواب کا انتظار کئے بغیر ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا اور نہایت تیز قدمی کے ساتھ پارک سے نکل گیا۔

شہناز لفافہ کھولنے کے لئے بے چین تھی۔ لیکن پارک میں ایسا کرنا مناسب نہ تھا۔ وہ جلد ہی اپنے کوارٹر میں آگئی۔ نہ جانے کیوں اُس وقت گھر کے در و دیوار مسکراتے محسوس ہوئے۔ اُس نے میز پر رکھے ہوئے برقی لیمپ کا بٹن دبا دیا۔ اور سہیل کا خط پڑھنے لگی

اوّل سے آخر تک بہت مؤثر انداز میں اُس نے اظہارِ بیتابی کرتے ہوئے سوال کیا تھا —— کیا میں اپنے اوّلین خواب کو شرمندۂ تعبیر دیکھ سکتا ہوں؟"

وہ پسینے پسینے ہو گئی۔ شرم کے احساس سے وہ قطعی ناواقف تھی۔ شرمانے کا اب تک کوئی موقع ہی نہ آیا تھا۔ اُس وقت اُس کی دوشیزگی اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ جاگ اٹھی۔ وہ خط کے ایک ایک لفظ سے شرما رہی تھی۔ گھر کی ہر چیز بولتی محسوس ہو رہی تھی، جیسے ہر طرف سے سوال کیا جا رہا تھا ——

"کیا لکھا ہے خط میں؟"

شرم نے نئے روپ بدل کر اُسے ستانے کی کوشش کر رہی تھی، اُس نے مشاہدہ کے ہاتھ جواب تو بھیج دیا، لیکن پارک میں جانا بالکل چھوڑ دیا۔

جلد ہی شہناز اور سہیل کی [illegible] ملاقاتیں [illegible] مرحلہ ہی ہو چکی [illegible] زندگی کا ہر شعبہ [illegible] وقت نغمان پر تھی، کامیابی سے چلتا رہا اور زندگی کا ہر لمحہ مسرت و شادمانی کے عالم میں بسر ہوتا رہا۔ سہیل اپنی فطرت کے لحاظ سے بہت سنجیدہ اور صلح پسند تھا اگر کبھی خفا ہو جاتی تو وہ منانے کی پوری کوشش کرتا اور اس کی ہر بات کو ہنسی میں ٹال دیتا۔ دونوں خوب مطمئن رہتے تھے۔ ایک دن شہناز نے سہیل سے کہا —— "پارک میں ٹہلنے کو جی چاہتا ہے۔"

"چلئے، ضرور چلئے!" اُس کا موڈ شاعرانہ ہو گیا۔ اُس نے [illegible] کہا —— "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!"

شہناز کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ان باتوں کے لئے بے حد بے چین رہتی تھی۔ وہ اُس تتلی کے مانند تھی جو پانی کی تلاش میں بے چین پھر رہی تھی۔ لیکن اُس کی بے چینی میں آواز نہ تھی۔ دیر تک وہ کھلی فضا میں ٹہلتے رہے۔ شہناز نے دھانی رنگ کی قیمتی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اُس کے جوڑے میں چنبیلی کے پھول لگے ہوئے تھے۔ یکایک اُس نے سہیل کی طرف دیکھ کر بہت التجا کے ساتھ کہا ——

"ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور!"

"آپ کو میری کیا چیز پسند ہے؟"

"بہت مشکل اور خطرناک سوال کر ڈالا آپ نے۔ اچھا تو یہ ہے شہناز کہ مجھے تمہاری تنخواہ بہت زیادہ پسند ہے۔ ایک بیکار اور مفلس انسان کو اس کے علاوہ اور کس چیز سے محبت ہو سکتی ہے!" شہناز کی ساڑی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ اُسے الفاظ کا ایسا لپکتا ہوا شعلہ سمجھنے لگی جس میں آگ سے زیادہ گرمی تھی۔ چنبیلی کے پھولوں میں مہک باقی نہ رہی۔ شہناز کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"آپ آزردہ نہ ہوں، سچ تلخ ضرور ہوتا ہے، لیکن اُس کی تلخی کا انجام بُرا نہیں ہوتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرا تعلق ایک غریب فیملی سے ہے۔ بیکاری نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ نوبت فاقہ کشی تک پہنچ گئی تھی اور آپ نے ایک فلاسفر کا یہ مقولہ ضرور سنا ہوگا —— To a man with empty Stomach food is God آپ جو میری بیکاری کی نفی ہیں میرے سب کچھ ہیں۔ جسم کی پیاس بجھ سکتی ہے۔ معاشی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ عورت شوہر کو مجازی خدا کہتی رہی ہے، میں بیوی کو خدائے رزق سمجھ کر اُس کی مستقل پرستاری کو زندگی سمجھتا ہوں!"

---

مدیرِ بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

# غزل

[illegible] ہفت ہزار
بلاک نمبر ۱۸ سرگودھا (پاکستان)
۲۴ ستمبر ۱۹۹۷ء

خوشتر بھائی جان! سلام محبت

آپ کے کئی نوازش نامے موصول ہوئے۔ مگر ان میں سے ایک بھی میں نے نہیں پڑھا۔ دراصل میں ڈیڑھ سال سے سخت بیمار ہوں۔ مجھے اعصابی دورے پڑتے ہیں۔ میں کوئی غمناک بات نہیں سُن سکتا۔ کسی دوست کی یاد بھی مجھے بے طرح "تڑپا دیتی" ہے۔ میں نے دانستہ آپ کے خطوط نہیں پڑھے کہ اس طرح میری بیماری میں اضافہ ہو جائے گا۔ میرے لئے دُعا فرمایئے اور قارئینِ "بیسویں صدی" سے بھی استدعا کریں کہ وہ میرے حالِ زار پر رحم کرتے ہوئے دُعا فرمائیں۔ ڈیڑھ سال بعد جب رات کو نیند مجھ سے کوسوں دُور تھی تو اچانک آپ یاد آگئے۔ میں آپ کی جُدائی میں بہت تڑپا اور ارسال کردہ غزل ہو گئی۔ میں بے حد کمزور ہو گیا ہوں۔ آپ دیکھیں تو ہرگز پہچان نہ سکیں۔ براہِ کرم برادرانِ عزیز ساحر لدھیانوی اور جگن ناتھ آزاد کی خدمت میں مجھ مایوسِ صحت و زندگی کا سلام عرض کردیں۔ جواب کا انتظار رہے گا۔

آپ کا بیمار بھائی
الطاف مشہدی

## الطاف مشہدی

آگ کو آب میں سموتے ہیں
لوگ کتنے شریر ہوتے ہیں

میرے دامن کی اُف وہ مہکاریں
جب کبھی آپ پھول روتے ہیں

جام و جلوہ سے جن کو نسبت ہے
کتنے رنگیں نگار ہوتے ہیں

کیا حقیقت ہے آپ بھی شب کو
آنسوؤں کی لڑی پروتے ہیں

جن کو خوشبو سُلا نہیں سکتی
میرے زانو پہ وہ بھی سوتے ہیں

صبحدم گلستاں میں ہم اکثر
زخمِ شبنم کے نے سر دھوتے ہیں

مضطرب ہیں مرے لئے خوشترؔ[1]
ایسے مخلص بھی یار ہوتے ہیں

الطاف مشہدی

[1] جناب خوشتر گرامی

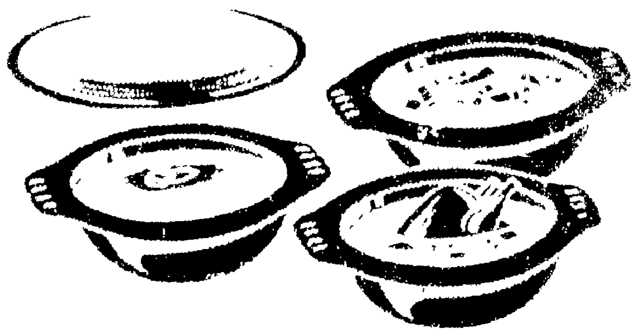


# آہا! یہ پُرکشش پکوان
# صرف ۲۷ منٹ میں
# تیار ہو گئے!

اس کے لئے

# TEMPO

## ٹیمپو پریشر کُکر کا شکریہ





وقت بے وقت مہمان آپہنچتے ہیں۔ تب ان کو نفیس سے نفیس کھانا منٹوں میں تیار کر کے پیش کرنا ہوتا ہے۔

ٹیمپو پریشر کُکر آپ کے پاس ہوگا۔ وہ آپ کے گھر کی عزت بنائے رکھے گا۔ چند ہی منٹوں میں طرح طرح کا کھانا تیار کر دے گا اور آپ کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں رہے گی۔

ہر ٹیمپو پریشر کُکر پہلے سے ٹسٹ کیا ہوا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ آپ کے پاس پہنچ کر بالکل ٹھیک کام دے سکے۔ ان میں میٹل سیفٹی والو لگے ہوتے ہیں

ہر ٹیمپو پریشر کُکر پانچ سال کے لئے گارنٹی شدہ ہے۔

**کانٹی نینٹل ٹریڈنگ کمپنی آف انڈیا**

ای۔۲، ۲۲ جھنڈے والا ایکسٹینشن نئی دلی ۵۵ فون: ۵۶۸۵۴۱

لوکل ایجنٹ:۔

**ہیرا لال اینڈ سنز، ۶۱۲۰ صدر بازار، دہلی۔۶ فون: ۳۲۷۲۹۴**

# جلاوطن

——— رام لعل

R-39/II ملٹی اسٹوریڈ فلیٹ، چارباغ، لکھنؤ
۲۴ر اگست ۱۹۷۰ء

محترم خوشتر صاحب! آداب

جلاوطنی کتنا بڑا عذاب ہے! اِس بات کا احساس ہر دَور کے انسان کو ہوتا رہا ہے۔ موجودہ دَور ایک نئی قسم کی جلاوطنی کا احساس کرا رہا ہے۔ ہم اپنے گھر میں رہتے ہوئے بھی خود کو جلاوطن محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ اپنے حالات سے مطمئن ہیں؟ ——— آپ کا جوڑوں کا درد کیسا ہے؟ اور وہ درد ——— جسے آپ ہم سب سے چھپا کر رکھتے ہیں؟

آپ کا ——— رام لعل

گھر سے ہزاروں میل دُور بیلجیم میں اچانک کوئی ہم وطن مل جاتا ہے تو دل کو کتنی خوشی ہوتی ہے! اس بات کا صحیح احساس وہی کرسکتا ہے جس نے کبھی گھر سے باہر نکل کر دیکھا ہو اور اُس نے واقعی ہوم سِک نس (HOME-SICK NESS) بھی محسوس کی ہو!

پونٹی اور میں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی خود کو بے حد اکیلا محسوس کر رہے تھے۔ اتنی دلکش اور ذہین لڑکی کا ساتھ ہونے پر بھی تنہائی محسوس کرنا کتنی انہونی سی بات معلوم ہوتی ہے! بالکل ایسی ہی بات پونٹی نے بھی مجھ سے کہی، جب وہ ایک صبح جاگی تو اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹتی ہوئی بولی۔

——— ڈیر شیکھر! تمہاری پتنی ہونا میرے لئے بہت فخر کی بات ہے کیونکہ تم بے حد اچھے معلوم ہوتے ہو، لیکن پتہ نہیں کیوں میں ساری رات سو نہ سکی! مجھے ہر کروٹ اپنا گھر یاد آتا رہا۔ ممی، ڈیڈی، شل جیشو، سروجی میری چھوٹی بہن، اپنے یہاں کی ہر چیز چھوڑ کر میں تمہارے ساتھ چلی آئی اور یہاں وہ اپنے شہر کا چھوٹا سا کناٹ پلیس بھی جس کے خوبصورت کوریڈورز میں میں برسوں اپنے فرینڈز کے ساتھ گھومی ہوں اور وہاں شاپنگ کی ہے۔ اور کبھی کبھی کچھ چیزیں بھی چرائی ہیں۔ ——— کیا آپ کو کوئی گھر گیا، کوئی رہ رہ ملے!"

یہ کہہ کر میری بیوی کا زور سے ہنس پڑی۔ صبح ہوتے ہی اپنی عورت کی اتنی شریلی ہنسی سنائی دے جائے تو وہ مرد کتنا خوش قسمت ہوگا!

ہماری محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اتفاقیہ محبت اور پھر فوراً ہی لَو میرج! اور پھر اچانک ہی کینیڈا کے سفر نے ہمیں بے حد اتوشش بنا دیا تھا۔ اموشنل تو ہم ابھی تک تھے۔ گرد و پیش کی ہر چیز ہمیں بے حد سہانی معلوم ہوتی تھی۔ کسی آن دیکھے ڈریم لینڈ کی طرح۔ لیکن اپنے اپنے گھر کے لئے، قریبی ریلیشنز کے لئے اپنے دوستوں کے لئے، ہر اس چیز کے لئے بھی جس کی پہلے اتنی اہمیت محسوس نہیں ہوئی تھی اب اُسی کے لئے یکایک اُداس ہو جانا دوسری بات ہے، بالکل دوسری بات!

ہم شام کو پھر ایکسپو (EXPO) گئے۔ عالمی نمائش میں جتنے دیشوں کے پویلین تھے انہیں پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ کئی کئی بار وہاں جا چکے تھے لیکن وہ نمائش اتنی بڑی تھی کہ ہر بار وہاں سے واپس ہوتے وقت یہی محسوس ہوتا ——— ابھی تو کچھ بھی نہیں دیکھا!

لیکن اپنے جس ہم وطن سے اچانک ملنے کی بات میں بتانے جا رہا ہوں اُس کا ایکسپو سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ بس اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ کئی سو ایکڑ دھرتی پر پھیلی ہوئی نمائش تو پس منظر میں جگمگا رہی ہے اور ہم ایک اطالوی ریسٹوران کی پچاس ضرب پچاس فٹ گلاس وال کے اس طرف بیٹھے انگوروں کا سرپ پی رہے ہیں اور چپ بیٹھے

ہیں اور اُداس بھی ہیں اور کچھ سوچ بھی رہے ہیں اور شیشے کی دیوار کے پار بے مقصد گھور بھی رہے ہیں! اُسی وقت اچانک وہاں پینتالیس اڑتالیس سال کا ایک طویل قامت وقبول صورت آدمی کسی کرسی کو گھسیٹتا ہوا سا آنکلتا ہے۔ ایک جگہ رُک کر آنکھوں پر سے ایک جھٹکے کے ساتھ [illegible] اُتارتا ہے اور میری والف کو ساڑی باندھے دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے اور جلدی سے ہمارے پاس آکر پوچھتا ہے —— "ایکسکیوز می! آر یو انڈینز؟" (EXCUSE ME ARE YOU INDIANS?)

وہ بھی ہندوستانی تھا۔ سامر تھ بہادر سنگھ! مونٹریال ہی میں لوکوموٹو فیکٹری میں انجینئر تھا۔ پچھلے پچیس سال سے وہاں تھا۔ اب وہیں کا شہری بن گیا تھا۔

اپنا تعارف کرانے کے بعد وہ بولا —— "اب آپ لوگ اپنے بارے میں گفتگو کیجئے۔ ہندوستان کے بارے میں بھی بہت سی باتیں کیجئے جہاں گئے ہوئے مجھے ایک مدت بیت چکی ہے!"

پھر وہ بہت حسرت سے کہہ اُٹھا: "ایسا معلوم ہوتا ہے ایک عمر بیت گئی ہے۔ جیسے اپنا وطن پچھلے ہی جنم میں کبھی دیکھا ہو!"

پونتی اور میں نے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کی کیونکہ سنگھ نے خود ہی [illegible] شروع کر دیں۔ اپنے متعلق ہی بولتا رہا۔

"میں چوبیس سال کی عمر میں رُڑکی سے ڈگری لے کر یہاں چلا آیا تھا۔ مزید [illegible] کے لئے مجھے یہاں والوں نے کام دے دیا تھا۔ اس آفر کو میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ بھی ایسا ہی کرتا۔ لیکن جو کچھ میں نے ہندوستان چھوڑتے وقت کیا تھا ویسا تو شاید کوئی بھی نہ کرتا! اس بات کا میرے دل پر گہرا صدمہ ہے۔ یہی صدمہ مجھے اپنے وطن واپس نہیں جانے دیتا۔ پچیس سال سے میں اپنے وطن جانے کے لئے تڑپ رہا ہوں!"

پونتی اور میں نے ایک دوسرے کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ سامر تھ بہادر سے یہ اچانک ملاقات کوئی بہت زیادہ دلچسپ تماشا نہیں تھا۔ لیکن ہم اپنی بے لوثی یقیناً کھو بیٹھے۔ پھر ایک اکائی بن گئے۔ ہمارے آرڈر پر بیرا ہمارے سامنے سَرو کیا ہوا ترکی رکھ گیا تھا۔ ہم تینوں نے بہت خاموشی سے اپنے اپنے لئے ایک ایک چیں کاٹا اور پھر دھیرے دھیرے ہڈیوں پر کا لذیذ گوشت دانتوں سے نوچنے لگے۔

گلاس وال کے اُس پار نیگرو اسکولی بچوں کا ایک گروہ اپنی سفید فام ٹیچرز (NEUNIS) کی سرکردگی میں گزر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی رالوں کے ساتھ چپکی ہوئی کھوپڑیوں میں اور رنگین بشرٹوں میں گھنے، گھنگھریالے بالوں والے افسردہ اور حیران حیران سے بچے! چند لمحوں تک انہیں گہری نظر سے دیکھتے رہنے کے بعد سامر تھ نے ایک فلسفیانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا —— "امریکن نیشنز!"

پونتی نے اسے [illegible] —— "آپ یہاں کے شہری [illegible] جلاوطن کیسے ہوگئے تھے؟"

پونتی کو وہ بہت دنوں سے تعجب [illegible] تھا [illegible] پیدا ہوچکا تھا۔ وہ آخر اپنے وطن کیوں نہیں جاسکتا؟ [illegible] تقسیم ہند انقلابیوں کے بارے میں کچھ پڑھا گیا، اُس [illegible] میں سے کوئی ایک ہے جو انگریزوں کی گرفت سے بچ نکلنے [illegible] تھا۔ لیکن اُس نے کینیڈا جیسے کا من ویلتھ کنٹری میں پناہ کیوں لی تھی، جہاں سے بہت آسانی سے ہندوستان کی انگریزی حکومت کے حوالے کیا جاسکتا تھا!

اس کا قہقہہ ختم ہوگیا۔ ہنستے ہنستے اُس کے آنسو نکل پڑے۔ وہ ایک ہاتھ کی پُشت سے آنکھوں کے کونے پونچھنے لگا۔ پونتی کی طرف بڑی عجیب سی نظر سے دیکھتا رہا۔ اُس نظر میں طنز کی چبھن تھی۔ محبت کی مٹھاس بھی۔ اُس نے کھانے کی پلیٹ ایک طرف سرکا دی اور وہسکی کا ایک گھونٹ لے کر بولا —— "معلوم ہوتا ہے تم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہو! کیا مجھے اجازت دو گے میں تمہیں اپنی محبت کی کہانی سناؤں؟ بہت لمبی نہیں ہے۔ لیکن اگر میں تم لوگوں کو واقعی بور نہیں کر رہا"

پونتی کے اور میرے منہ سے ایک ساتھ نکلا —— "نہیں [illegible] ایسا مت سوچئے۔ آپ اپنی لَو اسٹوری ضرور سنائیے!"

"لو اسٹوری!" وہ دیر تک لَو اسٹوری کے دو الفاظ زیر لب دہراتا رہا۔

گلاس وال کے اُس طرف ایرانی، عربی، جاپانی، برمی —— بہت سی قوموں کے لوگ اپنے اپنے نیشنل ڈریسیز میں اندر جھانکتے ہوئے گزر گئے۔ عورتیں اور مرد سبھی۔ اچانک ایک فرانسیسی جوڑا کاریڈور کی محراب کے نیچے رُک کر ایک دوسرے سے پیار کرنے لگا۔ گرد و پیش سے بالکل بے خبر اور بے پروا!

ہم تینوں اُن کی طرف خاموشی سے دیکھتے رہے۔ جب وہ وہاں سے ہٹ گئے تو میں نے اپنا ہاتھ پونتی کے ہاتھ پر رکھ دیا جو میرے سامنے میز پر پڑا تھا۔ اپنی پانچوں انگلیاں پھیلائے ہوئے سنگھ نے اپنے کھچڑی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا —— "پرانی دلّی میں جس مکان میں میں رہتا تھا وہیں اندر پہلو والی گلی کی ایک ٹیچر بھی رہتی تھی۔ لوشہرو کی ہندو پٹھان عورت! جوان! شرمیلی گلاب کی طرح پوری کھلی ہوئی! جیسا کہ اس عمر میں ہوتا ہے!" وہ خود اداس ہوگیا۔

"میں رُڑکی سے ہر سنیچر کی شام کو دلّی پہنچ جاتا تھا۔ جب سے [illegible] (مسز ملک) سے محبت ہوگئی تھی [illegible] تھا [illegible] رہتی۔ ہم دو سرے جوان لڑکے لڑکیوں کی طرح چلتے اور باتیں کرتے [illegible] ہی احمقانہ لیکن اکثر جذباتی! لیکن ہمارے [illegible]

ہیں تھے۔ سوالی نے ایک انگلینڈ سے مجھے وہاں کی ایک بڑی فرم میں جگہ دلوانے کی کوشش کی۔ یہاں بھی یہ پاس ہونے سے پہلے ہی۔ اور سوالی کے لئے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ پاس ہوتے ہی میں اُسے کالج کی نوکری سے نجات دلا دوں گا۔ انگریزی ادب۔ اسے بھی اس کا شوق کالج آیا تھا۔ وہ کسی اور سبجکٹ میں اب فرسٹ کلاس کے لئے کوشش کر سکتی تھی۔

آپ جانتے ہیں یہ خیالات اور ارادے محض جذبات پر مبنی نہیں ہوتے۔ ان کے پیچھے ایک سنجیدہ سوچ بھی ہوتی ہے جو دلوں میں خلوص اور ایمانداری پیدا کرتی ہے۔ وہ سامنے شک شبہے مٹا دیتی ہے۔ جو نوجوان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے قریب ہوتے وقت اپنے دماغ میں ابھرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ ہم اس طرح کی باتوں سے بالکل آزاد تھے۔ بہت محفوظ تھے! اسی لئے ہم نے شادی بھی کر لی۔ ایک الگ فلیٹ بھی لے لیا۔ کرزن روڈ پر جو شاداب، خوشبودار گھنے پیڑوں سے گھری ہوئی تھی۔ اور پھر اچانک مجھے کینیڈا آنے کا آفر مل گیا۔ دو سال کی مزید اسٹڈیز کا۔ سوالی نے مجھے بخوشی اجازت دے دی۔ اُس نے کہا تھا وہ کالج میں پڑھاتی رہے گی۔ میری واپسی کا بے صبری سے انتظار کرے گی۔ آئندہ گرمیوں کی چھٹیوں میں میرے پاس بھی آئے گی۔ اُس زمانے میں ہوائی سفر اتنی سہل نہیں تھی جتنی آج کل ہے۔ لیکن ہم دونوں نے اس کے لئے ایئر پیسیج (AIR. PASSAGE.) بہت پہلے سے ریزرو کرا لیا۔ اور میں اس کے ساتھ کینیڈا میں تین مہینے کی چھٹیاں گزارنے کے سپنے دیکھتا رہا۔ اس کے محبت بھرے خط آتے رہے۔ کبھی کبھی تار بھی آجاتے تھے۔ اُن میں صرف محبت ہی کا ذکر ہوتا تھا۔ یا صرف انتظار کا! محبت اور انتظار ——
یہ دو لفظ میرے لئے بہت اہمیت رکھتے تھے۔ یہ دو لفظ ایک خاص طرح کی کیفیت رکھتے تھے۔ ایک خاص طرح کی لذت بھی۔ ایک خاص طرح کا درد بھی! ایسا معلوم ہوتا تھا۔ میں ایک بہت ہی خوبصورت مکان میں رہتا ہوں۔ لیکن اس کی دیواریں نہیں ہیں۔ اس پاس بے شمار پیڑ اور جھیلیں ہیں جنہیں میں صرف محسوس ہی کر سکتا ہوں۔ انھیں چھو نہیں سکتا۔ میں ہموار اور ناہموار پہاڑی راستوں پر اس لئے اکیلا گھومتا رہتا ہوں کہ اُس کی آمد سے پہلے بہت سی سمتوں سے واقف ہو سکوں۔ جب سوالی یہاں آئے گی میں اس کی رہنمائی کروں گا۔ جو پیڑ پھولوں سے لدے رہتے تھے اور کبھی کبھی اپنی پتیاں پگڈنڈیوں پر بھی بکھیر دیتے تھے۔ اُن سے میں چپکے چپکے کہا کرتا، جب میری سوالی یہاں سے گزرے اُس دن پھول برسانا مت بھولنا! اُس دن اپنی ساری مہک لٹا دینا! تمہیں دنیا کی لازوال محبتوں کا واسطہ! پھولوں کی خوش رنگی اور خوشبو کے بغیر کوئی محبت مکمل نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے پھول ہیں اُن میں مہک صرف اس لئے ہے کہ یہاں بے شمار لوگ محبت کرتے ہیں۔ لوگ محبت نہ کرتے تو یہ پھول بھی خوشبو سے خالی ہوتے!"

اچانک وہ پونٹی کی طرف دیکھ کر مسکرا اٹھا۔ "آئی ایم سوری! بہت سنٹی منٹل ہو گیا نا! لیکن کوئی بھی لو اسٹوری سنٹی منٹلٹی سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اب میں اس کا آخری حصہ سنائے دیتا ہوں۔ جلدی جلدی! (اُس نے اپنی گھڑی بھی دیکھی) سوالی اُس فلائیٹ سے نہ پہنچی جس سے اُس کا ریزرویشن تھا۔ اُس نے کوئی اطلاع بھی نہ دی۔ میں نے ٹریول ایجنسی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا وہ دہلی ہی سے ہوائی جہاز میں سوار نہیں ہوئی ہے۔ میں بہت فکر مند ہو گیا۔ اُسے تار دیا۔ جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر تار دیا اور ایک مفصل خط بھی لکھا۔ اُن کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔ مجھے ایک شاک سا لگا۔ دھکا سا! میں اپنی اسٹڈیز کو فوراً ملتوی نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستان جا کر اس سے ملنے کے لئے مجھے کئی مہینے انتظار کرنا پڑا۔ اور جب میں وہاں پہنچا تو معلوم ہے وہ کہاں تھی؟"

سامرتھ نے ہم دونوں کی طرف باری باری سے دیکھا۔ بالکل پہیلی بوجھنے کے انداز میں۔ لیکن اُس کے چہرے پر ہنسی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ہماری حیرت سے لطف اندوز ہونے کی کوئی خواہش بھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں سے ایک کرب جھانک رہا تھا۔ اُس کے لہجے سے یوں معلوم ہوا جیسے اس کے اندر کی کوئی چیز ٹوٹی ہوئی ہے۔ کوئی بہت ہی نازک چیز!

بولا —— "وہ دہلی ہی میں رہ رہی تھی۔ اُسی گھر میں جو میں نے اُس کے ساتھ رہنے کے لئے کرائے پر لیا تھا جس کے سامنے ایک چوڑی سڑک تھی۔ دونوں طرف سے سایہ دار گھنے پیڑوں سے گھری ہوئی۔ میں جب ٹیکسی میں اس سڑک پر سے گزر رہا تھا تو مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ اگرچہ سوالی مجھے ریسیو کرنے نہیں آئی تھی۔ پھر بھی مجھے یقین تھا وہ اُسی گھر میں میری منتظر ہوگی!

وہ میری منتظر تو یقیناً تھی۔ لیکن اکیلی نہیں تھی۔ اُس کے ساتھ ایک اور مرد بھی تھا۔ وہ مجھ سے بہت ہی کولڈ ہو کر ملی۔ بے حد سرد مہری سے! اور اُس آدمی کو اپنا شوہر بتایا۔ میری بیوی ہونے پر بھی اُس کے ساتھ کیوں شادی کر لی۔ اس بارے میں اُس نے بہت ہی مختصر سی وضاحت دی —— "بس دل کا معاملہ!" اُس کے بعد ایک ندامت بھری مسکراہٹ! اُس مسکراہٹ کی زندگی بھی بس لمحہ بھر کی ہی تھی! اُس کے بعد وہ پلٹ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اپنے شوہر کو میرے پاس چھوڑ گئی۔ شاید اس اُمید پر کہ ہم دونوں گتھم گتھا ہو جائیں گے۔ ایک کا جبڑا مکّوں اور گھونسوں سے اپنی جگہ سے کھسکا دیں گے!

کتنی دیر تک خاموشی رہی۔ کتنی دیر تک ہم ایک دوسرے کی طرف

جس ویکھتے رہے۔ اس کے بعد میں اُٹھ کر چلا آیا۔ بغیر کسی پروٹسٹ کے۔ سوال سے نظر ملے کچھ کہنا مناسب ہی نہ سمجھا۔ ایک شدید ترین صدمے کا شکار ہو کر بھی میں نے غصہ نہ دکھایا جس طرح کے لگاؤ اور انتظار کی کیفیت میں میں مبتلا رہا تھا اُس میں غصے کی قسم کی کوئی بات ابھی نہ ہوتی۔ اس سے تو میرے جذبات کو اور ٹھیس پہنچتی! میرے دل کے اور ٹکڑے ہو جاتے!

"میں کینیڈا واپس آگیا۔ اپنی اسٹڈیز کی طرف پھر متوجہ ہونے کی کوشش کی۔ بطور انجینئر مجھے پل وغیرہ تعمیر کرنے کی کٹھن تربیت پائی تھی۔ ٹوٹے ہوئے پلوں کی مرمت کرنا بھی میری جاب میں شامل تھا۔ کیا آپ لوگوں نے ٹوٹے ہوئے پل کبھی دیکھے ہیں! پانی کے تیز بہاؤ سے یا اوپر سے اچانک بم آپڑنے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرتے ہوئے پل۔ آپ نے ضرور دیکھے ہوں گے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے تو ہمارے دیش کو دو جنگوں کا سامنا کرنا پڑا تھا! اُن جنگوں کا وقفہ اگرچہ مختصر تھا لیکن اتنے ہی میں کئی پل ٹوٹ گئے تھے۔ صدیوں کے اعتماد اور خلوص کے پل!"

وہ سگریٹ سلگانے کے لئے ذرا سا رکا۔ پھر بولا ـــــ "اُس کے بعد میں کیوں واپس دیش جاتا؟ وہاں میرا کون انتظار کر رہا ہے؟ کوئی بھی تو نہیں! ایسا معلوم ہوتا ہے اب تو میرے دیش نے بھی مجھے بھلا دیا ہے: جیسے میں وہاں کا کبھی تھا ہی نہیں!"

اچانک ریسٹوران میں ایک سفید فام خاتون داخل ہوئی۔ بہت ہی خوبصورت اور صحت مند! اُس نے جلدی ہی سنگل کو جیسے تلاش کر لیا۔ اُس کی طرف ہی لاگو سنگل بھی مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس عورت کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے سے بچے بھی تھے۔ وہ بھاگ کر 'پاپا' 'پاپا' کہتے ہوئے اپنے باپ کی ٹانگوں کے ساتھ آکر لپٹ گئے۔ وہ عورت قریب آگئی تو سنگل نے اُس کے گرد بازو کا حلقہ ڈال کر ہمیں بتایا۔ ـــــ "یہ اسٹیلا ہے! میری وائف! میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اب ہم ایکسپو دیکھیں گے۔ آپ لوگ کبھی ہمارے یہاں بھی آیئے۔ لیکن کسی ویک اینڈ کو! میں ورکشاپ میں سارا دن مصروف رہتا ہوں۔ اسٹیلا بھی ایک آفس میں کام کرتی ہے۔ بس ویک اینڈ ہی خالی رہتا ہے۔ یہ رہا میرا ایڈریس! بائی بائی!"

وہ سب ہمیں وِش کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ شیشے کی دیوار کی اُس طرف وہ بہت دُور تک دکھائی دیتے رہے۔ بھیڑ بھاڑ کے اندر بھی۔ طرح طرح کے دیش دیش کے لباسوں کے درمیان بھی! پھر اچانک وہ بیوی بچوں سمیت کھو گیا تو میں نے اور پونٹی نے ایک دوسرے کی طرف ایک عجیب سی حیرت سے دیکھا۔

میرے ہاتھ پر پونٹی کے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ ... کی شکوٹ گہری ہو گئی۔ آج گہری ... ساتھ!

# غزل

ضیا فتح آبادی۔ ایم۔ اے

ناممکن ہے بیتے لمحے واپس آئیں سوچ رہا ہوں
آج کے بعد جو آئے گی اُس کل کی باتیں سوچ رہا ہوں

خون سے کتنے ارمانوں کے غم کی مانگ بھر جاتی ہے
کتنی رہ جاتی ہیں اُمیدیں گھٹ کر دل میں سوچ رہا ہوں

تیری جفا کا شکوہ نہیں ہے، میری وفا کا رونا ہے یہ
عہدِ جوانی میں کھائی تھیں کیا کیا قسمیں سوچ رہا ہوں

جب تو میرے پاس نہیں ہے کانٹا ہے پھولوں کی مہک بھی
آتی جاتی رہتی ہیں کیوں صبحیں شامیں سوچ رہا ہوں

اُلفت کی اُس منزل میں ہوں ہوش نہیں دین و دنیا کا
دیکھو میرا حال، نہ پوچھو کیا کیا سوچیں سوچ رہا ہوں

ڈوبتا سورج، بڑھتے سائے، دشتِ تنہائی، روتا دل
کیا ہو اگر ایسے عالم میں وہ آجائیں سوچ رہا ہوں

کب سے رستہ روکے کھڑی ہیں کب تک آگے بڑھ نہ سکوں گا
کب نکلے گا دن کب ٹوٹیں گی دیواریں سوچ رہا ہوں

تاج محل کے خوابوں میں کیوں میری محبت بھی کھو جائے
کالے ناگ اُمیدوں کے کیوں مجھ کو ڈسیں سوچ رہا ہوں

میری وہی منزل ہو شاید کانٹوں کی اِس راہگذر میں
تھک کر تو بیٹھیں گی کہیں چلتی سانسیں سوچ رہا ہوں

ساحل دُور، ہوائیں اُلٹی، موجیں بپھری تو بھی ضیا ہم
انساں ہو کر کیوں جی چھوڑیں، ہمت ہاریں سوچ رہا ہوں

# وظیفۂ غمِ دل

پروفیسر زکی انور ۔ ایم ۔ اے

کریم سٹی کالج جمشید پور

یکم ستمبر ۶۷ء

بھائی جان! تسلیم

. . . اور اب "وظیفۂ غمِ دل" ملاحظہ فرمایئے۔ اُمید ہے کہ آپ ضرور پسند فرمائیں گے۔ یہ "وظیفہ" صوفیوں اور عبادت گزاروں کا وظیفہ نہیں ہے بلکہ STIPEND کا ترجمہ ہے اور "غمِ دل" مجازؔ کے مصرعے ؎

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

سے لیا گیا ہے۔ اِس افسانے کا پلاٹ ایک حقیقت پر مبنی ہے لیکن اگر میں اُس حقیقت کا تذکرہ کروں گا تو سب افسانہ بے لطف ہو جائے گا۔ صرف اتنا عرض کر دوں کہ اِس افسانے کے قبلہ نواب صاحب، نوشاد کے نام سے ہمارے دوستوں میں تھے اور بہت دلچسپ دوست تھے، لیکن جب بظاہر ملک اور دراصل دل کاٹ کر الگ الگ کئے جانے لگے تو ہماری محفل کا دل نوشاد پاکستان کے حصّے میں پڑ گیا! . . .

آپ کا ——— زکی انور

---

(۱)

محترم پرویز صاحب! تسلیم

پتہ نہیں آپ کی دی ہوئی قسم پر عمل کر کے میں نے آپ کے کتنے محبت نامے نذرِ آتش کئے۔ لیکن جب سے میں آپ کے خط حفاظت سے رکھنے لگی ہوں اب تک آپ کے اکیس خط جمع ہو چکے ہیں۔

آپ کے خطوں میں ایک ہزار شکایتیں ہیں۔ لیکن اُن میں سے بظاہر صرف ایک شکایت میں رفع کر رہی ہوں۔ لیجئے اب تو آپ خوش ہیں کہ میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں! خط نہ لکھنے کی شکایت تو رفع ہو گئی نا؟

اب رہیں باقی نو سو ننانوے شکایتیں! مجھے یقین ہے کہ وہ شکایتیں بھی اِسی خط کے ذریعے رفع ہو جائیں گی۔

بیشک میں کالج میں پڑھتی ہوں پرویز صاحب! اور اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ میں کالج کے ڈراموں میں اہم رول کیا کرتی ہوں۔ لیکن اِن باتوں سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ میں رومان لڑاتی پھروں اور درجنوں دل پھینک نوجوانوں کو خط لکھا کروں!

پرویز صاحب! میں ایک شریف، مہذب اور باعزت گھرانے کی لڑکی ہوں اور اکثر لڑکیوں سے بالکل مختلف۔ بے شک آپ کی یہ پیش گوئی بھی درست ہے کہ کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی سے میری شادی بھی ضرور ہوگی۔ اِس سلسلے میں عرض ہے کہ میرے گھر میں میرے سپردِ گھر کا صرف یہ کام ہے کہ میں گھر کے تقریباً ایک درجن بچّوں کی تعلیم کا انتظام کروں اور اُن میں سے اکثر کو گھر پر بھی ٹیوشن دوں۔ شادی بیاہ کا پورٹ فولیو ابّا جان اور امّی جان کے سپرد ہے اور میں یہ حماقت ہرگز نہیں کر سکتی کہ اُن کا کام اپنے ذمّے لے لوں کیوں کہ وہ لوگ بھی میرے پورٹ فولیو کا کام کبھی نہیں کرتے۔ ایک دن شہزو ایک شعر کا مطلب پُوچھنے امّی جان کے پاس چلی گئی تو اُنھوں نے ڈانٹ دیا کہ روحی سے پُوچھو۔ اور میرا تو پُر خلوص مشورہ یہ ہے کہ آپ بھی میری شادی کی فکر میں صحت خراب نہ کریں اور دُبلے نہ ہوں۔

آپ نے فرمایا ہے کہ "عشق حُسن کو جلا بخشتا ہے"۔ جی نہیں میں آپ سے ہرگز متفق نہیں ہو سکتی۔ میں تو حُسن کو جلا بخشنے اور حُسن کی افزائش کے لئے اپنے سنگھار میز پر ہی بھروسہ کر سکتی ہوں جس پر دُنیا کے مانے ہوئے اسنو، پاؤڈر، کریم اور روز وغیرہ موجود ہیں۔ میں ان کے علاوہ کسی اور الّم غلّم چیز کا استعمال نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ امّی جان جب مہندی لگانے کے لئے بضد ہو جاتی ہیں تو میں رو پڑتی ہوں اور وہ مجھے

بخش دیتی ہیں۔

آپ نے اپنے کئی خطوں میں لکھا ہے کہ اگر میں نے آپ پر نظرِ کرم دی تو آپ فیل ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے پرویز صاحب! کہ آپ کے فیل پاس ہونے سے مجھے کیا؟ لیکن نہیں۔ . . آپ میرے کالج کے طالبِ علم ہیں اور کالج کو میں ایک خاندان سمجھتی ہوں اس لئے آپ بھی خاندان کے ایک فرد ہوئے اور آپ کے فیل ہونے کا مجھے بھی بے حد ملال ہوگا۔ اس لئے میں نے آپ پر نظرِ کرم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں صبح کے سات بجے سے ساڑھے نو بجے تک بچوں کو ٹیوشن دیا کرتی ہوں۔ آپ بھی تشریف لے آئیں اور آپ کا جو سبجیکٹ کمزور ہے، مجھ سے پڑھیں جس کے لئے میں ٹیوشن فیس بھی نہ لوں گی۔

براہِ کرم اب خط لکھنے کی زحمت گوارا نہ کریں اور اگر میرا یہ خط پڑھ کر آپ نے ہتک محسوس کی ہے تو مجھے معاف کر دیں۔

مخلص ——— ریحانہ

——— (۲) ———

میری ریتو! خوش رہو

تمھیں اس بات کا ملال ہے کہ تمھاری برسوں کی تپسیا بھنگ ہو گئی اور [illegible] نے تمھارے دل کا پتھر پگھلا ہی دیا۔ چلو قصہ ختم ہوا۔ لیکن ذرا میری حالت پر غور کرو ریتو اور سوچو کہ میں کیسے کرب میں پھنس گئی ہوں۔ ہائے ہائے اگر کوئی پتھر کو پتھر جانتے ہوئے بھی خواہ مخواہ اُس پتھر سے اُمیدیں وابستہ کر کے اُس کی پوجا کرنے لگے تو سب جانے پتھر پہ کیا گزر سکتی ہے۔

ریتو ——— میری جان! تم یہ سن کر یقیناً بے ہوش ہوتے ہوتے بچو گی کہ جس دن میں نے پرویز صاحب کو خط لکھا تھا اُس کے تیسرے ہی دن میں نے اپنے کمرے سے جھانک کر [illegible] روم میں ابا جان کسی سے گرج گرج کر باتیں کر رہے تھے اور اُن کی باتوں میں اکثر میرا نام بھی آ رہا تھا۔ اس لئے میں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی اور یہ دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی کہ پرویز صاحب ٹھیک ایک پڑھاکو اسکول بوائے کی طرح اپنے سینے سے کچھ کتابیں اور کافی نوٹ بکس لگائے کھڑے تھے اور ابا جان اپنی مخصوص گرج دار آواز میں اُن سے اُن کی چودھری پوچھ رہے تھے۔ میرے ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی ابا جان نے مجھ سے اُن کے بیان کی تصدیق چاہی کہ میں نے ہی انھیں پڑھنے کے لئے بلایا تھا اور سچویشن کچھ ایسا تھا ریتو کہ مجھے کہنا ہی پڑا کہ ہاں میں نے ہی انھیں بلایا تھا!

اور اب ریتو! ہائے میں کیا بتاؤں، وہ روزانہ صبح کے سات بجے پہنچ جاتا ہے اور گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ ساڑھے نو بجے تک بہت محنت سے پڑھتا رہتا ہے۔ بہت حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ٹھیک دوسرے بچوں کی طرح میں اُسے ڈانٹتی بھی ہوں لیکن وہ کچھ نہیں بولتا۔ میں نے اُسے پریشان کرنے کے لئے بڑے لمبے لمبے ٹاسک دینا شروع کر دیے لیکن کمال ہے کہ وہ [illegible] تو یہ ہو گئی کہ ایک دن میں نے اُس سے [illegible] دوسرے بچوں کی طرح اُنھیں بھی مُرغا بنا دیں گے! اِس [illegible] بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ لیکن اُس کم بخت کا چہرہ [illegible]

سوچو میری حالت کیسی قابلِ رحم ہے۔ اب میں [illegible] میں نہیں آ رہا ہے کہ دسہرے کی چھٹی میں خالہ جان کے پاس بھاگ جاؤں۔

مہربانی کر کے تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ نجات کی۔

تمھاری ——— [illegible]

——— (۳) ———

مخدوم و مکرم کرنیل صاحب! تسلیمات

گزارش خدمت یہ ہے کہ میں جس وقت پہنچتا ہوں آپ اپنے دوست چترویدی جی کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوتے ہیں اور میں بھی شطرنج کا رسیا ہوں۔ اس لئے بخوبی جانتا ہوں کہ شطرنج کھیلتے وقت اگر کوئی ڈسٹرب کرتا ہے تو گولی مار دینے کو جی چاہتا ہے اس لئے میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور یہ درخواست حضور کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اُستانی جی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ دسہرے کی چھٹیوں میں اپنی خالہ جان کے پاس آگرے تشریف لے جا رہی ہیں۔ آپ کو علم ہوگا حضور کہ دسہرے کی فوراً بعد ہی ٹسٹ ہوگا اور اگر میں ٹسٹ میں کامیاب نہ ہو سکا تو پھر فائنل کے امتحان میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ اُستانی جی کے اور آپ کے احسان سے میں دبا ہوا ہوں مہربانی کر کے میری زندگی کی خاطر ایک احسان اور کیجئے حضور کہ مجھے بھی اُستانی جی کے ساتھ آگرے جانے کی اجازت دے دیجئے۔ وہاں میرے ماموں جان کی کپڑے کی بہت بڑی دکان ہے، میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں آگرے میں اپنے ماموں جان کے ہاں قیام کروں گا اور اُستانی جی کی خالہ جان پر ہرگز ہرگز بوجھ نہ ہوں گا۔

مجھے اُمید ہے حضور کے دربار سے میری درخواست مایوس نہ لوٹے گی۔

آپ کی نظرِ کرم کا محتاج ——— پرویز

——— (۴) ———

پرویز صاحب!

بچوں کے سامنے میں نے آپ کو کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا لیکن [illegible] اب میرے ضبط کی حد ہو چکی ہے۔ ابا جان کے ساتھ شطرنج کھیل کھیل کر آپ [illegible] آپ نے انھیں اپنا ہمدرد بنا لیا ہے تو آپ مجھے زیر کر لیں گے۔ اس [illegible] پرویز صاحب! آپ کی اصلیت ابا جان کے نزدیک بے نقاب [illegible]

ڈیئر بیا جی! بھیجے ہیں پاس محفوظ ہیں۔ ان کے کان کھول کر سُن لیجئے اگر آپ اگست تشریف نہ لائے تو پھر مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا اور یقیناً میں آپ سے کبھی بات نہ کروں گی کہ ... لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ میرے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھے ہوئے سارے الفاظ پڑھ لیں گے۔

ریحانہ ————

———— (۵) ————

باجی ڈیئر! تسلیم

آپ کا خط مل گیا تھا اور یقیناً آپ کو میرے جواب کا انتظار رہا ہوگا لیکن خط لکھنے میں اِس لئے دیر ہو گئی کہ روحی آپا آگئی ہیں اور ہم سب دن رات بس اُچھل کود کرتے رہتے ہیں۔ کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا۔ اِتنے دنوں کے بعد روحی آپا آئی ہیں۔ انھیں ایک پل کے لئے بھی چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ آخر وہ ہیں بھی تو روحی آپا۔ سارا گھر قہقہوں سے گلزار بنا رہتا ہے۔ کاش آپ ایک آدھ ہفتے کے لئے بھی آجائیں تو مزہ آجائے۔ بے چاری آجکل بیڈ منٹن کھیل نہیں سکتیں۔ کبھی ہمت کرکے ریکٹ ہاتھ میں لیتی ہی ہیں کہ امّی جان آموجود ہوتی ہیں اور اُن کے ہاتھ سے ریکٹ چھین لیتی ہیں۔ اِس لئے ہم صرف تین ہیں۔ بچّوں کو ساتھ لے کر کیا کھیلا جائے؟ روحی آپا نے بھائی جان کی لاکھ خوشامدیں کیں لیکن بھائی جان بھلا کیوں لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے لگے۔ آپ آجائیں تو اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، ہم جم کر بیڈ منٹن تو کھیل سکتے ہیں!

ارے ہاں۔ ایک بات تو میں نے بتائی ہی نہیں۔ روحی آپا اپنے ساتھ ایک عجیب و غریب چیز لے کر آئی ہیں۔ وہ چیز بظاہر ایک خوبصورت سا نوجوان طالب علم نظر آتا ہے لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، وہ جو بھی ہو آدمی نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہوگا چوک پر جو کپڑے کی ایک بڑی سی دُکان ہے جہاں سے ایک بار ہم نے کچھ کپڑے خریدے تھے، اُس دکان کے سامنے ہی ہم نے مٹھائیاں کھائی تھیں۔ بہرحال وہ چیز جس کا میں تذکرہ کر رہی ہوں اور جس کا نام پرویز ہے، اُسی کپڑے کی دُکان کے مالک کا بھتیجا ہے۔ روحی آپا کے کالج میں بی۔ اے فائنل کا طالب علم ہے اور گو روحی آپا بھی بی۔ اے فائنل ہی میں ہیں لیکن اُسے ٹیوشن پڑھایا کرتی ہیں۔ پرویز میاں نہایت ہی خاموشی سے صبح کے سات بجے بغل میں کتاب دبائے آتے ہیں اور نو بجے تک روحی آپا کو بور کرنے کے بعد ویسی ہی خاموشی کے ساتھ اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوتی ہے کہ روحی آپا اُس بیچارے بے زبان کے جانور پر اسی طرح برسا کرتی ہیں جیسے وہ تیسرے چوتھے درجے کا کوئی لڑکا ہو۔ لیکن کمال ہے کہ وہ چوں تک نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے روحی آپا اُس سے بیزار ہیں لیکن وہ اُسے پڑھاتے رہنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ وہ خالو جان کا چہیتا ہے اور اُن کی اجازت پر آگرے گیا ہے۔ وہ کچھ بھی ہو لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہے کہ وہ عشق کا مریض نہیں۔ میں نے کئی بار اُس کی خوشامد کی کہ وہ ہمارے ساتھ بیڈ منٹن کھیلنے آیا کرے لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا۔

عجیب چیز ہے وہ اور ہم سب کے لئے معمّہ بنا ہوا ہے۔ آپ کم سے کم دُنیا کا وہ عجوبہ دیکھنے کے لئے تو آجائیے۔

دولھا بھائی کو آداب، نمو اور چندا کو پیار۔

آپ کی ———— نشاط

———— (۶) ————

رینو ڈیئر!

تمھارا خط ملا۔ یہ سُن کر بے حد خوشی ہوئی کہ تمھاری ناؤ پار لگنے والی ہے۔ شادی بہرحال ایک کارآمد چیز ہے جس کے بعد بہت سے ہنگامے ازخود ختم ہوجاتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اشوک تمھارا سچا شریکِ زندگی ثابت ہو۔

میری مصیبت تو پوچھو، میری رینو! میں نے خود بخود اپنی جان آفت میں پھنسائی ہے۔ جو بدنامی میری امّی کی جنت سے پاکسی اورسے پیار کرکے ہوتی، وہی آج بھی ہو رہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ابّا جان کو مجھ پر کسی طرح کا شک نہیں۔ لیکن یہاں میری خالہ زاد بہنیں، بھائی، بھائی کی بیوی، خالہ جان اور خالو جان سب کو یقین ہوگیا ہے کہ پرویز میاں سے مجھے اتنا پیار ہے کہ میں پڑھانے کے بہانے اُنھیں ساتھ لے آئی ہوں۔ خالہ جان بتا رہی تھیں کہ میری اپنی امّی جان بھی کچھ دال میں کالا محسوس کرتی ہیں۔ اب تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے، مرکے ہی مجھے اِس اذیّت سے چھٹکارا ملے تو ملے ———— یا پھر ایک دن یہ کروں گی کہ پرویز میاں کو لے کے کسی قاضی کے پاس پہنچوں گی اور آنکھیں بند کرکے اور کلیجہ پر پتھر رکھ کے اُس کمبخت سے نکاح کرلوں گی۔ دردکی انتہا ہوگئی۔ میرے بچپن ہی سے خالہ جان یہ چاہتی تھیں کہ میں بڑی ہوکر اُن کی بہو بنوں اور امّی کو بھی اسلم سے میرا رشتہ پسند تھا۔ اِس بار خالہ جان نے بہت زور دے کر اسی لئے مجھے یہاں بلایا تھا کہ مجھے دیکھیں میں جوان ہوکر کیسی لگتی ہوں اور سچ پوچھو رینو، تو اسلم مجھے بھی پسند ہیں۔ لیکن میری ہم راز خالہ زاد بہن نشاط مجھے بتا رہی تھی کہ پرویز صاحب کو میرا پڑھانا نہ خالہ جان کو پسند ہے اور نہ اسلم صاحب کو۔ یہ اُلّو کا پٹھا، پرویز کا بچہ یقیناً میری جان لے کر مجھے چھوڑے گا۔ اُف میں کیا کروں؟

تم نے تو ایسی تدبیر بتائی ہے کہ اُس سے کہیں بہتر ہے کہ میں کچھ کھا کر سو جاؤں۔ بھلا اُس جانور سے بھی کوئی شادی کرسکتا ہے!

خدا کرے تمھاری ناؤ جلد کنارے لگ جائے۔ میرا کیا ہے میں نے تو خود ہی اپنی کشتی گرداب میں ڈال دی ہے۔ انجام ظاہر ہے۔

تمھاری ———— ریحانہ

———— (۷) ————

ڈیئر سلطان!

تمھارا خط ملا۔ گھبراؤ نہیں پیارے فتح یقیناً میری ہوگی۔ طوفتہ راکیش اور

[illegible]

میاں کا لیکن ... اقبال ... [illegible] ... کر دیا تھا

[illegible] شک ہے کہ ... [illegible]؟

پرسوں ریحانہ! میری ایک کتاب میں ایک پرچہ رکھ دیا تھا جس میں لکھا تھا۔

"اگر آپ کو مجھ سے ذرا بھی [illegible] ہے تو مجھے خودکشی
سے بچا لیجئے اور چند دن [illegible] آپ کو نہیں معلوم [illegible] کیا
سے کیا چھپتے ہیں۔ بدنامی کی زندگی سے میں موت کو بہتر سمجھتی ہوں
اور اگر آپ نے مجھے صاف نہ کہا تو میں خود [illegible] کر لوں گی۔"

کل سے میں نے پڑھنے جانا ترک کر دیا ہے۔ [illegible] بہت عجیب باتیں ہوتی ہیں۔ کیوں جانے کی کچھ کر بیٹھے۔ لیکن وہاں پہنچے تو [illegible] کرنل صاحب کے ساتھ شطرنج کھیلنا شروع کر دوں گا اور پھر ظاہر ہے کہ میری پڑھائی شروع!

پلنگوں کو پیار!

تمہارا اپنا ——— پرویز

(۸)

پرویز صاحب! تسلیم

ہو سکتا ہے آپ سے بھی میں نے خودکشی کے بارے میں [illegible] سوچا ہو، لیکن میں تنہا گھر اور [illegible] کو نہایت ہی ایمانداری سے عرض کر رہی ہوں کہ اب میں پچھلی زندگی اور آپ کی ملاقات سے بالکل عاجز آ گئی ہوں۔ آپ یہ سوچئے کہ [illegible] آپ سے کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن یہ تو بہرحال ڈوب مرنے کی بات ہے کہ میری [illegible] جان [illegible] پر شک کرنے لگی ہیں۔ اگر آپ کل بھی پڑھنے آئے تو پرسوں صبح آپ کو میرے جنازے میں شریک ہونا پڑے گا!

——— ریحانہ

(۹)

ریحانہ صاحبہ! تسلیم

روایتی عاشقوں کی طرح کھڑکی سے یہ خط پھینک کر میں بے حد شرمندہ ہوں لیکن سخت مجبوری تھی۔ آپ کے گھر کے حالات بے شک خراب ہو چکے ہیں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ پڑھنے کے وقت کے علاوہ آپ سے ملنا مناسب نہیں۔ شام کو میں کرنل صاحب کے ساتھ شطرنج کھیلنے تو ضرور آؤں گا۔ لیکن اُس وقت بھی خط دینے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اسی لئے انتہائی مجبوری طور پر آپ کو یہ خط بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ معاف کر دیں گی۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ سارا خط پڑھنے کے بعد آپ کو یقیناً معاف کرنا ہو گا مجھے۔

میم صاحب! اُٹھتے، عشق وغیرہ لغویات کے معاملے میں ہزار بار آپ سے کہہ

گیا ہوں ... ہے۔ آپ عشق سے اتنی نفرت کر ہی نہیں سکتیں جتنی میں کرتا ہوں۔ اگرچہ میں میں نے محسوس کیا تھا کہ اسلم صاحب کے لئے آپ کے دل کے کسی گوشے میں کچھ نرمی ضرور تھی۔ لیکن بندے نے تو کبھی کسی حسین سے حسین لڑکی کے لئے بھی کچھ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

لیکن اب تک میں اتنے ہنگامے کیوں کرتا رہا؟ کیا آپ کی قربت حاصل کرنے کے لئے؟ ——— اجی لعنت بھیجئے ایسے خیال پر بھی!

حضور! ان ساری حماقتوں کے جواب دہ آپ کے کالج کے ایم۔ اے فائنل کے میاں نواب احمد خاں ہیں، جنہیں ہم سب قبلہ نواب صاحب کہتے ہیں۔ کم سے کم نام سے آپ بھی واقف ہوں گی اور اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوں گی کہ بڑے باپ کا وہ اکلوتا بڑا بیٹا دولت سے اندھا ہے اور اپنی دولت بہت دلچسپ باتوں میں خرچ کرتا ہے مثلاً ۶۵ء میں انہوں نے یوم منتو منایا تھا اور اعلان کیا تھا کہ جو طالب علم زیادہ سے زیادہ [illegible] اور خالی بوتلیں جمع کرے گا، اُسے تین برسوں تک پچاس روپے ماہوار کا وظیفہ دیا جائے گا۔ آپ معلوم کر سکتی ہیں کہ آپ ہی کا ہم جماعت (میرا بھی) سعید الزماں ہر ماہ پچاس روپے فیضیاب کیا جا رہا ہے۔ گزشتہ سال قبلہ نواب صاحب نے یہ اعلان کیا کہ یادگار غالب کے طور پر اُس طالب علم کو پچاس روپے ماہانہ کا وظیفہ دیا جائے جو اچھے سے اچھے کاغذی پیرہن میں ملبوس کسی دن کالج آئے گا۔ اور اس وظیفے سے سردار درشن سنگھ فیضیاب ہو رہا ہے۔ جس کمبخت نے پگڑی تک کاغذ کی باندھ لی تھی! ——— اور محترمہ ریحانہ صاحبہ! نہایت ہی دست بستہ عرض ہے کہ اس سال قبلہ نواب صاحب نے سو فیصدی اپنے خرچ سے نہایت ہی شاندار طور پر [illegible] منایا۔ یقیناً آپ بھی اس میں شریک تھیں۔ لیکن آپ کو اس بات کا علم نہ ہوگا کہ جلسے کی تقریبات ختم ہونے کے بعد دوستوں کی خاص محفل میں قبلہ نواب صاحب نے "غم دل وظیفہ" کے عنوان سے سو روپے ماہوار کے ایک وظیفے کا اعلان کیا اور یہ وظیفہ اُس طالب علم کو دیا جانے والا تھا جو زیادہ سے زیادہ دنوں تک کسی لڑکی سے عشق کرتا ہے لیکن عشق میں کسی قسم کی گندگی پیدا نہ ہو اور نہ اُس کا اختتام شادی پر ہو۔

اور اب ——— اور اب میم صاحب! سارے کھلاڑی ڈس کوالی فائی ہو چکے ہیں۔ ایک میں ہوں جو سارے میدان میں دوڑ لگا رہا ہوں۔

اس لئے درخواست ہے کہ ایک طرف میری غریبی پر نظر کیجئے کہ میں ماموں جان سے صرف چالیس روپے ماہوار پا کر ٹھوکوں مر کر پڑھ رہا ہوں اور دوسری طرف ایک سو روپے کا ماہوار وظیفہ ایم۔ اے پاس کرنے تک!

خدا کے لئے آپ مجھے صرف اور صرف مزید تین دنوں تک پڑھا دیجئے۔ چوتھے دن انعام کا اعلان ہو نا ہے اور پھر قصہ پاک ہو جائے گا! آپ میرے دیا بتک کو ترسیں گی! گھبرایئے نہیں ریحانہ صاحبہ! فرض کیجئے کہ اتنے دنوں میں اگر میرے دل میں

آپ سمجھتے کہ آپ کے دل میں میرے لئے کوئی Soft Corner پیدا ہی ہوا ہے تو ہماری شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ "غم دل وظیفہ" میں شرکت کی ایک واضح شرط تھی کہ قبلہ نواب صاحب کی زندگی میں اگر وظیفہ یافتہ نے اپنی محبوبہ سے شادی کر لی تو وظیفہ کی ساری رقم ضبط ہو جائے گی!

اور اب میں پھر عرض کروں گا کہ میں آپ کی نظر کرم کا بھکاری ہوں۔

بھکاری ———— پرویز

—————— (۱۰) ——————

(ایک سرٹیفکیٹ کی نقل)

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

مجاز

لیکن اپنے دوست جناب پرویز اختر کو "غم دل وظیفہ" کا وثیقہ عطا کرتے ہوئے میں تصدیق کرتا ہوں کہ پرویز صاحب نہ تو کالج کی حسینہ مس ریحانہ روحی پر مرے اور نہ انھیں شباب کے بدلے موت آئی، پھر بھی پانچ مہینے اور ستائیس دنوں تک یاروں کے کلیجے پر سانپ لوٹتا رہا!

پرویز صاحب نے نہایت بیتابانہ انداز میں [illegible]
اور شاعرِ رومان مجاز کے شعر کی تصدیق کر دی۔

یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ
تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں

پرویز صاحب کو حقیر فقیر نواب احمد خاں کی دعا پہنچے!

دستخط:- نواب احمد خاں

(مرحوم نواب صاحب)





مس [illegible] ایم اے، بی ایڈ

چمن میں [illegible] بہاروں کی شمعیں
سرِ بزم جیسے مزاروں کی شمعیں

ہمارے یہ نقشِ قدم اے محبت
بنیں گے تری رہگزاروں کی شمعیں

چمن میں ہے جشنِ بہار و چراغاں
یہ غنچے یہ گل، شاخساروں کی شمعیں

نہ تھی ہم سے پہلے بہار اس چمن میں
ہمیں نے جلائیں بہاروں کی شمعیں

کہاں بحرِ آلام و تاریکیٔ شب
کہاں جھلملاتی کناروں کی شمعیں

ہمیں داغِ دل اپنے روشن کریں گے
نہ دکھلائیں آنکھیں سہاروں کی شمعیں

رکھیں گی یہ اے ہند دنیا کو روشن
تری عظمتوں کے مناروں کی شمعیں

فروزاں ہیں آنکھوں میں اس طرح آنسو
درخشاں ہوں جیسے ستاروں کی شمعیں

یہ شمعیں شبستانِ عشرت کی اسما
بجھاتی ہیں کتنے مزاروں کی شمعیں

سیّد حجاب ترمذی

ترے حسین تصور نے جب کلام کیا
فرازِ ارض و سما نے مجھے سلام کیا

یہ حُسنِ دیدۂ میگوں کا احترام کیا
تمام عمر کے تقوے کو نذرِ جام کیا

ہر اک نگاہ ہے رقصاں ہر اک خیال ہے مست
ترے حجاب نے جلووں کو اور عام کیا

دیارِ حُسن و محبت میں روشنی کے لئے
لہو سے دل کے فروزاں چراغِ شام کیا

سرِ چمن کہیں دامن نہ تھام لیں کانٹے
گلوں کو میں نے بہت دور سے سلام کیا

اس احتیاط کے قرباں کہ تیری نظروں نے
نہ اجتناب نہ مجھ سے کوئی کلام کیا

نفس نفس پہ تری یاد خضرِ راہ ہوئی
قدم قدم پہ ترے غم کا احترام کیا

ہزار تلخ نوائی سہی مگر ناصح
مری نوا نے زمانے کو تیز گام کیا

ہزار جلوۂ کون و مکاں سے بچ کے حجاب
مری نظر نے رُخِ دوست پہ قیام کیا

غزلیں


بون
انسٹنٹ کافی
کیف انگیز
ذائقے والی
BON
" واہ وا...
یہ ذائقہ - یہ خوشبو - یہ لطف بس
بون ہی ہو سکتی ہے "

# بند تالے

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر ایم۔ اے (آنرز) پی۔ ایچ۔ ڈی
ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ نمبر ۱۴

۱۴ ستمبر ۱۹۶۷ء

تنری تونسنر صاحب بتسلیم

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ بعد از مدت "بیسویں صدی" کی محفل میں شریک ہو رہا ہوں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ زمانہ جدید شہادت۔ جیسے زمانہ وحشی تک مطالعے میں انجھا رہا۔ خیریت یہ رہی کہ کشمکش کے سخت دور میں سے گزرنے کے بعد مخاری کے غیر مطبوعہ اور مطبوعہ مسودات پر مبنی اب اس مطالعے کو عہد مغلیہ میں جرم و سزا کے عنوان سے (انگریزی زبان میں) کتابی شکل میں شائع کرانے میں کامیاب ہو سکا ہوں ... اور ابھی سے اب قدرے آزاد ہوں۔ نتیجہ کے طور پر آزاد ہند کے ایک قومی خدمت گزار کا ایک علمی اور عملی کارنامہ "بیسویں صدی" کے قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ وہ تھے سے اس بات پر متفق ہوں گے کہ کوئی ایثار کے جذبہ سے تڑپنے والے مادر وطن کے ان نام نہاد سپوتوں نے ضرورت سے زیادہ خدمت کر کے بے چاری ماں کا حلیہ ہی بگاڑ دیا ہے۔ ایسے ہی لوگ اقتدار کی گدی سنبھالے بیٹھے ہیں اور نت نئے تجربات کر کے ماں کی حالت کو خراب تر بناتے جا رہے ہیں۔ جب تک کہ عوام کلی طور پر بیدار نہیں ہوں گے یہ لوگ اپنی من مانی کرتے اور اہل قوم کے لئے ایک زبردست چیلنج پیش کرتے رہیں گے ...

آپ کا ــــــــ ست پرکاش سنگر

---

"جہاں تک پنچایتوں کا تعلق ہے، ہم نے خاطر خواہ ترقی کر لی ہے ۔

کیسے ؟"

"ہر اعتبار سے" پنچایت منتری نے جواب دیا" لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ ہم نے پنچایتوں کو عقلمند توہمات سے مبرا کر دیا ہے ۔"

"مثلاً ؟" سکیول کرشن شرما نے پوچھا۔

"مثلاً تعلیم کے وہم سے" ٹھاکر صاحب نے جواب دیا۔

گیول کرشن نے بلدیو کرشن کی طرف اور ان دونوں نے میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا لیکن میں نے ان کی چال میں نہ آنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ میں نے اپنی نگاہ منتری جی کے چہرے پر جمائے رکھی۔ لال سرخ چہرہ تھا۔ سر پر کشتی نما ٹوپی تھی۔ آنکھوں پر [illegible] عینک کو دیکھنے سے یوں احساس ہوتا تھا کہ پڑھنے کے لئے انہیں [illegible] گردن کی اکڑ اس حقیقت کا صاف اعلان کر رہی تھی کہ اس مکمل سٹیج پر پہنچنے کے لئے اسے برسوں کی پریکٹس میں سے گزرنا پڑا ہے۔ ان کا جسم ایک شاہ کی شے سے ایکدم پاک تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی گردن میں سے گزرتی ہوئی سر کے پچھلے حصے تک چلی گئی ہے اور گردن کو ایک ہی حالت میں رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ بغور دیکھنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہو جاتا تھا کہ وہ اسپرنگ کی کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ اسپرنگ ڈھیلے ہونے کی وجہ سے کرسی نیچے کو سرک جاتی جسے وہ ایک چابی گھما کر اوپر کر لیتے۔ لیکن وہ کمال ہوشیاری سے چابی کو آہستہ آہستہ گھماتے اور ساتھ ہی جسم کو حرکت دیتے۔ عام ملاقاتی یہ سمجھتا کہ جسم کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں مصروف کار ہیں لیکن باریک بین اصابت کو بھانپے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جہاں قدرت نے منتری جی کو اتنی بڑی پوسٹ اور اسپرنگ کی کرسی پر بیٹھنے کی عزت عطا کی تھی، وہاں قد عنایت کرتے وقت قدرے بخل سے کام لیا تھا۔ قد میں چار پانچ انچ اضافہ ہونے سے قدرت کے خزانے میں کمی پڑنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن یہاں حالات میں کتنا فرق

## آنکھیں

نیند آ رہی ہے جو اُن کو آنکھیں جھپک رہی ہیں
پسند [illegible] ہے میرا شراب خانہ — اختر شیرانی

آنکھوں [illegible] ہے چُپ چُپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے — جگر مرادآبادی

کس کی آنکھیں دمِ آخر مجھے یاد آتی ہیں
دل مرقع ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کا — فانی

آ جا کہ اب تو آنکھ میں آنسو بھی آ گئے
ساغر چھلک اُٹھا مرے صبر و قرار کا — شکیل بدایونی

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے — یگانہ چنگیزی

مرسلہ:- ایس۔ ایس۔ ھنتکاری، ایم اے، کلکتہ

پڑھتا تھا۔ وہ اس حقیقت سے نا آشنا نہیں تھے کہ قدرت کے ہاں انصاف کے سوا سبھی کچھ ہے۔ انصاف ہوتا، انھیں دوسرے وزیروں کی طرح دراز قد عطا کرنے میں کنجوسی سے کام کیوں لیا؟ انھیں ایسے ذرائع کیوں مہیا نہیں کئے کہ وہ مڈل سکول تک ہی تعلیم پوری کر سکتے؟ ان کی قسمت میں چالیس سال کی عمر تک چپراسی گیری ہی کیوں لکھی تھی؟ یہ درست ہے کہ وہ منتری کے عہدے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن اس میں قدرت کو نہیں، ان کی اپنی لیاقت کو دخل حاصل تھا جسے عام بول چال کی بھاشا میں تکڑم کہا جاتا ہے۔ قدرت کی اس زیادتی کا بدلہ ٹھاکر زبجے سنگھ اس کے بندوں سے لیتے۔ ان کی نظر میں خود کو ہمیشہ برتر دکھانے کی کوشش کرتے۔ پیدل چلنا اپنی توہین سمجھتے۔ کیڈی لاک کار میں جاتے اور پچھلی سیٹ پر دو گدیاں رکھ کر بیٹھتے۔ پبلک لیکچر دیتے وقت پلیٹ فارم کے اوپر ایک چوکی پر کھڑے ہو کر بولتے۔ دفتر میں ملاقاتیوں سے بات کرتے وقت اسپرنگ والی کرسی پر بیٹھے ایسے معلوم ہوتے جیسے اُن کا قد پانچ فٹ سے نہیں، چھ فٹ سے کچھ انچ زیادہ ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں سے انھیں خاص چڑ تھی۔ اپنی ادھوری تعلیم کا ان سے ہر موقعے پر بدلہ لیتے۔ ان کی برتری کا ایک مخصوص انداز ہم نے بھی ملاحظہ کیا۔ ان کا چپراسی ہمارے لئے چائے کے تین پیالے اور ان کے لئے مُوگرام [illegible] سے بھرا ہوا گلاس لایا۔ بلدیو کرشن ورما نے ازراہِ حیرت اُن سے [illegible]

[illegible]
[illegible]

"بادام والا؟"

"بادام والا دودھ؟"

ہم تینوں کی زبان سے یہ لفظ نکل نہیں سکا۔

عوام تو بادام کی شکل تک کو بھول گئے ہیں [illegible] ان کی گرانی ہی کا علم ہے۔ دودھ میں بادام ہوں کہ نہیں [illegible] گال تو سرخ رہتے ہی ہیں۔ ساتھ ہی دوسروں پر رعب [illegible] بلوائے، ہم تینوں پر ان کی اس ادا کا بے حد اثر پڑا۔

"آپ تعلیم کے متعلق فرما رہے تھے" بلدیو کرشن نے انھیں [illegible] ہوئے کہا۔

"پنچایتوں کے متعلق، تعلیم کے خلاف" ٹھاکر صاحب نے تصحیح کرتے ہوئے فرمایا۔

"جی!" شرما جی نے چائے کا گھونٹ بھر کر ان کے بادام [illegible] گلاس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر جی نے دودھ کے گلاس پر نگاہ جمائی۔ ہماری نگاہیں [illegible] گلاس کو خالی کرنے کی انھیں کوئی جلدی نہ تھی۔ ہم پہ اثر ڈالنے کے لئے [illegible]

"سب سے مقدم کام ہم نے یہ کیا کہ پنچایتی لائبریریوں کو ختم کر دیا۔"

"ختم کر دیا!؟" شرما صاحب کی جیسے چیخ نکل گئی۔ ایک [illegible] کے متعلق اس طرح کا بیان، کسی بے قصور کے لئے سزائے موت کے مترادف تھا!

"ایسا کیوں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"دیش ہت کی خاطر!"

"اس سے تو ہت کو الٹی ہانی پہنچتی ہے" بلدیو کرشن [illegible] کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"بالکل نہیں!" ٹھاکر صاحب نے ہاتھ کو مٹھی کی شکل میں تبدیل کر کے میز کے نزدیک لا کر اور اسے [illegible] کی شکل میں [illegible] کا عمل کرتے ہوئے فرمایا "دیش کو تعلیم نے کتنا نقصان پہنچایا ہے [illegible] ہے۔ جانتے وہ بھی ہیں، لیکن مانتے نہیں۔ [illegible] تعلیم سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

[illegible]

[illegible]

[illegible] اس لئے چپراسی ہی کے سامنے [illegible]

"[illegible] مت کرو۔"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"میرا خیال ہے یہ تمھاری تعلیم کا قصور ہے۔ آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔"

وہ چلا گیا۔ ٹھاکر صاحب بولے۔

"وہ جانتے نہیں کہ [illegible] نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ دفتروں میں دسویں پاس چپراسی بھرتی کیے جائیں۔"

پھر ایک قہقہہ میری طرف منسوب کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

"صاحب آپ بھی کافی سمجھ دار معلوم دیتے ہیں . . ."

[illegible] میں [illegible] کی بات کو بیچ ہی میں کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں بھی آپ سے کم نہیں۔ [illegible] زیادہ ہوں، حالانکہ پرائمری پاس بھی نہیں۔ آپ [illegible] ایم۔ اے پاس ہیں اور آپ ڈاکٹر ہیں!"

"بہت اچھے!" میں نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی ہاں۔ ہیں تو سہی۔ لیکن آپ منتری کیوں نہیں بن سکے؟"

"میں خود حیران ہوں!" میں نے جواب دیا۔

"حیران ہونے کی نہیں، سمجھنے کی ضرورت ہے۔" انھوں نے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا "یہی [illegible] ہے کہ اعلیٰ تعلیم اور منتری پن دو متضاد باتیں ہیں۔ کیوں جی کیا سمجھے؟" وہ [illegible] صاحب سے مخاطب ہو کر بولے۔

"[illegible] اور کیا ہو سکتے تھے؟"

"کیا نہیں؟" ٹھاکر صاحب گلاس پر نگاہ جماتے ہوئے بولے۔

"[illegible] میں کون ایسا مائی کا لال ہے جو میری طرح، موقع بے موقع [illegible] دے سکتا ہے؟"

"[illegible] نہیں!" [illegible] صاحب اُن کی [illegible] کے دبدبے میں آکر بولے، حالانکہ [illegible] تھی۔

"[illegible] سکتے ہیں قسلم [illegible] کیا کرتا ہوں؟"

## رقیب

آس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
— مومن

رقیبوں کا تری محفل میں کیا کام
جہنم ان سے بھر جائے تو اچھا
— داغ

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
— غالب

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں
— اکبر الٰہ آبادی

جس کے پہلو میں ہو تم اُس کا نصیب اچھا ہے
میری دانست میں مجھ سے تو رقیب اچھا ہے
— داغ

مرسلہ:- ایس ایس۔ دستگاری، ایم اے۔ کلکتہ

انھوں نے ورما صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں کیسے جان سکتا ہوں؟" ورما صاحب نے کہا۔

"انھیں پڑھنا ہی نہیں۔"

"آپ بہت اچھا کرتے ہیں!" میں نے کہا۔

"اجی: ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ اس افسر کو بلا کر انگریزی عبارت کا ہندی میں مطلب پوچھتا ہوں۔ یہی اس کی کمزوری ہے۔ میں اُس کی کمزور رگ کو پکڑ لیتا ہوں۔ اُسے ہندی آتی نہیں۔ سی ی بھی نہیں آتی۔ کوئی ایک لائن تک کا درست ترجمہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں نقطہ داں ہوں۔ نقطہ پکڑ لیتا ہوں۔ پھر عقل کی تی کی مدد سے بات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہوں۔ اُس کی ناقص دلیل کو اپنی دلیل کی تلوار سے کاٹتا اور اُسے لاجواب کر دیتا ہوں!"

"تب تو آپ کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟"

"ہرگز نہیں!" وہ دودھ کے گلاس کو جواب دیتے ہوئے بولے۔ "یہ لازم تھا کہ ہماری نگاہیں بھی اُن کی نگاہ کی تقلید کرتیں۔ پریشانی مجھے نہیں، انھیں ہوتی ہے۔ اُن کی فائل غلط اور بات رد ہو جاتی ہے۔ میری دلیل کے سامنے اُن کی دلیل سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے۔"

"بڑی بات ہے۔" ورما صاحب ٹھاکر صاحب کی تائید کرتے ہوئے بولے۔

"بڑی بات نہیں ہے۔" ٹھاکر صاحب نے ہوا میں تنکا اُچھالتے ہوئے کہا۔

[illegible]

"خوب" ورما صاحب کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا خوب!" ٹھاکر صاحب گلاس پر گلاس پی کر رنگ میں آ چکے تھے۔ "ورما صاحب! آپ لفظ کتاب ہی کیوں استعمال کرتے ہیں؟ اردو میں ہے نا کتابیں ڈھیر کی ڈھیر چھپ رہی ہیں اور افسوس ہے کہ ان لوگ کیسے ہی کام کریں گے۔ انگریزی کی کتابیں پڑھیں گے، پڑھیں گے یا آنکھوں کی بینائی خراب کریں گے یا شامل کو منتر میں بند کر دیں گے یا اصطلاح مستر پکا کر لیں گے؟ اور آپ نے بے سوچے سمجھے خوب کہہ دیا؟"

ہم تینوں خاموش رہے۔ اس پر ٹھاکر صاحب اور بھی تیز ہو گئے۔ انہیں جواب نہ ملنے سے ان کی سمجھ میں سے معانی کا پتا مل گیا۔ آواز اور بازو کو بلند کرتے ہوئے بولے۔

"دیش کی تباہی کا عظیم ترین باعث تعلیم ہے۔ کتابیں ہی اس کی ترقی کے لئے سم قاتل ثابت ہو رہی ہیں۔"

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو بالکل عیاں ہے۔ اب یہ بتایئے آج تک اچھی اور موٹی کتابیں لکھنے کا فائدہ کیا ہوا؟ مثال کے طور پر آپ گیتا ہی کو لیجئے۔ کیوں صاحب! آپ لوگ گیتا ضرور پڑھتے ہوں گے؟"

"ضرور!" ہم تینوں کی زبان سے یوں ہی یہ غلط لفظ نکل گیا۔ ان کی ہاں میں ہاں ملانے کا اس سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا۔

"مجھے آپ تینوں سے دلی ہمدردی ہے۔" منتری جی نے دودھ کا گلاس اٹھا کر اسے پھر اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ ویاس جی نے ہزار ہا سال پہلے گیتا لکھی۔ کرشن بھگوان نے مہابھارت کے یدھ میں ارجن کو اس کا اپدیش دیا۔ اتنی بات تو سمجھ میں آ گئی اور یہیں ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن صاحب! نہیں ختم ہوئی طول پکڑ گئی۔ یہاں تک کہ ایک کی بیسیوں کتابیں بن گئیں۔ اچھی سوجھ بوجھ والے سیاست دان بھی اس چکر میں پڑ گئے۔ تلک اور گاندھی بھی اس دوڑ میں حصہ لینے لگے۔ اپنی ساری توجہ سیاست میں لگانے کی بجائے گیتا پر خیال آرائی فرمانے لگے۔ میرا یقین واثق ہے کہ اگر تلک اور گاندھی گیتا پر تبصرہ کرنے کی بجائے انگریزی سرکار کی کرتوتوں پر صرف کرتے جس وقت صرف کیا تو ہندوستان ۱۹۴۷ء کی بجائے ۱۹۰۷ء میں آزاد ہو جاتا۔ کیوں صاحب! درست ہے نا؟" وہ دودھ کے گلاس سے مخاطب ہو کر بولے۔ اپنی فصاحت سے وہ خود ہی مرعوب تھے۔

[illegible]

"اس [illegible]"

"[illegible] کتب [illegible] کر دینا چاہیے۔"

"ختم کر دیا!" شرما صاحب نے [illegible]

"جی جناب!" منتری جی نے [illegible] ایک الماری میں بند کر دیا اور الماری کو [illegible] گوڈسے کی اس الماری میں [illegible]"

ہم تینوں [illegible] کیا۔

"خوب!" ورما صاحب نے [illegible]

"خوب لفظ آپ نے [illegible] استعمال کیا ہے" [illegible] ہوئے کہا۔ "لیکن آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ گوڈسے کی الماری کہاں [illegible] ہے؟"

ہم نے ایک دوسرے کی نگاہوں میں [illegible] جان جوکھم کا کام کون کر سکتا ہے۔ ہم [illegible] اور ورما صاحب نے ملتجیانہ انداز سے ان کی طرف دیکھا [illegible] قبول فرماتے ہوئے شرما صاحب نے [illegible] لیا۔

"کہاں رکھی صاحب؟"

"کنوئیں میں!"

[illegible] اونچی آواز میں [illegible]

[illegible]

[illegible] دہلی

[illegible] کا ہی تو ہیں،
[illegible] تعلیم ہے۔ مجھے اس
[illegible]
[illegible] ہوئے
[illegible]
[illegible] ؟"

"اور نہیں تو کیا!" ٹھاکر صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا "نہ ہوگا بانس، نہ بجے گی بانسری!"

"بہت خوب!" ہم تینوں نے بے ساختگی سے کہا۔

---

"بیسویں صدی" میں وہی مضامینِ نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔

---

# غزلیں

## [illegible] اختر، ایم اے

[illegible]    [illegible] میرے دل کی [illegible] اے دوست

تیرے ہی دم سے [illegible] دل میں تھا آباد    شہرِ ہر کیف و مسرت کا جہاں اے دوست

وہ تیری نرگسی آنکھوں کی [illegible]    [illegible] دل میں تھا اک حشر کا [illegible] اے دوست

وہ تیرے عہدِ محبت کی قربتِ رنگیں    ہمیشہ لے گی مرے دل میں چٹکیاں اے دوست

[illegible]    نہ جانے وقت نے گم کر دیئے کہاں اے دوست

[illegible]    ہے تیرے ہجر میں [illegible] گراں اے دوست

[illegible]    میں کب تلک کہوں الفت کی داستاں اے دوست

[illegible] تیرے [illegible] کی جانب

[illegible] اے دوست

## پرکاش ناتھ پرویزؔ، ایم اے

تیرے جلووں میں کھو گیا ہوں میں    اپنی ہستی کو ڈھونڈتا ہوں میں

عشق کے جاں گداز لمحوں کو    حاصلِ زیست جانتا ہوں میں

کوئی دیکھے یہ محویت کا کمال    اُن کا آئینہ بن گیا ہوں میں

سنگِ در ہوں کہ نقشِ پا ہوں میں؟    کچھ بتاؤ تمہیں کہ کیا ہوں میں

کیا سُنے گی طرب زدہ دُنیا    بربطِ یاس کی صدا ہوں میں

آپ سے کیا اُمیدِ لطف و کرم    آپ کو خوب جانتا ہوں میں

میرے امکان سے یہ باہر ہے    کیا کہا آپ کو نہ چاہوں میں

راس آئی نہ زندگی مجھ کو

پھر بھی پرویزؔ جی رہا ہوں میں


لپٹن کی ہمالین گولڈن ڈسٹ چائے
LIPTON'S
FINEST
GOLDEN DUST TEA
دیکھتے ہی دیکھتے اِس چائے سے
آپ پیالی پر پیالی مزیدار، خوشبودار
اور خوش رنگ چائے حاصل کرسکیں گے.
خود پیجئے مہمانوں کو بھی پیش کیجئے۔ پینے میں تسکین
بخش، پلانے میں تسلی بخش۔ لپٹن ہمالین
گولڈن ڈسٹ چائے کا جواب نہیں۔
لپٹن یعنی
اچھی چائے
LIPTON

# شانِ نزول

نریش کمار شاد

۴۴۔ تیمار پور۔ دہلی
۳ دسمبر ۱۹۹۶ء

مخدومِ گرامی! تسلیم و نیاز

"شانِ نزول" کی نئی قسط پڑھنے سے پہلے ایک چھوٹا سا پُرلطف واقعہ سُنیے۔ چند دن ہوئے نئی دہلی کے ایک کافی ہاؤس میں ایک نام نہاد ادیب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں اُس نے جلے بھُنے انداز میں مجھ سے کہا کہ آپ بیک وقت "بیسویں صدی" اور "شمع" میں بھی لکھتے ہیں اور "نقوش" اور "افکار" میں بھی! اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کسی انفرادی مزاج یا لہجے کے مالک نہیں ہیں۔ میں نے بڑی حلیمی سے جب اُسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ انفرادی مزاج یا لہجے کی شناخت کا یہ معیار مضحکہ خیز حد تک غلط ہے۔ تو اُس نے آپ کے بارے میں کچھ ایسے کلمات کہے کہ میں بھی جذباتی ہو گیا اور میں نے کہا۔ خوشتر صاحب نے "بیسویں صدی" کے ذریعے بے شمار نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا ہے۔ ہندوستان میں شاید کسی دوسرے رسالے نے اتنے افسانہ نگار اور ادیب پیدا نہیں کئے یہ حقیقت ہے کہ آج کے صفِ اوّل کے کئی فنکاروں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز "بیسویں صدی" ہی سے کیا ——— یہ سُن کر وہ "ہونہار" سٹپٹاتا ہوا بولا تو مجھے وہ میری ادبی زندگی کا آغاز "بیسویں صدی" سے کیوں نہیں کرنے دیتے۔ اور میری کوئی کہانی اُس میں کیوں نہیں شائع کرتے؟ اُس کی دُکھتی رگ میرے سامنے آگئی، میں نے زیرِ لب ہنستے ہوئے صرف اتنا ہی کہا کہ آپ کی کہانیاں "بیسویں صدی" کے معیار سے بہت بلند ہوں گی!

آپ کا ——— نریش کمار شاد

---

اجمیر کے ایک مشاعرے میں منتظمینِ مشاعرہ نے سازش کر کے سیماب اکبرآبادی کو شرمندہ کرنے کے لئے سب سے پہلے شمع اُن کے سامنے رکھ دی۔ اِدھر شمع سیماب صاحب کے سامنے رکھی گئی اُدھر مجمع سے ایک شور اُٹھا۔ ہائیں ہائیں یہ کیا کر رہے ہو؟ مشاعرہ سیماب صاحب سے شروع نہیں ہوگا! لیکن سیماب صاحب نے شمع کو اپنی گرفت میں لے کر اپنے سامنے سے نہ ہٹنے دیا۔ سیماب صاحب کو غصہ بے حد تھا اور بلا خفقہ بھی۔ اسی حالت میں جب لوگ شمع اُٹھانے پر اصرار کر رہے تھے۔ سیماب صاحب نے ایک رُباعی برجستہ کہی اور شمع کے اُٹھتے اُٹھتے سُنا ہی ڈالی ؎

کچھ عیب نہیں غزل کا پڑھنا اوّل — پڑھنا ہے تو کیا بعد میں اور کیا اوّل
سیماب یہ شمع مجھ سے کہتی ہے کہ آج — تیرا ہے سخن وروں میں درجا اوّل

---

دہلی کے ایک مشاعرے میں سامعین اکثر انھیں شاعروں کا کلام توجہ سے سُننے اور داد کے قابل سمجھتے تھے جو ترنّم سے پڑھتے تھے۔ جب ایک پُرانے اُستاد مولانا احسن مارہروی اسٹیج پر آئے تو اُنھوں نے محفل کا یہ رنگ دیکھ کر غزل سُنانے سے پہلے فی البدیہہ یہ رُباعی کہہ کر سُنائی ؎

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں

فرمائیں حضرت فراق اور سنیں
بیٹھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

---

تلوک چند محروم نے کشمیر سے متعلق جوش ملیح آبادی کی یہ رباعی ؏

ممنوع شجر سے لطف دوام لیجئے
عصیاں کی گھنی چھاؤں تلے دم لیجئے
آواز دو کا کشمیر آپہنچا جوش
اللہ سے انتقام آدم لیجئے

جب پہلی بار کسی اردو اخبار میں پڑھی تو جذباتی طور پر انہیں کچھ ایسا صدمہ پہنچا کہ اسی وقت اس کے جواب میں بے اختیار یہ رباعی کہہ دی ؏

کشمیر میں لطف جام لینے والے
عصیاں کے شجر سے کام لینے والے
اللہ کی لاٹھی میں نہیں ہے آواز
اللہ سے انتقام لینے والے

---

فراق گورکھپوری کے والد محترم منشی گورکھ پرشاد عبرت نے دہرہ دون میں جس کوٹھی میں انتقال فرمایا اُن کے مرنے کے دن اُداس بالکل نہیں معلوم ہوتی تھی۔ فراق کی والدہ نے یہ دیکھ کر کہا کہ شریف النفس آدمی جب مرتا ہے تو اس کے مرنے کی جگہ جگمگا اٹھتی ہے۔ ساڑھے چار بجے صبح کو اُن کی وفات ہوئی تھی۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر فراق نے یہ رباعی کہی ؏

غفلت کا حجاب کوہ و صحرا سے اٹھا
پردہ فطرت کے رُوئے زیبا سے اٹھا
پَو پھٹنے کا کس قدر سُہانا ہے سماں
پچھلے کو فراق کون دنیا سے اٹھا

---

جوش ملیح آبادی صنفِ غزل کے بڑے کٹر مخالف ہیں اور اُسے قطعی غیر فطری صنف قرار دیتے ہیں حالانکہ اُن کے شاعرانہ شعور کی نشو و نما میں حافظ شیرازی کے مطالعے کا نمایاں اثر ہے۔ ایک روز حسبِ عادت حکیم آزاد انصاری سے بحث کرتے ہوئے غزل کے خلاف گل افشانی کرنے لگے تو آزاد نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی اور جوش صاحب کو سنا دی ؏

کہتے ہو کہ جچتی نہیں اب شانِ غزل
عکس ہو تو شعار ہے ایمانِ غزل
سرکار غزل ہی پہ ہے فوقیتِ شعر
افسوس ہے اسے عقل عدوِ غزل

---

۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کے باشندوں سے وعدہ کیا تھا تمام فرقوں کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے لیکن بعد میں انگریزوں نے جب اس وعدہ کے متعلق یہ کہا کہ یہ تو محض ملکہ کی ایک خواہش تھی تو جوش ملیح آبادی نے یہ شعر کہا۔

نااہل ہے وہ اہلِ سیاست کی نظر میں
وعدے سے کبھی جس کو مکرنا نہیں آتا

---

ٹونک کے ایک مشاعرے میں طرحی مصرع تھا

اللہ تیری شان کے قربان جایئے

وہاں کے ایک بزرگ شاعر مولوی عبدالسلام خیال سے اُن کے چند عقیدت مندوں نے کہا کہ اس مصرع پر گرہ لگانا تو ناممکن ہے۔ داغ نے یہ مطلع کہہ کر کچھ اور کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ ؏

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں مری مان جایئے
اللہ تیری شان کے قربان جایئے

خیال صاحب نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی اور کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد یکایک چونک کر بولے۔ گرہ لگانی محال ضرور ہے لیکن ناممکن تو نہیں۔ دیکھئے کاوش تو میں نے بھی کی ہے اور یہ کہہ کر یہ شعر سُنا دیا ؏

یوسف کو قید اور زلیخا کے ملک میں!
اللہ تیری شان کے قربان جایئے

---

کراچی (پاکستان) میں، جہاں آج کل جوش ملیح آبادی مقیم ہیں، وہاں اب سرکاری طور پر طوائفوں کی ممانعت ہے۔ ایک بار جب یہی سرکاری قانون موضوعِ گفتگو تھا اور جوش صاحب کے کچھ دوستوں نے اس ضمن میں اُن کی رائے دریافت کی تو جوش صاحب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جواب میں یہ رباعی انہیں سُنا دی ؏

یُوں تو جس کے جی میں آئے بک لے
لیکن جو حقائق ہیں، نہیں وہ بکتے
سنگِ حالات سے بنے اس زنداں

## خشت جذبات سے ڈھلے ہیں چٹکلے

مہاتما گاندھی ہندوستان کے افلاس کی علامت کے طور پر بالعموم نیم عریاں رہتے تھے اور اُن کے مشہور چیلے ونوبا بھاوے بھی انھیں کی تقلید کرتے ہوئے صرف ایک لنگوٹی ہی پہنتے تھے۔ اِن دونوں کے مختصر لباس کے پیشِ نظر ایک بار مولانا عبدالمجید سالک کی رگِ ظرافت پھڑکی تو اُنھوں نے علامہ اقبال کے اِس شعر کا ؎

جعفر از بنگال صادق از دکن
ننگِ ملت ننگِ دیں ننگِ وطن

حلیہ اِس طرح تبدیل کر دیا ؎

گاندھی از گجرات و بھاوے از دکن
ننگے پاؤں ننگے سر، ننگے بدن!

---

ایک صوفی منش شاعر جن کی زُلفیں تو کافی گھنی اور دراز تھیں لیکن وہ سے روشن داڑھی اور مونچھوں کی کثافت سے بے نیاز تھا جب وہ لکھنؤ میں اسرار الحق مجازؔ کو دکھائی دیئے تو مجازؔ نے دوسرے ہی لمحے یہ شعر کہہ کر اُن کی نذر کر دیا ؎

ترے بالوں کی لمبائی کا تیرے سر پہ کیا کہنا
اِنھیں بالوں کو تُو داڑھی بنا لیتا تو اچھا تھا!

---

۱۹۵۷ء میں جب مجھ پر فالج کا حملہ ہوا اور میں سول ہسپتال جالندھر میں زیرِ علاج رہا تو وہاں ایک نرس کی صورت اور سیرت کے حُسن نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد میں نے اس نرس سے متعلق ایک نظم بھی کہی اور چند قطعات بھی لکھے۔ اُس نرس کا تصوّر کئی سال تک میرے ذہن پر مسلط رہا۔ ۱۹۶۲ء میں ایک غزل کہتے ہوئے غزل کا مقطع پھر نیم شعوری طور پر اسی سے متعلق ہو گیا ؎

اے شادؔ مجھ کو غم سے محبت سی ہو گئی
اِک پیکرِ جمیل کو غم خوار دیکھ کر

---

وحیدؔ الہ آبادی کو ایک بار جب لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں بیگم صاحبہ کے یہاں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ وحیدؔ صاحب کو واپسی کی جلدی تھی۔ اِس لئے مشاعرے سے پہلے اُن کے ایک دوست انھیں بیگم صاحبہ کے یہاں لے گئے اور بیگم صاحبہ سے عرض کی کہ جو شاعر میرے ساتھ ہیں جلد ہی واپس جانے والے ہیں اِس لئے مشاعرے میں شرکت سے معذور ہیں ان کا کلام ابھی سُن لیا جائے۔ پردہ نشین بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ فی الحال کلام سُننے کی فرصت نہیں ہے۔ انھیں مصرعِ طرح دے دیا جائے تاکہ اس پر مصرع ختم کریں۔ میں اُسی سے اُن کے کلام کا اندازہ کر لوں گی۔ جو مصرعِ طرح سُنایا گیا وہ یہ تھا ؎

ذرّے سے آئے ہیں مشتاقِ تماشا ہو کر

وحیدؔ نے برجستہ مصرعہ ضم کیا ؎

ذرّے سے آئے ہیں مشتاقِ تماشا ہو کر
ہم سے پردہ نہ کرو مہرِ تماشا ہو کر

شعر سُن کر بیگم نے بے محابا پردہ اُٹھا دیا اور کلام سُننے کی مشتاق ہوئیں اور سُن کر بے حد محظوظ ہوئیں۔

---

میرزا عظیم بیگ جنھیں اپنے بارے میں یہ غلط فہمی تھی کہ وہ ہندوستان کے صاحب ہیں۔ ایک دن سیّد انشاء اللہ خاں انشاءؔ کے پاس آئے اور اپنی تازہ غزل سُنائی جو بحرِ رجز میں تھی لیکن ناواقفیت کی بنا پر کچھ اشعار بحرِ رمل میں جا پہنچے تھے۔ سیّد انشاءؔ اس نقص کو فی الفور تاڑ گئے۔ لیکن میرزا پر قطعاً ظاہر نہ کیا، بلکہ بہت زیادہ تعریف کے بعد اصرار کیا کہ یہ غزل مشاعرے میں پڑھی جائے۔ عظیم بیگ نے واقعی جب اُسے ایک مشاعرے میں پڑھ دیا تو سیّد انشاءؔ نے وہیں تقطیع کی فرمائش کی اور اس کے ساتھ ہی یہ مخمس پڑھ کر میرزا عظیم بیگ کو پانی پانی کر دیا ؎

گر تُو مشاعرے میں صبا آج کل چلے — کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے کوئی نہ باہر نکل چلے — پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحرِ رجز کو چھوڑ کے بحرِ رمل چلے

اور میرزا عظیم بیگ نے گھر جا کر اس مخمس کی طرح میں اپنی بساط کے مطابق دل کا بخار یوں نکالا ؎

موزونیِ معانی میں پایا نہ تم نے فرق — تبدیلِ بحر سے ہوئے بحرِ خوشی میں غرق
روشن ہے مثلِ بحر یہ از غرب تا بہ شرق — شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

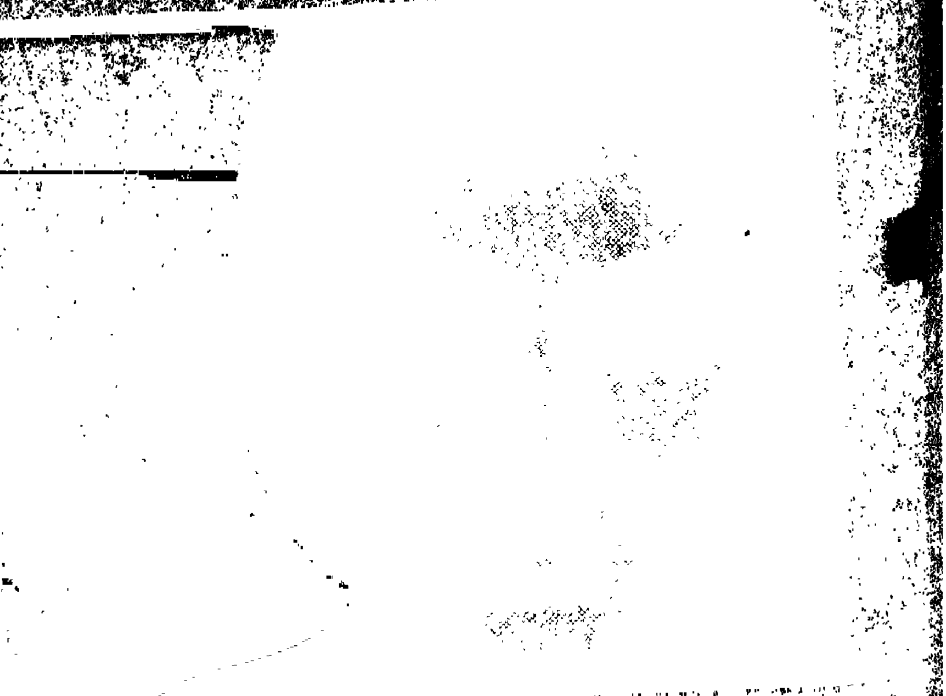
---

لکھنؤ میں ایک دن سیّد انشاء اللہ خاں انشاءؔ، سعادت یار خاں رنگینؔ دہلوی کے یہاں آئے اور اُنھوں نے رنگینؔ کو اپنی طرحی غزل کا یہ مطلع سُنایا ؎

توڑوں گا خُمِ بادۂ انگور کی گردن
رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اِک حُور کی گردن

مطلع سُنتے ہی رنگینؔ نے فی البدیہہ یہ مطلع اور شعر کہہ دیا ؎

سانچے میں ڈھلی ہے یہ تری نور کی گردن



کیا یہ
خوبصورت ہے
شنا
یہ ہے

اُس کی خوبصورتی افغان اسنو بیوٹی ایڈز کی مرہونِ منت ہے۔ افزائے حُسن ایڈز جنھوں نے لکھو کھا نازنینوں کو جلالی حُسن اور پائیدار دلکشی سے مستفید کیا ہے۔

افغان اسنو: چہرے کی دلکشی پیدا کرنے والی عمدہ ترین ایڈ۔

افغان اسنو: جلد کیلئے بے نظیر ٹانک جو دھبوں اور جھرّیوں کو دور کرکے چہرے کو مانند شبنم نرم و ملائم بناتی ہے۔

افغان ٹیلیں پاؤڈر: چہرے کے داغوں کو چھپانے اور ملاحت پیدا کرنے کیلئے چار مختلف شیڈوں میں ملتا ہے۔

افغان اسنو لپ اسٹک: لبوں کو دلکش اور رسیلا بنانے کیلئے بے شمار شیڈوں میں دستیاب ہے۔

افغان اسنو نیل پالش: چمکتے ہوئے رنگوں میں ہر مذاق کے مطابق جو ناخنوں کو سخت ہونے سے بچاتا ہے۔

افغان کریم کیک: کریم کے ساتھ تیار شدہ پاؤڈر خوبصورت ڈبیوں میں ایک فوری بیوٹی ایڈ جو کسی بھی میک اپ کے ساتھ خوب سنوار کر قدرتی خوبصورتی پیدا کرتا ہے۔

## افغان اسنو بیوٹی ایڈز

ای ایس پاٹن والا بمبئی نمبر 77 (انڈیا)




ایس سی مہدی دہلی

گرہ [illegible]
کیا [illegible] تھا
[illegible] کی گردن

---

جس زمانے میں جب میرزا غالب کو دو سو روپیہ جرمانہ اور چھ ماہ کی قید ہوئی تو تین مہینے بعد ایک روز مسٹر ولیم سول سرجن وہاں قیدیوں کے معائنے کے لیے تشریف لائے۔ دوسرے قیدیوں کے علاوہ جب غالب سے مزاج پرسی کی تو غالب نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا ؎

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

بالآخر اسی سول سرجن کی سفارش سے میرزا غالب رہا کر دیئے گئے۔

---

اُستاد ذوق دہلوی اس طرح میں ؎
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
طبع آزمائی کر رہے تھے اور اپنے شاگرد رشید داغ دہلوی کو یہ مطلع لکھوا کر ؎

مژگاں سے تیری نوک ہے دل پر لگی ہوئی
اِک پھانس سی کلیجے کے اندر لگی ہوئی

دوسرے شعر کہنے کی فکر میں تھے کہ اتنے میں خود داغ نے کہا۔ اُستاد! ایک مطلع میرا بھی سن لیجئے اور اپنا یہ مطلع پڑھ دیا ؎

یہ کس کی لَو ہے اے دلِ مضطر لگی ہوئی
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ادھر ذوق شعر پر شعر فرما رہے تھے اور اُدھر داغ کی غزل بھی مکمل ہو رہی تھی۔ تقریباً تیس منٹ میں اُستاد اور شاگرد دونوں کی غزلیں مکمل ہو گئیں۔ ذوق نے جب دونوں غزلیں صاف کرنے کے لئے کہا تو داغ کہنے لگے۔ پہلے میری غزل پر اصلاح دے دیجئے۔ پھر ساتھ ہی دونوں غزلیں صاف کر لوں گا۔ ذوق، داغ کی غزل سنتے رہے اور حسب ضرورت اصلاح بھی دیتے رہے۔ داغ نے جب یہ شعر پڑھا ؎

بے شک ہے کچھ لگاؤ جو کرتا ہے یہ گریز
زاہد سے دخترِ رز ہے مُنہ پر لگی ہوئی

ذوق نے بہت تعریف کی اور بولے کہ مجھ سے یہ قافیہ چھوٹ گیا اور تم لے اڑے۔ پھر چند لمحوں تک سوچنے کے بعد کہنے لگے۔ اچھا اس قافیے میں میری غزل میں بھی شعر لکھ لو ؎

کرتی ہے زیرِ پردۂ فانوس تاک جھانک
پروانے سے ہے شمع منہ پر لگی ہوئی

---

دہلی کے ایک مشاعرے میں شاعروں کا غیر معمولی اژدہام تھا جب بہاری لال مشتاق دہلوی وہاں پہنچے تو انھوں نے اس اژدہام میں اپنے بیٹھنے کی یہ صورت نکالی کہ صاحبِ مشاعرہ سے انتظامِ مشاعرہ کی خدمت اپنے ذمے لے لی اور خاصدان لے کر تواضع کے لئے شاعروں کے سامنے پہنچ گئے۔ میرزا غالب کے پاس پہنچے تو غالب نے کہا مشتاق صاحب یہ لطیفہ کیا ہے؟ جواب میں مشتاق دہلوی نے برجستہ یہ شعر کہہ دیا ؎

غیروں نے بیٹھنے نہ دیا جب کہیں مجھے
میں انجمن میں منتظمِ انجمن ہوا

---

ترکی سے ہلالِ احمر کا ایک وفد جب لاہور آیا تو ارکانِ وفد نے شاہی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی۔ مسجد کے امام نے نماز میں بہت طویل سجدے کئے۔ تُرک اتنے طویل سجدوں کے عادی نہ تھے۔ اس لئے انھیں حیرت ہوئی۔ رئیسِ وفد نے بھی اس کے متعلق علامہ اقبال سے دریافت کیا۔ اقبال اُس وقت تو اس سوال کو ٹال گئے۔ لیکن بعد میں اُس کا جواب اپنے اِن شعروں میں دیا ؎

کہا مجاہدِ تُرکی نے مجھ سے بعدِ نماز
طویل سجدے ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام
وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اُسے کیا چیز ہے نمازِ غلام
ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں
اُنھیں کے ذوقِ عمل سے ہیں اُمتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرورِ غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدے اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام
خُدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

---

مضطر خیرآبادی کو ریاست کے عہدۂ نظامت کے علاوہ نواب ابراہیم علی خاں والیٔ ٹونک کے دربار میں سرکاری شاعر کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ ایک بار نواب صاحب

...مضطر صاحب سے خوش ہو کر انہیں ایک شاہی سواری کا گھوڑا عطا فرمایا۔ گھوڑا کافی بوڑھا تھا اس لئے مضطر صاحب سلام کو گئے تو اظہارِ تشکر کے طور پر یہ برجستہ قطعہ پڑھ دیئے

سرکارِ نامدار نے گھوڑا کیا عطا
رنگت کا خوب، قد کا بڑا، اچھی ذات کا
دانہ تو خیر قرض بھی لے کر کھلاؤں گا
پانی کہاں سے لاؤں گا آبِ حیات کا!

مصرعِ آخر میں 'آبِ حیات کا پانی' کہہ کر مضطر صاحب نے نہ صرف اپنی خوش طبعی کا اظہار کیا تھا بلکہ یہ نواب مزاج کے بھی عین مطابق تھا اور ایسا ہی ہوا کہ مزید ایک خوش رنگ کمیت مع خلعتِ فاخرہ مرحمت فرمایا گیا۔

---

اکبر الٰہ آبادی نوعمری میں اپنے اُستاد وحید الدین وحید الٰہ آبادی کے ساتھ دریا باد کے ایک مشاعرے میں شریک تھے۔ وہاں ایک بزرگ صورت اور کہنہ مشق شاعر نے اپنا یہ شعر پڑھا

میں راضی قتل پر ہوں گر وہ مجھ کو اس طرح باندھیں
کہ رسّی ہاتھ میں اُن کے ہو پھندا میری گردن میں

تو اکبر داد دینے کے بعد نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے۔ بڑے میاں! اس کے بعد کا ایک شعر بھی تو پڑھ دیجئے۔ شاید آپ بھول گئے ہیں میں یاد دلاتا ہوں

مکاں اغیار سے خالی ہو، مجمع دوستوں کا ہو
کمر سے باندھ کر دامن نچادیں اپنے آنگن میں

---

جگر مراد آبادی کے والد مولوی علی صاحب نظر میرزا غالب کے معتقد تھے۔ لیکن جگر صاحب کے تایا مولوی علی اکبر قتیل کے مداح تھے۔ جگر صاحب اُس وقت پندرہ برس کے تھے۔ لیکن اپنے والد کی طرح وہ بھی غالب ہی کے پرستار تھے۔ جگر نے اس زمانے میں ازراہِ مذاق قتیل کی شاعری کو پست ثابت کرنے کے لئے قتیل کے نام سے خود ایک فارسی غزل کہی جس کا مقطع تھا

کرد مارا بہ یک نظارہ قتیل
ختم برگشت اے چہ رعنائی

افسانہ

# پروفیسر یوسف

انوار علیگی، ایم۔ اے

۳۱۴۸- ۷۱۱- سوداگران- دہلی نمبر ۶

محترمی! تسلیم

"پروفیسر یوسف" بھیجتے ہوئے ڈر رہا ہوں کہیں آپ واپس نہ کر دیں کیونکہ میری کئی کہانیاں آپ ناپسند فرما چکے ہیں ـــــ "بیسویں صدی" کا اپنا مزاج ہے اور اس میں وہی کہانیاں شائع ہوتی ہیں جو "بیسویں صدی" یا دوسرے لفظوں میں آپ کے مزاج کے مطابق ہوں ـــــ اگر آپ کسی چھوٹے یا بڑے افسانہ نگار کی کہانی واپس کر دیتے ہیں تو اس کا آپ کو حق ہے اور یہ بات ہرگز ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ـــــ اب دیکھئے اِس کہانی پر کیا بیتتی ہے! ـــــ پتے کی تبدیلی اس بات کی مظہر ہے کہ میں اپنا شہر چھوڑ کر آپ کے شہر میں آگیا ہوں۔ یہاں دلی یونیورسٹی میں میں نے ایم۔ لٹ میں داخلہ لے لیا ہے...

مخلص ـــــ انوار علیگی

---

جب پروفیسر یوسف عباسی نے عائشہ کو یعقوب کے ساتھ پکچر ہال سے نکلتے دیکھا تو انھیں شاک سا لگا۔ لیکن انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور نہ چہرے پر کوئی رنگ ہی آنے دیا۔

اُن کے ساتھ شعبۂ انگریزی کے اُستاد عارف ملک تھے۔ وہ دونوں فلم دیکھنے آئے تھے۔ جب عارف ملک کی عائشہ اور یعقوب پر نظر پڑی تو انھوں نے بڑی زور سے پروفیسر یوسف عباسی کا ہاتھ دبایا اور آنکھوں سے اُن دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ دیکھو؟"

یوسف بڑی متانت سے مُسکرائے۔ بولے "ہاں دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ اِس لونڈے کے دام میں کیسے آگئی؟" عارف ملک حیران تھے۔

"کسی کے ساتھ پکچر دیکھ لینے کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں کہ لڑکی اُس کے دام میں آگئی ہے۔"

"اس لڑکے کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں؟"

"یہی کہ یہ آوارہ ہے۔ خوبصورت لڑکیوں کو پھانس کر انھیں تباہ کرنا اُس کا محبوب مشغلہ ہے۔"

"پھر بھی آپ کو اُسے اس لڑکے کے ساتھ دیکھ کر افسوس نہیں ہوا۔"

"میرے آپ کے افسوس کرنے سے کیا ہوگا۔ عائشہ نادان نہیں ہے۔ وہ اپنا اچھا بُرا خوب سمجھتی ہے۔"

"پھر بھی" عارف ملک کہہ کر بھی کچھ نہ کہہ پائے۔

"پھر بھی کیا؟" پروفیسر عباسی بغیر کچھ کہے ہی سب کچھ سمجھ گئے مگر پھر بھی معصوم بنے رہے۔ وہ بے انتہا گہرے آدمی تھے۔ اُن کی تھاہ پالینا آسان نہ تھا۔

عائشہ یونیورسٹی کی حسین ترین لڑکیوں میں سے تھی۔ نرم نازک سے نقشے والی لڑکی! جو دیکھتا اُسے اُس لڑکی کی انتہائی خوبصورتی پر حیرت ہوتی۔ وہ سوچنے لگتا کیا لڑکیاں اتنی خوبصورت بھی ہوسکتی ہیں؛ اُس میں غالب کی غزل جیسی نزاکت، کشش، موسیقیت، متانت اور شیرینی تھی۔

وہ اُردو میں ایم۔ اے کر رہی تھی۔

اور شعبۂ اُردو کے صدر پروفیسر یوسف عباسی تھے۔ اپنے تمام شاگردوں کی طرح انھیں اس لڑکی سے بھی ہمدردی تھی۔ پروفیسر یوسف کا شمار ہند و پاک کے مشہور تنقید نگاروں میں ہوتا تھا۔ اسی سال اُن کے ایک تنقیدی مضامین کے مجموعے "میزان" کو ساہتیہ اکاڈمی نے پانچ ہزار روپے کا انعام دیا تھا جس سے اُن کی عزت اور شہرت میں چار چاند لگ گئے تھے۔

نہایت خلیق، منکسر اور ہمدرد انسان تھے۔ ان کی شخصیت [illegible]

کی وجہ سے بھی طلبا پر خاص اثر ہوتی تھی۔ وہ ایک خوبصورت سی کوٹھی میں تنہا رہتے تھے۔ کیونکہ ان کا رہن سہن بہت سادہ تھا۔ ٹھاٹ سے یونیورسٹی پیدل آتے تھے۔ سائیکل چلانا انھیں پسند نہ تھا اور کار خریدنے کے لئے ان کے پاس پیسہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ کافی بڑی رقم وہ [illegible] پر صرف کرتے تھے۔ ان کی کوٹھی کا اندر سادگی کا نمونہ تھا اور دوسرے لوگوں کی نظر میں کنجوسی کا نمونہ!

اتنی بڑی کوٹھی میں دو آدمی رہتے تھے۔ ایک پروفیسر یوسف اور دوسرا ان کا نوکر بدھائی۔

وہ ابھی تک کنوارے ہی تھے۔

ان کے کنوارے ہونے کا مسئلہ اکثر یونیورسٹی کے طلبا، خصوصاً لڑکیوں میں زیرِ بحث رہتا۔ ہر شخص اپنی اپنی عقل کے مطابق رائے زنی کرتا اور اس راز کو پانے کی کوشش کی جاتی۔ لیکن یہ بات اب تک راز ہی تھی۔ ہو سکتا ہے پروفیسر کے نزدیک اس مسئلے کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

پروفیسر یوسف بڑے سلجھے ہوئے ذہن کے نہایت سنجیدہ انسان تھے۔ ان کے چہرے پر آج تک اُلجھن اور پریشانی کے تاثرات نہ دیکھے گئے تھے۔

کتابی چہرہ، چہرے پر لازوال مُسکراہٹ، کشادہ پیشانی اور پیشانی پر کالے سفید بالوں کی ملی جلی لٹ گری رہتی۔ انگریزوں جیسا رنگ۔ کالے رنگ کا سوٹ پہن لیتے تو لڑکیاں تو لڑکیاں لڑکوں کی نظریں اُن پر سے نہ ہٹتیں۔ چالیس سالہ پروفیسر کی تندرستی سب کے لئے قابلِ رشک تھی۔

تنقید جیسے مشکل مضمون کو اس طرح پڑھاتے کہ احساس ہی نہ ہوتا کہ ارسطو کی بوطیقا پر لیکچر سن رہے ہیں یا غالب کے اشعار کی تشریح۔

[illegible]

[illegible] انھوں نے [illegible] یا کلچر روم میں یا کوٹھی پر [illegible] لڑکوں کو اور کیا چاہیے تھا [illegible] جب تک مطمئن نہ کر دیتے نہ چھوڑتے۔ [illegible] دیتے۔ یونیورسٹی میں کوئی طالب علم [illegible]

جب سے پروفیسر نے [illegible] سے ہو گئے تھے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ [illegible] لڑکے دھوکے میں اگر اپنی زندگی [illegible] لیکن وہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلے گا۔ [illegible] جہاں نصیحتیں تیر بن کر دل کو لگتی ہیں۔

پھر وہ عائشہ کے لئے کیا کر سکتے ہیں ـــــ یہ ایک اُلجھا ہوا مسئلہ سُلجھانے کے لئے غور و فکر ضروری تھی۔

پھر نہ جانے انھیں وہ دن کیوں یاد آ گیا جب عائشہ ان سے پڑھنے آئی تھی۔ پڑھنے کے دوران وہ اچانک سوال کر بیٹھی تھی۔

”سر! آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں۔ ہاں۔ ضرور ضرور!“

”آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟“

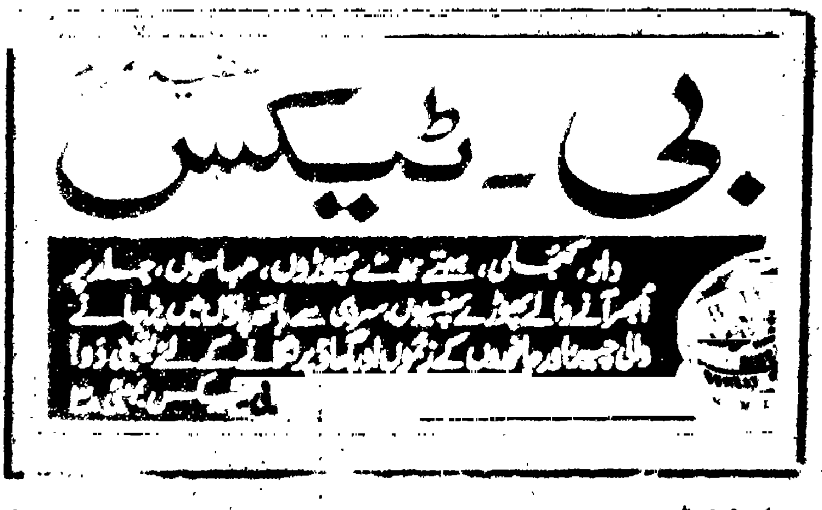
پروفیسر یوسف عباسی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ اس بات کی [illegible] اُمید نہ کرتے تھے۔ پھر یہ اُن کا ذاتی مسئلہ تھا۔ اس میں شاگرد کی دخل اندازی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ یوسف عباسی نے ایک نظر عائشہ کو دیکھا۔ وہ پروفیسر کے رنگ دیکھ کر کانپ رہی تھی۔

یوسف صاحب نے بہت جلد اپنے اوپر قابو [illegible] پھر وہ ارسطو کا نظریہ پڑھانے لگے۔

---

عائشہ کیپٹن قیصری لڑکی تھی کیپٹن سے [illegible] کے ذاتی مراسم تھے۔ انھوں نے سوچا کیوں نہ کیپٹن کو اس بات سے آگاہ کر دیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی ہاتھ ٹیلیفون ڈائرکٹری کی طرف چلا گیا۔ وہ جلدی [illegible] اس کے ورق اُلٹنے لگے۔

[illegible]



# غزل

[illegible]

[illegible] کبھی تم بھی دیکھئے

[illegible] کبھی تم بھی دیکھئے

یہ [illegible] کبھی تم بھی دیکھئے

[illegible] محبت، مری ہر نگاہ جلوہ

مری [illegible] کبھی تم بھی دیکھئے

[illegible] کبھی تم بھی دیکھئے

یہ کشاکش محبت، کبھی تم بھی دیکھئے

مرا کام ہے قفس میں رہوں آشیاں کو تکتا

مری قید با مشقت، کبھی تم بھی دیکھئے

غم عاشقی اٹھایا، غم دو جہاں بھلایا

دل ناتواں کی ہمت، کبھی تم بھی دیکھئے

[illegible] مرے جنوں کو جو زمانہ دیکھتا ہے

[illegible] کی تھی فرصت، کبھی تم بھی دیکھئے

کبھی دعویٔ خدائی، کبھی کاسۂ گدائی

یہ نظامِ جبرِ قدرت، کبھی تم بھی دیکھئے

شبِ انتظار مجھ پہ جو گزر گئی قیامت

وہی ہاں وہی قیامت، کبھی تم بھی دیکھئے

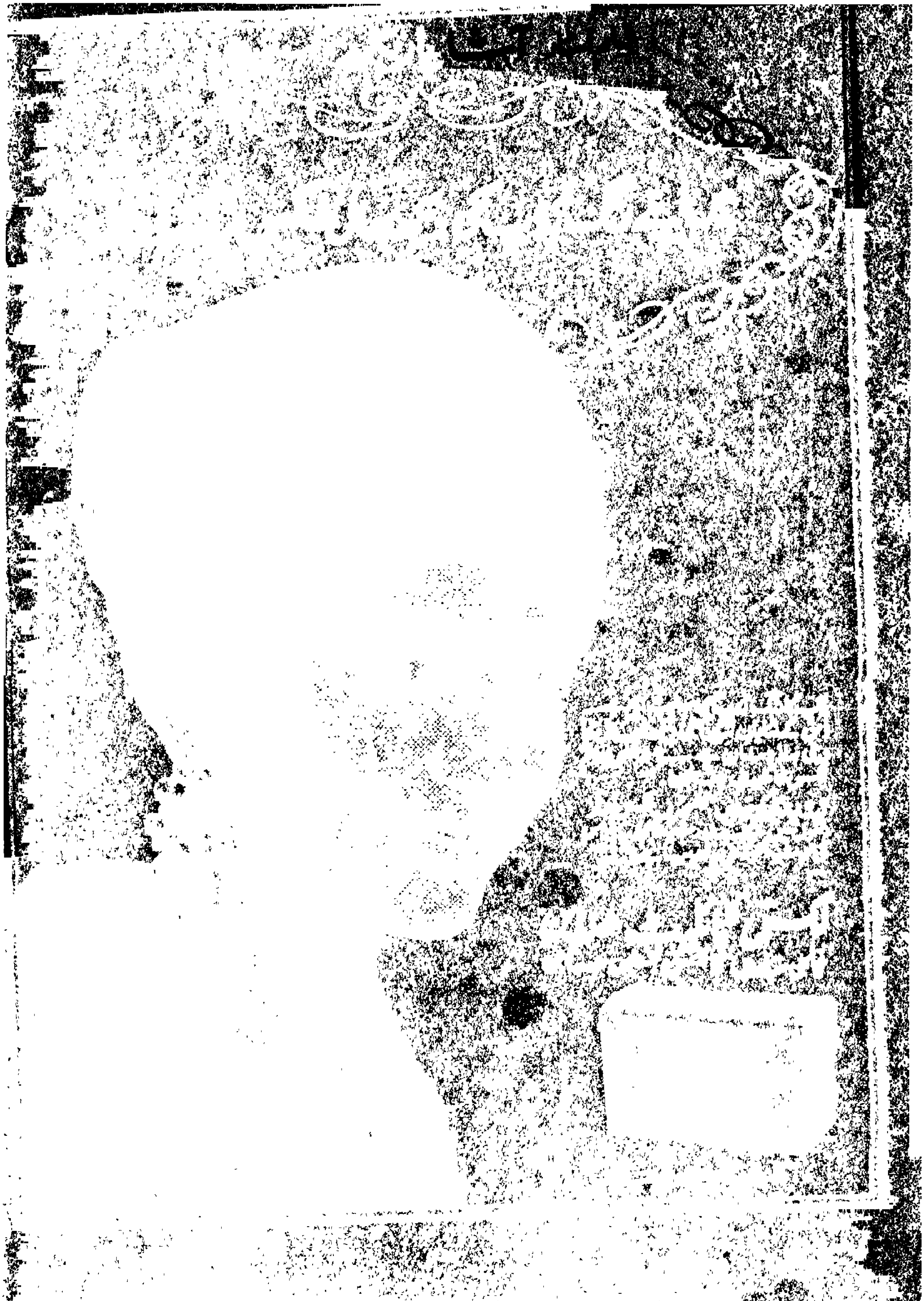
ہے محیط ہر دو عالم، فقط ایک تمہارا جلوہ

یہ [illegible] کثرت، کبھی تم بھی دیکھئے

دل [illegible] میں غم عشق کا ہے طوفان

یہ [illegible] محبت، کبھی تم بھی دیکھئے

[illegible]



# روح کا دامن بھیگا بھیگا

ظفر اقبال سہسرامی

[illegible] سہسرام (بہار)

برادر محترم ـــــ ظفر اقبال بسلام و احترام

آپ کی محبت و عنایت کا شکریہ کن الفاظ سے ادا کروں؟ ـــــ آپ نے اپنے مقبول ماہنامہ کے ذریعے
مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ سوچتا ہوں تو آپ کے دیار ادب کا قائل ہو جاتا ہوں۔ [illegible] کی بات نہیں ہے پر مجھے کتنے
خطوط ملے ہیں اور میرے قدر دانوں نے کیسی کیسی تعریف کی ہے۔ ایک خط سرحد سے بھی آیا ہے جس میں لکھا گیا ہے۔
"آپ اتنی غمناک، پُرسوز اور دل کو گھائل کر دینے والی کہانیاں نہ جانے کیوں لکھتے ہیں۔ کیا آپ کے سینے میں ایک مخلص،
ہمدرد اور درد مند انسان کا دل دھڑکتا ہے۔ آپ اس قدر پتھر دل انسان کیوں ہیں؟ میرے بزرگ [illegible] ہم
انسان ہیں ـــــ پھر تحریر [illegible] ـــــ [illegible] صاحب نے [illegible] سرحدی مجھ کر بیسویں صدی؟
[illegible] شروع کر دیا ہے۔ [illegible] کے اس بے پایاں خلوص کے لئے ہم سب تہ دل سے مشکور ہیں! ـــــ آپ اپنے
خیالات میں میرے محترم کہ آپ کے نام کے گُن گاتے جا رہے ہیں ـــــ "رُوح کا دامن بھیگا بھیگا" ارسال کر رہا ہوں۔
اپنی رائے سے ضرور دیجئے گا۔ آپ اچھے ہیں نا؟ میں تو اِدھر موسمی بخار میں پڑا رہا۔ اب کچھ طبیعت سدھری ہے۔

خلوص کار ـــــ ظفر اقبال

---

بہار کی وہ سانولی سلونی سی شام تھی۔
جب میں تمہاری تلاش میں نکلا تھا۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی اور میں کھڑکی کے قریب بیٹھا آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔ کہیں گدلے، کہیں بھورے، کہیں سفید اور کہیں روئی کے گالے جیسے بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ غالب نے شب کو سحر کے رنگ میں ڈھلتے دیکھا تھا اور میں بادلوں کو اپنی منزل تک کتنے رنگ میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ بارش ہو جانے سے جلتی تپتی فضا خوشگوار ہو چکی تھی اور پیاسی زمین بھیگ کر بوندوں سے ڈھک کر سیراب ہو رہی تھی۔ باہر سے آنے والے تیز رو جھونکوں میں شگفتگی کے ساتھ شگفتہ پھولوں کی مہک تھی ـــــ یعنی جدھر نظر اٹھتی تھی ایک انجمن سی سجی ہوئی تھی۔ لیکن جب سے دل کی بستی اجڑی ہے سہرا گلشن کھنڈر میں بدل گیا ہے۔ [illegible] کی وہ چہل پہل، وہ رونق اور رعنائی مجھے نہیں ملی۔ جتنی رنگینیاں [illegible] تھیں۔ مجھے تو اس بار موسم بہار کا چہرہ بھی دھندلا معلوم ہوا۔

کچھ ایسے موڑ پر تم مجھے چھوڑ گئی ہو جہاں معصوم کلیوں کا دل شگفتہ پھولوں کی سانس اور بہار کی رُت گُھٹی گُھٹی سی معلوم ہو رہی ہے۔ کل تک جس دل پر مجھے ناز تھا، وہ دل آج [illegible] ہے اور میں روحانی طور پر بکھرا بکھرا، ذہنی طور پر تھکا تھکا سا یہی سوچ رہا ہوں ـــــ آخر کس چیز سے میرا احساس بہل سکے گا اور دل میں بستے ہوئے زخم کی تکلیف کیسے ختم ہو سکے گی۔ ہاں دوست! یہ زخم دورِ جراحت کی عنایت ہے اور یہی دور مجھے اکسا کر تمہاری تلاش میں لے جا رہا ہے۔ زخم چونکہ ہرے ہیں، تکلیف بڑھ رہی ہے لیکن میرے لب بند ہیں اور احساس کے کانوں میں تمہاری ایک ہی آواز آ رہی ہے ـــــ "مسکرا دو دوست کہ درد کے اس رشتے میں سب کچھ سہنا پڑتا ہے۔"

اور میں ہجر کے اس دور میں بھی تمہاری رفاقت کے لمس کو محسوس کر رہا ہوں اور خوش ہوں کہ دل سے جگر تک کا ساحل "دریائے خوں آب" ہونے کے باوجود تم میرے پاس بھی ہو اور قریب بھی ہو۔ تمہیں دیکھ رہا ہوں اور تم سے مخاطب بھی ہوں۔ کل کی طرح جب تم میرے

ترنمِ ریزی ... کی تلاش ... [illegible]

... ہو جاتا ہے ... [illegible]

اور تم ... [illegible] ... تلاش

میں جا رہا ہوں ... [illegible]

کتاب کے ... [illegible] ... خواب

... [illegible]

... [illegible]

ہے۔ ... تلاش میں ... [illegible]

سلسلے کو ابد تک چلنا ہے۔

میرا سفر ختم ہو چکا تھا اور یادوں سے ... [illegible] ... ان

پہلے چھٹیں لگی تھی۔ وہی آفاقی سفید ... [illegible]

فطری بدن کو ... تھی ... [illegible] ... پر کل

تم میرے ساتھ تھیں اور تمھاری رفاقت آبشاروں، سبزہ زاروں، بہاروں ... کے

گیت گا رہی تھی۔ وہی گیت اِس جدائی میں نشتر لگا رہے تھے۔ ... پر سکت

ہے عاشی! اگر وقت جابر نہ ہوتا تو آرزوؤں کی کائنات یوں اُجڑتی ... کی بہت سات

بہت سہانی تھی کس لئے میرے دوست! ... آبادی کب ... جو

آسمانی، آفاقی اور موسیقی شے ہے۔ جس کی تکمیل میں قدرت نے تاروں کی چمک، ... چاند کا

داغِ جگر، شب کی زلفِ برہم کی تیرگی، بجلی کی تڑپ اور حور کی پاکیزگی کے ساتھ خالق نے

اپنی ربوبیت کی شانِ بے نیازی سے کام لیا۔ وہ محبت اِن کائناتوں کو سمیٹے ... ہوئی

ہے۔ اِس میں تمھارا کیا قصور! اور میں جگر کی آگ، نظر کی خلش اور رُوح کی ... اُسی

پگڈنڈی سے گزر رہا تھا۔ بلوطے کے درخت کے قریب پہنچ کر میرے پاؤں خود ہی رُک گئے۔

اُس کے گھنے سائے میں وہ چکنی چکنی سی چٹان پڑی تھی جہاں تم ... بیٹھی تھیں۔

اپنی آپی اور چند سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی نہ جانے کس بات پہ باتیں کر رہی تھیں اور میں

تمھارے بھائی کے ساتھ اچانک موڑ میں آتے ہوئے چکنی مٹی سے پھسل پڑا تھا ...

قدموں کے قریب پڑا جب نظریں اُٹھائی تھیں تو تمھاری آنکھوں کے ... نے ...

مجھے شرمندہ کر دیا تھا۔ حالانکہ تمھارا کہنا تھا کہ ... ہوں

میں گرا ہے۔ اسے تو میری روح کے دامن میں آجانا چاہیے ... اور واقعی تب سے ... روح

کے دامن میں چھپ گیا تھا لیکن میں ... تمھاری آنکھوں کے ... سطح

پر رہا تھا۔ ... [illegible]

مجھے بیٹھے بیٹھے یہی خیال ... [illegible]

کی سماعتوں اور گرانی میرے ساتھ ... [illegible]

ساتھ ہی آنکھ بھاری تھیں۔ وہی آنا ... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

خوبصورت اور ... نظروں سے دیکھنے لگا تم بھی تو چاہتی ہو ... اور

ملتے ہیں آگے جانے والی تھیں۔ تمھیں کیا خبر کہ دل کا ہر گوشہ ہر بار اور تاریک ہو رہا ہے

لیکن اب تم میرے ساتھ جا رہی تھیں ... کی شدت تھی۔ شادابی اور ہریالی کا

موسم ... بے پناہ اور جھلسانے والی گرمی کی شام تھی۔ بارش نہ ہونے سے آسمان سے

---

- جو شخص اپنا راز مخفی رکھتا ہے وہ گویا اپنی سلامتی کا محافظ ہے۔

(حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ)

- تین چیزیں محبت بڑھاتی ہیں۔ سلام، مخاطب کو بہترین لقب سے یاد کرنا، مجلس میں دوسروں کے لئے جگہ خالی کرنا۔

(حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ)

- بُرے کی صحبت سے تنہائی بہتر ہے اور نیکوں کی صحبت تنہائی سے بہتر ہے۔

(حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ)

- جو نرمی سے محروم رہا وہ گویا ہر نیکی سے محروم رہا۔

(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

---

زمین تک، شجر سے حجر تک بُری طرح تپ رہے تھے اور باہر سے آنے والے جھونکے میں حریفانہ اشتعال تھا۔ تم نے گرمی سے پریشان ہو کر کہا تھا۔

”اُف! کتنی شدید گرمی ہے! جی کے اِس عالم میں تو جان نکل جائے گی!“

اور میں مسکرا کر رہ گیا تھا ... میں تمھارے صندلیں وجود اور کافوری تنفس سے سرشار ایک گونہ بیخودی میں تھا۔

لیکن آج طوفانِ طرب سے ہر سُو موجِ گل، موجِ صبا اور موجِ شراب اُٹھ رہی ہے لیکن دل و نگاہ کی تپش سے مجھے کچھ بھی وہی ویرانی اور سوختہ سامانی نظر آ رہی ہے۔ میں بجھا بجھا، اُداس اُداس سا تمھاری تلاش میں وہی آتا جا رہا ہوں۔ جہاں تمھاری ... باہیں ... کی طرح بڑھ کر مجھے اپنے گھیرے میں لے لیں گی اور ... کی ساری کرب ناکی کو، دل کی تمام آزردہ سالی کو تم چوم چوم کر لو گی۔ ... مجھے بہت تنہا

[illegible]

[illegible] ہوتی ہے ... [illegible] تم ہو گئیں ہاشی [illegible] خوبصورت
[illegible] میں آتشیں زخم سپتا رہی تھی۔ دل زار
[illegible]

[illegible] ہم اپنے شباب پر تھا اور سیاحوں
[illegible] کی نظر نواز ماحول میں پا نو دس برس ہے ہیں میں
[illegible] کر نے کے بعد میں ناموش بکل پڑا تم تھیں
[illegible] ساتھ تھا اور ہوا کی گہرائیوں میں لطیف سی کسک تو
[illegible] جھیل بوٹنگ کرنے والوں سے بھری تھی۔ ہلکی چنچلی
ہنسی [illegible] ابھر کر فضا میں پھیل رہے تھے۔ زندگی کتنی ولولہ انگیز
تھی۔ [illegible] حسرت تھی۔ ہاشی! تم اپنے ساتھ زندگی کی اتنی رنگینیوں
اور بہاروں [illegible] ہوئی لے کر وارد احساس میں کانٹوں کے سوا گرد و غبار
کے سوا کچھ [illegible] کرتا ہوں۔ جب تلخ حالات کا زہر احساس میں پھیلنے لگا
تو میں نے سگریٹ [illegible] قدموں سے ہاشی وادی ریحان کی طرف چلا جہاں برت کی
نرم اور مہکی ہوئی زلفوں کے ریشمیں اندھیرے میں تمھیں اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا
کرتا تھا۔ تمھارے رخساروں کی آنچ سے پھیلے ہوئے سرخ پھول مہک اٹھتے تھے۔ سرمئی
ہوئی ہوائیں [illegible] بھینی بھینی مہک رچ جاتی تھی۔ میں بہک جاتا تھا۔

"ہاشی! [illegible] !! اگر تیری مرمریں بانہوں کا سہارا نہ ملا تو؟"

"نہیں دوست! ہاشی تمھارے لئے پیدا ہوئی ہے۔ تمھاری ہے اور تمھاری
رہے گی۔"

"کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے ... "

"کہ ہاشی ریاض کی ہے ... "

تم نے جملہ پورا کرتے ہوئے بڑے رندانہ موڈ میں قہقہہ لگایا تھا اور اُس قہقہے کا
ترنم چٹانوں کے جھرنے ٹوٹ پڑے تھے اور ریحان کی فضا مسرور ہو گئی تھی۔ اُس سرور نے
خوابوں کے کتنے پھول چن کر میری آنکھوں کے دامن میں بھر دیئے تھے پھر خوابوں نے اک
روشن زندگی کی بشارت دی تھی۔

"آؤ نا"

[illegible] ہو کر بیٹھ رہ گیا۔ ہر قدم پر یادوں کے سنگریزے احساس کے تلوے میں
چبھ رہے تھے۔ تم میٹھا چلوں ہاشی! تمھارا روپ کہاں کہاں نہیں ملتا اور جہاں
[illegible] نظروں کو چوٹ لگتی۔ تم چھپتے اور میں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتا۔ کاش! ایسے
[illegible] تمھارا اسپرتی دیکھتا تو تم بھی نہ بچتیں۔ یہاں شاداب چہروں اور نو دمیدہ
[illegible] فکر و نظر کی تازگی کے لئے وہ چہرے کافی تھے۔ لیکن تمھیں دیکھنے

کے بعد ____ یکم جنت محبت اپنا پہلا وار کتنی چوری سے کرتی ہے اور کتنے لطیف انداز
میں کہ دل گھائل ہوتا ہے لیکن گھاؤ لگنے کا احساس نہیں ہوتا ____ شاید وہ پہلا وار تھا
جس کی ضرب کا پہلا زخم کوشش کے باوجود میں تمھیں بھول نہ سکا اور اُس رات میرے
تخیل میں تمھارا سایہ رہ رہ کر اُبھرتا رہا۔ ایک عجیب سی ہم آہنگی کسک میں ڈھلتی رہی۔ مجھے
یہی محسوس ہو رہا تھا کہ تم میرے خواب کی تعبیر ہو۔ کیونکہ تمھارے سائے کے ساتھ کائنات
میں رہی تھی، اُس کائنات کی شہزادی تم تھیں۔ شیکسپیئر کی "نیر گرل" اور "فیلیا" جیسی۔ جسے
دیکھ کر ہیملٹ دیوانہ ہو گیا تھا۔ میں بھی تو نیم دیوانہ ہو رہا تھا۔ اُس نیم دیوانگی میں یہی دل
چاہتا تھا کہ تمھارا سایہ جس گیت کی صباحت و ملاحت کو میرے تخیل کی دنیا میں گھول
رہا تھا، اُس گیت کو میں اپنی روح میں اتنا سمیٹ لوں کہ میری روح تم میں جذب ہو کر
وحدت میں ڈوب جائے۔

---

- پرماتما دو طرح کے انسانوں سے نفرت کرتا ہے۔ دوسروں سے بے رُخی برتنے والا اور غرور سے چلنے والا۔ (مہابھارت)
- اپنے اندر چھپی ہوئی بُرائی، بُرے خیال اور بُری نیت کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ (سوامی سارشیدانند جی)
- دھرم کسی خاص وقت سے منتر کا جاپ کر لینا نہیں، یہ ایک سانچہ ہے جس میں پُوری زندگی کو ڈھالنا دھرم ہے۔ (سوامی وویکانند جی)
- نیکوں کی صفات یہ ہیں ____ بزرگوں کی صحبت، حسن نیت اور خدا کے نام سے لذت پانا، اہل کمال کی خدمت کرنا اور ریاکاری سے احتراز۔

(گرو نانک جی)

---

دوسری صبح ____ میں بہت سویرے تفریح کے لئے نکل گیا۔ راستے کے
اُترتے ہوئے اندھیرے اِس بات کے شاہد تھے کہ تمھاری یاد نے ایک پل بھی مجھے چین نہ لینے
دیا۔ حریم دل میں بسی وہ یاد کیسی کیسی شوخیاں کر رہی تھی اور کلیجہ میں چوٹ لگا رہی تھی۔
میں اُس چوٹ کو بہلانے کے لئے بہت سویرے نکل گیا تھا۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ فطرت
اپنی بے ساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے دیدہ و دل کو کھینچ رہی تھی۔ نسیم صبح کے
جھونکوں میں نو دمیدہ و نوشگفتہ پھولوں کی مہک تھی۔ سبزوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوانیں
جمالیاتی احساس کو بہلا رہی تھیں اور نور میں نہائے ہوئے شیلے اُفق کے سحاب پاروں
میں کھویا ہوا پہاڑوں کا یہ سلسلہ ڈھلوانوں سے نیچے نشیب میں خم کھاتی ہوئی جھیل،
جھیل کی نیلی نیلی سطح اور سطح پر تھرتھراہٹوں کا رقص بے تاب۔ رقص کے ساتھ جھکے جھکے
سُرمئی ابر پاروں کا آہنگ ____ نظاروں کی یہ دلفریبی اور روح پروری کو دیکھنے کے لئے


میری
سبھی قیمتی
اشیا
محفوظ ہیں...
"مجھے تو ذرا بھر بھی فکر نہیں ہے۔ بیٹا، اپنے سبھی زیور
پنجاب نیشنل بینک کے سیف ڈپازٹ لاکرز میں
رکھتی ہوں۔ وہ اندر محفوظ ہیں۔ تم بھی اپنی قیمتی اشیا
ان کے لاکرز میں رکھو۔"
"پشپا آنٹی آپ کو کوئی گھبراہٹ نہیں ہے۔؟
سو سنیلا کے گھر دن دہاڑے چوری ہو گئی ہے۔"
"پشپا آنٹی کا بھلا ہو۔ اب میرے
من کو شانتی ہے۔ یہ لاکرز
بیحد ہی بہت محفوظ ہیں۔
میرے سبھی فکر دالام ختم ہو گئے۔"
پی۔ این۔ بی سیف ڈپازٹ لاکرز میں رکھئے۔ یہاں ان کے چوری
جانے، آگ سے ضائع ہونے اور دیمک لگنے کا
قطعی کوئی خطرہ نہیں۔ لہٰذا آپ کو فکر سے چھٹکارا
ملے گا آپ کی پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔
پنجاب نیشنل
بینک
سیف ڈپازٹ لاکرز

شوق نظر کہاں تھا اور وہاں ترنم سی ہوتی تھیں ——— اور پھر اچانک میری نظروں نے دیکھا۔ ایک سفید بادل کے ٹکڑے کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر الٹتے آرام کرتے ہوئے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ ایک عجیب اور نامحسوس سی کیفیت سے میرے جسم میں ہلکی ہلکی لرزش پیدا ہو گئی۔ کہ ابھی تمام ماحول میرے قریب آکر ٹھہر گیا ہیں۔ تمہارے گلاب سے چہرے پر حجاب کے سائے کچھ [illegible] کی چمک سی تھی جیسے نئے نورانی چہرے پر شفق شباب کی سرخی ہو۔ میں شاید کچھ کہہ ہی سکتا تھا کہ تم نے اس سکوت کو توڑا۔

"[illegible] صاحب!"

"[illegible] دیکھئے نا!"

"[illegible] تمہارے چہرے پر گہرا شباب اور بھی حسین تر ہو گیا۔" "آپ مجھ سے بہت زیادہ unattainable ہیں۔ پھر میں اپنے ہاتھوں میں محبت کا جام کو کیوں کھو دوں؟"

تم نے [illegible] انداز میں کہا اور اس شوخی نے کوہسار کے ماحول کو شوخ کر دیا۔ فضا کی جلترنگ کیفیت شروع ہو گئی۔ اب تک جیسے کی رعنائیوں سے موسم میں جو حسن اور جمال تھا، تمہارے آنے کے بعد اس رعنائی میں شگفتگی اور نغمگی کا رچاؤ کتنا زیادہ ہو گیا تھا۔ جب کوئی بت رعنا سیر چمن کو جاتی ہوگی تو چمن کے شعلے جاگ جاتے ہوں گے۔

"میں تو تنہا چل رہی ہوں۔ میرا ساتھ دیجئے نا!"

تم نے [illegible] نظروں سے دیکھتے ہوئے مجبورانہ انداز میں کہا اور اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جیسے تم نے [illegible] بڑھایا تھا۔ اپنی زندگی کا وعدہ کر رہی تھیں، ساتھ دینے کا پیمان وفا باندھ رہی تھیں۔ ایک عہد سنا رہی تھیں۔ میں تمہیں دیکھ رہا تھا۔ تمہاری آنکھوں کے اندر اُس نئے اور خوبصورت دور کو جنم لیتے دیکھ رہا تھا۔ عورت جب کبھی کسی مرد کی جانب اپنے دل کی تمام تر صداقت اور روح کی تمام تر گہرائیوں کو لیے بڑھتی ہے ایک نئی کائنات بن جاتی ہے۔ میں نے تمہارا ہاتھ تھام لیا اور پھر میرے ہاتھوں کا سہارا پاکر تم کتنی بے باکی سے چلتی رہیں، باتیں کرتی رہیں۔ چلتے چلتے ایک جگہ میں رنگا رنگ طرح طرح کے پھولوں کے [illegible] کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ پھول تمہارے بالوں میں سجا دوں لیکن تمہارے بال گھنے اور بکھرے ہوئے تھے۔ میں سوچنے لگا۔ اور پھر ——— جب ندی میں سیلاب آتا ہے تو اس کی موج تیزی بند و مہد کی پروا نہیں کرتی، توڑ دیتی ہے۔ انسانی جذبے کی بھی حالت کچھ اسی طرح ہے۔ جذبے کے اشتداد نے مجھے زیادہ سوچنے نہ دیا اور میں بے تحاشا پھول چننے لگا۔ تم کھڑی مسکراتی رہیں۔ میرے دونوں ہاتھ پھولوں سے بھر گئے۔ میں نے چاہا ان پھولوں کو تمہارے سر پر بکھیر دوں لیکن وہ پھول سر کی بجائے تمہارے قدموں ہی میں بکھر گئے۔ اسی لیے کاشانی کی تیز ہنسی نے ہمیں چونکا دیا۔ وہ قریب آگیا اور ہنستے ہوئے پُر لطف انداز میں کہا۔

بے خودی میں ہاتھ کانپا، جام چھوٹا، مے گری
جانے کن نظروں سے دیکھے گی بھری محفل مجھے

"بھائی جان! یہاں کوئی بھری محفل نہیں کہ جانے کن نظروں سے دیکھے گی!"

تم نے برجستہ کہا۔

"ہاں جی! یہ تو جلوۂ طور ہے!" کاشانی نے پھر جملہ کسا۔

"تمہارا مطلب کیا ہے؟" میں نے مداخلت کی۔

"عزیزم! مصر کے بازار میں یوسف کے بکنے کا تذکرہ تو سنا تھا لیکن..."

"لیکن وی آنا کی پہاڑی پر ریاض صاحب کو بکتے دیکھا۔ ہے نا؟"

کاشانی کو تم نے منہ توڑ جواب دیا۔ وہ جملہ کب بُرا لگنے والا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا تم میری ہو جاتیں۔ وہ دور بھی کتنا نشاط انگیز تھا عاشی! میرے ماضی کی رُوپہلی جھلکیوں میں تمہارا سنہرا اور پُر وقار چہرہ اُبھر اُبھر کر جب نور افگن ہوتا ہے میرے دل کا ہر گوشہ تڑپ اُٹھتا ہے۔ وقت کے عزرائیل کو مجھ پر ذرا بھی رحم نہ آیا اور اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ مجھ سے تمہیں چھین کر جدا کر دینے کے بعد میرا کیا ہوگا لیکن جب وہ یہی سوچنے لگے تو قانون قدرت پر حرف آجائے۔

لوگ کہتے ہیں ماضی کی یاد عذاب ہے۔ لیکن میں اسی ماضی کی حسین وادی میں ایک صبح سے ٹہلتا رہا۔ خیالوں کے پاؤں ذرا بھی نہ تھکے اور اب شام کی آمد آمد ہے۔ نارنجی اِسی دھوپ کا زرد دوپٹہ ہولے ہولے سرسراتا ہوا سمٹتا جا رہا ہے۔ مجھے اپنے کمرے کی طرف لوٹنا چاہیے۔ تمہارے خیال میں ڈوبا صرف سگریٹ پھونکتا رہا۔ جس سے منہ کا ذائقہ تلخ ہو کر رہ گیا ہے ——— جب پوری زندگی تلخ ہو رہی ہو عاشی تو ایسی تلخیاں ابھی کتنی انگیز کرنا پڑیں گی۔ یہ کون سوچے ——— اور ایک آخری سگریٹ سلگا کر میں لوٹ رہا تھا۔ کتنے خوبصورت جوڑے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے شام کی تفریح میں نکلے تھے۔ مسرت و انبساط میں کتنی قوت و توانائی ہے۔ ان کے چہرے پر مسرت سے جو ہلکا گداز اور گداز میں جو برق رفتار زندگی کی حرارت ہے۔ وہ کبھی ہمیں بھی تو میسر تھی۔ تمہیں وہ رات یاد ہے عاشی! گزشتہ سال تم میرے ساتھ تنہا آئی تھیں۔ ہم یہاں کتنے خوش اور بشاش تھے۔ ہماری نظروں کے چراغ جل رہے تھے۔ حدِ نگاہ تک جدھر دیکھتے، عروسِ حیات کا چہرہ نکھرا نکھرا، شاداب و شگفتہ ہی تھا اور مہکتے پھولوں سے بھری بیلیں دل سے پیچ در پیچ لپٹی ہوئی تھیں۔ زندگی کا کوئی جھمیلا تھا نہ مسئلہ۔ بس وہی چلبلی زندگی اور شوخ عاشی میرے ساتھ تھی اور بہاروں بھری وہ چاندنی رات جب ہوا پھولوں کی مہک سے لدی چل رہی تھی۔ تم گھومتے گھومتے تھک کر جھیل کے کنارے سبزے پر لیٹ گئی تھیں۔ چاندنی کچھ اور نکھر آئی تھی۔ ہوا کے سبک رو جھونکے کچھ اور بہک گئے تھے۔ میں تمہارے قریب بیٹھا تمہیں خاموش دیکھ رہا تھا۔ دل میں جذبے

[illegible]

"مانی ـــــ"

[illegible]

مگر ـــــ میری روح میں چھپے ہوئے سچ تمہیں بھلا کون بتا سکے گا

شاید تمہارے لئے یہ فطرت قدرے کڑی گزر رہی تھی۔

جب ہی تو فطرت نے جو احساس کا خلا پیدا کیا ہے اس کا مظہر بنا یا دی آنسے

تو شاید کہ بعد ہی تمہاری شادی حمید اشرف سے کر دی گئی تھی۔ جب پاکستان میں اپنی حیثیت اور تمہاری حیثیت ہی بھول گیا تھا۔ تم ایک فیملی کی ایک فرد تھیں۔ تمہارے ڈیڈی دولت والوں کے حلقے کے ایک رکن تھے۔ تمہارا بھائی کتنی بڑی فرموں کا حصے دار تھا اور حمید اشرف جو امریکہ میں سروس کرتا تھا اور یوں بھی ایک رئیس زادہ تھا۔ اور میں؟ ایک مفلوک الحال شہر اجنبی دیار کا راہی! میری کوئی حیثیت تھی؟ میں تمہیں کس حشمت و ثروت کا شوہر کہلوانا چاہتا تھا؟ تم نے فاصلوں کو سمیٹا تھا اور کبھی بادلوں کی جھالروں سے، کبھی تاروں کی محفل سے، کبھی آنسوؤں کے چھینٹے سے اور کبھی سنگ زاروں کی وحشتوں سے چاندنی کی طرح جھانکتے ہوئے میری تنہائی کے لمحوں کو سنوارا تھا۔ سب ایک جھٹکے میں مٹا کر مجھے وہ اندھیرا دے گئی ہو جس میں بھٹک کر میں رہ گیا ہوں۔

شام کے ہلکے ہلکے سائے اب گہرے اور پُراسرار ہو چکے ہیں۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن بہت بوجھل ہو رہا ہے۔ دماغ کے سوچنے اور سمجھنے والے گوشے اونگھ رہے ہیں۔ فضا پر سنسنی سی بکھر گئی ہے اور شہتوت کے درخت کے اوپر اٹھنے والے چاند کا غبار سا ہے۔ میں تمہاری تلاش میں وہی آتا آیا ہوں ـــــ تمہیں پانے کے بعد میرے چھلکتے ہوئے زخم اور ان کی ٹیسیں سب جاتی گی۔ ایک لمحے کے لئے میں تمہاری زلفوں کے گھنیرے سائے میں چھپ کے جی رہا تھا۔ لیکن یہاں تو تمہارے مذہب کا ایک آذرکدہ کھلا ہوا ہے۔ ایک صنم آباد ہے۔ ہر بُت میں تم ہی جلوہ فرما ہو۔ ہر لمحہ [illegible] زخم لے رہا ہے۔ زخموں سے بھری یہ نظر [illegible]

[illegible]

"پھر؟"

"میری خاطر ـــــ [illegible]"

میں سکتے میں [illegible]

[illegible] تم مجھ سے ـــــ تمہیں [illegible]

"اچھا میں جا رہا ہوں۔"

میں اٹھنے کے لئے اٹھا تو تم مجھ سے [illegible]

جھکی ہوئی ہوئے تم نے میری پیشانی چوم لی اور سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر [illegible] طور پر کہا۔

"میری روح کا دامن تمہارے پیار کی تمنا سے [illegible] ہو؟"

یہ کہتے ہوئے تمہیں شبہ ہوا اور بہت تیزی سے [illegible] اپنا ہاتھ [illegible] لیا کر [illegible] ادا کیا اور اسی رات وہی آنا چھوڑ دیا۔

میں وہی آتا تمہاری تلاش میں آیا تھا۔ [illegible] سے بھر کر مجھے لوٹا دیا۔ آنسوؤں کی سوغات [illegible] کے چراغ ہیں [illegible]

[illegible]

# غزلیں

## پروفیسر ایم اے حفیظ بنارسی ایم اے۔ بی ایڈ

مے خانہ پہ کالی گھٹا چھائی تو کیا ہوگا
مری توبہ اگر موسم سے ٹکرائی تو کیا ہوگا

فضائے بزم عشرت بھی نہ راس آئی تو کیا ہوگا
طبیعت اُن کی محفل میں بھی گھبرائی تو کیا ہوگا

میں اکثر سوچتا رہتا ہوں شب ہائے جدائی میں
یونہی ڈستی رہی مجھ کو یہ تنہائی تو کیا ہوگا

چلا تو ہوں میں عرضِ شوق کی دنیا لئے دل میں
نہ کام آئی حضورِ دوست گویائی تو کیا ہوگا

وہ مجھ کو موردِ الزام ٹھہراتے تو ہیں لیکن
کہیں تقصیر خود اُن کی نکل آئی تو کیا ہوگا

مجھے کچھ غم نہیں اپنا کہ میں تو ہو چکا رسوا
جو لے ڈوبی تمہیں بھی میری رسوائی تو کیا ہوگا

فزوں ہو جائینگی کچھ اور بھی بیتابیاں دل کی
نگاہِ لطف سے کارِ شکیبائی تو کیا ہوگا

## خمار انصاری ایم۔ اے

گزر جاتی بڑی شائستگی سے
نہ کرتے مشورہ گر آگہی سے

ہمیں جنت سے بہلاتا ہے واعظ
ہمیں نسبت رہی ہے اس گلی سے

وہ میری روح میری زندگی تھے
وہی اب ہو گئے ہیں اجنبی سے

زمانے بھر کی رسوائی ہے اور ہم
قیامت ہو گیا ملنا کسی سے

اُدھر جشنِ طرب ہے میکدے میں
اِدھر ہم جاں بلب ہیں تشنگی سے

نہیں جرأت بھی میرے دشمنوں میں
بظاہر مل رہے ہیں دوستی سے

خمار اس آب و گِل کی تیرگی میں
اُجالا ہے تو دل کی روشنی سے

## پروفیسر اختر نظمی، ایم اے

دل کی دنیا ہی زیر و زبر ہو گئی
اُن کی پہلی نظر کارگر ہو گئی

میں تو رازِ محبت چھپاتا رہا
کیا خبر اُن کو کیسے خبر ہو گئی

وہ بھی آ ہی گئے منظرِ عام پر
داستاں جب مری مشتہر ہو گئی

راہ میں اُن سے ملنے کا امکان تھا
زندگی راستوں میں بسر ہو گئی

دن گزر ہی گیا درد کی چھاؤں میں
غم کی آغوش میں شب بسر ہو گئی

تلخ تھی یوں بھی نظمی مئے زندگی
اپنے احساس سے تلخ تر ہو گئی

# سر کا درد؟

# سیریڈون 'روش' لیجئے...

# درد غائب...



## ... اور آپ میں ایک نئی پھرتی!

یہی تو خوبی ہے سیریڈون کی! سیریڈون کے متوازن فارمولے کی بدولت درد اور اس سے پیدا ہونیوالا تناؤ دور ہو جاتا ہے اور بدن میں ایک نئی پھرتی آجاتی ہے۔ اسی میں تو ہے سارا فرق! آپ صاف ذہن کے ساتھ فوراً کام شروع کر سکتے ہیں اور اپنے دوست احباب کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ سیریڈون کی ایک ہی ٹکیہ درد دور کرتی ہے، آرام پہنچاتی ہے اور تازگی بھی بخشتی ہے! سیریڈون ہمیشہ اپنے پاس رکھئے۔ بچوں کے لئے صرف پاؤ سے آدھی ٹکیہ کافی ہے۔

سر کا درد
دانت کا درد
بدن کا درد اور
'ان دنوں' کی تکلیف
سیریڈون کی ایک ہی
ٹکیہ سے غائب!



'روش' کی تیار کردہ
سول ڈسٹری بیوٹرز : وولٹاس لیمیٹڈ

VT. 5626 (A)

افسانہ

# تلاش

ڈاکٹر کیول دھیر

میڈیکل آفیسر جیتو منڈی (پنجاب)

۱۱ ستمبر ۱۹۶۷ء — پیارے بھیا! آداب قبول ہو

. . . آپ حیدرآباد سے لوٹ آئے ہوں گے۔ اپنے خط میں آپ نے لکھا تھا کہ ان دنوں طاہرہ دیدی بھی حیدرآباد ہی میں ہیں۔ لیکن وہ تو حیدرآباد سے آپ کی روانگی سے کئی روز پہلے ہی بمبئی لوٹ گئی تھیں۔ شاید اپنی واپسی کی اطلاع انھوں نے آپ کو نہیں دی۔ آپ منی آرڈر بمبئی ہی بھجوا دیجئے گا ——— آپ سے متعلق دونوں کتابوں کے مسودے اور ان پر آپ کے دیباچے مجھے ابھی موصول نہیں ہوئے ہیں۔ اُمید ہے دو چار روز تک مل جائیں گے۔ ان کی اشاعت کے بارے میں اپنے پچھلے خط میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ آپ کی رائے کا انتظار ہے ——— لیجئے، ایک افسانہ "تلاش" حاضر خدمت ہے۔ لکھنے کے بعد جب پڑھا تو بے حد پسند آیا۔ شاید انداز میں آپ کو کچھ نیا پن سا بھی محسوس ہو۔ آپ کی اور اپنے قارئین کی رائے کا مجھے شدت سے انتظار رہے گا۔ . . آپ کا اپنا ہی ——— کیول دھیر

---

"ساری زندگی تم یونہی آہیں بھرتے رہو گے۔ شاید ایسی کوئی لڑکی ابھی دنیا میں پیدا نہیں ہوئی جو تمھاری نگاہِ انتخاب میں آسکے۔"

"ہو سکتا ہے۔ لیکن، میرا یہ فیصلہ ہے کہ شادی ایسی ہی لڑکی سے کروں گا جس کا تصور میرے لیے ہے ورنہ ساری زندگی اکیلا ہی رہنا بہتر ہے۔" ستیندر جب بھی راجن کو چھیڑتا تو وہ ایسا ہی کوئی جواب دیتا اور اس کے بعد دونوں دوست تازہ موضوع پر بحث میں اُلجھ جاتے۔

لیکن آج جب راجن ستیندر سے ملنے آیا تو اُس کا ہر انداز بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آج اُس نے ستیندر کو موقع نہ دیا کہ وہ اُسے چھیڑے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے کہا۔

"تمھیں ایک خوشخبری سنانے آیا ہوں۔"

"کیا کوئی لڑکی تمھیں پسند آگئی؟" ستیندر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو یار!"

"واقعی؟ کون ہے وہ؟ کیسی ہے؟ کب شادی کر رہے ہو؟"

ستیندر کو حیرت ہوئی۔ اسی عالم میں ایک ساتھ کئی سوال اُس نے کر دئے۔

"ارے دھیرے دھیرے۔ پوچھ یار! نازک باتیں نزاکت سے ہوتی چاہئیں!"

راجن نے مسکراتے ہوئے کہا اور اُس کے نزدیک ہو کر وہ یوں بیٹھ گیا جیسے کوئی نہایت راز کی بات کہنا چاہتا ہو۔

"کہو نا یار! کون ہے وہ؟" ستیندر بیقرار سا ہو اُٹھا۔

"اُس کا نام موہنی ہے ... بلا کی حسین ہے۔ جیسے کوئی حور آسمان سے اُتر آئی ہو! ایسی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی!" اور راجن نے اپنی کہانی کہہ سنائی۔

موہنی واقعی اتنی ہی حسین تھی ——— سر سے پاؤں تک سراپا پیکرِ حُسن! جیسے ساری دنیا کی حُسن و رعنائی سمٹ کر موہنی بن گئی ہو!

پرسوں ہی کلب میں راجن سے ملاقات ہوئی تھی اور پہلی ہی نظر میں جیسے وہ اُس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا تھا۔ نگاہوں کی تشنگی اُسے دیکھتے ہی جیسے مٹ گئی تھی اور محبت کی آرزو مچل اُٹھی تھی۔

موہنی مسز کوشل کے ساتھ ہال میں کونے کی ایک میز پر بیٹھی کافی کی چسکیاں

سے رہی تھی۔ راجن مسز کوشل سے بخوبی واقف تھا۔ مسٹر کوشل کے ساتھ اُس کے گہرے مراسم تھے۔ راجن جب کبھی ان کے یہاں جاتا تو وہ شادی کا موضوع چھیڑ دیتے اور اُس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ مسز کوشل بھی شریک رہتیں اس لئے راجن کو اُس میز تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ موہنی میں اس نے بے حد کشش محسوس کی۔ جسے آج پہلی بار وہ دیکھ رہا تھا۔

"ہلو مسٹر راجن! بہت دنوں کے بعد آج دکھائی دئے"

مسز کوشل نے راجن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھابی! کچھ مصروفیت ہی رہی"

"مصروفیت کی وجہ کہیں کوئی لڑکی تو نہیں تھی؟"

مسز کوشل اپنی ہی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ راجن صرف مسکرا دیا اور اُن کے ٹھیک سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"زندگی میں صرف ایک ہی بار تو چانس ملتا ہے شادی کرنے کا۔ جہاں تک ممکن ہو اُس کا بھرپور فائدہ اُٹھانا چاہئے"

راجن نے یہ بات کچھ اتنی معصومیت سے کہی تھی کہ مسز کوشل کے ساتھ ہی موہنی بھی ہنس دی۔

"لیکن آپ کو چانس ملا بھی یا نہیں؟" مسز کوشل نے کہا۔

"اب آثار دکھائی دینے لگے ہیں" راجن کی ترچھی نگاہ موہنی کی جانب تھی۔

موہنی پہلے ہی سے اُس کی طرف متوجہ تھی۔ لیکن اپنے چہرے پر اُس نے کوئی ردِ عمل پیدا نہ ہونے دیا تھا۔

مسز کوشل مسکرا دیں

"ارے تعارف کرانا تو بھول ہی گئی" مسز کوشل کو اچانک یاد ہو گیا اور راجن کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں "موہنی سے ملو میری بچپن کی سہیلی ہیں چند دنوں کے لئے میرے یہاں آئی ہیں ـــــ اور آپ مسٹر راجن ہیں۔ تمہارے بھیا کے دوست۔ بہت پُرلطف آدمی ہیں"

مسز کوشل خاموش ہو گئیں تو موہنی اور راجن نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ تبھی مسز کوشل اپنی جگہ پر سے اُٹھ گئیں۔ بیرے نے اطلاع دی تھی کہ اُن کا فون ہے۔

"تو آپ کو لائف پارٹنر کی تلاش ہے" موہنی نے پہلی بار راجن کو مخاطب کیا۔

"یقیناً۔ لیکن ابھی تک میرے ٹیسٹ کی کوئی لڑکی نہیں ملی مجھے"

"اگر خدانخواستہ آپ کی من پسند لڑکی آپ کو نہ ملی تو کیا زندگی بھر کنوارے ہی رہنے کا ارادہ ہے؟" موہنی کی رگِ شرارت پھڑک اٹھی اور لطف اندوز ہونے کے لئے شاید وہ اتنی جلدی بے تکلفی پر اُتر آئی تھی۔

جواب میں راجن نے ایک طویل آہ بھری۔ نظروں کے زاویے موہنی کی طرف منتقل کرتے اور شوخ سی لیکن مدھم آواز میں کہا اُس نے

"موہنی دیوی! میری من پسند لڑکی تو میری نظروں میں آ گئی ہے لیکن کہا نہیں جا سکتا کہ اُس کی نگاہِ انتخاب بھی مجھ پر ٹکے گی یا نہیں"

"اور اگر وہ لڑکی رضامند نہ ہوئی تب؟" موہنی نے راجن کی بات کی تہہ میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی یا شاید جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا اُس نے۔

"سرد آہ بھر کر رہ جائیں گے لیکن دل کو اتنی تسلی تو ضرور ہے کہ زندگی بھر کنوارا رہنے کا طعنہ نہیں ملے گا" راجن کے چہرے پر اب بھی معصومیت طاری تھی۔

"آپ کا مطلب نہیں سمجھی میں۔ جب شادی نہیں کریں گے تو آخر کنوارے ہی رہیں گے"

"سو فیصدی کنوارا نہیں"

"وہ کیسے؟"

"موجودہ زمانے میں عورت اور مرد کے حقوق برابر ہیں۔ ہر جگہ ففٹی ففٹی کا اصول رائج ہے۔ جب شادی کرنے کا مسئلہ آتا ہے تو اس پر بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے۔ یعنی پچاس فیصدی لڑکے کی پسند اور پچاس فیصدی لڑکی کی پسند۔ میں بھی اسی اصول کو تسلیم کرتا ہوں۔ میری پسند کی لڑکی اگر مجھ سے شادی کرنے کے لئے رضامند نہ ہوئی جب بھی میں پچاس فیصدی اپنے آپ کو شادی شدہ سمجھوں گا کیونکہ آدھا میں نے پسند کر لیا ہے"

راجن نے بے حد معصوم بنتے ہوئے کچھ اس انداز میں یہ بات کہی کہ موہنی اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکی اور بے اختیار ہنسنے لگی ـــــ ہنستی رہی۔

راجن سے موہنی کی یہ پہلی ملاقات تھی اور جب وہ کلب سے لوٹا تو اُس کے کانوں میں موہنی کے یہ الفاظ گونج رہے تھے "آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں!"

---

"لیکن تمہاری باتوں سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ موہنی بھی تم میں دلچسپی لینے لگی ہے؟" راجن کی کہانی سننے کے بعد ستیندر نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ موہنی کا جھکاؤ میری طرف ہے۔ دو چار ہی ملاقاتوں میں یہ جھکاؤ محبت کا روپ دھار لے گا"

"خدا کرے ایسا ہی ہو!"

"کل سنڈے ہے مسز کوشل نے دعوت دی ہے اس لئے دوپہر کا کھانا اُن کے یہاں ہوگا"

"تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ کل نہ آؤ گے!"

"ہاں یار! برا مت ماننا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ مسئلہ کتنا نازک ہے۔ آج تک تو وہ [illegible] پیار کرنا بھی ہمالہ کی سب سے اونچی چوٹی سر کرنے کے برابر ہے۔"

"جاؤ بھی معاف کیا ——— لیکن ایسا نہ ہو کہ تمھاری صورت تک دیکھنے کو ترس جاؤں!"

شوخ اور بہکے سے انداز میں چلتا ہوا راجن ستیندر کے یہاں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت وہ بے حد مسرور تھا۔

---

مسٹر کوشل کہیں گئے ہوئے تھے اور بارہ بجے تک لوٹ آنے کو کہہ گئے تھے۔ مسز کوشل [illegible] مصروف تھیں۔ گھر میں نوکر موجود تھا لیکن کچن کا کام وہ خود ہی کرتی تھیں۔ راجن دس بجے سے پہلے ہی یہاں پہنچ گیا تھا اور ڈرائنگ روم میں موہنی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ موہنی اس کی باتوں میں [illegible] دلچسپی لے رہی تھی اور ہنستے ہنستے اس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔

راجن اس وقت بھی اسے کوئی لطیفہ سنا رہا تھا۔ "دو ساتھی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک بولا ——— یار! سرجن جب کسی مریض کا آپریشن کرتے ہیں تو اپنے منہ پر نقاب کیوں ڈال لیتے ہیں؟"

"بزدل ہوتے ہیں یہ سرجن۔ اس لئے وہ نقاب پہن لیتے ہیں کہ مریض کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کس سرجن نے اسے چیر پھاڑ کرتے وقت درد پہنچایا ہے؟"

موہنی ہنستے ہنستے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ تبھی مسز کوشل وہاں آ گئیں اور موہنی کو لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ کر انھوں نے کہا

"کیا بات ہے جو ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے ہیں؟"

"راجن غضب کے آدمی ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو ان کی لطیفہ گوئی پر ضرور نوبل پرائز دیتی!" موہنی نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا

"ہم بھی کوئی نیا لطیفہ سنیں بھائی!" دلچسپی لیتے ہوئے مسز کوشل بھی بیٹھ گئیں۔

"اس کمرے میں آپ دو خواتین کو دیکھ کر ایک لطیفہ آ گیا۔" راجن نے پہلے مسز کوشل کی طرف دیکھا اور پھر موہنی کی طرف ——— "کسی ریستوران میں دو عورتیں ساتھ ساتھ داخل ہوئیں اور آ کر ایک ہی میز پر بیٹھ گئیں۔ کافی کا آرڈر دینے اور پھر کافی پی لینے کے کچھ دیر بعد تک بھی وہ خاموش ہی رہیں۔ اُن دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جب کافی ہاؤس سے باہر جاتے ہوئے بل ادا کرنے کے لئے وہ کاؤنٹر پر پہنچیں تو کاؤنٹر کلرک نے انھیں بتایا کہ ان کے دائیں طرف کی میز پر بیٹھے نوجوان نے بل ادا کر دیا ہے۔ انھیں بے حد حیرت ہوئی اور یہ پوچھنے کے لئے کہ اس نوجوان نے ان کا بل کیوں ادا کیا وہ دونوں اس کے قریب پہنچ گئیں۔

جواب میں نوجوان بولا "زندگی میں پہلی بار میں ایسی عورتوں کے نزدیک بیٹھا ہوں جنھوں نے مجھے اپنی فضول باتوں سے بور نہیں کیا۔ اس لئے آپ کا بل میں نے ادا کر دیا۔"

اس پر مسز کوشل بھی ہنس دیں۔ موہنی کا تو ہنستے ہنستے بُرا حال ہو رہا تھا۔

"شاید آپ کو بھی کسی ایسی ہی لڑکی کی تلاش ہے جو ریستوران کا خرچ دوسروں کی پاکٹ سے وصول کر سکے!" مسز کوشل نے راجن پر طنز کیا۔ راجن مسکرا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے موہنی نے کہا۔

"آپ کو کیسی بیوی پسند ہے؟"

اس سوال کے ساتھ ہی بات کا موضوع بدل گیا۔ شاید موہنی ہنستے ہنستے تھک گئی تھی اس لئے اس نے یہ سوال کر دیا تھا

راجن نے ایک لمحے کے لئے موہنی کی طرف دیکھا اور پھر جیسے خوابوں میں الجھ گیا۔ اس کے خوابوں کی ملکہ کوئی اور نہیں [illegible] ہی تھی جو اس کے تصور سے اُبھر کر گوشت پوست کی دنیا میں [illegible] زندگی [illegible] اس کی آنکھوں کے سامنے بیٹھی تھی۔

[illegible] کوئی [illegible] نہیں [illegible] راجن کو خود ہنسی جا رہی تھی جواب [illegible] آپ ہی میں [illegible]

"[illegible] سوچنے لگے [illegible] راجن [illegible]"

"آپ ہی کے سوال [illegible] مسکراتے ہوئے جواب دیا راجن نے۔

"کیا سوچ چکے؟"

"ہاں!"

"تو میرے سوال کا جواب دیجئے۔"

"اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دوں جو آپ کو بُری محسوس ہو تو ...؟"

"کہہ دیجئے۔ بُرا نہیں معلوم ہو گا۔"

"مجھے آپ [illegible] کی پسند ہے! بے ساختہ [illegible] راجن نے اور موہنی پر ہونے والا ردِ عمل دیکھنے کے لئے اس نے [illegible] موہنی کے چہرے پر [illegible] دیں۔

موہنی نے [illegible] چہرے [illegible] اور رخساروں کے گلاب جیسے مہک اٹھے۔ موہنی کا حسن دوبالا ہو گیا۔ راجن کی بے قراری اور [illegible] اس کی امید اب یقین میں بدل گئی تھی کہ موہنی کے دل میں بھی اس کے لئے محبت کا جذبہ ہے

"میری بات آپ پر گراں تو نہیں گزری؟"

لیکن موہنی نے راجن کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ جیسے وہ اور بھی زیادہ سمٹ گئی ——— سمٹتی ہی جا رہی تھی!!

---

"تو ہم نے اپنی منزل پا ہی لی دوست! صرف تین دن باقی ہیں اور پھر میری موہنی میرے خوابوں کی ملکہ نہیں میری زندگی کی ملکہ ہوگی!" راجن اپنے سامنے بیٹھے ستیندر سے مخاطب تھا۔

"یہ کامیابی تمھیں مبارک ہو راجن!" ستیندر بھی مسرور تھا۔

موہنی اچانک ہی راجن کی زندگی میں آئی تھی اور اچانک ہی دونوں شادی کی منزل پر پہنچ گئے تھے۔ یہ تین دن بھی گزر گئے اور دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے۔ راجن نے بہت دنوں تک جس کی تلاش کی تھی اچانک ہی اُسے وہ پا گیا تھا اور اس وقت اپنے آپ ہی میں اُلجھا وہ سوچ رہا تھا کہ اچانک ہی کسی کو پا لینا کس قدر مسرورکُن ہوتا ہے! زیرِ لب مُسکرا دیا وہ اور اپنے سامنے بیٹھی موہنی کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا ـــــ دیکھتا رہا۔ موہنی کا حُسن اور بھی نکھر اُٹھا تھا۔ دُلہن کے لباس میں سجی سنوری اس وقت وہ آسمان سے اُتری کوئی حُور معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے چاند کی ساری چاندنی اُس کے دامن میں سمٹ آئی ہو۔ جیسے گُلاب کی ساری رنگت اُس کے رخساروں میں بھر گئی ہو۔ جیسے شراب کی ساری مستی اُس کی آنکھوں میں سما گئی ہو اور جیسے سارے پھولوں کی مہک اُس کی زُلفوں میں رس بس گئی ہو۔ راجن محوِ حیرت اپنی موہنی کے بے پناہ حُسن کا جائزہ لیتا رہا اور اُس کے دل کی دھڑکنیں مچلتی رہیں۔

موہنی نے جب نظر اُٹھا کر راجن کی طرف دیکھا تو مُسکرا دی وہ۔ راجن تشنہ لب بھی مُسکان سے بھر گئے اور مچلتی بے قابو دھڑکنیں طوفان بن گئیں۔ جذبات میں ہیجان سا بپا ہو گیا اور اُسے اپنے پیار کے بندھن میں باندھنے کے لئے جیسے ہی قریب ہوا ـــــ کہ اچانک ہی ذہن کہیں اور بھٹک گیا۔

موہنی دیکھ رہی تھی کہ اُس کا راجن یک بیک اُداس سا ہو گیا ہے ـــ

کیوں ـــــ ؟؟؟ اُس کا دل دھڑک اُٹھا۔ وہ اُس کے قریب ہو گئی اور اُس کا ہاتھ اپنے نازک ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے راجن! اچانک ہی تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

راجن چونک گیا۔ جیسے ابھی ابھی وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اُداس موہنی کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ جیسے اُس کی خاطر مُسکرا لینے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم پریشان سے معلوم ہوتے ہو؟" موہنی نے پھر کہا۔ اُس کی نگاہیں راجن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کچھ بھی تو نہیں موہنی! ایسے ہی کوئی بات ذہن میں کوند گئی تھی۔" اُلجھے سے انداز میں جواب دیا راجن نے۔

"ایسی کیا بات تھی؟"

"کوئی خاص بات نہیں موہنی۔ تم تو یونہی گھبرا گئی ہو۔" لیکن راجن کا چہرہ پکار رہا تھا کہ بات کوئی خاص ہی ہے۔ موہنی ضد کرنے لگی اور آخر راجن کو ہار ماننی ہی پڑی لیکن اُس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ موہنی کو یہ بات بتانے میں اب بھی وہ جھجک محسوس کر رہا ہے۔

"برسوں کی تلاش کے بعد میں نے تمہیں پایا ہے موہنی... لیکن ڈرتا ہوں کہیں تم بھی میرے لئے کوئی خواب نہ بن جاؤ!"

"ایسے الفاظ منہ سے مت نکالو راجن!" موہنی تڑپ گئی اور جیسے راجن کی گود میں اُس نے اپنے آپ کو جھونکا دیا۔

"تو سنو بھی ہو۔ اب تو تمہیں بتانا ہی ہے۔" راجن اپنی انگلیاں موہنی کے بالوں میں اُلجھاتے ہوئے بولا: "تین سال پہلے اچانک ہی میں بیمار پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر اب نہیں سمجھتے تھے کہ میں موت کے گھیرے کو توڑ کر زندگی کے دائرے میں داخل ہو سکوں گا لیکن ڈاکٹروں نے مجھے بچا ہی لیا۔ جب میں صحت یاب ہوا تو مجھے میرے ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ ذہنی طور پر میں مفلوج ہو گیا ہوں، اور زندہ رہنے کا بس یہی ایک علاج ہے کہ میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کر لوں جو بے حد حسین ہو۔ جس کی لطیف آواز میں بے پناہ شیرینی ہو اور جسے دیکھ کر مجھے تسکین حاصل ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ کوئی چھوٹا صدمہ بھی میری زندگی کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔" راجن اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا اور موہنی پر ہوا ردِ عمل دیکھنے کے لئے اُس کی نگاہوں میں جھانکنے لگا۔

"بس اتنی سی بات کے لئے پریشان ہو گئے تھے؟" موہنی کھلکھلا کر ہنس دی۔ "تب تو میں بھی خوش قسمت ہوں جو تم مجھے مل گئے!"

"تم واقعی خوش ہو!" راجن اب پریشان نہیں تھا لیکن حیران تھا کہ اُس جیسی حسین، ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کیا واقعی ایک بیمار انسان کی زندگی میں آ کر بھی مسرور ہے!"

"صرف خوش ہی نہیں — خوش قسمت بھی ہوں!" موہنی کے لب مسکرا رہے تھے، آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور رخسار دہک اُٹھے تھے۔ "مجھے بھی تمہارے جیسے ہی ساتھی کی تلاش تھی اور تم مل گئے!"

"تمہارا مطلب —؟" راجن چونک کر موہنی کو دیکھنے لگا۔

"کچھ عرصہ پہلے مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا اور جب مجھے صحت مند قرار دیا گیا تو ڈاکٹر نے کہا تھا کہ مجھے کسی ایسے مرد سے شادی کر لینی چاہئے جس کے ساتھ میں ہنسی خوشی زندگی گزار سکوں ورنہ پھر کبھی اسی مرض کا شکار ہو سکتی ہوں۔" موہنی کی خمار بھری نظریں راجن کی نگاہوں میں سما جانے کو جیسے بے قرار ہو گئیں — "اور برسوں کی تلاش کے بعد تم مجھے مل ہی گئے — تمہاری شوخ شرارتیں، تمہاری مسکراہٹیں اب کبھی مجھے پاگل نہ ہونے دیں گی — کبھی نہیں —!" اور موہنی نے اپنے گورے گورے بازو راجن کی گردن کے گرد پھیلا دئے۔

راجن کی حیرانی، پریشانی پھٹ چکی تھی اور ایک بار پھر اُس کے چہرے پر مسکراتی سی زندگی کی رمق چھا گئی اور آنکھوں میں اُمڈی سرمست شوخی جیسے اُس کے دل کی بات کہہ رہی تھی — "میں بھی خود یہی تلاش... تلاش میں تھا کہ زندگی کی دھڑکن بن جائے!!"

---

**فردوسِ گوش** حضرت جوش ملسیانی داغ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ایسے صاحب فن استاد صاحب فن کا یہ مجموعہ کلام اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کتاب اس سال کا بہترین ادبی تحفہ ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ عمدہ قیمت: صرف چھ روپے۔

میرے قطعات کا یہ مجموعہ — اُس مسافر کی اک کہانی ہے
جس نے پھولوں کی آرزو لے کر — ہر بیاباں کی خاک چھانی ہے

**قاشیں** صاحب طرز شاعر نریش کمار شاد کے قطعات کا حسین و جمیل انتخاب۔ ترمیم و اضافے کے بعد — تازہ ترین ایڈیشن — قیمت چار روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

---

... اپنی منزل پا چکا ہے۔ دوست امروز شاید دنیا میں سب سے پیارے ... ہو جس کے ساتھ میری زندگی کی ملکہ ہوگی۔" راجن اپنے سامنے بیٹھے ستیندر سے مخاطب تھا۔

"یہ کامیابی تمہیں مبارک ہو راجن!" ستیندر بھی مسرور تھا۔

موہنی اچانک ہی راجن کی زندگی میں آئی تھی اور اچانک ہی دونوں شادی کی ڈور میں بندھ گئے تھے۔ یہ تین دن بھی گزر گئے اور دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے۔ راجن نے بہت دنوں تک جس کی تلاش کی تھی اچانک ہی اُسے وہ پا گیا تھا اور اس وقت اپنے آپ ہی میں اُلجھا دوسرا رہا تھا کہ اچانک ہی کسی کو پالینا کس قدر مسرورکن ہوتا ہے! زیرِ لب مسکرا دیا وہ اور اپنے سامنے بیٹھی موہنی کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا ۔۔۔۔ دیکھتا رہا۔ موہنی کا حسن اور بھی نکھر اُٹھا تھا۔ دلہن کے لباس میں کسی اپسرا سی اس وقت وہ آسمان سے اُتری کوئی حور معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے چاند کی ساری چاندنی اُس کے دامن میں سمٹ آئی ہو جیسے گلاب کی ساری رنگت اُس کے رخساروں میں بھر گئی ہو۔ جیسے شراب کی ساری مستی اُس کی آنکھوں میں سما گئی ہو اور جیسے سارے پھولوں کی مہک اُس کی زُلفوں میں رس بس گئی ہو۔ راجن محوِ حیرت اپنی موہنی کے بے پناہ حسن کا جائزہ لیتا رہا اور اُس کے دل کی دھڑکنیں مچلتی رہیں۔

... موہنی نے ... راجن کی طرف دیکھا ... راجن کے دل کی دھڑکن ... جیسے ... میں ... ساپا ہو گیا اور اُسے اپنے پہلو میں ... قریب ہوا ۔۔۔۔ کہ اچانک ہی ذہن کا ایک ... اور ... گیا۔

موہنی دیکھ رہی تھی کہ اُس کا راجن یک بیک اُداس سا ہو گیا ہے، نہ جانے کیوں ۔۔۔۔ اُس کا دل دھڑک اُٹھا وہ اُس کے قریب ہو گئی اور اُس کا ہاتھ اپنے نازک ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے راجن! اچانک ہی تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

راجن چونک گیا جیسے ابھی ابھی وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اُداس موہنی کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ جیسے اُس کی خاطر مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم پریشان سے معلوم ہوتے ہو؟" موہنی نے پھر کہا۔ اُس کی نگاہیں اب راجن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کچھ بھی تو نہیں موہنی! ایسے ہی کوئی بات ذہن میں کوند گئی تھی" الجھے الجھے سے انداز میں جواب دیا راجن نے۔

"ایسی کیا بات تھی؟"

بڑی خاص بات نہیں مگر تم تو یونہی گھبرا گئی ہو" لیکن راجن کا چہرہ
بتا رہا تھا کہ بات کوئی خاص ہی ہے۔ موہنی ضد کرنے لگی اور آخر راجن کو ماننا ہی پڑی
لیکن اس کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ موہنی کو یہ بات بتانے میں اب بھی وہ جھجک
محسوس کر رہا ہے۔

"برسوں کی تلاش کے بعد میں نے تمہیں پایا ہے موہنی ——— لیکن ڈرتا ہوں
کہیں تم پھر میرے لئے کوئی خواب نہ بن جاؤ!"

ایسے الفاظ منہ سے مت نکالو راجن!" موہنی تڑپ گئی اور جیسے راجن کی
گود میں اس نے اپنے آپ کو چھپا دیا۔

"جو بھی ہو۔ اب تو مجھے بتانا ہی ہے" راجن اپنی انگلیاں موہنی کے بالوں
میں الجھاتے ہوئے بولا۔ "تین سال پہلے اچانک ہی میں بیمار پڑ گیا تھا۔ کسی کو امید
نہیں تھی کہ میں موت کے گھیرے کو توڑ کر زندگی کے دائرے میں داخل ہو سکوں گا لیکن
ڈاکٹروں نے مجھے بچا ہی لیا۔ جب میں صحت یاب ہوا تو مجھے میرے ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ
نفسیاتی طور پر میں مفلوج ہو گیا ہوں اور زندہ رہنے کا بس یہی ایک علاج ہے کہ میں
کسی ایسی لڑکی سے شادی کر لوں جو بے حد حسین ہو۔ جس کی لطیف آواز میں بے پناہ
شیرینی ہو اور جسے دیکھ کر مجھے تسکین حاصل ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ کوئی چھوٹا صدمہ
بھی میری زندگی کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے" راجن اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا اور
موہنی پر ہوا ردِ عمل دیکھنے کے لئے اس کی نگاہوں میں جھانکنے لگا۔

"بس اتنی سی بات کے لئے پریشان ہو گئے تھے؟" موہنی کھلکھلا کر ہنس دی۔
"تب تو میں بھی خوش قسمت ہوں جو تم مجھے مل گئے!"

"تم واقعی خوش ہو!" راجن اب پریشان نہیں تھا لیکن حیران تھا کہ اس
جیسی حسین، ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کیا واقعی ایک بیمار انسان کی زندگی میں
آ کر بھی مسرور ہے!"

"صرف خوش ہی نہیں ——— خوش قسمت بھی ہوں!" موہنی کے لب
مسکرا رہے تھے، آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور رخسار دہک اٹھے تھے۔ "مجھے بھی تمہارے
جیسے جیون ساتھی کی تلاش تھی اور تم مل گئے!"

"تمہارا مطلب ———؟" راجن چونک کر موہنی کو دیکھنے لگا۔

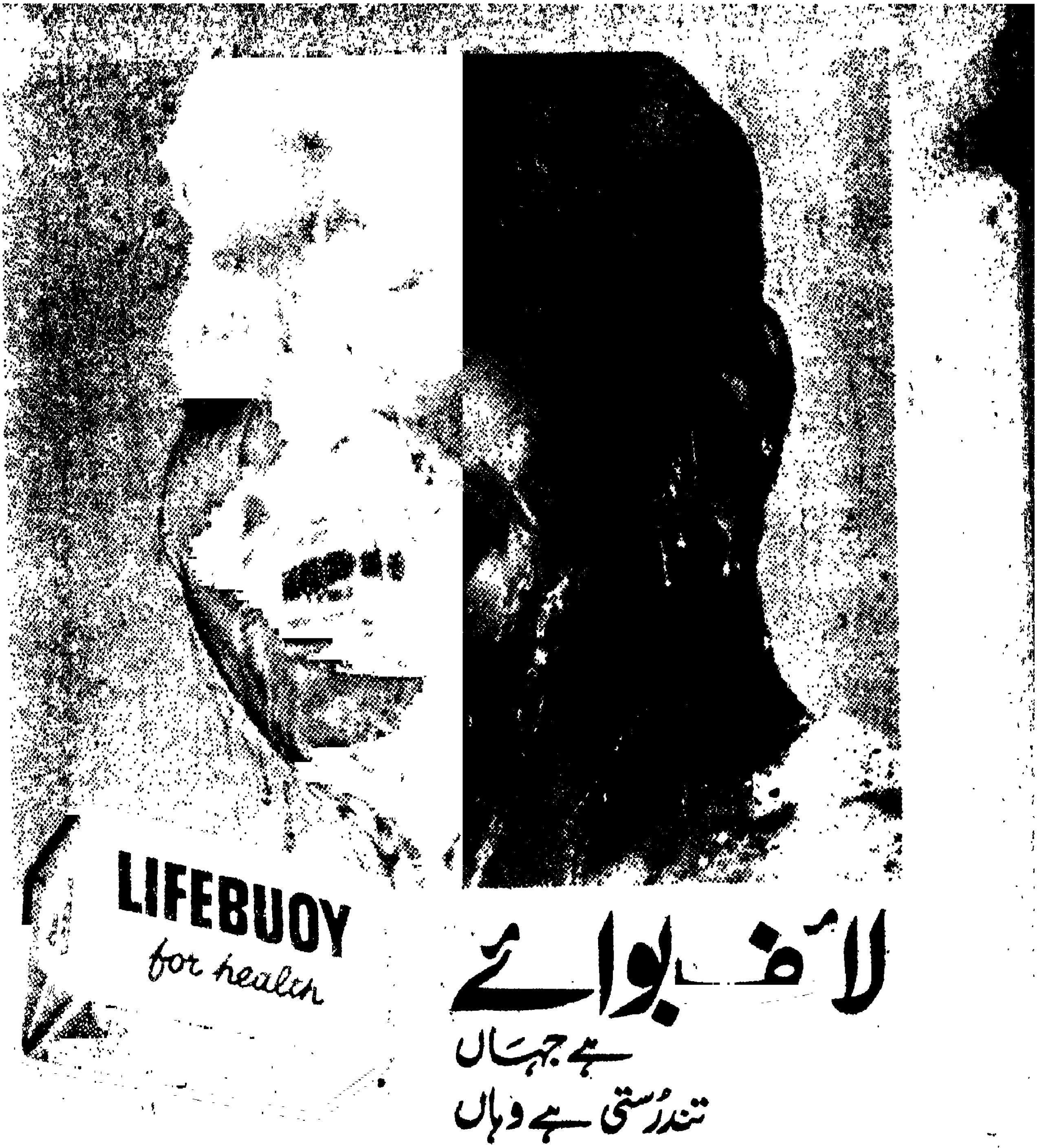
"کچھ عرصہ پہلے مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا اور جب مجھے صحت مند قرار
دیا گیا تو ڈاکٹر نے کہا تھا کہ مجھے کسی ایسے مرد سے شادی کر لینی چاہئے جس کے ساتھ میں
ہنسی خوشی زندگی گزار سکوں ورنہ پھر کبھی اسی مرض کا شکار ہو سکتی ہوں" موہنی کی
خمار بھری نظریں راجن کی نگاہوں میں سما جانے کو جیسے بے قرار ہو گئیں ——— "اور
برسوں کی تلاش کے بعد تم مجھے مل ہی گئے ——— تمہاری شوخ شرارتیں یہ چاہتی
مسکراہٹیں اب کبھی مجھے پاگل نہ ہونے دیں گی ——— کبھی نہیں ———" اور موہنی نے
اپنے بھرے بھرے بازو راجن کی گردن کے گرد پھیلا دئے۔

راجن کی حیرانی، پریشانی مٹ چکی تھی اور ایک بار پھر اس کے چہرے پر
مسکراتی سی زندگی کی رمق چھا گئی اور آنکھوں میں اتر آئی سرمست شوخی جیسے اس کے
دل کی بات کہہ رہی تھی ——— دیر بھی خوب رہی۔ تلاش ——— تلاش میں ہماری زندگی
کی دھڑکن بن گئی ہے!!"

---



---




# لائف بوائے

## ہے جہاں
## تندرستی ہے وہاں

لائف بوائے سے نہائیے اور ہر بار تازگی کی ترنگ، تندرستی کی اُمنگ کا
لطف اٹھائیے۔ لائف بوائے سے نہا کر آپ کی طبیعت کِھل اُٹھے گی،
کیونکہ اِسمیں اعلٰے صابن کے سبھی اوصاف ہیں اور اپنی مخصوص خوبیاں بھی!

## لائف بوائے میل میں چھپے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے

لیسنس L. 51-140-45

ہندستان لیور کا تیار کردہ

## راسخ عرفانی

حسن بے شک ترا یگانہ ہے
عشق میرا بھی والہانہ ہے

یا الٰہی یہ جستجو موہوم!
اک حقیقت ہے یا فسانہ ہے

سرنگوں ہیں نجوم گردوں بھی
جانے کس کا یہ آستانہ ہے

تیری نظروں کے فیض سے ساقی
سارا عالم شراب خانہ ہے

ان کا حسنِ کلام کیا کہیے
بات جو بھی ہے شاعرانہ ہے

سیم و زر کی ہوس نہیں مجھ کو
میرا غم ہی مرا خزانہ ہے

ہجر کیسا، وصال کیا راسخ
شعر کہنے کا اک بہانہ ہے

## اختر واصفی

میخانے میں کہتا تھا یہ فرزانہ سا اک شخص
اختر کو نہ چھیڑو یہ ہے دیوانہ سا اک شخص

سمجھو نہ حقیر اس کو یہ غیرت کا ہے پتلا
بیٹھا ہے جو محفل میں فقیرانہ سا اک شخص

مجھ کو بھی خبر ہے ترے کوچے میں سنا ہے
راتوں کو پھرا کرتا ہے مستانہ سا اک شخص

ساقی تری آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہے
آنکھوں کو بنائے ہوئے پیمانہ سا اک شخص

میں اس کو سمجھتا ہوں فقط اپنا جہاں میں
وہ سامنے بیٹھا ہے جو بیگانہ سا اک شخص

سنیے تو کہیں نام نہ ہو آپ کا اس میں
آنکھوں میں لیے پھرتا ہے افسانہ سا اک شخص

اختر ہے وہی دوستو محفل میں جو اک سمت
بیٹھا ہے بہ اندازِ حکیمانہ سا اک شخص

## شوان چند بسیم

جلا رہا ہوں شبِ غم بھی میں خوشی کے چراغ
چراغِ اشک ہیں میری نظر میں گھی کے چراغ

مری نگاہ سے تو دیکھ دیکھنے والے
برس رہے ہیں اندھیروں سے روشنی کے چراغ

یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ ماہِ پُرانوار
مری نگاہ میں سب ہیں تری گلی کے چراغ

جھلک رہے ہیں جو دو چار اشک پلکوں میں
یہی تو ہیں شبِ غم ہائے بیکسی کے چراغ

زیادہ تر وہ دیئے ہیں جو دے رہے ہیں دھواں
ضیا فگن ہیں کسی خوش نصیب ہی کے چراغ

ابھی تو رات ہے باقی وہ شاید آ جائیں
نہ جھلملا ابھی اے میری زندگی کے چراغ!

عجیب ہے یہ نئی روشنی کا دورِ بسیم
بجھے بجھے سے ہیں افراد کی ہنسی کے چراغ

# کیا آپ جانتے ہیں

کہ اسٹیٹ بینک اُن باہمت
لوگوں کو قرض کی سہولیات مہیّا کر رہا
ہے، جنکے ذہنوں میں نئی صنعتوں کی
قائمی کے محفوظ منصوبے ہیں، اور
جنکے پاس ایسے منصوبوں کو کامیابی
سے چلانے کیلئے ضروری جانکاری اور
صلاحیت ہے مگر اُن کے پاس
کافی مالی ذرائع نہیں ہیں۔



# دل پھپک

[illegible]

آپ کی بہن ___ [illegible]

اک کہرا سا چھایا تھا۔

کہ تم کہیں گئے ہوئے ہو ... [illegible]

وہ بچھڑے! ان کے طویل شب و روز اور شام و سحر کے جانگسل لمحے میں شمار کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے تو یہ ایک ایسی کالی اور لمبی رات معلوم ہوتی ہے جس کی تقدیر میں کوئی سحر نہیں۔ اتنے بہت سے دن کیسے گزر گئے! ابھی تو یہ کل ہی کی بات ہے۔ ذہن میں ہر چیز ہر بات اسی طرح تازہ ہے۔ تمھاری رخصتی کا منظر میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ دل سہم جاتا ہے۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں اور ساری ساری رات میں اُن یادوں کی پرچھائیوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے گزار دیتا ہوں۔ جن کا اب کوئی وجود نہیں۔ جو ختم ہو چکیں کبھی نہ واپس آنے کے لئے!

مجھے سب سے ڈر معلوم ہونے لگا ہے رضیہ! لوگ کہتے ہیں وقت کے پاس ہر زخم کا مرہم ہے۔ لیکن کوئی ایسا زخم بھی ہے جس کا وقت کے پاس کوئی مرہم نہیں!

آہ۔ رضیہ! میرے بائیں پہلو میں دہکتا ہوا شعلہ رکھا ہے۔ جو دل کو جلا جلا کر خاک کر رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیا ہو گیا اور اب کیا ہوگا؟ جانے والے کو بھلانا اپنے بس کی بات نہیں ہے رضیہ! ورنہ میں سچ کہتا ہوں میں تمھیں بھول جاتا۔ کاش! ایسا ہو سکتا۔ حافظہ اور ضمیر کبھی کسی مجرم کو چین نہیں لینے دیتے۔ رضیہ! ہر گزرتا ہوا لمحہ [illegible] کا شدید اور تلخ احساس دے جاتا ہے۔ جدائی بہت ہولناک ہوتی ہے۔ جب جدائی کے گہرے [illegible]

الجھے ہوئے ناک احساسات کا کہیں کوئی مداوا نہیں۔ جینے والوں کے ساتھ [illegible] جینا پڑتا ہے۔ لیکن اس زندگی کو زندگی کون کہے [illegible] اس دنیا میں جینا بہت مشکل ہے۔ پہلی ہی ٹھوکر پر میرا [illegible] سوچنے سمجھنے کی تاب نہیں رہی۔ ابھی کیا کچھ دیکھنا باقی ہے۔ کون جانے۔ [illegible] یہ تو عنوان ہے جو تم اپنی خونچکاں موت سے ثبت کر گئی ہو۔ میرے سینے میں [illegible] کے دل کی بجائے پتھر ہوتا تو شاید وہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا!

میں تمھارے پاس بیٹھا ہوں لیکن اتنا قریب ہو کر بھی تم سے کتنا دور ہوں۔ مکان و لامکاں کا ایک ایسا بُعد ہم میں حائل ہے جسے روح و جسم کے قدم بھی طے نہیں کر سکتے۔ میں تمھاری ابدی آرام گاہ کو دیکھ رہا ہوں! اور محبت کا انجام میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ ظالم محبت جو بغیر کسی امتیاز و تفریق کے ایک شہنشاہ و مفلس پر یکساں اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن انجام کے مظاہر کتنے مختلف [illegible] ہے۔ ایک شہنشاہ کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو تاج محل کے روپ [illegible] کی آنکھ سے بہا آنسو مٹی کا ڈھیر بن گیا! میری پیشانی [illegible] کر رہی ہے۔ لیکن یہ لوح سنگ [illegible] حقارت [illegible] ساری رات آنسو بہاتے [illegible]

[illegible]

[illegible]

... کو پتہ ہو گئے

[illegible] ایک نئے

[illegible] رضیہ اللہ

[illegible] آنسو بہا رہے

[illegible] حیات ہے ثبات کا

[illegible] رضیہ نہ جانے کتنے

[illegible] سنگ مرمر جیسی

[illegible] کی دھمک

[illegible] کی آواز سے دور ہو گیا ہے۔

---

- [illegible] اپنے حق سے دستبردار ہو گیا [illegible] ہونے کا ضامن ہوں۔

(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

- [illegible] سب سے [illegible] کرتا ہے۔

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ)

- اگر کوئی [illegible] غلطی [illegible] سے بہتر [illegible] ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

- نفس کی [illegible] زیادہ گناہوں سے بچاؤ۔ (حضرت ذوالنون مصریؒ)

---

[illegible] آہٹ نہ کھٹکا۔ وہ دور بہت دور کوئی شاعر کی نظم الاپ رہا ہے۔ جس کے ترنم میں جگر خراش آہیں بھی گھلی ملی ہیں۔ میرے خوابوں کے محور کو جاننے والی۔ اگر میں اپنے سارے آنسو پہلے ہی نہ بہا دیتا تو آج [illegible] رو تا رضیہ! میرے خواب بکھر گئے۔ مجھے تو کوئی تعبیر بھی نہ ملی۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا۔ یہ سب خواب پریشاں تھا اور وہ محور کے بھی کب کے ٹوٹ گئے جنھیں تم نے اپنے وجود سے سجایا تھا۔

جب کبھی میں [illegible] کی کوشش کرتا ہوں، یہ مٹی کا ڈھیر میری سوچ کی راہ میں پہاڑ بن کر حائل ہو جاتا ہے [illegible] قدم [illegible] اگر تم جانتے ہیں۔ اس منزل کے اُدھر بھی کچھ نہیں [illegible] کرتا ہوں۔ رضیہ زندہ ہے۔ کبھی [illegible] کبھی نہ کبھی۔ تب اس کے خاموش اور بے درد دیوار کے [illegible] ختم ہو گئیں!!

[illegible] آخری [illegible] اختیار میں ہوتا ہیں تمہاری [illegible] سے ازل [illegible] جنھیں مجبور کر بھگا دیتا۔ مجھے [illegible] کے ٹھیکے [illegible] رنگ کتنے ماہر ہوتے ہیں۔ جو تقدیر کی چوٹوں پر چپ چاپ آنسو بہاتی ہے اور کوئی آنچل اُن تک آنسو [illegible] نہیں ہوتا!

اتنا طویل [illegible] کے بعد [illegible] بار بار چونک پڑتا ہوں۔ رضیہ زندگی میں کیا اس سے بھی مشکل مقام آتے ہیں، جب کسی کی دید کو نظریں ترستی ہیں۔ کسی کی آواز کا دل متلاشی ہو۔ کیسی ہیں [illegible] زندگی کا قرب محسوس کرنے کو جی چاہے جس عالم بیب سے کا [illegible] بال سنوارنے کو آنگے بڑھیں اور قبر پر بکھیلے ہوتے مبرجن [illegible]۔ رضیہ! پتہ نہیں اپنے ہاتھوں [illegible] کر تم خوش ہوئیں یا مجھے سرہانے کر تمھیں [illegible] اُس وقت تم پہچانے لگیں۔ جب موت تمہارے سرہانے آکھڑی ہوئی۔ ہسپتال کے سرد و سفید بستر پر تم نے زندگی کی آخری سانس لی۔ آخری ہچکی اور لبوں کی موجوم جنبش سے میرا نام لیا!

رضیہ! انسان مجبور بھی تو ہو جاتا ہے اور تم نے تو یہ کبھی نہ سوچا یہاں مرنا کتنا آسان اور جینا کتنا مشکل ہے۔ رضیہ! میں جانتا تھا تمھیں مجھ سے محبت تھی۔ ہم نے دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھائیں۔ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر عہد کئے۔ ہم ہنس رہے تھے اور تقدیر ہماری معصومیت پر [illegible] رہی تھی۔ میں نے عہد شکنی کی۔ تم سے بے وفائی کی۔ لیکن تم نے میری تمام کمزوریاں خود سہہ لیں اور سر اٹھائے [illegible] دے دی!

جب میں تمہارے گھر سے نکلا تو تاریک آسمان پر ستاروں کے دیئے ٹمٹما رہے تھے۔ اُفق کے کناروں کو ماہتاب کی کرنیں منور کر رہی تھیں۔ ہواؤں میں اتنا ترنم تھا کہ میں مدہوش ہو گیا۔ اپنے سے بے خبر اور اُس تقدیر سے بے خبر جو میرے آگے آگے چل رہی تھی۔

جب میں گھر پہنچا تو ننھی شبانہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"بھائی جان! آج ہم آپ کی دُلہن کو دیکھ آئے ہیں!"

"اچھا!" میں نے ہنس کر اُس کے گال پر تھپکی دی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ یقین کرو رضیہ! خوشی سے میں پاگل ہو رہا تھا۔ قدم زمین سے اُٹھے جاتے تھے اور ذہن میں تمہاری آواز کا ترنم، تمہارے تکلم کا جلترنگ ابھی تک گونج رہا تھا! تمہارے ہاتھ کا لمس اور حدت ابھی تک میرے ہاتھ میں محفوظ تھی اور میں اتنا مدہوش و مخمور ہو رہا تھا کہ گھر کی اور گھر کے باہر کی ساری فکریں دل سے نکال پھینکیں۔ یہ بھی نہ سوچنا چاہتا تھا کہ میں ایک ایسا انسان ہوں، جس پر مستقبل کے آہنی دروازے بند ہیں اور جن کی کنجیاں اُن با اقتدار ہاتھوں میں ہیں، جو مجھ ایسے بے سر و سامان لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنی دولت سے خرید لیں اور اُس پر اپنی کسی صاحبزادی کا بوجھ لاد دیں!

مجھے اچھی طرح علم تھا۔ مہندی رچی ہتھیلیوں کی [illegible]
گئیں۔ جیسے کسی شب کا بوجھ میرے آنگن پر جھک گیا تھا۔ جن کی طرف نظر بھر کر دیکھنے
[illegible] سرخ ہو رہی تھی۔ میری بہنوں کی معصوم آرزوئیں جو جوانی کی اولین
[illegible] کسی کی طرح دل کی سرزمین سے سر اٹھا رہی تھیں اور اب
تھک چکی تھیں [illegible] کر مرجھا گئی تھیں۔ رات اور دن کی سیاہ و سفید
[illegible] آنکھیں [illegible] تھے! اور ابھی [illegible] کے دامن میں ان کے
سہرے کی ایک بھی کلی نہیں کھلی تھی!

ابا کی تو قسمت کا ستارہ گردش میں رہ گیا تھا! اماں نے اپنا ایک ایک زیور میری
تعلیم پر لگا دیا تھا۔ مجھے اونچے درجوں تک پڑھایا لکھایا تھا۔ جو ہر قابل سمجھ کر نکھارا سنوارا۔
لیکن اماں تقدیر کے [illegible] خوش فہمیاں بھول گئیں۔

ابا نے میری بولی لگا دی۔ بیس ہزار!!

مجھے ہنسی آ گئی۔

ڈیڑھ سو روپے ماہوار پانے والا انسان بھلا اتنا قیمتی کیسے ہو سکتا ہے لیکن
ابا کو یقین تھا یہ ہندوستان ہے۔ ان کنواریوں کا ملک جو اپنے لئے انمول شوہر نہیں
خرید سکتیں۔ لیکن یہاں ایسے عقل کے اندھے بھی مل ہی جاتے ہیں، جو منہ مانگے دام دے
دیتے ہیں۔ ابا شروع ہی سے کاروباری آدمی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں اپنے کاروبار
میں ہمیشہ گھاٹا ہوا ہو۔ نجانے کیوں۔ حیات کی اس گرم بازاری میں ابا اپنے پچھلے تجربے کو
یکسر فراموش کر گئے۔ رضیہ! تم انھیں مجبور کہہ سکتی ہو! انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ پانے سے
پہلے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ سوچو میری رضیہ! یہ نہ ہوتا تو پھر میری بہنیں دلہن کیسے بنتیں؟
اگر مجھے نہ بیچا جاتا تو پھر ان کے بر کہاں سے خریدے جاتے جو خود بھی نیلام پر چڑھے ہوئے تھے!

یہی تو انتظار تھا۔ کب میرے دن پھریں اور کب وہ سرخ گھونگھٹ میں مرجھائے
چہرے چھپا کر دوسرے ہاتھوں کی سخت مہندی میں ڈوب کر اپنے گھروں کی راہ لیں۔ میرے گھر میں
تو وہ جنم جنم کے قیدیوں کی طرح رہتی تھیں۔ جن پر جرم ثابت نہ تھا اور ماں باپ ایک ضمیر
شناس جیلر کی طرح ان سے نظریں چار کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

اور رضیہ! میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ محبت کی تقدیر میں ہمیشہ جدائی لکھی ہے۔
مجھے تم سے بچھڑنا پڑے گا۔ میں تو خوش تھا رضیہ! میرے خوابوں میں وہ راتیں جوان تھیں۔ جب
میں پہلی بار تم سے ملا تھا۔ کسی عزیز کی شادی تھی۔ تم دلہن کو سہارا دئے لا رہی تھیں اور میں
دولہا کے قریب کھڑا گرد و پیش سے غافل تمہیں تک رہا تھا! وہاں شور و غل تھا، قہقہے
تھے، کھنکتی ہوئی ہنسی کے آبشار گر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ سب کچھ پس منظر میں ڈوب گیا اور
وہاں ہم کھڑے رہ گئے۔

ایک دوسرے کے جویا ایک دوسرے کے متلاشی اور محبوب!

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فضا کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

[illegible]

[illegible]
کے ایک سے ہوتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ منزل بھی سب کی ایک ہو۔

میں تمہیں بہت چاہتا تھا رضیہ! کیونکہ تم میری [illegible]
لٹنے کی کوشش نہیں کی۔ چھوٹے سے کچے گھر میں رہنے والی بھولی بھالی لڑکی [illegible]

---

- دنیا کوئی خوشی نہیں دے سکتی، بلکہ خوشی جبھی ملتی ہے جب [illegible] فکر و خیال کی چمک احساس کے افسردہ کر دینے والے خیال کے ساتھ بلند ہو جاتی ہے۔ (بیکن)
- حسن جسم کا وصف ہے جس طرح وسعت روح کا حسن ہے۔ ([illegible])
- فضول باتوں سے اجتناب کرو۔ (جاپانی [illegible])
- سب سے بڑی دولت صحت مند جسم ہے۔ (ایمرسن)
- خفت پی جانے کی عادت ایک اچھی عادت ہے۔ (ڈاکٹر [illegible])
- اعصابی تھکان کا علاج آرام ہے۔ آرام اور صرف آرام! (ڈیل کارنیگی)
- بدترین کو بہترین بنانے کی کوشش کرو۔ (ایک مغربی مفکر)

---

کے سے جلد ہی ٹوٹ جانے والے خواب دیکھتی تھی اور جسے پتہ نہ تھا کہ [illegible] دروازے کے
باہر کی دنیا کتنی مکروہ، گھناؤنی اور مطلب پرست ہے۔ ہم تم ان حسین مستقبل کے سپنے دیکھتے
رہے جو ہماری قسمتوں میں تھا ہی نہیں۔

ہر گزرنے والا دن، ہر بیتنے والی رات ہمیں ایک دوسرے سے قریب کر جاتی۔
میں نے تمہارے حسن پر شاعری کی۔ تمہاری محبت کے گیت گائے اور اپنے پیار کا یقین دلایا۔
اس طرح میں نے خود کے بہلنے کا سامان کیا اور تمہیں بھی بہلا دیا۔ مجھے یقین تھا رضیہ!
ایک دن میں تمہیں ضرور پاؤں گا! ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرا چھوٹا سا گھر تمہارے چہکتے ہوئے
وجود سے بس جائے گا!

میں اپنی دنیا میں اتنا مگن تھا کہ میں محسوس نہ کر سکا کہ [illegible]
آہستہ آہستہ میری محبت کا گلا گھونٹنے کے [illegible]

تمھیں شاید پتا ہے رضیہ! محبت کبھی مرتی نہیں! وقت کی
دھیمی آنچ کی تپش کے ساتھ ساتھ یہ اور بھی شدت سے بڑھتی ہی جاتی ہے
... جلتی رہے گی!

تمھارے ... جو ... تمھاری ... اپنا ...
ایک دن ... جو انھوں نے تمھارے لیے بولے تھے
اور وقت ... انتظار میں ... لگا رکھے تھیں۔ وہ بھی مجبور تھیں لیکن تھی اور مہنگا
... خرید کر ... نہیں سکتا!

تمھیں یاد ہے رضیہ! جب میں نے ایک ایک کر کے وہ زیور اٹھائے تو مجھے محسوس
ہوا سونے چاندی کے ان نغموں سے انہار میں تمھارا دل دھڑک رہا ہے! تم پردے کی آڑ
میں کھڑی مسکرا رہی تھیں، پلکیں جھکائے۔ سوچتا رہا وہ پتے کا آنچل لے تمھیں انتظار تھا
میں تمھارے دل کی دھڑکنوں کا تحفہ قبول کر لوں اور آنچل تمھاری پیشانی تک سرکا دوں
لیکن مجھ سے یہ نہ ہوسکا۔ میں یہ نہ کرسکا۔

"وہ وقت ضرور آئے گا رضیہ! جب میں یہ سب کچھ تمھیں اپنے ہاتھ سے
پہناؤں گا!"

"کب؟" تم نے اپنا سر بہت نرمی اور آہستگی سے میرے سینے پر ٹیک دیا۔
"وہ ازلی اور ابدی لمحہ میرے اختیار میں نہیں ہے رضیہ! لیکن اُس لمحے کا کہیں
وجود ضرور ہے! وہ ہمیں مل جائے گا۔"

میرے اس گول مول جواب سے تم مطمئن نہ ہوئیں۔ تم جلد سے جلد میری ہو جانا
چاہتی تھیں اور وہ سب کچھ جاننا چاہتی تھیں جو میں تم سے چھپا رہا تھا۔

لیکن کب تک؟ ابا کے مسلسل اصرار، اماں کی خاموشی اور میری ضد نے بہت
جلدی ہمارا تمھارا پیار طشت از بام کر دیا۔ ابا غم و غصہ کی تصویر بن کر رہ گئے تھے۔ اماں
کی آنکھوں میں حسرتوں کے چراغ بجھنے کے قریب تھے۔

ابا گرج رہے تھے۔

"وہ مفلس لڑکی ہمارے گھر کیا لائے گی؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا! یاد رکھنا منصور!
تم بہت پچھتاؤ گے۔ میں خان صاحب کو اپنی اور تمھاری مرضی دے چکا ہوں۔ وہ صرف
بیس ہزار دیں گے بلکہ تمھیں اور شہلا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ بھی بھیج دیں گے۔ میں زندگی کا
سب سے بڑا آخری جوا کھیل رہا ہوں۔ اگر میں ہار گیا تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ
رہوں گا۔"

"ابا! میں نے مشکل سے حلق تر کر کے کہا "زندگی کا پہلا اور آخری جوا تو میں بھی
کھیل رہا ہوں۔ مجھے بھی ... ہار منظور نہیں!"

لیکن ابا چونکہ ہار جاتے کہ ہم سب لٹ گئے۔ انھوں نے میرے انکار کی صورت میں
خودکشی کی دھمکی دی تھی۔

"مان جاؤ بیٹا!" اماں نے باری باری میری بہنوں کے چہروں پر نظریں ڈالیں اور
میرے سامنے اپنا آنچل پھیلا دیا۔ میری اپنی بے بسی نگاہیں نغمے سے موند ہو گئیں۔ یہ اماں
کے آنچل کا پیوند نہیں تھا۔ میری برباد زندگی کی تاریخ کا ایک ایسا ورق تھا جس پر ماضی
کی تحریر تھی نہ حال کی اور نہ آئندہ کی کوئی خوش آئند خوشخبری۔ بس اُس سادے ورق پر
بار بار یہیں ہر لمحے کے ہندسے میں میری بہنوں کے چہرے زخم دکھائی دیتے ہیں۔

"تمھارے ابا کب تک جیتے پر دو پہاڑ اٹھائے پھریں گے!" اماں کہہ رہی تھیں۔
اور تبھی میں نے سوچا کیا فرض محبت کی قربانی بھی مانگتا ہے؟

میرے ذہن میں آندھیاں چلتی رہیں۔ اضطراب نے مجھے تھکا دیا۔ اللہ میں سوچتے
سوچتے پاگل ہو گیا! اور پھر میں نے تم سے بے رُخی برتی رضیہ! رات کی تنہائیوں میں میرے
قدم تمھارے دروازے تک جاتے اور پھر پلٹ آتے۔ میں سوچتا تھا اپنی کھڑکی کا پٹ
تھامے تم میری راہ تکتی ہوگی، دروازے سے لگی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ چاندنی کی نرم اور
ٹھنڈی کرنیں آگ کے گُرز بن کر تمھیں جلاتی ہوں گی۔ رات کی گمبھیر تاریکیاں تمھیں
ڈستی ہوں گی! ـــــ لیکن میں پھر اُن راہوں پر نہیں گیا رضیہ! کہ تم مجھے عہد شکن
اور وفا نا آشنا سمجھ کر دل کو بہلا لو اور یونہی میں بھی فرض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے
کے لیے خود کو سمجھا سکوں! ـــــ اور دل پر پتھر رکھ کر میں تم سے جدا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ
ایک دن محبت کی کشش تمھیں میرے پاس کھینچ ہی لائی۔ اماں اور بہنیں شادی کا سامان خریدنے
کے سلسلے میں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے تمھیں اپنے آنگن میں دیکھا لیکن مجھے یقین نہ آسکا
کہ سچ تم ہی آئی تھیں۔

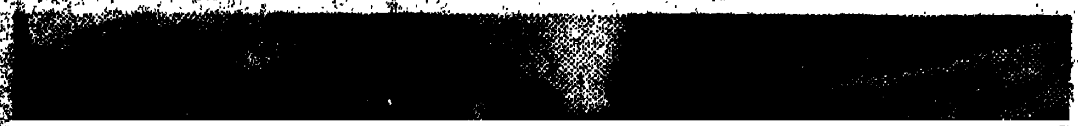
"رضیہ؟" میں ہولے سے گنگنایا۔
"جی ... !" تم مسکرائیں اور یوں اپنا کرب چھپا گئیں۔
"آپ کچھ خفا ہیں مجھ سے؟" تم نے پوچھا تھا "کیوں نہیں آئے؟"
"مجھے بھول جاؤ رضیہ!" میں کہنا چاہتا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا۔
لیکن میں نے بھی ہنس کر آنسو پی لیے۔

"یوں تو آپ کو حوصلہ نہ ہارنا چاہیے" نجانے تم کیا کہہ رہی تھیں۔ میں تمھارے
ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتا رہا اور آہستہ آہستہ امرت کی بوندیں میرے دل میں اترتی چلی گئیں۔
اور جب تم چلی گئیں تو میری نظریں اُس چھوٹے سے پرس پر پڑیں جو تم دانستہ وہاں
چھوڑ گئی تھیں۔ اُس میں تم اپنے زیور بھر لائی تھیں جو مجھے دے گئیں اور زبان بے زبانی سے جتا
گئیں۔ یہ سرمایہ میں اپنی کسی بہن کو دے کر اپنی قربانی سے باز آجاؤں۔ کیونکہ میں تمھارا تھا۔
صرف تمھارا!



## اب لیجئے، بالکل ہی نرالی قسم کے کمبل!

## بامبے ڈائینگ



[illegible] پھر جب میں نے تمھیں مجھے واپس [illegible]

[illegible] اپنا [illegible] کر دیا

[illegible] اور انگوٹھی کا نام بھی

نہیں ہے۔ [illegible] کے لبوں پر بکھرے [illegible]

[illegible] پوشیدہ ہیں۔ یہ تحریر نذرانہ آپ

[illegible] کر سکتی !؟"

تم [illegible] مضطرب اور بے قرار تھا تم نے خوشامد بھی کر کے اپنے زیور لینے

سے انکار [illegible] کام آ سکتے ؟

[illegible] کی دھمکی یوں بھی میرے قدموں کی زنجیر

بن گئی تھی۔ [illegible] کم ظرف اور بے وفا تھا ہیں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میں نے اس دھمکی پر

سر جھکا دیا [illegible] قریب کر رہے تھے۔ میں نے تمھارے یہاں آنا جانا بند کر دیا۔ میں

نہیں سمجھ سکتا رضیہ! یہ صدمہ میں نے تمھیں کیسے پہنچایا۔ میرا دماغ ماؤف تھا۔ سوچنے سمجھنے کی

ساری صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں۔ میں نہ احتجاج کر سکا، نہ اپنا حق منوا سکا، نہ اپنے پیار کی

قربانی پر حالات کی صعوبتیں [illegible] سکا۔ اگر فریاد کی لے جانتا تو فریاد بلند کرتا

لیکن میری آواز تو میرے ہی حلق میں گھٹ کر رہ جاتی !

تمھاری محبت کا محل زمیں بوس ہو گیا اور جب تم نے دیکھا۔ وہ عہد و پیمان،

پیار اور خلوص چند روپہلے سکوں اور کاغذ کے بیش قیمت ٹکڑوں کے عوض بک رہے ہیں

تو تم یقین نہ کر سکیں۔ میری اہانت اور توہین تم سے برداشت نہ ہو سکی۔ تم نے چپکے چپکے آنسو

بہائے۔ لیکن ایک حرف شکایت کا تمھارے لبوں پر نہ آیا۔ لیکن تم نے اپنی ہار اور میری بے وفائی

کا بدلہ اپنے سے بھی لیا اور مجھ سے بھی! دل ہی دل میں جھلستی رہیں۔ آنسو بہانا تمھیں پسند

نہ تھا۔ شاید وہی آنسو دل میں پہنچ کر انگارے بن گئے۔ دل کا رونا تو یوں بھی بہت

ہولناک ہوتا ہے!

رضیہ! میری خاموشی اُس پہاڑ کی سی خاموشی تھی جس کے سینے میں جوالا مکھی

پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے۔ لیکن جس دن مجھے معلوم ہوا کہ تم دردانہ سے میں مکٹرے کٹرے یکایک

گر گئیں اور تمھارے لبوں پر ایک نام مچل اٹھا۔

• منصور ——؟

اور جیسے میرے سینے کی جوالا مکھی پھٹ پڑی۔ میں نے دیوانہ وار تمھیں چیخ چیخ کر

آوازیں دیں۔ اِس معاشرے کو برا بھلا کہا۔ اپنی آن اور ماں باپ کی جان کی بھی پروا نہ کی رضیہ!

میری آوازیں خان صاحب تک بھی پہنچ گئیں۔ دُنیا نے میرا منہ بند کر دیا لیکن میرے دل

کے ہونٹ کون بند کرتا جو برابر چیخ رہے تھے۔ پھر میں ٹھیک اُس وقت گھر سے نکل بھاگا

جب مجھے تمھارا جنازہ اٹھنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور تمھارا بے ہوش جسم لوگ سنبھال کر

ایمبولنس میں رکھ رہے تھے!

خان بہادر صاحب۔ جنھیں میں نے ہمیشہ خان صاحب ہی کہا تھا کیونکہ وہ بہادر

نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو دو دلوں کی مجبوریاں اپنی دولت سے کبھی نہ خریدتے۔ وہ خان صاحب

پاگل داماد کیسے قبول کر لیتے۔ غصے میں بھرے ہوئے میرے شکست خوردہ باپ پر ٹوٹ پڑے جو

اپنی سب سے بڑی اور آخری بازی ہمیشہ کے لئے ہار چکا تھا۔ جس کی آنکھوں کے سیاہ

حلقوں میں پسینہ پھوٹ آیا تھا اور کمر زیادہ جھک گئی تھی!

"تم نے مجھے دھوکا دیا ہے!" خان صاحب گرج رہے تھے "میں سمجھا تھا تم میری

بیٹی کی خیرات میں اپنی لڑکیوں کو ٹھکانے لگانا چاہتے تھے۔ میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔

کیا میں تمھارے ہاتھ پر اتنی بڑی رقم رکھ دیتا اور اب تو میں ہرگز اپنی بچی کو تمھارے پاگل

بیٹے سے نہیں بیاہ سکتا!"

میرا باپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا، کمر کا بوجھ گردن تک بڑھ

آیا ہو۔

جب میں ہسپتال پہنچا، تو تم نیم مُردہ سی بستر پر لٹائی جا چکی تھیں۔ تمھارے

سرہانے آکسیجن سلنڈر رکھے جا رہے تھے۔ تمھاری آنکھیں باہر نکلی تھیں سکتہ زدہ سی۔ جیسے

رونا بھول گئی ہوں! اور میں، تمھارے سرد ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لئے تمھارے پاس بیٹھا

تھا۔ لیکن نہ میں تمھیں آواز دے سکا نہ اُس خواب سے جگا سکا، جو تم کسی اور ہی نیند میں

کھوئی دیکھ رہی تھیں! تمھارے قلب پر شدید دورہ پڑا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ تمھارا سینہ سانسوں

کے زیر و بم سے محروم ہوتا جا رہا تھا اور تمھارے چہرے پر ملکوتی نور اب بھی برس رہا تھا۔

پھر تم نے گنی گنائی ساعت کے لئے اپنی پلکیں جھپکائیں اور تمھاری نظریں میرے چہرے پر

پڑیں۔ ہلکی سی مسکراہٹ تمھارے لبوں پر بکھر گئی اور اس کے بعد ڈاکٹر نے سفید شال

تمھارے پائینتی سے کھینچی اور سر تک ڈال دی! پھر کچھ پتہ نہ چلا، کیا ہوا رضیہ! میری آنکھ

تو یہاں کھلی ہے!

مجاز مردی کے قریب ...

رضیہ! اپنے پیار کی خاطر میں نے سب کچھ ٹھکرا دیا۔ دولت عزت اور شہرت۔

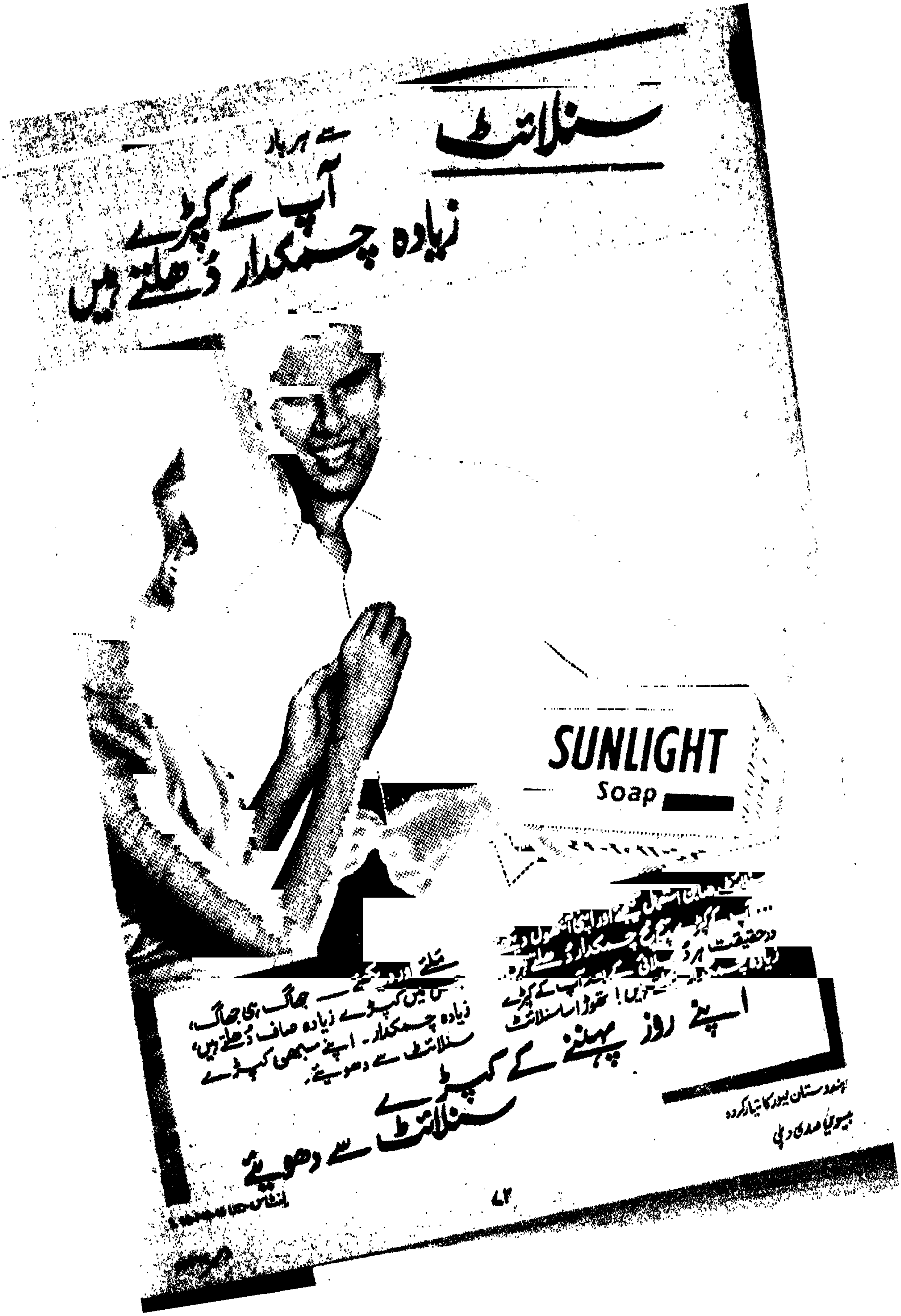
دیکھو تو۔ خدا کے لئے ایک بار۔ ایک پل کے لئے یقین کر لو۔ میں نے تم سے بے وفائی نہیں کی۔

رضیہ! میں تمھارے گجرے لایا ہوں!

یہ کون پہنے گا؟ کسے پہناؤں!!!

---

**مشہور افسانہ نگار حضرت آسی رام نگری** مناسب حق محنت پر اصلاح کا کام بھی کرتے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب خصوصاً نئے لکھنے والے اپنے مضامین، افسانوں اور کتابوں پر اصلاح لے کر ایک مستند ادیب کی خدمات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا ٹکٹ بھیجئے۔ پتہ: حضرت آسی رام نگری [illegible]


سنلائٹ
سے ہر بار
آپ کے کپڑے
زیادہ چمکدار دُھلتے ہیں
SUNLIGHT
Soap
زیادہ چمکدار۔ اپنے سبھی کپڑے
سنلائٹ سے دھوئیے۔
اپنے روز پہننے کے کپڑے
سنلائٹ سے دھوئیے
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

# خط لکھیں گے...

فکر تونسوی کے طنزیہ خطوط کا سلسلہ ۱۰

## اپنی محبوبہ کے نام

ڈارلنگ اُوشا، آشا، ابھلاشا (جو بھی تمھارا نام ہے)

تم ہر روز میرے خوابوں میں آتی ہو (کبھی کبھی ناغہ بھی کر لیتی ہو کبھی اور کے خوابوں میں چلی جاتی ہو شاید) آج سے پچیس سال پہلے بھی ایک لڑکی میرے خوابوں میں آیا کرتی تھی لیکن وہ صرف دو تین ہفتے ہی میری محبوبہ رہی بعد میں میری بیوی بن گئی۔ اس کے بعد پچیس سال تک میرے خواب ویران رہے اور محبوباؤں کی بجائے تیل، لکڑی، صابن، سبزی، چارپائیاں اور کرسیاں میرے خوابوں میں آتی رہیں۔ جن کی وجہ سے آرزوؤں کی دھرتی سوکھ گئی خوابوں کی شاخ پر نئی نئی کونپلوں نے پھوٹنا بند کر دیا اور میں یہ سوچ کر واقعات کے جبر تلے چپ چاپ پستا رہا کہ شرفاء کا یہی دستور ہے۔

لیکن پچیس سال بعد اچانک تم ٹپک پڑیں اور میرے خوابوں میں کوہنا بل مچانا شروع کر دیا۔ میں پوچھتا ہوں تم اب تک کہاں سوئی رہیں؟ کیوں بطن گیتی میں مستور رہیں؟ اور کیوں تم نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ تم بہت لیٹ ہو گئی ہو اور اب جبکہ میں شرفاء کے قبیلے میں شامل ہو چکا ہوں اور اپنے خوابوں کے مقبرے پر مجاور بن کر بیٹھ گیا ہوں، تم میرے خوابوں میں آنے لگی ہو اور عشوہ طرازیاں فرمانے لگی ہو اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے تم مجھ سے پیار کرنے نہیں آئیں میرے مقبرے پر دیا جلانے آئی ہو۔ کبھی کبھی میں یہ بھی سوچتا ہوں ڈارلنگ، کہ ممکن ہے تم میری تشنہ تمناؤں کا عکس ہو اور تمھیں میری تشنہ تمناؤں نے ہی تخلیق کیا ہو اور حقیقت میں کہیں تمھارا وجود نہیں ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو ڈارلنگ! تشنہ تمناؤں کی یہ شرارت افسوس ناک ہے۔ خواہ مخواہ ایک شریف انسان کی چلتی چلاتی زندگی میں اتھل پتھل پیدا کر دینا مناسب نہیں ہے۔

اور اگر ڈارلنگ! واقعی تمھارا کہیں کوئی وجود ہے تو میری ایک التجا قبول کرو کہ میری بجائے کسی سرسبز شاخ پر جا کر کھلا کرو۔ کیوں اپنی بہار اور میری خزاں دونوں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ تمھارے لئے کئی اور حضرات بھی خواب لیتے ہوں گے۔ تم میری طرف آنے کی بجائے اُدھر کا رُخ کیا کرو تاکہ خوابوں کی (کوئی بھی) تعبیر تو نکلے۔ البتہ اگر تم مجھ سے تفریحاً عشق کرتی ہو اور میرے خوابوں میں آئے بغیر تمھیں نروان پراپت نہیں ہو سکتا تو بے شک آتی رہو۔ لیکن ایک شرط پر کہ اب کے جب آؤ تو اپنا نام اور پورا پتہ مجھے ضرور بتا کر جاؤ۔ ورنہ میں سمجھوں گا، تم فراڈ ہو۔ صرف خواب ہی خواب ہو، محبوبہ نہیں ہو۔

## اپنی بیوی کے نام

میری اکلوتی رفیقۂ حیات!

یہ خط (جو نامۂ محبت ہرگز نہیں ہے) پڑھ کر شاید تم سوچو گی کہ لفافے کے پندرہ پیسے ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ یہی باتیں تم زبانی بھی مجھ سے کہہ سکتے تھے۔ ان پندرہ پیسوں میں گھر کے لئے دو ماچسیں ہی آ جاتیں ایک بینگن آ جاتا۔ خواہ مخواہ پندرہ پیسے ضائع کر دیئے۔ (تمھاری یہی فضول خرچی تو اس گھر کو لے ڈوبے گی)

لیکن جانِ من! تمھارے سامنے زبان چلانے کی مجال ہی کسے ہے؟ جب سے تم میری بیوی بنی ہو، میری زبان اپنی ان تمناؤں کا اظہار کرنا ہی بھول گئی ہے۔ جن کی قبر پر تم نے اپنے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں۔ گزشتہ پچیس سال سے میری زبان صرف وہی باتیں ادا کرنے کی عادی ہو گئی ہے، جو صرف تمھارے محبوب موضوع ہیں۔ مثلاً ڈاکٹروں کے بل، کپڑے لتے کے بھاؤ، دالوں اور سبزیوں کی مہنگائی اور بچوں کے قلم، دواتیں، کاپیاں اور کتابیں۔ بیوی صاحبہ! معاف کرنا، یہ موضوع میری تمنائیں ہرگز نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تو میرے اور تمھارے تعلقات کے انتہائی بھونڈے نتائج ہیں۔

لیکن یہ مت بھولو کہ میں صرف ایک خاوند نہیں ہوں۔ اِس خاوند کی دبیز تہوں کے نیچے پھنسا ہوا، کلبلاتا ہوا، تڑپتا پھڑکتا ہوا وہ شخص بھی موجود ہے جس سے پچیس سال پہلے تم نے محبت کی تھی۔ افسوس کہ تم بچوں اور سبزیوں اور فرنیچر کے بوجھ تلے یہ بھول گئیں کہ تم کبھی میری محبوبہ بھی تھیں اور میں آج بھی اُس محبوبہ کے ہجر میں آنسو بہاتا ہوں، حالانکہ تم دعویٰ کر سکتی ہو کہ تم تو ہر وقت میرے قریب رہتی ہو۔ اِس لئے یہ ہجر ایک طرح کا جعلی نعرہ ہے۔ لیکن آہ! میری سابق محبوبہ اور حال بیوی! میں جس محبوبہ کے ہجر میں تڑپتا ہوں، اُس کا نام بیوی نہیں ہے بلکہ وہ بیوی کے اندر ہی اندر کہیں گم ہو گئی ہے اور کبھی کبھی تو یہ سوچ کر میں کانپ

[illegible] مگر ابھی تک نہیں [illegible] سے بہت لمبی گزر چکی ہے۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی ایک ثانیہ، ایک لمحہ تم پر بھی آ جائے جب تمہیں اس لمحے کو مجھ سے [illegible] صرف ایک ثانیہ، ایک لمحے کی غیر حاضری [illegible] کہ میری [illegible] تھی، میری محبوبہ وفادار نہیں تھی۔

## اپنے دشمن کے نام

بڑے رام جی!

کوئی پندرہ برس پہلے ہم نے ایک دوسرے کو جلی کٹی سنائی تھیں اور اب تو ٹھیک طرح یاد بھی نہیں کہ وجہ نزاع کیا تھی؟ میرا خیال ہے وجہ نزاع انتہائی معمولی بلکہ لغو ہوگی۔ مثلاً دو چار روپوں کا جھگڑا ہوگا۔ کوئی چھوٹی سی توقع مجروح ہوئی ہوگی، مکان کی ایک آدھ اینٹ اِدھر اُدھر رکھنے پر بحث ہو گئی ہو گی یا بچوں کی گیند وغیرہ پر ہم ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہوں گے۔

لیکن میں حیران ہوں کہ پندرہ سال گزرنے کے باوجود وہ گیند اور اینٹ تمھارے دماغ میں موجود ہے۔ کل شاید ڈیڑھ برس بعد تم ریلوے بکنگ آفس پر نظر آئے تو تم نے مجھے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا اور شاید اس گاڑی پر سوار ہونا بھی اپنی توہین سمجھا جس پر سوار ہو کر میں جانے والا تھا۔ اُف! پندرہ سال میں بھی ہم اپنے اس زہر کو زائل نہ کر سکے جو کسی گیند کے راستے ہماری رگوں میں داخل ہوا تھا۔ میرے خیال میں یہ بات ہم دونوں کے لئے شرمناک ہے اور جب مجھے یاد آتا ہے کہ اس زہر سے پہلے ہم دونوں شہد کی طرح میٹھے تھے باہم شیر و شکر تھے۔ ہماری دوستی پر دنیا رشک کرتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نہایت گہرے دوست ہی نہایت گہرے دشمن بھی بن سکتے ہیں۔

اور کبھی کبھی میں باہم دونوں کی اس مضحکہ خیز حالت پر مسکرا بھی دیتا ہوں کہ ہم دونوں میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ ایک دوسرے کو آمنے سامنے بٹھا کر ایک دوسرے کے زخموں پر مرہم لگا سکیں۔ مجھے شک ہے کہ ہم دونوں اپنی اپنی دشمنی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جرأتِ رندانہ سے محروم ہیں کہ اس خاتمے کا آغاز پہلے کون کرے۔ ہم ڈرتے ہیں کہ ہم میں سے جس نے بھی پہل کی اس کا وقار کم ہو جائے گا۔ (میرا خیال ہے تم مجھ سے زیادہ وقار پرست ہو)

اس لئے اے میرے بیک وقت گھٹیا اور عظیم دشمن! یہ خط میں اسی جرأتِ رندانہ کے تحت لکھ رہا ہوں کہ آنے والے اتوار کو میرے غریب خانے پر تشریف لاؤ اور کھانا تناول فرماؤ۔

یہ پیشکش تم بھی کر سکتے ہو۔ یعنی میں بھی تمھارے دولت کدے پر آ سکتا ہوں۔

[illegible] دہلی

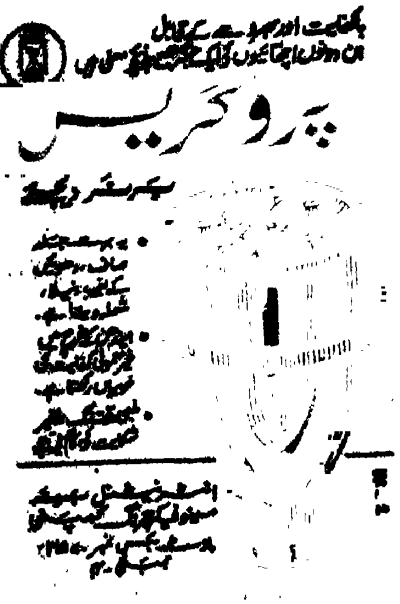
## چور کے نام

چور صاحب قبلہ!

پرسوں رات آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے [illegible] اطلاع ہوتی تو آپ کو یہیں یا [illegible] آپ کو گھر کی [illegible] سے آگاہ کر دیتے کہ [illegible]

[illegible] کو کوئی بیال [illegible]

معلوم ہوتا ہے آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی کہ ہماری [illegible] بھری پڑی ہیں۔ لیکن آپ نے خود ملاحظہ کر لیا ہوگا کہ ہماری الماری پر [illegible] اس کے پٹ تمھاری قسمت کی طرح بند نہیں تھے کھلے تھے۔ اس کا مطلب [illegible] تمہاری الماری کے اندر چوری کے قابل کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ تالا صرف اسی [illegible] لگایا جاتا ہے جو چوری کی جا سکے۔ اس لئے آپ کو یہ دیکھ کر اپنی [illegible] اور [illegible] بدنصیبی کا شدید احساس ہوا ہوگا کہ الماری میں کتابیں تھیں، پرانے ادبی رسائل، [illegible] اخبار، ایک خستہ حال گراموفون، بچوں کے کھیلنے کی ایک "لیڈو"، چند استعمال شدہ [illegible] اور



[illegible] آپ کے [illegible] سے [illegible] چیز [illegible] اس کا [illegible] ہے آپ
[illegible] قیمتی [illegible] اور جب آپ میرے
[illegible] سے خالی ہاتھ [illegible] برابر [illegible] ہوا ہوں کہ [illegible] دولت کمانے کے
طریقے [illegible] استعمال کئے ہیں [illegible] دولت [illegible] گھر [illegible]
[illegible] کے سامنے [illegible] زندگی گزار رہا ہوں [illegible]
[illegible] بجائے [illegible] کا دائیں استعمال کرتا ہوں۔
[illegible] کو دھوکہ دینا آسان ہے لیکن چور کو دھوکا دینا آسان نہیں۔ وہ تو الماری کھول کر
[illegible] یہاں صرف کتابیں ہیں یا جھینگر!

چور صاحب! آپ کی نگاہوں میں میری جو توہین ہوئی ہے اُس کا بدلہ لینے
کے لئے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں دولت جمع کرنے کے جائز اور ناجائز وسائل
سے کام لوں گا اور دوسری بار جب آپ تشریف لائیں گے تو اس دیار میں بہار ہی بہار
پائیں گے۔ بہار ہی اُس کے لئے ہونے کی سہا ضیں مجھے کسی کے ہاں سے چوری کیوں نہ
کرنی پڑیں۔

جب تک میرے پاس کچھ متاعِ زر اکٹھا ہو جاتے میں آپ کو اطلاع دے دوں گا
اور اُس وقت شاید آپ کو الماری پر ایک بھاری بھرکم آہنی تالا لگا ہوا ملے گا۔ جسے
توڑنے کے لئے آپ اپنے آلات ساتھ لائیں گا ـــــ لیکن جب تک یہ خاکسار اس
قابل نہیں ہوتا آپ ہمارے علاقے کے ایگزکٹو انجینئر شری واسودیو پرشاد جی کے گھر چوری
کرنے کی کوشش کیجئے۔ اُن کے یہاں قوم کی لوٹ کھسوٹ کا کافی مال اکٹھا ہو گیا ہے۔
(معاف کیجئے، کہیں غلطی سے آپ نے مجھے ایگزکٹو انجینئر تو نہیں سمجھ لیا تھا۔ ارے بابا!
میں تو فکر تونسوی ہوں۔ نوٹ کر لو)

## بیوی کی سہیلی کے نام ـــــ●

میری پیاری نہیں میری بیوی کی پیاری سہیلی!

میں نہیں جانتا کہ تم میری بیوی کی سہیلی کیسے بن گئیں؟ تمہارے اندر کوئی حُسن
نہیں۔ نہ جسم میں، نہ لب و لہجہ میں، نہ خیالات میں۔ لیکن پھر بھی میری بیوی تم پر یوں جان
چھڑکتی ہے جیسے تم اُس کی خاوند ہو۔ اس اعتبار سے تم میری رقیب رُوسیاہ بنتی جا رہی ہو۔
(حُسنِ اتفاق سے تمہارا چہرہ بھی سیاہ ہے) ہو سکتا ہے یہ میری بیوی کی بدمذاقی ہو جس نے
تمہاری ایسی لغو عورت کو اپنی سہیلی کے طور پر چُنا۔ لیکن کم از کم تمہیں بھی تو آئینے میں اپنے
جسم و ذہن کی شکل دیکھ لینی چاہئے تھی کہ تم کسی معقول انسان کی بیوی کی سہیلی بننے کے
قابل بھی ہو یا نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آئندہ تم ہمارے گھر آنا جانا ترک کر دو۔ میری بیوی اپنی

حالت [illegible] ہوں [illegible] ہے کہ تم
[illegible] سکتا [illegible] ذہین ہونے
کے ساتھ ساتھ تنزل [illegible] ہوں ـــــ [illegible] کہ تمہارے اور میری بیوی
کے درمیان صرف ایک چیز مشترک ہے کہ تم دونوں اپنے اپنے خاوندوں سے نالاں ہو۔
مگر یہ بنیاد دوستی کے لئے یہ مشترکہ بنیاد انتہائی کمزور اور بھونڈی ہے۔ اس لئے یا تو اپنے
جسم و ذہن میں حُسن پیدا کرو۔ (جو میری کمزوری ہے) ورنہ میری بیوی سے ترکِ تعلق کر لو۔
یاد رکھو کہ وہ میری بیوی ہے، تمہاری نہیں!!

# دوسرا ہیرو!

ایم کوٹھیاوی راہی

قاضی پور خورد۔ گورکھپور (یو۔پی)

۴ اگست ۹۶ء

برادرِ محترم خوشتر صاحب! آداب

آپ تو مجھے بھول گئے۔ اگر نہیں بھولے تو بتایئے کتنا عرصہ ہوا یاد کئے؟ لیکن "بیسویں صدی" برابر مل رہا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ بھول کر بھی آپ مجھے نہیں بھولے ہیں۔ میں اکیلا ہوں، اداس ہوں، پریشان ہوں۔ ہمیشہ کی طرح۔ لیکن اب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ایک کہانی ہو گئی تھی۔ آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ "بیسویں صدی" کا معیار تو اب آسمان سے باتیں کرنے لگا ہے۔ تاہم یقین ہے "راہی" کے اس راہی کو منزل ضرور ملے گی۔ ملے گی نا! . . .

آپ کا بھائی ——— ایم کوٹھیاوی راہی

---

"یار! کتے کیسے مارتے ہو؟"

"کچلا کھلا کر!"

"تھوڑا سا مجھے بھی دے دو!"

"آپ کیا کرو گے بابو؟"

"ہے ایک ضرورت۔ پیسہ لے لو!"

"پیسے کی کیا بات ہے بابو۔ لے لو۔ مگر بتاؤ نا کیا کرو گے تم؟"

لیکن نظیر نے بدلو بھنگی کو کچھ نہ بتایا۔ کچلا لے کر چلتا بنا۔

---

رات کے دس بج چکے تھے۔ اس کالونی میں سرِ شام ہی سے خاموشی چھا جاتی۔ اس وقت تو ہو کا سناٹا تھا۔ جاڑے کی سرد ہوا سائیں سائیں کرتی چل رہی تھی۔ سڑک پر جگہ جگہ ٹیوب لائٹ کا مٹمیلا اور گدلا سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ نظیر رابعہ کے بنگلے کے سامنے رک گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ حالانکہ کچلے کا پیکٹ جیب میں موجود تھا۔

"میں کتے سے نہیں ڈرتا، مگر . . ." وہ اپنے دل میں کہنے لگا: "رابعہ کا ہیرو کتنا خونخوار ہے۔ لیکن اس کا خاتمہ کر کے ہی دم لوں گا!"

"بھوں بھوں!" اچانک ہیرو کی بھونک فضا میں گونجی۔

"تُو تُو تُو، آ آ . . ." نظیر مدھم سی آواز میں بلانے لگا۔

"ہیرو، ہیرو!" اُدھر سے رابعہ نے پکارا: "کیوں شور مچاتے ہو۔ آؤ آؤ!"

"تُو تُو تُو، آ آ . . ." نظیر پیہم بلاتا رہا۔ اس کی یہ دھیمی آواز بھی شاید رابعہ کے کانوں تک پہنچ گئی۔

"کون ہے؟" کہتی ہوئی وہ سڑک پر آ گئی۔

"جی میں!" نظیر کانپ سا گیا۔

"تم پھر آ گئے؟" وہ درشت لہجے میں بولی: "معلوم ہوتا ہے آج اپنی قضا لے کے آئے ہو!"

اور پھر رابعہ زور سے گرجی۔

"اِدھر آؤ ہیرو!"

دُم ہلاتا ہوا ہیرو اس کے سامنے آ گیا۔

"دیکھو کیا رہے ہو؟" وہ چیخی۔

ہیرو نظیر پر جھپٹا۔

"خدا کے لئے اسے روکو!" نظیر رابعہ کے پیچھے ہوتے ہوئے گڑگڑایا۔

"ہیرو، ہیرو، ٹھہرو!"

اور پھر وہ زبان نکالے کھڑا تھا۔

رابعہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

[illegible] کی طرح [illegible] تھا۔

"واپس جاؤ۔ اب مت آنا۔" وہ [illegible] میں بولی۔

نظیر چپ چاپ چلا گیا۔

---

"پہلے اُسے ہلاک کرنے کی کوئی صورت بتاؤ۔"

دوسرے روز نظیر پھر بدلو بھنگی سے مخاطب تھا۔

بدلو ہنسا۔

"کیا کروگے بابو ایک کُتّے کو مار کر؟"

"تم کیا کرتے ہو مار کر؟"

"مجھے ایک کُتّا مارنے کا دام ایک روپیہ ملتا ہے۔"

"اور مجھے ایک ہزار سے بھی اوپر مل سکتا ہے۔"

"وہ کیسے بابو؟"

"یہ تمھیں کیوں بتاؤں!"

"میں بھی کوشش کروں!"

"وہ بہتوں کو کاٹ چکا ہے۔"

"مجھے نہیں کاٹ سکتا۔"

"یہی تو جاننا چاہتا ہوں کیسے؟"

"پہلے ایک ہزار والی بات بتاؤ۔"

"اور اپنا نقصان کروں۔ خیر! تم بتاؤ کیا لوگے اُسے ہلاک کرنے کا دام؟"

"یہ بات ہے بابو!"

"ہاں!"

"پانچ روپے!"

اور نظیر نے جھٹ پانچ کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اچھا تو بابو کل آبادی سے چکر لگانا۔ آج ہی سالے کا صفایا کر ڈالوں گا!"

"اور اُس کی لاش کی قیمت پانچ روپے!"

"اچھا تو لاش بھی لاؤں گا سالے کی!"

---

"پھر میں نہیں آتا۔ مارگریٹ! سوچو، ایک وہ کیا کرتا ہے اسے کیا چاہیے؟"

"تمھارا پیار!"

"تم تو بات بات میں پیار کو بدنام کرتی ہو!"

"دیکھ لینا کبھی یہی بات ہوگی!"

[illegible]

"[illegible]" [illegible]

"تو کیا ہے [illegible] کیا مطلب ہے؟"

"[illegible]"

"تو کیا [illegible] ہیرو [illegible]"

اس بات پر راجہ ہنس پڑی۔

"آج میں ہیرو کو [illegible] باندھ دوں گا!"

"گویا تم خود چاہتی ہو کہ۔۔۔؟"

"بس بس اب رہنے بھی دو۔ آخر شرافت کا بھی کوئی تقاضا ہے۔"

"بڑی آئیں شریف! پہلے کہاں تھی یہ شرافت [illegible]"

---

"رات کیا ہوا راجہ؟"

"ہوا کیا۔ میں نے ہیرو بچارے کو ناحق زنجیر میں جکڑ [illegible] دیا۔"

"نہیں آیا؟"

"ہاں۔ وہ نہیں آیا۔"

"تو کیا کوئی اور آیا تھا؟"

"ہاں۔ مگر اب رہنے بھی دو۔"

"وہ کون تھا؟"

"تھا کوئی کمینہ!"

"کمینہ؟"

"اور کیا۔ کُتّے کو گردن سے پکڑے [illegible] ۔۔۔"

"تو پھر کیا ہوا؟"

"اب چھوڑو اس ذلیل واقعہ کو۔"

"ذلیل واقعہ؟"

"ہیرو کی آواز [illegible]"

کھڑا ہے۔

[illegible]

پلیا۔ بعد کو میں نے [illegible]

چہرے کو غور سے دیکھا اور ہونٹ سکیڑ کر اپنا ہوا ہاتھ اُس کے بدن پر رکھتی ہوئی پیشانی سے پسینہ پونچھ لیا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"وہی جو پہلے کہا تھا۔ کتنا کھایا سامنے نے؟ تمہارا پانچ روپیہ ابھی میں دیے دیتا ہوں؟"

"نہیں نہیں۔ اب مجھے اُس کی ضرورت نہیں" نظیر نے کہا۔

بدلو کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔

"وہ کتیا بچے میں مر چکی ہوتی تو دیکھتا بیٹا کہاں جاتے ہیں!"

اور پھر سارا واقعہ ایک ہی سانس میں بدلو نے بتا دیا اور کراہتا ہوا بولا "تو وہ سوئیاں لگیں گی۔ ڈاکٹر بابو نے کہا ہے بہت جو پلا کتا ہے وہ آدمی اُس کے کاٹنے سے مر بھی سکتا ہے بابو۔ ہو سکتا ہے میری کیا آگئی ہو!"

نظیر کو اُس پر ترس آنے لگا۔ وہ اپنے آپ کو من ہی دل میں صلواتیں سنانے لگا۔ اگر بدلو مرا تو اِس کی موت کا ذمے دار میں ہوں گا۔ میں نے ہی غریب کو اِس خطرناک کام پر بھیجا اور مجھے اِس پر کس نے آمادہ کیا؟ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر اُس کی نظروں میں حسین سیٹھ کا بیٹا احمد علی گھوم گیا۔ نظیر کی مٹھیاں بھنچ سی گئیں۔ اُس کی جیب میں جو کچھ بھی تھا اُس نے بدلو بھنگی کے سامنے ڈال دیا اور یہ کہتا ہوا چلتا بنا "کہ گھبراتا کیوں ہے بدلو تم اچھے ہو جاؤ گے!"

---

"کہو یار کامیاب ہو گئے؟"

"لعنت ہے تم پر" نظیر احمد علی پر بگڑا "اِتنے بڑے عاشق ہو اور خوف کھاتے ہو ایک کتے سے؟"

"میں جو پوچھ رہا ہوں اُس کا جواب دو؟" احمد علی تجوری اور دوسری چابیوں کا گچھا گھماتا ہوا بولا "چاہو تو پیشگی اور کچھ لے جاؤ۔ اگر ہمت باقی ہو تو جلد سے جلد اُس کا کام تمام کر کے لاش پیش کر دو؟"

"میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی ایک حقیر سا کتا آپ کے عشق میں رکاوٹ بنا ہوا ہے؟"

"ہاں ۔۔۔۔ اگر وہ نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے رابعہ کب کی میری ہو چکی ہوتی۔ میں عشق کو دولت سے نہیں محبت سے حاصل کرنے کا قائل ہوں اور محبت کے لئے لازم ہے کہ میلا ساتھ ہو؟"

"نہ ہوتا تو آپ کیا کرتے؟"

"وہی جو عاشق لوگ کرتے ہیں۔ کیا میرا گانا تم نے نہیں سنا؟"

"اِس کی ضرورت نہیں" نظیر اکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے بولا "کیا تم اُس کتے کو اپنے ریوالور کا نشانہ نہیں بنا سکتے؟"

"میں خود یہ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مجھے اِس کا پورا پورا احساس ہے کہ ایسی لڑکی اپنے کتے سے کتنا پیار کرتی ہے۔ جب اپنے پیارے کتے کو میرے ہاتھوں ہلاک ہوتے دیکھے گی تو ہرگز مجھ سے پیار نہ کرے گی۔"

احمد علی کی اِس منطق پر نظیر کو ہنسی آگئی۔ اُس نے دل میں سوچا۔ ایسے بے وقوف دنیا میں شاذ و نادر ہی مل سکتے ہیں!

"سوچ مت نظیر! تم میرا یہ کام کر دو تو میں ایک ہزار کے بجائے تمہیں دو ہزار دے دوں گا! اور دو ہزار کیا ہے خدا کی قسم تین، چار، پانچ ہزار لے لینا! چاہو تو ریوالور لیتے جاؤ!"

اور احمد علی سے بھرا ہوا ریوالور اور سو کا ایک نوٹ لے کر نظیر اُس کے کارخانے سے چلا آیا۔ حسین سیٹھ کے مرنے کے بعد اِس کارخانے کے سیاہ و سفید کا تنہا مالک احمد علی تھا۔

---

"میں تمہیں آج یوں نہ جانے دوں گی!" رابعہ حسبِ عادت بگڑی "تمہیں بتانا ہی پڑے گا یہاں کس ارادے سے آتے ہو؟"

خلافِ معمول ہیرو آج کمرے میں سو رہا تھا۔

نظیر کی متجسس نگاہیں ہیرو کی تلاش میں تھیں۔

"اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو۔ ہیرو آرام کر رہا ہے۔ لیکن میری ایک ہی آواز اُسے بیدار کر سکتی ہے!"

"یہاں اور کوئی نہیں رہتا کیا؟"

"تمہارا مطلب؟؟"

"آپ کیا تنہا رہتی ہیں؟"

"نہیں ۔۔۔۔ مگر میں کیوں بتاؤں، یہاں میرے ساتھ ہیرو کے سوا اور کوئی نہیں رہتا۔ میرے ڈیڈی، میری ممی، میرے خاندان کے دوسرے لوگ ایئرپورٹ والے بنگلے میں رہتے ہیں۔ تمہیں کیوں بتاؤں کہ مجھے ہیرو کے سوا سب سے وحشت ہوتی ہے؟"

"مجھ سے بھی؟"

نظیر شوخی پر اُتر آیا۔ اُس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔

وہ تلملا اُٹھی۔

"گستاخ! ذلیل۔۔؟"

"جتنا بھی چاہئے نواز لیجئے۔ آپ کے گھر ہی میں کتے کے گھر میں؟"

[illegible] کر رہی ہو؟"

"تو کیا آپ کا پیر گنگا نہیں ہے گیا؟"

"کیا مطلب آنا دے رہی ہو؟"

"خود سے یہی پیچ حفاظت کروں گا؟"

"معلوم ہوتا ہے تمھاری بھی قضا آئی ہے!"

"تو کیا آپ کا گنگا کسی کی جان بھی لے چکا ہے؟"

"ہاں۔ ابھی ابھی اُس غریب کی بیوہ آئی تھی روتی ہوئی۔ کفن کے لئے روپیہ بھیج دیا ہے۔ مگر افسوس ہوتا ہے کہ . . ."

وہ اچانک اُداس سی ہو گئی۔

بدلو بھنگی نظیر کی آنکھوں میں پھر گیا۔

بدن میں چنگاریاں سی رینگ گئیں۔

وہ بے قابو سا ہو گیا۔ اُس کی آنکھ بھر آئی۔

"آپ کا گنگا نہیں آپ قاتل ہیں!" وہ گرجا: "آپ کو پھانسی کی سزا ملنی چاہئے۔ کہاں ہے وہ خونخوار . . . ؟"

"دیکھو میں خود اِس سلسلے میں بہت نادم ہوں۔ یقین کرو جب سے سُنا ہے پریشان ہوں۔ تم شور مت کرو۔ خدانخواستہ اُس کی آنکھ کھل گئی تو . . ."

"تو میرا حال بھی بیکا نہ ہوگا۔ وہ کہاں ہے؟"

نظیر اتنے زور سے چیخا کہ ہیرو کی آنکھ کھل گئی۔ بھونکتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ اور آتے ہی اُس کی طرف لپکا۔

"ہیرو، ہیرو!" رابعہ نے روکا: "اندر جاؤ۔ بھاگو یہاں سے!"

"کیوں بھگاتی ہیں۔ میں ابھی سمجھ لوں گا!"

اُس نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

لیکن ہیرو اندر جا چکا تھا۔

"اب تم چلے جاؤ۔ خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ!"

رابعہ گڑگڑائی۔

نہ جانے کیوں نظیر کے ذہن سے وہ ہزاروں کے نوٹ غائب ہو چکے تھے۔ احمد علی کا دیا ہوا پستول جیب ہی میں رہ گیا۔ وہ چلا آیا۔

---

نظیر کو ساری رات نیند نہ آئی۔ بدلو بھنگی واقعی مر چکا تھا اور یہ بھی سچ تھا کہ رابعہ نے اُس کی بیوی کو کفن دفن کے لئے پیسے دئے۔ یہ بدلو بھنگی کی بیوہ نے بتایا کہ رابعہ خود بھی بہت روئی اُس کی موت کی خبر سُن کر۔ نظیر رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ رابعہ اُس کی نگاہوں میں عجیب [illegible] ایک نہایت حسین سی سادہ [illegible] حسین سیٹھ کا بیٹا احمد علی اُس کے [illegible] چکا تھا لیکن گئے کر [illegible] درمیان سماج کی دیوار کی طرح حائل تھا۔

نظیر کو پھر اُن ہزاروں روپوں کا خیال آیا [illegible] میں جھرجھری سی ہونے لگی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن پھر لیٹ گیا۔ اُس کی [illegible] آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

---

دوسری رات نظیر پھر اُس کالونی میں پہنچا۔

پستول پینٹ کی جیب میں رکھے ہوئے۔

"اچھا ہوا کہ تم آ گئے!"

"بہت اچھے موڈ میں معلوم ہوتی ہیں آپ!"

"ہاں۔ آؤ میں تمھیں چائے پلاؤں!"

وہ اُسے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

"بیٹھو!"

وہ بیٹھ گیا۔

"اب ذرا بتاؤ کیوں آیا کرتے ہو؟"

"جی؟"

"صاف صاف بتاؤ!"

رابعہ اُس کی آنکھوں کو گھورتی ہوئی بولی۔

اُس وقت وہ کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے بہت زیادہ روئی ہو!

"جانتے ہو میں یہاں اکیلی کیوں رہتی ہوں؟"

"مجھے کیا معلوم!"

"مجھے سب سے وحشت ہوتی ہے۔ بچپن ہی سے۔ مگر سُنو۔ یہ عجیب بات ہے کہ تم سے مجھے وحشت نہیں ہوتی۔ میرے ڈیڈی کو پتہ چل گیا ہے کہ ایک ایسا شخص بھی اِدھر آتا ہے جس سے میں بات کر لیا کرتی ہوں۔ انھیں تمھارا علم ہو چکا ہے۔ اب وہ تمھاری تلاش میں ہیں!"

"میری تلاش میں؟"

"ہاں ــــ وہ بہت زیادہ خوش ہیں۔ یہ جان کر کہ میں بدل رہی ہوں۔ تم میری زندگی کا سب سے اہم موڑ ہو۔ مجھے کوئی بھی اچھا نہیں [illegible] لوگوں کو میری شادی کی فکر تھی۔ اب شاید اُن کی فکر دور ہونے والی ہے۔ مجھے [illegible]

[illegible] تم سے [illegible] ڈیڈی ہو سکتا ہے میرے لئے تمہارے
[illegible] ہے؟"
[illegible] معلوم ہوا کہ خواب دیکھ رہا ہے۔
کوئی [illegible] حسین سیٹھ کا بیٹا احمد علی رابعہ کی اس
[illegible] نکال پایا ہو اور اس کے لئے ہزار، دو ہزار،
پانچ ہزار [illegible] ـــــ نظیر کا سر چکرا سا گیا۔ جب بات کرتے کرتے رابعہ نے
[illegible] بولی۔
"[illegible] سنبھالو۔ مجھے تم سے وحشت نہیں ہوتی!"
نظیر کو [illegible] ہیرو کا خیال آ گیا۔
اُس نے رابعہ کا سر شانے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔
"[illegible] آپ کا ہیرو کہاں ہے؟"
"اُس کمینے کو میں نے مار دیا!"
"مار دیا؟"
"ہاں ـــــ اور سمندر میں پھنکوا بھی دیا!" وہ سسکتی ہوئی بولی۔ "اُسی کی وجہ سے . . .
ہاں ہاں . . . شاید اُسی کی وجہ سے مجھے کوئی بھی اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا . . ."

یہ بات نظیر کے دل کو چھو گئی۔
سارا معمہ سمجھ میں آ گیا۔
رابعہ کی شب بہ شب آنکھیں اُسے گھور رہی ہیں۔
وہ سوچ میں ڈوب گیا۔
"کیا سوچنے لگے؟"
"میں تمہارے ہیرو کو قتل کرنے آیا تھا!"
"کیوں؟"
"مجھے اُس کی لاش کے پانچ ہزار ملنے والے تھے!"
"وہ مجھ سے لے لو۔ مگر اب یہیں رہو۔ کہیں مت جاؤ۔ کہیں نہ جاؤ۔ میں ڈیڈی کو فون کرتی ہوں۔
ہاں وہ تم سے مل کر خوش ہوں گے کہ مجھے تم سے وحشت نہیں ہوتی . . . تم میرے . . ."
اور یہ کہہ کر رابعہ فون کرنے دوسرے کمرے میں بھاگی۔
نظیر آہستہ سے اُٹھا اور تیزی سے برآمدے میں آیا اور پھر بے تحاشا بھاگا۔ جیسے
"ہیرو" بننا اُسے کسی قیمت پر منظور نہ تھا!
لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا، ایک خوشبو اُس کا پیچھا کر رہی ہے ـــــ اُس کے
آگے پیچھے رنگین آنچل لہرا رہا ہے!!

---

# غزلیں

## مقصود نشتری

دل خوشی ہی میں پلا ہو جیسے — قصۂ غم نہ سُنا ہو جیسے
دیکھ کر اُن کو ہوا ہے خاموش — کچھ شکوں دل کو ملا ہو جیسے
ہر ستم اُن کا سہا خوش ہو کر — یہ بھی آئینِ وفا ہو جیسے
یُوں ہے دشمن کی نظر میری طرف — آپ کی طرزِ اَدا ہو جیسے
رُو برو اور یہ بیگانہ وشی — "تُو مجھے بھُول گیا ہو جیسے"
خُوب ہے طرزِ تغافل مقصود
یہ بھی اِک رسمِ وفا ہو جیسے

## قطب سرشار

اُفق زرد ہے اور زمیں پر نمی ہے — کہ جیسے سحر غمزدہ ہو گئی ہے
معطر ہوئی شب ترے پیرہن سے — کہ میرے ہی زخموں سے مہکی ہوئی ہے
سُلگتی ہوئی شب کے سینے میں جیسے — سِسکتی ہوئی چاندنی جل رہی ہے
تمناؤں کے پھُول کھِلنے لگے ہیں — تری یاد بادِ صبا بن گئی ہے
اُجالوں کے چہروں پہ ہے گردِ ظلمت — نئی روشنی بھی عجب روشنی ہے
نہ الزام دو مجھ پہ تشہیرِ غم کا — میں چُپ ہوں مگر خامشی بولتی ہے
حقائق کی تلخی بھی سرشار ہم نے
بصد شوق اشکوں کے ہمراہ پی ہے

# تنہائی

اختر عابد نوگانوی

گھیر شفاعت ۔ امروہہ (یو۔پی)

۲۹، جولائی ۹۶ء

محبّی! مدیرۂ خلوص

. . . کہانی کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ کہانی میں نے غم کی بیکراں گہرائی میں ڈوب کر لکھی ہے۔ مجھے یہ کہانی بہت عزیز ہے۔ کیونکہ میں نے اس کے لکھنے میں اپنی ساری کہانیوں سے زیادہ محنت کی ہے۔ یقین ہے آپ کو بھی یہ کہانی پسند آئے گی ـــــ افسانہ نمبر خوب تر ہے۔ اب سالنامے کا شدت سے انتظار ہے . . .

خلوص کار ـــــ عابد

---

کئی دنوں سے شہر کی لائٹ نہ جانے کیوں آف ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے سارا شہر کسی گہرے غم میں سوگوار ہے۔ لیکن دلوں کے چراغ ٹمٹما رہے ہیں۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی ہے۔ تاریکی کے دریا میں سناٹوں کی موجیں مچل رہی ہیں لیکن آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی چنگاریاں مشعلِ راہ معلوم ہو رہی ہیں۔ بھونکتے ہوئے کتّے اس رات کے سینے کو چیر دینے کے لئے بیقرار نظر آ رہے ہیں۔

معاً ملحقہ کمرے کے گھنٹے نے گیارہ بجائے ہیں اور میری نظریں سامنے رکھی ٹائم پیس پر مرکوز ہو گئی ہیں جس میں ابھی گیارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا ہے "میں ابھی تک کیوں جاگ رہا ہوں؟" نیند میری آنکھوں سے جیسے روٹھ گئی ہے۔ شمع پگھل رہی ہے اور میری آنکھیں اس کے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کو یوں دیکھ رہی ہیں جیسے یہ شمع نہ رو رہی ہو بلکہ میرا دل رو رہا ہے!

تکیے کے نیچے چھپی ہوئی ڈائری کے لئے میں مسلسل سوچ بچار رہا ہوں۔ قریب ہی زیبی مسہری پر کروٹیں بدل رہی ہے۔ وہ جلد ہی سو جانے کی عادی ہے اس لئے مجھے بھی تاکید کرتی رہتی ہے میں جلد سو جایا کروں۔ کیونکہ اس کے خیال میں کالج میں آٹھ گھنٹے گزارنے کے بعد تھک جاتا ہوں۔ ہاں تھکن کا احساس تو یقیناً ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت تھکن کا احساس ہوتے ہوئے بھی اس خیال کو لوریاں سنا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں زیبی کہیں جاگ نہ جائے۔ ورنہ فوراً ہی مجھ سے شکایت کرے گی کہ میں ابھی تک کیوں جاگ رہا ہوں۔ وہ میرے دیر تک جاگتے رہنے سے چڑتی ہے کیونکہ پھر کشمکش میں اسے نیند نہیں آتی۔ مجھے خوف ہے کہیں یہ روتی ہوئی شمع اُسے بیدار نہ کر دے۔ اسے نکتہ چینی کرنے کی بھی بیماری ہے۔ اس لئے یہ ڈائری کوئی بہانہ بنا کر یا اس پر کوئی دوسرا کور چڑھا کر بھی اس کے سامنے پڑھنا نہیں چاہتا۔ جو سوچیں اس وقت میرے ذہن کو جھنجوڑ رہی ہیں ان سے چھٹکارا پانا بھی دشوار ہے۔

زیبی کو میری زندگی میں آئے ہوئے ابھی پورے چھ مہینے بھی نہیں گزرے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ برسوں سے میرے قریب رہی تھی اور مجھے پرکھ چکی تھی کہ میں اس کی ہر بات کو سراہ سکتا ہوں۔ بس اس قلیل عرصے میں ایسا ہی ہوا ہے کہ میں زیبی کے اشاروں پر چلتا رہا ہوں۔ میرا کوئی اصول اپنے کام بہت کم آسکا ہے۔

میری زندگی کی بیشتر راتیں تنہائیوں میں جاگ جاگ کر گزری تھیں لیکن زیبی نے آتے ہی پابندی لگا دی اور میری آنکھوں کی نیند سے جیسے صلح کرا دی۔

لیکن آج ایک نئی بے چینی ہے، اضطراب ہے، الجھن ہے جس کی شدت کو میں محسوس کر رہا ہوں اور میں نے ڈائری اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا ہے۔

زیبی نے کروٹ بدلی ہے میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں کی شمعیں نیم تاریکی میں روشن ہو گئی ہیں۔ میں سہم سا گیا ہوں بالکل کسی چور کی طرح لیکن یہ ظاہر کر دیا ہے کہ میں جاگ نہیں رہا ہوں، سو رہا ہوں۔ صرف کروٹ بدلی ہے۔ زیبی مسہری سے اٹھی ہے اور جلتی ہوئی شمع کے آنسو صاف کر کے پھر مسہری پر آ کر لیٹ گئی ہے اور میں اندھیرے کے دریا میں غرق ہو گیا ہوں اور سوچ رہا ہوں، اب اس اندھیرے کے دریا سے ابھرنے کا موقع کیسے مل سکے گا؟

[illegible]

[illegible] بہت مشکل [illegible]

[illegible] معلوم ہوتا ہے کہ تنہائیاں میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہیں۔ میں تنہا ہوں

[illegible] ہوئی [illegible] کانپ رہا ہے۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے ڈائری کھولی ہے
ایک [illegible] کے لئے میں کھو سا گیا ہوں۔

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے... دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

یہ شعر پڑھ کر میں سوچوں کے سیلاب میں بہنے لگا ہوں۔ اسی عالم میں میں نے دوسرا ورق الٹ دیا ہے۔

ماضی کی یادیں میرے دل کے پہلو میں آج بھی چبھتی ہیں۔ میں نے کتنی بار چاہا ہے کہ ان یادوں کو خوشیوں کی لوریاں سنا کر ہمیشہ کے لئے سُلا دوں۔ لیکن میں محسوس کرتی ہوں ان یادوں کی بھی زبان ہے۔ ایک نہیں کتنی ہی زبانیں۔ کتنی ہی آوازیں جن کا میں گلا نہیں گھونٹ سکتی۔ جاگتے سوتے ان سے مفر نہیں۔

وہ دن مجھے آج کے واقعہ کی طرح یاد ہیں جب میں بے سہارا رہ گئی تھی۔ کوئی نہ تھا جو میرے غم کے دامن میں خوشیوں کی بھیک ڈال دیتا۔ راتوں کی سیاہیاں، دن کے اُجالے مجھے شعلہ بار معلوم ہوتے۔ ابو کبھی فوج میں کیپٹن تھے۔ میں نے ان کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ امی نے بتایا تھا کہ جب وہ جنگ میں دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے تو میں پیدا ہوئی تھی اور جب میں ذرا چلنے اور مسکرانے لگی تو وہ اللہ کو پیارے ہو کر جنت میں چلے گئے اور میں بدقسمت اس دنیا کے دوزخ میں زندہ رہی۔ امی نے مجھے کیسی کیسی صعوبتیں اٹھا کر اس قابل بنایا کہ میں چلنے پھرنے لگی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ جب میں اسکول جانے لگی تب بھی یہ احساس نہ ہوا کہ امی کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ ہاں جب کبھی انھیں اتفاق سے تنہائی میں روتے دیکھتی تو وجہ معلوم کرتی۔ لیکن ان کی محبت کے قربان وہ جواب میں مسکرا دیتیں اور مجھے اپنی ممتا بھری آغوش میں چھپا لیتیں اور اس آغوش کی پُرسکون گرمی مجھے ایسی معلوم ہوتی جیسے مہکتے پھولوں کے ڈھیر میں سانسیں لے رہی ہوں۔

اور جب میں ہائی اسکول میں پڑھ رہی تھی، جب بھی امی نے محسوس نہ ہونے دیا کہ مجھے پھولوں کے ڈھیر میں چھپا لینے والی خود غم کے شعلوں میں جل رہی ہے۔ لیکن اس وقت میں اتنی نادان نہ رہی تھی کہ کچھ محسوس نہ کرتی۔ میں کانپتے ہوئے آنسوؤں کا مطلب سمجھ سکتی تھی۔ دل کے چراغ کی تھرتھراتی لو کو دیکھ سکتی تھی۔ چہرے کے مرجھائے ہوئے کنول کے پھیکے پن کو محسوس کر سکتی تھی۔ آنکھوں کی خشک جھیلیں مجھے متاثر کر سکتی تھیں۔ شجر سے ٹوٹ کر گری ہوئی اور مرجھائی ہوئی شاخ کو میں پہچان سکتی تھی اور سب کچھ مجھے نظر آنے لگا تھا۔ گھر کے خاموش در و دیوار، سُونا آنگن، تنہائی اور ہر طرف پھیلی ہوئی ویرانی اور اس ویرانی میں بھٹکتی ہوئی ایک خاموش پرچھائیں ——— یہ سب کچھ دیکھ کر میرے دل میں بھی خلش کا احساس جاگنے لگا تھا۔

[illegible] سے [illegible]

[illegible]

گیا کہ [illegible]

---

ڈائری کے ورق [illegible]

کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر [illegible]

گئی ہیں جس پر میں نے شوکت [illegible]

گزارنے کے بعد میں نے پھر ڈائری کا ورق الٹ دیا ہے ———

میرے دل کے نحیف کاندھوں پر غموں کا بوجھ تھا۔ [illegible] دن

لگا جب یہ احساس ہوا کہ ماں کا سہارا بھی ساتھ چھوڑنے لگا ہے۔ اب کون ہوگا جو گلے لگا لیا کرے گا۔ میری آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو اپنے [illegible] جذب کر

اس خیال نے مجھے اتنا تڑپایا کہ میں نے پڑھنا چھوڑ دیا اور حالات کی قید میں اسیر ہر وقت امی کے سرہانے بیٹھ کر ان کی صحت کے لئے دعائیں مانگتی لیکن [illegible] آہ اثر نہ رہا تھا۔ ہاں ایک شخصیت جس کی آنکھیں روشن چراغ معلوم ہوتی [illegible] ہوتا اور سراپا ہرا بھرا نظر آتا۔ وہ میرے لئے بہت ہی پُراسرار تھا۔ میں نے [illegible] قریب دیکھا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس شخصیت کا امی سے کیا رشتہ تھا۔ اس نے مسکرا کر دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی وہ روشنی بھی مجھے نظر آئی تھی جس نے سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے بارے میں امی سے پوچھ نہ سکی: نہ ہو سکی تھی۔ لیکن جس دن سے امی موت کی لوریاں سن رہی تھیں اس دن سے یہ ان ہو گیا تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے۔ جس کی تمام تر ہمدردیاں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں کیا کئی کئی گھنٹے تک امی کے قریب بیٹھا ہوا دیکھتی۔ کبھی وہ انجکشن لگاتا، کبھی اپنے ہاتھ دوا پلاتا، کبھی ان کا سر دبانے لگتا۔ یہ سب کچھ کیوں کرتا ہے؟ میں سوچ کر رہ جاتی رات وہ حسبِ معمول امی کے قریب تھا۔ امی کو کچھ ہوش تھا اور وہ اس سے کانپتی [illegible] میں کہہ رہی تھیں۔

"شکیل! تم کب تک میری سانسیں روک سکتے ہو؟ ایک دن تمہاری کوششیں [illegible] ہو جائیں گی۔ تم ہاتھ مل کر رہ جاؤ گے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اپنا آرام کیوں [illegible] ہے کہ اس تنہائی میں دم نکل جائے۔"

"ایسا نہ کہو ثمینہ! مجھے کوشش کرنے دو، میرا دل نہ توڑو۔ جس طرح بھی ہو گا زندہ رکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ یہ میری روح کا تقاضا ہے!"

"زخم گہرا ہو چکا ہے شکیل!"

یہ سن کر وہ خلا میں گھورنے لگا اور [illegible]

... ڈاکٹر ... بتایا ... اپنی تمام تر توجہ ... مرکوز کرتے ... سے پوچھا ... خاموش رہیں اور کمرے کی چھت کو ... لگیں ... میں نے محسوس کیا ... دل پر شدید چوٹ سی لگی ہے کیونکہ میں ... کی آنکھوں میں ... پہچان ... دیکھ رہی تھی۔ لیکن پھر انھوں نے اسی غم میں ... بہت کچھ کہہ دیا۔

"زینی! ڈاکٹر شکیل فرشتہ ہے۔ اس کے ... غلط خیال ... کر ... پھر کہیں کھو گئیں اور میں ... سے پہلے ... دی۔

---

میں نے ڈائری کا ... پھر ایک طویل سانس لی ہے اور میری نظریں دور ستاروں پر ... خلا کے دامن میں ... معلوم ہوتے ہیں اور شمع کی لو کمزوری سے ... کانپ رہی ہے۔ میں سوچنے لگا ہوں۔ تب اندر میں میرا ذہن بھٹک گیا ہے اس کی منزل کون سی ہے ... اسی عالم میں میں نے پھر ڈائری کا ورق الٹ دیا ہے ——

وقت کے قدم آگے بڑھتے رہے۔ صبحیں اور شامیں کروٹیں لیتی رہیں ... ایک رات آئی تو اتنی بھیانک تھی کہ میں اس کے تاریک آنچل سے جھانکتی ہوئی تنہائیاں دیکھ کر چیخ اٹھی ... میری امیدوں کی زنجیر کی کڑیاں بکھر چکی تھیں۔ سب رسمیں ادا کی جا چکی تھیں۔ میں اس پیار کے لئے ترس رہی تھی جس نے میرا اور میرے دل کا ساتھ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا ——

اچانک اس مہیب تاریکی میں میری جانب کسی کا ہاتھ بڑھا۔ میں نے جلتے ہوئے دل کی روشنی میں دیکھا ڈاکٹر مجھے سہارا دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کا کنول سا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ میں بے اختیار اس کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا اس کے سینے میں محبت کی گرمی تھی۔ اس کی بانہوں میں اپنائیت کا لمس تھا۔

پھر وہ مجھ سے کہنے لگا: "زینی! تم اکیلی نہیں ہو۔ آؤ میرے ساتھ"

"کہاں؟" میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میرے گھر!"

"لیکن میں اس گھر کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں جس میں میری ماں کی محبت بے قرار ہے۔ میری ماں کی یادیں زندہ ہیں۔ مجھے اس گھر کی ہر اینٹ سے، ہر دیوار سے اپنی ماں کی طرح پیار ہے۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی۔ میں یہیں، یہیں دم توڑ دوں گی!"

"جذباتی نہ بنو زینی! اس دنیا میں سب کچھ خرید لیا جاتا ہے۔ یہ گھر تمھارا نہیں ہے۔ تمھاری امی نے ... سے ... گروی ... رکھ دیا تھا۔"

... بات کا ... میرے پاس ... کوئی جواب نہ تھا۔ ان دنوں کو یاد کر کے آنسو بہتی

جب امی نے مجھے یہ بھی محسوس نہ ہونے دیا تھا کہ وہ کٹھن سفر پر چل رہی ہیں اور میرے لئے صعوبتوں کے پہاڑوں سے ٹکرا رہی ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر نے میرے زخمی دل پر ایسا مرہم رکھا کہ ہر غم کا احساس مٹتا گیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہے۔ ڈاکٹر شکیل کی شخصیت ایک کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے تھی۔ جیسا کہ امی نے کہا تھا اسی طرح میں اسے فرشتہ نہ سہی لیکن فرشتہ خصلت انسان ضرور سمجھنے لگی۔ اس کی ہر بات میں شہد کی سی مٹھاس ہوتی لیکن جب میں اس کی زندگی کے لئے سوچتی تو عجیب سی خلش دل میں جاگ اٹھتی کہ وہ بھی زندگی کے سفر میں تنہا ہے۔ شاید پہلے بھی کوئی ہمسفر ساتھ نہ رہا تھا۔ اگر تھا تو منزل کے لئے قدم اٹھانے سے پہلے ہی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ یونہی اس کی راتیں تنہائیوں کے سوگوار لمحات کے ساتھ گزرتیں۔ اور دن ہوسپٹل کے متعفن ماحول میں۔

جس دن سے میں ڈاکٹر شکیل کے قریب آئی تھی میں نے بہت کم اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر کبھی مسکراہٹ لبوں تک آئی بھی تو صرف مجھے دکھانے کے لئے، سمجھانے اور بہلانے کے لئے۔ لیکن ان مسکراہٹوں کے پس پردہ ایک خلش بھی محسوس کرتی جسے وہ دل کے نہاں خانوں میں دفن کئے ہوئے تھا۔ میں نے تنہائیوں میں اسے دیر تک جاگتے دیکھا تھا۔ اس لئے اکثر سو رہنے کی تاکید بھی کرتی لیکن وہ صرف یہی کہہ کر ٹال دیتا۔

"زینی! ڈاکٹر کی زندگی بہت مصروف ہوتی ہے۔ تمھیں اس بارے میں سوچتے رہنے کی ضرورت نہیں۔"

---

ایک رات میں خوابوں کی حسین وادی میں کھوئی ہوئی تھی۔ اچانک کسی کی آہٹ نے مجھے بیدار کر دیا۔ پھر ایسا ہوا کوئی میرے قریب تھا۔ میں سہم گئی۔ پھر کوئی میرے قریب جھکنے لگا۔ اس کے بعد میں نے اپنے رخسار پر ایک ہاتھ کی گرمی محسوس کی۔ پھر پیشانی پر ہونٹوں کی جلن کا احساس ہوا اور دل دھڑکنے لگا۔ میں سمجھ گئی، یہ ڈاکٹر شکیل ہے کیونکہ اس کی سانسوں کی خوشبو میرے دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ پھر وہ انھیں دبے قدموں سے چلا گیا۔ میرا دل دھڑکتا رہا اور سوچنے لگی۔ اس بیقراری میں کون سا جذبہ پنہاں ہو سکتا ہے۔ رات گزر گئی۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

صبح ہوئی تو میں نے دیکھا ڈاکٹر کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ یہ حالت دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"آپ کی آنکھیں ...؟"

"ہاں ایک ضروری کتاب کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے جاگنا پڑا۔" اس نے آنکھیں چراتے ہوئے جواب دیا اور میں خاموش ہو گئی۔

ایک دن اس نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ میری آنکھیں شرم و حیا کی

# اپنے خاندان کے بارے میں
# جتنا زیادہ خیال کرینگے
# اُتنا ہی بیمۂ زندگی کی
# ضرورت محسوس کرینگے







## اپنی بیگم کا خیال کیجئے

وہ آپ کی اور بچّوں کی دیکھ بھال اس محبت سے کرتی ہیں کہ اس کا نعم البدل ممکن نہیں۔ بیشک جب تک آپ زندہ رہیں گے ان کا خیال رکھیں گے۔ لیکن زندگی کا کیا بھروسہ صرف بیمۂ زندگی ہی سے اس بات کی ضمانت ملتی ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں گی انہیں آمدنی ملتی رہیگی جس سے ان کی ضروریات پوری ہو جائیں گی۔

## اپنے لڑکے کا خیال کیجئے

اب تو لڑکپن کے بے فکر دن ہیں مگر بہت جلد وہ تیزی سے عمر کی منزلیں طے کریگا۔ آپ یہی چاہتے ہیں تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور زندگی کا آغاز اچھے پیمانہ پر کرے۔ بیمۂ زندگی کے اس کی ضرورتیں پوری کیجئے۔ ایک طرح کی مالی ضمانت ہے۔ بڑھتی ہوئی عمر کے لئے بیمۂ زندگی سے ضمانت ملتی ہے کافی رقم کی۔

## اپنی لڑکی کا خیال کیجئے

آپ کو یہ احساس بھی نہ ہوگا کہ آپ کی لڑکی اتنی جلد کیسے بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو کئی باتوں کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے جیسے اس کی تعلیم، پڑھائی، شادی، شاید نوکری۔ ایک باپ کے ناطے آپ اس کا مستقبل محفوظ بنانا چاہتے ہیں تو بیمہ کرائیے۔

**لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا**

[illegible] کی اُنہوں نے
[illegible] سوچ کر آئی تھی کہ دل
[illegible] کیونکہ ان کی بات نہیں ہو سکا
[illegible]

[illegible] ہو گئی تھی اور خیالات میں
[illegible] ہو سکتا تھا۔ شکیل کے
[illegible] رہا تھا اور کسی کتاب کا
[illegible] کتاب چھین کر پھینک دوں
[illegible] کروں جو اُس کے مسلسل جاگتے رہنے
[illegible] ایک پیاسے انسان کی طرح اپنی جگہ پڑی
رہی۔ [illegible] معلوم ہوا شکیل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔
میری سانسیں [illegible] شکیل میرے کمرے میں تھا اُس نے پھر گزشتہ
رات کی طرح [illegible] میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور چوم لیا۔
کچھ دیر [illegible] اُس رات مجھے یقین ہو گیا کہ شکیل کی روح تشنہ
چاہت [illegible] شدت سے تڑپتی ہے جو اُس کی تشنہ روح کی پیاس
بجھا دے [illegible] ہر اُس انسان کے پاس ہوتا ہے جس کے سینے میں درد آشنا
دل ہو۔ [illegible] کی بات زبان پر کبھی نہیں لاتا۔ چوروں کی طرح چاہت کی پیاس
کیوں بجھاتے ہو [illegible] ۔۔۔۔۔ میں اُس دن کا شدت سے انتظار کرنے لگی جب وہ اپنی زبان سے
کہے اور میں اپنی پیشانی اُس کے پیروں پر جھکا دوں۔

ایک دن حسبِ معمول میں ناشتے کے کمرے میں گئی تو اُس نے مجھے پھر اِس طرح
دیکھا کہ میرے جسم میں برق لہر سی کوند گئی۔ دل دھڑکنے لگا۔ بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا۔ ناشتہ
ٹیبل پر سجایا اور سامنے بیٹھ گئی۔ پلکیں خود بخود جھک گئیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے مجھ سے
کوئی بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ چند لمحے یوں ہی خاموش گزر گئے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" اس نے مجھے ٹوکا۔

میں چونک سی گئی۔ اس نے پھر کہا۔ "کچھ اُداس معلوم ہوتی ہو؟"

"نہیں تو۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تو شاید چائے بنانے کے موڈ میں نہیں ہو۔"

میں فوراً چائے بنانے لگی اور شکیل میری نقل و حرکت کا بغور جائزہ لینے لگا۔
ناشتہ [illegible] اٹھی تو اُس نے مجھے روکا۔ میں پھر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ پھر
اُس نے [illegible] کہا۔

"[illegible] ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"جی؟" میں سراپا حیرت بن گئی۔

"شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جواب نہ دے سکی۔

"میں تمہاری رائے ضروری سمجھتا ہوں۔ اِس میں شرمانے کی بات نہیں کیونکہ
یہ تمہاری زندگی کا اہم سوال ہے۔"

جس وقت کا مجھے انتظار تھا وہ آ گیا تھا۔ لیکن میری کیفیت اُس وقت اُس
معصوم ہرنی کی سی ہو گئی جو زخم کھا کر ایک جگہ پڑی شکاری کو پاس سے تک رہی ہو۔ نجانے
کون سی طاقت تھی جس نے میری طاقت جذب کر لی تھی۔

"شاید تمہیں میری بات سے اتفاق نہیں۔ میں تمہیں مجبور کرنا نہیں چاہتا۔"

اب میں آزاد تھی اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد
بمشکل میں نے کہا۔

"مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔"

یہ سن کر ایک لمحے کے لئے اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کوند گئی لیکن جلد ہی ایسا
محسوس ہوا جیسے مسکراہٹ کا وہ پھول کسی نے توڑ لیا ہو۔

"زیبی! آج بہت عرصے بعد خوشی محسوس کر رہا ہوں جس کے پس پردہ ایک غم
بھی ہے اور اُس غم میں وہ کیفیت ہے جس کا اثر دل و دماغ سے کبھی کم نہیں ہو سکتا۔"

"وہ کون سا غم ہو سکتا ہے؟" شکیل کے جانے کے بعد میں نے سوچا اور سوچتی رہی۔
کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی تو اُداس ہو گئی۔ شام ہوئی تو شکیل نے کہا۔

"زیبی! پکچر چلو گی؟" میں چونکی۔ شکیل نے پہلی بار مجھے پکچر میں ساتھ لے جانے کو
کہا تھا۔

رات بھر ان خوابوں کی حسین وادیوں میں گزر گئی۔ میرا جسم پھول کی طرح ہلکا تھا
اور شکیل کا چہرہ صبح کی طرح نکھرا ہوا۔ ناشتے کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب شکیل
جانے لگا تو اُس نے کہا۔ "آج شام کو کچھ ضروری چیزیں بازار سے خرید کر لانی ہیں۔" اُس نے
میرے جواب کا انتظار نہیں کیا اور میری آنکھوں میں چاندی کی سی چمک سونے کی دمک بن گئی۔
کانوں میں پازیب اور چوڑیوں کی جھنکار گونجنے لگی اور جسم ریشمی کپڑوں کی گداز سرسراہٹ
محسوس کرنے لگی۔ یہ سب کچھ ہوا تو دل کی بھی عجیب کیفیت ہو گئی اور آنے والے لمحات سے
شرماتی ہوئی شکیل کے کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحے بعد دروازے پر آہٹ سی ہوئی۔ دل دھڑکا۔
لیکن کوئی نہ تھا۔ صرف شانو تھی میری پیاری بلی جو مجھے بہت پیار سے دیکھ رہی تھی۔ دوسرے
لمحے چھلانگ کر وہ میری آغوش میں آ گئی اور میں نے فرطِ محبت سے اُسے اپنی بانہوں میں بھینچ
لیا اور اس طرح پیار کرنے لگی جیسے کوئی ماں اپنے خوبصورت بچے کو پیار کرتی ہے۔ معاً وہ میری
بانہوں سے نکل کر بھاگ گئی۔ میں شانو! شانو! پکارتی رہ گئی۔ پھر میں نے وقت گزارنے

[illegible]

... کو محبت کا سہارا ... لیا اور میں آج انھیں بہت پیار کرتا ہوں۔

وقت نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ اچانک ثمینہ زندگی کی راہ میں بھٹکتی ہوئی مل گئی ہے۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی چمک ختم ہو چکی ہے۔ غم کی دھوپ نے ... [illegible] ... مجھے یقین نہیں آتا ہے کہ یہ وہی ثمینہ ہے جس کی مسکراہٹوں میں بجلیاں سی کوندا کرتی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

"تمھیں میری یاد کیسے آگئی ثمینہ؟"

"میں تمھیں بھول گئی تھی شکیل! ایسا ہوتا ہی ہے۔ ایک مدت بعد میں نے سنا تم پونچھ میں ہو۔ سوچا دیکھ آؤں۔ ماضی کی یادیں پھر تازہ ہو گئیں۔ ایک دور گزر چکا ہے۔ ایک انقلاب آ چکا ہے۔ میں پھر تنہا ہوں۔ کیپٹن صاحب اِس دُنیا میں نہیں ہیں۔"

ثمینہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا: "تمھاری زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"اچھی ہی ہے!"

"شادی کیوں نہیں کی؟"

"تمھاری یادوں نے دل کا دامن نہیں چھوڑا۔"

ثمینہ خاموش ہو گئی۔ جب میں نے اُس کی زندگی کے آئینے میں جھانکا تو اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آسکا۔ وہ شہرِ خموشاں میں بھٹکتی ہوئی ایک روح معلوم ہوتی ہے۔ میں پھر اُسے چاہنے لگا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کھوئی ہوئی متاعِ حیات مجھے پھر مل گئی ہے۔ ثمینہ ماضی کی یادوں کو میری ہی طرح دل میں دفنائے رہی ہے۔

اُس نے کہا ہے: "شکیل! میں تمھیں کبھی نہیں بھلا سکی ہوں" لیکن وہ اِس دُنیا کا ساتھ چھوڑ دینا چاہتی ہے۔ وہ خار زاروں پر چلتے چلتے تھک گئی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں اُسے سہارا دوں۔ اُس کے زخم گہرے ہو چکے ہیں۔ میں اپنے آنسوؤں سے اُس کے زخموں کو مندمل کر دینا چاہتا ہوں۔ ثمینہ کسی ... کی نہیں رہی ہے۔ وہ اُس کا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ اب اُس کی زندگی کا سہارا ... [illegible] ... میں اُس کی زندگی کا اپنے آپ کو ... لگا رہا ہوں۔

یعسوب مہدی ... [illegible]

[illegible]

... پر وہ ٹالنے کی کوشش کی۔

لیکن میری آنکھوں میں ... [illegible] ... کوشش کی توہین ہو کر ... ٹوٹ گئی۔

"زرینہ! تمھیں ... احساس ہے ... [illegible] ... کبھی کوئی دکھ دے گا ... میں ہر وقت تمھارے قریب رہوں گا ... [illegible] ... زندہ تصویر ہو جسے میں نے ... میری روح نے چاہا ہے۔ ... [illegible] ... کر دو تمھارا ... رفیقِ حیات ثابت ہوگا۔ میں نے اُس کی ... [illegible] ... ہے۔ پھر بھی میں تمھیں مجبور نہ کروں گا۔"

اتنا کہہ کر شکیل خاموش ہو گیا اور میں ... [illegible] ... آنکھوں سے ... اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لیں ... [illegible] ... نے سر اُٹھایا تھا ... دل میں ... [illegible] ... کا ایک طوفان سا اُٹھ رہا تھا۔

پھر اس ... [illegible] ... شکیل ... [illegible]

[illegible] دیکھتی ہوئی

[illegible] تاجدار

[illegible] ملیے

[illegible] زیبی کی

[illegible] میں

[illegible] کرپ کو اس [illegible] ایک ایک میں پھر چونک گیا

[illegible] سامنے ایک [illegible]

• [illegible] نہیں رہ سکتیں ہو جانی پہچانی آواز نے مجھے

[illegible] مجبور ہے۔

• زیبی [illegible] کی کوشش کی ہے اور

[illegible]

• [illegible] زیبی نے

[illegible] کرہ گئی ہے۔

دوسرے دن میں دیر سے بیدار ہوا ہوں [illegible] زیبی سوئی ہوئی ہے الٹے کے

پھٹے ہوئے اوراق کمرے میں ادھر اُدھر منتشر پڑے ہیں ـــــ میں نے زیبی کو بیدار کرنے

کی کوشش کی ہے۔ پھر میری عجیب کیفیت ہو گئی ہے۔ آواز بھرا گئی ہے، دل ڈوب گیا ہے

میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ لیکن زیبی! ـــــ وہ ایسی گہری نیند سو رہی ہے کہ اب میں اُسے

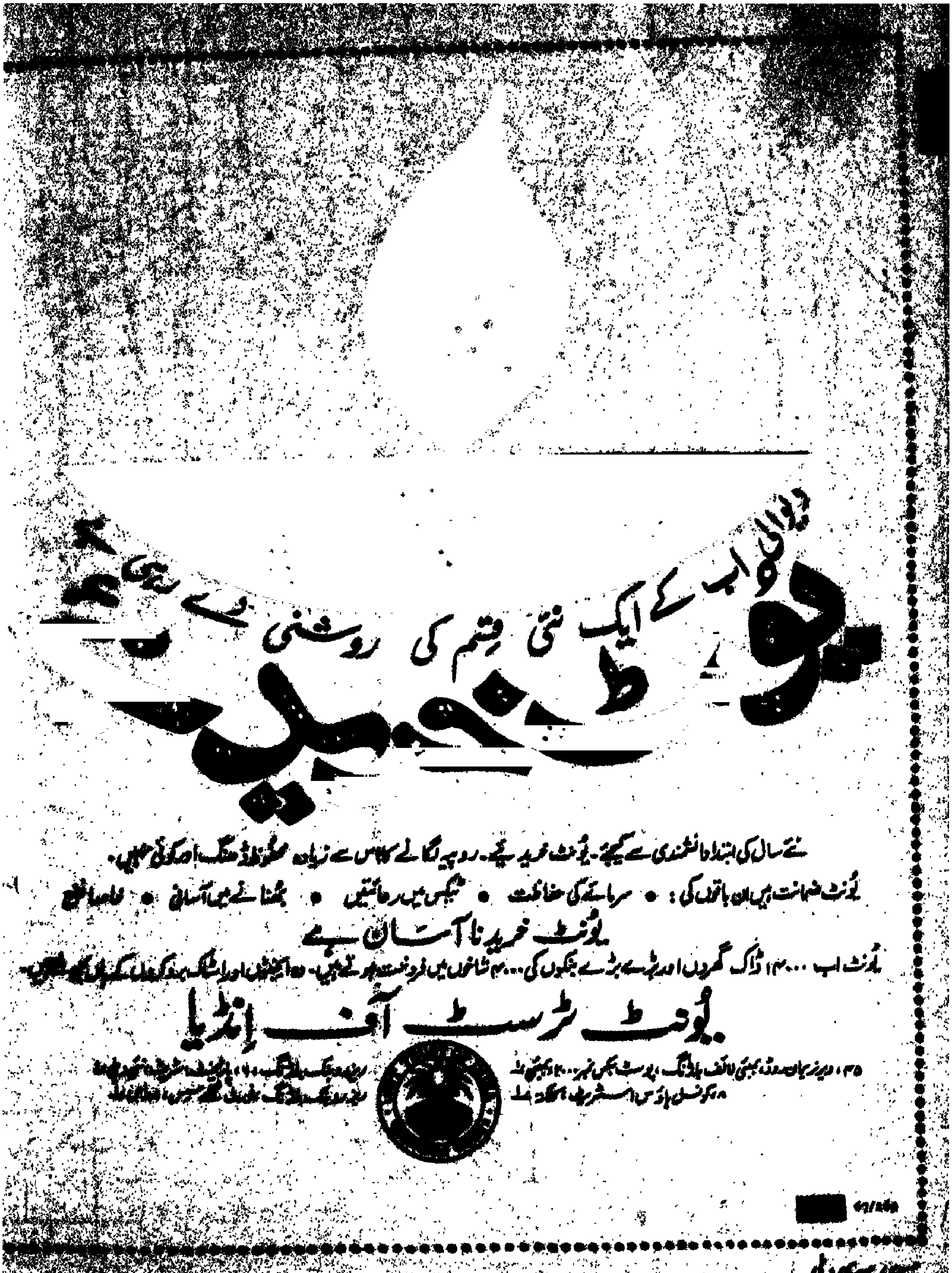
کبھی بیدار نہیں کر سکتا!!

**تحفۂ سرمد** شہید سرمد کی فارسی رباعیوں کا ترجمہ اُردو رباعیوں میں۔ از عرش ملسیانی۔ سرمد کے سوانح بھی کتاب میں درج ہیں۔ پہلے اصل رباعی ہے اس کے نیچے اُردو ترجمہ۔ اُردو اور فارسی ادب اور تصوف کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نادر تحفہ۔ قیمت پانچ روپے

## مُفت حاصل کیجئے

**صحت اور جوانی** صحت و جوانی اور حُسن و شباب کے وہ رموز جنھیں جاننا آپ کے لئے نہایت ضروری اور مُفید ہے، اس کتاب میں عام فہم زبان میں تفصیل کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ ایسے ایسے راز بیان کئے گئے ہیں جنھیں جاننے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ آپ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ کتاب اشتہارات سے پاک ہے محض بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لئے مُفت تقسیم کی جا رہی ہے۔ آپ بھی خط لکھ کر بلا قیمت منگوا سکتے ہیں۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶


دیوالی اب کے ایک نئی قسم کی روشنی دے رہی ہے
نئے سال کی ابتدا دانشمندی سے کیجیے۔ یونٹ خریدیے۔ روپیہ لگانے کا اس سے زیادہ محفوظ ڈھنگ اور کوئی نہیں۔
یونٹ ضمانت ہیں ان باتوں کی: • سرمایہ کی حفاظت • ٹیکس میں رعائتیں • بھنانے میں آسانی •
یونٹ خریدنا آسان ہے
یونٹ اب ۱۴۰۰۰ ڈاک گھروں اور بڑے بڑے بنکوں کی ۲۰۰۰ شاخوں میں فروخت ہوتے ہیں۔
یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا




زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

## ۱۔ مکئی [illegible]

ایک غذا ہے جو شیرینی دار مفید دانوں کا خوشہ ہے۔ اسے مکا اور جوار بھی کہتے ہیں۔ مکئی کو کوئلوں پر بھون کر کھاتے ہیں۔ بہت سے مکئی کے آٹے سے روٹی پکا کر کھاتے ہیں۔ یہ بہت ہی مفید اور طاقت بخش غذا ہے۔ اس کا مزاج سرد خشک ہے۔ مکئی خون اور گوشت پیدا کرتی ہے۔ اس میں روغنی اجزا بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ بالعموم چکنائی سے دل کے امراض لاحق ہوتے ہیں۔ لیکن مکئی کی چکنائی دل کے لئے مضر نہیں ہے۔ جدید طبی تحقیق سے اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ مکئی دل کے لئے مفید ہے۔ مکئی کھانے والے دل کے امراض میں ہرگز مبتلا نہیں ہوتے۔ اسی لئے یورپ میں اس کا بہت استعمال ہے۔ صبح ناشتے میں اسے دودھ میں ملا کر کھاتے ہیں۔

مکئی غذائی اجزا سے بھرپور ہے۔ لحمی مواد اور نشاستہ دار اجزا کے علاوہ فولاد، چونا اور فاسفورس بھی اس میں بہت ہے۔ مکئی میں وافر مقدار میں وٹامنز بھی موجود ہیں۔ ایک چھٹانک مکئی میں چھیالیس غذائی حرارے قوت ہوتی ہے۔ قدیم تحقیق سے یہ حقیقت واضح ہے کہ مکئی کے تیل کے عام فوائد روغن زیتون سے ملتے جلتے ہیں۔

مکئی کا آٹا قابض اثرات کا حامل ہے۔ بھوک میں اضافہ کرتی ہے۔ بدن کو طاقت بخش کر فربہ کرتی ہے۔ آنکھوں کی کمزوری کو دور کرتی ہے۔ مکئی کا تازہ بھٹا بھون کر کھانا معدے کو طاقت دیتا ہے اور نیا خون پیدا کرتا ہے۔ مکئی کو کوئلوں پر بھون کر کھائیں تو بعض اشخاص میں قبض کا باعث ہے۔ یہ غذائیت کے اعتبار سے دوسرے اناجوں سے کم نہیں ہے۔ طاقت بڑھاتی اور چھوٹے بڑے جسم کو اعتدال پر لاتی ہے۔

مکئی صفرا اور فساد خون کو دور کرتی ہے۔ قدرے قابض، خشک ——— اور [illegible] مکئی کی روٹی گھی ملا کر کھانے سے خشکی نہیں پیدا کرتی۔ بعض محققین کی رائے ہیں چونکہ اس میں چکنائی وافر مقدار میں ہے، اس لئے مکئی کھانے والوں کو گھی یا مکھن کم مقدار میں کھانا چاہئے۔

یونانی اطباء تپ دق جیسے موذی مرض میں اسے نافع گردانتے ہیں۔

## ۲• تندرستی پر آپ کا پیدائشی حق ہے

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ صحت ہی زندگی ہے ——— لیکن بہت کم لوگ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کس طرح تندرست رہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— اگر آپ تندرست رہنا چاہتے ہیں تو ہمیشہ خود کو بالکل تندرست و توانا اور طاقت ور سمجھئے۔ بیماری کا خیال بھی دل میں نہ لایئے۔ ہمیشہ تندرست اور توانا جسم کی تمنا کیجئے ——— یہ صحت مند خیال ہی آپ کے جسم کو تندرست بنائے گا۔

فکر نہیں آپ کا جسم صحت مند خیالات اور اس اعتماد کے مطابق نہیں، اپنے خیالات پر قائم رہئے۔ تندرستی کا یقین دل سے کبھی دور نہ ہونے دیجئے۔ رفتہ رفتہ آپ کے یقین و اعتماد کا اثر آپ کے جسم پر ہوگا اور سارے دکھ درد اور کمزوریاں رفع ہو کر ایک تندرست اور توانا شخصیت ابھر آئے گی۔

صحت ہی واحد دائمی صداقت ہے۔ بیماری یا خراب صحت عارضی اور باطل ہے ——— یہ یقین ہی سب سے بڑا علاج، سب سے بڑا مداوا ہے۔ ہر معالج کی کامیابی کا راز بھی اسی خیال کو اہمیت دینے میں ہے کہ تندرستی ہی انسان کا پیدائشی حق ہے۔

[illegible]

ایک دوسرے دانشور نے لکھا ہے ـــــ [illegible] ہمیشہ بے حوصلہ لوگوں کے پاس بیٹھنا بھی چھوڑ دو۔ ورنہ تم بھی ان سے [illegible] ہو کر رہ جاؤ گے ـــــ کلیوں کو شگفتہ دیکھ کر پھول بھی کھل جاتے ہیں۔

## ۴۔ خوش رہنا سیکھئے

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ ہر حال میں خوش رہنا، تسلیم و رضا کا فن ایسا ہے کہ اسے اگر بخوبی سمجھ کر اس پر عمل بھی کیا جائے تو دنیا میں ایک انقلاب آ جائے۔ دنیا کا نقشہ بدل جائے۔ کچھ ہی دنوں کے لئے کوشش کر کے دیکھو، ہر چیز اور ہر واقعے کا روشن رخ اور چمکتا ہوا پہلو دیکھا کرو۔ تمہاری دنیا ہی بدل جائے گی۔ تمہاری زندگی میں انقلاب رونما ہوگا۔ بہت سے [illegible] لوگ تمہاری طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ تمہاری صورت دیکھ کر لوگوں میں سرگرمی اور جوش عمل پیدا ہوگا۔ اگر پہلے تمہاری شکل سے ان کے دلوں میں سرد مہری پیدا ہوتی تھی اور چہروں پر مردنی چھا جاتی تھی۔ سورج کی تیز تر زندگی بخش اور نور افشاں شعاع کی طاقت کے ساتھ [illegible] کی مردنی اور تاریکی کا مقابلہ کرو۔ آفتاب کی شعاعوں میں دنیا بھر کی زندگی اور طاقت بھری پڑی ہے، لیکن اس کے مقابلے میں تاریکی میں زندگی کا نام و نشان نہیں۔ آس اور امید کا پتہ نہیں۔ جن لوگوں کے چہرے ہمیشہ خوشی سے دمکتے رہتے ہیں، ہم ان کے کتنے مشتاق ہوتے ہیں۔

## ۵۔ اپنی قوتوں کو ضائع نہ کیجئے

[illegible]

[illegible] ہلاک کر دیتے ہیں۔

اپنی طاقتوں کو [illegible] بچئے جن سے آپ کی طاقت ضائع ہوتی ہے۔ [illegible] کبھی غلطی [illegible] اپنا قیمتی [illegible] کیجئے۔ اس طرح آپ کی قوت [illegible] زندگی کے ہر موڑ پر، زندگی کی ہر منزل میں [illegible] اپنی طاقت کی حفاظت کیجئے۔

## ۶۔ صحت کا راز

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ صحت کی بنیاد [illegible] جسم میں [illegible]

[illegible]

[illegible] کا خیال [illegible] قائم رہیں گے [illegible] صحت اور صحت مندی کا [illegible]

[illegible] رہتا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔
لیکن انسان [illegible] ادیب و مفکر ہیں۔ یو۔ تانگ نے خاص
انداز [illegible] اس نے لکھا ہے۔
[illegible] دوسرے بندر کو کھایا ہو لیکن میں جانتا ہوں
انسان [illegible] جلوت دیتی ہے کہ دنیا میں ہر جگہ

[illegible] ایک پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ ہم اب بھی کسی لحاظ اور کسی پہلو سے ایک دوسرے کو کھاتے ہیں۔ مثلاً انفرادی طور پر، معاشرتی طور پر، بین الاقوامی طور پر ایک دوسرے کو نوچ کر ہڑپ کر جانا چاہتے ہیں۔ اس اعتبار سے تو آدم خور ہم سے بہتر ہیں کیونکہ وہ عمداً دوسرے کو قتل کرتے ہیں کہ اُسے کھا سکیں اور پھر وہ مرے ہوئے دشمن کے مردہ حصوں کا گوشت، کلیجی، گردے کھا کر بچا حاصل کرتے ہیں۔ لیکن مہذب انسانوں ز تہذیب و انسانیت کے دعوے دار انسانوں کا حال عجیب ہے۔ آدم خوروں اور مہذب انسانوں میں فرق یہ ہے کہ آدم خور اپنے دشمن کو مار کر کھا جاتے ہیں۔ لیکن تہذیب و انسانیت کا دعوے دار انسان اپنے دشمن کو مار کر اسے دفن کر دیتا ہے۔ اس کی قبر پر ایک کتبہ لگاتا ہے اور اس کی نجات کے لئے دعا بھی کرتا ہے۔ گویا ہم نفسانی خود پسندی اور بدمزاجی میں حماقت کا اضافہ بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ خود پسندی اور بدمزاجی کی وجہ سے ہم اپنے جیسے انسان کو جان سے مارتے ہیں۔ اسے مار کر اس کی زندگی چھین کر، پھر اس کے لئے اظہار تاسف کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

# سرگوشیاں

## سوال و جواب

[illegible]

خلیل احمد سیال روہتگی۔ سلی گڑی۔ دارجلنگ

س۔ مجھ سے ایک دن ڈاکٹر نے بنجو بنگالی میں کہی ہوئی۔ پھر پیسہ لینے سے انکار؟

ج۔ مجھ سے بھی ایک دن ڈاکٹر نے بنگالی میں کہی تھی۔ لیکن یہ تو فائدہ ہوگا لوگ فاقہ کرنے کے عادی ہو جائیں گے جو اب سب کا مقدر بنتا جا رہا ہے!

س۔ اگر افسانہ زندگی کی ایک قاش ہے تو ناول؟

ج۔ زندگی کا ایک ٹکڑا ہے۔

---

حسن تبسم۔ بی۔ اے۔ لکھنؤ

س۔ آپ کی سیاسی بصیرت بڑے بڑوں سے زیادہ ہے۔ بتایئے کانگریس کی ناکامی کی وجہ کانگریس کی مخالف پارٹیوں کی عوام میں مقبولیت ہے یا کانگریس والوں کا باہمی نفاق؟

ج۔ کانگریس والوں کا باہمی نفاق ع
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

س۔ کیا جن سنگھ کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ فرقہ پرست نہیں ہیں؟

ج۔ یہ کہنا حقائق کو جھٹلانا ہے۔

---

سیف الہ آبادی۔ رشرا، ہگلی

س۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟

ج۔ اپنے کو کمزور سمجھنا!

س۔ مرد کی سب سے بڑی طاقت کیا ہے؟

ج۔ عورت!

س۔ اکبر الہ آبادی کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ قوم کے غم میں وہ مے پیتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

---

خورشید گیلانی۔ کریم گنج۔ گیا

س۔ فراق گورکھپوری کے اس نظریے سے آپ کہاں تک متفق ہیں کہ اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے۔ اس سوال کا جواب ضرور دیجئے کیونکہ کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ اس نظریے سے آپ بھی متفق ہیں۔

ج۔ ہم اس نظریے سے ہرگز متفق نہیں۔ رسم الخط بدلنے [illegible] ان کا

[illegible]

---

[illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

س۔ اور آپ [illegible] کون تھا؟

ج۔ جبلپور۔

س۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے [illegible] خیال ہے؟

ج۔ [illegible]

---

[illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

بیدین حسن دہلی

[illegible]

س۔ اپنا اردو میں کتنا [illegible] ہے؟

ج۔ [illegible] تم کا [illegible]
[illegible] اور ادب میں منزل بہت

---

## [illegible] علی ساکن۔ جھری تلیا

س۔ آپ [illegible] کو [illegible]
سمجھتے ہیں کیا حکومت آپ سے باز پرس
نہیں کرتی؟

ج۔ کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن سچی بات کہنے والے کب
[illegible] ہیں
[illegible] سے اے دوست!
[illegible] وہ خوش کیا ہوں گے
[illegible] پہ خاموش!

س۔ [illegible] آزادی کے بعد کن کن چیزوں میں
[illegible]

ج۔ [illegible]
[illegible] اقربا نوازی، رشوت ستانی
[illegible] ہیں۔

---

[illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

[illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ سلسلہ [illegible] کوئی مذہب [illegible]
کی تعلیم نہیں دیتا [illegible] نہیں کرتا۔

---

## عبدالحمید خان۔ برہان پور

س۔ خوش [illegible] اپنا سال کیا پیغام دیتا ہے؟

ج۔ گزشتہ ناکامیوں کو بھول جانا چاہئے نئے
جوش و ولولے سے کامیابی حاصل کرنے کے لئے
سرگرم عمل ہو جانا چاہئے!

س۔ تنقید کیسا فن ہے؟

ج۔ فن کے حسن و قبح کو پرکھنے کے فن کو تنقید
کہتے ہیں۔

---

## محمد مظہر الدین آواز۔ حیدرآباد دکن

س۔ ان تینوں میں سب سے زیادہ [illegible] کون ہوتا ہے
لیڈر، ڈاکٹر، وکیل؟

ج۔ [illegible] ہوتے ہیں۔ لیڈر [illegible] ہے جو
[illegible]

---

[illegible] کوئی نہیں ہوتا۔

س۔ علامہ اقبال کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ باغباں چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تک

---

## احمد صابر۔ اورنگ آباد۔ گیا

س۔ بھائی صاحب! سب سے اچھا ذریعہ معاش
کیا ہے؟

ج۔ لیڈری!

س۔ ملک کا مستقبل؟

ج۔ حال سے بھی تاریک ہے!

---

## مس شہلا ناز۔ پٹنہ

س۔ [illegible] ہاتھوں سے چھوٹ جائے تو؟

ج۔ [illegible]

س۔ [illegible]...؟

ج۔ [illegible] قوم کی [illegible] کرلے
([illegible])

س۔ [illegible] ساتھ چھوٹ جائے تو؟

ج۔ [illegible] ساتھ چھوڑ دیں۔

---

## ایس۔ ایم۔ علی۔ نظام آباد

س۔ [illegible] مہدی علی [illegible]؟

ج۔ عزیز بھائی۔

س۔ قاتل، عاشق، عادل [illegible]
قابلِ [illegible]؟

ج۔ قاتل و عادل [illegible] سب سے [illegible]۔

س۔ [illegible]
ہے؟

ج۔ [illegible] کا دامن پکڑ کر۔

---

[illegible]

---

## [illegible] حیدرآباد

س۔ [illegible] سیاست میں کیا فرق ہے؟

ج۔ بہت گہرا رشتہ ہے۔

س۔ [illegible] ہمیشہ [illegible] باتیں کرتا ہے یہ عادت کس طرح چھوٹ سکتی ہے؟

ج۔ حوصلہ افزا باتیں سنئے، حوصلہ افزا تحریریں اور بلند حوصلہ انسانوں کے حالات زندگی پڑھئے۔

س۔ کوئی ایسا شعر سنائیے جس میں بہار و خزاں کا لطف ہو۔

ج۔ خزاں میں بھی کوئی تیرگی نہ بہار میں کوئی روشنی یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں جل گئے کہیں بجھ گئے

---

## مظفر حسین۔ آسنسول

س۔ پیٹ کی آگ نہ ہوتی تو لوگوں کی زندگی کیسی ہوتی؟

ج۔ پیٹ کی آگ بجھانے کی فکر نہ ہوتی تو یہ شرپسند انسان برائیوں کی اتنی آگ بھڑکاتا کہ زندگی جل کر راکھ ہو جاتی۔

س۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ آپ سے اور مجھ سے لڑائی ہو گئی ہے اور آپ نے میری [illegible] کر دی ہے۔ کیا آپ میرے اس خواب کی تعبیر بتا سکتے ہیں؟

ج۔ [illegible] خواب کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔

---

[illegible]

ج۔ [illegible]

ج۔ [illegible] کر چکے ہیں!

---

## محمد ابراہیم [illegible]۔ الٰہ آباد

س۔ جو شخص ہر معاملہ میں [illegible] وہ کیسا ہوتا ہے؟

ج۔ وہ بہت غیر ذمہ دار انسان ہوگا۔

---

## نیاز وارثی۔ مراد آباد

س۔ بھائی جان! کوئی حیات افروز شعر سنائیے۔

ج۔ جنوں [illegible] زمیں بھی وہ آسماں بھی ہمارے [illegible] ماہ و انجم بھی کہکشاں بھی

---

## محمد [illegible]۔ سمبوم

س۔ ایک شعر اس طرح ہے ؎

چند کلیوں کے ہار لایا ہوں

بلکہ کچھ بہار لایا ہوں

دوسرا شعر جسے دوسرے شاعر نے لکھا ہے۔ وہ اس طرح ہے ؎

چند کلیوں کے ہار لایا ہوں، بلکہ کچھ بہار لایا ہوں

[illegible] لایا ہوں

[illegible] دونوں شعر [illegible] پہلا شعر دوسرے شعر کا [illegible] ہے؟

ج۔ [illegible]

---

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ملک بھارت کا بہت ذکر ہے بہار جائے

... ہم کس بری نگاہوں میں الجھائے

س۔ ... اور محبوب کے ... میں کیا

فرق ہے؟

ج۔ کچھ زیادہ نہیں۔

---

ایم۔ تنویر نہپالی

س۔ ویت نام کی جنگ کا انجام کیا ہوگا؟

ج۔ جنگ کا جو انجام ہوتا ہے ——— تباہی و بربادی!

س۔ اچھی اور پائیدار جمہوریت کی پہچان کیا ہے؟

ج۔ تعمیر کے نام پر عام انتخابات میں منظرِ عام پر آنے والی عوام کی تخریبی کارروائیاں اور کارنامے ——— اپنے ملک کی وزیراعظم خاتون پر پتھر اچھالنے سے بھی گریز نہ کرنا۔

---

رضیہ جمیل۔ علیگڑھ

س۔ بھائی جان! ایک خوبصورت قطعہ سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

ایک معصوم سی اُداسی کی
اِس طرح کھینچی ہے تصویروں کو
کھوکھلے قہقہوں کے جھرمٹ میں
جیسے اک پر خلوص آنسو ہو

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں اس ملک میں کتنی خواتین نے حصہ لیا؟

ج۔ ... کوئی بھی دو درجن۔

س۔ کیا کوئی ایسا ملک بھی ہے جہاں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہ ہو؟

ج۔ ایک نہیں، متحدہ عرب امارات جیسے ممالک ہیں جہاں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں ہے۔ سوئٹزرلینڈ، یمن، کویت، سعودی عرب، کویت، نائجیریا، لیسوتھو میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں۔

---

شاہدہ تبسم۔ بسرا (اڑیسہ)

س۔ اگر اُردو نہ ہوتی!

ج۔ تو دنیا ایک دلکش و دلنواز، ایک جامع و سحر طراز زبان سے محروم رہتی۔

س۔ اس شعر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

ج۔ اُستاد داغؔ نے بالکل بجا فرمایا ہے۔

---

صدر عالم عراقی کشن گنج (پورنیہ)

س۔ سُنا ہے ہندوستان کی زمین کبھی سونا اُگلتی تھی، اب اس زمانے میں کیا اُگل رہی ہے؟

ج۔ بھارت کی زمین تو اب بھی سونا اُگل رہی ہے لیکن وہ غریبوں کو ملنے کے بجائے امیروں کی تجوریوں میں چلا جاتا ہے۔

---

ایم۔ اے۔ رانا سوجڑو۔ مظفر نگر

س۔ خوشتر بھیا! میں اپنی شادی ابھی دو سال نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن والدین بضد ہیں۔ میں کیا کروں؟

ج۔ اگر آپ کا عذر بہت اہم نہ ہو تو آپ کو والدین کی خوشنودی کا پاس ... چاہئے۔

س۔ شادی خوشی ہے یا غم؟

ج۔ خوشی ہے کچھ لوگ غم ... بنا دیتے ہیں۔

س۔ اس شعر کو مکمل کیجئے گا ع

کرتا نہیں گنہ تو گناہ عظیم تھا

ج۔ حضرت گنے کے طور پہ کہتے ہیں تیرو ع

کرتا نہیں گنہ تو گناہ عظیم تھا

---

رضی الدین گورکھپور

س۔ داغؔ دہلوی کس کے شاگرد تھے؟

ج۔ ذوقؔ کے۔

---

عتیق صدیقی حیدرآباد

س۔ ایک جرنلسٹ میں کیا خصوصیت پائی جاتی ہے؟

ج۔ وہ محنت اور مشق کے بغیر ادب کے آسمان پر چمکنا چاہتا ہے، سپہر ادب کا درخشاں ستارہ بننا چاہتا ہے ——— وہ اپنا پہلا ہی قدم اوج ثریا پر رکھنا چاہتا ہے!

س۔ قوسِ قزح صحیح ہے یا قوس قزح؟

ج۔ قوس قزح۔

---

اختر حسین۔ علی گڑھ

س۔ ایک حوصلہ افزا شعر سنائیے۔

ج۔ سُنئے ؎

ہم سے اُلجھ کے رہ گیا موجِ تلاطم آخرش
اپنا تو ایک کھیل ہے ڈوب گئے اُبھر گئے

س۔ مجید لاہوری کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ اُن میں راشی بھی ہے سمگلر بھی ہیں کالے چور بھی
لیڈری فرما رہے ہیں کیسے کیسے خوش خصال گدھے!

---

س۔ ... غالب سے ... بہت ... اشعار میں ... مطالب ... ہیں۔ اب آپ ہی
... حقیقت کیا ہے؟

ج۔ ... استاد غزل ہیں۔ غالب ہمارے محسن ہیں

....

س۔ سب سے اچھا مذہب؟

ج۔ ... مذہب انسانیت۔

س۔ جیبیں ہمدرد کی قیمت بڑھ جانے سے رسالہ حاصل کرنے میں دشواری ہے۔ کوئی آسان طریقہ بتائیں۔

ج۔ آپ سالانہ قیمت چودہ روپے دو خاص نمبر (بذریعہ منی آرڈر) بھیج دیں یا رسالہ بذریعہ وی پی بھیجنے کی ہدایت دیں۔ ہر ماہ نہایت آسانی سے جیبیں ہمدرد ملا کرے گا۔

---

**اقبال احمد ببوت بنگلہ**

س۔ ... بھیا! ہمارے سوالات بھیجنے کی تاریخ کیا ہے؟

ج۔ آپ جب بھی چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ کوئی خاص تاریخ متعین نہیں ہے۔

س۔ ... ہندوستان کو ... سے ... کون ...

---

ج۔ ... فرصت ... آپ ...

---

**اصغر شاکر ... ولسن ...**

س۔ صاف گوئی کیوں کامیاب نہیں ہوتی؟

ج۔ صاف گوئی بھی ناکام نہیں ہوتی ہے اور بات ہے کہ سمجھنے والے کامیابی کو ناکامی سمجھیں۔

س۔ قلم، زبان اور تلوار؟

ج۔ قلم میں زبان اور تلوار سے زیادہ طاقت ہے۔

س۔ تبسم، مسکراہٹ اور ہنسی؟

ج۔ گریہ انجام تبسم ہے جو ہنس لے غافل خون روئیں گے وہی زخم جو خنداں ہوں گے

---

**شمشاد علی خاں بی اے آنرز ... پریمپور**

س۔ اب تک جیبیں ہمدرد کے لیے کئی غزلیں بھیج چکا ہوں۔ لیکن افسوس کہ ایک غزل بھی شائع نہ ہوئی۔ کیوں؟

ج۔ غزلیں جیبیں ہمدرد کے معیار کی ہوں گی تو یقیناً قریب اشاعت ہوں گی۔

س۔ ... رسالے ... ختم ... ہے؟

ج۔ ...

# ڈکشنریاں، صنعت و حرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

## کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

- [illegible] کشیدہ کاری — [illegible] — چار روپے
- رنگین کشیدہ کاری — زینت کوثر — پانچ روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — چار روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — [illegible] — [illegible]
- دلہن — زینب انور — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- تنظیم — زینب انور — ایک روپیہ
- [illegible] — ایک روپیہ
- کامیاب [illegible] — زینب انور — [illegible]
- [illegible] اشعار — [illegible] — [illegible]
- [illegible] — [illegible] — [illegible]

### انگریزی اردو میں اپنی قابلیت بڑھائیے

اردو انگریزی کی کتابیں اور ڈکشنریاں

- [illegible] پاکٹ ڈکشنری — انگریزی سے اردو ہندی — چار روپے
- مصباح اللغات — بیس روپے
- اردو ہندی ڈکشنری — بیس روپے
- کریم اللغات — مولوی کریم الدین — دو روپے ۵۰ پیسے
- اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری — عبدالحق — [illegible] روپے
- اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری — بارہ روپے
- لغات کشوری — [illegible] — [illegible]
- جامع اللغات — [illegible] روپے ۵۰ پیسے
- جیبی آکسفورڈ ڈکشنری — انگریزی سے اردو ہندی — [illegible]
- اردو ادبی لغات — آٹھ روپے
- فیروز اللغات جدید کلاں — چوبیس روپے
- فرہنگ [illegible] — سات روپے ۵۰ پیسے
- فیروز اللغات ملکی خورد — چھ روپے ۵۰ پیسے

## صنعت و حرفت

- الیکٹریکل انجینئرنگ بک — زبید ناظم — [illegible] روپے
- [illegible] — آٹھ روپے
- [illegible] — چار روپے ۵۰ پیسے
- موٹر [illegible] — [illegible] روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — [illegible]
- [illegible] — [illegible]
- [illegible] — ایک روپیہ
- [illegible] — دو روپے
- [illegible] — دس روپے
- [illegible] — [illegible]
- رہنمائے [illegible] — تین روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — چھ روپے
- ریڈیو [illegible] ٹیلیویژن [illegible] — آٹھ روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- چھوٹے [illegible] الیکٹرک [illegible] بنانا — تین روپے ۵۰ پیسے
- پریکٹیکل [illegible] پرنٹنگ [illegible] — سات روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — زبید ناظم — آٹھ روپے ۵۰ پیسے
- ریڈیو [illegible] — [illegible]
- ٹرانسفارمر گائڈ — چار روپے ۵۰ پیسے
- الیکٹرک موٹرز — آٹھ روپے
- [illegible] گائڈ — تین روپے
- [illegible] — تین روپے
- [illegible] گیان — چھ روپے
- پریکٹیکل گھڑی سازی — [illegible] — چار روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے

## خانہ داری

- [illegible] دسترخوان — [illegible] — [illegible] روپے
- [illegible] — [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] / [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] کا کام — چار روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — چار روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- اچار [illegible] — [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- حلوے [illegible] — چندر بھان [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — ایک روپیہ ۵۰ پیسے
- [illegible] / [illegible] انگریزی [illegible] — [illegible] — چار روپے
- کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں — دو روپے ۵۰ پیسے
- موم بتی کا کاروبار — دو روپے ۵۰ پیسے
- [illegible] — چار روپے



پتہ: رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 630/57 Regd. No. D 100

BISWIN SADI

21 ST. YEAR OF PUBLICATION

Telephones Office 271637 Residence 619927